جاسوسی ڈائجسٹ کا مشہور سلسلہ

ایک نوجوان کی اثر انگیز سرگزشت جو آزاد ہوتے ہوئے بھی قید تھا

کتابیات پبلی کیشنز۔ پوسٹ بکس-۲۳- کراچی-۱

جبّار توقیر

وہ بڑی خوفناک رات تھی سناٹوں سے لبریز۔ یہاں سے وہاں تک کہر میں لپٹی ہوئی سوگوار، ماتم گسار، گناہ گار کی آنکھ کی طرح جھکی ہوئی شرمسار رات اور میں آہستہ آہستہ اس رات کے کہر کی دبیز تہہ میں دھنستا چلا جا رہا تھا۔

ماں کے یخ بستہ الفاظ اب تک میرے کانوں میں سیسہ انڈیل رہے تھے۔ اس نے مجھے میرے بے بس ہونے کا طعنہ دیا تھا۔ اس نے اس رات بھی وہی بات کہی تھی جو وہ سالوں سے کہتی آ رہی تھی۔ اس نے کہا تھا "تیرا فائدہ ہی کیا ہے جیلانی تو بھی بے بس ہے اور میں بھی بے بس ہوں۔"

بڑی سڑک میرے گھر سے یہی کوئی دو فرلانگ دور ہو گی اور میں چل رہا تھا اس بڑی سڑک کی طرف جو بدن میں پھیلی ہوئی شریانوں میں خون کی طرح خدا معلوم انسانوں کو کہاں کہاں تک لئے پھرتی تھی۔

میرے قدم کبھی تیز ہو جاتے تھے اور کبھی سست۔ میرے ذہن کے تمام گوشے تاریک تھے اور اگر کوئی شے ان گوشوں میں سرسرا رہی تھی تو وہ تھے نوٹ۔ ایک لاکھ روپے کے سرسر کرتے، کڑکڑاتے شخ شخ بجتے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے نوٹ۔ یہ نوٹ مجھے اپنے لئے نہیں اپنی بہن آسیہ کے لئے چاہئیں تھے۔ ان کا مطالبہ میرے تایا جان نے کیا تھا۔ وہ میرے سگے تایا تو نہیں تھے۔ ذرا ایک آدھ پیڑھی پھلانگنی پڑتی تھی ان سے اپنے خون کا رشتہ ملانے کے لئے،

پھر بھی وہ میرے تایا تھے۔ وہ کسی دور میں ہم پر بہت مہربان رہتے مگر یہ جب کی بات ہے جب میرے ابا زندہ تھے اور ہمارے گھر پر ہُن برستا تھا اسی دور میں آسیہ کی منگنی میرے تایا زاد سے ہوئی تھی۔

مگر پھر ایسا ہوا کہ میرے ابا مر گئے۔ ہُن برسنا بند ہو گیا۔ اور ہم پیسے پیسے کے محتاج ہو گئے ہیں روٹیوں کے لالے پڑ گئے۔ تب مجھ پر یہ حقیقت عیاں ہوئی کہ مجھے اپنے خوابوں کے شیش محل سے نکلنا ہو گا۔ زندگی مجھ سے اپنا خراج مانگ رہی تھی۔

اس وقت مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں کس طرف جا رہا ہوں شاید اس رات میرے سر پر خون سوار تھا۔ میں کچھ نہ کچھ کر گزرنے کی دھن میں تھا۔ میرے ذہن کے خرابے میں سرخ آندھیاں چل رہی تھیں۔ اور میرے وجود میں کوئی پھنکارتا ہوا زہریلا جذبہ بیکراں ہوتا جا رہا تھا۔

اپنی ماں کا چہرہ بار بار میری آنکھوں میں ابھر رہا تھا۔ کچھ ہی دیر پہلے اس کی باتیں سن کر مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے کسی نے میرے سر سے باندھ کر بم کے فلیتے کو کھول دیا ہے بم دھماکے سے پھٹا ہے اور میرے پرخچے اڑ گئے ہیں۔ میرے سارے خواب چکنا چور ہو کر میرے چاروں طرف بکھر گئے تھے۔ ماں کو، میری اپنی بھولی ماں کو احساس تک نہ ہوا تھا، کہ اس نے اپنے بیٹے کو کس قدر اذیت پہنچائی ہے۔ میں نے اس کی باتیں سنیں تو مجھے اپنی سماعت پر اعتبار نہیں آیا...... اس کی پلکوں پر لرزتے آنسو میں نے دیکھے تو میرا سارا وجود کانپ گیا۔ میں نے اسے باہوں میں

لے کر دلاسا دینے کی کوشش کی تو وہ بلک بلک کر رونے لگی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا تار بندھ گیا تھا۔

مجھے ڈر تھا کہ اگر وہ کچھ دیر اور روتی رہی تو اس کی آنکھوں سے خون رسنے لگے گا۔ آنا پانی کہاں تھا اس کے دیدوں میں کہ وہ اسے اتنی فراخ دلی سے لٹا سکتی۔

مگر وہ ایک بیٹی کی ماں تھی۔ اس کا دکھ بے اتھاہ تھا۔

میں نے صرف اتنا کہا تھا۔ "ماں ذرا پھر سے بتا کہ تو کیا کہہ رہی ہے مجھے تیری بات پر اعتبار نہیں آتا۔"

اور بس میری یہ بات اس کے دل میں تیر کی طرح چبھ گئی تھی اس کے چھالے بہہ نکلے تھے۔

وہ بلکتی ہوئی بولی ——

"میں نے غلط نہیں کہا ہے بیٹے! مجھے آج ہی شکورن بتا کر گئی ہے۔ اسے تیرے تایا نے ہی بھیجا تھا اس نے کہا ہے کہ ہمیں آسیہ کو جہیز میں ایک لاکھ روپیہ دینا ہوگا ورنہ وہ ڈولی نہیں اٹھائے گا۔"

"وہ ایسا کیوں کہتے ہیں ماں؟ ہم نے ان کا کیا بگاڑا ہے آخر؟ کیا وہ ہمارے تایا نہیں ہیں۔ انہیں کیا نظر آتا ہے ہمارے گھر میں؟"

"ان کی آنکھوں پر لالچ کی پٹی بندھی ہے بیٹے۔ ان کا لڑکا... ایم بی بی ایس ہو گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں انہوں نے اس کی تعلیم پر لاکھوں روپے خرچ کر دیئے ہیں اور ہماری بیٹی محض بی اے ہے، محض بی اے۔ انہیں لیڈی ڈاکٹروں کے رشتے آ رہے ہیں۔ وہ بھلا ہم سے پانی کے کوڑے پر کیوں بات کرنے لگے؟ آسیہ کی ان کی نظر میں کوئی وقعت نہیں رہی۔"

"مگر ایک لاکھ روپیہ؟ سوچ تو ماں! یہ ہم کہاں سے دے سکیں گے؟"

"دے سکتے ہیں ہم مگر صرف اس صورت میں کہ ہم اٹھ کر سڑک پر جا بیٹھیں اور یہ مکان بیچ ڈالیں۔ یہی چاہتا ہے وہ تیرا تایا۔ وہ جمیل مرزا۔ یہی اس کی مرضی ہے۔" ماں نے چیخ کر کہا۔ "انہیں ایک لاکھ روپے کی ضرورت ہے بیٹے۔ انہیں بہو نہیں روپیہ چاہیے روپیہ۔ یہ روپیہ۔"

تب مجھے یاد آیا کہ ہم تو ان کی نظر میں بالکل ہی کنگلے ہیں.... فقیروں سے بھی بدتر۔ بھک منگے ہیں نرے بھک منگے ——

مگر میرے گھر میں بہار آتی تو کیونکر آتی۔ میں تو سیدھے سادے راستوں پر چلتا رہا تھا۔ دسویں کرنے کے بعد میں نے دو سال تک ٹیکسی چلائی اور مالک کا گھر بھرتا رہا۔ وہاں سے نکلا تو پولیس میں بھرتی ہو گیا۔ ساٹھ روپلی کا سپاہی —— وہاں سے میرا جی اچاٹ ہوا تو ٹائپ سیکھ کر ایک سرکاری دفتر میں جا بیٹھا۔ وہ کام مجھے کچھ اچھا لگا تو میں نے شارٹ ہینڈ میں [illegible] بھی حاصل کر لی

بہت مارا ماری کرنے کے بعد اس وقت میں آٹھ سو روپے تنخواہ لے رہا تھا۔ اور چھوٹی وہی تنخواہ میرا اوڑھنا بچھونا تھی۔ اس میں سے بوند بوند کر کے میری ماں نے تیرہ ہزار روپے جمع کر لئے تھے بہت تنگی ترشی سے گزر اوقات کی تھی ہم نے، تب کہیں جا کر اتنے پیسے جمع ہو گئے تھے۔

مگر اب جو پیچ میرے تایا صاحب ڈال رہے تھے وہ میرے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔

ماں کی باتیں سن کر، اس کی سسکیوں اور اس کی آنکھوں سے بندھے آنسوؤں کے تار دیکھ کر میرا دماغ الٹنے لگا اور میرے وجود میں اپنے گرد و پیش کے خلاف زبردست نفرت پیدا ہونے لگی۔ اس لمحے میرا جی چاہتا تھا میں اس شمر کو جلا کر بھسم کر دوں جو میری بہن کی میری اور میری ماں کی اتنی سی خوشی کی اتنی بڑی قیمت طلب کر رہا تھا ——

میری ماں مکان کو بڑی حسرت سے دیکھنے لگی۔ یوں جیسے وہ وہاں دو گھڑی کی مہمان ہے۔

"مکان۔ یہ مکان۔ میرے باپ دادا کی آخری نشانی۔ نہیں ماں! میرے تایا اس جمیل مرزا بلکہ اس ذلیل مرزا سے کہلا بھیجو کہ اسے ایک لاکھ روپیہ مل جائے گا۔ وہ آج سے ٹھیک پندرہ دن بعد بارات لے آئے اس سے بائیس تاریخ ہی تو مقرر کی گئی تھی۔ ہم اسے ایک لاکھ روپے دے دیں گے۔" میں نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔ یوں جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں جیسے کسی نے ایک لاکھ روپے کی رقم سامنے کھلے نوٹوں کی صورت میں دیوار پر پھیلا کر سجا رکھی ہے۔ اور میں اٹھ کر اسے سمیٹ لوں گا۔

"تم..... دیوانے ہو گئے ہو، جیلانی بیٹے! ہم بھلا اتنی بڑی رقم کہاں سے دیں گے؟" ماں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"دیں گے ماں ضرور دیں گے۔ ہم لڑکی والے ہیں۔ ہمیں ان کی بات ماننی پڑے گی۔ اور اگر ہم ان کے اس حکم کی تعمیل نہ کر سکے تو پھر...... پھر پتہ نہیں کیا ہو جائے ماں۔ انہیں کہلا بھیجو کہ ہم رقم ضرور دیں گے۔" یہ کہہ کر میں ماں کے سامنے سے اٹھ گیا۔

اپنے بازوؤں کی مچھلیوں میں سے مجھے مایوسی کی ایک تیز کٹیلی برچھی گزرتی محسوس ہوئی۔ میں نے اپنی پیٹی کو کمر پر اچھی طرح کس کر باندھا۔ جوتوں پر پڑی گرد کو جھاڑا۔ ایک نظر آئینے میں ڈالی۔ اپنے چاکسو ایسے سیاہ گھنگھریالے بالوں میں کنگھی کی، مکمل بدن پر لپیٹا، اور دراز میں سے اپنا چاقو نکال کر جیب میں رکھتے ہوئے میں برآمدے میں جا نکلا اور پھر صحن میں اتر گیا۔

آسیہ دائیں ہاتھ رسوئی خانے میں چولہے سے لڑ جھگڑ رہی تھی یہ جیتی ایسی اونچی لمبی شہتوت [illegible] بہن تھی میری۔ اس نے بی اے کا امتحان تو پاس کر لیا تھا مگر لگتا تھا کہ اس نے اپنے دماغ پر زیادہ بوجھ نہیں ڈالا۔ اپنی جان کو خوب ترو تازہ رکھتی تھی وہ ۔ یہ بڑی بڑی ولایتی مرغی کے انڈے ایسی آنکھیں تھیں اس کی۔ بال اس کے اتنے لمبے تھے کہ جتنا کوئی جھوٹ بول لے —— یہ گھٹنے تک لمبے اور وہ بھی گھنگھریالے۔ میرا خیال ہے کہ اگر ان کو استری پھیر دی جاتی اور ان کے بل نکال دیئے جائیں تو اس کے بال ایڑی تک اتر جاتے۔

مجھے اپنی بہن کی تعریف نہیں کرنی چاہیے مگر اصل بات یہ ہے کہ اس کے پردے میں میں اپنی ہی تعریف کر رہا ہوں۔ میرا قد چھ فٹ ایک انچ ہے اور وزن ایک سو اسی پونڈ۔ سینہ چوڑا چکلا، کمر پتلی، رانوں اور پنڈلیوں کا دم خم مجھے ہمیشہ یہ احساس دلاتا رہتا ہے کہ میں عام آدمی نہیں ہوں کسی بہت ہی اچھی نسل کا گھوڑا ہوں جس کو صحراؤں میں دوڑاؤ یا مرغزاروں میں وہ ایک ہی جیسی رفتار سے چلے گا۔ میں... شاہ گام تھا۔ یہی حال میری ہمشیرہ کا تھا۔ اسے دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ فطرت ابھی تک انسان پر مہربان ہے اور کسی نہ کسی پر اپنی بے پناہ فراخ دلی کا اظہار وہ ضرور ہی کر دیتی ہے۔

اور میں نے اپنی ایسی خوبصورت بہن کو شکیل مرزا کے حوالے کر دینے کا فیصلہ کیا تھا کیونکہ وہ ہمارا عم زاد تھا۔ ہمارا ہم پلہ تھا تعلیم یافتہ تھا، مہذب تھا مگر اب ہمارے اور اس کے درمیان ایک خلیج حائل ہو گئی۔ جو ایک لاکھ گز چوڑی تھی۔ نہیں ایک لاکھ گز نہیں بلکہ ایک لاکھ فرسنگ وسیع تھی اور مجھے یہ خلیج پاٹنا تھی۔ ہر حال میں اس دیوار کو ڈھانا تھا تاکہ میں اپنی بہن کے سامنے سرخرو ہو سکوں وہ یہ نہ کہے کہ اس کے ویر نے اس کا مان توڑ دیا ہے۔

بس یہی ایک برقی رو تھی جو بار بار میرے وجود میں سے گزر رہی تھی۔

میں صحن عبور کر کے گھر سے باہر نکل آیا۔ میں کچھ دیر اور ماں کے سامنے بیٹھا رہتا تو میرا دم گھٹ جاتا۔ میں دھماکے سے ٹوٹ کر بکھر جاتا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ ایک کڑی آزمائش میری منتظر تھی۔

میں اس روز اپنی تن سازوں کی مجلس میں بھی نہیں گیا۔ وہ میرا انتظار ہی کرتے رہے ہوں گے۔ یہی دسمبر کے یخ بستہ دن تھے۔ سورج پانچ ہی بجے چھپنے لگتا تھا اس وقت چھ بج رہے تھے اور باہر آہستہ آہستہ سڑکوں پر دھند اترنے لگی تھی۔ یہ ایک دبیز پردہ تھا جو آپ ہی آپ لوگوں کے درمیان تنتا جا رہا تھا اور مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ ایک اس سے بھی کہیں زیادہ دبیز پردہ میرے اور تمام دنیا کے اعلیٰ و ارفع اصولوں کے درمیان حائل ہوتا جا رہا ہے۔ ایک دھندلکا میرے اندر بھی پھیلتا جا رہا تھا۔

یارو! چھ ماہ پہلے میری بھی تو ایک [illegible] ہو گئی تھی۔ اور میں نے طے کر رکھا تھا کہ کھلا موسم آتے ہی میں شادی کر لوں گا——

فروری میں آسیہ کے ہاتھ پیلے کر کے مارچ کے آخر میں اپنی دلہن گھر لے آنے کا ارادہ تھا میرے ذہن میں تو ایک لاکھ روپے کے کسی ٹیڑھے میڑھے، الٹے سیدھے اونٹ نے کروٹ نہیں لی۔ میں تو ہر روز بسوں میں دھکے کھاتے ہوئے چھ میل دور اپنی ملازمت پر جاتا ہوں۔ میرے دماغ میں تو کبھی کسی اسکوٹر کا، کار کا، سواری کا، سسرال نچوڑنے کا خناس پیدا نہیں ہوا۔ حالانکہ وہ اچھے کھاتے پیتے قسم کے لوگ تھے۔ تاندلیانوالہ کے گھی فروشوں کی برادری ہے، بہرام پوری کھوجے ہیں وہ۔ بڑا روپیہ ہے ان کے پاس مگر میں نے کبھی نہیں چاہا تھا کہ ان میں سے کسی کو پکڑ کر سیخ میں پرو لوں اور آگ پر رکھ کر بھون لوں۔ ایک لاکھ روپے کی آگ پر رکھ کر اس کے کباب بنا لوں۔ نہیں یارو میں نے تو ایسی بات کبھی نہیں سوچی۔ میں تو ان کی سلمیٰ کو ان کا سب سے بڑا انعام اور احسان سمجھ کر گھر لانے کی سوچ رہا تھا پھر یہ کیا بات تھی کہ میری بہن پر انہوں نے ایک لاکھ روپے کی گالی چڑھا دی ہے۔ میں کہاں جاؤں؟ یارو کس سے انصاف طلب کروں؟

بڑی سڑک پر ٹیکسیوں، کاروں، سائیکلوں اور رکشاؤں کا ہجوم دم نہیں مارنے دیتا تھا اور میرے ذہن میں بگولے اڑ رہے تھے رہ رہ کر چاقو پر میری گرفت مضبوط ہوتی تھی اور میں اندر ہی اندر کسمسا کر رہ جاتا تھا۔ میرے وجود میں کوئی انجانا بھیدوں بھرا منہ زور جذبہ سر اٹھا رہا تھا۔ ایسا جذبہ جو میرے کاسۂ سر کو توڑ کر باہر نکل جانے کے لئے بے چین تھا۔ ایک لاوے کی طرح کھولتا ابلتا سیل بے پناہ بن جانے کے لئے بے قرار، بے چین، سیماب پا جذبہ اور میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ میں کیا کروں؟ کدھر جاؤں؟ میں ماں سے وعدہ تو کر آیا تھا مگر میں اسے پورا کیونکر کر سکتا تھا۔ کہاں سے وہ ایک لاکھ روپے مجھے مل سکتے تھے۔ میرے گھر میں اس لمحے تیرہ ہزار روپیہ موجود تھا۔ میں نے مزید نو ہزار روپے کا بندوبست بھی کر رکھا تھا۔ وہ میں دفتر سے قرض لے رہا تھا۔ چھ سات سال کی ملازمت نے وہاں مجھے اتنا حق دلا دیا تھا کہ میں ان سے دس بیس ہزار روپے قرض لے سکتا تھا۔ اور اب کی بار میں نے موٹر سائیکل خریدنے کے لئے قرضہ مانگا تھا۔ مجھے امید تھی کہ بس چار دن تک مجھے رقم مل جائے گی۔ میں خوش تھا کہ بیس بائیس ہزار روپے میں میں باعزت طریقے سے اپنی بہن کو ڈولی میں بٹھا کر اس کے گھر بھیج سکوں گا۔

مگر ماں نے میرے ماتھے پر یوں کھینچ کر پتھر مارا تھا کہ میں سارے کا سارا اپنے ہی خون میں ڈوب گیا تھا۔ یارو! دنیا میں کیا ایسا بھی ہوتا ہے؟ مگر وہاں کون تھا جو میرے اس سوال کا جواب دیتا۔

میری ضرورت منہ کھول کر مجھے سموچا نگل جانے کے لئے آگے بڑھ رہی تھی

اچانک ایک ٹیکسی میرے قریب آ کر رکی۔

"جانا ہے باؤجی۔"

میں نے ایک لمحے کے لئے توقف کیا اور پھر دروازہ کھول کر غڑاپ سے اندر بیٹھ گیا۔

"کہاں جائیں گے باؤجی؟"

"کہیں لے چل یار، کہیں بھی لے چل۔" میں نے کہا۔

ڈرائیور نے گردن گھما کر ذرا دلچسپی سے میرے چہرے کا جائزہ لیا اور مسکرایا، بولا۔۔۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے نا آپ کی باؤجی؟" اس نے سگریٹ منہ سے لگا کر تیلی سلگالی تھی۔

"ہاں یار طبیعت تو بالکل ٹھیک ہے تجھے کوئی شک ہے میری طبیعت پر؟" میں نے بھی جیب سے سگریٹ نکال کر سلگالیا۔

"میرا مطلب ہے باؤجی، کوئی نشے پانی کا قصہ تو نہیں ہے۔ آپ کو پتہ ہی نہیں کہ جانا کہاں ہے؟"

"بات یہ ہے کہ جس آدمی کی جوان بہن ہو اور اس کی شادی سے پندرہ دن پہلے اس کا ہونے والا سسر اس کے بھائی سے کہے کہ ایک لاکھ روپیہ دوگے تو تمہاری بہن کی ڈولی اٹھاؤں گا۔ تو اس آدمی کو تیرے خیال کے مطابق کہاں جانا چاہئے میرے یار؟" میں نے ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر پوری طرح پھیلتے ہوئے کہا۔ کمبل میرے ایک بازو پر سے پھسل کر نیچے گر گیا تھا اور ڈرائیور نے میرے بازوؤں کی مچھلیوں کی تڑپ دیکھ لی تھی، بولا۔

"پہلوان جی! ایسے آدمی کو یا تو میانی صاحب جانا چاہئے یا پھر..... یا پھر کسی کروڑپتی کی تجوری پر۔"

وہ خاصا سمجھدار آدمی تھا۔

"تو پھر کسی تجوری پہ لے چل مجھے پیارے۔۔۔" میں نے اور زیادہ پھیلتے ہوئے کہا۔

"کرایہ تو ہوگا آپ کے پاس؟"

"ہاں کیوں نہیں۔ اتنا بھی الو کا پٹھا نہیں ہوں۔ جتنا تو سمجھتا ہے پیارے۔ یہ دیکھ کئی سرخے سبزے جیب میں دھرے رکھے ہیں۔"

ڈرائیور نے گاڑی چلا دی۔

ذرا دیر کے لئے ہم دونوں خاموش ہوگئے۔ ایسے محسوس ہوا تھا کہ مکالمہ اس نے غلط پٹڑی پر چڑھا دیا تھا۔ کوئی دو فرلانگ چلنے کے بعد وہ بولا۔

"تو پھر آپ کو مال روڈ پر اتار دوں باؤجی؟"

"نہیں۔ تو مجھے یہاں سے سیدھا گلبرگ لے چل پیارے! وہاں میں اپنے ایک جگری یار سے مل لوں گا۔"

ڈرائیور مطمئن ہوگیا اور اس نے گاڑی کا رخ گلبرگ کی طرف موڑ دیا۔

میرا ذہن مسلسل چیخ رہا تھا اس لکڑی کی طرح جسے بھڑکتی آگ نے جھر جھر جلا ڈالا ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کہاں جاؤں۔ رہ رہ کر اپنی معصوم سی بھولی بھالی اونچی لمبی جیتی ایسی الھڑ الھڑ بہن کا چہرہ میری آنکھوں میں ابھرتا تھا۔ ایک طرف وہ دلہن بنی بیٹھی تھی دوسری طرف ڈولی دھری تھی مگر۔۔ درمیان میں ایک تپتی ہوئی لوہے کی چادر تھی۔ جو لحظہ بہ لحظہ سرخ ہوتی جارہی تھی۔۔۔ ایک لاکھ روپے کی قربانی مانگتی تھی وہ چادر۔۔۔ ٹھنڈی ہونے کے لئے۔ وہ بلیدان مانگتی تھی۔ میرا یا میری بہن کا۔ اور ہم دونوں تہی دست تھے۔ دونوں بدنصیبی کے ڈسے ہوئے تھے۔

ہمارا باپ بہت عرصہ پہلے ہمیں بے یار و مددگار چھوڑ کر اس دنیا سے منہ موڑ گیا تھا۔ ہماری ماں نے کڑی مشقتوں اور..... اذیت ناک محرومیوں کے خاردار جنگل سے گزر کر ہماری جان اور جسم کا رشتہ برقرار رکھا تھا۔ میں وقت سے بہت پہلے بالغ ہو گیا تھا۔ ماں کے درد کو میں اچھی طرح سمجھنے لگا تھا یہی وجہ تھی کہ وقت سے بہت پہلے دکھوں کی کڑی دھوپ میں جا کھڑا ہوا تھا اور اس رات میں نے جو ماں سے وعدہ کیا تھا کہ اسے ایک لاکھ روپیہ مل جائے گا تو وہ میری اسی بے پناہ محبت کا مظہر تھا جو مجھے اپنی ماں سے تھی اور اپنی بہن سے تھی۔ ان کے لئے تو مجھے کوئی کہتا کہ اس بستی کو آگ لگا دو تو خدا کی قسم میں ذرا دیر کے لئے بھی توقف نہ کرتا۔ اور اس رات تو میری ماں نے مجھ سے صرف ایک لاکھ روپیہ مانگا تھا۔

میں نے دل میں یہ بات طے کر لی تھی کہ میں یہ روپیہ صبح سے پہلے پہلے پیدا کرلوں گا خواہ مجھے اس کے لئے خون کا دریا ہی کیوں نہ عبور کرنا پڑے۔ میں دریغ نہیں کروں گا۔ میں اپنی یہ کڑیل جوانی اپنی بہن پر نثار کردوں گا۔ آخر میں کس دن کام آؤں گا... ان کے۔۔۔

ڈرائیور نے مجھے گورو مانگٹ کے قریب جا اتارا۔ وہ علاقہ ان دنوں کچھ زیادہ آباد نہیں تھا۔

میں نے اسے دس روپے کا نوٹ دیا اور ٹیکسی سے اتر کر سڑک پر جا ٹھہرا۔ ڈرائیور مجھے عجیب سی نظروں سے گھور رہا تھا۔ وہ کچھ نہیں بولا ٹیکسی موڑ کر اسی لمحے واپس چلا گیا۔ اسے یقین تھا کہ میں اپنے حواسوں میں نہیں ہوں۔ اگر پاگل نہیں ہوں تو شراب کے نشے میں نیم پاگل ضرور ہو چکا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اس نے میرے بارے میں قطعی طور پر یہی رائے قائم کی تھی۔

میرے چاروں طرف گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ دور۔ دور

تک مجھے سڑک پر کوئی راہگیر نظر نہیں آیا۔ میں بجری کے ڈھیر سے اترا اور گلبرگ کے دل کی طرف چلنے لگا۔ اس بستی کے اس مقام کی طرف بڑھنے لگا جو شہر کے لئے روشنی کا منبع ہے۔

میں اس وقت فلیٹ بوٹ پہنے ہوئے تھا۔ ہر شام تن سازوں کے کلب میں جانے سے پہلے میں یہی بوٹ پہن لیتا تھا۔ ایک واللہ ماری جینز تھی میرے پاس۔ وہ میں نے ولایتی نقیروں کی پیروی کرتے ہوئے بڑے فخر سے چڑھا رکھی تھی۔ ایک آدھی آستین کی جرسی سی تھی سرمئی رنگ کی۔ وہ مجھے بہت عزیز تھی۔ وہ میں اس لمحے پہنے ہوئے تھا۔ عزیز مجھے وہ جرسی یوں تھی کہ وہ سلمیٰ نے بھیجی تھی میرے لئے اپنی چھوٹی بہن کے ہاتھ۔ اور..... اور۔

...یار یہ بھی تو دیکھو کہ وہ کتنی بڑی چیز تھی میرے لئے۔ ایسی ہی تو دو چار خوشیاں ہوتی ہیں زندگی میں۔ ننھی منی سی بے وقعت حقیر سی، بے بضاعت نظر آنے والی باتیں جو پھیل کر بے کراں ہو جاتی ہیں۔ جن کے وقوع پذیر ہو جانے سے ایسے رنگ ذہن میں ابھرتے ہیں کہ آدمی کی ساری سوچ رنگین ہو جاتی ہے۔

ایسی ہی جرسی تھی وہ۔ اور میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ مجھے سجتی بھی بہت تھی۔ میرا چوڑا چکلا سینہ۔ یہ بھرے بھرے ورزشی بازو، یار مجھے کہہ لینے دو کہ میں اپنی ہی محبت میں گرفتار تھا۔ کیا حرج ہے اس میں؟ میں خود کو واقعی بہت خوبصورت طرحدار، مضبوط اور بے مثال سمجھتا تھا۔ میں جو مجید مرزا کا بیٹا ہوں۔ اس مجید مرزا کا جس نے میرا نام غلام جیلانی مرزا رکھا اور جس نے میری پیدائش پر اتنی خوشی منائی تھی کہ وہ ایک ہندو بنئے کا دو ہزار روپے کا مقروض ہو گیا تھا۔ اور یہ جب کا قصہ ہے جب وہ سہارن پور کے قریب پردیلی تعلقے میں رہتا تھا اور نہیں جانتا تھا کہ ایک دن اسے اپنے ایمان کو بچانے کے لئے وہ سب کچھ چھوڑ کر ہجرت کرنی پڑے گی۔

میں چلتا رہا۔ اندھیرے میں۔ اجالے میں۔ کبھی کسی کھمبے کی روشنی مجھے آغوش میں لے لیتی لیکن پھر اندھیرا نگل لیتا۔ یہی ہوتا چلا گیا میں اس سوچ میں گم تھا کہ پاؤں دائیں طرف بڑھاؤں کہ بائیں طرف۔۔۔ میں کوئی دس بارہ میل چلا ہوں گا۔ اس رات ادھر ادھر کبھی جنوب میں کبھی شمال میں۔ میں دراصل کسی شے کی تلاش میں تھا۔ کسی ایسی شے کی تلاش میں جس پر میں ذرا دباؤ ڈالوں تو وہ.... ایک لاکھ روپے کے کرنسی نوٹوں میں ڈھل جائے۔ بس میں یہی چاہتا تھا کوئی آسان سا حربہ۔ کوئی غیر مرئی سا معجزہ۔۔۔

رات کے نو بج گئے۔ میری گھڑی نے کبھی مجھے دھوکا نہیں دیا۔ میں بہت تھک گیا تھا۔ گھڑی کے ریڈیم کے ڈائل نے مجھے جب بتایا کہ جیلانی مرزا نو بج گئے ہیں اور...... تو ابھی تک یونہی ڈھیلا ماجا لئے پھرتا ہے تو میرے قدم سینما کی طرف اٹھ گئے۔ میں نے ٹکٹ لیا اور اندر جا بیٹھا۔

وہاں ایک واہیات سی بے مغز لوگوں کی بنائی ہوئی بے تکی سی فلم چل رہی تھی۔ وہ میں نے رات کے ایک بجے تک دیکھی۔ اور آدھی رات کو میں سینما ہال سے نکل کر ایک بار پھر سڑک پر آگیا۔

بیس سگریٹوں کے پیکٹ میں سے میں آٹھ سگریٹ پی چکا تھا اور ابھی بات خطرے کے نشان سے ادھر ہی تھی۔ ابھی کافی سٹاک تھا میرے پاس۔

ایک کوٹھی کا نقشہ ٹھہر ٹھہر کر میرے ذہن میں ابھرتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ گلبرگ کا کون سا بلاک ہے اور اس کوٹھی کا نمبر کیا ہے؟ میں جان بوجھ کر وہاں رک گیا۔ اس کی ساخت اتنی دلفریب تھی اور اس کے چمن زار سے اس لمحے اتنی عطر بیز خوشبوئیں اٹھ اٹھ کر گرد و پیش کو مہکا رہی تھیں کہ میں مدہوش سا ہو گیا۔ میرا دل چاہا کہ میں اس دلآویز کوٹھی کے مالکوں کی خوش نصیبی میں شریک ہو جاؤں۔

ایک تاریک کونے میں رک کر میں احاطے کی دیوار پھاند کر چمن زار میں جا پہنچا۔ یہاں سے وہاں تک لان میں پھل دار اور خوشبودار درخت اور پودے اُگے ہوئے تھے۔

میں نے محسوس کیا کہ میرا دل میرا ساتھ دے رہا ہے۔ میری زندگی کا وہ پہلا موقع تھا کہ میں نے کسی کی چاردیواری کی یوں بے حرمتی کی تھی مگر محسوس مجھے یوں ہو رہا تھا جیسے میں سرشار ہوا جاتا ہوں میرے رگ و پے میں عجیب سی سرمستی کی لہریں اٹھنے لگی تھیں۔ تب میں نے جانا کہ وہ راستہ جس پر اس رات میں نے پہلا قدم دھرا تھا۔ میرے لئے بڑا ہی لذت انگیز تھا۔ حیرت ہے کہ مجھے زندگی کے چھبیس سال گزار لینے کے باوجود یہ احساس نہ ہوا کہ وہ راستہ میرے لئے سب سے زیادہ دلفریب راستہ ہے۔

میں اونچے اونچے پھیلے ہوئے پودوں اور درختوں کی اوٹ میں سے ہو کر عمارت کے جنوبی حصے میں جا پہنچا۔ وہ بہت بڑی کوٹھی تھی اور تہہ در تہہ کمرے بنے تھے اس میں۔ مدور انداز میں۔۔۔

میں ایک کونے میں دبکا کھڑا تھا کہ اچانک مجھ سے کوئی شے ٹکرائی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو..... تو حیران رہ گیا۔ وہ کتا تو ہرگز نہیں تھا۔ وہ اتنے زور میں آیا تھا اور مجھ سے ٹکرا کر اپنی ہی جھونک میں سیدھا دیوار میں جا لگا تھا۔

وہ چیتا تھا۔۔۔ پالتو چیتا۔۔۔ اف میرے اللہ۔ میں اپنی زندگی کے اس لمحے کو کبھی بھی فراموش نہ کر سکوں گا۔ وہ وحشی بے آواز آیا تھا میں نے اپنا چودہ انچ پھل کا چاقو سیدھے ہاتھ میں لے لیا۔ وہ درندہ دیوار میں لگتے ہی پلٹا اور لپٹ کے قد سے اچھل کر مجھ پر آگرا۔ میں نے بائیں ہاتھ سے اس کی ایال پکڑ کر اس کے کھلے منہ سے اپنے بدن

کو بچاتے ہوئے چاقو اس کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ وہ بلاخیز انداز سے گرجا۔ اس کی گھن گرج میں درد سے نڈھال ہوتے ہوئے بدن کی گونج سنائی دیتی تھی۔ اس نے اپنی پوری قوت سے اپنے دونوں اگلے پنجے میرے سینے پر مارے مگر درمیان میں میرا کمبل آ گیا۔ جو پھیل کر یونہی بے ارادہ اس کے منہ پر جا پڑا۔ میں نے چاقو کھینچ کر تابڑ توڑ انداز میں تین چار بار اس کے پیٹ اور سینے میں دھنسا دیا۔ اور....
وہ خوفناک انداز سے چیختا ہوا زمین پر جا رہا۔ میرا سارا کمبل اور ہاتھ اس کے خون میں لتھڑ گئے۔

اچانک مجھے دائیں طرف برآمدے کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی ایک عورت لپک کر برآمدے میں آ گئی۔ اس کے ایک ہاتھ میں پستول تھا۔ اور دوسرے ہاتھ میں ٹارچ۔ میں بالکل اندھیرے میں کھڑا تھا۔

وہ باہر نکلتے ہی پکاری۔

"موتی، موتی ـــ" وہ اس کے چیتے کا نام تھا۔ وہ سرخ رنگ کا گاؤن پہنے ہوئے تھی۔ ایسا گاؤن جس کی آستینیں نہیں تھیں اس کے وہ چمکتے ہوئے سونے ایسے ننگے بازو دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے وجود میں زلزلہ آ گیا ہے۔ اس کے سنہری بال شانوں تک کٹے ہوئے تھے جنہیں وہ عجب انداز دلربائی سے دائیں بائیں جھٹک رہی تھی ـــ

"موتی! کیا ہوا تمہیں موتی؟"

وہ بلا جھجک آگے بڑھتی چلی آئی۔ ٹارچ کی روشنی اس نے اس سمت پھیری تھی جدھر سے اسے چیتے کی وہ ہولناک آوازیں سنائی دی تھیں۔

میں تیزی سے پیچھے ہٹا اور دو قدم دور ایک قدِ آدم پودے کی گھنی شاخوں کے پیچھے جا ٹھہرا۔

وہ لپکتی ہوئی آگے بڑھی مگر چیتے کے پاس پہنچ کر وہ کچھ ایسی دہشت زدہ ہوئی کہ چیختی ہوئی پیچھے دوڑی۔

"اوہ نو.... نو۔ موتی نو۔ حیدر، حیدر کہاں ہو تم؟ اوہ مائی گاڈ۔ موتی مارا گیا۔ او حیدر، مائی گاڈ۔"

یہ کہتی ہوئی وہ دوڑتی ہوئی گئی اور دروازہ کھول کر کمرے میں جا گھسی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اندر سے چٹخنی چڑھنے کی آواز صاف سنائی دی۔

برآمدے میں دو بلب روشن تھے۔ اتنے روشن کہ سوئی پھینکو اور پکڑ لو ـــ

میں دبے پاؤں آگے بڑھا۔ اندھیرا وہاں بہت دبیز تھا۔ میں نے چیتے کے پاس پہنچ کر ذرا دیر کے لئے توقف کیا اور پھر چیتے کو دیکھنے کے لئے کمبل کی اوٹ میں لائٹر جلایا۔ چیتا مر چکا تھا اور آڑا ترچھا میرے سامنے پڑا تھا۔ مگر وہ روشنی میری دشمن بن گئی۔ مجھے اپنے پیچھے شیشے کے تڑاخ سے ٹوٹنے اور گولی چلنے کی آواز سنائی دی میں شیشے کے تڑخنے کے ساتھ ہی نیچے بیٹھ گیا۔ ایک ثانیے کے ہزارویں حصے میں میں نے خود کو نیچے گرا لیا تھا۔ اور وہی میری کوشش مجھے بچا گئی۔ ایک بار پھر شیشہ جھناکے سے ٹوٹا۔ اب کی بار کھڑکی کے دوسرے شیشے کی راہ سے گولی چلائی گئی تھی۔ مگر میں سنبھل چکا تھا۔ زمین پر لیٹے لیٹے میں اس طرح گھاس پر رینگتا ہوا آگے بڑھا کہ اب میں کھڑکی کے پیچھے سے چلتے ہوئے پستول کی زد سے باہر نکل چکا تھا۔

پستول کی تین اور گولیاں یکے بعد دیگرے میری سمت چلائی گئیں مگر میں بچ گیا میرے اور اس گولی کے زاویے بہت مختلف تھے۔

میں صورتحال کا اچھی طرح اندازہ کر چکا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میں نتالی کے جاگیرداروں کی کوٹھی میں ہوں جس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہاں نتالی والوں نے اپنی حفاظت کے لئے چیتا پال رکھا ہے جسے وہ رات کو کھلا چھوڑ دیتے ہیں۔

وہ کوٹھی بیس کنال رقبے پر پھیلی ہوئی تھی اور وہ چیتا ایسا سدھایا ہوا تھا کہ کسی طرح بھی اس چاردیواری سے باہر نہ..... نکلتا تھا ـــ

صرف نتالی والوں نے ہی وہاں چیتا نہیں پال رکھا تھا بلکہ میں نے سن رکھا تھا کہ گلبرگ میں اور بھی کئی خاندان ایسے ہیں جنہوں نے چیتے پال رکھے ہیں۔ ان کو وہ رات کے وقت اپنی اپنی کوٹھیوں میں کھلا چھوڑے رکھتے ہیں اور کسی کی مجال نہیں ہے کہ وہ ان کوٹھیوں کی طرف نظر بھی اٹھا سکے۔ یہ بھی مشہور تھا کہ ڈھالوں کی کوٹھی میں ایک چیتے نے دو چوروں کو ہلاک کر دیا تھا۔

اور اس رات میں نتالی والوں کی کوٹھی میں ایسی ہی صورتحال سے دوچار تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ چاقو اس روز میرے پاس محفوظ تھا اور میں نے دو چار ہاتھ چاقو پر آزما بھی رکھے تھے۔ ورنہ تو اس رات میں اس چیتے کا نوالہ بن گیا ہوتا۔

میں اب اس سوچ میں گم تھا کہ وہ عورت جو بلاشبہ گھر میں تنہا ہے پولیس کو ٹیلی فون پر اطلاع ضرور دے گی۔

جونہی یہ خیال میرے ذہن میں آیا۔ میں نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا ـــ ٹیلی فون کا تار شرقی سمت سے کوٹھی میں آ رہا تھا اور ایک جگہ چھ فٹ کی بلندی پر کمرے میں داخل ہوتا تھا۔ میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر چاقو سے اس تار کو کاٹ دیا۔

تار کاٹتے وقت مجھے گھر گھر کی آواز صاف سنائی دی۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی تھوڑے ہی فاصلے پر فون کے نمبر گھما رہا ہے۔ ذرا سی تاخیر ہو جاتی تو میرا ستیاناس ہو جاتا۔ وہ عورت پولیس کو اسی وقت خبردار کر چکی ہوتی مگر ایسا نہیں ہو سکا۔

یہ بات اب ثابت ہو چکی تھی کہ گھر میں کوئی اور ذی روح موجود نہیں تھا ـــ عورت تنہا تھی مگر مسلح۔ اور ابھی تک مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں اندر کس راستے سے داخل ہو سکتا ہوں؟

جونہی میں نے تار کاٹا وہ عورت جھلا گئی۔

"اوہ مائی گاڈ ـــ یہ حیدر بھی پتہ نہیں کہاں مر گیا ہے؟"

یہ کہہ کر اس نے شاید ریسیور زور سے کریڈل پر پٹخ دیا۔ کھڑکیوں کے شیشے اندھے تھے اور ان میں سے اندر کی کوئی شے دیکھی نہیں جا سکتی تھی ـــ

مجھے محسوس ہوا کہ وہ عورت اس کمرے سے نکل کر دوسری طرف جا رہی ہے۔ اچانک مجھے سامنے کوٹھی کے بڑے دروازے پر ایک آدمی نظر آیا۔ اس نے بڑی آہستگی سے دروازے کے جنگلے کے اندر ہاتھ ڈال کر تالا کھولا اور پھر کوئی آواز پیدا کئے بغیر وہ دروازہ بند کر کے عمارت کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ تاریکی میں تھا اور مجھ سے یہی کوئی دس ہاتھ دور۔ اس کی چال بتاتی تھی کہ وہ لنگڑا ہے۔ میں نے ایک جست لگائی اور ایک دم اس کے پیچھے پہنچ کر چاقو کی نوک اس کی گردن میں چبھو دی۔

"خبردار ـــ منہ بند رکھو حیدر، ورنہ جان سے مار دوں گا۔" وہ دوہرے جثے کا خاصا تنومند آدمی تھا۔ اس کی عمر یہی کوئی چالیس سال کے لگ بھگ ہو گی۔ مگر میری آواز اور اپنا نام سن کر وہ لرزنے لگا۔ اس کی تو گھگھی بندھ گئی۔

"ت... ت.... تم کون ہو بھیا؟"

"میں تیری ماں کا یار ہوں بیٹے۔ دیکھ میں جس طرح کہتا ہوں اسی طرح کر ـــ کیا نام ہے تیری مالکن کا؟"

"اس کا نام عالیہ ہے۔"

میں نے چاقو کی نوک پر ذرا اور دباؤ ڈالا۔

"مجھے اس تک لے چل۔ تو سامنے کے دروازے میں سے اندر جاتا ہے یا کسی اور طرف سے؟"

"میرا راستہ دوسری طرف سے ہے۔ میں مالکن کو اس وقت نہیں جگاتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں بھی سامنے کے دروازے سے نہیں جانا چاہتا. چل ـــ"

وہ میرے آگے آگے چل دیا۔ میں نے اسے لان کے اندر ہی پختہ روش سے اتار کر تاریکی میں دھکیل دیا۔ وہ چلتا رہا۔ اس نے پورچ کی طرف جانے کے بجائے کوٹھی کی مغربی سمت کا رخ کیا اور درمیان میں پہنچ کر ایک دروازے کے سامنے رک گیا۔ ہم نے یہ سارا فاصلہ اندھیرے میں طے کیا اور اب بھی ہم اندھیرے میں کھڑے تھے۔

"بلا آواز دروازہ کھول ـــ خبردار ـــ کوئی گڑبڑ نہیں چلے گی۔"

میں نے اسے خوفناک لہجے میں دھمکی دی۔

میں اس وقت تک کوئی پیشہ ور مجرم نہیں تھا۔ میری تمام تر حیات میں قیامت کا ہنگامہ برپا تھا۔ میں وہ سارے اسباق بھول چکا تھا جو میری ماں نے اور میرے مرحوم باپ نے پڑھائے تھے۔ میں ہر شے کو فراموش کر چکا تھا میں صرف یہ چاہتا تھا کہ اس کوٹھی میں سے مجھے ایک لاکھ روپیہ مل جائے اور میں اپنی بہن کے سامنے سرخرو ہو جاؤں۔

حیدر نے دروازہ کھولا تو میں اس کے ساتھ ہی اندر گھس گیا۔ چاقو کی نوک میں نے اس کی گردن میں پیوست کر رکھی تھی۔ میں اسے ذرا سی بھی مہلت نہیں دینا چاہتا تھا۔ میں نے اس رات اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے اپنی ساری زندگی داؤ پر لگا دی تھی اور میں نے طے کر لیا تھا کہ اگر میں کامیاب ہو گیا تو میرا وہ پہلا جرم آخری جرم ہو گا۔ پھر میں اپنی زندگی کی بڑی سے بڑی ضرورت کے لئے بھی کبھی غلط راہ پر قدم نہیں رکھوں گا۔

حیدر نے کمرے میں داخل ہوتے ہی بتی جلا دی۔ وہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ جس میں اس نے ایک طرف اپنا بستر ڈال رکھا تھا۔ اور دوسری طرف اپنا ٹرنک، میز کرسیاں بھی ایک طرف لگا رکھی تھیں اس نے ـــ اور ادھر ادھر الماریوں کے خانوں میں خاصی صاف ستھری چیزیں موجود تھیں جو اس کی خوشحالی کی غماز تھیں۔ اس کمرے کا دروازہ عمارت کے اندر کی طرف کھلتا تھا۔

"چل مجھے اندر لے چل۔" میں نے سرگوشی کی۔

اس کمرے میں اندر کی طرف دروازے کے اوپر کوئی روشن دان نہیں تھا۔ بلب کی روشنی عالیہ نے شاید دروازے کی درز میں سے دیکھ لی تھی۔ وہ اپنے سلیپر سٹرپٹر گھسیٹتی ہوئی اس دروازے تک آ پہنچی۔

"حیدر، تو کہاں مر گیا تھا خبیث! میں تو برباد ہو گئی۔ کسی نے موتی کو ہلاک کر دیا ہے۔"

حیدر کا رنگ پیلا پڑ گیا۔

"کیا کہا بی بی! وہ چیتا مر گیا ہے؟" وہ بڑبڑایا۔

دروازے کی دوسری طرف عالیہ کھڑی تھی۔

"ہاں۔ کوئی ایسا خونخوار چور تھا کہ اس نے چیتے کو مار دیا، وہ تو میری خوش قسمتی تھی کہ میں بچ گئی ورنہ وہ تو اندر ہی آ جاتا۔" عالیہ کی آواز بہت حیران تھی اور اس کے لب و لہجے میں نسوانیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ بڑی رنگ عورت معلوم ہوتی تھی۔

"دروازہ تو کھول بدبخت...."

میں نے اس کی یہ بات سنتے ہی حیدر کو ٹھوکا دیا۔ اس نے چٹخنی کھولی تو میں نے دیکھا کہ عالیہ کے دائیں ہاتھ میں پستول ہے مگر اس کا وہ ہاتھ نیچے جھول رہا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ چور حیدر کے کمرے میں موجود ہے۔ میں نے بجلی کی سی سرعت

سے چاقو اس کے سینے سے لگایا اور ساتھ ہی بائیں ہاتھ میں اس کی کلائی دبوچ کر پیچھے دھکیلی اور کچھ اتنے زور سے جھٹکا دیا کہ پستول اس کے ہاتھ سے گر گیا۔

پستول کے زمین پر گرتے ہی میں نے عالیہ کی کلائی مروڑ کر کمر سے لگا دی۔ اب میں حیدر کے کمرے سے نکل کر کوٹھی کے اندر ہی... راہداری میں تھا ـــــ میں نے نیچے جھک کر عالیہ کا پستول اٹھا لیا۔

"حیدر اگر تم نے کوئی حرکت کی تو گولی مار دوں گا۔ اپنے کمرے سے باہر نکل آؤ"

حیدر کا رنگ خوف کی وجہ سے ہلدی ہو رہا تھا۔ وہ لرزتا ہوا راہداری میں آیا تو میں نے کہا۔

"تم دونوں ادھر چلو۔ مجھے بتاؤ میڈم کہ تمہارا مال کہاں رکھا ہے؟"

راہداری کے بلب کی روشنی میں میں نے دیکھا کہ عالیہ میرے پستول سے، میرے چاقو سے اور میرے لہجے کی ہولناکی سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوئی تھی۔ وہ بالکل پرسکون نظر آتی تھی۔

"سنا نہیں تم نے؟" میں نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"کیا چاہتے ہو تم؟" اس نے اپنی وہ آئینہ سی بڑی بڑی صاف شفاف آنکھیں پوری طرح کھول کر یوں مجھے دیکھا جیسے وہ میری صورت ذہن نشین کر رہی ہو۔

"مجھے مال چاہیے مال۔" میں نے اسے خوف زدہ کرنے کے لئے بائیں ہاتھ سے ایک بھرپور تھپڑ اس کے بائیں رخسار پر مارتے ہوئے کہا۔ وہ تیورا کر دیوار سے جا لگی۔

حیدر اتنا خوف زدہ ہوا کہ میرے کہے بغیر ہی اس نے ہاتھ اوپر اٹھا لئے۔ وہ اس لمحے بہت ہی مضحکہ خیز نظر آ رہا تھا۔

عالیہ کے منہ سے خون رسنے لگا۔ اس کے ہونٹ تر ہونے لگے۔ اسے شاید گہری چوٹ آئی تھی۔ اس نے خون کو اپنی انگلیوں سے پونچھنے کی کوشش کی مگر وہ چوٹ کچھ ایسی گہری تھی کہ خون زیادہ بہہ نکلا تھا۔ اس نے اپنے سکرٹ نما گاؤن کا دامن اوپر اٹھا کر منہ صاف کیا

مجھے یقین ہے کہ اس نے عمداً ایسا کیا تھا۔ وہ مجھے رشوت پیش کر رہی تھی ـــــ

حیدر کا رخ دیوار کی طرف تھا اور ہاتھ اس نے ابھی تک اوپر اٹھا رکھے تھے۔

"چلو جلدی کرو ـــــ میرے پاس تمہارے جلوے دیکھنے کی فرصت نہیں ہے۔ چلو ـــــ" میں نے ایک اور تھپڑ اس کے دائیں رخسار پر جڑ دیا۔

اس کی وہ بلا خیز خود اعتمادی کی دیوار لرزنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو ابلے اور ایک تار ہو کر رخساروں سے ہوتے ہوئے نیچے گرنے لگے۔

"چلو ـــــ" اب کی بار میں نے جیب سے کھلا چاقو نکالا اور تو بائیں ہاتھ میں لے کر اس کی نوک سے اس کے بازو پر ایک لکیر ڈال دی۔ اس لکیر کے ساتھ ہی خون پھوٹ نکلا۔ یہاں سے وہاں تک۔ چاقو کی نوک بہت تیز تھی اور اس کی جلد متصور سے زیادہ نرم اور پتلی تھی ـــــ وہ ذرا دیر کے لئے اس خون کو دیکھ کر لرزی اور پھر ریلتی ہوئی میرے آگے چلنے لگی۔ اس نے راہداری میں دو دروازے عبور کئے۔ حیدر اس کے پیچھے تھا۔ تیسرا دروازہ مجھے جو نظر آیا وہ بیت الخلاء کا دروازہ تھا اور کھلا ہوا تھا۔

"حیدر!" میں نے بلند آواز سے کہا۔

وہ دونوں رک گئے۔

"چلو تم ادھر اس ڈربے میں گھس جاؤ۔ چلو..." میں نے حیدر کو اس کے کوٹ سے پکڑ کر بیت الخلاء میں دھکیل دیا۔ وہ تو شاید یہی چاہتا تھا۔ چپ چاپ اندر جا ٹھہرا۔ وہ بہت صاف ستھرا، سفید ٹائلوں سے مزین بیت الخلاء تھا۔ جس کا اندر سے کسی اور کمرے کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا۔ حیدر اندر پہنچا تو میں نے بائیں ہاتھ سے دروازہ بند کر کے باہر سے چٹخنی چڑھا دی۔

عالیہ کے منہ سے اب بھی خون رس رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر اسی بے ہودہ انداز سے گاؤن کا دامن اٹھا کر میرے سامنے اپنے ہونٹ پونچھے۔

"چلو مجھے مال دکھاؤ۔ سیف کہاں ہے تمہارا؟" میں نے اپنے وجود میں امنڈتے ہوئے جذبات کے طوفان سے بے چین ہو کر کہا ـــــ

وہ مسکرائی اور رخ پھیر کر میرے آگے آگے چل دی۔ لگتا تھا جیسے وہ مجھے خود میری منزل تک پہنچانے کے لئے بے قرار ہے۔ ڈر اسے یہ تھا کہ میں اسے گولی نہ مار دوں ورنہ میرا خیال ہے کہ مال دے دینے میں اسے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اس کا رویہ ایسا ہی تھا۔

میرے بدن میں قیامت کا ہنگامہ بپا ہو چکا تھا۔ اور نسوں میں ایسا تشنج پیدا ہو رہا تھا کہ لگتا تھا اگر یہی کیفیت چند سے اور طاری رہی تو میں پھٹ جاؤں گا میرے بدن کی سرحدوں پر میری نبضیں دھڑ دھڑ بج رہی تھیں۔

مجھے اس گشتی عورت نے زبردست آزمائش میں ڈال دیا تھا۔ اس کی کمر کسی شاعر کا تخیل معلوم ہوتی تھی۔ وہ ایسی نہ تھی کہ اسے نظر انداز کیا جا سکتا۔ وہ ساری کی ساری کسی خوبصورت سانچے میں ڈھلی لگتی تھی۔ اگرچہ اس کی عمر میرا خیال تھا یہی کوئی پچیس سال ہو گی مگر اسے معلوم تھا کہ بدن کے کس حصے کو کس وقت حرکت میں لانا چاہئے۔

راہداری میں چند قدم آگے چلنے کے بعد وہ دائیں ہاتھ کے کمرے میں جا گھسی۔ میں بھی اس کے پیچھے تھا۔ پستول کی نال سیدھی میں نے

اس کے شانے سے لگا رکھی تھی۔

وہ اس کی خواب گاہ تھی میرے تصور سے بھی زیادہ خوبصورت۔ اس میں جا بجا بڑے بڑے قد آدم آئینے دیواروں میں لگے تھے۔ کمرے کے عین بیچ میں ایک بہت بڑا پلنگ بچھا تھا۔ جس کی نرمی کا شاید تصور کیا جا سکتا تھا۔ کمرے کی ہر شے پیلے رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ بالکل اس کے اپنے بدن کی سونے ایسی پیلاہٹ کی طرح وہاں کی ہر شے اسی کے رنگ میں رنگی نظر آتی تھی۔

ایک کونے میں ایک چھ فٹ اونچا سیف رکھا تھا۔

"کتنا مال چاہئے تمہیں؟"

اس نے کمرے میں پہنچ کر ایک آئینے کے سامنے رکتے ہوئے کہا۔

"مجھے سارے کا سارا مال چاہئے جو اس وقت تمہارے پاس ہے۔"

وہ مسکرا رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں سے اب خون نہیں رس رہا تھا۔

"میرے سمیت؟"

"تمہاری ضرورت نہیں ہے مجھے۔ سیف کی چابیاں کہاں ہیں؟"

"وہ رہیں چابیاں۔ وہ ادھر میرے بیڈ کے نچلے حصے میں بنے ہوئے خانے میں پڑی ہیں۔"

"مجھے وہاں سے خود نکال کر دو۔"

"بہتر ہے۔" یہ کہہ کر وہ اپنے مہاگنی کے بنے ہوئے پلنگ کے سرہانے کی طرف بڑھی۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ مجھ سے کوئی نہ کوئی داؤ ضرور کھیلے گی مگر ایسا نہیں ہوا۔

میں عین اس کے سر پر کھڑا تھا۔ اس نے پلنگ کے نچلے خانے کی دراز کھول کر وہاں سے چابیاں نکالیں۔ وہ چھ چابیوں کا گچھا تھا۔ وہ رقص کے سے انداز میں گھوم کر اٹھی اور میری طرف چابیاں بڑھا کر بولی ـــــ

"لو ـــــ سیف کھول کر جو چاہے لے جاؤ مگر اس ڈرامے کو مختصر کر دو ـــــ"

اب کی بار اس کی آواز میں عجیب سی کرختگی جھلک رہی تھی جیسے وہ مجھے حکم دے رہی ہو ـــــ

"نہیں۔ تم خود سیف کھولو گی۔"

"اس کی تین چابیاں آگے کی طرف لگتی ہیں اور تیسری چابی کے ساتھ ہی چوتھی چابی لگنی چاہئے۔ یہ چوتھی چابی ہے اور یہ سیف کے دائیں حصے میں لگتی ہے۔ اسے کھولنے کے لئے ہمیشہ بہت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ یہ سیف خراب ہو سکتا ہے۔ لو تم تین چابیاں لگاؤ۔ یہ تین میں لگاتی ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے گچھے میں سے تین چابیاں نکال کر مجھے دے دیں۔ مجھے اس کی بات تسلیم کر لینے میں کیا تامل ہو سکتا تھا۔

میں نے بائیں ہاتھ سے تین چابیاں پکڑیں اور سیف کے سامنے جا ٹھہرا۔ میرے پستول کا رخ اب اس کے سینے کی طرف تھا۔ میرا خیال ہے کہ اگر میں اپنے ہاتھ کی صرف ایک انگلی سیدھی کر کے اس کے سینے میں مار دیتا تو وہاں سوراخ ہو جاتا۔ ایسی ہی بے پناہ نرمی نظر آتی تھی مجھے اس کے بدن میں۔

میں نے بائیں ہاتھ سے ایک ایک کر کے دو چابیاں لگا دیں جب تیسری چابی میں نے سیدھی کی تو وہ سرک کر سیف کے دائیں ہاتھ جا ٹھہری ـــــ بولی ـــــ

"لو اب تیسری اور چوتھی چابی ہم بیک وقت لگائیں گے۔"

یہ کہہ کر اس نے چوتھی چابی سیف کے دائیں ہاتھ کی دیوار میں بنے سوراخ میں داخل کر دی۔ اور۔ اور..... اس کے ساتھ ہی سیف کے سامنے کے حصے سے تیز دھار دھواں سا خارج ہوا جس کا پہلا ہی جھٹکا مجھے نڈھال کر گیا۔ اس دھوئیں کی دھار سیدھی میرے منہ پر لگی ـــــ میری آنکھیں، میری ناک نتھنے، منہ غرضیکہ ہر حصے میں وہ دھواں جا گھسا۔ مجھے اپنا دم گھٹتا محسوس ہوا۔ اور میں ایک ثانیے کے دسویں حصے میں دھڑام سے زمین پر جا گرا۔ میرا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔

جب ہوش آیا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کوئی بھیانک خواب دیکھ رہا ہوں۔ میں لوہے کے ایک ننگے پلنگ پر یوں پڑا تھا کہ میری دونوں رانوں کو چمڑے کی مضبوط بیلٹ سے کس کر پلنگ کے ساتھ باندھ دیا گیا تھا۔ میری دونوں کلائیاں بھی میرے دائیں بائیں پلنگ کے بازوؤں سے سفید موٹی ڈوری میں بندھی تھیں۔ اور ننگے پلنگ میں سرایت کرتی ہوئی شدید سردی میرے بدن میں منتقل ہو رہی تھی وہ حصے جو ننگے تھے پلنگ سے براہ راست مس ہونے کی وجہ سے زیادہ اذیت سہہ رہے تھے۔

وہ کوئی زیادہ بڑا کمرہ نہیں تھا۔ میرا خیال ہے دس فٹ مربع جگہ ہو گی۔ وہاں میرے پلنگ سے ذرا پرے ایک میز رکھی تھی۔ جس پر ایک شیشے کا جگ رکھا تھا۔ وہ پانی سے لبالب بھرا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک گلاس رکھا تھا۔ اور میز کے دوسرے کونے پر چند کتابیں اور رسالے پڑے تھے۔

کمرے میں دو دروازے تھے۔ ایک شاید باتھ روم میں کھلتا تھا اور دوسرا عمارت کے دوسرے حصے سے منسلک تھا مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں وہاں کب سے اس حالت میں پڑا ہوں میرے فلیٹ بوٹ میرے پاؤں میں موجود تھے۔ بلیو جینز کی پتلون اور جرسی بھی جوں کی توں تھیں اور کمبل میرے پیٹ کے اوپر اس طرح ڈالا گیا تھا کہ نہ ٹانگیں اس سے ڈھانپی گئی تھیں اور نہ چھاتی ـــــ

جوں جوں میرے حواس بحال ہو رہے تھے، بھوک کا احساس شدید ہوتا جا رہا تھا۔ اور اس بھوک سے ہی میں اندازہ لگا رہا تھا کہ مجھے وہاں اس حال میں

بے ہوش پڑے کم از کم تین دن گزر چکے ہیں۔ میں نے کئی بار عام دنوں میں یہ اندازہ لگانے کے لئے کہ میں کتنے گھنٹے کھائے پئے بغیر زندہ رہ سکتا ہوں کئی کئی وقت فاقے کئے تھے اور میرا یہ اندازہ تھا کہ میں کم از کم ڈھائی دن کچھ کھائے پئے بغیر اطمینان سے وقت گزار سکتا ہوں مگر ڈھائی دن کے بعد جو وقت مجھ پر آتا ہے وہ بہت کڑا اور ناقابلِ برداشت ہوتا ہے اور اس وقت مجھے یہی محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے گردے ٹوٹ چکے ہیں۔ مجھے وہ اپنی تمام تر کاوشیں جو میں نے اس کوٹھی کو لوٹنے کے لئے کی تھیں بے وقعت اور گزشتہ ایسی معلوم ہوتی تھی میرے قلعے کے تمام برج منہدم ہوتے جا رہے تھے اور مجھے معلوم ہو رہا تھا کہ میں اس عورت کے ہاتھوں کتے کی موت مارا جاؤں گا۔ مجھے تو وہ پوری طرح ہاتھ دے گی۔ وہ گشتی جو اپنی دکان کا سارا مال مجھے دکھانے کے بعد یہ توقع رکھتی تھی کہ میں ایک آدھ چیز تو ضرور ہی خرید لوں گا۔ مگر میں نے تو اس کی کسی شئے کو دیکھنا تک گوارا نہ کیا تھا۔ اب وہ مجھ سے جو بھی سلوک کرے کم ہو گا۔

میں نے کھینچ کھانچ کر اچھی طرح زور آزمائی کرنے کے بعد یہ اندازہ لگا لیا کہ میں اپنے جکڑے بندوں کو کسی طرح بھی نہ کھول سکوں گا۔ اس عورت نے مجھے اچھی طرح کس کر بے بس کر دیا تھا اور میں تیزی سے اپنے اندوہناک انجام کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جس میں ذلت تھی، رسوائی تھی، بے پناہ اذیت تھی، اپنی بہن کی دبی کچلی زندگی اپنی تمام تر مظلومیت سمیت مجھے اپنے سامنے پا بریدہ سر برہنہ نظر آ رہی تھی۔ میں اس کے دکھ کا مداوا کرنے گھر سے نکلا تھا مگر ہوا یہ تھا کہ اپنے ہی جال میں پھنس کر تباہ ہو گیا تھا۔

ایک خاص بات جو اس محبس میں میں نے محسوس کی وہ یہ تھی کہ وہاں چاروں طرف سگریٹ کی بُو پھیلی تھی جس سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہاں سے کوئی شخص ابھی اٹھ کر باہر گیا تھا۔

میں کوئی آدھ گھنٹے تک کسی کٹے درخت کی طرح لیٹا چھت کو تکتا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس عذاب سے کس طرح نجات حاصل کروں۔ سب سے زیادہ تکلیف مجھے اس احساس سے ہو رہی تھی، کہ میری ماں اور میری بہن میرے یوں گھر سے غائب رہنے پر سخت پریشان ہوں گی۔

سگریٹ کی بُو برابر میرے دماغ کو چڑھ رہی تھی اور اسی حساب سے میری سگریٹ کی طلب بھی بڑھتی جا رہی تھی مگر میرے تو دونوں ہاتھ بندھے تھے اور اپنی جیب کے بوجھ سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ سگریٹ ابھی تک وہاں موجود ہیں۔

اچانک مجھے محسوس ہوا جیسے میرا مثانہ پھٹ جائے گا۔ پیشاب مجھے اتنے زوروں کا لگ رہا تھا کہ بات برداشت سے باہر ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے اپنے اوپر بہت جبر کیا مگر میری کوئی پیش نہ چلی۔

"عالیہ! حیدر! کہاں ہو تم؟ میرے یہ نیکرے بند کھولو تمہاری....."

میں نے بلند آواز سے ان دونوں کو پکارتے ہوئے گندی گالی ان کی طرف لڑھکائی۔

وہ کمائی عورت تو شاید کہیں قریب ہی کھڑی تھی مجھے ایک دم دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ اُدھر جو میں نے دھیان دیا تو دیکھا سامنے عالیہ کھڑی ہے۔ وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ خدا جانے اس نے اپنے لباس کی تراش خراش پر کتنی محنت کی تھی وہ اس لمحے چھتیس کلی کا اودی رنگت کا زردوزی غرارہ زربفت کی قمیص اور اُودا ریشمی دوپٹہ اوڑھے ہوئے کوئی مغل شہزادی نظر آتی تھی۔ دوپٹے پر پشت ماہی کا جال بنا ہوا تھا۔ اس کے کانوں میں کندن کے جھالے، گلے میں حیدر آبادی زمرد کا گلو بند، ہاتھوں میں جڑاؤ جہانگیریاں انگلیوں میں پکھراج کے چھلے اور پاؤں میں گھنگرو والی پازیبیں تھیں۔ اس کی سج دھج پر تو نظر نہیں ٹکتی تھی خدا جانے وہ کس کو قتل کرنے چلی تھی۔ اور کہاں جا رہی تھی؟

اسے اس رنگ میں دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ وہ ایسی تو نہ تھی۔ رات جس رنگ میں میں نے اسے دیکھا وہ اس سے اس دم بالکل ہی جدا نظر آتی تھی۔

مجھے دیکھ کر وہ مسکرائی۔ عجیب سے اندازِ دلربائی سے اس کے سرخ ہونٹوں پر مسکراہٹ کی کلی کھلی۔ بولی۔

"کیسے ہو پہلوان؟" اس کی آنکھوں سے عجیب سی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ جیسے وہ مجھ پر فتح پا لینے پر بے حد خوش ہو۔

وہ میرے گرد گھوم کر پائنتی جا کھڑی ہوئی۔ اچانک اسے اپنے سلیپر تر ہوتے محسوس ہوئے اس نے جھک کر فرش پر نظر ڈالی تو بولی۔

"یہ...... یہ...... پانی کہاں سے آیا ہے؟"

اس کی آواز خاصی بلند تھی جسے غالباً حیدر نے سن لیا تھا وہ تیزی سے اندر آ گیا۔ بولا۔

"کیا ہوا؟ بی بی جی کیا ہوا؟"

"یہ پانی کیسا ہے یہاں؟"

"یہ میرا پیشاب ہے۔" میں نے کہا۔

میری یہ بات سنتے ہی وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ اتنے زور سے ہنسی کہ اس کے کانوں کے جھالے لرز گئے —— پھر وہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوتی ہوئی میز کے دائیں ہاتھ رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"پیشاب نکل گیا ہے پہلوان؟ حد ہو گئی۔ یہ تیرے اتنے بڑے بڑے مضبوط بازو۔ یہ چوڑا چکلا سینہ۔ یہ تیری موٹی موٹی رانیں۔ اور تیرا مُوت نکل گیا ہے۔ خوف سے نڈھال ہو گیا ہے تو۔ ابھی سے تیرا یہ حال ہے تو آگے کیا ہو گا؟"

"میں خوف زدہ نہیں ہوں۔ میرا خیال ہے میں ساٹھ گھنٹے تک بے ہوش رہا ہوں۔ ایسے میں مثانے پر بوجھ نہ پڑتا تو کیا ہوتا؟" میں نے تیکھے جلنطے سے کہا۔

"معلوم ہوتا ہے تیری اکڑفوں ابھی تک موجود ہے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ دیکھ لوں گی میں۔ اس کا خیال رکھو حیدر۔ اور ہاں اسے کھانا بھی کھلا دو۔ اور یہ پیشاب صاف کر دو۔"

"اگر مجھے اسی حالت میں رکھنا چاہتی ہو تو اس پلنگ پر ایک گدّا ڈال دو۔ میں بلاوجہ بے آرام نہیں ہونا چاہتا۔" میں نے اپنی آنکھوں میں سارے جہان کی سنجیدگی بھر کر کہا۔ وہ ہنس دی۔ ایک بار پھر کھلکھلا کر...... ہنس دی ——

"بلاوجہ بے آرام ہونے کی بھی خوب کہی تم نے۔ پتہ ہے تم نے میرے موتی کو مار دیا ہے۔ اس موتی کو جو میرے لئے انمول تھا۔ میں تم پر کتے چھوڑوا دوں گی۔ اسے اپنے کئے کی سزا سہنے کے لئے تیار کرو حیدر —— میں ذرا ڈاکٹر صاحب کے ساتھ جا رہی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ ہوا کے تیز جھونکے کی طرح باہر نکل گئی ——

حیدر چغدوں کی طرح سامنے کرسی پر بیٹھا میرا منہ تک رہا تھا۔

"سنا نہیں تم نے کتے کے بچے۔ میرے لئے کھانا لاؤ۔ وہ گشتی کہہ نہیں گئی تھی ——"

"گالی تو نہ دو استاد۔ اب تو بندھے پڑے ہو پھر بھی جانے کو خونزدہ کئے دیتے ہو۔" وہ واقعی لرز گیا تھا میری آواز سن کر۔ "مجھے سگریٹ سلگا کر دو اور پھر جا کر کھانا لے آؤ۔ مجھے سخت بھوک لگی ہے۔" میں نے پھر اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "ادھر دیکھو، میری جیب میں پیکٹ دھرا ہے اگر اس حرامزادی نے نکال نہیں لیا تو لائیٹر بھی یہیں ہو گا نکالو اسے۔"

حیدر ڈرتے ڈرتے اٹھا اس نے بہت احتیاط سے میری پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر سگریٹ اور لائیٹر نکال لیا۔ پھر اس نے ایک سگریٹ سلگا کر مجھے دے دیا۔

"تم بھی پیو —— سؤر کی اولاد۔ کتنی منحوس شکل ہے تمہاری۔ اگر میں رات ہی تم دونوں کو مار دیتا تو اچھا ہوتا۔" میں نے نہایت ہی بیزار لہجے میں کہا۔

وہ مسکرایا۔ بولا ——

"گالی تو نہ دو استاد۔ ایسا نہ ہو ہم تم پر ہاتھ اٹھا لیں۔ غصّے کے بہت برے ہیں ہم۔"

"ابے تیرے ہم کی......" میں نے ایک دم گرجتے ہوئے کہا۔ "تو کیا اور تیرا غصہ کیا —— جا دوڑ کر کھانا لا الّو کا پٹھا۔" میں نے اس کے خلاف اپنی زبان سے نیزے کا کام لیتے ہوئے کہا۔ وہ عجیب سی سہمی سہمی نظروں سے مجھے دیکھتا ہوا اٹھا۔ اور بولا۔

"مالکن کہہ گئی ہے ورنہ میں تمہیں بالکل بھوکا رکھتا۔"

"اور دیکھ ایک گدّا بھی لیتے آنا۔ پتہ نہیں کتنے دن رکھتی ہے وہ گشتی مجھے یہاں۔"

"ٹھیک ہے گدّا بھی لا دیتا ہوں استاد۔ اور کوئی حکم؟" اس نے مجھے ایک خاص انداز میں آنکھ ماری۔ جیسے وہ میری بے بسی کا مذاق اڑا رہا ہو۔

"بہت تیری اس آنکھ بازی کی......" میں نے ایک اور موٹی گالی اس کی طرف اچھالی تو وہ تو بہ تو بہ کہتا ہوا باہر نکل گیا۔

"کس رذیل سے واسطہ پڑا ہے اپنا۔" وہ دروازے سے باہر نکل کر بڑبڑایا۔

"میری رذالت تم لوگوں نے دیکھی ہی کہاں ہے بچّو۔ ابھی تو پتہ نہیں کیا کچھ ہو گا یہاں؟"

میں نے دل ہی دل میں کہا۔

مجھے خدا جانے کیوں یہ گہرا یقین تھا کہ وہ لوگ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ مجھے اپنے آپ کو وہاں بندھا دیکھ کر کوئی ملال یا خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اندر سے میرا دل پوری طرح مطمئن تھا اور مجھے کوئی طاقت آپ ہی آپ یہ احساس دلا رہی تھی کہ میں وہاں سے صاف طور پر بچ کر نکل جاؤں گا۔

جانے کیوں عجیب سا احمقانہ احساس تھا یہ جس کی بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد حیدر ایک ٹرالی دھکیلتا ہوا اندر آ گیا۔ وہ کھانے کی چیزوں سے لدی ہوئی تھی۔ ٹرالی لا کر اس نے میرے پلنگ کے ساتھ کھڑی کر دی۔

بولا "لے استاد کھا۔"

"بجائے اس ذکر کے میرے دونوں ہاتھ بندھے ہیں میں خود کیسے کھانا کھا سکتا ہوں؟"

"تیرے ہاتھ پیر تو میں نہیں کھول سکتا کیونکہ پٹیوں کو تالے لگے ہیں البتہ میں تجھے اٹھا کر بٹھا دیتا ہوں۔ تیرے منہ میں لقمے میں خود ڈالتا جاؤں گا بچّے۔" یہ کہہ کر اس نے پلنگ کی پائنتی میں لگے ہینڈل کو گھمایا جس سے میرا تکیہ اوپر اٹھا اور میں پلنگ پر اس طرح بیٹھ گیا کہ تکیہ میرے پیچھے بھی ایسا اٹھا سا بن گیا۔

حیدر نے بڑی احتیاط اور نفاست سے مجھے کھانا کھلایا۔ وہ مرغ مسلّم کرلایا تھا۔ وہ بہت عمدہ کھانا تھا یار! جس میں مرغ بھی تھا اور نان بھی، عمدہ قسم کا اچار بھی تھا اور سلاد بھی —— اور تو اور وہ سالا حیدر میرے لئے فرنی بھی لے آیا تھا۔ تب میں سمجھا کہ حیدر کے دل میں میرے خلاف کوئی نفرت نہیں ہے بلکہ وہ میرے لئے اپنے ذہن میں اچھے اور محبت بھرے خیالات رکھتا ہے۔ حالانکہ میں نے اسے بہت ذلیل کیا تھا۔ پھر بھی وہ مجھ سے اچھا سلوک کر رہا تھا۔ بڑو

حیرت کی بات تھی وہ میرے لئے۔

جب میں پیٹ بھر کر کھانا کھا چکا تو اس نے ایک صاف کپڑے سے میرے ہاتھ پونچھے ۔۔۔ کلّی کروائی اور جب وہ پوری طرح مطمئن ہو گیا تو بولا۔

" لے استاد اب میں تیری یہ پتلون بھی بدلتا ہوں تُو نے تو بچوں کی طرح پیشاب کر دیا ہے "

" اب زیادہ ٹر ٹر نہ کر۔ تم سالوں نے پتہ نہیں کب سے باندھ رکھا ہے مجھے " اب کی بار میرا لہجہ خاصا خوشگوار تھا۔ جیسے محسوس کر کے وہ مسکرایا، بولا ۔۔۔

" ٹھہر میں تجھے سگریٹ بھی سلگا دوں ورنہ تُو پھر گالی دے گا مجھے ۔۔۔ ہے تو خاصی ذلیل شے استاد، کسی شریف آدمی کا نطفہ نہیں لگتا تو مجھے " یہ کہہ کر وہ اور زیادہ کھل کر مسکرایا اور سگریٹ میرے منہ سے لگا کر اس نے آگ دکھا دی۔

" ابے تیری نطفے کی ..... تُو سمجھتا کیا ہے خود کو سؤر کی اولاد " میں نے پھر اسے پوری گھن گرج کے ساتھ گالی دی۔ پھر وہ سہم گیا۔ نظریں جھکا کر ٹرالی کو دھکیلتا ہوا باہر نکل گیا اور بولا۔

" بڑا سڑتا رہ تُو یہاں ۔ اب میں ادھر نہیں آؤں گا استاد۔ تُو ہے ہی کمینہ "

" تیرا باپ بھی آئے گا تجھے تو کیا سمجھتا ہے۔ میں یوں ہی پھنسا رہوں گا یہاں " ... میں نے ایک بار پھر بلند آواز اور دبنگ لہجے میں کہا مگر میری بات وہ سن نہ سکا آگے نکل چکا تھا۔

سگریٹ اس لمحے بہت مزہ دے رہا تھا مگر مصیبت یہ تھی کہ وہ بند ہاتھ ہونٹ اور سگریٹ کے درمیان ایک لطیف سا تعلق پیدا ہوتا ہے میں اس لمحے اس لذت سے محروم تھا۔ محض دھواں آدمی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ میرا خیال ہے کہ سگریٹ نوشی کے اس سارے عمل کو جب تک نہیں دہرایا جاتا آدمی کو تسکین نہیں ملتی۔ یہی وجہ تھی کہ میں لمبے لمبے کش لینے کے باوجود کچھ ہی دیر بعد شدید بے چینی محسوس کرنے لگا تھا۔

حیدر اپنی بات کا دھنی نکلا وہ کوئی دو گھنٹے تک واپس نہ آیا۔ میں بھی چپکا پڑا رہا۔ میں انہیں یہ احساس نہیں دلانا چاہتا تھا کہ میں اذیت میں ہوں اور ان کا حربہ کامیاب ہو رہا ہے۔

مگر جب دو گھنٹے گزر گئے اور وہ ادھر نہ آیا اور اس عرصے میں میری گیلی پتلون اس سرد موسم میں میرے لئے اور زیادہ تکلیف دہ ہو گئی تو میں نے اسے بلند آواز سے پکارا۔

" حیدر۔ ابے او کسی گیدڑ کی اولاد ادھر آئے گا کہ نہیں ۔۔"

مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے پھر اسے آواز دی۔ دو بار تین بار چار بار ۔ میں مسلسل اسے پکارتا رہا۔ جب نویں بار میں نے اسے ایک نہایت ہی خوفناک قسم کی تھانیدارانہ گالی دی تو وہ دروازہ کھول کر تیزی سے اندر آ گیا ۔۔۔

وہ مسکرا رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں گدا تھا اور دوسرے میں لٹھے کی چادر ۔۔۔

" استاد تُو گالی دینے سے باز نہیں آنے کا ؟ "

" ابے او بلوچستانی چوہے تُو ایسا غائب ہوا کہ ۔۔۔ ..... لا ادھر یہ پتلون بدل میری " میں نے چادر دیکھتے ہوئے کہا۔

اس نے میرے اوپر کمبل اچھی طرح ڈال کر میری پتلون اتاری مگر میری ٹانگیں تو پٹیوں میں پھنسی تھیں۔ پتلون کیسے اتر سکتی تھی؟

" پتلون پھاڑنی پڑے گی "

" اس کے پیسے تیری مالکن دے گی وہ کنجری " میں نے کہا۔

" شاید وہ دے مگر وہ تیرا چاقو کہاں ہے اس سے میں پتلون کاٹ دیتا ہوں "

حیدر نے میری جیبیں ٹٹولیں۔

" چاقو تو ادھر تیری جیب میں نہیں ہے استاد "

" اس حرامزادی نے نکال لیا ہو گا تو قینچی لے آ کوئی " میں نے بے زار ہو کر کہا۔

حیدر نے میرے کہنے پر عمل کیا جب وہ مجھے چادر پہنانے کے بعد میرے نیچے گدا بچھا چکا تو بولا ۔

" استاد ! یہ چمڑے کی پٹیاں ہیں جن سے تُو بندھا ہے میں چاہوں تو ان کو کاٹ سکتا ہوں مگر میں مالکن کو مایوس نہیں کرنا چاہتا؛ وہ مجھ سے خاصے فاصلے پر میز کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

میں چپ رہا۔ سوچ کی گہری دھند میرے دماغ پر اترتی چلی آ رہی تھی۔ اور اپنے گرد و پیش کی صورتِ حال کو میں اور زیادہ سنجیدگی سے سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

حیدر نے بہت پوچھا کہ میں کہاں سے آیا ہوں ؟ کہاں رہتا ہوں ؟ کیا کرتا ہوں ؟ اس کوٹھی میں کیسے آیا ؟ کس نے مجھے وہاں مال ملنے کی امید دلائی تھی ؟ مگر اس کے ان تمام سوالوں میں سے میں نے کسی بھی سوال کا جواب نہ دیا۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ حیدر دراصل وہ نہیں ہے جو باہر سے نظر آتا ہے۔ وہ اپنے ظاہر سے بالکل مختلف ہے اور اس کے باطن کی گہرائی کا اندازہ شاید ہی کوئی کر سکتا ہو گا۔

" کیا یہ نتالی کے جاگیرداروں کی کوٹھی ہے ؟ "

" ارے نہیں استاد ! یہ تو ڈاکٹر رحمٰن کی کوٹھی ہے "

" یہ ڈاکٹر رحمٰن کون ہے ؟ میں نے تو اس کا نام آج ہی سنا ہے "

" یہ سرجن ڈاکٹر ہے کبھی اُدھر لندن چلا جاتا ہے کبھی تاہو " ہ " کبھی یہاں آ جاتا ہے "

" اچھا اور یہ عالیہ کون ہے ؟ "

" یہ اس کی بیوی ہے یہ بھی ڈاکٹر ہے اور نینوں کے علاج اور آپریشن میں اس کی مدد کرتی ہے "

" یہ بھی لندن میں رہتی ہے ؟ "

" نہیں ۔ یہ تو یہیں رہتی ہے صرف ڈاکٹر رحمٰن ہی باہر چلا جاتا ہے "

" یہ چیتا انہوں نے یہاں کیوں باندھ رکھا تھا ؟ "

" یہ ڈاکٹر رحمٰن نے خود پال رکھا تھا۔ اس کے چند دانت بھی نکال دیئے تھے انہوں نے ۔۔ یہ پالتو ہونے کی وجہ سے نہیں جانتا تھا کہ کسی کو کیسے کاٹا جاتا ہے۔ جب ہی تو رات تم سے وہ یوں مات کھا گیا جیسے وہ چیتا نہیں گدھا تھا۔ اکثر اوقات تو ہم اسے باندھ کر رکھتے تھے۔ اسے کھولنے میں تو ہمیں نقصان ہوتا تھا "

" مگر اس نے مجھ پر حملہ تو زوردار طریقے سے کیا تھا "

" وہ محض ٹکرایا ہو گا۔ اپنے پورے وزن سے تم پر گرا ہو گا۔ ورنہ اگر وہ منہ کھول کر تمہاری گردن پکڑ لیتا تو تمہارا وہیں قصہ پاک ہو جاتا۔ اس کے تو پنجوں کے ناخن بھی کاٹ دیئے جاتے تھے باقاعدگی سے ۔ وہ بالکل بے ضرر جانور تھا "

" اگر یہی بات تھی تو ان لوگوں نے اپنی حفاظت کے لئے کوئی کتا ہی رکھ لیا ہوتا "

" کتے تو یہاں تین تھے مگر تین دن پہلے ڈاکٹر رحمٰن نے ان کو ایک تجربے کے دوران ہلاک کر دیا۔ اس بات پر انہیں بہت دکھ ہوا مگر کیا کہا جا سکتا تھا۔ وہ بڑے قیمتی کتے تھے ۔ اور بہت ہی خونخوار بھی "

حیدر مجھے آہستہ آہستہ اس گھر کی باتیں بتا رہا تھا مگر مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ کچھ باتیں وہ مجھ سے عمداً چھپا رہا تھا۔

" یہ بتا حیدر کہ عالیہ نے مجھے پولیس کے حوالے کیوں نہیں کیا ہے ابھی تک۔ مجھے یہاں بندھے ہوئے میرا خیال ہے تین دن گزر .... گئے ہیں ؟ "

" نہیں یہاں پڑے ابھی صرف ڈھائی دن گزرے ہیں۔ اور مجھے نہیں معلوم کہ مالکن نے ابھی تک پولیس کو کیوں خبردار نہیں کیا ہے ؟ "

" تجھے پتہ ہے ۔ گدھے کی اولاد تو جانتا ہے ۔ مگر جان بوجھ کر مجھ سے چھپاتا ہے۔ وہ میری مومیائی تو نہیں نکالے گی "

میری اس بات پر حیدر بے طرح چونکا۔ میری آنکھوں میں چند لمحوں تک بڑی محویت سے جھانکتا رہا پھر بولا ۔

" نہیں استاد ۔ مومیائی تیری بھلا کس کام آئے گی۔ اصل بات یہ ہے کہ شاید میری مالکن کا تجھ پر دل آ گیا ہے ۔ وہ لٹو ہو گئی ہے تجھ پر ۔۔۔ "

" تُو بکواس کرتا ہے ۔ میں لعنت بھیجتا ہوں تجھ پر اور تیری مالکن پر۔ یہ غلط فہمی دُور کر دینا اس کی ۔ میں جتی ستی آدمی ہوں لنگوٹ کا پکا ۔ پیر استاد کا چنڈا ہوا ۔ مجھ سے وہ ایسی امید رکھے گی تو ماری جائے گی ۔ وہ چولا سی پہن کر ناچتی بھی آئے تو بھی میرا دل نہیں برما سکتی ہے وہ " میں نے پریشان ہو کر کہا ۔ جانے اس کے سلسلے میں زندگی کے اس رخ سے مجھے کیوں اتنی وحشت محسوس ہو رہی تھی ۔ میں تو ایسا تھا کہ ایسی عورتوں کو چھ رنگ کاٹنا کار ثواب سمجھتا تھا۔ میں بھلا کیوں کر اس کی چھوڑ دھج سے زیر ہو سکتا تھا۔

حیدر نے میری یہ بات سنی تو چپ ہو رہا۔ کچھ دیر بعد ادھر ادھر کی ہانکنے لگا ۔ پھر وہ کمبل میرے اوپر اچھی طرح پھیلا کر بولا " لے استاد ! اب تُو سو جا ۔ مالکن آئے گی تو بات ہو گی " یہ کہہ کر وہ باہر جانے لگا تو میں نے اسے کہا ۔

" حیدر ایسا نہیں ہو سکتا کہ تُو یہ چمڑہ کاٹ دے۔ میں باہر چلا جاتا ہوں ۔ میں تیرا یہ احسان زندگی بھر نہ بھول سکوں گا " اب کی بار میں نے اس سے بڑی رسان سے بات کی ۔۔۔ اس نے گہری گہری نظر سے مجھے دیکھا ۔ اور کانوں پر ہاتھ رکھ کر بولا ۔

" مجھ سے یہ امید نہ رکھ استاد ۔۔ میں نے مالکن کا بہت نمک کھایا ہے۔ اس کے دشمن کو میں بھلا کس طرح رہا کر سکتا ہوں " یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

مجھے نیند بھلا کہاں آ سکتی تھی ۔۔۔ گدے نے البتہ بہت آرام دیا تھا ۔ کھانا پیٹ میں اترا تو ذہن میں دُور دراز کے اندیشے سر اٹھانے لگے ۔ مجھے اب یہ احساس ہونے لگا تھا کہ وہ لوگ میرے لئے شاید کوئی بڑی ہی خوفناک سزا تجویز کریں گے ۔ ایسی سزا جس کا ذکر ہی آدمی کے رونگٹے کھڑے کر دے ۔ ان سے کچھ بھی بعید نہ تھا کیونکہ وہ جو ٹھنڈے دل و دماغ کے آدمی ہوتے ہیں جب اپنے دشمن کو گالی نہیں دیتے، تھپڑ نہیں مارتے، اس سے ہنس ہنس کر باتیں کرتے ہیں تو وہ شیطان سے بھی زیادہ خطرناک حربے استعمال کرتے ہیں اپنے دشمن کو زیر کرنے کے لئے ، اس کا نام و نشان مٹانے کے لئے ۔

میں انہی سوچوں میں تا دیر غلطاں رہا۔ پھر آہستہ آہستہ نیند کے گھاٹ اتر گیا ۔ مجھے احساس ہی نہ رہا کہ میں ذلت کا اسیر ہوں اور میری زندگی کا چراغ آندھیوں کی زد میں ہے ۔

وقت کا تو مجھے صحیح اندازہ نہیں ۔ یوں لگتا تھا جیسے سہ پہر ڈھل چکی ہے ۔ کمرے میں روشنی بہت ہی کم کم تھی ۔ مجھے اپنا بدن پتھر ہوتا معلوم ہوتا تھا ۔ سارا دن ساری رات میں یوں مردے کی طرح سیدھا اس لوہے کے پلنگ پر پڑا رہا تھا ۔ میری نسیں کھنچ گئی تھیں میری باہیں میرے سر کی طرف پلنگ کے جنگلے سے بندھی تھیں ۔ اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں ۔

اس عورت نے سیف کے اندر کچھ ایسا انتظام کر رکھا تھا کہ وہ کسی کو بھی دھوکا دے کر بے بس کر سکتی تھی۔ مجھے اپنی حاضر دماغی اپنی قوت اور اپنے بدن کی بے پناہ پھرتی پر بے حد ناز تھا مگر اس نے ایک ہی جست میں مجھے زیر کر لیا تھا اب میں اس چوہے کی طرح وہاں پڑا تھا جیسے ردّی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا چوہے دان میں غڑاپ سے اندر پہنچ جانے کی دعوت دیتا ہے۔ میری نیند کا شیشہ میرے سر میں ٹوٹ گیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ میں زیادہ دیر تک نہیں سو سکا تھا۔

اچانک دروازے کے قفل پر کسی کا ہاتھ پڑا۔ میں نے کمرے کی نیم تاریک فضا میں آنکھیں بند ہی رہنے دیں۔ میں ان میں سے اب کسی کی صورت نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ دروازہ کھلنے کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ پھر قدموں کی چاپ کمرے میں ابھری۔ وہ تعداد میں تین تھے۔ میں نے جان بوجھ کر آنکھیں بند کر رکھی تھیں مگر پھر ایسا ہوا کہ کمرہ ایک دم چکا چوند ہو گیا۔ بلب جلا دیا گیا تھا۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

میرے سامنے عالیہ کھڑی تھی — اب وہ قمیص شلوار اور سفید کوٹ میں ملبوس تھی اور ایک شال اس نے ایک عجیب ادائے دلبری سے اپنے سینے پر ڈال رکھی تھی۔ اس کے پاس ہی ایک آدمی کھڑا تھا... ادھیڑ عمر کا چاق و چوبند آدمی — اس کے قریب ہی ایک اور عورت تھی وہ ڈاکٹر کا سامان اٹھائے ہوئے تھی۔ وہ غالباً ان کی نرس تھی۔

"ہم سمجھے یہ سویا ہوا ہے، خیر اچھا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے خون کا گروپ کون سا ہے اور اس کے مختلف اعضا کی حالت کیسی ہے؟"

"کیا بکتے ہو تم؟ میں بیمار نہیں ہوں میرے یہ جکڑ بند کھول دو" میں نے اس کی گفتگو پر غضب ناک ہو کر کہا۔

اس کا لہجہ بہت سرد بلکہ یخ بستہ تھا۔ وہ یوں بات کر رہا تھا جیسے کسی جانور کو کاٹنے سے پہلے قصائی اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے۔

"یہ بہت جلدی بھڑک اٹھتا ہے ڈاکٹر دھمن! اس کی فکر نہ کریں اس کا ڈنک تو میں نے نکال دیا ہے۔ اب تو یہ بس یسوع مسیح کی بھیڑ ہے — بے ضرر — بے بس" عالیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم مجھے پولیس کے حوالے کیوں نہیں کرتے ہو؟" میں نے چیختے ہوئے کہا۔

"وہاں جاؤ گے تو وہ مار مار کر تمہیں چکّی دُنبہ بنا دیں گے، اتنے جُوتے وہ تمہاری پیٹھ پر ماریں گے کہ یہ چھ چھ انچ ابھر آئے گی۔"

عالیہ نے ڈاکٹر کے ہاتھ سے اسٹیتھسکوپ لے کر میرے سینے پر لگاتے ہوئے کہا۔

"اے ون کنڈیشن ہے جوان کی ڈاکٹر۔ دیکھیں تو اس کی نبضیں دیکھیں، دل کی حالت کا اندازہ کریں۔" اس نے اسٹیتھسکوپ ڈاکٹر دھمن کے حوالے کر دیا۔

ڈاکٹر نے مجھے بڑی تفصیل سے دیکھا۔ اور پھر میرا فشارِ خون دیکھنے کے لئے اس نے پٹی میرے بازو سے باندھ دی۔ میرا فشارِ خون بالکل ٹھیک تھا۔ پٹی کھولنے کے بعد وہ بولا۔

"ڈاکٹر عالیہ! میں آپ سے پوری طرح متفق ہوں اے ون کنڈیشن ہے جوان کی — ہمارے لئے یہ ہر لحاظ سے موزوں ہے۔" ڈاکٹر دھمن نے کہا۔

"یہ میرا میڈیکل چیک اپ کس لئے کر رہے ہو، اُلّو کے پٹھو؟" میں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ ان پر اور اپنی قسمت پر مجھے سخت طیش آ رہا تھا میرے منہ سے گالی سن کر ڈاکٹر دھمن کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا۔ اس نے تڑاخ پڑاخ تین چار تھپیڑ میرے دونوں رخسار پر دے مارے۔ میں تو بلبلا اٹھا۔ وہ اپنے ہاتھ میں انگوٹھیاں پہنے تھا جن کی نوکیں میرے گالوں کو چیر گئیں — اور میرے منہ سے ویسے ہی خون رسنے لگا جیسے اس رات عالیہ کے منہ سے بہا تھا۔ وہ تڑپ کر آگے بڑھی اور ڈاکٹر دھمن کا اٹھا ہوا ہاتھ کھینچ کر بولی۔

"نو.... نو.... ڈاکٹر۔ پلیز — یہ بندھا ہوا کتا ہے جس کے بھونکنے پر زیادہ توجہ نہیں دینی چاہئے۔ پلیز! دفع کریں۔"

"یہ سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو یہ رذیل ایک تو ڈاکہ زنی کرتا پھرتا ہے اوپر سے گالی بھی دیتا ہے۔ اس نے میری زندگی کی سب سے قیمتی شے میرا موتی مجھ سے چھین لیا اور..... اور اوپر سے اکڑتا ہے میں تو اس کا خون پی جاؤں گا — اس سؤر کا۔" ڈاکٹر... کف در دہان ہو رہا تھا۔ وہ خاصا تنو مند آدمی تھا اور اس کے تھپیڑ میں چار سو چالیس وولٹ کی طاقت تھی۔ خبیث نے مجھے سن کر دیا تھا۔

عالیہ نے اپنی جیب سے رومال نکال کر میرے ہونٹوں سے رِستا خون صاف کیا پھر میرے رخسار تھپتھپا کر بولی۔

"اپنی زبان قابو میں رکھو — ورنہ خواہ مخواہ پٹتے رہو گے یہ ڈاکٹر دھمن ہیں عالیہ نہ دارد نہ خوف زدہ ہو جائے گی۔ اچھے بچے بنو۔" یہ کہتی ہوئی وہ مسکرا کر پیچھے ہٹی اور ڈاکٹر دھمن کو ساتھ لے کر باہر نکل گئی —

وہ میری زندگی کا تاریک ترین دن تھا۔ اس سے پہلے کبھی ایسا نہ ہوا تھا کہ کسی نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا ہو اور میں نے اسے بیچ کر جانے دیا ہو۔ ایسا کبھی ہوا ہی نہ تھا مگر اس وقت تو میں اس حال میں تھا کہ اپنے منہ پر سے مکھی بھی نہ اڑا سکتا تھا۔ میری بے بسی تو دیدنی ہو گئی تھی۔

وہ لوگ اس کمرے سے نکلے تو کوئی دس منٹ بعد حیدر ٹرالی لئے اندر آ گیا۔ وہ میرے لئے چائے لایا تھا۔ چھوٹتے ہی بولا۔

"لے میرے یار چائے پی اور یاد کر اس ستی کی پیاس جس نے صحرا میں پانی پانی پکارتے جان دے دی تھی۔ پنّوں دراصل پانی کا دوسرا نام ہے۔ ورنہ پنّوں نام کی کوئی شے دنیا میں پیدا نہیں ہوئی تھی۔ وہ پانی ہی تھا جسے وہ بلوچ چھاگلوں میں بھر کر اونٹوں پر لاد کر لے گئے تھے۔ اور یہی پانی ستی کو بر وقت نہ مل سکا تھا۔ میں نے سنا ہے چائے پیاس مٹاتی ہے اور سردی دُور کرتی ہے۔"

وہ بہت اچھے موڈ میں تھا۔ اسے شاید معلوم ہو چکا تھا کہ ڈاکٹر دھمن نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا ہے۔ میں بہت بھرا ہوا تھا مگر اپنا سبق میں لے چکا تھا۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہو چکا تھا کہ میں بندھا ہوا ہوں اور میری کھلی زبان میرے لئے مصیبت کا سبب بن سکتی ہے۔

"لگتا ہے تیری بولتی بند ہو گئی ہے استاد۔ بس ایک ہی جھانپڑ میں تیرا مانجھا ڈھیلا پڑ گیا۔ ابھی تو .... وہ کیا کہہ گیا ہے — شاعرِ مشرق! ہاں! ؎

ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

محلّے میں کچھ لڑکیاں اور بھی ہیں"

وہ بہت ہی اچھی گفتگو کر رہا تھا اس لمحے مجھے یقین ہو گیا کہ جتنا باہر سے بدھو کا آدا نظر آتا ہے اتنا ہے نہیں — وہ بہت گہرا ہے گمبھیر ہے کئی پرتوں کا حامل ہے اور اس کو سمجھنے میں میں نے غلطی کی ہے۔

وہ مجھے چائے بھی پلا چکا سگریٹ بھی سلگا کر میرے ہونٹوں میں دے چکا مگر میں نے اس سے کوئی بات نہ کی۔ اس کے کسی طنز کا جواب نہ دیا۔ وہ لوگ مجھ پر حاوی ہوتے جا رہے تھے میرے اعصاب آہستہ آہستہ چٹخنے چلے گئے —

اچانک مجھے اپنے پیٹ میں مروڑ اٹھتا محسوس ہوا۔ مجھے اجابت کی حاجت تھی۔

"حیدر میرے لئے کموڈ لا، یا مجھے باتھ روم میں پہنچا .... میں بے اختیار ہو رہا ہوں۔"

"دھت تیرے کی۔ مروا دیا نا تُو نے۔ ابے یہ انسانوں والی لعنت ابھی تک تیرے ساتھ لگی ہے استاد میں تو سمجھتا تھا تو پڑھا لکھا ہے کوئی سُپر مین قسم کی چیز ہے جو چیتے کو مار سکتا ہے حیدر کو چت کر سکتا ہے۔ مگر لعنت ہے تجھ پر تُو تو بالکل تھس چیز ثابت ہوا۔" یہ کہہ کر اس نے زبردست قہقہہ لگایا۔ اور باہر کی طرف لپکا۔

کچھ ہی دیر بعد ایک بوڑھی عورت کمرے میں آئی۔ وہ غالباً ان کی جمعدارنی تھی یا گھر کی صفائی ستھرائی کے لئے رکھی ہوئی کوئی اور ملازمہ۔ وہ ناک پر بہ بڑا سا پلّو لپیٹ کر میرے قریب آئی میرے تہمد کو سرکا کر اس نے کموڈ میرے نیچے رکھ دیا۔

کوئی پانچ منٹ بعد وہ پھر کمرے میں آئی۔ اب کی بار اس کے ہاتھ میں ایک پمپ ایسی چیز تھی جو اس نے سارے کمرے میں اسپرے کر دیا۔ جب کمرے کا تعفن ختم ہو گیا اور سانس لینے میں وہ ہوا خوشگوار محسوس ہونے لگی کمرے میں خوشبو کا چھڑکاؤ کر کے وہ باہر نکل گئی اور پھر تا دیر ویرانی تنہائی اور بے پناہ اذیت میرے وجود کو کنڈیالے سانپوں کی طرح اپنی لپیٹ میں لئے رہی۔ خدا جانے وہ میرے ساتھ کیا کرنے والے تھے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ میں دم بدم بکھرتا جا رہا تھا، ٹوٹتا جا رہا تھا۔ وہ جو مجھے وہاں سے صاف بچ کر نکل جانے کی امید تھی وہ موہوم ہوتی جا رہی تھی۔

اور پھر آہستہ آہستہ کمرہ تاریک ہو گیا۔ باہر سورج غروب ہو چکا تھا۔ اس کرۂ ارض کی بتی بجھ چکی تھی میرے اندر بھی یہی کیفیت تھی وہاں بھی لحظہ لحظہ اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا۔ اور اپنی ذات پر اپنے دست و بازو پر اپنی بے پناہ قوتِ برداشت پر جو مجھے اعتماد تھا، بھروسہ تھا ناز تھا۔ وہ آہستہ آہستہ ختم ہوتا جا رہا تھا۔

کمرے میں اندھیرا پھیلے خاصی دیر ہو چکی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ حیدر کو آواز دوں تاکہ وہ بتی جلا دے مگر نہیں اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔

کمرے کا دروازہ پھر کھلا۔ ڈاکٹر عالیہ اور ڈاکٹر دھمن ایک بار پھر اندر آ گئے۔ انہوں نے آتے ہی کمرے کی بتی جلائی تو مجھے ان کے ساتھ اب کی بار ایک اور آدمی نظر آیا وہ بھی شاید ڈاکٹر ہی تھا۔ کیونکہ وہ بھی سفید کوٹ پہنے ہوئے تھا۔

اب کی بار وہ لوگ آپس میں انگریزی میں گفتگو کر رہے تھے میرا خیال ہے وہ اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ میں کوئی جٹّا اَن پڑھ آدمی ہوں اور ان کی گفتگو کو سمجھ نہیں سکتا۔

وہ جو تیسرا آدمی تھا اس کا نام عرفان تھا۔ اس کا لب و لہجہ صاف بتا رہا تھا کہ وہ پاکستانی نہیں عربی ہے۔ وہ میرے ہی بارے میں گفتگو کر رہے تھے مگر ان کی باتیں سن کر میرے دل کی دھڑکن رکنے لگی۔

ڈاکٹر دھمن کہہ رہا تھا —

"میں نے اس کا اچھی طرح معائنہ کر لیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس سے بہتر دل گردے کا جوان ہمیں اگلے پانچ سال میں بھی شاید ہی مل سکے۔ قد کاٹھ کے لحاظ سے بھی یہ شیخ سعید کے برابر ہے۔ اس سے زیادہ موزوں آدمی انہیں اور کہاں ملے گا؟ اور ان کی ضرورت فوری اور اشد ہے اور اسی لئے وہ فوراً یہاں آئے بھی ہیں۔"

ڈاکٹر عرفان بولا۔ "تو پھر ٹھیک ہے کل صبح اس کا ایک گردہ نکال لیں گے۔ میں نے شیخ سعید کے آدمی سے بات کر لی ہے۔ وہ پانچ لاکھ ریال دینے کو تیار ہیں۔"

عالیہ پھڑک اٹھی۔

"ویری گڈ۔ ڈاکٹر عرفان کل ہی یہ قصّہ ختم کر دو۔ میں اسے آج ہی رات کلینک میں منتقل کر دوں گی۔" وہ بہت خوش تھی۔

"تو طے یہ رہا کہ چار لاکھ ریال ہمارے اور ایک لاکھ ریال... آپ کے"۔

"مجھے منظور ہے، ڈاکٹر، بالکل منظور ہے۔" یہ کہہ کر ڈاکٹر عرفان نے ڈاکٹر دھمن سے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔

"بند کرو یہ بکواس ڈاکٹر دھمن میں تمہاری کھال کھنچوا دوں گا۔ تو نہیں جانتا میں کون ہوں؟ اور میرے گروہ کے لوگ کون ہیں؟ وہ تیری ہڈیوں کا سرمہ بنا دیں گے۔ تو میرا یہ آپریشن نہیں کرے گا۔" وہ میری پائنتی کھڑا تھا۔ میں نے پورے زور سے اپنا پاؤں اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"اوہ مائی گاڈ! یہ تو پڑھا لکھا حیوان ہے۔ گاڈ ڈیم اٹ۔"

عالیہ کا منہ حیرت سے کھلا۔

"فکر کی کوئی بات نہیں ہے عالیہ۔ ہماری بات کو یہ سمجھتا ہے تو یہ اور بھی اچھا ہے۔ یہ ذہنی طور پر اپنے ایک گردے سے محروم ہونے کے لئے تیار ہو جائے گا۔ آؤ چلیں۔ ہم دیکھیں گے مسٹر ڈاکو! کہ وہ تمہارے گروہ کے لوگ کتنے پانی میں ہیں۔" وہ بہت سنجیدہ نظر آتا تھا۔ ڈاکٹر عرفان کے پلے شاید کچھ نہ پڑا تھا۔ وہ اردو نہیں سمجھتا تھا۔

اتنے میں حیدر اندر آگیا۔ اس کے پیچھے وہ نرس بھی تھی جو پہلے آئی تھی۔

"میرا خیال ہے اسے ٹیکہ لگا دینا چاہئے تاکہ یہ رات کو آرام سے سو سکے۔" عالیہ نے کہا۔

"ہاں، یہ اچھی تجویز ہے۔ چندن ذرا ٹیکہ لگا دے اس کتے کے بازو میں۔ کتنی ذلیل صورت ہے اس کی۔" عالیہ نے نہایت ہی نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

چار لاکھ ریال کی خبر نے اس کے دل و دماغ کی کایا ہی پلٹ دی تھی۔ حالانکہ اس سے پہلے وہ مجھ سے نرم لہجے میں بات کرتی تھی۔

چندن انہی قدموں واپس گئی اور جب وہ دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی تو ایک ٹیکے سے بھری سرنج اس کے ہاتھ میں تھی اور اسپرٹ میں بھیگا ہوا روئی کا ایک پنبہ بھی۔

ڈاکٹر عالیہ نے سرنج اپنے ہاتھ میں لے لی۔ دھمن نے میری کلائی کو اسپرٹ سے صاف کیا اور عالیہ نے میری نس میں سوئی گھونپ دی دس سیکنڈ بھی نہ گزرے تھے کہ میرا دماغ ماؤف ہونے لگا اور پھر میں ہر احساس سے عاری ہو کر ہر شے سے لاتعلق ہو گیا۔

جب میرے حواس بحال ہوئے تو مجھے یوں لگا جیسے کوئی آہستہ آہستہ میرے شعور و احساس کے بند ڈبے کا ڈھکنا اوپر اٹھا رہا ہے۔ سارا بدن شل ہو رہا تھا۔ نس نس میں درد بھرا تھا۔ مجھے اس حالت میں پڑے پڑے شاید چھیالیس گھنٹے گزر چکے تھے۔ میری کمر میں شدید درد اٹھ رہا تھا۔۔۔

کمرے میں سورج کی روشنی پھیل چکی تھی۔ بلب بجھا ہوا تھا میرا خیال ہے اس وقت دن کے نو بجے ہوں گے۔ میں کتنی ہی دیر یونہی بے حس و حرکت پڑا رہا۔ میں ہر طرف سے مایوس ہو چکا تھا۔ اتنا مایوس کہ زبان ہلانا بھی عبث نظر آتا تھا۔

اچانک دروازہ کھلا اور حیدر دندناتا ہوا اندر آگیا۔ وہ ٹرالی دھکیل رہا تھا اور میرے لئے ناشتے کا سامان لایا تھا مگر میں تو کچھ اس طرح سن ہو رہا تھا کہ کسی بات کی خواہش ہی نہیں رکھتا تھا۔ مجھے ان لوگوں کے اس خوفناک منصوبے کی تفصیلات نے مفلوج کر رکھا تھا۔ پھر بھی جب حیدر نے چائے کی پیالی میرے ہونٹوں سے لگائی تو مجھے محسوس ہوا کہ میں ابھی زندہ ہوں اور میرا بدن اپنی بھوک سے محروم نہیں ہوا۔ میری تمام تر حسیات ابھی بیدار ہیں۔

"لے استاد ناشتہ کر لے۔ اور خوش ہو جا کہ آج تیری زندگی کا عظیم ترین دن ہے۔"

"وہ کس طرح حیدر؟" میں نے بہت ہی بجھے ہوئے لہجے میں پوچھا میں جانتا تھا کہ وہ مجھ سے کھیل رہا ہے، وہ سب لوگ مجھ سے کھیل رہے تھے، چٹکیاں لے رہے تھے، میرا خون قطرہ قطرہ کر کے نچوڑ رہے تھے حیدر نے میرا سوال سنا تو بولا۔۔۔

"تجھے پتہ تو ہے میرے یار، پھر کیوں پوچھتا ہے؟ آج تیرے ختنے ہو رہے ہیں استاد۔ تیری مسلمانی ہو گی آج۔ تو آج دائرہ ایمان میں داخل ہو جائے گا۔"

"تیری...... حیدر اٹھا لے یہ سب کچھ یہاں سے، اور یاد رکھ اگر مجھے اس عذاب سے کسی نے گزارا تو میں اس کوٹھی کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔"

"تیرا جواب نہیں ہے استاد۔ ولایتی سؤر جتنا بڑا کلیجہ ہے تیرا۔ اور تیرے ایک گردے کی قیمت پانچ لاکھ ریال پڑ رہی ہے۔ کیسی رہی؟ بہت اونچے ریٹ ہیں تیرے استاد۔ ہو سکتا ہے تیری دونوں آنکھیں بیس لاکھ ریال میں بک جائیں۔ ایک گاہک لگ رہا ہے آج کل۔ مسقط سے آیا ہوا ہے وہ۔ کیا خیال ہے تیرا بیچ اس مسئلے پر؟"

حیدر ایسا حرامی تھا کہ اس کے لہجے کی چبھن نے مجھے ذلیل کر دیا تھا۔ اسے میری بے بسی نے اور زیادہ شیر کر دیا تھا اور اب اس کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی۔

"جا حیدر جا، خدا کے لئے دفع ہو جا یہاں سے۔" میں نے منہ بھر کر اس کے منہ پر تھوک دیا۔ سامنے ہی تو کھڑا تھا وہ۔ اس کا سارا چہرہ میری تھوک سے لتھڑ گیا۔ جسے اس نے ٹرالی میں رکھے سفید رومال سے صاف کیا اور مجھے نہایت ہی غلیظ گالی دیتا ہوا باہر نکل گیا۔

اسے وہاں سے گئے کوئی پندرہ منٹ ہوئے تھے کہ ایک اور آدمی کو ساتھ لے کر وہ دوبارہ اندر آگیا۔ وہ آدمی بھی ان کے عملے کا ہی فرد

ہوتا تھا۔ ان دونوں نے مل کر میرے لوہے کے پلنگ کو وہاں سے دھکیل کر باہر نکالا۔ پلنگ کے نیچے گول پہیے لگے تھے جس سے وہ آپ ہی آپ فرش پر پھسلتا جاتا تھا۔

وہ مجھے کوٹھی کی راہداری میں سے گزار کر بڑے دروازے تک لے گئے۔ اور پھر انہوں نے پلنگ سمیت مجھے سامنے کھڑی ایک بڑی سی گاڑی میں سوار کرا دیا۔ گاڑی کے پردے گر گئے۔ اور چند ہی لمحوں کے بعد کسی نے اندر میرے پاس آکر میرے منہ اور آنکھوں پر کس کر ایک چوڑی پٹی باندھ دی۔ یوں کہ میری آواز میرے کانوں تک نہ پہنچ سکتی تھی اور میری آنکھیں کچھ نہ دیکھ سکتی تھیں۔ کچھ ہی دیر بعد گاڑی کوٹھی سے نکل کر نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو گئی۔ وہ لوگ شاید مجھے کلینک کی طرف لے جا رہے تھے۔

اوہ میرے خدا! میں اس لمحے کی اذیت کو زندگی بھر نہ بھول سکوں گا۔ مجھے اپنی بے بسی پر اس قدر رونا آرہا تھا کہ جی چاہتا تھا میں چیخ چیخ کر ایک دنیا اکٹھی کر لوں اور انہیں بتاؤں کہ دیکھو یہ ڈاکٹر لوگ مجھ پر کس قدر ظلم کر رہے ہیں، مگر میں کچھ بھی نہ کر سکتا تھا۔ آسیہ کا معصوم سا ملکوتی چہرہ میری آنکھوں میں ابھرا۔ اپنی اپاہج ماں کی پلکوں پر لرزتے آنسو میرے تصور میں لہرائے۔ اور میرا وجود کانپ اٹھا۔ یارو میں ۔۔۔ میں کس لئے گھر سے نکلا تھا اور کس مصیبت میں پھنس گیا۔

اس گھر میں داخل ہونے کا میرے پاس کوئی جواز نہ تھا مگر میرے پیٹ کو چیر ڈالنے کا جواز ان بھیڑیوں کو کس طرح حاصل ہو گیا تھا؟ خود ہی انصاف کرو کہ میرے ساتھ کتنی بڑی ناانصافی ہو رہی تھی اب میں اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ وہ لوگ مجھے پولیس کے حوالے کیوں نہیں کرتے تھے۔ واقعی وہ میری مومیائی نکالنا چاہتے تھے۔

گاڑی کے پردے کچھ اس انداز سے کھنچے تھے اور وہ اتنے دبیز تھے کہ مجھے کسی طور اندازہ ہی نہ ہو سکتا تھا کہ وہ لوگ کس سمت سے کس طرف بڑھ رہے ہیں۔ اور پھر گاڑی ایک جگہ رک گئی اس کے پردے تیزی سے اٹھا دیئے گئے۔ دو آدمیوں نے مجھے پلنگ سمیت گاڑی سے اتارا اور پھر پلنگ کے پائے فرش پر ناچتے ہوئے آگے بڑھنے لگے پھر پلنگ کسی جگہ پہنچ کر رک گیا۔ وہاں مہیب سناٹا طاری تھا ۔۔۔ میں آنے والے لمحوں کے تصور سے لرز کر بری طرح ہاتھ پاؤں مروڑنے لگا۔ اپنے وجود کو ان سنگین پٹیوں کے حلقے سے چھڑانے کے لئے میں نے زبردست جدوجہد شروع کر دی۔

"ارے ارے! یہ جانور تو بدک رہا ہے۔ اسے باندھو بھئی۔ یہ کیا کر رہی ہو تم عالیہ! پلیز ادھر توجہ دو۔" یہ ڈاکٹر دھمن کی آواز تھی۔

"اسے انجکشن دے دو چندن۔" ڈاکٹر عالیہ نے کہا۔ وہ ذرا فاصلے پر کھڑی تھی ۔۔۔ اور پھر میں نے محسوس کیا کہ کسی نے میرے بازو کی نس تلاش کرنے کے لئے اس پر کس کر ربر باندھ دیا ہے۔ جونہی میرے بازو کی نس ابھری۔ چندن نے ٹیکہ لگا دیا مجھے بے ہوش کرنے کے لئے ان کے پاس سب سے زیادہ موثر حربہ یہی ٹیکہ تھا۔

اور پھر مجھے نہیں معلوم کہ کیا ہوا؟ کیسے ہوا؟ ان لوگوں نے مجھے کس کس مرحلے سے گزارا جب مجھے ہوش آیا تو مجھے اپنے پیٹ کے بائیں حصے میں درد محسوس ہوا۔ تھا میرے پیٹ اور کمر پر بڑی سی پٹی بندھی تھی ۔۔۔ اور میری آنکھیں کھلی تھیں۔ میں گرد و پیش کو بہت آسانی سے دیکھ سکتا تھا مگر میں آزاد نہیں تھا ۔۔۔ میری دونوں ٹانگیں پہلے کی طرح پلنگ سے بندھی تھیں چمڑے کی پیٹی سے۔ اور میرے ہاتھ اب کی بار سر کی طرف پلنگ کے جنگلے پر بندھنے کے بجائے پہلو کی طرف بندھے تھے۔ اس طرح کہ میں کہنیوں سے لے کر انگلیوں کی پوروں تک کا حصہ حرکت میں لا سکتا تھا مگر اپنے بازوؤں کو نہیں ہلا سکتا تھا۔

مجھے ان لوگوں نے سفید براق قمیص اور پاجامہ پہنا دیئے تھے اور میرے قریب ہی پلنگ کے ساتھ لگی ہوئی ایک تپائی رکھی تھی جس پر سگریٹ بھی تھے اور پھل بھی مگر نہ وہاں دیا سلائی تھی نہ چھری۔ تپائی پر میرے ہاتھ کی رسائی کے عین نیچے ایک گھنٹی رکھی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ مجھے کسی چیز کی ضرورت ہو تو گھنٹی بجا دوں۔

دائیں پہلو میں درد کی ٹیسیں خاصی اٹھ رہی تھیں۔ اور میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ کیا کروں جب میں کچھ زیادہ ہی نڈھال ہونے لگا تو میں نے گھنٹی بجا دی۔

گھنٹی کی آواز اس چھوٹے سے کمرے میں صورِ اسرافیل کی طرح گونج گئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ آواز بھی میرے لئے ناقابل برداشت ہے۔ میری نقاہت حد سے گزر چکی تھی اور درد و دقت کا احساس میرے دل و دماغ سے ختم ہوتا جا رہا تھا۔ میری بدنصیبی نے مجھے کھیل کھیل کر دیا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے میں نے خدا کی دی ہوئی صحت جوانی اور حوصلہ مندی ایسی تمام نعمتیں نالی میں بہا دی ہیں۔ ایک نہایت ہی ادنیٰ سی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے میں نے اپنی ساری زندگی داؤ پر لگا دی تھی۔ مجھ سے زیادہ بڑا مورکھ اور کون ہو سکتا تھا۔

گھنٹی کی پہلی آواز پر کوئی بھی اندر نہ آیا۔ میں نے پھر پے بہ پے گھنٹی پر دھپ مارے۔ اتنا تو ہاتھ نہیں کھلتا تھا کہ میں زیادہ زور دے سکتا۔ بالآخر گھنٹی کی آواز کام کر گئی۔ ایک نرس جو عمر میں یہی کوئی اٹھارہ انیس سال کی ہو گی تھل تھل کرتی اندر آگئی۔ وہ دہرے بدن کی خاصی فربہ جسم کی تر و تازہ لڑکی تھی ۔۔۔ وہ بری طرح ہانپ رہی تھی۔ بولی ۔۔۔

"گھنٹی تم نے بجائی ہے؟"

"ہاں ۔ مجھے پیٹ میں یہاں درد محسوس ہو رہا ہے مگر یہ تو بتاؤ یہاں پٹی کیوں بندھی ہے؟"

"پٹی کیوں بندھی ہے عجیب بے وقوف آدمی ہو تم۔ تمہارے گردے میں پتھری تھی۔ جس کو نکالنے کے لئے سات دن پہلے آپریشن کیا گیا ہے اب تو تم بہت بہتر ہو۔ ٹھہرو میں ابھی تمہیں گولی دیتی ہوں۔ درد ابھی ختم

جائے گا۔" یہ کہہ کر وہ باہر کی طرف بھاگی۔ اور میں سوچتا ہی رہ گیا کہ اس کلینک کے لوگوں کو یا تو ڈاکٹر دھمن نے بے وقوف بنایا ہے یا وہ مجھے احمق سمجھ رہے ہیں۔ ورنہ صاف ظاہر تھا کہ وہ لوگ مجھے میرے ایک گردے سے محروم کر چکے تھے۔ درد کی ایک اور لہر میرے پہلو سے اٹھی اور سارے بدن کو ہلاتی چلی گئی۔ میری حالت دگرگوں ہوتی جا رہی تھی۔ وہ نرس تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی واپس آئی اور بولی۔ "لو یہ کھالو اور سو جاؤ۔"

"ابھی تو سو کر اٹھا ہوں چھمک چھلو؟" میں نے نہایت ہی بازاری انداز میں کہا۔

"کیا؟ کیا کہا تم نے مجھے۔ میں چھمک چھلو ہوں؟" وہ چیختی ہوئی بولی ——

"وہ عالیہ حرامزادی کہاں ہے؟ اسے کہنا کہ جیلانی یاد کرتا ہے اسے۔" میں نے اس نرس کو اور زیادہ حیران کرتے ہوئے کہا۔ اور گولی اس کے ہاتھ سے لے کر منہ میں ڈال لی۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے پانی کا گلاس میرے لبوں سے لگا دیا۔

"لگتا ہے تم پاگل ہو گئے ہو۔ جانتے ہو وہ کتنی بڑی ڈاکٹر ہے —— ایف آر سی ایس ہے۔" وہ مجھے گولی کھلا کر بولی۔

"اس ایف آر سی ایس کی ایسی تیسی۔ اسے میرے پاس بھیجنا۔ مجھیں کیا نام ہے تمہارا؟" وہ گلاس لینے کے لئے ذرا آگے جھکی تھی کہ میں نے اس کے بالوں سے پکڑ کر آگے کھینچا۔

"اوئے کتے دے پتر۔ توں کیہہ مصیبت ایں۔" یہ کہتی ہوئی وہ تیزی سے پیچھے ہٹی اور تڑاخ سے اس نے میرے رخسار پر طمانچہ دے مارا۔

"تمہارا ہاتھ خاصا بھاری ہے۔ میرا خیال ہے تمہارا پاؤں بھی بھاری ہو گا۔"

"لعنت ہزار لعنت، تیرے اُپر۔ توں آدمی نئیں سُور ایں سُور۔" اس نے خالص پنجابی لہجے میں مجھے لتاڑا۔

اس لمحے وہ مجھے کسی ڈلیوڈ ھپٹاں کی اولاد لگتی تھی۔ وہ پیر پٹختی ہوئی باہر نکل گئی۔

ابھی اسے میرے کمرے سے گئے ہوئے دس منٹ ہی گزرے تھے کہ عالیہ اپنی پوری شانِ یغمائی سے دندناتی ہوئی اندر آ گئی۔ وہ اس لمحے بھی ڈاکٹر کا لباس پہنے تھی۔

"یہ کیا بکواس ہے کہ تم نے ریٹا سے کیا بدتمیزی کی ہے؟"

"عالیہ۔ تم سے وہ زیادہ دلکش لگی ہے مجھے۔" میں نے عالیہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ میں ان لوگوں کو جس حد تک ممکن تھا ذلیل کر دینا چاہتا تھا۔ میرے ٹوٹ کر بکھر جانے اور ان کے قدموں پر سر رکھ کر التجا کرنے اور اپنی زندگی کی بھیک مانگنے کی ذلت سے مجھے خدا نے بچا لیا تھا۔ ان کا دیا ہوا وہ بے ہوشی کا ٹیکہ میرے لئے رحمت ثابت ہوا تھا ورنہ مجھے گزرنا تو تھا ہی اس اذیت سے۔

اور مجھے یقین تھا وہ اپنا کام کر چکے تھے۔ پانچ لاکھ ریال وہ کما چکے تھے۔ میری وہ بات سن کر عالیہ کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا۔

"یہ حرامزدگی یہاں نہیں چلے گی —— کتے! کمینے۔ ذلیل انسان! میں تمہاری کھال کھنچوا دوں گی۔"

"وہ تو کھنچوا ہی دی ہے تم نے عالیہ! پانچ لاکھ ریال تو میرے گردے کا کما ہی چکی ہو تم؟"

اس لمحے ریٹا نے کچھ اس طرح مجھے دیکھا جیسے وہ حیرت کی فراوانی میں دم توڑ دے گی۔

"یہ کتا پاگل ہو گیا ہے ریٹا! اس کی بات کا برا نہ مانو۔ اسے دور سے راتب ڈال کر باہر نکل جایا کرو۔ آؤ ادھر۔" یہ کہہ کر عالیہ اس نرس کو ساتھ لے کر باہر نکل گئی۔

پھر وہ مجھے نظر نہیں آئی۔ سارا دن میں اپنے زخم سہلاتا رہا۔ روتا رہا، سوچتا رہا کہ میں کہاں سے کہاں جا پہنچا ہوں۔ یہ کس شکنجے میں کس دیا ہے مجھے تقدیر نے —— مگر میرے رونے سے بھلا کیا ہوتا تھا۔ میرے وجود پر عالیہ کا خنجر کچھ اس طرح چل چکا تھا کہ میں ساری زندگی بھی اگر سر پر ہاتھ رکھ کر روتا تو بھی اس کا اندمال نہ ہو سکتا تھا۔ مجھے وہ سات روز پہلے میرے ایک گردے سے محروم کر چکے تھے اور اب تک وہ مسلسل مجھے بے ہوش رکھتے چلے آ رہے تھے۔ غذا مجھے وہ نالی کے ذریعے دیتے رہے تھے۔ دن بھر کی دوا، دوپہر کا کھانا، سہ پہر کی چائے اور شام کا کھانا اس روز مجھے ایک بڑھیا نے پہنچایا۔ وہ منہ سے کچھ نہ بولتی تھی۔ شاید وہ کانوں سے بہری بھی تھی میری کسی بھی بات کا وہ جواب نہ دیتی تھی۔ اشاروں سے وہ میری ضرورت سمجھتی تھی۔ زبان سے اس کا میں کچھ اندازہ نہ کر سکا۔ رات کو اسی نے مجھے آخری بار دوا پلائی اور پھر چپ چاپ باہر نکل گئی۔

اردگرد چاروں طرف دس بجے تک سناٹا چھا گیا۔ دس بجے کا احساس مجھے یوں ہوا کہ جہاں میں قید تھا وہاں سے کچھ ہی دور کسی جگہ کوئی بہت بڑا کلاک لگا تھا جس کی آواز مجھے صاف سنائی دیتی تھی۔

اس وقت رات کے دو بجے تھے۔ نیند مجھ سے کوسوں دور تھی۔ درد کا احساس منجمد ہو چکا تھا وہ کوئی ایسی دوا دے گئے تھے مجھے جس سے بدن درد کے احساس سے عاری ہو جاتا ہے۔ میں سوچ سوچ کر پاگل ہوا جاتا تھا۔ زندگی تو نے جو مجھ سے اتنا سنگین مذاق کیا ہے تو اس کا انجام کیا ہو گا۔ وہ بہت طاقتور لوگ تھے جن کے شکنجے میں میں کس دیا گیا تھا۔ میرے ماتھے پر ایک بہت بڑے جرم کی مہر لگی تھی۔ مگر اس کی سزا مجھے کیا ملتی۔ مجھے پولیس پکڑتی عدالت میں پیش کرتی۔ بہت بک بک جھک جھک ہوتی۔ عدالت مجھے دو چار سال کے لئے جیل بھیج دیتی اور اس دارالامان سے میں ذہنی طور پر پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط اور توانا ہو کر نکلتا مگر اب تو میں چوہے کی موت مارا گیا تھا اور یہی میرا سب سے بڑا المیہ تھا۔

اچانک میرے محبس کا دروازہ کھلا۔ ریٹا ایک جھپاکے سے اندر

آئی اور اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے میرے قریب آ ٹھہری۔ اس کے ہاتھ میں دواؤں کی ٹرے تھی جس میں تھرمامیٹر بھی تھا اور سرنج اور سوئیاں بھی۔

"کیسے آئی ہو میری جان؟" میں نے نہایت ہی شہدے پن سے کہا۔

"پھر تم نے بدتمیزی کی۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ تم دل سے یہ باتیں کہتے ہو؟"

"کیوں یقین نہیں آتا ہے تمہیں؟ میرا ایک گردہ نکال لیا ہے تم نے، اور اب بھی امید رکھتی ہو کہ میں تم سے اچھے لہجے میں بات کروں۔ میں جس دن یہاں سے آزاد ہو گیا وہ دن تم لوگوں کی زندگی کا آخری دن ہو گا۔" میں نے بہت تپے ہوئے لہجے میں کہا۔

وہ ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کر کے پلٹی اور دروازے کو ذرا سا کھول کر باہر جھانکنے لگی۔ دو منٹ بعد وہ اپنا کوٹ اتار کر اطمینان سے کرسی آگے کھینچ کر میرے قریب بیٹھ گئی۔

"تمہیں کس نے بتایا ہے کہ تمہارا گردہ نکال لیا گیا ہے؟"

"میں نے اس عالیہ اور خبیث دھمن کی باتیں سنی تھیں۔ وہ کسی عرب شیخ کو میرا گردہ دے چکے ہیں پانچ لاکھ ریال میں، مگر تم تو یوں پوچھتی ہو جیسے تمہیں علم ہی نہیں ہے۔"

"یہ تمہارا وہم ہے۔ کیا نام ہے تمہارا؟"

"میرا نام جیلانی ہے مگر تم کیسے کہتی ہو کہ یہ میرا وہم ہے؟"

"اس لئے کہ گردے کی پتھری کے آپریشن میں تو پیٹ پر زخم لگتا ہی ہے اور یہی شکایت تھی تمہیں۔"

"یا تو تم بہت بھولی ہو ریٹا یا پھر شیطان کی خالہ کی پھوپھی کی بھانجی کی بھتیجی ہو — پتہ نہیں یہ لوگ اب تک کس کس کے گردے بیچ کر کھا چکے ہوں گے۔"

وہ ہنس دی۔ بولی۔

"چھ مہینے پہلے مجھے بھی گردے میں پتھری کی شکایت ہو گئی تھی ڈاکٹر عالیہ نے آپریشن کیا تھا اور میں ٹھیک ہو گئی تھی۔ یہ دیکھو میرا ابھی پیٹ اتنا کٹا ہوا ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنا دامن اٹھا دیا۔

اس کے پیٹ پر ایک لمبا سا گھاؤ تھا۔

"تو بھی بہت بھولی ہے ریٹا۔ تو سمجھتی ہے تیرے گردے سے پتھری نکالی تھی ان لوگوں نے۔ نہیں، نہیں۔ تو بھی میری طرح زن یک گردہ ہو چکی ہے۔ مگر پھر بھی تو بہت خوب صورت ہے ریٹا۔ بہت خوبصورت شے۔"

کچھ دیر کے لئے میں بھول ہی گیا کہ میں کس دکھ میں مبتلا ہوں مگر پھر وہ جلدی ہی مجھے کھینچ کر آگہی کے حلقے میں واپس لے آئی، بولی۔ "میں نے اپنا کئی بار معائنہ کرایا ہے میرے دونوں گردے صحیح سالم ہیں اور یہ دھوکا مجھے لگتا ہے میرے ساتھ نہیں کیا گیا ہے مگر یہاں پتہ نہیں کن کن لوگوں پر یہ دونوں ڈاکٹر ہاتھ صاف کر چکے ہیں۔" اسے اب میری باتوں پر یقین آنے لگا تھا۔

"اگر تیرا گردہ سلامت ہے تو بڑی اچھی بات ہے مگر میں اپنے گردے سے محرومی کا —— ان سے بہت خوفناک انتقام لوں گا ریٹا۔ ایسا انتقام کہ یہ نہ مر سکیں گے نہ جی سکیں گے مگر تم..... تم یہاں کیوں آئی ہو اس وقت؟"

"دیکھو میرے تمہارے درمیان یہ بات ہمیشہ ایک راز رہے گی۔ میرا خیال ہے میں تمہیں آج سے ٹھیک پندرہ دن بعد یہاں سے چپکے سے نکال کر آزاد کرا سکوں گی۔ اس سے پہلے تمہارا یہاں سے نکلنا اچھا نہیں۔ تمہارا زخم خراب ہونے کا خطرہ ہے۔" اس نے سرگوشی کی۔

"ٹھیک ہے اگر تم اتنی ہی مہربان ہو مجھ پر تو میں سمجھوں گا کہ یہ میری خوش قسمتی ہے مگر میرا ایک کام تو کر دو۔"

"کیا؟ اگر کوئی باہر کا کام ہے تو وہ میں صبح ہی کر دوں گی۔"

"تم بس یوں کرو کہ ایک کاغذ قلم لا دو۔ میں ایک رقعہ اپنی بہن کے نام تمہیں دوں گا۔ وہ تم لفافے پر میرا پتہ لکھ کر ڈاک میں ڈال دو گی۔"

"یہ بھی کوئی کام ہے میں صبح جب آؤں گی دوا دینے تو تمہیں کاغذ پنسل اور لفافہ دے دوں گی ٹھیک؟ اب میں چلتی ہوں تم آرام کرو۔"

"مگر یہ تو بتاؤ یہ جگہ کون سی ہے؟"

"یہ ڈاکٹر دھمن کا پرائیویٹ کلینک ہے شفا بار، اور مستونگ روڈ کی کوٹھی نمبر ۱۸ میں قائم ہے۔"

"بس ٹھیک ہے۔ امید ہے مجھے تم اپنی توجہ سے محروم نہیں کرو گی۔" میں نے کہا۔

جب وہ باہر نکلی تو اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ وہ بہت خوش جا رہی تھی مجھ سے۔

وہ چلی گئی تو مجھے دنیا پہلے سے زیادہ بہتر جگہ نظر آنے لگی۔ میں اس کے بارے میں جوں جوں سوچتا گیا یہ نتیجہ آپ ہی آپ میرے ذہن پر مرتب ہوتا گیا کہ ابھی زندگی اس قابل ہے کہ اسے ایک آہنی عزم کے ساتھ گزارا جائے۔ ابھی شاخوں پر پھول کھلتے ہیں اور ابھی کلیوں پر شبنم اترتی ہے۔

دوسرے دن میں نے اسے ماں کے نام رقعہ لفافے میں بند کر کے دے دیا جس میں میں نے ماں سے کہا تھا کہ وہ فکر نہ کرے میں خیریت سے ہوں۔ اس کے سوا میں نے اور کچھ نہ لکھا۔ ورنہ وہ بہت زیادہ فکر مند

ہو جاتی۔

اسی دن ریٹا نے مجھے بتایا کہ ڈاکٹر دھمن اور عرفان بغداد چلے گئے ہیں۔ صبح کی پرواز سے ___

مجھے قطعاً کوئی تعجب نہ ہوا۔

اور پھر یوں ہوا کہ اسی شام میرے کمرے میں دو نرسیں آئیں انہوں نے پہلے تو ایک مضبوط چمڑے پر بندھی لوہے کی زنجیر میرے بائیں ٹخنے پر لپیٹی اور اسے پلنگ کے پائے سے منسلک کر کے تالا لگا دیا۔ پھر انہوں نے میری باہوں اور رانوں کے جکڑ بند کھول دیئے۔

"یہ مہربانی میری کس نیکی کا ثمر ہے مائی ڈیئر سسٹرز؟" میں نے پوچھا۔

"اب آپ خطرناک مریض نہیں رہے ہیں۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ اب آپ کا پاگل پن ختم ہو گیا ہے۔" ایک نرس نے کہا۔

اچانک ایک لحیم شحیم آدمی اندر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں بید تھا۔ آتے ہی بولا "یہ کیا بکواس ہے؟ میں نے تمہیں کہا بھی تھا کہ تم مریضوں سے کوئی بات نہیں کرو گی چلو باہر نکلو۔" وہ دونوں نرسیں خوف زدہ ہو کر باہر بھاگ گئیں۔ اس آدمی نے گہری گہری نظروں سے مجھے دیکھا اور بولا ___

"دیکھ اوئے کتے کی ہڈی! اپنی زبان بند رکھا کر ورنہ میں اسے گدی سے کھنچوا دوں گا۔ اس رعایت کو کافی سمجھ کہ تیرے چار جکڑ بند کھل گئے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے بید آہستہ آہستہ اپنی ہتھیلی پر مارا۔ اس کی گردن خاصی اکڑی ہوئی تھی۔

"کیا نام ہے تمہارا پہلوان؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

وہ میری ٹکٹکی پر بدل سا گیا۔

"میرا نام سوات خان ہے مگر تو کیوں پوچھتا ہے میرا نام؟" اس نے بڑی ٹن فن سے پوچھا۔

"کچھ نہیں یونہی! میں نے سوچا شاید کبھی تم سے کوئی کام پڑ جائے پہلوان! آدمی آدمی کا دارو ہوتا ہے۔" میں نے پانسہ بدلتے ہوئے کہا میں اس قابل کہاں تھا کہ اس سے الجھ سکتا۔ وہ اپنی مونچھ چوستا ہوا باہر نکل گیا۔ بڑی گھیر دار شلوار پہنے ہوئے تھا وہ۔ اور جثے سے وہ... ہیبت خان کا سالا لگتا تھا۔ بڑا ڈیل ڈول تھا اس کا۔

میرے اگلے دس بارہ دن اس کمرے میں بہت اچھے گزرے۔ ریٹا مجھ پر بہت مہربان رہتی۔ میرا خیال ہے وہ مجھ پر کچھ زیادہ ہی فریفتہ ہو گئی تھی۔ اس عرصے میں نہ میں نے عالیہ کو دیکھا نہ ڈاکٹر دھمن کو ___ میرا زخم اب بڑی حد تک مندمل ہو چکا تھا۔ اور میں آسانی سے پلنگ پر اٹھ بیٹھ سکتا تھا۔ غذا بھی میں اب پوری طرح ہضم کرنے لگا تھا ___ حیرت مجھے یہ تھی کہ کسی بھی ڈاکٹر نے اس عرصے میں میرا معائنہ نہیں کیا مگر میرا یہ خیال غلط نکلا۔ مجھے وہ ہر شب نیند آور دوا دے دیتے تھے۔ اسی نیم بے ہوشی کی حالت میں ڈاکٹر عالیہ آ کر میرے زخم کی پٹی بھی بدلتی تھی اور میری عام حالت دیکھ کر دوا میں بھی مناسب رد و بدل کر دیتی تھی۔ یہ بات بہت دنوں بعد مجھے ریٹا نے بتائی۔

وہ لوگ بہت سی باتیں اپنے عملے سے مخفی رکھتے تھے۔ ریٹا کو میں نے پوری طرح شیشے میں اتار لیا تھا۔ یہی میرے لئے بہتر تھا۔ وہاں سے اپنی رہائی کا یہی راستہ کھلا تھا میرے لئے۔ اور یہی وجہ تھی کہ میں نے ریٹا پر حسن کی تعریفوں کے ہر موقع پر خزانے لٹا دیئے تھے ___ وہ بہت خوش تھی مجھ سے۔ اس کے انا کے تاروں کو تو جب بھی میں چھیڑتا تھا وہ جھنجھنا کر ایک مدھر موسیقی میں ڈھلنے لگتے تھے۔

وہ اس حد تک آگے بڑھ آئی تھی کہ میرے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے پر آمادہ تھی۔

اور پھر وہ رات آ گئی جس کا اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔

اس رات وہ پھر ایک بجے کے قریب میرے کمرے میں آئی۔ وہ نرسوں کے عام لباس میں ملبوس تھی۔ رات کی ڈیوٹی پر ہونے کی وجہ سے وہ کسی بھی مریض کے کمرے میں جا سکتی تھی۔ اس نے دواؤں کی ٹرے تپائی پر رکھی اور بولی۔

"جیلانی تیرا زخم بالکل ٹھیک ہو چکا ہے۔ تو اب تیار ہو جا۔ میں تیری زنجیر کاٹ رہی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔

"تیرا یہ احسان میں عمر بھر کبھی نہ بھول سکوں گا ریٹا۔"

"احسان کی بات نہیں ہے اگر تو کچھ دن اور یہاں رہ گیا تو پھر پتہ نہیں یہ لوگ تیرے ساتھ کیا سلوک کریں؟" یہ کہہ کر اس نے اپنے کرٹ کی جیب سے ایک چھوٹی سی آری نکالی اور میرے پلنگ کے پائے کے قریب بیٹھ کر میری لوہے کی زنجیر کاٹنے لگی۔

آری کی گھر گھر کی آواز اس سناٹے میں عجیب سی گونج پیدا کر رہی تھی۔ اس کی آواز کو دبانے کے لئے میں زور زور سے کھانسنے لگا۔

ابھی دو منٹ ہی گزرے تھے کہ دروازے پر بڑی زوردار دستک ہوئی۔ ریٹا کا رنگ اڑ گیا۔ اس نے آری میرے بستر کے گدے کے نیچے رکھی اور لپک کر چٹخنی بڑی آہستگی سے نیچے گرا دی۔ اتنی آہستگی سے کہ ذرا سی بھی آواز پیدا نہ ہوئی۔ ابھی وہ پیچھے ہٹ ہی رہی تھی کہ دروازہ زبردست دھماکے سے کھلا۔ اور وہ اس کی لپیٹ میں آ کر دیوار سے جا لگی۔ سوات خان دندناتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ کھلا چاقو اس کے بائیں ہاتھ میں تھا۔ اس نے جھک کر میری زنجیر دیکھی جس کی ایک کڑی کٹ چکی تھی۔ صورت حال کو سمجھتے ہوئے وہ ہنکارتا ہوا بڑھا اور ریٹا کو اس نے بازو سے دبوچ کر کچھ اس طرح جھنجھوڑ کر کے دیوار میں دے مارا کہ وہ بلبلا اٹھی۔

"یار کا راستہ کھولتی ہے مالزادی! تیری یہ جرأت۔" یہ کہہ کر اس نے تڑاخ پڑاخ اس کے رخساروں پر تھپڑ دے مارے۔ وہ بلند آواز سے چیخی۔

یہ سب کچھ میرے لئے ناقابل برداشت تھا۔ مجھے ڈر تھا، تو صرف یہ تھا کہ میرے زخم کے ٹانکے نہ ادھڑ جائیں مگر وہ صورت حال ایسی تھی کہ میں خاموش نہ رہ سکتا تھا۔ ریٹا صرف میری وجہ سے اس مصیبت میں پھنسی تھی۔ میں پورے قد سے اپنے پلنگ پر اٹھا اور اپنا کمبل میں نے سوات خان پر ڈال کر اسے ایک جھٹکے سے پلنگ پر گرا دیا۔ زنجیر جگہ نہیں دیتی تھی۔ اس لئے میں نے بیٹھ کر سوات خان کی گردن دونوں ہاتھوں سے دبا دی۔ وہ کمبل میں آدھا لپٹا ہوا تھا اور اس کا سر میری دونوں ٹانگوں میں پھنسا تھا۔

میں نے اس کی گردن کی حساس ترین رگ مل دی۔ یہ تجربہ میں کئی بار کر چکا تھا ___ ایک ہی سیکنڈ میں سوات خان بے ہوش ہو کر ادھ موئے کتے کی طرح لڑھک کر پلنگ سے نیچے جا گرا۔ مجھے زیادہ قوت صرف نہیں کرنی پڑی تھی، اس کا چاقو میرے پلنگ پر گر گیا۔ وہ میں نے اٹھا لیا۔

ریٹا نے اسے گرتے دیکھا تو لپک کر دروازہ بند کرنے چلی ___ مگر اچانک ایک آدمی دندناتا ہوا اندر آیا۔ اور ریٹا سے ٹکرا گیا۔ وہ گالی بک رہا تھا اور مجھ سے چار ہاتھ دور تھا۔ میں نے سوات خان کا چاقو پوری قوت سے اس کی طرف پھینکا۔ وہ سیدھا اس کے سینے میں جا دھنسا اور وہ ایک دلدوز چیخ مار کر فرش پر لڑھک گیا۔ ریٹا نے فوراً اندر سے دروازہ بند کر لیا اور چٹخنی چڑھا دی۔

"میری یہ زنجیر کاٹ دے ریٹا جلدی کر۔"

میں نے آری اس کی طرف بڑھائی مگر اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ وہ آری کو ٹھیک طرح سے پکڑ نہ سکتی تھی۔

"لا ادھر میں خود کاٹتا ہوں۔" آری میں نے اس کے لرزیدہ ہاتھ سے واپس لے لی۔ اور تیزی سے خود زنجیر کاٹنے لگا۔ اتنے میں دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ کوئی بہت جلدی میں تھا۔ میں نے ہاتھ اور تیز چلایا ___ زنجیر چند سیکنڈ میں کٹ گئی۔ وہ خاصی تیز آری تھی میرے خوب کام آئی۔

اب میں بالکل آزاد تھا۔ میں نے پلنگ سے اتر کر اپنے ہاتھ پاؤں سیدھے کئے۔ ان کی سلامتی دیکھی اور پھر سوات خان کا چاقو اس آدمی کے سینے سے نکال لیا۔ وہ بدبخت شاید مر چکا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور پتلیاں ساکن ہو چکی تھیں۔ وہ تیز دھار نو انچ لمبا چاقو کام دکھا گیا تھا۔ اس کے دستے پر سنہرے حرفوں میں سوات خان کندہ تھا ___

دروازے پر دستک تیز ہو گئی تھی۔ میں نے کمبل اپنے گرد لپیٹا اور جوتا پہن لیا۔ وہ لوگ دروازے کو شاید توڑ دینے کا فیصلہ کر چکے تھے ریٹا دیوار سے لگی بری طرح لرز رہی تھی۔ وہ لوگ میرا ایک گر دہ نکال چکے تھے پھر بھی مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میرے بدن کی بجلیاں برقرار ہیں۔ اتنے دنوں تک میں پلنگ سے بندھا رہا تھا پھر بھی میں ابھی تک بازوؤں میں خاصی سکت پا رہا تھا۔

اور پھر کوئی اندھے بھینسے کی طرح دروازے سے ٹکرا گیا مگر وہ بہت مضبوط دروازہ تھا۔ راہ نہیں دیتا تھا۔ میں نے ایک نظر کھڑکی پر ڈالی۔ اس میں خاصے بڑے بڑے شیشے لگے تھے۔

باہر کی طرف ایک جالی تھی۔ لوہے کا جنگلہ نہیں لگا تھا۔ میں نے پاؤں کی ٹھوکر سے شیشہ توڑ دیا۔ دروازے پر کسی نے ایک اور زوردار ضرب لگائی۔ کھڑکی کا شیشہ ٹوٹا تو میں نے اوپر اٹھ کر دونوں ہاتھوں سے جالی پر زور ڈالا۔ وہ کنارے سے کھسک گئی اور کونڈے سے دباؤ سے ایک طرف ہٹ گئی۔

دوسری طرف ایک چھوٹی سی راہداری تھی۔ میں نے ریٹا کو تیزی سے اس راہداری میں اتارا اور خود بھی اس کے پیچھے لپکا۔ راہداری دائیں طرف سے بند تھی۔ ہم بائیں طرف بڑھے۔ اور نکلتے چلے گئے۔

وہ لوگ برابر دروازے کو توڑنے کی کوشش کر رہے تھے مگر ابھی تک انہیں کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ ہم راہداری عبور کر کے عمارت کے پچھلے حصے میں جا نکلے جبکہ برآمدے سے آگے ہی ایک کار پورچ بنا تھا۔ وہاں ایک کار کھڑی تھی۔ ریٹا کو لے کر میں اس کی طرف بڑھا۔ اندر کار کا ڈرائیور پچھلی سیٹ پر سویا ہوا تھا۔ جونہی میں نے دروازہ کھولا وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

میں نے اسے کوٹ کے کالر سے پکڑ کر زبردست جھٹکا دیا۔ "نکل جا باہر تیری ماں......" اس لمحے میری آواز اس قدر ڈراؤنی ہو گئی کہ میں خود اسے نہ پہچان سکا۔

وہ بے چارہ شاید کوئی مریض لے کر وہاں آیا تھا خوفزدہ ہو کر کار کے دوسرے دروازے کو کھول کر سرپٹ بھاگا۔ سامنے کھلے لان کی طرف اپنی ٹوپی بھی وہ وہیں بھول گیا تھا۔

میں نے اگلی سیٹ پر اپنے ساتھ ہی ریٹا کو بٹھایا اور کار اسٹارٹ کر کے وہاں سے چل نکلا۔ وہ بالکل نئی کار تھی چمکتی جھلکتی عمدہ سی تیز رفتار کار۔ اشارے سے چلتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ نئے ماڈل کی ٹویوٹا کرولا تھی مگر مجھے کیا لینا تھا اس کے ماڈل سے۔ میں کار کو بھگاتا ہوا عمارت کے بڑے دروازے پر جا پہنچا۔ وہاں ایک سنتری کھڑا تھا۔ اس نے ہم سے کوئی تعرض نہ کیا۔ اس نے چپ چاپ دروازہ کھول دیا۔ اور ہم باہر نکل گئے۔

"ریٹا تمہیں پتہ ہے عالیہ اس وقت کہاں ہو گی؟"

"وہ اپنی کوٹھی پر ہو گی، گلبرگ میں۔"

"مجھے راستہ بتاتی چلو، ہم وہیں جا رہے ہیں۔" میں نے ڈرائیور کی ٹوپی سر پر رکھ لی تھی۔

"کیوں وہاں کیوں جاؤ گے تم، پھر پھنسنے کا ارادہ ہے کیا؟"

"نہیں بلکہ میں اسے پھانسنا چاہتا ہوں۔ خاصی خوبصورت عورت ہے وہ۔" میں نے ریٹا کو ایک ذہنی جھٹکا دینے کی کوشش کی۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ سوچتی ہو گی پتہ نہیں کس قسم کے آدمی سے پالا پڑا ہے۔ اس کا دل کیا ہے؟ پرزوں تو وہ دیکھ ہی چکی تھی۔

"مجھے راستہ بتاتی چلو ریٹا۔ پتہ نہیں مجھے کس طرف سے جانا ہے۔" میری یہ بات سن کر وہ سنبھل کر بیٹھ گئی اور خالصہ جی کی پریڈ کے انسٹرکٹر کی طرح کھبا، سجا، سجا، کھبا، بتاتی چلی گئی۔

کوئی پچیس منٹ بعد ہم گلبرگ کی اس کوٹھی کے سامنے کھڑے تھے جہاں سے چند ہی دن پہلے میری زندگی سر کے بل زوال کے غاروں میں گرنا شروع ہوئی تھی۔

میں نے کار کی بتیاں گل کر دیں۔ بڑا گیٹ اندر سے مقفل تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ ہمیں چار دیواری پھاندنا ہو گی۔ ابھی میں صورتِ حال کا جائزہ ہی لے رہا تھا کہ کوٹھی کی عمارت سے ایک کار تیزی سے باہر کی طرف لپکتی نظر آئی۔ وہ پلک جھپکتے میں گیٹ پر آ پہنچی۔ عالیہ اسے ڈرائیو کر رہی تھی۔ اور حیدر اس کے ساتھ کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ انہیں میرے فرار کی خبر مل چکی تھی۔

حیدر نے اتر کر گیٹ کا قفل کھولا اور پھر اس نے لوہے کے بھاری بھرکم گیٹ کے ایک حصے کو پیچھے دھکیلا۔ عین اسی وقت میں نے بجلی کی سرعت سے آگے بڑھ کر کار کی کھلی کھڑکی میں سے ہاتھ اندر ڈال کر عالیہ کی گردن دبا دی ــــ وہ خاص گانٹھ کی نس میری انگلی تلے آئی اور مسلی گئی۔ اس کے ساتھ ہی عالیہ کا سر ڈھلک گیا۔

میں نے جھٹکے سے کار کا دروازہ کھولا۔ اور عالیہ کو دوسری سیٹ پر دھکیل کر اسٹیئرنگ پر بیٹھ گیا۔

ریٹا لپکتی ہوئی میرے پاس آ ٹھہری۔

"اندر بیٹھ جا اری! کیا منہ تک رہی ہے؟" میں نے کار اسٹارٹ کر کے پچھلا دروازہ کھول دیا۔ ریٹا ایک جھپاکے سے اندر بیٹھی اور پیشتر اس کے کہ لنگڑا حیدر صورتِ حال کو سمجھ سکتا یا کوئی کارروائی کر سکتا۔ میں نے کار سے اتر کر اسے چاقو کی نوک پر دھر لیا۔ میں اسے بھی ساتھ لینا چاہتا تھا۔ مگر وہ پاگلوں کی طرح الٹے پاؤں بھاگا اور دیکھتے ہی دیکھتے نکلتا چلا گیا اب میرے پاس اتنا وقت کہاں تھا کہ میں اس کا پیچھا کرتا میں نے کار کا اسٹیئرنگ سنبھالا اور عالیہ کو لے کر وہاں سے چل دیا۔

میرے لئے اس لمحے وہی بہت کافی تھی ان لوگوں سے اپنی اس شکست کا بدلہ لینے کے لئے میں نے اپنی کارروائی کا آغاز کر دیا تھا۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ مجھے کدھر جانا ہے۔ ایک اندھا بہرہ تیز و تند طوفان ایسا بلاخیز جذبۂ انتقام تھا جو اندر ہی اندر مجھے بھسم کئے دیتا تھا اور میرا اس لمحے جی چاہتا تھا کہ میں ان سب لوگوں کو آگ پر رکھ کر بھون ڈالوں جنہوں نے مجھے زندگی بھر کے لئے میرے ایک اہم عضو سے محروم کر دیا تھا۔

عالیہ ابھی تک بے ہوش پڑی تھی۔ وہ رگ جو میں دباتا تھا آدمی کو پہروں دنیا جہاں کے غموں سے بے نیاز کر دیتی تھی۔ مجھے وہ گر ایک کاندھیا پہلوان نے بتا دیا تھا۔ وہ لکھنوی پہلوان تھا۔ بہت بڑا بنوٹ باز تھا وہ۔ رومال میں پیسہ باندھ کر دشمن کی گردن پر مار دیتا تھا تو دشمن ڈھائی پہر کے لئے چھٹی کر جاتا تھا۔ ایسا کاری حربہ تھا اس کے پاس۔ کاش میں نے وہ حربہ پہلے ہی دن عالیہ پر آزمایا ہوتا۔ بعد میں ہی کسی لمحے میں اپنے دشمنوں پر وہ حربہ استعمال کر لیتا تو اس ذلت سے بچ جاتا۔ مگر ان لوگوں نے تو مجھے شروع ہی سے خواب آور ٹیکے اور گولیاں کھلا کھلا کر بے بس کر رکھا تھا۔ میں تو ان کی اسیری کے دنوں میں بالکل موم کی ناک بن گیا تھا۔

وہ تو ریٹا کا بھلا ہو کہ اس نے مجھے اتنے دنوں تک الابلا دواؤں سے بھی بچایا۔ جی جان سے میری اس نے خدمت بھی کی اور پھر لپید خوراک بھی وہ مجھے کھلاتی رہی تھی کہ میں اتنے بڑے عذاب سے جلد نجات پا سکا تھا ورنہ وہ تو شاید آہستہ آہستہ مجھے کسی نشے کا عادی بنا دینے پر تلے ہوئے تھے۔

ریٹا نے مجھے یہی بتایا تھا۔ وہ مجھے مارفیا کا انجکشن دکھاتی تھی کہ وہ ٹیکہ ڈاکٹر عالیہ نے اسے دیا ہے تاکہ سرِ دز وہ تھوڑا تھوڑا مارفیا میرے بدن میں اتارتی رہے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ میں زندگی بھر کے لئے مفلوج ہو کر رہ جاتا۔ بھول ہی جاتا کہ میرا گردہ وہ لوگ نکال چکے ہیں اور میری زندگی نشے کی لہر پہ ڈال دی گئی ہے۔ یہی وہ میرا حشر کرنا چاہتے تھے۔ جس سے مجھے ریٹا نے کمال مہربانی سے بچا لیا تھا اور اب میں تندرست و توانا ہو کر وہاں سے بچ نکلا تھا۔

"کدھر کا ارادہ ہے اب جیلانی؟"

"میں اسے کسی جگہ پہنچا کر چھپا دینا چاہتا ہوں۔ تمہارا گھر کیسا رہے گا؟"

"نہیں نہیں۔ وہاں تو بہت سے لوگ ہیں، ایک ڈیڑھ کمرے کا کوارٹر ہے ہمارے پاس اور ارد گرد کے لوگ ہر وقت ایک دوسرے کے حالات سے واقف رہتے ہیں۔"

"تو پھر کسی ہوٹل میں چلتے ہیں کچھ پیسے کا بندوبست کر سکتی ہے تو؟"

"یوں کرو تم اس مصیبت کو ادھر کراچی یا کسی اور بڑے شہر لے چلو وہاں ہم ہر قسم کے خطرے سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔"

"مگر نہ تو میرے پاس اتنے پیسے ہیں کہ میں اسے ہوٹل میں رکھ سکوں اور نہ اتنا پیٹرول گاڑی میں ہو گا کہ لمبا سفر کر سکیں۔"

"تو پھر کچھ سوچو نا، کیا کرنا چاہئے؟ تم اسے اپنے گھر کیوں نہیں لے جاتے ہو؟"

"نہیں بابا میری بہن کیا سوچے گی میری ماں تو بیچاری صدمے سے ہی مر جائے گی۔ میں انہیں کیا بتاؤں گا کہ یہ کون ہے؟ اس سے تو میرے دو دو ہاتھ ہونے ہیں ابھی۔ میں اس سے اپنے سارے زخموں کا حساب لینا چاہتا ہوں۔"

"تو پھر تم ہی سوچو میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا ہے۔"

اس وقت تک ہم ملتان روڈ پر پہنچ چکے تھے۔

اچانک میں نے دیکھا کہ ایک موٹر سائیکل کے پیچھے ایک کار سرپٹ دوڑ رہی ہے اور کار والا اس کوشش میں ہے کہ کسی نہ کسی طرح موٹر سائیکل سوار کو کچل دے دونوں ایک دوسرے سے بار بار ٹکرا کر نکل رہے تھے۔ موٹر سائیکل سوار ایک جگہ اپنے آپ کو کار سے بچانے کیلئے بائیں ہاتھ مڑا مگر کسی چیز سے ٹکرا گیا اور رفتار کی تیزی میں کچھ اس بری طرح الٹ کر گرا کہ کئی قلابازیاں کھا کر ایک کوٹھی کی دیوار سے جا لگا۔ کار اسی جگہ رک گئی دو آدمی تیزی سے باہر نکلے اور اس کی طرف لپکے۔ یہ تماشا ایسا دلچسپ اور خوفناک تھا کہ میں نے کار روک لی۔ موٹر سائیکل سوار کی زندگی خطرے میں تھی۔

اچانک میرا ہاتھ کار کے اندر عالیہ کے پہلو سے ٹکرایا۔ وہاں اس کا ہینڈ بیگ دھرا تھا اور اس کا منہ کھلا تھا۔ میرا ہاتھ یونہی بے خیالی میں اس کے اندر چلا گیا۔ کوئی سرد شے میری انگلیوں سے چھو گئی۔ وہ عالیہ کا پستول تھا میں نے ایک دم اسے اٹھا لیا ـــــ اور اس کا لاک کھول کر میں باہر نکل آیا۔

وہ دونوں آدمی اس وقت موٹر سائیکل سوار کی طرف لپک رہے تھے۔ میں نے باہر نکلتے ہی بغیر سوچے سمجھے ایک آدمی کی پنڈلی کو تاک کر گولی چلا دی۔ وہ ایک قطعاً اضطراری حرکت تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ موٹر سائیکل سوار ان کے ہاتھوں مارا جائے۔

گولی اس آدمی کی پنڈلی میں پیوست ہو گئی تھی اور وہ تیورا کر دائیں طرف جا گرا تھا۔ دوسرا آدمی پناہ لینے کے لئے بائیں ہاتھ بھاگا۔ مگر میں نے اسے مہلت نہیں دی اور پے در پے دو گولیاں اس پر چلا دیں۔ ایک چیخ اس کے منہ سے نکلی اور وہ زمین پر جا رہا۔

میں لپک کر موٹر سائیکل سوار کے پاس پہنچا تو یہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا کہ وہ کوئی پولیس افسر تھا۔ اس کے بازوؤں پر لگے تمغے میں نے دیکھے تو حیران رہ گیا۔ کوئی ڈی ایس پی تھا۔ اور بے ہوش ہو چکا تھا۔

میں نے جلدی جلدی اس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ وہاں سے مجھے جو کچھ ملا اس سے یہ معلوم ہوا کہ اس کا نام ایس کے چیمہ تھا۔ اس کا دفتر چھاؤنی کے علاقے میں تھا اس کی جیب میں ساڑھے سینتالیس روپے موجود تھے۔ اس کے پستول میں اور اس کی پیٹی میں گولیاں نہیں تھیں۔ پستول گرم گرم محسوس ہوتا تھا۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنا اسلحہ چلا چکا تھا۔

میں نے اسے فوراً ہی پیٹھ پر لادنا چاہا مگر پھر میں ڈر گیا۔ مجھے اپنے زخم کے ٹانکوں کو بچانا چاہئے تھا۔ میں نے ریٹا کو پکارا۔ اور پھر ہم دونوں نے اسے پاؤں اور ہاتھوں سے پکڑ کر کار میں ڈالا اور اسی وقت میو ہسپتال کی طرف لے چلے۔

اس سارے جہاں کے ہسپتالوں سے اچھے ہسپتال اور مہربان ہسپتال کے ہنگامی وارڈ کے سامنے لے جا کے میں نے کار کھڑی کر دی۔ ایک آدمی سے کہہ کر میں نے اسٹریچر منگوایا اور اس پر ڈال کر چیمہ کو اندر لے گیا۔ ڈاکٹر نے میرے مریضوں ایسے سفید کپڑے دیکھے تو قدرے حیران ہوا مگر میں نے اسے بات کرنے کا موقع نہیں دیا کہا "دیکھیں ڈاکٹر صاحب! یہ ڈی ایس پی مسٹر ایس کے چیمہ ہے۔ یہ ادھر ملتان روڈ پر مجھے بے ہوش حالت میں ملا ہے اس کے پیچھے غنڈے لگے ہوئے تھے۔ ان کی کار کا نمبر یہ ہے۔" میں نے اس کے ہاتھ سے قلم لے کر کار کا نمبر کاغذ پر لکھ دیا۔ "وہ دونوں غنڈے وہاں زخمی پڑے ہیں ـــــ ملتان روڈ کے چوک سے ذرا ادھر۔ اس کا علاج کرو۔ میں انہیں بھی لے کر آتا ہوں۔ ان کی بھی زندگیاں خطرے میں ہیں۔" یہ کہہ کر میں وارڈ کے اسپرٹ زدہ ماحول سے تیزی سے باہر نکل آیا۔ ڈاکٹر مجھے پکارتا ہی رہا مگر میں نے اس کی کوئی بات نہ سنی۔

ریٹا فکرمند بیٹھی تھی۔ اس نے کار کے سارے شیشے اندر سے بند کر رکھے تھے تاکہ کوئی دیکھ نہ سکے کہ وہاں عالیہ بھی پڑی ہے، بے ہوش آڑی ترچھی۔ بے گناہ لوگوں کی طرح مسیح مصلوب کی طرح۔ حالانکہ...... حالانکہ بیمار جہاں کی خباثت اس کے وجود میں اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔

"میرا خیال ہے جیلانی! ہمیں ان دو آدمیوں کا بھی پتہ کرنا چاہئے وہ کہیں مر ہی نہ گئے ہوں۔ انہیں مار دینے کا ہمیں کوئی حق نہیں ہے۔"
وہ خاصی فکر میں ڈوبی ہوئی نظر آتی تھی۔

"تم ٹھیک کہتی ہو چھمک چھلّو! میں ادھر ہی چلتا ہوں۔ باقی باتیں پھر ہوتی رہیں گی ——" یہ کہہ کر میں نے کار کا رخ پھر ملتان روڈ کی طرف موڑ دیا۔ کوئی دس منٹ میں ہم وہاں جا پہنچے۔ رات سنسان تھی اور راستے ویران۔ ایسے میں کار کی رفتار تو آسمان سے باتیں کر سکتی ہے اور وہ بھی عالیہ کی کار سیڈان تھی اور وہ بھی ایسی ویسی سیڈان نہیں کسی عرب شیخ کی مرحمت کردہ خوبصورت مضبوط اور تیز رفتار سیڈان۔

میں نے دیکھا کہ وہ کار ابھی تک وہیں کھڑی ہے جس میں بیٹھ کر وہ غنڈے اس ڈی ایس پی کا پیچھا کر رہے تھے۔ میں نے کار سے اتر کر ادھر دیکھا جہاں وہ دونوں دائیں بائیں گرے تھے۔ وہ اب بھی وہاں پڑے تھے مگر دونوں یکجا ہو گئے تھے۔ میں بڑی احتیاط سے ان کی کار کی طرف بڑھا۔ کار کا دروازہ کھلا تھا۔ میں نے اندر جھانک کر دیکھا تو وہاں مجھے ایک بڑا سا بریف کیس ملا۔ اس کے ساتھ ہی گولیوں سے اٹا ہوا ایک ہولسٹر بھی تھا۔ مگر اس میں پستول نہیں تھا ——

ابھی میں بریف کیس لے کر کار سے نکلا ہی تھا کہ ایک شعلہ سا میرے سامنے روشن ہوا۔ اور ایک گولی سنسناتی ہوئی میرے سر پر سے گزر گئی۔ میں فوراً ہی کار کے دروازے کی اوٹ میں بیٹھ کر کار کو دھکیلنے لگا —— وہاں صاف ستھری پختہ سڑک کی ڈھلوان تھی۔ کار اس پر تیزی سے نیچے کی طرف چلی اور اس کے ساتھ ہی میں نے سیدھے ہاتھ میں عالیہ کا پستول سنبھال کر سامنے کی طرف اس نکتے پر گولی چلا دی جہاں سے دوسرا شعلہ بھڑکا تھا۔ میری گولی نشانے پر لگی تھی۔ ایک دلدوز چیخ فضا میں ابھری اور پھر سکوت چھا گیا۔ میں نے کار کو دھکیل کر ان کی طرف لڑھکا دیا۔ وہ بالکل سامنے ہی تو تھا اور جھاڑیوں سے نکل کر پختہ سڑک پر آ چکے تھے۔ کار ان کی طرف لڑھکی اور میں لپک کر اپنی کار میں جا بیٹھا۔ ان کا بریف کیس میرے ہاتھ میں تھا۔ بریف کیس نہ جانے کیوں مجھے خاصا بھاری لگ رہا تھا۔

رٹیا کو بریف کیس تھما کر میں نے کار اسٹارٹ کر دی اور ملتان روڈ کی جنوبی سمت میں بھاگ نکلا۔ مجھے یقین تھا کہ میں نے ان میں سے ایک کو تو ضرور ہی قتل کر دیا ہے۔ اس کی چیخ ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔

کار ملتان روڈ پر آگے بڑھتی رہی اور شاہ نور اسٹوڈیوز عبور کر گئی تو میں نے کہا۔
"رٹیا! ذرا دیکھو اس بریف کیس میں کیا ہے؟ یہ کون درویش تھے جو اس گنہگار جیمہ ڈی ایس پی کے پیچھے پڑے تھے۔"
"میں کیسے کھولوں؟ اس میں تو تالا لگا ہے۔"
"ارے تو کیسی لڑکی ہے۔ آج کل کی لڑکیاں تو بڑے بڑے دروازے توڑ دیتی ہیں۔ ذرا دیکھ تو شاید اس عالیہ بی بی کے بیگ میں کوئی چیز مل جائے جس سے تو یہ بریف کیس کھول سکے۔" میں نے ہینڈ بیگ اسے دے دیا۔

"یہ کوئی تالے چابیاں تو نہیں بنایا کرتی جیلانی! کیسی باتیں کرتے ہو تم؟"
"دیکھو تو سہی۔ کوئی باریک چاقو، کوئی سُر مچو، کوئی اس قسم کی چیز اس گشتی کے بیگ میں ضرور ہوگی۔" یہ کہہ کر میں نے کار کی بتی روشن کر دی ——

"ارے جیلانی! اس میں تو یہ ڈھیر سارے نوٹ ہیں۔ یہ دیکھ سو سو روپے کے نوٹوں کا ایک بنڈل اور یہ کھلے دس دس کے کئی نوٹ۔"
رٹیا خوش ہو گئی۔
"یہ تو بہت اچھی بات ہے رٹیا۔ ہمیں پیسوں کی تو اشد ضرورت تھی۔ اور بھی دیکھو کیا کچھ ہے اس میں؟"
"اس میں ایک چابیوں کا گچھا بھی موجود ہے۔ تمہاری بات سچ نکلی ہے ڈیئر۔"

"یہ انگریزی میں مجھے مت مخاطب کیا کرو رٹیا۔ یہ ڈیئر شیئر سب بکواس ہے۔ اس سے اچھا ہے تم مجھے یار کہہ لیا کرو۔" میں نے نگاہ سڑک پر جماتے ہوئے کہا۔ کار پچاس ساٹھ میل کی رفتار سے جا رہی تھی۔ اور مجھے ایک عرصے بعد تیز اور تازہ ہوا میں سانس لینے کا موقع ملا تھا۔ میرا دل بہت خوش تھا میں بھول ہی گیا تھا کہ مجھے گھر بھی جانا چاہئے تھا۔
"وہ تم نے میرا خط ڈال دیا تھا ڈاک میں میری ماں کے نام تھا وہ۔"
"ڈال دیا تھا یار۔ ایسی بھی الّو کی پٹھی نہ سمجھ تو مجھے۔ اور ہاں دیکھ یہ ایک چابی لگ گئی ہے بریف کیس میں۔"
"تو کھول دے نا تو اس مصیبت کو۔ دیکھ تو اس میں کیا ہے؟ مگر ٹھہر۔ پہلے اس عالیہ کو سنبھال یہ سیٹ سے نیچے گر رہی ہے۔" اس نے بریف کیس الگ رکھا اور عالیہ کو پکڑ کر اس نے سیدھا کر دیا پھر بولی۔
"یہ تو ہوش میں ہی نہیں آ رہی۔ کہیں مر تو نہیں گئی ہے؟"
"اتنی غیرت مند نہیں ہے یہ دیکھتی نہیں ہے تو اس کی سانس کیسے آرے کی طرح چل رہی ہے۔ دیکھ اپنے دوپٹے سے تو اسے سیٹ کے ساتھ باندھ دے، یہ جو تو گلے میں لٹکائے بیٹھی ہے نا کتے کے پٹے کی طرح اسے ادھر باندھ دے، اس کے سینے کے اوپر سے، پچھلے ٹِک کے ساتھ یہاں۔ جلدی کر۔" میں نے جھلّا کر کہا۔ وہ کچھ بھی نہ سوچ سکتی تھی بالکل ٹھس تھی عام عورتوں کی طرح۔

رٹیا نے میرے کہنے پر عمل کیا اور عالیہ کو ٹھیک طریقے سے سیٹ کے ساتھ باندھ دیا۔
"اب کھول اس بریف کیس کو۔ دیکھ اس میں کیا ہے؟"

"اچھا بابا اچھا۔ ناراض کیوں ہوتے ہو۔ تیری طرح میں کوئی مار دھاڑ نہیں کرتی رہی ہوں۔ کوئی بدمعاش تو نہیں ہوں میں۔ شریف لڑکی ہوں نرس ہوں سمجھے۔ مجھ سے شرافت سے بات کیا کر۔"
"بہت بہتر میم صاحب آپ کی شرافت کی ایسی تیسی ابھی کوئی اوٹ ملتی ہے تو میں آپ کی شرافت سے ملاقات کرتا ہوں۔" میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ وہ شوخ ہوتی جا رہی تھی۔ اور بے وقت چٹکی لے رہی تھی ——

"ارے باپ رے باپ! جیلانی ذرا دیکھ تو اس میں تو یہ پیلی پیلی اینٹیں بھری ہیں میرے یار۔ یہ کہیں وہ —— وہ چیز تو نہیں —— وہ جسے سونا کہتے ہیں۔ ارے دیکھ تو ——"

رٹیا کا سانس پھولنے لگا۔ اس نے ایک نمونہ میرے آگے کر دیا۔ میں نے گاڑی سڑک سے اتار کر ایک طرف کھڑی کر دی اور اس کی اندر کی بتی جلا دی۔

رٹیا نے جو چیز مجھے دکھائی وہ سونے کی، جی ہاں، خالص سونے کی اینٹ تھی۔ اور بریف کیس ان سے بھرا پڑا تھا۔ میرا دل تو اچھل کر حلق میں آ رہا۔ ایسی پیلی دولت تو میں نے زندگی بھر کہیں نہ دیکھی تھی قدرت مجھ پر ایک دم اتنی مہربان ہو گئی تھی۔ وہ دونوں حرامزادے بلاشبہ اسمگلر تھے سونے کے اسمگلر۔ اور کسی طرح ڈی ایس پی جیمہ کو ان کی اُن گُن مل گئی ہوگی جبھی وہ ان کے پیچھے لگا ہوا تھا مگر تنہا تھا مات کھا گیا ——

سونے کی وہ اتنی ساری اینٹیں دیکھ کر میں تو خوشی سے دیوانہ ہو گیا۔ ایسے بھی مقدر تھے اپنے کہ ہم برستی گولیوں اور چلتی تلواروں میں سے لہولہان ہو کر نکلتے ہیں تو ہماری ملاقات ایسی پیلی مدماتی دیوی سے ہو جاتی ہے۔ ایسے میں ہماری خوشیوں کا گلرنگ چہرہ اگر بدنصیبی دیکھ لے تو اپنا منہ نوچ لے۔

میں نے رٹیا سے کہا "دیکھ چھمک چھلّو اسے کہتے ہیں عربی میں.... 'کما ینبغی'۔"

وہ تادیر سانس بند رہنے پر ہانپ گئی تھی۔ اپنا دم درست کرتے ہوئے بولی۔
"تیرا ستیا ناس۔ لگتا ہے تو مجھے کاٹ ہی کھائے گا جیلانی۔ لعنت ہے تیری شکل پر۔ اب تو مجھے عربی میں گندی گالی بھی دے گا۔ یہ گئی ہوگی تیری کوئی ہوتی سوتی۔"
غصے میں وہ اور زیادہ دلآویز لگتی تھی۔ اور میں جانتا تھا کہ وہ مجھے جان بوجھ کر اکڑ فوں دکھا رہی ہے۔
"دیکھ ری تو ہے دراصل کسی ٹلیوڈ چٹسال کی اولاد! کسی انگریز کی بچّے —— تو بھلا عربی کیا سمجھے گی۔ اس کے معنی ہیں حسب اطمینان چیز کا مل جانا۔"

وہ میری یہ بات سن کر چڑ گئی بولی "دیکھ رے تو مجھے اس طرح ذلیل نہ کیا کر۔ میرا دادا جو تھا نا وہ بہت بڑا انگریز تھا۔ کلکتہ میل کا فسٹ کلاس ڈرائیور تھا۔ بڑی تنخواہ پاتا تھا۔ اس نے میری دادی ماں سے محبت کی شادی کر لی تھی۔ وہ مراثن تھی اور عیسائی ہو گئی تھی۔"
"ارے لعنت بھیج اپنے دادا اور دادی پر۔ سیدھی سیدھی کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو جا ورنہ ماری جائے گی کسی دین کے ڈنکے والے کے ہاتھوں۔ ہاں بند کر یہ بریف کیس، حفاظتی پیٹی باندھ لو اور اپنے کپڑے اتار دو۔ جلدی ہی ہم ملتان کے ہوائی اڈے پر اترنے والے ہیں۔" میں نے جھومتے ہوئے کہا۔
"بڑا گھنا بدمعاش لگتا ہے تو مجھے جیلانی۔ میں تو خواہ مخواہ ہی پھنس گئی تیرے چنگل میں۔" رٹیا نے لگاوٹ سے کہا۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ اب مجھے کوئی فکر نہیں تھی میرے پاس ڈھیروں روپیہ جمع ہو گیا تھا۔
کوئی تیرہ ہزار روپیہ تو مادام عالیہ ہی کے ہینڈ بیگ سے مل گیا تھا ہیں پھر اس کی کلائیوں میں سونے کی چوڑیاں بھی تو تھیں۔ خاصا زیور پہنے ہوئے تھی وہ۔ اور سب سے بڑا تحفہ جو مجھے اس گٹ دو میں ملا تھا وہ تھا بریف کیس جو سونے سے لبالب بھرا تھا۔

میں کہاں سے چلا تھا اور کہاں آگیا تھا بہن کے سسرال والوں کے مطالبے پر ایک لاکھ روپے کا بندوبست کرنے نکلا تھا اور اپنے ایک گردے سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ میں ان لوگوں کے ہاتھ چڑھ گیا تھا جو اپنے مقصد کے لئے میرا گلا کاٹنے سے بھی دریغ نہ کرتے۔ ریٹا رحمت کا فرشتہ بن کر نمودار نہ ہوتی تو پتہ نہیں میں اس وقت کہاں ہوتا؟ اب میرے سر سے رقم کا بوجھ اتر گیا تھا۔ سونے سے لبالب بھرا ہوا بریف کیس میرے پاس تھا۔

عالیہ ابھی تک بے ہوش تھی۔ اسے اسی حال میں رہنا چاہئے تھا مجھے معلوم تھا کہ ایسے مریض کو ہوش میں کیسے لایا جاتا تھا مگر میں نے اعتماد کیا۔ کسی منزل پر پہنچ کر ہی کوئی بات ہو سکتی تھی۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ عالیہ میرے ہاتھ آگئی تھی۔ ورنہ وہ بڑے طنطنے والی عورت تھی۔ ایسی عورت جو گا بھی گا بھہ ڈاہنی تھی —— بڑے بڑوں کا پتا آب کر دیتی تھی وہ۔ ریٹا نے اس کے رعب و دبدبے کی جو داستانیں مجھے سنائی تھیں وہ حیران کن تھیں۔ اور اب وہ فرعون کے بھانجے کی بھتیجی میری اسیر بنی تھی میرے سامنے مشتِ خاک کی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔

اور —— ریٹا میرے بہت کام آرہی تھی میرا حوصلہ بڑھاتی تھی میرا دل ڈولنے نہیں دیتی تھی۔ قدم قدم پر میرے لئے دلچسپیاں پیدا کرتی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ نہ ہوتی تو میں عالیہ کے اس شکنجے سے مر کر بھی نہ نکل سکتا تھا مجھے ریٹا نے بتایا تھا کہ ان لوگوں کا پروگرام یہ تھا کہ اگر کوئی اور موٹی اسامی مل گئی جسے میرے جیسے نوجوان کے تازہ صحت مند اور چربی چڑھے گردے کی ضرورت ہوئی اور وہ اتنے ہی دام دینے پر آمادہ بھی ہوا تو وہ لوگ میرا دوسرا گردہ اسے دے دیں گے۔

میرا مر جانا ان کے لئے ایسا ہی تھا جیسے کوئی کتا لب سڑک گاڑی سے کچل کر مر جائے۔ مجھے انہوں نے ردی مگر کار آمد لوگوں کی فہرست میں ڈال دیا تھا۔ تب مجھے محسوس ہوا کہ وہ ناطہ جو میں نے ریٹا سے پیدا کر لیا تھا۔ اس گاڑھی بھر آشنائی سے کہیں بہتر تھی جو میں دنیا سے رکھتا تھا۔

وہ مدھو مالکی ایسی ریٹا میرے لئے بہت مبارک ثابت ہوئی تھی میں چلتا رہا، چلتا ہی رہا۔ میری منزل ملتان تھی۔ مجھے راستے میں اور کہیں نہ ٹھہرنا تھا اور اس وقت سورج طلوع ہو رہا تھا جب میں ملتان شہر میں داخل ہوا۔

نیند نے ہم دونوں کو اس وقت تک بُری طرح نڈھال کر دیا تھا۔ مگر اس کے سوا اور کیا چارہ تھا کہ ہم کسی نئی دہلیز پہ پہنچ کر ہی دم لیتے۔ ملتان پہنچ کر جلدی ہی ہم کیقباد ہوٹل میں جا بیٹھے۔ گاڑی میں نے احتیاطاً گیراج میں بند کرا دی۔ وہ میرے ایک پرانے دوست کا ہوٹل ہے اس لئے آسانی رہی اس نے مجھے دوسری منزل میں دو کمرے دے دیئے —— جب ہم ہاتھ منہ دھو کر ناشتہ کر چکے تو میں نے عالیہ کو دیکھا جو ابھی تک بے ہوش تھی ——

"کیا خیال ہے مادام کو واپس لے آؤں اس دنیا میں۔ بہت سو لیا ہے اس نے۔"

"ہاں، ہاں بابا کیوں اس کی جان کے دشمن ہوئے ہو، کہیں یہ مر مرا گئی تو ہم دونوں فیتے پر چڑھ جائیں گے۔ کیا کہتے ہیں اسے فارسی میں؟ تختۂ دار ھ کہتے ہیں نا؟" ریٹا نے کہا۔

بڑی عجیب شے تھی وہ —— تختۂ دار کو تختۂ داڑھ بنا دیا تھا اس نے۔ وہ مسکرا رہی تھی ایسے انداز میں، جس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اسے مکمل یقین ہو چکا تھا کہ اس نے جیلانی پر فتح پالی ہے اور اسے زندگی بھر اس سے روگردانی کی جرأت نہ ہوگی۔

میں نے عالیہ کی اس چغتائی تصویر ایسی نرم و نازک گردن کے ایک خاص حصے پر دباؤ ڈالا۔ تھوڑی سی تیز تیز مالش کی اور پھر اس کے پاؤں کے انگوٹھے کے قریب کی ایک رگ دبائی۔ اس کے بدن میں جگہ جگہ درد کا پیغام پہنچا تو وہ کسمسائی اور پھر عجیب انداز سے کراہتے ہوئے اس نے آنکھیں کھول دیں اس وقت وہ ہوٹل کے نرم و گداز تکیے کی سمت میں مور کے رقص ایسے طرز پر پھیلے ہوئے خوبصورت پلنگ پر لیٹی تھی اور سرمئی رنگ کا ریشمی لحاف اس پر بہت ہی بھلا لگتا تھا۔ اس کے پاؤں کی سمت بھی ایک قدِ آدم آئینہ لگا تھا اور سر کی طرف بھی۔ اور میں اس کے قریب ہی بیٹھا تھا۔

میں نے اسے ہوش میں لانے سے پہلے صرف اتنی سی زیادتی کی تھی اس کی رانیں کس کر پلنگ کے ساتھ باندھ دیں۔ اور اس کی دونوں بانہیں بھی اسی طرح سر کی طرف باندھ دی تھیں جس طرح اس نے مجھے اپنے شفاخانے کلینک میں باندھے رکھا تھا۔ ایک اور احتیاط میں نے یہ کی تھی کہ اس کے خوبصورت لبوں پر ٹیپ چپکا دی تھی تا کہ مادام شور نہ مچا سکیں۔

اس کی آنکھیں کھلیں تو اس کی نظر سب سے پہلے چھت پر پڑی جہاں سامنے آئینے پر اور اس میں منعکس میری صورت پر۔ اور پھر وہاں سے سرکی ہوئی اس کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ خوف اور حیرت کا سیلاب اس کی آنکھوں میں امڈ آیا۔ پوری قوت سے وہ چیخی مگر اس کے لبوں پہ لگے ٹیپ نے اس کی آواز باہر نہ آنے دی۔ اس کی وہ ہولناک چیخ اندر ہی اندر دب کر رہ گئی جب اس نے دیکھا کہ میں اس سے دو ہاتھ دور کھڑا اپنے بدن کو خاص حرکت دے رہا ہوں اس میں مسکراہٹ کا ایک خاص مفہوم ہے تو اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

"کہو کیا حال ہے میری جان؟ مجھے امید ہے تمہیں مجھے اس جگہ اس حال میں دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی ہوگی —— اس رات تم نے بھی تو اپنی دکان کا سارا مال میرے سامنے رکھ دیا تھا" یہ کہہ کر میں نے اس کے سرخ بالوں میں انگلیاں دھنسا دیں۔ اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔ میرا خیال ہے اس کا خوف کسی حد تک کم ہو گیا تھا کیونکہ اس کی آنکھیں پیغام وصول کر رہی تھیں اور کچھ بھی رہی تھیں۔ مجھے یوں دیکھ کر اس کی کچھ حسیات بیدار ہو گئی تھیں اور دب گئی تھیں۔

یہ کچھ ایسا خوبصورت منظر نہیں تھا جلد ہی میں اس صورتحال سے اکتا گیا وہ بے حس اور مجبور تھی۔ بالکل بے زبان ہو گئی تھی۔ اسے اسی حال میں رہنا بھی چاہئے تھا مگر میں کیوں اپنی عزتِ نفس کو برباد کر رہا تھا کس لئے۔ ایک فاحشہ، عیار اور مکار عورت کے لئے تو یہ سب چیزیں روزمرہ کا معمول ہوتی ہیں۔

عالیہ کی نظر ریٹا پر پڑی تو وہ یوں چونکی جیسے اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آرہا ہو۔ شاید وہ کچھ کہتی مگر لبوں پر ٹیپ سدِ راہ بنتی تھی۔ اپنی بے بسی پر وہ ایسی جھلائی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو لہرا گئے۔

"دیکھتی ہو عالیہ یہ زخم! میں اسے کبھی نہ بھول سکوں گا —— میرے گردے کے جو دام ملے اس میں سے تم نے کیا وصول کیا تھا؟" میں نے ایک بار پھر اسے بالوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ دیا۔

"یاد رکھو میں تمہیں ایسی خوفناک سزا دوں گا عالیہ کہ تم ساری زندگی یاد رکھو گی۔ بڑی قیمت دینی پڑے گی تمہیں اس گردے کی۔"

عالیہ نے اپنا تنا ہوا بدن ڈھیلا چھوڑ دیا اور آنکھیں بند کر کے سسکنے لگی۔

"ادھر آؤ ریٹا، میری بات سنو" میں نے دوسرے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ وہ میرے ساتھ ہی چہکتی چلی آئی۔

"دیکھو! میں نہیں چاہتا کہ یہ یوں ہوش میں رہے، ہمیں کوئی چانس اسے نہیں دینا چاہئے۔ تم وہ ٹیکہ لکھو جس سے اسے بے ہوش یا نیم بے ہوش رکھا جا سکتا ہے ابھی اسے دودھ وغیرہ پلا دو۔ میں ٹیکہ سرنج اور دوسرا سامان منگاتا ہوں ٹیکہ خود لے آؤں گا جا کر —— پھر ہم اسے سلا دیں گے۔"

"یہ ٹھیک رہے گا مگر تم کرو گے کیا؟ اس کا اچار تو نہیں ڈالنا ہے ہمیں۔ لعنت بھیجو اس پہ۔"

"دیکھتی رہو میں کیا کرتا ہوں۔ تم میرے کہنے پر عمل کرتی جاؤ۔"

اس نے اسی وقت مجھے ان غنڈوں کے بریف کیس سے قلم اور کاغذ نکال کر ٹیکے کا نام، سرنج، روئی اور دوسری ضروری چیزوں کی فہرست بنا کر دے دی۔ روپے میں نے عالیہ کے ہینڈ بیگ سے نکالے اور ان کمروں کو باہر سے مقفل کر کے بازار چلا گیا۔ وہاں سے میں نے نہ صرف ٹیکے خریدے بلکہ اپنے لئے اور ریٹا کے لئے ریڈی میڈ کئی سوٹ بھی خرید لئے میرے پاس پہننے کے لئے تو کچھ بھی نہیں تھا —— کوئی آدھے گھنٹے بعد جب میں واپس آیا تو میری جان میں جان آئی۔ ہوٹل میں ہر طرح خیریت تھی۔ مجھے یہ ڈر تھا کہ میں نے ریٹا پر یوں اندھا دھند اعتبار کر کے خود کو تباہ نہ کر لیا ہو۔ کچھ بعید بات نہ تھی کہ ریٹا بریف کیس لے کر وہاں سے رفوچکر ہو جاتی۔ اس کی تو سات پشتوں کے لئے وہ سونا بہت کافی تھا۔ عین ممکن تھا وہ عالیہ کو بھی کھول کر اپنے ساتھ لے جاتی۔ مجھے اپنی حماقت پہ سخت افسوس ہو رہا تھا مگر خیر ہوئی کہ ریٹا کا دماغ اتنی دور تک کام نہیں کرتا تھا۔

ریٹا نے ٹیکہ تیار کر لیا۔ اس نے سب سے پہلے عالیہ کو اوولٹین ڈال کر گرما گرم دودھ پلایا۔ وہ اس کی ضرورتوں سے شاید واقف تھی جب ہی اس نے دودھ میں ڈالنے کے لئے مجھ سے اوولٹین منگوائی تھی —— اور وہ ندیدی عالیہ وہ تین پاؤ دودھ پی گئی —— اور مکھن کے ساتھ چھ توس بھی پیٹ میں اتار گئی بہت بھوک لگی تھی اسے۔ مگر نہیں میرا یہ خیال ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے تھی جو تکلیف کی حالت میں بے تحاشا کھاتے ہیں۔ غم واندوہ کی فراوانی ان کی بھوک کو خوب چمکاتی ہے یہی صفت عالیہ میں تھی —— جب اس کا پیٹ بھر چکا تو ریٹا نے اس کی نس میں ٹیکہ گھونپ دیا۔ عالیہ کی چھٹی حس نے بتا دیا تھا اسے کہ اسے کس قسم کا ٹیکہ لگایا جا رہا ہے۔ وہ بہت گریزاں رہی۔ بڑا زور مارا اس نے کہ کسی طرح سوئی نس میں نہ اترے۔ مگر ریٹا نے اسے معاف نہیں کیا اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ چند ثانیوں میں بے سدھ ہو گئی ——

"بڑی بے رحم ہو تم ریٹا۔ کتنی عاجزی، انکساری اور دلوں کو گرفت میں لینے والی فریاد تھی اس عالیہ کی آنکھوں میں" میں نے بہت زیادہ متاثر ہو کر کہا ——

"زیادہ شاعری کی ضرورت نہیں ہے مسٹر جیلانی! اپنے کام سے کام رکھو اور عورتوں کے معاملے میں ٹانگ مت اڑاؤ۔"

"اور کیا اڑاؤں ان کے معاملے میں؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا وہ تلملا سی گئی —— لال پیلی آنکھیں کرتی ہوئی بولی "اپنا سر، سمجھے! ایک دم واہیات آدمی ہو تم! ڈیم فول —— عورتوں سے ایسے باتیں کیا کرتے ہیں؟"

"اور کیسے باتیں کی جاتی ہیں ڈلیوڑ پھٹساں کی اولاد! اناروں تیرا بھی چھلکا" میں نے اس کو بالوں سے پکڑا۔

"چلو اب ہم بھی سو جائیں، بہت تھک گئے ہیں ——"

"میں کہاں سوؤں گی؟"

"تم یہ سب پردے کھینچ دو، دروازے بند کر دو۔ درمیان کا دروازہ کھلا رکھو اور عالیہ کے ساتھ والے اس پلنگ پر سو جاؤ۔ میں اس کمرے میں سوؤں گا۔"

"مجھے کیوں ادھر نہیں سلاتے ہو؟" وہ حیران ہوئی۔

"ہم نامحرم ہیں ریٹا۔ زبانی زبانی تو ٹھیک ہے سب کچھ مگر اس سے آگے نہیں۔ آئی ایم سوری، ویری سوری۔ اسے اپنی توہین نہ سمجھو۔ یہ اصول کی بات ہے" یہ کہہ کر میں دوسرے کمرے میں جا گھسا۔ میں ریٹا کے چہرے پر ابھرتی خجالت کی سرخی نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ میں اس کے باپ کا نوکر نہیں تھا۔ نہ میں ان الو کے پٹھوں ایسا تھا کہ جو ہر موقعے کو اپنا موقع سمجھتے ہیں۔

میں بستر پہ گرا تو بہت سی آگے پیچھے کی باتیں میرے ذہن میں ابھرنے لگیں اور پھر اچانک مجھے اپنی بلیو جین یاد آئی۔ اپنی وہ جرسی یاد آئی جو مجھے میری منگیتر نے دی تھی۔ پھر مجھے یاد آیا کہ میرے پاس خاصی رقم موجود تھی۔ میرا بٹوا بھی تھا جس میں میرا شناختی کارڈ بھی رکھا تھا میرا رومال میرا چاقو، میرا کنگھا۔ یا رو کوئی ایک چیز تو نہ رہ گئی تھی وہاں، اس گشتی عالیہ

کے کلینک پر اور اس کی کوٹھی پر۔ یہ تو گھپلا ہو گیا۔ سب سے زیادہ گڑبڑ کی بات یہ ہوئی تھی کہ میرا شناختی کارڈ وہاں رہ گیا تھا۔ عین ممکن ہے وہ اس سے کوئی غلط فائدہ اٹھائیں۔

میں لپک کر ریٹا کے پاس جا پہنچا۔ "اوئے یار! میں تو بالکل... مارا گیا"۔

"کیوں کیا ہوا؟ خیر تو ہے"۔ وہ ایک دم اٹھ بیٹھی۔

"وہ میرا شناختی کارڈ، میرا بٹوا اس میں رکھی ہوئی رقم، میری پتلون میری جرسی۔ وہ سب کیا ہوئے بھئی؟"

"دُور فٹے منہ — میں سمجھی شاید تیرا کوئی دوسرا گُردہ بھی لے گیا ہے دیکھ جیلانی! تیرا شناختی کارڈ، تیرے روپے، تیرا بٹوا اور تیرا رومال میرے پاس محفوظ ہیں یہ دیکھ"۔ اس نے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر یہ تینوں چیزیں نکالیں اور میرے سامنے رکھ دیں۔ "مجھے ڈاکٹر دمن کی میز کی دراز سے ملی تھیں یہ چیزیں"۔

"اوہ تھینک یو گریٹ ریٹمین۔ تھینک ڈلیڈ پھٹاں کہ تُو نے ایسی عمدہ لیوتی اپنے پیچھے چھوڑی ہے"۔

"ہم نامحرم ہیں مسٹر، چلو بھاگو یہاں سے"۔ وہ سخت ناراض معلوم ہوتی تھی مجھ سے۔ میں نے دل میں کہا لعنت بھیجو — یہ عورتیں ہوتی ہی ایسی ہیں۔ ہر وقت خوشامد کرانا چاہتی ہیں۔

میں وہ چیزیں سمیٹ کر اپنے بستر پر جا بیٹھا اور یہی سب سے بہتر صُورت تھی کہ میں اطمینان سے سو جاتا۔

مگر پھر بھی مجھے اپنے طور پر اطمینان کر لینا چاہئے۔ میں نے عالیہ کا پستول، اس کا ہینڈ بیگ، غنڈوں کا بریف کیس اور دوسری تمام چیزیں اپنے کمرے میں رکھ لی تھیں جس کمرے میں وہ دونوں تھیں وہاں سے باہر نکلنے کا صرف ایک ہی راستہ تھا اور وہ تھا درمیانی دروازہ۔ وہ بھی میں نے بند کر لیا اور اندر سے چٹخنی چڑھا دی۔ اب میں بالکل مطمئن تھا مگر وہ اطمینان بالکل کھوکھلا ثابت ہو رہا تھا۔ نیند مجھ سے کوسوں دُور تھی۔

میرے دل میں یہ خوف ابھر رہا تھا کہ ڈاکٹر دمن کی دراز سے میرے شناختی کارڈ کے ملنے سے اس بات کا ثبوت فراہم ہوتا تھا کہ وہ لوگ میرے گھر کے پتے سے آشنا ہو چکے تھے۔ ان کے کلینک سے میرے بھاگ نکلنے کے بعد وہ ضرور میرے گھر پہ گئے ہوں گے۔ خدا جانے ان لوگوں نے میری ماں سے کیا کہا ہو گا؟ میری بہن سے کیا سلوک کیا ہو گا؟ ان کو اپنے گھر میں دیکھ کر میری ماں کا تو بُرا حال ہو گیا ہو گا — وہ ان سے میرا پتہ پوچھتے ہوں گے۔ ان دونوں ماں بیٹی پر کیا بیتی ہو گی؟ یہ سارے سوال میرے ذہن میں سانپوں کی طرح پھن پھیلا کر پھنکارنے لگے۔ میں اٹھ بیٹھا میرے لئے ان حالات میں سو جانا کسی طرح بھی ممکن نہ تھا۔

اور میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ میں عالیہ کو کیوں پکڑ لایا ہوں۔ اس سے میں کیا فائدہ حاصل کر سکتا ہوں۔ ایک ہی صورت تھی اپنی شکست کا بدلہ لینے کی کہ میں انہیں مجبور کر دیتا کہ وہ پانچ لاکھ ریال کی پوری رقم میرے حوالے کر کے عالیہ کو لے جائیں۔ ورنہ میں اسے قتل کر دوں گا۔ ویسے بھی اس کا زندہ رہنا میری نظر میں کسی طرح بھی مفید نہ تھا۔ ریٹا نے بتایا تھا کہ وہ گُردے کے آپریشن میں بہت ماہر ہے اور اس کی یہی مہارت اسے شیطان کی راہ پر لے گئی تھی۔

میں کتنی ہی دیر تک وسوسوں میں ڈوبا رہا۔ میرا ذہن بری طرح الجھ رہا تھا۔ میں پلنگ پر لیٹا رہا اور سوچتا رہا مگر مجھے اپنے مسئلے کا کوئی حل نہ آیا۔ کوئی صورت ایسی نہیں تھی کہ میرا گُردہ مجھے واپس مل سکتا۔ کسی طور بھی اس نعمت کو دوبارہ نہ پا سکتا تھا۔ ان لوگوں نے مجھ پر جو ظلم کیا تھا اس کا ازالہ ہی نہ کیا جا سکتا تھا۔

میرا دل لہو روتا تھا۔ اس دن میں نے اپنے تکیے پہ بہت آنسو بہائے۔ خدا گواہ ہے مجھے اپنی بے بسی پر اس روز بہت رونا آیا۔ میری چھوٹی سی بھول کا خمیازہ کی ان لوگوں نے مجھے اتنی بڑی سزا دی تھی کہ اس کا تصور بھی نہ کیا جا سکے...

میں انہی سوچوں میں تا دیر غلطاں رہا اور پھر آپ ہی آپ نیند آگے بڑھ کر میری آنکھیں بند کر دیں اور میری سوچ کے دریچوں پر تاریکی گرا دیے۔

میں جب سو کر اٹھا تو دن ڈھل رہا تھا۔ سہ پہر کے تین بج چکے تھے۔ میری نیند کا قفل کھلا تو فوراً ہی مجھے عالیہ یاد آئی اور میں بستر سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں پہنچا۔ عالیہ ہوش میں آ چکی تھی — اس کی آنکھیں کھلی تھیں مگر منہ بند تھا اس پر وہ مضبوط ٹیپ ابھی تک موجود تھی اور اس کی دونوں بانہیں سر کی طرف پلنگ سے بندھی تھیں اس کے بدن پر ریٹا نے کمبل ڈال دیا تا کہ وہ سردی سے بچ جائے۔

عالیہ کی وہ بڑی بڑی سرمگیں آنکھیں دیکھ کر ایک خیال کسی لمحے بجلی کے کوندے کی طرح میرے ذہن میں لپکا اور میں نے فیصلہ کر لیا میں اس پر ہر حال میں عمل کروں گا — ریٹا ابھی تک سوئی ہوئی تھی میں نے اسے جھنجھوڑ کر جگا دیا — وہ آنکھیں ملتی ہوئی اٹھی اور ... سے بولی —

"قیامت آ گئی ہے کیا؟" وہ شوخ انداز سے مسکرا رہی تھی۔

"لوگ ملتان سے بھاگ رہے ہیں کہتے ہیں قیامت ریناله خورد پہنچ چکی ہے"۔ میں نے اُسے پلنگ سے اتارتے ہوئے کہا۔

"تم یوں کرو کہ اپنا سامان باندھ لو ہم ابھی یہاں سے چل دیں گے۔ تم جیسے گناہ گاروں کو فکر ہو گی مجھے کوئی ڈر نہیں ہے کا...." وہ جُوتے میں پاؤں پھنساتے ہوئے بولی — عالیہ عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھی جن میں غصّہ بھی تھا اور نفرت بھی، رحم کی بھیک بھی تھی اور تحکم بھی — وہ مجھے محض ایک ڈرا اندازاً سا لقب زن ایک ادھیا چور سمجھ رہی تھی۔

"جیلانی میرا تو خیال ہے کہ ہمیں اب کھانا کھا لینا چاہئے بھوک تیز ہو گئی ہے"۔ ریٹا نے غسل خانے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے میں ابھی کھانا منگواتا ہوں پہلے اپنی اس مادام کو تو سیدھی کر لوں"۔ یہ کہہ کر میں نے عالیہ کے منہ سے ٹیپ اتار دی۔ پھر میں نے اس کی دونوں کلائیاں بھی کھول دیں۔ "لے اب اٹھ جا۔ ذرا کمر سیدھی کر لے"۔

وہ کچھ نہیں بولی پلنگ پر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

"اگر تو نے شور مچایا تو یہاں کوئی تیری مدد کو نہیں آئے گا اور اپنی زبان کھول کر تو اپنی موت کو اور زیادہ قریب کر لے گی سمجھی! یہ لے پہلے تو یہ دُودھ کا گلاس پی"۔ میں نے میز پر سے اس کے لئے منگوایا ہوا دودھ کا مگ اٹھایا اور گلاس بھر کر اس کے لبوں سے لگا دیا۔ وہ بہت گاڑھا اور بالائی سے لدا پھندا دُودھ تھا جسے عالیہ بڑی رغبت سے پی گئی —

"ہاں تو اب بتا عالیہ کہ میرے گُردے کی کتنی قیمت ملی ہے تجھے؟"

اس نے بڑی نخوت سے منہ پھیر کر دوسری طرف کر لیا۔

"میری بات کا جواب دو۔ میں تمہاری خوشامد نہیں کر رہا ہوں جو پوچھتا ہوں۔ ٹھیک ٹھیک بتاؤ"۔ میں نے بالوں سے پکڑ کر اس کا رخ اپنی طرف کر لیا۔

"کتنے پیسے ملے تھے تمہیں؟"

"پانچ لاکھ ریال"۔ اس کی زبان کھل گئی۔

"آپریشن کس نے کیا تھا؟"

"ڈاکٹر دمن نے —"

"تمہارا اس سے کیا رشتہ ہے؟"

"وہ میرا خاوند ہے —"

"تم نے ڈاکٹری کی سند کہاں سے لی تھی؟"

"میں ڈاکٹر نہیں نرس ہوں۔ کڈنی ڈزیز کے دو کورس پاس کر رکھے ہیں میں نے۔ لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ میں ایف آر سی ایس ڈاکٹر ہوں میرے خاوند نے یہی بات مشہور کر رکھی ہے"۔

"یہ کورس کہاں سے پاس کئے تھے تم نے؟"

"لندن سے"۔

"وہاں تم کتنا عرصہ رہیں؟"

"ڈیڑھ سال"۔

"خرچ کس نے برداشت کیا تھا؟"

"ڈاکٹر دمن نے"۔

"اس سے شادی تم نے کب کی؟"

"لندن سے واپس آنے کے بعد —"

"میرا گُردہ نکالنے سے پہلے تم اور کتنے لوگوں پر جا تو چلا چکی ہو؟"

"ستر آدمیوں پر —"

"وہ کون تھے؟"

"وہ بھی تم جیسے چور تھے لچکے تھے۔ دو ٹکے کے آدمی تھے"۔

"انہیں تم کس طرح اس کام پر آمادہ کرتی تھیں؟"

"ان میں سے اکثر لوگوں کو تو سوات خان پھانس کر لایا تھا"۔

"وہ کس طرح؟"

"وہ ایسے گروہ میں اٹھتا بیٹھتا ہے جو چوری چکاری اور ڈاکہ زنی میں بدنام ہے۔ وہاں وہ کسی نہ کسی مجرم کو یہ لالچ دیتا ہے کہ وہ ڈاکٹر دمن کی کوٹھی پر رات کو ڈاکہ ڈالے۔ سارا نقشہ وہ اسے سمجھا دیتا ہے۔ پھر وہ مجھے اور حیدر کو خبردار کر دیتا تھا۔ چور اس کے بتائے ہوئے نقشے پر چلتا ہوا میری کوٹھی کے اس کمرے میں جا پہنچتا تھا جس کے دروازے از خود چاروں طرف سے بند ہو جاتے ہیں ہم اسے وہاں بے ہوش کر کے پکڑ لیتے تھے جس طرح... تمہیں پکڑا —"

"مگر مجھے تو سوات خان نے نہیں بھیجا تھا"۔

"مجھے معلوم ہے اور اسی لئے ہم اتنی بڑی مصیبت میں پھنس گئے ہیں"۔

"چوروں کو پکڑ کر تم کیا کرتی تھیں؟"

"ہم چور کو جیل، قید اور پھانسی کی سزا سے اس حد تک ڈراتے تھے کہ وہ خاموش ہو جاتا تھا۔ بسا اوقات ہم اپنے شکار کو ایسی دوا دیتے تھے جو اس کے گُردے میں یا مثانے کے قریب شدید درد پیدا کر دیتی تھی۔ ہم اس کو یہی یقین دلاتے تھے کہ اس کا گُردہ خراب ہو گیا ہے یہ درد کچھ دن میں ہم اس حد تک بڑھا دیتے تھے کہ وہ آدمی خود بخود گُردے کے آپریشن کے لئے تیار ہو جاتا تھا۔ ہم اسے یہی کہتے تھے کہ گُردہ ناکارہ ہو چکا ہے اور اس کا نکال لینا ہی بہتر ہے اور اس طرح ہم اس کو ایک گُردے سے محروم کر دیتے تھے"۔

"ان گُردوں کو تم کہاں بیچتی تھیں؟"

"ان میں سے زیادہ تر ہم عرب ملکوں میں بیچتے رہے ہیں"۔

"وہاں گُردوں کی اتنی ضرورت کہاں سے پیدا ہو گئی؟"

"عرب ممالک میں پانی کی آلائشیں ایسی ہوتی ہیں کہ ادھیڑ عمر کے لوگوں میں سے اکثر کے گُردے ناکارہ ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے انہیں باقاعدگی سے مشین کے ذریعے اپنا خون صاف کرانا پڑتا ہے مگر وہاں ایسے ایسے امیر آدمی ہیں جو اربوں ڈالر کے مالک ہیں ان کے ناکارہ گُردے کی جگہ ہم نیا صحت مند گُردہ لگا دیتے ہیں تو وہ صحت یاب ہو جاتے ہیں۔ ان سے ہم نئے گُردے کی قیمت کبھی پانچ لاکھ ریال لے لیتے ہیں کبھی دس لاکھ ریال۔ یہ بات آدمی آدمی پر منحصر ہے۔ جتنا بڑا آدمی ہوتا ہے اتنی بڑی قیمت"۔ عالیہ بڑی صاف گوئی سے کام لے رہی تھی۔ اس کا چہرہ اس وقت ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔ وہ یوں مجھے اپنے اس گھناؤنے جرم کی تفصیل

تبا رہی تھی جیسے کوئی قصائی بکروں کے سری پائیوں کی بات کرتا ہے۔ اسے قطعاً یہ احساس نہیں تھا کہ اس نے کس عیاری مکاری اور کمینگی سے کام لے کر اپنے وطن کے اتنے سارے لوگوں کو زندگی بھر کے لئے روگی بنا دیا تھا۔ ایک گردے سے انسان کتنے دن زندہ رہ سکتا ہے؟ اس کی عام کارکردگی بھی اس سے ضرور متاثر ہوگی۔ خوف کی ایک تیز لہر میرے بدن میں سرسراتی چلی گئی۔ مجھے احساس ہوا کہ پتہ نہیں میرا ایک گردہ مجھے کتنے دن تک زندہ رہنے میں مدد دے گا اور کون جانے میں کس مقام پر کس حالت میں ڈھیر ہو جاؤں گا۔

"جن لوگوں کا ایک گردہ تم نے نکال لیا ہے ان کے کتنے عرصے تک زندہ رہنے کے امکانات ہیں میرا مطلب ہے ان کی عمریں تو عام آدمی کی عمروں سے کم ہو جائیں گی؟"

"ہاں میرا خیال ہے کہ ایک گردے والا آدمی عام آدمی سے تین چوتھائی عمر بسر کر سکتا ہے۔"

"تمہیں کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ تم ان غریب لوگوں پر کس قدر ظلم کر رہی ہو۔ اپنے خاوند کے لئے تم نے ستر جوانوں کو تباہ کر دیا اور میں اکہترواں ہوں۔"

"وہ غریب نہیں تھے۔ وہ بھی ظالم تھے، ہمیں لوٹنے آتے تھے۔"

"مگر انہیں تو سوات خان بھیجتا تھا؟"

"اس سے کیا ہوتا ہے؟ انہیں نہ بھی کہا جائے تو بھی وہ لوگوں کو لوٹنے سے باز تو نہیں رہتے جیسے تم وہاں گھس آئے تھے۔"

بڑا طنطنہ پیدا ہو چلا تھا اس کے لہجے میں، جیسے وہ مجھے بہت کمتر بہت ادنیٰ اور گھٹیا سمجھ رہی ہو۔ بات وہ یوں کر رہی تھی مجھ سے، جیسے وہ کسی مریض کو بتا رہی تھی کہ اس کا مرض کتنا شدید ہے۔ میں نے اس کے لب و لہجے سے صرف نظر کیا۔ "تم نے رٹیا کا بھی گردہ نکال لیا تھا؟"

"ہاں! ایک عورت کو اس کی ضرورت پڑ گئی تھی۔ وہ پاکستانی تھی۔ اس سے ہم نے دو لاکھ روپے لئے تھے۔" اس کی یہ بات سن کر میرا خون کھول گیا مگر میں نے ضبط کیا۔ "اچھا یہ بتاؤ اس کام میں کتنے آدمی شریک ہیں؟"

"ہم سات آدمی ہیں جن میں تین ڈاکٹر ہیں دو نرسیں ایک.... سوات خان اور ایک اس کا ساتھی قاسم۔"

"نرسیں کون کون ہیں؟"

"ایک تو میں ہوں اور ایک عذرا۔ اسے تم نے شاید نہیں دیکھا۔"

"میں نے تو شاید قاسم کو بھی نہیں دیکھا ہے۔ تم نے یہ ساری باتیں مجھے بتا دی ہیں۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ میں پولیس کو تمہارے خلاف حرکت میں نہیں لا سکتا؟"

"پولیس کے پاس ہمارے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہوگا۔ البتہ ہمارے ہر شکار کے چوری کے جرم کی شہادت ہمارے پاس اس کی تصویروں کی صورت میں محفوظ ہوتی ہے جو ہمارے خفیہ کیمروں سے اتاری جاتی ہیں۔ کوٹھی کے مختلف کمروں میں یہ کیمرے لگے ہیں۔ تمہاری تصویریں بھی پاس محفوظ ہیں۔ تمہارے ہاتھ میں کھلا چاقو، مجھ پر اٹھایا ہوا تمہارا ہاتھ، سیف میں چابی گھماتے ہوئے تمہارے چہرے کی کیفیت... سب ہمارے کیمروں میں محفوظ ہے۔"

"اب تک تم نے کتنا مال جمع کیا ہے؟"

"میرا خیال ہے ہم میں سے ہر ایک کے پاس ستر ستر لاکھ تو ضرور ہی جمع ہو گیا ہوگا میرے پاس نوے لاکھ ہے۔"

"کہاں رکھتی ہو تم یہ رقم؟"

"یہ ساری کی ساری رقم ایک غیر ملکی بنک کی شاخ میں جمع ہے۔"

"کس شاخ میں؟"

"یہ میں نہیں بتا سکتی۔" اس نے اپنے بازو پھیلا کر انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔ رٹیا ابھی تک نہار رہی تھی۔

"جانتی ہو میں تمہیں یہاں کس لئے لایا ہوں؟"

"تم انتقام کی بات سوچتے ہو، مگر میری بات یاد رکھو تم کچھ نہ کر سکو گے۔ میں آج نہیں تو کل صبح تمہارے قبضے سے نکل جاؤں گی۔"

"کس طرح؟"

"وہ اس طرح کہ سوات خان اب تک اپنے آدمیوں کو حرکت میں [illegible] ہوگا جن کی خدمات ڈاکٹر دھمن نے ڈھیروں روپے دے کر خرید رکھی ہیں۔"

"یہ کون لوگ ہیں؟"

"ان کے بارے میں تمہیں میں کچھ نہیں بتاؤں گی۔ وہ اپنا کام کر چکے ہوں گے اور تمہیں کیا پتہ وہ اب تک تمہارے کتنے [illegible] ہیں؟ تمہیں ہوش جب آئے گا جب پانی تمہارے سر پر سے گزر چکا [illegible]"

اس نے نہایت ہی یخ بستہ لہجے میں کہا۔ ایک آہنی عزم اس کے چہرے پر نمایاں تھا۔ لگتا تھا وہ سارے جہان کو تہہ و بالا کر سکتی ہے۔ دو نازک بدن شعلے ایسے سرخ بالوں والی عالیہ۔ اس کی وہ ساری باتیں [illegible] میں حیران رہ گیا تھا۔ لوگ ایسے بھی خطرناک ہوتے ہیں یارو۔ میں نے [illegible] کی پگڈنڈی پر پہلا ہی قدم رکھا اور تباہ ہو گیا اور یہ...... یہ ایک [illegible] ہے جو بے گناہ معصوم لوگوں کی جانوں سے کھیل رہی ہے۔ جانے کب سے مصروف عمل ہے مگر کوئی اس کا بال بیکا نہیں کر سکا۔

اور اب یہ ناگن میرے سامنے پھن پھیلائے بیٹھی ہے [illegible] کہتی ہے کہ پتہ نہیں اس کے آدمیوں نے اب تک میرے کتنے بندے دبیے ہوں گے۔

میں نے کھانے کے لئے بہت پہلے گھنٹی بجا دی تھی۔ ابھی سلسلۂ گفتگو جاری تھا کہ بیرہ کھانے سے لدی پھندی دو ٹرے [illegible] ہمارے کمرے میں گھس آیا۔

"لو وہ کھانا بھی آ گیا ہے میرا خیال ہے تمہیں بھوک تو [illegible]

لگی ہوگی؟"

"کیوں نہیں! کھانا تو میں ضرور کھاؤں گی۔ تم مجھے خوف زدہ نہیں کر سکتے ہو جیلانی! تمہاری کوئی حیثیت ہی نہیں ہے میرے سامنے۔"

بیرے نے چونک کر پہلے اسے اور پھر مجھے بڑے غور سے دیکھا۔

"ابے جا تو میاں بیوی کے معاملے میں کیوں کان کھڑے کرتا ہے؟ چل بھاگ یہاں سے اور دیکھ کچھ کباب بھی لیتا آ۔" میں نے بیرے کو ڈانٹ دیا۔

رٹیا بہت جھینپی ہوئی تھی۔ وہ اپنی مالکن کا سامنا کرنے سے کترا رہی تھی۔ عالیہ تھی بھی ایسی ہی دبنگ۔ اس نے کلینک کے عملے پر لرزہ طاری کر رکھا تھا۔

"گھبرا مت میری چھمک چھلو۔ بیٹھ جا ادھر، یہ بے بس ہے۔ اگرچہ ناگن ہے مگر اس وقت اسے کیل رکھا ہے میں نے۔ بیٹھ جا ادھر میرے پاس۔"

"اس کی تو میں ٹانگیں چیر دوں گی جیلانی۔ یہ رٹیا سمجھتی کیا ہے خود کو؟ یہ اپنے انجام کو ضرور پہنچے گی۔" عالیہ نے ناک سکوڑتے ہوئے کہا اور مرغ کی ٹانگ پر پل پڑی۔

"مگر تیرے بعد مادام تیرے بعد۔ کیونکہ کل صبح تک تو میں ہی تیرا قصہ پاک کر چکا ہوں گا۔" میں نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

"اب یہ بکواس بند کرو اور کھانا کھا لو۔ نعمت سامنے رکھ کر بھی تمہاری زبان بند نہیں ہوتی۔" عالیہ نے بڑے رعب سے کہا۔ حد ہے یارو، وہ مجھے ایسا ہی مٹی کا مادھو سمجھتی تھی۔ ذرا برابر پروا نہیں اسے۔ وہ سمجھتی تھی میں یوں ہی ڈرامہ کر رہا ہوں اس کے ساتھ جس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔ بڑے مضبوط اعصاب کی مالک تھی وہ۔ اگر کوئی اور عورت ہوتی تو قسم اللہ کی صدمے سے مر گئی ہوتی۔ مگر وہ تو آسمان میں تھگلی سی لگاتی تھی۔

رٹیا کچھ نہیں بولی۔ آنکھیں جھکائے چپ چاپ کرسی پر بیٹھی کھانا کھاتی رہی جس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ عالیہ سے بہت زیادہ مرعوب ہے......

کھانے سے فارغ ہو کر میں نے عالیہ کے سامنے وہیں بیٹھے بیٹھے سگریٹ سلگایا تو وہ بولی: "ایک سگریٹ مجھے بھی دو۔"

"واہ! تو گویا تم سگریٹ بھی پیتی ہو۔ تو میری جان قسم اللہ کی، جی خوش ہو گیا ہے تمہاری یہ بات سن کر...... مگر......" میں نے سگریٹ اسے دے دیا۔ اسے اپنی آزادی کی قطعاً کوئی فکر دکھائی نہیں دیتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ بالکل مطمئن ہے۔

"مگر کیا؟" وہ میری باتوں کو بڑے دھیان سے سنتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہ اپنی زندگی سے مایوس ہو چکی تھی۔ اسے یقین تھا کہ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اس کی وہ دھمکیاں کھوکھلی دھمکیاں تھیں۔

"مگر...؟ ہاں میں یہ پوچھ رہا تھا کہ تمہارا کوئی بچہ بھی ہے؟"

"ہاں! ایک بچہ ہے میرا دس سال کا ہے وہ۔ اسے میں نے نیویارک بھیج رکھا ہے۔ وہیں پڑھ رہا ہے وہ۔"

"تمہاری عمر کتنی ہے؟"

"یہی کوئی تیس سال ہوگی۔"

"وہ بچہ ڈاکٹر دھمن سے ہے؟"

"ہاں تو اور کیا تم سے ہے۔"

"مجھ سے بھی ہو سکتا تھا۔ اس رات گاؤن تو تم نے اسی انداز میں اتارا تھا جیسے کوئی پہلوان اکھاڑے میں خم ٹھونک کر اترتا ہے۔"

وہ مسکرائی۔ عجیب سے بھیدوں بھرے گہرے گہرے رنگوں سے مزین خالصتاً نسائی انداز میں۔

"میں نے کوئی ایسا مرد نہیں دیکھا تھا جو ایسی صورت حال میں اپنے حواس پر قابو رکھ سکے۔ میرا خیال تھا تم مرد ہی نہیں ہو، مگر اب میرا خیال ایسا نہیں ہے۔"

"کیوں؟ اب کیوں ایسا نہیں ہے؟"

"رٹیا تمہارے کمرے میں جو کچھ کرتی تھی اس کی مجھے خبر رہتی تھی۔"

میرا دماغ الٹنے لگا۔ کتنے لمبے ہاتھ تھے ان لوگوں کے۔

"پھر بھی تم نے اسے اتنی کھلی چھٹی دے رکھی تھی؟"

"ہم اس رات کے منتظر تھے جس رات وہ تمہاری زنجیر کاٹ دیتی۔"

"اور وہ رات آگئی۔"

"ہاں آئی تو...... مگر ہمارے لئے پریشانی لائی۔ ہمارے حساب میں کچھ غلطی رہ گئی تھی۔ ہمیں نہیں معلوم تھا کہ تم سوات خان کو اتنی آسانی سے زیر کر لو گے۔ میں مکمل ہدایات دے کر کوٹھی پر واپس گئی تھی۔"

میں اس کے سامنے سمٹ کر اپنی ہی نظروں میں بے وقعت ہونے لگا۔ تو اتنی تیز طرار عورت تھی وہ عالیہ۔

رٹیا کا رنگ اڑ رہا تھا۔ عالیہ سگریٹ کے گہرے گہرے کش لے رہی تھی لگتا تھا اس سارے منظر میں سب سے زیادہ حاوی ہستی وہی ہے اور ہم دونوں میں اور رٹیا محض سائے ہیں۔ بے حقیقت، بے وقعت سائے منحنی سے نکتے.....

"تمہارے لئے بہتر یہی ہے جیلانی کہ میری کار مجھے دے دو اور مجھے یہاں سے جانے دو، ورنہ میرے آدمی تمہیں ایسی چوٹ دیں گے کہ ساری زندگی سر پہ ہاتھ رکھ کر روتے رہو گے، ہمیں نہیں جانتے ہو تم۔" اس نے مجھے نیم باز آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے ہونٹ وہ سرخ بوٹی ایسے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے اور سگریٹ پر اس کی گرفت یوں مضبوط ہو رہی تھی جیسے وہ کسی کا گلا دبا رہی ہو۔

"ایسا بھی خراسانی گدھا نہ سمجھو مجھے عالیہ۔ ابھی تو تم میری قید میں ہو اور مجھے اپنے گردے کا حساب لینا ہے تم سے۔"

یہ کہہ کر میں نے اس کی دونوں کلائیاں پکڑ کر تکیے کی طرف دوبارہ پلنگ سے باندھ دیں۔

"ٹیکہ لگا دے ریٹا اس حرامزادی کو، اس کی چیخ پکار سے میں تنگ آگیا ہوں۔ بار بار دھمکیاں دیے جاتی ہے یہ مجھے ــــ"

میں نے غصے سے جھنجلاتے ہوئے کہا اور نیا ٹیپ کاٹ کر عالیہ کا منہ دوبارہ سی دیا۔ اس کی آواز سے وحشت ہونے لگی تھی مجھے۔ ریٹا تو شاید اسی انتظار میں تھی ـــــ اس نے کھٹ سے سرنج تیار کی اور ٹیکہ بھر کر عالیہ کی نس میں گھونپ دیا۔ اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے بے ہوش ہو گئی ـــــ

خس کم جہاں پاک۔ ایسی ذلیل کی بچی تھی وہ۔ دماغ سن کر دیا تھا اس نے میرا۔ مرتی مر گئی تھی مگر اس کے کس بل ویسے کے ویسے ہی تھے ابھی۔

"ریٹا مجھے ڈر ہے کہ اس گستی کے ساتھی ہمیں چاروں طرف ڈھونڈ رہے ہوں گے۔ ہر شہر تک رسائی حاصل ہے انہیں کیونکہ روپیہ ہے ... ان کے پاس۔"

"تو پھر کیا کرنا چاہیئے؟ اس کی باتوں سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہم یہاں محفوظ نہیں ہیں۔"

ریٹا بھی پریشان ہو گئی تھی اور اس کے اطمینان کا وہ چھلکا، جو اوپر کی سطح پہ قائم تھا ٹوٹ رہا تھا۔

"میرا خیال ہے ہمیں یہ جگہ آج ہی چھوڑ دینی چاہیئے۔"

"مگر ہم جائیں گے کہاں؟"

"یہ علاقہ میرا بہت دیکھا بھالا ہے۔ ریٹا یہاں ایک ڈاک بنگلہ ہے اُدھر میلسی کی طرف، محکمہ نہر والوں کی ملکیت ہے وہ۔ ہم آج رات وہیں جا رہے ہیں۔"

"مگر اس مصیبت کو تم کہاں لئے پھرو گے جیلانی؟"

"اس کے لئے ہی تو میں وہاں جا رہا ہوں۔"

"احمق ہو تم۔ میری مانو تو اسے گولی مار کر اُدھر کسی کھڈے میں دفن کر دو۔ اور اطمینان سے گھر چلے چلو۔ خواہ مخواہ اپنے لئے مصیبت پیدا کر رہے ہو۔"

"مجھے ابھی ڈاکٹر دھمن اور اس کے ساتھیوں کو بھی پکڑنا ہے۔ ایک ایک سے انتقام لینا ہے مجھے۔"

"تو پھر اس کا یہ کون سا طریقہ ہے؟ جس کو پکڑو اسے جان سے مار دو۔ بس اس میں لمبی چوڑی سوچنے کی کیا بات ہے؟"

"مگر..... نہیں ریٹا۔ یہ اتنی آسانی سے مر گئے تو انہیں سزا کیا ملی؟ کیا سزا ملی انہیں؟ جو مر جاتے ہیں وہ تو ہر غم، ہر دکھ سے نجات پا جاتے ہیں پھر سزا کہاں ملی انھیں؟ نہیں! میں ان سب کو ایسی سزا دوں گا کہ یہ نہ مر سکیں گے اور نہ جی سکیں گے۔" میں نے فیصلہ کن انداز سے کہا۔

"تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی ہیں جیلانی! میں شاید زیادہ دور تک اور زیادہ دیر تک تمہارا ساتھ نہ دے سکوں۔"

"بکتی ہو تم! میں کوئی زیادتی تو نہیں کر رہا ہوں تمہارے ساتھ" میں نے حیران ہو کر کہا۔

"یہ بات نہیں ہے جیلانی! یہ اذیت ناک سلسلہ میں زیادہ دیر برداشت نہیں کر سکتی۔ میں ان کاموں کے لئے نہیں بنی ہوں۔" وہ بلکہ اور نڈھال ہو کر کرسی میں جا دھنسی۔

"اوہ اب سمجھا! ٹھیک ہے بے بی میں ... میں .... میں بس دن میں تمہیں تمہارے گھر پہنچا دوں گا اور ڈھیر سارا روپیہ بھی تمہیں دوں گا تاکہ تم اطمینان سے زندگی بسر کر سکو۔"

"مجھے روپیہ نہیں چاہیئے۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے جیلانی تم"

"نہ بابا نہ۔ یہ بہت مشکل کام ہے میرے راستے بڑے کٹھن ہیں نہیں زندگی مجھے کس راہ پر لئے جاتی ہے۔ نکال دو اپنے دماغ سے تمام خناس۔ تم کہو گی تمہیں مجھ سے محبت ہو گئی ہے، میں تمہارے لئے نہیں سکتی۔ سب بکواس ہے۔ اب تو میں کسی کا بھی نہیں ہو سکتا۔ کسی کا نہیں۔ سات آدمیوں سے انتقام لے کر ہی میں سکھ کی نیند سو دُں گا وعدہ ہے اپنے دل سے، اپنے رب سے اپنی ماں کی خیالی تصویر سے نے بہت سے لوگوں کو تباہ کر لیا ہے مگر اب انہیں میں تباہ کر چھوڑوں گا۔" میں نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے یوں کہا جیسے اگر میرے منہ سے نہ نکلے تو میں دم گھٹ کر مر جاؤں گا۔

ریٹا مجھے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ کچھ نہیں بولی ہوئی اٹھی اور دوسرے کمرے میں جا کر سسکنے لگی۔

میں اس کی گریہ زاری پر لعنت بھیجتا ہوا کمرے سے نکلا سے دروازے کو مقفل کر کے نیچے اتر گیا۔ مجھے اسی شام وہ جگہ چاہیئے عالیہ ٹھیک کہتی تھی اس کے آدمی میری تلاش میں ہوں۔

کاؤنٹر پہ جا کر میں نے بل ادا کیا۔ اپنے دوست علی نام لی اور اسی شام ان دونوں کو کار میں لاد کر میں ملتان سے باہر نکل عالیہ کے بارے میں میں نے اپنے دوست کو بتایا کہ وہ اور چلنے پھرنے سے معذور ہے اس لئے اسے اٹھا کر ادھر اُدھر پڑتا ہے۔ حالت عالیہ کی یہ تھی کہ اسے ریٹا نے ٹیکہ لگا کر بے کر رکھا تھا اور ہماری عافیت اسی میں تھی کہ ہم وہاں سے چپ نکل جاتے۔

مجھے میلسی جانے کی زحمت نہ اٹھانا پڑی۔ نہر کی پٹڑی! کار ڈالی تو شہر سے کوئی اکیس میل دُور ہارون آباد کی طرف سڑک پر مجھے ایک ڈاک بنگلے کی خبر ملی۔ ایک راہگیر نے بتایا کہ کچھ ہی دُور واپڈا کا ایک بنگلہ موجود ہے میں اس میں ٹھہر سکوں گا۔

یہ بڑی خوش آئند خبر تھی۔ راہگیر کے بتائے ہوئے پتے پر جب میں پہنچا تو یہ دیکھ کر میرا دل خوش ہو گیا کہ ایک نیا تعمیر کردہ نئی وضع قطع کا بنگلہ ایک پُر بہار جگہ پر راجباہ کے کنارے موجود تھا۔

بنگلے میں صرف ایک چوکیدار تھا۔ اس گھڑی وہ مجھے وہاں دیکھ کر بے حد خوش ہوا۔ میں نے جاتے ہی سو کا نوٹ اس کے ہاتھ پہ رکھ کر اسے اپنا مطیع کر لیا۔ اس نے ہمارے لئے بنگلے کے ایک حصے میں دو کمرے کھول دیئے ـــــ وہ دو کمرے ایک مکمل رہائشی حصہ تھے جن میں کچن بھی تھا اور دو باتھ رُوم بھی ـــــ بجلی کے ہیٹر بھی لگے تھے ان کمروں میں۔

فرش پہ دریاں بچھی تھیں اور وہاں جو فرنیچر رکھا تھا وہ واقعی سی ایس پی قسم کے افسروں کے شایانِ شان تھا۔ ان لوگوں نے شہروں کی بکواس سے دُور ماہی دو ماہی دوروں کے لئے اپنے لئے نہایت ہی خوبصورت آرام گاہیں مہیا کر رکھی تھیں جہاں نہ صرف تنہائی تھی بلکہ تھا بلکہ دنیا جہان کی آسائشیں بھی مہیا ہو سکتی تھیں۔

کار میں نے وہاں بھی عمداً گیراج میں بند کر کے تالا لگا دیا ـــــ

چوکیدار جس کا نام شیرو تھا ہمارے بہت کام آیا۔ میں نے عالیہ کو بستر میں لٹا کر لحاف اوڑھا دیا۔ اسے بالکل ہوش نہیں تھا۔ پھر میں نے چوکیدار کو پچاس روپے دیئے کہ وہ ہمارے لئے مرغ روسٹ کروا دے اور جو اچھی سے اچھی چیز وہاں کھانے کو مل سکتی ہے لے آئے۔

رات دس بجے تک ہمیں شیرو نے ہر شے سے بے نیاز کر دیا۔ ہم کھانا بھی کھا چکے تھے۔ گرم پانی سے نہا بھی چکے اور گرم کمروں کے اندر لحافوں میں بیٹھ کر قہوے کا بھی مزہ لے چکے۔ وہ بڑا ہی خدمت گزار قسم کا آدمی تھا۔ صاحب لوگوں کی ضرورت کو تو چہروں سے بھانپ لیتا تھا۔

ریٹا قہوے کی پیالی میز پہ رکھ کر ذرا دیر کے لئے ادھر غسل خانے میں گئی تو وہ میرے پاس آ گیا اور سرگوشی کے انداز میں بولا۔

"صاحب کوئی اور خدمت؟ میرا مطلب ہے صاحب کہ آپ کی تھکن تو دُور ہونی چاہیئے نا؟"

"میں تھکا تو نہیں ہوں شیرو۔"

"صاحب فوٹو تو میرے پاس نہیں ہے پر فردوس سے بڑھ کر ہے وہ لڑکی، اور صرف پچاس روپے ہیں ـــــ"

"نہیں شیرو نہیں۔ اسے نہیں دیکھا تو نے یہ جو ہمارے ساتھ ہے کیا بُری ہے یہ؟" میں نے دل لگی کی۔

"بالکل نہیں صاحب! یہ تو بالکل چمگادڑ کی مرافق ہے۔ میں آپ کے پری لا کر دیتا ہوں۔" وہ اور زیادہ قریب آ گیا۔ عمر اس کی یہی کوئی پچاس کے لگ بھگ ہو گی مگر انسانی نفسیات کا ماہر آدمی تھا وہ۔ مجھے کچھ ایسے انداز میں پھانس رہا تھا کہ میرا دل بھی تیتیس چونتیس ہونے لگا پھر میں نے کہا۔ ہٹاؤ یار۔ یہ تو شیطان کا پرانا حربہ ہے۔ میں نے ذرا غصے کی نظر سے اسے دیکھا اور کہا۔

"بدبخت یہ میری بیوی ہے سمجھا کہ نہیں۔ چلا جا یہاں سے ورنہ میں تجھے نوکری سے نکلوا دوں گا۔ گیٹ آؤٹ۔" اس کا رنگ ہلدی ہو گیا۔ ہاتھ جوڑ کر الٹے پاؤں چلا اور پھر ایکدم بھاگ نکلا، اس کا تیر نشانے پر نہیں بیٹھا تھا۔

وہ رات بھی میں نے بہت محتاط انداز سے گزاری۔ اس حال میں کہ ریٹا کو میں نے اپنے ہی کمرے میں سلایا، ساتھ کے پلنگ پر، اور تمام دروازے کھڑکیاں اندر سے اس طرح بند کر رکھیں کہ باہر سے کوئی بھی اندر نہ آ سکتا تھا۔

دو دن اسی طرح گزر گئے۔ میں نے عالیہ سے کوئی بات نہ کی اس کی ساری دیکھ بھال ریٹا کرتی رہی۔

تیسرے دن صبح مؤذن کی اذان کے ساتھ ہی میں اٹھ بیٹھا۔ مجھے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانا تھا۔ عالیہ کو سزا دینے کی جو تجویز میرے ذہن میں بجلی کے کوندے کی طرح لپکی تھی اب اس پہ عمل کرنے کا مرحلہ آن پہنچا تھا۔

میں نے ریٹا کو جگا دیا۔

"اب یہ مت پوچھنا کہ قیامت آ گئی ہے کہ نہیں۔" میں نے آئینے میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"تو پھر اس وقت کیوں جگا دیا ہے تم نے مجھے؟ ابھی تو چار ہی بجے ہیں۔" اس نے دیوار پر لگے کلاک کو دیکھ کر کہا۔

"میں ذرا ملتان تک جا رہا ہوں سمجھیں۔ میرا خیال ہے صبح سات آٹھ بجے تک آ جاؤں گا۔"

"وہاں کیا کرو گے جا کر؟"

"بس ایک کام ہے۔ بہت ضروری کام۔ تمہیں یہ کرنا ہو گا کہ اس بدبخت عورت کو جگا کر تم کھانا کھلاؤ گی۔ اس کا دل بہلاؤ گی مگر اس کا منہ حسبِ معمول ٹیپ سے بند رکھو گی۔ اس کو میں نے پلنگ سے اچھی طرح باندھ دیا ہے باقی سب خیریت ہے۔"

اسے تمام باتیں سمجھا کر میں نے گیراج سے گاڑی نکالی اور تاروں کی چھاؤں میں ملتان کی طرف چل نکلا۔

مجھے اچھی طرح معلوم تھا مجھے کہاں جانا ہے؟ کیقباد ہوٹل کی... ٹیلی فون ڈائریکٹری سے میں نے ڈاکٹر اظہر کا پتہ لکھ لیا تھا۔ میں سیدھا اس کی کوٹھی جا پہنچا۔ گلگشت کالونی میں رہتا تھا وہ۔ کوئی ایسا مشہور ڈاکٹر تو نہیں تھا وہ مگر اس کی پریکٹس خوب چلتی تھی۔ آنکھوں کے علاج کے لئے لوگ ان کے پاس دُور دُور سے چلے آتے تھے۔

اس کے ملازم نے مجھے کمرے میں بٹھایا ہی تھا کہ ڈاکٹر اندر آ گیا۔ وہ دھان پان قسم کا آدمی اپنی عمر کے ڈھلتے سالوں میں تھا میرا خیال ہے پچاس کے پیٹے میں تو تھا ہی وہ۔ مجھے بڑے تپاک سے ملا۔ "کہیئے کیسے آنا ہوا؟" میں سنبھل گیا۔ مجھے بہت سوچ سمجھ کر بات کرنی چاہیئے تھی۔

"میرا نام صفدر ہے صاحب ـــــ شب وادلپور سے آیا ہوں۔ میری وہاں تھوڑی سی زمین ہے۔ میری ایک عزیزہ ہیں کینسر کی مریضہ ہیں وہ۔ پتہ نہیں کس گھڑی وہ کہاں دم توڑ دیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ ان کی آنکھیں کسی کو دے دی جائیں۔ ایک آنکھ وہ اپنی زندگی میں ہی دینا چاہتی ہیں اور دوسری مرنے کے بعد۔ اور آج ان کی حالت بڑی ہی مایوس کن ہے میرا خیال ہے کہ وہ اب تک مر چکی ہوں گی۔ میں نے سنا ہے کہ مرنے کے ایک گھنٹے کے اندر اندر ہی آنکھ صحیح سالم طور پر الگ کی جا سکتی ہے۔ اس لئے آپ کے پاس آیا ہوں کہ آپ ابھی اپنا سامان لے کر میرے ساتھ چلیں میں آپ کو منہ مانگی فیس دینے کو تیار ہوں۔"

"یہ تو بڑا نیک کام ہے صاحب! وہ خاتون انسانی ہمدردی کے تحت اپنی آنکھیں بطور عطیہ دینا چاہتی ہیں۔ پھر مجھ پر کیا لازم ہے کہ میں فیس لوں مگر میں آج آپ کے ساتھ جا نہیں سکتا۔"

"کیوں؟ صاحب ضرورت تو آج ہے آپ کی۔ اگر آج نہ گئے آپ تو پھر کیا فائدہ؟ آپ......"

"دیکھیں، یہ محض ایک ٹیکنیکل کام ہے۔ میں یوں کرتا ہوں کہ سارا سامان دے کر اپنے ایک اسسٹنٹ کو بھیج دیتا ہوں۔ ان کا نام انور ہے ڈاکٹر انور، وہ ابھی پندرہ منٹ میں آپ کے ساتھ چل دیں گے۔" یہ کہہ کر وہ ڈاکٹر دوسرے کمرے کی طرف بڑھا۔

"میں آپ کا شکر گزار ہوں ڈاکٹر۔"

وہ مسکرا کر دروازے میں گم ہو گیا۔

ٹھیک پندرہ منٹ بعد ڈاکٹر اظہر نے ضروری سامان دے کر اپنے اسسٹنٹ ڈاکٹر انور کو میرے ساتھ روانہ کر دیا۔ وہ کوئی تیس بتیس سال کا جوان آدمی تھا۔ صورت شکل سے وہ یونہی سا تھا۔ رنگ سیاہی مائل، آنکھیں بے رونق، بال خشک اور چپڑے چپڑے۔ البتہ سوٹ اس نے بہت عمدہ پہن رکھا تھا اور میری گاڑی کو وہ بہت للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اپنے رویے سے صاف طور پر بتا رہا تھا کہ وہ حریص ہے، بے حد حریص۔ اور اسے خرید لینا کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔

شہر سے ابھی ہم چھ سات میل ہی دور نکلے تھے کہ میں نے سڑک سے اتار کر گاڑی ایک جگہ درختوں کی اوٹ میں ٹھہرا لی۔

"کیا ہوا صاحب؟ کوئی پرزہ ورزہ خراب ہو گیا ہے؟"

"جی نہیں ڈاکٹر صاحب! یہ دیکھیں یہ پستول اگر آپ نے ذرا بھی چوں چراں کی تو مغز پھاڑ دوں گا آپ کا۔ آپ کو اپنی آنکھیں بند رکھنی ہوں گی۔ میں جہاں جا رہا ہوں وہ جگہ آپ کو یاد نہیں رہنی چاہئے۔"

"یہ...... یہ کیا بدمعاشی ہے صاحب! میں تو آپ کو بہت معزز آدمی سمجھا تھا۔ صاحب کمال ہے، اظہر صاحب نے کہا تھا آپ بڑی فیس دیں گے۔ ہماری خدمت خاطر کریں گے مگر آپ تو پستول دکھاتے ہیں۔" اس نے تھر تھر لرزتے ہوئے کہا۔

"فیس تو میں آپ کو بہت دوں گا ڈاکٹر ـــــ تین ہزار روپے کافی ہوں گے؟"

"تین ہزار، ہاں۔ واللہ بہت معقول اور جائز فیس ہے مگر بھیا یہ پستول۔ نہیں نہیں میں آپ سے کچھ نہیں لوں گا بھیا، اتار دیں یہاں......"

"نہیں ڈاکٹر صاحب! لائیے میں آپ کی آنکھوں پر پٹی باندھ دوں منہ ادھر کیجئے ذرا۔"

وہ خوف سے تھر تھر لرز رہا تھا فوراً ہی میری بات مان گیا۔ میں نے اس کی آنکھوں پر کس کر پٹی باندھی اور پھر ایک ڈوری سے اس کے دونوں ہاتھ کمر پر باندھ دیئے۔

"آپ ہلیے گا نہیں ڈاکٹر صاحب! ورنہ گولی نرخرے سے آر پار گزار دوں گا ہاں ـــــ"

"نہیں نہیں بھیا میں بالکل نہیں ہلوں گا۔ خدا رسول کی قسم میں وعدہ کرتا ہوں ہاں بس تم گولی نہ چلانا، چھوٹے چھوٹے بچے ہیں میرے۔"

میں نے گاڑی سٹارٹ کی اور گاڑی کے تمام پردے گرا دیئے۔

جب میں سڑک پر آ کر گاڑی کو پہلی رفتار پر لے آیا تو میں نے آہستگی سے پوچھا۔

"کتنے بچے ہیں آپ کے ڈاکٹر صاحب؟"

"سات بچے ہیں بھیا سات، ان پر رحم کھانا۔ اللہ کی قسم آپ کا یہ احسان کبھی نہ بھولوں گا۔"

"شور تو نہیں کریں گے؟"

"نہیں نہیں میرے باپ دادا کی بھی توبہ بڑے بھیا۔ میں کیوں شور مچاؤں گا بھلا؟" اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

"جو میں کہوں گا کریں گے؟"

"میں وہی کروں گا جو آپ کہیں گے۔"

"اگر میں کہوں کہ فلاں آدمی کو قتل کر دیں؟"

"تو میں کر دوں گا صاحب، واللہ کر دوں گا، بس آپ مجھے گولی نہ ماریں ـــــ"

"میری حکم عدولی تو نہیں کریں گے؟"

"جی نہیں صاحب مجھ سے قرآن پر ہاتھ رکھوا کر قسم لے لیں۔ میں آپ کا ہر حکم مانوں گا۔"

"جھک کر بیٹھیں، سر نیچا رکھیں تاکہ کسی کو نظر نہ آئیں۔" میں نے اس کی کپکپاتی آواز اور مسمساتی صورت پر دل ہی دل میں خوش ہوتے ہوئے کہا۔ وہ خاصا مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔ وہ ایک دم نیچے جھک گیا بہت نیچے۔

بنگلے پر پہنچ کر جب میں نے گاڑی گیراج میں بند کی تو وہ بولا۔

"صاحب! میری پٹی تو کھول دیں۔ میں کام کس طرح کر سکوں گا؟"

"ابھی کھول دیتے ہیں ڈاکٹر صاحب! پہلے ذرا دیکھ تو لوں کہ آپ کا مریضہ کس حال میں ہے۔ آپ چپ چاپ بیٹھے رہیں۔" یہ لمحے گلو پستول د

دھیان رکھ ڈاکٹر صاحب کا۔" میں نے یونہی اسے الجھاتے ہوئے کہا ـــــ پھر میں آواز بدل کر بولا۔

"لاؤ صاب جی لاؤ، گولی مارنی تو نہیں ہے نا جی؟"

"نا بابا نا۔ گھلو بابا! گولی نہیں مارنی ہے نہیں بابا! ہم ڈاکٹر ہیں آئی سپیشلسٹ ہیں۔" ڈاکٹر اور زیادہ بھڑ گیا۔ اس کی صورت دیدنی تھی۔

بنگلہ بالکل سنسان تھا۔ چوکیدار کا دور دور کہیں پتہ نہیں چلتا تھا میں نے سونے کی اینٹوں سے بھرا بریف کیس کار سے نکالا اور بنگلے کے اس حصے کی طرف بڑھا جہاں ہم ٹھہرے تھے۔

میری چھٹی حس مجھے بتا رہی تھی کہ وہاں صورتحال میرے حق میں نہیں رہی ہے۔ ابھی میں گیراج سے نکل کر دس قدم ہی چلا ہوں گا کہ مجھے زمین پر ایک جگہ خون کے قطرے نظر آئے۔ اس سے ذرا آگے مجھے سوکھی لکڑیوں کے ڈھیر کے دوسری طرف شیرو چوکیدار نظر آیا وہ شدید زخمی تھا اور اس کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔

میں نے اسے وہاں سے اٹھایا تو پتہ چلا کہ اس کی ران میں گولی لگی ہے۔

"کیا ہوا شیرو؟ کیا ہوا ہے تمہیں؟ بتاؤ جلدی بتاؤ۔"

"وہ جی ساب جی چار آدمی سیاہ رنگ کی کار پر آئے تھے۔ وہ...... وہ ان بیبیوں کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔ میں نے ان کا پیچھا کیا تو وہ مجھ پر گولیاں چلانے لگے۔ میں یہاں چھپ گیا۔ پھر بھی ایک گولی میری ران میں لگ ہی گئی ـــــ"

میں بھاگ کر گیراج میں گیا۔ ڈاکٹر کے منہ سے میں نے پٹی اتاری اور اسے کھینچ کر شیرو کے پاس لے گیا۔

"میں تو محض مذاق کر رہا تھا ڈاکٹر! یہ دیکھو اسے ڈاکوؤں نے گولی ماری ہے اس کی مرہم پٹی کرو۔ لاؤ اپنا سامان جلدی لاؤ۔"

"اور وہ آنکھ کی مریضہ؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔ اسے اپنی فیس برباد ہوتی نظر آ رہی تھی۔

"اس کی فکر نہ کرو، وہ بھی مل جائے گی۔ آپ کو فیس بھی ملے گی پہلے اس کا علاج کریں۔"

وہ گیراج کی طرف بھاگا اور وہاں سے مرہم پٹی کا سامان لے کر فوراً ہی واپس آ گیا۔ شیرو زمین فرش پر لیٹ گیا تھا اور اس کی ران سے برابر خون بہہ رہا تھا۔

ڈاکٹر اپنے فن میں ماہر تھا۔ اس نے جلدی سے شیرو کو سنبھال لیا۔ جب وہ اس کی مرہم پٹی کر چکا تو ہم دونوں نے مل کر اسے اندر لے جا کر پلنگ پر لٹا دیا۔ یہ وہی کمرہ تھا جہاں سے میں صبح صبح ملتان کے لئے روانہ ہوا تھا۔ اب وہاں نہ عالیہ تھی نہ ریٹا تھی۔ عالیہ ٹھیک کہتی تھی۔ سراج خان کے آدمی حرکت میں آ چکے تھے۔ وہ رات ہی سے ہمارے پیچھے لگ گئے تھے انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ میں عالیہ کی کار میں سفر کر رہا ہوں۔ میرا خیال ہے میرا پیچھا کسی ایک آدمی نے کیا ہو گا پھر اپنے ساتھیوں کو لینے واپس ملتان گیا تھا وہاں وہ رات بھر اپنے ساتھیوں کو اکٹھا کرنے میں مصروف رہا۔ اور صبح سویرے وہ اس وقت وہاں حملہ آور ہوئے جب میں وہاں موجود نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے انہیں بعد میں پتہ چلا ہو کہ میں وہاں نہیں ہوں۔

سارے امکانات میرے ذہن میں واضح ہو رہے تھے اور اپنی اس شکست پر میرا خون کھول رہا تھا۔ عالیہ ایک بار پھر مجھے چکر دے کر نکل گئی تھی ـــــ

بڑی طاقت تھی اس کے بازوؤں میں۔ بڑا کس بل تھا اس کے روپے میں، جو اس نے بزنس سے کمائے تھے۔

مگر ـــــ میں یوں ہار نہیں مانوں گا عالیہ! جب تک تو زندہ ہے اور تیرے گروہ کا یہ جال موجود ہے میں تمہارا پیچھا کرتا رہوں گا۔ ہاں، عالیہ میں تمہیں معاف نہیں کروں گا۔

چوکیدار سے مجھے جو معلومات حاصل ہوئیں ان سے تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک سیاہ رنگ کی کار تھی جس میں چار آدمی بیٹھے تھے۔ وہ سب کے سب لمبے کوٹ پہنے ہوئے تھے اور انہوں نے اپنے سر مفلروں میں لپیٹ رکھے تھے۔

انہوں نے آتے ہی پوچھا تھا کہ یہاں کون ٹھہرا ہوا ہے؟ میں نے اپنا نام نہیں بتایا تھا چوکیدار کو۔ وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا اس پر ان لوگوں نے اسے خوب زدوکوب کیا۔

وہ بے چارا بلبلا کر ایک طرف ہٹ گیا۔ وہ لوگ دندناتے ہوئے آگے بڑھے اور ایک کھڑکی کو زبردستی توڑ کر اس کمرے میں جا گھسے جہاں ریٹا اور عالیہ لیٹی تھیں۔ پھر نہیں معلوم چوکیدار کو، کہ وہاں کیسا شور رچتا رہا۔ اس نے صرف یہی بتایا کہ ایک عورت مسلسل چیختی چلاتی رہی اور وہ اسے ماس مارتے رہے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ لوگ دروازے کھول کر دونوں عورتوں کو کندھوں پر ڈال کر باہر لے آئے اور پھر کار میں ڈال کر چل نکلے چوکیدار ان کے پیچھے بھاگا تاکہ وہ ان عورتوں کی مدد کر سکے مگر ان میں سے کسی نے گولی چلا دی۔ ایک گولی سامنے دیوار میں لگی اور دوسری چوکیدار کی ران میں۔ وہ بے چارا ان سے بچنے کے لئے پاگلوں کی طرح خشک لکڑیوں کے ڈھیر کے پیچھے جا چھپا اور وہ کار فراٹے بھرتی ہوئی نکل گئی۔

چوکیدار کو ڈاکٹر نے ضروری دوا بھی دے دی تھی اور مرہم پٹی بھی کر دی تھی ـــــ

"وہ مریضہ کہاں ہے صاحب؟"

"لعنت بھیجیں اس مریضہ پر ڈاکٹر صاحب! آئیے واپس چلتے ہیں اس عورت نے شاید اپنا ارادہ بدل دیا ہے، وہ لوگ یہاں سے چلے گئے ہیں آئیے واپس چلتے ہیں ـــــ"

میں نے ڈاکٹر انور کو ساتھ لیا اور الٹے قدموں ملتان کو واپس چل دیا ـــــ

مجھے ہر حال میں ان کا پیچھا کرنا چاہئے تھا۔ ریٹا بے گناہ ماری گئی

تھی۔ خدا ہی کو معلوم تھا کہ وہ اس سے کیا سلوک کرتے ہیں۔
وہ اس بدنصیب سے پہلے ہی اس کی ملازمت کی قیمت وصول کر چکے ہیں اس کو بھی میری طرح انہوں نے ایک گردے سے محروم کر دیا تھا اور وہ اس غلط فہمی میں مبتلا تھی کہ اس کے تمام اعضا صحیح سالم ہیں۔
ڈاکٹر انور سخت خوف زدہ تھا اور اس کی سمجھ میں وہ گورکھ دھندا نہیں آ رہا تھا مجھے یقین تھا کہ وہ عالیہ کو کسی محفوظ مقام پر چھوڑ کر دوبارہ میرے پیچھے آئیں گے ——— مجھے وہ کسی قیمت پر کھلا چھوڑنا پسند نہ کریں گے میں ان کے گروہ کے لئے زبردست خطرے کا نشان بن گیا تھا۔
راجباہ کی کچی سڑک پر ان کی موٹر کا نشان صاف نظر آ رہا تھا وہاں سے اس روز یا میری کار گزری تھی یا ان کی ——— ڈاکٹر انور بالکل خاموش تھا اور کسی گہری فکر میں ڈوبا تھا اور میرا ذہن عجیب طرح سے قلابازیاں کھا رہا تھا ———
وہ دسمبر کی سات تاریخ تھی جس دن میں گھر سے نکلا تھا اور اس روز جنوری کی چوبیس تاریخ تھی۔ مجھے گھر سے نکلے صدیاں ہی بیت چکی تھیں اور ماں سے میں کہہ کر آیا تھا کہ میں اسے ایک لاکھ روپے لا دوں گا۔ آسیہ کی شادی دسمبر کی بائیس تاریخ کو تھی جمعہ کا دن تھا وہ۔ اور..... اور..... وہ سب کچھ گڈمڈ ہو گیا تھا۔ ان حادثوں نے مجھے کہاں سے کہاں جا پھینکا تھا۔ میں ان چھ سات ہفتوں میں اتنا بدل گیا تھا کہ اپنے آپ سے بھی بیگانہ ہو چکا تھا۔
میں نے شفا بار میں ایک آدمی کے سینے میں چاقو اتار دیا تھا۔ اس کا خون میری گردن پر تھا۔ میں عالیہ کا گھر لوٹنے کے لئے رات کے اندھیرے میں اس کے چیتے کو ہلاک کر کے اس کے سیف تک جا پہنچا تھا اور..... قدرت نے مجھے میرے اس جرم کی یہ سزا دی تھی کہ ان لوگوں کی قید میں پہنچا دیا تھا جنہوں نے مجھے میرے بدن کے ایک اہم عضو سے ہی محروم کر دیا تھا۔ نہ میں اپنی فریاد لے کر تھانے جا سکتا تھا نہ میرے وجود میں اتنی سکت اور وسعت تھی کہ میں اس گروہ کو کچل سکتا۔ مجھے اپنے آپ پر ترس آنے لگا تھا۔ ایک بڑی ہی عجیب و غریب صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی وہاں ——— اور اب میں پھر انجانے خطروں کی زد میں تھا مجھے ہر جھاڑی کے پیچھے دشمن کا چہرہ نظر آتا تھا ہر قدم پر میں لرز رہا تھا ———
اور ابھی ہم راجباہ کی سڑک سے اتر کر نہر کی پٹڑی پر نہیں چڑھے تھے کہ درختوں کے ایک جھنڈ سے جس کی لمبی لمبی شاخیں بہت آگے پٹڑی پر جھک آئی تھیں ——— ایک دم کئی گولیاں یکے بعد دیگرے ہماری کار سے ٹکرائیں۔ ایک تو ایسی آئی کہ کار کا شیشہ ہی توڑ گئی۔ میں نے رفتار ایک دم تیز کر دی ——— ڈاکٹر چرمر ہو کر سیٹ کے نیچے دھنس گیا۔
ایک دو تین یکے بعد دیگرے ہم پر پیچھے سے بھی کئی فائر ہوئے نتیجہ یہ نکلا کہ گاڑی کا پچھلا شیشہ بھی ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو گیا۔
کار کی رفتار تیز ہوئی تو ہوا کے دھکے بڑھ گئے ——— پھر بھی میں نے ہمت نہ ہاری اور کار کو دوڑاتا ہوا بہت آگے نکل آیا۔ میرا خیال ہے وہ لوگ اپنے پیچھے صرف ایک آدمی چھوڑ کر گئے تھے تاکہ مجھ پر نگاہ رکھے مگر وہ تنہا آدمی سامنے آ کر میرا مقابلہ نہ کر سکا شاید مجھ سے وہ خوف زدہ تھا جب ہی تو اوہنے میری کار پر درخت کی ٹہنیوں میں چھپ کر گولیاں چلائیں اگر وہ کوئی بہادر آدمی ہوتا تو زمین پر رہتا اور جتنی گولیاں اس نے صرف کی تھیں ان میں سے کسی نہ کسی گولی سے تو وہ میری کار کا ٹائر پھاڑ ہی سکتا تھا مگر وہ ایسا نہ کر سکا۔
"اب سیٹ پر بیٹھ جائیں ڈاکٹر صاحب! خطرہ ٹل چکا ہے۔" میں نے اب ذرا مطمئن لہجے میں کہا مجھے یقین تھا کہ اب ہم عالیہ کے اس بدمعاش کی گولیوں کی زد سے نکل چکے ہیں۔
"یہ..... یہ گولیاں کس نے چلائی ہیں ہم پر صاحب! اور یہ ہوا تو بہت سرد ہے صاحب۔" ڈاکٹر انور نے سردی سے تھرتھر کرتے ہوئے کہا اس کے لئے سیٹ پر جم کر بیٹھنا ممکن نہیں رہا تھا۔ میں نے پچھلی سیٹ سے اٹھا کر کمبل اسے دے دیا۔ "یہ لیں ڈاکٹر صاحب! کمبل اوڑھ لیں۔ ورنہ سردی سے مر جائیں گے آپ۔" میں نے ہوا کے تیز تھپیڑوں سے بچنے کے لئے آدھا کمبل اپنے سینے پر لپیٹتے ہوئے کہا۔
بڑی مشکلوں سے اس روز میں دوپہر کو ملتان پہنچ سکا۔ ڈاکٹر کو سٹیشن کے قریب اتار کر میں سیدھا ایک ورکشاپ میں گیا جہاں سے میں نے گاڑی کے دونوں شیشے بدلوائے اور پٹرول کی ٹینکی بھروا کر میں لاہور کو چل دیا۔ میرے لئے اور کوئی راستہ کھلا نہیں رہ گیا تھا۔
میرے تصور میں آسیہ کا چہرہ ابھر رہا تھا ماں کی بھیگی ہوئی آنکھیں مجھے ونڈ سکرین پر جمی نظر آتی تھیں۔ انہیں میں نے کتنا دکھی کر دیا تھا۔ میں ایک لاکھ روپے انہیں نہ دے سکا اور میرے تایا نے ڈولی نہیں اٹھائی ہو گی آسیہ کے مہندی لگے ہاتھ یونہی خلا میں جھولتے رہ گئے ہوں گے کسی نے ان پر کوئی زیور نہ پہنایا ہو گا اور بائیس تاریخ کا دن ان کے لئے ماتم کا دن بن گیا ہو گا۔
رہ رہ کر عالیہ کے یہ لفظ میرے ذہن میں گونجتے تھے اس نے کہا تھا کہ خدا جانے اس کے ساتھی سوات خان کے آدمی اب تک میرے کتنے پتے کاٹ چکے ہوں گے۔
اور اس شام جب میں نے آٹھ بجے کے قریب اپنے گھر کے سامنے لے جا کر عالیہ کی کار کھڑی کی تو مجھے محسوس ہوا کہ میرے گھر کی کوئی بتی روشن نہیں تھی ہر دریچہ تاریک تھا اور..... اور ساری فضا سوگوار تھی۔
سونے کی اینٹوں سے بھرا وہ بریف کیس اور اپنی دوسری چیزیں اٹھا کر جب میں نے اپنے گھر کے دروازے پر دستک دی تو یوں لگتا تھا جیسے میں کسی قبر کی پشت پر ہاتھ مار رہا ہوں۔ کتنی ہی دیر مجھے گھر سے کوئی جواب نہ ملا پھر میں مسلسل دروازہ کھٹکھٹاتا رہا۔
اور..... اور..... جب دروازہ کھلا تو میں نے ڈیوڑھی کے کمزور بلب کی نحیف و نزار روشنی میں ایک سایہ سا لرزتا دیکھا۔ وہ میری ماں تھی اس تھوڑی سی مدت میں اس کی کمر جھک گئی تھی اور وہ لاٹھی کے سہارے کھڑی تھی۔ اس کی شاید بینائی بھی کمزور ہو چکی تھی۔ بولی: "کون ہے؟"
"ماں..... ماں..... یہ کیا ہو گیا ہے تجھے؟" میں نے آگے بڑھ کر اسے باہوں میں سمیٹتے ہوئے کہا۔
"تو..... تو آ گیا ہے جیلے؟ یہ تو ہے نا بیٹے، میرا جیلانی بیٹا۔"
"ہاں ماں میں جیلانی ہوں مگر یہ تیرا کیا حال ہو گیا ہے تجھے؟"
"وہ..... وہ بیٹے پہلے تو غائب ہوا تھا۔ پھر تین دن ہوئے وہ آسیہ کو زبردستی اٹھا کر لے گئے وہ۔ رات کو آئے تھے، آدھی رات کو..."
"کون لے گئے ہیں آسیہ کو؟ یہ تو کیا کہتی ہے ماں۔ میں..... میں ان کا خون پی جاؤں گا، ایک ایک کی رگیں کاٹ دوں گا وہ کون تھے ماں مجھے بتا۔" میں نے اپنا سر پیٹ لیا۔
ماں نے اپنی آنکھوں کی بچی کھچی روشنی کا سہارا لے کر دروازہ بند کیا اور مجھے ساتھ لے کر بیٹھک میں جا بیٹھی۔ وہ ٹٹول ٹٹول کر راستہ تلاش کرتی تھی ———
"پولیس بھی آئی تھی بیٹا، مگر وہ بھی کچھ نہیں کر سکی۔ ادھر جتنے منہ اتنی باتیں ہو رہی ہیں۔ کوئی کہتا ہے وہ آسیہ کے یار تھے۔ ہاں ایسی ایسی بکواس کرتے ہیں وہ۔ میری آسیہ میں کیا برائی دیکھی ہے ان لوگوں نے اسے یار کہاں سے ملے؟ وہ لوگ جو آئے تھے تیرا پوچھتے تھے کہتے تھے وہ مل گیا تو اس کا ہم قیمہ کر دیں گے۔ وہ آسیہ کو کار میں ڈال کر لے گئے۔ جیلانی پتہ نہیں وہ خدا کا عذاب تھے کہ میرے گناہوں کی شامت، وہ مجھے تباہ کر گئے بیٹا۔ کاش وہ ایک گولی میرے سینے میں اتار دیتے۔ تیرے تایا نے منگنی بھی توڑ دی۔ پتہ نہیں تو کہاں چلا گیا تھا۔ تو تو کہتا تھا ایک لاکھ روپے دے دیں گے ہم ان کو۔ لایا ہی نہیں تو وہ روپیہ، اور تیرے تایا نے ہمارے منہ پر تھوک دیا۔ اس نے پچھلے مہینے کی سترہ تاریخ کو کہلا بھیجا کہ وہ اپنے لڑکے کی شادی کہیں اور کر رہا ہے۔ اور..... اور..... پھر بیٹے یوں ہوا کہ اللہ نے آسیہ کی آپ ہی شادی کر دی۔ وہ اسے زبردستی اٹھا کر لے گئے پتہ نہیں کون تھے وہ؟ پتہ نہیں میرا دامادکون بنا ہے؟ اللہ ہی کو معلوم ہو گا ———"
ماں بولتی جا رہی تھی جیسے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہی ہو۔ میرا خیال ہے وہ اپنی سدھ بدھ کھو چکی تھی۔ ورنہ وہ ایسی ایسی خوفناک باتیں نہ کہتی اس نے بہت کچھ کہا تھا۔ عجیب عجیب سی گندی باتیں اس نے منہ سے کہہ دی تھیں وہی باتیں جو اس روز سوات خان کے آدمیوں نے اس سے کہی تھیں ———
اور پھر جب حد ہی ہو گئی تو میں نے ماں کو جھنجھوڑ ڈالا۔
"بس کر دے ماں بس کر دے خدا کے لئے بس کر دے۔ تیرے دودھ کی قسم میں تیرے دشمنوں کو تہس نہس کر دوں گا ماں، تیری بتیس دھاروں کی قسم میں چین سے نہیں بیٹھوں گا جب تک آسیہ نہیں مل جاتی۔ جب تک اس کے دشمن زمین کے پیٹ میں نہیں چلے جاتے۔"
میں نے ماں کے ہاتھوں کو آنکھوں سے لگاتے ہوئے کہا اور پانچ ہزار روپے کے نوٹ اس کی جھولی میں ڈال کر باہر نکل آیا۔
بریف کیس میرے ہاتھ میں تھا اور عالیہ کا پستول میری جیب میں ———
میں کار میں بیٹھا اور گلبرگ کی طرف چل دیا۔ مجھے ان لوگوں سے اب یہ نیا حساب بھی چکانا تھا۔

○

مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میرا دماغ پھٹ جائے گا رہ رہ کر مجھے آسیہ کا خیال آتا تھا۔ میں پوچھتا تھا خود سے سوال کرتا تھا پاگلوں کی طرح اپنے بال نوچتا تھا اور اس بات کا جواب چاہتا تھا۔ میں اپنے دل سے اپنے ضمیر سے کہ غلام جیلانی یہ تو نے کیا کر دیا۔ تو نے اپنی حماقت کی وجہ سے ایک بھرے پرے ہنستے بستے گھر کو اجاڑ دیا۔ تو محسوس کیوں نہیں کرتا کہ آسیہ کے لعل و گہر تو نے اپنی جہالت کی چکی میں ڈال کر پیس ڈالے ہیں تو نے کیا کر دیا ہے غلام جیلانی؟ تیری بہن، تیری مظلوم و بے بس بہن بھی تجھ سے پوچھتی ہے کہ تو کس راہ پر چل نکلا ہے میرے ویر تو تو میرے لئے ایک لاکھ روپے لینے نکلا تھا۔ تو نے یہی تو وعدہ کیا تھا ماں سے۔ تو تو مجھے ایک لاکھ روپے میں تول کر بڑی دھوم دھام سے میری ڈولی دروازے سے اٹھانے کا ارادہ رکھتا تھا یہ تجھے کیا ہو گیا۔ تو کہاں سے کہاں جا پہنچا ہے۔
تجھے کیا معلوم غلام جیلانی، وہ تیری گڑیا ایسی معصوم سی خوبصورت بہن کن بھیڑیوں میں گھر گئی ہے؟ وہ لوگ اسے کبھی معاف نہیں کریں گے چونکہ وہ تیری بہن ہے اس لئے وہ اسے بدترین اذیتوں سے دوچار کریں گے وہ عورت جو اپنے ذرا سے مالی فائدے کے لئے انسانوں کو ان کے بدن کے اہم حصوں سے محروم کر چکی ہے۔ وہ تیرے ناطے سے تیری بہن پر کیا کیا ستم نہ توڑے گی کہ تو نے عالیہ کو بڑے تکلیف دہ مراحل سے گزار دیا تھا وہ تجھے یا تیری بہن کو کبھی معاف نہیں کرے گی۔
میرے ذہن کے ایوانوں میں زلزلہ آیا ہوا تھا۔ اپنے ارد گرد کی ہر شے مجھے سرخ نظر آتی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ بہت دیر ہو چکی ہے وقت میرا ساتھ چھوڑ چکا ہے۔ میری عزت ان کے پاؤں تلے اب تک بار بار روندی جا چکی ہو گی۔ پھر بھی کوئی قوت تھی جو مسلسل مجھے آگے ہی آگے دھکیل رہی تھی ———
کار کی رفتار دم بدم تیز ہوتی جا رہی تھی ———
مجھے ان بھیڑیوں کا مقابلہ کرنے کے لئے طاقت کی ضرورت تھی اسلحہ کی ضرورت تھی کیونکہ وہ مجھ سے تعداد میں بھی زیادہ تھے اور وہ جدید ترین اور مہلک ترین اسلحہ سے لیس تھے ان کے وسائل بے پناہ تھے، ان کے مقابلے میں میری جیب میں اس وقت عالیہ کا ایک ننھا سا پستول تھا اور بس اس کے سوا تو کچھ

بھی نہیں تھا میرے پاس۔ مگر سوال یہ تھا کہ میں اسلحہ کہاں سے لے سکوں گا۔ یونہی نہتا اگر میں ان میں جا گھسا تو وہ تو میری بوٹیاں نوچ لیں گے میں سوچتا رہا سوچتا رہا اور آگے بڑھتا رہا۔

ایک جگہ رک کر میں نے ٹیلی فون بوتھ سے شفا بار کلینک میں فون کیا تو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر دھمن کلینک میں موجود تھا۔۔۔ دوسرے لوگ بھی وہاں حاضر تھے مگر نہ تو سوات خان کا کسی نے کچھ بتایا یا نہ عالیہ کے بارے میں کچھ پتہ چلا پھر میں نے عالیہ کی رہائش گاہ پر فون کیا۔ دوسری طرف سے کسی عورت کی باریک سی آواز سنائی دی۔ معلوم ہوا عالیہ وہاں بھی نہیں ہے۔ وہ اس کی ملازمہ تھی۔ اس نے بتایا کہ عالیہ کئی دنوں سے کوٹھی میں نہیں دیکھی گئی۔۔۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ لوگ ابھی تک آسیہ کو اپنے انتقام کا نشانہ بنانے میں مصروف ہیں اور عالیہ نے جان بوجھ کر خود کو کہیں چھپا رکھا ہے یہ بھی ممکن تھا کہ وہ کسی ہسپتال میں زیر علاج ہو کیونکہ میری وجہ سے اس کی ذہنی حالت بہت ابتر ہو گئی تھی۔

سونے کی اینٹوں سے بھرا اٹیچی کیس میرے ہاتھ میں تھا ٹیلی فون بوتھ سے میں باہر نکلا اور گاڑی کا رخ صرافہ بازار کی طرف موڑ دیا۔ مجھے روپوں کی سخت ضرورت تھی۔

کار ایک محفوظ جگہ پر کھڑی کر کے میں اس پیلے بازار کی ٹیڑھی میڑھی گلیوں سے نکلتا ہوا ایک بہت بڑی دکان پر جا پہنچا۔ وہ لوگ مجھے دیکھ کر پہلے تو بہت خوش ہوئے مگر جب میں نے انہیں بتایا کہ میں سونا بیچنا چاہتا ہوں تو وہ بدک گئے۔ بڑی مشکلوں سے میں نے انہیں یقین دلایا کہ انہیں ہرگز خوفزدہ نہیں ہونا چاہئے جو مال میں ان کے پاس لایا ہوں وہ خالص کھرا اور اسی راستے سے آیا ہے جس راستے سے ان کے پاس پہلے مال پہنچتا رہا ہے۔۔۔ کوئی ایک گھنٹے کی سر کھپائی کے بعد میں نے وہ سونا ان لوگوں کے پاس سترہ لاکھ پچاس ہزار روپے میں بیچ دیا۔ اتنے روپے ان کے پاس دکان میں موجود نہیں تھے مگر سودا طے پا چکا تھا۔ ادائیگی کے لئے دکان کا مالک سیٹھ رمضان علی خود میرے ساتھ چل کر بینک گیا اور وہاں سے اس نے میرے نام پر میرے حساب میں اسی وقت رقم منتقل کر دی۔

میں نے محسوس کیا کہ ایک خاص بلندی پر پہنچ کر وہ لوگ بلا بیمانی اور دغابازی میں ایک دوسرے سے دل کھول کر تعاون کرتے ہیں۔۔۔ سیٹھ رمضان علی کو جب یقین ہو گیا کہ غلام جیلانی کسی جن بھوت کا یا کسی تتلے کے پتر کا نام نہیں ہے بلکہ ایک ایسے سمگلر کا نام ہے جو دھوپ خریدتا ہے اور چاندی بیچتا ہے تو وہ میرا دوست بن گیا میرے ساتھ وہ جب بینک میں گیا اور اس نے منیجر سے کہا کہ وہ میرے نام اس کے حساب میں سے پندرہ لاکھ پچاس ہزار روپے فلاں بینک میں منتقل کر دے تو منیجر نے یہ نہیں پوچھا کہ میں کون ہوں اور کس طرح اتنی بڑی رقم کا حقدار بن گیا ہوں۔ کچھ بھی تو نہیں پوچھا اس نے۔ بس چپ چاپ میرے نام اس نے روپیہ منتقل کر دیا۔

مگر مجھے یقین نہیں آتا تھا۔۔۔ اپنی تسلی کے لئے میں نے اپنے بینک کے منیجر سے فون پر بات کی تو وہ بولا "فکر نہ کریں جیلانی صاحب! روپیہ یہاں پہنچ گیا ہے اور آپ کے حساب میں جمع کر دیا گیا ہے۔ مگر حضرت یہ اتنی بڑی رقم کہاں سے ملی ہے آپ کو؟" بڑا معنی خیز سوال کیا تھا اس نے۔

"میرے بھائی صاحب نے انتظام کیا ہے اس کا۔۔۔ وہ امریکہ سے اپنا کاروبار یہاں منتقل کر رہے ہیں۔" میں نے کچھ اپنی جان چھڑائی۔ وہ سوال ہی خاصا پریشان کن تھا کہ میں اتنی بڑی رقم کا خداوند کس طرح بن گیا ہوں؟

میں نے دو لاکھ روپیہ سیٹھ رمضان سے نقد لیا اور الٹے قدموں ماں کے پاس پہنچا۔۔۔ اسے میں نے ایک لاکھ پچھتر ہزار روپے کے نوٹ دیئے تو وہ حیران رہ گئی۔ "یہ میرا وعدہ تھا ماں مگر آسیہ نے انتظار ہی نہ کیا یہ اس کے لئے رکھ لو ماں۔ میں اسے تلاش کر کے لے آؤں پھر یہ روپیہ ہم تایا جان کو دے دیں گے۔ یہ کہہ کر میں نے باقی پچیس ہزار روپیہ اسی بریف کیس میں رکھا اور ماں سے رخصت ہو کر سیدھا مال روڈ پر جا پہنچا۔ عالیہ کی کار مجھے دور دور تک لئے پھرتی تھی۔

ایک جگہ سے میں نے اس میں پٹرول بھروایا اور پھر طے شدہ منصوبے کے تحت میں ایک اسلحے کی دکان میں جا گھسا۔ مجھے اپنے ارادوں کی تکمیل کے لئے اپنے دشمن کا سر کچلنے کے لئے بڑے موثر ہتھیاروں کی ضرورت تھی اور مجھے پتہ تھا کہ وہ انگریزوں کے دور کی قائم شدہ دکان میری تمام ضرورتیں پوری کر سکتی ہے۔

دکان کا مالک بہت ہی نرم گفتار، خوش لباس اور النسانوں کے ایمانِ کامل کی طرح صاف ستھری شخصیت کا حامل تھا۔ وہ دکان کے وسط میں دیوار کے ساتھ یہ بڑی سی خوبصورت میز کے سامنے بیٹھا تھا اپنے تینوں طرف اس نے شیشے کی دیواریں کھڑی کر رکھی تھیں اس لمحے اس کی دکان میں کوئی گاہک موجود نہیں تھا۔ اور اس کا ملازم ادھر ادھر گھوم پھر کر گرد جھاڑ رہا تھا۔ بندوقوں پر سے اور الماریوں پر سے۔

"میرا نام علی فارانی ہے۔" میں نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے اپنا تعارف کرایا۔

"جی بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" اس نے اپنا وہ صاف ستھرا گورا گورا سرد ہاتھ مصافحے کے لئے آگے بڑھایا۔

"میں کچھ اسلحہ خریدنا چاہتا ہوں۔ دو پستول، ایک سٹین گن اور گولیاں پستول ایسے ہونے چاہئیں جن پر سائیلنسر لگے ہوں۔"

"جی آپ کو سب کچھ مل جائے گا جناب! بلیجئم اور انگلینڈ کا مال ہے میرے پاس۔ لائسنس کس کس چیز کا ہے آپ کے پاس؟" وہ ایک دم خوش ہو گیا، بولا۔۔۔

"رشید صاحب ذرا فارانی صاحب کے لئے چائے تو لیتے آئیے عمدہ سی۔"

رشید اس کے نوکر کا نام تھا اور وہ اسے بھی بہت زیادہ عزت احترام سے مخاطب کرتا تھا۔

"نہیں، چائے کی ضرورت نہیں ہے جناب! کیا نام ہے آپ کا؟"

"میرا نام؟ خاکسار کو عبدالستار کہتے ہیں جناب!" وہ بولا۔

"ہاں تو جناب عبدالستار صاحب! بات یہ ہے کہ لائسنس میرے پاس نہیں ہے اور وقت بھی نہیں ہے مجھے فوراً یہ مال چاہئے۔ قیمت بتائیں کیا ہو گی؟ مال اپنے ملازم کے ذریعے منگوا کر یہاں رکھ دیں اور پیسے لے لیں۔۔۔ ورنہ یہ دیکھیں۔۔۔ میرا نشانہ کبھی خطا نہیں گیا۔" میں نے پستول کی نال ہاتھ میں بڑھا کر اس کے پہلو سے لگا دی۔ میری آنکھوں میں اترے ہوئے خون کی ٹپکتی ہوئی لہر نے اس صاف ستھرے سے اصول پرست آدمی کو ایک دم دہشت زدہ کر دیا۔ میرا خیال ہے وہ اس کی زندگی کا پہلا موقع تھا کہ کسی نے اتنے بھرے پرے رواں دواں بازار میں اسے پستول دکھا کر بے بس کر دیا تھا۔ حالانکہ وہ اسلحے کا سوداگر تھا مگر اس میں اسلحے کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ اس کی رنگت ہلدی ہو گئی ایسی زردی اس کے چہرے پر کھنڈ گئی کہ باید و شاید۔ وہ مجھے ایک طفلک السبی بے معنی شے معلوم ہوا۔

"نہیں نہیں۔ ہاں۔۔۔ ہاں جناب، یہ پستول دور رکھیں۔۔۔ رشید صاحب!" وہ لرزتے ہوئے بولا۔ آواز اس کی خاصی بلند ہو گئی تھی۔ "یہ صاحب جو کچھ مانگتے ہیں انہیں دے دیں مگر جلدی کریں۔"

رشید نے اس کی لرزاں آواز سنی تو ٹھٹکا۔ تیزی سے لپکتا ہوا وہ میز کے پاس آ ٹھہرا۔ وہ شیشے کی دیوار سے باہر حیرت کا بت بنا کھڑا تھا کہ میں نے ایک دم پستول اس پر ظاہر کر دیا۔ نال اب کی بار میں نے عبدالستار کے پہلو سے ہٹا کر اس کی گردن پر لگا دی۔ ہنسلی سے ذرا اوپر۔ اس کی بھی حالت دگرگوں ہو گئی۔۔۔ وہ بھی اس منظر کی تاب نہ لا سکا۔ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

"خدا کے لئے ساب! مالک کو کچھ نہ کہیں میں آپ کو مال دیتا ہوں۔" وہ ہاتھ جوڑ رہا تھا۔

"تو جلدی کرو۔ دو پستول سائیلنسر والے، ایک سٹین گن اور چار سو گولیاں۔ جلدی کرو۔۔۔"

وہ آدمی ایک جھٹکے سے پیچھے مڑا۔ اس نے ایک لمبا سا ڈبہ لیا اور اس میں میرے سامنے اس نے ایک خوبصورت سی چمکتی ہوئی۔۔۔۔ سٹین گن رکھی پھر پستول اس میں دھرے۔ اس کے بعد مجھے دکھا کر اس نے سائیلنسر بھی اس میں رکھے اور چار سو گولیاں بھی۔ ان تمام چیزوں کو میرے سامنے اس نے ڈبے میں بند کر کے اوپر ڈوری باندھ دی۔ اس عرصے میں میں نے عبدالستار کو پستول کی زد میں رکھا۔ میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس عرصے میں کوئی گاہک بھی اندر نہیں آیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اگر کوئی گاہک وہاں آ جاتا تو میں کیا کرتا؟ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی عقل و خرد کی ساری سرحدیں عبور کر جاتا ہے اور ایسا ہی وہ لمحہ تھا جس میں سے گزر کر جب میں دوبارہ عالیہ کی کار میں بیٹھا تو میں اپنی ضرورت کے تمام اسلحہ سے پوری طرح لیس تھا۔

میرا خیال ہے کہ ان تینوں ہتھیاروں کی قیمت دس ہزار سے زیادہ نہ ہو گی مگر میں نے خوش ہو کر مالک کو پندرہ ہزار روپیہ دے دیا تاکہ اسے افسوس نہ رہے کہ کوئی گاہک اسے نقصان پہنچا گیا ہے۔

جب میں ان ہتھیاروں کو شہر سے باہر لے جا کر ایک ویرانے میں اچھی طرح آزما چکا تو ایک نئے عزم اور ایک نئے ولولہ کے ساتھ میں شفا بار کلینک کی طرف چل دیا۔ مجھے اپنے ایک ایک زخم کا حساب لینا تھا عالیہ سے سوات خان سے، ڈاکٹر دھمن سے اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرا وہاں طریق کار کیا ہو گا؟ کچھ ایسا جنون طاری تھا میرے دل و دماغ پر کہ اگر میرے بس میں ہوتا تو میں اس عمارت کو ہی تباہ کر دیتا جس میں میرے ہی نہیں بے شمار لوگوں کے دشمن آباد تھے اور اپنے مکروہ کاروبار میں اتنے مگن تھے کہ انہیں کسی اصول کا احساس تک نہیں تھا۔

شفا بار کلینک کی یہ عمارت کچھ اس انداز سے بنی تھی کہ اس کے سامنے کے حصے میں ایک دروازہ تھا، داخلے کے لئے۔ یہ دروازہ ایک بہت بڑے کھلے ہال میں کھلتا تھا۔ اس ہال سے آگے کمرے بنے ہوئے تھے دائیں طرف بھی اور بائیں طرف بھی۔ اور درمیان میں ایک غلام گردش تھی۔۔۔ اس میں سے گزرتا ہوا آدمی سیدھا چلا جائے تو عمارت کی دوسری طرف نکل جاتا تھا۔ وہاں بھی ایک بڑا سا دروازہ تھا جس کی دوسری طرف ویسا ہی ایک کار پورچ بنا تھا جیسا عمارت کے سامنے کی طرف تھا۔

عالیہ کی کار اس عمارت سے ذرا دور درختوں کے جھنڈ میں کھڑی کر کے میں نپے تلے قدم اٹھاتا آگے بڑھا۔ میں نے دس ہزار کے نوٹوں سے بھرا بریف کیس کار میں چھوڑ دیا اور پستول اوور کوٹ کی جیبوں میں ڈال لئے۔ گولیاں بھی جیبوں میں ہی تھیں۔ سٹین گن کی گولیاں الگ تھیں اور پستولوں کی الگ۔

سٹین گن میں نے اوور کوٹ کے اندر ڈال کر کندھے پر لٹکا لی تھی اور پر میں نے کمبل اوڑھ رکھا تھا۔ سر پر یہ بڑی سی اونی ٹوپی پہن لی تھی۔ یہ ٹوپی میں نے اسی دن بازار سے خریدی تھی۔

اس تمام انتظام کے باوجود مجھے معلوم تھا کہ اگر کوئی میرا واقف کار مجھے مل جائے تو وہ مجھے فوراً پہچان لے گا لیکن میں کر بھی کیا سکتا تھا؟ اپنی صورت تو میں نہیں بدل سکتا تھا۔ انتقام کی آگ کے جو شعلے میرے دل میں بھڑک رہے تھے وہ مجھے اتنی مہلت ہی نہیں دیتے تھے کہ میں کوئی سوانگ رچا کر یا بھیس بدل کر ان کے دروازے پہ جا سکتا۔

میرے لئے وہ بہت قیمتی وقت تھا۔ مجھے ہر قیمت پر آسیہ کو ان کے چنگل سے چھڑانا تھا۔ میری عزت ان کی ٹھوکر میں تھی اور سوات خان کی مونث شہر ٹھہر کر میرے ذہن کے پردے پر ابھرتی تھی۔ میں نے قسم کھا رکھی تھی کہ اس کا چلو بھر خون میں ضرور پیئوں گا۔

اور پھر جب میں اس عمارت کے دروازے پر پہنچا تو مجھ سے منبطانہ ہو سکا۔ میں نے دونوں پستول ہاتھ میں تھام لئے مگر اس طرح کہ وہ کمبل کے نیچے چھپے تھے۔ انتظام ان لوگوں نے یہ کر رکھا تھا کہ بظاہر وہ شفا یار کلینک میں گلے، ناک، کان اور آنکھوں کے امراض کا علاج کرتے تھے۔ بڑی شہرت تھی اس کلینک کی مگر وہ اتنا مہنگا سودا تھا کہ صرف بڑے بڑے لوگ ہی وہاں جا سکتے تھے۔

دو ہال انہوں نے ان امراض میں مبتلا مریضوں کے لئے وقف کر رکھے تھے۔ جبکہ عمارت کا پچھلا حصہ وہ اپنے خاص مقاصد کے لئے استعمال کرتے تھے۔ یہی وہ حصہ تھا جہاں وہ لوگوں کو ان کے گردوں سے محروم کرتے تھے۔

ان کے بڑے دروازے پر مسلح پہرے دار موجود رہتے تھے یہ بات مجھے ریٹا نے بتائی تھی مگر اس وقت وہاں کوئی پہرے دار مجھے نظر نہ آیا دروازے میں داخل ہو کر میں سنبھل سنبھل کر چلتا ہوا اس ہال میں جا گھسا جہاں آنکھوں کے مریض رکھے جاتے تھے اس وقت ہال میں چھ مریض موجود تھے۔ وہ بڑے اطمینان سے بستروں پر لیٹے تھے۔ تین آدمیوں کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی تھیں اور تین ابھی علاج کے ابتدائی مراحل میں تھے۔ کونے میں ایک میز رکھی تھی جس کے سامنے ایک نرس بیٹھی کاغذوں پر جھکی ہوئی تھی۔

ابھی میں اس ہال کے جنوبی دروازے سے اندر داخل ہوا ہی تھا کہ پہلو کے دروازے سے ڈاکٹر دھمن تیزی سے اندر آیا۔ اس کے پیچھے دو آدمی اور بھی تھے۔ ایک نے چھوٹا سا ڈبہ اٹھا رکھا تھا ——— جبکہ دوسرا آدمی ایک ٹرالی دھکیل رہا تھا۔ اس میں مریضوں کے لئے دوائیں رکھی تھیں۔

ڈاکٹر تیزی سے ایک مریض کے بستر کی طرف لپکا تو میں نے پاگلوں کی طرح آگے بڑھ کر بائیں ہاتھ سے اس کے منہ پر ایک ایسا تھپڑ دیا کہ وہ لڑکھڑا کر دائیں طرف گر گیا۔ ایک آدمی نے اسے فوراً تھام لیا اس کی یہ حرکت دیکھ کر میں نے دونوں پستول اس پر تان لئے۔ اچانک ایک شعلہ سا میرے سامنے بھڑکا۔ جس آدمی نے ڈبہ اٹھا رکھا تھا۔ اس نے پہلو کی جیب سے پستول نکال کر مجھ پر گولی داغ دی تھی مگر بے آواز۔ اس نے بھی پستول پر سائیلنسر لگا رکھا تھا اس نے ایسی افراتفری میں گولی چلائی کہ میرے پھیلے ہوئے کمبل میں سے گزرتی چلی گئی اور اس کے ساتھ ہی میں نے اسے اس کی تمام تر تیزی، عجلت اور ذہانت کی نعمتوں سے محروم کر دیا۔ دو گولیاں میرے پستول سے یکے بعد دیگرے نکلیں اور اس کے دل میں سے گزر گئیں۔ تیسری گولی میں نے اس کے ساتھی پر چلائی مگر وہ بدبخت پہلو بچا گیا اور گولی اس کے سینے کے بجائے بازو میں جا لگی۔ وہ چلاتا ہوا دیوار سے جا ٹکرایا۔ میری گولیاں بھی بے آواز تھیں۔ عبدالستار نے اچھا مال دیا تھا۔

ڈاکٹر دھمن مجھ سے چار قدم دُور تھا۔ اس نے یہ صورت حال دیکھی تو میرے اشارے کے مطابق ہاتھ اوپر اٹھا لئے۔ نرس اپنی جگہ کھڑی کانپ رہی تھی ——— اس کی میز پر انٹر کام بھی پڑا تھا اور ٹیلی فون بھی۔

"ڈاکٹر! اس عمارت میں جتنے لوگ موجود ہیں انہیں اس کمرے میں بلا۔ انٹر کام پر انہیں کہہ کر وہ فوراً یہاں آ جائیں۔" میں نے ڈاکٹر دھمن کو دھکا دے کر کرسی پر گراتے ہوئے کہا۔

"مگر کیوں؟ کیا چاہتے ہو تم مجھ سے؟" وہ بہت تپے ہوئے لہجے میں بولا۔

"مجھے نہیں پہچانا تم نے۔" میں نے اس کے سامنے دیوار کے ساتھ پڑی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"نہیں! میں نہیں جانتا تم کون ہو؟"

"میرا نام غلام جیلانی ہے ڈاکٹر دھمن۔ وہی جس کا چند ہفتے پہلے تم نے گردہ نکال لیا تھا۔"

"مجھے نہیں معلوم تم کیا کہتے ہیں؟"

"مجھے بتاؤ ڈاکٹر وہ عالیہ کہاں ہے؟ تم اچھی طرح جانتے ہو میں کون ہوں۔ تمہارا وہ غنڈہ سوات خان میری بہن آسیہ کو اغوا کر چکا ہے مجھے بتاؤ میری بہن کہاں ہے؟ ورنہ میں تم سب کو قتل کر دوں گا۔"

"اوہ اب سمجھا۔ مجھے تو یاد ہی نہیں رہا تھا کہ ہمارا واسطہ ایک ڈاکو سے پڑا ہے۔" گہرا طنز تھا اس کے لہجے میں۔

"ڈاکو میں نہیں تم ہو۔ تم بدترین جرم کے مرتکب ہوئے ہو۔ دولت لُٹ جائے تو واپس مل سکتی ہے مگر...... مگر کسی کا گردہ کاٹ لیا جائے تو دوبارہ نہیں جُڑ سکتا۔ حرامزادے میں تم سے اپنے ایک ایک زخم کا بدلہ لوں گا۔" یہ کہہ کر میں نے اس کے سر کے اوپر سے گولی چلا دی۔ جو اس کے بالوں کو جلاتی ہوئی گزر گئی۔ وہ خوف سے اچھل کر زمین پر جا گرا۔

"اٹھ جاؤ۔ ورنہ گولی سیدھی سینے میں اتار دوں گا۔" میں نے چیخ کر کہا۔

عین اس وقت دائیں طرف سے ایک تکیہ اڑتا ہوا آیا اور میرے ہاتھ سے ٹکرا گیا۔ وہ مجھے بے بس کر دینا چاہتے تھے۔ تکیہ ایک مریض نے پھینکا تھا مگر میں فوراً سنبھل گیا۔ دوسرا پستول میرے بائیں ہاتھ میں تھا۔ میں نے اس کو سیدھا کر کے اس آدمی پر گولی چلا دی۔ نشانہ ٹھیک لگا۔ وہ آدمی دلدوز چیخ مار کر پلنگ پر گر گیا۔ گولی اس کے کندھے میں اتر گئی تھی۔

"سنا نہیں تم نے بلاؤ ان سب لوگوں کو جو اس عمارت میں موجود ہیں۔ انہیں انٹر کام پر کہو کہ وہ سب یہاں آ جائیں۔ میں نے ڈاکٹر دھمن کو بالوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ دیا۔

وہ فوراً انٹر کام پر بولا ———

"صبیحہ! فوراً سب کمروں میں موجود لوگوں سے کہو کہ وہ .... وارڈ ہال میں آ جائیں فوراً ——" ڈاکٹر دھمن نے انٹر کام پر کسی نرس سے کہا۔

"عالیہ اور سوات خان سے بھی کہو کہ وہ اِدھر آ جائیں ——" میں نے کہا۔

"وہ یہاں نہیں ہے اور مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہیں؟" ڈاکٹر دھمن اپنی تمام تر قوتِ ارادی کو مجتمع کر کے بولا حالانکہ اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔

"جھوٹ مت بول ڈاکٹر! میں اپنی بہن آسیہ کو لینے آیا ہوں خون کی ندیاں بہہ جائیں گی یہاں اگر تم نے میرا حکم نہ مانا تو اچھی طرح سوچ سمجھ کر بات کرو۔"

"میں قسم کھاتا ہوں کہ ان کے بارے میں مجھے کچھ علم نہیں ہے۔ مجھے تو یہی پتہ ہے کہ عالیہ کو تم نے اغوا کر لیا تھا۔"

"تم بکواس کرتے ہو۔ مگر مجھ سے بچ نہ سکو گے۔ تم میں سے کوئی بھی مجھ سے بچ نہ سکے گا۔ اس حرامزادی صبیحہ سے پھر کہو کہ سب کو یہاں بلا لائے۔" میں نے پھر اسے حکم دیا۔

ڈاکٹر نے پھر صبیحہ سے انٹر کام پر بات کی تو اس نے بتایا کہ وہ سب سے کہہ چکی ہے۔

ابھی چار منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ وارڈ ہال میں چھبیس آدمی اور جمع ہو گئے۔ ان میں بارہ تو مریض تھے اور باقی ڈاکٹر دھمن کے ملازم۔ میں نے ان لوگوں کی آمد پر پستول کمبل کے نیچے چھپا لئے تھے تاکہ وہ بدک نہ جائیں میں ان کی حرکات و سکنات کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ آخری چار آدمی جو اندر آئے وہ سوات خان کے کینڈے کے تھے۔ بڑے گٹھیلے ورزشی بدن تھے ان کے اور آنکھوں میں ویسی ہی دہشت ناک چمک تھی ان کی۔ جیسی مجھے سوات خان کی آنکھوں میں نظر آئی تھی۔

میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر دھمن کے چہرے پر نظر ڈالتے ہی وہ صورتحال کو سمجھ گئے تھے۔ وہ ایک دم پلٹے۔ مگر میں نے انہیں مہلت نہیں دی میرے دونوں پستولوں میں سے شعلے نکلے اور ان دونوں آدمیوں کو لڑھکا گئے۔ دروازہ ان کے آڑھے ترچھے گرتے سمٹتے وجود سے بھر گیا تھا۔

"ان کتوں کو اندر گھسیٹ کر دروازہ بند کر دو۔" میں نے اس لڑکی سے کہا جو ان کے ساتھ ہی اندر داخل ہوئی تھی۔ اسی کا نام صبیحہ تھا۔

ایک آدمی نے لرزتے ہوئے ان دونوں کو بڑی احتیاط سے کھینچ کر کمرے کے اندر ڈالا تو اس لڑکی نے چپ چاپ دروازہ بند کر دیا۔

"تم میں سے کوئی بھی آدمی حرکت نہیں کرے گا یہ میرا حکم ہے۔ ڈاکٹر دھمن کے غنڈوں نے میری بہن کو اغوا کر لیا ہے جب تک وہ واپس نہیں آتی میں تمہیں یہاں باندھ رکھوں گا۔ اگر کسی نے کوئی گڑبڑ کی تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" میں نے ان لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا میرا لہجہ بہت ہی یخ بستہ، خوفناک اور لرزہ خیز تھا ——— ان لوگوں کی آنکھوں میں ابھرتی ہوئی خوف کی لہر کو میں آج تک فراموش نہیں کر سکا ڈاکٹر دھمن کے دو آدمیوں کی لاشوں کو اپنے سامنے دیکھ کر اور میری وہ گمبھیر آواز سن کر وہ سُن ہو گئے تھے۔

"ڈاکٹر دھمن میری بات کا جواب نہیں دیا تم نے ——— سوات خان اور عالیہ کو بھی بلواؤ۔" میں نے دھمن کو بالوں سے پکڑ کر پھر جھنجھوڑا۔ اس کا رنگ پھر پیلا پڑ گیا۔ بولا۔

"میں قسم کھاتا ہوں مجھے نہیں معلوم کہ وہ دونوں کہاں ہیں۔ میں نے تو پولیس میں یہ رپورٹ دے رکھی ہے کہ تم عالیہ کو اغوا کر کے لے گئے ہو اور اس کی کار بھی تم نے چرا لی ہے۔"

"بہت خوب! یعنی چوری بھی اور سینہ زوری بھی۔ مگر تمہارے یہ ہتھکنڈے کام نہیں دیں گے دھمن۔ اپنا یہ کوٹ اور یہ قمیص اتار دو۔" میں نے بائیں ہاتھ سے چاقو لہرا کر اسے للکارا۔

اس نے فوراً میرے حکم کی تعمیل کی۔ پہلے اس نے کوٹ اتارا۔ پھر سوئیٹر اور اس کے بعد قمیص اور بنیان۔ وہ اندر سے خاصا گورا چٹا آدمی تھا اور بہت صحت مند بھی۔ پتلون کی بیلٹ کس کر بند کرتا ہوا وہ میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"تم نہیں بتاؤ گے کہ عالیہ کہاں ہے اور آسیہ کس کے پاس ہے؟" میں نے چاقو کی نوک اس کے سینے پر رکھتے ہوئے کہا۔

وہ ایک دم پیچھے ہٹ گیا مگر میں نے اسے پھر جا لیا۔ اب وہ میز کے آخری کونے سے دو قدم پیچھے تھا۔

"بولتے کیوں نہیں ہو۔ بتاؤ آسیہ کہاں ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے؟" ڈاکٹر نے مُردہ سی آواز میں کہا۔

میں نے چاقو کی نوک اس کے سینے پر دبا کر نیچے تک لکیر ڈال دی۔ ہلکی سی تیز دھار لکیر۔ اور اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر کی چیخ نکل گئی۔ لکیر پر یہاں سے وہاں تک خون ابھر آیا تھا۔ اس کی سفید جلد پر خون کی وہ لکیر بہت بھلی معلوم دیتی تھی ———

"بہت درد محسوس کرتے ہو مگر پتہ ہے تمہیں میرا درد کتنا گہرا ہے؟ تم نے مجھے میرے ایک گردے سے محروم کر دیا اب میری بہن بھی تم نے مجھ سے چھین لی ہے لیکن یاد رکھو اگر آسیہ کو کوئی نقصان پہنچا تو یہاں سے کوئی بھی زندہ بچ کر باہر نہیں جائے گا۔"

ڈاکٹر اپنے بدن پر خون کی دھار دیکھ کر بہت پریشان ہو گیا تھا وہ رونے لگا۔ یہ موٹے موٹے آنسو اس کی آنکھوں میں بھر آئے، بولا۔

"میں قرآن کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ان لوگوں کا مجھے کوئی علم نہیں ہے۔"

"تو پھر انہیں پیدا کرو، انہیں بلواؤ۔ ورنہ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا دھمن۔" میں نے چاقو کی نوک سے ایک اور لکیر اس کے بازو پر کھینچ۔

نوک شاید زیادہ دَب گئی تھی۔ وہاں سے خون زیادہ تیزی سے پھوٹ نکلا۔ ڈاکٹر تو چیخ اٹھا۔

”خدا کے لئے مجھ پر ظلم نہ کرو۔ مَیں بالکل بے گناہ ہوں۔“

”تو گنہگار کون ہے؟ میرا گُردہ تم نے کتنے میں بیچا تھا ڈاکٹر؟ بتاؤ کتنے ریال ملے تمہیں اس کے بدلے میں؟“ مَیں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ وہ لوہے کے فریم کی بڑی آرام دہ کرسی تھی جس کی سیٹ پر فوم لگا تھا۔

ڈاکٹر نے میری بات کا جواب نہ دیا۔ سامنے کرسی پر بیٹھ کر اپنا خون پونچھنے لگا۔ وہ بہت نڈھال ہو گیا تھا۔

ابھی مجھے وہاں بیٹھے دو منٹ بھی نہ ہوئے تھے کہ باہر غلام گردش میں بھاری بھرکم لوگوں کی آواز ابھری۔ ان لوگوں نے پولیس کو بلا لیا تھا۔

ہال کا دروازہ اندر سے اس طرح بند تھا —— کہ اس کے دستے کو باہر سے گھمانے پر وہ کھل سکتا تھا اور وہی بات ہوئی کسی نے دستہ گھما کر دروازہ ذرا سا کھولا تو مَیں نے ایک دم گولی چلا دی۔ دروازہ ایک دم بند ہو گیا ——

”خبردار! اگر کسی نے دروازہ کھولا تو گولی مار دوں گا۔“

”تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟“

کسی کی بھاری بھرکم آواز مجھے دروازے پر سنائی دی۔ کوئی پولیس افسر مجھ سے مخاطب تھا۔

”میرا نام غلام جیلانی ہے۔ میری بہن آسیہ کو ڈاکٹر دھمن کے غنڈوں نے اغوا کر لیا ہے۔ جب تک یہ میری بہن کو واپس نہیں کرتے مَیں انہیں اسی طرح باندھ رکھوں گا۔“

”قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر تم نے خود کو مجرم بنا لیا ہے۔ مَیں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو، ورنہ ہمارے سپاہی تمہیں گولی مار دیں گے۔“ وہ بڑی دھمکی آمیز آواز تھی۔ پولیس افسر خاصا تجربہ کار تھا۔

”اور میری بہن آسیہ؟“ مَیں نے اس کی بات پر زہرخند کیا وہ مجھے کوئی ایسا ہی لاابالی قسم کا گھامڑ سمجھ رہا تھا۔

”ہم وعدہ کرتے ہیں کہ تمہارے ساتھ جن لوگوں نے زیادتی کی ہے انہیں ہم بدترین سزا دلوائیں گے۔“ پولیس افسر دروازے کے ساتھ بھڑ کر کھڑا تھا۔ مَیں نے ہال میں چاروں طرف نگاہ ڈالی —— وہاں تین روشن دان لگے تھے جو دوسرے کمروں میں کھلتے تھے۔ ان کے نیچے تین بڑی بڑی کھڑکیاں تھیں جن میں شیشے لگے تھے۔

مجھے ابھی اور اسی وقت آسیہ کی آزادی درکار ہے اس سے کم پر کوئی بات نہیں ہو سکتی۔“ مَیں نے اس پولیس افسر سے کہا جس کی صورت میرے لئے ابھی تک پردے میں تھی۔ وہ یونہی باتوں باتوں میں اپنا اُلّو سیدھا کر لینا چاہتا تھا۔

”مجھے معلوم ہوا ہے تم نے تین آدمی ہلاک کر دیئے ہیں؟“ اس نے کہا۔

”ہاں اور شاید ان سب کو بھی میں ایک ایک کر کے قتل کر دوں کیونکہ مجھے اپنی بہن کی عزت سے زیادہ کوئی شے عزیز نہیں ہے۔ میری اگلی گولی دھمن کے سینے میں اترے گی۔ صرف دو گھنٹے کی مہلت دے رہا ہوں تم لوگوں کو۔ تین بج رہے ہیں۔ پانچ بجے تک آسیہ یہاں ہونی چاہئے ورنہ مَیں ان سب کو مار دوں گا۔“ مَیں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ لوگ کھڑکیوں اور روشن دانوں کے پیچھے بندوقیں تان کر کھڑے ہیں اور کسی بھی لمحے وہ مجھے قتل کر سکتے ہیں۔

میرے لئے حالات خاصے تباہ کن ہو چکے تھے۔ مَیں نے اتنے سارے لوگوں کو اس جگہ باندھ کر عقل مندی کا ثبوت نہیں دیا تھا۔ میری وہ چال میرے لئے بے حد نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھی مگر اب کیا کیا جا سکتا تھا؟ وہ لوگ گولی مجھ پر نہیں چلا رہے تھے، صرف اس لئے کہ انہیں ڈر تھا کہ اگر ان کی طرف سے گولی چلی تو پانچ دس آدمیوں کو تو مَیں پلک جھپکتے میں بھون ڈالوں گا اور میرا پہلا شکار ڈاکٹر دھمن ہو گا۔ جو بالکل میرے سامنے میرے پستول کی زد میں تھا۔

مگر نہیں —— میرے دشمن مجھ سے کہیں زیادہ قوی ثابت ہوئے انہیں گولی چلانے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔

⊛

وہ لوہے کی کرسی جس پر مَیں بیٹھا تھا میری تباہی کا سبب بن گئی اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مجھے ذبح کیا جا رہا ہے۔ کرسی میں بجلی کی رَو آ گئی تھی اور وہ اتنی طاقت ور رَو تھی کہ میں ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں اچھل کر دُور جا گرا۔ میرے ہتھیار میرے ہاتھ سے نکل گئے۔ اور میرا دماغ ماؤف ہو گیا۔ پھر مجھے محسوس ہوا کہ بہت سے ہاتھ میرے بدن پر پڑے ہیں اور...... پھر مجھے کچھ بھی یاد نہ رہا۔ اگر مَیں کرسی سے الگ نہ ہو جاتا تو شاید اب یہ سب کچھ بتانے کے لئے زندہ نہ ہوتا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں کسی ہسپتال کے کمرے میں پڑا تھا۔ اس طرح کہ میرے ایک ہاتھ میں ہتھکڑی لگی تھی۔ اور پولیس کے چار افراد میرے اردگرد بیٹھے تھے میرا سارا بدن یوں شل ہو رہا تھا جیسے کسی نے مار مار کر مجھے ادھ مؤا کر رکھا ہے۔

”سنا بھئی شہزادے جاگ پڑا ہے تو۔“ ایک سپاہی نے مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر بڑے جوش سے کہا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔

”مَیں کہاں ہوں؟“

”باؤ جی تسیں خیر نال ہسپتال وچ او۔ تہاڈا علاج ہو رہا اے۔ تسیں پاگل ہو گئے سو خیر نال۔“ دوسرے سپاہی نے نہایت ہی مسخرانہ لہجے میں کہا۔ وہ مجھ پر جھک آیا تھا۔ اور اب وہ میری نبض دیکھ رہا تھا۔

”نبض تے تہاڈی ٹھیک ٹھیک چل رئی اے۔ مَیں تے سمجھیا کہ بجلی

جھٹکے نال تہاڈا دی جھٹکا ہو گیا ہوسی۔“

”بکواس نہ کرا دئے —— مینوں کے کنجر دی اولاد نظر آنا ایں —— بک بک کری جار ہیا ایں۔“ مَیں نے اسے پنجابی میں ڈانٹ دیا۔

”زیادہ گرم سرد ہونے کی ضرورت نہیں ہے سردصاب! یہ ہسپتال ہے میو ہسپتال۔ آپ کا علاج ہو رہا ہے۔ یہاں سے ہم سیدھا آپ کو بڑے گھر لے چلیں گے وہاں سے جب آپ نکلیں گے نا، تو آپ کی گردن دو ہاتھ لمبی ہو چکی ہوگی۔ آپ نے تین آدمیوں کو قتل کر دیا ہے۔“ دوسرے سپاہی نے بڑی سنجیدگی مگر دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

مَیں چُپ ہو گیا۔ وہ مجھے پھر شکست دے چکے تھے۔ وہ ڈاکٹر دھمن اور اس کے ساتھی۔ کاش مَیں نے ڈاکٹر کو بھی قتل کر دیا ہوتا۔ ان سپاہیوں نے مجھے بتایا کہ اس لوہے کی کرسی میں پولیس کے سپاہیوں نے باہر سے بجلی کی رَو دوڑا دی تھی۔ دیوار میں پلاسٹک کی نالی لگی تھی جس میں سے بجلی کے تار گزرتے تھے۔ بس اسی نالی کے راستے انہوں نے مجھے ڈس لیا تھا۔

تین دن تک مسلسل میں زیر علاج رہا پھر چوتھے دن مجھے وہاں سے اٹھا کر انہوں نے جیل پہنچا دیا۔ وہ میرے خلاف قتل کا مقدمہ تیار کر چکے تھے۔ انہوں نے مجھ پر اور بھی کئی سنگین الزامات عائد کر دیئے تھے۔

میں نے کہا۔ ٹھیک ہے زندگی میری اگر ایسی ہی سستی ہے اور میرا مقدر ایسا ہی ہارا ہوا ہے تو ضرور مقدمہ چلاؤ اور چڑھا دو مجھے پھانسی۔ میں اسی قابل ہوں۔ مَیں نہ بہن کی عزت بچا سکا تھا نہ اپنی جان۔ میں کچھ بھی تو نہ کر سکا تھا۔ میرا فائدہ ہی کیا ہے۔ میری ماں نے بھی یہی کہا تھا۔

”مجھے مر ہی جانا چاہئے۔“

میری مایوسی اور زندگی سے میرے ٹوٹتے ناتے کی کربناک کیفیت دیدنی تھی۔ میں بہت دنوں تک جیل کی حوالات میں بند رہا۔ اور پھر خدا خدا کر کے مجھے ایک دن انہوں نے عدالت میں پیش کر دیا۔ مجھ پر جو کچھ بیتی تھی۔ وہ میں نے عدالت میں بے کم و کاست بیان کر دی مگر یہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا کہ وہ کسی طرح بھی یہ باور نہیں کرتے تھے کہ ڈاکٹر دھمن اور اس کی بیوی نے میرا گُردہ نکال لیا ہے۔

دہائی ہے یارو! وہاں ڈاکٹر دھمن نے ثابت کر دیا کہ مَیں نے دراصل وہ عرصہ ایک سرکاری ہسپتال میں گزارا تھا گُردے کے مریض کی حیثیت سے۔ حالانکہ اس عرصے میں مجھے ان لوگوں نے شفا یار کلینک میں قید کر رکھا تھا۔ سرکاری ہسپتال کے رجسٹروں میں مجھے انہوں نے دو ماہ تک زیرِ علاج دکھایا تھا اور وہاں یہ بھی لکھا تھا کہ چونکہ مریض کا بایاں گُردہ ناکارہ ہو چکا ہے اس لئے نکال دینے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے یہی وجہ تھی کہ میرا گُردہ آپریشن کے ذریعے میرے جسم سے نکال دیا گیا اور بس۔ اور ڈاکٹر دھمن اسی سرکاری ہسپتال کے ایک شعبے کا انچارج تھا۔

مَیں عدالت میں چیختا ہی رہ گیا مگر میری ایک نہ سنی گئی۔ ڈاکٹر دھمن کے وکیل نے ثابت کر دیا کہ میں نے دہشت گردی پھیلا کر ایک معزز شہری کو ذلیل کیا پھر تین آدمیوں کو قتل کرنے کے بعد جھوٹ بول کر اپنے گُردے سے محرومی کا ناٹک رچا کر میں نے عدالت کی ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔

دس مہینے کے مختصر عرصے میں مجھے سیشن جج نے تین آدمیوں کے قتل کے جرم میں پھانسی کی سزا سنا دی۔ میں بہت چیخا بہت چلّایا کہ میری بہن آسیہ کو تو بازیاب کرو۔ اسے سوات خان اور اس کے ساتھی اغوا کر چکے ہیں اسی کی عزت بچانے کے لئے مَیں نے ان لوگوں کو شفا یار کلینک میں پکڑا تھا تم میری مدد کرو مگر میری آواز صدا بہ صحرا ثابت ہوئی۔

⊛

حیرت کی بات یہ ہے کہ پولیس نے میری بہن آسیہ کے اغوا کے سلسلے میں جو کہانی عدالت میں پیش کی اس سے یہی ثابت ہوتا تھا کہ میری بہن آوارہ و بدچلن تھی۔ اور جن لوگوں نے اسے اغوا کیا ہے وہ دراصل اس کے اپنے یار تھے۔ وہ اسے زبردستی اٹھا کر نہیں لے گئے ہیں بلکہ وہ ان کے ساتھ برضا و رغبت گئی ہے! اغوا کا ڈرامہ میری ماں نے لوگوں کے سامنے اپنی مظلومیت ظاہر کرنے کے لئے رچایا تھا۔

مَیں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ ان لوگوں نے مجھے میری ماں کو اور میری بہن کو بدترین قسم کے جرائم پیشہ افراد ثابت کر دیا تھا۔

اور...... اور پھر...... مجھے پھانسی کی کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا ہر شے مجھ سے چھین لی گئی۔ ایک سنگی فرش میرے نیچے تھا۔ ایک آہنی دروازہ میرے سامنے اور اوپر ایک چھت تھی جو نیچے نہیں آ سکتی تھی۔ کاش ایسا ہو سکتا۔ پڑھنے کے لئے انہوں نے مجھے کلام مجید دے دیا تاکہ میں موت کے اس قدر قریب ہو کر تو خدا کو یاد کر لوں۔ اب میرے اور میرے بھیانک انجام کے درمیان فاصلہ بہت ہی کم رہ گیا تھا۔

رہ رہ کر مجھے آسیہ یاد آتی تھی۔ وہ ایسے سنگدل لوگ تھے کہ انہوں نے ایک بار بھی میری درخواست پر غور نہیں کیا انہیں یقین ہی نہیں آتا تھا کہ مجھے اپنی بہن کے بارے میں کوئی علم نہیں ہے۔ ڈاکٹر دھمن کا وکیل بار بار یہی کہتا تھا کہ آسیہ کا اس سارے معاملے سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ اسے میں نے عدالت کو گمراہ کرنے کے لئے کہانی میں شامل کر لیا ہے۔ وہ کہتا تھا کہ مجھے معلوم ہے کہ آسیہ کہاں ہے —— وہ ایسا ابلیس تھا کہ اس نے سفید جھوٹ کو سچ ثابت کر دکھایا اور مَیں سر پیٹ کر رہ گیا۔

پھانسی کی کوٹھڑی میں پڑے پڑے میرا دل بہت آزردہ ہوتا تو میں کلام مجید پڑھنے لگتا۔ اس سے بھی اگر سکون نہ ملتا تو میں رونے لگتا بے تحاشا آسیہ کو پکارنے لگتا۔ میری حالت دن بدن بگڑتی جا رہی تھی۔ لگتا تھا مَیں پاگل ہو جاؤں گا۔ اذیت اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ میرا پاگل ہو جانا بعید از قیاس نہ تھا اور میرا پہرے دار میری اس کیفیت کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ بہت ہمدردی دکھاتا تھا وہ میرے غم پر مگر وہ

کیا کر سکتا تھا۔ پھانسی کی کوٹھڑی کی چابیاں تو عدالت کے پاس تھیں اور یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ میں نے تین آدمی قتل کر دیئے ہیں۔ مجھے بھی اس سے کوئی انکار نہیں تھا اس کے باوجود میں نے رحم کی درخواست کر رکھی تھی صدرِ مملکت سے، کہ یہی دستور تھا۔ مرتے دم تک آدمی آس نہیں چھوڑتا۔ یہی میرا حال تھا مجھے امید تھی کہ کسی نہ کسی طرح میں بچ جاؤں گا مگر کس طرح۔ اس کا مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا۔

یہ نالہ و شیون، یہ فریاد و گریہ کی کیفیت میرے دل و دماغ پر پھانسی کی کوٹھڑی میں پہنچنے کے بعد بہت دن تک قائم رہی پھر نہ جانے کیا ہوا مجھے آپ ہی آپ سکون آنے لگا۔ میری بشاشت لوٹ آئی۔ شاید میں نے موت سے سمجھوتہ کر لیا تھا مگر نہیں مجھے یقین ہی نہیں آتا تھا کہ میں مر جاؤں گا اتنی جلدی زندگی کی سرحد سے کوئی شے اٹھا کر مجھے باہر پھینک دے گی۔ یہ بات میرا دل قبول ہی نہ کرتا تھا۔ میں نے رحم کی درخواست دے دی تھی اور دن تیزی سے گزرتے جا رہے تھے۔

ہر روز مجھے پیغام ملتا تھا کہ میری ماں مجھے ملنے آئی ہے جب سے میں جیل میں بند ہوا تھا جب سے اس نے اپنا گھر چھوڑ کر جیل کے قریب اپنی ایک دور کی رشتے دار کے پاس رہنا شروع کر دیا تھا۔ وہ ہر روز کوئی نہ کوئی شے میرے لئے ضرور بھیجتی تھی مگر میں اسے مل نہیں سکتا تھا۔ اسے دیکھ سکتا تھا وہ صبح ہی صبح گھر سے نکل کر جیل کے دروازے کے قریب ملاقاتیوں کی کھڑکی کے سامنے آ بیٹھتی تھی۔ وہ بہت منت سماجت کرتی تھی سپاہیوں کی کہ وہ کسی طرح اسے اس کے جیالے سے ملوا دیں مگر وہاں اس کی فریاد کون سنتا تھا۔ کس میں اتنی ہمت تھی کہ وہ جیل کے قانون کو بالائے طاق رکھ کر اس اپنی ماں ممتا کی ماری بوڑھی عورت کو مجھ سے ملوا سکتا۔ وہ بیچاری ہر روز شام تک وہاں بیٹھی رہتی اور پھر تھک ہار کر مایوسی کی سیاہ چادر میں لپٹ کر واپس چلی جاتی۔ رات کی طویل اداس اور تاریک ساعتوں میں وہ پھر اپنی بکھری ہوئی ہمت کو یکجا کرتی۔ امید کے نئے چراغ جلاتی اور دوسری صبح وہ پھر میرے بندی خانے کے دروازے پر آ بیٹھتی۔

یہ اس کا معمول ہو گیا تھا۔ وہ دیواریں اسے عزیز ہو گئی تھیں جن کے پیچھے اس کا بیٹا زندگی کی گھڑیاں گن رہا تھا۔ مگر مجھے بچا لینا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ تو دعا ہی کر سکتی تھی۔ سو وہ دن رات اپنے بیٹے کی زندگی کی بھیک اپنے خالق سے مانگتی رہتی تھی۔ اور پھر ایک رات میرے پروردگار کو مجھ پر رحم آ ہی گیا۔ میری ماں کی دعائیں قبول ہو گئی تھیں۔ وہ فروری کی ایک یخ بستہ رات تھی ـــ میری رحم کی اپیل مسترد ہو چکی تھی اور وہ لوگ مجھے کسی بھی دن زندگی کے بوجھ سے آزاد کر سکتے تھے میں اس رات بھی نہیں سو سکا تھا نیند انہیں کہاں آتی ہے جن کے دروازوں پر موت رقص کناں ہو۔ وہ بھلا کہاں سو سکتے ہیں؟ میرے ذہن میں اس گھڑی بھی اپنی مظلوم دبے بس بہن آسیہ کا آنسوؤں سے تر چہرہ ابھر رہا تھا۔ اور اپنی بے بسی پر مجھے اس لمحے بھی سخت طیش آ رہا تھا کہ اچانک مجھے اپنی کوٹھڑی کے قریب ہی آوازوں کا زبردست شور سنائی دیا۔ بہت سے لوگ پھانسی کی کوٹھڑیوں کی طرف بڑھ رہے تھے پہرے دار ایک دم چونکتے ہو گئے میرے دروازے پر جو سپاہی تھا ـــ اس نے رائفل سنبھالی اور میرے دروازے کے ساتھ لگ کر سامنے کے ہجوم پر گولی چلانے لگا ـــ اس کی پیٹھ میری طرف تھی۔ باہر آوازوں کا شور بڑھ رہا تھا۔ میں ڈرا کہ یہ بدحواس آدمی کسی بدنصیب کو گولی ہی نہ مار دے۔ میں اس کے تیور دیکھ کر لرز گیا تھا۔

کسی کی زندگی کو اس کی اندھی فرض شناسی سے بچانے کے لئے میں نے آگے بڑھ کر بڑی احتیاط سے اپنا ہاتھ جنگلے سے باہر نکالا اور فوراً ہی اس کی گردن کی رگِ احساس مسل ڈالی ـــ

وہ بے ہوش ہو کر نیچے جھول گیا اور رائفل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر پڑی۔ میں نے فوراً ہی رائفل اٹھا کر کوٹھڑی میں رکھی اور پھر اس کے گلے سے گولیوں کی پیٹی بھی اتار لی۔ شور بڑھتا ہی جا رہا تھا معلوم یہ ہوتا تھا کہ قیدیوں نے جیل کے عملے پر حملہ کر دیا ہے اور پھر ایک دم کئی گولیاں چلیں۔ زبردست چیخ و پکار پیدا ہوئی اور اس کے ساتھ ہی تیس چالیس آدمی ہماری کوٹھڑیوں تک آ پہنچے۔

"نکالو! ان بدنصیبوں کو نکالو یہاں سے۔" کوئی چیخا۔

"تالے توڑ دو۔" کسی اور نے کہا اور پھر کئی آدمی پاگلوں کی طرح ان کوٹھڑیوں کے تالوں پر پل پڑے۔ ان کے ہاتھوں میں اینٹیں تھیں لوہے کی سلاخیں تھیں ڈنڈے تھے، وہ بہت خونخوار نظر آتے تھے۔ انہی میں سے دو آدمیوں نے میری کوٹھڑی کا تالہ لوہے کی سلاخ ڈال کر توڑ دیا۔

"نکل آ باہر میرے یار۔ بچا اپنی جان ان قصائیوں سے، بھاگ جا۔"

ایک آدمی نے کوٹھڑی کا وہ بے رحم جنگلا کھولتے ہوئے کہا۔ میں نے کلام مجید اٹھایا کمبل سنبھالا بندوق ہاتھ میں لی اور ـــ تیزی سے باہر نکل گیا۔ بے ہوش سپاہی کی گولیاں بھی میرے پاس تھیں۔

جیل کے کئی حصوں میں آگ لگی ہوئی تھی۔ قیدیوں نے اپنی زنجیریں توڑ ڈالی تھیں۔ یہ بہت بڑا موقع تھا میرے لئے زندگی کو بچانے کا۔ میں مشرقی دیوار کی طرف بڑھا ـــ ادھر کچھ قیدیوں نے دیوار میں سوراخ کر دیا تھا اور لوگ دھڑا دھڑ اس میں سے گزر کر باہر جا رہے تھے۔ میں بھی انہی میں جا گھسا اور پھر چند ہی لمحوں بعد میں بدنصیبی کے ان ویران جزیروں سے باہر نکل چکا تھا۔

میرے ارد گرد اس گھڑی پچاس کے قریب قیدی تھے اور ہم سب نو آزاد وحشیوں کی طرح بھاگتے جا رہے تھے۔ کہ اچانک سامنے سے اور پیچھے سے کئی گاڑیاں ہماری طرف لپکیں۔

"رک جاؤ ورنہ گولی مار دی جائے گی۔" ایک خوفناک آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ کوئی پولیس افسر بھاگتے قیدیوں کو رک جانے کا حکم دے رہا

تھا مگر ہم نہیں رکے اور اس کے ساتھ ہی کوئی دس سیکنڈ بعد گولیوں کی بوچھاڑ نے ہمیں آ لیا۔ وہ ایک دو نہیں درجنوں گولیاں تھیں میرے ارد گرد کئی آدمی چیختے چلاتے اِدھر اُدھر لڑھک گئے مگر میں بھاگتا رہا اور سڑک سے اتر کر مغربی سمت میں اگی سبزی کے کھیت میں جا گھسا اس سے ذرا آگے ایک باغ تھا۔ تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں بہت دور نکل گیا۔ میرے تمام ساتھی پیچھے رہ گئے تھے ـــ زندگی مجھے بچا کر اس عقوبت خانے سے نکال لائی تھی اب میں کہیں بھی جا سکتا تھا کسی بھی طرف بڑھ سکتا تھا مگر حالت میری یہ تھی کہ میں ساری عمر کے لئے شہروں سے بستیوں سے، اپنوں سے، بیگانوں سے، زندگی کے ہنگاموں سے دلآویز صبحوں سے اور اس کی روح پرور شاموں کی لذتوں سے محروم ہو گیا تھا کیونکہ میں ایک مفرور قیدی تھا ایسا قیدی جس کو پھانسی کی سزا سنائی جا چکی تھی۔ اور جس کی گردن سے پھانسی کا پھندا بس دو چار ہاتھ ہی دور رہ گیا تھا۔ میری آزادیاں سلب ہو چکی تھیں اور اب مجھے ایک نئے آدمی کی حیثیت سے زندگی بسر کرنی تھی مگر کس طرح اس کا مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا۔

میں چلتا رہا، چلتا ہی رہا۔ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیے مارتا میں کھیت کھلیان عبور کرتا ہوا بہت دور جا نکلا اور..... اور پھر وہ وقت بھی آ پہنچا جب آدمی سفید دھاگے سے کالے دھاگے کو تمیز کر سکتا ہے۔

اچانک مجھے محسوس ہوا جیسے میں کسی قبرستان میں جا پہنچا ہوں خراب و خستہ قبروں پر میرے پاؤں پڑ رہے تھے، میں رک گیا وہ لوگ جو پہلے ہی اپنے انجام کو پہنچ چکے تھے مجھے اپنے ارد گرد سرگوشیاں کرتے سنائی دیئے۔

ابھی میں گرد و پیش کو سمجھ ہی رہا تھا کہ مجھے ایسا منظر دکھائی دیا، جسے پہلی نظر میں میں اپنی قوتِ متخیلہ کا کرشمہ سمجھا۔ میں نے میتوں کو قبروں میں اترتے تو دیکھا تھا مگر جو منظر میں دیکھ رہا تھا وہ اس سے بالکل مختلف اور لرزہ خیز تھا۔

میرے سامنے کوئی دس قدم دور ایک آدمی کھلی قبر میں سے ایک میت کو اوپر لا رہا تھا۔ میں تو سُن ہو کر رہ گیا سفید کفن میں لپٹی ہوئی میت کو قبر سے نکال کر اس آدمی نے ایک صاف جگہ پر لٹا دیا۔ اور.....

"تمہاری جوانمردی پر میں تمہیں مبارکباد دیتا ہوں جوان! بڑے حوصلے والے آدمی ہو تم۔" میں نے ایک دم اس کے پاس جا کر کہا۔ وہ چونک کر یوں پیچھے ہٹا جیسے اسے گولی لگ گئی ہے۔ اس کے چہرے پر لمبی داڑھی تھی پیشانی، رخساروں اور ہاتھوں پر برص کے داغ تھے۔

اس کا منہ یوں کھلا تھا جیسے اس نے کوئی بھیانک خواب دیکھا ہے رائفل کا رخ میں نے اس کی طرف کر رکھا تھا۔ اس کے بال بری طرح الجھے ہوئے تھے اور اپنے تہمد اور کرتے میں وہ مجھے کوئی اودھ بلاؤ نظر آتا تھا اس کی آنکھیں پاگلوں کی طرح مجھ پر جمی تھیں۔

"تم بولتے کیوں نہیں؟ کون ہے یہ بدنصیب جس کو تم مرنے کے بعد بھی ذلیل کر رہے ہو؟"

وہ پھر بھی چپ رہا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

"بولتے کیوں نہیں ہو؟ چاہتے ہو کہ میں تمہیں گولی مار دوں، کون ہو تم؟"

"جی وہ..... مجھ سے غلطی ہو گئی ہے جناب!" اس نے ایک دم میرے قدموں میں سر رکھ دیا۔

"اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے بدبخت! تو مجھے یہ بتا کہ آخر یہ قصہ کیا ہے؟" میں نے اسے زمین پر سے اٹھاتے ہوئے کہا۔ بال اس کے میرے بائیں ہاتھ کی گرفت میں تھے۔

"مجھے نہیں معلوم جناب، کہ مجھے کیا ہو جاتا ہے۔ مجھے کوئی شے ادھر کو دھکیلتی ہے جب کوئی عورت یہاں دفن ہوتی ہے تو اس رات مجھے نیند نہیں آتی اور...... اور پھر میں جب تک اس کو قبر سے نکال نہ لوں مجھے چین نہیں آتا۔" اس نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ وہ بہت زیادہ پشیمان نظر آتا تھا۔ اس کا وہ کھدر کا کرتہ اور تہمد مٹی میں اٹے ہوئے تھے، قبر کھودنے میں اس نے زبردست محنت کی تھی۔

"اچھا اب اس قبر کو بند تو کر دو، اس کی ذلت کو تو ڈھانپ دو پھر میں بات کروں گا تم سے۔" میں نے ایک طرف ایک ڈھیری پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ صبح کی روشنی دم بدم پھیلتی جا رہی تھی۔

وہ آدمی تیزی سے آگے بڑھا قبر پر لکڑی کے تختے اس نے بڑی مہارت سے چنے اور پھر بیلچے سے وہ پوری تندہی سے ان پر مٹی ڈالنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے قبر پھر سے بند کر دی اور اس پر عام قبروں ایسی ڈھیری بھی بنا دی لگتا تھا اسے اپنے اس کام میں خاصی مہارت حاصل تھی۔

جب وہ فارغ ہوا تو اس کی پیشانی سے پسینے کی دھار بہہ رہی تھی اتنی سخت مشقت نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔

"چلو اب کہیں چل کر منہ ہاتھ دھوؤ۔ چلو، مردوں سے محبت کرتے ہو، مر جاؤ گے بدبخت۔ مجھے تمہاری حالت پر ترس آتا ہے۔"

وہ عجیب سے کھسیانے انداز سے مسکرایا اور بولا۔

"خدا تو کبھی مجھے معاف نہیں کرے گا مگر آپ مجھے معاف کر دیں۔ آپ نے میرا ایسا جرم دیکھا ہے جس پر میں خود بہت شرمندہ ہوں۔"

اس کا لب و لہجہ عام دیہاتیوں ایسا نہیں تھا ــــ "میں تمہیں کیوں معاف کر دوں؟" میں نے حیرت کا اظہار کیا۔ وہ میرے پہلو بہ پہلو چل رہا تھا۔ بولا ــــ

"کیونکہ آپ بھی انسان ہیں آپ نے بھی کوئی نہ کوئی ایسی غلطی کی ہو گی جس پر آپ خود شرمندہ ہوں گے۔"

"بہت چالاک معلوم ہوتے ہو۔ یہ بتاؤ یہ قبرستان کس بستی کے مُردوں کا گھر ہے؟"

"آپ نہیں جانتے؟ حیرت ہے۔ یہ کمال پور کا قبرستان ہے۔" روشنی اور زیادہ واضح ہو گئی تھی۔ اس نے مجھے اب اور زیادہ غور سے دیکھا، تو ٹھٹھر گیا، بولا ــ

"یہ ...... یہ تو قیدیوں کے کپڑے ہیں جو آپ نے پہن رکھے ہیں۔" اس کی آنکھوں میں اچانک پُراسرار قسم کی چمک ابھری۔

"ہاں! میں یہی کپڑے پسند کرتا ہوں۔ میں بھی تو قیدی ہوں ــــ زندگی کا قیدی۔ اپنی جان کا اسیر۔" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ میرا خیال تھا کہ میں اس کا اعتماد جیت چکا ہوں۔ دل میرا اس خوف سے لرز گیا تھا کہ میرا بھید اس پر ظاہر ہو گیا ہے۔

"آپ جیل سے بھاگے ہیں؟ خیر کوئی بات نہیں فکر نہ کریں، میں کم ظرف آدمی نہیں ہوں۔"

"کیا مطلب؟ کیا کہنا چاہتے ہو تم؟"

"میں لوگوں کے عیب چھپا لیا کرتا ہوں۔ خدا تو نہیں ہوں مگر خدا کی یہ صفت میرے اندر موجود ہے۔"

"بکواس نہ کر او ئے ــــ تُو کسی کے عیب پر کیا پردہ ڈال سکتا ہے تیرا تو اپنا وجود اس زمین کے لئے باعثِ شرم ہے۔ پتہ نہیں میں تیرے ساتھ کیوں نرمی برت رہا ہوں؟" میں نے بندوق کا رُخ پھر اس کی طرف کر دیا اس کی مسکراہٹ پر مجھے طیش آ گیا تھا۔

مجھے وہ شخص مجسم شیطان نظر آتا تھا اور...... اب...... وہ اُلٹا میرے عیب کے حوالے سے مجھ پر حاوی ہونا چاہتا تھا۔

"ناراض نہ ہوں جناب! آدمی آدمی کا دارُو ہوتا ہے۔ آپ کو پناہ کی ضرورت ہے اور مجھے پردے کی! اپنے عیب پر ڈالنے کے لئے مجھے پردہ چاہئے وہ آپ مجھے فراہم کر دیں، مَیں آپ کو پناہ فراہم کر دوں گا۔" وہ اب کی بار اور زیادہ اعتماد سے بولا۔ ہم پانی کے ایک چھوٹے سے ندی نالے پر پہنچ گئے تھے ــــ وہ بڑی بے تابی سے اپنا منہ دھونے لگا۔ صبح کی روشنی اب چاروں طرف پھیل چکی تھی اور اِدھر اُدھر کھیتوں میں دُور دُور تک زندگی حرکت میں آ رہی تھی۔

"تیرا نام کیا ہے جوان؟"

"میرا نام صادق ہے، صادق علی۔ میں اُدھر دھمیال کے پرائمری سکول میں پڑھاتا ہوں۔"

اس نے مجھے حیران کر دیا۔

"کیا؟ کیا کہا تم نے؟ تم سکول ماسٹر ہو؟"

"ہاں۔ آپ کو حیرت ہوئی؟"

"ایسے حیرت کی بات ہی ہے، تُو بچوں کے مستقبل کا امین! ایک سکول ماسٹر اور یہ حرکت؟"

"اگر آپ اسی طرح حیران ہوتے رہے تو مجھے ڈر ہے کہ آپ جلدی بوڑھے ہو جائیں گے، مجھے دیکھیں کیا خیال ہے کتنی عمر ہو گی میری؟" اس کی خود اعتمادی لوٹ آئی تھی اور میرا رُعب اس پر قائم نہیں رہا تھا۔

"تیری عمر؟ میرا خیال ہے تیری عمر یہی کوئی تیس سال ہو گی۔"

وہ ہنسا۔ ایک دم کھلکھلا کر ہنس دیا۔

"کیوں؟ ہنستے کیوں ہو؟"

"ہنسنے کی بات ہی ہے جناب! میری عمر اس وقت اکسٹھ سال ہے۔"

اس نے مجھے حیران کر دیا۔

"کیا؟ کیا کہا تم نے اکسٹھ سال؟ ایسے ڈرامہ کر رہے ہو میرے ساتھ گھامڑ کہیں کے۔" میں نے بے ساختہ کہا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ دل لگی کر رہا ہے۔

"خدا کی قسم یہ ڈرامہ نہیں ہے۔ میری عمر اکسٹھ سال ہے اور ابھی میں اتنے ہی سال اور جیوں گا اور اچھی صحت کے ساتھ۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنی قمیص اتار کر جھاڑی۔ پھر اس نے تہمد بھی اتار دیا۔ اس میں بھی خاصی گرد جمع تھی۔ نیچے وہ جانگیہ پہنے ہوئے تھا۔ اب وہ میرے سامنے اپنے پورے گرانڈیل قد سے کھڑا اپنے دونوں کپڑے جھاڑ رہا تھا اور میں حیران تھا کہ اس کا بدن کس طرح اتنا گٹھا ہوا اور متناسب ہے کس طرح اس نے اپنے اعضا کو اتنا توانا اور متناسب کر رکھا ہے۔ اتنی ساری عمر کا ذرا سا بھی تو اثر اس کے جسم پر ظاہر نہیں ہوا تھا۔ اس کا ایک بھی بال سفید نہیں تھا۔

گرد جھاڑ کر اس نے کپڑے دوبارہ پہن لئے۔ اب وہ پہلے سے زیادہ ہشاش بشاش نظر آ رہا تھا۔ وہ جو میری وجہ سے اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا تھا وہ کیفیت اب اس کے وجود سے زائل ہو گئی تھی مگر چہرے پر بڑ کے داغوں نے اسے بہت مکروہ صورت بنا رکھا تھا البتہ باتوں میں وہ بہت تیز تھا بولا ــــ

"یہ کپڑے آپ کے لئے مصیبت بن سکتے ہیں میرے گھر چلیں اور کپڑے تبدیل کر کے ان کو جلا دیں، کھانا وغیرہ کھائیں اور آرام کریں۔ میں انسان ہوں مجھ پر بھروسہ رکھیں آئیں، کیا نام ہے آپ کا؟"

"میرا نام غلام جیلانی ہے اور یہ میرا اصلی نام ہے یہ مت سمجھنا کہ جھوٹ بول رہا ہوں۔"

میں اس سے مانوس ہوتا جا رہا تھا۔ وہ میرے لئے زندگی کی سب سے بڑی حیرت کا مظہر تھا اس جیسا اچھا اور اس جیسا بُرا آدمی میں نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

افق آسمان پر آخیر سرما کی کلفتوں کی ماری مُرغابیوں کی ایک ڈار نمودار ہوئی۔ صادق علی نے وہ ڈار دیکھی تو بولا۔

"آپ کو مرغابی کیوں نہ کھلاؤں آج، لائیں ذرا یہ بندوق دیں مجھے۔"

یہ کہہ کر اس نے یونہی بے تکلفی میں مجھ سے بندوق لے لی۔

"ایسے یہ تو مرغابی کے پرخچے اڑا دے گی یہ گولی۔" مَیں نے اُسے روکتے ہوئے کہا مگر وہ شست باندھ چکا تھا بولا۔

"صرف گردن میں سے گولی گزاروں گا۔"

اور اس کے ساتھ ہی اس نے لبلبی دبا دی۔ ڈار تتر بتر ہو گئی ذرا دیر کے لئے اس کی قطار میں افراتفری مچی اور ایک مرغابی نیچے آ رہی رائفل مجھے دے کر صادق علی تیزی سے مرغابی کی طرف بڑھا اور جب وہ واپس میرے پاس آیا تو میں حیران رہ گیا۔ پرندے کی صرف گردن غائب تھی۔ ایسا بلا کا نشانے باز آدمی تھا وہ صادق علی۔

"لائیں، ایک اور گراتا ہوں، وہ دیکھیں ایک اور ڈار آ رہی ہے۔" اس نے مجھ سے رائفل جھپٹ لی۔ میں نے اسے گولی بھی فراہم کر دی اس نے فوراً ہی بڑے ماہرانہ انداز میں رائفل لوڈ کی اور پھر شست باندھ کر گولی چلا دی۔ ایک اور مرغابی اس نے پھڑکا لی تھی۔ حیرت انگیز آدمی تھا وہ ــــ

"چلیں اب مَیں آپ کے شایانِ شان کھانا تیار کر سکوں گا۔"

سورج ابھی نہیں نکلا تھا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر کمال پور جا پہنچا اس کا گھر گاؤں سے باہر ہی تھا۔ ایک بڑے سے پیپل کے درخت سے ذرا آگے یہ لمبی سی ایک دیوار تھی جس کے عین بیچ میں ایک چھوٹی سی چار فٹ اونچی کھڑکی لگی تھی۔ اس کے سامنے پہنچ کر صادق علی نے دو بار دستک دی تو کچھ ہی دیر بعد وہ کھڑکی کُھل گئی۔ کنڈی کھول کر کوئی تیزی سے پیچھے ہٹ گیا تھا۔ مکان کا بڑا دروازہ دُوسری سمت تھا۔

"آئیے، بے تکلف آ جائیے۔" صادق علی جھک کر اندر داخل ہوا تو میں بھی اس کے پیچھے چلا گیا۔ سامنے یہ بڑا سا صحن تھا۔ کچا صحن جس کے عین وسط میں پختہ اینٹوں کی ایک روش بنی تھی۔ دائیں ہاتھ گھاس کا ایک چھوٹا سا قطعہ تھا جس کے اردگرد پھولوں کی کیاری تھی اور گھاس کے اس قطعے سے ذرا پرے دیوار کے ساتھ اونچے اونچے سَرو کے سات درخت کھڑے تھے اور بڑی بہار دے رہے تھے۔ مجھے وہ جگہ ایک دم بہت پسند آئی۔ بائیں ہاتھ ایک چھوٹا سا باورچی خانہ تھا۔ جس کی چھوٹی سی کھڑکی میں سے ایک چہرہ دمکتے سورج کی طرح چمکتا نظر آتا تھا۔ وہ کوئی نوخیز لڑکی تھی۔ صادق علی کی بیٹی ہو گی یہ۔ میں نے سوچا۔

"لے بھئی ــــ زینو! آج تو عید ہو گئی ہماری، مہمان بھی ہے اور مرغابی بھی بھون دے ذرا اس کو مزیدار کر کے۔"

صادق علی نے اس لڑکی کے قریب جا کر کھڑکی میں سے مُرغابیاں اسے تھما دیں۔ وہ لڑکی عجیب بجھے انداز میں مسکرائی تو مجھے محسوس ہوا۔ جہاں سے زیادہ معصوم اور سادہ طبع لڑکی ہے ایسی لڑکی جو گناہ کے تصور سے بھی ناآشنا ہے۔ وہ اداسی کی دبیز تہہ میں دبی نظر آتی تھی لگتا تھا وہ وہاں خوش نہیں ہے۔

صادق علی مجھے کمرے میں لے گیا اور بولا۔

"پتہ نہیں آپ زندگی کے کس معیار کے عادی ہیں۔ قیدیوں کے لباس میں تو کسی کا پتہ نہیں چلتا آدمی بس یونہی سا نظر آتا ہے آپ پہلے یہ کپڑے اتار دیں۔" یہ کہہ کر اس نے ایک کرسی میرے آگے کر دی اور خود دوسرے کمرے میں جا گھسا۔ پرانے طرز کی کرسی تھی وہ۔ میں اس پر بیٹھا تو پتہ چلا کہ لکڑی کی نشست پر رُوئی کی گدّی رکھی ہے کمرے میں ایک بڑا سا نواڑی پلنگ پڑا تھا جس پر پھولدار چادر بچھی تھی۔ وہ ایک عام سے دیہاتی آدمی کا گھر نظر آتا تھا جس میں آسائش کی کسی جدید شے کا کوئی تصور موجود نہیں تھا۔

کوئی پانچ منٹ بعد صادق علی واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں میرے لئے نیا لباس تھا۔ ایک کُرتہ اور ایک شلوار، دونوں ہی سلیٹی رنگ کے تھے اور میرا خیال ہے کہ وہ خاصے عمدہ لٹھے کے بنے تھے۔

"لیں جناب جیلانی صاحب! یہ پہن لیں بالکل پاک صاف کپڑے ہیں۔ مَیں نے اپنے لئے سلوائے تھے مگر ابھی پہنے بھی نہیں تھے کہ آپ آ گئے۔"

اس کے لہجے کی کھنک مجھے حیران کرتی تھی۔ تعجب خیز امر یہ تھا کہ وہ شیطان بھول ہی گیا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے اسے میں نے بدترین جرم کا ارتکاب کرتے دیکھا تھا۔ وہ میرے سامنے کھڑا یوں مسکرا رہا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ اس کی مسکراہٹ کے پیچھے اس کے صاف شفاف ہموار سے خوبصورت دانت قطعاً یہ نہیں بتاتے تھے کہ وہ اکسٹھ سال کا ہے میں نے اس سے وہ کپڑے لے لئے تو وہ بولا۔

"پہن لیں میرے سامنے ہی پہن لیں، کمبل اپنے گرد لپیٹ کر...... زینو نے اِزار بند ڈال دیا ہے شلوار میں۔"

"یہ زینو کون ہے میاں؟" میں نے کمبل اپنے گرد لپیٹ کر شلوار پہنتے ہوئے کہا ــــ

اس نے ذرا دیر کے لئے اپنی ایک آنکھ میچ لی پھر بڑے بھیدوں بھرے لہجے میں بولا۔

"یہ ...... یہ ایسے یہ میری بیوی ہے بھئی جیلانی صاحب کمال کرتے ہیں آپ بھی۔"

"اتنی جوان اور کم عمر بیوی ہے تمہاری۔" مَیں نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"پھر وہی حیرانی! ایسے اس طرح تو آپ بہت جلد بوڑھے ہو جائیں گے صاحب! پتہ ہے اس کی عمر کتنی ہے؟"

"کتنی ہے؟ تم ہی بتا دو۔"

پلیس دفع کریں۔ عورتوں کی عمر نہ تو پوچھنی چاہیئے اور نہ ہی بتانی چاہیئے۔ ویسے وہ جوان ہے، سورج کی پہلی کرن سے بھی زیادہ جوان اور تازہ دم اور دلکش بھی۔" صادق علی نے نہایت فراخ دلی سے کہا ــــ اس پر خدا کی لعنت ہو۔ وہ قدم قدم پر میرے پاؤں تلے سے زمین نکالتا جا رہا تھا ــــ

میں نے اس کے دیئے ہوئے کپڑے پہن لئے تو وہ بولا "لاؤ اس مصیبت کو میں یہیں جلا دیتا ہوں تمہارے سامنے۔ زینو کو میں نہیں بتانا چاہتا ہوں کہ میرے مہمان کہاں سے آئے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے جیب سے ماچس کی ڈبیہ نکالی اس کے ساتھ ہی سگریٹ کا پیکٹ بھی باہر آ گیا۔ وہ ٹکلے کے سگریٹ تھے۔

میری آنکھوں میں سگریٹ کی اشتہا کو لپکتے دیکھ کر وہ بولا۔

"ارے تو کہئے نا کہ آپ کو سگریٹ کی طلب ہے۔ یہ لیں پیئں.... میں تھوڑی دیر تک آپ کو اچھے سگریٹ لا دوں گا۔ ابھی یہی پی لیں۔" یہ کہہ کر اس نے ایک سگریٹ میرے منہ سے لگا دیا۔ میں نے کش لیا تو بڑی فرحت محسوس ہوئی لگتا تھا زندگی ابھی اس قابل ہے کہ اس کو شوق سے گزارا جائے۔ اس کی شاخوں پر کھلے سارے پھولوں کی خوشبو بدن میں اتاری جائے اور اس کے دکھائے ہوئے سارے خوابوں کی عملی تعبیریں تلاش کی جائیں۔ کبھی کبھی آدمی کتنی چھوٹی چھوٹی بے ثبات سی چیزوں سے بہل جاتا ہے۔

صادق علی نے ایک ٹوٹی ہوئی ہنڈیا میں رکھ کر میرے ان دونوں کپڑوں کو تیلی دکھا دی۔ کمرے میں دھواں بھرنے لگا تو وہ ہنڈیا اٹھا کر فوراً ہی باہر نکل گیا۔ کوئی پندرہ منٹ بعد جب وہ واپس آیا تو بولا "پانی گرم ہو چکا ہے میں ذرا نہا لوں پھر آپ کی خدمت میں بیٹھتا ہوں اتنے میں زینو آپ کو دودھ دے جائے گی۔"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ غسل خانہ کہیں انہی کمروں کے پاس تھا مگر دوسری طرف۔

اسے گئے ہوئے ابھی پانچ چھ منٹ ہی ہوئے تھے کہ ایک چھوٹی سی تام چینی کی گول ٹرے میں رکھ کر زینو میرے لئے جگ میں بھر کر دودھ لے آئی۔ وہ دروازے میں ایک جھپاکے سے داخل ہوئی۔ اس نے گلابی رنگ کی ساٹن کا سوٹ پہن رکھا تھا اور اسی رنگ کا دوپٹہ جو گلے میں جھول رہا تھا۔ اس کی رنگت شہابی سی تھی اور ایک عجیب سا بھورنگ احساس شرمگیں انداز سے اس کے چہرے پر لہراتا نظر آتا تھا۔ زلفیں اس کی گندھی تھیں اور اس کے چہرے پر ایسی سنجیدگی طاری تھی کہ اس کی طرف دیکھا نہ جاتا تھا۔

میرے قریب ہی پلنگ پر ٹرے رکھ کر اس نے جگ میں سے دودھ انڈیل کر گلاس میں بھرا تو ملائی کا یہ بڑا سا گولہ گلاس میں اتر گیا ــــ زینو نے بڑی ہی تمیز سے گلاس اپنی ہتھیلی پر رکھ کر مجھے پیش کیا، بولی۔

"لیں ابھی تو یہ پی لیں۔ آپ کو بھوک لگی ہو گی کھانا بھی تھوڑی دیر تک تیار ہو جائے گا۔" اس کا لب و لہجہ خاصا دیہاتی تھا اور شین قاف سے اکھڑا ہوا۔

گاؤں کے ماحول میں صاف ستھرے مہذب لہجے میں بات کرنے والا شاید ہی کوئی ملتا ہے۔ وہ بھی ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جسے میں دیکھ ہی آیا تھا۔ بہت ہوئے تو اس میں سو گھر ہوں گے اور تھا بھی وہ ایسی جگہ پر کہ بالکل اللہ میاں کے پچھواڑے میں پڑا نظر آتا تھا۔ بڑی سڑک سے ہٹ کر، لاہور ضلع کے مشرقی حصے میں۔ کوٹ لکھپت جیل سے نو دس میل دور۔

میں نے زینو سے گلاس لے کر منہ سے لگا لیا۔ وہ بہت عمدہ دودھ تھا اور بالائی نے اس کی لذت دوبالا کر رکھی تھی۔ زینو میرے اس قدر قریب کھڑی تھی کہ اس کے شعلہ آسا بدن کی بھبک مجھے اپنے وجود پر حاوی ہوتی محسوس ہوئی تھی۔

"یہ دودھ کہاں سے لیتے ہیں آپ؟" میں نے یونہی ایک بے تکی سی بات پوچھی۔

"یہ ہماری اپنی بھینس کا دودھ ہے پسند آیا آپ کو؟" وہ اپنے مخصوص بجھے بجھے انداز سے مسکرائی۔

اب وہ پوری کی پوری میرے سامنے کھڑی تھی اور اس کے بدن کے تمام نشیب و فراز مجھ پر عیاں تھے۔ وہ بہت خوبصورت تھی۔ اتنی خوبصورت کہ میرا خیال ہے ایک دنیا اس کی دیوانی ہو جائے اگر وہ یونہی بغیر برقعے کے سر بازار جا نکلے۔ آنکھیں اس کی ایسی تھیں کہ بولتی سنائی دیتی تھیں۔ یہ بڑی بڑی بادامی رنگ کی پٹ پٹ کھلتی بند ہوتی آنکھیں۔ تب مجھے رشک آیا اس صادق علی پر کہ اس نے گھر میں ایسا چاند بند کر رکھا تھا اور کراہت بھی محسوس ہوئی اس کی گھناؤنی شکل اور عمل پر کہ وہ خود خباثت کی پوٹ بنا ہوا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ زینو نہیں جانتی تھی کہ جس شخص کی وہ بیوی ہے وہ کس قدر قابلِ نفرت آدمی ہے۔

"بہت عمدہ دودھ ہے یہ۔" میں نے اپنی سوچ سے دامن چھڑاتے ہوئے یوں کہا جیسے میں بہت دور سے مڑ کر آیا ہوں۔

"اور پیئیں۔"

"جی نہیں شکریہ! پڑا رہنے دیں صادق علی آتا ہے تو اس کے ساتھ پیوں گا۔"

"آتا ہے؟ آپ بہت بے تکلف ہیں ماسٹر صاحب سے۔" زینو نے عجیب سے انداز سے میری بات پکڑی۔ مجھے یوں محسوس ہو جیسے اسے میرے اس طرزِ تخاطب پر صدمہ پہنچا ہے۔ "لو! اچھا اچھا۔ وہ.... دراصل میری اس سے بڑی بے تکلفی سی ہے برا نہ مانیں میری بات کا۔" میں نے اپنی خجالت کو چھپاتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ میں نے تو ایسے ہی کہہ دیا ہے وہ خود آپ کا نام بڑی عزت سے لیتے ہیں۔" وہ بولی۔

"یونہی مذاق اڑاتا ہے وہ میرا میرے سامنے بھی اور دوسر دلا

کے سامنے بھی مگر آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں؟ یہ بھی کوئی پریشان ہونے کی بات ہے؟" میں نے صادق علی کے دیئے ہوئے پیکٹ میں سے ایک اور سگریٹ سلگا لیا۔ نگاہیں میری یوں جھکی تھیں جیسے میں اس سے بہت شرمندہ ہوں اور فرار کی راہ نہیں پاتا ہوں۔

وہ عجیب سے انداز سے اپنے احمریں ہونٹ سکوڑتی ہوئی باہر نکل گئی صاف ظاہر تھا کہ اسے اپنے شوہر کے سلسلے میں میرے اس لب و لہجے پر سخت صدمہ پہنچا تھا۔

کوئی پانچ منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ زینو پھر ہوا کے تیز جھونکے کی طرح کمرے میں آ گئی۔ اس کے ہاتھوں میں کیپسٹن کے سگریٹ کا پیکٹ تھا۔ "یہ لیں ماسٹر صاحب لائے ہیں کہتے تھے کہ آپ کو اچھے سگریٹ ملنے چاہئیں۔" وہ مسکرا رہی تھی۔

"وہ تو نہانے گئے تھے۔" اب کی بار میں نے صادق علی کا احترام ملحوظ رکھا۔

"نہانے کے لئے وہ اب گئے ہیں پہلے وہ سگریٹ لینے چلے گئے تھے۔ پاس ہی تو ہے دکان۔" یہ کہہ کر اس نے خود پیکٹ میں سے سگریٹ نکال کر مجھے دیا پھر تیلی جلا کر میرے آگے کر دی۔ میں نے سگریٹ سلگایا

"آپ بھی نہانا چاہیں تو میں پانی گرم کر دوں؟"

"ہاں میں بھی نہا لوں تو اچھا ہے۔ کر دیں پانی گرم۔"

وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

کوئی بیس منٹ بعد صادق علی نہا کر واپس آیا تو وہ ایک دم.... تر و تازہ نظر آ رہا تھا۔ میں کسی طرح بھی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اکسٹھ سال کا پرانا کھوسٹ بڈھا ہے۔ وہ تو مجھ سے بھی زیادہ جوان نظر آتا تھا۔

"سگریٹ مل گئے ہیں آپ کو؟"

"ہاں بڑی مہربانی ہے تمہاری صادق علی۔ مگر میرے لئے زیادہ تکلف میں نہ پڑو۔"

"میرے گھر میں ایک عظیم انسان آیا ہے تو میں اس کی اتنی سی بھی خاطر مدارات نہ کروں؟ ناشکرا بن جاؤں۔"

"مجھے کس طرح عظیم سمجھتے ہو تم؟"

"وہ شخص جو خدا کی طرح پردہ پوشی ستار اور عیبوں کو ڈھانپنے والا ہو وہ تو اس دنیا میں مجسم رحمت کہلاتا ہے آپ مجھ سے میری اتنی سی سعادت بھی چھین لینا چاہتے ہیں۔"

"تمہاری شخصیت کے اس دہرے الجھاؤ کو میں شاید کبھی نہ سمجھ سکوں صادق علی۔ خدا کرے اب تک تمہارے بارے میں مجھے جو کچھ معلوم ہوا ہے غلط ہو یا غلط ہو جائے۔"

"دفع کریں۔ لعنت بھیجیں وہ کیا کہا ہے کسی شاعر نے ـــ

چھوڑو بھی اب مان بھی جاؤ جانے بھی دو پچھلی باتیں
کب کب ایسے دن آتے ہیں کب کب ایسی راتیں"

یہ کہہ کر وہ بلند آواز سے بولا۔

"بھئی وہ پرندے بھن گئے کہ نہیں؟"

"بھون رہی ہوں یہ بدبخت مرغابیاں ڈھیٹ ہوتی ہیں ذرا۔" زینو نے دور سے جواب دیا۔ اس کی آواز میں خاصی بیزاری تھی۔

"ہم خود بہت ڈھیٹ ہیں کیوں جیلانی صاحب! آپ جیل سے بھاگے اور بھول گئے اور میں وہاں سے آیا جہاں سے کوئی نہیں آتا اور بھول گیا۔"

"مجھے تم پر حیرت ہے صادق علی۔ جتنی دیر میں یہاں بیٹھوں گا مجھے کوفت ہوتی رہے گی۔" میں نے جھلا کر کہا۔ اس آدمی سے بات کرنا مجھے دوبھر ہو رہا تھا۔ ایسا ملعون شخص تھا وہ کہ اس کے جرم کا تصور ہی میرے رونگٹے کھڑے کر دیتا تھا اور وہ تھا کہ بڑی رعنائی و توانائی سے سکرا رہا تھا۔

"تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیئے آپ کے خیالِ اقدس میں؟" صادق علی نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔ وہ میرے سامنے پلنگ پر بیٹھ گیا تھا اور.... سگریٹ سلگانے لگا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نفرت سی سلگ اٹھی تھی۔

"میرا خیال ہے مجھے ابھی یہاں سے چلے جانا چاہیئے۔ یہ کم سے کم سزا ہے جو میں تمہیں دے سکتا ہوں بشرطیکہ اسے تم محسوس کر و۔"

"جیلانی صاحب! اب اگر ساری دنیا بھی یک زبان ہو کر مجھ پر یہ الزام عائد کرے تو ثابت نہیں ہو سکے گا کیونکہ میں اپنے جرم کے تمام نشان مٹا آیا ہوں ـــ ہاں آپ کے ذہن سے وہ نقوش نہ مٹ سکیں تو اس مشکل کا حل میرے پاس نہیں ہے.... ماسوائے اس کے کہ میں آپ سے معافی مانگ لوں، سو وہ میں کر کے دیکھ چکا ہوں۔" اس کی آواز بہت دھیمی تھی اتنی دھیمی کہ میں بھی مشکل سے سن رہا تھا۔ وہ زینو سے ہماری گفتگو کے اس پہلو کو مخفی رکھنا چاہتا تھا مگر اس کے لہجے میں چٹان ایسی سختی تھی۔

تب اچانک مجھے محسوس ہوا کہ اس آدمی سے مجھے بگاڑ نہیں پیدا کرنا چاہیئے۔ میرا تو اس بھری دنیا میں کوئی بھی دوست نہیں اور جو ہیں وہ اس برے دور میں کسی قیمت پر بھی میرا ساتھ نہ دیں گے ـــ یہ خیال میرے ذہن میں ابھرا تو میں مسکرا دیا۔

"میں سمجھتا ہوں صادق علی۔ آدمی آدمی انتر۔ کوئی ہیرا کوئی کنکر۔ ٹھیک ہے تم اپنی خو نہ چھوڑو تو ہم اپنی وضع کیوں بدلیں۔ لے آؤ کھانا بھوک چمک رہی ہے اب۔"

وہ خوش ہو گیا بولا۔

"یہ ہے خداوندوں ایسی بات اور یہی ہمارا پروردگار چاہتا ہے کہ ہم اس کی صفات کو اپنا لیں۔"

"تمہاری یہ وضاحت سراسر زیادتی اور جہالت پر مبنی ہے.... صادق علی۔ خدا تم ایسے لوگوں پر ہزار لعنت بھیجتا ہے۔" میں نے اسے ٹوکا مگر دھیمی آواز میں۔ وہ مسکرایا پھر ہنسا پھر کھلکھلا کر قہقہہ لگاتے ہوئے بولا

"آپ کی پختہ باتیں آپ کے پختہ شعور کی گواہی دیتی ہیں۔ مجھے یقین ہے میرا سابقہ کسی نابالغ سے نہیں پڑا۔ اور یہ بڑے شکر کا مقام ہے۔"

پھر اس کا قہقہہ ایک دم اس کے برص زدہ چہرے سے اتر گیا اس پر اس گھڑی بڑی عجیب کیفیت طاری تھی۔ کبھی تو وہ مجھے خوف زدہ کر دیتا تھا کیونکہ میری گردن اس کے ہاتھ میں تھی اور جیل وہاں سے زیادہ دُور نہیں تھی اور کبھی وہ مجھے خوش کر دیتا تھا، اپنی باتوں سے مجھے پُرامید بنا دیتا تھا اور یہ احساس دلاتا تھا کہ وہ میرا دوست ہے۔

اور پھر وہ مجھے بتائے بغیر چپ چاپ گھر سے باہر نکل گیا مجھے اس وقت بے حد حیرت ہوئی جب کوئی آدھا گھنٹہ گزر جانے کے بعد زینو نے بتایا کہ وہ تو سکول چلا گیا ہے دھمیال کی طرف۔

"کھانا کھائے بغیر ---"

"اس کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔ وہ ٹکے سے من جاتا ہے اور لاکھ پہ روٹھ جاتا ہے۔" زینو میرے قریب ہی پلنگ پر بیٹھ گئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ اپنی تنہائی سے خوف زدہ ہے اور بات کرنے کو ترستی رہی ہے۔

"یہ کیا بات ہوئی؟ وہ ساٹھ اکسٹھ سال کا بوڑھا اتنا سنکی کیوں ہے؟"

"کیا کہا آپ نے؟ ساٹھ اکسٹھ سال کا بوڑھا، یہ کس نے بتایا ہے آپ کو؟"

"اس نے خود کہا تھا مجھ سے کہ اس کی عمر اتنی ہو چکی ہے۔"

"اچھا! مگر مجھے نہیں معلوم تھا۔"

"یہی تو میں نے پوچھا تھا اس سے کہ جب وہ خود اتنا بوڑھا ہے تو اس نے اتنی کم عمر لڑکی سے کیسے شادی کر لی؟"

"کیا مطلب؟"

"کتنی عمر ہو گی آپ کی؟"

"مگر میں اس کی بیوی نہیں ہوں۔"

"کیا؟ کیا کہتی ہو تم! وہ تو مجھے یہی بتا رہا تھا۔ میں تو خود حیران تھا اس کے اس انکشاف پر۔"

"جی ہاں، میں اس کی بیوی نہیں ہوں۔"

"پھر کیا ہو تم اس کی؟"

"کچھ بھی نہیں! مجھے تو ایک اور آدمی نے اس کے پاس یہاں چھوڑ رکھا ہے۔"

"وہ آدمی کون ہے؟"

"ہے ایک آدمی۔ وہ چھوڑ گیا تھا مجھے یہاں --- وہ .... وہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔ بیٹی کی طرح چاہتا ہے وہ مجھے اس لئے۔"

زینو نے نہایت ہی سادگی سے یہ بات کہہ دی۔

"مگر اس سے تیرا کیا تعلق ہے بھئی؟ یہ قصہ کیا ہے آخر؟"

میں نے ایک اور سگریٹ سلگا لیا۔

"ٹھہریں میں کھانا لے آؤں پہلے آپ کو بھوک لگی ہو گی۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے اٹھی اور دوسری طرف نکل گئی مگر مجھے وہ ایسی حیرت دے گئی جس میں میں تادیر ڈوبا رہا۔ جب وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں بڑا سا تاش تھا جس میں اس نے کھانا لگا رکھا تھا۔ تاش لا کر اس نے میرے سامنے تپائی پر رکھا پھر ایک پیالے میں شوربا ڈال کر اس نے میرے آگے رکھا اور بولی۔

"کھائیں میں بھی آپ کے ساتھ کھاتی ہوں کیونکہ ماسٹر صاحب تو اب شام کو ہی واپس آئیں گے۔"

"بڑی اچھی بات ہے۔ ادھر کھینچ لو وہ دوسری کرسی۔" میں نے روٹیاں سیدھی کرتے ہوئے کہا۔ میری بھوک اس مرغابی کو دیکھ کر چمک اٹھی تھی۔ صادق علی نے اچھا انتظام کیا تھا۔ ہم دونوں کھانا کھا چکے تو وہ بڑے اطمینان سے کھیس کی بکل مار کر میرے سامنے پلنگ پر بیٹھ گئی۔

"ہاں، تو تم نے بتایا نہیں کہ یہ آدمی تیرا ہمدرد کیسے بنا؟" میں نے اس کے حالات میں دلچسپی لیتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"یہاں آنے سے پہلے میں حوالات میں تھی۔"

"کیا کہا؟ حوالات میں۔ وہاں کیوں تھیں تم؟"

وہ مجھے رہ رہ کر جھٹکے دے رہی تھی۔

"میں نے دراصل تین آدمی قتل کر دیئے تھے ایک میرا دوست تھا اور دو اس کے دوست تھے یعنی میرے دوست کے دوست۔"

"یہ کب کی بات ہے؟" میں نے اب تہیہ کر لیا تھا کہ زیادہ حیرت کا اظہار نہیں کروں گا۔

"میں دراصل سلیم پور کی رہنے والی ہوں شیخوپورہ کے قریب ہے یہ گاؤں۔ وہاں میری دوستی ہو گئی تھی وگن سے۔ وہ سلیم پور کے زمیندار کا بیٹا تھا --- مگر وہ میری دوستی کی قدر نہیں کرتا تھا۔" زینو کھلنے لگی۔ وہ مجھ پر اعتماد کر رہی تھی۔

"اچھا پھر؟"

"دراصل وہ دگن بڑا بدمعاش آدمی تھا، عورتوں کو عیاشی کے لئے پھانستا تھا، مجھے بھی اس نے اسی طرح اپنے چکر میں ڈال لیا۔ بڑے پیسے خرچ کر دیئے اس نے مجھ پر۔ مجھے دس بارہ سوٹ سلوا دیئے اس نے، ڈھیر سارے زیور بھی بنوا دیئے۔ میرا باپ گاؤں کا مصلی ہے میرے لئے چوہدری دگن کی دوستی بڑے فخر کی بات تھی۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا وہ مجھ سے شادی کرے گا۔ اسی لئے میں.... میں نے اس کی کوئی بات ٹالی اور.... اور اپنا سب کچھ اس کے حوالے کر دیا مگر وہ بہت کھوٹا نکلا۔ تین مہینوں تک تو اس نے اچھی طرح مجھے خراب کیا۔ جب وہ سمجھا کہ اپنے پیسے پورے کر لئے ہیں تو ایک رات اس نے مجھے بڑی محبت سے اپنی رہنے والی حویلی میں بلایا۔ وہ سلیم پور سے کوئی تین میل دُور ہے۔ دگن

زمینوں پر۔ وہاں انہوں نے ٹیوب ویل لگا رکھا ہے --- میں جا پہنچی وہاں مجھے کیا ڈر تھا کسی کا۔ اس کے لئے تو میں آگ میں بھی کود سکتی تھی۔

مگر جب میں وہاں پہنچی تو میں نے دیکھا کہ اس کی بیٹھک میں چار جوان بیٹھے ہیں میرے دل میں کوئی وہم نہ تھا۔ سو میں بے دھڑک ان کے کمرے میں جا بیٹھی مگر دگن سے جب میں نے بات کی تو معلوم ہوا کہ وہ نشے میں ہے۔

تب مجھے معلوم ہوا کہ دگن نے میرے ساتھ کتنا بڑا دھوکہ کیا ہے۔ نذرو نے بھی پی رکھی تھی۔ وہ بہک چکا تھا۔ بلند آواز سے منہ اونچا کر کے بولا۔

کیلے دیاں پھلیاں نیں
عشق مُلّنی دا
مِصری دیاں ڈلیاں نیں!

اس نے کان پر ہاتھ رکھ کر نشے میں چُور آواز میں یہ بول گائے اچانک وگن میرے قریب آیا اور میرے کان کے قریب منہ کر کے بولا۔

"یہ سب میرے یار ہیں زینوان کو بھی خوش کر دے
گھل مل جا اِن سے۔"

تب میں نے اپنی زندگی کا آخری فیصلہ کیا.....

جیلانی صاحب آخری اور سب سے خوفناک فیصلہ۔ میں نے دگن کا پستول کھینچ لیا۔ مجھے معلوم تھا وہ اسے ہمیشہ بھر کر رکھتا ہے۔ کئی بار وہ مجھے جھیل کے گرد پھیلے جھنڈ میں، روہی میں، اُدھر چھپ کی تنہائی میں اس پستول پر اپنا ہاتھ کھولنے کا موقع دے چکا تھا اور مجھے اس میں خاصی مہارت بھی ہو گئی تھی۔ میں نے پستول ہاتھ میں لیا اور پہلی گولی دگن کے سینے میں اتار دی۔ وہ ذبح ہوتے بھینسے کی طرح چیخا اور الٹ کر دلیا رہ کے پاس جا گرا۔

پیشتر اس کے کہ مونگلی سمجھ سکتا میں نے دوسری گولی اس کی پسلی میں اتار دی۔ کمرے میں ایک اور خوفناک چیخ ابھری اور میں نے بجلی کی سی تیزی سے پلنگ سے اٹھ کر نذرو پر گولی چلا دی مگر وہ پہلو بچا گیا اور دروازہ کھول کر باہر بھاگ گیا۔ ان کا چوتھا دوست کبریا اب میرے سامنے تھا۔ میں نے اس پر بھی فائر کر دیا۔

اتنے میں مونگلی اُچھل کر مجھ پر گرا مگر وہ مجھے بے بس نہ کر سکا۔ میں نے دو گولیاں یکے بعد دیگرے اس پر چلا دیں اور اس کا قصہ پاک ہو گیا۔

میں نے پاگلوں کی طرح جلدی جلدی کپڑے پہنے اور صورتحال پر غور کرنے لگی۔ جب میں نے تین لاشیں اپنے سامنے پڑی دیکھیں اور فرش بستر پر اِدھر اُدھر خون ہی خون مجھے بکھرا نظر آیا تو میں پستول سمیت کمرے سے نکل بھاگی۔ چاروں طرف گھُپ اندھیرا طاری تھا مگر مجھے کسی شئے سے کوئی خوف محسوس نہ ہوتا تھا۔ میں ایسی سیکڑوں اندھیری راتیں وگن کے ساتھ جنگل میں گزار چکی تھی۔ میں تیز تیز چلتی اپنے گھر جا پہنچی۔

ماں میری کو قطعاً کوئی خبر نہ ہوئی۔ وہ افیون کھاتی ہے اور رات کو گھوڑے بیچ کر سوتی ہے میں نے دل میں دھار رکھی ہے کہ اگرچہ نذرو بچ گیا تھا مگر میں اس کی ایک نہ چلنے دوں گی۔ میں ماں کو پتہ نہ دوں گی کہ میں دگن کے پاس گئی تھی --- پستول جس سے میں نے انہیں مارا تھا میں گاؤں کی مسجد کے کنوئیں میں پھینک آئی تھی۔ بستر پہ لیٹتے ہی میں لحاف میں منہ دے کر سو گئی۔

صبح جب میں سو کر اٹھی تو اپنے اِرد گرد کی ہر شے مجھے سرخ نظر آئی۔ تین آدمیوں کا خون میری گردن پہ تھا اور میں عورت ذات! جس نے ابھی زندگی کا کوئی بھی سُکھ نہیں دیکھا تھا۔ جیلانی بھائی! پڑھو کلمہ خدا کو حاضر ناظر جان کر کہو کہ جو کچھ میں نے کیا ٹھیک کیا تھا کہ غلط؟ پڑھو کلمہ۔"

وہ اچانک گلوگیر ہو گئی۔ ماضی کی یادوں کے زخم ابھی ہرے تھے اس کے سینے میں اور اس نے خود ہی ناخن مار کر ان پر سے کھرنڈ اتار دیا تھا۔

"تم ٹھیک کہتی ہو زینو ایسے ذلیل آدمی کا یہی حشر ہونا چاہئے اس نے تو تمہیں بیچ ڈالا تھا۔" میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں میں یہ بڑے بڑے آنسو ابھر آئے تھے۔

"مجھے دگن کی موت کا بہت افسوس ہے بھائی جی! میں اس کے چہرے پر کھنڈی زردی کو آج تک نہیں بھول سکی ہوں۔ میں نے جی جان سے محبت کی تھی اس سے مگر مجھے اس نے اس رات ذلیل کر دیا۔ میں اسے کس طرح معاف کر سکتی تھی؟"

"تم بڑی بہادر عورت ہو زینو! بڑی اچھی مثال قائم کی ہے تم نے۔ پھر کوئی عاشق اپنی معشوق کی دلالی نہیں کرے گا۔" میں نے نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ مجھے اس سے ہمدردی ہو گئی تھی اور اس کی صورت میں مجھے آسیہ کی صورت نظر آنے لگی تھی۔ میرے دل میں ہلکی ہلکی ٹیس اٹھنے لگی تھی۔ زینو کو کیا خبر تھی کہ میرے دل میں کس کے نیزے کی انی کتنی گہری دھنس چکی ہے۔ زینو تو اپنی عصمت کا گوہر بچا لائی تھی، مگر میری وہ سارے جہان سے زیادہ معصوم بہن آسیہ خدا ہی جانتا تھا کہ اس پہ سوات خان نے کیسے کیسے ظلم توڑے ہوں گے؟ مجھے اس سے جدا ہوئے پندرہ ماہ گزر چکے تھے --- اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے اجڑے گھر کا وہ پھول کس آنگن کی موری میں ڈال دیا گیا ہے کس بستر پر مسل دیا گیا ہے اور کس ہوا میں اس کی پتیاں ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئی ہیں؟

زینو رونے لگی تھی۔ اپنے آنسو دوپٹے میں جذب کرتے ہوئے وہ بولی۔

"وہ تو میرے سامنے ہی مر گیا تھا میری گولی اس کے دل میں کھُب گئی تھی۔ اتنا سوہنا جوان تھا وہ جیلانی بھائی! کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ جب وہ اکڑ کر چلتا تھا تو معلوم ہوتا تھا کوئی بادشاہ آ رہا ہے۔"

"لعنت بھیجو اس کی یادوں پر زینو! پاگل کتا کتنا ہی خوبصورت کیوں نہ ہو گولی کے لائق ہوتا ہے، بھول جاؤ اسے۔" میں نے اپنی آنکھوں کی نمی کو پلکوں میں دباتے ہوئے کہا۔ مگر وہ میرے چہرے کی کیفیت دیکھ چکی تھی، سمجھ گئی کہ میں پہلو میں بڑا دردمند دل رکھتا ہوں، بولی ———

"جیلانی بھائی! پھر پتہ ہے کیا ہوا۔ اسی شام پولیس نے مجھے میرے گھر سے پکڑ لیا۔ سارا گاؤں میرے ہاتھوں میں ٹوٹی چوڑیاں اور جڑی ہتھکڑیاں دیکھنے کے لئے دوڑا چلا آیا۔ اب تو میں شلوار پہنتی ہوں مگر ان دنوں میں "لاچا" باندھتی تھی۔ سیاہ رنگ کا ریشمی لاچا۔ وہ مجھے بہت سجتا تھا اور جب وہ لوگ مجھے پیدل تھانے کی طرف لے چلے تو جو چیز مجھ کو سب سے زیادہ پریشان کرتی تھی وہ میرا لاچا ہی تھا۔

میری ماں میرے ساتھ تھی۔ میرا چاچا شہامت ہمارے ساتھ نہیں آیا۔ یہ بڑی بڑی گالیاں دیں اس نے مجھے اور میری ماں کو۔ بولا "تم دونوں بدمعاش ہو کنجریاں ہو، چوہدریوں کا مال کھاتی رہی ہو اب خود ہی بھگتو، میرا کوئی واسطہ نہیں ہے تم سے۔ میں اپنے باپ کو چاچا کہہ کر پکارا کرتی تھی۔ مگر اب تو وہ رشتہ بھی میرا اس سے باقی نہیں رہا سب کچھ بدل گیا ہے۔"

"کیا تمہارا باپ اب زندہ نہیں ہے؟"

"زندہ ہے مگر مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ ..... وہ میرا باپ نہیں ہے۔"

"یہ کیسے پتہ چلا ہے تمہیں؟"

"میں اگر اس رات حوالات نہ پہنچتی تو شاید کبھی بھی نہ جان سکتی کہ میرا باپ شہامت نہیں ہے بلکہ میں کسی اور کی بیٹی ہوں۔"

"اچھا! کمال ہے، ذرا تفصیل سے بتاؤ کہ قصہ کیا ہے۔ تم نے تو حیران کر دیا ہے مجھے۔" میں نے سنبھل کر کہا۔

"سارا راستہ وہ چار سپاہی مسلسل مجھے گھورتے رہے، ہوا میں اڑتے میرے لاچے سے ان کی نگاہیں کھیلتی رہیں۔ ماں نے ساری راہ مجھے سنبھالے رکھا مگر میں کر بھی کیا سکتی تھی۔ میں تو ان کی قیدی بنی تھی۔ جب ان لوگوں نے لے جا کر مجھے حوالات میں بند کر دیا تو میری ماں باہر سلاخوں کے قریب ہی بیٹھ گئی اس کی آنکھیں لہو روتی تھیں مگر منہ سے وہ کچھ نہ کہتی تھی۔

میرا خیال ہے کہ رات کے دس بجے ہوں گے کہ اچانک بڑا تھانیدار سکوٹر پر شوں شوں کرتا تھانے کے احاطے میں داخل ہوا۔ وہ کوئی ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ جب سکوٹر گھما کر وہ آگے لے گیا تو میری ماں ایکدم اس کی طرف یوں دوڑی جیسے اس نے کوئی بھیانک خواب دیکھا ہو۔

حوالات کی اس ٹھنڈی یخ کوٹھڑی میں میں بالکل تنہا تھی۔ مردانہ حوالات کہیں دوسری طرف تھی۔ میری ماں تھانیدار کے پیچھے دوڑی تو میں ایک دم ڈول گئی۔ بے تحاشا رونے لگی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں تمام سہاروں سے محروم ہو گئی ہوں۔ اس وقت تک میں نے بہت ضبط کیا تھا مگر جب ان سلاخوں کے اس طرف بیٹھی میری ماں مجھے نظر نہ آئی تو میں اندر سے بالکل ہی ٹوٹ گئی۔ پہرے پر کھڑا سپاہی حیرت زدہ رہ گیا۔ میں بلند آواز سے رونے لگی تھی۔ میرا جی چاہتا تھا میں ان سلاخوں سے ٹکریں مار مار کر اپنا سر پھوڑ لوں۔ زندگی نے مجھے دکھوں کے بیلنے میں ڈال دیا تھا اور میں تیزی سے اس کے دندانوں کی طرف دھکیلی جا رہی تھی۔ پہرے دار میرے قریب نہیں آیا، دور سے تسلیاں دیتا رہا۔

کوئی پندرہ منٹ بعد میں نے دیکھا کہ وہ تھانیدار میری ماں کے ساتھ لمبے لمبے ڈگ بھرتا میری طرف آ رہا تھا۔ اور ..... اور جیلانی بھائی میں اسے دیکھتی رہ گئی۔ جانتے ہو میری حیرت کی کیا وجہ تھی؟ وہ تھانیدار جس کا نام وارث علی تھا شکل و صورت سے ہو بہو مجھ سے ملتا جلتا تھا ہاں مجھے یوں لگا جیسے میری تصویر میرے سامنے ہے اگر وہ مونچھیں اس کے چہرے پر نہ ہوتیں اور وہ عورت ہوتا تو میرے اور اس کے درمیان ذرہ بھر فرق نہ ہوتا۔ میں تو حیران رہ گئی۔ وہ میرے سامنے آ کر سلاخوں کو پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ لگتا تھا اس کی آنکھیں پتھرا گئی ہیں۔ ہنی یہ بڑی بڑی آنکھیں بالکل میری آنکھوں ایسی، اس نے میرے چہرے پر گاڑ دیں اور پھر میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسوؤں کے قطرے گرنے لگے۔ اس کے ضبط کے سارے بند ٹوٹ گئے اور وہ سسک سسک کر رونے لگا۔

میری حیرت اتنی بے پناہ تھی جیلانی صاحب! کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ میں اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ بڑھا کر میرے رخسار تھپتھپائے یوں جیسے کوئی اپنی ننھی منی بچی کو دلاسا دیتا ہے۔

اچانک پہرے دار کی کھانسی کی آواز احاطے میں گونج گئی۔ وہ بس یہی کوئی چھ قدم دور کھڑا تھا۔ تھانیدار فوراً سنبھل گیا بڑی دھیمی آواز میں بولا۔

"فکر نہ کر آرسی! میں کوئی نہ کوئی بندوبست ضرور کر لوں گا۔"

آرسی میری ماں کا نام ہے۔

ماں نے ڈبڈبائی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ ان نظروں کی تاب نہ لا کر اسی لمحے واپس چلا گیا۔

ماں اسے دور تک اور دیر تک وہاں کھڑی دیکھتی رہی جب وہ عمارت کے درمیانی حصے میں برآمدہ عبور کر کے نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تو ماں میری طرف متوجہ ہوئی بولی۔

"اس کا نام وارث علی ہے سب سے بڑا تھانیدار ہے یہاں کا۔"

"تم اسے کیسے جانتی ہو ماں؟" میں ماں کے پاس ہی سلاخوں کے ساتھ لگ کر فرش پر بیٹھ گئی۔

میری ماں کا رنگ اڑ رہا تھا ——— وہ مجھ سے نظریں نہیں ملا رہی تھی پہرے دار ہم سے خاصا دور تھا..... اتنی دور کہ ہماری باتیں

سن نہ سکتا تھا۔

"یہ کون ہے ماں؟ تم اسے کب سے جانتی ہو؟"

"میں اسے ستائیس سال سے جانتی ہوں، زینو! مگر آج میں نے اسے پچیس سال بعد دیکھا ہے پورے پچیس سال بعد۔" ماں اپنے ذہن کے تاریک گوشوں سے وقت کا جالا اتار رہی تھی۔

"اتنے عرصے بعد بھی تمہیں یاد رہا کہ اس کا نام وارث علی ہے؟" میں نے پوچھا۔ ماں میری میرے سامنے بہت خجل ہو رہی تھی۔ بہت پریشان تھی وہ، اس پر عجیب سا سکتہ طاری تھا۔ میں نے اسے سلاخوں کے اندر سے ہاتھ باہر نکال کر جھنجوڑا "بتاتی کیوں نہیں ہو ماں، کون ہے یہ؟"

ماں کی آنکھیں بہہ نکلیں۔

"تم شاید مجھے کبھی معاف نہ کر سکو گی بیٹی مگر میں تمہاری گناہ گار ہوں۔ یہی وہ تھانہ ہے جہاں یہ وارث علی آج سے چھبیس سال پہلے سپاہی بن کر آیا تھا۔ یہ اکثر کسی نہ کسی کام سے ہمارے گاؤں جاتا تھا۔ وہیں پر میری اس سے ملاقات ہوئی تھی بہت دنوں تک یہ میرے پیچھے پاگل بنا رہا۔ بہت ٹالا میں نے اسے مگر یہ اپنی ہٹ کا اتنا پکا تھا کہ کسی طرح بھی میرا خیال نہ چھوڑتا تھا۔ کوئی سال بھر اسی چکر میں گزر گیا۔ پھر یوں ہوا کہ ایک دن تیرا باپ شہامت چوری کے ایک مقدمے میں پھنس گیا مجھے معلوم ہے کہ اس میں شہامت قصوروار تھا۔ ڈنگروں کی اس چوری میں وہ بھی شریک تھا۔ وارث علی نے اسے بھی لے جا کر حوالات میں بند کر دیا۔ مکڑ وال کا چوہدری خورشید اس چوری میں مدعی تھا۔ اس نے ان کی ضمانتیں بھی نہ ہونے دیں۔ شہامت حوالات میں تھا کہ یہ وارث علی ایک رات میرے پاس آ گیا۔ میں گھر میں اکیلی تھی اس رات۔ اور مجھے یہ لالچ تھا کہ کسی نہ کسی طرح شہامت حوالات سے رہا ہو جائے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ رات وارث علی نے میرے گھر میں گزار لی اور..... اور..... تو اسی رات کی نشانی ہے۔ زینو میری بیٹی تو شہامت کی نہیں اسی وارث کی بیٹی ہے۔ وارث اپنی بات کا دھنی نکلا اس نے تیسرے ہی دن شہامت کو اس مقدمے سے نکلوا دیا۔

آج میں نے اس کو پورے پچیس سال بعد دیکھا ہے زینو! میں نے اسے بتا دیا ہے کہ اس کی بیٹی ادھر حوالات میں بند ہے اور اس پر تین آدمیوں کے قتل کا الزام ہے۔ وہ مجھے دیکھ کر کانپ اٹھا بولا آہستہ بات کر آرسی میں اس تھانے کا انچارج ہوں۔ میری عزت کو بٹہ نہ لگا۔" یہ کہہ کر میری ماں عجیب شکست خوردہ انداز میں مسکرائی۔ وہ ایسا انداز تھا جس سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ میری ماں ہارنے کے باوجود اس روز اپنی جیت کو یقینی سمجھ رہی تھی۔

"ماں! کتنی عجیب بات ہے میری اور اس کی شکل کتنی ملتی جلتی ہے؟"

"ہاں زینو جب تو پیدا ہوئی تو یہ تجھے دیکھنے آیا تھا۔ میں اسے کس طرح بھول سکتی ہوں۔ شہامت کو اس نے اپنا یار بنا لیا تھا مگر وہ بے وقوف آدمی بھلا کیا سمجھ سکتا تھا۔ وارث نے تیرے لئے خوبصورت سے چار جوڑے دیئے تو میں تو خوش ہو گئی۔ اس کی ساری زیادتی کو بھول ہی گئی۔ شہامت بھی بہت خوش تھا، وہ بدھو آدمی۔

مگر یہ چیزیں مجھے دینے کے بعد وارث علی دوبارہ میرے گاؤں نہیں آیا۔ اس نے اگلے ہی ہفتے وہاں سے اپنا تبادلہ کروا لیا اور اب تک پتہ نہیں کہاں کہاں پھرتا رہا ہے مگر یہ تقدیر کا چکر ہے بیٹی! آج وارث کو اپنی اس غلطی کی قیمت ادا کرنی پڑے گی ورنہ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی بیٹی کو پھانسی چڑھتے دیکھنا ہو گا۔ وہ تمہیں بچا بھی سکتا ہے اور مروا بھی سکتا ہے۔" میری ماں مجھ سے سرگوشی کر رہی تھی۔ رہ رہ کر اس کی نظر پہرے دار پر پڑتی تھی جو دور کھڑا سگریٹ پھونک رہا تھا ——— ماں کو اس رات نہ سردی کا احساس تھا نہ بھوک کا۔ اس کا بس نہ چلتا تھا ورنہ وہ ساری دنیا کو تہہ و بالا کر دیتی اور مجھے چھڑا لیتی اس سنگین کوٹھڑی سے۔ جہاں اتنی بدبو تھی کہ کلیجہ منہ کو آتا تھا۔ قیدیوں کو حکم تھا کہ وہ اپنی گندگی وہیں پھینکیں۔ یہ سب سے زیادہ تکلیف دہ بات تھی جسے میں آج تک نہیں بھول سکی ہوں۔"

"ارے بھئی یہ تو تم نے بتایا ہی نہیں کہ تم وہاں سے نکلیں کیسے؟ تھانیدار کو یہ اختیار کہاں حاصل تھا کہ وہ تمہیں چھوڑ دیتا۔" میں نے حیرت کے سیلاب کو روکتے ہوئے کہا۔ اس لڑکی نے مجھے پاگل کر دیا تھا۔

"یہ بات میرے لئے بھی حیرانی کا باعث ہے جیلانی بھائی! میں اس حوالات میں تین دن بند رہی، چوتھے دن مجھے عدالت میں پیش کرنے کے لئے دو سپاہی تانگے میں بٹھا کر شیخوپورہ کی طرف لے چلے ——— ہمیں چودہ میل کا فاصلہ تانگے میں طے کرنا تھا۔ سڑک کچی اور ویران تھی اور تانگے کا گھوڑا بھی یونہی سا تھا مریل مریل ہڈیوں کی موٹھ۔

اس وقت صبح کے چھ بج رہے تھے، سورج کی ٹکیہ ابھی نہیں نکلی تھی ——— دسمبر کے یخ ٹھنڈے دن تھے میری ماں میرے ساتھ ہی بیٹھی تھی۔ ہم دونوں کو انہوں نے کمبل اوڑھا رکھے تھے۔ سپاہی تانگے کی اگلی سیٹوں پر بیٹھے تھے۔ آپ کو یقین نہیں آئے گا جیلانی بھائی! مجھے یوں لگتا تھا جیسے وہ لوگ مجھے دفن کرنے جا رہے ہیں کسی قبرستان میں۔ عدالت اور جیل کے چکر کا تصور میرے لئے ناقابل برداشت تھا۔ میں دعا مانگتی جاتی تھی کہ اللہ ان ذلتوں سے مجھے بچا لے اگر موت اس سے سستی ہے تو وہ مجھے دے دے۔ اس زندگی کی روشنی سے قبر کا اندھیرا میرے لئے بہتر ہو گا۔

اور جیلانی بھائی! اس دن مجھے معلوم ہوا کہ اگر کوئی آدمی خدا سے اپنے دل کی گہرائیوں سے کوئی دعا مانگے تو وہ ضرور قبول ہو جاتی ہے۔ ہم اس وقت سڑک کے اس حصے پر سے گزر رہے تھے جس کے دونوں طرف گنے کی قلعے ایسی اونچی دیواروں ایسے اونچے کھیت تھے۔ سڑک کے دونوں طرف شیشم کے درخت اگے تھے، کہیں کہیں آم کے درخت بھی تھے ———

چاہک ڈز کی آواز گونجی اور تانگے کا گھوڑا تڑپ کر نیچے گر گیا۔ تانگہ یوں الٹا کہ سپاہی دائیں بائیں لڑھک گئے۔ میری ماں آگے کی طرف کھنچ گئیں۔ میری ہتھکڑی کی زنجیر ایک سپاہی کی پیٹی سے بندھی تھی جھٹکا جو لگا تو وہ پیٹی کھل گئی۔ اور میں نیچے گرنے سے بچ گئی۔ مگر حالت یہ تھی کہ تانگہ اپنے بموں کے بل آگے جھکا ہوا تھا اور میں اپنی ماں سمیت زمین سے کافی اوپر اٹھ گئی تھی۔

سپاہیوں نے فوراً ہی اپنی بندوقیں سنبھالیں اور وہ تانگے کے دائیں بائیں پہیوں کی اوٹ میں بیٹھ کر اپنے دشمن کو تلاش کرنے لگے۔ جو سامنے کے درختوں میں چھپا بیٹھا تھا۔ ابھی وہ سنبھل نہ سکے تھے کہ ایک گولی دائیں طرف بیٹھے سپاہی کی ران میں لگی وہ پاگل کتے کی طرح چیخا مگر بندوق پر اس کی گرفت ابھی مضبوط تھی۔

"ہتھیار پھینک دو، ورنہ میں تم دونوں کو گولی مار دوں گا۔"

وہ بڑی خوفناک آواز تھی۔ دونوں سپاہیوں نے بے بس ہو کر اپنی بندوقیں پھینک دیں۔

کوچوان گنے کے کھیت میں جا گھسا تھا۔

"ان دونوں عورتوں کو نیچے اتار کر آگے آنے دو ۔۔۔" آواز پھر گونجی۔

ایک سپاہی نے اس حکم کی تعمیل کرتے ہوئے تانگے کے پچھلے حصے کو دبا کر ہمیں نیچے اتارا۔

"اپنی بندوقیں ان کو دے دو اور انہیں آگے آنے دو۔" وہ آواز پھر ہمارے کانوں سے ٹکرائی۔ بڑا رعب تھا اس کی گھن گرج میں ایک سپاہی نے بندوقیں اٹھا کر ہمیں تھما دیں۔ ہم دونوں تیزی سے اس طرف بڑھے جدھر سے وہ آواز آ رہی تھی ۔۔۔ مگر دور دور تک دیکھنے کے باوجود ہمیں کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ وہ آدمی درختوں میں اس طرح چھپ کر بیٹھا تھا کہ اسے وہاں سے دیکھنا کسی طرح بھی ممکن نہ تھا جہاں وہ تانگہ کھڑا تھا۔

ہم تانگے سے ہٹ کر کوئی سو ہاتھ آگے گئے ہوں گے کہ وہ آواز اچانک ہمیں اپنے سر پر گونجتی سنائی دی۔

"دائیں ہاتھ کھیت میں گھوڑے کھڑے ہیں۔ ایک پر تم دونوں سوار ہو جاؤ۔" اب کی بار وہ آواز اتنی بلند نہیں تھی۔

ہم دونوں ماں بیٹی تیزی سے دائیں ہاتھ کھیت میں گھس گئیں وہاں دو گھوڑے بندھے تھے، گنوں کے ساتھ۔ ایک گھوڑا ابھی ہم نے کھولا ہی تھا کہ ایک آدمی سر سے پاؤں تک سیاہ کپڑوں میں ملبوس ہمارے سر پر آ پہنچا۔ اس نے منہ پر ٹھاٹھا باندھ رکھا تھا اور اس کی صرف آنکھیں ہی نظر آتی تھیں، جو بتا رہی تھیں کہ وہ کوئی ادھیڑ عمر آدمی ہے۔ ہمارے پاس آ کر اس نے منہ پر سے کپڑا اتار دیا۔

"ارے تم وارث! تم ۔" میری ماں نے خوشی سے سرشار ہو کر کہا۔

"ہاں! جلدی کرو اس وقت بہت کم ہے۔ ہمیں زینو کو بچانا ہے ہر قیمت پر بچانا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے ہم دونوں کو ایک گھوڑے پر سوار کرایا اور خود دوسرے گھوڑے پر بیٹھ کر بولا۔

"میرے پیچھے چلی آؤ۔ جلدی کرو۔ مجھے امید ہے تم گھوڑی بھگا سکتی ہو۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ سپاہیوں کی بندوقیں اس نے ہم سے لے کر اپنی زین کے ساتھ باندھ لی تھیں۔

وہ بہت تیز رفتار گھوڑیاں تھیں۔ پلک جھپکتے میں وہ ہمیں میلوں دور لے گئیں اس جگہ سے جہاں وہ ٹوٹا ہوا تانگہ کھڑا تھا اور جہاں وہ زخمی سپاہی اپنے ساتھی کے ہمراہ اپنی بے بسی پر دانت پیس رہا تھا۔

ہم کوئی چار گھنٹے بھاگتے رہے، راستے میں ہم نے راوی عبور کیا، تین نہروں کے پلوں پر سے گزرے اور دوپہر کے قریب یہاں... کمال پور آ پہنچے۔"

وارث علی نے مجھے اسی روز ادھر ماسٹر صاحب کے سپرد کر دیا۔ یہ دونوں بڑی دیر تک علیحدگی میں بیٹھے میرے بارے میں صلاح مشورہ کرتے رہے، پتہ نہیں ان کے درمیان کیا طے پایا بہر حال نتیجہ یہ نکلا کہ ماسٹر صاحب نے ہر حال میں میری نگہداشت کا ذمہ لے لیا۔

میری ماں یہاں چار دن رہی اس کے بعد وارث علی نے اسے سندھ بھیج دیا۔ اب میں نے سنا ہے کہ وہ وہاں کسی زمیندار کے ہاں ملازم ہے، زمیندارنی کی خدمت کرتی ہے اور میں یہاں بند ہوں۔ وارث علی اس عرصے میں کئی بار یہاں آیا ہے، وہ میرا باپ ہے مگر میں اسے آج تک باپو نہیں کہہ سکی ہوں، کیوں کہوں؟ میں کیسے اپنا باپو! کس طرح کہوں؟ میرے منہ پہ یہ لفظ چڑھتا ہی نہیں ہے۔ ہاں خود وہ مجھ سے باپ ایسا سلوک کر رہا ہے۔ بہت خیال رکھتا ہے وہ میرا۔ اس صادق علی کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کی نوکری بھی چھوٹ چکی ہے مگر اس کے گھر کا سارا خرچ وارث علی چلا رہا ہے۔"

"تو کیا یہ نوکری نہیں کرتا ہے یہ صادق علی؟"

"جی نہیں کئی مہینوں سے بے کار ہے اور ادھر ادھر آوارہ گردی کرتا رہتا ہے۔ ہر مہینے وارث علی آ کر اسے ہزار پانچ سو روپے دے جاتا ہے میرے گزارے کے لئے اور اس کا کام چل رہا ہے۔"

"اس سے تمہارے باپ کا کیا تعلق ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اس کا مجھے قطعاً کوئی علم نہیں ہے جیلانی بھائی! لگتا ہے یہ آپ کی طرح کوئی مفرور ہے پرانا مجرم ہے اور بھیس بدل کر اس گاؤں میں بیٹھا ہے میرے باپ وارث علی کو اچھی طرح علم ہے کہ یہ آدمی کون ہے اس کا ماضی کیا ہے مگر وہ اس بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتاتا۔ میں نے اس سے کبھی کچھ نہیں پوچھا اور صادق علی تو ہر آدمی سے جھوٹ بولتا ہے بارے میں، کسی کو کچھ بتاتا ۔۔۔ کسی کو کچھ۔

کمال ہے زینو! تم بھی منہ زور ہو اور یہ صادق علی بھی مفرور

حیرت کی بات ہے۔"

"آپ بھی تو جیل سے بھاگے ہوئے ہیں۔ صادق علی نے یہی بتایا ہے آپ کے کپڑے اس نے مجھے دکھائے تھے قیدیوں والے۔"

"ہاں! وہ جلانے کے لئے لے گیا تھا۔"

"مگر اس نے جلائے نہیں ہیں وہ کپڑے، سنبھال کر رکھ دیئے ہیں کہیں پہ....."

"اچھا؟ وہ تو یہی کہہ رہا تھا۔ خیر کوئی بات نہیں مگر اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ میں جیل سے بھاگ کر آیا ہوں لیکن زینو تم نے مجھ پر اتنا اعتبار کیسے کر لیا۔ کیوں تم نے اپنے سارے راز مجھ پہ ظاہر کر دیئے ہیں؟ ڈر نہیں آیا تمہیں مجھ سے۔ میں تو اجنبی ہوں یہاں، بالکل اجنبی۔"

"پتہ نہیں جیلانی بھائی کیوں میں نے اپنی ساری باتیں آپ کو بتا دی ہیں بس میں اندر سے بھری بیٹھی ہوں۔ ترس گئی ہوں میں کسی سے بات کرنے کو۔ صرف ایک سہیلی ہے میری یہاں مگر وہ بھی کبھی کبھی آتی ہے میرے گھر۔ میں خود بھی بہت ڈرتی ہوں کسی سے کچھ نہیں کہتی۔ آپ کے بارے میں جب صادق علی نے بتایا کہ آپ جیل سے بھاگ کر آئے ہیں تو میرے دل میں آپ کے لئے بڑی ہمدردی پیدا ہو گئی۔ آپ جب تک چاہیں یہاں رہیں کوئی آپ کا بال بیکا نہ کر سکے گا۔ ہم آپ کی ہر طرح حفاظت کریں گے۔" زینو بڑے دل گردے کی مالک تھی اور مجھ پر وہ اندھا دھند اعتبار کرتی چلی گئی تھی۔

صادق علی ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ پتہ نہیں وہ کس کام سے کدھر نکل گیا تھا۔

"اوہ مجھے یاد ہی نہیں رہا، آپ کے لئے پانی گرم رکھا تھا میں نے۔" یہ کہہ کر وہ اٹھی اور تیزی سے باہر نکل گئی۔ کچھ دیر بعد جب وہ میرے پاس واپس آئی تو بولی۔

"چلیں میں نے گرم پانی غسل خانے میں رکھ دیا ہے آپ نہا لیں۔ تولیہ بھی رکھ دیا ہے وہاں۔"

وہ بڑی خدمت گزار لڑکی تھی اور مجھ سے چھوٹی بہنوں ایسا سلوک کرتی تھی۔

جب میں اس کے چھوٹے سے صاف ستھرے غسل خانے سے نہا کر نکلا تو دیکھا کہ صادق علی سامنے صحن میں چارپائی پر بیٹھا دھوپ تاپ رہا تھا اور زینو نے کھانا اس کے سامنے چارپائی پر رکھ دیا تھا۔

"اچھا تو تم آ گئے ہو مگر یہ اچانک تم کدھر غائب ہو گئے تھے؟"

"وہ میں دراصل اپنے یار کے پاس گیا تھا گھوڑے لینے مگر وہ ملا ہی نہیں۔ میں پیغام دے آیا ہوں۔"

"گھوڑی کس لئے؟"

"میں ذرا دیر کے لئے شہر جانا چاہتا تھا۔"

"وہ کیوں؟"

"مجھے آپ کے بارے میں معلوم کرنا تھا ہمیں دیکھنا چاہئے کہ وہاں کیا حالات ہیں؟"

"اچھا؟ یہ تو بہت عمدہ بات ہو گی۔ تم ضرور شہر جاؤ اور ہو سکے تو میرا بھی ایک کام کرتے آؤ۔"

"وہ بھی کر آؤں گا۔ آپ کا تو میں ہاتھ بندھا غلام ہوں جناب۔ اک ذرا وہ میرا یار غوث محمد آ جائے گھوڑی لے کر، پھر دیکھیں میں کیا کرتا ہوں۔" اب وہ بڑے بڑے نوالے اٹھا کر اپنے برص زدہ ہونٹوں کے غار میں اتارتا جا رہا تھا۔ وہ کھانا کھا چکا تو بولا۔

"آپ بھی رات بھر بے آرام رہے ہیں اور میں بھی۔ میرا خیال ہے ہمیں دو گھڑی سو لینا چاہئے۔"

"تمہاری بے آرامی پر میں ہزار لعنت بھیجتا ہوں مگر تمہاری تجویز عمدہ ہے۔ لگا دو بستر اگر لگا سکتے ہو تو۔" میں نے اس کے پاس ہی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ زینو اتنے میں کنگھی شیشہ لے آئی۔ میں نے بال سیدھے کئے اور پھر سگریٹ سلگا کر دھوپ تاپنے لگا۔ تھوڑی سی دیر بعد زینو نے کمرے سے باہر آ کر بتایا کہ اس نے بستر لگا دیئے ہیں۔ صادق علی خوش ہو گیا، بولا۔

"چلیں جیلانی صاحب! اب ذرا آرام کر لیں۔"

سونے کے لئے میں اس کے ساتھ کمرے میں گیا تو دیکھا کہ زینو نے بہت صاف ستھرے لحاف الگ الگ پلنگوں پر ڈال دیئے تھے۔ صادق علی نے دروازہ بند کیا اور ہم دونوں لمبی تان کر سو گئے۔ وہ بھی ذلتوں کا مارا ہوا تھا اور میں بھی اور زینو جو ہمارے لئے پہرہ دے رہی تھی ہم سے کہیں زیادہ آفت رسیدہ اور مردم گزیدہ تھی۔ زندگی نے تین

اچانک ڈز کا ہے کو ایک تنگ، بے برگ دگیاہ ویران جزیرے میں یکجا کر دیا تھا ایسے جزیرے میں جس میں قدم قدم پر خطرات کے سانپ پھنکار رہے تھے۔

میں جب سو کر اٹھا تو دن ڈھل چکا تھا۔ صادق علی مجھ سے پہلے ہی بستر چھوڑ گیا تھا میں کمرے سے نکل کر صحن میں گیا تو دیکھا کہ صادق علی ایک سفید رنگ کی گھوڑی کے آگے گھاس ڈال رہا تھا گھوڑی کی کمر پر زین کسی تھی۔

"یس جناب جیلانی صاحب! گھوڑی آ گئی ہے میں ابھی شہر جانا چاہتا ہوں تاکہ آپ کے دشمنوں کا حال دیکھ آؤں۔"

"ہاں ضرور جاؤ مگر میرے بھی ایک دو کام کرتے آؤ۔ پہلا کام تو یہ ہے کہ تم اس پتے پر میری ماں سے ضرور ملو۔ اس کا نام سلیمہ ہے اور یہ پتہ ہے اس کا۔" یہ کہہ کر میں نے اس سے کاغذ قلم لے کر اس مکان کا پتہ لکھ دیا جہاں وہ اپنی سہیلی کے پاس رہ رہی تھی۔

"اب دوسرا کام بھی بتا دیں؟"

"دوسرا کام یہ ہے کہ اس رقعے کے مطابق تم میری ماں سے جو پچاس ہزار روپیہ لاؤ گے تو اس میں سے میرے لئے میرے ناپ کے مطابق دو جوڑے بوٹ دو سلیپر، تین جوڑے ریڈی میڈ دلائتی سوٹ لاؤ گے۔ چار ڈبے کیپسٹن کے سگریٹ اور دوسری تمام چیزیں جو اس فہرست میں لکھی ہیں۔" یہ کہہ کر میں نے اسے ایک فہرست دے دی جس میں میں نے لکھا تھا کہ وہ اپنے لئے زینو کے لئے اور میرے لئے ڈھیر سارے عام استعمال کپڑے اور دوسری چیزیں خرید کر لائے گا۔ کیونکہ جس بے سروسامانی میں میں مبتلا تھا وہ خدا معلوم کب تک مجھے نرغے میں لئے بیٹھی رہے ــــ

مستقبل کی غیر یقینی صورتِ حال سے بچنے کے لئے میں نے اپنی ضرورت کی تمام چیزیں اس کے ذریعے شہر سے منگوانے کا بندوبست کیا تھا۔ ویسے بھی اپنے اخراجات کے لئے مجھے خاصی رقم کی ضرورت تھی۔ میں کسی پر بھلا کس طرح انحصار کر سکتا تھا۔ پندرہ ہزار تو ادھر غالیہ کی کار میں رہ گئے تھے۔ صادق علی میری ہدایات کو اچھی طرح ذہن نشین کر کے اسی شام شہر روانہ ہو گیا ــــ وہ چاہتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح مجھے اس حد تک اپنا احسان مند کر لے کہ میں پھر کبھی اس کے سامنے سر نہ اٹھا سکوں اور کبھی اس کی اس شیطنیت پر اسے سرزنش نہ کروں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو پھر میرا خیال ہے وہ کسی طرح بھی میرے کسی کام نہ آتا۔

وہ رات میں نے بڑے وسوسوں میں گزاری مجھے زینو بتا چکی تھی کہ صادق علی کی طبیعت میں بڑا تلوّن ہے، وہ ٹکے سے من جاتا ہے اور لاکھوں سے رُوٹھ جاتا ہے اس نے مجھ سے کئی باتوں میں جھوٹ بھی بولا تھا اپنی عمر اس نے خواہ مخواہ اتنی زیادہ بتائی تھی کہ مجھے اس پر طیش آنے لگتا تھا۔ جب وہ کسی جگہ پڑھاتا ہی نہیں تھا تو کیوں اس نے یہ ڈھونگ رچا رکھا تھا کہ وہ سکول ماسٹر ہے۔ کیوں وہ مجھ سے اس طرح کی بے بنیاد باتوں کے بارے میں غلط بیانی کرتا چلا جاتا ہے اور اب یہ حالت تھی کہ میں نے اسے پچاس ہزار روپے کا امین بنا دیا تھا۔ ماں سے بھی میں نے اس کا تعارف نہایت عمدہ الفاظ میں کرا دیا تھا۔ وہ میرا رقعہ دیکھے گی وہ بدنصیب عورت، تو اسے فرشتۂ رحمت سمجھے گی۔ اس کے دل سے ابھی بیٹے کے غم کی سل نہ اٹھی ہو گی کہ اسے بیٹے کے پھانسی کی کوٹھڑی تک جا پہنچنے کا لرزہ خیز منظر دیکھنا پڑا۔ اس پر تو قیامت دوبار بیت چکی تھی اور اب جب وہ صادق علی کے ہاتھ میں میرا رقعہ دیکھے گی تو اس پر تو شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری ہو جائے گی۔ وہ صادق علی کو روپے تو دے دے گی مگر اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ صادق علی وہ رقم لے کر میرے پاس واپس بھی آ جائے گا۔ وہ معمولی رقم تو نہیں ہے۔ میں دیر تک بستر کی یخ بستگی میں لیٹا اس سارے معاملے پر غور کرتا رہا مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ وقت تو ہاتھ سے نکل چکا تھا۔

زینو دوسرے کمرے میں تھی اور وہ ایسی سادہ تھی کہ اس نے دروازے کا دروازہ بھی بند نہیں کیا تھا۔ مجھ پر وہ یوں اعتماد کر بیٹھی تھی جیسے وہ مجھے صدیوں سے جانتی ہو۔ صادق علی نے بھی اس کے معاملے میں مجھ پر بہت اعتبار کیا تھا۔ اپنے کسی دوست کی عزیز ترین متاع جو اس کے گھر میں امانت تھی میرے سپرد کر کے وہ شہر چلا گیا تھا۔ ہمارے درمیان کوئی رشتہ نہیں تھا پھر بھی ہم نے ایک دوسرے کو اپنا سمجھ لیا تھا۔ اس کی وجہ میری سمجھ میں اس کے سوا اور کوئی نہ آتی تھی کہ ہم تینوں ہی زخم خوردہ تھے۔ اپنے حلقے میں ہمارے دشمنوں نے ہمیں خوب خوب اذیتیں پہنچائی تھیں اور اپنے دکھ کے مشترک ہونے کا یہ احساس ہی ہمیں ایک دوسرے کے قریب لے آیا تھا۔

دوسرا دن بھی پہلے دنوں ایسا بے کیف بے آواز گزر گیا۔ زینو نے مجھے ناشتہ دیا، دوپہر کا کھانا دیا پھر شام سر پر آ گئی تو اس نے بہت عمدہ ساگ اور مکئی کی گھی سے تر بتر روٹیاں میرے آگے رکھ دیں میرے لئے وہ خود گاؤں کی دکان سے کیپسٹن کے چار پیکٹ خرید لائی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ میری خدمت خاطر میں صادق علی کی عدم موجودگی میں اور زیادہ توجہ دے رہی تھی یہ اس کا احسان تھا۔ اس کی مہربانی تھی ورنہ ایسا بے نوا کہاں جگہ پا سکتا تھا۔ ایسی صورت میں جبکہ سارے صوبے کی پولیس میری تلاش میں ہو گی۔

سارا دن گزر گیا مگر صادق علی نہیں آیا۔ میں نے سوچا ہو سکتا ہے چیزیں خریدنے میں اسے کچھ وقت لگ گیا ہو۔ اپنی امید اور انتظار کے چراغ کی لَو میں نے دوسرے دن کے طلوع تک اونچی کر دی۔

میرا خیال ہے اس وقت رات کے بارہ بجے ہوں گے۔ جب کمرے کی چھوٹی کھڑکی پر ہلکی سی دستک ابھری۔ میں اچھل کر بستر سے اترا۔ موٹی بندوق ہاتھ میں پکڑی اور جلتی لالٹین لے کر میں صحن میں نکلا۔ زینو گہری نیند میں تھی اس لئے میں نے اسے اٹھانا مناسب نہ سمجھا۔

"کون ہے؟" میں نے جمی ہوئی محتاط آواز میں پوچھا ــــ

"میں ہوں ــــ میرے بیٹے میں ہوں۔ دروازہ کھول میرے بچے" ماں کی آواز سنائی دی۔ رات کے دلگیر سناٹے کو چیرتی ہوئی ماں کی درد بھری آواز میرے کانوں سے ٹکرائی تو میں پاگلوں کی طرح کھڑکی سے بڑھا۔ اور کنڈی کھول کر باہر کود گیا۔ لیمپ اور بندوق صحن میں ہی رہ گئے تھے۔ میری ماں دیوار سے ہٹ کر کھڑی تھی اور صادق سامان کے ڈھیر کے پاس کھڑا تھا۔ گھوڑی کی لگام اس کے ہاتھ میں تھی۔ مجھے دیکھتے ہی ماں نے بانہیں پھیلا دیں۔

جذبات سے اس کی چیخیں نکل گئیں۔ میں نے اسے بانہوں میں سمیٹ لیا۔ وہ بے حد کمزور ہو چکی تھی۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ معلوم ہوتی تھی، دشمنوں نے اسے اپنی تلخیوں کے سبب موت سے ہمکنار کر رکھا تھا۔ وہ سسک رہی تھی میرے سینے سے لگی بلک رہی تھی کتنے دکھ جھیلے تھے اس نے۔ وہ میری زندگی سے مایوس ہو چکی تھی جب ہی تو میری خیر سن کر صادق علی کے ساتھ ہی چلی آئی تھی۔

"اندر چلیں ماں جی یہاں سردی زیادہ ہے۔"

صادق علی نے اپنی موجودگی کا ہمیں احساس دلایا۔

میں ماں کو بانہوں میں بھر کر کمرے میں لے گیا اور اس کے گرد کمبل لپیٹ کر اسے اطمینان سے بٹھا دیا۔ اتنے میں صادق علی یہ بڑا سا بستر اور دو بڑے بڑے سوٹ کیس چیزوں سے بھرے ہوئے اٹھا کر اندر لے آیا۔

"یس جناب! آپ کی والدہ صاحبہ کو تو میں ساتھ ہی لے آیا ہوں آپ کا نام سن کر یہ صبر نہ کر سکیں ساتھ ہی چل دیں۔"

"یہ تم نے بہت اچھا کیا ہے صادق علی! اب میں زیادہ جم کر زندگی بسر کر سکوں گا۔ تم نے بڑا احسان کیا ہے مجھ پر۔" یہ کہہ کر میں اپنی ماں کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ ہماری باتیں سن کر زینو کی آنکھ کھل گئی۔ وہ بھی ہمارے کمرے میں آ گئی۔

"لے زینو بہن یہ رہی میری ماں مل لے اس سے، یہ زینو ہے ماں، اس بیچاری نے بڑا خیال رکھا ہے میرا۔"

ماں نے خوش ہو کر زینو کے سر پر محبت سے شفقت سے اور ممتا کے جذبے سے لبریز ہاتھ پھیرا اور اسے قریب بٹھا کر بولی۔

"میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ مگر تقدیر نے اسے بھی مجھ سے جدا کر رکھا ہے۔" اس کی بے بسی جھلکتی اس کے ان الفاظ میں۔

"فکر نہ کریں ماں جی یہاں ٹھنڈا لاٹ بھی ان تک نہیں پہنچ سکتا۔" میں نے کہا وہ اٹیچی کیس کھول رہا تھا۔ اس میں سے اس نے ایک خوبصورت ڈبہ نکالا جس میں سے ایک سگار کھینچ کر میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

"یس صاحب یہ پئیں، مجھے امید ہے اسے آپ پسند کریں گے۔" میں نے سگار اس سے لے لیا۔

"شہر کی کہو کیا صورتِ حال ہے کتنے قیدی بھاگے اس رات؟"

"کچھ نہ پوچھیں جناب! بڑی افراتفری مچی ہے وہاں اس رات جیل سے ڈھائی سو قیدی فرار ہو گئے۔ میں آج کا اخبار لے آیا ہوں۔ پولیس نے ڈیڑھ سو قیدی دوبارہ پکڑ لئے ہیں مگر سو آدمی ابھی تک ہاتھ نہیں آئے اور ان میں چودہ ایسے ہیں جنہیں پھانسی کی سزا سنائی جا چکی تھی؟"

"میرے بارے میں تو کوئی خبر نہیں ہے اخبار میں؟"

"جو فہرست اخبار میں چھپی ہے مفرور قیدیوں کی۔ ان میں آپ کا بھی نام ہے ــــ میں ... آپ کی والدہ کو تو کل رات ہی ان کے گھر سے نکال لایا تھا مجھے ڈر تھا کہ پولیس وہاں ضرور چھاپہ مارے گی اور ان کو خواہ مخواہ پریشان کرے گی۔ زینو تم جا کر ذرا دودھ گرم کر لاؤ ماں جی کے لئے۔"

صادق علی نے کہا تو زینو فوراً ہی باہر نکل گئی۔

"وہاں سے نکال کر کہاں رکھا تم نے انہیں؟"

"میں انہیں اپنے ایک دوست کے ہاں لے گیا تھا اُدھر میاں میر کے قریب، کل سارا دن وہاں رہیں۔ آج میں انہیں اپنے ساتھ لے آیا۔"

"ماں جی آپ میرے ساتھ کہاں ماری ماری پھریں گی؟ میرا تو خیال ہے آپ اُدھر سرگودھا میں اپنے بھائی کے پاس چلی جائیں، حاکم علی کے گھر۔"

"اب میرا وہاں کون ہے بیٹے؟ حاکم علی کے پاس میں کیسے رہ سکوں گی اگرچہ وہ مجھے کئی بار کہہ چکا ہے کہ میں اس کے پاس چلی آؤں مگر میرا دل نہیں مانتا۔"

"رہ کیوں نہ سکیں گی۔ میں کل ہی صادق علی کو آپ کے ساتھ بھیجتا ہوں وہ آپ کو وہاں ایک مکان خرید دے گا۔ چاہیں تو آپ الگ رہیں چاہیں تو ماموں جان کے مکان میں رہ لیں صادق علی ایک ملازمہ بھی آپ کو لے دے گا آپ اطمینان سے وہاں رہیں۔ میں تو اب ساری زندگی قانون کے ... شکنجے سے بچنے کے لئے بھاگتا رہوں گا ہو سکتا ہے میں کسی دوسرے ملک میں چلا جاؤں اگر ایسا ہوا تو میں آپ کو وہاں بلوا لوں گا۔"

"ابھی تو میں نہیں جاؤں گی بیٹے۔ تیرے پاس رہوں گی۔" ماں نے فیصلہ کن انداز سے کہا۔

"میں سخت خطرے میں ہوں ماں جی! آپ نہیں سمجھتی ہیں .... میں تنہا ہوں گا تو جدھر چاہوں گا بھاگ لوں گا مگر آپ کا کسی محفوظ جگہ پر رہنا ہی بہتر ہے وہ رقم کہاں ہے جو آپ کو دی تھی میں نے؟"

"وہ میرے پاس ہے جناب! حد ہے اتنی بڑی رقم آپ نے ان کے ہاتھ میں دے دی۔ یہ اس کی کیسے حفاظت کر سکتی ہیں جناب؟ آپ نیا مکان خریدنے کا خیال چھوڑ دیں۔ یہ روپیہ میں کل ہی سرگودھا جا کر ان کے نام سے بینک میں جمع کرا دوں گا۔ یہ خود کرائے کے مکان میں رہیں، ایک چھوٹا سا ملازم رکھ لیں جب ذرا مطلع صاف ہو گا تو دیکھا جائے گا۔"

"ہاں یہی بہتر ہے گا۔ تم بس کل ہی انہیں سرگودھا لے جاؤ یہ بہت ضروری ہے۔"

"آسیہ کا کچھ پتہ چلا بیٹے کہ وہ کہاں ہے ؟"

"نہیں ماں جی ابھی تو مجھے اپنی جان کے لالے پڑے ہیں بہرحال میں اب اسے جلد ہی ڈھونڈ نکالوں گا۔ دیکھوں گا وہ لوگ کب تک اسے میری آنکھوں سے دُور رکھتے ہیں ۔"

"میں نے پہلے ہی کہا تھا بیٹے وہ بڑے طاقت ور لوگ ہیں انہیں مت چھیڑ مگر تُو باز نہ آیا اور تیرے بدلے میں وہ میری بیٹی اٹھا کر لے گئے۔" ماں نے بلکتے ہوئے کہا وہ دیکھتے دیکھتے بکھرنے لگی تھی ۔ میں نے اسے بڑی مشکلوں سے سنبھالا۔ زینو نے اسے لا کر گرم دُودھ پلایا تو اسے ذرا سکون محسوس ہوا۔ تھکی ہاری تو تھی ہی وہ ۔تھوڑی ہی دیر بعد سو گئی۔

صادق علی نے لیمپ کی روشنی میں گٹھری کھول کر تمام چیزیں مجھے دکھائیں وہ نہ اپنے لئے کچھ لایا تھا نہ زینو کے لئے۔

"بہت ہی نکما آدمی ہے تو صادق علی! کیوں نہیں لایا وہ چیزیں جو میں نے کہی تھیں زینو کے لئے اور تمہارے لئے۔"

"نہیں جناب! آپ خود شہر سے یہ چیزیں لائیں گے تو ہم لے لیں گے میں خواہ مخواہ آپ کے مال کو آگ لگاتا پھرتا۔ یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا تھا" ––– صادق علی نے نہایت سنجیدگی سے کہا ––– اس کا رویّہ مجھے حیران کئے دیتا تھا میرے لئے وہ میری تمام مطلوبہ چیزیں لے آیا تھا اور وہ سب کی سب بہت ہی عمدہ تھیں ۔ اس کے حسین انتخاب سے پتہ چلتا تھا کہ وہ ایسا بھی گاؤدی نہیں تھا۔ اچھے دن دیکھے ہوئے تھا۔ اس کی لائی ہوئی چیزیں اس کے عمدہ ذوق کی گواہی دیتی تھیں ۔ وہ آہستہ آہستہ میرے لئے معمہ بنتا جا رہا تھا۔

وہ بھی اس بات پر بہت متفکر تھا کہ میری والدہ اس کے ہاں آگئی ہیں اس حال میں کہ میرے سر کی پولیس نے ایک قیمت مقرر کر رکھی تھی۔ اخبار جب میں نے کھول کر پڑھا تو معلوم ہوا کہ وہاں میری تصویر چھپی ہے ان دوسرے تیرہ آدمیوں کے ساتھ جو پھانسی کی کوٹھڑیوں سے فرار ہوئے تھے ۔خبر کی تفصیلات نے مجھے اور زیادہ حیران کر دیا۔ میرے چہرے پر ڈاڑھی تھی اور مونچھیں بھی یہ لمبی لمبی نظر آتی تھیں۔

جیل میں دراصل ان دنوں ایک سیاسی پارٹی کے بیس کے قریب سرکردہ رہنما بند تھے ۔ان میں سے ایک ایسا تھا جس پر ایک سیاسی مخالف کے قتل کا الزام تھا۔ اس مقدمے کا فیصلہ چار دن پہلے سنایا گیا تھا جس میں اس رہنما کو پھانسی کی سزا دی گئی تھی ۔

اسی کے ایما پر سیاسی پارٹی نے جیل میں ایک طے شدہ منصوبے کے تحت ہنگامہ کرایا ۔ آگ لگوائی ––– قتل و غارت کا بازار وہاں گرم کیا اور ایسے آدمی جیل میں داخل کئے جو پھانسی کی کوٹھڑیوں کے تالے توڑ کر تمام مجرموں کو رہا کروا کر لے گئے ۔مطلب یہ تھا کہ اس رہنما کی جان کے صدقے میں ہم سب کی جانیں بچ گئی تھیں ۔

اور اب حکومت نے اعلان کر دیا تھا کہ جو کوئی ان مجرموں کو گرفتار کروانے میں مدد دے گا یا ان کے بارے میں پولیس کو معلومات فراہم کرے گا۔ اسے حکومت بیس ہزار روپے انعام دے گی ۔ ہر مجرم کی گرفتاری کا یہ انعام تھا مگر اس کی گرفتاری کا انعام پچاس ہزار روپے تھا۔ جو کوئی بھی اسے پکڑ کر حکومت کے حوالے کرتا پچاس ہزار روپیہ حاصل کر سکتا تھا اور صادق علی کو میرے بیس ہزار روپے مل سکتے تھے لیکن اس نے تھوکا تک نہیں تھا اس حالانکہ اسے کچھ بھی نہیں کرنا تھا صرف اپنے گھر کا پتہ کسی تھانیدار کو دینے کی ضرورت تھی ۔بڑے اطمینان سے وہ اتنی بڑی رقم لے سکتا تھا لا لچ کی اس سنگلاخ زمین پر سے صحیح سالم گزر آیا تھا اور بہت ہو کر بیٹھا تھا میرے سامنے

بلاشبہ مجھ پر اس کا یہ بہت بڑا احسان تھا۔ جسے میں کبھی فراموش نہ کر سکتا تھا۔ اس کا دوسرا رُخ اتنا روشن تھا کہ اس رات تصوّر بھی نہ کر سکتا تھا جس رات میں نے اسے اس مجبور میت کی بے حرمتی کرتے دیکھا تھا۔ جب کبھی وہ میری آنکھوں میں رات کے منظر کو منعکس دیکھتا تھا لرز جاتا تھا ––– وہ مجھ سے خوف زدہ ہو چکا تھا اور میری خوشنودی حاصل کرنے کے لئے بڑی تکلیف اٹھانے پر کمربستہ رہتا تھا۔ اس کی یہی خوبی مجھے اس کے کرتی چلی گئی ۔

صبح منہ اندھیرے میری آنکھ کھل گئی تو میں نے دیکھا کہ ماں بستر میں موجود نہیں تھی۔ میں تو اچھل کر بستر سے اتر گیا اور دوسرے کمرے کی طرف لپکا وہاں زینو بھی موجود نہ تھی۔ میرا تو کلیجہ میں اسی حالت میں باورچی خانے کی طرف بھاگا ۔ وہاں لالٹین تھی۔ تیرا شکر ہے خدایا، زینو اور میری ماں دونوں قالین سی جانماز پر بیٹھی نماز پڑھ رہی تھیں ––– ان دونوں کو خدا کے سجدہ ریز دیکھ کر میرا دل خوش ہو گیا۔ میں سمجھا کہ ابھی نہ تو انسان رحمت سے ناامید ہوا ہے اور نہ ابھی خدا انسان کی فطری نیکی ہوا ہے ۔ابھی دونوں طرف امید و خیر و برکت کے چراغ روشن

میں چپ چاپ وہاں سے ہٹ آیا اور خود بھی وضو کر حضور سجدہ ریز ہو گیا ۔ میری بے بسی مجھے یہی احساس دلاتی کہ بندے کے سامنے اکڑ کر چلنے والے سرکش جیلانی جھک جا خدا کے جا کہ اس کے آگے تیری کوئی پیش نہیں چل سکتی ۔

جب میں نے سلام پھیرا تو دیکھا کہ صادق علی جاگ چکا سر اٹھا اٹھا کر یہ ساری کارروائی دیکھ رہا تھا اور حیرت زدہ سا دعا مانگ کر میں پھر بستر میں گھس گیا تو وہ لپکا ۔

"جناب! آپ کے لئے میں گولڈ لیف کے بھی سگریٹ کہیں تو حاضر کروں ؟ "

"لا یار چکھا دے گولڈ لیف بھی ۔ دیکھیں ابھی زندگی دکھاتی ہے ۔"

صادق علی بولا "آپ تو سو گئے تھے مگر میں نہ سو سکا ۔ ۔ ۔ ماں جی کی بھی کچھ ہی دیر بعد آنکھ کھل گئی تھی ۔ ان سے جو میری باتیں ہوئیں تو ان کے مطابق طے یہ پایا ہے کہ میں آج ماں جی کو سرگودھا جا کر آپ کے ماموں کے ہاں ٹھہرا دوں گا پھر ہم دونوں آپ کی ہمشیرہ کو تلاش کریں گے اور جب وہ مل جائے تو پھر ہم پانچوں یہ ملک چھوڑ دیں گے ۔"

"ہاں صادق علی ۔ میرا بھی یہی خیال ہے ، یہی تجویز بہتر رہے گی ماں جی کو آج ہی لے جاؤ یہاں سے ––– میں بھی شاید دو چار روز یہاں سے ٹل جاؤں گا مجھے ایک جگہ جم کر نہیں بیٹھنا چاہیئے ۔"

"نہیں ۔ ہم یہیں رہیں گے جناب ! اور آپ بھی ۔ بس باہر نہ نکلیں ۔ ہاتھ پیر کھولنے کے لئے آپ صبح و شام ورزش کر لیا کریں ۔"

"دیکھیں گے کیا کرنا چاہیئے ہمیں ۔ ابھی تو تم ماں جی کو لے جاؤ یہاں سے ۔" میں نے بات کو مختصر کر دیا ۔

اسی دن صادق علی گھوڑی پر بٹھا کر ماں جی کو شہر لے گیا ––– میں نے کہہ دیا تھا کہ وہ گھوڑی راستے میں کسی کے پاس چھوڑ دے اور بس ہی میں بیٹھ کر شہر چلا جائے ––– ڈیڑھ لاکھ روپیہ بھی میں نے ان کے پاس ہی رہنے دیا تھا اور صادق علی کو میں نے سمجھا دیا کہ وہ ان سے روپیہ بینک میں جمع کرا دے ، یہی بہتر تھا ۔ ان کی طرف سے مجھے پوری مطمئن ہونے کی ضرورت تھی کیونکہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ زندگی مجھے کن کن حالات میں لئے پھرے گی ۔ میرا تو اب کوئی بھروسہ نہیں تھا ۔ چاہتا تو وہ صادق علی ہی مجھے بیس ہزار روپے میں بیچ سکتا تھا ۔ اگر وہ نہ چاہتا تو اور آنکھیں تھیں جو مجھے اس تصویر کے حوالے سے پہچان سکتی تھیں ۔ مجھے قدم قدم پر موت نرغے میں لے سکتی تھی ۔ ایسے میں میں ماں جی کو خواہ مخواہ اپنے ساتھ نڈھال کئے رکھتا ۔

صادق علی گھر سے چھ دن باہر رہا ––– اس عرصے میں مجھ پر قیامت گزر گئی ۔ زینو بیچاری جی جان سے میری خدمت میں لگی تھی اور میں بہت خوش تھا کہ اس نے مجھے وہاں کسی قسم کی تکلیف نہ دی تھی ––– میرا بدن ایک ہی گڑھے پر پل رہا تھا ۔ شاید یہی وجہ تھی پہلے ایسا چاق و چوبند نہیں رہا تھا ۔ طبیعت میں کاہلی سی بھر گئی تھی ۔ سارا دن گھر میں پڑا رہتا تھا ۔ صادق علی نے کچھ کتابیں ایک الماری میں رکھی تھیں میں ان سے دل بہلاتا تھا ۔ وہ اچھی ، صاف ستھرے آئینہ دار کتابیں تھیں جن سے پتہ چلتا تھا کہ صادق علی خاصا ... آدمی ہے مگر وہ اس قعر مذلت میں کیونکر گر گیا کس نے اسے اس انتہائی مکروہ گڑھے میں گرا دیا ہے ۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں اس کی شخصیت کا یہ تاریک پہلو کسی طور بھی روشنی میں نہیں آتا تھا ۔ بہت دنوں سے میں اس سوال پر سر کھپا رہا تھا مگر جب کوئی حل مجھے نہ ملا تو میں چپ رہا ۔ اس دوران زینو کی ایک سہیلی نوراں بیمار ہو گئی ۔ وہ ساتھ کی گلی میں رہتی تھی ۔ صادق کو گھر سے گئے ہوئے دو دن ہو چکے تھے ۔ شام کو معلوم ہوا کہ زینو کی وہ کچھ زیادہ ہی بیمار ہے ––– گاؤں کا حکیم جواب دے گیا تھا۔

چوتھے روز ایک ڈاکٹر کو بلایا گیا والٹن سے ۔ وہ بھی اپنی سی کوشش کر گیا مگر نوراں کو کسی طرح بھی آرام نہیں آیا اور جب صادق علی کو گھر سے گئے پانچ روز ہو گئے تو چھٹے دن کی صبح کو مجھے معلوم ہوا کہ نوراں مر گئی ہے وہ گاؤں کے چوہدری نیاز احمد کی بیٹی تھی ۔ مجھے شدید افسوس ہوا کسی کا یوں عین عالم شباب میں اس دنیا سے منہ موڑ جانا زندگی کے منہ پر ایک ہولناک طمانچے کی حیثیت رکھتا ہے میرا دل اور زیادہ بجھ گیا ۔ زینو پر اس کی موت کا اتنا گہرا صدمہ ہوا کہ وہ کئی گھنٹے کمرے میں بیٹھی مسلسل روتی رہی ایک ہی تو سہیلی بنائی تھی اس نے کمال پور میں اور وہ بھی موت نے اس سے چھین لی –––

اسی دوپہر صادق علی واپس آگیا ۔ اس وقت میں صحن میں بیٹھا تھا وہ بھی میرے قریب ہی بیٹھ گیا ۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا ––– لگتا تھا وہ بہت تھکا ہوا ہے عجیب سی مُردنی طاری تھی اس کے چہرے پر ۔

مجھے اس نے بڑے ہی مختصر لفظوں میں بتایا کہ میری ماں کو وہ میرے ماموں حاکم علی کے گھر پر چھوڑ آیا ہے ۔ وہ لوگ اسے وہاں دیکھ کر بے حد خوش ہوئے تھے پھر اس نے بینک کی رسیدیں بھی دکھائیں جن سے پتہ چلتا تھا کہ اس نے ماں کے نام سے اکاؤنٹ کھول کر سارا روپیہ بینک میں جمع کرا دیا تھا اور اب ماں جی کی طبیعت بڑی حد تک بہل گئی تھی ۔ ماموں اس کی بہت ڈھارس بندھاتے تھے اس کی یہ باتیں سن کر میں بے فکر ہو گیا ۔

کچھ ہی دیر صادق علی میرے پاس بیٹھا اور پھر وہ اپنے کمرے میں جا گھسا ۔ اور کتنی ہی دیر تک وہ وہاں دروازہ بند کر کے اندر بیٹھا رہا ۔ میں سمجھا کہ وہ لباس تبدیل کر رہا ہے مگر جب کچھ زیادہ ہی دیر ہو گئی اور وہ باہر نہ آیا تو میں گھبرا کر اس کے کمرے کی طرف لپکا ۔ دروازہ اندر سے بند دیکھ کر میں نے دستک دی تو دوسرے کمرے کے دروازے سے زینو تیزی سے باہر آئی ۔

"جیلانی بھائی دیکھیں تو ماسٹر صاحب کو کیا ہو گیا ہے ۔" اس کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا ۔ میں بھاگ کر دوسرے دروازے کی راہ سے اس کے کمرے میں پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ صادق علی کی آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں منہ سے جھاگ چھوٹ رہے تھے اور دونوں ہاتھ اس کے ٹیڑھے ہو چکے تھے اور اس کے حلق سے عجیب عجیب آوازیں نکل رہی تھیں ۔

"یہ کیا ہو گیا ہے اسے ؟" میں نے اپنی حیرت دباتے ہوئے کہا ۔

"پتہ نہیں چلتا ہے بھائی صاحب کبھی کبھی ان پر بڑا سخت دورہ پڑتا ہے اور ہر بار ان کی حالت ایسی ہی ہو جاتی ہے ۔" وہ بہت خوف زدہ ہو رہی تھی –––

"پھر آرام کس طرح آتا ہے کوئی دوا وغیرہ تو دیتے ہو گے تم لوگ ؟"

"اوہ ہاں یاد آیا ۔ ٹیکے رکھے ہیں گھر میں ۔ وہ ..... وہ جو تھانیدار صاحب

ـــے گئے تھے۔ وہ ٹیکہ لگانے سے انہیں نیند آجاتی ہے اور پھر آپ ہی آپ ٹھیک ہو جاتے ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ دوسرے کمرے کی طرف بھاگی اور ایک الماری کا تالہ کھول کر وہاں سے وہ ایک ڈبّہ نکال لائی۔ میں نے اسے کھول کر دیکھا تو اس میں چھوٹے چھوٹے تو ٹیکے رکھے تھے۔ ایک پیکٹ میں۔ وہاں سرنج بھی تھی اور سوئیاں بھی۔ ایک شیشی میں سپرٹ بھی دھری تھی۔ گویا اس ٹیکے کا سارا انتظام وہاں موجود تھا اور زینو جانتی تھی کہ اسے کیا کرنا ہے — اس نے فوراً ایک برتن میں سرنج اور سوئیاں گرم کیں پھر وہ سب کچھ لا کر اس نے میرے سامنے رکھ دیا۔

"آپ ٹیکہ لگا لیں گے؟"

"کوشش کرتا ہوں۔"

"نہیں تھا نیدار صاحب نے مجھے سکھا دیا تھا یہ کام۔ مجھے گھبراہٹ میں یاد ہی نہ رہا کہ مجھے کیا کرنا ہے؟ میں خود ٹیکہ لگا لوں گی۔" یہ کہہ کر اس نے جوں توں کر کے ٹیکہ بھرا اور پھر اس نے مجھے کہا کہ میں صادق علی کی نس اُبھار دوں۔ یہ کچھ زیادہ مشکل کام نہ تھا۔ جونہی میں نے اس کا بازو دبایا نس اُبھر آئی اور اس میں زینو نے اطمینان سے ٹیکہ لگا دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ صادق علی فوراً ہی پُر سکون ہو گیا۔ وہ جو اس کے گلے سے اس کُتّے ایسی آواز نکلتی تھی جس کے گلے میں ہڈی پھنسی ہو وہ آواز بند ہو گئی۔ اس کی آنکھیں آپ ہی آپ مند گئی تھیں۔ میں نے اس کے بُوٹ اتارے پھر کوٹ بھی اتار دیا۔ وہ بالکل بے سُدھ پڑا تھا۔ زینو نے اس پہ لحاف ڈال دیا یوں جیسے کوئی پرائے مُردے پر مٹی ڈالتا ہے۔

کہنے لگی "اب انہیں سونے دیں۔ جب اٹھیں گے تو آپ ہی ٹھیک نظر آئیں گے۔ یہی علاج ہے ان کا۔"

میرا پلنگ اس سے زیادہ دُور نہیں تھا۔ مجھے اس پر غصہ آرہا تھا میں نے دل میں کہا۔ "بدبخت! تو اتنے اہم سفر سے واپس آیا ہے لعنتی آدمی تو مجھے ذرا تفصیل سے بتا تو سہی کہ میری ماں کس حال میں ہے؟ وہ وہاں مطمئن بھی ہے کہ نہیں اس کے مستقبل کے بارے میں کیا سوچا ہے؟ چند دن بعد تُو نے اپنا بُرا تھا آن دکھایا ہے بِس زدہ منحوس شیطان ملعون کی شبیہہ ایسا۔ تُو یہ تو مجھے بتا کہ تُو کر کے کیا آیا ہے" مگر نہیں صاحب وہ تو آتے ہی زہر خوردہ کُتّے کی طرح منہ کھول کر بے سُدھ ہو گیا تھا —

وہ تو اچھا ہوا کہ زینو اس کی دوا جانتی تھی ورنہ تو میرا خیال تھا کہ وہ اس کی زندگی کا آخری دن ہوتا۔

اس رات زینو نے جوں توں کر کے مجھے کھانا پکا کر دیا تو سہی — مگر اس طرح کہ اس کے چولہے کا دھواں گھر کی چمنی سے باہر نہ نکلا کیونکہ اس کی سہیلی اس دن دنیا سے رخصت ہو گئی تھی۔

جنازہ شام ڈھلتے ہی اٹھ گیا اور اس کے ساتھ جو وہاں ... چیخ و پکار اٹھی اس کی کاٹ کا تو اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ سارا جہان سوگوار ہے فریاد کُناں ہے۔ گاؤں کی فضا میں ایسا رچ گیا تھا کہ زندگی سینے پر بوجھ محسوس ہو رہی تھی۔

زینو کا حال اور زیادہ قابلِ رحم تھا۔

مجھے گئی رات تک نیند نہ آئی۔ میں نوراں کے جنازے میں مجھے جانا بھی نہیں چاہئے تھا۔ اپنا چہرہ تو ان دنوں میں آئینے سے چھپاتا پھرتا تھا۔ اسی لئے میں گھر میں بیٹھا رہا۔

زینو نوراں کے گھر سے رات گیارہ بجے واپس آئی اور اپنے کمرے میں پڑ کر سو رہی اور میں لحاف میں پڑا سگریٹ پھونکتا رہا۔ پھر جب میں سویا تو یہ اندازہ ہی نہ رہا کہ رات کتنی بیت چکی ہے اور پھر اچانک کسی نے مجھے جھنجوڑ ڈالا۔

"بھائی صاب! بھائی صاب!" یہ زینو کی آواز تھی۔

"کیا بات ہے زینو! خیر تو ہے کیا ہوا تجھے؟"

"وہ..... وہ..... ماسٹر صاب باہر چلے گئے ہیں۔ باہر گئے ہیں وہ۔ میں انہیں بہت روکتی رہی مگر انہوں نے مجھے مار پیٹ کر دیا ہے وہ..... وہ..... اپنا بیلچہ بھی ساتھ لے گئے ہیں۔"

"بیلچہ بھی ساتھ لے گیا ہے وہ بدبخت۔" میرا دماغ چکرا گیا "میرے اللہ۔" میں بڑی مشکلوں سے پلنگ پر سے نیچے اترا۔ کمر ٹوٹ گئی ہے۔

"کتنی دیر ہوئی ہے اسے گئے ہوئے؟"

"کوئی ایک گھنٹہ ہو گیا ہو گا۔"

"ایک گھنٹہ؟ تم نے مجھے فوراً کیوں نہ بتایا؟"

"میں ڈرتی تھی آپ کی نیند خراب ہو گی مگر اب ڈرتی ہوں کہیں نہ جاگ رہیں۔ راجباہ بھی بھرا ہوتا ہے آج کل۔"

"اچھا تم آرام سے بیٹھو میں لاتا ہوں اس حرامزادے کو۔ زندہ نہ آیا تو مُردہ تو میں اسے لے ہی آؤں گا۔" یہ کہہ کر میں نے بندوق کندھے سے لٹکائی اور گولیوں سے بھری پیٹی ہاتھ میں پکڑ لی — میرے لئے ایک عمدہ سا خوبصورت اوورکوٹ ایک اُونی ٹوپی اور آیا تھا۔ وہ سب چیزیں میں نے پہن لیں تاکہ سردی سے بچ سکوں۔ سب چیزوں کے اوپر میں نے کمبل لپیٹ لیا اور تیزی سے چل دیا جدھر وہ شیطان گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ قبرستان ہی گیا ہو گا —

❋

میرے ایک ہاتھ میں ٹارچ تھی اور دوسرے ہاتھ میں بندوق۔ گولیوں کی پیٹی میں نے اوورکوٹ کے نیچے کندھے پر ڈال لی تھی۔ بہت دیر ہو گئی ہے — کاش زینو نے مجھے فوراً ہی جگا دیا ہوتا۔ ٹارچ کی روشنی میں میرے لئے راستہ تلاش کرنا آ…

میری رفتار خاصی تیز تھی پھر بھی مجھے قبرستان پہنچتے پہنچتے آدھا گھنٹہ لگ ہی گیا —

مجھے واقعی بہت دیر ہو چکی تھی مگر اس حساب سے کہ صادق علی کا سَر کچلنے کے لئے اور اس سے اگلے پچھلے تمام گناہوں کا حساب لینے کے لئے خدا نے پہلے ہی وہاں بڑا خوفناک انتظام کر دیا تھا۔

میں جب قبرستان پہنچا تو میری ٹارچ کی روشنی کو دیکھ کر کسی نے دُور سے کہا۔

"کون ہے؟" آواز خاصی تلخ تھی۔

"میں ایک مسافر ہوں بھائی۔"

"اچھا تو گزر جا۔" یہ جواب سن کر میں چپ چاپ ان لوگوں کی طرف بڑھا۔ ٹارچ میں نے جلا رکھی تھی۔ اب جو سامنے دیکھتا ہوں تو مجھے صادق علی سامنے ایک درخت سے بندھا نظر آیا۔ دو آدمی اس کے سامنے کھڑے تھے — صادق علی کا چہرہ لہولہان ہو رہا تھا اس کے تن پر صرف ایک کُرتہ تھا — اس کے بال چہرے پر اس طرح بکھرے تھے کہ وہ بھُوت معلوم ہوتا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ چلایا۔ "خدا کے لئے مجھے بچاؤ میرے بھائی مجھے بچا لو۔" اس کے ساتھ ہی اس کا سر نیچے ڈھلک گیا۔ وہ بہت کمزور ہو چکا تھا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی خوفناک منظر سے ہٹا کر ان آدمیوں کے چہروں پر ڈالی ان میں سے ایک تو بالکل جوان تھا۔ یہی کوئی بیس پچیس سال کا اور دوسرا ادھیڑ عمر کا تھا ان کے ہاتھ میں برچھی تھی۔ وہ دونوں چہروں سے اس قدر خونخوار نظر آتے تھے جیسے صادق علی کو ابھی چیر پھاڑ کر کھا جائیں گے۔

"بند کر دو یہ روشنی اور اپنی راہ لو۔ بھاگو یہاں سے ورنہ برچھی میں پرو دوں گا تمہیں۔" اس جوان نے نہایت ہی لرزہ خیز لہجے میں کہا۔ میں نے ٹارچ کا رُخ دوسری طرف کر دیا۔

اُف میرے اللہ — وہ بہت ہی بھیانک منظر تھا۔ ایک قبر تازہ کھدی نظر آتی تھی اور اس کے ایک طرف ہموار جگہ پر ایک کفن پوش میت پڑی نظر آتی تھی۔ اس میت کا چہرہ کھلا تھا اور بال دُور دُور تک پھیلے تھے۔ کفن جگہ جگہ سے اپنی گرہوں میں سے کھسکا نظر آتا تھا۔ ساری کہانی میری سمجھ میں آ گئی تھی۔

اچانک کسی نے پیچھے سے آ کر میرے دائیں ہاتھ پر کچھ اس طرح زبردست لاٹھی ماری کہ بندوق میرے ہاتھ سے گر کر دُور جا پڑی۔ میں دشمن کے دوسرے وار کا اندازہ کر کے ایک دم اُچھلا اور دائیں طرف ہٹ گیا۔ دوسری لاٹھی زمین پر لگی تو اس کے ساتھ ہی میں نے آگے جھک کر وہ ایک جھٹکے سے اس کے ہاتھ سے چھین لی۔

اس عرصے میں دوسرے آدمی نے بھاگ کر مجھ سے ذرا فاصلے پر پڑی میری بندوق اٹھا لی۔ وہ اسلحہ آشنا آدمی نظر آیا۔ اس نے مہارت سے بندوق کھول کر یہ دیکھا کہ اس میں گولی ہے کہ نہیں۔

جب اسے معلوم ہو گیا کہ بندوق بھری ہوئی ہے تو وہ بولا۔

"بہتر یہ ہے کہ تم فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔ ورنہ میں تمہیں گولی مار دوں گا۔"

"مگر میرا قصور کیا ہے؟ میری یہ بندوق تو مجھے دے دو۔"

"بندوق کو بھول جاؤ اور یہاں سے فوراً دفع ہو جاؤ — ورنہ اچھا نہ ہو گا۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"

اس کی یہ بات سن کر میں نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ میں وہاں سے ٹل جاؤں۔ میں سمجھ چکا تھا کہ صادق علی ان پر کیا ستم توڑ چکا تھا۔

میں نے ٹارچ بجھائی اور چپ چاپ وہاں سے ہٹ کر دوسری طرف چل دیا۔ میرے قدم اتنے تیز تھے کہ چند ساعتوں میں میں ان کی آواز کی حد سے باہر نکل گیا مگر میں ابھی تک قبرستان میں تھا۔

میں صادق علی کی مدد کرنا چاہتا تھا مگر بازی میرے ہاتھ سے نکل چکی تھی۔ بندوق بھی ان کے پاس تھی اور صادق علی بھی ان کی گرفت میں تھا۔ اچانک مجھے گاؤں کی طرف سے کُتّوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دیں۔ میں ٹھٹک گیا اور دوسری طرف چل دیا تاکہ میں چکّر کاٹ کر اُن لوگوں کے پاس جا پہنچوں جس جگہ وہ دونوں آدمی کھڑے تھے۔ ان سے کوئی دس فٹ دور ایک باڑھ تھی سرکنڈے کی۔ میں قبرستان کی دوسری طرف سے نکل کر آہستہ آہستہ وہاں جا پہنچا۔ کُتّوں کی آوازیں اب قریب آتی جا رہی تھیں۔ میں بڑے غور سے ان لوگوں کو دیکھ رہا تھا مگر وہاں اندھیرا اتنا تھا کہ مجھے صحیح صورتِ حال نظر نہیں آتی تھی۔

"چوہدری جی! اسے گولی ماریں۔ اس شیطان کا اس کے سوا اور کوئی علاج نہیں ہے۔"

"نہیں منیرے! گولی سے یہ مرا تو کیا مرا — دیکھ تو وہ کریم آگیا ہے کہ نہیں۔"

"تو کیا کریں گے آپ؟ کُتّے چھوڑیں گے اس پر چوہدری جی؟"

"ہاں! میں اسے بار بار موت کے گھاٹ اتاروں تو بھی میرا بدلہ نہیں چکتا ہے منیرے! اس ویرانے میں پڑی میری بیٹی نوراں کو اس حرامزادے نے ذلیل کیا ہے۔ میں اسے ترسا ترسا کر ماروں گا۔" اس کی آواز ایسی تھی جیسے کسی زخم سے مس ہو کر نکل رہی ہو۔ لہجہ اس کا بہت بھیگا ہوا بہت گلوگیر تھا — ایک تو جوان بیٹی کی موت نے اسے نڈھال کر رکھا تھا اس پر اس کی یہ ذلت دیکھ کر اس کا کلیجہ پھٹا جاتا تھا۔ بلاشبہ صادق علی بدترین سزا کا مستحق تھا۔

کُتّوں کی آواز اب اور زیادہ قریب آگئی تھی۔ وہ آدمی جو انہیں ساتھ لئے آتا تھا لالٹین اٹھائے ہوئے تھا — وہ دونوں بہت خونخوار کُتّے تھے — اور ان چوہدریوں نے خاص طور پر اپنی بڑی حویلی کے پہرے کے لئے پالے ہوئے تھے۔

صادق علی چیخنے لگا —

"مجھے معاف کر دو چوہدری جی! خدا رسولؐ کا واسطہ ہے۔ مجھے معاف کر دو۔"

صادق علی کے تمام حواس پوری طرح بیدار ہو گئے تھے۔ اگر اس پر ٹیکے کا اثر تھا۔ یا بیماری کا دَورہ تھا تو وہ اب اس سے گزر گیا تھا اب وہ پوری طرح ہوش میں تھا اور اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ اس کا انجام کس قدر ہولناک ہو گا۔ وہ درخت سے یوں بندھا تھا کہ اس کا کوئی ہاتھ بھی آزاد نہیں تھا۔

اور ــــ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں ــ بندوق میرے ہاتھ سے نکل چکی تھی اور صادق علی کے جرائم ایسے تھے کہ اس کی دعا بھی بے اثر ہو چکی تھی۔

کریم ان کے قریب پہنچا تو چوہدری نے انہیں عجیب انداز سے ہشکارا۔ کُتے ایک دم خوفناک انداز سے بھونکے ــــ لالٹین کی روشنی میں مجھے صادق علی کا فق ہوتا چہرہ اور زیادہ بے نور ہوتا نظر آیا ــــ میرا سارا بدن پسینے سے بھیگ گیا۔ چوہدری کے چہرے پر ایسا لرزہ خیز عزم ابھر رہا تھا کہ باید و شاید۔

اور پھر اچانک قبر سے باہر پڑی اپنی بیٹی کی میّت پر اس کی نظر جا پڑی۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ بولا ـــ

"میری نُوراں کو تو پردے میں بٹھا دو پہلے۔ اس ابلیس کی نظر سے اسے بچا لو ـــ"

اس کی یہ بات سن کر کریم نے کُتوں کو کھینچ کر ایک درخت سے باندھا اور پھر ان تینوں نے مل کر نوُراں کو قبر میں اتار دیا۔ چند ہی منٹ بعد وہ تختے جوڑ کر قبر کو پہلے کی طرح تیار کر چکے تھے۔

"اب چھوڑ دے گاچی اور بُل کو اس بدبخت پر۔" چوہدری نے لالٹین اونچی کر کے صادق علی کے منہ پر تھوک دیا۔

اس کی یہ بات سنتے ہی کریم نے وہ خونخوار کُتے کھول دیئے ـــ چوہدری نے صادق علی کے بالوں کا ایک گُچھا کھینچ کر توڑا۔ ساتھ ہی کچھ جلد بھی کھنچی چلی آئی۔ وہ بال اس نے گاچی اور بُل کو سنگھائے۔ پھر چوہدری نے بُل اور گاچی کی گردن تھپتھپائی تو وہ دونوں کُتے چیتوں کی طرح اچھل کر صادق علی پر پل پڑے۔

پہلے ہی ہلے میں گاچی نے بڑی پھُرتی سے صادق علی کی گردن پر منہ مار کر اس کا نرخرہ توڑ دیا۔ دوسرے نے اس کے پیٹ پر اپنے دانت گاڑ دیئے اور صادق علی کی آنتیں اس کے پاؤں میں ڈھیر ہو گئیں۔ وہ بہت ہی کریہہ اور لرزہ خیز منظر تھا۔ کُتے مسلسل اسے بھنبھوڑ رہے تھے۔ ان دونوں نے اس کی بوٹیاں نوچ لیں اور یہ سب کچھ دس منٹ میں ختم ہو گیا۔ وہاں.... صادق علی کے بجائے ایک کٹا پھٹا ڈھانچہ ہی باقی رہ گیا تھا ـــ اور میں وہاں باڑھ کے ساتھ لگا بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ ایک لفظ نہ کہہ سکا۔ ایک انگلی نہ اٹھا سکا۔ بلاشبہ وہ آدمیوں کی بدترین قسم کی نمائندگی کرتا تھا وہ صادق علی ـــ

اسفل السافلین کی بات خدا نے شاید ایسے ہی لوگوں کے لئے کہی تھی۔ یوں کُتوں کے منہ کا نوالہ بن جانا بھی تو بڑا عبرتناک ہوتا ہے۔ یہ... کے لئے خدا نے بدترین سزا تجویز کر دی تھی ـــ ایسی سزا جو اب بھی مجھے خیال آ جاتا ہے تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔

صادق علی کی روح تو اس کے قفسِ عنصری سے کُتوں کے حملے میں پرواز کر گئی تھی۔ باقی سارا تماشا تو وہ اس کی لاش سے کر... ان کی وہ ترنگ میں ڈوبی ہوئی بیخ بیخ میرے لئے ایک نیا تجربہ... قبرستان میں اِدھر اُدھر چاروں طرف ہُو کا عالم طاری تھا۔

لالٹین کی اس روشنی کے دائرے میں وہ وحشیانہ کھیل... جاری رہا۔ اس کے بعد کریم نے کُتوں کو للکارا۔ وہ فوراً پلٹ گئے... نے انہیں زنجیروں میں باندھ لیا تو منیر نے صادق علی کے پیچھے... کے جسم کے گرد بندھا رسا کھول دیا۔ اس کی وہ کٹی پھٹی، ٹوٹی پھوٹی... دھڑام سے نیچے جا گری۔ چوہدری کی آنکھوں سے ابھی تک آنسو بہ... گلے میں پڑی پگڑی سے اس نے اپنی آنکھیں پونچھیں اور پھر نوراں... جھک کر اس نے ڈھیری کو بوسہ دیا۔ جس کے نیچے اس کی مظلوم دبے لبو... کے لئے دب گئی تھی۔

پھر وہ لڑکھڑاتا ہوا اٹھا۔ منیر نے اسے سنبھالا دیا اور... وہاں سے چپ چاپ چل دیئے۔ مجھے یقین ہے صادق علی کی اس اذ... موت کا انہیں بھی گہرا دکھ تھا۔ ڈھارس ان کی اگر بندھتی تھی تو شاید... کر کہ انہوں نے دنیا کے بدترین آدمی سے تھوڑا سا انصاف کر دیا... میں بھی ان سے کچھ فاصلہ رکھ کر گاؤں کی طرف چل دیا۔... خاموش تھے۔ کوئی بات نہ کرتے تھے مگر کچھ ہی دیر بعد اس سناٹے... کریم بولا۔ "چوہدری جی! آپ یہاں دوبارہ کس لئے آئے تھے..."

"مجھے تو نوراں کے بغیر گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا..." سوچا میں یہ رات اپنی بیٹی کے پاس گزار دیتا ہوں اس بربادیوں... میں میری بیٹی کی یہ پہلی رات ہے۔ وہ تنہا ہے گھبراتی ہو گی۔... منیر پُتر کو لے کر یہاں آ گیا مگر نوراں کی قبر کے قریب پہنچ کر میں... کر رہ گیا.......

ہم سے بھی زیادہ مظلوم کوئی ہو گا کریم پُتر! مگر یاد رکھو... اس واقعے کا زندگی بھر تم دونوں ذکر نہیں کرو گے ورنہ ہم تباہ... گے۔" اس نے اپنے دونوں نوکروں کو لپنے دعوے کے تمام تر... خبردار کیا۔

"نہیں چوہدری جی ہم آپ کے حکم کے غلام ہیں۔ نوراں... بہن سے بھی زیادہ عزیز تھی۔ صادق علی کے تو منہ میں موتنا چا... ایسا ذلیل آدمی تھا وہ۔"

اس وقت وہ لوگ قبرستان سے ڈیڑھ میل دُور جا چکے... کے ایک کھیت کے قریب پہنچ کر چوہدری بولا۔

"تم چلتے جاؤ۔ میں ادھر کھیت میں بیٹھوں ذرا دیر کے لئے۔ میرے پیٹ میں گڑبڑ ہے کچھ۔"

"اچھا چوہدری جی ہم آہستہ آہستہ چلتے ہیں۔"

دونوں آدمی آگے نکل گئے تو چوہدری بندوق کی ٹیک لگا کر کھیت کے کنارے بیٹھ گیا۔ وہ گندم کے ڈیڑھ دو ہاتھ اونچے پودوں کی اوٹ میں تھا۔ میں کھیت میں دبے پاؤں چلتا اس کے پیچھے جا پہنچا اور چھوٹتے ہی میں نے اس کی گردن کی رگ مل دی۔ وہ بیچارا وہیں لڑھک گیا۔ میں بندوق اس کے ہاتھ سے چھین کر تیزی سے پیچھے ہٹا۔ اور قبرستان کی طرف بھاگا۔ مجھے یہ ڈر تھا کہ صبح ہونے تک جنگلی جانور صادق علی کی لاش کے بچے کھچے حصے بھی چٹ کر جائیں گے۔ وہ قبرستان میں پڑا تھا یہاں ایسے جانوروں کی بہتات ہوتی ہے۔

میں جب اس کے قریب پہنچا تو مجھے محسوس ہوا کہ اس کی لاش اپنی جگہ سے گھسیٹا گیا ہے زمین پر اس کے گھسیٹنے کے نشان موجود تھے اس کا مطلب یہ تھا جانور اپنا کام شروع کر چکے تھے۔

میں نے چاروں طرف گھما کر ٹارچ کی روشنی پھینکی تو مجھے ایک ہی قبر نظر آئی جو نیچے بیٹھ چکی تھی۔ گڑھا خاصا گہرا دکھائی دیتا تھا میں نے صادق علی کی لاش گھسیٹ کر اس گڑھے میں پھینک دی۔ دھڑام جیسی آواز پیدا ہوئی۔ کچھ کڑکڑ بھی مجھے سنائی دی۔ صادق علی پورا اندر دھنس گیا تھا ـــ نوراں کی قبر سے ذرا دُور صادق علی کا بیلچہ پڑا تھا۔ میں نے وہ اٹھایا اور تیزی سے اس گڑھے میں مٹی ڈالنے لگا، جس میں صادق علی میں نے پھینکا تھا۔ قبرستان کی مٹی ویسے ہی خاک دھول ایسی نرم بن چکی ہے۔ جلدی ہی میں نے وہ گڑھا مٹی سے بھر دیا۔ اب صادق علی کی ...محفوظ ہو گئی تھی جنگلی جانور اب اس تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔

اس کام سے فارغ ہو کر میں تیز تیز قدم اٹھاتا گاؤں کی طرف چل دیا میرے ذہن میں عجیب سی اذیت کا احساس اُبھر رہا تھا۔ صادق علی اپنی جگہ ...بھی تھا قابلِ نفرت تھا مگر میرے لئے وہ بہت اچھا تھا۔ مجھے اس ...گھڑی اپنے گھر میں پناہ دی تھی۔ جب آسمان بھی میری پردہ پوشی ...کرتا تھا اور موت ہر طرف میرے تعاقب میں پھر رہی تھی اگرچہ میں اس ...بھی قانون کے لمبے ہاتھ سے دُور نہیں تھا اور مجھے یہی دھڑکا لگا ...کہ مجھے کسی بھی لمحے وہ لوگ پکڑ لیں گے۔ پھر بھی صادق علی کی وجہ سے ...ذہنی طور پر بہت پُرسکون تھا۔ اس نے بالکل بھائیوں ایسا سلوک ...تھا مجھ سے اور میرا یہ حال تھا کہ میں نے اپنے سامنے اسے بدترین موت ...مرنے دیا۔ اس کو بچانے کے لئے میں ایک انگلی بھی نہ اٹھا سکا تھا۔ ...ضمیر کی انی ایسا تیز دھار بھچا وا میرے دل کو کاٹتا چلا جا رہا تھا ...کتنے ناقابلِ فہم تضادات کی پوٹ ہے اس بات کا اندازہ ہی نہیں کیا ...۔ شاید میں یہی چاہتا تھا کہ کوئی مضبوط مگر بے رحم ہاتھ اسے ایسی ...سزا دے کہ تمام مظلوم و بےبس عورتوں کا بدلہ اتر سکے۔

لاشعور میں یہ خواہش موجود ہو گی جب ہی تو میں نے اسے چپ چاپ مرنے دیا۔ یا پھر عین ممکن ہے کہ مجھے اپنی ہی جان اتنی عزیز ہو کہ میں صادق علی کے لئے اسے کسی خطرے میں ڈالنے پر آمادہ نہیں تھا۔

حالات جو کچھ بھی تھے وہ بالکل میرے سامنے تھے۔ پھر بھی میں صادق علی کے لئے کچھ نہ کر سکنے پر بہت شرمندہ تھا۔ میرا دل مجھے برابر ملامت کئے جاتا تھا اور میں سوچ سوچ کر پاگل ہوا جاتا تھا کہ زینو کو صادق علی کے بارے میں میں کیا جواب دوں گا۔

میں نے گاؤں میں کسی قسم کی سنسنی خیزی کو روکنے کے لئے.... صادق علی کی لاش قبر میں دفن کر دی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کے حوالے سے پولیس کا کوئی آدمی زینو کے گھر میں قدم رکھے اگر ایسا ہوتا تو پھر میرا بچنا کسی طور بھی ممکن نہ ہوتا۔ اس کی لاش کو مٹی تلے دبا کر میں نے چوہدری کو بھی قتل کے الزام سے بچا لیا تھا۔ صادق علی کی لاش وہاں سے غائب کر کے میں نے بہت سے مسائل کو حل کر لیا تھا مگر میں زینو کو کیا جواب دوں گا۔ یہی بات میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

اور جب میں گھر پہنچا تو زینو شاید پیپل والے احاطے میں کھلنے والی کھڑکی کے پیچھے ہی کھڑی تھی۔ میری پہلی ہی دستک پر اس نے پٹ کھول دیئے۔ وہ ایک ہاتھ میں لالٹین اور دوسرے میں لاٹھی لئے کھڑی تھی سردی سے بچنے کے لئے اس نے صادق علی کا لایا ہوا نیا کمبل اوڑھ رکھا تھا ـــ

"کچھ پتہ چلا ماسٹر صاحب کا؟"

"نہیں زینو۔ پتہ نہیں وہ کدھر نکل گیا ہے۔ بہت تلاش کیا ہے میں نے اُسے ـــ" میں نے اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

زینو نے کھڑکی بند کی اور لپکتی ہوئی میرے پیچھے آ گئی۔

"آپ لحاف اوڑھ کر بیٹھیں میں چائے لاتی ہوں آپ کے لئے ـــ سردی بہت بڑھ گئی ہے اس وقت۔" اس کے دانت بج رہے تھے۔ سردی شاید اس کی ہڈیوں میں اترتی جا رہی تھی۔ سہیلی کے غم نے اس رات اسے بے حد نڈھال کر رکھا تھا ورنہ وہ ایسی نہیں تھی۔ بڑے آہنی عزم اور مضبوط قد کاٹھ کی لڑکی تھی وہ۔ صادق علی کے بغیر اس کی زندگی کتنی نڈھال ہو جائے گی اس کا تصور ہی میرے لئے سوہانِ رُوح تھا۔

میں اوور کوٹ اتار کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ بدن تھک کر چُور ہو چکا تھا ـــ زینو تھوڑی ہی دیر بعد گرم دودھ کا گلاس لے آئی۔ وہ دودھ پی کر میں نے سگریٹ سلگا لیا۔ صادق علی کی صورت میرے ذہن میں گردش کر رہی تھی۔ اب وہ کبھی واپس نہیں آ سکتا تھا۔ اب زینو اپنے اس محسن کی صورت کبھی نہ دیکھ سکے گی ـــ اب اس گاؤں میں نہ میرا کوئی دوست باقی رہ گیا تھا نہ زینو کا۔ میں نے طے کر لیا کہ جیسے ہی موقع ملا میں زینو کو ساتھ لے کر کسی اور طرف نکل جاؤں گا۔ وہ جگہ ہم دونوں کے لئے غیر محفوظ ہو چکی تھی ـــ

دوسرے روز زینو نے صبح ہی صبح مجھے ناشتہ کھلا دیا۔ خود بھی جو کچھ وہ زہر مار کر سکی کر گئی اور پھر ابھی سورج ہاتھ بھر اوپر نہ اٹھا تھا کہ وہ اپنی قبر میں سوئی سہیلی کی ماں کے پاس جا بیٹھی تا کہ اسے کچھ تسلی دے سکے۔ مجھے وہ یہی کہہ کر گئی تھی میں نے دل میں کہا ٹھیک ہے بی بی تیرا وہیں جا ٹھہرنا بہتر ہے کہیں ایسا نہ ہو میری آنکھوں میں ناچتی صادق علی کی وہ تصویر تو دیکھ لے جس میں گاچی منہ کھول کر اس کی گردن پر اپنے دانت جما چکا تھا کہیں تو صادق علی کے ٹوٹتے ہوئے نرخرے اور ادھڑتے ہوئے پیٹ کا وہ منظر نہ دیکھ لے جو میری آنکھوں میں منجمد ہو چکا تھا۔ میں اپنے آپ سے خوف زدہ تھا... اس روز۔

اور میری بے بسی یوں دیدنی تھی کہ چوہدری صاف طور پر قتل کا مرتکب ہوا تھا۔ وہ وہیں موجود تھا مگر میں اس کے خلاف اُف تک نہ کر سکتا تھا کیونکہ صادق علی کا جرم ناقابلِ معافی تھا مگر میں یہ سمجھتا ہوں کہ بات صرف اتنی سی نہیں تھی۔ آدمی کی حرامزدگی صادق علی کے اس بھیانک جرم سے کہیں آگے بڑھی ہوئی ہے۔ مجھے دراصل اس کی موت کے اخفا میں اپنی زندگی کی سلامتی مضمر نظر آتی تھی۔ میں اپنی ہی جان بچانے کے لئے چپ تھا یہ سوچ کر کہ اگر پولیس آئی، پوچھ گچھ ہوئی۔ صادق علی کے گھر میں وہ لوگ جھانکنے آئے، وہاں انہوں نے مجھے دیکھا زینو کو وہاں پایا اور ہم سے پوچھا کہ ہم کون ہیں تو ہم کیا جواب دیں گے۔ کیا بتائیں گے ہم انہیں اپنے بارے میں۔ مجھے تو وہ ضرور ہی پہچان لیں گے اور پھر وہی میں ہوں گا اور وہی خارِ مغیلاں ہوں گے...... اپنا یہ اندوہناک انجام مجھے دُور سے نظر آتا تھا اسی لئے میں نے اپنے دوست کے قتل پر چوہدری سے لاشعوری طور پر سمجھوتہ کر لیا تھا۔ صادق علی مجھ سے کچھ کہتا مجھے طعنہ دیتا مجھے..... ننگِ دوستی قرار دیتا، خواب میں یا بیداری میں سامنے آ کر مجھ پہ ہنستا تو میں نے دل میں دھار رکھی تھی کہ میں اسے خوب بے نقط سناؤں گا اسے معاف نہیں کروں گا... کہوں گا تُو تو خود جہنمی گندہ ہے تُو مجھے اپنے قتل پر چوہدری کو معاف کر دینے اور دوست کو بیچ دینے کا طعنہ کس طرح دے سکتا ہے۔ اپنے ضمیر کے گرد میں نے بہت تیز گرم الاؤ دہکا دیا تھا۔ تا کہ اگر کہیں وہ سر اٹھا کر ادھر اُدھر نکلنے کی کوشش کرے تو اس میں جل کر بھسم ہو جائے۔ ایسے ضمیر کا فائدہ ہی کیا ہے جو اس وجود کو ہی کاٹنے لگے جس میں وہ پناہ لئے ہوتا ہے۔

اس وقت دن کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے — میں صحن میں بیٹھا صادق علی کا لایا ہوا چھوٹا سا ٹرانسسٹر ریڈیو سُن رہا تھا۔ اس کی خریدی ہوئی خوبصورت سی گھڑی میری کلائی پر بندھی تھی اور اس کی سوئیاں بتا رہی تھیں کہ ساڑھے گیارہ بج چکے ہیں۔ زینو ابھی اپنی سہیلی کی ماں کے گھر سے واپس نہیں آئی تھی — دھوپ آنگن میں چاروں طرف پھیل رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ میں آسیہ کو تلاش کرنے کے لئے اب کدھر جاؤں؟ کس طرح نکلوں؟ اس الجھی ہوئی ڈور کا سرا کہاں سے پکڑوں؟ میرا خیال تھا کہ اپنا حلیہ بدل کر میں ایک بار پھر ڈاکٹر دھمن کے کلینک پر قسمت آ کروں اپنی بہن کا سراغ مجھے اس جگہ کے سوا اور کہیں سے نہ مل سکتا میری سوچ کی باہیں دُور دُور تک پھیل رہی تھیں کہ اچانک گھر کے بڑے دروازے پر دستک ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے کسی گھوڑے کے ہ کی آواز آئی۔

میں کمبل اپنے گرد لپیٹ کر اٹھا۔ بھری ہوئی بندوق میں کے نیچے چھپالی اور دروازے کی جھری میں سے جھانک کر باہر دیکھا۔ ایک ادھیڑ عمر آدمی کھڑا تھا۔ ایسا آدمی جو غیر معمولی طور پر تندرست دکھائی دیتا تھا۔ گلے میں اس نے پستول ڈال رکھا تھا گولیوں سے بھ کے ساتھ — وہ سیاہ اچکن اور سفید شلوار پہنے ہوئے تھا۔ آنکھ اس نے سیاہ چشمہ لگا رکھا تھا۔ بال اس کے اگرچہ سفید تھے مگر اتنے بھرے اور گھنگھریالے تھے کہ ان کی خوبصورتی کی مثال دی جا سکتی تھی۔ میں نے غور سے دیکھا تو اس کا صفاچٹ چہرہ مجھے کسی اور کی تصویر نظر آیا۔ زینو کی تھی جو اس کی آنکھوں اس کے رخساروں اس کی بھنوؤں اور اس ٹھوڑی سے بنتی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ یہی وارث علی ہے۔

کوئی بات پوچھے بغیر میں نے دروازہ کھول دیا۔ وہ بہت دروازہ تھا۔ وارث علی نے مجھے دیکھا تو ذرا دیر کے لئے ٹھٹکا پھر انداز میں ایک جھٹکے کے ساتھ گھوڑے پر سے اترا — اس کے چھوٹا سا ایک سا خوبصورت بید تھا، بولا "ماسٹر صاحب کہاں اس کے لہجے میں خاصا تحکم تھا۔ نظریں اس کی میرے چہرے پر جم

"وہ تو کہیں باہر گئے ہیں جناب! آپ آئیے اندر آ جا

"تم کون ہو" اس نے دروازے میں داخل ہو کر گھوڑے کو ساتھ صحن میں اتار دیا۔

"میں مہمان ہوں ماسٹر صاحب کا"

"اچھا اچھا مہمان ہو تم ماسٹر صاحب کے" گھوڑے کی لگا اس نے دروازے کو اندر سے کُنڈی لگا دی۔ بلا کی خود اعتمادی تھی میں۔ کُنڈی لگا کر وہ مڑا اور گھوڑے کی لگام اس نے دائیں ہاتھ گڑے بیس کے کِلّے کے ساتھ باندھ دی۔ اس کے بائیں ہاتھ میں ایک ساچرمی تھیلا تھا۔

"آئیے ادھر چارپائی پر بیٹھئے"

میں نے بائیں ہاتھ کے اشارے سے اسے صحن میں بچھی چار بیٹھنے کے لئے کہا مگر جب میں نے بایاں ہاتھ کھولا تو کمبل ذرا سا ا جس کے نیچے چھپی بندوق اس نے دیکھ لی۔

ایک عجیب سی طنز بھری مسکراہٹ اس کے لبوں پر ا نے بڑی عیاری سی ایک آنکھ دبائی اور بولا۔

"یہ بندوق ہے تمہارے ہاتھ میں؟" اس کا بایاں ہا سے پستول پر جا پڑا تھا۔

"جی! جی ہاں۔ بندوق ہی ہے یہ"

"یہ کیوں اٹھائے پھرتے ہو اس وقت؟ ڈرتے ہو کسی سے؟"

یہ کہہ کر وہ چارپائی پر جا بیٹھا۔ وہاں گولڈ لیف کے سگریٹوں کا پیکٹ دھرا تھا۔ اس میں سے اس نے سگریٹ نکالا۔ نگاہیں اس کی مجھ پر جمی تھیں۔ اس نے پیکٹ کے ساتھ پڑے "رانسن" کے لائٹر سے سگریٹ سلگایا اور مجھے گہری گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"بتایا نہیں تم نے یہ دن کے وقت بندوق کیوں اٹھائے پھرتے ہو اپنے ساتھ۔ یہ تو پولیس کی پکی رائفل نظر آتی ہے۔ بڑا وزن ہوتا ہے اس کا"

"یہ آدمی کی حفاظت کرتی ہے۔ اُسے سؤروں، چوروں، ڈاکوؤں اور قاتلوں سے بچاتی ہے اسی لئے میں اسے ساتھ رکھتا ہوں"

"اپنی دولت بچا رہے ہو اس سے کہ اپنی جان؟" وہ اور زیادہ گہرا کش لے کر بولا۔ مجھے وہ مسلسل گھورتا چلا جا رہا تھا۔ یوں جیسے میری ہڈیوں میں سوراخ کر دے گا۔ پستول پر اس کا ہاتھ اب بھی مضبوطی سے جما تھا۔

"دونوں چیزیں بچا رہا ہوں اور یہی ہر انسان کا فرض بھی ہے"

"معلوم ہوتا ہے بڑی دولت ہے تمہارے پاس۔ وہ ماسٹر صاحب کی بہن کہاں ہے؟ وہ مجھے نظر نہیں آ رہی ہے"

"وہ زینو؟ وہ ابھی آ جائے گی۔ اس کی ایک سہیلی مر گئی تھی کل — اس کی ماں کے پاس گئی ہے وہ ساتھ کی گلی میں" میں نے کہا اور اس کے پائینتی جا بیٹھا۔

"آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں جناب؟"

"میں..... میں تو اُدھر شاہدرہ سے آیا ہوں"

"آپ کا اسمِ گرامی؟"

"میں ماسٹر صاحب کا دوست ہوں رستم خان معلوم ہوتا ہے م خاصے پڑھے لکھے نوجوان ہو؟"

"جی بس تھوڑا بہت پڑھا ہوا ہوں"

"کیا نام ہے تمہارا....؟"

"جی میرا نام..... میرا نام صفدر ہے جناب!" میں نے ذرا دیر کے ے سنبھلتے ہوئے کہا۔

اس نے اپنا نام غلط بتایا تھا تو میں کیوں اسے اپنا صحیح نام بتاتا۔

"دیکھو جھوٹ نہ بولو برخوردار! تمہارا چہرہ ہی بتا رہا ہے کہ تم ا نام صحیح نہیں بتا رہے ہو"

"اگر مجھ پر اعتبار نہیں آ رہا ہے آپ کو تو آپ ماسٹر صاحب سے پوچھ لیں۔ اچھا..... میرا مطلب ہے، ان کی بہن سے پوچھ لیں۔ مجھے کیا ضرورت جھوٹ بولنے کی" میں نے اس کے رویے سے عاجز آ کر کہا۔ وہ بہت یاں آدمی تھا اور اب تک میں اس کے خیالات پڑھنے سے قاصر تھا — مجھے اس سے سخت خطرہ محسوس ہو رہا تھا اسی لئے میں نے کمبل کے اندر بندوق کی نالی کا رخ اس کی طرف کر رکھا تھا اور اس کی لبلبی میری انگلی سے کچھ زیادہ دُور نہیں تھی۔ اس کی آنکھیں اس کے خبثِ باطن کی غماز تھیں۔ شکرے ایسی چستی جھلکتی تھی ان میں۔ کچھ دیر تک وہ گہری سوچ میں گُم رہا —

"تم ماسٹر صاحب کی بہن کو بلا کیوں نہیں لاتے ہو۔ میں خواہ مخواہ لیٹ ہو رہا ہوں یہاں"

"میں خود یہاں مہمان ہوں۔ کسی کا گھر نہیں جانتا۔ میرا خیال ہے کہ آپ بُوٹ اتار کر اطمینان سے بیٹھیں۔ میں آپ کے لئے دُودھ گرم کرتا ہوں"

"نہیں دُودھ کی ضرورت نہیں ہے" یہ کہہ کر اس نے اپنے چرمی تھیلے کی زِپ کھولی اور کچھ کاغذات کو اِدھر اُدھر کر کے اس نے ایک کاغذ باہر نکال لیا۔ وہ کوئی سوا انچ چوڑا اور ایک فٹ لمبا کاغذ تھا وہ اس نے میرے سامنے کر دیا۔ اس کاغذ پہ بارہ تیرہ آدمیوں کی تصویریں تھیں۔

"بتا سکتے ہو اس میں تمہاری تصویر کون سی ہے؟"

یہ کہہ کر اس نے وہ تصویر میرے سامنے رکھ دی اور پھر بجلی ایسی تیزی سے اس نے پستول نکال کر میری پسلی سے لگا دیا۔ بائیں ہاتھ سے اس نے میری بندوق تھام لی۔ یہ سب کچھ اس قدر اچانک ہوا کہ میں حیران رہ گیا مگر پھر بھی وہ کمبل ابھی تک میرا تحفظ کر رہا تھا پیشتر اس کے کہ وہ سمجھ سکتا۔ میں نے کمبل کے اندر سے بایاں ہاتھ ایک جھٹکے سے آگے لا کر اس کے پستول پر جو مارا تو اس کی دائیں کلائی میرے ہاتھ میں آ گئی۔ پستول میرے بدن سے چھُو کر آگے نکل گیا تھا۔ اسی لمحے اس نے گولی چلا دی۔ میرا خیال ہے ثانیے کے ہزارویں حصے کا فرق پڑا تھا کہ اس کی گولی بے اثر ہو گئی تھی۔ میں نے بندوق پھینک کر دایاں ہاتھ بھی اس کی دائیں کلائی پر لگا دیا پھر پوری قوت سے میں نے اس کی کلائی کو دیوار کی طرف گھما کر مروڑ دیا پستول اس کے ہاتھ سے گر کر دُور جا پڑا مگر وہ ہار ماننے والا نہیں تھا۔ اس نے آگے کو جھک کر اپنا وزن سنبھالا اور پوری قوت سے اپنی دائیں ٹانگ گدھے کی دولتی کی طرح میرے پیٹ میں دے ماری۔

میرا سارا وجود سنسنا گیا۔ گُردے کے آپریشن نے میرے جسم کا وہ حصہ خاصا حساس بنا دیا تھا۔ میں ذرا دیر کے لئے تو بالکل ہی بھونچکا سا رہ گیا مگر ابھی میرے حواس بجا تھے۔ میں نے پاگلوں کی طرح آگے بڑھ کر اس کی گردن پکڑ لی اور پھر اپنے پیرِ استاد کا نام لے کر میں نے اس کی رگِ احساس مَسل دی۔ اس کا سر فوراً ہی ڈھلک گیا۔ اس کی آنکھیں اپنے خانوں میں ساکن ہو گئیں۔ اب وہ میرے ہاتھوں میں جھول رہا تھا۔ میں نے اسے بڑی احتیاط سے اٹھا کر پلنگ پر لٹا دیا۔ وہ بہرحال میرے لئے قابلِ احترام تھا کیونکہ وہ زینو کا باپ تھا اس کا محسن تھا اور اس کی ماں آرسی مُسلن کا عاشق۔ مجھے اس کا احترام ملحوظ رکھنا ہی تھا۔

اسے چارپائی پر لٹا کر میں اندر گیا اور وہاں سے لحاف لا کر اس پر

ڈال دیا۔ اس کے آرام کا بھی مجھے ہر طرح سے خیال رکھنا چاہیے تھا۔
اس کا پستول اٹھا کر میں نے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ بندوق وہاں سے اٹھا کر میں نے زینو کے کمرے میں اس کی بڑی پیٹی کے پیچھے ڈال دی اور گولیاں بھی چھپا دیں پھر میں صحن میں کرسی ڈال کر اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

زینو ابھی تک نہیں آئی تھی۔ وارث علی کوئی ایک گھنٹے تک بے سُدھ پڑا رہا۔ مگر جب وہ ہوش میں آیا تو اس کی حالت دیدنی تھی۔ شدید نقاہت کے مظاہر انداز میں اس نے گردوپیش کو دیکھا مگر جب مجھ پر اس کی نظر پڑی تو وہ یوں اٹھا جیسے بجلی کے ننگے تار سے اس کا جسم مَس ہو گیا ہو۔

"لیٹے رہو وارث علی اور مت سمجھو کہ میں تم سے ناواقف ہوں"
وہ ٹکر ٹکر مجھے دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک دم سہم گیا کیونکہ اس کے اپنے پستول کی نالی کا رُخ اب اس کے سینے کی طرف تھا۔

"لیٹ جاؤ اور میری بات غور سے سنو۔ میں تمہارا دشمن نہیں ہوں مگر تم مجھ سے جو دشمنی کر رہے ہو اس سے تمہیں کوئی فائدہ نہ ہو گا۔" میں نے کرسی کھینچ کر اس کے اور قریب کر لی۔ پستول نے اسے سُن کر دیا تھا۔

"میں نے تمہارا یہ تھیلا بھی دیکھ لیا ہے تمہیں یہ لالچ ہے کہ مجھے گرفتار کرا کے تم بیس ہزار روپیہ اور محکمانہ ترقی حاصل کر لو گے مگر اب تمہارا یہ خواب پورا نہ ہو سکے گا۔ کم از کم میں تو تمہارے ہاتھ نہیں آ سکتا ہوں کیونکہ میں تمہارا راز جانتا ہوں یعنی تم خود بھی مجرم ہو"

وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ لحاف اس نے اپنے اردگرد یوں تان لیا جیسے اس میں سے گولی نہ گزر سکتی ہو۔ اس کی آنکھوں میں خوف نمایاں تھا بولا۔
"میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ میں خود پولیس افسر ہوں۔ میں ایس ایچ او ہوں ایک بہت بڑے تھانے کا انچارج"

"ٹھیک کہتے ہو تم۔ مجھے اس سے پوری طرح اتفاق ہے مگر پھر بھی تم مجرم ہو۔ تم نے اپنی قاتل بیٹی کو قانون سے چھپا کر یہاں بٹھا رکھا ہے حالانکہ وہ تمہاری ناجائز بیٹی ہے۔ آرسی مسلن سے تمہارے جوانی کے عشق کا ثمر"

"تم بکواس کرتے ہو" اس نے سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی مجھے جھٹلانے کی کوشش کی مگر رنگ اس کا فق ہو چکا تھا۔

"آؤ وارث علی ہم دونوں سمجھوتہ کر لیتے ہیں۔ نہ تم رستم خان ہو اور نہ میں صفدر ہوں۔ میرا نام غلام جیلانی ہے اور میں کوٹ لکھپت جیل کی پھانسی کی کوٹھڑی نمبر آٹھ سے بھاگا ہوا ہوں اور تم وارث علی ہو جس نے اپنی ناجائز بیٹی کو پھانسی سے بچانے کے لئے یہاں چھپا رکھا ہے اور یہی وہ حقیقت ہے جس کا ہمیں اعتراف کر لینا چاہئے"

"تو تم سب کچھ جانتے ہو؟"
"ہاں مجھے یہ سب باتیں ماسٹر نے بتائی تھیں ماسٹر صادق علی نے"
"اس نے میرے ساتھ بہت زیادتی کی ہے میرا راز اسے کسی اور پہ ظاہر نہیں کرنا چاہئے تھا"

"کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ اب میری بات غور سے سنو۔ صادق علی کو کل رات قتل کر دیا گیا ہے"
"کیا؟ کیا کہا تم نے؟ کس نے قتل کیا ہے میرے دوست کو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا" وارث علی نے لحاف ایک دم الگ کر دیا تھا۔

"زیادہ طیش میں آنے کی ضرورت نہیں ہے ٹھنڈے دل سے میری بات سنو"
یہ کہہ کر میں نے پستول اپنی جیب میں ڈالا اور سگریٹ سلگا کر اسے پیش کیا۔

"لو یہ پیو اور میری بات پر دھیان دو"
میں اس کے قریب ہی چارپائی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ میں نے صادق علی پر جو کچھ بیتی تھی اسے بتا دی جسے سن کر وہ ہکا بکا رہ گیا بولا۔

"اس لعنتی میں ایسے ایسے عیب بھی موجود تھے میں تو اس کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا اور میں نے اپنی بیٹی زینو کو اس کے گھر میں ٹھہرا دیا" وارث علی بڑبڑایا۔ وہ میرے انکشاف پر بہت زیادہ سراسیمہ ہو گیا تھا۔

"تمہاری بیٹی یہاں بالکل محفوظ رہی ہے وارث علی! وہ زینو کو اپنی بہن اور بیٹی برابر ہی سمجھتا تھا۔ بیشتر اس کے کہ تم اس کے قاتل کے خلاف کوئی قدم اٹھا سکو مجھے یہ بتاؤ کہ وہ کون تھا۔ تمہارا اس سے کیا تعلق تھا اور اس بدترین قسم کی انتہا پسندی تک اسے کس نے پہنچایا تھا تو میرے خیال میں وہ بہت ہی اچھا آدمی تھا اتنا اچھا کہ اس کی دیانت اور شرافت کی قسم کھائی جا سکتی تھی مگر وہ بے موت مارا گیا ہے اس کی بھٹی لاش مجھ سے اپنا حق مانگ رہی ہے جو میں اسے نہ دے سکا مجھے لہو رُلاتا ہے اور اپنی بزدلی پر میں یہاں بیٹھا صبح سے پچھتا رہا ہوں"

"اگر تم ذرا سی بھی ہمت کرتے تو شاید اس کی زندگی بچ جاتی میں نہیں کہتا کہ تم بزدل ہو، تم بہادر آدمی معلوم ہوتے ہو مگر تم سے حساب میں غلطی ہو گئی ورنہ وہ یوں قاتلوں کا نوالہ نہ بنتا۔ وہ میرا دوست تھا اور ابھی اس کے مرنے کی عمر تو نہ تھی۔ یہی کُل چالیس بیالیس سال کا ہو گا وہ۔ مگر وہ بہت دُکھی تھا"

"وہ تو کہتا تھا کہ اس کی عمر اکسٹھ سال ہے"
"جھوٹ بولتا تھا وہ۔ اجنبیوں سے وہ یہی کہا کرتا تھا کہ عمر ساٹھ سال ہے کئی لوگوں سے تو اس نے کہا کہ وہ ستر سال کا ہے"
"مگر کیوں جھوٹ بولتا تھا وہ اپنی عمر کے بارے میں؟"
"میں خود نہیں سمجھ سکا ہوں یہ بات۔ بہرحال اس کی زندگی میں کسی نے زہر گھول دیا تھا۔ وہ آج سے بائیس سال پہلے ایک لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ ان دنوں وہ اکبر کوٹ کے ایک ہائی سکول میں ٹیچر تھا۔ ایف اے تک تعلیم پائی تھی اس نے، اور وہاں وہ سکول میں بچوں کو اردو حساب اور فارسی پڑھاتا تھا۔ وہ لڑکی اس کی محبت کا جواب محبت سے دیتی تھی مگر ایک روز ایسا ہوا کہ ان کے تعلق کی خبر اس کے گھر والوں کو ہو گئی۔ دُردانہ تھا اس لڑکی کا نام۔ وہ کوئی بہت ہی کرخت طبیعت کے جاہل لوگوں کا خاندان تھا۔ اب بھی اکبر کوٹ میں موجود ہیں وہ لوگ تُندوال کہلاتے ہیں۔ دُردانہ کا ایک بھائی تھا غنی تُندوال۔ وہ ایک دن صادق علی کو بہلانے سے بلا کر اپنے گھر لے گیا۔ یہ بیچارہ سمجھا کہ شاید وہ لوگ اس کو اپنا داماد بنانے پر راضی ہو گئے ہیں مگر معاملہ ایسا نہیں تھا۔ غنی تُندوال دراصل اس روز صادق کی بہن شکیلہ کو سکول سے چھٹی کے بعد زبردستی رکشے میں ڈال کر اپنے گھر لے گیا تھا ـــــ وہ بہت ہی خونخوار آدمی تھا اور علاقے بھر کے لوگ اس کے نام سے تھراتے تھے۔ اس نے جب یہ سُنا کہ اس کی بہن دُردانہ کو صادق علی نے اپنی محبت کے جال میں باندھ رکھا ہے تو وہ تاؤ کھا گیا۔

جب صادق علی غنی تُندوال کے گھر پہنچا تو اس کی آنکھیں کُھلی کی کُھلی رہ گئیں۔ غنی نے وہاں اپنے چار غنڈے بُلا رکھے تھے۔ پہلے تو ان لوگوں نے مکان کے پچھلے حصے میں لے جا کر صادق علی کو خوب پیٹا۔ جب یہ ادھ مُوا ہو گیا تو اسے ان لوگوں نے ایک کرسی پہ باندھ کر بٹھا دیا پھر ان پانچوں نے صادق علی کی بہن شکیلہ پر مجرمانہ حملے کئے ـــــ وہ ایسی اذیت تھی جسے صادق علی کبھی نہ بھول سکا۔ وہ چیختا رہا روتا رہا شکیلہ بھی خدا اور رسول کا واسطہ دے کر ان سے اپنی عزت کی بھیک مانگتی رہی مگر انہیں ترس نہ آیا۔ انہوں نے صادق علی کی لاجونتی کے پھول ایسی بہن کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ ان کے گھر میں اس روز کوئی نہ تھا۔

شکیلہ کو یوں ذلیل و رُسوا کر کے ان لوگوں نے رات کے بارہ بجے دونوں بہن بھائیوں کو ایک دوسرے کے ساتھ سینہ بسینہ کر کے رسیوں سے جکڑا اور ایک ٹیکسی میں ڈال کر اکبر کوٹ قصبے سے بیس میل دُور ایک ویرانے میں پھینک آئے۔ وہ ایسی جگہ تھی کہ اُدھر سے کوئی آدمی مشکل سے ہی گزرتا تھا۔ دونوں بہن بھائی اسی بدنصیبی کی حالت میں صبح تک پڑے رہے مگر وہ کسی طرح بھی اپنے بند نہ کھول سکے۔

شاید خدا کو ان کی حالت پر رحم آ گیا تھا۔ صبح کے وقت وہاں سے کوئی شکاری گزرا۔ اس نے ان لوگوں کو اس حال میں دیکھا تو وہ رُک گیا۔ بہن نیم بے ہوش ہو چکی تھی اور بھائی بھی ذلت کی بدترین ساعتوں سے دوچار تھا۔ اس شکاری نے شکیلہ کی برہنگی کو اپنی چادر سے ڈھانپا، پتلون کے نیچے وہ پاجامہ پہنے تھا وہ بھی اتار کر اس نے شکیلہ کو دے دیا کپڑے اس نے صادق علی کو دے دیئے۔

وہ بہت پوچھتا رہا کہ انہیں اس حال کو کس نے پہنچایا ہے مگر اس حد تک ذہنی طور پر مفلوج اور خوف زدہ ہو چکے تھے کہ اسے کچھ بھی بتا سکے شکیلہ بڑی مشکلوں سے چلنے کے قابل ہوئی۔
صادق نے مجھے یہ ساری کہانی خود بتائی تھی۔ میں تمہیں اس کے الفاظ میں بتاتا ہوں سب کچھ ـــــ

اس نے کہا کہ جب وہ شکیلہ کو اپنے ساتھ لے کر اس ویرانے سے اکبر کوٹ کی طرف چلا تو اس نے اپنی ساری تعلیم اپنی ساری شرافت اور ساری تہذیب کو خیرباد کہہ دیا ـــــ اس نے قسم کھائی کہ جب تک غنی تُندوال سے حساب نہ چکا لے گا وہ چین سے نہیں بیٹھے گا۔ وہ بھول ہی گیا کہ غنی تُندوال دُردانہ کا بھائی ہے جس سے وہ محبت کرتا ہے۔ شکیلہ نے اس کی وجہ سے جو ذلت اٹھائی تھی وہ چاہتا تھا کہ اس داغ کو دھو ڈالے مگر نہیں آدمی کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ خدا کے منصوبوں کے آگے آدمی کے منصوبے کیا حیثیت رکھتے ہیں ـــــ

اکبر کوٹ میں داخل ہونے سے پہلے ایک نہر کا پُل عبور کرنا پڑتا ہے یہ بہت بڑی نہر ہے اس کا پُل اکبر کوٹ سے کوئی ایک میل دُور ہے۔ وہ اور شکیلہ وہاں سے اس حال میں گزر رہے تھے کہ ان کے بدن پر موجود ایک بھی کپڑا ان کا اپنا نہیں تھا۔ شکیلہ اس کے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ اپنا منہ سر اس نے چادر میں لپیٹ رکھا تھا۔ وہ اس کی اکلوتی بہن تھی جس کے لئے اس نے بہت سے خیالی شیش محل بنا رکھے تھے وہ چاہتا تھا کہ اسے اچھی تعلیم دلائے۔ وہ بڑی ذہین لڑکی تھی۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے آ رہی تھی اور اسے معلوم تھا کہ وہ مسلسل سسک رہی ہے۔ ایک لمحے کے لئے بھی وہ اپنے جسم اور روح کے اس گھاؤ کو نہیں بھول سکی تھی جو غنی تُندوال اور اس کے ساتھیوں نے لگائے تھے ـــــ وہ بے پناہ ذلت اس نے صرف صادق علی کی وجہ سے اٹھائی تھی۔

اچانک صادق علی کو کسی کے پانی میں گرنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو اس کی بہن غائب تھی۔ وہ دوڑ کر پُل کے جنگلے کے پاس پہنچا وہ بہت بڑی نہر تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے پُرشور پانی نے شکیلہ کو نگل لیا۔ صادق علی بس دیکھتا ہی رہ گیا۔

لڑکی کو نہر میں کودتے دیکھ کر بہت سے لوگ وہاں جمع ہو گئے مگر ان میں سے کوئی بھی نہر میں نہ اُتر سکا کیونکہ شکیلہ کو پُل کے نیچے سے گزرتا ہوا تیز رَو پانی بہا کر آناً فاناً بہت دُور لے گیا تھا۔

اسی دن صادق علی نے تھانے میں رپورٹ درج کرائی اور پولیس کو غنی تُندوال اور اس کے ساتھیوں کی ساری زیادتی سے آگاہ کیا پولیس کو اس نے یہ بھی بتایا کہ شکیلہ اپنی اسی ذلت کی وجہ سے نہر میں کودی ہے، وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہی تھی۔

پولیس نے مقدمہ درج کیا مگر ان میں سے کسی بھی آدمی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ غنی تُندوال پر ہاتھ ڈال سکے۔ وہ سب اس سے خوف زدہ تھے اور جب آٹھ دن گزر گئے اور پولیس کچھ بھی نہ کر سکی تو پھر ایک دن صادق علی کو بھی غنی تُندوال کے دل پر اسی سختی سے ہاتھ ڈالنا پڑا جس طرح اس نے اس کی عزت پر ڈالا تھا۔ دُردانہ سے وہ ان آٹھ دنوں میں ایک بار بھی نہ ملا تھا۔ ایک روز اس نے اسے پیغام بھیجا کہ وہ اسے اس

کے گھر آکر ملے۔ وہ محبت کی ماری سادہ لوح لڑکی اگلے روز اس کے کہنے کے مطابق رات کے دس بجے اس کے گھر آ پہنچی۔ ان کا مکان ساتھ والی گلی میں تھا۔

صادق علی نے مولوی کو بھی بلا رکھا تھا اور اس کے پانچ چھ دوست بھی جمع تھے وہاں۔ دُردانہ کو معلوم ہو چکا تھا کہ صادق علی کے ساتھ اس کے بھائی نے کس قدر ظلم کیا ہے —— اور شکیلہ کس وجہ سے نہر میں کود گئی تھی —— جب اسے معلوم ہوا کہ صادق علی اس سے شادی کرنا چاہتا ہے تو پہلے تو وہ بہت ہچکچائی مگر جب صادق علی نے اسے اپنی قربانیاں یاد دلائیں تو وہ مان گئی۔ اسی رات ان دونوں کی شادی ہو گئی اور صادق علی نے دوستوں کو رخصت کر کے غنی تندوال کی ہمشیرہ کے ساتھ وہیں شب زفاف منائی۔ وہ اسے اپنی زندگی کی سب سے بڑی فتح قرار دیتا تھا —— گزشتہ آٹھ دنوں میں اس نے اپنی ساری جمع پونجی یا تو دُردانہ کے لئے تحفے خریدنے پر صرف کی تھی یا اسلحہ خریدنے پر۔ اس نے ایک پستول حاصل کیا اور ایک عمدہ قسم کی ولائتی سٹین گن۔ اس کے علاوہ اس نے بہت سی گولیاں اور کارتوس بھی جمع کر لئے تھے وہ سب چیزیں اس نے ناجائز طور پر حاصل کی تھیں مگر وہ کہتا تھا کہ وہ ایک بھیڑیئے سے مقابلے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ اس عرصے میں اس نے چھپ چھپا کر نشانہ بازی کی بھی مشق کر لی۔

دُردانہ کے ساتھ رات گزار کر جب وہ صبح اٹھا تو اس نے غنی تندوال کو پیغام بھیجا کہ وہ آ کر اپنی بہن کو لے جائے اور باقاعدہ جہیز کے ساتھ رخصت کرے۔ نکاح نامے کی ایک نقل بھی اس نے اس بڑھیا کے ہاتھ بھیج دی جو اس کا پیغام لے گئی تھی۔

غنی تندوال نے وہ پیغام سنا تو خونخوار درندے کی طرح غراتا ہوا صادق علی کے مکان کی طرف لپکا۔ دروازہ صادق علی کی ماں نے کھولا۔ غنی تندوال نے دو گولیاں اس کے سینے میں اتار دیں —— یہ سب سے بڑی قیمت تھی جو صادق علی کو دُردانہ کے لئے ادا کرنا پڑی۔ غنی تندوال کے ساتھ اس کے دو بھائی اور ایک چچا اور دو دوست بھی تھے۔ وہ دندناتے ہوئے صحن میں داخل ہوئے —— غنی ہنکارا۔

"باہر نکل اوئے چوہے کی اولاد! دیکھ ہم تیرے لئے کیا لائے ہیں؟"

جونہی یہ لفظ اس کے منہ سے نکلے صادق علی نے سٹین گن کی گولی سے اسے بھون ڈالا۔ وہ سامنے ہی کھڑکی کے پردوں کے پیچھے دیوار کی اوٹ میں بیٹھا تھا اور سارے اسلحے اس کے ہاتھ تلے تھے —— اس نے صحن میں کھڑے ان سب آدمیوں پر باڑھ ماری۔ ان میں سے ایک بھی زندہ نہ بچ سکا —— غنی تندوال کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ وہ بزدل سا سکول ماسٹر اسلحہ لے کر اس کے مقابلے میں ڈٹ جائے گا۔ صادق علی کا صحن لاشوں سے اٹ گیا تھا۔ اپنی ماں کی لاش دروازے پر دیکھ کر اس کی دنیا ہی اندھیر ہو گئی تھی۔ وہ کہتا تھا کہ اسے یوں لگا جیسے اس کا اس دنیا میں کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا۔

دُردانہ اس وقت مکان کے پچھلے حصے میں تھی۔ گولیوں کی تڑ تڑ اس نے سنی تو بھاگی ہوئی اس کمرے میں پہنچی جہاں صادق علی سٹین گن دوبارہ لوڈ کر رہا تھا۔ اس کی نظر صحن میں اپنے تین بھائیوں اور چچا کی لاشوں پر پڑی تو وہ چیخنے لگی۔ بال نوچنے لگی۔

صادق علی کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ اپنے بھائیوں کا ماتم نہیں کر رہی اسے گالی دے رہی ہے۔

"چپ ہو جا۔ یہ ڈرامہ بند کر کُتیا۔ دیکھتی نہیں تیرے اس بدمعاش بھائی نے میری ماں کو قتل کر دیا ہے۔ وہ دیکھ تیری ساس کی لاش بھی پڑی ہے اس پر تجھے کوئی رونا نہیں آتا۔" اس کی یہ بات سن کر اس کا دماغ الٹ گیا —— نفرت کی چنگاریاں اس کی آنکھوں سے پھوٹنے لگیں اس نے صادق علی کے دائیں ہاتھ گولیوں کے ڈھیر کے نزدیک رکھے پستولوں میں سے ایک اٹھا لیا۔ وہ بھرا ہوا پستول تھا۔ بھائیوں کے غم نے اسے اس حد تک ذہنی صدمہ پہنچایا تھا کہ اس نے پے بہ پے صادق علی پر تین فائر کر دیئے۔ وہ اس آدمی کو ختم کر دینا چاہتی تھی جس نے اس کی خاطر اپنی زندگی تباہ کر لی تھی —— مگر صادق علی کی خوش قسمتی کہ ایک بھی گولی اسے نہ لگی۔

اپنی اس ناکامی سے جھنجلا کر دُردانہ نے پستول کی نالی منہ میں رکھ کر لبلبی دبا دی اور وہیں ڈھیر ہو گئی۔ صادق علی کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ وہ لڑکی جس کے لئے اس کے چاروں طرف خون کا تالاب بن گیا تھا۔ جس کو حاصل کرنے کی تگ و دو میں اس کی بہن بھی زندگی کی سرحد سے گزر گئی اور اس کی ماں بھی۔ وہ لڑکی اپنے بھائیوں کی محبت میں اس قدر اندھی ہو گئی کہ اس نے صادق علی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دنیا کی خوشی سے محروم کر دیا۔

اس عرصے میں کسی نے تھانے میں اطلاع کر دی کہ غنی تندوال اور اس کے ساتھی مارے گئے ہیں۔ پولیس والوں کے لئے یہ اس سال کی سب سے بڑی خوش خبری تھی۔

تھانیدار ایک پوری گارد لے کر گلی میں آ دھمکا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ اگر صادق علی کو گرفتار کر لیتے تو اسے کبھی نہ بخشتے۔ اتنے سارے آدمیوں کا خون تھا اس کی گردن پر۔ صادق علی ان سے بچنے کے لئے گھر کے پچھواڑے سے دیوار پھاند کر دوسرے مکان میں کودا اور پھر کوٹھے پر دوڑتا ہوا وہ تیسری گلی میں نکل گیا۔

صادق علی نے مجھے بتایا کہ جب وہ اپنے گھر سے بھاگا تو جیب میں صرف ستر روپے تھے اور سیاہ کمبل کے نیچے اس نے کوٹ کی جیبیں گولیوں سے بھر رکھی تھیں۔ صرف ایک پستول تھا اس کے پاس باقی سب کچھ وہ وہیں چھوڑ آیا تھا۔ آنکھیں اس کی لہو روتی تھیں کہ وہ اس ماں کو جس نے زندگی بھر اسے ہر مشکل اور مصیبت میں پناہ دی تھی اپنے ہاتھوں لحد میں بھی نہ اتار سکا۔ رہ رہ کر اسے اپنی ماں کی بے گور و کفن لاش

دروازے میں پڑی دکھائی دیتی تھی۔ اس کی آنکھیں ایک عرصے تک ماں کی اس نہایت حسرتناک موت سے بھری رہیں۔

وہ اکبر کوٹ سے نکلا تو میانوالی کی بس میں جا بیٹھا —— وہیں میری اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ میں اس دن دو ملزموں کو کُندیاں سے میانوالی لے جا رہا تھا عدالت میں پیش کرنے کے لئے۔

اس وقت میں ہیڈ کانسٹیبل ہو چکا تھا —— وہ دونوں ڈنگر چور تھے مگر اپنی مرضی سے یہ کام نہیں کرتے تھے بلکہ مٹرکال گاؤں کے زمیندار افضل جھالا کے کہنے پر وہ آس پاس کے گاؤں میں تباہی مچاتے تھے۔ جس کی چاہتے تھے فصل اجاڑ دیتے تھے، آگ لگا دیتے تھے۔ جھالا جس کا سر اپنے قدموں میں جھکانا چاہتا تھا اسے اپنے ان دونوں خوفناک غنڈوں کے ذریعے ذلیل کراتا تھا اور میں نے بڑی تگ و دو کے بعد ان دونوں کو گرفتار کیا تھا۔ ایک کا نام جیلا تھا اور دوسرے کا رسیلا۔

مجھے یقین تھا کہ ان کی گرفتاری اور عدالت کی طرف سے ان کو سزا دلوانے کے بدلے میں میری محکمانہ طور پر حوصلہ افزائی ہو گی۔ اسی لئے میں نے جی جان سے اس کیس پر محنت کی تھی مگر مجھے افضل جھالا کی قوت کا صحیح اندازہ نہیں تھا۔

اس وقت بس کُندیاں سے دس میل دُور تھی جب دو آدمیوں نے ہاتھ دے کر اسے رکوا لیا۔ وہ دونوں آدمی کھیسوں کی بُکل مارے ہوئے تھے بڑے تگڑے جوان تھے وہ دونوں ——

وہ بس میں سوار ہوئے تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ کوئی عام سے گنوار دیہاتی ہیں۔ سروں پر ان دونوں نے پگڑیاں باندھ رکھی تھیں بس میں سوار ہو کر انہوں نے چاروں طرف بہت غور سے دیکھا اور پھر میرے سامنے والی خالی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئے۔ جیلے اور رسیلے کو انہوں نے بہت گہری نظر سے دیکھا۔ ایک بولا۔

"ہشکے بھئی یہ سرکاری مہمان بھی بیٹھے ہیں یہاں۔ کیوں بھئی! ٹیکل چور ہو کر سکوٹر چور۔ کس لئے باندھا ہے کہاں صاحب ان کو آپ نے؟"

"تمہیں کیا تکلیف ہے؟ تم اپنے کام سے کام رکھو۔" میں نے اسے ڈانٹ دیا۔

"ہشکے بھئی! گولیاں بھی گرم ہیں اور حکیم بھی گرم ہے۔ کیوں بھئی سوار خان کیا خیال ہے تیرا؟ لگ جائے پراٹھا پھر ابھی ابھی؟"

"ابھی نہیں بھئی۔ پراٹھے تو تیرے پنڈ جا کر لگیں گے۔ لے تو سگرٹ چھک ذرا شرنو میرے یار۔" سوار خان بولا۔ وہ دونوں ترنگ میں تھے۔

"آپ بھی چکھیں سگرٹ کہاں صاب! ولائتی سگرٹ ہے لو چکھو۔" اس نے سگرٹ میری طرف بڑھایا مگر میں نے اس کا ہاتھ پرے جھٹک دیا ——

ان کی باتیں سن کر مجھے طیش آنے لگا تھا۔ میں تو انہیں عام سے گنوار دیہاتی سمجھا تھا مگر وہ دونوں بہت پہنچے ہوئے بزرگ دکھائی دے رہے تھے ——

میں نے ان سے بیزار ہو کر بڑے غصے سے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اس پر شرفو بولا۔

"گورنمنٹ تو ناراض معلوم ہوتی ہے۔ مگر یار بندی والو تم ہی پیو۔ پتہ نہیں تمہاری تقدیر میں آگے کیا لکھا ہے؟ تو چکھو ذرا۔ کیا نام ہے سوار خان اس سگرٹ کا؟"

"اکبرا مجھے اس کا نام تیا رہا تھا کہتا تھا باڑے سے لایا ہوں تو ہاں ہاں۔ رتھ مان تیا رہا تھا اس کا نام۔"

"چل دفع کر نام کو، تو کش لگا اور ان کو بھی دے۔ دیکھ تو کیسے کُتے کی طرح زبان مار رہا ہے لبوں پر، سگرٹ دیکھ کر۔"

"اوئے یہ بکواس بند کرو اور آرام سے بیٹھو ورنہ چمڑی اُدھیڑ دوں گا میں تمہاری۔" میں نے ان کو پھر ڈانٹا۔ وہ دونوں مسکرا دیئے —— بڑے ڈھیٹ تھے وہ حرامزادے ——

سوار خان نے میری بات سنی اَن سنی کر کے جیلے اور رسیلے کو ایک ایک سگریٹ سلگا کر تھما دیا اور وہ دونوں بہت مطمئن انداز میں کش لگانے لگے لگتا تھا وہ چاروں آپس میں گھل مل گئے ہیں۔ میرے پاس اس وقت پکی رائفل تھی تھری ناٹ تھری کی اور وہ میں نے لوڈ کر رکھی تھی۔ دونوں ملزموں نے دیکھتے ہی دیکھتے وہ سگریٹ ختم کر دیئے۔

"لو اور چکھو یارو! پتہ نہیں پھر تمہیں کچھ مل بھی سکے گا کہ نہیں۔" یہ کہہ کر سوار نے ان دونوں کو ایک ایک سگریٹ اور دے دیا۔

ابھی ہم کُندیاں سے آٹھ میل ہی آگے نکلے تھے۔ کہ سوار خان نے ایکدم ہاتھ مار کر مجھ سے رائفل چھین لی۔ میں تو ہکا بکا رہ گیا —— میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کوئی آدمی پولیس کے سپاہی سے بس میں بیٹھ کر ایسی حرکت بھی کر سکتا ہے۔ رائفل لوڈ تھی —— ابھی میں اپنی حیرت پر قابو بھی نہ پا سکا تھا کہ شرفو نے مجھ پر پستول تان لیا ——

"بس روکو اوئے —— ! روکو یہاں اپنی ماسی کو۔" سوار خان نے اٹھ کر رائفل کی نالی کا رخ ڈرائیور کی طرف کر دیا —— ڈرائیور بیچارا خوفزدہ ہو گیا مگر اس کا کنڈکٹر صورت حال کو پوری طرح نہ سمجھ سکا۔ وہ ایک دم سوار خان کی طرف لپکا مگر ابھی وہ اس تک پہنچ نہ سکا تھا کہ کسی نے راستے میں اڑنگا دے کر اسے بس کے فرش پر گرا دیا اس کے ساتھ ہی ٹھز کی آواز پیدا ہوئی۔ سوار خان نے ڈرائیور پر گولی چلا دی تھی۔ مگر اس کا نشانہ ذرا چُوک گیا۔ گولی ڈرائیور کا بازو چُومتی ہوئی نکلی اور بس کا شیشہ توڑ گئی۔ ڈرائیور نے بے بس ہو کر بس روک لی۔

"چل اوئے اٹھ ماں کے خصمے۔ چل نیچے —— تم دونوں بھی اترو یارو جلدی۔" سوار خان نے مجھے للکارا۔ اس کے ساتھ ہی رسیلا اور جیلا مجھے بازوؤں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے بس کے دروازے کی طرف بڑھے۔ میں ان کے ہاتھوں میں کھلونے کی طرح بیبس ہو کر رہ گیا —— وہ سب مسلح تھے اور میری جان سخت خطرے میں تھی۔

"خبردار — اگر کسی نے حرکت کی تو گولی مار دوں گا" سوار خان نے خوفناک آواز میں بس کے مسافروں کو دھمکایا اور اس کے ساتھ ہی ان لوگوں نے دھکا دے کر مجھے بس سے باہر پھینک دیا جس پٹی کے ساتھ ان دونوں کی ہتھکڑیاں بندھی تھیں، وہ بھی انہوں نے اتار لی تھی — تب میں سمجھا کہ افضل جھالا نے جیلے اور سیلے کو چھڑانے کے لئے شرفو اور سوار خان کو میرے پیچھے بھیجا تھا۔ ان کا ایک اور ساتھی پہلے ہی بس میں بیٹھا تھا اور اسی نے کنڈکٹر کو اڑنگا دیا تھا۔

وہ سب بس سے اتر چکے تو سوار خان نے رائفل کا بٹ مار کر بس کی کھڑکی کا ایک شیشہ زبردست دھماکے سے توڑ دیا پھر گرج کر بولا۔

"جا اوئے کُتی کے پُتر! لے جا اب اس ماسی کو جلدی سٹارٹ کر راسے"

ڈرائیور نے اس کی یہ بات سنی تو فوراً ہی پہلے گیئر میں ڈال کر بس کو بھگاتا ہوا دور لے گیا۔ اب وہ پانچوں مجھے گھیرے میں لے کر کھیتوں کی طرف دھکیل رہے تھے۔ بس دیکھتے ہی دیکھتے موڑ کاٹ کر نظروں سے اوجھل ہو گئی سارا منظر بدل گیا تھا۔ اب دُور دُور تک کوئی آدمی نظر نہیں آتا تھا اور ان پانچوں کے تیور ایسے تھے جن سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے۔

دائیں ہاتھ مکئی کے کھیت تھے۔ یہ اونچے اونچے ٹانڈوں والی مکئی یہاں سے وہاں تک پھیلی ہوئی تھی۔ سب سے زیادہ تکلیف دہ رویہ سوار خان کا تھا وہ ٹھہر ٹھہر کر میرے منہ پر طمانچے مار رہا تھا۔ کبھی پیچھے سے لات جما دیتا کبھی میری گُدّی میں دھول مار دیتا۔ وہ اپنے کسی پرانے زخم کا حساب چکار رہا تھا۔ جو اسے کسی پولیس والے کے ہاتھوں لگا تھا مگر اس کی ہر ضرب مجھے رلائے دیتی تھی۔ بہت سخت ہاتھ تھا اس کا اور میں بھلا کہاں عادی تھا اس قسم کی مار کا۔ میں نے تو پولیس میں بھرتی ہونے کے بعد حکومت ہی کی تھی۔ مار ہی تھا لوگوں کو، مار کیا چیز ہوتی ہے اس کا تو مجھے قطعاً کوئی اندازہ نہیں تھا۔

"یار میرا خیال ہے سیلے، جیلے! تم دونوں فوراً یہاں سے نکل جاؤ — ہم آجائیں گے بعد میں۔ ابھی تو ہمیں اس کا بھی ٹنٹا ختم کرنا ہے۔ پھر اُدھر لُدھڑ کے پاس بھی جانا ہے۔ بڑا زوردار پروگرام بنا رکھا ہے اس نے آج رات کے لئے کیوں بھئی شرفو ٹھیک ہے کہ نہیں؟"

"ہاں بھئی ہمارا یہ کام تو پورا ہو گیا کھول دے ان کی یہ ہتھکڑی اور اس کی وردی اتار کر جیلے کو دے دے کبھی کام ہی آئے گی ہمارے" یہ شرفو کی تجویز تھی۔ میں تو سر پیٹ کر رہ گیا۔ میں نے دل میں کہا "حرامزادو تمہارے ہاتھوں میری یہ دُرگت بھی بننا تھی۔ یہ ذلت بھی لکھی تھی میری تقدیر میں" مگر مرتا کیا نہ کرتا۔ میں چپ چاپ ان کی یہ زیادتی بھی سہہ گیا۔

جرسی اور بوٹوں سمیت انہوں نے میرے تمام کپڑے میرے جسم سے الگ کر لئے۔ اب میں ان کے سامنے ایک نیکر میں برہنہ کھڑا تھا اور وہ مجھے وہاں مکئی کے کھیت میں اپنے سامنے ننگا دیکھ کر ہنس رہے تھے۔ ایک دوسرے سے فحش مذاق کر رہے تھے۔ میں اس ذلت کو کبھی نہ بھول سکوں گا جیلانی میاں خدا کی قسم وہ بدترین دن تھا میری زندگی کا۔

پھر یوں ہوا کہ ان لوگوں نے میرے دونوں ہاتھ میری پیٹھ کے پیچھے باندھ دیئے — اس کے بعد انہوں نے میری آنکھوں پر یہ بڑی سی پٹی کس کر باندھی میرے تو پسینے چھوٹ گئے۔ وہ مجھے گولی مار دینے کی تیاری کر رہے تھے۔

"سوار خان! دوسری گولی کی ضرورت نہ پڑے۔ ہمیں کھان صاب کو زیادہ تکلیف نہیں دینی چاہئے صاف ستھرا کام ہونا چاہئے۔"

"صاف ستھرا ہی ہوگا پیارے! کوئی اناڑی سمجھا ہے تو نے مجھے لے ذرا کر کھڑا کھان صاب کو سیدھا کر کے" انہوں نے میرے منہ میں ایک موٹا سا گول پتھر ڈال کر اوپر سے کپڑا باندھ دیا تھا۔ حالت میری یہ تھی کہ نہ میں بول سکتا تھا نہ دیکھ سکتا تھا اور پانچوں بدبخت میرے سامنے کھڑے آپس میں میرے بارے میں سخت فحش مذاق کر رہے تھے۔ ان کے لئے میں دل لگی کا سامان بن گیا تھا۔

جہاں ہم کھڑے تھے وہاں سے سڑک چار فرلانگ دور تھی۔ میں اپنی زندگی سے قطعاً مایوس ہو چکا تھا وہ مجھے گولی مار دینے کا فیصلہ کر چکے تھے

"جلدی کر یار شرفو! اس کی ٹانگیں بھی باندھ دے۔ نشانہ چُوک گیا یا یہ خود ہل گیا تو دو گولیاں خرچ کرنی پڑیں گی۔ کس کر باندھ دے اس کی ٹانگیں۔" شرفو نے میری ٹانگیں پکڑ لیں بولا۔

"بڑا پلا ہوا سؤر ہے یہ۔ دیکھ تو سندھی پائے ایسی ٹانگیں ہیں اس کی۔ اِدھر کر اوئے بہن کے منگین۔ اپنی دونوں ٹانگیں ساتھ ملا۔ تیرے چلنے کا وقت آگیا ہے بچّو" یہ کہہ کر اس نے میری ٹانگیں اکٹھی کر کے ان کو کس کے پٹکے سے کس کر باندھ دیا۔ مجھ سے اپنا وزن نہ سنبھالا گیا اور میں دھڑام سے نیچے گر گیا۔ مکّی کے ٹانڈے بولتے ہوئے میرے ساتھ گرے اور اس کے ساتھ ہی یکے بعد دیگرے تیزی سے پانچ چھ گولیاں چلیں، تڑ تڑ تڑ تڑ اور میرے اردگرد چیخیں ہی چیخیں پھیل گئیں۔

"اوئے میں مر گیا شرفو! یہ کون ماں کا یار گولی چلا رہا ہے"

سوار خان کی آواز تھی وہ میرے قریب ہی گر گیا تھا۔

"اوئے بیڑہ غرق" ایک اور دلدوز چیخ ذرا فاصلے سے ابھری وہ شرفو کی تھی۔ میری آنکھیں بھی بند تھیں اور منہ بھی مگر کان کھلے تھے کسی نے ان سب کو شاید باڑھ مار دی تھی۔ وہ میرے چاروں طرف گرے تھے اور پھر اچانک کسی نے میری آنکھوں سے اور منہ پر سے پٹی اتار لی مجھے یوں لگا جیسے ماں کے پیٹ سے نکل کر پہلی بار روشنی دیکھ رہا ہوں میرے سامنے وہ آدمی کھڑا تھا جو سیاہ کمبل کی بُکّل مارے بس میں میرے ساتھ کی سیٹ پر چپ چاپ بیٹھا تھا۔ اس نے میرے ہاتھ اور پاؤں کھول کر مجھے کھڑا کیا تو میں حیران رہ گیا۔ سوار خان، شرفو، جیلا اور ان کا پانچواں ساتھی میرے سامنے اوندھے سیدھے پڑے تھے۔ وہ سب خاصے زخمی تھے اور ہتھیار ان سے چھین چکے تھے۔

"تم..... تم نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے جوان! تم وہی ہونا جو میرے ساتھ بس میں بیٹھے تھے میرے قریب ہی"

"ہاں۔ وہی ہوں —" وہ آدمی میری پتلون جیلے کے ہاتھ سے کھینچ کر مجھے دیتے ہوئے بولا۔ میں نے جلدی سے اس میں اپنا بدن چھپایا۔

"میں کس منہ سے تمہارا شکریہ ادا کروں جوان! یہ تو مجھے گولی مارنے لگے تھے"

"میں دیکھ رہا تھا" اس نے میری قمیص اور سوئیٹر بھی میری طرف بڑھا دیئے۔

"مگر تم نے کس طرح ہمت کر لی؟"

"میں — بس پاگل آدمی ہوں — اور پاگل پن میں ایسی ہمت کر ہی لیتا ہے آدمی"

"نہیں جوان — تم تو میرے لئے رحمت کا فرشتہ بن گئے ہو مگر یہ سب ہوا کیسے؟"

"ذرا آگے جا کر میں بس سے اتر گیا تھا —" اس نے اب میرے بوٹ میری طرف بڑھائے۔ جیلا سیلا اور سوار خان مجھے گالیاں دے رہے تھے —

شرفو بھی کراہ رہا تھا اور ان کا پانچواں ساتھی جس کا نام گل شیر تھا بے ہوش ہو چکا تھا —

میں نے بوٹوں کے تسمے بند کئے تو میری رائفل اس آدمی نے مجھے دے دی۔

"مگر تمہیں مجھے بچانے کا خیال کس طرح آیا۔ تم جانتے تھے کہ یہ کتنے خطرناک لوگ ہیں؟" میں نے اس آدمی سے پوچھا۔

"تم تنہا تھے۔ مجھے تم پر بہت ترس آرہا تھا۔ میں ایسے بہت سے شُہدوں کو جانتا ہوں — بالکل خصّی ہوتے ہیں ایسے لوگ۔ وہ ان ہی جیسے تھے جن سے میں ابھی نمٹ کر آرہا ہوں"

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"میرا نام صادق علی ہے"

"کون لوگ تھے وہ جن سے تم نمٹ کر آئے ہو؟"

"غنی تندال کا نام سنا ہے تم نے؟"

"ہاں — وہ جو اکبر کوٹ کا بدمعاش ہے؟"

"ہاں — میں نے اسے قتل کر دیا ہے۔ اس کے دو بھائیوں کو اور اس کے چچا کو بھی مار آیا ہوں۔ اس کے دو دوست بھی خرچ ہو گئے تھے اس پر" اس نے مجھے مختصر الفاظ میں اپنی کہانی سنائی۔

"بہت بڑا کارنامہ کیا ہے تم نے — مگر اب کہاں پر جا رہے تھے تم؟"

"میرا اب اکبر کوٹ میں کچھ بھی نہیں رہا۔ میری ماں، میری بہن اور وہ جسے میں زندگی سے زیادہ چاہتا تھا۔ تندال کی بہن وردانہ، سب ختم ہو گئے، میں مجھے اب جینے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے مگر میں پولیس جیل اور پھانسی گھر کے چکّر سے بچنا چاہتا ہوں" اس نے بڑے دلگیر لہجے میں کہا۔ وہ بہت دُکھی تھا۔

تب جیلانی میاں! میں نے سوچا کہ اس جوان کے احسان کا کچھ نہ کچھ بدلہ تو مجھے چکانا ہی چاہئے۔ میں کہہ سکتا تھا کہ ان پانچوں کو وہاں... کھیت میں میں نے مقابلہ کر کے ڈھیر کر دیا ہے کوئی میرا بال بیکا نہ کر سکتا تھا۔ اگر میں صادق علی کو اس قصّے سے بالکل نکال دوں تو میرا کوئی کچھ نہ بگاڑ سکے گا۔ بس یہی بات سوچ کر میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں اس کی ضرور مدد کروں گا۔ اس نے وہیں بیٹھ کر مجھے تفصیل سے جب اپنی کہانی سنائی تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ تو بہت ہی مظلوم ہے۔

ان دنوں میرا ایک دوست ادھر کاموکی میں ایک پرائیویٹ سکول میں پڑھاتا تھا۔ میں نے صادق علی کو وہیں کھڑے کھڑے ایک رقعہ لکھ کر دیا کہ وہ اسے لے جا کر میرے دوست کو دے دے۔ وہ اسے نوکری بھی دے گا اور رہنے کے لئے جگہ بھی فراہم کر دے گا۔ صادق علی نے میری تجویز پسند کی اور میرا رقعہ لے کر وہیں سے مجھ سے رخصت ہو گیا۔

مگر وہ سیدھا کاموکی نہیں پہنچا۔ وہ پہلے لاہور گیا۔ وہاں سے اس نے ایک خاص قسم کا تیزاب لیا اس میں کچھ چیزیں اس نے خاص تناسب سے ملائیں۔ مجھے اس نے بہت بعد میں ایک ملاقات کے دوران بتایا کہ وہ نسخہ اس نے ایک حکمت کی کتاب میں دیکھا تھا۔ اس کے مطابق اس نے ایک خاص قسم کی دوا تیار کی پھر وہ دوا اس نے ایک خاص طریقے سے اپنے چہرے کے کچھ حصّوں پر، ہاتھوں پر، پیٹ پر اور ٹانگوں پر اس طرح ملی کہ جہاں جہاں وہ دوا لگی وہیں وہیں سے اس کی جلد جل گئی۔ اور نیچے سے جلد کی دوسری پرت یوں ابھر آئی کہ دیکھنے والا یہی سمجھتا تھا کہ ماسٹر صادق علی کو برص کا مرض ہے۔

اس طرح اس نے اپنا حلیہ کچھ یوں تبدیل کر لیا کہ زندگی بھر کے لئے وہ پولیس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اپنا چہرہ بدل کر جب وہ کاموکی پہنچا تو میرے دوست نے اسے یہاں کمال پور بھیج دیا۔ یہ مکان میرے دوست کا جدّی پشتی مکان ہے۔ وہ اسے غیر آباد نہ رکھنا چاہتا تھا۔ اس نے سوچا کہ کیوں نہ یہاں صادق علی کو آباد کر دے۔ سو یہی ہوا۔ صادق علی یہاں آکر رہنے لگا۔

ایک رُوپوش کی حیثیت سے اس نے یہاں اپنی پوری زندگی چپ چاپ گزار دی۔ یہاں تک کہ اس گاؤں کے لوگ اس کی شرافت اور دیانت کی قسم کھاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب آرسی نے اپنی بیٹی کی بپتا مجھے سنائی تو میں نے فیصلہ کر لیا کہ زینو کو قانون کی چکّی سے نکال کر

صادق علی کی چھت تلے بٹھا دوں گا۔ اسی لئے میں زینو کو یہاں چھوڑ گیا تھا مگر اب جو کچھ تم نے بتایا ہے جیلانی! یہ سب میرے لئے بے حد تکلیف دہ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ چوہدری کو پھانسی کے تختے تک پہنچا دوں۔ یہ کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔ آج ہی دونوں کُتے پکڑے جا سکتے ہیں۔ ان کا فوراً طبی معائنہ ہو سکتا ہے کہ ان پر کس نے ستم توڑا ہے مگر..... مگر صادق علی کا جرم تو اسی قابل تھا۔ اس پر تو کُتے چھوڑنے ہی چاہیئے تھے۔"

یہ کہہ کر وارث علی خلا میں گھورنے لگا۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم تھا اور زینو ابھی تک واپس نہ آئی تھی۔ پھر اچانک وارث علی کو کچھ یاد آیا، بولا — "یار میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی ہے کہ وہ اس طرح مُردہ عورتوں کو کیوں ذلیل کرتا تھا۔ شکل تو اس نے اپنی بگاڑ ہی لی تھی — کام بھی اس نے بجوؤں ایسے شروع کر دیئے — آخر کیوں؟"

"میرا خیال ہے وارث علی! اسے عورتوں سے نفرت ہو گئی تھی وہ کہتا تھا کہ عورتیں اس قابل نہیں ہوتی ہیں کہ ان سے محبت کی جائے وہ بہت قیمت مانگتی ہیں اپنے بدن کی۔ عورت چاہتی ہے کہ اس کا عاشق اس پر اپنی ماں باپ بہن بھائی سب کچھ قربان کر دے۔ بہت اونچی قیمت لگاتی ہے وہ اپنی محبت کی۔ مَیں تو دے بھی چکا وہ قیمت مگر پھر بھی محروم ہوں۔ تو..... تو پھر مَیں لعنت نہ بھیجوں ان عورتوں پر — ان سے زیادہ بڑا خسارے کا سودا اور کون سا ہو گا جیلانی میاں — وہ مجھ سے یہی کہا کرتا تھا اور اس کے تجربے کی روشنی میں دیکھیں تو یہ بات کچھ بھی نصیحت انگیز نہیں رہتی۔

مجھے حیرت ہے جیلانی میاں — وہ بہت بڑی پناہ گاہ تھا میرے لئے اور میری اس بیٹی کے لئے، جسے آسی نے جنم دیا۔ تم نے زینو کو بھی دیکھا ہے اور مجھے بھی۔ خدا کی قسم کھا کر کہو کوئی فرق دیکھا ہے تم نے ہماری صورتوں میں؟ وہ ہو بہو میری شبیہ نظر آتی ہے۔ اسی لئے میں اسے موت کی تند و تیز آندھیوں سے بچانے کے لئے یہاں لے آیا تھا۔ صادق علی کی زندگی میں مجھے زینو کے بارے میں قطعاً کوئی تشویش نہیں تھی۔ زینو بھی اس کی بے حد عزت کرتی تھی مگر اب اس کے سر سے وہ سایہ ہی اُٹھ گیا ہے۔ میں اس چوہدری کو سزا دلوائے بغیر نہیں رہوں گا خدا کی قسم! صادق علی کا مجھ پر بڑا حق تھا۔ میں اس کی موت رائیگاں نہ جانے دوں گا۔"

"میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں وارث علی! مگر یہ بھی تو سوچو کہ میں صادق علی کے قتل کا واحد عینی شاہد ہوں۔ ابھی تک چوہدری کو یہ علم نہیں ہے کہ میں اس کے گاؤں میں چھپا ہوں اور صادق علی کے گھر میں رہتا ہوں اس نے رات پہلی بار میری صورت دیکھی تھی اگر معاملہ صادق علی کے قتل کا عدالت تک پہنچا تو تمہیں میری گواہی کی ضرورت ہو گی جو میں ایک معذور ہونے کی وجہ سے کبھی نہ دے سکوں گا۔ پھر اگر کسی طرح چوہدری نے مجھے یہاں شناخت کر لیا تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ یہی اس کی کوشش ہو گی کہ وہ مجھے ختم کر دے۔" میں نے اپنے اندیشے ان پر ظاہر کر دیئے۔

"تم فکر نہ کرو جیلانی میاں! میں کچی گولیاں نہیں کھیلا ہوں — تم آج ہی زینو کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ۔ اپنی والدہ کے پاس چلے جاؤ اور شہر میں الگ مکان لے کر رہنے لگو۔ میں صادق علی کے قتل کی تفتیش شروع کرا دیتا ہوں۔"

"اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ صادق علی کا فعل ساری دنیا کے سامنے الم نشرح ہو جائے گا۔ زینو بھی جان جائے گی کہ جس آدمی پر وہ اپنے باپ کی طرح بھروسہ کرتی تھی کس قدر گھناؤنے کردار کا مالک تھا۔ چوہدری کو اگر قتل کا اعتراف کرنا پڑا تو وہ یہ بات تو عدالت کے سامنے ضرور ہی کہے گا..... کہ صادق علی پر اس نے کُتے کیوں چھوڑے تھے؟" میں نے وارث علی کو سمجھایا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو جیلانی میاں! کوئی حل سمجھ میں نہیں آتا مجھے۔" ابھی وہ یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ زینو سامنے کی چھت پر نمودار ہوئی اس نے اپنے باپ کو سامنے دیکھا تو تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی نیچے آ گئی اور دوڑ کر وارث علی کے سینے سے جا لگی۔ خون اپنا کرشمہ دکھا رہا تھا —

"آپ کب آئے چاچا؟"

"میں..... میں، بس کوئی دو گھنٹے تو ہو ہی گئے ہوں گے سُنا ہے تمہاری سہیلی نوراں مر گئی ہے۔"

"ہاں چاچا! کنواری تھی بیچاری۔ پتہ نہیں کیا ہوا بس پیٹ میں درد اٹھا تھا اس کے — چار دن بھی نہ سہہ سکی وہ درد۔"

"ہمیں افسوس ہے بیٹی — وہی تو سہیلی تھی تمہاری اس گاؤں میں۔"

"زینو! ہمیں بھوک لگی ہے ہمشیرہ۔ کچھ ہمارے بارے میں بھی سوچو۔" میں نے اسے یاد دلایا۔

"اوہ مجھے تو خیال ہی نہیں رہا ہے جیلانی بھائی! وہ ماسٹر پتہ نہیں کہاں چلے گئے ہیں؟ ساتھ کے گاؤں گوکل پور سے وہ گوشت لا دیتے تھے۔ گامی بھینس لے کر اُدھر چھمب کی طرف گیا ہو گا۔"

"گوشت تو ضرور پکنا چاہیئے زینو! تمہارے چاچا آئے ہیں، ان کی گھوڑی پر جاتا ہوں ابھی لے آؤں گا۔"

"تو پھر ضرور جائیں۔ دو سیر گوشت لے آئیں وہاں وہ فقیرو ہو گا۔ بڑا اچھا جانور کاٹتا ہے وہ روزانہ۔"

"اتنی ساری باتیں معلوم ہیں تمہیں اس کے بارے میں۔ خیر لاؤ میں جاتا ہوں۔"

"کیا لاؤں؟ تھیلا دے دوں آپ کو؟"

"ہاں تھیلا بھی دے دو۔" یہ کہہ کر میں پلنگ سے اٹھ کر کمرے میں جا گھسا۔ میں نے اوور کوٹ پہنا اس کے نیچے پستول لٹکایا جس کی پیٹی پر گولیاں عجیب بہار دکھاتی تھیں۔ مجھے اب اسلحے سے محبت ہو گئی تھی۔ اس سے زیادہ انسان دوست اور انسان دشمن چیز اور کوئی نہ ہو گی۔ یہ بچاتا بھی ہے اور تباہ بھی کرتا ہے۔ مگر ہاتھ ہاتھ اور قسمت قسمت کے فرق کی بات ہے اور یہ اسلحہ اچھی قسمت اور بُری قسمت کے درمیان فیصلہ کن لکیر کھینچ دیتا ہے۔ صادق علی میرے لئے بہت عمدہ قسم کی ٹوپیاں لایا تھا۔ ایک ٹوپی میں نے سر پر جمائی سگریٹ اور لائیٹر جیب میں رکھے اور اچھی طرح تیار ہو کر میں باہر نکلا اور وارث علی کی گھوڑی پر بیٹھ کر گوکل پور کی طرف چل دیا۔ وہ پہلا دن تھا کہ میں یوں بے فکری سے باہر نکلا تھا۔ احساس مجھے یہ تھا کہ اپنے عمدہ لباس میں اور اپنی لمبی لمبی مونچھوں اور مُشت بھر لمبی ڈاڑھی سے جو میں نے قید کے دوران بڑھا لی تھی۔ نجات حاصل کرنے کے بعد میرا حلیہ یکسر تبدیل ہو چکا ہے اس لئے مجھے کوئی ہرگز پہچان نہ سکے گا۔

دُور دُور تک کھیتوں میں ہریالی کی چادریں سی بچھی نظر آتی تھیں وہ بڑا روشن دن تھا ایسے..... روشن دن میں نے زندگی میں بہت کم دیکھے ہیں۔ کچھ میں بھی اس روز عجیب سی ذہنی آزادی محسوس کر رہا تھا..... وارث علی سے مل کر مجھے بڑا اطمینان ہوا تھا — وہ پولیس کا ایک اہم افسر تھا ابھی ایک جرم میں ملوث تھا اسی وجہ سے وہ میرے بارے میں چشم پوشی سے کام لے رہا تھا — یہ سوچ کر مجھے طمانیت محسوس ہوتی تھی کہ ابھی لوگ ایسے ہیں جو میرے نکتۂ نظر کو سمجھتے ہیں مجھے اتنا بڑا مجرم اور..... بے ضمیر نہیں سمجھتے جتنا میں اپنے بارے میں سمجھتا ہوں۔

وارث علی کی گھوڑی اشارہ سمجھتی تھی۔ وہ پگڈنڈی پر چڑھتے ہی مجھے گوکل پور کی طرف لے اُڑی۔ سمت مجھے زینو نے سمجھا دی تھی کسی سے پتہ پوچھنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔

گوکل پور کمال پور سے خاصا بڑا گاؤں ہے — میں نے فقیریا قصائی کی دکان سے دو سیر گوشت خریدا اور انہی قدموں واپس چل دیا ابھی میں نے آدھا راستہ طے کیا تھا کہ اچانک راجباہ کے کنارے کھڑے ایک آدمی نے مجھے رُکنے کا اشارہ کیا۔ میں نے لگام کھینچ کر گھوڑی کو مدھم کیا اور اس آدمی کے قریب جا پہنچا۔ اب جو میں اسے غور سے دیکھتا ہوں معلوم ہوا کہ وہ تو وہی چوہدری ہے۔ صادق علی کا قاتل۔ میرا تو خون کھول اٹھا۔ میرا جی چاہا کہ میں اسے روند ڈالوں۔ اس کی ہڈیاں توڑ دوں وہ میرے سامنے کھڑا عجیب سے گھٹے انداز میں مسکرا رہا تھا۔ اس کی عمر یہی کوئی پچاس سال ہو گی مگر صحت اس کی بہت اچھی تھی — وہ لمبی سی اچکن پر گرم شال لپیٹے ہوئے تھا۔ ہاتھ میں اس نے بڑا نفیس قسم کا بید پکڑ رکھا تھا اور تہمد کے نیچے طلائی کام سے مزین کھسا اسے بہت سجتا تھا — میں اس کے قریب پہنچا تو بولا۔

"کہاں سے آئے ہو جوان؟"

"میں گوکل پور سے آیا ہوں۔"

"میرا مطلب ہے ادھر کیسے پھر رہے ہو کسی کے گھر مہمان ٹھہرے ہو یہاں؟"

اس کی آنکھیں صاف بتا رہی تھیں کہ وہ مجھے پہچان گیا تھا اور محض یہ اندازہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں بھی اسے پہچان سکتا ہوں کہ نہیں کسی طرح بھی اس کے چہرے سے اندازہ نہ ہوتا تھا کہ رات اس نے ایک آدمی کو اپنے خونخوار کُتوں کا نوالہ بنا دیا تھا۔

"ایک شخص صادق علی رہتا ہے ادھر کمال پور میں۔ مَیں اس سے ملنے آیا تھا۔ مگر وہ مل ہی نہیں رہا۔"

چوہدری کا رنگ بدلنے لگا۔ اس نے میری نظر کے برمے سے بچنے کے لئے اپنا دھیان گھٹنے پر پڑی گرد کی طرف منتقل کر دیا۔ دونوں جوتیاں بید کی ضرب سے جھاڑ کر اس نے سر اوپر اٹھایا اور بولا۔

"تم نے اس کے گھر سے معلوم نہیں کیا؟"

"کیا ہے؟ مگر وہاں سے ایک لڑکی نے بتایا ہے کہ صادق علی رات سے غائب ہے۔"

"تمہیں کیا کام ہے اس سے؟"

"مَیں اس کا پرانا دوست ہوں۔ ہم اکٹھے ہی ایک سکول میں پڑھاتے رہے ہیں۔" میں نے بات بنائی۔

"تم شاید وہی ہو جسے رات ہم نے قبرستان میں دیکھا تھا۔ میں اپنی بیٹی کو دفن کر کے بیٹھا تھا وہاں۔"

"اور پھر تم نے صادق علی پر اپنے کُتے بھی چھوڑے تھے۔ اسے درخت سے باندھ رکھا تھا تم نے۔"

"اچھا۔ تو یہ بات ہے پھر تو میرا خیال ہے مجھے تمہارا بھی قصہ پاک کر دینا چاہیئے۔" یہ کہہ کر اس نے کمبل کے نیچے سے اپنا دایاں ہاتھ اچانک باہر نکالا۔ اس میں اس نے پستول تھام رکھا تھا۔ مگر بیشتر اس کے کہ وہ فائر کرتا میں نے گھوڑی اس پر چڑھا دی گھوڑی کا اگلا دایاں سُم اس کے سینے پر لگا۔ اس نے افراتفری میں فائر کیا مگر سُم اپنا کام دکھا چکا تھا۔

چوہدری گر گیا۔ میں نے گھما کر گھوڑی کو ایک بار پھر اس کے اوپر سے گزار دیا۔ اب کی بار گھوڑی کا پاؤں اس کے پیٹ پر پڑا اور بس۔ چوہدری اپنے ہی خون میں لت پت پڑا تھا۔ دُور دُور تک مجھے کوئی آدمی نظر نہ آتا تھا سناٹا تھا بے پناہ سناٹا۔ میں نے لگام کھینچی اور گھوڑی کو پانی سے سیراب کھیتوں میں سے دوڑاتا ہوا کمال پور جا پہنچا۔ پانی میں چلنے کی وجہ سے گھوڑی کے کسی بھی سُم پر خون کا کوئی نشان موجود نہیں رہا تھا البتہ کیچڑ اور ریت کے موزے سے پہن لئے تھے اس نے۔ وہ چوہدری کا سینہ بھی کھول آئی تھی اور پیٹ بھی۔ کچھ راستہ میں نے گھوڑی کو گھاس پر بھی طے کروایا تھا کہ اس کا کھرا نہ لیا جا سکے۔

جب میں نے صحن کے اندر جا کر گھوڑی کو باندھ دیا تو ایک اطمینان

پھر اسانس میرے سینے سے یوں نکلا جیسے کسی بدنصیب کا کوئی ارمان نکلتا ہے۔ میں اس گھڑی بہت خوش تھا۔ میں نے صادق علی کے دشمن سے اس کا حساب چکا دیا تھا۔

گوشت کا تھیلا میں نے زینو کو دیا تو وارث علی میرے چہرے کو بڑے غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"کیا بات ہے بہت تمتما رہے ہو اس وقت۔ معلوم ہوتا ہے کوئی زبردست خوشی دیکھی ہے تم نے؟"

"ہاں۔ معاملہ ہی ایسا ہوا ہے وارث علی۔ بہت بڑی بات ہوئی ہے" میں نے سرگوشی کی۔

"مجھے نہیں بتاؤ گے" وہ دبی آواز میں بولا۔

"بتاؤں گا کیسے نہیں۔ وہ زینو گھینو اُدھر چلی گئی ہے نا؟"

"ہاں وہ گئی اُدھر باورچی خانے میں۔ ہماری آواز نہ سن سکے گی۔ اب وہ"

زینو کی طرف سے اچھی طرح تسلی کر لینے کے بعد میں نے وارث علی کو بتا دیا کہ کس طرح میں چوہدری کو اس کے تمام غموں سے نجات دلا آیا ہوں۔ وارث علی نے میری کہانی سنی تو عش عش کر اٹھا بولا۔

"تم نے کمال کر دیا ہے جیلانی میاں! اب کوئی تمہاری ہوا کو بھی نہیں چھو سکتا۔ تم بالکل بے فکر ہو جاؤ اب ہمیں ضرورت ہی نہیں رہی کہ ہم خواہ مخواہ تھانے اور پولیس کے چکر میں پڑیں۔"

"صادق علی کی روح مطمئن ہو گئی ہو گی وارث علی۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو ساری عمر بیٹھ کر پچھتاتا۔ مجھے اپنی اس بزدلی پر سخت ندامت محسوس ہوئی تھی" میں نے اوور کوٹ اتارتے ہوئے کہا۔ صحن میں دھوپ نے ڈیرے ڈال رکھے تھے اور ہوا میں سے نمی اور یخ بستگی کا احساس ختم ہوتا جا رہا تھا۔

"لو یہ سگریٹ پیو۔ مجھے خوشی ہوئی ہے کہ تم نے ضرورت کی اچھی اچھی چیزیں یہاں جمع کر لی ہیں۔"

"ان کے بغیر مجھے کوفت محسوس ہوتی رہتی تھی مگر یہ تم نے گردن پر پٹی سی کیسی باندھ رکھی ہے؟" میں نے پوچھا

"وہ زینو نے باندھ دی ہے کہتی تھی میری رگیں پھولی ہوئی ہیں۔ یار یہ بتا جیلانی تو نے مجھے بے ہوش کس طرح کر دیا تھا؟ میں تو حیران رہ گیا ہوں۔ میری گردن ابھی تک سیدھی نہیں ہو رہی ہے۔"

اپنا راز چھپاتے ہوئے میں نے کہا۔

"پتہ نہیں بس یونہی ہاتھ مار دیا تھا میں نے تمہاری گردن پر۔ مگر اب یہ بتاؤ کہ صادق علی کے بعد تم زینو کو کہاں رکھو گے؟"

"تم جو یہاں ہو اس کے پاس" وہ بولا۔

"نہیں۔ میں تو یہاں نہیں رہ سکتا ہمیشہ کے لئے۔ جب تم میری پوری کہانی سنو گے تو خود ہی کہو گے کہ مجھے آگے جانا چاہئے۔"

"ہاں یار! اپنے بارے میں تو تم نے مجھے کچھ بھی نہیں بتایا۔ آخر تم اس صادق علی تک کیسے پہنچے؟" یہ کہہ کر وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ سگریٹ لگاتار پھونکتا جا رہا تھا اور میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کھانے پینے کے معاملے میں بے حد حریص ہے۔

اس نے جب میرے معاملات میں دلچسپی دکھائی اور جب یہ اندازہ کر لیا کہ وہ کام کا آدمی ہے اور اس سے شاید میں کوئی اچھا کام لے سکوں۔ تو میں نے الف سے لے کر یے تک اسے اپنی ساری کہانی سنا دی۔ جوں جوں میں اسے اپنے زخم دکھاتا گیا اس کی حالت بدلتی گئی۔ جب میں اپنی بات ختم کر چکا تو وہ بولا۔ "کیا نام بتایا ہے تم نے اپنی بہن کا؟"

"آسیہ"

"تمہارے باپ کا کیا نام ہے؟"

"عثمان آفندی"

"عثمان آفندی؟" یہ نام سن کر وارث علی کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"کیا حلیہ ہے تمہاری بہن کا؟"

"اس کا حلیہ؟ میں کیا بتاؤں تمہیں وارث علی بس میری اس کی شکل خاصی ملتی جلتی ہے۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ..... بائیں رخسار پر یہاں ... نتھنے کے قریب یہ بڑا سا سیاہ تل ہے جو... بہت بھلا لگتا ہے اور اس کے اگلے دو دانتوں کے درمیان ایک سی کھڑکی ہے جو بہت ہی خوبصورت بناتی ہے اس کے دانتوں کو۔ اور اس کی ٹھوڑی کے نچلے حصے میں ..... یہاں کر کے ایک بھورے رنگ کا تل"

"وہ..... وہی وہی تھی۔ یقیناً وہ وہی تھی۔ کاش۔ میں اسے روک سکتا"

میں نے وارث علی کو ایک دم گریبان سے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا۔

"تم بتاتے کیوں نہیں ہو۔ کہاں ہے میری بہن؟ اسے تم نے دیکھا ہے ورنہ تم اتنی باتیں نہ پوچھتے مجھ سے — بتاؤ کہاں ہے بہن آسیہ؟"

میں ایک دم رونے لگا۔ میری آواز شدت جذبات سے لرز رہی تھی۔ وارث علی نے میری بہن کو دیکھا تھا۔ اس سے شاید باتیں بھی کی تھیں مگر وہ چپ تھا۔ کچھ نہیں کہتا تھا —

"بتاتے کیوں نہیں ہو؟ کہاں ہے میری بہن؟" میں نے پھر جھنجوڑا —

"بتاتا ہوں۔ ٹھہرو، ذرا دم لینے دو مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ وہ تمہاری بہن نکلی۔ اس آدمی کی بہن جو میری بیٹی کا بھائی جیسا خیال رکھتا ہے۔"

"میں تمہاری بیٹی پر اپنی جان وار سکتا ہوں وہ بھی میری آسیہ ایسی ہے وارث علی مگر مجھے بتاؤ تو سہی میری بہن کہاں دیکھا تھا تم نے اسے؟"

میں..... میں ان دنوں وزیر آباد میں متعین تھا صدر تھانے میں — رات کی گشت پر میں خود بھی نکلتا تھا میرے ساتھ ایک سب انسپکٹر ہوتا تھا اختر۔ وہ ذرا مزاج میلے کا شوقین آدمی ہے پیتا پلاتا بھی ہے — کبھی کبھار میں بھی اس کے ساتھ دو گھونٹ پی لیا کرتا تھا — میری یہ عادت ابھی تک نہیں گئی۔

مجھے یاد ہے وہ ہفتے کی رات تھی۔ ہم ادھر تحصیل کی عمارت کی طرف نکلے تھے میرا خیال ہے رات کا ایک بج رہا تھا ہم دونوں سکوٹر پر تھے۔ وہ میرا ذاتی سکوٹر تھا اب تو خیر بیچ دیا ہے میں نے — چلتے چلتے ہم مشن سکول کے پیچھے کی ایک گلی میں جا نکلے۔ ابھی ہم اس گلی کے وسط میں پہنچے تھے کہ ایک مکان سے زبردست چیخ و پکار کی آوازیں سنائی دیں۔ ہم دونوں تیزی سے اس مکان کی طرف بڑھے۔ ابھی ہم سکوٹر سے اترے ہی تھے کہ مکان کی بیٹھک کا دروازہ کھلا اور ایک لڑکی تیزی سے باہر نکلی اس کے بال کھلے تھے اور لباس تار تار ہو رہا تھا۔ وہ ایک چادر بدن پر لپیٹتی ہوئی گلی میں آ گئی — اس کے ہاتھ میں ایک لمبے دستے کا کھلا چاقو تھا جس کا پھل صاف طور پر چٹکی چاندنی میں خون آلود نظر آتا تھا۔

میں نے آگے بڑھ کر اس کی کلائی پکڑ لی مگر وہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح مجھ سے الجھ گئی — "چھوڑ دو میرا ہاتھ ورنہ میں تمہیں بھی جان سے مار دوں گی چھوڑ دو میرا ہاتھ —" اس نے میرے ہاتھ پر اپنے دانت گاڑ دیئے۔ یہ صورتحال دیکھ کر میں نے بائیں ہاتھ سے اس کے لمبے لمبے بال پکڑ کر اسے جھٹکا جو دیا تو اس کے دانت کھل گئے۔ اور وہ پیچھے کی طرف جھک گئی۔

اتنے میں مکان کے اندر سے ایک بوڑھی عورت باہر نکلی — وہ دہائی دے رہی تھی۔ اپنے گھر کے سامنے جو اس نے دو پولیس والوں کو دیکھا تو فوراً چپ ہو گئی اور تیزی سے واپس ہونے لگی۔

"ٹھہر مائی! لے چلو چوہدری جی اسے اندر۔" اختر نے آگے بڑھ کر اس بڑھیا کو روکا۔

میں اس لڑکی کو دھکیلتا ہوا مکان کے اندر لے گیا — "کس کو چاقو مارا ہے تم نے؟ کون رہتا ہے یہاں؟" میں نے اس لڑکی کو صحن میں لے جا کر بتی کی روشنی میں کھڑا کر کے کہا — لڑکی کے چہرے پر خراشیں تھیں۔ اس کے دائیں رخسار پر لگتا تھا کسی نے اپنے دانت گہرے گاڑ دیئے تھے۔ وہ رو رہی تھی مگر بے آواز —

"بتاتی کیوں نہیں مائی؟ کس کو مارا ہے اس نے؟"

"وہ..... وہ..... وہ اس نے میری چھوٹی بہن کو مار دیا ہے وہ اندر پڑی ہے۔"

اچانک مجھے دوسری منزل کے ایک کمرے میں سے دو آدمی تیزی سے ایک کھڑکی میں سے کود کر دوسرے مکان میں جاتے نظر آئے۔

"اسے سنبھالو اختر" میں نے لڑکی اختر کے حوالے کی اور تیزی سے سیڑھیاں چڑھا مگر وہ بہت تیز نکلے۔ جب تک میں چھت پر پہنچا وہ غائب ہو چکے تھے۔

مایوس ہو کر میں نیچے اترا اور اس لڑکی کو دھکیل کر کمرے میں لے گیا اس نے چادر سے اپنا پورا بدن ڈھانپ رکھا تھا — اور چہرہ اس کا خوف سے زرد ہو رہا تھا۔ کونے میں سے کسی کے کراہنے کی آوازیں آ رہی تھیں "کس کو مارا ہے تم نے؟"

"وہ پڑی ہے سامنے وہ چڑیل! اس کا نام صابری ہے یہی مجھے بُرے کام پر مجبور کرتی تھی۔"

میں نے آگے بڑھ کر دیکھا تو ایک ادھیڑ عمر عورت چارپائی پر پڑی تھی۔ اس کے جسم پر کئی زخم لگے تھے مگر کوئی بھی اتنا گہرا نہیں تھا کہ اس کے لئے جان لیوا ثابت ہوتا —

"ان سے تمہارا کیا تعلق ہے؟"

"کوئی تعلق نہیں ہے جناب! یہ ہمارے ایک واقف کار کی بہن ہے وہ آدمی اسے چھ دن پہلے ہمارے پاس چھوڑ گیا تھا۔ یہ بدچلن لڑکی ہے آج اپنے یاروں کو لے کر اوپر کے کمرے میں جا گھسی تھی کہ میری بہن گلو نے اس پر اعتراض کیا۔ بس اسی بات پر ان میں جھگڑا ہو گیا اور اس نے اسے چاقو مار دیا۔" مائی نے ہماری اچھی طرح تسلی کر دی۔

"اور وہ جو دو آدمی اوپر کے کمرے سے ساتھ کے مکان میں کود گئے ہیں وہ کون ہیں؟"

"وہ..... وہی تو اس کے یار تھے جی!"

"کہاں سے آئے تھے وہ؟"

"ہمیں کیا پتہ جناب! یہ خود ہی لائی تھی انہیں۔"

"کیوں جھوٹ بولتی ہو بڑھیا۔ خدا کو جان دو گی انہیں۔ میں بتاتی ہوں جناب، کہ وہ کون تھے۔ ان میں سے ایک کا نام الو ہے اور ایک کا نام خلوص خان — وہ دونوں لاہور کے ایک غنڈے سوات خان کے ملازم ہیں۔ مجھے یہ لوگ چھ روز پہلے لاہور سے اغوا کر کے لے آئے تھے سوات خان تو پیچھے رہ گیا اور یہ دونوں آدمی مجھے یہاں اس بڑھیا کے پاس لے آئے — آج ان لوگوں نے یہاں کے ایک آدمی ملک ریاض کے ہاتھ مجھے تین ہزار روپے میں ایک رات کے لئے بیچ دیا — وہ آدمی اوپر کمرے میں پڑا ہے میرا خیال ہے وہ مر گیا ہو گا۔ اسے بھی میں نے چاقو مار دیا تھا۔ میں اس سے جان چھڑا کر بھاگی تو راستے میں گلو آ گئی۔ وہ مجھے پکڑنا چاہتی تھی مگر میرے سر پر تو خون سوار تھا میں نے اسے بھی چاقو پر دھر لیا۔ یہ ہے اصل واقعہ — باقی سب باتیں جو یہ بڑھیا گھٹی بتا رہی ہے بالکل غلط ہیں۔"

اس لڑکی نے بڑے اعتماد سے ساری بات بتا دی۔ اس کا خوف بڑی حد تک ختم ہو چکا تھا۔ وہ اپنی عصمت کی حفاظت کرنے میں کامیاب ہو چکی تھی۔ اس کی گفتگو سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ پڑھی لکھی

لڑکی ہے۔

"تمہارا کیا نام ہے؟"

"میرا نام آسیہ ہے۔" وارث علی کے منہ سے جونہی یہ لفظ نکلے میرا دل اچھل کر حلق میں آ رہا۔ اپنی نبضیں مجھے اکھڑتی ہوئی محسوس ہوئیں وہ ظالم میری ہی ماں جائی ستم رسیدہ بہن کی کہانی سنا رہا تھا ——— اور میں ایسا بدنصیب تھا کہ اس کے لئے اب تک کچھ بھی نہ کر سکا تھا۔ میری آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو دیکھ کر وارث علی بولا۔

"مجھے معلوم ہے جیلانی میاں تم کیا محسوس کرتے ہو مگر...... مگر زندگی ایسی ہی ہے میرے دوست! میری بات غور سے سنو۔ تمہاری بہن تم سے بھی زیادہ مضبوط دل و دماغ کی مالک ہے۔ وہ بہت بہادر لڑکی ہے اس کی میں جتنی بھی تعریف کروں کم ہے۔ مگر وہ حالات کی چکی کے دو پاٹوں میں پس کر رہ گئی تھی۔ اسے قدم قدم پر زبردست مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔" پھر قدرے رک کر بولا، میں نے اس سے کہا۔

"میرے ساتھ آؤ اوپر دیکھیں تو تمہارا دوسرا شکار کون ہے؟"

یہ کہہ کر میں آسیہ کو لے کر اوپر کی منزل پر جا چڑھا۔ وہ ٹھیک کہتی تھی کمرے میں شہر کے سب سے بڑے رئیس کا بڑا بیٹا شدید زخمی پڑا تھا۔ وہ نیم بے ہوش تھا۔ اس کے جسم پر چاقو کے تین گہرے گہرے زخم تھے اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس کا کیا انجام ہو گا؟

اختر کو اسی وقت تھانے بھیج کر میں نے گاڑی منگوائی اور دونوں زخمیوں کو اسی وقت ہم نے ہسپتال منتقل کیا اور اس لڑکی کو بڑھیا کے ساتھ لے جا کر حوالات میں بند کر دیا۔

ہم نے بہت پوچھا آسیہ سے کہ وہ سوات خان کون ہے؟ انور اور خلوص خان کون ہیں؟ مگر وہ کچھ بھی نہ بتا سکی۔ یہی کہتی رہی کہ انہوں نے اسے رات کے وقت اس کے گھر سے اغوا کیا تھا کیونکہ وہ اس کے بھائی کے دشمن تھے۔ بھائی کا نام وہ غلام جیلانی ہی بتاتی تھی ——— سارے پتے اس نے صحیح دیئے تھے مگر اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کے اغوا کنندگان کون ہیں۔ ہم نے بعد میں اس کے دیئے ہوئے پتے پر جب رابطہ قائم کیا تو اس کی ماں وہاں موجود نہ تھی اور کسی ہمسائے کو علم نہ تھا کہ وہ کہاں چلی گئی ہے آسیہ کا بھائی بھی وہاں سے غائب تھا اس لئے ہم اس معاملے میں کچھ بھی نہ کر سکے۔

یہ بات ثابت تھی کہ اس بڑھیا کو اگر بروقت طبی امداد نہ ملتی تو وہ بھی جانبر نہ ہو سکتی تھی مگر ریاض کو ڈاکٹر سرتوڑ کوشش کے باوجود نہ بچا سکے۔ اور وہ تیسرے ہی دن مر گیا۔ جس سے آسیہ کے خلاف مقدمے کی نوعیت ہی بدل گئی۔ آسیہ ایسی بے سہارا تھی کہ اس کے مقدمے میں کسی نے بھی دلچسپی سے اس کی پیروی نہیں کی۔ ہماری بھی یہی کوشش تھی۔ مجھے معاف کر دینا جیلانی میاں۔ مگر حقیقت یہی ہے کہ ہم بھی اسے ہر حال میں سزا دلوانا چاہتے تھے یہی پولیس والوں کی کوشش ہوتی ہے۔

سو ہم نے ساتویں پیشی پر اسے سیشن کی عدالت سے عمر قید کی سزا دلوا دی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ وہ بڑھیا بھی اس مقدمے میں باعزت بری ہو گئی اور اس کی بہن بھی جسے آسیہ نے زخمی کیا تھا۔"

وارث علی نے بڑے ہی بے ساختہ انداز میں آسیہ کی بدنصیبی کی کہانی مجھے سنائی تو میرا یہ حال تھا کہ میرا سارا بدن پسینے میں تر ہو رہا تھا۔ وہ ہستی جس کے لئے میں فرشتے سے شیطان کے قالب میں ڈھل گیا، "قاتل بن گیا۔ زندگی کی ساری راستی اور رعنائی سے محروم ہوا۔ جھیر جھیر جل گئی تھی۔ اس کے رُدم رُدم سے لہو رس رہا تھا۔ زندگی نے اسے یوں تباہ کیا تھا۔ کہ وہ پھر کبھی زمین پر سر اوپر اٹھا کر نہ چل سکی۔"

"کس جیل میں گئی تھی وہ سزا پا کر؟"

میں نے بہت بجھے ہوئے دل سے پوچھا۔ ایک ایک کر کے سارے میرے ہاتھ سے چھوٹ چکے تھے۔

"وہ لاہور کی زنانہ جیل میں بھیجی گئی تھی۔ اس کا نہ کوئی عزیز نہ رشتے دار۔ ایسی غریب لڑکی کے لئے قانون بھی کوئی نرم گوشہ دل میں نہیں رکھتا۔"

"تمہیں پتہ چلا کہ وہ آدمی جو کھڑکی سے کود کر دوسرے مکان اتر گئے تھے، کون تھے؟"

"آسیہ نے یہی کہا تھا کہ وہ سوات خان کے ساتھی تھے۔ یہ ہا ہمیں پہلے دن ہی معلوم ہو گئی تھی مگر ہم انہیں پکڑ نہ سکے۔ ان کی ہمیں خبر نہ مل سکی نہ گمی ہی بتا سکی کہ وہ کہاں کہاں رہتے تھے اور نہ اس کا ہی جانتی تھی کہ ان کا ٹھکانہ کہاں ہے۔"

"اگر وہ چودہ سال کے لئے جیل میں بند کر دی گئی تھی تو پھر ابھی وہ وہیں ہو گی۔ تم یوں کرو وارث علی! زینو کو لے کر سرگودھا چلے جاؤ اور اسے میری ماں کے پاس چھوڑ دو۔ وہ اسے جانتی ہے۔ اس جا کر یہ بہت محفوظ رہے گی۔ میں کل صبح ہی یہاں سے نکل جاؤں گا ہر حال میں کل آسیہ سے ملنا ہے۔"

"مگر تم شہر میں کیسے جاؤ گے۔ چاروں طرف وہ لوگ تمہاری تلاش میں پھر رہے ہیں تمہیں بھی وہ پہچان لیں گے۔"

"تو پھر تم میری مدد کرو اور کل صبح وہاں جا کر آسیہ سے ملو۔ بتاؤ کہ اس کا بھائی اس سے ملنے کے لئے کتنا بے تاب ہے۔" میں نے سسکتے ہوئے کہا۔

"ہاں یہ بہتر رہے گا ——— میں کل صبح خود جاؤں گا۔ ہو سکا تو اس کی تصویر بھی اتار لاؤں گا۔ اللہ کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے۔ وہ جیل نہ جاتی تو ہو سکتا ہے ان غنڈوں کے ہاتھوں وہ بہت ذلیل ہوتی۔"

"ہاں وارث علی تم ٹھیک کہتے ہو کون کہہ سکتا ہے کہ اگر میں رات عالیہ کی کوٹھی میں نہ گھستا تو کیا ہوتا؟ اس ایک غلطی نے مجھے کتنا پیچھے دھکیل دیا۔ میں تحت الثریٰ میں جا گرا ہوں۔"

"اپنے آپ کو زیادہ اذیت نہ دو جیلانی میاں۔ اب یہ سوچو کہ اس چوہدری کے قتل کو کس طرح چھپاؤ گے۔ تم تو انصاف کرآئے ہو مگر قانون جب انصاف کرنے نکلے گا تو کیا ہو گا۔ کسی نے دیکھ نہ لیا ہو تمہیں۔ مجھے تو یہی فکر کھائے جاتی ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو وارث علی۔ ہمارا یہاں رہے ہی کیا ——— میرا تو خیال ہے میں ضروری سامان باندھتا ہوں۔ زینو کو لے کر میں آج ہی نکل جاتا ہوں ماں جی کے پاس جا رہوں گا میں۔ میرا ابھی دل بہت پریشان ہے۔ آسیہ کے مل جانے کی امید نے مجھے زندہ رہنے پر مجبور کر دیا ہے۔"

"ہاں! یہ بہتر رہے گا۔ تم کھانا کھا کر یہاں سے نکل جاؤ۔ صادق علی بتایا کرتا تھا کہ یہاں سے گھوڑے کرائے پر مل جاتے ہیں۔"

"نہیں۔ میں تمہاری گھوڑی لے جاتا ہوں۔"

"مگر چھوڑو گے کہاں اسے؟"

"تم جہاں کہو۔ میں چھوڑ دوں گا۔"

"تم یوں کرو کوٹ لکھپت پہنچ کر مہار گلی کے خورشید احمد کے پاس گھوڑی کو چھوڑ دینا۔ وہ کوارٹر نمبر پچاسی میں رہتا ہے۔ میں پتہ لکھ دیتا ہوں اس کا۔" یہ کہہ کر وارث علی نے اپنے دوست کے گھر کا پتہ دے دیا۔

زینو کھانا پکا کر ہمارے سامنے لگا ہی رہی تھی کہ گاؤں میں ہاہاکار مچ گئی۔ پچھلے مکانوں سے نالہ و شیون کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔

"یہ کون رو رہا ہے زینو؟" میں نے پوچھا۔

"شاید نوراں کی خالہ آئی ہے۔ اسے کل ہی تار دے دیا تھا انہوں نے۔"

یہ کہہ کر وہ سیڑھی کی طرف بڑھی۔

"ہمیں کھانا تو کھلا دو پہلے اور یوں کرو بیٹی کہ اپنی تمام ضروری چیزیں باندھ لو۔" وارث علی نے کہا۔

"وہ کیوں چاچا؟"

"ہم آج تمہیں جیلانی میاں کے ساتھ سرگودھا بھیج رہے ہیں۔ اب تم وہاں رہا کرو گی ماں جی کے پاس۔"

"مگر ماسٹر صاحب؟"

"وہ بھی وہاں پہنچ جائیں گے۔ ابھی وہ ایک ضروری کام سے نظر آباد گئے ہیں۔"

زینو ایک دم خوش ہو گئی ———

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے چاچا کہ اب ہم شہر میں رہیں گے۔ ہاں سے تو میرا دل بہت اچاٹ ہو گیا ہے ——— اب تو نوراں بھی نہیں رہی یہاں۔"

"بس ٹھیک ہے پھر جلدی جلدی سامان باندھوا لو۔" وارث علی نے کہا۔

کھانا ختم ہوتے ہی ہم دونوں نے جلدی جلدی اپنا سامان دو صندوقوں میں بھرنا شروع کیا۔ اچانک وارث علی کو کچھ خیال آیا بولا۔

"میں واقف ہوں اس گاؤں سے یار۔ وہ گاما ہے نا گاما تیلی۔ وہ بھی مجھے جانتا ہے اس سے میں دو گھوڑے لے آتا ہوں۔" یہ کہہ کر وارث علی تیزی سے باہر نکل گیا۔ وہ اپنی خوبصورت گھوڑی کسی اور کے رحم و کرم پر چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھا ——— کچھ ہی دیر بعد زینو واپس آ گئی۔ وہ بے حد سراسیمہ دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے لرزتے لہجے میں مجھے بتایا کہ کسی نے نوراں کے والد کو مار دیا ہے۔ میں نے اس پر ذرا سی حیرت ظاہر کی اور پھر اس گفتگو کو ختم کر دیا۔

کوئی بیس منٹ بعد ہی وارث علی واپس آ گیا ——— گاما اس کے ساتھ تھا اور دو گھوڑے بھی۔ دس دس روپے ان کا والٹن تک کا کرایہ طے کیا گیا تھا۔

ہم نے ایک گھوڑے پر سامان لادا۔ ایک گھوڑے پر وہ باپ بیٹی بیٹھے اور تیسرے گھوڑے پر میں سوار ہو گیا اور یوں صادق علی کے بھرے پرے گھر کو تالہ لگا کر ہم کمال پور سے رخصت ہو گئے۔ اس وقت دن کے تین بج رہے تھے۔ زینو، نوراں کی ماں اور چوہدری کی بیوہ سے مل آئی تھی۔ چوہدرائن پچھاڑیں کھا رہی تھی۔ دو دن میں اس کے گھر سے دو میتیں اٹھ رہی تھیں اس کی تو دنیا ہی اندھیر ہو گئی تھی مگر یہ تو مکافات عمل کا سلسلہ تھا جو چل رہا تھا اور چلتا رہے گا۔ کھڑی اینٹوں کی لمبی قطار کو نیچے ایک طرف سے ہلکی سی ٹھوکر لگاتے ہیں۔ کھیل ہی کھیل میں تو وہ ایک دوسرے کو اپنے سر کی ضرب سے گراتی ہی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ آخری اینٹ بھی سرنگوں ہو جاتی ہے جب وہ گر رہی ہوتی ہیں تو لگتا ہے نیچے کی ہلکی سی ٹھوکر نے ان میں بے پناہ جذبۂ انتقام بھر دیا ہے اور پہلی اینٹ جب اس نیچے سے اپنا بدلہ نہیں لے سکتی تو وہ غصے میں پاگل ہو کر اپنا سر دوسروں کے سر پر دے مارتی ہے۔ انسانوں کا بھی کچھ ایسا ہی خیال تھا انہیں بھی کسی مقام پر کسی معصوم سی قوت نے یونہی بے خیالی میں ہلکی سی ٹھوکر لگا دی تھی اور اب وہ چل رہے تھے مسلسل آگے ہی آگے، ایک دوسرے کا سر پھوڑتے ہوئے۔

زینو سے میں نے بڑی احتیاط سے گاؤں کے حالات پوچھے تھے چوہدری کا نام اجمل تھا۔ زینو نے بتایا تھا کہ نوراں کے باپ کو کسی جانور نے کچل دیا ہے۔ کسی کو یہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ جانور کس قسم کا تھا؟ ان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ اسے قتل کر دیا گیا ہے ——— وہ سب یہی سمجھتے تھے کہ چوہدری اتفاقاً کسی بپھرے ہوئے بے قابو جانور کی بھینٹ چڑھ گیا تھا ——— یہ ساری باتیں میرے فائدے میں تھیں۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ تھانے میں اس کی موت کی اطلاع نہیں دیں گے ——— ہم اگر کمال پور میں ہی بیٹھے رہتے تو بھی مجھے کوئی خطرہ نہ تھا۔ مجھے افسوس ہوا کہ میں نے خواہ مخواہ عجلت میں صادق علی کا اتنا آباد اور خوبصورت گھر مقفل

کر کے وقت کے بہتے دریا پر تیرا دیا تھا وہ کہیں بھی ڈوب سکتا تھا مگر اب کیا ہو سکتا تھا ـــــ میں اپنی زندگی کا ایک اہم باب پیچھے چھوڑ آیا تھا......

جب ہم والٹن کے قریب پہنچے تو دن چھپ رہا تھا۔ وارث علی کو اپنی بیٹی کی فکر کھائے جاتی تھی ـــــ وہ بولا۔

"میرا تو یہ خیال ہے جیلانی میاں کہ یہ رات تم شہر میں گزار لو ـــ میں تمہیں اپنے دوست کے گھر لے جاتا ہوں۔ بہتر ہوگا کہ تم ایک دو دن وہیں رہو۔ اس عرصے میں مَیں تمہیں آسیہ کے بارے میں بھی بتا سکوں گا پھر اس کے بعد تم اطمینان سے فیصلہ کر سکو گے کہ تمہیں کیا کرنا ہے ؟"

"یہ اچھی تجویز ہے وارث علی۔ میں ابھی دو چار دن یہیں رہ لیتا ہوں تم معلوم کر لو کہ میری بہن کس حال میں ہے" میں نے اس کی بات مان لی۔

وارث علی خوش ہو گیا۔ میرا خیال ہے کہ اسے زینو کے ساتھ دو چار دن اور گزار لینے کا موقع مل گیا تھا۔ اسی دن اس نے مجھے بتایا کہ اس کے اپنے صرف دو لڑکے ہیں جو اب کالج میں پڑھ رہے تھے مگر لڑکی اسے زینو کے سوا اللہ نے اور کوئی نہیں دی اور پھر لڑکی بھی ایسی جو بالکل اس کی ہم شکل ہو۔ زینو کی صورت میں وہ اپنی صورت دیکھتا تھا اور اس کا نام لے کر جیتا تھا۔ اس کے لئے اب کی بار بھی وہ ڈھیر سارے کپڑے اور دوسری چیزیں لے کر آیا تھا ـــــ وہ چاہتا تھا کہ اس کی بیٹی ہر طرح خوش رہے ـــــ اور مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ زینو بھی اس سے بہت زیادہ مانوس ہو چکی تھی۔ وہ بھول ہی گئی تھی کہ اس کی ماں آرسی نے اسے کن حالات میں جنم دیا تھا۔ اس آنگن کو بھی وہ فراموش کر چکی تھی جہاں اس نے پرورش پائی تھی۔ اس باپ کا نام بھی آہستہ آہستہ اس کے ذہن کی لوح سے مٹتا جا رہا تھا جس نے ہمیشہ زینو کو اپنا ہی سلب سمجھا۔ کیسی کیسی ستم ظریفی ہوتی ہے اس دنیا میں۔ انسان کے پاگل پن کا مشاہدہ جب خود پروردگار کرتے ہوں گے تو وہ بھی تبسم فرماتے ہوں گے جبھی تو کہا جاتا ہے کہ قیامت کے دن لوگوں کو ان کی ماؤں کی نسبت سے پکارا جائے گا۔ کوئی نہیں پوچھے گا کہ تیرا باپ کون ہے ہر کوئی ماں کے حوالے سے پہچانا جائے گا۔ مردوں کے لئے یہ بڑا کٹھن مرحلہ ہوگا۔

جب ہم وارث علی کے دوست خورشید احمد کے مکان پر پہنچے تو شام گہری ہو چکی تھی۔ وہ کوئی پچاس پچپن سال کی عمر کا سابق فوجی تھا بیٹھا پنشن کھا رہا تھا۔ ایک اس کا ملازم تھا جو اس کی خدمت پر مامور تھا اس کے دو بیٹے تھے مگر دونوں امریکہ میں ملازمت کر رہے تھے بیوی اس کی فوت ہو چکی تھی اور کوئی بیٹی بھی نہیں تھی کہ مڑ کر باپ کی خبر ہی پوچھ لیتی۔

مکان اس کا بہت خوبصورت تھا اور ہر آسائش سے مزین بھی۔ مَیں تو حیران رہ گیا اس مکان کی آرائش و زیبائش دیکھ کر۔

ایک عجیب طرح کا رشک محسوس ہوا مجھے اس آدمی کی زندگی پر ـــ وہ بہت صاف ستھرے ذوق کا حامل تھا۔ عمدہ سگریٹ پیتا تھا، بڑھیا لباس پہنتا تھا اور اونچی باتیں سوچتا تھا۔ لگتا تھا خدا اس پر بہت ہی مہربان ہے۔ میں بہت سٹپٹا گیا مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ وارث علی نے اس سے میرا تعارف کرایا تو بے دھیانی میں اس نے خورشید احمد کو میرا اصلی نام بھی بتا دیا ـــ

اس بیچارے نے ہماری بڑی آؤ بھگت کی۔ ہمارے ٹھہرنے کے لئے اس نے دو کمرے کھلوا دیئے۔ جن میں ہماری ضرورت کی ہر شے موجود تھی۔ ایک کمرہ زینو اور وارث علی نے لے لیا۔ باپ بیٹی ساتھ ساتھ رہنا چاہتے تھے۔ دوسرے کمرے میں مَیں ٹھہر گیا۔

خورشید احمد رات نو بجے تک ہمارے پاس بیٹھا رہا۔ بہت سارے چلغوزے اور بادام اس نے ہمارے سامنے رکھ دیئے۔ وہ بھی سگریٹ کا رسیا تھا اور مسلسل پیتا رہا۔ ہم نے بھی دل کھول کر اس کام میں اس کا ساتھ دیا۔ اسے اس رات دو آدمیوں کا انتظار تھا جن کے ہاتھ اس نے اپنی زمینوں کا ایک حصہ ڈھائی لاکھ روپے میں بیچا تھا۔ وہ رقم لے کر آنے والے تھے اس کے پاس۔

خورشید شب بخیر کہہ کر ہم سے رخصت ہو ہی رہا تھا کہ وہ آدمی آ گئے مگر وہ دو نہیں تعداد میں تین تھے۔ جن میں سے ایک بیساکھیوں پر چل رہا تھا کیونکہ اس کی دونوں ٹانگوں میں پلستر لگا تھا، پاؤں سے اوپر رانوں تک وہ بیچارا بڑی مشکل میں گرفتار نظر آتا تھا۔ جوان آدمی تھا وہ اور بڑے ورزشی جسم کا حامل تھا مگر کسی حادثے کی وجہ سے اس مصیبت میں پھنس گیا تھا ـــــ

خورشید احمد نے ان سے ہمارا تعارف کرایا تو بولا "یہ چوہدری بہادر علی ہیں ہریکا گاؤں کے زمیندار ـــــ یہ ان کے بھائی ہیں غلام محمد ـــ اور ان سے البتہ میں واقف نہیں ہوں" انہوں نے تیسرے آدمی کے بارے میں کہا ـــــ

"یہ ہمارا نوکر ہے اسلم۔ اسے میں صبح ڈاکٹر کو دکھاؤں گا۔ ایک ہفتہ ہوا یہ ایک حادثے میں زخمی ہو گیا تھا۔ دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئی تھیں اس کی۔ ڈاکٹروں نے اسی روز یہ پلستر لگا دیا تھا مگر اب یہ دو تین دن سے درد کی شکایت کرتا ہے" چوہدری بہادر نے کہا۔

"بہت افسوس ہوا۔ کیسا سوہنا جوان ہے اللہ اسے صحت دے" یہ کہہ کر خورشید احمد ان لوگوں کو بڑی عزت سے ہمارے پاس بٹھا کر دوسرے کمرے میں چلا گیا جب واپس آیا تو اس نے ہاتھ میں کاغذ اور قلم پکڑے ہوئے تھے۔ چوہدری بہادر علی نے ہمارے سامنے ڈھائی لاکھ روپے کی رقم گن کر اس کو دے دی۔ رقم وصول کر کے خورشید نے رسید لکھ دی جس پر اس نے گواہ کے طور پر وارث علی سے دستخط کروا لئے۔ رجسٹری پہلے ہو چکی تھی جسے دوسرے دن کچہری میں جا کر درج کروانا چاہتے تھے۔

جب خورشید احمد رقم وصول کر کے اندر لے جانے لگا تو میں نے اسلم کی آنکھوں میں عجیب سی پُراسرار چمک اُبھر آئی تھی۔ اس نے معنی خیز انداز سے خورشید احمد کی طرف دیکھا۔

مَیں سمجھا کہ زمین خرید لینے کی خوشی نے ان کے چہروں پر یہ کیفیت پیدا کر دی ہے۔ ظاہر ہے کسی زمیندار کے لئے اس سے بڑی بات اور کیا ہو سکتی ہے ؟ کہ کچھ اور زمین اس کے قبضے میں آ جائے۔

خورشید احمد نے رقم لے جا کر دوسرے کمرے میں رکھ دی وہ جب واپس آیا تو اس کا ملازم بھی اس کے ساتھ تھا۔ وہ ان کے لئے کھانا لایا تھا یہ بڑی سی ٹرے اٹھا رکھی تھی اس نے۔

وہ کھانا کھاتے رہے اور زمین کے بارے میں باتیں کرتے رہے مجھے ان کے کسی مسئلے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میرا ذہن ایک ہی نکتے پر مرکوز تھا۔ اور وہ نکتہ تھا آسیہ ـــ اس سے ملنے کی آرزو دم بدم بڑھتی جا رہی تھی جب سے وارث علی نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اسی شہر میں ہے اور جیل میں بند ہے اس وقت سے میری حالت ماہی بے آب جیسی ہو گئی تھی۔ میں کسی جگہ نظر ڈالتا تھا تو بس وہیں دیکھتا چلا جاتا تھا۔ لگتا تھا میری آنکھیں پتھر کی ہو چکی ہیں۔ حال میرا اس پرندے جیسا تھا جس کے سامنے ڈھیر سارا دانہ دھرا رہتا ہے مگر اس کی چونچ ٹوٹ جانے کی وجہ سے وہ دانہ اس کے لئے بے کار ہو کر رہ جاتا ہے۔ مجھے ڈھیر سارا روپیہ مل چکا تھا مگر میں اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکتا تھا۔ کتنی ستم ظریفی کی بات تھی یہ کچھ ہی عرصے پہلے ہمارے پاس ایک لاکھ روپیہ ہونے کی وجہ سے آسیہ کی تقدیر میں سیاہی گھلتی جا رہی تھی مگر اب ہم اس قابل تھے کہ جو چیز چاہتے خرید لیتے لیکن ہم اپنی منزل سے ہزاروں لاکھوں فرسنگ دور ہو چکے تھے۔ وہ آسیہ ہی ہم سے چھن گئی تھی جس کے لئے میں دنیا جہان کی ساری دولت چھین لینا چاہتا تھا۔

خورشید کے مہمانوں نے کھانا کھایا اور پھر اسی وقت وہاں سے رخصت ہو گئے وہ اپنے کسی عزیز کے ہاں رات گزارنا چاہتے تھے جو ادھر ہی منڈی میں رہتا تھا۔

وہ گھر سے نکلے تو ہم نے بھی اپنے خوابوں کے جزیروں کی راہ لی۔ زینو اور وارث علی الگ کمرے میں جا سوئے اور میں الگ کمرے میں لیٹ گیا۔ ہمارے میزبان نے ہماری ضرورت کی ہر شے ہمیں مہیا کر دی تھی۔ میرے کمرے میں بھی سوئی گیس کا ہیٹر لگا تھا اور زینو کے کمرے میں بھی۔ جس کی وجہ سے ہمیں سردی کی شدت نے زیادہ ہراساں نہیں کیا۔

مگر میرا ذہن کچھ اس حد تک ویران اور اجڑا ہوا تھا کہ نیند بھی مجھ پر غالب نہ آ سکی اور میں بستر کی بے رحم تنہائی میں آدھی رات تک پڑا کروٹیں بدلتا رہا میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں۔ زندگی ایک طویل لاینحل معمہ بن کر رہ گئی تھی اور اس کی پیچ در پیچ گرہوں میں مجھے آسیہ یوں الجھی نظر آتی تھی کہ ہر لمحے اس کا سانس گھٹتا تھا۔

اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا کہ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ ہیٹر بجھ رہا تھا بھپ بھپ کی سی آواز ابھری اور پھر ہیٹر کا چہرہ تاریک ہونے لگا۔ اس کی سرخی مدھم پڑی اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد ہیٹر سرد ہو گیا۔ میں نے کوئی دھیان نہ دیا بستر گرم تھا اور کمرے کی فضا بھی تپ رہی تھی میں چپ چاپ بستر میں پڑا رہا۔

مگر ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ مجھے شدید گھٹن کا احساس ہونے لگا سوئی گیس سارے کمرے میں پھیل چکی تھی۔ یہ بڑی تکلیف دہ صورتحال تھی۔ مجھے یاد ہی نہ رہا کہ ہیٹر بجھ جانے کی وجہ سے سوئی گیس برابر خارج ہو رہی تھی اور اس نے پھیل کر کمرے کی ہوا میں زہر بھر دیا تھا۔ مجھے اپنا دم گھٹتا محسوس ہوا تو میں نے ہیٹر بند کیا اور کمبل لپیٹ کر صحن میں جا نکلا۔ صحن ایسا تھا کہ اس کے چاروں طرف چوکور صورت میں عمارت ایستادہ تھی۔

ٹھیک اسی لمحے خورشید احمد کے کمرے میں روشنی ابھری مگر فوراً ہی بجھ گئی۔ یوں لگا جیسے کسی نے ٹارچ جلائی تھی۔ روشنی بڑی مدھم اور بیٹھی بیٹھی سی تھی جس کا چمکارا ٹارچ ایسا تھا۔ میں دبے پاؤں ادھر کو بڑھا۔ حیرت مجھے یہ تھی کہ خورشید احمد کو ٹارچ جلانے کی کیا ضرورت ہے وہ چاہتے تو کمرے کا بلب جلا لیتے۔ یونہی تجسس کا مارا میں ان کے کمرے کی بڑی کھڑکی کے سامنے جا پہنچا۔ اس کھڑکی کے باہر لوہے کی جالی لگی تھی اندر کی طرف آٹھ فٹ اونچے شیشے لگے تھے اور ان شیشوں کے پیچھے بڑے بڑے پردے لٹکے تھے۔ میں نے اس کھڑکی کے سامنے رک کر اندر کی آہٹوں پر کان دھرے تو مجھے محسوس ہوا کہ آہنی الماری کو کوئی شخص کھول رہا تھا۔ آوازیں ایسی آ رہی تھیں جیسے کوئی اس الماری سے زور آزمائی کر رہا ہے۔

میں کمرے کے دائیں ہاتھ کی چھوٹی کھڑکی کی طرف بڑھا۔ اتفاقاً مجھے اس کھڑکی کے اندر لگے شیشے کے ساتھ لٹکے پردے میں پورا بھر جگہ ایسی ننگی ملی جس میں سے اندر جھانکا جا سکتا تھا۔

اب جو میں اس جھری میں سے سامنے دیکھتا ہوں تو مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار ہی نہ آیا۔ لگتا تھا میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ فرش پر ٹارچ برابر جل رہی تھی اور اس کی مدھم روشنی میں مجھے خورشید احمد کی آہنی الماری کے سامنے چوہدری بہادر علی کا بیمار نوکر اسلم کھڑا نظر آیا۔ اس کی ٹانگوں پر پلستر جوں کا توں قائم تھا مگر وہ بیساکھیوں کے سہارے نہیں بلکہ اپنے پاؤں پر جم کر کھڑا تھا۔ اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے الماری کھول کر اس کے خانوں میں سے تمام نوٹ نکال کر ایک تھیلے میں بھر لئے۔ فرش پر رکھی اس کی روشن ٹارچ پاؤں کے قریب چمک رہی تھی۔ اور اس کی روشنی میں اس نے اپنا کام نہایت صفائی سے مکمل کر لیا۔

اسلم سے ذرا فاصلے پر اپنے لمبے چوڑے خوبصورت سے آبنوسی رنگ کے پلنگ پر خورشید احمد لیٹا تھا مگر وہ بے حس و حرکت تھا۔ منہ اس کا لحاف سے باہر تھا اور یوں لگتا تھا کہ وہ ابدی نیند سو چکا ہے۔

یہ سب کچھ میرے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔ اسلم نے اپنا وہ بھاری بھرکم تھیلا کندھے پر لٹکایا۔ سر پر اپنا ٹھاٹھہ اچھی طرح جما کر اس نے اپنا منہ اچھی طرح ڈھانپ لیا۔ مگر پھر اس نے ٹارچ اٹھائی اور کوٹ کی جیب سے پستول نکال کر سیدھے ہاتھ میں تھام لیا اور کمرے کے دروازے کی طرف بڑھا۔ میں نے لپک کر فوراً ہی وہ دروازہ باہر سے بند کر دیا اور پستول لینے کے لئے اپنے کمرے کی طرف بھاگا۔ باہر سے کنڈی لگنے کی آواز سے اسلم دہل سا گیا۔ اس نے پوری قوت سے دروازہ اندر کی طرف کھینچا مگر جب اسے دروازے کا یقین ہو گیا کہ وہ نہ کھل سکے گا تو وہ پوری قوت سے اس کے تختے سے ٹکرا گیا۔

زبردست آواز پیدا ہوئی۔ میں اس گھڑی اپنے کمرے میں تھا اور پستول اٹھا کر باہر آنے کو ہی تھا کہ مجھے محسوس یوں ہوا جیسے پلائی وڈ کا بنا دروازے کا تختہ ٹوٹ گیا ہے۔

ابھی میں اپنے کمرے سے نکلا ہی تھا کہ اسلم صحن میں نمودار ہوا وہ بڑی پھرتی سے چل رہا تھا۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ اس نے بیماری کا اور ٹانگوں کے ٹوٹ جانے کا تو محض بہانہ ہی بنا رکھا ہے۔ اصل میں وہ بہادر علی کا کارندہ تھا جو ہر اس جگہ پر ہاتھ مارتا تھا جہاں سے اسے رقم کی بو ملتی تھی۔۔۔ اچانک ٹھک کی سی آواز پیدا ہوئی۔ ایک گولی میرے دائیں ہاتھ مجھ سے چھ انچ کے فاصلے پر دروازے کے تختے میں لگی۔ اسلم نے مجھے دیکھتے ہی مجھ پر گولی چلا دی تھی۔ اس کی آنکھیں بہت تیز تھیں۔ میں حالانکہ گھپ اندھیرے میں کھڑا تھا مگر پھر بھی اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ میں تیزی سے نیچے بیٹھ گیا۔ اس نے ایک اور گولی چلائی مگر وہ بھی میرے اوپر سے نکل کر دروازے سے جا ٹکرائی۔ اب کی بار میں فرش پر لیٹ ہی گیا۔

اسلم سمجھا کہ اس کی گولیاں اثر کر گئی ہیں وہ جنون خیز رفتار سے گھر کے بڑے دروازے کی طرف لپکا تو میں نے تاک کر اس کی کمر پہ گولی چلائی۔ نشانہ شاید ٹھیک بیٹھا تھا وہ لڑکھڑا گیا مگر رکا نہیں تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ میں نے دوسری گولی چلائی مگر وہ بے کار گئی۔ یہ بڑی خوفناک صورتِ حال تھی۔ میں اس کے پیچھے لپکا اور بجلی ایسی تیزی سے باہر جا پہنچا۔

وہ میری سب سے بڑی غلطی تھی۔ ایک گولی سرسراتی ہوئی میرے کمبل میں سوراخ کرتی ہوئی آگے نکل گئی۔ وہ زیادہ دور نہیں تھا۔ مجھ سے چھ سات فٹ پرے دیوار کے ساتھ چمٹا کھڑا تھا۔۔۔ میں پیچھے ہٹ کر دروازے میں دبک گیا۔ عین اس وقت مجھے باہر کسی موٹر سائیکل کی آواز سنائی دی۔ میں نے اپنا آپ بچاتے ہوئے باہر جھانک کر دیکھا تو ایک زبردست تاسف نے میرا کلیجہ دبوچ لیا۔ اسلم ایک سکوٹر کے پیچھے بیٹھ کر میری آنکھوں سے اوجھل ہوتا جا رہا تھا۔۔۔ وہ خورشید کو شاید اس کی زندگی کی سب سے زیادہ قیمتی اثاثے سے محروم کر گیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ جس سکوٹر پر وہ بیٹھ کر بھاگا تھا۔ اسے بہادر علی خود چلا رہا تھا۔

مگر میں یہ بات یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

اس کے پیچھے بھاگنا میرے لئے کسی طرح بھی سود مند نہ تھا کفِ افسوس ملتا واپس آ گیا اور خورشید کے کمرے میں جا گھسا۔ اس کے دروازے کا ایک تختہ ٹوٹا ہوا تھا۔ میں نے خورشید کو جگانے کے لئے آواز دی مگر اس نے کوئی ردِ عمل ظاہر نہ کیا۔ فوراً ہی میں ادھر ادھر ٹٹول کر سوئچ ڈھونڈا اور بتی جلا دی۔ اب جو میں نے خورشید کے چہرے... پر نظر ڈالی تو میری حیرت سہ چند ہو گئی۔ اس کا رنگ پیلا ہو رہا تھا اور سانس اکھڑ چکا تھا۔ میں نے نبض دیکھی تو وہ بھی ڈوب رہی تھی۔ کمرے میں سوئی گیس کا کثیف دھواں پھیلا ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ اس کمرے کا بھی ہیٹر بجھا ہوا تھا مگر اس میں سے سوئی گیس خارج ہو رہی تھی۔ میں نے وہ گیس بند تو کر دی مگر سوال یہ تھا۔ خورشید کو ہوش میں کیسے لاؤں؟

یونہی پاگلوں کی طرح میں نے بلا سوچے سمجھے اس کے کھلے منہ پر منہ رکھ کر اس کے پھیپھڑوں میں اپنی ہوا بھر دی پوری قوت سے۔ نتیجہ یہ تھا وہ کربناک انداز سے کراہا۔ میں سمجھا کہ اسے پانی کی بھی ضرورت ہے یہ سوچ کر میں صحن میں نکلا اور نل سے ایک گلاس بھر کر اس کے لئے لے گیا۔ مگر اب وہ قدرے زیادہ بیدار تھا۔ عجیب انداز سے کراہ رہا تھا۔ اسے میں نے بڑی مشکلوں سے پانی کے چند گھونٹ پلائے۔ تازہ ہوا کے لئے میں نے ساری کھڑکیاں کھول دیں۔ باہر پچھلی طرف شاید کچھ پودے لگے تھے۔ بڑی سہانی اور جانفزا خوشبو کمرے میں پھیلنے لگی۔ نتیجہ یہ کہ خورشید احمد نے کچھ ہی دیر بعد آنکھیں کھول دیں مگر اب بھی وہ اس قابل نہیں تھا کہ بات کر سکے۔ سوئی گیس نے اس پہ بہت ہی بُرا اثر ڈالا تھا۔

اچانک خورشید کی نظر کھلی الماری پہ پڑی تو وہ یوں اپنی جگہ سے اچھلا جیسے اسے کسی بچھو نے کاٹ کھایا ہے۔ وہ تیزی سے الماری تک پہنچا اور اس کے خالی خانے پاگلوں کی طرح ٹٹول ٹٹول کر دیکھنے لگا اور جب اس نے دیکھا کہ وہاں سے سب کچھ غائب ہے تو سر پیٹ لیا اور بلند آواز سے یوں چیخا جیسے کوئی اسے ذبح کر رہا ہو۔

"یہ... میرا روپیہ کہاں ہے؟" درد و کرب کی شدت نے اس کی قوتِ گویائی اسے لوٹا دی مجھے یوں لگا جیسے وہ کہیں بہت دور سے بول رہا ہے۔

"میں پوچھتا ہوں میرا روپیہ کہاں ہے۔ کہاں ہے میرا روپیہ؟" وہ دیوانوں کی طرح منہ کھول کر میری طرف بڑھا۔

"آپ کا روپیہ بہادر علی کا بیمار نوکر اسلم لے گیا ہے۔ مجھ سے پہلے وہ یہاں تھا۔"

"تم جھوٹ بولتے ہو۔ اس کی تو ٹانگیں ٹوٹی ہوئی ہیں۔ پلستر چڑھا ہے ان پر۔ میرا ڈھائی لاکھ روپیہ چرا لیا ہے تم نے؟"

"وہ پلستر۔۔۔ سب جھوٹ ہے خورشید صاحب! وہ بہت بڑے دھوکے باز لوگ ہیں۔"

"تم جھوٹ بولتے ہو۔ کہاں ہے وارث علی؟ میں اس سے اپنا روپیہ لوں گا۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا بدمعاش آدمی۔ میرا روپیہ مجھے واپس دے دو۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے اس کمرے کی طرف بھاگا جہاں زینو اور وارث علی کو اس نے سلایا تھا۔ اس کمرے کا بھی دروازہ اندر سے بند تھا۔ خورشید احمد نے پوری قوت سے دروازے پر دستک دی، بار بار چیخا چلایا۔۔۔ دروازہ اس نے پیٹ ڈالا مگر وارث علی نہیں جاگا۔ اس کی بیٹی زینو بھی بیدار نہ ہوئی۔ اتنی گہری نیند میں تھے وہ لوگ کہ میں حیران رہ گیا مگر اچانک میں نے سوچا کہ کہیں ان پر بھی سوئی گیس کا اثر نہ ہو گیا ہو۔ جونہی یہ بات میرے ذہن میں ابھری میں پوری قوت سے دروازے کے ساتھ ٹکرا گیا۔ اندر کی چٹخنی شاید زیادہ مضبوط نہ تھی فوراً ہی ٹوٹ گئی اور دروازہ دھڑ سے کھل گیا۔ وہاں صورتِ حال واقعی بہت دگرگوں تھی کمرہ سوئی گیس سے لبالب بھرا تھا۔ تمام کھڑکیاں اور روشن دان بند تھے اور سوئی گیس کا ہیٹر بجھا ہوا تھا۔ میں نے وارث علی کو چھو کر دیکھا تو میرا کلیجہ دہل گیا۔۔۔ وہ دم گھٹ کر مر چکا تھا۔ اس کے بعد میں نے زینو کو دیکھا تو اس کا بدن بھی مجھے زندگی کی حرارت سے محروم نظر آیا۔۔۔ وہ بھی بہت دور نکل چکی تھی۔

اچانک کمرہ روشنی سے بھر گیا۔ خورشید نے بتی جلا دی تھی۔۔۔

"یہ تو شاید مر چکے ہیں خورشید صاحب! دم گھٹ کر مر گئے ہیں۔" میں نے ہیٹر کی سوئی گیس بند کرتے ہوئے کہا۔۔۔ میری اپنی آواز مجھے اجنبی محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے وہاں سانس لینا دشوار لگتا تھا۔ میں نے گھبرا کر ساری کھڑکیاں کھول دیں۔ تازہ ہوا نے سکون پہنچایا۔

"انہیں کس نے مارا ہے؟ تم ہی ان کے قاتل ہو۔ تم نے ان کا بھی گلا گھونٹ دیا ہے۔"

"بکواس بند کر بڈھے! میں تیرا گلا گھونٹ دوں گا۔ شکر کر تیری جان بچ گئی ہے ورنہ وہ شاید تجھے بھی اپنے حساب میں ختم کر گیا تھا۔"

"مجھے تیری کسی بات پر اعتبار نہیں آتا۔ کہاں ہے وہ گامی۔ میں ابھی اسے جگاتا ہوں۔ تم کہیں نہیں جاؤ گے۔ میری رقم دے دو پھر جہاں چاہے دفع ہو جاؤ۔ آؤ میرے ساتھ گامی کو جگاؤ۔"

یہ کہہ کر وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے کھینچتا ہوا اپنے کمرے سے ذرا فاصلے پر برآمدے کے آخری حصے میں لے گیا۔ گامی وہیں کوٹھڑی میں سوتا تھا۔ اس نے بھی اندر سے دروازہ بند کر رکھا تھا۔۔۔ میں نے بڑے زور سے دستک دی تو وہ ایک دم جاگ اٹھا۔ نیند سے بوجھل آواز میں بولا۔

"کون ہے؟"

خورشید چیخا "میں ہوں گامی! دروازہ کھول تیرا بیڑہ غرق۔ گھوڑے بیچ کر سو یار رہتا ہے۔ تیری افیون تجھے لے ڈوبی ہے۔"

"ابھی آیا میاں جی۔" دوسری طرف سے سلیپر کی سٹر پٹر سنائی دی اور پھر گامی نے دروازہ کھول دیا۔

"کیا بات ہے میاں جی؟"

"اوئے جا! ابھی پولیس کو بلا کر لا۔۔۔ گھر میں چوری ہو گئی ہے۔ الماری سے ساری رقم غائب ہے۔ ڈھائی لاکھ روپے لے گیا ہے چور۔"

"چوری ہو گئی۔ حد ہو گئی یہ کیسے ہو گیا میاں جی؟" گامی یوں... برآمدے میں نکلا جیسے اس نے کوئی بھوت دیکھا ہو۔

"ہونا کیسے تھا۔ یہ چاتر جو کھڑا ہے تمہارے سامنے۔ اسی نے چوری کی ہے اور اب کہتا ہے اسلم مال چرا کر لے گیا ہے۔"

"اسلم کون میاں جی؟"

"ارے وہی جو بہادر علی کے ساتھ آیا تھا۔ وہ جس کی ٹانگوں پر پلستر ہے۔" خورشید نے کہا۔

"ارے میاں جی وہ بچارا تو بیساکھی پر چلتا ہے۔ وہ کیا چوری کرے گا؟"

"اور وہ ہمارے مہمان مردہ پڑے ہیں اپنے کمرے میں۔ ان کا بھی اس نے گلا گھونٹ دیا۔ اوپر سے رعب جماتا ہے میں تو اسے جیل میں بند کرا دوں گا۔" خورشید نے مجھے گریبان سے پکڑ کر جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔

"پرے مر بڈھے تیرا دماغ چل گیا ہے میری بات غور سے سن۔ میں چور نہیں ہوں۔ چور اسلم ہی ہے مگر مجھے یہ پتہ نہیں چلتا کہ تیرا کمرہ بھی سوئی گیس سے بھرا تھا۔ وارث علی بھی اسی گیس سے مرا تھا اور میرے کمرے میں بھی گیس بھرنے لگی تھی یہ قصہ کیا ہے؟"

"مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش نہ کر۔ ذلیل آدمی۔۔۔ پولیس تجھ سے خود اگلوا لے گی کہ تو نے ان دونوں کو کیوں اور کس طرح مارا ہے۔۔۔ جا گامی بھاگ کر جا اور پولیس کو بلا لا۔"

یہ بات سنتے ہی مجھے احساس ہو گیا کہ بڈھا کسی طرح بھی میری بات پر کان نہیں دھرے گا وہ فیصلہ کر چکا ہے۔ کہ مجھے پولیس کے حوالے کر دے۔ چوری کا الزام بھی وہ مجھ پر دھرتا تھا اور زینو اور وارث علی کی موت کا بھی وہ مجھے ہی ذمہ دار ٹھہراتا تھا۔ یہ بڑی خوفناک بات تھی۔ میں پولیس کا کسی طرح بھی سامنا نہ کرنا چاہتا تھا۔ خاص طور پر لاہور شہر کی پولیس کا جس کی جیل کی آخری منزل سے میں فرار ہوا تھا۔ معاملے کے تمام پہلوؤں پر غور کرتے ہوئے میں نے پستول کی نالی ایک دم بڈھے کے سینے سے لگا دی۔

"اگر تم نے ذرا بھی حرکت کی تو گولی مار دوں گا۔ تم بھی چلو ادھر گامی! اس کے پیچھے کھڑے ہو جاؤ۔"

پستول کی صورت دیکھتے ہی بڈھا گھگھیانے لگا۔ گامی دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر اس کے عین پیچھے آ ٹھہرا۔

میں نے خورشید کو کھینچ کر بائیں ہاتھ کی زد پر لیا اور پھر پوری قوت سے میں نے اس کی گردن کی رگ مسل دی۔ دوہی ثانیوں

میں وہ جھول کر فرش پہ ڈھیر ہو گیا۔ اپنے مالک کی یہ حالت دیکھ کر گامی بُری طرح لرزا اور پیچھے ہٹنے لگا۔

"خبردار!" میں نے اسے للکارا تو وہ فوراً ٹھہر گیا۔

"میرے پاس آؤ۔" میں نے اسے بائیں ہاتھ سے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔

وہ بہت محتاط طریقے سے آگے بڑھا مگر اتنا بھی نہیں کہ میرا ہاتھ اس تک پہنچ سکتا۔ میں نے دو قدم آگے بڑھ کر اس کی گردن پہ ہاتھ رکھا اور انگوٹھے کی زد میں لا کر اس کی بھی رگ دبا دی۔ وہ ذرا دیر کے لئے کانپا اور پھر ایک دم نیچے گر گیا۔

اب میرے لئے وہاں ٹھہرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں تھا۔ میں نے صادق علی کا خریدا ہوا ولائتی سوٹ پہنا ٹائی لگائی۔ اپنی تمام چیزیں اٹیچی کیس میں بند کیں اور پھر نیو اور وارث علی کے اجڑے ویران چہرے پہ آخری نظر ڈال کر باہر نکل آیا۔ مجھے وہاں سے فوراً ہی نکل جانا چاہئے تھا۔ حیرت مجھے اس بات پہ ہے کہ ان بیچاروں پر موت وارد بھی ہوئی تو کن حالات میں اور کس بے سر و سامانی کے عالم میں۔ ایسے عالم میں کہ ان پہ کوئی رونے والا بھی نہیں تھا اور میں کسی کو یہ بھی نہ بتا سکتا تھا کہ وہ کون ہیں اور کہاں جا رہے تھے۔ خورشید البتہ وارث علی کو جانتا تھا وہ صبح ہوش میں آئے گا تو بہت ادھم مچائے گا مگر وارث علی کہاں باقی تھا جو اسے بتا سکتا کہ میں کون ہوں۔ خورشید ہمیشہ یہی سمجھے گا کہ میں نے ہی اس کی رقم چرائی ہے۔ یہ بھی خدا کی مرضی تھی کہ جو جرم میں نے نہیں کیا تھا وہ بھی یار لوگ میری جھولی میں ڈال رہے تھے میں نے مکان کے گیراج میں بندھی وارث علی کی گھوڑی کھول لی اور اس پہ سوار ہو کر سڑک پر جا نکلا۔

باہر اس گھڑی رات کے پچھلے پہر کی یخ بستہ ہوا ٹھٹک ٹھٹک کر چل رہی تھی اس کے رقص میں درد بھری سسکی تھی۔ تاروں کی روشنی زیادہ بکھری ہوئی تھی۔ چاند کا کہیں دُور دُور تک نام و نشان نظر نہیں آتا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میرا وجود کرچی کرچی ہو چکا ہے میری نہ کوئی منزل تھی نہ کوئی ٹھکانہ۔ وارث علی کو تو میں اس لئے ساتھ لے کر چلا تھا کہ شاید وہ مجھے معلوم کر کے بتا سکے کہ آسیہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔ مگر اس کی بے وقت موت نے سب کچھ گڈ مڈ کر دیا تھا۔

میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ آخر ان دونوں کو اسلم نے کیوں اور کس طرح موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ یہ بات اس وقت میرے لئے ناقابلِ فہم تھی کہ وہ دونوں یونہی کمرے میں پڑے پڑے گیس کے زہریلے اثر... سے مر گئے ہیں۔ اسلم نے تو اس طرح سارے گھر کے لوگ ہی مار ڈالے تھے مگر کس طرح؟ یہ سوال میں کسی طرح بھی حل نہ کر سکا۔

بڑی سڑک پر چلتے ہوئے ابھی میں خورشید احمد کے گھر سے ایک ڈیڑھ میل ہی دُور نکلا ہوں گا کہ مجھے اپنے سامنے سڑک کے دائیں ہاتھ ایک آدمی نظر آیا۔ وہ اوندھا پڑا تھا۔ اس سے ذرا فاصلے پر مجھے ایک موٹر سائیکل نظر آئی جس کا انجر پنجر ٹوٹ چکا تھا۔ میں گھوڑی سے اتر کر اس آدمی کے پاس پہنچا۔ وہ بُری طرح زخمی تھا میں نے اسے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس کی ایک ٹانگ ٹوٹ چکی تھی اور ایک ہاتھ بھی جھول گیا تھا وہ خاصا صحت مند آدمی تھا اور بدن سے ڈھیروں خون بہہ جانے کے باوجود ابھی تک زندگی کی رسی پر سے اس کی گرفت ڈھیلی نہ ہوئی تھی۔ وہ نیم بے ہوش تھا۔ میں نے اسے جوں توں کر کے گھوڑی پر لادا۔ اس طرح جس طرح سامان اپنا دوہرا بوجھ لادتے ہیں ــــ خود بھی میں اس کو سنبھالنے کے لئے زین پر اس کے سامنے بیٹھ گیا اور سید صاجزل ہسپتال کے ہنگامی وارڈ میں جا پہنچا۔ میرے قیمتی لباس کو دیکھ کر وہاں کے ملازم خاصے متاثر ہوئے۔ انہوں نے اس آدمی کو فوراً علاج معالجے کے مختلف مراحل سے گزار دیا۔ میں نے اپنا بٹوا بڑی فراخدلی سے ہلکا کیا۔ کسی کو دس روپے دیئے کسی کو بیس۔ میں نے کہا کہ جیسے بھی ہو سکے وہ لوگ اس کی زندگی بچائیں کیونکہ وہ میرا بھائی ہے۔

اس بدنصیب کی جیب سے جو کاغذات برآمد ہوئے ان سے معلوم ہوا کہ اس کے پاس ایک سو ستر روپے موجود تھے۔ نام اس کا سلیم احمد تھا۔ ماڈل ٹاؤن کا رہنے والا تھا اور پیشے کے اعتبار سے وہ ریڈیو مکینک تھا۔ اس کے تمام کاغذات میں نے اپنی جیب میں رکھ لئے۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ وہ کسی گاڑی سے ٹکرا کر وہ اس حال کو پہنچا تھا۔

میں صبح چھ بجے تک ہسپتال کے ہنگامی وارڈ کے ایک کونے میں بیٹھا سگریٹ پھونکتا رہا جن چار ملازموں کو میں نے بخشیش دی تھی وہ ٹھہر ٹھہر کر اس آدمی کا حال بتاتے رہے۔

ساڑھے چھ بجے ایک ملازم نے مجھے بتایا کہ سلیم احمد کی ٹانگ اور بازو پر پلستر کر دیا گیا ہے اور نیند کا ٹیکہ لگ جانے کے بعد وہ اپنے بستر پر اطمینان سے سویا ہوا ہے۔ میں نے سوچا اسے دیکھ لوں اسے کسی کے سپرد کر دوں تو وہاں سے نکلوں۔ دن کی روشنی میں تو مجھے وہاں ٹھہرنا ہی نہیں تھا۔

اس ملازم کے ساتھ میں تیز تیز چلتا ہوا جنرل وارڈ میں پہنچا۔ ایسا لگتا تھا کہ میں نے سر پر قراقلی ٹوپی پہنی تھی۔ آنکھوں پہ سیاہ عینک لگا رکھی تھی، میرے بدن پر سرمئی رنگ کا بہت ہی خوبصورت گرم ولائتی سوٹ تھا اور پاؤں میں خاکستری رنگ کے نئے جوتے تھے۔ میں اس صبح دیکھنے میں بارعب اور دیدہ زیب آدمی معلوم ہوتا تھا میرے ہاتھ میں اٹیچی کیس تھا جس سے لگتا تھا کہ میں سفر میں ہوں۔

سلیم احمد کا بستر نمبر سترہ تھا۔ میں ہال میں دبے پاؤں داخل ہوا۔ اکثر مریض اس وقت سو رہے تھے۔ دو چار ایسے بھی تھے جو اپنے دکھ کی شدّت سے نڈھال تھے اور کراہ رہے تھے ــــ وہ ملازم جو مجھے وارڈ تک لایا مجھے اندر بھیج کر لوٹ گیا۔ نرس سے اس نے کہہ دیا تھا کہ مجھے سلیم احمد کو دیکھنے دے۔ اس کی سرگوشی بھی میں نے سن لی تھی۔ نرس نے کہا تھا۔

"یہ بہت بڑے آدمی ہیں۔ کوئی بہت بڑے زمیندار ہیں ان کا خاص خیال رکھو۔"

"تم فکر نہ کرو طاہر۔ بالکل فکر نہ کرو۔" نرس نے جواب دیا۔

میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا سلیم کی طرف بڑھا۔ اچانک میری نظریں ایک بستر سے الجھ کر رہ گئیں۔ وہاں ایک ایسا چہرہ خوابیدہ نظر آتا تھا جسے میں کبھی نہ بھول سکوں گا وہ..... اسلم تھا۔ بہادر علی کا نوکر۔ جس کی ٹانگوں پر پلستر لگا تھا اور جو کچھ دیر ہی پہلے خورشید احمد کو تباہ کر آیا تھا۔ میں نے ایک نظر سلیم احمد پر ڈالی وہ گہری نیند میں تھا سترہ نمبر بستر پہ۔ اور اسلم کے بستر کا نمبر تھا چودہ۔ میں اس کے بستر کے قریب جا ٹھہرا۔ اور گہری گہری... نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے میں اس کے قریب ہی بنچ پر بیٹھ گیا۔ اسلم گہری نیند میں کھویا ہوا تھا۔ ظاہر ہے رات کی خوفناک تھکن اس سے تقاضا کرتی رہی ہوگی کہ وہ سو جائے۔

نرس تیزی سے میری طرف لپکی اور دبی آواز میں بولی۔ "سر! آپ کا مریض وہ ہے سترہ نمبر پہ۔"

"اوہ میں سمجھا..... مگر سسٹر یہ بھی ہمارے ہی آدمی ہیں۔ میرے ایک دوست کے ملازم ہیں ــــ ان کو بھی دیکھ لوں۔" میں نے نرس کو ٹہلا دیا وہ سادہ لوح چلی گئی۔ تو میں نے چاہا کہ میں اسلم کو جگا دوں مگر ابھی میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اس نے کروٹ لی اور وارڈ کی تیز روشنی سے بچنے کے لئے اپنا منہ اس نے کمبل سے ڈھانپ لیا۔

میں نے اس کی بغل میں ہاتھ ڈال کر اس کے بازو پہ ہلکی سی چٹکی بھری۔ اس نے فوراً ہی منہ کھول دیا۔ آنکھیں اس کی ابھی تک بند تھیں۔

"کیا ہے سسٹر؟"

"میں سسٹر نہیں سسٹرا ہوں۔ تیرا استاد۔ آنکھیں کھول بچے۔" میں نے یخ بستہ انداز میں سرگوشی کی۔ اس لمحے پستول میں نے رومال میں لپیٹ کر اس کے پہلو سے لگا دیا تھا۔ اس نے فوراً آنکھیں کھول دیں ان آنکھوں کی حیرت اور سراسیمگی دیدنی تھی ــــ اس کی پتلیاں یوں پھیلنے لگیں جیسے پھٹ جائیں گی۔ لگتا تھا کسی نے چاقو دستے تک اس کی کمر میں دھنسا دیا ہے۔

"کون ہو تم؟ کیا چاہتے ہو؟" وہ دبی آواز میں بولا۔

"بچے! وہ ڈھائی لاکھ روپیہ کہاں ہے جو تم خورشید احمد کی الماری سے لے آئے ہو۔"

"کیا بکواس ہے یہ؟ مریضوں سے مسخری کرتے ہو؟" وہ بھنّا سا گیا مگر پھر اچانک اس نے کمبل کے اندر ہی اندر سے ہاتھ اوپر لا کر کچھ اتنی تیزی سے میرے پستول کی نالی پر ہاتھ رکھ کر اس کا رُخ بدل دیا کہ میں حیران رہ گیا۔ اس کی آنکھیں سفّاک ہو گئیں۔

"پستول چھوڑ دو ورنہ گولی چل جائے گی اور تمہارا راز سب پر ظاہر ہو جائے گا۔"

"یہ دیکھو تمہیں پتہ نہیں ہے میرا یہ پستول بے آواز چلتا ہے میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ ہاتھ پیچھے ہٹا لو اور اپنا پستول بند کر لو۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا پستول کمبل کے نیچے سے آگے بڑھا کر میرے پہلو سے لگا دیا میں ششدر رہ گیا۔ وہ میری زد میں نہیں رہا تھا۔ وہ بہت ہی منجھا ہوا بدمعاش تھا اور اس کی وہ سخت کرخت نظریں اس بات کی شاہد تھیں کہ وہ اپنے دشمنوں کو معاف کرنا نہیں جانتا ہے۔ اس کی دھمکی کا مجھ پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ میں نے چپ چاپ اپنا پستول رومال میں لپٹا لپٹایا پیچھے کھینچا اور جیب میں ڈال لیا۔

"تم بہت اچھے بچے ہو۔" اس نے میرے الفاظ میرے ہی منہ پر دے مارے۔ میں نے اسے تھوڑی دیر پہلے بچہ ہی تو کہا تھا۔ اب وہ مسکرا رہا تھا۔

"تمہیں پتہ ہے وہاں دو آدمی مر گئے ہیں کمرے میں دم گھٹ کر؟"

"ان کی موت کا مجھے افسوس ہے دوست۔ حالانکہ میرا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا۔"

"مگر تم نے یہ کیا کیسے؟" میرے اس سوال پہ وہ پھر دبی ہوئی آواز میں بولا۔

"دیکھ پیارے! تمہارے چہرے سے ہی میں اندازہ کر چکا تھا کہ تم بھی اپنی ہی برادری کے آدمی ہو۔ تمہارا نام مجھے اچھی طرح یاد ہے ــــ تم نے مجھے زبردست چکّر میں ڈال دیا تھا۔ اب تمہارے اس پستول نے بھی ثابت کر دیا ہے کہ تم خاصی خطرناک شے ہو۔ مجھے اب یہ معلوم کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ تم نے کتنے آدمی مارے، کتنے ڈاکے ڈالے۔ کیا کیا چرایا۔ سب بے کار ہے۔ یہی بہت کافی ہے کہ تم بھی داغی ہو۔ اس لئے تمہیں بتلائے دیتا ہوں کہ میں وہاں کسی کو مارنا نہیں چاہتا تھا پھر بھی وہ مر گئے۔ میرا خیال تھا کہ وہ لوگ صرف بے ہوش ہو جائیں گے۔

میں نے یہ کیا تھا کہ گلی میں سوئی گیس کے میٹر کے نیچے جو سوئچ ہوتا ہے اسے بند کر دیا تھا، صرف دس منٹ کے لئے ــــ جس سے کمروں میں موجود ہیٹر بجھ گئے اس کے بعد میں نے دوبارہ سوئی گیس کھول دی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ تمام کمروں میں سوئی گیس کا زہر بھر گیا اور سب لوگ بے ہوش ہو گئے۔ تم البتہ جاگ رہے تھے اس لئے اٹھ کر باہر نکل گئے۔ تمہارے دونوں ساتھیوں پر گیس نے گہرا ہی اثر کیا اور وہ بے ہوشی کی حالت میں مر گئے۔ یہ بہت بُرا ہوا۔ میں نے ڈھائی لاکھ روپیہ جو وہاں سے چرایا ہے اس میں سے ایک لاکھ روپیہ میں تمہیں دے دوں گا ــــ آج یا کل شام چار بجے میں رقم تمہیں بھیج دوں گا۔"

"مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے بہت روپیہ ہے میرے پاس تم وہ رقم خورشید کو لوٹا دو ہم اس کے مہمان تھے اور وہ مجھے ہی مجرم سمجھا ہے اس کا خیال ہے وہ سب کچھ میں نے کیا ہے۔"

"لعنت بھیج اس سارے قصّے پہ یار! مگر یہ بتا تو وہاں سے نکلا کس طرح ہے؟"

میں نے اسے سارا واقعہ سنایا۔ تو وہ بولا۔

"پیر استاد معلوم ہوتے ہو پیارے بہرحال نکل جاؤ یہاں سے اور یقین رکھو کہ اگر تم مجھ پر آج احسان کر دگے تو میں کل اس کا بدلہ تمہیں ضرور دوں گا ۔۔۔ مجھے لگتا ہے تم بہت پریشان ہو۔"

"ہاں میری زندگی پریشانیوں سے بھری ہے۔" میں نے اعتراف کیا۔

"تمہاری آواز بتاتی ہے کہ تم ہمت ہار چکے ہو مگر تم ایسے مرد ہو جس کی دوستی اور خدمت پر میں فخر محسوس کروں گا ۔۔۔ لکھنا جانتے ہو، تو لکھو میں اپنے دوست کا پتہ دیتا ہوں تمہیں ۔۔۔ وہ ادھر راوی روڈ پر رہتا ہے بادامی باغ سٹیشن کے قریب۔ وہ میرا بھائی بنا ہوا ہے، پگڑی بدل بھائی۔ اپنے ہی کینڈے کا آدمی ہے اس سے جا ملو۔ وہ تمہاری ہر مشکل میں مدد کرے گا مگر اسے مت بتانا کہ میں کہاں ہوں۔" میں نے سگریٹ کے پیکٹ پر اس کا دیا ہوا پتہ لکھ لیا۔ وہ بولا "بڑے دل گردے والا آدمی ہے وہ۔ تمہارے حصے کا لاکھ روپیہ میں اسے بھجوا دوں گا ۔۔۔ میرا نام لینا اس کے سامنے کہنا کہ اسلم آبی نے بھیجا ہے پھر دیکھو کیا کیا خاطریں کرتا ہے وہ تمہاری۔"

"تم بتا سکتے ہو بہادر علی سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"میں کسی زمانے میں اس کا ملازم رہا ہوں اس کے کھیتوں میں کام کرتا تھا میں ۔۔۔ ہم ایک ہی گاؤں کے رہنے والے ہیں۔"

"اسے پتہ ہے کہ تمہارے یہ لچھن ہیں؟"

"نہیں پیارے وہ تو میری نیکی کی قسم کھا سکتا ہے۔ وہ مل بھی جائے تو اسے کبھی میرے بارے میں ایسی ویسی کوئی بات نہ بتانا۔"

"اسے پتہ ہے کہ تمہاری ٹانگیں ٹھیک ہیں؟"

"نہیں یہ پلستر تو میں نے چھ مہینے سے لگا رکھا ہے اس نے جب مجھے بتایا کہ وہ خورشید احمد کو ڈھائی لاکھ روپیہ دینے جا رہا ہے تو میں نے کہا مجھے بھی ساتھ لے چلو اپنے ساتھ۔ میری ٹانگوں میں درد رہتا ہے کوشش کر کے ہسپتال میں داخل کروا دینا۔ وہ مان گیا اور میں اس کے ساتھ ہی شہر چلا آیا۔ رات خورشید کے گھر سے نکل کر بہادر علی نے مجھے یہاں لا کر وارڈ میں داخل کرا دیا۔ میں نے ایک سو روپیہ دیا ایک آدمی کو اور کام بن گیا۔ اس نے مجھے باہر جانے دیا۔

رات بارہ بجے میں نے اپنے ایک ساتھی کو یہاں سلایا اور خود چپ چاپ خورشید کے گھر جا پہنچا وہاں سے فارغ ہو کر آیا تو اپنے ساتھی کو رقم دے کر میں نے گھر بھیج دیا اور خود یہاں لیٹ گیا۔ افسوس یہ ہے کہ دو آدمی خواہ مخواہ مر گئے۔"

"اس بات کا افسوس نہیں ہے تمہیں کہ تم نے خورشید احمد کو لوٹ لیا ہے؟"

"نہیں بھائی میرے! اس نے تو کوڑیوں کے مول حاصل کی تھی وہ زمین کسی زمانے میں۔ اب چاندی بنا رہا ہے اس کی۔ یہ دراصل ایک بیوہ کی زمین ہے جسے اس نے کوئی پانچ سال پہلے ہیرا پھیری سے اپنے نام لگوا لیا تھا۔ اب بھی پانچ مربع زمین باقی ہے اس کے پاس۔ اس آدمی کو لوٹنا تو عین ثواب ہے۔" اس نے بلا جھجک دبی زبان میں اپنی ساری کہانی مجھے سنا دی پھر بولا۔

"اب تم جاؤ ۔۔۔ اور سیدھے دل شیر کے پاس جا پہنچو۔ میں بھی جلد وہاں پہنچ جاؤں گا۔"

"میں ذرا سلیم احمد کو دیکھ لوں۔"

"ہاں دیکھ لو۔ اگر یہ آدمی زخمی نہ ہوتا تو شاید تم قیامت تک مجھے نہ پا سکتے مگر خیر مجھے خوشی ہے کہ تم ایسے جوانمرد سے میری ملاقات ہو گئی" یہ کہہ کر اس نے مجھ سے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا اور میرے ہاتھ کو چوم سے بوسہ بھی دیا۔ بہت چالاک آدمی تھا وہ۔ سلیم احمد ابھی تک سویا ہوا خواب آور ٹیکہ اپنا کام دکھا رہا تھا۔ میں نے اسے جگانا مناسب نہ سمجھا اور آگے ہی آگے چلتا ہوا دوسرے دروازے سے باہر نکل گیا۔

ہسپتال کے لان میں گھوڑی بے چین ہو رہی تھی میں نے اس کی لگام تھامی اور لمبے لمبے گام چلاتا ہوا باہر نکل آیا۔

***

سورج ابھی نہیں نکلا تھا۔ میں نے گھوڑی سرپٹ دوڑا دی اور یونیورسٹی کیمپس کے اوپر سے نکلتا ہوا نہر کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا محمود بوٹی پر جا پہنچا۔ میں شہر کے اندر سے بادامی نہیں پہنچنا چاہتا تھا اس میں خطرے تھے۔ لاہور شہر کی ہی نہیں پورے صوبے کی پولیس میری تلاش میں ہر آنکھ مجھے اپنی طرف گھورتی نظر آتی تھی اور مجھے ہر آنکھ سے بچنا تھا۔ شیر دل آہو کا میں نے راوی روڈ کے مشرقی حصے میں پہنچ ایک صبح خیز آدمی سے پتہ پوچھا تو اس نے بڑی توجہ سے میری بات اس وقت تک سورج طلوع نہیں ہوا تھا۔ اس آدمی نے مجھے بڑی تفصیل آہو صاحب کے گھر کا پتہ بتایا معلوم ہوتا تھا کہ آہو صاحب کی اس علاقے میں بڑی عزت ہے۔ اس شخص کی باتوں سے تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ ان سے زیادہ بڑے قد کا کوئی آدمی وہاں نہیں رہتا۔

میں گھوڑی کو ایڑ لگاتا ہوا آگے بڑھا تو معلوم ہوا کہ جو نشانیاں اس نے بتائی تھیں وہ مجھے ایک بہت بڑے دو منزلہ مکان کے سامنے لے گئی ہیں ۔۔۔

میں نے دروازے پر لگی گھنٹی بجائی تو ایک ادھیڑ عمر کا آدمی نکلا۔ وہ سر سے گنجا اور پاؤں سے ننگا تھا حالانکہ اتنی شدید سردی مگر اس نے اپنی دونوں سرحدیں غیر محفوظ چھوڑ رکھی تھیں وہ شاید فرش صاف کرتا ہوا ایک دم باہر آیا تھا۔ میں نے اسے اپنا نام بتایا اور کہا کہ مجھے اسلم آبی صاحب نے بھیجا ہے میں آہو صاحب سے ملنا چاہتا ہوں تو وہ سر ہلاتا ہوا الٹے قدموں لوٹ گیا۔

ابھی مجھے وہاں کھڑے تین چار منٹ ہی گزرے تھے کہ دروازے میں ایک لمبا تڑنگا خوبصورت رعنا جوان نمودار ہوا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ بہت ہی سجتی تھی۔ آتے ہی اس نے مجھ سے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا اور پھر بڑی معنی خیز نظروں سے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے بولا ۔۔۔ "فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"آہو صاحب آپ ہی ہیں؟"

"جی ہاں، میرا ہی نام دلشیر آہو ہے۔"

"دیکھیں جناب مجھے اسلم آبی صاحب نے بھیجا ہے۔ میں آپ کے ہاں چند دن کے لئے ٹھہرنے آیا ہوں ۔۔۔" میں نے بے دھڑک ہو کر کہا۔

"کیا نام بتایا آپ نے؟"

"غلام جیلانی ۔۔۔"

"پورا نام ۔۔۔؟"

"جی یہی میرا پورا نام ہے۔" وہ مجھے بہت ہی گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا ۔۔۔

"اوہ سمجھا، اندر تشریف لے آئیے، غریب خانہ حاضر ہے۔" یہ کہہ کر پیچھے ہٹ گیا۔

"اور یہ گھوڑی؟"

"اسے بھی اندر لے آئیے۔"

اس کے کہنے کے مطابق میں گھوڑی سمیت اس کے مکان میں داخل ہو گیا۔ سامنے ایک صحن تھا۔ کوئی تیس فٹ مربع کی وسعت ہو گی اس کی اس صحن کے چاروں طرف عمارت بنی تھی مگر اس طرح کہ دوسری طرف بھی اس دروازے جتنا بڑا دروازہ لگا تھا جس میں سے میں گزر کر صحن میں پہنچا تھا۔

آہو صاحب نے صحن میں پہنچتے ہی بلند آواز سے کہا "کبری اے او کبری ۔۔۔"

"جی سرکار! حاضر ہوا۔" ایک بہت ہی چاق و چوبند آواز میرے کانوں سے ٹکرائی اور پھر اس کے ساتھ ہی ایک آدمی سفید براق قمیص شلوار میں ملبوس تیزی سے درمیانی کمرے میں سے باہر نکلا۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ جونہی وہ میرے سامنے آیا میرے حافظے کے نہاں خانوں میں ہلچل مچ گئی۔ اس کو میں جانتا تھا وہ شبراتی تھا جسے میں کوٹ لکھپت جیل میں مل چکا تھا۔ میں جب وہاں کچا قیدی تھا تو وہ اس دور میں وہاں ایک سال کی قید بامشقت بھگت رہا تھا۔ وہ سر جھکائے تیزی سے ہمارے سامنے ٹھہرا تو آہو صاحب بولے "ابے ادھر بھی دیکھے گا کہ نہیں۔ جا اس ماں کو لے جا کر ادھر پیچھے لان کے کسی کونے میں باندھ دے پھر اس کے آگے دانہ بھی ڈال دینا۔"

آہو صاحب کا یہ حکم سن کر اس نے پہلی بار نظریں اوپر اٹھائیں اور جونہی میں اس کی بصارت کے چوکھٹے میں آیا وہ ایک دم دیدے پھٹ پھٹا کر مجھے یوں دیکھنے لگا جیسے میں کوئی بھوت ہوں مگر میں نے اسے دیکھا ان دیکھا کر دیا۔ یوں ظاہر کیا جیسے میں اسے بالکل نہیں جانتا ہوں۔

اس نے ایک دم میرے سامنے آ کر مجھے پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ آہو صاحب مجھے میرے اصلی روپ میں دیکھ سکیں۔ میں اپنی شناخت ان سے بہرحال چھپا لینا چاہتا تھا مگر اس شبراتی سالے نے میرا منصوبہ غارت کر دیا تھا۔ اب وہاں میرے لئے جھوٹ بولنے کی کوئی گنجائش باقی نہ رہ گئی تھی پھر بھی میں نے اپنے گرد ایک دیوار کھڑی کر لی اور اس گھٹے بدمعاش شبراتی جیب کترے کو پہچاننے سے انکار کر دیا میرے چہرے کے خالی خالی تاثر کو دیکھ کر شبراتی کے لبوں پر آئی مسکراہٹ آہستہ آہستہ غائب ہو گئی اور اس نے جلدی ہی اپنی بھیدوں بھری گھبراہٹ پر قابو پا کر کہا۔

"بہت اچھا سرکار! ابھی لیں مگر یہ کہیں کاٹتی پھاڑتی تو نہیں ہے نا سرکار۔ گھوڑیوں اور عورتوں کا کیا اعتبار؟"

"ابے اعتبار کے گھوڑے! چل اسے لے جا ادھر کچھ نہیں کہتی یہ تجھے تیری ماں کے برابر ہے یہ حرامی پلے، چل ادھر۔" آہو صاحب نے ایک انداز بے تکلف سے شبراتی کو اپنی مہربانی سے نواز دیا۔ وہ بھی سالا خوش ہو گیا۔ کھل کر منہنانے لگا اور دانت نکالتا ہوا گھوڑی کی لگام پکڑ کر دوسرے دروازے کی طرف بڑھ گیا مگر وہ جاتے جاتے بھی مجھے دہشت میں مبتلا کر گیا۔ دو تین بار اس نے مجھے یوں مڑ کر دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ حضرت یہ آپ ہیں تو آپ پر قربان جائیے۔ آپ کی تو مجھے بہت دنوں سے تلاش تھی۔

انداز اس کا بالکل ایسا ہی تھا واللہ باللہ میں تو اندر ہی اندر سکڑ کر رہ گیا۔ شبراتی جیسے رذیل آدمی سے کچھ بھی بعید نہ تھا اور میں آہو صاحب کے گھر میں دو گھڑی پناہ لینے کے لئے داخل ہوا تھا۔

شبراتی میری نظروں سے غائب ہوا تو میں نے محسوس کیا کہ آہو صاحب میرے چہرے کے بدلتے رنگوں کو بڑے غور سے دیکھ رہے ہیں۔ ہنس کر بولے۔

"یہ ہمارا لاڈلا نوکر ہے۔ کبری نام ہے اس کا۔ بڑا منہ پھٹ ہے ایسی ایسی چوکڑیاں بھرتا ہے کہ ....."

"آہو بھی پیچھے رہ جاتے ہیں ۔۔۔" میں نے فقرہ مکمل کیا۔ میرا اعتماد لوٹ آیا تھا۔ آہو صاحب کی مسکراہٹ میں بڑا جادو تھا۔ وہ کھل کر ہنس دیئے۔

"جی ہاں جی ہاں بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔ بات کچھ ایسی ہی ہے۔"

یہ کہہ کر وہ مجھے ایک صاف ستھرے سجے سجائے کمرے کے سامنے لے گیا مگر ابھی میں دروازے میں ہی تھا کہ دائیں طرف مکان کی دوسری منزل کی ایک کھڑکی میں مجھے ایک چہرہ نظر آیا۔ جو آنکھوں کے سوا سارے کا سارا ایک سیاہ دوپٹے میں چھپا ہوا تھا۔ ان آنکھوں میں مجھے قیامت کا تحیر نظر آیا، ایسا تحیر جو میں نے کسی آنکھ میں اس سے پہلے نہ دیکھا نہ شاید کبھی دیکھ سکوں گا۔ وہ بہت ہی خوبصورت سرمہ سا قسم کی شاعرانہ آنکھیں تھیں مگر اس گھڑی وہ جس انداز سے مجھ پر جمی تھیں وہ میرے لئے اپنی جگہ ایک بہت حیران کن بات تھی بس ایک لحظے کے لئے ہی میں ان آنکھوں کو دیکھ سکا اور بس۔ آہو صاحب نے

مجھے چونکا دیا تھا ـــــ

"آئیے اندر تشریف لے آئیے" وہ کمرے میں داخل ہو کر اپنی بھاری بھرکم آواز میں مجھے اندر داخل ہونے کا اِذن دے رہے تھے۔ میں نے ان.... آنکھوں کے طلسم کا جال توڑتے ہوئے کمرے میں قدم رکھا تو معلوم ہوا کہ وہاں آدمی کی سہولت کی ہر شے موجود تھی۔ ایک طرف بہت آرام دہ قسم کا بڑا سا صوفہ دھرا تھا جس کے سامنے شیشے کی ایک میز دھری تھی۔ اس پر خوبصورت راکھ دان پڑے تھے۔ فرش پر دبیز قالین بچھا تھا۔ دیواریں ہلکے پیلے رنگ میں رنگی تھیں۔ بائیں ہاتھ ایک پلنگ بچھا تھا بہت آرام دہ اور خوبصورت۔ اس

پر نرم کا گدا اتنا نرم اور دبیز تھا کہ میں نے چاہا کہ اس پر جا کر اسی وقت لیٹوں اور سو جاؤں اور پھر.... پھر پتہ نہیں میرا جی اس لمحے کیا کیا کچھ چاہنے لگا تھا یہ جو آدمی کے ساتھ اس   کا تخیل لگا ہے یہ ایک ہی زقند میں اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے۔ اس کا اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ دیوار کے ایک کونے میں ایک چھوٹا سا دروازہ لگا تھا۔ آہو صاحب بولے ـــــ

"بیٹھیں جناب! اس کمرے میں آپ کی ضرورت کی ہر شے پہنچ جائے گی۔ اُدھر کونے میں باتھ روم ہے۔ صابن تیل تولیہ سب آپ کو موجود ملے گا۔ کرایہ اس کا صرف آپ کی محبت اور خلوص کی صورت میں وصول کیا جائے گا۔" وہ بہت کھل کر مسکرا رہے تھے۔

"میں آپ کا شکر گزار ہوں آہو صاحب! کہ آپ نے اتنی توجہ فرمائی ہے۔"

"یہ میرا فرض ہے جناب! آپ کا دوست میرا صاحب ہوتا ہے ابھی کبری آتا ہوگا۔ وہ ہر طرح سے آپ کا خیال رکھے گا۔ میں اسے کہہ دیتا ہوں۔ سگریٹ بھی اُدھر رکھے ہیں سامنے ـــــ وہ پیکٹ کھول لیں اور بے فکر ہو کر بیٹھیں۔ جب تک جی چاہے یہاں رہیں یہ آپ کا اپنا گھر ہے۔" اس نے مجھے پوری طرح زیر کر لیا تھا۔

"آپ کا بہت بہت شکریہ آہو صاحب! میں اس صبح کو اور آپ کو کبھی نہ بھول سکوں گا۔"

"شکریے کی رٹ نہ لگائیے جناب! یہ دکھ دینے والی بات ہے۔ آپ میرے مہمان ہیں معزز مہمان!" یہ کہہ کر وہ مسکراتے ہوئے باہر نکل گئے اور میں ایک بار پھر اپنی سوچوں کے تاریک غار میں اتر گیا۔ آسیہ پھر میرے سامنے آ ٹھہری تھی۔ سر جھکائے بال بکھرائے۔ اس کے رخساروں کی ساری رونقیں اجڑی ہوئی تھیں۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی تھیں اور آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔ بدن اس کا بید مجنوں کی طرح لرز رہا تھا اور وہ مجھ سے بلک بلک کر پوچھ رہی تھی کہ میرا.... میرا کیا قصور ہے میرے بھیا ـــــ میں نے کیا گناہ کیا ہے جس کی مجھے یہ سزا مل رہی ہے۔ میں کس جرم میں یوں پیس دی گئی ہوں۔ کیونکہ مجھے جیل کی ان تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں پور پور مرنے کے لئے ڈال دیا گیا ہے تو اسی شہر میں ہے غلام جیلانی!

مگر تو کتنا کٹھور ہے کہ مجھے ایک بار بھی ملنے نہیں آیا۔ کیسی ستم ظریفی ہے حالات کی کہ ہم ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے بھی یوں بیٹھے ہیں جیسے ہمارے درمیاں سمندر حائل ہے اور میرا دل لہو ہو رہا تھا یہ سوچ کر کہ میں اپنی اس سامنے کھڑی بہن کو جس کا سر جھکا ہوا ہے جیسے صدموں نے چور چور کر رکھا ہے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہے ـــ اس کے ان سوالوں کا کیا جواب دوں۔ اسے میں کیا کہوں۔ یہ جو تنہا اس گو ہار میں ماری گئی ہے تو اس کا کیا گناہ ہے ـ اس کی تباہی بربادی کا سبب میں تھا۔ میں جسے لوگ غلام جیلانی کہتے تھے مگر جو اپنے اعمال کے سبب اب غلام شیطانی کہلانے کا مستحق ہو چکا تھا۔ میں ہی آسیہ کی ستاروں ایسی چمکتی ہوئی جھلمل جھلمل آنکھوں میں لہو رنگ آنسو لانے کا ذمے دار ہوں۔ میں نے ہی اس کی زندگی کے روشن آسمان سے سارے چاند سورج نوچ لئے ہیں۔ میں اسے بھلا کیا جواب دے سکتا تھا۔ اس کا چہرہ میرے تصور میں بار بار ابھرتا تھا اور میں آہو صاحب کے آرام دہ صوفے پہ بیٹھا یوں محسوس کرتا تھا جیسے میں دہکتے ہوئے گرم توے پر بٹھا دیا گیا ہوں۔

لیکن پھر اچانک ہی مجھے یہ خیال آیا کہ اب جبکہ میں آہو صاحب کے پاس آ پہنچا ہوں تو مجھے یہ امید رکھنی چاہیے کہ میرے اور آسیہ کے درمیان حائل فاصلوں کی دیوار جلدی مٹ جائے گی میں ضرور اسے آزاد کرا لوں گا۔ اس کی رہائی کے لئے میں اپنی جان بھی داؤ پر لگا دوں گا اور اگر میں اسے آزاد نہ کرا سکا اور اس کی سوچوں امنگوں اور آرزوؤں کے تاج محل کو حقیقت کا روپ نہ دے سکا تو جان سے گزر جاؤں گا۔ پھر زمین کا پیٹ میرے لئے زمین کی پشت سے بہتر ہوگا کہ اس درخت کا فائدہ ہی کیا ہے جس پہ نہ پھل لگتا ہو نہ پھول جو آس دے سکے نہ باس۔ اسے تو کٹ ہی جانا چاہیئے۔

میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ آہو کا ملازم شبراتی اندر آ گیا گھر میں اس کا نام کبری تھا اور میرا خیال تھا کہ وہ بھی یہی چاہتا تھا کہ اسے کبری کہہ کر پکارا جائے ـــــ وہ اندر آیا تو اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک لہرا رہی تھی وہ مجھے گہری گہری نظروں سے دیکھتا ہوا اندر داخل ہوا اور دروازہ اپنے پیچھے بند کر کے بولا ـ

"اُو استاد! یہ تم ادھر کیسے آ ٹپکا ـــــ بڑے شان بان میں ہو تیرے یہ سوٹ یہ بوٹ یہ ٹائی۔ تیرے تو طور ہی بدل گئے۔"

"کیا بکتے ہو کیا کہہ رہے ہو تم۔ اپنی کھال میں رہو۔"

"اُو استاد! اپنی کھال تو میں ادھر سالی کوٹ لکھپت جیل میں چھوڑ آیا۔ ادھر تو ہم نے بکرے کی کھال اوپر اوڑھ لی ہے پر مجھ سے مت بڑے بھائی۔ میں تمہیں پہچان گیا ہوں یار اور محترم جناب غلام جیلانی! السلام علیکم کے بعد عرض ہے کہ میں اصل میں شبراتی ہوں شبراتی پاکٹ مار سمجھے کہ نہیں سمجھے۔" وہ یہ کہتا ہوا ایکدم آلتی پالتی مار کر میرے پاس صوفے پر بیٹھ گیا۔

"ابے گھس چکر! آواز دبا کے بات کر لیا کر بیٹے! وہ تیری ماں کا سن لے گا تو بڑی بے عزتی ہوگی اپنی۔"

"وہ اوپر جا چڑھا ہے۔ اپنی بیگم کے پاس بیٹھا ہوگا اب۔ تمہارا 'چاچ' وہ مجھے دے گیا ہے۔ ہرن صاحب! ہرن ہی کہتے ہیں نا آہو کو اردو میں ـــ"

"لعنت ہے تیری شکل پر ابے تو زبان بند بھی رکھے گا کہ نہیں؟"

"استاد! گھبرا مت بس تیرا میرا راز ایک رہے گا ادھر میں بھی اس آہو صاحب کو بڑا چٹا دھاری سادھو بن کر ملا تھا۔ میں نے اپنے اس سسرال سے نکلتے ہی ادھر نوکری کر لی ہے۔ بابا لوگ! اُدھر پاکٹ ماری کا دھندا بہت نرم پڑ گیا تھا جس کا بڑا کھولو اُدی، بھنڈی، توری، آلو، دال، دھنیا اور ٹماٹر کی 'لسٹ' نکلتی ہے اس میں سے۔ تنگ آ کر میں نے ادھر نوکری کر لی ہے۔"

"تو نے بہت اچھا کیا ہے شبراتی۔ راستی بہت اچھی چیز ہے۔"

"راستی کی   ایسی تیسی ـــــ یہ بات نہیں ہے اوستاد۔ بس ایسے ہی میں ذرا دب گیا ہوں۔ اچھا! میں ابھی آتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکلا اور کوئی دس منٹ بعد جب وہ میرے پاس واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں یہ بڑا سا ولائتی ناخن تراش تھا۔

"لے اوستاد پہلے میں تیرے ناخن کاٹ دوں۔ اتنے لمبے کر لئے ہیں تو نے۔ اگر یہ ٹوٹ گئے تو زخم ڈال دیں گے۔" یہ کہہ کر اس نے بڑی محبت سے میرے پاؤں گود میں رکھے اور بڑے سلیقے سے میرے ناخن تراشنے لگا اس کام سے فارغ ہو کر وہ بولا۔

"دیکھ اوستاد تم مجھے ادھر شبراتی نہ کہا کرو۔ میرا نام کبری ہے میرا اصل نام تو غلام کبریا ہے نا۔ بس وہ بگڑتے بگڑتے کبری ہو گیا۔ اب مجھے یہی اچھا لگتا ہے آہو صاحب مجھے کبھی کبھی "کبرایا" بھی کہہ لیتے ہیں جس کا مطلب ہے گھبرایا ہوا۔ مجھے غصہ تو بہت آتا ہے پر پھر میں اس سالے کو معاف کر دیتا ہوں ورنہ تو میں اس کی پاکٹ ہی کاٹ دوں۔"

"اچھا جا تو پہلے میرے نہانے کا بندوبست کر، پھر ذرا ناشتہ لے آ۔ بڑی بھوک لگی ہے مجھے۔" میری یہ بات سنتے ہی وہ اٹھا اور بولا "ارے میں بھول ہی گیا تھا۔ بس ابھی لایا میں سب کچھ، پانی بھی گرم دوں گا اور ناشتہ بھی۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ کوئی ایک گھنٹے بعد وہ مجھے غسل خانے سے گزار کر ناشتہ کھلا چکا تھا برتن اٹھا کر باہر نکل گیا۔ بولا "میں ابھی آ رہا ہوں اوستاد! ذرا مالکن سے بھگت لوں۔"

اس کے لب و لہجے میں بڑی محبت تھی بے پناہ خلوص جھلکتا تھا جس کی طرف سے میں اس کی طرف سے مطمئن ہو کر بیٹھ گیا اور سگریٹ سلگا کر پینے لگا۔ زندگی کے بہت سے تلخ ترش دنوں کی یادیں میرے حافظے میں کلبلانے لگیں شبراتی کو میں نے پہلی بار جیل میں ہی دیکھا تھا۔ میں کچا قیدی تھا۔ وہ لوگ ابھی مجھ سے کوئی مشقت نہیں لیتے تھے میرے مقدمے کی ابھی سماعت جاری تھی۔

اس روز میں اپنی بیرک میں دوسرے قیدیوں کے ساتھ دیوار کے ساتھ ڈھاسنا لگائے بیٹھا تھا کہ اچانک بیرک کے دوسرے حصے سے شور سا اٹھنے لگا۔ میں نے ادھر نظر ڈالی تو دیکھا کہ سیال گوجر اور اس کے تین ساتھی اس شبراتی کو بری طرح پیٹ رہے تھے تمام قیدی یہ شور سن کر ادھر کو لپکے معلوم یہ ہوا کہ سیال گوجر کے گھر سے آئی ہوئی پانچ ہزار کی رقم اس کی جیب سے نکل گئی ہے۔ وہ اس بیرک کا سب سے امیر آدمی تھا اور ایک قتل کے سلسلے میں چودہ سال کے لئے اندر گیا ہوا تھا۔

کوٹ لکھپت جیل کا وہ سارا منظر میری نظروں کے سامنے تھا اور میرے حافظے کے سارے خانے چوپٹ کھل گئے تھے۔ شبراتی نے ان دنوں یہ لمبی سی ڈاڑھی پال رکھی تھی۔ اور سر پہ بال بھی اس نے خاصے بڑھا لئے تھے.... سیال گوجر اسے بالوں سے پکڑ کر کچھ اس طرح دھن رہا تھا کہ اس کی چیخیں نکل گئی تھیں۔ وہ کسی زمیندار کا بیٹا تھا اور وہاں بھی بڑے ٹھاٹھ تھے اس کے۔ گاؤں سے اس کے لئے ڈھیر سارے روپے اور سگریٹ چائے چینی، صابن تیل تولئے اور.... سینکڑوں قسم کی الا بلا چیزیں اندر پہنچتی رہتی تھیں۔ یہ بات وہاں مشہور تھی کہ رفیع سیال کے پاس ہر وقت پانچ دس ہزار روپے موجود رہتے ہیں اور جو چیز وہاں بڑے بڑے پاٹے خانوں کو نہیں ملتی تھی وہ اس کے پاس موجود رہتی تھی۔ اس نے جیل میں اپنا ایک الگ گروہ بنا رکھا تھا جس میں بڑے بڑے نامی گرامی بدمعاش شامل تھے۔ وہ اس کی خدمت بھی کرتے تھے اور لوگوں پر اس کا رعب قائم رکھنے میں اس کی مدد بھی کرتے تھے اپنی ان خدمات کے صلے میں انہیں رفیع سیال کے دربار سے ضرورت کی ہر شے مل جاتی تھی اور یوں ان کی زندگی کے دن وہاں بڑے آرام سے گزرتے تھے۔

جیل کے عملے کا منہ بند رکھنے کے لئے رفیع سیال بے دریغ روپیہ خرچ کرتا تھا ـــ اب جو اس کی جیب کٹ گئی تھی تو اس نے اپنے ساتھیوں کے کہنے پر شبے میں شبراتی کو پکڑ لیا تھا۔ میں اپنے حال میں مست اس بیرک میں گم سم سا ڈانواں ڈول پھرتا رہتا تھا اور میری اسی چپ کی وجہ سے مجھے کبھی کوئی نہ پوچھتا تھا کہ بھیا تیرے منہ میں کتنے دانت ہیں۔ سب لوگوں کو معلوم تھا کہ شبراتی بہت منجھا ہوا پاکٹ مار ہے۔ وہ اس سے پہلے بھی کئی بار جیل جا چکا تھا اب سیال اور اس کے ساتھیوں کا یہ متفقہ فیصلہ تھا کہ جیب شبراتی نے کاٹی ہے وہ معاملہ ایسا تھا کہ رفیع جیل کے حکام سے شکایت بھی نہیں کر سکتا تھا اس کا ایک ساتھی پھڈا تو بڑے دعوے سے کہتا تھا کہ جیب شبراتی کے "نیکرے" لگی ہے یہی لفظ کہے تھے اس نے۔

اور اب وہ سب لوگ اس بیچارے پر کتوں کی طرح پل پڑے تھے شبراتی کا یہ حال تھا کہ اسے راہ نہ ملتی تھی۔ وہ بری طرح بلک رہا تھا۔

میں نے اس جھگڑے سے خود کو بالکل دور رکھا اور بے نیاز ہو کر دیوار کے ساتھ اطمینان سے ڈھاسنا لگا کر بیٹھا رہا۔ وہ لوگ اسے مسلسل مار رہے تھے۔ شبراتی نے اچانک ان کے درمیان سے زقند لگائی اور پاگلوں کی طرح دوڑتا ہوا وہ میرے پاؤں پہ آ گرا، اور گڑگڑا کر بولا ـــــ

"خدا کے لئے بھاجی! مجھے بچائیں۔ میں بالکل بے گناہ ہوں بھاجی!

میرا کوئی قصور نہیں ہے۔"

یہ موٹے موٹے آنسو اس کی آنکھوں میں اُبل رہے تھے۔

اس کی یہ بات سنتے ہی میں نے اسے اپنی اوٹ میں لے لیا اور پورے قد سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا مجھے یہ سب کچھ بے حد مکروہ اور گھناؤنا نظر آتا تھا۔ وہ زندگی کے دھتکارے ہوئے بے بس جانوروں کی طرح سلاخوں کے پیچھے بند انسان اپنے خبثِ باطن کو وہاں بھی دبا نہ سکتے تھے اور اتنی ساری ذلت کی دلدل میں ڈوبنے کے باوجود ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوئے پھرتے ہیں۔ شبراتی کو میری اوٹ میں دیکھ کر وہ چاروں آدمی لپکتے ہوئے میرے سامنے آ گئے۔ وہ سب کے سب پلے ہوئے سانڈ تھے اور وہ ایسے شہدے تھے کہ ایک بے بس مجبور اور نہتے آدمی پر اپنے ہاتھ آزما رہے تھے۔ جس انداز سے شبراتی رو رہا تھا اس سے میرے دل میں یہ بات گہری دھنس گئی تھی کہ وہ بیچارا ہرگز قصوروار نہیں ہے۔ میرے تنے ہوئے سینے اور بگڑتے ہوئے تیور دیکھ کر سیال غرّایا، بولا ——

"پیچھے ہٹ جا جیلانی! ہم اس کی چمڑی ادھیڑ دیں گے اس کی.... یہ جانتا نہیں ہے ہیں میرے پیسے اسی نے چرائے ہیں ——"

"اسے چھوڑ دے سیال یہ تمہارا چور نہیں ہے" میں نے نہایت ہی جمے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تو پھر تم نے چرائے ہوں گے ہمارے پیسے۔ تم دے دو" وہ نہایت ہی بدتمیزی سے بولا۔

"میں تمہیں دے دوں گا مگر اسے چھوڑ دو" اب کی بار بھی میرا لہجہ خاصا جما ہوا تھا۔

"میں دے دوں گا! سن رہے ہو اوئے پھڈی! یہ پھوپھی جیلانی کہتی ہے میں دے دوں گا۔ اوئے ذات کی چھپکلی شہتیروں کو جپھے۔ تو کہاں سے دے دے گا خسرے! اس فقیرنی سے لے کر جو تجھے ملنے آتی ہے، دے دوں گا! ہٹ جا پیچھے اسے ادھر میرے حوالے کر اس پدی کے بچے کو۔"

یہ کہہ کر سیال پھنکارتا ہوا میری طرف بڑھا۔ اس کی بات سن کر میں تو پاگل ہی ہو گیا۔ اس نے میری ماں کو گالی دی تھی۔ اسے فقیرنی کہا تھا اس نے —— میری تو ہڈیاں چٹخ گئیں۔ غصے کی وجہ سے مجھ پر اس گھڑی ایسا جنون طاری ہوا کہ میں نے اپنے پورے قد سے اچھل کر سیال کے پیٹ میں کچھ اتنی قوت سے لات جمائی کہ وہ لڑھکتا ہوا اپنے ساتھی غوث پر جا گرا۔ چوٹ اسے اتنی شدید لگی کہ وہ اندر سے چُرمُر ہو کر رہ گیا۔ غوث نے یہ حال دیکھا تو اس نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کر دیا۔ وہ سب خوفناک انداز سے میری طرف بڑھے مگر میں ان کا اپنی جگہ جم کر انتظار کرنے کے بجائے تیزی سے ان میں جا گھسا اور جاتے ہی میں نے غوث کی گردن مسل دی۔ وہ آناً فاناً لڑھک گیا۔ راجہ اور تاری مجھ پر پل پڑے۔ تاری میں تو جیسے ایسی طاقت تھی مگر وہ فنکار نہیں تھا۔ وہ گھونسے مارتے ہوئے میرے بدن سے آ چمٹے۔ یہی میں چاہتا تھا یہ میرے لئے بڑا ہی غنیمت لمحہ تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر تاری پر بھی وہی ہاتھ آزمایا۔ اس نے فوراً ہی ... دے دی اور وہیں دھم سے زمین پر ڈھے گیا۔ اب راجہ اور شیدا میرے ... تھے۔ شیدا چند قدم پیچھے ہٹا اور اچھل کر مجھ سے ٹکرانے کے لئے اوپر اچھلا تو ... سمٹ کر ایک طرف ہو گیا وہ اپنی جھونک میں سیدھا دیوار میں جا لگا۔ دھم ... آواز پیدا ہوئی۔ اور وہ سر میں شدید چوٹ لگنے کی وجہ سے وہیں لمبا لیٹ گ... اب میدان میں صرف راجہ رہ گیا تھا۔ اس کے باقی سب ساتھی غین ہو چکے ... سیال البتہ آہستہ آہستہ اٹھ رہا تھا۔ تمام قیدی ہمارے گرد جمع تھے اور میرا ... ہے کہ وہ سب اس بات پر بے حد خوش تھے کہ میں نے سیال اور اس کے بدمعا... کی اچھی طرح ٹھکائی کر دی ہے۔ اچانک میری نظر سیال کے ہاتھوں پر پڑ... اس نے دائیں ہاتھ میں چھری پکڑ رکھی تھی۔ وہ یقیناً اسے اسی وقت کسی ... تھمائی تھی اس کے کسی ہمدرد نے۔ اس کے ہاتھ میں وہ چھری دیکھ کر میرا ... الٹ گیا اور میں نے پاگلوں کی طرح اندھا دھند آگے بڑھ کر اس کی کلائی پکڑ ... اس نے اپنی ٹانگ میرے پیٹ میں مارنا چاہی مگر میں نے فوراً ہی اس ... کلائی کچھ اس طرح جھٹکا دے کر مروڑ دی کہ وہ بے بس ہو کر دہرا ہو گیا۔ جھٹکا ... سے چھری اس کے ہاتھ سے گر گئی تھی۔ میں نے بائیں ہاتھ کی انگلیاں اس ... رگوں پر رکھیں اور پھر اس کی گردن پوری قوت سے دبا دی —— وہ یہ ... برداشت نہ کر سکا اور بغیر کچھ کہے سنے چپ چاپ زمین پر ڈھیر ہو گیا ... اس کی یہ حالت دیکھتے ہی راجہ خوف زدہ ہو کر بھاگ نکلا اور ... جیل کے سپاہیوں کے پاس جا پہنچا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید میں نے ان ... سارے ساتھیوں کو قتل کر دیا تھا۔ جب وہ لوگ بیرک میں داخل ہوئے تو ... کہہ رہا تھا ایک سپاہی سے —— اس کی رنگت ہلدی ہو رہی تھی۔

"اس نے بھاجی بیڑا غرق کر دیا ہے۔ ان سب کو قتل کر دیا ... نے یہ دیکھیں۔ سب کے سانس بند ہو گئے ہیں۔" حالت ان سب کی وا... مُردوں سے بدتر ہو رہی تھی یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ سب مر چکے ہیں ... سب سے زیادہ حیرت مجھے اس بات پر ہوئی کہ بیرک میں مو... قیدیوں نے یکزبان ہو کر یہی کہا تھا کہ وہ سب لوگ مجھے مارتے مار... ہی بے ہوش ہو گئے۔ قیدیوں نے بتایا کہ سیال میرے پیٹ میں چھ... مارنے لگا تھا۔ سپاہی ہاتھوں میں یہ بڑے بڑے ڈنڈے اٹھائے ... تھے۔ اور جیل کا اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ بھی ان کے ساتھ تھا —— وہ سب سے پیچھے تھا۔ وہ بڑے غضب ناک انداز میں بولا۔

"اگر یہ مرے نہیں ہیں تو پھر انہیں ہوا کیا ہے؟"

"یہ مرے نہیں ہیں جناب! بے ہوش ہو گئے ہیں۔ ... جوش میں یہ ابل کر بے ہوش ہو گئے ہیں" میں نے بڑے اطمینا...

"یہ کیسے ہو سکتا ہے" وہ سپرنٹنڈنٹ بولا۔

"اس نے انہیں قتل کر دیا ہے سرکار۔ ان کے منکے توڑ دیئے اس نے" راجہ نے بڑے جوش میں کہا۔

وہ بہت زیادہ سہما ہوا تھا۔ اس نے ایسا انوکھا تماشا ... دیکھا ہوتا تو اسے اتنی حیرت نہ ہوتی مگر وہ تو سب کچھ اس کے سامنے اس ... ندر اچانک اور اتنے سحر انگیز انداز سے ہوا تھا کہ اس کو یقین ہی نہیں آتا تھا میں نے کہا "نلچے! تیرا یہی علاج ہونا چاہئے تھا۔ بچے بہت اپنا تھا تو۔"

شبراتی نے راجہ کی یہ بات سنی تو فریاد زدہ لہجے میں بولا "مکار! جھوٹ کہتا ہے یہ سب لوگ ان کو مار رہے تھے۔ ان سب سے پوچھ لیں سرکار! ان کو تو اللہ نے خود بے ہوش کیا ہے" اس کی اس بات پر بہت سے قیدی ہنس دیئے۔

"ابے اللہ تعالیٰ کیا خود یہاں آیا تھا —— انہیں مارنے۔ ہائیں تو نے دیکھا تھا اسے" سپرنٹنڈنٹ نے کہا۔

"وہ جی.... وہ —— اللہ کوئی نظر تھوڑی آتا ہے سرکار! بس وہ تو اشارہ ہی کرتا ہے نا سرکار ——"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ جا شبیر حسین بُلا ڈاکٹر کو ادھر۔ ذرا دیکھے بھی ان کو ہوا کیا ہے۔ گگڑوں کی طرح یہ ایک ساتھ نیچے گر گئے ہیں۔"

"انہیں کچھ بھی نہیں ہوا ہے کمال صاحب! ابھی یہ آدھ گھنٹے چھٹی پر ہیں پھر یہ آپ ہی اٹھ جائیں گے۔"

"مگر چھٹی پر کیسے چلے گئے یہ ... اتنا راشن کھا جاتے ہیں چاروں۔ اچھا تم بتاؤ بدرالدین اصل واقعہ کیا ہوا تھا؟" سپرنٹنڈنٹ ... بدرالدین قیدی پر بے پناہ اعتماد تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر ... یت ہی فدویانہ لب و لہجے میں ساری بات کمال صاحب کو بتائی تو وہ ... ان رہ گئے۔ بولے "جوان! تیرے پاس ایسی کونسی گیدڑ سنگھی ہے ... بڑے خونخوار لوگ ہیں۔ چھٹے ہوئے بستہ "ب" کے نامی گرامی بدمعاش ... کیسے پورا تل گیا ان کے ساتھ؟"

"مجھے کچھ پتہ نہیں چلا ہے کمال صاحب! بس یہ مجھے مارتے مارتے خود بے ہوش ہو گئے ہیں" کمال مسکرا دیا۔ وہ بہت ہی ٹھنڈے اور سلجھے ... ج کا آدمی تھا اور قیدیوں پر مہربان بھی —— بولا "ٹھیک ہے ... ادھر سے انتقال فرماؤ اور دوسری بیرک میں چلے جاؤ ورنہ... پھر دنگا ہو گا۔ ان سے میں خود نمٹ لوں گا" پھر وہ شبراتی سے ... لب ہو کر بولے۔

"اور تو بھی سن لے شبراتی! اگر یہ ثابت ہو گیا کہ یہ سب تیری ... ستانی ہے بچے تو یاد رکھ میں تجھے اُدھر ٹکٹکی پر لگوا دوں گا سالے ... مار دوں گا کہ بس ساری عمر تیرے چوتڑ لال ہی رہیں گے۔"

"یہ جھوٹ بولتے ہیں سرکار! سیال صاحب کے ساتھیوں نے خود ... چُرا لو پھیرا ہے۔ خود پیسے اڑنچھو کر کے یہ مجھے پھنسا رہے ہیں۔ مجھے ... مار مار کر سؤر بنا دیا ہے انہوں نے" شبراتی نے کہا ——

"... بر ابھی میں ان سے پورا پورا حساب لوں گا۔ بے فکر رہ، کوئی ... ٹ نہیں مچا ہے یہاں" اتنے میں ڈاکٹر بیرک میں آ پہنچا۔ اس نے ان

سب کو ٹھوک بجا کر دیکھا اور پھر قدرے حیران ہو کر بولا۔

"ہیں تو یہ سب ٹھیک ٹھاک! بس ذرا بے ہوش ہو گئے ہیں، کسی شدید صدمے کی وجہ سے۔ مگر فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ مشینیں ان سب کی برابر چل رہی ہیں۔ ذرا پانی ڈال شبیر حسین ان کے منہ پر۔"

جب شبیر حسین نے ان لوگوں کے سرد منہ پر ٹھنڈا پانی ڈالا تو میں یہ دیکھ کر مطمئن ہو گیا کہ وہ سب کے سب جلدی ہوش میں آگئے اور ان کا.... احساس اور شعور انہیں وہیں واپس مل گیا ورنہ میں تو سمجھتا تھا کہ جو نسخہ میں نے ان پر آزمایا تھا وہ انہیں کم از کم دو گھنٹے تک تو اس دنیا کے ہنگاموں سے دُور رکھ ہی سکتا تھا۔

ابھی وہ سنبھل ہی رہے تھے کہ میں وہاں سے کھسک کر اپنے ایک بی کلاس کے قیدی کے پاس جا بیٹھا۔ میں اس سارے قصے کو بھول جانا چاہتا تھا۔

اس دن کے بعد شبراتی تو میرا ایسا مُرید بنا کہ وہ ہر وقت ہر جگہ میرا ہی کلمہ پڑھتا تھا۔ اس واقعے کے بعد میں جتنی دیر تک جیل میں رہا کسی نے بھی مجھ سے کوئی اونچی نیچی بات نہیں کی اور پھانسی کی کوٹھڑی میں بند ہو جانے تک سب لوگ میری بے حد عزت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ سیال کے ساتھیوں کا تو یہ حال ہوا کہ وہ جہاں بھی مجھ سے ملتے مجھے جھک کر سلام کرتے اور جب بھی مجھے کسی چیز کی ضرورت پڑتی وہ مجھے فوراً مہیا کر دیتے اور سیال کا تو یہ حال تھا کہ میرے آگے بچھا جاتا تھا۔ اس نے حیلے بہانے کئی بار کوشش کی کہ میں اسے وہ خاص گُر بتا دوں جس سے میں نے ان سب کو بے ہوش کر دیا تھا۔ بہت کوشش کی اس نے مگر میں کوئی کچی گولیاں تو نہیں کھیلا تھا، میں نے اسے ہمیشہ یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اپنے اس تجربے کی روشنی میں اسے خود مشق کرنی چاہئے۔

میرے اس مشورے پر عمل کرتے ہوئے اسے کئی بار میں نے اپنے ساتھیوں کی گردنیں دباتے دیکھا مگر وہ اس خاص رگ کو دریافت نہ کر سکا جس پر میں تکیہ کرتا ہوں۔ میں بھلا اپنا اتنا قیمتی راز اسے کیوں بتاتا وہ حربہ تو میری ساری زندگی کی کمائی کا حاصل تھا۔ وہ میرا سب سے بڑا اثاثہ تھا۔ میں بھلا اس میں کسی اور کو کیوں شریک کر لیتا۔

اب جو شبراتی مجھے آہو صاحب کے گھر میں ملا تھا تو اس نے مجھے میری چیز کر بڑی بھلا دی تھی۔ ڈاڑھی مونچھ رگڑ کر منڈوا رکھی تھی اس نے۔ لباس وہ اتنا اُجلا اور بے داغ پہنے ہوئے تھا کہ اسے دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی تھی۔ البتہ کندھے پر اس نے تولیے کا جھاڑن جو ڈال رکھا تھا اس پر مجھے بہت ہنسی آتی تھی۔ لگتا تھا وہ کوئی بہت پرانا خاندانی قسم کا گھریلو نوکر ہے۔ وہ بڑے فن جانتا تھا مگر سب سے زیادہ جو بات مجھے اس کی پسند تھی وہ تھی اس کی مُٹھی چاپی۔ اس کام میں وہ ایسا ماہر تھا کہ منٹوں میں نس نس سے پسینہ نکال کر آدمی کو یوں ہلکا پھلکا کر دیتا تھا کہ نیند آنے لگتی تھی۔

ابھی میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ کبری واپس آگیا اور میرے پاس بیٹھ کر بولا۔

"استاد اِدھر تو اپنا بیڑا ہو گیا ہے۔ بوریہ اور روٹی پیڑا یہی اوقات رہ گئی ہے اپنی۔"

"پھر؟ پھر کیا ارادے ہیں تیرے؟"

"یہ بتا استاد کہ تو جیل سے فرار ہو کر سیدھا ادھر ہی آیا! کہ راستے میں کوئی ہاتھ شاتھ بھی مارا ہے کہیں؟"

"ابے میں کوئی چور ڈاکو تو نہیں ہوں کنکوے۔ باتیں کیسی کر کرتا ہے تو۔" اس نے گہری گہری نظروں سے مجھے دیکھا تو میں ایک پھر دل میں ڈرا کہ یہ سالا کہیں مجھے بیچ ہی نہ ڈالے، پہچان تو لیا ہی اس نے مجھے۔ اور میرے سر کی قیمت پچاس ہزار مقرر کر رکھی تھی۔

"میں سب جانتا ہوں استاد! بڑا پہنچا ہوا بزرگ ہے تو۔ کے ہاں ڈاکہ کس نے ڈالا تھا۔"

"وہ..... سب بیکار رہا تھیں کبری۔ یہی کہوں نا میں تجھے"

"جو مرضی کہہ پیارے بے شک کتا کہہ لے مجھے۔ مگر ادھر ہاتھ بہت تنگ ہے۔"

"تو پھر میں کیا کروں؟ میں تو خود دربدر ہو رہا ہوں۔" میں اپنا پہلو بچاتے ہوئے کہا۔

"میں نہیں مانتا پیارے، تیرے یہ لاتی نخرے کچھ اور ہی ہیں۔ مجھے مال کی سخت ضرورت ہے اُدھر وہ میری بڑھیا ہے ماں بڑی بددعائیں دیتی ہے مجھے۔"

"تو پھر؟ خدمت کیا کر اس کی۔ دعائیں دے گی۔"

"بُرے کی ماں کا سر خدمت کروں۔ ادھر زہر کھانے کو نہیں ہے اور دیکھو یہ جو میری دو انگلیاں ہیں اس ہاتھ کی یہ سالی چکی ہیں۔" اس نے اپنی انگلیاں مجھے دکھاتے ہوئے کہا۔ وہ واقعی ہو چکی تھیں اور وہ انہیں اپنی مرضی کے مطابق حرکت نہیں دے سکتا تھا۔

"کسی کی بددعا لے ڈوبی ہو گی تجھے۔ کسی ضرورت مند کی ہو گی تو نے۔"

"بات کچھ ایسی ہی نظر آتی ہے استاد۔ مگر پتہ نہیں وہ کو.... تھا۔ ایسی دعا مانگی اس سالے نے کہ بس میرا تو بیڑا ہی یہ نیکی شیکی سب بکواس ہے وہ تو کیا کہا کرتا تھا کہ وقت پیری می شود پرہیزگار، کچھ فارسی بولا کرتا تھا تو، ہے نا۔ بس ہو گئی ہے مجھے۔"

مجھے اس کی یہ بات سن کر بے ساختہ ہنسی آگئی۔ عین اُسی مجھے محسوس ہوا کہ دوسرے کمرے میں سے کوئی مجھے دیکھ رہا ہے تھی، بالکل وہی تھی۔ اس کا چہرہ سیاہ دوپٹے میں چھپا ہوا تھا۔ میں ڈوبی ہوئی دو آنکھیں مجھ پر جمی تھیں۔ جونہی میری نگاہ وہ چہرہ ایک دم شیشے پر سے ہٹ گیا۔

میرے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں۔ یہ اس مجھے ڈسنے لگا کہ کوئی چھپ چھپ کر مجھے دیکھتا ہے مجھے پہچاننے شش میں ہے۔ اور عین ممکن ہے وہ مجھے پولیس کے حوالے کروا دے ڑا خوفناک احساس تھا۔ میں نے دوبارہ اُدھر دیکھا مگر اب وہاں کچھ تھا۔ کبری کو میں نے قطعاً یہ احساس نہ ہونے دیا کہ میں نے روشن دان یا دیکھا ہے۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ اس پر میرا اعتبار قائم نہیں رہا تھا بُوکا تھا، کنگال ہو چکا تھا پیسے پیسے کو ترس رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ یہ چ رہا تھا کہ جس طرح بھی ہو سکے وہ مجھ سے کچھ مال اینٹھ لے اور کسی طرح سکے تو وہ مجھے پولیس کے حوالے کر کے میری آہو صاحب کے گھر میں... بری کر کے ہی پچاس ہزار روپیہ بٹور لے۔ یہ شک میرے دل میں گہرا یں ہونے لگا تھا۔ اس کی باتیں سُن کر اس کے چہرے پر پھیلی سنجیدگی شکار دیکھ کر میرا یہ شک پختہ یقین میں بدلنے لگا تھا کہ وہ مجھے ضرور نہ کسی چکر میں پھنسا دے گا۔ اسی لئے میں نے اس چہرے کا جس ف دو حیران حیران اور حیران کن آنکھیں ہی آنکھیں تھیں اس سے ذکر نہیں کیا۔

"ہاں! تو اس بیماری کا کیا علاج ہے تیرے پاس؟"

"کچھ بھی نہیں یار۔ میں خود سخت پریشان ہوں۔" وہ منمنایا۔ ے لہجے کی وہ ساری تیزی، شوخی اور ہُن پھن ایک لمحے کے لئے ئی تھی۔ دُور کہیں بہت دُور اس کی پیچیدہ شخصیت کے بہت ہا چھپی تھی۔ میرا خیال ہے کہ مجھے دیکھ کر وہ اس لئے خوش ہو گیا تھا کہ ل سے بھاگا ہوا ایک روپوش مجرم ہوں۔ اور مجھے ڈرا دھمکا کر مجھ تنا چاہے گا مال اگلوانے گا مگر لگتا تھا کہ میری باتیں سن کر اس ں پر اوس پڑ گئی تھی جس کی وجہ سے اس کا لہجہ بجھنے لگا تھا۔

"اچھا! چھوڑ یار ان باتوں کو، کبری پہلوان یہ بتا تیرے مالک یہ آہو صاحب؟ یہ مال پانی کی بات تو ہوتی ہی رہے گی۔"

"آہو صاحب! ارے وہ بہت اچھے آدمی ہیں پہلوان، میں نے ہے کہ ان کی زمینیں بھی ہیں مگر اصل بات تو ان کا اثر رسوخ دبدبہ ہے۔" وہ ذرا سنبھل کر بیٹھ گیا۔

"کیا مطلب؟ کوئی سرکاری عہدہ ہے ان کے پاس؟"

"نہیں بھئی سرکاری عہدہ کیا چیز ہے، ان کے آگے؟ ویسے دربار میں بڑی پہنچ ہے ان کی۔ کئی لیڈر ایسے ہیں جو ڈھیروں روپیہ چلتے رہتے ہیں۔"

"وہ کیوں؟"

"وہ اس لئے کہ آہو صاحب ان کے کام بھی تو بہت آتے ہیں پچھلے یں آہو صاحب نے ان کو اسمبلی کا ممبر بنوا دیا تھا۔"

"اچھا؟ مگر یہ سب کچھ وہ کس طرح کر لیتے ہیں؟"

"وہ جو سکھیرا صاحب ہیں نا۔ ان کے لئے تو یہ بہت کام کرتے ہیں۔"

اب تو آہو صاحب کا شمار شہر کے رئیسوں میں ہوتا ہے۔ پرمٹ شرمٹ یہ وہ! بڑی نوکیں ہیں ان کی۔"

"اچھا؟ کمال ہے یار۔ پھر تو تیرے پو بارہ ہوں گے۔"

"نہیں استاد! میں تو سالا بالکل ہی رگڑا گیا ہوں اِدھر۔ وہ گجے میں چوہا ہوتا ہے نا۔ بس اپنی حالت اس سے بھی گئی گزری ہے۔"

ابھی وہ یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ آہو صاحب ٹھک ٹھک کرتے اندر آگئے۔ وہ تھانے سے ہو کر آئے تھے۔ آتے ہی بولے۔

"یار جیلانی صاحب معافی چاہتا ہوں۔ بس یہ لوگ مجھے بیٹھنے نہیں دیتے۔ رات یہاں محلے میں ایک جھگڑا ہو گیا تھا۔ اس کے سلسلے میں مجھے معاملہ رفع دفع کرانے کے لئے تھانے جانا پڑا۔" یہ کہہ کر وہ میرے پاس ہی صوفے پر ڈھیر کر کے بیٹھ گئے۔ کبری مؤدب کھڑا ہو چکا تھا۔

"ابے مُرغی کے انڈے! انہیں کچھ کھلایا پلایا بھی ہے کہ نہیں؟"

"ناشتہ کرا دیا ہے سرکار اور..... اور..... ان کے ناخن بھی کاٹ دیئے ہیں۔" کبری میرے پاؤں کی طرف دیکھ کر بولا۔

"ابے گدھے...! یہ ناخنوں کا کیا ذکر ہے۔ کہیں تیری اپنی عقل کے ناخن تو نہیں بڑھ گئے۔" آہو صاحب نے حیران ہو کر پہلے میرے پاؤں کی طرف اور پھر اس کے منہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ میں خجل ہو کر رہ گیا۔ کبری مجھے ذلیل کر رہا تھا۔

"وہ جی... وہ... دراصل ان کے پاؤں کے ناخن بہت بڑھے ہوئے تھے نا جی۔ پتہ نہیں جی شاید سال بھر سے نہیں کٹے تھے۔" وہ اوّل درجے کا عیار آدمی تھا۔ مالک کو یہ بات سمجھا رہا تھا کہ میں مشکوک آدمی ہوں مجھ پر زیادہ اعتبار نہ کرے۔ کیونکہ جس آدمی کے ناخن پور پور بڑھ جائیں وہ کسی حالت میں بھی قابل اعتماد نہیں ہوتا۔ میرے جی میں آئی، کہ اس بدمعاش کا اٹھ کر وہیں ٹینٹوا دبا دوں مگر میں ضبط کر گیا۔

چند لمحے بعد وہ معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھتا ہوا باہر نکل گیا۔ میرے چہرے پر چھائی گمبھیر سنجیدگی دیکھ کر آہو صاحب بولے۔ "اس کی بات کا برا نہ منائیں ایسے ہی اوّل فول بکتا رہتا ہے۔ آپ سنائیں کیا حال ہے۔"

"بس ٹھیک ہوں آہو صاحب! اس بچارے نے بہت خدمت کی ہے میری...."

"اچھا ہے! میں نے اسی لئے اسے یہاں چھوڑا تھا آپ کے پاس۔ مگر آپ نے اپنے بارے میں تو کچھ بھی نہیں بتایا۔ اور وہ اسلم آپی کہاں ہے آج کل؟"

"وہ دراصل اُدھر ہسپتال میں ہے اس کی ٹانگوں پر پلستر چڑھا ہے۔ شاید وہ چند دن تک یہاں آئے کیونکہ اب وہ بالکل ٹھیک ہو چکا ہے۔"

"اچھا اچھا! بہت خوب! تو بیمار رہتا ہے وہ آج کل۔ یہ اچھی

بات ہے۔ آدمی کو کبھی کبھی بیمار تو ہونا ہی چاہیئے۔" میں حیران رہ گیا میں سمجھا وہ میری بات کو مذاق سمجھ رہے ہیں۔ میں نے اب کی بار زیادہ سنجیدگی سے کہا۔

"وہ بہت بیمار رہا ہے آہو صاحب۔۔۔ اس کی ٹانگوں پر پلستر چڑھا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ شدید بیمار رہا ہوگا۔"

"اس پلستر سے اسے بہت فائدہ ہوا ہوگا مگر آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آپ سے اس کی ملاقات کہاں ہوئی تھی؟"

"ادھر جنرل ہسپتال میں۔ وہاں میرے ایک عزیز زیرِ علاج ہیں۔ میں ان سے ملنے وہاں جاتا رہا ہوں۔"

"صرف وہاں جاتے رہنے سے تو وہ آپ سے اتنا بے تکلف نہ ہو سکتا تھا کہ آپ کو میرے گھر کا پتہ دے دیتا۔ ذرا تفصیل سے بتایئے۔"

میں نے آہو صاحب کا چہرہ دیکھا تو مجھے سخت حیرت ہوئی۔ انہیں میری کسی بات پر اعتبار نہیں آ رہا تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو ایسے آدمی کے منہ پر تھوک کر میں اٹھ جاتا مگر میں تو پناہ کے لئے ان کے گھر میں بیٹھا تھا۔ میں سب کچھ چپ چاپ سہہ گیا اور طبیعت پر ضبط کر کے میں نے ان سے کہا۔

"حضرت! بات یہ ہے کہ ہسپتال میں ایسی دوستیاں ہو ہی جاتی ہیں۔ آبی صاحب بیمار ہیں کافی عرصے سے وہاں پڑے ہیں۔ میں ان کی بھی خدمت کرتا رہا۔ یہی وجہ تھی کہ جب میں نے انہیں بتایا کہ میں چند دن لاہور میں گزارنا چاہتا ہوں تو انہوں نے مجھے آپ کا پتہ دے دیا۔ آپ کے ان سے جو تعلقات ہیں ــــ ان کی نوعیت تو آپ ہی سمجھ سکتے ہیں۔ اگر آپ مجھے بار سمجھیں تو میں آج ہی یہاں سے چلا جاتا ہوں۔ میں آپ کے لئے زحمت بننا تو کسی طرح بھی گوارا نہ کروں گا۔"

میرے لہجے کی اس سنجیدگی کو وہ اچھی طرح سمجھ گئے بولے۔ "نہیں نہیں میرے لئے آپ کی آمد باعثِ رحمت ہے جیلانی صاحب ایسی بات نہ سوچیں میں تو ویسے ہی پوچھ رہا تھا۔ اب وہ یہاں آئے گا تو پھر اطمینان سے باتیں ہوں گی۔ مجھے تو یہ حیرت ہے کہ اس نے مجھے اپنی بیماری کی اطلاع کیوں نہیں دی۔ خیر دیکھا جائے گا۔ آپ یہ بتائیں کہ آپ کہاں کے رہنے والے ہیں اور آپ کا ماشاءاللہ کیا شغل ہے؟"

"میں دراصل ادھر ملتان کا رہنے والا ہوں۔ ایک بینک میں ملازمت کرتا تھا مگر وہ ملازمت چھوٹ گئی۔ عارضی آسامی تھی ختم ہو گئی۔ اب میں یہاں بیٹھ کر قسمت آزماؤں گا۔"

"مگر آپ کا لہجہ تو ملتانی نہیں ہے۔" بڑی تیز کاٹ تھی ــــ ان آہو صاحب کے لہجے میں۔

"آپ کی ذہانت کی داد دیتا ہوں آہو صاحب! مگر گھر میرا وہیں ہے۔" ان کی نظریں برمے کی طرح میرے وجود میں اترتی جا رہی تھیں اور میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ میں انہیں اپنے بارے میں کس طرح مطمئن کروں۔ وہ اپنی جگہ پر یہ اندازہ لگا چکے تھے کہ میں اسلم کی قبیل کی کوئی شے ہوں۔ یہی وجہ تھی کہ مجھ سے کرید کرید کر میرا[illegible] جاننے کی کوشش کر رہے تھے اور میں اس وقت سخت مشکل میں گر[illegible] ان کے پاس تو میں اس لئے پہنچا تھا کہ دو گھڑی مجھے ان کے گھر[illegible] سکتی تھی۔ وہاں بیٹھ کر میں اپنی بہن آسیہ کو بچانے کے لئے[illegible] لائحہ عمل پر غور کر سکتا تھا۔ اب جو کچھ مجھے کبریا نے بتایا تھا اس[illegible] آس بندھی تھی اور میں سمجھتا تھا کہ شاید میں آہو صاحب کی مدد[illegible] کے لئے کوئی ٹھوس کام کر سکوں۔ اسے جیل سے رہائی دلانے کے[illegible] دس لاکھ روپیہ بھی صرف کر سکتا تھا۔ اور وہ روپیہ میں نے اسی[illegible] رکھا تھا۔ میرے نزدیک آسیہ کی آزادی سے زیادہ کوئی چیز اہم[illegible] تھی۔ اس روپے کو تو میں نے اپنے مقدمے کے دوران بھی ہاتھ[illegible] یہ سوچ کر کہ بڑے سے بڑا وکیل بھی مجھے اس چکر سے نہیں نکال[illegible] کیونکہ میرا جرم بہت بڑا تھا اور خود بولتا تھا میرے خلاف اعلا[illegible] تھا، للکارتا تھا پکارتا تھا قانون کو، کہ مجھے سخت سے سخت[illegible] چاہیئے۔ میں بھلا اس منہ بولتے جرم پر کیسے پردہ ڈال سکتا تھا[illegible] میں جمع میری وہ پونجی بھلا میرے کس کام آ سکتی تھی۔

"کیا سوچ رہے ہیں آپ؟" آہو صاحب نے مجھے[illegible] دیکھ کر کہا۔

"کچھ نہیں آہو صاحب! میں دراصل یہ سوچ رہا تھا کہ[illegible] کہاں سے شروع کروں۔ میری ایک بہن ہے آسیہ اس کا نام[illegible] سچاری آج کل ادھر جیل میں بند ہے میں اس کے لئے بے حد[illegible]

"ذرا تفصیل سے بتایئے کہ قصہ کیا ہوا تھا اور جیل کیسے[illegible]

آہو صاحب کا یہ سوال سن کر اپنے بارے میں ساری باتیں چھپا کر[illegible] کی بے گناہی ثابت کرتے ہوئے ایک نئی کہانی گھڑ کر سنا[illegible] میری باتیں بڑے اطمینان سے سنتے رہے۔ میں جب چپ[illegible] تسلی ضرور تھی کہ میں نے اپنے ماضی کو ان سے پوری طرح چھ[illegible] نے انہیں یہی بتایا تھا کہ میری بہن کو ملتان سے اغوا کر لیا گیا[illegible] کے دوران اس نے ایک آدمی کو قتل کر دیا اور دو شدید زخمی ہو[illegible] جرم کی پاداش میں وہ سچاری جیل جا پہنچی۔ میں نے سوات[illegible] دشمن کا ذکر بھی اس سے نہیں کیا۔

"دیکھیں میں آج ہی زنانہ جیل سے معلوم کرتا ہوں[illegible] تو شاید میں اس کے لئے کچھ کر سکوں۔ ہو سکتا ہے میں آپ[illegible] ملاقات بھی کروا دوں۔ جو کچھ مجھ سے ہو سکا میں ضرور کروں گا[illegible] متاثر نظر آتے تھے۔

"میں خود وہاں نہیں جا سکتا ہوں آہو صاحب! جیل[illegible] دو بار میری آسیہ سے ملاقات کے دوران جھڑپ ہو چکی[illegible] کرتے تھے تو مجھے تاؤ آ گیا اور میں نے وہاں ہنگامہ کھڑا[illegible]

[illegible] لئے میرا وہاں جانا اب مناسب نہیں ہوگا۔" میں نے پھر جھوٹ بولا۔ آہو صاحب عجیب انداز سے مسکرائے، بولے۔ "فکر نہ کریں میں خود ہی ساری صورتِ حال سے نمٹ لوں گا اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ اب آرام کریں۔ آپ شاید رات بھر سو نہیں سکے۔ دروازہ بند کر لیں اور پلنگ پر لیٹ جائیں، میں دوپہر کے بعد [illegible] سے پھر ملوں گا۔" یہ کہہ کر بڑے اطمینان سے اٹھے اور مجھ سے ہاتھ ملا کر باہر نکل گئے۔

ان کے جاتے ہی کبریا میرے کمرے میں آ گیا اور بستر کی چادر درست کر کے صحن اور پچھلی طرف لان میں کھلنے والی دونوں کھڑکیوں پر پردے گرا کر بولا۔

"استاد! میں نے تمہاری ساری باتیں سن لی ہیں۔"

"اچھا تو پھر کیا ہوا۔ تو کوئی گورنر لگا ہے یہاں کا؟ کیا [illegible] لے گا تو؟"

"اوئے تم تو خواہ مخواہ گرم ہو گئے ہو جیلانی صاحب! میں یہ کہتا [illegible] ں کہ ادھر اس آہو صاحب کو بالکل مت بتانا تھا کہ تم کیا چاہتے ہو۔"

"تمہارا کیا مطلب ہے، پاکٹ مار خان! کہنا کیا چاہتے ہو تم؟"

"مطلب یہ ہے کہ ذرا محتاط رہو پہلوان! آہو صاحب اسی طرح اپنا [illegible] سیدھا کرتے ہیں۔ وہ تمہارا کام تو شاید کر دیں مگر کیا پتہ وہ تمہیں [illegible] ں چکر میں ڈال دیں۔"

"دیکھا جائے گا یار! تو نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔"

"اس لئے کہا۔ میں یہ کہہ رہا تھا استاد کہ پری پیکر آہو صاحب سے [illegible] پٹانگ سٹوری مت کہو۔ انہوں نے اچھی طرح پہچان لیا ہے استاد۔ [illegible] سے جتنا بچ سکتا ہے بچ۔"

"کیا مطلب؟ ان کی باتوں سے تو کچھ ظاہر نہیں ہوتا ہے۔" میں [illegible] سنبھل کر بیٹھ گیا۔

"مطلب یہ ہے کہ انہوں نے اخبار کے ذریعے سے تمہیں پہچانا ہے [illegible] صبح سے بار بار اخبار دیکھ رہے تھے۔ مجھے انہوں نے کہا ہے کہ میں [illegible] کا خاص خیال رکھوں اور کہیں اِدھر اُدھر نہ جانے دوں۔"

"وہ اخبار کہاں ہے اب؟"

"وہ تو اوپر ان کے کمرے میں ہے۔"

"خیر! اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے کبری! مجھے یقین ہے [illegible] کوئی غلط قدم نہیں اٹھائیں گے انہیں مجھ سے ہمدردی ہے۔"

"کوئی حسینہ [illegible] نہیں ہو تم استاد! ہمدردی شمدردی سب [illegible] کار کا منتا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ تمہاری گرفتاری پر پچاس ہزار روپے کا انعام [illegible] گیا ہے۔"

"اچھا؟ مگر پہلے تو بیس ہزار تھا؟"

"ہاں مگر اس مخالف پارٹی کو ذلیل کرنے کے لئے انہوں نے انعام کی رقم فی آدمی پچاس ہزار رکھ دی ہے۔"

"تم یہ انعام کیوں نہیں لے لیتے۔ تم بھی تو مجھے پہچان چکے ہو۔" میں نے اسے یاد دلایا کہ اس کی بھی تو ضرورتیں رکی پڑی ہیں۔ اس کی ماں اسے بددعائیں دیتی ہے۔ وہ پچاس ہزار اس کے بھی بہت کام آ سکتے ہیں۔ میری یہ بات سنتے ہی وہ بھڑک اٹھا۔ اور تیزی سے آگے ہو کر بولا۔ "استاد! میں برا آدمی ضرور ہوں مگر احسان فراموش نہیں۔ مجھے اتنا ذلیل نہ کر۔"

"دفع کر یار ان باتوں کو! تو نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ اگر آہو صاحب نے میری مدد کی تو ٹھیک ہے ورنہ پھر میں تجھے بورسٹل جیل بھیجوں گا۔ تو بھی تو آسیہ سے مل سکتا ہے۔"

"تم نے پہلے ہی مجھ سے کہا ہوتا تو میں اب تک وہاں پہنچ بھی گیا ہوتا۔"

"خیر! [illegible] بات نہیں۔ دیر آید درست آید۔ میں پہلے آہو صاحب کو دیکھ لوں پھر کچھ سوچوں گا۔"

"کیا کہا تم نے؟ دیر آئد درست آئد، یہی کہا ہے نا تم نے؟"

"ایسے یوں نہیں! مسٹر طالب علم۔ محاورہ ہے دیر آید درست آید۔"

اچانک اوپر سے کسی عورت کی نغمگی سے لبریز آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ اس نے کبری کو پکارا تھا۔ وہ ایسی سحر خیز اور طلسماتی سی آواز تھی کہ میں جھوم اٹھا۔ کبری تیزی سے اٹھا اور باہر نکل گیا۔

شام کو پانچ بجے کے قریب کبری نے مجھے بتایا کہ اسلم آبی آ چکا ہے اور اب وہ آہو صاحب کے پاس بیٹھا ہے۔

"وہ اِدھر میرے پاس کیوں نہیں آیا؟"

"مجھے کیا پتہ! وہ ادھر اوپر کی منزل میں ہیں اور دونوں سر جوڑ کر آپس میں صلاح مشورہ کر رہے ہیں مگر ان کی کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"ذرا معلوم تو کرو۔ وہ آبی کیا کہہ رہا ہے آہو صاحب سے؟ مجھے تو ان دونوں نے حیران کر دیا ہے کبری! دونوں چکر دار آدمی لگتے ہیں مجھے۔"

"ایسے ویسے! ارے ان سے تو خدا بچائے۔ استاد! بڑے بڑوں کے پر کینچ کر دیتے ہیں دونوں۔"

"اچھا تو جا ان کی تھوڑی سی سی آئی ڈی تو کر۔ آخر تو کس دن کام آئے گا سالے۔ تیرا کوئی گوشت تو نہیں پکانا ہے مجھے۔" میں نے اسے کمرے سے باہر دھکیلا۔ وہ چلا تو گیا مگر میرے دل میں شکوک و شبہات کے سینکڑوں بیج بو گیا۔ اس نے آہو صاحب کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا تھا۔ ان سے تو مجھے یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ حضرت بلاشبہ بہت

ہی پہنچے ہوئے بزرگ تھے اور اسلم آبی سے ان کی یاری اس بات کا پتہ دیتی تھی کہ نامی گرامی بدمعاشوں کے پشت پناہ بنے ہوئے تھے۔

کبری کو میرے کمرے سے باہر نکلے ابھی کوئی دس منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ وہ دونوں اندر آ دھمکے۔ آبی نہایت ہی عمدہ قسم کا ولائتی وضع قطع کا سوٹ پہنے ہوئے تھا اور بہت ہی بارعب دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی ٹانگوں پر سے پلستر یوں غائب ہو چکا تھا جیسے وہ کبھی بیمار تھا ہی نہیں۔ کمرے میں آتے ہی اس نے اپنا بریف کیس الگ رکھ کر مجھے باہوں میں بھینچ لیا۔ وہ مجھے اتنی محبت سے ملا جیسے میرے بغیر اس کا ایک ایک پل بڑی مشکل سے گزرا ہو۔

"کمال ہے بھئی! اتنی محبت ہے آپ دونوں میں۔ میں تو اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا" آہو صاحب نے حیران ہو کر کہا۔

"یہ ان کی مہربانی ہے جناب، ورنہ میں بھلا کس قابل ہوں" میں نے جھینپتے ہوئے کہا۔

"میرے دل میں آپ کی بڑی عزت ہے جیلانی صاحب! بہادر آدمی کا تو میں ہاتھ بندھا غلام ہوں" آبی نے کہا۔ وہ خاصی رواں اردو بولتا تھا اور لب و لہجہ اس کا کسی طرح بھی یہ ظاہر نہیں کرتا تھا کہ وہ گاؤں کا اجڈ گنوار مزدور رہا ہے۔ جیسا کہ اس نے بتایا تھا تب مجھے یہ احساس ہوا کہ اس نے اپنے بارے میں مجھے جو کچھ بتایا تھا وہ سارے کا سارا صحیح نہیں تھا۔ اس میں اس نے خاصی جلد کاری سے کام لیا تھا۔ اس کی باتوں میں گھلی ملی رتن جوت مجھے نئے نئے نکتے سمجھا رہی تھی......

ادھر ادھر کی گپ شپ کے بعد اس نے اپنا بریف کیس کھولا اور سو سو روپے کی دس گڈیاں نکال کر اس نے میرے سامنے رکھ دیں بولا۔

"یہ لیں جیلانی صاحب! اپنی امانت سنبھالیں۔ گن لیں یہ پورا ایک لاکھ ہے"

"نہیں جناب! مجھے اب اس کی ضرورت نہیں ہے یہ آپ ہی کو مبارک ہو۔ آپ ہی رکھ لیں اسے" میں نے اس کا ہاتھ پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔ اس لمحے آہو صاحب کے چہرے پر ایسی حیرت اتر آئی تھی کہ...... بایدوشاید۔ انہیں اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آ رہا تھا۔ آخر وہ رہ نہ سکے، بولے۔

"یہ کون سی امانت لوٹا رہے ہیں انہیں"

"بہت دنوں سے ان کی یہ رقم میرے پاس پڑی تھی۔ میں نے سوچا آج یہ انہیں واپس کر ہی دوں۔ ان کی بڑی مہربانیاں ہیں مجھ پر آہو صاحب! اسے رکھ لیں جیلانی صاحب! مجھ سے کہیں ادھر ادھر خرچ ہو گئی تو مشکل ہو جائے گی"

"اچھا! ٹھیک ہے۔ لائیں ادھر" میں نے اچانک اپنا فیصلہ بدل کر اس سے وہ رقم لے کر ایک طرف رکھ دی۔ یہ سوچ کر کہ وہ بدنصیب خورشید احمد اپنا سب کچھ لٹا چکا ہے۔ ایسے میں کسی نہ کسی طریقے روپیہ بھیج دوں گا تو وہ خوش ہو جائے گا۔ پھر سے جی اٹھے گا۔ آہو صاحب کے چہرے پر پھیلی حیرت مجھے یہ احساس دلاتی تھی اس سارے سلسلے کا کوئی علم نہیں ہے۔ میں تو یہ سوچتا تھا کہ آبی نے آہو صاحب کو ساری بات بتا دی ہو گی اور ان سے مشورے ہی وہ مجھے یہ رقم دے رہا ہے۔

"آپ نے آہو صاحب کو اس سلسلے میں کچھ نہیں بتایا!"

"ان کو میں نے پچاس ہزار روپیہ دے دیا ہے۔ ان کی تو ہمارا فرض ہے جیلانی صاحب! ان کے بغیر تو ہمارا دھندا چل سکتا ہے" آبی نے بے دھیانی میں یہ بات کہہ تو دی مگر محسوس کیا کہ اس کے ان الفاظ نے آہو صاحب پر گھڑوں پانی وہ بہت بری طرح سٹپٹا گئے وہ نہیں چاہتے تھے کہ آبی سے ان ملا ہے اس کا ذکر مجھ سے کیا جائے ـــــ آبی نے ان کے چہرے کو سمجھتے ہوئے ایک دم پینترا بدلا اور بولا۔

"بات یہ ہے جیلانی صاحب! کہ میرے کاروبار میں آہو کا بھی حصہ ہے۔ روپے میں پانچ آنے ان کے ہوتے ہیں۔ وہ خود ہی پہنچا دیتا ہوں"

"آپ کی ایمانداری کے تو ہم بہت زیادہ قائل ہیں اب دیکھیں نا اس بے سر و سامانی میں انہیں آپ نے بیٹھے بٹھائے لاکھ روپیہ دے دیا تو یہ آپ کی شرافت ہے۔ ورنہ ایسے حالات جن سے یہ دوچار ہیں کون کسی کو پوچھتا ہے"

"میں سمجھا نہیں آہو صاحب! میرے بارے میں اور کیا ہیں آپ۔ ایک ذہنی پریشانی ہے مجھے جو میں آپ کو بتا چکا ہوں تو اور کوئی چکر نہیں ہے میرے ساتھ"

"مجھے معلوم ہے جیلانی صاحب! میں تو آبی صاحب کی بات ہوں۔ اچھا خیر آپ آج رات ٹھہریں گے یہاں"

آبی بریف کیس ہاتھ میں لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ بولا "میں تو اب جا رہا ہوں۔ پھر کسی دن حاضر ہوں گا۔ ان کا بہر حال خیال رکھیں۔ انہیں کوئی کام ہو تو میری خاطر ان کی ہر طرح کریں گے"

"فکر نہ کریں آبی صاحب! مجھے خود احساس ہے"

آہو صاحب نے آبی سے ہاتھ ملایا تو وہ ان سے ہاتھ چھڑا کر طرف بڑھا بولا ـــــ

"آپ کو مجھ سے کوئی کام پڑے تو ان سے میرا پتہ لے کر آ ملیں" یہ کہہ کر وہ پھر بڑی محبت سے گلے ملا اور میرے کہنے لگا۔

"رقم کی حفاظت کرنا" یہ بات اس نے اتنے غیر محسوس

سے کہی کہ آہو صاحب اگرچہ ہمیں بہت گہری نظر سے دیکھ رہے تھے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ وہ قطعاً کوئی اندازہ نہ لگا سکے ہوں گے کہ وہ مجھ سے کیا کہہ گیا ہے وہ مجھ سے الگ ہوا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا باہر نکل گیا ـــــ آہو صاحب اس کے پیچھے پیچھے تھے۔

ایک لاکھ روپے کے نوٹ میرے سامنے دھرے تھے اور ان کا مصرف مجھے معلوم نہیں تھا۔ ماسوائے اس کے کہ میں کسی نہ کسی طریقے سے وہ روپے خورشید احمد کو لوٹا دوں۔ یہی سوچ کر میں نے وہ روپے اس سے لے لئے تھے مگر وہ میرے اس ارادے سے آگاہ نہیں تھا۔

وہ نوٹ میں نے رومال میں لپیٹے اور پلنگ کی نواڑ کے درمیان اس طرح رکھے کہ ان کے بارے میں کسی کو ہلکا سا شبہ بھی نہ ہو سکتا تھا۔ آبی ان کی حفاظت کے لئے مجھے خاص طور پر کہہ رہا تھا تو اس کے ذہن میں کوئی شک ضرور ہو گا۔

نوٹوں کی طرف سے مطمئن ہو کر میں لحاف میں لیٹ کر سگریٹ پھونکنے لگا۔ اپنے وہ نوٹ جو میں نے ماں سے لئے تھے میرے بریف کیس میں بند تھے اور مجھے یقین تھا کہ وہی رقم بہت دنوں تک میرے لئے بہت کافی ہو گی اور مجھے بینک میں جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ پتہ نہیں کیا بات تھی۔ میرا دل نہیں چاہتا تھا کہ میں بینک میں داخل ہوؤں۔ وجہ اس کی صرف یہ تھی میرا چہرہ چار...... وانگ عالم میں پولیس نے ہر آنکھ سے روشناس کرا دیا تھا اور مجھے یہی خوف لاحق تھا کہ میں جیسے ہی بینک میں گھسا وہ لوگ فوراً ہی مجھے اپنے لاسے میں جکڑ لیں گے اور پھر مجھے اپنی جان بچانی مشکل نظر آئے گی۔

کبری نے اس رات نو بجے تک اپنی شکل مجھے نہیں دکھائی۔ ورنہ وہ بات بے بات اپنی تھوتھنی اٹھائے اندر چلا آتا تھا اور اپنی باتوں سے مجھے حواس باختہ کئے رہتا تھا۔ اس کے ارادے تو مجھے قطعاً نیک نظر نہیں آتے تھے۔ وہ سالا خود اپنے مطلب کے لئے جامے سے باہر نکلتا دکھائی دیتا تھا۔ بھوں بھوں کر کے مجھے دہلا دیتا تھا۔ شام کا کھانا مجھے آہو صاحب کے دوسرے نوکر باچی نے کھلایا۔ وہ بچارا بہت ہی کم گو قسم کا آدمی تھا۔ ہاں کہتا تھا تو سر اوپر نیچے ہلاتا تھا اور نہ کہتا تھا تو سر کو دائیں بائیں جنبش دیتا تھا اور سر بھی اس کے کندھوں پر ایسا تھا کہ یا اس نام کی کوئی شے وہاں موجود نہیں تھی ـــــ آہو صاحب آبی کے ساتھ ایسے نکلے پھر وہ...... مجھے کہیں نظر نہ آئے حالانکہ مجھے ان سے کئی ضروری باتیں کرنا تھیں۔

باچی مجھے کھانا کھلا کر میز پر میرے لئے چائے بھی رکھ گیا ـــــ تو اچانک کبری شکاری کتے کی طرح ادھر ادھر دیکھتا تیزی سے اندر آ گیا اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے وہ سیدھا میرے پاس آ کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔

"تو کدھر چلا گیا تھا پہلوان؟"

"میں سالا ادھر تمہارے ہی ایک کام سے گیا تھا۔ قسم اللہ کی تیری یہ حالت مجھ سے دیکھی نہیں جاتی ہے اوستاد"

"کیا مطلب؟ ابے گھن چکر میری حالت کو کیا ہوا ہے۔ میں تو ٹھیک ٹھاک ہوں"

"کیا ٹھیک ہو۔ کچھ موج میلا بھی کیا ہے کبھی۔ جیل میں سڑتے رہے ہو۔ اس طرح سے تو اندر سے سوکھ جاؤ گے اوستاد"

"تیرا مطلب کیا ہے بے! تو کسی چکر میں تو نہیں ڈال رہا ہے مجھے"

"نہیں! بھئی نہیں۔ میں تیرے لئے...... وہ کیا کہتے ہیں...... ایک دانہ تلاش کرنے گیا تھا"

"اچھا پھر؟ وہ چنے کا دانہ تھا تو لے آئے ہوتے"

"مذاق نہ سمجھ اوستاد۔ بس صرف پانچ سو روپیہ لگے گا تیرا۔ صرف پانچ پاپڑ ڈھیلے کر قسم اللہ کی ایسا دانہ ہے کہ بس تو دیکھتا رہ جائے۔ لڑکی نہیں ریشم کا تھان ہے۔ یوں بس کھلتی چلی جاتی ہے ایک دم فسٹ کلاس"

"پانچ سو روپے! کتنے دنوں کے؟" میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ اندر سے ایک خواہش اٹھ کر میرے دل پر دستک دینے لگی تھی حالانکہ یہ راستے میں نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔

"کتنے دنوں کے؟ اوستاد تیری مت ماری گئی ہے۔ یہ صرف ایک رات کا سودا ہو گا۔ مگر قسم اللہ کی، وہ گندم کا دانہ دیکھا ہے جو ابھی سٹے سے نکلا ہو۔ بس سمجھ لے کہ وہ ایسی ہی ہے"

"ابے پیاٹے! الپ جھپ مت کر! میرے پاکٹ مار خان مجھے نہیں چاہئے یہ مال۔ میں سیدھا سادا جنتی ستی آدمی ہوں۔ دفع ہو جا یہاں سے۔ شرم نہیں آتی تجھے"

"اوستاد! خدا کی قسم تیری جوانی پر مجھے ترس آ گیا تھا۔ بس لا ادھر پانچ سرخے ڈھیلے کر ـــ میں اسے ابھی آدھ گھنٹے میں پچھلے راستے سے اپنے کمرے میں لے جاؤں گا پھر اسے یہاں پہنچا دوں گا۔

"معلوم ہوتا ہے تو حرام کھانے کا عادی ہو چکا ہے۔ مجھے یہ سودا منظور نہیں"

"نہیں اوستاد! میں زبان دے آیا ہوں۔ مجھے پتہ ہے تیرے پاس مال ہے، بس ڈھیلا کر دے۔ دیکھ ان کا بھی کام بن جائے گا اور تیری بھی عید ہو جائے گی" اس نے یہ بات کچھ ایسے انداز سے کہی کہ میرا دل پسیج گیا۔ میں نے اس بنڈیلے کو اس کے سامنے بریف کیس کھول کر پانچ سو روپے دے دیئے۔ میرے دل میں یہ احساس ابھر آیا تھا کہ وہ کسی مجبور کی مجبوری سے فائدہ اٹھا رہا ہے اگر میں نے وہ سودا نہ خریدا تو وہ اس مجبور کو کسی اور کے آگے بیچ کر رات ہی رات میں تاخت و تاراج کروا دے گا۔ اگر وہ کوئی ڈھنگ کی شے ہوئی تو میں اس موقعے سے فائدہ اٹھا لوں گا کہ میں نے آج تک کسی کو اپنے آگے یوں ایسی چیز

پھینکتے نہیں دیکھا۔ اگر وہ میرے راستے میں آ ہی گئی ہے تو دیکھتے ہیں وہ کیسی ہے۔ اس کبری کی خصلت کو تو میں اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اس نے اس سودے میں سے لمبا ہی ہاتھ مارا ہو گا۔ مجھے یہ تجسس گھیر بیٹھا تھا کہ اس خبیث کے ہاتھ کی لمبائی مجھے ضرور دیکھنی چاہئے۔ پتہ نہیں اس نے کہاں کہاں سینڈھ لگا رکھی تھی۔ نوٹ ہاتھ میں لے کر وہ پھدک کر اٹھ بیٹھا اور بولا۔

"بس میں ابھی آیا، تو ذرا اپنے آپ کو چاق و چوبند رکھنا۔" وہ بغلیں بجاتا ہوا تیر کی طرح سیدھا نکل گیا۔ اس کے جانے کے کوئی پانچ منٹ بعد باڈی اندر آیا اور چائے کے برتن اٹھا کر باہر لے گیا۔ وہ جاتے ہوئے مجھے کہہ گیا کہ میں دروازہ اندر سے بند کر لوں ـــــ مجھے وہ سالا کبری ایک نئے ہی چکر میں ڈال گیا تھا۔ میرے بدن میں عجیب عجیب سے جذبے سر ابھارنے لگے۔ میں نے سوچا ٹھیک ہے کبری پہلوان بڈھیا مرے تو مرے آگرہ تو دیکھ لیں گے۔ میں اس کے انتظار میں بیٹھا کافی دیر تک ایک رسالے کی ورق گردانی کرتا رہا ـــــ اس کبری کمینے نے مجھے عجیب سی دہشت میں مبتلا کر دیا تھا۔ حرفوں پر میری نظریں نہیں جمتی تھیں۔ وہ آدھا گھنٹہ میرے لئے آدھی صدی بن گیا۔ میں وہاں بادشاہ بنا بیٹھا تھا۔ پانچ سو روپے میں نے اسے یوں نکال کر دیئے تھے جیسے میں کہیں کا بہت بڑا جاگیردار ہوں ـــــ میرے لئے یا شاید اس دولت کی کوئی وقعت نہیں رہ گئی تھی۔ وہ مجھے ہاتھ بڑھاتے ہی مل تو گئی تھی مگر یوں کہ اس کے عوض میں اپنی اصل شناخت اور شخصیت کو گروی رکھ بیٹھا تھا پھر بھی مجھے اطمینان تھا کہ جو راہ میں نے پکڑی ہے وہ کہیں نہ کہیں تو مجھے پہنچا ہی دے گی۔

ٹھیک آدھے گھنٹے بعد میرے کمرے کے اس دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی جو پیچھے لان میں کھلتا تھا۔ میں نے اٹھ کر بتی بجھائی اور دبے پاؤں چلتا ہوا اس دروازے تک جا پہنچا۔ دل میرا دھڑ دھڑ بج رہا تھا۔ اس جل کاگ نے مجھے واقعی ایک نئے چکر میں ڈال دیا تھا۔

"کون ہے؟"

"میں ہوں کبری! دروازہ کھولو بھائی جان جلدی کریں۔" میں نے اس کی آواز پہچان کر چٹخنی نیچے گرا دی۔ دروازہ بے آواز کھلا تو کبری برقعے میں لپٹی لپٹائی ایک عورت کو لے کر اندر آ گیا۔

"یہ بتی کیوں بجھا دی ہے جناب آپ نے!" وہ اس لمحے مجھ سے بہت ہی مہذب انداز میں گفتگو کر رہا تھا۔

"یہی بہتر ہے۔ ادھر بٹھا دے انہیں پلنگ پر۔"

"ٹھہر دیں یہ چھوٹا بلب جلا دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے دائیں ہاتھ کی دیوار ٹٹول کر بتی جلا دی۔ کمرہ سبز رنگ کی ہلکی ہلکی روشنی سے لبریز ہو گیا۔ وہ میرے سامنے کھڑی تھی۔ سکڑی سمٹی اپنے آپ سے خوفزدہ ڈری ہوئی، سہمی ہوئی برقعے میں ڈھیری ہوئی جاتی تھی۔ مجھے تو یوں محسوس ہوا جیسے میرے سارے ہی جذبے ٹھنڈے پڑ گئے ہیں۔ مخصوص قسم کی سستی سی خوشبو اس نے لگا رکھی تھی جو کمرے کی [...] آہستہ آہستہ ناگوار بنا رہی تھی۔

"چل ری ادھر بیٹھ جا پلنگ پر۔ اور دیکھ فیل مت مچا! ماری جائے گی خواہ مخواہ میں۔ چل۔" یہ کہہ کر کبری نے اس کو دھکیل [کر] پلنگ پر بٹھا دیا۔ وہ ابھی تک اپنا نقاب سختی سے پکڑے ہوئے تھی۔ [جیسے] اس نقاب کے پیچھے اس نے پرندے روک رکھے ہوں جو ذرا سا اٹھتے ہی اس کے چہرے کی کابک سے نکل بھاگیں گے۔

"بس جناب میں تو چلا، اب آپ جانیں اور آپ کا کام۔ اتنی احتیاط رکھیں کہ ـــــ آپ [...] بھی باہر نہیں آنی چاہئے۔ یہ میری عزت کا معاملہ ہے۔" یہ کہہ کر تیزی سے مڑا اور ایک جھپاکے سے باہر نکل گیا۔ اب مجھے اس کا [...] تھا، اس پندگلی سے۔ جس کی تعریف میں اس حرامزادے نے زمین کے قلابے ملا دیئے تھے۔

"آپ برقعہ اتار کر آرام سے بیٹھیں، پاؤں اوپر کر لیں۔" اس نے میرے کہنے کے مطابق اپنی جوتی اتاری اور [...] ہو کر پلنگ پر بیٹھ گئی۔ وہ سردی سے ٹھٹھرتی نظر آتی تھی۔ ٹھٹھر [...] سی لیتی تھی۔

"لحاف اوڑھ لیں اور پہلے برقعہ تو اتار دیں۔ یوں بندھ ہو کر [...] سے کیا فائدہ۔" وہ پھر بھی کچھ نہیں بولی۔

"کیا بات ہے آپ میری بات نہیں سنتی ہیں؟"

یہ کہہ کر میں اس کے پاس بیٹھ گیا، آلتی پالتی مار کر۔ برقعے پر لگی وہ واہیات خوشبو اور زیادہ شدت سے میرے [...] میں چڑھنے لگی۔

"برقعہ اتار دیں۔" میں نے ایک بار پھر کہا۔ شاید میرے [...] کو اس نے محسوس کر لیا تھا۔ اس نے فوراً ہی نقاب الٹ کر برقعہ [...] دیئے۔ وہ سالا کبری بالکل ٹھیک کہتا تھا۔ لڑکی واقعی حسین تھی حسین۔ مگر صرف چہرے کی حد تک۔ اس کا باقی بدن بالکل [...] آتا تھا۔ ہڈیوں کی مٹھ دکھائی دیتا تھا۔ وہ شاید فاقوں کی [...] تھی۔ بہت ہی نحیف و نزار تھی۔ اتنی کمزور کہ اس کے ہاتھ [...] رگیں ابھر آئی تھیں۔ عمر اس کی یہی کوئی سولہ سترہ سال ہو گی۔ غذا نہ ملنے کی وجہ سے اس کا برا حال ہو چکا تھا اور وہ اس رات پہلی بار روپیہ کمانے نکلی تھی ـــــ اگرچہ وہ بے حد کمزور تھی [...] کے چہرے پر ایسی دغدغاہٹ تھی، ایسی چمک تھی کہ اس پر [...] تھی۔ اس نے آنکھیں پوری طرح کھول کر پہلی بار مجھے دیکھا [...] رہ گیا۔ یہ بڑے بڑے آنسوؤں میں اس کی آنکھیں تیر رہی تھیں۔ اس دکھ کی پوٹ کو دیکھا تو معاً مجھے اپنے وجود میں کوئی شے

ٹوٹتی محسوس ہوئی۔ میرے تصور میں آسیہ کا چہرہ ابھر آیا تھا۔ وہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا اجڑا اجڑا ویران چہرہ جو جیل کی سلاخوں کے پیچھے بند ہے آسیہ میرے ذہن میں کوندتی بجلی کی طرح نمودار ہوئی اور میرے سارے جذبوں کی رگوں سے خون نچوڑ کر لے گئی۔

میں اس سے دو ہاتھ پیچھے سرک کر پلنگ کے اس سرے پر جا بیٹھا ـــ "تمہارا کیا نام ہے؟"

"مجیدن۔" اس کے خشک لبوں سے اپنا نام یوں نکلا جیسے وہ اس سے بے حد متنفر ہو ـــ وہ ٹھہر ٹھہر کر لرزتی تھی۔

"یہاں کیوں آئی ہو؟ کس نے بھیجا ہے تمہیں؟"

"میری ماں نے۔"

"کیوں؟ ایسی کیا ضرورت پڑ گئی ہے اسے؟"

"وہ بیوہ ہے اور بیمار ہے۔ اسے فالج ہو گیا ہے۔"

"پھر؟ پھر کیا ہوا؟"

"اس کے پانچ بچے ہیں۔ میں بڑی ہوں۔"

"پھر؟ آگے بتاؤ۔ بات کرو۔"

"چار چھوٹے ہیں اور....." اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور ٹھوڑی اس نے اپنے زانو پر رکھ لی تھی۔

"اچھا پھر؟ چار بچے ہیں۔ تم بڑی ہو۔ پھر؟ پھر کیا ہوا؟"

"کچھ بھی نہیں۔ ماں نے مجھے کبری کے ساتھ بھیج دیا۔"

"مگر کیوں؟ کیوں بھیج دیا تمہیں؟"

"بچے بھوکے سوتے ہیں نا۔ تین دن سے بھوکے ہیں۔"

"اور تم؟"

"مجھے کبری نے آج شام کو دودھ پلایا تھا اور ڈبل روٹی بھی کھلائی تھی۔" وہ بولنے لگی تھی۔

"اور کسی کو کچھ نہیں کھلایا؟"

"نہیں! شام کو تو کچھ نہیں دیا اس نے۔ ابھی میں اس کے ساتھ [...] آنے لگی تو اس نے ماں کو ڈھائی سو روپے دیئے تھے۔"

"اس کبری کے بچے کا میں کچومر نکال دوں گا۔ وہ تو مجھ سے [...] سو روپے لے کر گیا ہے۔"

"وہ..... وہ کہتا تھا صاحب نے تین سو دیئے ہیں ـــ پچاس [...] لوں گا۔"

"تو پہلے بھی کہیں گئی تھی؟"

"نہیں! یہ پہلی رات ہے۔" اس کی ماتم کناں آواز نے مجھے [...] کر رکھ دیا۔

"تیرا گھر یہاں سے کتنی دور ہے؟"

"یہیں ادھر کچی آبادی میں رہتی ہوں لائن کے پار۔" اس لمحے [...] بالکل میرے سامنے کھڑی تھی اور اس کی آنکھوں سے بھی آنسوؤں کی رل ترل مسلسل جاری تھی۔ مجیدن کی آنکھوں سے بھی ساون بھادوں جھانک رہا تھا۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر اپنے آنسو دوپٹے میں جذب کر رہی تھی۔

"تمہارا مکان اپنا ہے؟"

"نہیں۔ بارہ روپے مہینہ کرایہ دیتی ہے ماں چوہدری کو۔"

"وہ کتنا بڑا مکان ہے۔ میرا مطلب ہے کتنی قیمت ہو گی اس کی؟"

"چوہدری ستا تین ہزار مانگتا ہے مگر ہم کہاں سے دے سکتے ہیں؟ ہم تو چھ ماہ سے کرایہ بھی نہیں دے سکے تھے۔"

"کیا نام ہے تیری ماں کا؟"

"پھتی! ویسے نام اس کا فتح بی بی ہے مگر سب اسے پھتی ہی کہتے ہیں۔"

"تو پڑھی لکھی ہے؟"

"میں نے آٹھویں میں سکول چھوڑ دیا تھا۔"

"کبری کب سے واقف ہے تم لوگوں سے؟"

"وہ بہت دنوں سے میری ماں کے پیچھے لگا تھا۔ تین چار مہینے سے۔ کہتا تھا پھتی لڑکی کو دھندے پہ لگا دے۔ تیرے دن پھر جائیں گے۔"

اس لڑکی کی باتیں سن سن کر میرا کلیجہ کٹنے لگا تھا۔ اس کبری حرامزادے نے پتہ نہیں کتنے گھر تباہ کر دیئے ہوں گے ـــ اس پر مجھے سخت طیش آنے لگا تھا۔ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔

"برقعہ پہن لے میری بہن، میری اچھی بہن اور اٹھ۔" یہ کہہ کر میں پلنگ سے اتر گیا۔ مجیدن نے مجھے یوں دیکھا جیسے وہ کوئی بھیانک خواب دیکھ رہی تھی اور اب اچانک اس کی آنکھ کھل گئی ہے۔ اس کی آنکھیں یوں کھلی تھیں جیسے اسے میری باتوں پر اور اپنے کانوں پر اعتبار نہ آ رہا ہو ـــ

"اٹھ میری بہن میری ننھی منی بہن اچھی سی بہن اٹھ۔" میری آنکھیں بہہ نکلی تھیں۔ میں نے بے اختیار ہو کر اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور کہا ـــ

"اٹھ مجھے اور گناہ گار نہ کر مجیدن میری بہن آ میرے ساتھ آ۔" وہ اٹھی۔ اور برقعہ پہن کر میرے سامنے یوں کھڑی ہو گئی۔ جیسے وہ اجل کا حکم سننے کے لئے خود کو تیار کر رہی ہو۔ اسے میری کسی بات پر یقین نہیں آتا تھا۔ میں نے اس کی آنکھ بچا کر پستول جیب میں رکھا۔ کمبل اپنے کندھے پر ڈالا اور بریف کیس ہاتھ میں لے کر پچھلے دروازے کی طرف چل دیا۔

مگر جونہی میں نے دروازہ کھولا میرے غصے کے تلووں کو آگ لگ گئی۔ وہ کبری مکڑ ادھر دروازے کے پیچھے کھڑا تھا اور حیران پریشان ہو رہا تھا۔ وہ ہزار کوشش کے باوجود ہماری کوئی بات نہ سن سکا تھا کیونکہ ہم نے جتنی بھی باتیں کی تھیں وہ اتنی آہستہ تھیں کہ میرے اپنے

کانوں کو ان کے سُننے کے لئے خاصی کاوش کرنی پڑی تھی۔

کبری نے خالی خالی نظروں سے ہمیں دیکھا اور بولا۔ "اوستادما میں اُدھر پہرہ دے رہا تھا۔ قسم اللہ کی یہ میری عزت کا سوال تھا۔"

"اچھا کیا تم نے۔" میں نے جل کر کہا۔

"مگر اتنی جلدی کیوں نکال رہے ہو اسے۔ ابھی تو پندرہ منٹ بھی نہیں ہوئے۔"

"بکو مت! چلو میرے ساتھ چلو۔ میں اس کے گھر میں رات گزاروں گا۔"

"کیوں؟ اِدھر کیا خطرہ ہے! سب لوگ سو چکے ہیں اوستاد۔ قسم اللہ کی بالکل گھامڑ ہے تو۔ مٹی کا مادھو بن رہا ہے اس وقت۔" وہ دبی آواز میں بولا۔

"ابے زیادہ بک بک مت کر۔ چل اُدھر باہر نکال ہمیں۔" میں نے اسے آگے دھکیلتے ہوئے کہا۔ میرے تیور دیکھ کر وہ بدکا اور آگے آگے چلنے لگا۔ اس نے درختوں کے سایوں کے تلے سے گزار کر ہمیں لان کی دوسری طرف پہنچایا اور پھر چھوٹے سے لوہے کے دروازے کا ارل کھینچ کر بولا۔

"حد کر دی ہے تم نے اوستاد! رقم حرام گنوا دی تو نے۔"

"بکواس بند کرو کبری ورنہ میں ایک چھاپنڑ دوں گا تیرے منہ پہ سیدھی طرح آگے لگ جا۔" اس نے میرا جلا کٹا لہجہ دیکھا تو خوفزدہ کتے کی طرح آگے ہو لیا۔ سامنے کھیت تھے۔ ان میں سے گزر کر ہم نے ریلوے لائن عبور کی اور پھر کوئی پندرہ منٹ بعد ہم ایک ایسے مکان کے سامنے کھڑے تھے جو چٹکی چاندنی میں کسی لب جاں مریض ایسا نظر آتا تھا۔ اس کے بوسیدہ سے کمزور کواڑ پر جب میں نے پاؤں کی ٹھوکر ماری تو وہ چیخ اٹھا پھتی ابھی تک سوئی نہیں تھی۔ صحن میں چھپر کے نیچے رکھے چولہے کے پاس بیٹھی تھی۔ کواڑ کی تڑی تڑی جھریوں سے اندر کا منظر مجھے صاف نظر آ رہا تھا۔ چار بچے اس کے گرد ایک چیتھڑا سی لوری پر کھیس میں لپٹے بیٹھے تھے۔ وہ بھوکے تھے اور شاید کھانا پکنے کے انتظار میں ماں کے گرد گھیرا ڈالے بیٹھے تھے۔

دوسری دستک پر پھتی نے دروازہ کھولا تو اس کے کھوکھا جسم کو دیکھ کر دماغ سُن ہونے لگا۔ اس کا بایاں ہاتھ اور بائیں ٹانگ فالج زدہ تھی اور وہ لکڑی کے سہارے چلتی تھی۔

اس نے دروازہ کھولا تو میں نے مجیدن کو اپنے آگے دھکیل کر صحن میں پہنچا دیا۔ پھتی حیرت زدہ سی ہو کر ہمیں دیکھنے لگی۔ کبھی وہ کبری کو دیکھتی تھی، کبھی مجیدن کو۔ پھر پھر کر اس کی نظر میرے چہرے پر آ ٹکتی تھی۔ لرزتی ہوئی آواز میں بولی ——

"کیا بات ہے باؤ جی! کوئی "گلتی" ہو گئی ہے چھوری سے؟"

"ہاں! غلطی ایسی غلطی، ذرا اندر چل پھر میں بتاتا ہوں تجھے۔"

یہ کہہ کر میں ان سب کو دھکیلتا ہوا کوٹھری میں لے گیا۔ بچے ہمارے پچھاڑے ہمارے پاس آ ٹھہرے۔ کوٹھڑی میں ایک جھلنگا سی چا اِدھر بچھی تھی اور ایک اُدھر۔ درمیان میں تھوڑی سی جگہ خالی

"دروازہ بند کر دے اماں! میں تجھ سے کچھ حساب کتاب آیا ہوں۔ تو بھی اُدھر بیٹھ جا ری۔ کیا نام ہے تیرا مجیدن، ہاں جا اُدھر۔" مجیدن کانپتی لرزتی سامنے کی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ رنگت کی اس گھڑی ہلدی ہو رہی تھی۔

"آخر کیا کیا ہے اس بدبخت نے باؤ جی؟ کوئی گلتی کی مجھے معاف کر دیں۔"

"میں نے اسے اپنی بہن بنا لیا ہے اماں! میری بھی ایک میں اس کی عزت کے لئے سارے جہان کو تہس نہس کر سکتا تو کیسی ماں ہے کہ اسے تو نے اس شہدے کے حوالے کر دیا!"

پھتی کا تو میرے یہ الفاظ سُن کر اُوپر کا سانس اُوپر اور نیچے رہ گیا۔ وہ کچے فرش پہ ڈھے سی گئی —— اور ہاتھ مسلتا

"میں.... میں بدنصیب کیا کرتی، کالے کرموں والی، بیوہ، فالج کی ماری! میں کیا کرتی؟ تین دنوں کا فاقہ بیت کسی ہمسائے نے بھی نہ پوچھا کہ پھتی تیرا کیا حال ہے۔ میں کیا کرتی میں کیا کرتی؟" یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کبری کا یہ کہ وہ پاگلوں کی طرح کبھی چھت کو گھورتا تھا اور کبھی ہم سب کو۔ اس کے منہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔

"اللہ جو کرتا ہے بہتر ہی کرتا ہے ماں جی۔ میں نے مجیدن ساری باتیں سُن لی ہیں۔ میرا تو کلیجہ کٹتا ہے اس کی باتیں اور میں اسی لئے آیا ہوں ماں جی۔ اب روئیں نہیں۔ بالکل نہیں مجھے اپنا بیٹا سمجھیں، مجیدن کے سگے بھائی ایسا۔"

"اللہ تجھے دنیا کا بادشاہ بنا دے باؤ جی! خدا تجھے ا سنبھال نہ سکے۔" اس کی یہ بات سن کر میں نے اوٹ میں رکھ کھولا اور اس میں سے دس ہزار کی گڈی نکال کر اس کے سامنے

"یہ لیں۔ یہ دس ہزار روپیہ ہے۔ اس چوہدری ستا کو اور یہ مکان تین ہزار روپیہ دے کر خرید لیں۔" نوٹ دیکھ کر آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس میں اتنی بھی سکت نہیں رہی ہاتھ بڑھا کر اس گڈی کو زمین پہ سے اٹھا لیتی۔ آنکھیں نبتی جا رہی تھیں —— میں نے وہ نوٹ خود اٹھا کر اس کی ڈال دیئے ——

"وہ ستا مل سکتا ہے اس وقت؟"

"ہاں باؤ جی وہ اِدھر ہی رہتا ہے۔ میں ابھی بلاتی"

یہ کہہ کر پھتی لاٹھی سنبھالتی ہوئی لاٹھی اور باہر نکل گئی۔ نو دو پٹے میں لپیٹ لئے تھے۔ مجیدن کا یہ حال تھا کہ وہ چار

میں سر دیئے بیٹھی تھی اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔

"جا بہن! اُٹھ کر ان کو کھانا تو پکا کر دے دے۔ جا! اٹھ میری اچھی بہن۔"

یہ کہہ کر میں نے مجیدن کو اس کی جگہ سے اٹھایا۔ وہ پہلی بار کھُل کر مسکرائی۔ آنکھیں اس کی بھیگی ہوئی تھیں اور وہ جو رذیل سی سُرخی اس نے ہونٹوں پر لگائی تھی وہ اس نے چپکے چپکے اپنے بُرقعے سے رگڑ کر پونچھ ڈالی تھی۔ اس نے آنکھوں میں سُرمہ بھی ڈالا تھا مگر اب اس کی سیاہی اس کے رخساروں تک بہہ آئی تھی اور اس حال میں اس کا چہرہ پہلے سے کہیں زیادہ دلکش نظر آتا تھا۔ اس نے بُرقعہ اتارا۔ ایک میلی سی چادر اوڑھی اور بچوں کو ساتھ لے کر چُولہے کے پاس جا بیٹھی۔ ہانڈی پک چکی تھی اور پرات میں آٹا گندھا رکھا تھا۔ وہ توا چُولہے پر رکھ کر روٹیاں پکانے لگی اور.... اور.... ایک بار پھر آسیہ میرے تصوّر میں اُبھر آئی۔ اب وہ مجھے بہت خوش نظر آ رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو تم نے بہت اچھا کیا ہے بھائی! تم نے خود کو میرا بھائی ہونے کا اہل ثابت کر دیا ہے۔ مجھے تم پر فخر ہے میرے بھائی! وہ بہت ہی خوش دکھائی دیتی تھی۔ یوں جیسے کوئی پرندہ صبح صبح گھونسلے سے اٹھ کر خوشبو سے مدے پھندے کسی باغ میں چہچہا رہا ہو ——

مجیدن باہر صحن میں نکلی تو کبری سرک کر میرے قریب آ گیا اور چارپائی کی پائینتی بیٹھ کر بولا۔

"اوستاد! تم پاگل ہو گئے ہو ایک دم پاگل۔ میں بولتا ہوں اِدھر ن گنتی لوگوں کو اتنا روپیہ دینے کی کیا ضرورت تھی؟"

"بک نئیں اوئے کبری! کمینے تیرا تو حساب تا ب میں باہر چل کر دوں گا۔ اس معصوم کو برباد کرتے تجھے شرم نہیں آئی۔"

"شرم کی کیا بات ہے! اِدھر تو بہت سی ایسی ہیں یہی دھندا تی ہیں۔ کس کس کو رقمیں دو گے تم۔ اوستاد تم بالکل گھامڑ ہو۔"

"اوروں پر لعنت بھیج۔ مجھے تو یہ اپنی بہن آسیہ لگتی ہے ویسی صوم اور سادہ لوح ہے کبری! اپنا منہ بند رکھ۔ میں کچھ نہیں سنوں گا۔ الے اتنے کمینے ہو کہ انہیں ڈھائی سو دے کر ڈھائی سو اپنی جیب میں ڈال جو۔ یہ شرافت ہے تمہاری؟"

"اچھا؟ تو اس نے یہ بھی بتا دیا ہے تجھے مگر اوستاد میرا د تو نے کوئی خیال نہیں کیا۔ اتنا روپیہ ہے تمہارے پاس۔"

"وہ تیرے جیسے شہدوں کے لئے نہیں ہے کبری! تو پتہ نہیں کیا ہے؟ مگر مجھے اتنا پتہ ہے کہ تیری نیت بہت کھوٹی ہے۔"

"نیت کھوٹی ہوتی تو میں اب تک تیرا نیا پانچہ کر چکا ہوتا۔ جیلانی ہزار مل سکتے ہیں مجھے، صرف انگلی اٹھانے کی دیر ہے۔" اس نے سمجھے میں مجھے صاف سیدھی دھمکی دی۔ میں نے آنکھیں پوری کھول کر اسے دیکھا۔ وہ ویسا ہی تھا جیسا میرے دل نے اس کے بارے مجھے تیار کیا تھا۔ وہ کسی بھی وقت کوئی بھی قدم اٹھا سکتا تھا۔ وہ میرے پاس ہی بیٹھا تھا میرے جی میں آئی کہ میں اس کا وہیں بیٹھے بیٹھے ٹینٹوا دبا دوں وہ اسی قابل تھا۔ اس پر اعتبار کیا ہی نہ جا سکتا تھا مگر میں جس کام کے لئے اس جھگی میں بیٹھا تھا وہ اس کی بکواس سے کہیں زیادہ اہم تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنا ہاتھ روکا۔ مجھے چپ دیکھ کر کبری شیر ہو گیا بولا۔

"تمہارے پاس اتنا روپیہ ہے لٹانے کے لئے تو مجھے دس بیس ہزار دے جاؤ۔ میری سو ضرورتیں رُکی پڑی ہیں۔ اس ماں کے لئے اِدھر خواہ مخواہ حاتم طائی بن بیٹھے ہو۔" وہ بہت ہی کبیدہ خاطر ہو رہا تھا اور میں دیکھ رہا تھا کہ اگر اس کا بس چلتا تو مجھے وہیں چھیل کر صاف کر دیتا۔

"تمہیں تو میں نوٹوں میں گاڑ دوں گا بچے! فکر نہ کر دیکھتا رہ میں کیا کرتا ہوں تیرے لئے۔ مگر یہ ظلم جو کر رہا ہے بند کر دے۔ مجھے آج اس سلسلے میں آہو صاحب سے بھی بات کرنی پڑے گی۔"

"او ہو آہو صاحب! اوستاد اُدھر سے بے فکر ہو جا۔ اس دلی کی بات رہنے دے۔ یونہی نہیں بیٹھا ہوں میں وہاں۔"

"اچھا تو یہ بات ہے۔ اس کی پگڑی کو بھی ایسی معصوم لڑکیوں کے خون کا کلف لگا ہے، بہت خوب!"

ابھی یہ بات میرے منہ میں ہی تھی کہ پھتی تیزی سے صحن میں داخل ہوئی اس کے ساتھ ایک چھریرے قد کا دھان پان آدمی تھا جو کھیس کی بکل مارے ہوئے تھا۔ اس کے سر پہ کالی ٹوپی تھی۔ وہ صورت شکل سے ہی مجھے شہدا نظر آ رہا تھا۔ عمر اس کی یہی کوئی چالیس سال ہو گی۔ وہ آیا اور... کوٹھڑی کے دروازے میں رُک کر مجھے اور کبری کو گہری گہری نظروں سے دیکھنے لگا....

"مجھے بلایا ہے آپ نے باؤ جی؟"

"ہاں! ستا تمہارا ہی نام ہے؟"

"جی ہاں! میرا نام ستا ہے اور یہ آبادی میں نے ہی بنوائی تھی۔"

"یہ زمین کس کی ہے؟"

"یہ تو خدا کی زمین ہے باؤ جی! میں نے ادھر دس کوٹھے کھڑے کر دیئے تھے۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ سرکاری زمین ہے۔"

"یہ متروکہ جائیداد ہے جی! بیلا رام ایک ہندو تھا اس کی ملکیت تھی یہ۔ اب تو میں نے یہ اپنے نام کرا لی ہے۔ کلیم خرید کر جمع کرا دیئے تھے۔"

"اچھا! خیر تم اپنا تین ہزار روپیہ لے لو اور یہ کوٹھا ماں جی کو دے دو۔"

"میں تیار ہوں سرکار! صبح ہی رجسٹری لکھوا دوں گا۔"

"ٹھیک ہے لاؤ ماں جی! میں اسے پیسے دیتا ہوں۔"

یہ کہہ کر میں نے بھیتی سے نوٹوں کی گڈی لے کر ستما کو تین ہزار روپے الگ کر کے دے دیئے۔ اور اس سے رسید پہ انگوٹھا لگوالیا۔ گواہ میں نے کبری کو بنایا۔ وہ الیاگھن چکر تھا کہ اس رسید پہ گواہ کے طور پر بھی دستخط کرنے سے گریزاں تھا۔

ستما بہت حیران تھا بولا۔

"آپ بھیتی کے کیا لگتے ہیں؟"

"یہ میری ماں برابر ہیں چوہدری! اور میرا خیال ہے کہ اب انہیں اِدھر کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہیئے۔ تم سے میں یہی امید رکھتا ہوں بے آسرا ہیں بیچاری! ان کا اگر تم خیال رکھو تو یہ تمہاری مہربانی ہوگی"

"آپ بے فکر رہیں باؤ جی! میں نے چھ ماہ سے کرایہ بھی نہیں مانگا ہے اس سے۔ بیچاری بہت پریشان رہتی ہے"

"اچھا ٹھیک ہے اب تم جاؤ۔ اور دیکھو صبح ان کو ساتھ لے جا کر اشٹام پیپر لکھ دینا"

"بہت بہتر باؤ جی آپ چنتا نہ کریں" یہ کہہ کر وہ اٹھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا باہر نکل گیا۔

"ماں جی! اس مجیدن کی شادی کیوں نہیں کرتی ہو؟"

"اتنے پیسے کہاں تھے بیٹا میرے پاس۔ ویسے اس کی منگنی میں نے کردی تھی۔ وہ پچھلے مہینے آئے بھی تھے مجھ سے دن مانگتے تھے مگر میرے گھر میں تو خاک اُڑتی ہے"

"تم ان کو دن دے دو۔ بس یوں کرو کہ اگلے مہینے کی اکیس تاریخ مقرر کر لو اور اس کی شادی کردو۔ یہ سات ہزار تو تمہارے پاس آ ہی گئے ہیں۔ اسی میں سارا کام مکمل کر لو اگر ضرورت پڑی تو میں اور دے دوں گا۔ میں اگلے مہینے کی بیس تاریخ کو پھر اِدھر آؤں گا"

"تمہاری بڑی مہربانی ہے بیٹے۔ اللہ تمہیں تخت پہ بٹھائے میری بھی عمر تمہیں لگ جائے"

"ارے نہیں ماں جی! اتنی عمر کیا کروں گا میں۔ لو میں اب چلتا ہوں مگر یاد رکھو میری اس بہن کو پھر کبھی تم نے اس راہ پہ لگایا تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا"

"توبہ توبہ! خدا میرا یہ گناہ معاف کرے بیٹا! میں تو خود زمین میں گڑ گئی تھی۔ میں....." وہ اپنا فقرہ مکمل نہ کر سکی اور بکھرنے لگی۔

"میں اگلے مہینے کی بیس تاریخ کو آؤں گا۔ اس کی شادی کی تیاری کرو" یہ کہہ کر میں کبری کو اپنے ساتھ کھینچتا ہوا صحن میں نکل گیا۔ مجیدن چولہے کے سامنے بیٹھی روٹیاں پکا رہی تھی اور بچے اس کے گرد ٹھک رہے تھے۔ اس نے اپنی وہ بڑی بڑی آنکھیں میرے چہرے پہ جمادیں ٹک ٹک مجھے یوں دیکھنے لگی جیسے میرے نقوش حافظے کی سطح پہ کندہ کر رہی ہو۔ چہرہ اس کا آگ کی تمازت سے اور زیادہ تمتما اٹھا تھا تھی وہ بالکل ہڈیوں کا پنجر مگر چہرہ اس کا یوں دمکتا تھا کہ مجھے حیرت ہوتی تھی۔ اسے دیکھ کر میں مسکرا دیا اور آگے بڑھ کر اس کے گال تھپتھپا کر میں نے کہا۔

"پھر کبھی تیری ماں نے تیرے ساتھ کوئی گھپلا کیا تو میں سمجھ لوں گا اس سے۔ یہ کبری بھی آئندہ تجھ سے بھائیوں کا سا سلوک کرے گا سمجھیں؟" وہ کچھ نہیں بولی۔ اپنی آنکھوں پر اس نے پلکوں کے پردے گرالئے اور کچھ اور زیادہ سمٹ سُکڑ کر چولہے کے قریب ہوگئی۔ میں نے ایک آخری نظر اس اجڑے ویران صحن کے کونے میں بیٹھے بچوں پر ڈالی اور پھر تیز تیز قدم اٹھاتا باہر نکل آیا۔ میرے دل پر تھوڑی دیر پہلے تک جو بوجھ تھا وہ اتر چکا تھا اور مجھے یہ اطمینان تھا کہ میں نے ایک گھر کو مکمل طور پر تباہ ہونے سے بچالیا تھا اور ایک لڑکی کو گناہ کی سیڑھی پر چڑھنے سے روک دیا تھا۔

راستے میں کبری بالکل خاموش رہا۔ جب ہم دوبارہ آہو صاحب کے گھر میں داخل ہوئے تو ہر شے مجھے اپنی اپنی جگہ ویسی کی ویسی نظر آئی جیسی میں چھوڑ کر گیا تھا مگر اپنے کمرے میں پہنچ کر مجھے محسوس ہوا جیسے کسی نے وہاں میری تمام چیزیں اُلٹ پلٹ کر اچھی طرح دیکھی ہیں۔ میرا لحاف بھی اپنی جگہ پر نہیں تھا۔ بستر کی چادر اور اس کے نیچے بچھے گدے کو اپنی جگہ سے اٹھا کر دیکھا گیا تھا۔ کوئی شخص میری غیر حاضری میں میرے کمرے کی مکمل تلاشی لے چکا تھا۔

"کیوں بے کبری! یہ کیا قصہ ہے؟"

وہ بالکل چپ تھا اور بے حد سنجیدہ نظر آرہا تھا۔

"ابے بولتا کیوں نہیں اس کمرے کی تلاشی لی گئی ہے دیکھتا نہیں ہر شے اپنی جگہ سے ہلی ہوئی ہے"

"تمہارا وہم ہے اُستاد! اِدھر بھلا کون آئے گا تمہارا مال تمہارے اس بریف کیس میں ہے"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر پھر بھی معاملہ گڑبڑ نظر آتا ہے ایسا تو نہیں کہ.....؟"

میں نے کچھ کہتے کہتے اپنی زبان دبالی۔ میں آہو کا نام لینا چاہتا تھا—

"بس اب تم آرام کرو۔ میں جارہا ہوں"

"ذرا ٹھہرو اور یوں کرو میرے لئے ایک پیالی چائے بنا دو بڑی مہربانی ہوگی اور دیکھو فکر مت کرو۔ کچھ نہ کچھ راتب میں تمہارے ڈالوں گا"

میری یہ بات سن کر اس کے چہرے پر جمی سنجیدگی کی پرت ہلکی ہوئی۔ وہ مسکرا دیا بولا۔

"مجھے ذلیل نہ کیا کرو اُستاد۔ تیری آج کی یہ شاہ خرچی مجھے پسند نہیں آئی۔ یہ دنیا سالی ایسی ہی ہے۔ تم بھلا کیا کر سکتے ہو؟"

"میں سب سمجھتا ہوں کبری مگر دیکھو تم سے میرا صرف چائے کا سوال ہے اس وقت"

وہ میری بات کا کوئی جواب دیئے بغیر باہر نکل گیا۔

میں نے لوازم کے اندر ہاتھ ڈال کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ آپی کا دیا ہوا روپیہ وہاں بالکل محفوظ تھا اور جس آدمی نے اِدھر آ کر میرے کمرے کی تلاشی لی تھی اس امید پر کہ وہ وہاں سے لاکھ روپیہ اُڑا لے گا، اپنی اس کمینگی میں کامیاب نہ ہو سکا تھا—میں نے لحاف اپنے گرد لپیٹ کر سگریٹ سلگایا اور دھوئیں کے مرغولے بنانے لگا۔

جب سے میں اس کمرے میں آیا تھا مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ کوئی شخص متواتر میری حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہا ہے۔ بس یونہی ایک احساس تھا جو ٹھہر ٹھہر کر مجھے یہ بات سمجھاتا تھا کہ دو آنکھیں ہیں دو تحیر میں ڈوبی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں مسلسل میرا تعاقب کر رہی ہیں وہ آنکھیں وہی تھیں جو میں نے دوسری منزل کی ایک کھڑکی میں دیکھی تھیں کمرے کی صورت یہ تھی کہ ایک کھڑکی اندر صحن میں کھلتی تھی صحن کی طرف جو کھڑکی تھی اس کے اوپر روشن دان لگا تھا۔ دوسرے کمرے میں جانے کے لئے درمیان میں ایک دروازہ تھا اس کے اوپر بھی روشن دان نصب تھا۔ اور اس کے شیشوں کے پیچھے مجھے کئی بار ایک سایہ سا ابھرتا نظر آیا تھا مگر جونہی میرا دھیان اُدھر جاتا تھا وہ چہرہ وہاں سے غائب ہو جاتا تھا۔ میں اب تک اس پُراسرار ہستی کے بارے میں کوئی قطعی رائے قائم نہ کر سکا تھا۔ جونہی میری نظریں اُوپر اٹھتی تھیں وہ ہیولیٰ وہاں سے ہٹ جاتا تھا۔

کبری چائے لے کر واپس آیا تو میں نے اسے بڑی محبت سے اپنے پاس بٹھا لیا وہ اب تک کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ مجھے اس پہ ترس آگیا۔ میں نے پانچ ہزار روپیہ نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"لے گھن چکر! یہ تیرے چہرے پر جو بارہ بجے ہیں نا، تو اس کی وجہ میں سمجھتا ہوں مگر یہ لے یہ تیرا راتب۔ اب تو خوش ہے نا؟" وہ نوٹ ہاتھ میں لیتے ہوئے مجھ سے لپٹ گیا۔ ایک دم بہک گیا۔ گلوگیر لہجے میں بولا۔

"تو بہت اچھا ہے اُستاد، بہت اچھا ہے میرے باپ سے بھی اچھا ہے تو" اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

"بک نہیں لوئے! اب تو یہ بتا کہ اس گھر میں کون کون رہتا ہے"

"کوئی بھی نہیں۔ ایک آہو صاحب ہیں ایک ان کی بیوی ہیں۔ بچہ ان کا کوئی نہیں ہے اور وہ دونوں اوپر کی منزل میں رہتے ہیں۔ نچلے حصے میں اِدھر باڈی رہتا ہے ساتھ کے کمرے میں میرا ٹھکانہ ہے اور بس"

"آہو صاحب کی بیگم کا کیا نام ہے؟"

"سروری خانم! اور سچ پوچھو تو میں بس اسی بی بی کی وجہ سے یہاں ٹکا ہوں۔ وہ بہت خیال رکھتی ہیں میرا۔ لو اُستاد! اتنی سوہنی ہے وہ کہ بس پوچھو مت— وہ سالا آنے بہانے میری اس راہ پر رال ٹپکانے کی کوشش کرتا تھا۔

"اور کون ہے اس گھر میں؟"

"اور تو کوئی نہیں ہے۔ کل آہو صاحب کی سالی یہاں آئی تھیں وہ ابھی تک یہاں ہیں" میں نے محسوس کیا کہ وہ کھُل کر بات نہیں کر رہا تھا۔ اس کے دماغ میں کوئی ایسا خناس سمایا تھا کہ وہ مجھ سے لحظہ بہ لحظہ دُور ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے تنگ آکر چائے کے برتن اس کے حوالے کئے اور اسے وہاں سے اسی وقت رخصت کر دیا۔

میں نے آلکسی کے مارے اٹھ کر اندر کی چٹخنی بھی نہ لگائی اور لحاف میں منہ ڈال کر لیٹ گیا۔ وہ بستر ایسا نرم گرم اور خوشبوؤں میں لبا تھا کہ مجھے جلدی ہی نیند آگئی مجھے نہیں معلوم کہ اس وقت رات کتنی گزر چکی تھی اور چاند کن منزلوں میں تھا۔ میں اس وقت ایک بہت ہی خوبصورت سا سپنا دیکھ رہا تھا۔

چھلا چھلا زلفیں تھیں کہ مجھے چاروں طرف سے اپنی آغوش میں بھینچ رہی تھیں۔ ایک سارے جہان کی سُندرتا سمیٹے خوشبوؤں میں ڈوبا ہوا گلاب کے پھولوں ایسا بدن تھا جو میری باہوں میں سمٹا چلا آرہا تھا— یہ خواب میں پہلے بھی بہت دفعہ دیکھ چکا تھا۔ ایک ہی چہرہ تھا جو سالہا سال سے میرے خوابوں میں آکر مجھے پریشان کیا کرتا تھا۔ اس رات بھی وہ چہرہ مجھے اپنے اوپر جھکتا نظر آرہا تھا۔ میرا وہ حسین خواب مجھے اپنی رسیلی منزلوں میں... لے چلا تھا کہ اچانک میرے رخساروں پر تپش کا احساس گہرا ہو گیا۔ میرے رخسار پہلے بھی ان ہونٹوں کی زد میں آتے تھے پہلے بھی میری سینکڑوں راتیں اُن چھلا چھلا سی خوبصورت گھنگھرالی زلفوں سے کھیلتے گزری تھیں مگر ایسی تپش مجھے کبھی محسوس نہ ہوئی تھی۔ اس خواب کو بھی میں نے کبھی کوئی اہمیت نہ دی تھی کیونکہ میں سوچتا تھا کہ ایسے خواب، ایسے میٹھے رسیلے خواب تو ہر وہ جوان دیکھتا ہے جس کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہوتی ہے۔ ہر کسی نے کوئی نہ کوئی چہرہ تراش رکھا ہے جس کی وہ سوتے میں جاگتے میں پرستش کرتا رہتا ہے۔ ایسا سہارا نہ بھی ملتا ہو تو آدمی ڈھونڈ ہی لیتا ہے۔ جاگتے میں نہیں تو سوتے میں۔ حقیقی زندگی میں نہیں تو خوابوں اور خیالوں کی دنیا میں ایک نہ ایک بُت آدمی کو اپنے من مندر میں بٹھانا ہی پڑتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے اپنے ایسے خوابوں کو پراگندہ طبعی سے زیادہ کبھی کوئی وقعت نہ دی تھی مگر اس روز اپنے رخساروں پر میں نے اپنے اس بُت کافر کے ہونٹوں کی آگ ایسی تپش محسوس کی تو میری نیند کا شیشہ کرچی کرچی ہو گیا۔

میں نے بہت آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ اس ڈر سے کہ اگر میں نے ایک دم آنکھوں کے دیدبان کھول دیئے تو یہ سپنا جو میری آنکھوں پر سجا تھا چھن سے ٹوٹ جائے گا۔ مگر جب میں نے اپنی بصارت کی چادر پھیلائی تو مجھے محسوس ہوا جیسے میں مخبوط الحواس ہو چکا ہوں۔

وہ کوئی خواب نہیں تھا۔ ایک جیتی جاگتی چمکتی چہکتی حقیقت میرے

سامنے کھڑی تھی۔ وہ کوئی لڑکی تھی۔ اس کا میں سراپا بیان کردوں تو معلوم ہوگا میں وارث شاہ کی ہیر کا ذکر کرتا ہوں۔ سسّی کے حسن کا پرتو دکھا رہا ہوں، سوہنی کو گھڑے پہ تیرتا دیکھ رہا ہوں۔ مگر نہیں، وہ ان سب سے کہیں زیادہ حسین تھی۔ اور اس کے چہرے کی چاندنی اور بدن کے نازک خطوط کے راز میں میں کسی اور کو شریک نہیں کروں گا۔ وہ.... وہ.... دراصل وہی تھی جسے میں نے خواب میں سینکڑوں بار دیکھا تھا۔ وہ میرے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی یوں جیسے کلی چٹکنے کے عمل سے گزر رہی ہو۔

وہ سیاہ ساٹن میں ملبوس تھی۔ ولایتی سکرٹ اتنی گھٹنوں تک لمبی قمیص زیب تن کئے تھی اسی رنگ کا دوپٹہ اس کے سر پہ تھا مگر اس طرح کہ اس دوپٹے میں اس کی زلفوں کو سمیٹ لینے کی سکت ہرگز نہ تھی اسی رنگ کی وہ شلوار پہنے تھی۔ وہ مجھ پہ جھکی ہوئی تھی۔ میری آنکھیں کھلی دیکھ کر وہ نہ تو گھبرائی نہ شرمائی نہ لجائی نہ سمٹی۔ بس تن کر کھڑی ہو گئی۔ مگر اسے دیکھ کر خوش ہونے اور اس کی راہ میں بچھ جانے کے بجائے مجھے ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔ میں اٹھ بیٹھا اور لحاف الگ رکھ کر بولا "آپ.... آپ کون ہیں؟ یہاں کیا کر رہی ہیں؟"

"میرا نام مسند ہے، مسند آرا" یہ کہہ کر وہ پلنگ پر بیٹھ گئی۔ میرے قریب میری شہ رگ کے قریب اپنے وجود کی تمام تر آگ اس نے میرے بدن سے مس کر دی۔ میں سر سے پاؤں تک دہک اٹھا مگر اس کے باوجود وہ ٹھنڈا پسینہ برابر میرے مساموں سے بہتا رہا۔

"آپ.... آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟ کیوں آئی ہیں آپ یہاں؟"

"میں.... میں آپ کو جانتی ہوں۔ میں نے آپ کو پہچان لیا ہے"

"مگر میں نے آپ کو کبھی نہیں دیکھا" میں نے جھوٹ بولا۔ حالانکہ وہ ہو بہو وہی تھی جسے میں بارہا خوابوں میں دیکھ چکا تھا۔ وہی ہونٹ، وہی آنکھیں وہی پیشانی وہی رخسار وہی گھنگھرالی زلفیں وہی تل وہی چاہِ زنخن! میں بھلا اسے کیسے بھول سکتا تھا۔ میں بھی اسے پہچان گیا تھا، مگر میری حیرت بے تحاشہ تھی۔

میری بات سن کر وہ زیادہ کھل کر مسکرائی اور بڑی بے تکلفی سے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولی "آپ نے مجھے کبھی نہیں دیکھا۔ میں مسند ہوں مسند آرا۔ میں کئی بار آپ کو اپنا نام بتا چکی ہوں آپ کو یاد کیوں نہیں رہتا؟"

"کیا کہتی ہیں آپ؟ میں تو آپ سے پہلے کبھی نہیں ملا" میرے چہرے پر پھیلی حیرت کو دیکھ کر وہ ہنسی تو مجھے یوں لگا جیسے سارے کمرے میں رَل تَرَل ہو رہی ہے۔ ایسا ترنم تھا اس کی ہنسی میں کہ میں سمجھا میں پاگل ہو جاؤں گا پھر بھی میں نے اپنے طوفانی جذبوں کے آگے بند باندھتے ہوئے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"آپ یقین کریں میں نے آپ کو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا" حیرت مجھے یہ تھی کہ وہ چہرہ جو میں نے بارہا خواب میں دیکھا تھا، مگر جسے میں نے کبھی کوئی اہمیت نہ دی تھی حقیقت کا روپ اختیار کر چکا تھا۔

"جھوٹ! بالکل جھوٹ! آپ ہر روز مجھے خواب میں ملتے رہے ہیں۔ ہو بہو وہی ہیں آپ۔ میں بھلا آپ کو کیسے بھول سکتی ہوں؟"

"خواب میں! کمال کرتی ہیں آپ؟ خواب میں تو آدمی وہ کچھ دیکھتا ہے جو اس نے جاگتے میں دیکھا ہو۔ میں تو کبھی آپ کے سامنے نہیں آیا"

"مجھے معلوم ہے! اجازت ہو تو لحاف میں بیٹھ جاؤں"

"مگر دیکھیں! یہ آہو صاحب کا ہی گھر ہے نا؟"

"جی ہاں! آپ کو شک ہے کوئی۔ آپ کا خیال ہے آپ کا پلنگ سوتے میں پریاں اٹھا کر لے گئی ہیں" بلا کی شوخی تھی اس کے لہجے میں۔

"اگر یہ آہو صاحب کا گھر ہے تو یقیناً آپ ان کی عزت ہیں۔ ان کے ناموس کی پاسدار ہیں۔ آپ کو اس وقت یہاں نہیں آنا چاہئے تھا"

"میں سروری بیگم کی بہن ہوں"

"مگر کبری نے تو مجھے نہیں بتایا کہ آپ بھی یہاں ہیں"

"میں گھر کے افراد میں شامل نہیں ہوں۔ پرسوں رات میں یہاں پر آئی تھی"

"اچھا اچھا! تو آپ آہو صاحب کی سالی ہیں؟"

"جی ہاں مگر آدھی گھر والی نہیں۔ آپ سے میں کچھ پوچھنے آئی ہوں" وہ زبردستی میرے لحاف میں گھستی ہوئی بولی۔

"سردی زیادہ ہے نا! آپ بھی لحاف اوڑھ لیں"

"جی نہیں شکریہ! آپ اپنا سوال پوچھیں"

"میں یہ پوچھتی ہوں جناب کہ آپ کوئی جادوگر تو نہیں ہیں؟"

"کیا مطلب؟ یعنی میں آپ کو کوئی ایسا ٹونے ٹوٹکے والا آدمی نظر آتا ہوں"

"مجھے تو یہی محسوس ہوتا ہے۔ آپ اسے جھوٹ سمجھیں گے، مگر ٹھہریئے میں قرآن شریف لاتی ہوں" یہ کہہ کر وہ اٹھی اور دائیں ہاتھ کی الماری میں رکھا خوبصورت جزدان میں لپٹا کلام پاک اٹھا لائی۔

"اس پر تو آپ کا یقین ہوگا؟"

"کیوں نہیں! یہ دو جہانوں سے افضل کتاب ہے، مگر آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟" میں سخت گھبرا گیا تھا اور میرا سارا بدن ٹھنڈا ہوا جا رہا تھا۔

"میرے سر پر یہ خدا کا کلام ہے میں اسے گواہ بنا کر کہتی ہوں کہ میں پچھلے کئی سال سے ایک ہی صورت کو خواب میں دیکھتی چلی آ رہی ہوں اور وہ صورت آپ کی تھی جسے آج میں نے حقیقت کے روپ میں دیکھا ہے۔ میری عمر اکیس سال ہے اور پچھلے پانچ سال سے میں عذاب میں مبتلا رہی ہوں کہ بارہا میں نے آپ کو خواب میں دیکھا ہے

آپ کو یقین آیا"

"قرآن شریف ادھر رکھ دیں۔ آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ مجھے آپ پر اعتبار ہے مگر اس سے میں کیا مطلب اخذ کروں؟" اس نے قرآن مجید الماری پر رکھا اور میرے پاس آ کر پلنگ کی پائینتی بیٹھ گئی۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے ابھر آئے تھے۔ قرآن کی قسم نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔

"میں نے آج صبح آپ کو صحن میں سے گزرتے دیکھا تو دنگ رہ گئی۔ سارا دن میں ادھر روشندان پر ٹنگی رہی میرا جی چاہتا تھا میں آپ کو دیکھتی رہوں" اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور اپنے دل کی بات سے جو بے ساختہ اس کی زبان پر آ رہی تھی وہ پریشان ہو گئی تھی۔

مجھے پہلی بار اپنے سرد رویّے پر ندامت محسوس ہوئی۔ میں اس کی طرف جھکا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

"یہ عجیب اور حیرت انگیز اتفاق ہے مسند! کہ میں بھی پچھلے بہت عرصے سے ایک ہی خواب دیکھتا آ رہا ہوں اور میرے ہر خواب کا عنوان آپ جیسی ہی ایک لڑکی رہی ہے۔ میں نے بھی آپ کو شاید پہچان لیا ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ میں ابھی تک خواب میں ہوں" اس نے میری یہ بات سنی تو پٹ پٹا کر اپنی آنکھیں —— پوری طرح کھول دیں اس کے ہونٹوں پر ایسی رسیلی مسکراہٹ ابھر آئی کہ میں نے چاہا میں اسے دل میں اتار لوں مگر میں یہ سوچ کر لرز اٹھا کہ وہ میری نہیں ہے۔ میرا اس پر کوئی حق نہیں ہے۔ اگرچہ وہ میرے کمرے میں درآنہ گھس آئی تھی۔ جذبے کی شدّت نے اسے مغلوب کر رکھا تھا مگر میں جو ایک قوی تر مرد ہوں اپنی قوّت ارادی سے اگر اپنے منہ زور جذبوں کو لگام نہ دے سکا تو مجھ سے زیادہ مُورکھ اور کوئی نہ ہوگا کہ روح کا وصال ہی بہت کافی ہے، جسموں کا اتصال آگ کو اور ہوا دے گا اور مجھے جو اب تک اپنے ضبطِ نفس پر بے پناہ فخر ہے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا۔

میں پیچھے ہٹا اور پلنگ سے اتر کر صوفے پر جا بیٹھا۔ وہ چپ تھی اور حیرت زدہ تھی کہ اتنی للکارتی ہوئی خلوت میں بھی میرا ہاتھ اس کی طرف کیوں نہیں بڑھتا۔ وہ ٹکٹکی باندھ کر میری طرف دیکھ رہی تھی میرے ذہن میں برپا شورش شاید اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ وہ لہرا کر اٹھی اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی میرے سامنے آ کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

بولی "میں ادھر کالج میں پڑھتی ہوں تھرڈ ایئر میں۔ ہوسٹل میں رہتی ہوں۔ آپ کو دیکھ کر میں نے سارے حجاب ختم کر ڈالے۔ مجھے ڈر ہے میرے بارے میں آپ کوئی بہت ہی غلط رائے قائم کریں گے۔ حالانکہ حقیقت وہ نہیں ہے جو آپ سمجھ رہے ہیں۔ مجھے پختہ یقین ہے کہ ہمیں خدا نے یہاں ملا دیا ہے اور مجھے اس نے آپ کے صرف اور صرف آپ کے لئے پیدا کیا ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو میں ایک اَن دیکھی صورت کو خواب میں کیونکر دیکھ سکتی تھی۔ میں بازاروں میں گلیوں میں، ہجوم میں، تنہائی میں، ریل میں بس میں، سڑک پہ، گھر میں ہر جگہ آپ کو تلاش کرتی رہی مگر آپ کی صورت کہیں نظر نہ آئی۔ آ ہی نہ سکتی تھی۔ میں سمجھتی تھی یہ میری دیوانگی ہے۔ اس صورت کو خدا نے پیدا ہی نہیں کیا وہ عدم سے اٹھ کر رات کو میرے سامنے آ جاتی ہے مگر آج جب میں نے آپ کو دیکھا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ آپ اس کمرے میں آئے تو میں سروری باجی کے گلے لگ کر بے تحاشا رونے لگی اتنا روئی، اتنا روئی کہ آنسوؤں سے میں نے اپنا دوپٹہ بھگو دیا۔ باجی حیران رہ گئیں۔ بہت پوچھا انہوں نے کہ میں کیوں روتی ہوں؟ کیا نظر آیا ہے مجھے؟ مگر میں انہیں کچھ بھی نہ بتا سکی۔ بتاتی بھی تو کیا بتاتی؟ اپنے دل کا غبار اتار کر میں ساتھ والے کمرے میں آ بیٹھی اور سارے دروازے بند کر کے اپنا منہ سر چادر میں لپیٹ کر میں اس روشندان کی راہ سے آپ کو دیکھنے لگی۔ سارا دن دیکھتی رہی میری تسلی ہی نہ ہوتی تھی۔ اب جو رات گہری ہو چلی ہے تو مجھے یہ ہمت خدا نے ویسے ہی دی کہ میں حجاب کے سارے بند توڑ کر آپ کے پاس آ پہنچی۔ آپ میری اس آمد سے جو چاہیں مطلب اخذ کر لیں۔ مگر خدا جانتا ہے آپ کو قریب سے دیکھنے کی آرزو میں میں مری جاتی تھی"

"میں سب کچھ سمجھ رہا ہوں مسند! میری بات کا بھی آپ یقین کریں آپ بھی شاید میرے لئے اجنبی نہیں ہیں۔ میں بھی سالہا سال سے آپ کو جانتا ہوں مگر یہ بھید میں نہیں سمجھ سکا کہ یہ ہوا کیسے؟ کیوں خدا نے ہمارا ملاپ اَن جانے حالات میں ایک دوسرے سے اتنی بار کرا دیا ہے کہ آپ کو جیتی جاگتی حالت میں دیکھ کر میں لرز اٹھا تھا"

"میں خود حیران ہوں۔ کبری سے میں نے آپ کے بارے میں بہت کچھ پوچھا مگر وہ کچھ بتاتا ہی نہیں تھا۔ اس نے صرف یہی کہا کہ آپ کا نام غلام جیلانی ہے اور آپ آہو صاحب کے مہمان ہیں اور بس۔ اس کے سوا اس نے کچھ بھی نہیں بتایا"

"اس وقت تو میری یہی شناخت کافی ہے مسند! اور کچھ جاننے کی آپ کو کیا ضرورت ہے؟"

"آپ کب تک یہاں رہیں گے؟"

"پتہ نہیں۔ ہو سکتا ہے میں کل ہی چلا جاؤں"

"مگر.... مگر.... میں.... میں پھر کیا کروں گی؟"

"کیا مطلب؟"

"مطلب بھی بتانا پڑے گا مجھے" وہ مسکرائی مگر اس کی مسکراہٹ میں خجالت نمایاں تھی۔

"نہیں مسند آرا جی! یوں نہیں۔ آپ اپنے مقام پر ہی سجتی ہیں میں سیلانی آدمی ہوں۔ میرا نہ کوئی ماضی ہے نہ مستقبل کسی کو بھی مجھ لوگوں کے تعاقب سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ میرے بارے میں کیوں فکرمند ہوتی ہیں آپ" ہم یوں باتیں کر رہے تھے جیسے صدیوں سے ہم ایک دوسرے سے آشنا ہیں۔ نہ اسے کوئی حجاب محسوس ہوا مجھ سے نہ مجھے اس سے

ہماری رُوح کے تار مکمل طور پر ہم آہنگ تھے اور اس رات پہلی بار مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ انسان اپنے خاکی وجود سے ماوراء بھی ایک شخصیت کا حامل ہے جو نہ سانس کی مرہونِ منت ہے نہ دھوپ چھاؤں کی متقاضی جسے نہ موسموں کے تغیّر و تبدّل سے کوئی فرق پڑتا ہے نہ چاند سورج کی گردش سے۔ اور اس رات مجھے محسوس ہوا کہ آدمی کی رُوح کا بھی ایک ماضی ہوتا ہے، ایسا ماضی جس کے آئینے اگر کثافت بشری دھندلا نہ دے تو وہ مستقبل پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ اگر یوں نہ ہوتا تو ہم دونوں خوابوں میں اپنے تمام تر مادی وجود کے مرئی خدوخال سمیت ایک دوسرے سے کیونکر مل سکتے تھے۔ میں نہیں کہتا کہ ہم دونوں تناسخ کے اور آواگون کے چکّر میں پھنسے تھے اور بار بار زندگی کی طرف دھکیل دیئے گئے تھے میں ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے ایسی بات کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا مگر مسند آرا سے مل کر مجھے یہ احساس ہوا کہ دُور کہیں افق پر... لوحِ محفوظ لکھی رکھی ہے وہیں پر کوئی صُورت گر بیٹھا ہے۔ وہ آدمی کی تقدیر کے تیر بھی ڈھالتا ہے اور اس کے لئے تدبیر کی کمانیں بھی تیار کرتا ہے اور وہیں سے ایک طے شدہ منصوبے کے مطابق زندگی کی راہیں متعیّن کی جاتی ہیں جن سے کوئی رتّی بھر تجاوز نہیں کر سکتا۔ انسان بلاشبہ تقدیر کا زندانی ہے اور مجھے صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ میری اور مسند آرا کی قسمت میں کیا لکھا ہے میرے نوشتۂ تقدیر کو ابھی آہستہ آہستہ میرے سامنے کھُلنا تھا مگر اس کمرے کی خوابناک تنہائی، وہ مسند آرا کا حسنِ بے مثال، وہ اس کی انتہا کو پہنچی ہوئی خود سپردگی میرے لئے ایسی آزمائش بن گئی تھیں یہ سب چیزیں کہ مجھے اپنا دم گھٹتا محسوس ہوتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ وہاں سے اٹھ کر اسی لمحے باہر چلی جائے۔ مجھے اس کی موجودگی دہشت زدہ کر رہی تھی۔ میں نسائیت کے بلند و بالا پُراسرار صنم خانے کی رعنائیوں سے ابھی تک ناآشنا تھا میرے وجود میں دوڑتا پھرتا لہو کسی کو پکارتا ضرور تھا اور وہ مسند ہی تھی جس کی آرزو میں میرے بدن کی سرحدوں پر شورش برپا رہتی تھی مگر اسے پالینے یا اسے پاکر اپنی روح میں سمو لینے کی ابھی مجھ میں ہمت نہیں تھی کہ میں ان لوگوں میں سے تھا جو اپنی راہ پر احتیاط کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ اس احتیاط کو میں نے ہر قیمت پر زندگی کے کٹھن ترین لمحوں میں بھی برقرار رکھا تھا۔ اس شیشے کو میں مسند کے سامنے اس لمحے یوں ٹوٹتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

میرے تیور دیکھ کر مسند گھبرا گئی بولی ”میں آپ کو پریشان نہیں دیکھ سکتی ہوں میں جا رہی ہوں یہ میرا پتہ ہے کالج کا۔ میں زندگی کے آخری سانس تک آپ کا انتظار کروں گی۔ بس آپ صرف میری اتنی بات یاد رکھیں۔ خدا حافظ“ یہ کہہ کر اس نے میرے سامنے تپائی پر اپنے ہاتھ کا لکھا ایک کاغذ رکھا اور تیزی سے مغربی دیوار کے دروازے میں غائب ہوگئی۔

اس کے جاتے ہی کمرے کی بے کراں تنہائی نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ میری نیند کے سارے ساغر ایک ایک کر کے ٹوٹ چکے تھے، میں صوفے پر بیٹھا سگریٹ پھونکتا رہا اور سوچتا رہا کہ یہ کیا ہو گیا ہے۔ کیوں میری تقدیر نے میرے خواب کو حقیقت کا رُوپ دے دیا ہے خواب تو بہت فرحت انگیز تھا۔ اس کی لذّت ایسی تھی کہ میں کئی کئی دن سرشار رہتا تھا مگر حقیقت اس سے کہیں زیادہ حسین ہونے کے باوجود کیوں اتنی اذیّت ناک ثابت ہوئی ہے۔ مجھے اپنے اس سوال کا جواب چاہئے تھا مگر وہ نہیں ملتا تھا، مل ہی نہ سکتا تھا کیونکہ وہ جواب مرئی صورت میں مسند کا روپ اختیار کر چکا تھا اور مسند آرا وہ تھی جس پر میرا کوئی حق کسی بھی طور ثابت نہ ہو سکتا تھا۔ صبح کی اذان فضا میں بلند ہوئی تو میں نے اس سوال کو ذہن سے جھٹک ڈالا یہ سوچ کر کہ اگر کبھی زندگی نے مہلت دی تو میں مسند کو اس کے دیئے ہوئے پتے پر ضرور ملوں گا۔ وہ میری منتظر ہوئی تو میں اسے باہوں میں سمیٹ لوں گا اگر کہیں آگے نکل گئی تو دل پر صبر کی سِل رکھ لوں گا کہ میں وہ آدمی ہوں جس کی گردن پر کئی آدمیوں کا خون ہے میں پھانسی کی کوٹھری سے بھاگا ہوا بدنصیب آدمی بھلا مسند ایسی بالا بلند ہستی سا دتری سے کیسے مل سکتا ہوں۔ کیونکر میں اس کا اہل ہو سکتا ہوں۔ اس کے بارے میں تو مجھے سوچنا ہی نہیں چاہئے کیا ہوا جو ہم سالہا سال تک خوابوں میں ملتے رہے ہیں ایسے تو بہت سے لوگ ہیں جو خوابوں میں چاند ہاتھوں میں لئے پھرتے ہیں مگر چاند کس کو ملتا ہے۔ جب آنکھ کھلتی ہے تو آدمی کفِ افسوس ہی ملتا رہ جاتا ہے۔

ابھی میری آنکھوں کے کشکول نیند کی خیرات کے لئے کھُلے ہی تھے کہ ایک بار پھر مجھے دروازہ بڑی آہستگی سے کھُلتا نظر آیا۔ میرا رُخ اُدھر طرف تھا۔ اسی دروازے میں وہ روشنی کے جھماکے کی طرح غائب ہوئی تھی اب جو میں نے دیکھا تو وہ پھر تیزی سے میری طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ ننگے پاؤں چل رہی تھی۔ اور اس کے ہاتھ میں لپٹے ہوئے بڑے کاغذ تھے۔ وہ آئی اور میرے سامنے ہی کرسی پہ بیٹھ گئی، بولی۔

• مجھے خیال ہی نہیں آیا۔ آپ کو میں ایک عجیب و غریب تماشہ دکھاتی ہوں پھر آپ کو یقین آئے گا کہ میری بات میں کتنی سچائی ہے“

”تم کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤ مسند! یہ بڑی نازک بات ہے تم پرائے گھر میں بیٹھی ہو۔ یہ تمہاری بہن کی عزّت کا سوال ہے“

”آپ کے لئے تو میں سارے جہان سے ٹکرا سکتی ہوں جناب! مجھے کیا سمجھا ہے آپ نے! یہ دیکھیں اور اچھی طرح غور سے دیکھیں۔ میں نے پہلے پہل آپ کو جس رنگ میں دیکھا وہ اس تصویر سے ظاہر ہے۔ یہ دیکھیں“ اس نے ایک کاغذ کھول کر میرے سامنے رکھ دیا۔

میں تو ششدر رہ گیا۔ وہ میری ہی تصویر تھی۔ اس دَور کی تصویر جب میں دفتر میں کام کرتا تھا اور ایک صاف ستھری، سیدھی سادی زندگی گزارتا تھا۔ میرے چہرے پہ ڈاڑھی مونچھ بالکل نہیں تھی۔ اس نے میری ایک تصویر بنائی تھی کہ میری اصلی صورت اور اس تصویر میں سرِ مو تفاوت نہیں تھا۔ حد یہ تھی کہ جس دَور میں اس نے وہ تصویر بنائی تھی، میرے اس دَور کے کوٹ اور ٹائی کا رنگ تک اس تصویر میں صاف نظر آتا تھا۔۔۔۔

”یہ تصویر تم نے کس طرح بنالی مسند! تمہاری آنکھ کیمرہ بن گئی ہے اتنے قریب سے دیکھتی رہی ہو تم مجھے“

”جی جناب! آپ سمجھتے تھے میں مذاق کر رہی ہوں۔ آپ نے کئی سال سے میری جان عذاب میں ڈال رکھی ہے اور حال آپ کا یہ ہے کہ آپ کے مزاج ہی ٹھکانے پر نہیں ہیں“ وہ بولی پھر ایک اور تصویر کھولتے ہوئے بولی۔

”یہ دیکھیں! مگر ٹھہریں پہلے آپ مجھے یہ بتائیں کہ آپ جیل میں بھی رہے ہیں کبھی؟ آپ کے دشمنوں پر مقدمہ بھی چلا تھا۔ دیکھیں جھُوٹ نہ بولیں۔ میں نے آپ کو ہر حال میں دیکھا ہے اور آپ کے ہر دَور کو میں نے تصویروں میں منتقل کیا ہے“ اس کی نظریں، وہ دور بین نظریں میرے سینے کے آر پار ہوئی جاتی تھیں۔ میں اتنا یارا نہیں پاتا تھا کہ اس کی ٹٹولتی ہوئی، بولتی ہوئی، آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتا مجھے یُوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں اس کے سامنے بے لباس ہوتا جا رہا ہوں اور میری حیا کے تار و پود بھی بکھرتے جا رہے ہیں۔ اس حیا کے جو اخفا کا دوسرا نام ہے جو آدمی کو اس کے خول میں محفوظ رکھتی ہے۔ اس لڑکی نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ وہ مسلسل مجھے گھُورے جا رہی تھی اور میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ میں خود کو اس سے کیونکر چھپالوں، اپنے مکروہ ماضی کو کیسے ڈھانپوں کہ وہ جان نہ سکے کہ میں کیا تھا؟ کیا ہو گیا؟ اور میرا اگلا قدم کس سمت میں اٹھے گا۔ میری بے بسی دیدنی تھی۔ مجھے خاموش پا کر وہ بولی۔

”آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟“

”پہلے تم یہ تصویر تو کھولو“ میں نے ہمت کر کے کہا۔ میرا خیال ہے میرا رنگ زرد ہو رہا تھا اور وہ بھانپ چکی تھی کہ مجھ پر کیا بیت رہی ہے، بولی۔

”آپ گھبراتے کیوں ہیں؟ آپ جو کچھ بھی ہیں میرے لئے ہر لحاظ سے قابلِ پرستش ہیں۔ یہ دیکھیں! میں نے آپ کو اس حال میں بھی دیکھا ہے“ یہ کہہ کر اس نے دوسری تصویر میرے سامنے رکھ دی۔ حیرت کے مارے میری پتلیاں پھیلنے لگیں۔ ایک انتہائی شوخ مسکراہٹ اس کے لبوں پر ناچ رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو ”کہئے کیسی رہی؟“

میں اس تصویر میں قیدیوں کے لباس میں کھڑا تھا۔ بالکل اسی حالت میں تھا جس حالت میں مجھے کبری نے کچے قیدی کی حیثیت سے بیرک میں دیکھا تھا۔ جیل کا پورا پس منظر تصویر میں اجاگر تھا مگر کسی اور قیدی کا وجود وہاں نظر نہیں آتا تھا۔ میں تنہا کھڑا تھا۔ میری ڈاڑھی اور مُونچھیں بڑھی ہوئی تھیں، سر کے بال اُلجھے ہوئے تھے اور میرے جسم پر قیدیوں کا مخصوص لباس میرا مذاق اڑا رہا تھا۔

”میں نے آپ کو بہت دنوں تک اس حال میں دیکھا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ میں نے آپ کو بہت زیادہ پریشان دیکھا۔ خواب میں آپ میرے سامنے آتے تھے مگر یوں جیسے زندگی سے مایوس ہو چکے ہیں۔ بہت دنوں تک میں نے آپ کو یوں زندگی سے بے تعلق اور مایوس پایا۔ تو میں نے آپ کی یہ تصویر بنا دی“

”تم..... تم..... بہت بڑی مصوّر ہو مسند! اگر میں کہوں کہ تم ولی ہو، خدا کی برگزیدہ ہستی ہو تو مبالغہ نہ ہوگا“ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں اس کے سامنے سمٹ کر بے حقیقت، بے وقعت اکائی میں بدل گیا ہوں۔ میں آہستہ آہستہ صفر ہوتا جا رہا تھا اس کی بیکراں شخصیت کے سامنے جو وقت اور فاصلے کی ساری حدیں پھلانگ کر خواب کی حالت میں مجھے میرے ہر دَور میں دیکھ سکتی تھی حالانکہ اس رات میں اُس قیدی سے بالکل مختلف آدمی تھا۔ ایک صاف ستھرے لباس میں ملبوس صاف ستھرے ماحول میں بیٹھا معزز آدمی نظر آتا تھا میں ــــ مگر پھر بھی وہ مجھ تک آپہنچی تھی میرے سارے مکروہ ماضی کو مٹھی میں بند کر کے وہ میرے سامنے لے آئی تھی۔ وہ اس لمحے مجھے کوئی مافوق الفطرت ہستی نظر آئی۔ ایسی ہستی جس کی پرستش کے لئے ایک طغیان کا سا جذبہ آپ ہی آپ دل میں اُمڈتا چلا آتا ہے۔

وہ کرسی سے اٹھ کر میرے پہلو میں آ بیٹھی۔ اب ایک اور تصویر اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ اس نے میرے کندھے پر سر رکھ کر اتنی محبت، اتنی خود سپردگی اور وارفتگی کے عالم میں کھولی کہ میرا سارا وجود جھنجھنا اٹھا۔

تیسری تصویر میں اس نے مجھے اس حال میں دیکھا تھا کہ میں پابرہنہ بھاگ رہا تھا بہت سے لوگ میرے ارد گرد تھے۔ وہ سب کے سب قیدیوں کے لباس میں تھے اور ان پر چند لوگ جو وردیوں میں ملبوس تھے اندھا دھند گولیاں برسا رہے تھے۔ میں اس تصویر میں سڑک کے کنارے دوسروں سے الگ ہوتا نظر آ رہا تھا میرے ہاتھ میں بندوق تھی مگر چہرے پر ایسی دہشت تھی کہ بایدوشاید۔

”جس رات میں نے آپ کو اس حال میں دیکھا میں بہت روئی تھی، جیلانی صاحب! کئی دن تک روتی رہی۔ مجھے کسی پہلو چین نہیں آتا تھا۔ میں نے اس حال میں آپ کو تین بار دیکھا تو پھر ایک دن صبح اٹھ کر میں نے وہ تمام کیفیت اس تصویر میں منتقل کر دی“

”تم نے کمال کر دیا ہے مسند! مجھے نہیں معلوم تھا اس دنیا میں ایک ایسی ہستی بھی موجود ہے جو ہر وقت میرے ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہے

۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے سارے جہاں کی شیرینی میرے وجود میں سرایت کر گئی ہے وہ بند جو میں نے اپنی فطرت کے آگے بڑی مشکل سے باندھ رکھا تھا ٹوٹنے لگا اور ہم بھول ہی گئے کہ ہم کون ہیں اور ہمارے درمیان کوئی حدِ فاصل بھی ہے۔

عین ممکن تھا کہ میں فطرت کے تقاضوں کے سامنے سپر ڈال کر

ایک قدم اور آگے بڑھ جاتا کہ اچانک کمرے کا دروازہ تیزی سے کھلا۔ میری حیرت سرپٹخنے لگی۔ سامنے ایک عورت کھڑی تھی جس کی صورت ہوبہو مسند سے ملتی جلتی تھی۔ اس کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں ہمیں اس حال میں دیکھ کر اس کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا۔

"مسند!" وہ آواز کو دبا کر بڑے تحکم آمیز لہجے میں چیخی۔

ہم دونوں تڑپ کر الگ ہوگئے۔ مسند نے تینوں تصویریں فوراً سنبھال کر لپیٹ لیں اور کھڑی ہوگئی — پورے قد سے تن کر کھڑی ہوگئی۔ بڑے اطمینان سے بولی: "یہ میری بہن سروری خانم ہیں۔" اس کے لہجے کے اعتماد نے مجھے سرشار کر دیا۔

"میں تمہارے اس تعارف پر لعنت بھیجتی ہوں۔ کم بخت ذلیل لڑکی۔ کمینی!" یہ کہہ کر وہ تیزی سے آگے بڑھی اور زناٹے سے اس نے ایک طمانچہ مسند کے منہ پر مار دیا وہ تیورا کر پیچھے ہٹی تو میں نے فوراً اسے اور پیچھے ہٹا کر اپنی اوٹ میں لے لیا۔ سروری خانم ایک دم میری طرف بڑھی اور تیز لہجے میں بولی۔

"آپ کو شرم آنی چاہئے۔ آپ کو اپنے میزبان کی عزت سے کھیلنے سے پہلے ڈوب مرنا چاہئے تھا۔"

"مجھے افسوس ہے خانم مگر..... مگر یہ ہماری پہلی ملاقات نہیں ہے۔"

"کیا؟ کیا مطلب؟ تم پہلے بھی ملتے رہے ہو؟ اُف میرے اللہ! اس بے حیا نے ہمیں پہلے ہی برباد کر رکھا تھا، اُف میرے خدا! یہ کیا سن رہی ہوں میں؟" وہ پریشان ہو کر صوفے پر ڈھے سی گئی۔

"آپ ٹھیک سن رہی ہیں مگر ہماری ملاقاتیں خوابوں تک ہی محدود تھیں۔ یہ پہلا موقع ہے کہ ہم نے ایک دوسرے کو روبرو دیکھا ہے۔" میں بھی اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

"خوابوں میں؟ کوئی جنوں پریوں کی کہانی سنا رہے ہو مجھے؟ بے وقوف سمجھتے ہو مجھے! میں ابھی آہو صاحب کو بلاتی ہوں۔ میں یہ بے عزتی برداشت نہیں کر سکتی۔" وہ بڑے غصے سے اٹھی اور پھنکارتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی۔

"بات بگڑ جائے گی خانم! یہ میرا گھر نہیں آپ کا گھر ہے۔ میں مسند کے کمرے میں نہیں ہوں بلکہ مسند میرے کمرے میں ہے — میں خود نہیں گیا بلکہ یہ خود میرے پاس آئی ہیں۔ آپ نے مجھے ان کی باہوں میں دیکھا ہے یہ میری باہوں میں نہیں تھیں۔ پھر بھی آپ مجھے قصوروار ٹھہرائیں گی...؟"

وہ رک گئی اور ایڑی پر گھوم کر میری طرف قہر آلود نظروں سے دیکھنے لگی —

"بات بڑھی تو اس میں آپ ہی کی عزت کا جنازہ اٹھے گا۔ میں تو مہمان ہوں ابھی اٹھ کر چلا جاؤں گا اور بس — مجھے آہو صاحب گولی تو نہیں مار دیں گے ٹھیک ہے نا۔ اس لئے خانم! ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟"

"یہ سب کچھ میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ آخر یہ لڑکی یہاں کر آئی؟ اسے جرأت کیسے ہوئی؟"

"میں نے کہا ہے نا کہ ہم ایک دوسرے کو سالہا سال سے خوابوں میں ملتے رہے ہیں۔ میں تو پاکستان میں موجود ہی نہیں تھا پانچ سال سے میں بھارت کی ایک جیل میں قید تھا جاسوسی کے الزام اس عرصے میں مسند نے مجھے اور میں نے مسند کو بارہا خواب میں ثبوت میں میں یہ تصویریں دکھا سکتا ہوں۔ یہ سب مسند نے بنائی یہ کہہ کر میں نے تینوں تصویریں اس کے سامنے کر دیں۔ وہ حیرت ہو کر ان کو دیکھنے لگی۔ پھر اچانک سر پکڑ کر بیٹھ گئی صوفے کے پر۔ مسند بڑے دھیمے انداز میں چلتی ہوئی اس کے پاس جا بیٹھی جمے ہوئے لہجے میں بولی۔

"باجی یہ وہی ہیں جن کا میں آپ سے ذکر کرتی رہی ہوں تو میں نے آپ کے سامنے بنائی تھی۔ اس وقت آپ کی شادی ہوئی تھی، میں نے کہا تھا نا آپ سے کہ آج میں نے اسے قید کر لیا میں دیکھا ہے یاد ہے نا آپ کو؟"

سروری بیگم کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا حیرت کے مارے آنکھیں پھٹی جاتی تھیں۔ وہ دوپٹے کے پلو کو انگلی پر لپیٹتی جا رہی کبھی وہ مجھے دیکھتی تھی کبھی اُن تصویروں کو۔ اس کے چہرے پر تھا کہ میں سمجھا اگر وہ اس کیفیت سے عہدہ برآ نہ ہو سکی تو پاگل گی اور پھر جب اس کی ذہنی اذیت حد سے بڑھ گئی تھی تو وہ ٹپ ٹپ آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپکنے لگے اور اس کے تر ہونے لگے۔

"آپ کیوں روتی ہیں باجی! میں نے — کوئی گناہ تو ہے اس آدمی کو میں نے بالآخر ڈھونڈ نکالا ہے جس نے حرام کر رکھی تھیں۔ آپ کو تو خوش ہونا چاہئے۔"

"تم..... تم کیا چاہتی ہو اب؟ ابّو کو جانتی ہو خاک میں مل جائے گی۔"

"میں جانتی ہوں وہ بہت بڑے آدمی ہیں۔ چوہدری علاقے کے، تین سو مربع زمین کے مالک ہیں، دو بیٹیوں کے ہیں، بیٹے کو ترس رہے ہیں، آہو صاحب ان کے بیٹے نہ بن ہی نہیں سکتے مگر یہ تو ان کے بیٹے کی جگہ لے سکتے ہیں۔"

"کیا مطلب؟ کیا بکنا چاہتی ہو تم؟"

"میں..... میں ان سے شادی کر رہی ہوں باجی! کے اپنے حالات ٹھیک ہو گئے، میں ان سے شادی کر لوں گی"

"میرے حالات..... میرے حالات کے بارے میں

تم؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ مسند مجھے ولی نظر آتی تھی، دلوں کے حال جان لیتی تھی۔

"پتہ نہیں کیا بات ہے؟ میرا دل کہتا ہے کہ ابھی کچھ عرصے تک ہم ایک دوسرے سے نہ مل سکیں گے جیلانی صاحب! لیکن یہ دَور جلدی ختم ہو جائے گا۔"

"اپنی یہ بکواس بند کرو اور چلو۔ اپنے کمرے میں چلو۔ پتہ نہیں یہ کون ہیں کیا ہیں؟ اور تم چلی ہو انہیں اپنا شوہر بنانے، چلو—" یہ کہہ کر سروری خانم مسند کو گھسیٹ کر کمرے سے باہر لے گئی۔ تینوں تصویریں مسند کے ہاتھ میں جھول رہی تھیں۔

میرا گرد و پیش ایک بار پھر سناٹوں سے لبریز ہونے لگا۔ میں نے سگریٹ سلگایا اور صوفے میں دھنس کر بیٹھ گیا — مسند اور سروری کی صورتیں میری آنکھوں میں منجمد ہو گئی تھیں۔ وہ حیرت انگیز حد تک ایک دوسرے سے مشابہ تھیں۔ فرق صرف یہ تھا کہ سروری فربہی کی طرف مائل تھی جبکہ مسند آرا اچھوتی کلی کی طرح سبک..... اور سبک رفتار تھی مگر میں پھر یہاں چپ رہوں گا۔ اس کے سراپا کو میں کسی کے سامنے بے نقاب نہیں کرنا چاہتا۔ صرف اتنا کہوں گا کہ اس کو دیکھ لینے کے بعد میں کہیں کا نہ رہا تھا۔ میں ساری رات اس کے تصور سے کھیلتا رہا، اس امید پر جاگتا رہا کہ شاید وہ کسی وقت پھر ادھر آ دھمکے مگر — وہ نہیں آئی۔ میں سمجھ گیا کہ سروری خانم نے اپنی قوتِ جبروت سے اس کو تالوں میں بند کر کے بے بس کر دیا ہو گا۔

صبح جب میری آنکھ کھلی تو نو بج چکے تھے اور کبری کمرے میں ادھر اُدھر ناچتا پھر رہا تھا۔ جھاڑن اس کے ہاتھ میں تھی مجھے بیدار دیکھ کر وہ مسکراتا ہوا میری طرف بڑھا اور بولا "اوستاد! وہ..... وہ..... یہ کیسا چکر لو پھیر لیا ہے تم نے؟ وہ..... ادھر سروری خانم کی بہن ہیں نا مسند آرا، انہوں نے تمہارے کے لئے یہ پھولوں کا گلدستہ بھیجا ہے۔ یہ دیکھو! کمال کر دیا ہے تم نے۔ وہ تو تمہارا کلمہ پڑھ رہی ہیں۔"

"ابے گھامڑ! گھاس تو نہیں کھا گیا۔ میرا اس سے کیا واسطہ؟" میں نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

"مگر وہ تو صبح صبح میرے کمرے میں آگئی تھیں، بولیں جا کبری! یہ گلدستہ وہاں رکھ آ۔ انہوں نے خود جا کر لان میں سے یہ پھول چنے تھے صاحب جی!"

"آہو صاحب نے میری تعریف کر دی ہو گی اس کے سامنے۔ بات کا بتنگڑ نہ بنا۔ یہ بتا آہو صاحب کہاں ہیں؟"

"وہ تو باہر چلے گئے ہیں — کہہ گئے تھے کہ وہ تمہارے کسی کام سے جا رہے ہیں۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ تو ذرا گرم پانی اُدھر رکھ دے ہم نہا لیں گے پھر ذرا تگڑا سا ناشتہ لے آ۔" یہ کہتا ہوا میں غسل خانے میں جا گھسا۔

کبری نے گرم پانی غسل خانے میں پہنچایا تو میں نہانے بیٹھ گیا۔ ایک مدت کے بعد مجھے اپنا گرد و پیش حسین نظر آیا تھا۔ اس روز میں بڑی تفصیل سے نہایا۔ جب میں باہر نکلا تو میرا بدن ہوا کی طرح ہلکا پھلکا ہو چکا تھا اور میرے دل و دماغ پر انبساط کی سی کیفیت طاری تھی کہ میں چاہتا تھا میں سارے گھر میں ناچتا پھروں۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ اس گھر کے آنگن میں ایک ایسی ہستی موجود تھی جس کے آسمان پر میں سورج کی طرح چمک رہا تھا، جس نے میری اَن دیکھے میں پوجا کی تھی۔ وہ ہستی ایسی تھی کہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر میری یاد میں سلگتی رہتی تھی اس نے مجھے پھر سے جینے کا حوصلہ بخش دیا تھا۔ اب مجھے دھوپ میں زندگی کی رمق نظر آتی تھی اور مجھے یقین ہو چلا تھا کہ اب اندھیرے مجھے کبھی خوفزدہ نہ کر سکیں گے کہ مسند میرے لئے ہر وقت دست بہ دعا رہتی ہے۔ میری سلامتی کے لئے خدا سے ضد کرتی رہتی ہے۔ میں اپنی خوش نصیبی پہ نازاں تھا بے حد نازاں۔

کبری نے مجھے ناشتے کی میز پہ بٹھایا تو میں نے دیکھا کہ اس میں اس روز خاص اہتمام کیا گیا تھا اور کسی نے میری پسندیدہ چیز فرنی سے لبالب پیالہ میرے لئے بھیج دیا تھا جس پر پستے کی تہہ جمی تھی۔ میں تو خوش ہو گیا۔ سب سے پہلے میں نے اسی پہ ہاتھ صاف کیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ پیالہ میرے لئے مسند نے بھیجا ہے۔ وہ میری پسند ناپسند کو بھی سمجھتی تھی۔ فرنی مجھے ایک مدت کے بعد اس روز نظر آئی تھی۔ قید کی زندگی میں تو اس کا تصور بھی نہ کیا جا سکتا تھا۔ زینو کے گھر میں میں اتنے دن رہا مگر اس نے بھی کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ میں کیا چاہتا ہوں؟ کیا چیز مجھے مرغوب ہے اور کیا نہیں۔

ناشتے کی میز سے اٹھ کر میں نے کبری سے کہا کہ وہ میرا ایک کام کرے۔ وہ اس موڈ میں تھا کہ میرے کسی کام آ سکے، بولا "حکم کرو اوستاد! کہو تو کسی کا سر کاٹ کر حاضر کر دوں۔" وہ اس روز مجھ سے بہت خوش تھا اور وجہ میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔
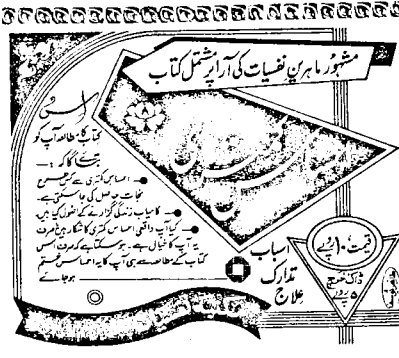
"تو کیا کسی کا سر کاٹنے گا کبری! میں یہ پتہ لکھ کر دے رہا ہوں وہاں جا کر معلوم کرو کہ ڈاکٹر دھمن اور اس کی بیوی عالیہ اُدھر موجود ہیں کہ نہیں۔ تمہیں خود جانا ہوگا۔ کوئی پوچھے کہ ان سے تجھے کیا کام ہے؟ تو کہنا کہ ایک مریض کے لئے ان سے تمہیں مشورہ کرنا ہے۔" اس نے کاغذ میرے ہاتھ سے لیا اور پتہ پڑھ کر بولا "ٹھیک ہے میں ابھی جاتا ہوں کوئی کام ہو تو باٹی کو بلا لینا۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا مگر ابھی وہ زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ صحن سے الٹے قدموں میرے کمرے میں لوٹ آیا اور دبی زبان سے بولا۔

"اوستاد.... وہ مسند آرا بیگم ہیں نا وہ اُدھر کھڑی ہیں دروازے کے پیچھے۔ وہ آنا چاہتی ہیں یہ چٹخنی میں کھول دیتا ہوں؟"

"یہ کس نے بند کی تھی؟"

"میں نے صبح بے خیالی میں بند کر دی تھی۔ میں معافی چاہتا ہوں۔"

وہ سالا اس روز بالکل بدلا ہوا نظر آتا تھا۔

"ٹھیک ہے جاؤ اب! پنجرہ خالی کرو۔" میں نے بدمزہ ہو کر کہا وہ میری کیفیت سمجھتا تھا مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔

اسے کمرے سے غائب ہوئے ابھی پانچ منٹ گزرے تھے کہ پہلو کا دروازہ بے آواز کھلا۔ سامنے مسند آرا کھڑی تھی۔ خوبصورت صبح ایسی نئی امیدوں کی نوید دیتی ہوئی۔ اس کا چہرہ شبنم سے دھلے پھول ایسا پاکیزہ نظر آتا تھا۔ وہ آئی تو مجھے محسوس ہوا کمرہ جگمگا اٹھا ہے۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ مجھے دھیمے لہجے میں سلام کر کے بولی۔

"میں جا رہی ہوں۔ باجی مجھ سے سخت ناراض ہیں۔ حالانکہ انہوں نے خود آہو صاحب سے عشق لڑا کر شادی کی ہے۔ ان کی محبت میں انہوں نے آہو صاحب کی عمر کا خیال کئے بغیر ان کی بیوی بننا منظور کر لیا مگر مجھے وہ ذرا سی بھی رعایت نہیں دیتی ہیں۔"

"یہ تو ہوتا ہی ہے۔ بڑے چھوٹوں کو رگیدتے آئے ہیں۔ اب کہاں جاؤ گی تم؟"

"میں کالج جا رہی ہوں، ہوسٹل میں رہوں گی میرا پتہ آپ کے پاس موجود ہے۔ فون نمبر بھی میں نے لکھ دیا ہے۔ جیسے ہی فرصت ملے آپ مجھ سے ملیں میرے پاس آنے سے پہلے آپ مجھے فون کر دیں۔"

"ٹھیک ہے مسند! میں ضرور آؤں گا۔ اگر جلدی نہ آسکا تو مایوس نہ ہو جانا۔ میں تمہیں کبھی نہ بھول سکوں گا تم میرا مقسوم ہو میری تقدیر ہو۔" یہ کہہ کر میں نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا تو اس نے میرا ہاتھ چوم لیا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہونے لگیں سسکتی ہوئی بولی "میری یہ تصویر رکھ لیں اور اسے کبھی خود سے جدا نہ کریں کیونکہ اگر آپ بھی مجھے بھول گئے تو پھر اس دنیا میں میرے لئے باقی کیا بچے گا؟ میں آپ کا زندگی کے آخری سانس تک انتظار کروں گی۔" یہ کہہ کر وہ میرے ہاتھوں کو فرطِ جذبات سے نم آلود لبوں سے پاگلوں کی طرح چومتی اور آنکھوں سے لگاتی ہوئی پیچھے ہٹی اور تیزی سے ایڑی پر گھوم کر واپس چلی گئی دروازہ اس کے وجود سے لبالب بھرا اور پھر خالی ہو گیا ـــــ اس کی تصویر میرے سامنے تھی اور اس کی بھیگی ہوئی پلکیں میرے تصور میں جم کر رہ گئی تھیں۔ اسے سر دری خانم نے پریشان کر دیا تھا۔ میں نے اس کی وہ چہرہ سی تصویر بڑی احتیاط سے کاغذ میں لپیٹ کر جیب میں رکھ لی، لیکن جیسے کوئی انمول ہیرے کو سارے جہان سے چھپا کر رکھتا ہے۔ بلا شبہ وہ میرے لئے زبردست اہمیت اختیار کر گئی تھی۔

کبری کوئی تین گھنٹے بعد واپس آیا تو بولا۔

"اوستاد! وہ ڈاکٹر دھمن تو یہاں نہیں ہے شفا بار کلینک پتہ کیا تھا میں نے۔ اس کے ملازموں نے بتایا ہے کہ وہ آج کل کوئٹہ گیا ہوا ہے اپنی بیوی عالیہ کے ساتھ۔ ان کا تو یہ خیال ہے کہ وہ شاید چھ ماہ تک وہاں رہے گا۔"

"مجھے یہی خدشہ تھا کہ وہ بدبخت یہاں نہ ہوگا۔" میں نے اپنے غصے کو دباتے ہوئے کہا۔

"ان سے کیا کام ہے تمہیں! کوئی اور ڈاکٹر دیکھ لو۔"

"نہیں! میرا علاج صرف اسی کے پاس ہے کبری! خیر وہ آئے تو سہی۔ میں پھر نپٹ لوں گا۔"

"نپٹ لوں گا؟ کیا کوئی گڑبڑ کی ہے اس نے تمہارے ساتھ"

"ہاں! کچھ ایسی ہی بات ہے مگر خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ یہ بتاؤ کہ وہ مسند آرا چلی گئی ہیں کہ ابھی یہیں ہیں؟"

"مجھے باٹی نے بتایا ہے کہ وہ دونوں باہر گئی ہوئی ہیں۔"

"اور وہ آہو صاحب؟ وہ واپس آئے ہیں یا نہیں؟"

"وہ بھی ابھی تک واپس نہیں آئے ہیں۔ میرا خیال ہے آتے ہی ہوں گے۔ اتنے میں تم کھانا کھا لو، دو بج رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے تم کھانا لے آؤ۔" میں نے ہتھیار ڈالتے ہوئے وہ دو گھڑی کی انبساط جو مجھے مسند آرا نے بہم پہنچائی تھی آہستہ آہستہ ہوتی جا رہی تھی اور ایک بار پھر میرے لئے گرد و پیش تاریک اور ہوتا جا رہا تھا۔

ابھی میں کھانے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ آہو صاحب واپس وہ جب میرے کمرے میں داخل ہوئے تو ان کے چہرے پر ایسی سنجیدگی تھی جیسے وہ جنازے کو کندھا دے کر لوٹے ہیں۔

"آئیے آئیے آہو صاحب کہئے کیا خبر لائے ہیں؟ آسیہ آپ کو؟"

وہ میرے پاس ہی صوفے پر بیٹھ گئے۔ بولے "ہاں آسیہ ہے۔ میں اس سے مل تو نہیں سکا البتہ دور سے ضرور دیکھ سکا ہوں صحت بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔"

میں ٹکٹکی باندھے انہیں دیکھ رہا تھا۔ میری محویت کو سمجھتے ہو

"وہ چودہ سال کے لئے وہاں بند کی گئی ہے میرا خیال ہے زیادہ سے زیادہ دس سال وہاں کاٹے گی اور پھر رہا ہو جائے گی۔"

"یہ تو مجھے بھی معلوم ہے آہو صاحب! آپ اس کی رہائی کی کوئی صورت بتائیے میں اتنا عرصہ اسے قید میں دیکھنا اپنی موت تصور کرتا ہوں۔"

"زیادہ بے صبر نہ بنیں جیلانی صاحب! آپ کے لئے میں دور دور تک ہو آیا ہوں۔ آسیہ رہا ہو سکتی ہے بڑی خاموشی سے اس کا نام جیل کی فہرست سے خارج کیا جا سکتا ہے۔"

"وہ کس طرح؟"

"جس شخص نے اس کی رہائی کی یہ تدبیر بتائی ہے وہ گورنر کا دستِ راست ہے اور اس نے ایک شرط رکھی ہے۔"

"میں وہ شرط پوری کرنے کو تیار ہوں۔ میں ہر قیمت پر آسیہ کی رہائی چاہتا ہوں ـــ"

"یہ کوئی ایسی ناممکن بات نہیں ہے۔"

"تو پھر بتائیں اسے رہائی کس طرح مل سکتی ہے؟"

"وہ یوں کہ اعلیٰ افسروں سے مل کر جیل کے ڈاکٹر اور سپرنٹنڈنٹ سے یہ بات لکھوائی جا سکتی ہے کہ آسیہ مر گئی ہے۔ اسے قیدیوں کی فہرست میں مردہ ظاہر کر کے چپ چاپ جیل سے باہر نکالا جا سکتا ہے۔"

"ہاں یہ تو بہت اچھی تدبیر ہے آہو صاحب! اس کے لئے میں بڑی سے بڑی قیمت دے سکتا ہوں۔"

"مثلاً؟" آہو صاحب نے بھویں سکیڑ کر میری طرف دیکھا۔

"مثلاً کیا؟ میں..... میں ایک لاکھ دو لاکھ بلکہ تین لاکھ روپیہ دے سکتا ہوں۔ منہ مانگی رقم میں اس کام کے لئے دے سکتا ہوں۔"

"اتنا روپیہ ہے آپ کے پاس؟" وہ حیرت زدہ رہ گئے۔

"جی ہاں! میں اس بہن کی آزادی کے لئے ناممکن کو ممکن بنا سکتا ہوں۔" میں نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

"مگر اتنی رقم آپ کہاں سے لیں گے؟"

"یہ بات آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ ایک ہاتھ سے وہ آسیہ بہن کو میرے حوالے کر دیں اور دوسرے ہاتھ سے وہ مجھ سے رقم لے لیں۔"

"مجھے حیرت ہے، حالانکہ آپ کے حالات سے میں جو کچھ اخذ کر سکا ہوں وہ یہ ہے کہ آپ اس وقت بالکل قلاش اور مفلس ہیں۔"

"نہیں یہ بات نہیں ہے۔ ذاتی طور پر میں واقعی مفلس ہوں مگر آسیہ کے لئے اللہ نے مجھے بے حساب دولت دے رکھی ہے۔ وہ سب کچھ آسیہ کا ہے ـــ"

آہو صاحب مسکرائے۔ ان کے چہرے پر پھیلی حیرت اور بدن پر چھایا تشنج کسی حد تک کم ہو گیا۔ وہ سمجھے میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ انہوں نے میری ان باتوں کو مجذوب کی بڑ سمجھا۔ سگریٹ کو بڑے اطمینان سے سلگا کر بولے "جیلانی صاحب! آپ اچھے آدمی ہیں، اپنی بہن کے لئے آپ کا جذبہ میرے لئے بے حد حیران کن اور قابلِ قدر ہے۔ ہو سکتا ہے اس کے لئے آپ بڑی سے بڑی رقم کا بندوبست بھی کر سکیں مگر ہر کام دولت سے نہیں لیا جا سکتا۔"

"تو پھر کیا مجھے کوئی اور راہ پکڑنی ہوگی؟"

"ہاں! دو مہینے بعد انتخابات ہو رہے ہیں۔ بڑے صاحب گجرات سے اسمبلی کی نشست کے لئے امیدوار ہوں گے مگر ان کا مدِ مقابل... چوہدری ہادی علی ان سے کہیں زیادہ طاقت ور ثابت ہو رہا ہے اگر بڑے صاحب انتخابات میں ہار گئے تو نہ ان کے پاس عہدہ رہے گا اور نہ عزت۔"

"اس بات کا آسیہ کی رہائی سے کیا تعلق ہے آہو صاحب! آپ نے مجھے حیران کر دیا ہے۔"

"حیران نہ ہوں بلکہ میری بات غور سے سنیں۔ چوہدری ہادی علی اپنے علاقے کا بہت بارسوخ آدمی تو ہے مگر وہ ایسا غنڈہ صفت آدمی ہے کہ اس کا اسمبلی کی ممبری کے لئے کھڑا ہونا کسی طرح بھی عام لوگوں کے مفاد میں نہ ہوگا۔"

"پھر؟ یہ تو بڑی آسان بات ہے اسے انتخاب لڑنے ہی نہ دیا جائے۔ یہ تو بڑے صاحب کے دائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔"

"نہیں! یہ ان کے بس کی بات نہیں ہے۔ ہادی علی دوسری پارٹی کے ٹکٹ پر کھڑا ہو رہا ہے۔"

"اچھا پھر؟ ہمیں اس سے کیا لینا ہے اس کی جو مرضی میں آئے وہ کرتا پھرے۔ ہمارا تو مسئلہ ہی جدا ہے۔"

"جدا نہیں ہے۔ بڑے صاحب کے مشیر سے میں مل کر آ رہا ہوں۔ اگر آپ ان کے کہنے کے مطابق عمل کریں تو آپ کو دُہرا فائدہ ہوگا۔ آپ کو بھی زندوں کی فہرست سے نکال کر مُردہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ کسی پولیس مقابلے میں مرے ہوئے کسی اور آدمی کی لاش کو آپ کی لاش ثابت کر کے یہ مشہور کر دیا جائے گا کہ غلام جیلانی پولیس سے مقابلے میں مارا گیا ہے وہ غلام جیلانی جو پھانسی کی کوٹھڑی سے بھاگ نکلا تھا اور جس کی گرفتاری پر حکومت نے پچاس ہزار روپے کا انعام مقرر کر رکھا ہے۔" آہو صاحب نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہایت ہی پُرسکون لہجے میں کہا۔ ان کی یہ بات سن کر میں تو سُن ہو کر رہ گیا۔ کتنی ہی دیر تک میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں تکتا رہا۔ ان کے لبوں پر طنز بھری مسکراہٹ جمی تھی اور وہ میرے سامنے صوفے میں دھنسے بڑے اطمینان سے سگریٹ کے گہرے گہرے کش لے رہے تھے۔

"تو.... تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ مجھے پہچان گئے ہیں؟"

"ہاں جیلانی صاحب میں چیزوں کو، چہروں کو، جگہوں کو سطحی نظر سے دیکھنے کا قائل نہیں ہوں میں جانتا تھا کہ وہ آدمی جس کا تعارف مجھ سے اسلم آپی کروا رہا ہے ـــ واقعی کوئی بہت ہی پُرکار قسم کا

آدمی ہوگا۔ اخبار میں بارہا آپ کی تصویر چھپ چکی ہے۔ داڑھی کے ساتھ بھی اور بغیر داڑھی کے بھی۔ پولیس کے پاس آپ کا مکمل ریکارڈ موجود ہے۔ میں نے آپ کو جلدی پہچان لیا تھا۔ اخبار کو تو آپ نہیں جھٹلا سکتے ہیں نہ آپ اپنے چہرے کے نقوش بدل سکتے ہیں۔ یہ بات کسی کے لئے بھی ممکن نہیں ہے خواہ وہ کتنا ہی بڑا بہروپیا کیوں نہ ہو۔"

"میں نے مان لیا کہ آپ مجھے پہچان گئے ہیں مگر آہو صاحب! آپ کیا چاہتے ہیں مجھ سے۔ میری بہن کو اگر آپ آزاد کروا دیں تو میں آج آپ کے وسیلے سے خود کو دوبارہ گرفتاری کے لئے پولیس کے سامنے پیش کر سکتا ہوں تاکہ آپ کو پچاس ہزار روپیہ مل جائے۔"

"ایسی اوچھی باتیں نہ مجھے پسند ہیں نہ آپ کو زیب دیتی ہیں۔ بہتر ہے آپ میرے بارے میں ایسے خیالات دل سے نکال دیں۔" وہ برافروختہ ہو کر بولے۔

"تو پھر میں آپ کی اس گفتگو سے کیا نتیجہ اخذ کروں جناب آہو صاحب! میں تو آپ کی زد میں ہوں آپ کے رحم و کرم پر ہوں۔"

"مجھے آپ سے کچھ نہیں لینا ہے جناب غلام جیلانی صاحب! مجھے معلوم ہے آپ کے پاس ـــــ اس وقت ایک لاکھ روپیہ موجود ہے مگر میں اس سے کوئی تعرض نہیں کرتا۔ مجھے کوئی لالچ نہیں ہے میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ جس طرح بھی ہو سکے آپ کا کام بن جائے آپ کو بھی آزادی مل جائے اور آپ کی بہن کو بھی۔"

"مگر وہ طریقہ بھی تو بتائیے جس سے یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ ابھی تک تو آپ کی اس پیچ دار گفتگو سے میں کچھ بھی اخذ نہیں کر سکا ہوں۔"

"بڑے صاحب آپ کی مدد کرنے کے لئے تیار ہیں۔ ان کے لئے یہ کام قطعاً بھی مشکل نہیں ہے مگر اس کے لئے وہ چاہتے ہیں کہ آپ بھی ان کے کام آئیں۔"

"میں ان کی کیا خدمت کر سکتا ہوں آہو صاحب! میں جیل سے بھاگا ہوا مجبور و بے بس آدمی۔"

"آپ کی یہی مجبوری اور گم نامی آپ کے کام آ سکتی ہے۔ آپ اتنا کریں کہ نہایت ہی غیر محسوس طریقے سے چوہدری ہادی علی کو قتل کر دیں۔"

میرا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ وہ مجھ سے میری اور میری بہن کی آزادی کی بہت بڑی قیمت طلب کر رہے تھے وہ... آہو صاحب، وہ رئیس شہر، وہ غنڈوں چوروں اور ڈاکوؤں اور گرہ کٹوں کے پشت پناہ جناب دل شیر آہو صاحب۔ وہ میری حیرت سے محظوظ ہوتے ہوئے اٹھے اور صوفے پر سنبھل کر بیٹھ گئے۔ بولے۔

"کیا خیال ہے یہ سودا مہنگا رہے گا آپ کو کہ سستا؟ آپ دونوں کی جان چھوٹ سکتی ہے اس عذاب سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔ نہ وہ اتنا طویل عرصہ جیل میں گزارے گی نہ آپ یوں دربدر پھرتے رہیں گے۔ آپ کی نئے سرے سے شناخت کرا دی جائے گی سرکاری کاغذوں میں۔ اور آسیہ کو کسی اچھے سے گھرانے میں بیاہ دیں گے ہم باعزت طریقے سے۔"

میں سوچ میں ڈوبا رہا گم صم بیٹھا ان کا منہ تکتا رہا۔ وہ کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولے۔

"بصورت دیگر مجھے مجبوراً آپ کو پولیس کے حوالے کرنا پڑے گا اور آپ کی بہن پر جیل میں نگرانی اور زیادہ سخت ہو جائے گی کیونکہ اب یہ راز آپ کے ہاتھ آ چکا ہے کہ صاحب کیا چاہتے ہیں؟"

میں پھر بھی چپ رہا۔

"مجھے آپ کا فوری اور قطعی جواب درکار ہے جیلانی صاحب! بات کا فیصلہ ابھی اور اسی وقت ہو جانا چاہئے کہ ہمارا آئندہ رویہ ایک دوسرے کے لئے کیا ہو گا۔ میں نہ آپ کا دشمن نہ دوست، میں تو محض گھڑی ایک وسیلہ ہوں آپ کے اور صاحب کے درمیان اور بس۔ اب آپ سوچ لیں کہ آپ کو کیا کرنا ہے۔ یہ سودا طے ہو سکتا ہے آپ کے سر کا بھی اور آپ کی عزت کا بھی۔ آپ کی بہن جیل میں قید ہونے اور اتنی ساری عورتوں کے درمیان رہنے کے باوجود بھی محفوظ نہیں ہے۔ اس پر بھی وہ لوگ بڑی آسانی سے ہاتھ ڈال سکتے ہیں جو آپ سے سودا طے کرنا چاہتے ہیں۔"

"انہوں نے اس کام کے لئے مجھے ہی کیوں منتخب کیا ہے؟" بڑی مریل سی آواز میں کہا۔ اپنا وہ لٹا پٹا لہجہ مجھے بالکل اجنبی محسوس ہو رہا تھا۔ آہو صاحب نے مجھے زبردست آزمائش میں ڈال دیا تھا۔

"آپ نے اچھا سوال پوچھا ہے میں بتاتا ہوں کہ اس کی وجہ کیا ہے؟ میں نے صاحب کے مشیر کے سامنے خود ہی آپ کا نام رکھا کیونکہ مجھے آپ سے دلی ہمدردی ہے آپ کی ذہنی کیفیت کو سمجھتے ہوئے میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ یا تو آپ کے سر سے یہ غم و اندوہ کا بار اتر جائے یا آپ کا سر اتر جائے۔ ان دو راستوں کے سوا اور کوئی راہ آپ کو راس نہیں آ سکتی ہے۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں آہو صاحب! میں تیار ہوں۔ میں ہادی کو ٹھکانے لگا دوں گا۔" میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ اب ساری بات میری سمجھ میں آ گئی تھی میرے لئے ان صاحب نے کوئی راستہ کھلا نہ چھوڑا تھا۔

"شاباش! مجھے آپ سے اسی جواب کی توقع تھی۔ جس دن آپ ہادی علی کو ٹھکانے لگا دیں گے اسی دن شام کو آپ آسیہ کو بھی پا لیں گے۔ یہ میرا آپ کا وعدہ رہا۔ اگر میں اپنا قول نبھا نہ سکا تو میرا سر آپ کے سامنے حاضر ہوگا۔"

"وہ تو میں جانتا ہوں کہ ایسی صورت میں مجھے کیا کرنا ہوگا مگر بہتر یہ ہوگا کہ آپ مجھے اس بات کی کوئی ٹھوس ضمانت... دیں کہ کام مکمل ہو جانے پر آپ میری بہن کو آزاد کروا کر میرے حوالے کر دیں گے۔"

"آپ جو ضمانت چاہیں میں آپ کو دینے کو تیار ہوں۔" وہ بڑے اعتماد سے بولے۔

میں سوچ میں ڈوب گیا۔ میں ان سے کس طرح کی ضمانت طلب کروں؟ یہ بہت ٹیڑھا اور کٹھن سوال تھا۔ مجھے کوئی ایسی رگ چاہئے تھی جسے میں جب بھی دباؤں آہو صاحب کو اپنا دم گھٹتا محسوس ہو اور وہ اس بات پر مجبور ہو جائیں کہ میری بہن کو آزاد کروانے کا وعدہ ہر حال میں پورا کریں۔ چند منٹ تک میں گہری سوچ میں ڈوبا رہا۔

"بتائیے نا آپ کس قسم کی ضمانت چاہتے ہیں۔ وہ میں آپ کو دینے کو تیار ہوں۔"

"دیکھیں! آہو صاحب میں آپ کا مہمان ہوں۔ آپ نے میزبانی کے سارے آداب بالائے طاق رکھ کر مجھ سے یہ خوفناک سودا طے کر لیا ہے اب میرے اور آپ کے درمیان مروت نام کی کوئی شے باقی نہیں رہی۔"

"بالکل ٹھیک! صورتحال ایسی ہی ہے۔ میں لگی لپٹی کا قائل نہیں ہوں۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے دروازے کی طرف لپکے اور دوسرے کمرے میں کھلنے والے اس دروازے کو کھول کر اچھی طرح دیکھنے بھالنے کے بعد واپس اپنی جگہ پر آ بیٹھے۔ ان کو یہ خدشہ تھا کہ کہیں کوئی ان کی باتیں نہ سن رہا ہو۔

"ہاں تو فرمائیے! میں آپ کو کس قسم کی ضمانت فراہم کروں؟"

"آپ مجھے اپنے ہاتھ سے ایک ایسی تحریر دے دیں جس سے یہ ثابت ہو کہ آپ نے مجھ سے آج پانچ لاکھ روپے قرض لئے ہیں اور یہ رقم آپ مجھے آج سے ٹھیک چھ ماہ بعد ایک لاکھ روپے منافع کے ساتھ... لوٹا دیں گے۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں یہ تحریر ابھی لکھ دیتا ہوں۔"

"اس کے علاوہ آپ مجھے یہ بھی تحریر لکھ دیں کہ اگر آپ نے میری بہن آسیہ کے سلسلے میں جو وعدہ کیا ہے پورا نہ کیا تو آپ کی بیوی مردی کو طلاق ہو جائے گی۔"

"ارے نہیں بھئی! ایسی کمینی حرکت مت کرو۔ اس سے میری عزت نفس مجروح ہوتی ہے یہ نہ ہو سکے گا۔"

"جی نہیں مجھے اصرار ہے اس بات پر۔ آپ کی عزت جب تک اس سلسلے میں خطرے سے دوچار نہ ہوگی، مجھے اطمینان نہ ہوگا۔ آپ کو ڈرنا نہیں چاہئے کیونکہ آپ تو اپنے وعدے پر کاربند رہیں گے۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ وہ ذرا دیر کے لئے غوطے میں گئے اور پھر جب وہ اوپر ابھرے تو بولے "ٹھیک ہے میں یہ بھی لکھ دوں گا۔ کوئی بات نہیں! مجھے یقین ہے کہ اس کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔"

"تو اٹھئے پھر بسم اللہ کیجئے اور اپنا پیڈ لے آئیے۔ یہ سب کچھ آپ کے پیڈ پر ہی تحریر ہوگا۔"

"ٹھیک ہے مجھے منظور ہے۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھے اور صحن میں نکل گئے۔ کچھ ہی دیر بعد جب وہ واپس آئے تو ان کے ہاتھ میں کاغذ قلم موجود تھا۔ انہوں نے نہایت صدق دلی سے مجھے دونوں تحریریں لکھ کر دے دیں اور ان پر اپنے دستخط ثبت کر دیئے۔ دونوں وعدے انہوں نے الگ الگ کاغذوں پر لکھے اور پھر بڑی فراخدلی سے وہ کاغذ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولے "لیں غلام جیلانی صاحب! ہم نے اپنی سارے جہان سے زیادہ چہیتی بیگم پر گالی چڑھا لی ہے۔ انشاءاللہ آپ ہمیں اپنے وعدوں میں پختہ پائیں گے۔"

"ٹھیک ہے آہو صاحب! اب میں بھی جم کر اطمینان سے کام کر سکوں گا۔ اب آپ مجھے اس آدمی کا حدود اربعہ بتائیں۔"

"اس کا حدود اربعہ مختصر ہے وہ کوٹ اکبر کا رہنے والا ہے۔ یہ گاؤں گجرات سے چالیس میل دور ہے کنجاہ سے آگے، وہاں ہادی علی کی زمین ہے اچھی تگڑی زمینداری ہے اس کی ـــــ اور مسلح باڈی گارڈ پال رکھے ہیں اس نے۔ اب یہ آپ کی ہمت ہے، رانائی ہے کہ آپ اس کام کو کس طرح سرانجام دیتے ہیں آپ کو ہر حال میں اپنی جان بچانی ہوگی اگر خدانخواستہ اس کام میں آپ پر کوئی آفت آئی تو آپ کو ہم ہر قیمت پر بچا لیں گے۔ آپ کو یہ کام اس طرح کرنا ہوگا کہ آپ کا..... اس سے یا اس کے محافظوں سے براہ راست ٹکراؤ نہ ہو کیونکہ اس عرصے میں آپ تنہا ہوں گے ظاہر یہ ہونا چاہئے کہ ہادی علی کو کسی ڈاکو نے دولت کے لالچ میں قتل کر دیا ہے اور یہ سارا معاملہ راز میں رہنا چاہئے کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو کہ میرے آپ کے درمیان کیا طے ہوا ہے۔"

"آپ بے فکر رہیں۔ میں بہت سوچ سمجھ کر قدم آگے بڑھاؤں گا۔"

"اس کام کے لئے آپ کو روپے پیسے کی زیادہ ضرورت نہ ہو گی پھر بھی یہ لاکھ روپیہ آپ کے پاس ہے۔ اس میں سے اسی ہزار آپ میرے پاس رکھ دیں یہ آپ کی امانت ہوگا۔ بیس ہزار آپ خرچ کے لئے رکھ لیں۔ آپ کو واپس آنے پر میں پورا ایک لاکھ روپیہ دے دوں گا۔"

"میرا تو خیال تھا کہ یہ روپیہ میں خورشید احمد کو لوٹا دوں گا۔"

"وہ بھی ہوتا رہے گا۔ پولیس نے اپنا کام شروع کر دیا ہے۔ آج کے اخبار میں بڑی سنسنی خیز خبریں چھپی ہیں اس ڈاکے کے متعلق۔ اگر اس وقت آپ ایسی احمقانہ حرکت کریں گے تو نقصان اٹھائیں گے۔ بہتر ہوگا اس روپے کو اپنے مصرف میں لائیں۔ وہ مر نہیں جائے گا۔ بڑی دولت ہے اس کے پاس......" ابھی وہ یہ بات کہہ ہی رہے تھے کہ معاً مجھے خیال آیا کہ جو کچھ میں نے آہو صاحب سے لکھوایا ہے اس کو اگر وہ تسلیم کریں، اس کے پابند رہیں تو میں ان سے انہی

تحریروں کی بنا پر آسیہ کی واپسی کا مطالبہ کر سکتا ہوں مگر کوئی ٹھوس بات تو پھر بھی نہ ہوئی میرے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ آسیہ اس جیل میں موجود بھی ہے کہ نہیں اور کسی کے دستِ راست نے آہو صاحب سے یہ سودا کیا بھی ہے کہ نہیں۔

"کیا سوچ رہے ہیں آپ؟"

"میں یہ سوچ رہا ہوں آہو صاحب! کہ اس بات کا آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ وہ آدمی جس کا آپ ذکر کرتے ہیں کام ہو جانے کی صورت میں ہماری مدد بھی کرے گا؟"

"اس بات کا ذمہ تو میں نے پہلے لے لیا ہے۔ اتنی بڑی رقم دینے کا میں نے آپ سے تحریری وعدہ کر لیا ہے اور کیا چاہتے ہیں آپ! ـ اس آدمی کو میں براہِ راست تو آپ سے نہیں ملوا سکتا۔"

آہو صاحب کی دلیل میں خاصا وزن تھا۔ صاف طور پر وہ اپنا پہلو بچا گئے تھے۔ اس کے باوجود میں نے امید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ مجھے دور کہیں دل کی گہرائیوں سے یہ صدا سنائی دیتی تھی کہ اگر کسی سے تمہیں آسیہ کے سلسلے میں کوئی مدد مل سکتی ہے تو وہ صرف آہو صاحب ہیں جو شہر کے رئیس ہیں جن کی سرکار دربار میں بڑی عزت ہے اور جن کی بات کو کبھی نہیں ٹال سکتا۔ کبری کی اور اسلم آبی اور پھر باہر گلی کے لوگوں کی باتیں سن کر میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا تھا۔ پھر بھی میں چاہتا تھا کہ آہو صاحب سے اس بارے میں کوئی ٹھوس بات ضرور کہلوا لوں۔

"کیا جیل کا سپرنٹنڈنٹ آپ کو جانتا ہے؟"

"نہیں بلکہ جیل خانہ جات کے انسپکٹر جنرل سے میری براہِ راست یاد اللہ ہے۔"

"آپ کے گھر میں ٹیلی فون ہے؟"

"ہاں ہے! اوپر کی منزل میں رکھا ہے سیٹ۔" آہو صاحب نے حیران ہو کر پوچھا۔

"کیا آپ آئی جی صاحب کی وساطت سے جیل کے سپرنٹنڈنٹ سے کہلوا سکتے ہیں کہ وہ براہِ راست فون پر آسیہ سے میری بات کرا دے مگر میرا نام آپ اسے نہیں بتائیں گے کسی کو بھی نہیں بتائیں گے۔"

آہو صاحب نے میری بات سنی تو سوچ میں ڈوب گئے۔ قدرے توقف کے بعد بولے: "ٹھیک ہے میں کوشش کرتا ہوں میرا خیال ہے یہ بات ناممکن نہیں ہے۔" یہ کہہ کر وہ اٹھے اور صحن میں نکل گئے۔

میں نے نیا سگریٹ سلگایا اور آسیہ کی یادوں میں کھو گیا۔ اطمینان مجھے یہ تھا کہ اگر آسیہ سے میری بات ٹیلی فون پر ہو گئی تو میں آہو صاحب کے اثر و رسوخ کا قائل ہو جاؤں گا اور جو کام وہ کہہ رہے ہیں اسے بلا چون و چرا سر انجام دے دوں گا بصورتِ دیگر میں اسی رات وہاں سے نکلوں گا اور پھر کبھی ان کی شکل نہ دیکھوں گا۔ مجھے یقین تھا کہ مجھ سے جو وہ اسی ہزار روپیہ لے کر اندر رکھ چکے ہیں تو وہ گویا مجھ سے اس بات کی نقد ضمانت لے چکے تھے کہ میں اس روپے کے لالچ میں ان کے پاس لوٹ کر ضرور آؤں گا۔ [illegible] نے بھی اپنے طور پر ان کو ایسی پہیلی بجھوائی تھی کہ اگر ان کی طرف سے [illegible] جواب نہ ملا تو میں ہمیشہ کے لئے ان پر لعنت بھیج کر وہاں سے نکل [illegible] یہ کوئی مشکل بات نہیں تھی۔ وہ اپنے لالچ میں مبتلا تھے۔ انہیں بیش بہا انعام کی امید تھی اس کام کے عوض جو وہ مجھ سے کروانا چاہتے تھے وہ انعام روپوں کی صورت میں بھی ہو سکتا تھا اور ایک جاگیر کی صورت میں بھی۔ ایسے دھندوں میں شہنشاہوں کے دور میں تو لوگ پشتوں تک کی اپنی قسمتیں سنوار لیتے تھے۔ مگر اس گئے گزرے دور میں بھی ایسے [illegible] اور سازشی لوگوں کے لئے انعام و اکرام کی گنجائش بڑی وافر تھی۔

اور جہاں تک میں آہو صاحب کے دھندے کو سمجھ سکا تھا وہ یہی تھا [illegible] وہ اب تک بڑے بڑے نامی گرامی مجرموں کے پشت پناہ بنے ہوئے [illegible] وہ کوئی واردات کر کے آتے تھے تو خود کو قانون کی گرفت سے بچانے کے لئے وہ سب سے پہلے آہو صاحب کے درِ دولت پر حاضر ہو کر اپنا [illegible] کرتے تھے اسلم آبی کی مثال میرے سامنے تھی ان کا گزارہ ہی اسی [illegible] پر چلتا تھا اسی کاروبار کی بدولت وہ شہر کے رئیسوں میں شمار ہوتے [illegible] حالانکہ کبری مجھے بتا چکا تھا کہ آہو صاحب کی کوئی اپنی زمین نہیں [illegible] نہ کوئی اتنی بڑی جائیداد تھی۔ کوئی کاروبار بھی ان کا سننے میں نہیں [illegible] تھا۔ میں اپنے طور پر اس شطرنج کی بازی کے سارے امکانات پر غور کر چکا تھا اور مجھے اطمینان تھا کہ آہو صاحب مجھے کسی غلط چکر میں نہیں [illegible] سکیں گے۔

کوئی آدھ گھنٹے بعد آہو صاحب میرے کمرے میں واپس آئے [illegible] بہت خوش تھے۔ ٹیلی فون ان کے ہاتھ میں تھا اور اس کے تار باہر [illegible] تک پھیلے ہوئے تھے۔

"لیں جناب جیلانی صاحب! آپ کا کام بن گیا ہے آئی جی [illegible] مجھے دفتر میں ہی مل گئے تھے۔ انہوں نے جیل کے سپرنٹنڈنٹ سے کہا [illegible] بات بن گئی۔ آپ ٹھیک دس منٹ بعد اپنی بہن سے بات کر سکیں گے جیل والے خود ہمیں اس نمبر پر فون کریں گے۔" یہ کہہ کر انہوں نے ٹیلی [illegible] میرے قریب ہی میز پر رکھ دیا اور بولے۔

"آپ کے اندیشے مٹے دُور دراز کو میں اچھی طرح سمجھتا ہوں [illegible] میرے بھائی! میں نے اس شہر میں بھاڑ نہیں جھونکا ہے۔ جائیداد [illegible] بنائی۔ دولت جمع نہیں کی صرف انسانوں کو اپنا دوست بنایا ہے [illegible] کی خدمت کر کے۔ اپنے خلوص سے اپنی محبت سے میں نے ان کے دل جیتے [illegible] ورنہ وہ میری پھوپی یا چاچی کے رشتے سے میرا لحاظ نہیں کرتے۔"

"میں سب سمجھتا ہوں آہو صاحب! اسی لئے تو میں آپ کی [illegible] میں حاضر ہوا تھا۔ داتا دربار پر لوگ یونہی حاضری نہیں دیتے [illegible] کوئی فیض حاصل ہوتا ہے تو جاتے ہیں۔ یہاں پر جو اسلم آبی جیسے [illegible] نیک بزرگ آتے ہیں تو یہ سب آپ کی عظمت کی دلیل ہے مجھے پوری [illegible] احساس ہے۔" میں نے بڑی تفصیل سے آہو صاحب کو اپنے نقطۂ نظر سے آگاہ کیا۔ وہ طنز بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے اور ہرگز میری بات پر مطمئن نظر نہیں آتے تھے۔ ان سے جو شرطیں میں نے لکھوالی تھیں اور انہیں اب جس اُلجھن سے دوچار کر دیا تھا آسیہ کے سلسلے میں تو وہ اس پر بہت زیادہ سٹپٹا گئے تھے مگر میں کرتا بھی تو کیا کرتا۔ میرے لئے تو کوئی راستہ کھلا نہیں تھا۔ میں یونہی اندھیرے کنوئیں میں آنکھیں بند کر کے تو چھلانگ نہ لگا سکتا تھا۔

میری بات کا انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ کسی گہری سوچ میں ڈوبے رہے۔ کبھی وہ مجھے دیکھتے کبھی ٹیلی فون سیٹ کو اور کبھی راکھ میں بدلتی سگریٹ کو۔ وہ سخت بے چین دکھائی دیتے تھے۔ اور میں اپنی جگہ پریشان تھا کہ اگر آسیہ سے آہو صاحب کے ذریعے بھی بات نہ ہو سکی تو پھر کیا ہو گا۔

ابھی پندرہ منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ آہو صاحب نے فون اٹھایا۔

"جی جی۔ میں آہو بول رہا ہوں دل شیر آہو۔ اچھا اچھا! آسیہ آگئی ہیں فون پر۔ بہتر جناب بہت بہت شکریہ۔" یہ کہہ کر انہوں نے ریسیور کے ایک حصے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"دیکھیں اب آپ آسیہ سے بات کریں گے۔ اسے آپ اپنا نام بتا دیں، بالکل نہ ڈریں کھل کر بات کر لیں۔" یہ کہہ کر وہ بولے۔

"ہیلو! کون؟ آسیہ بہن بول رہی ہیں؟"

"اچھا اچھا لیں آپ اپنے بھائی سے بات کریں میرا یہ خیال تھا کہ میرے بدن کا سارا خون کھنچ کر میرے سر میں پہنچ چکا تھا۔ میں نے ریسیور کان سے لگایا تو دوسری طرف سے مجھے اپنی ماں جائی بہن کی آواز سنائی دی اس کی آواز میں زندگی کی مہک تھی۔ کُن کا اِذن تھا۔ اس نے پوچھا۔

"کون بول رہا ہے؟"

"میں جیلانی ہوں غلام جیلانی۔ تم آسیہ ہو نا؟"

"ہاں ہاں میں آسیہ ہوں بھائی جان سلام علیکم۔"

"کیا حال ہیں میری بہن۔ میری اچھی بہن۔ یہ تم ہی ہو نا؟" میں نے اس کی آواز پہچان لی تھی۔

"ہاں ہاں! میں آسیہ ہی ہوں۔ آپ کہاں چلے گئے تھے بھائی جان! اس وقت کہاں ہیں آپ؟"

"میں یہاں ہی ہوں اسی شہر میں۔ ماں جی بالکل ٹھیک ہیں۔ اپنے ایک بھائی کے ہاں ہیں اُدھر فیصل آباد کے قریب، سمجھتی ہو نا؟"

"اچھا اچھا۔" وہ بولی۔ بڑی خوشی اور بے پناہ سرشاری تھی اس کے لہجے میں۔

"مجھے سارے حالات کا علم ہے آسیہ! مجھے پتہ ہے تمہیں کن لوگوں نے اس حال کو پہنچایا ہے مگر فکر نہ کرو میں سب کچھ ٹھیک کر لوں گا۔ میں تمہارے لئے اپیل بھی دائر کر دوں گا، بہت پیسے ہیں میرے پاس۔ تم جلدی رہا ہو جاؤ گی۔"

"اچھا؟ بہت روپیہ ہے آپ کے پاس؟ ڈھیروں ہے؟"

"ہاں ڈھیروں! اور دیکھو میں کل تمہیں تمہاری ضرورت کی چیزیں بھی بھجوا دوں گا۔ میں تمہارے لئے وہاں کسی آرام کی جگہ کا بھی بندوبست کروں گا گھبرانا نہیں میری بہن! حوصلے سے کام لینا تمہارا بھائی ابھی زندہ ہے۔"

"ہم دونوں ہی بدنصیب ہیں بھائی جان! پتہ نہیں آپ کس کس مصیبت سے گزر رہے ہیں۔"

"یہ تو ہوتا ہی ہے آسیہ۔ دیکھو بڑا اچھا ہوا تم سے بات ہو گئی۔ اب میں تمہیں جلدی ملوں گا سمجھو کوئی پندرہ بیس دن بعد۔"

اچانک آہو صاحب نے میرے کان کے قریب منہ لا کر کہا۔ "بات مختصر کریں جیلانی صاحب!"

"اچھا! اچھا آسیہ خدا حافظ! پھر ملیں گے۔"

"خدا حافظ بھائی جان! مجھے کچھ چیزیں ضرور بھیج دیں۔"

"ختم کرو اب یہ سلسلہ۔" کسی عورت نے آسیہ سے نہایت تحکمانہ لہجے میں کہا۔

اور پھر اس کے ہاتھ سے کسی نے ریسیور چھین کر کریڈل پر پٹخ دیا۔ میرا کلیجہ کٹ کر رہ گیا۔ وہ لوگ جیل میں میری بہن سے بہت ہی ہتک آمیز سلوک کر رہے تھے۔ میں خالی خالی نظروں سے ریسیور کو دیکھتا رہ گیا جو اب مُردہ ہو چکا تھا۔ ہاں البتہ اس کے سینے میں نزع کی کیفیت ایسی شائیں شائیں ٹھوں ٹھوں اب بھی باقی تھی ـــ میں نے اسے بڑی بزدلی سے کریڈل پر رکھ دیا۔

"کیوں جیلانی صاحب! اب تو اطمینان ہو گیا ہے نا آپ کو؟ کہ آہو کیا کچھ کر سکتا ہے؟"

"مجھے شرمندہ نہ کریں آہو صاحب! میں نے کبھی آپ کے کسی قول و فعل پر شک نہیں کیا ہے۔ آپ کو میں اپنا محسن سمجھتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے! آپ کو بہرحال میری طرف سے بالکل مطمئن ہو جانا چاہئے میں آپ کا دوست ہوں، مخلص اور بے لوث دوست۔ آپ میرے کام آئیں میں آپ کے کام آؤں گا۔"

"میں حاضر ہوں جناب ہر طرح سے حاضر ہوں۔ جیلانی کو آپ کبھی میدان سے منہ پھیرتے نہ دیکھیں گے۔"

"تو پھر کیا ارادے ہیں؟"

"ارادے بالکل نیک ہیں۔ میں آج ہی چل دیتا ہوں۔"

"تو پھر اپنا سامان تیار کر لیں اور شام کی گاڑی سے روانہ ہو جائیں آپ کے لئے رات کا سفر بہتر رہے گا کیونکہ آپ غائبانہ طور پر خاصے شہرت یافتہ آدمی ہیں۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں آہو صاحب! لیکن اگر آپ اجازت دیں تو میں کبری کو ساتھ لے جاؤں، مجھے سہولت رہے گی۔"

"جی نہیں! میں اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا یہ بات میرے اور آپ کے درمیان راز رہنی چاہئے آپ کی اور آسیہ کی رہائی کے علاوہ اس کام کے عوض آپ کو میں بہت بڑی رقم بھی دے دوں گا۔ یہ میرا وعدہ رہا۔"

"مجھے کسی رقم کی ضرورت نہیں ہے جناب ڈبل شیر آہو صاحب! مجھے تو صرف اپنی اور اپنی بہن کی آزادی درکار ہے۔"

"وہ آپ کو مل جائے گی بے فکر رہیں۔ کب روانہ ہوں گے آپ؟"

"میں بس آج ہی چل دیتا ہوں۔"

"بس ٹھیک رہے گا تیاری مکمل کر لیں اپنی چیزیں سنبھال لیں۔ آپ کو اسلحے کی صورت میں کیا کچھ چاہئے ہو گا؟"

"مجھے آپ ایک سائیلنسر والا پستول دے دیں اور ایک چھوٹی اسٹین گن۔"

"وہ میں آپ کو ابھی دے دیتا ہوں آپ بیٹھیں میں ابھی آتا ہوں اس کے لئے ایک اٹیچی کیس بھی میں آپ کو دے دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئے اور میں اپنی اِدھر اُدھر بکھری چیزیں سمیٹنے لگا۔ مجھے ایک نیا اور نہایت ہی پُر پیچ سفر درپیش تھا، ایسا سفر جس کے مرحلوں سے میں قطعاً ناآشنا تھا۔

شام کے سات بجے جب میں آہو صاحب کے گھر سے نکلا تو کبری اس وقت وہاں موجود نہیں تھا۔ اسے آہو صاحب نے جان بوجھ کر اِدھر اُدھر کر دیا تھا وہ نہیں چاہتے تھے کہ میں اس معاملے کی بھنک بھی اس کے کان میں ڈالوں۔ ان کی احتیاط پسندی نے مجھے حیران کر دیا تھا۔

میں ٹیکسی میں بیٹھ کر اسٹیشن کی طرف چل دیا۔ میرے پاس ایک بریف کیس تھا جس میں میری ضرورت کی چیزیں رکھی تھیں۔ بیس ہزار روپیہ میری جیب میں تھا۔ اسّی ہزار کی رقم میں آہو صاحب کے پاس چھوڑ آیا تھا اس کی بھی انہوں نے کمال دیانتداری سے مجھے رسید لکھ دی تھی جس میں یہ تحریر تھا کہ میری یہ رقم ان کے پاس امانت کے طور پر رکھی گئی ہے میرے اٹیچی کیس میں ایک جرمن ساختہ سٹین گن تھی، ہلکی پھلکی اور چھوٹی سی۔ اس کے لئے آہو صاحب نے دو سو گولیاں بھی مجھے دے دی تھیں اور ایک سائیلنسر لگا بلجیم کا پستول تھا چھ گولیوں والا۔ اس کے لئے بھی انہوں نے مجھے چھ درجن گولیاں دے دی تھیں۔

اور حلیہ میرا یہ تھا کہ میں اپنے لباس میں کوئی بہت ہی معزز آدمی نظر آتا تھا، کوٹ پتلون میں ملبوس۔ خوبصورت ٹائی میرے گلے میں تھی اور میرے سر پر فیلٹ ہیٹ تھی۔ اور میرا سارا لباس عمدہ قسم کی خوشبو سے معطر تھا۔ میرا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ آسیہ کی قید و بند کی سوچ تو کا تصور مجھے سارے جہان سے متنفر کئے دیتا تھا مگر اس کی آزادی کی جو قیمت میں ادا کرنے جا رہا تھا اس کا جواز کوئی کہاں سے لا سکتا تھا۔

مجھے یہ احساس برابر ڈس رہا تھا کہ مجھے آہو صاحب نے جس خوفناک کام پر مامور کیا ہے وہ ایسا ہے کہ اگر میں سر لا نہ سکا تو سر دے کر ہی آؤں گا۔ مجھے دو امکانات صاف صاف نظر آ رہے تھے۔ پھر بھی آسیہ کی محبت ایسی تھی کہ اس کے لئے مجھے سارے جہان سے بھی لڑنا پڑتا تو تنہا لڑ لیتا کہ دنیا کی ہر شے دوبارہ مل سکتی ہے مگر نہ گزرے ماں باپ کی واپسی ممکن ہے نہ آدمی کو دوبارہ اس کے بہن بھائی مل سکتے ہیں ــــ یہ ایسی نعمتیں ہیں جن کی قدر و قیمت کا مجھے بھرپور احساس تھا اور اسی وجہ سے میں نے اس سنگلاخ راستے پر قدم رکھ دیا تھا۔

گجرات کے لئے گاڑی آٹھ بجے چھوٹتی تھی اور میرے پاس اس وقت صرف بیس منٹ باقی تھے۔ میں ٹکٹ لینے کے لئے کھڑکی کی طرف بڑھا تو میں نے وہاں ایک آدمی کو عجیب سے فرصت کے انداز میں کھڑے دیکھا۔ وہ بڑی بے فکری سے کھڑکی کے ساتھ لگا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ میں نے ٹکٹ خریدنے کے لئے جیب سے روپے نکالے تو سو سو کے نوٹوں کی ایک پوری گڈی باہر نکل آئی۔ اس کے سوا کوئی چارہ کار ہی نہ تھا میرے پاس چھوٹے نوٹ نہیں تھے۔ سو روپے کا ایک نوٹ الگ کر کے میں نے کھڑکی کے اندر رکھا تو میں نے دیکھا کہ وہ کرنجی آنکھوں والا آدمی بھڑ کر میرے ساتھ کھڑا ہو گیا ــــ میں نے دل میں کہا بیٹے! تیرا تو میں ایسا بندوبست کروں گا کہ تیرے پُرزے بھی نہ مل سکیں گے یہ میری جیب اس کی دسترس سے بہت دور تھی مگر صورت شکل سے وہ مجھے کوئی بڑا فن کار نظر آتا تھا جس سے کچھ بھی بعید نہیں ہوتا۔

"کہاں جائیں گے آپ؟" بکنگ کلرک نے پوچھا۔

"گجرات! ایک سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ دے دیں۔"

وہ آدمی جواب تک بڑی بے فکری سے سگریٹ پھونک رہا تھا بڑے جوش سے بولا۔

"گجرات کے لئے سیکنڈ کلاس کا ایک ٹکٹ مجھے بھی دے دیں مگر جلدی کریں گاڑی نکلنے والی ہے۔" میری چھٹی حس نے مجھے یہ احساس دلایا کہ اس آدمی نے اسی وقت اپنی منزل کا تعین کیا ہے ورنہ اس سے پہلے وہ کہیں بھی جانے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک اُبھر آئی تھی اور میری طرف دیکھ کر وہ یوں مسکرا رہا تھا جیسے میرا وہ کوئی بہت پرانا آشنا ہو۔ مجھے الجھن ہونے لگی اس کی صورت شکل اور مونچھوں اور بالوں کی تراش خراش سے مجھے یہی محسوس ہوتا تھا کہ وہ پولیس کے محکمے کا کوئی اہلکار ہے۔ جونہی یہ خیال میرے ذہن میں ابھرا۔ میں بدک سا گیا۔ میں نے سوچا کہ ہو سکتا ہے یہ آدمی سی آئی ڈی کا فرد ہو۔ عین ممکن ہے اس نے مجھے پہچان لیا ہو۔ یہ بڑی خطرناک بات تھی۔

میں نے جلدی سے ٹکٹ اور بقیہ پیسے کھڑکی میں سے باہر کھینچے اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا پلیٹ فارم کی طرف لپکا۔ ابھی میں چند گز دور گیا تھا کہ وہ آدمی بھاگتا ہوا آیا اور میرے ساتھ چلنے لگا۔ "اتنی بھی کیا جلدی ہے جناب! ابھی تو گاڑی سٹیشن پر لگی بھی نہیں۔"

میں نے اس کی طرف سے بے نیازی اختیار کر کے اپنی رفتار تیز کر دی وہ دو قدم پیچھے رہ گیا تو پھر اچھل کر آگے بڑھا اور میرے ساتھ آملا۔ "آپ بھی گجرات جا رہے ہیں؟" اب کی بار اس نے زیادہ پُر اعتماد لہجے میں کہا۔

"جی ہاں میں بھی گجرات ہی جا رہا ہوں۔"

"لائیں یہ اٹیچی کیس مجھے دے دیں میں اٹھا لیتا ہوں۔" اس نے میرے اٹیچی کیس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"جی نہیں شکریہ! یہ زیادہ وزنی نہیں ہے۔" میں نے خشک لہجے میں کہا۔

"حرج ہی کیا ہے صاحب! ہماری منزل تو ایک ہی ہے مجھے نثار کہتے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے پھر میرے اٹیچی کیس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"کیوں شرمندہ کرتے ہیں جناب آپ!" میں نے اب کی بار قدرے گرمجوشی سے کہا۔ مگر وہ بضد ہو گیا اور میرا اٹیچی کیس اس نے زبردستی میرے ہاتھ سے لے لیا اور میرے ساتھ بھڑ کر چلنے لگا۔

اب ہم پلیٹ فارم پر پہنچ چکے تھے۔ نظریں اس کی بڑی تیزی سے میرا جائزہ لے رہی تھیں اور میں اس مخمصے میں مبتلا تھا کہ اس سے کس طرح چھٹکارہ حاصل کروں۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ وہ سی آئی ڈی کا آدمی ہے اور مجھے پہچان گیا ہے۔ اگر پہچان نہیں پایا ہے تو بھی وہ مجھے جس انداز سے ٹٹول رہا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ مجھے مشکوک آدمی سمجھ رہا ہے۔ شاید میرے چہرے پر پھیلی سراسیمگی اس کی سمجھ میں آ گئی تھی اس نے پلیٹ فارم پر پہنچ کر میرا اٹیچی کیس فرش پر رکھا اور جیب سے گولڈ لیف سگریٹ کا پیکٹ نکال کر بولا۔

"لیجئے شوق فرمائیے۔ میں اُدھر فیصل آباد میں آفندی ٹیکسٹائل ملز میں منیجر ہوں۔ گجرات اپنے سیل ڈپو کو دیکھنے جا رہا ہوں۔"

"جی شکریہ!" اس سے سگریٹ لے کر میں نے سلگا لیا۔

"آپ کا اسم گرامی؟"

"مجھے آصف کہتے ہیں۔" میں نے جان چھڑاتے ہوئے کہا۔

"اچھا اچھا۔ بہت اچھا نام ہے آپ کا۔ آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ کبھی موقع ملے تو فیصل آباد آئیے۔"

"جی ... میں ...... کوشش کروں گا۔" میں نے کہا۔ پھر گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے میں نے اٹیچی کیس اٹھا لیا۔

"آپ گھبرائیں مت! سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں بہت جگہ ہوتی ہے۔" اتنے میں گاڑی سٹیشن کے اندر داخل ہو گئی۔ اور ہم دونوں ایک خالی ڈبے میں جا گھسے نشستوں پر دھول جمی تھی۔ اس آدمی نے اپنا رومال نکال کر گرد جھاڑی اتنی محبت اور مروت سے اس نے یہ کام کیا جیسے وہ میرا ادنیٰ غلام ہے۔ اس کا انداز ایسا تھا کہ مجھے اپنے دل پر جمی شکوک کی دھول بھی صاف ہوتی نظر آئی وہ میرے پاس ہی بیٹھ گیا، بولا ــــ

"صاحب! کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی کی دو گھڑی کی ملاقات عمر بھر کا بندھن بن جاتی ہے۔ آپ کی شخصیت اتنی نکھری نکھری اور پُر شکوہ ہے کہ میرا دل چاہتا ہے کہ میں زندگی بھر آپ کے ساتھ ساتھ چلتا رہوں۔"

"یہ آپ کی نوازش ہے۔" ابھی میں یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ ایک صاحب بہت تیزی سے ڈبے میں داخل ہوئے۔ وہ اچکن اور شلوار میں ملبوس تھے۔ عمر ان کی یہی کوئی پینتیس سال ہو گی چہرے مہرے سے بہت ہی مہذب دکھائی دیتے تھے، پاؤں میں ان کے سفید چمڑے کا جوتا ایسا خوبصورت تھا کہ ان کی سفید شلوار اور کالی شیروانی کے ساتھ بڑی بہار دکھا رہا تھا۔ صحت کے لحاظ سے بھی وہ بہت ہی خوش نصیب نظر آتے تھے۔ گورا چٹا رنگ، بڑی بڑی غلافی آنکھیں سر کے بال گھنے اور سیاہ۔

وہ اندر داخل ہوئے تو بلند آواز سے بولے "لاؤ، بھئی لاؤ! یہ ٹرنک ادھر رکھ دو۔" ان کے سامنے دروازے پر دو قلی کھڑے تھے انہوں نے ایک ایک بھاری بھرکم صندوق سر پر اٹھا رکھا تھا۔ قلیوں نے اندر آ کر بڑے اطمینان سے وہ صندوق ڈبے کے فرش پر رکھ دیئے۔

"بس، انہیں یہاں ہی رہنے دو۔ سیٹوں کے نیچے رکھ لوں گا میں ــــ" وہ بہت سنجیدہ نظر آ رہے تھے اور ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ہنسنے مسکرانے سے ان کا زندگی بھر کوئی علاقہ نہیں رہا ہے۔ قلیوں نے ان کے کہنے پر وہ ٹرنک سیٹوں کے نیچے دھکیل دیئے۔ ان صاحب نے گہری گہری نظروں سے ہمیں دیکھا اور قلیوں کو بڑی فراخ دلی سے دس دس روپے دے کر بولے "خوش ہو۔"

"مہربانی میاں جی!" ایک قلی نے احسان مندی کے جذبے سے شرابور ہو کر کہا۔ ایک ایک ٹرنک اٹھانے کی مزدوری انہیں دس دس روپے مل گئی تھی اور انہیں کیا چاہئے تھا ــــ وہ ڈبے سے اترے تو وہ صاحب ہم سے مخاطب ہو کر بولے۔

"حضرات! ذرا خیال رکھئے گا میں ابھی واپس آیا، مجھے پشاور تک جانا ہے۔"

"بے فکر رہیں جناب! آپ کے صندوق بالکل محفوظ ہیں۔" نثار نے خوش دلی سے کہا۔

وہ صاحب فوراً ہی اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ڈبے سے نکلے اور تیز تیز قدم اٹھاتے آگے نکل گئے معلوم ہوتا تھا کہ وہ انجن کی طرف جا رہے ہیں۔

گاڑی کچھ ہی دیر بعد حرکت میں آ گئی ــــ مگر وہ صاحب واپس نہ آئے۔ میں اور نثار چاروں طرف نظریں دوڑاتے رہے مگر ان کا

کہیں کوئی پتہ نہ چل سکا۔ گاڑی کی رفتار تیز ہوگئی۔ نثار نے فکرمند لہجے میں کہا ــــ

"آصف صاحب! یہ آدمی کہاں چلا گیا ہے؟ ابھی تک واپس نہیں آیا۔"

"کہیں آگے پیچھے بیٹھ گیا ہوگا ــــ آجائے گا۔" گاڑی کی رفتار تیز ہوچکی تھی اور اب وہ سٹیشن سے باہر نکل آئی تھی۔ تشویش مجھے بھی ہوئی کہ وہ آدمی اپنے اتنے سارے بھاری بھرکم صندوق وہاں ڈال کر چلا گیا ہے۔ ایسا مغز پھرا تو وہ ہرگز نہ ہوگا کہ بھول گیا ہو یہی توقع تھی کہ وہ جلدی میں کسی اور ڈبے میں جا بیٹھا ہوگا۔

گاڑی شاہدرہ سے آگے نکلی تو نثار نے جیب سے ایک ڈبیا نکالی اس میں اس نے پان بند کر رکھے تھے۔ ایک گلوری اس نے چھالیہ الائچی ڈال کر مجھے دی "لو لاٹ لیجئے یہ بہت نایاب پان ہے ادھر تو آج کل مل ہی نہیں رہا ہے۔ میں نے ایک پی آئی اے والے سے چند پتے لئے تھے۔"

میں اس کی کسی بات پر اعتبار کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ دل میں میں یہ دھار کر بیٹھا تھا کہ جیسے ہی اس نے اپنی اصلی صورت ظاہر کی میں اس کی گردن مسل دوں گا، جان سے مار دوں گا۔ وہ خنزیر کا بچہ مجھے خدا جانے کس چکر میں ڈالنے کی فکر میں تھا مگر اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کا پالا کس بلا سے پڑا ہے۔

میں نے پان اس سے لے تو لیا مگر منہ میں اس طرح ڈالا کہ اس میں رکھا سارا مسالہ میں نے بڑی احتیاط سے اپنی ہتھیلی کی اوٹ میں رکھ کر کوٹ کی آستین میں گرا دیا۔ پان پر جو کتھا چونا لگا تھا، وہ خشک ہوچکا تھا۔ وہ خاصا کرارا اور خستہ پان تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر اس میں کوئی بھید ہے تو وہ سارے کا سارا اس مسالے میں ہوگا جو اس نے پان میں بھر رکھا تھا۔

نثار خوش ہوگیا کہ میں نے پان کھا لیا ہے۔ اس کی توقع کے عین مطابق میں نے کوئی دس منٹ تک پان کی جگالی کرنے کے بعد آنکھیں یوں موند لیں جیسے میں نیند میں دھت ہوتا جا رہا ہوں ــــ آہستہ آہستہ میں نے اپنے چہرے کو یوں ظاہر کیا جیسے میں گہری نیند میں کھو گیا ہوں۔ گاڑی چھوٹے چھوٹے سٹیشن پھلانگتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔

میں نے نثار کو اس کے اصلی روپ میں دیکھنے کے لئے اپنے بدن کو یوں ڈھیلا چھوڑ دیا جیسے میں دنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر ہوچکا ہوں۔ بریف کیس کو میں گود میں رکھے ہوئے تھا۔ اپنی گہری نیند کا اسے یقین دلانے کے لئے میں نے وہ بھی بڑی ہی فطری قسم کی اداکاری کرتے ہوئے سیٹ پر گرا دیا۔

نثار نے میری یہ حالت دیکھی تو وہ خوش ہوگیا۔ میں پلکوں کی جھری میں سے برابر اس کی حرکات و سکنات کا اندازہ لگا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر مسرت ناچ رہی تھی۔ میں نے دل میں کہا "نثار بیٹے تیری شامت اعمال تجھے میرے پیچھے لے آئی ہے۔ تو نہیں جانتا کہ تو نے کس مورخ

میں ہاتھ ڈال دیا ہے؟" وہ کھسک کر میرے قریب ہوگیا۔ اس نے بریف کیس درمیان میں سے ہٹایا اور پھر بڑے ماہرانہ انداز سے اس نے انتہائی غیر محسوس طریقے سے اپنا ہاتھ میرے کوٹ کی اندرونی جیب میں ڈال کر ایک گڈی لوٹوں کی اپنی انگلیوں میں پکڑ لی۔ ابھی اس کا ہاتھ میرے کوٹ کی جیب میں ہی تھا کہ میں جھرجھری لے کر اٹھ بیٹھا اور اس کی کلائی میں نے اپنی آہنی گرفت میں لے لی۔ میری آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا۔ اس کی کلائی کو میں نے دونوں ہاتھوں سے کچھ اس طرح مروڑا کہ وہ دُہرا ہوگیا۔ اس کا سر فرش کی طرف جھکنے لگا۔

"تیری ایسی تیسی..... لے گھن چکر! میں تو تجھے اُدھر لاہور پر ہی پہچان گیا تھا۔ تیری تو میں ہڈیاں توڑ دوں گا بچے!" اس کا دایاں ہاتھ میرے ہاتھوں میں تھا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ وہ اپنا بایاں ہاتھ اپنے کوٹ کی جیب میں ڈال رہا ہے۔ میں نے فوراً ہی پوری قوت سے بایاں ہاتھ اس کی گردن پر مارا۔ وہ بلبلا اٹھا اور اپنے بدن کو میری گرفت سے چھڑانے کے لئے مجھ سے زور آزمائی کرنے لگا۔ اس کا بایاں ہاتھ ابھی تک اس کی جیب میں تھا۔ میں نے فوراً اس کا دایاں ہاتھ چھوڑ کر اس کی گردن پر اپنی انگلیاں جما دیں اور دوسرے ہاتھ سے میں نے اس کے بائیں ہاتھ کو پیچھے کھینچا مگر اس کے ساتھ ہی ڈز کی آواز پیدا ہوئی۔ اس نے اپنے کوٹ کی جیب میں رکھے پستول کی لبلبی دبا دی۔ پستول کا رُخ اگرچہ میری ہی طرف تھا مگر اس کی نیت کو سمجھتے ہوئے اور اس کے ہاتھ کو جیب سے نکال لینے میں ناکام ہونے کی وجہ سے میں نے اس کا رُخ ایک جھٹکے سے عین اس وقت دوسری طرف موڑ دیا تھا جب وہ لبلبی دبا رہا تھا، گولی اس کے کوٹ کو پھاڑتے ہوئے ڈبے کی دیوار میں جا لگی۔

میں اسے بے ہوش نہیں کرنا چاہتا تھا مگر مجبوراً مجھے اس کی گردن کی رگ پوری قوت سے مسل دینی پڑی۔ نتیجہ ظاہر تھا وہ میرے ہاتھوں میں یوں جھول گیا جیسے اسے مَرے ہوئے مدت گزر چکی ہے۔

میں نے اسے بڑی آہستگی سے سیٹ پر لٹا دیا۔ وہ لمبی تان کر پڑ جا چکا تھا۔ میں نے بڑی احتیاط سے اس کے کپڑوں کی تلاشی لی۔ اس کے کوٹ سے ایک درہ ساختہ پستول ملا جس میں پانچ گولیاں ابھی تک موجود تھیں۔ دوسری جیب میں ایک بٹوا تھا جس میں ریل کا خریدا ہوا ٹکٹ اور چار سو ستر روپے برآمد ہوئے۔ میں نے بٹوے کی تہیں کھول کر دیکھیں تو مجھے اس میں سے ایک شناختی کارڈ ملا۔ یہ اقبال نامی کسٹم انسپکٹر کا کارڈ تھا۔ اقبال کے نام دو خط بھی اس میں رکھے تھے اور ایک فوٹو تھا جس میں اقبال کسی عورت کے ساتھ مسکرا رہا تھا۔ ان چیزوں کی اس کی جیب میں موجودگی صاف ظاہر کرتی تھی کہ وہ بٹوا اس نے کسی کی جیب سے تازہ تازہ نکالا تھا اور اس میں وہ اتنا بے فکر تھا کہ اس کو پھینک دینا بھی بے کار سمجھتا تھا۔

خیال ہے کہ وہ بٹوا اس نے اسی رات پلیٹ فارم کی بھیڑ میں چلتے ہوئے میرے ساتھ ڈبے میں سوار ہونے سے پہلے کسی کی جیب سے اڑایا تھا۔ میرا اولین اندازہ بالکل ٹھیک نکلا وہ واقعی زبردست فنکار تھا۔ مگر میرے لئے اس نے اپنا منصوبہ طویل کر دیا تھا کیونکہ میرا مال کسی ایک جیب میں اور کسی ایک بٹوے میں بند نہیں تھا۔ میں نے روپے اپنی تین جیبوں میں ڈال رکھے تھے اور وہ سب بٹوے کے بغیر تھے اور کھلے پڑے تھے چونکہ وہ خاصی بڑی رقم تھی اس لئے اس نے میرے ساتھ اسی ڈبے میں سفر کرنے کا فیصلہ کیا جس میں میں سوار ہو رہا تھا مقصد اس کا یہ تھا کہ گجرات پہنچنے سے پہلے پہلے وہ مجھے زیر کر لے گا۔

میں نے اس کی تیسری جیب دیکھی تو اس میں سے مجھے تراسی روپے ملے۔ سگریٹ کے دو پیکٹ، ایک رومال ایک کنگھا، ایک سگریٹ لائیٹر اور ایک تصویر ــ ایک چابیوں کا بھرا چھوٹا سا بٹوا۔ یہ سب چیزیں اس نے بڑی احتیاط سے اپنی قمیص کی اندرونی جیب میں سنبھال رکھی تھیں جو سوئیٹر میں چھپی تھی۔ مجھے اس کی پتلون کی پیٹی میں چھپا ایک تیز دھار چاقو ملا، جو کھلتا تھا تو بارہ انچ لمبا ہو جاتا تھا مگر بند ہونے پر پانچ انچ رہ جاتا تھا۔ جب میں نے اسے اچھی طرح صاف کر لیا تو میں نے سوچا کہ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ یہ سالا اگر اسی طرح چھٹی پر رہا تو میں اسے کیا سبق دے سکوں گا۔

میں نے ایک ایک کر کے اس کے تمام کپڑے اتار دیئے۔ کوٹ، پتلون، سوئیٹر، قمیص، بنیان اور پھر آخری چیز جو میں نے اس کے بدن پر رہنے دی وہ اس کا غلیظ جانگیہ تھا۔ لباس کے نیچے وہ بے حد گندا تھا۔ اس کا جسم سارے کا سارا ولائتی سؤر کی طرح بالوں میں چھپا ہوا تھا یہاں تک کہ اس کی کمر پر بھی بالوں کا کمبل سا لپٹا نظر آتا تھا۔ اس کو یوں برہنہ کر کے میں غسل خانے میں گیا اور وہاں سے اوک میں پانی لا کر اس کے منہ پر چھڑک دیا۔ اس نے جھرجھری سی لی مگر وہ ہوش کے دائرے میں واپس نہ آیا۔ مجھے تین بار غسل خانے سے پانی لا کر اس کے منہ پر ڈالنا پڑا۔ تب جا کر اسے ہوش آیا۔ اس وقت وہ ڈبے کے ٹھنڈے ننگے فرش پر سیدھا پڑا تھا۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور مجھے اپنے سامنے ہاتھ میں پستول لئے کھڑے دیکھا تو خوف سے اس کا رنگ پیلا ہوگیا۔ وہ یوں ہڑبڑا کر اٹھا جیسے اس نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہو۔ فرش پر سے اٹھتے ہی اس نے اپنے بدن پر نظر ڈالی تو ایک دم اکڑوں ہو کر نیچے بیٹھ گیا۔

"مجھے ــــ مجھے معاف کر دیں آصف صاحب! خدا کے لئے مجھے معاف کر دیں!" میں نے پاؤں کی پوری قوت سے اس کی پسلی میں ٹھوکر ماری اس کی آواز سن کر میں غصے سے پھنکنے لگا تھا۔ وہ خوفزدہ ہو کر سیٹ کے نیچے گھسنے لگا اور ایک ٹرنک کے ساتھ چمٹ گیا۔ میں نے اسے نیچے جھک کر باہر کھینچنا چاہا تو مجھے محسوس ہوا کہ اس ٹرنک میں سے عجیب سی سڑاند اٹھ رہی تھی۔ میں سمجھا وہ بدبو اس کے منہ سے آ رہی ہے۔

"باہر نکل آ استاد! ابھی تو تجھ سے بڑی باتیں کرنی ہیں مجھے۔ باہر آ میرے بچے!" یہ کہہ کر میں نے اس کو گردن سے پکڑ کر سیٹ کے نیچے سے باہر گھسیٹا۔ وہ میری گرفت سے نکل کر دوسری نشست کے نیچے جا گھسا۔

اب کی بار اسے باہر نکالنے کے لئے مجھے زیادہ نیچے جھکنا پڑا اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس سیٹ کے نیچے جو ٹرنک پڑا تھا اس کے اردگرد بھی ہلکی ہلکی بدبو پھیلی تھی مگر اس کے ساتھ خوشبو بھی تھی۔ مجھے اس خبیث پر سخت طیش آیا وہ اتنا گندہ تھا کہ شاید کُلی بھی نہیں کرتا تھا اور منہ کی بدبو کو دُور کرنے کے لئے خوشبودار پان کھاتا تھا۔

میں نے پریشان ہو کر نثار کا چاقو کھول لیا اور اس کی نوک اس کی ننگی کمر پر کچھ اس طرح چبھوئی کہ وہ درد سے نڈھال ہو کر ایک دم نشست سے باہر نکلا اور ہاتھ جوڑ کر میرے سامنے کھڑا ہوگیا۔ اس وقت وہ بڑا ہی مضحکہ خیز دکھائی دے رہا تھا۔ اس کو اس حالت میں دیکھ کر کوئی بھی نہ سمجھ سکتا تھا کہ وہ کوئی جامہ زیب حیوان ناطق ہے۔ لباس کے بغیر وہ سر سے پاؤں تک حیوان نظر آتا تھا۔

"کیوں بے! یہ دھندا کب سے کر رہا ہے تو؟"

"آصف صاحب! خدا کے لئے مجھے معاف کر دیں۔ میرے کپڑے مجھے دے دیں۔"

اس کی یہ بات سنتے ہی مجھے سیٹ پر دھرے اس کے کپڑے اور دوسری چیزیں یاد آئیں۔ اس کو پستول کی زد میں رکھتے ہوئے میں نے چاقو جیب میں ڈال کر بائیں ہاتھ سے کھڑکی کا شیشہ نیچے گرایا اور پھر اس کے تمام کپڑے اٹھا کر گاڑی سے نیچے پھینک دیئے۔

"یہ بڑا ظلم کیا ہے آپ نے مجھ پر۔ میں سردی میں مر جاؤں گا آصف صاحب!"

"ابھی کہاں بچے! ابھی تو میں تیرا پنڈا اچھی طرح تپاؤں گا۔ دیکھتا تو رہ۔" میں نے دانت پیستے ہوئے کہا میرے دل میں اس کے لئے شمہ بھر رحم نہیں رہا تھا حالانکہ میں خود بدترین قسم کا مجرم تھا۔ اب کبھی میں سوچتا ہوں تو مجھے بے حد افسوس ہوتا ہے کہ میں نے اس کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا۔ حیرت مجھے یہ ہوتی ہے کہ میں نے اس رات اس آدمی کی ایک ذرا سی خطا پر کیوں اسے اس قدر ذلیل کیا میرا دل اس گھڑی پتھر ہوچکا تھا۔ میرا خیال ہے کہ میں لاشعوری طور پر نثار سے وہی سلوک کر رہا تھا جو تھانے میں پولیس نے اور جیل میں وہاں کے مختلف اہلکاروں نے مجھ سے کیا تھا۔ میں اپنے بدن پر سہی ہوئی کڑی اذیتوں اور آزمائشوں کا اس سے انتقام لے رہا تھا۔

وہ خوف زدہ نظروں سے مجھے یوں دیکھ رہا تھا جیسے میں ابھی اس کے ٹکڑے کر دوں گا۔ اس کے بندھے جُڑے ہاتھ مجھے سکون پہنچا رہے تھے۔ میں نے اسے پوری طرح بے بس کر کے اس کی انا کی ساری طنابیں کاٹ

دی تھیں۔

"تو کب سے یہ دھندا کر رہا ہے؟"

"مجھے دس سال ہو گئے ہیں اس دھندے میں آصف صاحب! میرا گزارہ اسی کام پر ہے۔"

"گھر میں تیرے کون کون ہے؟" میں نے سیٹ پہ بیٹھ کر سگرٹ سلگا لیا۔ پستول کا رخ میں نے مسلسل اس کی طرف رکھا تھا۔

"کوئی بھی نہیں! میں تنہا ہوں بالکل تنہا۔ ایک میری جوان بہن تھی وہ بھی سال پہلے کسی کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔"

اس کے منہ سے بہن کا ذکر سنتے ہی میرا کلیجہ دہلنے لگا مجھے آسیہ کی بدنصیبیاں یاد آ گئیں مگر میں نے اپنے درد کو دل میں گہرا دبا دیا۔

"وہ کیوں بھاگی تھی؟"

"بس خرچ پیسے سے تنگ رہتی تھی میرا دھندا تو ایسا ہی ہے اور پھر میں ان دنوں جیل میں تھا ــــ اُدھر سا ہیوال جیل میں۔ وہ پریشان ہوئی تو کسی کے ساتھ نکل گئی۔" وہ ابھی تک میرے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑا تھا اس امید پر کہ میرا دل پسیج جائے گا۔

"کتنی بار جیل جا چکا ہے تو؟" میں تھانیداروں کی طرح اس لمحے گردن میں رعونت آمیز خم دیئے بیٹھا تھا اور وہ سردی سے ٹھٹھر رہا تھا۔

"چھ بار ــــ"

"پڑھے لکھے ہو؟"

"جی ہاں ایف اے تک پڑھا ہوں۔"

"یہ اچھی بات! مگر تو مجھے نہیں جانتا بچے! میں تو بالکل ان پڑھ ہوں میں تجھے ہرگز معاف نہیں کروں گا۔" میری یہ بات سنتے ہی وہ دائیں طرف کھسکا۔

گاڑی کی زنجیر اس سے ذرا دور رہ گئی تھی۔ اس کا ارادہ بھانپ کر میں نے پوری قوت سے بائیں ہاتھ کا ایک جھانپڑ جو اس کے منہ پر مارا تو وہ تیورا کر سیٹ کے اوپر گر گیا۔ برہنہ حالت میں وہ مجھے بہت ہی عجیب و غریب لگ رہا تھا اور میرا جی چاہتا تھا کہ میں چاقو کی نوک سے اس کی پیٹھ پر اپنا نام لکھ دوں۔

"مجھے معاف کر دو آصف صاحب! خدا کے لئے میرا گناہ بخش دیں۔"

میں نے سوچا تھا کہ میں اسے بدترین قسم کی سزا دوں گا تاکہ یہ مجھے ساری عمر یاد رکھے۔ یہ سوچ کر میں نے چاقو ہاتھ میں سنبھال لیا۔ میرے ہاتھ میں چاقو دیکھ کر وہ رونے اور گڑگڑانے لگا۔ اندر سے وہ اس حد تک ٹوٹ پھوٹ چکا تھا کہ اس کے اندر مزاحمت کی کوئی سکت باقی نہیں رہ گئی تھی۔

"روتا ہے سالے! یہ کم سے کم سزا ہے تیری اس کمینگی کی۔ تو مجھے دوست بنا کر ٹھگنا چاہتا تھا۔" میری بات سن کر اس کی آنکھوں میں ایسا خوف ابھر آیا جسے میں لفظوں میں سمو ہی نہیں سکتا۔

اس عرصے میں میں نے اپنا بریف کیس کھول کر اس کے لئے کرتا پاجامہ قمیص بنیان اور سویٹر نکال کر الگ رکھ لئے تھے۔

"ان کو پہن لے اور یاد رکھ کہ یہ دھندا آدمی کو ایسی ہی منزل تک پہنچاتا ہے۔" اس کے بُوٹ میں نے اس کے پاؤں میں ہی رہنے دیئے تھے جو باقی سارے جسم پر لباس نہ ہونے کی وجہ سے اس کے پاؤں پر عجیب سے لگتے تھے۔

اس نے فرمانبردار بچے کی طرح میرے سامنے وہیں کھڑے کھڑے چاروں کپڑے پہنے اور پھر یوں میری طرف دیکھنے لگا جیسے میرے اگلے حکم کا انتظار کر رہا ہو۔ ٹھہر ٹھہر کر اس کا ہاتھ کمر کی طرف جاتا تھا جہاں میں نے اس کی جلد پہ ہلکا سا زخم لگا دیا تھا اس میں سے شاید خون اب بھی رس رہا تھا۔

گاڑی کی رفتار آہستہ ہو رہی تھی وہ تھوڑی ہی دیر بعد رک گئی۔

"یہ کون سا سٹیشن ہے تو تو اکثر اپنے شکار کے پیچھے سفر کرتا ہو گا؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" وہ بڑی مرجھائی ہوئی مریل سی آواز میں بولا۔ ہمارے ڈبے میں وہاں سے بھی کوئی آدمی سوار نہ ہوا۔ دراصل گاڑی لاہور سے راولپنڈی تک چلتی تھی اور اس میں کوئی خاص رش نہیں ہوتا تھا۔

گاڑی چند لمحے رکی اور پھر آگے سرکنے لگی مگر اس کے جھٹکے سے ایک ٹرنک نشست سے نکل کر آگے آ گیا۔ وہ یہی ٹرنک تھا جو میری ٹانگوں سے ٹکرا رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے پاس سے عجیب سی بُو میرے نتھنوں کو چڑھ رہی ہے۔ وہ کافور ایسی بُو تھی۔

"یہ بُو کیسی ہے یہ اس ٹرنک سے آ رہی ہے کہ تیرے منہ سے؟" میں نے نہایت ہی اکھڑ لہجے میں کہا۔

وہ آگے جھکا اور ٹرنک کو سونگھ کر بولا۔

"یہ تو اسی میں سے آ رہی ہے۔"

"کمال ہے وہ کُتے کا بچہ کیا بند کر کے رکھ گیا ہے ان میں۔ اس ٹرنک کو کھول ذرا۔" میرے ہاتھ میں پکڑے پستول کا رخ اب اس کے سینے کی طرف تھا۔

"نہیں آصف صاحب اب نہیں، میری توبہ۔ میں اگر اپنے باپ کا تخم ہوں تو میں پھر کبھی بھی پرائی چیز کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔"

"اپنے اس چاچے کو کھول حرامزادے۔ یہ لے یہ رہا تیری چابیوں کا گچھا۔" یہ کہہ کر میں نے اس کا چابیوں سے بھرا چھوٹا سا بٹوا اس کی طرف اچھال دیا۔

اس نے بڑی بددلی سے اٹھ کر ٹرنک کو آگے گھسیٹا اور اس پر لگے تالے پر چابیاں آزمانے لگا۔ ایک چابی کام کر گئی۔ اس نے تیزی سے ٹرنک کا ڈھکنا کھول دیا اور پھر...... پھر ٹرنک کے اندر جو کچھ ہم دونوں نے

دیکھا وہ مدتوں تک ہمارے ہوش اڑانے کے لئے بہت کافی تھا۔ ٹرنک میں نیلے سے پلاسٹک کے تھیلے میں انسانی جسم کے مختلف اعضا یوں کٹے پڑے تھے جیسے قصائی کے پھٹے پر جانور کا گوشت صاف ستھرا کاٹ کر رکھا جاتا ہے۔

"اُف میرے اللہ!" وہ ایسا بھیانک منظر تھا کہ نثار اپنی آنکھوں پہ ہاتھ رکھ کر اپنی نشست پر پیچھے جا گرا۔ اس کے سانس کی آمدورفت میں بلا کی تیزی آ گئی تھی لگتا تھا جیسے وہ میلوں کی مسافت طے کر کے ابھی وہاں پہنچا ہے۔ میری اپنی کیفیت بھی اس سے قطعاً مختلف نہیں تھی۔

میں اس ٹکڑے ٹکڑے لاش کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا اور مجھے حیرت اس بات کی تھی کہ لاش کا سر غائب تھا۔ اس میں دو رانیں اور دو ٹانگیں، اور دو بازو ایک دوسرے کے متوازی یوں رکھے تھے جیسے کسی نے بڑی احتیاط اور صبر و سکون سے دھڑ سے کاٹ کر الگ کیا اور پھر ایک بڑے پلاسٹک کے بڑے لفافے میں سجا کر صندوق میں بند کر دیا ہو۔ رانوں پر چاندی کے ورق لگے تھے اور کسی بھی عضو سے خون نہیں رس رہا تھا......

ابھی میں اپنی حیرت پہ قابو نہیں پا سکا تھا کہ اچانک میرے پستول والے ہاتھ پر جو آگے بڑھا ہوا تھا نثار نے اُٹھ کر پاؤں سے زبردست ٹھوکر ماری۔ وہ ٹھوکر اتنی اچانک اور اتنی شدید تھی کہ پستول میرے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا پڑا۔ مجھے سنبھلتا دیکھتے ہی وہ مجھ پر گرا اور آتے ہی اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے میرا گلا دبوچ لیا۔ یہ وار اتنا غیر متوقع تھا کہ میں ایک لحظے کے لئے تو سمجھ ہی نہ سکا کہ مجھے اب کیا کرنا چاہئے؟

میرے دونوں ہاتھ کھلے تھے۔ میں نے بیٹھے بیٹھے اس کی دونوں کلائیاں پکڑ کر گردن پر سے اس کی گرفت ہٹانے کی کوشش کی مگر میں نے محسوس کیا کہ اس کے پنجے میں خاصی قوت ہے میں ڈرا کہ کہیں وہ مجھے بے بس ہی نہ کر دے۔ میں تیزی سے پیچھے ہٹا اور اپنی ٹانگیں اس کے پیٹ میں پھنسا کر پوری قوت سے اسے پیچھے دھکیلا۔ میری یہ کوشش کامیاب رہی اور میری گردن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی مگر وہ ایسا ڈھیٹ قسم کا آدمی تھا کہ اس نے میری گردن چھوڑتے ہی مجھے پاؤں سے پکڑ کر سیٹ سے نیچے گرا لیا اور اس کے ساتھ ہی وہ دائیں ہاتھ سے فرش پہ پڑے پستول کی سمت بڑھا۔ یہ بہت ہی خوفناک لمحہ تھا۔ میں بجلی ایسی سرعت سے فرش پر سے اٹھا اور نثار پر جا گرا۔ پستول پر اس کا ہاتھ نہ پڑ سکا تھا۔ وہ اوندھے منہ گرا مگر پھر الٹ کر سیدھا ہو گیا اور مجھ سے گتھم گتھا ہو گیا۔ میرے لئے اس کے جسم سے یوں بھڑ جانا بہت غنیمت تھا۔ میں نے جوں توں کر کے بڑی مشکلوں سے اس کی گردن تک رسائی حاصل کی اور پھر پوری قوت سے میں نے اس کی رگِ احساس مسل دی۔ وہ یوں بے حس و حرکت ہو گیا جیسے زندگی اس کا ساتھ چھوڑ گئی ہے ہمیشہ کے لئے۔

نثار کا ٹنٹا ختم کرتے ہی میں پھر ٹرنک کی طرف متوجہ ہوا اور اس کے اندر رکھے اعضا کو بغور دیکھنے کے بعد میں نے دوسرا ٹرنک نثار کی اسی چابی سے کھول دیا جس سے اس نے پہلا تالہ کھولا تھا۔ اس میں کسی عورت کا پورا دھڑ پڑا تھا۔ وہ دھڑ ٹانگوں سے بڑی صفائی کے ساتھ الگ کیا گیا تھا۔ اس کی گردن بھی یوں کاٹی گئی تھی کہ ذرا سا تسمہ بھی اِدھر اُدھر لٹکتا نظر نہیں آتا تھا۔

ابھی میں اس ٹرنک کو بند کر ہی رہا تھا کہ گاڑی کی رفتار ایک دم مدھم پڑنے لگی۔ میں نے ٹرنک کو جلدی سے سیٹ کے نیچے دھکیلا اور کھڑکی کی طرف لپکا۔ گاڑی کسی سٹیشن پر رک چکی تھی۔

میرے دل و دماغ پر ایسی لرزہ خیز کیفیت طاری تھی کہ میں اسے کسی طرح بھی بیان نہیں کر سکتا تھا۔ نثار میرے سامنے مُردوں سے زیادہ بدتر حالت میں آڑھا ترچھا پڑا تھا اور ان دو ٹرنکوں میں کسی بدنصیب عورت کی سربریدہ لاش کے ٹکڑے میرا منہ چڑا رہے تھے۔

وہ گوجرانوالہ سٹیشن تھا اور وہاں مسافروں کی ایک بھیڑ تھی جو گاڑی پر ٹوٹ پڑی تھی۔ میں کھڑکی کے پیچھے کھڑا سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ ڈبے کا دروازہ میں نے اندر سے بند کر رکھا تھا اور میرا خیال تھا کہ جب لاہور سے اس میں کوئی نہیں چڑھا تو کسی چھوٹے سٹیشن پر کوئی مسافر اتنی تسلی کا کہاں ہو گا کہ وہ سیکنڈ کلاس کا شوق رکھے۔ مگر نہیں! دروازہ کسی نے ایک دم پیٹ ڈالا۔ باہر پانچ آدمی کھڑے تھے ـــ وہ کوئی چوہدری قسم کے لوگ تھے جن کے ساتھ چلم بردار بھی تھے۔ تین آدمی سروں پر طُرّے دار پگڑیاں باندھے تھے اور دو ان کے ملازم تھے۔ انہوں نے دروازہ اندر سے بند دیکھا تو بہت تلملائے۔ عین اسی وقت گاڑی کا گارڈ ان کے قریب سے گزرا تو ایک طُرّے باز نے اسے بازو سے پکڑ کر روک لیا۔

"ڈبہ تے کھلواؤ بادشاہو! لوکی بند کر کے بیٹھے او۔"

گارڈ نے مسکرا کر اس چوہدری کی طرف دیکھا اور دروازے کا ہینڈل گھمانے لگا۔ میری نبضیں دھڑ دھڑ بج رہی تھیں۔ خوف کی ایک تیز کٹیلی لہر میرے بدن میں سرسرانے لگی۔

مجھ پر بڑا کڑا وقت آن پڑا تھا۔ ڈر مجھ پر یہ طاری تھا کہ میں تو ویسے ہی اشتہاری مجرم ہوں۔ مجھے انہوں نے اگر ان ٹرنکوں اور نیم مُردہ حالت میں پڑے نثار سمیت ڈبے میں دیکھ لیا تو وہ کیا سمجھیں گے؟ صاف ظاہر تھا کہ پہلے تو وہ مجھے سیدھا حوالات پہنچاتے اور پھر پوچھتے "چن کتھاں گزاری آئی رات وے۔"

مجھے کسی فوری نتیجے پر پہنچنے کی ضرورت تھی۔ گارڈ نے سٹیشن کے پلیٹ فارم پر دوڑتے ہوئے ایک مکینک کو اشارہ کر کے بلایا اور بولا۔ "دیکھو یہ دروازہ لاک تو نہیں ہے؟ میرا خیال ہے کسی مسافر نے شاید اندر سے بند کر رکھا ہے۔"

"لگتا تو یہی ہے جناب! میں دیکھتا ہوں اِدھر کیا گھپلا ہے؟"

یہ کہہ کر وہ کھڑکی کی طرف آیا تو میں نے اپنا بریف کیس اور اٹیچی کیس اٹھا کر تیزی سے پچھلا دروازہ کھولا اور گاڑی کی دوسری طرف اتر گیا اُدھر گھُپ اندھیرا تھا البتہ جب میں گاڑی کے پچھلے حصے کی طرف بھاگا تو ہر دروازے کے آگے سے گزرتے وقت میرا سارا وجود روشنی کے نیزوں کی زد میں آتا رہا۔ میں اپنے آپ کو کسی قسم کی پریشانی میں الجھانا نہیں چاہتا تھا۔ میری رفتار خاصی تیز تھی مگر ابھی میں پچھلی طرف تیسرے ڈبے تک پہنچا ہی تھا کہ مجھے اپنے پیچھے زبردست شور سنائی دیا۔

"پکڑو! اسے پکڑو! یہی ہے جانے نہ پائے۔" میرے پیچھے بہت سے آدمی لپکے چلے آ رہے تھے۔ صورتِ حال ایسی تھی کہ اب میرا وہاں سے بچ نکلنا ناممکن نظر آتا تھا لیکن پکڑے جانے کی صورت میں میرا جو حال ہوتا وہ بھی میری نظر میں تھا۔ ڈبے کو بند رکھ کے ان لوگوں کی بار بار کی دستک سے اغماض کر کے اور ڈبے سے یوں چوروں کی طرح بھاگ نکلنے سے، میں نے اپنے لئے خود ہی ایک خوفناک گڑھا کھود لیا تھا جس میں میں دم بدم نیچے لڑھکتا جا رہا تھا۔

وہ لوگ لحظہ بہ لحظہ میرے قریب ہوتے جا رہے تھے۔ نثار کا پستول میری دائیں جیب میں تھا اور میرا اپنا سائیلنسر لگا پستول میری پیٹی سے بندھا تھا جس پر میں نے موٹر چڑھا رکھا تھا۔

گوجرانوالہ کا پلیٹ فارم ایسا ہے کہ ایک طرف اسٹیشن کی عمارت ہے اور دوسری طرف چھوٹی سی دیوار ہے جس کی دوسری طرف مکانات ہیں۔ جو دُور کچہری تک پھیلتے چلے گئے ہیں۔

میں نے اپنی زندگی کا مشکل ترین فیصلہ کرتے ہوئے پہلے اٹیچی کیس کو دیوار کی دوسری طرف پھینکا اور پھر بریف کیس کو — اور پھر میں اپنے بدن کی تمام تر قوتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اچھل کر دیوار پر جا چڑھا جس کی بلندی آٹھ نو فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔

خدا کا شکر ہے کہ ابھی تک میرا تعاقب کرنے والے مجھ سے خاصے دُور تھے۔ اتنی دور کہ میں ان کی نگاہ میں تو تھا مگر دسترس میں نہیں تھا——

اچانک مجھے محسوس ہوا کہ ایک گولی سرسراتی ہوئی میرے سر پر سے گزر کر سامنے دیوار میں جا لگی ہے۔ میں نے پاگلوں کی طرح کوئی بات سوچے سمجھے بغیر دوسری طرف چھلانگ لگا دی۔ اس کے ساتھ ہی کئی گولیاں دیوار کے اوپر سے گزر کر سامنے کے مکان میں جا لگیں ——

میں... کسی مکان کے صحن میں اتر گیا تھا جس میں بتی جل رہی تھی میرا بریف کیس اور اٹیچی کیس سامنے پڑے تھے۔ میں نے دونوں چیزیں اٹھائیں اور تیزی سے مکان کے بڑے دروازے کی طرف بڑھا مگر میں یہ دیکھ کر سخت مایوس ہوا کہ دروازے پر اندر سے تالہ ڈال دیا گیا تھا۔ وہاں سے مڑ کے میں دائیں ہاتھ مڑا اور سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اوپر جا چڑھا۔ وہ سیڑھیاں مکان کی دوسری منزل میں کھلتی تھیں اور وہاں بھی دروازہ بند تھا۔ البتہ کمروں کے گرداگرد ایک راہداری تھی۔ میں اس میں چلتا ہوا آگے نکلا تو معلوم ہوا کہ وہ راہداری آگے گلی تک کا منظر دکھاتی تھی۔ میرا حال اس زخمی بھیڑیے جیسا تھا جس کے پیچھے شکاری کتے لگے ہوں۔ ایسے شکاری کتے جو دم بدم اپنا حلقہ تنگ کرتے جا رہے تھے۔

مجھے اس لحظہ بہ لحظہ تنگ ہوتے ہوئے نرغے سے بہر طور نکل جانا تھا۔ میں زندہ حالت میں کسی کے ہاتھ نہیں آنا چاہتا تھا۔ کیونکہ ایسی صورت میں تو میرے پلّے کچھ بھی باقی نہ رہ سکتا تھا۔ مجھ پر وہ تازہ ترین الزام وہ لگاتے وہ اس عورت کا قتل ہوتا جس کی کٹی ہوئی لاش میں نے ٹرنک میں دیکھی تھی۔ ان کا سب سے بڑا گواہ نثار ہوتا۔ وہ مجھے کسی طرح بھی بخشنے پر آمادہ نہ ہو سکتا تھا۔ کیونکہ میں نے اس کے ساتھ جو سلوک کیا تھا اسے وہ زندگی بھر فراموش نہ کر سکتا تھا۔

اچانک مجھے اس مکان کے صحن میں دھڑا دھڑ کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ لوگ میرا پیچھا کرتے ہوئے دیوار پھاند کر میری ہی طرح صحن میں آ گئے تھے۔ ان کی آوازوں نے مکان کو دہلا کر رکھ دیا تھا اور اس کے مکین جاگ اٹھے تھے۔ مجھے اپنے پیچھے راہداری میں کھلنے والے ایک دروازے میں سے نکلتی روشنی نے آلیا۔

جونہی میں اس روشنی کے حلقے میں آیا میں نے بلا سوچے سمجھے اپنے دونوں صندوق گلی میں پھینکے اور پیچھے کود گیا۔ یوں جیسے کوئی سرکس کا سینڈو تماشائیوں کو خوش کرنے کے لیے آگ میں چھلانگ لگا دے۔

چھت یہی کوئی بارہ فٹ بلند تھی۔ راہداری کی منڈیر کی اونچائی اس میں شامل کریں تو وہ اونچائی سولہ فٹ بنتی ہو گی۔ جب میرے پاؤں زمین پر لگے تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری ہڈیاں چٹخ گئی ہیں مگر وہ ہڈیوں کا حساب کرنے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے بریف کیس اور اٹیچی کیس اٹھایا اور گلی میں بھاگتا ہوا اندھا دھند آگے نکلتا چلا گیا۔

میں کافی دُور جا پہنچا تو ایک لحظے کے لیے رُک کر اپنا سانس درست کرنا چاہا مگر جونہی میری نظر اُدھر اٹھی جدھر سے میں بھاگ کر آیا تھا تو میں نے دیکھا کہ بہت سے لوگ لالٹینیں اور ٹارچیں ہاتھوں میں لیے میری سمت بھاگ رہے ہیں۔ وہ ابھی تک مایوس نہ ہوئے تھے۔ اور مسلسل میرے تعاقب میں لگے تھے۔ اور پھر اسی لمحے پیچھے گاڑی کی وسل سنائی دی۔ گارڈ نے ہری جھنڈی دکھا دی تھی۔ اس کے ساتھ انجن کی چنگھاڑتی کھنکار نے فضا کو ہلا کر رکھ دیا۔ گاڑی چل دی تھی مگر وہ لوگ پھر بھی میری طرف دوڑے چلے آ رہے تھے۔

میں نے فوراً اپنا رُخ بدلا اور پہلو کی گلی میں جا گھسا۔ میرا دم بُری طرح پھُول رہا تھا اور ہمت جواب دیتی جا رہی تھی۔ وقت میرا ساتھ دیتا نظر نہ آ رہا تھا۔ مجھے اپنی جان کے لالے پڑے تھے۔ وہ لوگ شاید ہر حال میں ہر قیمت پر مجھے پکڑ لینا چاہتے تھے۔ وہ گلی خاصی طویل تھی۔ میں جب اسے عبور کر کے باہر نکلا تو مجھے محسوس ہوا کہ میں کچہری روڈ پر جا نکلا ہوں۔

یہ بہت اچھی بات تھی۔ مجھے شہر کی سمت سے ایک ٹیکسی اپنی طرف آتی دکھائی دی۔ اس کے ہارن کی آواز بتاتی تھی کہ ڈرائیور سواری کی تلاش میں ہے۔ میں نے دونوں ہاتھ پھیلا کر اسے اشارہ کیا تو ڈرائیور نے میرے پاس پہنچ کر بڑے زوردار طریقے سے بریک لگاتے ہوئے "کہاں جانا ہے بالوجی!" وہ بہت تیزی سے بولا۔ مگر میں جواب دینے کے بجائے دھم سے گاڑی میں سوار ہو گیا۔ "مجھے چھاؤنی لے چل یار۔ اسی راستے سے مجھے گاڑی پکڑنی ہے۔" وہ راستہ میرا دیکھا بھالا تھا۔

ڈرائیور نے تیزی سے گیئر بدلا اور ہوا کی رفتار سے کچہری کی طرف چل دیا۔ اب میں ان لوگوں کی دسترس سے باہر تھا۔ دم بدم میرے اور ان کے درمیان فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا۔ جب میں چھاؤنی اسٹیشن پہنچا تو معلوم ہوا کہ گاڑی وہاں سے گزر کر آگے جا چکی ہے۔ یہ بہت اچھا ہوا تھا مگر میں نے نہایت مایوس لہجے میں کہا۔

"یہ تو بہت ہی بُرا ہوا یار، مجھے ایک نہایت ضروری کام سے ابھی گجرات پہنچنا ہے اگر تو مجھے لے چلے تو تیری مہربانی ہو گی۔"

"گجرات؟ پچاس روپے لگیں گے بالوجی!" ڈرائیور نے میری حیثیت بھانپ کر اکڑتے ہوئے کہا۔

"مجھے منظور ہے بھائی۔ بس مجھے تو سیدھا گجرات لے چل۔"

"ٹھیک ہے بالوجی آپ کے لیے چلتا ہوں رات کا وقت ہے میں شہر کبھی نہیں جاتا۔ پر آپ کی ضرورت نے مجبور کر دیا ہے۔" وہ مجھ پر اپنا احسان جتلانے لگا۔

"بڑی مہربانی ہو گی بھائی۔ اگر دقت ہو تو مجھے بتا دو میں شہر سے دوسری ٹیکسی لے لیتا ہوں میں تمہیں مجبور نہیں کر سکتا۔"

اس نے ٹیکسی میں لگے آئینے میں میری صورت دیکھی میرے چہرے پر چھائی گمبھیر سنجیدگی پر اس کی نظر پڑی تو اندر سے سکڑنے لگا۔ بولا۔

"نہیں جی! ایسی بھی کیا بات ہے میں ہی آپ کو چھوڑ آتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے ٹیکسی کا رُخ بڑی سڑک کی طرف موڑا اور رفتار بڑھا دی۔

سردی بہت بڑھ گئی تھی اور ٹیکسی کے شیشے کچھ یوں ہی سے تھے۔ سامنے سے ہوا برابر اندر آ رہی تھی۔ میں نے سگریٹ سلگایا اور ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گیا۔ میرے وجود میں آگ لگی تھی۔ میری چوٹیں اندر کا الاؤ جگا رہی تھیں۔ وہ چوٹیں جو مسلسل میں سہہ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ برداشت کر رہا تھا جس شام میں ماں سے یہ وعدہ کر کے گھر سے نکلا تھا کہ میں صبح تک ایک لاکھ روپے ضرور لا دوں گا۔ مجھے اس لمحے بالکل اپنی بے بسی پر ہنسی بھی آئی اور رونا بھی۔ میں آوارہ ہواؤں کے تعاقب میں کیسے کہاں چلا آیا تھا۔ کیا سے کیا بن گیا تھا۔ لگتا تھا وہ قدریں جو میرے اساتذہ اور والدین نے بڑی محنت سے میرے وجود میں پیدا کی تھیں ایک ایک کر کے ٹوٹتی جا رہی تھیں اور اب حالت یہ ہو گئی تھی کہ میں کرائے کے قاتل کی حیثیت سے آہو صاحب کے کہنے پر ایک اجنبی کو، ایک ایسے آدمی کو قتل کرنے جا رہا تھا جسے میں نے کبھی دیکھا تک نہ تھا۔ جس نے میرا کبھی کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ میں ایک ہنستے بستے گھر کو اجاڑنے کے لیے آگے بڑھ رہا تھا۔ کیوں؟ آخر کیوں؟ جیلانی یہ تجھے کیا ہو گیا ہے۔ کیوں تو ذلت کی ان گہرائیوں میں دھنستا چلا جا رہا ہے؟ میں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

کوئی آواز مجھے مسلسل متنبہ کیے جاتی تھی۔ وہ آواز آہستہ آہستہ بلند ہوتی جا رہی تھی اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں۔ میرا ارادہ متزلزل ہونے لگا۔ ٹیکسی بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی اور میں اس سوچ میں گم تھا کہ آخر اس ہادی علی کو قتل کر دینے کا وعدہ میں نے کیسے کر لیا۔ پھر اچانک میرے تخیل کے پردوں پر ایک چہرہ اُبھرا، ایک اونچی لمبی خوبصورت، شہتوت کی ٹہنی ایسی لچکیلی باہوں والی الھڑ اکھڑ لڑکی کا سراپا میری آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ اس کے چہرے پر اندھی کالی سوچوں نے ان گنت لکیریں ڈال رکھی تھیں۔ وہ موت سے پہلے مرتی جا رہی تھی۔ پور پور کٹ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تھے۔ اس کی آنکھوں کی چمک پر تقدیر کی سیاہی غالب آتی جا رہی تھی۔ وہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے لہو روتی تھی۔ وہ میری بہن آسیہ تھی جسے میں نے اپنی ہی بے تدبیریوں کے تیز خنجر سے ذبح کر ڈالا تھا۔ اور اب وہ مایوسی کی چیلوں کوؤں... کی غذا بنتی جا رہی تھی۔

آسیہ کا وہ دھواں دھواں چہرہ میرے تصور میں اُبھرا تو میں لرز اٹھا۔ میرا سارا بدن غصّے سے پھنکنے لگا۔ میں نے سوچا کہ اگر ایک ہادی علی کا سر اتار لینے سے میری بہن کے سامنے سے سلاخیں کٹ کر نیچے گر سکتی ہیں تو یہ سودا ہرگز مہنگا نہیں ہے۔ مجھے اس کے لیے اگر سارے جہان کو مارنا پڑے تو مار دوں گا کہ اس سے زیادہ اہمیت میں نے آج تک کسی کو نہیں دی۔

میری سوچیں مسلسل میرے تعاقب میں تھیں۔ ڈرائیور ٹھہر ٹھہر کر ٹیکسی کے اندر لگے آئینے میں نظر ڈالتا تھا۔ جب بھی کسی کھمبے کی روشنی ٹیکسی میں پڑتی وہ آئینے میں ضرور جھانکتا۔ اس کے چہرے پر میں نے بار بار عجیب سا تحیّر ابھرتے دیکھا، تو میں نے محسوس کیا جیسے وہ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ بڑی خطرناک بات تھی پھر بھی مجھے یہ اطمینان تھا کہ وہ چار پہیوں پر بیٹھا ہے اور میری زد میں ہے۔ بھرا ہوا سائیلنسر لگا پستول میری پیٹی سے بندھا تھا۔ میں نے سگریٹ سلگایا اور آئینے کے رُخ سے ہٹ کر دوسری طرف جا بیٹھا۔

گاڑی راہوالی سے آگے نکلی تو مجھے محسوس ہوا کہ ڈرائیور کی تڑپڑی میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اس نے بھی سگریٹ سلگا لیا۔ ایک اچٹتی سی نظر اس نے پیچھے ڈالی اور پھر سیٹ پر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اسٹیئرنگ پر اس کی گرفت مضبوط نہیں رہی تھی۔ اور مجھے یقین ہونے لگا تھا کہ وہ کسی اہم

فیصلے کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ بجری سے لدے دو تین ٹرک تو ہمارے قریب سے یوں گزرے تھے کہ اگر ڈرائیور فوراً ہی سنبھل نہ جاتا ہم فوراً ہی تسّو تسّو ہو گئے ہوتے۔

"کیا بات ہے اُستاد! خیر تو ہے!" میں نے لہجے میں خاصی لٹک لچک پیدا کرتے ہوئے پُوچھا۔

"خیر ہی ہے باؤ جی۔ بالکل خیر ہے۔"

"تمہاری نظر چُوک رہی ہے استاد! تمہاری نظریں پیچھے ہیں، اور کان آگے ہیں۔"

"نہیں باؤ جی ایسی تو کوئی بات نہیں۔ یہ جو بجری کے ٹرک چلاتے ہیں ان سے تو بس اللہ ہی بچائے آدمی کا منٹوں میں سُرمہ بنا دیتے ہیں۔"

"میں بھی بجری کا ٹرک ہوں استاد! نظر سیدھی رکھ اور تیرے دماغ میں جو کیڑا خارش کر رہا ہے نا اسے نیچے لے جا۔ اپنی سیٹ کے نیچے تاکہ تو پھر کہیں جھکی نہ کھا جائے۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہیں باؤ جی! آپ کیسی باتیں کرتے ہیں میں تو سمجھا تھا آپ بڑے پڑھے لکھے تمیز دار آدمی ہیں۔" وہ بدمزہ ہونے لگا۔

"تو اب کیا خیال ہے تیرا میرے بارے میں۔" میں نے ایک بار پھر خالص لقندری لہجے میں بات کی۔ وہ سٹپٹا گیا۔ ایک نظر پیچھے ڈالتا ہوا بولا

"باؤ جی! سنا نہیں آپ نے سیانوں نے کہا ہے کہ ستھری زبان ستھرا آدمی گندی لتری گندی گدڑی۔"

"اے لفافہ نہ دکھا مجھے بھائی ڈرائیور! یہ بتا، تو بار بار مجھے گھور گھور کیوں دیکھتا چلا آ رہا ہے، کیا لگا ہے میرے مُنہ پر۔" میں نے اسے تپانے کے لیے چھیڑا۔ میرا خیال تھا وہ بھڑک کر اپنے خدشے اُگل دے گا۔ مگر وہ بہت گھُنّا ثابت ہوا۔ سب کچھ اندر ہی اندر دبا کر مسکرا دیا اور پینترا بدل کر بڑی دھیرج اور مٹھاس سے بولا۔

"میرے بادشاہ! میں.. میں دراصل سوچ رہا تھا کہ اللہ نے کیسے کیسے سوہنے جوان پیدا کر رکھے ہیں۔ آپ بہت دیدہ زیب آدمی ہیں سرکار! بس اسی لیے میں آپ کو بار بار دیکھ رہا تھا۔"

میری طبیعت کا سارا تکدّر دور ہو گیا۔ اس کے ایک ہی لوچدار فقرے نے ساری فضا خوشگوار بنا دی اور میرے تمام خدشے اس کے بارے میں آپ ہی آپ صاف ہو گئے۔

"اچھا، تو یہ بات ہے۔ کیا نام ہے تیرا۔؟"

"میرا نام شکیل احمد ہے سرکار! مگر نام کا ہی شکیل ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے ٹیکسی کی رفتار ایک دم تیز کر دی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اسے پچاس پچپن پر لے گیا۔

"کیا کرتے ہو یار! کہیں مروا نہ دینا۔"

"بے فکر رہیں میرے بادشاہ! مجھے واپس بھی تو آنا ہے۔" وہ ایک دم بہت جوش میں آ گیا۔ میں اسے ابھی تک نہ سمجھ سکا تھا۔ میرا دل چاہا

کہ میں اس کو کالر سے پکڑ کر پیچھے کھینچوں اور سمجھاؤں کہ خرزادے آ...
چلا اپنی اس خالہ کو مگر پھر میں نے سوچا کہ ٹھیک ہے جتنی تیز وہ گا...
چلائے گا اتنی جلدی میں منزل پر پہنچ جاؤں گا۔ اس وقت تک رات ...
گیارہ بج چکے تھے، اور مجھے اس ڈرائیور سے جو ہے بلی کا کھیل کھیلنے...
الجھن ہونے لگی تھی میرے تصوّر میں وہ دو ٹرنک اُبھر آتے...
میں ایک سر بریدہ لاش ٹکڑوں میں بٹی رکھی تھی اور میں یہ سوچنے لگا تھا...
اس پر اسی صاف ستھرے دُھلے دُھلائے خنزیر نے خنجر چلایا ہوگا۔
اُن ٹرنکوں کو گاڑی میں ڈال کر واپس چلا گیا تھا۔ دیکھنے میں کتنا...
اور معزز آدمی نظر آتا تھا۔ میں تو سمجھا تھا کہ وہ کوئی نواب زادہ ہے...
عمدہ بات کرتا تھا وہ۔ اس کا لہجہ اتنا اجلا تھا کہ مجھے اپنی جگہ اپنے...
اور اکھڑ لہجے پر شرمساری محسوس ہوتی تھی میں نے سوچا تھا کہ...
سفر میں میرے ساتھ ہوگا۔ تو وقت بہت اچھا گزرے گا، مگر وہ...
وہاں دَھر کر ایسا غائب ہوا کہ پھر اس خبیث نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا...
مجھے اس بات پر بھی کہ اس نے کس دل سے اس خوبرو عورت کو موت...
گھاٹ اتارا ہوگا۔ اس نے ایسی صفائی سے اس کے ٹکڑے کیے کہ...
کر قصائی بھی اتنی مہارت نہ دکھا سکتا ہوگا۔ تصوّر میں اس حرماں نصیب...
کا بدن اُبھرا تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کیسے کیسے شیطا...
صفت لوگ پڑے ہیں اس دنیا میں۔ میں نے دل میں عہد کیا کہ اگر...
زندگی کے کسی موڑ پر مجھے مل گیا تو میں اسے ایسے ہی عبرتناک مرا...
گزاروں گا جن سے اس نے اس بے بس سی اور کمزور مہ جبیں کو گ...
تھا۔ میں یہی سمجھتا تھا کہ وہ مہ جبیں ہوگی۔ کندھوں پر ایسا چہرہ لیے...
ہوگی جو ماحول کو منوّر کر دیتا ہوگا۔ جس کے بالوں کی تابناک سیاہی...
کی اس رات کو بھی مات کرتی ہوگی جس میں لاکھوں جگنو جا بجا چمکتے...
ہیں مگر اس ناسپاس گزار درندہ صفت انسان نے اسے موت کے...
مراحل سے یوں گزار دیا۔ جیسے وہ بیچاری ہر احساس سے عاری...
مجھے بھانوری سی آنے لگی۔ میرا دماغ بری طرح چکرانے لگا تھا...

گاڑی گکھڑ سے نکل کر آگے بڑھ رہی تھی اور اس کی...
ڈرائیور نے خاصا اضافہ کر دیا تھا۔ ریل گاڑی بھی اس نے دھو...
قریب جا کر پیچھے چھوڑ دی۔

"ابے اتنی بھی کیا جلدی ہے تجھے میرے یار شکیل احمد۔ تو...
میں یہیں اُتر جاتا ہوں میرے بھائی مگر اتنی تیزی سے تو مجھے...
منہ میں مت ڈال۔ کیا خیال ہے بھائی تیرا تو بیمہ ہو چکا ہوگا۔"

"بیمہ تو کمزور دل کرواتے ہیں بادشاہ! مرد کو اور...
فکر نہیں ہونی چاہیئے۔"

بڑا دبنگ اور جما ہوا لہجہ تھا اس کا۔ مجھے یوں لگا...
بات نے اسے بے پناہ حوصلہ دے دیا ہے اور وہ لنی سی جو اس...
کو لجلجا سا ثابت کرتی تھی۔ اس وقت جب وہ گوجرانوالہ سے چلا...

اب غائب ہو چکی تھی۔ وہ کسی قطعی فیصلے پر پہنچ چکا تھا۔

"تو اس کی رفتار کم نہیں کرے گا پیھٹے۔" اب کی بار میں نے بڑے رعب سے کہا۔ وہ اتنے خوفناک انداز سے گاڑی چلا رہا تھا کہ ہر قدم پر مجھے کسی مہیب حادثے کا دھڑکا لگا تھا۔

"گھبرائیں نہیں باؤ جی! کوئی عورتیں تو نہیں بیٹھی ہیں اندر۔" وہ نہایت سنجیدگی سے بولا۔ نگاہیں اس کی سامنے سڑک پر جمی تھیں اور زبان کو کبھی کبھی چابک کی طرح استعمال کرنے کا گُر وہ خوب جانتا تھا۔

اب ہم وزیر آباد کے نواح میں پہنچ چکے تھے مگر اس نے رفتار پھر بھی مدھم نہ کی۔ بسوں کے اڈے کے سامنے سے بھی وہ زن سے گزر گیا۔ اس کے چہرے پر عجلت کی آندھی کے سوا مجھے اور کوئی شئے نظر نہیں آتی تھی۔ یا تو وہ مجھ سے خوفزدہ ہو گیا تھا اور چاہتا تھا کہ مجھے میری منزل پر گرا کر الٹے قدموں واپس ہو جائے یا پھر وہ وقت کی قدر و قیمت پہچانتا تھا۔ اس کے سوا تو کوئی اور بات میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

بسوں کے اڈے کے سامنے سے گزر کر اس نے ریلوے لائن کے اُوپر بنے پل کو عبور کیا۔ اور پھر کچھ ہی دُور جا کر اس نے گاڑی کو بائیں ہاتھ کچھ اتنی تیزی سے موڑا کہ میں حیران رہ گیا۔ میرے سامنے "ریلوے پولیس تھانہ" کا بورڈ تھا۔ وہاں دروازے پر ایک مسلح سپاہی کھڑا تھا۔

ایک لحظے کے لیے تو میرا دماغ سُن ہو کر رہ گیا۔ وہ بدمعاش مجھے گرفتار کرانے کے لیے سیدھا تھانے لے گیا تھا۔ پیشتر اس کے کہ وہ دروازہ کھول سکتا، وہ سپاہی کچھ سمجھ سکتا، میں نے اس کی گردن دونوں ہاتھوں میں دبوچ کر بڑی نرمی سے اس کی رگ مَل دی۔ وہ فوراً ہی بائیں ہاتھ جھُول گیا۔ ٹیکسی میں اندھیرا ہونے کی وجہ سے سپاہی کو فوراً ہی کچھ نظر نہ آ سکا۔

پھر بھی وہ متجسّس نظروں سے دیکھتا ہوا آگے بڑھا۔ یہ بڑا ہی خوفناک لمحہ تھا۔ میں پاگلوں کی طرح ٹیکسی سے اترا اور اگلا دروازہ کھولنے لگا۔

"کیا ہوا باؤ جی! خیر تو ہے؟" سپاہی نے میرے پاس آ کر اندر جھانکتے ہوئے کہا۔

"ڈرائیور کو شاید ہارٹ اٹیک ہو گیا ہے۔ ایک دم اس نے گاڑی روکی ہے اور اُلٹ گیا ہے۔" میں نے یہ کہتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھا ڈرائیور کو سنبھال کر دُوسری سیٹ پر اوندھا ڈال دیا۔

"یہاں کوئی ہسپتال ہے جناب! کوئی ڈاکٹر مل سکے گا اس وقت؟ پتہ نہیں اسے کیا ہو گیا۔ نبض تو اس کی چل رہی ہے۔" میں نے ڈرائیور کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

سپاہی میری بات پر اعتبار کر گیا۔ اس نے بھی ڈرائیور کی نبض دیکھی پھر گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"اُدھر سول ہسپتال میں لے جائیں جناب اسے۔ بدبخت پتہ نہیں کیسے کیسے نشے کرتے ہیں یہ ڈرائیور لوگ۔"

"اسے فوری علاج کی ضرورت ہے خدا کرے ڈاکٹر مل جائے۔" میں نے ٹیکسی میں بیٹھ کر اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔

"ہسپتال کس طرف ہوگا جناب!"

"وہ اُدھر پھاٹک کی طرف سے جائیں اور پُل کے نیچے سے گاڑی گزار لیں پھر کسی سے پوچھ لیں۔" سپاہی نے جان چھڑاتے ہوئے کہا۔

میں نے فوراً ہی گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ اور وہاں سے اسی وقت آگے نکل گیا۔ سپاہی کا خیال ہوگا کہ میں دائیں ہاتھ شہر کی طرف مڑوں گا مگر وہ سارا علاقہ میرا دیکھا بھالا تھا۔ مجھے کسی ہسپتال یا ڈاکٹر کی کیا ضرورت تھی۔ میں پلکھو کے پل پر سے گزرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

میں اس بچھّو کے ڈنک سے بال بال بچا تھا ورنہ اس نے تو مجھے سُولی پر چڑھوا ہی دیا تھا۔ اس کے تیور تو مجھے بہت پہلے یہ بتا چکے تھے کہ اس کے دل و دماغ میں زبردست جنگ جاری ہے مگر اس نے اشارۃً بھی مجھے یہ نہیں سمجھایا تھا کہ وہ مجھے پہچان گیا ہے۔ بڑی ڈھٹائی سے وہ میرے ساتھ ترکی بہ ترکی مکالمہ بازی کرتا آیا تھا اور اپنی باتوں سے وہ یوں ظاہر کر رہا تھا جیسے اس سے زیادہ بڑا عقلمند مہذب اور نرم مرد کبھی پیدا ہی نہیں ہوا مگر وہ سالا مجھے سیدھا تھانے کے دروازے پر لے گیا تھا۔ وہ تو شکر ہے کہ اس سپاہی کی عقل گھاس چرنے گئی تھی۔ اور اس گرامی قدر نے تو یہ تک دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی کہ کہیں میں نے اس کو گولی تو نہیں مار دی۔ ورنہ تو پتہ نہیں کیا ہو جاتا۔

میں سمجھتا ہوں کہ اُس لمحے میری وہ بلا کی اداکاری میرے کام آ گئی۔ میں جس افراتفری اور سراسیمگی کو چہرے پر سجائے گاڑی سے اترا تھا۔ وہ سپاہی کو فریب دینے میں میرے بہت کام آئی۔ اور اگر وہ دیکھ بھی لیتا۔ اس شکیل کا طبّی معائنہ بھی وہ اُس گھڑی کروا لیتا تو بھی وہ سب لوگ اسی نتیجے پر پہنچتے کہ ڈرائیور اچانک بے ہوش ہو گیا ہے۔ اور اس کی بے ہوشی اس کے کسی اندرونی پُرزے کی خرابی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ مگر وہ سالا مجھے گربھ میں گھونسا مارنے پر تُلا ہوا تھا۔ اس نے مجھے بہت بری طرح الجھا دیا تھا۔

میں گاڑی کو پچاس ساٹھ کی اسپیڈ پر دوڑاتا ہوا چناب کے پل پر سے گزر گیا۔ دونوں طرف کے سنتری ذرا دیر کے لیے چونکے مگر میں نے گاڑی کے اندر کی بتیاں روشن کر دیں کہ لو دیکھ لو، میں سادھ ہوں، چور نہیں ہوں۔ میرا حلیہ اچھی طرح ذہن نشین کر لو۔ ایک نفرت تھی جو میرے انگ انگ سے شعلوں کی طرح باہر کو لپکتی تھی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ جو کوئی بھی ملے اس کے کندھوں سے سر اتار دوں۔ یہ جو گھات میں بیٹھا آدمی آدمی کا شکار کھیلتا ہے اور چہرے پر پارسائی سجائے پھرتا ہے میرے لیے ناقابلِ برداشت ہو گیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس گھاگھس شکیل کا میں نے کیا بگاڑا تھا۔ میں تو اس بدبخت کو کرایہ پُورا ہی دے کر اُترتا۔ پھر بھی یہ مجھے باندھ کر

پولیس والوں کے پاس لے چلا تھا۔ وہ تو ساری رات مار مار کر میری چمڑی ادھیڑ دیتے اور پھر پوچھتے کہ ہاں میاں جیلانی یہ تمہاری ہی تصویر ہے نا بیٹے جو اخبار میں چھپی ہے اور جس کی نقل ہر تھانے میں پہنچا دی گئی ہے۔ میں گجرات شہر میں ٹھہرنے کے بجائے سیدھا کنجاہ کی طرف چل دیا۔ یہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جو پرندے کی اڑان پر چلیں تو گجرات سے چھ میل دُور ہے مگر پکی سڑک کے راستے وہ قصبہ گجرات سے چودہ میل کے فاصلے پر ہے۔ رات آدھی گزر چکی تھی مجھے صحیح اندازہ نہیں تھا کہ میں ابھی گجرات سے کتنی دور آ چکا ہوں۔ سڑک بالکل سنسان تھی۔ اتنی سنسان کہ اس جیسا سناٹا میں نے زندگی بھر نہیں دیکھا تھا۔ سردی اپنے عروج پر تھی۔ اور ارد گرد کھیتوں پر دُھند نے چادریں سی تان رکھی تھیں۔ سڑک بھی دُھند کی لپیٹ میں سہمی ہوئی نظر آتی تھی اور میں اس سمت بڑھ رہا تھا جدھر سُرخی تھی، خون تھا۔ قتل و غارتگری تھی اور میں نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ وہ سب کچھ میرے لیے لوحِ محفوظ پر کندہ ہے یا اب میں اپنے ہاتھوں سے اپنے نامۂ اعمال میں آپ ہی آپ زندگی کو سناٹوں کی زد میں پھینکتا جا رہا ہوں اور یہی وجہ ہے کہ مجھے قدم قدم پر بد ترین حالات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

میں آہو صاحب کے ہاں سے رات کا کھانا کھا کر نکلا تھا مگر پھر بھی اس وقت مجھے یہی محسوس ہوتا تھا کہ میں بھُوکا ہوں۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ جب میں بہت زیادہ غم زدہ ہوتا ہوں جب کوئی بات میرے وجود کو لرزا کر رکھ دیتی ہے تو میرا حال اس بچے کا سا ہو جاتا ہے جو نڈھال ہو کر دُودھ کی آرزو کرتا ہے یا پھر لوٹ پھُوٹ کر نیند کی آغوش میں جا گرتا ہے مجھ پر بھی لبا اوقات ایسی ہی کیفیت طاری ہوتی رہی ہے۔ اور اس وقت بھی میرا یہی جی چاہتا تھا کہ میرے سامنے ڈھیر سارا کھانا رکھا ہو اور میں اس پر دونوں ہاتھوں سے پل پڑوں۔ مگر میں سفر میں تھا، ایسے سفر میں جس کی کوئی منزل ہی متعین نہ ہو اور وہ چرکٹا ڈرائیور میرے ساتھ والی سیٹ پر آڑا ترچھا یوں پڑا تھا جیسے اس پر موت وارد ہوئے مدتیں گزر چکی ہیں۔

اچانک مجھے اپنے سامنے سڑک پر چار آدمی کھڑے نظر آئے وہ تیزی سے ہاتھ ہلا ہلا کر مجھے رُکنے کا اشارہ کر رہے تھے۔ ٹیکسی کی تیز روشنی اُن کے چہروں پر پڑی تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ خاصے کڑیل جوان تھے۔ انہوں نے سردی سے بچنے کے لیے کھیسوں کی بُکل مار رکھی تھی میں سمجھا وہ راہزن ہیں اور یونہی رات کے وقت اکیلے دُکیلے مسافروں کو اڑنگا دے کر لُوٹ لینے کا کاروبار کرتے ہیں۔ میں نے چاہا کہ گاڑی کی رفتار تیز کر کے ان کو کچلتا ہوا گزر جاؤں کیونکہ اپنی قسمت کے "یاوری" ہونے کا مجھے بخوبی اندازہ ہو چکا تھا۔ تقدیر نے میری راہ میں ہمیشہ گوکھرو ہی بچھائے تھے۔ ایسے نوکیلے سخت اور جان لیوا گوکھرو کہ ان پر چل کر میری ساری زندگی لہو لہان ہوئی جاتی تھی میری بھی، اور میری بہن آسیہ کی بھی۔

میں نے گاڑی کی رفتار تیز کر دی مگر جب میں ان کے [illegible] گزرا اور وہ پریشان ہو کر ایک طرف ہٹ گئے تو میں نے دیکھا [illegible] کے کنارے ایک چارپائی رکھی ہے جس پر کوئی آدمی لیٹا تھا اور کراہ رہا تھا۔ اس کے اوپر انہوں نے لحاف ڈال رکھا تھا۔ وہ [illegible] بیمار دکھائی دیتا تھا۔ میں نے وہ چارپائی دیکھی تو ان لوگوں سے [illegible] دور جا کر گاڑی روک لی اور دونوں پستولوں پر جیبوں کے [illegible] ڈال کر باہر نکل آیا۔ مجھے گاڑی سے اترتا دیکھ کر وہ پاگلوں [illegible] میری طرف بڑھے اور یک زبان ہو کر بولے۔

"باؤ جی خدا کے لیے ہماری مدد کرو۔ ہمارا باپ بہت بیمار ہے۔"

"اوہ" میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

"کیا تکلیف ہے اسے؟" میں نے سگریٹ سلگا کر [illegible] اطمینان سے پوچھا۔ ان چاروں کے ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں۔

"پتہ نہیں باؤ جی کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اسے دو خون کی [illegible] آئی ہیں۔ پیٹ میں درد ہے۔ اس کا بہت بُرا حال ہے باؤ جی اسے گجرات ہسپتال پہنچا دو۔"

"مگر میں تو... میں تو واپس نہیں جا سکتا۔"

"باؤ جی آپ فکر نہ کریں۔ میں گاڑی چلا سکتا ہوں [illegible] زیادہ سے زیادہ آدھ گھنٹہ لگے گا۔ میں آپ کو واپس جہاں [illegible] دُوں گا۔ میں خود آپ کی خدمت کروں گا۔" ایک جوان نے [illegible] دلگیر لہجے میں کہا۔ وہ کوئی پڑھا لکھا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ [illegible] بیماری نے اسے نڈھال کر رکھا تھا۔ میرے سارے اندیشے [illegible] ختم ہو گئے۔

"یہاں سے کنجاہ کتنی دور ہے؟"

"بس جی، یہی کوئی چھ سات میل ہو گا۔"

"ادھر کوئی ہسپتال نہیں ہے؟"

"ادھر ہی لے چلیں باؤ جی! آپ کی بڑی مہربانی [illegible]"

"ٹھیک ہے اپنے مریض کو اندر ڈالو۔ مگر اس [illegible] بیٹھ سکیں گے۔ چار کے لیے جگہ نہ ہو گی۔"

"ہم پیدل آ جائیں گے باؤ جی! آپ انہیں لے [illegible]"

"ٹھیک ہے۔ ڈالو بابا جی کو گاڑی میں۔" میں [illegible] سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ انہوں نے پچھلی سیٹ پر جوں [illegible] کو بٹھایا اور خود بھی اس کے ساتھ بھڑ کر بیٹھ گئے۔

"بشیر تم پیدل آ جاؤ ہم ادھر ہسپتال میں [illegible] کی دکان پر پہنچ جانا۔ صبح میں اسے بتا دوں گا۔" ایک [illegible] کھڑے دو جوانوں کو ہدایات دیں۔ وہ سب کے سب [illegible] ہوئے تھے۔ میں نے گاڑی چلا دی۔

"یہ... یہ کون ہیں بابو جی؟" ایک آدمی نے حیران ہو کر پوچھا۔

"یہ گاڑی کا ڈرائیور ہے۔ یہ بھی بیمار ہے اور بیہوش ہو چکا ہے۔"

"اچھا جی؟ کمال ہے۔ ہم تو سمجھے کہ..." وہ آدمی کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"کیا سمجھے تھے تم؟"

"ہم سمجھے تھے شاید یہ بالکل مر چکا ہے۔ چلو اس کا بھی ادھر علاج ہو جائیگا۔ ایک سگرٹ دیں گے باؤ جی آپ مجھے۔"

"یار قادر بڑا ہی کمینہ ہے تو!" اس کے ساتھی نے کہا۔

"اوئے یہ بھی تو حقہ ہی ہوتا ہے نا۔ باری لگا لینے میں کیا حرج ہے۔ حُقے والوں کی ایک اپنی ہی برادری ہوتی ہے۔ صادق بھائی تو پیتا نہیں ہے اس لیے بک بک کرتا رہتا ہے۔ دیں گے باؤ ایک سگریٹ،" اس کا نام قادر تھا اور بڑا ہی سادہ لوح قسم کا آدمی نظر آتا تھا۔ میں نے اسے سگریٹ دیا تو وہ خوش ہو گیا۔ گہرے گہرے کش لیتا ہوا بولا۔

"لُطف" آ گیا ہے باؤ جی! بڑا خوشبودار سگرٹ ہے آپ کا بہت مہنگا ملتا ہو گا جی۔"

"ہاں مگر حقے سے زیادہ مزیدار نہ ہو گا۔"

"ہاں جی حقے کی کیا بات ہے وہ تو اللہ کی رحمت ہوتا ہے۔ میرے میاں جی بھی کہا کرتے ہیں میاں جی اب کیا حال ہے۔" اس نے بڈھے کی طرف متوجہ ہو کے کہا۔ بوڑھا آنکھیں بند کیے خر خر سانس لے رہا تھا اور ٹھہر ٹھہر کر آہ کرتا تھا۔ وہ خاصا لمبے تڑنگے جسم آدمی تھا اور یوں لگتا تھا جیسے اسے اچانک ہی بیماری نے ڈھا دیا ہے۔

میں انہیں دو میل آگے لے آیا تو صادق بولا۔

"اوئے قادرا! بیڑہ غرق وہ پیسے تو اُدھر بشیر کے پاس ہی رہ گئے۔"

"دُر فٹے منہ تیرا۔ پڑھ لکھ کر گنوا دیا تو نے، اوئے میں نہ کہتا تھا کہ روپے تو خود جیب میں رکھ لے۔ اب وہاں جا کر تو اُدھر گنگ [illegible] رہے گا۔ چلا ہے میاں جی کا علاج کرانے۔ دوا کہاں سے خریدے گا۔ کیا کرے گا وہاں۔"

"یار وہ آتے ہی ہوں گے پیچھے۔ کوئی بات نہیں ہسپتال کا ڈاکٹر [illegible] دے دیگا۔" پھر سرگوشی میں بولا "پیسے ہی کتنے ہیں ان کے پاس کل [illegible] اٹھ روپے اس سے کیا ہو گا۔"

"ہو گا کیوں نہیں۔ ساٹھ روپے تیرے لیے کوئی چیز ہی نہیں۔ [illegible] رہے وہاں کیا ہوتا ہے۔ وہ تو پانی بھی مفت نہیں پلاتے۔ بیڑہ غرق [illegible] دیا ہے تو نے۔ باؤ جی! گڈی واپس نہیں ہو سکتی۔"

"نہیں، میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔"

"چلو قصہ ہی ختم ہوا۔ اپنے اس میاں جی کو بھی اسی وقت بیمار ہونا تھا۔ بھئی کوئی ٹیم دیکھو کوئی وقت ویلا، کوئی حالات شلات دیکھو پھر بیمار پڑو۔ پتہ نہیں اس کھنبی میں کیا مصیبت تھی۔" قادر سخت سٹپٹا گیا تھا۔

"وہ بڑی زہریلی کھنبی تھی قادر! شکر کرو میاں ابھی تک جی رہا ہے ورنہ وہ تو اندر پھاڑ کر رکھ دیتی ہے آدمی کا۔"

"پر اسے دوا کہاں سے ملے گی اب؟"

"مل جائے گی دوا بھائی مل جائے گی فکر نہ کرو۔" میں نے اس کی باتوں سے محظوظ ہو کر کہا۔

"اچھا جی باؤ جی؟ اگر آپ کہتے ہیں تو پھر ضرور ہی مل جائے گی دوا۔ بھلا آپ کے آگے کیا چیز مشکل ہے؟" پھر وہ اپنے باپ کی طرف متوجہ ہوا اور بولا۔

"اوئے یہ میاں بار بار کنوتیاں کیوں بدل رہا ہے، اسے ٹھیک سے بٹھا میرے یار۔" قادر نے ذرا پیچھے سرکتے ہوئے کہا۔ انہوں نے خود سُکڑ کر بوڑھے کے لیے جگہ بنائی اور اس کو زیادہ آرام سے بٹھا کر اس کے کندھے دبانے لگے۔

کنجاہ پہنچ کر میں انہیں سیدھا ہسپتال لے گیا اور اس کے سامنے گاڑی کھڑی کر دی۔

"اب ان دونوں کو اتارو۔ پہلے اپنے میاں کو اندر پہنچاؤ پھر اسے بھی اتارو۔"

وہ دونوں گاڑی سے نکلے اور اپنے میاں جی کو ہاتھوں پر اٹھا کر ہسپتال کے اندر لے گئے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ بھاگتے ہوئے واپس آئے۔ "وہ جی ڈاکٹر شاکٹر تو وہاں کوئی نہیں ہے۔ ایک کمپوڈر سا وہاں بیٹھا ہے اور دو نرسیں ہیں وہ بھی اندر سوئی ہوئی ہیں۔"

"چلو اسے بھی اندر لے چلو میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔" میں نے گاڑی سے اتر کر کہا۔

انہوں نے گاڑی سے ڈرائیور کو کھینچ کر باہر نکالا اور ہاتھوں پر اٹھا کر ہسپتال میں لے گئے۔ میں بھی اُن کے پیچھے تھا۔ ہسپتال ویران پڑا تھا۔ کچھ بھی تو نظر نہیں آتا تھا وہاں۔

میں ادھر زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھتا تھا مگر سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں۔ میں نے قادر کو اشارے سے باہر آنے کے لیے کہا۔ وہ تجسس کا مارا تیز تیز قدم اٹھاتا میرے ساتھ برآمدے میں آیا۔

"دیکھ قادر! تو ابھی ادھر جا کر ڈاکٹر کو جگا دے۔ یہ لے دو ہزار روپیہ۔ وہ جتنی فیس مانگے اسے دے دینا۔"

"دو ہزار؟ مگر باؤ جی۔"

"اوئے زیادہ باتیں نہ کر۔ لے یہ پکڑ۔ اس آدمی کا بھی علاج کرا دے۔

یہ بھی بہت بیمار ہے مگر دیکھ اسے بالکل یہ نہ بتانا کہ تو اس کے ساتھ اس ٹیکسی میں یہاں آیا ہے۔"

"کیوں باؤ جی؟"

"وہ آتا نہیں تھا۔ نخرے کرتا تھا۔ میں اسے زبردستی لایا تھا سمجھے؟ بالکل اسے کچھ نہ بتانا۔ وہ خود ہی سالا اٹھ کر گاڑی لے جائیگا۔ سمجھا کہ نہیں۔ میں اب جا رہا ہوں۔"

"آپ کی بڑی مہربانی ہے باؤ جی۔ یہ اچھے لوگ نہیں ہوتے ہیں یہ ڈرائیور کسی کی مصیبت کو سمجھتے ہی نہیں۔ پر آپ فکر نہ کریں۔ میں اس گل پھیڑے کو کچھ نہیں بتاؤنگا۔ پر جی یہ رقم۔"

"اب تو میرا بھائی ہے سمجھا کہ نہیں۔ تیری باتیں مجھے بہت اچھی لگی ہیں۔ بس اسی لیے یہ تجھے دے رہا ہوں میاں جی میرے بھی بزرگوں کی طرح ہیں۔ بس موج کر اب۔ اچھا خدا حافظ۔"

یہ کہہ کر میں نے اس کے کندھے تھپتھپائے اور ٹیکسی میں سے بریف کیس اور اٹیچی کیس نکال کر شہر کی طرف چل دیا۔ قادر کی حیرت دیدنی تھی وہ مجھے یوں دیکھ رہا تھا جیسے کوئی آسمانی مخلوق سمجھ رہا ہو۔

ایسا پاگل اس نے کہاں دیکھا ہوگا۔ جو لادے لدا دے اور لادنے والے کا ساتھ دے۔ کنجاہ میں میرا ایک بہت پرانا آشنا سا رہتا تھا ان دنوں اس کا نام رحیم داد تھا۔ کسی زمانے میں وہ میرے ساتھ لاہور میں پڑھا کرتا تھا۔ اس وقت میں دسویں میں تھا۔ دو سال تک ہمارا ساتھ رہا جس کے دوران اس نے دو بار مجھے اپنا گھر دکھایا تھا۔ میں نے سوچا کہ میں ادھر اُدھر بھٹکنے کے بجائے رات کا باقی حصہ اس کے گھر میں گزار لیتا ہوں میرے جیسے پریشان حال آدمی کے لیے ایسے وقت میں اس کے گھر سے زیادہ بہتر پناہ کہاں مل سکتی تھی۔

راستہ مجھے معلوم تھا۔ میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا سیدھا اس گلی میں جا پہنچا۔ جہاں رحیم داد سکونت پذیر تھا۔ اس سے میری ملاقات ہوئے بہت عرصہ گزر چکا تھا پھر بھی میرا خیال تھا کہ اگر گھر میں موجود ہوا تو مجھے دیکھ کر وہ بے حد خوش ہوگا۔ اس کا باپ بھی مجھے جانتا تھا اور مجھ سے بڑی محبت اور شفقت سے پیش آتا تھا۔

گلی میں روشنی نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ خاصی چوڑی گلی تھی، اتنی چوڑی کہ اس میں سے ٹرک بھی آسانی سے گزر سکتا تھا۔ میں تاروں کی دم توڑتی اداس، ویران اور موہوم روشنی کے سہارے آگے بڑھتا رہا۔ اور پھر میری یادداشت کے چراغ پوری آب و تاب سے جل اٹھے۔ میں ایک دروازے کو پہچان کر تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ چار سو لحد ایسی خاموشی طاری تھی۔ حد یہ تھی کہ رات کے اس حصے میں سردی نے زندگی کو اتنا شل کر دیا تھا کہ مجھے راستے میں کوئی کتا بھی نظر نہیں آیا تھا۔ حالانکہ ان کو بستیوں میں رات کو جاگنے اور بھونکنے کا فرض قدرت نے سونپ رکھا ہے۔ مگر اس رات کے اس جانگسل لمحے میں وہ بھی کہیں شاید اپنی ٹانگوں میں سر دیئے سمٹ سکڑ کر بے خبر لیٹے تھے۔

میں نے دروازے کو اس کی پرانی ہیئت کے لحاظ سے پہچ پھر بھی اپنی تسلی کے لیے میں نے ماچس جلا کر اچھی طرح اپنا اطمینان کے بعد دستک دی۔

چوتھی دستک پر اندر سے کسی عورت کی خاصے فاصلے پر لرزاں آواز سنائی دی "کون ہے؟" وہ کمرے سے نکل کر شاید آگئی تھی۔ اور گھر کے بڑے دروازے سے زیادہ دور نہیں تھی۔ اس خوف میں لتھڑی ہوئی آواز اور بے بسی سے لبریز لہجے نے مجھے کر دیا۔ گھروں میں مکین ہنستی بستی پرسکون عورتوں کو ایک ہلکی معمولی دستک پر یوں حواس باختہ ہونے کی کیا ضرورت ہے۔

میں دروازے کے ساتھ ہٹ کر کھڑا ہو گیا میری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر وہ ذرا بلند آواز سے بولی "کون ہے؟"

"میں رحیم داد صاحب سے ملنا چاہتا ہوں بی بی، میرا نام ہے میں لاہور سے آیا ہوں۔" میں نے اپنی آواز کو دبا کر کہا۔ میں تھا کہ میری آواز کسی اور کان تک نہ پہنچے۔ میں وہاں تک جا تو... تھا مگر میں اپنے ہی وجود سے خائف تھا۔ ہر جگہ مجھے اپنی شناخت بہت احتیاط سے ظاہر کرنے کی ضرورت تھی۔ اخباروں میں چھپے اور تصویروں نے مجھے زندہ درگور کر رکھا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی دروازے کے ساتھ آ ٹھ اب میرے اور اُس کے درمیان لکڑی کے تختے ہی حائل رہ گئے تھے تقریباً معدوم ہو چکا تھا۔ وہ پاؤں میں سخت ایڑی کا جوتا پہنے تھی کی ٹھک ٹھک اس کے قدموں کی آہٹ کا پتہ دیتی تھی۔

"رحیم داد تو یہاں نہیں رہتا۔ آپ اُن کے کوئی عزیز ہیں؟" اس کے لہجے کا ارتعاش اب بھی اس کے دل کی بے ترتیب اور دھڑکنوں کا پتہ دیتا تھا۔

"جی ہاں۔ مجھے ان کا عزیز ہی سمجھیں۔ ہم دراصل ایک پڑھتے رہے ہیں۔ ان کے والد عمر داد بھی مجھے جانتے ہیں۔" میں لہجے میں کہا۔ وہ کچھ دیر کے لیے چپ رہی اور پھر بولی۔

"آپ ذرا دیر کے لیے ٹھہریں۔ میں ابھی پتہ کر کے آپ ہوں کہ وہ آج کل کہاں رہتا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے پیچھے ہوئی اور ٹھک ٹھک چلتی میں دروازے سے ہٹ کر گلی کے وسط میں جا ٹھہرا۔ چاند آہستہ آہستہ اوپر اٹھ رہا تھا اور اس کی روشنی گرد و پیش کو منور کر رہی تھی ٹارچ کی تیز روشنی میرے چہرے پر پڑی میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ کوئی شخص اس مکان کی منڈیر پر کھڑا میرے چہرے پر روشنی ڈال رہا تھا۔ میں نے ادھر ذرا غور سے دیکھا تو مجھے معلوم ہوا

کسی عورت کے ہاتھ میں ہے جو سرخ چادر اوڑھے ہوئے چھت کی منڈیر پر کھڑی ہے۔ اس نے مجھے سر سے پیر تک ٹارچ کی روشنی میں سے گزارا پھر دور دور تک ہر شے پر نظر ڈالنے کے بعد اس نے ٹارچ بجھائی اور منڈیر پر سے غائب ہو گئی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ صرف مجھے دیکھنے اور اچھی طرح جانچنے کے لیے چھت پر چڑھی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ شدید بدگمانی کا شکار تھی اور انجانے خدشوں نے اسے پریشان کر رکھا تھا

ابھی چند ہی ساعتیں گزری تھیں کہ رحیم داد کے گھر کا دروازہ بڑی آہستگی سے کھل گیا۔ وہ سرخ پوش اب کی بار لالٹین لیے کھڑی تھی۔ بولی "آیئے، اندر آیئے۔" میں جب دروازے میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر عجیب سی زردی کھنڈی تھی نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ بڑے پھیکے انداز سے مسکرائی۔ اور دروازہ میرے پیچھے بند کرتی ہوئی بولی "ٹارچ اچانک خراب ہو گئی مجھے لیمپ اٹھانا پڑی۔"

"کوئی بات نہیں، یہ بھی تو روشنی دیتی ہے۔ رحیم داد صاحب گھر پر ہیں نا؟"

"جی نہیں، وہ لوگ تو عرصہ ہوا کراچی جا چکے ہیں۔ سارا کنبہ ہی وہاں رہتا ہے۔ ہم ان کے کرایہ دار ہیں۔"

"اچھا۔ پھر تو میں نے آپ کو بلاوجہ زحمت دی۔" یہ کہہ کر میں پیچھے مڑا تو وہ میرا راستہ روکنے لگی۔ اس کی سرخ رنگ کی چادر بہت خوبصورت تھی اور اس کے چہرے کی دلکشی میں چار چاند لگا رہی تھی۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر یہ احساس آپ ہی آپ میرے دل میں ابھر آیا تھا کہ گھر آدمی کی جنت ہے وہ بڑی ہی اپنائیت سے بھیگے ہوئے لہجے میں بولی۔

"آپ لاہور سے آئے ہیں؟"

"جی ہاں۔ مجھے یہاں پہنچنے میں دیر ہو گئی۔ اس زحمت کے لیے میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔"

"جی نہیں، معافی کی کیا بات ہے آپ بھلا اس وقت کہاں جا سکیں گے۔ کوئی اور عزیز ہیں آپ کے یہاں؟"

"نہیں مجھے اب ادھر کوئی اور ٹھکانہ دیکھنا پڑے گا۔" یہ کہہ کر میں پھر پیچھے ہٹا۔ تو پھر اس نے میرا راستہ روک لیا۔ بولی۔

"ایسے آپ رحیم داد ہی کا گھر سمجھیں۔ ہم ان کے کرائے دار ہی نہیں، عزیز بھی ہیں۔ رات یہیں ٹھہر جایئے۔"

"نہیں۔ آپ کو بلاوجہ پریشانی ہو گی۔"

"جی نہیں پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ آپ اندر تشریف لے چلیں" وہ میرے پہلو میں آ کھڑی ہوئی۔ وہ یوں دیکھ رہی تھی جیسے پوچھ رہی ہو، میرے کہنے پر بھی اندر نہیں چلو گے؟

ایک لحظے کے لیے میں نے صورتِ حال پر غور کیا اور پھر فیصلہ کن انداز سے پیچھے مڑ کر میں نے قدم آگے بڑھا دیا۔ لالٹین کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اس کے رخسار تمتمانے لگے تھے۔ مجھے یہی محسوس ہوا کہ میری غیر متوقع آمد پر وہ خوش ہو گئی ہے۔ وہ تیزی سے میرے آگے نکلی اور صحن میں پہنچ کر بولی "ادھر آجایئے۔ اس کمرے میں" اس نے ایک کھلے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے پیچھے پیچھے میں بھی کمرے میں جا گھسا۔ وہاں دائیں ہاتھ ایک پلنگ پڑا تھا۔ جس پر اس نے سفید چادر بچھا رکھی تھی اور ایک ریشمی لحاف اس پر ادھ کھلا پڑا تھا۔ وہ اسی میں سے نکل کر باہر گئی تھی۔ کمرے میں اگر بتی سلگ رہی تھی۔ پلنگ کے سامنے دیوار کے ساتھ ساتھ چار کرسیاں دھری تھیں جن کے سامنے ایک چھوٹی سی میز پڑی تھی۔ اپنی توفیق اور اپنے ذوق کے مطابق اس نے کمرے کو بہت عمدہ طریقے سے سجا رکھا تھا پلنگ کے ساتھ کھڑکی تھی۔ جس میں اس نے ایک خوبصورت سا ریڈیو رکھا تھا۔ اور وہ اس لمحے بھی شوں شاں کر رہا تھا۔ مجھے کمرے میں پہنچا کر وہ بولی۔

"بیٹھیں ادھر کرسی پر تشریف رکھیں میں آپ کے لیے چائے بناتی ہوں۔ اگر آپ چاہیں تو میں کھانا لے آؤں۔" اس کا لہجہ خاصا شستہ تھا۔

"آپ کہاں پریشان ہوتی پھریں گی۔"

"نہیں نہیں! پریشانی کی کیا بات ہے جیلانی صاحب آپ کی ـــــ خدمت کر کے مجھے دلی خوشی ہو گی۔" میں نے پھٹی پھٹی نظروں سے اسے دیکھا تو اس نے شرما کر نگاہیں جھکا لیں اور تیزی سے باہر نکل گئی۔ سرخ چادر کے نیچے وہ سفید رنگ کی ساٹن کی قمیص شلوار پہنے تھی اور اس کے پاؤں میں بڑے خوبصورت سے سفید سینڈل تھے۔ اسے لباس پہننے کا سلیقہ آتا تھا۔ آنکھیں اس کی غیر معمولی طور پر بہت ہی صاف شفاف اور چمکدار تھیں۔ رنگ گورا تھا اور جب وہ شرماتی یا کسی بات پر جوش میں آتی تھی تو اسکے رخسار تمتما کر سرخ انار ایسی رنگت پکڑ لیتے تھے۔ ایک عورت کے وجود میں ـــــ جتنا اسلحہ ہونا چاہیئے وہ سارے کا سارا اس میں موجود تھا۔ وہ مجھے غیر متوقع طور پر بہت ہی اچھی لگی۔ شاید اس لیے بھی کہ اس حرماں نصیب رات کے اس پہر میں ملی تھی اور ایسے شہر میں ملی تھی، جہاں میرا کوئی بھی پرسانِ حال نہ تھا جہاں اس گھڑی مجھے سر چھپانے کے لیے کسی جگہ کے مل جانے کی کوئی توقع ہی نہ تھی۔

وقت نے تو میری کوچیں کاٹ ڈالی تھیں۔ بگولوں کی آغوش میں تنکے کی طرح تقدیر مجھے کہاں سے کہاں اچھالتی پھر رہی تھی۔ اس اجنبی گھر میں وہ اجنبی عورت اس لمحے مجھے قدرت کا حسین ترین عطیہ نظر آئی۔ میں نے اٹیچی کیس اور بریف کیس اس کے پلنگ

کے نیچے رکھے اور خود بڑے اطمینان سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ میرا سارا بدن شل ہو رہا تھا۔ تھکن نے چور چور کر رکھا تھا۔ اور میرا جی چاہتا تھا کہ میں دنیا جہاں سے بے نیاز ہو کر اس پلنگ پر لیٹوں اور پھیل کر سو جاؤں۔

کوئی دس منٹ کے بعد وہ عورت ایک خوبصورت سے کشمیری طرز کے سماوار میں مہکتی ہوئی چائے بھر کر لے آئی۔ بولی۔ "لیں جناب یہ پئیں۔ اتنے میں میں آپ کے لیے کھانا بناتی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے ایک پیالی میں چائے بھر دی اور پھر میرے ساتھ والی کرسی پر یوں بیٹھ گئی جیسے وہ مجھے صدیوں سے جانتی ہو۔

"آپ نے اپنا نام نہیں بتایا۔"

"میرا نام ماجدہ ہے۔ ماجدہ وحید۔" وحید تک پہنچتے پہنچتے وہ پریشان ہو گئی۔

"یہ وحید صاحب کون ہیں؟" میں نے پیالی اس کے ہاتھ سے لی تو میری انگلیاں اس کی انگلیوں سے مس ہو گئیں۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس کی انگلیاں اس چائے سے زیادہ گرم تھیں۔ اس کی شخصیت کا سحر گرد و پیش کو تمازت بخش رہا تھا۔

"میرے شوہر۔"

"کیا مطلب؟ وہ کہاں ہیں اس وقت میں کچھ سمجھا نہیں۔"

"یہ لمبی کہانی ہے جیلانی صاحب! وہ دو سال سے ادھر ڈنمارک میں رہ رہے ہیں اور وہاں انہوں نے کسی یورپین سے شادی کر لی ہے۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اکیلی رہتی ہیں یہاں۔" میں نے پہلی بار اپنی حیرت کا اظہار کیا۔

"جی ہاں میں یہاں بالکل تنہا ہوں۔ ساٹھ روپے اس مکان کا کرایہ دیتی ہوں۔"

"آپ کا بچہ کوئی نہیں ہے؟"

"جی نہیں۔ وحید صاحب شادی کے کچھ ہی ماہ بعد باہر چلے گئے تھے۔"

"اوہ! میں سمجھا۔ بڑی حیرت کی بات ہے اور اب آپ یہاں تنہا ہیں اور اتنی جرأت سے آپ نے میرے ایسے اجنبی کو گھر میں ٹھہرا لیا۔"

"آپ اجنبی کہاں ہیں۔ سلیم داد کے دوست ہیں تو پھر میرے لیے آپ غیر تھوڑی ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر۔۔۔ مگر۔۔۔ مجھے حیرت ہے۔ بہر حال میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھ پر اعتماد کیا ہے۔"

"آپ بیٹھیں میں آپ کے لیے کھانا لاتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھی تو یونہی بے خیالی میں اس کا ہاتھ کرسی کے بازو پر دھرے میرے ہاتھ پر جا پڑا۔ اس کی ہتھیلی میں ایسا گداز تھا کہ میں نے چاہا کہ اس کا ہاتھ ابد تک میرے ہاتھ پر دھرا رہے۔ اس نے میرے ہاتھ کو ذرا سا دبایا اور پھر مسکراتی ہوئی صحن میں نکل گئی۔

اس کے اس رویے نے مجھے حیران کر دیا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ تنہائی میرے گرد پُراسرار قسم کا جال بن رہی ہے۔ زندگی میں پہلی بار میرے دل میں یہ آرزو ابھری کہ میں خود کو کسی وجود میں سمو دوں، تحلیل کر دوں۔ اپنی اکائی کو فنا کے گھاٹ اتار کسی میں ضم ہو جاؤں۔ ماجدہ مجھے اس سناٹوں سے لبریز گھر میں کے لق و دق صحرا میں ایسا نخلستان دکھائی دیتی تھی جس میں پہنچ کر آدمی اپنی ساری کلفتیں بھول جاتا ہے۔

جب ماجدہ مجھے کھانا کھلا چکی تو بولی۔

"آپ کپڑے تبدیل کر لیں اور آرام کریں۔"

"کہاں؟"

"یہیں سو جائیں اسی پلنگ پر۔"

"مگر آپ؟ یہ تو آپ کا پلنگ ہے۔"

"تو کیا ہوا! مجھے تو آج ویسے بھی نیند نہیں آ رہی ہے۔ ابھی تک جاگ رہی تھی۔ میں ادھر دوسرے کمرے میں سو جاؤں گی۔"

میں نے بریف کیس کھولا تو مجھے یاد آیا کہ اپنا کرتہ تو میں جیب تراش نثار کو دے آیا ہوں۔ وہ بڑی مشکل سے ہنستے ہوئے بولی۔

"ٹھہریں۔ میں آپ کو چادر لا دیتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ دوسرے کمرے کی طرف لپکی اور ایک صاف ستھری سفید ریشمی لاچہ الماری سے لاکر اس نے مجھے دے دی۔ وہ میں اس کے سامنے ہی کمر پر باندھ رہا تھا تو وہ بولی۔ "یہ اچھی لگی ہے آپ کو۔" میں نے اس کے سامنے ہی ٹائی کھولی اور پھر جب سوئٹر بدن سے الگ کیا تو میری کمر سے بندھے پستول کو دیکھ کر وہ ٹھٹکی، مگر پھر کھل اٹھی بولی۔

"یہ پستول کیوں باندھ رکھا ہے آپ نے؟"

"میرے پاس اس کا لائسنس ہے جناب! جو ہر شریف آدمی کو مل سکتا ہے جس کے پاس جائیداد ہو، روپیہ ہو اور جو اپنے علاقے کا باعزت آدمی ہو۔ سمجھتی ہیں نا آپ؟"

"جی معلوم ہوتا ہے کہ آپ بھی اپنے شہر کے رئیس ہیں۔" وہ پستول کو دیکھ کر ایک دم بے حد خوش ہو گئی تھی اور اسے بڑے پیار سے چھو رہی تھی۔

"اس میں کیا شک ہے جناب! بینک بھر رکھے ہیں اپنے پیسے سے۔ اب بھی میری جیب میں خاصے پڑے ہیں۔" میں نے نوٹوں کی گڈیاں نکال کر اسے دکھائیں۔ پتہ نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں اسے اچھی طرح مرعوب کر دوں۔ اس حد تک کہ اگر میں کہوں کہ میری انگلی پر ریشمی دھاگے کی طرح لپٹ جاؤ تو وہ انکار نہ کرے۔ اپنے وجود کو پگھلا کر بھی میرے حکم کی تعمیل کرے۔

"نوٹ نہ دکھائیں جناب مجھے۔ میرے دل پر ویسے ہی آپ کا بہت رُعب جم چکا ہے۔"

"اچھا! کتنا رعب جم چکا ہے؟"

"جتنا آپ سمجھ لیں۔"

"اتنا رعب کہ اگر میں کہوں۔۔۔ میں کہوں۔۔۔ کہ آپ۔۔۔"

"ہاں ہاں کہیے رک کیوں گئے آپ۔" اس نے میرے کپڑے ایک ایک کر کے بڑے سلیقے سے بنا سنوار کر ہینگروں میں لٹکاتے ہوئے کہا۔

"چلیں رہنے دیں کہیں آپ ناراض ہی نہ ہو جائیں۔"

"نہیں، میں آپ کی کسی بات کا برا نہیں مانوں گی۔" وہ ایکدم سنجیدہ ہو گئی۔ میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ ٹھہر ٹھہر کر ایک دم خاموش ہو جاتی ہے۔ اس کے کان کسی آواز کے منتظر تھے اور جب وہ اس آواز کی طرف متوجہ ہوتی تھی تو اس کے چہرے کی رنگت بدلنے لگتی تھی مگر پھر وہ اپنی اس حالت پر جلدی ہی قابو پا لیتی تھی۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ رات کا ڈیڑھ بج چکا تھا۔۔۔ یکایک باہر دروازے پر ایک بڑی ہلکی سی غیر محسوس قسم کی بھیدوں بھری دستک ابھری۔

"ٹھک، ٹھک، ٹھک" تین بار کسی نے دروازے کے تختے پر اپنی انگلی بجائی۔ ماجدہ تڑپ کر اٹھ کھڑی ہوئی — اس کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ اور ماتھے پر میرے دیکھتے ہی دیکھتے پسینے کے قطرے ابھر آئے تھے۔

"یہ دستک کیسی ہے؟"

"پتہ نہیں کون ہے۔ میں دیکھتی ہوں۔"

"کوئی تمہارا جاننے والا ہے؟"

"پتہ نہیں کون ہے میں دیکھتی ہوں۔" وہ بڑبڑائی۔ اس کے چہرے پر سوچوں نے جال سا بُن دیا تھا۔ دروازے پر ایک بار پھر دستک ہوئی کسی نے ایک بار پھر بڑے تسلسل سے تین بار تختے کو کھٹکھٹایا۔

"ٹھہرو۔ میں دیکھتا ہوں کون ہے۔"

"نہیں جیلانی صاحب! پتہ نہیں وہاں کون کھڑا ہے۔ آپ اپنے بارے میں کیا بتائیں گے اسے۔" یہ کہہ کر وہ اپنی گرم چادر بدن پر لپیٹتی ہوئی سلیپر پہن کر دروازہ کھولنے چلی۔ لالٹین اس نے وہیں رہنے دی۔

"میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔"

"نہیں، آپ ادھر اندر سے کمرے کا دروازہ بند کر کے بتی بجھی رہنے دیں۔" وہ جھنجھلا کر بولی اور کنڈی کھول کر باہر نکل گئی۔ سرد ہوا کا تیز جھونکا اندر آیا تو میں نے پیچھے ہٹ کر قمیص پہن لی۔ نہ جانے خدشے میرے دل میں سر اٹھا رہے تھے میں نے تیزی سے اپنا سائیلنسر لگا پستول پیٹی سے نکالا۔ اس کا چیمبر کھول کر گولیاں گنیں اور پھر اسے ڈب میں رکھ کر میں صحن میں نکل کر دبے پاؤں ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا۔ ڈیوڑھی کے دائیں طرف بالکل نکڑ میں ان کے گھر کا دروازہ تھا۔ ماجدہ اس دروازے کے ساتھ بھڑ کر کھڑی تھی اور کسی کو دبی زبان میں کہہ رہی تھی۔

"میرے گھر میں مہمان آئے ہوئے ہیں۔ چوہدری صاحب خدا کے لیے چلے جائیں۔"

"تم دروازہ تو کھولو میں بس ابھی چلا جاؤں گا۔ اتنی مشکلوں سے یہاں تک آیا ہوں۔" ایک بھاری آواز سرگوشی کر رہی تھی۔

"نہیں، میں دروازہ نہیں کھول سکتی۔ چوہدری صاحب بالکل نہیں۔ آپ کا قرض میں جلد چکا دوں گی۔"

"بکواس مت کر۔ دروازہ کھول دے ورنہ اچھا نہ ہوگا۔" اچانک چوہدری کا لہجہ بدلنے لگا۔ میں بالکل اندھیرے میں کھڑا تھا۔ ماجدہ ٹھہر ٹھہر کر پیچھے دیکھ رہی تھی اس ڈر سے کہ کہیں میں ادھر نہ آ جاؤں۔ وہ سخت خوفزدہ تھی۔ اپنے اس بھید کو وہ مجھ سے ہر حال میں چھپا لینا چاہتی تھی۔

"کیا کہتی ہے یہ گشتی چوہدری صاحب۔" ایک نہایت ہی کھردری آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ معلوم یہ ہوا کہ وہاں ایک نہیں دو آدمی کھڑے ہیں۔ انہوں نے بڑے زور سے دروازے کو پیچھے دھکیلا۔ خوفناک قسم کی چرچراہٹ پیدا ہوئی۔ ماجدہ گلوگیر آواز میں بولی۔

"اندر میرے مہمان آئے ہیں۔ میرے ماموں اور ان کا بیٹا۔ میں آج دروازہ نہیں کھولوں گی۔ چوہدری صاحب!"

"دروازہ کھول، ورنہ ہم چھت پر سے اندر آ جائیں گے۔" اس آدمی نے ایک خوفناک قسم کی بڑی پیچدار گالی ماجدہ کی طرف لڑھکائی۔ مجھ سے یہ سب برداشت نہ ہو سکتا تھا۔ وہ اس عورت کو ذلیل کر رہے تھے۔ جو تھوڑی دیر پہلے تک میری شہ رگ سے بھی۔۔۔ زیادہ قریب رہ چکی تھی۔ میں اس کی یہ ذلت برداشت نہ کر سکا۔ میں اندھیرے میں لپکتا ہوا آگے بڑھا اور ماجدہ کو ایک طرف ہٹا کر میں نے دروازہ چوپٹ کھول دیا۔ جاتے ہی میں نے پوری قوت سے سامنے کھڑے بھاری بھرکم آدمی کو گریبان سے پکڑ کر اندر کھینچ لیا۔ دوسرا آدمی بھی تیزی سے اندر آ گیا اور ڈب سے خنجر نکال کر میری طرف بڑھا۔ مگر میں نے اس چوہدری کو گھما کر اس کی طرف اچھال دیا۔ ڈیوڑھی میں دروازہ کھلنے کی وجہ سے روشنی سی نظر آتی تھی۔ چاند بھی خاصا اوپر ابھر آیا تھا۔

وہ دونوں ٹکرائے تو ماجدہ نے تیزی میں دروازہ بند کر دیا۔ روشنی کم ہو گئی مگر اب بھی وہ مجھے صاف نظر آ رہے تھے۔ میں نے پوری قوت سے ایک گھونسا اس چوہدری کے منہ پر مارا تو وہ بائیں ہاتھ جھک گیا۔ اتنے میں اس کا ساتھی مجھ پر خنجر سے حملہ آور ہوا۔ میں نے

ان کی خنجر بردار کلائی پکڑ کر مروڑی تو خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ ماجدہ نے اسے فوراً اٹھا لیا۔ اتنے میں چوہدری اپنی شیروانی کی جیب میں ہاتھ ڈال چکا تھا۔ وہ اپنا ہتھیار نکال رہا تھا۔ میں نے اس کے ساتھی کی کلائی اور زیادہ مروڑ کر اسے منہ کے بل دوسری طرف گرایا اور پھر دونوں ہاتھوں میں چوہدری کی گردن دبوچ لی۔ وہ میری طرف جھکا تو میں نے پوری قوت سے اس کی رگیں مسل دیں۔ نسخہ وہاں بھی کارگر ثابت ہوا اور وہ دھم سے زمین پر گر گیا۔ اس کا ساتھی اب بالکل نہتا تھا۔ وہ اٹھ کر [illegible] گھونسے برسا رہا تھا۔ میری پسلی پر میری کمر پر۔ میں نے پلٹ کر [illegible] ٹانگوں میں ٹانگیں پھنسائیں اور اس کا بازو پکڑ کر ایک بار پھر [illegible] کہ وہ درد سے بلبلا اٹھا۔

"چلا ادھر اندر چل۔ [illegible] ہوں تم دونوں کتنے پانی میں ہو۔" یہ کہہ کر میں اس کے بازو [illegible] دیتا ہوا اسے آگے لے چلا۔ وہ درد سے نڈھال ہو رہا تھا مگر گلے سے نکلتی آواز بلند نہیں کرتا تھا۔ وہ بھی میرا خیال ہے اپنی جگہ خوفزدہ تھا۔ کیونکہ وہ ایک آباد محلے میں ایک تنہا عورت کے گھر رات کے پچھلے پہر دھاوا بولنے کے مجرم تھے اور غالباً جانتے تھے کہ رسوائی اور جگ ہنسائی کتنی ہو گی۔

اس آدمی کو اندر لے جا کر میں نے کمر پر گھٹنے کی ٹھوکر ماری تو وہ منہ کے بل فرش پر گر گیا۔ میں نے اپنی ڈب سے پستول نکال کر ماجدہ کو دیا۔

"اگر یہ کوئی حرکت کرے تو اسے گولی مار دیں۔ اس گولی کی کوئی آواز نہیں نکلے گی۔" ماجدہ نے بڑے اعتماد سے پستول میرے ہاتھ سے لے کر اس آدمی پر تان لیا۔ میں انہی قدموں واپس ڈیوڑھی میں پہنچا۔ اور چوہدری کو گھسیٹتا ہوا ماجدہ کے کمرے میں لے آیا۔ اس کا ملازم خوف سے پیلا ہو چکا تھا۔ اور پھٹی پھٹی نظروں سے چوہدری کو دیکھ رہا تھا۔

"کیا نام ہے ان کا؟" میں نے پستول ماجدہ کے ہاتھ سے لیکر چوہدری کے ملازم پر تان لیا۔ وہ سہم کر پلنگ کے پائے سے جا لگا۔

"یہ چوہدری کرامت ہے اور یہ اس کا نوکر فیروز۔" ماجدہ نے بڑے بجھے ہوتے لہجے میں کہا۔

"کیا چاہتے تھے یہ؟" ماجدہ میرا یہ سوال سن کر کرسی پر ڈھے گئی۔ اور بڑے زخم خوردہ لہجے میں بولی۔

"یہ مجھے کئی دنوں سے ذلیل کر رہے تھے۔ اس کرامت سے میرے شوہر نے ڈنمارک جانے کے لیے پندرہ ہزار روپے قرض لیے تھے مگر وہ وہاں جا کر ایسا مست ہو گیا کہ اس نے مجھے ایک پائی نہیں بھیجی۔ یہ کرامت مجھ سے بار بار تقاضا کرتا رہا۔ مگر میں کیا کر سکتی تھی۔ وحید بالکل ہی لاپرواہ ہو چکا تھا۔ میں نے اپنے گزارے کے لیے ادھر ایک اسکول میں نوکری کر لی۔ جوں توں کر کے میں وقت تو گزار رہی ہوں مگر میں اس کا قرض کہاں سے چکاتی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یہ شیر ہو گیا۔ اور پھر ۔۔۔ کچھ دن پہلے اس نے میرے گھر میں آ کر میری سخت بے عزتی کی۔ مجھے دھمکی دی اگر میں نے اس کا کہا مان لیا تو یہ مجھ سے کبھی قرض کا مطالبہ نہیں کرے گا۔ ورنہ یہ مجھے گھر سے اٹھا لے گا۔ مگر میں اس کے منہ پر تھوکتی بھی نہیں ہوں۔ کل اس نے مجھے کہا تھا کہ آج یہ میرے گھر آئیگا۔ میں بے بس مجبور عورت اپنی عزت کی خاطر اس روز کی بے عزتی سہہ گئی تھی مگر اب سب کچھ میرے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ اس کی اپنی تین بیویاں ہیں پھر بھی یہ دوسروں کی بہو بیٹیوں پر نظر رکھتا ہے۔ ان کو ذلیل کرتا رہتا ہے۔ اس نے پندرہ ہزار روپے کی آڑ لے کر مجھے کھلونا بنانا چاہا۔ اس نے میرے شوہر کو اسی لالچ میں قرض دیا تھا۔ میں آج رات اسی لیے جاگ رہی تھی کہ اس نے آنے کی دھمکی دی تھی۔ مگر آج میں نے طے کر رکھا تھا کہ میں اپنی جان دے دوں گی مگر اس کی دھمکیوں میں نہیں آؤں گی۔ میں تو سمجھی تھی کہ میں اس کتے کے شر سے بچ گئی مگر یہ پھر بھی آ دھمکا۔ دیکھو تو اس کے منہ سے کیسی بو آ رہی ہے۔ شراب پی کر آیا ہے یہ۔" اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔

"ہوں۔ تو یہ بات ہے۔ اس طرح یہ بھیڑیے راتوں کو آ کر اپنے شہر کی بہو بیٹیوں کی عزت سے کھیلتے رہتے ہیں۔ یہ فیروز بھی ساتھ ہی ہوتا ہے؟"

"ہاں۔" ماجدہ ایک دم بکھر گئی۔ "اس کتے نے بھی اس دن مجھے بہت ذلیل کیا تھا۔"

"کیوں اوئے! سچ کہتی ہے یہ؟"

"مجھے معاف کر دیں چوہدری جی! خدا واسطے مجھے معاف کر دیں۔ میرا کوئی کسور نہیں ہے چوہدری جی۔ بس بھول ہو گئی مجھ سے۔"

"ہاں بھول تو ہوتی ہی ہے۔ دیکھنا رہ میں تم دونوں کا بندوبست کرتا ہوں۔ ایک رسی لائیں ۔۔۔ ماجدہ! ذرا مضبوط ہونی چاہیے۔" ماجدہ نے آنسو پونچھے اور دوسرے کمرے سے نائلون کی رسی کا سبز رنگ کا گچھا لے آئی۔ وہ میں نے کھولا اور پستول ماجدہ کے ہاتھ میں دے کر فیروز کی طرف بڑھا۔

"کھڑا ہو جا بے۔" اسے میں نے زبردست قسم کی گندی دے کر ٹھوکر ماری۔ وہ لرزتا لرزتا اٹھا اور ہاتھ جوڑ کر بولا "معاف کر دیں چوہدری صیب۔" اس کی یہ بات سنتے ہی میں نے بائیں ہاتھ کا ایک جھانپڑ اس کے منہ پر دے مارا۔ وہ پیچھے کو الٹا پلنگ پر گرا۔ میں نے فوراً ہی اس کی دونوں ٹانگیں پکڑ کر رسی میں جکڑ دیں۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر اس کی کمر پر میں نے کہنی کی ایسی ضرب لگائی کہ وہ پھر پلنگ پر اوندھے منہ گر گیا۔ مجھے یہ ڈر تھا کہ یہ شور نہ مچا دے۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن دبوچی اور انگوٹھوں سے پوری قوت سے اس کی رگ دبا دی۔ وہ اسی وقت بے ہوش ہو گیا۔ کام زیادہ آسان ہو گیا تھا۔ میں نے ان دونوں کے ہاتھ پاؤں رسی سے اچھی طرح جکڑ دیے۔ اس کے بعد اس کے منہ میں کپڑے ٹھونس کر ان پر مضبوط پٹیاں باندھ دیں۔

"کہیں یہ مر تو نہیں گئے؟" ماجدہ نے پریشان ہو کر کہا۔

"نہیں یہ مرے نہیں ہیں ایک دو گھنٹے کے لیے چھٹی پر چلے گئے ہیں۔"

"کیا کہا آپ نے؟" وہ حیران ہو رہی تھی۔

"میں نے انہیں بے ہوش کر دیا ہے۔ اب یہ دو گھنٹے تک ہل جل نہیں سکتے ہیں۔"

"آپ نے کمال کر دیا ہے جیلانی صاحب۔ اس خبیث سے تو سارا قصبہ عاجز ہے۔ اس نے میرے اسکول کی ایک استانی کو پچھلے سال اغوا کر لیا تھا۔ اس کی ابھی تک کوئی خبر نہیں ملی ہے۔ بہت ہی ذلیل آدمی ہے یہ۔ پانچوں عیب شرعی اس میں موجود ہیں۔ پہلے یہ خود لڑکیوں کی عزت لوٹتا ہے پھر ان کو اپنے نوکروں کے حوالے کر دیتا ہے۔" ماجدہ کرسی پر بیٹھ کر پھر رونے لگی۔ پتہ نہیں اس کے کس زخم پر سے کھرنڈ اترا تھا۔ کس گھاؤ کا ٹانکا ادھڑ گیا تھا۔ وہ بہت ہی سراسیمہ اور شکست خوردہ نظر آتی تھی وہ مجھ سے کچھ چھپا رہی تھی۔ بات کو گول کر رہی تھی۔ وہ کہتی تھی [illegible] نے اسے بے عزت کیا تھا مگر حقیقت مجھے یہ نظر آتی تھی کہ وہ دونوں کتے اس کی عزت سے کھیل چکے تھے اور گھر میں بے بس اور مجبور پا کر وہ اس پر چڑھ دوڑے تھے اور اس نے خوفزدہ ہو کر اُن کے آگے سپر ڈال دی تھی۔ وہ کسی بھی صورت میں یہ اعتراف کرنے پر آمادہ نہ تھی کہ وہ ان کے ہاتھوں اپنی عصمت کا گوہر لٹوا چکی ہے مگر حقیقت یہی تھی، اس کی تو بات ہی اور تھی۔ میرا خیال ہے کوئی بھی عورت جب تک اس کے اختیار میں ہو یہ اعتراف نہیں کرتی ہے کہ کوئی اس کو ذلت کے ان مراحل سے گزار گیا ہے۔ میرا خیال ہے ایسی ہزاروں لاکھوں عورتیں ہوں گی جن کے وجود پر ان گنت ہاتھوں کے ان گنت نقوش ثبت ہوتے ہیں مگر وہ ان کا نام نہیں لیتی ہیں لے ہی نہیں سکتی ہیں کہ شرم و حیا اور اخفاء راز کا دوسرا نام عورت ہے۔ یہی حال ماجدہ کا تھا۔ اس کا چہرہ اس کے اندر برپا قیامت کا پتہ دیتا تھا اور مجھے اس کرامت اور فیروز پر اس قدر طیش آ رہا تھا کہ میرا جی چاہتا تھا میں انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر کے زمین میں دبا دوں۔

اچانک ایک عجیب سا خیال میرے ذہن میں لہرا گیا۔ میں نے کہا۔

"آپ ان کو سنبھالیں میں ابھی آتا ہوں۔ ماجدہ گھبرائیں بالکل نہیں، میں انہیں ایسی سزا دوں گا، جو یہ زندگی بھر یاد رکھیں گے۔"

یہ کہہ کر میں نے پتلون پہنی، گلے میں ٹائی لگائی اور سوئیٹر چڑھا رہا تھا میں نے دائیں ہاتھ کرسی پر رکھے کمبل کو اٹھا کر اوڑھ لیا۔ جب میں ونے پہن چکا تو وہ بولی۔

"آپ کہاں جا رہے ہیں اس وقت؟"

"میں بس ابھی واپس آ جاؤنگا، ایک بہت ضروری کام کرنا ہے مجھے۔"

"کہیں آپ تھانے تو نہیں جا رہے ہیں؟"

"نہیں ماجدہ جی! مجھے ان لوگوں سے کیا لینا ہے۔ آپ بس اندر سے دروازہ بند کر لیں۔" یہ کہہ کر میں نے سائیلنسر لگا پستول جیب میں ڈال لیا اور نثار کا پستول میں نے ماجدہ کے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ حیران سی ہو کر بولی۔ "یہ دو پستول کیوں رکھے ہیں آپ نے؟"

"یہ میں نے ایک ڈاکو سے چھینا تھا۔ اس میں گولیاں بھری ہیں اگر کوئی گڑبڑ ہو تو اس سے کام لیں۔ میں بس آدھ گھنٹے میں آ جاؤں گا۔"

"آپ اس وقت باہر مت جائیں۔ مجھے سخت خوف محسوس ہو رہا ہے۔"

"بالکل مت ڈریں ماجدہ! حوصلہ رکھیں میں بہت جلد واپس آ جاؤنگا۔ ڈیوڑھی کا دروازہ بند کر لیں۔" یہ کہہ کر میں فیصلہ کن انداز سے صحن میں نکلا اور ڈیوڑھی کا دروازہ کھول کر باہر گلی میں جا پہنچا۔ اپنے حلیے پر ایک نظر ڈال کر مجھے اطمینان ہو گیا۔ میں خاصا معزز آدمی نظر آتا تھا اور کسی کو بھی مجھ پر شک کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہ رہ گئی تھی۔ آدمی کا لباس اس کی زندگی میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

چاند دھرتی پر مہربان ہو چکا تھا اور گلی اس گھڑی چاندنی سے لبالب بھری تھی۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا بازار کی طرف نکل گیا تھا۔ وہاں میں نے رات کو ماجدہ کے گھر کی طرف آتے ایک دکان کے سامنے دو کاریں کھڑی دیکھی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ وہ کسی کے گھر آئے مہمانوں کی کاریں تھیں۔ کسی ایسے آدمی کے گھر کے مہمانوں کی جنہوں نے اونٹ والوں سے یاری لگا رکھی تھی۔ جنہیں گیراج میسر نہیں تھا مگر جن کے تعلقات ایسے لوگوں سے تھے جو کاروں میں سفر کرتے تھے۔ میں تیز تیز چلتا اس سمت جا نکلا جدھر میں نے وہ کاریں دیکھی تھیں۔

ابھی میں قصبے کے بازار کے عین وسط میں تھا کہ مجھے دو چوکیداروں نے آ لیا۔ وہ کسی دکان کے تھڑے پر سے اٹھ کر اچانک ہی مجھ تک آ پہنچے تھے۔

"کون؟" انہوں نے یک زبان ہو کر پوچھا اور میرے پاس آ کر مجھے ٹارچ کی روشنی میں بڑے غور سے دیکھنے لگے میں مسکرا دیا۔ ان سے ڈرنے کی مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی تھی۔ میری خود اعتمادی اور میرے خوبصورت ولایتی لباس کی تراش خراش دیکھ کر وہ مرعوب ہو گئے۔ ایک بولا۔

"کہاں جا رہے ہیں۔ بابو جی!"

"یار ذرا ہسپتال جا رہا ہوں ڈاکٹر کے پاس۔ میری بیوی کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔"

"اچھا اچھا۔ آپ کہیں باہر سے آئے ہیں۔"

"ہاں، میں کل ہی لندن سے آیا ہوں۔ دو مہینے کی چھٹی پر۔ ڈاکٹر مل جائے گا نا اس وقت؟"

"ہاں۔ وہ گھر پر ہو گا مگر لیڈی ڈاکٹر تو ادھر کوئی نہیں ہے بابو جی۔"

"کوئی بات نہیں۔ بیماری ہی ایسی ہے کہ ڈاکٹر بھی اسے دیکھ سکتا

ہے۔ اُف! اس سردی نے تو لندن کو بھی مات کر دیا ہے۔" میں نے کمبل کپ اپنے گرد لپیٹتے ہوئے کہا۔ وہ خود بھی بری طرح ٹھٹھر رہے تھے اور سردی سے بچنے کے لیے انہوں نے تھڑے پر انگیٹھی سلگا رکھی تھی۔

"اچھا یار۔ دعا کرو ڈاکٹر میرے ساتھ آ جائے۔" یہ کہکر میں آگے چل دیا۔ وہ دونوں پوری طرح مطمئن ہو کر واپس اپنی جگہ پر جا بیٹھے۔ اور میں تیز تیز چلتا ہوا آگے نکل گیا۔ کوئی دس منٹ بعد میں ان کاروں کے پاس پہنچ چکا تھا۔

دونوں کاریں نئی تھیں اور مقفل بھی۔ میں پرانا ٹیکسی ڈرائیور تھا گاڑیوں کی رگ رگ سے واقف۔ میں نے نثار کی جیب سے نکلے چابیوں کے گچھے میں سے ایک مخصوص چابی نکال کر ایک گاڑی پر آزمائی اس کا تالہ فوراً ہی کھل گیا۔ اس بدبخت جیب کترے نے میرا خیال ہے وہ خاص قسم کی چابی شاید ایسی ہی وارداتوں کے لیے بنوا رکھی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ میرا یار ہرفن مولا تھا اور ہر کنوئیں میں ڈول ڈال دینے کا عادی — اس کی چابی میرے لیے کمرک ثابت ہوئی تھی۔ میں دل ہی دل میں نثار کا شکریہ ادا کر کے کار کے اندر بیٹھا اور اُسے اسٹارٹ کر کے آگے لے چلا۔ وہ بڑی ہی بے آواز سی سبک رفتار کار تھی جس کو چلاتے ہوئے ایک مدت بعد میرے دل میں یہ آرزو جاگی کہ میرے پاس بھی ایسی ہی ایک گاڑی ہونی چاہیے۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ کم از کم ستر اسّی ہزار میں مل سکتی ہوگی۔ اس وقت اور اتنی رقم خرچ کر دینا میرے لیے کچھ بھی مشکل نہ تھا، مگر معیبت یہ تھی کہ میرا روپیہ بینک میں پڑا تھا اور میں بینک میں جانے سے گھبراتا تھا، سخت خوفزدہ تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میں جب بھی وہاں گیا پکڑا جاؤنگا اسی لیے میں اس وقت تک بینک کے دروازے تک جانے سے گریز کرتا رہا تھا، ورنہ شاید میں بہت پہلے وہاں سے اپنی جمع شدہ رقم ضرورت کے مطابق نکلوا چکا ہوتا، مگر اُس رات میں نے تہیہ کر لیا کہ جیسے ہی میں لاہور واپس جاؤں گا اپنی اس رقم کو وہاں سے نکلوا لینے کی کوئی نہ کوئی تدبیر ضرور سوچوں گا۔

وہ پرائی کار لے کر میں تھوڑی ہی دیر بعد ڈاکٹر کے بنگلے پر جا پہنچا۔ اس کی رہائش گاہ کا پتہ مجھے ہسپتال میں موجود ایک چوکیدار نے بتایا تھا۔ وہاں اس ڈرائیور کی ٹیکسی موجود نہیں تھی جس کو میں بے ہوش کر کے وہاں تک لے گیا تھا۔ وہ شاید ہوش میں آنے کے بعد وہاں سے نکل بھاگا تھا، عین ممکن تھا کہ وہ اُس وقت تھانے میں بیٹھا ہو، بہرحال صورتحال ایسی تھی کہ میں ہسپتال کے اندر کسی کو اپنی صورت نہیں دکھانا چاہتا تھا۔ وہ گنوار بھی وہیں کہیں بیٹھا ہوگا جو اپنے باپ کا علاج کرانے نکلا تھا، میرے دو ہزار روپے جیب میں محسوس کر کے وہ خوش ہو رہا ہوگا مگر میں نے اس کے خیال پر تین حروف بھیجے اور چوکیدار کے بتلائے ہوئے پتے پر جا پہنچا۔

ڈاکٹر کا بنگلہ ہسپتال سے زیادہ دُور نہیں تھا جب میں نے کار سے اُتر کر اُس بنگلے کے بڑے دروازے پر لگے ہوئے کنڈے کو کھول کر قدم رکھا تو ایک خاصے قدآور کتے نے میرا استقبال کیا مگر وہ مجھ پر لپٹا نہیں، بس مجھ سے دو قدم دُور رُک کر بخ بخ کرنے لگا۔ اُس کا خاصا بڑا ہوگا کیونکہ اس کی بھَوں بھَوں نے بنگلہ ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ابھی وہاں کھڑا سوچ ہی رہا تھا کہ اس سے جان چھڑانے کے لیے اس کے سینے میں اپنی بے آواز گولی اتار دینی چاہیے کہ اچانک سامنے کے کمرے کا دروازہ کھلا اور برآمدے کی بتی جل اٹھی۔ کوئی آدمی گاؤن کے تسمے باندھتا تیزی سے برآمدے سے باہر آ رہا تھا۔

"بیٹن! شٹ اپ بیٹن!" اس آدمی کی مہین سی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ اکہرے بدن اور ادھیڑ عمر کا آدمی تھا جس کے سر کے بال سفید ہو چکے تھے۔ اس نے آنکھوں پر سنہری فریم کی خوبصورت سی عینک لگا رکھی تھی۔ کتا اس کی آواز سن کر بہت پیچھے جا کھڑا ہوا۔ نظریں اُس کی ابھی تک مجھ پر جمی تھیں۔

ڈاکٹر تیز تیز قدم اٹھاتا میری طرف بڑھا۔ وہ میری چمچماتی ہوئی چمکتی جلکتی کار اور میرے عمدہ سے ولایتی سوٹ کو دیکھ کر خاصا مرعوب ہوا۔ یہ بات اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ مگر جب وہ میرے پاس آیا تو بڑے مایوس کن لہجے میں بولا۔

"فرمائیے! آپ کیسے آئے ہیں اس وقت؟"

"مجھے ڈاکٹر صاحب سے ملنا ہے۔"

"میں ہی ڈاکٹر ہوں ڈاکٹر عرفان احمد، اس ہسپتال کا انچارج۔"

"آپ سرجن بھی ہیں؟"

"جی ہاں سرجن بھی ہوں آپ کو شک ہے کوئی۔ ہر ڈاکٹر سرجن ہوتا ہے۔" وہ جز بز ہو کر بولا۔ اب وہ میرے اور قریب آ گیا تھا اور غور سے میرے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

"دیکھیں میں چوہدری ہادی علی کے گاؤں اکبر کوٹ سے آیا ہوں" میں نے جھوٹ بولا۔

ہادی علی کا نام سنتے ہی وہ بدک گیا، بولا "صاحب میں معذرت خواہ ہوں میں ان کی کوئی خدمت نہیں کر سکتا۔ پارٹی بازی کی لپیٹ میں لے کر وہ مجھے بہت ذلیل کر چکے ہیں۔ اُن جیسا پھڈے باز آدمی میں نے کوئی نہیں دیکھا، آپ تشریف لے جائیں میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔" وہ سخت طیش میں آ گیا تھا۔

"آپ میری بات تو سنیں جناب، وہ کمشنر صاحب ہیں نا اکبر کوٹ کے نہری بنگلے میں کل سے ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ان کی لڑکی کو ایک پھنسی سی تھی وہ اچانک پھوڑا بن گئی ہے اور اتنی اوپر ابھر آئی ہے کہ وہ سخت پریشان ہو گئے ہیں۔"

"کون، آغا ناصر علی؟ کمال کرتے ہیں صاحب، آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ اُن کا تو میں خادم ہوں۔ میں ابھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے پیچھے ہٹا تو میں نے کہا۔

"شاید ہلکا سا آپریشن کرنا پڑے آپ اپنے اوزار ساتھ لے لیں تاکہ ٹانکے وغیرہ بھی لگا سکیں۔"

"آپ بالکل فکر نہ کریں۔"

"آپ کے پاس گاڑی ہے؟"

"جی ہاں، مگر آپ بھی تو گاڑی لائے ہیں۔"

"اس میں کچھ خرابی پیدا ہو گئی ہے۔ بہت پریشان کرتی آئی ہے مجھے، اگر آپ اپنی گاڑی لے چلیں تو ہم آپکے ممنون ہوں گے۔"

"اس میں ممنون ہونے کی کیا بات ہے جناب میری گاڑی کس لیے کھڑی ہے آپ ٹھہریں میں ضروری سامان لے لوں" یہ کہکر وہ تیزی سے برآمدے کی طرف لپکا اور کمرے میں جا گھسا۔

میرا کام اس نے آپ ہی آسان کر دیا تھا وہ مجھ سے کمشنر صاحب کا نام پوچھتا تو شاید میرا جھوٹ اُس کے دل میں بدگمانی پیدا کر دیتا کیونکہ مجھے قطعاً یہ علم نہیں تھا کہ کمشنر کا نام آغا ناصر علی ہے۔ اپنی حماقت سے اس نے میری یہ مشکل آپ ہی آسان کر دی۔ چوہدری ہادی علی اور اکبر کوٹ کے سوا کوئی اور نام مجھے معلوم ہی نہیں تھا مگر اس کی باتوں سے معلوم ہوا کہ ہادی علی سے وہ سخت متنفر ہے اور اس آدمی کی شہرت ادھر خاصی خراب اور نامسعود تھی اس کا مطلب یہ تھا کہ شیردل آہو صاحب کی رائے اس شخص کے بارے میں بالکل درست تھی مجھے اطمینان ہو گیا کہ جب میں ہادی کو قتل کروں گا تو مجھے کوئی ندامت نہ ہوگی کیونکہ اُس کا کردار ایسا ہی ہوگا جس کی وجہ سے آہو صاحب نے اس کو گردن زدنی قرار دیا ہے۔ اس کو جہنم رسید کرنا عین کارِ ثواب ہے۔ میں نے اُس لمحے یہی سمجھا اور اپنے جی میں خوش ہو گیا کہ میں کسی بُرے کام کے لیے ادھر نہیں آیا ہوں۔

ڈاکٹر عرفان ٹھیک پندرہ منٹ بعد مجھے اپنی گاڑی میں بٹھا کر بڑی سڑک پر پہنچ چکا تھا۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ وہ اسی راستے سے نکلا اور اس نے اسی گلی کی سمت سے ہو کر دوسری جانب بڑھنے کا ارادہ کیا جدھر میں اسے لے جانا چاہتا تھا۔ میں اس کے ساتھ ہی بیٹھا تھا، میرا جی بہت ہی مسرور تھا کہ وہ ایک اندھے معمول کی طرح میرے ذہن کے اشاروں پر کام کر رہا تھا۔

ابھی وہ بازار میں سے گزرتا ہوا اس گلی کے سامنے پہنچا ہی تھا کہ میں نے اس کی گردن دبوچ کر اسکی احساس کی رگ مسل دی۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے بائیں ہاتھ جھول گیا۔ میں نے بریک پر پاؤں پہلے ہی رکھ لیا تھا، اسے دوسری سیٹ پر ڈال کر میں نے گاڑی سنبھالی اور اُسے آہستہ آہستہ چلاتا ہوا ماجدہ کے دروازے تک لے گیا۔ اس کی رفتار میں نے اس لیے کم رکھی تھی تاکہ گلی میں کسی قسم کا شور نہ ہو اور کسی کو یہ معلوم نہ ہو کہ رات کے اس حصّے میں ماجدہ کے گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ اس کی والہانہ خودسپردگی نے مجھے اس کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کی عزّت پر کوئی حرف آئے، یا گلی میں اس کے بارے میں کسی کو کوئی اَنٹ شَنٹ بات کرنے کا موقع ملے۔ میں ڈاکٹر کے کمر کوٹ کو ڈھا کر اس تک صرف اس لیے جان ہتھیلی پر رکھ کر جا پہنچا تھا کہ مجھے ماجدہ کی مظلومیت کا اس کرامت اور اس کے ملازم سے انتقام لینا تھا۔

گاڑی ماجدہ کے دروازے کے سامنے کھڑی کر کے جب میں نے دستک دی تو مجھے معلوم ہوا کہ میرے انتظار میں وہ سخت بے چین تھی۔ اس نے فوراً ہی دروازہ کھول دیا۔ مجھے گاڑی سمیت سامنے دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔

بولی "یہ، یہ گاڑی کیوں لائے ہیں آپ؟"

"آپ اندر چلئے ماجدہ پریشان نہ ہوں۔ بس چلیں اندر۔" میں نے اسے رعب کُن لہجے میں کہا۔ وہ فوراً ہی لوٹ گئی۔ دروازہ البتہ وہ کھلا چھوڑ گئی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں ایسا تحیّر اُبھر آیا تھا کہ باید و شاید، مگر اُس کی شخصیت کا سحر ایسا تھا کہ میں اس کے لیے شہر کی اینٹ سے اینٹ بجانے کو تیار ہو سکتا تھا۔ وہ کرامت اور فیروز تو چیز ہی کچھ نہ تھے۔ اُن ذلیلوں کو تو میں ایسا سبق دینا چاہتا تھا کہ وہ اپنی آیندہ نسلوں کو بھی کسی نہتی کمزور اور بے بس عورت پر ہاتھ اٹھانے سے منع کر جاتے، میں جو کچھ کرنے والا تھا، وہ جب اجاگر ہوگا تو ان کے خاندان میں جو کوئی سُنے گا، جو کوئی انہیں دیکھے گا سالہا سال تک کلی پچھا کر بیٹھے گا اور اس کی آنکھوں سے آنسو کبھی خشک نہ ہوں گے۔

وہ جو اندھیری رات کا کحلِ سلیمانی آنکھ میں ڈال کر دوسروں کے گھروں کو تباہ کرتے پھرتے ہیں، اُن کی عزّتوں سے انہیں محروم کر دیتے ہیں کسی رعایت کے مستحق نہیں ہوتے۔ ڈاکٹر عالیہ اور ڈاکٹر دمنّ نے بھی میرے ایک چھوٹے سے جرم سے شبہ پا کر مجھے اُس اذیت ناک مرحلے سے گزار دیا تھا۔

میں نے ڈاکٹر عرفان کو گاڑی میں سے نکالا اور کمر پر لاد کر اُسے ماجدہ کے کمرے میں پہنچا کر پلنگ پر لٹا دیا۔ اس کے بعد میں پھر باہر نکلا اور اُس کا اوزاروں اور دواؤں سے بھرا صندوقچہ اٹھا کر اندر لے گیا۔ گاڑی میں نے مقفل کر دی اور مکان کا دروازہ بند کر کے ماجدہ کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ وہ حیرت زدہ سی ہو کر کرسی پر بیٹھی تھی۔ اور کبھی مجھے دیکھتی تھی اور کبھی ڈاکٹر عرفان کو۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں اور کیوں رات کے اس جانگسل حصے میں ڈاکٹر عرفان کو اغوا کر کے لے آیا ہوں، اسکی ان بڑی بڑی صاف اور شفاف آنکھوں میں آہستہ آہستہ دہشت اُبھرتی آ رہی تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ ہوگی کہ اس نے جس آدمی کو گھر میں پناہ دی ہے وہ ایسا صاحب

کرامت اور حیران کُن شخصیت کا مالک ہے۔
"آپ کیا کر رہے ہیں جیلانی صاحب! کچھ مجھے بھی بتائیں یہ سب کچھ دیکھ کر مجھے وحشت ہو رہی ہے۔"
"گھبرائیں نہیں ماجدہ، میں وہی کچھ کر رہا ہوں جو مجھے کرنا چاہیے اُن سے میں نے اگر انصاف نہ کیا تو پھر آپ اپنی فریاد لے کر کہاں جائیں گی۔ کون آپ کی دادرسی کریگا۔ آپ پانی کا ایک جگ بھر کر یہاں رکھ دیں، اور ایک گلاس بھی، مگر جلدی کریں۔"
وہ میری اس بات سے کچھ بھی اخذ نہ کر سکی۔ بڑی ہی حیرت زدہ سی مسحور و شکستہ کیفیت میں وہ یُوں کمرے سے باہر نکلی جیسے خواب میں چل رہی ہو۔ جب وہ واپس آئی تو اس وقت تک میں کرسی پر بیٹھ کر سگریٹ سُلگا چکا تھا اور کمرے میں دھوئیں کے مرغولے اِدھر اُدھر تیر رہے تھے۔
"اب آپ اپنے کمرے میں جا کر لیٹ جائیں اور اس وقت تک ادھر نہ آئیں جب تک میں آپ کو خود نہ بلاؤں ٹھیک!"
"وہ ٹھیک ہے جناب جیلانی صاحب بہادر، میں کیا کہہ سکتی ہوں مجھے ڈر ہے کہ آپ اپنے لیے کوئی زبردست مصیبت کھڑی کریں گے۔"
"جی نہیں، آپ بے فکر رہیں میں خود ایک بڑی مصیبت ہوں۔ مجھے کچھ نہیں ہوگا بس آپ پریشان بالکل نہ ہوں۔ آپ کو میری قسم، ان خوبصورت آنکھوں کی قسم بالکل فکر نہ کریں۔ آپ پر کوئی آنچ نہیں آئے گی مگر آپ کی بے بسی کا انتقام میں ان سؤروں سے ضرور لوں گا۔" وہ وہاں سے جانا نہیں چاہتی تھی۔ اُس کے ارادے کو بھانپ کر میں نے اسے زبردستی باہر دھکیلا۔
"اپنے کمرے میں جا کر اطمینان سے بیٹھ جائیں، یہ میرا حکم ہے۔" میں نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ وہ ڈر کر پیچھے ہٹی اور دوسرے کمرے میں جا گھسی اسے وہاں سے نکال کر میں نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے کنڈی چڑھا دی۔ لیمپ کی روشنی خاصی تیز تھی۔ میں نے پانی کا گلاس بھر کر ڈاکٹر کے چہرے پر انڈیل دیا۔ یخ ٹھنڈا پانی آہستہ آہستہ اپنا اثر دکھانے لگا۔ اس دوران میں میں نے اس کی گھڑی ایک گھنٹہ آگے کر دی۔ کوئی پانچ منٹ بعد ڈاکٹر پوری طرح ہوش میں آ چکا تھا۔ اس کی عارضی نیند کی کیفیت برخاست ہو گئی تھی۔ اب وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے کبھی مجھے دیکھتا تھا اور کبھی سامنے فرش پر پڑے بے ہوش آدمیوں کو۔ میں سامنے کرسی پر بیٹھا تھا اور میرے پستول کی نال اس کے سینے کی طرف اُٹھی تھی۔
"میں کہاں ہوں؟" پھر ٹھہر کر بولا۔ "مجھے کیا ہو گیا تھا، تم کون ہو، کیا چاہتے ہو؟" — ایک ساتھ کئی سوال ٹھہر ٹھہر کر اُس کے لبوں سے باہر آ گئے۔ وہ خود کو اس کمرے میں اور اتنے عجیب و غریب حالات میں گھرا دیکھ کر ششدر رہ گیا تھا۔ وہ غالباً اس کی زندگی کا سب سے زیادہ حیران کُن لمحہ تھا۔ وہ پلنگ سے اُٹھنے لگا، تو میں نے پستول کی نالی لہرائی۔

"اوں ہوں! ڈاکٹر عرفان، تم اس وقت کنجاہ سے بہت دُور، ادھر وزیرآباد میں بیٹھے ہو۔ تمھیں بے ہوش ہوتے ایک گھنٹہ ہو چکا ہے۔ تمھاری گاڑی باہر کھڑی ہے میرا نام آصف ہے اور میں تمھیں ایک خاص کام سے یہاں لایا ہوں۔"
"یہ کیا کہہ رہے ہو۔ کیا چاہتے ہو تم مجھ سے؟"
"ہو سکتا ہے تمہارے لیے یہ بڑا ناخوشگوار کام ہو مگر تمھیں یہ کام کرنا ہو گا۔ ورنہ تم یہاں سے زندہ واپس نہ جا سکو گے۔ یہ پستول بے آواز چلتا ہے اور ہم ایسے مکان میں ہیں جو آبادی سے بہت دُور ہے۔"
اس کی نظریں میرے چہرے پر جمی تھیں اور اُس کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا اور ایک جاتا تھا۔ وہ اپنی گھڑی کو بار بار دیکھتا تھا۔ میں چپ ہوا تو وہ قدرے توقف کے بعد بولا۔
"بولتے جاؤ، میں سُن رہا ہوں۔" اس نے اچانک مجھے حیران کر دیا اس کا لہجہ بہت جما ہوا ... اور حوصلے سے لبریز تھا، یوں لگتا تھا جیسے اس نے اپنے دل میں کوئی اہم فیصلہ کر لیا ہے۔ اس کی آواز جتنی مہین تھی اتنا وہ اندر سے کمزور اور بودا نہیں تھا۔
"کیا سمجھے ہو ڈاکٹر؟"
"میں سُن رہا ہوں اور سمجھ رہا ہوں کہ مجھے ایک بدمعاش اور دھوکے باز گھیر کر لے آیا ہے میں سن رہا ہوں۔"
"میں بدمعاش نہیں ہوں ڈاکٹر، شریف آدمی ہوں مگر کبھی کبھی شریف آدمی کو کسی ظالم سے انتقام لینے کے لیے یہ راستہ بھی اختیار کرنا پڑتا ہے۔ یہ بات میں نے انگریزی میں کی مگر اپنے دماغ کی ساری لیاقت مجھے اپنا مفہوم ادا کرنے میں صرف کرنی پڑی کیونکہ انگریزی میں ... میرا ہاتھ ہمیشہ سے تنگ ہے۔ وہ خاص دفتری قسم کی بابو انگریزی تھی جس میں میں نے اپنا مفہوم سمجھایا صرف اس خیال سے کہ وہ یہ نہ سمجھے کہ اس کے سامنے کوئی اجڈ جاہل اور وحشی صفت جرائم پیشہ آدمی بیٹھا ہے مگر وہ میری اس بات سے قطعاً متاثر نہ ہوا۔
"کہتے جاؤ میں سُن رہا ہوں ہو سکے تو ایک سگریٹ مجھے دے دو۔"
اس نے اپنے دونوں ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں ڈال کر باہر نکالتے ہوئے کہا۔ اس کدو کش لہجے سے میں چڑ گیا تھا۔ وہ مجھ سے ذرا بھی مرعوب نہیں ہو رہا تھا۔ میرا جی چاہا میں اُٹھ کر اس چھچھوندر کا سر کچل دوں مگر پھر بھی میں نے اُسے کچھ نہ کہا ضبط کر کے اسے بائیں ہاتھ سے ایک سگریٹ پیش کیا اور ماچس بھی اسے تھما دی میرے ہاتھ میں تھامے پستول کا رُخ مسلسل اس کی طرف تھا۔ اس کا وہ اکہرا بدن کمانچ جیسا نظر آتا تھا مجھے سینہ اس کا فراخ تھا مگر گردن اس سے لگا نہیں کھاتی تھی۔ سنہری عینک بار بار اس کی ناک کی پھننگ پر سے پھسل جاتی آنکھیں موٹی مگر پیشانی تنگ تھی۔ اس کے کان بڑے بڑے تھے مگر سر چھوٹا نظر آتا تھا۔ کچھ عجیب سی ہیئت تھی اس کی پھر بھی

اندر سے خاصا مضبوط تھا۔ سگریٹ کے گہرے گہرے کش لے کر وہ بولا۔ "ہاں کیا کہہ رہے تھے تم۔ میں سن رہا ہوں۔"
"ماں کا سر سُن رہا ہے تو! گدھے تیری سمجھ میں ابھی تک یہ بات نہیں آئی ہے کہ تو کہاں آ پہنچا ہے میں کوئی کمنگر نہیں ہوں، ہڈیاں توڑ دیا کرتا ہوں۔ سمجھا کہ نہیں؟"
"میں سمجھ رہا ہوں بھئی سمجھ رہا ہوں۔ کام بتاؤ کیا ہے اور اس ڈرامے کو مختصر کرو۔ میں حالات سے سمجھوتہ کر لیا کرتا ہوں۔" وہ پھر بڑے ہی بلکہ حیران کُن حد تک مضبوط لہجے میں بولا۔ اب کی بار وہ بڑی طمانیت سے مسکرا رہا تھا۔ میں تو سٹپٹا کر رہ گیا۔ بچے کو کسی بھولے معصوم بچے کو کن چھیدن کے لیے بھی بٹھاتے ہیں تو وہ ایک بار تو لرز ہی اُٹھتا ہے وہاں میرے سامنے ایک عاقل بالغ ایم بی بی ایس پاس سرجن ڈاکٹر بیٹھا تھا جسے معلوم تھا کہ گولی چلے تو بدن میں آر پار گول سوراخ ڈال دیتی ہے اور آدمی کو چند ساعتوں میں سفید اور سرد کر دیتی ہے۔ بھرا ہوا پستول وہ میرے ہاتھ میں دیکھ رہا تھا مگر پھر بھی یہ ظاہر نہیں کر رہا تھا کہ وہ خوفزدہ ہے۔ پہلے ... ں میں ہوش میں آنے کے بعد اس پر جو کیفیت طاری تھی وہ اس پر مکمل طور پر قابو پا چکا تھا۔ اس کا یہ حوصلہ دیکھ کر پہلی بار مجھے محسوس ہوا کہ مجھے اس آدمی سے اس کے خانے میں بیٹھ کر بات کرنی چاہیے۔ میں بھی مسکرا دیا اور گلا صاف کر کے میں نے کہا۔
"ڈاکٹر! ان دو آدمیوں نے میری بیوی کی عصمت دری کی ہے۔"
"اوہ سمجھا، ٹو مچ ... ٹو مچ، ویری سیڈ سٹوری۔" وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔
"ان حالات میں تمہارے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہیے۔"
"مار دو ان سالوں کو، گولی مار دو جسٹ کل دیم۔" وہ ان پر اچٹتی سی نظر ڈال کر بولا۔ پھر حیران ہو کر پوچھنے لگا۔
"یہ دونوں بے ہوش ہیں؟"
"ہاں۔"
"کیسے بے ہوش کیا ہے تم نے انہیں۔ کلوروفام سنگھایا ہے۔"
"نہیں میرا ایک اپنا ہی نسخہ ہے۔ نسخہ نمبر چار سو تیرہ۔"
وہ مسکرا دیا۔ عینک اتار کر اپنی ٹائی سے شیشے صاف کر کے اس نے اپنی نظریں مجھ پر جما دیں پھر ایک ہاتھ وہ اپنی گردن پر پھیر کر بولا۔
"نسخہ نمبر چار سو تیرہ؟ وہی جو تم نے گاڑی میں مجھ پر آزمایا تھا۔" اب کی بار وہ یہ ظاہر کر رہا تھا جیسے وہ مجھ سے بہت متاثر ہو چکا ہے۔
"ہاں وہی۔ اب تم یہ کرو ڈاکٹر اپنے چیر پھاڑ کے اوزار نکالو

مائی گاڈ! اتنے ظالم ہو تم۔" وہ اپنی جگہ سے ایک دم اچھل پڑا۔ میں نے پستول کی نال آگے بڑھا کر اس کے قریب کر دی۔
"زیادہ جوش میں مت آؤ ڈاکٹر! یہ بالکل انصاف کی بات ہے میں انہیں قتل بھی کر سکتا ہوں اور کوئی مجھے پکڑ بھی نہیں سکتا مگر یہ بے انصافی ہو گی۔"
"گڈ! ویری گڈ! تمہاری اس جیلس کی داد دیتا ہوں مگر یہ کام میں کیوں کروں۔" بڑے ماہرانہ انداز میں وہ مجھے پچوکے دے رہا تھا۔
لیکن وہ پوری طرح میری ذہنی کیفیت کا اندازہ لگانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ اس کی بات سُن کر میں ایک دم بھڑک اُٹھا اور پستول کی لبلبی پر انگلی رکھ کر کہا۔ "یہ کام تو تمھیں کرنا پڑے گا ڈاکٹر! نہیں کرو گے تو جان سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔" میرا سرد لہجہ محسوس کر کے اور لبلبی پر رکھی انگلی دیکھ کر ڈاکٹر کی ساری طراری ہوا ہو گئی۔ میں نے پہلی بار اس کے چہرے پر خوف کی علامات دیکھیں، زبان سے کچھ کہنے کے بجائے اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
"تو پھر شروع کر دو ان کی کانٹ چھانٹ میں ابھی دوسرے کمرے سے ہو کر آتا ہوں۔ گڑبڑ کرنے کی کوشش نہ کرنا۔" یہ کہہ کر میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ ہماری تمام باتیں ماجدہ نے سن لی تھیں کیونکہ جب میں کمرے سے نکلا تو وہ اپنے دروازے میں غائب ہو رہی تھی۔ میں نے دروازے کی کنڈی باہر سے چڑھائی اور سیدھا ماجدہ کے پاس جا پہنچا۔ وہ مضمحل سی ہو کر چارپائی پر ڈھیر ہو گئی تھی۔
"شاید آپ نے ہماری باتیں سن لی ہیں۔"
اس نے کمرے میں جلتے ہوئے تیل کے دیئے کی مدھم روشنی میں بڑے ہی بجھے ہوئے انداز سے سر ہلاتے ہوئے مجھے بتایا کہ اس نے ہماری باتیں سن لی ہیں۔
"تم پریشان ہو؟"
اس نے سر نیچے جھکا لیا۔ اس کی آنکھیں پُرنم ہو گئی تھیں۔
"میرا تو جی چاہتا تھا میں انہیں جان سے مار دوں۔ آپ میری کچھ بھی نہیں لگتی تھیں۔ آج آدھی رات تک بھی آپ سے میرا کوئی ناطہ نہیں تھا مگر اب میں آپ سے ایسے رشتے میں بندھ گیا ہوں جسے کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ میں اس تعلق کی لاج نبھاؤں گا مگر ان کتوں کو میں سزا دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جنہوں نے آپ سے وحشیانہ سلوک کیا ہے۔ کیا آپ چاہتی ہیں کہ میں انہیں چھوڑ دوں آپ معاف کر سکتی ہیں انہیں؟"
اس نے سر اور نیچے جھکا کر اپنا چہرہ چادر میں چھپا لیا۔ اب اس کا سر اس کے زانوؤں پر تھا۔ اور اس کے پاؤں پلنگ سے نیچے تھے۔
"بولتی نہیں ہیں آپ! جواب دیں مجھے۔"
اس نے آہستہ آہستہ اپنا سر اوپر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا تار بندھا تھا وہ رو رہی تھی بے تحاشہ رو رہی تھی۔

"روتی کیوں ہو، کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ کو اس کرامت سے محبت ہو گئی ہو؟" میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔ یہ بات ابھی تک میرے ذہن میں نہیں آئی تھی۔ میرا دماغ اچانک الٹنے لگا اور میں اس کی چارپائی سے اٹھ کر اس کے سامنے کرسی پر جا بیٹھا۔ اس کو سمجھنا مجھے مشکل نظر آ رہا تھا۔ میری بات سنتے ہی اس نے اپنی آنکھیں پونچھ لیں اور بولی۔

"ایسی بات پھر کبھی نہ کہیں، ورنہ میں جان دے دوں گی۔ وہ۔۔۔ وہ بھیڑیا ہے، اسے تو پھانسی بھی ہو جائے تو مجھے افسوس نہ ہو۔"

"پھر۔ پھر آپ روتی کیوں ہیں؟"

"آپ تو میرے محسن ہیں جیلانی! پتہ نہیں آج رات وہ میرے ساتھ کیا سلوک کرتے۔ بس مجھے ڈر لگتا ہے کہیں آپ کسی مصیبت میں نہ پھنس جائیں۔ آپ بہت خطرناک کام کر رہے ہیں۔ وہ آپ کو اچھی طرح دیکھ چکے ہیں۔ وہ آپ کو گرفتار کروا دیں گے۔ پھر۔۔۔ پھر کیا کریں گے آپ۔۔ مجھے تو وہ باہر نکلتے ہی تباہ کروا دیں گے۔"

"پگلی ہیں آپ! مجھے نہیں جانتی ہیں نا اسی لیے ایسی باتیں کر رہی ہیں۔ آپ کو اب دنیا کی کوئی طاقت کوئی دکھ نہیں پہنچا سکتی ہے بالکل بے فکر ہو جائیں اور یاد رکھیں جیلانی کی تو کوئی ہوا کو بھی نہیں پہنچ سکتا ہے اس جیسے دس ہزار ہوں تو بھی نہیں۔"

"سچ اتنے بہادر ہیں آپ؟"

"پتہ نہیں بہادر ہوں کہ نہیں مگر آپ تک کوئی میری لاش پر سے گزر کر ہی پہنچ سکے گا۔ آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔"

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر عرفان نے اندر سے دوسرے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ میں پستول ہاتھ میں لیے تیزی سے باہر نکلا اور دوسرے کمرے کی کنڈی کھول دی۔ ڈاکٹر عرفان سامنے کھڑا تھا۔

"ان کے زخموں پر پٹی باندھنے سے پہلے میں تمہیں دکھانا چاہتا تھا کہ میں نے انہیں مکمل طور پر وہ کیا کہتے تھے تم بالکل فاختہ کر دیا ہے۔" وہ بڑے حوصلے سے مسکرا رہا تھا۔ حالانکہ میں دیکھ رہا تھا کہ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو چکا تھا۔

"فاختہ نہیں آختہ کہو ڈاکٹر آختہ۔" میں نے ان دونوں کتوں کے زخموں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ان کا حال شاہی دور کے خواجہ سراؤں کا ہو چکا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ایسی صورتوں میں کیا کیا جاتا ہے۔

"ان کو کوئی ٹیکہ تو نہیں لگایا ہے تم نے۔"

"ہاں ہاں یہ بات تو میں نے تمہیں بتائی ہی نہیں۔"

"میں نے ٹیکہ انہیں لگا دیا ہے، انہیں ذرا سا بھی درد محسوس نہیں ہوا حالانکہ یہ بڑا خطرناک آپریشن تھا۔"

"بکتے ہو تم، اس میں خطرناک کچھ بھی نہیں ہوتا۔ مجھے یہ بتاؤ کہ اگر یہ ہوش میں آ گئے تو مجھے کیا کرنا چاہیے اور اب ان کی مرہم پٹی بھی کر دو۔"

"میں کیا بتا سکتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھا اور ان دونوں کے زخموں پر دوا لگا کر مرہم پٹی کرنے لگا۔ جب وہ ادھر سے فارغ ہوا تو میں نے کہا۔

"تم ان کے لیے مجھے مارفیا کے انجکشن دے دو اور ہر انجکشن کی مقدار بھی مجھے بتا دو۔ سرنج اور سوئیاں بھی ادھر رکھ دو میں ان کی نسوں میں خود ٹیکے لگا دیا کروں گا۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ جب تک یہ صحتیاب نہیں ہوتے ہیں انہیں ادھر ہی رکھوں گا۔"

"تمہاری مرضی۔ یہ لو یہ رہی سرنج یہ رہیں سوئیاں اور یہ ہیں بے ہوشی کے ٹیکے۔" پھر اس نے مجھے بتایا کہ ٹیکے کی کتنی مقدار کتنی مدت کے لیے کافی ہو گی۔ ان کو کھلانے کے لیے اس نے مجھے دوا بھی لکھ دی۔ پٹیاں بدلنے کے لیے بھی ضروری سامان اس نے میرے سامنے رکھ دیا۔ مجھے ضروری ہدایات دے کر اس نے اپنا صندوقچہ بند کیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ بولا "اب مجھے واپس کنجاہ پہنچا دو۔"

صبح کی روشنی چوروں کے تعاقب میں بڑھتی چلی آ رہی تھی، اور مجھے دن نکلنے سے پہلے پہلے اس سلسلے کو ختم کر دینا چاہیے تھا۔

"ذرا دیکھو، اس کی پٹی سے شاید خون بہہ رہا ہے۔" میں نے فیروز کی طرف اشارہ کیا۔ ڈاکٹر تیزی سے اٹھا اور فیروز کی پٹی کو بڑے غور سے دیکھنے لگا۔ اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے میں نے اس کی گردن دونوں ہاتھوں میں لے کر بجلی کی سی سرعت سے اس کی رگیں مسل دیں وہ میرے ہاتھوں میں جھول گیا تو میں نے فوراً ہی اسے کندھے پر ڈالا اور ماجدہ کو آواز دی۔ وہ ہچکتی ہوئی آئی اور سہم کر بولی۔

"مجھے بلایا ہے آپ نے؟"

"ہاں، یہ بکس اٹھا لیجئے ڈاکٹر کا۔" یہ کہہ کر میں ڈاکٹر عرفان کو لے کر ڈیوڑھی میں جا پہنچا۔ ابھی پو نہیں پھٹی تھی۔ میں نے کار کا دروازہ کھول کر ڈاکٹر کو پچھلی سیٹ پر ڈال دیا۔ ماجدہ نے مجھے اس کا صندوقچہ دیا۔ تو اسے ساتھ کی نشست پر رکھ کر میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور بتی جلائے بغیر سیدھا چل دیا۔ وہ گلی باہر بڑی سڑک پر نکلتی تھی۔ قصبہ آہستہ آہستہ بیدار ہو رہا تھا۔ نمازی مسجدوں کی طرف لپکے جا رہے تھے۔ اور مجھے یہ ڈر تھا کہ کہیں کسی جگہ مجھے کوئی رکاوٹ پیش نہ آ جائے۔ بڑی سڑک پر ایک جگہ رک کر میں نے ایک راہگیر سے ہسپتال کا پتہ پوچھا اور گاڑی کو اس راہ پر لگا دیا۔ حیرت مجھے یہ تھی کہ پولیس کسی جگہ بھی حرکت نظر نہیں آتی تھی۔ حالانکہ اس ڈرائیور نے زبردست واویلا مچایا ہو گا کیونکہ اسے میں نے گجرات پہنچنے سے بہت پہلے بے ہوش کر دیا تھا پھر اسی حالت میں لا کر کنجاہ کے ہسپتال میں پھینک دیا تھا۔

چاروں طرف بڑے غور سے دیکھتا ہوا میں گاڑی ڈاکٹر کے بنگلے کے پاس لے گیا۔ ادھر ابھی زندگی بیدار نہیں ہوئی تھی۔ ہسپتال اور اردگرد کا ماحول بالکل سنسان تھا۔ میں نے ڈاکٹر کی گاڑی اس کے بنگلے سے ایک فرلانگ دور سڑک سے ہٹا کر کھڑی کی اور اس کے دروازے اچھی

بند کر کے دوسری طرف چل دیا۔

جب میں سڑک سے اتر کر ایک گلی میں داخل ہوا تو مجھے پوری طرح اطمینان ہو چکا تھا کہ ساری کارروائی بخیر و خوبی طے پائی ہے۔ ماجدہ کے گھر تک پہنچنے میں مجھے آدھا گھنٹہ لگ گیا کیونکہ میں بار بار غلط ہاتھ کو نکل جاتا تھا۔ راہگیروں سے راستہ بھی میں نے پوچھا تو بہت احتیاط سے تاکہ کسی کو مجھ پر شک نہ پڑ جائے۔

جب میں ماجدہ کے پاس واپس پہنچا تو پونے چھ بج چکے تھے مگر سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا وہ سخت پریشان تھی۔ میں نے کرامت اور فیروز کو بڑی خاموشی سے مکان کے تیسرے کمرے میں ڈالا۔ وہ قدرے کم روشن کمرہ تھا مگر پھر بھی ہوادار تھا۔ وہاں جھلنگا سی دو چارپائیاں پڑی تھیں، ان دونوں کو الگ الگ لٹا کر میں نے ان پر چادریں ڈال دیں وہ ابھی تک بے ہوش تھے۔

"اب کیا سوچا ہے آپ نے۔"

"ابھی تو مجھے بہت سخت نیند آ رہی ہے آپ یوں کریں کہ تھوڑا پانی گرم کر دیں۔ میں نہا کر تھوڑی دیر سونا چاہتا ہوں۔"

"آپ سو تو جائیں گے مگر ان کا کیا کریں گے۔ اگر یہ کسی اپنے رازدار کو بتا کر آئے ہوتے تو پھر کیا ہو گا۔"

"کوئی آئے تو کہہ دیں کہ کوئی ادھر نہیں آیا تھا اور بس۔"

"مگر ان کو کب تک یہاں ڈال رکھیں گے، کون سنبھالے گا انکو؟"

"فکر نہ کریں جناب! میں آج رات انہیں کہیں پھینک آؤں گا۔"

"کس کنوئیں میں؟"

"کنواں پلید کرنا ہے ان سوروں کے وجود سے۔ میں انہیں ادھر پر لوپس کی طرف کسی ویران جگہ پر ڈال آؤں گا۔"

"وہ کس طرح؟ کوئی ٹرک ہے آپ کے پاس؟"

"کوئی گاڑی لے لوں گا میں کرائے پر، کرائے پر نہ ملی تو چرا لیں گے۔"

"بہت خطرناک آدمی ہیں آپ۔" وہ مجھے اپنے ساتھ رسوئی خانے میں لے گئی۔ "آپ ادھر بیٹھ جائیں پیڑھی پر۔ میں پانی گرم کرتی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے آگ جلا کر چولہے پر پانی کا ڈبہ رکھ دیا۔

جب ہم دونوں نہا کر ناشتہ کر چکے تو اس وقت پونے آٹھ بج چکے تھے۔ وہ بولی۔

"یہ میرا اسکول جانے کا وقت ہے۔"

"لعنت بھیجو اس اسکول پر۔ اب تم کبھی نوکری نہیں کرو گی۔"

"جی ہاں آپ کل چلتے بنیں گے اور میں اس کرامت ایسے شہدوں کے آگے ہاتھ پھیلاتی پھروں گی۔"

"ایسا نہیں ہو گا جناب، میں آپ کو جس شہر میں چاہیں مکان خرید دوں گا۔ جتنے پیسے کہیں گی میں آپ کو دے دوں گا۔"

"اور وہ وحید صاحب جب آئیں گے تو وہ آپ کو شوٹ کرتے پھر رہیں گے۔"

"ایسا نہیں ہو گا جناب! اس سے تو میں آپ کو ایک منٹ میں چھڑا لوں گا۔ مجھے سب نسخے یاد ہیں۔"

"آپ سے تو خدا ہی محفوظ رکھے۔ کرامت اور فیروز تو ہمیشہ کے لیے تباہ ہو گئے اب وحید صاحب کا پتہ نہیں کیا حشر کریں گے آپ۔"

"جو سزا آپ اس کے لیے تجویز کریں گی، اسے دے دی جائے گی۔"

جب ہم سو کر اٹھے تو دن کے تین بج رہے تھے اور پچھلے کمرے میں سے شور اٹھ رہا تھا۔ ہم سے غلطی ہو گئی، ہمیں چاہیے تھا کہ ان دونوں کو چارپائیوں سے باندھ کر ڈالتے۔ مگر وہ دونوں کھلے پڑے تھے۔ اور شدید زخمی ہونے کے باوجود وہ دونوں اٹھ کر دروازہ پیٹ رہے تھے ان کی چیخ و پکار سن کر میں نے لحاف الگ کیا۔ اور ہاتھ میں پستول تھام کر میں اس کمرے کی طرف لپکا جب میں نے دروازہ کھولا تو دیکھا کہ وہ دونوں میرے سامنے کھڑے تھے۔ اور پھٹی پھٹی نگاہوں سے مجھے یوں دیکھ رہے تھے جیسے میں کوئی بھوت ہوں۔

چوہدری کرامت بڑی مشکلوں سے چارپائی کی طرف بڑھا اور کراہتا ہوا اس پر بیٹھ گیا۔

"کیا حال ہے چوہدری صاحب طبیعت کیسی ہے اب آپ کی؟"

"اوئے کتے دے پتر یہ کیا کیا ہے تو نے ہمارے ساتھ۔" کرامت بڑے غصے سے بولا مگر آواز اس کی تھرا رہی تھی۔

"کیا دیکھ رہے ہیں آپ کیا محسوس کرتے ہیں دونوں؟"

"تم نے چوہدری صاحب کو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رکھا ہے۔ تمہیں ذرا ترس نہ آیا؟" یہ فیروز کی آواز تھی وہ بھی لنگڑا کر چلتا ہوا چارپائی پر جا بیٹھا۔

"اس نے مجھے تباہ کر دیا ہے فیروز۔" کرامت نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو بہہ نکلے تھے۔

"کوئی بات نہیں چوہدری صاحب امریکہ جا کر علاج کرا لیں۔ دولت تو آپ کے پاس بڑی ہو گی ہے نا؟"

"اوئے خدا تیرا بیڑہ غرق کرے میری دولت میرے کس کام کام آئے گی تم نے خود چاقو پھیر لیے ہم دونوں پر۔"

"نہیں بڑے بھائی نہیں، ایک بڑے ماہر ڈاکٹر کو بلا لایا تھا میں، یہ بڑا نازک آپریشن تھا مگر فکر نہ کریں آپ کی جان کو کوئی خطرہ درپیش نہیں۔ کیا کھائیں گے آپ۔" میں نے پستول کی نال بدستور ان کی سمت تان رکھی تھی اور وہ دونوں بے حد خوفزدہ ہو چکے تھے۔ رنگت ان کی ہلدی ہو چکی تھی۔

"خدا کے لیے ہمیں یہاں سے جانے دو، میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں میرے بھائی مجھے معاف کر دو۔" کرامت نے ایکدم بلکتے ہوئے کہا۔

"اتنی بھی کیا جلدی ہے چوہدری صاحب! آپ کو ذرا آرام

آجائے پھر میں ماجدہ کو آپ کے پاس بھیجوں گا۔"

"مجھے اور ذلیل نہ کرو میرے بھائی۔ تم پہلے ہی مجھے بہت خوفناک سزا دے چکے ہو۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر ماجدہ کا قرض تو آپ کو چکانا ہی پڑے گا۔"

ان دونوں نے میری یہ بات سُن کر سر جُھکا لیے۔

"بولتے کیوں نہیں ہو کُتو! ابھی تو میں نے اپنے انتقام کا پہلا مرحلہ مکمل کیا ہے ابھی تو میں تم دونوں کی آنکھیں بھی نکلواؤں گا۔ تم نے سمجھا کیا تھا" میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ کرامت یہ بات سنتے ہی ہاتھ جوڑنے لگا۔ فیروز نے ایک دم میرے پاؤں پر سر رکھ دیا، بولا۔

"خدا کے لیے ہمیں ماف کر دو چوہدری صاب۔ ہمیں آپ نے بڑی سزا دے لی ہے۔"

"ابھی کہاں بچے! ابھی تو کام شروع ہوا ہے۔ یاد رکھو تم نے کوئی شور مچایا تو یہیں ڈھیر کر دوں گا تمہیں۔"

"ان کے منہ پر پھر پٹی باندھ دیں ورنہ یہ بکواس کرنے لگیں گے" یہ ماجدہ کی آواز تھی۔ وہ باہر اوٹ میں کھڑی ہماری باتیں سن رہی تھی۔ اس نے اچھی تجویز پیش کی تھی۔

"ٹھیک ہے وہ پٹیاں بھی لے آؤ اور رسیاں بھی" میں نے وہیں سے ماجدہ کو پکارا۔ اس نے کچھ ہی دیر بعد دونوں چیزیں اندر پھینک دیں۔ وہ دونوں اس حد تک نڈھال ہو چکے تھے کہ درد کی وجہ سے ذرّہ بھر بھی مزاحمت نہ کر سکے۔ ان کے تو خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ ہو گی، کہ وہ ماجدہ کے گھر پر دھاوا بولنے کے بعد اس حد تک ذلیل و خوار ہو جائیں گے وہ سدھائے ہوئے کُتوں کی طرح چپ چاپ بیٹھے رہے۔

میں نے ماجدہ سے کہ کر ان کے سامنے کھانا رکھ دیا۔ وہ انہوں نے بڑی بددلی سے کھایا۔ جب وہ کھانا کھا چکے تو ڈاکٹر ان کے لیے جو گولیاں چھوڑ گیا تھا وہ میں نے ان کو کھلا دیں تاکہ ان کے زخم جلدی بھر جائیں۔ پھر میں نے ان کے ہاتھ رسیوں میں جکڑ کر کمر پر باندھ دیئے۔

"جب تک تمہارا پُوری طرح علاج نہیں ہو جاتا تم ادھر ہی رہو گے بچّو! چپ چاپ بیٹھے رہو۔" یہ کہہ کر میں نے ان کے گرد چادریں لپیٹ دیں تاکہ وہ سردی سے بچے رہیں۔ اس کے بعد ان کے منہ پر میں نے پٹیاں باندھ دیں۔

ان دونوں کو میں اس اذیت سے گزار تو چکا تھا مگر میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ انہیں کہاں پھینکوں نہیں اب کس شکنجے میں کَس دوں۔ ظاہر ہے کہ انہیں قتل کر دینا میرے لیے بہت آسان تھا مگر اس بات کا میرے پاس کیا جواز تھا۔ میں خواہ مخواہ ان کے خون سے ہاتھ نہیں رنگنا چاہتا تھا مگر سوال یہ تھا کہ میں انہیں وہاں کب تک بٹھا رکھوں گا؟ میرے سامنے اگلا مرحلہ تھا۔ مجھے چوہدری ہادی علی سے نمٹنا تھا۔ اسی کے لیے تو میں وہاں پہنچا تھا۔ میری بہن آسیہ ادھر قید و بند کی صعوبتیں سہہ رہی تھی اس کی آزادی مجھے ہر شے سے زیادہ عزیز تھی، مگر اب جو مصیبت میں نے خواہ مخواہ کے لیے پیدا کر لی تھی، اس کا ازالہ کرنے سے پہلے میں ماجدہ کے گھر سے نکل نہیں سکتا تھا۔

اگر میں ان دونوں کو کھلا چھوڑ دیتا تو وہ ضرور تھانے پہنچتے۔ پھر پولیس ماجدہ کو کبھی نہ چھوڑتی، کیونکہ اس کے لاکھ انکار کے باوجود بھی یہ بات باور نہ کرتا کہ جو کچھ ان دونوں پر بیتی ہے وہ اس سے بے خبر ہے۔ معاملہ خاصا پیچیدہ نظر آتا تھا اور میں سخت الجھن میں پھنس چکا تھا۔ ڈر مجھے یہ تھا کہ اگر وہ کسی آدمی کو بتا کر وہاں آئے تھے تو اس بات کا امکان قوی تھا کہ وہ کرامت اور فیروز کی تلاش میں وہاں ضرور آئے گا۔ اسے ٹالا تو جا سکتا ہے مگر زیادہ دیر تک نہیں۔

وہ رات میں نے ماجدہ کے گھر میں گزار دی۔ اس نے مجھے خوش کرنے کے لیے میری بہت ہی خدمت کی۔ ادنیٰ کنیز کی طرح وہ میرے ہر حکم کی تعمیل کرتی رہی۔ اس نے مجھے اتنا آرام پہنچایا کہ پردیس کی اس رات میں اس کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔

رات کو جب میں سونے کے لیے لیٹا، اس حال میں کہ دو آدمی شدید زخمی حالت میں مجھ سے بارہ فٹ کے فاصلے پر تیسرے کمرے میں نڈھال پڑے تھے۔ ان پر مجھے کوئی ترس نہ آتا تھا۔ میں نے اپنے جذبات کا اس رات اچھی طرح تجزیہ کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ ... ان دونوں کو آدھ موا کر کے دراصل میں نے اپنے ہی کسی پُرانے زخم کا ان سے انتقام لیا تھا۔ کبھی تو ڈاکٹر رحمٰن اور ڈاکٹر عالیہ نے اسی طرح ذلیل کیا تھا۔ پھر جب مجھے میرے جرم کی اتنی بڑی سزا دے سکتے تھے اور اس سزا کو بھی انہوں نے اپنے لیے منافع کا ذریعہ بنا لیا تھا تو میں ان دونوں کو کیوں کر معاف کر دیتا۔ ان کی حالت پر میں جب بھی غور کرتا تھا مجھے دلی سکون محسوس ہوتا تھا۔

مگر جب میں نیند میں کھو گیا اس ارادے سے کہ میں اگلے دن گجرات جا پہنچوں گا۔ اور ہادی علی کو اپنی بہن آسیہ کی آزادی کے لیے موت کی نیند سُلا دوں گا تو مجھے نیند میں عجیب و غریب قسم کے ڈراؤنے خواب دکھائی دیتے رہے۔ میں بار بار ہڑبڑا کر جاگ پڑتا تھا۔ مجھے اپنے ہر خواب میں آسیہ کے جسم سے لپٹے خوفناک پھنکارتے ہوئے سانپ نظر آتے۔ اس حال میں کہ میں بے بسی کی تصویر بنا سا کھڑا بس اسے ٹک ٹک دیکھتا جاتا تھا۔ میں اپنے ہاتھوں میں اتنی سکت نہیں پاتا تھا کہ آگے بڑھ کر آسیہ کو سانپوں سے نجات دلا دوں۔ میں ہر بار بُت بنا کھڑا رہ جاتا تھا۔

میرا خیال ہے کہ وہ رات کا پچھلا پہر تھا جب میں نے ایک بار مسند آراء کو دیکھا، اس حالت میں دیکھا کہ اس کے بال کھلے تھے چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔ اس کا لباس تار تار تھا اور خون آلودہ دکھائی دیتا تھا۔ کسی ایسے آدمی سے جس کا چہرہ میں اچھی طرح نہ دیکھ سکتا تھا، گتھم گتھا ہو رہا تھا۔ میرے لیے بالکل اجنبی تھا مگر میں خنجر کھولے اس پر وار کیے جاتا تھا اور بے تکان اور وہ آدمی مجھے بانہوں میں پکڑ کر برابر کھینچتا چلا جاتا تھا

زور سے کہ میرا دم گھٹ رہا تھا۔ جب مجھے سانس لینا بھی دوبھر نظر آیا تو میں نے گھبرا کر خنجر پھینک دیا۔ اس آدمی نے مجھے چھوڑ کر فوراً وہ خنجر اٹھایا اور خونخوار انداز سے میری طرف بڑھا اچانک مجھے کسی نے پیچھے سے پکڑ لیا میں نے ادھر جب نگاہ ڈالی تو مجھے مسند آراء نظر آئی۔ وہ چیخ رہی تھی۔ "نہیں نہیں، خدا کے لیے اسے چھوڑ دو اسے چھوڑ دو۔ اسے چھوڑ دو" اور اس کی آواز سنتے ہی میری آنکھ کھل گئی۔ میں پسینے میں نہا سا گیا تھا۔ مگر مسند آرا مجھے کہیں نظر نہیں آتی تھی۔ اس کا وہ وحشت زدہ چہرہ ابھی تک میرے تصوّر میں لرزاں تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ محض ایک خواب تھا۔ وہ عجیب پاگل کر دینے والا خواب تھا۔ میں کتنی ہی دیر تک اس خواب سے الجھتا رہا۔ اس کے بارے میں برابر سوچتا رہا مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ اس آدمی کا چہرہ بھی مجھے یاد نہیں رہا تھا اور مجھے قطعاً معلوم نہیں تھا کہ اس خواب کی تعبیر کیا ہے۔ ایسا تو کبھی بھی نہ ہوا تھا۔ میں نے مسند آرا کو اس سے پہلے کئی بار خواب میں دیکھا تھا مگر ایسی وحشت زدہ تو وہ کبھی بھی نہ تھی۔ اس کی وہ تار تار اوڑھنی مجھے بوٹ کی چادر ایسی نظر آتی تھی۔ اس لڑکی نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ اب تو میں اسے جیتی جاگتی حالت میں دیکھ چکا تھا۔ وہ میری نادیدہ عاشق تھی اسے القا ہوتا تھا۔ وہ دیواروں کے اس پار چہروں کو دیکھ لیتی تھی، ان کی تصویر بنا لیتی تھی۔ اس جیسی انوکھی پُراسرار ہستی تو میں نے زندگی بھر نہیں دیکھی۔ وہ ہمیشہ مجھے اپنے بے مثال ملکوتی حُسن سے مزین ہنستی مسکراتی نظر آتی تھی۔ اس نے بارہا میرے خوابوں میں آ کر الکھ جگایا تھا۔ لیکن اُس رات کے پچھلے پہر وہ جس حالت میں مجھے نظر آئی تھی، وہ ایسا نہ تھا کہ میں اسے نظر انداز کر سکتا مگر میں اس کے کسی بھی اشارے سے کچھ نہ سمجھ سکا۔ کوئی بھی مطلب اخذ نہ کر سکا۔

صبح جب ہم ناشتہ کر چکے اور اُن دونوں کو بھی ناشتہ کھلا چکے تو میں نے کہا "ماجدہ! یہ لیں پانچ ہزار روپے یہ اپنے خرچ کے لیے رکھ لیں۔ میں چند دن کے لیے باہر جا رہا ہوں۔ اس عرصے میں آپ ان کو ادھر ہی بند رکھیں گی۔ سمجھیں میں واپس آ کر ان کے بارے میں کوئی فیصلہ کروں گا۔"

وہ ایک دم بدک گئی اور روپے پرے ہٹا کر بولی۔

"یہ مجھ سے نہ ہو گا جیلانی صاحب مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلیں مرنے دیں ان کُتوں کو یہاں میں ان کے ساتھ تو اس گھر میں ایک منٹ نہیں رہ سکتی۔"

"مگر میں ایک ایسے کام سے جا رہا ہوں جہاں میں آپ کو ساتھ نہیں رکھ سکتا میری جان! اچھا آپ یہ بتائیں آپ کے عزیز رشتے دار ہیں ادھر ادھر۔"

"ہاں میری سگی خالہ ہیں مگر وہ تو ادھر ملتان میں رہتی ہیں۔"

"ویری گڈ۔ آپ ابھی سامان باندھیں اور اس کے پاس چلی جائیں، میرا آپ سے وعدہ رہا کہ میں ٹھیک پندرہ دن بعد آپ کے پاس پہنچ جاؤں گا۔"

"مگر میں انہیں کیا بتاؤں گی۔"

"آپ اُن سے کہہ دیں کہ آپ کی نوکری چھوٹ گئی ہے کسی کو ادھر پتہ تو نہیں ہے کہ آپ کی خالہ وہاں ہیں۔"

"نہیں! میں تو وحید کے ساتھ یہاں ادھر گوجرانوالہ سے آئی تھی میرے والدین وہیں رہتے تھے مگر وہ دونوں پچھلے سال فوت ہو گئے تھے میرا کوئی نہ بھائی ہے نہ بہن۔"

"وحید کیا کرتا تھا یہاں۔"

"وہ یہاں اسکول ماسٹر تھا۔ بی اے بی ایڈ کر رکھا ہے اُس نے۔ وہ بھی گوجرانوالہ کا رہنے والا ہے۔ وہ یہاں آ کر اس کرامت کا دوست بن گیا تھا۔ اسی نے اسے ایک ایجنٹ سے کہہ کہہ کر ڈنمارک بھجوایا۔ پلّے سے پیسے خرچ کیے۔ اس کی نیت شروع ہی سے میرے بارے میں خراب تھی بہت عرصے سے یہ میرے پیچھے لگا تھا مگر اب تو اس نے بہت ہی ذلیل کرنا شروع کر دیا تھا مجھے، اب میں اس کے ہوتے ہوئے یہاں کیسے رہ سکتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے آپ آج ابھی ملتان چلی جائیں اور گھر کو تالا لگا دیں۔"

"مگر ان کا کیا بنے گا؟"

"یہاں سے اپنی تمام ضروری چیزیں نکال لیں اور چابی ہمسایوں کو دے جائیں کسی کو پتہ بھی نہ چلے گا کہ آپ کہاں ہیں ان کو کوئی نہ کوئی باہر نکال دے گا۔"

"بچوں ایسی باتیں کرتے ہیں آپ! انہیں ابھی یہاں سے نکال دیں۔ پھر میں بھی ملتان چلی جاتی ہوں۔ اگر یہ یہیں پھنسے رہے تو ہم پر زبردست مصیبت آ پڑے گی۔"

"ٹھیک ہے میں آج رات انہیں یہاں سے نکال دوں گا۔"

میں نے فیصلہ کُن انداز سے کہا وہ مطمئن ہو گئی اور وہ پُورا دن ہم نے یونہی گزار دیا۔

رات جب گہری ہو گئی تو میں ماجدہ کے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ مجھے کسی گاڑی کی تلاش تھی تاکہ اس میں ڈال کر میں دونوں کو وہاں سے نکال دوں۔ مجھ سے سخت حماقت سرزد ہو چکی تھی میرے لیے یہی بہتر تھا کہ میں ڈاکٹر کی کار میں ڈال کر انہیں بھی ہسپتال پھینک آتا۔ ایک فائدہ تو یہ ہوتا کہ وہ لوگ کبھی بھی یہ نہ جان سکتے کہ ان کو اس حال میں کس نے پہنچایا ہے دوسرا فائدہ یہ ہوتا کہ میں اس نئے ٹنٹے سے بچ جاتا۔ بہرحال اب تو یہ مصیبت میرے گلے آ پڑی تھی۔ مجھے اس سے عہدہ برآ ہونا ہی تھا مگر راستہ مجھے کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ میں بازار سے نکل کر بڑی سڑک پر پہنچا ہی تھا کہ ایک کھمبے کی روشنی میں کھڑی مجھے ایک سوزوکی وین نظر آئی۔ میں سیدھا اس کے ڈرائیور کے پاس جا پہنچا۔

"کیوں بھئی خالی ہے؟"

"جی ہاں! میں گجرات جا رہا ہوں۔"

"میرا کچھ سامان ہے وہ ساتھ رکھ لو تو میں تمہیں گجرات تک کا کرایہ دوں گا"

"میں سامان ہی ڈھوتا ہوں جناب گجرات تک کا کرایہ ساٹھ روپے ہو گا۔"

"مجھے منظور ہے بھائی۔ مگر ذرا جلدی چلو"

یہ کہہ کر میں اس کے ساتھ بیٹھ کر ماجدہ کے مکان پر جا پہنچا۔ سوزوکی وین دروازے پر کھڑی کر کے میں اندر پہنچا اور جاتے ہی میں نے ماجدہ سے کہہ کر اس کے جہیز میں ملی ہوئی جست کی بڑی پیٹی خالی کروالی۔

"یہ کیا کریں گے آپ؟"

"ان دونوں کو کہیں پھینک تو آؤں، ورنہ تو یہ خواہ مخواہ مصیبت بنے رہیں گے ہمارے لیے۔" یہ کہہ کر میں نے کرامت اور فیروز کو بڑی بے رحمی سے بے ہوش کیا اور دونوں کو پیٹی میں ڈال کر میں نے ڈھکنا بند کر کے تالا لگا دیا۔

"میری یہ پیٹی تباہ کر دیں گے آپ۔" ماجدہ نے بڑی حسرت سے کہا۔ "یہ مجھے جہیز میں ملی تھی۔"

"مجھے معلوم ہے مگر ایسی ہزار پیٹیاں میں آپ کو خرید کر دے سکتا ہوں یہ تو چیز ہی کچھ نہیں ہے جناب۔" یہ کہہ کر میں نے پیٹی کی ایک دیوار میں دو اینچ چوڑا سوراخ کر دیا۔ تاکہ انہیں ہوا ملتی رہے۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو وہ دونوں بند صندوق میں دم گھٹ کر مر جاتے۔

"میں ان کو ٹھکانے لگا کر رات ہی رات واپس آجاؤں گا، آپ میرا انتظار کریں۔"

یہ کہہ کر میں نے ڈرائیور کو اندر بلایا اور اس کی مدد سے وہ پیٹی وین میں لاد کر اسی وقت کنجاہ سے باہر نکل آیا۔ گجرات پہنچ کر میں وین کو سیدھا ہسپتال کے اندر لے گیا اور پیٹی کو ہسپتال کے برآمدے کے سامنے اتار کر میں نے ڈرائیور کو اس کا کرایہ دے کر فارغ کر دیا۔ وہ ڈرائیور ادھیڑ عمر کا بہت ہی سنجیدہ سا آدمی تھا وہ بھی سارا راستہ خاموش رہا اور میں بھی وہ مجھ سے خوفزدہ تھا اور میں اس سے۔

ہسپتال کے کئی آدمیوں نے اس پیٹی کے بارے میں مجھ سے پوچھا مگر میں نے کہہ دیا کہ اس میں کچھ ضروری سامان ہے۔ چند منٹ تک میں اس پیٹی کے پاس ٹھیرا رہا پھر چپ چاپ وہاں سے کھسک آیا۔ ان کے سلسلے میں میرا کام ختم ہو چکا تھا۔ جب میں رات گیارہ بجے کے قریب ماجدہ کے گھر پہنچا تو دیکھا کہ اس کے مکان کا بڑا دروازہ تھوڑا سا بھڑا ہوا تھا۔ اس کا ایک پٹ کھول کر میں اس امید میں اندر داخل ہوا کہ ماجدہ میرے انتظار میں سامنے کھڑی ہوگی مگر وہاں وہ موجود نہیں تھی۔ میں بھاگ کر اندر پہنچا تو میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ ماجدہ کے اس کمرے کی تمام چیزیں ادھر اُدھر بکھری پڑی تھیں جس میں پچھلی رات میں نے ایسی نیند لی تھی کہ اس کا خمار اب بھی مجھے کبھی یاد آتا ہے تو میں سرشار ہو جاتا ہوں۔ میں نے پاگلوں کی طرح گھر کے تمام کمرے دیکھ لیے مگر وہ مجھے کہیں بھی نظر نہیں آئی۔ میری تو آنکھوں تلے اندھیرا چھانے لگا۔ وہ روپیہ جو میرے پاس تھا میں نے گجرات روانہ ہونے سے پہلے جیبوں میں بھر لیا تھا اور محفوظ تھا۔ سائلینسر لگا پستول بھی میری کمر سے بندھا تھا، مگر وہ لوگ میرا بریف کیس بھی لے گئے تھے اور اٹیچی کیس بھی جس میں آٹومیٹک کی دی ہوئی اسٹین گن بند تھی۔ یہ میرا بہت بڑا نقصان تھا۔ میرا سارا منصوبہ چوپٹ ہوا جاتا تھا مگر سب سے بڑا چرکا جو مجھے زندگی نے اس بار لگایا یہ تھا کہ وہ عورت وہاں سے زبردستی اغوا کر لی گئی تھی جو میری زندگی بن گئی تھی۔ کمرے کی حالت یہ بتاتی تھی کہ وہاں خاصی دھینگا مشتی ہوئی تھی۔ ماجدہ کی چوڑیاں فرش پر ٹوٹی پڑی تھیں اس کے کان کا ایک آویزہ بھی ٹوٹ کر دروازے میں گرا ہوا تھا اور صحن میں نالی کے قریب اس کا ایک سینڈل اوندھا پڑا تھا۔ میں نے ڈیوڑھی میں لالٹین لے جا کر ادھر اُدھر دیکھا تو وہاں سے مجھے ایک بٹوہ فرش پر پڑا ملا۔ وہ میں نے اٹھا کر کھولا تو اس میں سے مجھے میرے مطلب کی بہت سی چیزیں ملیں۔ وہ غالباً اس آدمی کا بٹوہ تھا جس نے ماجدہ کو وہاں سے زبردستی اغوا کیا تھا۔ اس میں اس کا شناختی کارڈ دھرا تھا۔ معلوم یہ ہوا کہ وہ کوئی فارسٹ گارڈ ہے اور اس کا نام مشتاق احمد ہے۔ بٹوے میں تیرہ روپے بھی موجود تھے اور ایک خط تھا جو اس کے نام کسی علی احمد نے جہلم سے بھیجا تھا۔ وہ سب چیزیں میں نے بڑی احتیاط سے جیب میں رکھیں اور ایک بار پھر ماجدہ کے گھر کی تباہ حال صورت پر غور کرنے کے لیے ایک ایک کمرے میں گھوم گیا۔ وہ لوگ میرے بریف کیس اور اٹیچی کیس کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزیں لے گئے ہوں گے کیونکہ ماجدہ کے تمام ٹرنک کھلے پڑے تھے۔ اور بہ صحیح طور پر اندازہ نہ ہو سکتا تھا کہ وہ اور کیا کیا اٹھا کر لے گئے ہیں۔

یہ بدترین صورتِ حال تھی اور تقاضا کرتی تھی کہ مجھے جس قدر جلد ہو سکے وہاں سے نکل جانا چاہیے کیونکہ وہ لوگ کرامت کی تلاش میں وہاں آئے تھے۔ انہیں اب تک ماجدہ پر ظلم و ستم توڑنے کے بعد یہ معلوم ہو چکا ہوگا کہ کرامت اور فیروز پر کیا گزری ہے انہیں ماجدہ نے یہ بھی بتا دیا ہوگا کہ میں رات کسی بھی وقت واپس آسکتا ہوں وہ اسے کسی محفوظ جگہ پہنچا کر مجھ سے نپٹنے کے لیے ضرور وہاں آئیں گے۔ ہو سکتا ہے وہ پولیس کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ ان سے کوئی بھی بات بعید نہیں تھی وہ جرائم پیشہ لوگ تھے جن کو ان کی بڑی زمینداری نے اس قدر دیدہ دلیر بنا دیا تھا کہ وہ جس جگہ چاہتے تھے انگلی مار دیتے تھے۔ وہ اپنے ساتھ میرا وہ پستول بھی لے گئے جو میں نے نثار سے حاصل کیا تھا اور جسے میں ماجدہ کو اپنی حفاظت کے لیے دے گیا تھا۔ کمرے میں کسی بھی طرف کوئی ایسا نشان نظر نہیں آتا تھا جس سے معلوم ہو سکتا کہ ماجدہ نے کوئی گولی چلائی ہوگی۔ اس بے چاری سے لبلبی بھی دب سکی ہوگی۔ وہ شاید ایک دم پکڑ لی گئی تھی۔ اچانک اور غیر متوقع طور پر۔

میں کتنی ہی دیر تک ماجدہ کے لٹے پٹے شکن در شکن بستر پر بیٹھا سوچتا رہا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے آخر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ جگہ فوراً چھوڑ دینی چاہیے کیونکہ وہاں کسی بھی وقت وہ لوگ مجھے پکڑنے کے لیے پولیس کو بھیج سکتے تھے۔ مگر سوال یہ تھا کہ میں آدھی رات کو کہاں جاؤں، کس طرف نکلوں میرے لیے تو سارے ہی راستے بند تھے۔ کہیں

کوئی ایسا ہوٹل بھی نہیں جہاں جا کر میں باقی وقت گزار سکتا۔ رات وہاں پہلے ہی بے رونقی کو سُن کر کے رکھ دیتی تھی اور پھر سردی نے الگ اندھیر مچا رکھا تھا۔

میں ادھر اُدھر نگاہ ڈال کر بڑی بے دلی سے ماجدہ کے کمرے سے نکلا اور گھر کو اسی طرح کھلا چھوڑ کر میں نے بڑا دروازہ اپنے پیچھے بند کیا اور باہر گلی میں آگیا چاروں طرف ہُو کا سا عالم طاری تھا۔ حد یہ تھی کہ کوئی چوکیدار بھی ادھر اُدھر پھرتا نظر نہیں آتا تھا۔ سردی نے ہر شے کو اپنی یخ بستہ گرفت میں لے رکھا تھا۔ میں ہونٹوں میں سگریٹ دبائے تیز تیز قدم اٹھاتا گلی سے باہر نکل رہا تھا۔ سامان نام کی کوئی بھی شے میرے پاس نہیں رہی تھی۔ میری ساری چیزیں اٹیچی کیس اور بریف کیس میں بند تھیں مگر وہ دونوں ماجدہ کے ساتھ ہی گھر سے غائب ہو چکے تھے۔

ماجدہ پر اس گھڑی کسی بھی چار دیواری کے اندر ان بدمعاشوں کے ہاتھوں جو کچھ بیت رہی ہوگی اس کے تصور ہی سے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ وہ میری وجہ سے خواہ مخواہ ایک ایسی مصیبت میں پھنس گئی تھی جس سے وہ کسی بھی طرح چھٹکارہ نہ پا سکتی تھی۔ اس کا تو وہاں کیا ساری دُنیا میں کوئی مونس و غمخوار نہیں تھا۔ وہ پہلے ہی شوہر گزیدہ تھی۔ اب اس کرامت اور اس کے بعد اس کے غنڈوں کے ہاتھوں وہ جس طرح لیر لیر ہو رہی ہوگی، اس کا اندازہ ہی نہ کیا جا سکتا تھا۔ رہ رہ کر میری مٹھیاں بھنچ جاتی تھیں میرا بس نہیں چلتا تھا ورنہ میں اس بستی کو ہی آگ لگا دیتا۔ مشتاق احمد کے شناختی کارڈ پر اس کے گھر کا پتہ اکبر کوٹ کا لکھا ہوا تھا۔ اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ کرامت کے وہ کون کون سے حواری ہیں جو ماجدہ کو اغوا کر کے لے گئے ہیں۔ اس بیچاری پر تو قیامت بیت چکی ہوگی۔

میں پچھلی رات بھی پوری نیند نہ لے سکا تھا اور اب دوسری رات ایسی آئی تھی کہ وہ میرا سکھ چین ہی لوٹ کر لے گئی تھی۔ اور اب میں وہاں ٹھن ٹھن گوپال بنا پھر رہا تھا۔ زندگی نے اس تھوڑے سے عرصے میں مجھے کتنے دکھ دکھوا دیئے تھے۔ تقدیر نے مجھے جواری بنا کر رکھ دیا تھا۔ ایسی جواری جس پر ہر کوئی اپنی برچھی قلم بھالا تیز کرنے چلا آتا تھا۔ میں نے ماجدہ کے لیے اپنے دل میں ہزار طرح کے خوبصورت منصوبے بنا لیے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ دنیا جہاں کی خوشیاں اس کے قدموں میں ڈھیر کر دوں مگر میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ سب کچھ راکھ کا ڈھیر ہو چکا تھا۔ ساری بساط ہی الٹ گئی تھی۔ میں ایسے بگولوں کی زد پر تھا جو پل میں تنکوں کی سمتیں بدل کر رکھ دیتے ہیں۔ میں دو قدم بھی کسی کے ساتھ چلتا تھا تو یہی سمجھتا تھا کہ میں ساری زندگی اس کے ساتھ گزار دوں گا۔ بڑی فراخدلی سے میں ہر ایک کو اپنا بنانے کی سعی کرتا تھا۔ ماجدہ کے سلسلے میں تو میں اور جذباتی ہو گیا تھا مگر اب جب میری آنکھ کھلی تھی تو مجھے معلوم ہوا تھا کہ میں تو محض ایک سپنا دیکھ رہا تھا — اور جب گر کر باہر دیکھا تو ہر شے کھنڈر میں بدلی نظر آتی تھی۔

مجھے تو اپنے ذمے لیا ایک کام سرانجام دینا تھا۔ آسیہ کی آزادی کے لیے مجھے ہادی علی کی زندگی کا چراغ گُل کرنا تھا۔ اس ہادی علی کا جس کی مجھ سے کوئی دشمنی نہ تھی جسے میں جانتا تک نہیں تھا پھر بھی میں ارادہ کر کے ادھر آیا تھا کہ اسے ختم کر دوں گا کیونکہ مجھ سے آہو صاحب نے آسیہ کی آزادی کا سودا اسی طرح طے کیا تھا مگر اب راستے میں ایسا پیچ آپڑا تھا کہ میرا وہ سارا منصوبہ دم توڑتا نظر آتا تھا۔

ابھی میں ماجدہ کے گھر سے دس قدم ہی دور گیا تھا کہ ایک اینٹ سے میرا پاؤں ٹکرایا اور اپنے آپ کو گرنے سے بچانے کے لیے میں پورے قدسے گھوم گیا۔ یونہی بے خیالی میں میری نظر ماجدہ کے گھر کی طرف اٹھی تو میں نے دیکھا کہ ایک آدمی اس کے دروازے میں گھس رہا تھا۔ میں الٹے قدموں واپس لپکا۔ پستول پر میری گرفت مضبوط ہو گئی اور میں سر سے پاؤں تک غصے میں پھنکنے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ لوگ میری ہی تلاش میں ہیں۔ اور وہ آدمی یہی دیکھنے آیا تھا کہ میں واپس آچکا ہوں کہ نہیں۔ مکان کا دروازہ کھلا تھا اور وہ آدمی جو مجھے خاصا گرانڈیل نظر آتا تھا، سامنے صحن میں کھڑا تھا۔ اس نے کمبل اوڑھ رکھا تھا اور سر پر اس نے یہ بڑا سا پگڑ باندھ رکھا تھا۔ وہ ماجدہ کے اس کمرے میں جھانک رہا تھا جس میں میں نے رات گزاری تھی۔

میں دبے پاؤں ڈیوڑھی میں داخل ہوا تو میرے قدموں کی چاپ اس نے سُن لی حالانکہ میں نے بہت احتیاط برتی تھی مگر اس کی سماعت حیرت انگیز تھی وہ تیزی سے اپنے پاؤں پر گھوما تو مجھے دیکھتے ہی وہ پیچھے ہٹ کر اُدھر نکل گیا جدھر سیڑھی بنی ہوئی تھی۔ وہ سیڑھی ڈیوڑھی میں سے نظر نہیں آتی تھی۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ مسلح ہے کہ نہیں پھر بھی یہ احساس بالکل فطری تھا کہ مجھے اس کے سامنے اچانک نہیں پہنچ جانا چاہیے اگر پستول اس کے پاس نہیں ہے تو بھی چاقو چھری تو اس نے نیفے میں اڑس ہی رکھی ہوگی۔

"تم جو کوئی بھی ہو سامنے آجاؤ ورنہ اچھا نہ ہوگا۔" میں نے دبے لہجے میں کہا۔

"تم کون ہو؟ ادھر تمہارا کیا کام ہے؟" وہ بڑے گمبھیر لہجے میں بولا معلوم یہ ہوا کہ وہ سیڑھی کی دیوار کے پیچھے کھڑا ہے۔ آواز اس نے بھی دبا لی تھی۔

"بکواس مت کرو، سامنے آجاؤ۔ اور بتاؤ یہاں تم ماجدہ کے گھر میں کیا لینے آئے ہو؟" میں نے اب کی بار ذرا آگے سرکتے ہوئے کہا۔ وہ شاید اسی انتظار میں تھا۔ اس نے دیوار پر رکھی آدھی اینٹ اٹھا کر میری طرف پھینکی۔ اگر میں فوراً ہی طرح نہ دے جاتا تو وہ اینٹ میرے سر میں لگ چکی تھی۔ وہ آدمی اندھیرے میں بھی دیکھ سکتا تھا۔ اس کی بصارت بھی اس کی سماعت کی طرح تیز تھی۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ اس کے پاس پستول نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ مجھ پر اینٹ پھینکنے کے بجائے گولی چلاتا۔ میں اینٹ سے اپنا سر بچا کر تیزی سے صحن میں جا پہنچا مگر وہ سیڑھیوں میں نہیں تھا۔ بھاگ کر چھت پر چڑھ گیا تھا۔ ابھی میں کوئی فیصلہ ہی نہ کر

پایا تھا کہ ایک اینٹ ٹھک سے میری کمر میں لگی میرے بدن پر خاصا موٹا کوٹ تھا اور اس پر میں نے کمبل بھی اوڑھ رکھا تھا۔ اگر یہ دونوں چیزیں نہ ہوتیں تو اس نے جس انداز سے وہ اینٹ ماری تھی وہ میری کمر توڑنے کے لیے بہت کافی تھی۔

اینٹ لگتے ہی میں سیڑھیوں پر جا دبکا۔ اب میں اس کی زد میں نہیں تھا مگر ابھی میں وہاں پہنچا ہی تھا کہ ایک اور اینٹ اس نے سیڑھی کے عین منہ پر پہنچ کر میری طرف پھینکی مگر اب کی بار اس کا نشانہ خطا ہو گیا۔ میں نے اُسے دیکھ لیا تھا وہ ایک اور اینٹ میری طرف لڑھکا ہی رہا تھا کہ میں نے اس پر اپنے "چپ شاہ" سے گولی داغ دی۔ میں نے جان بوجھ کر اس کے بدن کے کسی اہم حصے کو نشانہ نہیں بنایا تھا۔ گولی اس کی ران میں لگی اور وہ اپنی چیخ دباتا ہوا پیچھے ہٹا۔ اس کے ساتھ ہی میں دوڑ کر چھت پر جا پہنچا وہ گلی کی طرف بنی منڈیر کی طرف بھاگ رہا تھا۔ میں نے ایک گولی اور چلا دی۔ وہ بھی نشانے پر بیٹھی اور اس کی دوسری ران میں گھس گئی۔ وہ آدمی ڈگمگایا اور پھر چکرا کر منہ کے بل گر گیا۔ اب میں اس کے سر پر جا پہنچا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ایک چمکتا ہوا خاصے لمبے پھل کا چھرا تھا اور میرا خیال ہے کہ اگر میں گولی اُس پر نہ چلاتا تو سیڑھیوں میں اینٹوں سے سیدھا کر کے وہ مجھ پر چھرے سے وار کرتا۔

اس کی قوت برداشت حیرت انگیز تھی۔ وہ زخموں سے نڈھال تو ہوا مگر پھر بھی اُس نے اپنی چیخ ابھرنے نہیں دی تھی۔ اُس کی شلوار پر [illegible] ہوتی جا رہی تھی۔ مجھے اپنے سامنے دیکھ کر وہ سنبھل کر اٹھا مگر اُس کی ٹانگیں اس کا بوجھ سہار نہیں رہی تھیں۔

"میرے ساتھ آؤ۔" میں نے اس کی کلائی پکڑ کر چھرا اس کے ہاتھ سے جھٹک دیا۔ اس کی ہمت جواب دیتی جا رہی تھی۔ چھرا دور جا پڑا تھا۔ اور وہ سمجھ چکا تھا کہ وہ بازی ہار چکا ہے۔ میں نے اس کا چھرا اٹھا کر جیب میں رکھ لیا۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ وہ بہادر آدمی تھا، جانتا تھا کہ آدمی ہار جائے تو اسے کیا کرنا چاہیے۔ اسے سہارا دے کر میں نے بڑی مشکلوں سے صحن میں پہنچایا اور پھر اندر لے جا کر کرسی پر بیٹھا دیا۔ ڈاکٹر عرفان وہاں مرہم پٹی کا جو سامان چھوڑ گیا تھا وہ ماجدہ نے الماری میں ڈال دیا تھا۔

اس لمحے وہ مجھے بہت غنیمت نظر آیا۔ میں نے صحن میں نکل کر گلی کا دروازہ اندر سے بند کیا اور پھر کمرے میں جا کر میں نے اس کی شلوار پھاڑ کر اس کے زخم دیکھے۔ ایک گولی ران کے اندر تھی مگر زیادہ گہری نہیں تھی۔ دوسری گولی جلد کو آدھ انچ گہرا چھیلتی ہوئی باہر نکل گئی تھی۔ میں نے اس کے چھرے سے اس کی ران میں سے گولی نکالی۔ وہ خاصا تکلیف دہ مرحلہ تھا مگر میں اس جوان کی ہمت پر آفرین کہوں گا کہ اس نے سی تک نہیں کی۔ بس آنکھیں بند کر کے لبوں کو بھینچ کر بیٹھا رہا۔ میں نے اس کے دونوں زخموں پر پٹی باندھ دی تو اس کے وجود میں پھیلتا ہوا درد کا احساس کم ہونے لگا۔

وہ گندمی رنگ کا بڑا ہی صحت مند جوان تھا۔ عمر اس کی یہی کوئی تیس سال ہو گی۔ قمیص پر اُس نے خاکی رنگ کی جرسی پہن رکھی تھی اور سیلے! [illegible] براق شلوار کے نیچے اس کے پاؤں میں کینوس کے سفید بوٹ خاصے بھلے لگتے تھے۔ جرابیں اس نے خاصی موٹی پہن رکھی تھیں۔ میں مرہم پٹی کر کے الگ ہوا تو وہ مجھے گہری گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے مُسکرایا۔

"تم خاصے بہادر آدمی ہو کیا نام ہے تمہارا؟"

"میرا نام مشتاق ہے۔"

"ادھر کیسے آئے تھے تم؟" میں نے پلنگ پر بیٹھ کر سگریٹ سُلگاتے ہوئے کہا۔ پستول میں نے اپنے دائیں ہاتھ میں رکھ لیا تھا۔

"سگریٹ پیتے ہو تو لو پیو۔" یہ کہہ کر میں نے ایک سگریٹ اُس کی طرف بڑھایا۔ وہ پھر مسکرا دیا اور سگریٹ میرے ہاتھ سے لے کر اُس کا برانڈ دیکھنے لگا۔

"پیو۔ یہ اچھا سگریٹ ہے۔" یہ کہہ کر میں نے اس کا سگریٹ بھی سلگا دیا۔ وہ ایک طویل کش لے کر دھواں سینے میں دبا کر اُبلی اُبلی نظروں سے مجھ کو دیکھنے لگا۔

"بتایا نہیں تم نے کہ تم ادھر کیسے آئے تھے؟"

وہ کچھ نہیں بولا۔

"تمہارے ساتھی کہاں ہیں میری بات کا جواب دو۔" میں نے پستول اس کی طرف لہرایا۔

"کون سے ساتھی؟" وہ بہت ہی پُرسکون نظر آ رہا تھا۔

"وہی جو ماجدہ کو یہاں سے اٹھا کر لے گئے ہیں۔"

"کوئی زیادہ آدمی نہیں تھے ہم۔"

"کتنے آدمی تھے؟"

"ایک میں تھا اور ایک نذیر۔"

"ماجدہ کہاں ہے اب؟"

"وہ اُدھر چوہدری کرامت کی بیٹھک میں ہے۔"

"کرامت تمہارا کیا لگتا ہے؟"

"وہ... وہ میرا یار ہے۔ کہاں ہے وہ اب؟"

"یہ تو میں بعد میں بتاؤں گا پہلے مجھے ماجدہ کا پتہ بتاؤ اگر تم نے اس کے ساتھ کوئی زیادتی کی تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا قسم خدا کی میں تمہیں بھون کر رکھ دوں گا۔"

"میں نے اس سے کچھ نہیں کہا ہے وہ بالکل محفوظ ہے۔"

"تم ادھر کیوں آئے تھے؟"

"میں اپنا بٹوہ لینے آیا ہوں وہ ادھر گر گیا تھا۔"

"اچھا! ماجدہ کو کیوں اٹھایا ہے تم نے؟"

"وہ چوہدری کرامت کے بارے میں کچھ نہیں بتا رہی تھی، اس لیے اسے یہاں سے ہم نے اٹھا لیا ہے۔"

"کیا بتایا ہے اس نے؟"

"اس نے ابھی تک کچھ نہیں بتایا ہے۔ ادھر ہم اس پر ہاتھ اٹھاتے تو وہ شور مچاتی، محلے کو جگا دیتی۔ اب ہم اسی لیے اسکو وہاں لے گئے ہیں۔"

"تمہیں یہ پتہ تھا کہ میں بھی یہاں ہوں گا۔"

"نہیں! مگر ہمیں شک ضرور تھا لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ کوئی تم ایسا سُور یہاں بیٹھا ہو گا۔" یہ کہہ کر وہ پھر مسکرایا۔

"بڈھے کی کیوں اتنی فکر تھی تمہیں؟"

"اس میں میرا شناختی کارڈ موجود ہے۔ میں ادھر محکمہ جنگلات میں کام کرتا ہوں۔"

"یہاں سے تم کچھ چیزیں بھی اٹھا کر لے گئے ہو؟"

"ہاں ایک نیا سا اٹیچی کیس ہے کالے رنگ کا، وہ ابھی ہم سے کھل نہیں سکا، ایک اور اٹیچی کیس ہے اس میں ماجدہ کے کپڑے اور زیور ہیں۔"

"اس ماجدہ کا کرامت سے کیا تعلق ہے؟"

"اس کا شوہر کرامت صاحب کا دوست تھا۔ وہ باہر جاتے وقت کرامت صاحب سے پندرہ ہزار روپیہ لے کر گیا تھا۔ کرامت صاحب ماجدہ سے وہ رقم وصول کرتے ہیں قسطوں میں، مہینے میں چار قسطیں بندھی تھی مگر کل رات وہ قسط وصول کرنے آئے تو پتہ نہیں کہاں چلے گئے ــــ ہمیں وہ یہی کہہ کر آئے تھے۔ جب وہ آج شام تک بھی کہیں نظر نہ آئے تو میں اور نذیر ان کا پتہ کرنے ادھر آ گئے۔ یہاں ہمیں اس کمرے میں فرش پر خون جما ہوا نظر آیا۔

مگر ماجدہ کچھ بتاتی ہی نہیں۔ یہ چکر ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔" یہ کہہ کر وہ ذرا دیر کے لیے کسمسایا۔ اس کے زخم شاید ٹیسیں دینے لگے تھے۔

"تمہیں درد محسوس ہوتا ہے؟"

"ہاں تم نے تو بیڑہ ہی غرق کر دیا ہے میرا۔ بڑے ہیر کاریگر آدمی لگتے ہو مجھے، یہ تمہارا پستول بے آواز چلتا ہے۔"

"ہاں! اور میرا نشانہ بھی کبھی خطا نہیں جاتا۔"

"یہ لو، یہ گولی کھا لو۔ درد رک جائے گا۔" یہ کہہ کر میں نے الماری میں سے نکال کر اسے دو گولیاں دیں۔ وہ بھی ڈاکٹر عرفان وہاں چھوڑ گیا تھا۔

گولیاں اسے تھما کر میں صحن میں نکلا اور گلاس میں پانی بھر کر اندر لے گیا۔ تاکہ وہ گولیاں نگل سکے۔ اس کی آنکھوں میں ایسا اعتماد جھلکتا تھا کہ مجھے حیرت ہوتی تھی۔ وہ میرے پستول کی زد میں تھا۔ میں پلک جھپکتے میں اس کی زندگی کا چراغ گل کر سکتا تھا مگر وہ مجھ سے ذرہ بھر بھی خوفزدہ نظر نہیں آتا تھا۔ اس کی یہ دیدہ دلیری دیکھ کر میں سخت طیش کھا رہا تھا مگر اس کے باوجود میرا دل نہیں چاہتا تھا کہ اس پر کوئی اور وار کروں۔ اسے کوئی اور گزند پہنچاؤں۔ ایسے بہادر اور جرأت مند لوگ میں نے بہت کم دیکھے ہیں۔ وہ سخت زخمی تھا، اتنا زخمی کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہو سکتا تھا۔ اس کے باوجود وہ ٹھہر ٹھہر کر مسکراتا تھا۔ بے پناہ اعتماد تھا اس کی مسکراہٹ میں اور اسے قطعاً یہ احساس نہیں تھا کہ وہ کتنے زبردست خطرات میں گھرا ہوا ہے۔

"مجھے اس جگہ کا پتہ بتاؤ جہاں ماجدہ کو تم نے بند کر رکھا ہے۔"

"وہ کرامت کی حویلی میں بند ہے مگر تم وہاں نہ پہنچ سکو گے یہ بڑے بڑے کتے پال رکھے ہیں کرامت نے۔"

"کتے میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ مجھے بتاؤ کون سا راستہ ادھر جاتا ہے اور وہ حویلی کے اندر بند ہے یا کسی آس پاس کے مکان میں؟"

"ادھر وہ نذیر کی کوٹھڑی میں پڑی ہے میرے ایک طمانچے سے وہ بے ہوش ہو گئی تھی اب شاید اُسے ہوش آ گیا ہو۔ میں تو اپنے بٹوے کے لیے ادھر آ گیا تھا میں نہیں چاہتا تھا کہ صبح اس شناختی کارڈ کو دیکھ کر پولیس مجھے آ پکڑے۔"

"اس کے پاس میرا پستول بھی تھا۔"

"وہ نذیر کے پاس ہے مگر وہ چلتا ہی نہیں۔ اس میں شاید گولیاں پھنس گئی ہیں بالکل جام ہو چکا ہے وہ۔ ورنہ میں اسے ساتھ لے کر آتا اور تمہارا ادھر قصہ ہی پاک کر دیتا۔"

ابھی اس نے یہ بات کہی ہی تھی کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی میں پلنگ سے اترا اور کمرے کے دروازے پر باہر سے کنڈی چڑھا کر ڈیوڑھی میں جا پہنچا۔

"کون ہے؟" میں نے دبی زبان میں پوچھا

"دروازہ کھولیں جیلانی صاحب جلدی کریں۔" یہ ماجدہ کی آواز تھی۔ وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ میں نے پاگلوں کی طرح آگے بڑھ کر کنڈی کھولی تو ماجدہ تیزی سے اندر داخل ہوئی اس حال میں کہ اس کے سر پر ایک میلا کچیلا کمبل تھا اور ہاتھ میں دو اٹیچی کیس تھے۔ میں نے اس کے پیچھے دروازہ بند کیا اور اسے بانہوں میں بھر لیا۔

"آپ؟ آپ کیسے نکل آئی ہیں اس نذیر بدمعاش کے چنگل سے آپ نے تو کمال کر دیا ہے ماجدہ۔"

"آپ کو کس نے بتایا ہے کہ اس کا نام نذیر ہے؟ آپ کیسے جانتے ہیں اُسے؟" وہ ہانپ رہی تھی۔

"چلیں اندر چل کر بتاتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے دونوں اٹیچی کیس اٹھائے اور اسے اپنے ساتھ لے کر کمرے میں جا پہنچا۔

مشتاق اسے دیکھ کر یوں کرسی پر سے اچھلا جیسے اس نے کوئی بھیانک خواب دیکھا ہے۔ ماجدہ اسے دیکھتے ہی گالیاں دینے لگی۔ وہ غصے میں اس قدر بپھر گئی کہ پستول میرے ہاتھ سے چھیننے لگی۔

"یہ مجھے دے دیں میں اس کو یہیں ختم کر دوں گی۔ مجھے اس کی صورت سے نفرت ہے یہ مجھے دیں ادھر۔" وہ مجھ سے زور آزمائی کر رہی تھی۔

"نہیں ماجدہ! اتنا غصہ نہ کریں اسے اس کا سبق مل چکا ہے اس کی دونوں ٹانگیں زخمی ہیں۔" یہ کہہ کر میں نے ماجدہ کو بڑی ہی مشکلوں سے پلنگ پر بٹھایا۔ وہ ایکدم بکھر گئی۔ رونے لگی بے تحاشا آنسو اس کی آنکھوں سے گرنے لگے۔

"ان دونوں نے مجھے ذلیل کیا ہے جیلانی صاحب! یہ ..... یہ دونوں میری عزت لوٹنا چاہتے تھے۔ ادھر نذیر بھی میرے ساتھ یہی حرکت کرنے لگا تھا۔ میں جھوٹ موٹ بے ہوش ہو گئی تھی۔ اس کی کوٹھڑی میں پہنچ کر بھی میں بے ہوش پڑی رہی۔ میں نے یہی ظاہر کیا۔ یہ جب بڑے کی تلاش میں ادھر بھاگا تو نذیر کے ہاتھ بے قابو ہو کر گستاخی پر اتر آتے۔ میں نے اچانک پوری قوت سے لات اس کے پیٹ میں دے ماری۔ وہ دُہرا ہو کر پرے گرا تو میں نے اُس کا چھرا اٹھا کر اس کی پسلی میں دے ملرا۔ وہ اتنا سارا اندر دھنس گیا تھا۔ میرا خیال ہے وہ کتا مر چکا ہو گا۔ وہ زخمی ہو کر زمین پر گرا تو میں نے اس کا کمبل اوڑھا اور دونوں اٹیچی کیس اٹھا کر میں گلیوں میں اندر ہی اندر بھاگتی ہوئی یہاں آ گئی۔ آپ مجھے یہ پستول دے دیں میں اسے ابھی ختم کر دوں گی۔" یہ کہہ کر وہ ایک بار پھر میرے پستول کی طرف جھپٹی مگر میں نے ہاتھ پرے ہٹا لیا۔

"نہیں ماجدہ! یوں نہیں، یہ بتائیں وہ میرا پستول کہاں ہے؟"

"وہ کیسا پستول رکھا ہے آپ نے؟ وہ چلتا ہی نہیں، میں نے بہت کوشش کی سا گر وہ کام دیتا تو آج مجھ پر یہ مصیبت نہ آتی۔"

"اب کہاں ہے وہ؟"

"وہ اد[illegible] کمیہ ہی کے پاس ہے اس نے کہیں رکھ دیا تھا۔ مجھے ملا ہی نہیں ورنہ میں وہ بھی لے آتی۔"

"یہ میرا اٹیچی کیس کہیں کھولا تو نہیں انہوں نے؟"

"نہیں؛ یہ ان سے کھل ہی نہیں سکا اور پھر یہ بدبخت وہاں زیادہ دیر ٹھہرا بھی تو نہیں اسے اپنے بڑے کی فکر لگ گئی تھی ورنہ یہ اٹیچی کیس ضرور کھول لیتے۔"

"کیا کہتے تھے یہ تم سے؟"

"وہ یہ مجھ سے اس کرامت سور کا پوچھتے تھے اور فیروز کا بھی — میں نے جب کہا کہ مجھے نہیں معلوم وہ کہاں ہیں تو ان دونوں نے مجھے جکڑ کر ملنا شروع کر دیا۔ مجھے پتہ ہوتا تو میں بتاتی کہ وہ کس قبرستان کی کس قبر میں ہیں۔" ماجدہ بہت طیش میں تھی اور اس کا غصہ کسی طرح ٹھنڈا ہی نہیں ہو رہا تھا۔ وہ سامنے بیٹھے مشتاق کو اتنی قہر آلود نظروں سے دیکھ رہی تھی جیسے وہ اس کا وجود ہی برداشت نہ کر سکتی ہو۔

"تم اسے قتل تو نہیں کرا آئی ہو گشتی عورت! تیری وجہ سے پتہ نہیں کتنے آدمی تباہ ہو جائیں گے۔"

"زبان سنبھال کر بات کر مشتاق! میں ان کے خلاف ایک بات نہیں سن سکتا۔ کسی زعم میں مت پڑنا۔"

"پتہ نہیں تو کیا شے ہے یار! مگر تجھے شاید یہ پتہ نہیں یہ عورت کئی گھروں کو تباہ کر چکی ہے یہ تجھے بھی لے ڈوبے گی۔"

"تم بکواس کرتے ہو۔ جھوٹ بولتے ہو۔ مجھے تنہا اور مجبور دیکھ کر وہ کرامت مجھے ذلیل کرتا رہا اور اب تم دونوں یہاں آ گئے ہو۔" یہ کہہ کر ماجدہ رونے لگی۔

"تمہاری وجہ سے وہ شاکر مارا گیا۔ تمہارے پہلے دوست منظور نے اسے تمہاری وجہ سے گولی ماری تھی، خود وہ بے چارا عمر قید کے لیے جیل جا پہنچا۔ پھر وہ صدیق مراف تمہاری وجہ سے سرِ بازار زخمی ہوا۔ اسے بھی تمہاری محبت کی سزا ملی۔ اس کرامت کو بھی تم نے اپنے اڈے چڑھایا اس سے تم نے پندرہ ہزار..... وحید کو دلوایا۔ خود بھی تم اس سے بیس پچیس ہزار روپے کھا چکی ہو۔ اب پتہ نہیں کرامت کا کیا کیا ہے تم نے، وہ زندہ بھی ہے یا مر گیا ہے۔" مشتاق نے بڑی تفصیل سے ماجدہ کے سارے کارنامے اس کے سامنے گنوا دیئے۔ ماجدہ تو سر پیٹ کر رہ گئی چیخنے لگی۔

"یہ جھوٹ بولتا ہے جیلانی صاحب! مجھے مرتے دم کلمہ نصیب نہ ہو جو میں غلط کہوں۔ یہ بہتان باندھ رہا ہے۔ بالکل بکواس کر رہا ہے۔"

"کوئی بات نہیں ماجدہ، کوئی بات نہیں تنہا عورت پر ایسے الزام لگا کرتے ہیں۔ آپ فکر نہ کریں میں سب سمجھتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے ماجدہ کے آنسو پونچھے اسے تسلی دی کہ وہ میرے بارے میں فکرمند نہ ہو وہ جیسی بھی ہے میرے لیے ہر لحاظ سے قابلِ عزت ہے۔ مگر وہ کسی طرح چُپ ہی نہ ہوتی تھی مشتاق کو مسلسل گالیاں دیئے جاتی تھی۔ آخر تنگ آ کر میں نے اسے ڈانٹ دیا۔

"آپ خاموش بھی ہوں گی کہ نہیں۔ مجھے یہ آنسو شانسو بالکل اچھے نہیں لگتے۔ کوئی کام کی بات کرنے دیں مجھ کو اس سے۔" میرے لہجے کی چبھن اس نے محسوس کی تو قدرے مدھم پڑ گئی۔ بولی۔

"خدا میرا انصاف کرے گا مشتاق بندرے۔ اس کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں میں وہیں جا کر پٹہ ڈالوں گی تیری گردن میں۔"

"ہاں بڑی ہی ولی اللہ ہے تو۔ خدا تیرے مشورے ہی سے تو سارے کام کرتا ہے تو نے اس قصبے کو گندا کر دیا ہے کم ذات! تجھے میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔" مشتاق بھی فقرے بازی اور لن ترانی میں ماجدہ سے کسی طرح کم نہ تھا اور وہ میرے سامنے بیٹھا اس سے یوں نوک جھونک کر رہا تھا جیسے اس نے مجھے یکسر نظر انداز کر دیا ہو۔

"تم چپ نہیں ہو گے مشتاق! اُلو کے پٹھے یہ تمہاری ماں کا گھر نہیں ہے۔ میں تیری آنتیں کاٹ کے رکھ دوں گا۔" یہ کہہ کر میں نے کر، میں ہاتھ کا جھانپڑ اس کے منہ پر دے ماروں مگر وہ ایک دم دبک کر بولا۔

"مجھے معاف کر دے یار! میں تجھ سے بہت شرمندہ ہوں۔

بہادر آدمی ہے اور عزت دار بھی نظر آتا ہے۔ اس کی باتوں پر مجھے غصہ آ گیا تھا۔ اب میں کچھ نہیں کہوں گا اسے۔"

"ہاں اب ان کی خوشامد کر کتے یہی تجھے پٹہ ڈالیں گے۔ تمہاری ماں بہن کو اب یہی سیدھا کریں گے۔" یہ کہہ کر ماجدہ پلنگ پر سے اتری اور فرش پر پیر پٹختی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

"کیا یہ سب کچھ سچ ہے جو تو کہہ رہا ہے؟" میں نے بہت ہی شکستہ لہجے میں پوچھا۔ ماجدہ کے بارے میں اس نے جو کچھ مجھے بتایا تھا وہ اتنا تکلیف دہ تھا کہ میرا کلیجہ کٹنے لگا تھا۔

"تو اور کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں بھائی۔ بہت گندی شے ہے یہ۔ اب پتہ نہیں اس نذیر کا کیا حال ہو گا۔ یہ اسے چاقو مار آئی ہے۔" مشتاق اندر سے ادھ ڈر رہا تھا۔ نذیر کے بارے میں وہ سخت فکرمند تھا۔

"ہو سکتا ہے وہ مر ہی گیا ہو۔"

"اور ادھر وہ کرامت اور فیروز بھی غائب ہیں پتہ نہیں ان کو کس طرح مروایا ہے اس نے۔ ادھر یہ دیکھو ابھی فرش پر خون جما ہے یہ دیکھو۔" وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ ماجدہ نے وہ خون بھی صاف نہیں کیا تھا، حالانکہ اسے اگر عقل ہوتی تو وہ دن کے وقت دو بالٹیاں پانی ڈال کر اس دہشت کے نشان کو دھو سکتی تھی۔

"انہیں کچھ نہیں ہوا ہو گا۔ یہ اکیلی کیا کر سکتی ہے بھلا۔"

"تم نہیں سمجھتے ہو یار، پتہ نہیں اس نے کس کس ذات کے شہدے دوست بنا رکھے ہیں یہ کیا نہیں کر سکتی ہے یہ بدمعاش عورت۔"

"تم پھر اسے میرے سامنے گالی دے رہے ہو مشتاق۔" میں نے اسے ایک بار پھر ڈانٹا۔

وہ قدرے بدک گیا۔ بولا۔

"مجھے افسوس ہے یار کیا نام ہے تمہارا جیلانی ہاں جیلانی بھائی مگر اس نے مجھے غصہ دلا دیا ہے۔ نذیر کو پتہ نہیں کیا کر آئی ہے۔"

"اچھا ٹھیک ہے اب تم بتاؤ میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں؟ تھانے پہنچا دوں تمہیں؟"

مشتاق کی حیرت کے مارے آنکھیں پھیلنے لگیں۔ اس نے حالات کے اس رُخ پر غور ہی نہیں کیا تھا۔ ایک دم اپنے ہاتھ جوڑ کر میرے آگے کر دیئے اور بڑے ہی دردیلے لہجے میں بولا۔

"یہ ظلم نہ کر میرے بھائی میں تباہ ہو جاؤں گا۔ نوکری سے بھی جاؤں گا اور عزت بھی برباد ہو جائے گی۔"

"تو گویا تمہاری کوئی عزت بھی ہے۔"

"عزت تو گلی میں کھڑے کتے کی بھی ہوتی ہے بڑے بھائی! میں بھی ذات کا چیمہ ہوں۔ ادھر اکبر کوٹ میں ہماری زمینیں ہیں۔ زیادہ تو نہیں۔ لیکن پھر بھی ہم عزت دار لوگ ہیں میرے دو بچے ہیں۔ ایک ذکر ہے۔ گھر ہی ...[illegible] کرامت کی دوستی میں [illegible] گیا ہوں۔"

"اچھا، تو تم اکبر کوٹ کے رہنے والے ہو۔" میرے ذہن میں اچانک بجلی سی کوند گئی۔

"مگر اکبر کوٹ کی ساری زمینیں تو سنا ہے ہادی علی کی ملکیت ہیں شاید؟"

"وہ ایک پوری ونڈ کا مالک ہے، بہت بڑا آدمی ہے وہ علاقے کا سب سے بڑا چوہدری ہے ہم تو اُس کے آگے کچھ بھی نہیں ہیں۔"

"کیسا آدمی ہے وہ؟ لو سگریٹ پیو۔" یہ کہہ کر میں نے اسے سگریٹ سلگا کر دے دیا، وہ پھر سینے میں دھواں گھونٹ گھونٹ کر سگریٹ پینے لگا بولا۔ "کسی خنزیر کی اولاد ہے وہ۔ سارا علاقہ دہلتا ہے اس کے دبدبے سے ہم بھی اس کا ڈنک سہہ چکے ہیں۔"

"وہ کس طرح؟ مگر ٹھہرو میں تمہارے لیے چائے نہ بنواؤں اندر سے تم مجھے اچھے آدمی نظر آتے ہو۔"

"مہربانی ہے تمہاری جو ایسا سوچتے ہو۔ میرا خیال ہے ہم دوست بن سکتے ہیں جیلانی بھائی۔ بہادر آدمی کا میں ہاتھ بندھا غلام ہوں۔" وہ ایک بار بڑے اعتماد سے مسکرا دیا۔ اس کی کرنجی آنکھوں میں اس لمحے ایسی محبت بھری چمک اُبھر آئی تھی کہ میرا جی چاہا میں اسے سینے سے لگا لوں۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے اسے زخمی کر دیا تھا حالانکہ وہ خاصے گہرے زخم تھے مگر وہ بڑے صبر سے اُن کی اذیت سہہ رہا تھا۔

"ماجدہ! ادھر آئیں بھئی ذرا۔" میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے ماجدہ کو پکارا مگر اس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ شاید مجھ سے بھی ناراض ہو گئی تھی۔ میں نے پستول ہاتھ میں لیا اور پلنگ سے اُتر کر اُس کے کمرے میں جا پہنچا۔ وہ لحاف اوڑھ کر بیٹھی تھی اور چلغوزے ٹھونگ رہی تھی۔ "تو یہ ٹھاٹھ ہیں گویا! ہمیں نہیں پوچھیں گی آپ؟"

"جی نہیں، میں سخت ناراض ہوں آپ سے میرے دشمن سے آپ پینگیں بڑھا رہے ہیں۔" وہ بہت سنجیدہ تھی۔

"یہ بات نہیں ہے جناب! بلکہ مجھے تو ابھی اس سے بہت کام لینے ہیں۔ آپ جو نذیر کو مار آئی ہیں تو اس کا بھی تو کوئی بندوبست کرنا ہے۔"

"وہ مرا نہیں ہو گا سوّر۔ اتنا غیرت مند نہیں وہ۔ خیر یہ لیں آپ بھی کھائیں ڈھیر سارے منگوا رکھے ہیں میں نے، رات مجھے یاد ہی نہیں آئے۔" یہ کہہ کر اس نے ایک طشتری میں ڈال کر ڈھیر سارے چلغوزے دے دیئے۔

"چلغوزے تو مل گئے ہیں اب اگر چائے بھی پلا دیں تو آپ کی مہربانی ہو گی۔"

"ٹھیک ہے جناب میں ابھی بنا دیتی ہوں مگر اس کو ایک قطرہ نہیں دوں گی۔"

"ارے نہیں بھئی! وہ ہمارا مہمان ہے اب۔ پلا دو اسے بھی میں نے اس پر ... گولیاں چلائی تھیں۔"

"پھر بھی نہیں مرا وہ بے غیرت۔"

"میں نے جان بوجھ کر اس کی ٹانگوں کو نشانہ بنایا تھا۔ کس کس کو مارتے پھریں گے ہم۔"

"اچھا ٹھیک ہے، مگر یہ بات یاد رکھیں کہ میرے بارے میں وہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ بالکل غلط ہے جھوٹ بولتا ہے وہ بدمعاش۔ میں ایسی ہوتی تو ایسے شہدے مجھ پر چڑھ دوڑتے۔"

"میں سب سمجھتا ہوں۔ اسکی بکواس کا مطلب بھی جانتا ہوں — آپ فکر نہ کریں ماجدہ! بس ذرا اچھی سی چائے بنا دیں۔"

وہ سلیپر گھسیٹتی ہوئی رسوئی خانے میں جا گھسی اور میں پھر مشتاق کے پاس جا بیٹھا اور حلیقوں نے اس کے سامنے تپائی پر رکھ دیئے۔ وہ انہیں بڑی رغبت سے کھانے لگا۔ میری اس تواضع پر وہ خوش ہو گیا تھا۔

"ہاں تو کیا ڈنک مارا تھا اس ہادی علی نے تمہیں؟"

"ڈنک سا ڈنک مارا ہے اس نے میرے یار، ادھر وہ اشتمال اراضی کے وقت اس نے ایسی گڑبڑ کی کہ ہماری تمام اچھی اچھی زمین اس نے اپنے کھاتے میں ڈلوا لی۔ پورا ایک مربع تباہ کر دیا اس نے ہمارا۔ بڑا فساد پڑا وہاں۔ لڑائی بھی ہوئی جس میں میرے میاں جی مارے گئے تھے۔ انہیں ہادی علی کے ایک تلنگے نے بلوے میں گولی مار دی تھی۔"

"پھر؟"

"پھر کیا ہوتا؟ وہ آدمی تو سات سال کے لیے جیل چلا گیا مگر ہم اور کچھ بھی نہ کر سکے۔ ہادی علی آج بھی مونچھوں پر تاؤ دیئے پھرتا ہے۔ اب تو وہ اسمبلی کی ممبری کے لیے کھڑا ہو رہا ہے۔"

"مجھے تم سے بہت ہمدردی ہے مشتاق! اگر وہ ایسا ظالم آدمی ہے تو اس کا تو جھٹکا کر دینا چاہیے۔"

"مگر اتنی ہمت کس میں ہے یار! بڑے غنڈے پال رکھے ہیں اس نے اور ادھر اس کی سرکار دربار میں بہت مانی جاتی ہے۔"

"اچھا! کمال ہے، اگر تم کہو تو میں کاٹ دوں اس کی ڈوری؟"

"تمہیں کیا پڑی ہے بھائی میری آگ میں کودنے کی۔ میرا تمہارا ناطہ ہی کیا ہے۔ ابھی دو گھڑی بعد تم مجھے گولی مار دو گے۔ مجھے اپنا انجام معلوم ہے مگر میں ہمت ہارنے والا نہیں ہوں۔"

"اچھا، تمہیں یہی امید ہے مجھ سے! نہیں یار، ایسا نہ سوچ! تمہارے بارے میں میری رائے بہت اچھی ہے۔ تم حوصلے والے آدمی ہو۔"

وہ فرش پر تھوک کر بولا۔

"تم نے مجھے مروڑ کر رکھ دیا ہے یار۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے تم مجھے تو بس تم اب جانے ہی دو۔" وہ مسکرایا، مگر اب کی بار اس کی مسکراہٹ میں تازگی نہیں تھی۔

"اتنے زخمی ہو تم چل نہ سکو گے۔"

"یہی تو زیادتی کی ہے تم نے میرے ساتھ۔"

"اچھا دیکھو! یہ بتاؤ اگر ہادی علی کو میں تمہارے راستے سے ہٹا دوں تو تم اپنی زمین واپس لے سکتے ہو؟"

"کیوں نہیں میں دوسرے ہی دن وہاں اپنے ڈنگر پھیر دوں گا، پورا مربع زمین مجھے دوبارہ مل سکتی ہے۔"

"پھر تم کرامت سے دوستی چھوڑ سکو گے؟"

"اس پر تو میں نے آج ہی لعنت بھیج دی ہے وہ بڑا ہی چھوکری باز قسم کا آدمی ہے خواہ مخواہ مروا دے گا وہ اپنے یاروں کو۔ گھر میں اس نے تین بیویاں باندھ رکھی ہیں پھر بھی اِدھر اُدھر منہ مارنے سے باز نہیں رہتا۔"

"ٹھیک ہے میں ہادی علی کو ٹھکانے لگا دوں گا مگر ایک شرط پر!"

"وہ شرط کیا ہو گی؟"

"کوئی خاص نہیں! بس تم مجھے ادھر اکبر کوٹ لے چلو گے اپنے گھر میں ٹھہراؤ گے اور ہادی علی کے بارے میں سب کچھ بتاؤ گے کہ وہ کہاں رہتا ہے کیا کرتا ہے، کس وقت اس کو پکڑا جا سکتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔"

"وہ تو میں سب کچھ کر دوں گا مگر ایسا نہ ہو شبے میں میں بھی پکڑا جاؤں!"

"نہیں، تم بالکل سامنے نہیں آؤ گے۔"

"مگر جب تم میرے گھر پر ٹھہرو گے تو سب لوگ جان لیں گے کہ میرا تمہارا کیا تعلق ہے۔"

"تو پھر تم مجھے کسی اور جگہ ٹھہرا دینا۔ ہادی علی تک پہنچنے کے لیے مجھے چاروں طرف تو دیکھنا ہی پڑے گا نا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر تم کیوں میری ہمدردی میں یہ سب کچھ کر رہے ہو تمہیں کیا مصیبت پڑی ہے؟"

وہ پہلے تو میری باتوں کو مذاق پر محمول کر رہا تھا مگر جب معاملے کو میں نے آگے بڑھانا چاہا تو وہ سنجیدہ ہو گیا۔ حیرت اس کے چہرے پر نمایاں ہوتی جا رہی تھی۔

"مجھے تم سے ہمدردی ہے بھائی! بس یوں سمجھو کہ میں نے تمہیں جو زخم لگائے ہیں ان کی قیمت چکانا چاہتا ہوں۔"

وہ مطمئن ہو گیا۔ بولا۔

"سچی بات تو یہ ہے کہ اگر کوئی اس خنزیر پر ہاتھ ڈال سکے تو پورے سات گاؤں پر احسان کرے گا۔ میرے باپ کا قاتل تو وہ ہے ہی۔"

"بس تو ٹھیک ہے مجھے تم اپنے گھر پہنچا دو، میں تمہارے باپ کے قاتل سے انتقام لے لوں گا۔"

میری یہ بات سن کر اس نے مجھے اکبر کوٹ میں اپنے گھر کا پتہ بتا دیا۔ بولا۔

"میرے زخم پتہ نہیں کتنے دنوں میں ٹھیک ہوں۔ بہرحال میں کل پندرہ دن کی چھٹی لے کر گھر جا پہنچوں گا۔ تم بھی کل شام کو ادھر آ جاؤ۔ پھر دیکھیں گے تم کیا کر سکتے ہو۔"

اتنے میں ماجدہ چائے لے کر اندر آ گئی۔ اس نے بڑی پھرتی دکھائی تھی مگر اس کے چہرے پر ایسی سنجیدگی طاری تھی کہ کچھ کہنے کی مجھے ہمت ہی نہ پڑی۔ مشتاق اسے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ جب وہ کمرے سے باہر جانے لگی تو اس ظالم نے ایک دم پینترا بدلا اور نہایت ہی ملائم اور میٹھی آواز میں بولا۔

"بھابی مجھے معاف کر دیں۔ میں پتہ نہیں کیا کچھ بکتا رہا ہوں۔ طیش میں آدمی کے ہوش ٹھکانے نہیں رہتے۔ مجھے معاف کر دیں۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے نیچے جھکا اور اس نے ماجدہ کے پاؤں پر ہاتھ رکھ دیئے۔

ماجدہ ہکا بکا رہ گئی۔ اس کے فرشتوں کو بھی یہ امید نہیں تھی، کہ مشتاق یوں ایک دم بدل جائے گا اور اتنا نیچے گر جائے گا۔ وہ سُن ہو کر رہ گئی اور اپنی بڑی بڑی آنکھیں پٹ پٹ جھپکاتی ہوئی بولی۔

"دیکھ رہے ہیں آپ! یہ کیسا ڈرامہ رچا رہا ہے۔ کیا سکھایا ہے آپ نے؟" وہ مسکرانے لگی تھی۔

"نہیں! خدا کی قسم بھابی یہ بات نہیں ہے میں سچے دل سے آپ سے معافی مانگتا ہوں۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ اب کبھی کرامت سے کوئی تعلق نہیں رکھوں گا۔ آپ کو بہت ستایا ہے ہم نے۔" مشتاق کی آواز گلوگیر ہو رہی تھی اور ہاتھ اس کے اب بھی ماجدہ کے سلیپروں پر رکھے تھے۔

"معاف کر دیں اسے ماجدہ! یہ اچھا آدمی ہے۔ سمجھ لیں کہ یہ آج سے بندے کا پتر بن گیا ہے۔" میں نے اس کی سفارش کی۔ وہ منظر ہی ایسا تھا کہ میرا بھی دل پسیج گیا تھا۔ مشتاق نے ماجدہ کو اپنی عاجزی سے بے حد متاثر کر دیا تھا۔ وہ جھکی اور اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر الگ کر کے بولی۔

"ٹھیک ہے اگر تم سچے دل سے ایسا کہہ رہے ہو تو میں نے بھی تمہیں سچے دل سے معاف کیا۔ اب تم جا کر اس نذیر کو سنبھالو۔"

"اس کی فکر نہ کریں۔ اگر وہ زندہ ہے تو میں اس سے بیان دلوا دونگا کہ اس پر کسی نے اندھیرے میں وار کیا تھا۔ اور یہ کہ وہ اپنے دشمن کو بالکل نہیں پہچانتا ہے۔" اس کی یہ بات سنتے ہی ماجدہ مسکرا دی۔ اس کے چہرے کی دونوں خواتین پٹ پٹا کر ہنس دیں۔ ان کی روشنی اچانک سہ چند ہو گئی وہ مجھے اس گھڑی پہلے سے کہیں زیادہ حسین نظر آ رہی تھی۔

"ٹھیک ہے اب آپ آرام کریں میں ان کو رخصت کر کے ابھی آتا ہوں۔"

وہ باہر چلی گئی تو مشتاق بولا۔

"میرا خیال ہے میں آہستہ آہستہ چل کر گھر پہنچ سکتا ہوں۔ میرا ٹھکانہ بھی نذیر کے پاس ہی ہے، میں اب چلتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھا اور پاؤں پر بوجھ ڈال کر بولا۔

"کوئی لاٹھی دے دیں مجھے۔ اس ٹانگ پر بوجھ برداشت نہیں ہوتا۔" میں نے پلنگ کے نیچے رکھی ایک لاٹھی اسے تھما دی وہ اس کے سہارے چلتا ہوا باہر گلی میں نکلا تو میں نے کہا۔

"تو پھر ٹھیک ہے میں کل شام ادھر تمہارے بھائی اشفاق کے پاس پہنچ جاؤں گا۔"

"میں کل دوپہر تک گھر چلا جاؤں گا اور تمہارا انتظار کروں گا — خدا حافظ۔" یہ کہہ کر مشتاق لاٹھی ٹیکتا بڑی مشکلوں سے آگے بڑھا۔ اس کا زخم اسے بے چین کر رہا تھا پھر بھی وہ اپنی بے پناہ قوتِ ارادی کے بل بوتے پر چلتا ہوا گلی سے نکل گیا۔ میں نے اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے کنڈی چڑھا لی۔ دو گھڑی کے تڑکے میری آنکھ کھلی۔

اچانک مجھے کرامت اور فیروز یاد آئے میں نے ماجدہ کو جگا دیا۔

"بی بی جی، اب اُٹھ جائیے اور اس گھر کو چھوڑ دیجئے۔ وہ سالے کرامت اور فیروز ادھر شور مچا رہے ہوں گے اور پولیس کو لے کر سیدھے ادھر آئیں گے۔"

"ہائے میں مر گئی! ان کے ساتھ آپ نے سلوک بھی تو بہت برا کیا تھا مگر میں جاؤں گی کہاں؟"

"میں ابھی ٹرک لاتا ہوں آپ اس میں سامان لا دیں اور لاہور چلی جائیں۔ وہاں میرے ایک دوست ہیں آہو صاحب بادامی باغ میں رہتے ہیں، ان سے کہیے وہ آپ کو کرائے پر مکان دے دیں گے۔ آج ہی۔ بس آپ چپ چاپ وہاں رہیئے۔ پانچ سات دن تک میں بھی آ جاؤنگا۔"

"ٹھیک ہے جلدی سے آپ جا کر ٹرک لے آئیے میں آج ہی چل دیتی ہوں یہاں رہنا بہت خطرناک ہو گا۔" مگر پھر کچھ سوچ کر بولی۔

"آپ میری فکر نہ کریں جیلانی صاحب میں یہیں ٹھہروں گی۔ ان کے پاس کیا ثبوت ہے۔ میں صاف مکر جاؤں گی۔"

"ہاں، یہ بھی درست ہے اب ذرا خون شون دھو ڈالیں اور کوئی نشان ایسا نہ رہنے دیں جس سے کسی کو کوئی شک پڑ سکے۔"

"یہ میں ابھی کر دوں گی مگر میرا یہاں سے بھاگ جانا اچھا نہ ہو گا خواہ مخواہ پولیس کو شک کرنے کا موقع ملے گا۔"

"آپ ٹھیک کہتی ہیں اگر کوئی گھپلا ہوا تو میں سنبھال لوں گا، مگر دیکھیں میں آج دوپہر تک یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

"کہاں؟" وہ حیرت زدہ سی ہو کر میرا منہ تکنے لگی۔

"ایک کام ہے مجھے ادھر جہلم میں، وہ میں کر آؤں بس چار پانچ روز تک آ جاؤنگا۔" میں نے جہلم کا نام خواہ مخواہ لے دیا، حالانکہ میں اکبر کوٹ جا رہا تھا۔

"بہت بہتر جناب جیلانی صاحب کنیز کیا کہہ سکتی ہے۔" اس نے بہت ہی غمگین لہجے میں کہا۔ میرے نام کو اس نے بڑی خوبصورتی سے بگاڑ دیا تھا۔

"ارے آپ پریشان نہ ہوں آپ کو اب کبھی نہ بھول سکوں گا۔" میں سوچتا تھا کہ اگر سب عورتیں ایسی ہی ہوتی ہیں تو پھر گرینڈ پا نسائیت کہاں ملتی ہے، جو صدیوں تک دلوں میں آتشیں جذبے بیدار رکھتی ہے جو

مجنوں کو صحرا صحرا لیے پھرتی تھی۔ جو عزت بیگ کو مہینوال بناگئی تھی۔ وہ شے کیا ہوتی ہے وہ ایسی تو ہرگز نہ ہوگی جو ہاتھ بڑھانے پر لویں مٹھی میں سمٹتی چلی آتی ہے۔ یہ خاصے ٹیڑھے سوالات تھے مگر میں ان کا اس لمحے کوئی جواب نہ پاکر پلنگ سے اتر گیا۔ دو گھڑی کے اس سفر کو مکدر تو نہیں کرنا تھا۔ اس اجنبی قصبے کی ویران اور متعفن فضا میں اس کا میسّر آجانا میرے لیے بہت غنیمت تھا کہ اس کی بدولت میرے کچھ لمحے وہاں اچھے گزر گئے تھے۔

دوپہر کو میں نے اپنا سامان سمیٹا، لباس تبدیل کیا۔ تبدیل کیا کیا، بس کرتہ شلوار پہن کر انگریزی سے دیسی جون میں آگیا۔ کرتے کے اوپر میں نے کوٹ پہنا اور کمبل اوڑھ لیا۔ اس روز آسمان ابر آلود ہو رہا تھا اور باہر ایسی یخ بستہ ہوا چلتی تھی کہ آدمی کو ڈھیر سارے کپڑوں کی ضرورت پڑتی تھی۔ ڈر مجھے یہی لگا رہتا تھا کہ کہیں کوئی پولیس والا مجھے پہچان نہ لے کہ پولیس ہمہ وقت ہر جگہ چوکس رہتی ہے اور یار لوگ اور کچھ نہیں تو فساد فی سبیل اللہ کی خاطر ہی مشکوک لوگوں کو پکڑ کر تھانے پہنچانے میں پیش پیش رہتے ہیں۔ اسی خیال سے میں نے ماجدہ کا دیا ہوا ایک مفلر سر پر لپیٹ لیا۔ رقم جیبوں میں بھری اور اٹیچی کیس اور سوٹ کیس وہیں چھوڑ دیا۔

رخصت ہونے سے پہلے میں نے پانچ ہزار روپیہ ماجدہ کے ہاتھ پہ رکھا تو وہ بدک کر پرے ہٹ گئی۔ نوٹ نیچے گر گئے۔ اس نے ہتھیلی الٹ دی تھی۔ "کمال کرتی ہیں آپ بھی۔ یہ روپے رکھ لیں کہیں کام آئیں گے۔ میرے لیے دعا مانگیں میں بخیر و عافیت واپس آ جاؤں پھر ہم اپنی زندگی کے بارے میں سوچیں گے مجھے آپ کے ساتھ بہت دور تک جانا ہے۔" یہ کہکر میں نے نوٹ اٹھا کر پھر اس کے ہاتھ میں دے دیئے۔

"خدا جانے مردوں کا یہ زعم کس دن ختم ہوگا کہ وہ عورتوں کی محبت روپے پیسے سے خرید سکتے ہیں۔ حضور یہ کستوری آپ اپنی جیب میں رکھیں آپ نئے سفر پر جارہے ہیں — آپ کو ان کی زیادہ ضرورت ہے۔" یہ کہہ کر اس نے نوٹ میری جیب میں ٹھونس دیئے۔ میں کچھ خفیف سا ہو کر رہ گیا اور نوٹ دوبارہ اسے پیش کرنے کی مجھے جرأت نہ ہوئی۔

بازار میں نکلتے ہی میں نے ایک ٹیکسی پکڑی اور اس میں بیٹھ کر اکبر کوٹ کی طرف چل دیا۔ وہ ٹیکسی انہی دیہاتی علاقوں میں چلتی تھی — اکبر کوٹ کا نام سن کر ڈرائیور خوش ہوگیا میں نے اس کے منہ مانگے دام اسے دینے کا وعدہ کرلیا تو وہ جھوم اٹھا۔ سمجھ گیا کہ کوئی بھاگوان سواری مل گئی ہے۔ وہ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا اور اس علاقے کے تمام گاؤں اور ان کے رہنے والوں کے بارے میں خاصی معقول قسم کی معلومات رکھتا تھا — وہ اکبر کوٹ کے قریب کے گاؤں شاہ پور کا رہنے والا تھا۔

اکبر کوٹ کے ہادی علی کا ذکر آیا تو وہ بھی زہر اگلنے لگا۔ بولا۔

"اس کی کیا پوچھو ہو میاں جی۔ ہوس نے مار ڈالا ہے اسے — وہ بے اولاد ہے مگر چاہتا ہے کہ سارے ضلع کا مال اپنے گھر میں ڈال لے۔ بڑے ظلم توڑے ہیں اس نے اس علاقے میں۔"

"اس کا بچہ کوئی نہیں ہے؟"

"بچیاں تو اس کی دو ہیں مگر بچہ کوئی نہیں ہے۔ اور تم جانو میاں جی نرا ولاد کے بغیر وارث کون ہوگا۔ جوائی ہوں گے نا۔ وہ کھا پی کر ہضم کر جائیں گے اسکی جائداد یا پھر شریک لے جائیں گے۔ اس کے ہاتھ کیا آئیگا۔ وہ تو مر کر قبر میں جا لیٹے گا۔ پھر ایسی حرص کا کیا فائدہ میاں جی۔ مگر وہ سمجھتا ہی نہیں ہے کہیں ایک گز زمین بھی لاوارث ملتی ہے تو وہیں لاٹھی گاڑ دیتا ہے۔"

"ایسا خبیث آدمی ہے وہ؟"

"کوئی ایسا ویسا میاں جی۔ ابھی آج شام کو پتہ نہیں ادھر کیا ہو جائے لاٹو وَنڈ کے مزارعوں سے اس کی ٹھن گئی ہے اور شاید آج وہاں جھگڑا ہی ہو جائے۔ پولیس کو بھی اس نے بلوا رکھا ہے۔"

"اچھا، تو یہ بات ہے۔ خیر! بابا جی ایک نہ ایک دن تو حساب دینا ہی پڑے گا اسے۔ ڈوری زیادہ ڈھیلی نہیں چھوڑتا ہے اللہ میاں۔" میں نے بہت ہی بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ سوچ میں یہ رہا تھا کہ جس کسی سے بھی میں پوچھتا ہوں ہادی علی کے بارے میں وہ بیچارا توبہ توبہ ہی پکار اٹھتا ہے۔ ایسی ہی دہشت پھیلا رکھی ہے اس بھیڑیے نے علاقے میں۔ مگر وہاں کوئی ایسا نہیں تھا جو اسے نتھ ڈال سکے۔ ڈرائیور کا نام خیرات علی تھا۔ وہ جب اپنے دل کا غبار نکال چکا اور اس علاقے کے دولتمندوں کو جی بھر کر کوس کاٹ چکا تو میں نے پوچھا۔

"یہ بتاؤ خیرات بابا کہ وہ مشتاق صاحب کی کیا حیثیت ہے اکبر کوٹ میں؟"

"وہ جو محکمہ جنگلات میں گارڈ ہے؟"

"ہاں ہاں وہی۔ میں دراصل اسی سے ملنے جارہا ہوں۔"

"کیا کہوں میاں جی! وہ تین بھائی ہیں۔ ہادی علی کے مزارع ہیں۔ کسی زمانے میں ان کے باپ کی اپنی زمین تھی مگر لڑائی جھگڑوں میں پڑ کر انہوں نے وہ زمین بیچ ڈالی۔ اُن پر کوئی دس سال پہلے ایک مقدمہ چلا تھا جس میں اشفاق کو تین سال کے لیے جیل جانا پڑا۔ اس نے ایک آدمی کو شدید زخمی کر دیا تھا۔"

"اب کوئی زمین نہیں ہے ان کے پاس؟"

"نہیں! ایک مربع زمین تھی اُدھر ان کے پاس۔ وہ ساری کی ساری دریا کھا گیا۔ اب تو وہ ہادی علی کے مزارع ہیں۔"

"مگر میں نے سنا ہے کہ چوہدری نے اشتمال اراضی کے دوران ان کی زمین اپنے کھاتے میں ڈال لی تھی۔"

"وہ آدھا مربع زمین تھی۔ ان کے باپ غوث محمد نے لڑکی کی شادی پہ ہادی علی سے پانچ ہزار روپے قرض لیا تھا، وہ ادا نہ کر سکا تو

اس نے زمین اسے دے دی۔ بعد میں بہت جھگڑا ہوا۔ اس کے تینوں بیٹے اشفاق، مشتاق اور فاروق اٹھ کھڑے ہوئے بہت لڑائی ہوئی تھی گاؤں میں جس کے دوران ان کا میاں مارا گیا۔" خیرات علی وہی بات بتا رہا تھا جو میں مشتاق سے سن چکا تھا۔

اکبر کوٹ پہنچ کر میں خوش ہوگیا۔ وہ کوئی زیادہ بڑا گاؤں نہیں تھا پھر بھی اپنی صفائی ستھرائی کے اعتبار سے وہ بہت ہی قابلِ رشک گاؤں تھا۔ درختوں کے جھنڈ میں چھپا ہوا۔ اور اس میں سب سے الگ اور منفرد جو چیز مجھے نظر آئی تھی، وہ ہادی علی کی حویلی تھی۔ میں اس حویلی کے قریب سے گزرا تو مجھے لاہور کی کوٹ لکھپت جیل یاد آگئی۔ یہاں سے وہاں تک وسیع زمین اس حویلی کے نیچے تھی۔ چاردیواری پر ہی اس نے بے حساب روپیہ خرچ کردیا ہوگا۔ حویلی اس وسیع قطعہ زمین کے عین وسط میں کھڑی تھی۔ دو منزلہ عمارت تھی جس کے اندر ہر آسائش مہیا ہوگی۔ میں اس حویلی کے پاس سے گزر کر رستہ پوچھتا پوچھتا مشتاق کے گھر جا پہنچا۔ وہ مجھے دروازے پر ہی مل گیا میرے انتظار میں بیٹھا تھا۔ مکان اس کا کچا تھا اور گاؤں کی جنوبی سمت میں اس طرح بنا ہوا تھا کہ دروازے میں داخل ہوتے ہی ایک ڈیوڑھی سی تھی جس کے آمنے سامنے دروازے لگے تھے اور دائیں بائیں زمین کو اونچا کرکے دونوں طرف چبوترے سے بنائے ہوئے تھے۔ ان پر ادھر بھی چارپائیاں بچھی تھیں اور ادھر بھی سامنے یہ بڑا سا صحن تھا جس میں دونوں سمت چاردیواری کے ساتھ سایہ دار درخت لگے تھے۔ صحن سے آگے ایک برآمدہ تھا اور اس کے پیچھے تین کمرے تھے۔ بائیں ہاتھ صحن کے وسط میں دیوار کے ساتھ ایک چھپر تھا جس کے نیچے دو بھینسیں بندھی تھیں اور تین بیل — یہی اس گھر کی کل کائنات تھی۔ تینوں بھائی ایک ہی جگہ رہتے تھے اور ان میں سے صرف اشفاق ہی شادی شدہ تھا۔ باقی دونوں کنوارے تھے۔

مشتاق نے مجھے ڈیوڑھی ہی میں چارپائی پر بٹھا دیا۔ وہ بہت گھبرایا ہوا تھا۔ اور وہ جو بے پناہ اعتماد اور ٹھہراؤ اس کے چہرے پر میں نے ماجدہ کے گھر میں دیکھا وہ اب کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔

رات کو اس نے میرے پاس ہی ڈیوڑھی میں بستر جما لیا۔ حقہ وہ ساتھ لے آیا تھا۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ وہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا ہے — وہ مجھ سے کھل کر بات نہیں کر رہا تھا۔ اسے شاید یہ توقع ہرگز نہیں تھی کہ میں یوں اچانک اُن کے خاندانی دشمن کا سر اتارنے کے لیے وہاں پہنچ جاؤنگا ماجدہ کے گھر میری باتوں کو وہ بس گونگے کا خواب سمجھ کر سن آیا تھا۔ اب جو اس نے مجھے اپنے تیر و تفنگ سے لیس وہاں اپنے گھر میں دیکھا تو اس کے پرخچے بے جان ہو کر زمین پر گرنے لگے۔ میری گولیوں نے اس کی ٹانگوں پر جو زخم لگائے تھے وہ بھی اسے نڈھال کیے ہوئے تھے۔ اور وہ بیچارا بڑی مشکلوں سے چل پھر رہا تھا۔ رات کو جب ہر طرف سناٹا چھا گیا تو وہ بولا۔

"جیلانی بھائی ادھر بڑا فساد ہونے والا ہے پولیس آئی ہوئی ہے۔"

"کیا مطلب؟ پولیس کس لیے آئی ہے ادھر؟"

"ہادی علی نے بلائی ہے۔ ادھر بلادر گاؤں میں مزارع ہیں نا — ان سے فصل کی کٹائی پر جھگڑا ہوگیا ہے ہادی علی کا۔ چوہدری گندم کی ہری فصل کاٹ کر بازار میں بیچ دینا چاہتا ہے مگر مزارع نہیں مان رہے ہیں۔"

"اچھا پھر؟"

"پھر یہ کہ وہ مزارع بہت تگڑے ہیں۔ چار بھائی ہیں۔ چاروں بڑے شہ زور جوان ہیں اور ان کا بڈھا بھی بڑا جی دار ہے۔ انہوں نے للکار دیا ہے چوہدری کو۔ کہتے ہیں سر کٹ جائیں گے پر ہری فصل نہیں کٹے گی۔"

"بلادر کتنی دور ہے یہاں سے؟"

"تین کوس پرے ہے۔"

"اچھا، میں کل جاؤں گا وہاں۔ یہ تماشا ضرور دیکھوں گا میں۔"

"مت جانا ادھر، پتہ نہیں وہاں کیا ہو جائے۔"

"کچھ نہیں ہوگا دیکھا جائیگا۔ انہیں کیا پتہ میں کون ہوں اپنی پگڑی مجھے دے دینا وہ میں باندھ لوں گا۔"

"تمہاری مرضی، مگر مجھے تو خیر نظر نہیں آتی ہے۔"

"میں بھی خیر نہیں چاہتا ہوں میاں مشتاق! اب سو جا پٹی بدلوائی تھی آج۔؟"

"ہاں، میں دوا اور مرہم گھر میں لے آیا تھا۔ تو نے تو مار ہی دیا تھا مجھے پتہ نہیں کتنے دن لگ جائیں میرا۔ وہ بٹوہ تو دے دو اب۔"

"ہاں، یہ رہا تمہارا بٹوہ، دیکھ لو ساری چیزیں اس میں موجود ہیں ویسے مجھے افسوس ہے یاد کر میرے ہاتھوں تو زخمی ہوا ہے پکڑ۔" میں نے کوٹ کی جیب میں سے نکال کر بٹوہ اسے دے دیا۔ اس نے ساری چیزیں دیکھیں اور بولا۔

"یہ بھی ہمیشہ خالی رہا، ہمارے دل کی طرح۔ اس میں شناختی کارڈ نہ ہوتا تو میں تھوکتا بھی نہیں اس پر۔"

"یہ تو ہے، اچھا اپنا ہاتھ ادھر کر۔" یہ کہہ کر میں نے مٹی کے تیل کے دیئے کی مدھم روشنی میں اس کا ہاتھ اپنی طرف کھینچا اور ایک ہزار کے نوٹ اس کی مٹھی میں رکھ دیئے۔

"یہ ہزار روپیہ تو میری طرف سے رکھ لے تیرے دوا دارو اور گھی دودھ کے لیے ہے کھا پی کر تگڑا ہو جا ذرا۔"

"نہیں یار! یہ گڑبڑ مت کر، میں بہت غریب آدمی ہوں۔"

"خبردار کوئی بات کی تو نے تو۔ گولی مار دوں گا۔ یہ تیرے بھائی کی طرف سے ہے۔ تو فقرے مجھے پہلے ہی بہت دکھ ہوتا ہے تیری حالت دیکھ کر۔ یہ جنگلات کے گارڈ تو بہت امیر ہوتے ہیں۔ جنگل بیچ کر کھا جاتے ہیں تیرا بٹوہ کیوں خالی ہے۔" اس کی ہنسی

میں نے لحاف میں دصنادی۔ وہ بڑی بے دلی سے مسکرایا۔ بولا۔
"یار وہ میاں جی بھتے نا میرے۔ وہ قسم دے گئے تھے مجھے۔ اپنی بھی اور میری ماں کی بھی کہ میں کبھی حرام کا ایک پیسہ ہاتھ میں نہیں لوں گا، بس یہ سالی ایمانداری لے ڈوبی ہے مجھے۔ ورنہ تم جانو ان گارڈوں نے تو ادھر بڑی بڑی جائدادیں بنالی ہیں۔ بڑی آمدنی ہے ان کی۔"

"جسے اللہ ایمان دے اور ایمان رکھے اسے کیا چاہیے میرے بھائی اس زمانے میں۔ مگر تو فکر نہ کر۔ تیرے بھی یہ دن سدا نہیں رہیں گے میں زندہ رہ گیا تو تیرے لیے ضرور کچھ نہ کچھ کروں گا میں ——————
اور دیکھ خواہ کچھ ہو جائے میرے یہاں آنے اور اپنے گھر میں ٹھہرنے کا ذکر تو کسی سے نہیں کرے گا۔ ورنہ خواہ مخواہ مارا جائے گا تو۔"

"اس بات کی تو کوئی فکر ہی نہ کر میرے یار۔ بس میرا نام کسی بھی چکر میں نہیں آنا چاہیے۔"

"تیرا تو کہیں ذکر ہی نہ آئیگا مشتاق میاں! لا ہاتھ ادھر کر۔" یہ کہہ کر میں نے اس سے بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور پھر میں لحاف میں منہ ڈال کر لیٹ گیا نیند مجھ پر غالب آتی جا رہی تھی۔

مجھے معلوم نہیں رات کا وہ کون سا پہر تھا کہ میری نیند نے مجھے ایک عجیب غریب طوفان سے دوچار کر دیا۔ میں نے ایک بار پھر مسند آراء کو خواب میں دیکھا اس حال میں کہ وہ سخت پریشان تھی۔ بال اس کے بکھرے ہوئے تھے اور کھل کر گلے میں آپڑے تھے۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ کسی کے ہاتھ سے بندوق چھین رہی تھی۔ اس آدمی کا چہرہ اتنا دھندلا تھا کہ میں اس کو بالکل بھی پہچان سکتا تھا۔ بس وہ ایک ہیولی سا تھا جس کے ہاتھ میں بندوق تھی۔ وہ مسند آراء کی کسی بات پر دھیان نہیں دیتا تھا اور کسی بھی طرح ہاتھ سے بندوق نہیں چھوڑتا تھا۔ مسند آراء پاگلوں کی طرح چیخ رہی تھی۔ اس سے زور آزمائی کر رہی تھی۔ اس کے منہ سے غصے کی وجہ سے جھاگ نکل رہے تھے اور یہی کہہ رہی تھی کہ خدا کے لیے گولی مت چلانا میں مر جاؤں گی۔ خوف کے مارے اس کا چہرہ ہلدی ہو رہا تھا۔ مگر وہ ہیولی اس کی کوئی بات نہیں سنتا تھا۔ مسند آراء کے اس واویلے نے مجھے بھی پریشان کر دیا تھا مگر میرا یہ حال تھا کہ میں بغلوں میں ہاتھ دیئے چپ چاپ کھڑا یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ اچانک اس ہیولے نے گولی چلا دی "ڈز" ایسی خوفناک آواز پیدا ہوئی اور اس کے ساتھ ہی میری آنکھ کھل گئی میں اپنے ہی بستر پر تھا۔ اس احساس نے مجھے اطمینان بخشا۔ مگر اس مسند آرا سے خواب میں اپنی اس ملاقات نے ایک بار پھر مجھے حیران کر دیا۔ وہ ایک بار پہلے بھی ایسے ہی حالات میں مجھے خواب میں مل چکی تھی۔ میری نیند اچاٹ ہونے لگی۔ پتہ نہیں وہ کس طرح کی لڑکی ہے جس نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ کتنی ہی دیر میں اس معاملے پر غور کرتا رہا مگر میری سمجھ میں جب کچھ نہیں آیا تو ایک بار پھر میں لحاف میں منہ ڈال کر نیند کے تعاقب میں چل نکلا۔

صبح جب میری آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ مسند آراء کو خواب میں دیکھنے کے بعد میں اتنی گہری نیند سویا تھا کہ رات ایک پل میں گزر گئی ہو آئی تھی۔

مشتاق نے مجھے اپنی بھوری بھینس کے مکھن، مکئی کی روٹیوں اور چٹ پٹے ساگ کا ناشتہ دیا تو میرا دل خوش ہو گیا۔ ایسا ناشتہ میں نے شاید بارہ سال بعد چکھا تھا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے مشتاق کی پگڑی سر پر باندھی اسٹین گن کوٹ کے نیچے لٹکائی اور جیب شاہ کر لبالب بھر کر جیب میں ڈالا اور پیدل ہی بلادر گاؤں کی طرف چل پڑا میرا حلیہ ایسا تھا کہ مجھے پولیس نہ پہچان سکتی تھی مشتاق اگر چلنے پھرنے کے قابل ہوتا تو میرے ساتھ وہ بھی چلتا ضرور، مگر بہت ہی نڈھال ہو رہا تھا۔ ویسے بھی میں جس کام پر جا رہا تھا اس میں اس کی مشمولیت مجھے راس نہ آسکتی تھی اس لیے میں تنہا ہی بلادر کی طرف چل نکلا تھا۔

اس وقت صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔ دھند ابھی رستوں میں کھڑی تھی اور سورج کی کرنیں اس کے پردوں میں سے گزرتے ہوئے ڈر رہی تھیں میں کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر سے گزرتا ہوا بلادر کی طرف بڑھتا جا رہا تھا مشتاق نے مجھے بتایا تھا کہ عین ممکن ہے ہادی علی اپنے آدمیوں کو لے کر صبح ہی صبح بلادر جا پہنچے اسے یہی دھڑکا لگا تھا کہ وہاں آج خون خرابہ ضرور ہوگا۔ میں نے ایسی دھونس دھاندلی کا منظر اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ میں اندر سے خوش تھا بے حد خوش۔ ایک تو مجھے اس آدمی کا اصلی چہرہ دیکھنے کا موقع مل رہا تھا جس کے لیے میں وہاں تک جا پہنچا تھا۔ پھر مجھے یہ بھی دیکھنا تھا کہ وہ مزارع لوگ ایسے تشدد کے سامنے کیا کرتے ہیں۔ آندھی سے ٹکرا جاتے ہیں یا اس کے زور پر جھکنے لگتے ہیں۔ کچی شاخوں کی طرح لچک جاتے ہیں یا تناور درختوں کی طرح سینہ تان کر کھڑے رہتے ہیں۔

بلادر پہنچ کر میں نے سارا گاؤں گھوم پھر کر دیکھ لیا۔ وہ زندگی کی ادنیٰ سے ادنیٰ آسائشوں سے محروم مفلس و بے نوا لوگوں کا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ ان کی محنت نے گاؤں کے چاروں طرف ہریالی بکھیر رکھی تھی زمینیں لہلہا رہی تھیں، گندم تیزی سے سنہری سونے کی منزلوں کی طرف بڑھ رہی تھی مگر ہادی علی چاہتا تھا کہ اس کو اسی حالت میں کاٹ کر بازار میں چارے کی قیمت پر بیچ دے کیونکہ چارہ بہت مہنگا بک رہا تھا۔ ٹرک گاؤں کے باہر راجباہ کے کنارے کھڑے تھے جس کا مطلب یہ تھا وہ آج ہی فصلیں کاٹ لینے پر آمادہ تھا۔

راجباہ لبالب بھرا بہہ رہا تھا اور اس کا پانی زمین کی شریانوں میں لہو کا کام دیتا تھا۔ بلادر کی زمین بلاشبہ سونا اگلتی تھی جو پہلی منزل پر فصل کی صورت میں سبز ہوتا تھا اور آخری منزل میں تپ کر کڑی دھوپ کی کٹھالی میں سے گزر کر سنہری ہو جاتا تھا۔

اس وقت دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ اور میں مسجد کے صحن میں کھڑا تھا اچانک مجھے اکبر کوٹ کی طرف سے چار گھڑ سوار تیزی سے بلادر کی طرف بڑھتے نظر آئے۔ ان کے پیچھے پندرہ بیس آدمی تھے جو پیدل چل رہے تھے مگر چل کیا رہے تھے گھوڑوں کے ساتھ ساتھ رہنے کے لیے وہ پوری رفتار سے دوڑ رہے تھے۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ کھڑی فصلوں میں سے گزر کر بلادر کی مسجد کے سامنے کھڑے برگد کے درخت کے نیچے ٹھہرے۔ وہ سب کے سب چوہدری ہادی علی کے ساتھی تھے۔ پولیس کا کوئی آدمی ان میں موجود نہیں تھا۔ چوہدری ہادی علی کو میں نے اندازے سے پہچانا۔ وہ کالی سرج کی خوبصورت اچکن پہنے ہوئے تھا سر پر اس نے طرے دار پگڑی باندھ رکھی تھی سفید شلوار کے نیچے اس نے پاؤں میں سنہری کام کی نوک دار جوتی پہنی ہوئی تھی۔ اس کے کندھے پر گولیوں سے بھری ہوئی پیٹی لٹک رہی تھی جس کی جیب میں اس نے پستول اڑس رکھا تھا۔ وہ خاصا بارعب آدمی تھا۔ چہرہ اس کا سرخ و سفید تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کوئی تاتاری سردار ہو۔ بڑی بڑی سرخ چمکتی ہوئی آنکھیں پھڑکتے ہوئے حساس نتھنے، چوڑا چکلا سینہ وہ واقعی سرداری اور سپہ سالاری کے لائق آدمی تھا۔ عمر اس کی یہی کوئی چالیس بیالیس سال کی ہوگی مگر اس کے چہرے کی کرختگی سے اس کا خبث باطن پوری طرح عیاں تھا۔

ابھی وہ لوگ وہاں پہنچے ہی تھے کہ دوسری طرف راجباہ کے کنارے کھڑے ٹرکوں کی اوٹ میں سے تین گھڑ سوار نمودار ہوئے وہ پولیس کی وردیوں میں ملبوس تھے۔ وہ قریب آئے تو میں نے دیکھا کہ ایک ان میں تھانے دار ہے اور دو سپاہی ہیں۔ وہ آئے اور سیدھے چوہدری ہادی علی کے پاس جا ٹھہرے انہوں نے بڑے ادب سے ہادی علی کو سلام کیا — اور تینوں ہی گھوڑوں سے اتر گئے۔

اتنے میں گاؤں کے دو چوکیدار وہاں آنکلے۔ ان کو دیکھتے ہی باقی سب لوگ بھی گھوڑوں سے اتر گئے۔

ایک آدمی نے بڑے تحکم آمیز لہجے میں کہا:
"اوئے جا تو جا ان رنتموں کو بلا لا۔ کہاں ہیں وہ ساتا، صادق انور اور گاجی۔ بلا ان سب کو۔"

"وہ تو یہاں نہیں ہیں چوہدری جی۔ صبح سے شہر گئے ہوئے ہیں ان کا میاں گھر میں ہے۔"

ہادی علی نے جواب دیا۔ "اچھا ٹھیک ہے اسے ہی بلا لا۔ اور چارپائیاں بھی ڈال دے ادھر۔" ہادی علی نے نہیں للکارتے ہوئے کہا۔

ایک چوکیدار ابھی مسجد کی پچھلی گلی میں داخل ہی ہوا تھا کہ اسے وہ میاں جی مل گئے جن کو وہ بلانے گیا تھا۔ دور سے بلند آواز میں بولا۔
"ادھر چلو میاں صفدر شاہ جی۔ وہ چوہدری ہادی علی صاحب آئے ہیں۔" میں نے ادھر نگاہ ڈالی تو دیکھا کہ ایک آدمی کھیس کی بکل مارے بڑے پُروقار انداز میں آہستہ آہستہ چلتا آگے آرہا تھا۔ اس کے چہرے پر بڑی خوبصورت ڈاڑھی تھی جس کی سفیدی اس آدمی کی باطنی پاکبازی کی شہادت دیتی تھی۔ وہ برگد کے نیچے سے گزر کر سیدھا ہادی علی کے سامنے جا ٹھہرا۔ وہاں دھوپ تھی۔ سورج کی روشنی سے آنکھوں کو بچاتے ہوئے اس نے بایاں ہاتھ اوپر ماتھے پر رکھا اور دایاں ہاتھ مصافحے کے لیے آگے بڑھایا مگر ہادی علی نے اس کے ہاتھ کی طرف توجہ نہ دی، بولا۔

"صفدر علی ہم فصل کاٹنے آئے ہیں۔ کوئی اعتراض ہو تجھے تو اپنے لڑکوں کو بلا لے۔"

"میں کیا عرض کروں چوہدری صاحب فصل پک گئی تو یہ سونا بن جائے گی۔ میری فصل نہ کاٹیے یہی ہماری آپ سے بنتی ہے۔"

"تو ابھی تک سیدھا نہیں ہوا ہے بڈھے! یہ زمین تیرے باپ کی نہیں ہے اس کا میں مالک ہوں، چوہدری ہادی علی مالک ہے اس کا" یہ کہہ کر ہادی علی نے اپنے بید کی چھڑی کی نوک صفدر علی کے سینے میں چبھو کر اسے پیچھے دھکیلا۔

"میں پھر کہتا ہوں چوہدری جی یہ آپ کے بھلے کی بات ہے زمین آپ کی ہے مگر فصل میں ہم برابر کے شریک ہیں۔ یہ ہماری محنت ہے۔"

"بکواس بند کر بڈھے! ہم یہ فصل کاٹ [illegible] تو روک لے میرے آدمیوں کو۔ چلوا دے منڈ [illegible] یہ کہہ کر ہادی علی نے صفدر علی کو بڑے زور سے [illegible] بید کی چھڑی [illegible] سے اس کی پیٹھ پر دے ماری۔ چھڑی کی آواز [illegible] گونجی تو دس بارہ عورتیں واویلا کرتی ہوئی آگے بڑھیں [illegible] کو گالیاں دینے لگیں۔ وہ مسجد کی دیوار کی اوٹ میں کھڑی [illegible] آگے بڑھ کر آگئیں۔ ان میں جوان بھی تھیں اور بوڑھی [illegible] چوہدری ہادی علی کے گرد دیکھ کر پولیس کا وہ آدمی جو تھانیدار [illegible] پہنے تھا، بید لے کر ان پر پل پڑا۔ اور اس نے کسی کی آنکھ دیکھی نہ کان۔ ان سب کو اس نے بری طرح دھن ڈالا۔ عورتیں بری طرح چیخ [illegible] ان کی یہ چیخ دھاڑ سن کر گاؤں کی دوسری گلیوں سے پانچ [illegible] بوڑھے آدمی باہر نکل آئے ان کے پیچھے دس بارہ جوان بھی تھے۔ ان سب کے ہاتھوں میں لاٹھیاں اور برچھیاں تھیں۔ ان کو دیکھتے ہی تھانیدار نے اپنے دونوں سپاہیوں کو

بندوقیں سیدھی کرنے کا حکم دیا۔ اس کے ساتھ ہی ہادی علی نے اپنے ساتھ کھڑے تین گھوڑ سواروں کو بھی تیار رہنے کا حکم دے دیا اور وہ خود بھی پستول ہاتھ میں لے کر ان کے ساتھ قطار میں کھڑا ہو گیا۔ صورتِ حال یہ ہو گئی تھی کہ عورتیں بلند آواز سے رو رہی تھیں اور وہ آدمی جو مزارع تھے اور ابھی ابھی گاؤں سے نکلے تھے آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے مگر اس طرح کہ وہ سب اُن آتشیں ہتھیاروں کے سامنے بُری طرح سہمے ہوئے تھے۔ وہ سب مسجد کے قریب پہنچ کر رک گئے۔

ان میں سے دو بوڑھے آدمی آگے آئے تو ہادی علی بولا۔

"کیا کہتے ہو کُتّو! کس لیے آئے ہو تم مقابلہ کرو گے ہمارا، پولیس کا مقابلہ کرو گے؟"

"کُتّے تم ہو، کُتّے تمہارے یہ ساتھی ہیں۔ وہ صادق اور انور یہاں نہیں ہیں تو تم ان عورتوں پر ہاتھ اٹھا رہے ہو ہادی علی" اُن میں ایک جوان نے بلند آواز سے ہادی علی کو للکارتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز سنتے ہی ہادی علی نے گولی چلا دی جو اس جوان کے کندھے میں لگی اور وہ تڑپ کر نیچے جھک گیا۔ اس کے ساتھ ہی ان سپاہیوں نے بھی گولیاں چلا دیں اور دو اور آدمی کٹے ہوئے پودوں کی طرح نیچے گر گئے۔ اور پھر ہادی علی کے آدمی ان لوگوں سے بہت پیچھے ہٹ گئے جن پر گولیاں چلائی جا رہی تھیں۔ ہادی علی ان میں پیش پیش تھا۔

میرے لیے یہ سب کچھ ناقابلِ برداشت تھا۔ میں نے اسٹین گن کمبل کے نیچے سے نکالی اور ان کی طرف شست باندھ کر پہلی گولی میں نے ہادی علی کے سینے میں ماری وہ زخمی کُتّے کی طرح اچھلا تو میں نے ایک اور گولی اُس کے جسم میں اُتار دی۔ پولیس کے سپاہی اور ہادی علی کے ساتھی اوٹ کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ انہوں نے مسجد کی دیوار کے اوپر رکھی اسٹین گن کو موت اُگلتے دیکھ لیا تھا۔

"رک جاؤ اور اپنے ہتھیار پھینک دو۔" یہ کہہ کر میں نے تھانیدار کی وردی میں ملبوس آدمی کی ٹانگوں پر گولی داغ دی۔ وہ اوندھے منہ آگے کو گرا تو اس کے سارے ساتھی ہتھیار پھینک کر سیدھے کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے ہاتھ اُوپر اٹھا لیے تھے۔

"میاں جی یہ سارے ہتھیار اکٹھے کر کے ادھر رکھ دیں مسجد کے دروازے میں۔" میں نے صفدر علی سے کہا وہ مسجد کی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا تھا۔ اس نے ایک ایک کر کے ان کے پستول اور بندوقیں اٹھائیں اور مسجد کے دروازے میں رکھ دیں۔

"تم ان سب کو ادھر باندھ کر پھینک دو، چلو۔" میں نے سامنے کھڑے دو جوانوں سے کہا۔ وہ خاصے قوی ہیکل دکھائی دیتے تھے اور مجھے دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ وہ سب میری اس بروقت مداخلت پر خوش ہو گئے تھے۔ انہوں نے فوراً ہی ان سات آدمیوں کو پگڑیوں اور رسیوں سے جکڑ کر ایک طرف ڈال دیا۔ تھانیدار کی ران سے خون بہ رہا تھا اور درد نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔ ہادی علی کے باقی سارے حمایتی بھاگ چکے تھے۔ اپنی درانتیاں وہ وہیں چھوڑ گئے تھے۔

اچانک مجھے سامنے سے راجباہ کے کنارے کھڑے ٹرک کے انجن چلنے کی آواز سنائی دی۔ وہ لوگ بھی بھاگ رہے تھے۔ گاؤں کے تمام بے بس دبے ہوئے مزارع آہستہ آہستہ چلتے ہوئے میرے قریب آ گئے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کوئی فرشتہ ہوں کہ انسان۔ وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ خدا نے ان کی مدد کے لیے ایک مسلح فرشتہ مسجد پر اُتار دیا ہے۔

"سب لوگ بے فکر ہو کر اپنے گھر جاؤ کوئی پوچھے تو کہہ دینا کہ ایک اجنبی تھا۔ کوئی ڈاکو تھا جس نے ہادی علی کو مار دیا ہے، جاؤ۔" یہ کہہ کر میں نے اسٹین گن کمبل کے نیچے چھپا لی اور مسجد کے دروازے میں رکھے جوتے پہن کر باہر نکل گیا۔

"نہیں نہیں آپ ڈاکو نہیں ہیں آپ تو ہمارے محسن ہیں میرے بیٹے میرے بہادر بیٹے آپ تو رحمت کے فرشتے ہیں۔" ایک بوڑھے نے آگے بڑھ کر بڑی گلوگیر آواز میں کہا اور میرا ہاتھ پکڑ کر آنکھوں سے لگا لیا۔

"آپ اپنے گھروں میں جا بیٹھیں بابا جی! اب وہ سؤر ختم ہو چکا، آپ کی ساری مصیبتیں بھی ختم ہو گئی ہیں۔ شکرانے کے نفل ادا کریں، اور کوئی پوچھے تو کہہ دیں کہ وہ کوئی اجنبی تھا۔ کوئی ڈاکو تھا جس نے ان کو مارا ہے۔ یہی کہیں اور صفدر علی کے بیٹوں سے میرا سلام کہہ دیں میں کسی وقت آؤں گا، میں پھر آؤں گا میاں جی! خدا حافظ۔" یہ کہہ کر میں نے ہادی علی کے گھوڑے کی رکاب میں پاؤں رکھا اور اس پر سوار ہو کر اسی وہاں سے چل نکلا میرا کام ختم ہو چکا تھا، اب میرے لیے بلادے اور اکبر میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہ گئی تھی۔ عورتیں مجھے دعائیں دے رہی تھیں۔ بوڑھے پُرنم آنکھوں سے مجھے دیکھ رہے تھے اور ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ کیسے وقوع پذیر ہو گیا۔ کیسے میں نے آسمان سے آ کر اس کشمکش کو زمین بوس کر دیا۔ کیسے میں نے ان کے سب سے بڑے کو زیر کر لیا، اور کیوں؟

میں ابھی بلادے سے چار فرلانگ ہی دُور نکلا تھا کہ میں نے دیکھا کچھ گھڑ سوار بہت تیزی سے میرے پیچھے آ رہے ہیں۔ ان کی رفتار بتا رہی تھی کہ وہ میرے تعاقب میں آ رہے ہیں۔

میں نے ایک جگہ اوٹ میں رک کر انہیں غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ پولیس کے آدمی ہیں۔ ان کی وردیاں ان کی سرکاری حیثیت کا پتہ دے رہی تھیں۔ یہ بڑی خوفناک بات تھی اور میرا یہ حال تھا کہ میں علاقے سے قطعاً ناواقف تھا۔ اکبر کوٹ کی وہ سڑک جس پر چل کر پچھلی رات یہاں پہنچا تھا میری نظروں سے اوجھل تھی۔

اُن کو اپنے پیچھے یوں شکاری کتوں کی طرح لپکتے دیکھ کر میں نے گھوڑے کا رُخ دوسری طرف پھیرا۔ اور اسے کھیتوں میں دوڑاتا ہوا بائیں ہاتھ نکلا میرے سامنے اب ایک پگڈنڈی تھی جس کے دونوں طرف اونچے اونچے سرکنڈوں کی باڑ اُگی تھی۔ میں نے گھوڑے کو اس پگڈنڈی پر ڈالا اور سرپٹ بھگاتا ہوا آگے نکل گیا مگر ابھی میں زیادہ دُور نہیں گیا تھا کہ مجھے محسوس ہوا وہ لوگ دو حصوں میں بٹ گئے ہیں۔ علاقے کے زیادہ ہموار راستوں سے واقف ہونے کی وجہ سے وہ مجھ پر رفتار میں برتری حاصل کر چکے تھے۔ مجھے تین سوار دائیں ہاتھ سے اپنی طرف بڑھتے نظر آئے۔ میں نے تیزی سے گھوڑے کو بائیں ہاتھ موڑا تو مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ لوگ میرے گرد اپنا حلقہ تنگ کرتے جا رہے تھے انہیں ہادی علی کے ساتھیوں نے میرے پیچھے لگا دیا تھا۔ کاش میں نے ان میں سے کسی ایک کو بھی زندہ واپس نہ جانے دیا ہوتا۔ اب وہ میرے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔

اچانک ایک طرف سے گولیاں سرسراتی ہوئی میرے دائیں بائیں اور سر کے اوپر سے گزرنے لگیں۔ میں ان کی زد میں آ چکا تھا اور میرے لیے فرار کے راستے مسدود ہوتے جا رہے تھے۔ گولیوں کی بوچھاڑ سے بچنے کے لیے میں گھوڑے سے کُودا اور اس کی لگام گھسیٹتا ہوا ایک ٹبے کی اوٹ میں ہو گیا اب وہ مجھے دونوں طرف سے اس ٹبے کی طرف بڑھتے نظر آ رہے تھے اور مجھ پر اندھا دُھند گولیاں برسا رہے تھے۔ میری زندگی کا وہ بدترین لمحہ تھا۔ میں نے اسٹین گن ہاتھ میں لی اور بہت سنبھل کر دائیں ہاتھ سے آگے بڑھتے ہوئے تین گھوڑ سواروں پر فائر کھول دیا۔ میرا نشانہ خطا نہیں گیا۔ میری پہلی گولی ایک گھوڑے کے سینے میں لگی تو وہ سوار سمیت الٹ کر زمین پر جا گرا۔ میری طرف سے گولی کا جواب گولی سے ملنے پر باقی فوراً پیچھے مڑے اور درختوں کی اوٹ میں جا پہنچے ـــ ابھی میری توجہ ان پر مرکوز تھی کہ بائیں ہاتھ کی جانب سے میری طرف گولیاں چلنے لگیں۔ میں نے اُدھر نگاہ ڈالی تو تین آدمی گھوڑوں کی پیٹھ پر بیٹھے مجھے اپنے نشانے کی زد میں لے چکے تھے۔ میں ایک دم زمین پر لوٹ پلوٹ ہو کر پیچھے ہٹا تو کئی گولیاں اس ٹنڈ منڈ بے آب و گیاہ ٹیلے کی زمین میں دھنس گئیں۔ میں نے اسٹین گن کا رُخ اُدھر کر کے گولی چلا دی مگر وہ بہت تیز نکلے اور گھوڑوں کو بھگاتے ہوئے پیچھے ہٹ گئے۔

ابھی میں سنبھل ہی رہا تھا کہ دوسری طرف سے کسی خبیث کی گولی میرے ہاتھ سے نکل کر دُور جا گری۔ میری زندگی کا چراغ اس آندھی کی زد میں آ گیا تھا۔ اب مجھ میں اتنی سکت نہیں رہی تھی کہ میں اپنی اسٹین گن سنبھال کر گولی چلا سکتا۔ پھر بھی میں نے بائیں ہاتھ میں اسٹین گن سنبھالی اور جھاڑیوں میں رینگتا ہوا ... گندم کے کھیت میں جا پہنچا۔ میرے بازو سے خون مسلسل بہہ رہا تھا۔ شاید کوئی اہم نس کٹ گئی تھی۔ جُول کُن کر کے میں اس کھیت سے نکلا تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ لوگ ایک دوسرے کو آگے بڑھنے کے لئے کہہ رہے تھے۔ انہیں میرے فرار کی سمت کا صحیح اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ میں گندم کے کھیت میں رینگتا ہوا آگے بڑھا اور گنے کے کھیت میں جا گھسا۔ اب میرے لئے اٹھ کر چلنا زیادہ آسان تھا۔ میں نے اسٹین گن میں پھر سے گولیاں بھریں مگر اس حال میں کہ میرا دایاں بازو درد سے شل ہوا جاتا تھا۔

ابھی میں چند ہی قدم آگے نکلا تھا کہ مجھے اپنے پیچھے کھیت کے کنارے سے ان کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

"وہ اِدھر ہی گھسا ہے۔ اس کھیت کو چاروں طرف سے گھیر لو۔ یہ دیکھو وہ گندم کو لتاڑتا ہوا اِدھر آیا ہے۔" ایک بھاری بھرکم آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

میں اپنا کوٹ اتار کر بازو کا زخم دیکھنے لگا۔ گولی خاصا گوشت اُدھیڑ چکی تھی اور خون سے میرے کپڑے تر ہونے لگے تھے۔ میں نے جیب سے رومال نکال کر خون صاف کیا اور پھر چیونٹیوں کے گھر پر بنے ایک مٹی کے ڈھیر میں سے باریک سفوف ایسی مٹی لے کر زخم پر ڈال دی۔ اس کی تاثیر کا مجھے پتہ نہیں تھا لیکن اتنا مجھے معلوم تھا کہ اس کو زخم پر ڈالنے سے خون بند ہو جاتا ہے۔ مٹی نے اپنا اثر دکھایا اور خون بہنا بند ہو گیا ـــ یہ بڑی خوشی کی بات تھی ـــ میں نے کچھ اور مٹی رومال پر ڈالی اور اسے پٹی کی صورت میں بازو پر دانتوں کی مدد سے کس کر باندھ لیا۔ چند ہی لمحوں بعد مجھے محسوس ہوا کہ میری بے چینی بہت حد تک کم ہو گئی ہے۔ بازو میں درد کی شدت ڈھلنے لگی تھی۔

وہ سپاہی کھیت کے چاروں طرف گھوڑے بھگا رہے تھے۔ میں نے کوشش کی کہ کھیت میں اس طرح چلوں کہ کوئی پودا ہلنے نہ پائے کیونکہ وہ ہلتے ہوئے پودے میری نقل و حرکت کی چغلی کھاتے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد میں کھیت کے دوسرے کنارے پہنچ چکا تھا مگر ابھی میرا باہر نکلنا کسی طرح بھی خطرے سے خالی نہ تھا وہ لوگ دوسری طرف میرا انتظار کر رہے تھے اب میں ایسی جگہ کھڑا تھا جہاں سے میں سامنے کا منظر بخوبی دیکھ سکتا تھا اُدھر دو گھوڑ سوار موجود تھے اور وہ بہت بے چین تھے۔ انہیں احساس تھا کہ کھیت کے اندر سے میں کسی بھی وقت ان پر گولی چلا سکتا ہوں یہی وجہ تھی کہ وہ کھیت سے کبھی سو گز دُور چلے جاتے تھے کبھی دو سو گز دُور ـــ وہ کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتے تھے۔ میں نے ذرا آگے بڑھ کر صورتِ حال کا جائزہ لیا تو دیکھا کہ سامنے ایک درختوں کا جھنڈ ہے جس کے وسط میں پانی سے بھرا ہوا ایک جوہڑ ہے۔ پانی کی سطح پر کہیں کہیں کائی جمی نظر آتی تھی۔ اس جھنڈ میں پہنچنے کے بعد میں آگے سرکاری جنگل کی رکھ میں گھس سکتا تھا۔ اس رکھ میں پہنچنے کا مطلب یہ تھا کہ میں میلوں تک اس کے اندر ہی اندر چلتا ہوا آگے بڑھ سکتا تھا ـــ وہ اتنی گھنی رکھ تھی کہ پچھلے روز جب میں ٹیکسی میں بیٹھ کر اکبر کوٹ پہنچا تھا تو راستے میں ڈرائیور نے اس کی طرف اشارہ کر کے مجھے بتایا تھا کہ اس جنگل میں جو میلوں تک پھیلا ہوا ہے ہر قسم کے جانور ملتے

ہیں اس کا تو یہ خیال تھا کہ وہاں چیتے بھی پائے جاتے ہیں ـــ اس وقت میری یہی خواہش تھی کہ جس طرح بھی ہو سکے میں اس جنگل میں داخل ہو جاؤں ـــ

اب یہ بات میرے بس میں تھی کہ میں ان لوگوں کو ایک ایک کرکے قتل کر سکتا تھا۔ ان سے باہر نکل کر بھی مقابلہ کر سکتا تھا کیونکہ وہ بکھرے ہوئے تھے اور جب تک وہ سنبھل پاتے، میں سامنے کے دو گھوڑ سواروں کو تو لمبا لٹا سکتا تھا۔ میرے بازو سے بہتا ہوا خون رک گیا تھا اور اس مٹی کے باریک سفوف نے معجزہ نما اثر دکھایا تھا۔ اس میں شاید چیونٹیوں کا لعاب رچا ہوا تھا۔ وہ مٹی میرے زخم سے درد کو چوس گئی تھی، اور مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ لبلبی دبانے میں کوئی دقت نہ ہو گی اسٹین گن میرے بہت کام آ رہی تھی۔ آہن نے مجھے بہت عمدہ ہتھیار دیا تھا۔

اچانک مجھے دائیں ہاتھ کچھ سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے اُدھر جو نظر دوڑائی تو مجھے گنے کے اونچے اونچے پودے چند ہی قدم دُور ہلتے نظر آئے اور پھر دو پودوں کی جڑوں کے درمیان میں سے مجھے ایک سیاہ بوٹ نظر آیا۔ وہ شخص مجھ سے چار ہاتھ دُور تھا۔ میں نے جیب سے اپنا "چپ شاہ" نکالا اور گولی اُدھر داغ دی۔ میرا نشانہ خطا نہیں گیا۔ ایک ہلکی سی چیخ ابھری اور کوئی دھم سے زمین پر ڈھے گیا۔ میں بھاگ کر اس کے پاس پہنچا تو یہ دیکھ کر مجھے بے حد افسوس ہوا کہ میرے سامنے پولیس کا ایک بہت ہی خوبصورت سا نوعمر جوان زمین پر ڈھیر پڑا تھا۔ اور میری گولی اس کے گلے میں سے آر پار ہو چکی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بیچارا چیخ بھی نہیں سکا تھا۔ اس کی شہ رگ اور نرخرے کی نالیاں کٹ گئی تھیں۔ اس کے چہرے پر پھیلی بے پناہ اذیت نے مجھے نڈھال کر دیا۔ بندوق کی لبلبی پر اس کی گرفت جام ہو کر رہ گئی تھی ـــ اس کی موت کا مجھے آج تک افسوس ہے۔ وہ اپنے مقدس فرض کی انجام دہی میں میرے جیسے بد اندیش کی گولی کا نشانہ بن گیا تھا۔ بلا شبہ وہ بہت ہی جرأت مند نوجوان تھا۔ مگر اس کی وہ جرأت ہی اسے لے ڈوبی۔ وہ چاہتا تو مجھے وہیں ختم کر سکتا تھا مگر اس نے سوچا ہو گا کہ وہ مجھے بندوق کی زد میں لے کر زندہ گرفتار کر لے گا مگر اپنی اس کوشش میں وہ یوں ناکام رہا کہ گنے کے پودوں کی گھنی قطاریں اسے چھپا نہ سکیں۔

میرے پاس وقت نہیں تھا ورنہ میں اس کی کھلی آنکھیں ہی بند کر دیتا جن میں سے موت کی بے پناہ اذیت جھانک رہی تھی۔ میں تیزی سے پیچھے ہٹا اور کھیت کے کنارے پر جا پہنچا۔ اب بھی چھ فٹ اونچے موٹے اور تر و تازہ گنوں کی دو گھنی قطاریں میرے سامنے تھیں۔

"محمود صاحب! آپ کہاں ہیں؟ محمود صاحب!"

اچانک ایک تیز کٹیلی آواز چاروں طرف گونج گئی۔ پولیس کا ایک آدمی اس شخص کو پکار رہا تھا جو مجھے زندہ پکڑنے کے شوق میں اندھا دھند کھیت میں جا گھسا تھا۔ آواز دینے والا مجھ سے دس ہاتھ دُور تھا۔

میں نے اس موقعے سے فائدہ اٹھانے کے لئے اپنی آواز دبائی اور گھٹے گھٹے فریاد زدہ لہجے میں کہا۔

"میں... میں یہاں ہوں مجھے بچاؤ۔ یہ میرا گلا گھونٹ... مجھے بچاؤ ـــ" یہ آواز میں نے اس طرح چاروں طرف پھیلائی کہ جو لوگ تھے وہ یہی سمجھے کہ ان کا ساتھی محمود میری گرفت میں آ چکا ہے۔ وہ ساری احتیاطیں بالائے طاق رکھ کر گھوڑوں سمیت اس سمت لپکے جدھر سے انہیں وہ گھٹی گھٹی آواز سنائی دی تھی جونہی وہ کھیت میں گھسے میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔ دائیں بائیں میدان بالکل صاف تھا۔ میں بھاگتا ہوا اس جھنڈ کی طرف لپکا جس سے آگے چند کھیت عبور کرنے کے بعد میں گھنی رکھ میں پہنچ سکتا تھا۔

مگر ابھی میں کھیت سے کوئی دو گز دور نکلا تھا کہ مجھے اپنے پیچھے گولیاں چلنے کی آواز سنائی دی۔ وہ لوگ گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے میری طرف لپکے چلے آ رہے تھے۔ اب ان کا مقابلہ کرنے کے سوا میرے پاس کوئی اور چارہ کار نہ تھا۔ میں نے ایک مینڈھ کی اوٹ میں لیٹ کر اسٹین گن سیدھی کی اور ان پر اندھا دھند گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ میری کوشش یہ تھی کہ ان کے گھوڑے بے کار کر دوں اور مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ میں نے ان کے تمام گھوڑے پہلی ہی بوچھاڑ میں ناکارہ کر دیئے۔ گھوڑے زخمی ہو کر نیچے گر گئے تھے اور درد سے اس طرح چلا رہے تھے کہ مجھے ان پر ترس آتا تھا۔ ان کے سوار نیچے آ گئے تھے اور اب وہ لیٹ کر اور اپنا آپ بچا کر مجھ پر فائر کر رہے تھے۔ اب وہ فرض ہی ادا نہیں کر رہے تھے بلکہ اپنے انتقام کی آگ بھی مجھ پر برسا رہے تھے۔ ان کی گولیاں مجھے یہی پیغام دیتی تھیں کہ اگر میں ان کے ہاتھ آ گیا تو وہ میری بوٹی بوٹی کاٹ کر الگ کر دیں گے۔

وہ جہاں جہاں گھوڑوں سے گرے تھے ابھی تک وہیں جم کر لیٹے تھے اور شست باندھ کر مجھ پر گولیاں چلا رہے تھے مگر اب کی گولیوں میں وہ بے باکی اور دلیری نہیں رہی تھی۔

میں رینگتا رینگتا پیچھے ہٹا تو مجھے محسوس ہوا کہ وہاں کھیتوں کی سطح ایک دم نیچی ہو گئی ہے۔ وہ ایسے کھیت تھے جن میں سے دو فٹ گہری مٹی کھدوا دی گئی تھی تاکہ وہ زیادہ فصل دے سکیں۔ کھیتوں میں کام کرنے والے کسان گولیوں کی آواز سے پریشان ہو کر اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے مگر اس مصیبت کی وجہ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ میرے بازو کا زخم ایک بار پھر مجھے پریشان کرنے لگا تھا۔ رومال جو مٹی میں نے اس پر باندھی تھی وہ شاید کھسک گئی تھی۔ وہ لمحہ ایسا تو نہ تھا کہ میں اس زخم کی خاطر اپنی زندگی بیچ دیتا۔ گولیوں کی بوچھاڑ مدھم ہو رہی تھی۔ اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر میں اٹھا اور گندم کے کھیت میں دُہرا ہو کر تیزی سے بھاگا مگر ان لوگوں نے مجھے دیکھ لیا۔ ایک ساتھ کئی گولیاں میرے اوپر سے گزر گئیں۔ میں نے سمجھا کہ اب بچنے کی کوئی امید نہیں رہی ہے مگر نہیں میں اندھا دھند بھاگتا ہوا تیزی سے درختوں کے جھنڈ تلے جا پہنچا۔ اب میرے سامنے دو ہی صورتیں باقی رہ گئی تھیں یا تو میں کسی درخت پر چڑھ جاتا، یا پانی میں کود جاتا۔ وہ لوگ میرے تعاقب میں بڑھتے چلے آ رہے تھے اور میرے پاس صرف پانچ سات منٹ کی مہلت تھی۔

اچانک میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ جس جگہ میں کھڑا تھا وہاں ایک گڑھا بنا تھا اور اس کے ارد گرد ریت تھی۔ غالباً وہاں چکنی مٹی نکالنے کے لئے کسی نے گڑھا کھودا تھا۔ میں نے اپنے تمام کپڑے اتار کر ہتھیاروں سمیت سب کچھ کمبل میں لپیٹ کر اس گڑھے میں ڈالا اور اوپر ریت ڈال دی۔ اتنی ریت ڈال دی کہ وہ گڑھا پُر ہو گیا۔ اس کام میں مجھے زیادہ سے زیادہ تین منٹ لگے ہوں گے یہ تھوڑی سی مہلت مجھے یوں مل گئی تھی کہ وہ لوگ گھوڑوں سے محروم ہو گئے تھے اور میرے پیچھے پیدل دوڑ رہے تھے۔ وہ تعداد میں پانچ تھے۔ میرے قریب ہی جوہڑ میں ایسے سرکنڈے کے پودے اُگے تھے جن کے تنے نالی دار تھے۔ میں نے ایک پودے کے پتے الگ کر کے اس میں پھونک ماری تو معلوم ہوا کہ اس میں سے ہوا آر پار نکلتی تھی میں نے وہ نالی ہاتھ میں لی اور تیزی سے جوہڑ کی طرف بڑھا ـــ اس وقت میں جانگیہ پہنے ہوئے تھا۔

پولیس کے سپاہی کچھ زیادہ دُور نہیں تھے مگر میں ایسی جگہ کھڑا تھا جہاں سے میں انہیں نظر نہیں آ سکتا تھا۔ وہ بہت محتاط انداز میں کھیتوں سے نکل کر کھلی جگہ پر آ پہنچے تھے۔ ان کی رفتار خاصی تیز تھی۔ میرے اور ان کے درمیان فاصلہ زیادہ نہیں تھا وہ سخت تذبذب میں تھے مگر اس بات کا انہیں یقین تھا کہ میں ابھی تک جھنڈ میں چھپا ہوا ہوں۔ میں درختوں کی اوٹ سے ان کی نقل و حرکت دیکھ رہا تھا۔ میری سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ وہ میرا پیچھا چھوڑ دیں اور واپس چلے جائیں مگر ان کا استقلال مجھے حیران کئے دیتا تھا۔ وہ کسی طرح بھی میرے تعاقب سے دستبردار نہیں ہو رہے تھے۔

اب وہ بندوقیں تانے ہوئے ایک دوسرے سے الگ ہو کر آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے۔ میں نے ان سے بچنے کے لئے آخری فیصلہ کیا اور اپنے زخم پر رومال کی پٹی درست کر کے اللہ کا نام لیتے ہوئے جوہڑ میں اتر گیا۔ وہ جوہڑ خاصا گہرا تھا۔ پاؤں پانی میں ڈالتے ہی میں گلے گلے تک نیچے ڈوب گیا۔ وہاں کائی اُگی ہوئی تھی شاید سنگھاڑے کا بیج بھی اس میں ڈال دیا گیا تھا... کوئی کھیر رہا تھا۔ اچانک ان لوگوں کی آوازیں مجھے بہت قریب سنائی دینے لگیں۔

"وہ اس جھنڈ میں ہی چھپا ہے۔ اسے اچھی طرح دیکھو۔"

آواز میں غصہ اتنا شدید تھا کہ مجھے اپنے اعصاب چٹختے محسوس ہوئے تھے۔ انتقام کی آگ نے انہیں پاگل کر دیا تھا ـــ وہ آوازیں اور زیادہ قریب آ گئیں تو ان کی نظروں سے بچنے کے لئے میں نے وہ نالی منہ میں لی اور اپنا سر اس طرح پانی میں ڈبو لیا کہ نالی کا کچھ حصہ پانی کے اوپر رہا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ میں اس میں سے بڑی آسانی سے سانس لے سکتا تھا ـــ نالی پانی کے اوپر چھ انچ اونچی ہو گی جہاں میں کھڑا تھا اس جگہ پانی زیادہ گہرا نہیں تھا۔ میرے پاؤں زمین سے لگے تھے اور سر پانی میں ڈوبا تھا مگر اس طرح کہ منہ اونچا کر کے میں نے لب سختی سے بھینچ لئے تاکہ نالی پر میری گرفت مضبوط رہے۔

پانی بے حد ٹھنڈا تھا مگر میرا بدن اسے برداشت کر گیا۔ میں اسی حالت میں کوئی پون گھنٹے تک پانی میں ڈوبا رہا۔ وہ نالی اس روز میرے بہت کام آئی۔ پانی نے آہستہ آہستہ مجھے سُن کرنا شروع کر دیا تو میں نے اپنا سر باہر نکالا۔ اب وہاں میرے چاروں طرف مکمل خاموشی طاری تھی ـــ میں نے ذرا اُوپر ابھر کر جھنڈ کے آر پار دیکھا مگر کسی طرف سے بھی مجھے کسی ذی رُوح کی آواز نہ آئی۔ خطرہ ٹل چکا تھا۔ وہ لوگ مایوس ہو کر لوٹ گئے تھے۔

میں بڑی احتیاط سے اس جوہڑ میں سے باہر نکلا اور جھاڑیوں کی اوٹ میں ایسی جگہ جا ٹھہرا جہاں میں دھوپ سے اپنے بدن کو گرمی پہنچا سکتا تھا۔ دھوپ خاصی تیز تھی۔ چند ہی لمحوں میں میری یخ بستگی کا احساس چھٹنے لگا... میرے کپڑے جوہڑ کی دوسری طرف گڑھے میں دفن تھے اس طرف جانے کے لئے میں جھاڑیوں میں سے نکلا تو مجھے ایک درخت کی اوٹ میں ایک سپاہی کھڑا نظر آیا۔ اس کا دھیان سامنے کی طرف تھا اور بندوق اس نے یوں ہاتھ میں تھام رکھی تھی جیسے وہ اپنے ارد گرد ذرا سی آواز ابھرتے پر گولی چلا دے گا۔ میرے سارے اندازے غلط ہو گئے تھے۔ وہ لوگ ابھی تک وہاں میری تلاش میں سرگرداں تھے۔ میں دبے پاؤں اس سپاہی کے پاس پہنچا اور بڑی احتیاط سے آگے بڑھ کر اس کی گردن کی رگیں مسل دیں ـــ وہ شاید بہت ہی تھکا ہوا تھا ـــ رگ دبتے ہی جھول کر زمین پر گر گیا۔

میں نے اسے کھینچ کر جھاڑیوں میں ڈالا اور اس کی بندوق ہاتھ میں لے کر اس کے گلے سے کارتوسوں کی پیٹی اتار لی۔ میرا ارادہ تھا کہ میں اس کی وردی اتار کر پہن لوں مگر اچانک دائیں ہاتھ سے ابھرتی ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"یار اختر! تیرے پاس کوئی سگریٹ ہے کہ سب ختم ہو گئے ہیں؟"

میں نے اُدھر نگاہ ڈالی تو معلوم ہوا کہ ایک سپاہی بندوق ہاتھ میں لئے اس طرف بڑے غور سے دیکھ رہا تھا جہاں چند ثانیے پہلے وہ سپاہی

کھڑا تھا جسے میں نے بے ہوش کر دیا تھا۔ اپنی بات کا جواب نہ پاکر وہ بلند آواز سے بولا: "اختر؟"

مگر وہاں اختر موجود ہوتا تو جواب دیتا وہ تو لمبی چھٹی پر چلا گیا تھا ـــ میں نے اپنے حواس مجتمع کئے اور سانس روک کر جھاڑیوں میں دبک گیا۔ دوسرا سپاہی آہستہ آہستہ چلتا ہوا آگے بڑھا۔

"پتہ نہیں وہ گیا کدھر ہے، وہ بدمعاش! مل گیا تو مار مار کر دُنبہ بنا دوں گا۔ یار اختر! تو کہاں جا ٹھہرا ہے؟" وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا اور پھر اچانک اس کی چھٹی حس بیدار ہو گئی۔ اختر کو کہیں نہ پا کر وہ پریشان ہو گیا تھا۔

"اختر! بھئی بولتے کیوں نہیں ہو، وہ لعنتی لئیق بھی واپس نہیں آیا۔ اصغر بھی اُدھر ہی مر گیا۔ کہتے تھے ہم گارڈ لے کر آئیں گے! ایک نمبر کے کام چور ہیں۔ اوئے اختر تو کدھر مر گیا ہے بھوندو خان؟" وہ بلند آواز سے چلّایا۔

اور پھر وہ وہاں آ پہنچا جہاں اختر کھڑا تھا۔ اس نے ایڑی پر عادتاً گھوم کر چاروں طرف نگاہ ڈالی تو میں نے اوپر اٹھ کر بندوق تان لی اور پھیپھڑوں کی پوری قوت سے اسے للکارتے ہوئے کہا: "خبردار! جو تُو نے کوئی حرکت کی تو گولی مار دوں گا۔ بندوق پھینک دے کتے کی دُم۔"

وہ ایک دم ساکت ہو گیا۔ اس کی پیٹھ میری طرف تھی۔ بڑی احتیاط سے اس نے سر گھما کر مجھے دیکھا تو اس کا رنگ اڑنے لگا۔ اس نے فوراً ہی بندوق پھینک کر ہاتھ اوپر اٹھا لئے۔ ایسے میں وہ بہت ہی مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔ اس کا پیٹ خاصا پھولا ہوا تھا۔ ہاتھ اوپر اٹھنے سے اس کی جرسی کمر سے کھسک کر اوپر جا چڑھی تھی۔ اور پیٹی سمیت پتلون نیچے ڈھلک گئی تھی۔ وہ کوئی بہت پرانا اور پاپی قسم کا رشوت خور سپاہی تھا کیونکہ جب میں نے پیچھے سے دبے پاؤں اس کے قریب جا کر اس کی گردن کی رگ مسل کر اسے بے ہوش کر دیا تو تلاشی لینے پر مجھے اس کی جیب سے ساڑھے تیرہ سو روپے ملے اس کے علاوہ چار سو روپے کی قیمت کا ایک پارکر قلم بھی اس کی جیب سے نکلا ـــ کچھ اور الا بلا قسم کی چیزیں بھی تھیں اس کی جیب میں، مگر میں نے وہ وہیں رہنے دیں اور پچاس روپے بھی اس کی جیب میں ڈال دیئے تاکہ وہ خرچ وغیرہ سے تو تنگ نہ رہے۔ اس کے پیٹ کی وسعت بتاتی تھی کہ اس کی آنت دو مرغیوں سے کم میں نہیں بھرتی ہو گی۔

میں نے ان دونوں کی بندوقوں میں سے کارتوس نکالے اور ان کی کارتوسوں سے بھری پیٹیوں سمیت ان کی بندوقیں جوہڑ میں پھینک دیں۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں نے گڑھے میں سے اپنے کپڑے نکالے اور ان کو اچھی طرح سے جھاڑ پونچھ کر پہن لیا۔ میرے بازو کا زخم مجھے مسلسل پریشان کر رہا تھا مگر مجھے تو وہ درد بہرحال برداشت کرنا ہی تھا۔ چکنی مٹی کا کچھ اور سفوف میں نے زخم میں بھر دیا اور پھر تیز تیز قدم اٹھاتا میں رکھ کی طرف چل دیا۔ اس سپاہی کی باتوں سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ انہوں نے تھانے میں اطلاع بھجوا دی تھی اور کوئی دم جاتا تھا کہ پولیس کی ایک ہشت ناک مسلح گارد وہاں پہنچنے کو تھی۔ اس کے بعد اس علاقے کے لوگوں کا جو حشر ہونے والا تھا اس کے تصور سے ہی مجھے دہشت ہوتی تھی کیونکہ وہ لوگ دیہاتیوں کے اس بیان پر کبھی اعتبار نہ کریں گے کہ جس آدمی نے ہادی علی کو مارا اور پھر جس نے ایک سپاہی کو قتل کر دیا وہ ان میں سے نہیں تھا۔ وہ تو اس روز بلا در اور گرد کے غریب کمّی کمین اور مزارع قسم کے نہتے لوگوں کو ذلت کی انتہا کو پہنچا دیں گے۔ یہ احساس مجھے رہ رہ کر ڈستا تھا مگر میں بے بس تھا۔ ان کی کوئی بھی مدد نہ کر سکتا تھا، کر ہی نہیں سکتا تھا۔

رکھ اس جھنڈ سے زیادہ دُور نہیں تھی۔ میں اس کے اندر جا گھسا۔ وہاں شیشم، شہتوت، کیکر اور اس قسم کے دوسرے درختوں کی گھنی چھاؤں نے اندھیرا سا کر دیا تھا۔ بلاشبہ اس رکھ میں ہر قسم کے جانوروں کی موجودگی کا امکان ہو سکتا تھا۔ کیونکہ کئی مربع میل رقبے پر پھیلا ہوا وہ جنگل بہت مہیب نظر آتا تھا۔ میں کنارے سے اندر ہو کر درختوں کی اوٹ میں چلتا ہوا ابھی کوئی ایک میل آگے نکلا تھا کہ مجھے اپنے بائیں ہاتھ جنگل کے دل سے ایک بہت ہی المناک آواز سنائی دی۔ کوئی اللہ کا بندہ بڑے ہی درد بھرے سُروں میں گا رہا تھا

کیہ پچھناں ایں ذات میرے دی
لپ مٹی سُک چھائیاں

(بھلا مجھ سے اس کی ذات کیا پوچھتے ہو۔ وہ تو مٹھی بھر مٹی اور تھوڑی سی سیاہی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے)

وہ آواز اتنی غم انگیز اور اس قدر درد میں ڈوبی ہوئی تھی کہ میرا دل بیٹھنے لگا میرے قدم آہستہ ہو گئے۔ وہ آواز جنگل کے اس سناٹے میں سحر پھیلا رہی تھی۔ میں سمجھا کوئی چرواہا تنہائی کے مہیب احساس میں پھنسا کراہ رہا ہے۔ آواز ذرا دیر کے لئے ابھری اور پھر ختم ہو گئی جیسے چلتے چلتے رک گئی ہو۔ میں آگے بڑھنے لگا مگر اس طرح کہ میرا دل چاہتا تھا کہ وہ آدمی یونہی راگ الاپتا رہے۔ اپنی ذات کی نفی کے اس عمل کو اس وقت تک جاری رکھے جب تک میں کسی صاف سیدھے رستے پر نہیں جاتا۔

ابھی میں دس ہی قدم آگے نکلا تھا کہ وہ آواز ایک بار پھر سناٹے کو چیرتی ہوئی چاروں طرف پھیلنے لگی۔ میں راگ الاپ کا رسیا کبھی نہیں رہا ہوں۔ بڑے بڑے سُرباز قسم کے لوگوں کو بھی کبھی میں نے اہمیت نہیں دی۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ بے کار اور مسترد قسم کے ناکارہ لوگوں کا شغل ہے اور سُربازی میں کچھ نہیں رکھا ہے مگر اس آواز میں کچھ ایسی مٹھاس ایسی طرب انگیز اذیت اور ایسا درد تھا کہ میں نے اپنا ارادہ بدلا اور اس کی سمت چلنے لگا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کون آدمی ہے جس کے گلے میں خدا نے اتنی مقناطیسی کشش بھر دی ہے کہ وہ جب دھیمے دھیمے سُروں میں دل کے درد کا اظہار کرتا ہے تو میرے جیسے سیاہ کار آدمی کا بھی من موہ لیتا ہے۔ وہ اب مسلسل گا رہا تھا۔

کیہ پچھناں ایں ذات میرے دی
لپ مٹی سُک چھائیاں

میں کافی دیر تک جنگل کے قلب کی طرف چلتا رہا مگر اس آواز کے مخرج تک نہ پہنچ سکا۔ لگتا تھا جیسے وہ آواز ہر سمت پھیلی ہوئی ہے مگر اب میں جنگل کے وسط میں پہنچ چکا تھا۔ حیرت یہ تھی کہ راستے میں میں نے کئی جنگلی جانور دیکھے۔ ان میں سؤر بھی تھے اور گیدڑ بھی، اور خرگوش تو اتنے دیکھے کہ ان کو گننے سے عاجز تھا اور یہ بڑی حیرت کی بات تھی۔ کیونکہ گیدڑ، بھیڑیے اور سؤر جیسے جانور جہاں رہتے ہیں وہاں خرگوش کی نسل زیادہ نہیں پنپ سکتی۔ اور اس رکھ کے بائیں ہاتھ دریائے چناب بہتا تھا ـــ وہ موسم کے اس حصے میں بہت سی جگہوں پر لکیر کی صورت میں بہتا ہے مگر پھر بھی وہ دریا ان جانوروں کے لئے آبِ حیات مہیا کرتا تھا۔

میں نے اس آواز پر کان لگا رکھے تھے مگر وہ اس وقت اچانک تھم گئی جب میں اس کے مرکز سے شاید تھوڑی ہی دُور تھا۔ میں دم سادھے چند لمحوں تک وہاں کھڑا سوچتا رہا کہ اب کدھر نکلوں۔ اس میٹھی لَے کے تعاقب میں میں نے خواہ مخواہ اپنا رستہ کھوٹا کر لیا تھا مگر نہیں میری... طبیعت کا یہ تکدّر ایک بار پھر تحلیل ہونے لگا۔ وہ آواز ایک بار پھر جنگل پر چھائے سکوت کے شیشے کو توڑتی ہوئی ابھری۔ اب کی بار وہ ہیر الاپ رہا تھا۔

تقدیر اللہ دی نوں کون موڑے
تقدیر پہاڑ پلٹ دی اے
گیا بھج تقدیر دے نال ٹھوٹھا
سانتھوں قیمت لے کے مٹ دی اے

(تقدیر کو کون بدل سکتا ہے۔ تقدیر تو وہ چیز ہے جو پہاڑوں کو الٹ دیتی ہے اور تیرا یہ پیالہ، جو تقدیر کے ہاتھوں ٹوٹ گیا ہے اس کا غم نہ کر۔ اس کے بدلے میں ہم سے ایک گھڑے کی قیمت لے لے)

وہ آواز اب زیادہ دُور نہیں تھی۔ میں تیزی سے اس کی طرف لپکا۔ میری اسٹین گن کمبل کے نیچے بائیں کندھے پر لٹک رہی تھی اور میرا دایاں بازو درد سے بھرا ہوا تھا۔ میں ابھی چند ہی قدم آگے گیا تھا کہ مجھے ایک جھونپڑی نظر آئی۔ اس کا عقب میرے سامنے تھا۔ وہ درختوں کے عین بیچ میں بنی وہ جھونپڑی دھوئیں سے کالی ہو رہی تھی میں اس کے گرد گھوم کر سامنے کی طرف پہنچا تو میں نے دیکھا کہ ایک آدمی میلے کچیلے لحاف میں ایک چارپائی پر بیٹھا ہے۔ اس کے سامنے لکڑیاں سلگ رہی تھیں، ڈھیر کی صورت میں۔ اس کے بال جو بہت لمبے تھے، کندھوں تک پھیلے ہوئے تھے ـــ ان بالوں پر سفیدی غالب آ چکی تھی۔ یہی حال اس کی ڈاڑھی کا تھا وہ بھی چھاج کی طرح اس کے سینے پر پھیلی ہوئی تھی۔ چہرہ اس آدمی کا توے ایسا سیاہ تھا۔ یہی حال اس کے ہاتھوں کا تھا۔ وہ آگ کو کرید رہا تھا۔ میں اس کے سامنے جا پہنچا تھا مگر اسے میری آہٹ بھی سنائی نہ دی تھی۔ شاید وہ بہرہ تھا۔ میں دھیرے دھیرے چلتا ہوا اس کے بالکل قریب جا پہنچا تو اس نے سب سے پہلے میرے پاؤں پر نظر ڈالی اور پھر میرے قد کی ایک ایک پور کو دیکھتے ہوئے وہ اپنا چہرہ آہستہ آہستہ یوں اوپر لایا جیسے وہ اپنی نظروں کی میزان میں مجھے تول رہا ہو۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں لگتا تھا اس نے بہت فاقے جھیلے ہیں۔ کڑی مشقتیں سہی ہیں جب وہ مجھے اپنی ان بے نور آنکھوں سے تول چکا تو بولا: "کون؟"

"سلام باباجی! میں ادھر سے گزر رہا تھا کہ آپ کی آواز سن کر ادھر آ گیا ہوں۔ آپ بہت اچھا گاتے ہیں۔"

میری بات کا کوئی جواب نہ دیتے ہوئے وہ آگ کریدنے لگا۔ چنگاریوں کو اچھی طرح ننگا کر کے بولا۔

"بیٹھو!" اس کی آواز میں بھی زندگی نہیں تھی بہت ہی بھربھری سی بے جان آواز تھی۔ مجھے حیرت یہ تھی کہ اگر یہی شخص گا رہا تھا تو اس کی آواز میں اتنا رس کہاں سے پیدا ہو گیا تھا۔

"آپ ہی گا رہے تھے نا باباجی؟"

"ہاں! کبھی کبھی رو لیتا ہوں۔ گانا کہاں گا سکتا ہوں میں؟"

وہ اس بے کراں تنہائی میں مجھے اپنے قریب پا کر خوش ہونے کے بجائے اور زیادہ بجھ گیا تھا۔ کوئی بہت ہی سنکی قسم کا آدمی معلوم ہوتا تھا ـــ مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے خواہ مخواہ اپنا رستہ کھوٹا کیا۔ میں اب تک بہت آگے پہنچ گیا ہوتا۔ اس شخص سے مجھے بھلا کیا لینا تھا جو دنیا سے سارے رشتے ناتے توڑ کر اس جنگل میں وحشی جانوروں سے بھی زیادہ بدتر زندگی گزار رہا تھا۔ میں اس کا گیت سن کر ادھر کیوں آ گیا؟ میں چند منٹ تک وہاں بیٹھا اس کے اجڑے اجڑے ویران گرد و پیش کو دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ اگر کوئی ڈھلمل یقین توہم پرست آدمی میری جگہ ہوتا تو اس بوڑھے کے پاؤں پر سر رکھ دیتا اور کہتا۔ "میرے من کی مراد پوری کر دو باباجی! مجھے اپنا غلام بنا لو۔" اور یہ باباجی ایک دم اینڈنے لگتے، پھڈے بازی دکھاتے، پاس پڑا بڑا سا چمٹا اٹھا کر اس کی کمر میں دے مارتے۔ سو طرح سے اسے ذلیل کرنے اور اپنی کرامت دکھانے کے شوق میں شاید اسے اٹھا کر سر کے بل آگ میں ڈال دیتے کہ ہاں بچہ! مابدولت مُردے کو بھی زندہ کر سکتے ہیں مگر میں نے ایسے توہمات کا طوطا کبھی پالا ہی نہیں تھا۔ مجھے اس کے وجود سے گھن سی آ رہی تھی۔

وہ بوڑھا رہ رہ کر اپنی ٹانگیں لحاف میں کبھی دائیں موڑتا تھا اور کبھی بائیں۔ مجھے یہی محسوس ہوتا تھا کہ وہ بیمار ہے اور شاید اس کی ٹانگوں میں شدید درد ہے۔ جب اسے ٹیس بے چین کرتی تھی تو وہ جیرا کوا ہی پڑے رہنے کو ترجیح دیتا تھا۔

اچانک مجھے جنگل کے مشرقی حصّے سے گاڑیوں کے انجنوں کی گھر گھر سنائی دی۔ وہ ایک دو نہیں بہت سی گاڑیاں تھیں۔ میں نے گھبرا کر چاروں طرف نظر دوڑائی۔ اس بوڑھے کی اس چھپر نما جھونپڑی سے کوئی دس پندرہ ہاتھ دور ایک کھلی پگڈنڈی تھی اور مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ گاڑیاں اس پگڈنڈی پہ بڑھتی چلی آ رہی تھیں یہ بڑی خوفناک بات تھی۔ اس سپاہی کے الفاظ میرے ذہن میں.... گونج رہے تھے جسے میں بے ہوش کر کے جوہڑ کے کنارے پھینک آیا تھا۔ اس کی باتوں سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ اس کے ساتھی تھانے میں اطلاع دینے گئے ہوئے تھے کہ اس ڈاکو کے ہاتھوں ان کا کیا حشر ہوا تھا؟ اور اب وہ لوگ جیپوں میں بھر کر میرے پیچھے آئے تھے تاکہ وہ مجھے جس طرح بھی ممکن ہو گرفتار کر لیں۔ گاڑیوں کی آوازیں لحظہ بہ لحظہ قریب آتی جا رہی تھیں میں ان سے بدک کر اٹھا اور ان آوازوں کی سمت کا تعین کر کے دوسری طرف بڑھا تاکہ جس قدر جلدی ممکن ہو میں وہاں سے نکل جاؤں۔

مگر ابھی میں اس بوڑھے کے سامنے دہکتے الاؤ سے ایک ہی قدم اُدھر نکلا تھا کہ اس نے بڑی گمبھیر آواز میں کہا۔

"رک جاؤ! یہاں تم بالکل محفوظ ہو ــــ بھاگو گے تو پکڑے جاؤ گے۔"

مجھے یوں لگا جیسے میں نے کوئی خواب دیکھا ہے کیونکہ اب کی بار جو آواز میری سماعت سے ٹکرائی تھی وہ اس مریل سی آواز سے مختلف تھی جو میں پہلے سن چکا تھا میرے پاؤں وہیں رک گئے۔

"اُدھر جھونپڑی میں اندر جا بیٹھو!"

میں نے احمقوں کی طرح سے اس کو گہری گہری نظروں سے دیکھا اور کسی سحر زدہ معمول کی طرح گردن جھکا کر چپ چاپ جھونپڑی کا میلا سا پردہ ہٹا کر اندر جا گھسا..... مگر اس سرکنڈے کی بنی جھونپڑی کے اندر پہنچ کر میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہاں جھونپڑی کے فرش پر پیال بچھی تھی اور اس پیال پہ ایک ایسی خوبرو لڑکی اپنے گرد لحاف لپیٹ کر بیٹھی تھی کہ اس کے چہرے پر نظریں نہ ٹھہرتی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی پیازی رنگت شہابی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں ترس و قزح سی لہرا گئی۔ مجھے اپنے سامنے پا کر وہ سمٹی اور لحاف کو گھسیٹ کر جھونپڑی کی دیوار سے جا لگی۔ اس کے بالوں کی تابناک سیاہی مجھے حیران کر رہی تھی۔ وہ بوڑھا جس قدر گندا اور غلیظ تھا وہ لڑکی اتنی ہی صاف ستھری اور نہائی دھوئی نظر آتی تھی۔ میرے سامنے دونوں طرف ایک ایسا تضاد تھا جسے میری

عقل تسلیم کرنے سے گریزاں تھی۔

اچانک مجھے گاڑیوں کی گھر گھر قریب آتی سنائی دی۔ میں نے اپنی اسٹین گن کمبل سے نکال کر سیدھے ہاتھ میں پکڑ لی۔ میری زندگی اپنی تلخ ترین آزمائش سے دوچار تھی۔ میری سانسیں زیر و زبر ہوتی رہی تھیں گاڑیاں آگے سے نہیں گزریں بلکہ وہ عین اس جھونپڑی کے سامنے پہنچ کر رک گئیں۔ اس لڑکی نے وہ سنگین ہتھیار میرے ہاتھوں میں دیکھا تو مسکرا کر آگے بڑھی اور سرگوشی کے انداز سے نہایت ہی شیریں لہجے میں بولی "ہتھیار مت چلانا۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

"وہ مجھے پکڑنے آ رہے ہیں۔" میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ میرے منہ سے ایک گالی نکل گئی تھی۔

"تمہارے منہ سے گالی اچھی نہیں لگتی۔"

"تو اور کیا کہوں میں ان کو دُعا دوں۔ وہ میرے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں وہ بھیڑیئے۔" میں نے اپنی جگہ پہ جم کر کہا۔ رخ میرا باہر کی طرف تھا اور اب مجھے جھونپڑی سے آگے پگڈنڈی پر تین جیپیں کھڑی نظر آ رہی تھیں۔ ان میں سے کئی سپاہی اچھل اچھل کر اترے اور چاروں طرف پھیل گئے۔ پانچ سپاہی اور دو افسر تیز تیز قدم اٹھاتے جھونپڑی کی طرف بڑھے۔ ان میں سے ایک اپنی وردی کے اعتبار سے مجھے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس نظر آتا تھا۔ اس نے ہاتھ میں شیشم کی بید کی چھڑی سنبھال رکھی تھی اور اس کی چمکتی ہوئی پیٹی میں پستول لٹک رہا تھا۔ وہ مجھے اس گھڑی بہت ہی کھل رہا تھا۔ چھریرے بدن کا میرے سیال کا بھا نجا نظر آتا تھا۔ بہت گورا چٹا اور خوبصورت جوان وہ۔ ایسا جوان جسے اپنے بازوؤں کی مچھلیوں اور نگاہ کی تیزی پر فخر ہو۔ اس کے ساتھ دوسرا آدمی کوئی تھانیدار تھا۔ اپنی وضع قطع کے اعتبار سے وہ مجھے کوئی بڑا ہی سفلہ سا شخص دکھائی دیتا تھا۔ اس کے بھی گلے رشوت نے پھلا رکھے تھے۔ اس نے اپنا پستول سیدھے ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔ ان کے دائیں بائیں پانچ سپاہی ہاتھوں میں بندوقیں تانے یوں جھونپڑی کی طرف بڑھ رہے تھے جیسے وہ ابھی اسے پھونک دیں گے۔

میرا ہاتھ اسٹین گن کی لبلبی پہ تھا اور میں ان کے قدم گن رہا تھا۔ مجھے اب اپنے بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی ماسوائے اس کے کہ میں انہیں بھسم کر دوں۔ آن واحد میں فنا کے گھاٹ اتار دوں۔ وہ سب میرا بدن اپنی گولیوں سے چھلنی کر دیں۔ اس کے سوا اور کوئی صورت باقی نہیں رہی تھی اس گندے غلیظ بوڑھے پہ مجھے سخت طیش آ رہا تھا جس نے مجھے جھونپڑی میں چھپ جانے کا مشورہ دیا تھا اور وہ اس خوش شمائل چھوکری مجھے یہ مشورہ دے رہی تھی کہ میں گولی ہرگز نہ چلاؤں اس کا تو یہ کہنا تھا کہ اس کی ضرورت ہی نہیں ہے لو بولو۔ اُدھر وہ لوگ ملک الموت کی طرح میری جان قبض کرنے کے لئے بڑھے چلے آتے تھے

کہتی تھی میاں گولی مت چلانا۔ بہت تیری خوش اخلاقی کی ایسی تیسی! یہ وقت بھلا کوئی ایسے مشوروں کا ہے کھوتی کی بچّی؟ میں سرک کر جھونپڑی کے پردے کے قریب ہو گیا۔ وہاں ایک گھڑونچی رکھی تھی اس پر دھرا گھڑا میں نے نیچے اتارا اور اسٹین گن کی نال اس پر جما کر رکھ دی۔ اب میں زیادہ بہتر طریقے سے ان خبیثوں سے نمٹ سکتا تھا۔

وہ لوگ اب جھونپڑی کے سامنے آ ٹھہرے تھے۔ اب وہ بالکل میری زد میں تھے۔ میں نے چاہا کہ میں فائر کھول دوں مگر ابھی میں لبلبی پر انگلی رکھ ہی رہا تھا کہ مجھے اپنے رخسار پر اطلسی لمس کا احساس ہوا۔ وہ لڑکی میرے پیچھے کھڑی تھی۔ اور میرے رخسار تھپتھپا رہی تھی۔

"صبر سے کام لو غلام جیلانی پیچھے آ جاؤ۔" اس کے منہ سے اپنا نام سن کر میں سناٹے میں آ گیا۔ میری آنکھیں اور میرا منہ حیرت کے مارے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"زیادہ حیرت دُکھ دیتی ہے پیچھے ہٹ جاؤ۔"

یہ کہہ کر اس نے میری کمر میں ہاتھ ڈال کر مجھے پیچھے کھینچا تو میں سمجھا کہ ہوا سے ہلکا اور لفظ سے زیادہ بے وقعت ہو چکا ہوں۔ میرا کوئی وزن ہی نہیں رہ گیا تھا۔ میں روئی کے گالے کی طرح اس کی بانہوں میں کھنچتا ہوا پیچھے گیا تو اس نے جھونپڑی کے کونے میں سے پیال ہٹائی اس پیال کے نیچے دو تختے تھے۔ وہ اس نے تیزی سے کھینچے تو مجھے ان کے نیچے چھ فٹ گہرا گڑھا نظر آیا۔ اس لڑکی نے مجھے اشارہ کیا کہ میں اس میں کود جاؤں میرے لئے اس کا حکم ماننے کے سوا اور کوئی چارۂ کار باقی نہ رہ گیا کیونکہ وقت میرے خلاف چل رہا تھا میرے صبر و سکون کے سارے اونچے اونچے درخت نیچے گر چکے تھے۔ میں گڑھے میں کودا تو وہ بھی میرے ساتھ ہی نیچے آ گئی۔ اس نے ہاتھ اونچا کر کے فوراً ہی تختے اوپر رکھ کر پیال سے ڈھانپ دیئے۔ تختوں کا ایک کونا شاید اس نے ذرا سا ننگا رکھا تاکہ اس میں سے ہوا آ سکے۔ یہ سارا کام اس نے اتنی تیزی اور مہارت سے مکمل کیا کہ میں حیران رہ گیا۔

"یہ بابا جی کب سے رہتے ہیں یہاں؟" پولیس افسر نے بڑے طنطنے سے سوال کیا۔ مجھے اس کے لہجے سے نخوت اور تکبّر کی بُو آ رہی تھی۔ ان کی آوازیں میں صاف طور پر سن رہا تھا۔

"پتہ نہیں جناب! میں ایک سال پہلے بھی اِدھر آیا تھا، ایک مجرم کی تلاش میں۔ تو یہ بابا یہیں دُھونی رمائے بیٹھے تھے لوگ انہیں رُکھ شاہ کہتے ہیں۔"

"اچھا اچھا! تو یہ رُکھ شاہ ہیں درختوں کے بادشاہ مگر یہ سب بکواس ہے منیر صاحب! یہ دُھونی شونی۔ بالکل فراڈ ہوتے ہیں یہ لوگ۔"

وہ لڑکی میرے ساتھ بھڑ کر کھڑی تھی۔ گڑھے میں ان کی ضرورت کی چند چیزیں پڑی تھیں جن سے پَیر بچا کر میں اس طرح کھڑا تھا کہ میرا بدن اس لڑکی سے مس نہ ہو مگر وہ جگہ ہونے کے باوجود بھی میرے ساتھ چمٹ رہی تھی۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں سر! مَیں تو ان باتوں پر بالکل یقین نہیں رکھتا۔"

"اس کی جھونپڑی تو دیکھیں ذرا۔ یہ پردہ ہٹاؤ۔"

اس افسر کی آواز پھر میرے کانوں میں پڑی۔ میں لرز کر رہ گیا کیونکہ اگر کسی طرح ان لوگوں کا پاؤں ان تختوں پر رکھی پیال پر آ پڑتا تو وہ ضرور سمجھ جاتے کہ وہ تختے وہاں بلا وجہ نہیں رکھے ہیں۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ انہوں نے جھونپڑی کا پردہ ہٹا کر اندر دیکھنے کے سوا کچھ نہیں کیا ــــ بابا رُکھ شاہ خاموش تھا۔ اس نے ان لوگوں سے کوئی بات نہیں کی تھی۔

"جھونپڑی تو بالکل خالی ہے سر۔"

"ظاہر ہے وہ بدمعاش اِدھر اندر تو نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ وہ ضرور بھاگ گیا ہو گا۔" اسی افسر نے کہا۔

"تیری قسمت اچھی ہے غلام جیلانی! وہ اندھے ہو رہے ہیں۔" اس لڑکی نے سرگوشی کی۔

اس کی آواز کی نغمگی مجھے حیران کرتی تھی۔

"یہ گڑھا کام آ گیا ورنہ تو میں مارا ہی گیا تھا آج۔"

"اور مَیں کام نہیں آئی تمہارے۔"

"ہاں مگر مجھے تو تم کوئی بھوت پریت قسم کی چیز نظر آتی ہو؟"

"نہیں نہیں یہ بات نہیں ہے۔ مجھے ذرا چھو کر دیکھو۔ میں تمہیں بھوتنی لگتی ہوں۔"

"کیا کرتی ہو؟ پریشان نہ کرو مجھے۔" میں نے اسے پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"ہر وقت یہ اسٹین گن کام نہیں دیتی ہے۔ ایسے وقتوں میں دماغ پر زور ڈالا کرو۔" ایک بار پھر اس کے احمریں لب ہلے تو اس گڑھے میں جلترنگ سی بج اٹھی۔

"وہ سالے اندھراتے کے مارے ہمیں دیکھ ہی نہ سکے ورنہ وہ معاف کر دیتے مجھے۔ وہ دن کے اندھے۔ وہ تو پھاڑ پر رکھ دیتے مجھے اور میرے ساتھ تمہیں بھی۔"

"اندھے کی داد نہ فریاد۔ اندھا مار بیٹھے گا۔" وہ دونوں ہاتھوں سے عجیب سی ترنگ میں گدا مار کر ہنسی تو اس کے شب چراغ دانت اس کے زخم ایسے تنگ دہن میں جھلملا اٹھے۔ وہ بلاشبہ حسین تھی بے حد حسین۔ وہ ایسی تھی کہ اس جیسی نہ میں نے کبھی دیکھی تھی نہ پھر دیکھ سکوں گا۔ شوخ اتنی تھی کہ ان بدترین لمحوں میں بھی وہ چٹکی لینے سے باز نہیں رہتی تھی۔

"تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے اور وہ میرے خون کا بھاؤ پوچھتے پھرتے ہیں۔" میں نے جل کر کہا۔ میری جان پر بنی تھی اور اسے مذاق سوجھ.... رہا تھا ــــ

"سورج چھپنے سے پہلے پہلے یہ جنگل دیکھ لو۔ ٹھیک ساڑھے چار بجے واپسی ہونی چاہئے۔ میری ادھر ایس پی صاحب سے میٹنگ ہے۔" اس پولیس افسر نے جھونپڑی سے بے نیل و مرام واپس ہوتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے جناب! مگر میرا خیال ہے کہ وہ اِدھر نہیں آیا ہے وہ بدمعاش۔ وہیں سے کسی طرف نکل گیا ہے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ گاؤں میں کسی کے گھر چھپا ہوگا۔ میں اُدھر اکبر کوٹ میں دیکھتا ہوں تم بلادر میں خانہ تلاشی لو مجید۔ اور دیکھو یار محمد! یہ تیسری جیپ رکھ لو۔ اس جنگل کو دیکھ کر اُدھر ہی آ جاؤ مگر بہت ہوشیار رہنا۔ خواہ مخواہ کوئی اور آدمی نہ مروا لینا۔ اس محمود کی موت کا مجھے بہت افسوس ہو رہا ہے۔"

یہ کہتا ہوا وہ ڈی ایس پی پگڈنڈی کی طرف واپس چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد جیپیں وہاں سے روانہ ہو کر دوسری طرف نکل گئیں۔

جب ان گاڑیوں کی گھر گھر کی آواز آنی بند ہو گئی تو ہم دونوں گڑھے سے نکل کر اوپر آ گئے۔ وہ بہت خوش تھی اور میری سراسیمگی سے محظوظ ہو رہی تھی اور مجھے ٹک ٹک دیکھے جا رہی تھی جیسے وہ میرے خیالات پڑھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ اس کے دیکھنے کا انداز اپنائیت سے اتنا لبریز تھا کہ میں نے بھی اس کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں اور کہا "بتایا نہیں تم نے..... وہ میرا نام تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"میں بہت پہنچی ہوئی بزرگ ہوں غلام جی..... جی..... جی..... لا..... لا..... نی جی۔"

اس نے پھر چٹکی لی۔ وہ میرے نام کو سارے... گا ما... پا... دھا... نی... سا کی طرز پر گا کر ادا کرتی تھی۔ میں جھلا سا گیا۔ وہ مجھ سے ذرا بھی مرعوب نہیں ہو رہی تھی۔ حالانکہ میں قوی تر بلکہ خونخوار قسم کا ہتھیار بند مرد تھا۔ اور اس کا محافظ وہ بوڑھا قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا۔ میری عزت اور خاطر تواضع کرنے کے بجائے وہ ماہ رُو میرا مذاق اڑا رہی تھی۔

"دیکھ ری! تجھے لڑکی سمجھ کر میں چپ رہ جاتا ہوں ورنہ میں تیرا گلا گھونٹ دوں ہاں۔ بہت بے عزتی کر رہی ہے تو میری" میں نے بہت سنجیدہ لہجے میں کہا۔

وہ ایک بار پھر کھلکھلا کر ہنس دی۔ بولی "اچھا! تو تیری کوئی عزت بھی ہے غو..... لا..... م..... ذلی... ی... لانی۔"

"کیا؟ کیا کہا تم نے۔ میں ذیلانی ہوں۔ خبردار جو یہ بکواس تم نے پھر کی تو؟"

"تو کیا ہوگا غلام ذیلانی ذی۔" وہ پھر ہنسی اور سرک کر میرے قریب ہو گئی اور میرے چہرے پر ہتھیلی بر ہمی دیکھ کر بولی۔

"تیرا بازو تو بہت دکھتا ہوگا۔ انگلی بھر لمبی گولی گزر گئی تھی اس میں سے۔ میں دیکھ رہی تھی۔ لا میں مرہم لگا دوں۔ لا میرا غلام ذیلانی... لا۔" یہ کہہ کر اس نے ہاتھ بڑھا کر میرے کرتے کے بٹن کھول دیئے۔ میری حیرت بے حد و حساب ہو چکی تھی۔ وہ کوئی ارضی مخلوق ہرگز نظر نہیں آتی تھی۔ وہ وقت، فاصلے اور پردوں کی قید سے بالکل آزاد تھی۔ وہ ہر بات جانتی تھی اور آدمی کے دروں پردوں میں جھانک لینے کی قوت رکھتی تھی۔ پہلی بار مجھے یہ احساس ہوا کہ میں کسی مافوق الفطرت شے کے سامنے بیٹھا ہوں اور بالکل بے وقعت، بے بس اور حقیر ہو گیا ہوں۔ میرے چہرے پر کھنڈی زردی دیکھ کر اس نے بڑی محبت سے میرے گال تھپتھپائے، بولی۔

"ڈرتے کیوں ہو غلام جیلانی! میں تو یونہی مذاق کر رہی تھی۔ لاؤ میں تمہارا زخم تو دیکھوں۔ تم ہمارے مہمان ہو، غیر نہ بنو۔ لاؤ اتارو کوٹ۔" یہ کہہ کر اس نے پہلے میرا کمبل الگ کیا پھر کوٹ اتارا اور پھر قمیص بھی اس نے میرے گلے سے کھینچ کر الگ کر دیا ـــــ جب وہ میری قمیص اتار چکی تو بولی۔

"تم بڑے خوبصورت ہو غلام ذیلانی۔ بہت خوبصورت اور صحت مند بھی!"

"دیکھ پھر تو نے میرا نام بگاڑا۔ مجھے غصہ آ جائے گا ہاں!" میں نے جھوٹ موٹ کا طیش ظاہر کیا۔ اس کے سامنے میں بالکل کاٹھ کا بدھو بن چکا تھا اور میرے دل و دماغ کی چند ہی منٹوں میں اس نے ایسی حالت کر دی تھی کہ اس کی ہر بات مجھے امرت معلوم ہونے لگی تھی۔

"تیرا اصلی نام یہی ہے۔ تیرے کام بھی ایسے ہی ہیں تو پھر میں نہ کہوں تجھے گو..... لا..... م..... ذلی..... ی..... لا..... نی" وہ ایک بار پھر اپنے لہجے میں موسیقی پیدا کرتی ہوئی میرا زخمی بازو دیکھنے لگی۔ لیکن کا معائنہ کرنے لگی جیسے وہ مجھے ازل سے جانتی ہو۔ میرے لئے دُکھ رہی ہو۔ میرے فراق کے گیت گاتی رہی ہو۔ وہ یوں میرے ساتھ جڑ بیٹھی جیسے میرے اور اس کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں تھا نہ صنف کا نہ دل کا نہ وجود کا۔ اس نے بڑی احتیاط سے میرے زخم پر سے پٹی ہٹائی تو بولی۔

"تو بڑا سخت دل ہے۔ درد نہیں ہوتا تجھے؟"

"ہوتا ہے پر کیا کروں؟ کون بیٹھی ہے میری یہاں جو سب درد بٹائے؟"

"تیرے جیسے کے لئے کون برباد ہوتا پھرے۔ تو تو ٹھہرا بدمعاش، چور اُچکا، لفنگا۔" ایک ہی سانس میں اس نے مجھے ڈھیر نام دے دیے۔ ہونٹ اس نے یوں لگاوٹ سے سکوڑ لئے تھے کہ مجھے غصے کے بجائے پیار آنے لگا۔

"تو کیا کچھ جانتی ہے میرے بارے میں؟ تیرا اپنا کیا نام ہے؟ ذرا میں اسے بھی تو بگاڑ کر دیکھوں۔" میں نے اپنا بازو اس کے

پھیلاتے ہوئے کہا۔

وہ مسکرائی اور اپنی آنکھوں کو کیمرے کی طرح کلک کلک کرتی بولی: "میرا نام؟ تیرا کیا خیال ہے میرا کیا نام ہونا چاہیئے؟" یہ کہہ کر اس نے گھڑے میں سے انڈیل کر ایک پیالے میں پانی بھرا اور پھر جھونپڑی کے باہر نکل گئی۔ چند ہی منٹ بعد جب وہ واپس آئی تو اس پانی میں وہ کوئی بوٹی گھول رہی تھی جس سے پانی کا رنگ سرخ ہو گیا تھا۔ وہ میرے قریب آئی اور میرا بازو کندھے پر رکھ کر بولی۔

"تیرا کیا خیال ہے؟ میرا کیا نام ہونا چاہیئے غلام ذیلانی؟"

"تیرا نام؟ میرا خیال ہے کہ..... کہ تیرا نام..... تیرا نام چھاتاں ہونا چاہیئے۔" یہ بات سنتے ہی وہ کھلکھلا کر ہنس دی اور میرے بازو پر سرخ پانی ڈالنے لگی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ اس پانی کو گرم کر کے لائی ہے مگر مٹی کا پیالہ جب میں نے اپنے بائیں ہاتھ سے ٹٹولا تو اس کا پیندا سرد تھا۔ کوئی ایسی ہی تاثیر تھی اس بوٹی میں کہ پانی کھولنے کی حد تک گرم ہو چکا تھا ـــــ اس پانی سے وہ میرا زخم دھو چکی تو پھر اس نے کونے میں پڑے ایک کپڑے سے میرا بازو خشک کیا اور بولی۔

"لے دیکھ! تیرا زخم آدھا بھی نہیں رہ گیا ہے۔ صبح تک تو بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔" میں نے اپنے زخمی بازو پر نگاہ ڈالی تو مجھے پھر حیرتوں نے گھیر لیا۔ میرا زخم بھر چکا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے انگور آ رہا ہے۔ اس کے ان طلسمی لمس کے حامل ہاتھوں نے عجیب معجزہ دکھایا تھا۔

"تو نے مجھے حیران کر دیا ہے کیا نام ہے تیرا چھا..... تا..... ں... دل کھا تاں۔" میں نے اسے چڑانے کی کوشش کی۔ حالانکہ میں اپنے ذہن میں اچھی طرح محسوس کر رہا تھا کہ میں اس سے بے تکلف ہو کر خود اپنی ہی تذلیل کا سبب بن رہا ہوں۔ اس کے چہرے کے گرد پھیلے نور ایسے ہالے نے اس جھونپڑی کو ایسا تقدس بخش دیا تھا کہ میں اس کا پوری طرح احاطہ کر ہی نہ سکتا تھا۔ خدا جانے وہ کیا چیز تھی اور کیوں اس روپ میں وہ اس ویرانے میں اتر آئی تھی۔ بس وہ میرے اندر کا اکھڑ، جاہل مطلق اور ڈھیٹ مرد تھا جو میری زبان سے ایسے کلمے کہلوا رہا تھا۔ ورنہ وہ تو ایسی تھی کہ صاف سیدھی خدا کی برگزیدہ ہستی نظر آتی تھی جسے اس کے پروردگار نے ان گنت معجزوں سے نواز رکھا تھا۔ وہ عیسٰی نہیں تھی مگر پھر بھی مسیحائی کرتی تھی ـــــ اس نے قدم قدم پر مجھے حیران کر دیا تھا۔ اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اس کے بھید کو کس طرح پا سکوں گا۔

"پٹی باندھ ـــــ"

"نہیں اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔ تیرے اپنے پسینے سے یہ صبح تک ٹھیک ہو جائے گا۔ چل اب اپنی کھال کے اندر چلا جا، چل؟"

یہ کہہ کر اس نے مجھے کپڑے دوبارہ پہنانے شروع کر دیئے۔ جب میں کمبل بھی لپیٹ چکا تو وہ بولی۔

"تو اب جاتا کیوں نہیں وہ تیرے مامے تو چلے بھی گئے کب کے

چلے گئے۔"

"تنگ آ گئی ہے مجھ سے؟"

"چل بیٹھا رہ! یہ رات تجھ پہ بہت بھاری ہے۔ تیری آزمائش کی رات ہے۔ باہر نکلے گا تو کوئی شیشہ سپ تیرا ناس مار دے گا بیٹھا رہ۔"

"بڑی مہربانی ہے تیری! یوں کہہ رہی ہو جیسے میں کوئی بھک منگا ہوں۔" میں نے اسٹین گن دیوار کے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔ میں وہاں سے اُن کو جانے بنا کیسے چل دیتا۔ مجھے تو یہ معلوم کرنا تھا کہ وہ کون لوگ ہیں؟ جو میرے لئے اتنی بڑی پناہ گاہ ثابت ہوئے ہیں۔

اچانک باہر بیٹھے بوڑھے کی آواز پھر چاروں اور اپنی تمام تر شیرینی لئے پھیلنے لگی۔

لے کیہہ سچ دے او ذات بِٹھے دی

لپ مٹی ٹک چھائیاں

لپ مٹی ٹک چھائیاں

اس بوڑھے کی آواز کی نغمگی نے ایک بار پھر گرد و پیش کو مسحور کر کے رکھ دیا۔ میں بیان ہی نہیں کر سکتا کہ بلھے شاہ کے اس بول میں اس نے کیسے کیسے انوکھے مفہوم بھر دیئے تھے۔ وہ یہی بول الاپتا تھا اور بار بار اس سناٹے میں اگیا بیتال کی طرح سلگ اٹھتا تھا ـــــ اس کی آواز نرم کومل جذبات کو انگیخت کرتی تھی۔

"چھاتاں! یہ بابا اندر سے بہت دکھی لگتا ہے مجھے؟"

"اوئے۔ تو نے تو میرا نام ہی چھاتاں ڈال دیا ہے۔ دیکھ میرا نام قدسیہ ہے قدسیہ!" اور اس نے جونہی یہ الفاظ کہے میری آنکھوں تلے اندھیرا چھانے لگا۔ اس کے نام کے ساتھ بھی سیہ کا لفظ آتا ہے جس کے لئے میں یوں در بدر ہو گیا تھا ـــــ وہ میری بہن آسیہ اس کی خاطر میں کیا سے کیا بن گیا تھا۔ جھونپڑی میں بیٹھی اس لڑکی نے مجھے جتنے بھی نام دیئے تھے وہ سب کے سب میرے ہی نام تھے۔ میں ان میں سے کسی ایک کو بھی اپنے سے الگ نہ کر سکتا۔ وہ میری ذات پر بہتان تھے نہ تہمت۔ وہ ایسی سیاہیاں تھیں جو میں نے خود اپنے منہ پر پوت لی تھیں۔ مگر کیوں؟ کس کے لئے؟ اپنی اس الہڑ اکھڑ غنچۂ نودمیدہ ایسی بہن آسیہ کے لئے، اور وہ جیل کی اونچی اونچی سنگین دیواروں کے پیچھے بیٹھی لہو روتی تھی۔ اس کی رہائی کے لئے میں نے ہادی علی کو ٹھکانے لگا دیا تھا اور اب میں اس راستے پر چڑھنے کی کوشش میں تھا جو مجھے لاہور لے جا سکتا۔

اگر وہ پولیس والے میرے پیچھے نہ لگ جاتے تو میں اب تک لاہور جا پہنچا ہوتا۔ کسی تیز رفتار کار میں بیٹھ کر میں اب تک لاہور میں آہو صاحب سے معاملہ طے کر رہا ہوتا۔

"کیا سوچنے لگے ہو؟" وہ میری طرف سرکی۔

"کچھ نہیں! تمہارا نام بہت اچھا ہے۔ مجھے بہت پسند ہے یہ نام۔"

"اچھا؟ آسیہ سے بھی زیادہ؟" اس نے حیرت کا ایک اور کوڑا

میرے لرزتے دل پر برسایا۔

"خدا کے لئے قدسیہ! مجھے...... مجھے...... بتاؤ تم کون ہو کیا ہو؟ تم نے مجھے حیران کر دیا ہے" میں نے ایک دم اس کی طرف کھنچتے ہوئے کہا۔ میری عاجزی اور انکساری اس گھڑی دیدنی تھی۔

"ارے ارے..... یہ کیا کرتے ہو غلام ذلی... ی... ی.... لانی۔ پرے رہو" وہ سمٹ کر پیچھے ہٹی اور لحاف کھینچ کر دیوار کے ساتھ جا لگی

"مذاق نہ کرو قدسیہ مجھے خدا کے لئے بتا دو تم کون ہو؟ تمہیں میرا نام کس نے بتایا؟ تمہیں کیسے پتہ چلا کہ کوئی آسیہ بھی ہے؟ تم کیسے جانتی ہو میرے بارے میں اتنی باتیں تمہیں کس طرح معلوم ہوئی ہیں میں نے تو تمہیں آج پہلی بار دیکھا ہے"

وہ میرے لفظوں کی آنچ لگا رہی تھی مگر اس کی وہ تیز تیز جھپکتی آنکھیں جو میری سانسوں کے آمد و شد کا ذریعہ بن گئی تھیں مجھے کچھ بھی نہیں بتا رہی تھیں۔ وہ مسکراتی رہی اور سامنے بیٹھی ٹکٹکی دیکھتی رہی۔

"تم بولتی کیوں نہیں ہو قدسیہ؟ میرے لئے یہ بات زندگی موت کا سوال بن گئی ہے۔ میرے ساتھ آنا کانی نہ کرو۔ مجھے صاف صاف بتا دو"

"تمہیں بھوک لگ رہی ہے دوپہر کو تمہیں کچھ بھی نہیں ملا۔ چچ چچ بُری بات۔ اچھے بچے پہلے کھانا کھاتے ہیں پھر بات کرتے ہیں۔ تم بیٹھو مَیں تمہارے لئے کچھ کھانے کو لاتی ہوں" یہ کہہ کر وہ اٹھی اور آفتابی کی طرح مچلتی ہوئی تیزی سے باہر نکل گئی۔ اس کے جانے سے یوں لگا جیسے جھونپڑی تاریک ہو گئی ہے وہ بد رکاب گھوڑی کی طرح مجھے پریشان تو کر رہی تھی پھر بھی میرا حوصلہ نہیں پڑتا تھا کہ میں اس پر اپنے طیش اور جبر کا کوڑا..... برساؤں۔ مَیں خود میں اتنی ہمت ہی نہیں پاتا تھا اور اب وہ میرے لئے کھانا لینے گئی تھی مگر کہاں؟ اس جھونپڑی کے سوا بھی اس کا کوئی ٹھکانہ ہے۔ مَیں یہ بات معلوم کرنے کے لئے کمبل لپیٹ کر جھونپڑی سے باہر نکلا تو دیکھا کہ بوڑھا جھونک میں تھا اور خرّاٹے لے رہا تھا۔ مَیں اس کے پاس سے گزر کر جھونپڑی کے چاروں طرف گھوم گیا۔ مگر وہ کہیں نظر نہ آئی۔ وہ کسی چھلاوے کی طرح غائب ہو چکی تھی۔ میں زیادہ دُور نہیں جانا چاہتا تھا کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ پولیس کی ایک جیپ کے سپاہی ابھی اُدھر ہی.... سرگرداں ہوں گے —— اس کو دُور دُور تک نگاہ دوڑا کر میں نے دیکھ لیا تو مایوس ہو کر میں ایک بار پھر جھونپڑی کے اندر جا بیٹھا۔ دن ڈھلتا جا رہا تھا میرے ہاتھ پہ بندھے وقت کے بارے میں آدمی کا جہالت پیما آلہ بتا رہا تھا کہ شام کے ساڑھے چار بج چکے ہیں۔ سورج غروب ہونے میں آدھا گھنٹہ باقی تھا——

جب سورج غروب ہو چکا تو جھونپڑی کے اندر چاند طلوع ہونے لگا۔ وہ ایک بڑی سی چنگیر میں ڈھیر سارے جنگلی پھل بھر کر لائی تھی اور جھونپڑی میں داخل ہو کر کہہ رہی تھی۔

"تم کوئی خواب دیکھ رہے تھے۔ کسی اونچی مسند پر تو نہیں بیٹھے تھے؟ ریشمی سی خوبصورت سی مسند پہ؟"

"کیا؟ کیا کہتی ہو تم؟ یہ ٹھہر ٹھہر کر چٹکی کیوں کاٹتی ہو" میں نے ایک بار پھر اپنی جگہ سے اچھل کر پوچھا —— وہ شاید میری مسند آرا تک جا پہنچی تھی۔

"آہستہ بول، گولام ذلی.... ی.... ی..... لانی۔ آہستہ بول بابا جاگ پڑیں گے۔ دو گھڑی سونے دے انہیں، کسی بچھّو نے کاٹ لیا ہے تجھے۔ اچھلا کیوں تھا تو؟ لاؤ یہ لے کھا۔ اپنے پیٹ کا دوزخ بھر اور پھر سو جانا"

پتہ نہیں وہ کس کس قسم کے پھل تھے؟ وہ میں نے جنگل میں بارہا دیکھے تو تھے مگر ان کے بارے میں یہی سنا تھا کہ وہ زہریلے ہوتے ہیں۔ ان میں کئی ایک واقعی کڑوے بھی تھے۔ وہ ان کو کاٹ کاٹ کر میرے سامنے رکھتی گئی۔ وہ شاید اس کے ہاتھوں کی شیرینی تھی یا اس کی آنکھوں کا سحر تھا کہ میں وہ تمام پھل ایک ایک قاش کر کے کھا گیا اور تھوڑی ہی دیر میں ہم دونوں نے وہ بھری ہوئی چنگیر خالی کر دی۔ قدسیہ اس گھڑی مجھے روشنک نظر آتی تھی۔ سکندر کی طالع مند بیوی جس کی تقدیر کے اوج نے سکندر کو بھی بالا بلند کر دیا تھا۔ میں بھی کچھ ایسی ہی کیفیت محسوس کر رہا تھا مگر وہ میری بیوی تو ہرگز نہیں تھی۔

"بابا کے لئے بھی میں یہی پھل لائی ہوں —— انہوں نے برسوں سے نمک نہیں کھایا"

"ان کی ٹانگوں میں کوئی تکلیف ہے؟"

"ہاں! بہت دنوں سے وہ ایسے بیمار ہیں کہ چل پھر نہیں سکتے"

"تم اُن کی کیا لگتی ہو! بیٹی ہو؟"

"تو باز نہیں آتا ہے سیندھ لگانے سے۔ پکّا چور بن چکا ہے تو؟"

"مَیں نے کیا کیا ہے؟"

"تلّڑ سے بلّڑ اٹھا کر دیکھتا ہے اور پوچھتا ہے کیا کیا ہے تو نے؟ مونچھیں پونچھ اپنی، رس میں ڈوبی ہیں اور سیدھا ہو کر لیٹ جا....."

میں نے چھو کر دیکھا تو واقعی میری ایک مونچھ رنگین ہو رہی تھی اس پھل کے رس سے، جو اب سامنے نہیں تھا۔

اچانک بابا کی آواز میرے کان سے ٹکرائی "پھل کہاں میرے حصے کے؟"

"تیرے دائیں ہاتھ رکھے ہیں بابا۔ ٹھہر میں دیتی ہوں"

یہ کہہ کر وہ باہر نکلی اور اسے سنبھالنے لگی۔ میں بھی اس کے پیچھے گیا وہ دائیں ہاتھ ایک درخت کے تنے کے ساتھ لگے ایک چھپّر کو کھینچ رہی تھی۔ ہم دونوں نے مل کر وہ چھپّر بابا کی چارپائی کے اوپر اس طرح تان دیا کہ وہ رات کو پچھم سے چلنے والی ہوا اور اوس سے بچ سکتا تھا۔

"بابا کو اندر کیوں نہیں لے چلتی ہو۔ باہر تو اتنی سردی ہے"

"اسے سردی نہیں لگتی۔ ذرا اس کو ہاتھ تو لگا کر دیکھ۔ بابا تجھ سے زیادہ جوان ہے" میں نے اس کے کہنے کے مطابق اس کالے بھجنگ بوڑھے کا ہاتھ چھو کر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ اس کی حرارت عزیزی جوانوں سے بھی بڑھی ہوئی تھی۔ ہوا سے بچنے کے لئے بابا کے دائیں ہاتھ چارپائی کے ساتھ اس نے ایک چھپّر کھڑا کر دیا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس لڑکی نے پھلوں کی چنگیر بوڑھے کے سامنے رکھ دی۔ وہ اٹھ کر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور بڑی رغبت سے پھل کھانے لگا۔

وہ جب فارغ ہو گیا تو اس لڑکی نے چنگیر اٹھائی، چھلکے اکٹھے کر کے دُور پھینکے اور بولی۔

"اب سو رہو بابا! کوئی ضرورت ہو تو مجھے آواز دے لینا"

بوڑھے نے کچھ جواب نہ دیا۔ ہم دونوں کو خالی خالی نظروں سے دیکھتا ہوا وہ لحاف کو اچھی طرح اپنے بدن پر لپیٹ کر لیٹ گیا۔

"اگر بارش آ گئی تو پھر کیا ہوگا؟"

"بارش نہیں آئے گی۔ تو اس کی فکر نہ کر" یہ کہہ کر وہ لہراتی ہوئی کمر کو بڑے ہی دلفریب انداز سے لچکاتی ہوئی کوٹھڑی میں جا گھسی۔ اندر اس نے دیا بھی نہیں جلایا تھا۔ جب میں نے اصرار کیا تو وہ اٹھی اور ایک لکڑی کو باہر بابا کی چارپائی کے پاس دہکتے الاؤ سے جلا کر اندر لے آئی۔ وہ لکڑی خاصی روشنی دے رہی تھی۔ لکڑی کو اس نے جھونپڑی میں رکھی گھڑونچی پر اس طرح پھنسا کر رکھا کہ ہر شے منوّر ہو گئی۔ اس کے بعد اس نے جھونپڑی کے دروازے پہ چھپّر تان دیا اور میرے پاس آ کر لحاف میں گھس کر بیٹھ گئی اس طرح کہ میرے اور اس کے درمیان ذرا سا بھی فاصلہ باقی نہیں رہ گیا تھا۔ میں سرک کر پرے ہٹ گیا۔ پتہ نہیں کیا بات تھی اسے بانہوں میں لے لینے کی آرزو دل میں اٹھتی تو تھی مگر پھر میں عجیب سے خوف میں گھر جاتا تھا۔

"تو مجھے اندھیرے میں دیکھ نہیں سکتا تھا اسی لئے چاہتا تھا کہ مَیں روشنی کر دوں"

"یہ بات نہیں تھی پھاتاں —— روشنی بہرحال اچھی چیز ہے"

"تجھے میں کیسی لگتی ہوں ذلی.... ی.... ی.... لانی؟" اس نے پھر چٹکی لی۔ اس کے لہجے کی شوخی مجھے حیران کرتی تھی۔

"تو..... تو..... بہت اچھی ہے.... پھپھ.... پھپھ.... پھاتاں اتنی اچھی کہ میں نے تیرے جیسی خوبصورت لڑکی آج تک نہیں دیکھی، تو مجھے انسان معلوم نہیں ہوتی"

"تو کیا ہوں پھر میں؟"

"پتہ نہیں تو کیا چیز ہے۔ ہو سکتا ہے تو کوئی جنّی ہو جسے اس بابا نے اپنے کسی عمل سے تسخیر کر لیا ہے"

وہ کھل کھلا کر ہنس دی اور اس کے رخسار سرخ ہو گئے، آنکھیں جھلمل جھلمل کرنے لگیں۔

"یہ تو کس طرح کہہ سکتا ہے جیلانی! تجھے میں جنّی نظر آتی ہوں؟"

"نہیں! تو ہے تو انسان کی صورت مگر تجھ جیسی حسین میں نے کبھی نہیں دیکھی۔ تو نے کوئی بناؤ سنگھار نہیں کیا پھر بھی لاکھوں بناؤ سنگھار تجھ پر قربان کئے جا سکتے ہیں۔ تیرے بدن سے جو خوشبو اٹھ رہی ہے وہ نہ صندل میں ہے نہ گلاب میں۔ پتہ نہیں تو کیا چیز ہے؟"

"اچھا؟ تیری زبان بہت تیز چلتی ہے ذیلانی! مگر تو یہ پرے کیوں کھسک رہا ہے۔ ٹھیک سے بیٹھ نا۔ ادھر ہو جا میرے قریب!"

"نہیں! مجھے ادھر نہیں ہونا ہے۔ پہلے تو مجھے یہ بتا کہ تو میرا نام کس طرح جانتی ہے؟"

"تیرا پرنالہ ابھی تک وہیں ہے۔ دفع کر ان باتوں کو یہ تیری سمجھ میں آنے والی نہیں ہیں۔ ادھر ہو جا یہ رات پھر نہیں آئے گی" یہ کہہ کر وہ تیزی سے اٹھی اور روشنی گل کر دی

"کیا کرتی ہے تو، پرے ہٹ جا۔ تیرا میرا کوئی رشتہ نہیں ہے تو یہاں جو ادلی لگا کر بیٹھی اس سے تو میرے نفس کے ہاتھی کو بے بس نہیں کر سکے گی، ناممکن ہے" یہ کہہ کر میں نے اسے اپنے اوپر سے اچھال کر دوسری طرف گرا دیا —— وہ لحاف کے اس سرے پر چپ چاپ پڑی رہی پھر مجھے محسوس ہوا کہ وہ اٹھ گئی ہے —— باہر اس گھڑی چاند بھی بجھا ہوا تھا اور جھونپڑی میں ایسا گھنا اندھیرا تھا کہ مجھے اپنا وجود جنّی معلوم ہوتا تھا۔ دو تین منٹ اسی طرح گزر گئے۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اتنی شدید سردی کے باوجود مجھے اس لحاف میں گرمی محسوس ہو رہی تھی اور میرے خون میں ہلچل مچی تھی۔ بدن کی سرحدوں پر شباب کے تمام رسیلے جذبے دستک دے رہے تھے اور وہ لڑکی اگردان میں رکھی اگربتیوں کی طرح سلگ کر سارے ماحول کو مسحور کئے دیتی تھی۔ پھر بھی کچھ ایسی ہی بات تھی کہ میں اس کی طرف بڑھنے سے گریزاں تھا۔ شاید اس کی بے حد و حساب بے تکلفی نے مجھے بدمزہ کر دیا تھا یا میں اس کی معجزاتی قوتوں سے خوف زدہ تھا کوئی سبب ایسا ضرور تھا کہ میں نے اب تک خود کو اس سے دور رکھا تھا۔

ابھی میں اسی ادھیڑ بُن میں تھا کہ جھونپڑی روشنی سے لبالب بھر گئی۔ اس نے وہ لکڑی جلا دی تھی اور اب وہ میرے سامنے کھڑی تھی۔ یوں جیسے کسی یونانی مجسّمے کو زندگی مل گئی ہو، جیسے کسی شاعر کا تخیّل حقیقت کا روپ اختیار کر گیا ہو۔

"ہے.... ذیلانی..... دیکھ تو کیسی لگتی ہوں، ذرا دیکھ تو سہی"

پتہ نہیں اتنا صبر، اتنا حوصلہ، اتنی جرأت اس گھڑی میرے دل میں کیسے پیدا ہو گئی۔ میں نے پہلو میں رکھا اپنا "چپ شاہ" اٹھایا اور اس کی لبلبی پر ہاتھ رکھ کر نالی کا رُخ اس کے سینے کی طرف پھیر دیا۔ میری

نظروں سے دُور ہو جا قدسیہ! ورنہ اچھا نہیں ہو گا۔"

"نہیں، نہیں! تم اِدھر دیکھو اور بتاؤ میں کیسی لگتی ہوں؟"

اب کی بار اس کی آواز میں بے پناہ ملائمت ابھر آئی۔ میں نے اپنے طیش پر اس لمحے قابو پا لیا تھا مگر اس کی بات سنتے ہی میں غصّے میں پھنکنے لگا اور میں نے شست باندھ کر گولی چلا دی۔

اس نے ایک دلدوز چیخ ماری اور پاگلوں کی طرح بھاگتی باہر نکل گئی۔ میں تیزی سے اس کے پیچھے لپکا مگر وہ مجھے کہیں نظر نہیں آئی۔ وہ جھونپڑی کے باہر اُگی ہوئی گھنی جھاڑیوں میں غائب ہو چکی تھی۔ میں کتنی ہی دیر تک اسے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا مگر اس کا مجھے کہیں بھی کوئی نشان نہ ملا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ سردی سے سخت پریشان ہو رہی ہو گی۔ اس لئے میں اسے جلدی واپس لانا چاہتا تھا۔ میں کوئی ایک گھنٹے تک اِدھر اُدھر سرگرداں پھرتا رہا۔ مگر جب وہ مجھے کہیں بھی نظر نہ آئی تو میں بوجھل بوجھل قدموں سے ایک بار پھر جھونپڑی کے اندر جا گھسا۔

میں نے لحاف سیدھا کیا اور اسے اوڑھ کر پیال پر لیٹ گیا مجھے یقین تھا کہ وہ جلد یا بدیر واپس آ ہی جائے گی۔ افسوس مجھے یہ ہو رہا تھا کہ اگر وہ زخمی ہو چکی ہے تو اب تک ڈھیروں خون اس کے جسم سے نکل چکا ہو گا۔ اس کی وہ دِلدوز چیخ تو ایسی ہی صورت حال کا پتہ دیتی تھی۔ مگر اس کو وہاں تلاش کر لینا میرے بس میں نہیں رہا تھا۔ میں نے بہت دیدہ ریزی کر لی تھی۔

لحاف قدسیہ کے بدن کی خوشبو سے معطّر ہو رہا تھا اور میں اس سوچ میں گم تھا کہ اس بابا اور اُس قدسیہ کے بارے میں حقائق کس طرح معلوم کر سکوں گا۔ وہ دونوں ہی مجھے بے حد پُراسرار معلوم ہوتے تھے مگر یہ بات مجھے قرینِ قیاس نظر نہیں آتی تھی کہ وہ دونوں کوئی ماورائی مخلوق ہیں، ایسی مخلوق جو غیب کی باتیں جان لینے کی طاقت رکھتی ہے ایسی کرامتوں پر مجھے کبھی بھی کوئی یقین نہیں رہا۔ اس توہم پرستی کی دلدل سے میں زندگی بھر دُور رہا ہوں۔ مجھے ہر جگہ احسن التقویم کا ارشادِ ربّانی کارفرما نظر آیا۔ میں نے کہیں یہ نہ دیکھا کہ دو اور دو مل کر چار نہیں بلکہ تین پر منتج ہوئے۔ میں نے کسی تیز دھار آلے کو زخم لگانے سے باز رہتے نہیں دیکھا۔ دُھوپ نے ہر جگہ تمازت بکھیری ہے اور پانی کو میں نے ہر حالت میں زمین کی سیرابی اور بارآوری کا سبب بنتے دیکھا ہے۔ میں کیسے مان لیتا کہ اس بوڑھے میں کوئی مافوق الفطرت قوتیں موجود ہیں۔ پھر بھی اس قدسیہ کی باتیں مجھے حیران کرتی تھیں وہ میرا نام جانتی تھی اور میرے بارے میں شاید اسے اور بھی بہت کچھ معلوم تھا اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ مجھ سے اس حد تک بے تکلف ہرگز نہ ہوتی۔

رات خاصی گہری ہو چکی تھی مگر نیند مجھ سے ابھی تک کوسوں دُور تھی۔ مجھے قدسیہ کا انتظار تھا جو چھلاوے کی طرح میری نظروں سے غائب ہو چکی تھی۔ اس کا وہ ملکوتی حسن مجھے متاثر کرتا تھا مگر وہ سفلی جذبے بیدار نہیں کرتا تھا بلکہ دل میں کچھ ایسی کیفیت پیدا کرتا تھا کہ آدمی آپ ہی آپ الوہیت کی منزلیں طے کرنے کی آرزو کرنے لگتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ واپس آ جائے اور آ کر مجھ سے پہلی ایسی بے تکلفی سے باتیں کرے۔ میری حیرت کو فزوں تر کرتی چلی جائے اور اپنی ہنستی مسکراتی آنکھوں کے خیرہ کُن چاند سے میرے دل کے خانۂ محزوں کو منوّر کر دے مگر وہ آ ہی نہیں رہی تھی۔

اچانک باہر سے بوڑھے کی آواز ابھری۔

"پانی! مجھے پانی پلاؤ ——— پانی۔" میں جلتی لکڑی اٹھا کر بھاگتا ہوا باہر نکلا تو دیکھا کہ بوڑھا پیاس کی شدت سے نڈھال ہو رہا ہے ——— میں پانی لینے کے لئے جھونپڑی میں گھُسا تو دیکھا کہ گھڑا بالکل خالی تھا۔ اس میں پانی کی ایک بُوند باقی نہیں تھی حالانکہ شام سے پہلے اس میں پانی موجود تھا۔ میں گھبرا کر باہر نکلا تو دیکھا کہ بوڑھا پیاس سے اور زیادہ پریشان ہو گیا تھا۔ مجھے بھی شدید پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ یا تو یہ سب ان پھلوں کا کرشمہ تھا یا اس تشنگی پرور صحرا کی برکت تھی جس میں سے قدسیہ نے مجھے گزارا تھا میرے اپنے لب خشک ہو رہے تھے۔

"میں پانی لے کر آتا ہوں بابا! تم ذرا صبر کرو۔" یہ کہہ کر میں نے گھڑونچی پر سے گھڑا اٹھایا اور سیدھے ہاتھ میں پستول پکڑ کر باہر نکل گیا۔ اسٹین گن میں نے بھر کر کندھے پر لٹکا لی تھی۔

اب سوال یہ تھا کہ میں پانی کہاں سے حاصل کروں۔ دریا وہاں سے مغرب کی سمت میں تھا اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہاں تک آنے جانے میں مجھے کتنی دیر لگ جائے۔ اس جنگل میں دن کو بھی رات کا سماں نظر آتا تھا اور وہ تو وقت ہی رات کا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ میں نے روشنی کے لئے وہ لکڑی ہاتھ میں لے لی جسے قدسیہ جلا گئی تھی۔

"پانی کہاں سے مل سکے گا بابا جی؟"

"پتہ نہیں! شاید دریا سے مل جائے۔ اس سے مانگ لاؤ۔ ایک بوند کی ضرورت ہے۔" وہ بڑے نحیف و نزار لہجے میں بولا۔

"ٹھیک ہے میں ابھی لاتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں دریا کی طرف چل نکلا۔ راستہ اتنا مہیب تھا کہ میرا دل دہل رہا تھا پھر بھی اس بوڑھے کے لئے میں اس خطرات سے لبریز جنگل کے اندر ہی اندر چلتا مختلف پگڈنڈیوں پر سے گزرتا بڑی مشکلوں سے دریا تک پہنچا اور گھڑا بھر کر انہی قدموں واپس ہو لیا۔

ابھی میں جنگل میں چھ جریب ہی چلا ہوں گا کہ اچانک مجھے چاروں طرف سے بھیانک آوازیں سنائی دینے لگیں۔ مجھے گیدڑوں نے تنہا پا کر گھیر لیا تھا۔ وہ لحظہ بہ لحظہ میرے گرد اپنا حلقہ تنگ کرتے جا رہے تھے۔ ان سے بچنے کے لئے میں بھاگ کر ایک درخت کے مونڈھے کی طرف لپکا تو اچانک میرا پاؤں کسی ننگی جڑ میں پھنسا اور میں منہ کے بل زمین پہ گر گیا۔ میری ساری توجہ گھڑے پر تھی کہ وہ گر کر ٹوٹ نہ جائے اسے میں نے گرنے تو نہ دیا مگر جب میں خود منہ کے بل نیچے جا رہا تو اس میں سے سارا پانی زمین پر بہہ گیا۔ گھڑا خالی ہو چکا تھا اور وہ گیدڑ جن کی تعداد دس سے کسی طرح بھی کم نہ تھی مجھ پر پل پڑے تھے میں نے تیزی سے اسٹین گن سیدھی کی اور ان پر اندھا دھند گولی چلا دی جلتی ہوئی لکڑی زمین پر پڑی تھی۔ اس کی روشنی میں میں نے کئی.... گیدڑوں کو بھیانک انداز سے چیختے ہوئے زمین پر گرتے دیکھا۔ گولیوں کی آواز سے باقی گیدڑ خوف زدہ ہو کر بھاگ نکلے اپنے پیچھے وہ چھ حملہ آور مُردہ چھوڑ گئے تھے۔ میں نے لکڑی کی روشنی میں ان کو اوندھا سیدھا پڑے دیکھا اور پھر گھڑا اٹھا کر دریا کی طرف چل دیا۔ ایک بار پھر مجھے لمبا راستہ طے کر کے دریا سے پانی بھر کر واپس آنا پڑا مگر وہ ایسی مشقت تھی کہ میرا جوڑ جوڑ دکھنے لگا۔ سردی کا تو مجھے قطعاً کوئی احساس نہیں تھا لیکن اس فاصلے نے مجھے نڈھال کر دیا۔

کوئی ایک گھنٹے کے بعد جب میں بابا کے پاس پہنچا تو پیاس کے مارے اس کا حال اور بھی ابتر ہو چکا تھا۔ میں نے اس کے سامنے گھڑا رکھا تو اس نے ایک توانا و تندرست آدمی کی طرح وہ گھڑا اٹھا کر منہ سے لگا لیا۔ اس نے پیالے کا بھی انتظار نہ کیا۔ جب وہ سیر ہو کر پانی پی چکا تو گھڑا اس نے میری طرف بڑھا دیا ——— معلوم یہ ہوا کہ وہ ظالم آدھا گھڑا پی گیا تھا۔

"اتنی پیاس لگی تھی آپ کو بابا؟"

"یہ جنم جنم کی پیاس ہے جوان! کبھی کبھی بہت بھڑک اٹھتی ہے تیرے پاس "سِگرٹ" ہے کوئی؟"

میں نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا تو وہ بولا۔

"مجھے سلگا کر دے۔ اس تیلی سے میں بہت ڈرتا ہوں میرے بال جلا دیتی ہے۔" اس کا لہجہ بہت خوشگوار ہو گیا تھا۔ جب وہ سگریٹ کے گہرے گہرے کش لے رہا تھا تو اس گھڑی میرے دل میں یہ وسوسے اٹھ رہے تھے کہ اگر اسے معلوم ہو گیا کہ میں نے اس کی لڑکی کو قتل کر دیا ہے تو وہ پتہ نہیں میرے ساتھ کیا سلوک کرے۔ اس لڑکی میں اتنی معجزانہ قوتیں موجود تھیں تو اس کے باپ کے پاس کیا کچھ نہ ہو گا۔ میرا دل بُری طرح لرزنے لگا تھا۔

جب وہ آدھا سگریٹ پانچ چھ کش میں پی چکا تو بولا۔

"تجھے بڑی تکلیف اٹھانی پڑی پانی لانے کے لئے۔ راستے میں بڑے شینہہ سپ ملے ہوں گے، اُدھر گیدڑ بھی بہت ہیں۔"

"ہاں بابا! اُدھر راستہ بڑا خطرناک ہے۔ گیدڑوں سے ملاقات ہو گئی تھی۔"

"میں نے تیری گولیوں کی آواز سنی تھی۔ اِدھر آ ذرا میری ٹانگیں تو داب دے۔ بڑا درد اٹھ رہا ہے ان لکڑیوں میں۔"

اس کی یہ بات سنتے ہی میں اس کی چارپائی کی پائنتی جا چڑھا اور لحاف میں ہاتھ ڈال کر اس کی ٹانگیں ٹٹولنے لگا۔

میں بڑی دیر تک بابا کی پائنتی بیٹھا اس کی ٹانگیں دباتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ ایک بار پھر گہری نیند میں کھو گیا۔ جب اس کے خرّاٹوں کی آواز میں تواتر پیدا ہو گیا تو میں بڑی احتیاط سے اس کی چارپائی پہ سے اترا اور اس کے بدن پر لحاف درست کر کے جھونپڑی میں جا گھسا۔ وہ جلتی ہوئی لکڑی میرے ہاتھ میں تھی۔ اس کی روشنی جب جھونپڑی میں پھیلی تو یہ دیکھ کر مجھے بہت دُکھ ہوا کہ قدسیہ ابھی تک واپس نہیں آئی تھی میں نے اپنی آنکھیں مَل مَل کر چاروں طرف دیکھا وہاں سب کچھ اسی طرح پڑا تھا مگر قدسیہ وہاں سے جا چکی تھی۔

میں نے ذرا غور سے جھونپڑی کے کچّے فرش پر جھک کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہاں کسی درندے کے قدموں کے نشان موجود ہیں۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ درندہ وہاں سے کوئی شے گھسیٹ کر باہر لے گیا ہے۔ جھونپڑی کی ایک دیوار میں خاصا بڑا سوراخ نظر آ رہا تھا۔ وہ اتنا چوڑا تھا کہ اس میں سے ایک چیتا آسانی سے گزر سکتا تھا اور اس سوراخ میں سے پچھم کی طرف سے چلنے والی ہوا سسکیاں بھرتی اندر آ رہی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ قدسیہ وہاں آ کر لیٹی تھی مگر کسی درندے نے اندر منہ ڈال کر باہر گھسیٹ لیا تھا میرے لئے وہ سب کچھ اتنا غیر متوقع تھا کہ میں کتنی ہی دیر تک وہاں سن ہو کر کھڑا رہا۔

اور پھر میں دیوانگی کے عالم میں اس سوراخ میں سے گزر کر دوسری طرف نکل گیا۔ اسٹین گن میرے سیدھے ہاتھ میں تھی اور اس کی لبلبی پر میرا دباؤ دم بدم گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ حیرت مجھے یہ تھی کہ وہ درندہ اندر آیا۔ قدسیہ کی لاش گھسیٹ کر لے بھی گیا مگر اس بابا کو خبر تک نہ ہو سکی۔ یہ کیسا بابا ہے، کیسا فقیر ہے؟ اس کی روشن ضمیری کا تو میں قائل ہوتا جا رہا تھا وہ اسی کے دم قدم کی برکت تھی، اسی کی کرامت تھی کہ قدسیہ کو اَن دیکھی اَن جانی باتیں معلوم ہو جاتی تھیں ——— مگر یہ کیسا اندھیر تھا کہ وہ اس درندے کے بارے میں کچھ نہ جان سکا جو اس کی متاعِ عزیز کو جھونپڑی میں سے گھسیٹ کر لے گیا تھا اور جسے یہ بھی معلوم نہ ہو سکا تھا کہ جس آدمی سے وہ پانی مانگ رہا ہے وہ اس کی لڑکی کو زخمی کر چکا ہے۔

میں نے بائیں ہاتھ میں قدسیہ کی جلائی ہوئی شمع پکڑ رکھی تھی۔ اس روشنی کے لپکتے شعلوں نے اس کے بدن کی طرف لپکتی گولی بھی دیکھی تھی جو میرے "چُپ شاہ" سے نکلی تھی۔ اب وہ روشنی اس درندے کے پرخچے اڑتے دیکھے گی جو قدسیہ کی بے حرمتی کا مرتکب ہوا تھا۔

میں تیز تیز قدم اٹھاتا آگے بڑھ رہا تھا۔ اس درندے کے

پاؤں کے نشانات زمین پر دکھائی دیتے تھے۔ نشان بہت واضح اور صاف تھے۔ میں کوئی سو قدم تک ان نشانات کے پیچھے پیچھے چلتا رہا مگر آگے نکل کر وہ کھوج گھاس پر پہنچ کر معدوم ہو گیا تھا۔ میں نے اس سے آگے نکل کر پھر ننگی زمین پر چلنا شروع کر دیا مگر اب مجھے کوئی بھی نشان نظر نہیں آتا تھا۔ میں سمجھا وہ درندہ یہیں کہیں چھپا بیٹھا ہو گا۔ یہ سوچ کر میں پیچھے مڑا اور اس جلتی لکڑی کی روشنی میں میں نے ایک ایک جھاڑی دیکھ لی مگر کسی بھی سمت میں مجھے نہ قدسیہ نظر آئی اور نہ وہ درندہ۔ کوئی ڈھائی گھنٹے تک میں پاگلوں کی طرح اس جنگل میں پھرتا رہا مگر مجھے کچھ بھی نہ مل سکا اور پھر میں ہر طرف سے مایوس ہو کر واپس آ گیا۔

بابا گہری نیند میں تھا اور اس کے خرّاٹے بڑے تسلسل سے جاری تھے۔ میں دبے پاؤں چلتا ہوا جھونپڑی میں داخل ہوا اور جلتی لکڑی کو پھر گھر ونجی کے ایک سوراخ میں پھنسا کر لحاف میں جا لیٹا۔ نیند مجھ سے کوسوں دُور تھی۔ جھونپڑی کا ماحول مجھے آسیب زدہ سا نظر آتا تھا۔ میں ٹھہر ٹھہر کر بدک جاتا تھا۔ طرح طرح کے خیالات میرے ذہن کو پریشان کر رہے تھے۔ اس عالم میں میں نے کئی سگریٹ پھونک ڈالے مگر نیند مجھ سے پھر بھی رُوٹھی رہی۔

جب میں بہت زیادہ نڈھال ہو گیا تو میں نے کوٹ اتار کر الگ ڈال دیا اور اپنے زخمی بازو کو سہلانے لگا مگر یہ دیکھ کر میں دیوانہ سا ہو گیا کہ میرا زخم پوری طرح مندمل ہو چکا تھا۔ درد کا ذرا سا بھی احساس باقی نہ تھا۔ میں نے جرسی اور قمیص اتار کر اپنا زخم غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ اب زخم پر ہلکا سا کھرنڈ باقی رہ گیا تھا۔ قدسیہ نے مسیحائی دکھائی تھی۔ اس نے مجھے رات ہی رات میں صحت یاب کر دیا تھا مگر کوئی میری کم ظرفی دیکھے کہ میں نے..... میں نے..... اس کے بے مثال بدن کی صورت میں قدرت کی بے مثالی صنّاعی کی داد دینے کے بجائے اس پر گولی چلا دی تھی۔ محض اس لئے کہ وہ میری آرزو میں مری جاتی تھی اور صرف یہ چاہتی تھی میں اس سے محبت کروں۔ اس کی والہانہ خود سپردگی کو لبیک کہوں مگر میں نے اپنی بزدلی کے تارِ عنکبوت میں پھنس کر اس کو مجرم گردانا اور اس کے جذبوں بھرے نازک سے بدن پر گولی داغ دی۔ میرے سفلے پن کی تو کوئی انتہا ہی باقی نہ رہی تھی۔ میں اسے محبت نہ دے سکا۔ اس سے نفرت بھی نہ کر سکا۔ اور اسے کچھ دینے کے بجائے اس کی بے حد و حساب خاطر و مدارات کے عوض اس کی کوئی خدمت کرنے کے بجائے میں نے اس کی زندگی کے سارے لعل و گہر فنا کر دیئے تھے۔ پچھتاوے کے زہریلے ناگ مجھے ڈس رہے تھے مگر اب میرے بس میں تو کچھ بھی نہیں رہ گیا۔ اب میں کیا کر سکتا تھا میں نے چاہا کہ میں اسی "چپ شاہ" پستول کی گولی اپنی کنپٹی میں اتار کر اپنے اس گناہ کا کفّارہ ادا کر دوں۔ مایوسی کے اتھاہ گرداب میں پھنس کر پستول میں نے نکال بھی لیا۔ میں بلاشبہ اپنے ہی جسم پر وار کرنے پر تیار ہو چکا تھا کہ اچانک مجھے اس بوڑھے کی آواز سنائی دی۔

"پانی۔"

اسے پھر پیاس نے نڈھال کر دیا تھا۔ میں نے پستول جیب میں ڈالا اور تیزی سے اٹھ کر اس کے پاس جا پہنچا۔ وہ لحاف کو اپنے گرد لپیٹ کر چارپائی پر سیدھا ہو کر بیٹھا تھا۔ میں نے اب کی بار گھڑے سے پیالہ بھر کر اسے دیا تو وہ مسکرایا، بولا۔

"یہ تو اندر کیا کر رہا تھا پگلے؟"

"میں..... میں..... کچھ بھی نہیں باباجی کچھ بھی نہیں۔" میں ہکلا گیا۔

"تو شاید خودکشی کرنا چاہتا تھا۔" بابا نے سچی بات کہہ دی۔

"میں..... میں بہت دکھی ہوں باباجی! میں نے..... میں نے اس لڑکی پر گولی چلا دی تھی جس نے مجھے بچایا ہے۔"

"قدسیہ پر؟"

"ہاں..... وہ شاید مر چکی ہے مگر مجھے کہیں نظر نہیں آتی۔ میں بہت شرمندہ ہوں باباجی!"

"وہ مری نہیں ہے مگر تو نے بہت جلد بازی سے کام لیا تھا..... جیلانی..... وہ لڑکی میری بیٹی ہے ـــــ وہ تجھے پسند کرنے لگی تھی مگر تو نے اسے اچھا سبق دیا ہے۔"

"وہ..... وہ آپ کی بیٹی ہے۔"

"ہاں! وہ ایسی نہیں ہے جیسی تو سمجھتا ہے مگر آج وہ بہک گئی تھی۔ ایک دم پاگل ہو گئی تھی وہ ـــــ اب وہ کبھی تیرے سامنے نہیں آئے گی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں سلائی پھیر دی ہے۔"

"سلائی پھیر دی ہے! یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ وہ تیری گولی سے زخمی نہیں ہوئی تھی میں یہاں بیٹھا سب کچھ سن رہا تھا، سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ وہ باہر نکلی تو سیدھی میری چارپائی کے نیچے آ کر چھپ گئی ـــــ مگر میں اس کی نظر کی اس آوارگی سے پریشان ہو گیا تھا۔ تو جب پانی لینے گیا تو میں نے اس کی آنکھوں میں ایک جنگلی بُوٹی کے دو دو قطرے ٹپکا دیئے۔ جس سے اس کی نظر بہت دنوں تک بند رہے گی۔ اس کا علاج مجھے معلوم ہے۔ ایک بُوٹی بھی میرے علم میں ہے جس کا پانی اس کی آنکھ میں ڈالوں گا تو اس کی نظر لوٹ آئے گی جو دوا میں نے اس کی آنکھ میں ڈالی ہے وہ پتلیوں پر جم جاتی ہے۔ اسے میں پگھلا دوں گا تو وہ پھر سے دیکھنے لگے گی۔"

"یہ کیا کر دیا ہے باباجی آپ نے؟ اسے اتنی بڑی سزا نہیں ملنی چاہیئے تھی۔"

"اور اگر اسے تیری گولی لگ جاتی تو.....؟"

"وہ میری غلطی تھی باباجی! میرا پاگل پن تھا وہ، اس پر میں بہت پچھتا رہا ہوں۔"

"جو کچھ ہوا بالکل ٹھیک ہوا ـــــ"

کا حکم ہو چکا تھا اور وہ بھی اس روز میرے ساتھ ہی وہاں سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس کا نام بھی اخباروں میں چھپتا رہتا تھا۔

"تو نہیں جانتا اسے ؟"

"میں اسے کیسے جان سکتا ہوں بابا ؟"

"تو اسے جانتا ہے بچے ! وہ تیرے ساتھ والی پھانسی کی کوٹھڑی میں بند تھا اور تیرے ساتھ ہی جیل سے بھاگا تھا۔"

"اچھا ! تو آپ اس ترمیوں کا ذکر کر رہے ہیں مگر آپ اسے کیسے جانتے ہیں ؟ اس ترمیوں خاکی کو ؟" مجھے معلوم تھا کہ وہ جیل میں ترمیوں خاکی کہلاتا تھا۔ پنجابی میں شعر کہتا تھا اور خاکی تخلص کرتا تھا۔ بہت اچھا آدمی تھا وہ۔"

"وہ میرا منہ بولا بیٹا بنا ہوا ہے۔ وہ جہلم کا رہنے والا ہے اور جیل سے بھاگ کر آیا ہے اسی جنگل میں رہ رہا ہے بلاور میں اس کا ایک بھائی رہتا ہے۔"

"اچھا ! آپ نے تو مجھے حیران کر دیا ہے باباجی، مگر یہ بتائیں آپ کو میرے نام کا علم کس طرح ہوا ؟ قدسیہ کی باتوں سے پتہ چلتا تھا کہ وہ میرے بارے میں بہت کچھ جانتی ہے۔"

"ہمیں ترمیوں نے ہی سب کچھ بتایا ہے۔ جب تو نے بلاور میں ہادی علی کو مارا تو اس وقت وہ وہیں تھا۔ پولیس جب تیرے پیچھے بھاگی تو وہ بلاور سے نکل کر سیدھا ادھر آ گیا۔ اس نے تیرے بارے میں ہمیں سب کچھ بتا دیا تھا۔ اسی لئے جب تو ادھر آیا تو میں نے تجھے پہچان لیا تھا۔ تیرے رخسار کے اس کالے نشان کا اس نے مجھ سے ذکر کر دیا تھا۔"

"تو یہ بات ہے میں سمجھا کہ آپ کو شاید غیب سے یہ ساری باتیں معلوم ہو جاتی ہیں ؟"

"ارے نہیں جیلانی بیٹے ! ابھی میں ان منزلوں سے بہت دور ہوں۔ ہاں، اللہ نے مجھ پر اپنی بڑی رحمتیں نازل کر رکھی ہیں۔ مجھے جڑی بوٹیوں کا علم دے دیا ہے میرے ہاتھ میں اس نے شفا بھر دی ہے۔"

"یہ کرامت تو میں دیکھ چکا ہوں۔ میرا زخم اچھا ہو چکا ہے مگر... باباجی ! آپ یہ بتائیں کہ آپ نے یہاں جنگل میں کیوں ڈیرہ ڈال رکھا ہے؟ اور اپنی بیٹی کو بھی ادھر ہی باندھ رکھا ہے آپ نے ؟"

"یہ بہت لمبی بات ہے بیٹے ! ہم تجھ سے بہت خوش ہیں کہ تو نے ہادی علی جیسے ذلیل آدمی کے وجود سے یہ علاقہ پاک کر دیا ہے۔ ایک خلقت نالاں تھی اس سے۔ کوئی اور ہوتا تو ہم اس کے سامنے اپنی زبان نہ کھولتے مگر تم ہمیں اچھے لگتے ہو۔ خاکی نے آج تمہارے بارے میں ہمیں بہت سی باتیں بتائی تھیں۔ ہم نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر تم ادھر آ نکلے تو ہم تمہارے لئے وہ سب کچھ کر گزریں گے جو ہم کر سکتے ہیں۔"

"یہ آپ کی بڑی مہربانی ہے باباجی ! ورنہ میں کس قابل ہوں ؟ آپ کے ہاتھ میں اللہ نے واقعی بڑی شفا رکھی ہے اور آپ کو دیکھ کر میرا دل پُرسکون ہو جاتا ہے۔ ورنہ تو خدا ہی جانتا ہے میں ذلت کی کن گہرائیوں میں گر چکا ہوں۔ اپنے آپ سے شرمندہ رہتا ہوں۔"

"ہاں ! آدمی کو ہمیشہ اپنے عمل پر نگاہ رکھنی چاہیئے مگر میں سمجھتا ہوں بیٹے کہ ہیرا اگر کیچڑ میں گر جائے تو بھی ہیرا ہی رہتا ہے۔ تیرے راستے تو ہم نہیں بدل سکتے مگر ہم اتنی امید ضرور رکھتے ہیں کہ تو کبھی کسی پر ظلم نہیں کرے گا۔"

"میں ظلم کرنے کی طاقت ہی نہیں رکھتا ہوں باباجی ! میں تو خود تباہ حال آدمی ہوں۔ میں اندر سے اتنا دکھی ہوں باباجی، کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔"

"تمہارے دکھ کا ہمیں اندازہ ہے جیلانی بیٹے ! خدا کرے تمہاری یہ مصیبتیں جلدی ختم ہو جائیں۔ ترمیوں نے تمہاری ساری کہانی ہمیں سنا دی تھی مگر ہمیں نہیں معلوم کہ ہادی علی کو تم نے کیوں مارا ہے ؟"

"بس مجھے طیش آ گیا تھا باباجی ! وہ اپنے مزارعوں پر ظلم کر رہا تھا۔ میرے سامنے اس نے دو آدمی مار دیئے تھے۔ اس پر میں چپ نہ رہ سکا مگر آپ نے بتایا نہیں باباجی کہ آپ نے دنیا سے منہ کیوں موڑ لیا ہے ؟"

"میں بہت بدنصیب آدمی ہوں جیلانی بیٹے۔ اور اب اس منزل کی تلاش میں ہوں جہاں پہنچ کر بندے اور خدا کے درمیان کوئی فاصلہ باقی نہیں رہتا۔ میں اس راستے پر عرفان کی منزلوں میں سے گزر کر نہیں چڑھا ہوں۔ میں نے بہت دکھ جھیلے ہیں۔ میں ادھر پنڈی بھٹیاں میں رہا کرتا تھا۔ سرکاری ہسپتال میں کمپاؤنڈر کا کام کرتا تھا میں۔ عمر میری تیس سال ہو چکی تھی مگر میری شکل و صورت تو جیسی ہے تم دیکھ ہی رہے ہو۔ رنگ بھی میرا توے ایسا سیاہ ہے۔ میں شادی کو ترستا تھا اور چاہتا تھا کہ اپنا گھر بساؤں مگر کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا — اور زندگی میری ویران ہوتی جاتی تھی۔ میں یتیم خانے میں پلا ہوا آدمی ہوں اور مجھے نہیں پتہ کہ میرے والدین کون تھے اور کیا کرتے تھے۔ بس جب میں نے یتیم خانے کے اسکول سے دسویں کر لی تو انہوں نے مجھے آزاد کر دیا۔ میں نے کمپاؤنڈری کا امتحان پاس کیا اور ہسپتال میں نوکری کر لی۔ پنڈی بھٹیاں میں جب میں آیا تو اس وقت مجھ نوکری کرتے ہوئے آٹھ سال ہو چکے تھے اس ہسپتال میں ان دنوں لیڈی ڈاکٹر کوئی نہیں تھی۔

ہسپتال میں ایک دن دس بجے کے قریب ایک ادھیڑ عمر کی عورت آئی۔ اس کے پیٹ میں شدید درد تھا۔ ڈاکٹر اس روز چھٹی پر تھا اور میں ہی اس کی کرسی پر بیٹھا مریضوں سے نپٹ رہا تھا — جب وہ عورت میرے کمرے میں آئی تو اس نے اپنا پیٹ دبا رکھا تھا وہ درد کی شدت سے نڈھال ہوئی جاتی تھی۔ میں نے اسے بیڈ پر لٹا کر اس کا حال معلوم کرنا چاہا تو وہ ہچکچائی — وہ عجیب سے خوف زدہ نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

"تمہیں کیا تکلیف ہے بی بی !" میں نے سٹیتھ سکوپ کانوں میں لگا لیا۔ میرے سوال پر وہ جھینپ گئی بولی۔ "مجھے کوئی زنانہ تکلیف ہے۔ کوئی لیڈی ڈاکٹر ہوتی تو اچھا تھا۔"

"وہ تو ادھر کوئی نہیں ہے مگر تمہیں دوا کی ضرورت ہوئی تو ہم دے دیں گے۔"

وہ گندمی رنگ کی چاق و چوبند صحت مند عورت تھی اور اس کی عمر بھی کوئی پینتیس چالیس سال کے لگ بھگ ہوگی مگر ابھی تک اس کے وجود میں چمک چمک باقی تھی۔ اس کا نام مہر جان تھا اور وہ چک عزیز نامی گاؤں سے آئی تھی۔

"دوا کی نہیں مجھے اندرونی علاج کی ضرورت ہے۔ کوئی ڈاکٹرنی نہیں ہے یہاں ؟"

"وہ تو یہاں کوئی نہیں ہے مگر تمہیں ہوا کیا ہے ؟ اچھی بھلی نظر آتی ہو۔ کیا تکلیف ہے تمہیں ؟"

"یہ تم دیدے پھاڑ پھاڑ مجھے کیا دیکھ رہے ہو۔"

"اوہ اب سمجھا ! مگر یہ مصیبت تم نے کیوں اپنے گلے میں ڈال لی ہے ؟"

وہ تمتما اٹھی، بولی —

"تم زیادہ باتیں نہ بناؤ — دوا دے سکتے ہو تو دے دو۔" میں نے محسوس کیا کہ وہ خاصی عشوہ طراز قسم کی عورت ہے۔ اپنے حربے استعمال کرنے کا فن خوب جانتی تھی۔ وہ لاچا باندھے ہوئے تھی۔ سلیٹی رنگ کا ریشمی لاچا۔ وہ اس علاقے کا مخصوص لباس ہے جس کی خوبی یہ ہے کہ وہ بدن کے بھید چھپاتا بھی ہے اور ظاہر بھی کرتا رہتا ہے۔ مجھے اس عورت میں عجیب سی دلکشی محسوس ہو رہی تھی.... اس کی گفتگو کا انداز ایسا تھا جو میرا حوصلہ بڑھاتا تھا اور میرا یہ حال تھا کہ میں عورت کے مس کا بھوکا تھا لیکن اس راہ پر میں کبھی ایک قدم آگے نہ بڑھ سکا تھا۔ اس کی وجہ وہ کمتری کا احساس تھا جو میرے دل و دماغ کو ہمہ وقت گرفت میں لئے رہتا تھا۔ مجھے اپنے اوپر اعتماد ہی نہیں تھا — پھر بھی میں نے ہمت کر کے اس سے کہا۔

"ٹھیک ہے مہر جان ہم تمہارا علاج کریں گے مگر تمہیں ہمارے کوارٹر میں رہنا ہوگا۔"

میرا تیر نشانے پر لگا۔ اس نے برا نہیں منایا۔ بولی: "کہاں ہے تمہارا کوارٹر ؟"

"ادھر قریب ہی ہے۔ تم ابھی چلو میں تمہیں وہاں لے چلتا ہوں... ادھر بیٹھ کر ہم تمہارا علاج نہیں کر سکتے۔ لوگ شک کریں گے۔"

مہر جان میری باتوں کا مطلب سمجھ گئی۔ تھوڑی سی رد و کد کے بعد وہ مان گئی۔ اسے میں نے اپنے کوارٹر میں چار دن رکھا۔ اس عرصے میں اس کی تکلیف بھی دور ہو گئی اور میری بھی۔

معلوم یہ ہوا کہ وہ بیوہ عورت ہے اور وہ سلسلہ اس نے یوں ہی شغل ہی شغل میں گاؤں کے کسی آدمی سے قائم کر لیا تھا جس کے نتیجے میں وہ اس مصیبت میں پھنس گئی۔ وہ مجھ سے اتنی خوش ہو گئی کہ میرے کوارٹر سے جانے کا نام ہی نہ لیتی تھی جب میں نے اسے سمجھایا کہ اگر وہ زیادہ دن وہاں رہی تو میری بدنامی کا موجب بن جائے گی تو وہ بولی۔

"دیکھ کالے خان ! میں چاہتی ہوں کہ تیری میری یہ دوستی قائم رہے پکی طرح چلتی رہے۔"

"مگر وہ کس طرح ! میں آج نہیں تو کل یہاں سے تبدیل ہو کر کسی اور شہر میں جا ٹھہروں گا۔"

"اچھا دیکھ ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں اپنی پارو کی شادی تجھ سے کر دوں ؟"

وہ مجھے بتا چکی تھی کہ اس کی ایک جوان سوتیلی لڑکی بھی ہے جس کی عمر پندرہ سال ہے۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ میرا گھر بھی بس جائے گا اور ہمارا یہ معاملہ بھی چلتا رہے گا۔"

"بڑا ڈھیٹ ہے تو کالے خان، تجھے شرم نہیں آئے گی۔"

"شرم کی ضرورت ہوئی تو وہ بھی کر لیں گے تم بات پکی کرو۔"

"تو ٹھیک ہے مجھے تمہارا رشتہ منظور ہے۔" اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا —

"تم سن رہے ہو نا جیلانی ؟"

"جی باباجی سن رہا ہوں۔"

"تو ہوا یہ جیلانی میاں ! کہ اس بدمعاش عورت نے ایک ماہ بعد اپنی سوتیلی بیٹی کی شادی مجھ سے کر دی۔ اور میں اس کی پارو کو بیاہ کر اپنے کوارٹر میں لے آیا۔ اسے میں نے دیکھا تو حیران رہ گیا۔ وہ لڑکی نہیں چاند کا ٹکڑا تھی جو کوئی بھی اسے دیکھتا بس دیکھتا ہی رہ جاتا۔ میری تو زندگی ہی بدل کر رہ گئی — اس کی ماں بھی بے حد حسین ہو گی۔

خدا کو شاید پارو سے میرے رشتے کی حرمت عزیز تھی.... مہر جان ہماری شادی کے ایک ہی مہینے بعد مر گئی — میں نے پنڈی بھٹیاں میں شادی کے بعد آٹھ سال بڑے اطمینان سے گزارے اس کے بعد میرا تبادلہ ہو گیا اور میں کنجاہ کے ہسپتال میں آ لگا۔ میری بدنصیبی کا آغاز اسی شہر سے ہوا۔ اس وقت مجھے کنجاہ میں کام کرتے ایک سال ہو چکا تھا۔ میری اس بچی کی عمر اس وقت آٹھ سال تھی... تین بچے اور بھی ہو چکے تھے جو اس وقت ڈیڑھ سال کا تھا اور وہ سب سے چھوٹا تھا۔ اس سے بڑا شاہد تھا اس کی عمر چار سال تھی اور

جواس قدسیہ سے چھوٹا تھا اس کی عمر چھ سال تھی۔ میں نے اس کا نام کاظم رکھا تھا۔

پارو کے ساتھ میری زندگی بڑے آرام سے گزر رہی تھی۔ ایک دن ایسا ہوا کہ میں ایک مریض کو ٹیکہ لگانے کے لئے دن کے دس بجے ہسپتال سے نکل کر ادھر اسکول کی عمارت کی پچھلی آبادی میں گیا تو میں نے ایک مکان کے سامنے ایک کار کو رکتے دیکھا۔ اس کا دروازہ کھلا تو میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ کار میں سے پارو نکل رہی تھی۔ ڈیڑھ سال کا بچہ اس نے کندھے سے لگا رکھا تھا۔ وہ کار میں سے نکل کر مکان کے اندر جا گھسی اس کے پیچھے پیچھے کار میں سے ایک لمبا تڑنگا خوبصورت جوان نکلا۔ اس نے کار کو چابی لگائی اور اپنی سیاہ اچکن کے بٹن بند کرتا ہوا اسی دروازے میں داخل ہو گیا جس میں سے گزر کر پارو پہلے اندر جا چکی تھی۔۔

میرے لئے یہ سب کچھ اتنا غیر متوقع اور اتنا حیرت انگیز تھا کہ میں سُن ہو کر رہ گیا۔ میرے وہم و گمان میں بھی کبھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ وہ پارو جس کی میں نے عبادت کی تھی، جسے زندگی کی سب سے بڑی خوشی سمجھا ہے وہ میری غیر حاضری میں گھر سے غائب ہو کر یوں بے راہ روی اختیار کئے ہوئے ہے۔ بلاشبہ وہ حسین تھی، بے حد حسین۔ اسے بناؤ سنگھار کا بھی سلیقہ آتا تھا۔ وہ طرح دار تھی، ایسی طرح دار کہ وہ بازاروں میں کبھی کسی ضرورت سے میرے ساتھ چلتی تھی تو بڑے بڑوں کو میں نے ٹھوکر کھاتے دیکھا تھا اس پریشانی سے بچنے کے لئے میں نے ہمیشہ یہی کوشش کی تھی کہ اس کی ضرورت کی ہر شے اسے گھر میں مہیا کر دوں تاکہ اس کو خود باہر نہ جانا پڑے۔ اگر میں کبھی اسے ساتھ لے کر بازار جاتا تھا تو اس بات کا خاص خیال رکھتا تھا کہ وہ برقعہ پہن کر باہر نکلے۔ جدید طرز کے برقعے پر وہ جان دیتی تھی مگر میں نے ہمیشہ اسے سادہ برقعے پہننے پہ مجبور کیا تھا۔ وہ میری کسی بات کو ٹالتی نہیں تھی، مان جاتی تھی مگر پھر بھی بازار میں چلتے چلتے وہ کبھی اگر نقاب اٹھا دیتی تھی تو وہاں کھلبلی سی مچ جاتی تھی۔ مجھے اس کی۔۔۔۔ اس بلاخیز خوبی کا احساس تو تھا مگر اپنی جگہ میں اس کے رویے سے بالکل مطمئن تھا مجھے ہمیشہ یہی یقین رہا کہ وہ پاکباز ہے عفت مآب ہے اور کبھی بھی شوہر سے دغا نہیں کرے گی مگر میرا یہی اطمینان مجھے لے ڈوبا اور اس دن میں نے اپنی آنکھوں سے اسے ایک خوبرو نوجوان کی کار سے اتر کر اس کے گھر میں داخل ہوتے دیکھ لیا۔

جیلانی میاں میرے دل و دماغ کی اس گھڑی جو کیفیت ہوئی اسے تم بخوبی سمجھ سکتے ہو۔ میں نے جوں توں کر کے اس مریض کو ٹیکہ لگایا اور ہسپتال واپس پہنچ کر پورے دن کی چھٹی لے کر میں کوارٹر میں جا بیٹھا۔ پارو گھر سے غائب تھی اور چھوٹے بچے اس قدسیہ کی تحویل میں تھے میں نے قدسیہ سے اس روز پہلی بار پوچھا۔

"تمہاری ماں کہاں ہے قدسیہ؟"

"وہ بازار گئی ہے ابو جی ہمارے لئے مٹھائی لینے۔"

"پہلے بھی وہ جاتی رہی ہے بازار؟"

"وہ ابو جی ہر بدھ کو جاتی ہے ہمارے لئے پھل اور مٹھائی بھی لاتی ہے۔۔۔"

"ہر بدھ کو؟ کس وقت؟"

"اسی وقت جاتی ہے اور دوپہر کو آتی ہے۔ ابو جی! ڈھیر سارے کھلونے بھی لائی تھی وہ پچھلے بدھ کو ہمارے لئے۔"

"اچھا! مجھے تو تم نے نہیں دکھائے؟"

"وہ ادھر صندوق میں رکھے ہیں ابو جی۔ دکھاؤں آپ کو؟"

یہ کہہ کر وہ صندوق میں سے ایک پلاسٹک کا تھیلا نکال لائی۔ اس تھیلے میں کئی قسم کے قیمتی کھلونے تھے اور ایک گڑیا بھی تھی جس کی قیمت اس وقت بھی پچیس روپے سے کم نہیں تھی۔ میں خود کئی بار سوچتا تھا کہ اپنی قدسیہ کے لئے میں وہ گڑیا لے لوں مگر جیب اجازت ہی نہیں دیتی تھی۔ وہ قیمتی کھلونے اور وہ گڑیا دیکھ کر میرا خون کھول اٹھا میں نے پاگلوں کی طرح وہ سب کچھ فرش پہ پٹخ کر اپنے بوٹوں تلے دبا کر کرچی کرچی کر دیا۔ وہ سب کچھ میرے لئے ناقابلِ برداشت تھا، جیلانی۔ بیوی کی بے وفائی کسی بھی آدمی کے لئے اس دنیا میں سب سے بڑی آزمائش بن جاتی ہے اور میرا یہ حال تھا کہ میرا جی چاہتا تھا میں اپنے گھر کو آگ لگا دوں جسے میں نے تنکا تنکا جمع کر کے تعمیر کیا تھا جس کے چراغوں میں میں نے اپنی زندگی کا سارا تیل جلا دیا تھا میرا کلیجہ کٹ رہا تھا، جیلانی۔ پارو کی بے وفائی نے مجھے پاگل کر دیا تھا۔ میں ایک ایک بچے کو اس روز جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر دیکھتا رہا، ان کے نقوش میں اپنے نقوش تلاش کرتا رہا۔ مجھے وہ سب کچھ ہی ناقابلِ یقین معلوم ہوتا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ ان میں سے ایک بھی بچہ میرا نہیں ہے میرے صلب سے ایک بھی نہیں ہے۔ سب کے سب پارو کے عاشقوں کا تحفہ ہیں۔ کبھی میں ان کی آنکھوں میں جھانکتا کبھی ان کے چہروں کے خطوط پر غور کرتا۔ ان کے بدن کی ساخت پر نگاہ کرتا۔ ان کے ناخنوں اور لبوں کی شکل پر نظر دوڑاتا اور وہ بچے حیرت زدہ سے ہو کر مجھے دیکھ رہے تھے سب کے سب ایسے تھے کہ ان کے چہروں میں مجھے پارو کے نقوش تو جھلکتے نظر آتے تھے مگر میں خود ان کے وجود میں کہیں بھی نہیں تھا۔

بالکل دیوانوں ایسی کیفیت طاری تھی مجھ پر۔ کوئی دو گھنٹے اسی طرح گزر گئے آہستہ آہستہ میری وہ دیوانگی کم ہونے لگی۔ میں نے سارے صورتِ حال پہ نئے سرے سے غور کیا۔ مجھے یہ معلوم کرنے کی ضرورت تھی کہ وہ خوبرو جوان کون ہے جس کو خدا نے اتنی حسین صورت دے رکھی ہے اور جسے اس نے دولت سے بھی نواز رکھا ہے۔ وہ کیسے کس طرح پارو کی زندگی میں داخل ہوا؟ کیونکہ اس نے میرے آشیانے کو اتنی کامیابی سے آگ دکھا دی ہے۔ یہ سب کچھ کیونکر ممکن ہو گیا۔

پارو کے انتظار میں میں گھر کے دروازے پہ جا بیٹھا۔ اندر

اس وقت آٹا گوندھ رہی تھی اس کا مطلب یہ تھا کہ ماں نے اسے گھر کے کام دھندوں میں لگا لیا تھا۔ اس چھوٹی سی عمر میں اس نے قدسیہ کو گرہستی کے جنجال میں پھنسا دیا تھا تاکہ اسے اپنی آوارگی کے لئے وقت مل سکے۔ میں بھی مطمئن رہوں اور بچے بھی۔ میں عموماً ہسپتال سے ایک بجے اپنے کوارٹر میں آ کر کھانا کھاتا تھا اور ہر روز مجھے پارو اپنے مقام پہ حاضر ملتی تھی۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ کھانا تیار نہ ہو ـــ وہ ایسا صاف ستھرا انتظام کر کے جاتی تھی کہ مجھے کبھی کسی قسم کی کمی کا احساس نہ ہوا تھا۔

گھر کی صفائی ستھرائی کا کام بھی وہ عورت اپنی اس معصوم سی بچی سے لیتی تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ قدسیہ وقت سے پہلے بالغ ہوئی جاتی تھی۔ اس کا دماغ اور بدن پختگی کی منزلیں طے کر رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ بچوں کو کس طرح بہلایا جاتا ہے۔ کھانا کس طرح کس وقت تیار ملنا چاہئے۔ اپنے سن و شعور سے کہیں بڑھ کر وہ کاوش کر رہی تھی۔ پارو نے میری قدسیہ بیٹی سے اس کا بچپن چھین لیا تھا۔ میں کوارٹر کے دروازے کے باہر کھڑا اندر ہی اندر پھنک رہا تھا۔

میرا ایک دل چاہتا تھا کہ وہ جیسے ہی آئے، میں دونوں ہاتھوں میں جکڑ کر اس کی گردن مروڑ دوں۔ اسے دوسرا سانس بھی نہ لینے دوں۔ مگر پھر میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ میں نے اس سارے سلسلے کو اس کے عاشق تک پھیلا دینے کا فیصلہ کیا۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ جس طرح بھی ممکن ہو سکا میں ان دونوں کو بدترین قسم کی سزا دوں گا۔ کیونکہ وہ عورت جس نے دس سال میرے بستر پہ گزار دیئے، جس کیلئے میں نے دن کو دن سمجھا نہ رات کو رات۔ جس کی خوشی کے لئے میں نے کڑی مشقتیں اٹھائی ہیں وہ اگر یوں میرے آنگن سے اٹھ کر دوسرے کی آغوش میں جا بیٹھی ہے تو اس کا اسے کوئی "انعام" تو ملنا ہی چاہئے۔

میرے ذہن میں اس گھڑی اس کی سوتیلی ماں کا تصور ابھر رہا تھا۔ وہ مہر جان جو زندگی کی اتنی ساری گھاٹیاں عبور کر لینے کے بعد بھی نہیں تھکی تھی وہ جب مجھے ملی تھی تو اس کے پیٹ میں بھی گناہ کا کیڑا پل رہا تھا جس سے جان چھڑانے کے لئے اس نے کوئی بہت ہی زود اثر قسم کی دوا کھائی تھی مگر اس کی گلو خلاصی نہ ہو سکی تھی۔ جب وہ بہت زیادہ نڈھال ہوئی تو ہسپتال آ گری۔ میں نے اس کا علاج تو کر دیا مگر وہ اپنے کھلے دل اور وسعت پذیر حساب کتاب میں مجھے بھی سموتی چلی گئی۔

میں نے زندگی کا یہ رخ کبھی نہیں دیکھا تھا اور اب جو مجھے اس کا سامنا کرنا پڑا تو میرا سارا وجود لرزنے لگا۔ اپنے دل میں میں بار بار استقامت پیدا کرتا تھا مگر سوچتا میں یہ تھا کہ کوئی دشمن ہو تو اس سے آدمی نمٹ سکتا ہے، میں اس عورت سے کیسے نبرد آزما ہو سکوں گا جو دس سال سے میرا اوڑھنا بچھونا بنی ہے، جو میرے چار بچوں کی ماں کہلاتی ہے۔ جس کے دم سے میرے دل کی بہاروں میں خوشبو قائم ہے وہ یوں اچانک اتنے بھیانک روپ میں جو میرے سامنے آئی ہے تو میں اسے کس طرح اس کے اتنے بلند مقام سے اتار کر نیچے پھینک دوں۔ اس سے مجھے محبت تھی بے پناہ محبت۔ اس کے سوا میں نے کبھی کسی کو کچھ سمجھا ہی نہیں تھا مگر میری بدنصیبی دیکھو کہ اس نے دوسروں کے مقابلے میں مجھے کبھی کچھ۔۔۔ اہمیت ہی نہ دی تھی اور اس کا یہ رخ اتنا مکروہ تھا کہ میرے دل و دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔

بارہ بج گئے تو میں کوارٹر سے نکل کر باہر بڑی سڑک پہ جا کھڑا ہوا۔ میرا خیال تھا کہ شاید وہ آدمی اسے کار میں بٹھا کر لائے اور سڑک پہ ہی اتار کر واپس چلا جائے۔ اس لئے اس کو ایک بار اور دیکھ لینا ضروری تھا۔ ساڑھے بارہ بج چکے تھے مگر ابھی تک پارو کا کہیں نام و نشان نظر نہیں آتا تھا۔ گھڑی کی سوئیاں آگے سرک گئیں۔ میں ایک بجے تک سڑک پر کھڑا رہا مگر وہ مجھے کہیں نظر نہیں آئی۔ مایوس ہو کر میں کوارٹر کی طرف چل دیا۔ جب میں دروازے میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ پارو کوارٹر کے برآمدے میں لگے چولھے کے پاس پیڑھی پہ بیٹھی روٹیاں پکا رہی ہے۔ اس نے مجھے دیکھا تو مسکرائی۔ اس کی اس مسکراہٹ کو میں نے ہمیشہ خوش آمدید سمجھا۔ اس کی نگاہوں میں چمکتے چاند کو میں نے ہمیشہ اپنے لئے خوش بختی اور اس کے بے پایاں خلوص اور محبت کا نشان سمجھا مگر اس روز اس کی مسکراہٹ میں مجھے طنز نظر آ رہا تھا۔ جیسے کہہ رہی ہو۔ تم کہاں تھے بھوندو میاں؟ تم کیا شے ہو؟ کس برتے پہ میرے شوہر بنے ہو؟ میں تو بڑے بڑے لوگوں کو جیب میں ڈالے پھرتی ہوں تم کیا ہو ـــ میرے چہرے پر پھیلی سنجیدگی دیکھ کر وہ بھی سنجیدہ ہو گئی بولی۔

"یہ آپ نے بچوں کے کھلونے کیوں توڑ دیئے۔ میں ذرا دیر کے لئے بازار چلی گئی تو آپ کا پارہ ہی چڑھ گیا۔"

"تم بازار میں بیٹھ جاؤ تو زیادہ بہتر ہے پارو بیگم! بازار جانے سے تمہاری تسلی نہیں ہو گی۔" اس نے روٹی تھڑاپ سے توے پر ڈالی اور آٹے کی مروڑیاں ہاتھ پر سے اتارتے ہوئے بولی۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا تمہاری؟ کس بات پر اتنا ناراض ہو رہے ہو؟"

"مجھے ناراض ہونے کی کیا ضرورت ہے ماہ پارہ بیگم! مجھے تو خوشی ہے۔" اس کا اصل نام ماہ پارہ تھا۔

"کیا خوشی ہے تمہیں؟ ماتھے پر تو ٹھیکرے لوٹے پڑے ہیں تمہارے۔ خوش ایسے ہوتے ہیں؟"

"ہاں میں خوش ہوں پارو۔ دیکھو نا ہمارا کتنا اچھا گھر ہے، کتنے پیارے پیارے خوبصورت بچے ہیں۔ ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے جو میرا بچہ نظر آتا ہو۔ ورنہ وہ بدصورت ہوتا، کالا کلوٹا ہوتا۔"

"کیا کہتے ہو تم؟ یہ سمجھاؤ تم نہ سمجھاؤ۔ تمہارے بچے کیوں نظر نہیں آتے؟ کیا یہ ہمسایوں کے بچے ہیں؟"

"کیا پتہ کون کس کا بچہ ہے۔ مجھے تو اپنی ولدیت پر بھی شبہ ہے۔ ان واقعات کا علم تو ماؤں کو ہی ہوتا ہے نا... باپ بیچارے تو...... سمجھتی ہو نا؟" یہ کہہ کر میں اس کے پاس ہی پیڑھی پر بیٹھ گیا۔
اس نے بگھاری ہوئی دال کٹورے میں ڈالی تو میری طبیعت الٹنے لگی۔ بیچاری قدسیہ سے بھلا اس عمر میں ہانڈی کہاں پک سکتی تھی۔

"تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں قدسی کے ابا! میں ذرا دیر کے لئے اُدھر اپنی ایک سہیلی کے ہاں گئی تھی۔ اب اتنا تو شور نہ مچاؤ۔"

"میں نے کون سا شور مچایا ہے؟ میں تو......"

"کیا میں تو...... تمہیں تو آج یہ بچے بھی اپنے معلوم نہیں ہوتے کیا ہو گیا ہے تمہیں؟"

"میرا خیال ہے اب مجھے بھی ایک کار خرید لینی چاہیئے۔"

"کار اور تم! کہیں بھنگ تو نہیں پی لی ہے تم نے؟ کار والے اور ہوتے ہیں۔ ہم ایسوں کی ایسی قسمت کہاں؟"

"کیوں نہیں! تمہاری قسمت میں تو ضرور کار ہوگی۔ سواری کی ہے تم نے کبھی کار پر؟"

"خاک سواری کی ہے۔ اپنی کار کا تو اور ہی لطف ہوتا ہے۔ وہ میری سہیلی ہے نا اس کے میاں کے پاس کار ہے۔"

"کیا نام ہے تمہاری سہیلی کے میاں کا؟"

"اس کا نام ہادی علی ہے، چوہدری ہادی علی۔ اکبر کوٹ کے زمیندار ہیں وہ!"

بابا رُکھ شاہ کے منہ سے ہادی علی کا ذکر اس رُخ سے سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

"یہ وہی ہادی علی تو نہیں بابا جی جسے میں نے قتل کر دیا ہے؟"

"ہاں ہاں یہ وہی تھا۔ جیلانی میاں وہ واقعی وہی شیطان تھا۔ اس وقت وہ جوان تھا اور کھُل کھیلتا تھا۔ میری تباہیوں کا وہی ذمہ دار تھا۔ اسی لئے تو میں تمہیں اپنی یہ سرگزشت سنا رہا ہوں ورنہ میں اپنے ان ذلت بھرے زخموں کو کبھی تمہارے سامنے نہ کھولتا۔" بابا جی نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ جنگل کی رات سائیں سائیں کر رہی تھی۔ میں نے کچھ اور لکڑیاں الاؤ میں جھونک دیں اور سگریٹ سلگا کر بابا کو بھی دیا اور خود بھی پینے لگا۔ میرے کلیجے میں دھائیں دھائیں ہونے لگی تھی۔ مجھے زندگی نے ایک ایسے آدمی سے ٹکرا دیا تھا جس کی موت نے اس علاقے کے بے شمار لوگوں کے دلوں میں خوشیاں بھر دی تھیں۔ وہ زمین کا بوجھ تھا وہ ہادی علی۔ اور جب اس کی پشت سے اتر کر وہ اس کے پیٹ میں دھنسا تو ہر طرف خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ بلاور کے لوگ تو اس روز خوش تھے ہی مگر جو خوشی، جو طمانیت میں نے اس روز بابا رُکھ شاہ کے چہرے پر دیکھی۔ اس نے مجھے یہ اطمینان دلا دیا کہ میں نے

اگرچہ وہ کام آہو صاحب کے کہنے پر ہی کیا تھا مگر آدمی اس نے ایسا ہی منتخب کیا اور ایسے ہی خباثت بھرے وجود پر اس نے موت کا حکم صادر کیا جس کی زندگی لعنتوں کا طوق بن گئی تھی۔ اس کے اپنے لئے بھی اور اس کے گرد و پیش میں رہنے والے دوسرے لوگوں کے لئے بھی مجھے اس وقت آہو صاحب بہت ہی اچھے نظر آ رہے تھے اور میں سمجھتا تھا کہ انہوں نے مجھے جو کام سونپا تھا اس کے لئے ان کے پاس بڑا ٹھوس جواز موجود تھا۔
بابا جی نے ایک بار پھر آگ کو کرید۔ میں اوس میں بھیگا جا رہا تھا بولے ـــــ

"ادھر چارپائی پر بیٹھ جاؤ۔ چھپر اوس سے بچاتا ہے۔" میں ان کی پائنتی جا بیٹھا تو وہ بولے۔

"جیلانی میاں! میری بیوی نے جب ہادی علی کا نام لیا تو میرے تن بدن میں اور زیادہ آگ بھڑک اٹھی کیونکہ وہ ہسپتال کے نئے انچارج ڈاکٹر کا گہرا دوست تھا اور ان سے ملنے کے لئے اکثر وہ ان کی کوٹھی آتا جاتا رہتا تھا۔ میں نے اس کا نام تو سن رکھا تھا مگر صورت میں نے اس روز پہلی بار دیکھی تھی ـــــ

میری بیوی میرے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھ رہی تھی بولی۔
"یہ آج تمہاری رنگت کیوں بدلتی ہے بار بار! کیا سوچ رہے ہو؟"

"اب میری سوچ پر بھی پہرہ لگاؤ گی؟"

"یہ بات نہیں ہے قدسی کے ابا! مگر تم مجھ سے کچھ چھپا بھی رہے ہو۔"

"تم مجھ سے چھپ چھپا کر نہ جانے کیا کچھ کر آتی ہو۔ میں کچھ نہیں کہا کہہ ہی نہیں سکتا۔ میرے پاس بھلا چھپانے کے لئے کیا رکھا ہے...... اپنی بدنصیبی؟"

وہ سٹپٹا سی گئی۔ روٹیاں میرے آگے رکھتی ہوئی بولی۔
"پتہ نہیں کیا کہہ رہے ہو تم! تمہارے دماغ ہی نہیں پائے جاتے۔"
میں نے کھانا وہیں چھوڑ دیا اور اسے گہری گہری نظروں سے دیکھتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا۔

میرے وجود پر گالی تو چڑھ ہی چکی تھی۔ پارو نے میری عزت بیچ ڈالی تھی۔ اس روز پہلی بار مجھے محسوس ہوا کہ میری بدصورتی ہمیشہ اس کے لئے ایک لعنت کا طوق بنی رہی ہے۔ اسے مجھ سے کبھی بھی محبت نہ تھی۔ اپنی طویل ازدواجی زندگی کے مختلف مراحل میری نظر میں تھے۔ میں نے اسے بارہا اپنی سوتیلی ماں کو کوستے سنا تھا۔ جب بھی میری اس سے کسی بات پر چخ چخ ہوئی میں نے اسے اپنی مری ہوئی ماں کو بے تحاشا گالیاں دیتے سنا۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس سے میری ماں کا تعلق کیا تھا مگر اب میں اسے کسی ڈرامائی لمحے پر یہ بتا دینے کا تہیہ کئے ہوئے تھا کہ اس کی ماں بھی بدچلن تھی اور بیٹی اسی کی راہ پہ چل رہی ہے۔ میں اسے یہ بات بتا کر ذہنی طور پر مفلوج کر دینا چاہتا تھا مگر سب

پہلی بات تو یہ تھی کہ اس جگہ کے بارے میں تو معلومات حاصل کروں جہاں ان کی ملاقاتیں ہوتی رہتی ہیں۔
ہسپتال سے نکل کر میں اس مقام تک جا پہنچا جہاں میں نے صبح ہادی علی کی کار دیکھی تھی۔ وہ مکان اس وقت مقفل تھا۔ یہ بڑا سا تالا اس کے دروازے پر لٹک رہا تھا جیسے میرا منہ چڑا رہا ہو وہ خاصا صاف ستھرا مکان تھا۔ میں نے گلی میں گھوم پھر کر اِدھر اُدھر سے جو کچھ معلوم کیا اس سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وہ مکان ہادی علی نے کرائے پر لے رکھا ہے اور کبھی کبھار جب وہ شہر آتا ہے تو اس میں قیام کرتا ہے۔ اس کی صفائی ستھرائی کے لئے اس کا ملازم ہفتے دس دن بعد وہاں آیا کرتا ہے اور رات وہاں گزار کر واپس چلا جاتا ہے۔ میں نے اِردگرد کی ساری صورتِ حال پر نظر ڈالی تو مجھے محسوس ہوا کہ مکان کا جنوبی حصہ ایک چھوٹی گلی میں کھُلتا تھا اور وہاں دیوار ایسی ہے کہ اس پر چڑھ کر آدمی آسانی سے اندر کود سکتا ہے۔
ان امکانات پر میں اس لئے غور کر رہا تھا کہ میرا ارادہ ان دونوں کو ایسی حالت میں پکڑنے کا تھا جس میں پھنس کر پارو کسی طرح بھی اپنے اس گناہ سے انکار نہ کر سکے۔ تمام صورتِ حال کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد میں گھر جا پہنچا۔

میری زندگی کی وہ پہلی رات تھی جس میں میں نے اپنا بستر پارو سے الگ کر کے دوسرے کمرے میں سونے کا فیصلہ کیا وہ بڑی حیران ہوئی ششدر رہ گئی۔ "ایسی کیا مصیبت آ پڑی ہے آج! اُدھر کیا رکھا ہے تمہارا؟"
"اُدھر تو کچھ بھی نہیں ہے پارو مگر اِدھر بھی میرا کچھ نہیں رہا۔ کیا رکھا ہے یہاں میرا؟" میں نے بڑے تلخ لہجے میں کہا۔
میرا جواب درست تھا نا جیلانی! میں اور کیا کہہ سکتا تھا؟ جس طرح آج میں نے قدسیہ کو اندھی کر دیا ہے۔ کاش اس لونڈے سے میں اس دور میں بھی واقف ہوتا۔ آج میں سوچتا ہوں تو مجھے اپنے آپ پر سخت غصہ آتا ہے۔ قدسیہ کی حرکتوں نے میرا زخم ہرا کر دیا ہے اسی لئے میں نے اس کی آنکھوں میں وہ سلائی پھیری ہے۔ وہ میری بیٹی ہے۔ مجھے اس سے اپنی جان سے بھی زیادہ محبت ہے مگر میں اسے پارو کے نقشِ قدم پر چلتے نہیں دیکھ سکتا۔

میرے دل میں تمہاری بہت عزت ہے غلام جیلانی! تم نے اپنی عزت تو بچائی ہی ہے مگر مجھے بھی تم نے آج برباد ہونے سے بچا لیا ہے ورنہ وہ جس انداز سے تمہارے پیچھے لگی تھی، کوئی ولی اللہ بھی ہوتا تو بہک جاتا۔ وہ بڑی سزا کی مستحق ہے جیلانی! میں تمہارا احسان مند ہوں۔"
"نہیں بابا جی یہ میرا فرض تھا آپ نے مجھے کڑے وقت میں پناہ دی، مجھ پر شفقت فرمائی۔ میں بھلا آپ کا یہ احسان کیسے بھول سکتا تھا۔"
"تم اچھے آدمی ہو۔ تمہارے کردار کی میں جتنی بھی تعریف کروں کم ہے بیٹے! مگر میری بدنصیبی دیکھو میں اپنی ہی بیوی کے ہاتھوں مارا گیا۔"

میں اس رات الگ کمرے میں سویا تو پارو بلبلا کر رہ گئی۔ وہ سوچتی رہی کہ یہ تبدیلی میرے رویئے میں کیسے آ گئی مگر اپنے جرم سے تو وہ آگاہ تھی۔ اس کی چھٹی حس نے اسے خبردار کر دیا تھا لیکن جس آگ میں وہ کود چکی تھی اور جس جذبے نے اسے مغلوب کر لیا تھا وہ ایسا نہیں تھا کہ آدمی کو رکاوٹوں کے سامنے بے بس کر دے۔ وہ ایسا منہ زور جذبہ ہے کہ جس دل میں بھی سر اٹھاتا ہے اسے ہر خطرے سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ یہی حال پارو کا تھا۔ وہ صبح اٹھی تو سیدھی میرے کمرے میں چلی آئی اور میرے لحاف میں گھس کر بولی۔
"میں ساری رات نہیں سو سکی۔ یہ کوئی شرافت ہے تمہاری؟"
"میں کیا اور میری شرافت کیا ماہ پارہ بیگم! تم واقعی ماہ پارہ ہو، چاند کا ٹکڑا بنی ہوئی ہو، میرے جیسے بدصورت کے لئے کیوں پریشان ہوتی ہو؟"
"اچھا تو یہ احساس کب سے ہو گیا آپ کو میرے حضور میرے لئے تو کالے خان ہی سب کچھ ہے۔ دیکھو اب مَن جاؤ ورنہ میں بولوں گی نہیں۔"
"تنگ نہ کر پارو۔ جا اپنا کام کر میں بہت پیچھے رہ گیا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے بستر چھوڑ دیا اور کمبل اوڑھ کر صحن میں نکل گیا۔
ناشتہ تو پارو نے مجھے ٹھیک وقت پر دے دیا مگر وہ بڑی بجھی ہوئی نظر آ رہی تھی جیسے کسی گہری سوچ میں گم ہو۔ ٹھیک آٹھ بجے میں ڈیوٹی پر جانے کے لئے گھر سے نکل آیا۔ میری جیب میں اس وقت ایک تیز دھار چاقو تھا اور میں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ ان دونوں کو میں ان کے عیش کے لمحوں میں جہنم رسید کروں گا۔
ہسپتال سے میں نے چار دن کی چھٹی لے لی۔ ڈاکٹر میرا بہت لحاظ کرتا تھا۔ اس نے بلا چون و چرا میری درخواست منظور کر لی۔ مجھے معلوم تھا کہ ڈاکٹر کے پاس پستول ہے مگر وہ اسے ہمیشہ اپنی دراز میں مقفل رکھتا تھا اس نے پستول کے لئے باقاعدہ لائسنس لے رکھا تھا۔ جب میں ڈاکٹر کے کمرے سے چلنے لگا تو وہ بولا۔
"خان صاحب ذرا دواؤں کے رجسٹر کا یہ صفحہ دیکھیں اور خالی خانے پُر کر دیں، یہیں بیٹھ جائیں۔ میں ابھی آتا ہوں ایک مریض کو دیکھ لوں... اسے گردن توڑ بخار ہے۔"
یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔ میرے لئے وہ لمحہ بہت ہی غنیمت تھا جونہی ڈاکٹر باہر نکلا میں نے اس کے سوٹ کے کوٹ کی جیب سے چابیوں کا گچھا نکالا اور اس کی دراز کو چابی لگا کر میں نے ڈاکٹر کا پستول نکال لیا۔ میرا دل اس گھڑی بلیوں اچھل رہا تھا، خوف نے روئیں روئیں سے پسینہ نکال دیا تھا میں نے پستول کے ساتھ رکھی پیٹی میں سے چار گولیاں بھی نکال لیں اور دراز کو بند کر کے چابیاں کوٹ کی جیب میں رکھ دیں۔
ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق میں نے رجسٹر کی خانہ پُری کی اور کوئی

بیس منٹ بعد میں وہاں سے نکل کر باہر بڑی سڑک پر جا ٹھہرا۔ مجھے یقین تھا کہ پارو اس روز بھی ہادی علی سے ملنے جائے گی وہ رُک ہی نہیں سکتی تھی کیونکہ ایک خوبرو اور دولت مند آدمی اس کے ہاتھ لگ گیا تھا یہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو تھی۔ اس کا اظہار میں اس کے منہ سے بار بار سُن چکا تھا جو اس نے اپنی کئی جگری سہیلیوں سے کیا تھا۔ جو مجھ سے بدمزگی کے لمحوں میں وہ صاف کہہ دیتی تھی، کہ اس کی تو قسمت پھُوٹ گئی کہ اسے میری شکل صورت کے آدمی کے پلّے باندھ دیا گیا۔ وہ میرے کردار کی کوئی قدر نہ کرتی تھی —— اس کی ماں مہرجان کے سوا میری زندگی میں اس سے پہلے یا اس کے بعد کوئی عورت نہیں آئی تھی اور وہ مہرجان خود پکے ہوئے پھل کی طرح میری گود میں آ گری تھی ورنہ میں تو شاید وہاں بھی عادتاً چپ ہی رہ جاتا لیکن اب جس عذاب میں مجھے پارو نے ڈال دیا تھا وہ ایسا تھا کہ میں اپنی تمام تر شرافت کو الگ رکھ کر ان دونوں سے بدترین سلوک کرنے پر مجبور تھا کہ اگر میں چپ رہ جاتا یا میں اس سے سمجھوتہ کر کے آنکھیں موند لیتا محض اس لئے کہ پارو میری زندگی میں موجود رہے تو وہ گویا ایک پھوڑے کو وجود میں پھیلنے کی اجازت دینے کے مترادف تھا۔ میں جانتا تھا کہ میں جو کچھ کرنے جا رہا ہوں اس سے میرا گھر بھی تباہ ہو جائے گا، میرے بچوں کا مستقبل برباد ہو جائے گا میرے پاس کچھ بھی باقی نہیں رہے گا مگر مجھے اس کے سوا اور کچھ سوجھتا ہی نہیں تھا۔ میں اس طرح زندگی نہیں گزار سکتا تھا۔

میرے تمام اندازے صحیح نکلے۔ پارو گھر سے بن سنور کر ٹھیک ساڑھے دس بجے نکلی اور اونچی ایڑی کی خوبصورت جوتی پر ٹھمک ٹھمک چلتی وہ ہسپتال کے چھوٹے دروازے میں سے نکل کر ہائی اسکول کی طرف جانے والی سڑک پر جا چڑھی۔ وہ اس روز چھوٹے بچے پپّو... کو گھر چھوڑ گئی تھی۔ عیش میں خلل ڈالتا ہو گا نا وہ —— میرا خون کھول رہا تھا اپنے بچوں کی اس ماں کو دیکھ کر۔

میں اس سے خاصی دُور ایک درخت کی اوٹ میں کھڑا تھا۔ اس نے اس روز بھی جدید طرز کا فاختئی رنگ کا بُرقعہ پہن رکھا تھا اس کی چال میں ایسی لہردار تیزی تھی کہ میں سمجھا وہ ابھی ناچنے لگے گی جب وہ بہت خوش ہوتی تھی تو اس طرح ٹھمکا مار کر چلتی تھی کہ میں بے خود ہو کر جھوم جاتا تھا مگر اس روز اس کی چال میں بھری مستی نے مجھے یہی... احساس دلایا کہ وہ اوّل درجے کی بدمعاش عورت ہے اور دیکھنے والے کو خواہ مخواہ اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے لہراتی ہے۔

میں نے سڑک چھوڑی اور گلیوں گلیوں چلتا ہوا ایک درمیانی راستے سے ہادی علی کے مکان کی جنوبی گلی میں جا پہنچا۔ اس مکان کا چھوٹا دروازہ اسی گلی میں کھلتا تھا مگر وہ اندر سے بند تھا۔ گلی میں اس گھڑی چاروں طرف سناٹا تھا مکانوں کے دروازے چونکہ مشرقی سمت میں کھُلتے تھے اس لئے ادھر آمد و رفت بہت کم رہتی تھی۔ ابھی میں اندر جانے کے امکانات کا جائزہ ہی لے رہا تھا کہ مجھے ہادی علی کے مکان کے بڑے دروازے کے سامنے کسی کار کے رکنے کی آواز سنائی دی۔

میں سمجھ گیا کہ شکاری اپنے شکار کو اٹھا کر اپنے اڈے پر آ پہنچا ہے میرے دل و جگر کا لاوا ایک دم ابلنے لگا مگر میں نے ضبط سے کام لیا اس لئے جبکہ وہ لوگ اندر داخل ہو رہے تھے میرا ہادی علی کے صحن میں کودنا کسی طرح بھی مناسب نہیں تھا۔

تم سن رہے ہو نا جیلانی! یہ میری بدنصیبی کی تصویر ہے جو میں نے آج تک کسی کو نہیں سنائی۔"

"میں سن رہا ہوں باباجی! میں سوچ رہا ہوں کہ اس ہادی علی کو مار کر میں نے اسے سستا چھوڑ دیا۔ ورنہ وہ تو ایسا تھا کہ اس پہ تو کتے چھوڑنے چاہئے تھے۔"

"ہاں جیلانی تم ٹھیک کہتے ہو مگر جو کچھ بھی ہوا ہے، ٹھیک ہی ہوا ہے یہ نیکی تجھے ہی ملنی تھی نا — ایک سگریٹ دو مجھے۔"

میں نے ایک سگریٹ خود لیا اور دوسرا اسے سلگا کر دیا۔

"جب وہ دونوں مکان کے اندر داخل ہو گئے تو میں نے حساب لگایا کہ اب وہ کمرے میں بند ہو چکے ہیں تو میں دیوار پر چھپکلی کی طرح چڑھا اور بڑی آہستگی سے دوسری طرف اتر گیا۔ صحن خاصا بڑا تھا میں نے دیکھا کہ عمارت کے اندر صحن کی طرف ایک کھلا برآمدہ ہے۔ میں دیوار کے ساتھ چلتا ہوا اس برآمدے میں جا پہنچا۔ ہر طرف سناٹا طاری تھا۔ ان کی آواز مجھے بالکل سنائی نہیں دے رہی تھی اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ کس کمرے میں ہیں؟

برآمدے میں دبے پاؤں چلتا ہوا میں آگے بڑھا تو مجھے ایک راہداری نظر آئی۔ میں دیوار کے ساتھ لگ کر چلنے لگا۔ وہ راہداری دائیں ہاتھ بھی مڑتی تھی اور بائیں ہاتھ بھی۔ ادھر بھی تین کمرے تھے اور ادھر بھی اتنے ہی تھے اچانک مجھے دائیں ہاتھ کے آخری کمرے سے پارو کے ہنسنے کی آواز سنائی دی۔ میں اس وقت ربڑ سول کے جوتے پہنے ہوئے تھا۔ میرے قدموں کی آواز پیدا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

وہ لوگ کمرے میں بند ہو چکے تھے۔ میں ذرا آگے بڑھا تو مجھے پارو کی آواز سنائی دی۔

"جناب بڑے گھُنّے بدمعاش ہیں آپ! کالے خان تو بیچارہ روتا ہی رہ جائے گا۔"

"تے یار تینوں لے جان گے۔" ہادی علی نے گرہ لگائی۔

"لے جان گے سے کیا مطلب، لے گئے ہیں۔" پارو نے کہا۔ اس کی آواز میں ایسی انبساط اور ایسی مستی تھی کہ میں دنگ رہ گیا۔

"اسے پتہ چل گیا تو وہ تیری ناک کاٹ ڈالے گا۔"

"اس کا دماغ کل سے کچھ خراب ہو رہا ہے۔ اسے کچھ شک ہو گیا ہے ورنہ وہ ایسا تو کبھی نہ تھا۔"

"کیا کہہ رہا تھا وہ؟" ہادی علی نے دوبارہ پوچھا۔

"دفع کریں اس کے ذکر کو۔ خواہ مخواہ بدمزہ ہونے کا فائدہ۔ وہ تو جانور ہے جانور۔"

"اور ہم ——؟"

"آپ تو شہزادے ہیں جناب! آپ کے لئے تو میں ساری دنیا چھوڑ سکتی ہوں۔"

"اپنے بچّوں کو بھی اور شوہر کو بھی؟"

"کیوں نہیں۔ ان کی کیا حیثیت ہے آپ کے سامنے۔ آپ پر تو سارا شہر قربان کر سکتی ہوں۔"

میں نے اپنے سامنے کے کمرے کے دروازے پر ہاتھ ڈالا تو وہ کھُل گیا مگر اس سے جو آواز پیدا ہوئی وہ مجھے بے بس کر گئی۔ میں تیزی سے کمرے میں جا گھُسا۔ وہاں میری آنکھیں اندھیرے سے ابھی مانوس نہیں ہوئی تھیں۔ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ وہ دونوں ساتھ کے کمرے میں بند ہیں اور میں اس میں داخل ہونے کا دروازہ ابھی تلاش کر ہی رہا تھا کہ اچانک وہ دروازہ کسی نے باہر سے بند کر کے کُنڈی چڑھا دی۔۔ جس میں سے میں اندر داخل ہوا تھا —— وہ بڑی خوفناک بات تھی میں پھنس کر رہ گیا تھا۔

"معلوم ہوتا ہے کوئی آدمی ہے اندر۔" راہداری میں ہادی علی کی آواز سنائی دی۔ دراصل وہ کمرے کا دروازہ کھلنے سے جو آواز پیدا ہوئی تھی اسے چوکنا کر گئی۔ وہ فوراً ہی راہداری میں نکلا اور اپنی بے پناہ حاضر دماغی سے کام لے کر اس نے دروازے پر باہر سے کُنڈی چڑھا کر مجھے اندر بند کر دیا تھا۔

"پتہ تو کریں کون ہے وہ۔" یہ پارو کی آواز تھی۔ وہ سخت دہشت زدہ تھی۔

"ابھی دیکھتا ہوں۔" ہادی علی نے یہ الفاظ دبی زبان میں کہے۔ اب میں کمرے میں ہر شے دیکھ سکتا تھا۔ ساتھ کے کمرے میں کھلنے والا دروازہ اب مجھے نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس کے ہینڈل کو کھینچا تو معلوم ہوا وہ دوسری طرف سے بند ہے۔ میں نے پستول سیدھے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ میرا منصوبہ ناکام ہوا جاتا تھا۔

ایک بار پھر مجھے راہداری میں قدموں کی چاپ سنائی دی...... ہادی علی لوٹ پہن کر باہر نکلا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر کھڑکی پر پڑا پردہ ذرا سا ہٹایا تو مجھے ہادی علی بائیں ہاتھ کھڑا نظر آیا۔ وہ کمرے کے دروازے کو گھور رہا تھا۔ پارو بھی اس کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ پردے کی جھری کو بنا کر میں کھڑکی کے شیشے میں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ پارو کا رنگ اڑ رہا تھا اور وہ برقعے کے بٹن تیزی سے بند کر رہی تھی۔

"ادھر کھڑکی میں سے دیکھیں تو سہی کہ اندر کون ہے؟ یہ آپ کا گھر ہے آپ کو کس کا ڈر ہے؟"

ہادی علی کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ اس نے اس روز ولائتی سُوٹ پہن رکھا تھا۔ ہاتھ وہ جیبوں میں ڈالے ہوئے تھا۔ پارو کے کہنے پر وہ بڑی احتیاط سے کھڑکی کی طرف بڑھا مگر جونہی وہ میرے سامنے آیا میرے دماغ میں سنسنی پھیل گئی۔ میں نے غصّے سے پاگل ہو کر شیشے میں سے شست باندھ کر اس پر گولی چلا دی۔ شیشہ تڑاخ سے ٹوٹا اور گولی اس کی ران میں جا لگی۔ وہ بلبلا کر پیچھے ہٹا تو میں نے ایک اور گولی چلا دی مگر وہ سیدھی دیوار میں جا لگی۔ پارو اُسے کھینچ کر پرے لے گئی تھی۔ ہادی علی نے کراہتے ہوئے کہا۔

"تم چلی جاؤ پارو! میں نے دیکھ لیا ہے وہ کون ہے، تم فوراً چلی جاؤ۔ میں اس سے خود نپٹ لوں گا۔"

"مگر آپ زخمی ہیں —— کون آدمی ہے وہ؟"

"یہ سوال مت پوچھو، میری بھی خیر ہے۔ میں سب دیکھ لوں گا تم بس فوراً نکل جاؤ ورنہ بدنامی ہو گی، جاؤ!" وہ بڑے غصّے سے بولا۔

"اچھا ٹھیک ہے میں بلال کو بتا دیتی ہوں۔"

"ہاں اسے فوراً بھیج دو اور دیکھو سیدھی گھر چلی جانا۔" ہادی علی نے کہا۔ پھر مجھے پارو کے قدموں کی آواز دُور ہوتی سنائی دی۔ وہ صحن میں سے گزر کر مکان کے چھوٹے دروازے کی راہ سے نکل گئی تھی۔

اس کے جانے کے چند ہی لمحے بعد ہادی علی دیوار کے سہارے گھسٹتا ہوا میرے کمرے کے دروازے کے قریب آیا اور میرے پستول کی زد سے پوری طرح محفوظ رہ کر بولا۔

"اچھا تو یہ تُو ہے کالے خان! بیوی کے پیچھے آیا تھا؟"

"میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا ہادی علی! آج نہیں تو کل میں تیرا خون ضرور پیوں گا بدمعاش! یہ سودا تجھے بہت مہنگا پڑے گا۔"

"قیمت تو میں نے دے دی تھی کالے خان! اب تک میں اسے

پانچ ہزار روپے دے چکا ہوں بچے! اور یہ زخم تُو نے مفت میں لگا دیا ہے ــــ مگر اب تُو گھر نہیں جا سکے گا۔" یہ کہہ کر وہ پیچھے ہٹنے لگا اس کے بوٹ کی ٹھک ٹھک دُور ہوتی جا رہی تھی۔

"میں دیکھ لوں گا تُو کیا بگاڑے گا میرا۔"

میں نے پیچھے مڑ کر سارے کمرے کو کھنگال کر دیکھ لیا میرے باہر نکلنے کے تمام راستے بند تھے۔ دو ہی دروازے تھے اس کمرے میں۔ ایک راہداری میں کھلتا تھا اور دوسرا اس کمرے میں جس میں وہ دونوں بیٹھے تھے اور وہ دونوں دروازے باہر سے بند ہو چکے تھے۔ دو.... کھڑکیاں تھیں مگر ان دونوں میں یہ موٹی موٹی سلاخیں لگی تھیں میرے لئے باہر نکلنا کسی طرح بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ میں تو تلملا کر رہ گیا۔ ہادی علی مجھ پر غالب آتا جا رہا تھا۔

ابھی دس منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ مکان کا بڑا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کئی آدمی اندر آ گئے ہیں۔ میں نے کھڑکی کا پردہ سرکا کر دیکھا تو مجھے پولیس کے چار سپاہی نظر آئے۔ وہ اسلحہ ساتھ لے کر آئے تھے۔ یارو نے ہادی علی کے نوکر کو یہی بتایا ہو گا کہ مکان کے اندر کوئی چور چھپا بیٹھا ہے جس نے گولی مار کر ہادی علی کو زخمی کر دیا ہے۔

"چوہدری صاحب!" ایک بھاری بھرکم آواز ابھری۔

"میں یہاں ہوں شاہ جی! اِدھر آ جائیں۔" ہادی علی نے ساتھ کے کمرے سے جواب دیا اور پھر اس نے آگے بڑھ کر اپنے کمرے کا دروازہ کھول دیا ــــ دلدار شاہ تھانیدار خود آیا تھا موقعہ دیکھنے۔

"کیا ہوا چوہدری صاحب! اوئے آپ تو سخت زخمی ہیں۔ گولی لگی ہے آپ کو؟"

"جی ہاں شاہ جی! کوئی چور ہے اندر اس کمرے میں۔ اس نے پستول سے گولی چلائی ہے مجھ پہ۔ اوئے بلال ذرا سہارا دے مجھے ہاسپتال لے چل۔"

"ہاں تم جاؤ عادل ان کے ساتھ۔ ان کی مرہم پٹی تو کراؤ کہیں خون زیادہ نہ بہہ جائے۔ جلدی جاؤ اور تم دیکھو کبیر علی اِدھر۔ اس چور کے پُتر کو اندر ہی بھون ڈالو ــــ لوڈ ہے نا رائفل؟"

"جی شاہ جی!"

"بس ٹھیک ہے تم ادھر سے پوزیشن لے لو سلیم! میں نے دیکھ لیا ہے وہ دلہن کا باجا پردے میں سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ ابھی اندر ہی ہے وہ۔" دلدار شاہ نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ بہت تیز نظر تھی اس تھانیدار کی۔ آتے ہی اس نے ساری صورت حال کا صحیح صحیح اندازہ لگا لیا تھا۔

"اوئے سؤر کے پُتر باہر آئے گا کہ اندر ہی گولی کھائے گا۔ اپنا پستول باہر پھینک دے اور چپ چاپ باہر آ جا ورنہ تیار ہو جا، کُتے کی موت مرے گا سالے!" سپاہی کبیر علی نے مشرقی سمت کے برآمدے میں ستون کی اوٹ میں سے رائفل کی نالی کھڑکی کی طرف سیدھی کر کے کہا۔

"میں باہر آتا ہوں جناب! مگر میرے ساتھ انصاف ہونا چاہئے۔"

"اوئے تیرے ساتھ تو ہم ایسا انصاف کریں گے بچو! کہ تیری ماں بھی خوش ہو جائے گی، چوہڑے کے پُتر! پھینک باہر اپنا اسلحہ کیا ہے تیرے پاس۔" دلدار شاہ نے بلند آواز سے کہا وہ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا ــــ اس کی آواز میں ایسا تحکم تھا کہ میں اندر سے چرمر ہو کر رہ گیا میں نے یہ مرحلے کہاں دیکھے تھے جیلانی! میں یتیم خانے میں پلنے والا بدنصیب آدمی۔ میں نے کھڑکی کی چٹخنی کھولی اور اپنا پستول گولیوں سمیت باہر پھینک دیا۔

"شاباش! آدمی تو سمجھ دار لگتا ہے بچے! اب ذرا اپنی سوہنی صورت بھی تو دکھا نا، اپنے عاشقوں کو۔" دلدار نے خوش ہو کر کہا۔ پستول ایک سپاہی نے اٹھا لیا تھا۔

میں نے بڑے بجھے ہوئے دل سے دروازہ کھولا اور ہاتھ اوپر کر کے برآمدے میں جا نکلا۔

"اوئے یہ تو کمپاؤنڈر کالے خان ہیں۔" کبیر علی نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ رائفل کی نال اس نے میرے سینے کے ساتھ لگا دی۔

"اوئے تُو اِدھر کیا کر رہا تھا کالے خان! یہ دھندا بھی کر لیتا ہے تو ــــ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں بھئی۔ وہ ڈاکٹر عظمت تو خوش ہو جائے گا کہ اس کے بندے ایسے ایسے آپریشن بھی کر لیتے ہیں۔" دلدار شاہ نے میرے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ وہ سب مجھے پہچانتے تھے ہر روز ہی ان سے ہمارا واسطہ پڑتا تھا۔ لڑائی فساد میں زخمی ہونے والوں کے لئے رپورٹ لینے وہ ہمارے ہی پاس آیا کرتے تھے۔

میں کچھ نہیں بولا۔ نظریں جھکائے میں ان کے سامنے کھڑا تھا۔ حالت میری یہ تھی کہ میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے اور میرا سارا جسم لرز رہا تھا۔

"یہ قصہ کیا ہے میرے یار! یہ دن دیہاڑے کیسی کارروائی ڈال رہا تھا تو اِدھر۔" دلدار شاہ نے اب کی بار نرم لہجے میں پوچھا۔

میں ایک دم بکھر گیا اور آنکھوں پہ ہاتھ رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"یہ ڈرامہ کر رہا ہے شاہ جی! چوریاں اسی لئے نہیں پکڑی جا رہی ہیں کہ ایسے سادہ اس کاروبار میں لگ گئے ہیں۔" کبیر علی نے کہا۔

"لگا ہتھکڑی اس سالے خان کو۔ مار مار کر چمڑی اُدھیڑ دو گی، حد ہو گئی ہے ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ شہر کے ایسے لوگ کام کر رہے ہیں۔" دلدار شاہ نے کہا اس نے وہیں بیٹھ کر ضمنی رپورٹ تیار کی اور گلی کے دو تین معتبر آدمیوں کو بلوا کر ان کی شہادتیں کاغذ پہ ثبت کروا لیں۔

"میں چور نہیں ہوں شاہ جی! میں برباد ہو گیا ہوں سرکار! میرا کچھ نہیں رہا۔"

"ابھی کہاں پٹھے! ابھی تو اُدھر چل کر تیری بربادی کریں گے ہم۔ چل اوئے لے چل اس کو۔"

کبیر علی نے کھٹ سے میرے دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈالی اور وہ مجھے گلی میں سے نکال کر بھرے بازار میں میری نمائش کرتے ہوئے مجھے تھانے لے گئے۔ انہوں نے جان بوجھ کر ایسا راستہ اختیار کیا تھا جس پر چل کر سب لوگ جان جاتے کہ کالے خان چور ہے۔

وہ میری بربادی کا پہلا دن تھا جیلانی! تو سمجھ رہا ہے نا کہ میں کس عذاب میں پھنس گیا تھا۔"

"جی بابا جی! مجھے اندازہ ہو رہا ہے۔ خدا دشمن کو بھی یہ دن نہ دکھائے۔"

تھانے لے جا کر ان لوگوں نے مجھے حوالات میں بند کر دیا...... دلدار شاہ اسی وقت ہسپتال پہنچا۔ وہاں ہادی علی نے خدا معلوم اسے کیا بتایا وہ جب واپس آیا تو بہت بھرا ہوا تھا۔ اس نے مجھے حوالات سے نکلوا کر اپنے کمرے میں بلوایا تو بولا۔

"کالے خان! تیرے بُرے دن آ گئے ہیں بیٹے! تجھے بتانا ہو گا کہ تو نے اور کس کس کے گھر میں سیندھ لگائی ہے۔" اسے ہادی علی نے یقین دلا دیا تھا کہ کالے خان چور ہے۔

"میں چور نہیں ہوں جناب! میری بات تو پہلے سن لیں اور پھر کوئی فیصلہ کریں۔"

"تیری بات! تُو کیا کہنا چاہتا ہے آخر! حرامی کے پُتر۔ صاف سیدھا تجھے ہم نے موقعے پر گرفتار کر لیا ہے۔ پھر بھی تیرے پاس کوئی خاص وضاحت ہے ہمارے لئے۔"

"میں ٹھیک کہتا ہوں شاہ! مجھ پر ہادی علی نے ظلم کیا ہے۔ وہ میری عزت سے کھیل رہا ہے۔"

"اوئے تیری بھی کوئی عزت ہے۔ کس عزت کی بات کر رہا ہے تُو! ذرا کھل کر بتا مجھے۔" یہ کہہ کر دلدار شاہ نے کرسی میرے قریب کر لی ــــ

میں نے بے کم و کاست اپنی ساری بپتا اسے سنائی تو وہ عجیب سے تمسخر آمیز انداز سے ہنسا۔

"ہٹ کے بھئی ہٹ کے! اچھی سٹوری تیار کی ہے تو نے۔ تجھے تو اُدھر فلم لین میں ہونا چاہئے تھا۔ ٹھیک ہے بچو! تو یوں نہیں مانے گا اوئے کبیر علی لے جا اسے اُدھر چڑھا دے اسے ٹکٹکی پہ۔ سالا کیا یاد کرے گا یہ بھی۔" یہ کہہ کر اس نے مجھے ایسی ایسی گندی گالیاں دیں کہ میں کٹ کر رہ گیا۔

اور یہ سب کچھ مجھے یارو کی وجہ سے جھیلنا پڑا تھا۔ اس یارو کی وجہ سے جس پر میں نے اپنی زندگی نثار کر دی تھی تھانے کی چار دیواری کے اندر اگلے چودہ دن تک مجھ پر جو کچھ بیتی وہ میں جانتا ہوں یا میرا خدا۔ وہ مجھ سے ہر قسم کی چوریوں کا اعتراف کروانے پر تُلے ہوئے تھے اور میں نے جب دیکھا کہ وہ مجھے کہیں جان ہی سے نہ مار ڈالیں تو چپ چاپ یہ مانتا چلا گیا کہ ہاں فلاں چوری بھی میں نے کی تھی اور فلاں چوری بھی میرا ہی کارنامہ ہے۔ مختلف گھروں سے زیورات کی چوریوں کا الزام جب میں اپنے سر لے چکا تو وہ مجھے سمجھا کر اپنی تمام پٹیاں اچھی طرح پڑھا کر گجرات اور لاہور کے صرافہ بازاروں میں لئے پھرے۔ سپاہی رائفل کا دستہ میری کمر میں مار کر اشارہ کرتے تو میں انگلی اٹھا کر انہیں بتاتا کہ فلاں دکاندار کے ہاتھ میں نے فلاں زیور بیچا تھا اور یہ وہ اس صراف کو بھی ساتھ لے کر تھانے جا پہنچتے۔ اس طرح میں نے پندرہ بیس بے گناہ آدمی گرفتار کروا دیے۔ وہ یہی چاہتے تھے۔ کیونکہ میرا جسمانی ریمانڈ وہ لے چکے تھے، اگر میں ان کی بات نہیں مانتا تھا تو پھر مجھے اپنی چمڑی اُدھڑوانی پڑتی تھی۔

میرے خلاف انہوں نے مقدمہ اتنا ٹھوس بنایا تھا اور شہادتیں ہادی علی کے ایما پر اتنی مضبوط رکھی تھیں کہ میری بات کسی عدالت میں... درخورِ اعتنا سمجھی ہی نہ گئی اور مجھے ساتویں پیشی پر عدالت نے ہادی علی پر قاتلانہ حملے اور اس کے گھر میں چوری کی نیت سے داخل ہونے کے جرم میں چار سال کی قید بامشقت کی سزا دے دی۔ مقدمہ صرف چار مہینے چلا۔ میرا وہاں کون بیٹھا تھا جو میرے مقدمے کی پیروی کرتا۔ حالت یہ تھی کہ میری بیوی بھی مجھ سے بیگانہ ہو گئی تھی۔ اس نے کوارٹر چھوڑا اور ہادی علی کی داشتہ بن کر کسی اور مکان میں جا اتری۔ اس میں نہیں جہاں سے مجھے گرفتار کیا تھا ــــ مگر نہیں جیلانی میاں! اللہ تعالیٰ تو ہر شے کا حساب رکھتا ہے اور وہ اپنے کسی بندے کے حال سے غافل نہیں رہتا۔

جب میں سزا پا کر جیل جا پہنچا تو اس کے دس مہینے بعد مجھے ایک دن وہاں قیدیوں کا لباس پہنے کبیر علی سپاہی چکی پیستے نظر آیا۔ میں نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ ہتھکڑی تو مجھے اسی نے لگائی تھی نا۔ میں اسے بھلا کیسے بھول سکتا تھا وہ مجھ سے بڑی دیر تک نظریں چراتا رہا مگر میں نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔

اسے جب فرصت ملی تو میں اسے کھینچتا ہوا الگ لے گیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ رشوت لیتے ہوئے پکڑا گیا تھا۔ جرم ثابت ہو گیا تھا کیونکہ مجسٹریٹ نے نشان زدہ نوٹ اس کی جیب سے برآمد کر لئے تھے۔ عدالت نے اسے ایک سال قید بامشقت کی سزا دی تھی اور اس کی اپیل بھی خارج ہو گئی تھی۔

"یہ تو بہت بُرا ہوا بھائی! تیری تو ابھی نوکری بہت پڑی تھی۔"

"ہاں یار قسمت کے کھیل ہیں، پر تیری حالت پر مجھے بہت ترس

آتا ہے کالے خان! تو تو اپنی بیوی کے ہاتھوں تباہ ہوا ہے۔"

"ہاں بھائی! میرے لئے تو وہ ڈائن ثابت ہوئی ہے۔"

"مگر چین سے وہ بھی نہیں بیٹھی ہے کالے خان! تجھے تو پتہ ہی ہے اللہ نے انصاف کیا ہے۔"

"نہیں یار۔ مجھے تو کچھ پتہ نہیں کہاں ہوتی ہے وہ آج کل؟"

"ارے حد ہو گئی بھئی وہ تو چودہ سال کے لئے جیل میں بھیج... دی گئی ہے۔"

"نہیں یار! ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ میرے بچوں کو سنبھال کر بیٹھی تھی۔ وہ ہادی علی کے ساتھ خراب ضرور تھی مگر پھر بھی، وہ میرے بچوں کی ماں ہے میرے بھائی۔" میرا کلیجہ اس کے ذکر پر کٹنے لگا تھا۔

"تو بہت بھولا ہے کالے خان۔ اس کے تو اخبار چھپ گئے تھے پتہ ہے کیا کیا ہے اس نے؟"

"ہوا کیا تھا آخر؟ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔"

"وہ بڑی خوفناک بات تھی کالے خان! خبر ہمیں یہ ملی تھی کہ دو بچوں کی لاشیں نہر میں بہتی ہوئی ملی ہیں —— نہر کے پل کے پاس نہیں پتہ ہے جال لگا ہے، اس میں آ لگی تھیں۔ وہ ایسی حالت میں تھیں کہ پہچانی جا سکتی تھیں۔ پولیس نے ان کو اپنی تحویل میں لے کر ان کی تصویریں بنوائیں اور اگلے دن اخبار میں شائع کروا دیں۔ اگلے دن صبح ہی صبح تمہارے ہسپتال سے ایک بھنگی ہمارے پاس آیا اس نے بتایا کہ صاحب وہ بچے تو کالے خان کے ہیں اور میں انہیں پہچانتا ہوں۔ یہ اطلاع ملتے ہی ہم بھنگی کے بتائے ہوئے پتے پر جا پہنچے۔ وہ مکان اسے ہادی علی نے لے کر دیا ہوا تھا۔ تمہاری بیوی اس وقت گھر پر ہی تھی اور دہائی مچا رہی تھی کہ اس کے تینوں بچے کسی نے اغوا کر لئے ہیں۔"

"کیا کہتے ہو کبیر علی میرے بچے مر چکے ہیں، نہیں ایسا نہ کہو میں مر جاؤں گا کبیر علی۔"

"میری بات حوصلے سے سنو! یہ دکھ تمہیں اب سہنا ہی پڑے گا کالے خان۔ تمہیں پتہ چلے گا کہ تمہارے ساتھ کتنا ظلم ہوا ہے۔"

"کس نے مارا ہے انہیں! میں اسے قبر کی دیواروں تک نہیں چھوڑوں گا کبیر علی! مجھے بتاؤ وہ کون ہے؟" میں نے کبیر علی کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"صبر سے کام لے کالے خان! میں بتاتا ہوں تمہیں وہ کون تھا تمہاری بیوی نے جو بیان دیا اس سے یہ معلوم ہوا کہ اس کے تین بچے پچھلی دوپہر سے غائب ہیں۔ اس نے انہیں ہر جگہ ڈھونڈ لیا مگر ان کا کوئی سراغ نہیں ملا ہے۔"

" دلدار شاہ کو تو تم جانتے ہی ہو کہ وہ کتنا تیز آدمی ہے۔ وہ تفتیش کے لئے مجھے بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ تمہاری بیوی کی حالت بہت ہی خراب ہو چکی تھی۔ رو رو کر اس نے اپنی آنکھیں سجا لی تھیں دلدار شاہ نے اس کی باتوں پر اعتبار نہیں کیا۔ اس نے کہا۔

"بی بی! تم نے تھانے میں رپٹ کیوں نہیں درج کرائی۔"

پارو اس کا یہ سوال سن کر سٹپٹا سی گئی، بولی "میں تو اس انتظار میں تھی جناب کہ وہ خود ہی آ جائیں۔ تھانے کچہری کا راستہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ اب میں سوچ رہی تھی کہ آپ کے پاس جاؤں کسی کو ساتھ لے کر۔"

"تمہارا کوئی اور بچہ بھی ہے؟"

"جی ہاں میری ایک بیٹی بھی ہے، قدسیہ وہ اندر بیٹھی ہے۔"

"اسے بلاؤ ذرا——"

"اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے بخار آ رہا ہے اسے۔" پارو نے کہا۔

"ذرا اس سے ہمیں ملاؤ تو سہی۔ دیکھیں کیسا بخار ہے اسے۔"

دلدار شاہ نے کہا اور اٹھ کر کمرے میں جا پہنچا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے اندر چلا گیا۔ وہ بچی اس وقت بستر میں لیٹی تھی اور رنگ اس کا زرد ہو رہا تھا۔ وہ ہمیں اپنے قریب دیکھ کر ایک دم چلانے لگی۔

"چلے جاؤ، چلے جاؤ یہاں سے! مجھے ہاتھ مت لگاؤ میں مرنا نہیں چاہتی۔"

"گھبراؤ مت بیٹی۔ ہم تو تمہارا بخار دیکھنے آئے ہیں۔"

"اسے پریشان نہ کریں تھانیدار صاحب! یہ بہت خوف زدہ ہے۔"

"کیوں خوف زدہ ہے؟ کس نے ڈرایا ہے اس کو؟"

"پتہ نہیں۔ بس اپنے بھائیوں کے صدمے نے نڈھال کر دیا ہے اسے۔ بڑی محبت کرتی تھی یہ ان سے۔" یہ کہہ کر پارو نے قدسیہ کو اپنی بانہوں میں لے کر اس پر لحاف ڈال دیا۔ ہم اس کی تمام حرکتیں بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ پارو نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے دو تین بار کچھ ایسے اشارے کئے جن کا مطلب یہ تھا کہ وہ قدسیہ کو منہ بند رکھنے کی تاکید کر رہی ہے۔

"بی بی! چلو تم باہر صحن میں بیٹھو۔ ہم اس بی بی سے کچھ باتیں کریں گے۔"

"اس سے بھلا کیا کہیں گے آپ! اسے کیا پتہ کہ کیا ہوا ہے، ان بچوں کے ساتھ؟"

"اس کا خوف تو دور کر ہی دیں گے ہم۔ چلو باہر بیٹھو۔" دلدار شاہ نے اب کی بار اسے ڈانٹتے ہوئے کہا اور اسے باہر نکال دیا۔

دلدار شاہ نے جیب سے روپے روپے کے پانچ نوٹ نکال کر قدسیہ کی طرف بڑھائے۔

"یہ لے میری بیٹی! مٹھائی کھائے گی شاباش یہ لو رکھ لو۔ ہم تمہارے چچا ہیں بیٹے۔ بڑی اچھی بے بی ہے ہماری، لو شاباش۔" یہ کہہ کر دلدار شاہ نے روپے قدسیہ کی مٹھی میں دے دیئے۔ وہ اپنے ہاتھ میں

نوٹ دیکھ کر خوش ہو گئی۔ دلدار شاہ نے اسے گود میں لے کر اس کا منہ سر چوما تو وہ بچی مسکرانے لگی مگر وہ ایسی مسکراہٹ تھی جس میں خوف کا عنصر بے حد نمایاں تھا۔

"شاباش! بڑی بہادر بیٹی ہے ہماری۔ یہ تمہارے گلے پر نشان کیسے ہیں یہ نیلے نیلے اور یہ گال پر نیل پڑے ہیں۔ کیا ہوا ہے تمہیں؟"

"امی نے مارا تھا۔" وہ دروازے کی طرف دیکھ کر دبی زبان میں بولی۔

"کیوں مارا تھا اس نے؟"

"وہ کہتی ہیں کہ میں کسی کو نہ بتاؤں کہ پپو اور شاہد کہاں ہیں۔"

"کہاں گئے تھے وہ؟"

"وہ..... وہ..... انکل ان کو امی نے نہر میں پھینک دیا تھا۔"

"خود پھینک دیا تھا اس نے؟"

"ہاں انکل! ایک آدمی بھی اس کے ساتھ تھا —— امی نے کہا تھا میں تم پر اپنی ہر شے قربان کر سکتی ہوں...." بچی نے یہ بات ابھی کہی ہی تھی کہ پارو دوڑتی ہوئی اندر آئی اور قدسیہ کو دلدار شاہ کے ہاتھوں سے نوچتی ہوئی باہر لے گئی۔

دلدار شاہ اس کے پیچھے لپکا اور اس کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا کمرے میں لے آیا۔

"یہ دروازہ بند کر دے کبیر علی اور اس بچی کو ادھر لے آ میرے پاس۔" میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی تو دیکھا کہ پارو چارپائی پر سر جھکائے بیٹھی ہے۔ وہ سخت پریشان ہو چکی تھی۔

"ہاں تو پھر کیا ہوا تھا پارو بی بی تمہارے بچوں کو؟ یہ قدسیہ تو کچھ اور ہی کہانی سنا رہی ہے۔"

"یہ جھوٹ بولتی ہے صدمے سے پاگل ہو گئی ہے یہ۔"

"ہاں کیوں نہیں۔ ماں کو تو بچوں کی فکر نہیں ہے اور بیٹھی پچھاڑیں کھا رہی ہے۔ دیکھ پارو! اگر تو سیدھی طرح مجھے بتا دے کہ تو نے اپنے بچوں کو نہر میں کیوں پھینکا تھا اور تیرے ساتھ کون تھا؟ تو پھر شاید میرے ہاتھوں تو ذلیل ہونے سے بچ جائے ورنہ تو جانتی ہے میرا نام دلدار شاہ ہے۔"

"کوئی ماں اپنے بچوں کو نہر میں ڈال سکتی ہے، کیسی بات کرتے ہو تم تھانیدار جی۔ یہ بچی پاگل ہو گئی ہے، اس کی باتوں میں آ گئے ہیں آپ؟" پارو نے اپنی بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں نچاتے ہوئے کہا.....

"یار کالے خان! بڑی خوبصورت تھی وہ تمہاری پارو۔ پاگل ناگن ایسے رنگ تھے اس کے۔ وہ کسی طرح پٹھے پر ہاتھ ہی نہیں رکھنے دیتی تھی۔ بڑی دیر تک الجھتی رہی وہ دلدار کے ساتھ۔ مگر وہ بھی اپنے باپ کا تخم ہے۔ اس نے جب دیکھا کہ گھی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلے گا تو اس نے وہیں بچھا دیا تیری بیوی کو۔ بس تیسرے ہی بید پر وہ بلبلا اٹھی۔ ہاتھ جوڑنے لگی، بولی "بتاتی ہوں شاہ جی..... بتاتی ہوں ——"

"ہاں بتا وہ یار کون تھا تیرے ساتھ؟ کیوں مار دیا ہے تو نے اپنے بچوں کو؟"

"وہ ہادی علی تھا شاہ جی میرے ساتھ۔ اس کی خاطر میں نے اپنا گھر اجاڑ لیا ہے شاہ جی! میرا خاوند جب جیل میں چلا گیا تو ہادی علی نے مجھے شہر میں مکان لے دیا میرے تمام اخراجات وہی برداشت کرتا تھا مگر پھر بھی اسے میری محبت پر یقین نہیں آتا تھا۔"

"تیرا اس سے تعلق کیسے قائم ہوا؟"

"وہ..... وہ مجھے بازار میں مل گیا تھا ایک دن —— اس نے میرا کوارٹر تک پیچھا کیا پھر بعد میں اس نے اپنے نوکر بلال کے ذریعے مجھے پیغام بھیجا اور اس طرح میری اس سے ملاقاتیں ہونے لگیں۔"

"ملاقاتیں تو ہو گئیں تو نے اس کالے خان کو جیل میں بھجوا دیا مگر یہ بتا تو نے اپنے بچے کیوں مار دیئے۔ تو ڈائن کیوں بن گئی؟"

"میں اس پر اپنا سب کچھ قربان کر سکتی ہوں شاہ جی۔ وہ کہتا تو میں اس کے ہاتھ سے زہر بھی پھانک لیتی۔ میں نے اس سے سچی محبت کی ہے شاہ جی، اس کے سوا مجھے دنیا میں کچھ اچھا نہیں لگتا۔"

"ہاں کیوں نہیں! عشق کی آگ ایسی ہی ہوتی ہے بی بی! آدمی کو اوپر سے بھی جلاتی ہے اور اندر سے بھی مگر تیرے بچوں کا کیا قصور تھا۔ ان معصوموں کو کیوں مار دیا تم نے؟"

"وہ..... وہ میرا امتحان لینا چاہتا تھا۔ میں نے اسے کہا تھا کہ تم جس طرح چاہو مجھے آزما لو۔ وہ مجھے کل نہر پر لے گیا تانگے میں بٹھا کر وہ جو غازی پور سے ادھر چھوٹا پل ہے نا۔ ہم وہاں جا پہنچے۔ یہ قدسیہ بھی میرے ساتھ تھی اور میرا پپو، شاہد اور کاظم بھی —— ہادی علی کو یہی ضد تھی۔ وہ کہتا تھا کہ میں تجھ سے شادی کرنا چاہتا ہوں مگر تمہارے یہ بچے مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتے اور پل پر پہنچ کر جب ہم نے تانگہ واپس بھیج دیا تو وہ بولا۔

"دیکھ پارو! اگر تو اپنے بچوں کو نہر میں پھینک دے تو مجھے تیری محبت کی سچائی پر یقین آ جائے گا۔"

اس کی یہ بات سنتے ہی میں نے پپو کو اس کے سامنے نہر میں اچھال دیا۔ قدسیہ نے پپو کو یوں پانی میں گرتے دیکھا تو وہ خوف زدہ ہو کر بھاگ نکلی۔ کاظم اور شاہد پھٹی پھٹی نظروں سے کبھی پانی میں دیکھتے تھے کبھی مجھے۔ پپو کو دیکھتے ہی دیکھتے پانی نے نگل لیا۔ وہ اب کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

"وہ پپو ڈوب گیا ہے امی اسے بچاؤ۔" کاظم چلایا۔

"جاؤ تم اسے نکال کر لاؤ۔" یہ کہہ کر میں نے کاظم کو دونوں ہاتھوں

سے اٹھا کر نہر میں پھینک دیا۔ اور میرا وہ خوبصورت بیٹا بھی نہر کی.... خوفناک لہروں میں چھپتا ہی چلا گیا، وہاں اب کچھ بھی نہیں تھا۔

ہادی علی بولا "شاباش پارو! مگر ابھی تمہارا ایک امتحان اور باقی ہے۔"

اس وقت میرا کلیجہ تو پتھر ہو چکا تھا میں نے ہادی علی کی خوشی کی خاطر اپنے تیسرے بچے شاہد کو بھی اٹھا کر نہر میں پھینک دیا۔ ہادی علی نے زوردار قہقہہ لگایا۔ شاہد کی چیخ ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی ہے مگر ہادی علی کو ذرا ترس نہ آیا۔ وہ مجھے پاگلوں کی طرح باہوں میں لے کر ناچنے لگا۔ وہ بے حد خوش تھا۔ قدسیہ اس وقت ہم سے تھوڑی دور ایک درخت کی اوٹ میں کھڑی کانپ رہی تھی مجھے اس پر اس وقت بے حد ترس آیا۔ آپ نے دیکھا ہے اسے وہ ہو بہو میری صورت ہے۔ ہادی علی نے اسے دیکھا تو بولا۔

"اس کا کیا کرو گی؟ اسے بھی پھینکو ادھر۔"

وہ مستی میں جھوم رہا تھا مگر اس وقت تک میرے جنون کی حالت ختم ہو چکی تھی۔ میں نے بہت سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

"نہیں چوہدری صاحب! نہیں میں اپنی اس بچی کو نہیں مار سکتی۔ نہیں، نہیں! خدا کے لئے میرا اور امتحان نہ لیں۔"

"ٹھیک ہے پارو! دیکھو میں آج شام اکبر کوٹ جا رہا ہوں۔ میرا انتظار نہ کرنا۔ میں اگلے جمعے کو تم سے شادی کر لوں گا اور پھر تمہیں گجرات میں رہنے کے لئے مکان لے دوں گا۔" یہ کہہ کر وہ جانے کے لئے اٹھا تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"اب کہاں جا رہے ہیں آپ؟"

"تم تانگے میں بیٹھ کر گھر چلی جاؤ۔ میں جمعرات کی شام کو تمہارے پاس آؤں گا۔" سڑک پر اس وقت ایک لاری گزر رہی تھی۔ ہادی علی نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکا اور اس میں بیٹھ کر دوسری طرف چل دیا۔ اور میں ٹنڈ منڈ درخت کی طرح وہاں لٹی پٹی حالت میں کھڑی دیر تک یہ سوچتی رہی کہ یہ میں نے کیا کر دیا ہے.... مامتا نے ایک بار پھر میرے دل میں طوفان اٹھا دیا۔ مگر میں تو سب کچھ ہی کھو بیٹھی تھی میرے پاس تو اب کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا۔ ایک اپنے اس یار کی خوشی کی خاطر میں نے اپنی ہر شے لٹا دی تھی اور قدسیہ مجھے سہمی سہمی نظروں سے دیکھ رہی تھی میں خود کو گھسیٹتی ہوئی اس تک پہنچی اور اسے سینے سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ شاہ جی! میں تباہ ہو گئی ہوں مگر میں خوش ہوں کہ میں ہادی علی کی محبت میں ثابت قدم ہوں اب ہمیں کوئی ایک دوسرے سے الگ نہیں رکھ سکتا۔ اس پہ میں اپنی جان بھی قربان کر دوں گی۔ وہ جو مانگے گا میں دوں گی۔"

"ہاں! وہ سسّی، سوہنی اور ہیر تو بیچاری تیرے آگے کچھ بھی نہیں پارو! اصل عشق تو تو نے کیا ہے مگر یاد رکھ اب تو بھی بہت جلدی اپنے بچوں کے پاس پہنچ جائے گی حرامزادی گشتی! تیرے عشق کا بھوت تو میں تھانے چل کر نکالوں گا، لگا دے ہتھکڑی اسے کبیر علی! ایسی ڈائن ہے یہ عورت، اپنے بچوں کو کھا گئی توبہ ہے۔" دلدار شاہ نے غصّے میں تپتے ہوئے کہا۔ میں نے پارو کو ہتھکڑی پہنائی تو دلدار شاہ بولا۔

"دیکھ تو اس گشتی کے رنگ دیکھ! مسکرا رہی ہے جیسے اسے کنگن پہنائے گئے ہوں۔"

"آپ دل کی لگی کو نہیں سمجھ سکتے ہیں شاہ جی! آپ اس منزل پر پہنچ ہی نہیں سکتے ہو میں۔ عبور کر چکی ہوں — یہ قید، یہ جیل، یہ پھانسی سب بے کار باتیں ہیں۔ یار کی خاطر یہ سب کچھ میں خوشی خوشی جھیل لوں گی۔"

ڈھٹائی کی حد کر دی تھی اس نے کالے خان! تیری اس عورت کو میں دیکھ دیکھ کر حیران ہوتا تھا۔

ہم نے پارو کو اسی دن لے جا کر حوالات میں بند کر دیا۔ قدسیہ کو دلدار شاہ نے اپنے گھر بھیج دیا۔ وہ وہیں رہتا تھا ان دنوں۔ مزے کی بات یہ ہے کالے خان کہ پارو نے تھانے جا کر جو بیان دیا اس میں اس نے ہادی علی کا نام تک نہیں لیا، صاف مکر گئی۔ اس نے کہا کہ بچوں کو اس نے خود اپنی مرضی سے نہر میں پھینکا ہے۔ کیونکہ وہ جس شخص کے بچے ہیں اس سے اسے شدید نفرت ہے۔ حالانکہ وہ گشتی ان کی ماں تھی — اس کے اپنے جسم کا حصّہ تھے وہ بچے۔ مگر وہ.... ہادی علی کو صاف بچا گئی۔ ہم نے بہت کوشش کی کہ کسی نہ کسی طرح وہ ہادی علی کو بھی اپنے جرم میں شامل ہونے کا ثبوت فراہم کر دے مگر وہ ایسی پکّی نکلی کہ اس نے عدالت کے آخری مرحلے تک بھی ہادی علی کا نام نہیں لیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اسے سیشن کورٹ سے چودہ سال قید کی سزا سنا دی گئی اور ہادی علی ہر الزام سے بری الذّمہ رہا۔

وہ ایسی ہی تھی کبیر علی! اس جیسی حسین عورت اپنے حسن کی ایسی ہی اونچی قیمت لگایا کرتی ہے۔ واہ! میرے مولا۔" میں نے رنجیدہ ہو کر کہا۔

میری جو حالت ہو رہی تھی اس کا تم اندازہ ہی نہیں کر سکتے ہو غلام جیلانی — ہم دونوں برباد ہو گئے تھے۔ وہ اپنے حسن کے زعم میں ماری گئی اور مجھے اس سے میری بے پناہ محبت لے ڈوبی۔

کبیر علی نے اس کے بارے میں مجھے اور بھی بہت کچھ بتایا مگر میں کس کس کا ذکر کروں تم سے جیلانی میاں! بس یوں سمجھو کہ میں نے دل پر پتھر کی سل رکھ لی مگر وہ غم ایسا تھا کہ میں اسے سہار ہی نہیں سکتا تھا۔ میری صحت کو گھن لگ گیا۔ جیل کی وہ سنگین دیواریں مجھے قبر ایسی اذیت دیتی تھیں — مگر میں کچھ بھی نہ کر سکتا تھا۔ وہاں سے وقتِ مقررّہ سے پہلے میرا نکلنا ناممکن تھا اور میری یہ بیٹی قدسیہ

دلدار شاہ کے گھر میں تھی۔ میں اس کا شکر گزار ہوں جیلانی! اس نے میری بیٹی کو اپنی ہی بیٹی کی طرح گھر میں رکھا۔ اس کا یہ احسان میں عمر بھر نہیں بھول سکتا۔

میں جب جیل سے نکلا تو میرا یہ حال تھا کہ میری ٹانگیں بیکار ہو چکی تھیں۔ ان میں ایسا درد رہنے لگا کہ میں دو قدم بھی نہیں چل سکتا تھا۔ ہادی علی میری نظر میں تھا مگر میں اس قابل کہاں تھا کہ اس سے انتقام لے سکتا۔ میں نے دلدار شاہ سے اپنی بیٹی واپس لی تو وہ یوں رو دیا جیسے اس سے اس کی اپنی بیٹی چھن رہی ہے مگر میری تو نظر کی روشنی ہے یہ قدسیہ۔ میں اسے لے کر ادھر بلاور کی طرف آ گیا۔ پھر کسی نے مجھے بتایا کہ اس جنگل میں ایک فقیر رہتا ہے جو میری ٹانگوں کا علاج کر سکتا ہے۔ میں اس کے پاس پہنچا تو اس نے میری کایا ہی پلٹ دی۔ وہ ایسا صاحبِ نظر فقیر تھا کہ اس نے میرے دل سے نفرت اور انتقام کا سارا گندہ مادّہ نکال کر باہر پھینک دیا۔ میری ٹانگیں تو اس نے ٹھیک کر دیں مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ اس نے میرے نفس پہ بھی تالا ڈال دیا۔ اب میرا یہ حال ہے کہ مجھے اپنے اس پیر و مرشد ٹھیکری والے کے طفیل اللہ نے ایسی برکت دی ہے کہ مجھے دنیا جہان کی ہر نعمت سے بے نیاز کر دیا ہے۔ مجھے یہاں رہتے ایک عرصہ گزر گیا ہے۔ خدا نے مجھے میرے مرشد ٹھیکری والے کی دعا سے جڑی بوٹیوں کے علم سے مالا مال کر دیا ہے کہ خلقِ خدا مجھ سے فائدہ اٹھا رہی ہے میرے ہاتھ میں اللہ نے شفا بھر دی ہے اور میں خوش ہوں کہ پارو کو کھو کر میں نے اپنی منزل پالی ہے۔"

"قدسیہ کا گناہ معاف کر دیں بابا جی! وہ مجھے اپنی آسیہ بہن ایسی نظر آتی ہے اس کی بینائی ٹھیک کر دیں۔"

"ہاں میں ایسا ہی کروں گا اس کے بغیر تو میرا ایک پل بھی نہیں گزرتا ہے اس کی وہ حرکت دیکھ کر مجھے پارو یاد آ گئی تھی بیٹے! مگر اب میں اسے معاف کر دوں گا۔ میں اسے پریشان نہیں دیکھ سکتا۔"

"میرے لئے بھی دعا کریں بابا جی! میں.... میں بہت دکھی ہوں۔" اس کی باتوں نے میرے اندر کے تمام پتھر توڑ کر پگھلا دیے تھے۔ میری آنکھیں بہہ نکلی تھیں۔

"ہاں رویا کر.... زیادہ وقت دل کے بے لگام گھوڑے پر چابک برسانے میں گزارا کر۔ تیری آنکھ کا غسل تیری روح پر اچھا اثر ڈالے گا رونا بھی سیکھ کہ خدا کو زاری پسند ہے۔ وہ منہ زوری برداشت نہیں کرتا کہ اصل طاقت اور شہ زوری اسی کے ہاتھ میں ہے اور اسے ہی زیب دیتی ہے۔"

اس کی یہ بات سن کر میری آنکھیں اور زیادہ شدّت سے بہہ نکلیں۔ میں اس کے سامنے سر جھکا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ وہ پتہ نہیں کن کڑی منزلوں سے گزار رہا تھا مجھے۔ کسی کٹھالی میں پگھلا رہا تھا۔ میرے وجود کے سارے فاسد مادّے پگھل پگھل کر اس راہ سے خارج ہوتے جا رہے تھے۔ اس کی باتوں نے میرے دل میں چھید ڈال دیئے تھے۔ وہ مجھے ایسی گپت مار دے رہا تھا جس سے نہ لہو بہتا ہے نہ زخم لگتا ہے مگر اندر ہی اندر آدمی ٹوٹ پھوٹ کر کچھ کا کچھ بن جاتا ہے۔

مجھے یوں امڈ امڈ کر روتے دیکھ کر اس نے ایک بار پھر بڑے زور سے میرا کندھا تھپتھپایا۔ بولا "صبح زیادہ دور نہیں ہے۔ لا میں تجھے ایک اپنی نشانی دے دوں۔ لا اپنا بازو ننگا کر۔ دایاں بازو تیرا زخم تو بھر گیا ہوگا؟"

"ہاں بابا جی! زخم تو رات ہی رات میں ٹھیک ہو گیا۔ اب تو پتہ بھی نہیں چلتا۔" یہ کہہ کر میں نے کوٹ اتار کر اپنا بازو کندھے تک ننگا کر دیا۔

اس نے الاؤ میں سے ایک باریک سی جلتی ہوئی لکڑی اٹھائی۔ بولا —

"آنکھیں بند کر لے۔ شاید میرا مولا تیری فریاد سن لے، تجھے عزت دے دے۔"

میں نے آنکھیں بند کر لیں تو اس نے میرا بازو ہاتھ میں پکڑا اور اس لکڑی کا جلتا سرا میری کلائی کے اندر کی طرف جلد پہ رکھ دیا اور درد کی ایک تیز کٹیلی لہر میرے بدن میں سرایت کر گئی۔ میں نے جلدی سے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ وہ مسکرا رہا تھا۔ میں نے کلائی اس سے چھڑانی چاہی مگر ناکام رہا۔

اس نے میری کلائی پر اندر کی طرف تین جگہ سے برابر فاصلہ دے کر میری جلد جلا دی مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ درد کا احساس جو پہلی بار جلتی لکڑی کا سرا جلد پر اترتے ہی پیدا ہوا تھا وہ ختم ہو چکا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میرا بازو سُن ہو گیا تھا میرے دل میں خوف کی کوئی رمق موجود نہیں تھی۔ درد نے مجھ سے شرما کر گھونگھٹ نکال لیا تھا۔ جب وہ میری کلائی کو تین جگہوں سے داغ چکا تو میں نے دیکھا کہ وہاں تین ہلکے ہلکے زخم ابھر آئے ہیں۔

"شاباش! اب وہ ذرا سی گرم گرم راکھ دے دے مجھے۔" میں نے الاؤ کے گرد پھیلی راکھ مٹھی میں بھر کر اس کی ہتھیلی پہ رکھی تو اس نے سرہانے رکھی ایک شیشی میں سے چند قطرے راکھ پہ ڈالے پھر اسے اچھی طرح ملا کر وہ گیلی راکھ اس نے میرے ان زخموں پہ لگا دی اور پھر ہاتھ جھاڑ کر لحاف میں دبک گیا۔ بولا —

"جا اب اندر جا کر سو جا! صبح سورج نکلنے سے پہلے یہاں سے "چڑھدے" کو چل دینا۔ میرے چِلّے میں تیرے لئے یہی کچھ تھا بچّے۔ اب جا اٹھ جا۔" یہ کہہ کر اس نے چارپائی پہ لیٹ کر لحاف میں منہ ڈال لیا۔ میں ہکّا بکّا سا ہو کر کبھی اسے دیکھتا تھا اور کبھی اپنی کلائی کو، جس پر

سے اٹھا کر اُس نے ڈال دیئے تھے مگر وہ ایسے زخم تھے کہ بات ہی نہیں کرتے تھے، اپنا آپ منوانے کی انہیں پروا ہی نہیں تھی۔

میں نے اسے نیند میں ڈوبتے دیکھا تو اپنا کوٹ اور وہ جلتی لکڑی اٹھا کر اندر جا بیٹھا۔ لحاف میں نے اپنے گرد لپیٹ لیا مگر بازو ابھی تک میں اوپر اٹھائے ہوئے تھا اس ڈر سے کہ کہیں وہ راکھ نیچے نہ گر جائے۔ ورنہ زخم ننگے ہو جاتے۔ میں نے بائیں ہاتھ سے سگریٹ منہ میں رکھا اور تیلی جلانے کے لئے بایاں ہاتھ ذرا سا آگے کیا تو وہ لحاف سے یونہی بے خیالی میں یوں رگڑ کھا گیا کہ ساری راکھ زخموں پر سے اتر گئی اور..... اور..... شاید میری بات کا کسی کو یقین نہ آئے، مگر حقیقت یہی ہے کہ وہ پیسے پیسے برابر چوڑے اور گول تینوں زخم مندمل ہو چکے تھے اور یوں لگتا تھا جیسے وہ بہت پرانے زخم ہیں جن پر بڑے موسم گزر چکے ہیں، میں سمجھا میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ وہ ایک ناممکن بات نظر آتی تھی۔

میں نے اپنا شک دُور کرنے کے لئے ان زخموں پر چٹکی بھری تو مجھے یہ معلوم ہوا کہ وہ بس معمولی قسم کے داغ ہیں۔ زخم تو وہاں کبھی تھے ہی نہیں۔ تب میرا جی چاہا کہ میں ساری زندگی اس بابا کے قدموں میں گزار دوں۔ اپنی عاقبت سنوار لوں۔ اس کے پاؤں کی دھول دھو دھو کر پیتا رہوں اور میرے اندر کا سارا فاسد مادہ آپ ہی آپ زائل ہو جائے۔ وہ تو خدا کا کوئی بہت ہی برگزیدہ بندہ تھا جسے نادیدہ قوتوں پر اختیار حاصل تھا۔ میں تو اس کو صحیح طور پر سمجھ ہی نہ سکا تھا۔ اسے تو خدا نے طرح طرح کی کرامتوں سے نواز رکھا تھا۔ میں تو بھولا ہی رہا۔ مجھے تو سب کچھ چھوڑ کر اسی جنگل میں رہ جانا چاہئے۔

مگر پھر اچانک مجھے اس بابا کے وہ لفظ یاد آئے۔ وہ یخ بستہ سے بے رحم اور بے التفاتی سے لبریز لفظ۔ اس نے مجھے صبح سویرے وہاں سے نکل جانے کو کہا تھا اور تب کہیں سے ہواؤں کے دوش پر اڑتی ہوئی آسیہ کی تصویر میرے حافظے کی سطح پر اتری اور میں ایک بار پھر نڈھال ہونے لگا۔ مجھے اس تک ضرور پہنچنا تھا۔ اتنی کڑی منزلوں سے میں گزرا ہی اس کے لئے تھا۔ میں وہاں رُک گیا، فقیر ہو گیا تو کون اس کی آزادی کے لئے تگ و دو کر سکے گا۔ میں نے اس سے وعدہ کر رکھا ہے۔ مجھے بابا نے جانے کا جو حکم دیا ہے تو اس میں بھی کوئی مصلحت ہوگی۔ مجھے وہاں نہیں رکنا چاہئے۔ خواہ وہ مجھے جنت کی بشارت کیوں نہ دے دے مجھے وہاں نہیں ٹھہرنا ہے کہ آسیہ میری منتظر ہے۔ اس بابا کی اوس سے میری پیاس نہیں بجھ سکے گی میرا سفر لمبا بھی ہے اور کٹھن بھی۔ اور یہ بابا تو میری منزل ہرگز نہیں ہے۔

میں نے اپنے بازو پر قمیص چڑھا کر جرسی کی آستینیں نیچے گرا لیں اور کوٹ ایک طرف رکھ کر سو گیا۔ اب مجھے اور کچھ بھی نہیں کرنا تھا صبح سویرے اٹھ کر وہاں سے چل دینا تھا۔ یہی بابا کا حکم تھا اور یہی میری آرزو بھی۔

میرا خیال ہے میں زیادہ دیر تک نہیں سویا تھا۔ میرے بدن پر ابھی کسلمندی طاری تھی کہ میری آنکھ کھل گئی۔ وہ لکڑی ابھی تک جل رہی تھی۔ میں نے باہر نکل کر سامنے نظر ڈالی تو صبح کی روشنی زیادہ دُور نہیں تھی۔ سیاہی سے سفیدی الگ کی جا سکتی تھی۔ میں نے جھونپڑی کے اندر جا کر کوٹ پہنا۔ بُوٹ کے تسمے باندھے کمبل اوڑھا سر پر پگڑی۔ پٹکے کی صورت میں باندھی اور اسٹین گن کندھے پہ لٹکا کر میں جھونپڑی سے باہر نکل آیا۔ بابا لحاف میں منہ ڈال کر سویا ہوا تھا اور اس کے ہلکے ہلکے خراٹے اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ وہ گہری نیند میں ہے الاؤ کی آگ مدھم پڑ چکی تھی۔ میں نے کچھ اور لکڑیاں اس میں ڈال کر آگ تیز کر دی اور دل ہی دل میں اس برگزیدہ ہستی کو سلام کہتا ہوا..... چپ چاپ وہاں سے چل نکلا۔

جب میں جنگل سے باہر آیا تو پو پھٹ رہی تھی۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا بابا کی بتائی ہوئی مشرقی سمت میں چل دیا۔ "چڑھدے" کا مطلب یہی تھا۔ میں کوئی ڈھائی تین میل ناک کی سیدھ میں چلا تھا کہ میرے قدم پکی سڑک پر جا چڑھے ـــــ ابھی مجھے وہاں کھڑے چند ہی منٹ گزرے تھے کہ ایک ٹیکسی مجھے اپنی طرف آتی نظر آئی۔ اسے میں نے ہاتھ کے اشارے سے روکا تو معلوم ہوا کہ اس ٹیکسی میں دو آدمی ڈھٹوں کی بُکل مارے پچھلے حصے میں بیٹھے تھے۔ ان کی پگڑیاں کالی تھیں جن کے لڑ انہوں نے مجھے دیکھ کر منہ پہ لپیٹ لئے تھے۔ ان کی آنکھوں کی غیر معمولی چمک ان کے دلوں کا حال کہہ رہی تھی۔ وہ بھی کوئی وارداتیے قسم کے لوگ تھے

"کیا بات ہے میاں جی ؟"

"یار میں گجرات جانا چاہتا ہوں جگہ ہو تو بٹھا لو ـــــ بہت پریشان ہوں"

"کیوں، خان جی بٹھا لوں، بیچارا مسافر ہے"

"بٹھا لے یار ! مگر جلدی کر، خواہ مخواہ روک لی ٹیکسی تُو نے !" ایک آدمی نے بہت جُز بُز ہو کر کہا۔ وہ میری آمد کو شاید کوئی نیک فال نہیں سمجھ رہا تھا۔

ابھی میں گھوم کر اگلی سیٹ کا دروازہ کھول ہی رہا تھا کہ دوسرا آدمی بولا ـــــ

"ٹھہر بھائیا ٹھہر ! یہ بتا تُو آیا کہاں سے ہے ؟"

"جی میں اُدھر رکھ سے آیا ہوں فارسٹ گارڈ ہوں۔ ادھر کسی نے بہت سارے درخت کاٹ لئے ہیں دریا کی طرف سے۔ میں اس کی اطلاع اپنے افسر کو فوراً دینا چاہتا ہوں" میں نے نہایت ہی گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"بیٹھ جا یار ! میں سمجھا پتہ نہیں کس جوٹھ کا منہ دیکھ رہا ہوں سویرے سویرے بیٹھ جا"

وہ بہت ہی بدتمیز اور منہ پھٹ قسم کے لوگ تھے۔ مجھے تاؤ تو بہت آیا مگر میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ اپنی ضرورت نے مجھے باندھ رکھا تھا۔

ڈرائیور نے گاڑی چلائی تو میں نے سگریٹ جیب سے نکال کر سلگائی۔

"اوئے بند کر یہ دھوئیں بازی ! سخت نفرت ہے ہمیں اس سے سمجھا اس چاچے کو ورنہ اتر جا یہیں"

میں اس کے اس لہجے سے اوپر سے نیچے تک سُلگ کر رہ گیا ـــ غصے سے میرا سارا بدن پھنکنے لگا۔

"تُو کوئی انسان کا بچہ نظر نہیں آتا ہے مجھے ! تیری ماں نے تجھے تمیز نہیں سکھائی ہے حرامزادے !" یہ کہہ کر میں نے دائیں ہاتھ کا ایک جھانپڑ اس آدمی کے منہ پر کچھ اس طرح مارا کہ اس کا نچلا جبڑا اوپر کے جبڑے سے ہٹ کر بائیں طرف نکل گیا اس کی شکل یوں بگڑ گئی جیسے وہ کوئی انسان نہیں بھوت پریت ہے اس کے گلے سے ایسی آوازیں نکلیں جیسے کتے کے نرخرے میں ہڈی پھنس گئی ہو۔ اس کی حالت اس آدمی جیسی ہو گئی تھی جس پر اچانک لقوے کا حملہ ہوا ہو۔

دوسرا آدمی اس کی یہ حالت دیکھ کر سٹپٹا گیا اور وحشت زدہ ہو کر بولا "اوئے صنوبر خان یہ کیا ہو گیا تجھے اوئے صنوبر خان !" مگر صنوبر خان تو شاید بے ہوش ہوتا جا رہا تھا۔ اس آدمی نے اس کا چہرہ ہاتھ میں لیا اور اس کے اپنی جگہ سے ہلے ہوئے جبڑے پر اس نے زوردار مُکا مارا جس سے جبڑا فوراً ہی اپنی صحیح حالت میں آ گیا مگر آواز اس کی پھر بھی نہیں نکل رہی تھی۔ رنگ اس کا ہلدی ہو گیا تھا۔

"اوئے صنوبر خان ! تُو ٹھیک تو ہے نا میرے یار۔ اوئے بہن کے یار ! یہ کیا کر دیا تو نے ؟ تو جانتا نہیں ہے ہمیں" یہ کہہ کر اس نے تیزی سے اپنی ڈب میں سے پستول نکال لیا۔ مگر پیشتر اس کے کہ وہ ہاتھ سیدھا کرتا میں نے دائیں ہاتھ سے اس کی کلائی پکڑ کر جھٹکا جو دیا تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کی کلائی کی ہڈی تڑاخ کر کے ٹوٹ گئی۔ پستول اس کے ہاتھ میں جھول کر نیچے گر گیا۔

"اُف میرے اللہ !" اس نے جو درد سے بلبلا کر چیخ ماری تو ڈرائیور نے فوراً گاڑی کو بریک لگائے اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ اس پر ایسی دہشت طاری ہو گئی تھی کہ باید و شاید۔ میں نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"اوئے کسی ڈرائیور کے کتے ! رک جا ورنہ گاڑی کو آگ لگا دوں گا چل ادھر" اگرچہ میں خود بھی گاڑی چلا سکتا تھا مگر میں خواہ مخواہ کسی مخمصے میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔

ڈرائیور نے میری آواز سنی تو اس نے ہاتھ اوپر اٹھا لئے اور پھر پاؤں پر لٹو کی طرح گھوم کر واپس آ گیا۔

"بیٹھ جا اندر بھوتنی کے بندر ! اور چلا اپنی اس ماسی کو۔ ان پر مجھے خواہ مخواہ ہاتھ اٹھانا پڑا۔ چل اندر ـــــ" وہ لرزتا ہوا اپنی سیٹ پر بیٹھا اور گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے چل دیا۔ جس آدمی کی کلائی ٹوٹی تھی وہ درد سے بُری طرح کراہ رہا تھا۔ صنوبر خان ابھی تک آنکھیں مُوندے پڑا تھا۔ سر اس کا سیٹ کی پشت پر ٹِکا تھا اور جھول رہا تھا۔

"دِکھا اِدھر کیا ہو گیا ہے تجھے ! بڑی تیز زبان چلا رہا تھا سؤر کا تخم" میں نے اس کی کلائی کہنی سے پکڑ کر دیکھی تو معلوم ہوا کہ اندر سے ہڈی بالکل دو حصے ہو چکی تھی۔ خون بالکل بھی نہیں نکلا تھا۔ اس کی کھال سالم و ثابت تھی۔ میں نے کلائی کو ہاتھ لگا کر دیکھا تو درد سے وہ اتنا نڈھال ہوا کہ اس کے پسینے چھوٹ گئے۔

"دیکھ اوئے ! ان کو سیدھا ہسپتال لے جانا سمجھا کہ نہیں"

"ٹھیک ہے چوہدری صاحب ! میں سیدھا ہسپتال لے جاؤں گا انہیں"

"ہاں ! ان کو ان کے کئے کی سزا ملی ہے۔ میں عاجزی دکھا رہا تھا تو یہ سالے بکواس کرتے تھے۔ اب ان کو نصیحت ہو جائے گی آئندہ کے لئے کہ ہر ایک سے سینگ پھنسانا کتنا مہنگا پڑتا ہے"

"توبہ میری توبہ چوہدری جی ! کوئی مہنگا ایسا مہنگا" ڈرائیور نے دونوں کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا رنگ اس کا ابھی تک پیلا ہو رہا تھا۔

"کہاں سے لایا ہے تُو انہیں ؟"

"بس جی وہ اُدھر تلواڑہ گاؤں ہے نا اُدھر۔ کل شام کو لے گئے تھے یہ مجھے۔ رات مجھے ایک حویلی میں سُلا کر خود یہ پتہ نہیں کہاں چلے گئے تھے۔ صبح اذان کے وقت انہوں نے مجھے اٹھا لیا اور اب انہیں لے کر میں غوث پور جا رہا تھا"

"کتنے پیسے طے کئے تھے انہوں نے ؟"

"تین سو روپے !"

"اور تُو بھوتنی کا بُلکڑ چلا آیا ان کے ساتھ۔ ابے یہ تو شکل سے ہی ڈاکو لگتے ہیں مجھے"

"شک مجھے بھی یہی پڑا تھا چوہدری جی ! پر میں پھنس گیا تھا جی، کیا کرتا ـــــ میں تو مزدور آدمی ہوں جی جس نے جدھر کہا ادھر چلنا پڑتا ہے۔ سواری کا محتاج ہوں نا جی، پر یہ..... بڑا گندا دھندا ہے جی یہ ٹیکسی ڈرائیوری کا" اس نے اپنے پیشے کو گالی دی۔

"ذرا گاڑی روک ! میں اس کی کلائی ذرا باندھ تو دوں یہ سالا بکرے کی طرح بَیں بَیں کر رہا ہے"

اس نے گاڑی روکی تو میں نے گاڑی کے اندر پڑی ایک لوہے کی چپٹی سی لے کر اس کی کلائی کے نیچے رکھی اور اپنے طور پہ ہڈی کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر اس کی پگڑی سے کس کر باندھ دیا۔ وہ چیخا تو بہت مگر پھر بھی اس نے وہ پٹی بندھوا ہی لی۔ حالت اس کی بہت ہی

دگرگوں ہو رہی تھی۔ اور میں حیران تھا کہ وہ سالا اتنا لمبا چوڑا چھ فٹ اونچا جوان، بازو پر ایسی چینی کی بنی کلائی لئے پھرتا ہے جو ایک ہی جھٹکے میں تڑاخ سے ٹوٹ گئی۔

اُدھر سے فارغ ہو کر میں پھر اپنی جگہ پر جا بیٹھا۔ چند منٹ کے بعد میں نے ایک نظر پھر پیچھے ڈالی تو معلوم ہوا کہ اسے کچھ سکون سا محسوس ہونے لگا تھا اور وہ جو دم بدم اس کی حالت غیر ہوئی جا رہی تھی اس میں قدرے اعتدال آ گیا تھا البتہ وہ صنوبر خان ابھی تک غشی ہو رہا تھا۔ گاڑی پھر آگے چل نکلی۔ اور جب ہم گجرات پہنچے تو اس وقت صبح کے ساڑھے چھ بج رہے تھے۔ سورج سات بجے طلوع ہوتا تھا۔

میں نے شہر کی بڑی سڑک پر پہنچتے ہی گاڑی چھوڑ دی۔ ڈرائیور نے مجھے بڑے ادب سے سلام کیا اور ٹیکسی بھگاتا ہوا فوراً ہی میری نظروں سے غائب ہو گیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ انہیں سیدھا ہسپتال ہی لے جائے گا کیونکہ انہیں طبی امداد کی فوری ضرورت تھی۔

لاہور کے لئے مجھے ٹیکسی ڈھونڈنے میں دس پندرہ منٹ لگ گئے مگر کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ تھک ہار کر میں بسوں کے اڈے پر جا پہنچا وہاں ایک سُرمئی رنگ کی نئی چمکتی دمکتی ٹیکسی کار کھڑی تھی۔ اس کے ڈرائیور نے خود ہی مجھے آواز دی جسے غنیمت جان کر میں اس کے اندر جا بیٹھا "چل یار! مجھے لاہور لے چل۔"

"سو روپیہ لگے گا چوہدری صاحب!"

"ٹھیک ہے میں تمہیں دے دوں گا مگر جلدی چل۔ کچہری کے وقت تک مجھے وہاں پہنچا دے۔"

وہ خوش ہو گیا بولا۔

"ابھی لو جی! میری گاڑی تو راکٹ ہے راکٹ، پینتالیس ہزار میں خریدی ہے، میں نے دس دن ہوئے، بالکل برانڈ نیو ہے۔ شوروم سے نکلوائی ہے میں نے۔" یہ کہہ کر وہ جھومتا ہوا گاڑی کو اسٹارٹ کر کے لاہور کی طرف چل دیا۔

اب میں بالکل مطمئن تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس نئی کار کو دیکھ کر راستے میں کوئی مجھے روکنے کی جرأت نہیں کرے گا، افسوس مجھے اپنی حالت پر بہت تھا کہ میں اب اس قابل ہی نہ رہا تھا کہ منہ کھول کر سڑک پر چل سکوں۔ مجھے اپنے سائے سے بھی دہشت ہوتی تھی۔

وہ بہت آرام دہ گاڑی تھی، جھٹکا شٹکا بالکل نہیں دیتی تھی۔ میں اس کی پچھلی سیٹ پر کمبل کو اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ کر بیٹھ گیا۔ اور سگریٹ سلگا کر اپنے مصائب و مسائل کی پستک کھول کر اس کے اوراق کی سیاہی کا اندازہ کرنے لگا۔ سارے ہی اوراق سیاہ ہو رہے تھے روشنی کا دُور دُور تک کہیں کوئی نشان نہیں ملتا تھا ہاں اگر کہیں روشنی نظر آتی تھی تو وہ تھی جھونپڑی اس بابا کی جس سے میں اس کا نام بھی نہیں پوچھ سکا تھا۔ اس بات کا بھی مجھے بے حد افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے اس بزرگ کا نام نامی بھی معلوم نہ کیا جس نے مجھ پر اپنی محبتوں کی بارش برسا دی تھی۔

میرا ذہن چلتے چلتے ایک نکتے پر پہنچ کر رُک گیا۔ مجھے بابا کی وہ نشانی یاد آئی جو اس نے میری کلائی پر مُہر کی صورت میں ثبت کر دی تھی۔ حیرت مجھے یہ تھی کہ میری ضرب میں اتنی بے پناہ قوت کہاں سے آ گئی ہے کہ میں نے ایک جھانپڑ اس صنوبر خان کے منہ پر مارا اور اس کا نچلا جبڑا اپنی جگہ چھوڑ کر دوسری طرف مڑ گیا اور جب میں نے اس کے ساتھی کی کلائی کو جھٹکا دیا تو وہ دو ٹکڑے ہو گئی۔ یہ اتنی ساری طاقت میری کلائی میں پہلے تو ہرگز نہیں تھی۔ میں کسی کی گردن پوری قوت سے مسلتا تھا تب کہیں جا کر میری آسامی بے ہوش ہوتی تھی۔ مگر اب تو یہ بم شے بن گئی تھی۔ میں سمجھا یہ میرا وہم ہے۔ ان سالوں کو میں نے یونہی بے خبری میں توڑ موڑ کر رکھ دیا تھا۔ اگر وہ سیدھی طرح لڑتے اور جذبے سے جم کر میری مزاحمت کرتے تو یوں نقصان نہ اٹھاتے۔ یوں ہی بے خیالی میں تو کوئی پہلوان بھی صراحی جیسی ہلکی شے کو اٹھا لے تو اس کی بھی کلائی میں موچ آ سکتی ہے۔ یہ قطعاً میرے ہاتھ اور کلائی کی قوت کا اعجاز نہیں تھا بلکہ وہ یونہی ڈھیلے بدن اپنی ہڈیاں تڑوا بیٹھے تھے۔

وزیر آباد سے گزرتے وقت میں نے ڈرائیور سے کہہ کر اخبار لیا تو اس کی بڑی بڑی سُرخیاں پڑھ کر میرے خون کی گردش تیز ہو گئی۔ اخبار میں چوہدری ہادی علی کے قتل کی خبر شہ سُرخیوں میں چھاپی گئی تھی مُردہ حالت میں اس کی تصویر بھی اتاری گئی تھی انہوں نے لکھا تھا کہ بلاور کی مسجد کے صحن میں کھڑے نامعلوم قاتل نے اس وقت چوہدری صاحب پر گولیاں چلائیں جب وہ گاؤں کے مزارعوں سے بات چیت کر رہے تھے اس وقت اتفاقاً پولیس بھی کسی معاملے کی تفتیش کے لئے موجود تھی۔ پولیس کا ایک اور دستہ اس وقت اکبر کوٹ میں کسی ڈاکو کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ نامعلوم قاتل نے نامعلوم وجوہ کی بنا پر چوہدری صاحب پر حملہ کیا جو اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا کہ چوہدری صاحب موقع پر ہی ہلاک ہو گئے۔ اس نے اسٹین گن کے فائر سے گاؤں کے مزارعوں کو بھی قتل کر دیا۔ ایک آدمی اس کی گولی سے سخت زخمی ہو گیا۔ قاتل نے پولیس کے آدمیوں سے ہتھیار رکھوائے اور چوہدری صاحب کی گھوڑی پر سوار ہو کر بھاگ نکلا عینی شاہدوں کا بیان ہے کہ قاتل نے اپنا منہ پگڑی کے پلّے سے ڈھانپ رکھا تھا۔ اس لئے اس کو کوئی بھی پہچان نہیں سکا۔ پولیس نے اس کا پیچھا کیا تو اس نے جوابی فائرنگ کر کے ایک سب انسپکٹر کو گنّے کے کھیت میں ہلاک کر دیا۔ قاتل کے پاس بے آواز چلنے والا پستول بھی موجود تھا۔ اس کی تلاش میں پولیس نے سارے علاقے کو گھیرے میں لے رکھا ہے۔ امید ہے کہ وہ

جلد گرفتار کر لیا جائے گا۔ غالب قیاس یہ ہے کہ اسے گاؤں کے کسی آدمی نے اپنے گھر میں پناہ دے رکھی ہے یا وہ جنگل میں روپوش ہو چکا ہے۔

خبر کی یہ تفصیلات خاصی سنسنی خیز تھیں۔ خبر کا بقیہ پچھلے صفحے پر درج تھا جس میں رپورٹر نے بڑے دکھ کے ساتھ عوام کو یاد دلایا تھا کہ تین دن پہلے ایک قاتل اپنے مقتول کی لاش ریلوے کے سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں چھوڑ کر گوجرانوالہ اسٹیشن سے اس وقت فرار ہو گیا تھا جب پولیس اسے گرفتار کرنے کے لئے اس ڈبے کو کھلوا رہی تھی۔ اس نے ڈبے کو اندر سے مقفل کر رکھا تھا۔ ڈبے میں موجود ایک معزز شہری نثار احمد کو وہ ادھ موا کر کے چھوڑ گیا تھا اور اس نے اس کے کپڑے بھی اتروا کر گاڑی سے باہر پھینک دیئے تھے اس نے آگے چل کر یہ بھی لکھا تھا کہ صوبے میں امن و امان کی حالت روز بروز ابتر ہوتی جا رہی ہے اور پولیس بظاہر بے بس نظر آتی ہے کیونکہ صندوق میں بند سر بُریدہ لاش کے قاتل کو بھی پولیس ابھی تک گرفتار نہیں کر سکی ہے۔

جی ہی جی میں میں اس اخبار والے کو کوس رہا تھا۔ اس نے میرے خلاف لمبی چوڑی بکواس لکھی تھی۔ عینی شاہدوں اور ہادی علی کے مزارعوں سے پوچھ پوچھ کر اس نے میرا حلیہ درج کیا تھا میرے کمبل کی رنگت تک اس نے لوگوں کو بتا دی تھی۔ مطلب یہ تھا کہ لوگ سالے ہر کالے کمبل والے کو روک کر پوچھیں کہ میاں کہیں ہادی علی کو تو نے تو قتل نہیں کیا تھا۔ یہی مطلب تھا اس کا۔

ہنسی مجھے اس بات پر آ رہی تھی کہ اس سالے نثار جیب تراش نے میرے سارے خدشوں کی تصدیق کر دی تھی۔ اس نے مظلوم بن کر پولیس کو یہی بتایا تھا کہ وہ ٹرنک میں نے گاڑی میں رکھوائے تھے۔ جن میں کسی بدنصیب کی لاش کے ٹکڑے بند تھے۔ خود وہ پولیس کے سامنے معزز شہری بن بیٹھا تھا۔ گپ تو وہ بلاشبہ بہت شاندار قسم کی مارتا تھا ایسی کہ سننے والا ایک دفعہ تو سُن ہو کر رہ جاتا تھا۔ وہ جیب کترا اسی قسم کی لن ترانیوں سے کام لے کر اپنے کھمب چھڑا گیا ہو گا۔

کار کا ڈرائیور کوئی بہت ہی بھلا آدمی تھا اس نے راستے میں مجھ سے کوئی بات نہیں کی اور میں بڑے اطمینان کے ساتھ سفر کرتا رہا۔ اس نے ٹھیک نو بجے مجھے لاہور پہنچا دیا اور میں اسے سیدھا آہو صاحب کے دروازے پر لے گیا۔

"لے بھائی سو کے بجائے میں تجھے ایک سو بیس روپے دیتا ہوں بڑی مہربانی تیری" میں نے رقم اس کے ہاتھ پر رکھی تو وہ خوش ہو گیا۔ بولا۔

"آپ کا بہت شکریہ صاحب جی بڑی مہربانی" یہ کہہ کر اس نے گاڑی کا رُخ بدلا اور انہی قدموں واپس چلا گیا۔ اخبار میں نے تہہ کر کے جیب میں ڈال لیا تھا۔

جب میں نے آہو صاحب کے دروازے پر دستک دی تو اندر سے مجھے نالہ و شیون کی صدائیں سنائی دیں۔ کوئی عورت اوپر کی منزل میں بیٹھی بین کر رہی تھی۔

میں نے دستک پر شدّت سے اصرار کیا تو کسی نے دوسری طرف صحن میں تیز تیز قدم چل کر دروازے کو کھولا۔ میرے سامنے کبری کھڑا تھا مگر اس حال میں کہ اس کے چہرے پر بارہ بج رہے تھے۔

وہ خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا جیسے اس کی آنکھیں اس کے ذہن تک کوئی تصویر منعکس نہیں کر رہی ہیں۔

"کیا حال ہے کبری بچے! یہ تو ہونقوں کی طرح میرا منہ کیا تک رہا ہے۔ پہچانا نہیں مجھے۔ ایسے میں......"

"سلام علیکم استاد معاف کرنا۔ میں دراصل کچھ پریشان ہو رہا۔ آؤ اندر آ جاؤ۔"

"ابے پریشانی کیسی ہے تجھے! یہ اوپر کون رو رہا ہے، خیر تو ہے۔"

"وہ استاد! مالکن ہیں میری، سرور خانم! ان کے والد مر گئے ہیں کسی نے انہیں قتل کر دیا ہے۔"

"کیا کہتے ہو یار! کس نے قتل کر دیا ہے انہیں۔ کہاں قتل ہوئے ہیں وہ؟" میں نے حیرت زدہ ہو کر صحن میں قدم دھرتے ہوئے کہا۔

"اندر چل کر بیٹھو! میں ابھی بتاتا ہوں۔ بڑا لمبا چوڑا فساد پڑ گیا ہے۔ پتہ نہیں کیا ہو جائے۔" یہ کہہ کر اس نے میرے لئے کمرے کا دروازہ کھولا اور میرے ساتھ ہی اندر پہنچ کر بولا۔

"تم بیٹھو استاد! دو گھڑی آرام کرو۔ میں تمہارے لئے چائے پانی کا بھی بندوبست کرتا ہوں۔ مالکن بہت پریشان ہیں، پچھاڑیں کھا رہی ہیں۔ میں ابھی آ جاؤں گا۔"

یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکلا اور اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے صحن میں چلا گیا۔

اس کبری سالے نے ہمیشہ ہر بات کو ڈرامہ بنا کر مجھے حواس باختہ کیا تھا اور اب بھی وہ اُلو کا کان یہی کچھ کر رہا تھا۔ میں نے اسٹین گن سامنے کی الماری کے سب سے نچلے خانے میں چھپا کر رکھی اور جوتے اتار کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔ لحاف وہاں موجود نہیں تھا۔ میں نے کمبل اپنے گرد اچھی طرح لپیٹا اور سگریٹ سلگا کر دھوئیں کے مرغولے بنانے لگا۔ میرے سارے بدن پر عجیب طرح کی تھکن طاری تھی۔ میں اپنے منصوبے میں پوری طرح کامیاب ہو کر لوٹا تھا مگر اس بدمعاش کبری نے مجھے بدمزہ کر دیا تھا۔ اس نے یہ تک پوچھنے... کا موقع نہ دیا تھا کہ آہو صاحب کہاں ہیں اور کیسے ہیں۔ سالا مالکن سے کہیں زیادہ پریشان لگ

رہا تھا۔ کوئی پوچھے کہ اس سروری کا تو خیر باپ مرا ہے مگر تیرا کون مر گیا ہے۔ تو کیوں یوں آنسو بہاتا پھر رہا ہے ـــ تیرے اس ناٹک کے تجھے کتنے پیسے دے گی تیری مالکن سروری بیگم۔

دوسری منزل میں شاید کچھ اور عورتیں بھی آ گئی تھیں۔ نالہ و شیون کی صدائیں اور زیادہ گمبھیر ہو گئی تھیں ـــ تیری قسمت ہی پھسڈی ہے جیلانی! تو جہاں گیا ایسے ہی حالات سے دوچار ہوا۔ اب بھلا اس کے مرنے کی خبر کے اس وقت وہاں پہنچانے کی کیا تک تھی بھلا۔ ظاہر ہے کہ وہ کہیں کل دل کو قتل ہوا ہو گا۔ بھئی تم ان کو اسی وقت خبر پہنچا دیتے تاکہ وہ رو دھو کر رات کو دو گھڑی آرام تو کر لیتے۔ اب صبح اس خبر کو وہاں پہنچا کر تم نے جو سارے گھر کو بے آرام اور.... بے چین کیا ہے تو اس سے تمہیں کیا حاصل ہوا؟ میں نے اٹھ کر وہاں غسل خانے میں منہ ہاتھ دھویا اور پھر پلنگ پر جا کر لیٹ گیا۔ کبری کسی طرح آ ہی نہیں رہا تھا۔

میں سخت پیچ و تاب میں تھا۔ مجھے ہر شے الٹ ہوتی نظر آ رہی تھی۔ میں آہو صاحب سے ان کے وعدے کے مطابق آسیہ کی رہائی مانگنے آیا تھا اور وہاں صفِ ماتم بچھی نظر آ رہی تھی۔

کبری کوئی آدھ گھنٹے بعد واپس آیا۔ سالا پہلے سے بھی زیادہ پریشان لگ رہا تھا۔ اپنے ساتھ وہ میرے لئے ناشتہ بھی لیتا آیا تھا ـــ آتے ہی بولا۔

”اوستاد! یہ لے تو چائے تو پی۔ گھر میں تو کسی کو کسی بات کا ہوش ہی نہیں ہے۔“

”ابے کبری! یہ تو زنخا کب سے ہو گیا ہے۔ عورتوں کی طرح رو رہا ہے۔ دیکھ تو تیری آنکھیں کتنی سوجی ہوئی ہیں؟“

”بات ہی ایسی ہے اوستاد! وہ اپنی سروری خانم ہیں نا، میری مالکن، ان کے باپ کو کسی نے گولی مار دی ہے۔“

”تو پھر کیا ہوا۔ آدمی تو مرتے ہی رہتے ہیں۔ تو اس کے نطفے سے تو نہیں ہے؟“

”مذاق نہ کر اوستاد! وہ بہت بڑا آدمی تھا میری مالکن کا باپ! گجرات ضلعے کا سب سے بڑا رئیس تھا وہ۔“

”کیا؟ ضلع گجرات کا۔ تیرا کیا مطلب ہے، کبری؟“

”ہاں ہاں! اس قتل کے تو اخبار چھپ گئے ہیں۔ چوہدری ہادی علی کا نام تو تم نے بھی سنا ہو گا؟“

چائے کی پیالی میرے ہاتھ میں لرز کر رہ گئی۔ ”یہ کیا کہتے ہو تم! وہ ہادی علی جس کی تصویر آج کے اخبار میں چھپی ہے۔“ میرے دل میں ٹیس سی اٹھنے لگی تھی۔ سارا کمرہ مجھے اپنی نگاہوں کے سامنے گھومتا نظر آتا تھا۔

”ہاں ہاں! اسی کی تو بات کر رہا ہوں اوستاد! وہ آہو صاحب کا خسر تھا۔“

”اچھا تو یہ بات ہے۔ اس آہو نے...... یہ اس کا داماد ہوتا ہے۔“ میں نے اپنے آپ پر ضبط کرتے ہوئے کہا۔ حیرت کا پہلا ریلا میرے وجود پر سے گزر چکا تھا۔

”ہاں! اسی لئے تو وہ بھی صبح سے پریشان ہیں۔ ہاکر اخبار دے کر گیا تو میں نے پڑھا نہیں، بس اوپر لے جا کر وہ آہو صاحب کے سامنے رکھ دیا۔ ان کی نظر جونہی اخبار کے پہلے صفحے پر پڑی، ان کا خون ہی خشک ہو گیا۔ بستر سے یوں اچھلے جیسے انہیں خود گولی لگ گئی ہو۔“

”حالانکہ اس خبیث کو خوش ہونا چاہئے تھا۔“ میں نے بے خیالی میں کہا۔ اپنے چہرے پر پھیلتی حیرت کو میں نے دبا لیا تھا۔

”کیا کہتے ہو اوستاد! ایسی کمینگی کی بات تو نہ کرو۔ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ سیاسی قتل ہے۔“

”ابے نہیں! خواہ مخواہ دماغ پچی مت کر، لے سگریٹ پی اور بھول جا اس قصے کو۔ آہو کہاں ہے اس وقت؟“

”وہ تو اخبار سروری بیگم کے آگے رکھ کر اسی وقت گھر سے نکل گئے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے ان کا فون آیا تھا کہ وہ آدھ گھنٹے تک آئیں گے اور گاڑی میں گجرات چل دیں گے۔“

”اچھا! وہ آئیں تو انہیں میرا سلام بولو، کہو میں حاضر ہو گیا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں نے ناشتے پر جلدی جلدی ہاتھ صاف کیا اور پھر کمبل لپیٹ کر سگریٹ پھونکنے لگا۔ کبری برتن اٹھا کر باہر نکل گیا۔ میں نے اسے پھر تاکید کی کہ جیسے ہی آہو آئے اس سے وہ میری ملاقات کرا دے۔ میرے دل سے اس آدمی کی عزت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی تھی۔ وہ ایسا عیار آدمی تھا کہ اس نے ایک تیر سے دو نہیں کئی شکار مار گرائے تھے۔ اس کی منصوبہ بندی کی میں جتنی بھی داد دیتا کم ہوتی۔ وہ بہت ہی کائیاں آدمی ثابت ہوا مگر یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ اس نے اپنے اس رشتے کو کیوں بالائے طاق رکھ دیا۔ وہ صرف بڑے صاحب کو خوش کرنے کے لئے اس آدمی کو ٹھکانے لگوا دینے پر آمادہ نہ ہو سکتا تھا۔ بلاشبہ اس کے مقاصد کہیں زیادہ گہرے اور وسیع تر ہوں گے۔ کسی بڑے فائدے کی امید نے اسے یہ کام کرنے پر آمادہ کیا ہو گا ورنہ وہ خوفناک فیصلہ کبھی نہ کرتا۔

میرے دماغ کی اس وقت جو حالت ہو رہی تھی اس کا اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مجھے اپنے وہ خواب یاد آ رہے تھے جن میں مسند آرا نے مجھ سے روتے بلکتے بار بار یہ کہا تھا کہ میں گولی نہ چلاؤں۔ تو وہ ہادی علی تھا مسند آرا کا باپ جس کے قتل کی اسے پہلے سے بشارت مل گئی تھی۔ اسے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ ہادی علی میرے ہی ہاتھوں قتل ہو گا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ یوں عالمِ خواب میں مجھے کیوں بار بار جھنجوڑتی۔ میرا برا ہو، میں نے ان دونوں خوابوں کو کوئی اہمیت ہی نہ دی تھی۔ میں سمجھا تھا کہ وہ محض میری محبت میں غلطاں ہونے کی وجہ سے مجھے اس راہ پر چلنے سے روک رہی ہے ورنہ اس کا ذاتی مفاد اس میں کوئی نہیں تھا۔ وہ مجھے کسی کے خون سے اپنے ہاتھ رنگ لینے کے بعد کی اذیتوں سے بچانے کے لیے ہی یہ سب کچھ کر رہی ہے، میں تو خدا کی قسم یہی سمجھتا رہا تھا۔ اس کی نادیدہ محبت میرے لیے نعمتِ غیر مترقبہ تھی مگر یہ معلوم نہیں تھا وہ میرے ہی ہاتھوں یتیمی کے صحرا میں جا گرے گی۔ میں ہی اس کی تمام تر تباہیوں کا سبب بن جاؤں گا۔ یہ سب کچھ میرے لیے ناقابلِ یقین تھا۔ حالات جو رخ اختیار کر گئے تھے وہ ایسے تھے کہ میں مسند آراء کی محبت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم ہو چکا تھا، عین ممکن ہے اسے یہ بھی معلوم ہو چکا ہو کہ میں اس وقت آہو کے گھر میں موجود ہوں۔ اس بات کے امکان کو کسی طرح بھی رد نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ اپنی اسی مستقبل بینی کی بے مثال قوت سے سارے حالات معلوم کر کے پولیس کو میرے پیچھے بھیج دے۔ میں نے اس کے باپ کو مار دیا تھا۔ بلا وجہ بے قصور اور بے سبب وہ بھلا مجھے کیسے معاف کر دے گی مجھے یہ احساس ڈسنے لگا تھا کہ میں سارے جہاں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر بچ سکتا ہوں مگر مسند آراء کو خدا نے جو آئینہ سا صاف، شفاف ذہن عطا کیا تھا۔ اس کی رسائی مجھ تک کسی طرح بھی روکی نہیں جا سکتی تھی۔ میں نے چاہا کہ میں آہو کے مکان سے اٹھ کر کسی اور طرف نکل جاؤں مگر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ میں نے جو اتنا بڑا خطرہ مول لیا ہے ایک آدمی کی زندگی سے یوں بے دریغ کھیل گیا ہوں تو میری یہ ساری محنت رائیگاں تو نہیں جانی چاہیے۔ میرے پاس آہو کی تحریریں موجود ہیں۔ مجھ سے اس نے آسیہ کی رہائی کا وعدہ کر رکھا ہے۔ میں اب اس کی گردن پر انگوٹھا رکھ کر بھی آسیہ کو اس سے مانگ سکتا ہوں۔ وہ انکار کر ہی نہیں سکتا۔ اگر وہ اپنے وعدے سے منحرف ہو گیا تو پھر خدا ہی جانتا ہے کہ اس کا کیا حشر ہو گا۔ میں... میں تو اس کے مکان کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔ اس کی چہیتی سروری خانم کو وہاں سے اٹھا کر ٹبی میں بٹھا دوں گا۔ پتہ نہیں میں کیا کر دوں۔ آہو کے بارے میں جو کچھ مجھے کبری نے بتایا تھا وہ بلاشبہ بہت ہی اذیت ناک تھا۔ میں مسند آراء سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے شرمندہ ہو گیا تھا۔ میرے پاس اپنے اس فعل کا کوئی جواز تھا ہی نہیں ـــ کتنی ہی دیر تک میں پلنگ پر بیٹھا اپنے آپ سے الجھتا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں۔ زندگی نے مجھے زبردست مخمصے میں ڈال دیا تھا۔ ہادی علی اگرچہ اسی قابل تھا کہ یونہی سرِ راہے بے سوچے سمجھے اس کا سر اتار لیا جائے کہ وہ زمین کا بوجھ تھا۔ وہ ایسا مردم آزار تھا، جس سے ایک خلقت بے زار تھی۔ اور جب میں نے اسے قتل کیا تھا تو میرا خدا گواہ ہے اس وقت میرے دل و دماغ میں اس کے خلاف شدید نفرت پیدا ہو چکی تھی اور میں نے اس کے سینے میں جو گولی اتاری تھی، وہ ان دو مظلوموں کے نام کی تھی جن کی لاشیں میرے سامنے تڑپ تڑپ کر ٹھنڈی ہو رہی تھیں اور اتنے سارے مجبور و بے بس مزارع اس ہادی علی کے سامنے کھڑے لرز رہے تھے۔ میں نے اس گھڑی خدا جانتا ہے ہادی علی کو اپنے لیے یا اپنی آسیہ کے لیے نہیں مارا تھا میں قدرت کے خوفناک انتقام کی صورت اختیار کر چکا تھا اور اس پر اور پولیس والوں پر خدا کا قہر بن کر ٹوٹا تھا۔ میں نے بلاشبہ اپنے اعمال میں ایک نیکی لکھوائی تھی۔ ہادی علی کے خون میں کاتبِ تقدیر کا قلم ڈوبنے کے بعد جب ابھرا تھا تو مجھے یقین تھا کہ اس نے میرے نامۂ اعمال میں اچھے لفظوں میں میرا ذکر کیا ہو گا۔ میں اپنے اس فعل پر ہرگز نادم نہیں تھا۔ جو کچھ ہو چکا تھا وہ بہت اچھا تھا اسے ہونا ہی چاہیے تھا اگر منہ کالا کسی کا ہوا تھا تو وہ آہو کا تھا اس دل شیر آہو کا جس نے اپنے ہی کسی مکروہ مقصد کے لیے مجھے استعمال کر لیا تھا اور اب میں لٹی پٹی حالت میں اس کے گھر کے اس کمرے میں اس امید پر بیٹھا تھا کہ وہ اپنا وعدہ پورا کرنے آئیگا۔ مگر وہ نہیں آیا۔ دو گھنٹے گزر گئے۔ دوسری منزل سے نالہ و شیون کی صدائیں بھی اب نہیں آ رہی تھیں مگر کبری نے مجھے اپنی شکل نہیں دکھائی۔

اس وقت دن کے بارہ بج رہے تھے کہ کبری تیز تیز قدم اٹھاتا اندر داخل ہوا۔ بولا۔

”اوستاد معاف کرنا مجھے ادھر آنے میں دیر ہو گئی۔ بھاگ دوڑ میں مجھے کچھ بھی یاد نہیں رہا۔“

”ہاں بیٹے! تجھے ہم کہاں یاد رہ سکتے تھے۔ ادھر تیرے مالک کے خسر کا جلوس جو نکل رہا ہے۔“

”بڑے سنگدل ہو اوستاد قسم اللہ کی جو کوئی بھی سنتا ہے دل تھام لیتا ہے مگر تو مذاق اڑا رہا ہے۔“

"تو مذاق کی کہہ رہا ہے، ابے میرا دل تو اس واقعے پر ہنسنے کو چاہتا ہے۔ وہ آہو کہاں ہے وہ چیپڑ قناطیا۔"

میرے منہ سے آہو کے بارے میں یہ لفظ سُن کر وہ حیران رہ گیا۔ بولا۔

"اب آہو صاحب کو گالی بھی دے گا تو، بُری بات ہے اوستاد، وہ تیری اتنی عزت کرتے ہیں۔"

"ابے یہ بتا وہ گیا کہاں ہے وہ چر غینہ۔ میں صبح سے اس کے انتظار میں ہلکان ہو رہا ہوں۔" میں نے اب کی بار ذرا دبنگ لہجے میں کہا۔

"وہ گجرات چلے گئے ہیں، مالکن بھی ان کے ساتھ گئی ہیں جنازے میں شرکت کے لیے۔"

"اور کون گیا ہے اُن کے ساتھ؟"

"کہہ کر گئے تھے کہ کالج سے وہ اپنی سالی کو بھی ساتھ لے کر جائیں گے۔"

"میرے بارے میں بتایا تھا تو نے انھیں؟"

"ہاں، انہوں نے کہا ہے کہ آپ ان کا انتظار کریں — انھیں وہاں دو تین دن لگ جائیں گے۔"

"اور گھر کس کے سپرد کر گئے ہیں وہ؟"

"گھر کی دیکھ بھال میں کروں گا۔ اور کون ہوگا یہاں۔ وہ ساری ذمے داری مجھے دے گئے ہیں۔"

"ٹھیک ہے بیٹے۔ جا پھر کھانا لے آ مجھے بڑی سخت بھوک لگ رہی ہے اور دیکھ ادھر ایک لحاف بھی ڈال دے۔ میں سونا چاہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے اوستاد، میں ابھی لحاف لا دیتا ہوں۔" یہ کہہ وہ جانے لگا تو میں نے اسے ٹھہرا لیا۔

"یہ بتا اس مجیدن کا کیا حال ہے اس سے ملا تھا پھر تو کہ نہیں؟"

"ہاں میں کل گیا تھا اُدھر۔ اس بڑھیا نے مکان خرید لیا ہے اور اب وہ بہت خوش ہیں وہ دونوں ماں بیٹی۔"

"کب ہو رہی ہے مجیدن کی شادی؟"

"اگلے مہینے کی اکیس تاریخ مقرر کر لی ہے انہوں نے؟"

"ٹھیک ہے ہم دونوں چلیں گے اس کی شادی میں۔ مجھے خوشی ہوگی۔ وہ بہت ہی بے آسرا لوگ ہیں۔"

"بے آسرا لوگوں سے تو ملک بھرا پڑا ہے اوستاد، بات کچھ اور ہی ہے جو تو ان پر اتنا مہربان ہے۔"

"وہ میری ماں کی بہن لگتی ہے۔ جا کھانا تیار کر اور لحاف پہلے پہنچا دے ادھر — تجھے تو ہر بات میں گھپلا نظر آتا ہے چل دفع ہو۔"

کبری نے میری بات پر بُرا سا مُنہ بنایا اور چُپ چاپ باہر نکل گیا۔ میں کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ کبری ٹھہر ٹھہر کر میری آنکھوں میں جھانکتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کوئی خاص بات جانتا ہے اور میرے منہ سے اس کی تفصیل معلوم کرنا چاہتا ہے مگر میں کوشش کے باوجود نہ سمجھ سکا کہ مجھ سے کیا سُننا چاہتا ہے۔

کوئی ایک گھنٹے بعد وہ واپس آیا تو ٹرالی میں اُس نے کھانا سجا رکھا تھا میرے لیے اس روز اس نے خاصا اہتمام کیا تھا مُرغ مسلم بریانی فرنی پلاؤ زردہ اور نہ جانے کیا کیا الم غلم وہ اٹھا لایا تھا۔

"ابے یہ اتنی ساری چیزیں تیرا باپ کھائے گا۔ خواہ مخواہ حاتم طائی کا بھتیجا بن بیٹھا ہے۔"

"عیش کر اوستاد! آہو صاحب مجھے کہہ گئے ہیں کہ میں تیرا بہت خیال رکھوں پتہ نہیں کیا سنگھا دیا ہے تو نے اسے۔"

"آہو؟ وہ آہو وہی جو تمھارا مالک ہے، اچھا آدمی ہے کیا خیال ہے تیرا۔ اس نے کوئی قتل شتل بھی کیا ہے کبھی کہ نہیں"

"دفع کر یار! اندر سے سب ایسے ہی ہوتے ہیں — میں نے تمھیں بتایا تو تھا کہ وہ کس کینڈے کا آدمی ہے۔ تو کھانا کھا میں تیرے لیے لحاف بھی لے آؤں۔"

میری بھوک اس گھڑی بہت چمک رہی تھی۔ میں نے تمام چیزوں پر دل کھول کر توجہ دی۔ جب میں نے فرنی کی پلیٹ اُٹھائی تو اس گھڑی کبری اندر داخل ہوا۔

بولا "لے بھائی میں یہ لحاف لے آیا ہوں تیرے لیے۔ ارے یہ فرنی کیوں نہیں کھا رہا ہے تو اوستاد، یہ میں نے خاص طور پر بنائی ہے تیرے لیے۔"

"ابے گھامڑ! یہ دیکھ اس میں تو مکھی دبی پڑی ہے۔" میں نے بدمزہ ہو کر وہ پلیٹ الگ رکھ دی۔ اس میں ایک مکھی صاف نظر آ رہی تھی۔

"اچھا؟ کمال ہے دفع کر لعنت بھیج اس پر میں اور دیتا ہوں تجھے۔" یہ کہہ کر وہ پلیٹ اٹھائے الٹے قدموں چلا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد جب واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک اور پلیٹ تھی جس میں فرنی بھری تھی اس نے یہ اہتمام کیا تھا کہ اس پر چاندی کے ورق بھی لگا لایا تھا۔ وہ فرنی میں نے رغبت سے کھائی۔ کبری اچھا باورچی تھا اور اس نے دونوں کھانے بڑی محنت سے تیار کیے تھے۔

میں کھانے سے فارغ ہوا تو وہ برتن سمیٹ کر باہر گیا۔ میں نے کلی کی ہاتھ دھوئے اور ہر طرف سے مطمئن ہو کر

شاید گیا۔ مگر جب میں نے سگریٹ سلگایا تو مجھے محسوس ہوا کہ سگریٹ بھی ساری لذت کھو چکا ہے میرے منہ کا ذائقہ بدل گیا، مجھے محسوس ہونے لگا جیسے میں ابھی قے کر دوں گا۔ میرا جی متلانے لگا تھا۔ میں نے سگریٹ الگ پھینکے اور بھاگ کر غسل خانے میں جا گھسا۔ مجھے ابکائیاں سی آ رہی تھیں آہستہ آہستہ میرے معدے میں ایسی جلن اُبھرنے لگی تھی کہ اس کا تجربہ مجھے اس سے پہلے زندگی بھر کبھی نہیں ہوا تھا۔

یہ بڑی خوفناک بات تھی میرا سر بھی چکرانے لگا تھا۔ اچانک مجھے قے ہو گئی اور یہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا کہ اس میں خون بھی تھا میرے معدے میں درد کی ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں تب مجھے یہ احساس ہوا کہ مجھے کبری نے زہر دے دیا ہے۔ یہ خیال میرے ذہن میں کوندے کی طرح لپکا اور میں پاگلوں کی طرح کوٹ پہن کر کمبل بدن پر لپیٹ کر باہر صحن میں نکل گیا۔

گیٹ سے ذرا ادھر مجھے باٹی نظر آ گیا۔

"میرے ساتھ آ باٹی جلدی کر مجھے ڈاکٹر کے پاس لے چل جلدی کر۔" میں نے اسے اپنے ساتھ گھسیٹتے ہوئے کہا۔ وہ حیرت زدہ سا ہو کر میرے ساتھ گیٹ تک پہنچا تو مجھے ایک اور قے ہو گئی۔ اب کی بار جو کچھ میں نے کھایا پیا تھا سب باہر نکل گیا مگر اس میں خون اتنا تھا کہ میرا بدن ٹوٹنے لگا۔ نقاہت کا احساس مجھے ڈسنے لگا تھا۔ اس نے بڑے گیٹ کو مقفل کیا اور مجھے سنبھالنے لگا۔

"ٹیکسی پکڑ باٹی جلدی کر۔" میری یہ بات سُن کر وہ تیزی سے آگے بڑھا اور فوراً ہی ایک ٹیکسی روک کر میری طرف لپکا۔ اس نے مجھے بڑی احتیاط سے سنبھالا اور ٹیکسی میں ڈال کر وہ میرے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

"چل بھائی ڈاکٹر باری کے پاس لے چل، مگر جلدی کر۔" باٹی نے تیزی سے کہا۔ وہ بھی سخت گھبرا گیا تھا۔ ٹیکسی نے ہمیں تین ہی منٹ میں ڈاکٹر باری کی دکان پر پہنچا دیا۔ وہ اپنا کام ختم کر کے باہر نکل ہی رہا تھا کہ باٹی نے اسے روک لیا۔

"ڈاکٹر صاحب ان کو دیکھیں ان کا بیڑہ غرق ہو رہا ہے۔" ڈاکٹر رکا اور میرے چہرے پر نظر ڈال کر مطب میں جا گھسا۔ اس نے مجھے بڑے غور سے دیکھا اور بولا۔

"کیا ہوا ہے آپ کو؟"

"مجھے... مجھے شاید زہر دیا گیا ہے مگر مجھے پتہ نہیں وہ کون تھا۔"

"پولیس کیس؟" وہ ذرا پیچھے ہٹا۔

"پولیس پر لعنت بھیج ڈاکٹر۔ یہ میری زندگی کا سوال ہے میرا علاج کرو۔" یہ لو۔ میں نے جیب سے پانچ سو روپے نکال کر اس کے سامنے رکھ دیئے۔ نوٹ دیکھ کر اس کا رویّہ فوراً ہی بدل گیا وہ مجھے نرس کی مدد سے کلینک کے پچھلے حصے میں لے گیا۔ اس نے مجھے یکے بعد دیگرے کئی ٹیکے لگائے۔ مجھے قے کے لیے دوا دی۔ جس سے میرا معدہ بالکل صاف ہو گیا۔ میں وہاں شام تک لیٹا رہا۔ یہ سارا عرصہ بیچارا باٹی باہر ہی بیٹھا میرا انتظار کرتا رہا۔ اسے مجھ سے دلی ہمدردی تھی۔ بار بار اندر آ کر مجھ سے میرا حال پوچھتا رہا۔ اُس کا میں شکر گزار ہوں کہ اس نے اتنی توجہ سے اس روز میری دیکھ بھال کی۔ ڈاکٹر بیچارا بھی اس روز دوپہر کے کھانے کے لیے گھر نہیں گیا۔ آہو کا نام سُن کر وہ اور مروّت سے پیش آیا۔ باٹی نے اسے بتا دیا ہوگا کہ میں آہو کا مہمان ہوں۔ وہ گھر پر نہیں ہے اور اس کی غیر حاضری میں یہ سب کچھ ہوا ہے۔

ڈاکٹر باری کا کلینک دن رات کھلا رہتا تھا۔ رات کو نو بجے تک میری طبیعت بڑی حد تک سنبھل چکی تھی مگر کمزوری اتنی بڑھ گئی تھی کہ میں وہاں سے اُٹھ کر اپنے قدموں پر واپس نہیں جا سکتا تھا۔ نو بجے گھر جانے سے پہلے اس نے مجھے آخری بار دیکھا اور پھر وہ اپنے ماتحت ڈاکٹر کو ضروری ہدایات دے کر اپنے گھر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد باٹی میرے پاس آ بیٹھا بولا۔

"یہ زہر آپ کو کس نے دیا ہے جناب صاب ادھر کیا کھایا تھا آپ نے؟"

"پتہ نہیں کیا ہوا ہے بابا۔ بس وہ کبری نے مجھے جو کھانا دیا اس میں کوئی گڑبڑ تھی۔ اور تو کوئی چیز میں نے نہیں کھائی۔"

"کبری؟" باٹی نے یہ نام منہ میں دو تین بار دہرایا۔ بولا "وہ... بدبخت تو مجھے یہ کہہ کر گجرات چلا گیا ہے کہ اُسے آہو صاحب نے ایک کام بتایا تھا جس کے لیے وہ اُن سے ملنے جا رہا ہے۔"

"کوئی بات نہیں، ہو سکتا ہے یہ میرا وہم ہو۔ بہرحال اب فکر کی کوئی بات نہیں ہے باباجی۔ میں بچ گیا ہوں۔ دوبارہ کوئی یہ ہاتھ نہیں دکھا سکے گا۔" میں نے بڑے پُرعزم لہجے میں کہا۔

باٹی دس بجے تک میرے پاس بیٹھا رہا۔ اور پھر یہ کہہ کر وہ واپس چلا گیا کہ گھر میں اس کے سوا اور کوئی نہیں ہے اس لیے اس کا وہاں ہونا بہت ضروری ہے۔

صبح تک میری طبیعت بہت بہتر ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر اس روز سات ہی بجے مطب میں آ گیا۔ آتے ہی اس نے میرا معائنہ کیا اور بولا۔

"آپ معجزانہ طور پر بچ گئے ہیں مسٹر جیلانی! ورنہ وہ زہر بہت ہی خطرناک تھا۔ ذرا بھی دیر ہو چکی ہوتی تو آپ کا قصہ پاک تھا۔"

"میں آپ کا شکر گزار ہوں ڈاکٹر۔ آپ نے بڑی توجہ دی ہے مجھ پر۔"

"یہ میرا فرض تھا اور پھر آپ کی فیس۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ بچ گئے ہیں۔ آپ کو پانچ سو روپیہ اور دینا ہوگا۔"

اُس کی یہ بات سن کر میں مسکرا دیا۔ وہ اپنے مطلب کی بات کر رہا تھا اور چاہتا تھا کہ اچھی طرح میری کھال ادھیڑ لے۔ میری جیب میں اُس نے ڈھیر سارے نوٹ دیکھ لیے تھے۔

"پانچ سو کی کیا بات ہے ڈاکٹر صاحب، یہ لو میں تمھیں ایک ہزار روپیہ دے دیتا ہوں۔ تم اچھے آدمی ہو یہ لو۔" یہ کہہ کر میں نے اس کی ہتھیلی پر سو سو کے دس نوٹ گن کر رکھ دیئے۔

"اور بھی دوں؟"

"نہیں نہیں! میں نے صرف پانچ سو مانگے تھے۔"

"اپنی زندگی سے زیادہ کوئی شے عزیز نہیں ہوتی ہے ڈاکٹر۔ میری بے تکلفی کو معاف کر دو۔ مجھے تم اچھے لگتے ہو مسیحائی کرتے ہو۔" یہ کہکر میں اس کے پلنگ سے اٹھ بیٹھا۔

"اب اجازت ہے مجھے۔"

"ہاں مگر بہت محتاط رہنا۔ یہ تمھارے کسی دوست نما دشمن کا کارنامہ تھا۔"

"مجھے معلوم ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ پتہ نہیں میرے ہاتھ سے کس کی موت آئی ہے۔" یہ کہہ کر میں نے جوتے پہنے۔ تکیے کی طرف رکھا کوٹ بانہوں میں پھنسایا اور کمبل اوڑھ کر باہر نکل آیا۔ میری تمام چیزیں میری جیبوں میں محفوظ تھیں۔ کلینک میں کسی نے مجھ سے کوئی زیادتی نہیں کی تھی۔ ڈاکٹر مجھے بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ حیرت اسے یہ تھی کہ میں نے اسے اپنے دشمن کا نام پتہ نہیں بتایا تھا اور جس آدمی کے گھر میں ٹھہرا تھا اس کے کردار سے بھی شاید وہ اچھی طرح واقف تھا۔ اس نے مطلب میں میرے قیام کے دوران آبو کا جس لہجے میں ذکر کیا تھا اس میں مجھے گہرے طنز کا رنگ گھلا نظر آتا تھا۔

میں جب دوبارہ آبو کے گھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ کبری ابھی تک وہاں سے غائب ہے۔ بیچارے بانٹے نے میری بہت آؤ بھگت کی۔ بڑا خیال رکھا اس نے میرا۔ ضرورت کی ہر شے اس نے میرے کمرے میں پہنچا دی۔ میں چاہتا تو آبو کے گھر سے اُٹھ کر کسی ہوٹل میں جا ٹھہرتا مگر اس میں مجھے سو خطرے نظر آتے تھے۔

بانٹے نے ٹھیک کہا تھا۔ کبری مجھ پر اپنا ہاتھ آزما کر گجرات بھاگ گیا تھا اپنے گرو گھنٹال کے پاس۔ میرا یہ شبہ یقین میں بدل گیا کہ کبری نے مجھے آبو کے کہنے پر ہی کھانے میں زہر ملا کر کھلا دیا تھا ورنہ کبری کو مجھ سے بھلا کیا کد ہو سکتی تھی۔

وہ تو بات بات پر میرے سامنے کورنش بجا لاتا تھا۔ بہت کرتا تھا وہ میرا اور عجیب سی بات تو یہ ہے کہ میں نے اسے کبھی دکھ نہیں پہنچایا۔ مجھے اس کی تشکر سے لبریز آنکھیں یاد تھیں جو مجھ سے پانچ ہزار روپے لے کر اس رات بھیگ گئی تھیں۔ ایسے آدمی سے کسی کور کسر کی اُمید رکھ ہی نہیں سکتا تھا جو ہوا تھا وہ آبو کا کیا دھرا تھا۔ اب اس کے حساب کا وقت آ گیا تھا۔ اس نے مجھ سے اس آدمی کا سر کٹوا لیا تھا جسے وہ کبھی کسی راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتا تھا۔ مجھے یہ احساس ہو رہا تھا صاحب کا نام اُس نے بیچ میں خواہ مخواہ ٹھونس دیا تھا ورنہ وہ اپنی ہی ڈاڑھی کی جوئیں نکلوا رہا تھا۔ اس نے ہادی علی کو مجھ سے مروا کر کوئی اپنا ہی ارمان نکالا تھا۔ اور اب وہ مجھے بھی ہٹانے پر تُل گیا تھا۔ اُس کا منصوبہ صاف سیدھا تھا۔ چاہتا تھا کہ وہ آدمی جس نے ہادی کو مارا ہے، اگر خود بھی اس سے گزر جائے تو کوئی ایسا نہیں رہے گا جو کسی بھی موڑ پر یہ کہہ سکے کہ ہادی علی اُسی کے ایما پر قتل ہوا تھا اس کے علاوہ میرے اس کے پاس پڑے تھے۔ پھر اس نے مجھے ایسی تحریر دے رکھی تھی اس بات کا دستاویزی ثبوت تھی کہ میرے اور اس کے درمیان بہت ہی اہم سودا ہوا تھا اور اب وہ مجھے لداؤ کی چھت پر تھا اس طرح کہ میں جس کروٹ بھی بیٹھوں لڑھکتا ہوا نیچے جا گروں۔ نیچے جو گہرائی تھی وہ اتنی مہیب تھی کہ میری ہڈیاں سرمہ بن جاتیں۔

میں نے دل میں کہا آبو بیٹے تیرا پنجہ ایسے آدمی سے لڑا ہے جس نے ہر شے ہواؤں کے رحم و کرم پر چھوڑ رکھی ہے۔ جس جہاز کے سارے بادبان پہلے ہی جل چکے ہیں تو اس بدنصیب بھڑک کر خود بھی راکھ ہو جائے گا۔ تو نہیں جانتا کہ میں وہ پتھر ہوں جس پر گھس کر ہر شے جل جاتی ہے اپنا وجود ہی کھو دیتی ہے۔ تو نے ایسے سوداگر کے ہاتھ اپنا مال بیچا ہے جس کے اونٹوں پر بدنصیبی لدی ہے تو کیا پائے گا مجھ سے۔ کچھ بھی نہیں۔ جب تو اس گرداب سے نکلے گا تو تجھ سے اپنی بھی شکل نہیں پہچانی جائے گی دکھیارہ تو مایا پتر ہے تو میں مایا روپی ہوں۔ تیرا تو میں ستیاناس مار دونگا۔ آبو سے سگ نہ بنا دیا تجھے تو سمجھنا مجھے میری ماں نہیں کُتیا نے پالا ہے۔

وہ رات اور اگلا پورا دن تو میں نے آبو کے کمرے میں سلگتے گزار لیا مگر جب میں نے دیکھا کہ ان دونوں میں سے کوئی نہیں لوٹا ہے تو میں نے شام کو وہ کمرہ چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا۔ محسوس ہو رہا تھا کہ میں ان کے گھر میں ہوں وہ مجھ پر کسی بھی وقت کسی بھی طرف سے وار کر سکتے ہیں۔ ایسے میں میں کسی لمحے بھی...

میں آ جاؤں گا۔ اور وہ چُپ چاپ گھر کے پچھلے آنگن میں میری تیں دفن کر دیں گے بے گور و کفن دبا دیں گے وہ مجھے اور قیامت تک کسی کو معلوم بھی نہ ہوگا۔ وہ غلام جیلانی کیا ہوا جو پھانسی کی کوٹھڑی سے بھاگ نکلا تھا۔

میں نے اسٹین گن نکال کر کمبل کے نیچے رکھ کر کندھے پر لٹکائی اور بانٹے سے یہ کہہ کر میں وہاں سے چل نکلا کہ میں چار دن بعد پھر آؤنگا۔

بانٹے نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا جب سے وہ زہر خورانی کا واقعہ پیش آیا تھا وہ اپنی جگہ بہت پریشان تھا اور اس خیال سے ہی خوفزدہ تھا کہ وہاں کوئی ہنگامہ نہ اُٹھ کھڑا ہو۔

میں نے آبو کے گھر سے نکل کر ریلوے لائن عبور کی اور اپنی یادداشت کے سہارے چلتا ہوا مجیدن کے گھر جا پہنچا۔ میں نے اس خیف و نزار دروازے پر دستک دی تو چند ہی ثانیوں میں کسی نے دروازہ کھول دیا۔ سامنے مجیدان کھڑی تھی۔ اس روز وہ بہت صاف ستھرے سے نئے گلابی رنگ کے سوٹ میں ملبوس تھی اور اسی رنگ کا اس نے دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ بے ساختہ لہجے میں بولی۔

"بھائی جان آپ! آئیے آئیے اندر آئیے۔ اماں دیکھ تو کون آیا ہے۔" وہ کلیلیں بھرتی ہوئی کوٹھری میں جا گھسی اور پھر اس کی آواز کی بازگشت صحن میں گونج ہی رہی تھی کہ تینوں بچے بھی نکل آئے۔ اُن کے پیچھے مجیدن کی ماں بھی دوپٹہ سنبھالتی ہوئی باہر آگئی اور مجھے دیکھتے ہی بولی۔

"دھن بھاگ جو میرا پتر آیا۔ اری تیل چوا اُدھر دہلیز پہ، تیرا بھائی آیا ہے تیرا راجہ ویر آیا ہے۔" اس کا چہرہ مجھے دیکھ کر تمتما اٹھا تھا۔ "اندر آجا بیٹے۔ ادھر اندر آجا۔" یہ کہہ کر وہ ایک طرف ہٹی اور میں ان کی کوٹھڑی میں جا کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ بچے مجھے یوں دیکھ رہے تھے جیسے کوئی مہابلی ان کے گھر آگیا ہو۔ چند ہی دن پہلے اس گھر کی یہ حالت تھی کہ نہ چولھے میں آگ تھی، نہ گھڑے میں پانی مگر اس بڑھیا نے میرے دیئے ہوئے دس ہزار روپوں کو بڑے سلیقے سے استعمال کیا تھا۔ گھر کی صورت نکھری نکھری نظر آتی تھی۔ کوٹھری میں چار چارپائیاں پڑی تھیں جن پر صاف ستھری چادریں بچھی تھیں۔ ایک طرف چھوٹی سی تپائی پر چھوٹا سا ریڈیو پڑا تھا۔ گھر میں چار دن طرف سفیدی ہو چکی تھی۔ چند ہی دنوں میں ان لوگوں نے اپنے سارے دلدر دھو ڈالے تھے۔

"یہ گھر خریدا ہے تم نے کہ نہیں؟"

"خرید بھی لیا بیٹے۔ رجسٹری بھی کروالی میں نے۔ میں نے تو زاد راہ بنوا لی تھی۔" بڑھیا نے خوش ہو کر کہا۔

"کب شادی کر رہی ہو اس بچی کی؟"

"بس وہی تاریخ جو تم نے دی تھی۔ اگلے مہینے کی اکیس انگریزی کے حساب سے۔"

"بہت اچھا کیا ہے تم نے اماں، یہ بوجھ اتار ہی دینا چاہیے ہماری یہ بہن بیاہی جائے گی تو ہماری فکر دور ہو جائے گی۔"

"اللہ تجھے اتنا دے بیٹا کہ تو شمار نہ کر سکے، گن نہ سکے۔۔۔ میرے دل سے تو دن رات تیرے لیے دعائیں نکلتی ہیں۔"

"زیادہ دعائیں نہ مانگا کر اماں! اُدھر اوپر جو فرشتے ہیں ان کے حساب کتاب میں گڑبڑ ہو جاتی ہے۔ کیا پکایا ہے تو نے آج؟"

"ساگ اور مکئی کی روٹی ہے بیٹے۔ چل ری تازہ پکا کے دے بھائی کو۔ چل۔"

مجیدن بھاگ کر چولھے کے پاس جا بیٹھی۔

"میں دو چار دن یہاں رہوں گا اماں! تمھیں کوئی دقت تو نہ ہوگی۔"

"آئے ہائے کیسی باتیں کرتا ہے تو بیٹے۔ ماں کے پاس رہے گا اور کہتا ہے ماں کو دقت ہوگی۔ یہ تیرا گھر ہے میرے بچے۔ ہٹ رے میں ذرا بستر ڈھنگ سے بچھا دوں۔" اُس نے تینوں بچوں کو دیوار کے ساتھ لگی چارپائی پر سے اتارتے ہوئے کہا۔

کوٹھری میں باہر سے اُپلوں کا دھواں دھنسا چلا آ رہا تھا۔ اس کی فضا میں عجیب سی ناگوار بو پھیلی تھی۔ وہ بلاشبہ اس گھر کا ایک حصہ تھی مگر میری ناک اس سے بالکل نا آشنا تھی۔ مجھے یہاں ٹھیرتے ہوئے یہ احساس ہو رہا تھا کہ ادھر مجھے کسی بھی شے کا آرام نہیں ملے گا۔ دن کو وہاں مکھیاں ہوں گی اور رات کو مچھر۔ پھر بھی میں نے یہی فیصلہ کیا کہ جس طرح بھی ہو سکے مجھے دو چار دن وہاں گزار لینے چاہئیں۔ آبو کی واپسی کا انتظار مجھے وہاں بیٹھ کر ہی کرنا چاہیے تھا۔

کچھ ہی دیر بعد مجیدان کٹورے میں ساگ اور چنگیر میں مکئی کی روٹیاں رکھ کر اندر لے آئی۔ مکھن کا تو اُدھر تصور ہی محال تھا پھر بھی وہ بناسپتی سے روٹیاں تر کر لائی تھی۔ ساگ اس نے بہت اچھا پکایا تھا اور روٹی بہت میٹھی تھی جو میں نے پیٹ بھر کر کھائی اور پھر اللہ کا شکر ادا کر کے دیوار کے ساتھ لگی چارپائی پر حالانکہ دیر تک بیٹھے اور نے جو لحاف مجھے دیا تھا اس میں بھی مجھے وہ قے آ بچنے کے لیے میں نے کمبل اس کے ساتھ

میری انا کا امتحان لینا مقصود تھا۔ رب! ہو سکتا ہے انہیں بہت دیر ہو کو مسہل کی ضرورت تھی۔ میں نے خود تلا تھا اور اس کے چہرے پر وہ جو اور وہ رات میں نے اس کُنبے کے ساتھ کاٹی تھی۔

جس کے افراد کو زندگی کے شعبے سے کچھ بھی مہمان کا انتظار کروں گا۔"

آنکھوں میں رچی بھوک اور گرسنگی دل کو ہلاتے دیکھے نا؟"

ہے۔"

تو نہال ہو ہو جاتی تھی۔ بڑھیا دنیاداری کے فن سے خوب آشنا تھی اور میرا خیال ہے کہ آدمی جب ذلت کی اس حد تک نیچے گرا ہوتا ہے تو اس کے لبوں سے تشکر، کلمۂ صبر کے سوا اور کچھ نہیں نکلتا۔ وہ زردار کو دیکھ کر اس کی جوتیاں چاٹ لینا اپنے لیے باعثِ رحمت تصور کرتا ہے۔ میں نے ان بچوں کے لُتڑوں پر اس مجیدن کے رخسار پر اس بڑھیا کے جھریوں کی لپیٹ میں آتے ہوئے اجڑے ویران چہرے پر ایسی ایسی حیرتیں اس رات دیکھیں کہ میں اپنی ساری زندگی انہی لوگوں کی خدمت میں گزار دوں۔ عمر بھر انہی کا پانی بھرتا رہوں تاکہ وہ چہرے تابناک ہو جائیں۔ زندگی کی آنکھ سے آنکھ ملا کر بات کر سکیں۔

صبح اُٹھ کر میں نے غیر متوقع طور پر بڑھیا کے ہاتھ پر دو ہزار روپیہ رکھ دیا۔

"اماں بازار سے مجیدن کے جہیز کے لیے کچھ چیزیں خرید لا۔ گھر میں جس جس چیز کی ضرورت ہے وہ بھی لے آ۔ اور کچھ اگر بتیاں بھی لے آ تیرے گھر سے یہ بدبو نہیں نکل رہی ہے اور دیکھ یہ جو تو ادھر اتنی دور سے پانی لاتی ہے نا یہ قصہ بند کر اور ادھر آج ہی ایک پمپ لگوا کر اس کے گرد غسل خانہ بنوا لے۔"

"ٹھیک ہے بیٹا، بالکل ٹھیک ہے۔ میں پمپ تو سب سے پہلے لگواتی ہوں اور غسل خانہ بھی آج ہی بنوا لیتی ہوں۔ تیرا میں کس منہ سے شکر ادا کروں بیٹے تو تو ہمارے لیے رحمت کا فرشتہ بن گیا ہے۔"

"پھر وہی باتیں! بیٹے کو ذلیل کرتی ہو۔ جاؤ شاباش ۔۔۔ آج ہی یہ سب کچھ ہونا چاہیے اور دیکھ میں ادھر اندر ہی بیٹھوں گا کسی سے مت کہنا کہ تیرے گھر میں کون آیا ہے، لوگ سو باتیں بنائیں گے۔"

"تو فکر نہ کر بیٹے میں بھلا کسی سے کیوں کہوں گی۔"

"بیشک کہتی پھر۔ یہ نہ سمجھ کہ میں کوئی منہ چھپا کر بیٹھا ہوں یا کسی سے گھونگھٹ نکالتا ہوں یہ بات نہیں ہے بس مجھے تیری عزت زیادہ عزیز ہے۔ جا اب یہ کام نپٹا دے۔"

یہ کہہ کر میں پھر چارپائی پر لیٹ گیا۔

تک وہاں سے عاجز ... روز بہت پھرتی دکھائی۔ وہ پانچ سو کی۔ بڑا خیال رکھا اس نے بڑھیا بھر ریت دس بجے سے پہلے کمرے میں پہنچا دی۔ میں چاہتا وہ ساتھ ہی لے آئی۔ شام تک میں جا ٹھہرتا مگر اس نے مجھے پمپ بھی نصب کروا لیا۔ مستری بانٹنے ٹھیک کہا تھے اور وہ بڑھیا کے لیے زیادہ تردد بھاگ گیا تھا اپنے گھر۔

بدل گیا کہ کبھی اس گھر کی صورت بہت بہتر ہو چکی تھی۔ بلیسہ ہو ملا کر کھ۔

تو کیا نہیں ہو سکتا۔ اس گھر کی دنوں میں کایا پلٹ ہو گئی تھی۔

میں دن بھر اندر بیٹھا رہا اور بڑھیا بچوں کو لے کر بازار جاتی رہی۔ دن بھر اس کے ہاں ہمسایوں کا تانتا بندھا رہا اس سے یہی پوچھتی تھیں کہ سونے کی کان اس کے ہاتھ کہاں سے لگ گئی ہے آنا پیسہ اسے کہاں سے مل گیا ہے۔ جو وہ راتوں رات گھر میں ضرورت کی اتنی ساری چیزیں بھر کر بیٹھ گئی ہے اس کے گھر کے چاروں طرف جو افلاس تھا اس کا اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اور میں سوچتا تھا کہ اس بڑھیا کو تو مجیدن کے لیے خدا نے اتنا کچھ دے دیا ہے اُن کے دن کیسے پھریں گے؟ انھیں غلام جیلانی کہاں سے میسر آئے گا۔ اور کب؟ مگر یہ ایسا سوال تھا جس کا جواب تو شاید کاتبِ تقدیر ہی دے سکتا تھا۔ میں تنہا اپنا لہو کس کس آنگن میں بکھیر سکتا تھا۔ وہاں تو ہر آنگن زہر میں بجھا ہوا تھا۔ ان لوگوں میں سے ہر ایک موت مانگتا پھرتا تھا کسی کے چہرے پر کوئی رونق تھی نہ زندگی کی رمق۔ سب کے سب اس دنیا میں آ گئے تھے اور لد جانے کے لیے شعوری طور پر تیار بیٹھے تھے۔ وہ ارسطو کے معاشرے کا وہ حصّہ تھے۔ جو کھیتوں میں کھاد اور کارخانوں میں ایندھن کے طور پر استعمال ہوتا تھا مگر میں ان بدنصیبوں کے گرد کھڑی اونچی موٹی دیوار کو کس طرح گرا سکتا تھا، کہ ان کا حصار تاریخ کی تہہ در تہہ جڑھی بے الضافیوں سے تعمیر ہوا تھا۔ خدا کی اس وسیع و عریض دنیا میں آ کر یہ اس حد تک سکڑ چکے تھے کہ ان کا وجود عنقا معلوم پڑتا تھا۔ پھر بھی وہ مطمئن تھے کہ انہیں صبر کی عادت پڑ گئی، شکر ادا کرنے اور کرتے رہنے کا سلیقہ آ گیا تھا۔

تیسری رات میں نے اماں سے کہا کہ وہ کسی طرح یہ معلوم کرے کہ آہو یا کبری گھر واپس آ چکے ہیں کہ نہیں۔ میں نے اسے سمجھا دیا کہ میرا ذکر کسی سے ہرگز ہرگز نہ کرے مگر وہ کوئی بہت ہی بھولی بھالی قسم کی عورت تھی۔ بعد کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ اس عورت کی بے وقوفی نے مجھے خواہ مخواہ موت کے منہ میں ڈال دیا تھا۔ آدھ گھنٹے بعد وہ واپس آ گئی ۔۔۔ تو بولی "بیٹا وہ دونوں آج شام واپس آ گئے ہیں۔ اور اس وقت گھر پر ہیں۔"

"یہ بات تجھے کس نے بتائی ہے اماں۔"

"وہ ان کا نوکر کبری ہے نا، اسے تو میں نے گلی میں سے گزرتے دیکھا تھا۔ پھر ان کے گھر کی نوکرانی ہے نا چاندنی بوا وہ مجھے مل گئی تھی۔"

"کیا بتایا ہے اس نے۔"

"وہ کہتی ہے کہ آہو کا سسر قتل ہو گیا ہے وہ اس کے جنازے کے لیے گجرات گئے ہوئے تھے۔ سُنا ہے اس کے کسی پرانے دشمن نے اسے مار دیا ہے۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو اماں! میں ذرا اُس سے مل آؤں۔ تھوڑی دیر بعد آ جاؤں گا۔"

یہ کہہ کر میں نے کمبل اوڑھا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا میں آہو کے گھر کی طرف چل دیا۔ اس وقت تک یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ اُس بڑھیا نے اُن حرامزادوں کو میرے بارے میں پوری اطلاعات فراہم کر دی تھیں۔

میں ریلوے لائن عبور کر کے گوبھی کے ایک کھیت کے کنارے کنارے چل رہا تھا کہ اچانک میرے سامنے کوئی بیس قدم دور ایک شعلہ سا لپکا۔ ڈز کی آواز پیدا ہوئی اور ایک گولی سنسناتی ہوئی میرے کندھے کے اوپر سے گزر گئی۔ میری جان سخت خطرے میں تھی۔ میں نے جھوٹ موٹ ایک چیخ ماری اور فوراً نیچے بیٹھ کر منڈیر کی اوٹ میں لیٹ گیا۔ مجھ پر کسی نے اندھیرے میں چھپ کر وار کیا تھا۔

میرے دشمن نے مجھے گرتے دیکھا میری بلند چیخ سُنی تو سمجھا کہ اس نے میدان مار لیا ہے۔ وہ تن کر کھڑا ہوا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا میری طرف بڑھنے لگا اب وہ میری زد میں تھا۔ میں چُپ سادھے لیٹا رہا۔ اس حال میں کہ اپنا سائلنسر لگا پستول میں نے سیدھے ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔ وہ مجھ سے ابھی دس قدم دور تھا کہ میں نے اس کے سمت کو اندھیرے میں تاک کر گولی چلا دی میرا نشانہ خطا نہیں گیا۔ گولی اس کے سینے میں لگی اور وہ زخمی درندے کی طرح اچھل کر آگے گرا۔ میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ تیزی سے اپنی جگہ پر سے اُٹھ کر میں اس کے سر پر جا پہنچا مگر جب میں نے اس کی صورت دیکھی تو میں حیران رہ گیا کیونکہ میرا دشمن میرا اپنا یار کبری تھا۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا تھا۔ اس کی صورت دیکھتے ہی میرا دماغ اُلٹ گیا میں نے بڑے غصے سے اس کے منہ پر تھوکا۔ وہ بُری طرح کراہ رہا تھا۔ مگر مجھے اب اس سے کوئی ہمدردی نہیں رہ گئی تھی۔ وہ اسی قابل تھا۔ وہ محسن کُش ۔۔۔ وہ کسی بھی رو رعایت کا حقدار نہیں تھا۔ غصہ مجھے اس بڑھیا پر آنے لگا تھا جو میرے دشمنوں کو خبردار کر آئی تھی اور انھوں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر مجھے اپنے پتال جنتر پر رکھ لیا تھا تاکہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میرا تیل نکال کر مجھے ٹھنڈا ٹھار دل بہار کر دیں۔

میں نے کبری پر الوداعی نظر ڈالی اور اپنا کمبل جھاڑتا ہوا آہو کے گھر کی طرف چل دیا۔ مجھے اب بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ مجھے ان لوگوں نے ایسی چڑیا نوچن میں ڈال دیا تھا کہ میں اپنے سائے سے بھی بدگمان ہونے لگا تھا۔ وہ آہو مجھے اچھی طرح تباہ کر چکا تھا۔ اور میری چیتک اب وہ کبری اپنے حصے میں ڈال رہا تھا۔ اس کا تو میں نے بندوبست دوامی کر ہی دیا تھا اب مجھے آہو سے نپٹنا تھا جو نہیں چاہتا تھا کہ میں اس سے اپنا حق طلب کروں۔ وہ سمجھتا ہو گا کہ اس طرح مجھے ہلاک کر کے وہ مجھ سے اپنی جان چھڑا لے گا۔ اس نے شاید میرے ماتھے پر لکھا پڑھ لیا تھا کہ میں بس یونہی بھٹن بھٹن گوپال ہوں مٹی کا مادھو ہوں۔ سوچ نہیں سکتا ہوں۔ وحشی تو ضرور ہوں مگر ہمرنگِ زمین دام کو پہچان نہیں سکوں گا۔ یہی سوچ رہا تھا وہ گیدڑ کی اولاد۔ اسی لیے اس نے کبری کو میرے پیچھے لگا دیا تھا مگر یہ اس کی محض خوش فہمی تھی۔ کاش وہ مجھے اچھی طرح سمجھ سکتا میرے ٹھناکے کو اتنا معمولی نہ سمجھتا، کیونکہ میں تو وہ ہوں کہ... جس کسی سے بھی ٹکرایا ہوں اسے بھسم کر کے لوٹا ہوں۔

اپنے اندر میں بڑا جسّ پاتا تھا، پھر بھی اس آہو کے ٹیٹک منتّے نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔ زندگی کے اس ریتا پھیر نے میرا سر چکرا دیا تھا۔ ابھی اس کبری سالے کی گولی کام کر جاتی تو میں لمبا لیٹ چکا ہوتا اس گوبھی کے کھیت میں اور وہ کُتّے کے بچے میری لاش وہاں سے اٹھواتے تھوڑی! وہیں پڑی رہنے دیتے۔ اور میں صبح تک ایسا ہو گیا ہوتا کہ جو کوئی مجھے دیکھتا وہ خوفزدہ ہو کر بھاگ نکلتا۔ رات کو جنگلی جانور میرا بھرکس نکال کر میری بتیسی ننگی کر دیتے اور نظر میں یوں آتا جیسے ہنس رہا ہوں۔ اس کبری بچے کا بھی اب یہی حال ہو گا۔ پڑا مرتا ۔۔۔ رہ سالے ادھر ہی۔ وہ تیرا یار آہو آئے گا تو تو یہاں سے اٹھے گا۔ اگر اس نے بھی دل کے آنکھوں کے کانوں کے اور تیری طرف سے اپنی دوسری اندریوں کے پٹ بھیڑ رکھے تو پھر تیرا خدا ہی حافظ ہے میرے بچے میرے پرانے جیب کترے۔

کبری پر لعنت بھیجتا ہوا میں تیز تیز قدم اٹھاتا آہو کے گھر جا پہنچا۔ دروازہ بند تھا۔ میں نے دستک دی تو کوئی پانچ منٹ بعد بائی بابا نے دروازہ کھولا۔ وہ بہت سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہوئے بولا

"جناب صاحب وہ آہو صاحب تو گھر پر نہیں ہیں۔"

"کہاں ہیں؟"

"کہیں باہر گئے ہیں۔ شام کو آئے تھوڑی دیر بیٹھے اور پھر باہر نکل گئے۔"

"کب تک آئیں گے؟"

"پتہ نہیں جناب صاحب! ہو سکتا ہے انہیں بہت دیر ہو جائے۔" اس کا اندازہ بہت نپا تلا تھا اور اس کے چہرے پر وہ جو بشاشت تھی وہ پھٹکار میں بدل چکی تھی۔

"تو ٹھیک ہے تم کمرہ کھولو۔ میں ان کا انتظار کروں گا۔"

"آپ کا نام جناب صاحب غلام جیلانی ہے نا؟"

"ہاں یہی نام ہے۔ پہلی بار دیکھ رہے ہو مجھے۔"

"جی نہیں۔۔ وہ۔۔۔ وہ جناب صاحب آپ کو آہو صاحب نے کہا ہے کہ آپ آئیں تو آپ کو اندر نہ بٹھاؤں " بانی بابا نے بڑی مشکلوں سے اپنے مالک کی بات مجھ تک پہنچائی۔

"کیا؟ کیا کہتے ہو تم؟ مجھے نہیں جانتے۔ ان سے بہت ضروری کام ہے مجھے۔ وہ کبری کہاں ہے اسے بلاؤ۔"

"وہ بھی کافی دیر سے باہر گیا ہوا ہے جناب صاحب۔"

"اچھا تو پھر مجھے بٹھاؤ گے نہیں۔" میرے منہ کا ذائقہ بدلنے لگا تھا۔

"جی نہیں جناب صاحب مجھے افسوس ہے مالک کا یہی حکم ہے۔ آپ صبح تشریف لے آئیں۔" یہ کہکر اس نے بھڑاپ سے دروازہ میرے منہ پر بند کیا اور دوسری طرف سے ارل چڑھا کر صحن کی طرف چلا گیا۔ میرے اندر کوئی شے تڑاخ سے ٹوٹ گئی۔ میری انا کی ساری اسب اڑتی جا رہی تھی۔ آہو نے مجھے دھتکار دیا تھا۔ وہ گھر کے اندر موجود تھا مگر مجھ سے ملنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ حال کیا تھا اس نے میرا۔ اور اپنے وعدوں کا مجھے وہ سارا قصّہ ہی غلط ہوتا نظر آرہا تھا اور اسیہ آہنی سلاخوں کے پیچھے میری منتظر تھی۔ وہ کیا سوچتی ہوگی تیرے بارے میں۔ وہ کیا رائے قائم کرے گی جیلانی!

آہو کے گھر کا وہ بڑا سا آبنوسی لکڑی کا بنا ہوا بہت ہی خوبصورت بند دروازہ میرا مذاق اُڑا رہا تھا۔ میں جو بڑا کوہِ الوند بنا پھرتا تھا، پل بھر میں سکڑ کر ذرّہ بن گیا تھا۔ اتنی سکت میرے اندر نہیں رہی تھی کہ میں اس دروازے کو توڑ دیتا۔ کہ مصلحتوں نے میرا دامن پکڑ رکھا تھا۔ یہ تو سچ ہے کہ میری گردن آہو کے ہاتھ میں آگئی تھی وہ مجھے کسی بھی وقت پولیس کے پاس فروخت کر سکتا تھا۔ شاید اب بھی اسے پچاس ہزار روپیہ انعام مل جاتا۔ کیونکہ میرے سر کی ان لوگوں نے یہی قیمت مقرر کی تھی مگر اس سے آگے بھی تو بہت کچھ تھا۔ اس سے آگے آہو کی گردن شکنجے میں آتی تھی۔ میں بھی تو منہ میں زبان رکھتا تھا۔ میں بھی تو پولیس کو عدالت کو اور عدالتِ عالیہ کو بتا سکتا تھا کہ میں نے ہادی علی کو کیوں قتل کیا تھا۔ میں جو آڑے پکڑتا وہ آہو صاحب کو بے آڑ کرنے کے لیے بہت کافی ثابت ہو سکتی تھی۔ آپ تو میں ڈوبتا ہی مگر جہان کو بھی ساتھ لے ڈوبتا۔ یہی وجہ تھی کہ آہو میرے سامنے آنے سے گریزپا تھا اور پولیس کو بھی میرے بارے میں کوئی بات بتانے سے ڈرتا تھا ورنہ تو اب تک کب کا مجھے چکی کے پاٹ نیچے دبا چکا ہوتا۔ اتنا نیک بچّہ تو وہ ہرگز نہیں تھا کہ مجھے وہ بلا وجہ چھوڑ دیتا۔

ابھی اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ میں نے کبری کو کہاں پہنچا دیا تھا۔ اس کی موت کا جو بلاشبہ کتے کی موت تھی مجھے بے حد افسوس تھا اس بِر کٹے کو یہ احساس نہ ہوا کہ وہ کیا کرنے جا رہا ہے۔۔ وہ بھی سالا مجھ سے نفرت ہی کرتا تھا۔ مگر میں نے بھی قسم کھائی تھی کہ اس کو زیادہ اہمیت دوں گا ہی نہیں۔ اب وہ جس آڑے اگواڑی پر لگ گیا تھا اس میں شاید آہو سے چار چھلڑے اسے مل جاتے مگر میں تو شاید اُس کے منہ میں کہیں زیادہ چھپھلا چکا تھا۔ پھر بھی اُس کی تسلی نہیں ہوتی تھی اب اُس کی چھاتی کو سر لیجیے کہ اس نے چند ٹکوں کی خاطر اور آہو سے اپنی وفاداری نبھانے کے لیے مجھ پر وار کر دیا جو اگر خالی نہ جاتا تو میں کہاں جا چکا ہوتا۔

چند منٹ تک میں گم صُم سا کھڑا اس دروازے کو تکتا رہا اور پھر مایوس ہو کر وہاں سے واپس چل دیا۔ اس تک پہنچنے کے لیے اب مجھے کسی اور ہی دروازے کی ضرورت تھی۔ کسی اور ہی راہ سے اب مجھے اس کی گردن تک پہنچنا تھا اور مجھے سمجھ نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں۔ معاملہ ایسا نازک تھا کہ جب تک آہو خود آگے بڑھ کر اسیہ کے لیے جیل کا دروازہ نہ کھولتا وہ وہاں سے نکل ہی نہیں سکتی تھی۔ اور میری یہ حالت تھی کہ مایوسی کے اس اتھاہ اندھیرے نے میری ذات کو اور تر بتر کر کے رکھ دیا تھا۔ میں بڑے بوجھل بوجھل قدم اٹھاتا ایک اور راستے سے ہوتا ہوا بڑھیا کے گھر جا پہنچا۔ اس نے مجھے صحن میں دیکھا تو چھوٹتے ہی بولی۔

"اچھا ہوا بیٹے تم آگئے مجھے بڑی فکر لگی ہوئی تھی۔"

"کیوں تجھے کیا فکر لگی تھی میری؟"

"وہ۔۔۔ وہ اُدھر کہتے ہیں کوئی آدمی مرا پڑا ہے۔ کسی نے اُسے قتل کر دیا ہے۔"

"اور تو سمجھی کہ وہ میں ہی ہوں گا۔ یہی سمجھی تھی نا تو؟" میں نے خلافِ درشت لہجے میں کہا۔

"نہیں نہیں بیٹے! خدا نہ کرے تجھے تو میری اور میرے لال بچوں کی بھی عمر لگ جائے۔ یہ بات نہیں تھی۔ میں تو تیری سلامتی کی دعائیں مانگ رہی تھی بیٹا۔"

بڑھیا بہت ہی سادہ تھی۔ وہ دراصل اس قتل کی خبر مجھے سُنا رہی تھی مگر اس کے لفظ جو تاثر دے رہے تھے وہ ان سے بالکل بے خبر تھی۔

"میری اتنی فکر نہ کیا کر اماں! مجھے کچھ نہیں ہوتا۔ تو جا دیکھ کون مرا ہے ادھر اور کیا قصّہ ہے۔ مگر رہنے ہی دے۔ تیری ہمت ماری گئی ہے۔ کوئی ضرورت نہیں تجھے ادھر جانے کی۔"

میں نے کوٹھری میں جا کر چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ میں سخت پریشان ہو رہا تھا۔ آدھ گھنٹہ گزر گیا مگر میں کوئی فیصلہ نہ کر سکا میرا دل چاہتا تھا کہ میں وہاں سے فوراً نکل جاؤں کیونکہ آہو جانتا تھا کہ میں بڑھیا کے گھر میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ وہ مجھے کبری کے قتل کے الزام میں گرفتار کرا سکتا تھا۔ کرنا اسے صرف یہ تھا کہ وہ ایک ٹیلیفون کر کے

اپنا پستول کھیت میں سے اٹھاتا اور اسے کہیں چھپا دیتا اس کے بعد وہ ٹیلیفون پر پولیس کو اطلاع دیتا کہ ادھر کھیتوں میں اس نے کسی کی لاش دیکھی ہے اسے اپنا نام بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ معاملہ بالکل سیدھا سادا تھا۔

پولیس لاش تک پہنچتی تو وہ تھانے والوں کو بڑھیا کے گھر کی نشاندہی کروا دیتا۔ اپنا نام بتائے بغیر وہ پولیس کی رہنمائی کر سکتا تھا۔ بعد میں وہ تھانے پہنچتا اور کہتا حضور یہ تو میرے نوکر کبری کی لاش ہے۔ پولیس مجھے بڑھیا کے گھر سے پکڑ لیتی اور اس کے سامنے لے جاتی تو وہ یہی کہتا کہ جناب اسی نے کبری کو قتل کیا ہوگا یہ فلاں آدمی ہے اور اس کا نام یہ ہے۔ نہ کوئی اونچا سنتا نہ کان پہ ہاتھ رکھتا۔ سارا قصہ ہی پاک ہو جاتا میرے خدشے دم بدم بڑھتے ہی جاتے تھے میرے خوف کی آنت آہستہ آہستہ پھیلتی ہوتی جا رہی تھی۔ اور وہ جو مجھے اپنے اوپر تصرف اور اعتماد حاصل تھا وہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ وہ کوٹھری میرے لیے کسی بھی طرح محفوظ نہ رہی تھی کہ سامنے کھیتوں میں کبری کی لاش پڑی تھی ریلوے لائن کے اس پار اور اس کی وجہ سے علاقے میں ہاہا کار مچ گئی تھی۔ آہو کوئی بھی غلط قدم اٹھا سکتا تھا۔

میں بڑھیا کے گھر میں بیٹھا سوچ کے تارِ عنکبوت میں الجھا ہوا تھا اور باہر دنیا کہاں کی کہاں جا پہنچی تھی۔ جب مجیدن کھانا چنگیر میں دھر کر اندر لائی تو عین اس وقت باہر زبردست شور اٹھتا سنائی دیا۔ میں نے گھبرا کر کمبل اپنے گرد لپیٹا اور اسٹین گن بستر کے گدے تلے سے نکال کر کندھے سے لٹکا لی۔

اچانک بڑھیا کا منجھلا بیٹا باہر سے بھاگتا ہوا اندر آیا بولا "اماں وہ پولیس آ رہی ہے۔ ہمارا گھر پوچھ رہے تھے وہ لوگ انھیں بتا رہے تھے کہ مجیدن ادھر رہتی ہے۔ ایک بابو ان کو ادھر ہی لا رہا ہے۔"

اس کی یہ بات سنتے ہی میں مجیدن کو دھکیلتا ہوا باہر صحن میں نکلا۔ "اماں میں جا رہا ہوں میرے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتانا۔" یہ کہکر میں نے بڑھیا کے صحن میں دھری لکڑی کی سیڑھی پر قدم رکھا اور گلہری کی سی رفتار سے چھت پر جا پہنچا۔ لوگوں کا ایک ہجوم بڑھیا کے گھر کی طرف بڑھ رہا تھا ان کے ہاتھوں میں لالٹینیں تھیں جن کی روشنی میں مجھے آہو کا غضبناک چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ میرے تمام خدشے درست ثابت ہوئے تھے۔ آہو چال چل گیا تھا۔ یہ بات تو ثابت ہو سکتی تھی کہ میں نے ہادی علی کو مارا ہے مگر کبری کی موت کا الزام وہ مجھ پر ثابت نہ کر سکتے تھے۔ بلا دریں تو کئی لوگ کہہ دیں گے پولیس کے دباؤ میں آ کر کہ ہاں یہی وہ آدمی ہے کہ جس نے ہادی علی پر گولی چلائی تھی مگر میرے لیے یہ ثابت کرنا کسی طرح بھی ممکن نہ تھا کہ وہ کام میں نے آہو کے ایما پر سرانجام دیا تھا اور پھر اگر وہ مجھ پر ان دونوں سلسلوں میں کچھ بھی ثابت نہ کر پاتے تو بھی میری گرفتاری اُن کے لیے بہت بڑا انعام ہوتی جو وہ اس گھڑی بڑھیا کی کوٹھری میں ہاتھ مارنے سے حاصل کر سکتے تھے۔

میں نے اپنے ارد گرد نگاہ ڈالی تو مجھے چھتیں ہی چھتیں نظر آئیں۔ منڈیر کسی پر بھی نہیں تھی نیچے صحن میں بڑھیا اور اس کے بچے مجھے یوں دیکھ رہے تھے جیسے انھوں نے ابھی ابھی کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے۔ مجیدن کی تو آنکھیں بہہ نکلی تھیں اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ اُس کا بس نہیں چلتا تھا ورنہ شاید مجھے اپنے سینے میں چھپا کر زمین کے اندر اتر جاتی۔ ایسا کرب تھا اس کی آنکھوں میں کہ میں لرز کر اور پیچھے ہٹ گیا۔

وہ لوگ اور قریب آ چکے تھے۔ اچانک روشنی کا ایک نیزہ میرے جسم پر پڑا اور مجھے اُن پر عیاں کر گیا۔ میں تڑپ کر وہاں سے آگے نکلا اور دوسری چھت پر جا پہنچا۔ ابھی میں آخری چھت سے ادھر ہی تھا کہ تڑتڑ گولیاں چلنے لگیں۔ وہ گولیاں آڑی ترچھی سمتوں سے میری طرف آ رہی تھیں۔ میں ایک ہی جست میں دوڑتا ہوا چھٹی ساتویں چھت عبور کر گیا۔ اب شاید میں اس بستی کے پچھواڑے تک پہنچ چکا تھا کیونکہ اُدھر پیچھے کھیت ہی کھیت دکھائی دیتے تھے۔ گولیاں اب تھم گئی تھیں۔ میں ان کی زد سے نکل گیا تھا۔۔ اپنی اپنی چھتوں پر میرے پاؤں کی دھمک سن کر کئی لوگ اوپر چڑھ آئے تھے۔ اُن کو چھتوں پر دیکھتے ہی میں نے ایک کوٹھے پر سے نیچے چھلانگ لگا دی۔ وہ زیادہ اونچی چھت نہیں تھی۔ نیچے پہنچتے ہی میں سامنے کی طرف بھاگا۔ اتنا تیز بھاگا کہ میرا تھوڑی ہی دور پہنچنے پر دم پھول گیا۔ وہ لوگ اپنا رُخ بدل کر بستی کے پیچھے آ گئے تھے اور اُن کی ٹارچوں کی روشنی اُن چھتوں کے اس طرف دکھائی دے رہی تھی جدھر سے میں نیچے کودا تھا مگر میرے اور ان کے درمیان فاصلہ بہت بڑھ چکا تھا۔

میرا دل میرے قابو میں نہیں تھا۔ میں نرغے میں آئے ہوئے کُتّے کی طرح ہانپ رہا تھا۔ پھر بھی میں نے اپنی رفتار کم نہیں کی اور مسلسل بھاگتا رہا۔ اتنا تیز۔۔۔ میں زندگی میں شاید ہی کبھی دوڑا ہوں گا۔ وہ لوگ میرے تعاقب میں زیادہ آگے نہیں آئے اندھیرا اتنا گھنا تھا اور کچا راستہ اتنا ناہموار تھا کہ ان لوگوں نے آگے آنے کے بجائے تھانے پہنچ کر خانہ پُری کو زیادہ بہتر سمجھا ہوگا۔ ویسے بھی ایسے خطرے کے سامنے کوئی بھی مائی کا لال اپنا سینہ تان کر آگے نہیں بڑھ سکتا ہے، چہ جائیکہ پولیس کے تنخواہ دار ملازم۔۔۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں اگر میری

ہی طرح اُن میں کوئی ایک آدمی بھی اپنے مقصد سے سچی لگن اپنے سینے میں محسوس کرتا تو وہ استقلال کے ساتھ میرا پیچھا کر کے اُس روز مجھے بہت آسانی سے پکڑ سکتا تھا کیونکہ میرے راستے میں کوئی جگہ ایسی نہ تھی جہاں میں پناہ لے سکتا۔ کئی بار میں ریلوے لائن پر چڑھ کر بھی دوڑا تھا۔ میں آڑا ترچھا بھاگ رہا تھا کیونکہ مجھے کہیں بھی کوئی آڑ نہیں مِل رہی تھی۔ چلتا چلتا میں محمود بوٹی بند پر جا چڑھا۔ یہ وہی راستہ تھا جو چند روز پہلے میں نے آپی سے ملنے کے بعد صبح سویرے گھوڑی پر سوار ہو کر اختیار کیا تھا مگر اب میں پیدل تھا اور مسلسل دوڑنے کی وجہ سے میرا حوصلہ اور دم دونوں ہی پھول چکے تھے۔

افسوس مجھے یہ ہو رہا تھا کہ اس گھر سے میرے یوں بھاگ آنے کے بعد وہ لوگ اس بڑھیا اور اس کی جوان بیٹی مجیدن پر عرصۂ حیات تنگ کر دیں گے۔ کون کسی کے ساتھ ایسے حالات میں کوئی رُو رعایت کر سکتا ہے کہ جگر جگر ہے اور دِگر دِگر ہے اور یہ پولیس والے تو کسی کے بھی میت نہیں ہوتے۔ یہ اب اُس لکیر کو پیٹیں گے، جو سانپ اپنے پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ گیا تھا۔

میری خمیارہ تقدیر مجھے رسوا کرنے پر تُلی ہوئی تھی۔ میرا یہ حال تھا کہ میں اس گھڑی اُس ویران راستے پر یوں چل رہا تھا، جیسے میرے تمام ہمراہی ایک ایک کر کے کٹ گئے ہوں اور میں ایک بھرے پُرے ہنستے کھیلتے معمورے سے صرف اپنی گردن بچا لانے میں کامیاب ہو سکا ہوں۔ میری کوئی منزل نہ تھی۔ میرا کوئی گھر نہ تھا۔ نہ میرے کوئی آگے رہا تھا نہ کوئی میرے پیچھے۔ میرے نصیب نے میری زندگی کے ایک ایک حصّے پر چھکتے سے ڈال دیے تھے۔ اور آسیہ کا چہرہ لہو رنگ اشکوں میں نہایا ہوا میرے سامنے تھا۔ وہ پھر مجھ سے سوال کر رہا تھا پھر پُوچھ رہا تھا کہ بھیّا اب کیا ہوگا۔ اب کیا کرے گا تو۔ وہ آدمی جس کے کہنے پر تو نے ہادی علی کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ اپنے وعدے سے پھر گیا ہے اور میری اُمید کے چراغوں کی روشنی دھندلی پڑتی جا رہی ہے میرے بارے میں اب کیا سوچا ہے تو نے میرے بھیّا! میں کب تک یہ اذیت سہتی رہوں گی۔ میں تو جیل میں جب چکی پیستی ہوں تو مجھے وہ جتنا ساری گیت بھی یاد نہیں آتے جو گاؤں کی لڑکیاں اس مشقت کے وقت خوشی سے گایا کرتی ہیں۔ میں تو بالکل ہی بجھ کر رہ گئی ہوں میرے بھیّا میرے لیے کیا سوچا ہے تو نے۔

بڑھیا کی وہ صورت مجھے نہیں بھولتی تھی۔ اُسے کتنا صدمہ ہوا ہوگا جب اس پہ یہ بات عیاں ہوئی ہوگی، کہ وہ آدمی جو اسے اماں کہہ کر پکارتا تھا اتنا بڑا مجرم ہے۔ وہ لہو روتی ہوگی۔ اس کے اعتماد کے سارے شیشے تڑاخ تڑاخ ٹوٹ گئے ہوں گے۔ مجیدن پر بھی وہ گھڑی بہت بھاری تھی۔ اس کی وہ ڈبڈبائی آنکھیں رہ رہ کر میرے حافظے کی سطح پر اُبھرتی تھیں۔ پولیس نے خدا جانے اُن کے ساتھ سلوک کیا ہوگا۔ اُن بے چاروں کی حالت تو دیدنی ہوگی۔ ساری بستی اُن پر تھڑی تھڑی کر رہی ہوگی۔ وہ بڑھیا جس کا میں نے اپنے پیسے سے مان بڑھایا تھا جس کو نئی زندگی کی نوید سُنائی تھی وہ یہ سارے صدمے کہاں سہہ سکے گی۔ اندر سے وہ بیچاری ٹوٹ پھوٹ کر رہ جائے گی۔ میں نے انہیں سکھ پہنچانے کے بجائے اور زیادہ دُکھ میں مبتلا کر دیا تھا میرے جیسے مُورکھ سے دوستی پال کر انھوں نے کیا نفع کمایا تھا۔

میں بخت بلند تو کبھی بھی نہیں تھا مگر اب تو میری یہ صورت بنی تھی کہ بخت اُڑ گئے تھے اور صرف بلندی رہ گئی تھی۔ ایسی بلندی جس پر پستیاں ہنستی رہی تھیں۔ میں اندھیرے میں آہستہ آہستہ بوجھل بوجھل قدم اُٹھاتا ہوا بند روڈ پر چلتا رہا۔ رات کے وقت اُس سڑک پر ٹرکوں کی آمد و رفت بہت بڑھ جاتی ہے۔ وہ ٹرک بجری ریت، سیمنٹ سریا لے کر چلتے ہیں تاکہ اطمینان سے وہ ٹریفک کے ہجوم سے بچ کر رات ہی رات میں یہ کام نمٹا لیں۔ اُن میں سے بہت سے ٹرک سبزی اور اناج سے بھی لدے پھندے ہوتے ہیں — ان ٹرکوں کی تیز تیز روشنیوں سے بچتا ہوا میں سڑک کے ایک طرف ہو کر چل رہا تھا کہ اچانک ایک ٹرک میرے سامنے سے آیا اور اپنی ڈگر پر سیدھا چلنے کے بجائے دائیں ہاتھ مڑا اور اتنی تیزی سے میری طرف بڑھا کہ میں سمجھا وہ ڈرائیور مجھے جان بوجھ کر کچل دینا چاہتا ہے۔ میں پاگلوں کی طرح پیچھے ہٹا اور مٹی کے اس ٹیلے پہ جا چڑھا جو بند کے دائیں ہاتھ دریا کی سمت میں مٹی کاٹ کر بنایا گیا تھا۔ ٹرک کے اگلے دونوں پہیے اس ٹیلے کی بھُربھُری مٹی میں دھنس گئے اور اس کا انجن خاموش ہو گیا۔ میں سمجھا کہ وہ ڈرائیور سالا چنڈو باز ہے اور نشے میں دھت ہونے کی وجہ سے یہ حرکت کر بیٹھا ہے۔ ابھی وہ انجن چُپ ہوا ہی تھا کہ پیچھے سے دو آدمی تیزی سے نیچے اُترے اور ڈرائیور کی سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر دیکھنے لگے۔ میں بھی ٹیلے سے اُتر کر آگے بڑھا۔ ڈرائیور اپنی سیٹ پر بے ہوش پڑا تھا اس حال میں کہ اس کی آنکھیں پتھرائی ہوئی نظر آتی تھیں اور وہ ایک طرف لڑھکا پڑا تھا۔ ایک ہاتھ اس کا اسٹیرنگ پر تھا اور دُوسرا کچھ اس طرح مڑا ہوا تھا جیسے اس کو مرگی کا دورہ پڑا ہے اس کے منہ سے جھاگ نکل رہے تھے۔

"اوئے کاکا یہ کیا ہو گیا ہے تجھے پُترا" ایک آدمی بلکتے ہوئے کہا۔

"چاچا اسے کوئی دورہ پڑ گیا ہے اسے نیچے اُتار لو۔" دوسرے آدمی نے لرزتے لہجے میں کہا۔ دونوں ہی سخت پریشان ہو گئے تھے۔ میں اُن کے قریب پہنچا تو میرا غصّہ اس ڈرائیور

کی حالت دیکھ کر بڑی حد تک فرو ہو چکا تھا ورنہ اگر وہ ہوش میں ہوتا تو شاید میں مار مار کر اس کا بھرکس نکال دیتا۔

"کیا ہوا ہے اسے۔ اس نے تو ٹرک چڑھا ہی دیا تھا مجھ پر۔" میں نے بہت سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"معاف کر دیں بھاجی! یہ میرا بیٹا ہے اسے پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے۔"

"بڑے اچھے کام پر لگا رکھا ہے تو نے اسے شہر میں ہوتا تو مار دیا تھا اس نے دس بیس کو۔"

"ہاں بھاجی!" ہم بھی مارے ہی گئے تھے آج اس کے ساتھ۔ وہ تو اچھا ہوا پہیے اس جن کے مٹی میں دھنس گئے۔ سامنے یہ ٹبّہ تھا ورنہ تو ٹرک ہی اُلٹ جاتا۔"

اس آدمی نے اپنے دوسرے بیٹے کے ساتھ مل کر ڈرائیور کو نیچے اُتار کر ایک صاف جگہ پر چادر بچھا کر لٹا دیا۔

"کیا نام ہے اس کا؟"

"اس کا نام روشن دین ہے جی! اوئے احمد دین کہیں سے پانی لا بیٹے۔" اس بوڑھے نے بیٹے کی مخدوش حالت دیکھ کر کہا۔

احمد دین اسی وقت وہاں سے بھاگا۔ کہیں قریب سے ہی ٹیوب ویل کے پانی کی شاں شاں سُنائی دے رہی تھی لگتا تھا وہ پانی خاصی بلندی سے نیچے گر رہا ہے۔ میں اس ڈرائیور کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ اُس کی حالت دم بدم بگڑتی جا رہی تھی اس کا سارا بدن مروڑا جا رہا تھا۔ اور اُس کے گلے سے خوفناک قسم کی آوازیں نکل رہی تھیں معلوم یہ ہوتا تھا کہ وہ کوئی دم کا مہمان ہے — مجھے اس کی حالت پر بے حد ترس آ رہا تھا۔ اچانک وہ ہاتھ بھر اونچا اچھلا اور دھڑام سے زمین پر گر گیا۔ اس کے منہ سے اور زیادہ جھاگ نکلا۔ اس کا چہرہ بگڑتا جا رہا تھا اور اس کے باپ کی حالت دیدنی تھی۔

"کچھ کرو بھاجی! میرے بیٹے کو بچا لو بھاجی۔ کوئی ٹرک روکو۔ اسے ہسپتال لے چلو۔"

"اسے ٹرک میں ڈالو۔ میں خود چلا کر اسے ہسپتال پہنچاتا ہوں۔"

"چاچا میں پانی لے آیا ہوں۔" احمد دین ہاتھ میں ٹین کا ڈبہ لیے واپس آ رہا تھا مگر روشن دین کا تو شاید چل چلاؤ تھا۔ اس کی حالت لحظہ بہ لحظہ بگڑتی جا رہی تھی۔ احمد دین نے آتے ہی گلاس میں پانی بھر کر اس کے منہ سے لگایا مگر وہ پانی اس کے حلق میں اترنے کے بجائے دائیں بائیں بہہ گیا اس کے بدن کا تشنج بڑھتا جا رہا تھا۔ روشن دین کا باپ اس کی یہ حالت دیکھ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

"ہٹو ذرا میاں جی! اس کی نبض تو دیکھنے دو مجھے۔" میں نے آگے بڑھ کر اس کی نبض ٹٹولی تو معلوم ہوا کہ اس کے دل کی بھی وہ زیر و زبر ہو رہی تھی۔ وہ ایک بار پھر ہاتھ بھر اُوپر اچھلا اور پر ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح لوٹنے لگا مگر میں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اسے روکا اور پھر ایک ہاتھ اس کے سینے پر دل کی طرف رکھا اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ روشن دین کے دل پر جونہی میں نے ہاتھ دھرا وہ ساکن ہونے لگا۔ میں نے آہستہ آہستہ اس کے مڑے ہوئے ہاتھوں پر اپنا دایاں ہاتھ پھیرا تو وہ یوں سیدھے ہو گئے جیسے میں نے سلوٹوں بھرے کپڑے پر استری پھیر دی ہو۔ اس کا نچلا جبڑا بھی مُڑ چکا تھا اور زبان اس کی دانتوں تلے کچلی جانے کی وجہ سے مُنہ سے خون بہہ نکلا تھا۔ میں نے بڑی احتیاط سے اس کے مُڑے ہوئے جبڑے پر ہاتھ پھیرا تو میری حیرت فزوں تر ہو گئی۔ اس کا وہ جبڑا بغیر کسی دباؤ کے آپ ہی آپ اپنی حالت پر آ گیا اور اس کا اکڑا ہوا بدن ڈھیلا ہونے کے بعد اپنی فطری حالت کی طرف لوٹنے لگا۔

اس کا باپ مجھے یُوں حیرت سے دیکھ رہا تھا جیسے اس نے کوئی عجیب و غریب خواب دیکھا ہو۔ میں نے اس کے بدن کے مختلف حصّوں کو دیکھا جہاں خون نہ پہنچنے کی وجہ سے جگہ جگہ سفید برص ایسے داغ نظر آنے لگے تھے۔ اس کے ہاتھوں اور بازوؤں کی حالت تو خاص طور پر بہت ہی کریہہ منظر پیش کر رہی تھی۔ روشن دین کا سانس اب معمول پر آ رہا تھا۔

"اوہ میرے بادشاہ! یہ کیسے ہو گیا میرے مائی باپ آپ نے یہ سب کیسے کر لیا میرے پیر و مرشد میرے سائیں، یہ کرامت آپ نے کیسے دکھا دی؟"

"کیا بکتے ہو؟ کیسی کرامت؟ میں نے روشن دین کو چھوڑ کر پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ میرا لہجہ خاصا تلخ تھا۔

مگر وہ دونوں باپ بیٹا میرے سامنے ہاتھ جوڑ کر یوں کھڑے تھے جیسے میں کوئی شہنشاہ ہوں جسے ان کی زندگیوں پر بھی اختیار حاصل ہے۔

"نہیں پیر و مرشد! آپ بڑے کرنی والے ہیں میرے بادشاہ! میرے بچے کو آپ کے ہاتھ سے شفا ہو گئی۔" روشن دین کے باپ نے بڑے ہی مودبانہ لہجے میں کہا۔

"ہاں سائیں بادشاہ! اس کو تین سال پہلے ایسا ہی دورہ پڑا تھا۔ اس وقت اس کی حالت اتنی خراب نہیں تھی پر علاج کے لیے اسے تین مہینے ہسپتال میں رہنا پڑا تھا مگر آپ نے کمال کر دیا ہے مائی باپ۔" احمد دین نے آگے بڑھ کر میرے پاؤں چھو لیے۔ اس کا لہجہ عقیدت و احترام سے بھرا ہوا تھا۔

"کیا کرتے ہو بھئی! یہ میرا کوئی کمال نہیں ہے۔ اس کا

ہی طرح اُڑنیلے اب یہ خود بخود ٹھیک ہو رہا ہے یہ دیکھو۔" میں یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ روشن دین نے آنکھیں کھول دیں، یوں جیسے وہ بہت عرصے سے بیمار ہو۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا اور اس کے رخساروں پر بھی سفید داغ سے ابھر آئے تھے۔

"اوہ میاں جی! پانی مجھے پانی دو میاں جی۔"

"لے میرے بچے پی، یہ لے، اور ان کو سلام کر۔ یہ اللہ کے چھپے ولی ہیں جو تیری مدد کو آ پہنچے ورنہ آج تیرا بچنا محال تھا میرے لال۔" اس بوڑھے نے ایک گلاس اور بھر کر روشن دین کے لبوں سے لگایا جسے وہ بڑی آسانی سے پی گیا۔ اسے بہت پیاس لگی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے تین گلاس حلق سے نیچے اتار لیے اور پھر اچانک اس کی نظر اپنے ہاتھوں پر پڑ گئی جو داغ داغ ہو رہے تھے۔

"یہ... یہ کیا ہو گیا ہے مجھے میاں جی یہ داغ کیسے ہیں؟" اس نے دیوانوں جیسی بے قراری سے اپنے ہاتھ پر دوسرا ہاتھ رگڑا۔ مگر وہ داغ تو بہت نمایاں تھے۔ اندر کے کسی روگ کا پتہ دیتے تھے۔

"پتہ نہیں میرے لال، کیا ہو گیا ہے یہ! اپنا شکر کر انھوں نے تیری جان بچالی ہے۔ ان کے ہاتھ میں اللہ نے بڑی شفا رکھی ہے میرے بیٹے۔ ان کے پاؤں سے اپنا ماتھا رگڑ، اللہ کرم کرے گا۔ مر بیچے کرا اپنا چوم لے ان کے پاؤں۔"

روشن دین احمقوں کی طرح کبھی مجھے دیکھتا تھا اور کبھی اپنے باپ کو۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا اول فول بک رہا ہے۔ ایسا تو اس نے کبھی دیکھا ہو گا نہ سنا ہو گا۔ اسے اپنے باپ کی دماغی صحت مشکوک نظر آئی۔ وہ ہنسا۔ عجیب سے طنز بھرے انداز میں ہنسا مگر نقاہت نے اس کی آواز بلند نہ ہونے دی۔ اپنا گلا ہاتھ میں لے کر کھانستا ہوا بولا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو میاں جی؟ ان کے پاؤں کیوں چوم لوں؟ کیا دیکھا ہے ان میں تو نے؟ سدا کا وہمی ہے تو۔ چل کسی ڈاکٹر کو دکھاتے ہیں یہ سالے داغ کہاں سے پیدا ہو گئے؟" پھر اس کی نظر تہمد میں سے جھانکتی ہوئی اپنی ٹانگوں پر جا پڑی اور وہ سراسیمہ ہو کر بولا۔

"یہ... یہ کوئی چیز پھر گئی ہے میرے بدن پر۔ کیا ہوا تھا مجھے ــــ"

"پتہ نہیں بچے! تو نے ٹرک اُدھر مٹی پہ چڑھا دیا تھا ــــ جب ہم نے دیکھا تو تو بے ہوش تھا اور تیرا بُرا حال ہو رہا تھا۔ کچھ کریں مائی باپ! اپنا ہاتھ پھیر دیں میرے اس بدنصیب بچے پر۔" یہ کہکر اس آدمی نے زبردستی میرا دایاں ہاتھ پکڑ کر بڑی ہی اضطراری حالت میں چوم کر اپنے بیٹے کی ٹانگ پر رکھ کر آگے پیچھے پھیر دیا۔ اور... اور... میری بات کا شاید کوئی یقین نہ کرے۔ جہاں جہاں میرا ہاتھ پھرتا جاتا تھا وہاں وہاں سے روشن دین کے بدن کے داغ مٹتے جاتے تھے۔ اور اس کی وہ گندمی جلد معمول پر آتی جاتی تھی۔ یہ تماشا دیکھ کر میرا ذہن خود اپنے آپ سے الجھنے لگا اور میں نے گھبرا کر اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

"ہٹاؤ اس ناٹک کو۔ یہ خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔"

"بس بس ہمیں آپ کے یہی الفاظ کافی ہیں مائی باپ۔ یہی بہت کافی ہیں۔ اُٹھ میرے بچے، اُٹھ ان کو سلام کر۔"

اپنے داغوں کو میرے ہاتھ تلے مٹتے دیکھ کر روشن دین بھی دنگ رہ گیا تھا وہ دیوانہ وار آگے بڑھا اور بے اختیار ہو کر اس نے میرے پاؤں پکڑ لیے۔ میں نے سٹپٹا کر اپنے پاؤں پیچھے کھینچے اور بڑے تلخ لہجے میں کہا۔ "بند کرو یہ بکواس۔ جاؤ اب اپنی راہ لو۔ کہاں جا رہے تھے تم؟"

روشن دین خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔ اب وہ تینوں میرے سامنے سراپا عجز و نیاز بنے یوں کھڑے تھے کہ انہیں اگر حکم دیتا کہ خود کو آگ لگا لیں تو شاید وہ اس سے بھی دریغ نہ کرتے۔

"کہاں جا رہے تھے تم؟" میں نے پھر پوچھا۔

"ہم کنجاہ جا رہے تھے سرکار۔ وہاں سے ہم مونجی لائیں گے مائی باپ! ہمارے لیے دعا کریں۔"

کنجاہ کا نام سنتے ہی میرا ذہن زقند بھر کر پیچھے لوٹ گیا۔ وہاں ماجدہ تھی جس کو میں مل کر نہیں آیا تھا۔ میں نے سوچا کیوں نہ اس کو دیکھ لوں۔ مگر پھر میں نے اس خیال کو جھٹک دیا۔

"ٹھیک ہے جاؤ۔ اللہ تمھارا نگہبان ہو گا۔"

"ہمارے جوگا کوئی کام بتائیں ہمیں کوئی حکم دیں سرکار! ہم آپ کے قدموں کی دُھول کو امرت سمجھتے ہیں۔" اس بوڑھے نے مجھے کوئی ولی ابدال ہی سمجھ لیا تھا۔ کنجاہ کا منظر بار بار میرے حافظے میں جھلملا رہا تھا۔

"کیا نام ہے تمھارا؟"

"اس عاجز کو فیروز دین کہتے ہیں سرکار! کوئی خدمت بتائیں اور مجھے اپنا پتہ بھی دے دیں مائی باپ۔" وہ عاجزی اور انکساری کی تصویر بنا تھا وہ فیروز دین۔

"دیکھو میرا ایک کام کرتے آؤ۔"

"ہزار کام کہیں میرے بادشاہ! مجھے اپنے کتے کا بھی غلام سمجھیں۔"

"تم بکواس بہت کرتے ہو فیروز دین! سنو..." یہ کہہ کر میں نے اسے ماجدہ کے اسکول اور گھر کا پتہ بتایا جو فیروز دین کے کہنے پر اس کے بیٹے احمد دین نے ٹرک میں رکھی ایک کتاب میں لکھ لیا۔ میں نے فیروز دین سے کہا۔ "دیکھو میں کل شام کو چھ بجے ادھر اسی جگہ پر ملوں گا۔ تم ماجدہ کو اپنے ساتھ ٹرک میں بٹھا کر لے آنا۔ یہ میری نشانی ہے اسے دے دینا۔ وہ سمجھ جائیگی۔" میں نے ماجدہ کا دیا ہوا رُومال جیب سے نکال کر اسے دے دیا۔

"بہت بہتر سرکار، آپ فکر نہ کریں اگر وہ بی بی آ گئی تو میں ضرور لے کر آؤں گا، ورنہ میں آپ کو یہاں بتا ضرور جاؤں گا، مائی باپ آپ بے فکر رہیں۔"

"اپنا پتہ بھی مجھے بتا دو۔"

"ہم اِدھر لکھو ڈھیر میں رہتے ہیں سرکار۔ محمود بُوٹی کے قریب۔ میں آپ کو پتہ لکھ دیتا ہوں۔" یہ کہکر اس نے احمد دین سے کہکر ایک پرزے پر اپنا پتہ لکھ کر مجھے دے دیا۔

"ٹھیک ہے میں کل شام چھ بجے تم سے یہیں ملوں گا۔"

"آپ کی بڑی مہربانی سرکار! کچھ میرے لال پر مہربانی ضرور کریں۔ اس کا منہ دیکھیں کیا ہو گیا ہے۔ چکتے پڑ گئے ہیں۔"

"اللہ کرم کرے گا۔ جاؤ اب اپنی راہ کھوٹی نہ کرو۔" میں نے روشن دین کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کا سارا ہی منہ داغ داغ ہو رہا تھا۔

وہ تینوں مجھے جھک کر سلام کرتے ہوئے میری طرف منہ کئے یوں پیچھے ہٹے جیسے کوئی اپنے پیر کے مزار پر سلام کر کے اس کی طرف پیٹھ موڑ کر چلنے کو گناہِ کبیرہ تصور کرتا ہو۔ فیروز دین کے دونوں بیٹے ٹرک میں جا بیٹھے تو وہ خود کچھ سوچتا ہوا پیچھے مڑا اور بولا۔

"سرکار میرا گناہ معاف کر دیں کیا یہ بہتر نہ ہو گا مائی باپ کہ آپ آج کی رات اور کل کا دن مجھ غریب کی جھگی میں گزاریں۔ میں ماجدہ بی بی کو لے کر وہاں کل حاضر ہو جاؤں گا۔"

اس نے بڑی معقول بات کہی تھی۔ "ٹھیک ہے! اگر تمھیں تکلیف نہ ہو تو مجھے یہ بات پسند آئی ہے۔" میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا اس کا گھر میرے لیے جائے اماں ثابت ہو سکتا تھا۔ میں اپنی سیاہ بختی کی وہ رات اس کے گھر میں گزار لینا ہر لحاظ سے غنیمت سمجھ رہا تھا۔ میری بات سن کر وہ اپنی جگہ یوں خوش ہو گیا جیسے اُسے دنیا جہان کی دولت ہاتھ آ گئی ہو۔

بولا۔ "اوئے کاکا خوش ہو جاؤ سرکار مان گئے ہیں۔ حضور ہمارے گھر ٹھہریں گے آج رات۔ اوئے تمھاری خوش نصیبی کی رات آ گئی۔ چلو واپس چلو۔" یہ کہہ کر اس نے ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ کا دروازہ کھولا اور مجھے بڑے ادب سے اندر بٹھا کر اس نے نہایت احتیاط سے دروازہ بند کر دیا۔ وہ ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھے احمد دین کی طرف گیا اور بولا۔

"حضور آج رات ہمارے گھر پر رہیں گے۔ کل کا دن بھی وہ وہیں گزاریں گے۔"

"اچھا یہ تو بہت اچھا ہوا میاں جی۔ چلو ان کو پہلے میں گھر پر پہنچاتا ہوں۔ ہمیں تو اللہ نے اپنی رحمت میں لے لیا ہے۔" وہ بھی یوں خوش ہو گیا جیسے اسے کوئی عجوبۂ روزگار شے مل گئی ہو۔ اُن کی احمقانہ باتیں سن سن کر میں دل ہی دل میں ہنس رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ٹھیک ہے سالو بنا لو مجھے اپنا پیر اور ولی۔ تمھاری توہم پرستی آج رات میرے بہت کام آئے گی۔ میں اس ویران اداس اور منحوس رات میں اپنی بدنصیبی کو ساتھ لیے کہاں مارا مارا پھرتا۔ تمھارے گھر کی کوئی جھلنگا سی چارپائی اور کڑی لپی کوٹھری اس ویرانے میں خوار و زبوں ہونے سے میرے لیے ہزار بہتر ہو گی۔

اب ٹرک احمد دین نے سنبھال لیا تھا۔ وہ بھی ڈرائیونگ جانتا تھا۔ روشن دین کو بیماری کے اس حملے کے بعد سخت آرام کی ضرورت تھی۔ احمد دین نے اسی وقت ٹرک کا رُخ موڑا اور واپس چل دیا۔ فیروز دین اور روشن دین ٹرک کے پچھلے حصے میں سوار تھے۔ میں نے دل میں کہا اچھا ہے مُنڈو... تمھارا یہ وطیرہ مجھے خوش کر گیا ہے۔ تم سب عقل سے پیدل ہو میرے جیسے عقل سوار کے لیے تم اچھی کاٹھی ثابت ہو سکتے تھے۔ میری اس تیرہ بختی کی رات اور صبح کی امید افزا روشنی کے درمیان تم مضبوط پُل کا کام دے سکتے ہو۔ مجھے تم ایسے ہی کاٹھ کے الوؤں کی تلاش تھی کیونکہ میں تو وہ آدمی ہوں جس کے نتھنوں میں بدنصیبی نے تیر دے رکھا ہے میری منزل ذلت اور خواری ہے۔ میں شاید مچھلی کا جایا ہوں کہ مجھے کسی نے تیرنا تو نہیں سکھایا مگر میں اپنی اس خوبی کے سبب صاف ستھری ندی سے نکل کر گندے غلیظ مہیب سمندر میں آ گرا ہوں اور اب یہ مصائب و آلام سے لبریز ساگر مجھے راہ نہیں دیتا۔ میں لوٹ نہیں سکتا اور باہر نکلوں گا تو مر جاؤں گا مگر میرے متکلین یہ سمجھتے ہیں کہ میں خدا کی کوئی برگزیدہ ہستی ہوں۔ کوئی ولی ہوں ابدال ہوں مجھ پر ہزار لعنت کہ تقدیر نے یہ نیا رُوپ بھی مجھے ابھی بخشا تھا تاکہ میں اپنے آپ سے ہی شرمسار ہو جاؤں اور تنگ آ کر اپنے ہی وجود کی نفی کرنے لگوں۔

رات نے اپنا جوڑا کھول لیا تھا۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ٹرک کی روشنیاں اس اندھیرے کو چیرتی چلی گئیں۔ کچھ ہی دیر بعد وہ لوگ محمود بُوٹی گاؤں میں سے گزر کر لکھو ڈھیر پہنچے اور ایک خاصی چوڑی گلی میں سے گزر کر ایک مکان کے سامنے رک گئے۔

فیروز دین اُچھلتا ہوا آگے آیا اور دروازہ بڑے ادب سے کھول کر بولا۔ "آئیں حضور میرے گھر پہ اپنی برکت کا سایہ ڈالیں

مجھ عاجز پر کرم کی نظر کریں۔"

اس کی وہ نرمی و گداختگی عجز و انکساری اور لہجے کی وہ حیران کن فروتنی مجھے حیران کر رہی تھی۔

"میں ایک شرط پر تمھارے گھر ٹھہروں گا۔"

"ہزار شرطیں بتائیں سرکار! کہیں تو میں سارے گھر کے سارے جیتوں کو باہر نکال دوں۔"

"نہیں بھئی ہماری شرط یہ ہے کہ تم ہمارے بارے میں کسی بھی آدمی سے کچھ نہیں کہو گے۔ بس ہم گمنام رہنا چاہتے ہیں۔" میں نے بھاری بھرکم لہجے میں کہا ایسے لہجے میں جس کا طنطنہ اپنا کام دکھا گئے۔

"جو حکم سرکار میرے گھر میں رحمت آئی ہے میں کسی سے اس کا ذکر کیوں کروں گا۔ اپنی بدنصیبی کو آواز دینی ہے مجھے حضور بالکل بے فکر رہیں۔"

"بس ٹھیک ہے اس شرط پر ہم تیری جھونپڑی میں رات گزار لیں گے۔" میں نے خالص قلندرانہ انداز سے کہا۔

اس نے بڑے ادب سے مجھے ٹرک پر سے آتارا اور گھر کے کھلے دروازے میں سے اندر لے گیا۔

سامنے کھلا صحن تھا اس میں سے گزار کر اس نے مجھے ایک کمرے میں لے جا کر صاف ستھرے پلنگ پر بٹھا دیا۔ اس کے دونوں لڑکے ابھی باہر ہی تھے۔

"روشن کے میاں تم واپس کیوں آ گئے؟" ایک عورت نے دروازے کی اوٹ میں رک کر پوچھا۔

"بتاتا ہوں بھلی لوک بتاتا ہوں ذرا دم لے۔ تجھے پتہ نہیں ہمیں آج کتنی بڑی دولت مل گئی ہے۔" یہ کہکر وہ تیز تیز قدم اٹھاتا باہر نکل گیا۔ دروازہ وہ اپنے پیچھے بڑی آہستگی سے بند کر گیا تھا۔ میں پاؤں لٹکا کر پلنگ پر بیٹھا کمرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ فیروزدین خاصا خوش حال آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس کمرے کے ایک سرے پر دیوار کے ساتھ ایک اونچے پایوں پر کھڑا بڑا سا ٹیلیویژن سیٹ رکھا تھا۔ دوسرے ہاتھ لمبی دیوار کے ساتھ ساتھ دو صوفے دھرے تھے جن کے سامنے دو لمبی لمبی میزیں پڑی تھیں۔ فرش پر اس نے سرخ اور نیلے رنگ کی موٹی دری بچھا رکھی تھی۔ دیواروں پر ملک کے مختلف رہنماؤں کی تصویریں آویزاں تھیں جن میں سب سے نمایاں قائد اعظم کی تصویر تھی جو دیوار کے عین وسط میں تھی اور دوسری تصویروں سے خاصی بڑی تھی۔

پلنگ اور کمرہ دونوں بڑے آرام دہ دکھائی دیتے تھے۔ میں نے دل میں کہا عیش کر غلام جیلانی بچے! پتہ نہیں کس کی دعا کی برکت سے آج رات یہ صاف ستھرا پلنگ اور یہ آرام دہ کمرہ تجھے میسّر آ گیا ہے ورنہ تو اس لائق ہرگز نہیں ہے تیرے کرتوت تو ایسے ہیں کہ یار لوگ تجھ پر بھوکے کتے بھی چھوڑ دیں۔ تجھے کمر کمر گڑھے میں دفن کر دیں تو بھی کسی کو ملال نہ ہو گا۔ تیری جیب تپ تو گولی اور بندوق ہے۔ خون کی ہولی تیرا شغل ہے۔ تیری رکابی میں بھات خدا جانے کیسے ڈال دیا جاتا ہے۔

میں کتنی ہی دیر تک اسی سوچ میں غرق بیٹھا رہا کہ یہ کیا ہو رہا ہے میرے ہاتھ میں واقعی شفا آ گئی ہے یا اس بدبخت کا دورہ آہستہ آہستہ ختم ہو گیا تھا۔ یہ اسرار میرے لیے لاینحل معمہ بنتا جا رہا تھا۔ تقدیر کی ٹنکار مجھے دہلائے دیتی تھی اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ صبح جو سورج طلوع ہو گا وہ لہو رنگ ہو گا کہ سنہری ہو گا۔

میرے گناہوں کی فہرست طویل ہوتی جا رہی تھی اور اسی حساب سے میرے دل کی پشیمانی بھی بڑھتی جا رہی تھی اور میں سوچتا تھا کہ مرا اے کاش کہ مادر نہ زادے میری ماں نے میرے لیے یہ سپنے تو کبھی نہیں دیکھے تھے۔ اسے تو اپنے اس جیلانی سے محبت تھی جو راستی پر تھا، راستبازی کا پرستار تھا جس نے تسبیح خوانوں ایسا مزاج پایا تھا۔ اس نے تو کبھی خواب میں بھی یہ نہیں دیکھا ہو گا کہ اس کا بیٹا ڈاکو لٹیرا اور قاتل بن جائے گا۔ مگر میں بن چکا تھا اور بلا درکی رکھ میں جو میرے باباجی نے کہا تھا۔ "تیرے بھی بس میں کچھ نہیں ہے بچے۔" تو انھوں نے ٹھیک ہی کہا تھا میرے بس کا تو یہ حال تھا کہ مجھے اپنے اوپر بھی کوئی اختیار حاصل نہیں رہا تھا۔ مجھے گناہ کی تسار نے ٹنڈ منڈ کر کے رکھ دیا تھا۔ اب میرے شجر کی شاخوں پر کوئی خوشبودار پھول نہیں اگتا تھا کہ جرم و عصیاں کی برف نے مجھے لتاڑ کر رکھ دیا تھا۔

ابھی کوئی پانچ منٹ ہی گزرے تھے کہ فیروزدین ایک صاف ستھرے مگ میں دودھ بھر کے لے آیا تھا۔

"یہ لیں حضور، یہ دودھ ہمیں ہماری اپنی بھینس کا دودھ ہے قبول کریں۔"

وہ اس گھڑی میری تواضع کے لیے بہت عمدہ چیز لایا تھا دودھ گرم تھا اور اس میں ڈھیر ساری بالائی موجود تھی۔ میں نے ایک گلاس پیا تو ایک اس نے اصرار کر کے اپنی خوشی کی خاطر مجھے پلا دیا۔ میں بہت ہی تھکا ہوا تھا۔ اس دودھ نے میرے دل و دماغ میں تازگی پیدا کر دی۔ فیروزدین کا کمال یہ تھا کہ وہ پچارا دینے میں ماہر تھا۔ آدمی کو ایسا تیل لگاتا تھا کہ وہ اس کے ہاتھ میں موم کی ناک بن جاتا تھا میرے سلسلے میں تو اس نے اپنی ساری توانائیاں اس بات پر صرف کر دیں کہ جس طرح بھی بن پڑے، وہ میری خوشنودی حاصل کر لے۔ وہ مجھے واقعی کوئی پہنچا ہوا بزرگ سمجھ بیٹھا تھا۔ حالانکہ میں ڈاڑھی مونچھ منڈا پانچوں عیب شرعی کا حامل

چھٹا ہوا بدمعاش آدمی تھا۔ میری صورت ہی مکروہ ہو چکی تھی شاید مگر اس میں بھی اسے نور جھلکتا نظر آتا تھا۔

میں نے دل میں کہا ٹھیک ہے فیروزدین جی! تو جپنے کو پوجنے لگا ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں اپنی اس حماقت کی دلدل میں دھنستا جا مجھے کیا ہے مجھے تو رات ہی گزارنی ہے۔ وہ ویرانے میں گزرتی تو بہت بے آرام ہوتا۔ صبح تک سارے لوگوں کو گالیاں دیتا رہتا مگر اب تو مہربان ہو گیا ہے تو ٹھیک ہے ایسے ہی سہی۔ مگر مجھے نہیں معلوم کہ تو اپنی اس عبادت کو، اپنی اس عقیدت اور احترام کے بے پایاں جذبے کو کس طرح پٹیل رہا ہے میرے جیسے گناہ کے جذام میں مبتلا آدمی کو تو سمجھا تو ہوتا میرے یار۔

میں نے کمبل اپنے بدن پر اچھی طرح لپیٹا اور سگریٹ سلگا کر یوں پلنگ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا جیسے میں واقعی کوئی پہنچا ہوا بزرگ ہوں۔ اپنے اس حال پر مجھے بہت ہنسی آ رہی تھی مگر میں کھل کر ہنس نہیں سکتا تھا لیکن ہوا یوں کہ اس صورت حال پر غور کرتے کرتے میں آپ ہی آپ کھلکھلا کر ہنس دیا۔

فیروزدین برتن لے کر ساتھ کے کمرے میں گیا تھا۔ اس نے میرا قہقہہ سن لیا تھا۔ بولا۔

"دیکھا تم نے برکتے! حضور خوش ہو گئے ہیں ہماری اس خاطر تواضع سے اب تو یوں کر کہ ایک مرغی چھیل دے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے روشن کے میاں! پر تو نے سوچا بھی ہے کچھ۔ وہ نکی کہہ رہی تھی کہ اس کے پاس بندوق بھی ہے کمبل کے نیچے سے نکال کر اس نے گدے تلے رکھ دی ہے۔ پتہ نہیں کس کو اٹھا لایا ہے تو؟"

"زیادہ بڑبڑ نہ کر ماں! وہ بھسم بھی کر سکتے ہیں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ان کا معجزہ دیکھا ہے۔ بھائی کو انھوں نے موت کے منہ سے بچا لیا ہے۔" یہ احمد دین کی آواز تھی۔ وہ اپنی ماں پر خفا ہو رہا تھا۔

"اچھا بابا تم جانو اور تمھارا کام۔ مجھے تو یہ کوئی واردا تیا معلوم پڑتا ہے ولی ہے تو بندوق کیوں لیے پھرتا۔ دھاڑے تو نہیں مارتے ہیں پیر فقیر۔"

"پھر وہی بک بک! ایک تو اس عورت کی کھری مت لے ڈوبی ہے مجھے اری نیک بخت۔ ان فقیروں کے کئی رنگ ہوتے ہیں۔ سات جنم سانپ لیتا ہے تو تب وہ گیٹھ بھر کا آدمی بنتا ہے۔ فقیر کو تو پتہ نہیں ولایت کا درجہ حاصل کرنے کے لیے کتنی صعوبتیں جوکھم جھیلنا پڑتا ہے۔ کر تیری سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا جا تو ادھر مرغی بھون دے۔ تو ذبح کر دے احمد دین۔" یہ کہہ کر فیروزدین شاید صحن میں نکل گیا تھا کیونکہ اس کے قدموں کی چاپ دور ہوتی جا رہی تھی۔

تو یہ قصہ ہے گویا۔ یہ سالی برکتے ہماری کرامت کا یقین ہی نہیں رکھتی ہے۔ اس کا کچھ بندوبست کرنا ہی پڑے گا۔ خاصی موٹی تھی وہ۔ عمر اس کی یہی کوئی چالیس سال ہو گی۔ اچھی صحت تھی اس کی اور ناک نقشہ بھی اچھا اور ابھی دلفریب تھا مگر دماغ اس نے کافر کا پایا تھا۔ ہم پر ایمان ہی نہیں لا رہی تھی۔ اور یہ نکی پتہ نہیں کس بلا کا نام تھا۔ وہ شاید دروازے کی جھریوں میں سے مجھے دیکھتی رہی تھی۔ میں نے واقعی اپنی اسٹین گن کندھے سے اتار کر گدے کے نیچے رکھی تھی تاکہ ذرا کھل کر پلنگ پر بیٹھ سکوں مگر وہ سالی میری جاسوسی کرتی پھر رہی تھی اسے یہ نظر نہیں آیا کہ سامنے کتنا بانکا سجیلا جوان بیٹھا ہے۔ اونچا لمبا چوڑا چکلا، کھلتے رنگ اور شربتی آنکھوں والا۔ اس بات پر غور ہی نہیں کیا تھا اس نے۔ دیکھا تو صرف یہ دیکھا کہ میں نے کندھے پر بندوق بھی لٹکا رکھی تھی اور اس برکتے سے کوئی پوچھے اری بھلی مانس تو مجھے کب سے جانتی ہے تجھے کس نے بتایا کہ میں کوئی واردا تیا ہوں۔ کتنا رذیل لفظ استعمال کیا تھا اس نے میرے لیے۔ زبردست گستاخی کی تھی اس نے فیروزدین کے پیر صاحب کے حضور۔

میں نے پلنگ پر رکھا گاؤ تکیہ کمر کے پیچھے رکھا اور ذرا ٹانگیں پسار کر نیم دراز ہو گیا۔ وہ میرا کمبل میرے لیے پوٹ کی چادر بنا ہوا تھا۔ ہر جگہ میرے کام آتا تھا جب میرا دم بہت گھٹتا تھا اور مجھے دنیا قبر کی طرح تنگ اور تاریک نظر آتی تھی تو اس گھڑی وہ کمبل مجھے کسی بانکی سجیلی نار کے ارمانوں بھرے دوپٹے کی طرح ڈھانپ لیتا تھا۔ میں بہت ہی مضمحل ہوتا تھا۔ اتنا مضمحل کہ اپنا آپ مجھے ہر آنکھ کے سامنے عریاں نظر آتا تھا تو اس گھڑی بلاشبہ وہ کمبل میرے لیے پوٹ کی چادر بن جاتا تھا اور اس رات بھی میرے تصور میں کفن ہی ابھر رہا تھا کہ میں موت کے لب چوم کر واپس آیا تھا۔ ورنہ ان پولیس والوں نے مجھ پر جس طرح گولیاں برسائی تھیں۔ اس بڑھیا کی چھت پر سے بھاگتے وقت وہ ایسی تھیں کہ مجھے کاٹ کے ڈال سکتی تھیں۔ یہ انگلی برابر لمبی لمبی گولیاں چلاتے ہیں وہ۔ اور بے دریغ چلاتے ہیں۔ جانتے ہیں سرکاری مال ہے۔ لٹاؤ جس طرح بھی لٹتا ہے۔ وہ خود خریدیں تو پتہ چلے کہ ایک گولی پانچ روپے سے کم میں ہرگز نہیں پڑتی اور جسے لگتی ہے اسے بہت ہی مہنگی پڑتی ہے۔ زندگی کے عوض، خوف کے بھاؤ۔

کوئی دس منٹ بعد فیروزدین میرے کمرے میں واپس آ گیا۔ بولا۔ "سرکار اب ہمیں اجازت دیں آج رات ہمارا کنجاہ پہنچنا بہت ضروری ہے وہاں سے مال اٹھانا ہے۔ میری بیوی بہو اور بیٹی نکی آپ کی خدمت کریں گی۔ روشن دین کو بھی میں آپ کی خدمت کے لیے

یہاں چھوڑ رہا ہوں بس کل شام تک ہم واپس آجائیں گے۔"

"ٹھیک ہے فیروز دین! ہمیں کچھ عجیب سا لگتا ہے یہاں دیکھو نا تم سے ہمارا کوئی رشتہ ہے نہ ناطہ۔ ہمیں بہت گھبراہٹ ہو رہی ہے یہاں۔ دل چاہتا ہے یہاں سے ہم ابھی چل دیں۔" میں نے اسے ٹٹولتے ہوئے کہا۔

"لیکن سرکار ایسا ظلم نہ کریں۔ سرکار ابھی تو آپ کو روشن دین پر دم درود بھی کرنا ہے۔ وہ نکّی بھی تکڑی نہیں رہتی۔ اسے بھی ایک نظر دیکھ لیں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی حضور! میں کل شام تک ضرور... آجاؤں گا اور ماجدہ بی بی کو بھی ساتھ لے آؤں گا۔"

"ٹھیک ہے بھائی جی! ادھر لحاف رکھوا دو ایک۔ وضو کے لیے تھوڑا پانی اور ایک مصلّہ بھی بھیج دو۔"

"آپ فکر نہ کریں حضور، برکتے آپ کو ساری چیزیں مہیا کر دے گی اچھا اب اجازت دیں۔" یہ کہہ کر اس نے مجھ سے مصافحہ کیا اور میرا ہاتھ آنکھوں سے لگا کر باہر چلا گیا۔

اس اینلے کی سادگی مجھے حیران کیے دیتی تھی۔ ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں اس دنیا میں۔ اللہ کی شان ہے۔ وہ باہر چلا گیا تو تھوڑی ہی دیر بعد برکتے اپنے سر پر دوپٹہ درست کرتی ہوئی اندر آئی وہ مسکرا رہی تھی۔ اس نے بڑے ادب سے مجھے سلام کیا اور وضو کے لیے پانی کا لوٹا ایک طرف اور غالیچہ نما مصلّہ دوسری طرف رکھتی ہوئی بولی۔

"آپ نماز پڑھ لیں بابا جی پھر میں کھانا لاتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ مٹک مٹک چلتی ہوئی باہر نکل گئی۔ مجھے حیرت تھی کہ اس کی ہڈیاں تو جسم میں کہیں نظر ہی نہیں آتی تھیں۔ بہت ہی گول مٹول فتم کا بدن تھا اس کا۔

رات کو گیارہ بجے کے قریب ان لوگوں نے مجھے کھانا کھلایا۔ مُرغ تو اس برکتے اور اس کی بہو نے پکا لیا تھا مگر مزہ اس کا صرف اتنا تھا کہ اس میں کچے گھی کی بساند تھی اور پیاز کی بو۔ میں نے جوں توں کر کے وہ کھانا زہر مار کیا اور کمرے کا دروازہ اندر سے چٹخنی لگا کر بند کر دیا۔ اب میں بالکل مطمئن تھا میرے دشمن اس رات میری ہوا کو بھی نہیں پہنچ سکتے تھے۔ مجھے میرے مولا نے ایک نئی چھت مہیا کر دی تھی۔ جو بڑھیا کی چھت سے ہزار گنا زیادہ بہتر اور محفوظ تھی۔

صبح میں منہ اندھیرے ہی بستر سے اٹھ گیا۔ برکتے تو شاید فجر کی اذان پر ہی بستر چھوڑ دیتی تھی۔ صحن میں سے اس کے جوتوں کی سٹر پٹر سنائی دے رہی تھی میرے کمرے کی بتی اس نے جلتی دیکھی تو دروازے پر آگئی بولی۔

"آپ اٹھ گئے ہیں سرکار۔" یہ سرکار کا لفظ وہ فیروز دین اس کے منہ میں ڈال گیا تھا ورنہ جو کچھ اس نے میرے بارے میں بکواس کی تھی وہ میں اپنے کانوں سے سن چکا تھا۔ بہت گھنّی عورت تھی وہ۔ دل میں اس کے کچھ تھا اور زبان پر کچھ۔

"جی ہاں! مائی جی میں اٹھ گیا ہوں۔" اسے چڑانے کے لیے اس کی عمر میں نے ایک ہی جست میں تیس سال بڑھا دی۔ مائی جی کا لفظ میرے منہ سے سن کر وہ کچھ سٹپٹا سی گئی مگر تڑ سے جواب دینے سے باز نہ رہی بولی۔

"نماز کے لیے پانی رکھ دوں بابا جی۔"

"ہاں دے دیں اذان تو ہو ہی گئی ہے۔" میں نے پلنگ سے اُتر کر کہا۔ حالانکہ نماز میں نے رات بھی محض دکھاوے کے لیے پڑھی تھی۔ خدا میرے گناہ معاف کرے۔ ان لوگوں نے خواہ مخواہ مجھے ایسے بانس پر چڑھا دیا تھا کہ مجھے بلا وجہ اپنے زہد و تقویٰ کا وہاں ڈھونگ رچانا پڑ رہا تھا۔ ورنہ کہاں میں کہاں میرا معصیت سے لبریز دل اور کہاں خدا کی یاد۔ اس روشنی سے تو میں شاید ازل سے محروم تھا کہ میری تقدیر میں وہ سجدہ لکھا ہی نہ تھا جو آدمی کو ہزار سجدوں سے واقعی نجات دلا دیتا ہے۔

میں نے دروازہ کھولا تو وہ سامنے کھڑی تھی۔ وضو کا لوٹا ہاتھ میں لیے۔ وہ عجیب کینڈے کی عورت تھی۔ شوقِ خودنمائی میں ابھی تک مبتلا تھی۔ مجھ سے کانا گھونگھٹ نکال کر اس نے لوٹا میرے ہاتھ میں دیا اور بڑے گھٹے دبے لہجے میں بولی۔

"آپ کو نیند تو اچھی طرح آئی تھی نا؟"

"ہاں میں خوب سویا ہوں۔"

"آپ نماز پڑھ لیں پھر زینب آپ کے پیر دبا دے گی۔"

"کیوں! میرے پاؤں کو کیا ہوا ہے؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"میاں جی کہہ گئے تھے کہ ہم آپ کی خدمت خاطر میں کوئی کسر نہ رکھیں۔ مجھے بھی بڑی آس ہے جی آپ سے۔"

"نہیں نہیں، اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے درشت لہجے میں کہا اور دروازہ اندر سے بھیڑ کر وضو کرنے لگا۔ کمرے کے کونے میں ایک کھرا سا بنا تھا جس میں سے پانی نالی کے ذریعے باہر نکل جاتا تھا۔

نماز پڑھ کر میں جلدی ہی مصلّے سے اٹھ گیا۔ مجھے کرنا ہی کیا تھا۔ صبح کی نماز تھی دو سنتیں دو فرض۔ اللہ اللہ اور خیر سلّا، اللہ کوئی دم درود، اسم وظیفہ تو نہ مجھے یاد تھا نہ میرے دل میں اس کا کوئی شوق ہی تھا مصلّے سے اٹھ کر میں پلنگ پر جا لیٹا کہ ابھی صبح ہونے میں بڑی دیر تھی۔ میں نے اندر سے کنڈی چڑھائی اور لحاف کو اپنے گرد لپیٹ کر بیٹھ گیا۔

میں نے اپنی سوچوں کے تانے بانے میں پھنس کر وہیں لحاف کے اندر بیٹھ کر کئی سگریٹ پھونک ڈالے پھر بھی میرا ذہن صاف نہ ہو

سکا۔ ابھی سورج نکلنے میں خاصی دیر تھی۔ میں ایک بار پھر لحاف میں منہ ڈال کر سو گیا۔

وہ عجیب سی بھید بھری نیند تھی جو اتنی خمار آگیں بن گئی کہ مجھے دُور دُور تک باہنوں میں بھر کر لیے پھرتی رہی۔ اس نیند نے مجھے اس تھوڑے سے عرصے میں کئی گھر دکھا دیئے۔ میں دور دور تک ہو آیا تھا کہ آہستہ آہستہ میرے ذہن میں ایک چہرہ ابھرا اور میں ٹھٹک کر رہ گیا۔ مسند آراء میرے خواب کی بصارت پر نازل ہو رہی تھی۔ اس کا رنگ زرد تھا۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور نہ اسے سر کا ہوش تھا اور نہ سرپوش کا۔ وہ مجھے خالی خالی سی ویران اور اجڑی اجڑی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹ لرز رہے تھے مگر وہ بات نہیں کرتی تھی۔ مجھے اس نے چند ثانیوں تک گہری گہری نظروں سے دیکھا اور پھر اخ تھو کرتی ہوئی پیچھے ہٹ گئی۔ اس اخ تھو کی آواز اتنی واضح تھی کہ میری آنکھ کھل گئی۔ میں اسے پکار رہا تھا مگر نیند جب ٹوٹی تو معلوم ہوا کہ وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ بس میں تھا، اور میری تنہائی تھی۔

میں ایک بار پھر اٹھ بیٹھا۔ گھڑی میں اس وقت سات بج رہے تھے اور باہر روشنی پھیلتی جا رہی تھی مسند آراء کے خواب کی توجیہہ میں کر سکتا تھا اپنے جرم کا مجھے علم تھا اور میں جانتا تھا کہ، مسند آراء بھی اچھی طرح ان تمام واقعات سے آگاہ ہے جو پیش آچکے ہیں۔ کوئی بات اس سے پوشیدہ نہ رہ سکی ہوگی کہ میرے اور اس کے درمیان جو لاسلکی اور غیر مرئی تعلق قائم ہے وہ اتنا گہرا مضبوط اور واضح ہے کہ میں جن مراحل سے بھی گزرتا ہوں وہ اُن سے آپ ہی آپ آگاہ ہوتی چلی جاتی ہے۔

میں نے بستر چھوڑ دیا۔ ناشتہ کرنے سے پہلے میں نے نکّی کو بلوا کر ہاتھ منہ دھویا اور تیار ہو کر بیٹھ گیا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں جس طرح بھی ہو سکا مسند آراء سے ضرور مل لوں گا تاکہ اسے ساری صورتحال سے خود آشنا کر دوں، وہ وجوہات اسے بتا دوں جن کی بنیاد پر میں نے وہ قدم اٹھایا تھا۔ یہی بات سوچ کر میں نے ناشتہ کر لینے کے بعد روشن دین کو آواز دی۔ وہ بیچارا بھاگتا ہوا آیا، بولا۔

"حکم پیر سائیں، حکم۔ مجھے معاف کر دیں میری نیند جلدی نہ کھل سکی مجھے ابھی ماں نے جگایا ہے۔" اس کی آنکھوں میں ابھی تک نیند کا خمار باقی تھا اور چہرے پر سفید سفید سے داغ ابھی تک موجود تھے

"دیکھو میں تھوڑی دیر کے لیے شہر جا رہا ہوں شاید دوپہر تک واپس آجاؤں اگر دوپہر کو نہ آسکا تو شام تک میں بہرحال آجاؤں گا وہ ماجدہ بی بی شاید فیروز دین کے ساتھ آجائیں۔"

"ٹھیک ہے پیر سائیں! لیکن آپ کوئی چیز منگوانا چاہتے ہیں تو میں لا دیتا ہوں۔"

"نہیں مجھے ایک آدمی سے ملنا ہے۔"

"بہت بہتر پیر سائیں۔ پر شام کو واپس ضرور آجائیں ورنہ، میاں جی میری جان نہیں چھوڑیں گے۔" برکتے اور زینب اس وقت باہر دیوار کے ساتھ لگی کھڑی تھیں اُن کی موجودگی محسوس کر کے میں نے بلند آواز سے کہا۔ "فکر نہ کرو میں ضرور آجاؤں گا مگر اپنی ماں اور اپنی بھابی سے کہو کہ وہ آج پاک صاف ہو کر مصلّے پر بیٹھیں اور عصر کی اذان تک قرآن کریم پڑھتی رہیں۔ ان کو باندھ کر بھی بٹھانا پڑے تو ضرور بٹھانا۔ ورنہ اُن کی وجہ سے اس گھر میں زبردست تباہی آسکتی ہے۔" یہ کہہ کر میں نے اسٹین گن احمد دین کو گدّا الٹ کر دکھائی۔ "یہ میری بندوق پڑی ہے یہاں اسے کوئی ہاتھ نہ لگائے۔ سمجھا کہ نہیں۔"

"ٹھیک ہے پیر سائیں بے فکر رہیں، میں ادھر کسی کو نہیں آنے دوں گا۔ تالا ہی ڈال دوں گا ادھر۔"

اس کی یہ بات سُن کر میں صحن میں نکلا تو دیکھا کہ وہ دونوں سر جھکائے ابھی تک دیوار کے ساتھ کھڑی تھیں۔

"چلو اندر بیٹھو۔ کسی نے تمھیں سمجھایا نہیں ہے کہ غیر مرد سے پردہ کرنا چاہیے بدبختو چلو اندر۔" انھیں میں درشت لہجے میں ڈانٹتا ہوا صحن میں نکلا اور دروازہ کھول کر باہر گلی میں جا پہنچا۔

ابھی میں فیروز دین کی گلی عبور کر کے دوسری طرف بڑھا ہی تھا کہ سامنے سے مجھے ایک ہاکر نظر آیا۔ اس کی سائیکل اخباروں سے لدی ہوئی تھی۔ میں نے فوراً ہی اس سے دو اخبار خریدے اور ان کو وہیں کھڑے کھڑے جستہ جستہ دیکھنے لگا۔ سیاسی خبریں بڑی سنسنی خیز تھیں مگر جرائم کی خبریں ان لوگوں نے اور زیادہ نمک مرچ لگا کر چھاپی تھیں۔ میں نے اخبار کا اندر کا صفحہ کھولا تو میری سٹی گم ہونے لگی۔ پولیس نے ایک بار پھر میری تصویر چھاپ دی تھی مگر اب کی بار اس میں میری گرفتاری کا انعام ثانوی حیثیت رکھتا تھا۔ خبر انھوں نے یہ دی تھی کہ پھانسی کی کوٹھری سے بھاگے ہوئے مجرم غلام جیلانی نے شہر میں کل شام کبری نام کے آدمی پر گولی چلا دی۔ کبری کی حالت نازک ہے معلوم یہ ہوا ہے کہ کبری غلام جیلانی کو پہچان گیا تھا وہ اُس کا پیچھا کر رہا تھا کہ اس سے جان چھڑانے کے لیے غلام جیلانی نے اس پر گولی چلا دی۔ مجرم کبری کو شدید زخمی کر کے بادامی باغ کی کچی آبادی میں ایک عورت حاجاں کے گھر...... میں جا چھپا تھا۔ حاجاں نے بتایا ہے کہ مجرم دوڑتا ہوا اس کے گھر میں آگھسا۔ اس کے ہاتھ میں مشین گن تھی جس سے اس نے گھر والوں کو خاموش رہنے کا حکم دیا مگر پھر پولیس کے ڈر سے وہ اتنے کچھ کہے سنے بغیر چھت پر چڑھا اور چاروں طرف گولیاں برساتا ہوا فرار ہو گیا۔ پولیس کا کہنا ہے کہ مجرم بہت جلد گرفتار کر لیا جائے گا۔

میں نے دونوں اخبار لپیٹ کر کمبل میں چھپائے اور اپنی قدم

فیروزدین کے گھر پہنچا ۔۔ میرا اس روز شہر میں نکلنا کسی طرح بھی مناسب نہیں تھا۔ اخبار تو گھر گھر جاتے ہیں۔ ایک سے ایک تیز نظر آدمی شہر میں پڑا ہے۔ میری گرفتاری پر انعام حاصل کرنے کے لالچ میں لوگ قدم قدم پر ایک دوسرے آدمی کو ٹھٹک ٹھٹک کر دیکھیں گے اور حالت یہ ہو گئی تھی کہ اب میں ہی پولیس کی نگاہ میں صوبے کا سب سے زیادہ اہم اور خطرناک مجرم تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اس روز دوسروں سے بالکل الگ اشتہار کی صورت میں ایک بار پھر میری تصویر شائع نہ کرتے اس روز کے اخبار میں اور کسی بھی مفرور کی تصویر نہیں چھپی تھی۔ وہ سب لوگ پس منظر میں چلے گئے تھے اور ایک صرف غلام جیلانی ایسا تھا، جس کا انہیں نام یاد رہ گیا تھا۔

مجھے اگر کوئی اطمینان اس صبح حاصل ہوا تو وہ یہ تھا کہ کبری ابھی زندہ تھا۔ اللہ جانتا ہے اسے جان سے مار دینا میرا مقصد تو ہرگز نہیں تھا۔ میں صرف اسے اپنے راستے سے ہٹا دینا چاہتا تھا۔ اگر وہ مجھ پر گولی نہ چلاتا اور وہ بھی یوں چھپ کر، تو میں اتنی بیدردی سے اس پر گولی کبھی نہ داغتا۔ مگر ابتدا اس نے خود کی تھی۔ بہر حال میں خدا سے دعا مانگ رہا تھا کہ وہ بچ جائے۔ اس کی موت سے مجھے کوئی فائدہ حاصل نہ ہو سکتا تھا۔ میں یہ بات اس لیے کہہ رہا ہوں کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ میرے منہ کو لہو لگ چکا تھا اور میں لوگوں کو بے دریغ قتل کر کے خوشی محسوس کرتا تھا۔ حاشا وکلّا یہ بات ہرگز نہیں تھی ۔۔ میں ایسا کبھی نہیں چاہتا تھا۔ میں پیشہ ور قاتل بن کر زندگی گزارنا نہیں چاہتا تھا۔

ایک اور اطمینان جو مجھے ملا وہ یہ تھا کہ مجیدن کی ماں حاجاں نے پولیس کے سامنے بہت عمدہ بیان دیا تھا ایسا بیان جو اس کی جان بچانے کے لیے بہت کافی تھا۔ اس نے حاضر دماغی سے کام لیا تھا اور مجھے یقین تھا کہ اس آبادی کا چوہدری جس نے حاجاں سے مکان کی قیمت وصول کی تھی میرے خلاف کوئی بیان نہیں دے گا کیونکہ اس کا میرے بارے میں کوئی بات کہنا حاجاں کے لیے سخت نقصان دہ ثابت ہو سکتا تھا۔ اور اس چوہدری کے متعلق میں نے جو کچھ سنا تھا اس سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ وہ اپنے اردگرد کے لوگوں کو اپنی رعایا سمجھتا تھا اور یہ برداشت نہیں کرتا تھا کہ ان میں کسی کو بھی کسی کی طرف سے کوئی گزند پہنچے۔

میں نے جب فیروزدین کے دروازے پر دستک دی تو برکتے آگے بڑھی بولی، "کون ہے۔"

"میں ہوں بی بی، دروازہ کھول۔"

میری آواز پہچان کر اس نے دروازہ کھول دیا۔ بڑے چاؤ سے بولی۔ "پیر سائیں آپ واپس آ گئے؟"

"ہاں میں نے استخارہ کیا ہے۔ آج میرا اس گھر کے اندر رہنا بہت ضروری ہے۔ ہو سکتا ہے روشن دین کو پھر میری ضرورت پڑ جائے۔" میں نے بڑے دبنگ لہجے میں کہا۔ اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا صحن عبور کرنے لگا زینب اس گھڑی دائیں ہاتھ نلکے پر کھڑی دانت مانجھ رہی تھی کمرے کا دروازہ ابھی ویسے ہی کھلا تھا جیسے میں چھوڑ گیا تھا۔ میں اندر داخل ہوا تو روشن دین میری اسٹین گن کو ہاتھ میں لیے اس کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔

"یہ کیا کر رہے ہو روشن دین، بری بات ہے۔ ہمارے اس کھونٹے کو وہیں رکھ دو۔"

اس نے گھبرا کر مجھے دیکھا اور اسٹین گن فوراً گدے کے نیچے چھپا دی۔ "آپ؟ آپ واپس آ گئے پیر سائیں۔ آپ تو ۔۔۔۔"

"ہاں یار۔ بس تیری وجہ سے میں واپس آ گیا ہوں میرا حساب بتاتا ہے کہ تجھے آج پھر میری ضرورت پڑ جائے گی۔" میں نے نہایت ہی فلسفیانہ لہجے میں اسے اپنی واپسی کی وجہ بتائی وہ گھبرا گیا بولا۔

"آپ کی بڑی مہربانی ہے پیر سائیں! مجھے کوئی تعویز دے دیں میں باندھ لوں گا۔ بہت ڈر گیا ہوں۔"

"دیکھیں گے کیا ہو سکتا ہے تو ابھی اندر جا کر آرام کر اور دیکھ اپنے بدن پر زیتون کے تیل کی مالش کر جہاں جہاں بھی داغ ہیں۔ ہاں تیل لگا دے جا شاباش۔"

میری یہ بات سن کر وہ فوراً ہی باہر نکل گیا۔ میں نے دروازہ بند کیا اور لحاف کھول کر ایک بار پھر پلنگ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا ڈر مجھے یہ تھا کہ اگر فیروزدین کے گھر والوں میں سے کسی ایک نے بھی آج کا اخبار دیکھ لیا تو وہ مجھے پہچان لیں گے ۔ میری حماقت کی حد یہ تھی کہ میں نے اپنے چہرے کو بدلنے کے لیے اور لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے ابھی تک کچھ بھی نہیں کیا تھا۔

مصیبت یہ آن پڑی تھی کہ پولیس والوں نے میری وہ تصویر بھی چھاپ دی تھی۔ جس میں میرے چہرے پر داڑھی تھی اور وہ بھی شائع کر دی تھی جس میں میری داڑھی اور مونچھیں منڈی ہوئی تھیں اب فرق صرف یہ آ پڑا تھا کہ میں نے اپنے لبوں پر یہ بڑی بڑی مونچھیں پال لی تھیں اور انہی کے پردے میں میں اپنی شناخت کو چھپائے پھرتا تھا مگر اس حال میں کہ میں اپنے سائے سے بھی لرزاں تھا۔

فیروزدین کے گھر میں واپس پہنچ کر میں نے سکھ کا سانس لیا۔ میرے دل کی بے ترتیب دھڑکنیں معمول پر آنے لگیں تو میں نے ایک بار پھر دونوں اخباروں میں چھپی خبر بڑی تفصیل سے پڑھی۔ حیرت مجھے یہ ہوئی کہ اس میں دل شیر آہو کا ذکر علاقے کے سرکردہ سیاسی نمائندے کی حیثیت سے کیا گیا تھا اور لکھا تھا کہ انہوں نے مجرم کے تعاقب کے وقت پولیس سے بہت تعاون کیا اور گئی رات تک اس کوشش میں مصروف رہے کہ جس طرح بھی ہو سکے وہ خطرناک مجرم گرفتار ہو جائے۔

آہو نے مجھے جو پٹخنی دی تھی اس کی وجہ سے میں بلاشبہ اوندھے منہ جا گرا تھا مگر میں جو کچھ اس کے ساتھ کرنے والا تھا اس کا تو اس کے فرشتوں کو بھی اندازہ نہیں تھا۔

وہ دن میں نے فیروزدین کی بیٹھک میں اس طرح گزارا کہ ساری نمازیں اذان کے بعد وقت پر باقاعدگی سے پڑھیں اور ہر بار برکتے سے پانی گرم کروا کر وضو کیا۔ نمازوں کے درمیان کا وقت میں نے سو کر گزار دیا۔

میں بڑی شدت سے فیروزدین کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا اخبار میں نے دونوں لپیٹ کر سنبھال لیے تھے تاکہ اگر ضرورت پڑے تو میں ماجدہ کو اپنے بارے میں ساری باتیں تفصیل سے بتا دوں میرا ارادہ یہ تھا کہ اس کے سامنے میں خود کو ظاہر کر دوں گا کیونکہ ہمارے درمیان اب کوئی بھی پردہ حائل نہیں رہنا چاہیے تھا۔ یہی بات مجھے مناسب معلوم ہوتی تھی میرے سلسلے پانسے الٹے پڑ رہے تھے اور میں چاہتا تھا کہ خدا کے بعد کوئی ایک تو ہستی ایسی ہو جس کے سامنے میں جھوٹ نہ بولوں جس پر میں خود کو جیسا ہوں ویسا ہی ظاہر بھی کر سکوں جس سے مجھے ڈرنے یا خوف کھانے کی ضرورت محسوس نہ ہو اور وہ ہستی ماجدہ کے سوا اور کوئی نہیں تھی۔ مجھے اس کے خلوص پر بے پناہ اعتماد تھا اور مجھے یقین تھا کہ وہ میرا پیغام سنتے ہی دوڑی چلی آئے گی۔ اور میرا ایک ایک پل اب اسی کے انتظار میں گزر رہا تھا۔

برکتے اور زینب نے میرے کہنے پر باقاعدہ عمل شروع کر دیا تھا۔ وہ میرے کمرے کے ساتھ والے کمرے میں بیٹھ گئی تھیں اور بلند آواز سے قرآن پڑھ رہی تھیں۔ بارہ بجے کے قریب وہ اٹھ کر باورچی خانے میں جا گھسیں۔

دوپہر کا کھانا روشن دین نے مجھے میرے پلنگ پر ہی پہنچا دیا مغرب کی اذان سن کر میں نے روشن دین کو آواز دے کر اس سے وضو کے لیے پانی منگوایا۔ جب میں نماز پڑھ چکا تو اچانک مجھے بائیں ہاتھ کے کمرے سے رونے پیٹنے کی آوازیں سنائی دیں۔ برکتے اور زینب بلند آواز سے واویلا مچانے لگیں تھیں۔ روشن دین بھاگا بھاگا میرے پاس آیا، بولا۔

"پیر سائیں! خدا کے لیے بچی کو دیکھیں اسے پھر دورہ پڑ گیا ہے۔"

"کیسا دورہ! کیا کہتے ہو تم؟"

"پیر سائیں! اس کے ہاتھ پاؤں ٹیڑھے ہو رہے ہیں، منہ سے جھاگ نکل رہے ہیں اسے دیکھیں پیر سائیں کوئی دم درود کریں۔"

"چلو دکھاؤ مجھے کیا ہوا ہے اسے! تم سب کو بس دورے ہی پڑتے رہتے ہیں کہ اور بھی کوئی کام کرتے ہو۔" میں کمبل اپنے گرد لپیٹ کر اس کے ساتھ دوسرے کمرے میں جا پہنچا۔ بچی ٹھنڈے فرش پر پڑی پچھاڑیں کھا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں یوں باہر کو نکلی پڑ رہی تھیں جیسے ابھی اس کے ڈھیلے اپنے خانوں سے باہر گر جائیں گے۔ اس کے منہ سے جھاگ چھوٹ رہے تھے اور ہاتھ اس نے ٹرائنوں کی طرح موڑ رکھے تھے۔ وہ فرش پر لوٹ پوٹ ہوتی کبھی ادھر جاتی کبھی ادھر اور برکتے سے وہ سنبھالے نہ سنبھلتی تھی۔ اس کی حالت دم بدم خراب ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں اور زیادہ وحشتناک ہوتی جا رہی تھیں۔ اور وہ پلنگ سے اٹھ اٹھ کر باہر کو دوڑتی تھی۔ کبھی بالوں سے سر جھنجھوڑتی تھی اور کبھی بلند آواز سے سب کو نام لے لے کر گالیاں دے رہی تھی ۔۔ میں تو سناٹے میں آ گیا۔ وہ لڑکی واقعی کسی جن کے قبضے میں جا چکی تھی۔ اس کے پاس جاتے ہوئے مجھے ڈر محسوس ہو رہا تھا۔

جونہی میں اس کے سامنے ہوا وہ اپنی ماں سے ہاتھ چھڑا کر پلنگ سے اتری اور میری طرف یوں سر آگے کر کے بڑھی جیسے کوئی مغز پھری گائے اپنے سینگ سیدھے کر کے اپنے مخالف پر حملہ آور ہوتی ہے۔ میں ایک دم دوسری طرف ہٹا تو وہ اپنی جھونک میں بھاگتی ہوئی دروازے میں سے نکلتی چلی گئی مگر دہلیز سے باہر قدم رکھتے ہی اس کا پیر شلوار کے کھلے پائنچے میں پھنسا اور وہ دھڑام سے منہ کے بل فرش پر گر گئی۔ اس کے ہونٹوں پر سخت چوٹ لگی۔ برکتے اور زینب نے بھاگ کر اسے اٹھایا تو میں نے دیکھا کہ اس کے رخسار چھل گئے تھے اور اس کے ہونٹوں سے خون رسنے لگا تھا۔

وہ خاصی صحت مند لڑکی تھی۔ ڈیل ڈول بھی اس کا بہت اچھا تھا مگر مرض نے اسے اجاڑ کر رکھ دیا تھا۔ جونہی برکتے اور زینب نے اسے اٹھایا وہ ان کو دو ہتڑیں مارتی ہوئی چیختی چلاتی ہوئی کمرے میں گھسی اور دروازے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر وہ تن کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا اور مجھے گالیاں دے رہی تھی میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر ہلکا سا طمانچہ مارا مگر وہ طمانچہ ہی غضب کا ہو گیا۔ وہ یوں زمین پر گر گئی جیسے کسی نے جڑ سے کاٹ کر درخت کو نیچے گرا دیا ہو۔ وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ ہاتھ اس کے ابھی تک مڑے ہوئے تھے اور اب نچلا جبڑہ بھی قدرے باہر کو سرکا نظر آ رہا تھا۔

"اسے ادھر پلنگ پر ڈال دے روشن دین۔"

میری یہ بات سنتے ہی برکتے اور زینب نے اسے اٹھا کر پلنگ پر لٹا دیا۔ اب اس بدنصیب کے پاؤں بھی اندر کی طرف مڑنے لگے تھے۔ اس کا مرض بڑھتا جا رہا تھا۔ اس لمحے اس بچاری پر مجھے بے حد ترس آیا۔ میں نے سوچا میں نے کیوں اس تیرہ بخت پر ہاتھ اٹھایا۔ کیوں اس کی اذیت میں مزید اضافے کا سبب بنا۔ اپنے اس گناہ کا کفارہ ادا کرنے کے لیے میں نے آگے بڑھ کر اس کے دونوں مڑے ہوئے ہاتھ دائیں ہاتھ میں لے کر اس کے قدرے باہر کو نکلے جبڑے پر بڑی محبت اور شفقت سے ہاتھ پھیرا تو

مجھے محسوس ہوا کہ ذرا سا دباؤ ڈالنے پر اس کا جبڑا اپنی جگہ پر آ گیا ہے۔ میں نے اس کے دونوں ہاتھ آہستہ آہستہ سیدھے کئے تو اس کی انگلیاں یوں کھلنے لگیں جیسے ان میں ہڈی تھی ہی نہیں — اپنے ہاتھ کے اس اعجاز کو مزید آزمانے کے لیے میں نے اس کے مڑے ہوئے پاؤں پر ہاتھ پھیرا تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ لکڑی کی طرح سخت ہوتے ہوئے پاؤں نرم ہونے لگے تھے۔ میرے ہاتھ کی حرکت کے ساتھ ہی ساتھ وہ اپنی اصلی حالت پر آتے گئے۔

"اوہ میرے پیر! آپ نے تو کمال کر دیا ہے حضور! آپ نے کمال کر دیا ہے۔"

بے اختیار یہ لفظ روشن دین کے منہ سے نکلے تو میں ایک دم پورے قد سے تن کر کھڑا ہو گیا۔

"کیا بکتے ہو۔ میرا کیا کمال ہے اس میں بدبخت اب مجھے ذلیل کرتا ہے تو۔" جا پانی کا ایک گلاس لا۔" میں نے اسے بُری طرح ڈانٹ دیا۔ وہ دُم دبا کر باہر بھاگا اور فوراً ہی پانی کا گلاس بھر کر اندر لے آیا۔ میں نے وہ گلاس اس کے ہاتھ سے لے کر بچی کے منہ سے لگا دیا۔

"لے میری بہن یہ لے پانی پی۔ اللہ کرم کرے گا۔"

بچی ابھی تک بے ہوش تھی اور اس کی کھلی آنکھوں کی وہ المناک وحشت ابھی تک برقرار تھی مگر میری یہ بات سنتے ہی وہ آہستہ آہستہ اٹھی۔ اور میرے ہاتھ سے گلاس لے کر خود پینے لگی۔ ایک ہی سانس میں وہ سارا پانی حلق سے اتار گئی مگر پانی پینے کے فوراً ہی بعد وہ پھر تکیے پر گر گئی۔ اب اس کی آنکھیں مندنے لگی تھیں۔

سونے کی ضرورت نہیں ہے اب اُٹھ جاؤ بہنا۔ دیکھو تو تیرا بھائی کتنا پریشان ہے۔" یہ کہہ کر میں نے اس کے کھلے بالوں پر ہاتھ پھیرا تو اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں اس کے گلے میں پڑے دوپٹے سے میں نے اس کے منہ پر لگی جھاگ صاف کی اور پھر دوپٹہ اس کے سینے پر ڈال دیا۔

"اٹھ جا میری بہن شاباش! دیکھ تو اب ٹھیک ہو گئی ہے۔ اب تو پھر کبھی بیمار نہیں ہو گی" یہ کہہ کر میں نے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا تو وہ آپ ہی آپ اٹھتی چلی گئی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اور پھر وہ حیران پریشان ہو کر ہم سب کو دیکھنے لگی۔ اس لمحے میری نظر برکتے اور زینب کے چہروں پر پڑی۔ ان کی آنکھوں میں جو تحیّر تھا۔ اس کا کوئی آدمی اندازہ ہی نہ کر سکتا تھا۔ اُن کے نزدیک شاید میں نے ایک ناممکن بات کو ممکن بنا دیا تھا۔ ان کے منہ کھلے تھے اور نظریں میرے چہرے پر گڑی تھیں۔ اُن کا بس نہ چلتا تھا ورنہ شاید وہ اس لمحے رو بھی دیتیں مگر وہ روئی نہیں۔ دونوں تیزی سے میری طرف بڑھیں اور دونوں نے میرے پاؤں پر سر رکھ دیئے۔ جی ہاں۔ اپنے سر میرے قدموں میں ڈال دیے۔ میں نے پاؤں کھینچ کر ان دونوں کو بڑی احتیاط سے اوپر اٹھایا۔

"جاؤ بی بی جاؤ۔ اُدھر بیٹھ کر قرآن کی تلاوت کرو۔ تم نے بڑا وقت ضائع کر دیا ہے جاؤ میری بات پر عمل کرو۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔ مجھے اپنا بھائی سمجھو سگا بھائی۔" میں نے ان کے اشک آلود گال تھپتھپائے اور پھر تیزی سے باہر نکل کر اپنے کمرے میں جا بیٹھا۔ میری حیرت کا ٹھکانا نہیں تھا۔ یہ میرے ہاتھ میں ایسی معجزانہ قوتیں کہاں سے پیدا ہو گئی تھیں۔ میں تو خدا کا عاجز گنہ گار بندہ ہوں ایسا گنہ گار کہ جس کے نام پر سارا زمانہ تھوک رہا ہے۔ یہ میرے وجود میں میرے اس گندے خون آلود ہاتھ میں اتنی ساری شفا کہاں سے آ گئی ہے۔ میں نے اپنی آستین کھولی اور اپنی کلائی کے ان داغوں کو دیکھنے لگا۔ جو باباجی نے جلتی لکڑی سے لگائے تھے۔ وہ پُراسرار داغ دیکھنے میں بس عام زخموں ایسے داغ تھے مگر مجھے ان کی پُراسراریت نے حیران کر دیا تھا۔ یہ تیسرا موقع تھا کہ میں نے دل میں جو چاہا تھا۔ وہ وقوع پذیر ہو گیا تھا۔ رات بھی میں نے اپنے ہاتھ کی کرامت دیکھی تھی۔ روشن دین کے سلسلے میں اور اب بچی کو میں نے بدترین حالت میں سے صحیح سالم باہر آتے دیکھا تھا یہ کیا قصہ ہے میرے خدا۔ یہ کتنا سنگین مذاق ہو رہا ہے میرے ساتھ۔ میں۔۔۔ میں غلام جیلانی، خونی! قاتل! انسانوں کی بستی کا بھیڑیا۔ یہ مجھے ارذل ترین سطح سے اٹھا کر قطب غوث کا درجہ دینے کی کیا سوجھی ہے تجھے میرے مولا میرے امتحان میری آزمائشیں اور زیادہ سنگین نہ بنا میرے مالک میں۔۔۔ میں یہ بوجھ نہیں اٹھا سکوں گا۔ میں تو۔۔۔ میں تو تسلیم ہی کر چکا ہوں کہ میری مزاولت، ذلّت و خواری ہے۔ میں اُن ملامتیوں میں سے ہوں جو سر پر خاک ڈالے پھرتے ہیں جو بدترین قسم کی غلاظتوں میں لوٹتے پھرتے ہیں اور جنھیں اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ ذلتوں کے لیے ہیں اور ذلتیں ان کے لیے ہیں۔ مجھے کیوں اس صاف ستھری بے داغ عظیم اور یکتا مسند پر بیٹھ جانے کی رغبت دلا رہا ہے میرے خدا۔ میں۔۔۔ میں تو یہ بوجھ ہرگز نہیں اُٹھا سکتا۔ میں سر جھکائے بیٹھا اپنی کلائی کے داغوں کو دیکھ رہا تھا اور میری آنکھوں سے آنسو پھوٹ نکلے تھے۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں دھاڑیں مار مار کر روؤں اور یہی ہوا بھی۔ میں نے کمبل میں اپنا منہ چھپایا تو اندر سے میرے دل کے چھالے پھوٹ نکلے۔ میں دھاڑیں مار مار کر رونے لگا جیسے کوئی بچہ بہت زیادہ پٹ جانے کے بعد بلک بلک کر روتا ہے۔ ایسا روتا ہے جس میں شکوہ بھی ہوتا ہے اور ندامت بھی، ناز بھی ہوتا ہے اور اپنے حقیر و بے بس و ناتواں ہونے کا احساس بھی۔ اور جب میں کمبل میں منہ چھپا کر آنکھیں موتے جی بھر کر رو چکا اور میرے آنسو کا تار ٹوٹنے لگا تو میں نے کمبل سے منہ نکال کر آنکھیں جو کھولیں تو مجھے اپنے گرد و پیش پر

ایک دم طیش آنے لگا۔ روشن دین، برکتے اور زینب دروازے میں کھڑے ٹکٹک مجھے دیکھ رہے تھے۔ اُن کے رنگ زرد پڑ چکے تھے اُن کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں رو کیوں رہا ہوں اور پھر بلک بلک کر۔ آخر ایسی کیا بات ہوئی کہ میں کمبل میں منہ دے کر پھوٹ پھوٹ کر گریہ زاری کر رہا ہوں۔ اُن کو سامنے دیکھ کر میں نے اپنے لہجے کی پوری گھن گرج سے ڈانٹا۔

"یہاں کیوں کھڑے ہو، دفع ہو جاؤ میری نظروں سے۔۔۔ جاؤ۔۔ ورنہ میں خود نکل جاؤں گا یہاں سے۔"

میں نے پلنگ پر سے پاؤں نیچے ٹکا دیئے۔

"بس بس پیر سائیں ہمیں معاف کر دیں۔ ہم جا رہے ہیں پیر سائیں! آپ نہ جائیں۔ خدا کے لیے آپ یہیں رہیں۔ میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔" روشن دین نے ڈر کر میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر چوم لیے۔ اس کی سادہ لوحی مجھے خوش کر گئی۔ میرا غصّہ فرو ہونے لگا۔

"ٹھیک ہے روشن دین دروازہ بند کر دو اور جاؤ اپنا کام کرو۔ مجھے آرام کرنے دو۔"

چند لمحوں تک وہ مجھے غور سے تکتا رہا اور پھر وہ فوراً ہی اُلٹے قدموں مڑا اور ان دونوں کو دھکیل کر اپنے پیچھے دروازہ بند کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ ان سب کے لیے وہ سب کچھ قطعی طور پر ناقابلِ یقین اور ناقابلِ فہم تھا۔ میرے اپنے ذہن کی حالت بھی اُن سے کچھ مختلف نہیں تھی۔ مجھے بھی اپنے اوپر اعتبار نہیں آ رہا تھا۔ میں بھی اپنی شناخت بھولتا جا رہا تھا۔ میرے ذہن میں بھی سیکڑوں ہزاروں سوالات سنپولیوں کی طرح اُبھرتے آ رہے تھے اور وہ میرے دماغ کی سطح پر برابر ڈنک مار رہے تھے ان کے وہ ڈنک اتنے تیز اور زہریلے تھے کہ میرا سارا وجود لرزنے لگا تھا۔ وہ بات جس کا میں نے کبھی خواب میں بھی تصوّر نہیں کیا تھا وقوع پذیر ہو رہی تھی۔ میرے ہاتھ میں جادوئی طاقت پیدا ہو چکی تھی۔ میں جس نے ایک عرصے سے لوگوں کی گردنیں مل دینے کے سوا کوئی اور کام نہیں کیا تھا۔ خدا کا برگزیدہ بندہ بننے کے عمل سے گزر رہا تھا۔ اپنے خدا کی ان بخششوں کی مثالیں تو میں نے بہت دیکھ رکھی تھیں کہ اُس نے شیطانوں کو قارون کے خزانے اور اندھوں کو فرعون ایسے اختیارات دے دیئے تھے — کروڑوں لوگ رات کو بھوکے پیاسے سو جاتے ہیں جب کہ سینکڑوں ایسے ہیں جن کے کتے راتب بچانے کے لیے اُچھل کود کرتے ہیں۔ یہ خدا کی باتیں ہیں وہی ان کے اسرار کو صحیح سمجھ سکتا ہے۔ مگر میں ایسا کہاں کا ایاز تھا کہ مجھے اس نے اپنا خاص بندہ بنانے کی ٹھان لی تھی، یہی وہ سوال تھا جو میں شام ہونے تک سر کھپانے کے باوجود حل نہ کر سکا۔

سب سے بڑی مشکل یہ آ پڑی تھی کہ مجھے اس روز دکھاوے کے لیے عصر کی نماز بھی پڑھنی پڑی تھی اور مغرب کی بھی — خدا میرے گناہ معاف کرے۔ میں کوشش کے باوجود اپنے دل میں یکسوئی اور گداز کی کیفیت محسوس نہیں کر رہا تھا۔ اور مجھے اپنی وہ نمازیں کھوکھلی اٹھک بیٹھک معلوم ہوتی تھیں میرا دل چاہتا تھا کہ میں سب کچھ چھوڑ کر وہاں سے بھاگ نکلوں۔ وہ لوٹا مصلّے اٹھا کر باہر صحن میں پٹخ دوں۔ میں خدا کو منہ دکھانے کے قابل رہا ہی کہاں تھا کس برتے پر میں تتا پانی مانگتا تھا روشن دین سے۔ اپنی رُوسیاہی پر وضو کا پانی ڈالتے مجھے سخت ندامت محسوس ہوتی تھی۔ مگر میں نمائشی پاکیزگی طہارت اور عبادت و زہد کے ایسے جال میں پھنس گیا تھا کہ مجھے ان لوگوں کو مطمئن رکھنے کے لیے وہ سب کچھ کرنا پڑ رہا تھا اور میں خدا سے دعا کر رہا تھا کہ یا تو وہ مجھے مکمل طور پر اپنی طرف متوجہ کر کے میرے دل میں یکسوئی پیدا کر دے یا پھر مجھے اس عذاب سے باہر نکلنے دے کہ میں ساری دنیا سے تو مکر و منافقت کر سکتا ہوں مگر وہ جو میرے سامنے ہے حاضر ہے ناظر ہے میری شہ رگ سے بھی قریب ہے اسے میں کیونکر فریب دے سکتا ہوں۔ اور یہی وجہ تھی کہ جب میں مغرب کی نماز پڑھ کر مصلّے سے اُترا تو میرا دل بُری طرح سسک رہا تھا اور میں نے طے کر لیا تھا کہ اس ڈرامے کو ختم کر کے میں کل صبح سُورج نکلنے سے پہلے پہلے وہاں سے چل دوں گا۔ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے۔ میں خدا کے سامنے اور اپنی نظروں میں اور زیادہ ذلیل و رسوا نہیں ہونا چاہتا تھا۔ جب میری طبیعت اِدھر مائل ہی نہیں تھی حالانکہ مجھے ثوابِ طاعت و زہد معلوم تھا پھر میں کیوں خواہ مخواہ اُن رذیل لوگوں کی نظروں میں اپنی پیر خانی کا بھرم قائم کرنے کے لیے یہ سود اور پُرازریا اُٹھک بیٹھک جاری رکھوں۔ مجھے ان نعمتوں سے کیا لینا تھا۔

ایک آدھ رات کی پناہ کے سوا وہ مجھے اور کیا دے سکتے تھے اور وہ پناہ، وہ امان، وہ تحفظ مجھے مل ہی چکا تھا۔ اب مجھے نئی منزلوں کی طرف چل دینا تھا۔ ان منزلوں کی طرف جن پر پہنچ کر میں آہو سے اپنا حساب چکا سکتا۔ آسیہ کو رہائی دلانے اور ڈاکٹر دھمن سے انتقام لینے کے لیے کچھ کر سکتا۔

عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد میں نے کھانا کھا کر اندر سے کنڈی چڑھائی اور ایک بار پھر اخبار کھول کر بیٹھ گیا۔ آہو اور کُبری کی خبر تو اپنی جگہ بے حد اہم تھی مگر پہلے ہی صفحے کے ایک کونے میں ایک اور خبر نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ خبر یہ تھی کہ گجرات اور گوجرانوالہ کے ضلعوں کے تمام بڑے بڑے شہروں اور قصبوں میں کل زبردست ہڑتال ہوئی تھی اور وہ ہڑتال اس سیاسی پارٹی کی اپیل پر کی گئی تھی جس کے ٹکٹ پر چوہدری ہادی علی انتخابات کے

لیے کھڑا ہوا تھا۔ پارٹی کا موقف یہ تھا کہ ہادی علی کو برسرِاقتدار پارٹی نے مروایا ہے تاکہ اس کی راہ صاف ہو جائے اور بڑے صاحب بلا مقابلہ منتخب ہو جائیں۔

یہ بڑی ہی خطرناک خبر تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ آہو نے ایک تیر سے دو شکار مارے تھے۔ وہ اپنی راہ بھی صاف کر چکا تھا اور بڑے صاحب کی بھی۔ مگر مجھے اس نے اس سارے معاملے سے یوں الگ کر دیا تھا جیسے کوئی مکھن سے بال کھینچ کر باہر پھینک دیتا ہے۔

اس خبر کی تفصیلات پڑھ کر میرا سارا وجود لرزنے لگا تھا۔ وہ ہستی جس کی آزادی کے لیے میں نے ہادی علی کو قتل کیا تھا ابھی تک جیل کی سنگین دیواروں کے پیچھے محبوس تھی اور میں اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکا تھا۔ میں ہنوز اس سے ہزاروں لاکھوں میل دور تھا۔ وہ راتوں کے دلگیر سناٹوں میں اپنے جوؤں اور کھٹملوں سے اَٹے بستر سے اُٹھ اٹھ کر سوچتی ہو گی کہ اس کا بھائی جیلانی اُس کی رہائی کے لیے کوشاں ہو گا، مگر اُس حرماں نصیب کو یہ خبر ہی نہیں تھی کہ جیلانی کس حد تک بے بس ہو چکا تھا اور اسے حالات کی سنگینی نے کس حد تک اپاہج بنا دیا تھا۔

اس وقت رات کے نو بج رہے تھے ابھی میں کھانے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ صحن میں مجھے فیروز دین کی آواز سنائی دی — میں نے کھڑکی میں سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ تنہا ہے۔

"پیر صاحب کہاں ہیں؟"

"وہ اندر بیٹھے ہیں۔ نکی کے ابا وہ اندر بیٹھے ہیں۔" یہ برکتے کی آواز تھی۔ فیروز دین تیز تیز قدم اٹھاتا میرے کمرے میں داخل ہوا۔

"السلام علیکم پیر صاب۔"

"وعلیکم السلام۔ تم تو اکیلے ہی واپس آ رہے ہو فیروز دین۔"

"ہاں پیر سائیں وہ لڑکی تو ہمیں نہیں ملی۔ اس کے گھر پر تالا لگا ہے ہمسایوں نے بتایا ہے کہ اسے پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔"

"پولیس پکڑ کر لے گئی ہے مگر کیوں؟"

"کنجاہ کے دو آدمی ہیں۔ چوہدری کرامت اور فیروز — وہ ہسپتال میں پڑے ہیں۔ اُن کی رپورٹ پر انھوں نے ماجدہ کو گرفتار کیا ہے۔"

"تم کھڑے کیوں ہو۔ بیٹھ جاؤ ادھر اور مجھے بتاؤ کہ یہ باتیں تمھیں کس نے بتائی ہیں۔"

"اس کے ہمسائے میں ایک بُڑھیا رہتی ہے اس نے یہ سب کچھ مجھے بتایا ہے وہ تو بہت گالیاں دیتی تھی۔ ماجدہ کو کہتی تھی ... کہتی تھی کہ وہ بہت ہی ... بہت ہی ... " فیروز دین نے میرے پلنگ کی پائنتی پر بیٹھ کر کہا۔

"ہاں ہاں بولو کیا کہتی تھی وہ۔"

"وہ تو پیر سائیں یہی کہتی تھی کہ وہ ماجدہ کوئی اچھی لڑکی نہیں ہے۔ تھی تو وہ اُستانی مگر وہ کہتی تھی کہ اس کے پاس بہت سے لوگ آتے تھے۔ سارا محلہ تنگ تھا اس سے۔"

"ایسے ہی بکواس کرتی ہے وہ بدکار بُڑھیا۔ اور کیا خبر ہے اُدھر کی۔"

"میں تو آپ کی وجہ سے آ گیا پیر سائیں۔ ورنہ ادھر تو سارا کاروبار ٹھپ پڑا ہے۔ گجرات، کنجاہ، جلال پور، وزیرآباد، گوجرانوالا تک زبردست ہڑتال ہے۔ میں تو ٹرک بھی نہیں لا سکا۔ اس ڈر سے کہ کہیں لوگ اسے آگ ہی نہ لگا دیں۔ راستے میں کئی گاڑیوں کو لوگوں نے توڑ دیا ہے۔"

"وہ کیوں؟" میں نے دبی زبان سے پوچھا۔ "یہ ہڑتال کیوں ہوئی اور لوگ تشدد کیوں کر رہے ہیں۔ ہوا کیا ہے آخر؟"

"وہ... وہ پیر سائیں کوئی چوہدری تھا ادھر ہادی علی وہ قتل ہو گیا ہے کہتے ہیں وہ ممبری کے لیے کھڑا ہو رہا تھا۔ اسے کہتے ہیں سرکاری آدمیوں نے قتل کروا دیا ہے۔"

"اچھا؟ تو یہ بات ہے! ٹھیک ہے فیروز دین تم یہ بتاؤ کہ ادھر کوئی آدمی رہتا ہے جس کی اپنی ٹیکسی ہو۔ میں ابھی ایک جگہ جانا چاہتا ہوں۔"

"ٹیکسی تو مل جائے گی پیر سائیں ادھر وہ اپنا یوسف بادر رہتا ہے وہ یہی کام کرتا ہے میں اسے بلا لیتا ہوں مگر اس وقت آپ کہاں جائیں گے؟"

"مجھے ایک کام ہے ادھر ہریکا گاؤں میں۔ تم اسے بلا دو میں اسے ڈبل کرایہ دے دوں گا۔" برکتے تیزی سے آگے بڑھی۔

"مگر پیر سائیں ہم آپ کو نہیں جانے دیں گے اس وقت دیکھیں تو کتنی رات ہو گئی ہے۔" وہ مجھے بڑی دلفریب معصومیت سے دیکھ رہی تھی۔

"نہیں بی بی ہم ابھی جائیں گے۔ کام ہی کچھ ایسا ہے تم اسے بلاؤ فیروز دین۔"

"اچھا پیر سائیں، میں ابھی جاتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکلا تو برکتے بھی اس کے پیچھے لپکی اس کے پیچھے روشن دین بھی۔ صحن میں جا کر ان لوگوں نے فیروز دین کو خدا معلوم سرگوشیوں میں کیا بتایا کہ وہ انھی قدموں واپس آ گیا اور بولا۔

"پیر سائیں میں... میں... اس قابل تو نہیں ہوں کہ کچھ عرض کر سکوں مگر آپ پھر بھی یہاں ضرور تشریف لائیں گے۔"

"فیروز دین! لگتا ہے تیرا دماغ خراب ہو گیا۔ پاگل آدمی تو پتہ

نہیں مجھ گناہگار کو کیا سمجھ بیٹھا ہے۔ بھائی اگر تجھے پتہ چل جائے کہ میں کیا ہوں تو تو میرے نام سے بھی خوفزدہ ہو جائے — تیری تو مت ماری گئی ہے۔"

میں نے پلنگ سے اتر کر کوٹ پہنا۔ پاؤں میں بوٹ اڑائے اور کمبل لپیٹ کر اسٹین گن کندھے سے لٹکا لی۔

وہ چند لمحوں تک بڑے غور سے مجھے دیکھتا رہا۔ پھر میرا ہاتھ پکڑ کر آنکھوں سے لگاتے ہوئے بولا۔

"مجھے بھی اپنے رنگ میں رنگ لیں پیر سائیں۔ میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں آپ کی سیوا کروں گا۔"

"تو واقعی پاگل ہو گیا ہے میرے یار۔ بس وہ کیا کہتے ہیں کہ ہبنول اور کچھ نہ کھول۔ سمجھتا ہے نا۔ سنا نہیں تو نے کہ چمکنے والی ہر چیز سونا نہیں ہوتی۔"

"وہ تو ٹھیک ہے پیر سائیں مگر... مگر میں جانتا ہوں۔ اللہ کے بندوں کو میں پہچان لیتا ہوں مجھے برکتے نے سب کچھ بتا دیا ہے۔"

"برکتے؟ کیا کہتا ہے تو میرے یار! اس کا خیال رکھا کر، فیروز دین! مجھے لگتا ہے تو اس سے دور دور رہتا ہے۔ اُس کی آنکھیں ہی بتاتی ہیں۔"

فیروز دین کے چہرے پر ایسا تحیر پھیلا کہ باید و شاید۔

"اسی لیے تو کہتا ہوں پیر سائیں آپ صاحبِ نظر ہیں، کرامات والے ہیں۔ مجھے اپنا غلام بنا لیں۔"

"دیکھ زیادہ باتیں نہ بنا۔ بھاگ کر میرے لیے ٹیکسی لے آ اور چار پیکٹ سگریٹ بھی، مجھے ابھی جانا ہے۔"

چند ہی لمحوں بعد روشن دین اندر آ گیا۔ بولا۔

"پیر سائیں ٹیکسی میں لے آیا ہوں۔"

"تو چلو پھر۔ بٹھاؤ مجھے اس کے اندر۔" یہ کہہ کر میں اس کے ساتھ باہر نکلا۔ اور تیز تیز قدم اٹھاتا گلی میں جا پہنچا۔ روشن دین جو ٹیکسی لایا تھا وہ بالکل نئی تھی اور دلہن کی طرح اندر باہر سے سجی ہوئی تھی۔

میں ٹیکسی میں بیٹھا تو فیروز دین میرے لیے سگریٹ لے آیا بولا۔ "یہ لیں پیر سائیں سگریٹ اور یہ ماچس بھی رکھ لیں۔" یہ کہہ کر اس نے ایک بڑا سا لفافہ میری طرف بڑھایا۔ وہ لفافہ ہاتھ میں لے کر میں نے کھولا تو معلوم ہوا کہ اس میں فیروز دین نے میرے لیے چھ پیکٹ گولڈ لیف کے سگریٹ اور دو ڈبیہ ماچس کی رکھ دی تھیں مگر ان کے ساتھ کچھ اور بھی تھا۔ وہ میں نے باہر نکالا تو حیران رہ گیا۔ فیروز دین نے میرے لیے دس دس کے نوٹوں کی ایک گڈی بھی لفافے میں ڈال دی تھی۔ وہ نئے نوٹوں کی گڈی تھی اور مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ایک ہزار روپیہ تھا جو اس نے میری نذر کیا تھا۔

میں نے ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور تیزی سے باہر نکل کر فیروز دین کو دھکیلتا ہوا پرے لے گیا۔ وہ ہکا بکا سا ہو کر میرے ساتھ لڑھکتا چلا گیا۔ ٹیکسی سے دس قدم دور لے جا کر میں نے اسے روکا تو اس کا دم بھول چکا تھا۔

"یہ... یہ روپے تو نے کیوں ڈالے ہیں لفافے میں فیروز دین۔ تو باز نہیں آئے گا مجھے ذلیل کرنے سے۔ کیا سمجھا ہے تو نے مجھے۔" میں نے گھٹی گھٹی آواز میں اسے ڈانٹا۔ مگر... مگر میری باتوں کا اس پر اُلٹا اثر ہوا میرے آگے وہ اور زیادہ بچھنے لگا۔ بولا۔

"سرکار! مجھے پتہ ہے آپ کی نظر میں اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے پیر سائیں مگر یہ میری طرف سے آپ کی نذر ہے اسے قبول کر لیں۔"

"تو اول درجے کا احمق آدمی ہے مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے میرے بھائی۔ تیری اس محبت کا بہت بہت شکریہ۔" یہ کہہ کر میں نے وہ نوٹوں کی گڈی اس کے لمبے سے چغے ایسے لنڈے سے خریدے ہوئے کوٹ کی جیب میں ڈال دی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ وہ سمجھا میں اس سے ناراض ہوں۔ بہت ہی آزردہ ہو رہا تھا وہ گلوگیر آواز میں بولا۔

"پیر سائیں مجھے معلوم ہے آپ مجھ سے ناراض ہیں۔ میرے گھر سے آپ خوش نہیں نکلے ہیں۔ میری خدمت میں کمی رہ گئی ہو گی۔"

"نہیں فیروز دین یہ بات نہیں ہے پگلے مگر میں... میں... وہ نہیں ہوں جو تو سمجھتا ہے۔ اچھا خدا حافظ۔ موقع ملا تو میں کسی دن پھر آؤں گا۔" یہ کہہ کر میں نے اس کا کندھا تھپتھپایا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ٹیکسی کے اندر جا بیٹھا۔

"چل یار مجھے ادھر ذرا ہریکے لے چل۔ وہ جو مناواں کے پاس ہے مجھے ایک بہت ضروری کام ہے وہاں مگر تو ادھر داروغہ والا کی طرف سے چل۔"

"ٹھیک ہے جناب مجھے کب تک وہاں رہنا ہو گا۔"

"میں کہہ نہیں سکتا ہوں درست ہو سکتا ہے ساری رات کے پیسے میں تجھے روک لوں۔ بس تو چل دے اب۔"

وہ ستائیس اٹھائیس سال کا کوئی بہت ہی سنجیدہ طبع آدمی تھا اور بڑے رکھ رکھاؤ سے بات کرتا تھا۔ میری بات پر ذرا دیر کے لیے غور کرنے کے بعد اُس نے گاڑی چلا دی۔

اس نے میرے کہنے پر عمل کیا اور سلامت پورہ کے سامنے سے گزرنے والی سڑک پر سے ہوتا ہوا وہ ہریکے روڈ کی طرف چل دیا۔

میرا ذہن قلابازیاں کھا رہا تھا۔ مجھے ماجدہ کی عقل پر رونا

آتا تھا۔ اس مورکھ نے جان بوجھ کر اپنی جان شکنجے میں ڈال دی تھی۔ اگر وہ گھر چھوڑ کر میرے کہنے کے مطابق کسی اور جگہ چلی جاتی تو آج پولیس کے چکر میں تو نہ پڑتی مگر جب مجھے یاد آتا تھا کہ میں نے اسے ہی شیر آہو کے گھر جانے کا مشورہ دیا تھا تو مجھے اپنے آپ پر ہنسی آتی تھی۔ وہ آہو کے گھر پہنچ جاتی تو پھر شاید وہ میرے لیے کسی زبردست مصیبت کا سبب بن جاتی۔ آہو اسے ڈھال بنا کر مجھ سے جو چاہتا کروا سکتا تھا اور اب مجھے آہو سے نپٹنے کے لیے اسلم آبی کا سہارا لینا پڑ رہا تھا۔ اس نے مجھے یہی بتایا تھا کہ وہ اور بہادر علی ایک ہی گاؤں کے رہنے والے ہیں مجھے امید تھی کہ بہادر علی سے مل کر میں آبی تک پہنچ جاؤں گا۔ مگر رات میرے راستے میں حائل تھی اور نہیں معلوم تھا کہ میں بہادر علی کو کیسے تلاش کروں گا۔ بہر حال میرا وہ اضطراری فیصلہ میری ذہنی کیفیت کا عکاس تھا۔ میرے لیے کوئی بھی راستہ کھلا نہیں رہ گیا تھا اور میرے پاس اس بات کی بھی کوئی حتمی ضمانت نہیں تھی کہ وہ آبی میرے کسی کام بھی آسکے گا۔ خاص طور پر آہو کے خلاف جو منصوبہ میرے ذہن میں پک رہا تھا اس پر عملدرآمد کے لیے مجھے آبی سے جس تعاون کی توقع تھی اس کے بارے میں میں خود بھی بہ وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

ڈرائیور بیچارا بہت ہی خاموش طبع آدمی تھا وہ سارا راستہ خاموش رہا۔ میں نے بھی اسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا مگر جب ہم آگے نکلے تو وہ بولا "جناب کے پاس کوئی ہتھیار وغیرہ تو نہیں ہے"

"کیوں بھئی کیا مطلب ہے تیرا خیر تو ہے" میں نے کہا۔

میرا خیال ہے کہ میں نے بے خیالی میں کہیں کمبل کو ذرا کھول کر بدن پر لپیٹا تھا اور اس نے شیشے پر نظر ڈال کر دیکھ لیا تھا کہ میرے کندھے سے ایک بندوق لٹک رہی ہے۔

"ادھر رات پولیس گشت پر ہوتی ہے وہ رات کو سمگلروں کو پکڑتے ہیں انھوں نے کہیں روک کر تلاشی لے لی تو بڑی گڑبڑ ہو گی"۔

"تو ٹھیک کہتا ہے پیارے، پہلے تیری اطلاع کے لیے عرض کر دوں کہ میرے پاس ایک سٹین گن بھی ہے اور پستول بھی۔ ان کی گولیاں بھی موجود ہیں" میری اس بات پر اس نے ذرا سی بھی گھبراہٹ ظاہر نہیں کی۔ بڑے اعتماد سے مسکرا کر بولا۔

"مجھے خوشی ہے کہ آپ نے مجھے یہ بات بتا دی ہے۔ آپ کی سیٹ کے نیچے ایک خانہ بنا ہے اس میں اپنی چیزیں ڈال دیں۔ یہ چور خانہ ہے کسی ٹیکسی میں نہیں ہوتا کسی نے تلاشی لی بھی تو وہ کچھ نہ پا سکے گا"

یہ کہہ کر اس نے سڑک کے کنارے ذرا دیر کے لیے گاڑی روک کر مجھے میری سیٹ سے اٹھایا اور اس کے نیچے بنے خانے کو کھولنے کے لیے اس نے ایک تختہ ہٹایا۔ وہاں واقعی ایک خانہ موجود تھا مگر جو تختہ اس نے ہٹایا تھا وہ کچھ اس طرح لگا تھا کہ اس کا گہری نظر سے مشاہدہ کیے بغیر پتہ نہ چل سکتا تھا۔ میں نے اس کے کہنے کے مطابق اپنی تمام ضروری چیزیں اس میں رکھ دیں۔ اور پھر نشست پر بیٹھ گیا۔

گاڑی ایک بار پھر آگے چل دی۔ مگر اب اس کی رفتار اس نے بہت تیز کر دی تھی۔ ابھی ہم ایک دو فرلانگ ہی آگے بڑھے تھے کہ ہمیں سڑک پر چار سپاہی کھڑے نظر آئے۔ وہ سب کے سب مسلح تھے اور سڑک پر پھیل کر یوں ایستادہ تھے جیسے وہ کسی بھی تیز رفتار گاڑی کو چھاتی کے زور سے روک لیں گے ان کو یوں سامنے دیکھ کر میرے تو پسینے چھوٹ گئے۔ اس ڈرائیور نے میرے تمام ہتھیار نیچے رکھوا دیئے تھے۔ اور اتنے سارے مسلح سپاہیوں کے سامنے بالکل تنہا اور نہتا تھا شکل صورت میری ایسی ہو چکی تھی کہ کوئی بھی شخص مجھے شریف آدمی قرار نہیں دے سکتا تھا میرے حوصلے کی تو کرچیں کٹنے لگی تھیں۔ اس باؤ یوسف نے مجھے زبردست مصیبت میں پھنسا دیا تھا۔

"تیزی سے گزر چل یوسف۔ یہ خواہ مخواہ مصیبت کھڑی کر دیں گے"

اس نے گاڑی کی رفتار آہستہ کر دی۔

"یہ زیادہ سے زیادہ چھ سو روپے لیں گے جناب! میں جانتا ہوں انہیں فکر نہ کریں"

"کیا مطلب؟"

"تجربے کی بات بتا رہا ہوں جناب آپ انہیں بتا دیں کہ آپ کہاں جا رہے ہیں کیوں جا رہے ہیں، میں بھی انھیں سمجھا دوں گا مگر پھر بھی یہ پیسے لیے بغیر نہیں چھوڑیں گے آپ کو"

اتنے میں گاڑی ان سپاہیوں تک جا پہنچی۔ وہ اسے رکنے کا اشارہ کر رہے تھے۔ میں نے غلطی یہ کی تھی کہ اپنی ساری رقم بھی میں نے خانے میں ڈال دی تھی۔

باؤ یوسف نے بڑے اطمینان سے گاڑی ان کے قریب روکی اور انجن بند کر دیا۔ یوں جیسے وہ مجھے وہیں لانا چاہتا تھا۔

ایک سپاہی نے آگے بڑھ کر ڈرائیور پر نظر ڈالی۔ بولا—

"اوے یوسف پتھے کدھر جا رہا ہے آج؟"

"وہ جی ایک سواری ہے بھٹی صاب۔ ادھر ہر یکے گاؤں جا رہے ہیں ہم" اس نے گاڑی کے اندر کی بتی جلا دی اور خود اتر کر باہر جا ٹھہرا، یوں جیسے وہ ان کا بہت پرانا بے تکلف دوست ہو— دو سپاہی اندر سر ڈال کر مجھے دیکھنے لگے۔ تیسرے نے دوسری طرف سے دروازہ کھول دیا۔ اور... اور... پھر میری آنکھیں جل اٹھیں۔ میرے سامنے فلک شیر تھانیدار کھڑا تھا۔ وہی تھانیدار جس نے تین بار مجھے سپاہیوں کی گارد کے ساتھ عدالت میں پیش کیا تھا۔ وہ ان دنوں باغبانپورہ تھانے میں متعین تھا۔ اس نے ایک اچٹتی سی نظر

مجھ پر ڈالی تو مجھے معلوم ہوا جیسے اس کی آنکھوں میں اچانک ایک چمکارا سا پیدا ہوا ہو۔ اس کے دائیں ہاتھ میں چھڑی تھی اور بائیں میں لمبی سی ٹارچ۔ کلک کی آواز پیدا کر کے اس نے ٹارچ جلائی اور اس کی روشنی میرے چہرے پر ڈالتے ہی اس کے تیور بدل گئے۔

"اوے! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں سردار خان۔ ذرا باہر تو نکالو اس سواری کو"

اس نے پیچھے ہٹ کر پستول نکال کر سیدھے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اس کا سپاہی سردار خان آگے بڑھا اور مجھے دیکھ کر بولا۔

"باہر آؤ میاں صاحب ذرا اپنا معائنہ تو کراؤ"

"میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے جناب! یہیں سے بتا دیں کیا حکم ہے" میں نے حتی الوسع اپنی آواز بدلتے ہوئے کہا۔ سردار خاں ایک دم بھڑک اٹھا۔

"اوے باہر آ۔ طبیعت خراب کیسے ہو گئی تیری اچانک کوئی حمل گر گیا ہے کیا تیرا۔ چل باہر آ" یہ کہہ کر اس نے اپنی رائفل کا دستہ گاڑی کے دروازے میں جمایا اور دائیں ہاتھ سے مجھے دوسری طرف دھکیلنے لگا۔ میرا حال اس گھڑی اس دھنیے کا سا تھا جس کا کمانچہ ٹوٹ چکا ہو۔ اس گھڑی میری جگہ کوئی کرکٹیت بھی ہوتا تو ہمت ہار جاتا۔ میں بھی اندر سے ٹوٹ گیا تھا کیونکہ اس مصیبت کے لیے میں قطعاً تیار نہ تھا۔ ڈرائیور کی بات مان کر میں بڑی غلطی کا مرتکب ہو چکا تھا اور میری وہ غلطی اب مجھے بدترین صورت حال سے دوچار کر رہی تھی۔ اس سپاہی نے نہایت ہی بدتمیزی سے مجھے دوسری طرف دھکیلا تو میں نے اپنی زندگی کا اہم ترین فیصلہ کرتے ہوئے اس کی گردن کی رگِ احساس کو پوری قوت سے مسل دیا وہ جھول کر مجھ پر گرا۔ کوئی آواز پیدا کیے بغیر وہ غین ہوا تو میں نے اس کی رائفل جھپٹ کر اسے اپنے اوپر ڈال لیا۔ اس طرح کہ دوسری طرف کھڑا فلک شیر اگر گولی چلاتا تو وہ سیدھی سردار خاں کے سر میں لگتی۔ میں نے ایک سیکنڈ کے سوویں حصے میں.... یہ کارروائی مکمل کر کے رائفل فلک شیر پر تان لی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس رائفل کے چیمبر میں گیارہ راؤنڈ موجود ہوتے ہیں۔ رات کو وہ سپاہی اس طرح اپنی رائفلیں بھر کر چلتے ہیں۔ رائفل کی نالی اپنے سامنے تنی دیکھ کر فلک شیر تلملا کر کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"اگر تم نے ہمیں راستہ نہ دیا تو میں اس سردار خاں کو مار دوں گا اور تم میری زد میں ہو مسٹر تھانیدار!"

میری بات سن کر وہ گرجدار آواز میں بولا۔

"میں تجھے پہچان گیا ہوں جیلانی تو بچ کر نہیں جا سکتا"

اس کی یہ بات سنتے ہی میں نے اس کی ران کا نشانہ لے کر گولی چلا دی۔ مجھے فوری فیصلے کی ضرورت تھی وہ میرے اس حملے کے لیے قطعاً تیار نہیں تھا۔ گولی اس کی ران میں لگی تو وہ بری طرح چیخا اور اچھل کر پیچھے گر گیا مگر پستول پر اس کی گرفت ابھی تک مضبوط تھی۔ میں نے ایک گولی اور چلائی تو اس کے ساتھ ہی اس نے بھی گولی چلا دی مگر وہ گاڑی کی باڈی میں لگی البتہ میری گولی اس کے کولہے میں جا دھنسی۔ اچانک دوسری طرف کھڑے سپاہی نے بند دروازے کے چڑھے شیشے میں سے مجھے تاک کر گولی چلا دی۔ مگر شیشہ ٹوٹنے سے پہلے میں نیچے جھک گیا۔ گولی دوسری طرف کھلے دروازے میں سے نکل گئی۔ اس سپاہی کو میں نہ دیکھتا تو میرا سر اڑ چکا ہوتا۔

تیسرا سپاہی گاڑی کی ونڈ اسکرین کے سامنے کھڑا تھا۔ میں نیچے جھکا تو وہ وہاں سے ہٹ کے کئی قدم پیچھے جا کر کھلے دروازے کی راہ سے مجھ پر گولی چلانے کے لیے گھٹنا ٹیکنے لگا تو میں نے اسے مہلت دینے کے بجائے سردار خان کو آگے کر کے اس پر گولی چلانی چاہی لیکن وہ مجھ سے کہیں تیز نکلا اور اس کی گولی سیدھی سردار خان کے کندھے میں آ لگی مگر اس کے ساتھ ہی میں نے بھی گولی چلا دی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ سپاہی گیند کی طرح اچھل کر کئی ہاتھ پرے جا گرا۔ شاید میری گولی اس کے سینے میں لگی تھی۔ میری خوش قسمتی یہ تھی کہ دو سیٹوں کے درمیان جھکنے کی وجہ سے میں چوتھے سپاہی کو نظر نہیں آ رہا تھا اور یکے بعد دیگرے چار گولیاں چلانے کے باوجود مجھ تک نہ پہنچ سکا تھا میں نے سردار خان کو شدید زخمی دیکھ کر کھلے دروازے میں سے باہر گرا دیا۔ اور پھر اس کے پیچھے خود بھی اسی طرف اتر گیا۔ چوتھا سپاہی گاڑی کی دوسری طرف تھا وہ خود کو پوری طرح اوٹ میں رکھ کر مجھے مارنا چاہتا تھا اس کے حوصلے پر اس کی عقل حاوی تھی۔ وہ بہت ہی محتاط قسم کا آدمی تھا۔

"اوے جھانویں! رائفل پھینک دے ورنہ بے موت مارا جائے گا" میں نے اسے للکارتے ہوئے کہا اور خود کھسکتا ہوا میں انجن کی اوٹ میں جا پہنچا۔ اس نے میری آواز سنی تو سمجھ گیا کہ میں گاڑی سے نکل چکا ہوں میرے ان لفظوں نے اور میرے لہجے کی کڑک نے اس پر کچھ ایسی ہیبت طاری کی کہ وہ تیزی سے پیچھے ہٹا اور سڑک کے کنارے بنی کھائی میں جا لیٹا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اسے بھی میرے ہاتھ سے کوئی گزند پہنچے۔ تین آدمیوں کو میں پہلے ہی بیکار کر چکا تھا۔ مگر کھائی کی ڈھال ملتے ہی اس کی ہمت عود کر آئی۔ بولا،

"تو بچ کر نہیں جا سکتا کتے کے پتر!" یہ کہہ کر اس نے ٹائر کو تاک کر گولی چلا دی مگر ٹائر بچ گیا۔ گولی پہیے کے لوہے میں لگی تھی۔ وہ باؤ یوسف مجھے کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ پہیے پر گولی لگی تو معلوم ہوا کہ وہ سالا گولیوں کی سسکار سے ڈر کر ٹیکسی کے نیچے گھس گیا تھا وہ بڑبڑانے لگا۔ بولا۔

"بہت تمھارا ستیاناس ہو جائے میری ٹیکسی تباہ کر دی تم

نے۔ اپنی لڑائی لڑو میرا کیوں کباڑہ کرتے ہو؟"

میں ٹیکسی کی اوٹ میں بہت سنبھل کر بیٹھا تھا اور اس سوچ میں تھا کہ کس چیز کو ڈھال بنا کر اسے دبوچوں مگر ابھی میری سمجھ میں کوئی بات بھی نہیں آئی تھی کہ میں نے دیکھا کہ وہ سپاہی کہنیوں کے بل سرکتا ہوا خاصا آگے نکل رہا تھا اور اس کوشش میں تھا کہ پوری طرح مجھے زد میں لے کر مجھ پر فیصلہ کن وار کرے۔ یہ اتفاق تھا کہ اس پر میری نظر پڑ گئی اور وہ بھی اس لیے کہ ٹیکسی کی بتیاں ابھی تک روشن تھیں۔ میں نے جونہی اسے دیکھا میں اپنی جگہ سے سرکا اور ٹیکسی ——— کے ہڈ کے اوپر رکھ کر میں نے نال کا رخ ادھر کیا اور شست باندھ کر گولی چلا دی۔ میری گولی اس کی کمر میں لگی اور وہ ایک لرزہ خیز چیخ مار کر کھائی میں منہ کے بل گر گیا۔

اب میرے لیے میدان بالکل صاف تھا۔

"اوے باہر آ اوئے کسی گیدڑ کی اولاد! تو نے مجھے مروا ہی دیا تھا آج۔ باہر آ۔" میں نے ٹیکسی کے نیچے ہاتھ ڈال کر یوسف کو ٹانگ سے پکڑا اور باہر گھسیٹ لیا۔ وہ لرز رہا تھا۔ بالکل جھانکڑ نظر آتا تھا مجھے وہ اس لمحے۔ کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھا اور بولا۔

"ان لوگوں نے تو جناب میری ٹیکسی تباہ کر دی ہے۔"

"بہت اچھا کیا ہے انہوں نے سالے۔ تو ہے ہی اسی قابل۔ تو جانتا تھا کہ یہ تیرے مامے ادھر کھڑے ہوتے ہیں پھر بھی تو مجھے اس راستے سے لے آیا۔"

"اس میں میرا کیا قصور ہے جناب! مناداں کا راستہ تو یہی ہے۔"

"ابے تو ادھر راجباہ کے راستے سے بھی تو جا سکتا تھا مگر تیری تو ٹیکسی کے پیر میلے ہوتے تھے۔"

"اب۔ اب میرا کیا بنے گا جناب؟"

"اب تیرا مقبرہ بنے گا یہاں۔ چل ادھر اندر بیٹھ ۔۔ اور مجھے میری منزل پر پہنچا۔" یہ کہہ کر میں نے ایک ایک کر کے ان سپاہیوں کو دیکھا۔ وہ سب کے سب زندہ تھے البتہ زخموں نے انہیں نڈھال کر دیا تھا مگر زخم کوئی بھی ایسا نہ تھا جو مہلک ثابت ہوتا۔ وہ سپاہی جو کھائی میں لیٹا تھا خوف کی وجہ سے سن ہو رہا تھا ورنہ گولی اس کا کولہا چھیدتی ہوئی آگے نکل گئی تھی فلک شیر کی ران البتہ زیادہ کھل گئی تھی۔

"چل اوئے ٹیکسی کے اندر بیٹھ۔" میں نے ڈرائیور کو ٹیکسی کے اندر دھکیلا اور خود اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ سپاہیوں کی تمام رائفلیں میں نے اکٹھی کر کے خود ہی ٹیکسی کے اندر رکھ لی تھیں اور فلک شیر کا پستول بھی۔

ڈرائیور بہت ہی خوفزدہ تھا، بولا۔

"نہیں جناب میں آپ کے ساتھ نہیں جا سکتا۔"

"ٹھیک ہے بیٹے۔ تو یہاں بیٹھ کر ماہیا گا۔ میں چلتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں اس کی سیٹ پر بیٹھا اور گاڑی چلا دی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ میں خود گاڑی چلا سکوں گا۔ جب میں اس کی نشست پر بیٹھا تو وہ یہی سمجھا کہ میں مذاق کر رہا ہوں مگر جب گاڑی حرکت میں آئی تو وہ گاڑی ساتھ بھاگنے لگا۔

"میں چلتا ہوں جناب میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔" وہ چیخنے لگا مگر میں نے ایک دم گاڑی کی رفتار تیز کر دی۔ میں اسے ساتھ لے جا کر اس کا مستقبل تباہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ پولیس اسے کبھی معاف نہ کرتی وہ یہی سمجھتے کہ باؤ یوسف نے ہی مجھے پناہ دے رکھی ہے۔ اب وہ پیچھے رہ گیا تھا تو اسی میں اس کی بہتری کا راز مضمر تھا۔ وہ کہہ سکتا تھا کہ اس آدمی نے اس سے ٹیکسی چھین لی ہے وہ زبردستی اسے گاڑی سے اتار گیا ہے۔ وہاں رہ کر وہ ان زخمیوں کی تیمارداری بھی کر سکتا تھا ان کے بارے میں کسی کو اطلاع بھی دے سکتا تھا کیونکہ ان کا علاج فوری طور پر بہت ضروری تھا۔ خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے ان میں سے کسی کی بھی موت واقع ہو سکتی تھی اور یہی میں نہیں چاہتا تھا وہ میرے دشمن نہیں تھے۔ میرا راستہ روک کر وہ اپنا فرض ادا کر رہے تھے۔ میں سمجھتا ہوں اگر وہ لوگ منظر سے ہٹ جائیں، گلیوں اور بازاروں سے نکل جائیں تو سارا معاشرہ تباہ ہو جائے۔ وہ جو میرے ایسے خونخوار بھیڑیے ماؤں نے جن رکھے ہیں، وہ تو راتوں رات سب کچھ تہس نہس کر کے رکھ دیں کہ انسان پر انسان کا اعتماد کبھی بھی نہیں رہا ہے۔ یہ قانون یہ عدالتیں یہ کچہریاں ۔۔ یہ محبس یہ زنجیریں نہ ہوں تو زندگی کا سارا حسن ختم ہو جائے کہ انسان کے اندر جو ابلیس پرورش پاتا ہے وہ گرد و پیش میں پھیلے ہوئے رنگ و نور کے تمام آثار مٹا دینے پر آمادہ رہتا ہے۔ میں سوچتا تھا کہ وہ فلک شیر بھی کسی ماں کا بیٹا ہے کسی بیوی کا شوہر اور کسی بچے کا باپ ہے وہ ذاتی منفعت کے لیے تو اتنا بڑا خطرہ مول نہیں لے رہا تھا۔ وہ اپنی آنکھ کھلی رکھتا تھا تو صرف اس لیے کہ شہروں اور گاؤں میں رہنے والے ہزاروں لاکھوں لوگ آرام کی نیند سو سکیں اس نے اپنی جان ایک چھوٹی سی تنخواہ کے عوض نہیں بیچی تھی بلکہ اس کے پیش نظر کوئی اور بہت ہی اعلیٰ و ارفع مقصد تھا اور وہ مقصد یہ تھا کہ زندگی کی قدریں ملیامیٹ نہ ہوں۔ اس کا غازہ قائم رہے اور اس کی خوشبوؤں میں جرائم کی بدبو نہ رچ سکے۔ یہی وہ اعلیٰ اور ارفع نصب العین تھا جس کے حصول کے لیے اس نے مجھ پر گولی چلائی تھی۔ میں اس کی موت کا ہرگز خواہاں نہیں تھا۔ اگر وہ اس رات میری گولی سے مر جاتا تو مجھے بے حد افسوس ہوتا کہ پہلے ہی میں ایک قتل کا مرتکب ہو چکا تھا۔ بلادر کے قریب گنے کے کھیت میں پہلے ہی میں ایک سپاہی کو موت کے گھاٹ

اتار چکا تھا۔ اور اس کو زندگی کے حسن سے محروم کر کے جو پچھتاوا مجھے ڈس رہا تھا ابھی سے ہی میں عہدہ برا نہ ہو سکا تھا اور اب وہ ایک نہیں چار تھے جنہیں میں گھائل کر آیا تھا۔ میں دل سے دعا مانگ رہا تھا کہ وہ زندہ رہیں۔ انہیں میری بھی عمر لگ جائے کہ میں تو زندگی کے چہرے پر ایک بدنما داغ ہوں۔ میں جیا جیا، نہ جیا۔ میرا کیا ہے۔

میں اس ڈرائیور کو بڑے اطمینان سے اپنے ساتھ لے سکتا تھا مگر میں نے ایسا نہیں کیا تو صرف اس وجہ سے کہ وہ ان لوگوں کے پاس رہ کر ان کی دیکھ بھال کر سکتا تھا، انہیں سکھ پہنچا سکتا تھا ان کو یوں بے موت مرنے سے بچا سکتا تھا۔

گاڑی کا انجن ٹھیک کام کر رہا تھا اور اس میں پیٹرول بھی کافی مقدار میں موجود تھا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ اس سپاہی کی گولی سے اس کا ٹائر بچ گیا تھا ورنہ میں تو وہیں بندھ کر رہ جاتا۔ میں نے کئی میل آگے جا کر گاڑی اینٹوں کے ایک بھٹے کی طرف جانے والی کچی سڑک کی طرف ڈال دی۔ وہ علاقہ میرا دیکھا بھالا تھا اور میں جانتا تھا کہ اس بھٹے سے ذرا آگے دوسری طرف بھی ایک راستہ ہے جو ٹرکوں کے لیے بنا ہوا ہے۔ بڑی سڑک جو سیدھی واہگہ جاتی ہے میں نے عمداً چھوڑ دی تھی کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ میں ہرکیے گاؤں جا رہا ہوں اور میرے لیے یہ بات کسی طرح بھی سودمند نہ تھی کہ میں اس وقت وہاں پہنچوں جب وہ پہلے سے ہی وہاں میری راہ روک کر بیٹھے ہوں باغبانپورہ پولیس کے لوگ فون پر مناداں تھانے کی پولیس کو خبردار کر سکتے تھے۔ ان کو یہی امید ہو گی کہ میں ٹیکسی لے کر سیدھا وہاں پہنچوں گا۔ اسی خطرے سے بچنے کے لیے میں نے راستہ بدل لیا۔

اینٹوں کے بھٹے پر اس وقت مکمل خاموشی طاری تھی۔ مزدوروں کے لیے وہاں جو جھونپڑے بنے تھے ان میں بھی مجھے کسی جگہ کوئی روشنی نظر نہ آئی۔ وہ جھونپڑے بھٹے سے ذرا ہٹ کر بنائے گئے تھے۔ بھٹے کے ایک ٹیلے پر چوکیدار کی کوٹھری تھی۔ میں ٹیکسی سے اتر کر ادھر لپکا۔ دراصل میں اس چوکیدار سے ہرکیے گاؤں کا راستہ معلوم کرنا چاہتا تھا کیونکہ میں نے وہ گاؤں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جب میں اینٹوں کے بڑے بڑے ڈھیروں کی اوٹ میں سے نکل کر کوٹھری کے سامنے پہنچا تو مجھے اس کوٹھری میں روشنی نظر آئی۔ میں دبے پاؤں آگے بڑھا اور کوٹھری کے دروازے کے سامنے جا ٹھہرا۔ مجھے اندر سے آوازیں سنائی دے رہی تھیں عجیب سی ہاؤ ہو بپا ہو رہی تھی۔ وہاں لگتا تھا اندر بہت سے آدمی موجود ہیں۔ اچانک مجھے ایک زنانہ قہقہے کی آواز سنائی دی معلوم ہوا کہ وہاں کوئی عورت بھی موجود ہے میں سمجھا چوکیدار کی بیوی ہو گی۔ میں نے دستک دینے سے پہلے دروازے کی ایک جھری پر آنکھ رکھ دی۔ اندر جو منظر مجھے نظر آیا وہ ایسا تھا کہ میرا سارا بدن جھنجھنا اٹھا۔ کوٹھری... میں دو عورتیں اور تین مرد موجود تھے اور وہ سب کے سب شراب نوشی میں مصروف تھے۔ سامنے صف پر شراب اور سوڈے کی بوتلیں دھری تھیں اور وہ اس کو گلاسوں میں بھر کر پی رہے تھے۔ تینوں آدمی شکل صورت سے چھٹے ہوئے بدمعاش نظر آتے تھے۔ عورتیں جوان تھیں اور اپنے لباس کی وضع قطع سے بالکل دیہاتی معلوم ہوتی تھیں رنگت ان دونوں کی سانولی تھی۔ ایک نے راجپوتانہ کی مزدور عورتوں ایسا لہنگا پہن رکھا تھا۔ اس کی باتوں سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اسی بھٹے پر کام کرتی ہے اور کسی پتھیرے کی عورت معلوم ہوتی تھی۔

"اوئے گوگے تو اس آپی سے ملا تھا آج کہ نہیں؟" ایک آدمی نے پوچھا۔

آپی کا نام اس کے منہ سے سن کر میں چونکا، وہ آدمی مجھے اپنے ہی قبیلے کا معلوم ہوتا تھا۔

"یار اسی کے لیے تو تمہیں ادھر لایا ہوں آج۔ ٹھیک بارہ بجے وہ یہاں پہنچ جائے گا۔"

"پر تیرا ارادہ کیا ہے گوگے! دیکھ تو وقت کتنا ہو چلا ہے۔"

"ابھی تو باراں ہی بجے ہیں یار، پر یہ بوتل بھی تو ختم ہو چلی ہے تو بالکل بکواس آدمی ہے گوہرے۔ لایا بھی تو صرف ایک ہی بوتل۔ یہ تو یہ میری جان بینو ہی چڑھا گئی ہے۔"

اس کا مطلب یہ تھا کہ دوسرے آدمی کا نام گوہر تھا اور وہ ایک عورت جس کے دائیں رخسار پر ننھا سا تل تھا اس کا نام بینو تھا۔

"اوئے اس کے واری صدقے بعد میں ہونا پہلے یہ بتا گوگے کہ آج تیرا پورگرام کیا ہے۔"

"پورگرام؟ بھئی اس حبیب شاہ کے چول چٹے کرنے ہیں ہمیں آج رات۔ بڑی دولت لایا ہے وہ ولایت سے۔"

"اچھا اچھا۔ ہمیں ادھر نہ بگڑی جانا ہے آج۔ اپنے اس کتر دین نے اس کا پتہ بتایا ہوگا تمہیں۔"

"دیکھ اوئے میرا نام قطب دین ہے قطب دین۔" کتر دین نے چمک کر کہا۔ "اپنی اس بینو کی اطلاع یہ ہے کہ حبیب شاہ کے گھر میں دو سیر سونا ہے اور کم سے کم دو لاکھ روپیہ موجود ہے۔"

"بینک میں نہیں رکھتا ہے وہ اپنا مال؟" گوہر نے پوچھا۔

"نہیں، روپیہ گھر لے آیا ہے بیٹی کی شادی کر رہا ہے نا وہ اس مہینے۔" گوگا اپنا گلاس خالی کر کے بولا۔

"پر یار وہ تو بڑا غریب آدمی ہے۔" گوہر نے کہا۔

"کیا مطلب؟ وہ... سوٗر کا بچہ غریب آدمی ہے تیری نظر میں۔" گوگا تپ کر بولا۔

"ہاں ہاں دو شیر سونا ہے اس کے پاس اور یہ اسے غریب بتا رہے ہے۔" اس لہنگے والی نے ہنس کر کہا۔

"ہائے میری باگڑ بلی تو ٹھیک کہوے ہے تو بس اپنی طرف سے

سین کو شین بتاتی جا۔"

"چل ہٹ کُترِ دین تیرے منہ شئے بڑی بدبُو آوے ہے۔"

"چل اوے ادھر مسواک کر پہلے پھر عشق کی نماز پڑھ پلید کہیں کے۔" گوہر نے کُتر دین کی گردن میں دھپ مارتے ہوئے کہا۔

"ایسے ہی بکتی ہے یار یہ خراب کرتی ہے مجھے۔" کُتر دین نے اپنے کھیس سے سامنے کے دانت صاف کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں بھئی گوہرے وہ غریب کیسے ٹھہرا تیری نظر میں؟"

"یار گوگے، تو سوچتا کیوں نہیں ہے۔ میں نے سنا ہے کہ وہ حبیب شاہ ادھر تیس سال تک فیکٹری میں کام کرتا رہا ہے کاریں بنتی ہیں اس فیکٹری میں۔ کہتے ہیں کہ وہ اٹھارہ گھنٹے کھڑا رہتا تھا وہاں۔ اس کے گوڈے گٹوں میں پانی اُتر آیا ہے۔"

"گوڈے گٹوں میں نہیں بلکہ کہیں اور پانی اُتر آیا ہے۔" کُتر دین نے کہا۔

"چل اچھا یوں ہی سہی۔ کوئی تھوڑی محنت تو نہیں کی ہے اس نے۔" گوہر نے اس کی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔

"تو ٹھیک کہتا ہے گوہرے، مگر یہ کہاں لکھا ہے کہ ہم اس کے گھر ڈاکہ نہ ماریں، وہ مالدار تو ہے نا۔"

"نہیں وہ مالدار نہیں ہے عیالدار ہے عیالدار۔ تین بیٹیاں ہیں اس کی، اور دونوں لڑکے نالائق اور آوارہ ہیں۔"

"تیری طرح۔" کُتر دین نے کہا۔

"چل یوں ہی سہی۔" میری طرح ہی سمجھ لے۔"

"اچھا پھر؟ اس سے کیا ہوتا ہے تو کہنا کیا چاہتا ہے آخر؟" گوگے نے حیران ہو کر پوچھا۔

"میں... میں یہ کہتا ہوں گوگے یار کہ یہ... یہ ظلم ہے۔ وہ مزدور آدمی ہے اس نے بڑی محنت سے وہ روپیہ کمایا ہے۔ یہ اچھی بات نہ ہوگی۔"

"غداری کرے گا تو ہم سے۔"

"نہیں! تمہارے ساتھ تو میں دوزخ میں بھی جانے کو تیار ہوں پر یار اصول بھی تو کوئی چیز ہے۔"

"اوئے اصول نام کی کوئی شئے ہوتی ہے اس دُنیا میں۔" گوگے نے بوتل میں باقی بچی شراب سوڈے کی ضمانت کے بغیر حلق سے نیچے اتار کر کہا۔

"تمہاری مرضی ہے گوگے مگر یہ ظلم ہے۔ مجھے یہ بات اچھی نہیں لگتی۔ اس تلونڈی والے کے گھر جاؤ تو ایک بات بھی ہے۔"

"اچھا وہ دبگڑی کا چوہدری خالق داد۔ وہی ہے نا تلونڈی والا۔"

"ہاں! وہ حرام کا تخم پشتوں سے عیش کرتا آ رہا ہے اسے چھیل دو تو میں راضی ہوں۔"

"نہیں یار۔ ابھی اس کی باری نہیں آئی ہے۔" گوگے نے کہا۔

"مگر، مگر اس حبیب شاہ کے پیچھے تجھے کس نے لگایا ہے؟ یہ تیرا اپنا منصوبہ تو ہرگز نہیں ہے۔"

"اس میں بھی ایک بھید ہے پیارے مگر ہمارا منصوبہ زبردست ہے۔"

"اشا تو یہ تمہارے منصوبے میں شامل نہیں ہوتا۔" بینو نے پھر اپنے شین پھینکے۔

"ہائے تیرے ان منصوبوں پر قربان جاؤں۔ تیری کیسی سوہنی واج ہے۔" کُتر دین نے خوش ہو کر کہا۔

"وہ آبی ابھی تک نہیں آیا۔" گوگے نے دروازے کی طرف دیکھ کر کہا۔

"وہ آ بھی گیا تو کوئی فرق نہیں پڑیگا۔" گوہر نے بڑے بے زار لہجے میں کہا۔

"کیا کہتا ہے یار تو ادھر سیندھ کے منہ پر بیٹھ کر یار ماری کرتا ہے تو۔" گوگے نے حیران ہو کر کہا۔ بوتل اس نے ہاتھ مار کر دور پھینک دی۔

"نہیں۔ یار ماری کی بات نہیں ہے گوگے۔" میں اس کام میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا۔"

"تو سُن رہا ہے نا قطب دین، اسے سمجھا۔ میں اس جنتے کی وجہ سے اس کا لحاظ کر رہا ہوں مگر یہ غداری نہیں چلے گی۔ کوئی رشتے دار نہیں ہے وہ حبیب شاہ ہمارا۔"

"یہ گوہرا ایسی ہی کُتی شئے ہے شکار کے وقت موتنے لگتا ہے کیوں بھئی کیا صلاح ہے تیری؟"

"تو زیادہ بڑ بڑ نہ کر کُتر دین! یہ اصول کی بات ہے۔ میں کسی غریب پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتا۔ ادھر وہ چنن چوہدری ہے بری وال کا، ادھر چلو وہ سیٹھ ہے عارف علی رائس ملز والا — اس کے گھر پہنچو میں تیار ہوں مگر یہ حبیب شاہ؟ نہیں یارو — میں نے اسے دیکھا ہے۔ اس پیسے کی خاطر اس نے بڑی محنت کی ہے نہیں نہیں اس کا گھر میرے لیے حرام ہے۔" گوہر نے ان لوگوں سے تین چار قدم پیچھے سرک کر کہا۔ وہ بھورے رنگ کا کمبل اوڑھے ہوئے تھا اور جب وہ ان سے بات کر رہا تھا تو اس کی نظر بڑی تیزی سے ان کے چہروں پر گردش کر رہی تھی معلوم ہوتا تھا کہ وہ اُن سے بہت زیادہ محتاط رہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی وہ گھنی لمبی لمبی سیاہ مونچھیں عجیب انداز سے پھڑک رہی تھیں۔

"تو اس طرح نہیں ٹلے گا گوہرے! وہ تیرا ماما نہیں لگتا ہے تجھے ہمارے ساتھ چلنا ہو گا۔"

"یہ تمہاری خام خیالی ہے گوگے۔ میں اس کام میں تمہارا ساتھ نہیں دوں گا۔ میری بات سمجھو۔ اس حبیب شاہ کو دیکھو اس کی عمر یہی کوئی

پچاس سال ہوگی مگر لگتا ہے وہ گور کنارے پہنچ گیا ہے ساری جوانی وہ اس کارخانے میں تباہ کر کے آیا ہے۔ اس کو چھوڑ دو، یہ ظلم ہے۔"

"چھوڑ دو، اس کو چھوڑ دو، یہ ظلم ہے۔" گوگے نے اس کی عجیب انداز سے نقل اتاری پھر بڑے گمبھیر اور خوفناک لہجے میں بولا۔ "یہ نہیں ہوگا گوہرے، یہ نہیں ہوگا۔ ابھی وہ آبی آ جائے تو پھر فیصلہ کروں گا کہ ہمیں تیرا کیا بندوبست کرنا چاہیے۔"

عین اسی وقت مجھے دُور سے گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سنائی دی گھوڑ سوار سیدھا اُدھر ہی آ رہا تھا۔ میں اس کی نظروں سے بچنے کے لیے کوٹھری کی پچھلی دیوار کے پیچھے جا ٹھہرا۔ وہ آدمی اُدھر سے آ رہا تھا جدھر ٹرکوں کے لیے ایک چبوترا سا بنا ہوا تھا۔ وہ آیا اور سیدھا اس کوٹھری کے سامنے پہنچ کر گھوڑے سے اُتر گیا۔ اس نے سر پر سیاہ پگڑی باندھ رکھی تھی۔ وہ دروازے پر پہنچا تو مجھے بڑی مایوسی ہوئی وہ آبی نہیں تھا کوئی اور تھا۔

اس نے بڑی آہستگی سے دروازے پر دستک دی تو چند ہی لمحوں بعد کنڈی کھل گئی۔ اس کے فوراً ہی بعد مجھے دروازہ اندر سے بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ میں سرکتا ہوا پھر دروازے کے سامنے جا ٹھہرا۔ میں نے جھری کی راہ سے اندر نظر ڈالی تو دیکھا کہ گوگا اور وہ بغلگیر ہو رہے تھے۔

"یار تاہیے وہ آبی نہیں آیا ابھی تک۔"

"وہ نہیں آئیگا آج۔ ادھر ہریکے گاؤں میں اس کا یار بہادر علی مر گیا ہے۔ اسے سانپ نے ڈس لیا ہے۔" اس نے اپنے کالے کمبل کی بُکل درست کرتے ہوئے کہا۔ وہ کوئی ساڑھے چھ فٹ اونچا جوان تھا اور سر اس کا کوٹھری کی چھت کو چھو رہا تھا۔

"اوے بیڑہ غرق یہ تو بہت بُرا ہوا، بڑا جی دار آدمی تھا یار وہ بہادر علی۔" گوگے نے بڑے متاسف لہجے میں کہا۔

"ہاں یار اس کی موت کا تو مجھے بھی بہت افسوس ہے۔ اس جنتے کو تم ابھی تک یہاں بٹھائے ہوئے ہو۔"

"یہ آج رات ادھر بینو کے گھر رہے گی۔ آبی خود ہی لے جائے گا اسے کسی وقت۔"

"اچھا؟ ٹھیک ہے اسے ادھر بھیجو اور چلو۔ دبگڑی وقت بہت ہو چلا ہے۔"

"چلتے تو ہیں تاہیے مگر اپنا یہ گوہر راضی نہیں ہے کہتا ہے یہ ظلم ہے۔"

"یار! اس کی کہیں سے ڈاکٹری کراؤ کہیں یہ عورت تو نہیں بنتا جا رہا۔ میں نے سُنا ہے آج کل ایسا بھی ہو رہا ہے۔ کیوں اوئے گوہرے؟ کیا ہو گیا ہے تجھے؟"

"یہ بات نہیں ہے تاہیے! تم ابھی آزما کر دیکھ لو مجھے، بیشک مگر میں دبگڑی نہیں جا سکتا۔ یہ ظلم ہے۔" گوہر نے بڑے جمے ہوئے لہجے میں کہا۔

اس کی یہ بات سنتے ہی تاہیے نے گھوم کر کمبل کے نیچے چھپی بندوق کا دستہ کچھ اتنے زور سے اور اتنی برق رفتاری سے گوہر کی کنپٹی میں مارا کہ وہ بے چارا دیوار میں جا لگا اور بے سُدھ ہو کر لمبا لیٹ گیا۔

تاہیے نے گالی دے کر کہا۔ "خسرے کا پُتر۔ اوئے قطب دین باندھ دے اس کے ہاتھ پیر اور دیکھ بینو وہ دبنجلی خان چوکیدار ہے نا اسے کہنا کہ اسے ادھر ہی باندھ رکھے۔ ہم کل اسے یہاں سے لے جائینگے۔"

"اشا۔ چوہدری جی اشا میں اسے کہہ دوں گی وہ ادھر میرے گھر میں بیٹھا ہے اس وکھت۔" بینو نے خوفزدہ ہو کر کہا۔ اس کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ گوہر کو اس نے ٹٹول کر دیکھا۔ پھر اس کی نبض پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

"جندہ ہے یہ ابھی جندہ ہے چوہدری جی۔ نبج چل رہی ہے اشکی۔ گوہر کی بندوق اس کے بھورے کمبل میں سے جھانک رہی تھی۔

"ایسے سوّر اتنی جلدی نہیں مرا کرتے۔ چل اوئے قطب دین باندھ دے اس کے ہاتھ پاؤں۔"

قطب دین نے بڑی فرمانبرداری سے اُٹھ کر ایک رسی سے گوہر کے ہاتھ اس کی کمر کے پیچھے کس کر باندھے اور پھر پاؤں بھی کمر کی طرف موڑ کر پیٹ کے ساتھ جکڑ دیئے۔

"چل بھئی گوگے۔ کوئی دارو شارو ہے کہ چڑھا گئے ہو سارا۔"

"نہیں یار، بس ایک ہی بوتل تھی یہ گوہر ہی لایا تھا۔ بالکل زنخا ہے سالا۔"

"اچھا چلو ہمیں دیر ہو رہی ہے چل بینو تو اس جنتے کو اپنے گھر لے جا۔"

یہ کہہ کر وہ پیچھے مڑا تو میں تیزی سے کوٹھری کی پچھلی دیوار کی اوٹ میں ہو گیا۔ میرا وہ چیپ شاہ پستول اس گھڑی میرے ہاتھ میں تھا اور ان کی طرف سے کسی قسم کی ذرا سی گڑبڑ میں وہ ان دونوں پر خالی کر دینے کو تیار تھا۔ اگر وہ مجھے دیکھ لیتے تو مجھے یقین تھا کہ کسی قسم کا سوال کیے بغیر وہ مجھ پر وار کر دیتے کیونکہ ایسے لوگ اپنے راز کی ہر قیمت پر حفاظت کرتے ہیں اور میں وہاں اس لیے رک گیا تھا کہ مجھے گوہر کی مدد کرنی تھی میری نظر میں وہ بہت بڑا آدمی تھا۔ اتنا بڑا کہ اس کے مقابلے میں میں خود کو بالکل ہیچ سمجھ رہا تھا۔ اس نے اپنے اصول کی خاطر اتنا بڑا خطرہ مول لیا تھا۔ ان بھیڑیوں کو حبیب شاہ کے شکار سے روکنے کے لیے اس نے بڑی بہت بڑی قربانی دی تھی اور میرے دل میں اس کے لیے عزت و احترام، ہمدردی اور محبت کے بے پناہ جذبات موجزن ہو چکے تھے۔

وہ پانچوں کوٹھری سے نکلے تو قطب دین نے دروازے کی کنڈی چڑھادی۔ بینو اور جلتے مزدوروں کے جھونپڑوں کی طرف چل دیں اور وہ تینوں بائیں ہاتھ نکل گئے۔ تابیے نے گھوڑے کی لگام پکڑلی تھی اور وہ اسے گام گام چلا رہا تھا۔

چند منٹ تک میں کوٹھری کی دیوار کے... پیچھے کھڑا رہا اور ان کے دور ہٹ جانے کا انتظار کرتا رہا جب مجھے یقین ہوگیا وہ کافی فاصلہ طے کر گئے ہیں تو میں نے آگے بڑھ کر کوٹھری کا دروازہ کھول دیا۔ گوہر گہرے گہرے سانس لے رہا تھا میں نے اس کے پاؤں کے جکڑ بند کھول کر اسے دیوار کے ساتھ بٹھایا تو اس نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی مگر اپنے حواس وہ مجتمع نہ کر پا رہا تھا۔ کونے میں ایک گھڑا رکھا تھا۔ میں نے اس میں سے پانی لے کر اس کے ہونٹوں سے لگایا تو یہ دیکھ کر مجھے اطمینان محسوس ہوا کہ وہ پانی قبول کر رہا تھا۔ کوئی دس منٹ کے تتو تنبو کے بعد وہ ہوش میں آگیا مگر جب گردوپیش کو سمجھنے کے قابل ہوا تو مجھے دیکھ کر حیرت کا اظہار کرنے لگا۔ ابھی وہ کوئی سوال کر نہیں پایا تھا کہ بھٹے کا چوکیدار ونجلی خان تیز تیز قدم اٹھاتا اندر آگیا۔ اس کی آہٹ سن کر میں نے ایڑی پر گھوم کر پستول کی نالی کمبل کے نیچے سے اس کی طرف گھمادی۔ وہ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا مگر چہرے مہرے سے وہ بہت ہی کرخت نظر آتا تھا۔ مجھے اس نے گوہر پر جھکے دیکھ لیا تھا، کڑک کر بولا۔

"تم کون ہو بھئی۔ ادھر کیا کر رہے ہو؟" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی لاٹھی زمین پر جمادی۔ اس نے ابھی تک یہ اندازہ نہیں لگایا تھا کہ کمبل کے نیچے میں نے اس کے سامنے کیا چیز تان رکھی ہے۔

"یہ بیچارا زخمی ہے میں اسے ہوش میں لا رہا تھا۔" میں نے نہایت ہی خوشگوار لہجے میں کہا۔

"مگر تم ہو کون! ادھر کیا کرنے آئے ہو؟" اب بھی اس کا لہجہ نہایت ہی اکھڑ تھا۔

"دیکھو ونجلی خان زیادہ مت بھڑکو۔ میں تمہارا دشمن نہیں ہوں میں ہریکے گاؤں جا رہا تھا مگر راستہ معلوم نہیں تھا سوچا ادھر کسی سے پوچھ لیتا ہوں مگر میں جب یہاں آیا تو دیکھا کہ یہ آدمی بے ہوش تھا اور اس کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے۔ پاؤں تو اس کے میں نے کھول دیئے ہیں مگر ہاتھ ابھی تک بندھے ہیں۔"

"اسے ادھر بندھا ہی رہنے دو اور تم جاؤ۔ ہریکے کا راستہ اُدھر ہے۔ اس کچی سڑک پر چل دو۔ جاؤ۔"

اس کے لہجے کی گھن گرج بدستور قائم تھی اور گوہر کبھی مجھے دیکھتا تھا اور کبھی اسے۔ وہ ہکلاتا ہوا بولا۔

"مم۔ مم۔ میر۔ یہ۔ ہا۔ ہا۔ ہاتھ تو کھولو خان ان حرامزادوں نے......"

"ادھر کسی کو گالی والی مت دو استاد۔ ہاتھ نہیں کھلیں گے تمہارے۔ چلو میاں جی تم باہر نکلو۔ یہ ہمارا آپس کا معاملہ ہے۔" یہ کہہ کر اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے باہر نکل جانے کے لیے کہا۔ اس کی وہ دھونس دھڑنی تھی۔ میں نے پستول کمبل سے نکال کر اس کے سامنے کر دیا۔

"مجھے نہیں جانتے ہو ونجلی خان! میں آدمی کو چیر کر رکھ دیتا ہوں کتے کے بچے! تیرا میں نے بہت لحاظ کیا ہے۔" یہ کہہ کر میں نے اس کے پیٹ میں پوری قوت سے گھٹنا دے مارا۔ وہ زخمی بھینسے کی طرح چیخا اور لاٹھی پرے پھینک کر اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ تھام لیا مگر درد کی شدت سے وہ کھڑا نہ رہ سکا اور لڑکھڑا کر دیوار میں جا لگا۔ میں نے پیچھے سے اس کی کمر پر لات جمائی تو وہ اوندھا ہوگیا۔

"میرا خیال ہے اب تیری زبان بہت دن تک سیدھی چلے گی۔" یہ کہہ کر میں نے غصے کی شدت سے الٹے ہاتھ کا ایک جھانپڑ اس کے منہ پر جڑ دیا۔ اس کی صورت سے مجھے نفرت ہوگئی تھی۔ وہ میری کوئی بات سمجھ ہی نہیں رہا تھا اور ایسے سوّر... آدمی تو قدم قدم پر ملتے ہیں جن کے دماغ میں چیرا لگائے بغیر کوئی بات اتاری ہی نہیں جاسکتی۔ وہ بھی کسی ایسے ہی الو کے پٹھے کی اولاد تھا۔ اس سے نپٹ کر میں نے گوہر کے دونوں ہاتھ بھی کھول دیئے۔

"تو۔۔ تو کون ہے جوان! کیوں میرے لیے اتنا تپ گیا ہے تو؟" اس نے اپنے ہاتھوں کی اکڑی ہوئی رگوں کو سہلاتے ہوئے کہا۔

"تو اچھا آدمی ہے گوہر اور مظلوم بھی ہے۔ چل اٹھ میرے ساتھ آ۔ دیر نہ کر۔۔۔ اٹھ میرے ویر۔" میں نے اسے زمین پر سے اٹھاتے ہوئے کہا۔ اس نے اپنی بندوق کندھے سے لٹکائی اور کمبل کی بکل مار کر میرے ساتھ باہر نکل آیا۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ کوٹھری سے باہر آکر بولا۔

"تجھے پتہ ہے تو کیا کہہ رہا ہے جوان۔ وہ ایسے ماتھا پیٹی کے جنے ہیں کہ ہر طرف لاشیں ہی لاشیں ڈال دیتے ہیں۔"

میں نے کمبل کی بکل کھول دی تاکہ وہ میرے کندھے سے لٹکی اسٹین گن دیکھ سکے۔

"تو مجھے نہیں جانتا ہے گوہر، پر چل تجھے میں آج اپنی کرامت دکھاؤں گا، چل آ۔ جیب شاہ کو بچانا چاہتا ہے نا تو؟"

"ہاں یار! وہ تو بیچارا تباہ ہوجائے گا مگر۔۔ مگر میں تیرے ساتھ کیسے چل دوں میرے یار، پتہ نہیں تو۔۔۔ تو۔۔۔"

"ابے گھس کھدا نہ بن۔ چل میرے ساتھ چل۔ میں تجھے

کہاں نہیں جاؤں گا۔ تیرے جیب شاہ کو بچانا ضروری ہے۔" یہ کہہ کر میں نے اسے آگے دھکیل دیا۔ چند قدم آگے جاکر بولا۔

"وہ۔۔۔ وہ لوگ تو گھوڑیوں پر گئے ہیں۔ اب ہم کیا کر سکتے ہیں۔ وہ تو ڈاکہ ڈال چکے ہوں گے۔"

"تو فکر نہ کر وہاں تک گاڑی جاسکتی ہے کہ نہیں۔ اب بھی ہم ان کو روک سکتے ہیں۔"

"ہاں گاڑی تو جاسکتی ہے کوئی کار ہے تیرے پاس؟" اس کی حیرت بڑھتی جارہی تھی۔

"ہاں میرے پاس ٹیکسی ہے۔ ادھر کھڑی ہے۔" یہ کہہ کر میں اسے گھسیٹتا ہوا آگے لے چلا۔ اس کے قدم زمین پر جم جم جاتے تھے مگر میں نے اسے کچھ سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا اور آگے لے جاکر ٹیکسی میں ڈال دیا۔

"دیکھ باقی باتیں بعد میں ہوں گی تو مجھے بس دیگرڑی کا راستہ بتادے۔"

"اچھا ٹھیک ہے تو سیدھا چل آگے کچی سڑک ہے، وہ لوگ ادھر ہی گئے ہیں وہ تینوں۔"

وہ اب کی بار زیادہ اعتماد سے بولا، وہ میرے ساتھ ہی بیٹھا تھا اور ٹک ٹک مجھے دیکھے چلا جا رہا تھا۔

میں نے گاڑی کچی سڑک پر ڈال کر اس کی رفتار تیز کردی۔ رات چاندنی تھی اور راستہ صاف نظر آ رہا تھا اس لیے میں نے کار کی بتیاں نہ جلائیں اس کی نظریں اب بھی میرے چہرے پر جمی تھیں بولا

"آدمی تو شیر دل نظر آتا ہے مجھے۔ پرائی آگ میں بھی کود جائے گا تو۔"

"ہاں! کیوں نہیں! اس ظلم کو تو روکنا ہی چاہیے نا۔ ظلم ہی ہے نا تیری نظر میں، وہ جو گوگا تاہیا اور وہ کتر دین کرنے جا رہے ہیں۔"

میری یہ بات سنکر وہ کھل کر مسکرا دیا۔ گاڑی کی گھر گھر سے ہی آواز زیادہ بلند کر کے بولا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تو نے ہماری ساری باتیں سن لی تھیں مگر تو ادھر آیا کیسے تھا یار۔ کیا کام تھا تجھے ادھر۔ تو بھی کسی شکار کے پیچھے ہے؟"

"نہیں یار! میں تو اسلم آبی سے ملنے آیا ہوں۔ وہ میرا جگری یار ہے مگر تیری باتیں سن کر اور تیرا حال دیکھ کر میں نے سوچا کہ پہلے یہ جیب شاہ والا کام کر لوں۔"

"اچھا تو اسلم آبی کا دوست ہے۔ میں بھی سوچتا تھا کہ تو کوئی ایسا ویسا نہیں ہے آبی کے یار تیرے ایسے ہی ہوسکتے ہیں۔"

"مگر وہ آج ادھر کیوں نہیں آیا؟"

"وہ ایسے چھوٹے موٹے کام نہیں کرتا ہے رنگوں ایسے۔ مرد ہے وہ یہ تاہیا خواہ مخواہ اسے اس کام میں ڈال رہا تھا۔ اچھا ہوا وہ نہیں آیا۔ وہ آ بھی جاتا تو کبھی ان لوگوں کے ساتھ نہ جاتا۔"

"ہاں یہ تو ہے۔ تیری بات مجھے بہت پسند آئی ہے گوہر، اسی لیے میں تیرے ساتھ چل رہا ہوں اب جو کرے کرتار۔"

"وہاں مقابلہ ہوجائے گا ہمارا ان سے۔ تاہیے کے پاس بڑا خوفناک اسلحہ ہے۔ دستی بم بھی ہیں اس کے تھیلے میں۔"

"کوئی بات نہیں ہے گوہر۔ ہم ایک اچھے کام کے لیے جا رہے ہیں۔" میں نے اسے اطمینان دلایا۔

"پر جوان، تو نے ابھی تک اپنا نام نہیں بتایا ہے مجھے۔ اس ونجلی خان کا تو نے اچھا بندوبست کیا ہے، بہت ٹرٹر کرتا تھا وہ۔"

"اس کا آپریشن بہت ضروری تھا میرے بھائی۔ جب گوشت نہ گلے تو اسے دم پخت کر دیتے ہیں۔"

"ہاں یہ تو ہے پر تیرا نام کیا ہے یار۔"

"میرا نام؟ میرا نام خواہ مخواہ ہے تو مجھے چاچا خواہ مخواہ کہہ لیا کر۔"

وہ ہنس دیا، بولا۔

"اب سمجھا تو مجھے اپنا نام نہیں بتانا چاہتا ہے، مگر ہو سکتا ہے تو جیب شاہ کے لیے غیبی فرشتہ ثابت ہوجائے۔"

"پتہ نہیں غیبی فرشتہ ہوں کہ احمق ہوں بہر حال یہ قصہ میں تیری نظر سے دیکھ رہا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے ایک سگریٹ اسے دیا اور ایک خود سلگا لیا۔ وہ خوش ہوگیا ایک دم لہک اٹھا۔ بولا۔

"تو اچھا آدمی ہے یار، راشن پانی ساتھ رکھتا ہے۔۔۔ اس "سگریٹ" نے مٹیار کے لبوں ایسا مزہ دیا ہے اس وقت۔ گولیاں ہیں نا تیرے پاس۔"

"ہاں تو ذرا دیکھتا جا۔ میرا خیال ہے ہم انہیں پیچھے چھوڑ جائیں گے۔"

"وہ سیدھوں سیدھ کھیتوں میں سے گئے ہوں گے۔" اس نے چاروں طرف سر گھما کر دیکھتے ہوئے کہا۔ ہم کافی آگے نکل چکے تو میں نے پوچھا۔

"تجھے اس کے گھر کا، گلی کا پتہ ہے نا؟"

"مجھے سب پتہ ہے جوان، مگر وہ بڑے خوفناک آدمی ہیں۔ کئی گھر اجاڑ چکے ہیں۔ میں بھی کوئی ولی کا پتر نہیں ہوں پر اصول بھی تو کوئی چیز ہوتا ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے مگر تو جیب شاہ کو جانتا ہے نا؟"

"جانتا کتنا ہے تو! میں۔۔ میں تو کچھ زیادہ ہی جانتا ہوں اسے یار جی۔"

اس کی آواز میں عجیب سی بھیدوں بھری مہک پیدا ہوگئی تھی یہ بات کہتے ہوئے۔ کوئی ایسی ہی راز کی بات تھی جسے وہ اس لمحے مجھ سے چھپا گیا تھا۔ میں اس سے ابھی کچھ پوچھنے والا ہی تھا کہ دائیں ہاتھ سے تین گھڑسوار ہماری گاڑی کے آگے سے گزر کر

بکچی سڑک پھلانگتے ہوئے تیزی سے دُوسری طرف کے کھیتوں میں جاگھسے۔

"یہ وہی ہیں جوان اور... اور ابھی راستے ہی میں ہیں۔" گوہر نے بڑے جوش میں کہا۔

"اب تو کوئی فکر نہ کر، اب ہم ان سے نپٹ لیں گے۔ ڈبگری کتنی دُور رہ ہے اب؟"

"بس تھوڑی دُور رہ ہے۔ یہ اُدھر نہر کی طرف سے وہاں جائیں گے ذرا تیز کرو ٹیکسی کو۔"

میں نے اس کے کہنے کے مطابق گاڑی کی رفتار اور تیز کر دی۔ کچھ ہی دُور جاکر اس نے مجھے دائیں ہاتھ مڑنے کا اشارہ کیا، ایک کچی سڑک ادھر آنکلی تھی۔

سرما کی چاندنی نے چاروں اور فضا کو عجیب انداز سے سوگوار بنا رکھا تھا۔ سامنے ڈبگری گاؤں تھا جو مجھے اداس اور بے یار و مددگار دکھائی دیتا تھا۔ کہیں کہیں مجھے کوئی دیا ٹمٹماتا نظر آتا تھا اور وہ بھی ان جگہوں پر تھا جہاں ڈھور ڈنگر بندھے تھے۔

میں نے ٹیکسی گاؤں سے کافی فاصلے پر ایک گنے کے کھیت کے قریب کھڑی کر دی۔

"یہاں کیوں رُک گئے ہو؟"

"اب ہم پیدل چلیں گے مگر ذرا قدم تیز اٹھاؤ۔" یہ کہہ کر میں نے گاڑی کے دروازے بند کر کے ڈیش بورڈ میں لگی چابیوں کے گچھے سے اس کو مقفل کیا اور گوہر کو ساتھ لے کر گاؤں کی طرف لپکا۔

"تم حبیب شاہ کو ذاتی طور پر جانتے ہو؟"

"ہاں۔"

"اسے جگا کر اطلاع دے سکتے ہو کہ اس کے گھر ڈاکہ پڑنے والا ہے؟"

"نہیں یار! یہ بہت مشکل ہے۔ وہ پوچھے گا ماما جی تمھیں کیسے پتہ ہے اور تمھارا اُن سے کیا تعلق ہے جو ڈاکہ ڈالنے آرہے ہیں؟"

"ہاں یہ تو ہے خیر تم مجھے وہاں تک پہنچا دو۔"

"ہاں، اُدھر تو ہم جا ہی رہے ہیں۔ میں ان سب کو بھُون کر رکھ دوں گا۔ ایسی تیسی میں گئی ان کی دوستی۔" گوہر نے بڑے جوش سے کہا گاؤں میں اس گھڑی چار سُو سناٹا طاری تھا۔ ہم جب اُن درختوں کے قریب پہنچے جو مسجد کے قریب اُگے تھے تو ہم نے دیکھا کہ وہاں دو کتے لمبے لمبے لیٹے تھے۔ انھیں کچھ سنگھا دیا گیا تھا۔ اور وہ اکھڑے اکھڑے سانس لے رہے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ لوگ اپنی منزل کے بہت قریب پہنچ چکے تھے۔ ہم دونوں نے اپنے چہروں کو کپڑوں سے ڈھانپ لیا۔ چند قدم آگے جاکر مجھے گوہر نے کہا "حبیب شاہ اسی گلی میں رہتا ہے۔"

میں نے اسے اپنے ساتھ گھسیٹا تو یہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا کہ مسجد کی پچھلی دیوار کے قریب ایک آدمی چت لیٹا تھا۔ اس کا کھیس کہیں تھا اور لاٹھی کہیں۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔

"یہ... یہ شاید چوکیدار ہے۔" گوہر نے دبی آواز میں... "وہ لوگ اسے زخمی کر گئے ہیں۔"

"چلو مجھے حبیب شاہ کا گھر دکھاؤ جلدی کرو۔"

"وہ... وہ رہا اس کا گھر۔" گوہر نے بندوق سیدھے ہاتھ میں تھامتے ہوئے کہا۔ وہ جس مکان کی طرف اشارہ کر رہا تھا، وہ ہم سے کوئی سات مکان دور تھا۔ وہ دو منزلہ پختہ عمارت تھی جو کسی نے بڑی محنت سے تعمیر کرایا تھا۔ میں نے اسے اپنے ساتھ کھینچا اور تیز تیز قدم اٹھاتا آگے بڑھا۔ اچانک ایک کچے مکان کی چھت پر سے کسی نے بڑی بے جگری سے ہمارے اوپر چھلانگ لگائی اور بائیں ہاتھ سے میری گردن دبوچنے کی کوشش کی۔ میرے دائیں ہاتھ میں پستول تھا۔ وہی میرا حبیب شاہ جو کام کرتا تھا مگر بولتا نہیں تھا۔ اس نے نیچے آتے ہی بایاں ہاتھ میری گردن پر ڈالا، اور دائیں ہاتھ میں پکڑا چھرا اس نے گوہر کے سینے میں دھنسانے کی کوشش کی مگر وہ کمبل اوڑھے ہوئے تھا اور نیچے اس نے موٹا کوٹ پہن رکھا تھا۔ اس لیے اس کی کوشش ناکام ہوگئی۔ وہ ابھی ہم دونوں پر سوار ہی تھا کہ میں نے پستول پھینک کر اس کی گردن دبوچی اور اس کی رگ دبا دی۔ وہ فوراً ہی جھول کر نیچے گر گیا۔ وہ جوشیلے کا پہاڑ تھا وہ آدمی۔ اس نے ایک بار تو ہم دونوں کو بدحواس کر دیا تھا۔ وہ دھم سے نیچے گرا تو معلوم ہوا کہ وہ... وہ قطب دین ہے۔ پینو کا عاشق، گوگے کا غلام اور تاہیے کا زر خرید۔

"ارے یہ تو کُترا دین ہے۔" گوہر نے کمبل سنبھالتے ہوئے کہا۔ اُس کی حیرت بے حد و حساب تھی۔

"اسے چھوڑ، اب آگے چل۔" میں نے اسے دبی آواز میں کہا اور زمین پر سے اپنا پستول اُٹھا کر آگے بڑھ گیا۔

ہم تیز تیز قدم اٹھاتے حبیب شاہ کے مکان کے سامنے پہنچے تو دیکھا کہ ایک آدمی دوسری منزل کی کھڑکی کے سامنے بنے شہ نشین پر اُتر رہا تھا۔ انہوں نے دُوسری منزل کی چھت پر بنے جنگلے پر کمند ڈال رکھی تھی ایک آدمی آگے جا چکا تھا اور دُوسرا رہا تھا کمند کا رستا نیچے جھول رہا تھا۔ وہ کھلی کھڑکی کے اندر غائب ہوا تو ہم دونوں نے کمبل کندھوں پر ڈالے اور اس آدمی کے پیچھے شہ نشین پر جا چڑھے۔ پہلے وہاں میں اترا اور پھر گوہر۔ وہ دونوں اب آگے جا چکے تھے۔ ہم دبے پاؤں کھڑکی میں سے گزر کر دُوسری طرف پہنچے تو دیکھا کہ سامنے ایک چھوٹا سا کمرہ تھا، جس میں ایک پلنگ بچھا تھا مگر وہاں کوئی آدمی موجود نہیں تھا۔ میں گوہر کو دروازے میں کھڑا کر کے آگے بڑھا، سامنے دوسری منزل کا...

میں نے دیکھا کہ گوگا اور تاہیا دونوں ایک کمرے کے سامنے کھڑے تھے۔ میں ایک صندوق نما تنور کی اوٹ میں جا ٹھہرا۔ وہ تنور انھوں نے چھت پر کھلے موسم میں روٹیاں پکانے کے لیے لگا رکھا تھا۔ گوگے نے بڑی آہستگی سے سامنے کے دروازے پر دستک دی۔ انہیں معلوم تھا کہ اہلِ خانہ کس کمرے میں سوتے ہیں اور حبیب شاہ رات کو کہاں ہوتا ہے۔

دستک کا کوئی جواب نہ پاکر گوگے نے پھر بڑی آہستگی سے دستک دی۔

"کون ہے؟" اندر سے کسی کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔

"دروازہ کھولو شاہ جی ہم آئے ہیں آپ کے مہمان۔ یہ شاہنی بھی ہمارے ساتھ ہیں۔" گوگے نے بڑے جمے ہوئے لہجے میں کہا۔

"مہمان؟ کیسے مہمان؟" اندر سے پھر وہی آواز ابھری۔ اب کی بار اس آواز میں سراسیمگی نمایاں تھی۔

"اوئے دروازہ کھول۔ کھوتے دے پتر۔ ورنہ تیری اس شاہنی کو اور تیری بیٹیوں کو یہیں ختم کر دیں گے۔" یہ تاہیا تھا۔ اس کی یہ بات سُنتے ہی گوگے نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ وہ بڑے ماہرانہ انداز میں عورت کی طرح رو دیا۔ یُوں جیسے اس کے گلے پر چھری چلائی جا رہی ہو۔ اور وہ آواز سُنتے ہی اُس سادہ لوح نے دروازہ کھول دیا۔ یہی اس کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ تاہیے نے اُسے فوراً ہی گردن سے دبوچ کر باہر کھینچ لیا۔ وہ بیچارا گھگھیانے لگا "ت... ت... تم کیا چاہتے ہو بھائیو، میرا کیا گناہ ہے؟"

"گناہ! شاہ جی گناہ کی بات چھوڑو۔ مال نکالو۔ سونا کہاں چھپایا ہے تم نے اور نوٹ کدھر ہیں؟"

"وہ... وہ تو اُدھر سب اُدھر بینک میں رکھے ہیں بھائیو۔" "میرے گھر میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔" حبیب شاہ نے خوف سے تھر تھر لرزتے ہوئے کہا۔ اس کی یہ بات سنتے ہی تاہیے نے بائیں ہاتھ سے ایک زبردست تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا۔

"بینک میں رکھا ہے! اور ہم اِدھر سوتیاں کھانے آئے ہیں تیرے گھر۔ ہمیں مال چاہیے بُڈھے، مال۔" یہ کہہ کر اس نے بندوق کی نال اس کی ہنسلی کے اُوپر دھنسا کر اسے دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ میں چٹکی چاندنی میں یہ خوفناک منظر دیکھ رہا تھا۔ ان کی سنگدلی عروج کو پہنچی ہوئی تھی۔

"مجھے... مجھے مت مارو بھائیو! سارا مال اندر ہے۔ اندر سیف میں ہے وہ سب لے لو۔ لے لو مگر مجھے معاف کر دو۔"

"چابیاں کہاں ہیں؟" تاہیے نے گھُٹی گھُٹی آواز میں کہا۔

"وہ اُدھر... اُدھر تکیے میں رکھی ہیں۔ اندر میرے بستر پر... مجھے چھوڑ دو۔" اس کی یہ بات سُنتے ہی تاہیے نے اُسے اندر دھکیل دیا۔ حبیب شاہ کمرے میں گرا تو وہ اس کے پیچھے لپکے

ابھی وہ دہلیز پر پاؤں رکھ ہی رہے تھے کہ میں نے اپنے سائیلنسر لگے پستول سے تاہیے کی پنڈلی کو تاک کر گولی چلا دی۔ وہ اچھل کر دروازے کے باہر کی طرف گرا اور فوراً ہی منہ کے بل لیٹ کر شست باندھنے لگا مگر میں اسے نظر نہیں آرہا تھا۔ میں دراصل مرغیوں کے پختہ ڈربے کی اوٹ میں بیٹھ چکا تھا۔

"ہتھیار پھینک دے تاہیے ورنہ میں تیرا مغز پھاڑ دوں گا۔"

گوگا کمرے میں گھُس کر اوٹ میں ہو کر شست باندھ رہا تھا۔ چاندنی کی لکیر سی اس کے بازو پر پڑ رہی تھی اور اس کی بندوق کی نال مجھے صاف نظر آرہی تھی۔ میں نے اس کی کلائی کو تاک کر گولی چلائی، تو بندوق اس کے ہاتھ سے دور جا گری اور وہ اپنا زخمی بازو تھام کر چیختا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔

تیسری گولی پھر تاہیے پر چلائی مگر میرا نشانہ چُوک گیا اور اس کے ہاتھ کے بجائے گولی اس کے بازو میں جا لگی۔ میں حیران اس بات پر تھا کہ اس نے فوراً ہی مجھ پر گولی کیوں نہیں چلائی تھی۔ بازو میں گولی لگتے ہی اس نے بندوق پرے پھینک دی اور اُف اُف کرتا تیزی سے پیچھے سرکا اور کمرے میں گھسنے لگا۔ میں نے بھاگ کر اُسے دہلیز پر جا لیا اور گردن سے پکڑ باہر گھسیٹا مگر اس طرح کہ اس کی رگِ احساس بھی میں نے پوری طرح مسل دی وہ فوراً ہی بیہوش ہو گیا۔ اس سے نپٹتے ہی میں اندر گھُسا تو دیکھا کہ گوگا ایک کونے میں نڈھال پڑا ہے۔ اُس کا بازو بُری طرح زخمی تھا۔ میں نے جاتے

ہی پوری قوت سے ایک لات اس کی پسلی میں جمائی وہ الٹ کر دیوار میں جا لگا۔ اس کی بندوق مجھے نظر نہیں آ رہی تھی حبیب شاہ بھی مجھے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے گوگے کی گردن پر اپنا ہاتھ آزمایا۔ میں انہیں کوئی موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ گوگے نے گردن پر میری گرفت مضبوط ہوتی دیکھ کر اپنی جان چھڑانے کے لیے بائیں ہاتھ سے میری دونوں ٹانگیں جکڑ لیں اور مجھے جھٹکا دے کر نیچے گرانے کی کوشش کرنے لگا مگر میں نے اسے مہلت نہ دی۔ میں اس فساد کو فوراً ہی ختم کر دینا چاہتا تھا مگر اس کی موٹی گردن میرے ایک ہاتھ میں نہیں آ رہی تھی۔ میں نے پستول کی نال دانتوں میں دبا کر دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن پکڑی اور جھٹکا دے کر اس کی رگیں مسل دیں۔ میری ٹانگوں پر سے اس کی گرفت فوراً ہی ڈھیلی پڑ گئی وہ بیہوش ہو چکا تھا۔ وہ پہلا آدمی تھا جس کو بے ہوش کرنے کے لیے مجھے خاصی محنت کرنی پڑی۔ ورنہ اس سے پہلے تو ایسا کبھی نہ ہوا تھا۔ مجھے اپنی مطلوبہ رگ ہر گردن میں فوراً ہی مل جاتی تھی۔

ان دونوں سے فارغ ہو کر میں نے لائیٹر جلا کر ادھر ادھر دیکھا مگر حبیب شاہ کہیں نظر نہ آیا۔ آخر میں نے اسے تلاش کر ہی لیا۔ وہ پلنگ کے نیچے جا گھسا تھا۔

"باہر آ جائیے شاہ جی! اب خطرہ ٹل چکا ہے۔" میں نے بڑے اطمینان سے پلنگ کے نیچے لائیٹر کی روشنی ڈالتے ہوئے کہا۔ میری بات کا اس پر اچھا اثر ہوا اور وہ آہستہ آہستہ کھسکتا ہوا باہر آ گیا مگر حالت اس کی یہ تھی کہ وہ سر سے پاؤں تک تھر تھر کانپ رہا تھا عین ممکن تھا کہ کچھ دیر اگر اس کی وہی کیفیت رہتی تو اس کے دل کی حرکت ہی تھم جاتی۔ وہ موسموں کا مارا ہوا آدمی زندگی سے مایوس ہو چکا تھا۔ وہ پلنگ کے نیچے سے نکلا تو میں نے بڑی احتیاط سے اُوپر اٹھایا۔

"اب پریشانی کی کوئی بات نہیں رہی ہے شاہ جی، آپکے دشمن ڈھیر ہو چکے ہیں وہ دیکھیں۔" میں نے گوگے اور تاہیے کی بندوقیں اٹھا کر اس کے سامنے رکھ دیں۔ اسے اپنی بصارت اور سماعت پر اب تک بھی اعتبار نہیں آ رہا تھا۔ وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔ "یہ سب کچھ کیسے ہو گیا بیٹے! تم نے مجھے اُن سے کیسے بچا لیا ہے۔"

"اطمینان سے بیٹھ جائیں شاہ جی ادھر پلنگ پر۔"

"میں... میں پہلے لیمپ تو جلا لوں۔" یہ کہہ کر اس نے میز پر رکھی ماچس کی ڈبیا اٹھا کر ایک تیلی جلائی اور لیمپ روشن کر دیا۔

اب کمرے کا ماحول واضح ہونے لگا تھا۔ اس نے اپنی قمیص کے دامن سے اپنے چہرے کا پسینہ پونچھا اور پھر رخساروں کے اندر دھنسی آنکھوں کو پوری طرح کھول کر مجھے یوں دیکھنے لگا جیسے میں کوئی اچنبھا چیز ہوں اس کے لیے۔ کوئی عجوبہ ہوں۔ کوئی ماورائی مخلوق سمجھ رہا تھا وہ مجھے۔ میں نے لحاف کھول کر اسے پلنگ کی طرف دھکیلا تو وہ اپنے سلیپروں سے پیر نکال کر اوپر بیٹھ گیا۔ بدن اس کا اب تک لرز رہا تھا۔ وہ لحاف اپنے گرد اچھی طرح لپیٹ کر بولا۔

"تم کون ہو بیٹے! تم نہ ہوتے تو میں تو برباد ہو گیا تھا ان کے ہاتھوں۔" اس کی آواز تھرتھرا رہی تھی۔

"شاہ جی آپ کو میں نے نہیں گوہر نے بچایا ہے آپ جانتے ہیں نا اسے؟"

"گوہر نے؟ وہ جو عبدالکریم کا بیٹا ہے۔ ہمارے گاؤں کا گوہر ہے نا وہ؟"

"پتہ نہیں کہاں کا ہے وہ مگر اس کا نام گوہر ہے۔" میں نے دروازے کے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ گوہر اس وقت تاہیے کے پاس کھڑا اسے پاؤں سے پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔

"ادھر آ بھئی۔ شاہ صاحب تیرے بارے میں پوچھ رہے ہیں گوہر۔" میری یہ بات سنتے ہی گوہر کمرے میں آ گیا۔

"السلام علیکم شاہ صاحب! یہ بدمعاش تو آج آپ کو چٹا کر ہی چلے تھے۔"

"وعلیکم السلام گوہر بیٹے! مگر تم کیسے یہاں آ پہنچے۔ تمہیں کس نے بتایا تھا کہ میرے گھر ڈاکہ ڈالنے آ رہے ہیں۔" شاہ جی نے حیرت اور مسرت کے ملے جلے جذبات سے کہا۔ ان کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو تیرنے لگے تھے۔ تکیے کے نیچے رکھے سگریٹ کا پیکٹ اٹھا کر انہوں نے لرزتے ہاتھ سے ایک سگریٹ سلگایا۔

"مجھے تھوڑی ہی دیر پہلے کسی نے بتایا تھا شاہ جی کہ یہ لوگ آپ کے گھر آ رہے ہیں۔ میں نے اپنے اس دوست کو ساتھ لیا اور فوراً ہی ادھر آ گیا۔" یار یہ تو مر گئے دونوں ہی ختم ہو چکے ہیں۔ وہ گوگے کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے بولا۔

"مرے نہیں ہیں یہ ابھی زندہ ہیں۔ کہو تو مار دوں۔ ہمارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

"مار دو ان دونوں کو میرے ہی گاؤں میں ڈاکہ ڈالنے گئے تھے مگر پتہ نہیں تھا انھیں ادھر گوہر بھی رہتا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے بڑی نفرت سے گوگے کی کمر میں ٹھوکر ماری۔

"نہیں یار! اتنی ہی نصیحت کافی ہے انھیں، اب یہ ادھر کا رخ کبھی نہیں کریں گے۔"

"میں تمہارا کس منہ سے شکریہ ادا کروں بیٹے! مجھے تو یہ تباہ ہی کر دیتے آج۔"

اچانک صحن سے پار سیڑھیوں میں مجھے تین چار سائے نظر آئے۔ میں چونک کر ایک طرف ہو گیا اور پستول کا رخ میں نے ان کی طرف کر لیا۔

وہ لوگ سیڑھیوں سے نکل کر صحن میں آئے تو چاندنی نے مجھے اُن کے چہرے دکھا دیئے۔

"یہ کس سے باتیں کر رہے ہو شاہ جی؟" ایک ادھیڑ عمر کی عورت بولی۔ اس کے ساتھ دو جوان لڑکیاں بھی تھیں اور ان کے دائیں ہاتھ دو لڑکے تھے۔

"ادھر تو آ سلیماں! یہ دیکھ کیا ہو گیا ہے ادھر۔"

"ہائے میں مر گئی۔ یہ کون اُلٹا پڑا ہے یہاں۔" وہ تاہیے کے پاس پہنچ کے رُک گئی۔

گوہر اس کی یہ بات سنتے ہی باہر نکلا اور بولا۔ "سلام خالہ جی۔"

"وے تو اس وقت یہاں کیا کر رہا ہے؟" اس عورت نے بڑے بیزار لہجے میں کہا۔

"میں۔ میں آپ کی حفاظت کر رہا ہوں خالہ جی۔ میں نہ ہوتا تو آج دُھل گئے تھے آپ سب کپڑے لتّے کی طرح۔" گوہر نے دُون کی لیتے ہوئے کہا۔

"کیا دُھل گئے تھے ہم؟ یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟" اس عورت نے بڑی رعونت سے کہا۔ اس کی دونوں بیٹیاں اور دونوں بیٹے حیرت سے اُسے تک رہے تھے۔ ایک لڑکی نے اپنا چہرہ چادر میں چھپا لیا تھا۔

"میں بتاتا ہوں تمہیں سلیماں! میں تو مارا ہی گیا تھا آج۔ یہ ڈاکو مجھے لوٹنے آئے تھے۔ مگر اپنے اس گوہر بیٹے نے، اور اس جوان نے مجھے بچا لیا۔" حبیب شاہ نے کمرے سے باہر نکل کر کہا۔

"میرے پلّے تو کچھ نہیں پڑ رہا ہے۔ یہ مونڈی کاٹے ہیں کون آخر؟"

"یہ چکر کیا ہے آخر ابا جی! یہ کون لوگ ہیں؟" حبیب شاہ کے ایک لڑکے نے آگے بڑھ کر کہا۔

"مجھے کیا پتہ۔ ان سے پوچھو۔ یہی تمھیں سب کچھ بتائیں گے۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔" حبیب شاہ نے بڑے بے زار لہجے میں کہا۔

"میں بتاتا ہوں خالہ جی۔ یہ دونوں ڈاکو ہیں۔ میں انہیں نہیں جانتا مگر مجھے کسی نے بتایا تھا کہ آج رات آپ کے گھر ڈاکہ ڈالنے آئیں گے مجھے یقین نہیں آتا تھا پھر بھی میں ساری رات ادھر اپنے دوست کے ساتھ پہرہ دیتا رہا۔ ہم شاید گاؤں کے دوسری طرف تھے جب یہ تین آدمی گھوڑیوں پر بیٹھ کر ادھر آ گئے ہم دونوں نے ان کا پیچھا کیا مگر جب ہم یہاں پہنچے یہ چھت پر چڑھ چکے تھے۔ ہم بھی ان کے پیچھے اوپر آ گئے۔ یہاں پہنچ کر ہم نے ان دونوں کو اکٹھا دیا بس اتنی سی بات ہے میں تو آپ کے لیے اپنی جان بھی دے سکتا ہوں خالہ جان۔"

"اللہ تیرا شکر ہے۔ تو نے تو بڑا احسان کیا ہے ہم پر گوہر ہمیں کیا پتہ تھا تو ہمارا اتنا خیال رکھتا ہے۔" حبیب شاہ کی بیوی نے گوہر کی باتوں سے متاثر ہو کر کہا۔

"میں نہ کہتی تھی بی بی جی کہ یہ گوہر ہمارا ہمدرد ہے۔ یہ نہ ہوتا تو پتہ نہیں آج کیا ہو جاتا۔" حبیب شاہ کی ایک لڑکی نے خوش ہو کر کہا۔ وہ اپنی دوسری بہن سے زیادہ خوبصورت اور زیادہ شوخ نظر آتی تھی۔

"اِن باتوں کو ختم کر گوہر اور اِن کو اٹھا کر باہر چل۔ میں انہیں یہاں نہیں چھوڑ سکتا۔" میں نے صورتحال کو مزید بگڑنے سے بچانے کے لیے کہا۔

"مگر ہم تو انہیں پولیس کے حوالے کرینگے۔" حبیب شاہ بولا۔

"نہیں شاہ جی۔ یہ دونوں زخمی ہیں کیا پتہ مر ہی جائیں۔ ہم ان کو کہیں پھینک دیں گے ورنہ پولیس خواہ مخواہ آپ کو پریشان کرے گی۔ میں نہ اپنا نام تھانے میں دینا چاہتا ہوں، نہ گوہر کا۔" یہ کہہ کر میں نے تاہیے کو اٹھا کر کندھے پر ڈال لیا۔

"اس کو تو اٹھا لے گوہر جلدی کر ورنہ ہم خود کسی مصیبت میں پھنس جائیں گے۔"

گوہر نکتہ رس آدمی تھا بولا۔

"ہاں یار۔ انھیں یہاں چھوڑنا کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے ورنہ پولیس مجھے بھی کھینچتی پھرے گی۔ پتہ نہیں وہ اس سارے چکر کا کیا مطلب سمجھیں۔" یہ کہہ کر اس نے گوگے کو اٹھا کر کندھے پر ڈال لیا۔

حبیب شاہ حیرت زدہ ہو کر ہمیں تک رہا تھا بولا۔ "ٹھیک ہے بیٹے۔ جو مناسب سمجھتے ہو کرو۔ مگر گوہر صبح مجھ سے ضرور ملنا۔ اور یہ بھی معلوم کر کے آنا کہ یہ لوگ ہیں کون؟ مجھے تو ان کو پولیس کے حوالے کیے بغیر چین نہیں آئے گا۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں مگر اس چکر میں ہم خواہ مخواہ مارے جائیں گے شاہ جی۔ اگر یہ زندہ بچ گئے تو پھر ان سے میں سب کچھ پوچھ لوں گا۔ ورنہ پھر یہ جانیں اور ان کی قسمت۔"

یہ کہکر گوہر سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ میں بھی تاہیے کو اٹھا کر نیچے آ گیا۔

"تو یہاں ٹھہر، میں ٹیکسی لے کر آتا ہوں۔ تم میرے ساتھ آؤ یار۔" میں نے حبیب شاہ کے ایک لڑکے سے کہا۔ وہ فوراً ہی میرے ساتھ چل دیا۔ مسجد کے قریب سے گزرتے ہوئے میں نے اُسے قطب دین کے بھی درشن کرائے۔ وہ گلی میں ابھی تک اوندھے منہ پڑا تھا اور بے ہوش تھا۔ اسے اس حال میں دیکھ کر وہ لڑکا بے حد

حیران ہوا بولا۔ "یہ کون ہے بھاجی؟"

"یہ بھی انہی کا ساتھی ہے۔ پہلے ہم نے اسی کی گردن دبائی تھی۔ اس نے ہم پر حملہ کر دیا تھا۔"

"آپ نے تو کمال کر دیا ہے بھاجی۔ میری تو بہن کی شادی ہے اگلے جمعے کو۔ گھر میں سارا جہیز تیار کر رکھا ہے۔ ہم تو لٹ گئے تھے آج۔"

"ہاں! مگر گوہر نے تمھیں بچا لیا ہے وہ نہ ہوتا تو تم مارے گئے تھے آج رات۔"

"پر وہ تو اچھا آدمی نہیں ہے بھاجی! وہ میری بہن ہے نا شمشاد۔ وہ۔۔۔ وہ اس کے پیچھے لگا ہے میں نے تو بہت لحاظ کیا ہے اس کا ورنہ۔۔۔"

"وہ بہت اچھا آدمی ہے یار کیا نام ہے تیرا۔"

"میرا نام ارشاد ہے جی! میرے ابا جی ولایت سے روپیہ لائے ہیں تو ہم اب باجی سلمہ کی شادی کر رہے ہیں۔ مگر وہ گوہر میری چھوٹی بہن کو بدنام کرتا ہے۔ اس نے تو اپنی ماں کو بھی بھیجا تھا۔ میری امّی کے پاس۔ شمشاد کے رشتے کے لیے مگر یہ بھلا کیسے ہو سکتا تھا۔ امّی نے صاف انکار کر دیا۔"

"نہیں یار! وہ گوہر اچھا آدمی ہے بڑے پیسے ہیں اس کے پاس۔ اُدھر شہر میں ایک دکان بھی لے رکھی ہے اس نے۔ بس وہ اگلے مہینے سے وہاں کام بھی شروع کر رہا ہے۔ میری مانو تو یہ رشتہ کر دو۔ بہت اچھا آدمی ہے وہ گوہر۔" میں نے ارشاد کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"مگر وہ۔۔۔ نہیں بھاجی۔ وہ کوئی کام نہیں کرتا ہے۔ بدمعاشوں کے ساتھ مل کر وہ بھی بدمعاش ہو چکا ہے۔"

"اس کے باپ کو جانتے ہو تم؟"

"ہاں عبدالکریم صاحب کو تو میں جانتا ہوں۔ وہ فوج میں سپاہی رہ چکے ہیں اب وہ کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ وہ تو بہت اچھے آدمی ہیں۔" ارشاد نے میرے ساتھ قدم ملاتے ہوئے کہا۔ ہم باتیں کرتے ہوئے گاؤں سے باہر نکل آئے تھے

"تو پھر اور کیا چاہیے تمھیں! آج اس گوہر نے اپنی جان پر کھیل کر تمھیں بچا لیا ہے ورنہ کون کسی کے لیے اتنا خطرہ مول لیتا ہے۔" میں نے ارشاد کو سمجھایا۔

"وہ تو ٹھیک ہے بھاجی پر۔۔۔ وہ بدنام بہت ہے۔"

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔ گوہر کو تم لوگ سمجھنے کی کوشش کرو۔" میں نے کہا۔

اب ہم ٹیکسی کے قریب پہنچ چکے تھے۔ میں نے ارشاد کو ساتھ بٹھایا اور ٹیکسی اسٹارٹ کر کے ان کی گلی میں جا گھسا۔

گاؤں کے ندیدے کتوں نے اس گھڑی وہاں گاڑی کا شور سن کر واویلا مچایا۔ ہر طرف سے وہ ہم پر یلغار کرنے لگے مگر میں نے کوئی پروا نہ کی۔ ان کی کسی بات کا جواب دیے بغیر میں نے گاڑی لے جا کر پہلے قطب دین کے قریب ٹھہرائی اور اسے اندر ڈالا۔ پھر میں حبیب شاہ کے دروازے کے سامنے جا ٹھہرا۔ گوہر نے اب تک گوگی کے بازو اور تاہیے کی پنڈلی پر راکھ ڈال کر پٹیاں باندھ دی تھیں اور ان کے زخموں سے بہتے خون کو روک دیا تھا۔ اس نے حبیب شاہ کے نہ چاہنے کے باوجود جب ان دونوں کو گاڑی کے اندر ڈالا تو وہ لوگ مکان کے دروازے کے سامنے تصویرِ حیرت بنے کھڑے تھے۔ وہ گدرائی ہوئی لڑکی شمشاد بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ جب میں گاڑی کو گلی کے باہر لے آیا تو گوہر بولا۔

"یار یہ سب کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ وہ کہیں یہ نہ سمجھیں کہ ہم نے ہی اس ڈاکے کا انتظام کرایا تھا اور پھر خود ہی ان کے حامی بن گئے۔"

"جو کچھ بھی ہوتا ہے ہونے دو۔ یہ تمھارے دوست ہیں ان کو یہاں چھوڑنا کسی بھی طرح مناسب نہیں تھا۔"

"یہ تو ٹھیک ہے تو چلو پھر لعنت بھیجو اس قصے پر، ویسے میں نے شاہ جی سے کہہ دیا ہے کہ وہ اس واردات کا کسی سے ذکر نہ کریں اور اپنا سارا جمع جتھا بینک میں رکھ آئیں۔"

"ہاں یہ اچھا کیا تو نے۔ ویسے میں نے اس ارشاد سے تمھاری سفارش کر دی ہے کہ جس طرح بھی ہو سکے وہ شمشاد سے تیری شادی کرا دے۔"

"نہیں یار! گپ نہ ہانک۔ تجھے کیا پتہ ہے کہ شمشاد کون ہے اور۔۔۔"

"مجھے سب پتہ ہے پیلے! تو نے حبیب شاہ کو صرف اس شمشاد کے لیے ہی بچایا ہے۔ ورنہ تو اس آگ میں ہرگز بھی چھلانگ نہ لگاتا۔"

"یار یہ ساری باتیں تمھیں کس نے بتائی ہیں۔ تو بڑی پہنچی ہوئی شے معلوم ہوتا ہے۔" اس نے حیران ہو کر کہا۔ ہماری تینوں سواریاں پچھلی سیٹوں پر ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ وہ سب لمبی چھٹی پر جا چکے تھے اور ابھی تک بے ہوش تھے۔

"مجھے الہام نہیں ہوتا ہے گوہر۔ میں نے ارشاد سے سب باتیں معلوم کر لی تھیں۔"

"اچھا! تو پھر کیا جواب دیا ہے اس نے؟"

"میرا خیال ہے کہ اگر تو اپنی شہرت ذرا درست کر لے تو وہ مان جائیں گے۔ ویسے میں نے کہہ دیا ہے کہ تو نے شہر میں دکان رکھی ہے اور تو اگلے مہینے وہاں کام بھی شروع کر دے گا۔"

"یہ گپ ہانکنے کی کیا ضرورت تھی میرے پاس کون سی دکان ہے بھلا۔"

"تیرے پاس کوئی مال شال تو ہوگا ہی۔ ان کے ساتھ مل کر تو جو کارروائیاں کرتا ہے اس کا حصّہ تو ملتا ہی ہوگا تجھے۔"

"نہیں یار! کچھ بھی نہیں ہے میرے پاس۔ میں تو تھوڑے ہی دن ہوتے ان سے ملا ہوں۔ صرف ایک بار انھوں نے مجھے چھ ہزار روپے دیے تھے کوئی پندرہ دن پہلے، اس سے میں نے ایک بھینس خرید لی اور پندرہ سو روپے میاں جی کو دے دیے تھے انہیں بیج اور کھاد کے لیے روپے کی ضرورت تھی۔"

"تیرے میاں جی نے پوچھا نہیں کہ یہ مال تو نے کہاں سے لیا ہے؟"

"میں نے کہہ دیا تھا کہ کچھ کاروبار کر رہا ہوں۔ میں آج کل ایک آڑھتی کے ساتھ مل کر۔ بس وہ مطمئن ہو گئے۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ تو فکر نہ کر، میں تجھے کاروبار کے لیے بیس ہزار روپے دے دوں گا۔ یہ اسلم آبی ہے نا ہریکے والا، اس سے دس دن بعد لے لینا۔ پھر اس سے کوئی ڈھنگ کا کاروبار کر کے تو یونہی شمشاد سے شادی کر سکے گا۔ تیرا کاروبار دیکھ کر وہ مان جائیں گے۔"

"یار تو؟ تو بھلا مجھے اتنے روپے کیوں دے گا۔ میں کیا لگتا ہوں تیرا۔ یہی تیرا بڑا احسان ہے کہ تو نے آج ان سے حبیب شاہ کو بچا لیا۔ ورنہ میں اکیلا کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ساری عمر مجھے اس بات کا افسوس رہتا۔"

"میں تجھے بیس ہزار روپے ضرور دے دوں گا گوہر۔۔۔ میں چاہتا ہوں تو یہ رستہ چھوڑ دے یہ تجھے سیدھا جیل لے جائے گا۔"

"تیری مہربانی ہے یار کہ تو میرے بارے میں ایسی اچھی باتیں سوچ رہا ہے ورنہ مجھے تو اِدھر سب لوگ گالی دیتے ہیں۔"

"یہ سب اندھے ہیں۔ انہیں کیا پتہ کوئی اندر سے کیا ہے۔ اب تو مجھے ہریکے کا راستہ بتلا دے۔"

"وہ تو میں بتا دیتا ہوں مگر ان کا کیا کریں؟"

"تجھے گاڑی چلانی آتی ہے؟"

"ہاں یہ کام تو میں نے سیکھ رکھا ہے۔ تاہیے سے سیکھا تھا میں نے۔"

"اچھا تو مجھے ادھر ہریکے پہنچا کر آبی کے گھر چھوڑ دے اور پھر واپس آ کر یہ ٹیکسی تو سیدھی اُدھر بھٹے پر لے جا اور ان سالوں کو وہاں چوکیدار کے پاس چھوڑ دے۔"

"مگر وہ پوچھے گا تو میں کیا بتاؤں گا انہیں۔"

"کہہ دینا کہ تجھے ادھر زخمی حالت میں ملے تھے ڈبگری کے باہر۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے اب میں ان سے اچھی طرح نپٹ لوں گا۔۔۔

پہلے میں بے خبری میں مارا گیا تھا۔"

کچھ ہی دیر بعد ہم ہریکے پہنچ گئے۔ اس وقت صبح کے دو بج رہے تھے۔ رات کی ناگن ابھی تک دھرتی پر کنڈلی مارے بیٹھی تھی اور ستارے دم بخود تھے۔ چار سو ہُو کا سناٹا تھا۔ سردی اتنی شدید تھی کہ ہم دونوں اپنے اپنے کمبلوں میں ٹھٹھر رہے تھے اور ہماری سواریاں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر پیچھے پڑی تھیں۔ یوں جیسے کسی مذبح میں ذبح شدہ جانور ایک کے اوپر ایک کر کے ڈال دیے گئے ہوں۔

گاڑی میں نے گاؤں سے باہر کافی فاصلے پر کھڑی کر دی۔ گوہر ان راستوں سے پوری طرح آشنا تھا۔ وہ مجھے لے جا کر گاؤں میں جا گھسا۔ کچھ ہی دور چلنے کے بعد ہمیں ایک حویلی کے بڑے سے صحن میں گیس کے لیمپ جلتے نظر آئے۔ وہاں لوگ ابھی تک جاگ رہے تھے اور گھر سے ٹھہر ٹھہر کر نالہ و شیون کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔

"معلوم ہوتا ہے یہاں کوئی آدمی مر گیا ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں یہاں چوہدری بہادر علی مر گیا ہے۔ وہ اسلم آبی کا جگری یار تھا۔ آبی اسی لیے آج تاہیے کے پاس نہیں پہنچا تھا۔ یہ چوہدری بہادر علی کا ہی گھر ہے۔ بیچارا۔ بڑی دولت جمع کی تھی اس نے مگر کس کام آئی۔" گوہر نے حویلی کے سامنے سے گزرتے ہوئے کہا۔

میں چپ رہا مجھے تو یہ بات پہلے ہی معلوم تھی مگر میری خاموشی کی وجہ کچھ اور ہی تھی۔ گاؤں کا ماحول مجھے دہلا رہا تھا اور میری چھٹی حس مجھے کسی شدید خطرے کا احساس دلانے لگی تھی۔ حویلی کے سامنے کھلی جگہ سے ذرا آگے مجھے درختوں کے نیچے سائے سے چلتے نظر آئے تھے۔ ان سایوں کے بوٹوں نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔ وہ یقیناً پولیس کے سپاہی تھے۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس تو ہوا مگر اس وقت بہت دیر ہو چکی تھی۔ اس بادو یوسف نے غالباً پولیس والوں کو بتا دیا تھا کہ جس آدمی نے انہیں زخمی کیا تھا وہ ہریکے جا رہا تھا۔ وہ میری تلاش میں وہاں پہنچ چکے تھے۔ میرا سارا بدن سنسنا گیا میں نے گوہر کو اپنی طرف گھسیٹا۔

"گوہر ہم سخت خطرے میں ہیں۔ یہاں سے بھاگ چلو۔" میں نے سامنے کی تاریک گلی میں گھستے ہوئے کہا۔

"کیوں خطرے کی کیا بات ہے۔" گوہر نے میرے قدم کے ساتھ قدم ملاتے ہوئے کہا۔

"بات کچھ ایسی ہی ہے۔ نکل چل۔" یہ کہہ کر میں نے گھپ اندھیری گلی میں دوڑ لگا دی میرے ساتھ گوہر بھی دوڑنے لگا۔

اچانک مجھے اپنے پیچھے بھاری بھرکم بوٹوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ وہ سپاہی ہمارے پیچھے بھاگ رہے تھے۔

"رک جاؤ ورنہ گولی مار دی جائے گی۔" ایک گمبھیر آواز فضا میں ابھری۔ کسی نے ہمیں پیچھے سے للکارا تھا مگر ہم رکے نہیں،

بڑھتے رہے۔ اور اس کے ساتھ ہی کئی گولیاں سنسناتی ہوئی، میرے دائیں بائیں سے گزر گئیں۔ میں نے اپنی رفتار اور تیز کر دی وہ گلی خاصی لمبی تھی۔ گولیوں کی ایک اور باڑھ ماری گئی۔ اُن سے بچنے کے لیے میں تیزی سے ایک دروازے کی اوٹ میں ہو گیا، مگر گوہر آگے نکل گیا۔ میرا گلی میں آگے بڑھنا ناممکن ہو گیا تھا کیونکہ وہ بہت قریب آ پہنچے تھے۔ میں نے زور سے دروازے کو پیچھے دھکیلا تو اس کی اندر کی کُنڈی کھل گئی میں پاگلوں کی طرح اس کچے مکان کے صحن میں جا گھسا اور گارے مٹی کی بنی بے ہنگم سی سیڑھی کو عبور کر کے چھت پر جا چڑھا۔ وہ لوگ گلی میں بھاگتے ہوئے اس دروازے تک آئے مگر پھر گوہر کو بھاگتا دیکھ کر وہ اس کے پیچھے لپکے۔ وہ ایک لمحہ مجھے بے حد غنیمت لگا اور میں چھتوں پر چلتا ہوا دوسری گلی کے اختتام تک جا پہنچا۔ میرے ساتھ ایک بار پھر وہی ہو رہا تھا جس کا تجربہ مائی حاجاں کے گھر پر ہو چکا تھا۔ میں ایک بار پھر ویسے ہی حالات میں گھر چکا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کدھر جاؤں کس طرف نکلوں۔ آبی کا گاؤں میرا مقتل بن رہا تھا۔ وہ لوگ بہت بپھرے ہوئے تھے۔ ان کی بوچھاڑ نے ایسے دھماکے پیدا کئے تھے کہ سارا گاؤں نیند سے بیدار ہو چکا تھا ہر گھر سے مجھے آوازیں سُنائی دے رہی تھیں۔ میرے لیے دُوسری گلی میں کُودنا کسی طرح بھی سُود مند نہ تھا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ وہ لوگ کھُلی جگہ پر دیکھتے ہی مجھ پر گولیاں برسانے لگیں گے۔ ان کے دلوں میں انتقام کی آگ سُلگ رہی تھی۔ اور وہ مجھے ہر قیمت پر پکڑنے کے لیے اپنی پوری کوشش صرف کر رہے تھے۔

میرا اندازہ صحیح نکلا۔ مجھے دُوسری گلی میں اُن کے بُوٹوں کی دگڑ دگڑ سنائی دینے لگی۔ وہ اُدھر نکل آئے تھے۔ میں تیزی سے پیچھے ہٹا۔ مجھے بہرحال ان کی نظروں سے بچنا تھا۔ میری نبضیں دھڑ دھڑ بج رہی تھیں۔ میرا حال اس وحشی کا سا تھا جو چاروں طرف سے نیزہ بازوں کے انبوہ میں گھِر گیا ہو۔ مجھے ان کی صحیح تعداد کا اندازہ نہیں تھا۔ مگر یہ بات صاف ظاہر تھی کہ وہ ایک دو نہیں کئی تھے۔ پُوری گارد میرے تعاقب میں وہاں پہنچی ہوئی تھی ——
میں گھبرا کر اس مکان کی چھت پر منڈیر کے ساتھ لگ کر لیٹ گیا تاکہ وہ کسی بھی طرف سے مجھے نہ دیکھ سکیں۔

"یہ ... کیا ہو رہا ہے دینو یہ گلی میں دبڑ دبڑ کیسی ہو رہی ہے، گولیاں بھی چلی ہیں" کسی عورت نے خوف زدہ گھُٹے گھُٹے لہجے میں کہا۔ وہ نیچے صحن میں کھڑی تھی۔

"چل اندر۔ تو کیوں باہر نکل آئی ہے، خواہ مخواہ ...... چل اندر۔ اذان کے وقت —— چلی جانا" یہ کسی مرد کی آواز تھی۔

"ہائے میرا دل ڈر رہا ہے دینو۔ ماں بھی جاگ گئی ہو گی۔ وہ تو میری جان کھا جائے گی۔"

"دفع کر جیلاں، اس وہم پر مٹی ڈال۔ پتہ نہیں کیا قصہ ہے باہر —— چل آ، اندر بیٹھتے ہیں۔"

"نہیں بیبا، میں چلتی ہوں" وہ عورت بولی۔

"نہیں بھئی۔ میں ابھی نہیں جانے دوں گا تجھے۔ ابھی تو دل بھرا نہیں" مرد کی آواز بہکی ہوئی تھی۔ اس کا لہجہ بہت ہی کھُردرا سا تھا مگر اس میں مجھے اس گھڑی ایک دیوانگی میں مبتلا آدمی کی کیفیت جھلکتی نظر آتی تھی۔ میں نے سر آگے کر کے صحن میں جھانک کر دیکھا تو وہ اس عورت کو پیچھے کھینچ رہا تھا۔

چھت یہی کوئی آٹھ نو فٹ اونچی تھی —— کچے گھروندوں کی چھتوں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ اچانک گلی میں کسی سپاہی کی کرخت آواز گونجی۔ وہ بھاگتا ہوا چلاّ رہا تھا" وہ کسی گھر میں چھُپ گیا ہے سارے گھروں کی ناکہ بندی کر دو۔"

اس کی یہ بات سُنتے ہی میں نے صحن میں چھلانگ لگا دی۔ دینو مجھ سے دو ہاتھ دُور تھا۔ مجھے صحن میں دیکھ کر وہ تیزی سے دیوار کی طرف ہٹا۔ جیلاں بھی اس کے ساتھ تھی۔ وہ دونوں یوں گُنگ ہو گئے تھے جیسے انہوں نے صحن میں کسی بھُوت کو دیکھا ہو۔ میں نے اسٹین گن کی نال دینو کے سینے سے لگا دی۔

"تم دونوں اندر چلو۔ خبردار جو منہ سے کوئی آواز نکالی،... گولی مار دُوں گا۔"

میری دھمکی کا اُن پر خاطر خواہ اثر پڑا۔ اور وہ دونوں کوٹھری کی طرف چل دیئے۔

"تیز چلو۔" میں نے انہیں آگے دھکیلتے ہوئے کہا۔

باہر پولیس کے سپاہی اب سیٹیاں بجا رہے تھے۔ ایک دوسرے کو خبردار رکھنے کے لیے وہ چاروں طرف بکھر کر مجھے تلاش کر رہے تھے۔

دینو اور جیلاں کو جب میں کوٹھری میں دھکیل چکا تو دیئے کی روشنی میں میں نے دیکھا کہ دینو یک چشم کل آدمی تھا اور وہ جیلاں شکل سے بس یونہی سی نظر آتی تھی سیاہ رنگت، موٹے موٹے ہونٹ جسم البتہ اُس کا خوب کسا ہوا تھا۔ عمر اس کی زیادہ نہیں تھی۔ یہی کوئی پچیس چھبیس سال ہو گی۔ اس کی آنکھیں بہرحال بولتی نظر آتی تھیں۔ ایسی خوبصورت آنکھیں میں نے زندگی میں بہت کم دیکھی ہیں۔ بڑی بڑی۔ گائے کی آنکھوں ایسی۔ اور ان کی چمک ایسی تھی کہ نگاہ کو خیرہ کرتی تھی۔ ہر عورت کو فطرت کی طرف سے کوئی نہ کوئی خوبی ضرور عطا ہوتی ہے جو کسی نہ کسی کو اس کا دیوانہ... بنا دیتی

وہ دونوں ٹک ٹک مجھے دیکھ رہے تھے۔ دونوں کا رنگ اُڑ رہا تھا۔

"تمہیں مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے دینو! میں اِدھر چوہدری اسلم سے ملنے آیا تھا۔ اسلم آبی سے مگر میرے پیچھے پولیس لگ گئی۔ گولیوں کی جو آواز تم نے سُنی ہے وہ انھوں نے مجھ پر ہی چلائی تھیں میں تھوڑا عرصہ یہاں گزاروں گا۔" میں نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ جیلاں کے بال کھلے تھے اور وہ اتنے لمبے تھے کہ اس کے کولھوں تک پھیلے نظر آتے تھے۔ دینو نے کھیس کی بُکل مار رکھی تھی۔ اور معلوم یہ ہوتا تھا کہ نیچے قمیص نہیں پہنے ہوئے ہے۔ میری بات کا انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دینو اپنی واحد آنکھ بار بار جھپک رہا تھا۔

"تم بیٹھتے کیوں نہیں ہو۔ بیٹھ جاؤ اِدھر۔" میں نے چارپائی کی پائنتی کھِسکتے ہوئے کہا۔ اسٹین گن کا رُخ ابھی تک میں نے انکی طرف کر رکھا تھا۔

"میں جا رہی ہوں دینو، مجھے بہت دیر ہو گئی ہے۔"

"تم ابھی نہیں جاؤ گی جیلاں۔ میرا بھی ایک کام کر دو۔ اس کام کے تمھیں پیسے بھی دے سکتا ہوں۔ یہ دیکھو۔ یہ سو کا نوٹ رکھ لو" میں نے بائیں ہاتھ سے جیب کو ٹٹول کر ایک نوٹ باہر نکالا اور اس کے سامنے کر دیا۔

"میں۔۔ میں۔۔ تھوکتی بھی نہیں ہوں تمھارے نوٹ پر —— میں کوئی کنجری نہیں ہوں" وہ ایک دم بھڑک کر بولی میرے ہاتھ میں نوٹ دیکھ کر وہ خدا جانے کیا سمجھ بیٹھی تھی۔

"اسے سمجھاؤ دینو، میں۔ میں آدمی کو سمو چا نگل جاتا ہوں۔"

"سورو پیہ بڑی چیز ہے۔ میں نے تو اسے تیس روپے دیئے تھے۔"

"بکواس نہ کر دینو، میں تو تیری محبت میں یہاں آ گئی تھی۔ یہ لو اپنے یہ پیسے رکھ لو۔"

وہ اپنی پہلو کی جیب میں ہاتھ ڈالنے لگی۔

"تم دونوں غلط سمجھے ہو۔ جیلاں میں یہ پیسے کسی ایسے ویسے کام کے لیے نہیں دے رہا ہوں تجھے۔ میں چاہتا ہوں کہ تو اسی وقت جا کر اسلم کو یہاں بُلا لائے۔ یہ تیری بڑی مہربانی ہو گی۔ مجھے اس سے ایک بہت ضروری کام ہے۔"

"اچھا؟ تو پہلے کیوں نہیں بتایا تو نے، اس نوٹ کی ضرورت ہی نہیں ہے میں اسے ویسے ہی بُلا لاتی ہوں، پر پتہ نہیں وہ گھر میں ہو گا بھی کہ نہیں۔" جیلاں نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ دینو نے وہ نوٹ میرے ہاتھ سے لے لیا۔ بولا،

"یہ نوٹ تم مجھے دے دو۔ میں بُلا لاتا ہوں اُسے۔"

"نہیں تمھارا جانا ٹھیک نہیں ہے۔ باہر پولیس موجود ہے۔"

"میں کہہ دوں گا کہ میں چوہدری بہادر علی کے گھر جا رہا ہوں۔ اسلم کا گھر اس کے قریب ہی ہے۔"

"مگر بہادر علی تو مر گیا ہے۔"

"ہاں! اُدھر وہ سب لوگ جاگ رہے ہیں مجھے سب پتہ ہے۔"

"مگر تو پولیس کو کچھ نہیں بتائے گا۔ ورنہ یاد رکھ دینو، یہاں خون کی ندیاں بہہ جائیں گی تیری اس ذرا سی غلطی پر۔"

"نہیں جی، میں انہیں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ وہ میرے "ساک" تو نہیں لگتے۔ مجھے اُن سے کیا لینا ہے۔" دینو نے نوٹ کو دُہرا کرتے ہوئے کہا۔

"تو ٹھیک ہے تو ہی چلا جا مگر بڑی احتیاط سے جانا۔"

"آپ فکر ہی نہ کریں بھائی جی۔ چل جیلاں تو اب جا تیری ماں فکر کر رہی ہو گی۔"

"نہیں یہ ابھی نہیں جائے گی۔ تو آئے گا تو پھر یہ بھی چلی جائیگی تجھے کسی نے اُدھر روک لیا تو اس کے ذریعے میں معلوم تو کر سکوں گا۔ جا اب جلدی نکل جا۔"

"اچھا ٹھیک ہے جی! میں بس ابھی آیا۔" یہ کہہ کر اس نے کرتہ پہنا اور پھر کھیس کے پلّے کو سر پر بل دے کر باندھتے ہوئے وہ بُکل مار کر باہر نکل گیا۔ جیلاں نے صحن میں جا کر اندر سے کنڈی چڑھائی اور پھر دبے پیروں چلتی ہوئی اندر آ گئی مگر چارپائی پر نہیں بیٹھی، حالانکہ وہاں بڑی جگہ تھی۔ سردی سے وہ ٹھٹھرنے لگی تھی۔

"اری تو بھی اِدھر بیٹھ جا۔ وہاں کیوں کھڑی ہے۔ میں کوئی کھا تو نہیں جاؤں گا تجھے۔ بے بس اور مجبور آدمی ہوں پناہ کے لیے اِدھر آ گیا ہوں جیلاں بیٹھ جا۔"

"وہ تیرے پیچھے پولیس کیوں لگی ہے؟" وہ چارپائی کے ایک کونے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"یہ لمبا قصہ ہے جیلاں۔ وہ بچارے میری محبت میں مرے جا رہے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ مجھے سینے سے لگا لیں۔" میں نے بائیں ہاتھ سے لحاف اس کے گرد لپیٹتے ہوئے کہا۔

"یہ اوپر اوڑھ لے۔ تجھے سردی لگ رہی ہے نا۔"

اُس نے لحاف کو اپنی طرف سمیٹا اور بولی "کوئی قتل شتل کیا ہو گا تو نے یا پھر کہیں ڈاکہ ڈالا ہو گا۔ مجھے تو تیری شکل سے ڈر لگتا ہے۔"

"تجھے ڈرنا بھی چاہیے۔ آدمی آدمی انتر ہوتا ہے۔ پتہ نہیں میں کیا کر دوں مگر تو ادھر دینو کے پاس کیا کر رہی تھی۔"

وہ خجل ہو گئی۔ چہرے کے آگے اس نے لحاف پھیلا لیا۔

"ساری بات تو خیر دینو نے خود ہی بتا دی تھی۔ بڑا کچا یار ہے تیرا۔"

"بڑا دُت ہے یہ دینو۔ اس کے پیچھے میں اتنی جان مارتی ہوں

اور یہ سمجھتا ہے کہ میں پیسے کے لالچ میں یہاں آتی ہوں۔

" وہ حساب صاف رکھتا ہوگا تاکہ کل کلاں کو کوئی بکھیڑا نہ کھڑا ہو جائے۔"

" آج تو اس نے مجھے بہت ذلیل کیا ہے اب میں اس سے کبھی نہیں ملوں گی۔"

" اور وہ تیس روپے؟"

وہ میں اس کے منہ پر دے ماروں گی۔ اس کمینے نے سمجھا کیا ہے مجھے۔" یہ کہہ کر اس نے جیب سے تیس روپے نکال کر زمین پر پھینک دیئے۔ اس کی اس سادگی نے مجھے حیران کر دیا۔ ایسی ندامت اس کے چہرے پر ابھر آئی تھی کہ میں سمجھا کہ وہ ابھی وہاں سے اٹھ کر چل دے گی۔ باہر گلی میں اس وقت مکمل سناٹا چھا چکا تھا۔ پولیس کے سپاہی گلیوں کی ناکہ بندی کر کے ایک دوسرے سے الگ تھلگ کھڑے تھے یہی وجہ تھی کہ ہمیں ان کی طرف سے کسی قسم کی کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

" یہ دینو اکیلا رہتا ہے یہاں۔"

" ہاں! اس کی ماں بھی مر چکی ہے اور باپ بھی۔ ادھر سوتر مل میں کام کرتا ہے یہ۔ تین سو روپے لیتا ہے۔ مجھے بڑھاتا رہتا ہے کہتا تھا میں تجھ سے شادی کر لوں گا مگر دو سال ہو گئے۔ میری اس کی بول چال کو مگر اب یہ کنی کھسکاتا ہے۔"

" یہ تو ہوتا ہی ہے۔ تو جب ویسے ہی اس کا دل خوش کر دیتی ہے تو پھر وہ تجھ سے شادی کیوں کریگا۔ تو اس کی پیاس بڑھائے گی تو وہ سیدھا ہو جائے گا۔" اس کے چہرے پر شرم کی ردا بچھنے لگی۔ ایک بار پھر اس نے لحاف میں منہ چھپا لیا۔ بولی،

" تو بڑا وہ ہے سخت بے شرم آدمی ہے تو۔"

" میں یہ سارے پتن تیر چکا ہوں بی بی۔ مجھ سے کوئی بات اوجھل نہیں ہے۔"

" لگتا ہے تیرے پاس بڑے پیسے ہیں۔ بغیر کسی وجہ کے تو نے اسے سو روپیہ تھما دیا۔"

" بھئی وہ کام ہی ایسا ہے رشوت کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا۔ میں ویسے ہی داغی آدمی ہوں وہ بھلا کیوں میرا کام کرتا ۔۔۔ اور پیسے تو تیری دعا سے میرے پاس بہت ہیں۔"

" اچھا؟ اتنے پیسے ہیں تیرے پاس۔ کوئی دو چار سو مجھے بھی دے جا۔"

میرا ذہن قلابازیاں کھانے لگا۔ پیسہ پیسہ پیسہ۔ ایک ہی سوال ابھرتا ہے ہر جگہ، ہر مقام پر، اور اس پیسے کے بل بوتے پر مرد نے عورت کو کس کس مرحلے سے نہیں گزار دیا ہے اگر پیسے پر مرد کی اجارہ داری نہ ہوتی تو عورت بھی شاید اسے اتنے ہی جانگسل مراحل سے گزارتی اور اتنی ہی بلکہ اس سے کہیں زیادہ اذیت پہنچاتی جتنی مرد نے اسے پہنچائی ہے اور وہ گاؤں کی سیدھی سادھی الھڑ اکھڑ دوہرے بدن والی جیلاں مجھے اس گھڑی اندر سے پگھلا کر میری مومیائی نکالنے پر آمادہ تھی پیسے کے لیے اس کی گرسنگی دیدنی تھی۔

عین اسی وقت دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی ۔۔۔ وہ ٹھٹک گئی۔

" یہ لے تو سو روپیہ رکھ لے اور جا دیکھ شاید وہ دینو آ گیا ہے۔" میں نے اسے سو روپے کا نوٹ تھما دیا۔ وہ خوش ہو گئی ۔۔۔ نوٹ کو میرے ہاتھ سے جھپٹ لیا، تہ کر کے پہلو کی جیب میں ڈالا اور دبے پاؤں صحن میں نکل کر اس نے کنڈی پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں بھی اس کے پیچھے دروازے پر جا پہنچا۔

" کون ہے؟" وہ بولی۔

" میں ہوں دینو۔ دروازہ کھول۔" باہر سے دینو نے سرگوشی کی۔ جیلاں نے دروازہ کھولا تو پہلے دینو اندر آیا اور پھر اس کے پیچھے ایک اور آدمی اندر آ گیا۔ اس نے آتے ہی گہری نظر سے مجھے دیکھا اور ایک دم مجھ سے لپٹ گیا۔ " اوئے میرے یار! تو ادھر کیسے آ گیا۔" دینو نے دروازے کو کنڈی لگانے سے پہلے جیلاں کو باہر نکال دیا اور پھر ہماری طرف مڑا۔ بولا۔

" اندر چل کر بیٹھو چوہدری جی۔ وہ پولیس والے بہت تیز ہیں۔" آبی مجھے کھینچتا ہوا کوٹھری میں لے گیا۔ وہ مجھے دیئے کی مدھم روشنی میں یوں دیکھ رہا تھا جیسے میں کوئی عجوبہ چیز ہوں۔ پھر وہ مجھے بڑی محبت سے چارپائی پر بٹھاتے ہوئے بولا۔

" یار، میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ تجھ سے ملنے کو بہت جی چاہتا تھا میرا۔ یہ پولیس والے کہیں تیرے پیچھے تو دھنا دھن نہیں کر رہے تھے؟"

" بات کچھ ایسی ہی ہے آبی۔ میں ان کے گھیرے میں آ گیا تھا۔ اللہ نے ہی جان بچائی ہے آج۔"

" وہ تو میں دیکھ رہا ہوں۔ چھ سپاہی آئے ہوئے ہیں ادھر اور ایک تھانیدار ہے۔ بڑا تھانیدار۔ کہتے ہیں تو نے ادھر پولیس مقابلہ" کیا تھا۔

" ہاں! مجھے ان پر گولی چلانی پڑی تھی۔"

" پر یار انہوں نے تو گاؤں کی ناکہ بندی کر رکھی ہے گاؤں کے آدمیوں کو بھی ادھر ادھر کھڑا کر دیا ہے۔"

" تجھے کیسے آنے دیا انہوں نے؟"

" ہم تو ایک پل نہیں سوئے آج۔ وہ بہادر علی مر گیا ہے نا میرا جگری یار۔ اس کے کوئی دو سو رشتے دار آ چکے ہیں اب تک۔ انہی کے لیے مجھے ساری رات ادھر ادھر پھرنا پڑا۔ کسی سے بستر مانگا کسی سے چارپائی کہیں سے کھیس لیے اور کہیں سے رضائیاں ۔۔۔ ایک عذاب جھیلا ہے میں نے رات بھر۔"

" ہاں یار، بہادر علی کی موت کا مجھے بہت افسوس ہوا ہے۔"

" تجھے کیسے پتہ چلا؟" اس نے حیرت ظاہر کی۔ میں نے چاہا کہ میں تاہیے کا نام لے دوں مگر مصلحتاً میں نے اپنا ارادہ بدل لیا ۔۔۔ تاہیا آبی کا دوست تھا اگر اسے معلوم ہو جاتا کہ میں نے ان کا کیا حشر کیا ہے تو پتہ نہیں وہ مجھ سے کیا سلوک کرتا۔ میں نے اسے ٹالتے ہوئے کہا۔ " تو نے خود ہی تو بتایا ہے مجھے۔"

" اچھا؟ ہاں! بس اس کا وقت آ گیا تھا ورنہ انہی کھیتوں میں تو وہ پل کر جوان ہوا تھا۔ یہاں کے تو سانپ بھی اسے جانتے تھے مگر کل ایک سانپ نے اسے ڈس ہی لیا۔"

" کوئی اجنبی سانپ ہوگا۔ بے خبری میں کام دکھا گیا۔"

میری یہ بات سن کر وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرا دیا۔ بولا،

" تو نکتے پکڑنے میں ماہر ہے میرے یار! خیر ۔۔۔ اب تو مجھے یہ بتا کہ تجھے میں کیسے یاد آ گیا۔"

" تجھے تو میں کبھی بھی نہیں بھول سکا ہوں آبی۔ بڑے دھکے کھائے ہیں میں نے مگر تو مجھے یہاں سے نکالے تو میں کچھ کہوں۔"

" ہاں یار! یہ تو بڑی مصیبت کی بات ہے۔ وہ تو ادھر چھاؤنی ڈالے بیٹھے ہیں۔ ایک ٹیکسی ڈرائیور یوسف بھی ان کے ساتھ ہے بہت تپا ہوا ہے وہ تو اس کی ٹیکسی بھی لے آیا تھا۔"

" ہاں مگر یہ تو بہت برا ہوا۔ وہ تو مجھے اچھی طرح پہچانتا ہے۔"

" ہاں میرا خیال ہے کہ سورج نکلنے پر وہ گھر گھر تلاشی لینگے۔" آبی نے کہا۔ وہ بہت فکرمند نظر آنے لگا تھا۔

" ذرا اس دینو کو ٹلا یہاں سے۔ پھر میں تجھے ساری بات بتاتا ہوں۔" میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

دینو کوٹھری کے کونے میں بچھی چارپائی پر بیٹھا تھا اور ہماری باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا۔ آبی نے میرے مشورے پر غور کیا اور پھر بولا۔

" یار دینو! تیرے پاس فالتو رضائی تو ہے وہ ادھر دے آ ہمارے گھر کسی مہمان کے کام آئے گی۔"

" ٹھیک ہے بھاجی! میں یہ لحاف دے آتا ہوں۔ یہ ذرا صاف ہے۔" اس نے چارپائی پر رکھے لحاف کو لپیٹ دیا اور اسی وقت اسے بغل میں دبا کر باہر نکل گیا۔

آبی نے صحن میں جا کر اندر سے کنڈی چڑھائی اور پھر میرے پاس آ کر وہ اطمینان سے بیٹھ گیا۔ بولا۔ " اب بتا یار، قصہ کیا ہے۔ تو نے تو ادھر گورنمنٹ ہلا کر رکھ دی ہے۔"

" بات ہی کچھ ایسی ہے آبی۔ میں شکنجے میں جکڑا گیا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے دلشیر آہو کا سارا قصہ اسے سنا دیا۔ وہ حیرت کی تصویر بنا میری باتیں سنتا رہا۔ میں نے قطب دین۔ تاہیے اور گوگے کی بات اسے جان بوجھ کر نہ بتائی اس خیال سے کہ کہیں وہ بھڑک نہ اٹھے تاہیے سے اس کے تعلق کی گہرائی کا مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا۔

" یار، اس آہو کو کیا ہو گیا ہے۔ وہ تو معاملے کا بڑا کھرا آدمی ہے۔ اپنے کسی یار کو اس نے کبھی اس طرح دھوکا نہیں دیا۔"

میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔ میرا تو خیال ہے کہ اس کی آنکھوں پر لالچ کی پٹی بندھ گئی ہے۔"

" یہی ہوا ہے۔ وہ کاغذات ہیں تیرے پاس جو اس نے لکھ کر دیئے تھے۔"

ہاں۔ وہ تو میرے پاس محفوظ ہیں۔ یہ رہے۔" میں نے اپنی جیب سے آہو کے ہاتھ کی لکھی وہ دستاویزات اسے دکھا دیں۔ آبی نے ان کو بڑے غور سے پڑھا اور پھر مسکرا دیا۔ بولا۔

" بالکل بچوں ایسی حرکت کی ہے تم نے۔ تو ان کاغذوں کو کسی کچہری میں پیش کر سکتا ہے؟ ان کو تو کس کے سامنے رکھے گا؟"

میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ کاغذات جن پر مجھے بہت بھروسہ تھا آبی کی نظر میں محض ردی تھے۔ میں نے اپنی خفت مٹاتے ہوئے کہا۔

" دیکھ آبی! میں اس معاملے میں تجھے ہی سب سے بڑی کچہری سمجھتا ہوں تو نے ہی مجھے اس کے گھر بھیجا تھا۔ اس سے میں تیری ہی وجہ سے مل سکا تھا۔ ورنہ میں تو اسے جانتا بھی نہیں تھا۔"

" اب تو مجھ سے منصفی کرائے گا اس جھگڑے کی معاملہ بڑا پیچدار ہو گیا ہے جیلانی مگر خیر تو فکر نہ کر میں تیرے ساتھ ہوں۔ آہو کے مجھ پر بڑے احسان ہیں۔ اس نے کئی بار مجھے کئی چکروں سے نکالا ہے مگر یہاں میں سمجھتا ہوں کہ تو حق پر ہے۔ میں تیرے ساتھ چلوں گا پھر دیکھیں گے وہ کیا کہتا ہے۔"

" مگر اس کا کوئی بھروسہ نہیں ہے وہ مجھے گرفتار کرانا چاہتا ہے۔"

" نہیں، تیری گرفتاری سے تو وہ خود مارا جائے گا۔ اس کا بہت بڑا راز تیرے پاس ہے اور پھر اس وقت یہ کاغذ تیرے بہت کام آ سکتے ہیں۔ ان کے ذریعے تو اس کے راز کا ثبوت بھی پیش کر سکتا ہے۔"

" ہاں یہ تو ہے۔ اسی لیے میں نے یہ تحریر لی تھی اس سے۔"

" مگر یہ تو جب کام آئیں گے جب تو گرفتار ہوگا پر میرے

یار تیری گردن پر کئی لوگوں کا خون ثابت ہوتا ہے۔ تو کیا کرے گا گرفتار ہو کر؟" آبی نے کہا وہ خاصا سمجھدار آدمی نظر آتا تھا۔

"اس نے وہ تمہارا دیا ہوا اسّی ہزار روپیہ بھی دبا لیا ہے — بے ایمان ہو گیا ہے وہ۔"

"میں سمجھ رہا ہوں جیلانی۔ اسی لیے اس نے تجھے زہر دلوایا۔ اسی لیے تجھے کبری کے ذریعے مروانے کی کوشش کی تھی اس نے۔ پر خیر اب سب سے بڑا مسئلہ تو یہ ہے کہ تمہیں یہاں سے کس طرح نکالوں۔ اگر تجھے پکڑ کر لے گئے تو پھر تو قصہ ہی پاک ہو جائے گا جیلانی۔ بڑا مورکھ ہے تو۔ آج رات تجھے ادھر آنے کی کیا ضرورت تھی بھلا۔ کسی کے ذریعے مجھے بلا لیا ہوتا۔"

"اب تو جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ میری سمجھ میں تو اب صرف ایک ہی تدبیر آتی ہے یہاں سے نکلنے کی۔"

"وہ کیا۔ اگر کوئی کام کی بات ہے تو جلدی بتا دے۔"

"تو کسی سپاہی کو کسی بہانے ادھر گلی میں لے آ۔ میں اسے بے ہوش کر کے اس کی وردی خود پہن لوں گا اور پھر اسی وردی میں باہر نکل جاؤں گا۔"

وہ آگے بڑھ کر میری آنکھوں میں جھانک کر بولا۔

"تو جاگ رہا ہے نا۔ بھائی یہ بلّی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے والی بات ہو گی۔ اور پھر میں اگر اسے یہاں لے بھی آؤں تو اسے بلا رے پنا تو بے ہوش کیسے کریگا۔"

"یہ تو مجھ پر چھوڑ دے۔ کسی ایک کو بس ادھر لے آ۔ زیادہ نہ ہوں، ورنہ شور مچ جائے گا۔"

"یار بکوں ایسی باتیں کرتا ہے تو۔ وہ بہت بھڑکے ہوئے ہیں کسی سے سیدھے منہ بات نہیں کرتے۔"

"پھر کیا کریں۔ میں تو بندھ کر رہ گیا ہوں یہاں۔"

"زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے تو ادھر اطمینان سے بیٹھا رہ۔ دینو حوصلے والا آدمی ہے۔ تیرا خیال رکھے گا۔ میں اسے کچھ پیسے بھی دے دوں گا۔"

"ایک سو روپیہ تو میں بھی دے چکا ہوں اسے تمہیں بلانے کا معاوضہ۔"

"اچھا! تو نے پہلے ہی کانا کر دیا اسے۔"

"ہاں، مگر دیکھ یار وہ ایک چیز ہے جیلاں۔"

"ہاں ہاں! ہے تو۔ مگر تو اسے کیسے جانتا ہے؟"

"وہ ادھر دینو کے ساتھ مصروف تھی۔"

"اچھا یہ قصہ ہے۔"

"وہ میرے کام آ سکتی ہے۔"

"وہ کس طرح؟"

"بس وہ گلی میں نکلے اور کسی نہ کسی سپاہی کو اپنے پیچھے لگا کر ادھر لے آئے۔"

"ہاں یہ بات تو ہے! وہ زیادہ دُور نہیں ہے یہاں سے۔ اس دینو کے گھر میں سیڑھی نہیں ہے ورنہ میں چھت پر جا کر اسے بلا لاتا یا اس کو سمجھا دیتا۔"

"یہ کون سی اُونچی چھت ہے تو میرے کندھے پر بیٹھ اور چڑھ جا اُوپر۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔ وہ فوراً مان جائے گی۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا میں نے صحن میں جا کر اسے کندھے پر بٹھایا تو وہ میرے اوپر اٹھتے ہی چھت پر جا چڑھا۔ اور میں ایک بار پھر کوٹھری میں جا بیٹھا۔

اندر سے اپنی اس بے بسی پر میرا کلیجہ کٹ رہا تھا۔ میری زندگی کا سارا چلن ہی بدل گیا تھا۔ میں وہ تھا کہ میں نے کبھی تھانے میں قدم ہی نہیں رکھا تھا۔ پولیس کے نام سے مجھے چڑ تھی۔ میری زندگی کے سارے چشمے صاف شفاف تھے۔ مجھے نہ کوئی ڈر تھا، نہ خوف اور اب یہ حال تھا کہ قدم قدم پر میں دہل جاتا تھا۔ اپنے آپ سے ہی ترساں و لرزاں پھر رہا تھا۔ میرا نہ کوئی گھر تھا نہ در۔ کوئی دہلیز ایسی نہیں رہی تھی جو شام کے جھٹپٹے میں میری منتظر ہوتی۔ میں ماں سے بھی محروم ہو گیا تھا اور بہن سے بھی۔ میرا حال اس ٹنڈ منڈ درخت ایسا تھا جسے موسموں کی سختی نے اجاڑ دیا تھا۔ جس کی جڑیں بھی کھوکھلی ہو چکی تھیں۔ میرے لیے کوئی بھی راستہ کھلا نہ رہ گیا تھا۔ چار سُو مجھے تاریکی ہی تاریکی نظر آتی تھی۔ میں کبھی اس تنکے کا سہارا لیتا تھا اور کبھی اس تنکے کا۔ ہوائیں مجھے ایک خشک پتے کی طرح اِدھر اُدھر اڑائے لیے پھرتی تھیں۔ میرا جینا بھی کوئی جینا تھا یارو۔ مجھے بہت عجلت تھی آبی کے گاؤں پہنچنے کی۔ میں چاہتا تھا کہ جس قدر بھی جلدی ممکن ہو سکے۔ میں آبی کے تعاون سے آہو کو راہِ راست پہ لے آؤں تاکہ میری بہن آسیہ جیل کی سنگین دیواروں کے پیچھے مرجھا جانے سے پہلے رہائی پا سکے۔ مگر اب میں چوہے کی طرح پنجرے میں بند ہو کر رہ گیا تھا۔ میں آبی کے پاس پہنچ تو گیا تھا مگر یوں کہ حالات کی ستم ظریفی نے میرے لیے باہر نکلنے کے تمام راستے مسدود کر دیئے تھے۔

میں دینو کی اس کوٹھری میں بیٹھا کتنی ہی دیر تک اپنے آپ سے الجھتا رہا۔ اپنے ہر اقدام میں مجھے اس رات سو عیب نظر آتے تھے مجھے اپنے وجود سے نفرت ہونے لگی تھی۔ میرا ہر قدم ہر فیصلہ مجھے گمراہی کے گڑھے میں اور گہرا دھکیلتا چلا جا رہا تھا۔ میں اس بچارے فیر دزدین کے گھر سے اس لیے تو نہیں نکلا تھا کہ میں پولیس سے مقابلہ کروں گا اور یوں قانون کے ان بے گناہ محافظوں کو گھائل کر کے اپنا راستہ بناؤں گا۔ مگر نہیں میرے نصیب میں وہ سیاہی بھی لکھی تھی۔ لوحِ محفوظ پر میرے لیے خدا جانے کیا کیا کچھ مرقوم تھا کہ وہ پراسرار تحریر جونہی میرے سامنے لمحوں کے تختے پر چڑھ کر ذرا سی کھلتی تھی تو میں خود کو اور زیادہ مہیب ذلتوں سے دوچار پاتا تھا۔ میں ایک طمانچہ ابھی سہہ بھی نہ پاتا تھا کہ میرے دوسرے رخسار پر تقدیر کا نادیدہ ہاتھ دوسرا طمانچہ دے مارتا تھا۔ کوئی پودے تو ایسے ہیں کہ انہیں خشک سالی مار ڈالتی ہے مگر میں ایسا کھیت تھا جس کی فصل بن کال نے تباہ کر دی تھی۔ ایسے بن کال نے جس میں مجھے بڑی دولت ملی۔ بڑی کشادگی نصیب ہوئی۔ نئے راستے، نئی منزلیں سامنے آئیں۔ مگر وہ سب کی سب چیزیں ایسی تھیں جو مسلسل مجھے ایک مہیب اور اندوہناک انجام کی طرف دھکیل رہی تھیں۔ بات تقدیر نے شاید اسی لیے مجھے ان بلا خیز بگولوں کی گود میں ڈال دینے کا اہتمام کیا تھا یوں کہ جو پنہاں تھا وہ میری نظر کے سامنے ظاہر نہیں ہوتا تھا اور جو ظاہر تھا میں اس کی نوعیت سمجھنے سے قاصر ہو چکا تھا۔ شاید میرا شمار اب ان لوگوں میں کیا جا سکتا تھا جو بیگانے بردے آزاد کرتے ہیں۔ اور دوسروں کے مال پر عیش سے زندگی گزارتے ہیں مگر میں تو عیش کے نام سے بھی واقف نہیں تھا۔ بہت روپیہ پڑا تھا بینک میں میرے نام مگر وہ ایسا تھا جسے میں چھو نہ سکتا تھا کہ میں خود سے ہی خوفزدہ تھا۔ اور اتنی ہمت نہیں رکھتا تھا کہ جا کر اپنے حساب میں سے چار آنے ہی نکلوا سکوں۔ وہ سب کچھ بھی مجھے پرائے کھاتے میں پڑا نظر آتا تھا اور وعدے میں بڑی فراخدلی سے کرتا پھرتا تھا۔ میں نے مجیدن کی ماں حاجاں سے بھی یہی کہا تھا کہ میں اس کی بیٹی کی شادی پر کوئی کور کسر باقی نہیں رکھوں گا۔ اب میں گوہر سے بھی وعدہ کر بیٹھا تھا کہ میں اسے دکان کھولنے میں مدد دوں گا۔ مگر میں سوچتا تھا کہ یہ سب کچھ تو شاید میں عالمِ خواب میں کرتا جا رہا ہوں کیونکہ جس صورتِ حال سے میں دوچار تھا وہ تو ایسی تھی کہ میں اس کارگہِ شیشہ میں سانس بھی دبا لینے پر مجبور تھا۔

آبی کوئی بیس منٹ بعد واپس آیا۔ اس کی دستک کو سمجھتے ہوئے میں نے کنڈی کھولی تو وہ دبی آواز میں بولا،

"لے بھئی وہ تیری جیلاں تو ڈرتی ہے باہر ہی نہیں نکلتی تھی میں نے بہت کہا مگر وہ نہیں مانی۔ مگر تیرے لیے خوش خبری یہ ہے وہ سپاہی یہاں سے نکل بھاگے ہیں۔"

"کیا مطلب؟ انہیں کس نے بھگا دیا؟"

"ادھر کوئی ٹیکسی کھڑی تھی۔ ادھر ٹنگے پیر کے مزار کے قریب۔ اس میں بیٹھ کر کوئی آدمی یہاں سے فرار ہوا ہے۔ کسی سپاہی نے وہ ٹیکسی دیکھ لی تھی اس نے تھانیدار کو بتا دیا۔ وہ یہی سمجھے ہیں کہ تو خود ٹیکسی لے کر بھاگا ہے۔ اب وہ اس کے تعاقب میں نکل گئے ہیں۔"

"یہ تو بہت اچھا ہوا ہے آبی! مگر تجھے یہ ساری باتیں کس نے بتائی ہیں؟"

"وہ دینو وہیں تھا ان کے پاس۔ وہ جب لحاف پہنچا کر واپس آ رہا تھا تو سپاہیوں نے اسے بلا لیا تھا۔ وہ اس سے گاؤں کے حالات پوچھ رہے تھے۔ ابھی وہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ ایک سپاہی نے انہیں ٹیکسی کی اطلاع دے دی اور وہ سب منہ اٹھا کر ادھر چل دیئے۔"

"گڈ۔ ویری گڈ۔ اب تو چل میرے ساتھ۔ میں آہو سے آج ہی ملنا چاہتا ہوں۔"

"نہیں یار، اب تو میرے گھر چل اور اپنی نیند پوری کر۔ میں صبح اپنے یار کے جنازے سے فارغ ہو لوں گا پھر ہم کل شام لاہور چلیں گے۔ چل اُٹھ میرے بھائی۔ بہت خراب ہو لیا ہے تو۔ اب ذرا آرام بھی کر لے۔" یہ کہہ کر اُس نے مجھے اپنے ساتھ لیا اور دینو کے گھر کی کنڈی چڑھا کر گلی میں نکل گیا۔

آبی کا گھر بہادر علی کی حویلی کے قریب ہی تھا۔ میں جب اس میں داخل ہوا تو مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ اس کا گھر ایک عام سے مفلس دیہاتی ایسا تھا جس میں آسائش نام کی کوئی شے نہیں تھی اور آبی اس گھر میں اپنی ماں کے ساتھ تنہا رہتا تھا۔ اس نے شادی بھی نہیں کی تھی اور گھر کی یہ حالت تھی کہ وہاں نہ کوئی آسائش تھی، نہ زیبائش صحن خاصا بڑا تھا اور یہاں سے وہاں تک کچا تھا۔ دائیں ہاتھ ایک دستی نلکا تھا جس کے گرد اس نے ایک غسل خانہ پختہ اینٹوں کا بنا رکھا تھا۔ سامنے ایک دالان تھا جس کے بائیں ہاتھ چھوٹا سا رسوئی خانہ تھا۔ دالان خاصا وسیع تھا۔ سمجھیں کوئی تیس فٹ لمبا اور بارہ فٹ چوڑا ہو گا۔ اس کے پیچھے دو کوٹھریاں بنی تھیں۔ گھر اندر سے صاف ستھرا اور لپا پتا تھا۔

"تم یہاں اکیلے رہتے ہو آبی؟"

"ہاں یار۔ ایک میری ماں ہے وہ آج رات ادھر حویلی میں گئی ہوئی ہے۔ آ جا ادھر کوٹھری میں تیرے لیے بستر لگا ہے۔" یہ کہہ کر وہ مجھے دائیں ہاتھ کی کوٹھری میں لے گیا۔ وہاں آمنے سامنے دو چارپائیاں بچھی تھیں۔ دونوں پر بستر لگے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان ایک میز رکھی تھی جس پر اس نے مٹی کے تیل سے جلنے والا لیمپ رکھ دیا۔ میں چارپائی پر بیٹھا تو میرے چہرے کے تاثرات دیکھ کر بولا۔ "یار میرا خیال ہے میرا گھر دیکھ کر تجھے حیرانی ہوئی ہے۔"

"ہاں، حیرانی کی بات ہی ہے آبی۔ یہ مجھے اسلم آبی کا گھر نظر نہیں آتا۔"

"کیوں ایسی کیا بات ہے۔ یہ میرا ہی گھر ہے جیلانی۔"

"تو اتنے لمبے لمبے ہاتھ مارتا ہے آبی اور تیرے گھر کی یہ

حالت ہے کہ ڈھنگ کی کوئی چیز بھی نظر نہیں آتی ہے مجھے؟

"میں... میں اپنے لیے تو کچھ بھی نہیں کرتا ہوں میرے یار، سب کچھ دُوسروں کی نذر کر دیتا ہوں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اب تو اس ڈھائی لاکھ کی ہی بات سُن لے۔ ایک لاکھ میں نے تجھے دے دیا تھا۔ پچاس ہزار میں نے ادھر آہو کو دے دیا۔ باقی بچا ایک لاکھ تو وہ میں نے ادھر آکر خرچ کر دیئے"

"کہاں خرچ کر دیئے؟"

"مت پوچھ یار۔ ادھر میں نے پچیس ہزار تو ایک بڑھیا کو دے دیئے۔ اس کی دو بیٹیاں دروازے پر بیٹھی تھیں۔ وہ اس نے چار دن پہلے بیاہ دی ہیں۔ بیوہ عورت تھی بیچاری — میرا جی خوش ہو گیا۔ پچیس ہزار روپے میں نے ایک اور بیوہ عورت کو دے دیئے تھے۔ وہ ادھر ماڈل ٹاؤن میں رہتی ہے بیچاری، بڑی دعائیں دیتی ہے مجھے۔ پچاس ہزار روپے میں نے زمین کے ایک ٹکڑے پر خرچ کر دیئے۔ اس پر ایک اسکول بن جائے گا ادھر۔ بچے پڑھا کریں گے تو مجھے خوشی ہوگی ادھر کوئی ہائی سکول ہی نہیں ہے۔ بس چوتھی جماعت پڑھ کر بچے گھر بیٹھ جاتے ہیں۔ اپنے لیے تو میں نے کچھ بھی نہیں رکھا۔"

"مگر تیرا گزارہ کس طرح ہوتا ہے آبی؟"

"میں نے بہت دن ہوئے یہاں زمین خرید لی تھی۔ آدھا مربع۔ بس اسی پہ گزارہ کرتا ہوں۔ مزارع کو دے رکھی ہے میں نے وہ زمین۔"

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ اگر اسی طرح اڑا دیتے ہو اپنا مال جو نیزے کی نوک پر چڑھ کر کماتے ہو تو پھر فائدہ ہی کیا تیری اس مار دھاڑ کا۔ کیوں اپنی عاقبت خراب کرتے ہو۔"

"بس یار، مجھ سے کسی مفلس کی بے بسی نہیں دیکھی جاتی۔ میں... بس میرا دل ڈوبنے لگتا ہے۔"

"اور... اور... لوگ نہیں پوچھتے تجھ سے کہ تو یہ مال کہاں سے لاتا ہے؟"

"میں نے انھیں کہہ رکھا ہے کہ ادھر بہاول پور میں میری سو مربع زمین ہے۔"

"اور اگر کسی دن تو پکڑا گیا تو؟ لوگ تجھے شاباش تو نہیں دیں گے۔"

"وہ میری زندگی کا آخری دِن ہوگا۔ جس دن میں کسی نرغے میں پھنس گیا، کسی گھیرے میں آ گیا۔ اس دن میں... میں وہ گولی نگل لوں گا۔ اپنا انتظام میں ہر وقت میں اپنی جیب میں رکھتا ہوں۔"

"نہیں آبی۔ یہ بات مجھے پسند نہیں آئی۔ تو نے مجھے ایک لاکھ روپیہ کیوں دیا تھا۔ مجھے تو اس کی ضرورت ہی نہیں تھی؟"

"بس میں تجھ سے وعدہ کر بیٹھا تھا۔ اور پھر میرا خیال تھا کہ تو اُن دنوں بہت زیادہ ضرورت مند تھا۔ بس ایک اندازہ لگایا تھا میں نے تیرے چہرے سے اور پھر سچی بات تو یہ ہے کہ ہسپتال کے بستر پر جب تو نے مجھے دبوچا تھا تو میں تجھ سے بہت خوفزدہ ہو گیا تھا اسی لیے میں نے تجھ سے وہ وعدہ کر لیا تھا اور میں اپنے وعدے پر تو اپنی جان بھی قربان کر سکتا ہوں۔"

"تو ہو سکتا ہے اپنی جگہ ٹھیک کہہ رہا ہو مگر اس آہو کو تو کیوں اتنے پیسے تھما آیا تھا؟"

"یار وہ ایسا آدمی ہے کہ اگر میں کبھی تھانے کچہری کے چکر میں پھنستا ہوں تو وہ مجھے صاف بچا لیتا ہے اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی بڑے کمال کا آدمی ہے وہ۔ تین بار وہ میری مدد کر چکا ہے۔ بڑے صاحب تک رسائی ہے اُس کی۔ تُو تو خود دیکھ چکا ہے مگر اتنے پیسے میں بس اُسے سال میں ایک آدھ بار ہی دیتا ہوں۔ اور وہ خوش ہو جاتا ہے۔ کئی بار خود اُس نے مجھے اسامیاں بتائی ہیں اور اس کا انتظام بہت اچھا ثابت ہوتا ہے۔"

"تو بس خواہ مخواہ ہی جگا ڈاکو بننے کی کوشش کر رہا ہے وہ جو پلستر تو نے لگا رکھا تھا اس سے تو چلتا پھرتا کیسے تھا؟"

"وہ تو محض دھوکا تھا میرے یار، ہلکی پٹی کا پلستر تھا وہ — کوئی وزن تو نہیں تھا اس کا۔"

"اچھا! یہ بتا کہ اس خورشید احمد کے گھر سے تو کس کے اسکوٹر پر بیٹھ کر باہر بھاگا تھا؟"

"یہ میں تجھے نہیں بتاؤں گا جیلانی۔ بس اس بات کو ڈھکی ہی رہنے دے۔"

"مجھے بتلانے میں ہرج ہی کیا ہے آخر؟"

"مجھے اپنی اس حرکت پر آج تک بے حد افسوس ہے جیلانی! وہ آدمی جسے تم زخمی حالت میں ہسپتال لائے تھے، وہی تھا جس کے اسکوٹر پر بیٹھ کر میں اس رات وہاں سے بھاگا تھا۔ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا جب میں وہاں سے نکلا تو وہ اُدھر سے گزر رہا تھا میں نے اسے زبردستی روک لیا تھا اور اسے پستول کی زد میں لے کر وہاں سے بھاگا تھا مگر سڑک پر آتے ہی اس نے مجھے خراب کرنا شروع کر دیا۔ میں نے چاہا کہ اسے گولی مار دوں مگر میرا پستول جام ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ درّے کا بنا ہوا دیسی پستول تھا عین وقت پر میرا ساتھ چھوڑ گیا۔ اس آدمی نے جب یہ دیکھا کہ میرا ہتھیار بے کار ہو گیا ہے تو اس نے مجھے دو بار نیچے گرانے کی کوشش کی مگر وہ کامیاب نہیں ہوا اسکوٹر دائیں بائیں ڈول رہی تھی۔ اسی وقت سامنے سے ایک ٹرک آیا۔ وہ آدمی میری وجہ سے ہینڈل سنبھال نہ سکا اور اس کی اسکوٹر ٹرک سے ٹکرا گئی۔ میں اچھل کر دُور جا گرا۔ جب میں اُٹھا تو دیکھا کہ ٹرک جا چکا تھا، اور وہ آدمی زخمی حالت میں پڑا تھا اس کی اسکوٹر بھی چور چور ہو چکی تھی۔ مجھے اس کی حالت پر بڑا ترس آیا مگر میں کیا کر سکتا تھا۔ مجھے تو اپنی منزل پر پہنچنا تھا۔ میں اسے اُسی شدید زخمی حالت میں چھوڑ کر ہسپتال جا پہنچا اور اپنے بستر میں جا دبکا۔ اسے تم میرے ہی وارڈ میں چھوڑ کر گئے مگر وہ جانبر نہ ہو سکا۔ ساتویں دن مر گیا تھا۔ مجھے اس کی موت کا آج تک بے حد افسوس ہے۔ پچیس ہزار میں نے اُسی کی بیوہ کو دیئے تھے۔ مجھے پتہ ہی بعد میں چلا ورنہ شاید میں اسے ایک لاکھ روپے دے آتا مگر اس وقت تک میں رقم بانٹ چکا تھا۔"

"اس کے گھر کا پتہ تو میں وہاں لکھوا آیا تھا۔"

"ہاں اسی سے تو مجھے معلوم ہوا تھا کہ اس کا گھر کہاں ہے۔ دو بچے ہیں اس کے۔ اور بیوی اس کی ابھی نو عمر ہے۔ یہی کوئی پچیس سال کی ہوگی وہ۔ بڑا ترس آتا ہے مجھے اُس پر۔ موقع ملا تو میں اسے کسی دن بہت بڑی رقم پہنچا دوں گا۔"

آبی اس سلیم احمد کے ذکر پر بہت اداس ہو گیا تھا، یوں جیسے وہ آدمی اسی کے ہاتھوں قتل ہوا ہو۔ اتنا نازک دل تھا اس عادی مجرم کا۔ اور حالت اس کی یہ تھی کہ وہ اس رات خورشید کے گھر سے نکلنے کیلئے مجھے بھی موت کے گھاٹ اتار دینے سے دریغ نہیں کر رہا تھا۔ وہ تو ابھی میری زندگی باقی تھی ورنہ اس کی گولیاں تو سیدھی میری طرف اُڑی آتی تھیں۔

"تیری بات میری سمجھ میں نہیں آتی ہے آبی۔ تُو شاید بہت بڑا آدمی ہے۔ بہت سے بڑے لوگوں سے بھی بڑا۔"

"نہیں یار! اول درجے کا اُوت آدمی ہوں میں۔ تُو اب یُوں کر کہ لحاف کھول کر سو جا اور دماغ پر زیادہ بوجھ نہ ڈال۔ کل شام تک ہم لاہور ضرور چلیں گے۔" یہ کہہ کر اس نے بتی مدھم کی اور دروازہ بند کر کے باہر نکل گیا۔ میں نے اٹھ کر اندر سے کنڈی چڑھا لی اور بستر میں لیٹ گیا۔

اس گریزپا رات کے دو ہاتھ باقی بچے دامن کو غنیمت سمجھ کر میں نے لحاف اوڑھا اور آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد مجھے نیند آ گئی۔

آنکھ میری جب ہی کھلی جب کسی نے زور زور سے دروازے پر دستک دی۔ باہر آبی کھڑا تھا۔

"بادشاہو اُٹھ جاؤ اب! دیکھو تو سورج کہاں آ پہنچا ہے۔" میں نے اُٹھ کر کنڈی کھولی تو آبی کمبل میں پٹا لپٹایا اندر آ گیا۔ آنکھیں اس کی سوجی ہوئی تھیں لگتا تھا وہ بہت دیر تک روتا رہا ہے۔

"یار دس بج گئے۔ تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں جگا دیا"

"میں تو ابھی واپس آیا ہوں قبرستان سے میری ماں آ گئی ہے اسے اپنا اسلحہ شسلہ بالکل نہ دکھانا۔ اسے بالکل پتہ نہیں ہے میں کیا ہوں۔"

"فکر نہ کر۔ یہ سب کچھ ادھر ہی رہے گا بستر کے نیچے" میں نے کوٹ پہن کر کمبل اوڑھ لیا۔

منہ ہاتھ دھونے کے لیے میں باہر نکلا تو آبی میرے سا[تھ] تھا۔ اس کی ماں سامنے نلکے پر کھڑی تھی۔

"ماں، یہ ہے میرا دوست جیلانی، جس کا میں ذکر کر رہا تھا"

"سلام ماں جی۔" میں نے نہایت ادب سے اسے سلام کیا۔

"جیتے رہو بیٹے۔ آؤ ادھر مُنہ ہاتھ دھو لو۔ پھر کھانا کھا لینا۔" یہ کہہ کر وہ رسوئی خانے میں جا بیٹھی۔

ابھی ہم کھانے سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ آبی کے دروازے پر بڑی زوردار دستک ہوئی۔ میں اس وقت کوٹھری میں بیٹھا تھا۔ آبی ایک جھٹکے سے اٹھا اور سلیپر پاؤں میں پھنسا کر بولا۔

"یہ کون رانی خان کا سالا آ گیا ہے اس وقت دیکھو تو، دروازہ کس طرح ٹھوک رہا ہے لگتا ہے بیاج وصول کرنے آیا ہے کوئی۔" یہ کہتا ہوا وہ تیزی سے باہر نکلا۔ کوئی دس منٹ بعد جب وہ واپس آیا تو سخت بوکھلایا ہوا تھا۔ آتے ہی اس نے سلیپر پرے پھینکے اور چارپائی کے نیچے سے اپنے بوٹ نکال کر پہننے لگا۔ اس کا چہرہ غصے سے پھنکنے لگا تھا۔ کونے میں ایک بھاری بھرکم صندوق تھا جس پر یہ بڑا سا تالا لگا تھا۔ اس نے جیب سے چابی نکال کر وہ تالا کھولا اور پھر اس میں سے اُس نے پستول نکال کر اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ اس پر عجیب سی جنونی کیفیت طاری تھی میرے سامنے ہی اس نے ایک ڈبے میں سے مٹھی بھر کر پستول کی گولیاں نکال کر جیب میں ڈال لیں، پھر اُس نے الگنی پر ٹنگی شلوار اتار کر پہنی اور کوٹ کے اوپر کمبل اوڑھ کر بولا۔

"یار تو ادھر ہی بیٹھ جیلانی، میں ادھر ایک بہت ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ شام تک اگر میں واپس نہ آیا تو میرا ادھر انتظار کرنا۔" لہجہ اس کا بے حد غضبناک ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ بڑی مشکل سے اپنے غصے کو ضبط کر رہا ہے۔

"تو جا کہاں رہا ہے آبی! مجھے بھی تو پتہ چلے۔"

"یار ادھر تو ہمارا بیڑہ ہی غرق ہو گیا۔ ہم تو تباہ ہو گئے۔"

"آخر ہوا کیا ہے کچھ مجھے بھی تو پتہ چلے؟"

"پھر میں ابھی آیا۔ ایک تو اس ماں نے مجھے بزدل بنا رکھا ہے"

یہ کہہ کر وہ باہر نکلا اور صحن میں اِدھر اُدھر جھانک کر فوراً ہی واپس آیا۔ بولا

"اچھا ہوا وہ باہر نکل گئی ہے۔ ادھر بہادر علی کے گھر گئی ہوگی۔ تو بس میرا انتظار کر ادھر بیٹھ کر۔ میں شام تک ضرور آجاؤں گا۔"

"پر تو چلا کہاں ہے؟ کسی نے کھلیان جلا دیئے ہیں تیرے؟"

"نہیں یہ بات نہیں ہے میرے یاروں کو کسی نے زخمی کر دیا ہے۔ اگر بہادر علی کل نہ مرتا تو رات ان کا یہ حشر نہ ہوتا۔"

"آخر ہوا کیا ہے کس نے مارا ہے ان کو، کتنے آدمی تھے وہ۔"

"یار دیکھ رات ہم نے اُدھر ڈنگری میں ڈاکہ ڈالنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ میں اُدھر نہ جا سکا۔ وہ لوگ ادھر کریم بخش کے بھٹے پر جمع تھے۔ وہ خود ہی اُدھر چلے گئے اکیلے ہی۔ مگر ابھی دنجلی خان نے مجھے بتایا ہے کہ ان تینوں کو کسی نے مار مار کر بے ہوش کر دیا اور پھر ان کو لا کر واپس بھٹے کے قریب پھینک دیا۔ انہیں رات کو تین بجے دنجلی خان کے پاس پہنچنا تھا وہ پہنچے تو ضرور مگر مُردوں سے بدتر حالت میں۔ تاہیے کی پنڈلی پر گولی لگی ہے اور گوگے کے بازو پر، کسی نے ان کو زخمی کرنے کے بعد مرہم پٹی بھی کر دی اور پھر گاڑی میں ڈال کر ان کو واپس بھٹے پر بھی چھوڑ گیا۔" اس کی بات سن کر میں اپنی مسکراہٹ چھپا نہ سکا۔ بس وہ اسی بات پر گرمی کھا گیا۔ بہت زیادہ تپ کر بولا۔

"یار تو اچھا ہمدرد ہے ہمارا۔ اُدھر کسی نے ہمارا بھٹہ بٹھا دیا ہے اور تو ہنس رہا ہے۔"

"یہ بات نہیں ہے آبی! میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ ایسا کبھی ہوا نہیں ہے۔ وہ دنجلی خان جھوٹ نہ بول رہا ہو۔ تمہیں فوراً وہاں بلانے کے لیے کوئی چکر نہ چلا رہا ہو۔"

"نہیں بھئی۔ وہ غلط بات نہیں کہہ سکتا ہے۔"

"کیا نام ہے تیرے یاروں کا؟ کون کون شامل ہے تیرے جتھے میں۔"

"اُدھر ایک تو تاہیا ہے، ایک گوگا ہے اور ایک قطب دین۔"

"کوئی اور بھی ہے تمہارے ساتھ؟"

"ہاں، ایک گوہر ہے ڈنگری کا۔"

"وہ بھی ساتھ تھا؟"

"نہیں، اسی نے تو بیڑا غرق کیا ہے ہمارا۔ مگر دنجلی خان بتاتا ہے کہ اُدھر ایک آدمی آیا تھا اونچا لمبا جوان وہ گوہر کو ساتھ لے گیا تھا۔"

"وہ تاہیے کے ساتھ کیوں نہیں گیا؟"

"یار تو ادھر بیٹھا جرح کرتا رہے گا۔ میرا میٹر الٹا چلنے لگے گا پھر مجھے افسوس ہوگا کہیں میں تیری شان میں کوئی گستاخی نہ کر دوں۔ مجھے جانے دے۔ تیری دوستی مجھے بہت عزیز ہے۔" وہ بہت سنجیدہ نظر آتا تھا، لگتا تھا کہ وہ ایک دم بھڑک اٹھے گا۔ اس کی یہ بات سنتے ہی میں کمبل اوڑھتا ہوا چارپائی سے اُٹھ گیا، اور اسٹین گن میں نے بستر کے نیچے سے اٹھا کر کندھے پر ڈال لی۔

"ٹھیک ہے آبی تیرا میرا تعلق اگر ایسا ہی کچا ہے کہ تیرا میٹر اُلٹا چلنے لگے گا تو پھر میں چلتا ہوں میرے بھائی۔ سلام علیکم۔"

وہ بھونچکا سا رہ گیا۔ پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اس کے سامنے بیٹھ کر بوٹوں کے تسمے بند کر لیے۔

"کیا کرتے ہو یار۔ مجھے خواہ مخواہ ذلیل نہ کرو جیلانی بھائی۔ میرا یہ مطلب تھوڑی تھا۔ میں اس وقت پاگل ہو رہا ہوں تمہیں نہیں پتہ ادھر کیا گڑبڑ ہوئی ہے کس نے ہمیں برباد کیا ہے میں اس آدمی کی گردن توڑ دوں گا جس نے گوہر کو وہاں سے نکالا ہے اور پھر میرے یاروں کو اس نے ڈنگری گاؤں جا کر زخمی کیا۔ دنجلی خان نے مجھے جو باتیں بتائی ہیں وہ ایسی ہیں کہ ہمیں تو ڈوب مرنا چاہیے۔"

"آخر کیا کیا ہے اُس نے؛ مجھے تو تم کچھ بتاتے نہیں ہو۔"

"یار وہ اُدھر ایک آدمی ہے حبیب شاہ، اس کے گھر گئے تھے۔ عین اس وقت جب وہ حبیب شاہ کو پکڑ کر اس سے سیف کی چابی مانگ رہے تھے کسی نے ان پر گولی چلا دی۔ وہ زخمی ہو کر گرے تو اس آدمی نے ان کی گردن دبا کر انہیں بے ہوش کر دیا۔ ہاں پتہ نہیں وہ بدمعاش کون سا علم جانتا ہے کسی سرجن کا تخم معلوم ہوتا ہے وہ، اُس نے ان کی گردن کی کوئی رگ دبا دی اور بس۔ وہ دونوں غوطے میں چلے گئے۔ اُدھر گلی میں قطب دین پہرے پر تھا۔ انھوں نے اس کا بھی یہی حشر کیا۔ اُس قطبے نے دنجلی کو بتایا ہے کہ ادھر دو آدمی تھے، ایک گوہر تھا مگر گردن اسکی دوسرے نے دبائی تھی۔"

"اچھا پھر کیا ہوا، وہ بھٹے پر کیسے پہنچے؟"

"بھائی پھر تو انھیں کسی بات کا ہوش ہی نہیں رہا، ان تینوں کو۔ ان کی تو ماں ہی مر گئی۔ بعد میں وہ کتے کا پُتر ان کو کار میں ڈال کر بھٹے پر چھوڑ گیا۔ یہ کام اس نے گوہر کے مشورے پر ہی کیا ہوگا۔ اب میں پہلے اس گوہر سے ملوں گا۔ اس کو تو میں کچا ہی چبا جاؤں گا۔"

"یار وہ تو تمہارا ساتھی ہے، اسے کیا ضرورت تھی کسی اور آدمی کا ساتھ دینے کی۔"

"یہی تو پتہ نہیں چلتا۔ ویسے اس تاہیے نے بتایا ہے کہ وہ حبیب شاہ کے گھر ڈاکہ ڈالنے کے خلاف تھا۔ اس بات پر تاہیے نے اس کے سر میں بندوق کا دستہ مار کر اسے بے ہوش بھی کر دیا تھا۔ اگر میں وہاں ہوتا تو اسے شاید گولی ہی مار دیتا۔"

"اچھا ٹھیک ہے تو جا میں تیرا یہاں انتظار کروں گا، لیکن ایک وعدہ کر۔"

"کیا؟"

"اس گوہر کو ابھی تو کچھ نہیں کہے گا۔"

"کیوں کچھ نہ کہوں۔ اس سے تو میں ضرور پوچھوں گا کہ وہ مداری کا بچہ کون تھا جو رگ دبا کر آدمی کو لمبا لٹا دیتا ہے۔"

"اگر وہ آدمی تجھے مل جائے تو تو کیا کرے گا؟ اس نے تو حبیب شاہ کو لٹنے سے بچایا ہے اور پھر تیرے آدمی صحیح سلامت اڈے پر واپس پہنچا دیئے ہیں۔ یہ تو اس کی مردانگی کی دلیل ہے کہ نہیں؟"

"میں مانتا ہوں، وہ بہادر دشمن ہے یار، پر اس طرح تو ہم ادھر "چھنکنا" بن کر رہ جائیں گے جو چاہیگا وہ ہم سے کر لے گا۔"

"نہیں میرا خیال ہے اسے تمہارے کام میں پھڈا ڈالنے کی کوئی ضرورت نہ ہوگی۔ ہو سکتا ہے وہ گوہر کا کوئی خفیہ پتہ ہو۔"

"یہی تو میں ڈرتا ہوں کہ اس گوہر نے سائی ہم سے لگا رکھی ہے مگر۔۔ بدھائی کہیں اور دیتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا بولا "میری بات کا برا نہ ماننا میرے بھائی تیرا تو میں ویسے ہی ہاتھ بندھا غلام ہوں۔ بس میں شام تک آجاؤنگا۔" یہ کہہ کر میرے روکنے کے باوجود وہ باہر نکل گیا۔

میرے کلیجے سے ہوک سی اُٹھنے لگی صورت حال میرے لیے بڑی ہی تکلیف دہ ہو گئی تھی۔ مجھے گوہر پر ترس آ رہا تھا۔ اگر آج وہ اُن کے ہاتھ آ گیا تو مجھے یقین تھا کہ وہ اس کی کوچیں کاٹ کر رکھ دیں گے۔ اپنی تمام تر ناکامی کا انتقام وہ اس سے لیں گے اس آدمی سے جو ابھی تک پوری طرح اُن کے رنگ میں نہیں رنگا تھا جس میں ابھی تک آدمیت کی بُو باس باقی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اُسے کتنی زبردست اذیتوں سے گزار دیں گے، حالانکہ جو کچھ بھی ہوا تھا وہ میں نے خود کیا تھا۔ اس نے تو صرف اپنے ایک دکھ کی نشاندہی کی تھی۔ ایک گرتی ہوئی دیوار کا پتہ بتایا تھا۔۔ اس گرتی ہوئی دیوار کا جس کے انہدام کو وہ کسی طرح بھی پسند نہیں کرتا تھا اور اب وہ آبی اپنے تیر و تفنگ سے لیس ہو کر اس کے تعاقب میں نکل گیا تھا۔

اگر وہ عقل مند آدمی ہوا وہ گوہر تو اُسے اگلے کئی دنوں تک اپنے گھر میں نہیں رہنا چاہیے، اسے ان لوگوں کے سائے سے بھی بچنا چاہیے تھا۔ یہی میں چاہتا تھا، یہی اس کے لیے بہتر تھا۔ اور اگر وہ اتنی سی بات بھی سمجھ نہیں پایا تھا تو یہ سب سے بڑی بدنصیبی تھی۔

میرا جی چاہا کہ میں ڈنگری جا کر گوہر کو خبردار کر دوں مگر پھر سارے حالات کو مدنظر رکھ کر میں کوٹھری میں بند ہو کر بیٹھا رہا۔ آبی کی ماں نے دو بجے کے قریب مجھے کھانا دیا اور پھر میں لمبی تان کر سو گیا۔ اب مجھے آبی کا انتظار تھا۔ اب جو کچھ بھی ہو سکتا تھا وہ اس کی آمد پر ہی ممکن تھا۔

آبی رات کو نو بجے واپس آیا۔ بس حال میں اس کا بند بند ٹوٹا ہوا نظر آتا تھا۔ وہ بہت ہی مضمحل دکھائی دیتا تھا۔ اس نے کوٹھری میں واپس آ کر بڑی بے دلی سے سلام کیا اور پھر بوٹ اتار کر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ اس طرح کہ کمبل اس نے اپنے چاروں طرف تنبو کی طرح تان لیا تھا۔

"وہ گوہر ملا کہ نہیں۔"

"نہیں! وہ گھر سے غائب ہے۔"

میں نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔

"تمہارے یار کیا کہتے ہیں؟"

"کچھ بھی نہیں۔ بالکل بیکار ہیں وہ سالے۔ اُدھر بھٹے پر بیٹھے اپنی گردنیں سینک رہے ہیں۔" وہ بہت بجھا ہوا تھا اور لہجہ اُس کا اتنا زہریلا تھا کہ مجھے حیرت ہوتی تھی۔

"یار اس میں اتنا کڑھنے کی کیا بات ہے دفع کر اس قصے کو مٹی ڈال اس پر۔"

"وہ تو میں ڈال ہی آیا ہوں، پر یار اُس نے مجھے حیران کر دیا ہے۔ اس کی شرافت کی بھی داد دیتا ہوں۔ اس نے انہیں جان سے نہیں مارا۔ حالانکہ یہ بہت آسان بات تھی۔ اس لیے کہ وہ سالے پرائے گھر میں تھے۔ ڈاکہ ڈالنے گئے تھے۔ ان کو وہیں قتل کر دینا اس کے بس میں تھا۔ کسی پر بھی کوئی بات نہ آ سکتی تھی مگر نہیں یار۔ اس کی جواں مردی دیکھ۔ اس نے تاہیے کی پنڈلی پر اور گوگے کی کلائی پر ہی گولی ماری۔ تاکہ وہ مریں بھی نہیں اور سالے اپاہج بھی ہو جائیں۔"

میں ہنس دیا۔ اس نے منہ ہی ایسا بنا رکھا تھا۔ وہ بھی مسکرا دیا اور سگریٹ سلگا کر گہرے کش لگانے لگا۔

"تیری باتیں مجھے بہت اچھی لگتی ہیں آبی۔ تو دل کا بہت صاف آدمی ہے، اب کیا ارادے ہیں تیرے۔"

"بس صبح اُٹھ کر چل دیں گے یار اُدھر کو۔ آج تو میں بہت تھک گیا ہوں۔"

"اس پولیس کا کیا ہوا جو میرے پیچھے لگی تھی۔"

"وہ بھی سالے واپس چلے گئے۔ انھیں وہ ٹیکسی والا ہاتھ ہی نہیں آیا۔"

"چلو اچھا ہوا، جان بچی سو لاکھوں پائے۔ اب تو یہ بتا کہ صبح یہاں سے جائیں گے کیسے؟"

"ادھر ایک ٹرک والا رہتا ہے میں اسے کہہ آیا ہوں وہ صبح پانچ بجے ہمیں ادھر سے اُٹھا لے گا۔"

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد وہ میرے ساتھ والی چارپائی پر لیٹ گیا۔ میں اُس سے پوچھنا ہی چاہتا تھا کہ پینو اور اُس جنتے کا اس سے کیا تعلق ہے مگر مصلحتاً چُپ ہو رہا۔ کیونکہ میں اپنی کسی بھی بات سے اسے یہ احساس نہیں دلانا، چاہتا تھا کہ اُس کے ساتھیوں پر جو گزری ہے اس میں کس کا ہاتھ کارفرما رہا ہے۔ اگر ایسا ہو جاتا تو شاید میرے اور اس کے درمیان ہمیشہ کے لیے ٹھن جاتی اور یہی میں نہیں چاہتا تھا۔ اس جیسے قول کے دھنی اور مخلص آدمی کو میں ہاتھ سے کھو دینا نہیں چاہتا تھا۔

صبح ٹھیک پانچ بجے ہم دونوں تیار ہو کر ٹرک میں جا بیٹھے وہ ٹرک بجری لینے کے لیے سیدھا شہر جا رہا تھا۔ ایک بار پھر میرے ذہن میں دلشیر آہو کا مکان اُبھر رہا تھا۔ آہو سے میرے تعلق کی نوعیت کچھ عجیب و غریب ہو گئی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اس سے کس رُخ سے ملوں۔ اسے پستول کی زد میں لوں یا اس کے قدموں پر سر رکھ دُوں۔ عجیب بات یہ تھی کہ آبی کی کوٹھری میں رات میں نے ایک بار پھر مسند آراء کو خواب میں دیکھا تھا۔ وہ بہت مضمحل اور آزردہ نظر آتی تھی اور ایسی نظروں سے گرد و پیش کو دیکھ رہی تھی۔ جیسے وہ کسی چیز کو خلاؤں میں تلاش کر رہی ہو۔ اس کی وہ بڑی بڑی آئینہ سی حسّاس عکّاس آنکھیں اشکوں سے لبریز نظر آتی تھیں۔ وہ بس پل بھر کے لیے میرے تصوّر میں ابھری اور پھر پلک جھپکتے میں غائب ہو گئی۔

اس لڑکی نے اُس رات بھی مجھے عجیب سے ذہنی ہیجان میں مبتلا کیا تھا۔ وہ بارہا میرے خوابوں میں آئی تھی مگر جب تک میں نے اسے رُوبرو نہیں دیکھا تھا میں نے اس سے کوئی تاثر نہیں لیا تھا۔ میں اُس کے پیکر کو آتشیں جذبوں کا مرہونِ منت سمجھتا رہا۔ ہر بار یہی ہوتا رہا۔ اس نادیدہ کی دید مزہ دیتی تھی مگر اپنے تخیل کے تراشیدہ بُت کو جب میں نے مرئی طور پر اپنے سامنے دیکھا تھا میں اس کے بارے میں خاص نکتہ نظر سے سوچنے لگا تھا۔ مگر میرے دکھ اتنے بے پناہ تھے اور ذلتیں اتنی لامتناہی تھیں کہ میں اُسے کسی خوبصورت طاق میں سجا لینے کی آرزو کو عبث سمجھتا تھا مگر اب جس تاریک دائرے میں وہ گھر چکی تھی اور جس طرح میں نے آہو کو اس کے گھر کی بربادی کے درپے دیکھا تھا۔ اس کے سبب میں چاہتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح مسند آراء کو ان نحوستوں سے بچا لوں جو اس کے تعاقب میں تھیں۔ اور جن بلاؤں کی زنجیریں اس کے پیچھے آہو نے کھول دی تھیں اُن سے اسے محفوظ کر لوں مگر کوئی واضح لائحہ عمل ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ پھر بھی میں نے تہیّہ کر رکھا تھا کہ جس طرح بھی ہو سکا میں لاہور جا کر اس سے ضرور ملوں گا۔ مگر یہ تو جب ہی ممکن ہو گا جب وہ اپنے کالج میں موجود ہو۔ اگر وہ باپ کی موت کے بعد سے ابھی تک ادھر اکبر کوٹ ہی میں بیٹھی ہے تو پھر اس سے ملاقات کا سرِدست تو سوال ہی پیدا نہ ہو سکتا تھا۔

زندگی کانٹوں پر گھسٹ کر رہ گئی تھی اور میرے روم روم سے لہو رستا نظر آتا تھا۔ میں ساری راہ اپنے ہی آئینہ خانے پر پتھر برساتا رہا۔ اپنے آپ سے دست و گریباں رہا اور آبی دل ہی دل میں اس شخص کو کوستا رہا جس نے ان کے حبیب شاہ کو لوٹ لینے کے منصوبے پر پانی پھیر دیا تھا۔

جب ہم راوی روڈ پر پہنچ کر ٹرک سے اترے تو اُس وقت تک سُورج طلوع نہیں ہوا تھا۔ ہم صبح کے ملگجے اجالے میں چلتے ہوئے آہو کے مکان کی طرف بڑھے۔

"تم نے سوچا بھی ہے آبی کہ وہ تمہارا آہو تو مجھ سے ملنا ہی نہیں چاہتا ہے۔"

"پہلے میں خود اس سے ملنے جاؤں گا۔ اگر اُس نے کوئی تڑپھڑ کی اور راہِ راست پر نہ آیا تو پھر میں تمہیں بتاؤں گا کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔"

"کیا یہ بہتر نہیں کہ تم اُسے کہیں باہر بلا کر ملو۔ میرا مطلب ہے اُسے تم فون کرو کہ وہ تمہیں کسی جگہ فوراً مل لے۔"

"نہیں! اس کا نوکر مجھے اندر بیٹھک میں بٹھا دے گا تو میں موقع ملتے ہی پچھلے دروازے سے تمہیں اندر لے جاؤں گا۔ تم کہیں بیٹھک میں چھپ کر بیٹھ جانا۔ پھر دیکھ لیں گے ہم کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ باہر اس سے ملنا ٹھیک نہیں ہے۔" آبی نے میری تجویز رد کر دی۔

"چلو یوں ہی سہی، میں اس کے مکان کے عقب میں جا کھڑا ہوتا ہوں۔"

آبی تو تیز تیز قدم چلتا آہو کے مکان کے بڑے دروازے پر جا پہنچا اور میں اس چھوٹے سے عقبی دروازے پر جا کھڑا۔ جس میں سے گزار کر کبری مجیدن کو میرے پاس لایا تھا۔ آبی کی تجویز کارگر ثابت ہوئی۔ مجھے وہاں کھڑے ہوئے ابھی پندرہ منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ وہ چھوٹا عقبی دروازہ بے آواز کھلا۔۔۔

سامنے آبی کھڑا تھا۔ اس نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا، اور خود تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا وہ بیٹھک میں جا گھسا۔ کمبل میں منہ چھپا کر میں بھی لان عبور کر کے اندر جا گھسا۔

آبی نے پلنگ کے نیچے لیٹ جانے کا اشارہ کیا۔ بولا۔۔۔

"ادھر نیچے لیٹ جا، تاکہ تو ساری باتیں اپنے کانوں سے سُن سکے۔ جب مجھے تیری ضرورت ہو گی میں ہلکی سیٹی بجاؤں گا، فوراً باہر نکل آنا۔" اس کی تجویز بے حد معقول تھی۔ پلنگ کے نیچے بھی قالین بچھا تھا۔ میں دم سادھ کر اس کے نیچے لیٹ گیا۔ اپنا سائلینسر لگا پستول میں نے سیدھے ہاتھ کی زد میں رکھا۔ تاکہ اگر کوئی گڑبڑ ہو تو میں اسے اطمینان سے استعمال کر سکوں۔

آہو نے کوئی آدھے گھنٹے تک ہمیں سُولی پر لٹکائے رکھا۔ اس عرصے میں اس کے نوکر نے آبی کو چائے وغیرہ پلا دی۔ مجھے تو چائے کی ایسی کوئی بھڑک نہ تھی اس پر میں صبر کر سکتا تھا مگر سگریٹ کی اشتہا نے مجھے نڈھال کر دیا۔ پھر بھی میں ضبط کیے لیٹا رہا۔ بالآخر آہو آ ہی گیا۔

آبی سے علیک سلیک کے بعد جب وہ جم کر پلنگ پر بیٹھ چکا تو بولا۔ "اس وقت کیسے آنا ہوا آبی جی؟"

"یہ کبری کہاں ہے آج کل؟" آبی نے پوچھا۔

"وہ ایک ماہ کی چھٹی پر گاؤں گیا ہوا ہے۔ آپ خیر سے تو آئے ہیں نا؟" آہو نے بے صبر ہو کر پوچھا۔

"خیر ہے میرے بادشاہ، میں در اصل اس غلام جیلانی کے سلسلے میں یہاں آیا تھا۔"

"غلام جیلانی! وہی جسے تم نے ایک لاکھ روپیہ سوچے سمجھے بغیر دے دیا تھا؟"

"جی ہاں اس کے بارے میں میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیا ہوا ہے اسے۔ تم سے ملا تھا وہ؟"

"جی ہاں وہ مجھ سے ملا تھا اور اس نے مجھے آپ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی چیزیں بھی دکھائی تھیں۔"

"کیا چیزیں تھیں وہ؟"

"یہ تو آپ کو بھی معلوم ہو گا آہو صاحب، یہ سچ ہے کہ وہ اچھا آدمی نہیں ہے مگر آپ کی وہ دل و جان سے عزت کرتا ہے آپ نے اس سے ملنے سے کیوں انکار کر دیا؟"

"میرا اس سے کیا واسطہ ہے۔ تمہاری وجہ سے میں نے ایک بار اسے یہاں ٹھہرایا تھا۔ دوسری بار تو تم نے اسے نہیں بھیجا تھا اگر دوسری دفعہ بھی وہ تمہارے کہنے پر آیا تھا اور میں نے اس سے ملنے سے انکار کر دیا تھا تو پھر تو یہ میری غلطی تھی میں اس کی معافی چاہتا ہوں تم سے۔"

"یہ بات نہیں ہے جی! آپ کے کہنے پر اس نے چوہدری ہادی علی کو قتل کر دیا۔ اب وہ چاہتا ہے کہ آپ اس کی بہن کی رہائی میں اس کی مدد کریں۔"

"اوہ! تو یہ بات ہے۔ اس نے یہ بکواس کی ہے۔ خوب! دیکھ آبی میاں وہ جھُوٹ بولتا ہے۔ میں بھلا کسی آدمی کے قتل کے لیے کیسے کہہ سکتا تھا۔ کسی سے مجھے دشمنی ہوتی تو نہیں کہتا۔ کئی اور میرے تم ایسے محسن ہیں میں انھیں کہتا۔ وہ جھُوٹ بکتا ہے۔ پتہ نہیں کس کو کس کے ایما پر قتل کر آیا ہے اور نام میرا لے رہا ہے۔"

"اس کے پاس آپ کی تحریر موجود ہے وہ اپنا اسی ہزار روپیہ آپ کے پاس چھوڑ گیا ہے۔ اس کی رسید آپ نے لکھ کر دی ہے۔ آپ نے لکھ کر وعدہ کیا ہے کہ اگر آپ اس کام کے عوض، جو وہ کر کے آیا ہے اس کی مدد نہیں کریں گے تو آپ کی بیوی کو طلاق ہو جائے گی۔ ظاہر ہے کہ وہ کام کوئی یونہی سا تو نہیں ہو گا۔"

"تو پھر اسے کہو کہ وہ میری تحریر عدالت میں لے جائے۔ مجھ پر مقدمہ دائر کر دے۔ ایسے جھُوٹ تو خدا جانے کتنے لوگ تراش لیتے ہیں۔ تم بھی اتنے سمجھ دار آدمی ہو کر اس کی باتوں میں آ گئے۔"

"آہو صاحب آپ جانتے ہیں کہ وہ عدالت میں نہیں جا سکتا کیونکہ وہ مفرور ہے۔"

"تو پھر میرا اس سے کیا واسطہ، جہنم میں جائے وہ۔"

"بات یوں ختم نہیں ہو گی جناب! آپ نے اس کو کبری کے ذریعے زہر دلوایا وہ بچ گیا پھر آپ نے ادھر ریلوے لائن کے قریب اندھیرے میں اس پر کبری کے ذریعے گولی چلوائی مگر وہ بچ گیا۔ اس قصے میں آپ کا کبری زخمی ہو گیا تھا۔ پھر آپ نے اُسے پکڑوانے کے لیے ادھر مائی حاجاں کے مکان پر پولیس کا چھاپہ ڈلوایا۔ آخر کیوں؟ کیوں آپ اس کے دشمن بن گئے ہیں؟"

"یہ سب جھُوٹ ہے۔ وہ تمھیں کہانی گھڑ کر سنا رہا ہے۔ میرا تمھارا اتنا پرانا ساتھ ہے کیا تم بھی مجھے ایسا ہی نیچ سمجھتے ہو۔ میں دشمن پر پیچھے سے نہیں سامنے سے وار کرنے کا عادی ہوں مگر اس سے تو میری نہ کوئی دشمنی ہے نہ دوستی۔ میں اسے کیوں مرواؤں گا؟"

"پھر کبری پر گولی کس نے چلائی تھی؟"

"کبری کے بازو پر گولی لگی تھی اور وہ بزدل ڈر کر یہ ظاہر کرنے لگا جیسے وہ مر گیا ہے۔ اسی حالت میں اس نے اپنے دشمن کو دیکھ لیا تھا وہ جیلانی ہی تھا۔"

"مگر کبری نے اس پر گولی کیوں چلائی تھی۔ اس کا کیا جواب

ہے آپ کے پاس؟"

"اس نے گولی نہیں چلائی تھی اس کو تو بندوق اٹھانی بھی نہیں آتی۔" آہو کی مکاری نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ آبی کو بھی طیش آنے لگا۔ وہ تیز لہجے میں بولا۔

"آہو صاحب پہلے تو جناب آپ وہ اسّی ہزار روپیہ منگوائیے اُوپر سے ابھی اور اسی وقت۔ کیونکہ وہ جیلانی کا روپیہ ہے اور آپ کے پاس امانت کے طور پر رکھا گیا ہے۔"

"یہ تمہیں کس نے کہا ہے۔ وہ جعلی کاغذ ہے پھر تا ہے اگر اس کے پاس ہیں بھی تو وہ بالکل جعل سازی کا نتیجہ ہیں۔ اگر وہ میری تحریر ہوتی تو میں تمہیں لاکھ کے دو لاکھ دے دوں گا، ابھی۔ اور اسی وقت۔"

"تو کیا آپ دو طرح سے لکھتے ہیں؟" آبی نے حیرانی سے پوچھا

"تم میری توہین کر رہے ہو آبی۔"

"نہیں آہو صاحب میں پھر آپ سے یہی التماس کروں گا جناب عالی کہ اس مظلوم سے منہ نہ پھیریں، اسے اس کی بہن کی رہائی میں مدد دیں۔ آپ نے اس سے وعدہ کیا تھا۔"

"میں نے وعدہ تو ضرور کیا تھا مگر یہ بات میرے بس میں نہیں رہی ہے۔ آئی جی جیلخانہ جات سے میرے تعلقات درست نہیں رہے۔"

"تو پھر اسے صاف صاف کہہ دیں۔ اس کا دل تو نہ توڑیں اس سے منہ تو نہ پھیریں۔"

"یہ ضروری نہیں ہے۔ میرا اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ نہ اس کا مجھ پر کوئی حق ہے میں کیوں خواہ مخواہ اس کے سامنے جھکتا پھروں؟"

"تو گویا آپ اپنے تمام وعدوں کو بھلا چکے ہیں۔"

"میں نے اس سے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔"

"میں بتاؤں آہو صاحب آپ کو کہ آپ نے کیا کیا ہے۔"

"کیا کیا ہے میں نے۔ میں کوئی مجرم ہوں تمہارا۔"

"آپ بہت بڑے اور گھنے مجرم ہیں دل شیر آہو صاحب! اور آپ نے ایک تیر سے دو شکار کیے ہیں۔ آپ نے بڑے صاحب کو بھی خوش کر دیا ہے کہ اس کا حریف ختم ہو گیا ہے۔ آپ نے اپنے سگے سُسر کو کرائے کے قاتل کے ہاتھوں مروایا ہے تاکہ اس کی کروڑوں کی جائداد آپ کو مل جائے۔ کیونکہ اس کی صرف دو بیٹیاں ہیں اور ایک آپ کے عقد میں ہے۔ یہی کیا ہے نہ آپ نے؟"

"تم بکواس کرتے ہو۔ یہ جھوٹ ہے بالکل جھوٹ ہے۔ بہتر ہے کہ تم فوراً یہاں سے نکل جاؤ ورنہ میں تمہیں بھی پولیس کے سامنے ننگا کر دوں گا۔ آبی! مت سمجھو کہ تم میرے ہاتھ سے نکل چکے ہو۔"

اس کی یہ بات سنتے ہی آبی نے ہلکی سی سیٹی بجائی، یوں جیسے کوئی بے حد حیران اور خجل ہو کر اپنی خفت مٹانے کے لیے ایسا کر رہا ہو۔ اس کی سیٹی کی آواز سنتے ہی میں نے تیزی سے پلنگ کے نیچے سے نکل کر اپنا پستول آہو پر تان لیا۔

"ادھر دیکھو مسٹر آہو مجھے پہچانتے ہو نا بیٹے۔"

آہو اپنی جگہ سے یوں اچھلا جیسے اس نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔

"زیادہ بھُدکنے کی ضرورت نہیں ہے آہو صاحب! اطمینان سے بیٹھ کر حساب دیجیے۔ ہم تو آپ کے پُرانے خادم ہیں۔" آبی نے اچانک ہی اپنا لہجہ بدل لیا۔ اس کے لفظوں کی کاٹ ایسی تھی کہ آہو پسینہ پسینہ ہو گیا ہکلاتے ہوئے بولا۔

"تم کیا چاہتے ہو مجھ سے؟"

"میں نے آپ کے ارشاد کے مطابق آپ کے سُسر چودھری ہادی علی کو قتل کر دیا ہے۔ اب میں اپنی بہن آسیہ کی رہائی چاہتا ہوں جناب دل شیر آہو صاحب۔" میں نے اس کی پسلی میں پستول کی نالی چبھوتے ہوئے کہا۔ "آپ کا دیا ہوا یہ پستول اب بھی بے آواز چلتا ہے جناب، اور کرشمے دکھاتا ہے۔ کہیں تو آپ کو بھی دکھاؤں۔"

"انہیں وہ رسید دکھاؤ جیلانی۔ مجھے افسوس ہے آہو صاحب کہ آج میرا آپ کا تعلق ٹوٹ گیا ہے۔ درمیان کی کڑی کہیں گر گئی ہے۔"

"اسے اندر لا کر تم نے مجھے دھوکا دیا ہے۔"

"ایک دھوکے باز سے نمٹنے کے لیے ہمیں اور کیا کرنا چاہیے تھا آہو صاحب؟ بہر حال قصہ مختصر کریں بتائیں کہ آپ اپنا وعدہ پورا کرتے ہیں کہ نہیں۔" میں نے اس کو بالوں سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں ابھی تمہیں اس آدمی کے نام رقعہ لکھ دیتا ہوں جس نے مجھ سے اس کام میں مدد دینے کا وعدہ کیا تھا۔"

"تو پھر جلدی کریں۔ قلم کاغذ تو رکھا ہو گا یہاں۔" میں نے اس کے بال چھوڑ دیے۔

"ہاں ادھر الماری میں کاغذ قلم رکھے ہیں۔"

"ذرا دیکھو آبی، وہ الماری کھولو۔"

آبی اٹھ کر الماری میں سے کاغذ قلم اُٹھا لایا۔

آہو نے صوبائی حکومت کے ایک بہت ہی اعلیٰ افسر ...... کے نام ایک رقعہ ہمارے سامنے تحریر کیا جس میں اس نے

صاف طور پر لکھا کہ وہ ——— آسیہ نامی عورت کی رہائی کے لیے حامل رقعہ ہذا کی مدد کریں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی لکھا کہ چونکہ یہ رقعہ نہایت اجلت کی حالت میں لکھ رہے ہیں اس لیے وہ اس میں زیادہ تفصیل نہیں دے سکتے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس نے لفظ 'اجلت' ہی لکھا تھا۔ مجھے آہو کی اس نالائقی پر بہت حیرت ہوئی مگر میں چپ رہا۔ وہ رقعہ اس نے لکھ کر مجھے دے دیا۔ اس پر انھوں نے اس افسر کے دفتر اور گھر کا پتہ بھی لکھ دیا تھا اس لیے میں نے مطمئن ہو کر وہ رقعہ آبی کے حوالے کر دیا۔ اس نے بھی اسے پڑھ لیا مگر وہ مطمئن نظر نہیں آیا۔ رقعہ مجھے دیتے ہوئے بولا۔

"دیکھیں جناب آہو صاحب! اگر آپ اپنی جان کی سلامتی چاہتے ہیں تو آپ کو چپ چاپ یہاں میرے حکم پر اس وقت تک چلنا ہو گا جب تک آسیہ رہا نہیں ہو جاتی۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"میرا مطلب یہ ہے جناب کہ آپ اپنی بیگم کو بھی ادھر ہی بلا لیں اور اپنے نوکر باٹی کو کہیں کہ وہ ٹیلیفون بھی ادھر ہی رکھ دے۔ آپ کا کھانا پینا رہنا سہنا سب اِدھر ہی ہو گا۔ اس وقت تک جب تک آسیہ رہا نہیں ہو جاتی۔"

"تم مجھے اپنا قیدی بنانا چاہتے ہو؟" آہو سٹپٹا اُٹھا۔

"مجبوری ہے جناب۔ کیا کیا جا سکتا ہے۔ ادھر باہر کے دروازے پر ہم تالا ڈال دیں گے اور آپ اپنے نوکر سے کہیں گے کہ وہ ایک مہینے کے لیے گاؤں چلا جائے۔ گھر کا سارا کام دھندا آپ کی بیگم کریں گی۔ باہر کا کام ہم کریں گے اور اگر آسیہ رہا ہو گئی تو ہم آپ کا شکریہ ادا کر کے چلے جائیں گے ورنہ ہادی علی کے پیچھے آپ کو بھی دوزخ کے سفر پر روانہ کر دیا جائے گا۔ وہ اُدھر آپ کا منتظر ہو گا جناب۔ یہ ہے ذرا سی زحمت جو ہم آپ کو دیں گے۔ اب اس پر ذرا جلدی سے عمل شروع کر دیں جناب ہرن لاہوری صاحب قبلہ و کعبہ! آپ کی میں نے چار سال تک بہت خدمت کی ہے آخر میرا بھی تو کچھ حق ہے آپ کے چولھے پر۔"

آبی کی وہ باتیں سن کر میں حیران رہ گیا۔ اس نے جو منصوبہ بنایا تھا وہ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا میرے لیے اپنے ایک بہت بڑے سہارے کو اس نے تج دیا تھا۔ اس نے اپنے اس دوست کی گردن دبوچ لی تھی جس کی تعریفوں میں وہ زمین و آسمان کے قلابے ملایا کرتا تھا۔ اسے بہت ناز تھا اس آہو پر، اس کی خوش معاملگی پر، اس کی دیانت پر، اس کے سرکاری درباری اثر و رسوخ پر۔ لیکن اس روز اس نے میری خاطر وہ سب کچھ پس پشت ڈال دیا تھا کیونکہ اسے یقین ہو چکا تھا کہ آہو صاحب نے میرے ساتھ بد ترین قسم کی زیادتی کی ہے۔

آبی کے اس تخ بستہ لہجے نے آہو کو متزلزل کر دیا۔ اس کا رنگ اُڑنے لگا۔ پھر بھی اس نے اپنے خوف کو چھپاتے ہوئے چیخ کر کہا۔ "تم دونوں یہاں سے نکل جاؤ ورنہ اچھا نہ ہو گا۔"

اس کی یہ بات سنتے ہی آبی نے تڑاخ سے الٹے ہاتھ کا ایک تھپڑ اس کے منہ پر مارا اور اسے گھسیٹ کر پلنگ سے اُتار لیا۔ اس ڈر سے کہ کہیں وہ شور نہ مچا دے آبی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھنے کی کوشش کی مگر آہو نے پوری قوت سے اپنا ماتھا آبی کے ماتھے سے ٹکرا دیا۔ آبی اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ اور صوفے پر گر گیا۔ آہو اس کے اُوپر جا پڑا اور اس کی گردن پر ہاتھ ڈالنے لگا۔ اس کی قوت کا مجھے اندازہ ہی نہیں تھا۔ وہ آبی کو پریشان کر گیا تھا مگر اچانک میں نے دیکھا کہ آبی نے آہو کے دونوں بازو پکڑ کر اپنے دونوں پیر اس کے پیٹ میں دے کر اسے صوفے کے اُوپر سے دوسری طرف اُچھال دیا۔ مگر اس کے ساتھ ہی صوفہ بھی اُلٹ گیا اور آبی اس کے نیچے آ گیا۔

آہو نیچے گرتے ہی بلند آواز سے چیخا۔

"باٹی ادھر آ، میری بندوق لا ادھر۔" وہ پھر اُٹھ گیا تھا۔ اس کی آواز کمرے میں گونجی تو میں ڈرا کہ اگر معاملات دوسروں کے ہاتھ میں آ گئے تو سارا قصہ ہی خراب ہو جائے گا۔ میں لپک کر آہو کے سر پر پہنچا اور پوری قوت کے ساتھ اس سے ٹکرا گیا۔ وہ بوسیدہ دیوار کی طرح ڈھے گیا۔ اس کا سر دیوار میں جا لگا تھا۔ میں نے موقع غنیمت جان کر آبی سے نظریں بچاتے ہوئے اس کی گردن میں اپنی انگلیاں دھنسا کر اس کی رگِ احساس مسل دی وہ فوراً ہی بے سُدھ ہو گیا۔ اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا جب وہ بے ہوش ہوا، تو اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ آبی اس وقت تک صوفے کو سیدھا کر چکا تھا

"یار آبی! تو اُوپر جا کر اس سر دری خانم کو قابو کر اور باٹی کو بھی ادھر باندھ لے۔ یہ لے میرا پستول لیتا جا، بے آواز چلتا ہے یہ۔"

آبی نے میرا پستول ہاتھ میں لیا تو اس کی غیر معمولی لمبی نال دیکھ کر بولا۔

"یہ کیا چیز ہے بھئی۔ کمال کا ہتھیار ہے یہ۔" اس نے اسے الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ نالی جو اس کے ساتھ لگی ہے یہ آواز کو دباتی ہے۔ تو فوراً اُوپر چلا جا۔ میں اسے سنبھالتا ہوں۔"

"اسے بے ہوش کیسے کر دیا ہے۔ تو نے۔ اس نے تو بڑی

جان کھائی ہوئی ہے۔ اس نے تو مجھے بھی الٹ دیا تھا۔۔۔"

ابھی میں اس کی بات کا جواب نہ دے پایا تھا کہ دروازہ کھلا۔ سامنے باٹی کھڑا تھا۔ میں نے آہو کو اوٹ میں لے لیا۔ سامنے صوفہ پڑا تھا۔ باٹی کی نظر آہو تک نہ جا سکی۔

"اوپر بی بی جی بلا رہی ہیں آہو صاحب کو، کہاں ہیں وہ؟"

"ابھی آتے ہیں وہ، تم ذرا اندر آؤ۔" یہ کہہ کر آبی نے آگے بڑھ کر اسے بازو سے پکڑ کر اندر گھسیٹ لیا۔

"دیکھ باٹی یہ پستول ہے نا۔ اس کی نال سیدھی تیرے مغز میں اتار دوں گا۔ اگر تو نے کوئی گڑبڑ کی۔" یہ کہہ کر اس نے باٹی کے کندھے پر پڑا رومال اچک کر اپنی دونوں ٹانگیں اس کی ٹانگوں میں پھنسا کر رومال اس کے منہ پر کس دیا۔ یہ اتنی تیزی سے ہوا کہ باٹی صورتِ حال کو اس وقت ہی صحیح طور پر سمجھ سکا جب میں اس کی دونوں بانہیں کمر پر باندھ چکا تھا۔ اس کام کے لیے میں نے اس کی شلوار سے ازار بند نکال لیا تھا۔

"یار تو خود ہی جا اوپر۔ میں اس کا سامنا نہیں کر سکتا۔ اس سروری خانم کا۔" آبی نے باٹی کو پلنگ پر گراتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے لا پستول مجھے دے دے۔" یہ کہہ کر میں نے چپ شاہ اس کے ہاتھ سے جھپٹا۔ اور دروازہ کھول کر صحن میں نکل گیا۔ گھر میں ہر طرف اس وقت خاموشی طاری تھی۔ بچہ تو ان کے ہاں کوئی بھی نہیں تھا اور کبری شاید ہسپتال میں تھا، یا ہو سکتا ہے آہو ٹھیک کہتا ہو کہ وہ گاؤں گیا ہوا ہے۔ گھر میں سروری خانم کے سوا اور کوئی نہ ہو سکتا تھا۔ کوئی عورت بھی ان کے ہاں ملازم تھی مگر اس کے بارے میں مجھے اس وقت تک کچھ معلوم نہیں تھا۔ بہرحال میں دبے پاؤں سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر جا پہنچا سامنے ایک بڑا سا ہال کمرہ تھا جس کے چاروں طرف کمرے بنے ہوئے تھے۔ میں ہال کمرے میں داخل ہوا تو مجھے سروری خانم ایک دروازے میں داخل ہوتی نظر آئی۔ وہ اس وقت گلابی رنگ والی بڑی ہی خوبصورت ساڑھی پہنے ہوئے تھی۔ بال بڑی نفاست سے اس نے کندھوں پر پھیلا رکھے تھے۔ اور اس کا وہ سرو سا قد دروازے میں سج گیا تھا۔ میں فاصلہ پھلانگتا ہوا ایک دم اس کے اوپر جا پہنچا اور اسے بالوں سے پکڑ کر اس کا منہ اپنی طرف کر لیا۔

"خبردار جو تم نے منہ سے کوئی آواز نکالی تو۔ چلو ادھر اندر چلو۔" یہ کہہ کر میں نے اسے دھکیل کر آگے بڑھایا تو اس کا رنگ ہلدی ہو گیا۔ میری آنکھوں میں جمی بربریت اس کے لیے عجوبہ چیز تھی۔ منہ اس کا یوں کھل گیا تھا حیرت سے کہ اس کے حلق کا کوا تک مجھے نظر آ رہا تھا۔ اس کے خوبصورت سے گلاب کی پتیوں ایسے ہونٹ لرز رہے تھے۔ میں نے اندر لے جا کر اس کو ایک پلنگ پر گرا دیا۔ میرے ایک ہاتھ میں پستول تھا اور دوسرے ہاتھ میں باٹی کا آدھا ازار بند۔

"تم مجھے جانتی ہو سروری خانم! میں آہو سے اپنا حساب چکانے آیا ہوں۔ اس نے مجھے تباہ کر دیا ہے اور اسی سلسلے میں، میں تمہیں باندھ رہا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے پلنگ کے ایک طرف پڑا اس کا دوپٹہ اٹھا کر تیزی سے اس کے منہ پر باندھ دیا۔ اس کا سارا بدن لرزنے لگا تھا۔ ایسا صدمہ اس نے شاید زندگی میں پہلی بار جھیلا تھا۔ اس کے منہ سے اُف تک نہ نکلی حالانکہ وہ خاصی اونچی لمبی دراز عورت تھی اور ڈیل ڈول اس کا ایسا تھا کہ اگر وہ مجھ سے الجھتی تو دو چار ہاتھ تو وہ مجھے دکھا ہی سکتی تھی۔ اس کا منہ باندھ کر میں نے اس کے دونوں ہاتھ اس کی پیٹھ پر لا کر ازار بند سے باندھ دیئے۔ میں نے اس کی خوبصورت اونچی ایڑی کی سبک سی جوتی اس کے پاؤں سے اتاری اور اس کی دونوں ٹانگیں اٹھا کر اسے پلنگ پر پہلو کے بل گرا دیا۔

آہو کا فون اسی کمرے میں رکھا تھا ایک خوبصورت سی تپائی کے اوپر۔ وہ بہت ہی سجا سجایا کمرہ تھا۔ آئینہ خانہ نظر آتا تھا وہ مجھے۔ آمنے سامنے دو بڑے بڑے قدِ آدم آئینوں والی سنگار میزیں رکھی تھیں۔ فوم کے گدوں والے دو پلنگ ساتھ ساتھ بچھے تھے۔ اور فرش پر قالین اتنا دبیز تھا کہ اس پر چلنے سے آدمی کی ساری کلفت دور ہو جاتی تھی۔ دیواروں پر بڑے سلیقے سے انہوں نے عمدہ قسم کی تصویریں سجا رکھی تھیں جن میں سے کچھ تو بڑی ہیجان خیز تھیں۔

سروری خانم کو بے بس کر کے میں نے دروازہ بند کیا اور ہال کمرے سے گزر کر سیڑھیوں میں آ گیا۔ پہلے قدم پر آبی کھڑا تھا وہ باٹی کو کھینچ کر وہاں تک لے آیا تھا۔

"اسے اوپر لے آ یار۔ میں نے اسے باندھ دیا ہے۔" میں نے دبے لہجے میں کہا۔ آبی نے باٹی کی کمر میں ٹھوکا دیا تو وہ آہستہ آہستہ سیڑھی چڑھنے لگا۔ مگر جب وہ درمیانی زینے پر پہنچا تو ایک دم پلٹ کر آبی پر گرا اور اسے اپنے ساتھ لے کر لڑھکتا ہوا صحن میں جا پڑا۔ اب وہ آبی کے اوپر یوں جھکا تھا کہ اس نے اپنے دونوں گھٹنوں میں آبی کا پیٹ دبا لیا تھا اور اپنے۔۔۔ سر سے اس کے ماتھے پر ٹکریں مار رہا تھا حالانکہ اس کے ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے تھے وہ باٹی اپنی جوانی میں سیکھے ہوئے پہلوانی کے گر اس پر استعمال کر رہا تھا۔ سیڑھیوں میں یوں اچانک لڑھکنے کی وجہ سے آبی کے سر پر گہری چوٹ آ گئی تھی۔ وہ باٹی کے سامنے بے بس ہوا جاتا تھا۔ میں سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے اترا اور جاتے ہی پوری قوت سے باٹی کی پسلی میں لات جمائی۔ وہ الٹ کر دوسری طرف جا گرا۔ غصے نے مجھے پاگل کر دیا

تھا۔ میں نے باٹی کو بے تحاشا پیٹنا شروع کر دیا۔ منہ اس کا بندھا تھا ورنہ شاید وہ مار سہتے ہوئے اتنا چلاتا کہ دور دور تک لوگ اس کی آواز سن لیتے۔ پانچ چھ ہاتھ جب بہت کرارے سے اس کے بدن پر پڑ چکے تو وہ بے سدھ فرش پر گر گیا۔ اس عرصے میں آبی اٹھ کر خود کو سنبھال چکا تھا۔ میں اس کی طرف متوجہ ہوا تو وہ اپنے سر پر ہاتھ پھیر کر بولا۔

"اس نے تو مجھے چکرا کر رکھ دیا تھا یار۔ بڑا خطرناک بڈھا ہے یہ۔"

"چوٹ تو نہیں آئی تجھے۔"

اس نے سر پہ ہاتھ پھیر کر میرے آگے کر دیا۔ اس کی انگلیاں خون آلود ہو گئی تھیں۔

"سیڑھی کی نوک لگ گئی ہے سر میں۔ اس باٹی نے تو کمال کر دیا ہے۔"

"حق نمک ادا کر رہا ہے سالا۔ چلو اسے اوپر لے چلتے ہیں۔" یہ کہہ کر میں نے باٹی کے ٹھوکر لگا کر اسے۔۔۔ اٹھایا اور پھر اسے اپنے ساتھ کھینچتے ہوئے اوپر لے گیا۔

"میں اسے بھی اوپر ہی لے آتا ہوں۔" آبی نے سیڑھیوں میں منہ ڈال کر کہا اور پیچھے ہٹ گیا۔ باٹی میں اب مزید مار کھانے کی سکت باقی نہیں رہی تھی۔ وہ بڑی فرمانبرداری سے میرے ساتھ اوپر چڑھا تھا۔ میں نے اسے ہال کمرے میں سے گزار کر سروری خانم کے ساتھ والے کمرے میں ڈال دیا۔۔۔ یہ سروری خانم کا وہ کمرہ تھا جہاں وہ لباس تبدیل کرتی تھی۔ اس الگنی پر اس کی تین چار شلواریں ٹنگی تھیں جن میں ریشمی ازار بند پروتے ہوئے تھے۔ میں نے ازار بند نکال کر باٹی کی ٹانگیں بھی کس کر باندھ دیں۔ اس کے پاؤں کی آزادی ہمارے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔

اس کام سے فارغ ہو کر میں سروری خانم کے کمرے میں گیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہاں موجود نہیں تھی۔ وہ شاید دوسرے کمرے میں جا گھسی تھی۔ اس کی ٹانگیں بھی آزاد تھیں صرف ہاتھ بندھے تھے اور اس پہلو کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں نے اس کو دھکیل کر کھولنے کی کوشش کی مگر معلوم یہ ہوا کہ وہ اندر سے کنڈی چڑھا چکی ہے۔ وہ کنڈی ایسی تھی تختے کے درمیان میں لگی تھی۔ سروری خانم نے اپنے ہاتھ کو ذرا سا بڑھا کر اسے بڑی آسانی سے بند کر لیا تھا۔ میں نے ہال کمرے میں جا کر عقب میں کھلنے والی کھڑکیوں میں سے باہر جھانک کر دیکھا تو مجھے اطمینان ہو گیا کہ ادھر کوئی راہداری نہیں تھی اور اس طرف سے سروری خانم باہر نہیں نکل سکتی تھی۔

ابھی میں وہاں کھڑا ہی تھا کہ آبی سیڑھیاں چڑھ آیا۔ اس نے آہو کو کمر پر لاد رکھا تھا۔ آبی بری طرح ہانپنے لگا تھا۔ پھر بھی اس نے آہو کو آگے لا کر دھڑام سے فرش پر پھینک دیا۔

"اسے پکڑ ذرا اور ادھر اندر لے چلو، پلنگ پر ڈال دیں گے ہم اسے۔"

"بڑا وزن ہے یار اس سوّر کا۔ مجھے تو تھکا دیا ہے اس نے۔" اس نے اپنا سانس دباتے ہوئے کہا۔

"اس کے گناہوں کا بوجھ بھی تو شامل ہے اس کے وزن میں لے پکڑ اسے ادھر سے۔"

ہم دونوں نے آہو کو اوپر نیچے سے پکڑا۔ اور اسی پلنگ پر لے جا کر ڈال دیا۔ جس پر تھوڑی دیر پہلے میں نے سروری خانم کو لٹایا تھا۔

"یار وہ سروری بیگم تو ادھر مورچہ بند ہو گئی ہے اس نے اندر سے کنڈی چڑھا لی ہے۔"

"تم نے باندھا نہیں تھا اسے؟"

اس کے ہاتھ اور منہ تو میں نے باندھ دیئے تھے مگر اس کی ٹانگیں آزاد تھیں۔"

"کمال کر تا ہے تو بھی میرے یار۔"

"اتنا تجربہ نہیں تھا مجھے اس لیے چوک ہو گئی مگر ٹھہر میں دیکھتا ہوں یہ اندر کیا کر رہی ہے۔" میں نے دروازے کے اوپر چھوٹا سا روشندان دیکھتے ہوئے کہا۔ اور تپائی آگے کھینچ کر اس پر پاؤں رکھ دیا۔ وہ میرا وزن سہار سکتی تھی۔ تپائی پر چڑھ کر میں نے روشندان کے شیشے میں سے دوسرے کمرے کے اندر نگاہ ڈالی سروری خانم اس گھڑی اپنے سارے بدن کو بانہوں میں سے گزار کر اپنے بندھے ہوئے بازو آگے لانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس کا لچکیلا بدن اس کی بانہوں کے حلقے میں سے گزر جائیگا مگر مجھ سے غلطی یہ ہوئی تھی کہ میں نے ڈوری اس کی کلائیوں پر وہاں باندھی جہاں وہ اپنی گھڑی باندھے ہوئے تھی۔ اسکی وجہ سے اس کی بلا آستین بلاؤز کی برہنہ بانہیں اتنی جگہ ضرور بنا رہی تھیں کہ اگر وہ ذرا سی اور کوشش کرتی تو بانہوں کو آگے لا سکتی تھی اور پھر اپنے دانتوں سے وہ بڑی آسانی سے ڈوری کی گرہ کھول سکتی تھی۔ وہ سوتی ازار بند اس کے لیے ہتھکڑی تو بن گیا تھا مگر اسے کھول لینا کسی طرح بھی مشکل نہیں تھا۔

میں تپائی سے نیچے اتر آیا۔ صورتحال خاصی مخدوش تھی۔ اگر وہ اپنی بانہیں کھول لیتی ہے تو وہ دوسری طرف کے دروازے کی کنڈی نیچے گرا کر بڑی آسانی سے آگے نکل سکتی تھی اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ آگے کیا ہے۔ عین ممکن تھا کہ اس کمرے کے

راستے وہ کسی اور طرف نکل کر ہماری دسترس سے باہر چلی جاتے مجھے کسی فوری اقدام کی ضرورت تھی۔

"کیا کر رہی ہے وہ؟"

"یار وہ اپنے ہاتھ کھولنے کی کوشش کر رہی ہے۔"

"اسے پکڑو میرے بھائی۔ اس کمرے کے آگے ایک بڑا مداری ہے جو ادھر مکان کے عقب میں چھوٹی سیڑھی کی طرف جاتی ہے اسے روک۔" آبی نے پریشان ہو کر کہا۔

میں پستول سیدھے ہاتھ میں لے کر ایک بار پھر تپائی پر چڑھ گیا۔ سروری خانم ابھی تک اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔

"اٹھ جا سروری اور ادھر آ کر کنڈی کھول دے ورنہ میں تیرے سر میں سوراخ کر دوں گا۔"

میں نے اپنی آواز کا تمام تر تحکم اس کے کانوں میں انڈیلتے ہوئے کہا۔ اس کی پیٹھ میری طرف تھی۔ میری آواز سن کر اس نے سر گھما کر اوپر دیکھا تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔ اس کا دوپٹہ اس کے منہ پر بدستور بندھا تھا اور اس کا ساتھ دے رہا تھا مگر اس طرح کہ اس نے اس چوہدری ہادی علی کی سرد قد بیٹی کی ساری گویائی چھین لی تھی۔ اس نے مجھے روشن دان میں دیکھا تو اس کی آنکھوں میں نفرت سلگنے لگی۔ میں نے اس کو خوفزدہ کرنے کے لیے اس کے سر کے اوپر سے گولی چلا دی۔ اس کے ریشمی بالوں کو چھوتی گولی آگے کے گھونسلے ایسے ابھرے ابھرے ریشمی بالوں کو چھوتی گولی آگے نکلی اور دیوار میں جا لگی۔ گولی کو دیوار میں لگتی دیکھ کر وہ تیزی سے اٹھی اور میری طرف منہ کر کے کھڑی ہو گئی۔ وہ نسائیت کے تمام ہتھیاروں سے لیس تھی اور فطرت نے اسکے جسم کی تراش خراش میں بڑی فیاضی سے کام لیا تھا۔ آہو کا انتخاب بلاشبہ لاجواب تھا۔ بانہیں اس کی ابھی تک پیچھے بندھی تھیں۔

"یہ دروازہ کھول دو اسی طرح جس طرح تم نے بند کیا تھا۔ ورنہ مجھے اسے توڑنا پڑے گا۔" میں نے ایک بار پھر تحکم بھرے لہجے میں کہا۔

وہ اپنی آنکھیں پوری طرح کھول کر مجھے دیکھنے لگی۔ وہ میری بات ماننے پر آمادہ نظر نہیں آ رہی تھی۔

"ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے سروری خانم، ہمیں تم سے ہمدردی ہے تم ایسے آدمی کی بیوی ہو جس نے تمہیں مکمل طور پر برباد کر دیا ہے۔ ہم نے تمہیں خاموش رکھنے کے لیے باندھا ہے ورنہ ہم تمہیں کوئی تکلیف نہیں دینا چاہتے۔ دروازہ کھول کر میری بات اطمینان سے سن لو پھر جو فیصلہ تم کرو گی ہمیں منظور ہو گا۔ تمہارا شوہر ہم سے بدترین قسم کی زیادتی کر چکا ہے چلو دروازہ کھول دو چلو۔۔۔ ورنہ اب کی بار گولی تمہارے دل میں اتر جائے گی۔"

میری باتوں کا اس پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ وہ آگے بڑھی اور دروازے کے پاس پہنچ کر پیٹھ موڑ کر کھڑی ہو گئی پھر اس نے ذرا سا جھک کر اپنی انگلیوں کو پھیلا کر اس کو کھینچا اور دروازہ کھول دیا۔

میں تپائی سے نیچے اتر آیا۔ اب وہ میرے سامنے کھڑی تھی، پورے قد سے تن کر، آنکھیں اس کی جھرنے بن رہی تھیں اور آنسو اس کے رخساروں پر اک تار بہہ رہے تھے۔

"آؤ ادھر بیٹھ جاؤ۔" یہ کہہ کر میں نے بڑی ملائمت سے اس کا بازو تھام کر پلنگ پر بٹھا دیا۔ اس عرصے میں آبی نے آہو کو دھکیل کر دوسرے پلنگ پر ڈال کر اس کو لحاف اوڑھا دیا تھا، اس طرح کہ اس کا سر بھی اس میں چھپ گیا تھا اور پیر بھی۔

آبی نے مجھ سے کچھ کہے بغیر تیزی سے سروری خانم کے منہ پر سے دوپٹہ اتار دیا۔ میرے پستول کی نال اس کے سینے کی طرف تھی۔ منہ سے دوپٹہ اترتے ہی وہ بولی۔

"تم... تم کیا چاہتے ہو۔ کیا کیا ہے آہو صاحب نے تمہارے ساتھ۔ وہ.. وہ تو اتنا خیال رکھتے تھے آپ لوگوں کا۔"

"اچھا ہے کہ آپ ہم سے ساری باتیں پوچھ لیں... مگر یہ بھول جائیں کہ آپ شور مچا کر ہم سے چھوٹ جائیں گی۔" آبی نے بڑے پر اعتماد لہجے میں کہا اور دیوار کے ساتھ بڑی کرسی کو کھینچ کر سروری کے قریب ہو بیٹھا اور گہرے گہرے سانس لینے لگا جیسے وہ اس عورت کو سانس کے ذریعے پی جانے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ دراصل اس لمحے سروری خانم کے بدن پر لگی اس خوشبو کو سونگھ رہا تھا جو اس خوبصورت کمرے میں بہت ہی خوشگوار محسوس ہو رہی تھی اور ماحول کے تکدر کو دور کیے دیتی تھی۔

"مجھے بتائیں کہ میرے شوہر کا کیا قصور ہے؟"

"آپ کو پتہ ہے کہ آپ کے والد ہادی علی چوہدری کو آہو صاحب نے خود مروایا ہے۔"

"نہیں نہیں یہ غلط ہے یہ جھوٹ ہے سراسر جھوٹ۔ میرے شوہر ایسے نہیں ہو سکتے ہیں۔"

"وہ ایسے ہیں سروری خانم جی۔ انہوں نے ہادی علی کو خود مروایا ہے۔"

"مگر مگر کیوں۔ کیوں۔ اس سے انہیں کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ میں کبھی نہیں مان سکتی کہ انہوں نے ایسا کیا ہے۔"

"دیکھیں جس آدمی کے ذریعے انھوں نے ہادی علی کو قتل کروایا ہے اس کی ایک بہن ہے وہ ادھر جیل میں قید ہے اُسکی رہائی کا وعدہ کر کے آہو صاحب نے اس سے سودے بازی کی تھی۔ کہا انھوں نے یہ تھا کہ اگر وہ ہادی علی کو مار دے تو وہ اس آدمی کی بہن کو رہا کروا دیں گے۔" میں نے سروری کے قریب ہو کر کہا۔

وہ پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

"اس سلسلے میں انہوں نے ایک تحریر بھی لکھ کر دی تھی۔ وہ یہ ہے۔" یہ کہہ کر میں نے آہو کے ہاتھ کی تحریر بھی اس کے سامنے رکھ دی۔ وہ حیرت زدہ سی ہو کر اس کو دیکھنے لگی۔ پھر وہ اسے پڑھ کر بولی۔

"اس میں تو میرا بھی ذکر ہے۔"

"جی ہاں، انھوں نے کہا تھا کہ اگر وہ اپنا وعدہ پورا نہ کریں یا نہ کر سکیں تو وہ سمجھیں گے کہ ان کی بیوی کو طلاق ہو گئی۔"

سروری خانم کا رنگ اور زیادہ دھواں دھواں ہونے لگا۔

"اس وقت انھوں نے اس آدمی سے اسی ہزار روپیہ بھی لیا تھا۔ امانت کے طور پر اور غالباً اس خیال سے کہ اگر وہ آدمی ہادی علی کو نہ مار سکا تو وہ اسی ہزار روپیہ دبا لیں گے۔ جرمانے کے طور پر۔۔۔ اور یہ اس روپے کی رسید ہے۔"

"یہ... یہ روپیہ تو ادھر موجود ہے، مجھے دے رکھا ہے انھوں نے پورا اسی ہزار ہے۔"

"جی یہ وہی روپیہ ہے۔" میں نے کہا۔

"اور یہ وہی آدمی ہے جس نے یہ روپیہ آہو کو دیا تھا"

"تم! تم نے میرے باپ کو قتل کیا ہے۔" وہ بدک کر مجھ سے کچھ ہاتھ پرے سرک گئی مگر رہی وہ پلنگ کے اوپر ہی۔

"گھبرائیے نہیں! میں نے جو کچھ کیا ہے بالکل لاعلمی میں کیا ہے۔ مجھے، خدا گواہ ہے بالکل علم نہیں تھا کہ ہادی علی آپ کے والد ہیں۔ ورنہ میں مر جاتا مگر ان پر ہاتھ کبھی نہ اٹھاتا۔" میں نے آبی کی اس حماقت کی وجہ سے اس کے آشکارا ہو جانے پر خجل ہوتے ہوئے کہا۔

"بالکل جھوٹ۔ تمھیں پتہ تھا کہ ہادی علی سے ان کا کیا رشتہ ہے۔"

"میں قسم کھا سکتا ہوں سروری خانم۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔ آپ جانتی ہیں مسند آرا سے میرا کیا رشتہ ہے۔ میں بھلا اُسکے باپ پر کس طرح ہاتھ اٹھا سکتا تھا۔ نہیں نہیں ایسا کبھی بھی نہیں ہو سکتا تھا۔"

مسند آراء کا نام میرے منہ سے سن کر اسکی آنکھیں ایک بار پھر بہہ نکلیں۔

"تم نے۔۔۔ تم نے مجھے اور اسے برباد کر دیا ہے۔"

"نہیں میں نے نہیں بلکہ آپ کے شوہر نے آپ کو تباہ کیا ہے اور ایک خاص مقصد کے تحت۔"

"مقصد؟ انھیں کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے اپنے سسر کو مارنے سے۔" وہ بہت ہی آزردہ خاطر ہو گئی تھی۔ آبی نے آگے بڑھ کر اس کی کلائیوں پر بندھی ڈوری کھول دی۔ بولا۔

"آپ اطمینان سے بیٹھیں ہم آپ کے دشمن نہیں ہیں۔ سمجھیں کہ آپ اپنے بھائیوں کے سامنے بیٹھی ہیں۔ خدا کی قسم مجھے آپ اپنا بھائی سمجھیں۔" یہ کہہ کر اس نے سروری کے سر پر بڑی شفقت سے ہاتھ پھیرا۔

اس نے ایک دم ساری صورتِ حال بدل ڈالی تھی۔ میں بھی شاید اسے یہی کہنے والا تھا مگر میری زبان کو یارا نہ ہوا۔ وہ ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے آبی کو دیکھنے لگی۔ آبی بہت ہی متاثر ہو گیا تھا، اس کے آنسوؤں سے۔ اس نے دوپٹہ اٹھا کر اس کے رخساروں پر بہتے آنسو پونچھ ڈالے۔ بولا۔

"آپ کو اس صدمے کے لیے تیار ہو جانا چاہیے تھا کیونکہ آپ کا شوہر تو چوروں اور ڈاکوؤں کی کمائی کھاتا رہا ہے۔"

"کیا کہتے ہو تم! وہ شریف آدمی ہے۔"

"ہاں سرکاری طور پر وہ واقعی شریف آدمی ہے سروری خانم! مگر اصل روپ اس کا اور ہی ہے۔ جس دن یہ شخص یہاں ٹھیرا تھا اس دن آپ کو آہو نے پچاس ہزار روپیہ دیا تھا کہ نہیں؟"

"ہاں دیا تھا مگر وہ تو، وہ تو ان کا منافع تھا جو انہیں کاروبار میں ہوا تھا۔"

"کیا کاروبار کرتے ہیں وہ؟"

"وہ آڑھت کا کام کرتے ہیں ان کے دو ٹرک بھی چلتے ہیں پھر اور بھی کئی کام ہاتھ میں لے رکھے ہیں انھوں نے۔"

"یہی تو آپ سمجھ نہیں سکی ہیں۔ وہ روپیہ اس روز ہمیں انھیں دے کر گیا تھا۔ میں نے ایک آدمی کے گھر ڈاکہ ڈالا تھا۔ اس میں سے ایک لاکھ میں نے اس دوست کو دیا اور پچاس ہزار آہو کو۔" سروری خانم کی حیرت دیدنی تھی۔ بڑی بجھی ہوئی آواز میں بولی۔

"ان کو کیوں دیا تھا وہ روپیہ آپ نے؟"

"وہ اس لیے میری بہن کہ آہو ہمیں پولیس کے چکروں سے بچاتا رہا ہے۔ کچہری میں سو طرح سے مدد کرتا ہے اس لیے میں ہی نہیں کئی اور لوگ بھی اسے لمبی لمبی رقمیں دیے جاتے ہیں۔"

"اُف میرے اللہ یہ میں کیا سن رہی ہوں۔ آہو ایسے آدمی ہیں، یہ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔"

"جی ہاں! آپ نے پتہ نہیں کیا سوچ کر ان سے شادی کر لی تھی۔ کہاں سے ٹکرے تھے یہ آپ کو؟"

"یہ ادھر میرے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتے تھے۔ ہم ایم اے کر رہے تھے ان دنوں۔ یہ سائیکالوجی پڑھ رہے تھے اور میں سیاسیات۔"

"تو یہ بات ہے انہوں نے اپنی اس نفسیات کے علم کو آپ پر بھی آزمایا اور جرائم پیشہ لوگوں پر بھی۔ رستیا میں دل جیسی ان کو آپ نے دلائی ہو گی۔"

"یہ بھی ان کا شوق تھا اور اس میں بھی خاصے کامیاب رہے ہیں۔" اب وہ قدرے بہتر محسوس کرنے لگی تھی۔

"بہت ہی کامیاب کہیں — ایسے آدمی تو ڈھونڈے سے نہیں ملتے ہیں جناب۔" میں نے دل کھول کر آہو کی تعریف کی۔

"اب آپ کیا چاہتے ہیں مجھ سے۔"

"میں چاہتا ہوں میری بہن کہ تم اپنے شوہر کو سمجھاؤ کہ وہ اپنا وعدہ پورا کرے میری بہن آسیہ ادھر جیل میں بند ہے اس کی رہائی کے لیے میں اپنی جان بھی قربان کر سکتا ہوں — اس کی خاطر میں نے اتنے بڑے آدمی کو قتل کر دیا مگر اب یہ اپنے وعدے سے پھر گئے ہیں یہ بھائی آہو صاحب۔"

"وہ اب کہاں ہیں۔ آپ سے ملنے کے لیے نیچے گئے تھے۔"

"وہ ادھر آپ کے پیچھے لیٹے ہیں۔ لحاف اٹھا کر دیکھیں" میں نے اسے آہو کا سراغ دیا۔ وہ پلٹ کر پیچھے ہٹی اور آہو کے منہ سے لحاف الٹ کر اسے دیکھنے لگی۔ "یہ سوئے ہوئے ہیں کیا کھلا دیا آپ نے انہیں؟"

"کچھ نہیں، بس ذرا بے ہوش ہو گئے تھے یہ اپنے غصے کی شدت میں۔"

"انھیں ہوش میں لائیے تو میں ان سے بات کروں۔"

"یہ جلدی ہوش میں آ جائیں گے بی بی پہلے تو آپ وہ اسّی ہزار روپیہ ادھر لائیں۔" آبی نے اسے خاص کام یاد دلایا۔

"ہاں وہ میں لا دیتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھی اور پہلو کے کمرے کی طرف چلدی۔ میں نے پستول سیدھے ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔ اس پر کسی قسم کے اعتماد کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ وہ اوّل تا آخر آہو کی بیوی تھی۔ ہمارے دشمن کی جیون ساتھی۔ میں بھی اس کے ساتھ دوسرے کمرے میں جا گھسا۔ وہاں پہنچ کر اس نے الگنی پر ٹنگے اپنے کوٹ کی جیب سے چابیوں کا گچھا نکالا، اور سامنے دیوار کے ساتھ رکھے سیف کو کھولنے لگی۔ تین چابیاں وہ لگا چکی تو پھر اس نے دستہ گھما دیا سیف آپ ہی آپ کھل گیا۔ اس کے بہت سے خانے مقفل تھے۔ اس نے صرف ایک خانہ کھولا۔ اس میں بہت سے نوٹ دھرے تھے۔ وہ خاصا بڑا خانہ تھا۔ نوٹوں کی کچھ گڈیاں ایک طرف ہٹا کر اس نے ایک رومال میں لپیٹے نوٹ نکالے اور میری طرف بڑھا کر بولی۔

"یہ لیں۔ یہ وہی نوٹ ہیں اور اسی طرح رومال میں بندھے ہیں جس طرح مجھے ملے تھے، انہیں گن لیں۔"

میں نے وہ نوٹ بائیں ہاتھ میں تھام لیے پستول کا رخ میں نے ابھی تک اس کی طرف کر رکھا تھا۔ وہ مجھے کوئی بہت ہی عیّار عورت نظر آتی تھی۔ اپنے سارے خوف پر قابو پا لینے کے بعد بڑی حد تک پُرسکون نظر آ رہی تھی۔ جب آبی نے اسے میری اور اپنی بہن بنایا تھا تو میں دیکھ رہا تھا کہ اس کو اس لفظ سے کوئی خاص خوشی محسوس نہیں ہوئی بلکہ ایک مخصوص قسم کی کراہت سی اس کے چہرے پر ابھر آئی تھی۔ اور میں سمجھتا تھا کہ وہ ہم پر کسی بھی ناطے سے کسی قسم کا اعتبار کرنے پر تیار نہیں تھی۔ نوٹ مجھے تھما کر اس نے سیف بند نہیں کیا بلکہ ایک اور چابی سے ایک اور خانہ کھولنے لگی۔ اس وقت اس نے سارے سیف کو اپنے بدن کی اوٹ میں لے لیا تھا۔

وہ اس خانے میں چابی گھما چکی تو میں نے اس کے کندھے کے اوپر سے آگے جھانکا۔ اس نے سر گھما کر مجھے دیکھا اور بولی۔

"یہ کیا کرتے ہیں آپ، نیت تو ٹھیک ہے نا آپ کی۔ پرائی عورت کے اتنا قریب نہیں ہوتے۔" وہ مسکرانے لگی تھی۔

"اس خانے میں کیا رکھا ہے آپ نے؟"

"آپ کے لیے خوشبو نکال رہی ہوں۔ میرا کمرہ بدبو سے بھر دیا ہے آپ نے۔ پتہ نہیں کب سے نہلائے نہیں ہیں آپ۔"

ایسے نازک اور وحشت کے لمحات میں اسے ایسی ایسی نازک باتیں سوجھ رہی تھیں۔ اس نے ایک بار پھر مجھے نگاہِ غلط انداز سے دیکھا اور خانہ کھول دیا۔ اس میں خوشبو کی دو شیشیاں دھری تھیں جن پر پمپ سے لگے تھے۔ ایک شیشی اس نے اٹھائی، اور بولی۔

"ذرا گریبان کھول لیں اپنا۔ دیکھیں یہ کیسی عمدہ خوشبو ہے۔"

میں ابھی تک کمبل اوڑھے ہوئے تھا۔ مجھے بھلا ایسی خوشبو سے کیا لینا تھا۔ اچانک میری چھٹی حس نے مجھے یہ احساس دلایا کہ جیلانی تجھ پر شاید یہ عورت وہی حربہ آزما رہی ہے جس کی بدولت عالیہ نے تجھے زیر کر لیا تھا۔ میں نے تیزی سے وہ شیشی اس کے ہاتھ سے جھپٹنا چاہی مگر وہ بہت تیز نکلی۔ اس نے شیشی کا پمپ چلا دیا۔ عجیب سی بھینی بھینی خوشبو میرے نتھنوں میں چڑھی، مگر پیشتر اس کے کہ اس کا پورا فوارہ میرے چہرے کو تر کر دیتا میں اچھل کر پیچھے ہٹا اور کمبل کا پلہ پورے زور سے اس کے ہاتھ پر دے مارا۔ شیشی اس نے پوروں میں پکڑ رکھی تھی۔ وہ اس کے ہاتھوں سے نکل کر فرش پر جا گری اور ٹوٹ گئی مگر اس کا ٹوٹنا ہی غضب ہو گیا۔ کمرے میں عجیب سا کثیف دھواں پھیلنے لگا جس میں سے بڑی بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی۔ میں گھبرا کر کمرے سے نکلا اور اس کا دروازہ اپنے پیچھے بند کر کے باہر سے کنڈی چڑھا دی۔

میرے چہرے کی سراسیمگی آبی نے بھانپ لی، بولا۔ "کیا ہوا خیر تو ہے؟"

"پتہ نہیں اس نے کوئی خوفناک چیز مجھ پر آزمائی ہے۔"

دوسرے کمرے میں سرورِی زور سے کھانسنے لگی تھی اور اب وہ دروازے پر دستکیں مار رہی تھی۔ مجھے اپنا دم گھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ چند سانس جو اس کثیف دھوئیں میں میں نے لیے تھے میرے اعصاب سُن کر گئے تھے۔ میرا گلا خشک ہوتا جا رہا تھا۔

"مجھے تھوڑا پانی پلا آبی، پتہ نہیں اس سالی نے کیا کر دیا ہے۔" میں نڈھال سا ہو کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔ دروازے پر سرورِی کی دستک اور شدید ہو گئی تھی اور پھر وہ خوفناک انداز سے چلائی۔ "دروازہ کھولو خدا کے لیے مجھے باہر نکالو۔" یہ کہہ کر وہ پھر نہایت ہی ہولناک طریقے سے کھانسنے لگی۔ یوں لگتا تھا اس کا دم گھٹ رہا ہے۔ آبی پانی لایا تو اس نے سرورِی کی آواز سن لی۔

"یار میں یہ دروازہ کھول دوں، پتہ نہیں کیا ہوا ہے اسے۔"

"دروازہ مت کھولنا آبی۔ اس نے بڑا خوفناک ہتھیار آزمایا ہے مجھ پر۔" میں نے آبی کا راستہ روکتے ہوئے کہا۔

"خدا کے لیے دروازہ کھولو۔"

"یار یہ کیا کر رہا ہے تو! اسے دیکھو تو۔"

میں نے اپنے خشک ہوتے گلے کو پانی سے تر کیا، اور سینے پر بڑھتے ہوئے بوجھ کو گہرے گہرے سانسوں سے اتارتے ہوئے کہا۔

"یہ دروازہ مت کھولنا آبی! اس نے بڑی خوفناک گیس جلائی ہے مجھ پر۔ وہ گیس ادھر آ گئی تو ہم سب مر جائیں گے۔"

میں ہانپنے لگا تھا۔ موت کے لرزہ خیز تصور نے مجھے نڈھال کر دیا تھا اور پھر مجھے دوسرے کمرے کے دروازے کے پیچھے سے دھم کی سی آواز سنائی دی۔ سرورِی کی کھانسی تھم گئی تھی اور اب وہ دروازہ کھولنے پر اصرار نہیں کر رہی تھی۔

"یار یہ ہوا کیا ہے۔ اب اس کی آواز بھی نہیں آ رہی دیکھو تو سہی۔ وہ کہیں ادھر سے دوسری طرف نہ نکل گئی ہو۔"

"ادھر بیٹھ جا آبی۔ یہ دروازہ میں ابھی نہیں کھولوں گا۔ اس نے جو حربہ مجھ پر استعمال کیا ہے وہ ایسا ہے کہ اس کے سامنے شیر بھی بے بس ہو جاتے ہیں۔ عالیہ نے مجھے اسی طرح تباہ کیا تھا۔ میں یہ دروازہ نہیں کھولوں گا۔"

میں نے سراسیمہ ہو کر کہا۔ میرا خیال ہے میرا بھی اس گھڑی رنگ اڑ رہا تھا اور آبی میری وہ حالت دیکھ کر سخت حیران تھا مجھے معلوم تھا کہ وہ کمرہ جس میں انہوں نے سیف رکھا تھا، چاروں طرف سے بند تھا۔ اس میں نہ کوئی کھڑکی تھی نہ روشن دان۔ اسی میں انہوں نے اپنی تمام لوٹ مار کی دولت جمع کر رکھی تھی۔ اور جس نگاہِ غلط انداز سے اس سرورِی نے مجھے دیکھا تھا۔ اس سے میں یہی نتیجہ اخذ کر سکا تھا کہ وہ بہت ہی عیّار عورت ہے۔ اور ہادی علی کے قتل کا سارا انتظام اس کے علم میں بھی تھا۔ وہ آہو کے تمام اقدامات میں برابر کی شریک تھی۔

تب اچانک میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح لپکا۔ یہ عورت یہ حرص و ہوا کے مارے ہوئے آدمی کی یہ پڑھی لکھی بیوی کہیں اپنی بے حد و حساب ہوسِ زر میں مبتلا ہو کر مسند آراء کو تو راہ سے نہیں ہٹا بیٹھی ہے تاکہ باپ کی کروڑوں کی جائداد پر یہ بلا شرکتِ غیرے قابض ہو سکے۔ مجھے اس سے پوچھنا چاہیے کہ مسند آرا کہاں ہے۔ جونہی یہ خیال میرے ذہن میں ابھرا میں نے پاگلوں کی طرح آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ مگر یہ میری بہت بڑی حماقت تھی۔ وہ کمرہ سفید رنگ کے کثیف دھوئیں سے بھرا ہوا تھا اور دروازے کے پیچھے سرورِی خانم بے سُدھ پڑی تھی۔ بالکل چت۔ دھوئیں کا ایک بادل سا خوفناک شکل میں دروازے سے باہر نکلا اور مجھے اپنی لپیٹ میں لینے لگا۔ میں کمبل منہ پر لپیٹ کر چیخا۔

"آبی یہ سارے دروازے کھول دے اور یہ پنکھے چلا دے جلدی کر۔" یہ کہتا ہوا میں تیزی سے ہال کمرہ میں نکل گیا۔ آبی بھی کھاؤں کھاؤں کھانسنے لگا تھا۔ مگر پھر بھی اس نے نہایت جی داری سے کمرے کے تینوں دروازے کھول دیئے اور ہال کمرے میں آنے سے پہلے اس کے پنکھے کا بٹن دبا دیا۔

"اسے پکڑ۔ اس آہو کو ادھر کھینچ۔" میں نے آبی کو گھسیٹتے ہوئے کہا اور ہم دونوں نے کمرے میں پھیلتے دھوئیں میں آگے بڑھ کر آہو کو اس کے پلنگ پر سے کھینچ کر اتارا اور اسے ٹانگوں سے گھسیٹتے ہوئے ہال کمرے میں لے آئے۔

میں نے پاگلوں کی طرح آگے بڑھ کر اس کمرے کی آٹھوں کھڑکیاں کھول دیں۔ چار عقب میں تھیں اور چار صحن میں کھلتی تھیں۔ تازہ ہوا مکان کے اس حصے میں بھرنے لگی تو دھوئیں کی

کثافت گھٹنی شروع ہو گئی جس کمرے میں باٹی لیٹا تھا وہ چاروں طرف سے بند تھا اس لیے میں اس کے بارے میں زیادہ پریشان نہیں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اس بلائے بے درماں سے بچ گیا ہو گا جب ذرا دھوئیں کا زور کم ہوا اور کمروں کی فضا صاف ہو گئی، تو میں بڑے محتاط انداز سے اس کمرے میں گیا جس میں سروری خانم محبوس ہو کر رہ گئی تھی۔

میں نے دھوئیں کے مہیب اثرات سے بچنے کے لیے منہ پر اپنا کئی دنوں کا دھویا ہوا رومال رکھ لیا تھا۔ میں جب اندر پہنچا تو دیکھا کہ سروری خانم اندمال و علاج کی تمام سرحدیں عبور کر گئی تھی۔ اس کی نبضیں ڈوب چکی تھیں اور موت اس سونے ایسی رنگت کے دلآویز بدن پہ وارد ہو چکی تھی۔ زندگی اسے دغا دے گئی تھی۔

"آبی! ادھر آ آبی۔ دیکھ تو اسے کیا ہو گیا ہے" میں نے سروری خانم کے پہلو میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ میری آواز یوں لرز رہی تھی جیسے کسی زخم سے مس ہو کر نکل رہی ہو۔ آبی نے میرے گلوگیر لہجے پر حیرت زدہ ہو کر زقند بھری اور بجلی ایسی سرعت سے میرے پاس آ پہنچا۔

"یہ... یہ کیا ہو گیا ہے اسے" اس نے سروری کی کلائی ہاتھ میں لے کر اس کی نبض ٹٹولی اور پھر ہکا بکا ہو کر مجھے دیکھنے لگا۔ سروری کی کلائی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر اس کے بے جان سینے پر دھپ سے گر گئی تھی۔

"یہ... یہ تو مر گئی ہے جیلانی۔ یہ کیا ہو گیا میرے یار! یہ تو ہمارا مقصد ہرگز نہیں تھا"

"ہاں یہ مر گئی ہے اپنے ہی خنجر سے ہلاک ہو گئی ہے"

"مگر یہ... یہ سب ہوا کیسے میرے بھائی؟"

"ایسے دغاباز امیروں کے خزانے سیف کی ایسی ہی خوفناک چیزوں کی پناہ میں ہوتے ہیں آبی! یہ اپنے ہی ہتھیار سے ماری گئی ہے"

"مگر اب... اب کیا ہو گا میرے بھائی۔ اس کو ہم کہاں چھپائیں گے؟" آبی نے ڈوبتے ڈولتے لہجے میں کہا۔

"اس کی فکر نہ کر۔ اس کا بندوبست ہم کر ہی لیں گے۔ چل اس آہو کے ہاتھ پاؤں باندھ دے، وہ سالا ہوش میں آ رہا ہو گا۔ اس کا ٹائم پورا ہو گیا ہے اب"

"کوئی ٹائم پیس فٹ کر دیا ہے تو نے اس کے اندر۔ تیری کئی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی ہیں جیلانی" وہ بڑے بجھے دل سے اٹھتے ہوئے بولا۔

میں بھی اس کے ساتھ ہی ہال کمرے میں جا پہنچا۔ آہو کے سانس کی آمد و رفت ٹھیک تھی۔ ہم دونوں نے اس کے ہاتھ پاؤں باندھے اور پھر اٹھا کر اسے دوبارہ پلنگ پر لٹا کر اس کے اوپر لحاف ڈال دیا۔ وہ ابھی تک بے سدھ پڑا تھا۔

آبی کی حیرت ابھی تک ختم نہیں ہوئی تھی بولا "یار! یہ ایسی خوفناک گیس بھر رکھی تھی اس نے اس شیشی میں"

"ہاں! یہ لے وہ رقم جو اس نے مجھے سیف سے نکال کر دی تھی" میں نے کوٹ کی جیب سے رومال میں بندھے نوٹ اس کی طرف بڑھائے۔ اس نے رومال کھولا اور نوٹ گننے لگا۔

"یہ پورے اسی ہزار ہیں مگر یہ تم مجھے کیوں دیتے ہو۔ رکھو اپنے پاس"

"نہیں مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنے گھر میں چار چیزیں خرید کر ڈال دے آبی۔ مجھے وہ تیکھے ایسا ویران لگتا ہے"

"نہیں یار! میں ٹھیک ہوں مجھے وہ درویشی ہی اچھی لگتی ہے۔ یہ دھوم دھڑکا سب بیکار ہے۔ لے یہ تو رکھ لے" اس نے وہ پوٹلی میری طرف اچھال دی۔ نوٹوں سے اس کی اس قدر بے رغبتی میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ میں نے بہرحال کسی مناسب وقت پر وہ روپے اسے لوٹا دینے کے ارادے سے وہ پوٹلی اپنی جیب میں ڈال لی۔

اب ہمارے سامنے سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ ہم آہو کو کیا بتائیں گے اسے کس طرح مطمئن کریں گے کہ سروری خانم کی موت میں ہمارا کوئی ہاتھ نہیں ہے وہ تو باؤلا ہو جائے گا یہ سن کر۔ سروری پر تو اس کی ساری زندگی کی تابناکی کا انحصار تھا۔ وہ دونوں اسی کینڈے کے تھے اور میں نے جو نتیجہ اخذ کیا تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے صلاح مشورے سے ہی تمام اقدامات کرتے تھے۔ تو یہ میرا خیال ہی نہیں بلکہ پختہ یقین تھا کہ میرا وہ اندازہ بالکل درست تھا مگر اب اس آدھے آہو کو ہم کس طرح راہِ راست پر لائیں گے کہ اس کا نصف حصہ تو موت نے نگل لیا تھا اور وہ بھی ایسے عجیب و غریب حالات میں کہ اس سانحہ کی ساری ذمے داری ہم پر آ رہی تھی ہم اپنی بے گناہی کے ثبوت میں کوئی بھی دلیل نہیں دے سکتے تھے آہو تو ہماری قسموں پر بھی اعتبار نہیں کر سکتا تھا۔

دیر تک ہم اسی ادھیڑبن میں رہے مگر کوئی بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ باٹی اور آہو کی مسلسل بے ہوشی پر آبی بدحواس ہونے لگا تھا، تنگ آ کر بولا۔

"یار تو نے کیا کر دیا ہے انھیں، کچلا کھلا دیا ہے کیا؟"

"میں نے کیا کرنا تھا میرے بھائی، بس گدی پر ہاتھ پڑتے ہی یہ بے ہوش ہو گیا تھا یہ آہو اور یہی حال اس باٹی کا ہوا" دراصل میں اپنے حربے کو آبی سے چھپا لینا چاہتا تھا کیونکہ وہ جس انداز سے

تاہیے گو گے اور اس کنتر دین کے سلسلے میں پریشان ہوا تھا اور جس بے پناہ غم و غصے کی حالت میں وہ سارا دن ادھر اپنے دشمن کو تلاش کرتا رہا تھا اس سے میں بہت زیادہ تشویش میں تھا اور اس سے میرا جو تعلق تھا اُسے میں ہر حال میں برقرار رکھنا چاہتا تھا کیونکہ آبی بڑی خوبیوں کا مالک تھا۔ وہ دوستوں کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار رہتا تھا۔ دھونس دھاندلی اور بے ایمانی کے خلاف وہ چٹان کی طرح ڈٹ جاتا تھا۔ آہو کے سلسلے میں اس کی سرگرمی میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ پھر سب سے بڑی بات یہ تھی، کہ اسے روپے پیسے کا قطعاً کوئی لالچ نہیں تھا وہ جو کچھ لوٹتا تھا کوڑیوں کی طرح لوگوں میں بانٹ دیتا تھا۔ یہی بات تھی کہ میں اپنی کسی بات سے اُسے ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔

سب سے پہلے آہو ہوش میں آیا۔ ہم اس کے سامنے ہی بیٹھے تھے۔ کرسیوں پر۔ وہ لحاف کے نیچے کسمسایا تو میں چونک اٹھا۔ میں نے پستول سیدھے ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ اس نے کروٹ لی تو لحاف اس کے منہ پر سے اتر گیا۔ اس نے آنکھیں جھپکا جھپکا کر ہمیں دیکھا۔ اُس کے ادراک کی سطح پر گرد و پیش کے نقوش ثبت ہونے لگے تو۔ ایک جھٹکے سے اُٹھ بیٹھا۔ اپنے ہاتھ کمر کے پیچھے بندھے دیکھ کر اس نے مجھے بڑی فحش گالی دی۔ بولا "میں تم دونوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ بدمعاشو میرے یہ ہاتھ کھول دو"

پھر اچانک اسے محسوس ہوا کہ اس کے پاؤں بھی بندھے ہیں تو اس نے دونوں ٹانگیں اکھٹی اٹھا کر لحاف پرے پھینک دیا۔

"زیادہ شور نہ مچا آہو۔ ابھی تو شاید تجھے بڑے صدمے سہنا پڑیں میرے پیارے آہو" آبی نے بڑے یخ بستہ لہجے میں کہا۔

"تم چاہتے کیا ہو آخر؟"

"ہمیں اس آدمی سے ملاؤ جس کے کہنے پر تم نے ہادی علی کو قتل کر دیا ہے" میں نے کہا۔

"میں نے تمھیں رقعہ لکھ دیا تھا" اب کی بار وہ شعوری طور پر قدرے تحمل سے بات کر رہا تھا۔

"دیکھیں آہو صاحب! آپ ہمارے دوست ہیں اور آپ سے ہم وہی کچھ مانگ رہے ہیں جس کا آپ نے وعدہ کر رکھا ہے"

"ہاں کوئی بدمزگی پیدا کرنے سے بہتر ہے کہ آپ ہم سے تعاون کریں یہ بات آپ کے اختیار میں ہے" میں نے آہو کو اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔

"بہتر ہو گا کہ آپ اس آدمی سے فون پر ہماری بات کرا دیں"

"نہیں ایسی باتیں فون پر [illegible] ہو سکتی ہیں"

"اچھا ٹھیک ہے آپ یہ رقعہ کر ان صاحب کے پاس

چلے جاؤ اور دیکھو کہ وہ کیا کہتے ہیں" میں نے کہا۔

"میرا وہاں تنہا جانا درست نہ ہو گا۔ تم بھی میرے ساتھ چلو"

"ٹھیک ہے میں بھی تمھارے ساتھ چلتا ہوں ویسے میرا خیال ہے کہ تم خود ہی اس سے مل لیتے تو اچھا تھا۔ مگر خیر، میں چلتا ہوں تمھارے ساتھ، پر اُس سے ہم دفتر میں نہ ملیں تو اچھا ہو گا"

"تو پھر گھر پر مل لیں گے۔ ہم یہاں سے تین بجے اکھٹے چلیں گے اس وقت تک تو وہ گھر جا چکا ہو گا" آبی نے دیوار پر لگی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"وہ... وہ سروری کہاں ہے۔ وہ مجھے نظر نہیں آ رہی" آہو نے پلنگ پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔ اس نے دونوں پاؤں پلنگ پر سے اتار لیے تھے حالانکہ وہ دونوں بندھے ہوئے تھے۔

"آپ کے لیے شاید یہ کوئی اچھی خبر نہ ہو جناب ہرن لاہوری صاحب کہ آپ کی بیوی مر چکی ہے" آبی نے ایک بار پھر بڑے ہی یخ بستہ لہجے میں کہا۔

"نہیں نہیں۔ خدا کے لیے ایسا نہ کہو، ورنہ میں... میں تمھارا خون پی جاؤں گا" یہ کہہ کر وہ پلنگ سے اٹھا اور اچھل اچھل کر آبی کی طرف بڑھنے لگا۔ مگر پھر توازن برقرار نہ رکھ سکا اور دھڑام سے قالین پر گر گیا۔ اب وہ ہذیان بکنے لگا تھا۔ اور ہم دونوں کو بڑی فحش گالیاں دے رہا تھا۔ ساری صورت حال ایک دم بدل گئی تھی۔

"اسے لگام دے جیلانی۔ باندھ دے پٹکا اس کتے کے منہ پر، یہ سب گالیاں اس نے پولیس والوں سے سیکھی ہیں۔ دن رات ان کے ساتھ اس کا اٹھنا بیٹھنا ہے"

میں نے الگنی پر لٹکتا سروری کا ایک فاختئی رنگ کا دوپٹہ لیا اور آہو کے منہ پر باندھ دیا۔ اس کی آنکھوں سے جو شعلے سے نکل رہے تھے وہ میں آج تک نہیں بھول سکا ہوں اور پھر وہ شعلے اس کے آنسوؤں نے بجھا دیئے۔ وہ رونے لگا تھا۔ اپنی بے لبسی پر اور اس کسمپرسی کی حالت پر جس میں اس کی بیوی مر گئی تھی۔ آبی کے اشارے پر میں نے آہو کو باہوں میں بھر کر اٹھایا تاکہ میں اسے پلنگ پر ڈال دوں مگر وہ مجھ سے اُٹھ نہ سکا۔

"یہ بہت وزنی شے ہے جیلانی تجھ سے کیسے اٹھ سکے گا؟ پکڑ اسے ادھر سے" یہ کہہ کر اس نے آہو کو ٹانگوں سے پکڑا تو میں نے کندھوں کی طرف ہاتھ ڈال کر اسے پلنگ پر ڈال دیا۔ آہو شدتِ غم سے اب لرزنے لگا تھا۔ کچھ سردی بھی بہت زوروں پر تھی۔ ہم نے اس کو سکون پہنچانے کے لیے اس پر لحاف ڈالا اور پھر بجلی کا ہیٹر اس کے پلنگ کے قریب لا کر جلا دیا تاکہ وہ ٹھٹھرنے سے بچ جائے۔

آبی نے آہستہ آہستہ اسے وہ سارے واقعات بتائے جن کی وجہ سے سردری خانم ہلاک ہوئی تھی۔ وہ سنتا رہا اور روتا رہا۔ منہ سے وہ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں نے دوپٹہ کس کر باندھ رکھا تھا آبی اپنی طرف سے سردری خانم کی موت کا جواز پیش کرکے مطمئن ہوگیا۔

پھر جانے اسے کیا سوجھی وہ تیزی سے اس کمرے میں گھسا جس میں سردری خانم فرش پر ڈھیر ہو رہی تھی۔ اس نے اسے باہوں میں بھر کر اٹھایا اور لاکر آہو کے پہلو میں ڈال دیا۔ آہو نے اسے یوں اپنے قریب دیکھا تو دیوانہ وار اس پر گرنے لگا۔ میں نے ان دونوں پر لحاف ڈال دیا۔ زندگی موت سے ہمکنار ہو گئی تھی۔ آہو کی آنکھوں سے اشکوں کا تار بندھ گیا تھا وہ کبھی سردری خانم کے رخسار چومتا تھا اور کبھی ہونٹ جن کی سرخی موت نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نوچ لی تھی۔

ہم دونوں ان کے پلنگ کے سامنے کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ اور دونوں نے وقت کٹی کے لیے سگریٹ سلگا لیے تھے۔

"یار، یہ تو نے اچھا نہیں کیا یہ سالا تو صدمے سے ہی مرجائیگا۔"

"نہیں جیلانی! یہ یوں نہیں مر سکتا ہے پیارے۔" اس کے اندر کی میں کو یہ میت فنا کر دے گی۔ پھر یہ ہمارا ہر حکم چپ چاپ مانتا جائے گا۔" آبی نے بڑی معقول بات کی تھی۔ وہ آہو کا نفسیاتی علاج کر رہا تھا۔

"تو اسے کب سے جانتا ہے آبی! تجھے یہ کہاں سے ٹکر گیا تھا؟"

"اس کی صورت پر نہ جا جیلانی! یہ اُن لوگوں میں سے ہے جو ماں کی کوکھ سے مجرم بن کر نکلتے ہیں۔" اس کی یہ بات سنتے ہی آہو نے سردری خانم پر سے اپنی توجہ ہٹا کر کچھ ایسی خوفناک نظروں سے آبی کو دیکھا کہ میں سمجھا وہ اسے وہیں بھسم کر دے گا۔ صرف اپنی نظر کی آگ سے اسے بھون ڈالے گا۔ آہو کی سب سے بڑی قوت اس کی نظروں میں مخفی تھی ــ وہ جب کسی چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کر دیتا تھا تو پھر اس کا مخاطب بے سوچے سمجھے اس کے اشاروں پر چلنا شروع کر دیتا تھا۔ آبی نے اس کی ٹکٹکی سے گھبرا کر میرا بازو دبایا اور اٹھ کر ہال کمرے میں جا بیٹھا۔ میں بھی وہاں سے نکلا۔ وہاں بھی دیوار کے ساتھ سوئی گیس کے ہیٹر کے اردگرد کرسیاں بچھی تھیں۔ آبی نے وہ ہیٹر جلا دیا اور بولا۔

"بیٹھ جا اِدھر میں تجھے بتاتا ہوں کہ یہ بدتخم ہے کیا چیز۔"

"معلوم ہوتا تو اسے بہت عرصے سے جانتا ہے۔"

"یہ پانچ سال پہلے کی بات ہے۔ میں تو ہمیشہ بارات لیکر اسی گھر پہنچا ہوں جہاں پر مجھے معلوم ہوتا ہے کہ مال موجود ہے۔ میں اس روز ایک بینک کے اندر کھڑا تھا۔ میں کسی ایسے آدمی کی تاک میں تھا جو وہاں سے بڑی رقم نکلوا رہا ہو۔ میرا ایک ساتھی ہاتھی بھی میرے ساتھ تھا۔ نام تو اس کا افتخار تھا مگر ہم سب اسے ہاتھی ہاتھی کہتے تھے۔ بس بگڑ گیا تھا نام اس کا۔ وہ بھی اس دھندے میں میرے ساتھ رہتا تھا۔ اس کے پاس ایک بہت عمدہ کار تھی جو ہمارے بہت کام آتی تھی۔ اس ہاتھی نے بڑے معنی خیز انداز سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔

"اُدھر دیکھ آبی! اس قیامت کو تو دیکھ۔"

میں نے سر گھما کر دوسری طرف نگاہ کی تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی حور آسمان سے اتر آئی ہے۔ ایک عورت بے انتہا سجی سنوری ...... رقص کے انداز میں تیرتی ہوئی کاؤنٹر کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس کے ساتھ دو آدمی تھے۔ ایک تو یونہی سا تھا، شاید نوکر تھا اس کا مگر دوسرا آدمی بارعب اور باعزت نظر آتا تھا

"یہ کون ہے ہاتھی؟"

"ابے اسے نہیں جانتا۔ یہ فلم ایکٹریس سلمٰی ہے۔"

"اوئے بیڑہ غرق! یار ایسی خوبصورت چیز ہے یہ ــ اور یہ آدمی کون ہے اس کے ساتھ؟" میں نے کاؤنٹر کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"یہ اس کا شوہر فارابی ہے۔"

میں نے اس چیک پر نگاہ ڈالی جو وہ کاؤنٹر پر بیٹھے کلرک کو دے رہی تھی۔ ہاتھی نے بھی وہ چیک دیکھ لیا۔ مجھے پیچھے گھسیٹتے ہوئے دبی آواز میں بولا۔ "یہ ہے وہ اللہ کی نیک بندی جس کا ہمیں انتظار تھا۔"

"ہاں یار! تو چل اُدھر گاڑی میں بیٹھ ــ میں اس کا بندوبست کرتا ہوں۔"

سلمٰی کو ایک خلقت پہچانتی تھی۔ اس کی آمد پر بنک میں عجیب سی افراتفری مچ گئی تھی۔ ہر شخص اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ یار لوگ اپنا کام دھندا بھول کر بس اسی کے دیدار میں محو ہو گئے تھے۔ بینک کا منیجر اسے دیکھ کر کاؤنٹر پر آ گیا اور بولا۔ "میڈم آپ اُدھر تشریف لے آیئے روپے وہیں مل جائیں گے آپ کو۔" وہ اسے اصرار کرکے اپنے کیبن میں لے گیا۔ اس کا شوہر اور اس کا نوکر بھی اس کے ساتھ تھے۔ بینک میں اس وقت زیادہ بھیڑ نہیں تھی۔ دن کے گیارہ بج رہے تھے اس وقت۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا، کہ میں کیا کروں کیونکہ میں دیکھ چکا تھا کہ وہ عورت سب کی نگاہ میں تھی۔ میری جیب میں گولیوں سے لبالب بھرا پستول تو موجود تھا مگر میں کوئی ہنگامہ وہاں کھڑا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ایسے مال کا فائدہ ہی کیا تھا کہ جس کو اُچکنے سے آدمی خود شکنجے میں پھنس جائے۔ میں نے ایسی حماقت کبھی نہیں کی۔

میں کاؤنٹر سے ہٹ کر سرکتا ہوا اندر منیجر کے کیبن تک جا پہنچا۔ وہ کیبن لکڑی کا بنا ہوا تھا اور اس میں جابجا شیشے لگے ہوئے تھے۔ منیجر اس اداکارہ کے سامنے بس پگھلا جا رہا تھا...... یوں لگتا تھا جیسے وہ سالا اپنی نئی دلہن کے سامنے بیٹھا ہو۔ ڈھیر سارے بسکٹ ڈبے سے نکال کر ان کے سامنے رکھ دیئے تھے۔ چائے بھی اس نے فوراً ہی منگوا لی تھی۔ فارابی اور اس کے نوکر کو وہ یوں سگریٹ پیش کر رہا تھا جیسے وہ اُن کا ادنیٰ غلام ہو۔ اس پر اس وقت جو کیفیت طاری تھی نا میں اسے بیان نہیں کر سکتا ہوں جیلانی! میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس کا بس چلتا نا تو وہ اس سلمٰی کو لے کر اسی وقت کہیں چلا جاتا۔"

"آخر اتنے روپے کی آپ کو اچانک کیسے ضرورت پڑ گئی؟"

"میں نے دراصل ایک اپنی فلم شروع کی ہے کل کچھ لوگوں کو پے منٹ کرنی ہوگی نا اس لیے ـ چیک وہ نہیں لیتے ہیں ـ اُدھر انکم ٹیکس کا چکر ہے۔"

"اس میں ہیروئن تو آپ ہی ہوں گی نا؟"

"جی ہاں، سنٹرل رول میرا ہی ہوگا۔"

"واہ واہ کیا بات ہے آپ کی۔ میں تو آپ کی ہر فلم دس دس مرتبہ دیکھتا ہوں میڈم۔ اداکاری تو بس آپ پر ختم ہے ـ کیا بات ہے آپ کی۔ یہ لیں یہ بسکٹ کھائیں نا۔"

"جی بڑی مہربانی ہے آپ کی۔"

"کیا نام رکھا ہے آپ نے اپنی فلم کا؟"

"خزاں کا گیت۔"

"ہاں یار اس فلم کے اشتہار تو میں نے بھی دیکھے تھے مگر وہ فلم کہیں لگی نہیں۔"

آبی کی اس بات پر اس فلم کا اشتہار میرے ذہن میں ابھر آیا تھا جو میں نے بہت عرصہ ہوا کئی فلمی رسالوں میں بار بار دیکھا تھا۔

"ہاں وہی فلم مگر وہ بن نہیں سکی تھی۔

فلم کا نام سن کر منیجر بلند آواز سے بولا۔

"واہ صاحب واہ کیسا خوبصورت نام رکھا ہے آپ نے 'خزاں کا گیت' بہت سپرہٹ فلم بنے گی جناب۔"

وہ منیجر اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں پیئے جاتا تھا۔ بالکل فنا ہوگیا تھا وہ اس گلبدن کی صورت دیکھ کر۔ اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے سلمٰی کو دو لاکھ روپیہ گنوا دیا۔ سلمٰی نے روپیہ اپنے بریف کیس میں بند کیا اور دلوں پر دھپ دھپ پاؤں رکھتی ہوئی وہ بنک سے باہر نکل گئی۔ فارابی میری توقع کے بالکل برعکس اسکے ساتھ نہیں بیٹھا بلکہ ایک ٹیکسی لے کر دوسری طرف نکل گیا۔

اس میڈم نے پچھلی سیٹ سنبھالی اور بریف کیس بغل میں رکھ کر بیٹھ گئی۔ دوسرا آدمی جو ان کے ساتھ تھا وہ اس کا شوفر نکلا۔ اس نے اسٹیرنگ سنبھالا اور کار لے کر چل دیا۔ ہم بھی ان کے پیچھے لگ گئے۔ میڈم کی کار مال روڈ پر جا رہی تھی۔ نہر کے پل پر

پہنچ کر وہ بائیں ہاتھ مڑے۔ اب ان کا رُخ گلبرگ کی طرف تھا۔ اتھی نے کار کی رفتار تیز کی اور بائیں ہاتھ سے میڈم کی گاڑی سے آگے نکلتے ہوئے کچھ اس طرح اسے سائڈ ماری کہ کار لڑکھڑا کر دائیں ہاتھ باڑھ میں جا گھسی۔ میڈم کا ڈرائیور کوئی بہت ہی احمق آدمی تھا۔ اس سے وہ ذرا سی ضرب بھی برداشت نہ ہو سکی۔ اور وہ کار کو باڑھ میں لگنے کے باوجود بھی سنبھال نہ سکا، اور آگے نکل گیا — یہ صورتِ حال دیکھتے ہی مجھے اتھی نے گاڑی سے اتار دیا۔ میں نے جیب میں رکھے پستول پر اپنی گرفت مضبوط کی اور میڈم کی کار کے پیچھے بھاگا۔ ڈرائیور نے گاڑی کھیت میں گھسنے سے پہلے ہی روک لی تھی۔ میں جب وہاں پہنچا تو میڈم بُری طرح ہانپ رہی تھی۔ وہ دروازہ کھول کر باہر نکلنے کی کوشش کر رہی تھی کہ میں نے وہاں پہنچتے ہی دروازہ بہت زور سے بند کیا مگر یوں کہ اس کی خوبصورت کلائی دروازے میں پھنس گئی اس طرح کہ اس کی طلائی چوڑیاں اور نازک سی گھڑی دروازے کی ضرب سے بُری طرح کچلی گئیں۔ میں نے پستول سیدھے ہاتھ میں لے کر اونچا اٹھانے کے بجائے اس کی گود میں رکھا اور ایک خوفناک جھٹکے سے بریف کیس اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ یہ صورتحال دیکھتے ہی وہ شور مچانے لگی۔ میں نے دروازہ کھول کر اسے باہر کھینچا اور تڑاخ تڑاخ چار زوردار تھپڑ اس کے منہ پہ دے مارے۔ وہ سب کچھ اس کے لیے اتنا غیر متوقع تھا جیلانی بھائی کہ وہ اُلٹ کر گاڑی کے کھلے دروازے کے سامنے جھول گئی — مگر اس عرصے میں اس کا ڈرائیور ایک لوہے کی سلاخ لے کر مجھ تک پہنچ چکا تھا۔ اس کے تیور بڑے ہی خوفناک تھے۔ میں چاہتا تو اسے گولی مار سکتا تھا مگر میں نے خواہ مخواہ لوگوں کو گولی کی آواز سے اپنی طرف متوجہ کرانے کے بجائے بریف کیس کو اپنی ڈھال بنا لیا۔ وہ برچھی کی طرح اپنی اس نوکدار سلاخ کو مجھ پر آزما رہا تھا۔ دو بار اس نے مجھ پر کچھ اس طرح دونوں ہاتھوں میں تول کر وہ چار فٹ لمبی سلاخ ماری کہ اگر میں بریف کیس آگے نہ کر دیتا تو وہ سلاخ سیدھی میرے سینے میں اُتر جاتی۔ تیسری بار جب وہ مجھ پر حملہ کرنے کے لیے پیچھے ہٹا تو میں نے پستول نکال لیا۔ یقین کرو جیلانی بھائی پستول کی صورت دیکھ کر اس کا رنگ ہلدی ہو گیا اور وہ سلاخ وہیں پھینک کر سیدھا کھیت میں جا گھسا۔

"ٹھہر جا" میں نے چار قدم اس کے پیچھے بھاگ کر اس کی طرف یہ موٹی سی گالی لڑھکا دی۔ میری آواز سن کر وہ ایسا بدحواس ہوا کہ دھڑام سے منہ کے بل گر گیا۔ اس سے جان چھڑانے کے لیے میں نے سلاخ اٹھائی اور اس کے اوپر پہنچ کر میں نے وہ سلاخ لاٹھی کی طرح اس کے سر پر دے ماری۔ وہ ضرب میں نے اچھی طرح ناپ تول کر لگائی تھی۔ میں اشد ضرورت کے بغیر کسی کو قتل نہیں کرتا ہوں جیلانی — یہ میرا اصول ہے۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ بے ہوش ہو چکا ہے تو میں وہاں سے پلٹا۔ اتھی میرا منتظر تھا مگر اس طرح کہ اس کے پیچھے ایک کار کھڑی تھی اس کار کا رنگ ٹماٹر ایسا سرخ تھا۔ اسے میں نے بینک کے سامنے میڈم کی کار سے ذرا فاصلے پر دیکھا تھا۔ اتھی پر میری نظر پڑی تو میں حیران رہ گیا۔ اس کا رنگ اُڑ رہا تھا اور بے بسی اس کے چہرے پر عیاں تھی۔ اس کے ساتھ کی سیٹ پر ایک آدمی بیٹھا تھا اور اس نے پستول اتھی کی پسلی سے لگا رکھا تھا۔ ابھی میں کچھ سمجھ بھی نہیں پایا تھا کہ وہ آدمی بولا۔

"یہ لوٹ کا مال مبارک ہو میرے بھائی مگر آدھا حصہ میرا ہو گا۔ ایک لاکھ مجھے گن کر دے دو تو میں خوش میرا خدا خوش، ورنہ تم جانتے ہو کیا ہو گا اور ہاں اپنا پستول بھی اِدھر کر دو۔" وہ اتنے دبنگ لہجے میں بات کر رہا تھا کہ میں بھی حیران رہ گیا۔"

"وہ آدمی کون تھا یار۔ وہ اللہ کا نیک بندہ، وہ درویش کون تھا؟"

"وہ یہی تھا یار! یہ کُتّے کا پُتّر، یہ آہو۔"

"اچھا؟ کمال ہے ایسا پیر کاریگر آدمی ہے یہ" میں حیران رہ گیا۔

"ہاں۔ اس نے تو ہمیں گردن سے پکڑ لیا تھا۔ اتھی مجھے جان سے زیادہ عزیز تھا۔ اور اس کی آنکھیں یہ بتا رہی تھیں کہ وہ مجھ سے اپنی زندگی کی بھیک مانگ رہا ہے۔ میں نے کار کا پچھلا دروازہ کھول کر اپنا پستول چپ چاپ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے بائیں ہاتھ سے اسے فوراً اچک لیا اور مسکرا دیا۔ بڑا جاندار آدمی معلوم ہوتا تھا یہ۔ اس نے کالی شیروانی پہن رکھی تھی اور آنکھوں پر اس نے سیاہ چشمہ چڑھا رکھا تھا۔ چہرے مہرے سے یہ بہت ہی بارعب اور مہذب آدمی معلوم ہوتا تھا۔

میں نے سو سو کے نوٹوں کی دس گڈیاں الگ کر لیں تو یہ بولا۔ "یہ نوٹ رومال میں باندھ دو میرے بھائی۔ بڑی مہربانی ہو گی تمہاری۔" میں نے اس کے حکم کی تعمیل کر دی تو وہ پوٹلی میرے ہاتھ سے اُچک کر بولا۔ "یہ لو یہ میرا پتہ ہے کبھی پولیس شولیس کے چکر میں پڑ جاؤ تو مجھے بتا دینا۔ فون نمبر بھی لکھا ہے اس میں۔" یہ کہہ کر اس نے ایک وزیٹنگ کارڈ میری طرف پھینکا، اور دروازہ کھول کر نیچے اُتر آیا۔ اپنا پستول اس نے رومال میں چھپا رکھا تھا اور اس کا رُخ اب بھی اتھی کی طرف تھا۔ بڑے محبت بھرے لہجے میں بولا۔ "اب جاؤ اور کم از کم پندرہ دن تک شہر سے دور رہو۔"

"ٹھیک ہے میرے بادشاہ! مگر ہم تجھ سے حساب ضرور لیں گے۔" میں نے سٹپٹاتے ہوئے کہا۔ سڑک پر گاڑیوں کی آمد و رفت جاری تھی مگر کسی کو احساس تک نہ ہوا تھا کہ وہاں کیا

ہو گیا ہے۔ میڈم کی گاڑی دائیں ہاتھ تھی۔ جھاڑیوں کی باڑھ کے پیچھے کھڑی تھی اور اس زاویے پر تھی کہ کسی کی نظر اس پر نہیں پڑتی تھی۔ اس آہو نے میری وہ دھمکی سُنی تو مسکرا دیا۔

"میں تمہارا انتظار کروں گا۔ تم دونوں کا۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے اپنی کار میں جا گھسا۔

"یار اس بدمعاش کا مغز توڑ دے آبی، پکڑ لے اس کو۔" اتھی نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"نہیں! یہ کام کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ یہ ایک لاکھ ہی کافی ہے چل اب گاڑی اسٹارٹ کر۔" میں نے اتھی کو تسلی دی۔ اس نے انجن اسٹارٹ کیا اور چپ چاپ آگے چل دیا۔ آہو نے اپنی گاڑی وہیں سے موڑ لی اور دوسری طرف چلا گیا۔

"یہ تو ہمیں خواہ مخواہ ذلیل کر گیا ہے یار! تو نے اسے رقم دے کے اچھا نہیں کیا ہے آبی۔"

"لعنت بھیج اس قصے پر اتھی اور جلدی نکل چل — وہ میڈم ہوش میں آ گئی تو مصیبت کھڑی کر دے گی۔"

اتھی نے میری یہ بات سُنی تو اس نے خوفزدہ ہو کر گاڑی کی رفتار ایک دم تیز کر دی اور ہم اسی وقت شہر سے باہر نکل کر ہریکے جا پہنچے۔

اگلے چھ دن ہم نے گاؤں میں گزارے۔ میڈم پر ڈاکوؤں کے حملے کی خبریں اگلے دن اخباروں میں شہ سرخیوں سے چھاپی گئیں۔ میڈم کہتی تھی کہ وہ مجرموں کو پہچان سکتی ہے۔ اس کے ڈرائیور فتن کا بیان تھا کہ وہ بھی ڈاکوؤں کو آسانی سے شناخت کر سکتا ہے۔ شہر میں کہرام مچ گیا تھا۔ فلمی حلقوں میں صفِ ماتم بچھی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ یہ سب کچھ ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت ہوا ہے اور اس کے پیچھے کوئی سیاسی مقصد کارفرما ہے۔ وہ لوگ حکومت کے خلاف اول فول بکنے لگے تھے۔ میں ہر روز مناداں سے اخبار منگوا کر پڑھتا رہا۔

چوتھے دن معلوم ہوا کہ پولیس نے بہت سے آدمیوں کو شبے میں گرفتار کر لیا ہے۔ گرفتار ہونے والے سب کے سب بے گناہ تھے مگر پولیس نے ان میں سے چند ایک پر جب اپنے خاص نسخے استعمال کیے تو کئی ایک نے اپنی جان بچانے کے لیے اعتراف بھی کر لیا کہ ہاں میڈم کو انھوں نے ہی لوٹا تھا۔ اخباروں میں پولیس کی ساری کارروائی بڑی تفصیل سے چھپ رہی تھی۔ میڈم ایسی ایکٹریس تھی کہ ایک دنیا اس کے غم میں برابر کی شریک ہونے کا دعوےٰ کر رہی تھی۔

میڈم نے سب سے بڑا اور احمقانہ دعویٰ یہ کیا تھا کہ ڈاکوؤں نے اس کی عصمت لوٹنے کی بھی کوشش کی تھی مگر جب اس کے ڈرائیور فتن نے مزاحمت کی تو وہ صرف بریف کیس اٹھا کر بھاگ نکلے۔ میڈم کے اس بیان پر بہت سے سماجی اور سیاسی حلقوں کی طرف سے اس "درندگی" کی سخت مذمت کی گئی۔

پانچویں دن اخباروں کے اس واویلے سے تنگ آ کر سپرنٹنڈنٹ پولیس نے ایک اخباری کانفرنس بلائی جس میں اخبار نویسوں کو اس نے بتایا کہ ملزم گرفتار کیے جا چکے ہیں — انہوں نے اعتراف تو کر لیا ہے مگر ابھی تک رقم برآمد نہیں ہو سکی۔ کیونکہ ان کا یہ کہنا ہے کہ انہوں نے پولیس کے چھاپے سے گھبرا کر رقم سے بھرا بریف کیس نہر میں پھینک دیا تھا مگر نہر سے وہ بریف کیس ابھی تک برآمد نہیں ہو سکا ہے۔ انہوں نے اس بات کی سختی سے تردید کی کہ مجرموں نے میڈم کی عزت پر ہاتھ ڈالا تھا۔ ایس پی نے کہا کہ مجرم ایسی کمینی حرکت کے مرتکب ہرگز نہیں ہوئے کیونکہ وہ تو صرف رقم کے لالچ میں اس پر حملہ آور ہوئے تھے۔"

"تو تو یہ خبریں پڑھ کر خوب ہنستا ہو گا۔"

"ہاں یار اس میڈم سالی نے رسّی کا سانپ بنا دیا تھا — میرا اندازہ تھا کہ اس کے مالکی بینک میں کم از کم چالیس لاکھ روپیہ موجود تھا مگر وہ صرف دو لاکھ کے بکھر جانے کی وجہ سے چلّا رہی تھی۔

ساتویں دن میں اتھی کو اس کے گھر چھوڑنے کے لیے شہر آیا تو شالامار باغ سے ذرا آگے باغبانپورہ چوک میں سے گزرتے ہوئے ہماری بدقسمتی نے ہمیں آ گھیرا۔ ایک راہگیر اتھی کی کار سے ٹکرا گیا۔ حالانکہ اس کی رفتار کچھ اتنی زیادہ نہیں تھی۔ وہ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ وہ کار سے ٹکرا کر سڑک پر گرا تو اس کے سر پر ایسی چوٹ آئی کہ وہ بے ہوش ہو گیا۔ اس کی ٹانگ بھی ٹوٹ گئی تھی۔

اُس کی یہ حالت دیکھ کر لوگوں نے ہماری کار کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ میں تو سمجھا وہ سالے کار کو آگ لگا دیں گے مگر اتھی فوراً ہی گاڑی سے اُتر گیا۔ لوگوں نے اسے پکڑ لیا۔ خیریت یہ گزری کہ ہم نے اپنے ہتھیار سیٹ کے نیچے چھپا رکھے تھے کیونکہ چوک میں کھڑے دو سپاہیوں نے ہمیں اس وقت گھیر لیا تھا۔ وہ ہمیں سیدھے تھانے لے گئے۔ اپنے لباس کی وضع قطع سے اس وقت ہم کوئی بہت بڑے جاگیردار نظر آتے تھے۔ میرے سر پر اونچے شملے والی پگڑی بھی تھی اور میں نے سیاہ شیروانی سفید شلوار اور سنہری طلّے دار سُبک سا ملتانی کھُسّہ پہن رکھا تھا۔ مگر تھانیدار نے کوئی گھاس نہیں ڈالی۔ بہت ذلیل کیا اس نے ہمیں لیکن تہذیب کے دائرے کے اندر رہ کر، کیونکہ اسے یہ احساس ضرور تھا کہ ہم کوئی ایسے ویسے آدمی نہیں ہیں۔

ہمارے خلاف وہ خاصا پیچیدہ مقدمہ درج کرنا چاہتا تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ ہمیں اس چکر میں بہت دن خوار ہونا پڑتا۔ اس تھانیدار کا نام رفیع گورایا تھا۔ جب وہ کسی طرح بھی ہمارے خلاف مقدمہ درج کرنے سے باز نہیں آیا تو میں نے اس سے کہا کہ مجھے وہ اپنے دوست کو ٹیلیفون کرنے کی اجازت تو دیدے۔ وہ مان گیا۔ میں نے اسی وقت اس آہو کے بتائے ہوئے نمبر گھمائے تو یہ مجھے گھر پر ہی مل گیا اب سوال یہ تھا کہ میں اس سے اپنا تعارف کس طرح کراؤں۔ گورایا سامنے بیٹھا تھا اور جن حالات میں ہرن کا بچہ ہم سے ملا تھا وہ ایسے تھے کہ ہم اسے اپنا نام بھی نہ بتا سکے تھے۔

جب اس نے فون پر ہیلو کہا تو میں نے بڑی بے تکلفی سے اسے سلام علیک کیا مگر یہ سن کر تمھیں حیرت ہوگی جیلانی کہ وہ آدمی فوراً میری آواز پہچان گیا، بولا۔

"اچھا اچھا! تم وہی ہو نا وہ ایک لاکھ والے۔ کہو کیسے یاد کیا ہے مجھے، کوئی گڑبڑ ہو تو مجھے بتاؤ۔"

میں تو اس کی ذہانت پر سٹپٹا کر رہ گیا۔ میری سب سے بڑی مشکل اس نے خود ہی آسان کر دی۔

"دیکھیں جناب! ادھر ہماری کار سے ٹکرا کر ایک آدمی شدید زخمی ہو گیا ہے اور اب ہم یہاں باغبانپورہ کے انچارج گورایا صاحب کے رحم و کرم پر ہیں۔"

"ابھی پرچہ کٹا تو نہیں ہے؟"

"جی نہیں مگر وہ کسی طرح بھی ہمیں چھوڑنے پر تیار نہیں۔"

میری یہ بات سنتے ہی وہ بولا۔

"ذرا فون گورایا صاحب کو دے دو۔"

میں نے اس کے کہنے پر تھانیدار کو ٹیلیفون تھما دیا۔

تھانے دار نے اس کی آواز سنی تو فوراً ہی اس کے چہرے کی کرختگی ماند پڑنے لگی۔ بولا۔

"اوہ، میں سمجھا! فکر نہ کریں آہو صاحب! بس اب آپ سب کچھ مجھ پر چھوڑ دیں۔ میں آپ کا خادم ہوں جناب بس وہ ہمارا کام بھی کر ہی دیں۔۔۔۔"

"بس ٹھیک ہے مجھے نہیں پتہ تھا کہ یہ آپ کے آدمی ہیں۔ میں۔۔ میں۔۔ بس انہیں چھوڑ ہی رہا ہوں۔ بالکل فکر نہ کریں، آہو صاحب۔"

یہ کہہ کر تھانیدار نے فون بند کیا اور بولا۔

"چوہدری صاحب آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا بس اب آپ جائیں۔ میں سب ٹھیک کر لوں گا۔ اگر آپ اس آدمی کو ہزار پانچسو روپے دے دیں تو میں اس کا منہ بند کر دوں گا۔"

اس کی یہ بات سنتے ہی میں نے دو ہزار روپے کے نئے نئے نوٹ نکال کر تھانیدار کے سامنے ڈال دیئے اور بولا

"یہ لیں یہ آپ کے سپاہیوں کے چائے پانی کا خرچ ہے یہ میری طرف سے رکھ لیں۔"

"اس کی کیا ضرورت ہے صاحب۔" تھانیدار نے سارے نوٹ سمیٹتے ہوئے کہا۔

"آپ کی مہربانی کے سامنے اس کی کیا وقعت ہے صاحب! بس اب ہمیں اجازت دیں۔"

تھانیدار نے تمام نوٹ دراز میں ڈالے اور ہمیں رخصت کرنے کے لیے کمرے کے دروازے تک ہمارے ساتھ آیا۔ اس کا سارا کروفر ختم ہو چکا تھا۔ اس کا رویّہ یوں بدلا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔

ہم اسی وقت تھانے سے نکل کر آتھی کے گھر جا پہنچے۔ یہ آہو سے میری پہلی ملاقات تھی جیلانی۔ اس کے بعد تو میرا اس سے باقاعدہ دوستانہ ہو گیا۔ اس نے بڑے بڑے صبر آزما موقعوں پر میری اتنی مدد کی کہ میں خود کبھی کبھی دنگ رہ جاتا تھا۔ حالت اس کی یہ ہے کہ جہاں سے ہوا نہ گزرتی ہو یہ وہاں سے بے دھڑک گزر جاتا ہے۔"

"اسی لیے تو میں نے بھی اس پر اعتبار کر لیا تھا یار۔ اس کے کہنے پر میں نے ہادی علی کو مار دیا مگر اب یہ میرا ہی دشمن ہو گیا ہے۔"

"یہ تم سے ڈر گیا ہے جیلانی۔ ہادی علی کے قتل سے اسے بے حد حساب فائدہ ہوگا۔ سیاسی بھی اور مالی بھی۔ دونوں ہاتھوں سے یہ دولت کمائے گا مگر تو جو اس کے سامنے رہا تو یہ ہمیشہ بے چین رہے گا۔ اسی لیے اس نے تجھ پر بار بار حملہ کیا ہے۔ یہ اچھا ہے کہ کبری ابھی تک زندہ ہے اس سے ہمیں بہت کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔"

"مگر اب کیا کرنا چاہیے؟"

"بس ہم اس سروری خانم کو آج رات ادھر لان میں دفن کر دیں گے۔ اگر یہ آہو ہمارے کام نہیں آیا تو اسے بھی میں ختم کر دونگا۔"

"مگر ہمارا مسئلہ تو حل نہ ہوگا۔"

"اس کی تم فکر نہ کرو۔ کوئی نہ کوئی راستہ میں ضرور تلاش کر لوں گا۔ سب سے پہلے تو ہم اس آدمی سے ملیں گے جس کے نام اس نے یہ رقعہ ہمیں دیا ہے۔"

"ہاں اس آدمی کو ضرور آزمانا چاہیئے مگر یار! آہو کے پہلو میں سروری کو لٹا کر تو نے اس پر بہت ظلم کیا ہے۔"

"اس کا بہت اچھا اثر پڑے گا۔ یہ سالا بالکل سیدھا ہو جائے گا۔"

اچانک ہمیں آہو کی آواز سنائی دی، وہ پاگلوں کی طرح چیخ چیخ کر سروری کو پکار رہا تھا۔

ہم دونوں بھاگ کر اس کے کمرے میں پہنچے تو ہم نے دیکھا

کہ آہو نے اپنے منہ پر بندھا ہوا دوپٹہ اتار لیا تھا اور وہ بری طرح سسک رہا تھا۔ بازو اور ٹانگیں ابھی تک بندھی تھیں۔ پھر بھی وہ سروری پر پوری طرح چھایا ہوا تھا۔

میں نے آگے بڑھ کر اسے سروری سے پرے ہٹایا تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سروری کا جسم پہلے جیسا سرد نہیں تھا۔ اس میں حرارت پیدا ہو رہی تھی۔ میں تو خوفزدہ ہو گیا۔ ایسا تو میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ مُردوں کے زندہ ہو جانے کی کہانیاں تو میں نے سن رکھی تھیں مگر اس روز سروری کے مُردہ جسم میں نئے سرے سے پیدا ہوتی ہوئی حرارت نے مجھے ششدر کر دیا تھا۔ میں نے ایک دم پیچھے ہو کر پھٹی پھٹی نظروں سے آبی کو دیکھا۔ وہ آہو کے منہ پر دوپٹہ ایک بار پھر کس کر باندھ چکا تھا۔ اس نے میرے چہرے پر پھیلی بے پناہ حیرت دیکھی تو بولا۔

"کیا ہوا۔ خیر تو ہے۔ تیرا تو رنگ اڑ رہا ہے۔"

"یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ اس کا جسم گرم ہو رہا ہے۔ دیکھ تو سہی۔"

وہ کوک بھرے کھلونے کی طرح پلٹا اور سروری کی نبض ٹٹولنے لگا۔ پھر اس نے اس کی ناک کے قریب ہاتھ رکھا۔ اس کی نبض کو بائیں ہاتھ سے محسوس کر کے بولا۔

"یہ۔۔۔ یہ تو زندہ ہے یار! اس کا سانس بھی بحال ہو رہا ہے یہ مری تو نہیں ہے۔" اس کی یہ بات سنتے ہی آہو تیزی سے اس کے قریب ہو گیا اور اپنے رخسار اس نے سروری کے رخساروں پر رکھ دیے۔

میں نے ایک بار پھر سروری کی نبضیں دیکھیں، اس کا ماتھا چھوا۔ اس کے بدن میں زندگی پھر سے لہلہانے لگی تھی۔

"اس کا مطلب ہے یار، کوئی مر کر بھی زندہ ہو سکتا ہے۔"

"یہ کوئی ناممکن بات نہیں ہے جیلانی ہو سکتا ہے اسے سکتہ ہو گیا ہو۔ ایسی حالت میں لوگ پورا پورا دن مُردوں سے بدتر حالت میں پڑے رہتے ہیں۔ دیکھ تو اس کی نبض درست ہوتی جا رہی ہے۔" آبی نے ایک بار پھر سروری کی نبض پر ہاتھ رکھ دیا۔

آہو نے ایک بار پھر سروری کے بالوں میں لگی پن کے ساتھ دوپٹہ پھنسا کر اپنے منہ پر بندھی پٹی اتار لی تھی۔

"یار! اس سوّر نے دوپٹہ پھر کھول لیا ہے۔ اس کا گلا اچھی طرح۔۔۔" میں نے آبی کو ادھر متوجہ کیا۔

عین اسی وقت بڑے دروازے پر دستک ہوئی۔ ٹھک ٹھک۔ ٹھک۔ کوئی بہت عجلت میں تھا اور تیزی سے دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ میں نے پستول سیدھے ہاتھ میں تھام لیا۔ آبی نے مجھے گہری گہری نظروں سے دیکھا اور بولا۔

"تو ادھر ٹھہر۔ اس دروازے کو باہر سے بند کر کے سیڑھیوں پر کھڑا ہو جا۔ میں دیکھتا ہوں کون آیا ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنا پستول نکال کر ہاتھ میں لیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا سیڑھیاں اتر گیا۔ میں نے آہو کے منہ پر ایک بار پھر کس کر دوپٹہ باندھا اور اسے پلنگ سے اتار کر فرش پر ڈال دیا۔ اس کے بعد میں نے سروری کے دونوں ہاتھ اس کی کمر پر باندھ دیئے اور دروازے کو باہر سے بند کر کے سیڑھیوں کے دروازے پر جا ٹھہرا۔

ابھی مجھے وہاں کھڑے دو منٹ ہی ہوئے تھے کہ آبی زینے میں نمودار ہوا مگر وہ تنہا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ کوئی برقعہ پوش عورت تھی۔ وہ سیاہ برقعے میں لپٹی ہوئی تھی۔ آبی کے پیچھے دو تین قدم اوپر پہنچی تو اس نے نقاب الٹ دیا۔

مجھ پر تو شادیٔ مرگ ایسی کیفیت طاری ہو گئی۔ میرے سامنے ماجدہ تھی۔ چاندنی رات کی طرح تاریک زمین پر روشنی پھیلا دینے والی مہربان ماجدہ۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ مجھ سے اس کی نگاہیں ملیں تو وہ آبی کو کاٹتی ہوئی تیزی سے اوپر چڑھی۔ میں بھی کئی زینے پھلانگ کر اس تک جا پہنچا اور جب ہم روبرو ہوتے تو اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور وہ ثمر بار شاخ کی طرح لچکتی ہوئی میرے سینے سے لگ گئی۔ آبی چپ چاپ اوپر چلا گیا۔

"یہ۔۔۔ یہ میں کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں؟ میں نے تو سنا تھا آپ گرفتار ہو گئی ہیں۔"

"ہاں مگر میری ہیڈ مسٹریس نے مجھے ضمانت پر رہا کروا لیا ہے۔"

"یہ تو بہت ہی اچھا ہوا ہے ماجدہ مگر یہاں تک تم کس طرح پہنچیں؟"

"آپ نے یہاں کا پتہ لکھوایا تھا نا وہ مجھے یاد رہ گیا۔ میں نے سوچا میں آہو صاحب سے مل کر آپ کا پتہ معلوم کر لوں گی۔"

"آپ نے بہت اچھا کیا ہے ماجدہ۔ میں آپ کے لیے بہت پریشان تھا اور۔۔۔ سوچ رہا تھا کہ کل صبح میں کنجاہ ضرور جاؤں گا۔"

"ایسے ہی گولی کھلا رہے ہیں آپ مجھے نیند آ رہی ورنہ میں بھلا آپ کو کہاں یاد رہوں گی۔"

"آئیں اوپر چلتے ہیں۔ میں آپ کو اپنا دل چیر کر دکھا دوں آئیں اوپر۔" یہ کہہ کر میں ماجدہ کو لے کر ہال کمرے میں جا پہنچا۔ آبی کو میں ماجدہ کے بارے میں سب کچھ پہلے ہی بتا چکا تھا۔ اسی لیے وہ اسے بلا جھجک اوپر لے آیا تھا اور وہ کنجاہ سے اس حال میں

آئی تھی کہ اس کے ہاتھ میں اپنا پرس بھی نہیں تھا معلوم یہ ہوتا تھا کہ اسے دوبارہ گھر جانے کی فرصت نہیں ملی تھی۔ ضمانت پر رہا ہوتے ہی وہ لاہور کے لیے روانہ ہو گئی تھی۔

میں نے اُسے ہیٹر کے سامنے کرسی پر بٹھایا تو وہ بولی :۔

"یہ آپ کے آہو صاحب کہاں ہیں؟ ان کی بیگم کے بارے میں بھی تو آپ نے بتایا تھا، وہ کہاں ہیں؟"

"وہ سب ادھر ہی ہیں ماجدہ آپ کو ہم ابھی سب کچھ بتا دیں گے پہلے تو آپ ادھر باورچی خانے میں جا کر ہم سب کے لیے کھانا تیار کریں ہمیں سخت بھوک لگی ہے۔"

آبی سامنے کی کرسی پر بیٹھا مسکرا رہا تھا بولا۔

"یہ اچھا انتظام کر دیا ہے اللہ نے۔ بھوک سے میرا بھی بُرا حال ہو رہا ہے۔"

ماجدہ نے برقعہ اُتار دیا۔ اس کے پیکر کے وہ دلکش خطوط ایک بار پھر میرے دل و دماغ میں کوڑے برسانے لگے۔ میں اُسے کھینچ کر باورچی خانے میں لے گیا۔

"آپ کو میں بہت یاد کرتا تھا ماجدہ! اچھا ہوا آپ آ گئیں۔ میں بہت اداس رہنے لگا تھا۔"

"میں نے سوچا تھا کہ آپ مل گئے تو آپ کو خوب ماروں گی اچھی طرح سزا دوں گی اس بدمعاشی کی جو آپ میرے ساتھ کر آئے تھے۔"

یہ کہتی ہوئی وہ فریج کی طرف بڑھی۔ وہاں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ گوشت سبزی انڈے مکھن دودھ، ڈبل روٹی، پھل — ہر شے آہو نے وہاں جمع کر رکھی تھی۔

جب ماجدہ چولھے پر ہانڈی رکھ چکی تو بولی۔

"وہ مجھے تیسرے ہی دن پکڑ کر لے گئے تھے۔ چوہدری کرامت اور فیروز نے ہوش میں آتے ہی ہسپتال والوں کو بتا دیا تھا کہ ان پر جو کچھ بیتی وہ اس آدمی کی کارستانی ہے جو ماجدہ کے گھر میں ٹھہرا ہوا تھا۔ ان کے اس بیان پر پولیس مجھے پکڑ کر لے گئی مگر میں نے کہہ دیا کہ یہ جھوٹ بولتے ہیں ان کے پاس ثبوت تو کوئی بھی نہیں ہے اسی لیے میری ضمانت بھی ہو گئی۔ مگر سارے شہر میں لوگ ہنس رہے ہیں۔ پولیس والے مجھے شناخت کے لیے فیروز کے پاس بھی لے گئے تھے اس کی حالت دیکھنے کے لائق ہے۔"

"وہ تو ہیجڑا بن چکا ہے سالا ساری عمر کے لیے گیا وہ کام سے۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔

"ہاں! یہ موٹی موٹی گالیاں دیتا ہے وہ مجھے بھی اور آپ کو بھی۔"

"آپ نے کیا کہا اُس سے؟"

"میں نے کہا کہ میں تو اسے جانتی بھی نہیں۔ پہلی بار ان کی شکل دیکھ رہی ہوں۔ میری اس بات پر وہ بہت چیخا چلایا مگر میں نے کہا میں نے تمھیں کبھی دیکھا نہیں ہے۔"

"اچھا کیا۔ بہت اچھا کیا آپ نے ماجدہ۔ تھانیدار تو پریشان نہیں کرتا تھا آپ کو؟"

"نہیں۔ وہ بھی یہی سمجھتا ہے کہ وہ دونوں جھوٹ بکتے ہیں۔"

"انھوں نے اس قرض کا ذکر تو نہیں کیا جو تمھارے شوہر نے اُن سے لیا تھا؟"

"اس کا ذکر بھی کرتے تھے بدمعاش۔ میں نے کہا کہ وہ جانیں اور میرا شوہر۔ مجھے کیا پتہ۔ میں تو گھر میں رہتی ہوں۔"

"یہ بہت اچھا ہوا ہے ماجدہ۔ اب اگر مقدمہ بھی چلے تو کچھ نہیں ہو سکتا۔"

"آپ نے ویسے نہیں اچھا سبق دیا ہے جناب جیلانی صاحب!"

"آپ کے لیے تو میں سارے شہر کا یہی حشر کر سکتا ہوں ماجدہ۔ آپ نہیں جانتی ہیں کہ میرے دل میں آپ کے لیے کتنی عزت ہے۔ بس اب آپ اچھا سا مزیدار کھانا پکا دیں ہمیں اور دیکھیں یہاں کی صورتِ حال خاصی دگرگوں ہے مگر آپ گھبرائیں ہرگز نہیں۔"

کیا مطلب؟ یہاں بھی کسی کا آپریشن تو نہیں کر دیا ہے آپ نے؟"

"بات کچھ ایسی ہی ہے۔" یہ کہہ کر میں نے ماجدہ کو ساری بات بتا دی۔ آبی کا سارا پس منظر بھی میں نے اسے سمجھا دیا۔ ہریکے گاؤں کا سارا قصہ بھی میں نے اس کے گوش گزار کر دیا۔ جب وہ ساری بات سن چکی تو بولی۔ "اچھا تو اس ہادی علی کو آپ نے راہِ ہدایت دکھائی ہے۔ میں بھی کہوں آپ جیسا پہنچا ہوا بزرگ ادھر کیسے آ نکلا۔"

"اچھا تو آپ ہمیں پہنچا ہوا بزرگ سمجھتی ہیں؟"

"یہ بات تو ہے۔ پتہ ہے ادھر کیسا چکر چلا ہے سارے بازار بند ہو گئے جلسے ہوئے جلوس نکلے سارے شہر میں افراتفری مچ گئی۔ بڑی ہڑتال ہوئی وہاں، وہ کہتے تھے یہ سیاسی قتل ہے۔"

"بات تو یہی تھی مگر اب یہ آہو ہمیں خراب کر رہا ہے۔"

"میرا خیال ہے میں خود صبح جیل جا کر آپ کی بہن سے مل لیتی ہوں وہاں ایک لیڈی کانسٹبل میری جاننے والی ہے۔ میرے ساتھ پڑھتی رہی ہے وہ۔"

"ہاں آپ بیشک وہاں چلی جائیں ویسے آج ایک آدمی سے ہم ملنے جا رہے ہیں۔ آہو نے اس کے نام ہمیں ایک رقعہ دیا ہے۔"

"ٹھیک ہے آپ اُدھر سے ہو آئیں۔ ویسے میں اپنے طور پر آسیہ سے ضرور ملوں گی۔"

اچانک آبی دروازہ کھول کر باورچی خانے میں آ گیا۔

"میاں! اب ادھر آواز دے کر آیا کرو۔ سمجھے ہو کہ نہیں ادھر پردہ ہے یہ۔ وہ کیا کہتے ہیں انگریزی میں، ہاں یہ میری گرل فرینڈ ہیں۔"

"تیرے مزے ہیں استاد۔ مگر وہ گشتی ہوش میں آ گئی ہے اور شور مچانے کی خواہش کرتی ہے۔"

"کچلا کھلا دے یار، اس جل ککڑی کو۔ باندھ بھی دیا ہے اُسے کہ نہیں؟"

"باندھ تو دیا ہے بھائی مگر وہ دونوں اب تک نرم نہیں ہوئے ہیں۔"

"ہو جائیں گے۔ میں خود ذرا ان دونوں کی کپڑ چھان کروں گا تو سیدھے ہو جائیں گے وہ۔"

"وہ رقعہ ہے نا تیرے پاس؟"

"ہاں وہ تو میں نے جیب میں رکھ لیا ہے، یہ رہا۔"

"ٹھیک ہے اسے سنبھال کر رکھ۔ وہ آدمی ضرور ہماری مدد کرے گا۔ ٹھیک دو بجے ہم یہاں سے چل دیں گے۔"

"اب تو فکر کی کوئی بات نہیں ہے آبی۔ اب تو سارا معاملہ یہ بھی سنبھال سکتی ہیں۔"

"ہاں! مجھے یقین ہے کہ ہماری یہ بھابھی تم سے زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتی ہیں۔" آبی نے ماجدہ کو پہلی بار غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اس کا نام آبی ہے ماجدہ۔ اسلم آبی۔ ایسے جگری یار تو خوش بختی سے ہی ملتے ہیں۔ بڑا نصیب یاور ہو تو آدمی کو ایسا دوست میسر آتا ہے۔"

"ہاں وہ تو میں بھی دیکھ رہی ہوں۔ نتھا سنگھ اینڈ پریم سنگھ آر ون اینڈ دی سیم تھنگ۔"

"اچھا تو یہ بات ہے سن رہے ہو آبی ہم دونوں ان کی نظر میں نتھا سنگھ اینڈ پریم سنگھ ہیں۔"

"بہت اونچی شے معلوم ہوتی ہیں تمھاری یہ گرل فرینڈ!" یہ کہہ کر آبی باہر نکل گیا۔ وہ بہت کھل کر مسکرا رہا تھا۔ اس کے چہرے ہی سے عیاں تھا کہ اس نے ایسی بے باک عورت زندگی میں پہلی بار دیکھی تھی۔

ایک بجے کے قریب ہم کھانے سے فارغ ہو گئے۔ اس عرصے میں باٹی بھی ہوش میں آ چکا تھا مگر اس کو ہم نے ہاتھ نہیں لگایا۔ وہ بھی بڑے صبر و استقامت سے بندھا پڑا رہا۔ اپنے جکڑبند پر اس نے کوئی طبع آزمائی نہیں کی۔ آہو کی بیگم سروری پوری طرح ہوش میں آ چکی تھی۔ اور میں خوش تھا کہ اس نے موت کو شکست دے کر ہماری گردن پر ایک اور خون کا بوجھ نہیں ڈالا تھا۔ ورنہ ہم کیا کر لیتے۔ وہ مر تو گئی ہی تھی۔ اسی حالت میں اٹھا کر ہم رات کو اسے آہو کے لان میں دفن کر دیتے۔ یہی ہم نے طے کر رکھا تھا۔ مگر اب صورتِ حال بالکل بدل گئی تھی، اور اب آہو پہلے کی طرح زیادہ پریشان نہیں تھا۔

کھانے سے فارغ ہو کر ہم دونوں نے آہو کے ٹرنکوں میں سے دو جوڑے کپڑوں کے نکال کر پہن لیے۔ میرا اور آبی کا ڈیل ڈول آہو سے ملتا جلتا تھا اس لیے وہ کپڑے پہن کر ہمیں یہی محسوس ہوا کہ وہ اس نے ہمارے ہی لیے تیار کروائے تھے۔ اس کے پاس آٹھ شیروانیاں تھیں۔ ایک ایک نکال کر ہم نے پہن لیں اور وہ ہمیں سج بھی گئیں۔ میں نے سیاہ اچکن کا انتخاب کیا اور آبی نے فاختئی رنگ پسند کیا۔ اور اس طرح اپنے بدن کے تمام ولدّر دُور کر کے رحمان صاحب کے پاس جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ آبی نے سروری خانم کی ڈریسنگ ٹیبل سے اٹھا کر خوشبو کی آدھی شیشی میرے اوپر انڈیل دی اور آدھی اس نے اپنے کپڑوں میں جذب کر لی۔ اور یوں ہم شہر کے معززین کا حلیہ اپنا کر اور ماجدہ کو ضروری ہدایات دے کر آہو کے گھر سے روانہ ہو گئے۔ آنکھوں پر ہم نے آہو کی سیاہ عینکیں چڑھا لی تھیں اپنی شناخت کو زائل کرنے کے لیے میں نے آبی کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اپنی مونچھیں بھی رگڑ کر صاف کر دی تھیں اور اب میں بالکل نیا آدمی تھا۔ آہو کے بڑے دروازے پر ہم نے تالا ڈال دیا۔ اور پھر ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر رحمان صاحب کی طرف چل دیئے۔ ماجدہ کو میں نے سمجھا دیا تھا کہ اگر وہ کوئی خطرہ محسوس کرے تو فوراً پچھلے دروازے سے نکل کر کچی آبادی میں مجیدن کے گھر چلی جائے۔

سروری خانم سے جو نوٹ میں نے لیے تھے وہ اس رقم کے ساتھ جو میرے پاس پہلے سے موجود تھی میں نے ایک بریف کیس میں رکھ لیے تھے۔ میرا پستول بھی بریف کیس میں ہی رکھا تھا۔ آہو کا ٹیلیفون مجھے کاٹ دینا چاہیئے تھا مگر یہ بات مجھے اس وقت یاد آئی جب ہم بہت دور نکل چکے تھے۔

رحمٰن صاحب واقعی بہت بڑے افسر تھے۔ وہ نہر کے قریب جی او آر اسٹیٹ میں رہتے تھے۔ ان کی کوٹھی اپنی وسعت اور آرائش و زیبائش کے لحاظ سے اپنی مثال آپ تھی۔ زندگی کی ہر سہولت انھیں وہاں حاصل تھی۔ جب ہم نے ان کے دروازے پر دستک دی تو اس وقت سہ پہر کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔

کوٹھی کے دروازے پر پولیس کا ایک سپاہی متعین تھا اس نے ہم سے ہمارا نام پوچھا تو میں نے کہا۔
"میرا نام ابرار احمد ہے اور ان کا نام سیّد علی اکبر ہے رحمٰن صاحب سے کہیں کہ ہمیں دل شیر آہو صاحب نے بھیجا ہے۔"
سپاہی اندر گیا تو میں نے آبی سے کہا۔
"بھئی یاد رکھنا تیرا نام علی اکبر ہے اور میرا نام ابرار احمد۔"
"یہ بڑی مصیبت کی بات ہے یار۔ ذرا بھول چوک ہو گئی تو ستیاناس ہو جائے گا مسٹر ابرار احمد۔"
ہاں مائی ڈیر سیّد علی اکبر مگر کیا کریں یہ مصیبت تو جھیلنی ہی پڑے گی۔"
سپاہی جلدی سے واپس آگیا۔ ہمیں رحمٰن صاحب نے شرفِ باریابی عنایت کر دیا تھا۔ سپاہی نے کوٹھی کے اندر لے جا کر ہمیں ایک خوبصورت سے سجے سنورے کمرے میں بٹھا دیا۔ وہ کمرہ برآمدے کے سامنے ہی تھا اور رہائشی کمرے اس کے ساتھ ہی بنے ہوئے تھے۔
کمرے میں خاصا عمدہ قسم کا دبیز قالین بچھا تھا سُرخ رنگ کا۔ تینوں دیواروں کے ساتھ بڑے قرینے سے صوفے رکھے تھے جن کے سامنے شیشے سے مزیّن میزیں دھری تھیں۔ ان میزوں پر اعلیٰ قسم کے سگریٹ ڈبوں میں بند تھے۔ اور ان کے ساتھ سنگِ مرمر کی خوبصورت ایش ٹرے رکھی تھیں۔
وہاں بیٹھے ہمیں ابھی پانچ ہی منٹ گزرے تھے کہ ایک سُرخ و سفید رنگ کے صاحب کمرے میں داخل ہوئے قد ان کا چھ فٹ سے بھی اوپر نکل رہا تھا۔ وہ بہت خوبصورت قسم کا گاؤن پہنے ہوئے تھے۔ اور ان کے ہاتھ میں پائپ سُلگ رہا تھا۔ وہ بڑے کرّوفر سے آئے اور ہم سے علیک سلیک کے بعد ہمارے پاس ہی صوفے میں دھنس گئے۔ بولے۔
"آہو صاحب خود کیوں نہ آگئے؟ فون پر یہی بتا دیا ہوتا انہوں نے مجھے۔"
"خود تو وہ نہیں آئے۔ بس یہ رقعہ دیا ہے انھوں نے مجھے۔"
یہ کہہ کر میں نے آہو کا لکھا ہوا رقعہ رحمٰن صاحب کے ہاتھ میں دے دیا۔ انھوں نے سرسری نظر سے رقعہ پڑھا مگر پھر سنبھل کر بیٹھ گئے۔ اور ایک بار پھر بڑے غور سے رقعہ پڑھنے لگے۔ چند ہی سطریں تھیں اس میں مگر ان صاحب نے ایک بار نہیں کئی بار وہ رقعہ پڑھا۔ ان کے چہرے سے یوں ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ معمہ حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کے اس رویّے نے مجھے شش و پنج میں ڈال دیا۔ اس آہو نے تو صاف طور پر لکھا تھا کہ رحمٰن صاحب آپ حاملِ رقعہ کی بہن آسیہ کی رہائی کے سلسلے میں ان کی مدد کریں۔
"ہوں، کیا نام بتایا ہے آپ نے اپنا؟"
"میرا نام ابرار احمد ہے جناب۔"
"اور ان کا؟"
"یہ سیّد علی اکبر ہیں۔"
"ہوں۔ اس لڑکی سے کیا تعلق ہے آپ کا؟"
"وہ میری بہن ہے۔"
"مگر اس کے بھائی کا نام تو جیلانی ہے؟"
"جی ہاں۔ میں آسیہ کا خالہ زاد بھائی ہوں۔"
میں نے بے دھڑک ہو کر کہا۔ مجھے اپنی شناخت اس سے بہرحال مخفی رکھنی چاہیئے تھی۔
"جب یہ رقعہ آہو صاحب نے آپ کو لکھ کر دیا تو اس وقت وہ کہاں تھے؟" اس نے بڑا ہی بے ڈھب سوال پوچھا۔
"وہ... وہ اس وقت مال روڈ پر کار میں کہیں جا رہے تھے کہ میں نے انھیں روک لیا۔ انھوں نے وہیں کھڑے کھڑے یہ رقعہ لکھ دیا۔"
میں نے بات بنائی مگر مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بڑا ہی دروں بیں آدمی تھا۔ وہ پولیس کا پرانا گھاگ افسر تھا۔ سامنے مینٹل پیس پر رکھی اور پھر دیواروں پر لگی اس کی تصویروں سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ اس کا زیادہ وقت برسرِ اقتدار پارٹی کے بڑے بڑے رہنماؤں کے ساتھ گزرتا تھا۔ کئی تصویروں میں وہ گورنر کے پہلو بہ پہلو نظر آتا تھا۔
اس نے میرا یہ جواب سُنا تو مُسکرایا، یوں مُسکرایا جیسے اُسے میری بات پر اعتبار نہ آیا ہو۔ اس کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو دیکھ کر آبی بولا۔
"صاحب ہم آپ کے پاس بڑی آس لے کر آئے ہیں۔ جیلانی نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے اب آپ بھی اپنا وعدہ پورا کریں اور آسیہ کو رہا کروا دیں۔"
رحمٰن صاحب نے تیزی سے پہلو بدلا۔ بولے
"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔ جیلانی نے کون سا وعدہ پورا کیا ہے؟"
"وہی ہادی علی والا قصہ پاک کر دیا تھا اُس نے۔ اور وہ سب کچھ میرا خیال ہے آپ ہی کے کہنے پر ہوا تھا۔"
"میں تو اس قصے کو بالکل نہیں جانتا ہوں جناب بہرحال اگر جیلانی خود آتے تو میں اس سے بات کر سکتا ہوں۔"
"ہم آہو صاحب کا رقعہ لے کر آئے ہیں جس میں انھوں نے صاف طور پر لکھا ہے کہ آپ آسیہ کو رہا کروا دیں۔" آبی نے کہا

"وہ تو ٹھیک ہے مگر جیلانی کو خود آنا چاہیئے۔ اس کے بغیر میں کچھ نہ کر سکوں گا۔"
"یہ... یہ جیلانی ہی ہے جو آپ کے سامنے بیٹھا ہے۔ بڑے صاحب! اس نے اپنا نام آپ کو صحیح نہیں بتایا۔"
رحمٰن صاحب نے اس بات پر زبردست قہقہہ مارا، بولے۔
"میں پہلے ہی سمجھ چکا تھا کہ آپ دونوں میں سے ایک غلام جیلانی ہے۔ انھوں نے اپنی صورت اتنی بدل لی ہے کہ میں پہچان ہی نہ سکا۔ بہرحال اب بات ہو سکتی ہے آپ بیٹھیں میں ابھی فون پر معلوم کر کے آپ کو بتاتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گئے۔ دروازہ وہ اپنے پیچھے بند کرتے گئے۔
"تم نے اچھا نہیں کیا ہے آبی! مجھے یہ آدمی گھن چکر معلوم ہوتا ہے۔"
"کوئی حرج نہیں ہے جیلانی! ہمارا اور ان لوگوں کا راز ایک ہے۔ تم ان کے لیے بڑی زبردست اہمیّت کے آدمی بن چکے ہو۔ تم بڑی آسانی سے ان کا بیڑہ غرق کر سکتے ہو۔"
"وہ کس طرح؟"
"ان کی مخالف پارٹی کے کسی لیڈر کو صرف ٹیلیفون پر اصل بات بتا دینے سے ان کو تباہ کیا جا سکتا ہے۔ ہادی علی کا خون انھیں بہت مہنگا پڑے گا۔"
"مگر اسی وجہ سے تو یہ میری جان کے دشمن بن گئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اوپر سے انھیں یہی حکم ملا ہے کہ مجھے ختم کر دیا جائے اگر ایسا نہ ہوتا تو آہو مجھ پر اتنے خطرناک وار نہ کرتا۔"
"تم ٹھیک کہتے ہو یار۔ مگر اب ہم صحیح آدمی کے پاس آ پہنچے ہیں، یہ آدمی ہمارے ساتھ کوئی دھوکہ نہیں کر سکتا ہے۔"
"خدا کرے ایسا ہی ہو۔ مگر مجھے لگتا ہے کہ یہ بیل منڈھے نہیں چڑھے گی، اتنے معمولی کام کے لیے ان کا یہ لیت و لعل بالکل سمجھ میں نہیں آتا۔"
"مایوسی گناہ ہے بچے۔ ویسے لگتا ہے کہ یہ گھی واقعی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلے گا۔ یہ آدمی بہت چالاک نظر آتا ہے۔" آبی نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ میں نے بھی سگریٹ سلگا لیا اور ہم دونوں گہری سوچوں میں ڈوب گئے۔
ابھی پانچ منٹ ہی گزرے تھے رحمٰن صاحب کو کمرے سے باہر گئے ہوئے کہ ایک سپاہی قسم کا نوکر اندر داخل ہوا۔ بولا۔
"آپ کو صاحب نے دوسرے کمرے میں بلایا ہے۔"
ہم دونوں اٹھ کر اس کے ساتھ ہو لیے۔ کمرے سے نکل کر ہم ایک راہداری میں سے گزرے جب چوتھے دروازے پر پہنچے تو وہ ملازم رک گیا بولا۔ "ادھر آجائیے۔" یہ کہہ کر اس نے دروازہ کھولا اور ہمارے آگے آگے چل دیا۔ اس کمرے میں دو پلنگ بچھے تھے۔ وہ شاید رحمٰن صاحب کی خواب گاہ تھی۔ نوکر ہمیں اس کمرے سے گزار کر اگلے کمرے میں لے گیا۔ وہ کمرہ نسبتاً چھوٹا تھا اور قدرے تاریک بھی۔ ایک کمزور سا بلب وہاں جل رہا تھا۔ دیوار کے ساتھ چار کرسیاں پڑی تھیں جن کے سامنے ایک میز رکھی تھی۔ دائیں ہاتھ ایک الماری تھی جس میں کتابیں بھری ہوئی تھیں سامنے کی دیوار کے ایک کونے میں ایک نل لگا تھا جس کا پانی ایک بیسن میں سے گزرتا تھا۔ کمرے کا آدھا فرش ایک دری سے ڈھنپا ہوا تھا معلوم یہ ہوتا تھا کہ وہ رحمٰن صاحب کا مطالعے کا کمرہ ہے۔ اس کا ایک دروازہ دوسری طرف کھلتا تھا مگر اس وقت وہ بند تھا۔ روشنی اس کمرے میں صرف روشندان کے ذریعے اندر آرہی تھی۔
"آپ یہاں بیٹھیں جناب! صاحب ابھی ادھر آتے ہیں۔"
نوکر نے ہمیں کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا اور خود تیزی سے باہر نکل گیا۔ دروازہ اس نے بڑے مودبانہ انداز میں اپنے پیچھے بے آواز بند کیا۔ ابھی ہم کرسیوں پر بیٹھے بھی نہیں تھے کہ ہمیں دروازے پر باہر سے چٹخنی گرنے کی آواز سُنائی دی۔ میں تیزی سے اس کے پیچھے لپکا مگر اس وقت تک وہ سپاہی نما نوکر باہر سے چٹخنی لگا کر جا چکا تھا۔ آبی نے میرے چہرے پر پھیلتی پریشانی کو بھانپتے ہوئے کہا۔
"یار گھبرا نہ جایا کر۔ بیٹھ جا اِدھر۔ وہ رحمٰن صاحب ابھی آتے ہی ہوں گے، ہمیں کھا نہیں جائیں گے وہ۔"
"تو نہیں سمجھ سکا ہے آبی! ہم ان کے نرغے میں آگئے ہیں آہو کا وار چل گیا ہے۔" میں نے دوسرا دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر وہ بھی باہر سے بند تھا۔ کمرے میں ہوا اور روشنی کا صرف ایک ہی راستہ تھا اور وہ تھا روشندان مگر وہ بھی بہت بلند تھا اور تنگ اتنا تھا کہ اس میں سے کسی آدمی کا گزر جانا کسی طرح بھی ممکن نہیں تھا۔ آبی ابھی تک بالکل مطمئن تھا اور ایک عجیب سے احساسِ بے نیازی سے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر سگریٹ پھونکنے لگا تھا۔ میں بھی اس کے قریب بیٹھ گیا۔ مگر اس طرح کہ میرا سارا وجود مضمحل ہوتا جا رہا تھا۔ دم بدم مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ موت اپنا حلقہ ہمارے گرد تنگ کرتی جا رہی ہے۔ وہ چاروں طرف سے ہمیں گھیر چکے تھے اور اس چھوٹے سے کمرے کی دیواریں مجھے قبر کی طرح لمحہ بہ لمحہ سکڑتی محسوس ہو رہی تھیں۔
میرا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔ رحمٰن صاحب کا کہیں کوئی پتہ نہیں تھا۔ میں نے آبی کو بازو سے پکڑ کر جھنجوڑ دیا۔ وہ تیزی سے میری طرف جھکا اور بولا۔
"یار کہیں ہم پھنس تو نہیں گئے ہیں! وہ کُتّے کی دم دیس

کیوں نہیں آیا ہے ابھی تک —

آبی اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ بریف کیس اس کے ہاتھ میں تھا ابھی وہ دروازے تک پہنچا بھی نہیں تھا کہ مجھے چٹخنی گرنے کی آواز سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی دروازہ کھل گیا۔ مگر اس طرح کہ دو سپاہی بندوقیں تانے اندر گھس رہے تھے۔ آبی کا پستول ابھی تک اس کی شیروانی کے نیچے بند تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ رحمٰن صاحب ہمیں یوں بے بس کر دیں گے۔ میں بھی ابھی تک اتنا مایوس نہیں ہوا تھا کہ گھبرا کر پستول اپنے بریف کیس سے نکال لیتا۔ مگر ان دو سپاہیوں نے ہمیں ایک دم چت کر کے رکھ دیا۔ انھوں نے آتے ہی ہمیں بندوقوں کی زد میں لے لیا۔ ایک نالی کا رخ میرے سینے کی طرف تھا اور دوسری کا آبی کی سمت — ہم دونوں سن ہو کر کرسیوں میں دھنس گئے۔

"یہ — یہ کیا قصہ ہے؟ کیا چاہتے ہو تم؟"

"میں بتاتا ہوں پتر دا، کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔" یہ بات کہتے ہوئے رحمٰن صاحب اندر آ گئے۔ اب کی بار ان کے ہاتھ میں پستول تھا۔ سیدھے ہاتھ میں اور الٹے ہاتھ میں انہوں نے آہو کا وہ رقعہ پکڑ رکھا تھا جو ہم نے انہیں لا کر دیا تھا۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا رحمٰن صاحب! مہمانوں سے یہ سلوک کیا جاتا ہے آپ کے ہاں!"

"جی ہاں آپ نے آہو صاحب سے جو سلوک کیا ہے وہ بھی آپ کو یاد ہو گا۔"

"وہ ہمارے قابلِ احترام دوست ہیں۔ ہم نے ان کے ساتھ ہمیشہ دوستوں کا سا سلوک کیا ہے۔"

"ہوں، دوست ایسے ہی ہوتے ہیں — آپ نے یہ رقعہ اُن سے حبس تشدد کے ذریعے... لکھوایا ہے اس کی ساری روئیداد اس میں آہو صاحب نے درج کر دی تھی۔"

"کیا فرماتے ہیں آپ رحمٰن صاحب! خدا کے لیے یہ مذاق بند کریں ان سپاہیوں کو یہاں سے ہٹا دیں۔"

"ہٹا دیں گے، ان کو بھی ہٹا دیں گے مگر اس وقت جب آپ ہٹ جائیں گے..." یہ کہہ کر رحمٰن صاحب نے وہ رقعہ میرے منہ کے سامنے کر دیا۔ بولے —

"میں آہو صاحب کے گھر چار بار فون کر چکا ہوں۔ پہلی بار وہاں سے ایک عورت نے ریسیور اٹھایا مگر اپنا نام اور نمبر نہیں بتایا۔ جب میں نے کہا کہ آہو صاحب کا گھر یہی ہے تو اس نے کہا کہ نہیں یہاں کوئی آہو صاحب نہیں رہتے اور فون بند کر دیا پھر اس نے ریسیور کریڈل سے اتار دیا کیونکہ میں اب تک تین بار فون کر چکا ہوں مگر وہ مصروف مل رہا ہے۔ میں نے ایکسچینج سے بھی پوچھا ہے وہ کہتے ہیں کہ ریسیور کریڈل سے اترا ہوا ہے اب میں نے تھانے والوں سے کہا ہے کہ وہ جا کر معلوم کریں کہ آہو صاحب کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔ بہتر یہ ہو گا کہ آپ ہمیں ساری بات خود ہی بتا دیں۔"

"میرا خیال درست نکلا۔ آپ کی طبیعت واقعی ٹھیک نہیں ہے رحمٰن صاحب آپ کو پاگل خانے ضرور جانا چاہیے — آہو صاحب کے صاف ستھرے رقعے میں بھی آپ کو فریب نظر آتا ہے!"

"ہاں جی! یہ لفظ یہ الف جیم لام تے" اجلت" کس بات کی خبر دیتے ہیں۔ آہو صاحب جیسا پڑھا لکھا آدمی عجلت کو اجلت کبھی نہیں لکھ سکتا ہے۔ یہ لفظ موت کی سی حالت کی خبر دیتے ہیں۔ اس میں آہو صاحب نے میرے نام جو پیغام بھیجا ہے وہ میں نے پڑھ لیا ہے جب تک آہو صاحب مجھے نہیں مل جاتے ہیں میں آپ کو یہاں سے نہیں جانے دوں گا۔" یہ کہہ کر رحمٰن صاحب رقعہ تہ کر کے جیب میں رکھتے ہوئے باہر نکلنے لگے پستول ابھی تک اُن کے سیدھے ہاتھ میں تھا اور دونوں سپاہی سامنے کی دیوار کے ساتھ ہم پر بندوقیں تانے کھڑے تھے۔

وہ رقعہ جو ہم نے آہو صاحب سے اپنی بہتری کے لیے لکھوایا تھا ہمارے لیے موت کا پیغام بن گیا تھا۔ رحمٰن صاحب باہر نکلے تو وہ سپاہی بندوقوں کا رخ ہماری طرف کیے ہوئے الٹے پاؤں دروازے کی طرف بڑھے۔ دونوں کندھے سے کندھا ملا کر چل رہے تھے۔ ہم ایک ایک کر کے اپنے سارے پتے ہار چکے تھے۔ ایک سپاہی تو ایسا بدصورت تھا کہ اس کے چہرے پر ترخ ترخ نور برستا نظر آتا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اس کے پیٹ میں گھونسا مار کر اس کا پوٹا پھاڑ دوں۔ دوسرا مجھے پشاوری پٹھان نظر آتا تھا۔ دونوں بے حد خونخوار نظر آتے تھے۔ رحمٰن صاحب دروازے کے باہر کھڑے تھے تاکہ وہ سپاہی باہر نکلیں تو وہ اپنے سامنے دروازہ بند کروا دیں۔

اچانک آبی نے فلک شگاف چیخ ماری اور کرسی پر سے دھڑام کر کے نیچے گر گیا۔ دونوں سپاہی شدید ذہنی ابتری میں اس کی طرف بڑھے۔ دونوں اپنا فرض ایک لمحے کے لیے بھول گئے تھے۔ میں نے ایک ثانیے کے ہزارویں حصے میں اٹھ کر دونوں کی بندوقیں یکجا کر کے نالیوں کے قریب سے دبا کر بغل میں لیں، اور اس یوسفِ ثانی کی گردن مسل دی وہ گرنے لگا تو میں نے دوسرے کی گردن دبا دی۔ دونوں کے ہاتھوں سے بندوقیں چھوٹیں تو میں نے سامنے کھڑے رحمٰن صاحب پر انھیں گرا دیا۔ وہ دھڑام سے ان پر جا پڑے تو انھوں نے سراسیمہ ہو کر گولی چلا دی مگر وہ گولی پتہ نہیں کہاں لگی، اس کی سمت کا اندازہ نہیں ہوا کیونکہ وہ اُن

دونوں کے ساتھ ہی زمین پر جا پڑے تھے۔ میں نے انھیں دوسری گولی کی مہلت نہیں دی۔ دروازے سے نکلتے ہی میں نے پاؤں کی ٹھوکر ان کے اٹھتے ہوئے ہاتھ پر ماری تو پستول ان کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا۔ آبی بریف کیس اٹھا کر میرے پاس آ کھڑا تھا اور اپنا پستول اس نے سیدھے ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔ میں نے لپک کر رحمٰن صاحب کا پستول اٹھا لیا۔ اب ہم دونوں مسلح تھے۔

آبی نے رحمٰن صاحب کو ان کے خوبصورت بالوں سے پکڑ کر اوپر اُٹھایا اور بولا —

"چل باؤ "مانے" آگے چل پتر! تیرا حساب تو ہم باہر جا کر کریں گے۔" یہ کہہ کر اس نے رحمٰن صاحب کے پیٹ میں کچھ اتنے زور سے گھٹنا مارا کہ وہ بےچارے دوہرے ہو گئے مگر آبی نے انہیں نیچے نہیں گرنے دیا۔

اچانک سامنے کا دروازہ کھلا اور دو لڑکیاں تنگ پتلونوں میں ملبوس بڑی افراتفری کے عالم میں اندر آئیں ان کے رنگ اُڑے ہوئے تھے مگر اس زردی میں بھی بلا کا حسن تھا۔

"کیا ہوا۔ کیوں پکڑا ہے تم نے ہمارے ڈیڈی کو؟"

ان کا لب و لہجہ خاصا یورپی معلوم ہوتا تھا۔ اردو وہ یوں بولتی تھیں جیسے انگریزی میں گفتگو کر رہی ہوں۔ میں تو اُن کے صحیح اندازِ تکلم کو دہرا بھی نہیں سکتا۔

آبی سخت تپا ہوا تھا۔ اس نے ایک موٹی سی گالی ان کے ڈیڈی کو دی۔ یہ موٹی سی گالی دے کر اس نے رحمٰن صاحب کو ان لڑکیوں کی طرف لڑھکا دیا۔ بےچارے ایئرکنڈیشنڈ کمروں میں قوم کے گدوں پر بیٹھ کر عوام پر حکومت کرنے والے رحمٰن صاحب سخت نڈھال ہو چکے تھے۔ کٹے درخت کی طرح فرش پر ڈھیر ہو گئے۔ حالت ان کی یہ تھی کہ آبی کی مار نے ان کا جوڑ جوڑ ہلا دیا تھا لڑکیاں چیختی ہوئی اُن پر جھکیں تو ہم دونوں کمرے سے نکل کر راہداری سے ہوتے ہوئے لان میں جا پہنچے۔ رحمٰن صاحب کی کوٹھی پر دو ہی مسلح سپاہی موجود تھے وہ دونوں انھوں نے ضائع کر دیے تھے، البتہ وہ سپاہی نما نوکر ابھی بچا ہوا تھا اگر وہ ہمیں مل جاتا تو ہم اس کو بھی کدو کش کر دیتے۔ ہم سخت تپے ہوئے تھے مگر وہ شاید کہیں بھاگ چکا تھا۔ ہو سکتا ہے اسے رحمٰن صاحب نے کسی کام سے باہر بھیج دیا ہو۔ لان میں سے گزر کر ہم کوٹھی کے بڑے گیٹ سے باہر نکلے اور ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر اسی وقت راوی روڈ پہنچے۔ آہو کے مکان سے بہت پیچھے ہم نے گاڑی چھوڑ دی اور صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لیے اس کے مکان کے پچھلے چھوٹے دروازے کی طرف بڑھے جب ہم تنگ سی گلی میں سے گزر کر وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ ہمارے بدترین خدشے درست ثابت ہو چکے تھے۔ آہو کے مکان کے عقب کی کھڑکیاں کھلی تھیں اور ایک کھڑکی میں دو سپاہی نظر آئے وہ ارد گرد کے حالات کا اندازہ لگا رہے تھے۔ آبی کو میں نے کھینچ کر پیچھے ہٹایا۔ وہ ایسا ظالم تھا کہ ان سپاہیوں کو دیکھ کر اور تیزی سے آہو کے مکان کی طرف بڑھنے لگا تھا۔

"ابے بھوندو! وہ دیکھ تیرے سالے کھڑے ہیں اُوپر — انھوں نے تجھے پہچان لیا تو ایک ایک رات کے پیسے کھرے کر لیں گے تجھ سے — جوتے کی نوک پر پوچھیں گے کہ "چن کتھے گزاری آئی رات دے..."

"بہت بُرا ہوا یار، وہ تیری گرل فرینڈ تو خواہ مخواہ ماری گئی۔ وہ تو اسے پکڑ چکے ہوں گے۔"

"تو اس کی فکر نہ کر، میں اسے سلور داؤ سمجھا آیا تھا چل آ ادھر۔ دیکھتا ہوں وہ کہاں گئی ہے۔" یہ کہہ کر میں نے اسے موڑ کر دوسری راہ پر لگا دیا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم اس بستی سے نکل کر کچی آبادی میں جا پہنچے۔ مائی حاجاں کا گھر میری منزل تھا۔

"یار وہ سردری... وہ بھی تو زندہ ہو گئی تھی سالی — وہ اگر مر گئی ہوتی تو ایک بات تھی۔"

"وہ تو پولیس کو وہاں دیکھ کر پائینچے سے نکل نکل باہر آتی ہو گی بھائی میاں! بڑا تنتنا ہے اس عورت میں۔ وہ تو مجھے بھی لے ڈوبی تھی۔" میں نے آبی کے ساتھ ریلوے لائن عبور کرتے ہوئے کہا۔ آہو کا گھر بہت پیچھے رہ گیا تھا۔

میں دعا مانگ رہا تھا کہ ماجدہ ان شتر غمزوں کے ہاتھ سے بچ کر مجیدن کے گھر پہنچ گئی ہو۔ ماجدہ میری زندگی کے تمام دردیلے حصوں پر بنفشیں بن جاتی تھی۔ اس کی سلامتی میرے لیے بے حد ضروری تھی۔

"یہ تو اب جا کہاں رہا ہے؟"

"بس چلا آ میرے ساتھ آبی! مجھے افسوس ہے میرے ساتھ آج تجھے بھی خواہ مخواہ خوار ہونا پڑ رہا ہے۔"

"بدھیاں نہ ڈال میرے یار! ذلیل نہ کر مجھے، تیرے جیسا جی دار تو میں نے آج تک نہیں دیکھا ہے جیلانی۔ تو کہے تو میں تیری خاطر آگ میں کود جاؤں۔" آبی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم مائی حاجاں کے دروازے پر جا پہنچے۔

وہ نیا دروازہ تھا جس پر اس نے سبز رنگ پھیر رکھا تھا۔ مکان کی حالت پہلے سے بہت بہتر تھی۔ مائی حاجاں کو زندگی سے محبت ہو گئی تھی۔ اسے پھر سے جینے کا ڈھنگ آ گیا تھا۔ میں نے دستک دی تو آبی بولا۔

"یہاں کون رہتا ہے تیرا؟"

میں نے اسے مجیدن کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

"یہاں میری بہن رہتی ہے مجیدن۔" میں نے زور دے کر کہا۔

دوسری دستک پر دروازہ کھل گیا۔ سامنے مجیدن کھڑی تھی۔۔۔ مجھے دیکھتے ہی وہ مسکرا دی۔ بولی۔

"اوہ بھیا آپ! اندر آ جائیں، آپ ہی کا ذکر ہو رہا تھا۔" اتنے میں مائی حاجاں بھی صحن میں آ گئی۔ مجیدن نے ہمارے پیچھے کھٹ سے دروازہ بند کیا تو مائی نے آگے بڑھ کر میرے سر پہ ہاتھ پھیرا۔

"جی صدقے میرا پتر آیا۔ اری ماجداں، لے اب منہ میٹھا کرا میرا۔"

اس کی آواز سنتے ہی ماجدہ کوٹھری کے دروازے پر نمودار ہوئی۔ وہ ابھی تک بُرقعے میں لپٹی تھی۔ بولی۔

"اچھا ہوا آپ آ گئے۔ میں تو بڑی مشکل سے بچی ہوں اُن موذیوں سے۔"

"یہ میری ماں کا گھر ہے ماجدہ! مجھے معلوم تھا یہاں آپ کو پناہ مل جائے گی۔" میں نے آبی کے ساتھ کوٹھری میں گھستے ہوئے کہا۔ کوٹھری میں اب وہ پہلے ایسی اُپلوں، سرسوں کے تیل اور مٹی کے تیل کی بدبو کے بھبکے نہیں اُٹھ رہے تھے۔ وہاں کی فضا بہت صاف تھی۔

ہم دونوں ایک چارپائی پر جا بیٹھے تو ماجدہ۔۔۔۔۔ اور مجیدن اپنی ماں کے ساتھ سامنے کی چارپائی پر جا بیٹھیں۔۔۔ بچے دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے۔ ماجدہ کی نظریں مجھ پر جمی تھیں۔

"آپ وہاں سے کس طرح نکلیں؟"

میری یہ بات سن کر وہ مسکرائی۔ کہنے لگی۔ "پہلے تو مجھے ٹیلیفون نے پریشان کر دیا کوئی آدمی بہت رعب سے پوچھ رہا تھا کہ یہ آہو صاحب کا مکان ہے؟ میں نے کہہ دیا کہ یہ ان کا گھر نہیں ہے۔ پھر دوبارہ فون آیا، وہ میں نے نہیں اٹھایا۔ اس کے بعد میں نے ریسیور اُٹھا کر الگ رکھ دیا۔ کوئی ایک گھنٹے بعد پولیس کی گاڑی بنگلے کے سامنے آ ٹھہری میں نے نیچے جا کر ان کو دروازے میں لگے شیشے میں سے دیکھ لیا تھا۔

"اچھا؟ وہ عدسہ بھی لگا ہے وہاں۔"

"ہاں! اس شیشے میں سے انھیں دیکھتے ہی میں نے۔" سنبھالا اور آپ کے بتلائے ہوئے راستے سے ہو کر میں پچھلے دروازے سے نکلی اور ریلوے لائن کراس کر کے ادھر آ نکلی۔ اماں نے آپ کا نام سنتے ہی مجھے یہاں چھپا لیا تھا۔ میں آپ کی چیزیں ساتھ لے آئی ہوں اس اٹیچی کیس میں رکھ کر۔"

"یہ بہت اچھا کیا ہے آپ نے، مجھے یہی اُمید تھی کہ اماں آپ کے لیے سب کچھ کرے گی۔"

"ہائے بچہ میں تو تم پر اپنی جان بھی وار سکتی ہوں۔ میں تو اکیس تاریخ کا انتظار کر رہی تھی کہ تم اس دن ضرور آؤ گے۔ میں نے مجیدن کے بیاہ کی وہی تاریخ مقرر کی ہے جو تم نے تجویز کی تھی۔"

"تم نے بہت اچھا کیا ہے اماں۔۔۔ میں اکیس تاریخ کو ضرور آؤں گا۔"

"اب کیا کرنا ہے مجھے تو سخت خوف محسوس ہو رہا ہے۔" ماجدہ نے کرک بھرے لہجے میں کہا۔ وہ بچاری مجھے ملنے آئی تھی۔ ڈری ہوئی فاختہ کی طرح وہ میری جھولی میں اتری تھی مگر اسے آتے ہی ایسے اندوہناک حالات کا سامنا کرنا پڑا تھا کہ وہ پہلے ہی مرحلے میں لرز کر رہ گئی تھی۔ میرے خلاف تقدیر کی کلوخ اندازی کسی طرح تھمنے میں ہی نہیں آ رہی تھی۔۔۔ اب وہ بھی اس کی زد میں آ گئی تھی۔ یہی حال آبی کا تھا اور سخت پریشان تھا۔

"کیا خیال ہے آبی ہمیں ابھی یہاں سے نکل چلنا چاہیے۔۔۔ وہ آہو ادھر کا راستہ بھی جانتا ہے۔"

"ہاں جلدی نکل چلو۔ یہاں ٹھہرنا کسی طرح بھی ٹھیک نہیں ہے۔" اس نے بریف کیس میرے ہاتھ میں تھما کر اُٹھتے ہوئے کہا۔

"کہاں چلے ہو؟"

"مجھے غسل خانہ دکھاؤ۔"

"چل بیٹے میں دکھاتی ہوں۔" یہ کہہ کر حاجاں آبی کے ساتھ صحن میں نکل گئی۔ مجیدن کی آنکھیں چمچما رہی تھیں۔ آبی باہر گیا تو وہ بولی۔

"بھیا آپ اکیس تاریخ کو آئیں گے؟"

"ہاں بہنا میں ضرور آؤں گا اور اگر نہ آ سکا تو یہ پیسے رکھ لو میری طرف سے اچھے اچھے کپڑے خرید لینا، سمجھنا کہ میں خود موجود ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے بریف کیس کھول کر اس میں سے دو ہزار روپے نکالے اور مجیدن کے ہاتھ پر دھر دیئے۔ اتنے میں مائی حاجاں اندر آ گئی۔ اس نے وہ نوٹ دیکھے تو بولی۔

"یہ کیا کر رہے ہو بیٹا۔ پہلے تیرے احسان کوئی کم ہیں، ہم پر۔"

"ہاں یونہی ذلیل کرتی رہو اماں اپنے بیٹے کو۔ یہ لو پانچ ہزار روپیہ تم رکھ لو، میں نہ آیا تو یہ تیرے کام آئے گا۔" یہ کہہ کر میں نے اسے پانچ ہزار روپے تھما دیے۔ اس نے وہ نوٹ تو لے لیے مگر اس کے چہرے پر زردی سی کھنڈ گئی۔ وہ بے جان سی ہو کر زمین پر بیٹھ گئی بولی۔

"میں تیرا کس منہ سے شکریہ ادا کروں بیٹے، تو نے مجھ بیوہ کے بچوں کو مرنے سے بچا لیا ہے۔ میں تیرے یہ احسان کیسے اتار سکوں گی؟"

"مجھے غصّہ نہ دلایا کر اماں ایسی باتیں کر کے۔" میں نے طیش

سے کہا اور بریف کیس بند کر کے گود میں رکھ لیا۔ وہ میرے لہجے کی کاٹ کو محسوس کر کے چپ ہو گئی اور مجیدن کے ہاتھ سے نوٹ لے کر اس نے ساری رقم ٹرنک میں رکھ دی۔ بولی۔

"اُٹھ مجیدن ان کے لیے کھانا تیار کر۔"

"بس اماں بس ہم جا ہی رہے ہیں۔ ہم یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتے۔ حالات ٹھیک نہیں ہیں۔۔۔ چل بھئی آبی، تو ادھر ہی غٹ ہو کر بیٹھ گیا ہے۔" میں نے آبی کو آواز دی۔ وہ جلدی ہی باہر آ گیا۔ مجیدن نے اس کے ہاتھ دھلائے تو وہ تولیے سے انھیں خشک کر کے اندر آ گیا۔ بولا۔

"چلو بھئی۔ یہ مصیبت تو ٹلی، اب بھاگ نکلو یہاں سے۔ اُدھر وہ آہو پیٹک پیا کر رہا ہوگا۔"

"اٹھیں ماجدہ!" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے چارپائی سے اُٹھا دیا۔

"بھیّا یہ ہماری بھابی ہیں نا؟" مجیدن نے پوچھا۔

"شٹ اَپ! یہ تو بھابی سے بھی کہیں اونچی ہیں۔ تمہارے لیے۔۔۔ سمجھ لو تمہارے بھیّا کی سب سے بڑی ہمدردی ہیں۔" میں نے مجیدن کے گال تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ وہ کچھ نہ سمجھنے کے باوجود کھل ہی تو اُٹھی۔

"انھیں پھر کسی وقت یہاں ضرور لائیے بھیا۔" وہ ماجدہ کے کندھے پر لٹک سی گئی۔

ماجدہ اس کی باتیں سن کر بہت سنجیدہ ہو گئی تھی۔ اس نے مجیدن کے ہاتھ کندھے پر سے ہٹا دیے اور تیز تیز قدم اُٹھاتی صحن میں جا نکلی۔ اٹیچی کیس اس نے ساتھ لے لیا تھا۔

ہم ان لوگوں سے رخصت ہو کر اسی وقت دوسری طرف چل نکلے تھے۔ بڑی سڑک پر پہنچتے ہی ہمیں ٹیکسی مل گئی اور ہم اس میں سوار ہو گئے۔

"چل بھئی ادھر لے چل ہمیں شیخوپورہ۔"

شیخوپورہ کا نام سنتے ہی ڈرائیور بدکا، بولا۔

"سو روپیہ کرایہ لوں گا جناب! اُدھر سے واپسی پہ کوئی سواری نہیں ملتی ہے۔"

"سو ہی دے دیں گے میرے یار۔ پیسہ کیا چیز ہے تیری محبت کے سامنے۔ چل میرے ویر۔" آبی نے اسے تسلی دی۔ ڈرائیور راضی ہو گیا اور شیخوپورہ جانے کے لیے راوی کے نئے پل کی طرف چل دیا۔ آبی اگلی سیٹ پہ بیٹھا تھا اور ماجدہ میرے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی تھی۔

ہمیں اپنے نئے اقدام کے لیے اطمینان سے بیٹھ کر سوچنے کے لیے کسی موزوں جگہ کی تلاش تھی اور آبی نے وہ جگہ سوچ کر ہی ٹیکسی کا رُخ شیخوپورہ کی طرف پھیر دیا تھا۔

ابھی ہم راوی روڈ عبور نہ کر سکے تھے کہ ماجدہ بولی۔ "جس کام کے لیے آپ پریشان ہو رہے ہیں اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ لاہور میں قیام فرمائیں جناب عالی!" اس کے لہجے کی شوخی عود کر آئی تھی۔

"آپ بجا فرماتی ہیں ملکۂ عالیہ مگر کہاں؟" میں نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

"آپ ادھر چوبرجی کی طرف گاڑی موڑ لیں۔"

"مگر کہاں؟" میں نے اپنا سوال دہرایا۔ وہ اپنا منہ میرے کان کے قریب لا کر بولی۔

"وہاں میری ایک پرانی سہیلی رہتی ہے اسکول میں پڑھایا کرتی تھی وہ۔ بوڑھی عورت ہے اور بال بچے دار ہے مگر بیوہ ہو چکی ہے۔۔۔ وہاں ہم جب تک چاہیں رہ سکتے ہیں۔ بڑی جگہ ہے اس کے پاس۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم ادھر ہی چلتے ہیں۔ شہر سے باہر جا کر تو ہم کچھ بھی نہ کر سکیں گے۔ ارے بھائی پائلٹ صاحب، جہاز کا رُخ چوبرجی کی طرف موڑ لو۔"

"کیوں؟ ادھر کیا ہے؟" آبی نے حیران ہو کر پوچھا۔

"میرا ایک دوست رہتا ہے وہاں۔ ہم اس کے گھر جا ٹھہریں گے باہر جا کر تو ہم کچھ بھی نہ کر سکیں گے۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ چل بھئی ادھر لے چل چوبرجی کی طرف۔"

ڈرائیور نے آبی کا دوسرا حکم سن کر گاڑی کا رخ چوبرجی کی طرف موڑ لیا۔ ماجدہ ہمارے اس فیصلے پر بہت خوش ہوئی۔ آبی بہت اُلجھا ہوا تھا۔ بولا

"یار، یہ پڑھے لکھے لوگ تو بہت ہی خطرناک ہوتے ہیں اس آہو نے تو مروا دیا تھا ہمیں۔"

"اس نے وہ رقعہ نہیں لکھا تھا بلکہ ہماری موت کا پروانہ لکھ دیا تھا۔"

"اس نے وہ کیا لفظ لکھا تھا؟"

"عجلت، مگر عین کے بجائے اس خبیث نے الف لکھ کر ہمارا بیڑہ غرق کر دیا۔ وہ رحمٰن صاحب بھی بہت تیز نکلے۔۔۔ فوراً پہچان گئے۔"

"میرا تو وہیں دم نکل گیا تھا۔ دیکھا نہیں تھا تم نے؟ رقعہ اس نے کوئی چھ بار پڑھا تھا۔ بس اسی لفظ نے اسے ساری بات بتا دی۔"

"آج تو کوئی نذر نیاز دینی پڑے گی اُستاد! اس آہو نے ہمیں زبردست مصیبت میں پھنسا دیا تھا۔"

"مگر ہم اب جا کہاں رہے ہیں، کوئی ڈھنگ کی جگہ ملنی چاہیے

میں۔ میرا تو دماغ خراب ہو رہا ہے۔" آبی نے ماجدہ کو۔۔۔۔ غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ فکر نہ کریں بھائی جان! وہاں ہر طرح کا آرام ملے گا۔"

"آپ کی مہربانی ہے ورنہ آرام نام کی تو ہماری زندگی میں کوئی شے باقی نہیں رہی۔"

میں نے آبی کو آنکھ کے اشارے سے خاموش رہنے کے لیے کہا۔ ڈرائیور ہماری باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا۔

ماجدہ کے بتلائے ہوئے راستے پر چلتے ہوئے ہم چوبرجی کے پیچھے شالامار کالونی میں جا پہنچے۔

ڈرائیور کو فارغ کر کے جب ہم گاڑی سے اترے تو ماجدہ نے اٹیچی کیس فوراً اٹھا لیا جس میں اس نے ہماری چیزیں بند کر رکھی تھیں۔ میری اسٹین گن بھی اسی میں تھی۔ میں نے چاہا کہ وہ اٹیچی کیس میں خود اٹھاؤں مگر ماجدہ نے مجھے منع کر دیا۔ دبی زبان میں وہ بولی۔

"یہ بہت اہم اٹیچی کیس ہے جناب! میں اس کے سلسلے میں اس وقت اپنے باپ پر بھی اعتماد نہیں کر سکتی۔"

"اچھا؟ کوئی ایٹم بم بند کر رکھا ہے تم نے اس میں؟"

"بس یونہی سمجھ لیں۔ گھر جا کر میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گی تو آپ بس دیکھتے ہی رہ جائیں گے۔" وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔

ماجدہ کی سہیلی کا گھر زیادہ دور نہیں تھا۔ ٹیکسی سے اتر کر ہم ایک گلی میں گھسے تو ماجدہ ایک ایسے مکان کے سامنے رک گئی، جس کی تعمیر مکمل نہ ہو سکی تھی۔

اس کی سہیلی کا نام حمیدہ تھا۔ دستک دینے پر وہ دروازے پر آئی تو مجھے محسوس ہوا کہ میرے سامنے ایک مکمل منہدم وجود کھڑا ہے۔ کسی زمانے میں وہ بہت ہی خوبصورت عورت ہوگی مگر اب اس کی شکستگی دیدنی تھی۔ اس کے چہرے پر کچھ ایسا حزن و ملال طاری تھا کہ میں بس اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ ماجدہ کو دیکھ کر۔۔۔ ایک پھیکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر ابھری۔ اس نے اپنی عینک کا زاویہ درست کیا اور بولی۔

"بڑے اچھے وقت پر آئی ہو ماجدہ۔ آؤ اندر آ جاؤ۔ یہ کون ہیں تمہارے ساتھ؟"

"یہ میرے بھائی جان ہیں اور یہ ان کے دوست ہیں۔" ماجدہ نے پہلے آبی کا اور پھر میرا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

حمیدہ ایک طرف ہٹ گئی تو ہم تینوں اندر داخل ہو گئے وہ ہمیں دائیں ہاتھ کے کمرے میں لے گئی۔ اس کمرے کی ویرانی دیکھ کر میرا دل بجھ سا گیا۔ مفلسی نے ہر شے کو اپنے بے رحم پنجوں میں دبوچ رکھا تھا۔ کمرے کے ایک حصے میں دو جھلنگا سی چارپائیاں پڑی تھیں۔ دائیں ہاتھ چار کرسیاں تھیں مگر ان کا بھی یہ عالم تھا کہ ان پر بس کرسیاں ہونے کا الزام ہی تھا ورنہ ان پر بیٹھنا ممکن نہ تھا۔ بائیں ہاتھ کونے میں ایک پرانی وضع کی میز رکھی تھی جس پر کچھ پرانی کتابیں کاپیاں بچوں کے میلے کپڑے چائے کی پیالیاں اور ایک پھٹا ہوا تکیہ اور ایک بے رنگ سا گلوب اور اسی قسم کی کئی اور چیزیں رکھی تھیں۔

حمیدہ اپنے گھر کی اس ویرانی پر شرمندہ نظر آتی تھی۔ اس نے چارپائیاں گھسیٹ کر کمرے کے وسط میں کر دیں۔

"تشریف رکھیں۔ مجھے افسوس ہے کہ۔۔۔۔۔" کہہ کر وہ تیزی سے دوسرے کمرے میں جا گھسی۔ ادھر سے کسی بچے کے رونے کی آواز ابھری تھی۔ ماجدہ نے ہمارے چہروں پر پھیلے تکدر کو دیکھا تو بولی۔

"یہ بیچاری بہت ہی غریب عورت ہے جیلانی صاحب مگر دل کی بری نہیں ہے آپ ادھر بیٹھیں میں چائے کا انتظام کرتی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے برقعہ اتار کر اپنے اٹیچی کیس پر یوں پھیلا دیا کہ وہ اس میں چھپ گیا۔

"کوئی بات نہیں ماجدہ۔ شاید ہم اس عورت کے کچھ کام آ سکیں، بیٹھ جا یار آبی۔" میں نے اپنا بریف کیس چارپائی پر ڈال دیا۔

آبی میرے ساتھ ہی بیٹھ گیا وہ بہت پریشان دکھائی دیتا تھا۔

"غربت آدمی کو کتنا مجبور کر دیتی ہے جیلانی دیکھنے میں یہ عورت کتنی معزز نظر آتی ہے مگر اس کے گھر کی حالت دیکھو۔ میں سہم گیا ہوں یار۔"

"مجھے بھی یہاں آکر بہت دکھ ہوا ہے آبی۔ پتہ نہیں یہ مفلسی کا کوڑھ کس کس گھر کو تباہ کر رہا ہے۔"

"یہ کوئی ایک آدمی کا قصہ تو نہیں ہے جیلانی میرے بھائی۔ کروڑوں آدمی اس سوچ کے نیچے تباہ حال پھرتے ہیں۔ کس کس کا ذکر کرو گے تم۔ اسی لیے تو میں اپنے گھر میں ایک پائی نہیں رکھتا ہوں جو کچھ بھی ملتا ہے میں بانٹ دیتا ہوں۔ میں کسی آدمی کو یوں ذلیل ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ میرا باپ ادھر چھیترے کا کام کرتا تھا۔ اسے دق ہو گئی تھی میں نے اسے بے علاج مرتے دیکھا ہے۔ مجھے اپنی بے بسی اور اپنے باپ کی وہ لہو روتی آنکھیں یاد ہیں۔ وہ خون تھوک تھوک کر مر گیا تھا مگر ہمارے پاس اتنا بھی نہیں تھا کہ اسے کوئی ڈھنگ کی دوا ہی دے دیتے۔ وہ وقت مجھے کبھی نہیں بھولتا ہے۔ وہ بے علاج مر گیا تو میرے گاؤں کا ایک آدمی انور علی مجھ پر چڑھ دوڑا۔ اس سے میرے باپ نے بیٹی کی شادی پر دو ہزار روپے قرض لیے تھے جس کا تقاضا کر رہا تھا۔ میری ماں نے اس کی بہت منت سماجت کی مگر وہ ایسا پتھر دل آدمی تھا کہ کسی طرح بھی اس کی کوئی بات نہیں مان رہا تھا۔ کہتا تھا جب تک اس کا قرض ادا نہیں ہو جاتا وہ میت نہیں اٹھنے دے گا۔ ہمیں بہت ذلیل کیا اس نے جیلانی۔ اور میں باپ کی میت کے پاس

بیٹھا اسے ٹک ٹک دیکھ رہا تھا۔ ماں کی منت سماجت حد سے بڑھی تو وہ اور زیادہ شیر ہو گیا۔ مجھ سے وہ سب کچھ برداشت نہ ہوا۔ تو میں نے انور علی کو وہیں صحن میں گرا لیا۔ بہت طیش۔۔۔ آگیا تھا مجھے۔ میں چاہتا تھا کہ اس کا وہیں خاتمہ کر دوں مگر پھر لوگوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ وہ دن میں کبھی نہیں بھول سکوں گا جیلانی۔ میں نے باپ کو لحد میں اتار تو دیا مگر اس کے ساتھ ہی میں نے اپنی تمام ایمانداری اور شرافت بھی قبر میں دفن کر دی۔ دوسری صبح جب میں سو کر اٹھا تو میں بالکل ہی بدلا ہوا تھا۔ وہ دن گیا اور آج کا آیا پھر میں نے کوئی رات واردات کے بغیر نہیں گزاری ۔۔۔ میں نے ہزاروں کو لوٹا ہے اور ہزاروں کو مالا مال کر دیا ہے۔ اب یہی میری زندگی کا مقصد ہے۔ میں کسی کو یوں تباہ حال دیکھتا ہوں تو میرا کلیجہ پھٹنے لگتا ہے۔" آبی کا لہجہ گلو گیر ہوتا چلا گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دینے کی کوشش کی مگر میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا تار بندھ گیا تھا۔ اس حمیدہ کے گھر کی حالت نے اس کو بری طرح رُلا دیا تھا۔ اتنا درد تھا اس کے دل میں کچلے ہوئے بے بس مجبور لوگوں کے لیے ۔۔ آبی مجھے اس گھڑی کوئی اور ہی آدمی نظر آ رہا تھا۔

اچانک ماجدہ دوڑتی ہوئی کمرے میں آئی اور بولی۔

"وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ حمیدہ باجی کی بڑی بیٹی سخت بیمار ہے۔ اسے ٹائیفائڈ نے بے حال کر رکھا ہے اور اس کا چھوٹا بیٹا بھی بیمار ہے اس کے سارے جسم پر آبلے پڑے ہوئے ہیں۔ پتہ نہیں کیا بیماری ہے اُسے۔" یہ کہتی ہوئی وہ اٹیچی کیس کھولنے لگی۔ جب ہی وہ اتنی پریشان نظر آ رہی تھی۔

آبی نے کہا۔

"ہاں بھائی جان اس بچاری کے پاس تو زہر کھانے کو بھی پیسہ نہیں ہے۔"

میں نے بریف کیس کھول لیا۔

"آپ مجھ سے یہ پیسے لے جائیں ماجدہ۔"

"نہیں میرے پاس بہت پیسے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا اٹیچی کیس اوٹ میں لیا اور پھر بند کر دیا جب وہ میرے سامنے آئی تو اس کے ہاتھ میں سو سو روپے کے بہت سے نوٹ تھے۔

"میں ان دونوں بچوں کو ادھر کسی کلینک میں داخل کرواتی ہوں تاکہ ان کا علاج ہو سکے، آپ ایک ٹیکسی لا دیں ادھر۔"

"ہسپتال کیوں نہیں لے جاتی ہیں انھیں۔" میں نے کہا۔

"نہیں! سرکاری ہسپتال بس ایسے ہی ہوتے ہیں اور انھیں فوری علاج کی ضرورت ہے۔" یہ کہہ کر وہ دوسرے کمرے میں جا گھسی۔

آبی اُٹھا اور ٹیکسی لانے کے لیے باہر نکل گیا۔ میں ماجدہ کے پیچھے دوسرے کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا کہ ایک گیارہ بارہ سال کی لڑکی چارپائی پر پڑی ہے اس کی آنکھیں اندر دھنس چکی تھیں۔ رخساروں کی ہڈیاں بہت نمایاں تھیں۔ گال پچک چکے تھے۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ وہ بہت دنوں سے بخار میں مبتلا ہے۔ اس کے ساتھ دوسری چارپائی پر سات آٹھ سال کا ایک بچہ لیٹا تھا۔ اس کے جسم کے آدھے حصے پر آبلے سے ابھرے نظر آتے تھے۔ جن میں سے پانی رس رہا تھا اس کی آنکھیں اس عذاب سے بجھی ہوئی تھیں۔ اس کی بھی حالت بہت ہی خراب ہو رہی تھی۔ لڑکی کی پائنتی حمیدہ سر جھکائے بیٹھی تھی اور غم سے نڈھال ہو رہی تھی۔

"بہن آپ گھبرائیں نہیں۔ اللہ خیر کرے گا ہم ان کا علاج کرائیں گے۔"

باہر ٹیکسی رُکنے کی آواز سُنائی دی تو ماجدہ بولی۔

"انہیں ٹیکسی میں ڈالدیں باجی۔ آپ اس چھوٹے بیٹے کو اٹھائیں۔" یہ کہہ کر اس نے لڑکی کو خود اٹھا کر کندھے پر ڈالا اور باہر نکل گئی۔ حمیدہ نے لڑکے کو اٹھایا اور بڑی خجل سی نگاہوں سے مجھے دیکھتی ہوئی بولی۔

"مجھے افسوس ہے بھائی جان۔ میں۔۔۔ میں آپ کی کوئی بھی خدمت نہ کر سکی۔"

اس کے لہجے میں ایسی یاسیت گھلی تھی کہ میں کانپ اٹھا۔ اس عورت کو غموں نے چُور چُور کر رکھا تھا۔ اس کی بینائی بہت کمزور ہو چکی تھی کیونکہ اس کی عینک کے وہ موٹے شیشے اس بات کی گواہی دیتے تھے کہ وہ گریۂ یعقوبؑ میں مبتلا رہی ہے۔ میں نے اس کے سر پر دوپٹہ درست کیا اور اس کا کندھا تھپتھپایا۔

"آپ کے بھائی آپ کی خدمت کے لیے آگئے ہیں بہن! آپ فکر نہ کریں ہم آپ کا سارا غم بانٹ لیں گے۔ جائیں ان بچوں کا علاج کرائیں۔۔۔ اللہ بہتر کرے گا۔"

وہ میری یہ بات سُن کر بلکنے لگی اور لڑکھڑاتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کی وہ حالت دیکھ کر میری بھی آنکھیں بہ نکلیں۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ اس عورت نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ دائیں ہاتھ کے کھلے دروازے میں سے مجھے اس کا باورچی خانہ نظر آ رہا تھا اور اسکی ویرانی اس بات کا پتہ دے رہی تھی کہ وہاں عرصے سے چولہا بجھا ہوا ہے۔ بدنصیبی نے خدا جانے کب سے اس گھر میں ڈیرہ جما رکھا تھا۔ ایسا حزن برستا تھا اس گھر کی فضا پر کہ میں سمجھا سورج تاریک ہو چکا ہے۔

آبی اُن کے ساتھ ہی چلا گیا۔ میں نے تمام گھر گھوم پھر کر۔۔۔

دیکھ لیا۔ باورچی خانے میں کھانے کی کوئی چیز موجود نہیں تھی۔ وہ لوگ تیل کا چولہا استعمال کرتے تھے مگر گھر میں تیل کا ایک قطرہ تک موجود نہیں تھا۔ آٹے کا پیپا بھی خالی تھا اور نمک مرچ نام کی بھی کوئی شے وہاں نہیں تھی۔ گھر میں صرف تین لحاف تھے اور وہ بھی اتنے میلے اور پھٹے ہوئے تھے کہ وہ موسم کی بلا خیز سردی کا کسی طرح مداوا نہ کر سکتے خدا ہی جانتا ہے کہ وہ عورت کب سے حالات کی اس سنگ باری کی زد میں آئی ہوئی تھی مگر اس کا لب و لہجہ بہت شستہ تھا اور اس کی نشست و برخاست اس بات کی گواہی دیتی تھی کہ وہ ہمیشہ سے ایسی تباہ حال ہرگز نہیں تھی۔

آبی اور ماجدہ کوئی دو گھنٹے بعد واپس آ گئے مگر اس حال میں کہ جب وہ صحن میں داخل ہوئے تو چیزوں سے دونوں ہی بری طرح لدے پھندے تھے۔ وہ اپنے ساتھ آٹا گھی گوشت سبزیاں پھل اور اس قسم کی بہت سی چیزیں لے آئے تھے تاکہ حمیدہ کے باورچی خانے کو آباد کر سکیں۔

"اے یار! یہ تمھاری گرل فرینڈ چولہا چوکا سنبھالے گی۔ بس اُجاڑ پنڈی میں لا کر بٹھا دیا ہے اس ماجدہ نے۔" آبی نے اپنا بوجھ زمین پر رکھتے ہوئے کہا۔

"کبھی کبھی تھوڑی بہت غریب پروری بھی کر لیا کریں بھائی جان!" ماجدہ نے باورچی خانے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ وہ باورچی خانے سے پلٹی تو آبی بولا۔

"مگر یہ لڑکی ہے بہت مالدار۔ بڑے پیسے خرچ کر دیئے ہیں اس نے۔ پیچھے ایک ٹرک بھی کھڑا ہے۔"

"اس میں کیا لائی ہیں یہ؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

اتنے میں ایک لڑکا چھ لحافوں کا گٹھا سر پر اٹھائے اندر داخل ہوا۔

"ادھر لے آ لڑکے اس کمرے میں۔" ماجدہ نے اسے راستہ دکھایا۔

"یہ پوچھو کیا نہیں لائی ہے یہ ۔۔۔ لوہے کی نئی چارپائیاں، فوم کے گدے لحاف، بستر کی چادریں دریاں، ایک ڈائننگ سیٹ چھ کرسیاں، کراکری کا سامان، برتن بھانڈے کوئی ایک چیز لائی ہے یہ؛ دولت لٹا دی ہے آج۔" آبی نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"انھوں نے تو کمال کر دیا ہے یار! اتنی دولت کہاں سے آئی ہے ان کے پاس؟"

"مجھے کیا پتہ؟" آبی کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔

ماجدہ نے تمام چیزیں کمرے میں رکھوا دیں تو بولی ۔۔

"ادھر آئیں جیلانی صاحب، اب یہ سب کچھ ترتیب سے لگوا دیں۔ تھوڑا کام بھی کیا کریں خواہ مخواہ موٹے ہوتے جا رہے ہیں آپ۔"

وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔

"بہت بہتر جناب عالی، بندہ حاضر ہے، مگر وہ حمیدہ صاحبہ کہاں ہیں؟"

"ان کو میں ادھر آصف کلینک میں بٹھا آئی ہوں۔ دونوں بچے وہاں داخل کرا دیئے ہیں میں نے۔ بس دو چار دن میں تندرست ہو جائیں گے وہ۔ اچھا ہوا ہم ادھر آ گئے ورنہ یہ تو سارا گھر ہی تباہ ہو گیا تھا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے جناب ماجد علی خاں صاحب، مگر یہ اتنی ساری دولت آپ کو کہاں سے مل گئی ہے حضور پُر نور، یہ قصّہ کیا ہے آخر، کچھ پتہ تو چلے؟"

"یہ ساری باتیں میں بعد میں بتاؤں گی، پہلے یہ چیزیں اِدھر ڈھنگ سے رکھ لوں۔"

یہ کہہ کر وہ کام میں جُت گئی اس نے دونوں کمروں میں چھ نئے پلنگ بچھا دیئے، ان پر نئی چادریں ڈالیں پھر اس نے ڈائننگ ٹیبل ایک جگہ سجائی دوسری طرف اس نے کرسیاں رکھیں اور ان کے سامنے میز لگا دی، گھر کی تمام پھٹی پرانی چیزیں اٹھا کر اس نے صحن میں ڈال دیں، ایک گھنٹے تک وہ ہم دونوں کو اِدھر اُدھر بھگاتی رہی شام کو آٹھ بجے جب وہ کام سے فارغ ہوئی تو گھر کا نقشہ ہی بدل چکا تھا۔

ڈائننگ ٹیبل پر بٹھا کر جب وہ ہمیں کھانا کھلا چکی تو بولی۔

"جیلانی صاحب میں آپ کے دوست آہو صاحب کے سیف پر ہاتھ صاف کر آئی ہوں۔ مجھے ذرا یہ نوٹ گن دیں۔"

یہ کہہ کر اس نے اٹیچی کیس کھولا اور اس میں سے نکال کر اس نے نوٹوں کی گڈیوں کا ڈھیر میز پر ڈال دیا۔

"یہ اتنے سارے نوٹ! بیڑہ غرق، ان کو لانے کے لیے آپ سے کس نے کہا تھا؟ وہ تو جان سے مار ڈالے گا ہمیں وہ آہو۔" میں نے پریشان ہو کر کہا۔

"ماجدہ نے بالکل ٹھیک کیا ہے جیلانی۔ سیف کھلا پڑا تھا اس میں سے یہ نوٹ نکال لائی ہے تو کیا بُرا کیا ہے اس نے۔" آبی خوش ہو کر گڈیاں ایک قطار میں لگانے لگا۔

"گنو تو سہی کتنا روپیہ ہے یہ۔" میں نے ایک گڈی ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

"یہ۔۔۔ ایک دو تین چار پانچ چھ سات آٹھ نو دس گیارہ بارہ، ارے یہ تو ایک لاکھ بیس ہزار روپے ہیں۔"

"اور چھ ہزار پانچ سو چالیس روپے میں خرچ کر آئی ہوں۔" ماجدہ نے اپنے پرس میں سے کچھ نوٹ میز پر ڈالتے ہوئے کہا۔

"اور کتنے نوٹ باقی تھے وہاں؟"

"میں نے صرف ایک ہی خانہ خالی کیا تھا۔ اس میں سے یہ شیشی

بھی ملی ہے مجھے۔ یہ ولایتی سینٹ ہے۔" ماجدہ نے اٹیچی کیس میں سے وہ شیشی نکال کر میز پر رکھی جس کے ساتھ رکھی دوسری شیشی سروری خانم نے مجھ پر ہتھیار کے طور پر استعمال کی تھی۔

"یہ خوشبو کی شیشی نہیں ہے ماجدہ۔ بڑی خطرناک گیس بھری ہے اس میں۔ یہ ایسی گیس ہے جو آدمی کو ہلاک کر کے رکھ دیتی ہے۔"

"اچھا؟ مگر یہ وہاں کیوں رکھی تھی انھوں نے؟"

"یہ اس مال کی حفاظت کے لیے وہاں رکھی تھی انہوں نے۔ سروری خانم نے اسے مجھ پر استعمال بھی کیا تھا مگر اللہ نے مجھے بچا لیا۔"

"ایسی خطرناک شے ہے یہ! میں اسے باہر پھینک دیتی ہوں۔"

"نہیں نہیں اسے محفوظ رکھیں شاید یہ کسی دن ہمارے کام آ جائے۔ ادھر سنبھال کر رکھ دیں اسے۔"

ماجدہ نے میرے کہنے پر اس شیشی کو کپڑے میں لپیٹ کر اٹیچی کیس میں رکھ دیا۔

"اس روپے کا کیا کرنا ہے اب؟" آبی نے پوچھا

"آپ بتائیں کیا کرنا چاہیے اس کا۔" ماجدہ نے نوٹ سمیٹ کر سامنے رکھ لیے۔

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا ہے یار، ماجدہ نے تو ہمیں ایک اور چکر میں ڈال دیا ہے وہ آہو بہت ناراض ہوگا۔"

"ہاں پیسے کا تو پتہ ہے میرا خیال ہے یہ روپیہ ماجدہ کے پاس ہی رہنا چاہیے۔"

"وہ تو رہے گا ہی۔ مگر یہ کریں گی کیا، کہاں رکھیں گی اسے؟"

"میری مانیں تو مجھے ایک مکان خرید دیں اس پیسے سے ادھر سمن آباد میں۔ میں وہاں اپنا ایک اسکول کھول لوں گی۔" ماجدہ نے اپنا منصوبہ ہمیں بتا دیا۔ وہ شاید اس سلسلے میں مسلسل سوچتی رہی تھی اور اس وقت تک وہ ایک قطعی اور قابلِ عمل نتیجے پر پہنچ چکی تھی۔

"ٹھیک ہے جناب! ہم کل ہی آپ کو ایک مکان خرید دیتے ہیں۔"

"مگر رجسٹری آپ کے نام ہوگی۔" ماجدہ نے کہا۔

"جی نہیں! مکان آپ کے لیے ہوگا تو رجسٹری بھی آپ ہی کے نام لکھی جائے گی۔ اتنی دریا دلی کی ضرورت نہیں ہے ہمیں۔"

"ہاں ہم تو سیلانی آدمی ہیں ہمارا کیا ہے۔ گھر تو عورت کی ضرورت ہے۔" آبی مسکرایا۔

"ہاں! ہم تو پہاڑوں کی چٹانوں پر بھی بسیرا کر سکتے ہیں۔ ہمارا کیا ہے۔"

"بس ٹھیک ہے کل آپ مجھے کوئی ڈھنگ کا مکان لے دیں۔" ماجدہ خوش ہو گئی۔

"مگر وہ آپ کے شوہر صاحب کا کیا بنے گا۔ وہ کل کو ادھر آ گئے تو کیا جواب دیں گی آپ؟"

"اپنے اس شوہر کو تو میں چھٹی کرا دوں گی۔ اس کا حق ہی کیا ہے اب میرے اوپر۔" ماجدہ نے نہایت سنجیدگی سے کہا

"بس تو پھر بجوا دو اس کا باجا۔ ختم کرو اس قصے کو، جیلانی سے نکاح پڑھوا لو۔" آبی نے تجویز پیش کی۔

"میرا ان سے نکاح ہو چکا ہے۔ ہمیں اب کسی مولوی کی ضرورت نہیں ہے کیوں جیلانی صاحب؟"

"جی ہاں جی ہاں! بس یہی میں کہنے والا تھا ماجدہ! یہ بوری کو اٹھا کر چلنے والی بات غلط ہے۔ اپنا سر تو ویسے ہی گروی رکھا ہے پتہ نہیں کب پھندے پر چڑھ جاؤں۔"

"ہاں یہ تو ہے، ویسے وِد آؤٹ ٹکٹ سفر کرنے میں زیادہ مزہ آتا ہے۔ اب تم یہ بتاؤ کہ کل کیا کرنا ہے ہمیں۔ یہ آہو تو جکمہ دے گیا ہے ہمیں۔"

"پھندے پر چڑھیں آپ کے دشمن! میں کل جیل جا کر آسیہ سے ملاقات کروں گی۔ پھر دیکھیں گے ہم کہ اسے رہائی کیسے دلائی جا سکتی ہے۔"

"آسیہ سے مل لینے میں کوئی حرج نہیں ہے مگر اب یہ بات صاف ظاہر ہے کہ ہمیں اپنا طریقِ کار بدلنا ہوگا۔" آبی نے کہا۔

"تم ہی کوئی تدبیر سوچو، میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا ہے۔"

"عدالت میں جانے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ یہ کیس ہم دوبارہ نہیں کھلوا سکتے۔ آہو بھی ہمارا ساتھ چھوڑ چکا ہے۔ اب ایک ہی راستہ کھلا رہ گیا ہے۔"

"کون سا راستہ کھلا رہ گیا ہے میرے بھائی؟"

"تمہارے پاس کتنے پیسے ہیں اس وقت؟"

"میرے پاس یہی کوئی اسی نوے ہزار روپیہ ہوگا۔"

"بس ٹھیک ہے تم ابھی اٹھو میرے ساتھ چلو۔"

"ایک ترکیب میری سمجھ میں آئی ہے۔ بیس تیس ہزار روپیہ اور ساتھ رکھ لو۔" آبی کرسی پر سے اٹھ بیٹھا۔

"مگر جائیں گے کہاں ہم، کچھ مجھے بھی تو پتہ چلے۔"

"بس تم اٹھ جاؤ۔ بی بی تم جیلانی کو بیس ہزار روپیہ اور دینا۔"

"یہ لیں۔ بیشک سارا ہی رکھ لیں۔" ماجدہ نے بڑی فراخدلی سے سامنے رکھی نوٹوں کی گڈیاں میری طرف سرکا دیں۔

آبی نے دس دس ہزار کی دو گڈیاں اٹھا کر مجھے دے دیں، بولا "یہ بریف کیس میں رکھ لو اور نکل چلو۔"

میں نے اس کے کہنے کے مطابق مزید بیس ہزار روپیہ بریف کیس میں رکھا اور اس کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

"دیکھ بی بی! میرا خیال ہے کہ ہم بارہ بجے تک واپس آ جائیں گے اگر کسی وجہ سے ہم نہ آ سکے تو تمھیں یہیں ہمارا انتظار کرنا ہوگا سمجھیں؟ میرے گاؤں کا نام ہرکیے ہے یہ ادھر منڈا واں کے پاس

ہے۔ اگر ہم نہ آ سکے اور ہمیں کسی اور مصیبت کا سامنا کرنا پڑا تو بھی تم ادھر ہی رہو گی۔ یہ بہت ضروری ہے اپنے گاؤں کا نام تمھیں میں اس لیے بتا رہا ہوں کہ اگر ہماری کئی دنوں تک کوئی خبر نہ ہو تو تم میری ماں کے پاس ضرور چلی جانا اُسے پیسے کی ضرورت ہو تو اسے پانچ دس ہزار روپے دے آنا مگر ٹھکانا تمھارا ہماری واپسی تک یہی ہونا چاہیئے۔"

"آپ نے تو مجھے پریشان کر دیا ہے، آخر آپ جا کہاں رہے ہیں؟"

"یہ میں واپسی پر آ کر بتاؤں گا۔ چل بھئی۔" یہ کہہ کر آبی مجھے کھینچتا ہوا باہر لے گیا۔ ماجدہ نے جب ہمارے پیچھے دروازہ بند کیا تو اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ وہ غالباً ہماری سلامتی کی دعا مانگ رہی تھی۔

اپنے پستول ہم دونوں نے شیروانیوں کے نیچے باندھ لیے تھے۔ آبی بہت سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ کس سمندر میں چھلانگ لگانے جا رہا ہے۔ آسیہ کا چہرہ رہ رہ کر میرے تصور میں ابھرتا تھا۔ میں اس کے لیے اپنے کسی بھی وعدے کو پورا نہ کر سکا تھا اور اس کی آنکھوں میں یہی سوال مجھے منجمد نظر آتا تھا کہ بھیا تم اب تک بھی کچھ نہیں کر سکے ہو۔ میں کب تک ان سلاخوں کے پیچھے برباد ہوتی رہوں گی۔ تم نے میرے لیے کیا سوچا ہے اور میں اس سے نظریں چرا رہا تھا۔ میں اس کا سامنا کرنے سے قاصر تھا۔ مجھے اب تک سب کچھ میسر آ چکا تھا۔ میں چاہتا تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کسی گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر بڑے آرام چین سے زندگی بسر کر سکتا تھا۔ بہت روپیہ تھا میرے پاس مگر میں سکون سے محروم تھا۔ میری ماں کہیں جا بیٹھی اور میں کہیں۔ میرا اپنا نہ کوئی گھر تھا نہ در۔ پاگل کتے کی طرح میں سمت کا تعین کیے بغیر بھاگا چلا جا رہا تھا اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ مجھے کہاں جانا ہے۔

آبی نے سڑک پر پہنچ کر ایک ٹیکسی پکڑی اور بولا۔

"چل بھئی ہمیں ادھر جیل روڈ لے چل۔"

یہ کہہ کر وہ مجھے اپنے ساتھ گھسیٹ کر ٹیکسی کے اندر جا بیٹھا۔

"ادھر کس کے پاس جائیں گے۔ کچھ بتاؤ تو سہی۔"

"ہم ڈاکٹر مس نفیسہ کے پاس جا رہے ہیں۔ زنانہ جیل کی انچارج ہے وہ۔" آبی نے مجھے دبی آواز میں بتایا۔

"ہاں یہ اچھی تجویز سوچی ہے تم نے۔ آہو بھی کسی ایسے ہی منصوبے پر عمل کرنا چاہتا تھا۔"

"اس سے پہلے وہ میرے دو ساتھیوں کو چھڑا چکا ہے۔ وہ سالے سات سات سال کے لیے اندر ہو گئے تھے۔ مگر وہ ڈاکٹر وہاں سے تبدیل ہو چکا ہے۔ اس کی جگہ یہ نئی ڈاکٹر آئی ہے۔"

"اس سے ہم کس طرح بات کر سکیں گے؟"

"روپے میں بڑی طاقت ہے جیلانی۔ تو دیکھتا رہ میں کیا کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ مجھ سے پرے ہٹ کر بیٹھ گیا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ ایک آہنی عزم اس کی آنکھوں میں جھلکنے لگا تھا اور اسے دیکھ کر میرا سینہ فخر سے تن رہا تھا۔ وہ میدان کا مرد آدمی تھا۔ اور جس کام کو ہاتھ میں لے لیتا تھا اسے مکمل کیے بغیر پیچھے نہیں ہٹتا تھا۔

جیل روڈ پر پہنچ کر ہم نے ٹیکسی چھوڑ دی۔ آبی کو جیل کے افسروں کی رہائش گاہوں کا اچھی طرح علم تھا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ کھینچتا ہوا بائیں ہاتھ کی سڑک پر لے گیا۔ کوٹھی کے سامنے پہنچ کر اس نے دروازے پر لگی نام اور نمبر کی تختی دیکھی۔ بالآخر ہم ڈاکٹر نفیسہ کی کوٹھی کے سامنے جا پہنچے۔ ہمیں کسی سے راستہ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔

اپنے لباس کی تراش خراش سے ہم خاصے معزز آدمی نظر آتے تھے۔ ڈرتا میں اس بات سے تھا کہ وہ ڈاکٹر اگر بدک گئی اور ہم سے روپے کی پٹی اس کی آنکھوں پر نہ بندھ سکی تو سارا معاملہ الٹ ہو سکتا تھا۔ آسیہ کے لیے وہ لوگ اور زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتے تھے پھر بھی مجھے اتنا اطمینان ضرور تھا کہ ہم ڈاکٹر سے مل کر ایک نئے امکان کو ٹٹول سکتے تھے۔

آبی نے گھنٹی پر انگلی رکھی اور اسے کئی سیکنڈ تک ٹرن ٹرن بجاتا رہا۔ کچھ ہی دیر بعد ایک آدمی لان میں سے گزرتا ہوا دروازے تک آیا۔ وہ ڈاکٹر کا ملازم نظر آتا تھا۔ عمر اس کی پینتالیس کے لگ بھگ ہوگی۔ اس نے بڑے مودبانہ لہجے میں ہمارے آنے کا مقصد پوچھا تو آبی بولا۔

"ڈاکٹر صاحب سے کہو کہ ہم جھنگ سے آئے ہیں۔ میرا نام چوہدری اصغر علی ترانڈہ ہے۔ ان سے کہو ہمیں ان سے بہت ضروری کام ہے۔"

ملازم واپس چلا گیا تو میں نے کہا۔

"یہ ترانڈہ کیا شے ہے آبی صاحب؟"

"ارے تو نہیں جانتا۔ ترانڈ کے جاگیردار تو مشہور لوگ ہیں بڑی عزت ہے ان کی ادھر جھنگ ضلع میں۔"

"میرا نام کیا تجویز کیا ہے آپ نے؟"

"تمھارا نام اکبر علی ترانڈہ ہے اور تم میرے چھوٹے بھائی ہو۔"

"بہت بہتر جناب ترانڈہ صاحب۔"

کچھ ہی دیر بعد ملازم نے واپس آ کر دروازہ کھولا۔ اور ہمیں لان میں گزار کر اندر لے گیا۔ ہمیں ڈاکٹر کے سجے سجائے ڈرائینگ روم میں بٹھا کر وہ بولا۔

"ڈاکٹر صاحب کھانا کھا رہی ہیں، بھی دس منٹ تک آپ کو انتظار

کرنا پڑے گا۔"

"کوئی بات نہیں، ہم انتظار کرتے ہیں۔" آبی نے کہا۔

اس کا لہجہ کبھی کبھی تو اتنا مہذب اور شستہ ہو جاتا تھا کہ میری حیرت بے حد و حساب بڑھ جاتی تھی حالانکہ اس نے مجھے یہی بتایا تھا کہ اس کا باپ اُدھر بیٹھک پر پیتھرے کا کام کرتا تھا اور وہ خود بہادر علی کے کھیتوں میں جتا رہتا تھا۔

"آپ کے لیے کافی لاؤں کہ چائے؟"

"کافی لے آؤ۔ ہمیں کافی زیادہ پسند ہے کیوں ترانڈہ صاحب کیا خیال ہے آپ کا؟"

"کافی بہتر رہے گی جناب۔" میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

ملازم باہر نکلا تو میں نے کہا۔

"یار آبی، ایک بات بتا، یہ تو کبھی کبھی ایسی خوبصورت باتیں کرتا ہے کہ میں خود کو تیرے سامنے جاہل تصور کرنے لگتا ہوں، حالانکہ تو نے اسکول کالج تک نہیں دیکھا ہے۔"

"یہ بات تو ہے جیلانی میاں مگر یہ زمانہ سب سے بڑا استاد ہے۔ میں نے اس شہر میں بڑی عمر گزاری ہے یہاں میں نے دو سال تک ایک استاد سے انگریزی اُردو اور حساب کی کتابیں پڑھی تھیں۔ اسے میں نے پچاس ہزار روپے دیئے تھے۔ اس بھلے آدمی نے دو ہی سال میں سارا علم دے دیا۔ پھر تو ایسا ہوا کہ میں نے اس کی باتوں پر عمل کرتے ہوئے بے شمار کتابیں پڑھ ڈالیں یہ اس کی تعلیم کا فیض ہے کہ اب میں موقع محل کے مطابق ہر قسم کی گفتگو کر لیتا ہوں ورنہ میں نے نہ اسکول میں قدم رکھا ہے نہ کالج میں۔"

"یہ بہت اچھا کیا ہے تو نے۔ پیشہ آدمی کا کچھ بھی ہو، تعلیم بہت ضروری ہے آدمی کو بات کرنے کا تو سلیقہ آنا ہی چاہیے۔"

"اگر میں اس پیشے میں نہ آتا اور باقاعدہ پڑھتا رہتا تو مجھے یقین ہے کہ میں آج کسی یونیورسٹی میں پڑھا رہا ہوتا۔ میرا حافظہ تیری دعا سے بہت تیز ہے۔" آبی نے بڑے پُرجوش لہجے میں کہا اور پھر سامنے سُبک سی شیشے کی میز پر رکھے ڈبے میں سے نکال کر دو سگریٹ سُلگائے۔ ایک اس نے مجھے دیا اور بولا۔

"میں تیری بات چیت سے ہی تیرا گرویدہ ہوا تھا جیلانی! تیری زبان میں بڑی مٹھاس ہے پیارے۔ تیرا وار عورتوں پر بھی خوب چلتا ہوگا۔"

میں نے سگریٹ کا گہرا کش لیتے ہوئے کہا اسے غور سے دیکھا میرا خیال تھا کہ وہ میرا مذاق اڑا رہا ہے مگر وہ بہت سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

"میں کچھ کہہ نہیں سکتا ہوں آبی۔ میں نے کبھی اپنی اس خوبی کو آزما کر نہیں دیکھا۔"

"اور وہ ماجدہ یونہی تو تیری کنیز نہیں بن گئی ہے۔"

"وہ تو پاگل ہے شوہر کی بے نیازی نے اسے اس حال تک پہنچا دیا ہے۔"

"یہ تو ہے مگر یار، ہے وہ بہت خوبصورت۔" آبی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کہیں اُدھر اُنگلی نہ مار دینا۔ بڑی حساس چیز ہے وہ۔ پلٹ کر ڈستی ہے اور ڈس کر پلٹتی ہے۔" میں نے آبی کو خبردار کیا۔

"فکر نہ کر۔ میں اس گاڑی کا بیل نہیں ہوں۔" وہ میرے ساتھ صوفے میں دھنس کر بیٹھا تھا اور ہم نہایت ہی دھیمے لہجے میں باتیں کر رہے تھے تاکہ کوئی اور نہ سُن لے۔ ڈاکٹر کا نوکر کافی لینے کے لیے ایسا گیا کہ اس نے ہمیں دوبارہ اپنی صورت ہی نہیں دکھائی۔

ڈاکٹر نفیسہ دس منٹ کے بجائے کوئی پچیس تیس منٹ بعد کمرے میں آئی۔ مگر اس طرح جیسے کوئی بجلی سی لہرا کر گرد و پیش کو منور کر دے۔ وہ چھریرے بدن کی سرو قد عورت تھی۔ اس کی عمر کوئی چھتیس ستائیس سال ہوگی۔ ہر قسم کی آرائش و زیبائش کی آلائشوں سے پاک ہونے کے باوجود جب وہ اٹھلا کر چلتی تھی تو دلوں کو دھچکا سا لگتا تھا۔ اس کے بدن پر ساڑھی نے اور قیامت ڈھا رکھی تھی۔ ہم دونوں کی کیفیت یہی ہوئی۔ آبی بھی اسے دیکھ کر اُٹھ گیا اور میں بھی۔ وہ اپنی کٹورا ایسی بڑی بڑی آنکھیں جھپکاتی ہوئی بولی۔

"معاف کیجیے گا چوہدری صاحب مجھے کچھ دیر ہوگئی۔"

"کوئی بات نہیں ڈاکٹر صاحب آپ سے ملنے کی امید پر تو ہم دس دن تک ایک ٹانگ پر بھی کھڑے رہ سکتے ہیں۔" آبی نے کہا۔

"ہاں یہی کیا کم نوازش ہے آپ کی کہ آپ نے ہمیں وقت عنایت فرما دیا ہے۔" میں نے گرہ لگائی۔ وہ مسکرائی اور ہمارے قریب ہی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"تشریف رکھیں۔ مجھے افسوس ہے آپ کو ابھی تک کافی نہیں مل سکی۔ دراصل وہ اپنا رمضو کافی کا ڈبہ کہیں رکھ کر بھول گیا ہے۔ اب میں نے اسے بازار سے نیا ڈبہ لانے کے لیے بھیجا ہے۔"

"اتنے تکلف کی ضرورت نہیں تھی ڈاکٹر صاحب! ہم مہمان نہیں بلکہ سائل ہیں۔ ادنیٰ سائل۔"

"نہیں صاحب! ایسا ہرگز نہ کہیں! آپ حکم کریں۔"

"حکم نہیں ڈاکٹر صاحب! ہم تو صرف عرض ہی کر سکتے ہیں، دراصل ہم ایک بہت ہی اہم کام کے سلسلے میں آپ کے پاس حاضر ہوئے ہیں۔"

"فرمایئے۔ شاید میں آپ کے کچھ کام آسکوں۔"

"آپ بتائیں انہیں چوہدری صاحب آسیہ کے سلسلے میں انہیں ساری بات بتا دیں کہ وہ اس حال کو کیسے پہنچی۔" آبی نے مجھ سے

مخاطب ہو کر کہا۔ اس کے کہنے کے مطابق میں نے وہ تمام حالات ڈاکٹر نفیسہ کو بتا دیئے۔ جن میں سے گزر کر وہ جیل میں بند ہوئی تھی۔ نفیسہ بڑے اطمینان سے میری باتیں سنتی رہی۔ میں نے اسے یقین دلا دیا کہ آسیہ بالکل بے گناہ ہے اور اسے جو سزا ملی ہے، وہ مبنی بر انصاف نہیں ہے۔

"آپ کی کیا رشتے داری ہے اس سے؟"

"میں نے عرض کیا تو ہے کہ وہ ہماری چچا زاد بہن ہے۔ اس کے والد فوت ہو چکے ہیں اور اب اس کی ساری ذمے داری ہمارے کندھوں پر ہے۔" میں نے کہا۔

"مگر یہ سب کچھ آپ مجھے کیوں بتا رہے ہیں۔ مجھ سے کیا چاہتے ہیں آپ؟"

"ہم۔ ہم دراصل اس کی رہائی کے سلسلے میں آپ سے مدد کے طلبگار ہیں۔ ڈاکٹر صاحب۔"

"وہ کس طرح؟ میں کیا کر سکتی ہوں اس سلسلے میں۔"

"دیکھیں ڈاکٹر صاحب ہم آپ کو منہ مانگی رقم دے سکتے ہیں بیس ہزار چالیس ہزار جتنی بھی رقم آپ کہیں۔ آپ صرف اتنا کریں کہ آپ اسے پاگل قرار دے دیں۔" آبی نے بات کھول دی۔

ڈاکٹر نفیسہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہمیں یوں دیکھنے لگی، جیسے اُسے اپنی سماعت پر اعتبار نہ آ رہا ہو۔ چند ثانیے اسی طرح گزر گئے۔ اس کی حیرت کسی طرح بھی کم نہیں ہو رہی تھی

"دیکھیں ڈاکٹر صاحب! آدمی آدمی کا دارو ہوتا ہے۔ ہمیں اپنی بہن کی رہائی اپنی زندگی سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ آپ ہم پر یہ نوازش کر دیں۔ اس کی زندگی تباہ ہونے سے بچ جائیگی ہم آپ کو منہ مانگی رقم دے دیں گے۔" آبی نے اور زیادہ پُرجوش لہجے میں کہا۔ اور پھر بے اختیار اٹھ کر اس نے ڈاکٹر کے پاؤں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ گڑگڑا کر بولا۔

"ہماری مدد کریں گے ڈاکٹر صاحب آپ کے لیے یہ کچھ مشکل نہیں ہے۔ اس سے پہلے بھی ایسا ہو چکا ہے۔ میں ایسے دو تین آدمیوں کو جانتا ہوں جن کو اسی طرح جیل سے رہائی مل گئی تھی۔" یہ کہہ کر اس نے ڈاکٹر کے پاؤں پر سے ہاتھ اٹھا کر اس کے سامنے یوں جوڑ دیے جیسے وہ کسی مندر میں رکھی مورتی کو پرنام کر رہا ہو۔

"آپ مجھے ان لوگوں کے نام بتا سکتے ہیں جو اس سے پہلے ڈاکٹروں نے رہا کروا دیئے تھے؟"

"ان کے ناموں کی ضرورت نہیں ہے ڈاکٹر صاحب! ہم کسی کا نام نہیں لیتے۔ آپ صرف ہماری بہن پر رحم کریں۔"

"اگر میں اسے پاگل ڈکلیئر کر دوں تو بھی اسے میڈیکل بورڈ کے سامنے پیش ہونا پڑے گا۔"

"اس کا بھی آپ بندوبست کر سکتی ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ ایک ایسی دوا موجود ہے جس کا ٹیکہ لگانے سے آدمی عارضی پاگل ہو جاتا ہے۔"

"آپ بہت چالاک آدمی نظر آتے ہیں ترانڈہ صاحب مگر اسکو پاگل ثابت..... کر دینے کے بعد بھی اس کی رہائی ممکن نہ ہو اسے ہم پاگل خانے کے خاص وارڈ میں بھیج دیں گے۔"

"آپ آگے کی فکر نہ کریں ڈاکٹر صاحب۔ وہاں سے خود چھڑوا لیں گے۔"

"غائب کریں گے اسے وہاں سے؟"

"ہو سکتا ہے ہم اسے وہاں سے غائب کروا دیں۔ ایسی صورت میں....."

"ٹھیک ہے میں آپ کی بات سمجھ رہی ہوں مگر مجھے کیا فائدہ ہوگا اس ڈرامے سے؟"

"ہم آپ کو منہ مانگی رقم دے سکتے ہیں ڈاکٹر صاحب۔"

"آپ مجھے پچاس ہزار روپیہ دے دیں تو میں یہ رسک لے سکتی ہوں۔"

میں نے بریف کیس اوٹ میں لے کر کھولا اور پچاس ہزار کے نوٹ نکال کر ڈاکٹر نفیسہ کے سامنے میز پر ڈھیر کر دیئے۔ اس نے گرسنگی کی کیفیت میں ڈوبے ہوئے انداز سے وہ نوٹ چھوئے اور انہیں اپنی طرف گھسیٹ کر بولی۔

"کتنی رقم ہے یہ؟"

"یہ پورے پچاس ہزار ہیں۔"

آبی نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے وہ نوٹ کھینچ کر اپنی طرف کیے اور دس دس ہزار کی دو گڈیاں اس کو دے کر بولا۔

"یہ بیس ہزار روپے آپ ابھی رکھ لیں یہ تیس ہزار ہم آپ کو اس روز دیں گے جس روز میڈیکل بورڈ کی طرف سے آسیہ کو پاگل خانے بھیجنے کا فیصلہ کر دیا جائے گا۔"

"ٹھیک ہے ترانڈہ صاحب! آپ مجھ سے ٹھیک ایک ہفتے بعد ملیں۔ اسی وقت اسی جگہ۔ میں آپ کو میڈیکل بورڈ کے فیصلے کی نقل دے دوں گی۔" یہ کہہ کر اس نے بیس ہزار روپے کے نوٹ بھی آبی کی طرف دھکیل دیئے۔

اس کا نوکر رمضو کافی کے برتن اٹھائے اندر آ رہا تھا۔ اس نے کافی ہمیں نازک اندام پیالیوں میں بھر کر دی تو ڈاکٹر نفیسہ بولی۔ "یہ رقم آپ رمضو کو دے دیں۔"

آبی نے دو گڈیاں اٹھا کر رمضو کی طرف بڑھا دیں۔ وہ بولی۔ "رمضو یہ روپے رکھ لو میں تم سے صبح لے لوں گی۔"

"بہت بہتر بیگم صاحب۔" یہ کہہ کر رمضو نے دو گڈیاں

میز پر سے اٹھائیں اور تیز تیز قدم اٹھاتا کمرے سے باہر نکل گیا۔

"ہم آپ کا یہ احسان عمر بھر نہیں بھولیں گے ڈاکٹر صاحب ہماری بہن کی زندگی تباہ ہونے سے بچ جائیگی۔ یہ آپ کا بہت بڑا احسان ہوگا ہم پر۔" آپی نے کہا۔ وہ بہت ممنون نظر آرہا تھا۔

"یہ احسان کہاں ہے یہ تو سودے بازی ہے جناب ترانڈہ صاحب۔"

"آپ کی مہربانی ہے کہ آپ ایسا فرماتی ہیں ورنہ ہم تو بہت زیادہ خوفزدہ تھے۔" آپی نے کہا۔

"کوئی ایسی صورت ہو سکتی ہے کہ ہم آسیہ سے آپکی کوٹھی پر ملاقات کر سکیں۔"

"جی نہیں! میں اس بات کا ذمہ نہیں لے سکتی۔ بس ہفتے دس دن کی بات ہے انتظار کرلیں میرا خیال ہے کہ ہمیں ناکامی نہیں ہوگی۔"

"تو پھر ہمیں اجازت دیں جناب ہم آج سے ٹھیک ایک ہفتے بعد آپ سے یہیں مل لیں گے۔"

"بہتر ہے۔ میں کل سے اپنا کام شروع کردوں گی اس سلسلے میں مجھے آسیہ کو بھی اعتماد میں لینا ہوگا۔"

"ظاہر ہے ڈاکٹر صاحب اسکے بغیر تو کام نہیں چلے گا۔" میں نے کہا۔

"اچھا تو پھر آپ مجھے اپنی بہن کے نام ایک خط لکھ دیں۔ میں اس کی بنا پر کل اس سے بات کروں گی۔ اسے معلوم تو ہونا چاہیئے کہ یہ سب کچھ آپ کے ایما پر ہو رہا ہے۔"

"یہ بہت عمدہ خیال ہے آپ کا۔ کاغذ منگوائیے میں اُس کے نام آپ کو رقعہ لکھ دیتا ہوں۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔

"کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ہم کل خود اس سے مل لیں کسی بات کا تحریر میں آنا ہمارے لیے کسی بھی وقت نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔" آپی نے میرا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

"ہاں یہ تو اور بھی اچھا ہے۔ آپ کل اس سے خود مل لیں یا کسی اور کو اس کے پاس بھیج دیں۔ اسے ذہنی طور پر اس مرحلے کے لیے تیار کرنا بے حد ضروری ہے۔ اگر وہ اچھی اداکاری کرسکے تو اسے ٹیکہ لگانے کی ضرورت بھی نہ ہوگی۔" ڈاکٹر نفیسہ نے اپنی بے لوث رائے ظاہر کی۔ اسے ہم پوری طرح شیشے میں اتار چکے تھے۔

"ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب! ہم کل اپنی عزیزہ کو اس کے پاس بھیج دیں گے۔"

"جیسے آپ کی مرضی مگر کل اسے ساری بات آپ بتا ضرور دیں ورنہ میں کچھ نہ کرسکوں گی۔" یہ کہہ کر ڈاکٹر کرسی پر سے اٹھ گئی ہم نے اس سے اجازت لی اور اسی وقت وہاں سے نکل کر باہر آگئے۔

سڑک پر پہنچتے ہی میں خوشی سے پاگل ہوگیا اور آپی کو باہوں میں لے لیا۔

"تو نے میری بہت بڑی مشکل حل کردی ہے آپی۔ میں تیرا یہ احسان کبھی نہ بھلا سکوں گا۔" احساسِ تشکر سے میری آنکھیں امڈ آئیں۔

"ابھی نہیں میرے یار! ابھی سے اتنا خوش نہ ہو جا۔ وہ کیا کہتے ہیں انگریزی میں جس کا مطلب یہ ہے کہ ہونٹ اور پیالے کے درمیان بڑے مرحلے ہوتے ہیں تو اس کے مطابق صبر کر۔" وہ اپنے آپ کو مجھ سے چھڑاتے ہوئے بولا۔

بات اس نے بالکل سچی کی تھی۔ میری قسمت تو بار بار مجھے اوندھا کر کے ڈال دیتی تھی۔ میرا کوئی بھی کام سیدھا نہیں ہوتا تھا زندگی کی تمام لکیریں ایک دوسری میں گڈمڈ ہونے لگی تھیں۔ میں پورب کی سوچتا تو پچھم جا نکلتا تھا۔ ایک اس ماں جائی بہن کے لیے میں نے کتنے کنوئیں جھانک لیے تھے کتنے صحرا عبور کر آیا تھا میں مگر اب تک اس کے صبر و سکون کے لیے میں کچھ بھی نہ کر سکا۔ اپنی قوتِ بازو پر سے میرا اعتماد اٹھتا جا رہا تھا۔ بے بسی کا احساس کبھی کبھی تو میرے دل و دماغ پر اس قدر تند و تیز آندھی کی طرح حاوی ہو جاتا تھا کہ میرا دل چاہتا تھا وہی تیشہ اپنے سر میں مار کر مر جاؤں جس سے میں جا بجا پتھر توڑ کر آسیہ کے لیے راہیں ہموار کرنے کی کوشش میں لگا رہتا تھا مگر ایسا حرماں نصیب اور ایسا کم حوصلہ تھا کہ خود پر بھی وار نہ کرسکتا تھا۔

آپی مجھے ساتھ لے کر سڑک پر نکلا اور پھر ٹیکسی میں بٹھا کر حمیدہ کے گھر لے آیا۔ ہماری غیر حاضری میں ماجدہ نے گھر کی صورت کو نکھارنے سنوارنے میں کچھ اور محنت کرلی تھی۔ دونوں کمروں میں اس نے اگربتیاں سلگا دی تھیں اور وہاں بچھے نئے پلنگ ایک نئی رات کی نئی نویلی خوشیوں کی نوید سناتے تھے۔ ماجدہ ہماری واپسی پر خوش ہوگئی۔ اس نے ہمارے لیے بڑے اہتمام سے قہوہ بنایا۔ اور ان خوبصورت فرانسیسی پیالوں میں بھر کر ہمیں دیا جو وہ اسی دن خرید کر لائی تھی۔ وہ بہار کے تازہ جھونکے کی طرح اس گھر کے خزاں زدہ ماحول میں پھیر گئی تھی اور چند ہی گھنٹوں میں اس نے اس کے کمروں اور صحن کے کونوں پر جمی یاسیت و نحوست اور حزن و یاس کی ساری پپڑیاں اتار ڈالی تھیں۔ ہر طرف زندگی کا چمکتا چھلکتا احساس اس نے اجاگر کر دیا تھا، اگرچہ وہ سب روشنی وہ ساری چکاچوند اس پیسے کی مرہونِ منت تھی جو اپنی سہیلی کے لیے ماجدہ نے وہاں بے دریغ خرچ کیا تھا مگر جس دل سے جس گرمجوشی اور جس ایثار و خلوص کے جذبے سے سرشار ہو کر اس نے وہ سب کچھ کیا تھا یہ اسی کا فیض تھا کہ وہ خانۂ محزون

جو کرن کرن کو ترستا تھا۔ رات ہونے سے پہلے تک بقعۂ نور بن گیا تھا۔ آدمی کیا کچھ نہیں کر سکتا، مگر آدمی کے آگے پیسہ چلے تو بات بنتی ہے۔ اور یہ پیسہ ماجدہ نے لمحوں کی لہر پر چلتے ہوئے آہو کے گھر سے اڑا لیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ آہو کی تجوری میں بھی وہ پیسہ اس کی اپنی جگر کاوی کی وجہ سے جمع نہیں ہوا تھا۔ وہ سب کا سب ہیرا پھیری کا ثمر تھا اور اس تجوری کو بھر دینے میں آبی جیسے لوگوں کا ہاتھ تھا مگر جس چابکدستی اور خوش اسلوبی سے ماجدہ نے اس پر ہاتھ صاف کیا تھا اس پر مجھے حیرت ہوئی تھی۔

وہ آہو کے گھر میں تنہا تھی اور وہ دونوں کمرے میں پلنگ کے اوپر بندھے پڑے تھے۔ وہ مزاحمت نہیں کر سکتے تھے اور ماجدہ کو جب پہلا ٹیلیفون ملا تو اس کا دل بلّیوں اچھل گیا ہو گا۔ اس کی حیثیت وہاں نہ چاہتے ہوئے بھی مجرم ایسی بن چکی تھی ۔۔ وہ خوف سے سرتاپیر لبریز گھر تھا کیونکہ وہاں سے ہم ہو کر گزر گئے تھے۔ پھر بھی اس نے اپنے اوسان خطا نہ ہونے دیئے اور بڑی دلجمعی سے وہ اپنی پسند کی چیزیں اٹیچی کیس میں ڈالتی رہی تھی۔

جب پولیس نے وہاں دستک دی تو اس نے عقل سے کام لے کر باہر کی ساری صورت حال دروازے میں لگے عدسے میں سے دیکھ لی۔ وہ خوف سے لرز رہی ہو گی۔ اس کی وہاں گرفتاری اسے زبردست مصیبت میں مبتلا کر سکتی تھی پھر بھی وہ اپنے حواس کو قابو میں رکھتے ہوئے دروازے پر سے ہٹی، اوپر جا کر اس نے برقعہ پہنا اور اٹیچی کیس اٹھا کر پچھلے دروازے سے بے آواز نکل کر مجیدن کے گھر جا پہنچی۔

یہ سب کے سب بڑے حوصلہ شکن مراحل تھے پھر بھی وہ انہیں بخیر و خوبی طے کر گئی۔ اس نے مجھے مجیدن کے گھر میں کچھ بھی تو نہیں بتایا تھا۔ اس رقم کا ذکر تو وہ گول ہی کر گئی۔ اس کے آہنی اعصاب کی میں جتنی بھی تعریف کروں کم ہے وہ اپنے لیے آہو کے گھر سے بہت کچھ سمیٹ لائی تھی اور مطمئن یوں تھی کہ وہ میرے ساتھ تھی ۔ اسے یقین تھا کہ اگر کسی مرحلے پر اس سے پوچھ گچھ ہوئی تو کوئی بھی حتیٰ کہ آہو بھی اس کے خلاف کوئی ثبوت پیش نہ کر سکے گا۔ بالکل اسی طرح جس طرح وہ گجرات کے ہسپتال میں بڑے چوہدری کرامت اور اس کے نوکر فیروز کے واویلے پر گرفتار ہونے کے باوجود ضمانت پر رہا ہو کر میرے پاس چلی آئی تھی، محض اس لیے کہ اس کے خلاف وہاں بھی کوئی ٹھوس ثبوت کسی کے پاس موجود نہیں تھا۔

ہمیں قہوہ پلانے کے بعد وہ ہمارے لیے طشتری میں رکھ کر ڈھیر سارے خشک میوے لے آئی۔ بادام، چلغوزے، اخروٹ، مونگ پھلی اور الا بلا ۔۔ اس کے وجود سے خوشی کی کرنیں پھوٹتی نظر آتی تھیں۔ وہ

خریداری کے دوران خود کو بھی نہیں بھولی تھی۔ اپنے لیے عمدہ قسم کی تین ساڑھیاں بھی خرید لائی تھی۔ اور وہ اس وقت گلابی رنگ کی ساڑھی میں ملبوس تھی جس نے اس کے سراپا کو اور زیادہ دلکش بنا دیا تھا۔ ہم اس وقت ڈائننگ ٹیبل کے گرد بیٹھے تھے۔ ہم دونوں ایک طرف تھے اور ماجدہ ہمارے سامنے میز کی دوسری طرف بیٹھی تھی۔

"وہ حمیدہ واپس نہیں آئے گی آج؟" آبی نے پوچھا ۔۔ وہ مسلسل سگریٹ پھونکتا چلا جا رہا تھا اور میرے دل میں یہ خدشہ جنم لے رہا تھا کہ آبی بھی ماجدہ کی طرف ملتفت ہو رہا ہے۔ اس کی نگاہیں عجیب سی تشنگی کا پتہ دیتی تھیں اور میں ڈرتا تھا کہ ماجدہ ہمارے درمیان وجہ تنازعہ نہ بن جائے کیونکہ ماجدہ کا رویہ اس شمع کا سا تھا جو محفل میں موجود ہر شخص کو روشنی بخشتی ہے پھر بھی میں جب سوچتا تھا تو اس کے دل میں آبی کے لیے بہنوں ایسا جذبہ ضرور موجود ہو گا۔ جب اس نے حمیدہ کے بارے میں پوچھا تو ماجدہ بڑے دلفریب انداز میں بولی۔ "جی نہیں، وہ بچوں کے پاس ہی رہے گی۔ آج کی رات اس کے گھر کے آپ مالک ہیں۔"

"جیلانی بھائی۔ میں تو چلا۔ مجھے سخت نیند آ رہی ہے مجھے کہاں سلائیں گے آپ لوگ؟"

ماجدہ کی آنکھوں میں شرارت ناچ گئی بدن کو لہرا کر بولی۔

"ان سے پوچھیں، بستروں کی الاٹمنٹ یہی کریں گے۔"

"ہاں یہ کمشنر بحالیات لگا ہوا ہے نا ادھر ۔۔ بتا بھئی کدھر لیٹوں؟"

"میرے سینے پر لیٹ رہ میرے یار! تیرے لیے تو میری جان بھی حاضر ہے۔" میں نے باہیں اس کی طرف پھیلا دیں۔

آبی کا چہرہ کھل اٹھا میرا جملہ سن کر۔ وہ مسکراتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

صبح جب ہم سات بجے سو کر اٹھے تو میں نے دیکھا کہ آبی بستر میں موجود نہیں تھا۔ اس کی تمام چیزیں البتہ وہیں تھیں۔ ماجدہ نے پانی گرم کر دیا۔ نہا دھو کر جب میں ناشتے کی میز پر بیٹھا تو آبی واپس آ گیا۔ حمیدہ اس کے ساتھ تھی ان کی زبانی معلوم ہوا کہ حمیدہ کے دونوں بچوں کی حالت بہت بہتر ہے اور ڈاکٹر ان کا علاج بڑی تندہی سے کر رہے تھے۔ بے نوا عورت اس صبح مجھے کل کی راکھ راکھ بیوہ کے مقابلے میں کہیں زیادہ بہتر نظر آئی۔ ماجدہ اسکے لیے بھی چار جوڑے کپڑے خرید لائی تھی۔ اس نے اسی وقت اسے نہلا دھلا کر ایک نیا جوڑا پہنا دیا اور پھر اس نے مجھے الگ لے جا کر کہا کہ میں اسے بیس ہزار روپیہ دے دوں جو کل رات اس نے مجھے دیا تھا۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ میں نے دوسرے کمرے میں لے جا کر

اسے وہ رقم واپس کر دی۔ ماجدہ نے دس ہزار تو اپنے اٹیچی کیس میں رکھے اور دس ہزار روپے میرے سامنے اس نے حمیدہ کو دے دیئے، بولی "یہ لیں باجی یہ دس ہزار روپیہ ہے یہ انھوں نے آپ کے لیے دیا ہے اپنے خرچ کے لیے رکھ لیں۔"

"دس ہزار! یہ کیا کہتی ہو ماجدہ میں یہ رقم کیسے اتار سکوں گی؟"

"یہ میں آپ سے واپس لینے کے لیے نہیں دے رہی ہوں۔ یہ آپ کی بہن کے ہاتھ آپکے بھائی کا ادنیٰ نذرانہ ہے۔" ماجدہ نے کہا۔

"یہ رقم رکھ لیں بہن جی۔ آپ کو ضرورت پڑی تو ہم اور بھی دیں گے۔ یہ سامان بھی ماجدہ نے آپ کو خرید دیا ہے۔ یہ اس کی طرف سے آپ کے لیے حقیر تحفہ ہے۔ ہسپتال میں جتنا روپیہ خرچ ہو گا وہ بھی ہم ادا کریں گے۔ آپ بس خوش خوش رہا کریں۔"

"اللہ آپ کا بھلا کرے بھائی۔ میں تو ۔ میں تو ۔۔۔۔ بے آسرا ہو کر رہ گئی تھی۔ کئی دنوں سے میرے بچے بیمار، میں میری آمدنی کا کوئی بھی ذریعہ نہیں۔ آپ تو میرے لیے فرشتۂ رحمت ثابت ہوئے ہیں۔ میں کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔"

"آپ نے نوکری کیوں چھوڑ دی بہن جی؟"

"میری نظر کمزور ہو گئی ہے بھائی اور سماعت بھی، اس لیے مجھے نوکری چھوڑنی پڑی۔"

"اللہ کرم کرے گا بہن جی، بس اب آپ بالکل کوئی فکر نہ کریں۔ یہ سامان پسند آیا آپ کو؟"

"میں تو دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہی ہوں اس ماجدہ نے تو میرے گھر کی قسمت بدل دی ہے۔ اللہ اس کے بھاگ اور روشن کرے۔"

"بس بس ساری دعائیں مجھے ہی نہ دے دو باجی! کچھ اپنے لیے بھی رکھ لو۔ یہ ساری چیزیں آبی بھائی نے خود پسند کی تھیں ۔۔ آپ کے لیے ۔۔"

"ہاں میرا نام بھی لکھوا دو شہیدوں میں۔ بہن جی یہ ۔۔۔ جو ہے نا اس کی زبان بہت چلتی ہے بس ذرا بچ کے رہیں اس سے ۔۔" آبی نے کہا۔ وہ کرسی پر بیٹھا اطمینان سے سگریٹ پھونک رہا تھا۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ وہ صبح صبح اٹھ کر حمیدہ کی طرف چل دیا تھا۔ اس کے بچوں کی خیریت دریافت کرنے کے لیے۔

ماجدہ نے آبی کے سامنے بھی ناشتہ رکھ دیا۔ حمیدہ نے بھی ناشتہ نہیں کیا تھا۔ وہ بھی وہیں بیٹھ کر کھانے لگی۔ ڈائننگ میز کے فارمیکا پر وہ بار بار ہاتھ پھیر کر اس کی چکناہٹ کو سراہ رہی تھی۔ ناشتے سے فارغ ہو کر اس نے ماجدہ کی خریدی ہوئی ایک ایک چیز دیکھی اور اسے قدم قدم پر ڈھیروں دعائیں دیتی رہی۔ کسی مجبور و بے کس آدمی کو اچانک اتنی ساری خوشیاں دے دینے سے جو خوشی آدمی کو محسوس ہوتی ہے اس کا اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔

عجیب سا احساس ربوبیت دل میں ابھرنے لگتا ہے۔ میں آبی، اور ماجدہ اس دکھوں کی ماری عورت کو گھر میں ادھر ادھر انبساط کی لہروں پر چلتی دیکھ کر مسرور ہو رہے تھے۔ اسے اپنے گھر سے بے پناہ محبت تھی۔ اس کی ایک ایک اینٹ اس نے سینت سینت کر خود دیواروں میں لگوائی تھی مگر اس گھر میں روشنی نہ ہونے کے سبب وہ خود اندھی ہوتی جاتی تھی۔ غم نے اس کی بینائی چاٹ لی تھی مگر اب جو اتنی بڑی رقم اس نے دیکھی اتنی ساری چیزوں کو گھر میں سجی سنوری صورت میں پایا تو اس پر شادی مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ اسے نہ اپنی سماعت پر اعتبار آتا تھا، نہ اپنی بصارت پر۔ بولی۔ "یہ چیزیں تو اپنے لیے لائی ہے نا ماجدہ!"

"ارے نہیں باجی یہ سب چیزیں تمھاری ہیں، تمہارے لیے ہی خرید کر لائی تھی۔ وہ تمھارا پپو ہے نا، وہ دیکھے گا تو خوش ہو جائے گا۔ عذرا بھی یہ چیزیں دیکھے گی تو حیران رہ جائے گی۔ یہ سب تمھاری ہیں باجی ہم تو بس چند دن آپ کے پاس ہیں پھر چل دیں گے۔"

"یہ تمھارا اپنا گھر ہے ماجدہ، جب تک چاہو رہو۔ جانے کا کیوں ذکر کرتی ہو۔ تم تو یہاں روشنی بن کر آئی ہو۔"

"بس اب ان چیزوں کا ذکر ختم کریں۔ بہن جی جائیں ادھر باورچی خانے میں بیٹھیں اور دوپہر کے کھانے کا بندوبست کریں۔ ماجدہ کو ہم ابھی ایک کام سے باہر بھیج رہے ہیں۔" میں نے ان کے سلسلۂ گفتگو کو منقطع کرتے ہوئے کہا۔

حمیدہ فوراً ہی اٹھ کر باورچی خانے میں جا گھسی۔ اس کے اٹھتے ہی میں نے ماجدہ کو ساری صورت حال سمجھائی اور اسے اسی وقت آبی کے ساتھ آسیہ سے ملاقات کے لیے زنانہ جیل بھیج دیا۔ وہ گھر سے نکلے تو حمیدہ کے گھر میں سناٹا چھا گیا۔ لگتا تھا وہاں کوئی رہتا ہی نہیں ہے ایسی دلگیر خاموشی میں نے ویرانوں میں بھی نہیں دیکھی تھی۔ مجھے وہ گھر آسیب زدہ سا نظر آتا تھا کچھ دیر تو میں کمرے میں بیٹھا سگریٹ پھونکتا رہا مگر جب وہ سکوت ناقابل برداشت ہو گیا تو میں نے کرسی لے جا کر صحن میں رکھ دی اور وہاں بیٹھ کر دھوپ تاپنے لگا۔ مگر وہ دھوپ بھی مجھے گرمانے میں ناکام رہی میرے دل پر تو تہہ در تہہ جمی اداسی کسی طرح کم ہونے میں نہیں آتی تھی۔ رہ رہ کر آسیہ کا چہرہ میرے تصور میں گھومنے لگتا تھا اور اب میں اس سے منہ چھپانے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ میں آسیہ کا تصور میں بھی سامنا نہیں کر سکتا تھا۔ ندامت نے مجھے کچھ اس حد تک کچل کر رکھ دیا تھا اور اپنی لغزشوں پر میں اتنا شرمندہ ہو رہا تھا کہ میں نے آسیہ کا خیال اپنے ذہن سے جھٹک دینے کی سر توڑ کوشش کی مگر وہ ہر سمت تھی، ہر طرف موجود تھی اور وہی پرانا سوال دہراتی تھی کہ بھیا میرا کیا قصور ہے مجھے میرے کس گناہ کی سزا مل رہی ہے اور یہی وہ سوال تھا

جس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

آسیہ کی اذیتیں بے تھاہ تھیں اس کو زندگی نے جھیر جھیر جلا ڈالا تھا۔ وہ تو حجلۂ عروسی کے خواب دیکھتی تھی مگر ذرا دیر کے لیے اس کی آنکھ جھپک گئی تو اس کو حالات نے بندی خانے میں ڈال دیا۔ کسی جلّاد کی سب سے بڑی خوبی یہی سمجھی جاتی ہے کہ وہ تلوار کے ایک ہی وار میں معتوب کا سر تن سے جدا کردے۔ اور آسیہ پر جو تلوار چلی تھی اس کے تھامنے والے کا یہی کمال تھا کہ جب اس کا وجود اُس کے اپنوں سے کاٹ کر الگ کر دیا گیا تو اس ایک لمحے کی مختصر مدّت میں اسے احساس تک نہ ہو سکا کہ اس پر کیا کچھ بیت چکی ہے مگر اُس نے اپنے سامنے قانون کی سلاخیں تنی دیکھیں تو وہ اپنی بے لسی پر تلملا کر رہ گئی۔

یہی حال میرا تھا۔ مجھے بھی حالات نے گانج کر رکھ دیا تھا اور میری وہ بہن جس کی آنکھوں میں مروارید ناسُفتہ کی چمک دیکھنے والے کو مسحور کر دیتی تھی اب بجھ کر رہ گئی تھی۔ اب وہ اپنے سامنے ماجدہ کو دیکھے گی تو خدا جانے دل میں کیا سوچے گی۔ ماجدہ سے میرے تعلق کا وہ کچھ نہ کچھ تو اندازہ کر ہی لے گی جب ہم ایک ہی چھت تلے سوتے تھے۔ تو وہ اس بات کا بہت خیال رکھتی تھی کہ اس کا بھائی غلط راستوں پر نہ چل نکلے۔ وہ اپنی کسی سہیلی کو بھی میری موجودگی میں گھر میں نہیں آنے دیتی تھی۔ وہ اپنے بھائی کو اندر سے بھی اتنا ہی خوبصورت دیکھنا پسند کرتی تھی جتنا وہ باہر سے تھا مگر اب جو اسے ماجدہ کی آنکھوں میں میری تصویر نظر آئے گی تو وہ کس قدر پریشان ہو گی۔ یہ بات ممکن تھی کہ وہ ماجدہ کے لب و لہجے سے اندازہ نہ کر سکے کہ میرا اس سے کیا رشتہ ہے۔

میری سوچ مجھے دُور دُور لیے پھرتی تھی۔ میرے ذہن میں عجیب وسوسے اور اندیشے جنم لے رہے تھے۔ گرد و پیش مجھے لھو رنگ نظر آتا تھا۔ کوئی شے اچھی نہیں لگتی تھی۔

میں صحن میں بیٹھا سگریٹ پہ سگریٹ پھونکتا جا رہا تھا، اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ حالات کی یہ پیچ در پیچ گرہیں میں کس طرح کھول سکوں گا۔ اس وقت صبح کے نو بج چکے تھے، دھوپ سارے آنگن میں پھیل چکی تھی۔ اچانک مجھے اپنے پیچھے ایک خوفناک چیخ ابھرتی سنائی دی۔ میں نے اُدھر نگاہ ڈالی تو دیکھا کہ ایک نوجوان عورت چادر میں لپٹی ہوئی دوسرے مکان کے باورچی خانے کی چھت پر سے حمیدہ کے کچے صحن میں گھاس پر کود گئی ہے۔ اس کے پیچھے ہی ایک آدمی بھی پاگلوں کی طرح صحن میں کودا۔ اس کے ہاتھ میں چمکتا ہوا خنجر تھا وہ نیچے گرا تو وہ عورت تیزی سے اُٹھی اور پاگلوں کی طرح میری طرف لپکی۔ میں نے دیکھا کہ وہ اپنے بدن کو لستر کی چادر سے ڈھانپنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ وہ گھٹی گھٹی آواز میں بولی۔

"بچاؤ خدا کے لیے مجھے بچاؤ۔ یہ مجھے قتل کر دے گا۔"

ابھی وہ میرے پاس پہنچی بھی نہیں تھی کہ وہ آدمی گندی گالیاں بکتا ہوا اس کی طرف شکرے ایسی تیزی سے لپکا اور پلک جھپکتے میں اس تک آ پہنچا۔ میرے لیے یہ سب کچھ ناقابلِ برداشت تھا۔ وہ خنجر سے اس کے برہنہ سینے پر وار کرنے ہی کو تھا کہ میں پورے قد سے اُس پر جا پڑا۔ اور اسے نیچے گرا کر میں نے وہ کلائی دبوچ لی جس میں اس نے خنجر تھام رکھا تھا۔ اس ظالم نے گرتے گرتے بھی اس عورت کو اپنی ٹانگوں میں یوں دبوچ لیا تھا کہ وہ ہل نہ سکتی تھی۔ وہ عورت بُری طرح چیخ رہی تھی۔ میں نے اس آدمی کی کلائی مروڑ کر اس کے ہاتھ سے خنجر چھین کر پوری قوت سے اس کے منہ پر [illegible] وہ خاصا مضبوط جسم کا مالک تھا۔ اس نے خنجر تو چھوڑ دیا مگر پھر اُس نے دونوں ہاتھوں سے میرے بال پکڑ کر مجھے جھنجوڑ ڈالا۔ میں نے اپنے بال اس کی گرفت سے چھڑانے کے لیے اس کا نرخرہ دبا دیا۔ یہ حربہ کارگر رہا۔ اس کا دم گھٹنے لگا تو اس نے میرے بال چھوڑ دیئے۔ میں نے اس کی گردن پر سے اپنی گرفت ڈھیلی کی تو وہ منہ کھول کر مجھے کتے کی طرح پھاڑ کھانے کے لیے اُوپر اٹھا۔ وہ عورت اب تک اس کی ٹانگوں میں پھنسی ہوئی تھی۔ وہ اپنی بے پناہ قوّت کو دو سمتوں میں صرف کر رہا تھا اور یہ اس کی قوّتِ ارادی کا کمال تھا کہ وہ نہ مجھ سے ہار مان رہا تھا اور نہ وہ اس عورت کو چھوڑنے پر آمادہ تھا۔ اس نے پاگلوں کی طرح میرے بائیں ہاتھ کی دو اُنگلیاں دانتوں میں لے کر دبائیں تو میں ڈرا کہ کہیں وہ میری انگلیاں ہی نہ کاٹ دے۔ میں نے مجبوراً اس کی گدّی پر ہاتھ ڈال کر اس کی رگِ احساس پوری قوت سے دبا دی اور وہ فوراً ہی بے سُدھ ہو کر جھُول گیا۔ میں نے اس عورت کو اس کی ٹانگوں سے نکالا تو وہ تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ یہی کوئی تئیس چوبیس سال کی نازک اندام سی عورت تھی۔ آنکھوں میں اس نے کاجل کے کرشمے سے شام کا سا سماں پیدا کر رکھا تھا اور اس کے رخساروں پر غازے کی تہہ نے اس کی دلکشی میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا۔ لبوں پر اُس نے گہرے سرخ رنگ کی لپ اسٹک لگا رکھی تھی۔ وہ سر جھکائے میری طرف پیٹھ موڑ کر یوں کھڑی تھی کہ نگاہیں اس کی اس آدمی پر جمی تھیں جو اب بالکل بے ہوش ہو چکا تھا۔ حمیدہ کو شاید کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا تھا وہ ابھی تک باورچی خانے سے باہر نہ نکلی تھی جو ان کمروں کی دوسری طرف بنا ہوا تھا۔

"یہ آدمی کون ہے آپ کو کیوں مارنا چاہتا تھا یہ؟"

"یہ... یہ میرا شوہر ہے۔ یہ... یہ مر تو نہیں گیا۔" اس نے دبی زبان میں کہا۔ چہرہ اب بھی اس کا میری طرف نہیں تھا۔

"یہ آپ کا شوہر ہے؟ کمال ہے مگر فکر نہ کریں یہ مرا نہیں ہے آئیں ادھر کمرے میں چلیں آئیں۔" میں نے اسے شانوں سے پکڑ کر

اپنی طرف کھینچا تو وہ میرے سینے میں اپنا منہ چھپا کر سسکنے لگی۔

میں نے بڑی آہستگی سے اسے اپنے آپ سے الگ کیا اور اسے ساتھ لے کر کمرے میں پہنچا۔ میں نے ماجدہ کے سلیپر اس کی طرف بڑھا دیے۔ وہ انہیں پاؤں میں پھنسا کر میرے سامنے ہی بستر پر بیٹھ گئی۔ نگاہیں اس کی جھکی ہوئی تھیں اور مجھے یوں لگتا تھا جیسے وہ ابھی رو دے گی۔

"کیا نام ہے آپ کا؟"

"میرا نام رُوحی ہے۔"

"یہ کیوں آپ کو مارنا چاہتا تھا۔ کیا نام ہے اس کا؟"

"اس کا نام اشفاق ہے۔ میرا شوہر ہے یہ۔"

"وہ تو آپ بتا ہی چکی ہیں مگر یہ آپ کے پیچھے خنجر لے کر کیوں دوڑا تھا۔ کیوں مارنا چاہتا تھا یہ آپ کو۔ اگر میں وہاں نہ ہوتا تو اس نے تو ختم کر دیا تھا آپ کو۔"

وہ کچھ نہیں بولی۔ فرش پر نگاہیں جمائے بیٹھی رہی۔ میں نے اُٹھ کر کمرے کے دونوں دروازے بند کر دیئے اور پھر اس کے پہلو میں جا بیٹھا۔ وہ سرک کر پرے ہو گئی۔

"مجھے بتائیں روحی کہ یہ معاملہ کیا تھا؟"

"وہ... وہ... دراصل میرے ایک کزن ہیں جمال صاحب وہ کوئی ایک گھنٹہ پہلے ہمارے گھر آئے تھے۔ اشفاق سات بجے دفتر کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں مگر وہ آج کچھ ہی دیر بعد واپس آ گئے۔ انہوں نے واپس آ کر مجھے جمال صاحب کے پاس بیٹھے دیکھ لیا۔ اس پر وہ مشتعل ہو گئے۔ جمال صاحب دوسرے دروازے سے بھاگ گئے، تو میں اشفاق سے خوفزدہ ہو کر صحن میں نکل گئی مگر یہ چھُرا لے کر میرے پیچھے دوڑے۔ میں ان سے اپنی جان بچانے کے لیے چھت کی طرف دوڑی تو یہ اوپر آ گئے۔ میں نے ان کے سر پہ خون سوار دیکھا تو پاگلوں کی طرح ادھر کود گئی۔ اگر آپ وہاں نہ ہوتے تو یہ مجھے جان سے مار دیتے۔ ان کی شکّی طبیعت ہمیں ایک ایک دن ضرور تباہ کر دے گی۔"

"اب کہاں ہیں وہ؟"

"وہ بھی کہیں چھپے ہوئے ہوں گے۔"

"ہوں، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ شوہر جب گھر سے نکل جاتا ہے تو آپ جمال صاحب کے ساتھ ملاقاتیں کرتی ہیں؟"

وہ چپ رہی کچھ نہیں بولی۔ اپنی سرمہ سا آنکھیں اس نے پوری طرح کھول کر میرے چہرے پر جما دیں یوں جیسے وہ میری تصویر اتار رہی ہو۔

"یہی بات ہے نا؟"

"جی۔ وہ... وہ... دراصل مجھے جمال صاحب سے بہت محبت ہے میری منگنی انہی کے ساتھ ہوئی تھی مگر پھر میرے ماں باپ نے میری

شادی اشفاق صاحب سے کردی۔"
"ہوں! تو یہ محبت کا پرانا زخم ہے جس کی مرہم پٹی کے لیے جمال صاحب آپ کے پاس اس وقت آتے ہیں جب ڈاکٹر اشفاق وہاں موجود نہیں ہوتے۔"
"وہ ڈاکٹر تو نہیں ہیں۔ اُن کی تو سگریٹ کی ایجنسی ہے۔"
"میرا مطلب یہ تھا کہ جمال صاحب نرس سے دوا لیتے ہیں اور ڈاکٹر سے مُنہ چھپاتے ہیں۔"
"آپ میرے زخموں پر نمک تو نہ چھڑکیں۔" اس نے بڑے جلے کٹے لہجے میں کہا۔ اب وہ اپنے ہونٹوں پر لگی سرخی چادر سے پونچھ رہی تھی۔
"میں نمک تو نہیں چھڑک رہا ہوں رُوحی میں تو حقیقت عرض کر رہا ہوں ویسے میرا خیال ہے جمال صاحب کے انتخاب کی داد نہ دینا زیادتی کی بات ہوگی۔"
"کہیں وہ اشفاق مر تو نہیں گئے ہیں؟" اس نے میری بات اَن سُنی کردی۔
"ہو سکتا ہے وہ مرگئے ہوں۔ آپ کو بچانے کے لیے میں نے تو کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہے۔"
"آپ نے کیا کیا ہے ان کے ساتھ۔ ان کو زخم بھی تو کوئی نہیں لگا ہے۔"
"اگر وہ مرگئے تو یہ بات آپ کے لیے اچھی ہی ہوگی۔ اس طرح آپ جمال صاحب سے بڑے آرام سے شادی کر سکیں گی۔"
"نہیں جناب۔ میں... میں... میں جمال صاحب کے لیے اپنی زندگی تباہ نہیں کر سکتی۔"
"وہ تو ہو ہی گئی ہے خانم! کیا خیال ہے آپ کا اشفاق آپ کو معاف کردے گا۔"
"بس میری آنکھوں پر پٹی بندھ گئی تھی۔ مجھے جمال صاحب نے ...مجبور کردیا تھا۔"
"آپ کہاں کی رہنے والی ہیں؟"
"میرے ماں باپ ادھر ڈسکہ میں رہتے ہیں۔"
"اور یہ اشفاق صاحب ان کا وطن مالوف کونسا ہے؟"
"وہ کیا ہوتا ہے۔" اب کی بار اس نے پھر اپنی وہ کاجل بھری آنکھیں پُوری طرح کھول کر مجھے دیکھا۔ اس کے ہونٹ خون آلود زخم ایسے تھے۔ باریک اور ترشے ہوئے۔
"میرا مطلب ہے کہ وہ کہاں کے رہنے والے ہیں؟"
"اوہ میں سمجھی! وہ قلعہ دیدار سنگھ میں رہتے ہیں۔ یہاں کاروبار کے لیے آئے ہوئے ہیں۔"
"کتنا عرصہ ہوا آپ کی شادی کو؟"
"تین سال۔"
"بچے کتنے ہیں آپ کے؟"
"بچہ کوئی نہیں ہے ہمارا۔"
"کیوں؟"
"مجھے کیا پتہ! ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اشفاق میں کوئی نقص ہے۔"
"گُڈ خاصی سمجھدار معلوم ہوتی ہیں آپ۔"
"پلیز! مجھے اس مصیبت سے چھڑالیں۔ مجھے بہت ڈر لگتا ہے اشفاق مجھے قتل کردیں گے۔ وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔" پہلی بار اسے حالات کی سنگینی کا احساس ہوا۔ پہلی بار اس کے چہرے پر شدید کرب کے آثار نمودار ہوئے۔ اب تک وہ واقعات کی تیزی میں تنکے کی طرح بہتی رہی تھی مگر اب اس کے شعور کی لہروں پر بجلیاں کوندنے لگی تھیں اور ایک گمبھیر سی سنجیدگی اس کے بشرے سے ہویدا ہونے لگی تھی اور وہ یوں سمجھنے لگی تھی کہ اگر میں نے اسے پناہ نہ دی تو وہ بھسم ہو کر رہ جائے گی۔
اچانک مجھے باورچی خانے کی طرف سے حمیدہ کے سلیپروں کی سٹر پٹر سُنائی دی۔ وہ شاید صحن کی طرف جارہی تھی۔ میں تیزی سے اٹھا اور دروازہ کھول کر باورچی خانے کی طرف لپکا۔ حمیدہ ابھی تک باورچی خانے سے نکل کر چھوٹے سے برآمدے کو عبور نہ کرپائی تھی کہ میں نے اسے جالیا۔
"کہاں جارہی ہیں باجی؟"
"میں ادھر سے کچھ لکڑیاں لے آؤں صحن میں رکھی ہیں۔" وہ بہت سنجیدہ دکھائی دے رہی تھی۔
"آپ ادھر باورچی خانے میں بیٹھیں۔ میں لا دیتا ہوں لکڑیاں۔ میرے لیے ذرا جلدی سے ایک پیالی چائے بنا دیں۔" میں نے حمیدہ کو کندھوں سے پکڑ کر باورچی خانے کی طرف موڑ دیا۔ وہ حیرت زدہ سی ہو کر میرے ساتھ چلی اور باورچی خانے میں جا گھُسی۔
"صرف ایک پیالی چائے کا سوال ہے باجی جان!" میں نے انگشت شہادت بلند کر کے اسے مسکراتے ہوئے بتایا
"چائے میں ابھی بنا دیتی ہوں پر یہ لکڑیاں کچھ گیلی تھیں اس لیے میں نے سوچا کچھ اُدھر سے سوکھی لکڑیاں لے آتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ چولھے کے پاس جا بیٹھی۔
"وہ میں لا دیتا ہوں آپ کیتلی میں پانی بھر کر چُولھے پر رکھیں۔" یہ کہہ کر میں صحن کی طرف نکلا اور وہاں کونے میں رکھی صحن میں لگے درخت کی پرانی کٹی ہوئی سوکھی ٹہنیاں اٹھا کر باورچی خانے میں پہنچا دیں۔ اشفاق وہاں ابھی تک بے سُدھ پڑا تھا۔
باورچی خانے میں حمیدہ کو مصروف کر کے میں پھر صحن میں نکلا اور اشفاق کو کندھے پر اٹھا کر کمرے میں لے گیا۔ اسے دیکھتے ہی رُوحی اپنی جگہ

سے اچھل کر اٹھی اور وحشت زدہ سی ہو کر بولی:
"یہ زندہ تو ہیں نا ابھی تک؟"
"ہاں آپ بالکل بے فکر رہیں یہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔" میں نے اشفاق کو بڑی آہستگی سے پلنگ پر لٹا کر اس پر لحاف ڈال دیا۔
روحی اس کے پاس بیٹھ کر اس کی نبض ٹٹولنے لگی۔ جب اسے اطمینان ہوگیا کہ وہ ابھی زندہ ہے اور اس کی نبضیں ٹھیک چل رہی ہیں تو اسے اطمینان ہوا۔
اچانک دروازے پر حمیدہ نے دستک دی۔ وہ چائے تیار کر کے لائی تھی۔ میں نے روحی کو لحاف میں لپیٹ کر بند کیا اور دروازے پر جا پہنچا۔
"کون ہے؟"
"میں ہوں۔ یہ چائے لے لو۔" حمیدہ کی آواز خاصی کرخت تھی۔
"اوہ! میں تو بھول ہی گیا تھا۔ لائیں، میں دراصل لحاف میں لیٹ گیا تھا۔ سخت نیند آرہی تھی۔" یہ کہہ کر میں نے دروازے کا پٹ ذرا سا کھول کر اس کے ہاتھ میں سے چائے کی پیالی لے کر دروازہ بند کردیا۔
"اب میں ذرا آرام کروں گا باجی! ایک بجے سے پہلے مجھے نہ جگائیں۔"
میری بات کا کوئی جواب دیئے بغیر وہ باورچی خانے کی طرف واپس چلی گئی۔ میں نے چائے کی پیالی لے کر روحی کے لبوں سے لگادی وہ خوش ہوگئی بولی۔
"یہ بہت اچھا کیا آپ نے، مگر آدھی پیالی آپ پیئں۔"
"اس حمیدہ باجی کو جانتی ہیں آپ؟"
"نہیں! ہمیں یہاں اس مکان میں آئے ابھی ایک ہی مہینہ ہوا ہے۔ پہلے ہم اُدھر اسلامیہ پارک میں رہتے تھے۔ اب کیا کریں گے آپ؟ اشفاق تو ابھی تک بے ہوش ہے۔"
"دیکھیں روحی! میرا تو یہ خیال ہے کہ اگر آپ اب اس شخص کے ساتھ رہیں تو یہ کسی بھی وقت آپ کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔"
"یہی تو میں ڈرتی ہوں جناب.... کیا نام ہے آپ کا؟"
"میرا نام خاکوانی ہے، رحیم خاکوانی۔"
"اوہ میں سمجھی! آپ خاکوانی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ تو بہت بڑے جاگیردار لوگ ہیں۔"
"ہاں! میری بہت بڑی زمینداری ہے اُدھر کوٹ ادو کی طرف یہ حمیدہ میری خالہ زاد بہن ہیں۔ میں بس انہیں ہی دیکھنے آیا تھا۔"
"میں تو سمجھی تھی کہ آپ کوئی نئے نویلے دولہا ہیں۔ یہ سارا سامان بالکل نیا ہے اور کسی کے جہیز میں آیا لگتا ہے۔"
"جی نہیں۔ یہ حمیدہ باجی کا اپنا سامان ہے۔ ایک جگہ بہت عرصے سے محفوظ پڑا تھا۔ کل ہی آیا ہے یہاں۔"
"یہ بہت عرصے کا خریدا ہوا تو ہرگز نہیں لگتا ہے؟"
"ہاں! مگر اسے اب تک کسی نے استعمال نہیں کیا تھا۔"
"وہ تو خیر ٹھیک ہے خاکوانی صاحب! مگر اب مجھے بتائیں کہ میں کیا کروں۔ میری جان تو سخت خطرے میں ہے۔" وہ اشفاق کے پلنگ کو گہری گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔
"آپ یوں کریں کہ اپنا ضروری سامان باندھ کر آج ہی ڈسکے چلی جائیں اور اس آدمی سے طلاق لے لیں۔"
"طلاق لے لوں؟ مگر.... مگر پھر میں کیا کروں گی؟"
"آپ جمال صاحب سے شادی کرلیں۔"
"جی نہیں! میں اس خبیث کے بغیر ہی بھلی۔ اس میں تو اتنی بھی جرأت نہیں تھی کہ وہ مڑ کر یہ ہی دیکھ لیتا کہ مجھ پر کیا گزری ہے۔"
"جس صورتِ حال سے وہ دوچار تھا۔ اس میں وہ اور کیا کر سکتا تھا؟"
"مقابلہ کرتا! اشفاق سے وہ کم طاقتور تو نہیں ہے۔"
"آپ کے لئے یہی بہتر ہے کہ آپ اس سے شادی کرلیں۔"
"نہیں خاکوانی صاحب میں..... میں تو اب... اب۔"
"ہاں ہاں کہیں! رُک کیوں گئی ہیں آپ؟"
"مجھے..... مجھے آپ اپنی کنیز بنالیں۔"
"اجی نہیں! میں اس گاڑی کا بیل نہیں ہوں روحی بانو! یہ دو گھڑی کی ملاقات بہت کافی ہے۔ میں تو پہلے ہی شادی شدہ ہوں تین بیویاں ہیں میری!"
"اچھا! تین بیویاں ہیں آپ کی۔ چلیں ایک کی گنجائش اور نکال لیں۔ میں آپ کی کنیز بن کر رہ لوں گی اور آپ کی بیویوں کی بھی۔"
"پاگل ہیں آپ! اتنی جلدی اتنے بڑے بڑے فیصلے کرلیتی ہیں حد ہوگئی۔ آپ میری بات مانیں اور ابھی واپس جا کر اپنا سامان درست کریں اور آج ہی ڈسکے چلی جائیں۔ جمال صاحب کا پتہ مجھے دیتی جائیں میں انہیں سمجھاؤں گا۔ آپ ان کو نہ چاہتے ہوئے بھی ان سے شادی کرلیں۔"
"ٹھیک ہے۔ مجھے آپ کا یہ مشورہ منظور ہے۔"
اس نے فرش پر پڑا ہوا سگریٹ کا خالی پیکٹ اٹھا کر اس کے سفید حصے پر مجھ سے پنسل لے کر جمال صاحب کا اور اپنا ڈسکے کا پتہ لکھ دیا۔ وہ کاغذ کا ٹکڑا میں نے جیب میں رکھا اور پھر اسے چُپ چاپ بڑے دروازے میں سے گزار کر اس کے گھر بھیج دیا۔
جب میں دروازہ بند کر کے پیچھے مڑا تو میں نے دیکھا کہ حمیدہ باورچی خانے کی کھڑکی میں سے مجھے حیران پریشان نظروں سے دیکھ

رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں جمی حیرت نے مجھے پریشان کر دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ رجی کے اس راز سے واقف ہو جائے۔ مگر بات کھل کر بکھرتی جا رہی تھی۔ میں نے اپنے چہرے پر پھیلی خفت کو مٹاتے ہوئے اس صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لئے کمرے میں واپس جانے کے بجائے حمیدہ سے بات کرنا بہتر سمجھا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا میں باورچی خانے میں جا گھسا۔ اس نے مجھے یوں اپنے سامنے دیکھا تو... نظریں جھکا کر چولھے کے سامنے جا بیٹھی۔ اور ہانڈی کا ڈھکنا اٹھا کر اس میں ڈوئی پھیرنے لگی۔

"باجی آپ اس لڑکی کو جانتی ہیں جو ابھی باہر گئی ہے؟"

"ہاں! یہ ہمارے محلے میں رہتی ہے۔ کوئی ایک مہینہ پہلے یہاں آئے تھے یہ لوگ۔"

"آپ کو پتہ ہے یہ یہاں کیوں آئی تھی؟"

"نہیں! یہ پہلے تو کبھی ہمارے گھر نہیں آئی۔"

"پھر آج یہ ادھر کیا لینے آئی تھی۔ کہتی تھی ادھر اس کی مرغی صحن میں گر گئی ہے۔"

"آپ نے کیا کہا؟"

میں نے آپ کو زحمت نہیں دی خود اسے صحن دکھا دیا تھا وہ اِدھر اُدھر جھانک کر چلی گئی۔ میں نے کہا بھی تھا کہ وہ آپ سے مل لے مگر وہ اِدھر نہیں آئی۔ کہتی تھی میں پہلے مرغی تلاش کر لوں۔"

"بکواس کرتی ہے وہ! میرا خیال ہے وہ کسی اور ہی کام سے آئی تھی۔" حمیدہ نے ہانڈی پھر سے بند کر دی۔ وہ بہت پریشان نظر آتی تھی اور مجھ سے نظریں نہیں ملا رہی تھی۔

"اور کیا کام ہو سکتا ہے اسے؟ میں تو اسے بالکل نہیں... جانتا تھا۔"

"پتہ نہیں کیا لینے آئی تھی وہ! مجھ سے آپ نے ملوایا ہوتا تو میں پوچھتی۔" دھیان اس کا ابھی تک چولہے کی طرف تھا۔

"بس مجھ سے یہی غلطی ہو گئی۔ ویسے بھی میرا خیال ہے کہ وہ آپ سے ملنا نہیں چاہتی تھی۔"

"بڑی کم ذات عورت ہے یہ۔ میں نے سنا ہے کہ ایک لڑکا اکثر اس کے گھر آتا ہے مگر اس وقت جب اس کا شوہر گھر میں نہیں ہوتا۔ ہو سکتا ہے یہ آپ کو پھانسنے کے لئے ادھر چلی آئی ہو۔ اس نے آپ کو صحن میں بیٹھے دیکھ لیا ہو گا۔"

"اچھا! ایسی بدمعاش عورت ہے یہ۔ مگر مجھ سے اس نے کوئی انٹ شنٹ بات نہیں کی۔ ورنہ میں تو اس کی اچھی طرح خبر لیتا۔ ایسا کچا کھلا نہیں ہوں میں۔"

"اچھا کیا آپ نے اُسے چلتی کیا۔ بڑی چھنال عورت ہے یہ۔ بڑا ناز ہے اسے اپنے حُسن پر۔" حمیدہ نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ اب وہ زمین پر گری کوئی چیز ٹٹول رہی تھی۔ اس کے لہجے کی سرد مہری مجھے کھٹک رہی تھی۔

"اچھا ٹھیک ہے اور ہاں اس عورت کے سلسلے میں آپ میرے متعلق کوئی غلط نظریہ قائم نہ کریں۔"

"نہیں! مجھے کیا ضرورت ہے؟ میں تو اپنے گھر کی ذمہ دار ہوں"

حمیدہ کی یہ بات سن کر میں کمرے میں جا گھسا۔ اشفاق ابھی تک بے ہوش تھا اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اس سے کس طرح چھٹکارا پاؤں۔ میں نے خواہ مخواہ اپنے لئے ایک مصیبت کھڑی کر لی تھی اس رُجی کی ہمت پر مجھے حیرت تھی۔ وہ آٹھ نو فٹ اونچی چھت سے بے خطر کود کر نیچے آ گئی تھی اور اسے ذرا بھی چوٹ نہیں آئی تھی اشفاق کا حال مجھے البتہ نہیں معلوم تھا۔ عین ممکن ہے اس کی ایک آدھ ہڈی چٹخ گئی ہو۔ کیونکہ وہ خاصا تنومند اور بھاری بھرکم آدمی تھا۔ پھر بھی جس انداز سے وہ مجھ سے ٹکرایا تھا اور جس آہنی عزم سے وہ مجھ سے الجھ گیا تھا۔ اس سے تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ جب نیچے کودا تھا تو اسے کوئی چوٹ نہیں آئی تھی۔

مگر جو زخم اس کے دل پر لگا تھا۔ اس کا اندازہ میں بخوبی کر سکتا تھا۔ رُجی نے اس کی غیرت کے دامن کو تار تار کر دیا تھا۔

میں کتنی ہی دیر تک کمرے میں بیٹھا اپنے آپ سے الجھتا رہا ـــ میں اس انتظار میں تھا کہ رُجی گھر سے روانہ ہونے سے پہلے مجھے ضرور خبردار کرے گی۔ ایسے میں نے یہی سمجھا تھا اور اس نے وعدہ بھی کیا تھا کہ وہ تیار ہو کر کوٹھے پر مجھے خدا حافظ کہنے ضرور آئے گی۔

کوئی ڈیڑھ گھنٹے بعد مجھے پچھلے دروازے پر ٹھک کی آواز سنائی دی۔ میں تیزی سے صحن میں نکلا۔ وہ اپنے مکان کی چھت پر کھڑی تھی۔ اس نے برقعہ پہن رکھا تھا اور چہرے کو دھو کر اس نے میک اپ کی آلائش سے پاک کر لیا تھا۔ میں جونہی اس کے سامنے گیا وہ انگلی کے اشارے سے مجھے کچھ بتانے لگی۔ میں نے اس کی انگشتِ شہادت کی سمت میں صحن پر نظر ڈالی تو وہاں مجھے ایک لفافہ نظر آیا۔ وہ میں نے لپک کر اٹھا لیا۔ وہ منڈیر پر جھکی اور دبی زبان میں بولی: "میں جا رہی ہوں خاکوانی صاحب.... خدا حافظ۔" پھر تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھی اور پھر میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

میں نے لفافہ وہیں کھڑے کھڑے کھول کر پڑھا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نشے میں ہوں۔ اس نے میری ماں کا واسطہ دیا تھا کہ میں جس طرح بھی ہو سکے اسے ڈسکہ میں اُس کے گھر آ کر ملوں۔ اس کا باپ اُدھر کسی سکول میں ہیڈ ماسٹر تھا۔ اس کا نام نوازش علی تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ میں ہیڈ ماسٹر کی اکلوتی اولاد

ہے اور ماں اس کی فوت ہو چکی ہے۔ اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ وہ اُدھر ایک مربع زمین کی مالک ہے۔ جسے وہ میرے نام لکھوا دے گی۔ وہ میری چوتھی بیوی بننے کو بھی اپنے لئے بہت بڑا اعزاز قرار دے رہی تھی۔ اشفاق اور جمال دونوں پر اس نے ہزار لعنت بھیجی تھی اور وہ چاہتی تھی کہ میں اسے ہمیشہ کے لئے اپنا لوں۔ اس نے دبے لفظوں میں اشفاق کی زبردست مذمت کی تھی۔

یہ بہت بڑا المیہ تھا۔ میں نے عورت کا یہ رُخ کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔

لفافہ جیب میں ڈال کر میں کمرے میں واپس پہنچا اور دیکھا کہ اشفاق لحاف کے اندر کسمسا رہا تھا۔ اس کا چہرہ اس بات کا غماض تھا کہ اسے ہوش آ رہا ہے۔ تب مجھے اس کا وہ خنجر یاد آیا جو میں بے خیالی میں وہیں صحن میں بھول آیا تھا۔ حمیدہ اس وقت بھی باورچی خانے میں بیٹھی تھی۔ میں بھاگ کر صحن میں نکلا اور خنجر ہاتھ میں لے کر کمرے میں آ گیا۔ اس وقت تک اشفاق نے آنکھیں کھول دی تھیں اور وہ حیران پریشان ہو کر گردوپیش کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ بدک کر اٹھا اور لحاف الگ پھینک کر سیدھا ہو گیا۔ مگر پھر اچانک اسے گردن کے پٹھوں پر بوجھ سا محسوس ہوا تو وہ اپنی گُدّی سہلانے لگا۔

"اب کیا حال ہے آپ کا؟"

میں نے اس کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ خنجر میرے ہاتھ میں تھا۔ جس کی چمک حیرت انگیز تھی۔ ایسا خنجر میں نے بالعموم ایسے لوگوں کے پاس دیکھا تھا جو جنگ و جدل کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ وہ یا تو فوج کے سپاہیوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے یا شاید جیب تراشوں کی بغل میں۔

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ بار بار گردن کو دائیں بائیں ہلا کر پٹھوں کو رواں کرتا رہا۔

"اب طبیعت کیسی ہے آپ کی؟ آپ ادھر صحن میں.... بے ہوش ہو گئے تھے۔"

اب کی بار میں نے ذرا بلند آواز میں کہا۔ اس نے گہری گہری نظروں سے مجھے بڑے نفرت بھرے انداز سے دیکھا اور بولا۔

"میں بے ہوش ہو گیا تھا یا تم نے میری گردن دبا دی تھی؟"

"ایک ہی بات ہے جناب! بہرحال آپ بے ہوش ہو گئے تھے اور اس کے بعد اب ہوش میں آئے ہیں۔"

میں نے خنجر اپنی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا ـــ نظریں میری برابر اس کی حرکتوں پر جمی تھیں۔ مجھے اس سے بہت زیادہ ہوشیار رہنے کی ضرورت تھی کیونکہ میں دیکھ چکا تھا کہ وہ داؤ پیچ کا ماہر آدمی ہے۔ اگر میں اس کی رگِ احساس نہ مسل دیتا تو وہ مجھے صحن میں زیر کر چکا تھا۔

"یہ کون سی جگہ ہے؟"

"یہ آپ کے ہمسائے کا گھر ہے۔ یہاں حمیدہ باجی رہتی ہیں۔ انہی کے صحن میں تو آپ کودے تھے۔ آپ کو یاد ہو گا۔"

"وہ..... وہ..... وہ حرامزادی کہاں ہے ـــ وہ میری بیوی.....؟"

"وہ اپنے گھر چلی گئی تھی۔ اسی وقت جب آپ بے ہوش ہوئے تھے۔ آپ نے تو اسے آج مار ہی ڈالا تھا۔"

اس نے تیزی سے اپنے پاؤں پلنگ سے نیچے اتارے۔

"یہ خنجر مجھے دے دیں۔ ابھی مجھے اس سے حساب لینا ہے۔" اس نے بڑے بارُعب لہجے میں کہا۔

"جی نہیں! میں آپ کو کسی کی جان لینے کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

"تم کون ہو ہمارے معاملے میں دخل دینے والے۔ یہ خنجر مجھے دے دو..... یہ میرا ہے۔"

"کیا یہ کافی نہیں کہ یہ آپ کا گھر نہیں ہے اور مجھ پر آپ کا کوئی حق نہیں ہے۔"

"میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔ میری بیوی بدچلن ہے۔ میں نے اسے اپنی آنکھوں سے غیر مرد کے ساتھ دیکھا ہے۔ تم سمجھتے ہو میں اسے معاف کر دوں گا۔ میں..... میں ـــ" وہ مٹھیاں بھینچ کر پلنگ سے اٹھ گیا۔ میں نے بھی کرسی چھوڑ دی۔ میں اسے کوئی... موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔

"میرا راستہ چھوڑ دو۔ میرے اور اس کے درمیان فیصلہ ہو کر رہے گا۔"

"ایک نہتی کمزور عورت پر ہاتھ اٹھانا مردانگی نہیں ہے، اشفاق صاحب! آپ جوان آدمی ہیں۔ اس کو قتل کر کے آپ خود مصیبت میں پھنس جائیں گے۔"

"مجھے سب کچھ معلوم ہے میرے لئے ساری نصیحتیں بے کار ہیں یہ خنجر اِدھر لائیں۔"

"یہ تو میرے پاس رہے گا۔ آپ وہاں سے کوئی اور ہتھیار لے لیں۔ گھر میں اور بھی چھُریاں ہوں گی۔ اور اس کام کے لئے تو چمٹا بھی بہت کافی ہے۔ وہ کمزور سی دھان پان عورت کیا کر سکتی ہے بھلا۔ بہتر تو یہ ہو گا کہ آدھ گز رسی لے کر اس کا گلا گھونٹ دیں۔ اسے تو مارنا کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔" میں نے دیوار کے ساتھ کھڑے ہو کر کہا۔

میری مسکراہٹ پر وہ جل کر رہ گیا۔

"ٹھیک ہے۔ میں تم سے پھر نپٹوں گا مگر یاد رکھو! میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں۔ مجھے نہیں جانتے ہو تم۔" یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف بڑھا۔

"ٹھہرو اشفاق میاں! میری بات غور سے سنو! ایسی لفنگی عورت کے پیچھے تمہیں پاگل ہونے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ گھر جاکر اسے طلاق دے دو ـــــ یہی تمہارے لئے بہتر ہوگا۔ سمجھے کہ نہیں۔ میری بات پر ٹھنڈے دل سے غور کرو۔" یہ کہہ کر میں نے اسے ایک طرف دھکیل کر دروازہ کھول دیا۔ خنجر میرے سیدھے ہاتھ میں تھا۔ وہ تلملاتا ہوا دروازے سے نکلا اور باہر چلا گیا۔ اس کے چہرے پر ایسی دہشت طاری تھی کہ میں سمجھتا تھا کہ اگر اس وقت روحی گھر میں موجود ہوئی تو وہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا مگر اچھا ہوا کہ وہ وہاں سے فرار ہو چکی تھی۔

اشفاق نے گلی کا دروازہ اپنے پیچھے تھڑاپ سے بند کیا تو میں نے دیکھا کہ حمیدہ پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ وہ باورچی خانے کے باہر کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر پھیلا تحیّر مجھے نڈھال کر گیا۔ اس تحیّر میں ایک عجیب سی نفرت گھلی ہوئی تھی۔ جس کا وہ اظہار نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مجھے اس نے مڑتے دیکھا تو وہ فوراً ہی باورچی خانے میں جا گھسی۔ میرا جی چاہا کہ میں اس کے پاس جاکر اس سے پوچھوں کہ اس کے چہرے پر اتنا سارا تحیّر اور تکدّر کہاں سے پیدا ہو گیا ہے مگر روحی کی وجہ سے میرے دل میں خوف پیدا ہو گیا تھا۔ اب جو حمیدہ نے اشفاق کو برافروختہ حالت میں میرے کمرے سے باہر جاتے دیکھا تھا تو خدا معلوم وہ اپنے دل میں کیسے کیسے وسوسوں کو جگہ دے بیٹھی ہوگی۔ اس کا رویّہ میرے لئے بہرحال خاصا تشویشناک بن گیا تھا۔ وہ بہت بپھری ہوئی نظر آتی تھی ـــــ اس کا سامنا کرنے کے بجائے میں کمرے میں جا گھسا۔ خنجر میں نے میز کے دوسری طرف ڈال دیا۔

ابھی مجھے وہاں بیٹھے دس منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ دروازے پر بڑی زوردار دستک ہوئی۔ لگتا تھا کوئی سگ گزیدہ آدمی دروازے سے سر پھوڑ رہا ہے۔ میں کمرے سے باہر نکلا تو حمیدہ بھی باورچی خانے سے لپکتی ہوئی آگے بڑھی۔

"آپ ٹھہریں میں دیکھتا ہوں باجی یہ کون بدتمیز ہے۔" انہیں راستے میں روکتے ہوئے میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تو اشفاق نے اندھے بھینسے کی طرح مجھ سے ٹکرا کر مجھے پیچھے دھکیل دیا۔ اس کی ٹکر سے تیورا کر میں سامنے کی دیوار میں جا لگا۔

وہ گندی گالی بکتا ہوا میری طرف بڑھا۔ ایک چمکتا ہوا خنجر اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ میرے بالکل سامنے آکر رک گیا اور کڑک کر بولا۔

"بتاؤ! مجھے بتاؤ! اس گشتی کو تم نے کہاں بھیجا؟"

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے اشفاق! مجھے کیا معلوم وہ کہاں گئی؟ میرا کیا واسطہ ہے اس سے؟"

"تم جھوٹ بولتے ہو! بتاؤ وہ کہاں گئی ہے۔ وہ میرے گھر سے سوئی سلائی تک لے گئی ہے۔ سارا سامان وہاں سے غائب ہے۔" وہ بہت زیادہ غضب ناک ہو رہا تھا۔

"مگر مجھے کیا پتہ وہ کہاں گئی ہے؟ میرا کیا واسطہ ہے اس سے؟" میں نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"تم یوں نہیں بتاؤ گے۔ میں..... میں تمہارا خون پی لوں گا" یہ کہہ کر اس نے ایک دم آگے بڑھ کر خنجر کی نوک میری گردن پر رکھ دی۔ ٹھیک بائیں ہنسلی سے ذرا اوپر۔ اس سے بچنے کے لئے میں تیزی سے پیچھے سرکا تو میرے اور اس کے خنجر کی نوک کے درمیان ذرا سا فاصلہ پیدا ہو گیا۔ اس نے پھر خنجر آگے کیا تو میں نے اس کی کلائی دبوچ کر پوری قوت سے مروڑ دی۔ وہ بے بس ہو کر میری گرفت سے نکلنے کے لئے ایڑی پر گھوما تو اس کا بازو میں نے مروڑ کر اس کی کمر سے لگا دیا۔ وہ بہت ہی فحش گالیاں بک رہا تھا غصے کی شدت نے اسے پاگل کر دیا تھا۔ میں نے اس کی کلائی پر ذرا سا دباؤ ڈالا تو خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑا۔

"یوں کام نہیں چلے گا استاد! میرا خیال ہے تو اپنے دل کے ارمان نکال ہی لے۔" میں نے پاؤں کی ٹھوکر سے خنجر کو دور پھینک کر اس کی کلائی کو ذرا سا جھٹکا دیا اور پھر اس کی کمر پر گھٹنا مار کر میں نے اسے سامنے کی دیوار میں دے مارا۔ اس کا سر دیوار میں اتنے زور سے لگا کہ وہ نڈھال ہو کر اوندھے منہ زمین پر گر گیا۔

"یہ..... یہ کیا ہو رہا ہے میرے گھر میں؟" حمیدہ نے ہاتھ مسلتے ہوئے کہا۔

"یہ بات آپ اپنے اس ہمسائے سے پوچھیں۔" یہ کہہ کر میں نے دروازہ اندر سے بند کر کے اشفاق کو اس کے گریبان سے پکڑ کر اٹھایا اور پوری قوت سے ایک گھونسا اس کے منہ پر دے مارا۔ اور..... اور..... میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کا نچلا جبڑا ایسے انداز سے باہر نکل آیا کہ اس کی شکل ہی نہ پہچانی جاتی تھی۔ وہ بالکل بن مانس لگ رہا تھا اس وقت ـــــ اس کا حال بالکل اس بدبخت ایسا ہو رہا تھا جسے میں نے اس روز گجرات کی طرف سفر کے دوران ٹیکسی میں الٹے ہاتھ کا جھانپڑ دے مارا تھا۔ اشفاق درد سے بلبلا کر زمین پر گرا تو حمیدہ نے واویلا شروع کر دیا۔

"ہائے یہ کیا کر دیا تو نے بھائی! یہ تو مر گیا ہے بیچارا۔ ہائے میرے گھر میں خون خرابہ!"

وہ پاگلوں کی طرح چیخنے لگی تھی۔ اشفاق کی آنکھیں مندنے لگی تھیں۔ درد نے اسکے ہوش وحواس معطل کر دیئے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر اس کے جبڑے پر باہر کی طرف سے دائیں ہاتھ سے دباؤ ڈالا تو اس کا جبڑا اپنی اصلی حالت پر آ گیا۔ مگر اب اس میں مقابلے کی سکت باقی نہیں رہی تھی۔

"اسے پانی پلائیں باجی۔ مسالہ کچھ زیادہ ہی لگ گیا ہے اسے۔" یہ کہہ کر میں نے اشفاق کو سیدھا کر کے دیوار کے ساتھ بٹھا دیا۔ وہ ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ کر بری طرح ہانپ رہا تھا۔ سر اس کا دائیں طرف جھول گیا تھا اور سانس اس کا دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔

حمیدہ دوڑ کر پانی لائی ـــــ وہ اس نے غٹا غٹ پی کر بڑی بے چارگی کے انداز سے مجھے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔ تو..... تو کیا چیز ہے میرے یار؟

"ہاں پہلوان جی! اب کہو کیا حال ہے؟" میری یہ بات سن کر اس کی آنکھیں بہہ نکلیں۔ یہ موٹے موٹے آنسو اس کے رخساروں پر اتر آئے۔ سانس اس کا ابھی تک قابو میں نہیں آیا تھا۔

"میرے ساتھ آؤ! ذرا میں بھی تو دیکھوں ادھر ہوا کیا ہے تیرے گھر میں؟"

"بھائی جی کیا ہوا ہے ادھر۔ کیوں حملہ کیا اس نے آپ پر؟"

"اس کی بیوی گھر سے بھاگ گئی ہے باجی! اور یہ کہتا ہے کہ وہ اپنا سارا سامان بھی ساتھ لے گئی ہے۔"

"مگر آپ پر کیوں ہاتھ اٹھایا ہے اس نے؟"

"پتہ نہیں۔ یہ کہتا ہے کہ اس کی بیوی کو بھگانے میں میرا ہاتھ ہے۔ حالانکہ میں اس بے چاری کو جانتا تک نہیں۔ پہلی بار زندگی میں میں نے یہ گلی دیکھی ہے اور اس کی یہ منحوس صورت بھی میں آج ہی دیکھ رہا ہوں۔ اس بے غیرت کی۔"

"ہائے میں مر گئی! کیسے کیسے معاملے ہو رہے ہیں یہاں؟ وہ تو چی پتہ نہیں کس کے ساتھ بھاگی ہے؟" حمیدہ نے حیرت زدہ ہو کر اور زیادہ تیزی سے اپنے ہاتھ ملے۔

میں نے اشفاق کو کندھوں سے پکڑ کر اس کے پاؤں پر کھڑا کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ اس کے بدن میں سکت ہی نہیں رہی ہے کچھ تو روحی کی اس بے وفائی نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔ اس پر میری اس ٹھکائی نے اس کا رہا سہا حوصلہ بھی ختم کر دیا۔ میں اسے اپنے ساتھ لے کر پاؤں پاؤں چلاتا ہوا اس کے مکان تک لے گیا ـــ گلی اس وقت بالکل سنسان پڑی تھی۔ چاروں طرف سناٹا طاری تھا۔ البتہ ایک ریڑھی والے پٹھان کی آواز ذرا فاصلے پر گونج رہی تھی "آلو وا پیاز لے لو، آلو وا پیاز۔"

اشفاق لڑکھڑاتا ہوا اپنے گھر کے کھلے دروازے میں داخل ہوا تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ بہتان نہیں باندھ رہا تھا۔ اس کی گھاتیا بیوی ہاتھ دکھا گئی تھی۔ جب میں حمیدہ کے کمرے میں بیٹھا تھا تو مجھے گلی میں سے ٹرک گزرنے کی آواز تو سنائی دی تھی مگر یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کا بندوبست روحی نے کیا ہے۔ اشفاق کو ساتھ لے کر میں اس کے مکان کے چاروں کمروں میں گھوم گیا۔ ہر طرف بس کاٹھ کباڑ ہی دھرا نظر آتا تھا۔ روحی وہاں سے سارا قیمتی سامان ٹرک میں لاد کر لے گئی تھی۔ اشفاق پھٹی پھٹی نظروں سے اپنے خالی ڈھنڈار گھر کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے کوئی بھیانک خواب اس کی آنکھوں میں منجمد ہو کر رہ گیا ہو۔ میں نے اسے ایک جھلنگا سی چارپائی پر بٹھایا تو وہ اس پر یوں ڈھے سا گیا جیسے وہ کڑے کوسوں کی مسافت طے کر کے وہاں تک پہنچا ہو۔ اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا اور صورت حال کی سنگینی نے اس کے دل پر ایسی دہشت طاری کر دی تھی کہ اس کے منہ سے بات نہیں نکل رہی تھی۔

"تمہارا تو حلیہ ہی بگڑ گیا ہے میرے یار۔ ذرا حوصلے سے کام لے۔ میں تمہارا دشمن نہیں ہوں پیارے۔ ذرا اپنی ہوا روک۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اس کے کندھے تھپتھپائے۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر اپنا جبڑا سہلاتا تھا جو ایک طرف سے تھوڑا سا سوج گیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اندر کچھ توڑ پھوڑ زیادہ ہی ہو گئی تھی۔ سسکتے ہوئے بولا۔

"وہ مجھے تباہ کر گئی ہے۔ وہ خبیث عورت! میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں اسے جان سے مار دوں گا۔" غصے کی ایک اور تیز کیلی لہر اس کے سر تک پہنچی اور اس کی آنکھیں پھر خون آلود ہونے لگیں۔ مجھے ان حالات کا قطعاً علم نہیں تھا۔ جس نے ان کی زندگی میں زہر گھول دیا تھا۔ میں تو اب تک اس کی بڑھتی ہوئی دہشت سے اپنا ہی تحفظ کرتا چلا آ رہا تھا۔ وہ مجھے ہی اپنی اس بربادی کا ذمے دار ٹھہراتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میرے ساتھ ابھی تک اس کا رویّہ نہایت ہی توہین آمیز تھا۔

"ٹھیک ہے بیٹے! تو جا اور اس کے پیچھے جاکر اسے قتل کر دے، میری بلا سے۔ خدا حافظ۔" یہ کہہ کر اسے اسی منہدم حالت میں چھوڑ کر باہر آ گیا۔ اس کے گھر کی وہ اجڑی صورت میرا دل ہلاتی تھی اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس نے اپنی بیوی کو کن اذیتوں سے دوچار کر رکھا تھا جس سے تنگ آکر اس نے ہمیشہ کے لئے اس کے چمن سے اپنا آشیانہ اٹھا لیا تھا۔ خاوند کے ہاتھوں ہنسی خوشی ذبح ہو جانے کے لئے تو کوئی ستی ساوتری بھی تیار نہ ہوتی ہوگی اور وہ تو روحی تھی جس کے سینے میں چاہنے اور چاہے جانے کی آرزو نے آگ دہکا رکھی تھی۔ روحی کی مایوسی تو اس لمحے انتہا کو جا پہنچی جب اس نے اپنے مجازی خدا کو قصائی کا چھرا ہاتھ میں لئے اپنے پیچھے بھاگتے دیکھا۔ وہ تو اس کی قسمت اچھی تھی کہ میں صحن میں بیٹھا تھا

اور اتنی اونچی چھت سے وہ بے خطر کُود کر میرے سامنے آگئی تھی ورنہ اب تک تو سارا قصّہ ہی ختم ہو چکا ہوتا۔

حمیدہ کے گھر واپس پہنچ کر میں نے اندر سے کُنڈی چڑھائی اور سیدھا باورچی خانے میں جا پہنچا۔ حمیدہ بہت پریشان تھی۔ مجھے اپنے پاس رکھی پیڑھی پر بیٹھتے دیکھ کر بولی۔

"بھائی جی! آپ مجھے صحیح بات کیوں نہیں بتلاتے ہیں۔ آخر یہ آدمی آپ پر کیوں چڑھ دوڑا تھا؟"

"مجھے نہیں معلوم ہے باجی! اس کی بیوی ذرا دیر کے لئے ادھر آئی ضرور تھی مگر وہ تو مرغی کی تلاش میں تھی۔ اس سے زیادہ تو مجھے کسی بات کا علم نہیں ہے۔"

حمیدہ میری یہ بات سن کر چُپ ہو رہی مگر اس کے رویّے سے یہ معلوم ہو رہا تھا کہ اُسے میری بات پر اعتبار نہیں آیا ہے اور وہ میری توقع سے کہیں زیادہ معلومات سینے میں سمیٹے بیٹھی ہے۔

ابھی کھانا تیار ہونے میں شاید کافی دیر تھی اور اس نے جو چائے میرے لئے تیار کی تھی۔ وہ کیتلی میں پڑی ٹھنڈی ہو رہی تھی اس نے ایک بار پھر قہوہ چولھے پر رکھا اور چند ہی منٹ میں ایک پیالی چائے تیار کر کے اس نے میرے سامنے رکھ دی۔ ابھی میں وہیں اس کے پاس ہی بیٹھا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں سمجھا وہ اشفاق پھر آگیا ہے۔ میں تیزی سے باہر نکلا اور زمین پر پڑا اس کا خنجر اٹھا کر میں نے سیدھے ہاتھ میں لے لیا۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ اب کی بار اس نے کوئی گڑبڑ کی تو میں اس کی انتڑیاں کاٹ کر رکھ دوں گا۔ اس بدبخت نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔

میں نے بڑی احتیاط سے دروازہ کھولا تو میرے سارے اندازے غلط ثابت ہو گئے۔ میرے سامنے اشفاق نہیں آپی کھڑا تھا۔ ماجدہ اس کے پہلو سے لگی تھی۔ دونوں کے منہ لٹکے ہوئے تھے۔ مجھے نظر انداز کرتے ہوئے وہ دونوں آگے بڑھے اور چپ چاپ چلتے ہوئے کمرے میں جا گھسے۔ ان کی وہ لٹکی ہوئی صورتیں دیکھ کر میں تلملا کر رہ گیا۔ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ وہ آسیہ کے بارے میں کوئی اچھی خبر نہیں لائے ہیں۔ میں بڑی آہستگی سے اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے آپی کے پاس پلنگ پر جا بیٹھا۔ وہ اب تک خاموش تھا۔ ماجدہ دوسرے پلنگ پر مہر بلب بیٹھی تھی۔

"کیا بات ہے تم دونوں کچھ پریشان نظر آتے ہو۔ خیر تو ہے؟"

"خیر نہیں ہے جیلانی! ہم تمہارے لئے کوئی اچھی خبر نہیں لائے ہیں۔" آپی نے بڑے ہی آزردہ لہجے میں کہا۔

"آخر ہوا کیا ہے میرے بھائی! اب تو میرے لئے کوئی بھی خبر بُری نہیں رہی ہے۔ مجھے بتاؤ تم نے وہاں کیا دیکھا ہے؟"

میں نے آپی کے لہجے کی زخم خوردگی پر پیچ و تاب کھاتے ہوئے کہا میں..... میں بے بسی اور بے چارگی برداشت نہیں کر سکتا مجھے اس لفظ اور کیفیت سے نفرت ہے۔ کوئی شے میرے وجود میں اس وقت تڑاخ سے ٹوٹ جاتی ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ میری راہ میں کوئی شے حائل ہو گئی ہے۔ انسانی ہمت اور تگ و دو کی حدیں تو زیادہ وسیع نہیں ہیں۔ مگر اس کی سرشت میں فطرت نے لامحدود جذبے بھر دیئے ہیں۔ وہی جذبے کی حرکی اور برقی قوت ہے جو اسے لامکان تک رسائی دلا رہی ہے مگر اس گھڑی آپی کے چہرے پر جو دھواں پھیلا تھا اس سے میں چڑ کر رہ گیا۔

"وہ..... آپ کی بہن آسیہ یہاں سے رات ہی رات کسی اور جگہ بھیج دی گئی ہے۔" ماجدہ نے آپی کی مشکل آسان کرتے ہوئے مجھے صحیح صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔

"ہوں! تو یہ بات ہے۔ انہوں نے اس شیر دل آہو سے سب کچھ معلوم کر لیا ہے۔ وہ ہم سے خوف زدہ ہو گئے ہیں آپی۔ انہیں ہماری قوت کا اندازہ ہو گیا ہے۔" میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"ظاہر ہے۔ ہم بغل میں ایٹم بم جو لئے پھرتے ہیں۔" آپی نے طنز کیا۔ "جیلانی میاں! انہوں نے آسیہ کو اُدھر راولپنڈی جیل میں منتقل کر دیا ہے۔ اور ہمارے وہ بیس ہزار روپے بھی گُل ہو رہے ہیں جو ہم ڈاکٹر لفیبہ کو دے آئے تھے۔"

"وہ روپیہ ہم واپس لے لیں گے۔ مگر سوال یہ ہے کہ یوں اچانک انہوں نے اسے راولپنڈی کیوں بھیج دیا؟"

"یہ سب کچھ آہو کے مشورے پر ہوا ہے۔ ہمیں آہو کو یوں نہیں چھوڑ دینا چاہئے تھا۔"

"بھئی بڑا ہی عیار آدمی ہے وہ آہو! کیسی پٹخنی دی ہے اس نے ہمیں۔ ع کو الف لکھ کر تو اس نے ہمیں مرا ہی دیا تھا۔"

"تیرا وہ خاص گُر کام آگیا جیلانی! ورنہ وہاں تو ہم کوئی توپ نہ چلا سکتے تھے۔ بہت بڑا افسر ہے وہ جس کی گردن تم نے مَل دی تھی۔"

"ارے نہیں! وہ تو ویسے ہی کانچ کا بنا ہوا آدمی تھا۔ گردن پر ہاتھ پڑتے ہی لٹک گیا۔ خیر مٹی ڈال اس کے ذکر پر، مگر..... یہ بتا.....؟"

"ماجدہ! ادھر آئیو ذرا۔" اچانک پیچھے سے حمیدہ کی آواز سنائی دی۔ وہ دروازے کی اوٹ میں کھڑی تھی۔ اس کے لہجے کی وہ کرختگی میرے لئے بڑی اذیت ناک تھی۔ وہ بہت ناراض دکھائی دیتی تھی۔

"کیا ہے باجی؟" ماجدہ تیزی سے اٹھ کر دروازے کے پاس جا ٹھہری۔

"اندر کیوں نہیں آتی ہو! پہلے تو ان سے تم نے پردہ نہیں کیا۔"

"بس میں بھی ٹھیک ہوں ماجدہ! کہنا میں یہ چاہتی ہوں کہ آپ سب لوگ ابھی اور اسی وقت میرے گھر سے چلے جائیں اور اپنی یہ سب چیزیں ساتھ لے جائیں اور یہ رقم بھی۔"

یہ کہہ کر اس نے نوٹوں کی گڈی بڑے غصّے سے ماجدہ کے قدموں پر پھینک دی۔

"یہ کیا کہتی ہو باجی! کیا قصور کیا ہے ہم نے تمہارا! کوئی غلطی ہو گئی ہے ہم سے!"

"ہاں! میری زبان میں اتنی طاقت نہیں کہ میں وہ سب کچھ تمہیں بتا سکوں جو یہاں آج ہو چکا ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم ایسے بے ضمیر اور بدچلن لوگوں کو لے کر یہاں آؤ گی۔ بہتر یہی ہے کہ آپ آج ہی یہاں سے چلے جائیں۔"

یہ کہہ کر وہ دروازے سے ہٹ کر دوسری طرف چلی گئی۔ اس کے لہجے کی گھن گرج نے مجھے حیران کر دیا۔ وہ دبلی پتلی دردرسیدہ حمیدہ تو نظر ہی نہیں آتی تھی۔ میرا رنگ اڑنے لگا۔ ماجدہ مجھے گہری گہری نظروں سے دیکھتی ہوئی میرے سامنے آ ٹھہری، بولی۔

"یہ..... یہ..... یہ میں کیا سُن رہی ہوں جیلانی صاحب! لگتا ہے کوئی نیا گُل کھلایا ہے آپ نے!" وہ بہت سنجیدہ نظر آرہی تھی اور اس کے چہرے پر ایسا تحیّر تھا کہ جیسے اس نے مجھے فضا میں تحلیل ہوتے ہوئے دیکھ لیا ہو۔

میں ٹکٹکی اسے دیکھتا رہ گیا۔ اپنی بات کا کوئی جواب نہ پا کر وہ ایک قدم اور آگے بڑھی اور بولی۔

"جیلانی صاحب! بات کیا ہے آخر؟ حمیدہ باجی کو یہ سب کچھ کہنے کی جرأت کیسے ہوئی؟"

"میں..... مجھے کیا معلوم۔ اسی سے پوچھو میرا تو خیال ہے وہ پاگل ہو گئی ہے۔" میں نے اپنے آپ کو سمیٹتے ہوئے ذرا دھیمے سے کہا۔ آپی مسکرا رہا تھا۔ بولا۔

"کوئی مرغی تو ذبح نہیں کر ڈالی تو نے اِدھر۔ آدمی تو بہت لاسے دار ہے جیلانی بھائی۔"

"نہیں یار! یہ عورتیں بس ایسی ہی ہوتی ہیں۔ پل میں تولہ، پل میں ماشہ۔"

"آپ اس سے پوچھیں ماجدہ جی کہ قصّہ کیا ہے؟ یہ نادر شاہی حکم کس سلسلے میں صادر فرما رہی ہیں آپ کی یہ حمیدہ باجی!" آپی نے مجھے نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے میں اسی سے پوچھتی ہوں۔" یہ کہہ کر ماجدہ باہر نکل گئی۔ آپی بڑے غور سے میرے چہرے کے بدلتے رنگوں کا شاہد کر رہا تھا۔ میری اُس کیفیت سے ایک خاص مفہوم اخذ کر کے بولا۔

"جیلانی میاں! مجھے تو کچھ گڑبڑ گھوٹالا نظر آتا ہے۔ ہماری غیر حاضری میں ہوا کیا تھا آخر؟" وہ میرے پاس آ بیٹھا اور سگریٹ سلگانے لگا۔

"کچھ بھی نہیں یار! پتہ نہیں یہ عورت کیا چاہتی ہے۔ ویسے بھی میرا خیال ہے کہ ہماری صورتیں اب شریفوں ایسی نہیں رہی ہیں۔"

"خیر نہ بتا! ابھی ماجدہ سے سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ لے اتنے میں سگریٹ پی۔ یہ لے۔" یہ کہہ کر اس نے ایک سگریٹ میرے لبوں میں رکھ دیا۔

کوئی دس منٹ بعد ماجدہ آئی تو وہ مسکرا..... رہی تھی اور پریشان بھی تھی۔ آتے ہی بولی۔

"تو یہ بات ہے۔ باجی نے آپ کو روحی کے ساتھ دیکھ لیا تھا اور اس کے شوہر کو بھی جو اس وقت یہاں اس پلنگ پر بے ہوش پڑا تھا۔"

"اچھا اچھا! ذرا مجھے بھی بتائیے ماجدہ بیگم! یہ پلنگوں کا کیا قصّہ ہے؟" آپی نے چہکتے ہوئے کہا۔

"بس ہاتھ صاف کر گئے ہیں۔ یہ کسی کی بیوی پر۔ وہ بیچاری ہمسائی تھی حمیدہ باجی کی۔ پتہ نہیں وہ ان کے ہتھے کیسے چڑھ گئی۔ بعد میں سنا ہے کہ اس کا خاوند ابھی یہاں بے ہوش ہی تھا کہ وہ اپنے جہیز کا سارا سامان ٹرک میں لاد کر بھاگ گئی اور جب شوہر کو ہوش آیا تو وہ بیچارا ہاتھ پتا ہی رہ گیا۔ اُس نے، باجی بتاتی ہے کہ اِن پر چھُرے سے حملہ بھی کیا تھا۔ بہت واویلا مچا رہا ہے وہ۔"

"شابش بھئی شابش! حد ہو گئی۔ کمال ہے جیلانی بھائی! صد آفرین ہے! مرد ہو تو ایسا ہو۔ مگر وہ کہاں ہے اب؟ وہ اُس ہمسائی کا شوہرِ نامدار ــــ"

"پتہ نہیں! اس کا گھر سُنا ہے بالکل خالی پڑا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ تھانے جا پہنچا ہو۔" یا اپنے دوستوں کو لینے گیا ہے آپ کو سبق سکھانے کے لئے۔"

"اوئے بیڑہ غرق! یہ تو اچھا نہ ہو گا جیلانی بھائی! بھگت کبیر کہہ گئے ہیں کہ اگر تو بچنا چاہتا ہے نا تو پولیس سے بچ کہ اس سے زیادہ بے لگام چیز میں نے اور کوئی نہیں دیکھی۔" آپی نے مجھے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

ماجدہ کے منہ سے تھانے کا نام سن کر میں بدکا۔ اور اٹھ کر لباس تبدیل کرنے لگا۔ ابھی میں بالوں میں کنگھی ہی کر رہا تھا کہ باہر کے دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔

"لو میرا خیال ہے وہ مصیبت آ ہی گئی ہے۔" ماجدہ نے گھبرا کر کہا۔

"ارے تو آ جانے دیں نا۔ ہماری بھی ذرا ورزش ہو جائے گی۔ کئی دنوں سے کوئی اٹھک بیٹھک نہیں کر سکے ہیں ہم۔" آبی نے بڑے دبنگ لہجے میں کہا۔

"اور اگر وہ پولیس والے ہوئے تو؟"

"تو کیا ہے۔ میں نمٹ لوں گا ان سے۔" یہ کہہ کر آبی تیزی سے صحن میں نکلا اور دروازے کے قریب جا کر جمے ہوئے لہجے میں بولا۔

"کون ہے؟"

"دروازہ کھول اوئے گشتی کے بچے ہم دیکھتے ہیں تو کتنے پانی میں ہے۔ توڑ دے تختہ پہلوان۔"

دروازے پر کوئی بڑے ہی رذیل قسم کے آدمی کھڑے تھے اور ان کی صحیح تعداد کا اندازہ ہم نہیں لگا سکتے تھے۔ لہجہ ان کا ایسا بازاری تھا کہ میں صحن میں نکلا اور آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ ایک دم دونوں تختے میں نے دائیں بائیں ڈال دیے اور بالکل سامنے کھڑے آدمی کی گردن دونوں ہاتھوں میں دبوچ کر اندر گھسیٹ لیا۔ وہ تعداد میں پانچ تھے پکے غنڈے پہلوان صفت آدمی تھے۔ وہ سب کے سب۔ اس آدمی کی گردن پر میری گرفت سخت ہوئی تو اس نے ڈب سے چاقو نکال لیا مگر پیشتر اس کے کہ وہ چاقو کھول سکتا، میں نے اسے آگے گھسیٹ کر اس کا سر سامنے کی دیوار میں دے مارا۔ اور خود پیچھے ہٹ گیا۔ پہلوان کے سر میں ایسی گہری چوٹ آئی کہ وہ وہیں بے ہوش ہو گیا۔ اتنے میں چاروں آدمی جن میں اشفاق بھی موجود تھا، مجھ پر پل پڑے مگر دو کو آبی نے الجھا لیا اور وہ یوں کہ اس نے پیچھے سے ان کی ٹانگوں میں ہاتھ ڈال کر ان کو کچھ اتنی تیزی سے اوپر اٹھا کر اچھالا کہ وہ دونوں دھڑام سے فرش پر جا گرے۔ اشفاق اور اس کا ایک ساتھی مجھ پر گھونسے برسا رہے تھے اور کچھ اتنی سرعت سے وہ اپنا بدن مجھ سے بچاتے تھے کہ نہ ان کی کلائی میرے ہاتھ آتی تھی نہ گردن۔ اشفاق کو تو میں آزما چکا تھا۔ وہ خاصا مضبوط ہڈی کا آدمی تھا اور اپنی گردن وہ مجھ سے ہر حال میں بچا رہا تھا۔ ان کے تابڑ توڑ حملوں سے بچنے کے لیے میں نے درمیان کا فاصلہ کم کرنا چاہا تو اشفاق ایک دم پیچھے ہٹا اور زمین پر پڑی ہاکی اٹھا کر میری طرف لپکا۔ وہ ہاکی اس آدمی کے ہاتھ سے چھوٹی تھی جسے آبی نے چھاپ لیا تھا۔ اشفاق کا ساتھی اسے موقع دینے کے لیے ایک طرف سرکا تو میں نے کئی فٹ اونچا اچھل کر اشفاق کے سینے کو کچھ اس طرح پاکوب کیا کہ وہ ایک دم زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ میں اس سے کوئی دو ہاتھ آگے گرا۔ وہ سودا مجھے بہت مہنگا پڑا۔ اینٹوں کے فرش پر گرنے سے میری کمر پر سخت چوٹ آئی۔ ابھی میں سنبھل بھی نہیں سکا تھا کہ اشفاق کا ساتھی مجھ سے گتھم گتھا ہو گیا۔ یہی میں چاہتا تھا مصیبت یہ آپڑی کہ اس حرامزادے نے پہلوان کا وہ چاقو اٹھا لیا تھا جو اس نے مجھ پر آزمانے کے لیے کھول لیا تھا۔ میں نے لیٹے لیٹے بائیں ہاتھ سے اس کی گردن کی رگ مسل دی۔ کچھ اتنی سختی سے میں نے اس کی گردن دبائی کہ میرا انگوٹھا خاصا گہرا دھنس گیا۔ وہ اس ہولناک تجربے کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ بے ہوش ہو کر میرے اوپر ہی جھول گیا۔ اسے بے کار کر کے میں اٹھا تو دیکھا کہ ہاکی اب آبی کے ہاتھ آ چکی تھی اور اس نے مار مار کر دو آدمیوں کے سر کھول دیے تھے۔ مگر وہ کوئی بڑی ہی ڈھیٹ شے تھے۔ ابھی تک اس سے الجھے ہوئے تھے۔ ان کے سروں سے خون بہہ کر ان کے چہرے تر کر گیا تھا مگر وہ آبی سے ہار نہیں مانتے تھے۔

میں نے آبی کا کام آسان کرنے کے لیے آگے بڑھ کر ایک پہلوان کے منہ پر نچلے جبڑے کو تاک کر مولا علی کے نام کا ایک زوردار مکا جو لگایا تو اس کا جبڑا اپنی جگہ چھوڑ کر دوسری طرف نکل گیا۔ وہ ضرب اتنی شدید تھی کہ وہ آدمی وہیں ڈھے گیا۔ اس کی شکل اس لمحے ایسی مکروہ ہو گئی کہ اس کی طرف دیکھا نہیں جاتا تھا۔

اپنے چار ساتھیوں کا یہ حال دیکھ کر آبی کا دوسرا مدمقابل پریشان ہو گیا۔ پیچھے ہٹا اور کھلے دروازے میں سے چھلانگ لگا کر گلی میں جا نکلا۔

"پکڑو اس بدی کے بچے کو، اس کا نور میں بھرتہ بنا دوں گا۔" آبی چیخا۔ اس کی یہ بات سنتے ہی میں اس کے پیچھے لپکا۔ وہ ابھی زیادہ دور نہیں گیا تھا۔ حالت اس کی ایسی ناگفتہ بہ تھی کہ اس سے بھاگا بھی نہیں جاتا تھا۔

گلی میں کئی آدمی تماشا دیکھنے کے لیے دروازے پر جمع تھے۔ میں ان کی بھیڑ کو چیرتا ہوا نکلا اور اسے سولھویں قدم پر جا پکڑا۔ میری گرفت سے بچ نکلنے کی کوشش میں اس سگ زادے نے میری بائیں کلائی پر اپنے دانت گاڑ دیے۔ یوں کہ میں درد سے بلبلا اٹھا۔ اپنی کلائی چھڑانے کے لیے میں نے پوری قوت سے اس کی گدی پر کھڑے ہاتھ کی چوٹ لگائی تو اس کا منہ کھل گیا۔ اس کی گردن پر چوٹ کچھ ایسی شدید لگی کہ اس کی آنکھیں مندنے لگیں۔ میں اسے دونوں باہوں میں تھام کر گھسیٹتا ہوا واپس لے آیا۔ اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ آبی دروازے میں کھڑا تھا اور غصے میں بہت بری طرح پھنک رہا تھا وہ سمجھا کہ شاید ابھی تک اس آدمی کے کس بل نہیں نکلے ہیں۔ اس نے ہمیں گالیاں بھی بہت دی تھیں۔ آبی نے اسے میرے ہاتھوں سے جھپٹ لیا۔ وہ نڈھال تو ہو ہی رہا تھا، آبی کے ہاتھوں میں جاتے ہی وہ دہرا ہو گیا۔ آبی نے بائیں ہاتھ سے اس کے بال پکڑے اور دائیں ہاتھ سے شلوار کے نیفے کو گرفت میں لے کر اسے زمین سے اوپر اٹھا کر ذرا دیر کے لیے آگے پیچھے جھلاتے ہوئے پوری قوت سے دیوار میں دے مارا۔ اس کی تو شاید ہڈیاں ہی چٹخ گئیں وہ ایسا گرا کہ پھر دیر تک نہ اٹھ سکا۔

ان پانچوں کو یوں فرش کر کے آبی دروازے میں جا ٹھہرا اور بولا۔

"اب آپ جائیں بھائی جان! تماشا ختم ہو چکا ہے سلام علیکم۔" وہ دل میں مسکرا رہا تھا جیسے ان لوگوں کی وہ ساری کپڑ چھان انہی کو دکھانے کے لیے کی گئی تھی۔ ابھی آبی نے دروازہ بند نہیں کیا تھا کہ مجھے گلی کے موڑ پر پولیس کی ایک جیپ رکتی نظر آئی۔ اس میں سے کئی سپاہی بندوقیں ہاتھ میں لیے تیزی سے نیچے اترے اور گلی میں داخل ہو گئے۔ ان کا رخ ہماری ہی طرف تھا۔ کسی نے شاید انہیں اس بلوے کی اطلاع دے دی تھی جو ہمارے دروازے پر ہو رہا تھا اور پولیس نے اپنی مستعدی دکھانے کے لیے فوری کارروائی کی تھی۔ ان کی تعداد چھ تھی۔ تھانیدار سب سے آگے تھا۔ ان کی اس دخل اندازی کا یہ انداز ہمیں کسی بھی طرح منظور نہیں تھا۔ پولیس کی تو صورت سے ہم لرزتے تھے۔ ان کے ہاتھ آ جانے کا مطلب یہ تھا کہ غلام جیلانی سیدھا تختۂ دار پر جا چڑھے۔

"اوئے آبی یہ کیا مصیبت ہے بھئی۔ تو ہی ان سے نمٹ میں تو چلا۔" یہ کہہ کر میں تیزی سے پیچھے ہٹا اور صحن میں جا نکلا۔ ماجدہ میرے پیچھے لپکتی آئی، سپاہیوں کو وہ بھی دیکھ چکی تھی۔ وہ مجھے صحن کے آخری کونے میں لے گئی۔ بولی۔ "آپ ۔۔۔ آپ ادھر پانی کی ٹینکی میں چھپ جائیں۔" یہ کہہ کر اس نے فرش کے نیچے بنے پانی کے حوض پر سے سیمنٹ کا ڈھکنا اٹھانا چاہا مگر وہ خاصا بھاری تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ حوض کتنا گہرا ہے۔ پھر بھی ڈھکنا اٹھانے میں میں نے ماجدہ کی مدد کی۔ اس حوض کا منہ اتنا کھلا ضرور تھا کہ آدمی اس کے اندر آسانی سے اتر سکتا تھا تاکہ صفائی میں دقت پیش نہ آئے۔ پولیس کے سپاہی دروازے پر آ پہنچے تھے اور آبی نے ان کا رستہ روک رکھا تھا اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ حوض کے اندر میں نے نگاہ ڈالی تو میں نے دیکھا کہ وہاں پانی نام کی کوئی شے نہیں ہے۔ مجھے بہر حال پولیس سے بچنا تھا۔ کیونکہ مجھے یہی ڈر تھا کہ ان میں سے کوئی نہ کوئی ایسا ضرور ہو گا جو مجھے پہچان لے گا۔ وہ لمحہ مجھ پر بہت بھاری تھا اور اس وقت مجھے وہ حوض بہت ہی غنیمت معلوم ہوا تھا۔

"اس میں اتر جائیے۔" ماجدہ نے آواز دبا کر کہا۔

اس کی یہ آواز سنتے ہی میں پیر دستگیر کا نام لے کر اس میں اتر گیا۔ ماجدہ نے اپنے وجود کی ساری قوت صرف کر کے اس کے منہ پر ڈھکنا رکھا اور پھر اینٹوں کے فرش پر ٹھک ٹھک چلتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی۔

اس کے قدموں کی چاپ معدوم ہوئی تو پہلی بار مجھے اپنی اس خوفناک حماقت کا احساس ہوا جو مجھ سے سرزد ہو چکی تھی۔ ڈھکنے کی وجہ سے حوض کے اندر گھپ اندھیرا چھا گیا تھا اور میں اس کے فرش پر اکڑوں بیٹھا تھا اس حال میں کہ تازہ ہوا کا گزر وہاں ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ اگر میں وہاں پندرہ منٹ بھی بیٹھا رہتا تو زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا مگر نہیں ماجدہ نے مجھے قبر میں نہیں اتارا تھا۔ اس نے میری زندگی کی پھڑکتی لرزتی لو کو قانون کی تند و تیز آندھی سے بچانے کے لیے مجھے ایک گوشۂ عافیت مہیا کیا تھا۔ اور اسے معلوم تھا کہ میں حوض میں دم گھٹنے سے نہیں مروں گا۔ اس نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا تھا۔ چند ہی لمحوں میں مجھے معلوم ہو گیا کہ اس حوض کے دائیں بائیں دو نالیاں لگی ہیں جو باہر گلی کی دیوار میں کھلتی ہیں۔ چونکہ ابھی تک اس میں پانی جمع کرنے کے لیے نالیوں کا سلسلہ باہر کی کسی نالی سے منسلک نہیں ہوا تھا اس لیے ان دونوں نالیوں میں سے ہوا اندر آ رہی تھی۔ وہ ہوا اتنی زیادہ تو نہیں تھی۔ پھر بھی ان کے ذریعے سے وہاں جتنی بھی ہوا آتی تھی وہ کسی نہ کسی حد تک میری ضرورت پوری کر سکتی تھی۔ اگر یہ بات مجھے جلدی ہی معلوم نہ ہو جاتی تو شاید اس قبر سے نکلنے کے لیے کسی بڑے ہی خوفناک لمحے میں اس کا ڈھکنا اوپر اٹھا دیتا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ پولیس کے سپاہی آبی کے ساتھی کو گھر کے چاروں کونوں میں تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ اور پھر وہ سب کے سب صحن میں آ ٹھہرے تھے اور ان کی باتیں مجھے صاف سنائی دے رہی تھیں۔

"آپ سے ڈر کر وہ آدمی بھاگ گیا ہے جناب جو ان سے لڑ رہا تھا۔" یہ آبی کی آواز تھی۔

"مگر وہ تھا کون؟"

"مجھے تو کچھ پتہ نہیں ہے جناب؟ میں بھی آپ کی طرح یہاں اجنبی ہوں۔"

"کیا بکواس ہے یہ! بی بی تم بولتی کیوں نہیں ہو۔ کون لوگ ہیں یہ؟"

"یہ میری اس سہیلی کے خاوند ہیں تھانیدار صاحب! ماجدہ کے شوہر ہیں یہ۔"

"اور وہ دوسرا آدمی کون ہے؟"

"اس کا مجھے کچھ پتہ نہیں ہے بھائی صاحب۔ یہ لوگ لڑتے بھڑتے میرے گھر میں آ گھسے۔ میری تو خود کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

"وہ آدمی ہے کہاں اب؟"

"وہ تو جی ادھر دیوار پھاند کر دوسری طرف نکل گیا تھا۔ میں نے خود دیکھا ہے اسے۔" یہ ماجدہ کی آواز تھی۔ وہ بڑے بے خوف لہجے میں انسپکٹر کو بے وقوف بنا رہی تھی۔ اور انسپکٹر پانی کے اس حوض کے بالکل اوپر کھڑا تھا جس میں میں اس طرح بند تھا کہ جس کی وجہ سے میرا دم گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

"جھوٹ بولتی ہے جناب یہ عورت۔ وہ آدمی اس کے گھر میں ٹھہرا ہوا تھا۔ یہ اسے اچھی طرح جانتی ہے۔"

یہ اشفاق کی آواز تھی۔ اس زن گزیدہ بدمعاش کو ہوش آ چکا تھا۔

"وہ جی بھا جی وہ ایسا بدمعاش آدمی تھا جناب کہ ۔۔۔ کوئی" الفتا ہی نہ تھا وہ جی میری تو گردن ہی توڑ دی ہے اس نے جناب۔" یہ غالباً اس

آدمی کی فریاد تھی جس کی گدی پر میں نے کھڑے ہاتھ کی چوٹ لگائی تھی۔

"مونچھیں نیچی کر لو بھاجی، اور گردن پر تیل ملواؤ۔ تم پانچ تھے اور وہ اکیلا تمہارے چاول چٹے کر گیا۔" انسپکٹر نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یہ بھی تو اس کے ساتھ ہی تھا بھاجی۔ ہمارا شیر پہلوان جی تو شاید "جاں بحق" کر گیا ہے بھاجی!"

"تمہارے ساتھ ایسا ہونا ہی چاہیے مگر غصہ تو مجھے اس اشفاق پر آ رہا ہے۔ یہ ہمارا دوست ہے مگر ایسا بے وقوف نکلا کہ پڑھ دوڑا ہے تمہیں ساتھ لے کر ان سے لڑائی لڑنے کے لیے۔ سیدھا تھانے کیوں نہیں آ گیا تو۔"

"آپ کو کس نے اطلاع دی تھی؟" اشفاق نے پوچھا۔

"پتہ نہیں کوئی حامد علی صاحب ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ادھر ہمارے محلے میں بلوہ ہو گیا۔ بڑا خون خرابہ ہو رہا ہے۔"

"اچھا اچھا۔ وہ حامد علی ریٹائرڈ پرنسپل ہیں۔ ان کے ہاں ٹیلیفون موجود ہے۔ انہوں نے دیکھ لیا ہو گا یہ فساد۔"

"تو چل بھئی۔ لے چل اسے تھانے کیا نام ہے تیرا پہلوان! تو ابھی تک اصل بات نہیں بتا رہا ہے ہیں!"

"میرا نام افضل ہے جناب! مگر یہ آپ مجھے کس خوشی میں لے جا رہے ہیں؟" یہ آبی کی آواز تھی۔

"تیری خوشنودی کے لیے میاں۔ اس خوشی میں کہ تو نے اتنے سارے آدمیوں کو لمبا لٹا دیا ہے۔ تجھے ہم تخت پر بٹھائیں گے تیرے سر پہ ہم سہرا باندھیں گے، تمغۂ شجاعت دلائیں گے تجھے۔ سالا پوچھتا ہے کس خوشی میں۔ چلو اوئے باندھ لو اس سوّر کو۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے جناب مگر میں ذرا کپڑے تبدیل کر لوں اور اپنی بیوی سے ایک بات کہہ دوں۔ اتنی مہلت تو آپ مجھے دے ہی دیں گے جناب!" آبی نے نہایت ہی عاجزانہ لہجے میں کہا۔

"ہاں ہاں جلدی کرو۔ کپڑے بھی بدل لو اور بیوی سے بات بھی کر لو مگر بات لمبی نہ ہو جائے۔ چل اوئے یونس ان زخمیوں کو ادھر گاڑی میں بٹھا۔" انسپکٹر نے کہا۔

"بہت اچھا جناب! تم میرے ساتھ آؤ ارشد۔ اور تم بھی۔" سپاہی نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ مجھے اپنے اوپر فرش پر تین چار آدمیوں کے چلنے کی آوازیں سنائی دیں۔

"تم بھی تھانے چلو بی بی۔ تمہارے بغیر تو یہ فلم مکمل نہ ہو گی۔ اصل ہیروئن تو مجھے تم ہی نظر آتی ہو اس کہانی کی۔ چل ادھر۔"

جب یہ بات انسپکٹر نے کہی تو میں ڈرا کہ کہیں وہ ماجدہ کو تھانے لے جانے کا ارادہ تو نہیں کر رہا ہے مگر جب مجھے حمیدہ کی گلوگیر آواز سنائی دی تو مجھے اس انسپکٹر پر سخت طیش آیا۔ وہ بدبخت اس بدنصیب کو خواہ مخواہ ان کانٹوں پر گھسیٹ رہا تھا جو ہم نے اس کے آنگن میں بکھیر دیے تھے اور پولیس کی وہ مصیبت ہم پر اس لیے آئی تھی کہ کسی حامد علی نے انہیں فون پر اطلاع دے دی تھی اور اب وہ آبی اور حمیدہ کو اپنے ساتھ ساتھ تھانے اس لیے لے جا رہے تھے کہ اشفاق اس تھانیدار ———— کا دوست تھا اور وہ انسپکٹر اس بات کو فراموش کر بیٹھا تھا کہ اشفاق نے اپنے غنڈوں کی مدد سے حمیدہ کے مہمانوں پر حملہ کیا تھا۔ وہ الٹا گھر والوں کو پابہ زنجیر کر رہا تھا۔ حمیدہ اب تک خاموش تھی اس کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر تھانیدار پھر بھونکا۔

"بولتی کیوں نہیں ہو، اوپر کوئی چادر شادر لے لو اور تھانے چلو۔ اس افضل سے کہو جلدی باہر آ جائے۔"

"مگر میرا قصور کیا ہے تھانیدار صاحب۔ میری مدد کرنے کے بجائے آپ مجھے ہی تھانے لے جا رہے ہیں۔"

"تو اور کیا کروں میں میری پیاری پھوپھی جان سلمہٗ تعالیٰ ادھر یہ غنڈے تم نے اندر بٹھا رکھے ہیں۔ کیا لگتے ہیں یہ تمہارے؟"

"میرے؟ یہ میرے کچھ نہیں لگتے ہیں۔"

"ہاں اب تو یہی کہو گی! یہ مجھے کوئی لمبا ہی چکر نظر آتا ہے کیوں کریم خان! عورت یہ مجھے پہنچی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اس افضل کو باہر لاؤ۔ چل اوئے تیری بات ہی ختم نہیں ہوتی۔"

"ابھی آیا چوہدری صاحب! بس ابھی آیا۔" یہ آبی کی آواز تھی۔ پتہ نہیں وہ کمرے میں ماجدہ سے کیا کہہ رہا تھا۔

"آپ انصاف نہیں کر رہے ہیں تھانیدار صاحب۔"

"زیادہ ٹرٹر مت کر مائی، تجھے تو میں ضرور ساتھ لے کر جاؤں گا۔ ان لوگوں نے مار مار کر گلی کے شریف آدمیوں کا بھرکس نکال دیا ہے۔ آخر یہ ہیں کون؟"

"مجھے نہیں معلوم ہے کہ یہ کون لوگ ہیں۔ میں انہیں بالکل نہیں جانتی یہ کل زبردستی میرے گھر میں گھس آئے تھے۔ اس عورت کے ساتھ جو میرے کمرے میں بیٹھی ہے۔ وہ ادھر کنجاہ میں استانی ہے وہی انہیں لے آئی ہے مجھے تو یہ لوگ شکل صورت سے جرائم پیشہ نظر آتے ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے بی بی! مگر تمہارا ان سے کیا تعلق ہے؟"

"میرا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے صرف اس ماجدہ کو میں جانتی ہوں۔ یہ کچھ عرصہ پہلے ریل گاڑی میں میری واقف بنی تھی۔"

"اچھا! تو اب یہ اپنے خاوند کے ساتھ یہاں آئی ہے۔"

"نہیں ان میں سے کوئی بھی اس کا خاوند نہیں ہے۔"

"کیا؟ کیا کہتی ہو تم۔ یہ افضل اس کا خاوند نہیں ہے؟"

"اس کا نام افضل نہیں ہے۔"

"اچھا! کیا نام ہے پھر اس کا جو اندر جا گھسا ہے۔"

"اس کا نام آبی ہے۔ یہی میں نے سُنا ہے۔ مجھے تو یہ ڈاکو نظر آتا ہے۔ اس کا ساتھی جو ہے اس کا نام جیلانی ہے۔ غلام جیلانی۔"

"غلام جیلانی! او مائی گاڈ۔ یہ کیا کہہ رہی ہو تم۔ اس کی گرفتاری پر تو پچاس ہزار روپے کا انعام مقرر ہے وہ جیل سے بھاگا ہوا مجرم ہے بی بی۔"

"مجھے کچھ پتہ نہیں ہے جناب۔ مجھے تو ان لوگوں نے خواہ مخواہ ذلیل کر دیا ہے۔ ... میں نے خود دیکھا۔ اشفاق کو اس نے ادھ موا بے ہوش کر کے ڈال دیا تھا۔ اسی کمرے میں۔"

"اوئے کریم خان یہ تو قصہ ہی اور ہو گیا۔ اس جیلانی کو کھو کر تو ہم برباد ہو گئے۔ وہ ہے کہاں بی بی اب؟"

"وہ... وہ... اس ماجدہ نے اسے ادھر کونے میں جو پانی کا حوض ہے وہاں چھپا دیا تھا۔ ادھر ہی بیٹھا ہے یہ آپ کے بالکل پیچھے۔"

حمیدہ نے ہماری موت کا سامان پیدا کر دیا۔ تھانے کی بک بک سے بچنے کے لیے اس نے میری اور آبی کی نشاندہی کر دی تھی۔

"اچھا تو یہ بات ہے وہ گیدڑ کا بچہ ادھر چھپا بیٹھا ہے۔ بیٹھا خود ہی جال میں پھنس گیا ہے۔ ذرا یہ ڈھکنا اٹھا کریم خان" تھانیدار نے پرجوش لہجے میں کہا۔

عین اس وقت صحن میں دو گولیاں چلیں اور وہاں بھگدڑ مچ گئی۔ کسی کی دلدوز چیخ میرے کان سے ٹکرائی۔

"خبردار کوئی بھاگنے کی کوشش نہ کرے۔ ورنہ میں سب کو گولی مار دوں گا۔" یہ آبی کی آواز تھی جس کی گھن گرج نے مجھے حیران کر دیا۔

کوئی سپاہی زخمی ہو کر کراہ رہا تھا۔ "ہاتھ اوپر اٹھا کر ادھر دیوار کے ساتھ لگ جاؤ تھانیدار جی! اور تم بھی چلو اوئے۔" آبی نے اپنے وجود کا سارا تحکم ان کی طرف منتقل کرتے ہوئے کہا۔

صحن میں ابھی تک اچھل کود ہو رہی تھی۔

"یہ پستول پھینک دے اُستاد ورنہ تیرا یہ پیٹ میں پھاڑ دوں گا۔"

آبی کی یہ بات سنتے ہی تھانیدار نے پستول دُور پھینک دیا۔ اس طرح کہ ٹھیک میرے سر کے اُوپر حوض کے ڈھکنے سے دھم کر کے ٹکرایا۔

"یہ رائفلیں بھی پھینک دو۔ چلو۔" آبی نے سپاہیوں کو للکارا۔

رائفلیں صحن کے فرش پر گرنے سے دھم دھم کی آوازیں پیدا ہوئیں اور پھر سناٹا چھا گیا جس کو کسی زخمی سپاہی کی کراہیں ٹھہر ٹھہر کے درہم برہم کر رہی تھیں۔

"تم ادھر آ جاؤ بی جمالو، آؤ ادھر ورنہ اچھا نہ ہوگا" آبی نے اب کی بار حمیدہ کو آڑے ہاتھوں لیا۔

"میں... میں تم سے نمٹ لوں گا بیٹے۔ قبر کی دیواروں تک تمہارا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔"

"اوئے جا! بہت دیکھے ہیں تیرے جیسے۔ بیٹی بند۔ چل ادھر دیوار کی طرف منہ کر۔ کتنی منحوس شکل ہے تیری۔" یہ کہہ کر آبی نے ایک اور گولی ان کو حواس باختہ کرنے کے لیے چلائی۔ جس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔

"شاباش! بہت فرمانبردار بچے ہو۔" آبی نے خوش ہو کر کہا۔ میرا خیال ہے کہ ان لوگوں نے اس کا حکم مان لیا تھا۔

عین اسی لمحے ڈھکنا اوپر اٹھا کر میں حوض سے باہر نکل آیا تھا۔ تھانیدار نے ڈھکنا ایک طرف گرنے کی آواز سُن لی تھی۔ وہ سب لوگ اس وقت دیوار کی طرف منہ کر کے اس طرح کھڑے تھے کہ ان سب کے ہاتھ اُوپر اٹھے ہوئے تھے۔ ڈھکنا گرنے کی آواز سن کر تھانیدار نے مجھے گردن گھما کر دیکھا تو اس کی پتلیاں پھیلنے لگیں۔ اس کی آنکھوں میں ایسی حیرت ابھر آئی تھی کہ باید و شاید۔ میرے سیدھے ہاتھ میں سائلینسر لگا پستول دیکھ کر وہ اور زیادہ حواس باختہ ہو گیا۔

"چلو اوئے ادھر شاہی مہمان خانے میں چلو۔"

"چلو ادھر کمرے میں، وہاں بیٹھ کر تم سے بات ہو گی۔" میری بات کا ان پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ اور وہ سب ہاتھ اوپر اٹھا کر کمرے کی طرف چلنے لگے۔ آبی کی اسٹین گن کی نال کھڑکی کی جالی میں سے باہر نکلی ہوئی تھی۔ ایک سپاہی صحن کے وسط میں ٹانگ پکڑے بیٹھا تھا۔ گولی اس کی پنڈلی میں لگی تھی۔ اور زخم سے بہتا ہوا خون اس کی پتلون کو رنگین کر رہا تھا۔

میں نے ان تمام سپاہیوں اور تھانیدار کو اسٹور روم میں دھکیل کر باہر سے کنڈی چڑھا دی۔ وہ ایسا گھپ اندھیرا کمرہ تھا کہ اس میں صرف ایک چھوٹا سا روشندان تھا۔ وہ اُن کی ہوا کی ضرورت بخوبی پوری کر سکتا تھا مگر اس کمرے میں کاٹھ کباڑ اتنا تھا کہ وہ وہاں ٹھیک سے بیٹھ بھی نہ سکتے تھے۔ پھر بھی ان سے جان چھڑانے کے لیے ہمیں یہ سب کچھ کرنا ہی تھا۔

میں نے ان کی رائفلیں اور تھانیدار کا پستول اٹھا کر حوض کے اندر ڈال کر اوپر ڈھکنا رکھ دیا۔ زخمی سپاہی میری اس کارروائی کو دیکھ رہا تھا۔ ایسے میں ضروری تھا کہ میں اس کی صدق دلی سے مدد کرتا۔ مجھے اس پر بہت ترس آ رہا تھا اسٹین گن کی گولی نے اس کی پنڈلی کا گوشت ادھیڑ ڈالا تھا۔

اس کی یہ دگرگوں حالت دیکھ کر میں نے پیچھے سے آگے بڑھ کر اس کی گردن میں ہاتھ ڈال کر اس کی رگِ احساس دبا دی۔ وہ فوراً زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ اب وہ بہت مطمئن دکھائی دے رہا تھا۔ حمیدہ اس وقت ڈری سہمی صحن کے کونے میں کھڑی تھی۔ اس کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا اور ایسی نظروں سے مجھے... دیکھ رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو کہ مجھے معاف کر دو جیلانی... میں... میرا کوئی قصور نہیں ہے۔

"ادھر آئیں باجی! میں نے آپ کو بہن کہا ہے تو یہ رشتہ مجھے

حال میں عزیز رہے گا۔"

"اس پر لعنت بھیج یار۔ اور یہاں سے نکل چل۔"

آبی نے تیزی سے باہر نکل کر کہا اسٹین گن اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس کی آنکھوں میں خون اُترا ہوا تھا۔ اور مجھے یوں نظر آتا تھا کہ اگر کوئی اور مشکل اس کی راہ میں آئی تو وہ پاگل ہو کر اپنے ارد گرد کی ہر شے کو تباہ کر دے گا۔ اس کے چہرے پر جو بربریت پھیلی تھی۔ میں اسے آج تک نہیں بھول سکا ہوں۔ نرغے میں آتے ہوئے وحشی ایسی حالت ہو رہی تھی اس کی وہ مجھے بازو سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا کمرے میں لے گیا اور بولا۔

"اپنی چیزیں سمیٹ۔ میں اس جیپ کو خالی کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔ میں نے ماجدہ کو ساتھ لے کر اپنی تمام چیزیں دو سوٹ کیسوں میں بھریں اور انہیں اٹھا کر صحن میں جا ٹھہرا۔ آبی نے ایک ایک آدمی کو جیپ سے اتارا اور لا کر صحن میں ڈال دیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر آبی حمیدہ کی طرف بڑھا اور کڑک کر بولا

"تیری اس بکواس کا تجھے میں پھر مزہ چکھاؤں گا۔ تو نے میرے یار کو تو آج مروا ہی دیا تھا۔ سنبھال اپنا گھر

چل ادھر۔"

یہ کہہ کر اس نے ہانپتی کانپتی حمیدہ کی کلائی پکڑ کر اسے گھسیٹ کر دائیں ہاتھ کے کمرے میں دھکیل دیا اور باہر سے کنڈی چڑھا کر بولا۔

"چل یار جلدی نکل چل اس چوہے دان سے ورنہ یہ عورتیں تجھے تباہ کر دیں گی۔" یہ کہہ کر اس نے ایک سوٹ کیس خود اٹھایا اور ایک مجھے دے دیا۔ ماجدہ اپنا صندوق اٹھائے ہوئے تھی۔

ہم تینوں بڑی افراتفری کے عالم میں باہر نکلے تو دیکھا کہ ابھی تک وہاں بہت سے آدمی بھیڑ لگائے کھڑے تھے۔

"تم کیوں کھڑے ہو یہاں۔ دفع ہو جاؤ ادھر سے ورنہ بھون کر رکھ دوں گا۔" آبی ان پر اسٹین گن تانتے ہوئے غرایا۔ وہ سب لوگ لرز کر اِدھر اُدھر بکھرنے لگے۔ آبی نے ماجدہ کو بڑے دہشت انگیز انداز سے کلائی پکڑ کر جیپ میں ڈال دیا۔

"چل یار چلا اس مصیبت کو اور بھاگ چل یہاں سے۔ یہ سالے تھانے میں فون ضرور کریں گے۔" آبی بہت جھلایا ہوا تھا۔ اس نے جیپ کے پچھلے حصے کے تمام پردے گرا لیے۔ میں نے گرد و پیش پر آخری نگاہ ڈالی اور جیپ کو اسٹارٹ کر کے وہاں سے چل دیا۔

چوبرجی کی طرف نکلنے کے بجائے میں جیپ کو نواں کوٹ میں سے گزار کر یتیم خانے کی طرف لے چلا۔ بند روڈ پر پہنچتے ہی مجھے ایک خالی ٹیکسی نظر آئی۔ اسے رکنے کا اشارہ کر کے جیپ میں نے بند روڈ سے اتار کر ایک زیر تعمیر کوٹھی کے سامنے کھڑی کی پھر ماجدہ اور آبی کے ساتھ اس ٹیکسی میں جا بیٹھا۔ جیپ میں بیٹھے رہنا ہمارے لیے کسی طرح بھی سود مند نہ تھا کیونکہ وہ پکار پکار کر کہتی تھی کہ میں پولیس کی ملکیت ہوں اور مجھے اغوا کر لیا گیا ہے۔

آبی نے یوں کیا کہ اسٹین گن جیپ سے اترتے ہی میرے حوالے کر دی۔ میں نے اسے کندھے سے لٹکا کر کمبل کے نیچے چھپا لیا۔ ٹیکسی ڈرائیور کوئی بڈھا سا آدمی تھا اس نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا کہ ہم کون ہیں۔ ہمارے حلیے کیا ہیں اور ہماری شکلیں کیا کہتی ہیں جب ہم ٹیکسی کے دروازے بند کر چکے تو وہ بولا۔

"کدھر چلوں میاں جی؟"

"چل ادھر لاہور ہوٹل کی طرف چل مزنگ کے رستے سے مگر جلدی کر بہت ضروری کام ہے۔" اس کا موڈ ابھی تک خراب تھا۔ اس کے چہرے پر ایسی سنجیدگی چھائی تھی کہ وہ مجھے اس روز اسلم آبی تو دکھائی ہی نہیں دیتا تھا۔

سارا راستہ وہ چُپ رہا۔ میں اس کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو دیکھ رہا تھا۔ میں اس کی پریشانی کو بھی سمجھتا تھا۔ سارا شہر آباد تھا۔ رنگوں اور روشنیوں نے گلی گلی اودھم مچا رکھا تھا۔ ہر شخص کی اپنی ایک چھت تھی۔ ایک اس کا اپنا بستر تھا مگر ہم دونوں بگولوں کی زد میں تھے ہمارا کوئی در تھا نہ دہلیز۔ ہم اپنے ہی سائے سے لرزاں ترساں اِدھر اُدھر بھٹکتے پھرتے تھے۔ ہم سے زیادہ بدنصیب بھلا اور کون ہو سکتا تھا۔ میں اپنی گردن پھانسی کے پھندے سے بچاتا پھر رہا تھا اور آبی کو معلوم تھا کہ جس دن اس کا چہرہ ان لٹے پٹے ویران گھروں کے پس منظر میں شناخت کر لیا جائے گا جنہیں وہ برباد کر چکا تھا، تو وہ دن اس کی زندگی کے بدترین دور کے آغاز کا دن ہوگا۔ اس نے خود اپنے لیے بڑی ہی سنگلاخ راہ منتخب کی تھی اور میرا یہ حال تھا کہ ایک لمحے کی غلط سوچ نے میری ساری زندگی لہولہان کر دی تھی۔

آبی کے ماتھے کی وہ شکنیں اس کی سوچ میں غلطاں رُوح... کی آئینہ دار تھیں اور مجھے یہ ڈر تھا کہ کہیں وہ میرے ساتھ چلتے چلتے تھک کر کسی اور راہ پر نہ چل نکلے۔

لاہور ہوٹل کے سامنے پہنچ کر ہم نے ٹیکسی چھوڑ دی تو آبی نے بڑی بجھی بجھی نظروں سے اس ہوٹل پر نظر ڈالی اور بولا۔

"ہم یہاں کیا کریں گے جیلانی! وہ لوگ تو ہماری تلاش میں آج زمین و آسمان ایک کر دیں گے۔"

"تو پھر یہ شہر ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ ڈاکٹر لطیف سے پھر کبھی نمٹ لیں گے۔"

آبی نے میری بات سنی اَن سنی کر دی۔ وہ ابھی تک کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اچانک اس نے جھرجھری سی لی۔ اور ایک ٹیکسی کو روک کر بولا۔

"چلو اس میں بیٹھو۔ آج رات ہم شنگری صاحب کے ہاں

ٹھہر رہے گئے۔"

"یہ کون صاحب ہیں؟"

"میرے دوست ہیں۔ پنکھوں اور سائیکلوں کا کارخانہ ہے ان کا۔ ان سے میری ملاقات آہو کے ذریعے ہوئی تھی۔"

یہ کہہ کر وہ ٹیکسی کے اندر جا گھسا۔ وہ اگلی سیٹ پر بیٹھا تو میں نے ماجدہ کو اپنے ساتھ پچھلی سیٹ پر بٹھا لیا۔ اس کے چہرے پر بھی سوچ کی لکیروں نے جال سا بُن رکھا تھا۔ وہ بھی غالباً اسی فکر میں ڈوبی تھی کہ اس غلام جیلانی کا ساتھ دے کر کیوں اس نے اپنی زندگی تباہ کر لی ہے۔ وہ تو نہ اِدھر کی رہی نہ اُدھر کی۔ میں نے اُس کے ذہن سے اس کے شوہر کا نام کھرچ ڈالا تھا اور مجھ سے اس نے ایسی امیدیں وابستہ کر لی تھیں جو سرتاسر سراب تھیں، وہ کبھی پوری نہیں ہو سکتی تھیں کیونکہ میں تو گھر بسانے کی صلاحیت ہی کھو چکا تھا۔ میں اس وہم میں تو ہرگز مبتلا نہیں تھا کہ ماجدہ میری محبت میں گرفتار ہو چکی ہے۔ ایسی بات ہرگز نہیں تھی۔ وہ صرف ایک مضبوط پناہ کی متلاشی تھی۔ اسے ایسی باہوں کی ضرورت تھی، جو اس کی حفاظت کر سکیں۔ یہ قوت اس نے میرے بازوؤں میں دیکھی تھی وہ میری طرف کھنچتی چلی آئی مگر اسے نہیں معلوم تھا کہ میری چار دیواری کے اندر تو جرائم کا دوزخ دہک رہا ہے۔ مجھے تو کسی بھی معاملے میں کوئی عار محسوس نہیں ہوتی۔ اپنا مطلب نکالنے کیلئے میں انسانی خون بہانے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اندر ہی اندر لرز رہی تھی۔ رہ رہ کر اپنے اس بڑے سے بریف کیس پر اس کی گرفت مضبوط ہو جاتی تھی۔ جس میں اس نے آہو کی الماری سے نکالا ہوا روپیہ بھر رکھا تھا۔ وہ ایک مکان خریدنے کا سپنا دیکھ رہی تھی۔ مگر حمیدہ کے گھر میں اس نے مجھے اور آبی کو جس سفاکی سے پولیس کو زیر کرتے دیکھا تھا اور جن عجیب غریب حالات کا وہ روجی کے سلسلے میں مشاہدہ کر چکی تھی۔ وہ سب ایسی باتیں تھیں جو اسے پریشان کر رہی تھیں۔ وہ فطری طور پر بہت ذہین عورت تھی۔ ہر سوال کا جواب وہ تلاش کر لیتی تھی۔ وہ میری سرشت سے اچھی طرح واقف ہونے کے بعد اب اپنے وجود کو مجھ سے چھپا لینا چاہتی تھی۔ کیونکہ جس جنتِ گم گشتہ کی بازیافت کیلئے وہ کوشاں تھی۔ وہ اسے نہیں مل رہی تھی اور میرے ساتھ یوں دربدر پھرنا اسے کسی بھی طرح گوارا نہیں تھا۔ اس کے رویے سے بہر طور میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا۔ کیونکہ ٹیکسی میں جب وہ میرے ساتھ بیٹھی تو درمیان میں اس نے خاصا فاصلہ قائم رکھا۔ وہ ہر جگہ میرے ساتھ جڑ کر بیٹھتی تھی مگر اُس روز وہ مجھ سے دُور ہو رہی تھی۔ میری قربت سے شاید اسے وحشت ہونے لگی تھی۔ اس کے چہرے پر کھنڈی زردی اس بات کی غماز تھی کہ اپنے مستقبل اور اپنے حال کی بے یقینی نے اسے بہت بُری طرح نڈھال کر رکھا تھا۔

اور میں ڈرتا تھا کہ میرے یہ دونوں ساتھی کسی بھی وقت مجھ سے دغا کر سکتے ہیں۔ وہ دونوں ہی تھک چکے تھے اور اب میرے ساتھ اور آگے چلنے سے گریزاں تھے۔ میرے اور ان کے مقاصد جداگانہ تھے۔ آبی محض اپنے ایک جذبے کی تسکین کے لیے قزاقی اور رہزنی کا پیشہ اختیار کیے ہوئے تھے۔ وہ پیشہ اس کی ضرورت ہرگز نہیں تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو اس کے گھر کی وہ حالت نہ ہوتی جو میں دیکھ کر آیا تھا اور اس کی ماں یوں افلاس و نکبت کی زندگی نہ گزارتی۔ وہ تو مہارانی بن کر رہ سکتی تھی۔ محلوں میں بسیرا کرتی تو بھی وہ اسے راس آ جاتے۔ کیونکہ اس کے بیٹے نے اپنی قوتِ بازو اور بے مثال ذہانت سے اس وقت تک لاکھوں روپے اِدھر سے اُدھر کر دیے تھے۔ مگر وہ روپیہ، وہ محنت اور وہ اس کی شب زندہ داری، وہ اس کی اندھیروں سے لامتناہی جنگ بے کار جا رہی تھی کیونکہ جو کچھ آبی کے ہاتھ آتا تھا تیزی سے دُوسروں کی جیبوں میں پہنچ جاتا تھا۔ اس کے دریائے فیض کا ایک قطرہ بھی اس کے گھر نہیں پہنچتا تھا۔ وہ ہوا کے اس عطر بیز جھونکے ایسا تھا جو باغوں سے خوشبو چرا کے جھونپڑوں کے تنگ آنگنوں کو مہکانے کے لیے وجود میں آتا ہے اور یہ احساس دلاتا ہے کہ زندگی ابھی اس قابل ہے کہ اُسے ڈھنگ سے گزار دیا جائے۔ اس سے محبت کی جائے اور اس کے دامن میں بکھرے سارے ہی پھولوں سے استفادہ کیا جائے۔ آبی ایسا ہی تھا مگر اب وہ مجھ سے بُری طرح اکتا چکا تھا۔ اس کے چہرے سے تو یہی ظاہر ہو رہا تھا۔ کیونکہ اُس کی وہ چپ کسی بھی طرح بے معنی نہیں تھی۔

ٹیکسی آبی کے اشارے پر ایک جگہ رُکی تو معلوم ہوا کہ وہ ریلوے ورکشاپ کا عقبی علاقہ ہے۔ ہمارے سامنے ایک بہت بڑا مکان تھا جس کی پیشانی کی آرائش و زیبائش پر مالک نے خاص توجہ دی تھی۔

آبی نے ٹیکسی ڈرائیور کو دس کے بجائے بڑی فراخدلی سے بیس روپے دیے۔ اور ہمیں اپنے ساتھ لے کر دروازے پر جا ٹھہرا۔ وہ مکان ایسی جگہ بنا تھا کہ اس کے ارد گرد خاصی دُور تک کوئی مکان نہیں تھا اور اس کے عقب میں ریلوے ورکشاپ کا لامتناہی سلسلہ افق تک پھیلتا چلا گیا تھا۔ وہاں سناٹا ایسا تھا کہ مجھے اپنے دل کی دھڑکن بھی صاف سُنائی دیتی تھی۔ مکان کے دو دروازے تھے۔ ایک بہت بڑا گیٹ تھا، جس میں سے بڑی سے بڑی گاڑی بھی اطمینان سے گزر سکتی تھی۔ وہ دائیں ہاتھ صحن میں کھلتا تھا۔ آبی نے جس دروازے پر دستک دی وہ بائیں ہاتھ تھا۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ اس مکان میں بجلی کا کوئی انتظام نہیں ہے، کیونکہ آس پاس مجھے کہیں کوئی تار یا کھمبا نظر نہیں آ رہا تھا۔ دروازے کے سامنے کھڑے ہوئے... ہمیں خاصی دیر ہو گئی۔ میرا خیال تھا کہ دس منٹ تو گزر ہی گئے تھے۔ مگر کسی نے دروازے کھولنے کی زحمت نہیں کی۔ آبی کا پارہ دم بدم اوپر اُٹھتا جا رہا تھا۔ جب انتظار زیادہ ہی طویل ہو گیا تو اس نے بڑے زور سے دروازہ پر پاؤں سے ٹھوکر ماری بولا۔ "معلوم ہوتا ہے اندر کے سب آدمی قتل ہو چکے ہیں۔" وہ بہت سنجیدہ ہو رہا تھا۔

"ارے نہیں یار ایسا نہ کہو۔ اتنا بھی اندھیر نہیں مچا ہے۔"

"اندھیر کی کیا بات ہے۔ یہ دروازہ کیوں نہیں کھولتے۔" یہ کہہ کر اس نے ایک بار پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔

"کون ہے؟" ایک غنغنی سی مردانہ آواز سنائی دی۔

"اوئے دروازہ کھول فیقے! یہ تو اندر کیا کر رہا تھا۔ یہاں کھڑے کھڑے ہم تختہ ہو گئے ہیں۔"

"اوئے بیڑہ غرق! آبی سائیں آپ! میں بھی کیسا اُلو ہوں۔" اُس آدمی نے یہ کہہ کر دروازہ کھول دیا اور باہیں پھیلا کر آبی سے لپٹ گیا۔

وہ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا مگر اس کا قد کاٹھ اتنا مضبوط تھا کہ وہ جو[illegible]ں کو بھی مات کرتا تھا۔ اس کے ہاتھ مجھے مٹی میں سنے نظر آئے تھے اور کپڑے بھی گرد آلود تھے۔ حد یہ تھی کہ اس کے بالوں میں بھی مٹی سنی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ٹوکری مزدور ہے اور ابھی ابھی کسی مستری کی چاکری سے اُٹھ کر اِدھر آیا ہے۔

"بس زیادہ چاپلوسی نہ کر فیقے میں تجھے اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ کہاں ہے وہ سنگری؟"

"وہ تو ادھر سکھر گئے ہوئے ہیں کل سے۔ بس ایک دو دن میں آجائیں گے۔"

"لعنت بھیج اُس پر، تو ہمیں اندر بٹھا بہت تھکے ہوئے ہیں ہم۔"

"ہیں حاضر سائیں۔ گھر آپ کا، گھر والے آپ کے۔ میں حاضر سائیں! میرے ماں باپ حاضر۔"

"ابے! تیری یہ لچھے دار باتیں ختم ہوتی ہیں کہ نہیں ابھی — کوئی کھانا شانا بھی مل سکے گا کہ نہیں؟" آبی نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ اس کا سوٹ کیس فیقے نے اٹھا لیا تھا۔ ماجدہ اور میں اپنا اپنا بوجھ اٹھائے ہوئے ان کے پیچھے چل رہے تھے۔ فیقا ہمیں ساتھ لے کر مکان کے اندر داخل ہوا تو معلوم ہوا کہ صرف پیشانی ہی مکی ہے باقی سب کچھ کھنڈر ہے وہاں کوئی شے بھی سلیقے سے نہیں رکھی تھی جس کمرے میں فیقے نے ہمیں بٹھایا وہاں ایک نواڑی پلنگ بچھا تھا۔ نواڑ اس کی اتنی میلی تھی کہ دیکھ کر طبیعت الجھتی تھی اس پر گرد اتنی جمی تھی جیسے اسے کسی نے صدیوں سے استعمال نہیں کیا۔ یہی حال وہاں رکھی ہوئی کرسیوں کا تھا جو دائیں ہاتھ دیوار کے ساتھ لگی تھیں۔ ان کے سامنے ایک میز تھی جس پر شیشہ لگا تھا وہ بھی گرد میں اَٹی تھی۔

فیقے نے جلدی جلدی ان تمام چیزوں کو جھاڑ پونچھ کر صاف کیا تو ان کی اصل صورت نظر آئی۔ بولا۔

"آبی سائیں مجھے افسوس ہے مگر یہ گھر تو بس ایسا ہی ہے — شنگری صاحب تو بس اپنے کمرے سے غرض رکھتے ہیں۔"

"کسی پوستی کی اولاد ہے تو فیقے! اسے کبھی صاف تو کر لیا کر۔ یہ کمرہ کوئی رہنے کے لائق ہے۔"

"شنگری صاحب کے دونوں کمروں میں تالے پڑے ہیں آبی سائیں! ورنہ میں آپ کو اُدھر ہی بٹھاتا۔ بہرحال گزارا کریں۔ ادھر غسل خانہ ساتھ ہی ہے آرام رہے گا۔"

"مجھے کیا آرام رہے گا؟"

"آپ کی عادت ہے نا آبی سائیں بار بار جانے کی، اس لیے۔"

یہ کہہ کر فیقا مسکرایا تو اس کے نسوار زدہ دانت دیکھ کر مجھے شدید کراہت محسوس ہوئی۔ وہ خاصا گندہ آدمی تھا۔

ماجدہ فرش پر اپنا اٹیچی کیس رکھ کر ابھی تک چپ چاپ کھڑی تھی۔ آبی کی نگاہ اس کے چہرے پر پڑی تو بولا۔

"فیقے شنگری کے کمرے کھول دے ہم اِدھر نہیں رہیں گے۔"

"ٹھیک ہے سائیں! میں اُن کے گھر سے چابی لے آتا ہوں۔"

"جو مرضی آئے کر، مگر یہ جگہ بالکل بیکار ہے۔ چل اُدھر، وہ کمرے کھول دے کسی طرح۔"

"دیکھتا ہوں سائیں، شاید وہ چابیاں گھر چھوڑ گئے ہوں۔ ادھر گڑھی شاہو جاتا ہوں میں۔" یہ کہہ کر فیقا کچھ سوچتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔

آبی اگرچہ فیقے سے بہت اچھے لہجے میں بات کرتا رہا تھا مگر اس

کے چہرے پر پھیلا ہوا تکدّر ابھی تک دور نہیں ہوا تھا۔ پلنگ کے ایک کونے پر بیٹھتے ہوئے بڑے بھڑے ہوئے لہجے میں بولا۔
"جیلانی بھائی! مجھے نہیں معلوم تھا تو اس قدر من چلا اور لاپروا آدمی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے جیب سے نکال کر سگریٹ سلگا لیا۔
"تو بھی بیٹھ جا ماجدہ بی بی، کہاں دربدر ہوتی پھر رہی ہے۔ تو بھی ہمارے ساتھ بیٹھ جا۔"
"میں تیرا مطلب نہیں سمجھا ہوں آبی بھائی۔" میں نے حیران ہو کر کہا تھا۔
"میرا مطلب یہ ہے کہ حمیدہ کے گھر میں تجھے مردار کھانے کی کیا ضرورت تھی۔ پتہ نہیں وہ گشتی کون تھی، کیا تھی اور تو نے ڈال دیا اس پر اپنا جال۔"
"مجھے افسوس ہے یار! مگر وہ تو خود ہی مجھ پر جھپٹ پڑی تھی بڑی تیز عورت تھی وہ۔"
"اور خوبصورت بھی؟"
"عورتیں تو سبھی خوبصورت ہوتی ہیں یار! آدمی جوان ہو تو ہر چہرے میں حور نظر آتی ہے۔" میں نے ماجدہ کو ایک کرسی میں دھنساتے ہوئے کہا۔
"مگر تو جس دھندے میں ہے نا میرے یار اس میں آدمی اگر مار کھاتا ہے تو صرف عورت کے ہاتھوں۔ یہ روپ کا جال آدمی کو کہیں کا نہیں رکھتا ہے۔ دیکھا نہیں تو نے کہ اس حمیدہ پر کتنا روپیہ صرف کیا ہے ہم نے۔ کتنی دل جوئی کرتے رہے ہیں ہم اس کی۔ مگر ذرا سا دباؤ بھی وہ برداشت نہیں کر سکی۔"
"ہاں یہ تو ہے۔"
"یہی نہیں بلکہ اس نے ایک بار پھر سارے شہر کی پولیس کو چونکا دیا ہے۔ آج وہ تمہیں جگہ جگہ تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔"
"میرا تو خیال ہے کہ ہم آج ہی اس شہر سے نکل جاتے ہیں۔"
"پاگل ہے تو بالکل۔ ارے میں کہتا ہوں انہوں نے آج ساری سڑکوں کی ناکہ بندی کر دی ہوگی۔ وہ تجھے کسی بھی طرح معاف نہیں کریں گے۔ انہوں نے تیرے لیے زبردست مشکلات پیدا کر دی ہیں۔"
"کچھ بھی نہیں ہوگا میرے یار! اگر میں یوں ڈرنے لگا..... تو پھر ہو چکی دکانداری۔ وہ مجھ تک نہیں پہنچ سکتے۔"
"میری یہی دعا ہے تو محفوظ رہے مگر میں کل یہاں سے نکل جاؤں گا۔"
"تم کیسے نکل سکو گے۔ خود ہی کہتے ہو کہ سڑکوں پر انھوں نے ناکہ بندی کر دی ہوگی۔"
"میرا گھر پہنچنا بہت ضروری ہے میرے یار۔ ادھر برباد ہو رہے ہیں۔ انہیں کسی بدمعاش نے ادھر سخت زخمی کر دیا تھا اور میں اُن کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکا۔"
"مجھے افسوس ہے آبی! کہ وہ سب کچھ میرے..........." میں نے فقرہ نامکمل چھوڑ دیا۔
"کہو کہو۔ رُک کیوں گئے!"
"وہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا تھا آبی! میں نے ہی نہیں اُس رات حبیب شاہ کے مکان پر جا کر زخمی کیا تھا۔"
"اچھا۔ تو وہ تیرا کارنامہ تھا۔ میں بھی سوچتا تھا کہ ایسا کون مائی کا لال ہے جس نے میرے آدمیوں کو یوں چت کر دیا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے چیتے ایسی پھرتی سے پستول نکال کر اس کی نال میری طرف کر دی۔ اس کی آنکھوں سے اچانک ہی نفرت کی چنگاریاں پھوٹنے لگی تھیں۔ وہ پورے قد سے اب میرے سامنے تن کر کھڑا تھا اور اس کا چہرہ شدتِ غضب سے لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ انگلی اس نے لبلبی پر جمائی تھی۔
"تجھے..... تجھے اُن سے کیا دشمنی تھی جیلانی! کیوں تو نے اُن کا راستہ روکا؟"
"مجھے افسوس ہے آبی مگر مجھے محسوس ہوتا تھا کہ وہ تاہیا اور گوگا اور وہ قطب دین گوہر کے ساتھ زیادتی کر رہے تھے۔ مگر یہ تو اتنا بھڑک کیوں گیا ہے؟"
"یہ میں تجھے بعد میں بتاؤں گا۔ مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ تو بیچ میں کیوں کودا؟ تیرا کیا بگاڑا تھا ان لوگوں نے۔ وہ ادھر ابھی تک برباد ہو رہے ہوں گے۔"
"میں نے ادھر اینٹوں کے بھٹے پر ان کی باتیں چھپ کر سن لی تھیں۔ وہاں دو عورتیں بھی موجود تھیں۔ ایک کا نام پینو تھا اور دوسری کا جلنے۔ وہ سب لوگ اُن سے چہلیں کر رہے تھے۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ حبیب شاہ کے گھر ڈبگری جا کر ڈاکہ ڈالیں گے۔ گوہر اس بات کا سخت مخالف تھا۔ وہ کہتا تھا کہ وہ مزدور آدمی ہے، محنت سے روپیہ کما کر انگلینڈ سے واپس آیا ہے اسے مت لوٹو۔ مگر تاہیے نے اس کو مار کر بے ہوش کر دیا تاکہ وہ ان کا راستہ نہ روک سکے۔ بس اسی بات پر میں نے گوہر کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا تھا اور پھر جو کچھ ہوا، وہ تمھیں معلوم ہی ہے۔"
آبی بڑے غصے سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس گھڑی وہ مجھے کوئی دوسرا ہی آدمی نظر آ رہا تھا۔ بڑے جمے ہوئے لہجے میں بولا۔
"باہر آ جا جیلانی! تیرے میرے درمیان اب کوئی بات اپنائیت کی نہیں رہی۔ باہر آ جا۔"
"یہ کیا کہہ رہے ہو آبی۔ مجھ سے لڑو گے تم؟"
"بکواس بند کر جیلانی! میں نے قسم کھائی تھی کہ اپنے اُن یاروں کے دشمن سے بدلہ ضرور لوں گا، باہر آ جا! میں نے ماں کے دودھ کی قسم کھا رکھی

ہے، تجھے میرا مقابلہ کرنا ہوگا۔"
"نہیں آبی! میں تیرے مقابلے پر نہیں آ سکتا۔ نہیں نہیں! تو اپنی قسم پوری کر لے۔ یہ لے، یہ رہا میرا پستول اور یہ رہی میری اسٹین گن۔ میں ..... میں تجھ سے نہیں لڑ سکتا۔"
یہ کہہ کر میں نے اپنے دونوں ہتھیار آبی کے سامنے ڈال دیے۔ مگر ان ہتھیاروں کو بڑے زور سے پاؤں کی ٹھوکر مار کر آبی مجھ پر جھپٹا اور میرے گلے میں لپٹے کمبل کو بائیں ہاتھ سے پکڑ کر وہ مجھے گھسیٹتا..... ہوا دروازے کی طرف لے چلا۔ میں نے قطعًا کوئی مزاحمت نہیں کی یوں چپ چاپ اپنے سامنے مجھے زیر ہوتے دیکھ کر اس کا غصّہ اور بھڑک اٹھا۔ اس نے کمبل چھوڑ دیا۔ اور بائیں ہاتھ سے اُس نے پوری قوت سے میرے منہ پر ایسا چھانپڑ مارا کہ میری آنکھوں میں ترمرے سے ناچنے لگے۔ میں نڈھال سا ہو کر دروازے کے ساتھ لگ گیا۔ آبی کی آنکھوں میں کھولتی نفرت کے سوا اس گھڑی مجھے کوئی اور جذبہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔
مجھے بڑی فحش گالی دیتے ہوئے وہ بولا۔
"میں تجھے معاف نہیں کر سکتا جیلانی! ہرگز نہیں۔ میں نے تاہیے کے سامنے قسم کھائی تھی۔ ہاں، میں وہ قسم ضرور پوری کروں گا۔" یہ کہہ کر وہ پلٹا اور زمین پر سے پستول اٹھا کر میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "لے اسے پکڑ، میں اپنی قسم پوری کر کے رہوں گا۔"
اس کی یہ بات سن کر ماجدہ بڑے غصے سے بولی۔
"پاگل ہو گئے ہیں آپ آبی صاحب! یہ کیا کر رہے ہیں؟ آپ کو شرم آنی چاہیے۔ یہ بھی تو آپ کے دوست ہیں۔"
آبی نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور دانت پیستے ہوئے بولا۔
"تو چپ رہ گشتی عورت! تیری قیمت کا بھی مجھے علم ہے۔ چل جیلانی! مجھے کوئی غلط قدم اٹھانے پر مجبور نہ کر۔ یہ لے یہ پستول پکڑ۔" یہ کہہ کر اس نے میرا پستول زبردستی میرے ہاتھ میں تھما دیا اور پھر مجھے وہ گھسیٹتا ہوا صحن میں لے گیا، وہاں فرش کچا تھا جس پر جا بجا باریک بجری نظر آتی تھی۔
"تجھے مجھ پر گولی چلانی ہوگی جیلانی! اگر تو نے ایسا نہیں کیا تو مجھے مجبورًا تجھے ٹھنڈے پنڈے مارنا پڑے گا مت سمجھ کہ میں تجھے چھوڑ دوں گا۔"
"میں تجھ پر گولی نہیں چلا سکتا ہوں آبی! تو..... تو اپنی قسم پوری کر لے۔ میں تیار ہوں۔ میرا سینہ حاضر ہے۔" یہ کہہ کر میں نے کمبل اتار کر ماجدہ کی طرف پھینک دیا۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے کبھی مجھے دیکھتی کبھی آبی کو۔ اور بدن اس کا بُری طرح لرز رہا

تھا۔ اس کے وہم و گمان میں یہ بات نہ آسکتی تھی کہ کسی مرحلے پر میرے اور آبی کے درمیان یوں ٹھن جائے گی۔ اس نے کمبل پکڑنے کی کوشش نہ کی اور وہ اس کے سامنے زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

آبی اس وقت مجھ سے دس قدم دور کھڑا تھا۔ اور مجھے للکار رہا تھا۔ "جیلانی گولی چلا جیلانی! میں تجھے موقع دیے بغیر نہیں ماروں گا۔"

میں نے اپنا پستول بڑے غصے سے دور پھینک دیا۔

"تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے آبی! میرا خیال تھا کہ تو مجھ سے محبت کرتا ہے مگر یہ پتہ نہیں تھا کہ تو مجھے غیر سمجھتا ہے ابتک۔" میں نے بڑی گلوگیر آواز میں کہا۔ اس کے رویّے سے مجھے جو صدمہ پہنچا تھا، اس کا اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ آبی کے اس نئے رُوپ نے میرے دل میں گہرے زخم ڈال دیے تھے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اپنے ان شہدے دوستوں کی خاطر مجھ سے یوں بھڑ جائے گا۔ مگر اس کے چہرے پر ایسی سفاک سرد مہری طاری تھی کہ اس کو سمجھ لینا میرے بس کی بات نہیں تھی۔

میں نے پاگلوں کی طرح اپنا سینہ اس کے سامنے کھول دیا۔

"لے چلا گولی آبی۔ میں اُف بھی نہیں کروں گا۔ تیرے ہاتھوں مرنا مجھے بہت سستا اور آسان نظر آتا ہے۔"

وہ چند قدم دائیں طرف ہٹا۔ اور پھر شست باندھ کر پستول کی نال کا رُخ اس نے میرے سینے کی طرف کر دیا۔ میں اپنی جگہ جم کر کھڑا رہا۔ میں تو زندگی سے ویسے ہی عاجز آیا ہوا تھا۔ میرے بے رنگ و نور شب و روز کی گردش نے مجھے ویسے ہی ہر شے سے بیزار کر رکھا تھا۔ اس کے پستول کی نال میں مجھے گلزار کھلتے نظر آئے۔ میں نے آبی سے زیادہ کسی کو زندگی بھر اپنے قریب نہیں پایا تھا۔ وہ بن کہے میری باتیں سمجھ جاتا تھا۔ میرے وجود کے سارے تانے بانے سے وہ پہلے ہی دن آگاہ ہو گیا تھا۔ بڑی عزت تھی میرے دل میں اس کی مگر اس روز وہ اچانک زندگی کے مظاہرے پر تُل گیا تھا۔ ماجدہ دروازے میں کھڑی لرز رہی تھی اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اس خونیں ڈرامے کو کس طرح ختم کرا دے، اسے وقوع پذیر ہونے سے روک دے۔

آبی نے ایک بار پھر مجھے فحش گالی دی اور بولا۔

"تیار ہو جا جیلانی! میں تجھے معاف نہیں کروں گا۔ تجھے میں نے بہت موقع دے لیا ہے۔"

"یار اس ڈرامے کو مختصر کر دے میری جان! تیری قسم سے زیادہ قیمتی ہوتی تو میں اسے ضرور بچا لیتا۔ جلدی کر آبی مجھے کوفت ہو رہی ہے۔" میں نے اسے اپنے ارادے کی تکمیل پر اکسایا۔

اس نے پھر مجھے گالی دی اور پھر اس نے شست باندھ کر گولی چلا دی۔ ایک دو نہیں بلکہ تین گولیاں اس نے داغ دیں مگر وہ سب کی سب میرے سر کے اُوپر سے گزر گئیں، وہ میرے سینے کو چھلنی کر دینے کی سکت ہی نہیں رکھتا تھا۔ تیسری گولی پر اُس نے پستول زمین پر پھینکا اور دوڑ کر مجھ سے لپٹ گیا۔

"مجھے۔۔۔ مجھے معاف کر دے میں اپنی قسم کے ہاتھوں مجبور ہو گیا تھا مگر تجھے مار کر تو میں بھی مر جاتا۔" اس کی آواز رندھ گئی تھی۔ وہ مجھے یوں بھینچ رہا تھا جیسے وہ مجھے صدیوں کی فرقت کے بعد ملا ہو۔ اس کی آنکھوں سے بڑے بڑے آنسو ٹپک رہے تھے۔ میں نے اُسے سنبھالا اس کی آنکھیں پونچھیں اور پھر اسے ساتھ لے کر اندر پلنگ پر جا بیٹھا۔

"یا اللہ تیرا شکر ہے کہ دو درندوں کے درمیان صلح ہو گئی۔" ماجدہ بڑبڑائی وہ بھی اپنی آنکھیں پونچھ کر اب مسکرانے لگی تھی۔ وہ سامنے ہی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ وہ خاصی دہشت زدہ نظر آ رہی تھی ہمارے مزاج کا رُخ اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔ مجھے تو اس نے پہلے روز سے اب تک ایک محبت کرنے والا اور یاروں کے لیے دیدہ و دل فرشِ راہ کر دینے والا ہی پایا تھا۔ آبی پر بھی اسے بے پناہ اعتماد تھا۔ اور وہ اس کی ہر بات پر عش عش کر اٹھتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ آبی سے زیادہ بہادر اور فراخ دل آدمی کوئی اور ہے ہی نہیں مگر اب جو اس نے ہم دونوں کو بدکار کتّوں کی طرح ایک دوسرے کے خون کا پیاسا ہوتے دیکھا تو اس کے تصوّرات کا سارا شیش محل چُور چُور ہو کر اس کے ارد گرد بکھر گیا۔ اس کی خوبصورت سوچ کے سنہرے کلسوں پر گدھ آ بیٹھے تھے۔ وہ مسکرا رہی تھی مگر یوں جیسے کہہ رہی ہو تمھیں شرم آنی چاہیے۔ غیرت ہو تو چلّو بھر پانی میں ڈوب مرو۔ آبی پر اسے بہت طیش آ رہا ہو گا کیونکہ اس نے تو اُسے بُری طرح ڈانٹ دیا تھا۔ نہ صرف ڈانٹا تھا بلکہ اس کے چال چلن پر بھی اس نے چوٹ کی تھی جسے بڑی سے بڑی فاحشہ عورت بھی برداشت کرنے کو تیار نہیں ہوتی، اور وہ تو پھر ماجدہ تھی جسے میں نے ہمیشہ بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا تھا۔ میں تو ایسا تھا کہ اُسے میں نے ایک بار بھی تم ایسی بے تکلفی سے نہیں پکارا تھا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ میں کوئی اسے اپنی پیر و مرشد تصور کرتا تھا، یا اسے کوئی برگزیدہ ہستی سمجھ کر اس کی تکریم و تعظیم کرتا تھا۔ یہ بات ہرگز نہیں تھی بلکہ میرے اس جذبۂ تکریم کو اکسانے میں اس کی وہ اپنی صاف ستھری نستعلیق گفتگو ممد و معاون ثابت ہوئی تھی۔ اس پر اس کی وہ نکھری نکھری بے عیب شخصیت بھی سونے پر سہاگے کا کام کر جاتی تھی مگر اب جو ماجدہ نے اپنی وہ تصویر دیکھی جو آبی کے دماغ میں محفوظ تھی۔ تو وہ تلملا اٹھی تھی مگر میرے بس میں تو کچھ بھی نہیں رہ گیا تھا۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ آبی کے الفاظ کا دُشنہ ماجدہ

کے دل میں گہرے زخم ڈال گیا تھا جسے میں تو کم از کم کسی بھی طرح مندمل نہ کر سکتا تھا۔

میرا یہ حال تھا کہ میں آبی سے بھی شرمندہ تھا اور ماجدہ سے بھی۔ میری جان ان کے درمیان دو برابر حصّوں میں بٹی ہوئی تھی۔ وہ دونوں ہی مجھے عزیز تھے۔ ماجدہ اگر میرے دل کا سُرور تھی تو آبی میری آنکھ کا نور تھا۔ میں ان دونوں کے بغیر کچھ بھی تو نہ تھا میری ذات ان کے بغیر سمٹ کر صفر ہو جاتی تھی۔ کیونکہ جب سے وہ مجھے ملے تھے میری پرواز میں تیزی اور بلندی پیدا ہو گئی تھی مگر اب آبی مجھے بے یار و مددگار چھوڑنے پر آمادہ نظر آ رہا تھا۔ اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اس کے بغیر کیا کر سکوں گا۔ وہ تو میرے راستوں کی روشنی بن گیا تھا۔ اسے کھو دینا مجھے کسی طرح گوارا نہ تھا، مگر وہ اپنا ارادہ ظاہر کر چکا تھا۔ اسے تابیا، گوگا اور قطب دین عزیز تھے۔ وہ میرے ساتھ بندھ کر تھک گیا تھا۔ بالکل اس کھلاڑی کی طرح، جس کو اپنی دائیں ٹانگ دوسرے کی بائیں ٹانگ سے باندھ کر دوڑنا پڑتا ہے۔ اور ساتھی کی ذرا سی لاپروائی سے اپنا توازن کھو بیٹھتا ہے۔ ہمارا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ میرا شعور مجھے ایسی ایسی باتیں سمجھانے لگا تھا کہ میں اپنے گرد و پیش سے خوفزدہ ہو رہا تھا۔ اس لیے نہیں کہ قانون کا ہاتھ میری گردن کی تلاش میں تھا۔ نہیں بلکہ اس لیے کہ اپنے اس ساتھی سے محروم ہو کر میں اپنی منزل کے کھوج میں نابینا ہو جانے کا خدشہ محسوس کر رہا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟ لو سگریٹ پیو۔" میں نے سگریٹ اس کی طرف بڑھایا۔

"اں۔ کچھ نہیں جیلانی! میں تم سے بہت شرمندہ ہوں میرے دوست! یہ کیسی حماقت ہو گئی ہے مجھ سے۔"

"لعنت بھیج۔ مٹی ڈال اس بات پر۔ مجھے کوئی گلہ نہیں ہے تجھ سے۔ اب یہ بتا کہ کھانے کا کیا بندوبست ہو گا۔ اس حمیدہ نے تو صاف ہی ٹرخا دیا ہے ہمیں۔"

"شکر کرو اس کے چکر سے بچ نکلے ہو ورنہ اس نے تو پکڑوا ہی دیا تھا تمھیں۔" آبی نے پلنگ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "شطرنج کھیلتی ہے وہ اس ماجدہ کی سہیلی۔ سامان سے اپنا گھر بھروا لیا۔ روپیہ بھی اینٹھا اور پھر ہمیں گھر سے یوں نکال باہر کیا جیسے کوئی مکھن سے بال نکال دیتا ہے۔"

میں نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔ حمیدہ کی وہ دبی کچلی عورت کے رنگ میں رنگی تصویر میرے حافظے پر ابھر آئی تھی۔

"مزے کی بات یہ ہے جیلانی صاحب کہ اس نے خود کو پولیس سے بچا لیا ہے آپ کی نشاندہی کر کے۔" ماجدہ نے ہماری گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں یہ تو ہے۔ زبردست پتّا پھینکا تھا اس نے۔ حالانکہ اس سارے قصے میں وہ پوری طرح ملوّث نظر آتی تھی مگر تھانیدار کو اس نے ایک ہی فقرے میں شکار کر لیا۔"

"یہ عورتیں ایسی ہی ہوتی ہیں جیلانی باؤ۔ اسی لیے تو کہتا ہوں کہ ان سے اور پیلے رنگ کی چھپکلی سے آدمی کو ہر حال میں بچنا چاہیے۔" آبی نے سگریٹ کا گہرا کش لیتے ہوئے کہا۔

"اور تم جو اس بینو اور جلتے کوا ڈے پر چڑھائے بیٹھے ہو، وہ کس کھاتے میں جائے گا؟"

"وہ! ارے وہ جلتے تو تابیے کی جند جان ہے۔ وہ اسے بھگا لایا تھا گھر سے۔ اور بینو اس گوگے کی منظورِ نظر ہے۔ میں تو بس تم جانو بس ایسا ہی مولا مست آدمی ہوں، ایسے طوطے نہیں پالتا ہوں میں۔"

"اچھا تو یہ بات تھی۔"

"یار یہ فیقا کہاں غرق ہو گیا باہر جا کر۔ سالا ابھی تک واپس نہیں آیا۔" آبی نے موضوع بدل دیا۔ "کہتا تھا چابیاں لے کر ابھی آتا ہوں۔"

"کہیں کوئی اور ہی چکر تو نہیں چل رہا ہے ہمارے خلاف؟ یہ زمین تو ویسے ہی ہمارے لیے تنگ ہو چلی ہے۔"

اچانک ہمیں مکان کا بڑا دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔

فیقا باہر سے تالا لگا گیا تھا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اندر آیا۔ اور بولا "آبی سائیں! چابیاں میں لے آیا ہوں اور آپ کے لیے کھانا بھی مستری صاحب کی بیگم نے بھیجا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے بڑا سا توشہ دان ہمارے آگے رکھ دیا۔

جب وہ شگری صاحب کے دونوں رہائشی کمرے کھول کر ہمیں اُدھر لے گیا تو ان کی آرائش و زیبائش دیکھ کر میرا دل خوش ہو گیا۔ دونوں کمروں میں دو دو پلنگ بچھے تھے۔ جن پر دبیز گدے اور صاف ستھری چادریں آدمی کو اپنے مقدر کی ساری کلفتیں مٹا لینے کی دعوت دیتی تھیں۔

ہم کھانے سے فارغ ہو کر بستروں پر لیٹ گئے۔ میں اور ماجدہ ایک کمرے میں ہ اور آبی دوسرے کمرے میں۔ ہماری ضرورت کی ہر شے ہمیں فیقے نے مہیا کر دی تھی۔

"یار ہم بہت تھکے ہوئے ہیں فیقے اگر تو اجازت دے تو دو گھڑی نیند لے لیں" میں نے اس سے بے تکلف لہجے میں پوچھا۔

"کیوں نہیں سائیں، اللہ نے بستر تو بنایا ہی اسی لیے ہے کہ آدمی اس پر لیٹ کر اپنی تھکن مٹائے۔ میں یہ دروازے بند کر دیتا ہوں" یہ کہہ کر اس نے دونوں پٹ بھیڑ دیے۔ اور دوسرے کمرے میں جا گھسا۔ اس کے جاتے ہی میں نے اندر سے کنڈی چڑھا لی۔

بستر پر لیٹنے سے پہلے میں نے ماجدہ کے چہرے پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ اس کے وجود کی ساری بتیاں بجھی ہوتی ہیں۔ وہ مجھ سے بہت ہی کھنچی کھنچی نظر آتی تھی میرے اور اس کے درمیان شاید طویل فاصلہ حائل ہو گیا۔ ہمارے ربط و ضبط کی درمیانی کڑی ٹوٹ گئی تھی۔ میری ممنونِ احسان ہونے کے بجائے وہ مجھ سے ناراض معلوم ہوتی تھی۔ ڈھیر ساری رقم اس کے اٹیچی کیس میں بند تھی۔ میں چاہتا تو ایک منٹ میں وہ سب کچھ اس سے وہیں دھروا لیتا مگر وہ ایسی تھی کہ اس رقم کا ذکر تو کجا اس کی موجودگی کو بھی وہ مجھ سے چھپا لینا چاہتی تھی۔ اس نے بڑی احتیاط سے اٹیچی کیس کپڑوں کی الماری کے اندر رکھا اور اس کے پٹ بند کر کے اس پر تالہ ٹھونک دیا اور مجھ سے خاصے فاصلے پر دوسرے پلنگ پر جا کر یوں لیٹ گئی جیسے اسے میرے وجود سے گھن آتی ہو۔

اس کا رویہ میرے لیے حیران کن تھا مگر پھر میں نے سوچا کہ یہ اپنے اس دیرینہ یوندی کے حربے سے میری آتشِ شوق کو مہمیز دینے کا سامان پیدا کر رہی ہو۔ میں بھی لحاف میں منہ ڈال کر چپ چاپ لیٹ گیا کچھ ہی دیر بعد مجھے نیند نے آ لیا اور پھر مجھے کسی بھی بات کا ہوش نہیں رہا۔ نہ اس اجنبی گھر کی اجنبی چھت کا احساس باقی رہا، نہ اس بات کی کسک دل میں رہی کہ کچھ ہی دیر پہلے آبی نے مجھ سے ازلی ابدی دشمنوں ایسا سلوک کیا تھا۔ میں نے وہ ساری باتیں ذہن سے جھٹک ڈالی تھیں۔ میں اگر ان کے بارے میں سوچتا اور ان کی تلخی کو اپنے بدن میں پھیلاتا رہتا تو نیند مجھ سے کوسوں دور بھاگ جاتی، مگر میں اس حد تک شل ہو چکا تھا کہ سب کچھ بھول کر میں نے دو گھڑی سو لینا غنیمت سمجھا۔

مگر جب میری آنکھ کھلی تو اندر باہر ہر طرف اندھیرا چھا چکا تھا۔ میں نے کلائی کی گھڑی کے چمکتے ہندسوں پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ رات کے ساڑھے بارہ بج چکے ہیں۔ میں چھ گھنٹے سوتا رہا تھا اس حال میں کہ مجھے اپنے گرد و پیش کا قطعاً کوئی ہوش نہیں رہا تھا۔ میں نے ماچس جلا کر سگریٹ سلگاتے ہوئے دوسرے پلنگ پر نظر ڈالی تو یہ دیکھ کر میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی کہ ماجدہ وہاں سے غائب تھی اور شگری کے کپڑوں کی الماری کے دونوں پٹ کھلے تھے میں نے الماری کے قریب جا کر ایک اور تیلی جلائی تو معلوم ہوا کہ وہاں سے ماجدہ کا وہ نوٹوں اور کپڑوں سے بھرا اٹیچی کیس بھی غائب تھا۔ ماجدہ کی تمام چیزیں وہاں سے جا چکی تھیں۔

مجھے اپنی بصارت پر اعتبار نہیں آ رہا تھا۔ میں نے آنکھیں مل مل کر اور بار بار دیا سلائیاں جلا جلا کر کمرے کا بغور جائزہ لیا۔ مگر وہاں کچھ ہوتا تو مجھے نظر آتا۔ میرا سوٹ کیس البتہ پلنگ کے نیچے موجود تھا۔

میں تیزی سے برآمدے میں نکل کر اس کمرے کی طرف گیا، جہاں آبی سویا ہوا تھا۔ اس کا دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ میں نے اسے بہت آہستگی سے پیچھے دھکیلا۔ تو اس کے دونوں پٹ کھل گئے۔ وہ کمرہ بالکل خالی تھا۔ آبی بھی وہاں سے غائب تھا۔ اس کا سوٹ کیس بھی کہیں نظر نہیں آتا تھا۔ لحاف یوں کھلا پڑا تھا جیسے کسی نے نہایت عجلت میں اسے پرے پھینکا اور پھر اپنا سامان اٹھا کر فوراً ہی وہاں سے نکل گیا۔

تو اس کا یہ مطلب تھا کہ وہ ماجدہ آبی کے ساتھ فرار ہو گئی تھی۔ مجھے نیند کے فریب میں مبتلا کر کے وہ دونوں وہاں سے بھاگ نکلے تھے۔ مگر کیوں؟ کس لیے؟

ان کے دماغوں میں یہ خناس کیسے پیدا ہو گئی۔ انہیں یوں چوروں کی طرح بھاگنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں نے تو ان کے درمیان کوئی دیوار کھڑی نہیں کی تھی۔ اگر اس ماجدہ کی رال آبی پر ٹپکنے لگی تھی تو میں تو اس کی راہ میں ہرگز حائل نہ تھا۔ اسے یوں منہ چھپا کر رات کے اندھیرے میں میری نیند کا فائدہ اٹھا کر اس طرح چوروں کی مانند بھاگنے کی کیا ضرورت تھی۔ اور وہ آبی تو ہرگز ایسا نہیں تھا۔ اس کی زندگی میں عورت اور روپے کی کوئی وقعت نہیں تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ ان دونوں چیزوں سے اپنا گھر بھر سکتا تھا۔ وہ اپنے دست و بازو میں اتنی سکت رکھتا ہے کہ وہ چاہے تو ایک حرم آباد کر لے۔

سینکڑوں عورتیں اس کی غلامی پر فخر کر سکتی ہیں۔ پھر... پھر کیا وہ اس روپے کے لالچ میں ماجدہ کو اپنے ساتھ لے کر بھاگا ہے جو اس نے آہو کے گھر سے اٹھایا تھا۔ نہیں نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ روپیہ تو وہ جتنا چاہتا مجھ سے لے سکتا تھا۔ اور اس پر تو اس کا حق بھی تھا میرے صندوق میں جو نوٹ بھرے تھے، وہ جب چاہتا مجھ سے طلب کر سکتا تھا۔ ایسا نہ بھی ہوتا، تو بھی روپیہ پیدا کر لینا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ کوئی بھی شے اس کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ ایسا ڈاکو تھا، ایسا دلیر چور تھا کہ سات پردوں میں چھپی دولت بھی آپ ہی آپ چل کر اس کے سامنے آ جاتی تھی۔ نہیں نہیں آبی ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ اس تھوڑے سے روپے کے لیے ماجدہ جیسی گندی مچھلی پر ہاتھ ڈالنا گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ پھر بھی حقیقت میرے سامنے کھڑی میرا منہ چڑا رہی تھی۔ وہ دونوں وہاں سے غائب تھے۔ اور تمام شواہد اس بات کی طرف اشارہ کناں تھے کہ باہمی صلاح مشورے سے ہی وہاں سے نکلے ہیں — وہ میرا ساتھ چھوڑ دینے پر پہلے ہی سے متفق ہو چکے تھے۔ عین ممکن ہے کہ صبح جب وہ آسیہ سے ملنے کے لیے جیل گئے تو اس وقت ان کے درمیان کوئی ایسی بات ہو گئی ہو جس نے ان کو ایک دوسرے کے بیحد قریب کر دیا۔ آبی ٹھیک کہتا تھا ان عورتوں سے کچھ بھی تو بعید نہیں۔ وہ کیا نہیں کر سکتی ہیں مگر اس آبی نے یہ کیا کر دیا ہے — ایسی کمینگی کی تو میں اس سے کبھی بھی توقع نہیں کر سکتا تھا۔ پھر یہ... یہ سب کچھ کیسے وقوع پذیر ہو گیا۔ آبی پھسلا بھی تو کس پھسلن پر۔ اس سالے کو نہیں معلوم کہ ایسی پھسلن آدمی کا گھٹنا بھی توڑ سکتی ہے۔ اس ماجدہ کی ان جھکی جھکی آنکھوں نے بالآخر وہ کرشمہ دکھا ہی دیا تھا۔ جس کا خدشہ بہت پہلے میرے دل میں ابھرا تھا مگر میں نے اسے کبھی بھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھا تھا۔ کیونکہ آبی کی فولاد صفت شخصیت پر مجھے مکمل اعتماد تھا۔ مگر ماجدہ کی یہ سیمابی طبیعت یوں مجھے میرے جگری دوست سے محروم کر دے گی، یہ تو کبھی میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

اپنے شکوک و شبہات دور کرنے کے لیے میں ایک بار پھر دونوں کمروں میں گھوم گیا۔ وہاں سے آبی بھی جا چکا تھا اور ماجدہ بھی، اور اپنے پیچھے وہ کوئی نشان بھی چھوڑ کر نہیں گئے تھے۔

میں نڈھال ہو کر صحن میں نکلا اور مکان کے دروازے تک جا پہنچا۔ اس کے دونوں پٹ بھڑے ہوئے تھے مگر زنجیر کی قید سے وہ دونوں ہی آزاد تھے جس کا مطلب تھا کہ فیقے کو اس کی روانگی کا قطعاً کوئی علم نہیں تھا۔ پھر بھی میں اس سے کوئی سراغ معلوم ہو جانے کی امید میں اس کے کمرے کی طرف بڑھا۔ وہ بڑے گیٹ کے ساتھ بنے چھوٹے سے گیراج نما کمرے میں سوتا تھا۔ اس کا یہ بڑا سا چوبی دروازہ اندر سے بند تھا۔

ابھی میں اس دروازے پر دستک بھی نہ دے پایا تھا کہ اندر سے گھڑی کا الارم بجنے کی آواز گونج اٹھی۔ الارم کو بجتے ہوئے ابھی تین سیکنڈ ہوتے تھے، کہ ٹھک کی آواز پیدا ہوئی۔ فیقے نے شاید ہاتھ مار کر الارم بند کر دیا تھا۔

"اٹھ اوئے کاکا اٹھ۔ وہ ٹرک آنے والا ہو گا۔ اٹھ میرا دیر بارہ بج گئے ہیں۔" فیقے نے کسی کو پکارا۔ اور پھر لمبی جماہی لے کر وہ شاید چارپائی سے اتر گیا تھا۔ کیونکہ گیراج میں چارپائی کی کرڑ کرڑ گونجنے لگی تھی۔

"اوئے اٹھ جا۔ وہ تیرے گاہک آتے ہی ہوں گے۔" فیقے نے اب کی بار ذرا بلند آواز سے کہا۔

"بارہ بج گئے ہیں چاچا۔"

"ہاں بچے اب تو سوئیاں آگے نکل گئی ہیں۔" فیقے نے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے تو چل ذرا پھاٹک کھول دے۔ وہ ہارن بجائیں گے تو مہمان خواہ مخواہ ہی کوئی پھڈا ڈال دیں گے۔" کاکے نے کہا۔

پتہ نہیں مجھے کیا سوجھی میری چھٹی حس نے مجھے وہاں سے سرک جانے کا اشارہ کیا۔ اور میں دبے پاؤں چلتا ہوا وہاں سے دوسری طرف نکلا اور ایک درخت کی اوٹ میں جا کھڑا۔

ابھی مجھے وہاں کھڑے ہوئے دو منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ فیقے نے بڑی آہستگی سے پھاٹک کھولا اور باہر نکل کر ادھر ادھر جھانکنے لگا۔

ہوا اس وقت بہت ٹھہر ٹھہر کے چل رہی تھی مگر فضا میں خنکی اتنی تھی کہ سردی کی شدت کے احساس کو آپ ہی آپ بڑھاتی چلی جاتی تھی۔ مجھ سے حماقت یہ سرزد ہوئی کہ میں صرف ایک قمیص میں باہر نکل آیا تھا۔ اپنے اوپر میں کمبل بھی نہ اوڑھ سکا تھا۔ اس ماجدہ کے فرار نے مجھے کچھ اس طرح حواس باختہ کر دیا تھا کہ میں کچھ بھی نہ سوچ سکا تھا۔

فیقا دور دور تک نظر دوڑا کر پھاٹک کے اندر آیا تو اس کا ساتھی کاکا گیراج میں سے باہر نکلا اور بولا۔ "ادھر سے بھی تو ابھی کوئی گھنٹی نہیں بجی۔"

"یار وہ لوگ بس آتے ہی ہوں گے، تم ادھر چھپر کے نیچے جا کر سنگل ڈاؤن کر دو۔" فیقے نے کہا۔ اس کی یہ بات سن کر کاکا صحن عبور کر کے پچھلی دیوار کے ساتھ بنے بڑے سے ٹین کے چھپر تک جا ٹھہرا۔ اس نے ٹارچ جلا کر فرش پر سے کچھ اینٹیں اٹھا کر ایک طرف رکھیں اور پھر نیچے بیٹھ کر کوئی چیز اٹھانے لگا۔ میں اندھیرے میں کھڑا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کاکے کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے چور... ایسی احتیاط سے فرش پر پڑے تختے اٹھائے۔ ان میں سے ہر تختہ کم از کم تین فٹ لمبا اور ایک فٹ چوڑا تو ضرور ہی ہو گا۔ ایک ایک کر کے اس نے چھ تختے وہاں سے ہٹائے تو چھپر کے نیچے ایک

عجیب سی پُراسرار آواز پھیل گئی۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے سیٹی بجائی ہے۔ اس سیٹی کی آواز سن کر فیقا تیزی سے چھپّر کی طرف لپکا۔ اور اس جگہ جا کھڑا جہاں سے کاکے نے تختے ہٹائے تھے۔

ان کی اِس پُراسرار حرکات وسکنات کو ابھی میں سمجھ بھی نہیں پایا تھا کہ ایک درمیانے درجے کا ٹرک پھاٹک میں داخل ہوا۔ اُسکی بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔

"لو وہ بھی آ گئے۔ میں نہ کہتا تھا کہ وہ لوگ ٹھیک وقت پر پہنچ جائیں گے۔" فیقے نے خوش ہو کر کہا۔

ٹرک اس مکان کے وسیع وعریض صحن میں گھوم کر مڑا اور اس کا پچھلا حصّہ چھپّر کے سامنے لے جا کر ڈرائیور نے انجن بند کر دیا۔ ٹرک کے اگلے دروازے کھلے اور اس میں سے دو آدمی برآمد ہوئے۔ دونوں ہی سیاہ لباس پہنے ہوئے تھے۔ غالبًا وہ ملیشیا کے کپڑے تھے۔ جو انہوں نے زیب تن کر رکھے تھے۔ سردی سے بچنے کے لیے انھوں نے اوپر سیاہ رنگ کے کمبل اوڑھ رکھے تھے۔

"لے بھئی فیقے بس اب جلدی کرلے میرے بھائی۔ مال آرہا ہے کہ نہیں؟"

"آرہا ہے گوندل جی، آئیگا کیوں نہیں رقم خرچ کی ہے آپ نے کوئی مخول تو نہیں ہے۔"

"یہ لو یہ بقایا پچاس ہزار روپیہ، یہ بھی رکھ لو شنگری صاحب کو دے دینا۔ کہاں ہیں اس وقت؟"

"وہ تو کہیں باہر گئے ہوئے ہیں یار جی۔ یہ پچاس ہزار لے ہے نا گن لیا ہے نا تم نے؟"

"ہاں اب تمھیں پورا ڈیڑھ لاکھ مل چکا ہے۔"

"بالکل ٹھیک، آج ہم تمھارا مال پورا کر دیں گے گوندل جی۔ لو وہ پہلی ٹرالی آ گئی ہے۔" فیقے نے کہا۔ اور اس کے ساتھ ہی چھپّر کے نیچے ایک لالٹین کی روشنی جھلملانے لگی۔ وہ لالٹین ویسی ہی تھی جیسی ریلوے اسٹیشنوں پر روشنی والے مزدور لیے پھرتے ہیں۔

اس لالٹین کی روشنی میں میں نے دیکھا۔۔۔ کہ ایک ٹرالی اوپر اُبھر رہی ہے۔ وہ جب چھپّر کے اندر پہنچ گئی تو اس کے پیچھے ایک آدمی بھی اوپر اٹھ آیا۔ اس نے قلیوں کا سا لباس پہن رکھا تھا۔ مگر وہ سارے کا سارا مٹی میں اٹا ہوا تھا۔ وہ لوگ ٹرالی میں کوئی ٹھوس چیز بھر کر لائے تھے۔

"پیچھے تین ٹرالیاں اور بھی آرہی ہیں۔" وہ آدمی بولا۔

"صرف تین؟ بھائی فتّے اتنے مال سے ہمارا کیا بنے گا؟" فیقے نے کہا۔

"چار اور بھر کر لا دیں گے فیقے سیٹھ! ہمارا حصّہ ہمیں ملنا چاہیے۔" فتّے نے کہا۔

"لو یہ پانچ ہزار روپیہ تم رکھ لو۔ اور یہ رہا تمھارے فورمین کا حصّہ۔ یہ دس ہزار ہے پورا دس ہزار۔" یہ کہہ کر فیقے نے نوٹوں کی تین گڈیاں فتّے کے ہاتھ پر رکھ دیں۔

"ہمیں تو انجن کے پُرزوں کی زیادہ ضرورت ہے بھائی فتّے۔ یہ تانبا تو چلتا ہی رہتا ہے۔" گوندل نے کہا۔

"دو ٹرالیاں پرزوں سے بھری ہیں گوندل صاب! آپ فکر نہ کریں۔ میں ابھی اُوپر کھینچتا ہوں انھیں۔" یہ کہہ کر وہ ایک بار پھر اس گڑھے میں اُتر گیا۔ جس کے مُنہ پر سے کاکے نے تختے ہٹائے تھے۔

میرے لیے وہ سارا منظر بے حد حیرت انگیز تھا۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ ان لوگوں نے چھپّر کے نیچے کوئی سُرنگ کھود رکھی ہے جس کا دوسرا منہ ادھر ریلوے ورکشاپ کے کسی حصے میں کھلتا ہے اور اس سُرنگ کے راستے سے یہ لوگ ریلوے کے چند لوگوں سے مل ملا کر تانبا اور دوسری چیزیں وہاں سے چوری کر کے ادھر لے آتے ہیں جہاں سے گوندل انہیں اپنے ٹرک میں بھر کر باہر لے جاتا ہے۔

خدا ہی بہتر جانتا تھا کہ وہ کب سے یہ دھندا کر رہے تھے۔ اب تک وہ ریلوے کو اندر ہی اندر کتنا نقصان پہنچا چکے تھے۔ ٹرالیاں کشتی نما تھیں اور لبالب بھری تھیں، اُن کے اوپر انھوں نے ترپال ڈال رکھا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے دو ٹرالیاں اور باہر آ گئی تھیں۔ ان میں سے ایک وہ ٹرک کے قریب لے گئے۔ جب اُس پر سے انھوں نے پردہ ہٹایا تو معلوم ہوا کہ اس میں انھوں نے لبالب تانبا بھرا تھا۔ ان تینوں نے مل کر تانبے کی سلاخیں ٹرک میں رکھیں۔ جب آخری ٹرالی بھی وہ خالی کر چکے تو گوندل ٹارچ کاکے کے ہاتھ سے لے کر ٹرک کے پچھلے حصے میں داخل ہو گیا۔

یونہی بے خیالی میں اس نے ٹارچ کی روشنی صحن کے اس حصے میں ڈالی جہاں میں کھڑا تھا۔ درخت کا تنا زیادہ موٹا نہیں تھا۔ میں ڈرا کہ کہیں میں اس روشنی کی زد میں نہ آ جاؤں۔ اسی خیال سے وہاں سے ہٹ کر دوسری طرف نکلنے کی کوشش کی گوندل نے ٹارچ بجھا دی۔ میں وہیں رُک گیا۔ مگر عین اسی وقت تین چار کتّے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے اندر آ گئے۔ وہ اپنے کسی ذاتی تنازعے کو طے کرنے کے لیے ایک دوسرے کو بے نقط سُنا رہے تھے۔ ان کا بھونکنا ہی میرے لیے غضب ہو گیا۔ گوندل نے فوراً ہی ٹارچ جلا کر اُن کتّوں کو دیکھا اچانک کُتّے ادھر لپکے جہاں میں کھڑا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی گوندل کی ٹارچ کا رُخ میری طرف آ گیا۔ اب میں روشنی کے حلقے میں آ چکا تھا مجھ پر نظر پڑتے ہی گوندل نے چھلانگ لگا دی اور گھُٹی گھُٹی آواز میں بولا۔ "اوئے فیقے یہ کیا مصیبت ہے ادھر کوئی بندہ کھڑا ہماری سی آئی ڈی کر رہا ہے۔"

"تیرا وہم ہے گوندل! ادھر بھلا کون آ سکتا ہے۔"

"میں نے خود دیکھا ہے۔" اس نے ایک بار پھر روشنی کا نیزہ میری سمت پھینکا۔ مگر میں اس عرصے میں بھاگ کر برآمدے میں جا پہنچا تھا۔ مجھے درختوں کے نیچے نہ پا کر گوندل نے کہا۔

"اوئے کاکا یہ پھاٹک بند کر دے وہ آدمی اُدھر کمروں کی طرف بھاگا ہے۔"

"گولی مار دو اس سوّر کے پُتر کو، بالکل پروا مت کرو۔" فیقے نے پریشان ہو کر کہا۔

اب وہ چاروں آدمی کمروں کی طرف آ رہے تھے۔ میں بھاگ کر اپنے لبستر میں جا گھسا۔ فیقے نے ہاتھ میں لالٹین اُٹھا رکھی تھی۔ اور گوندل نے ٹارچ کو بجھایا نہیں تھا۔ وہ چاروں دروازہ کھلا دیکھ کر دندناتے ہوئے اندر گھُسے اور میرے پلنگ کے پاس آ ٹھہرے۔ میں نے اپنا منہ لحاف میں چھپا رکھا تھا۔ ظاہر میں یہی کرنا چاہتا تھا کہ میں تو ادھر سویا ہوا ہوں مگر گوندل نے مجھے برآمدے کی طرف جاتے دیکھ لیا تھا۔

"یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔" فیقے نے ادھر اُدھر نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔

"یہ کون سویا ہوا ہے یہاں؟"

"یہ شنگری سائیں کے مہمان ہیں۔ آپی سائیں کے ساتھ ادھر آئے تھے یہ۔"

"تم بھی بالکل بھولے بادشاہ ہو۔ فیقے جی!" یہ کہہ کر گوندل نے انتہائی بدتمیزی سے لحاف میرے منہ پر سے نوچ کر الگ پھینک دیا۔ اس کے بائیں ہاتھ میں ٹارچ تھی اور دائیں ہاتھ میں پستول۔

"یہی تو ہے جو اُدھر کھڑا تھا۔ میں نے ابھی اسے دیکھا تھا وہاں درخت کے نیچے۔ گوندل نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ میں آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔

"کیا بات ہے، کون ہو تم؟"

"زیادہ بھولے نہ بنو مائی ڈیر۔ اس سے پُوچھو فیقے جی کہ اُدھر یہ کیا کر رہا تھا۔" اس نے پستول کا رُخ میرے سینے کی طرف کر رکھا تھا۔

"کیا کہہ رہے ہو تم! میں شنگری صاحب کا مہمان ۔۔۔۔۔ ہوں۔ یہ کون صاحب ہیں فیقے! یہ کیا بدتمیزی ہے۔" میں نے پلنگ پر سنبھل کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"آپ ادھر صحن میں کھڑے تھے ابھی؟" فیقے نے بہت محتاط لہجے میں پُوچھا۔

"میں تو ادھر سویا ہوا تھا۔ مجھے کیا معلوم ادھر کون تھا، اور تم کیا کہہ رہے ہو۔"

"میں پھر کہتا ہوں اُستاد، جھوٹ نہ بول۔ ورنہ میں تیرا مغز ادھیڑ دوں گا۔ اور کون کون ہے ادھر فیقے جی!"

"وہ۔۔۔ ماجدہ کہاں ہے فیقے؟ ذرا آپی صاحب کو تو جگا دو

میں یہ بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا۔" میں نے پلنگ سے اُترتے ہوئے کہا
"مجھے کیا معلوم ہے صاب! وہ تو اِدھر ہی سوتی تھی وہ بی بی،
آبی سائیں اپنے کمرے میں ہوں گے۔"
"انہیں جگا دو ذرا، اور یہ آدمی مجھ سے بات کس طرح کرتا
ہے، تھوڑی تمیز سکھاؤ اسے۔"
"تمیز تو بیٹے میں تمہیں ایسی سکھاؤں گا کہ عمر بھر یاد رکھو گے۔
گوندل کو نہیں جانتے ہو تم۔"
"بکواس نہ کر اوئے۔ پتہ نہیں تو کہاں کی جُوٹھ ہے۔ ذرا آبی
صاحب کو ادھر بُلا فیقے۔ تمہارا لحاظ ہے ورنہ میں اسے ابھی مزہ
چکھا دُوں۔" میں نے گدے کے نیچے سے اپنا چُپ شاہ نکالتے
ہوئے کہا۔ اسے ہاتھ میں پکڑنے کے بجائے میں نے پہلو کی جیب
میں ڈال لیا۔
"یہ پستول چھوڑ دے ورنہ اچھا نہ ہوگا۔"
گوندل بدک کر پیچھے ہٹ گیا۔
"میں تجھ پر گولی نہیں چلاؤں گا۔ بے فکر رہ۔ انہیں دیکھ فیقے۔"
فیقا مجھے گہری گہری نظروں سے دیکھتا ہوا دوسرے کمرے
میں گھسا مگر پھر جلدی ہی وہ واپس آگیا۔ بولا۔
"وہ تو وہاں نہیں ہیں بستر خالی پڑا ہے۔"
"وہ دونوں ہی جا چکے ہیں۔۔ اس ماجدہ کا صندوق بھی یہاں
سے غائب ہے۔ تمہیں پتہ ہے وہ کس وقت یہاں سے نکلے ہیں؟"
"مجھے تو کچھ پتہ نہیں ہے بھائی جی۔ کھانا بھی ان لوگوں نے
نہیں کھایا۔ بس ایسے دُھت ہو کر سوئے کہ پھر مجھے ملے ہی نہیں۔"
"یہ فضول باتیں ختم کرو، مجھے بتاؤ تم اِدھر صحن میں کیا دیکھ
رہے تھے؟"
"تمہارا کیا خیال ہے وہاں کیا دھرا تھا میرے دیکھنے کے لیے۔
کیوں اتنے خوفزدہ ہو رہے ہو؟"
"اسے پکڑ لے کاکا، اور باندھ دے اس چارپائی سے۔ میں
۔۔ میں اسے کوئی موقع نہیں دینا چاہتا۔" کاکا میرے دائیں ہاتھ
کھڑا تھا اور فتا بائیں ہاتھ۔ ان دونوں نے گوندل کا حکم سنتے ہی
مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس طرح کہ کاکا میری کمر سے لپٹ گیا،
اور فتے نے میرے بازو جکڑنے کی کوشش کی۔
"اس کی جیب سے پستول نکال لے فتے۔ یہ خاصی نوکدار شے
نظر آتا ہے مجھے"، گوندل نے کہا۔ مگر جونہی فتے نے میرے بازوؤں
پر ہاتھ ڈالا میں نے پوری قوت سے اپنی دائیں کہنی اس کے سینے پر
ماری۔ وہ اس ضرب کی شدت سے گھبرا کر ذرا پیچھے ہٹا تو میں نے کاکے
کی گردن مسل دی وہ درد کی شدت سے چیخا اور نیچے جھول گیا۔ فتا
پھر میری طرف بڑھا تو میں نے اس کے نچلے جبڑے پر اُلٹے ہاتھ
کا ایک جھانپڑ دے مارا۔ وہ ہاتھ بہت کاری لگا۔ فتا گرنے لگا تو میں نے اسے باہوں
میں لے کر اپنی ڈھال بنا لیا۔ اس طرح کہ اگر گوندل مجھ پر گولی چلاتا
تو وہ سیدھی فتے کے بدن میں لگتی۔ میں اسے گھسیٹ کر دیوار کے ساتھ
جا لگا۔
"یہ پستول پھینک دے گوندل ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔" یہ کہتے
ہوئے میں نے بجلی کی سی سُرعت سے اپنا چپ شاہ جیب سے نکال کر
گوندل پر تان لیا۔ مگر مجھے دیر ہو گئی تھی۔ اس نے میرے ہاتھ کی
حرکت دیکھتے ہی مجھ پر گولی چلا دی لیکن فتا میری صحیح ڈھال ثابت
ہوا گولی سیدھی اس کے پیٹ میں دھنس گئی۔ مگر میں نے گوندل
کو دوسری گولی کی مہلت نہیں دی۔ میں نے اپنے چپ شاہ سے
بے آواز گولی چلائی۔ اس طرح کہ اس کی کلائی شل ہو گئی اور گوندل
کا پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر جا گرا۔ فیقے کے ہاتھ
میں پکڑی لالٹین کی روشنی میرے بہت کام آ رہی تھی۔
میں نے فتے کو زمین پر ڈال دیا۔ اور گوندل کو پستول کی زد
میں لے کر اس کے پاس جا پہنچا۔ وہ بائیں ہاتھ میں اپنی کلائی تھام کر
خون روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔
"کہو بیٹے کیسی رہی۔ تم نے مجھے پہچاننے میں زبردست غلطی
کی ہے گوندل۔ میں نہ کہتا تھا مجھ سے بچ جا۔ میں تو پوری فوج کو
تباہ کر سکتا ہوں میرے یار۔"
گوندل نے کوئی جواب نہ دیا۔ فیقا پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے
دیکھ رہا تھا۔ اس کے منہ سے بات ہی نہیں نکلتی تھی۔
"فیقے! یہ سلوک کرتے ہو تم اپنے مہمانوں سے، میرا خیال
ہے کہ تنگری صاحب یہاں ہوتے تو یہ حال نہ ہوتا نہ تمہارا، نہ میرا۔"
"میں نے تو گوندل کو سمجھایا تھا سائیں، مگر یہ اپنی ضد پر
اڑا رہا۔"
"خیر اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ اس فتے کا علاج کراؤ ورنہ
یہ مر جائے گا۔ میں جا رہا ہوں، اب میں ایک منٹ یہاں نہیں رہوں گا۔"
"آپ کی مرضی ہے سائیں۔ مگر۔۔۔ مگر آپ ہمارے بارے
میں کسی کو کچھ نہیں نہ بتائیں، یہ میری آخری درخواست ہے آپ سے۔"
"بے فکر رہو۔ مجھے کسی کو تمہارے بارے میں کچھ بتانے کی
ضرورت نہیں ہے۔"
یہ کہہ کر میں نے گوندل کا پستول اور اپنا سوٹ کیس اٹھاتے
اور کمبل اوڑھ کر اسی وقت کمرے سے باہر نکل آیا۔ اُن میں سے دو
تو زمین پر ڈھیر ہو چکے تھے اور دو کی حالت ایسی تھی جیسے انھوں نے
کوئی بہت ہی بھیانک خواب دیکھا ہو۔ گوندل کی ساری تن پھن ختم

ہو چکی تھی اور اپنی زخمی کلائی سے بہتے خون کو دیکھ دیکھ کر وہ سہم رہا تھا۔
خاصا لوہے لاٹھ قسم کا آدمی تھا وہ۔ اونچا لمبا مضبوط قد تھا اُس کا۔
مگر میرے ہاتھوں ذلیل ہو کر وہ بالکل پھسپھسا بن گیا تھا۔
میں صحن میں نکلا اور درختوں کے قریب سے گزر کر پھاٹک کی طرف
بڑھا تو مجھے محسوس ہوا کہ اندھیرے میں کوئی آدمی درختوں کے نیچے
سے آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا ہے۔ لومڑی ایسی احتیاط تھی اس کی
چال میں، اور اس کے پاؤں تلے ٹوٹتی ہوئی خشک ٹہنیاں مجھے
یہ احساس دلاتی تھیں کہ وہ بھی گوندل کا ساتھی ہے۔ دراصل میں اس
آدمی کو بھول ہی گیا تھا۔ وہ گوندل کے ٹرک کا کلینر تھا جو چھپر کے
نیچے کھڑا رہ گیا تھا۔ وہ اُن کے ساتھ میرے تعاقب میں آگے
نہیں آیا تھا۔
اُس نے ساری صورتِ حال کو یوں بگڑتے دیکھا۔ تو اندھیرے
میں چھپ کر مجھ پر حملہ آور ہونے کا منصوبہ بنانے لگا تھا۔ اب جو
اُس نے مجھے یوں باہر نکلتے پایا تو وہ دبے پاؤں میرے پیچھے آگیا
تھا۔ میں نے اسے قطعاً محسوس نہ ہونے دیا کہ میں اسے دیکھ چکا ہوں۔
میں جان بوجھ کر دیوار کے اُس حصے کی طرف بڑھتا چلا گیا جہاں وہ
درختوں کی آڑ میں چلتا ہوا میرے پیچھے آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں
لوہے کا وہ موٹا سریا تھا جو اس نے ٹرک میں سے اٹھایا تھا میرا
چپ شاہ میرے دائیں ہاتھ میں تھا۔
جب میرے اور اس کے درمیان تین قدم کا فاصلہ رہ گیا تو
وہ ایک دم درخت کی اوٹ سے نکل کر مجھ پر ٹوٹ پڑا مگر میں
تو اس کی ایک ایک حرکت کو دیکھ رہا تھا۔ جونہی اس نے سریا تول کر
میرے سر میں مارنا چاہا، میں نے گھوم کر اپنا سوٹ کیس اس کی پسلی
میں دے مارا۔ وہ اس جوابی کارروائی کے لیے ہرگز تیار نہ تھا۔ سوٹ کیس
کی ضرب سے وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا اور کٹے درخت کی طرح وہ
دھڑام سے زمین پر جا گرا۔ سریا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا
تھا۔ اسے یوں چت دیکھ کر میں نے پستول کی نال اس کے سینے
پر رکھ دی۔
"اُٹھ کُتے کے بچے میرے ساتھ چل، اٹھ ورنہ جان سے مار
دوں گا۔" میں نے اپنی آواز دباتے ہوئے اس کی پسلی میں گھٹنا دیتے ہوئے
کہا۔ وہ لرزتا ہوا اٹھا اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔
"مجھے معاف کر دو بھاجی مجھے معاف کر دو۔"
"معاف بھی کر دوں گا بچے مگر تو میرے ساتھ تو چل ذرا،
چل ماں صدقے جائے۔"
یہ کہہ کر میں نے اس کی کمر پر ایک گھٹنا دیا اور اسے آگے لگا لیا۔ وہ
بہت ہی خوفزدہ ہو گیا تھا عمر اس کی یہی کوئی پچیس سال ہو گی۔ بس
اکہرے بدن کا جوان تھا وہ اور اس کو قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ اس
نے کس اوکھلی میں سر دے دیا ہے۔ وہ پھاٹک سے باہر نکلا تو دھڑام
سے منہ کے بل زمین پر گر گیا۔ میرا خیال ہے کہ خوف کی فراوانی میں
اسے اپنے سامنے کی بھی کوئی شے نظر نہیں آئی تھی حالانکہ وہ صاف
ستھری دھلی دھلائی رات تھی جس کے چہرے پر برص نما کوئی داغ
کہیں نظر نہیں آتا تھا۔ اور تاروں کی روشنی میں راستہ صاف دکھائی
دیتا تھا۔
میں نے اسے گریبان سے پکڑ کر اوپر اٹھایا اور۔۔۔ دھکیلتا ہوا
اس مکان سے دُور لے گیا۔ دائیں ہاتھ ایک ٹیلہ تھا۔ اس کی اوٹ میں
پہنچ کر میں نے اس کو اپنے سامنے بٹھا لیا۔ تنگری کا مکان وہاں سے
صاف دکھائی دیتا تھا۔
"کیا نام ہے تیرا میرے یار! تو تو بڑا جی دار آدمی معلوم
پڑتا ہے۔"
"جی بھاجی میرا نام۔۔ اچھی ہے۔ میں اُدھر راوی روڈ کی کچی آبادی
میں رہتا ہوں۔"
"وہ جو بادامی باغ کے پاس ہے۔"
"ہاں بھاجی بالکل وہی۔ وہ جو ریلوے لائن کے پار ہے۔"
"تمہارا گھر وہاں کس طرف ہے؟"
"میں جی بھاجی اُدھر مائی پھتی کے گھر کے قریب رہتا ہوں۔"
پھتی کا نام اس کی زبان پر آیا تو میرے ذہن میں بہت سی
یادیں انگڑائیاں لے کر اُٹھ بیٹھیں۔
"پھتی! وہ بڑھیا جسے لڑنے کا مرض ہے، کچھ جھول کر چلتی
ہے وہی نا؟"
"جی بھاجی بالکل وہی، پر آپ اُسے کیسے جانتے ہیں بھاجی!"
"بس ایسے ہی یار میرے ایک دوست کی وہ منہ بولی ماں ہے
کیا حال ہے اس کا؟"
"بہت بُرا حال ہے اس کا تو بھاجی۔ بڑی امیر ہو گئی تھی وہ۔
اس نے وہ مکان بھی خرید لیا تھا۔ پر جی پتہ نہیں کیا ہوا کسی نے اس
کی بیٹی مجیدن کو اغوا کر لیا ہے جی۔ چند دن پہلے کی بات ہے۔ وہ
رات کو آئے اور گھر والوں کو باندھ کر پھتی کی بیٹی اٹھا کر لے گئے۔"
"مجیدن کو اٹھا کر لے گئے، یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔"
"میں نے سُنا ہے بھاجی کہ ادھر کوئی رئیس رہتا ہے۔ وہ اُس کا
دشمن ہو گیا تھا۔ مائی پھتی کا۔
بس اسی نے لڑکی اٹھوا دی ہے اُس کی۔ وہ بے چاری تو اس روز سے
پاگل ہو رہی ہے ابھی اکیس تاریخ کو اس کی شادی ہونے والی تھی۔" اچھی
کا لہجہ بہت غمناک تھا۔

"یہ تو بہت برا ہوا یار۔ وہ مائی تو بیچاری بہت ہی نیک دل عورت ہے۔ بہت بُری خبر سُنائی ہے تم نے۔"

"وہ جی تھانے والے بھی مائی کو پکڑ کر لے گئے تھے۔ کہتے تھے کہ وہ ڈاکوؤں کو پناہ دیتی ہے۔ کوئی ایسی ہی بات ہوگی جی ورنہ وہ اتنی امیر کیسے ہو سکتی تھی راتوں رات۔"

"ہاں یہ بھی ہو سکتا ہے۔ مگر وہ ایسی ہرگز نہیں تھی میرے یار۔ تو یہ بتا کہ یہ فیقا اور یہ گوندل کیا کرتے ہیں۔ یہ ٹرک میں کیا چیز لادے تھے۔"

"یہ۔۔۔ یہ بہت لمبی کہانی ہے بھاجی۔ میں آپ کو بتا نہیں سکتا وہ مجھے جان سے مار دیں گے۔"

"وہ تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ میں ان کو اچھا سبق سکھا آیا ہوں" میں نے اس کے سامنے پستول کی گولی سامنے کے پتھر پر چلاتے ہوئے کہا۔ ٹھک کی آواز پیدا ہوئی اور پتھر اپنی جگہ سے اُلٹ گیا۔

"یہ کیسا پستول ہے بھاجی، گولی چلی مگر آواز ہی پیدا نہیں ہوئی"

"یہ خاص قسم کا پستول ہے۔ میں نے ولایت سے منگوایا تھا۔ یہ آدمی کو بے آواز مار دیتا ہے۔ ذرا بھی تکلیف نہیں دیتا۔ جب آدمی اس کی گولی سے مرتا ہے نا تو اسے بالکل درد نہیں ہوتا۔ چلا کر دیکھوں تیرے سینے پر اسے؟ قسم اللہ کی تجھے بالکل درد نہیں ہوگا۔ بڑے آرام اور اطمینان سے مر جائے گا تو۔ پڑھ کلمہ شہادت۔" میں نے پستول کی نالی اُس کے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ وہ پاگلوں کی طرح گھسٹتا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔ گھگھیانے لگا۔

"نہیں بھاجی، خدا کے لیے اسے ادھر کر لو۔ میں ابھی بتاتا ہوں بھاجی!"

"شاباش! اب آیا ہے تو سیدھی راہ پر۔ بتا میرا دیر، کہ یہ معاملہ کیا ہے؟"

"یہ۔۔۔ یہ بڑے پکے چور ہیں بھاجی یہ گوندل یہ فیقا اور یہ شگری یہ سب ملے ہوئے ہیں۔ انھوں نے ادھر چھپر کے نیچے سے ایک سرنگ کھود رکھی ہے جو دوسری طرف ریلوے ورکشاپ میں کھلتی ہے۔ اس سرنگ کے ذریعے یہ لوگ ریلوے کا لوہا تانبہ اور دوسرا سامان نکالتے ہیں اور کارخانوں میں لے جا کر بیچ دیتے ہیں۔ یہ ہزاروں من مال ہر مہینے وہاں سے چُراتے ہیں۔ بڑا پیسہ کما رہے ہیں یہ بھاجی۔"

"یہ سرنگ کب کھودی تھی انھوں نے؟"

"یہ تو بھاجی تین سال پہلے کھودی گئی تھی۔ بڑے حساب کتاب سے یہ مال نکالتے ہیں اندر۔ سرنگ میں سے آدمی لیٹ کر گزر سکتا ہے اور ٹرالی یہ رسّوں سے گھسیٹتے ہیں۔"

"ہوں، تو یہ بات ہے۔ کس کس کارخانے میں مال بیچتے ہیں؟"

"یہ کبھی تو اپنا ٹرک گوجرانوالے لے جاتے ہیں اور کبھی ادھر شیخوپورہ روڈ پر، برانڈرتھ روڈ پر بھی ان کے گاہک موجود ہیں۔ یہ لاکھوں کروڑوں کا مال چُرا چکے ہیں اب تک۔"

"تجھے کیا ملتا ہے ان سے؟"

"مجھے یہ ہر مہینہ تین ہزار روپے دیتے ہیں کبھی یہ بہت خوش ہوتے ہیں تو ہزار دو ہزار انعام میں بھی دے دیتے ہیں۔"

"اتنا روپیہ کہاں رکھتا ہے تو؟"

"میں نے بھاجی اُدھر کچھ زمین خریدی ہے ادھر بکر منڈی کے قریب وہاں میں مکان بناؤں گا۔"

"ہوں، تو یہ ٹھاٹ ہیں تمھارے۔ پلاٹ کے علاوہ بھی تو بہت کچھ ہوگا تمھارے پاس؟"

"نہیں بھاجی! بس اسی ہزار کا وہ پلاٹ ہی خرید سکا ہوں میں۔ اور کچھ نہیں ہے میرے پاس۔ البتہ اس گوندل اور فیقے نے بڑی جائیدادیں بنائی ہیں اس کام سے۔"

"وہ تو ظاہر ہے۔ اچھا دیکھ، اب تو جا اور ان کے ساتھ مل جا۔ میں تمھارے پھٹے میں ٹانگ نہیں اڑاؤں گا۔ مزے کرو، میں تو بس یونہی پوچھ رہا تھا۔"

"نہیں بھاجی، اب تو میں اُن کے پاس نہیں جاؤں گا۔ مجھے پتہ ہے آپ انھیں پکڑوا دیں گے۔ آپ کوئی خفیہ پولیس کے آدمی نظر آتے ہیں مجھے۔"

"نہیں، مجھے بھی تم اپنا بھائی بند ہی سمجھو۔ جاؤ مزے کرو جاؤ۔" یہ کہہ کر میں نے اسے وہاں سے اُٹھا دیا۔ مگر ابھی وہ دو قدم ہی چلا تھا کہ ہمیں شگری کے پھاٹک میں سے ٹرک باہر آتا دکھائی دیا۔۔۔ انھوں نے ٹرک کی بتیاں حسب سابق بجھا رکھی تھیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ سارا مال لادنے کے بعد فتے اور کاکے کو بھی اس میں ڈال کر باہر لے آئے تھے۔ اچھّی وہیں رُک گیا۔ بولا۔

"دیکھا بھاجی! انھوں نے میرا بھی انتظار نہیں کیا۔ مجھے ساتھ لیے بغیر ہی نکل گئے ہیں۔"

"وہ سمجھ رہے ہوں گے کہ میں تمھیں یرغمال بنا کر ساتھ ہی لے گیا ہوں۔"

"ہو سکتا ہے وہ یہی سمجھ رہے ہوں بھاجی، پر اب مجھے جانے دیں میرا رکنا ٹھیک نہیں ہوگا۔"

"ہاں تم جاؤ۔ مگر۔۔۔ ٹھیک ہے کھسک جاؤ یہاں سے اور پھر کبھی ان کے سامنے مت جانا ورنہ یہ تمھیں جان سے مار دیں گے۔"

"میں کل ہی کسی اور شہر میں جا رہوں گا۔ میں نے بیس ہزار روپیہ بچا کر رکھا ہے اس سے میں کوئی کاروبار کر لوں گا۔ میرا کیا ہے میں قید

نہیں ہونا چاہتا۔ یہ ایک ایک دن ضرور پکڑے جائیں گے۔"
"ہاں یہ تو ہے۔ ٹھیک ہے بچے۔ اب تو جا، تیرا اللہ نگہبان۔"
میں نے اس کو وہاں سے بھاگ جانے کا اشارہ کیا۔ ٹرک بائیں ہاتھ مڑا اور پھر ہوا کی رفتار سے آگے نکل گیا۔ فیقا بھی ان کے ساتھ ہی فرار ہو گیا تھا کیونکہ پھاٹک کی اندر کی کنڈی کھلی پڑی تھی۔ اگر کوئی شخص مکان میں موجود ہوتا تو وہ پھاٹک کو اندر سے بند تو ضرور ہی کر لیتا۔ میں ٹیلے کی اوٹ سے نکلا اور ایک بار پھر شگری کے مکان میں جا گھسا۔ پھاٹک کو بند کر کے میں نے اندر سے کنڈی چڑھائی اور چھپر کے نیچے جا ٹھہرا۔ ان لوگوں نے سرنگ کے منہ پر تختے رکھ کر اس کے اوپر اینٹوں کو یوں ہموار کر کے جوڑ دیا تھا، کہ کسی کے فرشتوں کو بھی یہ خبر نہ ہو سکتی تھی کہ اینٹوں کے اس فرش کے نیچے سرنگ کھدی ہوئی ہے کیونکہ فرش کے اوپر وہ پیال ڈال گئے تھے۔ میں نے پیال ایک جگہ سے ہٹائی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہاں دو فٹ مربع سوراخ موجود تھا جس کے ذریعے سے ایک آدمی بڑی آسانی سے سرنگ میں اتر سکتا تھا۔ وہ سوراخ میں نے پیال سے ڈھانپ دیا۔ میں اس سرنگ میں اتر کر خواہ مخواہ مصیبت میں نہیں پھنسنا چاہتا تھا۔
چھپر سے ہٹ کر میں ایک بار پھر شگری کے کمرے میں جا بیٹھا۔ وہاں فرش پر فتے کا خون پڑا تھا۔ کسی نے کپڑا لگا کر صاف کرنے کی کوشش تو کی تھی۔ مگر داغ دھبے ابھی تک موجود تھے۔ وہ لوگ اسے اٹھا کر اپنے ساتھ ہی لے گئے تھے۔ جس بستر پر میں سویا ہوا تھا۔ اس کی سفید چادر بھی خون آلود تھی شاید گوندل نے اپنی زخمی کلائی اسی چادر سے صاف کی تھی۔ میں نے وہ چادر پلنگ سے اتار کر فرش پر پڑے خون کے دھبے اچھی طرح صاف کر کے چادر کو باہر صحن میں لے جا کر آگ دکھا دی۔ جب وہ اچھی طرح جل کر راکھ ہو گئی۔ تو میں نے وہ راکھ ہاتھوں میں بھر کر صحن کے ایک کونے میں ڈھیر کر دی۔ میں اس معرکے کے تمام نشان مٹا دینا چاہتا تھا جو چند لمحے پہلے میرے اور گوندل کے درمیان وہاں ہو چکا تھا۔
جب میں کمرے میں واپس آ کر پلنگ پر بیٹھا تو میرا ذہن بری طرح الجھ چکا تھا۔ مجھے اس بے ضمیر آہو پر طیش آ رہا تھا جس نے مجیدن کی ماں کو سزا دینے کے لیے معصوم اور بے گناہ مجیدن کو اغوا کرا دیا تھا۔ محض اس لیے کہ میں اس بے چاری کے آنگن میں سے گزر کر آگے بڑھا تھا اور اس کی بیٹی کو کبری کے ہاتھوں تباہ ہونے سے بچا لیا تھا۔ اس نے مجھے ذلیل و رسوا کرنے میں بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ اس نے حکام سے رابطہ قائم کر کے انھیں یہی باور کرایا تھا کہ میں آسیہ کو جیل سے رہا کرانے کے لیے سر توڑ کوشش کر رہا ہوں اس لیے بہتر یہی ہو گا کہ اسے وہ لوگ وہاں سے کسی اور جگہ منتقل کر دیں۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے ذرا سی تاخیر کے بغیر آسیہ کو وہاں سے نکال کر راولپنڈی بھیج دیا تھا۔ اس بدنصیب پر خدا جانے کیا گزری ہو گی۔ وہ آدھی رات کو نیند کی ڈولی سے نکال کر کسی ٹرک کے سنگین فرش پر ڈال دی گئی ہو گی۔ وہ میری بے یار و مددگار بہن جس کا گناہ صرف یہ تھا کہ وہ غلام جیلانی کی سگی بہن تھی اور جس کے ہاتھوں میں مہندی کا رنگ رچتا دیکھنے کے لیے اس نے ڈاکہ زنی شروع کر دی تھی۔ آہو نے مجھے اچھی طرح اپنے شکنجے میں جکڑ لیا تھا۔ حالت میری یہ ہو گئی تھی کہ اب میں کسی بھی طرف نکل نہیں سکتا تھا۔ میرے تمام راستے اس نے مسدود کر دیے تھے۔
اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا۔ اچانک ایک خیال میرے ذہن میں بجلی کے کوندے کی طرح ابھرا اور میں نے سوٹ کیس میں سے تمام روپیہ نکال کر اپنی جیبوں میں ٹھونس لیا۔ اسٹین گن میں نے کندھے پر ڈالی اور پستول کمر سے باندھ کر میں شگری کا مکان اچھی طرح بند کر کے باہر نکل آیا۔
مجھے ہر حال میں اور ہر قیمت پر آہو تک پہنچنا تھا جس نے آسیہ کی مجیدن کی اس کی ماں کی، اور خود میری زندگی میں ایسا زہر گھول دیا تھا کہ اب ہم سب کے سب پور پور مر رہے تھے اور ایسا کوئی تریاق ایجاد نہ ہو سکا تھا، جو ہمیں بچا سکتا۔
آہو ایسا بھیت ثابت ہوا تھا کہ ہر قسم کے جرائم کا مرتکب ہونے کے باوجود وہ اپنے گھر میں ذی وقار بن کر بیٹھا تھا۔ انتظامیہ کی دیواروں میں اس نے سیندھ لگا رکھی تھی۔ مگر کوئی ایسا نہیں تھا جو اس پر ہاتھ ڈال سکتا۔ وہ چوروں اور ڈاکوؤں کی پناہ گاہ بنا ہوا تھا۔ جس سے جو کام چاہتا تھا، لے لیتا تھا۔ وہ بنا بھی سکتا تھا اور مسمار بھی کر سکتا تھا۔ اس کی پدمنی صورت بیوی وہ مسند آرا کی بہن بھی اس کے ان جرائم میں برابر کی شریک تھی مگر کوئی اس کے اصل چہرے کو پہچان نہ سکتا تھا۔ غصہ مجھے اس بات پر آ رہا تھا کہ میرے اور آپی جیسے لوگوں پر ہی کیوں یہ الزام ہے کہ ہم مجرم ہیں۔ آہو جیسوں کو کوئی کیوں نہیں پوچھتا، جنہوں نے ہر آدمی کو پیدا کر رکھ دیا تھا۔ ایسے پتال پیٹ لوگوں سے کوئی ان کی گردن پر ہاتھ ڈالے بغیر کیسے نمٹ سکتا ہے اور اب تو مجیدن بھی اس کی بھینٹ چڑھ گئی تھی۔ وہ دھان پان سی کمزور بے بس لڑکی۔ اس کو خدا معلوم اس حرام زادے نے کیسی کڑی آزمائشوں میں ڈال رکھا تھا اور سچی بات تو یہ ہے کہ میں اس وقت جو آندھی طوفان کی طرح آہو کے گھر کی طرف بڑھ رہا تھا تو اس کی وجہ صرف مجیدن کی وہ بے پناہ مظلومیت تھی جس پر میں تلملا کر رہ گیا تھا۔ میں اس رات اس آہو کے تمام کشتی کیش تباہ کر دینے پر تلا ہوا تھا۔ میرے ذہن کے ایوانوں میں سرخ آندھی اٹھ رہی تھی اور میرے چاروں جانب خون ہی خون بکھرا نظر آتا تھا۔
وہ آپی اس رات میرے ساتھ ہوتا تو میری قوت سہ چند ہو جاتی مگر وہ کمینہ کسی اور راہ پر چل نکلا تھا۔ تف ہے اس کی صورت پر۔ کیسا بگلا بھگت بنا رہتا تھا وہ سالا۔ کہتا تھا ان عورتوں سے بچ جیلانی! یہ آدمی کو فرش کر دیتی ہیں۔ رگوں سے خون اور دل سے

ساری جرأتیں نچوڑ لیتی ہیں۔ یہ آدمی کو کہیں کا بھی نہیں رہنے دیتیں۔ الو کا پٹھا۔ کیسی تڑاتڑ بکواس کرتا رہتا تھا وہ میرے سامنے۔
وہ یہ سارے پینترے دراصل میرے اور ماجدہ کے درمیان دیوار کھڑی کرنے کے لیے بدلتا تھا۔ نیت اس کی اپنی خراب تھی اور اس ماجدہ کو بھی تو کوئی دیکھے، وہ بھی چپ چاپ اس کے بھرّے میں آ گئی۔ وہ لفنگی عورت اندر ہی اندر چلتی ہوئی وہ آپی کے دل میں جا اتری تھی۔ اس لمحے مجھے آپی کی سخت ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ مگر اب میں بالکل تنہا رہ گیا تھا۔ اس پر بھی میں اپنے وجود کی ساری نفرت ایک نکتے پر مرکوز کر کے بادامی باغ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کافی پیدل چلنے کے بعد میں جی ٹی روڈ پر جا پہنچا۔ وہ سڑک اسٹیشن سے واہگہ کی طرف جاتی تھی۔ اس وقت رات کا ڈیڑھ بج چکا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس وقت پولیس کی گشت میں کمی آ جاتی ہے۔ وہ ایسا ٹھنڈا میٹھا سبک رفتار پہر ہوتا ہے کہ چوروں ڈاکوؤں اور اندھیرے کے دوسرے مسافروں کا سفر اس کے تاریک و دبیز پردوں میں اور زیادہ آسان اور تیز ہو جاتا ہے۔
مجھے کسی سواری کی تلاش تھی مگر دور دور تک مجھے کوئی ٹیکسی تانگہ آتا دکھائی نہیں دیتا تھا اور وقت تیزی سے گزرتا جا رہا تھا۔ میرے ذہن میں مجیدن کا وہ بھولا بھالا سا چہرہ بار بار ابھرتا تھا۔ اسے بھی میری ہی وجہ سے وہ روز بد دیکھنا پڑا تھا۔ اگر اس کی عصمت کا گوہر آبدار کہیں لٹ گیا تو اس کی بھی تمام تر ذمے داری مجھ پر ہی عائد ہوتی تھی اور میں اس گھڑی جو یوں جنون و وارفتگی کے عالم میں سڑک پر جا نکلا تھا۔ تو میرے پیش نظر یہی مقصد تھا کہ جس طرح بھی ہو سکے میں اس عفیفہ کو اس آہو کے چنگل سے چھڑا لوں۔ یہی میری آرزو تھی اور خدا کے حضور اس لمحے میرے دل سے یہی دعا نکلتی تھی کہ... جس طرح بھی ہو سکے، اس نحیف و نزار، بے بس اور نادار لڑکی کو وہ اپنی امان میں رکھے۔ اور اسے کسی موری کی اینٹ بننے سے بچا لے، کہ وہاں جو اینٹ لگ جاتی ہے، وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غلاظت کی زد میں رہتی ہے۔ پھر اسے کوئی بھی یاد نہیں رکھتا۔ بستیاں تباہ ہو جائیں غلاظت... کا گزر اس موری میں سے ناممکن ہو جائے جب جا کر کہیں وہ اینٹ اس ذلت سے محفوظ ہوتی ہے مگر ایسا دن کہاں آتا ہے۔ ایسے شہر کہاں ہوتے ہیں جو اس لیے تباہ ہو جاتے ہیں کہ... وہاں ظلم اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ اب تو ایسی بستیاں اور زیادہ پھیلتی ہیں اور زیادہ برگ و بار لاتی ہیں جہاں کنواریوں کی عصمتوں کا خون بے تحاشا اور بے دریغ بہایا جاتا ہے۔ ایسے میں فطرت کی قہرمان قوتیں کہاں جا سوتی ہیں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا اور اسباب ان ویرانیوں اور ذلتوں کے آہو جیسوں کے نامۂ اعمال میں ہی تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ مگر ایسا کون ہے جو خود آگے بڑھ کر ایسے لوگوں کے قدم کاٹ سکے۔
بے بسی، ذلت اور لاچارگی کے احساس نے انسانوں کو یوں نڈھال کر رکھا ہے کہ وہ ہر ظلم، ہر تعدی پر صبر کر لیتے ہیں۔
میں بڑی سڑک پر کسی سواری کی تلاش میں پاگلوں کی طرح آگے بڑھ رہا تھا۔ اور میرے ذہن میں بگولے اڑ رہے تھے۔ میرا بس نہیں چلتا تھا ورنہ میں سارے شہر کو جلا کر راکھ کر دیتا کہ اس شہر میں ایسی سنگین عمارت تھی، ایک محبس تھا جس نے میری زندگی کے چند نہایت ہی خوبصورت دن نگل لیے تھے اور جس نے میری چاندی ایسے بدن والی بہن کو برباد کر دیا تھا اور جس کے کسی خانۂ تاریک میں اس گھڑی مجیدن بھی پور پور کٹ رہی ہو گی۔
کوئی فرلانگ بھر پیدل چلنے کے بعد میں ایک کھمبے کے نیچے رک گیا۔ وہ کھمبا ایک پیٹرول پمپ کے بالکل سامنے تھا اور اس گھڑی بالکل ویران پڑا تھا۔ اس کے شیشے کے کیبن میں بتی جل رہی تھی اور ایک نوجوان آدمی سامنے کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ میں اس انتظار میں وہاں جا ٹھہرا کہ اگر کوئی گاڑی وہاں پیٹرول لینے کے لیے رکی تو میں سوار ہو جاؤں گا۔
میں نے پیٹرول پمپ کے احاطے کا اچھی طرح جائزہ لیا تو مجھے کیبن کے دائیں ہاتھ تاریکی میں ایک سکوٹر کھڑا نظر آیا۔ وہ غالباً اس نوجوان کا تھا جو کیبن کے اندر بیٹھا تھا۔ میری تمام تر توجہ اس کی طرف مرکوز ہو کر رہ گئی۔ پندرہ بیس منٹ گزر گئے۔ مگر ادھر سے کوئی گاڑی نہ گزری۔ سڑک پر ہو کا سا عالم طاری تھا۔
ہر طرف سے میں مایوس ہو کر آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کیبن تک جا پہنچا۔ اسکوٹر کو میں اچھی طرح دیکھ چکا تھا۔ وہ بالکل نیا نظر آتا تھا۔ یا تو اس کی دیکھ بھال اچھی طرح کی گئی تھی یا پھر اسے خریدے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ اور میرے لیے وہ اس وقت جیٹ طیارے سے بھی زیادہ قیمتی تھا۔ کیونکہ گھڑی کی سوئیاں تیزی سے آگے بڑھ رہی تھیں اور مجھے بہر حال جلد از جلد آہو کے گھر تک پہنچنا تھا۔
مجیدن پر ہاتھ ڈال کر اس نے میرے سارے زخم ہرے کر دیے تھے۔ اس نے میری بے خبری سے فائدہ اٹھا کر مسند آرا کے باپ کو میرے ہاتھوں سے قتل کروا دیا تھا۔ اور یہی ایک چوٹ ایسی تھی جو رہ رہ کر مجھے خون کے آنسو رلاتی تھی۔ میں سوچتا تھا کہ اگر کسی دن مسند آرا کو معلوم ہو گیا کہ اس کے باپ کا اصل قاتل میں ہوں تو پھر کیا ہو گا۔ وہ معصوم سی بھولی بھالی لڑکی جس نے میرا بت تراش کر اس کی دن رات پرستش کی تھی مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے متنفر ہو جائے گی۔ اور یہ سب کچھ محض اس لیے ہوا کہ اس سارے شیطانی منصوبے کا مصنف آہو تھا جس نے ایک تیر سے دو شکار مارے تھے۔
میرے پاؤں کی آہٹ سن کر کیبن کے اندر بیٹھا نوجوان سنبھل کر

بیٹھ گیا۔ وہ مجھے گہری گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اندر اس نے بجلی کا ہیٹر جلا رکھا تھا۔

میں نے شیشے پر دستک دے کر کہا۔ "پینے کے لیے کچھ پانی مل سکے گا میاں جی!"

اس نے میری آواز سن لی، بڑے رُوکھے لہجے میں بولا۔

"پانی نہیں ہے یہاں۔ کہیں اور سے پیو جا کر۔"

معلوم یہ ہوا کہ وہ میرے لیے کیبن کا دروازہ کھولنے پر آمادہ نہیں تھا۔ کیونکہ اُسے مجھ پر اعتماد نہیں تھا۔ میرا حال یہ تھا کہ میرے بال بکھرے ہوئے تھے۔ ان میں ایک عرصے سے میں نے تیل نہیں ڈالا تھا۔ کبھی شاید کنگھی بھی نہیں کی تھی۔ اگرچہ میں کمبل میں لپٹا ہوا تھا مگر میرے کپڑوں کا میل صاف نظر آتا تھا۔ میں سیلانی آدمی بھلا اپنے وجود کی اور اپنی شخصیت کی نوک پلک سنوارنے کے لیے اتنا وقت اور اتنی فرصت کہاں سے لاتا۔ میں تو کُتّے کی طرح تُور تُور پھر رہا تھا۔ مجھے اتنی توفیق کہاں تھی کہ میں اپنے حلیے کی تراش خراش کی طرف توجہ دے سکتا۔

اس کی یہ بات سُن کر میں نے اب کی بار زیادہ زور سے دستک دی تو وہ آدمی گھبرا کر اپنی جگہ سے اُٹھ گیا۔

اُٹھتے وقت اس کا ہاتھ میز کی دراز سے باہر آیا تو میں نے دیکھا کہ اُس نے مجھ سے نپٹنے کے لیے پستول نکال لیا تھا۔ وہ مجھے پٹرول پمپ لُوٹنے والا کوئی راہزن سمجھ رہا تھا، چیخ کر بولا، "چلے جاؤ یہاں سے ورنہ میں تمھیں گولی مار دوں گا۔"

"بھائی ناراض کیوں ہوتے ہو۔ میں تو نہتّا آدمی ہوں۔ ذرا دیر کے لیے دروازہ تو کھول دو۔" میں نے اب کی بار اور زیادہ ملائم لہجے میں کہا اور دونوں ہاتھ کہنیوں سے اوپر اُٹھا لیے جیسے میں کان پکڑ کر توبہ کر رہا تھا۔

اُسے اپنے آپ پر، اپنے پستول پر بہت بھروسہ تھا پھر بھی وہ دروازہ نہیں کھول رہا تھا۔ اندر سے چٹخنی لگا کر بیٹھا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس کے اسکوٹر میں تالہ لگا ہوگا۔ میں اس سے چابی طلب کرنا چاہتا تھا، زور، زاری اور جس طریقے سے بھی ہو سکتا، میں اس سے اسکوٹر لے لینا چاہتا تھا۔ اس نے میرا راستہ مسدود کر رکھا تھا۔

میری منّت کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا تو میں نے جیب سے دس ہزار روپے کی ایک گڈّی نکال کر اسے دکھائی۔

"یہ دس ہزار روپیہ ہے یہ لے لو اور اپنا یہ اسکوٹر مجھے دیدو۔"

میری یہ بات سنتے ہی وہ آگ بگولہ ہو گیا اور بڑے غصّے سے کیبن کا دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ اس کا چہرہ آگ کی طرح سُرخ ہو گیا تھا، آتے ہی بولا۔

"دفع ہوتے ہو یہاں سے کہ نہیں، جاؤ۔ پتہ نہیں کہاں سے چور ڈاکو آ جاتے ہیں آدھی رات کو اسکوٹر خریدنے ہیں۔ میں کوئی دکان کھول کر بیٹھا ہوں اسکوٹروں کی، چل بھاگ یہاں سے۔"

یُوں معلوم ہوتا تھا جیسے اُسے میری صورت سے گھن محسوس ہوتی تھی۔ وہ میری کوئی بھی بات سننے پر آمادہ نہیں تھا۔

"ناراض نہ ہو میرے بھائی! یہ دس ہزار روپے امانت کے طور پر رکھ لو۔ میں اسکوٹر تمھیں صبح واپس کر دوں گا۔ میری بہن اُدھر شاہدرہ میں سخت بیمار ہے اور مجھے کوئی سواری نہیں مل رہی ہے۔" میں نے اسے سمجھانے کی ایک اور کوشش کی میری اس درخواست کا بھی اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ اور تنپ کر بولا۔

"میں کہتا ہوں دفع ہو جاؤ یہاں سے ورنہ اچھا نہ ہوگا۔" اس کے لہجے کی گھن گرج پر میں تلملا کر رہ گیا۔ اپنے ہاتھ میں نے اس وقت تک کمبل میں چھپا کر پستول سیدھے ہاتھ میں تھام لیا تھا۔ وہ کسی طرح بھی راہِ راست پر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے کمبل کے اندر ہی اندر اس کے آگے بڑھے ہاتھ کو تاک کر اپنے چیپ شاہ سے اس کی مٹھی داغ دی۔ میرا وار خالی نہیں گیا۔ کمبل میں سوراخ تو ہو گیا مگر میرا کام آسان ہو چکا تھا۔ اس کا ہاتھ زخمی ہوا تو پستول اس کی گرفت سے نکل کر نیچے گر گیا۔ اس نے درد سے نڈھال ہو کر بائیں ہاتھ سے اپنی کلائی دبائی اور اپنا پستول اُٹھانے کے لیے وہ نیچے جھکا تو میں نے اسے بالوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا اور اٹھا کر دُوسری طرف ڈال دیا۔ وہ نیچے گرا تو اپنا پستول میں نے اسکی پسلی سے لگا دیا۔

"اسکوٹر کی چابی، گاڑی کے کاغذات اور پانچ ہزار کی رسید مجھے دے دو، ورنہ اچھا نہ ہوگا۔"

"وہ سب کچھ اُدھر دراز میں پڑا ہے۔ لے لو اور یہاں سے دفع ہو جاؤ۔"

"تمھاری بڑی مہربانی ہے میرے بھائی۔ یہ پانچ ہزار روپیہ میں دراز میں رکھے جاتا ہوں۔ اسکوٹر سمجھ لو میں تم سے امانتاً لے رہا ہوں۔ اسے واپس کر کے میں اپنی رقم لے جاؤں گا۔ دکھاؤ تو اپنا ہاتھ۔" یہ کہہ کر میں نے اس کی کلائی پکڑ کر زخم کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ گولی اس کی جلد کو چاٹتی ہوئی نکل گئی تھی۔ اس طرح کہ ہتھیلی پور زخمی ہو گئی تھی مگر ہڈّی محفوظ رہی تھی۔

"یہ زخم جلدی بھر جائے گا اس کا مجھے بے حد افسوس ہے مگر میری ضرورت بڑی شدید ہے۔" یہ کہہ کر میں نے اسے زمین پر سے اُٹھایا اور کیبن کے اندر لے جا کر کرسی پر بٹھا دیا۔ اس نے بڑی ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بائیں ہاتھ سے دراز کھولی اور اس میں سے مجھے اسکوٹر کی چابی نکال کر دیتے ہوئے بولا۔

"یہ مہربانی مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔ تم ایسا ڈاکو میں نے آج تک نہیں دیکھا۔"

"میں ڈاکو نہیں ہوں برادر! شریف آدمی ہوں۔ میری ضرورت نے مجھے مار ڈالا ہے۔"

یہ کہہ کر میں نے پانچ ہزار روپے اُس کے سامنے رکھے اور کیبن سے باہر نکل کر اسکوٹر کا تالہ کھول دیا۔ جب میں اسکوٹر پر سوار ہو کر پٹرول پمپ کے احاطے سے نکلا تو اس وقت وہ نوجوان کیبن کے دروازے میں کھڑا نوٹ گن رہا تھا۔ سخت قسم کی کاروباری ذہنیت کا حامل وہ نوجوان یہ دیکھ رہا تھا کہ کہیں میں اسے جعلی یا کم نوٹ تو نہیں دے گیا۔ وہ بھول ہی گیا تھا کہ میں نے اس کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ حیرت مجھے یہ تھی کہ اس کے ہاتھ کے زخم سے خون کچھ اتنا زیادہ نہیں بہہ رہا تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ اس کے ہاتھ کی وہ خاص نس نہیں کٹی تھی۔ جو ہاتھ تک خون کی ترسیل میں کام آتی ہے۔

میں اسکوٹر بھگاتا ہوا شاہجہاں کی دایہ انگا کے مقبرے کے سامنے سے گزرا تو مجھے وہاں دائیں ہاتھ پولیس کے چند سپاہی نظر آئے اُن کا رُخ اُدھر سُلطان پورہ کی طرف تھا۔ وہ انجینیرنگ یونیورسٹی کے احاطے کے گرد لمبا چکر کاٹ کر اُدھر جانے کے بجائے درمیانی راستے پر چل رہے تھے۔ اور دایہ انگا اپنے مقبرے کے اندر مٹی میں مل کر مٹی ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے ایک شہنشاہ کو دُودھ پلایا تھا اور شہنشاہ نے اس کے مرنے کے بعد اس کی میّت کو مٹی میں اتار کر اُس پر ایک خوبصورت مقبرہ تعمیر کروا دیا۔ اب وہ خاتون جو بقول کسے رشکِ جناں مہتاب تھی اِک دن، شاہوں کا جو خواب تھی اِک دن، اب مشتِ خاک بن کر معدوم ہو چکی تھی۔ میری بھی آخری منزل وہی تھی۔ مگر مجھے معلوم تھا کہ میری قبر پر۔ تو کوئی فاتحہ پڑھنے کے لیے بھی نہیں رُکے گا۔ پتہ نہیں کس لمحے کے کس حصے میں کہاں میں جان دے دوں۔ کس ویرانے کی مٹی کا حصّہ بنوں۔ موت کا خیال میرے ذہن میں اُبھرا تو مجھے جھرجھری سی آ گئی۔ میں نے اسکوٹر کی رفتار اور تیز کر دی، اور پھر دائیں ہاتھ مُڑ کر چمڑہ منڈی کے سامنے سے گزر کر دو موریا پل عبور کر گیا۔

اب میرا رُخ سیدھا بادامی باغ کی طرف تھا۔ اور وقت تیزی سے گزرتا جا رہا تھا۔ ڈر مجھے یہ تھا کہ اگر مجھے آہو تک پہنچتے پہنچتے سپیدۂ سحری نے آ گھیرا تو پھر کیا ہوگا۔

جب میں نے آہو کے مکان کے پچھلے حصے میں جا کر اسکوٹر بند کیا تو اس وقت رات کے دو بج رہے تھے۔ چاروں اور گمبھیر سنّاٹا طاری تھا۔ اور فوری طور پر مجھے نہیں معلوم تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میں مکان کے پچھلے حصّے کی قدِ آدم دیوار پر چڑھ کر لان میں کُود گیا۔

آہو کے گھر کے اندرُونی صحن میں بتی جل رہی تھی اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس وقت گھر میں کون کون لوگ موجود ہیں۔ میں نے چھوٹا گیٹ کھول کر اسکوٹر لان میں کھڑا کر کے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔

میرے لیے آسان ترین راستہ یہ تھا کہ میں آہو کے اُس مہمان خانے کے عقبی دروازے پر دستک دیتا جس میں وہ مجھے ٹھہرایا کرتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہاں اُس وقت کوئی نہ کوئی آدمی ضرور موجود ہوگا۔ آہو کے اکثر مہمان میرے ایسے لوگ ہی ہوتے ہیں اور وہ ان کو وہیں سلایا کرتا ہے۔

یہ خیال میرے ذہن میں آتے ہی میں دبے پاؤں آگے بڑھا اور اس کمرے کے عقبی دروازے کے ساتھ کان لگائے تو مجھے زوردار قسم کے خرّاٹوں کی آواز سُنائی دی۔ خرّاٹے کسی ایک ہی آدمی کی تصنیف معلوم ہوتے تھے۔ کیونکہ اُن کا سُرتال ایک ہی جیسا تھا۔ چند لمحوں تک میں وہاں دم سادھ کر کھڑا رہا اور پھر میں نے چوروں ایسی احتیاط سے دروازے پر دستک دی۔ بڑی نرم، بڑی مدھم اور بڑی ہی غیر محسوس دستک تھی وہ۔

پہلی دستک ناکام رہی تو میں نے دُوسری بار دبا کر دروازے کو آگے پیچھے اس طرح دھکیلا کہ اندر کا آدمی شور سُن کر بیدار ہو گیا۔ چند ہی لمحوں بعد کمرے کی بتّی روشن ہو گئی۔ اب مجھے کسی کے قدموں کی چاپ سُنائی دے رہی تھی۔ اُس نے دبی آواز میں پُوچھا۔ "کون ہے؟"

یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ آدمی بھی کسی کا انتظار کرتے کرتے تھک ہار کر سو گیا تھا اور اب اس دستک پر اس کی اُمیدیں جاگ اُٹھی تھیں۔ میں نے فوراً ہی اپنی آواز بدلی اور اپنے لہجے میں مقدور بھر نسائیت بھر کر کہا۔ "میں ہوں جی، دروازہ تو کھولیں۔"

"اوہ اچھا! تو اب بھیجا ہے تمھیں کبری نے۔"

"ٹھہرو، ذرا پہلے میں بتّی بجھا لُوں۔" یہ کہہ کر اس آدمی نے کمرے کی بتّی گل کر دی۔ وہ ایک دم خوش ہو گیا تھا۔ اس کے بھاری بھرکم لہجے میں ترنگ بھر گئی تھی۔ اُس نے بڑی آہستگی سے چٹخنی نیچے کی اور پھر نہایت احتیاط سے دروازہ کھولا۔ میں دائیں ہاتھ کھڑا تھا۔ دیوار سے لگ کر۔ تاریکی میں اسے اپنے سامنے کچھ نظر نہ آیا تو سرگوشی کے انداز میں بولا۔ "کہاں ہو میری جان! کل بھی تم نے ساری رات انتظار کرایا۔ حالانکہ میں نے رقم تمھیں بھیج دی تھی۔" یہ کہہ کر وہ دروازے سے باہر نکل آیا۔ تو میں نے اپنے چیپ شاہ کی نالی اس کی پسلی سے لگا دی۔

"میں تمھاری جان نہیں بیٹے جانا ہوں جانا۔ منہ سے آواز نکالی تو گولی آر پار کر دوں گا۔ چل اندر۔" یہ کہہ کر میں نے اسے دروازے

کی طرف دھکیل دیا۔ وہ بدک کر یوں دروازے میں گھسا جیسے اس نے اپنے سامنے کوئی آٹھ پاؤں کی چڑیل دیکھ لی ہو۔ حالانکہ میں نہ مؤنث تھا، نہ مخنث، پھر بھی مجھے یہی تشبیہ سوجھ رہی تھی۔

میں نے اسے کمرے میں لے جا کر بائیں ہاتھ سے دروازہ بند کیا۔ اور پھر سوئچ دبا کر بتی جلا دی۔ وہ ادھیڑ عمر کا خاصا صحتمند آدمی تھا۔ اس کا رنگ سرخ و سفید تھا البتہ مونچھوں اور سر کے بال کھچڑی ہو رہے تھے۔ وہ مجھے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ہاتھ اس نے لاشعوری طور پر بن کہے اوپر اٹھا لیے تھے۔ بوسکی کے کرتے کے نیچے اس کی ذرا سی آگے کو بڑھی توند اس کے تموّل کی مظہر تھی۔ اس نے کلائی پر خوبصورت سی سنہرے رنگ کی گھڑی باندھ رکھی تھی۔ تہمد بھی اس نے بوسکی کا باندھ رکھا تھا جس میں اس کی بھری بھری تنومند رانیں پھنسی پھنسی سی دکھائی دیتی تھیں۔

"چل ادھر پلنگ پر بیٹھ جا پہلوان کیا نام ہے تیرا۔"

"میرا نام چوہدری منظور حسین ہے مگر۔۔۔ مگر تم کون ہو؟"

وہ پیچھے ہٹ کر پلنگ پر یوں بیٹھا کہ اس کے دل کا خوف اور نمایاں ہو گیا۔

"وہ کبری کہاں ہے؟"

"وہ اپنے کمرے میں ہو گا۔ کیا کام ہے تمھیں اس سے؟" اب کی بار اس نے ذرا دل جمعی سے بات کی۔

"میرے ساتھ چلو اور اسے جگاؤ۔ مگر نہیں، تم ادھر آؤ میرے پاس اٹھو۔" میں نے پستول اس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔ وہ کوک بھرے کھلونے کی طرح اٹھا۔ اور دھپ دھپ چلتا ہوا میرے سامنے آ ٹھہرا۔ اس کے چہرے پر زردی غالب آ رہی تھی۔

"ادھر منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔ اور آنکھیں بند کر لو۔" اس نے میرے حکم کی تعمیل کی تو میں نے بائیں ہاتھ سے اس کی گردن پکڑ کر اس کی رگ مسل دی۔ اس نے گھبرا کر میری گرفت سے نکلنا چاہا۔ تو میں سمجھا کہ وہ خاصا تنومند آدمی ہے مجھے دوہری توانائی صرف کرنی ہو گی۔ میں نے پستول کا دستہ اس کی کھوپڑی میں مارا اور اس کی رگیں اور زور سے دبائیں نتیجہ خاطر خواہ نکلا اور وہ دھپ کر کے قالین پر گر گیا۔ اس کام سے فارغ ہوتے ہی میں نے بتی بجھائی اور دوسرا دروازہ بے آواز کھول کر صحن میں جا نکلا۔ میں اس مکان میں داخل تو ہو گیا تھا مگر سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ میں دوسری منزل میں آہو کی خوابگاہ تک کس طرح پہنچوں سب سے پہلے مجھے اس سے صرف یہ معلوم کرنا تھا کہ مجیدن کہاں ہے اور کس حال میں ہے، تاکہ میں اس کی مدد کو پہنچوں۔ دوسری منزل کی سیڑھیوں کا دروازہ اندر سے بند تھا اور اس کو کھلوا لینا کسی بھی طرح ممکن نہیں تھا۔ اگر میں پائپ کے ذریعے دوسری منزل پر پہنچتا، تو یہ بات ممکن تو تھی مگر پھر دہی مشکل سدِ راہ بنتی تھی۔ آہو کبھی بھی میری دستک پر اپنی خوابگاہ کا دروازہ ہرگز نہ کھولتا۔ میں اپنی آواز بدل لینے میں کامیاب بھی ہو جاتا تو بھی وہ ایسا شاطر آدمی تھا، کہ صورت حال کو فوراً سمجھ جاتا۔ اسے رات کے اس لمحے میں بھی زیر کر لینا بہت مشکل تھا اور مجھے اپنے مقصد میں کامیابی کی امید معدوم نظر آنے لگی تھی۔

مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے اس چوہدری منظور حسین کو بیہوش کر کے سخت غلطی کی ہے اس کے ذریعے میں آہو کا دروازہ کھلوا سکتا تھا۔ یہ بات قطعاً مشکل نہیں تھی۔ آہو اپنی خوابگاہ سے نکل آتا تو پھر سارا معاملہ ہی آسان ہو جاتا۔ میں نے چاہا کہ منظور حسین کو ہوش میں لے آؤں مگر پھر میں نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔

مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ باٹی اور کبری مہمان خانے کے ساتھ والے کمروں میں سوتے ہیں مگر یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ کبری کس کمرے میں ہے اور باٹی کس حجرے میں۔ منظور نے بتایا تھا کہ وہ اپنے کمرے میں ہے۔

عین اس وقت سامنے کے کمرے کی بتی جلی۔ میں دبے پاؤں چلتا ہوا مہمان خانے کے دروازے کی اوٹ میں جا ٹھہرا۔ وہاں سے میں سارے صحن پر نظر ڈال سکتا تھا۔ چند ہی لمحوں بعد اس کمرے کا دروازہ کھلا اور کبری کمبل کی بکل مار کر غسل خانے کی طرف بڑھا۔ میری جان میں جان آنے لگی۔ میرا کام آسان ہو گیا تھا۔ کبری اس وقت پیشاب کے لیے باہر نکلا تھا۔ فارغ ہو کر باہر نکلا تو میں نے اپنے چپ شاہ کی نال اس کی گدی پر رکھ دی۔ وہ ایک دم پلٹا اور مجھے دیکھتے ہی اس کا منہ حیرت کے مارے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اور پتلیاں پھیلنے لگیں۔

"کیا کہتے ہو اب! کیا چاہتے ہو مجھ سے؟" اس نے بڑی مشکل سے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"اپنے کمرے میں چل، وہیں بات ہو گی۔ تجھ سے تو لمبا چوڑا حساب لینا ہے مجھے۔" یہ کہہ کر میں اسے گردن سے پکڑ کر دھکیلتا ہوا اس کے کمرے میں لے گیا۔

"بیٹھ جا ادھر پلنگ پر۔ میں تجھے زیادہ تکلیف نہیں دوں گا۔" یہ کہکر میں نے اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے بائیں ہاتھ سے چٹخنی چڑھا دی۔ وہ بڑے محتاط انداز سے مجھے خالی خالی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں اس کے سامنے کرسی پر بیٹھا تو وہ مسکرا دیا، بولا۔

"یہ اس وقت تمھاری تشریف آوری کیسے ہوئی ہے اوستاد؟ پھر کوئی مصیبت کھڑی کرے گا تو ادھر۔"

"آہو سے میری ملاقات کرا۔ ابھی اور اسی وقت۔"

"بہت مشکل ہے اوستاد! صاب اس وقت میٹنگ میں ہے۔" اس نے صورتِ حال کی نزاکت کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ پھر میز پر سے گولڈ لیف کا پیکٹ مجھے دیتے ہوئے بولا۔ "لے یہ سگریٹ پی اور اپنے چہرے سے یہ نحوست اتار دے۔ ذرا کھل کر بیٹھ اور ہنس کر۔

بات کر، تو جو کہے گا، میں کروں گا۔ پہلے ہی مجھ سے زبردست غلطی ہو چکی ہے۔ میں یار مار تو نہیں تھا پر اس ہرن صاب کے جھانسے میں آگیا تھا۔ ورنہ تیرا میں اب بھی ہاتھ بندھا غلام ہوں۔ یے سگریٹ لی اور اس غریب خانے کو اپنا ہی گھر سمجھ۔ لے پکڑ۔" یہ کہہ کر اس نے ایک سگریٹ میرے ہونٹوں میں پھنسا کر اسے سلگا دیا۔ اب وہ پہلے ایسا خوفزدہ نظر نہیں آتا تھا۔ اس کے چہرے کی بشاشت لوٹ آئی تھی۔ میں نے سگریٹ کا کش لگایا تو اس نے اپنی قمیص دونوں ہاتھوں سے اوپر اٹھا کر اپنا سینہ مجھے دکھایا۔ کوئی ڈھائی انچ لمبا چیرا تھا۔ تیسری اور چوتھی پسلی کے درمیان، بولا۔

"یہ زخم تو دیکھ ہی لینا چاہیے تجھے۔ زندگی تھی تو بچ گیا ورنہ تیرا وار تو کبھی خالی نہیں گیا۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی قمیص نیچے ڈال دی۔

"تو اس سے زیادہ بڑے زخم کا مستحق تھا بیٹے! میرا ہاتھ ہل گیا تھا ورنہ تیرے تو باجے بج گئے ہوتے اسی روز۔"

"تو ٹھیک کہتا ہے اوستاد! میں بھی کوئی بدنسل قسم کا آدمی ثابت ہوا ہوں۔ اس آہو نے مجھے غلط راستے پر لگا دیا تھا۔ خدا بیڑہ غرق کرے اس کا۔"

"اور تمہارا بھی... اپنے لیے بھی تو یہی دعا مانگو۔"

"وہ تو میں مانگتا ہی رہتا ہوں پر اوستاد یہ بتا اس وقت تو نے یہ زحمت کیوں اٹھائی ہے مجھے بلوا لیا ہوتا۔"

"ہٹ تیری... سالے۔ مجھ سے تو تُو یوں بات کرتا ہے جیسے تیری بہن کا خصم سامنے بیٹھا ہے۔ میں تو تجھ سے حساب کتاب کرنے آیا ہوں۔"

"نہیں اوستاد! میں نہیں مانتا۔ تو اتنا نیچے نہیں گر سکتا۔ بات کوئی اور ہی ہے حساب تو تو نے برابر کر لیا تھا اب بتا تو کس لیے آیا ہے۔ آہو کو مارنا چاہتا ہے؟"

"پتہ نہیں میں کیا کر دوں! بہتر ہے کہ تو اسے ابھی باہر نکال کر میرے سامنے لے آ۔"

"میں بتا چکا ہوں اوستاد کہ صاب اس وقت میٹنگ میں ہے" وہ ایک آنکھ دبا کر مسکرایا۔ میرے پستول سے وہ بالکل خوفزدہ نہیں تھا۔

"میٹنگ، میٹنگ! کیا کہہ رہا ہے تو، کوئی دفتر کھول رکھا ہے اس نے اوپر؟"

"بات کچھ ایسی ہی ہے۔ اس کی بیوی اس سے ملنے کے لیے اس کے کمرے میں گئی ہوئی ہے۔"

"اچھا؟ اب سمجھا! یہ ساتھ کے کمرے میں کون سویا ہوا ہے؟"

"اسے تو اچھی طرح سُلا آیا ہو گا۔ میں جانتا ہوں تیرے نسخہ نمبر چار سو تیرہ کو۔ وہ اُدھر کھڑیانوالہ سے آیا ہے۔ یار ہے آہو صاب کا۔"

"اسے کسی کا انتظار تھا، کسی عورت کا؟"

"یہ بھی بتا دیا تجھے اس خرمغز نے۔ بہت ہی پھسڈی نکلا، یہ چیہدری بھی۔ کچھ موج میلا چاہتا تھا۔ میں نے بندوبست بھی کر دیا تھا، پر وہ سالی پہنچی ہی نہیں۔ رات بارہ بجے کا وعدہ تھا اس کا۔"

"پھر تو کیوں سو گیا اتنا بے فکر ہو کر؟"

"بس ایسے ہی یار — میں سمجھا وہ آ ہی جائے گی۔ تو نے تو دیکھا ہو گا اسے؟"

"نہیں۔ وہ اسی کے انتظار میں تھا۔ اور اسی کی امید پر اس نے دروازہ بھی کھول دیا تھا۔"

وہ پھر مسکرایا اور عجیب سے مسرور انداز سے سر کھجانے لگا۔ اس کے چہرے سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ مجھ سے مل کر بے حد خوش ہو رہا ہے میری اس بے وقت آمد پر اسے ذرا بھی پریشانی نہیں ہوئی تھی بلکہ وہ اندر ہی اندر کھلکھلا کر ہنس رہا تھا اور اس کی یہ کیفیت میرے دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا کر رہی تھی۔ میں سوچتا تھا کہ کہیں اس نے میرے لیے کوئی جال تو نہیں بُن رکھا تھا جس کا حلقہ میرے گرد آہستہ آہستہ غیر مرئی طور پر تنگ کرتا جا رہا ہو۔

"تو نے بتایا نہیں اوستاد تو اس وقت آیا کس لیے ہے؟ یہ بڑی اہم بات ہے۔ میں تیرے کام آنا چاہتا ہوں۔"

"تو یہ بتا کبری کہ وہ مجیدن کہاں ہے؟"

"اچھا! تو یہ قصہ ہے — دیکھ اوستاد! میں تجھے ساری بات بتا دوں گا۔ افسوس مجھے بھی بہت ہے مگر اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔"

"مجھے یہ بتا کہ وہ بدنصیب اس وقت کہاں ہے؟ اس پہ کس نے ہاتھ ڈالا تھا؟"

"بات یہ ہوتی تھی اوستاد کہ جب میرے زخمی ہونے کے بعد پولیس تجھے نہ پکڑ سکی اور تو اس بھتی کی چھت پر سے کود کر دوسری طرف نکل گیا تو آہو بہت زیادہ طیش میں آ گیا۔ اس نے پہلے تو مجیدن کی ماں کو ادھر تین دن تک حوالات میں سڑایا مگر جب اس نے کچھ بھی نہ بتایا اور آں باں شاں کر کے رہ گئی تو آہو نے اسے وہاں سے رہا کروا دیا۔ بھتی بھی ایک مصیبت ہے۔ اس نے یہ کیا کہ وہ سیدھی چوہدری شاکر علی کے پاس جا پہنچی۔ وہ حکومت کی مخالف پارٹی کا آدمی ہے اس نے بھتی کی ساری کہانی اگلے روز اخبار میں چھپوا دی۔ بس سارا معاملہ یہاں سے خراب ہوا۔ شاکر علی کو آہو کے کہنے پر تیسرے دن ایک آدمی کے قتل کے الزام میں جیل بھجوا دیا گیا۔ بھتی کا کوئی حامی نہیں رہا تھا۔ آہو نے اپنے ایک غنڈے شرفو کے ذریعے اس کی بیٹی مجیدن کو اس کے گھر سے اٹھوا دیا۔ تین دن تک تو وہ مجیدن سے اپنا محنتانہ وصول کرتا رہا۔ پھر اس نے چوتھے روز اسے شاہی محلے کے ایک چوہدری کے پاس سات ہزار روپے میں بیچ دیا۔ وہ بچاری جب سے اب تک وہیں ہے۔"

"یہ شرفو کون ہے؟"

"یہ اُدھر چونا منڈی میں رہتا ہے۔ بہت چھٹا ہوا بدمعاش ہے۔ آہو کا خاص آدمی ہے اور بڑا جتھا بنا رکھا ہے۔ تھانے کی پولیس بھی اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتی ہے۔"

"اس چوہدری کا کیا نام ہے جس نے مجیدن کو خریدا ہے۔"

"اس کا نام بندو خان ہے۔ کرنال سے آیا ہے پر ہے بڑی ہی پلید چیز وہ۔" کبری نے مجھے ساری صورت سمجھا دی۔

"تجھے اس کارروائی کا علم کب ہوا؟"

"مجھے یہ ساری باتیں ایک دن آہو نے خود ہی بتا دی تھیں۔ ترنگ میں بیٹھا تھا۔ میں نے کہا جناب! یہاں اپنے غلام جیلانی کی ایک منہ بولی بہن بھی رہتی ہے مجیدن! بس اس کا نام سنتے ہی وہ ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسنے لگا اور پھر اس نے وہ سب کچھ مجھے بتا دیا جو اس نے بھتی سے انتقام لینے کے لیے کیا تھا۔ وہ تو بچاری تباہ ہو کر رہ گئی ہے اوستاد! میرا دل بہت کڑھتا ہے اس کی حالت پر۔ مگر میں کچھ بھی تو نہیں کر سکتا۔"

"آہو نے یہ کام تجھ سے کیوں نہیں لیا؟"

"میں... مجھے در اصل اس نے وہ کیا ہوتا ہے انگریزی میں، ہاں، ڈس کوالیفائیڈ کر دیا ہے۔ ایک دم کنڈم سمجھتا ہے وہ مجھے۔ کیونکہ اس دن میں تیرے معاملے میں ناکام رہ گیا تھا، بس اس دن سے تو وہ مجھے بہت ذلیل کرتا ہے۔ "آپا جی" کہہ کر بلاتا ہے وہ مجھے۔ کبھی وہ سالا کہتا ہے "پھوپھی کبریا" ادھر آنا ذرا۔ بڑی گندی چیز ہے اوستاد یہ آہو۔ اسے تو تر نوالہ سمجھتا ہے؟"

"تجھے پتہ ہے میں ایک دن پہلے بھی یہاں آیا تھا؟"

"وہ تو مجھے سب پتہ چل گیا تھا۔ اسی لیے تو میں تجھے اپنا پیر و مرشد سمجھتا ہوں۔ اس روز بڑی ڈانگ ڈفلی بجائی اس آہو نے۔ اس کے بعد سارے شہر کی پولیس تیرے پیچھے لگا دی۔ اس کی قسمت اچھی تھی کہ پولیس کے سپاہی اس سے ملنے آ گئے تھے اس روز۔ ورنہ تو یہ بے موت مر گیا ہوتا۔ اچھی کوچی پھیری تھی تم نے ان دونوں میاں بیوی پر۔"

"بس بچ گیا یہ اس روز میرے ہاتھوں سے۔ ورنہ تو میں انھیں مار ہی دیتا۔"

"پر اوستاد! یہ سالا کہتا ہے کہ تم اس کے سیف سے دو لاکھ روپے بھی لے گئے تھے۔"

"میں تو اپنی ہی رقم لے کر گیا تھا، اس سے۔ باقی روپیہ کسی اور کے ہتھے چڑھ گیا ہو گا۔ پولیس والے بھی تو کچھ حق رکھتے۔ میں اس پر انھوں نے بوجھ ملکا کیا ہو گا اس کا۔"

"تمہارا اپنا کتنا روپیہ تھا اس کے پاس؟"

"یہی کوئی ایک لاکھ کے قریب تھا۔"

"اچھا تو یہ اسٹوری ہے در اصل۔ خدا تجھے حج نصیب کرے اوستاد! تو واقعی اللہ کا خاص بندہ ہے۔ بس افسوس یہ ہے کہ میرے لیے تیری ٹہنی پر کوئی پھل نہیں لگتا۔"

"کبری! یہ پستول دیکھ رہا ہے نا تو؟ مت سمجھ کہ میں تیری خیر خیریت پوچھنے آیا ہوں۔ تو مجھے اوپر لے چل۔"

"میں سب سمجھتا ہوں اوستاد! مگر تو اوپر جائے گا تو لفڑا ہو جائے گا بہت بڑا۔ آہو کے ہاں مہمان آئے ہوئے ہیں۔"

"کون سے مہمان؟"

"اس کا جو سسر تھا نا ہادی علی! اسے تو کسی مزارع نے قتل کر دیا تھا۔ اس کی پہلی بیوی کی بہن آئی ہے اپنے تین بیٹوں کے ساتھ۔ اور مسند آراء بھی تو ادھر ہی ہے۔"

"وہ... وہ بھی ادھر ہی ہے؟ کیا حال ہے اس کا؟ وہ تو باپ کی موت کے بعد بہت پریشان ہو گی۔"

"مت پوچھ اوستاد! وہ تو پہچانی نہیں جاتی۔"

"کیوں کیا ہوا اسے؟"

"پتہ نہیں! بس دن بدن نیچے ہی جا رہی ہے وہ۔ کہتے ہیں وہ ذہنی مریض بن گئی ہے۔ ذرا ہوش میں آتی ہے تو سارا گھر سر پر اٹھا لیتی ہے۔ ڈاکٹر اسے نیند اور سکون کے ٹیکے ہی لگاتا رہتا ہے مجھے تو بہت دکھ ہوتا ہے اس کی حالت دیکھ کر۔"

"مگر یہ سب کچھ ہوا کیسے؟"

"آہو نے مجھے بتایا تھا کہ باپ کے قتل کا صدمہ اسے لے بیٹھا ہے۔ اس سے آہو کو ہمدردی بھی بہت ہے حالانکہ وہ اس کی سگی سالی بھی نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ ہے کہ مسند آراء ہادی علی کی دوسری بیوی سے ہے اس بدنصیب نے خاوند کے قتل کے بعد ادھر کسی کنوئیں میں چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی۔ بس مسند آراء کو یہ دوہرا صدمہ برباد کر گیا ہے۔"

"ہوں۔ تو یہ بات ہے، آہو نے اپنا راستہ صاف کر ہی لیا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں اوستاد! آہو بچارا تو خود پریشان ہے، کئی بار تو بیٹھے بٹھائے رونے لگتا ہے میرے سامنے۔"

"تو نہیں سمجھ سکے گا اس بات کو کبری! تو ابھی بہت پیچھے ہے۔ تیری سمجھ میں یہ گورکھ دھندا نہیں آ سکتا ہے۔ یہ آہو نہیں مگر مچھ ہے مگر مچھ۔ اس کو زندہ چھوڑ کر میں نے اچھا نہیں کیا ہے کبری! مجھے اس کے پاس لے چل۔" وہ اٹھا اور دائیں ہاتھ کی الماری میں سے جزدان اٹھا کر میرے سامنے کرتا ہوا بولا۔

"دیکھ اوستاد! یہ۔۔۔ یہ قرآن ہے میرے ہاتھ پر۔۔۔ مجھے اس کی مار پڑے جو میں پھر کبھی تیرے خلاف کوئی حرکت کروں تو۔ اس پر تو اعتبار ہے نا تجھے۔ اس دو جہانوں کے بادشاہ کے کلام پہ؟"

"ہاں کیوں نہیں! مگر۔ مگر اسے کیوں اٹھا لیا ہے تو نے؟"

میں گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا، کیونکہ میں اپنے پلید اور گناہگار ہاتھ اس مقدس کتاب سے مس کر کے بے حرمتی کے خوف سے بری طرح لرز گیا تھا۔ کبری کے اپنے کپڑے اس وقت ناپاک تھے مگر پھر بھی اس نے کلام پاک کو ہاتھ میں تھام لیا تھا اور اس کا رنگ فق ہو گیا تھا لرزتے لہجے میں بولا۔

"میں اس کی قسم اٹھا کر کہتا ہوں کہ میں تجھے غلط مشورہ نہیں دوں گا۔ تو آہو کو شاید مجھ سے بہتر جانتا ہے مگر میں یہی کہوں گا کہ اس وقت تو آہو پر ہاتھ ڈال کر پریشانی کے سوا کچھ حاصل نہیں کر سکے گا۔ اوپر اس بائیں ہاتھ کے کمرے میں آج اس نے دو ڈاکو بھی سلا رکھے ہیں۔ وہ ادھر انڈیا سے آئے ہیں۔"

"مگر۔۔۔ میں انتظار نہیں کر سکتا ہوں کبری! اگر دیر ہو گئی تو وہ سب کچھ تباہ کر دے گا۔ وہ مسند آرا کو بھی کھا جائے گا، کبری! تو نہیں جانتا ہے مجھے کیا کچھ نظر آ رہا ہے۔" میں نے اپنی آواز قدرے بلند کرتے ہوئے کہا۔ اب تک ہم بہت دبے گھٹے لہجے میں بات کرتے رہے تھے کیونکہ ہم نہیں چاہتے تھے کہ ہماری آواز رات کے اس مہیب سناٹے میں کسی اور کے کان میں پڑے۔

کبری نے قرآن مجید الماری میں رکھ دیا۔ اور پھر میرے سامنے سگریٹ سلگا کر بڑے اطمینان سے بیٹھ گیا۔ چند لمحوں کے سکوت کے بعد وہ آہو کو گندی گالی دیتے ہوئے بولا۔

"اسے کسی اور جگہ کسی اور دن پکڑو۔ آج کی رات تیرے حق میں اچھی نہیں ہو گی۔"

"مسند آرا کا علاج کون کرتا ہے؟"

"ڈاکٹر بخاری ہے ادھر۔ لیڈی ولنگڈن ہسپتال کے سامنے دکان ہے اس کی۔ آہو خود اسے کار میں بٹھا کر وہاں لے جاتا ہے کسی دن طبیعت زیادہ خراب ہوتی ہے تو ڈاکٹر گھر پہ آ جاتا ہے۔"

"یہ کار کب سے خریدی ہے اس نے؟"

"کار تو بہت دنوں سے ہے اس کے پاس۔ مگر کچھ عرصہ یہ ادھر ورکشاپ میں پڑی رہی جس کی وجہ سے یہ تمہیں نظر نہیں آئی۔"

"کس وقت جاتا ہے یہ ڈاکٹر کے پاس؟"

"دس بجے کے قریب اتارتا ہے یہ مسند آرا کو نیچے۔ سروری بیگم بھی ساتھ ہی جاتی ہیں۔"

"تجھے پتہ ہے کہ وہ مجیدن کس مکان میں ہے آج کل؟"

"میں ایک دن گیا تھا ادھر۔ ایک دلال نے مجھے بتایا تھا، کہ وہ ابھی ادھر ہی ہے کہیں اور ٹرانسفر نہیں کیا ہے اسے بندو خان نے۔ وہ تو مجھے بتاتا تھا کہ ابھی بقول اس کے مجیدن کے ہاتھ پاؤں سیدھے کیے جا رہے ہیں۔ بندو خان اسے ناچ گانا سکھا رہا ہے۔ اس میں منافع زیادہ ملتا ہے نا۔"

"وہ کس طرح؟" میں نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"وہ کس طرح! حد کرتے ہو تم بھی اوستاد۔ گائے کو ایک ہی دن ذبح کر کے اس کا گوشت کھا لو تو قصہ ختم پیسہ ہضم مگر جب کوئی باقاعدہ اس کی کیا کہتے ہیں۔۔۔ فیملی پلاننگ کرتا ہے تو وہ اس کا دودھ بھی پیتا ہے اور بچھڑے بھی حاصل کرتا ہے۔ یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو کبری! مگر وہ مجھے نہیں جانتا وہ بندو خان۔ میں تو اس کی پیٹھ میں سے گولیاں گزار دوں گا۔ اس کی موت آئی ہے میرے ہاتھوں۔"

"مشکل ہے اوستاد! بڑے ڈنڈ پیٹھوں والے بدمعاش پال رکھے ہیں اس نے، تیری دال نہیں گلے گی وہاں، پولیس کو وہ الگ دیتا رہتا ہے وہ کیا کہتے ہیں ہندی میں 'گھوس'۔ ہاں یہی بات کہی تھی اس سکھ نے۔"

"یہ سکھ کون ہے؟"

"یہ ان ڈاکوؤں میں سے ایک کا نام ہے جو آہو سے ملنے کے لیے آیا ہوا ہے انڈیا سے۔ وہ ادھر چنڈی گڑھ کا رہنے والا ہے۔ بڑا سوہنا جوان ہے اوستاد سونا سکھ ہے۔ الیشر سنگھ نام ہے اس کا۔"

"ہوں، تو بارڈر کے اس پار بھی یاری لگا رکھی ہے اس آہو نے۔ تو ٹھیک کہتا ہے کبری۔ واقعی بڑی پلید شے ہے یہ تیرا ہرن صاحب۔ مگر۔۔۔ خیر۔۔۔ تو چل میرے ساتھ مجھے اس بندو خان سے ملوا ہی دے۔ ابھی اور اسی وقت۔ میں اس مجیدن کے لیے یہاں آیا ہوں۔"

"ذرا اذان ہو لینے دے، پھر میں بڑا دروازہ کھول کر نماز کے بہانے باہر نکل جاؤں گا تو ادھر پچھلی طرف سے نکل سکتا ہے نا؟"

"ہاں میرے پاس اسکوٹر ہے وہ میں ادھر لان میں چھوڑ آیا ہوں۔"

"گھوڑی نہیں لایا ہے تو اور کوئی؟" یہ کہتے ہوئے وہ ایک آنکھ دبا کر پھر مسکرایا۔

"اس پہلی گھوڑی کا کیا کیا تھا تم لوگوں نے؟"

"وہ بچاری تو اب کسی تانگے کے آگے جتی ہو گی۔ آہو نے مجھے بخشش دی تھی وہ۔ سالا کہتا تھا، کبری یہ تجھے کچھ نہیں کہے گی۔ تیری ماں برابر ہے یہ۔ یاد ہے نا تجھے۔۔۔ حرام کا تخم بہت ذلیل کرتا ہے مجھے۔ میں نے اسے لے جا کر ایک کوچوان کے ہاتھ بیچ دیا دو ہزار روپوؤں میں۔"

"چل اچھا ہوا کچھ تو فائدہ اٹھایا تو نے۔"

"ہاں! تو نے بھی تو کہیں سے وہ راہ چلتے کھول لی ہو گی۔ لے یہ سگریٹ پی۔ اگر ٹھک ٹھک کا خطرہ نہ ہوتا تو میں تجھے چلتے پلاتا ایک دم فسٹ کلاس چائے مگر ڈرتا ہوں گھر والے نہ جاگ اٹھیں۔"

میں نے اس کے ہاتھ سے سگریٹ لے کر سلگا لیا۔ کبری پر مجھے اعتبار آنے لگا تھا۔ اس کی باتوں میں خلوص جھلکتا تھا۔ اس نے نہایت سادگی اور صاف دلی سے مجھے ساری باتیں بتا دی تھیں۔ میری راہ کے سارے کانٹے اس نے مجھے سجھا دیے تھے۔ وہ شاید اس گولی کی ندامت کے بوجھ تلے دبا جاتا تھا جو اس نے مجھ پر آہو کے کہنے سے چلائی تھی۔ اور اب وہ صاف شفاف آئینے کی طرح میرے سامنے یوں بیٹھا تھا کہ مجھے اس کی کسی بھی بات پر کوئی شک نہیں رہا تھا۔

آہو کے بارے میں مجھے اس نے جو کچھ بتایا تھا اس سے یہی معلوم ہوا تھا کہ آہو اب اپنے راستے کی دوسری رکاوٹیں ہٹانے میں مصروف تھا۔ مجھے یقین تھا کہ مسند آراء کی ماں کو اس نے ہی کنوئیں میں پھینکوا کر مار دیا ہو گا۔ مسند آراء کی دگرگوں ذہنی کیفیت کی ایک وجہ تو مجھے نظر آتی تھی۔ اس کو جو صدمہ پہنچا تھا وہ بے حد و حساب تھا۔ اس کی جگہ کوئی بھی ہوتا یقیناً پاگل ہو جاتا۔ وہ اگر باؤلی ہو گئی جاتی تھی اور اسے اب علاج کی ضرورت تھی تو کوئی انہونی بات نہیں تھی۔ مگر یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ آہو کیوں اس پر اس قدر مہربان ہو چکا ہے اور وہ سروری بیگم کو ساتھ لے جا کر اس ڈاکٹر سے مسند آرا کو کس قسم کی ادویات دلا رہا ہے کہ اس کی حالت سنبھلنے کے بجائے اور زیادہ بگڑتی جا رہی ہے۔

میرے ذہن میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہو رہے تھے۔ اور کبری میرے سامنے بیٹھا میری سوچوں کے تعاقب میں مصروف تھا۔

میرے وجود میں درد کا پیر تسمہ پا آ کے آیا تھا۔ اور اس کی شاخیں اندر ہی اندر پھیل کر مجھے نڈھال کیے دیتی تھیں۔ میں ابھی تک آسیہ کے لیے ہی کچھ نہ کر سکا تھا۔ اس کے گرد چنے ادبار کے بلند و بالا حلیم و حصار کو میں ابھی سر نہ کر سکا تھا کہ مجھے مجیدن کی دبی کچلی لاش راہ میں مل گئی تھی۔ جن جن لوگوں کو میں عزیز رکھتا ہوں، وہی تقدیر کے ہاتھوں گھائل ہو جاتے ہیں۔ مجھے وہیں وہیں چوٹ لگتی ہے جہاں مجھے سب سے زیادہ درد محسوس ہوتا ہے۔ میں اس مفلسی کی اسیر اس بے نوا اور بے بس لڑکی کو صحیح سالم ان درندوں کے منہ سے کیسے نکال سکتا تھا کیونکہ وہ تو اب تک اس کا سارا تقدس، اس کی ساری معصومیت اور اس کے وجود کے سارے شیشے چکنا چور کر چکے ہوں گے۔ مجھے وہ پہلی سی نرم و نازک سیدھی سادی مجیدن کہاں مل سکے گی۔ سب کچھ ملیا میٹ ہو کر رہ گیا تھا۔ اور میں نے سوچ رکھا تھا کہ میں کیس تاریخ کو اس کی شادی میں ضرور شریک ہوں گا۔۔۔ مگر اب تو حالات نے اس بچاری کو کچھ اس طرح جو کوب کر دیا ہو گا۔ پہچانی نہ جاتی ہو گی۔ اس کی آنکھوں کی ساری چمک چلک ان درندوں نے نوچ کر بھسم کر دی ہو گی۔

زندگی آہستہ آہستہ فنا کے گھاٹ اترتی جا رہی ہے۔ نہ چاند کو ثبات ہے، نہ سورج کو۔ اگر قرار اور دوام کسی شے کو یہاں حاصل ہے تو وہ ہے انسان کے خون میں پلتی ہوئی بہیمیت کو۔ وہ اپنی راہ میں آنے والی ہر کمزور شے کو نگلتی چلی جاتی ہے۔ مجیدن اور مسند آراء کا قصور صرف یہی ہے کہ وہ نحیف و نزار ہیں۔ اپنی حفاظت نہیں کر سکتی ہیں۔ ان کی کمزوری ہی ان کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ٹوٹے ہوئے ریزہ ریزہ لعل و گوہر میں کس کے پاس لے جاؤں گا۔ کہ وہ اپنی مسیحائی سے ان کو پھر ثابت و سالم کر دے۔ یہ ناممکن تھا۔ پھر بھی مجھے مجیدن کے پیچھے ضرور جانا ہو گا۔ کہ میں نے اسے بہن کہا تھا اور بہن ہی سمجھا تھا۔ کبری اسے خانگی بنانے پر تلا ہوا تھا۔ مگر میں نے اسے ایک نئی زندگی سے روشناس کرانے کی کوشش کی تھی۔ وہ ماں جو اس بیٹی کے چھقدے مٹے کرتی نہ تھکتی تھی اس رات اس قدر سفاک ہو گئی کہ ایک فاقے کو ٹالنے کے لیے اس نے اپنی نرم و نازک بھولی بھالی مجیدن کو کبری کے ساتھ روانہ کر دیا اور اب آہو نے بھی میرے دل کے سب سے نازک مقام پر گرز نہ پہنچانے کے لیے مجیدن ہی کو منتخب کیا تھا تاکہ میں درد سے بلبلا اٹھوں اور ہمیشہ کے لیے جرمی کے تپ میں مبتلا ہو جاؤں۔ مگر نہیں میں خود کو ایسی پستی میں نہیں گرا سکتا تھا۔ میں اس ریزہ لعل بدخشانی کو اس گندی موری سے اٹھا کر سینے پر سجا لوں گا۔ میں تو مجیدن کو یوں زندہ درگور ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ مجھے تو وہ اتنی ہی عزیز ہے جتنی آسیہ۔

مجھے معلوم تھا کہ وہ مجیدن اب تک چائے کی پیالی کی طرح ان گنت لبوں سے لگ چکی ہو گی جس گلی میں وہ بیچ دی گئی تھی وہاں تو ہر شام اس کا تیجی کا نکاح پڑھا جاتا ہو گا۔ ہر رات وہ نئے گاہک کا منہ دیکھتی ہو گی۔ اس کے سارے تیج پات پامال ہو چکے ہوں گے مگر پھر بھی مجھے وہ عزیز تھی۔ جان و دل سے زیادہ محترم۔ اور اسی لیے میں چاہتا تھا کہ کبری مجھے وہ مکان دکھا دے جو اس بدنصیب کا محبس بن چکا تھا۔

مجھے آہو سے بھی حساب لینا تھا اور اس کی اس تورہ بیٹی بیوی سروری بیگم سے بھی جو مسند آرا کی سوتیلی بہن تھی۔ اور اپنے طور پر اس کی تباہی کے سارے انتظامات مکمل کیے بیٹھی تھی مسند آرا کے سامنے تقدیر تلوار سونت کر کھڑی تھی اور مجھے اس کو بھی اس اندوہناک انجام سے بچانا تھا کہ ابھی تو وہ تتلی کی زد میں آئی تھی۔ ابھی اسے گہرے پانیوں نے نہیں نگلا تھا۔ ابھی اس کی گردن کے گرد شکنجہ اتنا سخت نہیں ہوا تھا۔ اور ابھی میں اسے آہو کے دندان حرص و آز

جا سکتا تھا۔

کبری متواتر سگریٹ پی رہا تھا مسکراہٹ اس کے لبوں پر منجمد ہو چکی تھی اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ مجھے دیکھ کر وہ اتنا خوش کیوں ہو رہا ہے پستول ابھی تک میرے سیدھے ہاتھ میں تھا اور اسکی نال کا رخ اس کے سینے کی طرف تھا پھر بھی وہ مجھ سے قطعاً خوفزدہ نہیں تھا۔

اچانک اس نے تکیے کے نیچے بچھے گدے کا ایک سرا اوپر اٹھا دیا، بولا۔

"یہ دیکھ اوستاد میں بھی بھرا ہوا پستول اپنے سرہانے رکھ کر سوتا ہوں یہ مجھے آبو نے دیا تھا۔ مگر میں اس سے کام نہیں لوں گا تیرے سامنے نہیں، بالکل نہیں، پر تجھے مجھ پر اعتبار ہی نہیں آتا ہے۔"

میں نے ہاتھ آگے بڑھا کر وہ پستول اٹھا لیا۔ وہ بلجیم کا بنا ہوا ہلکا پھلکا کھلونے ایسا پستول تھا۔ اس کا چیمبر اس نے لبالب بھر رکھا تھا۔

"مجھے تجھ پر اعتبار ہے کبری! ایسا بھی اندھا نہیں ہوں میں" یہ کہہ کر میں نے وہ پستول اپنی بائیں جیب میں رکھ لیا۔

"مجھے واپس نہیں کریگا تو اسے؟"

"ابھی نہیں، پہلے تو مجھے مجیسلن تک لے چل"

"میرا خیال ہے اذان ہونے ہی والی ہے۔ میں اتنے میں ذرا دوسرے کپڑے پہن لوں" یہ کہہ کر وہ اٹھا اور اس نے ٹرنک سے نکال کر کارڈرائے کی پتلون پہنی اور پھر ایک موٹی سی جرسی بدن پر سجا کر جرابیں پہن کر فلیٹ بوٹ میں پاؤں ڈال دیے، بولا۔

"یہ اوورکوٹ بھی چڑھا ہی لوں، باہر سردی زیادہ ہوگی ——" جب وہ اس کام سے فارغ ہو چکا تو بولا۔

"لا اب یہ پستول مجھے دے دے۔ ادھر پتہ نہیں کیسے حالات پیش آئیں۔"

"نہیں کبری! یہ پستول میرے ہی پاس رہے گا میرے ہوتے ہوئے تمھیں کوئی ہتھیار رکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

یہ کہہ کر میں کرسی سے اٹھ گیا۔

اس وقت چار بج رہے تھے۔ گھڑی پر ایک نظر ڈال کر میں نے دروازہ کھول دیا مگر کبری نے پٹ پھر بھیڑ دیے۔ بولا۔

"ذرا رک جا اوستاد"

"نہیں تو ابھی چل میرے ساتھ۔ میں زیادہ انتظار نہیں کر سکتا"

یہ کہہ کر میں اسے کھینچتا ہوا صحن میں لے آیا اور اس کمرے میں سے گزار کر پچھلی طرف لے گیا جہاں میرا اسکوٹر کھڑا تھا۔ باہر چاندنی نے کھیت کر رکھا تھا۔ چادرِ مہتاب یہاں سے وہاں تک یوں بچھی تھی کہ ہر شے صاف نظر آتی تھی۔ میں نے اسکوٹر بڑی احتیاط سے چھوٹے گیٹ سے باہر نکالا اور کبری کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتا ہوا آگے نکل گیا۔

اس مکان سے سو گز آگے جا کر میں نے اسکوٹر اسٹارٹ کر کے کبری کو پیچھے بٹھایا اور ہیرا منڈی کی طرف چل دیا۔ کبری نے دوبارہ مجھ سے اپنا پستول واپس نہیں مانگا۔ مجھے یہ ڈر تھا کہ وہ سالا کہیں میرے پیچھے بیٹھ کر چپکے سے میری پسلیوں میں چاقو نہ دھنسا دے۔ اس سے تو کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ روپے کے لالچ میں اس روز اس نے مجھے جان سے مار ڈالنے کا انتظام کر دیا تھا اور اب تو صورتحال یہ تھی کہ اس کے سینے پر میری گولی کا نشان صاف نظر آتا تھا بہت دن تک وہ ہسپتال میں پڑا سسکتا رہا تھا اسی خیال سے میں نے راوی روڈ پر چڑھتے ہی اسے متنبہ کر دیا۔ وہ میرے ساتھ چمٹ کر بیٹھا تھا۔

"دیکھ بے! اگر تیرے پاس کوئی چاقو چھری ہے تو وہ نکال کر مجھے دیدے۔ میں تیری زد میں آگیا ہوں بیٹے۔"

"تجھے ابھی تک مجھ پر اعتبار نہیں آیا ہے اوستاد حالانکہ میں نے قرآن پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی ہے۔" وہ ناراض ہونے لگا ——

"اب تو بہتر ہے میں تیرے ساتھ نہ جاؤں۔ تجھے مجھ پر کبھی اعتبار نہیں آئے گا۔" اس کا لہجہ خاصا زخمی معلوم ہوتا تھا۔

"بس پھر بیٹھا رہ اطمینان سے۔ میں نے تجھے صرف یاد دلایا ہے کہ تیرے سامنے غلام جیلانی بیٹھا ہے۔" میں اسکوٹر دوڑاتا ہوا لنگڈن ہسپتال کے سامنے سے گزر کر بادشاہی مسجد کی طرف چل دیا۔ کبری اب بالکل خاموش تھا۔ سڑکیں اس گھڑی بالکل سنسان ہو رہی تھیں۔ ہیرا منڈی تھک ہار کر سو چکی تھی۔ جسموں کا کاروبار ختم ہو چکا تھا۔ وہ آغوش جو رات کے شباب کے ساتھ ہی وا ہونے لگتے تھے، اب چکنا چور شیشوں کی طرح بستروں پر بکھرے ہوں گے۔ ٹبی بازار کی جاگتی رات اس گھڑی دم توڑ چکی تھی۔ میں بادشاہی مسجد کے قریب سے گزر کر کبری کے کہنے کے مطابق حضرت سید قاسم شاہ مشہدی کے مزار کی طرف چل دیا۔ اس مزار کے قریب سے گزر کر آگے بڑھا تو کبری بولا۔

"اوستاد ادھر بائیں ہاتھ چل"

میں نے اسکوٹر کا رخ بائیں ہاتھ موڑ لیا۔ ڈر مجھے یہ تھا کہ اگر کہیں گشتی پولیس سے آمنا سامنا ہو گیا تو ہم خواہ مخواہ مصیبت میں پھنس جائیں گے۔ مگر خیریت یہ گزری کہ راستے میں ہمیں کسی بھی جگہ کوئی سپاہی نظر نہیں آیا۔

کبری نے ایک مکان کے سامنے اسکوٹر روکنے کا اشارہ کیا اور جونہی میں نے انجن بند کیا وہ سیٹ پر سے اتر کر مکان کے دروازے پر جا کھڑا ہوا۔

"وہ اسی مکان میں رکھی گئی تھی"

"تم خود آتے تھے اس کے ساتھ؟"

"نہیں، میں تو نہیں آیا تھا مگر مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔ بندو خان کی گشتیاں یہیں رہتی ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے دروازے پر بڑے زوردار طریقے سے دستک دی اور بولا۔

"میں تیرے ساتھ اندر نہیں جاؤں گا، وہ مجھے پہچانتا ہے۔ میں اب واپس چلتا ہوں۔ صبح میں تجھے ادھر نو بجے شاہی مسجد کے دروازے پر ملوں گا۔" یہ کہہ کر وہ پیچھے ہٹا تو میں نے اسے روک لیا۔

"تمہیں ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"میں خواہ مخواہ آپ کی نظروں میں مشکوک نہیں ہونا چاہتا۔ اگر ایسا ہو گیا تو پھر میں تیرے کسی کام نہ آسکوں گا۔ اچھا خدا حافظ۔" یہ کہہ کر اس نے مجھ سے ہاتھ چھڑایا اور تیزی سے بائیں ہاتھ کی تنگ گلی میں گھس گیا۔

پہلی دستک بے اثر ثابت ہوئی تھی۔ میں نے چند لمحے انتظار کیا۔ اور پھر دروازے کو پوری قوت سے کھٹکھٹا دیا۔ چار سو ہُو کا سا عالم طاری تھا۔ چوتھی دستک پر مجھے دروازے کے پیچھے روشنی کی جھلک دکھائی دی۔ کسی نے اندر کا بلب جلا دیا تھا۔

"کون ہے؟" کسی عورت کی آواز تھی۔ بڑی بیزار، بڑی تھکی ہوئی۔ واماندہ سی۔

"دروازہ کھولو مجھے بندو خان سے ملنا ہے۔"

"مگر تم ہو کون؟"

"میں... تھانے سے آیا ہوں۔ انسپکٹر جمیل میرا نام ہے۔ مجھے بندو خان سے ابھی ملنا ہے اسے فوراً باہر بھیجو۔" میں نے عورت کو خوفزدہ کرنے کے لیے اپنا تعلق پولیس سے ظاہر کر کے اپنے مقصد کے حصول کی راہ آسان کر لی تھی۔ میری بات کا اس عورت پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ اس نے فوراً ہی دروازہ کھول دیا۔ وہ کوئی ادھیڑ عمر کی ندھر قسم کی عورت تھی۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس کے بال بے حد لمبے تھے اور چونکہ وہ اپنا جوڑا کھول کر سوئی تھی اور اسی حالت میں اٹھ کر باہر آگئی تھی۔ اس لیے اس کے بال کھل جانے کی وجہ سے کولھوں تک لٹکے نظر آتے تھے۔ اس نے دروازہ کھول کر مجھے ڈیوڑھی کے بلب کی روشنی میں گہری گہری نظروں سے دیکھا اور بولی۔

"کس تھانے سے آئے ہیں آپ؟"

"میں کاموکی تھانے سے آیا ہوں۔ وہاں دو عورتیں گرفتار ہو کر آئی ہیں ان کے بارے میں مجھے بندو خان سے کچھ پوچھنا ہے۔ ایک عورت شدید زخمی ہے۔"

"ہائے میں مر گئی۔ وہ کون کلمونہیاں ہیں۔ آپ اندر آجائیں، میں بندو خان کو جگاتی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے مجھے اندر جا کر دائیں ہاتھ کے ایک صاف ستھرے کمرے میں صوفے پر بٹھا دیا۔ یہ ان کے گانے بجانے کا کمرہ تھا۔ ادھر ادھر کئی ساز دیواروں کے ساتھ بڑے قرینے سے رکھے نظر آتے تھے۔ کمرے میں رات کے پہلے پہر کی سلگائی ہوئی اگربتیوں کی خوشبو ابھی ہلکے دم توڑتے قہقہوں... اور جاں بلب تانوں کا پتہ دیتی تھی۔

فرش پر بچھا دبیز قالین اس بات کی شہادت دیتا تھا، کہ اس بیٹھک میں سیم و زر کی بارش خاصی زور سے برستی ہے۔

میں نے سگریٹ سلگا کر اپنے ذہن سے اس مکروہ صورت حال کی ساری تلخی دھو ڈالی۔ مجھے لینا ہی کیا تھا ایسی باتیں سوچ کر۔ میں کون سا مصلح تھا۔ میری اپنی زندگی سر تا سر جرم کے دلدل میں دھنسی نظر آرہی تھی میرے شب و روز تاریکی میں گزرے تھے۔ میں نے بھی تو ہر احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر اپنا رُواں رُواں گناہ کی گود میں پھینک دیا تھا۔ مجھے کیا حق پہنچتا تھا کہ قائد اعظم کی تصویر کو اس عشرت کدے کی دیوار پر دیکھ کر تاسف اور ملال کے سیلاب کی نذر ہو جاتا، میں زہر خند کر کے چپ ہو رہا۔

کوئی دس منٹ بعد بیٹھک کا دروازہ ایک اونچے لمبے گندمی رنگ کے پہلوان صفت آدمی کے وجود سے لبالب بھر گیا۔ وہ بندو خان تھا۔ اس نے لوسکی کا لاچا اور لوسکی کا کُرتا پہن رکھا تھا۔ پاؤں میں وہ نازک سی سلیم شاہی جُوتی پہنے ہوئے تھا۔ بال اس نے بلوچی خانہ بدوشوں کی طرح اتنے بڑھا رکھے تھے کہ وہ اس کے کاندھوں کو چھو رہے تھے۔ ایک کان میں اس نے طلائی بالی لٹکا رکھی تھی۔ کمر پر اس نے ایک خوبصورت سی اونی چادر لپیٹ رکھی تھی۔ جس کا ایک سرا اس نے بغل میں سے گزار کر کندھے پر ڈال لیا تھا۔ اس کی آنکھیں نیند سے خمار آلود تھیں۔ ایک لمحے کے لیے وہ دروازے میں رکا اور چند لمحوں تک مجھے بڑے غور سے دیکھنے کے بعد آگے بڑھ آیا۔ وہ عورت اس کے پیچھے تھی۔

"السلام علیکم جناب! یہ آپ نے ایدھر اس بخت آنے کی کیسے جہمت پھرمائی؟"

"بندو خان تمہارا ہی نام ہے؟" میں نے خالص حاکمانہ لہجے میں پوچھا۔ اس طرح کہ وہ بدکے بھی نہیں اور مجھے اتنا سستا بھی نہ سمجھے کہ باتوں میں اڑایا جا سکوں۔

"جی جناب! کھادم کو ہی بندو خان کہتے ہیں۔ آپ کا نوکر ہوں۔ جا صابری ان کے لیے جرا چا بنا لا۔" وہ میرے بائیں ہاتھ کی کرسی پر آ بیٹھا۔

"نہیں چائے کی ضرورت نہیں ہے مجھے تم سے کچھ باتیں پوچھنا ہیں۔" میں نے کہا۔

"پھر بائیے سرکار! میں تو نوکر ہی آپ کا ہوں۔ آپ اودھر کاموکی سے آئے ہیں۔ جا صابراں چائے تو لے ہی آ۔ اس نکی کو جگا لے جرا۔"

صابراں اُلٹے پاؤں باہر نکلی تو میں نے اُٹھ کر دروازہ اندر سے بند کر کے کنڈی چڑھا دی۔ میری یہ حرکت دیکھ کر بندو خان کرسی پر تن کر بیٹھ گیا۔ دونوں ہاتھ اس نے چادر میں چھپائے تھے جیسے وہ سردی سے بچنے کے لیے بُکل مار رہا ہو۔ مگر میں نے دیکھ لیا تھا اس نے لاچے کی ڈب میں سے کوئی چیز نکال کر چادر کے نیچے سیدھے ہاتھ میں تھام لی تھی۔ بلاشبہ وہ کوئی ہتھیار تھا مگر اس کی نوعیت کا مجھے اندازہ نہیں ہو سکا۔

دوبارہ صوفے پر بیٹھنے کے بجائے میں نے کوٹ کی جیب سے اپنا چپ شاہ نکال کر ایک دم اس پر تان لیا۔

"یہ پستول دیکھتے ہو بندو خان، یہ بے آواز چلتا ہے اور میرا اشارہ سمجھتا ہے اس نے مجھے کبھی دھوکہ نہیں دیا۔"

وہ ذرا نہیں گھبرایا، میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرا دیا، بولا "مجھے پہلے ہی جبھی کھدشہ تھا میرے جار! تیری صورت تو مجھے کچھ اور ہی بتاتی تھی۔ پر میں دھوکا کھا گیا۔ کھیر۔ تو مطلب کی بات کر۔" یہ کہہ کر وہ کھل کر مسکرا دیا۔ اس کے سامنے کے دانتوں میں لگی سونے کی دو کیلیں نمایاں ہو گئیں۔ وہ کیلیں اس کی مسکراہٹ کو جاذب نظر بناتی تھیں۔

"میں مجیدن کو لینے آیا ہوں۔"

"تو جہ بات ہے۔ مجیدن سے تیرا کیا واسطہ ہے؟"

"وہ... وہ میری بہن ہے۔"

میری یہ بات سنتے ہی اس کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ اس نے چادر کے نیچے سے اپنا ہاتھ نکالا اور اس میں پکڑا ہوا، گراری دار چاقو اس نے میرے قدموں میں پھینک دیا، بولا۔

"جہ پستول پرے ہٹا لے جوان اور مجھے بتا وہ تیری بہن کیسے لگتی ہے۔ اس نے تو کہا تھا کہ ادھر اس کا کوئی انگ ساک نہیں ہے سوائے ماں کے۔"

"وہ مجھے بے عزت کرنا نہیں چاہتی ہو گی اسی لیے اس نے تمہارے سامنے میرا نام نہیں لیا۔"

"بیٹھ جا جوان اور دھرج سے کام لے، مجھے تیرے ساتھ ہمدردی ہے میرے ویر بیٹھ جا۔ مجیدن کو میں لینے نہیں گیا۔ کوئی خود ہی اسے میرے پاس بیچ گیا تھا۔"

"کون تھا وہ؟" میں نے اپنا پستول اس پر مسلسل تان رکھا تھا۔

"وہ شرفو کے جریعے میرے پاس آئی تھی۔ وہ چونا منڈی کا بدمعاش۔ وہی کن کٹا۔ تیں نے دیکھا تو ہو گا وہ منڈا۔"

"نہیں، میں نے نہیں دیکھا ہے اسے پر اب دیکھنا پڑے گا۔ کتنے روپے دیے تھے تو نے اسے؟" میں نے اس کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"سات ہجار۔ اس سے کم پر وہ تولتا ہی نہیں تھا اور وہ تھی بھی اس لائق۔ بڑی بے جبان لڑکی ہے وہ۔"

"وہ ہے کہاں۔ اسے ادھر لاؤ۔ میں اسے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"وہ ایدھر نہیں ہے جوان، وہ کل رات سے ایدھر نہیں ہے۔"

"کہاں بھیجا ہے تم نے اُسے۔"

اُس نے سر جھکا لیا۔ وہ مجھ سے آنکھ ملانے سے اب گریزاں نظر آتا تھا۔

"میری بات کا جواب دو بندو خان! مجیدن کو تم نے کہاں بھیجا ہے؟"

"مجھے افسوس ہے میرے ویر! پرسوں آجاتے تو میں تمہاری چیج تمہارے حوالے کر دیتا، پر اب نہیں۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔"

"دیکھو اب کیوں نہیں ہو سکتا۔ میں تمہارے گھر بار کھود دینے کے لیے ...."

"بات یہ ہے میرے جار! وہ .... میں نے اُسے کل ایک جمیندار کے ساتھ ٹور دیا۔ نتھ کھلائی کے لیے۔"

"بکواس نہ کر بندو خان! میرے سامنے ایسی بات مت کہہ ورنہ میں تجھے جان سے مار ڈالوں گا۔"

"مجھے افسوس ہے میرے ویر! تمہارا گُسّہ اپنی جگہ ٹھیک ہے۔ پر یہ، میرا دھندا ہے۔ میں نے پندرہ دن کے لیے اسے باہر بھیج دیا ہے۔ وہ ناچ گانا نہ سیکھ سکی تھی اور مجھے پیسے پورے کرنے تھے۔"

"کتنے پیسے لیے ہیں تم نے اُس سے؟"

"بیس ہجار روپے میرے ویر، پر میرا کوئی قصور نہیں ہے یہ میرا کاروبار ہے۔"

"کون آدمی ہے وہ؟"

"اس کا نام سردار خان ہے وہ ادھر چھانگا مانگا میں رہتا ہے بڑی جمینداری ہے اس کی اور موج میلے کا شوقین آدمی ہے وہ۔"

"تو نے اچھا نہیں کیا بندو خان! مجیدن کو برباد کر دیا تو نے۔"

پر تو ٹھیک کہتا ہے تیرا بھی اس میں کیا قصور ہے۔ چولہے میں جو لکڑی گرے گی، جل کر رہے گی۔" میں نے گویا اپنے آپ سے کہا۔ اور پستول کو جیب میں رکھ لیا۔ میں بندو خان سے کہتا بھی تو کیا کہتا۔ وہ اپنی جگہ بالکل بے قصور تھا۔

"مجھے آج جندگی میں پہلی بار کسی لڑکی کی بربادی پر افسوس ہو رہا ہے میرے ویر! مجھے ماف کر دے کہے تو میں ... پر تیں گُسّہ کھا جائے گا۔"

"کہو کہو رُک کیوں گئے ہو؟"

"تیں کہے تو میں تمہارے کو / ہ سالا بیس ہجار دے سکتا ہوں اپنے سات ہجار کاٹ کر۔" اس کا لہجہ بے حد ناتواں محسوس ہو رہا تھا۔

"مجھے اور ذلیل نہ کر بندو خان! بہت ہو گئی۔ اب کوئی بات نہ کرنا۔ ایسا نہ ہو میں تجھ پر ہاتھ اُٹھا لوں۔"

اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔

اس مقبول سلسلے کے بقیہ واقعات دوسرے حصے میں ملاحظہ کیجیے۔
جو کہ اس حصے کے ساتھ ہی شائع ہو چکا ہے۔

جاسوسی ڈائجسٹ کا مشہور سلسلہ

ایک ایسے آتش زادے کی داستان جو دُنیا کی بھول بھلیوں میں گم ہوگیا

کتابیات پبلی کیشنز۔ پوسٹ بکس ۲۳- کراچی-۱

جبار توقیر

دروازے پر دستک ہوئی تو بندو خان نے اٹھ کر کُنڈی کھولی۔ ایک لڑکی چائے کی ٹرے اٹھائے اندر آ گئی۔ اس کی عمر یہی کوئی سولہ سترہ سال ہو گی۔۔ اس کے رخساروں پر بھی نیند کا عکس جھلکتا تھا۔ بال اس کے بھی کھل کر گلے میں پڑے تھے۔ ساٹن کی سفید قمیص جو اس نے پہن رکھی تھی ضرورت سے زیادہ چست تھی۔ صابراں اس کے ساتھ نہیں آئی تھی وہ آئی اور جب جھک کر اس نے میرے سامنے تپائی پر وہ ٹرے رکھی تو میں سمجھا میں کوئی خوبصورت خواب دیکھ رہا ہوں۔ وہ ایسی نہیں تھی کہ اسے نظر انداز کیا جا سکے۔ وہ ٹرے تپائی پر رکھ کر اسی رکوع کی حالت میں چائے بنانے لگی تو اس کی وہ تاریک رات ایسی گھنی زلفیں نیچے جھک کر اس کے رخساروں کو چھونے لگیں۔ وہ بہت ہی حسین منظر پیش کر رہی تھی۔ اس کی پیٹھ بندو خان کی طرف تھی۔ وہ ساری کی ساری کسی سنگتراش کا شاہکار نظر آتی تھی۔ اور رات کا وہ پچھلا پہر تیزی سے گزرتا جا رہا تھا۔

میری آنکھوں کے بدلتے رنگ بھانپ کر بندو خان اپنی جگہ سے اٹھا اور بڑے بھاری بھرکم لہجے میں بولا "میں اُدھر مسجت جاؤں ہوں اجان ہونے والی ہے تیں چائے پی کر ایدھر ہی آرام کر میرے ویر۔ اسے اپنا ہی گھر سمجھ "جہ" چھوری تمھاری کھدمت کرے گی کسی چیج "کی جرورت" ہو تو اس کو بول دینا۔"

"نہیں بندو خان! میں بھی جا رہا ہوں۔ میرا یہاں ٹھہرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ میں تمہیں کوئی موقع نہیں دینا چاہتا۔ ٹبی تھانہ یہاں سے زیادہ دُور نہیں ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

وہ پھر بیٹھ گیا ــــ

"تیں مجھ کو اتنا گھٹیا نہ سمجھ میرے ویر! میں بندے چراتا ہوں ڈنگر نہیں چراتا ــــ تمھاری میں قدر کروں ہوں برادر! تیں مرد آدمی ہے جو دھیرج سے بات سنتا ہے اور سوچ کر "پھیسلہ" کرتا ہے۔ میں ابھی دو متھے رگڑ کر آؤں ہوں ــــ جھیتی آؤں۔ پھکر کی بات کوئی نہیں ہے۔"

وہ لڑکی پیالی میں قہوہ ڈال رہی تھی۔ بندو خان کی بات سن کر اس نے اپنی بڑی بڑی سُرمہ سا آنکھوں کو عجیب انداز سے پٹ پٹا کر مجھے دیکھا اور سر کو دائیں بائیں یوں غیر مرئی سی جنبش دی جیسے کہہ رہی ہو "مت جاؤ۔"

"ٹھیک ہے بندو خان! میں تمہارا انتظار کروں گا۔ شرفو کے ٹھکانے کا پتہ بھی مجھے تو ہی بتائے گا۔"

"جہ" میرا اصول تو نئیں ہے میرے ویر، پر میں تمھارے لئے "جہ" بھی کر دوں گا۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔

لڑکی نے چائے کی پیالی بڑے دلفریب انداز سے اٹھا کر مجھے دی تو اس کی گدرائی ہوئی کلائیاں مجھے بہت ہی بھلی معلوم ہوئیں۔ پتہ نہیں وہ کیا سوچ رہی تھی۔ اس کی رنگت آپ ہی آپ شہابی ہوئی جاتی تھی۔

بندو خان کمرے سے باہر نکلا تو اس نے دائیں ہاتھ کھڑے کسی آدمی کو کوئی اشارہ کیا ——— جونہی بندو خان بڑے دروازے کی طرف گیا۔ صابراں نے چپ چاپ دروازے کے پٹ اپنی بانہیں پھیلا کر پکڑے اور بھیڑ دیئے اس طرح کہ وہ خود باہر ہی رہ گئی۔

چائے میرے ہاتھ میں دے کر وہ لڑکی بولی "آپ کے لئے جلدی میں بس بسکٹ لانا بھول گئی۔ میں وہ لے کر آتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ ہوا کے سبک رفتار جھونکے کی طرح باہر نکل گئی اس نے پاؤں میں بہت ہی نرم و نازک سے سلیپر پہن رکھے تھے مجھے وہ پاؤں دیکھ کر منور آرا یاد آ گئی۔ وہ بھی اس رات ویسے ہی خوبصورت سلیپر پہنے ہوئے تھے جس رات وہ پہلی بار مجھے آہو کے مکان پر ملی تھی۔ اس کے پاؤں بھی اتنے خوبصورت تھے کہ ان کی قسم کھائی جا سکتی تھی۔

کوئی تین منٹ بعد وہ لڑکی ایک ہوا جاک جھپاکے سے اندر آ گئی۔ اس نے ایک بڑی سی پلیٹ اٹھا رکھی تھی۔ جس میں بسکٹ بھی تھے اور انڈے بھی۔ مکھن کی ٹکیاں بھی تھیں اور توس بھی۔ اُسے شاید بن بتائے یہ احساس ہو گیا تھا کہ میں بھوکا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ یہ بات میرے چہرے پر عیاں تھی۔ میں کل دوپہر کے کھانے سے بھی محروم تھا اور رات کے کھانے سے بھی۔ زندگی کچھ ایسے مخمصے میں الجھ گئی تھی کہ کسی بات کا ہوش ہی نہیں رہا تھا۔

"لیں یہ کھائیں اور اسے صبح کا ناشتہ سمجھیں۔" لڑکی نے بڑے شستہ لہجے میں کہا اور میرے سامنے کی کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ عشوہ و ناز و ادا کی قدر و قیمت کو سمجھتی تھی۔

"آپ کی بڑی مہربانی ہے جو آپ اتنا کچھ لے آئی ہیں۔ مجھے واقعی بہت بھوک لگی ہے۔" میں نے انڈوں پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔ وہ اگرچہ ٹھنڈے تھے اور پہلے سے ابال کر رکھے گئے تھے مگر وہ انہیں گرم پانی میں سے گزار کر لائی تھی۔

"آپ میرے لئے آئے ہیں ؟" اس نے میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب ؟" میں حیرت زدہ سا ہو کر اسے دیکھنے لگا۔

"خالہ صابراں نے مجھے یہی بتایا ہے۔"

"اوہ اب سمجھا ؟ کیا نام ہے تمہارا ؟"

"زرینہ ! میں ایف اے تک پڑھی ہوں۔"

"صابراں نے اور کیا بتایا ہے تمہیں ؟"

"وہ کہتی ہے کہ آپ میرے لئے آئے ہیں۔ کتنے پیسے مانگے ہیں آپ سے انکل بندو نے ؟ میں حیران ہوں کہ آپ کو بھلا اس وقت آنے کی کیا ضرورت تھی ؟" وہ بہت سنجیدہ دکھائی دے رہی تھی۔

"کیا تم پہلے بھی کسی کے ساتھ گئی ہو ؟"

"جی نہیں ! اب تک تو میں صرف ناچ گانا ہی سیکھ رہی ہوں۔ پر میں آپ کے ساتھ نہیں جا سکتی۔"

"کیوں ؟ کیوں نہیں جا سکتی ہو ؟"

"دیکھیں ناجی !" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ پھر بولی "کتنے پیسے مانگے ہیں انکل نے آپ سے ؟"

"پچاس ہزار روپے کی بات کرتا ہے وہ۔"

"پچاس ہزار ؟ وہ..... وہ تو کہتے تھے کہ ایک لاکھ سے کم نہیں لیں گے وہ۔ دیکھیں ناجی ! انہوں نے مجھے میٹرک بھی پاس کرائی ہے اور ایف اے بھی۔ میں تو پڑھی لکھی ہوں ناجی ! تو اتنے تو کم سے کم ہونے ہی چاہئیں نا میرے حق مہر کے۔"

"کیا مطلب ؟"

"وہ جی بس کہتے تھے کہ اگر کوئی ایک لاکھ روپیہ ان کو میرے حق مہر کا نقد دے دے تو وہ اس کے ساتھ میری شادی کر دیں گے۔ تو جی آپ اُن کو ایک لاکھ روپیہ دے دیں ناجی ! میں پڑھی لکھی بھی ہوں اور خوبصورت بھی ہوں۔ ہوں نا۔"

"کیوں نہیں ! تم واقعی بہت خوبصورت ہو۔"

"بس جی جب آپ بھی کہتے ہیں تو پھر تو میں واقعی خوبصورت ہی ہوں گی ناجی ! مجھے انہوں نے گھر پہ ٹیوشن لگوا کر پڑھایا ہے جی۔ اور سارا خانہ داری کا کام میں کر سکتی ہوں۔ میں سارا گھر سنبھال سکتی ہوں جی ! بس آپ ان کو ایک لاکھ روپیہ دے کر مجھ سے شادی کر لیں ناجی۔ میں..... میں آپ کی بہت خدمت کروں گی جناب !"

اس لڑکی کی باتیں مجھے حیران کرتی تھیں۔ وہ پتہ نہیں کیسے کیسے خواب سجا کر بیٹھی تھی۔ ان لوگوں نے اس کے ذہن میں کیسے کیسے خوبصورت روشن اور تابناک سپنوں کا تانا بانا بن رکھا تھا وہ اسے کسی سے ناسمجھی کی عمر میں خرید لینے کے بعد اس کی بے تحاشا سادگی سے فائدہ اٹھا کر اب تک یہی تاثر دیتے چلے آئے تھے کہ وہ جب ایف اے کر لے گی ، جب وہ ناچ گانا اچھی طرح سیکھ لے گی تو وہ ایک لاکھ روپیہ بطور حق مہر اس کے شوہر سے وصول کر کے اسے اس کے ساتھ رخصت کر دیں گے ——— وہ ایسی سادہ لوح تھی کہ اس ماحول میں رہ کر بھی اب تک حقائق کی سنگینی کا اندازہ نہیں کر سکی تھی اور میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ ان لوگوں نے اسے کیوں میرے سامنے پیش کر دیا تھا۔

اور اب وہ زرینہ کی بھی بھاری قیمت وصول کرنا چاہتا تھا۔ وہ عربی بھی سمجھتی تھی ——— اور فارسی میں بھی شُد بُد رکھتی تھی۔ اس کے نشست و برخاست کے انداز سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ بندو خان نے اسے کسی بہت بڑے مقصد کے لئے بہت ہی عمدہ طریقے سے ایک خاص سانچے میں ڈھال دیا تھا مگر وہ لڑکی مسلسل تنہائی کے گنبد میں بند رہنے کی وجہ سے ذہنی طور پر بہت پسماندہ ہو چکی تھی۔ اور اپنی انتہائی... سادگی کے سبب بڑی حد تک پاگل نظر آتی تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ مجھ سے یوں بات نہ کرتی اور اپنی اس بے پناہ مصیبت کو یوں راحت بنا کر پیش نہ کرتی بندو خان نے اس پر یہ ظلم کیا تھا کہ اس بدنصیب کو سارے جہاں سے الگ تھلگ کر کے اس کی ذہنی ترقی ہی روک دی تھی اور اب اس کا یہ حال تھا کہ وہ نہ خود کو سمجھتی تھی نہ مخاطب کی آنکھ کے بدلتے رنگ کو۔ وہ بالغ ہونے کے باوجود بے شعور اور بے نور تھی۔ اس سے زیادہ بڑا بدنصیب بھلا اور کون ہو گا۔

حیرت مجھے یہ تھی کہ اس نے مجھے اس گھر کے بارے میں اتنی ساری باتیں بتا دی تھیں مگر نہ صابراں نے اسے ٹوکا تھا اور نہ بندو خان نے ہی اس میں کوئی قباحت سمجھی تھی۔ وہ اپنے گھر کا سب سے قیمتی موتی میرے سامنے پھینک کر وہاں سے کھسک گئے تھے۔

ابھی وہ لڑکی مجھ سے باتیں کر ہی رہی تھی کہ مجھے ڈیوڑھی کا دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اس طرح کہ کمبل کو میں نے اچھی طرح بدن پر لپیٹ کر اپنا "چپ شاہ" سیدھے ہاتھ میں تھام لیا۔ وہ لڑکی تیزی سے برتن سمیٹ کر ٹرے میں رکھنے لگی۔ دبی زبان میں بولی "آپ انہیں ایک لاکھ روپیہ ضرور دے دیں ——— میں آج ہی آپ کے ساتھ چل دوں گی نکاح پڑھا کر۔" بالکل پاگل نظر آ رہی تھی وہ مجھے۔ وہ کمرے سے نکلنے لگی تو بندو خان دروازے میں داخل ہو رہا تھا۔

"چائے پلا دی انہیں ؟"

"جی ! جی چچا چچا !" وہ لڑکی تیزی سے بولی اور سمٹ کر باہر نکل گئی۔

"آ جائیں چوہدری صاحب ! ادھر اپنے ہی آدمی ہیں آ جائیں۔" بندو خان نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور اس کے ساتھ ہی ایک پینتیس چالیس سال کا ناٹے قد کا آدمی اندر داخل ہوا۔ وہ بہت خوبصورت قسم کا ہزارائی کا کمبل اوڑھے ہوئے تھا۔ سر پر اس نے مفلر لپیٹ رکھا تھا۔ کمبل کے نیچے اس نے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر باندھ رکھے تھے۔ جونہی وہ اندر آیا اس نے دایاں ہاتھ باہر نکال کر مصافحے کے لئے میری طرف بڑھایا۔ اس ہاتھ میں اس نے تسبیح تھام رکھی تھی۔ میں نے پستول کمبل کے اندر ہی اندر بائیں ہاتھ میں منتقل کر دیا۔

"السلام علیکم ! خاکسار کو غنی کہتے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے میرا ہاتھ بڑی گرمجوشی سے دبایا۔

"جہ " ادھر کوچہ شہباز خان میں رہتے ہیں میرے دوست ہیں " مسیحت " میں کبھی کبھی مل جاتے ہیں۔ قہوہ چلے گا چوہدری جی کہ چائے ؟"

"نہیں بندو خان ! بس محبت کا ایک بول کافی رہے گا یار جی !" یہ کہہ کر وہ آدمی میرے سامنے کی کُرسی پہ بیٹھ گیا۔ وہ برابر تسبیح رولتا نظر آ رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ لب ہلاتا تھا جیسے سبحان اللہ سبحان اللہ کا وِرد کر رہا ہو۔ پاؤں میں اس نے پشاوری چپل پہن رکھے تھے اور شلوار اس کی ہلکے گیروے رنگ کی تھی۔ اپنی وضع قطع کے اعتبار سے وہ کوئی بہت ہی عابد و زاہد قسم کا آدمی نظر آتا تھا مگر اس جیسے پرندے کی بندو خان کے ڈیرے پر یہ آمد و رفت میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ مجھے اس کا اس وقت وہاں آنا کسی طرح بھی اچھا محسوس نہیں ہو رہا تھا میرے دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہونے لگے تھے۔

"آپ کی تعریف ؟" اس پرندے نے تسبیح پر ہاتھ روک کر بندو خان سے پوچھا۔

"جہ " تمہارے " بہت پرانے مہربان ہیں چوہدری جی ! اپنا " تارف " کراؤ نا میاں جی اِن سے ؟"

"جی میرا نام قاضی اسد ہے۔ میں ایک کام کے سلسلے میں ان کے پاس آیا تھا۔"

"اوہ سمجھا۔ آدمی آدمی کا دارو ہوتا ہے میاں جی ! یہ اسکوٹر غالباً آپ کا ہی ہے جو باہر کھڑا ہے۔"

"جی ہاں ! یہ میرا ہی اسکوٹر ہے۔"

"آپ کا دولت خانہ کہاں ہے جناب ؟"

"میں ادھر نارو وال میں رہتا ہوں میرے والد وہاں ہیڈ ماسٹر ہیں ....."

"خوب ! خوب ! پھر تو آپ پڑھے لکھے گھرانے کے چشم و چراغ ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے قدرے توقف کیا اور تسبیح پر ہاتھ روک کر بولا۔ "کب آئے ہیں آپ یہاں ؟ لگتا ہے آپ رات بھر سوئے نہیں ہیں۔ کیوں خان صاحب ! ان کی آنکھیں تو یہی بتاتی ہیں۔"

"ہاں ! میں رات بھر سفر میں رہا ہوں۔ تھوڑی دیر پہلے میں یہاں پہنچا تھا۔" میں نے اپنا چپ شاہ دائیں ہاتھ میں پکڑ لیا مجھے بندو خان گمبھیر قسم کے چکر میں پھنسا چکا تھا۔ وہ بہانے سے کسی باز کو پکڑ لایا تھا۔ تاکہ وہ وہاں سے مجھے پکڑ کر سیدھا بڑے گھر پہنچا سکے

اس نے میرے لئے ایسا ہم رنگِ زمیں دام بچھا دیا تھا کہ مجھے اپنی سلامتی مخدوش نظر آ رہی تھی۔ وہ پرندہ میرا سر سے پاؤں تک گہری نظر سے جائزہ لے رہا تھا اور مجھے یقین تھا کہ وہ پولیس کے سپاہی باہر کھڑے کر کے اندر آیا تھا۔ اس کے لہجے کا وہ بے پناہ اعتماد اور اس کے سوالوں کی وہ پُراسرار تہیں مجھے یہ احساس دلا رہی تھیں کہ وقت میرے خلاف زبردست چال چل گیا ہے اور میرا حال ان کتے کا سا ہے جو مشتعل چوہدریوں کے غیض و غضب سے بچنے کے لئے دارالامان میں جا گھستا ہے اور مارا جاتا ہے۔

مجھے اپنی حماقت پر سخت افسوس ہو رہا تھا۔ وہ وقت جو میں نے اس نیم پاگل لڑکی سے بات چیت میں ضائع کر دیا تھا وہی میری ہلاکت کا سبب بن رہا تھا۔

"ہاں صاحب! کبھی کبھی آدمی کو بڑی عجلت میں اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ کرنا پڑتی ہے۔ کوئی ایسا ہی خاص کام ہو گا جس کے لئے آپ یہاں آئے ہیں؟"

"جی ہاں! مجھے اپنی بہن کی تلاش ہے۔ میں نے سنا ہے کہ وہ یہاں آئی ہے مگر وہ یہاں بھی نہیں ملی۔" میں نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"اوہ! یہ تو بہت بُرا ہوا۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں بندو خان۔ آپ کا دھندا بھی تو کچھ ایسا ہی ہے گڑبڑ گھوٹالے والا۔"

"ایسے ہی وہم تھا ان کو۔ وہ میں نے دُور کر دیا ہے چوہدری صاحب تمہاری دعا سے ایسے نیچ کام نہیں کرتا ہوں میں۔"

اتنے میں صابری دوپٹہ سر پر سنبھالتی اندر آئی۔ وہ ہاتھ میں چائے کی ٹرے پکڑے ہوئے تھی۔ وہ بندو خان نے اس کے ہاتھ سے اُچک لی اور بولا۔

"وہ حقہ تازہ کر کے بھیج دے صابراں اِدھر چوہدری صاحب کے لئے۔"

اس کی یہ بات سن کر صابراں انہی قدموں واپس چلی گئی۔

"ہاں بندو خان نے تو لاعلمی ظاہر کی ہے۔ ٹھہریں میں آپ کو اس کی تصویر دکھاتا ہوں۔ شاید اسے کہیں آپ نے دیکھا ہو۔ تصویر اُدھر اسکوٹر کے خانے میں رکھی ہے میں لاتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں تیزی سے اٹھا اور دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ اس آدمی نے پیچھے سے مجھے یوں پکارا جیسے وہ ایک دم چونک اٹھا ہو۔

"ذرا رک جاؤ میرے بھائی اِدھر تو دیکھو۔" میں دروازے میں پہنچ چکا تھا۔ میں نے گردن پھیر کر کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا تو میرے سارے وسوسے درست ثابت ہوئے۔ وہ مجھ پر پستول تان کر کھڑا تھا اور کمبل اس نے کرسی پر ڈھیر کر دیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے بلا کی عیاری ٹپک رہی تھی۔ وہ بڑے خوفناک انداز سے مسکرا رہا تھا بولا۔

"اتنے بھی چالاک نہ بنو بیٹا کہ اپنے باپ کو بھی پیچھے چھوڑ جاؤ۔" اس کے لہجے میں ایسا استہزا تھا کہ میں جل کر رہ گیا۔ مگر بیشتر اس کے کہ وہ مجھ پر گولی چلانے کا فیصلہ کر سکتا، میں بجلی ایسی سرعت سے ڈیوڑھی میں پہنچا۔ کمرے کے دروازے تک آنے میں اسے تین سیکنڈ لگے اور اتنی ہی مہلت میرے لئے بہت کافی تھی میں نے لمبی چھلانگ لگا کر ڈیوڑھی سے باہر نکل کر بڑا دروازہ اپنے پیچھے اتنی تیزی سے بند کر کے کنڈی چڑھائی کہ جب وہ دروازے پر پہنچا میں اسکوٹر پر بیٹھ چکا تھا مگر وہ اسکوٹر سٹارٹ نہیں ہو رہا تھا۔ معلوم یہ ہوا کہ وہ پرندہ جب بندو خان کے ساتھ اندر آیا تو صورتِ حال کو اچھی طرح سمجھنے کے بعد اس نے اسکوٹر کا پٹرول کھول دیا تھا جس کی وجہ سے وہ بہت بُری طرح "اوور فلو" ہو چکا تھا۔

یہ بڑی خوفناک بات تھی میرے پاس وقت بہت کم تھا میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی تو یہ دیکھ کر میں مطمئن ہو گیا کہ میرے اِردگرد کوئی سپاہی موجود نہیں تھا۔ بندو خان سے یہ غلطی ہوئی تھی کہ وہ تھانے کے دوسرے لوگوں کو خبردار کرنے کے بجائے صرف ایک آدمی کو سادہ کپڑوں میں ساتھ لے کر میرے پاس آ پہنچا تھا۔ وہ اب دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر وہ تو نہیں کھل سکتا تھا دو تین بار انہوں نے دروازے کے تختوں کو آگے پیچھے دھکیلا اور پھر وہاں سناٹا چھا گیا۔ میں ڈرا کہ وہ کہیں چھت پر پہنچ کر مجھے اپنی گولی کا نشانہ نہ بنا لے۔ اس خیال کے آتے ہی میں اسکوٹر کو دھکیلتا ہوا ساتھ کی گلی میں مڑ گیا۔

اب میں بندو خان کے مکان سے دو مکان آگے نکل چکا تھا پٹرول میں نے بند کر دیا تھا کچھ اور آگے جا کر میں نے اس کو بڑے زور سے تین چار کک لگائے اسکوٹر سٹارٹ ہو گیا۔ اس کی بتی جل اٹھی اور میں اس پر بیٹھ کر گلی کے وسط میں بہتی نالی سے بچتا بچاتا آگے نکل گیا کچھ ہی دیر بعد میں سینما کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ اب راستہ زیادہ وسیع اور ہموار تھا۔ پلک جھپکنے میں میں بادشاہی مسجد کے سامنے سے ہوتا ہوا راوی روڈ پر جا پہنچا۔

مگر سوال یہ تھا کہ میں جاؤں تو کہاں جاؤں؟ میری تو کوئی بھی منزل نہیں تھی اور کبری کو میں ہاتھ سے گنوا بیٹھا تھا۔ جب میں بادشاہی مسجد کے سامنے سے گزر رہا تھا تو اس وقت موذن یہ مژدہ سنا رہا تھا کہ "اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْم"۔ راوی روڈ سے ذرا آگے نکل کر مجھے بائیں ہاتھ کی آبادی میں ایک مسجد نظر آئی اور میں نے اسکوٹر کا رُخ اُدھر موڑ دیا۔ اسکوٹر میں نے مسجد کے باہر ایک کونے میں کھڑا کر کے مقفل کیا اور سر جھکا کر بڑے سہمے دل سے مسجد میں داخل ہو گیا۔

جب میں وضو کر رہا تھا تو میری آنکھوں سے سیلِ اشک رواں

تھا کہ میں وہ تھا جو شاید ماں کی دعا اور خدا کے رحم سے محروم ہو چکا تھا مجھے کوئی چھت پناہ دینے کے لئے تیار نہیں تھی۔ کسی چار دیواری میں میرا وجود سما نہیں سکتا تھا اس سے زیادہ بڑی بدنصیبی کسی کی اور کیا ہو گی؟

نماز میں نے جماعت میں شامل ہو کر پڑھی اور وہ صبح شاید ایک عرصے کے بعد ایسی آئی تھی کہ میں نے اپنا سب کچھ سجدے میں ڈال دیا۔ اپنا دل، اپنا دماغ اپنے تمام اعمال میں نے خدا کے سامنے رکھ دیئے۔ میں نے چاہا کہ میں پاگل ہو جاؤں میرا حافظہ مجھ سے چھن جائے میرے سارے تصورات ملیامیٹ ہو جائیں۔ میری ایسی کایا پلٹے کہ میں ایک بالکل ہی نیا اور بدلا ہوا آدمی بن جاؤں ایسا آدمی جو اپنے ماضی سے کٹ چکا ہو جس کو یہ شعور نہ رہے کہ اس کا حال کیا ہے اور جس کو یہ احساس نہ ستائے کہ اس کا مستقبل کیا ہو گا۔ ایسے بھی لمحے میرے خدا تیرے بندوں پر آتے ہیں جب وہ صاحبِ جنوں ہو جانے کی آرزو کرتے ہیں۔ میرا بھی اس گھڑی یہی حال تھا۔ میں کتنی ہی دیر تک سجدے میں سر ڈال کر روتا رہا کہ میری عاجزی اور بے بسی دیدنی تھی۔ جنہیں میں پناہ دینا چاہتا تھا۔ جن کی داد رسی کے لئے میں نے راتوں کے اندھیروں کا جگر چیر دیا تھا۔ جن کو ظلم کے پنجے سے چھڑانے کے لئے میں نے اپنی زندگی داؤ پر لگا رکھی تھی۔ وہ ایسے ہاتھوں میں مجبورِ محض بن کر بیٹھے جن کو توڑ دینا کسی بھی طرح میرے بس میں نہیں تھا میں ایسا پاگل تھا جو ہواؤں کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ میرے پاگل پن کا تو کوئی کنارہ ہی نہیں تھا۔ میری ابتلائیں دیدنی تھیں اور میرا خدا مجھے اپنے حلقۂ کرم سے نکال باہر کر چکا تھا یہی تو وجہ تھی کہ ہر کہیں پر مجھے اپنے سینے میں نیزے کی انی ایسی کوئی چیز چبھتی محسوس ہوتی تھی اور میں ہر جگہ سے بے نیل و مرام واپس آ جاتا تھا۔ میں نہ آسیہ تک پہنچ سکا تھا نہ مجیدن کے لئے ہی کچھ کر سکا تھا اور اب منذرا بھی انہیں سنگین مرحلوں میں سے گزاری جا رہی تھی مگر میں ان میں سے کسی کے لئے بھی کچھ نہ کر سکتا تھا۔ میری اس سے بڑی بدنصیبی اور کیا ہو گی میرے خدا!

بندو خان کی بیٹھک میں بیٹھ کر میں نے طے کر لیا تھا کہ وہاں سے نکل کر میں سیدھا شرفو کے پاس پہنچوں گا اور اسے بدترین منزلوں سے گزار کر میں چھانگا مانگا جاؤں تاکہ وہاں سے میں سردار خان کی آغوش سے مجیدن کو نوچ کر اس کی ماں کے پاس پہنچا دوں مگر اب میری دونوں راہیں مسدود ہو گئی تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ بندو خان اب پولیس کو شرفو کے اِردگرد متعین کرا دے گا تاکہ میں جونہی وہاں پہنچوں وہ لوگ مجھے چھاپ لیں۔ وہ لوگ وہاں تک ہی محدود نہیں رہیں گے بلکہ اُدھر سردار خان کو بھی خبردار کر دیں گے۔ میرے حلیے سے تو وہ آگاہ ہو ہی چکے تھے۔ عین ممکن ہے وہ غنی چوہدری جس کا اصل نام خدا معلوم کیا تھا تھانے کے ریکارڈ پر موجود مجرموں اور مفرور لوگوں کی تصویروں میں میرا چہرہ تلاش کر لے۔ کوئی بھی بات ممکن ہو سکتی تھی۔ ان کے فتنے کسی کو کہاں چین لینے دیتے تھے۔ وہ قانون کے بل بوتے پر زمین آسمان ایک کر سکتے تھے۔

مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا تھا اور میں سوچتا تھا کہ میرے مولا میں کدھر نکلوں؟ کدھر جاؤں؟ کہ میں وہ دیوانہ ہوں جس سے اب دنیا جہان کے لوگ آشنا ہو چکے ہیں۔ میں کس کس کی آنکھوں میں دھول جھونک سکوں گا۔ یہ..... یہ تو تُو نے مجھ پر کہیں زمین تو تنگ نہیں کر دی ہے میرے پروردگار!"

میں سورج طلوع ہونے تک مسجد میں بیٹھا رہا۔ میرا دل دکھ رہا تھا۔ افسوس مجھے اس بات کا تھا کہ میں نے جس ہستی کے لئے بھی اپنے سینے میں درد کی ٹیس محسوس کی وہی ہستی لٹ کر رہ گئی اور میرے لئے ان تک پہنچنا ناممکن ہو گیا۔

اس وقت ساڑھے سات بج رہے تھے۔ مجھے کبری نے بادشاہی مسجد کے دروازے کے سامنے نو بجے ملنے کے لئے کہا تھا اور مجھے ڈر تھا کہ وہ لوگ اس علاقے میں جگہ جگہ پھیل کر میری تلاش میں مصروف ہوں گے مگر صورتِ حال ایسی تھی کہ مجھے بہرحال اس سے مل لینا چاہئے تھا۔ سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ صبح ہوتے ہی اس پٹرول پمپ والے نے پولیس چوکی میں اپنے اسکوٹر کے چھن جانے کی رپورٹ درج کرا دی ہو گی۔ اور اس کا نمبر میری بربادی کا سبب بن سکتا تھا۔

یہ خیال آتے ہی میں مسجد سے نکلا اور اسکوٹر پر بیٹھ کر میں بلال گنج جا پہنچا۔ دکانیں نو بجے کھلتی تھیں مگر وہاں کے کباڑی اپنے کارندوں میں سے ایک آدھ کو وہاں رات بھر کے لئے دیکھ بھال کی خاطر چھوڑ جاتے تھے۔ میں کئی دکانیں چھان چکا تھا تو ایک جگہ مجھے تین چار پرانے اسکوٹروں کے ڈھانچے نظر آئے۔ ان کی حالت دگرگوں تھی۔ انجن شنجن سب غائب تھے مگر ان کی نمبر پلیٹیں ابھی تک صحیح سالم تھیں۔ ایک اسکوٹر تو ایسی حالت میں تھا کہ اسے تھوڑی سی مرمت کے بعد قابلِ استعمال بنایا جا سکتا تھا۔

میں نے اس اسکوٹر کا سودا کر لیا۔ وہ مجھے دو ہزار میں مل گیا اسے میں اسی وقت ایک ریڑھے پر لاد کر داتا دربار کے عقب میں دائیں ہاتھ کے بازار میں ایک مستری کے پاس لے گیا۔

اپنے اسکوٹر کی نمبر پلیٹ میں نے راستے میں توڑ کر پھینک دی اور اس کباڑیے کے سکوٹر کی نمبر پلیٹ اکھاڑ کر ہاتھ میں پکڑ لی یہ سارا سلسلہ خاصا تکلیف دہ ثابت ہو سکتا تھا۔ مستری کی ذرا سی نگہ سے سارا معاملہ خراب ہو سکتا تھا مگر وہ کوئی چشم پوش قسم کا آدمی تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ صورتحال کو سمجھ بھی گیا تھا۔ پھر

بھی اس نے کباڑیے کے اسکوٹر کی نمبر پلیٹ فوراً ہی میرے اسکوٹر پر نصب کر دی۔ ایسے میں نے کہہ دیا کہ اس تباہ حال اسکوٹر کو وہ جس طرح بھی ہو سکے نیا انجن اور دوسری چیزیں ڈال کر استعمال کے قابل بنا دے اس کام کے لئے میں نے ایک ہزار روپیہ اس کے ہاتھ پر دھرا۔ ابھی نو بجنے میں دس منٹ باقی تھے کہ میں اقبال پارک کے سامنے کی سڑک پر سے گزر کر رنجیت سنگھ کی مڑھی کے پاس جا پہنچا۔ اپنا اسکوٹر میں نے وہاں قلعے کے دروازے سے ادھر ایک اسٹینڈ پر رکھا اور کمبل کی بُکل مار کر بادشاہی مسجد کے دروازے کی اوٹ میں جا ٹھہرا۔

مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ کبری ٹھیک نو بجے وہاں پہنچ گیا مجھے سامنے کھڑا دیکھ کر وہ تیز تیز قدم اٹھاتا میرے پاس آ پہنچا اور چھوٹتے ہی بولا۔

"ادھر ٹھہرنا مناسب نہیں ہے استاد! میرا خیال ہے وہ لوگ ادھر ہی آ رہے ہیں۔ اپنا یہ کمبل اتار دو۔"

"کون لوگ؟" میں نے کمبل اسے دیتے ہوئے کہا۔

"ٹبی تھانے کے سپاہی۔ وہ غنی چوہدری بھی ان کے ساتھ ہے۔ وہ خود شاید چونا منڈی کی طرف جا رہا ہے۔"

"تم کیسے جانتے ہو اسے؟"

"وہ آہو صاحب کے پاس آیا کرتا ہے۔ ابھی میں نے ان کے ساتھ چل کر ان کی باتیں سنی ہیں۔"

"کیا کہہ رہے تھے وہ؟" میں نے کبری کو ساتھ لے کر اسکوٹر کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

کبری نے اپنی اونی ٹوپی مجھے دے دی۔ بولا۔

"اسے پہن لو، کچھ تو اپنا حلیہ بدل لو۔ بڑے بدمعاش ہوتے ہیں یہ چار پشیے۔ آدمیوں کو چھان کر رکھ دیتے ہیں۔ وہ غنی کہہ رہا تھا کہ اس نے پہچان لیا ہے وہ جیلانی ہی تھا، بالکل وہی تھا اس نے تمہارا حلیہ کسی تصویر سے ملایا تھا۔ جلدی چل وہ کہیں دیکھ ہی نہ لیں تجھے۔"

میں نے تیزی سے اسے اسکوٹر کے پیچھے بٹھایا۔ میرا کمبل اس نے اوڑھ لیا تھا اور میں نے اپنی وہ چھوٹی سی اسٹین گن کوٹ کے نیچے دبالی تھی۔

اسکوٹر کو بھگاتا ہوا میں اسی وقت راوی دریا پار کر کے نور جہاں کے مقبرے جا پہنچا "نہ چراغ نے گلے" کا دگداز نغمہ گانے والی وہ نور جہاں شاید مٹی کے جس ڈھیر تلے دبی تھی وہ مٹی بھی میرے دکھ کو سمجھتی تھی۔ ایسا ہوا کہ وہاں پہنچتے ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے دل کو سکون میسر آ گیا ہو اور میرے وجود پر طاری خوف کی ساری دھول اتر گئی ہو۔

کبری کو اپنے ساتھ لے کر میں ایک دیوار کی اوٹ میں جا بیٹھا اس رُخ پر جدھر سورج کی دھوپ گھاس پر سے شبنم کے موتی چنتی جا رہی تھی۔ دونوں طرف جب سگریٹ جل چکے تو کبری بولا۔

"استاد! ادھر ہوا کیا تھا آخر؟ وہ غنی اپنے ساتھیوں کو بڑے طیش میں بتا رہا تھا کہ تو اس کو پھر جُل دے گیا۔ قصہ کیا ہوا تھا ادھر؟" میں نے بے کم و کاست ساری بات بتا دی تو وہ بولا۔

"تو قسمت کا دھنی ہے استاد! اُدھر اس چوہدری منظور حسین نے ہوش میں آ کر بہت واویلا مچایا۔"

"آخر اسے انتظار کس کا تھا۔ کس کے لئے اس نے میری زنانہ آواز سن کر دروازہ کھولا تھا۔"

"ایک گشتی ہے اُدھر۔ وہ بہت دنوں سے اس پر ریشہ خطمی ہو رہا تھا۔ پیسے بھی بہت لیتی ہے۔ ہزار سے کم پر بات نہیں کرتی فلموں میں ڈانس شانس بھی کر لیتی ہے۔ اس کو میں آدھی رقم دے آیا تھا مگر کل رات اس کے دو بھائی آ گئے۔ اُدھر اٹک سے۔ وہاں کی رہنے والی ہے وہ! صاعقہ نام ہے اس کا۔ مجھے اس نے کہا کہ چونکہ اس کے بھائی آ گئے ہیں اس لئے وہ ان کو سلا سلو کر بارہ بجے آئے گی۔ چوہدری سے میں نے کہہ دیا کہ وہ بارہ بجے آئے گی بس ذرا وہ اپنے دل کو تھام کے رکھے۔ پھر یوں ہوا کہ میں تو سو ہی گیا تھا اپنے چوہدری صاحب کو بھی نیند آ گئی۔ وہ دل پر ہاتھ رکھ کر سو گئے بیچارے جب دو بجے تم نے آواز بدل کر دستک دی تو وہ باغ باغ ہو گئے مگر پھر تم نے جو ان کی گت بنائی اس پر انہیں بہت غصہ آ رہا ہے۔"

"کیا کہتے تھے وہ چوہدری صاحب؟"

"کوئی ایک بات کہتے تھے استاد! یہ سیر بھر کی موٹی گالیاں دیتے تھے وہ! آہو کو بھی انہوں نے بے نقط سنائیں یہی کہنا چاہیئے نا۔ محاورہ ٹھیک بولا ہے نا میں نے؟"

"ہاں ہاں تو محاورے کو پرے پھینک ..... یہ بتا کہ وہ کہتا کیا تھا؟"

"استاد قسم اللہ کی مزہ ہی آ گیا۔ آہو پر چڑھ گیا وہ راشن لے کر۔ بولا یہ کوئی شریفوں کے ٹھہرنے کی جگہ ہے۔ جو ڈاکو دیکھو اِدھر گھستا چلا آتا ہے۔ آہو بھی نمبری بدمعاش ہے بولا چوہدری صاحب آخر ہوا کیا ہے۔ چوہدری نے اپنی بپتا سنائی تو وہ بولا آخر آپ نے چوہدری صاحب! اتنی رات گئے ادھر سے دستک سننے پر دروازہ کیسے کھول دیا۔ اس سوال کا کوئی جواب نہ دے سکے۔ کچھ دیر تو سر جھکائے بیٹھے رہے تھے پھر بولے اس سؤر کے بچے نے تمہارا نام لیا تھا۔ بس میں نے چٹخنی نیچے گرا دی۔ اس نے آتے ہی میری گردن

دبوچ کر ایسی رگیں ملی تھیں میری کہ بس میں تو فوراً ہی بے ہوش ہو گیا تھوڑا زور وہ اور لگاتا تو میں تو قتل ہو گیا تھا ادھر۔ یہ شہر ہے کہ بدمعاشوں ڈاکوؤں کا گڑھ۔"

"اچھا! اچھا! پھر؟ پھر کیا ہوا؟" میں نے خوش ہو کر کہا معاملہ دلچسپ ہو گیا تھا۔

"پھر کیا ہوتا؟" آہو سوچ میں پڑ گیا پھر کہنے لگا۔ ذرا اپنی گردن تو دکھائیے مجھے چوہدری صاحب! وہ بے چارے تو بہت ہی بھنّائے ہوئے تھے۔ بولے ہاں دیکھ لو بس کٹتے سے بچ گئی ہے میں نے خود بھی اُن کی وہ موٹی سی پلپلی گردن دیکھی۔ ایک رگ پھول کر باہر کو نکل آئی تھی۔ وہ رگ عام طور پر نظر نہیں آتی ہے۔ اس کا یہ حال دیکھ کر آہو مجھے گھورنے لگا اور وہاں سے ہٹا کر وہ مجھے دوسرے کمرے میں لے گیا، بولا معلوم یہ ہوتا ہے کہ رات جیلانی اِدھر آیا تھا میں نے کہا صاب یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ آتا تو مجھے بھلا زندہ چھوڑ جاتا۔ میری اس بات پر وہ کچھ چُپ سا ہو گیا۔ مگر اسے پورا یقین ہے کہ وہ تم ہی تھے۔ میرا خیال ہے وہ تمہارے اس گردن توڑ داؤ کا مزہ چکھ چکا ہے۔"

"ہاں، اس روز یہی نسخہ استعمال کیا تھا۔ میں نے اس پر۔ خیر مگر اب یہ بتا کہ میں کیا کروں؟ مجھے تو ہر حال میں مجیدن کو اس ذلت سے نکالنا ہے۔ اُدھر مسند آرا سے بھی میں ملنا چاہتا ہوں۔"

"دیکھ استاد! میرا خیال ہے کہ تو چھانگا مانگا جانے کا پروگرام ذرا شام تک ملتوی کر دے۔ میں بھی تیرے ساتھ چلوں گا۔ نپٹ لیں گے اس سردار خان سے ہم۔ میں تیرے ساتھ ہوں گا تو تجھے ذرا آسانی رہے گی۔"

"چلو یونہی سہی۔ مگر اس مسند آرا کا کیا کریں؟ مجھے معلوم ہونا چاہیئے کہ اسے کیا مرض ہے؟"

"یہ گڑبڑ کی بات ہے مگر خیر ہم یوں کرتے ہیں کہ تو ابھی ڈاکٹر بخاری کے کلینک میں جا بیٹھ۔ میں اس لڑکی کے ساتھ آتا ہوں میرا خیال ہے کہ آج آہو اسے میرے ہی ساتھ بھیجے گا کیونکہ وہ پانڈے اور اس کے ساتھی کو لے کر شہر سے باہر جا رہا تھا مجھے تو اس نے صبح ہی بتا یا ہے۔"

"بس ٹھیک ہے۔ تو چل میرے پیچھے بیٹھ۔ میں تجھے اُدھر راوی روڈ پر اتار کر ڈاکٹر بخاری کے پاس جا پہنچتا ہوں۔"

"پہلے ایک کام کر۔ اپنی یہ خوفناک مونچھیں تو ابھی منڈوا دے چل اُدھر نائی سے مل لیتے ہیں پہلے۔"

"ہاں یار! ان کی قربانی تو دینی ہی پڑے گی۔" یہ کہہ کر میں اٹھا اور کبری کو ساتھ لے کر شاہدرہ ریلوے اسٹیشن کے باہر بیٹھے ایک نائی کے پاس جا پہنچا۔ اس سے میں نے داڑھی بھی منڈوائی اور مونچھیں بھی صاف کروا دیں ــــ جب دوبارہ میں اسکوٹر پر بیٹھا تو کبری مسکرا رہا تھا بولا "اب تو اتنی جلدی نہیں پہچانا جا سکے گا استاد! اب بے فکر ہو کر چل اور لے یہ کالی عینک بھی چڑھا لے آنکھوں پر۔" میں نے عینک لگائی تو اسکوٹر کی ہوا سے بھی بچ گیا کبری کو راوی روڈ پر اتار کر میں اسکوٹر بھگاتا ہوا ڈاکٹر بخاری کے کلینک جا پہنچا ــــ وہاں مریضوں کی بھیڑ لگی تھی۔ میں نے اس عمارت کے تمام حصے کا اِدھر اُدھر گھوم کر پھر کر اچھی طرح جائزہ لیا اور پھر مسکین سی صورت بنا کر ہال میں بیٹھے مریضوں کے پاس جا بیٹھا کبری نے اچھا کیا تھا کہ مجھے سیاہ عینک اس نے دے دی تھی کیونکہ اب میری نگاہ کا زاویہ کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا البتہ میں بے دھڑک ہو کر ہر ایک کا بغور جائزہ لے سکتا تھا۔

میرے ذہن میں بگولے اڑ رہے تھے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں لداؤ کی چھت پر کھڑا ہوں میرا پاؤں ذرا سا رپٹا تو میں سر کے بل نیچے جا گروں گا۔ کوئی مجھے سنبھالنے والا نہ ہو گا۔ کلینک میں مریضوں کی بھیڑ لگی تھی مگر میں جس چہرے کی تلاش میں تھا وہ ابھی تک مجھے نظر نہیں آیا تھا مسند آرا شاید ابھی تک وہاں نہیں پہنچی تھی مگر کبری مجھے غلط راہ پر نہیں لگا سکتا تھا۔ اس کے دل میں ابھی تک میرے لیے ہمدردی موجود تھی۔ یہ بات اس کی آنکھوں کے رنگ سے ظاہر تھی۔ میں ولی نہیں ہوں مگر دلوں کا حال چہروں پر صاف لکھا ہوتا ہے۔ اسے تو میں پڑھ سکتا تھا۔

میں بخاری کلینک کے بڑے ہال سے گزر کر اس حصے میں جا پہنچا جہاں خواتین بیٹھی تھیں۔ اندر جھانکنا بدتمیزی تھی مگر پھر بھی میں نے دروازہ پیچھے دھکیل دیا۔ آٹھ دس عورتیں بیٹھی تھیں۔ وہ سب کی سب اس طبقے سے تعلق رکھتی تھیں جنھیں توجہ کی محرومی بیمار کر دیتی ہے۔ وہ بھی ایسی ہی تھیں۔ بظاہر تندرست و توانا، مگر اندر سے ٹوٹی ہوئی شکستہ اور بے زار۔ میں نے ایک نظر ان سب کو دیکھ لیا۔ مگر ان میں مسند آراء شامل نہیں تھی۔ وہ ابھی تک وہاں پہنچی ہی نہیں تھی۔ میں ایک بار پھر ہال میں بیٹھے مریضوں کے درمیان سے گزر کر دروازے کے پاس جا ٹھہرا۔ وہ آٹھ فٹ اونچا دروازہ تھا جس میں یہ بڑے بڑے شیشے لگے تھے میری نظریں اب ان کے اوپر سے پھسلتی ہوئی بڑے گیٹ پر جم گئی تھیں۔ وقت ایسا تھا کہ کبری کے اندازے کے مطابق اب تک وہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ ابھی مجھے وہاں کھڑے ہوئے چند منٹ گزرے تھے کہ..... ایک کار تیزی سے اندر داخل ہوتی ہوئی نظر آئی۔ دِل بلیوں اچھل گیا۔ کار آہو چلا رہا تھا اور اس کے پہلو میں اس کی بیوی بیٹھی تھی۔ کار رقص کے زاویے کی طرح لان کی قوس کے متوازی چلی اور

جھوم کر پورچ میں آٹھہری۔

اس کی پچھلی سیٹ پر مسند آراء بیٹھی تھی۔ اس کو دیکھ کر میں سمجھا میں بھک سے اُڑ جاؤں گا۔ وہ مسند آرا ہی تھی۔ وہ ہی چھلا چھلا زلفیں وہی چیرویں لانبی آنکھیں اور اس کے وہی مصحف ایسے رخسار۔ اس کی وہ پیشانی، وہ ابرو، وہ ہونٹ میرے سامنے تھے۔ مگر وہ اس کے چہرے کی تازگی، وہ بشاشت کہاں چلی گئی تھی۔ یہ... یہ مسند آراء کو کیا ہو گیا ہے غلام جیلانی! اس کی آنکھوں کی بہت سی تب و تاب کہاں کھو گئی تھی۔ وہ بہت ہی بجھی بجھی سی نظر آ رہی تھی۔ پہلے سے وہ بڑی حد تک دبلی بھی ہو چکی تھی۔ ایک عجیب سی پیلاہٹ نے اس کی شہابی رنگت کو چاٹ لیا تھا۔

سروری خانم نے گاڑی سے نکل کر اسے پچھلی سیٹ سے اٹھایا اور پھر وہ اسے گام گام سہلا دیتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی۔ آہو گاڑی کو مقفل کر رہا تھا۔ میں ان کی نظروں سے بچنے کے لیے پیچھے ہٹا اور تیزی سے دائیں ہاتھ کی راہداری میں جا ٹھہرا۔ مسند آراء کو ساتھ لے کر سروری خانم خواتین کی انتظار گاہ میں داخل ہوئی تو آہو بھی گاڑی کی چابیاں انگلی میں لہراتا ہوا اندر آ گیا۔ اس نے اچٹتی سی نظر ہال میں بیٹھے مریضوں پر ڈالی اور پھر وہ ایک ڈاکٹر کے کمرے میں جا گھسا۔ میرے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوئی جاتی تھیں۔ میرے اور مسند آراء کے درمیان ایک پتلی سی چوبی دیوار حائل تھی۔ مجھے یقین تھا کہ میں اگر ذرا سا دھکا دے دیتا تو وہ دیوار دھڑام سے نیچے گر جاتی مگر اتنی طاقت اتنا حوصلہ میں کہاں سے لاتا کہ... سروری خانم اور آہو کی موجودگی میں اس تک جا پہنچتا۔ میرے اور اس کے درمیان تو خدا جانے کتنے صحرا حائل تھے۔ اور وہ بیمار تھی۔ اس کا وجود آہستہ آہستہ اپنی توانائیوں سے اپنی بے پناہ چمک چلک سے محروم ہوا جاتا تھا۔ اور ابھی مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ کیوں زندگی پر سے اس کی گرفت کمزور پڑتی جا رہی ہے۔ کیوں اس نے خود کو دوا کے حوالے کر دیا ہے۔ وہ کیوں اتنا سارا زہر پھانکنے پر مجبور ہو گئی ہے۔ کہیں یتیمی کے احساس نے تو اسے نڈھال نہیں کر دیا۔ یہ مجھ سے کیسی غلطی سرزد ہو چکی ہے کہ وہ جو تجھے اور صرف تجھے ہی چاہتی تھی تو نے اسی کے سر پر سے سائبان اتار دیا۔ تیرا وجود بلاشبہ اس شیش ناگ ایسا ہے جیلانی جو جس کو پیار کرتا ہے اسی کو مار دیتا ہے۔ اسے وہ اپنی سانسوں کی راہ سے ایسا زہر پلاتا ہے کہ وہ بالآخر اپنی جان ہار دیتا ہے۔

ایک لحظے کے لیے میں سمجھا میرا وجود میرے اپنے لیے ناقابلِ برداشت ہو گیا ہے۔ آدمی پر اذیت کے ایسے لمحے اتنے بھاری ہوتے ہیں کہ وہ اپنے ادبہ کاری نذار کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ مجھے اپنے آپ سے گھن آنے لگی۔ میں ابھی کچھ سوچ بھی نہ سکا تھا کہ مجھے آہو پھر نظر آیا۔ وہ ایک ڈاکٹر کے ساتھ سامنے کے دوازے سے باہر آ رہا تھا اور ان کا رخ میری ہی طرف تھا۔

خود کو آہو کی نظروں سے بچانے کے لیے میں پیچھے ہٹا۔ اور تیزی سے کلینک کے پچھلے حصے میں جا پہنچا۔ میں مسند آراء سے ملنے اور اس سے بات کرنے کی آرزو میں مرا جا رہا تھا مگر مجھے کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ کلینک کی نچلی منزل تھی۔ اور میرے سامنے ایک راہداری تھی جس کے دونوں طرف بنے کمروں میں مریض لیٹے ہوتے تھے۔ مجھے یہ ڈر تھا کہ کہیں میں آہو کی نظروں میں نہ آ جاؤں اگر ایسا ہو جاتا تو پھر اس روز مسند آراء سے ملنے کے سارے ہی امکانات معدوم ہو جاتے پھر کوئی بھی راستہ کھلا نہ رہتا۔

میں ابھی وہاں کھڑا ہی تھا کہ میری آنکھوں کے سامنے ایک چھماکا سا ہوا۔ کلینک کی عقبی سیڑھیوں کے پہلے قدم پر مجھے ایک صورت نظر آئی اور میرا سارا بدن ٹھٹھر کر رہ گیا۔ ان گنت یادیں میرے ذہن میں کلبلا کر رہ گئیں۔ میرے سامنے ریٹا کھڑی تھی۔ وہی ریٹا جس نے مجھے نئی زندگی دی تھی۔ جس نے مجھے ڈاکٹر دھمن اور عالیہ کی زنجیروں سے آزادی دلائی تھی جس نے ایک طویل راستے پر میرا ساتھ دیا تھا اور شاید میری وجہ سے جس نے بڑے زخم سہے تھے۔ صرف اس لیے کہ وہ... وہ مجھے چاہنے لگی تھی۔ ایک سانپ کی محبت میں مبتلا ہو گئی تھی اور جس نے اسے بالآخر مار ڈالا تھا۔ اپنے زہریلے لمس سے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ وہ دواؤں کی ٹرے ہاتھ میں لیے سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔

میں نے اسے دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ میرا دل بیٹھنے لگا تھا۔ اس جان ہار کی صورت نے میری آنکھوں میں ان گنت صورتیں اجاگر کر دی تھیں۔ وہ بڑی متانت سے زینوں پر تول تول کر قدم دھرتی ہوئی اوپر جا پہنچی اور میری نظروں سے اوجھل ہونے لگی تو میں یوں دیوانہ وار اس کے پیچھے لپکا جیسے اگر وہ کسی اور سمت نکل گئی اور میں نے اسے کھو دیا تو پھر میری آنکھوں کی روشنی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی۔

وہ بڑے پُر وقار انداز سے راہداری میں چلتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی کہ میں پاگلوں کی طرح دوڑ کر اس کے آگے نکلا اور پھر اس کا راستہ روکتے ہوئے دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے بھنویں سکیڑ کر مجھے دیکھا مگر مجھے پہچان نہ سکی۔ وہ ذرا دیر کے لیے ٹھٹکی میری آنکھوں میں پُر اسرار کیفیتوں سے جب وہ کچھ بھی اخذ نہ کر سکی تو بولی۔

"کیا بات ہے۔ آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں؟" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی پلکیں تیزی سے کچھ اس طرح جھپکیں جیسے وہ آنکھوں کے آگے پھیلی دھند کو صاف کر رہی ہو۔ میں مسکرایا تو

اس کے ذہن کا دریچہ کھل سا گیا۔ اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ اس کے ہونٹ حیرت کی فراوانی میں عجیب سے پُر فریب انداز سے کھلے اور وہ اپنی ڈوبتی سانسوں کو سنبھالتے ہوئے بولی۔ "اوہ تم غلام جیلانی! یہ تم ہو!" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے بائیں ہاتھ سے میرا گریبان پوری سختی سے پکڑا اور ٹرے کو بڑی مشکلوں سے دائیں ہاتھ پر سنبھالتی ہوئی وہ مجھے کھینچ کر راہداری کی دوسری سمت لے جانے لگی۔

"میرے خدا! تم آ ہی گئے ہو۔" وہ ہانپ رہی تھی۔ چھ سات دروازوں کے سامنے سے گزار کر اس نے مجھے ایک دروازے پر روکا اور اس کا دروازہ کھول کر اس نے پوری قوت سے کمرے میں دھکیلا۔ ٹرے اس نے دائیں ہاتھ کی میز پر رکھی اور دروازہ اپنے پاؤں کی مدد سے بند کر دیا۔

"تم... تم کہاں چلے گئے تھے جیلانی! یہ تم ہی ہو نا!" اسے اعتبار نہیں آ رہا تھا۔ وہ مجھے سر سے پاؤں تک دیکھ رہی تھی۔ میں سمجھا وہ پاگل ہو گئی ہے۔ کتنی ہی دیر تک وہ دروازے کے پیچھے کھڑی مجھے حیران کرتی رہی جب اس کی وحشت کو کچھ قرار آیا، تو بولی۔

"تمھیں کیسے پتہ چلا کہ میں یہاں ہوں؟" اس نے مجھے دھکیل کر بستر پر بٹھا دیا۔

"میں ایک کام کے سلسلے میں ادھر آیا تھا مجھے کیا پتہ تھا کہ تم یہاں ہو۔"

"میں تو ایک عرصے سے یہاں ہوں۔ تم نے تو مڑ کے بھی نہ دیکھا کہ ریٹا پر کیا گزر گئی ہے۔"

"میں کہاں دیکھتا رہتا ریٹا۔ اُدھر تو مجھ پر قیامت بیت گئی تھی۔ ان لوگوں نے تو مجھے تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ وہ میری بہن آسیہ کو بھی اٹھا کر لے گئے۔ میرے پلے تو کچھ بھی باقی نہیں بچا ہے ریٹا۔ وہ بہت طاقتور لوگ ثابت ہوتے ہیں۔"

"تمھاری بہن! مجھے ساری تفصیلات بتاؤ جیلانی! میں تو تمھیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئی ہوں۔"

"تمھیں میرے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہوا۔"

"نہیں جیلانی! میں تو خود مصیبت میں پھنس گئی تھی۔ مجھے انھوں نے ڈاکٹر عالیہ کے ساتھ میلسی کے اس ڈاک بنگلے سے اٹھایا تو میں سمجھی میری زندگی ختم ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر عالیہ کے غنڈے سوات خان نے چھیمے کو میرے پیچھے لگا دیا تھا۔ تم وہاں سے نکل کر شہر گئے تو وہ آ پہنچے۔ چھیمے کے ساتھ دو غنڈے اور بھی تھے۔ ایک کا نام گھیبا خان تھا اور دوسرے کا جامی۔ وہ ہمیں وہاں سے جب کار میں ڈال کر لاہور لے آئے تو ڈاکٹر عالیہ نے مجھے سوات خان کے حوالے کر دیا۔ وہ میری زندگی کے بدترین دن تھے جیلانی! میں بے بس چڑیا کی طرح اس خبیث کے پنجے میں پھنس کر رہ گئی تھی۔ اس ذلت کو میں کبھی نہ بھول سکوں گی، کبھی نہیں۔"

وہ بہت ہی جذباتی ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھیں بہ نکلیں، بدن پر عجیب سی کپکپی طاری ہو گئی۔ ان دنوں کی تلخ یادوں نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔

"مجھے بتاؤ ریٹا! ساری بات کھول کر بتاؤ۔ میرے انتقام کی فہرست میں وہ نام بھی آنے چاہئیں جن کی وجہ سے تمھیں اتنی ذلت اٹھانا پڑی۔"

"میں... میں تمھیں کیا بتاؤں جیلانی! میں ان سارے ہی مرحلوں سے گزر گئی جو کسی مغویہ کا مقدر ہوتے ہیں۔ وہ سوات خان تو ایک عرصے سے میرے پیچھے لگا تھا۔ مگر میں تو اس کے منہ پر تھوکنا بھی پسند نہیں کرتی تھی۔ مجھے اس شہدے سے نفرت تھی سخت نفرت۔

مجھے اس کی صورت سے گھن آتی تھی۔ مگر مجھے... مجھے وہ زہر بھی پینا پڑا۔ اس نے مجھے ایسی ایسی اذیتیں دیں کہ میں اب کبھی ان کا تصور بھی کرتی ہوں تو لرز جاتی ہوں۔ وہ مجھ سے تمھارا پتہ پوچھتا تھا اور سوال کرتا تھا کہ ملتان میں جیلانی کس کے پاس گیا ہے مگر میں اسے کیا جواب دیتی۔ وہ پوچھتا تھا کہ میں نے جیلانی کو کیوں رہائی دلائی۔ اور کیوں اس کے ساتھ کار میں بیٹھ کر بھاگی۔ میرے پاس ان سوالوں کا کیا جواب تھا جیلانی! میں نے وہ سب کچھ تمھارے لیے کیوں کیا۔ وہاں ایک دو مریض تو نہیں آتے تھے، ہزاروں وہاں سے ہو کر گزر گئے تھے۔"

"ہاں یہ تو ہے۔ مجھے احساس ہے ریٹا۔" میں نے خجل ہو کر کہا۔ اس کی ان گنت مہربانیوں اور نوازشوں کا میں اسے کوئی بھی تو صلہ نہ دے سکا تھا۔

"وہ یہی پوچھتا تھا بدمعاش، جیلانی صاحب، مائی ڈیئر کہ ریٹا تو نے اس پر کیوں اتنی مہربانیاں کیں۔ آخر میں نے کہہ دیا۔ ہاں کہہ دیا کہ مجھے... مجھے اس سے محبت ہو گئی تھی۔" ٹھیک کہا تھا نا میں نے، یہی بات تھی نا؟ ورنہ تم میرے کیا لگتے تھے۔ کیا لگتے تھے تم میرے؟ وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔

"مجھے افسوس ہے ریٹا کہ میں تمھاری مدد کو نہ پہنچ سکا۔"

"نہیں، افسوس کی کوئی ضرورت نہیں ہے مگر وہ صرف تمھارا ہی پتہ نہیں پوچھتا تھا۔ وہ کچھ اور بھی چاہتا تھا وہ ابلیس کا بچہ وہ سوات خان۔ وہ مجھ سے جو کچھ چاہتا تھا، اس کی قدر و قیمت کو میں خوب سمجھتی تھی مگر جب پانی سر سے گزر گیا، جب میری ہمت جواب دے گئی، جب میری جان اور میری قبر

کے درمیان بال برابر بھی فاصلہ نہ رہا تو میں مجبور ہو گئی۔ پھر تم میری نظر سے اوجھل ہو گئے۔ جیلانی! میں۔۔۔ میں ریٹا تو نہیں ہوں۔ میں تو شاید اس کا سایہ بھی نہیں ہوں۔" وہ رونے لگی تھی۔ اس کی آواز کسی زخم سے مس ہو کر لبوں تک آتی تھی۔ اس کی لرزش میرے دل میں گھاؤ ڈال رہی تھی۔ اسے غم تھا بے پناہ غم تھا بے کراں تاسف کہ۔۔۔ کہ وہ اپنا سب کچھ ہار گئی تھی۔ وہ سب کچھ جسے وہ سارے جہاں سے عزیز رکھتی تھی۔ اور جس کی حفاظت وہ اس لیے کرتی تھی کہ وہ میری چاہت میں مبتلا تھی۔ مگر اب وہ اس غم میں گھل رہی تھی کہ اس کے لعل و گہر کسی بدرو میں جا گرے تھے۔

"دیکھ ریٹا! تو میری بات سنے گی نا تو پھر تو مجھے ضرور معاف کر دے گی۔ دیکھ تو تنہا نہیں تھی تیرے ساتھ میں بھی کچلا گیا ہوں۔ یہ آنسو پونچھ دے اور یاد رکھ کہ یہ غلام جیلانی ابھی زندہ ہے اور اسے ان سب لوگوں کے نام یاد ہیں جو تمہاری، اور اس کی تباہی کا سبب بنے ہیں۔" یہ کہہ کر میں نے اسے وہ سب کچھ بتا دیا جو اس سے جدا ہونے کے بعد وقوع پذیر ہوا تھا۔۔۔ وہ تو دنگ رہ گئی۔ بولی۔

"ہائے! تمہیں پھانسی کی سزا ہوئی تھی جیلانی! یہ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ میں۔۔۔ میں دراصل تمہارے بارے میں کسی سے پوچھ بھی تو نہیں سکتی تھی۔ میں اتنی خوفزدہ ہو چکی تھی کہ بیان نہیں کر سکتی۔ وہاں سے نکل کر میں نے اپنی رہائش بھی بدل لی۔ ماں کو میں نے ادھر رائے ونڈ بھیج دیا۔ خادر کلا ہو سے پاس اور خود یہاں ملازمت کر لی۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ تو اس حال کو پہنچ چکا ہے۔"

"بس ابھی کچھ زندگی باقی تھی کہ میں بچ کر باہر نکل آیا۔ اب تو اتنی مہربانی کر کہ مجھے اس مسند آرائے سے ملوا دے۔ میں اس سے دو باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"وہ تو بہت دنوں سے یہاں آ رہی ہے۔ ذہنی مریضہ ہے وہ! علاج تو اس کا ہو رہا ہے مگر اسے کچھ فائدہ نہیں ہوا ہے ابھی تک۔"

"بس تم اسے کسی بہانے ادھر لے آؤ ریٹا! مجھے اس پر بہت ترس آتا ہے۔ وہ میری ہی وجہ سے اس حال کو پہنچی ہے۔"

میں نے ریٹا سے اپنے اس تعلق کو ظاہر نہیں کیا تھا۔ جو میرے اور مسند آرائے کے درمیان قائم تھا۔

"ٹھیک ہے میں دیکھتی ہوں میرا خیال ہے میں اسے کسی بہانے اوپر لے آؤں گی تم ادھر اطمینان سے بیٹھو۔" یہ کہہ کر اس نے دواؤں کی ٹرے اٹھائی اور دروازہ اپنے پیچھے بند کر کے باہر نکل گئی وہ چھوٹا سا کمرہ کلینک کی طرف سے اسے ملا ہوا تھا۔

اس میں ریٹا نے اپنی ضرورت کی ساری چیزیں بھر رکھی تھیں۔ ایک عمدہ سی سنگھار میز تھی جس پر اس نے اپنی آرائش و زیبائش کا سامان بڑے قرینے سے سجا رکھا تھا۔ دیوار میں ایک گہری سی الماری تھی جس میں اس کے کپڑے رکھے تھے۔ دوسری الماری میں اس نے اپنی ضرورت کے برتن سنبھال رکھے تھے۔ کمرے کے پہلو میں ایک باتھ روم تھا جس کی صفائی کی قسم کھائی جا سکتی تھی۔ ہر شے اس نے وہاں بڑی احتیاط سے جھاڑ پونچھ کر سجا دی تھی۔

میں نے شاور کھولا تو معلوم ہوا کہ اس میں گرم پانی آ رہا ہے۔ یہ اچھی بات تھی۔ میں نے دروازہ بند کیا اور کپڑے اتار کر نہانے لگا۔ ایسا اچھا غسلخانہ سامنے ہو تو آدمی پانی سے دور رہنے کے گناہ کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔ دس منٹ کے اندر اندر میں نے غسل سے فارغ ہو کر کپڑے پہن لیے ریٹا ابھی تک واپس نہیں آئی تھی۔

میں نے اس کے چھوٹے سے کمرے میں لگے سوئی گیس کے صاف ستھرے چولہے کے قریب رکھی دھلی دھلائی کیتلی میں پانی ڈال کر اسے چائے کے لئے چولہے پر رکھ دیا۔ وہاں الماری میں بسکٹ بھی تھے اور کیک بھی، ڈبل روٹی بھی موجود تھی اور انڈے بھی۔ ریٹا نے چھوٹی سی گھر گرہستن چڑیا کی طرح وہاں اپنی ضرورت کی ہر شے جمع کر رکھی تھی۔

ابھی میں چائے پی ہی رہا تھا کہ دروازہ بڑی آہستگی میں کھلا میرے سامنے مسند آرا کھڑی تھی ۔۔ مجھے یوں اچانک اس اجنبی جگہ پر دیکھ کر اس کے وہ پھول کی پتیوں ایسے نازک ہونٹ حیرت سے کھلے کے کھلے رہ گئے۔ اس کی آنکھوں نے کئی بار کلک کلک کیا۔ ریٹا نے اسے دھکیل کر آگے کر دیا۔

"آپ ان سے بات کریں۔ میں ابھی واپس آ کر آپ کو نیچے لے جاؤں گی۔" یہ کہہ کر اس نے مسند آرا کو کرسی کے قریب پہنچا دیا۔ یوں جیسے اس حیرتوں کی ماری دھان پان مسند آرا میں خود آگے بڑھنے کی سکت نہ رہی ہو۔ اس کی آنکھیں میرے چہرے پر جمی تھیں۔

ریٹا نے اپنے پیچھے بڑی آہستگی سے دروازہ بند کیا تو میں نے مسند آرا کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ برف ایسا ٹھنڈا ہاتھ تھا۔

"آپ نے مجھے پہچانا نہیں ہے مسند آرا! میں۔۔۔ میں۔ وہی ہوں!"

"آپ نے مجھے بلایا ہے۔ مجھے یہ نرس کہتی تھی کہ میری ایک سہیلی مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔"

"مجھ سے مل کر آپ کو خوشی نہیں ہوئی؟"

"آپ یہاں کیا کرتے ہیں؟ ملازم ہیں یہاں؟"

"ارے نہیں مسند آرا! میں تو آپ سے ملنے کے لئے ادھر آیا تھا۔ اور کوئی صورت ہی نہیں تھی۔ اس نرس کو رشوت دینا پڑی۔"

وہ چپ رہی۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ وہ ذہنی طور پر بہت زیادہ الجھی ہوئی ہے۔ کسی بات کو وہ صاف سیدھے طریقے سے سمجھنے کی صلاحیت سے شاید محروم ہو چکی تھی۔ وہ اب خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کی سرد مہری نے مجھے کچل کر رکھ دیا۔ کسی ہستی سے ایسے کوئی کیا کہہ سکتا ہے جو ماضی کو دفن کر کے کسی مستقبل کو جنم دینے سے قاصر ہو گئی ہو۔

"میری کوئی اور تصویر نہیں بنائی ہے آپ نے؟ میں تو آپ سے بار بار خوابوں میں ملتا رہتا ہوں۔"

"میرے خواب۔۔۔ میرے خواب اندھے ہو چکے ہیں۔ اب مجھے کوئی چیز صاف دکھائی نہیں دیتی۔" اس نے بہت ہی بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں۔۔۔ میں تو دن رات آپ کے خیالوں میں گم رہتا ہوں۔ مسند آرا! مگر لگتا ہے آپ نے مجھے بالکل ہی بھلا دیا ہے۔"

"آپ نے مجھے کس لئے یہاں بلایا تھا؟ جلدی بتائیں۔ باجی اور بھائی جان میرے ساتھ ہیں۔" وہ بہت ہی اکھڑی اکھڑی نظر آ رہی تھی۔ یوں جیسے وہ دو جذبوں کے درمیان تقسیم ہو گئی ہے۔

"میں۔۔۔ میں نے سنا ہے آپ بیمار ہیں؟"

وہ چپ رہی۔ میں چڑ سا گیا۔ کیسے اندھے کنویں کے تارا پانی میں میں اپنا عکس دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"دیکھیں مسند آرا! میں آپ کو خبردار کرنا چاہتا ہوں۔ یہ آہو آپ کا خیر خواہ نہیں ہے۔ اس کی وجہ سے آپ کے والد ہادی علی قتل ہوئے انہیں آہو نے ہی قتل کرایا ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہیں آپ! میں۔۔۔ میں۔۔۔ وہ میرے بھائی جان ہیں۔ ہمارے خاندان کے سب سے بڑے ہمدرد!" وہ تلملا اٹھی ۔۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔ مسند آرا جو کچھ مجھے معلوم ہے اس کی روشنی میں میں آپ سے یہی کہوں گا کہ آپ اس سے بہت محتاط رہیں۔ وہ۔۔۔ وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔ وہ اس جاگیر کے لئے شاید آپ سب کو موت کے گھاٹ اتار دے گا۔"

"میں آپ کی کوئی بات نہیں سننا چاہتی۔ مجھے بھائی جان نے بتا دیا ہے۔ باجی بھی یہی کہتی ہیں۔ آپ۔۔۔ آپ اچھے آدمی نہیں ہیں۔ میں۔۔۔ آپ میرے بھائی جان کے خلاف کوئی بات نہ کہیں!" وہ اچانک کھڑی ہو گئی۔

"مجھے آپ سے کوئی لالچ نہیں ہے مسند آرا! آپ کے لئے میری جان بھی حاضر ہے۔ مگر خدا کے لئے اپنا دھیان رکھیں۔ آپ کی زندگی خطرے میں ہے۔ یہ۔۔۔ یہ دوائیں جو آپ کھا رہی ہیں آپ کو اور زیادہ بیمار کرتی جائیں گی۔ یہ مت کھائیں۔ یہ علاج ترک کر دیں وہ۔۔۔ وہ آہو صاحب آپ سب کا سب سے بڑا دشمن ہے۔" میں نے یہ سب باتیں ایک ہی سانس میں کہہ ڈالیں۔

اس کی قوت برداشت شاید جواب دے گئی تھی۔ وہ پیچھے ہٹی اور دروازہ کھولنے کے لئے اس نے ہینڈل دبایا مگر دروازہ باہر سے بند تھا۔ اس نے اس پر بڑے زور سے مکا مارا تو دروازہ کھل گیا۔۔۔ ریٹا ہانپتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ بولی۔

"چلیں بی بی! میں آپ کو ادھر سے نیچے لے چلتی ہوں۔ آپ کی باجی آپ کو ڈھونڈ رہی ہے۔ میں تو باتھ روم کے بہانے انہیں یہاں لائی تھی جیلانی صاحب!" یہ کہہ کر وہ مسند آرا کو اپنی اوٹ میں لے کر بائیں ہاتھ کی چھوٹی سیڑھی کی طرف نکل گئی۔

اور میں۔۔۔ دروازے میں کھڑا اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ اسے سیڑھی کی پستی نے۔۔۔ نگل لیا تھا تو میں ایک بار پھر ہارے ہوئے جواری کی طرح کرسی میں دھنس کر بیٹھ گیا۔ مسند آرا کتنی بدل گئی تھی۔ اس کی سوچ کے سارے شیشے دھندلا گئے تھے۔ وہ اپنے برے بھلے کی تمیز کھو بیٹھی تھی۔ اور مجھے یقین ہو چلا تھا کہ وہ اپنی موت کے قریب پہنچ چکی ہے۔ آہو کے ذرا سے دھکے سے وہ قبر میں جا گرے گی۔ اور اس طرح اس خبیث کا سارا منصوبہ مکمل ہو جائے گا۔ وہ ہادی علی کی جاگیر پر بلاشرکت غیرے قابض ہو جائے گا۔۔۔ اس کی کامیابی میں اب مجھے کوئی شبہ نہیں رہا تھا کیونکہ وہاں کوئی اس کی راہ میں رکاوٹ بننے والا موجود ہی نہیں تھا۔ ساری مزاحمتیں از خود ختم ہوتی جاتی تھیں اور اس کی سب سے بڑی معاون و دستگیر سروری خانم تھی، مسند آرا کی بڑی بہن۔ اور میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ خون کے رشتے اتنے زہریلے کیونکر ہو جاتے ہیں، کس لئے۔۔۔ آخر کس کے لئے وہ لوگ اس گھر کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ جس نے بظاہر نہ آہو کا کچھ بگاڑا تھا نہ سروری خانم کا۔ یہ راز میری سمجھ میں بالکل نہیں آ رہا تھا۔

دل میرا اجڑ کر رہ گیا تھا میرے سارے خواب درہم برہم ہو گئے تھے ۔۔ مسند آرا کے بارے میں میں یہی سوچتا تھا کہ وہ میرے ہی وجود کا حصہ ہے۔ میری ہی سوچ کا مرئی عکس ہے مگر اس روز اس سے مل کر میرے سارے سپنے کرچی کرچی ہو گئے۔ اس کی ذہنی واماندگی نے اسے شاید ہر شے سے بیگانہ کر دیا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد ریٹا کمرے میں واپس آئی تو وہ مسکرا رہی تھی۔ بولی: "مسٹر جیلانی! یہ کون تھی۔ چیز اچھی چنی ہے تم نے۔ ڈیم بیوٹی فل ہے۔" اس کا چہرہ رقابت کی چغلی کھا رہا تھا۔

"مجھے اس سے ہمدردی ہے ریٹا! میری وجہ سے یہ تباہ ہو کر رہ گئی ہے۔"

"وہ تو تم بتا ہی چکے ہو مگر یہ تو تمہیں کوئی لفٹ ہی نہیں دیتی۔ مسند آرا، ہوتی تو یوں نہ کرتی۔"

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس کی یہ حالت ہو چکی ہے ورنہ اس سے ہرگز نہ ملتا۔"

"خیر دفع کرو۔" بڑی ہنر دیپ "مٹی ڈالو اس پر۔ تم اپنے یہ کپڑے تو بدل لو پلیز! بالکل ڈیم فول لگتے ہو ان کپڑوں میں۔ اِدھر ایک قمیص شلوار پڑی ہے مردانہ۔ بالکل نئی ہے۔ میں نے بہت دن ہوئے تمہارے لئے خریدی تھی۔ رومال بھی ہے اور دیکھو تمہارے لئے میں نے ایک گھڑی بھی خریدی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ جب تم ملو گے تو میں یہ تمہیں تحفے میں دوں گی۔ مگر تم ملے ہی نہیں اور میں ان میں بس عطر لگا لگا کر تھک گئی۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے بڑے سے جستی ٹرنک میں سے میرے لئے مدت سے خریدی ہوئی چیزیں نکال کر بڑی چاہت سے میرے آگے رکھ دیں۔ اس کی آنکھیں اس گھڑی یوں چمک رہی تھیں جیسے وہ ہیرے خرید رہی ہو مگر میں تو پتھر تھا۔ راستے کا پتھر۔ جسے ٹھوکروں نے اور زیادہ بدزیب بنا دیا تھا۔ "ریٹا! تم۔۔۔ میں تمہاری ان مہربانیوں کا کیسے شکریہ ادا کروں؟" میں نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ان تمام کپڑوں میں خوشبو بسی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھوں کے لمس کی تازگی ان میں رچ بس گئی تھی۔ وہ بہت ہی عمدہ کپڑے تھے دو گھوڑا بوسکی کہیں نہیں ملتی مگر وہ اس نے میرے لئے خدا جانے کہاں سے خریدی تھی۔ اسے میرے قد کا۔۔۔۔۔ ناپ یاد تھا۔ ایک ایک لوٗ وہ کپڑے میرے جسم پر پورے اترے۔۔۔ میرا خیال تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے اور محض مجھے مرعوب کرنے کے لئے باتیں بناتی ہے کہ یہ کپڑے اس نے فلاں وقت صرف میرے لئے خریدے تھے مگر ان کو جب میں غسل خانے میں جا کر قدِ آدم آئینے کے سامنے پہن کر باہر نکلا تو میرے سارے شبہات دُور ہو چکے تھے اس نے وہ کپڑے میرے ہی لئے بنوائے تھے۔ وہ مجھے دیکھ کر چہکنے لگی۔

"ونڈر فل! یہ تمہیں ایک دم سج گئے ہیں۔ تم ہو ہی بہت ہینڈسم اور دیدہ زیب۔ لو یہ گھڑی بھی باندھ لو۔ یہ تمہارے ڈیوڈ ڈھیٹا لی کی اولاد کی طرف سے ہے۔" اس نے مجھے میری باتیں یاد دلائیں۔ میں گھڑی پہن چکا تو اس نے اپنے ٹرنک میں تمام کپڑوں کے نیچے رکھا ایک بڑا ہی خوبصورت سا بادامی رنگ کا کمبل نکالا۔ وہ بالکل نیا تھا اور ہرنائی کا بنا ہوا تھا۔ بولی۔۔۔

"یہ لو آج سے یہ کمبل اوڑھا کرو۔ اور یہ بجرہ والوں ایسا مُچورا اتار دو۔ بہت میلا ہو چکا ہے یہ۔ اور اس میں یہ سوراخ بھی ہے۔" اس نے میری ہر شے کا اچھی طرح جائزہ لے رکھا تھا۔ میں نے کوٹ پہن کر اپنے ہتھیار اس کے اندر چھپائے اور کمبل اوڑھ لیا۔

"اب تم کچھ کچھ بندے کے پتر نظر آنے لگے ہو۔ لو یہ خوشبو بھی لگاؤ۔ یہ پروفیسی ہے۔ نئی نئی بازار میں آئی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے مجھے خوشبو میں لبسا کر رکھ دیا۔ وہ مجھ پر زمین کی طرح مہربان ہوئی جاتی تھی۔

"اب بیٹھ جاؤ۔ میں نے کھانے کے لئے کہہ دیا ہے۔ وہ لڑکا ابھی آ رہا ہو گا۔ روسٹ مرغا ملے گا آج۔"

"تم کھانا خود نہیں پکاتی ہو؟"

"نہیں بس چائے کافی ناشتے کے لئے بنا لیتی ہوں ورنہ ادھر کچن بہت عمدہ ہے۔ بڑے بڑے امیر مریض آتے ہیں یہاں۔ غریب آدمیوں کا کلینک تو نہیں ہے نا یہ!"

"وہ مسند آرا، چلی گئی کہ یہیں ہے ابھی؟" میرا ذہن ابھی تک ایک ہی نکتے پر مرکوز تھا۔

"میرا خیال ہے وہ چلی گئی ہو گی۔ مگر وہ بہت دکھی ہے جیلانی! اس کی بڑی بہن لیڈی ڈاکٹر فاخرہ بیگم کو بتا رہی تھی کہ مسند آرا، کی ماں بھی مر گئی ہے۔"

"او لو! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ریٹا۔ یہ کیسے ہو گیا؟"

"مجھے کیا پتہ۔ وہ خود ہی بتا رہی تھی اور میں وہیں کھڑی تھی۔ اس نے کہا کہ مسند آرا، کی ماں ادھر گاؤں میں اپنی حویلی کے اندر کنوئیں کے قریب سے گزر رہی تھی کہ ایک خونخوار کتا ان پر آ پڑا۔ وہ گھبرا کر بھاگیں تو کنوئیں میں جا گریں۔"

"وہ کتا حویلی کا تھا کہ باہر سے آیا تھا؟"

"وہ عورت تو کہہ رہی تھی کہ کتا آہو صاحب کا تھا۔ وہ بہت عرصہ سے انہوں نے وہاں چھوڑ رکھا تھا۔"

"اور آہو صاحب کہاں تھے اس وقت؟"

"وہ وہیں تھے۔ اندر کمرے میں سو رہے تھے۔ وہ جب تک اٹھ کر اس عورت کی مدد کرتے وہ بیچاری ڈوب کر مر چکی تھی۔ وہ بتاتی تھی کہ وہ کنواں بہت گہرا ہے۔"

"تو یہ بات ہے۔ آہو اپنے راستے کی ایک اور رکاوٹ دُور کر چکا ہے۔"

"کیا مطلب؟ تمہارا خیال ہے کہ۔۔۔۔۔"

"ہاں ریٹا! آہو نے جان بوجھ کر یہ سب کچھ کیا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ کتے نہیں پالتا۔ اپنے گھر میں بھی وہ کتا نہیں رکھتا حالانکہ اس کی اُسے بہت ضرورت ہے۔ یقیناً وہ خونخوار کتا کسی نے عمداً خرید کر وہاں لے گیا ہو گا اور موقع ملتے ہی اس نے کتے سے وہ کام لے لیا۔ جو وہ کسی آدمی سے لیتا تو اور پریشانی اٹھاتا۔"

"ایسا خطرناک آدمی ہے یہ آہو!" ریٹا حیرت زدہ سی ہو گئی۔

"ہاں! اس کے جرائم کا تم اندازہ ہی نہیں کر سکتی ہو ریٹا۔ اس نے تو میری بھی زندگی تلخ کر دی ہے میری زندگی اور آزادی

کا بھی وہ دشمن بن چکا ہے۔ میری ہمت پر جو کچھ گزر رہی ہے اس کو وہ ختم کر سکتا ہے مگر نہیں کرے گا۔"

"تم پولیس کو کیوں نہیں بتا دیتے ہو؟"

"تم پاگل ہو گئی ہو ریٹا! میں تو خود پولیس سے منہ چھپاتا پھر رہا ہوں۔ پھانسی کے تختے سے بھاگا ہوا آدمی ہوں۔ میں بھلا یہ راستہ کیسے اختیار کر سکتا ہوں؟"

ابھی میں یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک لڑکا کھانے کی ٹرے اٹھائے اندر آ گیا۔

ریٹا نے میرے لئے واقعی روسٹ مرغا منگوایا۔ کھانے سے فارغ ہونے اور باتیں کرنے میں دن خاصا نیچے جا چکا تھا۔ میرے اور اس کے درمیان کوئی بھی تو پردہ حائل نہیں تھا۔ وہ بولی۔۔۔ "تم ابھی آرام کرو مسٹر جیلانی! میں ڈیوٹی ختم کر کے واپس آ جاؤں گی۔"

"نہیں ریٹا! اب مجھے جانے دو میرے پاؤں میں چکر ہے۔ جب تک آسیہ رہا نہیں ہوتی مجھے چین نہیں آئے گا۔"

"مگر رات تو یہاں رہ جاؤ فضول آدمی!"

"مجھے احساس ہے ریٹا! مگر۔۔۔۔ مگر انتظار کرو۔ میں کسی دن پھر آؤں گا۔ پھر جتنی راتیں کہو گی میں یہاں رہوں گا۔" یہ کہہ کر میں نے جیب سے دس ہزار روپے کی دو گڈیاں نکال کر ریٹا کے ہاتھ میں دے دیں۔

"یہ میری طرف سے رکھ لو ریٹا! پتہ نہیں زندگی مجھے کس طرف لے جائے؟ سب کچھ چھلنی ہو چکا ہے اور چھلنی میں کچھ نہیں رُکتا نہ پانی نہ وقت۔" میری آواز گلوگیر ہو گئی۔ وہ میرے رخسار تھپتھپا کر بولی۔ "جیلانی! یہ کالک میرے منہ پر نہ ملو مجھے روپے کی نہیں تمہاری ضرورت ہے۔ یہ تم رکھ لو۔ تمہیں اس کی بہت ضرورت پڑے گی۔" یہ کہہ کر اس نے روپے میری جیب میں ٹھونس دیے۔

میں نے نوٹ اس کی میز پر رکھے اور اس کے ہاتھوں کو بوسہ دے کر اپنی بھیگی ہوئی آنکھوں کو اس سے چھپا کر باہر نکل آیا۔ اس کی بے لوث اور بے پناہ محبت کی زنجیر بہت بھاری اور بہت مضبوط تھی۔ وہ میرے دل سے اتر کر پاؤں میں بندھ جاتی تو پھر میں کہیں کا بھی نہ رہتا۔ اس جیسی مجھے معلوم تھا روئے زمین پر بس دو چار ہی ہوتی ہوں گی اور کسی مقدر والے کو ہی ملتی ہیں مگر میں اس کا اہل ہی نہیں تھا۔ میرا راستہ بھی تو بہت مختلف اور بہت کٹھن تھا۔ مگر میرے پاس اتنی فرصت کہاں تھی؟ میرے غم مجھے کسی بھی بات کی مہلت نہیں دیتے تھے۔ مجھے تو آسیہ کی رہائی کی فکر نے مار ڈالا تھا اور میرے دل میں اُن گردہ فرد شوں کے خلاف انتقام کی آگ دہک رہی تھی۔ میں بھلا وہاں کیسے رُک سکتا تھا۔

اس کے کمرے کا دروازہ آہستگی سے اپنے پیچھے بند کر کے میں راہداری سے گزر کر نیچے اترا اور کلینک کی عمارت سے نکل کر باہر گیٹ پر جا پہنچا۔۔۔ مجھے اسی وقت اور اسی لمحے ڈاکٹر نفیسہ سے ملنے کی ضرورت تھی۔ میرے دکھ کا درماں اس کے پاس موجود تھا۔

میں باہر نکل کر اپنے اسکوٹر کے پاس پہنچا مگر میری پوری کوشش کے باوجود اسکوٹر اسٹارٹ ہونے پر آمادہ نہ ہوا۔ میں نے جھنجلا کر اس کے ایک زبردست لات رسید کی اور اسے وہیں چھوڑ کر پیدل ہی چل پڑا۔

سڑک پر پہنچ کر جب میں ایک ٹیکسی میں بیٹھ گیا تو یہ دیکھ کر میرا دل بلیوں اچھل گیا کہ اس ٹیکسی کا ڈرائیور وہی تھا جو مجھے، ماجدہ، اور آپی کو لے کر شگری کے مکان پر چھوڑ آیا تھا۔ اس نے ٹیکسی کے اندر کی بتی جلا کر میٹر ٹھیک کیا اور ایک نظر مجھ پر ڈال کر بولا۔

"کدھر چلوں میاں جی؟"

"جیل روڈ کی طرف چلو۔" میں نے اپنی آواز دباتے ہوئے کہا۔ اس نے انجن اسٹارٹ کیا اور ٹیکسی کا رُخ موڑ کر دوسری طرف چل دیا۔ جب ہم نوّر مال روڈ پر سے اُتر کر آگے یونیورسٹی گراؤنڈ کی طرف نکلے تو وہ بولا۔

"آپ نے آج کا اخبار پڑھا ہے میاں جی؟"

"نہیں تو! کیا ہے آج اخبار میں؟"

"پولیس اس ٹیکسی کی تلاش میں ہے جس میں بیٹھ کر دو ڈاکو اور ایک عورت ادھر بند روڈ پر سے کل فرار ہوئے تھے۔"

"کون لوگ تھے وہ؟" مجھے اس بڈھے پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ اُس کا لہجہ بہت ہی خوفناک تھا۔

"یہ تو مجھے نہیں معلوم میاں جی! پر وہ لوگ ادھر چوبرجی کے پچھلے محلّے میں کوئی واردات کرنے آتے تھے۔ انہوں نے پولیس کے سپاہیوں کو بے بس کر کے ایک مکان میں بند کیا اور پھر ان کی جیپ لے کر بھاگ نکلے۔ بند روڈ پر پہنچ کر انہوں نے جیپ چھوڑ دی اور ایک ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔"

"اچھا؟ اس ٹیکسی کا پتہ چلا ہے انہیں کہ نہیں؟"

"پتہ تو چل سکتا تھا میاں جی، پر میں نے انہیں کچھ نہیں بتایا۔"

"تمہارا کیا تعلق ہے اس معاملے سے؟"

"وہ میری ہی ٹیکسی تھی اور ان سواریوں میں سے ایک کو میں نے پہچان بھی لیا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"آپ نے مونچھیں منڈوا لیں یہ اچھا کیا میاں جی۔ مگر میں نے آپ کو پہچان لیا ہے۔"

اس کی یہ بات سنتے ہی میں نے اپنا جیب شاہ نکال کر اگلی دو سیٹوں کے درمیان سے ہاتھ آگے لے جا کر اس کی پسلی سے لگا دیا۔

"میرا خیال ہے کہ یہ پستول تمھارے لیے اچھا استاد ثابت ہوگا۔"

میری یہ بات سُن کر وہ مسکرا دیا۔

ذرہ بھر بھی خوف اُس کے چہرے پر نظر نہیں آ رہا تھا۔ اسٹیرنگ پر اُس کی گرفت ویسی ہی نرم رہی جیسی تھی۔ بڑے پُراعتماد لہجے میں بولا۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے میاں جی! آپ جیسے درویشوں کا تو میں ویسے ہی ہاتھ بندھا غلام ہوں۔ میں نے آپ کو... پہچان تو لیا ہے مگر آپ کو مجھ سے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔"

"کیا مطلب ہے تمھارا؟ میرے ساتھ تم یہ چوہے بلی کا کھیل مت کھیلو۔ سمجھے؟"

"یہ بات نہیں ہے میاں جی! مجھے نہ آپ سے کوئی دشمنی ہے، نہ پولیس سے کوئی انعام چاہیے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ آپ فوراً یہ شہر چھوڑ دیں۔ اخبار میں تصویر بھی چھپی ہے آپ کی۔ جیلانی نام ہے نا آپ کا؟"

"ہاں! مگر، مگر... تمھیں یہ سب کیسے معلوم ہوا؟"

"انھوں نے لکھا ہے کہ آپ جیل سے بھاگے ہوئے وہی آدمی ہیں جنھیں پھانسی کی سزا ہو چکی تھی۔"

"اچھا؟ تو یہ قصہ ہے۔ اور کیا لکھا ہے اخبار میں؟"

"انھوں نے کہا ہے کہ اس آدمی کو گرفتار کروانے والے کو پچاس ہزار روپیہ انعام دیا جائے گا۔ سودا بہت اچھا ہے میاں جی، پر یہ میری قسمت میں نہیں ہے۔"

میں نے پستول پیچھے ہٹا لیا۔ اس آدمی کی باتوں نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ نگاہیں اس کی سامنے سڑک پر جمی تھیں اور ایک بار بھی میں نے اُس کے اسٹیرنگ پر جمے ہاتھوں میں لرزش نہیں دیکھی تھی۔ وہ بڑے مضبوط دل و دماغ کا آدمی تھا۔ مجھ سے وہ یوں بات کر رہا تھا جیسے کوئی معمر آدمی بچے کو سمجھا رہا ہو کہ اُسے کیا کرنا چاہیے۔

"تم وہ انعام کیوں نہیں لے لیتے؟ کیوں نہیں ہے وہ تمھاری قسمت میں؟"

"نہیں میاں جی! میں تھوکتا بھی نہیں ہوں اس انعام پر۔ میرا تو یہ ایمان ہے کہ پھانسی کی کوٹھری تک زیادہ تر وہ لوگ پہنچتے ہیں جن کے ساتھ کوئی ایسی ہی بے انصافی ہو چکی ہوتی ہے۔ کوئی ایسا ہی ظلم سہہ چکے ہوتے ہیں وہ کہ اس کا بدلہ نہ انھیں قانون دلوا سکتا ہے نہ کوئی اور۔ یہی بات ہے نہ میاں جی!"

"ہاں! تم ٹھیک کہتے ہو بڑے میاں! مجھے... مجھے افسوس ہے کہ میں نے تم پر پستول تان لیا تھا۔"

"کوئی بات نہیں میاں جی! اللہ تمھیں ہر مصیبت سے بچائے۔ مجھے تمھاری جوانی پر ترس آتا ہے۔ کوئی بڑا ہی دُکھ جھیلا ہوگا تم نے جو اس تختے تک جا پہنچے جس پر سے آدمی اترتا ہے تو اس کے پلے حسرت کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا۔"

"تمھیں مجھ سے اتنی ہمدردی کیوں ہے بڑے میاں؟"

"بس... مجھے... نفرت ہے اس سارے سلسلے سے میاں جی۔ کوئی جب پھانسی تک پہنچا دینے والا کام کرتا ہے تو اس کی کوئی بڑی ہی وجہ ہوتی ہے نا! میاں جی میرے اکمل کی بھی کوئی بات نہیں سنی تھی ان لوگوں نے۔"

"یہ اکمل کون تھا بڑے میاں؟"

"میرا بیٹا تھا۔ تمھاری طرح بڑا کڑیل جوان تھا۔ اُس کی بیوی اغوا کر لی تھی... اس کے ایک دوست نے۔ بس یہی روگ کھا گیا اُسے۔ اکمل نے ایک دن ان دونوں کو بازار میں دیکھ لیا۔ غیرت کھا کر اس نے ان کو وہیں ڈھیر کر دیا اور چڑھ گیا سُولی۔ میری ساری عمر کی کمائی لوٹ لی انھوں نے۔"

ڈرائیور کا لہجہ بہت ہی زخم خوردہ اور درد بھرا تھا۔ اب ہم جیل روڈ پر پہنچ چکے تھے۔

"بس یہیں اُترنا ہے مجھے بڑے میاں۔ میں تمھارا کس طرح شکریہ ادا کروں۔ تم ایسا بڑا آدمی میں نے آج تک نہیں دیکھا۔"

"نہیں میاں جی! میں تو کچھ بھی نہیں ہوں۔ تمھارے پیروں کی خاک دھول کے برابر بھی نہیں۔ اللہ تمھاری زندگی کی حفاظت کرے۔ میں اُدھر بکی ٹھٹھی میں رہتا ہوں، مسجد کے پاس — پیرو کہتے ہیں مجھے۔ کبھی کسی مصیبت میں گھر جائیں تو میرے پاس چلے آئیں یا مجھے یاد کرلیں۔ شاید میں کچھ آپ کے کام آسکوں، مجھے لگتا ہے آپ بہت دکھی ہیں میاں جی۔ یہ لیں یہ آج کا اخبار ہے اسے ضرور پڑھیں۔"

میں نے اخبار اس سے لے لیا اور پھر جیب سے پانچ ہزار روپے... کی گڈی نکال کر اس کے ساتھ کی سیٹ پر رکھ دی۔

"یہ میری طرف سے رکھ لو بڑے میاں! اور مجھے اپنا بیٹا سمجھو۔ کبھی مجھے راستہ ملا تو تمھارے پاس ضرور آؤں گا۔" یہ کہہ کر میں ٹیکسی سے اُتر گیا۔

"نہیں نہیں، یہ آپ اپنے پاس رکھیں میاں جی۔ آپ کی ضرورت مجھ سے زیادہ بڑی ہے۔" اس کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی مگر میں تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا سڑک سے اتر کر درختوں کے جھنڈ تلے پھیلی تاریکی میں گم ہو گیا۔ مجھے ڈاکٹر نفیسہ سے ملنا تھا۔ اُن سے پوچھنا تھا کہ آسیہ کو ان لوگوں نے کیوں ایسی افراتفری میں راولپنڈی منتقل کر دیا۔ آخر ایسی بھی کیا جلدی تھی انھیں۔ ایک کمزور سی، بے بس و مجبور لڑکی کو وہ کیوں اس طرح اتنی ساری اذیت دے رہے ہیں؟

ڈاکٹر نفیسہ کے بنگلے کی بتیاں روشن تھیں۔ باہر لان میں دھند پھیلی ہوئی تھی جس نے ماحول کو بہت ہی پُراسرار دلکشی بخش دی تھی۔ وہ پرانی طرز کے بنگلے کچھ اس طرح بنے تھے کہ ارد گرد پھیلے اونچے اونچے پیڑوں نے سارے علاقے میں ایک جنگل ایسی فضا پیدا کر دی تھی۔ ہر طرف گمبھیر سناٹا طاری تھا۔ جب میں نے بڑے گیٹ پر لگی اطلاعی گھنٹی بجائی تو میرے دل میں کہیں بس جانے کسی ایسے ہی رُوح پرور ماحول میں بھیدوں بھرے بنگلے میں کسی غمگسار اور دمساز ہستی کے ساتھ آباد ہو جانے کی آرزو ہُوک بن کر اُٹھ رہی تھی۔ اپنی اس دربدری اور آوارگی پر مجھے افسوس ہو رہا تھا۔ دکھ یہ تھا کہ کوئی دہلیز ایسی نہ تھی جسے میں اپنی کہہ سکتا۔ اس سے بڑی بدنصیبی اور کیا ہو سکتی تھی۔

ڈاکٹر نفیسہ کے بنگلے کی کھڑکیوں میں لگے اندھے شیشوں سے بہت ہلکی روشنی باہر آ رہی تھی۔ دوسری بار میں نے گھنٹی بجائی تو برآمدے کا بلب روشن ہو گیا۔ کچھ ہی دیر بعد نفیسہ کا بوڑھا ملازم باہر آیا اور تیز تیز قدم اُٹھاتا مجھ تک آ پہنچا اور مجھے غور سے دیکھ کر بولا۔

"اوہ چوہدری صاحب آپ! ڈاکٹر صاحبہ نے بھی آپ کا بڑا انتظار کیا۔ ٹھہریں میں انہیں اطلاع دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ انھی قدموں واپس چلا گیا۔ جب وہ دوبارہ برآمدے میں نمودار ہوا تو مجھے سامنے کے دروازے میں نفیسہ بھی نظر آ رہی تھی۔

میں ملازم کے ہمراہ جب بنگلے کا لان عبور کر کے عمارت کے دروازے پر پہنچا تو ڈاکٹر نفیسہ مجھے راستہ دیتے ہوئے بولی۔

"آپ کل کیوں نہیں آئے چوہدری صاحب۔ مجھے بہت انتظار رہا آپ کا۔"

"مجھے افسوس ہے ڈاکٹر صاحبہ! کچھ ایسا ہی کام پڑ گیا تھا جس کی وجہ سے میں وعدے کے مطابق ادھر نہ آسکا۔" میں نے اپنے لہجے میں سارے جہاں کی شائستگی پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ڈاکٹر نفیسہ کچھ ایسی ہی اسم بامسمیٰ تھی کہ اس کے سامنے میں خود کو بہت ہی ہیچ اور میلا محسوس کر رہا تھا۔ اس جیسی خوش لباس عورت میں نے کہیں نہیں دیکھی۔ میرا خیال ہے کہ اُس کے بدن پر ہر شے سج جاتی تھی — اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اس قدر سج سنور کر اور اتنی ساری خوشبوؤں میں بس کر کس لیے اور کس کے لیے رہتی ہے۔

اس نے بے تکلفی سے اپنا وہ کومل سا ہاتھ آگے بڑھا کر میرا دایاں ہاتھ پکڑا اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی مجھے اپنے ڈرائنگ روم میں لے گئی۔ بولی۔ "جاؤ بابا ان کے لیے عمدہ سی کافی تیار کر کے لاؤ۔ میرا خیال ہے آپ کو سردی بہت لگتی ہے۔" وہ صوفے کی دوسری کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"جی... جی... نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔" میں اس کے لہجے کی بے تکلفی پر جھینپ سا گیا۔

"یہ کمبل تو یہی بتاتا ہے۔ ہر وقت اوڑھے رہتے ہیں آپ۔"

"اوہ، یہ کمبل! دیہاتی آدمی ہوں نا۔ وہاں ہر آدمی اپنے اوپر کوئی نہ کوئی چیز اس موسم میں اوڑھے رہتا ہے۔ آپ کو اچھا نہیں لگتا تو اتار دیتا ہوں۔" میں نے اس کی بے تکلفی سے شہہ پا کر ایک خاص زاویے سے بات کہی۔

"ارے نہیں چوہدری صاحب! یہ اچھا لگتا ہے آپ کو۔ میں تو ویسے ہی کہہ رہی تھی۔ مجھے تو... چھوئی موئی قسم کے آدمی، ویسے ہی زہر لگتے ہیں۔ آدمی کو ذرا بھاری بھرکم اور رعب دار ہونا چاہیے۔ نزاکت وغیرہ قسم کی چیزیں تو عورتوں ہی کو بھلی لگتی ہیں۔"

"میں آپ کا شکرگزار ہوں۔ آپ میرا مان بڑھا رہی ہیں۔ کچھ ہماری مشکل کا حل بھی سوچا ہے آپ نے؟"

"مجھے افسوس ہے چوہدری صاحب! کہ ابھی میں کچھ بھی نہ کر سکی تھی کہ انھوں نے آسیہ کو راولپنڈی بھیج دیا۔"

"ایسا کیوں کیا ہے انھوں نے؟"

"میں نے سُنا ہے کہ انھوں نے راتوں رات آسیہ کو دو اور قیدی عورتوں کے ساتھ پنڈی بھیج دیا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ نے مجھے بتایا تھا کہ ان کے بارے میں احکامات رات کے دس بجے موصول ہوئے تھے۔"

"آسیہ تو قتل کے جرم میں بند ہے پھر کیا بات تھی؟"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر معاملہ کچھ اس سے زیادہ سنگین لگتا ہے۔"

"کیا وہ شروع ہی سے آسیہ کو اتنی اہمیت دیتے تھے؟"

"نہیں، پہلے تو میں نے ایسی کوئی سرگرمی وہاں نہیں دیکھی تھی اور آسیہ بھی عام قیدیوں ایسی لگتی تھی۔ میں کئی بار اس کا طبی معائنہ کر چکی ہوں۔ ایک مہینہ پہلے اس کے پیٹ میں درد اٹھا تھا تو میں نے اسے دوا دی تھی۔ بڑی خوبصورت لڑکی ہے وہ اتنی خوبصورت ہے کہ... مجھے اس پر رشک آتا تھا۔"

"اس پر ترس نہیں آتا تھا؟" آسیہ کے ذکر پر میں نے دل کی بے ترتیب ہوتی ہوئی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"کیوں نہیں۔ وہ بات کرتی ہے تو لگتا ہے جیسے اس کے منہ سے پھول جھڑ رہے ہیں۔ آپ مل کیوں نہیں لیتے اُسے؟ ملاقات کی تو اجازت ملی ہوگی آپ کو؟"

"بس کچھ ایسی ہی بات ہے ڈاکٹر صاحب! کبھی کبھی آدمی کی بدنصیبی اسے کچھ بھی کرنے نہیں دیتی۔" میں نے اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"یہ خوشبو کون سی لگا رکھی آپ نے؟ سارا کمرہ مہک اٹھا ہے کوئی فارن سینٹ ہے۔" اس نے میرے چہرے پر کرب کے آثار دیکھ کر موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

"میرے ایک دوست نے یونہی مذاق مذاق میں آدھی شیشی انڈیل دی تھی میرے اوپر۔ آپ کو پسند آئی یہ خوشبو؟"

"ہاں! بہت عمدہ خوشبو ہے یہ۔ میرا خیال ہے کہ اب میں آپ کو وہ رقم لا دوں جو آپ مجھے دے گئے تھے۔" ایک لحظہ کے لیے میں نے اس کی چمکتی جھلکتی شخصیت کو آنکھوں کی راہ سے دل کے نہاں خانے میں لے جا کر دیکھا۔ وہ مجھے اس اداس اور ویران شام کے اس اجڑے کونے میں ایک بیش بہا خزانہ معلوم ہو رہی تھی۔ میں اس کے سحر میں مبتلا ہوتا جا رہا تھا۔ اور اس کی بھید بھری بے تکلفی مجھے یہ احساس دلا رہی تھی کہ وہ میری آمد پر بے حد خوشی محسوس کر رہی ہے۔ میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا تو وہ قدرے توقف کے بعد پھر بولی۔

"لا دوں وہ رقم! میں نے گھر میں ہی سنبھال رکھی تھی۔ اس خیال سے کہ اگر لینے کے دینے پڑ گئے تو میں آپ سے شرمسار تو نہ ہوں گی۔"

اس کی یہ بات سن کر میری محویت کا شیشہ تڑاخ سے ٹوٹ گیا۔

"نہیں نہیں ڈاکٹر! میں وہ رقم تو واپس لینے نہیں آیا۔ اس کی حیثیت ہی کیا ہے آپ کے خلوص کے سامنے۔ آپ تو ایسی ہیں کہ ایسی ہزار ہا رقمیں آپ پر قربان کی جا سکتی ہیں۔" میں نے یہ بات کچھ بے ساختہ لہجے میں کہی کہ وہ چہرے پر نظریں جما کر مجھے چند لمحوں تک عجیب سے مبہوت انداز میں دیکھتی رہی اور پھر بہت سوچ سوچ کر بولی

"معلوم ہوتا ہے آپ بہت امیر آدمی ہیں جب ہی پیسے کی کوئی پروا ہی نہیں ہے آپ کو۔ وہ بیس ہزار روپیہ ہے بابا۔ میری چھ مہینے کی تنخواہ سے دگنا۔"

"ہو گا۔ مگر آپ نے مجھے جو عزت بخشی، جس خلوص سے آپ نے مجھے یہاں بٹھایا، جس طرح آپ نے میرے مسئلے پر بات کی ہے اس کے مقابلے میں تو اس کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے ڈاکٹر! آپ کو کیا پتہ کہ میرے دل میں آپ کی کتنی عزت پیدا ہو گئی ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے چوہدری صاحب مگر جب میں آپ کا کام نہیں کر سکی تو اسے میں کس طرح رکھ سکتی ہوں؟"

"اس رقم کا ذکر رہنے دیں۔ مجھے کوفت ہونے لگی ہے۔ مجھے یہ بتائیں کہ آپ راولپنڈی میں ہماری کوئی مدد کر سکتی ہیں؟"

"دیکھیں وہاں ڈاکٹر علی نواز موجود ہیں، مگر میرا خیال ہے وہ آپ کے کام نہیں آ سکتے۔"

"لیڈی ڈاکٹر بھی تو ہو گی۔"

"ہاں، مگر وہ وہاں جز وقتی کام کرتی ہے ڈاکٹر خالدہ۔ لیکن اس سے بھی میں واقف نہیں ہوں۔ اور پھر جس دلیری سے آپ نے یہ معاملہ مجھ سے طے کر لیا تھا کوئی اور ہوتی تو آپ پر کبھی اعتبار نہ کرتی۔"

"یہ ہماری خوش قسمتی تھی۔"

"میں نے بھی کبھی ایسے کام میں ہاتھ نہیں ڈالا مگر آپ کی حد سے زیادہ پریشانی دیکھ کر میں نے ہامی بھر لی تھی۔"

"اب کیا کرنا چاہیے۔ ہم تو بہر حال اس کی رہائی چاہتے ہیں۔"

"دیکھیں وہاں ایک صاحب ہیں سردار من گردیزی، اُن کا پتہ میں آپ کو لکھ دیتی ہوں۔ آپ اُن سے جا ملیں میرا خیال ہے وہ آپ کی مدد کر سکیں گے۔"

"کیا کام کرتے ہیں وہ؟"

"وہ پولیس افسر ہیں اور جیل کے حکام سے اُن کا ہر وقت واسطہ رہتا ہے۔ آپ بس میرا نام لیں اُن کے سامنے۔ وہ جو کچھ ہو سکا ضرور کریں گے۔" یہ کہہ کر اس نے دائیں ہاتھ کی تپائی پر سے جہاں ٹیلیفون بھی رکھا تھا، ایک کاغذ لے کر مجھے ان صاحب کا پتہ لکھ دیا۔ میں نے دل میں کہا۔ وہ تو میری شکل دیکھتے ہی مجھے دھر لے گا۔ ایسا رگڑا لگائے گا کہ میرے چھکے چھوٹ جائیں گے پھر بھی میں نے ڈاکٹر نفیسہ پر ظاہر نہ ہونے دیا کہ مجھے اس کی اس تجویز سے اتفاق نہیں ہے۔

اتنے میں اس کا ملازم کافی لے آیا۔ ڈاکٹر نے اٹھ کر خود پیالی میرے سامنے رکھی اور بولی۔

"آپ کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں؟"

"میں... میں ادھر انٹرنیشنل ہوٹل میں ٹھہرا ہوں۔" میں نے سٹپٹاتے ہوئے فوراً ہی ایک اونچے ہوٹل کا نام لے دیا۔ اس سوال کے لیے میں قطعاً تیار نہیں تھا۔

"کیا مزہ آتا ہو گا وہاں۔" وہ میرے سامنے ہی میز کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔

"مزہ تو اپنی قسمت میں ہی نہیں ہے ڈاکٹر صاحب۔"

"کیوں؟ اتنے بڑے زمیندار ہیں آپ۔ کس چیز کی کمی ہو سکتی ہے آپ کو۔"

وہ مسکرا رہی تھی۔ اس کی سنہری فریم کی عینک میں لگے صاف شفاف شیشوں کے پیچھے اس کی آنکھیں بول رہی تھیں۔

"وہ تو ٹھیک ہے مگر یہاں تو ہوٹل ہی میں ٹھہر سکتے ہیں۔"

"آپ اپنی بیگم کو ساتھ لے آئے ہوتے۔"

"اجی نہیں! ابھی تو اس چکر سے بچا ہی ہوا ہوں آپ کی دُعا سے۔ اپنے ہاتھ میں شادی کی لکیر ہی نہیں ہے۔"

"اچھا؟ دکھائیں تو اپنا ہاتھ۔"

میں نے اپنا ہاتھ پھیلا دیا۔ وہ میری ہتھیلی کو بڑے غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"اوہ، کتنا مضبوط ہاتھ ہے آپ کا، اور روپیہ بھی آپ کی قسمت میں بہت ہے۔"

"اچھا؟ اور شادی؟"

"وہ تو ہے ہی۔ مگر... مگر آپ کسی سے وفا نہیں کر سکتے ہیں۔"

"جی نہیں! کوئی آزمائے تو سہی ہمیں! کُتّے سے زیادہ وفادار ثابت ہو سکتے ہیں ہم۔ مگر یہ کُتّے کی صفت آدمی میں کچھ اچھی نہیں لگتی۔" میں نے جان بوجھ کر اسے انگیخت کیا۔ میرا دل کہتا تھا کہ وہ عورت مجھے آسیہ کی رہائی کے سلسلے میں بڑی مدد دے سکتی ہے، اور اب میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ وہ جذباتی طور پر مجھ سے وابستہ ہوتی جا رہی ہے۔

میری بات سن کر وہ کھلکھلا کر ہنس دی اور کرسی گھسیٹ کر میرے پاس بیٹھتی ہوئی بولی۔

"آپ کے خیال میں وفاداری کُتّے کی خصلت ہے؟"

"جی بالکل! میں تو سمجھتا ہوں کہ تمام خوبصورت عورتوں کو بہت سخی اور فراخ دل ہونا چاہیے۔ سورج کی طرح انہیں فیاض، اور چاندنی کی طرح مہربان ہونا چاہیے۔"

"اُف اللہ! کیسی عجیب باتیں کرتے ہیں۔ فرض کریں کہ میں خوبصورت ہوں، فرض کریں، حالانکہ میں نہیں ہوں۔"

"کیوں نہیں۔ آپ کی خوبصورتی کی تو قسم کھائی جا سکتی ہے۔"

"بس بنائیے نہیں ہمیں، آپ... کافی پئیں... ٹھنڈی ہو رہی ہے۔" اس نے اچانک موضوع بدلتے ہوئے میز پر سے پیالی اٹھا کر منہ سے لگائی۔

"پئیں نا! ابھی تو آدھی پیالی باقی ہے۔"

"یوں نہیں۔ اب یوں نہیں پیوں گا جناب۔"

"کیسے پئیں گے پھر۔ زبردستی پئیں گے۔"

"آپ کے ہاتھ سے۔ ورنہ نہیں۔"

"ایک شرط پر۔"

"وہ کیا؟"

"آپ کو ہوٹل چھوڑ کر یہاں ٹھہرنا پڑے گا۔"

"آپ کا ملازم کیا کہے گا؟"

"وہ میرا وفادار ملازم ہے۔"

"اور میرے وہ بھائی صاحب؟"

"انہیں بتا کر آئے ہیں آپ؟"

"نہیں۔"

"بس تو پھر انہیں خط ڈال دیجیے کہ آپ ایک ہفتے تک واپس نہیں آ سکتے۔"

"اتنے دن؟"

"ہاں! اس عرصے میں شاید میں آسیہ کے لیے کوئی بڑی تدبیر سوچ سکوں۔"

"ٹھیک ہے جناب!"

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد اس نے مجھے اپنی خوابگاہ میں پہنچا دیا اور بولی۔ "اب آپ سو جائیں صبح ملاقات ہو گی۔"

میں نے بتی بجھا کر اپنے ہتھیار اس کی الماری کے پیچھے رکھے اور شلوار اتار کر ایک چادر باندھ لی کمبل کوٹ، کرتا اور شلوار میں نے بڑی احتیاط سے الماری میں لٹکا دیے۔ کوٹ کی جیبیں نوٹوں سے بھاری بھرکم نظر آتی تھیں مگر ان نوٹوں کو میں کہاں رکھ سکتا تھا اور پھر اس سے مجھے بھلا خطرہ بھی کیا ہو سکتا تھا۔

صبح کو جب ہم ناشتے سے فارغ ہو چکے تو وہ بولی۔

"آسیہ کے لیے اب جو کچھ بھی میرے بس میں ہے میں وہ کر گزروں گی۔"

"کوئی تدبیر آئی ہے آپ کے ذہن میں؟"

"دیکھیں پرسوں یہاں سے ڈاکٹروں کی ایک ٹیم پنڈی، جہلم اور اٹک کی جیلوں کے معائنے پر جا رہی ہے۔ وہ لوگ ایسے مریضوں کا خاص طور پر معائنہ کریں گے جو کسی پیچیدہ مرض میں مبتلا ہیں۔"

"اچھا، پھر۔ اس سے کیا ہو گا؟"

"سنیں تو سہی۔ میں بھی اس ٹیم میں شامل ہوں گی۔ ٹیم کے ساتھ چار نرسیں بھی جائیں گی۔"

"بالکل ٹھیک۔"

"ہم سب سے پہلے راولپنڈی جائیں گے، وہاں سے اٹک اور پھر واپسی پر جہلم اُتریں گے۔"

"اچھا؟ پھر؟ آگے کہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ ایک نرس میں اپنے ساتھ لے جاؤں گی جس کا قد کاٹھ اور حلیہ بڑی حد تک آسیہ سے ملتا جلتا ہے۔ اس کا نام جمیلہ ہے۔"

"گڈ۔ ویری گڈ۔ آگے کہیے۔"

"میں یوں کروں گی کہ آسیہ کا بند کمرے میں معائنہ کرتے وقت اس کا لباس میں نرس کو پہنا دوں اور نرس کا لباس اس کے بدن پر ڈال دوں۔"

"بالکل ٹھیک۔" میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ وہ بڑے

پتے کی بات کر رہی تھی۔

"میں نرس کے حلیے میں آسیہ کو جیل سے باہر لے آؤں گی۔"

"اور وہ نرس! وہ بے چاری کیا کرے گی وہاں۔ خود قید ہو جائے گی۔"

"نہیں ایسا کیوں ہوگا۔ آسیہ کو باہر آتے ہی آپ لے اڑیں۔ اندر جمیلہ شور مچا دے گی کہ اس نے لباس تبدیل کرنے کے لیے کمرے میں رکھا تھا مگر کوئی اسے چرا کر لے گیا ہے۔ اس طرح وہ بھی اسی وقت باہر آجاتے گی۔"

"کہیں وہ نرس خواہ مخواہ ماری جائے؟"

"وہ کس طرح؟"

"دیکھیں جیل میں معائنے کے دوران نرس کے لیے کپڑے بدلنے کا کیا جواز دیں گی آپ؟"

"اوہ! اس کی آپ فکر نہ کریں کوئی نہ کوئی معقول وجہ بیان کی جا سکتی ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ یہ منصوبہ ہر لحاظ سے قابلِ عمل ہے۔"

"تو پھر یہ طے رہا کہ پرسوں جب ہم راولپنڈی جائیں تو آپ بھی ایک کار لے کر جیل روڈ کے دروازے پر کھڑے رہیں۔"

"یہ انتظام میں کر لوں گا خواہ مجھے نئی کار ہی کیوں نہ خریدنا پڑے۔"

"آپ کے پاس اپنی کار نہیں ہے؟"

"ہے تو سہی مگر وہ میرے والد صاحب کے پاس ہے ادھر جاگیر پر۔"

"خیر کسی اور کار کا بندوبست کر لیں۔ آپ وہاں پہنچ جائیں، ہم لوگ تو ہوائی جہاز میں جائیں گے۔"

"اب کیا ارادے ہیں؟"

"میں تو اب جیل جا رہی ہوں۔ تین بجے واپس آؤں گی۔ آپ اتنے میں چاہیں تو گھوم پھر آئیں اپنے بھائی صاحب سے بھی مل لیں۔"

"نہیں میں بس ادھر ہی ٹھیک ہوں، آپ کی یاد سے دل بہلاتا رہوں گا۔"

"پتہ نہیں آپ کے والد بڑے چوہدری صاحب مجھے بہو بنانے پر رضا مند بھی ہوتے ہیں یا نہیں۔"

"ان کو تو منا ہی لوں گا۔ اتنے پرانے تعلقات ہیں اُن سے وہ کس دن کام آئیں گے آخر۔ اِتنا سا کام بھی نہیں کریں گے ہمارا۔" میں نے صریحاً جھوٹ کی سیڑھی رکھ دی تھی اس کے سامنے۔ اور وہ اس پر چڑھتی چلی جا رہی تھی۔ عام عورتوں کی طرح وہ بھی میرے قریب سے گزر کر مستقبل کی سوچ میں ڈوب گئی تھی۔

میری یہ بات سُن کر وہ ہنستی ہوئی اٹھی اور لباس تبدیل کرنے کے لیے دُوسرے کمرے میں جا گھسی۔ اس نے رات مجھے سرگوشیوں میں جو کچھ بتایا تھا اس سے میں یہی کچھ نتیجہ اخذ کر سکا تھا کہ وہ خود کو شادی کے معاملے میں بہت منحوس سمجھتی ہے۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ اس کی دو جگہ منگنی ہوئی تھی مگر دونوں منگیتر اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ ایک سڑک پر حادثے میں جاں بحق ہوا اور دُوسرا بیماری کے دوران ڈاکٹر کی ٹیبل پر مر گیا۔ پھر اس کی تیسری جگہ منگنی ہوئی جو شادی پر منتج تو ہوئی مگر شوہر سیڑھیوں پر سے پاؤں پھسل جانے کی وجہ سے گر کر مر گیا۔ اور وہ لُٹی پُٹی کر دنیا جہان کی نحوست سر پہ لاد کر ٹھنڈی ٹھنڈی میکے لوٹ آئی۔ اس کے والدین ادھر بہاولپور میں رہتے تھے۔ اس کا باپ وہاں اسکولز انسپکٹر تھا اور ماں اُستانی تھی۔ وہ جب بہت زیادہ مایوس ہو گئے تو انھوں نے بیٹی کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ اب وہ جیلخانہ جات کی سروس میں تھی۔ اور اسی غم میں بیٹھی گھلتی رہتی تھی کہ اس..... کی نحوست اس کے تعاقب میں رہتی ہے اور وہ کبھی بھی اپنے ہاتھوں میں مہندی نہ رچا سکے گی۔ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ اس کا مہمان ایک بہت بڑے جاگیردار کا بیٹا ہے جو اتنا امیر ہے کہ دس بیس ہزار روپے کی تو پروا ہی نہیں کرتا۔ اونچے درجے کے ہوٹلوں میں رہتا ہے اور اپنی ایک چچا زاد بہن کے لیے پاگل ہوا پھرتا ہے۔ اس عم زادی کے لیے جس سے اسے محبت نہیں ہے بلکہ محض خون کے ناطے سے وہ اس کی رہائی کے لیے بے چین ہے۔

ساڑھے آٹھ بجے وہ گھر سے تیار ہو کر نکلی تو اس کے چہرے پر گلاب کھلتے نظر آ رہے تھے۔ اور اس کی آنکھوں کی چمک بھی چند ہو گئی تھی۔ اس کی چال میں ایسی سرشاری تھی کہ میں خود حیران ہوا جاتا تھا۔ گھر میں ٹیلیفون کھلا پڑا تھا۔ میں نے وہ سامنے رکھ کر آہو کے نمبر گھما دیے۔ میں مسند آرا سے بات کرنا چاہتا تھا۔ اگر کبری مل گیا تو میں نے سوچا کہ میں اس سے مل کر کچھ اور باتیں معلوم کر سکوں گا۔

ریسیور کسی عورت نے اٹھایا۔ ہیلو کے لفظ پر ہی میں سمجھ گیا کہ وہ سروری بیگم ہے۔ اس سے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے فون بند کر دیا۔ وہ بدبخت کہیں اس کے پاس ہی منڈلا رہی تھی۔ کوئی دس منٹ بعد میں نے پھر نمبر گھماتے تو اب کی بار مجھے ایک مردانہ آواز سنائی دی۔ میں چُپ رہا جب اس نے تیسری بار ہیلو کہا تو میں سمجھا کہ وہ کبری ہے۔

"کیا حال ہیں بچے؟"

"اوئے بیڑہ غرق۔" اس نے آواز دبا لی۔ پھر بولا "اوستاد جلدی سے ٹائم بتاؤ اور جگہ بھی۔" اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔

"ادھر کوئی آس پاس ہے تو نہیں؟"

"ابھی نہیں ہے اوستاد پر کوئی بھی آسکتا ہے جلدی بولو۔"

"ادھر جناح باغ! پچھلا دروازہ۔ ابھی گیارہ بجے۔"

"ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر اس نے بلند آواز سے کہا۔ "تم کون ہو بھئی، یہ رانگ نمبر ہے ادھر کوئی گیانی صاحب نہیں رہتا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

پورا دس نمبری بدمعاش تھا وہ کبری بھی۔ اس وقت دن کے پونے نو بج رہے تھے۔ ابھی بڑا وقت تھا میرے پاس۔ میں نے تپائی پر رکھی ڈائرکٹری میں شفا بار کلینک کا نمبر لیا اور شفا بار کلینک میں فون کیا۔ ریسیور کسی خاتون نے اٹھایا تھا۔ وہ بڑے ہی مہذب اور شُستہ لہجے میں گفتگو کرتی تھی۔ نغمگی تھی اس کی آواز میں۔

"خاتون! میں ڈاکٹر دھمن سے بات کر سکتا ہوں؟"

"جی نہیں! وہ تو آج کل یہاں نہیں ہیں۔"

"کہاں ہیں؟"

"آج کل وہ امریکہ میں ہیں۔"

"میں نے تو سُنا تھا کہ وہ سعودی عرب گئے تھے اور اب واپس آ چکے ہیں۔"

"جی ہاں، وہ جدہ گئے تھے۔ اپنا کلینک کھولنے کے لیے۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ کویت بھی گئے تھے اور دوہا بھی مگر آج کل وہ نیو یارک میں ہیں۔"

"اور ڈاکٹر عالیہ؟"

"وہ بھی ان کے ساتھ ہی گئی ہوئی ہیں۔ یہاں کا سارا کام ڈاکٹر اختر اور ڈاکٹر نصیر چلا رہے ہیں۔"

"سوات خاں اور چھیما تو ادھر ہی ہوں گے؟"

"اُن سے کیا کام ہے آپ کو؟"

"وہ بھی مجھے جانتے ہیں۔ میں ڈاکٹر کاظمی بول رہا ہوں کراچی سے۔ کچھ ضروری بات کرنی تھی۔ مجھے اُن سے ہی ملوا دیجئے۔"

"معاف کیجئے گا پلیز۔ مجھے کہنا تو نہیں چاہیے مگر وہ دونوں بھی کافی دنوں سے یہاں نہیں آئے۔ میں نے سنا ہے کہ وہ آجکل جیل میں ہیں۔"

"وہ کس خوشی میں؟"

"کسی سے ان کا جھگڑا ہو گیا تھا۔ پولیس نے انہیں دو آدمیوں کو زخمی کر دینے کے جرم میں سال بھر کے لیے قید کروا دیا۔"

"اوہ! ویری سیڈ نیوز! اور وہ حیدر کہاں ہے آجکل؟"

"وہ تو جی ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی پر ہوتا ہے سر۔"

"اس کا نمبر دے سکتی ہیں آپ مجھے؟"

"وائی ناٹ سر۔" یہ کہہ کر اس خاتون نے مجھے عالیہ کی کوٹھی کا فون نمبر دے دیا۔

"ویری نائس آف یو۔ کتنی سویٹ آواز ہے آپ کی۔ میں آپ کا اسمِ مبارک پوچھ سکتا ہوں خاتون؟"

"وائی ناٹ ڈاکٹر کاظمی! میرا نام عظمیٰ ہے۔"

"گڈ عظمیٰ! اچھا نام ہے جیسے برطانیہ عظمیٰ، وہی والا نا؟"

وہ ہنس دی۔ بولی۔

"یس ڈاکٹر یس! وہی عظمیٰ۔"

"ٹھیک ہے سویٹی! کسی وقت لاہور آیا تو آپ سے ضرور ملوں گا اوکے سو لانگ۔" یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔

عالیہ کی کوٹھی کے جب میں نے نمبر گھمائے تو کسی نے فوراً ہی ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو۔" کسی عورت کی بڑی کراری اور تیز طرار آواز تھی۔ لہجہ خاصا دہقانی تھا۔

"میں ڈاکٹر کاظمی بول رہا ہوں مجھے ڈاکٹر عالیہ سے بات کرنی ہے۔"

"وہ تو جناب گلینڈ گئی ہوئی ہیں۔"

"چلو چھٹی ہوئی۔ وہ انگلینڈ کو گلینڈ کہہ رہی تھی۔

"اچھا؟ تم کون ہو؟"

"میں تو ان کی ملیجماں ہوں جناب سرداراں ناؤں ہے میرا جی!"

"اچھا سرداراں دیکھ تو حیدر سے میری بات کروا دے۔"

"اچھا جی! میں بلاؤ تی ہوں اس "ڈ شکرے" کو۔" یہ کہہ کر وہ ریسیور میز پر رکھ کر ٹخ ٹخ چلتی باہر نکل گئی۔ پاؤں میں وہ سخت لکڑی کی ایڑی کا جوتا پہنے ہوئے تھی۔

کچھ ہی دیر بعد... مجھے حیدر کی آواز سنائی دی۔ وہ سرداراں سے دبی زبان میں پوچھ رہا تھا۔

"کون ہے آخر؟"

"آئے ہائے کوئی کھا تو نہیں لے گا تجھے۔ ڈاک دار کا جی ہے بات کر اس سے۔"

سرداراں نے اسے ڈانٹا۔ حیدر نے ریسیور اٹھا لیا بولا۔

"ہیلو۔ جی میں بول رہا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کیا حکم ہے؟"

اس کا سانس پھول رہا تھا، میرا خیال ہے وہ بھاگتا ہوا آیا تھا۔

"حیدر! وہی نا جو ذرا لنگڑا کر چلتا ہے۔" میں نے آواز بدل کر اس میں اچھا خاصا طنطنہ پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"وہی جی وہی آپ کا خادم! آپ نے کیا نام بتایا اپنا۔"

"ڈاکٹر کاظمی! میں کراچی سے بول رہا ہوں۔ کیا حال ہیں بچے! میں نے تمھیں شفا بار میں دیکھا تھا۔"

"اچھا ہوں ڈاکٹر صاحب! کیا حکم ہے؟"

"دیکھو، مجھے ایک گردے کی فوری ضرورت ہے مل سکتا ہے؟"

گردے کا ذکر سن کر وہ گھبرا گیا۔ اس کا لہجہ بدلنے لگا بولا۔

"مجھے تو اس بارے میں کوئی علم نہیں ہے جناب۔"

"کیوں نہیں! ڈاکٹر دھمن کے سارے راز تمھیں معلوم ہوتے ہیں کب آ رہے ہیں وہ؟"

"وہ تو جی گرمیاں گزار کر اکتوبر میں واپس آئیں گے۔ امریکہ میں ہوتے ہیں وہ آج کل۔"

"ٹریننگ پر گئے ہیں؟"

"پتہ نہیں جی۔"

"کل ایک آدمی آیا تھا میرے پاس اپنا نام جیلانی بتاتا تھا کہتا تھا کہ اس کا گردہ ......" ابھی میں یہاں تک ہی کہہ پایا تھا کہ ریسیور اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ مگر اسے اس نے جلدی ہی اٹھا لیا۔ بولا۔ "کیا... کیا نام بتایا تھا اس نے جی؟"

"غلام جیلانی۔ اس نے کہا تھا کہ اس کا گردہ تم لوگوں نے بیچ کھایا تھا۔ وہ کس کے جسم میں لگایا تھا ڈاکٹر دھمن نے؟"

"وہ... وہ بدمعاش جھوٹ بولتا ہے بکواس کرتا ہے وہ جناب! ہمارے کو بدنام کرتا ہے اس کا پتہ بتائیں مجھے۔"

"میرا خیال ہے وہ آج رات کی فلائٹ سے امریکہ چلا جائیگا۔ مجھے ڈاکٹر دھمن کا پتہ بتاؤ میں ابھی انہیں فون پر خبردار کر دیتا ہوں کہ وہ اس خبیث سے ہوشیار رہے۔ مجھے معلوم ہوتا تو میں اسے یہیں پکڑ لیتا۔"

"ہاں جی بالکل۔ وہ تو ڈاکو ہے کئی آدمیوں کو قتل کر کے وہ جیل سے بھی بھاگ گیا تھا۔ اس کو تو ضرور پکڑنا چاہیے۔"

"تو پھر مجھے ڈاکٹر دھمن کا پتہ بتاؤ۔"

"میں ابھی بتاتا ہوں جناب لکھیں۔ یہ ادھر میرے سامنے ڈائری پر موجود ہے ان کا پتہ۔" یہ کہہ کر اس نے مجھے ڈاکٹر دھمن کا پتہ لکھوا دیا۔

"اچھا جدہ میں ان کے کلینک کا کیا نام ہے؟"

"البدادی کلینک۔ بڑی مشہور جگہ ہے جی وہ۔ پر ڈاکٹر صاحب آپ کا پتہ کیا ہے؟"

میں نے اپنا پتہ اسے کراچی کا لکھوا دیا۔

"اور فون نمبر۔"

میں نے فون نمبر بھی بتا دیا۔ بولا۔ "آپ پتہ کریں اگر وہ ابھی یہیں ہے تو اسے پکڑوا دیں۔ پچاس ہزار روپے کا انعام مقرر ہے اس کی گرفتاری پر۔"

"اچھا! پھر تو میں ضرور کوشش کروں گا۔ تم فکر نہ کرو۔"

یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔ جیلانی کا ذکر سن کر اس کا دم اور زیادہ پھول گیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے ہاتھوں میں رعشہ پیدا ہو رہا ہو گا جبھی تو اس کے ہاتھ سے ریسیور گر گیا تھا۔ مجھے بہرحال ان کی گردن کے گرد اپنا حلقہ تنگ کرنا تھا۔ انھیں میں معاف تو ہرگز نہ کر سکتا تھا۔ مجھے انھوں نے ساری عمر کے لیے ایک گردے پر چلنے کے لیے بے علاج چھوڑ دیا تھا۔ میں اگر اس آسیبہ کے پیچ میں نہ پھنستا تو اب تک ان کا قلع قمع کر چکا ہوتا۔ سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ اصل مجرم ملک سے باہر جا چکے تھے۔ لے دے کے ایک حیدہ وہاں تھا۔ اس سے میں کیا کہہ سکتا تھا۔ اس کا تو کوئی قصور نہیں تھا۔

فون بند کر کے میں نے نفیسہ کے ملازم سے کہہ کر چائے بنوائی اور پھر وقت کٹی کے لیے ریڈیو کھول کر بیٹھ گیا۔ پونے گیارہ بجے اپنے نوٹ اور اسٹین گن وہیں چھوڑ کر میں کمبل کی بکل میں باہر نکلا اور ٹیکسی میں بیٹھ کر جناح باغ کی طرف چل دیا۔ ٹیکسی میں نے ریس کورس روڈ پر چھوڑی اور وہاں سے پیدل چلتا ہوا دیوار پھاند کر باغ کے اندر داخل ہو گیا۔ چور ایسی احتیاط سے چاروں طرف دیکھ بھال کر چلتا ہوا ابھی چند قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ مجھے ریٹا نظر آئی۔ وہ میری طرف اڑتی چلی آ رہی تھی۔ میرے پاس پہنچ کر وہ ایک دم گھاس پر لیٹ گئی جیسے وہ ٹھوکر کھا کر گری ہو ہانپتی ہوئی بولی۔

"جیلانی! خدا کے لیے بھاگ جاؤ۔ پولیس تمھیں گھیرے میں لے رہی ہے۔ نکل جاؤ۔" اس کا سانس بری طرح پھول رہا تھا۔ میں تو سن ہو کر رہ گیا۔

"پولیس کو کیسے پتہ چلا؟"

"مجھے مسند آراء نے بتایا ہے۔ فون کے دوسرے سیٹ پر آ ہو نے تمھاری باتیں سن لی تھیں۔ وہ اسی وقت باہر نکل گیا تھا۔ پولیس کے سپاہی ادھر سفید کپڑوں میں پھر رہے ہیں۔"

"تم بھاگ جاؤ۔" یہ کہہ کر وہ الٹ گئی جیسے گرنے کی وجہ سے اسے شدید چوٹ آ گئی ہو۔ اس کی بات سن کر میں بجلی کی سی رفتار سے ریس کورس روڈ کی طرف دوڑا مگر وقت میرا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ ابھی میں دیوار سے دو قدم دور ہی تھا کہ میرے کان سنسنا گئے۔

"رک جا جیلانی، ورنہ گولی مار دوں گا۔"

ایک کڑکتی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ بولنے والا مجھ سے زیادہ دور نہیں تھا مگر ان دو ثانیوں میں میں باغ کی دیوار پھلانگ گیا۔ ایک ساتھ کئی گولیاں چلیں۔ کچھ میرے اوپر سے گزریں اور کچھ باغ کی دیوار میں لگیں۔ ان سے غلطی یہ ہوئی کہ انھوں نے ریس کورس کی طرف کوئی آدمی کھڑا نہیں کیا تھا۔ زیادہ زور

انھوں نے باغ کے پچھلے گیٹ پر صرف کر دیا تھا۔ میں چند ثانیوں تک باغ کی دیوار کو اپنی ڈھال بنائے رہا مگر یہ میری حماقت تھی۔ دو آدمی دوسری طرف سے بھاگتے ہوئے دیوار کی طرف آ رہے تھے۔ وہ سفید کپڑوں میں ملبوس پولیس کے سپاہی تھے۔ بڑے گرانڈیل اور بڑے خونخوار، ان کو اپنی طرف آتے دیکھ کر میں دیوار کی اوٹ سے نکلا۔ سامنے سے گزرتے ایک ٹرک کے اگلے حصے کے پائیدان پر جا چڑھا۔ ایک ساتھ دو گولیاں چلیں اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے بائیں بازو میں کسی نے نیزہ دے مارا ہو۔ ٹرک کی رفتار کچھ اتنی تیز نہیں تھی۔ اور... ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ خالی تھی۔ میں نے دروازہ کھول کر تیزی سے اندر گھس کر ڈرائیور پر پستول تان لیا۔

"اسٹیرنگ مجھے دے دے استاد ورنہ اچھا نہ ہو گا۔"

ڈرائیور نے گھبرا کر اسٹیرنگ پر سے ہاتھ اٹھا لیا۔ میں نے پھر کر اس کے ساتھ بیٹھتے ہی اسٹیرنگ خود سنبھالا اور ٹرک کو پہلے گیئر میں ڈال کر گورنر ہاؤس کے سامنے جا پہنچا۔ میں نے ٹرک کو دائیں ہاتھ موڑ کر رفتار تیز کر دی۔

"اتر جا گتے کے بچے! چھلانگ لگا دے ورنہ جان سے مار دوں گا۔" میں نے ڈرائیور کو پرے دھکیلتے ہوئے کہا۔ اس نے دروازہ کھولا تو مجھے پیچھے سے پولیس گاڑی کا خوفناک سائرن سنائی دیا۔

"اتر جا۔"

"رفتار بہت زیادہ ہے میری ہڈی پسلی تڑوائے گا تو؟ تو جدھر مرضی لے چل میں کچھ نہیں کہوں گا۔" اس آدمی نے بہت ہی بجھے بجھے لہجے میں کہا۔ اس کی آواز خوف سے لتھڑی ہوئی تھی دروازہ اس نے پھر بند کر دیا اور چند ساعتوں کی خاموشی کے بعد صورت حال کو سمجھتے ہوئے بولا۔

"تیرے پیچھے پلیس لگی ہے وہ موٹر سائیکل اور جیپ پر تیرا پیچھا کر رہے ہیں۔" اب کی بار وہ قدرے بہتر طریقے سے بول رہا تھا۔

ٹرک کی رفتار اتنی تیز تھی کہ سامنے سے آتی ہوئی گاڑیوں میں بیٹھے لوگ خوفزدہ ہو کر بہت پرے ہٹ کر گزر رہے تھے۔

میں مال روڈ کے سارے پرسکون ماحول کو دہلاتا ہوا، نہر کے پل پر پہنچ کر دائیں ہاتھ مڑا تو مجھے محسوس ہوا کہ میری رفتار کو زیر و زبر کرتے ہوئے وہ لوگ تیزی سے فاصلہ سمیٹ رہے تھے۔ ٹرک اب نہر کے کنارے چل رہا تھا۔ میں نے کمبل الگ رکھ دیا۔

"اسٹیرنگ سنبھال بیٹے! میں نے کہا۔ "میں اتر رہا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے اگلی سیٹ چھوڑ دی اور ساتھ کی سیٹ پر بیٹھ کر بائیں ہاتھ کا دروازہ کھول دیا۔

"رفتار تیز رکھ۔ ورنہ اچھا نہ ہو گا۔" میں نے پستول کی نالی اس کی طرف لہراتے ہوئے کہا۔ میرے بائیں بازو میں آگ لگی ہوئی تھی۔ اس نے میرے حکم کی تعمیل کی۔ "ادھر بائیں ہاتھ رکھ اسے، پانی کے قریب۔" میں نے اسے للکارا۔ اس نے ٹرک نہر کے کنارے کے زیادہ قریب کر دیا تو میں نے بایاں دروازہ کھول کر پوری قوت سے آگے کی طرف چھلانگ لگا دی۔ گھاس پر گرتے ہی میں نے الٹ کر پانی میں ڈبکی لگا دی۔ میرے پیچھے کئی گولیاں پانی میں سنسناتی ہوئی ٹھنڈی ہو گئیں۔ میں نے پانی کے اندر ہی اندر گہرائی میں تیرتے ہوئے کوئی ڈیڑھ منٹ بعد سر اوپر اٹھایا تو معلوم ہوا کہ میں بہاؤ کے ساتھ چلتا ہوا بہت آگے نکل آیا ہوں۔ ایک سیکنڈ کے لیے میں نے اپنے پھیپھڑوں میں تازہ ہوا بھری اور پھر گہرائی میں جا کر نہر کے بہاؤ کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ وہ پانی میرے لیے رحمت ثابت ہو رہا تھا۔ اس کی برودت نے میرے بازو میں مچی قیامت کو کسی حد تک کم کر دیا تھا۔ اگلے ڈیڑھ منٹ بعد میں نے سانس لینے کے لیے سر اوپر اٹھایا تو معلوم ہوا کہ میں نہر کا دوسرا پل بھی عبور کر آیا ہوں۔ ان دونوں پلوں کے نیچے پانی کا بہاؤ متوازن ہے اور کہیں کوئی گھاٹ نہیں ہے۔ اپنا سانس درست کر کے میں نے پھر ڈبکی لگا دی اور گہرائی میں پہنچ کر آگے بڑھنے لگا۔ میں دس منٹ تک اسی طرح نہر کے اندر ہی اندر تیرتا رہا۔ اور جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ اب میں بہت دور نکل آیا ہوں تو میں نے کنارے کے قریب جا کر پانی سے سر باہر نکالا۔ معلوم یہ ہوا کہ میں یونیورسٹی کیمپس کو بھی بہت پیچھے چھوڑ آیا ہوں اور اب دور دور تک مجھے پولیس کا کوئی نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہر طرف سے اطمینان کر لینے کے بعد میں نہر سے باہر نکلا اور اپنے کپڑے نچوڑتا ہوا میں سامنے کی ایک تنگ سی سڑک پر نکلا۔ دائیں بائیں پھیلے چھوٹے چھوٹے خوبصورت بنگلوں اور کوٹھیوں کے درمیان سے گزر کر وہ سڑک کھیتوں میں ختم ہو جاتی تھی۔

میرا زخمی بازو مجھے پھر نڈھال کرنے لگا تھا۔ گولی کچھ زیادہ ہی کام دکھا گئی تھی اور کسی قسم کی طبی امداد کا وہاں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اچانک مجھے ایک کوٹھی کے دروازے میں سے ایک کار نکلتی نظر آئی۔ کوئی باوردی ڈرائیور اسے چلا رہا تھا۔ نمبر پلیٹ سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ زرعی کارپوریشن والوں کی

کار ہے۔ میں سر جھکائے ہوئے یہ تاثر دیتا ہوا کہ میں نے اسے دیکھا ہی نہیں لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ کار کی رفتار مدھم تھی، ڈرائیور نے میرے بالکل قریب پہنچ کر بڑے زور سے ہارن دے کر بریک لگاتے تو میں یوں چونکا جیسے مجھے کسی بات کا ہوش نہیں ہے۔ جب میں گاڑی کے بائیں ہاتھ کے دروازے کے سامنے پہنچا تو ڈرائیور مجھے گندی گالی دیتے ہوئے بولا۔

"ابے مرنا ہے تو کچلا کیوں نہیں کھا لیتا کُتّے کے بچّے"

بڑی گندی زبان تھی اُس کی۔ گالی سنتے ہی میں نے کار کا پچھلا بایاں دروازہ کھولا اور دھڑام سے اندر بیٹھ کر میں نے پانی میں تربتر پستول نکال کر اگلی دو نشستوں میں سے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ پستول کی نالی پسلی پر محسوس کرتے۔۔۔ ہی اس کی گھگی بندھ گئی۔

"کک۔۔۔ کک۔۔ مم۔۔ مم۔۔ مجھے معاف کر دو بھا جی غلطی ہو گئی"

"کوئی بات نہیں بچّے! ایسی غلطیاں تو بالک لوگ کیا ہی کرتے ہیں۔ چل ذرا ادھر مجھے کسی ہسپتال تک لے چل۔۔۔ میں زخمی ہو گیا ہوں"

یہ کہہ کر میں نے اس نئی نویلی کار کے سارے پچھلے پردے کھینچ کر برابر کر دیے۔ اب باہر سے کوئی مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

"دیکھ کوئی چالاکی مت دکھانا میرے بیٹے۔ سمجھتا ہے نا بچّے؟" یہ کہہ کر میں نے پستول کی نالی اس کی پسلی میں ذرا اور گہری دھنسا دی۔

اس کا رنگ فق ہو گیا تھا اور حالت اس کی یہ تھی کہ اس سے اسٹیرنگ نہیں سنبھل رہا تھا۔ کار کسی شرابی کی طرح لڑکھڑانے لگی تھی۔ یونیورسٹی کیمپس میں سے گزرتے ہوئے ایک قدرے تنہا مقام پر میں نے اسے کار روک دینے کو کہا۔ اس نے بریک لگا کر کار روکی تو میں نے پستول کی نالی پھر اس کی پسلی میں دھنسائی۔

"اب یہاں اتر جا بچّے۔ یہ ڈرائیونگ تیرے بس کی بات نہیں، چل اُتر چمرنگ کی اولاد"

میری بات سن کر وہ لرزتا ہوا اُٹھا اور دروازہ کھول کر کار کے دروازہ میں سے باہر لڑھک گیا۔ جب پیچھے سے کر کسی کی نشست الانگ کر کے اسٹیرنگ سنبھالا تو میں نے دیکھا کہ وہ زمین پر سے اٹھ کر سرپٹ بھاگ رہا تھا۔ یہ اچھی بات تھی۔ وہ سالا کسی کو مدد کے لیے ڈھونڈ رہا تھا مگر وہاں دُور دُور تک کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔

میں نے کار اسٹارٹ کی اور دائیں ہاتھ پڑی اس کی ٹوپی سر پر رکھ لی۔ اب میں اس کار کا غیر جریدی ڈرائیور بن چکا تھا۔ کار کو بھگاتا ہوا میں اسی وقت ڈاکٹر نفیسہ کے بنگلے پر جا پہنچا۔ ملازم نے دروازہ کھولا تو میں نے کار اندر لے جا کر گراج میں بند کر دی اور باہر سے شٹر نیچے گرا دیا۔

میرا حلیہ دیکھ کر نفیسہ کا ملازم گھبرا گیا بولا۔ "یہ۔۔۔ یہ کیا ہوا ہے چوہدری صاب! آپ تو زخمی دکھائی دیتے ہیں"۔

"بابا! کسی دشمن نے مجھ پر گولی چلا دی ہے ہم زمینداروں کے ساتھ یہی مصیبت ہے۔ ذرا ڈاکٹر صاحب کا نمبر ملا دو" یہ کہہ کر میں نے کمرے میں پہنچ کر اپنے بھیگے ہوئے کپڑے اتار کر چادر باندھی اور بنیان کے بغیر ہی بیٹھ گیا۔

بابا نے فون پر جیل کے نمبر گھما کر ریسیور میرے ہاتھ میں دے دیا اور خود باہر نکل گیا۔

"ڈاکٹر نفیسہ سے بات کرا دیں"

کچھ ہی دیر بعد مجھے نفیسہ کی آواز سنائی دی بولی "کون؟"

"میں گھر سے بول رہا ہوں ڈاکٹر صاحب آپ کا خادم"

اس نے میری آواز پہچان لی تو اس کے لہجے میں مٹھاس پیدا ہو گئی۔

"اداس ہو گئے؟"

"ہاں، کچھ ایسی ہی بات ہے جناب، آپ مرہم پٹی کا سامان لے کر ذرا دیر کے لیے ادھر آ جائیں"

"کیوں خیر تو ہے؟"

"بس خیر ہی ہے۔ بابا کے بازو میں زخم آ گیا ہے وہ گر گیا تھا۔ کوئی چیز شاید بازو میں گہری دھنس گئی ہے"

"اوہ، یہ تو بہت برا ہوا میں ابھی آتی ہوں۔ اسے ذرا سنبھالنے کی کوشش کریں۔ کوئی انٹ شنٹ چیز نہ لگائیں زخم پر" یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

کوئی دس منٹ بعد جیل کی گاڑی دروازے پر رُکی۔ اُس میں سے ڈاکٹر نفیسہ بڑی عجلت میں اُتری، اس کے پیچھے ایک نرس بھی تھی۔ میں نرس کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بابا کو میں دروازے پر جانے سے روک نہیں سکتا تھا اور خود وہاں تک جانا میرے لیے اچھا نہ تھا کیونکہ ایسی صورت میں مجھے نرس بھی دیکھ لیتی اور گاڑی کا ڈرائیور بھی۔ اسی لیے میں کمرے ہی میں بیٹھا رہا۔

نفیسہ نے بابا کو صحیح سلامت دیکھا تو بہت حیران ہوئی۔ مگر عورت وہ بہت زیرک تھی۔ بابا سے اس نے کوئی سوال نہیں پوچھا۔ نرس کو برآمدے میں روک کر نفیسہ بابا کے ساتھ اندر آئی اور مجھے اتنی ابتر حالت میں دیکھا تو بولی۔

"ہائے اللہ! یہ۔۔۔ یہ آپ کے دشمنوں کو کیا ہوا ہے۔ آپ تو خود زخمی ہیں" یہ کہتی ہوئی وہ میرے بازو کا معائنہ کرنے لگی۔ گولی گوشت کو پھاڑتی چلی گئی تھی۔

"اُف! یہ تو خاصا گہرا زخم ہے ہنی، آخر ہوا کیا ہے؟"

"کسی نے گولی چلائی ہے مجھ پر۔ میں اُدھر اقبال پارک گیا تھا۔ ایک دوست سے ملنے کے لیے سوئمنگ پول کے کنارے کھڑا میں اس سے باتیں کر رہا تھا کہ کسی نے مجھ پر گولی چلا دی۔ میں نے پانی میں کُود کر اپنی جان بچائی اور اپنے دوست کی کار میں یہاں پہنچا ہوں"

زخم کو اچھی طرح دیکھنے کے بعد وہ بولی "شاید پستول کی گولی تھی، دوسری طرف نکل گئی ہے۔ ہڈی بہرحال بچ گئی ہے"

یہ کہہ کر اس نے بابا کے ہاتھ نرس سے مرہم پٹی کا سامان اندر منگوایا اور بڑی احتیاط سے دوا لگا کر پٹی باندھ دی۔ اُس کے چہرے سے صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ کسی گہری سوچ میں گم تھی اور لمحہ بہ لمحہ اس کی پریشانی فزوں تر ہوتی جا رہی تھی۔ مجھے یوں ننگے پنڈے بیٹھا دیکھ کر وہ دوسرے کمرے میں گئی اور میرے لیے ایک کرتا اور پاجامہ لے آئی بولی۔

"یہ پہن لیں۔ سردی میں ننگے کیوں بیٹھے ہیں ٹھنڈ لگ جائے گی"

میں نے باتھ روم میں جا کر وہ کپڑے پہنے اور تولیے سے بالوں کو خشک کر کے جب میں باہر نکلا تو وہ اس وقت تک نرس کو گاڑی میں واپس بھجوا چکی تھی۔ جب وہ واپس کمرے میں آئی تو میں سگریٹ سلگا کر اطمینان سے پلنگ پر بیٹھ چکا تھا۔ وہ آئی اور میرے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ چند لمحوں تک وہ بڑی محویت سے میرے چہرے کا جائزہ لیتی رہی پھر بولی۔

"آپ پر گولی کس نے چلائی ہے؟"

"کسی دشمن نے ہی چلائی ہو گی میں اسے دیکھ نہیں سکا"

"پولیس کو اطلاع نہیں دی آپ نے؟"

"نہیں بھئی یہ چکر مجھے اچھا نہیں لگتا۔ ہم گاؤں کے باسی ایسی دشمنیوں سے نپٹنا خوب جانتے ہیں۔ زمینداروں پر ایسے حملے تو ہوتے ہی رہتے ہیں"

"اور اگر خدانخواستہ گولی دل میں اُتر جاتی تو؟"

"تو وہاں میرے دل میں بیٹھی آپ بھی زخمی ہو جاتیں اور وہ صرف مجھے مارنا چاہتا تھا آپ کو نہیں"

"اوہ ہنی! مذاق کی بات نہیں ہے ہمیں پولیس کو اطلاع دینی چاہیے"

"نہیں نہیں پولیس کو اطلاع دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں مجھے کیا کرنا ہے"

"اتنے سخت ہیں آپ! مجھے حیرت ہوتی ہے کوئی اور ہوتا تو اتنا خون بہہ جانے پر وہیں گر جاتا"

"آپ مجھے نہیں جانتی ہیں نا! اس لیے یہ بات کہتی ہیں۔ شیر کا دل رکھتا ہوں اس سینے میں جناب۔ بہرحال آپ اب ڈٹ من سے بھرپور کھانا تو کھلا ہی دیں"

"بابا سے کہہ دیا ہے میں نے۔ وہ کھانا میز پر لگا رہا ہو گا۔ یہ گیراج میں گاڑی تو زرعی کارپوریشن کی نظر آتی ہے"

"ہاں، اسے میں آج شام واپس کر دوں گا۔ میرا وہ دوست میرے دشمن کے پیچھے گیا ہے۔ وہ گاؤں تک اس کا تعاقب کرے گا"

"خدا خیر ہی کرے۔ یہ اچھا شگون نہیں ہوا ہے ہنی! میں۔۔ میں بہت منحوس ہوں چوہدری صاحب! جو بھی مجھ سے ملے گا۔ مارا جائے گا۔۔ میں بہت کلموہی ہوں چوہدری صاحب! مجھے۔۔ مجھے معاف کر دیں۔ میں آپ کے قابل ہرگز نہیں ہوں"

وہ میرے کندھے پر سر رکھ کر بلکنے لگی۔ اسے ماضی کی تلخ یادوں نے دہلا کر رکھ دیا تھا۔

"کیا کہتی ہیں آپ؟ یہ خیال دل سے نکال دیں نفیسہ! آپ بہت ہی خوش نصیب ہیں کہ آپ کی وجہ سے میں آج زندہ سلامت بچ کر واپس آ گیا ہوں ورنہ کوئی کسر باقی نہیں رہ گئی تھی"

"نہیں نہیں نہیں ہنی، یہ بات نہیں ہے۔ میں جانتی ہوں میں جنم جنم کی بدنصیب ہوں"

"ایسا نہیں ہے۔ میں نے آپ سے زیادہ مبارک اور خوش نصیب کسی کو نہیں سمجھا۔ یہ بہت معمولی زخم ہے۔ دو چار دن میں بھر جائے گا نفیسہ! مت روئیں مجھے آنسوؤں سے سخت نفرت ہے" یہ کہہ کر میں نے الماری کے پیچھے رکھے اسے اپنے دونوں ہتھیار دکھائے۔

"یہ دیکھیں۔ میں یہ ہتھیار ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا ہوں۔ اپنی حفاظت کرنا میں خوب جانتا ہوں۔ بس آج میں انہیں ساتھ نہ لے جا سکا ورنہ وہ مجھ سے بچ کر نہ نکل جاتا۔ زمینوں کے جھگڑے ایسے ہیں کہ ہمیں اس قسم کے حالات سے گزرنا ہی پڑتا ہے۔ میں تو ہمیشہ اپنے ساتھ ایک گن مین رکھتا ہوں، اسے میں شہر نہیں لا سکا بس یہی غلطی ہو گئی مجھ سے۔ یہ آنسو پونچھ دیں۔ زندگی موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ آپ کا اس میں کیا قصور"

میرے ہاتھ میں وہ خوفناک ہتھیار دیکھ کر وہ رونا بھول گئی۔ ذرا دیر کے لیے اُسے احساس ہوا کہ اُس نے جو ہاتھ پکڑا ہے وہ ایسا کمزور نہیں ہے کہ ذرا سے جھٹکے سے ٹوٹ جائے۔ اس کے چہرے پر ٹھہراؤ پیدا ہونے لگا۔ ٹھیک اس وقت دروازے پر

دستک ہوئی۔ بابا کہہ رہا تھا۔
"میں نے کھانا میز پر چُن دیا ہے بی بی جی!"
نفیسہ اپنی آنکھیں دوپٹے سے پوری طرح خشک کرتی ہوئی اُٹھی اور بولی۔
"درد تو بہت ہو رہا ہوگا آپ کو؟"
"نہیں جناب! درد تو ہم ایسے درویشوں کے پاس بھی نہیں پھٹک سکتا اور پھر جب آپ ایسی ہمدرد مِل جائے تو بات ہی اور ہو جاتی ہے۔"
"بڑے وہ ہیں آپ؟ میں تو پاگل ہی ہوگئی تھی۔ آخر آپ باہر گئے ہی کیوں تھے؟" وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر دوسرے کمرے میں داخل ہوگئی۔
"تو اور کیا میں گھر میں بیٹھا رہوں گا سگھڑ بیبیوں کی طرح؟"
بابا نے ڈھیر ساری چیزیں میز پر چُن دی تھیں اور روسٹ مُرغ تو ایسا تھا کہ مزہ آگیا۔
کھانے کے دوران میں نے محسوس کیا کہ نفیسہ آہستہ آہستہ پُرسکون ہوتی جارہی تھی۔ وہ تاریک خیال جو زہریلی ہوا کی طرح اس کی سوچ پر چھا گئے تھے، اب چھٹنے لگے تھے اور وہ مجھے زیادہ سے زیادہ خوش کرنے اور میرا دل بہلانے کی کوشش میں مصروف ہوگئی تھی۔
وہ رات بھی میں نے نفیسہ کے گھر میں گزار دی۔ صبح منہ اندھیرے اُٹھ کر اس نے میری پٹی بدلی اور بولی۔
"آپ ہمارے ساتھ ہوائی جہاز میں بھی جاسکتے تھے مگر مجھے خیال ہی نہ آیا ورنہ کل ہی سیٹ بک کروالیتی۔"
"کوئی ہرج نہیں، میں کسی نہ کسی طرح وہاں پہنچ ہی جاؤں گا"
"ٹھیک ہے، آپ یوں کریں کہ کل صبح گیارہ بجے جیل کے دروازے پر پہنچ جائیں۔ اپنی کار آپ کے پاس ضرور ہونی چاہیے۔ تاکہ اس میں آپ آسیہ کو بٹھا کر بھاگ سکیں۔"
"فکر نہ کریں میں گاڑی لے آؤں گا مگر مجھے آپ کی طرف سے اطلاع کس طرح مِل سکے گی؟"
"ہاں۔ یہ تو بہت اہم بات ہے۔ آپ اُدھر کشمیر روڈ پر ڈاکٹر عابدی کے کلینک پر بیٹھیں۔ میں وہاں فون کرکے آپ کو ساڑھے دس بجے اطلاع دوں گی۔ مگر آپ کا یہ زخم آپ کو کچھ نہیں کرنے دے گا۔"
"اس کی فکر نہ کریں۔ میں کل سے بہتر محسوس کر رہا ہوں۔"
"ٹھیک ہے ہنی۔ بہرحال ہمیں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔"
"وہ تو ہے ہی۔ آپ اپنی نرس کے کپڑے آسیہ کو دینے کے بجائے ایک الگ جوڑا کیوں نہیں لے جاتی ہیں نرسوں کے لباس کا۔ تاکہ آپ وہ آسیہ کو پہنا سکیں۔"
"میں یہی کر رہی ہوں ہنی! پاگل تھوڑی ہوں۔ جمیلہ کو خواہ مخواہ پریشان کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اچھا اب میں چلتی ہوں ساڑھے پانچ بج رہے ہیں گاڑی آتی ہوگی۔ جہاز سات بجے روانہ ہوگا۔"
"بہت بہتر جناب ڈاکٹرنی صاحبہ۔"
"نہیں، نفیسہ کہا کریں مجھے! میرا آپ سے ایک دن کا ساتھ نہیں ہے ہنی! آپ کے لیے میں اپنی زندگی بھی داؤ پر لگا سکتی ہوں۔"
"مجھے یقین ہے نفیسہ! منہ سے کہہ کر بات کو بے وقعت نہ بناؤ۔"
وہ بڑے ہی جذباتی انداز سے مجھے الوداع کہہ کر لان میں نکل گئی۔ جیل کی گاڑی اس کے دروازے پر آٹھہری تھی — ابھی سُورج طلوع نہیں ہوا تھا۔ باہر ملگجا سا اندھیرا ابھی تک راستہ روکتا تھا۔
مجھے یقین ہو چلا تھا کہ اب آسیہ کو رہائی ضرور مِل جائیگی۔ نفیسہ اُس کے لیے تائیدِ ایزدی بن گئی تھی۔ میں نے کپڑے تبدیل کیئے اور گیراج میں سے گاڑی نکال کر میں اس کی بتیاں جلائے بغیر باہر نکل گیا۔ مجھے اس سے پیچھا چھڑا لینا چاہیے تھا۔
گاڑی میں نے اچھرہ سے آگے لے جا کر ایک ویران جگہ پر کھڑی کر دی اور پھر وہاں سے پیدل چل کر بڑی سڑک پر جا پہنچا۔ سُورج ابھی بہت دور تھا۔ صبح صادق کا اجالا چار سو پھیل رہا تھا۔ سڑک پر پہنچتے ہی مجھے ایک ٹیکسی مِل گئی۔ کوئی صبح خیز ڈرائیور رزق کی تلاش میں نماز پڑھنے کے فوراً بعد ہی سڑک پر نکل آیا تھا اور ابھی تک اُس کے چہرے پر سجدے کا تقدس جھلکتا نظر آتا تھا۔
جیل روڈ پر پہنچ کر میں نے نفیسہ کے بنگلے سے کافی دُور ٹیکسی چھوڑ دی اور پھر تیز تیز قدم اٹھاتا میں نفیسہ کے گھر جا پہنچا۔ بابا اس وقت لان کے پودوں کو پانی دینے کے لیے ربر کی نالی کو دوسرے کونے تک لیجا رہا تھا۔ وہ بہت ہی محنتی آدمی تھا اور جانتا تھا کہ اسے کس وقت کیا کرنا ہے۔ اس نے میرے معاملے میں خواہ مخواہ کسی قسم کے تجسس کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اسے اپنی مالکن پر اعتماد تھا اور دل میں اس بات کا یقین رکھتا تھا کہ وہ جو کچھ بھی کرتی ہے ٹھیک ہی کرتی ہے۔
کمرے میں پہنچ کر میں ایک بار پھر بستر میں جا گھسا۔ نیند ابھی تک تکیے پر سر رکھے میری منتظر تھی۔ میں جب دوبارہ سو کر اٹھا تو دن کے دس بج رہے تھے۔ بابا نے مجھے شیو کے لیے سامان دے دیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ ساری چیزیں نفیسہ کے

بھائی کی ہیں جو اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرونِ ملک گیا ہوا ہے — میں اپنے روزمرہ کے معمولات سے فارغ ہو کر میں راولپنڈی جانے کے لیے تیار ہوگیا۔ رہ رہ کر مجھے یہ احساس ڈستا تھا کہ اگر ریٹا بروقت میری مدد کو باغ میں نہ پہنچتی تو میرا کیا حال ہوتا۔ وہ لوگ تو مجھے بے خبری میں آلیتے اور سیدھے تختۂ دار پر پہنچا دیتے۔ ریٹا کا میں بے حد شکر گزار تھا۔ اس نے میرے لیے بہت بڑا خطرہ مول لیا تھا۔ اس جاں نثار ریٹا نے فرشتۂ رحمت بن کر میری مدد کی تھی۔ اور اس کو میرے لیے بھیجنے والی مسند آراء تھی۔ مجھ سے جو غلطی ہو چکی تھی اس کا ازالہ اس نے نہایت ہی ذہانت سے کیا تھا۔ اس نے گھر میں ہونے والے واقعات پر چونک کر ریٹا کو خبردار کر دیا تھا کہ وہ جس طرح بھی ہوسکے مجھے بچالے۔ کبری پر خدا معلوم کیا بیت گئی ہوگی۔ میری ذرا سی لاپرواہی اسے لے ڈوبی تھی۔ وہ اپنے لہجے میں بہت محتاط تھا۔ مجھے اس نے فون پر زیادہ دیر تو نہیں روکا تھا۔ بڑی مختصر بات کی تھی، اس نے مگر میری بدنصیبی ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی میرے تعاقب میں تھی۔ وہ میرے لیے میری لوحِ تربت لیے پھرتی تھی۔ میں ریٹا اور مسند آراء کی کوشش سے اس روز بچ گیا تھا ورنہ میرے اور تختۂ دار کے درمیان کوئی فاصلہ باقی نہیں رہ گیا تھا — میری زندگی کے سارے گہنے وہ اب تک نوچ کر موری میں پھینک چکے ہوتے۔ میں جانتا تھا کہ ایک بار میں ان کے ہاتھ آگیا تو وہ مجھے پھانسی چڑھا دینے کے لیے اگلے دن یا اگلے پہر کا انتظار نہیں کریں گے۔ پھر دن ایسے تھے کہ گالے ڈوبتے تھے اور... پتھر تیرتے تھے۔ کسی بھی چیز کا کوئی بھروسہ نہیں تھا۔
ڈر مجھے یہ تھا کہ آہو نے کبری پر بہت سخت ہاتھ ڈالا ہوگا۔ وہ اپنی فزوں تر احتیاط کے حصار کو کبھی بھی کسی طرف سے کمزور نہیں ہونے دیتا تھا۔ اور یہی اس کی کامیابی کی سب سے بڑی وجہ تھی۔ اب جو اس نے کبری کو میرے حوالے سے اس نئے رُوپ میں دیکھ لیا ہے تو وہ اسے کبھی نظر انداز نہیں کریگا مگر وہ وقت ایسا تھا کہ میں کبری کی کوئی مدد نہیں کرسکتا تھا۔ اتنا مجھے یقین تھا کہ وہ کبری کو کبھی بھی پولیس کے آگے نہیں ڈالے گا۔ کیونکہ وہ گرہ کٹ کبری آہو کے بے شمار راز سینے میں چھپائے پھرتا تھا اس سے بگاڑ کر آہو اپنی ساری عافیت کو بالائے طاق نہ رکھ سکتا تھا۔ میں نے چاہا کہ آہو کے گھر فون کرکے کسی سے وہاں کی صورتِ حال معلوم کروں مگر یہ اپنے زخم کو اپنے ہی ناخن سے چھیل دینے کے مترادف ہوتا۔ میں پہلے ہی بہت سی زک اٹھا چکا تھا۔ اب اس راہ سے کوئی خطرہ مول نہ لے سکتا تھا۔ میری ساری کاؤ کاؤ تو اس نکتے پر مرکوز تھی کہ جس طرح بھی ہوسکے میں سب سے پہلے آسیہ کو اس طویل اسیری کی ابتلا سے بچا لوں —
میری تدبیروں کی کاہیدگی اور ناکامی اگر یونہی بڑھتی رہی تو میں سمجھتا ہوں کہ آسیہ مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مایوس ہو جائے گی۔ وہ کافوری شمع کی طرح زنداں کے کسی خانے میں رواں رواں جل رہی تھی۔ اور میں اب تک ہزار بھاگ دوڑ کے باوجود کچھ بھی نہ کرسکا تھا۔ میری کارسنجی ساری کی ساری بیکار ثابت ہوتی تھی۔
اپنی اس طویل ناکامی اور بے بسی پر جھلا کر میں اپنا حُلیہ درست کرکے نفیسہ کے کمرے سے نکلا اور اس کے ملازم کو خدا حافظ کہکر اسی وقت وہاں سے روانہ ہوگیا مگر میرے کاسۂ سر میں ہلچل مچی تھی۔ میں جانتا تھا کہ پولیس میری تلاش میں ہے۔ عین ممکن ہے ان لوگوں نے شہر کی تمام سڑکوں کی ناکہ بندی کر رکھی ہو۔ وہ مجھے ہر قیمت پر گرفتار کر لینا چاہتے تھے۔ مجھے اپنے سارے وجود کی قندیلیں بجھا کر آگے بڑھنا تھا تاکہ ان میں سے کوئی بھی مجھے پہچان نہ سکے۔ میری سنگلاخ راہوں کی سب سے بڑی خرابی یہی تھی کہ ان پر چلتے ہوئے آدمی اپنے سائے سے بھی لرزاں رہتا ہے۔ قانون کے ہاتھ بہت ہی لمبے تھے اور میں ایک منحنی سا بے وقعت اور بے وقار آدمی اپنی زندگی کے چراغ کو اُن کی آندھیوں سے بچا کر اپنی اسیرِ زنداں بہن کے لیے کچھ کرنے کی دُھن میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ اور میری بدنصیبی کا یہ حال تھا کہ میرا ہر قدم مجھے مایوسی کے اتھاہ غاروں کے قریب کیے دیتا تھا۔
سڑک پر نکلتے ہی میں نے ایک ٹیکسی پکڑی اور پچھلی سیٹ پر کچھ اس طرح پھیل کر لیٹ گیا جیسے میں بہت بیمار ہوں۔ میں جان بوجھ کر کراہنے لگا تھا۔
"کیا بات ہے باؤجی! طبیعت تو ٹھیک ہے نا آپ کی؟"
"نہیں یار! مجھے بخار آرہا ہے۔ تو مجھے اُدھر کسی ٹیکسی اسٹینڈ پر لے چل جہاں سے میں کوئی کار کرائے پر لے سکوں۔ پنڈی جانا ہے مجھے۔"
"ٹھیک ہے جناب!" باؤجی کے بجائے اب کی بار اس نے مجھے جناب بنا دیا۔ سمجھ گیا ہوگا کہ کوئی مالدار آسامی ہے — جو پنڈی تک ٹیکسی کار میں سفر کرنے کی سوچے وہ اس کی نظر میں اہم آدمی تھا۔
جیل روڈ سے اُتر کر وہ ریس کورس روڈ کی طرف چل دیا۔ اس سڑک پر سے گزرتے ہوئے کل کے واقعات میرے ذہن میں پھر سے تازہ ہونے لگے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ ریٹا پر کیا گزری تھی میں اس سے فون پر بات کرلیتا تو میری یہ فکر دور ہو جاتی مگر فون سے مجھے اب وحشت ہونے لگی تھی۔ ڈرائیور گورنر ہاؤس کے قریب سے گزر کر ڈیوس روڈ کی طرف مُڑنے لگا تو میں نے اسے روک لیا۔
"مجھے تو پہلے راوی روڈ پر لے چل یار! میں وہاں ڈاکٹر

بخاری سے دوا لے لوں میری طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب ہو رہی ہے۔"

اس نے گاڑی کا رُخ بدلا اور راوی روڈ کی طرف چل دیا۔ ریٹا کی خیریت معلوم کرنا بہت ضروری تھا۔ وہ اگر کسی مصیبت میں پھنس گئی تو بہت ہی برا ہو گا۔ وہ لوگ شک کی بنا پر اسے بھی ادھیڑ کر رکھ دیں گے۔ وقت نے میرے پہلو میں قرولی گھونپ رکھی تھی جو کوئی بھی میرے قریب سے گزرتا، داغ داغ ہو جاتا تھا۔ میرے لہو کے چھینٹے اسے بھی گنہ گار بنا دیتے تھے۔ ریٹا نے مجھے بچانے کے لیے شاید اپنی گردن ان کی تیغ تلے دے دی تھی۔

بخاری کلینک کے سامنے پہنچ کر میں نے ٹیکسی چھوڑ دی۔ کبری کی دی ہوئی ٹوپی سر پر جما کر میں کلینک کے دروازے میں داخل ہو گیا۔ دل میرا دھڑ دھڑ بج رہا تھا۔ ڈر مجھے یہ تھا کہ اگر پولیس نے ریٹا کو دھر لیا تھا تو وہ لوگ وہاں ابھی تک دھرنا مارے بیٹھے ہوں گے۔ اس کے کمرے کی تلاشی لینے اور میرا کھرا ناپنے کے لیے وہ لوگ بخاری کلینک کا احاطہ کیے ہوں گے۔ پھر بھی میں اس عمارت میں داخل ہو گیا۔ یہ سوچ کر کہ اگر ریٹا وہاں موجود ہوئی تو میں اس کا شکریہ ادا کر دوں گا اور اگر وہ پکڑی گئی ہے تو اس کی رہائی کے لیے کوئی تدبیر کر سکوں۔ اس کی ذرا سی بھی مصیبت میرے لیے ناقابلِ برداشت تھی کیونکہ اس کے مجھ پر بڑے احسانات تھے۔

سامنے کے پورچ میں تین گاڑیاں کھڑی تھیں اور درمیان کی گاڑی کا رنگ کہتا تھا کہ وہ آہو کی ملکیت ہے۔ میں کسی کی نظروں میں آئے بغیر دائیں ہاتھ نکلا اور عمارت کے اندر چلا گیا۔ زنانہ اور مردانہ حصوں میں مریضوں کی بھیڑ لگی تھی ان سے صرف نظر کرتا ہوا میں دُوسری منزل پر جا پہنچا۔ ابھی میں راہداری میں ہی تھا کہ مجھے ریٹا کے کمرے سے دو باوردی آدمی نکلتے دکھائی دیے۔ ان کا رُخ دوسری طرف تھا وہ کسی مسئلے پر سرگوشی کے انداز میں باتیں کرتے ہوئے عمارت کی چھوٹی سیڑھی کی طرف بڑھ رہے تھے میرے پاؤں لڑکھڑا کر رہ گئے میرے اور ان کے درمیان بس ایک لمحے کا فاصلہ رہ گیا تھا وہ دونوں تھانیدار تھے اور ان کے پہلو میں لٹکتے پستول ایک ثانیے کے ہزارویں حصے میں آگ اُگل سکتے تھے۔ اس ایک بڑے ہی مہربان اور مبارک لمحے نے مجھے اپنی اوٹ میں لے کر ان کی نظروں سے محفوظ کر لیا۔

دو چار قدم آگے نکلا تو ریٹا نے کھلے دروازے میں سے جھانک کر انھیں دیکھا اور پھر سر گھما کر اس نے راہداری کی دُوسری طرف نگاہ ڈالی اور پھر اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیلنے لگیں۔ وہ تیزی سے پیچھے ہٹی تو میں بے آواز جھونکے کی طرح اس کے کمرے میں جا گھسا اور دروازہ اپنے پیچھے بند کر لیا۔ ریٹا سامنے دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی تھی اور اس قدر وحشت زدہ نظر آتی تھی کہ اُس کے منہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔ چند لمحوں تک وہ ٹکٹکی باندھ کر مجھے دیکھتی رہی۔ رنگ اس کا ہلدی ہو رہا تھا۔

"کیا بات ہے ریٹا! یہ کیا ہو رہا ہے تمھیں، اتنی خوفزدہ کیوں ہو؟"

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ میری آواز سُن کر وہ مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کر کے میری طرف بڑھی اور بولی۔

"اُدھر۔۔ اُدھر باتھ روم میں گھس جاؤ جلدی۔۔۔۔ وہ تمھارے کچھ لگتے اِدھر سے ہلتے ہی نہیں تھے۔" یہ کہہ کر وہ مجھے دھکیل کر غسلخانے کے دروازے تک لے گئی۔

"چلے گئے ہیں ریٹا وہ۔"

"نہیں، وہ پھر آئیں گے۔ مجھے کہہ گئے ہیں وہ نیچے گئے ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"مجھے کچھ معلوم نہیں ہے جیلانی۔ کل مجھے انھوں نے دو گھنٹے تک تھانے میں بٹھائے رکھا۔ انھیں یقین ہے کہ میں نے ہی تمھیں باغ میں سے فرار ہونے میں مدد دی ہے۔"

"اور حقیقت بھی یہی ہے لیڈی ریٹا! میں تو تمھارا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں۔"

"وہ تو میرا فرض تھا جیلانی! میرا بھی شکریہ ادا کرنے کی ضرورت ہے تمھیں؟ کیا سمجھتے ہو مجھے۔ آنکھ سے کہتے ہو وہ جسم کے درد پر نہ روئے۔ وہ تو روئے گی۔ چلو ادھر اندر جلد چھپ جاؤ۔"

"نہیں، میں اب جا رہا ہوں ریٹا! مسند آرا کا شکریہ ادا کر دینا۔ تم دونوں نے مجھے کل پھانسی کے پھندے سے بچایا ہے یہ تمھاری بڑی مہربانی ہے۔"

"ہاں وہ بہت گھبرائی ہوئی سی تھی۔ اس کا پیغام سنتے ہی میں ٹیکسی میں بیٹھ کر ادھر چلی گئی تھی مگر اب اُن سے جان چھڑانا مشکل ہو رہا ہے۔"

"کیا کہتے ہیں وہ؟"

"پوچھتے ہیں کہ میں باغ میں اُس وقت کیوں گئی تھی؟ انھیں درمیانی کڑی نہیں مل رہی ہے ورنہ وہ مجھے کبھی نہ چھوڑیں۔"

"بس ٹھیک ہے۔ تم اپنی بات پر اڑی رہو اور دیکھو یہ دس ہزار روپیہ رکھ لو تمھیں کسی بھی وقت ضرورت پڑ سکتی ہے۔"

"نہیں مجھے روپے کی جھلک مت دکھایا کرو ـــــ یہ

بالکل بکواس ہے۔"

"پاگل نہ بنو ریٹا! یہ کوئی بہت بڑی رقم نہیں ہے۔ حالات ایسے ہیں کہ تمھیں روپے کی کسی بھی وقت ضرورت پڑ سکتی ہے۔" یہ کہہ کر میں نے نوٹوں کی گڈی جیب سے نکال کر اس کی الماری میں رکھ دی۔

"تم نے اِدھر آ کر اچھا نہیں کیا ہے جیلانی! وہ تمھیں نہیں چھوڑیں گے۔ کہیں چھپ جاؤ۔"

"نہیں، میں اب چلتا ہوں۔ وہ مجھے کبھی بھی نہیں پکڑ سکیں گے ریٹا! بالکل مطمئن رہو۔ مسند آرا سے کہنا کہ میں اتوار کو اس کے گاؤں پہنچ جاؤں گا۔"

یہ کہہ کر میں اس کی آنکھوں میں اُمڈتے آنسوؤں کو نظر انداز کر کے باہر نکل آیا۔ راہداری میں لوگ آ جا رہے تھے۔ دائیں بائیں کے کمروں میں مریض شفا کی آس میں پاؤں پسار کر لیٹے تھے انہیں جیتے جی بیماری نے ادھ موا کر رکھا تھا اور ایک میں تھا جسے تندرستی لے بیٹھی تھی۔

راہداری عبور کر کے میں عمارت کی بڑی سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے اُترا اور اپنا وجود کمبل میں چھپا کر عمارت سے باہر نکلا تو میں نے دیکھا کہ آہو ان دو تھانیداروں کے ہمراہ کار میں بیٹھ رہا تھا۔ پچھلی کار وہاں سے روانہ ہو چکی تھی اس لیے اسے اپنی کار وہاں سے پیچھے ہٹانے میں کوئی دشواری نہیں تھی۔ وہ تینوں بہت سنجیدہ نظر آ رہے تھے۔ میں ایک ستون کی اوٹ میں کھڑا ان کے چہروں پر پھیلی سوچ کے زاویوں کو اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ آہو نے کار پیچھے ہٹا کر بڑے گیٹ کی طرف موڑی تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ آہو نے گیٹ سے نکلنے کے بجائے کار ایک زبردست جھٹکے سے وہیں روک دی۔ وہ بائیں ہاتھ کی گاڑی تھی اور میرا خیال ہے اُس بدبخت نے گاڑی کے آئینے میں مجھے ستون کے ساتھ کھڑے دیکھ لیا تھا۔ اُس نے تیزی سے دروازہ کھولا اور اپنے پیچھے بیٹھے تھانیداروں سے کچھ کہتا ہوا وہ جنوں خیز رفتار سے عمارت کی طرف لپکا۔ اس کی یہ حرکت دیکھ کر میں تو پاگل ہی ہو گیا کیونکہ میں کل سے زیادہ خوفناک صورتِ حال سے دوچار تھا۔ وہ لوگ اب عمارت کی طرف آ رہے تھے اور میرے تمام راستے مسدود کیے دیتے تھے۔ ان تینوں کی نگاہیں ستون پر جمی تھیں جو میرے وجود کو ان سے مخفی رکھنے میں ناکافی ثابت ہوا تھا۔ پستول ان تینوں نے سیدھے ہاتھ میں تھام رکھے تھے۔

ان سے بچنے کے لیے میں ستون کی اوٹ میں پیچھے ہٹا۔ عمارت کے بڑے دروازے میں گھسا اور بجلی ایسی سُرعت سے سیڑھیاں پھلانگتا ہوا دُوسری منزل پر جا پہنچا۔ راہداری میں ریٹا کے کمرے کی طرف بڑھنے کے بجائے میں دوسری منزل کے پچھلے حصے میں جا پہنچا۔ اُدھر عقبی کھڑکیاں سب کی سب آہنی جالیوں سے ڈھپنی تھیں اور پیچھے دس فٹ چوڑا صحن تھا۔ اس میں کود جانا میرے لیے کسی بھی طرح ممکن نہیں تھا۔ کوئی راہِ فرار نہ پا کر میں پاگلوں کی طرح بائیں ہاتھ مڑا اور ایک کمرے میں گھس گیا میرے سامنے ایک ادھیڑ عمر کی بڑے ہی دلکش خد و خال والی مریضہ لیٹی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ حواس باختہ ہو کر بستر سے اٹھنے لگی تو میں ایک دم اس کے سر پر جا پہنچا۔

"گھبرائیں مت آپا جی! میرے پیچھے پولیس لگی ہے۔ میری زندگی خطرے میں ہے۔" میں نے کچھ ایسی افراتفری سے بھرپور لہجے میں یہ بات کہی کہ اس کا رنگ اُڑنے لگا۔ مگر پھر فوراً ہی اپنے آپ پر قابو پا لیا کیوں کہ وہ تیزی سے اپنے کمرے کا جائزہ لینے لگی تھی۔

باہر کسی کے بھاری بوٹوں کی ٹھک ٹھک سنائی دے رہی تھی۔ کوئی آدمی سامنے سے گزر کر آگے نکل گیا تھا۔

میں نے اس عورت کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "مجھے بچالیں آپا جی"۔ میرے لہجے کی آزردگی دیدنی تھی۔ وہ عورت کوئی بڑے ہی مضبوط دل گردے کی مالک تھی۔ اپنی لمحاتی سراسیمگی پر قابو پا کر بولی۔ "ادھر میرے ساتھ لیٹ جاؤ۔ پاؤں کی طرف۔" یہ کہہ کر اُس نے اپنا بڑا خوبصورت ریشمی لحاف پاؤں کی طرف سے اُوپر اُٹھا دیا۔ میں نے جوتوں سمیت اس کے لحاف میں گھس کر اپنا سارا بدن توڑ مروڑ کر کچھ اس طرح ڈھانپ لیا کہ میرا خیال ہے میں اس کے جسم کا حصہ بن کر رہ گیا تھا۔ اپنے گھٹنے اس نے کچھ اس طرح اوپر اُٹھا لیے تھے کہ میرا دھڑ اس کی دونوں ٹانگوں کے نیچے دب گیا تھا۔ وہ دوہرے بدن کی خاصی تندرست عورت تھی۔ عمر اس کی یہی کوئی چالیس سال کے قریب ہو گی۔ اس کے مرض کی نوعیت کا میں اندازہ نہیں کر سکتا تھا۔ مگر اس کے لحاف میں رچی خوشبو یہی بتاتی تھی کہ وہ کسی خاص مرض میں مبتلا نہیں تھی محض کسی وہم تلے دب کر وہاں آ لیٹی تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے دیکھ لیا تھا کہ وہ خاصی متمول اور آسودہ حال عورت ہے۔ ڈھیر ساری خوبصورت چیزیں اُس نے اپنے گرد جمع کر رکھی تھیں

دروازے کے باہر ایک بار پھر کسی آدمی کے تیز تیز قدموں کی چاپ اُبھری۔ اس عورت نے دونوں ہاتھ بڑھا کر لحاف کو اچھی طرح پھیلا کر مجھے چاروں طرف سے ڈھانپ دیا۔

"وہ باہر نہیں جا سکتا۔ پچھلی دیوار میں کوئی کھڑکی کھلی نہیں ہے۔" ایک بھاری بھرکم آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"وہ کسی کمرے میں گھس گیا ہو گا خاں صاحب! اُسے پکڑیں

ورنہ ان مونچھوں کو منڈوالیں۔" یہ آہو تھا۔ اس کے لہجے میں بلا کا تمسخر اور استہزا تھا۔

"ان میری مونچھوں سے کیا ضد ہے آپ کو آہو صاحب! آئیں ادھر دیکھتے ہیں اس کمرے میں۔"

یہ کہہ کر وہ تھانیدار ساتھ کے کمرے میں گھس گیا تھا۔ کیونکہ مجھے اسی کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی تھی۔ چند ہی لمحوں بعد وہ واپس آ گئے۔

"ایک ایک کر کے سارے کمرے دیکھ لیں۔" آہو کہہ رہا تھا۔

"اتنی دیر میں وہ دوسری طرف نکل گیا تو؟" تھانیدار بولا۔

"میں تھانے فون کرتا ہوں وہ ساری عمارت کو گھیر لیں گے۔"

"بڑی دیر ہو جائے گی۔ ایک کمرہ آپ دیکھیں، ایک میں دیکھتا ہوں۔" تھانیدار نے کہا۔

"ہاں، میں وہ کمرہ دیکھتا ہوں۔" آہو کی آواز مجھے دور ہوتی سنائی دی۔

اچانک ہمارے کمرے کا دروازہ کھلا۔ تختوں کی چوں چرہ مجھے دہلا گئی۔

"السلام علیکم۔" تھانیدار خان نے کمرے کے اندر آ کر کہا۔

"وعلیکم السلام۔" اس عورت نے بڑے متوازن لہجے میں کہا۔

"میں معافی چاہتا ہوں آپا جی! ہم دراصل ایک مجرم کو تلاش کر رہے ہیں۔ آپ کا غسل خانہ دیکھ سکتا ہوں؟"

"دیکھ لیں، مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟"

مجھے تھانیدار کے بوٹوں کی بیزار کن چاپ سنائی دی وہ مجھ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اب وہ غسل خانے میں داخل ہو چکا تھا وہاں سے نکل کر وہ پھر کمرے کے وسط میں آ پہنچا۔ وہ غالباً اب کمرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا پلنگ کے قریب بھی آ گیا۔

"نیچے بھی دیکھ لیں۔ ادھر کوئی مجرم آتا تو میں اس کا گلا نہ گھونٹ دیتی۔ اس عورت نے بڑے مضبوط اور دبنگ لہجے میں کہا۔

تھانیدار ایک قدم اور آگے بڑھا۔ وہ اب پلنگ کے نیچے جھانک رہا تھا۔

"مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو خواہ مخواہ تکلیف دی۔"

اب وہ پیچھے ہٹ چکا تھا۔

"کوئی بات نہیں۔ دروازہ اچھی طرح بند کر جائیں۔" اس عورت نے اب کی بار پھر بڑے جمے ہوئے لہجے میں کہا۔

تھانیدار نے اپنے پیچھے بڑی آہستگی سے دروازہ بند کیا تو اس خاتون نے بستر سے اٹھ کر پھر اسی احتیاط سے اندر کی چٹخنی چڑھا دی۔

میں لحاف الگ ہٹا کر اس کے پلنگ پر یوں بیٹھا تھا جیسے کوئی خجالت کے بوجھ تلے دبا ہوا شخص بیٹھا ہو۔ اپنا سر میں نے ہاتھوں میں تھام رکھا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اس کا کس طرح شکریہ ادا کروں۔

وہ بڑی آہستگی سے چلتی ہوئی بستر پر واپس آئی اور لحاف کو کھینچ کر اپنے بدن پر ڈالتی ہوئی بولی۔

"وہ کیوں پیچھا کر رہے ہیں تمہارا؟"

"میں فوج سے بھاگا ہوا سپاہی ہوں۔ بس یہی جرم ہے میرا۔" میں نے اپنی جان چھڑانے کے لیے قصے کو بے حد مختصر کر دیا۔

"اسے تو اس میں ان مونڈی کاٹوں کو کیا تکلیف ہے۔ نہیں کرتے تم ان کی نوکری۔ کوئی دھونس ہے ان کی؟"

"بس قانون ہی ان کا ایسا ہے آپا جی کہ جو کوئی نوکری چھوڑ کر بھاگے، اسے جیل میں ڈال دیتے ہیں یہ لوگ اور مجھے بس چڑ ہے اس سارے چکر سے۔" میں نے سارے جہان کی بے بسی اور آزردگی اپنے لہجے میں سموتے ہوئے کہا۔

"دفع دور کر انھیں، لعنت بھیج ان پر۔ ذرا یہ دفعان ہو جائیں تو اطمینان سے چلے جائیو۔ کب سے بھاگ رہے ہو ان کے آگے سے آگے؟"

"تین مہینے ہو گئے ہیں آپا جی! یہ میرا پیچھا ہی نہیں چھوڑتے۔"

"ادھر کیسے آئے تھے تم؟"

"میرے معدے میں درد رہتا ہے اس کی دوا کے لیے آیا تھا میں۔"

"اور یہ تیرے پاس کوئی لوہا لاٹھی قسم کی بھی تو کوئی چیز ہے مجھے چبھ رہی تھی۔ کیا چیز ہے وہ؟"

"یہ بندوق ہے آپا جی! اسٹین گن یہ میں ساتھ ہی لے آیا تھا۔" یہ کہہ کر میں نے اپنے کمبل میں سے نکال کر اپنے دونوں ہتھیار اسے دکھا دیے۔

"مردوں کا زیور ہوتے ہیں یہ ہتھیار۔ انھیں سنبھال کر رکھ۔ تو نوکری کرے گا؟"

"کیسی نوکری آپا جی؟"

"ادھر ہمارے مربعوں پر چلا جا۔ میں لاشاری صاحب کو کہہ دوں گی۔ وہ تجھے اپنا گن مین رکھ لیں گے انھیں ضرورت ہے۔ شکل صورت سے تو مجھے کوئی بہت ہی بھلا آدمی لگتا ہے۔"

"مجھے پتہ دے دیں ان کا اور ایک رقعہ بھی۔ میں ان کے پاس چلا جاؤں گا۔"

"وہاں کوئی تیری ہوا تک بھی نہیں پہنچ سکے گا۔ وہ نام بھی کٹوا دیں گے لام سے۔"

"ٹھیک ہے آپا جی!"

"بس تو کل شام کو ادھر آ جائیو۔ لاشاری صاحب ادھر آئیں گے میں ان سے کہہ دوں گی۔"

"بہت بہتر آپا جی! یہ آپ کا بڑا احسان ہوگا مجھ پر۔"

"اب تم یوں کرو کہ اُدھر غسل خانے میں جا بیٹھو۔ یہ کرسی لے جاؤ۔ جب مجھے اطمینان ہو جائے گا کہ وہ چلے گئے ہیں تو میں تمھیں یہاں سے نکال دوں گی۔"

اس نے اچھی تجویز پیش کی تھی۔ میں اس کے سامنے نظریں نہیں اٹھا سکتا تھا۔ مجھے میری بدنصیبی نے اس روز ایک مریض عورت سے پناہ لینے پر مجبور کر دیا تھا۔

"آپ نے بتایا نہیں کہ آپ نے یہاں کیوں داخلہ لے رکھا ہے؟" میں نے کرسی غسل خانے کی طرف لے جاتے ہوئے کہا۔

"مجھے بلڈ پریشر کی تکلیف تھی جس کی وجہ سے دل بھی ڈوبتا رہتا تھا۔"

"اب تو میرا خیال ہے آپ کی طبیعت بہتر ہے۔"

"ہاں، میں اب کافی بہتر محسوس کرتی ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے لحاف کھینچ کر اپنے کندھوں پر ڈال لیا۔ وہ اب مجھ سے زیادہ بات کرنے کے موڈ میں نظر نہیں آتی تھی۔

میں نے غسل خانے میں گھس کر اندر سے چٹخنی لگائی، اور کرسی پر بیٹھ کر سگریٹ سلگا لیا۔ مجھے وہاں مطلع صاف ہونے تک بند رہنا تھا۔

میری سوچ کے پرندے پر پھیلا کر دور دور تک پرواز کرنے لگے۔ اپنے نصیب کی سیاہیاں مجھے دہلائے دے رہی تھیں۔ ہر ہر قدم پر مجھے اس اندھے کی طرح ٹھوکر لگتی تھی جس کے ہاتھ سے اس کی آنکھوں کے نور کی طرح اس کی لاٹھی بھی کھو چکی ہو۔

بیٹا وہاں سے زیادہ دور نہیں تھی مگر وہ میرے حال سے بالکل بے خبر تھی۔ میں چاہتا تو اس عورت کے ذریعے اسے وہاں بلوا سکتا تھا مگر اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ وہ اور زیادہ سراسیمہ ہو جاتی۔ اس کو اور زیادہ پریشان کرنا کسی بھی طرح مجھے منظور نہیں تھا۔

میں کوئی دو گھنٹے تک وہاں بیٹھا رہا مگر اس عورت نے میری طرف کوئی توجہ نہ دی۔ اس کے کمرے سے بھی مجھے کسی قسم کی نقل و حرکت کی کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی اور میں اس حیرت میں تھا کہ وہ مجھے وہاں بند کر کے اتنی بے نیاز کیسے ہو گئی۔ تاکید اس نے یہ کی تھی کہ میں اس وقت تک باہر نہ نکلوں جب تک کہ وہ خود مجھے آواز نہ دے اور اب دو گھنٹے یعنی سات ہزار دو سو ساعتیں گزر گئی تھیں اور اس نے مجھے پوچھا تک نہیں تھا۔ میرے پاس اب سگریٹ بھی ختم ہو چکے تھے اور مسلسل اسی شغل میں مبتلا رہنے کی وجہ سے میرا کلیجہ دکھنے لگا تھا۔ کچھ اس غسل خانے کی دربند ہونے بھی مجھے عاجز کر دیا تھا۔ جب میری مایوسی حد سے زیادہ بڑھ گئی تو میں نے بڑی احتیاط سے چٹخنی پیچھے کھسکائی اور دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہ عورت نیند میں دھت ہو کر لیٹی تھی۔ میں چند لمحوں تک اسے بڑے غور سے دیکھتا رہا اور اس کی میز پر رکھے کاغذات کو پرکھنے لگا۔ میں اب تک اس سے اس کا نام بھی نہیں پوچھ سکا تھا۔ اور میں چاہتا تھا کہ اسے جگائے بغیر یہ معلوم کر لوں کہ وہ کون ہے کہاں رہتی ہے۔

اپنی اس کوشش میں مجھے جلدی ہی کامیابی ہو گئی۔ اس کا پرس سامنے کی الماری میں رکھا تھا، اسے میں نے کھول کر دیکھا تو اس میں سے مجھے اس کا پاسپورٹ مل گیا جس میں اس کی تصویر بھی لگی تھی اور دوسری تفصیلات بھی درج تھیں۔ ایک طرف اس کے علاج کا چارٹ تھا۔ اس کو دیکھ کر مجھے معلوم ہوا کہ اس کمرے میں میرے داخلے سے چند ہی منٹ پہلے اس نے سکون آور دوا کھائی تھی جس کے زیر اثر وہ کچھ ہی دیر بعد گہری نیند میں کھو گئی تھی اور اسے یاد بھی نہیں رہا کہ وہ کہاں پڑی ہے۔ اس کے دوسرے کاغذات سے معلوم ہوا کہ خانیوال کے قریب گاؤں ادھم کی رہنے والی تھی۔ اس کا اپنا نام خالدہ اور اس کے شوہر کا نام عبدالولی لاشاری تھا۔ وہ عورت اس وقت تک دو بار برطانیہ اور ایک بار فرانس، مغربی جرمنی، اٹلی اور سوئٹزرلینڈ جا چکی تھی۔ اس کی تعلیم ایف اے تک تھی اور اس کے تین بچے تھے۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی۔ رہائش ان کی ان دنوں گلبرگ میں تھی۔

میں نے اس کے گاؤں اور شہر کے دونوں پتے لکھ لیے اور ساری چیزیں پرس میں بند کر کے میں نے کاغذ کے ایک ٹکڑے پر لکھا۔

"خاتونِ محترم! آپ گہری نیند میں ہیں۔ آپ کو جگا کر میں آپ کو پریشان نہیں کروں گا۔ آپ کی صحت کے لیے دعا کرتا ہوں۔ زندگی رہی تو میں انشاءاللہ کسی دن پھر آپ کی خدمت میں حاضر ہونگا۔ میرا نام نہیں، صرف میرا چہرہ یاد رکھیے کہ میرا نام جس کسی کے منہ پر آتا ہے وہ پریشان ہو جاتا ہے۔"

یہ چند لفظ لکھ کر میں نے کاغذ کا وہ ٹکڑا اس کے تکیے کے قریب رکھا اور دروازے کو بے آواز کھول کر باہر نکل گیا۔

مجھے یقین تھا کہ اس وقت تک وہ مکھیاں وہاں سے ٹل چکی ہوں گی۔ میرا اندازہ بالکل درست نکلا۔ اس وقت دن کا ڈیڑھ بج رہا تھا اور ہسپتال میں آئے ہوئے باہر کے مریض واپس جا چکے تھے۔ ڈاکٹر بھی شام کی ڈیوٹی پر دوبارہ حاضر

ہونے کے بیلے تھوڑے سے آرام کی غرض سے گھروں کو چلے گئے تھے۔ راہداری بالکل خالی پڑی تھی۔ میں نے چاہا کہ میں رینگتے بھی ہلتا چلوں مگر پھر یہ سوچ کر کہ اب اسے زحمت دینا قرینِ مصلحت نہیں ہوگا، میں بڑی سیڑھی کی راہ سے آہستہ آہستہ نیچے اترتا ہوا عمارت کے بڑے ہال میں جا پہنچا۔

وہاں بھی کوئی آدمی موجود نہیں تھا۔ زنانہ ہال کی طرف دو خاکروب صفائی میں مصروف تھے۔ دیوار گیر شیشوں میں سے میں نے باہر کا منظر دیکھا تو معلوم ہوا کہ سامنے پورچ میں ایک گاڑی کھڑی ہے۔ لان سے آگے گیٹ پر بھی کوئی آدمی موجود نہیں تھا۔ مگر ابھی میں صورت حال کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ مجھے اس گیٹ پر دو مسلح سپاہی نظر آئے۔ آہو کے ایماء پر وہ تھانیداران سپاہیوں کو وہاں نگرانی کے لیے کھڑا کر گئے تھے۔ اور اب وہ دونوں ہونقوں کی طرح کھلے گیٹ کے سامنے لیفٹ رائٹ کر رہے تھے۔ اور مجھے اُن کے درمیان سے ہو کر گزرنا تھا کہ اس منحوس عمارت سے باہر نکلنے کا ایک صرف وہی راستہ تھا۔

مجھے اپنا دم گھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ میں ابھی تک اُن کے نرغے میں تھا۔ وہ اپنا محاصرہ اٹھانے پر آمادہ نظر نہیں آتے تھے اور مجھے بہرحال راولپنڈی پہنچنا تھا۔ کل کا دن میری زندگی کا اہم ترین دن ہوگا کہ میں آسیہ کو سورج کی کھلی دھوپ اور آزادی کی روپہلی چاندنی میں نہاتے دیکھ سکوں گا۔ آسیہ کا خیال بگولوں کی طرح میرے ایوانوں میں کھلبلی مچا گیا اور میں دروازہ کھول کر پورچ میں جا پہنچا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں باہر کس طرح نکلوں۔ اِن دو سپاہیوں سے نمٹ لینا میرے لیے کچھ بھی مشکل نہیں تھا مگر اس کی کیا ضمانت تھی کہ وہ دو ہی تھے۔ ان کی تعداد بہت زیادہ بھی ہو سکتی تھی۔ وہ سب کے سب مجھ پر بھوکے کتوں کی طرح ٹوٹ پڑیں گے۔ غلام جیلانی وہ تجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے تیرے لیے سارے ہی راستے بند ہیں مگر یہ سب کچھ تو کب تک برداشت کرتا رہے گا۔

میں پورچ میں کھڑا تو تھا مگر میری توجہ کار پر مرکوز تھی۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ کار کا دروازہ مقفل نہیں ہے۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ ایک بڑا ہی سنہری موقع مجھے مل رہا تھا۔ وہاں سے اپنی زندگی کے چراغ کی ڈوبتی لو کو بچا لینے کا۔ میں نے بڑی آہستگی سے کار کا دروازہ کھولا اور اگنیشن کی چابی گھما کر انجن چلا دیا۔

وہ بہت ہی عمدہ قسم کی نئی نویلی ڈاٹسن کار تھی اور اشارے پر چلتی تھی۔ اسٹیئرنگ گھما کر میں نے گاڑی کو پیچھے کیا تو وہ دونوں سپاہی چوکنے ہو گئے مگر میں نے کمبل اتار کر الگ رکھ دیا تھا اور سیاہ عینک کسی بھی دیکھنے والی پتلی پر چڑھے میرے عکس کو بڑی حد تک بدل دینے میں مؤثر کردار ادا کر رہی تھی۔ میں نے چھوٹتے ہی کار کی رفتار تیز کر دی۔ تاثر میں یہ دینا چاہتا تھا کہ میں کسی مریض کے لیے کوئی اہم دوا لینے جا رہا ہوں۔ سپاہیوں نے کار کو قریب پہنچتے دیکھا تو وہ دائیں بائیں ہٹ گئے مگر نگاہیں ان کی میرے چہرے پر جمی تھیں۔ گیٹ سے نکلتے ہی میں نے کار کا رُخ راوی دریا کی طرف موڑا پھر شاہ گام رفتار سے میں اُن کی دست بُرد سے نکل کر اُن سے دُور جا پہنچا۔

ڈر مجھے یہ تھا کہ اگر انھیں ذرا سا بھی شک پڑ گیا تو وہ لوگ راوی کے پل پر رکاوٹیں کھڑی کر کے مجھے آگے جانے سے روک دیں گے۔ یہ بڑی خوفناک بات تھی کیونکہ ادھر شاہدرہ کی پولیس کو خبردار کرنے میں انہیں کوئی دیر نہیں لگ سکتی تھی۔ سارے ہی امکانات میرے سامنے تھے۔ کار کا مالک مجھے نیچے اتر کر وا دیلا مچا سکتا تھا۔ یہ ایسے خدشات تھے جنہیں میں کسی بھی طرح نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ یا ارحم الرحمٰن! یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ یہ سب لوگ تو مجھے تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں مگر تُو تو میرا ساتھ نہ چھوڑ میرے مولا! یہ سارا سلسلہ میرے لیے ناقابلِ برداشت ہوتا جا رہا ہے۔ یہ ارب کھرب لوگ جو تو نے اس کرۂ ارض پر آباد کر رکھے ہیں، سب کے سب پاکباز تو نہیں ہیں۔ ایک سے ایک بڑا پاپی پڑا ہے یہاں مگر اُن میں سے کسی کے بھی پانچنے راہ چلتے کُتّے نے نہ پھاڑ دیے ہوں گے پھر۔۔۔۔ یہ ساری گردشیں تو نے میرے ہی حساب میں کیوں لکھ دی ہیں۔ میں نہ ارجمند ہوں نہ ارج کا خواہاں، ایک صرف دو گھڑی سکون سے جی لینے کی آرزو کرتا ہوں اس سے تو محروم نہ رکھ۔ کہ۔۔۔ یوں۔۔۔ یوں چکی کے دو پاٹوں کے درمیان مجھے دانوں کی طرح پیس کر تجھے کیا حاصل ہوگا۔ ان پاٹوں کے درمیان کوئی اردب رکھ دے میرے پروردگا کہ ابھی آسیہ میری راہ تک رہی ہوگی۔ میں۔۔۔ میں۔۔۔ اس سے وعدہ کر بیٹھا ہوں مجھے شرمندہ ہونے سے بچا لے میرے مالک بیشک مجھے اور بہشت زندگی نہ دے مگر جینے کا حق تو مجھ سے نہ چھین۔

میرا دل لرز رہا تھا۔ میری راہ بہت ہی پُرخطر تھی۔ لاہور شہر سے نکلنا ہی میرے لیے محال ہو گیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے میرے حوصلے کی دیوار گرتی جا رہی ہے ایسے بھی لمحے زندگی میں آتے ہیں کہ آدمی تھک ہار کر کسی سایہ لے نام تلے بیٹھ کر آنکھیں موندنے منزل پر پہنچنے کی آرزو کرنے لگتا ہے۔ میری بھی حالت کچھ ایسی ہی ہو رہی تھی۔

فیصلہ کرنے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ میں نے راوی سیدھا جانے کے بجائے گاڑی بائیں ہاتھ کی ایک سڑک پر چڑھائی اور ایک محلے کے عین بیچ میں پہنچ کر اسے ایک مکان کے سامنے روک دیا۔ اس کے دروازے مقفل کر کے میں نے چابیاں جیب میں ڈالیں اور تیز تیز قدم اٹھاتا آگے نکل گیا۔

کچھ ہی دور جا کر میں نے چار پیکٹ سگریٹ خریدے اور پھر ایک ٹیکسی پکڑ کر شاہدرہ کی طرف چل دیا۔ کمبل میں نے تہہ کر کے سیٹ کے نیچے ڈال لیا تھا اور اب کوٹ کے نیچے لٹکی اسٹین گن کو چھپانا میرے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ پھر بھی میں دب دبا کر کچھ اس طرح بیٹھا کہ ڈرائیور کی توجہ کا مرکز بننے سے بچ گیا۔

جب میں راوی کے پل پر سے گزرا تو میرے سارے خدشے بے بنیاد ثابت ہوئے۔ وہاں نہ کوئی پولیس کا سپاہی موجود تھا، نہ کوئی رکاوٹ ہی راستے میں کھڑی کی گئی تھی۔

شاہدرہ اسٹیشن کے سامنے پہنچ کر میں نے ٹیکسی چھوڑ دی۔ راولپنڈی جانے کے لیے ایک گاڑی وہاں ابھی آ کر کھڑی ہوئی تھی میں سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ لے کر گاڑی میں جا بیٹھا۔ اب میں ہر طرف سے محفوظ تھا۔

گاڑی حرکت میں آئی تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ لاہور اپنی تمام تر نحوستوں سمیت پیچھے رہ گیا تھا۔ بڑی اذیتیں سہی تھیں میں نے اس شہر کے گلی کوچوں میں رہ کر۔ میری زندگی وہاں عذاب بن گئی تھی۔

ڈبے میں تین آدمی پہلے سے موجود تھے۔ ان میں سے ایک میرے پہلو میں براجمان تھا۔ دو سامنے بیٹھے تھے میرے ساتھ جو آدمی بیٹھا تھا اس کے ہاتھ میں اخبار تھا۔ اور وہ بڑے انہماک سے اس کے مطالعے میں غرق تھا۔ ابھی اس نے پہلے صفحے کی خبریں پوری طرح نہیں پڑھی تھیں کہ وہ بڑبڑایا، بولا۔

"توبہ ہی کرنی چاہیے۔ یہ اشتہار دیکھ رہے ہیں ربّانی صاحب دیکھیں۔" یہ کہہ کر اس نے اخبار پھیلا کر اپنے سامنے بیٹھے ایک ادھیڑ عمر آدمی کے سامنے کر دیا۔ میں بھی وہ اشتہار دیکھنے لگا مگر اس کی تفصیلات پڑھ کر میرا خون خشک ہونے لگا۔

اخبار میں پولیس کی طرف سے غلام جیلانی کی گرفتاری کے لیے عوام سے بھرپور تعاون کی درخواست کی گئی تھی۔ اطلاع دینے والے کو پچاس ہزار روپے انعام دینے کی نوید بھی دی گئی تھی، اور اشتہار کے عین درمیان میں میری دو تصویریں چھپی تھیں۔ ایک تصویر وہ تھی جب میرے چہرے پر داڑھی تھی اور دوسری وہ، جب میں نے یہ بڑی بڑی مونچھیں پال رکھی تھیں۔

میں دل ہی دل میں ان کو کوس رہا تھا بالکل ان بڈھی عورتوں کی طرح جن کا کسی بھی شخص پر بس نہیں چلتا نہ خاوند پر نہ بیٹے پر۔ اشتہار میرے سامنے تھا اور ایک عجیب سی زہر بھری مسکراہٹ میرے چہرے پر منجمد ہو کر رہ گئی تھی۔

"کمال ہے صاحب! کوئی بڑی نرالی شے ہوگا یہ غلام جیلانی بھی۔" ربّانی بولا۔

"دکھائیں تو صاحب میں بھی تو دیدار کروں اس جی دار کا جس نے پولیس کو بھی بے بس کر دیا ہے۔" تیسرے آدمی نے اخبار ربّانی کے ساتھی اکمل کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔ وہ آدمی بالکل میرے سامنے بیٹھا تھا۔ میں نے اپنے سر پر ٹوپی ذرا جما کر سیدھی کر لی۔ اور عینک کے زاویے درست کر کے بیٹھ گیا۔ مجھے ان کی گفتگو سے اب زیادہ دور تک آگے جانے سے خوف آنے لگا تھا۔ مگر وہ تینوں ان تصویروں میں اور اشتہار کی عبارت میں ایسے کھو گئے کہ انھیں یہ سوچنے ہی کی فرصت نہ رہی کہ ان کے سامنے جو آدمی بیٹھا ہے اس کے چہرے پر اگر مونچھیں اور داڑھی اُگ آئے تو وہ اس تصویر سے ہو بہو ملتا نظر آئے گا۔ جو اب ان۔۔۔۔ کے سامنے تھی۔ اور ہاتھ میں پچاس ہزار روپے کا انعام لیے ہوئے تھی۔

اور میرا یہ حال تھا کہ میں ازیں سو راندہ اور ازاں سو راندہ اُن کے سامنے بیٹھا ہونقوں کی طرح ان کے چہرے تک رہا تھا۔ مجھے ڈر یہ تھا کہ اگر اُن میں سے کسی نے میرے چہرے کے نقوش کی تصویر سے مشابہت تراش لی تو میرا کیا بنے گا۔ طے میں نے یہ کر لیا تھا کہ اگر ان سالوں نے ذرا سی بھی انٹ شنٹ کی تو ان سب کو بے ہوش کر کے گاڑی سے باہر پھینک دُوں گا۔ ان کے شکوک کی ندیاں جوش میں آنے سے پہلے ہی میں ان کا ازالہ بد کر دوں گا۔ ایسا جھٹکا کروں گا ان کا کہ انھیں تڑپنے کی بھی مہلت نہیں ملے گی۔

خدا کا شکر ہے کہ وہ سب کے سب باتوں ہی باتوں میں اتنی دور نکل گئے اور پولیس کے خلاف اپنی نفرت کے اظہار میں اس قدر منہمک ہوئے کہ انھیں یہ احساس تک نہ ہوا کہ غلام جیلانی تو ان کے سامنے بیٹھا ہے۔

میں بڑے اطمینان سے کھڑکی کے قریب ہو کر شیشے میں سے باہر کے مناظر دیکھنے لگا۔ سگریٹ کا پیکٹ اور ماچس میں نے سیٹ پر اپنے برابر رکھ دیے تھے۔ اپنی ساری پریشانی اور بدحواسی میں نے کمر میں اڑس لی تھی۔ اور میرا دایاں ہاتھ ٹھہر ٹھہر کر جیب میں رکھے لبالب بھرے "چُپ شاہ" پر پڑتا تھا۔ کیونکہ صورتِ حال کسی بھی وقت خراب ہو سکتی تھی۔ وہ مجھ سے کوئی ذاتی اڑ پنچ تو نہیں رکھتے تھے مگر وہ سالی پچاس ہزار کی خطیر رقم کسی بھی آدمی کو اس کے عزیز ترین رشتے سے دُور کر

سکتی تھی۔ اُس کو موڑ سے ہٹا سکتی تھی۔ میں بہت زیادہ محتاط ہو گیا تھا۔ وہ لوگ ذرا سے شُبہے پر مجھ کو زبردست قسم کا اڑنگا دے سکتے تھے۔

ربّانی صاحب اچانک چہچہانے لگے۔ بولے۔

"صاحب کوئی آدمی پیدائشی مجرم نہیں ہوتا۔ یہ سب کچھ معاشرے کا ہی دیا ہوتا ہے جو اسے کچھ باغی قسم کے لوگ لوٹا دیتے ہیں۔"

ان کی یہ بات سُن کر تیسرے آدمی نے کہا۔

"واہ صاحب واہ! کیسی عمدہ بات کہی ہے آپ نے مگر میں آپ سے متفق نہیں ہوں صاحب! رذیلوں کے بچے بھی رذیل ہی ہوتے ہیں، وہ سنا نہیں آپ نے کسی نے کیا خوب کہا ہے "اُتم سے اُتم ملے اور ملے نیچ سے نیچ۔ پانی سے پانی ملے اور ملے کیچ سے کیچ۔"

"یہ سب کہاوتیں ہیں قبلہ! کیا نام ہے آپ کا، میرا مطلب ہے آپ کا اسم گرامی؟"

"مجھے حبیب میمن کہتے ہیں، میں کراچی سے آیا ہوں جناب۔ بڑا اچھا سفر کٹ رہا ہے آپ کے ساتھ۔"

"شکریہ میمن صاحب! تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ دراصل ماحول ہی آدمی کو بناتا ہے۔ سانچہ وہی ہے صورتیں تو اللہ ہی کی بنائی ہوئی ہیں مگر سیرتیں اسی دنیا کی ساختہ ہیں۔" ربّانی صاحب بولے۔

"یہ بات نہیں ہے جناب! میں دودھ کی تاثیر کو دیکھتا ہوں۔ اب مثال کے طور پر آپ ہیں۔ شکل صورت سے آپ بہت پڑھے لکھے آدمی نظر آتے ہیں جیسے کوئی بہت صاحبِ ذوق اور فنکار ہوں آپ۔ تاثر یہ ملتا ہے کہ آپ اگر کوئی گڑبڑ کریں گے بھی تو بس ذرا بچ بچا کر۔ کوئی نہیں دیکھ رہا ہے تو آپ کسی کے ڈرائنگ روم سے گھڑی ہی جیب میں رکھ کر چل دیں گے۔"

میمن صاحب نے اپنا غیبی طمانچہ ربّانی صاحب پر داغ دیا۔ وہ تلملا اٹھے، بولے۔

توبہ، استغفراللہ۔ توبہ نعوذ باللہ من ذالک۔ کیسی بات کرتے ہیں صاحب آپ بھی۔ میں ایسا نظر آتا ہوں آپ کو۔"

وہ لال پیلے ہونے لگے۔ اپنی ٹائی کی گرہ انھوں نے اور زیادہ تنگ کر لی۔ اگر ان کا بس چلتا تو میمن صاحب کے گلے میں رسی ڈال کر اُن کا دم برابر کر دیتے۔

"حاشا و کلا میرا یہ مطلب نہیں تھا صاحب۔ میں.... میں تو مثال کے طور پہ کہہ رہا تھا۔" میمن صاحب ممیاتے۔ وہ ربّانی صاحب کا ردِ عمل دیکھ کر گھبرا گئے تھے کہ کہیں ڈھیں ٹپاس تک نوبت نہ جا پہنچے۔

"اچھی مثال دی ہے آپ نے۔ آپ سُن رہے ہیں اکمل بات۔ اکمل صاحب! مجھے ذلیل کر کے رکھ دیا اور فرماتے ہیں میں تو جی مثال دے رہا تھا۔ حد ہو گئی۔" ربّانی صاحب کا غصّہ کسی طرح ڈھل ہی نہیں رہا تھا۔

"میں صورتوں کے تاثر کی بات کر رہا ہوں جناب! اب مجھ ہی دیکھیں۔ میرا حلیہ دیکھ کر خواہ مخواہ ان صاحب ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں کھجلی ہونے لگتی ہے کہ مار دو ایک آدھ ہاتھ اس میمن پر۔ کیا کرے گا یہ۔" میمن صاحب نے میری طرف اشارہ کرتے ہوتے کہا۔ میں بھی بھنّا کر رہ گیا۔ وہ سالا مجھے اپنی صورت شکل کے اعتبار سے خونخوار ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دلیل کے استرداد کے لیے اس نے مجھے بھی اپنا مخالف بنا لیا تھا۔ اب وہ سب مجھے بڑے غور سے دیکھنے لگے تھے۔ میں تو سٹپٹا کر رہ گیا۔ اس بے وقوف نے مجھے بن دیکھے 'اتو' کر کے رکھ دیا تھا۔

"تم اپنی لڑائی لڑو میاں جی! مولوی کو درمیان میں مت گھسیٹو۔" میں نے بڑی مشکل سے مسکراتے ہوئے کہا۔

مولوی کا ذکر سُن کر اکمل صاحب کِھل اُٹھے۔ بولے

"آپ نے انھیں خوب اشارہ دیا ہے صاحب مگر یہ سمجھے نہیں ہوں گے کیوں میمن صاحب! اس مولوی کا قصہ یاد ہے آپکو"

"کون سے مولوی صاحب کا جناب؟" میمن نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

"وہی مولوی! جو کوٹھے پر کھڑی دو ہمسائیوں کی لڑائی کے دوران میں گلی سے گزرا تھا اور ان دونوں نے ایک دوسری کو مولوی کی جھولی میں ڈال دیا تھا۔ بڑا مشہور قصہ ہے یہ۔"

"میں نے نہیں سنا ہے صاحب اگر آپ تفصیل بتائیں تو میں بھی حظ اٹھا لوں اس قصے سے۔"

اُن کی یہ بات سنتے ہی اکمل صاحب نے بیچارے سادہ لوح مولوی کا قصہ انھیں سُنا دیا۔ اس کی تفصیلات پر تو ربّانی صاحب اور میمن صاحب ہنس ہنس کر دُہرے ہو گئے۔ جب میمن صاحب کی آنکھوں سے آنسو ہی بہ نکلے تو وہ رُکے اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولے۔

"خوب صاحب خوب بڑے مزے کا اشارہ دیا تھا آپ نے مجھے۔ ایسی صادق آتی ہے یہ بات ہم دونوں پر کہ بس پوچھیے"

"بس آئندہ احتیاط رکھیں جناب! ویسے میں آپ کا ہوں۔" میں نے ماحول کی اس خوشگوار تبدیلی پر سُکھ کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

ربّانی اور اکمل صاحبان گجرات پہنچ کر گاڑی سے اُتر گئے۔ خس کم جہاں پاک۔ میری سلامتی اسی میں تھی۔ جتنی آبجھ

میرے گرد کم ہوتیں اتنا ہی اچھا تھا۔ اُن کی تھکی تھکی ذہانت اور واماندہ بصارت کا میں شکر گزار تھا کہ وہ میری تصویر دیکھ کر بھی مجھے نہیں پہچان سکے تھے۔ میرے خلاف تو دشمنوں کے لنگ لگے تھے۔ میں کس کس کا منہ بند کر سکتا تھا۔ تیجنے کی لن ترانیاں کہاں تک اُس کا ساتھ دے سکتی ہیں۔ دیوانہ کر مو جائے کس طرف نکلے کہ کوئی اسے دیکھ نہ سکے پہچان نہ لے۔ مگر اُس سے تو ایک دنیا آشنا ہوتی ہے۔ وہ بھلا کہاں چھُپ سکتا ہے۔

اور پولیس کے ہاتھ تو دور دور تک پھیلے تھے۔ وہ تو لوپ الوپ میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں۔ اُن سے میری جو چشمک چل رہی تھی اس کا انجام مجھے معلوم تھا۔ ایک میری ماں جائی بہن آسیہ کا پیر جیل میں نہ ہوتا تو اب تک میں کبھی کا کسی اور منہ چھپا کر نکل چکا ہوتا۔ خدا کی زمین بہت وسیع ہے ایک آدمی کے لیے اُس کے سات پردوں میں سے کسی ایک پردے میں چھپ جانا کسی بھی طرح ناممکن نہیں ہوتا مگر وہ آسیہ مجھے باندھے بیٹھی تھی۔ وہ مجھے ہر سمت سے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ اور اُس کی اذیتوں کے خیال سے مجھے ایسی وحشت ہوتی تھی کہ سکون اور اطمینان کی ہر آغوش میں نے تج دی تھی۔ اور اپنی تمام توانائیاں میں اس بات پر صرف کر رہا تھا کہ جس طرح بھی بن پڑے میں اس حرماں نصیب آسیہ کو اس بندی خانے سے آزاد کرا لوں مگر میں ابھی تک کہیں بھی نہ پہنچ سکا تھا۔

ربّانی اور اکمل کے جاتے ہی میں اچھل کر برتھ پر جا چڑھا۔ اور کمبل میں منہ لپیٹ کر سو گیا میرے لیے یہی بہتر تھا میرے اردگرد تو مصائب کا لنگر بٹتا تھا۔ میری ساری زندگی لہو لہان ہوئی جاتی تھی۔ زخم اتنے زیادہ اور اتنے گہرے تھے کہ مرہم کو بھی شرمندہ کرتے تھے اور پنپنے کو بھی میرے غم بھڑبھڑ کر لو دے اٹھتے تھے۔ گاڑی کی رفتار خاصی تیز تھی۔ رُک رُک کر مجھے جو جھٹکے لگتے تھے اُن کی وجہ سے میں ڈھنگ سے سو بھی نہیں سکتا تھا۔ مجھے رہ رہ کر اس بات پر غصہ آتا تھا کہ وہ شہر جس سے میری اَن گنت یادیں وابستہ ہیں۔ وہ لاہور، وہ اونچے برجوں اور بڑی بڑی مسجدوں والا شہر میرے لیے یوں اچانک اتنا اجنبی اور کٹھور ہو گیا تھا کہ اس کی کوئی چھت میرا وجود برداشت کرنے پر آمادہ نہیں تھی۔ وہ گلی جس میں میں نے اپنا بچپن اور لڑکپن اور اپنے شباب کے بڑے ہی میٹھے رسیلے سال گزار دیے تھے مجھے راہ نہیں دیتی تھی مگر یہ نورجہاں کا بے وفا شہر، یہ جہانگیر کی میت کا امین بے مہر شہر اپنی فصیلوں میں اُن بے مثال لوگوں کو جگہ نہیں دے سکا تو میری اس کے نزدیک کیا وقعت ہو سکتی ہے انھیں، اس شہر نے اپنی مٹی میں سمو کر ایسی جگہ ڈالا کہ اُن بدنصیبوں کے مقبرے اس شہر کا حصّہ ہی معلوم نہیں ہوتے۔ حالانکہ یہ وہی شہر ہے جس سے اپنی بے پایاں محبت کے اظہار میں نورجہاں نے کہا تھا۔

لاہور را بہ جانِ برابر خریدہ ایم
جاں دادہ ایم و جنتِ دیگر خریدہ ایم

کوئی ایسے سنگدل حصار سے کیا کہہ سکتا تھا۔ حالت وہاں میری یہ ہو گئی تھی کہ میرے لیے وہاں دو قدم چلنا دشوار ہو گیا تھا۔ وہ عقابوں کی طرح مجھ پر جھپٹ پڑے تھے۔ وہ مجھے پہچانتے تھے اور میری شناخت کے لیے انھوں نے ہر جگہ میری تصویر پہنچا دی تھی۔ وہ مجھ پر ہمہ وقت نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ رہ رہ کر وہ اپنی پے در پے شکستوں پر دانت پیستے تھے۔ اُن کے انتقام میں ایک ذاتی رنگ پیدا ہو گیا تھا۔ اب میرے پیچھے قانون ہی اپنے لامتناہی تقاضے نہیں لیے پھرتا تھا بلکہ میرے تعاقب میں پولیس کے بے شمار لوگ میری گرفتاری کو اپنی انا کا سوال بنا کر بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ اور ان سانپوں کی سبھا میں جیبیوں کی لپالپ صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ سانٹے کی سگائی پر بھی راضی تھے۔ اپنے دس بیس آدمی مروا کر بھی وہ مجھے پکڑ لینا چاہتے تھے۔ اور میں سانسی بنا پاگلوں کی طرح کبھی ادھر جا نکلتا تھا کبھی ادھر۔ میری بھی کوئی زندگی رہ گئی تھی۔ وہ میرے پیچھے سانگریاں لیے پھرتے تھے اور اپنے حسابوں یہ سمجھتے تھے کہ میں بھی کوئی وحشی درندہ ہوں جسے ہانکا کر کے وہ کسی نہ کسی دن اچانک کسی جگہ بے بس کر کے پکڑ لیں گے۔

میمن اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگا تھا۔ ڈبے میں میرے اور اس کے سوا کوئی اور آدمی موجود نہیں تھا۔ میمن بچارا کوئی بڑا ہی ستودہ صفات آدمی تھا۔ اس نے مجھے کسی اور جھنجھٹ میں نہیں ڈالا۔ مجھ سے کوئی اور بات نہیں کی۔ جب اس نے دیکھا کہ میں بھی منہ سر لپیٹ کر سو گیا ہوں تو اس نے آنکھوں پر رومال رکھا، اور سیٹ پر پھیل کر لیٹ گیا اور کچھ ہی دیر بعد خراٹے لینے لگا۔ اس کو یوں نیند میں غٹ دیکھ کر میری بھی آنکھیں مندنے لگیں۔ اور میں سارے جہان کو صلواتیں سُناتا ہوا..... خود بھی گہری نیند میں کھو گیا۔

مجھے نہیں معلوم کہ میں کتنی دیر تک سوتا رہا۔ منہ میں نے اپنے کمبل میں اس طرح لپیٹ لیا تھا کہ صرف میری ناک ہی ننگی تھی اور رخ میرا ڈبے کی دیوار کی طرف تھا۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ کسی نے کمبل میرے چہرے پر سے سرکا دیا ہے۔ میں سمجھا یہ میرا وہم ہے مگر نہیں، ایک ہاتھ میں نے تیزی سے پیچھے کی طرف ہٹتے دیکھ لیا تھا۔ میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ میرے سامنے میمن کی سیٹ پر پاؤں رکھ کر ایک آدمی کھڑا تھا۔ اونچا لمبا تنومند آدمی جس نے پولیس کی وردی

پہن رکھی تھی۔ جس کی تراش خراش بتاتی تھی کہ وہ کسی ذمے دار پولیس افسر کے جسم پر سجی ہوئی ہے۔ ڈبے میں میمن اور اس کے سوا اور کوئی آدمی نہیں تھا۔ وہ پولیس افسر مجھے گہری گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اپنی نیند سے بوجھل آنکھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے میں اُٹھ بیٹھا۔

"برتھ پر چڑھنا چاہتے ہیں؟" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ وہ مسکرا دیا، بولا۔

"نہیں! میں... آپ کی یہ اسٹین گن کمبل سے باہر نکلی ہوئی ہے اسے پیچھے رکھ لیں، کہیں گر نہ جائے۔"

"اوہ! تو یہ بات ہے۔" میں نے کندھے پر لٹکتی اسٹین گن کو پہلو میں دبا کر کمبل کے نیچے چھپاتے ہوئے کہا۔

وہ پیچھے ہٹ کر میمن کے پاؤں کی طرف بیٹھ گیا۔ پستول اس کے پہلو سے بندھا تھا اور نگاہیں اس کی میرے چہرے پر جمی تھیں۔ اس کی وہ مانوس مسکراہٹ اور عیّار آنکھیں مجھے کچھ بتا رہی تھیں۔

"کہاں جا رہے ہیں آپ؟" اس کے لہجے کا تجسّس اور تحکّم میری سمجھ میں آ رہا تھا۔

"میں پشاور جا رہا ہوں۔" میں نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگاتے ہوئے کہا۔

"یہ اسٹین گن... میرا مطلب ہے یہ کیوں ساتھ لیے پھرتے ہیں آپ؟"

میں اپنی آنکھیں پوری طرح کھول کر اپنی شخصیت کی تمام تر دہشت اس کی طرف منتقل کرتا ہوا برتھ سے نیچے کودا اور اس کے سامنے جم کر بیٹھ گیا۔ بڑا مشکل مرحلہ درپیش تھا۔ چہرے مہرے سے وہ کوئی پٹھان نظر آتا تھا۔ اس کا لہجہ بھی ایسا ہی تھا کہ وہ لفظوں کو جھٹکا دے کر بات کرتا تھا۔ میمن ابھی تک خرّاٹے لے رہا تھا۔ اس کے پاؤں کی طرف ایک آدمی کے بیٹھنے کی جگہ تھی جس پر وہ پولیس افسر پھیل کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ میری ہر حرکت کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ اپنے پہلو سے بندھے پستول کو وہ ایک ثانیے کے ہزارویں حصے میں نکال سکتا تھا۔ عمر اس کی یہی کوئی تیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔ بڑی بڑی غلافی آنکھیں رنگ کے اعتبار سے کرنجی تھیں۔ بال اس کے قدرے بھورے اور گھنگھریالے تھے۔ "آپ نے بتایا نہیں کہ یہ اسٹین گن کیوں ساتھ رکھی ہے آپ نے؟"

"یہ میری ملکیت ہے، اور اس کا لائسنس بھی میرے پاس ہے۔" میں نے اس کے سوال سے بچنے کی راہ نہ پاتے ہوئے کہا۔

"اس کا لائسنس تو بڑے بڑوں کو نہیں ملتا آپ کو کیسے مل گیا؟"

"بڑے سے کیا مراد ہے آپ کی؟ کیا میں آپ کو کوئی گھسیارا نظر آتا ہوں؟"

"نہیں نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ آپ کمانڈو تو نہیں ہیں؟" میرے پُراعتماد لہجے سے وہ مات کھا گیا۔ میں مسکرانے لگا۔ اب اس کی بات کا جواب دینا بیکار تھا۔

"بتائیے نا۔"

اس سے پہلے کہ میں پولیس افسر کی بات کا جواب دیتا میمن صاحب جاگ اُٹھے۔ اپنے سامنے پولیس افسر کو دیکھ کر اُن کا رنگ ایک دم فق ہو گیا مگر یہ کیفیت صرف ایک ثانیے کے لیے ان کے چہرے پر قائم رہی جس پر فوراً ہی انھوں نے قابو پا لیا وہ کھنکارتے ہوئے اٹھے اور پاؤں سمیٹ کر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور اپنے گرد و پیش پر نگاہ ڈال کر بولے۔

"یہاں اخبار رکھا تھا میں نے۔"

"پتہ نہیں کہاں گیا۔ یہیں کہیں ہوگا ممکن ہے ہوا سے اُڑ گیا ہو۔" پولیس افسر نے درشت لہجے میں جواب دیا۔

"کمال ہے بھئی۔" میمن صاحب نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ "آخر گیا کہاں وہ اخبار؟ اتنا اہم تھا وہ۔ اس میں جو تصویر چھپی تھی وہ میری قسمت بدل سکتی تھی۔"

"زیادہ پریشان نہ ہوں میمن صاحب! میں نیا اخبار لے دوں گا آپ کو۔" میں نے اسے ٹالتے ہوئے کہا۔

"کیا تھا اس اخبار میں؟" پولیس افسر نے پوچھا۔

"صاحب اس میں جیل سے مفرور کسی غلام جیلانی ڈاکو اور قاتل کی تصویر چھپی تھی جس کی گرفتاری پر حکومت نے پچاس ہزار روپے انعام رکھا ہے۔ اور... اور یہ محض اتفاق ہے کہ ان کی صورت بڑی حد تک اس سے ملتی ہے۔ میں معافی چاہتا ہوں جناب مگر ہے کچھ ایسی ہی بات۔"

میں اندر سے لرز کر رہ گیا۔ وہ میمن سالا ایسا سادہ لوح تھا کہ مارتا بھی تھا اور معذرت بھی کرتا جاتا تھا۔

"آپ کی والدہ ماجدہ کی شان میں میں کوئی گستاخی نہ کر بیٹھوں میمن صاحب! آپ کی بکواس حد سے بڑھ گئی ہے۔" میں نے اپنا بوٹ اس کے گھٹنے پر رکھ کر دباتے ہوئے کہا۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹا۔ بھیگے مرغ کی طرح سکڑنے لگا۔ ہکلاتے ہوئے بولا۔

"میں... میں معافی چاہتا ہوں جناب دراصل وہ جناب...!"

ابھی میری نگاہیں اس کے چہرے پر ہی جمی تھیں کہ اچانک پولیس افسر نے پستول کھینچ کر مجھ پر تان لیا اور بڑے تحکم آمیز لہجے میں بولا۔

"یہ اسٹین گن نیچے پھینک دو مسٹر جیلانی!"

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ! اس پاگل پر اعتبار کر لیا ہے آپ نے؟"

"میں اچھی طرح پہچان گیا ہوں تمھیں غلام جیلانی! میرے

بریف کیس میں اخبار رکھا ہے میری نظر مجھے دھوکا نہیں دے سکتی۔ یہ اسٹین گن نیچے پھینک دو۔"

"آپ کو سخت غلط فہمی ہوئی ہے جناب! آپ کو بعد میں بہت پچھتانا پڑے گا۔ میں یہ پیٹی اتروا دوں گا آپ کی۔"

"زیادہ ٹرٹر مت کر جیلانی! یہ ہتھیار پھینک دے۔"

"جیسے آپ کی مرضی مگر سوچ لیں انجام اچھا نہ ہوگا۔" میں نے ساری صورتحال کا اچھی طرح سے جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ میرے چہرے پر شمہ بھر خوف ظاہر نہیں ہوا تھا مگر وہ مجھے کسی بھی طرح معاف کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔

"جلدی کرو۔ یہ زنجیر کھینچ دیں میمن صاحب!" وہ پولیس افسر کچھ زیادہ ہی پُرجوش ہو گیا تھا۔ میمن اٹھ کر کل بھرے کھلونے کی طرح زنجیر کی طرف بڑھنے لگا تو میں نے بڑے ہی غیر محسوس طریقے سے اپنی پھیلائی ہوئی بائیں ٹانگ اس کی ٹانگوں میں پھنسا دی۔ وہ دھڑام سے منہ کے بل گرا اور دروازے سے ٹکراتا ہوا فرش پر ڈھے گیا۔ ایک لحظے کے لیے پولیس افسر کی توجہ ادھر منعطف ہوئی تو میں نے اس کی کلائی دبوچ کر اس کے پستول کا رُخ کھڑکی کی طرف موڑ دیا۔ اس نے پوری قوت سے بایاں گھٹنا میری ٹھوڑی کے نیچے دے مارا مگر میں نے منہ پیچھے ہٹا کر اس کی کلائی کو کچھ اس طرح جھٹکا دیا کہ 'کڑاک' کی آواز پیدا ہوئی اور اس نے درد سے بلبلاتے ہوئے پستول چھوڑ دیا۔ میمن اپنی چوٹ بھول کر اٹھ گیا تھا۔ اور اس کا ہاتھ زنجیر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے پولیس والے کو دھکیل کر اس کے اوپر گرا دیا۔ میمن ایک بار پھر دیوار سے ٹکرایا اور فرش بوس ہو گیا۔ پولیس افسر درد سے پاگل ہو کر اس کے اوپر جا پڑا تھا۔ اس کی کلائی کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی جس کی وجہ سے اسے اتنی اذیت محسوس ہو رہی تھی کہ اس کا رنگ ہلدی ہو گیا تھا اور منہ اس کا یوں کھلا تھا جیسے اسے سانس لینے میں سخت دِقت محسوس ہو رہی ہو۔

میں نے پولیس افسر کو گریبان سے پکڑ کر اٹھایا اور گھسیٹ کر سیٹ پر ڈال دیا۔ میمن لرزتا ہوا خود ہی اُٹھ گیا۔ اب وہ میرے سامنے دیوار کے ساتھ کھڑا تھا اور مجھے یوں دیکھ رہا تھا جیسے کوئی خطا کار طالب علم اپنے استاد کے سامنے کھڑا ہو۔ پولیس والے کی آنکھیں درد کی شدت سے مُندتی جا رہی تھیں اور اپنی جھولتی ہوئی کلائی اس نے بائیں ہاتھ میں تھام لی تھی۔

"ہاں بیٹے تو تجھے پچاس ہزار روپے کا انعام چاہیے۔"

"نہیں نہیں جناب قسم لے لیں میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ میں تو مثال دے رہا تھا جناب! مشابہت کی بات کر رہا تھا میں۔" اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"تم ٹھیک سمجھے ہو بیٹا۔ میں ہی غلام جیلانی ہوں۔ کتنے پیسے چاہئیں تجھے۔ ادھر آؤ۔" میں نے سیٹ پر تن کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ وہ کپکپانے لگا، یوں جیسے اسے لرزنے کا تپ چڑھ گیا ہو۔

"ادھر آؤ۔" میں نے اب کی بار گرجتے ہوئے کہا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا میری طرف بڑھا۔ میں نے دائیں ہاتھ سے اس کا بایاں کان پکڑ کر کھینچا تو وہ چیخ اُٹھا۔ "خدا کے لیے جناب عالی قبلہ مجھے معاف کر دیں۔" مگر اس نے یہ بات کہنے میں دیر کر دی تھی۔ اس کا کان اپنے خانے سے کھنچ کر آدھ انچ باہر آ چکا تھا وہ درد سے بلبلا اُٹھا اور جب میں نے اس کا کان چھوڑا تو وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ وہ ذرا سا بھی جھٹکا برداشت نہ کر سکا تھا۔ وہ کان پر دونوں ہاتھ رکھ کر گھوما اور دھم سے فرش پر گر گیا۔ اُسے بھی اٹھا کر میں نے سیٹ پر ڈال دیا۔ فرش پر پڑی ہوئی دھول میں اس کے کپڑے اَٹ گئے تھے۔

پولیس افسر سے اپنی شکستہ کلائی کا درد برداشت نہیں ہو رہا تھا اور مجھے ڈر تھا کہ اگر کوئی اور آدمی اندر آ گیا تو خواہ مخواہ ایک نیا فضیحتا شروع ہو جائیگا۔ کیونکہ وہ مسلسل کراہ رہا تھا۔ سارا سفر بدمزہ اور کرکرا ہو گیا تھا۔ بلاشبہ پولیس کے ہاتھ بہت لمبے تھے مگر یہ احساس مجھے اس روز ہوا کہ مجرم کی کوتاہ قامتی کا تو کوئی علاج ہی نہیں ہے وہ ہر کہیں ہر آنکھ کے سامنے آشکار ہو جاتا ہے اور وہ خود کو کسی بھی طرح مخفی نہیں رکھ سکتا۔ وہ اپنے چہرے پر ہی اپنے گناہوں کی داستان لیے پھرتا ہے جسے کوئی بھی پڑھ سکتا ہے۔ اس کی طرف کوئی بھی ہاتھ بڑھ سکتا ہے۔ وہ کہیں بھی محفوظ نہیں نہ زمین پر، نہ زمین کے اندر، نہ ہوا میں نہ خلا میں — وہ جہاں بھی ہوگا پہچان لیا جائے گا کیونکہ یہ اس کی سیاہ رُوئی ہی اُسکی سب سے بڑی دشمن ہے۔

میں نہ تو اپنا سفر ملتوی کر سکتا تھا، نہ وہ حلیہ ہی تبدیل کر سکتا تھا۔ پولیس افسر کی دگرگوں ہوتی ہوئی حالت سے پریشان ہو کر میں نے اُس کی جیب سے رومال نکالا اور اس کی کلائی پر کس کر باندھ دیا۔ وہ ذرہ بھر بھی مزاحمت نہیں کر رہا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ آ سکتی تھی کہ کوئی اسے یوں آناً فاناً بے بس کر دیگا۔ ایسا تو اس نے کبھی نہ دیکھا نہ سُنا ہوگا وہ میرے سامنے بندھا ہوا بنا پڑا تھا اور مجھے یوں دیکھ رہا تھا جیسے اسے میرے انسان ہونے پر شبہ ہو۔ بے کراں حیرت اس کی آنکھوں میں جھلکتی تھی۔ میں نے بڑی آہستگی سے اس کی گردن پر ہاتھ پھیرا اور پھر بڑے ہی غیر محسوس طریقے سے اس کی رگِ احساس پر انگلی رکھ کر اسے مسل دیا۔ اس کی ساری مشکلیں فوراً ہی آسان ہو گئیں۔ درد کی ساری سُوئیاں اس کے وجود میں تحلیل ہوئیں اور وہ گہری نیند میں کھو گیا۔ اسے میں نے سیٹ پر لٹا کر اوپر میمن کا کمبل ڈال دیا۔

"یہ دیکھیں جناب میرا کان بالکل باہر نکل آیا ہے یہ دیکھیں مجھے سخت درد محسوس ہو رہا ہے جنابِ عالی!" میمن نے یہ موٹے موٹے آنسو آنکھوں میں بھر کر کہا۔ وہ اس دوران ہوش میں آ چکا تھا۔

"کوئی بات نہیں ہے بیٹے! گوشمالی میں تو یہ سب کچھ ہوتا ہی ہے۔ مجھے امید ہے کہ آئندہ تم اپنی زبان بند رکھا کرو گے۔"

"کیا مر گئے ہیں یہ صاحب؟" اس نے میری بات کے مفہوم سے صرفِ نظر کرتے ہوئے کہا۔

"ابھی تو نہیں، مگر ہو سکتا ہے شام تک ان کا قصہ پاک ہو جائے۔" میں نے میمن کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

"یہ ۔۔ یہ تو بہت بڑے پولیس افسر لگتے ہیں جناب! یہ کیا کر دیا ہے آپ نے قبلہ!"

"اور تم ان کے پٹھو ہو۔ یہی بات ہے نا؟"

"نہ۔ نہ۔ جنابِ عالی ہرگز نہیں۔" اس نے اپنے درد سے بھرے کان پر دونوں ہاتھ رکھ کر ٹیس کو دباتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے بچے! لو اب لیٹ کر سو جاؤ اور خبردار جو منہ سے کوئی آواز نکالی تو پیٹ چاک کر دوں گا تمھارا۔"

وہ چُرمُر ہو کر سیٹ پر لیٹا اور آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا۔ اپنا دردیلا کان اس نے اوپر کی جانب اٹھا رکھا تھا۔

اس کی طرف سے مطمئن ہو کر میں نے پولیس افسر کا بریف کیس کھول لیا۔ اس میں ساڑھے تین سو روپے پہلو کی جیب میں دھرے تھے۔ دو جوڑے کپڑوں کے اس نے بڑی احتیاط سے تہہ کر کے رکھے تھے اور ان کپڑوں کے نیچے دو فائلیں تھیں وہ میں نے کھول کر پڑھیں تو معلوم ہوا کہ وہ پولیس افسر کچہری میں کسی چور کے خلاف ٹھوس ثبوت فراہم کرنے جا رہا تھا۔ دوسری فائل کسی قتل کے مقدمے سے تعلق رکھتی تھی۔ اور اس میں ملزم کا اقبالی بیان۔ اس کی دو تصویریں جس آدمی کو اس نے قتل کیا تھا، اس کی تصویر۔ اور ایک درخواست تھی مقتول کی بیوی کی طرف سے کمشنر راولپنڈی کے نام۔

اس مقدمے کی تفصیل بڑی ہی دردناک تھی اور معلوم یہی ہوتا تھا کہ وہ ثبوت جو پولیس والا مہیا کرنے جا رہا تھا، ملزم کو تختۂ دار تک پہنچانے کے لیے بہت کافی ثابت ہوں گے۔۔۔ میں نے غسل خانے میں لے جا کر دونوں فائلوں کو آگ دکھا دی۔ کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ میں جان چکا تھا اور اس تلخ تجربے سے خود بھی گزر چکا تھا کہ ان چکروں میں آدمی کو سب سے پہلے جس شے سے محروم ہونا پڑتا ہے وہ ہے عزتِ نفس اور اس محرومی کا نکتۂ آغاز تھانے کی دہلیز ہے۔ وہیں سے آدمی پور پور کٹنا شروع ہو جاتا ہے۔ اور جب وہ سزا پا کر بندی خانے پہنچتا ہے تو اس کی ذات کی شکست و ریخت کا ایسا ظالمانہ اور وحشیانہ سلسلہ شروع ہو جاتا ہے کہ آدمی چاہنے لگتا ہے کہ مر جائے کاش کہ ماں نہ زائے۔ اور وہ جو بچ نکلتے ہیں۔ مدعی ہوتے ہیں اور کامیاب کامران لوٹتے ہیں تو وہ بھی گھر پہنچ کر جب حساب کرتے ہیں تو ان پر یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ اُن کے خسارے کا تو حساب ہی نہیں کیا جا سکتا اور وہ سوچنے لگتے ہیں کہ شاید وہ ہم ہی ہیں جن کے بارے میں پروردگار نے زمانے کی قسم کھا کر کہا ہے کہ بیشک انسان خسارے میں ہے۔

فائلیں پوری طرح جل گئیں تو ان کی راکھ میں نے غسل خانے کے سوراخ کے راستے نیچے گرا دی۔ پھر میں نے پولیس والے کا پستول فرش پر سے اٹھا کر بریف کیس میں رکھ کر بند کر دیا۔ اب میں ان دونوں کی طرف سے بالکل مطمئن تھا۔ اُن سے اب مجھے کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔

خدا کا شکر ہے کہ چکلالہ تک ہمارے ڈبے میں کوئی اور آدمی سوار نہ ہوا۔ میں چاہتا تو راولپنڈی اسٹیشن پر بھی اُتر سکتا تھا مگر میں نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ میں چکلالہ اسٹیشن پر اُتر جاؤں۔ میمن ابھی تک سو نہیں سکا تھا۔ کان کے درد نے اسے نڈھال کر رکھا تھا۔ میں نے اس کی گردن دبا کر اسے پوری طرح بے ہوش کر دیا۔ اس کے ذہن پر کھدے اپنے نام کو تو بہرحال محو نہیں کر سکتا تھا۔ اسے دُنیا و مافیہا سے بے خبر کر کے میں چپ چاپ ڈبے سے نکلا، اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا پلیٹ فارم کے ایک جانب چل دیا۔

باہر رات زمین پر اپنا تاریک آنچل پھیلا چکی تھی۔ اسٹیشن ویران تھا اور عملے کا کوئی آدمی ٹکٹ دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کر رہا تھا۔ میں جنگلے میں بنے ایک آدم گزار سوراخ میں سے جھک کر نکلا اور ایک میدان میں سے گزر کر گریسی لائنز کی طرف چل دیا۔

اب میرے سامنے وہ شہر تھا جس کے ایک حصے میں بنی اونچی اونچی۔۔۔ سنگین دیواروں کے حبس کے پیچھے بیٹھی میری بدنصیب بہن اپنی بدنصیبی پر آٹھ آٹھ آنسو رو رہی تھی جس کے سپنوں کے سارے سنہرے کلسوں پر چیلیں آ بیٹھی تھیں اور جس کے مقدر کا سورج ایسا گہنایا تھا کہ اب وہ روشنی اور امید کی ایک کرن کو ترس کر رہ گئی تھی۔

آسیہ کا اذیت ناک خیال میرے ذہن میں ابھرا تو میری رفتار میں ایک دم تیزی آ گئی۔ میں دو رویہ کھڑے کوارٹروں کی قطاروں کے درمیان سے گزرتا ہوا بڑی سڑک پر جا پہنچا۔ رات ٹھنڈی بھی تھی اور تاریک بھی اور میں اس شہر کے گھنے خوفناک جنگل میں یکہ و تنہا اور بے آسرا بن باسی سدھارت (بدھ) کی طرح جا گھسا تھا۔ شاید مجھے بھی نروان کی تلاش تھی۔ ایسے نروان کی، جس میں مجھے میری ماں جائی بہن آسیہ مل سکتی تھی۔ جس کی آزادی کے لیے میں نے بڑے جوکھم اٹھائے تھے مگر ابھی تک مجھے اس راہ میں ناکامی کے سوا کچھ بھی نہ مل سکا تھا۔ میں ایسا بدنصیب تھا کہ اپنے لیے اور اپنی بہن آسیہ کے لیے میں قانون سے بھی کوئی مدد نہ لے سکا تھا۔ یہ ناممکن تھا۔ بہرِ معاملہ تو قانون کی ہر حد سے آگے نکل ہی چکا تھا مگر آسیہ کا مقدر مجھ سے زیادہ تاریک تھا۔ اس کی سزا کے خلاف میں کوئی اپیل بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ ساری ہی مدتیں گزر چکی تھیں۔ جرم ثابت اور سزا صادر ہو چکی تھی۔ ثبوت کے سارے پتے پولیس کے ہاتھ میں تھے اور میں اس طرف سے مکمل طور پر مایوس ہو چکا تھا۔ اگر مجھے کوئی توقع ہوتی تو میں ملک کے بڑے سے بڑے وکیل کو آسیہ کی مدد کے لیے بھیج سکتا تھا مگر افسوس تو یہ تھا کہ بڑی دیر ہو چکی تھی۔ اور اب یہ دروازہ دوبارہ نہیں کھولا جا سکتا تھا۔ مُہر لگ چکی تھی اور ہم دونوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنی بے پناہ قوت سے مہر بہ لب کر گئی تھی۔

ڈبے میں اپنے پیچھے میمن اور پولیس افسر کو اپنی جان کا دشمن بنا کر میں چھوڑ آیا تھا۔ خیریت یہ گزری کہ میں نے انھیں یہی بتایا تھا کہ میں پشاور جا رہا ہوں۔ وہ جب ہوش میں آئیں گے تو پولیس کو یہی بتا سکیں گے اور وہ لوگ میری تلاش میں پشاور کی طرف دوڑیں گے۔ لیکن میرا یہ اندازہ غلط بھی ہو سکتا تھا۔ وہ راولپنڈی میں بھی مجھے تلاش کر سکتے تھے۔ بہرحال ہرچہ بادا باد کہتا ہوا میں ایک ٹیکسی میں بیٹھا اور صدر کے ایک اونچے ہوٹل میں جا ٹھہرا۔ اندازہ میں نے یہ لگایا کہ ہوٹل جتنا بڑا ہو گا اتنا ہی آپ محفوظ ہوں گے۔ میں نے اعتدال سے کام لیتے ہوئے اپنے روپے کی وہاں کم سے کم نمائش کی۔ اپنا نام میں نے وہاں نصیر احمد چوہان لکھوایا۔ پتہ کراچی کا دیا اور غرض و غایت اپنے ورودِ سعید کی یہ بتائی کہ میں کاروبار کے سلسلے میں وہاں آیا ہوں۔ پیسے تو ان لوگوں نے بہت زیادہ لیے مگر خدمت خاطر میں بھی انھوں نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ کسی صاف ستھرے سے عمدہ ہوٹل میں رات گزارنے کا میرا یہ پہلا تجربہ تھا۔ اس رات پہلی بار مجھے محسوس ہوا کہ زر کو قاضی الحاجات جو کہا گیا ہے تو یہ بات ہر قدم پر سچ ثابت ہوتی ہے۔ میں کسی بھٹیچر سے کھٹمل مارے گندے غلیظ ہوٹل کی پھسڈی سی چارپائی کے بدبودار بستر میں لیٹا ہوتا تو پولیس کے سپاہی کئی بار اندر آ کر میری کمر پر لات مار کر مجھے جگاتے اور میرے اگلے پچھلے سارے گناہوں کا حساب طلب کرتے اور ٹلتے جب ہی جب وہ میری جیبوں کا اچھی طرح صفایا کر چکتے۔۔۔ مگر وہاں تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں شہنشاہ ہوں اور سب لوگ میرے ادنیٰ اشارے پر جان قربان کرنے پر تیار ہیں۔ یہ اچھی بات بھی مجھے پسند آئی۔

صبح اُٹھ کر میں نہا دھو کر جب ناشتے کی سجی سجائی میز پر بیٹھا تو وہاں اخبار بھی ساتھ ہی دھرا تھا۔ ملازم نے میری ہر ضرورت کا خیال رکھا تھا۔ میں نے سب سے پہلے اخبار کو کھولا۔ پہلے صفحے پر دنیا جہان کی خبریں موجود تھیں۔ جنگ، زلزلے، قحط۔ مگر ان میں سے کوئی بھی خبر ایسی نہیں تھی جو اپنی تعریف پر پوری اُترتی جو یہ بتا سکتی کہ کسی آدمی نے کتے کو کاٹ کھایا ہے۔ یہ جنگیں، یہ زلزلے، یہ قحط یہ بسوں ٹرکوں کے حادثے۔ یہ سیاسی بیان بازیاں تو انسان کا ازلی ابدی مقدر ہیں۔ میں نے صفحہ الٹ دیا۔ دوسرے صفحے پر میرا ذکر موجود تھا۔ مجھے یہی توقع تھی۔ پولیس افسر جس کا نام رفیع آفندی تھا اور میمن کی تصویریں چھپی تھیں سالے دونوں ہی مرجھائے ہوئے تھے۔ پھٹی پھٹی نظروں سے کیمرے کی طرف یوں دیکھ رہے تھے جیسے کوئی بھیانک خواب دیکھ رہے ہوں اور وہ بھیانک خواب انھیں ذہنی طور پر سُن کر گیا ہو۔ لکھا تھا کہ اشتہاری مجرم غلام جیلانی پولیس افسر آفندی اور ایک مسافر میمن کو ٹرین کے ڈبے میں زخمی کر کے نکل بھاگا۔ یہ وہی مجرم تھا جس کی گرفتاری پر حکومت نے پچاس ہزار روپے انعام مقرر کر رکھا ہے معلوم یہ ہوا ہے کہ مجرم پشاور جا رہا تھا آفندی کی ان لوگوں نے بہت تعریف لکھی تھی کہ اس نے مجرم کو پکڑنے کے لیے اپنی جان داؤ پر لگا دی مگر اس مقابلے میں وہ اچانک زمین پر گر پڑے جس کی وجہ سے اُن کی کلائی ٹوٹ گئی۔ اور وہ بے ہوش ہو گئے۔ میمن کے بارے میں انھوں نے لکھا تھا کہ شواہد بتاتے ہیں کہ وہ بے چارے خوف اور دہشت کی وجہ سے بے ہوش ہو گئے تھے۔ اُن کے کان پر گہری چوٹ آئی ہے مجرم نے ان کا کان بہت بُری طرح کھینچا تھا۔ دونوں زخمی ہسپتال میں زیرِ علاج ہیں اور پولیس مجرم کی گرفتاری کے لیے جگہ جگہ چھاپے مار رہی ہے۔ مصیبت یہ آ پڑی تھی کہ ان لوگوں نے خبر کے دونوں کالموں کے عین وسط میں میری بھی تصویر چھاپ دی تھی مگر میں نے جب آئینے میں اپنا تازہ ترین حلیہ دیکھا تو مجھے یہ احساس ہوا کہ پہلی دوسری یا تیسری نظر میں بھی عام آدمی مجھے نہیں پہچان سکتا۔ میمن تو کچھ زیادہ ہی ذہین تھا ایسوں کی چھٹی حس ویسے ہی تیز ہوتی ہے۔

میں نے اخبار الگ رکھ کر اطمینان سے ناشتہ کیا پھر اپنا سامان ایک اونچی الماری کی چھت پر ڈال دیا۔ الماری کی چھت کے گرد چھ انچ چوڑا حاشیہ لگا تھا اور وہ اتنی اونچی تھی کہ پلنگ کو یا کرسی کو آگے کھینچ کر اُوپر اٹھے بغیر وہاں رکھی کوئی چیز دیکھی نہ جا سکتی تھی۔ میں نے اوپر چڑھنے کے لیے کرسی استعمال کی تھی۔

اپنے لباس اور چہرے کی تراش خراش سے مطمئن ہو کر میں نے سر پر ٹوپی رکھی اور دروازے کو تالا لگا کر اطمینان سے سیڑھیاں عبور کر

کر کے ہوٹل سے باہر نکل آیا۔ تین راتیں وہاں گزارنے کے لیے پیشگی رقم پہلے ہی جمع کرا چکا تھا، اور ہوٹل والوں پر میرا اعتبار اچھی طرح جم چکا تھا اس وقت دن کے ساڑھے نو بج رہے تھے۔ ہوٹل سے کچھ ہی دور جا کر میں نے ایک ٹیکسی اسٹینڈ سے ایک سفید رنگ کی کار کرائے پر لی، اور سیدھا کشمیر روڈ پر ڈاکٹر عابد کے کلینک پر جا پہنچا۔ کار میں نے دروازے کے سامنے ٹھہرا دی۔

وہ ایک چھوٹی سی دکان تھی، یہی کوئی پچیس فٹ لمبی اور اور دس فٹ چوڑی۔ ڈاکٹر عابد اس کے وسط میں بیٹھے تھے۔ ایک طرف انھوں نے عورتوں کے لیے ایک چھوٹا سا کیبن بنا رکھا تھا۔ مردانہ حصہ وہی تھا جہاں وہ خود بیٹھے تھے۔ اُن سے میں نے ڈاکٹر نفیسہ کے بارے میں کہا تو وہ مجھ سے بڑے تپاک سے ملے۔ اُٹھ کر انھوں نے مجھ سے مصافحہ کیا۔ پرانی وضع کے معمر آدمی تھے، اپنائیت سے لبریز لہجے میں بولے۔

"وہ مجھے آپ کے بارے میں بتا گئی تھیں۔ رات کا کھانا انھوں نے ہمارے ہاں ہی کھایا تھا میرا خیال ہے وہ آپ سے ملنے یہاں آئیں گی۔ آپ بیٹھیں۔"

"آپ کی بڑی مہربانی ہے۔ میں اُدھر بیٹھتا ہوں صوفے پر، اُن کا فون آئے تو مجھے بتا دیں۔" اس وقت دس بج کر پندرہ منٹ ہو چکے تھے نفیسہ نے مجھے ساڑھے دس بجے کا وقت دیا تھا۔

میرا دل دھڑ دھڑ بج رہا تھا اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ اُس روز مجھے آسیہ کا چاند چہرہ دیکھنے کو ملے گا کہ مجھے خاک چاٹنی پڑے گی۔ اب تک تو میرا کوئی بھی کام سیدھا نہیں ہوا تھا۔ گرہیں تھیں کہ پیچ در پیچ پڑتی ہی جاتی تھیں۔ حالات کی اس گردشِ مدام نے مجھے نڈھال کر رکھا تھا۔ وہ جو ہر حال میں آدمی امید کی لَو اونچی رکھنے کی کوشش کرتا ہے وہ تو میری طرف سے بھی ہمہ وقت جاری رہتی تھی مگر یہ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ کچھ چیزیں ایسی ہیں جو میرے وجود میں پھل پھول نہیں رہی تھیں بلکہ شکست و ریخت سے دوچار تھیں۔ وہ جو سورج کو آسمان کے سینے سے نوچ کر نیچے لے آنے کی امنگ دل میں موجود تھی، اب وہ پہلی سی خود سری اس میں باقی نہیں رہی تھی۔ جانے ایسا کیوں ہوا جاتا تھا۔ ڈاکٹر عابد کی وہ سفید داڑھی وہ اُس کے رخسار اور اُس کی پیشانی پر پھیلتی لکیریں مجھے یہ احساس دلاتی تھیں کہ آدمی کی ساری دانائی اس کی ساری چارہ سازی، اس کی ذہانت فطانت بہادری دلیری اور جاں سپاری و جاں گدازی اس کے جذبے اُسکی امنگیں اس کے ولولے حوصلے غرضیکہ ہر شے جو اس کے وجود میں قدرت نے بھڑکتی آگ کی طرح بھر رکھی ہوتی ہے اپنے نکتۂ آغاز سے ہی رُو بہ زوال ہوتی ہے۔ اس کا شباب ہی اس کے عجوزنی کی طرف سفر کا پتہ دیتا تھا۔ اور یہیں سے آدمی کی بدنصیبی اور محرومی شروع ہو جاتی ہے۔

میرا زخمی بازو اب بھی مجھے یہ احساس دلاتا تھا۔ ذہن درد کے اشارے وصول کرتا تھا۔ رگِ احساس بدن کے ہر حصے پر اپنا تعلق قائم رکھے ہوتے ہے مگر ایسا کیوں ہے کہ مجھے آسیہ کا، آسیہ کو میرا حال جوں کا توں معلوم نہیں ہوتا۔ مجھے یہ دیکھ لینے کی قوت خدا نے کیوں نہیں بخشی کہ وہ میری حرماں نصیب دل کی پگلی بہن آسیہ اس وقت کہاں کیا کر رہی ہے۔ یہ جو گھونسا سا میرے دل پر ٹھہر ٹھہر کر لگتا ہے تو اس کی کوئی واضح توجیہہ میں کیوں نہیں کر سکتا۔ یہ کیسا پردہ ہے جو میری آنکھوں پر پڑا رہتا ہے تو نے کیسا مضحکہ خیز خلیفہ بھیجا ہے اس زمین پر میرے پروردگار۔ جس کے بارے میں یہی بات مشہور کی گئی کہ اس میں تیری تمام صفات موجود ہیں، اسے تو نے سب کچھ دے دیا مگر دقت اور فاصلے کا پردہ اس کی آنکھوں پر ڈال کر تو نے اسے اس کرۂ ارض کی لامتناہی وسعتوں میں بھٹکنے کے لیے یوں چھوڑ دیا کہ اب وہ اندھے کی طرح رہ چلنے اور قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتا ہے اور لہولہان ہوا جاتا ہے۔

میں شاید فلسفی ہوتا جا رہا تھا۔ طرح طرح کے بے سروپا خیالات میرے ذہن میں پیدا ہوتے۔ جب غم کی دیوار میرے گرد اونچی چن دی جاتی تھی تو میں ایسی ہی باتیں سوچنے لگتا تھا۔ کبھی میں پروردگار سے لڑنے لگتا تھا اور کبھی اپنے آپ سے دست و گریباں ہو جاتا تھا کہ ایک پروردگار شاید میرے اندر بھی چھپ کر بیٹھا تھا جو مجھے مختلف سمتوں میں دوڑا دوڑا کر میری سعیِ لاحاصل سے لطف اندوز ہوتا رہتا تھا۔ اور مجھے بے طرح غصہ آنے لگتا تھا میرے وجود میں کوئی ایسی جابر و قاہر ہستی بیٹھی نہ ہوتی تو میں اُس غم نصیب تاریک رات کے دامن میں یوں چھپ کر بے سوچے سمجھے ڈاکٹر عالیہ کی کوٹھی میں نہ گھس جاتا اور یوں خود کو خارجی طور پر ہلاک نہ کر لیتا اور اب یہ حال تھا کہ میری واپسی کا کوئی امکان باقی نہیں رہا تھا میرے پیچھے تمام راستے مسدود ہو چکے تھے۔ میں دراصل چالیسویں دروازے کو کھول بیٹھا تھا جس کو نہ کھولنے کی تاکید کی گئی تھی۔ کہ اس کو جس نے کھول لیا بلاؤں کو اپنے اوپر مسلط کر لیا۔

وقت بہت آہستہ رو تھا۔ دس بجے تو میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ مگر ڈاکٹر کے دائیں ہاتھ رکھا ٹیلی فون چپ رہا۔ ایک ایک لمحہ مجھے کچوکے دے رہا تھا یہاں تک کہ ساڑھے دس بج گئے میرا سارا بدن سنسنانے لگا۔ ٹیلیفون کی طویل چپ مجھے مارے ڈالتی تھی مجھے نہیں معلوم تھا کہ آسیہ پر کیا گزر رہی ہے۔ مجھے تو اب تک جیل کے دروازے پہ ہونا چاہیے تھا۔ نفیسہ نے مجھے یہی کہا تھا مگر اب تک وہ مجھ سے بات ہی نہ کر سکی تھی۔ میری تقدیر ہاتھ میں خنک لیے مجھے چاروں طرف سے دُھن رہی تھی۔ اور میں رقصِ بسمل میں مبتلا تھا۔

میں نے چاہا کہ میں اُٹھ کر جیل کی طرف چل دوں کہ اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی بلبلا اٹھی۔ میں لپک کر ڈاکٹر کے پاس جا پہنچا۔ وہ نفیسہ ہی تھی۔ ڈاکٹر نے ریسیور مجھے دے دیا، بولا "لیں بات کریں۔" یہ کہہ کر اس نے ایک کرسی میرے قریب ہی کر دی۔

"ہیلو۔" میں نے اپنے دل کی بے ترتیب دھڑکنوں پر قابو... پاتے ہوئے کہا۔

"لڑکے! تم ابھی تک وہیں بیٹھے ہو؟" وہ مجھے ڈانٹ رہی تھی

"اور کیا کروں؟"

"فوراً پنڈی پہنچ جاؤ اور میری بات سمجھنے کی کوشش کیا کرو۔" اس کا لہجہ اور تیز ہو گیا۔

"اور کچھ؟"

"نتھنگ ایلس، جسٹ ہری اپ" یہ کہکر اس نے فون بند کر دیا۔ میں نے ریسیور ڈاکٹر کے ہاتھ میں تھمایا اور بھاگ کر کار میں جا بیٹھا میرے کہنے پر ڈرائیور نے کار کا رخ کچہری کی طرف موڑ دیا۔ کار وہ ایسی تھی کہ اس کے عقبی دائیں بائیں کے شیشوں پر پردے لگے تھے۔ وہ میں نے کھینچ کر اس طرح برابر کر دیے کہ میں باہر سے کسی کو نظر نہ آ سکتا تھا۔ میں ایسی صورت حال سے دوچار تھا کہ وہ گاڑی مکمل طور پر میرے تصرف میں ہونی چاہیے تھی مگر وہ ڈرائیور میرے لیے وبالِ جان بنا ہوا تھا۔ اس کی موجودگی مجھے ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ ابھی میں کوئی آدھ میل ہی گیا ہوں گا کہ میں نے ڈرائیور سے صدر واپس چلنے کو کہا۔ وہ حیران تو بہت ہوا مگر منہ سے کچھ نہیں بولا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ مجھے میرے ہوٹل کے دروازے پر لے گیا۔

"بھائی جی! ذرا میرے ساتھ اوپر تک چلیں۔ کچھ سامان لانا ہے مجھے اپنے کمرے سے۔"

"آپ لے آئیں۔" وہ لاپروائی سے بولا۔

"ایک آدھ چیز آپ بھی پکڑ سکتے ہیں۔ زیادہ وزنی سامان نہیں ہے آیئے۔"

"چلیں صاب! نوکر کس کے ہیں ہم۔" یہ کہہ کر وہ بادلِ ناخواستہ گاڑی سے نکلا اور اس کے دروازے مقفل کر کے میرے ساتھ ہو لیا۔ اپنے کمرے میں پہنچتے ہی میں نے چیتے ایسی پھرتی سے گھوم کر اُس کی گردن دبوچ کر اُس کی رگِ احساس مسل دی اور یوں اُسے بے بس کر دیا۔ وہ فرش پر ڈھیر ہوا تو میں نے اُسے اٹھا کر بستر پر ڈالا اور اس کے ہاتھ اسی کے ازار بند سے کمر پر باندھ کر اس کے منہ پر پٹی چڑھا دی — الماری پر رکھی اپنی اسٹین گن میں نے کمبل میں لپیٹی اور اٹیچی کیس اٹھا کر باہر نکل آیا۔ کمرے کی چابی ابھی تک میری جیب میں تھی — اور ہوٹل کے کاؤنٹر پر میں نے اگلے تین دن کا پیشگی کرایہ جمع کرا رکھا تھا — کار اب پوری طرح میرے تصرف میں تھی۔ میں نے اسٹین گن کار کی پچھلی سیٹ کے نیچے رکھی اور پھر اسے بھگاتا ہوا جیل کے دروازے پر لے گیا۔ اس وقت دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ کار میں نے جیل کے دروازے کے بالکل سامنے کھڑی کی اور پھر باہر نکل کر گرد و پیش کا جائزہ لینے لگا۔ نفیسہ نے مجھے گیارہ ہی بجے کا وقت دیا تھا۔ میری ساری توجہ اب جیل کے دروازے پر مرکوز تھی مگر وہاں نفیسہ موجود نہیں تھی۔ نہ اندر نہ باہر۔ بائیں ہاتھ جیل کی سلاخ دار کھڑکیوں کے باہر ملاقاتیوں کی بھیڑ لگی تھی۔ وہ ایسا اندوہناک منظر ہے کہ سلاخوں کے پیچھے جانوروں کی طرح بندھے قیدیوں کے چہروں کی اذیت مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ میں نے اس بھیڑ پر نظر ڈالی تو مجھے ایک کھڑکی کے سامنے کچھ شناسا چہرے نظر آئے۔ اُن کو وہاں دیکھ کر میری حیرت سہ چند ہو گئی۔ وہاں تاہیا بھی کھڑا تھا اور گوگا بھی۔ یہ آبی کے ساتھی تھے۔ اور انہیں میں ڈگری میں جیب شاہ کے مکان پر زبردست زک پہنچا چکا تھا۔ یہی وہ لوگ تھے جن کو زخمی دیکھ کر آبی نے ان کے دشمن سے انتقام لینے کی قسم کھائی تھی اور وہ انہی لوگوں کی شکست کا بدلہ لینے کے لیے شگری کے مکان پر مجھ سے بھڑ گیا تھا۔

اچانک تاہیا کی نظریں مجھ سے ملیں۔ وہ اپنی جگہ سے یوں اُچھل کر پیچھے ہٹا جیسے اسے بچھو نے ڈس لیا ہو۔ وہ بھورے رنگ کا کمبل اوڑھے ہوتے تھا اور سر پر سیاہ رنگ کی پگڑی تھی۔ اس نے گوگے اور قطب دین کو پیچھے کھینچا اور انھیں میرا چہرہ دکھانے لگا۔ میں نے ان کو یوں اپنی طرف گھورتے دیکھ کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ تاہیے کی آنکھوں سے نفرت اور انتقام کے شعلے سے لپکتے نظر آتے تھے۔ مگر وہ ایسا لمحہ تھا کہ میں اُن کی کسی بات پر توجہ نہیں دے سکتا تھا۔ وہ تینوں ایک جیسے لباس پہنے ہوتے تھے اور اپنے کسی قیدی دوست سے ملاقات کے لیے وہاں آئے ہوتے تھے۔ مجھے یہ احساس تو تھا کہ وہ بہت گھٹیا اور کمینے لوگ ہیں اور اپنی اس چوٹ کو ابھی تک نہیں بھولے ہونگے مگر مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ وہ وہیں میرے لیے ایک مصیبت کھڑی کر دیں گے۔ پھر بھی میں اُن سے صرفِ نظر کر کے دروازے کے پاس جا کھڑا۔

اچانک مجھے دروازے کی جالی کے پیچھے سفید لباس میں ملبوس دو صورتیں نظر آئیں۔ وہ ڈیوڑھی میں کھڑی تھیں۔ ڈیوڑھی کے منشی نے انہیں دیکھتے ہی دروازہ کھول دیا۔ اور... اور پھر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری ساری مصیبتیں ختم ہو گئی ہیں۔ ڈاکٹر نفیسہ آسیہ کو دھکیلتی ہوئی باہر آ رہی تھیں میں نے ان کو دیکھتے ہی کار کا پچھلا دروازہ کھولا تو وہ دونوں تیزی سے مجھ سے کچھ کہے بغیر کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھیں اور پھر پاگلوں کی طرح میں کار اسٹارٹ کر کے وہاں سے بجلی کی سی سُرعت سے سڑک پر جا نکلا اور بائیں ہاتھ

کو قصرِ صدارت کی طرف جانے والی سڑک پر ہو لیا۔

میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ یہ معاملہ اتنی آسانی سے طے پا جائے گا۔ میں آسیہ کو جیل سے رہا کرانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ مگر مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔

"یہ... یہ تم ہی ہو نا آسیہ میری بہن!"

"ہاں بھائی جان! یہ میں ہی ہوں آپ کی بدنصیب بہن۔"

"ایسا مت کہو۔ تم بدنصیب نہیں ہو آسیہ! شکر کرو تمھاری جان بچ گئی ہے۔" نفیسہ نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ کار کے اندر لگے عقب نما آئینے میں مجھے آسیہ کی صورت صاف نظر آ رہی تھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔ وہ بہت کمزور اور مرجھائی ہوئی نظر آتی تھی۔ پھر بھی میں خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ میں اسے جیل سے نکال لایا تھا۔ اب دُنیا کی کوئی طاقت اسے مجھ سے چھین نہیں سکتی تھی۔

مگر ابھی میں قصرِ صدارت کو جانے والی سڑک سے اُتر کر ایوب پارک کی طرف بڑھا ہی تھا کہ مجھے جیل کا سائرن بجنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ اس کا مطلب تھا کہ آسیہ کے فرار کی خبر انھیں مل گئی تھی۔ اور انھیں یہ احساس ہو گیا تھا کہ ایک قیدی عورت اُن کی آنکھوں میں دھول جھونک کر بھاگ نکلی ہے۔

میں نے کار کی رفتار ایک دم تیز کر دی۔ مجھے ان کی دسترس سے دور نکل جانا چاہیے تھا مگر میں ابھی ایوب پارک کے قریب پہنچا ہی تھا کہ مجھے پیچھے سے ایک کار تیزی سے اپنے پیچھے بڑھتی نظر آئی۔ میں نے غور سے دیکھا تو میرے اوسان خطا ہونے لگے۔ کار کی کھڑکی میں سے تاہیا سر باہر نکالے مجھے دیکھ رہا تھا۔ تو اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ میرا تعاقب کر رہے... اپنی اس رات کی چوٹوں کا حساب برابر کرنا چاہتے تھے۔ میں جانتا تھا کہ وہ آبی کے گہرے دوست ہیں۔ اور یہ بھی ممکن تھا کہ آبی نے انھیں میرا نام بھی بتا دیا ہو۔ تاہیا جب زخمی ہوا تھا تو اس نے مجھے اچھی طرح پہچان لیا تھا۔ اس نے قسم کھائی تھی کہ وہ مجھ سے حساب ضرور لے گا۔ لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ ایسے وقت میں مجھ سے ٹکرائے گا جب میں اپنے سرمایۂ حیات کو جھولی میں بھر کر بھاگ رہا ہوں گا۔

کار کی رفتار ممکنہ حد تک میں نے تیز کر دی۔ وہ لوگ برابر میرا تعاقب کر رہے تھے اور اس کوشش میں تھے کہ میں اُن کی نظروں سے اوجھل نہ ہو سکوں۔ اتنے پاگل تو وہ ہرگز نہیں تھے کہ آبادی میں مجھ پر حملہ آور ہوتے۔ میری زندگی کے سب سے پُرمسرت لمحے کو ان لوگوں نے مسموم کر کے رکھ دیا تھا۔ اگر میں تنہا ہوتا تو وہیں رُک کر اُن سے سارا حساب چکا لیتا۔ اُن کی تکا بوٹی اُڑا دیتا۔ میں اُن سے قطعاً خوفزدہ نہیں تھا مگر اب جس صورتِ حال سے میں دوچار تھا وہ ایسی تھی کہ مجھے اُن سے ہر حال میں بچ کر کسی طرف نکل جانا چاہیے تھا۔

"ڈاکٹر صاحب آپ نے آسیہ کے ساتھ باہر نکل کر اپنے آپکو بھی خطرے میں ڈال لیا ہے۔"

"میں نوکری پر لعنت بھیج آئی ہوں چوہدری صاحب۔ میری بہن رہا ہو گئی یہی بہت کافی ہے۔" نفیسہ نے آسیہ کو باہوں میں بھرتے ہوئے کہا۔

"وہ آپ کو نوکری سے برخاست کر دیں گے۔ آپ خود وہاں رہ جاتیں تو آپ کی نوکری بچ سکتی تھی۔" میں نے نفیسہ کے لیے دل میں بیش بہا جذبے ابھرتے دیکھ کر کہا۔ اس اینلی نے میرے لیے ایسا کام کیا تھا جو کسی رستم سے بھی نہ ہو سکتا تھا۔ وہ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر آسیہ کو جیل سے نکال لائی تھی۔

"نوکری کی کوئی وقعت نہیں ہے چوہدری صاحب! یہ بھی تو دیکھیں کہ آسیہ میری ذرا سی کوشش سے رہا ہو گئی ہے۔" نفیسہ نے آسیہ کے لمبے لمبے اُلجھے ہوئے خشک بالوں کو سلجھاتے ہوئے کہا۔ وہ کسی شکر گزار بچے کی طرح نفیسہ کی آغوش میں ڈوب گئی تھی۔ تاہیے کی کار ایک مناسب فاصلے پر میرے پیچھے آ رہی تھی اور اب ہم راوات سے خاصے دُور نکل آئے تھے۔ اور میرا رُخ جہلم کی طرف تھا۔ مجھے یقین تھا کہ تاہیا راستے میں مجھ سے کوئی تعرض نہیں کرے گا اس لیے کہ میرے ساتھ دو خواتین تھیں۔ اس کا اسے کچھ نہ کچھ پاس ہونا ہی چاہیے۔

"یہ سب کچھ ممکن کس طرح ہوا ڈاکٹر صاحب؟ مجھے تو یوں نظر آتا ہے جیسے میں خواب دیکھ رہا ہوں۔"

"میری مانیں تو کار کو ادھر بائیں ہاتھ کھوٹے روڈ پر چڑھا لیں۔" نفیسہ نے میری بات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟"

"عین ممکن ہے وہ راستے کے تمام تھانوں کو خبردار کر دیں۔ آپ نے جیل کے سائرن کی آواز نہیں سُنی تھی؟"

"آپ ٹھیک کہتی ہیں نفیسہ مجھے احساس ہی نہیں رہا تھا۔" یہ کہہ کر میں نے کار کا رُخ بائیں ہاتھ کی ایک کچی سڑک پر پھیر دیا۔ رفتار چونکہ خاصی تیز تھی، کار اپنے پیچھے دھول کا بادل اُڑانے لگی۔ ابھی میں کچھ ہی آگے نکلا تھا کہ میں نے عقب نما آئینے میں تاہیے کی کار دیکھی وہ لوگ برابر میرا پیچھا کر رہے تھے۔ اور اب ان کی رفتار بہت تیز ہو چکی تھی وہ مجھے زیادہ مہلت نہیں دینا چاہتے تھے۔ میں نے کار کی رفتار ساٹھ پر پہنچا دی مگر وہ ناہموار سڑک میرے لیے مصیبت بن گئی تھی۔

اچانک پیچھے سے ہماری کار پر گولیوں کی بوچھاڑ پڑی۔ پچھلا شیشہ تڑاخ سے ٹوٹا تو نفیسہ اور آسیہ چیختی ہوئی سیٹ پر لیٹ گئیں۔ تاہیا مجھ پر اسٹین گن سے گولیاں برسا رہا تھا۔ میں نے کار کی رفتار اور تیز کر دی مگر عین اسی وقت کار کا پچھلا ٹائر پھٹ گیا۔

تاہیے کی کوئی گولی ٹائر میں دھنس گئی تھی۔ ٹائر پھٹا تو گاڑی میرے قابو سے باہر ہو گئی اور پھر مجھے کچھ بھی یاد نہیں ہے۔ کار ایک درخت کے تنے سے جا ٹکرائی اور بس۔ پھر میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا تھا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں ایک بڑے سے دیہاتی قسم کے پلنگ پر پڑا تھا۔ اس حال میں کہ مجھے اس پلنگ پر رسّیوں سے کس کر جکڑ دیا گیا تھا۔ نہ میرے ہاتھ کھلے تھے نہ پاؤں، میں پلنگ پر چت لیٹا تھا۔ کمرے میں ملگجا سا اندھیرا تھا جس سے میری آنکھیں مانوس ہوئیں تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ کوئی دیہاتی طرز کا بنا ہوا کچا کوٹھا ہے جس کی چھت کوئی نو فٹ اونچی تھی۔ کمرے میں ایک ہی دروازہ تھا۔ روشن دان نام کی کوئی چیز وہاں موجود نہ تھی۔ میرا منہ کھلا تھا مگر پیاس کی وجہ سے حلق میں کانٹے پڑے ہوئے تھے میرے زخمی بازو میں درد کی ٹیس سی اٹھ رہی تھی۔ شاید زخم ادھڑ گیا تھا میرا کوٹ میرے بدن پر موجود نہیں تھا۔ گھڑی بھی اتار لی گئی تھی میرے سینے میں ہلکا ہلکا درد تھا اور میرے چہرے پر کچھ خراشیں تھیں جن سے خون رس رس کر خشک ہو چکا تھا۔

گرد و پیش کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ وہ لوگ جو میرے تعاقب میں آ رہے تھے مجھے پکڑ لینے میں کامیاب ہو چکے تھے اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ آسیہ اور نفیسہ کہاں ہیں اور وہ مجھ سے کیا چاہتے تھے۔ ان کو اگر مجھ سے کد تھی تو وہ بہادروں کی طرح مجھ سے آمنے سامنے ہو کر مقابلہ کر سکتے تھے۔ مگر جس اوچھے انداز میں وہ مجھ پر حملہ آور ہوئے تھے وہ کسی طرح بھی اس رویے اور اس عالی ظرفی سے لگا نہیں کھاتا تھا جو میں آبی کے کردار کا حصہ سمجھتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ آبی کو اس بارے میں قطعاً کوئی علم نہ ہو گا۔ وہ لوگ جیل کے دروازے پر مجھے پہچان کر مجھ سے انتقام لینے کے لیے چڑھ دوڑے تھے مگر آسیہ اور نفیسہ کا کیا قصور تھا۔ اُن کا خیال آتے ہی میں بلند آواز سے چیخا۔

"اوئے تاہیے!" میں نے اسے گندی گالی دے کر پوری قوت سے پکارا۔ ان رسّی سے میں زور آزمائی کر کے دیکھ چکا تھا۔ اس کی وہ پیچیدہ گرہیں مجھے راستہ نہیں دے رہی تھیں۔ انھوں نے مجھے پوری طرح بے بس کر دیا تھا۔

میری پکار کا کسی نے جواب نہیں دیا۔ میرا حال اس چوہے کا سا تھا جو کڑکی میں پھنس چکا ہو۔ ذرا سا ہلنا بھی مجھے دشوار نظر آتا تھا۔

"اوئے گوگے، اوئے تاہیے... اِدھر آ... میرے سامنے آ کر بات کرو نامردو۔" میں ایک بار پھر چیخا۔ اب کی بار میری آواز انھوں نے شاید سن لی تھی مجھے دروازے کی کنڈی نیچے گرنے کی آواز آئی۔ اور پھر کچھ ہی دیر بعد دروازہ کھل گیا۔ ایک کالا بھجنگ آدمی ہاتھ میں برچھی لئے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کا سر گھٹا ہوا تھا۔ اور وہ کھیس کی بُکل مارے ہوئے تھا۔

وہ دروازہ کھول کر مجھے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"کیا گل ہے اوئے بھینسے کی اولاد کیوں چیختا ہے تو۔ بھوک لگی ہے؟"

اس کے چہرے کی کرختگی مجھے حیران کر گئی۔ میں نے ایسے ہیبتناک چہرے بہت کم دیکھے تھے۔ بہت پالا ہوا سور دکھائی دیتا تھا وہ۔ حالت اس کی یہ تھی کہ اس نے جو تہمد باندھ رکھا تھا اس میں سے اس کی وہ موٹی موٹی رانیں باہر پھوٹی پڑ رہی تھیں۔

"میں کہاں ہوں بھائی؟ مجھے یہاں کس نے باندھا ہے؟"

"توں ادھر خالوں کی حوالات میں ہے سجنا!"

"پر مجھے باندھا کس نے ہے؟"

"اس نے جس کا نام توں لے رہا تھا ابھی۔"

"تاہیے نے؟"

"ہاں۔"

"کہاں ہے وہ سالے ادھر بھیج۔ کیا چاہتا ہے وہ مجھ سے؟"

"آدمی تو بڑا جی دار لگتا ہے مجھے۔ تیری پتلون دیکھ کر تو میں سمجھا کوئی باؤ شاؤ پکڑ لایا ہے تاہیا۔ پر ہے تو شیر مرد۔"

"اُسے ادھر بھیج! کسی کو باندھ کر مارا تو کیا مارا۔ اسے کہہ مجھے کھول کر مجھ سے دو ہاتھ کر لے۔"

"وہ ادھر نہیں ہے۔ ابھی لاہور گیا ہے شام کو آئیگا تو بات ہو گی۔"

"تیرا کیا نام ہے؟"

"خالو۔"

"یہ کون سی جگہ ہے؟"

"تو ادھر زیادہ تفتیش خان بننے کی کوشش نہ کر سجنا! یہ تیرے بہنوئی کا گھر نہیں ہے، زبان بند رکھ اور رب رب کر اللہ مشکل آسان کریگا۔"

"خالو! مجھے تھوڑا پانی پلا ۔ یہ دھندا تو پتہ نہیں کب تک چلے گا۔"

"تیری باتیں مجھے پسند آئی ہیں۔ ٹھہر میں پانی لاتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ پیچھے ہٹا تو میں نے دیکھا کہ سامنے ایک کچا صحن ہے اور اس کے آگے ایک کچی دیوار ہے جو زیادہ سے زیادہ چھ ہاتھ اونچی ہو گی۔ ماحول میں رچی بو باس بتاتی تھی کہ میں کسی گاؤں میں ہوں۔ خالو کا لب و لہجہ بتاتا تھا کہ وہ پوٹھوہار کا رہنے والا نہیں تھا۔ اس نے لاہور شہر کا نام لیا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ میں اس شہر کے آس پاس کے کسی گاؤں میں رکھا گیا ہوں۔

صحن میں دائیں ہاتھ کھڑے کسی درخت کا ڈھلتا سایہ یہ احساس دلاتا تھا کہ سہ پہر ہو چکی ہے۔

خانو ایک ہاتھ بھر لمبے گلاس میں پانی لے کر آیا اور بولا۔

"لے سجنا پی اور جی۔ مجھے آدمی کو کتے کی طرح بندھا دیکھ کر دکھ ہوتا ہے پر میں مجبور ہوں۔ تاہیا آئے تو پتہ چلے کہ تیرا قصور کیا ہے۔"

"میں... میری کار ادھر ایک درخت سے ٹکرا گئی تھی۔"

"ہاں مجھے پتہ ہے۔ اس نے یہی بتایا تھا لے پانی پی۔" یہ کہہ کر اس نے میرے سر کے نیچے ہاتھ دے کر مجھے ذرا سا اوپر اٹھا کر گلاس میرے منہ سے لگا دیا۔ میں نے پانی پیا تو گلاس میں سے اٹھتی ہوئی کچی لسی کی لساند نے مجھے بہت بدمزہ کیا مگر جوں توں کر کے میں نے سارا پانی حلق سے نیچے اتار لیا۔ پیاس نے مجھے نڈھال کر رکھا تھا۔

اس نے گلاس پیچھے ہٹایا تو میں ایک بار پھر پلنگ پر سر ڈال کر لیٹ گیا۔

"میرے ساتھ میری بہن بھی تھی اور ایک لیڈی ڈاکٹر بھی۔"

"وہ دونوں تو بالکل ٹھیک تھیں، انھیں تاہیا اپنے ساتھ لاہور لے گیا ہے۔"

"اگر اس نے انھیں کوئی نقصان پہنچایا تو وہ زمین کے اوپر زیادہ دن تک نہیں چل سکے گا خانو۔ مجھے نہیں جانتا ہے وہ۔"

"دھمکی مت دے یارا۔ تو مجھے بھی نہیں جانتا۔ تاہیا میرا جگری یار ہے۔ تو اپنی یہ گز بھر کی زبان بند ہی رکھ۔ بہت ٹرٹر کرتا ہے تو۔" وہ ایک دم بھڑک اٹھا۔

"میرے یہ جکڑ بند کھول دے خانو! یہ مردانگی نہیں ہے۔"

"نہ نئیں اوئے مجھے تو ایسا ہی اُلّو کا چرخا سمجھ رہا ہے۔ سو جا اب اپنی ماں کو یاد کر کے سو جا۔" یہ کہہ کر وہ برچھی کا پھل کمرے کے کچے فرش پر مارتا ہوا باہر نکل گیا۔ دروازہ اس نے اپنے پیچھے بند کیا تو کمرے میں اندھیرا پھیل گیا۔ اب میرے چاروں طرف بے کراں سناٹا پھیل گیا تھا اور اس کچے کوٹھے کا محبس مجھے یہ احساس دلاتا تھا کہ اب کی بار میں جس شکنجے میں جکڑا گیا تھا اس سے زندہ سلامت بچ نکلنا آسان نہ ہوگا۔ مگر میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ تاہیا آسیہ اور نفیسہ کو لے کر لاہور کیوں چلا گیا ہے آخر وہ مجھ سے چاہتا کیا ہے؟ تین گھنٹے گزر گئے۔ تین بڑی ہی اذیت ناک صدیوں ایسے طویل اور بے رنگ و نور گھنٹوں کی مدت میرے وجود میں سے آرے کی طرح گزر گئی۔ باہر دن کی آنکھیں مندتی جا رہی تھیں۔ دروازے کی جھریوں میں سے نظر آنے والی روشنی ماند پڑتی جا رہی تھی اور مجھے یہ احساس ڈستا تھا کہ اس خالی ڈھنڈار گھر کے اس اجڑے اور آسیب زدہ کمرے میں میں اپنے کردہ اور ناکردہ گناہوں کا کفارہ ادا کر رہا ہوں۔ خانو بھی شاید باہر جا چکا تھا۔

اچانک مجھے صحن میں کسی جانور کے گلے میں پڑی گھنٹیوں کی آواز سنائی دی۔ کوئی عورت انہیں ہانک کر کھرلی کی طرف لے جا رہی تھی۔

"ادھر مر! وہاں کیوں چڑھی جا رہی ہے۔ خانو! اے خانو! اس بھوری کو باندھ دے ادھر۔"

"آتا ہوں، ابھی آتا ہوں۔"

خانو کی آواز مجھے کہیں قریب سے سنائی دی اور پھر مجھے باہر صحن میں خانو کے قدموں کی دھپ دھپ سنائی دی۔ وہ بھاگ کر دوسری طرف نکلا تھا۔

"بڑی دیر لگا دی تو نے صابری۔"

"ادھر رو ہی میں اس بھوری نے کھپا مارا ہے مجھے۔ ہاتھ ہی نہیں آ رہی تھی۔" صابری نے جواب دیا۔

"اچھا ٹھیک ہے تو اب اس کا دودھ دوہ لے۔ کچھ مہمان آنے والے ہیں، ایک مرغا بھی بھون دے۔"

"کون سے مہمان! کوئی مار دھاڑ والے ہی ہوں گے تیرے پروہنے۔"

"ہاں ہاں کچھ ایسی ہی بات ہے اور دیکھ اس کوٹھڑی میں مت جانا۔ ادھر ایک شکار باندھ رکھا ہے تاہیے نے۔"

"آئے ہائے اس تاہیے کے تو میں آج گوڈے توڑ دوں گی ہے کہاں یہ۔ چوڑیوں کا وعدہ کرتا تھا مجھ سے۔"

"وہ بھی لے آئیگا صابری میرا یار بات کا دھنی ہے۔ بس تو مرغا کاٹ دے ادھر ایک۔"

"آخر ہے کون؟ جسے اس نے ادھر باندھ دیا ہے کسی کو پتہ چل گیا تو مصیبت آ جائے گی۔"

"کسی کو پتہ نہیں چلے گا۔ اسی لیے تو گاؤں سے الگ کوٹھا کھڑا کیا تھا میں نے۔"

"اچھا لا وہ بالٹی لے آ ادھر۔ میں دھاریں نکال لوں بھوری کی۔ اس بھینسے کو تو اب نیچ ہی دے کوتی اور لو ویرا لے آ۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں تاہیے سے کہتا ہوں وہ بکوا دیگا اسے۔" خانو بولا۔

کچھ ہی دیر بعد صحن میں دودھ دوہنے کی آواز ابھری۔ دھاریں شاں شر کرتی بالٹی میں گرنے لگی تھیں۔

دودھ دوہ کر صابری خانو کے ساتھ دوسری طرف نکل اور پھر صحن میں جانوروں کے گلے میں بندھی گھنٹیوں کی آواز کے سوا کچھ بھی باقی نہ رہا۔ چار سو سناٹا چھا گیا۔

اب باہر سورج غروب ہو چکا تھا۔

میں اسی طرح کھرے پلنگ کے موٹے بان کی پھانسی پر ٹنگا چت لیٹا تھا۔ میرے بازو اور میری ٹانگیں درد سے بھر گئی تھیں۔ سارا جسم اینٹھ کر رہ گیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ آسیہ اور نفیسہ کے ساتھ وہ لوگ کیا سلوک کر رہے ہوں گے۔ اگر ان درندوں نے ان کی عزت پر ہاتھ ڈال دیا تو میرے پلے کیا رہ جائے گا۔ میں پھر کاہے کو زندہ رہوں گا۔ میری تیرہ بختی نے مجھے یہ دن بھی دکھا دیا تھا کہ آسیہ اور نفیسہ ان لوگوں کے ہتھے چڑھ گئی تھیں جن کے پنجۂ ستم سے ایک بے گناہ آدمی کو بچا لینے کا گناہ مجھ سے سرزد ہو چکا تھا۔ میں نے حبیب شاہ کو لٹنے سے بچایا تھا تو کوئی برائی تو نہیں کی تھی۔ وہ بھیڑیے اس غریب کو اس کی عمر بھر کی کمائی سے محروم کر دینا چاہتے تھے۔ مگر وہ لوگ میری تاک میں تھے۔ آہو نے تو اس روز مجھے معاف کر دیا تھا۔ اس نے گولی براہ راست میرے سینے پر نہیں چلائی تھی مگر یہ... یہ تاہیا تو ساری حدیں پھلانگ گیا تھا۔

میرے ذہن کے ایوانوں میں ڈھول اڈ رہی تھی اپنی بے بسی اور لاچارگی پر مجھے رہ رہ کر طیش آ رہا تھا۔ میں نے آسیہ کو ایک عذاب سے نکال کر دوسرے عذاب میں مبتلا کر دیا تھا اور اب وہ تنہا نہیں تھی، اس کے ساتھ نفیسہ بھی تباہ ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ اپنی بدقسمتی پر پہلے ہی اتنا گہرا یقین رکھتی تھی کہ اسے کسی چمکیلی، روپہلی صبح کی توقع ہی نہیں تھی۔ اب اگر اس کے ساتھ کوئی اونچ نیچ ہو گئی تو وہ بیچاری بھی آسیہ کی طرح جیتے جی مر جائے گی۔ اور یہ ایسا داغ ہوگا جسے میں اپنے خون سے بھی نہ دھو سکوں گا۔ میں ان کو اب زندگی بھر منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا تھا۔ آسیہ جیل میں تھی تو اتنا تو مجھے اطمینان تھا کہ اس پر کوئی بری نگاہ تو نہ اٹھتی ہوگی۔ وہاں کوئی اس کی عزت اور عفت پر تو ہاتھ نہیں ڈال سکتا تھا مگر اب وہ جن شہدوں کے ہتھے چڑھ گئی تھی، ان سے تو کچھ بھی بعید نہ تھا۔ میرے تن بدن میں آگ لگی تھی، مگر وہ رسیاں مجھے راہ نہ دیتی تھیں۔

اندر باہر گھپ اندھیرا طاری تھا اور بدن پر کوٹ نہ ہونے کی وجہ سے اس کھری چارپائی پر لیٹے لیٹے مجھے سردی نے پریشان کرنا شروع کر دیا تھا۔

اچانک مجھے صحن میں کئی آدمیوں کی آوازیں سنائی دیں۔

"اوئے خانو! کیا حال ہے ہمارے اس بدمعاش کا۔"

"بالکل ٹھیک ہے تاہیے یار جی! ادھر تو پرندہ پر نہیں مار سکتا۔"

"اوئے کتر دین! چل ذرا درشن تو کریں اس چوہے کے۔ بڑا تیس مار خاں بنا پھرتا تھا۔" یہ تاہیے کی آواز تھی۔

"کھول دے دروازہ خانو! اور وہ لالٹین ادھر لے آ۔" قطب دین نے پرجوش لہجے میں کہا۔ وہ سب کے سب صحن میں کھڑے تھے اور یوں باتیں کر رہے تھے جیسے وہ ہر قسم کا خوف و خطر دل سے نکال چکے ہوں۔

کچھ ہی دیر بعد دروازے کے سامنے روشنی سی جھلملانے لگی۔ اور پھر کنڈی نیچے گر گئی۔ دروازہ کھلا اور چار آدمی اندر آ گئے۔ خانو نے لالٹین اٹھا رکھی تھی۔ تاہیا قطب دین اور گوگا اس کے پیچھے تھے۔ انھیں میں نے اینٹوں کے بھٹے پر ونجلی خان چوکیدار کی جھونپڑی میں بھی دیکھا تھا اور ڈنگری گاؤں میں حبیب شاہ کے مکان کی دوسری منزل پر بھی۔ ان کے رنگ ڈھنگ بالکل پہلے ایسے تھے۔

تاہیا خانو کو ایک طرف ہٹا کر میرے سامنے پاؤں کی طرف آ ٹھہرا۔ پستول اس نے تہمد کی ڈب سے نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔

"کیا حال ہے بیٹا جی۔ کہو کیسی رہی؟"

"اچھا ہوں استاد! مگر یہ کوئی مردانگی نہیں ہے تمھاری۔ میرے ہاتھ کھولو تو پتہ چلے کہ میں بیٹا ہوں تمھارا یا باپ۔"

وہ بڑے معنی خیز انداز سے مسکرایا۔ بولا۔

"بچے! تمھارا اصلی باپ تو آہو ہے۔ میں تو صرف تمھارا منہ بولا ڈیڈی ہوں۔"

"ڈیڈی نہیں ڈیڈا کہو ڈیڈا۔ ڈیڈی تو اتنی سی چیز ہوتی ہے پور بھر۔" یہ کتر دین تھا۔ وہ پہلو کی طرف کھڑا تھا۔ اس کی یہ بات سن کر گوگا کھلکھلا کر ہنس دیا۔ مگر آہو کا نام سن کر میرا مغز الٹ گیا تھا۔

میں ایک جھٹکے سے اوپر اچھلا تو تاہیا سٹپٹا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"اس آہو سے کیا تعلق ہے تمھارا، اس خنزیر کے پتر... سے کیا واسطہ ہے تمھارا؟"

"بڑا واسطہ ہے بچے! ہمارا تو پیر استاد ہی وہی ہے۔ آبی کو میں نے ہی اس سے ملایا تھا۔"

"اوہ سمجھا۔ تو تم آبی اور آہو کے کہنے پر میرے پیچھے آئے ہو۔"

"آبی نہیں صرف آہو کے کہنے پر۔ اس نے کہا ہے کہ تم اس کا دو لاکھ روپیہ اور ہیرے واپس کر دو۔ جو تم اس کے گھر سے چرا کر لے گئے تھے۔"

"بکواس کرتا ہے وہ۔ میں نے کوئی چیز وہاں سے نہیں چرائی ہے۔ آبی اس بات کا گواہ ہے۔"

"تم بہت پیر کا جگر ہو جیلانی! مگر یاد رکھو اب تم ہمیں خراب نہیں کر سکو گے۔ تمھاری بہن آسیہ کو میں آہو کے عقد میں دے آیا ہوں اور وہ تمھاری نفیسہ بھی ادھر ہی ہے۔ اور آہو بڑا دل گردے والا آدمی ہے۔"

"بکواس کرتے ہو تابیے، مگر یاد رکھو یہ سودا تمھیں بہت مہنگا پڑے گا۔"

"مہنگا تو خریدا ہی ہے ہم نے۔ ہم تینوں کو زخمی کر دیا تم نے۔ اور جب ہم آہو صاحب سے ملے تو معلوم ہوا کہ گردن کا داؤ تم اور صرف تم ہی جانتے ہو۔ تمھیں آج میں ادھر پہچان نہ لیتا تو مجھے زندگی بھر افسوس رہتا۔"

"اب کیا چاہتے ہو؟"

"کچھ بھی نہیں، بس وہ دو لاکھ روپیہ اور وہ ہیرے آہو کو واپس کر دو۔ ان کی مالیت چوبیس لاکھ روپے ہے بچے اور تمھاری آسیہ اور نفیسہ اب اس کے حرم میں ہیں۔"

تابیے کو میں یوں ہی سا بدمعاش سمجھا تھا مگر اس کی باتیں سنکر میرے ہوش اُڑ گئے۔ وہ بھی آہو کا حلقہ بگوش تھا اور آبی کو وہی اس کے پاس لے کر گیا تھا۔ اب وہ میری گردن دبا رہے تھے محض اس شک کی بنا پر کہ میں آہو کی الماری سے وہ مال نکال لایا تھا حالانکہ میں نے وہاں سے صرف اپنی ہی رقم سروری بیگم سے واپس لی تھی۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ باقی سارا مال وہ ماجدہ اٹھا کر لے گئی تھی۔ اس نے رقم کا ذکر تو مجھ سے کیا تھا مگر یہ اس نے مجھے قطعاً نہیں بتایا تھا، کہ وہ وہاں سے ہیرے بھی اٹھا لائی تھی۔ یہ نیا پیچ پڑا تھا۔ اور اب میں کسی بھی طرح انھیں یقین نہیں دلا سکتا تھا کہ وہ چیزیں میں نے نہیں ماجدہ نے اٹھائی ہوں گی۔

"کیا تم آبی سے ملے ہو؟" میں نے تابیے کے لہجے کے طنز سے صرفِ نظر کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں، وہ ہمیں نہیں ملا ہے اگر مل جاتا تو شاید تم یہ جھوٹ نہ بول سکتے۔"

میں نے محسوس کیا کہ وہ یہ بات کہتے ہوئے مجھ سے آنکھ نہیں ملا رہا تھا۔

"میں تمھیں کیسے یقین دلاؤں تابیے کہ میں نے صرف اپنی ہی رقم سروری بیگم سے لی تھی۔"

"تو پھر دوسرا مال کس نے اٹھایا تھا وہاں سے؟"

"اس کا مجھے کچھ علم نہیں۔ ایک لڑکی ماجدہ وہاں آئی تھی۔ وہ میری دوست تھی۔ اس نے وہاں سے ایک لاکھ روپیہ اٹھایا۔ مگر ہیروں کا اس نے مجھے نہیں بتایا۔"

"بالکل غلط۔ کیوں کتر دین بہے نا یہ شخص اسٹوری باز قسم کا آدمی۔ اب اپنی کسی بھتیجی ماجدہ کا ذکر کر رہا ہے مگر جیلانی بچے یوں تیری جان نہیں چھوٹے گی۔ مال آہو کو واپس کر دو گے تو رسی کھول دوں گا ورنہ نہیں۔"

"قسم پر اعتبار کرو تو میں وہ بھی کھا سکتا ہوں۔" میں نے بہت بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بالکل بکواس۔ وہ کیا کہتے ہیں چوراں یاراں عاشقاں قسماں سنگ بیوپار۔ کیوں اوئے گو گے۔"

"میرا خیال ہے یہ جھوٹ نہیں بول رہا ہے تابیے۔ اس سے پوچھو وہ ماجدہ کہاں ہے۔"

"مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے مگر اسے آبی بھگا کر لے گیا تھا تابیے۔"

"نک نئیں اوئے! آبی ایسا آدمی نہیں ہے وہ استری پر ہاتھ ڈالنا کفر سمجھتا ہے۔"

"نہ مانو مگر۔ مجھے تو یہی معلوم ہے لیکن یاد رکھو تابیے اُس آہو سے بھی کہہ دو کہ اگر آسیہ اور نفیسہ کو کوئی نقصان پہنچا تو پھر قیامت آجائے گی۔ جیلانی سے وہ بچ نہیں سکے گا۔"

"دھمکی مت دے استاد! ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ تو تنہا کام کرنے کا عادی ہے اور ہمیں پتہ ہے تیرے پیچھے ایک تنکا بھی نہیں ملے گا۔ تو اپنے دل سے یہ اکڑفوں نکال دے اور اپنا قصہ اب ختم جان۔" تابیے نے پستول ڈب میں رکھتے ہوئے کہا۔ اچانک دروازے میں ایک لمبی تڑنگی دوہرے بدن کی عورت نمودار ہوئی۔

"اے خانو چل اب اُدھر روٹی تو کھا لے۔ آئے ہائے یہ کسے باندھ رکھا ہے تو نے اُدھر۔" مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ گھبرا کر میرے پلنگ کے پاس آٹھہری۔

"یہ جیلانی ہے بھابی! نامی گرامی آدمی ہے یہ۔ پھانسی کی کوٹھری سے بھاگ نکلا تھا یہ۔ پچاس ہزار روپے کا انعام مقرر ہے اس کی گرفتاری پر۔"

"آئے ہائے کیسا سوہنا جوان ہے، پر یہ خون کیسا ہے اس کے مُنہ پر۔ جیسے چاقو سے لکیریں ڈال دی ہوں کسی نے۔" وہ جھک کر میرے چہرے کی خراشیں دیکھنے لگی۔

"کار کے شیشے ٹوٹ کر یہ زخم لگا گئے تھے اسے۔ بڑے کام کی شے ہے یہ بھابی! بھون کر کھاؤ تو اور مزہ دے گا یہ۔"

"آئے ہائے توبہ توبہ! کیسے ظالم ہو تم لوگ! باندھ کر مارتے ہو غریب کو۔ میرے دیر ایسی شکل ہے اس کی۔"

"چلو چھٹی ہوئی۔ پرے دفع ہو جا صابری ورنہ جھانپڑ مار دوں گا۔ چل ادھر۔" خانو نے اسے کمرے سے باہر دھکیل دیا۔

"اے مجھے کیا۔ کھوہ میں ڈال دو اس کو۔ میں لعنت بھیجتی ہوں تم پر اور اس پر۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی باہر نکل گئی۔

"اب کیا پروگرام ہے تابیے یار جی؟" قطب دین نے پوچھا۔

"راتب ڈال دو اس کے آگے، آہو صاحب کا حکم ہے کہ اس وہ رقم اور ہیرے لے کر اسے ہم پولیس کے حوالے کر دیں گے۔ تاکہ"

اس کی گردن لمبی کر کے اسے گھر واپس بھیج دیں۔"

"ایسا نہیں ہو گا تابیے! میری گردن کے لیے ابھی کوئی رسّہ نہیں بنا ہے استاد! اس آہو سے کہہ دینا کہ آسیہ اور نفیسہ پر آنچ آئی تو پھر نہ مسند آراء رہے گی نہ سروری بیگم، اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا میں اس کے گھر کی۔" میں نے غراتے ہوئے کہا۔

"دیکھا جائے گا بچے! ابھی تو ریسٹ کر، ریسٹ۔ اور سمجھ رکھ کہ تو پہلے مال دے گا یا جان۔"

یہ کہہ کر تابیا اپنے ساتھیوں کو باہوں میں سمیٹتا ہوا باہر لے گیا۔ خانو نے دروازہ بند کر کے باہر سے کنڈی چڑھا دی ——— باہر نکلتے ہی تابیا دبی زبان میں بولا۔

"اوئے خانو! اس عورت ذات کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ اپنی اس صابری کو میکے بھیج دے آٹھ دس دن کے لیے۔" وہ دروازے کے قریب ہی رک گئے تھے۔

خانو کا جواب میں نہیں سن سکا۔ وہ ٹہلتے ہوئے آگے نکل گئے تھے۔

میرے چاروں طرف ایک بار پھر دبیز تاریکی چھا گئی وہ مجھے بدترین انجام کی دھمکی دے گیا تھا وہ تابیا۔ اس کو آہو نے میری سرکوبی پر متعین کر رکھا تھا۔ اس کی باتوں سے میں یہی اندازہ لگا سکا تھا کہ کچھ تو وہ اس ڈبگری کے قصے پر مجھ سے انتقام لینے کی تاک میں تھا۔ پھر وہ چونکہ آہو کا آدمی تھا اور اس نے اپنی ہر بات اسے بتا رکھی تھی اس لیے آہو کو معلوم ہو گیا تھا کہ ڈبگری میں جس آدمی نے انھیں بے ہوش کر کے بے بس کر دیا تھا وہ جیلانی کے سوا اور کوئی نہ ہو سکتا تھا۔ آبی پر سے آہو کا اعتماد اٹھ چکا تھا۔ عین ممکن ہے انھوں نے آبی کو پکڑ کر اسے بھی ذلیل و رسوا کر دیا ہو کیونکہ تابیا جب اس کا ذکر کر رہا تھا تو اس کے چہرے پر عجیب سا معنی خیز تاثر اُبھرتا نظر آتا تھا۔ آہو کے ایما پر تابیے نے ہو سکتا ہے آبی پر بھی ہاتھ ڈال دیا ہو کیونکہ آہو کے گھر سے جب مال غائب ہوا، تو اس وقت آبی بھی میرے ساتھ تھا۔ وہ ہم دونوں کو اس کا ذمے دار ٹھہراتا ہو گا۔ ماجدہ کے وجود کو وہ کسی بھی طرح تسلیم نہیں کر سکتے تھے کیونکہ اسے تو ان میں سے کسی نے بھی نہیں دیکھا تھا۔

سب سے زیادہ کوفت مجھے اس بات پر ہو رہی تھی کہ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا کے مصداق میری وہ حرماں نصیب بہن آسیہ اور وہ اپنی بدقسمتی کی شاکی نفیسہ اب اس آہو کی گرفت میں آ چکی تھیں۔ اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ انھیں کن ذلتوں سے دوچار کرے گا۔ وہ ایسا بدطینت آدمی تھا کہ اس سے محض اس شک کی بنا پر کہ مجیدن کی ماں نے میری مدد کی تھی، اس کی دھان پان بیٹی کو اغوا کروا کے چکلے پہنچا دیا تھا۔ اور اب وہ نمتھ اتروائی کے بیس ہزار روپے کی بھینٹ چڑھ کر ملیا میٹ ہو رہی تھی۔

کاش میں آسیہ کی طرف جانے سے پہلے اس بچاری کو اس اذیت سے نجات دلا سکتا۔ مگر میرا برا ہو، میں اپنی اس منہ بولی بہن کی مدد کو پہنچنے کے بجائے خون کے رشتے کے پیچھے چل نکلا اور نتیجہ یہ نکلا تھا کہ میں نے نہ صرف آسیہ کو ایک نئی مصیبت میں پھنسا دیا تھا بلکہ اب نفیسہ کو بھی دوزخ میں جھونک دیا تھا۔ اس نفیسہ کو جو ایک صاف ستھری عمدہ قسم کی باعزت زندگی گزار رہی تھی اسے میں نے اس کے پُرسکون گھونسلے سے نکال کر تقدیر کے اندھے تیر میں پرو دیا تھا۔ اس کی مایوسیوں اور بدنصیبیوں کا بھی اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ اس گوہار میں خواہ مخواہ ماری گئی تھی۔ آسیہ تو تھی ہی ایسی تیرہ بخت کہ مصائب نے ہمیشہ سے اس کے نتھنوں میں تیر دے رکھا تھا مگر اب میری وجہ سے مجیدن بھی تباہ ہو رہی تھی اور نفیسہ بھی اور شاید اب مسند آراء کی باری آنے والی تھی کیونکہ آہو کی راہ کا وہ سب سے بڑا کانٹا تھی۔

میں کتنی ہی دیر تک وہاں اس پلنگ پر رسیوں کی گرفت میں بے بس پڑا اپنے حالات پر غور کرتا رہا مگر جن مسائل سے میں دوچار تھا، ان کا کوئی فوری حل میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

کوئی ایک گھنٹے بعد خانو اور قطب دین دروازہ کھول کر اندر آئے وہ میرے لیے کھانا لائے تھے۔

"لے سجنا! کچھ بھوجن تو کر لے۔ خانو کھائے اور اس کا قیدی بھوکا رہے یہ نہیں ہو سکتا۔"

"اس کا ہاتھ مت کھولنا خانو! بڑی کتی شے ہے یہ۔" قطب دین نے خانو کو خبردار کرتے ہوئے کہا۔ لالٹین اس کے ہاتھ میں موجود تھی۔

"تو پھر یہ کھائے گا کیسے؟" خانو نے حیران ہو کر پوچھا۔

"میں اس کے ہاتھ کا مزہ چکھ چکا ہوں۔ یہ ایسی بدمعاش شے ہے کہ چٹکیوں میں آدمی کی بتی گل کر دیتا ہے۔"

"اچھا!" خانو نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"یوں کر، اس کا بایاں ہاتھ کھول دے۔ اس کا یہ بازو زخمی بھی ہے، پٹی بندھی ہے اوپر، شاید گولی لگ گئی تھی اسے۔ اب زخم تو بہتر ہے میں دیکھ چکا ہوں، پھر بائیں ہاتھ سے یہ کوئی کرتب بھی نہیں دکھا سکے گا۔"

"ہاں، یہ ٹھیک رہے گا تو نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔ میں سمجھا خاص قینچی مارتا ہے یہ۔"

خانو نے آگے بڑھ کر میرے بائیں ہاتھ کو صرف اتنا سا کھولا کہ میں لقمہ توڑ کر منہ تک لے جا سکتا۔

بڑی مشکلوں سے میں نے وہ کھانا زہر مار کیا۔ مرغے کی ایک

ٹانگ اور کچھ اور اچھی اچھی بوٹیاں رکابی میں رکھی تھیں۔ میں سمجھ گیا کہ وہ صابری کی نوازش ہے کہ وہ مجھے ویر ایسا سمجھتی تھی۔ اور مجھ پر ترس کھاتی تھی۔ کھانا کھا کر میں نے پانی پیا تو خانو بولا۔

"اور کچھ؟"

"مجھے کچھ سگریٹ دے دو تو تمھاری مہربانی ہے۔"

"ابے اسے سگریٹ مت دینا خانو! بڑی پلید شے ہے یہ سگریٹ سے رسّی جلا کر یہ اپنے جکڑ بند کھول لے گا۔"

"تو ٹھیک کہتا ہے یار! مجھے تو معاف ہی رکھ سجنا سگرٹ شرگٹ نہیں مل سکے گا۔"

یہ کہہ کر خانو باہر جانے لگا تو قطب دین بولا۔

"تیرے کوٹ میں رکھی ساری چیزیں محفوظ ہیں پیارے! جب تو تختے سے اُترے گا اور تیری گردن لمبی ہو چکی ہوگی تو ہم وہ ساری چیزیں تجھے واپس کر دیں گے۔"

"اور وہ نقدی میری طرف سے اپنی بہن کے عوض رکھ لینا۔" میں نے بڑے غضبناک لہجے میں کہا۔

قطب دین نے پلٹ کر تڑاخ سے ایک تھپڑ میرے منہ پر جڑ دیا۔

"زبان کاٹ دوں گا سالے! تیری۔ کُتے کا بچہ۔ خنزیر کی اولاد۔" وہ بہت زیادہ تپ گیا تھا۔

"بس اوئے بس قطب دین یار! تو تو گرمی کھا گیا ہے۔ لعنت بھیج اس پر بندھا ہوا برابر ہوتا ہے۔" یہ کہہ کر خانو قطب دین کو کھینچ کر باہر لے گیا۔ میرا گال سنسنا کر رہ گیا تھا۔ سوئر کے بچے نے بہت کڑا کے دار ہاتھ مارا تھا میرے منہ پر۔ کاش میرے ہاتھ کھلے ہوتے۔ میری ذلتیں اور رسوائیاں اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھیں۔ وہ بے وقعت سا بے حیثیت اور بے مغز قطب دین بھی مجھے تھپڑ مار کر چلتا بنا۔ اور میں دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔ میری انا کی پشت پر ایسے ایسے تازیانے پڑ رہے تھے کہ میں بلبلا اٹھتا تھا مگر کچھ بھی نہ کر سکتا تھا۔

اُس رات میں دل سے چاہتا تھا کہ پولیس آجائے۔ میری تلاش میں وہاں تک آپہنچے اور مجھے پکڑ کر ان کُتوں کی گرفت سے نجات دلا دے خواہ وہ مجھے تختۂ دار پر ہی چڑھا دیں مگر میں اُن کے ہاتھوں اس بے حد و حساب ذلت سے بچ جاؤں گا۔ اُن کے طفیل شاید میری وہ بہن بھی محفوظ ہو جائے کہ اُس کی عصمت کے لعل و گہر اس رات آہو کے رحم و کرم پر تھے۔ اور نفیسہ بھی اس کی ہوس کی بھینٹ چڑھ سکتی تھی۔ یہ تصور ہی مجھے خون کے آنسو رُلا دینے کے لیے بہت کافی تھا مگر کچھ بھی نہ ہوا۔ میری فریاد اس اندھیری کوٹھری میں گھٹ کر رہ گئی تھی۔

میری مایوسی حد سے بڑھی تو میرے آنسو بہ نکلے۔ میں رو دیا۔ ہاں میں غلام جیلانی ایک تند خو تنومند خونخوار صفت غلام جیلانی اس رات کے پہلے پہر کے دیگر سناٹے میں اُمڈ اُمڈ کر آنسو بہاتا رہا کہ میری بے بسی دیدنی تھی۔ میری شکستگی باعثِ عبرت تھی۔ میرے ہاتھوں میں طاقت موجود تھی مگر اُن سے کام نہ لے سکتا تھا۔

مجھے نیند نہیں آ رہی تھی اور وقت آہستہ آہستہ سرک رہا رہا تھا۔ چار سو بھیانک سناٹا طاری تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ غالباً انھوں نے باہر دروازے پر تالا ڈال دیا تھا۔ وہ مجھے کوئی موقع بھی نہیں دینا چاہتے تھے۔ ان سے اتنا بھی نہ ہوا کہ مجھے سردی سے بچاؤ کے لیے کوئی لحاف کوئی کمبل، کوئی چادر ہی دے دیتے۔ وہ مجھے زیادہ سے زیادہ اذیت دینا چاہتے تھے۔ ابھی تک انھوں نے مجھ پر کوئی تشدد نہیں کیا تھا شاید وہ آہو کے مزید احکامات کے منتظر تھے۔ جو مجھ سے دو لاکھ روپے اور ہیروں کی واپسی کا مطالبہ کر رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا وہ میری کسی بھی بات پر یقین نہیں کریں گے اور مجھ سے سچ اگلوانے کے لیے مجھ پر ہر طرح کے نرم گرم ہتھکنڈے آزمائیں گے۔ میری جیب سے انھیں ساٹھ ہزار روپیہ تو مل ہی گیا تھا۔ میرا پستول بھی ان کے ہاتھ آچکا تھا۔ میری اسٹین گن شاید انھیں نہ مل سکی ہو کیونکہ وہ کار کی سیٹ کے نیچے تھی مگر یہ دو لاکھ روپیہ اور ہیرے میرے بس کی بات نہیں تھی۔ اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ ماجدہ کہاں ہے۔ یقیناً وہ ہیرے اُس کے پاس ہوں گے۔ اُس خبیث گھٹی عورت نے مجھے ایسی مصیبت میں پھنسا دیا تھا کہ اس سے گلوخلاصی کی کوئی صورت مجھے نظر نہیں آتی تھی۔

میرا خیال ہے کہ اُس وقت آدھی رات گزر چکی تھی۔ میں ابھی تک جاگ رہا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ کسی نے دروازے کے تالے پر ہاتھ ڈالا ہے۔ میری تمام تر توجہ دروازے پر مرکوز ہو گئی۔ مجھے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ دروازے پر کون ہے۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ تالا کھل گیا ہے مگر ابھی کنڈی کوئی شخص کھول ہی رہا تھا کہ مجھے دھپ کی سی آواز سُنائی دی اور اس کے ساتھ ہی بھیانک چیخ گونج گئی۔

"تیری یہ جرأت! تاہیا ٹھیک ہی کہتا تھا۔" یہ خانو کی آواز تھی۔ وہ غرا رہا تھا۔ اس نے شاید کسی کی کمر میں لاٹھی مار دی تھی۔

"چھوڑ دے مجھے خانو چھوڑ دے ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔"

یہ صابری کی آواز تھی۔ وہ چیخ رہی تھی۔

"گشتی! اس وقت اُٹھی ہے تیرا تو میں خون پی لوں گا۔"

اچانک کوئی آدمی دروازے کے ساتھ ٹکرا گیا۔ ان دونوں میں باقاعدہ دھینگا مشتی ہو رہی تھی۔ صابری بُری طرح ہانپ رہی تھی اور اُس نے شاید خانو کے کسی نازک حصے کو گرفت میں لے لیا

تھا کیونکہ اب وہ بُری طرح چیخ رہا تھا۔ یوں جیسے اسے ذبح کیا جا رہا ہو۔ دہائی بھی وہ یہی دے رہا تھا۔

"مجھے چھوڑ دے ... اوہ میں مر گیا۔" اس نے یہ کہتے ہوئے ایک بھیانک چیخ ماری اور اس کے ساتھ ہی کنڈی کسی نے کھول دی۔ اب میرے سامنے صابری کھڑی تھی۔ وہ اندھیرے میں میری رسیاں ٹٹول رہی تھی۔

مگر ابھی وہ کچھ بھی نہ کر پائی تھی کہ تین آدمی آندھی طوفان کی طرح کمرے میں گھسے اور صابری کو بالوں بازوؤں اور ٹانگوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ انھوں نے دروازے سے باہر نکلتے ہی اس پر لاتوں مکوں تھپڑوں کی بارش کر دی۔ وہ بچاری اب بُری طرح چیخ رہی تھی۔

"میں نے کہا بھی تھا خانو! عورت ذات پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا مگر یہ گدھا مانا ہی نہیں۔" تاہیے نے ہانپتے ہوئے کہا۔ انھوں نے صابری کو مار مار کر چند ہی لمحوں میں ادھ مُوا کر دیا تھا۔

"چل اوئے ڈال دے اس چڑیل کو ادھر ڈنگروں کے کوٹھے میں۔ باندھ دے اس کے ہاتھ پیر، ایسی گشتی عورت ہے یہ۔" تاہیے نے خانو کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔ وہ دروازے کے سامنے اوندھے منہ گرا ہوا تھا۔

ان دونوں کو وہاں سے اٹھانے کے بعد تاہیا لالٹین لے کر اندر آیا۔ قطب دین اور گوگے نے میرے تمام جکڑ بند بڑے غور سے دیکھے اور پھر جب وہ ہر طرف سے مطمئن ہو گئے تو تاہیا میرے منہ پر زبردست قسم کا گھونسہ مار کر بولا۔

"تیری اس نئی بہن سے بھی میں نمٹ لوں گا... سالے! اور تیرا بند و بست میں صبح آہو کے آنے پر کروں گا۔" یہ کہہ کر وہ میرے بال نوچتا ہوا باہر نکل گیا۔ ایک بار پھر انھوں نے دروازے پر تالا ڈال دیا اور ایک بار پھر میری امیدوں کے جلتے ہوئے چراغ بجھ کر رہ گئے۔ وہ صابری وہ جان نثار صابری اپنے ویر جیسے جیلانی پر قربان ہو گئی تھی اور مجھے اس بات کا آج تک اتنا قلق ہے کہ جب بھی مجھے اس کی وہ دُرگت یاد آتی ہے تو میں تڑپ اُٹھتا ہوں۔ اُس نے میرے لیے خواہ مخواہ اوکھلی میں سر دے دیا تھا۔ میرا اس سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔ نظر سے نظر نہیں ملی تھی۔ میں اس کا چہرہ بھی اچھی طرح نہیں دیکھ سکا مگر اس کے دل میں میری وہ بندھی مجبور حالت دیکھ کر ایسی ہوک اُٹھی، ایسا درد جاگا کہ وہ بے خوف و خطر خانو کے پہلو سے اُٹھی، اس کی جیب سے اس نے تالے کی چابی نکالی اور آکر میرا دروازہ کھولنے لگی۔ مگر اس ایثار کی پتلی صابری کو نہیں پتہ تھا کہ میرے نصیب کی گرہیں تو ایسی زنجیر در زنجیر بندھی ہوئی ہیں اور میرے لہو میں بھیگ کر اتنی سخت ہو چکی ہیں کہ وہ کسی تدبیر کنندہ کے دانتوں سے بھی نہیں کھل سکتی ہیں۔ میرے راستے بھلا کون سیدھے کر سکتا ہے میرے لیے کوئی در وا کرنا تو اپنے لیے سارے دروازے بند کر لینے کے مترادف تھا اور اس کا اسے بڑا تلخ تجربہ ہوا تھا۔

وہ پوری رات میں نے اسی طرح اس گھپ اندھیری کوٹھری میں رسیوں میں جکڑی بندھی حالت میں چت لیٹ کر گزار دی۔ کبھی میں دو گھڑی کے لیے سو جاتا تھا تو بدن میں اٹھتی تیز کیلی لہر مجھے ذرا جھنجوڑ کر بیدار کر دیتی تھی۔ سارا جسم اکڑ کر تختہ ہو گیا تھا اور سردی نے میری حالت اور زیادہ ناگفتہ بہ کر ڈالی تھی۔

ڈرتا میں اس بات سے تھا کہ اگر آہو صبح وہاں آگیا تو کیا ہوگا۔ وہ اپنے ایک ایک زخم کا مجھ سے حساب لے گا۔ اس روز میں نے اور آبی نے اسے اور سروری بیگم کو بہت ذلیل کیا تھا۔ ان کی ایک نہ چلنے دی تھی، یہاں تک کہ سروری بیگم کو میں نے اس روز موت کے منہ میں ڈال دیا تھا۔ رقم سے وہ الگ محروم ہو گیا تھا۔ اسے اپنی ایک ایک چوٹ یاد ہوگی۔ اگرچہ وہ اس کا مستحق تھا مگر اب جب کہ میں اس کے ہاتھ آگیا تھا، وہ مجھ سے حساب ضرور طلب کرے گا۔ ایسی صورت میں اگر میں یونہی بندھا پڑا رہا تو وہ تو میری بوٹی بوٹی نوچ لے گا۔ وہ آدمی جس نے اتنے سارے بدمعاشوں چوروں اور ڈاکوؤں کو رام کر رکھا ہے جس نے میرے ایسے بہت سے لوگ دیکھے ہیں، وہ بھلا مجھے کیونکر معاف کرے گا۔ میں نے دیکھا تھا کہ آبی جیسا آدمی بھی اس کے سامنے لوٹا اٹھاتا تھا۔ اس روز ہم نے اسے بہت مارا تھا مگر گدھا پٹنے سے گھوڑا تو نہیں ہو جاتا۔ اس کے اندر کا رذیل کسی طرح شریف نہیں بن سکتا تھا۔

صبح ہونے میں ابھی پہر آدھ پہر باقی ہی تھا کہ مجھے اس کوٹھری کے بائیں ہاتھ باہر کی طرف عجیب سی ٹھک ٹھک سنائی دی۔ وہ ایسی آواز تھی جیسے کوئی دیوار میں کیل ٹھونک رہا ہے۔ آہستہ آہستہ وہ آواز زیادہ واضح ہوتی گئی۔ کوئی پندرہ منٹ بعد مجھے محسوس ہوا کہ میرے پاؤں کی طرف سے ہوا تیزی سے اندر آرہی ہے۔ میں نے سر اونچا کر کے دیکھا مگر اندھیرے میں مجھے کچھ بھی نظر نہ آیا۔ پھر کچھ مٹی نیچے گرنے کی آواز مجھے سُنائی دی۔ ابھی میں کچھ سمجھ نہیں پایا تھا کہ مجھے اپنے پاؤں پر کسی کے نرم گرم ہاتھوں کا لمس محسوس ہوا۔ میں تڑپ کر رہ گیا۔ میں سمجھا میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔

"باؤ جی! باؤ جی!" یہ صابری کی آواز تھی، دبی دبی، گھٹی گھٹی سی۔

"صابری! یہ تم ہو؟"

"ہاں باؤ جی میں ہوں۔ آپ کی خاطر میں نے بڑی مار کھائی ہے خانو سے۔ پر میں یہ ظلم برداشت نہیں کر سکتی ہوں باؤ جی۔" یہ

کہتی ہوئی وہ میرے سر کی طرف آگئی اور رسیاں ٹٹولنے لگی۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا چاقو تھا جس کا دستہ بھی کوئی انگلی بھر لمبا ہوگا۔

"رات میں یہ چاقو جیب میں ڈال کے نکلی تھی مگر خانو کا بیڑہ غرق ہو اس نے مجھے مہلت ہی نہیں دی۔" یہ کہہ کر اس نے ایک ایک کر کے میرے سارے جکڑ بند کاٹ دیے۔ میں تڑپ کر اٹھ بیٹھا اور اپنے ہاتھ پاؤں ہلا کر پلنگ سے اتر گیا۔

"میں تمھارا کس منہ سے شکریہ ادا کروں صابری! تم نے مجھے ایک بڑی مصیبت سے بچا لیا ہے۔"

"باؤ جی، ان کے ارادے نیک نہیں ہیں۔ وہ شاید آہو کے آنے کے بعد آپ کو پولیس کے حوالے کر دیں۔ باؤ جی مجھے آپ پر بہت ترس آتا تھا۔" وہ بہت جذباتی ہو گئی تھی۔

"یہ سب کچھ تو نے کیوں کیا ہے صابری؟"

"مجھے آپ کو دیکھ کر اپنا ویر یاد آگیا تھا باؤ جی! اُس کو بھی دشمنوں نے اسی طرح ایک ٹیوب ویل پر باندھ کر مار دیا تھا۔"

"کیا نام تھا تمھارے بھائی کا؟"

"اس کا نام عاقل تھا باؤ جی! بالکل آپ کی طرح تھا۔ میں اسے بچا نہ سکی باؤ جی، مجھے دیر ہو گئی تھی۔"

"کون دشمن تھے اس کے مجھے بتاؤ۔"

"وہ ادھر جھنگ ضلع کے گاؤں قاضی چک میں رہتے ہیں باؤ جی! ایک کا نام رستم خان اور دوسرے کا راجو۔ انھوں نے ہماری زمین بھی چھین لی باؤ جی! میرا ایک ہی ویر تھا۔"

"اس خانو سے تمھاری شادی کب ہوئی تھی؟"

"کچھ نہ پوچھیں باؤ جی! بس میں اس کے فریب میں آگئی تھی مگر یہ بہت بُرا آدمی ثابت ہوا ہے۔ چوری چکاری مار دھاڑ اس کا پیشہ ہے باؤ جی، بس زندگی گزار رہی ہوں۔"

"مجھے بڑا دکھ ہوا ہے تمھاری یہ حالت دیکھ کر۔ اگر میں زندہ رہا تو قاضی چک اور رستم خان کا نام مجھے یاد رہے گا اور ان سے میں تمھارا حساب بھی ضرور کروں گا۔ میری بہن یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔"

"اللہ آپ کی عمر خضر جتنی لمبی کرے باؤ جی۔ میں نے آپ کے جکڑ بند تو کاٹ دیے پر دروازہ ڈنگروں کی کوٹھری کا بھی بند ہے اور اس کوٹھری کا بھی۔"

"اب تو فکر نہ کر صابری! اب میں اکیلا ہی ان جیسے پچاس شہدوں سے نپٹ سکتا ہوں۔"

"نہیں باؤ جی! ان کے پاس بندوق بھی ہے اور پستولیں بھی۔"

"وہ تو ٹھیک ہے میرا پستول بھی اس تابے نے جیب سے نکال لیا تھا۔ میرے ساٹھ ہزار روپے بھی ان کے قبضے میں ہیں اور میری بہن اور اس کی سہیلی کو یہ آہو کے پاس چھوڑ آئے ہیں۔"

"یہ آہو کون ہے باؤ جی! خانو بھی اب اس کا ذکر کرتا رہتا ہے اور کہتا ہے وہ بڑا آدمی ہے اس کے ہوتے ہوئے کوئی اس کی ہوا تک بھی نہیں پہنچ سکتا۔"

"بھی ہے ایک شہدا۔ لاہور کا نامی گرامی غنڈہ ہے مگر شریف بنا ہوا ہے وہی ان سب کو پناہ دیتا ہے۔"

"باؤ جی ایسا کریں، اس خانو کو کسی جگہ سے لمبی مار پڑوا دیں ایسی مار، جو اس کا مغز درست کر دے۔ یہ جب ہی ٹھیک ہوگا۔"

"ایک دن ایسا ضرور آئے گا صابری! یہ بتا کہ تو نے یہ دیوار کیسے کاٹی ہے؟"

"ادھر ایک رمبی پڑی تھی وہی میرے کام آگئی۔"

"یہ لوگ کس جگہ سوئے ہوئے ہیں؟"

"یہ ساتھ کی کوٹھری میں ہیں۔"

"اس دیوار کے پرے؟"

"ہاں باؤ جی۔"

"ہوں! وہ رمبی ادھر لاؤ میں یہ دیوار کاٹتا ہوں۔"

"وہ جاگ اٹھے تو؟"

"دیکھا جائے گا۔ تم رمبی ادھر لاؤ۔"

"یہ لیں! بس کاٹ دیں یہ دیوار۔ پتہ ہے باؤ جی ادھر انھوں نے رات شراب بھی پی ہو گی۔ تین بوتلیں تھیں ان کے پاس ہو سکتا ہے یہ بے ہوش پڑے ہوں۔"

"پھر تو اور بھی اچھا ہے۔" یہ کہہ کر میں نے رمبی لے کر دیوار میں سوراخ کرنا شروع کر دیا۔ وہ بھُربھری سی بے جان مٹی جلدی جلدی کٹنے لگی اور کوئی پندرہ منٹ بعد میں دیوار میں اتنا بڑا شگاف ڈالنے میں کامیاب ہو گیا کہ اس میں سے اب میں آسانی سے لیٹ کر گزر سکتا تھا۔

"ٹھہریں باؤ جی پہلے میں اندر جاتی ہوں۔"

اس پگلی کو اپنی جان سے زیادہ میری جان کی فکر تھی ایسی مخلص اور بے پایاں ایثار کی حامل عورت میں نے آج تک نہیں دیکھی اسے . . . پتہ تھا کہ وہ زہر ہے مگر چاہتی تھی کہ پہلے وہ جگہ لے تاکہ اگر موت آئے تو سب سے پہلے وہ اپنی جان کا نذرانہ اسے پیش کر سکے۔

میں نے اسے پیچھے ہٹا دیا اور خود اس سیندھ کے منہ میں سر ڈال کر آگے نکل گیا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ وہ چاروں اس کوٹھڑی میں بے سُدھ ہو کر آڑے ترچھے پڑے تھے صابری ٹھیک ہی کہتی تھی۔ روشندان میں سے چھن کر اندر آنے والی چاندنی میں میں نے جائزہ لیا تو ان کی چارپائیوں کے نیچے مجھے شراب کی بوتلیں نظر آئیں۔ وہ سوڈا ملا کر اس پری سے شغل فرماتے رہے تھے۔

میں نے سب سے پہلے تابے اور قطب دین کے سرہانے تلے رکھے دونوں پستول اٹھائے۔ ان میں سے ایک میرا جُپ شاہ بھی تھا۔ وہاں میری اسٹین گن بھی تھی جو گوگے نے اپنے گدے کے نیچے رکھی ہوئی تھی۔ وہ بھی میں نے بڑی احتیاط سے اٹھالی۔ اس عرصے میں صابری بھی اندر آچکی تھی اور میری سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ وہ اپنے مستقبل کے بارے میں اتنی بے فکر کیوں تھی۔ ظاہر تھا کہ اس کا یہ رویہ اس کے خاوند کو اس کے خلاف بہت بری طرح بھڑکا سکتا تھا۔ ایک زک تو وہ اسے رات ہی پہنچا چکی تھی۔ میں نے پستولوں کی گولیاں اور ان کی بندوق اور دس کارتوس بھی اپنے قبضے میں لے لیے۔ میری گھڑی گوگے نے باندھ رکھی تھی وہ میں نے اس کی کلائی سے اتار لی۔

انہیں پوری طرح غیر مسلح کر کے میں نے صابری کو واپس اس کے کمرے میں بھیج دیا۔ وہ نہیں مانتی تھی مگر میں نے اسے سمجھایا کہ مصلحت اسی میں ہے کیونکہ وہ زیادہ دیر اور زیادہ دور تک میرے ساتھ نہ جا سکے گی۔

اب میرے سامنے اس روپے کا مسئلہ تھا جو وہ لوگ میری جیب سے نکال چکے تھے۔ میرا کوٹ ایک طرف دیوار کے ساتھ کیل پر ٹنگا ہوا تھا اور بالکل خالی تھا۔ وہ میں نے اتار کر پہن لیا۔ روپے کی تلاش میں مجھے خاصی دیر لگ گئی بالآخر میں نے اسے ڈھونڈ ہی لیا۔ ان سالوں نے سارے نوٹ ایک گھڑے میں بند کر رکھے تھے جس میں گندم بھری تھی۔ وہ میں نے زمین پر الٹ دیا۔ تو اس میں سے مجھے وہ نوٹ مل گئے۔ میرے حساب کے مطابق وہ بالکل پورے تھے۔ میں نے وہ بڑی احتیاط سے تقسیم کر کے مختلف جیبوں میں بھرے اور پھر تابے اور قطب دین کی چارپائی الٹ دی۔ وہ لحاف سمیت نیچے گرے تو میں نے چارپائی پیچھے ہٹا دی۔

"اوئے سور کے پتر، آہستہ چلا اوئے ایکسیڈنٹ کرائے گا کیا حرام خور تابے!"

قطب دین نے آنکھیں مُوندے مُوندے تابے کو گالی دی۔ وہ شہدا ابھی تک نشے میں دُھت تھا۔ تابے نے کوئی جواب دینے کے بجائے قطب دین کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔

وہ بھی سالا غین ہو رہا تھا۔ اُن سے الجھنا بے کار تھا۔ انہیں ان کے حال پر چھوڑ کر میں نے ان کا بھورا کمبل اٹھایا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ صحن میں نکل کر میں نے اس کمرے کی کنڈی کھول دی جس میں ڈھور ڈنگر بندھے ہوئے تھے اور جس میں صابری نے تمام رات اکڑوں بیٹھ کر گزار دی تھی، اس حال میں کہ اس کے بدن پر ایک پتلی سی ریشمی قمیص اور . . . گھسے پٹے کپڑے کی شلوار تھی۔ یہ اسی کا حوصلہ تھا کہ اس نے ایسی کس مپرسی کی حالت میں مجھے اس مصیبت سے نجات دلائی تھی۔ میں نے اسے کوٹھری سے باہر نکالا اور اس کے دونوں ہاتھ چوم لیے۔

"صابری میری بہن! اگر میرے بس میں ہوتا تو میں تجھے ایک پل یہاں نہ رہنے دیتا۔ پر میرا سفر لمبا اور غیر یقینی ہے مجھے بڑی مصیبتوں کا سامنا ہے پھر بھی میں وعدہ کرتا ہوں کہ تیرے بھائی کا انتقام میں ضرور لوں گا۔ آج نہیں تو کل میں تیرے اس احسان کا بدلہ ضرور چکاؤں گا۔"

"آپ کیا بات کرتے ہیں باؤ جی آپ کے لیے تو میری جان بھی حاضر ہے۔ اس گاؤں کا نام سید پور ہے یہ فیروز والا سے گیارہ میل دور ہے۔ وقت ملے تو ادھر ضرور آنا میں سمجھوں گی مجھے میرا ویر ملنے آیا ہے۔"

"میں ضرور آؤں گا صابری! یہ لے یہ بیس ہزار رکھ لے اپنے بھائی کی طرف سے ادنیٰ سا نذرانہ۔ خانو کو سمجھانا، کہنا میں اُس کا دشمن نہیں اس کا بھائی ہوں میرا نام یاد رکھنا۔ میں غلام جیلانی ہوں۔"

"اچھا ہے باؤ جی یہ اچھا جوتا مارا ہے آپ نے مجھے۔ اس کام کی مزدوری دے رہے ہیں آپ۔" یہ کہہ کر صابری نے روپے زمین پر پھینک دیے۔

"میرا دل ٹوٹ جائے گا صابری میری بہن! دیکھ مجھے مایوس نہ کر۔ کبھی موقع ملا تو میں تجھے ادھر کئی مربعے زمین خرید دوں گا۔ بہت روپیہ ہے میرے پاس، اسے رکھ لے میری بہن۔ سمجھیں کہ یہ تیرے بھائی عاقل کی طرف سے ہے۔"

یہ کہہ کر میں نے زمین پر سے نوٹ اٹھا کر اس کے دوپٹے کے پلو میں ڈال دیے۔ وہ صبح کے پھیلتے اجالے میں مجھے ٹک ٹک دیکھ رہی تھی روپے اس نے عاقل کا نام سنتے ہی ہاتھوں میں سنبھال لیے تھے۔ اب وہ بہت مطمئن نظر آرہی تھی۔

"یہ لے پستول رکھ لے اپنے پاس اور یہ بندوق کہیں چھپا دے تیرے کام آئے گی یہ کبھی۔ مگر انھیں مت بتانا کہ میں یہ تیرے حوالے کر گیا ہوں۔"

یہ کہہ کر میں نے ایک بار پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر آنکھوں سے لگایا اور اس کے گھر کے کھلے آنگن کو عبور کر کے باہر نکل آیا۔

وہ گاؤں بڑی سڑک سے پانچ میل دور تھا۔ وہ سارا سفر مجھے پیدل طے کرنا پڑا۔ سڑک پر پہنچتے ہی مجھے ایک تانگہ مل گیا۔ اس میں چار سواریاں پہلے ہی موجود تھیں میں بھی ان میں گھس کر بیٹھ گیا۔ وہ تانگہ فیروز والا جا رہا تھا۔

سورج نکلنے سے بہت پہلے میں فیروز والا پہنچ گیا۔ لاہور کے لیے بس تیار کھڑی تھی۔ میں کمبل کی بکل مار کر اس میں سوار ہوا، اور سب سے آخری سیٹ کے ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گیا۔ مجھے جلد از جلد لاہور پہنچنا تھا۔ میرے سینے میں آگ لگی تھی اور میں نتائج

سے بے پروا ہو کر اس روز یہ تہیہ کر کے بادامی باغ کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اگر آہو نے مجھے کسی ذلت سے دوچار کر دیا ہے تو یہ اس کی زندگی کا آخری دن ہو گا۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ کسی قیمت پر بھی میں اسے زمین کے اوپر نہیں رہنے دوں گا۔

جب میں بادامی باغ جانے کے لیے راوی روڈ پر منٹو پارک سے ذرا ادھر اترا تو اس وقت صبح ہو رہی تھی۔ اور زندگی بستروں سے نکل کر ابھی سڑکوں پر نہیں آئی تھی۔ میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا سڑک پر چند ہی قدم چلا تھا کہ مجھے ایک ٹیکسی مل گئی۔ میں تیزی سے اس میں بیٹھا اور بادامی باغ جا پہنچا۔

جب میں نے بے دھڑک ہو کر آہو کے دروازے پر دستک دی تو چپ شاہ پر میری گرفت بہت مضبوط تھی۔ دروازہ کھلا تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میرے سامنے کبری کھڑا تھا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ یوں پیچھے ہٹا جیسے اس نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔

"او۔۔ ادستاد تم؟"

"ہاں میں غلام جیلانی۔" میں نے دروازے میں گھس کر اس کے دونوں تختے اپنے پیچھے بند کر کے پستول کبری پر تانتے ہوئے کہا۔

"قسم اللہ کی ادستاد! میں بے گناہ ہوں۔ اس نے۔۔۔ اس نے ہماری باتیں سن لی تھیں۔" کبری نے سرگوشی کی۔

"اور پھر بھی اس نے تمھیں اپنے ہاں گھر میں جگہ دے رکھی ہے مجھے بے وقوف بناتے ہو سالے۔"

"ایک جھوٹ گھڑ لیا تھا میں نے اوستاد! قسم خدا کی میں نے اس کے سامنے تمھیں گالیاں شالیاں دے کر اپنی جان چھڑا لی تھی۔" وہ پیچھے ہٹتا رہا۔ میں اس کو پستول کی زد میں لیکر اس کی کوٹھری میں جا گھسا۔ گھر کے ہر حصے میں مکمل خاموشی طاری تھی۔ شاید وہ سب لوگ ابھی تک سو رہے تھے۔

"تو نے کس طرح اسے اپنی بے گناہی کا یقین دلایا؟ میرا سب سے بڑا دشمن تو وہ ہے۔"

"یہ بات نہیں ہے ادستاد۔ مجھے اپنی ماں کی قسم یقین کر۔ میں نے یہ کہہ کر جان چھڑا لی تھی کہ میں دراصل تمھیں کسی نہ کسی طرح پھانس کر پولیس کے حوالے کرنا چاہتا تھا تاکہ میں انعام لے لوں۔ بس میری یہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی اور اس نے اپنا دل میری طرف سے صاف کر لیا۔"

"یہ بتا کہ رات کو یہاں دو عورتیں آئی تھیں وہ کہاں ہیں؟"

"کون عورتیں؟ مجھے تو ان کے بارے میں کوئی علم نہیں ہے۔"

"بکواس نہ کر کبری! یہ میری موت اور زندگی کا سوال ہے۔ ان میں سے ایک میری بہن آسیہ اور ایک اس کی سہیلی نفیسہ ہے۔"

"نہیں ادستاد! قرآن کی قسم اوستاد! میں نے انھیں نہیں دیکھا۔ مجھے بالکل کچھ علم نہیں ہے۔"

"تم جھوٹ بولتے ہو کبری! ان کو تین بدمعاش اٹھا کر ادھر لے آئے تھے۔ مجھے خود بتایا ہے اس تابیے نے جو انھیں یہاں چھوڑ گیا تھا۔"

"وہ تابیا! وہ تو ادھر آیا تھا اور اس کے ساتھ دو آدمی اور بھی تھے مگر میں نے انھیں اس وقت دیکھا جب آہو صاحب انھیں خدا حافظ کہہ رہے تھے۔ لڑکیاں تو ان کے ساتھ نہیں تھیں۔"

"ہوں! تو تو سیدھی طرح سے منہ نہیں کھولے گا بدمعاش!"

یہ کہہ کر میں نے اس کے قریب پڑی میز پر سے چھری اٹھا کر اس کی گردن پر رکھ دی اور اس کی نوک ذرا سی دبا کر میں نے اس کی ہنسلی کے قریب ایک لکیر کھینچ دی۔ خون کی ایک دھار سی وہاں سے پھوٹ نکلی مگر وہ یوں بیٹھا رہا جیسے پتھر ہو چکا ہو۔ آنکھیں اس کی حیرت سے پھٹ رہی تھیں جیسے وہ کوئی بھیانک خواب دیکھ رہا ہو۔

"بتا دے کبری ورنہ اچھا نہ ہو گا۔"

"مجھے کچھ پتہ نہیں ہے۔" یہ کہہ کر وہ میرے قدموں میں گر گیا۔ اپنا سر اس نے میرے پاؤں پر رکھ دیا۔ میں نے پاؤں کی ٹھوکر سے اسے پرے ہٹا کر بالوں سے پکڑ کر اوپر اٹھا لیا۔

"آہو کہاں ہے اس وقت؟"

"وہ تو یہاں نہیں ہے۔ رات کو دس بجے وہ اپنی کار میں بیٹھ کر باہر چلا گیا تھا۔ میرا خیال ہے وہ ابھی تک واپس نہیں آیا۔ باٹی بھی اس کے ساتھ ہے۔"

"اور وہ سروری بیگم؟"

"وہ تو اوپر ہی ہے۔"

"اور وہ مسند آرا؟"

"وہ گاؤں چلی گئی تھی۔ کل صبح گئی ہے وہ۔"

"ہوں۔ تو ٹھیک ہے پیٹھے۔ ذرا اوپر کا دروازہ کھلوا۔ میں سروری خانم سے بات کروں گا۔"

"ایسا نہ کرو اوستاد میرا اعتبار جاتا رہے گا۔ میں پھر کبھی تیرے کام نہ آسکوں گا۔"

"مجھے اس سے ملنا ہے اور ابھی ملنا ہے۔"

"اچھا تم یوں کرو کہ ادھر اندر کی طرف جو چھوٹی سیڑھی ہے اس کی راہ سے اوپر چلے جاؤ۔ وہ سمجھے گی کہ تم خود ہی اوپر آ گئے ہو۔"

"چلو یونہی سہی مجھے وہ سیڑھی دکھاؤ۔"

"مگر پہلے مجھے باندھ کر ڈال دو۔ اچھی طرح۔ اور اسے کسی طرح دکھا بھی دینا کہ تم نے مجھے باندھ دیا ہے۔ یہ لو رسی باندھو!" یہ کہہ کر اس نے چارپائی کے نیچے سے رسی کا ایک گولا نکال کر مجھے

دے دیا۔

"یہ ڈرامے کا وقت نہیں ہے سالے! میرا ایک ایک منٹ بہت قیمتی ہے۔ مجھے وہ راستہ دکھاؤ۔" میں نے زچ ہو کر کہا۔

کبری اٹھ گیا اور اپنے کمرے کا پچھلا دروازہ کھول کر مجھے مکان کے عقبی برآمدے میں لے گیا۔ وہاں برآمدے کے گرد لوہے کا موٹا جنگلا لگا تھا جو اوپر چھت تک اٹھا ہوا تھا۔ کبری مجھے اس برآمدے کی سیڑھی تک لے گیا اور بولا۔

"یہ سیڑھی چڑھ جاؤ۔ یہ ایک کمرے میں کھلتی ہے۔ اس کمرے سے آگے اس کی خواب گاہ ہے۔"

"میرے ساتھ چل کبری ورنہ میں تیرا مغز توڑ دوں گا۔" میں نے اس کے منہ پر الٹے ہاتھ کا ایک تھپڑ مارتے ہوئے کہا۔ وہ دیوار میں لگا تو میں نے اسے گریبان سے پکڑ کر آگے دھکیل دیا۔ اب وہ صورتِ حال کو اچھی طرح سمجھنے لگا تھا۔ میری آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ اسے احساس ہو چلا تھا کہ اگر اس نے زیادہ ہیر پھیر کی تو اس کی اور زیادہ پٹائی ہو گی۔

وہ چپ چاپ میرے آگے آگے چلنے لگا۔ سیڑھیاں چڑھ کر وہ بند دروازے کے سامنے رک گیا۔

"اسے آواز دے۔ کہہ اس سے کہ وہ دروازہ کھول دے۔" میں نے کبری کی گردن پر اپنا پنجہ جماتے ہوئے کہا۔

کبری نے بڑی آہستگی سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ تیسری دستک پر دوسری طرف سے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔

"کون ہے؟" وہ سروری بیگم تھی۔

"دروازہ کھولیں بی بی جی۔" کبری کی آواز سنتے ہی اس نے دروازہ کھول دیا۔ میں نے کبری کی کمر میں پوری قوت سے گھٹنا مار کر اسے سروری بیگم کی طرف اچھال دیا۔ وہ چیخ کر پیچھے ہٹی تو میں نے جاتے ہی اس کو بالوں سے پکڑ کر تین چار تھپڑ اس کے دونوں رخساروں پر جما دیے۔ وہ بلبلا اٹھی۔ کبری اٹھ کر بھاگنے لگا تو میں نے اسے پاؤں سے اڑنگا دے کر فرش پر گرا دیا اور پھر ان دونوں کو دائیں بائیں بغل میں دبا کر اگلے کمرے میں جا گھسا۔ وہ سروری بیگم کی خواب گاہ تھی۔ دونوں کو فرش پر پٹخ کر میں نے پستول سیدھے ہاتھ میں تھام لیا۔ سروری دہشت کی فراوانی سے لرزنے لگی تھی۔

کبری سن ہو کر فرش پر اوندھے منہ یوں پڑا تھا جیسے وہ بے ہوش ہو چکا ہو۔

"مجھے بتا سروری کہ میری بہن آسیہ اور اس کی سہیلی نفیسہ کہاں ہے کل رات اسے تابیا لے کر یہاں آیا تھا۔"

میری بات سن کر سروری سنبھل کر اٹھی اور اپنے بال سمیٹتی ہوئی مجھے بڑی نفرت سے گھورنے لگی۔ وہ ساڑھی میں ملبوس تھی جو اس نے کمر پر اچھی طرح کس کر باندھی ہوئی نہیں تھی۔

"میری بات کا جواب دے سروری! آسیہ کہاں ہے؟"

میری آواز میں شاید وہ دہشت انگیز اثر باقی نہیں رہا تھا یا میری ساری بے بسی کا بھید اس پر عیاں ہو گیا تھا۔ وہ سنبھل کر بستر پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی، بولی۔

"وہ کل رات یہاں آئی تھیں مگر دس بجے آہو صاحب انھیں کار میں بٹھا کر باہر لے گئے تھے۔"

"اور وہ ربڑ کی گڑیاں تھیں چپ چاپ اس کے ساتھ چلی گئیں۔"

"نہیں! انھیں تابیے نے اچھی طرح کس کر باندھ رکھا تھا۔ ان کے منہ بھی اور ہاتھ پیر بھی۔"

"ہوں، اور وہ آہو انھیں لے کر باہر چلا گیا۔ مگر کہاں؟"

"اس کا مجھے علم نہیں ہے مگر وہ یہی کہہ رہے تھے کہ جب تک تم ہمارے دو لاکھ روپے اور وہ ہیروں کی تھیلی واپس نہیں کرو گے، وہ دونوں تمھیں نہیں مل سکیں گی۔"

"آسیہ میری بہن ہے سروری! اور میں اسی کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے یہاں سے صرف وہی رقم لی تھی جو میری تھی اور جو تم نے خود مجھے دی تھی اور کسی چیز کو میں نے ہاتھ نہیں لگایا۔"

سروری اپنے رخساروں پر ہاتھ پھیرتی ہوئی بولی۔ "ہمیں بے وقوف نہ بنا۔ آہو صاحب نے تیرے جیسے کئی بندر نچا دیے ہیں۔ ہمیں وہ رقم اور ہیرے واپس کر دو تو تمھاری بہن تمھیں واپس مل سکتی ہے۔"

"ورنہ نہیں؟ یہی کہنا چاہتی ہو نا تم؟"

"ہاں۔ یہی سمجھو۔" وہ بڑے جمے ہوئے لہجے میں بولی۔ وہ مجھ سے اب اتنی خوفزدہ نہیں تھی جتنی پہلے تھی۔

اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی بج اٹھی۔

سروری تیزی سے اٹھی تو میں نے ایک بار پھر اس کی زلفوں کو جڑوں کے قریب سے مٹھی میں لے کر اسے پوری طرح جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ "اگر یہ آہو ہے تو اسے کہو وہ فوراً گھر پہنچے میرے بارے میں اسے کچھ بتایا تو تیرے سینے میں آر پار سوراخ ڈال دوں گا۔ چل ادھر سن وہ کیا کہتا ہے۔"

اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ رنگ اس کا خوف سے پیلا ہونے لگا تھا، بولی۔

"فکر نہ کرو۔ میں یہ تو پوچھ لوں کہ آہو صاحب نے انھیں کہاں رکھا ہے۔"

میں نے اس کے بال چھوڑ دیے۔ وہ فون کی طرف بڑھی اور میز کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھ کر ریسیور اٹھا کر بولی۔

"ہیلو۔"

"ہاں کیا خبر ہے آہو صاحب!"
"بہت بُرا کیا آپ نے ہم مصیبت میں پھنس جائیں گے۔"
پھر وہ میری طرف دیکھتی ہوئی تیزی سے بولی۔
"شامع دب ینایج نم و بربک دزد بوک شندُ وائی دف آہوُ یریج ورک۔" یہ کہہ کر اس نے تیزی سے فون بند کر دیا۔
میرا خیال ہے میرا حافظہ ٹھیک کام کر رہا ہے۔ اس گشتی نے فون پر کچھ ایسے ہی جناتی زبان کے الفاظ کہے تھے۔ جن کو سن کر میں پاگل ہو گیا۔ میں نے اسے پھر بالوں سے پکڑ کر پیچھے کھینچا اور کبری کے کمرے سے اٹھائی تیز دھار چھری میں نے اس کے سینے پر رکھ دی۔
"یہ کیا بکواس کی ہے تو نے؟ بتا اس نے کیا کہا ہے تجھ سے؟"
"اس نے دونوں لڑکیاں کسی اور شہر بھیج دی ہیں اور اب وہ واپس آ رہا ہے۔"
اس کی یہ بات سنتے ہی میرا دماغ خراب ہو گیا۔ میں نے تڑاخ تڑاخ کئی تھپڑ اس کے منہ پر دے مارے۔ وہ بلبلا کر بستر پر گری اور دھاڑ دھاڑ رونے لگی۔
"مجھے بتا تو نے اسے کیا پیغام دیا ہے خفیہ زبان میں؟"
میں نے پھر اسے اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ مگر وہ کچھ نہیں بولی۔ اور زیادہ بلند آواز سے چیخنے لگی۔ میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اس کی آواز دبا دی مگر اس نے میری ہتھیلی میں اپنے دانت گاڑ دیے پھر پاگل کتیا کی طرح مجھ سے لپٹ کر اپنے تیز ناخن اس نے میری گردن میں گاڑ دینے چاہے۔ اس وقت اس میں بلا کی طاقت پیدا ہو گئی تھی۔ مجھے اس کی دونوں کلائیاں دبا کر اسے بے بس کرنا پڑا۔ اچانک مجھے اپنے پیچھے کبری اٹھتا نظر آیا۔ وہ ایک تانبے کا گلدان ہاتھ میں لیے مجھ پر حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھ رہا تھا۔ میں نے گھوم کر سروری کو اپنے ساتھ کھینچا اور اسے کبری پر اچھال دیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے ٹکرا کر دھڑام سے دیوار میں جا لگے۔ سروری کے سر میں شاید گہری چوٹ لگ گئی تھی وہ دیوار سے لگتے ہی بے سدھ ہو کر فرش پر گر گئی۔
مجھے کبری پر سخت طیش آ رہا تھا۔ میں نے اسے مکوں، اور تھپڑوں سے دھن ڈالا۔ غصے نے مجھے پاگل کر دیا تھا۔ کبری نڈھال ہو کر دیوار کے ساتھ جا لگا۔ اس کے منہ سے خون بہہ نکلا تھا۔
میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں۔ میری ساری محنت اکارت جا رہی تھی۔ اس آہو نے مجھ سے ایسا خوفناک انتقام لیا تھا کہ اب میں ساری زندگی سر پر ہاتھ رکھ کر رونے کے سوا اور کچھ بھی نہ کر سکتا تھا۔ مجھے یہ معلوم ہونا چاہیے تھا کہ اس نے آسیہ اور نفیسہ کو کس کے حوالے کیا ہے اور اس وقت وہ دونوں کہاں ہیں۔ میں اپنی حرماں نصیب زیست کے بدترین مقام پر کھڑا تھا۔ آہو کے گھر میں اس گھڑی میری موجودگی میرے لیے کسی طرح بھی سود مند نہیں تھی۔ آہو کو اس گشتی نے خدا جانے اس خفیہ زبان میں کیا کہا تھا البتہ اتنا مجھے یقین تھا کہ اس نے میرے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہوگا اور اب آہو تنہا نہیں بلکہ پولیس کو لے کر آئے گا۔
اس گھر کی چار دیواری میرے لیے عمر بھر کا روگ بن سکتی تھی سروری بے ہوش ہو چکی تھی اور کبری بھی ادھ موا ہو رہا تھا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ ان دونوں کو گولی مار دوں مگر میں کچھ بھی نہ کر سکا تھا۔ میری چھٹی حس مجھے بار بار وہاں سے نکل بھاگنے کا اشارہ کر رہی تھی۔ میری جان سخت خطرے میں تھی مگر سوال یہ تھا کہ میں آسیہ اور نفیسہ کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کیے بغیر وہاں سے کیسے نکل جاؤں میرا تو سب کچھ میرے ہاتھ سے چھن چکا تھا۔ میں وہاں سے نکل کر کہاں جا سکتا تھا میرے لیے تو سارے ہی راستے مسدود ہو چکے تھے۔ میں آسیہ اور نفیسہ جیسی بیش قیمت دولت کی حفاظت کرنے میں ناکام ہو چکا تھا۔ آسیہ کو ایک محفوظ مقام سے نکال کر میں نے چنگھاڑتے طوفان کی راہ میں پھینک دیا تھا۔ یہی حال نفیسہ کا تھا۔ وہ بھی اب کہیں کی نہ رہی تھی۔ بے چاری بے موت ماری گئی تھی۔
میں چند لمحوں تک ان دونوں کے پاس کھڑا صورت حال پر غور کرتا رہا مگر کسی بھی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ میرے ذہن میں گندی غلیظ گرد آلود آندھی چل رہی تھی اور میرا دل چاہتا تھا کہ میں ہر شے کو تہس نہس کرتا ہوا آسیہ تک جا پہنچوں۔ آنے والے خطرات سے خود کو محفوظ رکھنے کے لیے میں نے آہو کے گھر سے نکل جانا ہی مناسب سمجھا مگر ابھی میں سیڑھیاں اتر کر واپس کبری کے کمرے میں پہنچا ہی تھا کہ دروازے پر بڑے زور سے دستک ہوئی۔ میں پریشان ہو کر ایک بار پھر سروری کے کمرے میں جا پہنچا اور مختلف دروازوں میں سے گزر کر اس کھڑکی کے سامنے جا ٹھہرا جہاں سے باہر دروازے پر کھڑے آدمی کو میں دیکھ سکتا تھا۔
میں نے چالاکی کے ساتھ لگ کر نیچے نگاہ ڈالی تو یہ دیکھ کر میں دنگ رہ گیا کہ نیچے آبی کھڑا تھا۔ تابیا اور قطب دین اس کے ساتھ تھے۔ وہ تینوں شملے دار پگڑیاں، بوسکی کے کرتے اور کھدر کے کمبل اوڑھے ہوئے تھے۔ اور یوں لگتا تھا جیسے وہ تینوں سگے بھائی ہوں اور وہ تازہ دم دکھائی دے رہے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ تابیا اور قطب دین سیدپور سے صبح سویرے نکل کر میرے پیچھے لاہور آ گئے تھے اور وہیں سے انھوں نے کسی جگہ سے آبی کو اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ آبی بھی میری اس ذلت و رسوائی میں برابر کا شریک ہے۔ پہلے تو اس نے ماجدہ کو مجھ سے چھینا اور اس کے روپے اور ہیروں سمیت اسے

بھگا کر لے گیا اور اب اس تابیے اور قطب دین کی مدد سے آہو کے اشارے پر اس نے مجھ سے آسیہ اور نفیسہ کو بھی چھین لیا تھا۔ وہ ان لوگوں کی سازش میں برابر کا شریک بن چکا ہے ان تینوں کو وہاں آہو کے دروازے پر دیکھ کر میرا خون کھول اٹھا۔ وہ سبز رنگ کی کار... میں وہاں پہنچے تھے۔
میں تیزی سے پیچھے ہٹا اور سروری کے کمرے میں پہنچ کر میں نے کبری کی گردن پر ایسا ہاتھ مارا کہ شاید وہ جان سے ہی گزر گیا ہوگا۔ وہ سالا اٹھ کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اسے بے ہوش کر کے میں نیچے اترا اور صحن عبور کر کے بڑے دروازے پر جا پہنچا جہاں وہ تینوں کھڑے بار بار دستک دے رہے تھے۔
پستول سیدھا ہاتھ میں لے کر میں نے چٹخنی کھسکا کر دروازہ چوپٹ کھول دیا۔
ان کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ حواس باختہ ہو کر دیوار کے ساتھ لگ گئے۔
"تم تینوں میرے ساتھ چلو یہاں پولیس آنے والی ہے۔ فوراً یہاں سے نکل چلو مجھے تم سے بہت کچھ پوچھنا ہے آبی!"
"تم دوست تو نظر نہیں آ رہے ہو اس وقت۔"
"تمھاری دوستی کا زخم بھی میں تمھیں دکھاؤں گا آبی! سیدھی طرح میرے آگے لگ جاؤ۔ چلو۔"
"دھونس نہ دو۔ ویسے تم جو چاہتے ہو میں کر لیتا ہوں چلو بھئی ہو سکتا ہے ادھر پولیس آ رہی ہو۔"
آبی نے تابیے اور قطب دین سے مخاطب ہو کر کہا اور ان کو ساتھ لے کر کار کی طرف مڑا۔ تابیا ڈرائیور کی نشست پر جم گیا قطب دین اس کے ساتھ کی نشست پر بیٹھا۔ میں نے آبی کو اپنے ساتھ پچھلے حصے پر بٹھا لیا۔
"کدھر چلنا ہے آبی صاحب!"
"کہیں بھی چلے چلو مگر فوراً یہاں سے غائب ہو جاؤ۔ پولیس کو اطلاع ہو چکی ہے۔" میں نے تابیے کو ایڑھ دیتے ہوئے کہا۔
وہ ماہر ڈرائیور تھا چند ہی منٹوں میں وہ راوی روڈ پر جا چڑھا۔ وہ سب بالکل خاموش تھے مجھے یقین تھا آبی غیر مسلح نہیں ہے مگر اس نے اپنے پتے ظاہر نہیں کیے بالکل چپ بیٹھا رہا۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم تھا میرے چہرے کے طنز کو وہ بھانپنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہم راوی روڈ پر ذرا آگے نکلے تو وہ مسکرا کر بولا۔
"کہیں تم آہو کو ٹھکانے تو نہیں لگا آئے ہو؟"
"نہیں وہ خوش قسمت نکلا۔ گھر سے غائب تھا۔"
"پھر پولیس کا کیا قصہ ہے ادھر؟"
"اس سور زادی سروری نے اسے فون پر بتا دیا تھا کہ میں وہاں اترا ہوا ہوں۔"
"تم کیا لینے آئے تھے ادھر؟"
"گویا تمھیں کچھ پتہ ہی نہیں ہے۔ مجھے پاگل سمجھتے ہو آبی۔"
"نہیں یار، یہ تو مجھ سے بات کس طرح کرتا ہے آج۔ خیر تو ہے؟"
"تم نے خیریت رہنے ہی کہاں دی ہے آبی! آج میں تم سب کو مار دوں گا یا تمھارے ہاتھوں مر جاؤں گا۔"
"پاگل ہو گئے ہو جیلانی! مجھے تمھاری کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔"
"تمھیں کیسے سمجھ میں آ سکتی ہے میری بات۔ تم نے ماجدہ کو اغوا کر لیا۔ اس کے پاس جو روپیہ اور ہیرے تھے وہ تم نے ہضم کر لیے، اب آسیہ اور اس کی سہیلی نفیسہ کو آہو کی بھینٹ چڑھا دیا۔ تمھیں میری بات جب سمجھ میں آئے گی جب میں تم سب کو شوٹ کر دوں گا۔ آبی! اب مجھے اور نہیں جینا ہے۔" میں نے پستول آبی پر لہراتے ہوئے کہا۔ وہ سیٹ کے آخری کونے میں بیٹھا تھا میری باتیں سنتے ہوئے اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلنے لگیں جیسے اس نے بہت ہی لرزہ خیز خواب دیکھا ہو۔ بولا۔
"یہ تم کیا بکواس کر رہے ہو۔ میں لعنت بھیجتا ہوں اس لفنگی ماجدہ پر۔ میرا اس سے کیا واسطہ؟"
"وہ تمھارے ساتھ بھاگی ہے اور تم کہتے ہو اس سے تمھارا کوئی واسطہ ہی نہیں ہے۔"
میں نے دانت پیستے ہوئے کہا
گاڑی اب راوی کا پل عبور کر چکی تھی۔
"مجھے نہیں پتہ تھا جیلانی کہ تم اتنے کمینے ہو چکے ہو۔ میرے بھائی میں تو اس رات اپنی شرمندگی میں وہاں سے اٹھ کر چلا آیا تھا تم سے آنکھ ملانے کی میں جرأت نہیں رکھتا تھا۔ میں نے تمھیں بہت دکھ دیا تھا جیلانی! تمھارے لیے میں ادھر تکیے کے نیچے، تمھارے پستول کے پاس رقعہ رکھ کر آیا تھا جس میں میں نے تم سے معافی مانگی تھی مگر تم آج اور ہی کہانی سنا رہے ہو۔"
"تو پھر وہ ماجدہ کہاں ہے؟ اس گشتی کو کون اٹھا کر لے گیا تھا؟"
"مجھے کیا معلوم؟ مجھے تو ویسے ہی وہ بہت گڑبڑ عورت نظر آتی تھی۔ روپیہ اس کے پاس ہے وہ لے کر خود ہی بھاگ گئی ہوگی۔ اب تم کہتے ہو کہ آہو کے ہیروں کی تھیلی بھی اسی کے پاس ہے تو پھر باقی کیا رہ گیا۔ وعلیکم السلام ہو گئی ہم سب کی۔"
"لے اوئے تلیے بدمعاش! اب تو صاف ہو گئی نا بات تو کہتا تھا کہ نہیں آہو ٹھیک کہتا ہے رقم تو وہ پچی لے گئی اور "ڈانگو ڈانگی" ہم ہو رہے ہیں خواہ مخواہ۔"
"یہ تو بہت برا ہوا آبی جانی، ہم سے تو بڑی غلطی ہو گئی

ہیں تو... میں تو خواہ مخواہ بے وقوف بن گیا۔" تاہیے نے بہت ندامت آمیز لہجے میں کہا۔

"تمہیں کس نے کہا تھا کہ تم آسیہ اور اُس کی سہیلی کو لے کر سیدھے آہو کے پاس جا پہنچو۔"

"یار اس نے مجھے ایسی کہانی سنائی تھی کہ مجھے اس سے ہمدردی ہوگئی۔ میں نے سوچا تھا کہ اگر یہ دونوں لڑکیاں میں آہو کے حوالے کردوں تو یہ جیلانی خود ہاتھ جوڑ کے اس کی رقم اور ہیرے اُسے دے دے گا مگر مجھ سے غلطی ہوگئی۔ وہ وقت میرے ہاتھ نہیں آتا مجھے نہیں پتہ تھا کہ جیلانی سے تمھیں اتنی محبت ہے۔"

"ان لڑکیوں کو تم نے آہو کے کہنے پر اغوا کیا تھا؟" آبی نے اس سے پُوچھا۔

"نہیں یار میں تمھیں بتا تو چکا ہوں ہم اپنے یار تلکو سے ملنے پنڈی جیل گئے تھے۔ وہاں میں نے جیلانی کو دیکھ کر پہچان لیا۔ میں نے سوچا کہ اس کی ذرا کپڑ چھپان کرتے ہیں اس کا ادھار تھا ہمارے ذمے۔ بس اسی لیے ہم اس کے پیچھے لگ گئے۔ تلکو سے ملاقات ہی ہم بھول گئے اس پر ہمیں غصہ بہت تھا یار۔ جب ہم اس کے پیچھے لگے تو اس نے گھبرا کر کار ایک درخت میں دے ماری۔ خود یہ بے ہوش ہوگیا۔ لڑکیاں البتہ بالکل محفوظ رہیں۔ ان کو اپنی کار میں ڈال کر ہم خالو کے ڈیرے جا پہنچے۔ پھر میں نے دونوں لڑکیوں کو باندھ بوندھ کر آہو کے گھر پہنچا دیا۔ وہ تو خوش ہوگیا۔ پہلی بار اس نے اپنی جیب سے ہمیں پانچ پانچ ہزار روپے انعام کے طور پر دیے۔ مگر سید پور واپس پہنچے پر رات اس جیلانی نے ہمیں ایسا چکر دیا کہ بس ہم ہاتھ ہی ملتے رہ گئے۔ اب اسی لیے تمھیں میں آہو کے پاس لے جا رہا تھا کیونکہ آہو نے کہا تھا کہ اگر آبی بیچ میں پڑ کر اس کے ہیرے اور رقم واپس دلوا دے تو وہ لڑکیاں جیلانی کے حوالے کر دے گا۔" تاہیے نے ساری بات تفصیل سے بتاتے ہوئے کہا۔

"مجھ سے تو اس نے خود ہی صلح کر لی تھی حالانکہ ہم دونوں نے اس روز اس کی بہت دُھلائی کی تھی۔"

"کہاں ملا تھا وہ تمھیں؟" میں نے پُوچھا۔

"مال روڈ پر مل گیا تھا وہ مجھے ایک دن تمھیں بہت گالیاں دیتا تھا وہ جیلانی! سخت خوف زدہ ہے وہ تم سے۔"

"اس کی تو میں انتڑیاں نکال دوں گا آبی! میری تباہی میں اس نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہے۔"

"پر اب ہم جا کہاں رہے ہیں تاہیے؟"

"جسٹ فار اے واک، مارننگ واک۔" قطب دین نے خالص انگریزی لہجے میں کہا۔

"بند کرو اپنے یہ واک شاک! یہ بتا جیلانی کی آسیہ کہاں ہے؟ گاڑی روک لے تاہیے۔"

"وہ آہو کے گھر میں نہیں ہیں۔ فون پر اُس نے سرورہی کو بتایا تھا کہ وہ لڑکیوں کو دوسرے شہر لے گیا ہے۔"

"یار۔ اس آہو کی موت آئی ہے میرے ہاتھوں۔ گاڑی واپس لے چل تاہیے ہمیں ان لڑکیوں تک فوراً پہنچنا چاہیے۔"

"مگر وہ ہیں کہاں؟ پتہ نہیں اس نے انھیں کہاں پہنچا دیا ہے۔" تاہیے نے گاڑی کا رخ لاہور کی طرف موڑتے ہوئے کہا۔

"وہ وقت میرے ہاتھ نہیں آتا بہت بُرا ہوا آبی! بہت ہی بُرا ہوا ہے۔"

"یہ بات تو آہو ہی بتلائے گا نا ہیے کہ لڑکیاں کہاں ہیں، اوئے اب یہ کام تجھے کرنا ہے وہ کھوتے کا پتر ہم میں سے کسی کا بھی خیر خواہ نہیں ہے۔ اتنی مشکلوں سے اس بچارے نے آسیہ بہن کو جیل سے رہا کرایا تو اس آہو نے اس کو نئی مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ چل ادھر۔ ابھی مل اس ہرن کے موتر سے۔" آبی نے بہت تپے ہوئے لہجے میں کہا۔

گاڑی اب دوبارہ راوی کا پل عبور کر رہی تھی اور اب مجھے پھر آہو کا سامنا کرنا تھا جس نے مجھے تباہ کر کے رکھ دیا تھا۔

آبی کی باتوں میں مجھے سچائی نظر آتی تھی۔ ماجدہ کے سلسلے میں اس کے خلاف میرے دل میں جو شکوک اُبھرے تھے وہ ختم ہوگئے تھے۔ وہ بیچارا اس رات مجھے للکارنے کے بعد اتنا شرمسار ہوا تھا کہ مجھ سے منہ چھپا کر چپ چاپ باہر نکل گیا۔ وہ میرے لیے رقعہ بھی چھوڑ گیا تھا مگر میں اسے تکیے کے نیچے دیکھ ہی نہ سکا۔ اتنی تو افراتفری مچ گئی تھی وہاں۔ شکر... کے ان گرگوں نے مجھے پریشان ہی کر دیا تھا۔ آبی مجھے یوں دیکھ رہا تھا جیسے کوئی بڑا بھائی اپنے بے وجہ روٹھے ہوئے چھوٹے بھائی کو دیکھتا ہو۔ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"تو بہت بھولا ہے جیلانی! تیرے لیے تو ہم اپنی جان بھی قربان کر سکتے ہیں۔ پگلے! تو ہے کس خیال میں۔ جیب میں رکھ اپنا یہ چپ شاہ۔" یہ کہہ کر اس نے میرے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ وہ بڑی محبت سے میرا ماتھا چوم رہا تھا۔ اس کے خلوص کی تپش مجھے اپنے اندر سموتی جا رہی تھی۔ اس کے بارے میں میری بدگمانیاں ختم ہوگئی تھیں۔ بلاشبہ وہ میرا دوست تھا، بھی تھا اور میرے لیے وہ بڑی سے بڑی جوکھم اٹھانے کو تیار تھا۔

ہم راوی کے پل پر سے گزر گئے تو ایک جگہ کھڑے قطب دین نے اخبار خرید لیا۔ آبی نے فوراً ہی اس سے وہ اخبار جھپٹ لیا، بولا۔

"ابے تجھے کیا پتہ اس میں کیا لکھا ہے، یہ اردو میں ہے اور تو ٹھہرا انگریز۔ ادھر سے بھی اور اُدھر سے بھی۔"

"کچھ نہیں یار، بالکل جاہلوں سے واسطہ پڑا ہے اپنا۔ ذرا تمیز نہیں ہے تم لوگوں کو کہ ایک معزز آدمی سے کیسے بات کی جاتی ہے۔" قطب دین نے بدمزہ ہو کر کہا۔

"بڑا معزز آدمی ہے تو! کیا بات ہے تیری عزت داری کی۔" آبی نے اخبار کھولتے ہوئے کہا۔ اب ہم اخبار کی سرخیاں پڑھ رہے تھے۔ ایک جگہ ہماری نظریں جم کر رہ گئیں۔ لکھا تھا "راولپنڈی جیل سے قیدی عورت کا فرار۔"

اخبار نے بڑے سنسنی خیز انداز میں وہ خبر چھاپی تھی۔ لکھا تھا کہ کسی نامعلوم مجرم نے جیل کے عملے سے ساز باز کر کے آسیہ نامی ایک قیدی عورت کو نرس کا لباس پہنا کر جیل سے رہا کروا لیا۔ مجرم کار لے کر جیل کے دروازے پر کھڑا تھا کہ قیدی عورت نرس کا لباس پہن کر لیڈی ڈاکٹر نفیسہ کے پیچھے چپ چاپ باہر نکلی اور کار میں بیٹھ کر وہاں سے فرار ہوگئی۔ معلوم ہوا ہے کہ مجرم لیڈی ڈاکٹر نفیسہ کو بھی زبردستی کار میں ڈال کر بھاگ نکلا۔ سارے صوبے کی پولیس کو خبردار کر دیا گیا ہے اور چھاپہ مار پارٹیاں مختلف سمتوں میں روانہ کر دی گئی ہیں۔ جیل کے عملے کے چار آدمی معطل کر دیے گئے ہیں۔ کسی گہری سازش کے انکشاف کی توقع ہے۔ پولیس سرگرمی سے تفتیش کر رہی ہے۔

"لے بھئی جیلانی! تیرے کارنامے کی خبر تو چھپ گئی ہے، بڑا کام دکھایا تو نے میرے یار۔ کمال کر دیا ہے تو نے۔"

"ہوا کیا ہے بھئی۔ کچھ مجھے بھی تو بتاؤ۔" قطب دین نے آگے جھک کر پوچھا۔

"لڑکا ہوا ہے مبارک ہو۔ منت تیرے کرتو دین کی۔ ابے اخبار نہیں پڑھ سکتا تھا تو خریدا ہی کیوں تھا بُدھو کے آوے۔"

"یار میں اتنی دور سے نہیں پڑھ سکتا۔ میری 'نگاں' کچھ کمزور ہوگئی ہے۔"

"جیلانی نے انھیں پچھاڑ دیا ہے اسی لیے تو میں اس کا داس بن چکا ہوں۔"

"لکھا ہوگا کہ پولیس تفتیش کر رہی ہے۔" قطب دین نے ترش ہو کر کہا۔

"ہاں لے تو بھی پڑھ لے۔ پولیس بھلا تفتیش کے سوا اور کر ہی کیا سکتی ہے۔" آبی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اگر کبھی ان کی ڈاڑھ کے نیچے آگئے نا تو پتہ چل جائے گا صاحب! دل کر رکھ دیتے ہیں وہ آدمی کو سیکنڈوں میں۔"

"میں لوہے کا چنا ہوں بچے ڈاڑھ بھی توڑ سکتا ہوں۔"

آبی نے کمبل کی بُکل سیدھی کرتے ہوئے کہا۔ آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر وہ خوش ہو رہا تھا۔ وہ کالی ڈیرہ غازی خانی پگڑی اسے بہت سجتی تھی۔ یہی حال تاہیے کا تھا۔ وہ بھی بہت طرح دار جوان تھا اور چہرے مہرے سے وہ کوئی بہت بڑا زمیندار نظر آتا تھا۔

"اب کیا کاریکرم ہے متر؟" قطب دین نے پوچھا۔ گاڑی اب راوی روڈ پر پہنچ چکی تھی۔

"ہائے متراں دی لون دی ڈلی
توں مصری برو بر جانیں
نیں متراں دی لون دی ڈلی"

آبی کو متر کے لفظ پر ایک بول یاد آگیا تھا جسے وہ مہک کر گانے لگا تھا۔ پھر اچانک اس کی نظر میرے چہرے پر پڑی تو ایک دم چپ ہوگیا اور میرے قریب کھسک کر بولا۔ "مجھے افسوس ہے یار! میں خواہ مخواہ بکواس کرنے لگا ہوں۔ تمھاری پریشانی کا مجھے پوری طرح اندازہ ہے جیلانی۔ ہم اس آہو سے نپٹ لیں گے۔ چل تاہیے تو ہمیں ادھر اسحاق کے گھر اتار دے۔"

"ٹھیک ہے۔ وہاں تم ہمارا انتظار کرو۔ آہو سے میں ساری باتیں معلوم کر کے ابھی واپس آتا ہوں۔" تاہیے نے کار کا رُخ دائیں ہاتھ موڑ دیا۔

"مگر وہ تو شاید ابھی گھر واپس نہ آیا ہو۔" میں نے سرور کی بات انھیں یاد دلائی۔

"آگیا ہوگا۔ نہ آیا ہو تو اس کا انتظار کرو اور اسے جس طرح بھی ہو سکے ادھر اسحاق کے ڈیرے پر لے آؤ۔" آبی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

تاہیے نے گاڑی ایک گلی میں سے گزار کر بند روڈ کے قریب ایک بڑے سے احاطے کے سامنے روک دی۔ احاطے کے گرد چار فٹ اونچی چار دیواری بنی تھی۔ اور سامنے بھینسوں کا ایک چونا بندھا تھا جس کے سامنے یہ لمبی سی لکڑی کی کھرلی میں کٹا ہوا برسیم کا ہرا چارہ پڑا تھا۔ احاطے میں چاروں طرف گوبر ہی گوبر نظر آ رہا تھا۔ یہاں تک کہ دیواروں پر بھی گوبر تھا۔ تھپے ہوئے اُپلوں کی صورت میں۔ احاطے کے آخری حصے میں چار کمرے بنے ہوئے تھے جن کے سامنے ایک بڑے سے پلنگ پر کچھ آدمی بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔

کار کو احاطے کے سامنے رُکتا دیکھ کر ایک پہلوان صورت آدمی اپنا تہمد کس کر باندھتے ہوئے اُٹھا اور جوتی میں پاؤں پھنسا کر گوبر سے بچتا بچاتا تیزی سے ہماری طرف لپکا۔ اس عرصے میں میں اور آبی کار سے اُتر چکے تھے۔ وہ آدمی دروازے

پر آیا اور بڑے تپاک سے بولا۔

"جنتلے بھئی! آج تو رحمتیں ہی آگئی ہیں۔ کیا حال ہیں آبی صاب۔ جی آئیاں نوں؟" یہ کہہ کر وہ بڑے خلوص سے آبی سے لپٹ گیا۔

تابیہ نے گاڑی آگے بڑھائی تو وہ آدمی آبی سے فارغ ہو کر مجھ سے لپٹ گیا۔ یوں جیسے وہ اپنے کسی مدتوں کے بچھڑے ہوئے بھائی سے مل رہا ہو۔

"یہ میرا بھائی بھی ہے اور دوست بھی ساقا گلبھڑیا، اور یہ میرا دوست جیلانی ہے پہلوان جی۔"

"جی آئیاں نوں بھاجی! جی آئیاں نوں آؤ۔ اُدھر سے اندر چلتے ہیں ادھر تو گند ہی گند ہے۔" یہ کہہ کر وہ ہمیں اپنے ساتھ لے کر احاطے کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا عمارت کے عقب میں جا پہنچا اور ایک دروازہ کھول کر ہمیں ایک صاف ستھرے کمرے میں لے گیا۔ وہاں دیوار کے ساتھ بڑے قرینے سے کرسیاں لگی تھیں۔ گلبھڑیے نے ہمیں ان پر بٹھا دیا۔ اور پھر دروازہ بند کر کے بولا۔

"کیا پئیں گے بھاجی؟"

"یار ہم نے تو ابھی تک ناشتہ بھی نہیں کیا تھا۔ ایک سیاپے میں پھنسے تھے صبح سے۔"

"ابھی لو بادشاہو! مزہ ہی آجائے گا۔ ادھر مکئی کی روٹی ساگ اور مکھن حاضر ہے۔ اماں نے بہت چٹ پٹا پکایا ہے ساگ۔ میں ابھی لایا۔" یہ کہہ کر وہ دروازہ اپنے پیچھے بند کر کے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ اس کے نام نے ہی نہیں بلکہ اس کی آنکھوں کی دہشتناک چمک نے بھی مجھے حیران کیا تھا۔ اس کے پنجے خلافِ معمول بہت بڑے تھے۔ جسم اس کا کسرتی تھا۔ چھوٹی چھوٹی پھڑکتی مونچھیں، محراب دار بھنویں اور حساس نتھنے اس کی شخصیت میں عجیب سا انوکھا پن پیدا کرتے تھے۔ جب وہ مسکراتا تھا تو اس کے سامنے کے دانتوں میں لگی سونے کی کیلیں نمایاں ہو جاتی تھیں۔ جب وہ بات کرتا تھا تو یہی محسوس ہوتا تھا کہ وہ کوئی بہت ہی سادہ لوح آدمی ہے جسے یہ بھی پتہ نہیں ہوگا کہ ازار بند کیسے باندھا جاتا ہے۔ یہ بات میں نے آبی سے کہہ ہی دی۔ وہ پہلو بدل کر مسکرا دیا، بولا۔

"بہت پہنچا ہوا بزرگ ہے یہ گلبھڑیا۔ اسے اتنا سیدھا نہ جان۔"

"اس کا نام گل بھڑیا کیسے پڑ گیا؟"

"میں نے سنا ہے کہ یہ اگر کسی کا گلا دبوچ لے تو کوئی مائی کا لال اسے چھڑا نہیں سکتا۔ گل سے مراد گلا ہے اور بھیڑیا کے معنی ہیں پکڑنے والا۔ شکنجے ایسی گرفت ہے اس کی۔"

"گوجر ہے نا یہ؟"

"ہاں! ادھر گوبر میں بیٹھا ہے تو اور کون ہو سکتا ہے!"

"وہ اس کی دوسری خوبیاں بھی مجھے بتاؤ۔ مجھے یہ آدمی اچھا لگتا ہے۔" میں نے بے ساختہ کہا۔

"تعریفیں تو سب اللہ کے لیے ہیں مگر یہ یاروں کا یار ہے جیلانی۔ یہ جتنی بھینسیں ادھر بندھی ہیں نا، ان میں سے زیادہ تر یہ خود چرا کر لایا ہے۔ بڑا خوفناک قسم کا رسہ گیر ہے۔"

"کسی بھلے آدمی سے بھی مل لیا کرو کبھی۔"

"بھلے آدمی اب پیدا ہی نہیں ہوتے ہیں جیلانی بھائی۔ وہ مائیں ہی مر گئیں جن کے دودھ کی تاثیر میں نیکی ہوتی تھی۔"

"تو ٹھیک کہتا ہے آبی! مگر ادھر کیوں آیا ہے تو۔ یہ آدمی ہماری کیا مدد کر سکتا ہے اور وقت گزرتا جا رہا ہے۔"

"وہ تینوں واپس آجائیں تو پھر سوچیں گے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ یہ گلبھڑیا تو واقعی ہمارے کسی کام نہیں آسکتا۔ اس کے پاس تو میں اس لیے آیا ہوں کہ اور کوئی جگہ بیٹھنے کی نہیں تھی۔"

"مجھے یہ ڈر ہے کہ وہ تینوں کسی چکر میں نہ پھنس جائیں۔ ان کو اس سردری نے خبردار کر دیا تھا۔"

"کیا کہا تھا اس نے؟"

"میں کچھ سمجھ نہیں سکا۔ کچر مچر کر کے اس نے فوراً فون بند کر دیا تھا۔"

"کوئی خفیہ زبان بول رہی تھی وہ؟"

"ہاں بھئی۔ ایسی خفیہ! میں تو پاگل ہی ہو گیا تھا۔ وہ بہت چکر دار لوگ ہیں آبی! دونوں میاں بیوی بہت خبیث ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ تیرے یاروں نے ہی مجھے تباہ کیا ہے۔"

"اس کا تو مجھے بھی دکھ ہے۔ مگر یہ سب کچھ میرے علم میں نہیں تھا اور تابیہ نے تو قسم کھا رکھی تھی کہ تو اسے جہاں بھی نظر آیا وہ تجھے ڈھیر کر دے گا، خواہ تو کتنی ہی بھیڑ میں کیوں نہ ہو۔"

"تو پھر اس نے کیوں نہیں مار دیا مجھے۔ کیوں ہاتھ روک لیا تھا اس نے؟ ... میں... میرے جینے کا فائدہ ہی کیا ہے!" میرا لہجہ گلوگیر ہو گیا۔

"تو اتنا مایوس نہ ہو یار۔ اللہ بہتر کرے گا۔"

"اب کچھ نہیں ہو سکے گا آبی! دیکھ تو میرا کیا حال ہو رہا ہے۔ میں... میں اس قابل بھی نہیں کہ اس زیادتی کے خلاف کسی کی مدد لے سکوں اور وہ دونوں میری وجہ سے خدا جانے اب کس حال میں ہوں گی۔"

"اس راستے پر تو یہی کچھ ہے جیلانی!"

"اور... اور مجھے آگے ہی آگے دھکیلنے میں کس کا ہاتھ ہے، اس آہو کا۔ کاش میں اس سے نہ ملا ہوتا۔"

"ہاں یہ تو ہے۔ مگر پیارے اب تجھے کسی جگہ منہ چھپا کر بیٹھ جانا چاہیے۔ وہ لڑکیاں مل جائیں تو میرا خیال ہے ہم بارڈر کراس کر جائیں۔"

"کدھر کا بارڈر؟"

"انڈیا کی طرف نکل جائیں گے یار! کسی کو کیا پتہ ہوگا وہاں کہ ہم کون ہیں۔"

"مگر یہ تو جب ہی ہوگا جب ہم آسیہ کو واپس لا سکیں گے۔ اس کے بغیر تو میں کسی طرف نہیں جا سکتا۔"

"وہ کہیں نہیں جا سکتیں۔ آہو کو بتانا پڑے گا کہ اس نے ان دونوں کو کہاں رکھا ہے۔ تابیہ کو میں نے اسی لیے بھیجا ہے۔ میرا تو خیال ہے ہم سردری کو اغوا کر لیتے ہیں۔ پھر وہ آہو خود ہی بتا دے گا کہ آسیہ اور نفیسہ کہاں ہیں۔"

"نہیں آبی نہیں۔ میں پہلے ہی اس عورت کے ساتھ بہت زیادتی کر چکا ہوں۔ میں اسے اغوا کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ اس سے لیے یہ بات بہت آسان تھی مگر میں ایسا نہیں کروں گا۔"

"اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ آہو کی گردن تو اسی طریقے سے دبائی جا سکتی ہے۔"

"تو ٹھیک کہتا ہے آبی! مگر یہ بڑی اوچھی حرکت ہوگی لانکہ مجھے یقین ہے کہ سردری خانم بھی اس سازش میں برابر شریک ہے۔ مگر نہیں میں اس پر اب کبھی ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔ مجھے اپنے آپ سے گھن آنے لگی ہے۔"

"ایک دم پاگل آدمی ہے تو۔ اس کے سوا اور کوئی راستہ کھلا نہیں رہ گیا ہے جیلانی۔ وہ سیدھی طرح کوئی بات نہیں بتائے گا۔"

"بہتر یہ ہے آبی! کہ ہم اس ماجدہ کو تلاش کریں۔ میری ساری مصیبت کی اصل وجہ وہی ہے۔"

"اس کا کوئی اتا پتہ تجھے معلوم ہو تو بات ہو۔ وہ کمبخاہ واپس نہیں گئی ہو گی۔"

"نہیں، وہ ادھر ہی ہو گی۔ اس کے دماغ میں مکان خریدنے کی دھن سمائی تھی۔"

"ہم بڑے سخت پیچ میں آ گئے ہیں جیلانی! دعا کرو، ہماری بہن کسی شیطان کے ہتھے نہ چڑھ گئی ہو، ورنہ تو ہم جیتے جی مر جائیں گے۔" آبی کی آواز گلوگیر ہونے لگی۔ میں خود بھی اپنی بے بسی پر تلملا کر رونے لگا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اس نے مجھے بانہوں میں لے لیا۔ مگر میرے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا اور میں اس کی بانہوں میں بکھر بکھر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ آسیہ کی صورت میری آنکھوں میں ابھر کر مجھے اندھا کیے دیتی تھی۔ اس کا وہ ستا ہوا حیران پریشان چہرہ مجھے رہ رہ کر یاد آتا تھا۔ وہ پہلے سے بہت دبلی ہو گئی تھی۔ اس کی چال میں نقاہت نے لڑکھڑاہٹ پیدا کر دی تھی۔ اس کی آنکھوں کی وہ موتیوں ایسی چمک ماند پڑ چکی تھی اور جب میں نے اس سے پوچھا تھا کہ یہ تو ہی ہے نا آسیہ! تو اس نے جس لہجے میں جواب دیا وہ میرے منہ پر طمانچے سے کم نہیں تھا۔ وہ یوں بول رہی تھی جیسے اس کی آواز کسی زخم سے رس ہو کر نکل رہی تھی کتنی یاسیت سے لبریز آواز تھی وہ۔ اس نے کہا تھا ہاں یہ میں ہی ہوں بھائی جان آپ کی بدنصیب بہن آسیہ۔ اس ایک فقرے میں کتنا کرب تھا کتنی ہلاکت خیز چیخ تھی، اس کا اندازہ میں ہی کر سکتا تھا۔ آبی مجھے سنبھال رہا تھا۔ مجھے تسلیاں دے رہا تھا مگر میرے آنسو کسی طرح تھمنے ہی میں نہیں آتے تھے۔

اچانک دروازہ کھلا اور گل بھڑیا ہاتھ میں بڑی سی ٹرے لیے اندر داخل ہوا۔ اس نے مجھے یوں روتے دیکھا تو حیران ہو کر وہیں ٹھٹھ گیا بولا۔

"اوئے! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ یہ کیا معاملہ ہے آبی صاب! یہ آپ کا دوست رو رہا کیوں ہے؟"

"کچھ ایسا ہی دکھ ہے میرے یار کو جو اسے اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہے۔ لا یہ کھانا ادھر رکھ دے۔" یہ کہہ کر آبی نے اس کے ہاتھ سے ٹرے تھام لی اسے مختصر سے الفاظ میں میرے معاملے سے آگاہ کر کے بولا۔ "تو اب جا کچھ لسی شسی بھی لے آ۔ میں اسے سیدھا کرتا ہوں۔ ایسے ہی ہمت ہار بیٹھا ہے یہ۔"

ساقا الٹے قدموں واپس ہوا تو میں اپنی آنکھیں پونچھ کر خود کو سنبھالنے لگا۔ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ مجھے یوں روتے دیکھ کر یہ گلبھڑیا خواہ مخواہ میرا مذاق اڑائے گا۔ کیونکہ میں نے اس کی وہ طنز بھری مسکراہٹ دیکھ لی تھی جو مجھے روتے دیکھ کر اس کے لبوں پر ابھری تھی۔

ابھی ہم کھانا کھا کر فارغ ہی ہوئے تھے کہ باہر گلی میں کسی گاڑی کی شوں شوں سنائی دی۔

آبی اور گلبھڑیے نے تیزی سے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے تابیہ اور قطب دین کھڑے تھے۔ دروازہ کھلتے ہی وہ اندر آ گئے۔ تابیہ بہت جوش میں تھا، بولا۔

"لے آبی ہم سردری کو ادھر لے آئے ہیں۔"

"کیا؟ تم نے اسے اغوا کر لیا ہے؟" میں نے حیران ہو کر گاڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر گوگا بیٹھا تھا۔ اس طرح کہ اس نے ایک بڑی سی کمبل کی گٹھڑی گود میں ڈال

رکھی تھی۔

"تم ادھر بیٹھو جیلانی! چلو اور خواہ مخواہ کوئی مصیبت کھڑی نہ کر دینا۔" یہ کہہ کر آبی نے مجھے دھکیل کر کرسی پر بٹھایا اور خود باہر نکل گیا۔ چند ہی لمحوں بعد وہ کمبل میں لپٹی سروری کو لے کر اندر آ گئے۔ وہ بے ہوش تھی۔ آبی نے اسے دائیں ہاتھ بچھے پلنگ پر لٹایا۔ اور اس پر کمبل ڈال دیا۔

"یہ۔۔۔ یہ میں دیکھ کیا رہا ہوں آبی! یہ کون ہے یہ اتنی فیشن ایبل عورت؟"

"ابھی بتاتا ہوں ساقے! یہ بہت لمبا قصہ ہے۔"

"ہاں بھئی تاہیے! تم یہ سب کچھ کیسے کر سکے ہو؟ کچھ مجھے بھی تو بتاؤ۔"

"ادھر پولیس شولیس تو ہم نے کوئی نہیں دیکھی۔ بڑا دروازہ بھڑا ہوا تھا اسے کھول کر ہم اوپر گئے تو دیکھا کہ یہ سروری اور ایک آدمی وہاں بے ہوش پڑے تھے۔ اسے تو میں اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ میں نے آہو کی گردن دبانے کے لیے اسے وہاں سے اُٹھا لیا۔" تاہیے نے بڑے اطمینان سے کرسی پر بیٹھ کر کہا۔

"مگر وہ آہو خود کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اس کا تو کوئی پتہ نہیں ہے ہمیں۔ وہ مل جاتا تو ہم اسکی ٹانگیں نہ توڑ دیتے۔"

"اور سینگ بھی کاٹ لاتے اس ہرن کے۔" قطب دین نے خوش ہو کر کہا۔ اتنے میں گوگا بھی اندر آ گیا، بولا۔

"میرا خیال ہے کہ اِدھر سے ہمیں اٹھ جانا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کوئی ہمارا کھُرا ناپتے ہوئے یہاں آ پہنچے۔"

"نہیں یار! ادھر تو کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی سارا آپریشن نہایت خاموشی سے کیا گیا ہے۔" تاہیے نے بڑی دلجمعی سے کہا۔ وہ قطعاً خوفزدہ نظر نہیں آتا تھا۔ عجیب سی درویشانہ طمانیت اس کے چہرے پر اُتر آئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اپنے اس کارنامے پر بہت خوش ہو۔

"اسے تم نے بے ہوش کس طرح کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ تو پہلے ہی بے ہوش تھی۔ میرا خیال ہے تم نے اسے کوئی گہری چوٹ لگائی ہے۔"

"نہیں! یہ دیوار سے ٹکرائی تھی مگر اتنی دیر بے ہوش رہنے کا مطلب تو یہ ہے کہ یہ۔۔۔" اتنا کہہ کر میں پلنگ کی طرف بڑھا اور اس کی نبض ٹٹولنے لگا۔ اس کے دل کی دھڑکن معمول کے مطابق تھی۔ اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ آہستہ آہستہ ہوش میں آ رہی ہے۔

ساقے سے کہہ کر میں نے ٹھنڈا پانی منگوا کر اس کے چہرے پر ڈالا تو کچھ ہی دیر بعد اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی نظر میرے چہرے پر پڑی تو خوف سے اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ بستر سے اچھل کر پیچھے ہٹنے لگی تو تاہیے نے لپک کر اسے دونوں کلائیوں سے پکڑ کر بستر پر گرا دیا اور اس کے گلے میں پڑے دوپٹے سے اس نے سروری کا منہ کس کر باندھ دیا اور بولا۔

"ایک رسی لا ساقے! اس خبیث کی ٹانگیں اور ہاتھ بھی باندھ دے۔"

ساقے نے پلنگ کے نیچے جھانک کر وہاں سے ستلی کا ایک گولہ اٹھا کر تاہیے کو دے دیا۔

جب تاہیا اور قطب دین سروری کو اچھی طرح باندھ کر اس پر کمبل ڈال چکے تو آبی بولا۔

"اب کیا حکم ہے جیلانی صاحب! آہو کی جان تو اب ہمارے قبضے میں ہے۔"

"مجھے یہ اچھا نہیں لگتا ہے آبی! یہ ظلم ہے۔"

"ابے! یہ تو کیا کہہ رہا ہے میرے یار! اُدھر تو نے ما[illegible] کر اس کا بھرکس نکال دیا تھا اس وقت تجھے اس پر رحم نہیں [آیا]"

"وہ میری غلطی تھی جس کا مجھے اب تک افسوس ہے۔ ہمارا اصل دشمن آہو ہے۔"

"تو کوئی بات نہیں۔ یہ اس کی پی اے ہے۔ اس سے بہت کام لے سکتے ہیں ہم۔"

"پھر تو یہ شارٹ ہینڈ بھی جانتی ہو گی۔" قطب دین نے خوش ہو کر کہا۔

"وہ کیا ہوتا ہے بھئی؟" گوگے نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اس کا سر ہوتا ہے۔ اب یوں کر جیلانی پیارے [illegible] میرے ساتھ چل کر کسی ٹیلیفون پر جا بیٹھ۔ ہم آہو سے فون پر بات کریں گے۔"

آبی نے کہا۔ "اب ہم اس سے سودے بازی کر سکتے [ہیں]"

تاہیا خوش ہو گیا۔ اسے اپنی خوش تدبیری کی کامیابی نے مسرور کر دیا تھا۔

"مگر اسے کہاں رکھیں گے ہم؟"

"اس کی فکر نہ کرو بھا جی۔ یہ تو سمجھو اِدھر تک یہ اب ہماری ذمے داری ہے۔" ساقے نے سینہ بجاتے کہا۔

"ٹھیک ہے تم ادھر اس کی مشکیں کس کر رکھو۔ ہم بات کر کے اسے لے جائیں گے۔"

"تم فکر ہی نہ کرو بھا جی! اگر تم نہیں آ سکے نا تو میں [illegible]

شادی کرا دوں گا اپنے صدیق سے۔" ساقے نے بڑے پُرعزم لہجے میں کہا۔

"وہ کون ہے؟"

"وہ میرا بڑا بھائی ہے۔ جب سے پیدا ہوا ہے تب سے کنوارا چلا آ رہا ہے۔ آج کل وہ کسی ایسی ہی بلبل کی تلاش میں ہے۔"

"اس کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہیں ہونی چاہیے ساقے صاحب! یہ کسی کی امانت ہے۔ اور۔۔۔ اور مجھے اس کی عزت بہت عزیز ہے۔" میں نے نہایت ہی سنجیدہ لہجے میں کہا۔

ساقا ہنس دیا، بولا۔

"میں تو مذاق کر رہا تھا بادشاہو، بالکل فکر نہ کرو۔۔۔ ساقے کو اتنا بے ایمان نہ سمجھو۔"

"چل بھئی جلدی کر۔" یہ کہہ کر آبی ہم سب کو اپنے ساتھ لے کر کار میں جا بیٹھا۔ کار جب بادشاہی مسجد کے سامنے سے گزری تو آبی بولا۔ "ہمیں کسی ایسے ٹیلی فون کی ضرورت ہے، جس پر ہم بے فکر ہو کر بات کر سکیں۔"

"ہاں، ہمیں شاید فون پر آہو کے جواب کا انتظار کرنا پڑے۔" میں نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔

"تو پھر چلو ادھر ہیرا منڈی میں چلتے ہیں۔ ادھر وہ اپنی مہتاب کے پاس ٹیلیفون ہے۔" تاہیے نے کہا۔

"وہ جو غزل گانے میں مشہور ہے؟" آبی نے خوش ہو کر کہا۔

"ہاں یار، بیچاری بہت آؤ بھگت کرتی ہے میری۔"

"مال بھی تو بہت کھلا چکا ہے تو اسے؟" قطب دین نے کہا۔

"مال پر لعنت بھیج یار، یہ دیکھ کہ ہم نے کتنی اونچی جگہ ہاتھ مارا ہے۔"

"مگر ادھر تو بہت بھیڑ بھڑکا ہو گا تاہیے۔ وہاں ہم کیسے بات کر سکیں گے؟"

"ارے نہیں بھئی! بڑی شان سے رہتی ہے وہ۔ مجال ہے کوئی پرندہ بھی پر مار سکے اس کے مکان کے پچھلے حصے میں۔" تاہیے نے بڑے زعم سے کہا۔

کچھ ہی دیر بعد گاڑی ہیرا منڈی کے بازار سے ہوتی ہوئی چونا منڈی کی طرف مڑی اور پھر ایک گلی میں جا گھسی۔ قطب دین اس جگہ سے آشنا تھا۔ اس نے گاڑی ایک دو منزلہ عمارت کے سامنے کھڑی کر دی۔ عمارت کی پیشانی پر زمرد منزل لکھا تھا۔

"یہ مہتاب کا اپنا مکان ہے۔ ایک زمیندار نے خرید کر دیا تھا اسے۔" تاہیے نے بڑے فخر سے کہا۔ آبی نے وہ جگہ شاید پہلی بار دیکھی تھی بولا۔

"یار تاہیے کسی نئے چکر میں نہ ڈال دینا ہمیں ــــ ہم پہلے ہی بہت خوار ہو رہے ہیں۔"

"تم فکر ہی نہ کرو آبی صاب دیکھتے جاؤ کیسی کیسی صورتیں نظر آتی ہیں یہاں تمہیں۔" یہ کہہ کر اس نے دروازے پر لگی گھنٹی بجا دی۔

کچھ ہی دیر بعد ایک ادھیڑ عمر کے آدمی نے دروازہ کھولا اور تاہیے کو سامنے دیکھ کر وہ کھل اٹھا۔

"آیئے چوہدری صاب! آیئے۔ بٹیا کل بھی آپ کا ذکر کر رہی تھی، آیئے۔" یہ کہہ کر اس نے راستہ چھوڑ دیا ــــ ہم ڈیوڑھی میں داخل ہوئے تو اس نے دروازہ بند کر دیا اور پھر ہمیں ساتھ لے کر وہ چوکور صحن میں سے گزرتا ہوا ایک سجے سنورے کمرے میں جا گھسا۔ اس کمرے کی آرائش و زیبائش اور اس کے نیم خوابیدہ سے مسحور کن ماحول نے مجھے حیران کر دیا۔ ہر شے مکینوں کے عمدہ ذوق کی آئینہ دار تھی۔ تضاد اتنا تھا کہ مجھے محسوس ہوا کہ ہم سب کے سب بے حد میلے اور گندے ہیں۔

"مہتاب کہاں ہے نوری میاں؟"

"میں انہیں اطلاع دیتا ہوں۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھی ہیں۔" یہ کہہ کر وہ آدمی بڑے نستعلیق انداز سے چلتا ہوا باہر نکل گیا۔

کچھ ہی دیر بعد اس کمرے کا عقبی دروازہ کھلا تو ہم سب کی نظریں اُدھر اُٹھ گئیں۔ دروازہ جھلمل جھلمل کرنے لگا۔ ایک سرو قد عورت جس کے گدرائے ہوئے بدن کی قسم کھائی جا سکتی تھی۔ سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس کے گلاب کی پتیوں ایسے سُرخ ہونٹ ذرا دیر کے لیے کھلے تو میں سمجھا کلی کھلنے کے عمل سے گزر گئی ہے۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے ذرا سا جھک کر ہمیں سلام کیا اور پھر اپنا غرارہ سنبھالتی ہوئی... آگے بڑھ آئی۔

"کیا حال ہے تاہیا صاحب بڑے دنوں بعد آنا ہوا۔"

"کچھ وقت ہی نہیں مل سکا مہتاب کہ میں ادھر آ سکتا۔ یہ میرے دوست ہیں آپ سے ملنا چاہتے تھے۔" یہ کہتے ہوئے تاہیا اُٹھ گیا۔ وہ بڑے ہی دلفریب انداز سے چلتی ہوئی آگے آئی اور بولی۔

"آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی صاحب! آپ نے ہماری عزت بڑھائی ہے اس غریب خانے پر قدم رنجہ فرما کر۔"

"ہم دوپہر کا کھانا اِدھر ہی کھائیں گے مہتاب! میرا خیال ہے آپ کو کوئی دقت تو نہیں ہوگی۔ دراصل ہم اسی بہانے کچھ دیر یہاں ٹھہر لیں گے۔"

"یہ آپ کا اپنا گھر ہے تاہیا صاحب! میں نوری میاں سے کہہ دیتی ہوں وہ انتظام کر دے گا۔" اس کی وہ شہابی رنگت وہ جنگل کی رات ایسے لانبے سیاہ بال، وہ چڑھی کمان ایسی بھنویں، وہ گھنی گھنی پلکیں، وہ لانبی گردن۔ میں تو بس اُسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ اگر کسی زمیندار نے پاگل ہو کر اس کے پاؤں تلے دل رکھ دیا تھا اور اسے وہ بڑی سی دو منزلہ عمارت خرید کر دے دی تھی تو یہ کوئی بعید از قیاس بات ہرگز نہیں تھی۔ کہ کوئی بھی مہتاب کے سامنے آ کر اس کے بے پناہ حسن کی حدت سے محفوظ نہ رہ سکتا تھا۔

"میرے یہ دوست آپ سے غزل سُننا چاہتے ہیں۔ یہ کس وقت ممکن ہو سکے گا؟"

"شام سے پہلے نہیں۔ دو بھلے آدمی جمع ہوں تو پھر بہتر رہتا ہے۔"

"مگر لوگوں کی بھیڑ بھاڑ میں کیا لطف آئے گا؟"

"ہم بھیڑ زیادہ نہیں ہونے دیں گے صرف آپ کے دوستوں کے لیے گائیں گے، مگر کوئی ڈھنگ کی بات تو ہو گی نا۔"

"مگر ہم شام تک تو نہیں ٹھہر سکیں گے۔" تاہیے نے ضد کی۔

"اگر روپے کی بات ہے تو ہم پہلے آپ کے قدموں میں ڈ... کر دیتے ہیں۔ ہم اس چشمے پر بہت دور سے آئے ہیں۔" آ... تاہیے کا ساتھ دیا۔

"نہیں صاحب ایسی بھی اندھی نہیں ہوں کہ آدمی کی حیثیت نہ جان سکوں مگر یہ اس وقت ممکن نہیں ہے۔ سازندے ہی موجود نہیں ہیں۔" اس نے کمال سنجیدگی سے یہ بات کہی اور کرسی سے اُٹھ گئی۔

"اچھا ٹھیک ہے مہتاب! شام تک ہو سکا تو ہم ضرور ٹھہریں گے۔ اب یوں کریں تھوڑی دیر کے لیے اپنا ٹیلیفون اِدھر رکھوا دیں۔ ہم ایک دو آدمیوں سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

"کیا مضائقہ ہے۔ میں فون اِدھر رکھوا دیتی ہوں اور حکم ہو تو نوری میاں سے کہہ دیں۔ ویسے وہ آپ کے لیے چائے لا ہی رہا ہے۔" یہ کہہ کر وہ عقبی دروازے کی راہ سے دوسری طرف چلی گئی۔

"توبہ! میرا تو ایمان ہی ڈول گیا تھا یار تاہیے! پہلے تو نے اس کا کبھی مجھ سے ذکر نہیں کیا۔"

"اس قصے میں کسی کی شراکت قبول نہیں کر سکتا... انٹ شنٹ خیال دل میں مت لاؤ۔ اسے اپنی بہن سمجھو۔" ... نے ایک خاص انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں اسے اپنی بھابھی تو سمجھ سکتا ہوں۔ سکھوں والی... قطب دین چکا۔"

"یعنی شاملات! اوئے گردن تڑوانے کی صلاح تو نہیں تیری۔ لے وہ ٹیلیفون بھی ادھر آ گیا ہے۔ لا نوری میاں دے یہ حقہ۔" تاہیے نے نوری میاں کے ہاتھ سے سیٹ ... ہوئے کہا۔

"اچھا اب میں چائے لے آؤں چوہدری صاحب۔" نوری میاں عقبی دروازے میں غائب ہو گیا۔

"لے بھئی آبی، اب تو جان اور تیرا کام۔"

"نمبر تو تجھے یاد ہے نا جیلانی!" آبی نے پوچھا۔

"ہاں یہ ہے نمبر اس کا۔" یہ کہہ کر میں نے دائیں ہاتھ تپائی پر سے کاغذ قلم اٹھا کر اس پر آہو کا فون نمبر لکھ...

"میرا خیال ہے میں ہی بات کرتا ہوں اس سے۔" یہ کہہ کر آبی نے نمبر گھما دیے۔ مگر دوسری طرف سے کسی نے کوئی جواب... کتنی ہی دیر تک گھنٹی بجتی رہی مگر فون کسی نے نہیں اٹھایا۔

"میرا خیال ہے کہ وہ پٹھا ابھی تک گھر واپس نہیں..." تاہیے نے یہ کہہ کر فون رکھ دیا۔

"تھوڑا انتظار کر لو۔ وہ واپس ضرور آئے گا۔ پتہ نہیں وہ اس وقت کہاں سے بول رہا تھا۔"

"یہ بھی ممکن ہے وہ ان دونوں لڑکیوں کو لے کر کسی اور شہر چلا گیا ہو۔" آبی نے کہا۔

"ہاں! ہو سکتا ہے وہ اس وقت گوجرانوالہ سے بول رہا ہو یا شیخوپورہ سے۔ واپسی میں اسے وقت لگے گا۔"

"مگر ہمیں وہاں سے نکلے ہوئے تو ایک ڈیڑھ گھنٹہ ہو چکا ہے لاؤ میں نمبر ملاتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے خود نمبر گھمائے مگر اب بھی وہاں سے کوئی جواب نہیں آ رہا تھا۔ تقدیر مجھ سے ابھی تک پنجہ آزما تھی۔ حالانکہ وہ میرا سب کچھ چھین چکی تھی۔ میں نے آسیہ کی خاطر اپنے پنج پاتر بیچ دیے تھے۔ کچھ بھی اپنے پاس نہیں رکھا تھا مگر وہ میرے قریب آ کر ایک بار پھر مجھ سے دور ہو گئی تھی۔ اور درمیان میں وقت اور فاصلے کی اندھی دیوار تھی جو دم بدم موٹی ہوتی چلی جا رہی تھی۔ نہ میرے ہاتھوں میں اتنی سکت تھی کہ میں اُسے گرا سکتا۔ نہ میری زبان میں یہ طاقت تھی کہ وہ اسے چاٹ کر پتلا کر دیتی۔ اتنا پتلا کہ اس کے آر پار دیکھ سکتا۔ اور اب میں شاید پتھر نچوڑنے میں مصروف تھا۔ جانتا تھا کہ اس رنج و محن کا کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ پھر بھی میں وہ ساری محنت اٹھائے چلا جا رہا تھا کہ مجھے کچھ کرنا تھا بس ہاتھ پر ہاتھ دھرے کب تک بیٹھا رہتا اور وقت تھا کہ تیزی سے گزرتا چلا جا رہا تھا۔

نوری میاں کچھ ہی دیر بعد چائے لے آیا اور میرا دھیان ذرا دیر کے لیے آسیہ کی طرف سے ہٹ گیا۔ آبی مجھے ٹھہر ٹھہر کر تسلیاں دیتا تھا۔ اس کی یہی کوشش تھی کہ میں اپنی آس امید اور ہمت کو برقرار رکھوں مگر میں کیا کرتا میرے سارے پاسے مایوس لوٹتے تھے۔ کسی کے ہاتھ میں خوشی کا کوئی نامہ نہیں تھا۔ مجھے حالات نے ایک بار پھر پتال جنتر پر رکھ لیا تھا۔ اور وہ قطرہ قطرہ کر کے میرے تمام بلند بانگ ارادوں کا لہو نچوڑتی چلی جا رہی تھی۔ مجھے بھلا چین کہاں مل سکتا تھا۔

چائے سے فارغ ہوتے ہی میں نے ایک بار پھر آہو کو فون کیا اب کی بار کسی نے فوراً ریسیور اٹھا لیا۔ وہ آہو کی آواز نہیں تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی پولیس افسر بول رہا ہو۔

میں نے فون آبی کے ہاتھ میں دے دیا۔

"ہیلو، مجھے دل شیر آہو سے بات کرنی ہے۔"

"میں بول رہا ہوں۔" دوسری طرف سے اسے شاید یہی جواب ملا تھا۔ آبی بہت تپ کر بولا۔

"بڑے بھائی مجھے چکر دے رہا ہے تو۔ میں آہو کی آواز پہچانتا ہوں۔ اسے کہو مجھ سے بات کرے۔"

....

"اچھا تو آپ ہیں میرے دل شیر آہو صاحب کیسے کیسی رہی۔ آپ ہرنی کو تلاش کر رہے ہوں گے۔"

....

"کیوں اس وقت بات کیوں نہیں ہو سکتی؟"

....

"اوہ تمہاری مصروفیت خوب سمجھتا ہوں بیٹے! تو پولیس کے سامنے بیٹھا ہے نا؟ اس لیے بات نہیں کرتا۔"

....

"اچھا ٹھیک ہے۔ میں آدھ گھنٹے بعد تجھ سے بات کروں گا۔ مگر یاد رکھ تیری ہرنی تجھے جب ہی ملے گی جب تو وہ دونوں لڑکیاں واپس کر دے گا۔" آبی نے دانت پیستے ہوئے کہا اور اس نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

"کیا کہہ رہا تھا وہ؟" میں نے پوچھا۔

"وہ اس وقت کھل کر بات نہیں کر رہا ہے۔ کہتا ہے میں بہت مصروف ہوں۔ پولیس کو... وہ اُدھر بلا لایا ہو گا تاکہ تمہیں موقعے پر گرفتار کرا دے۔"

"پھر اب کیا کرنا چاہیے؟"

"میں آدھ گھنٹے بعد پھر اس سے بات کروں گا وہ بہت گھبرایا ہُوا ہے۔"

"آدھ گھنٹے بعد تو پتہ نہیں کیا ہو جائے گا۔ آبی میں انتظار نہیں کر سکتا۔"

"صبر سے کام لو جیلانی بھائی! یہ معاملہ اتنی جلدی نہیں سلجھ سکتا۔ مجھے یُوں لگتا ہے لڑکیاں اس کی دسترس میں نہیں رہی ہیں۔"

"کیوں؟ کہہ رہا تھا وہ؟"

"مجھے فون کے قریب دو آدمیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ آہو صاحب صبح صبح شہر سے باہر گئے ہوئے تھے کہ کسی نے سرودی بیگم کو اغوا کر لیا۔"

"وہ تو وہی کہتے ہوں گے جو انہیں آہو نے بتایا ہو گا۔ خیر یہ آدھ گھنٹہ بھی گزار لیتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں ایک بار پھر کرسی پر سُکڑ کر سمٹ کر بیٹھ گیا۔ دل میرا کسی طور بھی ٹھکانے

پر نہیں آ رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میرے اور آسیہ کے درمیان فاصلہ مسلسل بڑھ رہا ہے اس آہو بدن شنکر نے مجھے کہیں کا بھی نہیں رہنے دیا تھا۔ وہ اس وقت اسی شہر میں موجود تھا۔ مگر میں اس کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اور اب وہ سروری کو بے بس کر کے وہاں سا تھ گل پھڑ یے کے گھر چھوڑ آئے تھے۔ ہو سکتا ہے ان کی یہ تدبیر کارگر ہو جائے۔ مگر جس انداز سے اُس نے آبی کو ٹال دیا، اس سے تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ ان کے تمام اندازے غلط ثابت ہوں گے۔ آہو یوں ہتھیار نہیں ڈالے گا۔ اپنے روپے کی واپسی اور ہیروں کی بازیافت کے لیے وہ کڑی سے کڑی آزمائش سے گزر جائیگا۔ اسے سروری خانم کے مزاج کا بھی علم ہے اسے یاد ہے کہ سروری خانم بڑی سے بڑی جوکھم اُٹھا کر بھی اپنا سر اونچا رکھے گی۔ میں نے تو یہی دیکھا تھا۔ وہ عورت لوہے کے اعصاب کی مالک تھی۔ میں نے اسے بڑی اذیتیں دی تھیں مگر وہ فروتنی شکستگی اور درماندگی جو ایسے حالات میں عورت کے اندر اُبھر آتی ہے وہ اس میں ہرگز نظر نہیں آتی تھی۔ وہ میری بات سے بھی خوفزدہ نہیں ہوئی تھی۔ کوئی اور عورت ہوتی تو اس کے اعصاب چٹخ جاتے۔ وہ فوراً ہمت ہار دیتی مگر وہ کسی بھی طرح راہ دینے پر آمادہ نہیں تھی۔ اس کے سامنے بھی ایک بہت بڑا مقصد تھا اور وہ مقصد یہی تھا کہ وہ جس طرح بھی ہو سکے اپنے باپ کی جاگیر کی بلا شرکت غیرے مالک بن جائے۔ اُسے مسند آراء کا وجود کھٹکتا تھا۔ اس نے ماں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ باپ کو اس نے آہو کے مشورے سے گولی مروادی تھی۔ میں کسی بھی طرح یہ بات باور نہ کر سکتا تھا کہ تنہا آہو اس سارے خون خرابے کا ذمّے دار ہے۔ سروری خانم اس کے جرائم میں برابر کی شریک تھی۔ اور بڑے حوصلے سے وہ اس کے نتائج کا سامنا بھی کر رہی تھی۔ آہو کو وہ اوتار سمجھتی تھی۔ مگر وہ ایسا اوتار تھا جو تیسرے جنم میں پہنچ کر باراہ بن چکا تھا۔ خنزیر کی ساری صفات اس میں اکھٹی ہو گئی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ اتنے سارے جرائم پیشہ لوگ اس کے سامنے بے بس تھے، اور اس کی توجہ اور استعانت کے محتاج ۔

ٹھیک آدھ گھنٹے کے بعد میں نے خود آہو کو فون کیا — کسی نے ریسیور فوراً ہی اُٹھا لیا۔

"کون صاحب ؟" میرے کانوں میں آہو کی آواز سنائی دی۔ وہ بہت گھبرایا ہوا تھا۔

"میں جیلانی بول رہا ہوں آہو۔ بہتر یہ ہوگا کہ تم مجھے سروری پر زیادتی کرنے پر مجبور نہ کرو۔ آسیہ اور نفیسہ کو فوراً میرے پاس پہنچا دو۔ ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔ اب کی بار شاید میں تمھیں بھی زندہ نہ چھوڑوں۔"

"میں سمجھ رہا ہوں جیلانی! یقین کرو کہ ان کے اغوا میں میرا ہاتھ بالکل نہیں ہے۔ بہر حال میں انھیں جہاں کہو پہنچا دیتا ہوں مگر سروری خانم کو آج تمھیں واپس کرنا ہوگا۔"

"میں تیار ہوں، بتاؤ مجھے تم کہاں مل سکتے ہو۔"

"میں تمھیں ادھر اقبال پارک میں ملوں گا۔ ٹھیک دو بجے سوئمنگ پُول کے سامنے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔ مگر سروری کو میں اس وقت تمھارے حوالے کروں گا، جب مجھے یقین ہو جائے گا کہ تمھارے ہاتھوں میں بالکل محفوظ رہی ہیں۔ سروری کو میں خود لے کر آؤں گا۔ آسیہ کی واپسی کے تین گھنٹے بعد۔"

"مجھے منظور ہے۔ تم دو بجے وہاں پہنچ جاؤ۔" یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

"کیا کہہ رہا ہے یہ خبیث ؟" آبی نے میرے چہرے کے بدلتے رنگوں پر تلملا کر کہا۔ قطب دین اور گوگا بھی سخت پریشان نظر آ رہے تھے۔ میں انہی کے ہاتھوں مارا گیا تھا اور اب وہی میری جاگیر کے لیے سردھڑ کی بازی لگا دینے پر آمادہ تھے۔

"اس نے دو بجے کا وقت دیا ہے۔"

"ٹھیک ہے میں اس سے خود جا کر بات کروں گا۔"

"وہ کسی چکر میں نہ پھنسا دے ہمیں۔" گوگے نے اپنا خدشہ ظاہر کر دیا۔ وہ صورتِ حال کو اتنی آسان نہیں سمجھ رہا تھا۔ جتنی وہ بظاہر نظر آ رہی تھی۔

"ہم سروری کو ساتھ تو نہیں لے جائیں گے۔ اس نے کوئی گڑبڑ کی تو پھر دیکھ لیں گے۔" آبی نے کہا۔

"مجھے حیرت ہے کہ اُس نے دو لاکھ روپے اور ہیروں کا ذکر نہیں کیا جن کی مالیت وہ چوبیس لاکھ روپے بتاتا تھا۔" میں نے آہو کی باتیں ذہن میں دُہراتے ہوئے کہا۔

"وہ چوکڑی بھول چکا ہے جیلانی۔ اسے سروری کے سوا کسی بھی بات کا ہوش نہیں ہوگا۔" آبی نے مجھے اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں وہ اتنی جلدی بدحواس ہونے والا آدمی نہیں ہے ہمیں بہت سوچ سمجھ کر اُس سے معاملہ کرنا ہوگا۔"

"کیا مطلب ؟"

"مطلب یہ کہ ہم سروری کو ساتھ نہیں لے جائیں گے۔ اگر اس کی نیت نیک ہے تو پھر ہم اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا کر سروری کو اس کے حوالے کر دیں گے ورنہ نہیں۔"

"ٹھیک ہے تم میں سے کوئی بھی اس کے سامنے نہ جائے میں اکیلا اس سے بات کروں گا۔" آبی نے کہا۔

اس سارے معاملے کی تفصیلات طے کر کے ہم ٹھیک ڈیڑھ بجے مہتاب کے گھر سے نکلے اور ٹیکسی میں بیٹھ کر قلعے میں جا پہنچے۔ طے پایا تھا کہ میں تابیا، قطب دین اور گوگا قلعے کے ... برجوں کی اوٹ میں کھڑے رہیں گے اور آبی تنہا اقبال پارک جائے گا۔ ہم قلعے کی دیوار پر سے صاف دیکھ سکتے تھے کہ سامنے سوئمنگ پُول کے پاس کھڑا آہو کیا کرتا ہے۔ اس کام کے لیے میں نے انار کلی میں سے گزرتے ہوئے چھ سو روپے کی ولائیتی دوربین خرید لی تھی جسے دیکھ کر قطب دین خوش ہو گیا تھا۔ بچوں کی طرح ہمک ہمک کر اُسے آنکھوں سے لگا کر گرد و پیش کو دیکھتا چلا گیا تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا کہ اس کی اس روز کوئی بہت ہی دیرینہ خواہش پوری ہو گئی تھی۔ جب آبی کو اقبال پارک کے کنارے پر اتار کر ہم قلعے کے اندر پہنچے تو قطب دین بولا۔

"یار جیلانی تیرا یہ کام مکمل ہو جائے اور آج تجھے آسیہ مل جائے تو یہ دُوربین مجھے دے دینا۔"

"کیوں ایسی کیا بات ہے اس میں ؟"

"یار وہ تیرا بھتیجا ہے نا سلیم، وہ بہت ضد کیا کرتا ہے۔ اُدھر وہ چوتھی جماعت میں پڑھتا ہے۔ روز مجھ سے کہتا تھا کہ دوربین لا دو۔ ایک دُوربین تو میں نے اسے خرید کر دے بھی دی تھی مگر وہ بالکل اندھی سی ہے۔ سامنے کا آدمی بھی نظر نہیں آتا ہے اس بین سے۔ بہت آزردہ خاطر ہو رہا تھا وہ۔"

"یہ کون سی بڑی بات ہے، لے جانا اپنے بیٹے کے لیے۔ میرے تو کسی کام نہیں آئے گی بعد میں۔" میں نے ہاں کہہ دی تو وہ خوش ہو گیا۔ بے اختیار ہو کر وہ مجھ سے لپٹ گیا۔

"کتنا اچھا آدمی ہے تو میرے یار! پر ہم نے تجھے بہت نقصان پہنچایا ہے۔ مجھے تو وہ وقت ہاتھ نہیں آ سکتا ہے۔"

"اب یہ مکھن بازی بند کر دے کُتر دین! ایک دم کمینہ آدمی ہے تُو۔" تابیے نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

جب ہم نے قلعے کی جنوبی دیوار کے پاس پہنچ کر سامنے دیکھا تو آبی اُس وقت اقبال پارک کے وسط میں پہنچ چکا تھا۔ وہ بھرا ہوا پستول جیب میں ڈال کر ساتھ لے گیا تھا اور میں دعا مانگ رہا تھا کہ اسے وہ پستول استعمال کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ میں نے دُوربین آنکھوں سے لگا کر سوئمنگ پول کے گرد بنی عمارت کے سامنے نظر ڈالی تو وہاں مجھے آہو ایک درخت کے نیچے کھڑا نظر آیا۔ دو عورتیں اس سے ذرا فاصلے پر کھڑی تھیں اور وہ دونوں برقعوں میں ملبوس تھیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ آہو اپنے وعدے کے مطابق ان دونوں کو ساتھ لے آیا تھا۔ اس نے انہیں برقعے پہنا دیے تھے تاکہ کوئی انھیں پہچان نہ سکے۔ یہ اچھی بات تھی۔ اُن کے غم زدہ چہروں پر جس کسی کی بھی نظر پڑتی وہ حیران رہ جاتا۔ اب کوئی دم جاتا تھا کہ میں آسیہ کے سامنے ہوں گا۔ اپنی ساری کوتاہیوں کی اس سے معافی مانگتا ہوا۔ شرمندہ شرمندہ سا۔ خجل خجل۔ بجھا بجھا، خوش خوش، وہ ساری کیفیتیں میری نظر میں پھر گئیں جو مجھ پر اُس کا سامنا کرتے وقت گزر جاتیں۔

آبی تیز تیز قدم اُٹھاتا بالآخر آہو تک جا پہنچا میرے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں۔ ہم نے آبی کے تحفظ کے لیے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ وہ دونوں اب بالکل آمنے سامنے کھڑے تھے۔ ان کے درمیان شاید کوئی تلخ کلامی ہونے لگی تھی۔ کیونکہ آبی بہت تیزی سے ان عورتوں کی طرف بڑھا تھا۔ اس نے جاتے ہی اُن کے نقاب اُلٹ دیے تھے۔ اُف میرے پروردگار۔ وہاں نہ آسیہ تھی اور نہ نفیسہ۔ وہ کوئی اور ہی عورتیں تھیں پولیس کی زنانہ سپاہی تھیں وہ۔ ان کو دیکھتے ہی آبی نے پستول نکالنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ مگر نہیں۔ سوئمنگ پُول کے دائیں طرف درختوں کے جھنڈ میں سے اچانک چار سپاہی بندوقیں تانے باہر نکل آئے۔ اور پیشتر اس کے کہ آبی پستول ان پر چلا سکتا، وہ دو عورتیں اس سے لپٹ گئی تھیں۔ آبی نے انھیں پوری قوت سے گھوم کر خود سے الگ کیا مگر اتنے میں دو سپاہیوں نے پیچھے سے آ کر اپنی بندوقیں اس کی دائیں بائیں پسلیوں سے لگا دیں۔ آبی بے بس ہو گیا تھا۔ انھوں نے اسے پستول چلانے کی مہلت ہی نہیں دی تھی۔ ایک سپاہی نے اس کے ہاتھ سے پستول چھین لیا۔ میرا کلیجہ پھٹنے لگا۔ آبی اُن کے لیے تو شکار بن گیا تھا۔ وہ جیلانی پر قربان ہو رہا تھا۔ جیلانی کی خاطر مر رہا تھا مگر جیلانی بدنصیب کچھ بھی نہ کر سکتا تھا۔ میں نے چاہا کہ اسٹین گن کا فائر کھول دُوں مگر فاصلہ اتنا تھا کہ میری ایک بھی گولی ان تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

"اوئے گوگے نامراد یہ کیا ہو گیا۔" میں نے تابیے کی آواز سُنی۔ وہ پاگلوں کی طرح پیچھے بھاگ رہا تھا۔ گوگے اور قطب دین نے اس کے پیچھے دوڑ لگا دی۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ میں بھی اُن کے پیچھے لپکا مگر وہ اتنی برق رفتاری سے قلعے کی مختلف منزلیں طے کر کے باہر نکلے کہ جب میں بڑے دروازے پر پہنچا تو وہ بہت آگے نکل چکے تھے۔ ان کی کار وہیں کھڑی تھی اور مقفل تھی۔

میں بھی قریب ہی کھڑی ہوئی ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر ان کے پیچھے لپکا مگر جب میں اقبال پارک کے سامنے پہنچا تو اس وقت تابیے کی ٹیکسی بلا خیز رفتار سے سوئمنگ پُول کی طرف بڑھ رہی تھی۔ سامنے سے وہ جیپ آ رہی تھی جس میں انہوں نے آبی کو گرفتار کر کے بٹھا لیا تھا۔ چھ سپاہی اس کے اردگرد بیٹھے تھے۔ جیپ چھت

کے بغیر تھی۔ تھانیدار اور آہو اگلی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ ابھی میں کوئی فیصلہ نہ کرنے پایا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے، کیونکہ صورتحال بالکل واضح نہیں تھی۔ سارے پتے پولیس کے ہاتھ میں تھے۔ آبی ان کی گرفت میں آچکا تھا۔ کہ اچانک میں نے تاہیے کی ٹیکسی کو پوری رفتار کے ساتھ جیپ سے ٹکراتے دیکھا۔ خوفناک دھماکہ ہوا اور جیپ اُلٹ گئی۔ ٹیکسی ٹکرانے سے پہلے اس کے دروازے کھل گئے تھے۔ اور تاہیا قطب دین اور گوگا اس میں سے کود کر باہر نکل گئے تھے۔ میں نے دُور بین آنکھوں سے لگائی تھی اور میں ابھی تک ٹیکسی کی اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ تاہیے نے ٹیکسی سے نکلتے ہی کوئی چیز زوردار طریقے سے جیپ پر پھینکی۔ وہ کوئی گولا سا تھا جو ایک ہلکے سے دھماکے سے پھٹا اور جیپ دیکھتے ہی دیکھتے دھوئیں کی لپیٹ میں آگئی۔ چند ہی سیکنڈ بعد مجھے اس دھوئیں کے بادل میں سے تاہیا باہر نکلتا نظر آیا۔ وہ آبی کو اپنے ساتھ کھینچ رہا تھا۔ آبی کے ہاتھوں میں ہتھکڑی لٹک رہی تھی سپاہی کی پیٹی سمیت۔ قطب دین اور گوگا اس کے پیچھے تھے۔ وہ سب لوگ تیزی سے بھاگتے ہوئے ابھی دھوئیں کے حلقے سے تھوڑی ہی دُور نکلے تھے کہ تین سپاہی مجھے دھوئیں کے ڈھیر میں سے کھانستے ہوئے باہر آتے دکھائی دیے۔ بندوقیں ان کے ہاتھوں میں تھیں۔ انھوں نے ان چاروں کو اپنے سامنے بھاگتے دیکھا تو وہ اُن کے پیچھے لپکے اور چند ہی قدم آگے آکر انھوں نے ان پر گولی چلا دی۔

اور۔۔۔ اور ان کا نشانہ خطا نہیں گیا۔ گوگا اور قطب دین ان کی زد میں آگئے تھے۔ وہ دونوں لڑکھڑا کر زمین پر گر گئے تو میرا مغز اُلٹ گیا۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو گاڑی کے کھلے۔۔۔۔ دروازے سے باہر گرا کر اسٹیئرنگ خود سنبھالا اور بلاخیز رفتار سے گاڑی دوڑاتا ہوا آبی اور تاہیے کے پاس جا پہنچا۔ وہ مجھے پہچان کر تیزی سے ٹیکسی میں بیٹھے تو میں نے گاڑی کا رُخ دوسری طرف موڑ کر اس کی رفتار ایک دم تیز کر دی۔ چند ہی لمحوں میں اقبال پارک سے نکل کر راوی روڈ پر جا چڑھا۔ اب میرا رُخ بند روڈ کی طرف تھا۔ پولیس کے سپاہی اور ان کی جیپ تاہیے کے جاں نثار دوست قطب دین اور گوگا بہت پیچھے رہ گئے تھے۔

"تو تو ٹھیک ہے نا آبی!"

"یہ کیا ہو گیا ہے جیلانی۔ وہ میرے یار وہ قطب دین اور گوگا۔۔۔ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔" آبی بلکنے لگا تھا۔ تاہیے کا رنگ فق ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اُس کے دل پر گھونسہ لگا ہو۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔

"تو بولتا کیوں نہیں ہے تاہیے، تو نے یہ کیا کر دیا ہے پاگل، میں قطب دین کی بیوی کو کیا جواب دُوں گا؟ تو کیوں لایا تھا انہیں میرے پیچھے۔" آبی نے روتے ہوئے کہا۔

"مجھے معاف کر دے آبی! میں تو تیری خاطر ہی ادھر آیا تھا؟"

"میری خاطر دو آدمی مروا لیے تو نے تاہیے، دو بازو کٹوا دیے۔ تجھے کس نے کہا تھا میرے پیچھے آنے کو؟"

"وہ تجھے گرفتار کر چکے تھے آبی! میرے لیے وہ سب ناقابلِ برداشت تھا۔"

"گولی تو نہیں مار دی تھی مجھے انہوں نے۔ اندر ہی بھیج دیتے مجھے۔ کیا کر لیتے وہ میرا۔ مگر میرا یار قطب دین اور وہ گوگا۔ تو نے اچھا نہیں کیا ہے تاہیے، اچھا نہیں کیا۔۔۔" آبی بکھر گیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کے سگے بھائی مارے گئے ہوں۔

"اس سے کیا کہتے ہو آبی! یہ سب کچھ میری بدنصیبی کی وجہ سے ہوا ہے۔ میں ہی اُن کی موت کا ذمّے دار ہوں۔" میں نے بند روڈ کی ویران سڑک پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔

"انھیں تو نے گرتے دیکھا تھا جیلانی! میرے منہ پر تھوک۔۔۔ میں۔۔۔ انھیں مُڑ کر بھی نہ دیکھ سکا۔ نہ گوگے کو نہ قطب دین کو۔ ہماری نامردی دیکھ، ہم اپنی جان بچا لائے۔" آبی کو کسی طرح بھی چین نہیں آ رہا تھا۔ یہ موٹے موٹے آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ اور تاہیا یوں گم صم بیٹھا تھا جیسے پتھر ہو چکا ہو۔ قطب دین اور گوگا تاہیے کے زیادہ قریب تھے۔ آبی تو ان سے کبھی کبھار ملتا تھا۔ مگر اب جو آبی کی حالت میں دیکھ رہا تھا، اس سے تو مجھے یہی معلوم ہوتا تھا کہ اسے اُن سے بے پناہ محبت تھی۔ وہ ان کے دکھ کو برداشت ہی نہیں کر سکتا تھا اور تاہیے کے لبوں پر مہرِ سکوت یوں لگ گئی تھی۔ کہ وہ اس سارے خونی المیے کا خود کو ذمّے دار ٹھہرا رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ پاگلوں کی طرح اُدھر نہ جا نکلتا تو اس کے دونوں ساتھی بچ جاتے تھے۔ مگر اس صورتِ حال میں آبی کو پولیس کے بے پناہ مظالم سہنے پڑتے۔ کیونکہ اس کا جیلانی کے ساتھ تعلق تو اب قطعی طور پر ثابت ہو چکا تھا۔ وہ اگر پولیس کی تحویل میں رہتا تو ان لوگوں کی ایذا رسانی سے تنگ آکر وہ شاید تاہیے کا بھی پتہ بتا دیتا اور میرا بھی۔ وہ اس سے پہلے کبھی کسی چکر میں نہیں پھنسا تھا۔ آہو اور بہادر علی ہر مرحلے پر اس کی اعانت کو پہنچتے تھے۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ آبی کو بہادر علی سے جو عقیدت تھی، تو اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ گاؤں میں اس کے خلاف کوئی انگلی نہیں اٹھنے دیتا تھا۔ اور اس کے عوض وہ بہادر علی کو سال چھ مہینے میں ڈیڑھ لاکھ روپیہ ادا کر دیتا تھا۔ اس کی گرفتاری قطب دین اور گوگے کے لیے بھی مصیبت بن سکتی تھی۔ میں تو شاید بچ نکلتا

کیونکہ میرا کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا وہ میری نشاندہی نہیں کر سکتا تھا۔ میرا آخری ٹھکانہ ساقے گلپھڑیے کا مکان تھا مگر آبی کے پکڑے جانے کی صورت میں میں شاید اُدھر کا کبھی رُخ ہی نہ کرتا۔ میرا خیال ہے کہ ایسے ہی وہ اندیشے تھے جن سے لرز کر تاہیا پاگلوں کی طرح آبی کی طرف لپکا تھا۔ وہ اپنی کوشش میں بہت کامیاب رہے تھے۔ مگر وقت ان کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ جیپ کے اُلٹنے سے وہ تین سپاہی زخمی ہونے سے بچ گئے تھے۔ میں نے آہو کو بھی اس دھوئیں کے گرداب سے باہر نکلتے دیکھا تھا مگر وہ بہت پیچھے تھا۔ وہ بھی محفوظ ہی رہا تھا۔ اللہ نے اس کی رسّی بلاشبہ دراز کر رکھی تھی مگر اب جو چوٹ ہم سہہ چکے تھے وہ ہمیں نڈھال کر گئی تھی۔ ہم تینوں میں سے کوئی بھی اپنے حواسوں میں نہیں تھا اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آگے کیا ہوگا۔

"یار اگر وہ زندہ ہوئے تو کیا ہوگا؟"

تاہیے نے بہت بجھی ہوئی آواز میں پوچھا۔ اس کی آنکھیں اب خشک ہو گئی تھیں۔ اس وقت ہم محمود بُوٹی گاؤں کے قریب پہنچ چکے تھے۔ اور گاڑی میں نے سڑک سے اتار کر ایک کھیت کے ساتھ کھڑی کر دی تھی۔

"کیا مطلب ہے تیرا۔۔۔ اگر وہ بچ گئے تو اس سے اچھی بات اور کیا ہوگی؟"

"نہیں یار! وہ سب کچھ بک دیں گے وہ تو ایک جھٹکا بھی نہیں سہہ سکتے۔ وہ پولیس والے تو پتہ ہے مُنہ کے ساتھ گند کا ڈبّہ باندھ دیتے ہیں۔ آدمی کی کھال ادھیڑ دیتے ہیں۔" تاہیے نے اپنے پچھلے تجربے کو یاد کرتے ہوئے جھرجھری لی۔

"تو ٹھیک کہتا ہے یار، مگر اب کیا کرنا چاہیے؟" آبی نے فکرمند لہجے میں کہا۔

"وہ میرے گھر کا پتہ بھی بتا دیں گے اور تیری بی بی کا بھی۔ اس جیلانی کا تو خیر نہ کوئی گھر ہے نہ گھاٹ۔" تاہیے نے میری طرف بڑی سرد مہر نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

تب ہم تینوں کے دل میں ایک ہی آرزو ابھری کہ خدا کرے وہ مر گئے ہوں اور آبی نے تو کہہ ہی دیا۔ "یار یہ تو بہت ہی بُرا ہوا۔ خدا کرے وہ دونوں مر گئے ہوں۔"

"ہمیں صحیح بات معلوم ہونی چاہیے ورنہ تو ہم سب مارے جائیں گے۔ میری بی بی تو جیتے جی مر جائے گی۔" تاہیے نے بہت پریشان ہو کر کہا۔ اس کی وحشت دیدنی تھی۔ اس گھڑی وہ اپنی ساری پھبتی بھول گیا تھا۔ اس کی جلد بازی اُسے لے ڈوبی تھی۔ آبی گرفتار تو ہو گیا تھا۔ مگر یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اپنے بچاؤ کی کوئی تدبیر نہ کر سکتا۔ وہ سو طرح سے پولیس کو چکر دے سکتا تھا۔ مگر گوگا اور قطب دین تو کچھ بھی نہ کر سکتے تھے۔ ان کی ذرا سی غلطی ہماری زندگی میں ایسا نغارہ ڈال سکتی تھی جسے ہم کبھی رفو نہ کر سکتے تھے۔ طرح طرح کے خدشے ہمارے ذہنوں میں سر اٹھا رہے تھے۔ اور ہم تینوں سخت فکرمند تھے۔

"یار یہ بتا۔ وہ ٹیکسی کس کی تھی جسے تم نے جیپ سے ٹکرا کر تباہ کر دیا ہے۔"

"وہ ادھر قلعے کے سامنے کھڑی تھی، اس کا ڈرائیور سامنے کھڑا دہی بھلّے کھا رہا تھا۔ وہ ہم لے اڑے تھے۔ اپنی کار کی چابی مجھ سے اُدھر قلعے ہی میں گر گئی تھی۔"

"بڑی زیادتی کی ہے تم نے۔ اس غریب کی روزی پر لات مار دی ہے تم نے۔"

"کوئی تھوڑا سا نقصان تو نہیں ہوا ہے آبی۔ ہمارے دو جگری یاروں کا اس ٹیکسی سے کیا مقابلہ ہے۔ تو اُن کی بات سوچ۔" تاہیے نے کہا۔

"دیکھ اگر وہ مر گئے تو سمجھ اُن کا وقت پُورا ہو گیا تھا۔۔۔ مگر تجھے قطب دین کی بیوی کو روپیہ پہنچانا ہوگا اور گوگے کے اندھے والد کو بھی۔۔۔ ورنہ وہ تو تباہ ہو جائیں گے۔" آبی نے کہا۔

"اس کا بندوبست تو ہم نے کر رکھا ہے۔ چار لاکھ روپیہ ہم نے ایسے وقت کے لیے ادھر ایک جگہ دبا رکھا ہے۔ میں ایک ایک لاکھ انھیں دے آؤں گا۔"

"تو گویا میرا حصّہ بھی اس میں الگ کر رکھا ہے تم نے۔"

"وہ تو ہماری بیمہ پالیسی ہے یار۔ تجھے اِدھر کچھ ہو جاتا تو ہم تیری بی بی کو یُوں بے آسرا تو نہ ہونے دیتے۔"

"تیری مہربانی ہے تاہیے۔ تو نے اچھا انتظام کر رکھا ہے اب کیا کریں۔ یہاں کب تک کھڑے رہیں گے؟"

"میری مانو تو یہاں سے الگ الگ ہو جاؤ۔" آبی نے کہا۔

"ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔ تو بھی اپنے گھر جا، اور ابھی گھر والوں کو کہیں اِدھر اُدھر کر دے۔۔۔ ورنہ اُن لوگوں نے قطب دین اور گوگے سے معلوم کر لیا تو وہ ان کو باندھ کر لے جائیں گے۔" تاہیے نے کہا۔

"ہاں، اور تم بھی اپنی بی بی کو لے کر کسی اور جگہ چھوڑ آؤ۔"

"یہی بہتر ہے ورنہ تو ہم سب مارے جائیں گے۔ خدا کرے وہ دونوں مر ہی گئے ہوں۔" آبی نے بڑی آرزو بھری آواز میں کہا۔ اس کی طبیعت کا وہ تلوّن مجھے حیران کر گیا۔ مگر میرا خیال ہے کہ جس صورتِ حال سے ہم دوچار تھے، وہ ایسی ہی بے حسی کا تقاضا کرتی تھی اور یہ محض اتفاق تھا کہ کوئی گولی اُن تک نہیں پہنچی تھی اور اگر میں اُن کی طرف ٹیکسی نہ لے جاتا تو شاید وہ بھی وہیں ڈھیر

ہو گئے ہوتے۔ تابیے نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"دیکھ جیلانی! ہم اپنے گھر جا رہے ہیں۔ ایک آدھ دن میں ہم واپس آجائیں گے۔ کوئی پیغام ہو تو تم مہتاب کو دے سکتے ہو۔ اس کا فون نمبر تو تمھیں معلوم ہی ہے۔"

"ہاں وہ تو مجھے یاد ہو گیا ہے۔"

"بس ٹھیک ہے تم ابھی اس ساقے گلپھڑیے کے پاس جاؤ، اور اس گشتی کو وہاں سے نکال لو۔ ورنہ قطب دین یا گوگے سے پوچھ کر وہ آہو اس تک جا پہنچے گا۔" آبی نے تابیے کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"اب یہی کرتا ہوں آبی! مگر مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ لوگ اب تک اپنا ہاتھ نہ دکھا گئے ہوں۔"

"نہیں وہ دونوں شدید زخمی تھے۔ میں نے ان کی دل دوز چیخیں سنی ہیں۔ پکی رائفل کی انگلی انگلی برابر لمبی گولیاں لگی ہیں انہیں ابھی وہ نہ بھی مرے ہوں تو بھی کئی دن تک انہیں ہسپتال میں رہنا پڑیگا۔" آبی نے مجھے اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے یار! چلو میں تمھیں ادھر دارو غہ والا تک چھوڑ آتا ہوں۔"

"نہیں! اب تو ہمیں یہیں اتار دے اور دیکھ یہ جو تیرے پاس کچھ رقم ہے نا۔ اس میں سے کچھ روپے اس ڈرائیور تک پہنچا دے جس کی ٹیکسی تابیے نے تباہ کر دی ہے۔"

"اس پر تو مجھے بھی بہت ترس آتا ہے میں اسے ڈھونڈ لونگا"

"کیسے ڈھونڈے گا تو اسے؟"

"بس ڈھونڈ ہی لوں گا کسی ڈرائیور سے پوچھ لوں گا۔" میں نے آبی کو تسلی دی۔

"لے پھر اللہ بیلی! تجھ سے اب ہماری ملاقات دو دن بعد رات کو مہتاب کے ڈیرے پر ہو گی۔" یہ کہہ کر آبی تابیے کے ساتھ ٹیکسی سے نکلا اور آگے بڑھ گیا۔ مگر ابھی وہ چند ہی قدم چلے تھے کہ میں نے انھیں روک لیا۔ میری نظر سیٹ پر رکھی اس دور بین پر جا پڑی جو میں نے اسی دن خریدی تھی ——— مجھے قطب دین کی بات یاد آگئی۔ اس کے لہجے کی آزردگی مجھے تڑپا رہی تھی۔ اپنے بیٹے سلیم کے لیے کیسی محبت سے اس نے وہ دور بین مجھ سے مانگی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اتنی معمولی سی چیز خود بھی خرید کر اپنے بیٹے کو دے سکتا تھا مگر اسے تو شاید زندگی نے کبھی اتنی فرصت ہی نہیں دی تھی۔ کہ وہ کسی ایسی بات کے لیے وقت نکال سکتا۔

آبی پلٹ کر میرے پاس آیا تو بولا "کیوں خیر تو ہے؟"

"خیر ہی ہے یار ــ یہ ــ یہ دور بین لے جاؤ۔ قطب دین کے بیٹے سلیم کو دے دینا۔ اس نے مجھ سے مانگی تھی یہ رکھ لو۔" یہ کہہ کر میں نے دور بین آبی کے ہاتھ پر رکھ دی۔ وہ بڑی ہی یاس انگیز صورت بنا کر بولا۔

"خدا کرے وہ بچ گیا ہو۔ دو چار سال کی جیل ہی ہو سکی نا، اسے لیکن اگر وہ مر گیا تو ... تو پھر ..."

"میں پتہ کرتا ہوں اگر وہ زخمی ہے تو وہ اسے علاج کے پہلے تو ہسپتال بھیجیں گے۔ ہو سکا تو میں دونوں کو وہاں سے نکال لوں گا۔"

"نہیں یار، اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ خواہ مخواہ کسی اور مصیبت میں نہ پھنس جانا۔ وہ تو اُن کی لاشوں کا بھی بھروسا نہیں کریں گے اچھا خدا حافظ۔" یہ کہہ کر وہ مجھ سے ایک بار پھر مصافحہ کر کے آگے نکل گیا۔ وہ دونوں بہت ہی بوجھل قدموں سے چل رہے تھے۔ لگتا تھا دونوں کی کمریں ٹوٹ گئی ہیں۔ وہ گوگا اور قطب دین کو کھو کر آدھے رہ گئے تھے۔ اور اُن کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اپنے اس نقصان کی ذمے داری کس پر ڈالیں۔ کس سے اس کا خون بہا طلب کریں۔ مجھ پر اُن کی نظریں بار بار اٹھتی تھیں۔ وہ مجھے اپنی اس بدنصیبی کا ذمے دار سمجھتے تھے۔ مگر ... مگر انھیں کیا پتہ کہ میری وجہ سے اور کتنے گھر ویران ہو چکے ہیں۔ میں تو ایسی نحوست تھا کہ جس راہ سے میرا گزر ہوتا تھا وہ راہ اُجڑ جاتی تھی۔ میں اپنی بہن آسیہ کی رہائی کی للک میں خدا جانے کتنے کنوئیں جھانک چکا تھا۔ اور کتنوں کو برباد کر گیا تھا۔ یہ قطب دین اور گوگا بھی میری لگن کنڈلی کے سیاہ داغ تھے۔ انھیں میری تقدیر کے حلقے میں آتے ہی موت نے دلوچ لیا تھا۔ اور اب اس کے وہ جگری یار مجھ سے پوچھتے تھے۔ منہ سے تو کچھ نہیں کہتے تھے مگر اُن کی آنکھوں سے تو یہی سوال جھلکتا تھا کہ جیلانی یہ ... یہ جو ہمارے لانگ میں تیری وجہ سے آگ لگ گئی ہے یہ کس پانی سے بجھ سکے گی؟ دو آدمیوں کا لہو تو اسے ٹھنڈا نہیں کر سکا ہے۔

میں نے ٹیکسی کا رُخ موڑا تو مجھے احساس ہونے لگا کہ اگر میں اسی ٹیکسی میں دوبارہ شہر میں داخل ہوا تو پولیس میری بُو سونگھ کر میرے پیچھے لگ جائے گی۔ کیونکہ اس کے مالک کو تو میں نے اقبال پارک میں داخل ہونے سے پہلے ہی دھکا دے کر باہر نکال دیا تھا۔ وہ تو ہر جگہ شور مچاتا ہو گا۔ اس نے ٹیکسی کا نمبر ٹریفک پولیس کے ہر سپاہی کو حفظ کرا دیا ہو گا۔ وہ مجھے شہر میں دو قدم بھی چلنے دیں گے۔ سب طرف سے سیٹیاں بجاتے میرے اوپر آ چڑھیں گے۔ اس مصیبت سے بچنے کے لیے میں نے ٹیکسی بند روڈ سے اتار کر درختوں کے ایک جھنڈ میں کھڑی کی اور خود پیدل شہر کی طرف چل دیا۔ راستہ خاصا طویل تھا اور مجھے اس گھڑی ساقے گلپھڑیے کے گھر پہنچنا تھا کیونکہ میرے پاس ترپ کا ایک ہی پتہ تھا—

آہو کی جان سرداری کے وجود میں اٹکی ہوئی تھی۔ وہی میری نجات کا ذریعہ بن سکتی تھی۔

حالت یہ ہو گئی تھی کہ میرے اور آسیہ کے درمیان ایک بار پھر ایک زمانہ حائل ہو گیا تھا۔ اس کسوف نے جس کا تجربہ مجھے ہو رہا تھا میرے اور اس کے گرد اندھیرا پھیلا دیا تھا۔ اسے بھی کچھ سجھائی نہیں دیتا ہو گا۔ اور میری آنکھوں کا نور تو بہت عرصے پہلے دم توڑ چکا تھا۔ میری تقدیر کی کچہری بند ہو چکی تھی۔ اور وہ بیچاری کچہری چڑھ کر اُتر چکی تھی۔ نہ میرے ساتھ کسی نے انصاف کیا تھا نہ اسے کبھی نے پوچھا تھا کہ اس نے اتنی ساری اذیت کس جرم میں سہہ لی ہے۔ قانون اندھا تھا اور اس اندھے کی لاٹھی سے بچتا بچاتا میں آسیہ تک جا تو پہنچا تھا مگر پھر سب کچھ الٹ کر رہ گیا۔ ہر شے اوندھی ہو گئی میری کارسعی اکارت جا رہی تھی۔

بند روڈ پر ابھی میں آدھ فرلانگ ہی چلا تھا کہ مجھے ایک ٹیکسی مل گئی اور میں اس میں بیٹھ کر ساقے کے گھر جا پہنچا تھا۔ وہ اس وقت ایک بھینس کے نیچے بیٹھا اس کا دودھ دوہ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے پاس کھڑی ایک بوڑھی عورت کو بھینس کے پاس بٹھایا اور تہمد سے ہاتھ پونچھتا گوبر سے پاؤں بچاتا وہ دروازے تک آیا بولا۔

"پہلوان اُدھر سے اندر آجا۔ یہ راستہ تیرے لائق تو نہیں ہے۔ میں دروازہ کھولتا ہوں۔" یہ کہہ کر انہی قدموں واپس ہو گیا۔ میں چار دیواری کا چکر کاٹ کر اس کی بیٹھک کے سامنے پہنچا تو اس نے دروازہ کھول دیا۔ اور دبی زبان میں بولا۔

"یار، اس ماسی مصیبتے نے تو مجھے چکر میں ڈال دیا تھا۔ پہلے ہوش نہیں تھی۔ ہماری ساری باتیں اس نے سن لی تھیں۔" اس نے سامنے پلنگ پر پڑی سرداری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ساقے نے اسے پلنگ سے باندھ کر ایک پٹکے سے اس کا منہ بند کر کے اس کے اوپر لحاف ڈال رکھا تھا۔ میں نے لحاف اٹھا کر اس کا سر سے پیر تک جائزہ لیا۔ تو اس کی کھلی آنکھوں سے غصے کی شدت سے چنگاریاں پھوٹنے لگیں۔

"یہ ایک بہت بڑے خبیث کی بہت بڑی خبیث بیوی ہے سلقے۔ اس نے تمھیں بہت پریشان کیا ہو گا۔"

"کوئی ایسا ویسا! پہلوان اس نے تو ایسی لت جھڑکی کہ بس پوچھو مت۔ مگر اب کیا کرو گے اس کا؟"

"اسے میں اپنے نسخے میں استعمال کروں گا پہلوان ساری بات تو تمھیں معلوم ہو ہی چکی ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے یار مگر تو کسی چکر میں نہ پھنس جائے۔ وہ بڑا زور آور آدمی ہے وہ آہو۔ میں نے اس کے بڑے قصے سن رکھے ہیں۔"

"مر ہی جاؤں گا نا ساقے! اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے مگر یہ زیادتی میں کیسے برداشت کر لوں۔"

"میرا تو خیال ہے کہ وہ جو تابیا اور قطب دین ہے نا، وہ بھی اس آہو سے ملے ہوئے ہیں، ورنہ وہ دونوں لڑکیوں کو سیدھا اُدھر کیوں پہنچا دیتے۔"

"جس نے جو کچھ کیا ہے اس کی سزا تو ضرور پائے گا ساقے! وہ قطب دین اور گوگا پولیس کے ہاتھوں مارے جا چکے ہیں۔ ادھر اقبال پارک میں مقابلہ ہو گیا تھا اُن کا ابھی دو گھنٹے پہلے۔ گولیاں لگ گئی تھیں انھیں میرا خیال ہے وہ مر چکے ہیں۔"

"اچھا! نہیں یار! ایسے سوہنے جوان تھے وہ ایسی بات نہ کہہ یار۔"

"میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں پہلوان! وہ دونوں مر گئے ہیں۔" یہ کہہ کر میں نے اسے تمام واقعات سنائے تو وہ ہاتھ ملنے لگا۔ بولا۔

"یہ تو بہت ہی برا ہوا ہے جیلانی! ایسا نہ ہو تیرا کھرا ناپتے ہوئے وہ یہاں بھی آجائیں۔"

"مجھے بھی یہی دھڑکا لگا ہے۔ میں اسے ابھی یہاں سے لے جاتا ہوں مجھے ایک ٹیکسی لا دے، ہمارا یہاں ٹھہرنا مناسب نہ ہو گا۔"

"ہاں تو اسے کسی اور جگہ لے جا یار! دیکھ ناخواہ مخواہ میں اس چکر میں تل تلا گیا تو بہت برا ہو گا۔" ساقا پریشان ہو گیا گوگے اور قطب دین کی موت نے اسے دہلا کر رکھ دیا تھا۔ سرداری میری باتیں بڑی غور سے سن رہی تھی۔ نظریں اس کی میرے چہرے پر جمی تھیں جن سے صاف پتہ چلتا تھا کہ اسے بھی ان دونوں کی موت پر گہرا دکھ ہوا تھا۔

"ادھر آس پاس کوئی ہے تو نہیں، ان کمروں میں؟"

"نہیں وہ سب لوگ ادھر صحن میں بیٹھے ہیں۔" سلقے نے کہا۔ اس کی یہ بات سن کر میں نے سرداری کے منہ پر بندھا کپڑا کھول دیا۔

"دیکھیں، آپ نے اگر شور مچانے کی کوشش کی تو میرا یہ پستول بے آواز چلتا ہے۔ یہ آپ کے شوہر نے ہی مجھے دیا تھا۔ چوہدری ہادی علی کے لیے۔ بہتر ہو گا کہ آپ بالکل خاموش رہیں۔"

میری یہ بات سنتے ہی اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں، آنسو اس کے رخساروں پر بہہ نکلے۔ میں نے دوپٹے سے اس کے آنسو پونچھے تو اس کے ہونٹ لرزنے لگے۔

”مجھے اپنا دشمن نہ سمجھیں — میں آپ کو خود یہاں نہیں لایا ہوں، نہ میں اس بات کے حق میں تھا مگر اب میں کسی نتیجے پر پہنچے بغیر آپ کو واپس نہیں بھیج سکتا۔“

”آپ۔۔۔ آپ مجھے آہو کے پاس لے چلیں، میں وعدہ کرتی ہوں کہ میں اسے اس بات پر مجبور کر دوں گی کہ وہ آسیہ اور نفیسہ کو واپس کر دے۔“

”آپ کو پتہ ہو گا کہ وہ لڑکیاں اس نے کہاں رکھی ہیں؟“ میری یہ بات سنتے ہی اس نے نگاہیں دوسری طرف پھیر لیں۔ پہلی بار مجھے یہ احساس ہوا کہ وہ بہت کچھ جانتی ہے۔ اور اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ آہو نے آسیہ اور نفیسہ کو کہاں پہنچا دیا ہے۔

”مجھے بتائیں سردری میری بہن! میں عاجز آ چکا ہوں۔ بے بس ہو گیا ہوں۔ مجھ سے یہ سب کچھ برداشت نہیں ہوتا ہے۔ آپ یقین کریں کہ آپ کی الماری سے میں نے کوئی پائی پیسہ نہیں چرایا تھا۔ وہ کوئی اور ہی تھا مگر اس پر میرا کوئی اختیار نہیں ہے۔ اسے بس موقع مل گیا تھا۔“

”آہو یہی چاہتا ہے۔ اُدھر ایک ڈبے میں پلاسٹک کی پوٹلی رکھی تھی، اس میں ہیرے تھے اور کچھ بہت ہی مہنگے موتی تھے۔ وہ پوٹلی وہاں نہیں ہے اور اس کی قیمت بائیس تیئس لاکھ سے کم نہیں ہے آپ وہ پوٹلی اسے واپس دلا دیں۔“ اب کی بار سردری نے بڑے پُرعزم لہجے میں بات کی۔

”میں آپ سے قسم کھا کر کہتا ہوں سردری بہن، ان ہیروں کا مجھے قطعاً کوئی علم نہیں ہے ایک عورت ماجدہ وہاں آئی تھی میں اسے جانتا ہوں وہ میرے ہی پیچھے وہاں آئی تھی۔ اب وہ غائب ہو چکی ہے اگر یہ چیزیں وہاں سے نکلی ہیں تو اس کے پاس ہوں گی۔“ یہ کہہ کر میں نے سردری کی دونوں ٹانگوں کے جکڑ بند کھول دیے۔

”میرے ہاتھ بھی کھول دو۔ میں کوشش کروں گی یہ جھگڑا ختم ہو جائے۔ مگر آہو صاحب کے پاس وہ ہیرے کسی کی امانت تھے۔“

”کس کی امانت تھے وہ ہیرے؟“ میں نے اس کے ہاتھ بھی کھول دیے۔ اب وہ بستر سے اتر کر اپنے ہاتھ پاؤں سیدھے کر رہی تھی بولی۔

”دراصل ایک پولیس افسر وہ ہیرے بڑے صاحب کی بیگم کو پیش کرنا چاہتا تھا مگر وہ خود اس کے پاس نہیں جا سکتا تھا — اسی لیے اس نے آہو سے کہا تھا کہ وہ ہیرے خود اس کے نام پر بیگم کو دے دے۔“

”ہوں! تو یہ قصہ ہے۔ بہرحال سردری بہن یقین کرو۔ میں اس سلسلے میں بالکل بے گناہ ہوں میری مدد کریں۔ آسیہ مجھے ل[illegible] دیں میں اس شہر ہی سے نہیں، اس مُلک سے بھی نکل جاؤں گا۔ کسی معاملے میں میں آہو صاحب کے بارے میں کوئی بات نہیں کروں گا جو ہو چکا ہے میں اسے بالکل بھول جاؤں گا۔“

”مگر اس ماجدہ کا پتہ تو آپ کو بتانا ہو گا جیلانی صاحب۔“

”وہ اسی شہر میں ہے یا کہیں اور چلی گئی۔ اس کی مجھے کوئی خبر نہیں ہے۔ بہرحال اگر آسیہ مجھے مل جائے تو پھر میں اطمینان سے تلاش کر سکتا ہوں۔ آپ کو پتہ ہے کہ میں اسے بڑی مشکلوں سے جیل سے نکال کر لایا تھا۔“

”ٹھیک ہے آپ گاڑی منگوائیں، میں آسیہ تک آپ کو پہنچا دیتی ہوں مگر آپ کو ایک وعدہ کرنا ہو گا۔ اور وہ یہ ہے کہ آپ نے بلادر میں جو کچھ کیا ہے اس کا آپ کسی سے ذکر نہیں کریں گے اور مسند آراء کے پیچھے کبھی نہیں جائیں گے۔“

”اگر اسے آپ کوئی تکلیف نہ پہنچانے کا وعدہ کریں تو میں اس کا تعاقب چھوڑ دوں گا۔ میں اس قابل کہاں ہوں کہ مسند آراء جیسی لڑکی کے بارے میں سوچ سکوں۔ میں تو اس کے پاؤں کی دھول بھی نہیں ہوں۔“ میں نے نہایت گلوگیر آواز میں کہا۔ بہت دن ہو گئے تھے، اس نے میرے خوابوں میں بھی آنا چھوڑ دیا تھا۔ یا میرے دل کا آئینہ اتنا میلا ہو گیا تھا کہ اس میں اب کوئی صاف ستھری خوبصورت بات ابھرتی ہی نہیں تھی یا مسند آراء کو میرے تمام سیاہ اعمال کا علم ہو چکا تھا میرے اور اس کے درمیان جو غیر مرئی تعلق تھا بہت ہی دُھندلا پڑ چکا تھا میری ذہنی کیفیت کو بھانپ کر سردری بولی۔

”ایک ٹیکسی منگوائیں، میں خود آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔ دونوں لڑکیاں اس وقت اُدھر پتوکی کے قریب ایک گاؤں میں ہوں گی۔“

”جا ساقے یار! ایک ٹیکسی اِدھر لے آ۔“ سردری کی یہ بات سن کر میں خوش ہو گیا۔ وہ میری مدد پر آمادہ ہو چکی تھی۔ ساقے باہر نکلا تو سردری نے اپنے بکھرے ہوئے بال گوندھے اور دیوار میں لگے ایک چھوٹے سے آئینے میں اپنی صورت دیکھ کر بولی۔

”میرے لیے پانی منگوائیں، میں منہ تو دھو لوں آپ نے میرا حلیہ ہی بگاڑ دیا ہے۔“

وہ مجھ سے ناراض معلوم نہیں ہوتی تھی لیکن میں اسے چھوڑ کر مکان کے اندر نہیں جا سکتا تھا۔ پستول ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا۔

”مجھے افسوس ہے سردری بہن کہ میں نے آپ کو اس قدر پریشان کیا مگر میں۔۔۔ میں پاگل ہو چکا تھا۔ میری ساری [illegible] ضائع ہو رہی تھی۔“

”وہ تاہیا اور قطب دین کل شام ہمارے گھر پہنچے تھے — لڑکیاں اُن کے ساتھ تھیں۔ انھیں وہ آہو کے حوالے کر کے واپس چلے گئے تھے۔“

”میری بدنصیبی میرے ساتھ ساتھ چلتی ہے سردری بہن!“

”یہ کیا آپ بہن بہن کی رٹ لگاتے ہوتے ہیں۔ آپ کو اعتماد نہیں ہے اپنے اُوپر۔“ اس نے ایک دم مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا، اور تنک کر کرسی پر جا بیٹھی۔ یوں جیسے وہ اپنے کسی چاہنے والے سے رُوٹھ گئی ہو۔ اس کے اس رویے نے مجھے حیران کر دیا۔ ایک بار پہلے بھی مجھے اس کے گھر کے اندر اس کی آنکھوں میں سے کسی ایسے ہی موہوم سے بے نام سے جذبے کی جھلک نظر آئی تھی مگر میں اُسے اپنا وہم سمجھ رہا تھا۔ مگر اب جس لہجے میں اس نے مجھ سے یہ بات کہی تھی تو میں سمجھا آسمان کی گردش تھم گئی ہے۔ بلاشبہ وہ بے حد حسین عورت تھی۔ میری اور اس کی عمر میں کوئی خاص فرق نہیں تھا مگر جس تشنگی نے اس کی صاف شفاف آنکھوں میں ابھر کر مجھے حیران کیا تھا وہ ایسی نہ تھی کہ کوئی بھی دانا بینا مرد اسے نظر انداز کر سکتا۔

”مجھے افسوس ہے سردری خانم! مگر۔۔۔ مگر مجھے تو یہی اچھا لگتا ہے۔ دیکھیں نا! آپ میرے دشمن کی بیوی تو ضرور ہیں مگر آپ کا تو اپنا ایک مقام ہے۔ آپ کا احترام تو مجھ پر ہر حال میں لازم ہے۔“

”اسی لیے آپ نے اُدھر مجھ پر ہاتھ اٹھایا تھا؟“

”اس کا مجھے بے حد افسوس ہے خانم! مگر میری ذہنی حالت بھی تو دیکھیں۔ میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو یہی کرتا۔“

”میں نے یہاں آپ کی باتیں سن لی تھیں۔ میں بے ہوش نہیں تھی۔ آپ کو میری عزت کا اتنا خیال کیوں تھا، آپ نے ساقے کو خاص طور پر بڑے دبنگ طریقے سے خبردار کیا تھا کہ۔۔۔“

”ہاں وہ میرا فرض تھا خانم! وہ میری مرضی سے آپ کو اِدھر نہیں لائے تھے۔ مگر میں آپ کے ساتھ کوئی زیادتی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ آپ کی حفاظت میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔“

اس نے اپنی وہ بڑی بڑی دنبالہ دار آنکھیں پوری طرح کھول کر مجھے یوں دیکھا جیسے وہ میری تصویر کھینچ رہی ہو — پلکیں اس کی کلک کلک بجتی سنائی دیتی تھیں مجھے کچھ ایسا ہی احساس ہو رہا تھا، بولی۔

”آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی ہیں۔ لوگ تو دشمن کی ہر شے پامال کر دیتے ہیں۔ بہرحال میری حالت ایسی ہے کہ میں سفر نہیں کر سکتی۔ میرا جوڑ جوڑ دُکھ رہا ہے۔ میں دن میں دو بار نہانے کی عادی ہوں، مجھے کپڑوں کی بھی ضرورت ہے۔“

”آپ بس منہ ہاتھ دھو لیں۔ اس وقت نہانے اور کپڑے بدلنے کا خیال چھوڑ دیں۔ جیسے بھی ممکن ہو مجھے آج ہی آسیہ کے پاس پہنچا دیں۔“

”یہ بات میں نے اپنے ذمے لے لی ہے جیلانی صاحب! بہن کے لیے آپ کی یہ محبت دیکھ کر میں حیران رہ جاتی ہوں۔ آپ بہت بڑے آدمی ہیں جیلانی صاحب! ایسا آدمی میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا۔“

میرا مذاق نہ اڑائیں سردری بہن! میں تو۔۔۔ میری کمینگی کی تو مثال دی جا سکتی ہے۔“ ایک بار پھر بہن کا لفظ میرے منہ سے سُن کر وہ تلملائی مگر اپنا ردِعمل ظاہر نہیں کیا، بولی۔

”کیا آپ قسم کھا سکتے ہیں کہ ہماری الماری میں سے آپ نے کوئی چیز ازخود نہیں اٹھائی تھی؟“

میں نے سامنے دیوار میں بنی الماری کے اوپر کے خانے میں رکھے کلام مجید کو اٹھا کر سر پر رکھ لیا۔ ”میں اس کی قسم کھا کر کہتا ہوں خانم کہ میں نے وہاں سے آپ کے دیے ہوئے ان روپوں کے سوا اور کوئی چیز یار قسم نہیں اٹھائی تھی۔“

وہ بھاگ کر میرے پاس پہنچی اور کلام مجید میرے ہاتھ سے لے کر اسے چومتی ہوئی الماری میں واپس رکھ آئی اور پھر بڑے ہی آزردہ لہجے میں بولی۔

”میرا یہ مطلب نہیں تھا جیلانی صاحب! کہ آپ اتنی بڑی قسم کھالیں۔ مجھے پہلے ہی یقین ہو گیا تھا کہ یہ کام آپ نے نہیں کیا۔ میں بس ایسے ہی پوچھ بیٹھی تھی۔“ وہ خجل ہو رہی تھی۔ میرا اتنی بڑی قسم کے بوجھ تلے آ جانا اسے پسند نہیں آیا تھا۔

”میری طرف سے آپ بالکل تسلی رکھیں خانم میں جھوٹ سے نفرت کرتا ہوں۔“

”مجھے معلوم ہے۔ مجھے یقین ہے آپ کو پتہ ہے کہ ہادی علی میرے والد نہیں تھے۔“

”کیا! کیا کہہ رہی ہیں آپ؟“

”میں سچ کہہ رہی ہوں جیلانی صاحب! میں اُن کی بیٹی نہیں ہوں میرے والد مرزا عبدالمعبود مال افسر تھے۔ اُن کے تمام عزیز و اقارب اُدھر روہیل کھنڈ میں رہتے ہیں۔ اب بھی وہاں موجود ہیں۔ وہ مغل تھے۔ اور میں مغل زادی ہوں۔ پاکستان بننے کے بعد وہ ہندوستان سے اِدھر چلے آتے تھے۔ انھوں نے یہاں آ کر اپنا نیا عہدہ سنبھال لیا۔ میری عمر اس وقت ایک سال کی تھی۔ جب ان کا تبادلہ اِدھر گجرات شہر میں ہو گیا۔ یہیں ہادی علی کی میری والدہ سے ملاقات ہوئی اور یہ ملاقات ایسی عجیب و غریب ثابت ہوئی کہ میری والدہ کو

ہادی علی نے اپنے شیشے میں اُتار لیا۔ میرے والد عبدالمعبود کو ہادی علی نے میری ماں کے دل سے یوں نکال دیا کہ اُن کے درمیان طلاق تک نوبت جا پہنچی۔ مگر میرے والد طلاق دینے پر رضامند نہیں تھے۔ پھر یوں ہوا کہ میرے والد اچانک فوت ہو گئے۔ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر اُدھر بھمبر کی طرف جا رہے تھے کہ ایک اونچائی پر سے ان کے گھوڑے کا پاؤں رپٹا اور وہ سوار سمیت نیچے سیکڑوں فٹ۔۔۔ گہرے کھڈ میں جا گرے۔ مجھے اب تک یقین ہے کہ میرے والد کی موت میں بھی ہادی علی کا ہاتھ تھا۔ مگر مجھے اس کا ثبوت نہیں مل سکا۔ اسی لیے میں نے یہ بات کسی سے نہیں کہی۔ ہاں آہو صاحب کو میں نے اپنے خدشوں سے آگاہ کر دیا تھا۔ ابھی میرے والد کا کفن بھی میلا نہیں ہوا تھا کہ میری والدہ یاسمین نے ہادی علی سے شادی کر لی۔ مگر وہ اکبر کوٹ میں جا کر بس تین سال تک زندہ رہ سکیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ اُن کی موت کے چھ ہی مہینے بعد ہادی علی نے مسند آراء کی ماں سے شادی کر لی۔ اور یوں میں اور مسند آراء نے سگی بہنوں کی طرح ہادی علی کی چھت کے نیچے پرورش پائی ہے۔"

"ہوں! تو جب ہی آپ نے ہادی علی کے قتل کے سلسلے میں آہو کے منصوبے کی مخالفت نہیں کی تھی۔"

"آپ جو جی میں آئے سمجھیں مگر یہ حقیقت ہے کہ مجھے ہادی علی کی جاگیر پر مسند آراء کے وسیلے سے کسی غیر کا قبضہ پسند نہیں ہے۔"

"ظاہر ہے بالکل فطری بات ہے مسند آراء اور آپ کے درمیان خون ہی کا فرق نہیں، سوچ اور مفاد کا بھی فرق ہے۔" میں نے معاملے کی سنگینی کا اندازہ کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کو میں ساری باتیں اس لیے بتا رہی ہوں تاکہ آپ کو اصل معاملات کا علم ہو جائے۔ سرکاری کاغذات میں میرا نام ہادی علی کے وارثوں میں سرِفہرست ہے، دوسرا نام مسند آراء کا ہے۔ اگر مسند آراء کی ماں زندہ ہوتی تو صورت حال مختلف ہوتی۔"

"کیا یہ صحیح ہے کہ مسند آراء کی ماں کو بھی آہو صاحب نے ہی مارا ہے؟"

"اس کا مجھے علم نہیں ہے مگر یہ بات آہو کے منصوبے میں شامل تھی۔" سروری نے نہایت بےباک لہجے میں کہا۔ "مجھے آپ سے ہمدردی ہے جیلانی صاحب! خدا کرے آپ کی یہ مشکلات ختم ہو جائیں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھی اور بولی۔

"مجھے لگتا ہے آپ نے بھی صبح سے منہ ہاتھ نہیں دھویا۔ کپڑے بھی آپ کے میلے ہو رہے ہیں۔ کیسی کٹھن زندگی گزار رہے ہیں آپ؟"

ہاں سروری بہن! آسیہ مل جائے تو میری زندگی اعتدال پر آ جائے گی۔"

"پلیز جیلانی صاحب! مجھے سروری بہن نہ کہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے آپ مجھے بڑی بی کہہ رہے ہوں۔" وہ سٹپٹا سی گئی۔ اس کے ہونٹوں کے زاویے اس کی لگاوٹ کا پتہ دیتے تھے اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے بارے میں اس نے اپنے دل میں کیا کچھ ٹھان لیا ہے۔

اسی لمحے دروازہ کھلا اور ساقا تیزی سے اندر داخل ہو گیا۔ چھوٹتے ہی بولا۔

"جیلے پہلوان! اُدھر تو بڑا دھما کا ہو رہا ہے۔ راوی روڈ، بند روڈ اور ادھر بھاٹی دروازے تک پولیس ہر گاڑی، ہر موٹر کا معائنہ کر رہی ہے۔ سارے شہر کی پولیس حرکت میں آئی ہوئی ہے۔ ایک سپاہی میرا واقف ہے وہ بولا کہ پولیس ان مجرموں کو ڈھونڈ رہی ہے جو آج اقبال پارک سے بھاگ نکلے تھے۔ پتہ ہے کیا ہوا۔ اُدھر ایک ڈی ایس پی بھی مارا گیا تھا جیپ کے نیچے آ گیا۔ ارے ای تو بھاری ہوتی ہے وہ جیپ۔ ایک چھوٹے تھانیدار کی ٹانگ بھی ٹوٹ گئی تھی۔ بڑے غصے میں ہیں یار وہ لوگ۔ لگتا ہے سارے شہر کی ناکہ بندی کر رکھی ہے ان لوگوں نے۔" ساقا بہت جوش میں تھا۔

"ان دونوں کا کیا بنا۔ اس قطب دین اور گوگے کا جو زخمی ہوئے تھے کہ۔۔۔۔"

"وہ تو واقعی مر گئے یار۔ سادھر ہی ختم ہو گئے دھن دھنا کر میں۔ وہیں تھاؤں۔۔۔ پر دم دے دیا ان لوگوں نے، اور اس کا انھیں بہت افسوس ہے۔ بڑا غصہ چڑھا ہوا ہے انہیں۔ وہ تینوں سپاہی انھوں نے معطل کر دیے۔ کہتے ہیں وہ ان ڈاکوؤں سے ملے ہوئے تھے جبھی۔۔۔ انھوں نے انھیں مار دیا۔ ورنہ وہ سپاہی کہہ رہا تھا کہ سالو مارنا ہی تھا تو ان کی ٹانگوں پر گولی ماری ہوتی یہ کیا کہ گولی سیدھی دل جگر میں سے گزار دی۔ سب کا بیڑا ہو رہا ہے ادھر۔ اللہ معافی دے یار۔ میں تو ڈرتا ہوں وہ کہیں اُدھر رکھی بھنگیوں کی توپ ہی نہ چلا دیں۔ اس کا تو ایک ہی گولا کافی ہے سارے شہر کے لیے۔" ساقا بہت زیادہ پریشان تھا۔

"ٹیکسی نہیں لائے ہو کوئی؟" سروری نے پوچھا

"کیسی ٹیکسی رکشا بی بی! ادھر تو کھوتا بھی آج کرائے پر نہیں ملتا ہے۔" ساقے نے کانوں پہ ہاتھ رکھ دیے۔

"یہ تو بہت بُرا ہوا یار! اب کیا کریں گے ہم؟"

"تم ادھر بیٹھ کر اپنے اوپر سورۂ یٰسین پڑھوا لو۔ کوئی بھروسہ نہیں ہے تمھاری زندگیوں کا۔ میرا تو اپنا بیڑا ہو گیا ہے مجھے کسی نے پوچھا تو کیا جواب دوں گا انہیں؟ پر تم فکر نہ کرو جب

میری لاش پر سے گزر کر ہی کوئی تم تک پہنچے گا۔ میں نے آپی سے قول ہار رکھا ہے۔ میں سنبھال لوں گا اُن سب کو۔" ساقے نے اپنی چوڑی چکلی چھاتی پر اپنا وہ گرز ایسا ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"اس کا مطلب ہوا کہ یہ رات ہمیں یہیں گزارنی ہوگی۔"

"کیا ہرج ہے؟ ماں کا پیٹ سمجھو اس کمرے کو۔ یہ ساقے کا گھر ہے پیارے کسی تنبولی کی کوٹھری نہیں ہے یہ۔"

"ٹھیک ہے پیارے! تو یوں کر کہ پہلے ان کے لیے پانی گرم کروا دے، یہ منہ ہاتھ دھوئیں گی شاید نہا بھی لیں۔ بڑے امیر گھر کی خاتون ہیں یہ۔ ذرا سا مَیل برداشت نہیں کر سکتی ہیں۔ اس کے بعد تم بازار سے ان کے لیے دو جوڑے کپڑے اور کچھ دوسری چیزیں لے آؤ، فہرست میں بنا دیتا ہوں۔"

"اچھا یار! ہم تو ویسے ہی گوبر زادے ہیں۔ ہمیں تو مہینہ مہینہ پانی نہ ملے تو گزر ہو جاتی ہے۔ میں پانی گرم رکھواتا ہوں تم ایک لسٹ بنا دو، میں اس منتو کی بیوی کو ساتھ لے جاتا ہوں۔ وہ خرید دے گی ساری چیزیں۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آئے گا۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔ سروری خانم اس کی باتوں پر کھل کر مسکرا رہی تھی، بولی۔

"بہت ہی سادہ دل آدمی ہے یہ ساقا! میں تو ڈرتی تھی کہ کہیں یہ۔۔۔ ادھر میرے ساتھ کوئی غلط حرکت ہی نہ کر بیٹھے میں ادھر بندھی پڑی تھی۔ یہ اُدھر بیٹھا تو رہا لیکن دوسری طرف منہ کر کے اس نے مجھے باندھا بھی مگر بڑی احتیاط سے۔ اچھا آدمی ہے یہ۔ اس نے مجھے کھانا بھی کھلایا۔ بڑا خیال رکھا ہے اس نے میرا۔"

"مجھے یہی اطمینان تھا کہ آپ محفوظ جگہ پر ہیں۔ آپی کو اس پر بڑا بھروسہ ہے۔ اسی لیے وہ آپ کو یہاں چھوڑ گیا تھا۔"

یہ کہہ کر میں نے سروری خانم سے پوچھ کر اس کی ضرورت کی چیزوں کی ایک فہرست تیار کر دی۔ کاغذ قلم مجھے سامنے کی الماری میں رکھے کسی بچے کے بستے سے مل گئے تھے۔

کچھ ہی دیر بعد ساقا ہمارے لیے گرم گرم دودھ وہاں رکھ گیا۔ وہ ہم پی چکے تو وہ فہرست لے کر بازار چلا گیا۔ اپنے ساتھ وہ اپنے چھوٹے بھائی منتو کی بیوی چندا کو ساتھ لے گیا تھا۔ اسے میں نے دو ہزار روپے دے دیے تھے۔ جب وہ باہر نکل گیا تو سروری خانم لحاف لے کر پلنگ پر بیٹھ گئی۔ وہ مجھے بڑے غور سے دیکھ رہی تھی، بولی۔

"آپ اتنے سارے نوٹ جیب میں لیے پھرتے ہیں۔"

"کیا کروں؟ میرا کوئی ٹھکانا تو ہے نہیں، جہاں رات پڑتی ہے وہاں روپے کی ضرورت محسوس ہونے لگتی ہے۔"

"جہاں رات پڑتی ہے! کیا مطلب؟ کوئی مجرا دیکھنے چلے جاتے ہیں آپ؟"

"نہیں تو! یہ کس نے کہہ دیا آپ سے؟ میرے نصیب میں ایسا عیش نہیں ہے خانم!"

"جب اتنی رقم پاس ہو اور وہ بھی مالِ حرام بود، تو پھر جائے حرام رفت بھی تو مل ہی جاتی ہے۔"

"جی نہیں! میں نے کہا نا میرے ایسے نصیب نہیں ہیں اور یہ روپیہ تو وہی ہے جو مجھے آپ نے دیا تھا سینت سینت کر استعمال کر رہا ہوں۔"

"اچھا! تو یہ وہی روپیہ ہے۔ اور بھی اِدھر اُدھر سے بہت کچھ لوٹا ہوگا آپ نے۔"

"آپ مجھے بھی ڈاکو ہی سمجھتی ہیں؟ نہیں خانم، یہ میرا دھندا نہیں ہے۔ بس ایک غلطی کر بیٹھا تھا میں، اسی کی سزا ختم نہیں ہوتی ہے۔" یہ کہہ کر میں نے اسے ڈاکٹر دھمن کی کوٹھی میں اترنے کا واقعہ سنایا تو وہ حیرت زدہ سی ہو کر بولی۔

"اس کا مطلب ہے کہ آہو صاحب نے آپ کے بارے میں صحیح نظریہ قائم نہیں کیا تھا۔ اُن کا تو یہ خیال ہے کہ آپ بہت نامی گرامی ڈاکو ہیں۔ اور کئی آدمیوں کو قتل کر چکے ہیں۔"

"اُن کا خیال صحیح نہیں ہے خانم! میں ایسا ہوتا تو دکھ کس بات کا تھا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ آپ کے پاس اس روپے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ سچ کہہ رہے ہیں آپ؟"

"یقین کریں میرے پاس اس روپے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کچھ روپیہ میں نے ایک جگہ محفوظ ڈال رکھا ہے مگر وہ کسی ناجائز طریقے سے نہیں آیا تھا۔"

"پھر تو اسے آپ جس طرح چاہیں استعمال کر سکتے ہیں۔"

"ابھی تو اس بارے میں میں نے کچھ نہیں سوچا، خدا میری مشکلات آسان کر دے تو میں اس کے بارے میں سوچوں گا۔"

"اچھا! تو یہ ارادے ہیں آپ کے۔" میری بات سن کر وہ بولی۔ اچانک اندرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے اٹھ کر دیکھا تو وہاں ساقے کی والدہ کھڑی تھی۔ سیدھے سادے گوجروں کی سیدھی سادی بیٹی۔ مگر اتنی عمر ہو جانے کے باوجود اس کا قد کاٹھ جوانوں سے بہتر تھا بولی۔ "پُتر! ادھر غسلخانے میں پانی رکھ دیا ہے میں نے۔ بی بی سے کہو نہا لے۔"

"غسل خانہ کدھر ہے اماں جی!"

"وہ دوسرا دروازہ کھولو گے تو سامنے نظر آ جائے گا۔" یہ کہہ کر وہ پیچھے ہٹ گئی، اسے اپنے بیٹوں کی خاطر داری میں بہت لطف آتا تھا اور وہ اُن کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی تھی اور ہمیں بھی وہ ایسا ہی سمجھ رہی تھی۔ سروری کے پاس وہ ابھی تک نہیں آئی تھی۔ ساقے نے

اُدھر آنے سے شاید سلک نے گھر والوں کو منع کر رکھا تھا۔ میں نے پیچھے مڑ کر کمرے کی جنوبی دیوار کا دروازہ کھولا تو سامنے غسل خانہ تھا جس کو اُس کمرے سے بھی اندر آکر استعمال کیا جا سکتا تھا۔ وہ خاصا صاف ستھرا غسل خانہ تھا جس میں صاف ستھرا تولیہ، صابن دو بالٹیاں گرم پانی اور ضرورت کی دوسری چیزیں بلس اُن لوگوں رکھوا دی تھیں۔

"چلیں خانم آپ غسل فرمائیں ساری چیزیں اُدھر موجود ہیں۔" میں نے سروری کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا میرے ایک تھپڑ کا نشان ابھی تک اُس کے بائیں رخسار پر موجود تھا۔

"مہربانی ہے آپ کی جیلانی صاحب! ورنہ میں تو آپ کی مغویہ ہوں۔ ہاتھ بندھی کنیز۔"

"مجھے شرمندہ نہ کریں۔ یہ سارا سلسلہ ہی مجھے بہت تکلیف دہ نظر آتا ہے۔" یہ کہہ کر میں کرسی پر جا بیٹھا۔

جب وہ آدھ گھنٹے بعد غسل خانے سے نکلی تو اس کی طبیعت پہلے سے کہیں زیادہ ہشاش بشاش تھی۔ لگتا تھا وہ میری ساری غلطیاں اور زیادتیاں معاف کر چکی ہے۔ اپنے وہ ٹوکرا بھر بال اس نے تولیے میں باندھ رکھے تھے، اسی حالت میں لحاف میں جا بیٹھی۔ اس کے بعد میں بھی غسل خانے میں جا گھسا۔ مجھے کسی تتے پانی کی ضرورت نہیں تھی۔ جب میں نہا کر باہر نکلا تو وہ بے خیالی میں بولی۔

"آہو صاحب کا پتہ نہیں کیا حال ہوگا میرے بغیر تو وہ گھر میں پاگل ہو جاتے ہیں۔"

"ہاں ایسی بیوی جو مرد کے قول و فعل سے اتنی ہم آہنگ ہو، آدمی کے لیے نعمت ہوتی ہے۔"

"کیا مطلب ہے آپ کا جیلانی صاحب! اتنی بھی ہم آہنگی نہ سمجھیں بس اس منصوبے میں میں اُن کی ہاں میں ہاں ملاتی رہی ہوں تو اسکی وجہ یہ تھی کہ میں بھی ہادی علی سے نفرت کرتی تھی کیونکہ اس نے میرے والد کی زندگی تباہ کر دی تھی۔ یہی نہیں مجھے یقین ہے کہ اس نے میری ماں کو بھی خود ہی موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ ورنہ وہ اس کے مرنے کے دن تو نہیں تھے۔ اور پھر معاملہ اتنی بڑی جاگیر کا تھا۔ وہ مجھے کیوں نہ ملے، دوسرے کیوں اس کے مالک بن جائیں۔"

"آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ آپ سے کسی اختلاف کی تو میرے پاس کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔"

"آپ انصاف کی نظر سے دیکھیں تو آپ مجھ سے اتفاق کرینگے۔"

"وہ تو میں کر ہی رہا ہوں خانم! مگر آہو صاحب کے فائدے کا علم نہیں ہو سکا۔"

"کیوں نہیں۔ انھیں امپورٹ کا لائسنس مل رہا ہے۔ ایک ہی سودے میں وہ پچاس لاکھ روپیہ کما لیں گے۔"

"کیا چیز درآمد کریں گے وہ؟"

"اس کا تو مجھے علم نہیں ہے مگر سنا ہے کہ ایک کروڑ روپے کا لائسنس مل جائے گا انہیں۔ بڑے صاحب بہت خوش ہیں ان سے۔"

"ہوں۔ آدمی کی حرص بڑھ جائے تو اس کا نہ کوئی علاج ہی رہتا ہے نہ کوئی حد باقی رہ جاتی ہے۔ حالانکہ وہ اب تک بے اولاد ہیں۔"

میری یہ بات سنتے ہی سروری خانم تڑپ اُٹھی۔ اسکی آنکھیں ایک دم بھیگنے لگیں، بڑے آزردہ لہجے میں بولی۔

"یہی تو دُکھ ہے جیلانی صاحب! اور میں ڈرتی ہوں کہ آہو کوئی غلط قدم نہ اُٹھا لے۔ اسی لیے میں نے جاگیر کے لیے دوڑ دھوپ بھی کی ہے۔ اس کی اصل مالک میں ہی ہوں گی۔ سرکاری کاغذات میں نام میرا ہی لکھا جائے گا۔"

"اور پھر وہ آپ کو کسی دن چپ چاپ قبر میں اُتار دے گا تاکہ قصہ ہی ختم ہو جائے۔"

"ایسا نہ کہیں جیلانی صاحب! خدا کے لیے مجھے اس معاملے کا یہ رُخ نہ دکھائیں۔" پھر قدرے جوش سے بولی۔ "آہو ایسا نہیں کر سکتا۔ میں، میں عبدالمعبود کی سادہ لوح بیوی ایسی نہیں ہوں۔ لقمہ چکھانے کے بعد چکھتی ہوں۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو اور آپ محفوظ رہیں مگر جس دریا میں یہ تیر رہی ہیں وہاں ذرا سی غفلت چھوٹی مچھلی کی موت کا سبب بن جاتی ہے۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں مگر کیا پتہ کون کس کی موت کا سبب بنے گا۔" اس نے بڑے معنی خیز انداز سے کہا اور بالوں سے منہ ڈھانپ کر سر پر تولیہ پھیرنے لگی۔

"مجھے بتائیں خانم کہ اِدھر پتوکی میں کس کے ہاں آسیہ کو پہنچایا ہے آہو نے؟"

"وہاں ایک گاؤں ہے چوگوٹھ۔ آسیہ اس گاؤں کے مالک مختار ڈھلوں کی حویلی میں ہوگی۔ آہو مجھ سے یہی کہہ رہا تھا۔"

"وہ لوگ آپ کو جانتے ہیں؟"

"ہاں۔ مختار ڈھلوں کی بیوی ڈیرہ غازی خان کے سردار ہی کی بیٹی ہے، وہ بھی مجھے جانتی ہے۔ آہو کے ساتھ ہم کئی بار وہاں گئے ہیں۔ سردیوں میں اُدھر مرغابی کا شکار بہت ہوتا ہے۔"

"ہوں! میرا خیال ہے کہ ہم آج رات وہاں جا پہنچتے ہیں۔"

"نہیں رات کا سفر اچھا نہیں رہے گا۔ بس صبح سویرے اُٹھ کر اُدھر چل دیں۔ بہتر یہ ہوگا کہ میں آہو کو بھی ساتھ لے چلوں۔"

"اس بات کی اجازت میں آپ کو نہیں دے سکتا۔ مجھے اس پر اعتماد نہیں رہا ہے۔ اگر میرا اس کا اب کی بار آمنا سامنا ہو گیا تو نتیجہ اچھا نہیں ہوگا۔"

"کیا کریں گے آپ؟"

"پتہ نہیں میں کیا کروں۔ وہ آپ کا شوہر ہے مگر میرے لیے اب وہ ناقابلِ برداشت ہو چکا ہے۔"

"مار دیں گے اسے؟"

"میں۔۔ میں۔ میرے لیے بڑے مواقع تھے اسے مارنے کے، پر میں طرح دے گیا۔ مگر اب میں شاید نہ رُک سکوں۔"

"اس فساد کو مِٹانے کیلیے ہی میں آپ کے ساتھ جاؤں گی ورنہ میں ایسا کبھی نہ کرتی۔ آسیہ کو میں آپ سے ملا دوں گی، مگر ماجدہ سے ہماری رسم اور ہیرے آپ کو لے کر دینے ہوں گے۔"

"میں نے اس کی تلاش کا جو وعدہ کیا ہے میں اس پر قائم ہوں خانم!"

"بس ٹھیک ہے باہر جیسے ہی مطلع صاف ہونے کی خبر ملے یہاں سے نکل چلیں۔ یہ کوئی رہنے کی جگہ نہیں ہے ہر طرف گوبر کی بدبو پھیلی ہوئی ہے۔"

ساقا جب بازار سے واپس آیا تو اس وقت شام ہو چکی تھی۔ وہ ساری چیزیں ہمارے حسبِ منشا خرید لایا تھا۔ سروری خانم کے لیے دو ساڑھیاں اور ان کے متعلقات، کنگھی شیشہ اور عطر کریم پوڈر تولیے برش ٹوتھ پیسٹ اور اس قسم کی دوسری چیزیں جن کے بغیر عورتیں رہ ہی نہیں سکتی ہیں۔ وہ سب کچھ ایک اٹیچی کیس میں بھر لایا تھا۔

سروری خانم ان تمام چیزوں کو دیکھ کر خوش تو نہیں ہوئی بہرحال مطمئن ضرور ہو گئی کہ اس کی کوئی ضرورت رُکی نہیں رہے گی۔ وہ میرے لیے ڈھیر سارے سگریٹ بھی لے آیا تھا۔ تمام چیزوں کی فہرست اور ان کی قیمتوں کا حساب وہ لکھوا لایا تھا۔ وہ سب کچھ، اس نے میرے سامنے رکھ کر باقی پیسے لوٹا دیے، بولا۔

"اب کہو بادشاہو خوش ہونا؟"

"تیری مہربانی ہے یار! مجھے بتا کہ باہر کیا حال ہے اب؟"

"پولیس تو اُدھر سڑکوں پر سے ہٹ گئی ہے وہ پہلا سا شور شرابا نظر نہیں آتا۔ مگر پھر بھی تمھیں سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا ہوگا۔"

"پھر کیا کریں ہم؟"

"آج ہی جانا چاہتے ہو؟"

"ہاں۔"

"تو پھر یوں کرو۔ تم دونوں برقعے پہن کر ٹیکسی میں بیٹھ جاؤ۔ برقعوں کا بندوبست میں کر دیتا ہوں۔"

"ہاں، یہ بہتر رہے گا۔ ٹیکسی والے کو کیا پتہ چل سکے گا۔ مگر بار کسی نہ کسی جگہ پر تو اُس پر ہم ظاہر ہو ہی جائیں گے۔"

"پتوکی پہنچ کر کسی جگہ اندھیرے میں اُتر جانا اسے کیا پتہ چلے گا۔ بات چیت اس سے بی بی کرے گی۔"

"ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔ بس تو ٹیکسی لے آ۔"

"میرا خیال ہے جیلانی صاحب کہ اس وقت وہاں جانا ٹھیک نہ ہوگا۔ ہم رات کو دس بجے وہاں پہنچیں گے تو بڑی مشکل ہوگی۔" سروری خانم نے اس تجویز کی مخالفت کی۔

"آپ بہتر سمجھ سکتی ہیں کیونکہ وہاں کے حالات کا آپ ہی کو پتہ ہے۔"

"ہمیں پتوکی نہیں بلکہ آگے جانا ہے جیلانی صاحب، صبح سویرے یہاں سے نکلیں گے تو دن چڑھے وہاں پہنچ جائیں گے۔"

"چلیں یوں ہی سہی، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میری بہن ایک دن کی اذیت اور سہہ لے گی۔"

"بے فکر رہیں جیلانی صاحب! وہ وہاں بالکل محفوظ رہے گی بالکل پریشان نہ ہوں۔" سروری خانم نے ساڑھی کو اپنے بدن پر سجاتے ہوئے کہا۔ وہ بھول ہی گئی تھی کہ اسے وہاں اغوا کر کے لایا گیا ہے اور میں نے اُسے یرغمال بنا لیا ہے۔ وہ سارا سلسلہ اسے ایک نیا ہیجان خیز تجربہ نظر آ رہا تھا۔ نہانے کے بعد اس کی سندرتا اور نکھر آئی تھی۔ اس نے ابھی تک تخلیق کا کرب نہیں سہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اتنے سالوں کی متاہل زندگی گزارنے کے باوجود اس کے چہرے پر کنواریوں ایسی آب و تاب قائم تھی۔

ساقا بھی اسے دیکھ رہا تھا بولا۔

"ساڑھی پسند آئی آپ کو! یہ رنگ میں نے خود چُنا تھا۔ وہ چندن تو جامنی رنگ پر ہاتھ رکھتی تھی۔ یہ تربوزی رنگ آپ کو بہت اچھا لگے گا۔"

ساقے کی یہ بات سُن کر سروری نے ساڑھی لپیٹ کر الگ رکھ دی۔ بڑے خشک لہجے میں بولی۔ "اچھا ہے! گزارا تو کرنا ہی ہے۔" اُسے ساقے کی زبان سے وہ تعریف اچھی نہیں لگی تھی۔

"اچھا بھائی میں آپکے لیے کھانا لا دوں پک گیا ہوگا۔" یہ کہہ کر وہ شرمندہ سا ہو کر نکل گیا۔

"آپنے ساقے کا مان رکھ لیا ہوتا، اس کا دل بڑھ جاتا۔"

"مجھے اس کی تعریف کی ضرورت نہیں ہے جیلانی! پتہ نہیں کون گنوار آدمی ہے یہ۔ اپنی حیثیت بھی تو آدمی کو دیکھنی چاہیے۔"

"اوہ! میں سمجھا! آپ طبقاتی فرق کی بات کر رہی ہیں۔ میں آپ سے بالکل متفق ہوں سروری خانم! حالانکہ ہم دونوں اُس کے رحم و کرم پر ہیں۔"

"آپ ہوں گے میں نہیں ہوں۔ میرا گھر یہاں سے زیادہ دُور نہیں ہوگا۔ اس کے ہر کمرے کو میں معطر رکھتی ہوں... اور اِدھر؟ اِدھر کیا ہے گوبر، بدبو، مچھر، مکھی، توبہ توبہ۔" یہ باتیں وہ دبے لہجے میں کہہ رہی تھی مگر اس گرد و پیش سے اس کے دل میں دبی نفرت کی بھرپور آئینہ دار تھیں اس کی وہ باتیں۔ میں چپ ہو گیا۔

اِس معاملے پر اس سے بحث فضول تھی۔ وہ جاگیردارانہ ذہنیت کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ اور مجھے وہ کس طرح برداشت کر رہی تھی، اس کی وجہ میں سمجھ ہی سکتا تھا میرے بارے میں اُس کے دل میں جو دہشت تھی، وہ کبھی کی ختم ہو چکی تھی۔

جب ہم کھانے سے فارغ ہوئے تو ساقا بولا۔

"میں اِدھر دُوسری چارپائی ڈال دیتا ہوں جیلانی صاحب! آپ اُس پر سو رہیں۔ بی بی کے لیے وہ پلنگ ٹھیک رہے گا۔ اور کوئی ڈھنگ کا کمرہ ہمارے پاس ہے نہیں۔"

"تم فکر نہ کرو۔ میں تو اِدھر فرش پر بھی سو سکتا ہوں مجھے تو صرف اِن کے آرام کی فکر ہے۔"

"ان کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی یہاں۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا، تو میں نے سروری کی طرف دیکھا۔ وہ لحاف میں دبک چکی تھی مگر چہرہ اُس کا ابھی لحاف کے باہر تھا۔

"مجھے افسوس ہے مگر حالات ایسے ہی ہیں کہ یہ رات ہمیں ایک ہی چھت تلے گزارنی ہوگی۔"

"پتہ نہیں ابھی ایسی کتنی راتیں باقی ہیں۔ میں تو آپ کی یرغمالی ہوں نا!"

"ایسا نہ کہیں خانم! خدا کی قسم اِس میں میرے ارادے کو کوئی دخل نہیں تھا۔" میں نے پریشان ہو کر کہا۔

"ارے آپ تو بُرا مان گئے جیلانی صاحب! یوں نہ سوچیں، مجھے آپ سے کوئی گلا نہیں ہے۔ میں نے اس بارے میں آپ کی باتیں آتے ہی سُن لی تھیں۔ میں ہوش میں تھی۔ اب میں صرف آپ کی مدد کرنے کے لیے اِدھر ٹھہری ہوں مجھے تو اب آہو پر بھی غصّہ آنے لگا ہے اُس نے خواہ مخواہ اس معاملے کو پیچیدہ اور تکلیف دہ بنا دیا ہے۔" وہ لحاف الگ رکھ کر اُٹھ بیٹھی تھی۔ بال ابھی تک اُس کے شانوں پر بکھرے پڑے تھے۔ مگر وہ میرے لیے بہرحال پرائی عورت تھی۔ میں نے اس کی رعنائیوں سے اپنی نظریں اُلجھتی دیکھیں تو منہ دُوسری طرف پھیر لیا۔ میں سروری خانم کے اعتماد کو دھوکا نہیں دینا چاہتا تھا۔

"میں آپ کا شکرگزار ہوں خانم کہ آپ ایسا کہہ رہی ہیں ورنہ یقین جانیں میں آپ سے بے حد شرمندہ ہوں۔" یہ کہہ کر میں... سگریٹ سُلگا کر دھوئیں کے مرغولے اُڑانے لگا۔ وہ چپ ہو گئی۔ اب وہ اُس رات ساقے کی خریدی ہوئی سُرخ رنگ کی ساڑھی پہن کر بیٹھی تھی اور اِس لباس میں وہ... کسی شاعر کے خوابوں میں ملکوتے لیتی ہوئی کوئی پری نظر آ رہی تھی۔ اور... اور میں تیرگی کا مارا ہوا پرندہ کسی جگنو کی تلاش میں سرگرداں تھا جو مجھے میری سمت سجھا سکے۔

وہ رات بلاشبہ میرے لیے کڑی آزمائش کی رات تھی۔ میرے دشمن کی ساری دولت مجھ سے دو ہاتھ دُور پڑی تھی... اور... میں یہ تہیّہ کیے بیٹھا تھا کہ اپنے آپ کو بہرحال اس سے بچاؤں گا۔ جو دشمن کا خون چلّو میں بھر کر پی لینے کے بعد اس کے دل میں بے پناہ تکبّر اور طمانیت بھر دیتی ہے مگر وہ تکبّر طمانیت کسی بھی طرح آدمی کے ضمیر کی آواز دبا نہیں سکتے۔ کسی کی تذلیل کے وقت اپنی کسی ممکنہ تذلیل کو بھی یاد رکھنا چاہیے۔ کیا پتہ کل کو یا آج ہی رات میری بہن آسیہ پر بھی کوئی ہاتھ مار دے۔ اور یہی وجہ تھی کہ میرا دل لرز رہا تھا۔ میں بُری طرح ڈر رہا تھا۔ میں ڈرتا تھا اپنے آپ سے بھی اور اُس اندھیرے سے بھی جو بتی کے جانے اور... بتی بجھنے کے بعد سارے کمرے میں پھیل گیا تھا۔

مجھے ٹھہر ٹھہر کر آبی کی تنبیہہ یاد آتی تھی۔ اس نے کہا تھا۔ عورتوں کی دوستی تجھے لے ڈوبے گی جیلانی۔ اور وہ سچ ہی تو تھا۔ ماجدہ مجھے جو چرکا لگا گئی تھی یہ اُسی کا نتیجہ تھا کہ میری ایک بار پھر مجھ سے چھن گئی تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آہو نے تا ہیے میرے خلاف یوں بھڑکایا نہ ہوتا۔ تاہیا اپنے ایک زخم کا بدلہ لینے کے لیے میرے پیچھے لپکا تھا مگر وہ لیتا تو اپنے زخم کا بدلہ مجھ سے لیتا۔ وہ آسیہ اور نفیسہ کو آہو کے حوالے نہ کرتا۔ آہو کے دندان آز اُن پر اسی لیے تیز ہوئے تھے کہ مجھے ماجدہ فریب دے گئی تھی اور وہ میری آنکھوں میں دھول جھونک کر وہ آہو کے گھر سے اتنا لے گئی تھی کہ مجھ سے اس کی تلافی ناممکن تھی۔

سروری خانم کے اشارے جو مجھے اتنے واضح نظر آتے تھے مجھے اس گھڑی اپنے دل کی سہل انگاری معلوم ہوتے، جب وہ بتی بجھنے کے تھوڑی ہی دیر بعد گہری نیند میں کھو گئی۔ وہ ماحول کی اجنبیت اور حالات کی سنگینی کو یکسر نظرانداز کر کے ہلکے ہلکے خراٹے لینے لگی تھی۔ تب میں سمجھا کہ میں نے اس کے بارے میں جتنے اندازے بھی لگائے تھے، وہ سب کے سب غلط تھے۔ اس کے بازار میں ایسی کوئی شے نہیں بکتی تھی جسے ارزاں یا ارزل کہا جا سکے۔ اپنے دونوں پستول میں نے بڑی احتیاط سے اپنی چارپائی کے گدّے کے نیچے اس طرح رکھے تھے کہ ذرا سی حرکت پر مجھے معلوم ہو سکتا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ وہ نیند میں کھو گئی تو میں نے آنکھیں موند لیں۔ وہ بہر حال سلطانہ بنی تھی اور سمجھتی تھی کہ اُسے کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ سلطان وہاں کوئی تھا ہی نہیں۔ ایک میں تھا تو میں اپنے آپ سے اتنا ڈرا ہوا تھا کہ کچھ سوچ ہی نہیں سکتا تھا اپنی ابتلا کے سوا۔

میرے پپوٹوں کی کسلمندی بتا رہی تھی کہ مجھے سوتے ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ میری حسیات بیدار ہونے لگیں۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے اپنا تپتا ہوا ہاتھ میرے

رکھ دیا ہے۔ میں نے پہلو بدل کر آنکھوں کے دریچے ذرا سے کھولے تو میرا وجود روشن ہونے لگا۔ سروری خانم میرے سرہانے کھڑی تھی۔ یوں کہ اُس کے خوشبو میں نہائے ہوئے بدن نے مشامِ جان میں ہلچل مچا دی تھی۔ اس کے وہ لمبے لمبے سیاہ بال اس کی کمر پر لہرا رہے تھے۔ اس نے سامنے کے غسلخانے کی بتی جلا کر دروازہ یوں نیم وا چھوڑ رکھا تھا کہ روشنی کی ایک لکیر سی کمرے میں پھیلتی نظر آتی تھی۔ میں نے آنکھیں میچ کر پہلو بدلا اور اس کے اگلے اقدام پر غور کرنے لگا۔

وہ چند لمحوں تک میرے سرہانے کھڑی کچھ سوچتی رہی اور پھر وہ میرے پلنگ پر آ بیٹھی تھی اور گھٹی گھٹی آواز میں کہہ رہی تھی "جیلانی صاحب! جیلانی صاحب! پلیز مجھے ڈر لگ رہا ہے مجھے نیند نہیں آ رہی۔ پلیز آنکھیں کھولیے۔" اور پھر اس نے مجھے جھنجوڑ ڈالا۔ میں ایک دم اُٹھ بیٹھا۔

"کیا ہوا یہ... کیا ہوا ہے خانم!"

"مجھے ڈر لگتا ہے جیلانی صاحب! میں ایک پل نہیں سو سکی۔"

میں نے بستر سے نکل کر بتی جلا دی۔

"یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ! ڈرنے کی کیا بات ہے یہاں؟"

"میں... میں کبھی تنہا نہیں سوتی جیلانی صاحب! پلیز مجھے اِدھر سونے دیں۔ مجھے اُدھر سخت ڈر لگتا ہے۔"

"نہیں خانم! بہت بُری بات ہے۔ یوں تو بچے ڈرا کرتے ہیں، یہاں آپ بالکل محفوظ ہیں۔ پلیز اپنے بستر پر چلی جائیں۔ آپ کو مجھ سے ڈر لگتا ہے تو میں برآمدے میں سو جاتا ہوں۔"

"نہیں نہیں! میں اکیلی نہیں سوؤں گی پلیز۔"

"نہیں! ایسا نہیں ہو سکتا آپ اُدھر چلی جائیں۔" یہ کہہ کر میں نے اُسے لحاف میں بھر کر اٹھایا اور لے جا کر اس کے بستر پر پھینک دیا۔ وہ دھڑام سے بستر پر گری اور سسکنے لگی۔ "نہیں خانم! آپ کو بالکل ڈرنا نہیں چاہیے۔ آپ تو بہت بہادر خاتون ہیں۔" یہ کہہ کر میں نے اپنا لحاف الگ کر کے اس کے اوپر اس کا اپنا لحاف ڈال دیا۔ اور پھر بتی بجھا کر اپنے بستر میں جا لیٹا۔ اس کڑی آزمائش سے میں سرخرو ہو کر نکل آیا تھا۔ اس کے بعد وہ اپنے بستر سے نہیں اُٹھی اور میری نیند اچاٹ ہو گئی۔

تو یہ تھی وہ عورت جس کی خوشنودی کے لیے آہو... بڑے بڑے معرکے سرانجام دے رہا تھا۔ اس عورت کی نہ اور ہاں کے درمیان بال برابر فرق نظر نہیں آتا تھا۔ کوئی زُلف کے خم میں لگی کچہری سے انصاف کی اُمید کیسے رکھ سکتا ہے۔ بڑی خوبیاں تھیں اس سروری خانم میں۔ وہ بہادر تھی دلیر تھی، مضبوط اعصاب کی مالک تھی۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ حسین تھی۔ چغتائی اور افغانی خون کی آمیزش نے اُس کے بدن کو آتشہ بنا رکھا تھا۔ وہ کسی بھی اُونچے

بُرج کو تاک کر اپنی آنکھ کے بے پناہ زور سے گرا سکتی تھی۔ وہ میرا اُس رات اس کی وحشتناک یورش سے بچ جانا ایک معجزے سے کم ہرگز نہیں تھا۔

وہ کچھ ہی دیر بعد گہری نیند میں کھو گئی۔ مگر میں ایک پل کے لیے بھی پلک نہ جھپک سکا۔ وہ چاہتی تو میرے ہی پستول سے مجھے آہو کے راستے سے ہٹا سکتی تھی۔ وہیں میرا فیصلہ کر سکتی تھی ـــ مگر اس نے ایسا کیوں نہیں کیا حالانکہ میں اُسے بڑی اذیتیں پہنچا چکا تھا۔ دو بار میں نے اسے بہت بُری طرح زدوکوب کیا تھا۔ اُس کے شوہر کو بھی ذلیل کرتا چلا آیا تھا۔ اس کی کوئی وجہ میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی اسی اُدھیڑ بُن میں آدھی رات گزر گئی۔ نیند مجھ سے رُوٹھ چکی تھی۔ اس وقت ایک بج رہا تھا۔ رات تابہ کہ نیچے ڈوب چکی تھی کہ مجھے ساقے کے اس حویلی نما مکان کے دُوسرے دروازے کے سامنے کسی ٹرک کے رُکنے کی آواز سُنائی دی۔ میں نے کھڑکی کا چوبی دروازہ کھول کر صحن میں نظر ڈالی تو مجھے معلوم ہوا کہ ساقا ٹارچ ہاتھ میں لے کر تیزی سے صحن میں جا رہا تھا۔ ٹرک میں سے تین آدمی اُترے۔ انھوں نے سروں پر سیاہ پگڑیاں باندھ رکھی تھیں اور اُن کے کُرتے اور تہمد بھی سیاہ تھے۔ ساقا اُن سے بڑے تپاک سے ملا اور کچھ ہی دیر بعد انھوں نے ٹرک کا پچھلا حصّہ کھول کر اس کے ساتھ لکڑی کے تختے جوڑ دیے۔ اُن تختوں پر سے گزار کر انھوں نے چار بھینسیں ٹرک پر سے اتاریں اور ان کو ہانک کر صحن میں لے آئے۔ ان میں سے دو بھوری تھیں اور دو سیاہ۔ وہ بہت پلی ہوئی بھینسیں تھیں اور حوانے ان کے پھولے ہوئے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ دُودھ کی نہریں بہا سکتی ہیں۔

ساقے نے انھیں کھُرلی پر باندھ کر اُن کے آگے چارہ ڈالا اور پھر اپنے مہمانوں کو لے کر کمرے میں جا گھسا۔ مجھے آبی سب کچھ بتا چکا تھا اور میں اچھی طرح سمجھتا تھا کہ وہ بھینسیں کس راستے سے رات کے اس حصے میں ساقے کے گھر پہنچی ہیں۔

کوئی دو گھنٹے بعد ساقے نے حویلی کے دائیں ہاتھ بنے چھپّر تلے بندھی دو بھینسیں کھول کر ٹرک میں لدوا دیں۔ اس وقت صبح کے تین بج رہے تھے۔ اور میں ابھی تک اپنے بستر کی خارزار تنہائی سے اُلجھ رہا تھا۔ بے خوابی سے میری آنکھیں جل رہی تھیں۔ اور اس وقت تک میں بستر پر بیٹھا کتنے ہی سگریٹ پھونک چکا تھا۔ سامنے کی کھڑکی کھلی تھی اور اس میں سے میں ساقے کی تمام نقل و حرکت کو برابر دیکھ رہا تھا۔ جب وہ دو بھینسیں ٹرک میں لدوا چکا تو اس میں سوار آدمیوں سے کہہ کر وہ تیزی سے پلٹا اور اس کمرے کے دروازے تک آ پہنچا جس میں میں لیٹا تھا۔ اس نے بڑی آہستگی سے دستک دی اور بولا ـــ "جیلانی صاحب!"

"کیا بات ہے ساقے!" میں نے اُٹھ کر دروازہ کھول دیا۔
اُس نے ٹارچ کی روشنی میرے چہرے پر ڈالی اور بولا۔
"ہشکے بھئی! لگتا ہے آپ ابھی تک جاگ رہے ہیں۔"
"ہاں یار، مجھے نیند نہیں آئی، کہو کیا بات ہے۔"
"یہ ٹرک پتوکی جا رہا ہے میرا خیال ہے آپ دونوں اس میں بیٹھ کر چلے جائیں۔ اچھے رہیں گے۔"
"ہاں یار! یہ تو بہت اچھا ہو جائے گا۔ انھیں روکو، ہم ابھی تیار ہو جاتے ہیں۔" یہ کہہ کر میں نے خانم کو جگا دیا۔
"کیا بات ہے جیلانی صاحب خیر تو ہے؟" وہ نیند میں دُھت پڑی تھی۔ اچانک جاگی تو حیرت کا اظہار کرنے لگی۔
"ہاں خیر ہے۔ اِدھر ایک ٹرک جا رہا ہے ہم اس میں بیٹھ کر پتوکی جا پہنچیں گے آپ تیار ہو جائیں۔"
وہ بستر سے اٹھی اور بولی۔ "میں بڑی گہری نیند میں تھی، ڈسٹرب کر دیا آپ نے مجھے۔"
"کوئی بات نہیں۔ بس آپ جلدی سے تیار ہو جائیں۔" یہ کہہ کر میں نے اپنا حلیہ درست کیا، منہ پر پانی کے دو چھپاکے مارے اور سر پہ پگڑی باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس عرصے میں سروری نے بھی خود کو کیل کانٹے سے لیس کر لیا تھا۔
ٹرک ڈرائیور چہرے مُہرے سے اور حُلیے کے اعتبار سے مجھے کوئی چھاچھی معلوم ہوتا تھا۔ یہ بڑی بڑی مونچھیں پال رکھی تھیں اُس نے۔ آنکھیں اُس کی چڑھی ہوئی تھیں۔ لگتا تھا جیسے وہ ابھی ابھی پوری بوتل چڑھا کر باہر نکلا ہے۔ انگلیوں میں اُس نے بڑی بڑی نانا شاہی قسم کی انگوٹھیاں پہن رکھی تھیں جن میں مختلف رنگوں کے نگینے جڑے تھے۔ موٹی اون کی لوئی اس نے کندھوں پر ڈال رکھی تھی۔ جب میں ٹرک کی اگلی نشست پر سروری کو بائیں ہاتھ اپنے پاس بٹھا چکا تو ساقا بولا۔
"یار گھیبا خان ان کو اُدھر پتوکی میں اُتار دینا۔ تمھیں ساری بات تو میں نے بتا ہی دی ہے۔"
"فکر نہ کر میرے بادشاہ! باؤ جی کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔" یہ کہہ کر اُس نے ایک نظر میرے چہرے پر ڈالی اور ٹرک آگے بڑھا دیا۔ اس کے دوسرے ساتھی پیچھے بیٹھ گئے تھے۔
جب ہم شہر سے باہر نکلے تو گھیبا خان بولا۔ "باؤ جی! ادھر پتوکی میں کس کے پاس جا رہے ہیں آپ اتنی سویرے؟"
"میرے ایک دوست ہیں وہاں ہم اُن کے گھر جائیں گے۔"
میری یہ بات سن کر وہ میری طرف جھکا اور دبے لہجے میں بولا "باؤ جی دانا اچھا چنا ہے آپ نے۔ پرانی محبت ہو گی آپ کی۔" اس کی آواز میں ہلکی سی تھرتھراہٹ تھی جو اُس کے خبثِ باطن کا پتا دیتی تھی۔

"کیا مطلب؟" میں نے ذرا کھُردرے لہجے میں پوچھا۔
"میرا مطلب ہے باؤ جی۔ کس کی تیویں ہے یہ؟ بہت سوہنی ہے کہاں سے اٹھایا ہے آپ نے؟" وہ میری طرف جھکا ہوا تھا اور یوں بات کر رہا تھا جیسے وہ مجھے یونہی سا بے لسیلی کا شہری بابو سمجھ رہا ہو۔
"مجھ سے ایسی باتیں نہ کرو گھیبا خان! سامنے دھیان رکھو۔" میں نے اب کی بار ذرا دبنگ لہجے میں کہا۔
وہ ٹھہر ٹھہر کر سروری خانم پر یوں نظر ڈالتا تھا جیسے وہ اسے نظروں میں تول رہا ہو، ٹٹول رہا ہو، بولا۔
"اوئے چھیمے بدبخت پانی ڈالا تھا اس میں کہ نہیں۔" اُس نے میری بات سُنی اَن سُنی کر کے بڑے کرخت لہجے میں پیچھے بیٹھے ساتھی سے پوچھا۔
"ہاں استاد جی! سب کام میں نے ٹھیک کر دیا تھا اُدھر کھڑا میں۔" پچھلی کھڑکی میں سے مجھے گھیبا خان کے کلینر کی آواز سنائی دی۔ وہ بھی سر اُس روزن میں ڈال کر سروری خانم کو دیکھنے لگا تھا اور ایک عجیب سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر چپکی تھی۔
ٹرک اب بڑی سڑک پر جا چڑھا تھا اور اُس کے سامنے روشنیوں میں رات کا پچھلا پہر بہت ہی پُراسرار نظر آ رہا تھا۔ اس گھڑی اپنے عروج پر تھی اور سروری خانم کے پاس نہ کوئی چادر تھی نہ کوٹ۔ میں نے اپنا کمبل کھول کر اس کے کندھوں پر ڈالا تھا۔ وہ بالکل چپ اور کھوئی کھوئی سی نظر آتی تھی۔ شاید رات کے واقعات نے اُسے خجل کر رکھا تھا جس کی وجہ سے وہ اپنی ہی نظروں میں گر گئی تھی۔ وہ مجھ سے کوئی بات نہیں کر رہی تھی اور مجھے ہو رہا تھا کہ میرے ساتھ اس نئی راہ پر چل کے اسے شاید ان جانے وسوسوں نے آ دبوچا تھا۔ اس کا خوف بالکل فطری تھا۔ وہ اتنے اجنبی مردوں میں گھری بیٹھی تھی۔ جن کے دروں بروں سے وہ قطعاً ناواقف تھی۔ اس کی سلامتی کے پوآل میں ذرا سی چنگاری ساری آگ سلگا سکتی تھی۔ جس پاؤں پھندنی سے میں نے اُسے باندھ لیا تھا وہ اُسے قبول تو کرتی تھی مگر میرے زیادہ دیر تک اور زیادہ دُور تک چلنے میں اسے خدشے محسوس ہوتے تھے۔ اور اپنی جگہ بالکل حق بجانب بھی تھی۔ اسے ہم لوگوں سے ڈرنا ہی چاہیے تھا۔
اچانک ٹرک گھاں گھاں کر کے رُک گیا۔
"اوئے چھیمے نیچے اُتر کر ہینڈل مار۔"
گھیبا خان یہ کہہ کر خود بھی ٹرک سے اُتر گیا۔ چاروں طرف مہیب سناٹا طاری تھا۔ سڑک کے بائیں ہاتھ گنّے کا کھیت تھا۔ یہاں سے وہاں تک پھیلا ہوا تھا۔ وہ اتنا گھنا تھا کہ اس میں ایک فوج چھپ سکتی تھی۔
"کیا ہوا گھیبا خان جی؟" میں نے بلند آواز سے پوچھا۔

اس کے دونوں ساتھی انجن کا مڈ اُٹھا کر اندر جھانک رہے تھے۔ گھیبا خان ٹرک کے سامنے سے ہو کر سروری خانم کے سامنے جا کھڑا ہوا بولا۔
"باؤ جی ذرا باہر آ جائیں شاید اسے دھکا لگانا پڑے گا۔" وہ بہت سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ سروری خانم سہم گئی تھی اور اس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں مجھے یہ احساس دلاتی تھیں کہ ساقے نے ہمیں اچھے لوگوں کے سپرد نہیں کیا تھا۔ سروری سرک کر میرے قریب آ گئی بولی
"ذرا دیکھیں تو جیلانی صاحب! پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے ٹرک کو؟"
"کچھ بھی نہیں ہوا، فکر نہ کریں انجن میں کوئی نقص پیدا ہو گیا ہے۔" یہ کہہ کر میں گھیبا خان کی سیٹ پر جا بیٹھا۔
"ذرا باہر آ جائیں بابو جی! آپ کو تھوڑی تکلیف اٹھانا پڑیگی۔" چھیمے نے انجن میں دو تین بار ہینڈل گھمانے کے بعد میرے پاس آ کر کہا۔
میں ٹرک سے اُتر کر انجن کے سامنے جا کھڑا۔
"کیا ہوا ہے اسے؟"
"پتہ نہیں باؤ جی! میرا خیال ہے کہ اس کی بیٹری ٹھنڈی... ہو گئی ہے۔" چھیمے نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔
اب میں ٹرک کے سامنے کھڑا تھا۔ چند ہی لمحوں بعد مجھے محسوس ہوا کہ گھیبا خان اور اُس کا تیسرا ساتھی قصداً میرے دائیں بائیں آ ٹھہرے ہیں۔ کمبل میں اپنے ساتھ ہی لے کر اترا تھا اور وہ ابھی تک میرے ہتھیار نہیں دیکھ سکے تھے۔ چھیما انجن سے الجھ رہا تھا۔
اچانک گھیبا خان نے جیب سے چاقو نکال لیا بولا۔
"باؤ جی ذرا اُدھر کھیت تک چلو۔ چل اوئے بکّو لے چل ان کو اُدھر۔"
اس کی یہ بات سنتے ہی بکّو نے مجھے باہوں میں جکڑنا چاہا مگر میں باہیں پھیلا کر کچھ اتنی تیزی سے گھوما کہ میرا ایک ہاتھ گھیبا خان کے منہ پر لگا اور دوسرا بکّو کی گردن پر۔ وہ دونوں مجھ سے پرے ہٹ گئے۔ میری نگاہ ان دونوں پر جمی تھی۔ وہ مجھ سے دو دو قدم پیچھے ہٹ گئے تھے۔ پُشت میری ٹرک کی طرف تھی اچانک مجھے اپنے پیچھے حرکت محسوس ہوئی۔ میں ایڑی پر گھوما تو سہی مگر دیر ہو چکی تھی۔ چھیمے نے ٹرک کا ہینڈل تڑاخ سے میرے سر میں دے مارا۔ وہ ایسی شدید ضرب تھی کہ میں اگر پگڑی نہ باندھے ہوتا تو میرا سر کھل گیا تھا مگر پھر بھی اس ہینڈل کی بھاری موٹھ جب میرے سر پر لگی تو میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ اور میں تیورا کر نیچے گر گیا۔ چند ثانیوں تک مجھے اپنے اردگرد کا کوئی ہوش نہیں رہا۔ پھر فوراً ہی میرے خون کی کسی تیز لہر نے سر میں آ کر میری مُندی ہوئی آنکھیں کھلوا دیں۔ سروری کی بھیانک چیخ نے . . . .
میرے اعصاب پر کوڑے ایسا کام کیا تھا۔ میں فوراً ہی اُٹھا مگر اس سے چھیما اپنا ہینڈل میرے سر پر مارنے کے لیے ہاتھ اوپر اٹھا چکا تھا۔ اپنا سر بچانے کے لیے میں ایک طرف ہوا تو اس کا وار میرے کندھے پر پڑا۔ ہینڈل میری اسٹین گن سے ٹکرایا۔ چھن سی آواز پیدا ہوئی۔ میں غصے کی شدت سے تڑپتا ہوا اٹھا اور چھیمے سے جا ٹکرایا۔ وہ پیچھے گرا تو اچانک گھیبا خان میرے اوپر آ گرا۔ یوں کہ اگر میں ذرا سی غفلت دکھاتا، تو اس کا چاقو میری کمر میں دھنس چکا ہوتا۔ میں نے اُس کی کلائی اپنے بدن سے دُور روک کر پوری قوت سے اسے اپنی کمر پر اٹھا کر دوسری طرف اُلٹا دیا۔ وہ دھڑام سے انجن کے اگلے حصے پر گرا۔ میں ابھی اپنا توازن صحیح طور پر قائم نہ کر سکا تھا کہ بکّو نے نیچے جھک کر پیچھے سے میری دونوں ٹانگیں پکڑ کے مجھے منہ کے بل گرا دیا۔ چھیما ایک بار پھر ٹرک کا ہینڈل تول کر مجھ پر حملہ آور ہو رہا تھا مگر میں تیزی سے اُلٹ کر انجن کے نیچے جا گھسا۔ وہ ایک لمحے کی فرصت میرے بہت کام آئی۔ میں نے جیب سے چپ شاہ نکالا اور چھیمے کی ٹانگوں پر گولی داغ دی۔ اس کا دھڑ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا۔ گولی اس کی ران میں لگی تو وہ چیخ کر پیچھے ہٹا۔ ہینڈل اُس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ ٹرک کے نیچے لوٹ پوٹ ہوتا ہوا میں اس کے پچھلے حصے میں پہنچ کر باہر نکلا اس عرصے میں گھیبا خان اور بکّو ٹرک کے اندر جا بیٹھے تھے۔ بکّو نے شاید سروری خانم کو دبوچ لیا تھا۔ اس کی فلک شگاف چیخیں میرے کانوں سے ٹکرائیں اور اس کے ساتھ ہی ٹرک اسٹارٹ ہو گیا۔ میں ایک ہی جست میں ٹرک کے اگلے حصے تک پہنچا مگر گھیبا خان نے ٹرک چلا دیا تھا اور اس کی رفتار اس نے ایک دم تیز کر دی تھی۔ میرا دماغ اُلٹنے لگا۔ میں نے پستول جیب میں رکھ کر اسٹین گن ہاتھ میں لی اور ٹرک کے ٹائروں پر گولی چلا دی۔ دونوں ٹائر زبردست دھماکے سے پھٹے اور ٹرک لڑکھڑاتا ہوا دائیں ہاتھ مڑا اور ایک درخت کی سمت لڑکھڑاتا ہوا بڑھا۔ گھیبا خان شاید بڑے ہی مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔ حادثے کو سامنے دیکھ کر اس نے ٹرک کو بریک کچھ اتنی قوت سے لگائے کہ جب وہ درخت سے ٹکرایا تو اس کی رفتار بہت کم ہو چکی تھی۔ درخت سے ٹکراتے ہی ٹرک کا دایاں دروازہ کھلا اور گھیبا خان چھلانگ لگا کر نیچے اُترا۔ میں نے تاک کر اس پر گولی چلائی مگر وہ اس ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں زمین پر لیٹ کر کھیت کی منڈیر کو اپنی ڈھال بنا چکا تھا۔ میں بھاگ کر آگے بڑھا تو وہاں گھیبا خان نہیں تھا۔ وہ گنّے کے کھیت میں جا گھسا تھا۔ دوسرے دروازے سے بکّو نکل کر سڑک پر اترا تو میری نظر اس پر جا پڑی۔ اسے مار دینا میرے لیے کچھ بھی مشکل نہیں تھا مگر میں نے ہاتھ روک لیا۔ سامنے سے ایک بس بہت تیزی سے آ رہی تھی۔ بکّو اسے دیکھتے ہی پاگل کتے کی طرح اچھل کر ٹرک سے اترا اور سامنے کے گندم کے کھیت میں جا

گھُسا۔ بس دندناتی ہوئی آگے نکلی تو میں بھاگ کر سروری خانم کے پاس جا پہنچا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور اس کی آنکھوں سے ایسی وحشت ہویدا تھی کہ میں سمجھا اپنی سُدھ بُدھ کھو بیٹھی ہے میں نے سروری کو بڑی مشکلوں سے سنبھالا وہ ذہنی طور پر کچھ اس بُری طرح نڈھال تھی کہ میری کسی بات کو سمجھتی ہی نہیں تھی۔ میں نے اُسے ٹرک سے اُتار کر سڑک کے بائیں ہاتھ بہتے پانی کی ایک آڈ پہ پہنچا کر اس کے مُنہ پر چھینٹے مارے تو اسے کچھ ہوش آیا۔ پانی سامنے دیکھ کر وہ خود اپنا منہ دھونے لگی۔ وہ بُری طرح سِسک رہی تھی۔۔۔ جب وہ مُنہ ہاتھ دھو چکی تو پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ چٹکی ہوئی چاندنی میں اس کا پانی سے تر چہرہ میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ میں نے اس کے دوپٹے سے اس کا مُنہ پونچھا اور کہا۔

"مجھے افسوس ہے خانم کہ میری وجہ سے آپ کو اتنی تکلیف اٹھانا پڑی۔"

میری آواز سُن کر وہ ایک دم پھٹ پڑی اور آنکھوں پر دوپٹہ رکھ کر رونے لگی میرے ہاتھوں اس نے بڑی اذیتیں سہی تھیں۔ مگر ان کا ایک جواز اس کے سامنے تھا اسی لیے وہ انھیں بھُلا بیٹھی تھی۔۔ اور میرا خیال ہے اس نے مجھے معاف بھی کر دیا تھا مگر اس بیپا ہوتی ہوئی رات کا پچھلے پہر اس ویران اجاڑ طور پر اس نے جو اذیت سہی تھی وہ اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ میں نے اُس کو آڈ پر سے اٹھایا تو وہ میرے سینے میں سر دے کر اور زیادہ بلند آواز سے رونے لگی۔

"مجھے معاف کر دیں خانم! یہ سب کچھ میری ہی وجہ سے ہوا ہے۔"

وہ میرے کوٹ کا گریبان پکڑ کر مجھے جھنجوڑتے ہوئے بولی "ان کو آپ نے جانے کیوں دیا جیلانی صاحب! انھیں گولی کیوں نہیں مارتے ہیں آپ؟"

"نہیں خانم۔۔۔ میں۔۔۔ میں خواہ مخواہ کسی کی جان نہیں لے سکتا۔ چھیما میرے ہاتھوں سخت زخمی ہوا ہے اس کا بھی مجھے سخت افسوس ہے اگر آپ کی عزت کسی طرح نہ بچ سکتی تو پھر شاید مجھے ان تینوں کو قتل کرنا پڑتا۔ مگر اب نہیں۔ آئیں سڑک پر چلتے ہیں۔"

وہ ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے مجھے یوں دیکھنے لگی جیسے کہہ رہی ہو، یہ تم ہو جیلانی جس نے ہادی علی کو بے دریغ قتل کر دیا تھا کیونکہ اُس معاملے کا تعلق تمھاری بہن سے تھا۔ اس کے لیے ہر کام کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہو مگر یہاں آہو کی بیوی پر درندے چڑھ دوڑے تھے، ان کے خلاف تم کوئی ایسا قدم نہیں اٹھاتے ہو محض اس لیے نا کہ وہ آہو کی بیوی تمھاری کچھ نہیں لگتی ہے اس کے خیالات کو پڑھتے ہوتے میں نے اُس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے اور کہا۔

"ایسا نہ سوچیں خانم! مجھے آپ کی عزت بھی اتنی ہی عزیز ہے جتنی آسیہ کی اور نفیسہ کی۔ بس میرے حساب کتاب میں غلطی ہو گئی بہر حال آپ بچ گئی ہیں یہی بہت کافی ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے جیلانی صاحب! آپ میرے ساتھ نہ ہوتے کوئی اور ہوتا تو پھر آج تو میں تباہ ہو گئی تھی ایسے کمینے لوگ ہوتے ہیں دفع کریں! مرد سب۔۔۔ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ان کی تو سدا سے ایسی ہی رہی ہے۔" یہ کہہ کر میں اسے آہستہ آہستہ چلاتا ہوا سڑک پر لے آیا۔

رات اور پیچھے ہٹ گئی تھی۔ مگر صبح کا تارا ابھی کہیں نظر نہیں آتا تھا۔ ہم دونوں کتنی ہی دیر تک کھڑے رہے۔ میں نے اسٹین گن ایک بار پھر کمبل کے نیچے چھپالی۔ چھیمے کا کہیں کوئی نشان نظر نہیں آتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ مجھ سے خوفزدہ ہو کر گنے کے کھیت میں کسی جگہ بیٹھا اپنی ران کا زخم چاٹ رہا ہوگا۔ گھیبا خان بھی کسی کھیت میں تھا۔ اور بکو سڑک کی دوسری جانب کہیں چھُپ گیا تھا۔ چپٹا شاہ پر جیب کے اندر ہاتھ ڈال کر میں نے اپنی گرفت مضبوط کر لی تھی۔ اب میں ایک لحظے کے لیے بھی کسی خطرے کو سر اٹھانے نہیں دے سکتا تھا۔ میری ذرا سی غفلت پہلے ہی مجھے بہت زیادہ شرمندہ کر گئی تھی۔ اگر میں نے گھیبا خان کی باتوں پر دھیان دیا ہوتا اور پہلے ہی قدم پر اس کی کوچیں کاٹ دی ہوتیں تو سروری کو اتنی اذیت نہ اٹھانا پڑتی۔

پتوکی کی طرف جانے والی کئی بسیں ہمارے پاس سے گزریں مگر کسی نے بھی ہمیں نہ اُٹھایا۔ میرا خیال ہے کہ وہ یا تو سب کی سب بھری ہوئی تھیں یا پھر ڈرائیور رات کے اس حصے میں سڑک پر کھڑے کسی آدمی پر بھروسہ کرنے پر تیار نہ تھے۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد ایک خالی ٹیکسی وہاں سے گزرتی نظر آئی۔ اسے میں نے ہاتھ دیا تو وہ رک گیا۔ ہم دونوں پر گہری گہری نظریں ڈالتے ہوئے بولا۔

"آپ کو کہاں جانا ہے بھائی جی؟"

مگر میں اس کا جواب دینے کے بجائے پچھلا دروازہ کھول کر اندر جا گھسا۔ سروری بھی تیزی سے میرے قریب آ بیٹھی۔

"چل یار ہمیں اُدھر پتوکی لے چل۔"

"میں وہیں سے تو آ رہا ہوں بھائی جی۔ لاہور جانا ہو تو بتائیں میں ادھر ہی جا رہا ہوں۔"

"نہیں یار! دو گھڑی دیر سے چلے جانا۔ ہمیں بس پتوکی پہنچا دے ہم بہت پریشان ہو رہے ہیں۔"

وہ مان تو گیا مگر کرایہ اس نے دُگنا طلب کیا۔

"کرائے کی فکر نہ کر یار! ہمیں ہماری منزل پہ پہنچا دے مہربانی ہوگی۔"

پتہ نہیں مجھے کیا ہوتا جا رہا تھا۔ وہ جو میرے اندر ایک ہوا خونخوار جذبہ تھا وہ سرد پڑتا جا رہا تھا مجھے اب طیش نہیں

آسیہ کو یوں دوسری بار اپنے دوستوں کے ہاتھوں کھو دینے کے بعد میرے دل و دماغ کی عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔ وہ پہلی سی تند خوئی میرے اندر باقی نہیں رہی تھی۔ کوئی اور موقع ہوتا کوئی اور شخص مجھ سے ایسی لیت و لعل کرتا تو شاید میں اُس کے جبڑے توڑ دیتا مگر اُس ڈرائیور کے سارے نخرے میں چپ چاپ سہہ گیا۔ اُلٹا میں اُس کی خوشامدیں ہی کرتا رہا کہ وہ ہمیں جس طرح بھی ہو سکے ہماری منزل پر پہنچا دے۔۔۔ یہ تبدیلی مجھے محسوس بھی ہوئی تھی مگر اس پر میں پریشان ہرگز نہیں تھا۔ مجھے۔۔۔ مجھے دراصل اپنے اُوپر جو بے پناہ اعتماد تھا، اپنی منہ زور قوت اور اپنے عمل کی قطعیت پر جو مجھے یقین تھا وہ متزلزل سا ہو گیا تھا۔ میں وہ پہلا سا غلام جیلانی نہیں رہ گیا تھا اور اس کی وجہ میرے ارادوں کی شکستگی اور پیہم ناکامی تھی۔ اب جو میں سروری خانم کے ساتھ جا رہا تھا تو میرا دل اندر سے چُرمُر ہو چکا تھا۔ مجھے اُمید نہیں تھی کہ میں سُرخرو لوٹ سکوں گا۔ حالات ایسے پیچیدہ تھے اور آہو نے میرے لیے ایسی مشکلات پیدا کر دی تھیں کہ مجھے کوئی شے صاف سیدھی نظر نہیں آتی تھی۔

پتوکی شہر سے ابھی ہم آدھ میل دور ہی تھے کہ سروری نے گاڑی کو بائیں ہاتھ مُڑنے کا اشارہ کیا۔ ڈرائیور بدکا، بولا۔

"کہاں جائیں گے آپ! مجھے تو آپ نے پتوکی جانے کے لیے کہا تھا۔"

"ہمیں چوگوٹھ جانا ہے میرے بھائی! تیری مہربانی ہوگی۔ ہمیں تو وہاں پہنچا دے۔"

"مگر یہ تو کچا راستہ ہے میرے بھائی۔ میں تو اِدھر نہیں جا سکتا۔ ٹیکسی کا ستیاناس ہو جائے گا۔"

"کوئی بات نہیں بڑے بھائی! ہم تمھیں زیادہ کرایہ دے دینگے۔" میں نے اُس کی منت کی۔

"نہیں جناب میں آگے نہیں جا سکتا۔ بس آپ مجھے تو یہیں چھوڑ دیں۔" اس نے اینٹھتے ہوئے کہا میرے لہجے کی نرمی سروری کو حیران کیے دیتی تھی، میری طرف جھک کر بولی۔ "یہ سیدھی طرح نہیں ملنے گا۔" اس کا منشا یہی تھا کہ میں اس ڈرائیور کو اپنے دانت دکھا دوں مگر میرا دل بجھ چکا تھا۔ کچھ ایسی کیفیت طاری تھی مجھ پر کہ جیسے میں انسانوں سے بالکل ہی مایوس ہو چکا ہوں۔

"چوگوٹھ یہاں سے کتنی دُور ہے؟"

"چھ میل دُور ہے یہاں سے جناب۔" ڈرائیور نے بڑے جلے کٹے لہجے میں کہا۔

"کوئی بات نہیں میرے ویر! دیکھو نا میرے ساتھ زنانہ سواری ہے۔ اتنی دُور ہم پیدل کیسے جا سکیں گے اور یہ بیمار ہیں۔" میں نے ایک بار پھر بڑی نرمی سے کہا۔

صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ دُور کسی مسجد سے اللّٰہ اکبر کی صدا اُٹھ رہی تھی۔ موذن نے کہہ دیا تھا کہ 'الصّلوٰۃ خیرٌ من النوم' مگر اس ڈرائیور کا دِل نہیں پسیجا تھا، بولا۔

"بھائی جی کرایہ نکالیں مجھے دیر ہو رہی ہے۔ میں چوگوٹھ نہیں جا سکتا یہ قطعی بات ہے۔"

"کیا نام ہے تیرا بھائی؟" میں نے سیٹ کی پُشت پر سر ڈالتے ہوئے کہا۔

"تم گاڑی سے اُترتے ہو کہ نہیں۔ مجھے نہیں جانتے ہو تم۔ تمھاری ایسی سواریاں میں نے بہت دیکھی ہیں۔" ڈرائیور نے بڑے تیز لہجے میں کہا، اور سامنے ڈلیش بورڈ میں رکھا پستول اس نے ایک جھٹکے سے نکال کر مجھ پر اتنی پھرتی سے تان لیا کہ میں حیران رہ گیا۔

"مار دے یار! یہ پہلی گولی تو میرے ہی سینے میں اُتار دے۔ تیرا یہ بڑا احسان ہوگا میرے بھائی۔" میں نے بڑے ہی گلوگیر لہجے میں کہا۔ آسیہ کی تصویر میری نگاہوں میں جم کر رہ گئی تھی اور مجھے ہر شے سے نفرت ہوتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ اپنا سر بھی مجھے اپنے کندھوں پر بوجھ معلوم ہوتا تھا۔ کسی چیز کے مقابلے کی میرے اندر سکت ہی نہیں رہی تھی۔ میری یہ بات سُن کر میرے لہجے کی شکست خوردگی کو محسوس کر کے وہ ڈرائیور پریشان ہو گیا۔ اُس نے پستول پیچھے ہٹایا اور مجھے گہری گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"تم نے مجھے پاگل کر دیا ہے۔ بہت دُکھی معلوم ہوتے ہو۔ کیا دکھ ہے اسے بہن جی!" اب کی بار اُس نے سروری کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ سروری نے کوئی جواب نہیں دیا۔ منہ دُوسری طرف پھیر لیا۔ ڈرائیور خجل سا ہو کر رہ گیا، بولا۔ "ٹھیک ہے میرے بھائی میں تمھیں چوگوٹھ پہنچا ہی دیتا ہوں۔ میں نے تجھ سے خوفزدہ ہو کر پستول نکالا تھا مگر لگتا ہے تیرا کوئی پُرزہ ہی ٹوٹ چکا ہے۔" یہ کہہ کر وہ چوگوٹھ کی طرف چل دیا۔

سروری نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور پرے ہٹ کر کھڑکی میں سے باہر دیکھنے لگی۔ پو پھٹ رہی تھی۔ تارے دم توڑ گئے تھے۔ اوس میں بھیگی فصلوں پر سے تیرتی ہوئی ہوا ایک نئی صبح کی خبر دے رہی تھی۔ وہ منظر اتنا خوبصورت تھا کہ میرا دل چاہا وہیں اُتر کر فطرت کا حِصّہ بن جاؤں کسی پودے کا روپ دھار کر وہیں رہ جاؤں۔ یہ حرکت، یہ عمل یہ ارادے کی حرکی قوت، یہ جھمیلے یہ زندگی کے ہنگامے، اس جمود اور سکوت پر ہزار بار قربان کر دیے جائیں تو بھی اس صبح کے ایک لمحے کی قیمت ادا نہیں ہو سکتی جو آہستہ آہستہ زمین کی طرف رُخ کر رہی تھی۔

سروری بھی چپ تھی اور میں بھی۔۔۔ وہ آہو کے بارے میں سوچ رہی ہو گی، اپنے گھر کا تصوّر اس کے ذہن میں ابھر رہا ہو گا اور میں آسیہ کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اس کے زخموں کا حساب لگا رہا تھا جو میری وجہ سے

اس کے بدن اور رُوح پر لگے تھے۔
سروری کا رویہ مجھے حیران کرتا تھا۔کبھی کبھی تو میں سوچتا تھا، کہ یہ عورت مجھے کسی نئی مصیبت میں تو نہیں پھنسا رہی ہے میرے پہلو میں وہ ایک مغویہ کی حیثیت سے بیٹھی تھی۔وہ جانتی تھی کہ اُس پر جبر ہوا ہے۔ وہ اپنی مرضی سے سلقے کے گھر نہیں پہنچی تھی۔اس کی قوتِ مزاحمت میں نے ختم کر دی تھی۔جب تابیا اور گوگا اور قطب دین اس کے پاس پہنچے تھے تو وہ ہوش میں تو تھی مگر اس قابل نہیں تھی کہ اپنے آپ کو اُن کے پنجے سے بچا سکتی۔یہی وجہ تھی کہ وہ لوگ اُسے اتنی آسانی سے وہاں سے اُٹھا لائے تھے۔اس کی سماعت کے دَر کھلے تھے۔وہ دیکھ بھی سکتی تھی اور اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ کن مراحل سے گزری ہے اس کے باوجود وہ بڑی ثابت قدمی سے میرے ساتھ چل رہی تھی۔مجھ پر وہ اندھا دُھند اعتماد کرتی چلی گئی تھی۔مگر اس اعتماد نے مجھے متزلزل کر رکھا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر اُس نے مجھے کسی رنگین دام میں پھنسا دیا تو میرا انجام کیا ہوگا ؟ پھانسی کا تختہ تو مجھے صاف سیدھا نظر آ رہا تھا مگر آسیہ کو تمام خطرات سے محفوظ کیے بغیر میں مرنا نہیں چاہتا تھا۔مجھے اس خیال ہی سے وحشت ہوتی تھی۔اپنی صلیب میں ساتھ لیے پھرتا تھا۔مجھے معلوم تھا کہ ایک دن کسی اجنبی شہر کے اجنبی چوک میں رک کر میں اس صلیب پر چڑھ کر جان دے دُوں گا۔مجھے قانون کے لمبے ہاتھوں۔۔۔مرنا منظور نہیں تھا کہ ایک بے انصاف معاشرے میں صاحبِ امر لوگوں کے فیصلے کبھی بھی مبنی بر انصاف نہیں ہوتے ہیں۔ہو ہی نہیں سکتے۔یہی وجہ تھی کہ میں اس فرصت یک لحظہ کو غنیمت سمجھ کر اپنی اس ندامت کو مٹانے کی کوشش میں مصروف تھا جو آسیہ کے سامنے اٹھانی پڑ رہی تھی۔وہ ہر کہیں پر موجود تھی اور میرے اعصاب پر اپنی چیخوں کے کوڑے برساتی رہتی تھی۔ اُسے میں کیا آرام پہنچا سکا تھا۔
ٹیکسی ڈرائیور کی نگاہ سامنے کے آئینے پر جمی تھی راستہ بہت ہی ناہموار تھا اور رات بھر کی اوس میں بھیگی ہوئی دُھول اُٹھ اُٹھ کر ہمارے پیچھے لپکتی تھی۔اچانک میرا کمبل میرے کندھوں پر سے اُتر گیا۔ ڈرائیور نے میرے کندھے سے لٹکتی اسٹین گن آئینے میں دیکھ لی۔اس کا چہرہ بھی مجھے آئینے میں صاف نظر آ رہا تھا۔اسٹین گن پر نظر پڑتے ہی اس کے لبوں سے سیٹی سی نکلی اور کھنکارتا ہوا سنبھل کر بیٹھ گیا۔منہ سے کچھ نہیں بولا۔رفتار اس نے اور تیز کر دی۔اس کا رنگ اڑنے لگا تھا۔میں نے کمبل پھر سے سیدھا کر کے کندھے پر ڈال لیا۔مگر اس کی دہشت کم نہ ہوئی۔کوئی دو فرلانگ آگے چل کر بولا۔
"آپ مجھ سے ناراض تو نہیں ہیں بھائی جی۔"
"نہیں بھئی! ناراضی کس بات کی؟ یہ تمھاری ٹیکسی ہے تمھاری مرضی سے چلتی ہے کوئی بھلا تمھیں کس طرح مجبور کر سکتا ہے؟"
"ہاں جی ہو تو ہے۔آپ۔۔۔آپ بہت اچھے آدمی ہیں جی۔میں ہی پاگل تھا۔مجھے معاف کر دیں۔میں نے آپ پر پستول تان لیا تھا۔"
"کوئی بات نہیں یار۔ایسا تو ہوتا ہی ہے۔ہم تمھیں زیادہ کرایہ دیں گے میرے بھائی۔" میری یہ بات سن کر وہ چپ ہو گیا اور اس کے بعد چوگوٹھ پہنچنے تک کچھ نہ بولا۔
ہمیں اس نے گاؤں سے باہر ہی اتار دیا۔میں نے اُسے پچاس رُوپلے دیے تو وہ خوش ہو گیا۔بولا۔
"آپ کا بہت بہت شکریہ چوہدری صاحب۔میں ایک بار پھر آپ سے معافی مانگتا ہوں۔"
میں نے اس کے لہجے کی ندامت دیکھی تو جانے کیا ہوا میری آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔چند ثانیوں تک میں اُسے اسی طرح ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا اور پھر اس کا کندھا تھپتھپا کر میں ٹیکسی سے اتر گیا۔سروری دُور سے کھڑی گاؤں کی طرف دیکھ رہی تھی جس پر اونچے اونچے درختوں نے چھاؤں کر رکھی تھی۔
ٹیکسی وہاں سے ہٹی تو سروری میرے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے لگی۔وہ سردی سے ٹھٹھر رہی تھی مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میں اس کے لیے کوئی گرم کپڑا نہ منگوا سکا تھا۔بولی۔
"یہ ہے چوگوٹھ۔اور آہو صاحب نے لڑکیوں کو یہیں پہنچایا ہے۔"
"آپ کو ٹیلیفون اُس نے کہاں سے کیا تھا؟"
"پتوکی سے۔"
"ہوں۔اب کیا کرنا ہوگا مجھے؟"
"دیکھیں آپ میرے ساتھ چلیں ڈھلوں صاحب سے میں آپ کو ملوا دیتی ہوں۔"
"اس سے کیا ہوگا۔وہ آپ کو جانتے ہیں اُن سے کہیں کہ وہ رابعہ اور نفیسہ کو ہمارے ساتھ کر دیں۔"
"میں یہی کہوں گی۔آپ فکر نہ کریں۔"
"حیرت مجھے یہ ہے کہ لڑکیوں کو یہاں لانے سے آہو کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟"
"دیکھیں جیلانی صاحب! میرا خیال ہے کہ آہو کے پیشِ نظر دو مقاصد تھے۔ایک تو یہ کہ اس طرح آپ کو دباؤ میں لا کر وہ آپ سے اپنے اور میرے اُگلوا سکے گا۔دُوسرا مقصد یہ تھا کہ وہ ہادی علی کے خلاف آپ کا منہ بند رکھ سکتا ہے۔"
"کیا مطلب؟ مجھے پریشان کر کے وہ اس بات کے امکان کو قریب لا رہا ہے کہ میں کسی بھی پولیس اسٹیشن جا کر ساری بات بتا دوں۔"
"نہیں! آپ ایسا نہیں کر سکتے۔آپ کی اپنی جان خطرے میں ہے۔آہو صاحب دراصل آپ کو اسی چکر میں رکھنا چاہتے ہیں۔"
"میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔مجھے تو یہی لگتا ہے کہ وہ دو خوبصورت لڑکیوں کو ڈھلوں کے پاس فروخت کر گیا ہے۔"

"یہ بھی ممکن ہے کیونکہ ڈھلوں صاحب اپنا حرم خوبصورت عورتوں سے بھرا رکھنے کے عادی ہیں۔"
"اور کتنی عورتیں ہیں اس کے گھر میں؟"
"زیادہ نہیں! بس سال چھ ماہ کی خدمت کے بعد وہ عورت کو آگے بھیج دیتا ہے۔زیادہ لمبے طوطے نہیں پالتا ہے وہ۔"
"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ان دونوں کی عزت یہاں محفوظ نہیں رہی ہو گی۔"
"میں کچھ کہہ نہیں سکتی مگر مجھے یقین ہے کہ ابھی ان کی باری نہیں آئی ہو گی۔"
"اگر ایسا ہو گیا خانم تو پھر پتہ نہیں کیا ہو۔میں۔۔۔میں اپنے آپ میں نہیں رہوں گا خانم! بڑے گھر تباہ ہو جائیں گے۔" میرے منہ میں زہر گھلنے لگا۔دماغ کی نسیں کھنچنے لگیں میرے چہرے پر پھیلی غصّے کی لہر دیکھ کر سروری ٹھٹکی اور بولی۔
"آپ کو بڑے صبر اور تحمل سے کام لینا ہو گا جیلانی صاحب! آپ کا واسطہ ڈھلوں صاحب سے ہے۔علاقے میں بادشاہ بن کے بیٹھا ہے وہ۔"
اب ہم گاؤں کے قریب پہنچ چکے تھے۔اور چڑھتے سورج کی رُوپہلی کرنیں درختوں کو چھونے لگی تھیں۔
وہ گاؤں دو حصّوں میں منقسم تھا۔ایک حصّہ کچے گھروندوں کا تھا جس میں مزارع اور کمّی کمین رہتے تھے۔دُوسرا حصّہ ڈھلوں صاحب کی حویلی پر مشتمل تھا۔وہ حویلی کئی ایکڑ زمین پر پھیلی تھی۔اس کی عمارت ایک وسیع و عریض چار دیواری کے وسط میں کھڑی تھی۔
گاؤں میں داخل ہونے سے پہلے میں نے سروری کو ایک جگہ روک لیا۔وہ استفہامی نظروں سے مجھے دیکھتی ہوئی بولی۔"کہیے۔"
"اس بات کی کیا ضمانت ہے خانم کہ آپ اس حویلی میں جا کر بدل نہیں جائیں گی؟" میرے لہجے کی سنجیدگی پہ وہ حیران ہونے لگی۔بولی۔
"کیا مطلب ہے آپ کا؟ مجھ پر اعتبار نہیں ہے آپ کو؟"
"میرا مطلب صاف ظاہر ہے خانم! میں بہت دُکھی ہوں۔مجھے آسیہ تک پہنچا دیں،میں کوئی اور جھٹکا برداشت نہیں کر سکوں گا۔"
"مجھ پر بھروسہ رکھیں جیلانی صاحب! میں وہ سروری نہیں رہی ہوں اب۔آپ نے میری کایا پلٹ دی ہے۔میں اپنے آپ سے شرمندہ ہوں۔آپ سے میں دھوکا نہیں کر سکتی ہوں، بالکل پریشان نہ ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے میرا بازو تھپتھپایا۔بولی۔"مجھے نہیں معلوم تھا جیلانی صاحب! آپ کے بارے میں میں سخت غلط فہمی میں مبتلا تھی۔مگر اب تو میں آپ کی احسان مند بھی ہوں کہ آپ نے آج میری عزت بچائی ہے یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔میں آہو کے ساتھ بھی ہوتی تو ایسے حالات میں وہ بھی کچھ نہ کر سکتا۔" پہلی بار اُس نے آہو کے لیے صاحب کا لفظ استعمال نہیں کیا تھا۔
"ٹھیک ہے چلیں۔جو ہو گا دیکھا جائے گا،" یہ کہہ کر میں اس کے ساتھ چلنے لگا۔
پختہ حویلی کے بڑے سے دس فٹ اُونچے دروازے کے سامنے پہنچ کر ہم رُک گئے۔دروازے کی کھڑکی کھلی تھی۔ہمیں سامنے دیکھ کر ایک آدمی باہر نکلا۔وہ کندھے سے پستول لٹکائے ہوئے تھا۔
"ہم ڈھلوں صاحب سے ملنا چاہتے ہیں۔میں آہو صاحب کی بیوی ہوں لاہور سے آئی ہوں۔" سروری نے تعارف کرایا۔
"آؤ۔جی آیاں نوں۔اندر چلو بی بی جی! آپ بھی چلیں بھائی جی۔" یہ کہہ کر وہ آدمی ہمیں کھڑکی میں سے گزار کر اندر لے گیا۔دائیں ہاتھ ایک وسیع کمرہ تھا جس میں ہر طرف دیوار کے ساتھ بیس کے قریب کرسیاں دھری تھیں اُن کے سامنے ایک لمبی سی میز تھی۔دُوسری دیوار کے ساتھ بھی اتنی ہی کرسیاں پڑی تھیں۔اور اُن کے سامنے بھی خاصی لمبی میز تھی۔فرش پر نیلے رنگ کی موٹی دری بچھی تھی۔میزوں کے درمیان جگہ کھلی تھی۔چار کرسیوں پر ڈھلوں صاحب سے ملنے والے آدمی بیٹھے تھے۔وہ بھی غرض مند تھے اور صبح ہی صبح وہاں آ گئے تھے۔

۳۱

ملازم نے مجھے تو کرسی پر بٹھایا اور سروری کو ساتھ لے کر کمرے سے باہر نکل گیا۔سروری کا اٹیچی کیس میرے پاس ہی پڑا تھا۔اُس میں میری بھی کئی چیزیں بند تھیں۔
میرے دل میں عجیب سی پکڑ دھکڑ ہو رہی تھی۔میں ایک ایسے اجنبی دروازے پر بیٹھا تھا جس کے مکینوں کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔میں نہیں جانتا تھا کہ اگلی گھڑی مجھ پر کس انداز سے وارد ہو گی میرے سامنے دیوار کے ساتھ لگی کرسیوں پر جو چار آدمی بیٹھے تھے، اپنی وضع قطع کے اعتبار سے بڑے ہی مغلوک الحال نظر آتے تھے۔اُن کی بھی کوئی بادلی غرض انہیں کھینچ کر اس بڑے در پر لے آئی تھی جس کے پیچھے میری بہن آسیہ بند تھی۔وہ دروازہ بھی جیل کے دروازے ایسا تھا، اونچا اور فراخ۔انسانوں کو نگلنے کے لیے جس طرح درِ محبس بہت فراخ ہوتا ہے کچھ ایسی ہی صورتِ حال مجھے وہاں بھی نظر آتی تھی۔مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ مختار ڈھلوں کا دروازہ بھی آدمیوں کو نگلتا ہے کہ نہیں۔میری نظریں برابر اس کمرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔مجھے محسوس ہوا کہ اس کمرے میں کئی اشتہار ٹنگے ہوئے ہیں۔وہ ایک سیاسی پارٹی کی انتخابی مہم کے اشتہار تھے اور اُن کی عبارتوں سے صاف ظاہر تھا کہ وہ پارٹی جس کا امیدوار ہادی علی تھا اس پارٹی کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ان اشتہاروں کو پڑھ کر مجھے محسوس ہوا کہ

انتخابات کچھ زیادہ دُور نہیں تھے۔ نامزدگیوں کے دن قریب آ گئے تھے۔ اور اس علاقے میں مختار ڈھلوں کی انتخابی مہم زوروں پر تھی۔ اور مختار ڈھلوں کو فرشتہ ثابت کیا گیا تھا۔ وہ سب کچھ دیکھ کر مجھے ایک بار پھر یہ احساس ہونے لگا تھا کہ آہو کا مختار ڈھلوں کے گھر پہنچنا بے وجہ نہیں تھا۔ وہ اس زمیندار کی بھی مدد کر رہا تھا اور اس کوشش میں تھا کہ مختار ڈھلوں قومی اسمبلی کا رکن بن جائے۔

ابھی مجھے وہاں بیٹھے ہوئے پندرہ بیس منٹ ہی ہوئے تھے کہ وہی ملازم جو سروری کو لے کر حویلی کے اندر گیا تھا تیز تیز قدم اُٹھاتا اندر آیا اور بولا۔ ”آؤ بات شاہ آپ کو ڈھلوں صاحب نے بُلایا ہے۔“

میں کمبل سنبھالتا ہوا اُٹھا اور اس کے پیچھے چل دیا۔ کمرے سے نکل کر ہم ڈیوڑھی میں آئے اور ڈیوڑھی کا اندرونی دروازہ عبور کر کے حویلی کی طرف چل دیے۔ سامنے پختہ اینٹوں کی ایک سڑک سی بنی تھی۔ جس پر سے ایک ٹرک آسانی سے گزر سکتا تھا۔ اس کے دو رویہ اونچے اونچے سرو کے درخت لگے تھے اور ان درختوں کے پیچھے وسیع قطعۂ زمین پر پھل دار اور پھولدار درخت اور پودے اُگے تھے۔ درمیان میں خوبصورت روشیں بنی تھیں اور ہر طرف ایک پُربہار باغ کا سا نظارہ دکھائی دیتا تھا۔

وہ ملازم میرے آگے آگے چلتا ہوا مجھے حویلی کے دروازے پر لے گیا۔ وہ جدید طرز کی عمارت تھی جس کے سامنے قوس کی شکل کا ایک پورچ بنا تھا اور وہاں ایک لمبی سی سُرخ رنگ کی گاڑی کھڑی تھی۔

ملازم نے مجھے پورچ میں سے گزار کر ایک برآمدے میں پہنچایا، اور پھر ایک دروازے کا جالی دار پٹ کھول کر بولا۔

”آپ کے پاس کوئی ہتھیار ہو تو مجھے دے دیں، واپسی پر مل جائے گا۔“ یہ بات اُس نے کچھ ایسے غیر متوقع انداز میں کہی کہ میں سُن ہو کر رہ گیا۔ چند لمحوں تک میں سوچ میں ڈوب گیا۔ وہ میرے قریب ہو کر بولا۔ ”ڈھلوں صاحب سے ملنا ہے کہ نہیں؟“

”ملنا تو ہے بات شاہ، مگر یہ شرط کیوں لگاتے ہو؟“

”ڈھلوں صاحب سے سب لوگ اسی طرح ملتے ہیں — انھیں ہتھیاروں سے نفرت ہے۔“

”مگر تم — تم نے بھی تو یہ پستول باندھ رکھا ہے میرے بات شاہ۔“ میں نے دبی زبان میں کہا۔

”میں تو اُن کا نوکر ہوں بات شاہو! اُن کے در کا کُتا — میرے دانت تو تیز ہی ہونے چاہئیں نا۔“

”مجھے بھی کُتا بناؤ گے؟“

”زیادہ بحث نہ کر بھائی! مجھے اور بھی بڑے کام ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ مجھے یہ ہتھیار واپسی پر مل جانے چاہئیں۔“ میں نے یہ کہا اور بڑے بجھے ہوئے دل سے اپنی اسٹین گن اور چیمبر اس کے حوالے کر دیے مگر اُن کو خود سے جُدا کرتے ہوئے میرا بدن کانپ کر رہ گیا۔ اگر وہ ڈیوڑھی میں مجھ سے یہ سوال کرتا تو میں آگے ہی نہیں۔ لیکن جس مقام پر پہنچ کر اُس نے میرے ہتھیار مجھ سے طلب کیے تھے وہاں سے لوٹ کر جانا مجھے محال نظر آتا تھا۔

میرے دونوں ہتھیار اس نے سنبھالے اور پھر بولا۔ ”کوئی چیز تو نہیں ہے کوئی چاقو شاقو۔“

”نہیں بھائی! کوئی اور چیز نہیں ہے میرے پاس۔“

میری یہ بات سُن کر اُس نے میرے سارے جسم پر ماہر پولیس افسروں کی طرح ہاتھ پھیرا۔ جب اُسے تسلی ہو گئی کہ نوٹوں اور سگریٹوں کے سوا میرے پاس اور کوئی چیز نہیں تو اُس نے دروازہ کھول کر مجھے اندر داخل کر دیا۔ سامنے ایک راہداری تھی۔ وہ میرے ساتھ چلتا ہوا آگے بڑھا اور دائیں ہاتھ کا ایک دروازہ کھول کر بولا۔ ”اندر چلے جائیں۔ ڈھلوں صاحب آپ سے یہیں مل لیں گے۔“

میں نے اندر قدم رکھا تو معلوم ہوا کہ سارا کمرہ صندل کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ اس خوشبو کا موہوم سا احساس مجھے راہداری میں بھی ہُوا تھا جس کے فرش پر دبیز قالین بچھا تھا۔ اتنا دبیز کہ کسی کے قدموں کی چاپ اُبھر ہی نہیں سکتی تھی۔ اس سے کہیں زیادہ خوبصورت اور دبیز قالین کمرے میں بچھا تھا۔ دائیں ہاتھ ہیٹر جل رہا تھا۔ بڑا ہیٹر۔ یہ بڑی عجیب بات تھی کہ اس گاؤں میں سے گزرتے ہوئے میں نے کسی جگہ بجلی کا کوئی کھمبا یا تار نہیں دیکھا تھا مگر ڈھلوں کے گھر میں بجلی موجود تھی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اس آدمی نے وہاں اپنا جنریٹر لگا رکھا تھا جو اتنا طاقتور تھا کہ اس کی حویلی کی تمام ضروریات پوری کر رہا تھا۔

کمرے میں دو صوفے دھرے تھے جن کے سامنے کشمیری طرز کی اخروٹ کی بنی ہوئی میزیں رکھی تھیں۔ میں ایک صوفے میں دھنس کر بیٹھ گیا اور سگریٹ سلگا کر پینے لگا۔ عمارت کے تمام حصّوں میں مکمل خاموشی طاری تھی۔ کسی طرف سے بھی مجھے کوئی آواز سُنائی نہیں دے رہی تھی۔ دراصل وہ مکان کا مردانہ حصّہ تھا اور اس کا زنان خانہ عقب میں تھا۔ دونوں حصّوں کے درمیان کوئی بیس فٹ کا فاصلہ تھا جسے انھوں نے ایک چھت سے ڈھانپ رکھا تھا۔

مجھے وہاں بیٹھے آدھ گھنٹہ گزر گیا مگر ڈھلوں صاحب وہاں نہ آئے۔ البتہ اس عرصے میں ایک ادھیڑ عمر کی عورت دو بار اندر آئی۔ پہلی بار تو وہ میرے لیے چائے مکھن انڈے اور توس لائی۔ اور اس کے کوئی بیس منٹ بعد وہ میرے سامنے پھل رکھ گئی۔ جب وہ جانے لگی تو میں نے اُسے روکا۔

”وہ ڈھلوں صاحب کہاں ہیں بی بی! میں تو اُن کے انتظار

میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔“

”پتہ نہیں جی، مجھے تو صغیر خان نے کہا تھا کہ میں آپ کو ناشتہ اور پھل دے آؤں۔“

”یہ صغیر خان کون ہے؟“

”وہ جی حویلی کا منشی ہے نا! اُس نے مجھے یہی کہا تھا۔“

”اچھا ٹھیک ہے، ڈھلوں صاحب سے ہمارا سلام بولو۔ کہو وہ جلد ہی مہربانی کریں تو دُعا دُوں گا۔“

وہ میری بات سن کر کوئی جواب دیے بغیر باہر نکل گئی اور میں اس معطر کمرے کی نیم تاریک فضا میں بیٹھا سوچتا ہی رہ گیا کہ میری خم بارہ تقدیر مجھے کہاں لے آئی ہے۔ وہ چرباک دیدہ سروری مجھے کہیں نظر نہیں آئی تھی اور میں اس امید میں وہاں تک جا پہنچا تھا کہ میری سب سے پہلے اسی سے ملاقات ہو گی۔ مگر وہ خدا جانے کس جھولے میں جھونٹے لے رہی ہو گی۔ اتنا البتہ ضرور تھا کہ اس کی وجہ سے مجھے حاضری کے لیے فوراً اندر بُلا لیا گیا تھا۔

دس منٹ اور گزر گئے۔ میں پریشان ہو کر وہاں سے اُٹھ جانے کی سوچ رہا تھا کہ دروازہ کُھلا اور ایک ساڑھے چھ فٹ قد کا... اونچا لمبا آدمی اندر داخل ہوا۔ اُس کی سُرخ و سفید رنگت، اس کی تلوار کے گھاٹ ایسی خمیدہ بھنویں، بڑی صفائی سے تراشی ہوئی سینڈھرسٹ طرز کی مونچھیں اور اُس کی شارک اسکن کی اچکن سفید براق شلوار اور طلائی کام سے مزین نازک سی جُوتی دیکھ کر میں اتنا مرعوب ہوا کہ ایک دم صوفے سے اٹھ کر یوں کھڑا ہو گیا جیسے میں اس کا کوئی زرخرید غلام ہوں۔

”السلام علیکم جناب!“ بے ساختہ یہ الفاظ میرے منہ سے نکل گئے۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا نہیں، بڑی سنجیدگی سے اس نے وعلیکم السلام کہا اور پھر مجھے بیٹھنے کا اشارہ کر کے میرے ساتھ بڑے صوفے پر بیٹھ گیا۔ اُس کے پیچھے دو آدمی اندر آ گئے تھے۔ ایک نے اُس کا سنہری سگریٹ کیس اور لائیٹر لا کر سامنے رکھ دیا اور دُوسرا دائیں ہاتھ مودّب کھڑا رہا۔ اس نے بھی کندھے پر پستول لٹکا رکھا تھا۔ وہ آدمی جو سگریٹ کیس لایا تھا، بڑے مودّب انداز سے باہر نکل گیا تو اس آدمی نے دوسرے ملازم کو بھی باہر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ فوراً ہی وہاں سے ٹل گیا۔ جب ہم دونوں تنہا رہ گئے تو وہ بولا۔

”میں نے آپ کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔“ اُس کی آواز بھاری بھرکم تھی اور اُس کا طنطنہ اس بات کی غمازی کرتا تھا کہ اُسے اپنا حکم منوانا آتا ہے۔ وہ مجھے کسی بہت بڑی ریاست کا نواب نظر آتا تھا۔ ایسی سج دھج کے لوگ خال خال ہی نظر آتے ہیں۔

”میں پہلی بار ادھر آیا ہوں جناب۔“

”کیسے آئے ہیں آپ؟“ اب بھی وہ میری طرف نظر اُٹھا کر دیکھنا اپنے لیے باعثِ عار سمجھ رہا تھا۔ پہلی بار مجھے اپنے لہجے کی فروتنی اور اس کی آواز کی رعونت کا احساس ہوا اور میرے نفس نے مجھے ایسا کچوکا دیا کہ میں ایک دم سنبھل کر بیٹھ گیا۔ میں اُس کی حرکات و سکنات کا گہری نظر سے جائزہ لے رہا تھا۔ وہ سگریٹ سُلگاتے وقت خاص انداز سے لائیٹر کے شعلے کو اوٹ میں لے لیتا تھا۔ اور جلتے ہوئے سگریٹ کو دوبارہ سہ بارہ خواہ مخواہ آگ دکھانے کا عادی تھا۔

”بتایا نہیں آپ نے کہ آپ کا آج کیسے ادھر آنا ہوا؟“ وہ اب بھی بے حد سنجیدہ تھا اور میری طرف دیکھنے کے بجائے وہ لائیٹر سے کھیل رہا تھا۔ ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر وہ شلوار کی سلوٹیں دُور کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ اس کی ان حرکات سے تکبّر کی بُو آتی تھی میں چِڑ سا گیا۔

”میرا خیال تھا آپ کو میری حاضری کا مقصد معلوم ہو گا۔“

”نہیں صاحب! مجھے آپ بتائیں گے تو پتہ چلے گا ورنہ از خود میں کیسے سمجھ سکتا ہوں۔“

”میں دراصل اپنی بہن آسیہ اور اس کی سہیلی نفیسہ کے لیے آیا ہوں۔“

”اوہ! میں سمجھا۔ وہ جنھیں آہو صاحب یہاں لائے تھے؟“ اُس نے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا۔

”جی ہاں میں اسی سلسلے میں آیا ہوں ڈھلوں صاحب! وہ بچاری دونوں بہت مظلوم ہیں اور آپ کے پاس میں دادرسی کے لیے حاضر ہوا ہوں۔“

دیکھو بھائی! وہ لڑکیاں میری مہمان ہیں اور میں آہو صاحب کی اجازت کے بغیر آپ کے یا کسی کے بھی ساتھ نہیں بھیج سکتا۔“

”اجازت! وہ — وہ آہو صاحب کی بیوی نہیں ملی ہیں آپ سے — سروری خانم۔“

”ملی ہیں — اور اچھا ہے کہ وہ یہاں آ گئی ہیں میرے دل میں اُن کی بڑی عزّت ہے، وہ بھی تو مظلوم ہیں۔“

”میں سمجھا نہیں جناب۔“

”سمجھ جائیں نا! انہیں آپ نے کہاں سے اُٹھایا تھا؟“

”اوہ! تو یہ بات ہے۔“ میں بڑبڑایا۔

”بتایا نہیں آپ نے کہ وہ آپ تک کیسے پہنچی تھیں۔“

”انھوں نے کیا بتایا ہے آپ کو؟“

”مجھے ساری بات آہو نے بتا دی تھی۔ اس کی تصدیق سروری خانم نے بھی کر دی ہے۔“

”وہ ٹھیک کہتی ہیں۔ اور اب وہ چاہتی ہیں کہ یہ جھگڑا ختم ہو جائے۔“

”عین ممکن ہے کہ وہ خوف کی وجہ سے ایسا کہتی رہی ہوں۔“

”نہیں وہ بہ رضا و رغبت میرے ساتھ یہاں تک آئی ہیں۔“

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ آپ کے ساتھ چال چل گئی ہوں اور آپ اپنی سادگی میں مات کھا گئے ہوں۔"

"نہیں! ایسا نہیں ہے جناب! ابھی آدمیت کی موت واقع نہیں ہوئی ہے۔"

وہ مسکرایا۔ بڑے پُروقار انداز سے ہاتھ اٹھایا جیسے کہہ رہا ہو آدمیت کہاں ملتی ہے اس دُنیا میں۔ اس کی انگلیوں کی سنہری انگوٹھیاں چمک اُٹھیں، بولا۔

"اس بیچاری نفیسہ کو کیوں اُٹھا لاتے تھے جیل سے؟"

"اس نے کیا بتایا ہے آپ کو؟"

"وہی۔ جو اُس کے ساتھ بیتی ہے۔ وہ تو ڈاکٹر ہے اور سرکاری ملازم ہے، اُسے آپ نے زبردستی آسیہ کے ساتھ کار میں ڈال لیا۔"

"میرا خیال ہے کہ۔۔۔ مگر خیر۔۔۔ مجھے وہ قدم مجبوراً اٹھانا پڑا تھا کیونکہ میں سمجھا وہ بھی آسیہ کے ساتھ بھیس بدل کر جیل سے بھاگنا چاہتی ہے۔" میں نے نفیسہ کے بیان کی تائید کرتے ہوئے باقی سارے واقعات پر مٹی ڈال دی۔ اس میں نفیسہ کی بہتری تھی۔

"دیکھیں میں نے نفیسہ کو کل رات پولیس کے حوالے کر دیا تھا۔ اُس نے وہاں جا کر یہی بیان دیا کہ اسے جیل سے نکلتے ہی اس بدمعاش نے زبردستی کار میں ڈال لیا تھا اور وہ بے بس ہو گئی تھی۔"

"اوہ نو۔۔۔ تو اس کا مطلب ہے کہ نفیسہ کو آپ واپس بھیج چکے ہیں۔" میرا دل بیٹھنے لگا۔ آسیہ اس گوہار میں تنہا رہ گئی تھی۔

"آسیہ کے بارے میں کیا سوچا ہے آپ نے؟"

"اس کا فیصلہ آہو صاحب ہی کر سکتے ہیں مجھے تو بہر طور ایک امانت کی طرح اس کی حفاظت کرنی ہے۔"

"لیکن یہ۔۔۔ اس کا کوئی جواز نہیں ہے ڈھلوں صاحب!"

"کس کے پاس؟"

"کسی کے پاس بھی نہیں۔ اور آپ کے پاس تو بالکل ہی کوئی جواز نہیں ہے کیونکہ آپ کو تو ہم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔"

"میں سمجھتا ہوں جیلانی میاں۔ میں سب سمجھتا ہوں۔ آپ میرے مہمان ہیں۔ آپ کی عزت کرنا میرا فرض ہے۔ اس گھر کو اپنا گھر سمجھیں۔ آسیہ اس گھر میں بالکل محفوظ ہے۔ آپ چند دن یہاں رہیں۔ آہو صاحب کو میں بلوا لیتا ہوں پھر بیٹھ کر آپ کا میں تصفیہ کروا دوں گا۔" اب کی بار اس کے لہجے میں ہلکی سی گرمجوشی جھلکتی تھی۔

"کیا نفیسہ اپنی ملازمت پر واپس چلی گئی ہے؟"

"ضرور چلی گئی ہوگی۔ کیوں نہ جائیگی۔ اس پر تو خواہ مخواہ یہ مصیبت آ گئی تھی۔"

"آپ نے آسیہ کو پولیس کے حوالے کیوں نہیں کیا؟"

"آہو صاحب اس کے حق میں نہیں تھے اور رہ گئی نفیسہ کی بات تو وہ بے چاری بالکل بے گناہ تھی۔"

"وہ آسیہ کے بارے میں پولیس کو بتا سکتی ہے کہ وہ کہاں ہے۔"

"یہ بات میں نے اسے سمجھا دی تھی اور اسی میں اس کی بہتری ہے کہ وہ اپنا منہ بند رکھے۔ ورنہ ہم نفیسہ کو بھی مجرم ثابت کر سکتے ہیں کئی باتیں کہی جا سکتی ہیں۔ افسانہ تراشا جا سکتا ہے۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ اور نفیسہ کو واپس بھیج کر آپ نے بہت اچھا کیا۔ بیچاری کے لیے میں بھی بہت شرمندگی محسوس کرتا تھا۔ میری اور آسیہ کی تو شاید قسمت میں ہی ذلت ہے۔"

"نہیں ایسا نہ سوچیں! اس کے یہاں پہنچ جانے میں بھی کوئی بہتری پوشیدہ ہوگی۔"

"جی ہاں ڈھلوں صاحب وہ دَر دَر کی ٹھوکریں کھاتی پھر رہی ہے۔ اس میں بھی کوئی بہتری مضمر ہو گی۔" میرے لہجے کی اداسی نے اسے متاثر کر دیا۔ وہ اپنے صوفے سے اٹھ کر میرے پاس آ بیٹھا اور بولا۔ "لیں سگریٹ پیئیں۔ آپ کا برانڈ پتہ نہیں کیا ہے لیکن۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا طلائی سگریٹ کیس میری طرف بڑھایا۔ اس کا رویہ آہستہ آہستہ بدلتا جا رہا تھا۔ شاید یہ میری باتوں کا اثر تھا یا اُس کی حکمت عملی کا کوئی مرحلہ تھا۔ بہرحال وہ پہلے سے کہیں کھل کر بات کر رہا تھا۔ میں اس کا پیش کردہ سگریٹ سلگا چکا تو وہ بولا۔ "آپ نے اپنے مستقبل کے بارے میں کیا سوچا ہے؟"

"میرا مستقبل تو تختۂ دار ہے ڈھلوں صاحب! آہو صاحب نے آپ کو میرے بارے میں سب کچھ بتا ہی دیا ہوگا۔"

"اسی لیے تو پوچھ رہا ہوں۔"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں ڈھلوں صاحب! آسیہ کو لے کر کسی طرف نکل جاؤں گا اور کسی جگہ روپوش ہو کر زندگی گزار دوں گا۔"

"شاید یہ بات آپ کے لیے ممکن نہ ہو۔"

"میں سمجھا نہیں۔ ممکن کیوں نہیں ہے۔ میں ایک عرصے سے اسی طرح کی زندگی گزار رہا ہوں۔"

"آپ سخت غلط فہمی میں ہیں قانون سے بچ کر آپ کہیں نہیں جا سکتے۔"

"کیوں نہیں جا سکتا۔ یہ انڈیا کا بارڈر کس لیے ہے۔ ہزاروں بھیڑیے اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر نکل جاتے ہیں، میں کیوں نہ جا سکوں گا۔"

ڈھلوں مسکرایا، بولا۔

"برخوردار میری اطلاع یہ ہے کہ پولیس کے چند آدمی ایسے ہیں جنہیں آپ کے ہر ٹھکانے کا علم ہے۔ وہ دن رات آپ کو نگاہ میں رکھتے ہیں مگر انھیں یہ حکم ہے کہ وہ آپ کے خلاف کوئی قدم

"کیا کہتے ہیں آپ؟ یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟" میں اس کی یہ بات سن کر لرز اٹھا تھا۔ "اگر ایسا ہوتا تو آہو کب کا میرا قصہ پاک کر چکا ہوتا۔"

"اس بات کی آہو صاحب کو بھی خبر نہیں ہے جیلانی میاں! آپ سے حکومت بہت خوش ہے اِسی لیے آپ پر اب تک ہاتھ نہیں ڈالا گیا۔"

"کس لیے خوش ہے حکومت مجھ سے۔ کیا کیا ہے میں نے حکومت کے لیے؟"

"یہ تو آپ خود جانتے ہیں۔ بڑے صاحب کے دشمن کو کس نے تہہ تیغ کیا تھا؟"

"اوہ! میں سمجھا۔ مگر ڈھلوں صاحب وہ سب کچھ تو اس آہو بدبخت کے کہنے پر ہوا تھا۔"

"ایسے کام اکثر اُنہی کے ذریعے ہوتے ہیں۔"

"مگر وہ تو اُس نے اپنے فائدے کے لیے کیا تھا۔"

"اُس کا فائدہ اس میں سے اتفاقاً نکل آیا تھا جیلانی میاں تم سمجھے کیوں نہیں ہو۔"

اُس کی یہ باتیں سُن کر میرا دماغ چکرانے لگا۔ میں سمجھا مجھے کسی بیتال جنتر پر رکھ دیا ہے۔ میری عقل ہی کام نہیں کر رہی تھی۔ ڈھلوں میرے بارے میں مجھ سے بھی کہیں زیادہ خبردار تھا چل بے آہو! تو نے مجھے کیسی بے خبری کے عالم میں بدھیا بنا کر رکھ دیا ہے اور اب میں پشتینی مخنثوں کی طرح بے بس ہو کر ڈھلوں صاحب کے سامنے بیٹھا تھا۔

"آپ نے مجھے حیرت میں ڈال دیا ہے ڈھلوں صاحب! بہرحال مجھ پر کرم کریں اور آسیہ کو میرے ساتھ بھیج دیں۔ وہ بہت دُکھی ہو رہی ہوگی۔"

"اُسے کوئی دکھ نہیں ہے جیلانی میاں! یہاں پر۔ میں اُس سے آپ کی ملاقات کرا دوں گا مگر ایک دو دن صبر کریں۔ سروری خانم نے بھی آپ کی بہت سفارش کی ہے حالانکہ آپ اُس پر بہت تشدد کر چکے ہیں پھر بھی وہ آپ کی بہت تعریف کرتی ہے۔"

"یہ خانم کی مہربانی ہے ورنہ میں اِس قابل ہرگز نہیں ہوں۔"

"آپ یہی سمجھیں جیلانی میاں! کہ آپ کی مصیبت کے دن ختم ہو گئے ہیں۔ میرے ہاں رہیں۔ آہو سے میں بات کروں، پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

یہ کہہ کر وہ اُٹھ گیا اور دروازے کے باہر کھڑے اپنے ملازم سے کہنے لگا۔ "برکت! انہیں مہمان خانے میں لے جاؤ اور ایک کمرہ ان کے لیے وقف کر دو۔ ہم ان سے بعد میں بات کریں گے۔" یہ کہہ کر وہ مجھ سے مصافحہ کیے بغیر باہر نکل گیا۔ برکت اندر آیا اور میرے پاس ٹھہر گیا۔ جب ڈھلوں کمرے سے دور جا چکا تو وہ بولا۔

"چلیں صاب میں آپ کو مہمان خانہ دکھا دوں۔"

"چل بھئی، جو کرے کرتار۔ یہ چکر تو لمبا ہی ہو گیا ہے۔"

میں اُس کے ساتھ چل کر عمارت سے باہر نکلا تو وہ مجھے برآمدے کے دائیں حصے میں سے گزار کر ایک جنوبی روش پر جا چڑھا کوئی تین سو گز دُور جا کر وہ مجھے ایک چھوٹی سی انیکسی میں لے گیا۔ اُس میں چھ کمرے بنے تھے، جن کے ساتھ ملحقہ غسل خانے بھی تھے۔ یہ کمرے انسانی ضرورت کی تمام چیزوں سے آراستہ تھے۔ مجھے برکت نے دائیں ہاتھ کے ایک کمرے میں ٹھہرا دیا بولا۔

"صاب کوئی ضرورت ہو تو یہ گھنٹی بجا دیں خادم فوراً پہنچ جائے گا۔ اِدھر مسلح پہرے دار موجود رہتا ہے کہیں باہر اندر جانا ہو تو پوچھ لیں ورنہ اسے حکم ہے کہ بلا اجازت اِدھر اُدھر جانے والے کو وہ گولی مار دے۔"

"اچھا! یہ کوئی جیل خانہ تو نہیں ہے تیرے ڈھلوں صاحب کا۔"

"نہیں صاب! یہ تو اُن کا مہمان خانہ ہے اور وہ اپنے مہمان لوگوں کی ہر طرح سے حفاظت کرتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے بھائی! میں تو تیرا ابھی بایاں پاؤں پوجتا ہوں۔ میرا ایک اٹیچی کیس اُدھر ڈیوڑھی میں رکھا ہے وہ اُدھر پہنچا دو۔"

"وہ تو بی بی جی نے اندر منگوا لیا تھا۔"

"کس بی بی جی نے؟"

"وہ جو آپ کے ساتھ آئی تھیں۔"

"تم نے کب دیکھا تھا انہیں؟"

"میں اُدھر ڈیوڑھی پر ہی تھا جناب! وہ تو سیدھی اندر چلی گئی تھیں بڑی بیگم کے پاس۔"

"تمہارا مطلب ہے ڈھلوں صاحب کی بیوی کے پاس؟"

"جی ہاں۔ اُن کی تو چار بیویاں ہیں صاب جی، پر ساری کارمختاری بڑی بیگم کی ہے۔"

"اچھا یہ بتا کہ کل صبح جو دو لڑکیاں یہاں آہو صاحب کے ساتھ آئی تھیں وہ کہاں ہیں؟"

"وہ۔۔۔ وہ آہو صاحب کے ساتھ آئی تو تھیں مگر اور کچھ میں اُن کے بارے میں نہیں جانتا۔"

"وہ خود چل کر اندر آئی تھیں؟"

"نہیں جی کچھ بیمار نظر آتی تھیں وہ۔ ڈیوڑھی سے آگے کار میں وہ بڑی حویلی تک پہنچی تھیں پھر دو مسلّنوں نے انہیں کار سے اُٹھا کر اندر پہنچایا تھا۔"

"ٹھیک ہے برکت! تیری مہربانی ہے کہ تو نے اتنی ساری باتیں مجھے بتا دی ہیں۔"

"نہیں صاب! ایسی کیا بات ہے میں تو چومدری صاحب کے مہمانوں کا بھی نوکر ہوں۔ یہاں تو بڑے بڑے لوگ ہی ٹھہرتے ہیں۔ مجھے بڑا انعام دے کر جایا کرتے ہیں۔ چار دن پہلے ادھر لاہور کے ایک بڑے پولیس افسر آئے تھے۔ وہ ایک رات یہاں ٹھہرے مجھے اور گلّو کو بڑے پیسے دے گئے تھے وہ۔"

"کتنے پیسے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ جی بس دو سو مجھے اور دو سو ہی گلّو کو دے گئے تھے وہ جی۔ بڑے بیبے آدمی تھے جی وہ۔"

"فکر نہ کر ہم بھی تمھارا حق نہیں رکھیں گے تو بس ایک کام کر۔"

"حکم کریں صاب جی!"

"مجھے بس اُن لڑکیوں سے کسی طرح ملوا دو۔ میں ڈھیر سارے پیسے دوں گا تمھیں۔"

وہ میرے قریب آ کر بولا "میں کوشش کروں گا صاب جی! پر یہاں آپ کوئی گڑبڑ تو نہیں کریں گے؟"

"کیا مطلب ہے تیرا؟"

"میرا مطلب ہے کہ کہیں آپ انھیں یہاں سے نکالنا تو نہیں چاہتے ہیں؟ کیونکہ ایسا آپ ہرگز نہیں کر سکتے ہیں۔ پہرہ بہت سخت ہے یہاں اور وہ ایسی گڑبڑ کرنے والے کو فوراً گولی مار دیتے ہیں۔"

"یہ ڈھلوں صاحب یہاں لڑکیاں کیوں منگواتے ہیں؟"

"او جی بس موج میلے کے لیے، اور کیا۔ بڑے آدمیوں کے بڑے چونچلے، یہاں تو کئی ایکٹریسیں بھی آ چکی ہیں جی۔ گانے والیاں، ناچنے والیاں، کوئی رنگ رلی تو نہیں ہوتی ہے یہاں۔"

"اور وہ دو لڑکیاں! اُن کو کیا کریں گے یہ؟"

"وہ تو جی شاید آ ہو صاحب کی رشتے دار ہیں۔ بیچاری بہت ہی بُری حالت میں تھیں۔ اُن کے بارے میں تو ڈھلوں صاب کوئی بری بات سوچ بھی نہیں سکتے، پر جی آپ کا کیا سنبندھ ہے اُن کے ساتھ؟"

"وہ... وہ میری بھی رشتے دار ہیں۔ بہنیں لگتی ہیں میری رشتے میں۔"

"اچھا اچھا، آپ فکر نہ کریں۔ میں کوشش کروں گا۔ آگے جو میرے مولا کو منظور۔"

"ٹھیک ہے برکت مگر یہ بتا ادھر اور کون کون ٹھہرا ہے یہاں آج۔"

"اِدھر تو اور کوئی بھی نہیں ہے جی۔ بس اب وہ پہریدار علی زئی آ جائے گا ادھر۔ بڑا نشانہ اور بڑی تیز نظر ہے اُس کی۔ یوسف زئی پٹھان ہے وہ۔"

"اچھا کوئی بات نہیں اب تم جاؤ، میں آرام کروں گا۔"

میری یہ بات سُن کر برکت، مجھے سلام کر کے باہر نکل گیا۔ میں نے کمبل اتار کر الگ رکھا اور دیوار کے ساتھ لکڑی کے فریم میں ننگے قدِ آدم آئینے کے سامنے جا ٹھہرا۔ ایک عرصے بعد مجھے سر سے پاؤں تک دیکھنی نصیب ہوئی تھی۔ لگتا تھا غلام جیلانی تو بہت پیچھے رہ چکا ہے اور وہ آدمی جو آئینے میں نظر آ رہا تھا کوئی اور ہی ہے۔ اس میں اور اصل غلام جیلانی میں اب کوئی بات بھی مشترک نظر نہیں آتی تھی۔ چند لمحوں تک میں گہری گہری نظروں سے آئینے میں جھانکتا رہا۔ اور پھر دھڑام سے بستر میں گر گیا۔ زندگی مجھے فریب دیے جاتی تھی۔ اس کے جبر کا یہ عالم تھا کہ میری بہن آسیہ مجھ سے چند ہی قدم دور بیٹھی تھی مگر میری مجبوری کا یہ عالم تھا میں اس کی صورت بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

میں نے جوتے اتار کر الگ رکھے اور ڈھلوں صاحب کے فراہم کردہ نرم گرم بستر پر رکھے ریشمی لحاف میں گھس گیا۔ میرا سارا بدن شل ہو رہا تھا۔ جوڑ جوڑ فریاد کرتا تھا کہ اس بدن کو میں نے بہت دوڑایا تھا، بہت بھگایا تھا۔ مگر حاصل میں کچھ بھی نہ کر سکا تھا۔

لحاف کا ابرہ ایسے بُردار ریشم کا بنا تھا کہ اس کا لمس کسی کی زلفِ عنبر بار کا احساس دلاتا تھا۔ مگر میری تیرہ نصیبی کی حد یہ تھی کہ میں کسی ایسے خیال سے بھی لطف اندوز نہ ہو سکتا تھا۔ ذہن کے گوشے گوشے میں غم و اندوہ نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ مجھے مسند آرا بہت یاد آتی تھی۔ ماجدہ کا لطف و کرم بھی دل میں کھلبلی مچاتا تھا۔ کئی صورتیں تصور میں ابھرتی تھیں مگر ان پر جو وجود میں رچا ہوا غم ایسی سنگباری کرتا تھا کہ وہ سب صورتیں لہولہان ہو جاتی تھیں۔ کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ محسوس یہ ہوتا تھا کہ ایک صحرا ہے جس میں سے گزرتے ہوئے میں اچانک ریگِ رواں پر آ دھر بیٹھا ہوں۔ اور میری جان مسلسل عذاب میں ہے۔ میں اس ریگِ رواں کے اندر دھنستا جا رہا ہوں اور کوئی نہیں جو میری اس بربادی کے آگے بند باندھ سکے۔ مجھے بچانے کی سعی کر سکے۔ ایسی بے بسی میرے مقدر میں تھی۔ بٹھر بٹھر کر میرے ذہن میں مختار ڈھلوں کی باتیں ابھرتی تھیں۔ اس نے کہا تھا کہ وہ لوگ جان بوجھ کر میری رسی دراز کیے بیٹھے ہیں۔ وہ مجھے نہیں پکڑتے۔ مجھے کسی کچہری کے کٹہرے میں نہیں کرتے۔ وہ مجھ سے خوش ہیں اور مجھے آزاد رکھنا چاہتے ہیں۔ اس نے کہا تھا کہ پولیس کے چند آدمی مسلسل میرے تعاقب میں ہیں۔ انھیں معلوم ہے کہ میں کہاں کہاں جاتا ہوں کس کس سے میری یاری ہے۔ وہ سب کچھ جانتے ہیں۔ ہر بات ان کے علم میں ہے مگر وہ عمداً مجھ پر ہاتھ نہیں ڈالتے کیونکہ وہ مجھ سے بہت خوش ہیں۔ بڑے صاحب کا تردد جو میں نے دُور کر دیا تھا۔ ان کے ایک کاری دشمن کو میں نے اُن کی راہ سے ہٹا دیا تھا۔

ڈھلوں صاحب یہی کہتے تھے۔ ہوں، تو وہ سالے مجھ سے بہت خوش تھے۔ خوش تھے کہ خوفزدہ تھے۔ انھیں معلوم ہے کہ اگر

نے مجھے پکڑا اور کسی کچہری میں پیش کر دیا تو پھر میرا منہ بند نہ رہ سکے گا۔ میں وہاں ہادی علی کے قتل کے سارے محرکات عدالت کے سامنے رکھ دوں گا۔ پھر اس سے ان کی جو بدنامی ہو گی اس کا تو کوئی حساب ہی نہیں لگا سکتا تھا مگر وہ یہ حساب لگا چکے تھے۔ جبھی تو وہ مجھ سے اغماض برت رہے تھے۔ انھوں نے جان بوجھ کر میرا پٹّہ کھول رکھا تھا تاکہ اُن کے خلاف کوئی ہنگامہ کھڑا نہ ہو۔ انھیں میرے وجود نے عجیب سے آزار میں مبتلا کر کے ٹُنڈ مُنڈ کر دیا تھا اور اب وہ مجھے گھیر گھار کر ایسے مقام پر لے آئے تھے جہاں پہنچ کر میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کامدار نے سب سے پہلے مجھ سے میرے ہتھیار رکھوا لیے تھے اور اب وہ لوگ بالکل بے فکر تھے۔ کیونکہ وہ مجھے پنجرے میں ڈال چکے تھے۔ میں یہی سوچ رہا تھا۔ انھوں نے جو میرے معاملے کو تعویق میں ڈال رکھا تھا تو اس کی وجہ ان کے اپنے ہی مفادات تھے جن پر ایسی ضرب لگا سکتا تھا کہ اُن کے سارے ہی بُرج اُلٹ جاتے اور آسیہ کو انھوں نے مجھے خاموش رکھنے کے لیے اب باقاعدہ یرغمال بنا لیا تھا۔

اور یہ جو سروری خانم ہے، کوئی اس کی خوبصورت تاگڑی کو دیکھے جو اس نے میری کمر سے باندھ کر مجھے بے بس کر دیا تھا، کس دعوے سے کہتی تھی کہ آسیہ کو وہ رہا کروا دے گی۔ اسے یہ تو معلوم ہی تھا کہ آسیہ کہاں ہے مجھے وہ وہاں تک لے بھی گئی تھی، مگر اب جو پیکان اس نے میرے سینے میں مارا تھا اس کی تیزی کا تو کوئی جواب ہی نہیں تھا۔ مگر اب وہ مجھے کس جال میں پھنسانا چاہتے ہیں، اپنے اردگرد کھنچے حصار کو دیکھ کر میں لرزنے لگا تھا۔ وہ لحاف میں نے الگ پھینک دیا۔ مجھ سے اس کا بوجھ برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ میرا دم گھٹنے لگا تھا۔ میں اس بستر سے نکل کر صوفے پر جا بیٹھا۔ مجھے اپنے گرد و پیش سے وحشت ہونے لگی تھی۔ میں نے بجھے ہوئے پھیکٹ کی طرح زندگی کی جنگ لڑی تھی۔ مگر اب... اب مجھے اپنی ہزیمت کا احساس ہونے لگا تھا۔ وہ ایک دو نہیں، بہت سے تھے اور منظم تھے طاقت، دولت، حکومت اُن کے ہاتھ میں تھی۔ وہ ابھی تک مجھے نہیں بھولے تھے۔ اور... اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ اب وہ مجھے کس نسخے میں استعمال کریں گے۔ میری تقدیر اب میرے ہاتھ میں کوئی نئی پریگ ٹھونکنے کا ارادہ کر رہی تھی۔ جو کوئی بھی میرے قریب سے گزرتا تھا نئی نئی آفتیں اس کے گرد پرکما لگا بیٹھی تھیں اور وہ بیچارا سوچتا ہی رہ جاتا تھا کہ اسے کیا ہو گیا ہے۔ اب جو مختار ڈھلوں، یہ جابر زمیندار جس کی قابلِ رشک صحت نے اسے نوجوانوں ایسی صورت دے رکھی تھی میرے حلقے میں آیا تھا تو خدا ہی جانتا ہے کہ اسے کس کس جان گسل مرحلے سے گزرنا ہو گا کیونکہ میں تو سب کچھ ہی کھو چکا تھا۔ میرے پاس اب لُٹانے کے لیے اور کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا۔ ایک میری زنجیر تھی جسے وہ گلا کر بیچتے بھی تو انھیں کچھ نہ ملتا۔

میری سوچ مجھے کہیں بھی نہیں پہنچا رہی تھی۔ میں نے اس عمارت کا اچھی طرح جائزہ لے لیا تھا۔ اس مہمان خانے کے گرد ایک اونچی دیوار بنی ہوئی تھی اور اس چار دیواری کے دروازے پر ایک مسلح پہریدار چوکی پر بیٹھا رہتا تھا۔ وہ اس وقت وہاں موجود نہیں تھا مگر برکت کے وہاں سے جانے کے پندرہ منٹ بعد ہی وہ وہاں آ بیٹھا تھا۔ اس کا اصل نام برکت نے مجھے علی زئی بتایا تھا۔ چہرے مہرے سے وہ کوئی بڑا ہی درشت اور خونخوار آدمی معلوم ہوتا تھا۔ وہ مجھ سے خاصے فاصلے پر تھا۔ وہ آیا اور دروازے کے اندر چوکی سنبھال کر بیٹھ گیا تھا۔ مجھ سے بات کرنی اس نے گوارا نہیں کی تھی۔

جب میں بیٹھ بیٹھ کر تھک گیا تھا تو ایک بار پھر میں لحاف میں جا گھسا۔ نیند بہت سے دُکھوں کا علاج ہے اور میں تو بہت ہی درماندہ اور تھکا ہارا تھا مگر ابھی میں وہاں لیٹا ہی تھا کہ مجھے باہر کسی کی جھلا بور صورت نظر آئی۔ میں کھڑکی میں سے اُسے صاف دیکھ رہا تھا۔ میں تڑپ کر بستر سے نکلا اور ننگے پاؤں بھاگتا ہوا اس کے پاس جا پہنچا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی اور بولی۔

"چلیں میں آپ سے کمرے میں بیٹھ کر بات کرتی ہوں۔ یہ پٹھان بہت اکھڑ ہے کچھ سمجھتا ہی نہیں۔"

"خوچہ اَمیں کیا پتہ بی بی تمھارے کو کون ہے کیدھر سے آیا ہے۔ اب ڈھلن صیب کا تم بولتا ہے تو ٹھیک ہے بات کر لو۔"

وہ بہت جلا بھنا بیٹھا تھا۔

اتنے میں برکت وہاں آ گیا، بولا۔ "انھیں جانے دو خان! یہ اپنے ہی آدمی ہیں۔ ڈھلوں صاب کی اجازت ہے۔"

"خوچہ ام نے کوئی روکا تو نئیں پر ادھر ام اُلّو کا پٹھا تو نئیں بیٹھا ہے۔ کوئی پوچھ پاچ کرے گا ای۔"

سروری ہنس دی۔ بولی۔ "فکر نہ کرو خان! تمھارے فرض کا ہمیں احساس ہے۔"

یہ کہہ کر وہ میرے ساتھ چل دی۔ میں اُسے دوڑاتا ہوا اپنے کمرے میں لے گیا اور صوفے پر بٹھا کر میں اس کے قدموں میں دری پر بیٹھ گیا۔

"اُدھر بیٹھیں نا صوفے پہ۔ یہاں کیوں بیٹھے ہیں۔"

"بس میں یہیں ٹھیک ہوں خانم آپ کے قدموں میں۔ بتائیں آسیہ کیسی ہے؟"

"ارے وہ بالکل ٹھیک ہے۔ میں اُس سے مل کر آئی ہوں۔ پہلے تو وہ بہت ہی گھبراتی ہوئی تھی مگر اب میرے سمجھانے پر وہ

مطمئن ہوگئی ہے۔"
"اسے اِدھر کیوں نہیں لے آئیں آپ؟"
"ابھی نہیں! وہ ڈھلوں صاحب اجازت نہیں دے رہے۔"
"وہ کیا چاہتے ہیں آخر؟ ہمیں قیدی بنا کر رکھیں گے یہاں۔"
"نہیں ایسی بدگمانی کی ضرورت نہیں ہے جیلانی صاحب! آپ کو خوش ہونا چاہیے کہ آپ اچھی جگہ پہنچ گئے ہیں۔"
"میرے بارے میں بتایا ہے آپ نے آسیہ کو؟"
"ہاں، آپ کا نام سُن کر تو وہ خوش ہوگئی تھی۔ میں نے اُسے بتا دیا تھا کہ آپ اسی کی خاطر یہاں آئے ہیں۔"
"اور آپ مجھے لے کر آئی ہیں۔"
"ہاں! میں نے اسے یہ بھی بتا دیا ہے۔ اب جو میں آپ کے پاس آئی ہوں تو میری بات غور سے سنیں۔ اِدھر کوئی دنگا فساد ہرگز نہ کریں۔"
"میں آپ کی بات نہیں سمجھ سکا ہوں۔"
"دیکھیں یہ ڈھلوں صاحب کی حویلی ہے آہو کا گھر نہیں، جہاں دو ٹوڑ دو آپ کے ہاتھ آجاتے تھے۔ یہاں کا ہر ملازم مسلح ہے اور اُن کی طاقت کا آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔"
"اچھا پھر؟ آگے کہیں۔"
"آگے یہ کہ ذرا عقل سے کام لے کر ڈھلوں صاحب کی خوشنودی حاصل کریں کیونکہ آپ کے سامنے صرف آسیہ کی رہائی کا ہی مسئلہ نہیں ہے بلکہ آپ کو اپنی جان بھی بچانی ہے۔ آپ کی گرفتاری آپ کی موت کا پیغام ثابت ہوسکتی ہے۔"
"میں کیا کروں خانم! میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا ہے۔"
"یہ حویلی آپ کے لیے بہت بڑی پناہ گاہ ثابت ہو سکتی ہے اور میں آپ سے یہی کہنے آئی ہوں کہ خود کو حالات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کریں۔"
"مگر میں اپنے طور پر تو کچھ بھی نہیں کر سکتا ہوں میرے آئندہ رویّے کا انحصار ڈھلوں صاحب کے رویّے پر ہوگا۔"
"وہ بہت اچھے آدمی ہیں جیلانی صاحب! بس آپ اُن سے ایسے انداز سے بات کریں کہ اُن کا آپ پر اعتبار جم جائے۔ پھر آپ کی ساری مشکلیں آسان ہو جائیں گی۔"
"مگر وہ آپ کے آہو صاحب مجھے کہیں چین نہیں لینے دیں گے۔"
"وہ بیچارے خود ہی ایسے جال میں پھنس گئے ہیں کہ اب وہ آپ کے خلاف کچھ بھی نہ کر سکیں گے۔"
"وہ کیسے؟"
"وہ یوں کہ اپنی سادگی میں وہ آسیہ کو یہاں لے آئے ہیں اور اب آپ بھی یہاں آپہنچے ہیں۔ ڈھلوں صاحب کو آپ کی ضرورت ہے جیلانی صاحب! یہ بات مجھ کو اُن کی گفتگو سے معلوم ہوئی۔ اب یہ آپ کی عقل پر منحصر ہے کہ اتنے بڑے آدمی سے آپ کیا حاصل کرتے ہیں۔"
"آپ مجھ سے کھل کر بات نہیں کر رہی ہیں۔"
"نہیں جیلانی صاحب! بلکہ جو کچھ مجھے محسوس ہوا، آپ سے کہہ رہی ہوں کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتائیں۔"
"جی نہیں، بس آسیہ سے مجھے ملا دیں تو یہ آپ کی ... ہوگی۔"
"اس کا بھی بندوبست ہو جائے گا بے فکر رہیں۔ در اصل آپ کو دیکھنے آگئی تھی۔ اس خیال سے کہ کہیں آپ ... میں کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو جائے۔ کیونکہ بہرحال میں آپ ... دشمن کی بیوی ہوں۔"
"ہاں یہ تو ہے میرے دل میں بڑے وسوسے پیدا ہو ... تھے۔ آپ کا اعتبار بھی تو نہیں کیا جاسکتا۔"
"آپ ٹھیک کہتے ہیں... مگر یہ دیکھیں میں آپ ... کیا لائی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے سُرخ کوٹ کی جیب سے رنگین تصویر نکال کر میرے سامنے رکھ دی۔ وہ آسیہ کی تصویر تھی جو کسی جدید قسم کے کیمرے سے اُس نے اسی روز اتاری تھی۔ اس کو دیکھ کر میرے دل سے ہُوک سی اُٹھی۔ میں نے اسے آنکھوں سے لگایا اور میرے آنسوؤں کا تار بندھ گیا۔ آسیہ پہلے سے کمزور دُبلی ہوگئی تھی۔ اس کی وہ آنکھیں جن میں موتیوں ایسی آب و تاب تھی، بجھی بجھی سی نظر آتی تھیں۔ اُن کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ وہ رنگین تصویر تھی اور جو کچھ جیسا تھا ویسا ہی اس میں نظر آرہا تھا۔ اُس کے ہاتھوں کی پشت پر نیلی نیلی رگیں اُبھر آتی تھیں۔ جو لباس اُس نے عمدہ پہن رکھا تھا۔ وہ غالباً ڈھلوں صاحب کے گھر ہی اسے ملا تھا مگر اس کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ صاف بتا دیتی تھی کہ وہ زخم خوردہ ہے، یا اس کے زہر نے اسے چاٹ لیا ہے۔ وہ پہلی سی آسیہ نظر ہی نہیں آتی تھی۔ پھر بھی وہ بہت خوبصورت نظر آتی تھی۔ تصویرِ غم بن کر بھی وہ نسائیت کا پیکر دکھائی دیتی تھی۔ میری آنکھوں سے بہتے آنسو دیکھ کر سروری خانم ... ہوگئی۔ اس نے جیب سے رومال نکال کر میری طرف بڑھایا، بولی: "مرد روتے اچھے نہیں لگتے ہیں جیلانی صاحب! آپ نے تو ... بارے میں میرے سارے اندازے غلط کر دیے۔ اتنا چھوٹا سا دل آپ کا۔"
میں نے تصویر میں آسیہ کے ماتھے پر لب رکھ دیے ... کے لیے میں نے کتنے جوکھم اٹھائے تھے۔ مگر... مگر وہ بھی ...

اُن کی جانوری ختم نہیں ہوسکی تھی۔ تقدیر اسے آج بھی در در کھینچتی پھرتی تھی۔ اس نئے محبس میں آکر تو اس پر قیامت بیت گئی ہوگی۔ میرے خانہ برانداز کو ابھی معلوم نہیں اور کیا کیا کچھ مسمار کرنا تھا۔ وہ کسی تذبذب کسی دُگدا میں مبتلا نہیں تھا۔ میرے لیے اور آسیہ کے لیے اس کے فیصلے اٹل اور ناقابلِ تنسیخ تھے۔
"یہ کپڑے اسے کہاں سے ملے ہیں اس پگلی کو؟"
"یہ بڑی بیگم نے دیے ہیں۔"
"یہ کچھ کھاتی پیتی بھی ہے کہ نہیں؟"
"میں نے خود آج اسے ناشتہ کرایا ہے ورنہ وہ میں نے سُنا ہے بہت کم ہی ہوتی تھی۔"
"آپ کو یہ کوٹ کہاں سے ملا؟"
"یہ بھی بڑی بیگم نے دیا ہے۔ ایک دُنالی سی عورت اُن کے پاس کھڑی تھی، اس نے بھانپ لیا کہ میں سردی میں کانپ رہی تھی وہی میرے لیے یہ کوٹ لے آئی تھی۔"
"اور وہ نفیسہ کہاں ہے؟"
"ہاں، اس کا تو میں بھول ہی گئی۔ اس کی تو جان چھوٹ گئی۔ ڈھلوں صاحب نے اسے واپس بھجوا دیا۔ یہ کہہ کر کہ یہ انھیں اِدھر ایک سڑک پر بے ہوش ملی تھی وہ ڈاکو جیلانی اُسے مار پیٹ کر وہاں اس نے پھینک گیا تھا۔ اچھی پٹی پڑھا دی اسے ڈھلوں صاحب نے۔ اب اسکی ملازمت بھی اُسے مل جائے گی۔"
سروری خانم نے ڈھلوں صاحب کی بات کی تصدیق کر دی تھی۔ میں مطمئن ہوگیا کہ وہ بیچاری اور زیادہ برباد ہونے سے بچ گئی۔ اس کی بدنصیبی اس کے آگے بہت حرارہ لاتی تھی مگر خدا نے اسے بالآخر بچا ہی لیا تھا۔
"یہ تو بہت اچھا ہوا خانم! آہو صاحب کب تک آرہے ہیں یہاں؟"
"میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔ مگر ایسا لگتا ہے کہ ڈھلوں صاحب مجھے آج ہی گھر بھیج رہے ہیں۔ انھوں نے ڈرائیور سے کہہ دیا ہے شاید میں تھوڑی دیر میں چلی جاؤں۔"
"آپ سے میری ایک درخواست ہے۔"
"کہیے، آپ حکم کریں۔ جیلانی صاحب میرے دل میں بخدا آپ کی بڑی عزت ہے۔"
"میری ایک منہ بولی بہن ہے مجیدن۔"
"اوہ میں سمجھی! وہی مائی معاجاں کی بیٹی۔"
"آپ کو پتہ ہے اس کا کیا حشر ہوا ہے؟"
"نہیں تو! میں نے اُس کا نام تو سُنا ہے مگر مجھے نہیں معلوم کہ اُس کا کیا حشر ہوا ہے۔"
"آہو صاحب نے اسے ایک غنڈے کے ذریعے گھر سے اٹھوایا اور ہیرا منڈی پہنچا دیا۔"
"ہائے میں مرگئی! نہیں نہیں آہو ایسے نہیں ہوسکتے۔"
"وہ ایسے ہی ہیں۔ ہوسکنے کی تو بات ہی نہ کریں۔ ہیرا منڈی سے اُس بدنصیب کو چھانگا مانگا کا ایک زمیندار لے گیا تھا، نتھ اُتروائی کے لیے اُس نے بیس ہزار روپے دیے تھے۔"
"یہ نتھ اُتروائی کیا ہوتی ہے؟"
"یہ بھی ہوتی ہے۔ بس سمجھ جائیں کہ یہ حرامزدگی کی انتہا ہوتی ہے۔ اب وہ بیچاری اُس زمیندار کے ہاتھوں تباہ ہورہی ہے۔ میں اس آسیہ کے جھمیلے میں اُس تک نہیں پہنچ سکا ورنہ شاید میں اس زمیندار کو مار ہی دیتا۔"
"ہاں یہ تو بڑی خباثت کی بات ہے۔"
"جس کا ذمے دار آہو ہے مگر اس سے میرا کوئی گلہ نہیں ہے خانم! وہ انسانوں کی بدترین قسم کی نمائندگی کرتا ہے وہ آپ کا شوہر ہے۔"
"مجھے حیرت ہے جیلانی صاحب!" وہ واقعی بے حد حیران ہورہی تھی۔
"آپ سے میری یہ گذارش ہے کہ جس طرح بھی ہوسکے آہو سے کہیں کہ وہ مجیدن کو واپس لا کر اس کے گھر پہنچا دے اور آپ اُس کے لیے کوئی اچھا سا رشتہ دیکھ کر اُس کی شادی کرا دیں۔"
"میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں جیلانی صاحب کہ اس کام میں تاخیر نہیں کروں گی۔ یہ ظلم ہے، سراسر ظلم ہے۔"
"ایسے تو پتہ نہیں کتنے ظلم آہو صاحب کر چکے ہیں بہرحال یہ کام آپ کر دیں تو میں آپ کا احسان مند رہوں گا۔ اس کے علاوہ مجھے اس بات کی بھی ضمانت چاہیے کہ مسند آراء محفوظ رہے گی مجھے معلوم ہے آہو صاحب کا اگلا شکار وہی ہوگی۔"
سروری خانم کا رنگ اُڑنے لگا۔
"میں صحیح کہہ رہا ہوں خانم! اسے کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔"
"اُس کے بارے میں آپ قطعاً فکر نہ کریں۔ ہم اس کے دشمن نہیں ہیں۔" ابھی وہ یہ بات کہہ رہی تھی کہ علی زئی آگیا اور افراتفری ڈالتے ہوئے بولا۔
"خو، بی بی جی اُدھر وہ ڈرائیور آپ کو جلدی آنے کو بولتا ہے۔"
میں نے دروازے پر نظر ڈالی تو ایک آدمی وہاں کھڑا تھا۔
"آپ بے فکر رہیں جیلانی صاحب! میں یہ کام ضرور کروں گی آپ صرف اتنا کریں کہ اس ماجدہ بدبخت کا پتہ کریں۔ ہمارا وہ مال ہمیں واپس دلا دیں اور مسند آراء کا دل میں کوئی ذرہ نہ لائیں۔"
"میں کوشش کروں گا خانم! جیسے ہی وہ مل گئی میں اُسے

پکڑ لوں گا۔ ورنہ آپ چاہیں تو میں اپنے حساب سے آپ کو اُس کی قیمت دے سکتا ہوں۔"

"ان ہیروں کی مالیت بائیس لاکھ ہے جیلانی صاحب! اور اس بات کا عِلم ڈھلوں صاحب کو بھی ہے میرا خیال ہے اُن میں ان کا بھی حِصّہ ہے۔"

"خدا بہتر کرے گا خانم! مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ ماجدہ میرے لیے اتنی بڑی مصیبت کھڑی کر دے گی۔"

"میرا خیال ہے کہ وہ بہت زیادہ حسین ہوگی۔" سردری نے ایک خاص زاویے سے تیر پھینکا۔ وہ اس صورتِ حال کے اصل سبب کو سمجھ چکی تھی۔

"مجھے شرمندہ نہ کریں بہرحال آپ سے زیادہ حسین ہرگز نہیں تھی۔" میں نے سردری کو اسی کے ہتھیار سے مارنا چاہا۔ وہ مسکرا کر آگے بڑھی اور میرا کندھا تھپتھپاتی ہوئی بولی۔

"آپ۔۔ آپ بہت اچھے ہیں جیلانی صاحب!" اُس کا چہرہ تمتما اٹھا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی باہر نکلی اور دروازے پر جا کر ہاتھ سے مجھے الوداع کہتی ہوئی آگے نکل گئی۔

اس کے جاتے ہی میں آسیہ کی تصویر سینے پر رکھ کر لیٹ گیا۔ میں بھی لُٹ چکا تھا اور وہ بھی اجڑ گئی تھی۔ نہ میں کبھی بس سکا تھا اور نہ وہ آباد رہ سکی تھی۔ ہم دونوں کے ہاتھ کٹے تھے اور سر زخمی تھے اور چیلیں ہر طرف سے ہمارا گوشت نوچنے کے لیے ہم پر جھپٹتی رہتی تھیں اور ماں نے جانے کتنے ارمانوں سے ہمیں جنم دیا تھا۔ اس بے چاری کی طرف مُڑ کر بھی نہ دیکھ سکا تھا۔ وہ تو شاید ہم دونوں کے لیے رو رو کر اندھی ہو چکی ہوگی اور میں نے سوچا تھا کہ آسیہ کو جیل سے نکال کر سیدھا اس کے پاس لے جاؤں گا۔" مگر تقدیر کے شکرے نے اسے میرے ہاتھ سے راستے ہی میں جھپٹ لیا تھا۔ اور میرا کشکول خالی کا خالی رہ گیا تھا۔

آسیہ کے بارے میں میری سوچ کے ساگر میں غم کا زہر کچھ زیادہ ہی گھلنے لگا تو اُس کی تصویر تکیے کے نیچے رکھ کر میں نے اس کا خیال ذہن سے جھٹک دیا۔ یہی کیا کم تھا کہ میں اور وہ ایک ہی چار دیواری میں آن بیٹھے تھے۔ یہ خیال ایسا اطمینان بخش ثابت ہوا کہ مجھے جلد ہی نیند آگئی۔

جب میری آنکھ کھُلی تو دیکھا کہ برکت میرے سرہانے کھڑا ہے۔ وہ ایک ملازم کے ساتھ ایک بڑے سے طشت میں رکھ کر میرے لیے کھانا لایا تھا۔ اور اس وقت دِن کے تین بج چکے تھے سورج نصف النہار پہنچ کر آگے بڑھ گیا تھا اور تیزی سے زوال کی منزلیں طے کر رہا تھا۔ دو گھنٹے بعد شام ہونے کو تھی۔

"بڑی گہری نیند ہے آپ کی میاں صاحب! کھانا تو کھا لیں۔"

میں نے بستر سے اُتر کر انگڑائی لی اور غسل خانے میں جا گھسا۔ کچھ ہی دیر بعد جب ملازم نے میرے سامنے کھانا رکھا تو دل خوش ہوگیا۔ وہ لوگ میرے لیے بھنا ہوا مرغ اور پلاؤ، زردہ اور لائے تھے۔ روغنی نان بھی موجود تھے۔ تو گویا یہ ٹھاٹھ ہوتے تھے ڈھلوں صاحب کے معزز مہمانوں کے۔ میں نے کھانے پر اچھی طرح ہاتھ صاف کیا۔ بھوک نے نڈھال کر رکھا تھا مجھے۔ رات کے کھانے میں بھی لوگوں نے میرے لیے خاصا اہتمام کیا تھا۔

اگلی صبح ابھی میں ناشتے سے فارغ ہی ہوا تھا کہ ڈھلوں صاحب شکاری لباس میں ملبوس گھٹنوں تک لمبے لوٹ پہنے تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اندر آگئے۔ وہ بہت خوش نظر آرہے تھے اور یوں لگتا تھا جیسے وہ میرے لیے دل میں محبت کا سیلاب لیے پھرتے ہیں۔ بڑی گرمجوشی سے انھوں نے مجھے سلام کیا اور

"کیا حال ہے جیلانی صاحب!"

"ایک دم فرسٹ کلاس ہوں ڈھلوں صاحب! کھانا آپ کے ہاں بہت عمدہ ملتا ہے۔"

"معلوم ہوتا ہے آپ بھی اچھے کھانے پر جان دیتے ہیں۔"

"پرندے پھنستے ہی اچھے دانے پر ہیں۔" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

وہ مسکرا دیے اور مجھے تیز تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے۔ "چلیں ہمارے ساتھ شکار پر چلیں، ادھر مرغابی کا شکار ملتا ہے ہمارے چھمب میں۔"

"میں تو اس میدان میں بالکل اناڑی ثابت ہوں گا۔ اِس کے اسرار و رموز سے بالکل ناواقف ہوں۔"

"باتیں بھی عمدہ کر لیتے ہیں آپ! ہمیں آپ ہی جیسے ساتھی کی ضرورت تھی۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کے ساتھ ہمارا وقت اچھا گزرے گا۔"

"آپ کی ذرہ نوازی ہے ڈھلوں صاحب ورنہ من آنم کہ..."

"اوئے برکت جا اِن کے لیے برجس، لوٹ اور جیکٹ نکال لا۔ یہ بھی ہمارے ساتھ چلیں گے۔"

برکت اُن کی یہ بات سنتے ہی ٹل گیا۔

جب ہم دونوں کمرے میں تنہا رہ گئے تو ڈھلوں صاحب بولے۔ "حضرت وہ ٹرک پتہ ہے کس کا تھا جس کا آپ نے بیڑہ غرق کر دیا تھا؟"

"جی! میں... میں سمجھا نہیں۔" میں نے اپنی جگہ سے اُچھلتے ہوئے کہا۔

"وہ ایک پولیس افسر کا ٹرک تھا۔ ڈی ایس پی حفیظ خان کا۔ وہ آپ کو ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔"

"واقعی! حیرت کی بات ہے مگر آپ کو کیسے پتہ چلا؟"

"مجھے سردری خانم نے ساری بات بتا دی تھی۔ اس گھیبا خان پر تو مجھے بھی بہت طیش آرہا ہے آپ نے مار کیوں نہیں دیا انہیں۔ یہی بہتر تھا۔ خواہ مخواہ شہادت کو زندہ نہیں رہنے دینا چاہیے۔ سب کو مار دیتے۔ وہ اِسی قابل تھے۔ آہو کی عزت ہماری عزت ہے۔"

"بس ایسے ہی میرا ہاتھ اُلٹ گیا تھا ڈھلوں صاحب! ویسے بھی خواہ مخواہ کی قتل دغارت سے مجھے نفرت ہے۔ اُن کے لیے اتنی ہی سزا بہت کافی تھی۔"

"کافی نہیں تھی! وہ حفیظ خان پولیس افسری کے زعم میں بڑی بھاگ دوڑ کر رہا ہے۔"

"میں نے تو بڑی نرمی برتی تھی اُن کے ساتھ ڈھلوں صاحب پھر بھی وہ میرے شکر گزار نہیں ہیں۔"

"پتہ نہیں! اب وہ ساتے تگلیھڑیے کو حوالات میں بند کریں گے وہی جو آپ کا یار ہے۔"

"یہ تو زیادتی ہوگی ان کی کیونکہ اُس بچارے سے تو میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"یہ تو آپ ہی بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ بہرحال آپ کے لیے میرا یہی مشورہ ہے کہ آپ اطمینان سے اِدھر بیٹھے رہیں۔ یہاں آپ بالکل محفوظ ہیں۔"

"وہ تو میں بیٹھ ہی گیا ہوں ڈھلوں صاحب آگے دیکھیں کیا ہوتا ہے۔"

"اس ساتے کو تو پتہ ہے کہ آپ کہاں جا رہے تھے۔"

"نہیں اُسے آپ کا نام نہیں بتایا گیا تھا۔ آپ کے بارے میں سردری خانم نے اِدھر پتوکی پہنچ کر مجھے بتایا، ورنہ وہ تو ساتے سے یہی کہتی تھی کہ ہم پتوکی جائیں گے۔"

"بس پھر ٹھیک ہے۔ وہ ایسی صورت میں آپ کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکے گا۔ مجھے یہی فکر لگی تھی۔"

"مگر ڈھلوں صاحب کیا وہ پولیس افسر رشتہ گیر ہے؟"

"وہ تو نہیں، اور ہو بھی تو میں کہہ نہیں سکتا مگر وہ گھیبا خان ٹرک کو ایسے ہی کاموں کے لیے استعمال کر رہا ہے۔"

"حد ہوگئی! کیسا اندھیر مچا ہے یہاں۔ خدا غارت کرے اِن لوگوں کو۔"

"دعا تو یہی کرنی چاہیے جیلانی صاحب! مگر آپ اپنا ریکارڈ بھی تو دیکھیں۔ آپ کی دعا کیسے سُنی جا سکتی ہے۔۔۔" ڈھلوں صاحب مسکرا رہے تھے۔ میں کٹ کر رہ گیا۔ وہ مجھے آئینے میں میری صورت دکھا رہے تھے۔ حالانکہ اُن کے اپنے کردار کے بارے میں مجھے یہی احساس ہو رہا تھا کہ "کند ہم جنس باہم جنس پرواز۔" وہ آہو کے دوست تھے۔ آہو جیسے ہی۔ جیسا چاچانی ونڈ ویسا اگلا بنڈ۔

میرے چہرے پر پھیلے تکدر کو دیکھ کر انہوں نے رُخ بدلا اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ میں بھی ہوں ہاں کرنے لگا۔ کوئی پانچ منٹ بعد میں نے اُن سے پوچھا۔

"آپ نے مجھے میری بہن سے نہیں ملوایا۔"

"ارے ملوا دیں گے بھائی! میں نے سردری خانم کے ہاتھ پیغام بھیجا ہے۔ آہو صاحب آ جائیں تو پھر بات کر لیں گے۔ آپ کیوں فکر کرتے ہیں۔ وہ اب میرے گھر میں ہے کسی تلو ہنجو کے پاس نہیں۔"

"جیسے آپ کی مرضی! مجھے یہ دن بھی دیکھنا تھا۔"

"کیسا دن؟"

"یہی کہ میری بہن دیوار کے اُس طرف موجود ہے مگر میں اُسے دیکھ نہیں سکتا۔"

"خواہ مخواہ دِل چھوٹا نہ کریں جیلانی صاحب! مجھ پر اعتماد کریں۔ کچھ مصلحتیں بھی ہوتی ہیں آخر۔"

یہ کہہ کر وہ اُٹھے اور دروازے میں جا ٹھہرے۔ برکت میرے لیے لباس لا رہا تھا۔ وہ میں نے غسل خانے میں جا کر پہن لیا۔ برجس اچھی تھی اور لوٹ میرے ناپ کے عین مطابق تھے۔ جیکٹ بھی بہت خوبصورت تھی۔ وہ سب کچھ پہن کر میں باہر نکلا تو ڈھلوں صاحب مجھے دیکھ کر خوش ہو گئے۔

"بڑے دیدہ زیب جوان ہیں آپ! یہ لباس آپ پر بہت سجتا ہے جیلانی صاحب!"

"آپ کی مہربانی ہے جناب ورنہ بندہ کس قابل ہے۔"

برکت ایک دونالی بھی لے آیا تھا۔ وہ اس نے میری طرف بڑھا دی۔

"مگر میرے لیے تو یہاں ہتھیار رکھنا منع ہے جناب! میرے ہتھیار تو برکت صاحب نے پہلے ہی رکھ لیے تھے۔"

"یہ بندوق شکار کے لیے آپ کو دی گئی ہے۔" ڈھلوں صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مگر آپ تو میرے ساتھ ہوں گے، مجھ سے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوگا آپ کو؟"

"شرمندہ نہ کریں جیلانی صاحب! اس وقت تک میں آپ کو نہیں جانتا تھا مگر اب تو میں آپ پر اعتبار کر سکتا ہوں۔ میں آدمی کو پہچانتا ہوں۔" اُس کے لہجے کی خود اعتمادی نے مجھے حیران کر دیا۔ یا تو... تضاد کا شکار تھے وہ بھائی صاحب یا اُن کی حکمت عملی بدل گئی تھی۔ کسی نہ کسی جگہ کوئی گڑبڑ ضرور ہوئی تھی۔ ورنہ وہ یوں دونالی میرے ہاتھ میں نہ تھماتے۔

کچھ ہی دیر بعد ہم جیپ میں بیٹھ کر چھمب کی طرف روانہ ہو گئے۔ ڈھلوں صاحب کے چار مسلح ملازم بھی ہمارے ساتھ تھے۔ برکت اُن میں شامل نہیں تھا۔ وہ حویلی میں رہ گیا تھا۔

چوگوٹھ سے... جیپ کوئی پانچ میل دُور تھا۔ جیپ ایک پہیے پر سے گزرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی گئی۔ ڈھلوں صاحب اگلی سیٹ پر بیٹھے تھے اور میں اُن کے چار ملازموں کے ساتھ پچھلے حصے میں بیٹھا تھا۔ میں اُن میں سے کسی کو بھی نہیں جانتا تھا۔ مگر جب وہ آپس میں باتیں کرنے لگے تو مجھے معلوم ہوا کہ اُن میں سے ایک کا نام مبارک، دوسرے کا مسیتا خان، تیسرے کا بلّو اور چوتھے کا فرید تھا۔ یہ نام مجھے اس لیے یاد رہ گئے کہ اُس روز اُن لوگوں کے درمیان پھنس کر میری زندگی اور زیادہ اُدھڑ کر مفلس کی قبا بن گئی تھی۔

مُبارک دوہرے کسرتی بدن کا آدمی تھا۔ یہ بڑے بڑے چوڑے چکلے شانے تھے اُس کے۔ اپنی شکرے ایسی تیز تیز آنکھیں جب وہ گھماتا تھا تو مدِمقابل کے حوصلے بلاوجہ پست ہو جاتے تھے۔ میرے ساتھ اُس کا رویّہ بہت ہی عجیب و غریب تھا، اور اس کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ وہ مجھ سے بڑی رعونت سے بات کرتا تھا۔ یوں جیسے وہ میرے وجود کو برداشت نہیں کر سکتا ہو۔

راستے میں ایک جگہ جیپ ناہموار راستے کی وجہ سے دائیں طرف جھکی تو میں اچھل کر مبارک سے ٹکرا گیا۔ میں یونہی بے دھیانی میں لڑھک گیا تھا۔

"اوئے سیدھا بیٹھ۔ کیا زنانیوں کی طرح جھول رہا ہے تو۔" مبارک نے مجھے بڑی بدتمیزی سے پیچھے دھکیلا۔۔۔ اُس کے تینوں ساتھی بھی ہنسنے لگے۔ مسیتا خان بہت محظوظ ہوا، بولا۔

"پیدل آدمی ہے، نیا نیا جیپ میں بیٹھا ہے نا۔" اُس کی یہ بات سن کر وہ تینوں قہقہہ مار کر ہنسنے لگے۔ میں نے اُن کی باتیں سُنی اَن سُنی کر دیں اور سگریٹ سُلگا لیا تو بلّو بولا۔

"اوئے دُوجے بھی بیٹھے ہیں یہاں۔ ایک اِدھر بھی تھمائے باؤ۔" اس کا لہجہ اور زیادہ استہزا آمیز تھا۔ اُس نے میرے ہاتھ سے سگریٹ کا پیکٹ جھپٹ ہی لیا تھا مگر میں نے کھینچ کر پیکٹ اُس کی انگلیوں سے چھڑایا اور جیب میں رکھ لیا۔

"یہ تمھارے پینے کا نہیں ہے استاد! بڑی مہنگی چیز ہے۔"

"لو اور سنو چھانگے پہلوان! اور بے عزّتی کرالو اپنی۔" بلّو نے مبارک کو مخاطب کیا۔ اُس کی کنیّت چھانگا بھی تھی کیونکہ اُس کے بائیں ہاتھ پر ایک کے بجائے دو انگوٹھے تھے۔

"دفع کر یار! خواہ مخواہ میرا سفر خراب نہ کر۔ آدمی کمینہ ہو، تو اُسے مُنہ نہیں لگاتے ہیں۔" چھانگے نے بڑی رعونت سے گردن اکڑاتے ہوئے کہا اور جیب سے ایک چمکتا ہوا سگریٹ کا پیکٹ نکالکر اُس نے اپنے ساتھیوں کی طرف بڑھا دیا۔

"مجھے تم جانتے نہیں ہو پہلوان! ورنہ تمھارا اُونٹ کی طرح نہ کھلتا۔ تیرے لیے بہتر یہی ہے تو چپ رہ" یہ بات سُنتے ہی اس نے میرے بائیں ہاتھ میں پکڑی ڈبیا جھپٹ کر جیپ کے فرش پر پھینکی اور مجھے اس نے گریبان سے کچھ اس طرح جھٹکا دے کر آگے کھینچا کہ میں اگر جیپ کی چھت میں لگی لوہے کی نالی نہ پکڑتا تو اس کی گود میں جا گرتا۔

"اوئے کیا کرتے ہو بھئی! کیوں دنگا کرتے ہو، چوہدری صاب۔" مسیتا خان چیخا۔ اُس کی یہ آواز سُن کر ڈرائیور نے جیپ روکی اور ڈھلوں صاحب ایک دم نیچے اتر گئے۔ چھانگے نے ابھی تک بائیں ہاتھ سے میرا گریبان پکڑ رکھا تھا اور دائیں ہاتھ سے اس نے اپنا گراری دار شکاری چاقو کھول لیا تھا۔ جیپ رکتے ہی بلّو نے میری کمر کے گرد اپنی بانہیں ڈال کر مجھے جیپ سے نیچے پھینک دیا۔ اس کام میں چھانگے نے بھی اُس کی مدد کی اور اس طرح کہ جب میں جیپ کی طرف جھکا تو اس نے بلّو اور مجھے دھکا دے کر نیچے لڑھکا دیا۔

میرے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے۔ جیپ سے نیچے گر کر میں اُلٹ کر اٹھا اور بلّو کے منہ پر میں نے زبردست گھونسا مارا۔ وہ میرے ساتھ ہی نیچے گرا تھا مگر ابھی میں اس سے نپٹ رہا تھا کہ چھانگا جیپ سے چھلانگ لگا کر مجھ پر اس طرح آ پڑا کہ اگر میں اس کا دایاں ہاتھ نہ سنبھالتا تو اُس کا وہ چمکتا ہوا چاقو سیدھا میرے سینے میں اتر گیا ہوتا۔

ڈھلوں صاحب اُن دونوں کو گالیاں دے رہے تھے کہ مجھ سے الگ ہو جائیں مگر وہ دونوں تو شاید مجھے جان سے مار دینے پر تُلے ہوئے تھے۔ میں نے جھٹکا دے کر چھانگے کو اُس کے پاؤں سے اور ہاتھوں میں تول کر اوپر اُٹھانا چاہا مگر وہ اتنا وزنی تھا کہ میں اُسے اوپر نہ اُٹھا سکا۔ مسیتا خان، فرید، ڈھلوں صاحب اور ڈرائیور ہمارے اردگرد کھڑے تھے اور وہ مجھے اُن کی گرفت سے چھڑانے کے لیے کوئی عملی قدم نہیں اٹھا رہے تھے۔ اچانک میں نے بلّو کا چاقو بڑی تیزی سے اپنی پسلی کی طرف بڑھتا دیکھا تو میں نے چھانگے کو بلّو پر اُلٹ دیا۔ وہ اپنی جھونک میں بلّو سے ٹکرایا اور وہ دونوں زمین پر جا رہے۔

"اوئے بس کرو اوئے حرامزادو۔ یہ کیا کر رہے ہو تم، مہمان ہے۔" ڈھلوں صاحب کی کڑکتی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی مگر اُس میں وہ تحکم مفقود تھا جو اُن کا ہاتھ روک سکتا۔ بلّو نے زمین پر لیٹے لیٹے اپنا چاقو میری طرف پھینکا۔ پتہ جب چلا جب وہ میری برجس کو پھاڑ کر میری ران میں دھنس چکا۔

زخم کی اذیت نے مجھے بالکل پاگل کر دیا۔ میں نے وہ چاقو ران سے کھینچا اور اسے سیدھے ہاتھ میں لے کر چھانگے کی طرف بڑھا۔ وہ اٹھ کر اپنا شکاری چاقو مجھ پر تول رہا تھا۔ میرے اندر کا وحشی اس وقت تک پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔ میرے اور چھانگے کے درمیان اس گھڑی پانچ قدم کا فاصلہ تھا جو اُس نے خود پیدا کیا تھا۔ تاکہ وہ دُور سے مجھے اپنے آزمودہ ہتھیار کا نشانہ بنا سکے۔ مگر پیشتر اس کے کہ وہ کچھ کر سکتا۔ میں نے پُوری قوت سے چاقو تول کر اس کی طرف پھینکا۔ اور۔۔۔ اور وہ میرا وار کاری لگا کہ چاقو اُس کے سینے میں کئی انچ نیچے دھنس گیا۔ اُس کا پھل اُس کے دستے سے زیادہ بھاری تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ میری توقع کے عین مطابق اُس کے دل میں ترازو ہو گیا۔ اُس کا اٹھا ہوا چاقو بردار ہاتھ نیچے گرا اور سینے پر آ ٹھہرا۔ ایک بھیانک چیخ اس کے منہ سے نکلی اور وہ منہ کے بل اس طرح دھول میں گرا کہ چاقو اس کے سینے میں اور زیادہ گہرا اُتر گیا۔ اس کی یہ چیخ سن کر بلّو پاگل کتے کی طرح مجھ سے آ ٹکرایا۔ اس طرح کہ وہ اپنا چاقو میری گردن میں دھنسا دینا چاہتا تھا مگر میں نے دائیں ہاتھ سے اُس کی کلائی پکڑی اور بائیں ہاتھ سے اُس کی گردن کچھ اس طرح مسلی کہ اس کی رگ احساس سُن ہو گئی اور وہ ادھ مُوا ہو کر زمین پر جا پڑا۔

ڈھلوں صاحب چھانگے پر جھکے ہوئے تھے۔ بلّو کو زمین پر گرتے دیکھ کر وہ پھرکی کی طرح گھوم کر اُٹھے اور چیخ کر بولے۔

"یہ کیا کر دیا تو نے جیلانی! یہ تو مر گیا ہے۔"

"اچھا ہوا ڈھلوں صاحب ایسے پاگل کتے کا یہی علاج تھا۔"

"یہ میرا بہت قیمتی آدمی تھا جیلانی! تم نے اِسے قتل کر دیا۔" اُن کے منہ سے جھاگ نکل رہے تھے۔

مسیتا خان بلّو پر جھکا اس کی نبض ٹٹول رہا تھا۔

"یہ۔۔۔ یہ بھی شاید مر گیا ہے سرکار اسے بھی دیکھیں۔"

"میں تم لوگوں کو اس لیے تو نہیں لایا تھا اِدھر حرامزادو، اپنے دو آدمی ضائع کروا لیے۔ یہ کب کہا تھا میں نے۔ ہائیں بولو۔" یہ کہکر ڈھلوں صاحب نے تڑاخ تڑاخ دو تھپڑ مسیتا خان کے منہ پر مار دیے۔ دونالی بندوق اُن کے ہاتھ میں تھی اور میرے ران کے زخم سے خون برابر رِس رہا تھا۔ مجھے اس زخم کا جائزہ لیتے ہوئے انھوں نے دیکھا تو گرج کر بولے۔

"اسے کیا دکھاتے ہو! یہ کوئی زخم ہے۔ میں۔۔۔ میں تمھیں کبھی معاف نہیں کروں گا جیلانی!"

میں نے کٹی ہوئی برجس کو اور زیادہ پھاڑ کر زخم پر راستے کی سفوف دھول ڈالی اور اُن کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔ وہ مجھے قہر آلود نظروں سے گھور رہے تھے۔

"کیا مجھے اپنی جان نہیں بچانی چاہیے تھی ڈھلوں صاحب قبلہ! یہ مجھے قتل کرنا چاہتے تھے۔"

"بکواس کرتے ہو تم! انہیں کیا پرخاش تھی تم سے؟ یہ تو تمھیں جانتے بھی نہیں تھے۔"

"یہ بلّو تو خیر زندہ ہے، اس چھانگے کو سنبھالیں اس کا علاج کریں۔" میں نے مبارک چھانگے کی طرف بڑھ کر کہا۔

"وہ تو دم توڑ چکا ہے۔" ڈھلوں صاحب پھر چیخے اور بلّو کی نبض ٹٹولنے لگے۔ وہ واقعی زندہ تھا۔ چند لمحوں تک وہ اُس کا چہرہ تکتے رہے اور پھر اپنے ملازموں کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

"میرا منہ کیا تک رہے ہو، اس بلّو کو جیپ میں ڈالو۔"

جب مسیتا خان اور فرید اس کو جیپ میں ڈال چکے، تو ڈھلوں صاحب چھانگے کی طرف بڑھے اور اس کی لاش کو انھوں نے اُلٹ دیا۔ اس کا کھُلا منہ اب آسمان کی طرف تھا۔ اور اس کی آنکھیں یُوں کھلی تھیں جیسے موت کا کرب اُن میں مجسّم ہو چکا ہو۔ اس کے سینے میں اس کا شکاری چاقو اندر دھنس کر دل کی کئی شریانیں کاٹ چکا تھا۔

ڈھلوں صاحب کسی گہری سوچ میں تھے۔ وہ چند لمحوں تک اُسے دیکھتے رہے۔ پشت اُن کی میری طرف تھی۔ سب ملازم سہمے کھڑے تھے اور شاید حکم کے منتظر بھی کیونکہ بندوقیں انھوں نے اس طرح تھام رکھی تھیں جیسے وہ اشارہ ملتے ہی مجھے بھُون ڈالیں گے۔

وہ بڑا خوفناک لمحہ تھا۔ مجھے اُن کی نیّت میں فتور نظر آ رہا تھا۔ وہ اس گھڑی کوئی بھی قدم اٹھا سکتے تھے۔ مگر ان کے اگلے اقدام کا تمام تر انحصار ڈھلوں صاحب کے فیصلے پر تھا۔ اور میں وہاں ان بھیڑیوں کے درمیان یکہ و تنہا رنے میں آئے خرگوش کی طرح کھڑا تھا۔ نہتا اور بے بس۔۔۔ وہ میرے ہتھیار مجھ سے پہلے ہی چھین چکے تھے اور وہ دونالی بندوق جو ڈھلوں صاحب نے مجھے دی تھی، اب مسیتا خان نے اُٹھا کر اپنے کندھے پر لٹکا لی تھی۔ ایک پستول ڈھلوں صاحب کی کمر سے لٹک رہا تھا اور ایک بھری دونالی ان کے ہاتھ میں تھی۔ جسے وہ بروقت استعمال نہ کر سکے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان کے ملازم مجھے جلد ہی زیر کر لیں گے۔ اُن کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ یوں آناً فاناً پانسہ پلٹ جائے گا۔ مگر اب جو کچھ ہو چکا تھا، اس کے نتائج و عواقب میرے لیے اتنے ہولناک تھے کہ میں ان کے تصوّر ہی سے لرز رہا تھا۔ میری مُشتِ استخواں یعنی ایک بار پھر آندھیوں کی زد میں تھی۔

چند لمحے ڈھلوں صاحب اسی طرح میری طرف پشت کر کے مبارک چھانگے پر جھکے رہے پھر اچانک وہ مڑے اور اپنے پستول

کی نال میری طرف اُٹھا دی۔
"میں۔۔۔ میں۔۔۔ تم نے مجھے زبردست مصیبت میں ڈال دیا ہے جیلانی!" ان کا چہرہ غصے کی شدت سے تمتما رہا تھا۔ میں پیچھے نہیں ہٹا۔ اُن کے سامنے تن کر کھڑا رہا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ پستول کی لبلبی دبا دیں میرے تارِ رگِ جاں کو کاٹ ڈالیں ۔۔۔ اس زندگی نے مجھے دیا ہی کیا تھا۔ میری ران کا زخم ٹیسیں دے رہا تھا اور زندگی کی وقعت میری نظروں میں دم بدم گھٹتی جا رہی تھی۔ کہ میرے سامنے چھانگے کی لاش پڑی تھی جسے میں نے اپنی جان بچانے کے لیے چند ہی منٹ پہلے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اور اب ڈھلوں صاحب اپنے اس جان نثار ملازم کی اوندہناک موت کا بدلہ مجھ سے لینے کے لیے مجھ پر پستول تانے کھڑے تھے۔ اُن کے باقی چاروں ملازم بندوقیں ہاتھ میں لیے ان کے ذرا سے اشارے کے منتظر تھے۔ اُن کی آنکھوں میں ابلتی نفرت کا مجھے اچھی طرح احساس ہو رہا تھا۔ اور۔۔۔ اور میں اپنی جان وہیں ہار دینے کے لیے پوری طرح آمادہ ہو چکا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں مزاحمت نہیں کروں گا۔ اپنے چراغِ نفس کو بچانے کے لیے بالکل ہاتھ نہیں ہلاؤں گا۔ مگر نہیں ۔۔۔ ڈھلوں صاحب نے اچانک اپنا پستول چرمی خانے میں رکھا اور بولے۔
"اوے مسیتے خان! اسے ادھر ہی پڑا رہنے دے۔ تم میں سے کسی نے اپنی زبان کھولی تو اچھا نہ ہوگا۔ ہم اس کی بیوہ کی زندگی بھر کفالت کریں گے۔ تم جا کر پنو کی تھانے میں رپٹ درج کرا دو کہ کسی نے مبارک کو ادھر جیپ کے پاس قتل کر دیا ہے سمجھے۔ کہہ دینا کہ اس کے قاتل کا ہمیں کوئی علم نہیں۔ سمجھے ہو کہ نہیں؟"
"جو حکم سرکار!"
"یہی بہتر ہے۔ ہم اس فساد کو آگے نہیں بڑھانا چاہتے ۔۔۔ اس کی زندگی واپس نہیں آسکتی۔ مگر ہم اپنے مہمان کو کسی مصیبت میں پھنسا کر اپنی خاندانی روایت کو برباد نہیں کریں گے۔ ہم نے جیلانی صاحب کو پناہ دے رکھی ہے۔"
"جو حکم سرکار!"
مسیتا خان نظریں جھکائے کھڑا تھا۔
"تو چلو پھر اُدھر جیپ میں بیٹھو اس شکار پر لعنت بھیجو۔ یہ دن ہی بڑا منحوس ہے چلو جیپ میں بیٹھو۔"
"اس کا کیا کریں سرکار" فرید نے چھانگے کے پاس جاتے ہوئے کہا۔
ڈھلوں صاحب کا پارہ ایک دم تیز ہو گیا اُسے گندی گالی دیتے ہوئے بولے۔ "سنا نہیں تم نے؟ اسے ادھر ہی پڑے رہنے دو، اور تم یہاں رہو۔ لاش کی نگرانی کرو۔ پولیس کو ہم بلا رہے ہیں۔"
"وہ مجھ سے پوچھیں گے سرکار تو۔۔۔"
"کہہ دینا کہ تم ادھر سے گزر رہے تھے کہ تمہیں اسکی لاش پڑی ملی۔ اور کچھ نہیں کہنا سمجھے۔"
"بہت اچھا سرکار۔"
مگر ڈھلوں اس کی ہاں سے مطمئن نہیں ہوئے۔ اسے گھسیٹ کر ہم سے دُور لے گئے۔ وہ چند منٹ تک اُسے کوئی بات سمجھاتے رہے اور پھر اس کا کندھا تھپتھپا کر وہ ہماری طرف مڑے۔ کچھ دیر وہ لاش کے قریب کھڑے رہے پھر فرید کو وہاں چھوڑ کر انہوں نے ہم سب کو جیپ میں بٹھایا اور کوئی آدھ میل جا کر ایک اور راستے سے واپس چوگوٹھ پہنچ گئے۔
ڈھلوں صاحب نے ڈرائیور کو مجھ سے الگ لے جا کر کچھ ہدایات دیں جن کے مطابق وہ بلو کو بے ہوش حالت میں ساتھ لے کر گاؤں کے دوسرے حصے کی طرف بڑھ گیا اور مجھے اپنے ساتھ لے کر ڈھلوں صاحب اپنی حویلی کے اندر جا پہنچے۔
وہ بہت زیادہ پریشان تھے۔ مہمان خانے میں وہ میرے ساتھ ہی آگئے۔ میں نے اپنے کپڑے تبدیل کیے تو اس عرصے میں وہ کرسی پر بیٹھے سگریٹ پھونکتے رہے۔ میں نے شلوار کا پائنچہ ران تک اُٹھا کر اُن کے سامنے اپنا زخم دیکھا۔ جس پر سے دھول جھاڑ کر دھو ڈالی تھی۔ میرے زخم پر اُن کی نظر پڑی تو بولے۔
"ادھر اس الماری میں مرہم پٹی کا سامان پڑا ہے۔ زخم پر لگا لیں۔" اُن کی ہدایت پر میں نے الماری میں سے مرہم پٹی کا سامان نکالا اور زخم کو اچھی طرح اسپرٹ سے صاف کر کے اس پر دوا لگا کر پٹی باندھ لی جب میں ذرا مطمئن ہو کر اُن کے سامنے بیٹھا تو وہ بولے۔
"میں نے یہ سامان اسی لیے رکھا ہے کسی وقت بھی اس کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔"
"یہ تو بہت ضروری ہے ڈھلوں صاحب! اس وجہ سے کہ یہاں آدمی ہر وقت مسلح رہتا ہے اور مرنے مارنے پر تُلا رہتا ہے۔"
میری یہ بات سُن کر وہ ایک عرصے بعد پہلی بار مسکرائے۔ میری طرف اپنا طلائی سگریٹ کیس بڑھاتے ہوئے بولے۔
"آخر یہ جھگڑا ہوا کیسے؟ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔"
"میں خود حیران ہوں ڈھلوں صاحب مگر مجھے یوں لگتا ہے وہ پہلے سے تُلے بیٹھے تھے۔ اُن کے ارادے شروع سے خطرناک تھے۔ کہہ کر میں نے ساری صورتِ حال انھیں سمجھائی تو وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ میں بڑے غور سے اُن کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ کا اندازہ لگاتا رہا۔ مگر میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ آتا بھی مجھے ضرور محسوس ہو رہا تھا کہ وہ لوگ جو میری موجودگی پر اس قدر بھرے بیٹھے تھے تو اس کے پیچھے کوئی خاص بات ہی ہوگی ورنہ وہ یوں ہی نہ بیٹھے ہوتے۔

مجھ پر اتنے خوفناک انداز میں یوں بلا وجہ نہ بل پڑتے۔ مگر انھیں مجھ سے کیا پرخاش تھی؟ کیوں وہ مجھ پر اتنی درندگی سے حملہ آور ہوئے تھے۔ حالانکہ اس سے پہلے وہ میری صورت سے بھی آشنا نہیں تھے۔ یہ ایسے سوالات تھے جن کا کوئی جواب میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔
کافی دیر تک مراقبے میں رہنے کے بعد انہوں نے سر اُٹھایا۔ اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے ۔۔۔
"مردوں کی زندگی میں بڑے بڑے سخت مرحلے آتے ہیں ایسے میں ہمت ہار دینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ میرے دل میں آپ کی بڑی عزت ہے جیلانی صاحب، میں پوری کوشش کروں گا کہ اس قتل کا الزام آپ کے سر نہ آئے۔ آپ پہلے ہی بہت زیادہ مصیبت میں ہیں۔"
اُن کی یہ بات سُن کر میرے دل میں اُن کے لیے سپاس گزاری کے جذبات اور زیادہ گہرے ہو گئے۔ وہ مجھے اس قتل کے سلسلے میں پولیس کی پکڑ دھکڑ سے صاف بچا لینا چاہتے تھے یہ اُن کا مجھ پر بہت بڑا احسان تھا، بہت ہی بڑا احسان۔ ورنہ میرے بچ جانے کے کوئی امکانات موجود نہیں تھے۔ ایسی صورت میں کہ میری جان اُن کے قبضے میں تھی۔ وہ اس قتل کے عینی شاہد تھے۔ وہی نہیں اُن کے باقی ملازموں نے بھی وہ سارا خونی منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ڈھلوں صاحب نے انہیں بھی زبان بند رکھنے کا حکم دیا تھا۔ اس چھانگے کے قتل کو کسی نامعلوم آدمی کے سر ڈال دینا چاہتے تھے، تاکہ میری گردن کسی اور الزام سے بچ جائے۔ ان کے کردار کی اس عظمت نے مجھے حیران کر دیا۔ اُن سے بڑا آدمی میں نے کوئی اور دیکھا ہی نہیں تھا۔ لوگ تو اپنا کھلونا ٹوٹ جانے پر سر دھڑ کی بازی لگا دیتے ہیں۔ وہاں تو اُن کا ایک خاص اور بڑا ہی قابلِ اعتماد اور جاں نثار ملازم میرے ہاتھوں قتل ہو گیا تھا۔ ہر چند کہ وہ قتل میں نے اپنے تحفظ کے لیے کیا تھا اور مجھے صاف معلوم ہو چکا تھا کہ وہ دونوں آدمی مجھے قتل کر دینے پر تُل چکے ہیں مگر اپنے دفاع میں بھی کسی کو قتل کر دینا کہاں جائز ہے۔ بالخصوص ایسی صورت میں کہ مقتول کے مالک اور وارث سامنے کھڑے ہوں اور قاتل اُن کے قبضۂ قدرت میں ہو۔
یہ سب کچھ مجھے الف لیلوی قسم کی بات معلوم ہو رہا تھا۔ پھر بھی ڈھلوں صاحب میرے سامنے تھے اور وہ مجھے بچا لینے کا وعدہ کر رہے تھے۔ اُن کے وعدے پر کسی قسم کے شک و شبہے کی گنجائش ہرگز نہ تھی۔
"میں۔۔۔ میں آپ کا کس منہ سے شکریہ ادا کروں ڈھلوں صاحب! آپ کے اس احسان کو میں کبھی نہ بھول سکوں گا مگر جو کچھ ہوا ہے اس میں میرے ارادے کو کوئی دخل نہیں تھا ڈھلوں صاحب!"
"میں سمجھتا ہوں۔ میں وہیں تو کھڑا تھا۔ شاید وہ آپ کو جان سے مار دینا چاہتے تھے۔ وہ بہت مشتعل ہو چکے تھے۔ وہ میری بھی بات نہیں سن رہے تھے۔"
"یہی تو میں کہہ رہا ہوں ڈھلوں صاحب!"
"دیکھیں اب آپ کے لیے سب سے بہتر یہی ہے کہ آپ ادھر چُپ چاپ پڑے رہیں۔ یہاں آپ کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ کوئی کام ہو گا تو میں آپ کو بتا دوں گا۔"
"آپ کے لیے میری جان بھی حاضر ہے ڈھلوں صاحب آپ حکم کریں۔ آپ کے لیے میں اپنی گردن بھی کٹوا دوں گا۔" میں نے گلوگیر آواز میں کہا۔
وہ میرے لہجے کی فروتنی اور سپاس گزاری کو محسوس کر کے مسکرائے اور ایک اور سگریٹ میری طرف بڑھا کر بولے۔
"آدمی آدمی کا دارُو ہوتا ہے جیلانی صاحب اور مجھے امید ہے کہ آپ وقت آنے پر مجھے مایوس نہیں کریں گے۔ ہماری اس علاقے میں رہتے ہوئے ذمے داریاں کچھ ایسی ہیں کہ ہمیں ہر کام بہت سوچ سمجھ کر کرنا پڑتا ہے۔ چھانگا تو واپس نہیں آسکتا پھر میں آپ جیسے جی دار آدمی کو پولیس کے حوالے کیوں کر دوں۔ وہ تو پہلے ہی آپ کے خون کے پیاسے ہیں۔ پھانسی کی کوٹھری سے بھاگے تھے نا آپ؟"

"جی ہاں آپ کو تو آہو صاحب نے سب کچھ تباہی دیا ہوگا۔" میں نے نہایت ندامت آمیز آواز میں کہا۔

"کوئی بات نہیں، اب آپ آرام کریں۔ وہ آہو صاحب تو آئے ہی نہیں، میں آج آسیہ سے آپ کی ملاقات کرا دوں گا۔ اس کے بارے میں آپ بالکل فکر نہ کریں۔ انھیں یہاں اپنے گھر سے زیادہ آرام ملے گا۔ آپ کسی ملازم سے اِدھر اُدھر کی کوئی بات نہ کریں۔ اور ہاں اپنا نام آپ کسی کو نہ بتائیں۔ آج سے آپ کا نام ہاشم علی ہوگا۔ ہر ایک سے یہی کہیں۔ ہاشم علی۔"

"مگر آپ کے نوکر تو جان چکے ہیں کہ میرا نام کیا ہے۔"

"میں انھیں سمجھا دوں گا، بے فکر رہیں۔"

"جیسے آپ کی مرضی، میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"یہ بھی اچھا نام ہے آپ کے لیے یہ زیادہ مبارک ثابت ہوگا۔ میں نے سوچ سمجھ کر یہ نام تجویز کیا ہے۔"

"مگر نام سے کیا ہوگا ڈھلوں صاحب! میری صورت تو نہیں بدل جائے گی نا۔"

"اس کی بھی فکر نہ کریں آپ کے چہرے کی تھوڑی بہت مرمت میں کروا سکتا ہوں۔ اپنے ڈاکٹر کو میں یہاں لے آؤں گا۔"

"کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں۔" میں گھبرا گیا۔

"پریشان نہ ہوں ہاشم صاحب! کوئی بڑی گڑبڑ نہیں ہو گی مگر جو کچھ میں کروں گا اس سے آپ ہمیشہ کے لیے پولیس کے جھنجھٹ سے بچ جائیں گے۔"

یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے باہر نکل گئے۔

کچھ ہی دیر بعد سردری خانم کا سوٹ کیس لے کر ایک ملازم میرے پاس آیا اور بولا۔

"صاب! اس میں آپ کا سامان رکھا ہے۔ حجامت بھی بنا لیں بال دیکھیں آپ کے کتنے بڑھ آئے ہیں۔"

یہ کہہ کر اس نے وہ سوٹ کیس میرے سامنے رکھ دیا اور خود باہر نکل گیا۔

میں نے غسل خانے میں جا کر شیو کیا اور منہ ہاتھ دھو کر لیٹ گیا۔ زندگی ناسور بنتی جا رہی تھی۔ اب مجھے ہاشم علی بن کر بھی زندگی گزارنا پڑے گی۔ میں سمجھتا تھا کہ ڈھلوں صاحب کی پناہ میں آکر میں ہر بلا سے محفوظ ہو گیا ہوں۔ اُن کا رویّہ میرے ساتھ بہت ہی اچھا تھا۔ جس نے میرے دل میں نیا حوصلہ پیدا کر دیا تھا مگر اس روز جو کچھ ہوا تھا۔ اس کی وجہ سے سب کچھ ہی اُلٹ پلٹ ہو کر رہ گیا تھا۔ میں ایسا مٹیال بن کر رہ گیا تھا جس میں سے مسلسل مٹی کھودی جا رہی تھی۔ جس کا خلا دم بدم بڑھتا ہی جا رہا ہو۔ میرا ماس کبار سارے کا سارا گھاٹے کا کھاتہ تھا میرے مہ د سال ویران ہو کر رہ گئے تھے۔ اور اسی حساب سے میرے حوصلوں کے منہدم ہوتے چلے گئے تھے۔ میری فروتنی اور عاجزی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اور اب میں وہ پیالا سا پُخ بہادر ہرگز نہیں میرا یہ خیال تھا کہ میں مر مر کے بچ رہا تھا اور بچ بچ کر سلامتی کی طرف میری مراجعت ناممکن ہو چکی تھی، اور اب پھندا اُس چھانگے کی موت نے میری گردن میں ڈال دیا تھا مجھے ضیقِ نفس میں مبتلا کر دیا تھا۔

ڈھلوں صاحب کا معتمد برکت میرے لیے ایک نوکر پر رکھوا کر دوپہر کا کھانا لایا تو میں اس میں سے ایک لقمہ سے نیچے نہ اتار سکا۔ میری بھوک ہی مر گئی تھی۔ برکت میرے سامنے بیٹھا تھا۔ جب میں نے کھانا جوں کا توں چھوڑ دیا، بہت حیران ہوا، بولا۔

"آپ نے تو ایک بُرکی بھی نہیں توڑی، خیر تو ہے؟"

"میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے برکت بھائی۔ کسی چیز کو جی نہیں چاہتا۔"

"کمال ہے۔ اُدھر چوہدری صاحب نے بھی کھانے کو ہاتھ نہیں لگایا ہے۔"

"کیوں، اُن کی طبیعت خراب ہے کیا؟"

"وہ جی! چوہدری صاحب کا ایک ملازم تھا چھانگا، کسی نے اُدھر چھمب کے پاس قتل کر دیا ہے۔"

"اچھا! تمھیں کس نے بتایا؟"

"وہ جی پولیس اس کی لاش اٹھوا کر لے گئی ہے۔ ابھی آئے تھے چوہدری صاحب سے بات ہوئی تھی اُن کی۔"

"اچھا! پھر پتہ چلا ہے کہ کس نے اسے قتل کیا ہے؟"

"وہ جی ایک اس کا پرانا دشمن ہے یہاں۔ گاڈی نام اس کا۔ پولیس اسے پکڑ کر لے گئی ہے۔ اسے اُدھر انھوں نے ... میں ہی پکڑا ہے۔"

"چوہدری صاحب نے کیا کہا؟"

"وہ کیا کہتے۔ وہ تو خود بہت تنگ تھے اُس سے ... کیا ہے اُس نے چوہدری صاحب کا۔"

"نقصان! وہ کیسے؟"

"وہ جی بڑی لمبی بات ہے۔ وہ پہلے چوہدری صاحب کا مزارع تھا مگر پھر چوہدری صاحب نے اُسے بے دخل کر دیا ... سال کی بات ہے اپنے گاؤں سے بھی نکالنا چاہتے تھے مگر ... رہا۔ پچھلی فصل آئی تو اُس نے دھان کے کھیت کو آگ لگا دی۔ اس نے چوہدری صاحب کی دو گھوڑیاں بھی چرا لیں مگر کوئی ... نہ ملنے کی وجہ سے وہ بچ گیا۔ اس چھانگے سے کئی بار اس کی

چکی ہے۔"

"کس بات پر لڑائی ہوئی تھی اُن کی؟"

"جی وہ گاڈی کی ایک بہن تھی جیراں۔ اسی بات پر اُن کا تین بار جھگڑا ہوا۔"

"پھر کیا ہوا؟" میں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"پھر کیا جی؟ میں نے سُنا ہے کہ کسی نے اسے اغوا کر کے اُدھر وہاں رادھا رام پہنچا دیا۔ یہ چار مہینے پہلے کی بات ہے۔ اس بات پر گاڈی نے بہت واویلا مچایا مگر وہ جیراں کہیں ملی ہی نہیں۔ وہ کئی بار وہاں رادھا رام جا چکا ہے مگر جس بنتے پر وہ جاتا تھا وہاں وہ لڑکی ملتی ہی نہیں تھی۔"

"تو اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ لڑکی چھانگے نے اغوا کی تھی؟"

"میں نے یہ تو نہیں کہا ہے صاب جی! پر شک وہ اُسی پر کرتا تھا۔ آج موقع ملتے ہی اس نے چھانگے کو مار دیا۔"

"کوئی گواہ بھی ہوگا اس بات کا۔"

"وہ جی اپنا پراغ ترکھان ہے اُس نے پولیس کو یہی بتایا ہے۔ لاش اُدھر چھمب کے پاس جو رستہ ہے نا وہاں پڑی ہوئی تھی۔ وہ کہتا ہے کہ اُس نے گاڈی کو لاش کے قریب کھڑے دیکھا تھا۔"

"ہوں، اور بھی کسی نے گواہی دی ہے؟"

"جی ہاں! مستیا خان نے بھی یہی کہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اُس نے گاڈی کو چھمب کی طرف دوڑتے دیکھا تھا۔ وہ ذرا آگے گیا تو رستے میں چھانگا مرا پڑا تھا اور گاڈی چھمب کی طرف دوڑ رہا تھا۔"

"تو یہ بات ہے۔ چوہدری صاحب کی پریشانی قدرتی بات ہے گاڈی کو انھوں نے کہاں سے پکڑا ہے؟"

"بتایا ہے نا میں نے صاب جی! وہ اُدھر چھمب پر مچھلیاں پکڑ رہا تھا۔"

"یہ تو بہت ہی بُرا ہوا یار! چھانگا تو مارا ہی گیا ہے۔ اب وہ اُس گاڈی کو بھی مار دیں گے۔ پھانسی چڑھا دیں گے۔"

"نہیں جی! چوہدری صاب بہت نرم دل آدمی ہیں۔ مائی باپ بن جاتے ہیں ایسے موقعوں پر۔ بس اسے زیادہ سے زیادہ آٹھ دس سال کی سزا ہو جائے گی اور کچھ بھی نہیں ہوگا۔"

"وہ کیسے؟"

"وہ جی! سارا معاملہ تو گواہوں پر ہی چلے گا نا۔ اور چوہدری صاحب کے بغیر کوئی گواہ عدالت میں جا ہی نہیں سکتا۔"

"یار کہیں ایسا تو نہیں کہ اس جیراں پر چوہدری صاحب بھی مہربان رہے ہوں۔"

"چھوڑو بات شاہو! بیچ کی بات مت کھولو۔ ویسے آپ بڑے سیانے ہو۔ چھانگا اس جیراں کو اِدھر ہی لایا کرتا تھا۔"

"اب کہاں ہے وہ؟"

"اب تو وہ اُدھر سندھ جا چکی ہے۔ گلے کی رسّی تو نہیں بنانا تھا اُسے ڈھلوں صاب نے۔" برکت بڑی عیّاری سے مسکرایا پھر میرے چہرے کو غور سے تکتے ہوئے بولا۔

"صاب جی! آپ ایک سو روپیہ مجھے دے سکیں گے؟ بچہ میرا دسویں میں ہے اُس کا داخلہ بھیجنا ہے۔ بڑی مہربانی ہوگی صاب آپ کی۔"

"ارے یہ کون سی مشکل بات ہے۔ یہ لو۔ داخلہ تو ضرور ہو جانا چاہیے۔" یہ کہہ کر میں نے جیب میں سے ہاتھ ڈال کر ایک نوٹ دُوسروں سے الگ کر کے باہر نکالا اور اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ برکت خوش ہو گیا اور مجھے ڈھیر ساری دعائیں دیتا ہوا وہ کھانے کا طشت اٹھا کر باہر چلا گیا۔

میری حیرت فزوں تر ہوتی جا رہی تھی۔ ڈھلوں صاحب نے اس قتل کا سارا بوجھ کسی بے گناہ کی گردن پر ڈال دیا تھا اور اس میں بھی وہ اپنا مفاد محفوظ کر گئے تھے۔ انھوں نے اپنے کسی پرانے دشمن کو اس قتل کے وسیلے سے اپنی راہ سے ہٹا دیا تھا۔ اور اب وہ لاکھ شور مچائے اُس کی گلو خلاصی نہیں ہو سکتی تھی۔ اصل قاتل اُن کی اس وسیع و عریض حویلی کے خوبصورت مہمان خانے میں بیٹھا تھا۔

غلام جیلانی کے گناہ کی سزا اس بدنصیب گاڈی کو مل رہی تھی۔ جس کے فرشتوں کو بھی علم نہ ہوگا۔ کہ چھانگا قتل ہو چکا ہے۔ اس کی لاش تو اُدھر بیہے میں پڑی تھی پھر وہ اُدھر چھمب کے پاس پھیلے رستے میں کیسے جا پہنچی۔ صاف ظاہر تھا کہ اُسے ڈھلوں صاحب نے وہاں سے اٹھوا کر اُدھر پھینکوا دیا تھا۔ اور اس سلسلے میں اُن کے چاروں ملازموں میں سے کوئی بھی منہ نہ کھول سکتا تھا۔ نہ وہ ڈرائیور نہ مستیا خان، نہ فریداد، نہ وہ گلو۔ وہ ان ڈھلوں صاحب کے زرخرید غلام تھے۔ اُن کی زبانیں گنگ تھیں۔ وہ خدا جانے کیسے کیسے خوفناک جرائم کے عینی شاہد تھے۔ مگر وہ بول ہی نہیں سکتے تھے۔ نہ اُن کی آنکھ اٹھتی تھی، نہ اُن کی زبان کھل سکتی تھی۔ انہیں ڈھلوں صاحب کی جاگیردارانہ سطوت نے خاموش کر رکھا تھا اور میرا یہ حال تھا کہ میں قانون کے ہاتھ سے اپنی گردن بچانے کے لیے دربدر پھرتا اب ایسی جگہ آ پہنچا تھا جہاں ڈھلوں صاحب کا ذرا سا اشارہ مجھے تختۂ دار پر کھنچوا سکتا تھا۔ میرے ہاتھ چھانگے کے خون سے رنگے تھے مگر انھوں نے مجھے صاف بچا لیا تھا۔ مگر کیوں؟ انہیں مجھ سے کیا ہمدردی ہے۔ وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ انھوں نے آسیہ کو بھی جیراں بنا لیا ہو۔ نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ ایسا ہو گیا تو پھر خدا جانے کیا ہو جائے۔ میرے ہاتھوں سے کیسے کیسے بھیانک

جرائم سرزد ہونے لگیں۔ کس کس کی گردن کا منکا میرے ہاتھوں ٹوٹے۔ میں تو۔۔۔ میں تو زمین آسمان ایک کردوں گا۔ صاحب! مجھے آزمائش میں نہ ڈالیے گا چوہدری مختار ڈھلوں صاحب! ورنہ اس حویلی کی اینٹ سے اینٹ بج جائے گی۔ آپ کو نہیں پتہ ہے، آپ نے کس سے سینگ پھنسا لیا ہے۔ تیری یہ گورگانی ساری کی ساری دھری کی دھری رہ جائے گی۔ آسیہ پہ کوئی آنچ نہیں آنی چاہیے نہیں آنی چاہیے۔

یہ خیال اتنا سوہانِ رُوح تھا کہ میں سر سے پاؤں تک پسینے میں نہا گیا۔ چند لمحوں تک مجھ پر ایسی مجنونانہ کیفیت طاری رہی کہ لفظ اس کے اظہار سے قاصر ہیں مگر پھر آہستہ آہستہ میرے شکوک کا تارِ عنکبوت کٹنے لگا۔ مجھے ڈھلوں صاحب کے بارے میں ایسے وسوسوں کو اپنے دل میں جگہ نہیں دینی چاہیے۔ انہوں نے آج مجھے اس چھانگے کے چکر سے بچا کر مجھ پر بہت بڑا احسان کیا تھا۔ ورنہ انہیں کیا پڑی تھی کہ وہ مجھے یوں چھپا کر اپنے گھر میں بٹھا لیتے۔ کسی نہ کسی کو تو وہ پولیس کے حوالے کرتے ہی۔ اب اگر انہوں نے کسی گاڈی نام کے آدمی کو قربانی کا بکرا بنالیا تھا تو اس میں بھی اُن کی کوئی مصلحت ضرور ہوگی۔ میں تو بہرحال محفوظ ہوگیا تھا۔ میں نے معاملے کے تمام پہلوؤں پر غور کرکے اپنے سارے خدشے ذہن سے جھٹک دیے۔ ایک بات صاف ظاہر تھی کہ ڈھلوں صاحب اپنی معاملہ فہمی میں اُن آہو سے سو ہاتھ آگے تھے۔ جس نے مجھے ذلیل کر دیا تھا۔ آہو تو اُن کا پاسنگ بھی نہیں تھا۔ انھوں نے جس حکمت اور دانائی کا مظاہرہ اس چھانگے کے معاملے میں کیا تھا وہ میرے لیے باعثِ حیرت بھی تھا اور باعثِ اطمینان بھی۔

آسیہ کے سلسلے میں جو شکوک میرے دِل میں اُبھرے تھے اُن کے ازالے کے لیے میں نے بہرحال فیصلہ کرلیا کہ اب جیسے ہی میری ڈھلوں صاحب سے ملاقات ہوئی میں انھیں مجبور کردوں گا کہ وہ آسیہ کو میرے حوالے کردیں۔ میں اور زیادہ دیر انتظار نہیں کروں گا۔"

سُورج چھپنے میں ابھی آدھ گھنٹہ باقی تھا کہ ڈھلوں صاحب مہمان خانے کے احاطے میں نمودار ہوئے۔ چوکیدار اس گھڑی دروازے میں اسٹول پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ انہوں نے اُسے یوں بے خبر دیکھا تو بڑے زور سے سٹول کو ٹھوکر مار کر۔۔۔۔۔۔ چوکیدار کو زمین پر گرا دیا۔ وہ۔۔۔ علی زئی بڑبڑا کر حقیقت کی دُنیا میں آیا تو اس نے دیکھا کہ اُس کی بندوق اچھل کر دُور جا پڑی تھی۔ اُس نے فوراً اپنی بندوق اُٹھائی اور اور سر جھکا کر ڈھلوں صاحب کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ اس حالت میں کہ اُس کے چہرے سے ندامت عیاں تھی۔ ڈھلوں صاحب نے اُسے یوں اپنے سامنے تصویرِ خجالت بنے دیکھا تو مسکرا دیے۔ بولے۔

"اوئے ککڑ خان تو ادھر بیٹھے گا کہ کسی گوری کے خواب دیکھے گا؟"

"غلطی ہوگیا ڈھلوں صاب بالکل غلطی ہوگیا۔"

"ذرا جم کر کھڑک کر بیٹھا کر۔ تیرا کچھ فائدہ تو ہونا چاہیے راشن تو ڈبل کھاتا ہے اور کام سنگل بھی نہیں کرتا۔"

"اب ادھر ام لیفٹ رائٹ کرے گی ڈھلوں صاب ایک بار معافی دے دو۔"

"ٹھیک ہے، ادھر دھیان سے بیٹھو۔" یہ کہہ کر وہ میری طرف پلٹے اور میرے چہرے پر پھیلی سوچ کی لکیریں دیکھ کر بولے۔

"کیا حال ہے ہاشم صاحب! آپ کا سُنا ہے آپ نے کھانا نہیں کھایا۔" یہ کہہ کر انھوں نے میری کمر میں ہاتھ ڈالا اور مجھے برآمدے میں سے دھکیل کر کمرے میں لے گئے۔

"بس جی نہیں چاہتا تھا کچھ کھانے کو۔ اس چھانگے نے پریشان کردیا ہے مجھے۔"

"ہاں، یہ تو ہے۔ بڑی خوفناک بات ہوگئی ہے ہاشم صاحب اب میں آپ کو اسی نام سے پکاروں گا۔"

"پولیس آئی تھی ادھر؟"

"ہاں! مگر آپ فکر نہ کریں۔ اُن کا مُنہ بند کرنے کا بندوبست میں نے کردیا ہے۔"

"وہ کس طرح؟" میں نے پوچھا۔

"بس یہ بات آپ مجھ پر چھوڑ دیں ہاشم صاحب آپ کی جان کا میں ذمے دار ہوں۔ آدمی آدمی کا دارو ہوتا ہے۔" پھر وہ مسکرا کر مجھے دیکھ کر بولے۔ "اب آپ کو کچھ ہمارا خیال بھی کرنا ہوگا ہاشم صاحب آپ پر ہمارا بھی کچھ حق ہے۔"

"کیوں نہیں! آپ نے مجھ پر اتنا بڑا احسان کیا ہے ڈھلوں صاحب! مجھے بتائیں میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟" میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ بلاشبہ اس نے مجھے خرید لیا تھا۔

"دیکھیں پرسوں گیارہ بجے ادھر نامزدگیوں کے کاغذات جمع کیے جا رہے ہیں مرکزی اسمبلی کے لیے انتخابات ہو رہے ہیں نا۔"

"جی ہاں جی ہاں۔ وہ ہادی علی بھی انتخاب ہی لڑ رہا تھا۔"

"ہاں!" وہ مسکرائے، بولے "مگر یہاں کسی کو ہادی علی کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے اس خون خرابے سے سخت نفرت ہے۔ آپ کو میں صرف اتنی زحمت دوں گا کہ میرے مدِ مقابل ملک رحمت علی کو پرسوں شہر نہ پہنچنے دیں۔"

"میں سمجھا نہیں۔" میں نے سنبھلتے ہوئے کہا۔

"بات صرف اتنی ہے کہ اُسے آج رات گھر سے غائب کردیں۔ اسے اغوا کرکے پرسوں شام تک کسی ایسی جگہ بند رکھیں کہ وہ نامزدگی کے کاغذات داخل نہ کروا سکے۔"

"اس سے آپ کو کیا فائدہ ہوگا۔"

"فائدہ یہ ہوگا کہ دوسرے دو آدمی جو ہمارے مقابلے پر ہیں وہ تو اپنی ضمانتیں ضبط کرا بیٹھیں گے۔ ایک کو تو شاید میں آج بٹھا ہی دوں، اُسے میں نے رقم کا لالچ دیا ہے۔ دوسرا امیدوار بھی یونہی سا ہے۔ میرا اصل مقابلہ رحمت علی سے ہے اگر وہ درمیان میں سے نکل جائے تو میری کامیابی یقینی ہے۔"

"کیا یہ کام آج ہی کرنا ہوگا؟"

"ہاں پرسوں کاغذاتِ نامزدگی داخل کیے جائیں گے۔"

"کہاں رہتا ہے یہ رحمت علی؟"

"یہ چھوٹا سا زمیندار ہے۔ اُدھر پیر آباد میں رہتا ہے۔ پتوکی کے پاس گاؤں ہے اس کا۔ میرا کوئی آدمی آپ کے ساتھ نہیں جائے گا۔"

"مگر میں اُسے پہچانوں گا کس طرح؟ تنہا آدمی کا تو یہ کام ہرگز نہیں ہے۔"

"بات دراصل یہ ہے کہ میرے تمام آدمیوں کو وہ لوگ اچھی طرح پہچانتے ہیں۔ میں باہر سے کوئی آدمی منگوا کر یہ کام اُس سے بھی لے سکتا تھا مگر آپ سے معتبر آدمی مجھے اور کوئی نظر نہیں آیا۔ آپکی بہادری اور جی داری کے میں بہت سے قصے سن چکا ہوں جیلانی صاحب! آپ سے بہتر یہ کام کوئی نہ کرسکے گا۔"

"میرا مسئلہ یہی ہے کہ میں اُسے پہچان نہیں سکتا ہوں۔"

"یہ کوئی ایسی مشکل بات نہیں ہے۔ پیر آباد میں اس کا گھر مشہور ہے اور اُسے ڈھونڈ لینا بہت ہی آسان ہے۔"

"ملک رحمت علی! ہوں۔ ویسے ڈھلوں صاحب اگر میں اِس کام سے اپنی معذوری کا اظہار کردوں تو؟" میں نے سگریٹ کو راکھدان میں مسل دیا۔

ڈھلوں صاحب نے تیزی سے پہلو بدلا اور میرے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے بولے۔

"مجھے معلوم ہے جیلانی صاحب آپ کے لیے یہ کام کچھ مشکل نہیں ہے کیونکہ جس دانائی اور دلیری کی اس میں ضرورت ہے وہ آپ میں موجود ہے لیکن اگر آپ اس کام کو نہ کرنا چاہیں تو یہ آپ کی مرضی ہے۔ میں نے آج چھانگے کے قتل کے بعد آپ کو جو بچایا ہے تو یہ میرا فرض تھا۔ آپ میرے مہمان ہیں اور میں نے آپ کو پناہ دی ہے مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں ہوگا۔"

اُن کا لہجہ بتدریج معمول پر آتا چلا گیا۔ اُن کے چہرے سے قطعاً یہ عیاں نہیں ہوتا تھا کہ میری بات سے انہیں مایوسی ہوئی ہے یا وہ ناراض ہوگئے ہیں۔ اُن کے احسان کو مدِنظر رکھتے ہوئے میں نے ساری صورتِ حال پر غور کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ اب صرف میری جان اُن کے قبضۂ قدرت میں آ چکی تھی بلکہ آسیہ بھی انہیں کے رحم و کرم پر تھی۔ میری معمولی سی لغزش یا بے حسابی ہم دونوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تباہ کرسکتی تھی کیونکہ چھانگے کے قتل کے کئی عینی گواہ موجود تھے۔

"میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ میرے بارے میں ایسے خیالات رکھتے ہیں۔ میں رحمت علی کو آپ کے راستے سے ہٹا دوں گا۔" میں نے فیصلہ کن انداز سے کہا۔ اب میرے لیے انکار یا فرار کی کوئی راہ کھلی نہیں رہ گئی تھی۔ مجھے اب کسی کو قتل نہیں کرنا تھا بلکہ ڈھلوں صاحب کے ایک مدِ مقابل کو تھوڑی دیر کے لیے منظر سے غائب کر دینا تھا اور بس۔ یہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں تھی۔

"مجھے آپ کا یہ جواب سُن کر خوشی ہوئی ہے جیلانی صاحب! ابھی سُورج چھپنے پر آپ کو برکت پچھلے دروازے سے نکال دے گا۔ وہ آپ کو ایک گھوڑی بھی دے گا اور آپ کے ہتھیار بھی۔ بس آج رات یہ کام ہوجانا چاہیے۔" یہ کہہ کر وہ کرسی سے اُٹھ گئے۔

"آپ بے فکر رہیں۔ ایسا ہی ہوگا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ مجھے آسیہ سے مِلا دیں۔"

"اس کے بارے میں بالکل فکرمند نہ ہوں جیلانی صاحب ابھی میں کہ وہ اپنے بڑے بھائی کے گھر میں ہیں۔ آپ واپس آئیں تو میں اُس سے آپ کو ملوادوں گا۔ مجھ پر بھروسہ رکھیں جیلانی صاحب وہ یہاں بالکل محفوظ ہے۔"

"پھر بھی! مجھے اس سے ملوا دینے میں آپ کا کیا حرج ہے؟"

"حرج تو کوئی نہیں ہے مگر ابھی آپ کے پاس وقت کہاں ہے۔ جلدی سے پیر آباد کے لیے تیار ہو جائیں۔ آسیہ سے کل بھی ملاقات کی جاسکتی ہے۔"

یہ بات انھوں نے کچھ ایسے لہجے میں کہی کہ میں اُن کا منہ ہی تکتا رہ گیا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتے باہر نکلے تو میں نڈھال سا ہوکر بستر پر گر گیا۔ میں چکی کے دو پاٹوں میں دب کر رہ گیا تھا۔ میرے اپنے اختیار میں کچھ بھی نہیں تھا۔ میں اگر انکار کرتا تو وہ آسیہ کو کسی اور بلاخیز دریا میں پھینک دیتے۔ ڈھلوں صاحب کے پاس آسیہ کو آہو نے خاص مقاصد کے لیے پہنچایا تھا اور اب وہ میری اس مجبوری سے دُہرا فائدہ اٹھا رہے تھے۔ میں ڈھلوں صاحب کا یہ نیا حکم ٹال ہی نہیں سکتا تھا اور وہ مجھ سے وعدہ لے کر واپس جا چکے تھے۔

کوئی آدھ گھنٹے بعد برکت میرے پاس آیا۔ میرے دونوں ہتھیار لا کر میرے سامنے رکھ دیے۔ بولا۔

صاب جی! گھوڑی اُدھر تیار کھڑی ہے ڈھلوں صاحب نے کہلا ہے کہ آپ ابھی نکل جائیں مگر پہلے کھانا کھالیں۔ وہ دیکھیں شوکا آ ہی گیا ہے۔"

میں نے برآمدے میں نظر ڈالی تو ملازم سر پر پرٹے رکھے اندر چلا آ

رہا تھا۔ اور اس وقت میری بھوک چمک چکی تھی۔ میرے لیے اس وقت بھی انہوں نے خاص اہتمام کیا تھا۔

کھانے سے فارغ ہو کر میں نے ہتھیار سنبھالے اور کمبل کی بکل مار کر برکت کے ساتھ مہمان خانے کے عقبی حصے میں جا پہنچا وہاں آٹھ ہاتھ اونچی دیوار میں ایک چھوٹا سا مضبوط آہنی دروازہ لگا تھا۔ اس کا تالہ کھول کر مجھے برکت نے باہر نکال دیا۔

دروازے پر ایک دُبلا پتلا سا ادھیڑ عمر آدمی چتکبری گھوڑی کی راس پکڑے کھڑا تھا۔ اس نے چمکار کر گھوڑی میرے حوالے کی تو برکت بولا۔

"صاب جی! رب راکھا۔ واپسی پر آپ سیدھے ڈیوڑھی میں آ جائیں اور اپنا نام ہاشم خان بتائیں۔"

"بہت بہتر جنابِ عالی!" میں نے جھلا کر کہا اور گھوڑی پر سوار ہو گیا۔ وہ کوئی بڑی ہی اصیل گھوڑی تھی۔ میرا ہاتھ گردن پر پڑتے ہی وہ رام ہو گئی۔ اُسے میں نے ایڑ دیکر پتوکی کی طرف بڑھا دیا۔

یار لوگوں نے مجھے ایک نئے مخمصے میں ڈال دیا تھا اور یہ میری تقدیر تھی کہ مجھے ایک روز اس پل صراط پر سے بھی گزرنا تھا۔ میں اب ڈھلوں صاحب کا آلۂ کار بن چکا تھا۔ میری زندگی کی ساری لکیریں آپس میں گڈمڈ ہو گئی تھیں۔ میں جو اس رات ملک رحمت علی کے تعاقب میں چل نکلا تھا، تو اس کی وجہ ڈھلوں صاحب کا وہ احسان تھا جس نے اُن کے سامنے میری گردن جھکا دی تھی اور میں حیران تھا کہ یہ سب کچھ کیسے وقوع پذیر ہو گیا۔

جس انداز سے وہ بدنصیب چھانگا مجھ سے بات کر رہا تھا اس سے تو مجھے یہی محسوس ہوتا تھا کہ وہ پہلے ہی سے میرے خلاف بہت زیادہ بھڑکا ہوا تھا۔ اس کے فلیتے کو کسی نے پہلے ہی سے آگ دکھا رکھی تھی ورنہ میری اس کی تو کوئی دشمنی نہیں تھی۔۔۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ لوگ میری طرف ڈھلوں صاحب کے بے پناہ التفات پر بھڑک اُٹھے ہوں۔ اُن کے دلوں میں رقابت اور حسد کا جذبہ پیدا ہو گیا ہو کیونکہ ایسے لوگ کسی اور کو اپنے مالک کے سامنے نمایاں ہوتا نہیں دیکھ سکتے۔ ایسے آدمی کا وجود ہی ان کے لیے۔۔۔۔ ناقابلِ برداشت ہو جاتا ہے۔ مگر میں تو ابھی اُن کے مالک سے ملا ہی تھا۔ اس سے کچھ حاصل تو نہیں کر سکا تھا۔ پھر اُن کی نظروں میں ایسے شعلے کس نے بھڑکا دیے تھے۔ یہ ایسا سوال تھا جو مجھے رہ رہ کر پریشان کرتا تھا مگر اس کا جواب مجھے نہیں ملتا تھا۔ میری درماندگی فزوں تر ہوتی جاتی تھی۔

پیر آباد وہاں سے تیرہ میل دور تھا۔ میں راستہ پوچھتا ہوا جب وہاں پہنچا تو عشاء کا وقت گزر چکا تھا۔ چاند ابھی زیا[illegible] اوپر نہیں اُٹھا تھا یوں لگتا تھا جیسے وہ گاؤں کے مشرق [illegible] اُوپر اُٹھے آم کے درختوں کو چوم رہا ہے۔ میں پیر آباد کی مسجد کے سامنے جا ٹھہرا۔ گھوڑی کی لگام میں نے باہر ایک درخت کے [illegible] باندھی اور مسجد کے دروازے میں داخل ہو گیا۔ مُلّا اس وقت [illegible] کے اندرونی دروازے بند کر رہا تھا۔ جوتے اتار کر میں نے ہاتھ پکڑے اور دبے پاؤں مُلّا کے پیچھے جا ٹھہرا۔

"السلام علیکم مولوی صاحب!" میں نے اسے اپنی طرف [illegible] کیا۔ وہ پاؤں پر گھوم کر مجھے حیرت سے دیکھنے لگا۔

"وعلیکم السلام کیا بات ہے بھائی مسافر ہو؟"

"جی ہاں مولوی صاحب رات اِدھر ہی گزاروں گا۔ تھک گیا ہوں۔" اس نے طاق میں رکھے سرسوں کے تیل کے [illegible] کی روشنی میں مجھے غور سے دیکھا اور بڑے روکھے لہجے میں بو[illegible]

"کہاں جانا تھا تمہیں؟"

"میں تو منا داں جا رہا تھا گھوڑی پر مگر وہ بھی تھک گ[illegible] ہے اور میں بھی۔ سوچا رات یہاں ہی گزار لیتا ہوں۔ مجھے [illegible] سے تھوڑا دودھ مل جائے تو بڑی مہربانی ہو گی۔ بہت بھوک لگی ہے۔" یہ کہہ کر میں نے دس دس کے نوٹ جیب سے نکال کر ان کی جھلک دکھائی۔ وہ لمبا تڑنگا دُہرے بدن کا مُلّا ان کو دیکھ کر میرے قریب کھسک آیا اور بڑے ملائم لہجے [illegible] بولا۔ "میں کھانا لا دیتا ہوں آپ کو۔ بھلا دودھ سے کیا [illegible]"

"نہیں، میرے پیٹ میں خرابی ہے میں سخت چیز [illegible] نہ کر سکوں گا بس دُودھ مل جائے تو بہتر ہو گا۔ یہ لیں رکھ[illegible] میری طرف سے مسجد کا چندہ بھی اس میں شامل ہے۔"

یہ کہہ کر میں نے بیس روپے اس کے ہاتھ پر رکھ دیے وہ خوش ہو گیا، بولا۔

"میاں صاحب خدا آپ کے درجات بلند کرے۔ اللہ کے گھر کی خدمت کا کتنا شوق ہے آپ کو۔"

"یہ تو ہر مسلمان کا فرض ہے مولوی صاحب یہ لیں [illegible] آپ کے لیے۔ آپ اس گھر کی اتنی خدمت کرتے ہیں آپ [illegible] حق تو ادا ہی نہیں کیا جا سکتا۔" یہ کہہ کر میں نے دس دس کے دس نوٹ گن کر مولوی صاحب کے ہاتھ میں دے دیے۔ [illegible] نہال ہی ہو گیا۔ مجھے ڈھیر ساری دعائیں دے کر بولا۔

"میاں صاحب اِدھر آپ کو کیا آرام ملے گا۔ صف[illegible] تو یہاں کچھ بھی نہیں آپ میرے غریب خانے پر چلیں [illegible] آپ بستر پر سو سکیں گے۔ اچھا بڑا لحاف بھی میں دے سکوں گا۔"

"آپ کی مہربانی ہے مولوی صاحب۔ مگر آپ کو خواہ مخواہ تکلیف ہو گی۔"

"نہیں جی! تکلیف کیسی! یہ تو میری خوش بختی ہے کہ آپ جیسا اللہ کا نیک بندہ میرے گھر میں مہمان ہو گا۔ چلیں میرے غریب خانے پر رات گزاریں۔"

یہ کہہ کر اُس نے طاق میں رکھا دیا بجھایا اور مسجد کا وسطی دروازہ بند کر کے میرے ساتھ باہر نکل آیا۔ میں نے گھوڑی کی لگام پکڑی اور پیچھے چل دیا۔ اس کا گھر گاؤں کی جنوبی سمت میں تھا۔ ایک بڑے سے کنوئیں کے پاس۔ صحن اس کے گھر کا بس اتنا سا تھا کہ اس میں جا کر جب میں نے گھوڑی کو ایک دیوار کے ساتھ باندھا تو معلوم ہوا کہ وہاں جگہ ہی ختم ہو گئی ہے۔ خدا کی اتنی ساری وسیع و عریض زمین میں سے اس مُلّا کے حصے میں چند گز کی جگہ ہی آ سکی تھی۔ اس کی بیوی مٹی کے تیل کی لالٹین لیے دالان کے دروازے میں کھڑی تھی۔ مجھے اپنے میاں کے ساتھ دیکھ کر اس نے یہ لمبا سا گھونگھٹ کھینچ لیا تھا۔ ایسے میں اس کی کلائی کی چوڑیاں کھلکھلا کر ہنس دی تھیں۔ دونوں بانہیں اُس نے چوڑیوں سے بھر رکھی تھیں۔ وہ خاصی گورے رنگ کی عورت تھی۔ اور میرا خیال ہے کہ وہ اپنے لباس پر مُلّا کی آمدنی سے زیادہ روپے خرچ کرتی تھی۔

مُلّا اسے دھکیل کر اندر لے گیا اور پھر چند ہی لمحوں بعد جب وہ باہر آیا تو اس کی بیوی اس کے پیچھے تھی۔ اس نے اپنے چہرے پر سے گھونگھٹ ہٹا لیا تھا۔ بلاشبہ وہ بڑی قبول صورت عورت تھی۔ عمر اس کی یہی کوئی تیس سال ہو گی۔ نگاہیں نیچی کر کے اس نے خاصی بے تکلف آواز میں کہا۔ "السلام علیکم بھائی جان! آپ اندر آ جائیں۔"

"اسے اپنا ہی گھر سمجھیں میاں صاحب یہ میری بیوی ہے کبیرن۔ میں نے اسے سمجھا دیا ہے بھلا آپ سے کیا پردہ۔ مہمان تو اللہ جل شانہٗ کی رحمت ہوتے ہیں کیوں کبیرن؟"

"جی قادری صاحب! یہ ان کا اپنا گھر ہے جس طرح چاہیں رہیں۔ اندر آ جائیں بھائی صاحب۔" کبیرن نے بڑی تمیز داری سے کہا اور دروازے سے ہٹ گئی۔

میں کمرے میں داخل ہوا تو میرا دل خوش ہو گیا۔ وہ گارے مٹی کا بنا ہوا صاف ستھرا لپا پُتا گھر تھا۔ وہ کمرہ بڑا سا دالان تھا جس کے دائیں ہاتھ ایک چوبی تخت تھا اور بائیں ہاتھ دو نواڑی پلنگ ساتھ ساتھ بچھے تھے۔ دالان کی تینوں دیواروں میں چھوٹے چھوٹے روشندان تھے جن کی وجہ سے اندر کی ہوا بہت صاف رہتی تھی۔ اس دالان کے پیچھے دو کوٹھریاں تھیں۔ مولوی صاحب نے مجھے بڑی عزت سے پلنگ پر بٹھایا اور بولا۔

"آپ آرام سے بیٹھیں میں آپ کے لیے دودھ لے کر آتا ہوں مائی شالی کے گھر سے مل جائے گا۔ انہیں وہ ریشمی لحاف دے دے کبیرن! میں بس ابھی آیا۔" یہ کہہ کر اس نے سامنے کی پرچھتی پر رکھا ایک صاف ستھرا ڈول اٹھایا اور باہر نکل گیا۔

مُلّا باہر نکلا تو کبیرن نے کوٹھری میں سے لا کر ایک صاف ستھرا لحاف پلنگ کی پائینتی رکھ دیا۔ بولی۔

"آپ جوتے اتار کر آرام سے بیٹھ جائیں۔ قادری صاحب بتا رہے تھے کہ آپ بہت تھک گئے ہیں اور آپ کے پیٹ میں کچھ گڑبڑ ہے۔"

"ہاں بی بی! کچھ ایسا ہی لگتا ہے۔ خدا بھلا کرے مولوی صاحب کا بیچارے بڑے مہمان نواز آدمی ہیں۔"

"یہ تو ہمارا فرض ہے جی۔ ہم تو ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ کوئی اللہ کے گھر میں ٹھہرے تو اسے کوئی تکلیف نہ ہو۔" یہ کہہ کر اس نے میرے اتارے ہوئے جوتے اٹھا کر دیوار کے ساتھ رکھ دیے۔

اب میں پلنگ پر آلتی پالتی مار کر یوں بیٹھ گیا تھا کہ کمبل میں نے اپنے چاروں طرف لپیٹ لیا تھا اس طرح کہ میری اسٹین گن باہر سے نظر نہیں آ سکتی تھی۔ کبیرن مجھ سے ذرا فاصلے پر پڑے مونڈھے پر بیٹھ گئی۔

"اس گاؤں کا نام پیر آباد ہی ہے نا؟"

"جی میاں جی! ملک رحمت علی کا نام آپ نے سُنا ہو گا۔ وہ ممبری کے لیے کھڑے ہو رہے ہیں۔ وہ اسی گاؤں میں رہتے ہیں۔"

"زمیندار ہیں وہ؟"

"جی ہاں! چار مربع زمین کے مالک ہیں وہ۔ اُن کے بیٹے کراچی میں ہیں۔ چمڑے کا کاروبار کرتے ہیں۔ بڑے اچھے لوگ ہیں جی اور غریب پرور بھی۔"

"کتنے بیٹے ہیں اُن کے؟"

"تین بیٹے ہیں۔ دو کراچی میں، ایک اُدھر لاہور میں وکالت کرتا ہے۔ ہم سب تو ملک صاحب کو ہی ووٹ دیں گے۔"

"ان کے مقابلے میں کون ہے؟"

"تین آدمی ہیں جی میاں جی۔ دو تو یوں ہی سے ہیں پر وہ تیسرا آدمی بہت تگڑا ہے وہ جو گوٹھ کا جاگیردار مختار ڈھلوں۔"

"بھاری کون ہے ان میں سے؟"

"وہ تو جی بھاری تو اللہ کی ذات ہے پر وہ ملک صاحب کو لوگ بہت پسند کرتے ہیں۔ ڈھلوں صاحب کا داؤ نہیں چلے گا۔"

"آپ تو بڑی مرید لگتی ہیں ملک رحمت علی کی۔"

"وہ جی اپنے گاؤں کا بندہ ہے نا جی۔ ڈھلوں صاحب نے ہمیں کیا بنا دینا۔ ہمارا مرن جیون تو اُن کے ساتھ ہی ہے نا میاں جی۔"

"ہاں یہ تو ہے۔ ملک صاحب ادھر قریب ہی رہتے ہوں گے۔"

"جی ہاں مسجد کے پچھواڑے میں نیا پکّا مکان انہی کا ہے۔ پانچ وقت کے نمازی ہیں جی وہ۔ ہمارا تو بہت ہی خیال رکھتے ہیں۔ سال بھر کا دانہ پھکا تو ہمیں انہی سے مل جاتا ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہے وہ آدمی بہت سخی ہے۔"

"ہاں اولیا سخی جی! انھیں پتہ چل جائے کہ کوئی مسافر مسجد میں ٹھہرا ہے تو وہ اس کی بڑی خاطر کرتے ہیں۔ بڑے اچھے آدمی ہیں جی وہ۔"

"پھر تو مجھے اُن سے ضرور ملنا چاہیے۔"

"آپ صبح مل لیں جی اُن سے۔ وہ فجر کی اذان سنتے ہی مسجد میں پہنچتے ہیں۔ نماز پڑھ کر وہ دیر تک کوئی وظیفہ کرتے ہیں اور پھر جب سورج نکلنے کو ہوتا ہے تو وہ ادھر نہر کی طرف سیر کو نکل جاتے ہیں۔ مجھے قادری صاحب بتایا کرتے ہیں اُن کی باتیں۔ بڑے ہی نیک آدمی ہیں جی وہ۔" کبیرن نے اپنی سادگی میں مجھے رحمت علی کے بارے میں سب باتیں بتا دیں۔

"اپنے مولوی صاحب کا نام نہیں بتایا آپ نے۔"

"وہ جی — ان کا نام نیاز محمد قادری ہے۔" وہ جھینپ سی گئی۔

"آپ کے بچے کہاں ہیں؟"

میرے اس سوال پر وہ پریشان سی ہو گئی۔ بولی "اللہ نے دیے ہی نہیں — میری جھولی ابھی تک خالی ہے۔" میں اس کی آواز میں گھُلی یاسیت کو تادیر نہیں بھلا سکا۔ بے اولاد عورت کے غم کا اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی آنکھیں بہہ نکلی تھیں۔ اتنے میں مولوی صاحب اندر آ گئے اور کبیرن کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر بولے۔ "یہ تم رو کیوں رہی ہو کبیرن! ہائیں — مہمان کی اس طرح خاطرداری کرتے ہیں۔ کیا کہہ رہی تھی یہ آپ سے میاں صاحب؟"

"کچھ نہیں مولوی صاحب! میں غلطی سے پوچھ بیٹھا تھا کہ آپ کے بچے کہاں ہیں؟"

"چھوڑو جی میاں صاحب! اب یہ بس ایک مہینے کے لیے تو کسی کام کی نہیں رہی۔ اللہ کی رضی ہے اس میں بندے کا کیا دخل! کھوڑے کتے بلّے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے دودھ کا ڈول کبیرن کے سامنے رکھ دیا۔

"لے اسے گلاس میں ڈال کر میاں صاحب کو پیش کر۔ جھلّی کہیں کی۔ ارے میں کہتا ہوں کیا پتہ کوئی ہمارا لڑکا ہوتا اور ڈاکو نکل آتا۔ پھر — پھر ہم کیا کرتے۔ اُٹھ چل اِدھر چینی ڈال دے اس میں۔"

کبیرن نے اس کی کسی بات کا جواب نہ دیا چپ چاپ اُٹھی، اور صحن میں بنے چھوٹے سے رسوئی خانے میں جا گھسی۔ لالٹین وہ اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ کمرے میں شب دیجور ایسی تیرگی پھیل گئی۔ میں نے سگریٹ سلگایا تو جلتی تیلی کی روشنی میں دیکھا کہ مولوی نیاز کی آنکھیں بھی بھیگ گئی تھیں۔ میں نے تیلی بجھا دی۔ کوئی دس منٹ بعد کبیرن لالٹین لے کر اندر آئی تو اس دوران میں قادری صاحب نے اپنے آپ پر قابو پا لیا تھا۔ اور اب وہ مسکرا رہے تھے۔

"لیں میاں صاحب پیئیں۔ خالص دودھ ہے اور گرما گرم بھی۔"

میں گلاس اس کے ہاتھ سے لے کر گھونٹ گھونٹ پینے لگا۔ واقعی دودھ بہت اچھا تھا اور بالائی بھی اس میں موجود تھی۔ اس میں انہوں نے دیسی شکر نہیں بلکہ چینی ڈالی تھی۔

"صبح مجھے بھی مسجد لے چلیں قادری صاحب! میں بھی آپ کے ساتھ نماز پڑھوں گا۔ یہ آپ کی بی بی ملک رحمت علی کی بہت تعریف کرتی ہیں۔ اُن کے بھی نیاز حاصل کر لوں گا۔"

"ضرور جی ضرور! نماز ہی مومن اور کافر کے درمیان ایک فرق ہے۔ میں آپ کو ساتھ لے چلوں گا۔"

"ملک صاحب تو باقاعدہ نماز پڑھتے ہوں گے۔"

"جی ہاں نماز بھی پڑھتے ہیں اور صبح کی سیر بھی ضرور کرتے ہیں۔ بڑی اچھی صحت ہے اُن کی۔ دراصل آدمی کے چہرے کی روشنی اس کے دل کی نیکی کا عکس ہوتی ہے۔"

وہ گاؤں کا نیم خواندہ مُلّا بڑی روانی سے بات کرتا تھا اور زندگی کے مختلف معاملات پر وہ اپنی رائے بھی رکھتا تھا جس کا برملا اور مؤثر اظہار وہ اپنی باتوں میں جا بجا کرتا رہتا تھا۔

وہ دونوں تو اس رات پچھلی کوٹھری میں سوئے اور میں دالان میں ان کے گھر کا سب سے عمدہ لحاف لپیٹ کر سو رہا۔

صبح چار بجے قادری صاحب نے جگا دیا۔ اور اپنے ساتھ ہی مسجد میں لے گئے۔ میرا خدا مجھے معاف کرے۔ اس روز میں ایک اور گناہ کا مرتکب ہو رہا تھا اور ایک نمازِ منافقت ادا کر رہا تھا۔ قادری صاحب سے میں نے کہہ دیا تھا کہ وہ مجھے اشارے سے بتا دیں کہ ملک رحمت علی کون ہیں۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ میں اس کی شناخت کے لیے اتنا مصر کیوں ہوں۔

نماز سے فارغ ہو کر قادری صاحب نے ایک کونے میں بیٹھے تسبیح کے دانوں پر وظیفہ پڑھتے ہوئے ایک ادھیڑ عمر کے آدمی کی طرف اشارہ کر کے مجھے دبے لہجے میں بتایا کہ وہ ملک رحمت علی ہے۔ اس آدمی پر میری نظر پڑی تو میرے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں۔ وہ بڑے خشوع و خضوع سے نماز پڑھ رہا تھا۔ چہرہ اس کا صفاچٹ تھا۔ داڑھی مونچھ کے آزار سے آزاد۔ صحت اس کی بلاشبہ قابلِ رشک تھی۔ محسوس مجھے یہ ہو رہا تھا کہ اس پر ہاتھ ڈالنا

کسی بھی طرح مناسب نہ ہوگا۔ مگر میں نے اس خیال کی بیل کو زیادہ پھیلنے نہ دیا۔ میں اسے کوئی گزند نہیں پہنچاؤں گا بس دو دن کے لیے اسے زندگی کے اس کاروبار سے چھٹی دلا دوں گا اور بس — پھر میں اسے عزت و احترام سے اُس کے گاؤں چھوڑ جاؤں گا — آگے وہ ڈھلوں صاحب جانیں اور اُن کا کام۔

ابھی قادری صاحب اپنے وظیفے میں مصروف ہی تھے کہ میں چپکے سے مسجد میں سے نکلا اور اُن کے گھر پہنچ کر میں نے اُن کی بیوی سے کہا کہ میں اب جا رہا ہوں۔ وہ ناشتے کے لیے اصرار کرتی رہی مگر میں نے انکار کر دیا اور اسے ایک بھائی کی حیثیت سے سو روپیہ دیکر میں نے گھوڑی کھولی اور اسے گام گام چلاتا گاؤں سے باہر نکل آیا۔ مجھے ملک رحمت علی کا انتظار تھا۔

ابھی سورج نہیں نکلا تھا۔ ملگجی سی روشنی چاروں طرف البتہ پھیلتی جا رہی تھی۔ میں مسجد کے سامنے کھلے میدان سے ذرا آگے درختوں کے جھنڈ کے پیچھے جا ٹھہرا۔ وہاں کھڑے ابھی مجھے پندرہ ہی منٹ گزرے تھے کہ مجھے اس میدان میں ملک رحمت علی ایک اور آدمی کے ہمراہ چلتے نظر آئے۔ اُن دونوں نے کمبل اوڑھ رکھے تھے۔ اور سروں پر اُونی کنٹوپ رکھ لیے تھے۔ صبح بہت خنک اور ٹھنڈی تھی۔ سبزہ اوس میں بھیگا ہوا تھا۔ آسمان بہرحال صاف تھا۔ میری نظریں اُن دونوں پر جمی تھیں۔ وہ دائیں ہاتھ مُڑے اور کچھ ہی دیر بعد نہر کی پٹڑی پر جا چڑھے۔ وہ نہر ان دنوں پایاب ہو رہی تھی — وہ گاؤں سے کوئی ایک میل آگے نکلے ہوں گے کہ میں گھوڑی دوڑاتا ہوا اُن کی طرف لپکا۔

میرے اعصاب جھنجھنا رہے تھے۔ اس آدمی پر مجھے ترس آ رہا تھا۔ اُس نے میرا کچھ بھی نہیں بگاڑا تھا مگر پھر بھی میں اسے گزند پہنچانے کے لیے اس کے تعاقب میں تھا۔ دوسرا آدمی جوان اور خاصے مضبوط قد کاٹھ کا نظر آتا تھا۔ وہ شاید روزانہ ہی ملک رحمت علی کے ساتھ ہوتا تھا۔ مجھے اُس کے بارے میں کبیرن نے کچھ نہیں بتایا تھا۔ نیاز محمد نے بھی اس سلسلے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ اور وہ آدمی اب کباب میں ہڈی بن رہا تھا۔ مجھے اس سے بھی نمٹنا تھا اور ہتھیار مجھے استعمال نہیں کرنے تھے۔ کسی قیمت پر بھی میں اُن کی جان خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔

میں بہرحال گھوڑی دوڑاتا ہوا آگے بڑھا مگر جب میں اُن کے پاس پہنچا تو گھوڑی کی دگڑ سُن کر وہ دونوں الگ الگ ہو گئے میں نے اس جوان آدمی کے ساتھ جان بوجھ کر گھوڑی کو ٹکرا دیا۔ وہ الٹ کر گرا تو میں نے گھوڑی روکی اور اسے اٹھانے کے بہانے اس پر جھکا۔ وہ اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں نے اس کی گردن پر ہاتھ رکھ کر اُس کی رگِ احساس مسل دی۔ اس کی زندگی کا وہ انوکھا تجربہ تھا۔ وہ بے چارہ بے سُدھ ہو کر لڑھک گیا۔ اس عرصے میں ملک رحمت علی میرے پاس پہنچ چکا تھا۔

"اسے دیکھیں میاں جی یہ تو شاید بے ہوش ہو گیا ہے۔"

"یہ کیا کر دیا تو نے جوان! اندھا ہو گیا تھا تو۔ تیرا دماغ تو خراب نہیں ہے؟" ملک رحمت علی نے اپنے غم و غصے کا کوڑا میرے اعصاب پر برساتے ہوئے ایک نہایت ہی غلیظ گالی میری طرف لڑھکائی۔ آدمی کی عبادت و ریاضت، اس کی راستی و منافقت، اس کی عظمت اس کی پستی، اُس کی طہارت اور اُس کا خبثِ باطن، اُس کے کردار کی ساری خوبیاں خامیاں غصّے کی حالت میں آپ ہی ظاہر ہو جاتی ہیں۔ اس ملک رحمت علی نے پہلے ہی وار میں اپنا سب کچھ مجھے دکھا دیا۔ اس نے بھی اپنی شخصیت پر مصنوعی خول چڑھا رکھا تھا۔

"اسے دیکھیں ملک صاحب! پتہ نہیں اسے کیا ہو گیا ہے۔" میں نے اب کی بار اور زیادہ لجاجت آمیز لہجے میں کہا۔ اس پر انہوں نے اُس جوان کی نبض پر ہاتھ رکھا اور غصّے سے پھنکارتے ہوئے بولے۔ "اوئے تو ہے کون، تیری ـ ـ ـ"

وہ کف در دہاں ہونے لگے تھے اور مجھے گندی گالیوں سے نواز رہے تھے۔ وہ ملک رحمت علی صاحب امیدوار قومی اسمبلی۔ میں نے ان کی اس گندہ ذہنی پر تپ کر اُلٹے ہاتھ کا ایک جھانپڑ اُن کے مُنہ پر مارا۔ وہ تیورا کر پیچھے گرنے لگے تو میں نے ان کی گردن دبوچ کر اُن کی رگ دبا دی۔ وہ فوراً ہی لمبی چھٹی پر چلے گئے۔ سورج کی رُوپہلی کرنیں اب سامنے نظر آ رہی تھیں۔ میں نے بڑی احتیاط سے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ دُور دُور تک کوئی آدم زاد نظر نہیں آ رہا تھا۔ نہر کے دونوں طرف گنّے کی اونچی فصل نے جنگل کا سا سماں پیدا کر رکھا تھا اور ابھی کسی بھی کھیت میں 'چھیلائی' شروع نہیں ہوئی تھی۔ کسان غیر مزروعہ زمینوں کی طرف متوجہ تھے جو مجھے نظر نہیں آ رہی تھیں۔

میں نے رحمت علی کو سر سے پاؤں تک اُس کے کمبل میں لپیٹا اور اسے گھوڑی پر اپنے آگے ڈال کر اسی وقت آگے چل دیا۔ ایک آدمی کو لاش کی صورت گھوڑی پر ڈال کر چلنا بہت مشکل ہوتا ہے، پھر میں جہاں تک ممکن ہو سکا گھوڑی کو سرپٹ دوڑاتا ہوا پیر آباد کی جُو سے باہر نکل آیا۔ اب میرا رُخ چوگوٹھ کی طرف تھا۔ راستہ میں پہچاننے لگا تھا اور اپنی سمت کی درستی پر میرا یقین بڑھتا جا رہا تھا۔ کمبل میں نے رحمت علی پر اس طرح ڈال رکھا تھا کہ اس کا منہ سر نظر نہیں آتا تھا۔ جوتیاں اس کی وہیں کہیں نہر پر ہی گر گئی تھیں جب میں ڈھلوں صاحب کی ڈیوڑھی پر پہنچا تو اتفاق سے برکت اُس وقت باہر کھڑا تھا۔ دروازہ بند تھا۔

اُس نے مجھے اس حال میں دیکھا تو تیزی سے میری طرف آیا۔ بولا۔

"یہ کیا ہے صاب جی کون آدمی ہے؟"

"ادھر پچھلا دروازہ کھولو برکت میں ادھر ہی جا رہا ہوں جلدی کرو۔" یہ کہہ کر میں نے گھوڑی کا رُخ بدلا اور اس دروازے کے سامنے جا ٹھہرا جہاں سے میں رات کو نکلا تھا۔ مجھے وہاں پانچ ہی منٹ گزرے تھے کہ وہ دروازہ کھل گیا۔ میں نے گھوڑی برکت کے حوالے کی اور رحمت علی کو باہوں میں اٹھا کر میں مہمان خانے میں جا پہنچا۔ وہ چوکیدار علی زئی اُس وقت وہاں موجود نہیں تھا۔ میں نے رحمت علی کو بستر پر لٹا کر اس پر لحاف ڈال دیا۔ اب میرے لیے فکر کی کوئی بات نہیں رہی تھی۔ میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا تھا کسی خون خرابے کے بغیر۔ بڑے ہی پُراسرار انداز سے میں نے ایک ناممکن بات کو ممکن بنا کر دکھا دیا تھا۔

پیاس سے میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ میں نے غسل خانے میں جا کر پانی پیا اور پھر اپنے ہتھیار وہیں لٹکا کر میں رحمت علی کے پاس کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ ابھی تک بالکل بے سُدھ تھا البتہ اس کی سانس کی آمد و رفت بتا رہی تھی کہ اس کی جان کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اُستاد نے مجھے یہ بتا رکھا تھا کہ کوئی نرم طبیعت کا آدمی اس جھٹکے سے جان بحق بھی ہو سکتا ہے اس لیے آدمی کو بہت سوچ سمجھ کر وار کرنا چاہیے۔ خدا اسے ہمیشہ خوش رکھے۔ اس نے مجھے ایسا صدری نسخہ دے دیا تھا کہ ہر کڑے وقت میں وہ میرے کام آتا تھا۔

ابھی کوئی دس منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ ڈھلوں صاحب کمبل سنبھالتے ہوئے آ پہنچے۔ انھیں شاید برکت نے اسی وقت جگا دیا تھا۔ اُن کے بال اُلجھے ہوئے تھے اور چہرے پر نیند کا غلبہ ابھی تک نظر آ رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی کھل اُٹھے اور دروازہ اپنے پیچھے بند کر کے بولے۔

"شاباش جیلانی صاحب شاباش — یہ ہوئی نا مردوں والی بات اور کوئی مائی کا لال یہ کام نہیں کر سکتا تھا۔"

میں نے رحمت علی کے منہ سے لحاف ہٹا دیا۔ وہ اس کی صُورت دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ "یہ کہیں مر تو نہیں گیا؟"

"جی نہیں! مال بالکل صحیح سالم ہے البتہ ذرا سا 'سی کے ڈی' حالت میں ہے۔"

"کیا مطلب؟ مجھے تو گڑبڑ لگتی ہے۔"

"مطلب یہ ہے کہ اپنے ملک رحمت علی صاحب اُمیدوار قومی اسمبلی کی درآمد 'ناکڈ ڈاؤن کنڈیشن' میں ہوئی ہے اس لیے یہ ذرا ٹوٹے پھوٹے نظر آتے ہیں۔"

"اچھا اچھا اب سمجھا جیسے اسکوٹر وغیرہ سی کے ڈی آتے ہیں مگر کسی نے دیکھا تو نہیں؟"

"کوئی دیکھتا تو مجھے اس طرح یہاں آنے دیتا؟"

"پھر بھی ساری احتیاطیں لازم ہوتی ہیں۔"

"مجھے یقین ہے کہ اس واردات کا کسی کو علم نہیں ہے۔"

یہ کہہ کر میں نے انھیں ساری صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔ وہ سگریٹ پیتے رہے اور میری باتیں بڑے غور سے سنتے رہے۔ ان کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔ کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر انھوں نے نوٹوں کی گڈی نکالی اور میرے سامنے تپائی پر رکھ کر بولے۔

"یہ دس ہزار روپیہ ہے جیلانی صاحب آپ کا انعام۔ آپ نے مجھے خوش کر دیا ہے۔ آپ ایسے شیر کی تو مجھے ایک عرصے سے تلاش تھی۔ ادھر میرے یہ سب ملازم زنخے ہیں۔ ایک دم پنجرے کے بندر۔" میں نے نوٹ اُن کی جھولی میں پھینک دیے۔

"مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے ڈھلوں صاحب اِسے میں اپنے لیے خنزیر برابر سمجھتا ہوں۔"

"کیا؟ کیا کہتے ہیں آپ! یہ دس ہزار روپیہ ہے بھائی۔"

"جی نہیں یہ ایک لاکھ بھی ہو تو میں نہیں لوں گا۔ مجھے سمجھنے کی کوشش کریں ڈھلوں صاحب! مجھے حالات نے اس راہ پر ڈال دیا ہے تو کیا ہوا کبھی میں بھی بڑی آن بان اور خاندان والا تھا۔"

وہ حیرت زدہ ہو کر میرا مُنہ تکنے لگے۔ نوٹوں پر انگلیاں بجاتے ہوئے بولے۔

"آپ نے مجھے حیران کر دیا ہے۔ یہ۔۔۔ ادھر جتنے بھی تخم ہیں نا! دس دس روپے پر جان لینے اور دینے پر تل جاتے ہیں۔ آپ کو واقعی میں نہیں سمجھ سکا۔"

"مجھے ان کے ساتھ نہ گنیں ڈھلوں صاحب! خدا کے لیے یہ میری توہین ہے۔ بس مجھے اپنا جاں نثار دوست سمجھیں کہ میری بدنصیب بہن آپ کی چھت تلے بیٹھی ہے اور میں نے آپ کا ایک آدمی ضائع کر دیا ہے۔"

"اُس چھانگے کی بات کرتے ہو۔ اس کا وقت آ گیا تھا بس۔ موت برحق ہے میرے دل میں آپ کی بڑی قدر ہے جیلانی صاحب۔ میں سروری خانم کا شکر گزار ہوں کہ اس نے میری آپ سے ملاقات کرا دی۔ یہ رحمت علی کہیں ہماری باتیں تو نہیں سن رہا۔"

"جی نہیں! ملک صاحب نے خدا سے لَو لگا رکھی ہے۔ اس وقت یہ دنیا کی کوئی بات نہیں سن سکتے۔ بندوبست میں نے پکا کر دیا ہے۔"

"اچھا! ٹھیک ہے میں اسے اب ادھر تہہ خانے میں ڈال دیتا ہوں۔"

"تہہ خانے میں؟ وہاں کیا کریں گے آپ؟"

"بس اب میں جانوں اور میرا کام۔ اِس سے تو مجھے اور بھی کئی حساب لینے ہیں۔ بڑی زک پہنچائی ہے اس نے مجھے۔"

"اس کی جان کو کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے ڈھلوں صاحب! میں اسے چوبیس گھنٹے کے لیے آپ کے پاس لایا ہوں۔ ٹھیک کل شام چھ بجے میں اسے واپس لے جاؤں گا۔"

"ہاں ٹھیک ہے مگر اس کا ابھی ادھر پڑا رہنا درست نہیں ہے۔ یہاں کسی وقت کوئی بھی مہمان آ سکتا ہے۔"

"یہی بہتر ہے۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں ورنہ فساد بڑھ جائے گا۔"

"بہرحال میں ابھی اسے یہاں سے اٹھوا دیتا ہوں۔"

یہ کہہ کر انھوں نے دروازہ کھول دیا۔ برکت باہر صحن کے وسط میں کھڑا دھوپ تاپ رہا تھا۔ ڈھلوں صاحب نے اسے اپنے قریب بلوا کر اس کے کان میں کچھ کہا تو وہ فوراً ہی باہر نکل گیا۔ کوئی پانچ منٹ بعد وہ واپس آیا تو اس کے پیچھے سیتا خان چلا آ رہا تھا۔ مجھے ڈھلوں صاحب نے غسل خانے میں چلے جانے کا اشارہ کیا۔ میں نے وہاں جا کر اپنے دونوں ہتھیاروں کا معائنہ کیا۔ وہ بالکل ٹھیک ٹھاک حالت میں تھے اور گولیوں سے لبالب بھرے تھے۔ چند ہی منٹ بعد ڈھلوں صاحب نے مجھے باہر آنے کے لیے کہا۔ پلنگ خالی ہو چکا تھا اور اس پر بچھی چادر کی ساری سلوٹیں دور ہو چکی تھیں۔ لحاف بھی قرینے سے تہہ کر دیا گیا تھا۔

"اچھا جیلانی صاحب! اب آپ آرام کریں۔ میں ذرا نہا لوں۔ آپ کے لیے میں کپڑے بھجواتا ہوں۔ وہ لے لیں میرا خیال ہے میرا اور آپ کا ناپ ایک جیسا ہی ہے۔"

خوشی اُن کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے انھوں نے کوئی بہت بڑی جنگ جیت لی ہے۔ بولے۔ "میں ابھی ساتھ کے گاؤں جا رہا ہوں دوپہر تک واپس آ جاؤں گا اتنے میں آپ کچھ آرام کر لیں۔"

"ٹھیک ہے جناب ڈھلوں صاحب! آسیہ کے بارے میں میں پھر آپ سے درخواست کروں گا کہ مجھے اُس سے ملوا دیں۔"

"کیوں نہیں یار! یہ بھی کوئی بات ہے بھلا۔ وہ تو اُدھر ہماری بڑی بیگم کے پاس ہی رہتی ہے کسی وقت بھی ملوا دوں گا۔ ویسے بھی بے صبرے نہ بنو۔" وہ بے تکلف ہونے لگے مگر پھر انھیں کوئی بات یاد آئی تو بولے۔ "جیلانی صاحب! ہماری ہمشیرہ نے بتایا ہے کہ آپ کی والدہ حیات ہیں۔ انھیں آپ کیوں یہاں نہیں بُلا لیتے۔ اب تو آپ یہاں ہی رہ جائیں۔ لاہور والا مکان بیچ دیں اور یہاں زمین خرید لیں اور آرام سے زندگی بسر کریں۔"

"آرام کا تو میری زندگی سے کوئی تعلق ہی نہیں رہا۔ وہ پولیس والے مجھے کہاں چین لینے دیں گے۔"

"میرے علاقے میں تو وہ آپ پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے۔ اس بات کی میں ضمانت دیتا ہوں کچھ آپ کا حلیہ بھی میں بدلوا دوں گا پھر تو آپ نئی زندگی شروع کر سکتے ہیں۔"

"خدا جانے میرے نصیب میں کیا لکھا ہے ڈھلوں صاحب! آپ کی اس محبت کا بہرحال میں شکر گزار ہوں۔"

"دیکھیں آپ مجھے اپنی والدہ کا پتہ بتا دیں میں انھیں کل ہی یہاں بلوا لیتا ہوں۔ اپنا رقعہ لکھ کر میرے آدمی کو دے دیں وہ انھیں جا کر لے آئے گا۔"

"ٹھیک ہے آپ کل کے سیاسی چکر سے فارغ ہو لیں پھر کچھ کریں گے۔"

"ہاں یہ بہتر رہے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ تینوں ایک بار پھر باعزت زندگی گزاریں۔ وہ آہو ادھر آیا تو اسے میں اتنے جوتے ماروں گا کہ اس کا مغز توڑ دوں گا۔ اتنے ہیرے آدمی کو اس نے یوں پریشان کر دیا۔"

یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئے — علی زئی ایک بار پھر بندوق لے کر بڑے دروازے پر آ بیٹھا تھا۔ ڈھلوں صاحب اس کے قریب پہنچ کر مڑے اور میرے پاس آ کر بولے۔

"آپ بُرا نہ منائیں جیلانی صاحب مجھے وہ اپنی اسٹین گن اور پستول دے دیں ہتھیاروں کا ادھر رہنا اچھا نہیں۔"

"کیوں؟ کیا خطرہ ہے آپ کو مجھ سے؟"

"مجھے تو کوئی خطرہ نہیں! مگر وہ بہت قیمتی ہتھیار ہیں اور میرے یہ ملازم بس ایسے ہی ہیں۔ آپ کی بہتری کے لیے کہہ رہا ہوں میری نیت پر شبہ نہ کریں ان کے چوری ہونے کا خطرہ ہے۔"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا ہے ڈھلوں صاب، بہرحال میں نے اپنی ڈور آپ کے ہاتھ میں دے دی ہے۔ جو چاہیں کریں۔ ہتھیار اُدھر غسل خانے میں ہیں۔" میں نے بہت ہی بجھے دل سے کہا — وہ میرے ساتھ سراسر زیادتی تھی مگر مجھے وہ بھی برداشت کرنا پڑی کیونکہ اس چھانگے کے قتل نے ان کے سامنے میری گردن ہمیشہ کے لیے جھکا دی تھی۔ اور میں ایسا ہو گیا تھا کہ اُن کی کوئی بھی بات ٹال نہیں سکتا تھا۔

ڈھلوں صاحب نے غسل خانے سے وہ ہتھیار نکالے اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے باہر نکل گئے۔

اور میں ایک بار پھر خلا میں جھُول کر رہ گیا۔ میں اُن کے ہاتھوں میں معمول بن کر رہ گیا تھا۔ محض ایک کھلونا۔ ایسا کھلونا جس کی اپنی کوئی مرضی نہیں ہوتی۔

کچھ ہی دیر بعد غسل خانے میں گرم پانی ایک ملازم نے پہنچا دیا۔ وہ میرے لیے بوسکی کا عمدہ سلا ہوا سوٹ اور نئی بنیان اور نیا زیر جامہ بھی لایا تھا۔ سر پر لگانے کے لیے عمدہ قسم کے تیل کی شیشی اور بدن پر چھڑکنے کے لیے پاؤڈر اور عطر بھی ساتھ

تھا۔ میں نے بڑے اطمینان سے غسل کیا اور پھر نیا لباس پہن کر کرسی پر جا بیٹھا۔ میری بشاشت لوٹ آئی تھی۔ زندگی پر میرا اعتبار بحال ہونے لگا تھا۔ ڈھلوں صاحب کے ارادے جو کچھ بھی تھے۔ اتنا مجھے احساس ہو چلا تھا کہ وہ میرے بہی خواہ ہیں اور میرے لیے وہ مضبوط پناہ گاہ ثابت ہوں گے۔

کچھ ہی دیر بعد برکت میرے لیے ملازم کے ہاتھ پر رکھوا کر ناشتہ لے آیا۔ اس کی زبانی معلوم ہوا کہ ڈھلوں صاحب حویلی سے باہر جا چکے ہیں۔ اور وہ دو بجے تک واپس آئیں گے۔ اس کمرے کی ایک الماری میں کچھ کتابیں پڑی تھیں۔ میں نے وہ نکالیں تو مجھے اپنی تیرہ بختی پر سخت طیش آیا۔ میں زندگی کی کتنی ساری آسائشوں اور لطافتوں سے محروم ہو چکا تھا۔ مجھے اپنے گھر میں پلنگ کے ساتھ تپائی پر رکھی وہ سبھی سنوری کتابیں یاد آئیں جن کو میں ہر روز جستہ جستہ پڑھ کر سویا کرتا تھا۔ وہ خوبصورت ٹیبل لیمپ یاد آیا جس کی روشنی میرے گرد و پیش کو بہت ہی دلآویز بنا دیتی تھی۔ سب کچھ پیچھے رہ گیا تھا۔ اب وہ دودھ کا چھوٹا سا بالائی سے لبریز پیالہ خواب و خیال ہو چکا تھا جو کسی دور میں مجھے آسیہ ہر رات سونے سے پہلے پلایا کرتی تھی۔ اس کی وہ میرے آرام کے ہمہ وقت کی بے آرامی یاد آئی تو میرا دل پھر سے بجھنے لگا۔ میں کن نحوستوں کے اندھیرے میں گم ہو چکا تھا۔ نہ رات میری تھی نہ دن۔ میری صبحیں بھی ویران تھیں اور شامیں بھی۔ کچھ بھی تو باقی نہیں بچا تھا۔ آشیانے پر برق گرنے کی بات مجھے محض شاعری معلوم ہوا کرتی تھی مگر اب جب میں اپنے آپ کو اور اپنے گھر کی حالت کو دیکھتا تو مجھے معلوم ہوتا تھا کہ جب بجلی گرتی ہے تو پھر آشیانہ اسی طرح جل جاتا ہو گا۔ کچھ بھی باقی نہ بچتا ہو گا۔ ایسے میں تو شجر کی شاخیں بھی جل جاتی ہوں گی جنہوں نے آشیانے کو سنبھال رکھا ہوتا ہے کوئی میری بربادیوں کا اندازہ ہی نہیں کر سکتا تھا۔ میں بڑی بے دلی سے ان کتابوں کو دیکھتا رہا۔ بالآخر مجھے دستوئیفسکی کا ناول "جرم و سزا" ان کتابوں میں مل گیا اور میں بستر میں لیٹ کر اس کے مطالعے میں محو ہو گیا۔ اس مصنف سے مجھے عجیب سی ذہنی ہم آہنگی محسوس ہوا کرتی تھی مگر اس روز میں نے اسے غور سے پڑھا اور چند ہی صفحات میں سے گزرنے کے بعد مجھ پر یہ حقیقت عیاں ہوئی کہ انسان کے وجود میں متضاد قوتیں ہمہ وقت برسرِ پیکار رہتی ہیں۔ اور اس کے اعمال انہی قوتوں کی شکست و فتح کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ نہ کوئی آدمی مکمل فرشتہ ہے نہ مکمل شیطان — اور یہی وجہ ہے کہ زندگی کے دو رنگ پانیوں کے دریا میں تیرتے وقت آدمی کسی ایک سے اپنا پہلو پوری طرح نہیں بچا سکتا ہے انہی متضاد قوتوں کے شکنجے میں جکڑا ہوا آدمی اپنے رویتے کے اعتبار سے کبھی کچھ ہوتا ہے اور کبھی کچھ۔ کبھی تو وہ ایک چیونٹی کے کچلے جانے سے ملول ہو جاتا ہے اور کبھی ہزاروں لاکھوں انسانوں کو قتل کر دینے کے باوجود اسے اپنی شقاوت اور درندگی کا احساس نہیں ہوتا۔

اس وقت بارہ بج رہے تھے کہ اچانک برکت تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا میرے کمرے میں گھس آیا۔ بولا۔

"صاب جی! ایک آدمی آیا ہے۔ پتہ نہیں اسے کس نے بتایا کہ آپ یہاں ہیں۔ وہ آپ کا پوچھ رہا ہے کہتا ہے میں غلام رسول سے ملنا چاہتا ہوں۔ آپ کا اصل نام یہی ہے نا؟"

"میرے بارے میں پوچھ رہا ہے۔ کون ہے وہ؟ کیا نام ہے اس کا؟" میں نے بستر سے اٹھتے ہوئے پوچھا۔ میں سمجھا اس راز کے کسی خیر خواہ نے میرا پیچھا کر کے مجھے اس حویلی میں گھستے دیکھ لیا ہے میرا سارا بدن جھنجھنا سا گیا۔ وہ ڈھلوں مجھ سے میرے ہتھیار بھی لے گیا تھا۔ رحمت علی کے اغوا پر مجھے معلوم تھا کہ بڑا واویلا مچے گا۔ مگر۔ مگر یہ تو میں نے سوچا تک نہیں تھا کہ کوئی میرے ٹھکانے تک بھی آ پہنچے گا۔ برکت نے میرے چہرے کے بدلتے رنگوں پر حیران ہو کر کہا۔

"آپ گھبرائیں نہیں صاب جی! ادھر کوئی مائی کا لال آپ تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس آدمی کے بارے میں بتائیں اگر وہ دشمن ہے تو میں اس کو یہاں سے زندہ نہیں جانے دوں گا۔ قبریں بنی ہیں یہاں لوگوں کی۔"

"اس کا نام کیا ہے برکت! تو مجھے بتاتا کیوں نہیں؟"

"اس نے اپنا نام آبی بتایا ہے عجیب سا نام ہے۔ پردہ بڑا جی دار لگتا ہے مجھے۔"

آبی کا نام سن کر میرے کلیجے میں ٹھنڈ سی پڑ گئی۔ جیسے تپتی دھرتی پر بارش کی پہلی پھوار برسنے لگی۔

"لاحول ولا قوۃ۔ اسے کہاں بٹھایا ہے تم نے۔ چلو مجھے اس کے پاس لے چلو۔ وہ میرا بھائی ہے برکت! میرا جگری یار" میں نے اسے کمرے سے باہر گھسیٹتے ہوئے کہا۔

"آپ یہیں بیٹھیں۔ میں اسے ادھر ہی لے آتا ہوں۔"

"نہیں اس کے لیے مجھے خود ڈیوڑھی میں جانا ہو گا۔"

"ادھر مت جائیں۔ ادھر بہت سے آدمی بیٹھے ہیں۔ آپ کا کسی کی نظر میں آنا ٹھیک نہیں ہے۔ میں اسے ادھر ہی لے آتا ہوں۔" برکت نے مجھے برآمدے میں روکا اور تیز تیز قدم اٹھاتا وہ مہمان خانے کے احاطے سے باہر نکل گیا۔

پانچ منٹ بعد جب وہ واپس آیا تو آبی اس کے پیچھے تھا۔ اس نے کالا کمبل اوڑھ رکھا تھا اور سر پر اس نے مغلئی طرز کی پگڑی باندھ رکھی تھی۔ مجھے اس نے برآمدے میں دیکھا تو برکت کو ایک طرف دھکیل کر وہ میری طرف لپکا اور مجھے بازوؤں میں بھر کر بولا۔

"تم کہاں چلے گئے تھے یار۔ میں تو تمہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر پاگل ہو گیا۔" اس کے لہجے کی لرزش بتاتی تھی کہ وہ بہت پریشان رہا ہے میرے بارے میں بہت فکر مند تھا۔

"برکت جا ذرا چائے بنا لا میرے بھائی کے لیے۔ ساتھ کچھ کھانے کو بھی لے آنا۔"

"ٹھیک ہے صاب جی! پر آپ مجھے بتائے بغیر اِدھر اُدھر مت نکلیں بہت ضروری ہے۔" یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر گیا تو آبی بولا۔

"یہ کون ہے، یہ چمگادڑ کی اولاد۔ تمہیں قیدی بنا رکھا ہے کسی نے۔"

"نہیں یار۔ یہ بات نہیں ہے۔ آسیہ اب اس حویلی میں ہے، اور میں اسی کے لیے یہاں ٹھہرا ہوا ہوں تو بتا، تجھے اس ٹھکانے کا کیسے پتہ چلا۔"

"یار خدا بھلا کرے اس سروری خانم کا۔ اس کی تو کایا ہی پلٹ گئی ہے۔ آج صبح میں نے اس سے فون پر دریافت کیا، اسی نے مجھے تمہارا پتہ بتایا ہے۔ آسو شاید گھر پر نہیں تھا۔ بڑی دیر تک وہ مجھ سے باتیں کرتی رہی۔ حیرت مجھے اس بات پر ہے کہ وہ تمہاری تعریف کر رہی تھی۔ کیا کر دیا ہے تو نے اسے؟"

"کچھ بھی نہیں یار! میں نے تو بہت ذلیل کیا ہے اسے۔ کیا سکھ پہنچایا ہے اسے میں نے۔ پھر بھی وہ مجھے اچھا سمجھتی ہے تو یہ اس کی مہربانی ہے۔"

"کچھ ہوا ضرور ہے بچے! تم نے اس کا کوئی خاص 'ناب' دبا دیا ہو گا۔ خیر یہ اچھی بات ہے تیرے حق میں جاتی ہے۔ تو یہ بتا کہ یہاں تیرا کیا دھندا ہے۔ یونہی دولہا بن کے بیٹھا رہتا ہے کہ تیرے کوئی فرائض بھی ہیں۔"

"کچھ نہ پوچھ یار! ایک سے ایک بڑا ہے اس دنیا میں۔ اس حمام میں سب کے سب ننگے ہیں۔ اب تو یوں سمجھ کہ میں ڈھلوں صاحب کی ملازمت میں ہوں۔"

"بات کچھ میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔" وہ میرے ساتھ سنبھل کر بستر پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ میں نے اسے اس دن تک کے سارے واقعات بتائے تو وہ بولا "کمال ہے یار! اس چھانگے کا قتل تو تیرے لیے مصیبت بن گیا ہے۔ اس پر خاموش رہنے کا معاوضہ بھی اس حرامزادے نے تم سے وصول کر لیا ہے۔"

"میں نے چکر میں پھنس گیا ہوں آبی! اور ابھی تک وہ مجھے آسیہ سے بھی ملنے نہیں دیتا۔"

"اسے آنے دے میں اس سے بات کروں گا، پر یار ایک گھپلا ہو گیا۔ تیری وجہ سے وہ بات مجھے ماننی پڑی۔ یہ چمگادڑ کی اولاد، یہ برکت بہت حرامی آدمی ہے۔ ڈیوڑھی سے نکال کر اس نے میرا پستول مجھ سے رکھوا لیا۔ بولا ادھر ڈھلوں صاحب کا حکم ہے کہ کوئی باہر کا آدمی اسلحہ لے کر اندر نہیں جا سکتا۔"

"وہ ڈرتے ہیں میرے ساتھ بھی وہ یہی ہاتھ کر چکے ہیں۔ مگر تو فکر نہ کر پستول میں تجھے دلا دوں گا۔ ان سب کی رستمی میں دیکھ چکا ہوں۔"

"یار مجھے تو اپنے ان یاروں کا غم ہے جو میرے لیے مارے گئے۔ اس قطب دین کی بیوی کو میں ایک لاکھ دے آیا ہوں اور اسے اُدھر شاہدرہ میں ایک مکان لے کر وہاں بٹھا آیا ہوں۔"

"اور وہ گوگا۔ اس کے بچوں کا کیا بنا؟"

"اسے بھی میں نے اپنے بیمہ فنڈ سے ایک لاکھ روپیہ دے دیا ہے۔ اس بے چاری نے تو رو رو کر برا حال کر لیا ہے کسی بھی طرح اسے چین نہیں آتا۔"

"پولیس کو تو پتہ نہیں چلا کہ وہ دونوں کون تھے۔"

"بس یہ ہماری خوش قسمتی تھی جیلانی کہ وہ مر گئے اور ان کی جیبوں میں ان کی شناخت کے لیے کوئی چیز نہیں تھی۔" آبی نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

"ان کی موت کو ہم اپنی خوش قسمتی نہیں کہہ سکتے ہیں آبی۔" میں نے تکیے کو ذرا پیچھے ہٹا کر پلنگ پر اس کے لیے جگہ کھلی کرتے ہوئے کہا۔ اس کی نظریں تکیے کی جگہ پر جم کر رہ گئیں۔

"یہ --- یہ تصویر کس کی ہے؟" اس نے قدرے حیران ہو کر کہا۔ میں نے بائیں ہاتھ نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ تکیہ ہٹانے سے آسیہ کی تصویر سامنے آ گئی تھی۔

"یہ --- یہ آسیہ کی تصویر ہے یار۔ اس روز سروری خانم نے اتار کر مجھے دے دی تھی۔"

آبی وہ تصویر اٹھا کر گہری گہری نظروں سے دیکھنے لگا۔ چند لمحوں تک اسے مختلف زاویوں سے دیکھنے کے بعد بولا۔

"تیرا اس سے فوراً مل لینا بہت ضروری ہے جیلانی۔ میری نظریں تو اور ہی کچھ دیکھ رہی ہیں۔"

"کیا مطلب ہے تیرا؟ کیا کہنا چاہتا ہے تو؟" میں نے تصویر اس کے ہاتھ سے جھپٹ لی۔ اس نے نگاہیں جھکائیں اور جیب سے سگریٹ نکال کر سلگانے لگا۔ جب وہ سگریٹ سلگا چکا تو پلنگ سے اتر گیا۔ بولا۔ "ہم نے انہیں اپنے ہتھیار دے کر اچھا نہیں کیا۔ بڑی حماقت ہو گئی ہے ہم سے۔"

"تو کیا کہنا چاہتا ہے آبی! اس تصویر میں تجھے کیا نظر آیا ہے۔"

"اس چمگادڑ کی اولاد برکت کو بلا۔ میں جب تک اپنی بہن کو خود نہیں مل لیتا تجھے کچھ نہیں بتاؤں گا۔ اس پر قیامت بیت چکی ہے۔"

"تُو کیا کہنا چاہتا ہے۔ کیا وہ زندہ نہیں ہے؟"

"یہ بھی ہو سکتا ہے وہ تجھے بہلا ہی رہے ہوں — یہ پٹھان پہریدار کیا نام ہے اس کا؟ اس نے احاطے کے دروازے پر کھڑے علی زئی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ پھر خود ہی بلند آواز سے بولا۔ "خان! ادھر آ ذرا۔" یہ کہہ کر وہ برآمدے میں نکل گیا۔ میں نے تصویر جیب میں رکھی اور اس کے پیچھے صحن میں جا اُترا۔ پہریدار اپنی رائفل خاص انداز سے سنبھالتا ہوا آگے آیا تو آبی بولا۔

"وہ کیا نام ہے اس آدمی کا جو مجھے ادھر لایا تھا اُسے بلاؤ اِدھر فوراً۔ ہمیں اُس سے بہت ضروری کام ہے۔"

"ام کو اِدھر سے ہلنے کا آرڈر نئیں ہے چوہدری صاحب۔"

"اوئے جا چلا جا، اُسے بُلا کر لا اِدھر، ابھی اور اسی وقت۔"

آبی نے ایک دم گرج کر کہا۔ پہریدار سہم کر پیچھے ہٹا اور بولا۔

"ام پر رعب بھی ڈالیں گا چوہدری صاحب؟" اُس نے گلے میں لٹکی گولیوں کی پیٹی کو درست کر کے رائفل پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ مجھے ڈر تھا کہ آبی کہیں اسے اور زیادہ مشتعل نہ کر دے۔ کیونکہ کسی بھی خوفزدہ آدمی کو آخری حد تک کھینچ لے جانا۔ کچھ بھی مشکل نہیں ہوتا۔

"رعب کی بات نہیں ہے خان بھائی۔ ذرا برکت کو ادھر بُلا دے۔ ہمیں اُس سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔" میں نے اُسے پچکارتے ہوئے کہا۔ میری آواز سُن کر وہ کچھ سنبھل گیا، بولا۔

"وہ ابھی ادھر سے گزریں گا تو ام اُسے بُلا لیں گے۔" یہ کہہ کر وہ پھر احاطے کے گیٹ پر جا ٹھہرا۔ آبی اُسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"اس سے اُلجھنے کی ضرورت نہیں ہے آبی! وہ برکت آتا ہی ہوگا۔ وہ جانے کا کہہ کر گیا ہے۔"

آبی میری یہ بات سن کر پیچھے ہٹ آیا مگر اس کے چہرے پر سوچ نے جالا سا بُن دیا تھا۔ وہ مجھ سے نظریں نہیں مِلا رہا تھا۔

"تُو پاگل ہے جیلانی۔ کیوں نہیں مِلا ہے تو اَب تک اُس سے؟"

"وہ... وہ کانچ کی گڑیا ہے آبی۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے وہ کسی اور مشکل میں پھنس جائے۔ میں یہاں بیٹھ کر اس کے لیے دِن رات دعا کرتا ہوں۔"

"تیرا دماغ چل گیا ہے اس ڈھلوں کے ہاتھ۔ تو بھی تو کھلونا بن کر رہ گیا ہے۔ اور وہ بیچاری۔ ۔ ۔ ۔ خدا کرے میری ساری سوچ غلط ہو جائے۔" آبی بہت دُکھی نظر آنے لگا تھا۔ وہ اچھا بھلا آیا تھا مگر آسیہ کی تصویر دیکھتے ہی اس کا دماغ اُلٹنے لگا تھا۔

"تو۔۔۔ تو کیا کہنا چاہتا ہے آبی!"

"دیکھ وہ برکت آ ہی گیا ہے۔" آبی نے صحن میں نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ برکت ایک ملازم کے ہاتھ پر چائے کی ٹرے رکھوا کر اندر لا رہا تھا۔ ہم کمرے میں جا بیٹھے۔ برکت نے چائے میز پر رکھوائی تو آبی بولا۔ "برکت صاحب ذرا ادھر بیٹھ جائیں۔ جا بھئی برتن بعد میں لے جانا۔" اس نے ملازم کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ بیچارا کوئی بہت ہی عاجز مسکین سا آدمی تھا۔ فوراً ہی نِکل گیا۔ برکت بڑے غور سے آبی کے چہرے کو تک رہا تھا۔ میز کے ساتھ لگی کُرسی پر بیٹھ کر بولا۔

"حکم کرو سائیں۔ کوئی خاص بات ہے۔"

"ہماری بہن آسیہ کا کیا حال ہے۔ ہم اس سے مِلنا چاہتے ہیں۔"

"وہ تو سائیں اُدھر زنان خانے میں ہوتی ہیں۔ ہم کو اُدھر جانا ہی نہیں ہوتا۔"

"تم نے اُسے دیکھا ہے؟"

"نہیں سائیں۔ ہم نے تو نہیں دیکھا پر سُنا ہے وہ بہت بیمار ہے اور ڈھلوں صاحب گھر میں نہیں ہیں۔"

"کیا کہتے ہو تم! کب سے بیمار ہے وہ؟" میں نے برکت کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجوڑ دیا۔

"وہ کما لو اندر سے ہو کر آئی تھی۔ کہہ رہی تھی کہ آسیہ بی بی کے پیٹ میں سخت درد ہے اور اُسے بخار بھی ہے۔"

"تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں۔"

"اس نے تو مجھے ابھی بتایا ہے سائیں۔"

"بڑی بیگم سے کہو کہ ہم فوراً آسیہ سے مِلنا چاہتے ہیں اور اسی وقت۔"

"ٹھیک ہے میں اُنہیں بتا دیتا ہوں، پر ڈھلوں صاحب کا حکم ہے کہ۔ ۔ ۔"

"اُن کا نام مت لو۔ ہم کسی کے قیدی نہیں ہیں۔ جاؤ بڑی بیگم کو بولو ہم ابھی آسیہ کو دیکھنا چاہتے ہیں۔" آبی نے کہا اور چیتے ایسی پھرتی سے اُس نے برکت کے ہاتھ سے رائفل لے لی۔ "میری بات سمجھتے ہو کہ نہیں؟"

یہ کہہ کر وہ دروازے تک پہنچا اور پہریدار کو للکارا۔

"اوئے! یہ رائفل پھینک دے ورنہ تیرا مغز توڑ دوں گا۔"

برکت کی رائفل کا رخ پہریدار کی طرف تھا۔ وہ اس صورتِ حال سے بالکل ہی بھونچکا سا رہ گیا اور پاگلوں کی طرح اس نے رائفل صحن میں پھینک کر ہاتھ اُوپر اُٹھا لیے۔

"جیلانی! وہ رائفل اٹھا کر اس کو اِدھر لے آ۔" آبی نے یخ بستہ لہجے میں کہا۔

میں نے آگے جا کر پہریدار کی رائفل اُٹھا لی۔ اس کا چیمبر

بھرا تھا۔ گیارہ راؤنڈ کا چیمبر تھا وہ۔ اور برکت نے بھی اپنی رائفل پوری طرح لوڈ کر رکھی تھی اور اب وہ کُرسی میں یوں دھنس کر بیٹھا تھا جیسے منجمد ہو چکا ہو۔

میں اس پہریدار کو آگے لگا کر کمرے میں لے آیا تو آبی نے اپنی رائفل کا رُخ ان دونوں کی طرف پھیر دیا۔ بولا۔

"اگر تم نے کوئی گڑبڑ کی تو میں زندہ نہیں چھوڑوں گا سمجھے! بتا ہمارے ہتھیار کہاں ہیں؟ وہ ہمیں زندگی سے زیادہ عزیز ہیں۔"

"وہ تو میں نے الماری میں بند کر دیے تھے۔ اُدھر ڈھلوں صاحب کے کمرے میں۔"

"ہوں، ٹھیک ہے۔ زنان خانے میں کون کون ہے اور آسیہ کس حصّے میں ہے؟"

"وہ تو اُن کی بیگم، بڑی بیگم کے حصّے میں ہے، آپ اُدھر نہیں جا سکیں گے سائیں!" برکت نے بہت بُجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ اس کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا — علی زئی کا بھی یہی حال تھا۔ وہ ابھی تک ہاتھ اُونچے کیے ہوئے تھا۔

اچانک ہمیں باہر قدموں کی چاپ سُنائی دی۔ میں ایڑی پر گھوم سا گیا۔ ڈھلوں صاحب تیزی سے اندر آ رہے تھے۔ دروازے پر پہنچتے ہی برکت بلبلا اُٹھا۔

"ہمیں بچا لیں سائیں۔ ہم نہتے ہو گئے ہیں۔ انھوں نے ہمارے ہتھیار دھوکے سے چھین لیے ہیں۔"

"بکواس بند کر لوئے کھسرے کے پُتر۔ تم نے انھیں ضرور پریشان کیا ہوگا۔ کیا بات ہے ہاشم صاحب؟"

"میں بتاتا ہوں آپ کو۔" آبی نے میرے مُنہ کی طرف بالاں ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"آپ نے تو ابھی اپنا تعارف بھی نہیں کرایا ہے بھائی صاحب! یہ کون صاحب ہیں ہاشم بھائی؟"

"یہ میرا بھائی ہے ڈھلوں صاحب! مجھے ملنے آیا ہے۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آسیہ سخت بیمار ہے۔ ہم برکت سے کہہ رہے تھے کہ یہ ہمیں اُس سے مِلوا دے۔"

"میں نے ہی اُسے منع کر رکھا ہے اور یہ بات دُرست ہے کہ وہ لڑکی اچانک بیمار ہو گئی ہے۔ میں نے ابھی معلوم کیا ہے۔ اور ایک لیڈی ڈاکٹر کو بھی بلوا بھیجا ہے آپ کو میں یہی بتلانے آیا تھا۔"

"یہ کتنے ظلم کی بات ہے ڈھلوں صاحب! کہ وہ بیمار ہے اور ہم اُسے دیکھ بھی نہیں سکتے۔" میں نے بڑے ہی آزردہ لہجے میں کہا۔

"مجھے اس بات کا احساس ہے ہاشم صاحب! میں اُسے اِدھر بُلوا لیتا ہوں۔ میری ملازمہ بھی اُس کے ساتھ ہو گی۔ چل اوئے

برکت اُس لڑکی کو اِدھر لے آ اور خاداں سے کہہ کہ وہ بھی ساتھ ہی آ جائے۔ اس کے کپڑے لتے ساری چیزیں یہاں لے آ۔"

برکت ڈھلوں صاحب کی یہ بات سُن کر باہر نکلا تو انہوں نے پہریدار کو خونخوار نظروں سے دیکھا اور بولے۔

"چل اوئے چُوزہ خان! جا اُدھر اپنے حجرے میں بیٹھ — میں تجھ سے بعد میں نپٹوں گا۔"

پہریدار باہر نکلا تو ڈھلوں صاحب نے اپنی طرّہ دار پگڑی کے اُوپر سے گھما کر اپنا پستول پیٹی سمیت اچکن سے الگ کر کے دونوں ہاتھوں پر دھرا اور میری طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔

"گر قبول اُفتد زہے عزّ و شرف۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں بھی اب اس کا اہل نہیں رہا۔ یہ بھی رکھ لیں۔"

بڑا زہریلا طنز تھا اُن کے لہجے میں۔

"یہ بات نہیں ہے ڈھلوں صاحب! آپ کے یہ ملازم ہمیں ذلیل کرتے تھے۔ اس برکت نے آبی سے بھی پستول دھروا لیا۔"

"وہ بھی میرا ہی حکم تھا۔ میں تو کسی پولیس افسر کو بھی اِدھر اسلحہ لے کر اندر نہیں آنے دیتا۔"

"ہتھیار ہمارے لیے محض دکھاوا ہیں ڈھلوں صاحب۔ یہ آدمی کی حفاظت نہیں کرتے۔ آدمی کا محافظ اُس کا دل ہے۔ یہاں دھک دھک نہ ہو تو بغیر ہتھیار کے بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ میرے ملازم بہت کچھ کر سکتے ہیں مگر نہیں — معاملہ گڑبڑ ہو گیا ہے۔"

"آپ ہمیں شرمندہ نہ کریں۔ ہم یہ رائفلیں واپس کر دینگے۔"

"تو پھر یہ پستول میں دوبارہ پہن لیتا ہوں۔ یہ رائفلیں ابھی اپنے پاس ہی رکھیں اور دعا کریں کہ آپ کی بہن کی صحت ٹھیک ہو جائے۔ میں اسے دیکھ کر آ رہا ہوں۔ اس کی طبیعت زیادہ ہی خراب ہے۔" یہ کہہ کر انہوں نے پستول پھر کندھے پر لٹکا لیا۔ آبی نے رائفل مجھے دے دی۔ بولا۔

"ڈھلوں صاحب! اس بدنصیب کو بھائیوں سے اور دُور نہ رکھیں۔" یہ کہہ کر آبی کُرسی پر ڈھے گیا۔

"نہیں صاحب آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ اور اپنے اِس ہاشم صاحب نے تو مجھ پر ایسا احسان کیا ہے کہ میں اس کا بدلہ چکا ہی نہیں سکتا۔ انھوں نے آپ کو تو بتا ہی دیا ہوگا۔"

"جی ہاں! مجھے معلوم ہو چکا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب میدان آپ کے لیے بالکل صاف ہوگا۔"

"ہاں! صورتِ حال بالکل بدل گئی ہے۔ وہ لوگ رحمت علی کو جگہ جگہ ڈھونڈ رہے ہیں۔"

"آپ پر تو شک نہیں ہے انہیں؟"

"بالکل بھی نہیں! میرے ہاتھ تو بالکل صاف ہیں۔" ڈھلوں صاحب نے کہا۔

اُن کے حوصلے کی داد نہ دینا بے انصافی ہوگی۔ ہم چند لمحے پہلے خوفناک موڈ میں وہاں کھڑے تھے۔ اُس کی ساری گھن گرج وہ محسوس کر چکے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ ہم کس کینڈے کے آدمی ہیں — چھت پھاڑ کر اُوپر اُٹھ جانے والے لوگ — لیکن ان سب باتوں کے باوجود وہ بڑے تحمل اور حسنِ تدبیر سے فضا میں رچی اُس وحشت کو دُور کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ وہ سرداری کا مستحق آدمی تھا۔ اعصاب اُس نے لوہے کے پائے تھے۔ اُس نے دیکھ لیا تھا کہ ہم بپھر چکے ہیں۔ ذرا اور ہمیں دبایا گیا تو پھر ہم ساری ہی حدیں پھلانگ جائیں گے۔ اسی لیے اُس نے اپنے لب و لہجے میں تلخی نہیں گھلنے دی تھی۔ اور اپنی باتوں سے اُس نے سارا تکدر دور کر دیا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد برکت بھاگا ہوا واپس آیا۔ بولا۔

"بی بی کو درد نے پاگل کر رکھا ہے اُسے فوراً کسی ڈاکٹر کے پاس لے جائیں۔ بڑی بی بی نے آپ کو اندر بلایا ہے۔"

"اچھا تم ہماری گاڑی باہر نکلواؤ ہم ابھی اُسے شہر لے کر چلتے ہیں۔" یہ کہہ کر ڈھلوں صاحب تیز تیز قدم اُٹھاتے باہر نکل گئے۔ برکت بھی اُن کے پیچھے تھا۔

کوئی دس منٹ بعد برکت ہمیں مہمان خانے سے اُٹھا کر عمارت کے سامنے کے حصے میں لے گیا۔ وہاں ڈھلوں صاحب کی کاہی رنگ کی لمبی کار کھڑی تھی اور اس میں وہ آسیہ کو پچھلی سیٹ پر بٹھا چکے تھے۔ وہ بچاری درد کی شدت سے نڈھال ہو رہی تھی۔ اُس کو دیکھ کر میری آنکھیں بہہ نکلیں — وہ پہلے سے بہت دُبلی ہو چکی تھی۔ اس نے مجھے دیکھا تو روتی ہوئی میرے گلے لگ گئی۔ آبی کار سے باہر کھڑا تھا۔

"ہمت نہ ہار آسیہ! میں تمھارے ساتھ ہوں پگلی۔ تیرے لیے تو میری جان بھی حاضر ہے۔"

"مجھے امی جان سے ملا دو بھیا۔ میں آخری بار انھیں دیکھ لوں۔ مجھے پتہ نہیں کیا ہوتا جا رہا ہے۔" وہ بڑی ہی دردیلی آواز میں بولی۔

خاداں اتنے میں اُس کے لیے تکیے کمبل اور چادریں لے آئی۔ تکیہ میں نے بڑی احتیاط سے آسیہ کے سر کے نیچے رکھا اور اُس پر کمبل ڈال دیا۔ وہ ادھ مُوئی سی ہو رہی تھی۔ ڈرائیور نے اسٹیرنگ سنبھالا تو ڈھلوں صاحب باہر آ گئے۔ انہوں نے دس دس ہزار کے نوٹوں کی دو گڈیاں آبی کے ہاتھ پر رکھ دیں۔

"یہ روپیہ ساتھ رکھ لیں بھائی صاحب! یہ ہاشم صاحب تو سمجھتے ہی نہیں ہیں۔ چل بھئی برکی بچی کو فوراً شہر پہنچا۔ اس کا علاج ضروری ہے۔"

برکی اُن کے ڈرائیور کا نام تھا۔ آبی نے وہ نوٹ ... طرف بڑھا دیے۔ بولا۔

"رکھ لو۔ یہ کام آئیں گے۔ چل یار برکی جلدی نکل ..."

یہ کہہ کر وہ ڈرائیور کے ساتھ کی نشست پر بیٹھ گیا۔ خاداں ... کے پاؤں کی طرف بیٹھی اور میں وہاں اور جگہ نہ ہونے کی وجہ ... آبی کے ساتھ گھس کر بیٹھ گیا۔

ڈھلوں صاحب نے آگے بڑھ کر میرا کندھا تھپتھپایا ...

"کوئی خاص بات ہو تو مجھے فوراً اطلاع دیں۔ یہ کار یہ ڈرائیور ... وقت آپ کے ساتھ رہے گا۔ خدا حافظ۔"

میں نے اُن کا ہاتھ دبا کر اُن کا شکریہ ادا کیا تو ڈرائیور ... گاڑی آگے بڑھا دی۔ آسیہ آنکھیں بند کر کے لیٹی تھی۔ ا... دونوں ہاتھوں سے اس نے پیٹ کو دبا رکھا تھا اور میں حیران ... کہ اُسے کیا ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی عمر ایسی تو نہ تھی کہ وہ یوں ... مرض کے رحم و کرم پر چھوڑ دے مگر محسوس میں یہ کر رہا تھا کہ ... ہمت جواب دے چکی ہے۔ وہ زندگی سے مایوس ہوتی جا رہی ... دُکھوں کے اس گھمسان میں وہ تنہا ماری جا چکی تھی۔ میں سائے ... طرح اس کے ساتھ ساتھ لپٹنے کے باوجود اس کے لیے کچھ نہ ... سکا تھا۔ خیالات کا ایک اُمڈتا ریلا تھا جو مجھے بہائے لیے ... رہا تھا۔ درد کی ٹیسیں ٹھہر ٹھہر کر میرے دل میں اُٹھتی تھیں ... جھرجھری سی لے کر رہ جاتا تھا۔ آبی نے میری یہ کیفیت بھانپ ...

"حوصلہ رکھ میرے یار! یہ زندگی ایسی ہی ہے۔ آسیہ ٹھیک ... ہو جائے گی۔" یہ کہہ کر اُس نے مجھے سگریٹ سلگا کر دے دیا۔

آسیہ کا درد حد سے بڑھ کر دوا ہوتا جا رہا تھا۔ گاڑی ... اسے اُونگھ آ گئی۔ خاداں اُس کی خبر گیری میں لگی تھی۔ وہ کبھی ... کے پاؤں دباتی کبھی کمبل کے نیچے ہاتھ ڈال کر اس کے پیٹ ... ہلکے مالش کرتی چلی جا رہی تھی۔

برکی اچھا ڈرائیور تھا اور گاڑی ایسی سُبک رفتار تھی ... تک کا سفر کچھ بھی طویل نظر نہ آیا۔

برکی ڈھلوں کی ہدایت پر ہمیں مال روڈ کے محسن کلینک ... پر لے گیا۔ وہ بڑا ہی آراستہ پیراستہ کلینک تھا جسے ڈاکٹر ... علوی نے امریکن طرز پر جدید ترین سامان سے مزین کر رکھا ... بھی اُس نے بہت سوچ سمجھ کر متعین کیا تھا۔ آسیہ کو علوی ... فوراً ہی ایک ماہر لیڈی ڈاکٹر کے سپرد کر کے ایک کمرے ... کر دیا۔ میں اور آبی کمرے کے سامنے برآمدے ہی میں ... اس لیڈی ڈاکٹر کا نام عذرا تھا۔ ادھیڑ عمر کی عورت تھی اور ...

تپتی بلکتی دوپہر میں گھنگھور گھٹا کی طرح چھا جاتی تھی۔ اس نے فوراً ہی آسیہ کو معائنے کے مختلف مراحل سے گزار دیا مگر جب وہ بیس منٹ کے بعد آسیہ کے کمرے سے باہر نکلی تو بولی "یہ لڑکی آپ کی کیا لگتی ہے جناب؟" وہ مجھ سے مخاطب تھی۔

"یہ میری بہن ہے ڈاکٹر! سگی بہن۔"

"کیا یہ شادی شدہ ہے؟" وہ بہت سنجیدہ تھی۔

"نہیں جی! ابھی تو اس کی منگنی ہوئی ہے۔"

"یہ صاحب کون ہیں؟"

"یہ میرے بھائی ہیں۔ آپ بتائیں اسے مرض کیا ہے؟"

"دیکھیں۔ پہلی بات تو یہ ہے، کیا اسے پہلے بھی گردے کی تکلیف رہی ہے؟"

"جی نہیں، ایسا تو کبھی نہیں ہوا۔"

"یہ میں کیسے مان لوں۔ اس کا ایک گردہ پہلے ہی نکالا جا چکا ہے اور اب دوسرا گردہ بھی ٹھیک طرح سے کام نہیں کر رہا۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ اس کا ایک گردہ نکالا جا چکا ہے۔ نہیں ڈاکٹر خدا کے لیے ایسا نہ کہیں۔" میں پاگلوں کی طرح چیخ پڑا۔

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں جناب! میرا خیال ہے آپ اپنی بہن سے بہت دُور رہے ہیں۔ وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ اُس کے پیٹ میں ایک ماہ کا بچہ بھی ہے۔"

مجھے یوں لگا جیسے میرے بدن سے جان ہی نکل گئی ہو۔ میرا دماغ چکرانے لگا تھا۔ میں شاید ڈوبنے لگا تھا۔ آبی نے مجھے نہ سنبھالا ہوتا تو میں وہیں گر جاتا۔ میرا رنگ ہلدی ہونے لگا تھا۔ آبی نے میری یہ حالت دیکھی تو بولا۔

"تھوڑا پانی منگوائیں ڈاکٹر صاحب! ان کی حالت ٹھیک نہیں رہی۔" ڈاکٹر نے فوراً ہی ایک نرس کے ہاتھ پانی منگوا کر مجھے پلایا اور برآمدے میں پڑے صوفے پر مجھے بٹھا کر بولی۔

"مجھے افسوس ہے جناب! مگر مریضہ کی حالت سے آپ کو باخبر رکھنا میرا فرض تھا۔"

میں نے پانی پی کر گلاس آبی کو دے دیا۔ اب میں خالی خالی نظروں سے اسے یوں دیکھ رہا تھا جیسے وہ کوئی غیر مرئی وجود ہو۔ وہ میرے پاس ہی بیٹھ کر میری نبض ٹٹولنے لگی۔ پھر مطمئن ہو کر بولی۔ "آپ تو پریشان ہی ہو گئے میں ابھی آتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی ڈسپنسری میں جا گھسی۔ کوئی تین منٹ بعد وہ واپس آئی تو اس کے ساتھ ایک نرس بھی تھی — میرے لیے وہ کوئی ٹیکہ بھر لاتی تھی۔ آتے ہی اُس نے وہ ٹیکہ میرے بازو میں گھونپ دیا۔ اور پھر نرس کو واپس بھیج کر بولی۔

"میں۔۔۔ میرا خیال ہے کہ اِس لڑکی کے گردے میں سوزش ہے وہ انشاء اللہ شام تک کافی کم ہو جائے گی۔ میں نے علاج شروع کر دیا ہے۔ رہ گیا دوسرا معاملہ تو اس کا فیصلہ پہلے آپ خود کر لیں پھر میں کوئی مشورہ دے سکوں گی۔ کیونکہ آپ نے کہا ہے کہ یہ لڑکی شادی شدہ نہیں ہے۔"

"کیا میں آسیہ سے مل سکتا ہوں؟"

"نہیں ابھی میں نے اسے نیند آور ٹیکہ لگا دیا ہے تاکہ درد بند ہو جائے۔ ساتھ کے ساتھ میں نے سوزش ختم کرنے کے لیے بھی اسے ٹیکہ لگا دیا ہے۔ کوئی ایک گھنٹے بعد آپ اس سے بات کر سکیں گے۔"

"ٹھیک ہے ڈاکٹر۔ میں انتظار کروں گا۔" میں نے اب کی بار اپنے آپ کو قابو میں لاتے ہوئے کہا۔

میں بکھرتا ہی جا رہا تھا۔ میرے ذہن کے ویران آنگن میں دھول اُڑنے لگی تھی۔ میں اس کے اس خوفناک انکشاف پر کیا کہتا، کیا سمجھتا۔ بہن کو بدچلن قرار دے دیتا۔ اس بہن کو جس نے ایک عرصہ قید و بند کی صعوبتوں میں گزارا تھا۔ جس پر دُکھوں کا بیلن گھم گھم برس گیا تھا۔ جس کا نازک بدن ابھی اپنے کسی فطری تقاضے کو سمجھ بھی نہ پایا تھا۔ جو چاند کی رُوپہلی کرنوں ایسی معصوم اور پاک صاف تھی۔ اس کے پیٹ میں یہ کیڑا کہاں سے آیا؟ آسیہ تو جیل کی اونچی اونچی دیواروں کے پیچھے لہو روتی رہی تھی۔ وہ تو کسی ایسی ویسی بات کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ پھر یہ سب کیا ہے اور کیوں ہے۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔ اُس کا وہ ایک گردہ — وہ کیا ہوا؟ کیا وہ بھی ڈاکٹر دھمن کی سفاکی کا شکار ہو گئی تھی۔ اسے دُکھوں کے گھورے پر پھینک دینے سے پہلے اُس خبیث نے اُس سے بھی اس کی متاعِ عزیز چھین لی تھی۔ یہ سوالات میرے ذہن میں زہریلے ناگوں کی طرح پھن پھیلائے ہوئے تھے۔ اُن کی سسکاریاں مجھے وحشت زدہ کر رہی تھیں۔ میری خمیارہ تقدیر نے مجھے یہ دن بھی دکھانا تھا کہ وہ ہستی جس کے سکھ چین کے لیے اور آرام کی تلاش میں میں نے اپنے اَن گنت دن اور رات اندھیروں کی نذر کر دیے تھے، یوں جھیر جھیر مل گئی تھی اور مجھے علم بھی نہ ہو سکا تھا کہ کیا ہو گیا ہے میرے پروردگار! میں اس سے کیا پوچھوں۔ کس رخ سے آئینہ رکھوں کہ اس کے وہ سارے تاریک لمحے میری نظروں میں آ جائیں۔ جب وہ خود کو بھول کر کسی کی آغوش میں گرنے جا رہی تھی۔ کیا اس نے عمداً کسی مرد کو راہ دی ہوگی۔ نہیں نہیں، آسیہ ایسی نہیں ہو سکتی۔ وہ میری بہن ہے وہ ایسی راہ پر چلنے کا کبھی سوچ بھی نہیں سکتی۔

وہ تو بڑی ہی سنگلاخ راہوں پر چلتی رہی ہے۔ اپنی عصمت کی حفاظت کے لیے اس نے قتل ایسے جرم سے بھی گریز نہیں کیا۔ پھر وہ یوں اتنی آسانی سے کسی کی ہوس کا شکار کس طرح ہو گئی — وہ کون تھا —

"یہ... یہ کیا ہو گیا ہے آبی! وہ کون ہو سکتا ہے؟ وہ کون ہو سکتا ہے۔ وہ کون تھا۔ آبی مجھے بتا۔ یہ ڈاکٹر کیا کہہ گئی ہے؟" میں بڑبڑایا۔ سر میں نے صوفے کی پشت پر یوں ٹکا رکھا تھا جیسے وہ میرے بدن کا حصہ ہی نہ ہو۔

آبی نے میرا کندھا دبایا۔ میرے لہجے کی آزردگی کو محسوس کر کے وہ میرے اور قریب ہو گیا۔ میری آنکھوں سے بہتے آنسو اس نے رومال سے پونچھے اور بولا۔

"ہو سکتا ہے یہ ڈاکٹر غلط بھی ہو۔ ایسی باتوں کا پتہ چلانے کے لیے خاص ٹیسٹ لیا جاتا ہے۔"

"اسے بلاؤ۔ اس کتیا کو بلاؤ۔ اس نے اتنی بڑی بات میری بہن کے خلاف کیسے کہہ دی ہے؟" میں نے بلکتے ہوئے کہا۔

"سنبھلنے کی کوشش کرو۔ میں خاداں سے پوچھتا ہوں۔"

"چلو میں بھی اندر چلتا ہوں۔" میں صوفے سے اٹھ بیٹھا۔ میری آنکھیں جھرنا بنتی جا رہی تھیں۔ وہ خبر سننے سے پہلے ہی مجھے موت آجانی چاہیے تھی۔ مگر میں وہ بدنصیب بے غیرت آدمی تھا کہ خبر سن بھی چکا تھا اور ابھی تک زندہ بھی تھا۔ میرا وجود ریزہ ریزہ ہوا جاتا تھا۔ آبی کے سامنے میں خجل ہو کر رہ گیا تھا۔ مگر وہ بہت زیرک بہت دانا اور شیر ایسے دل گردے کا آدمی تھا۔ وہ مجھے سہارا دیکر آسیہ کے کمرے میں لے گیا۔ خاداں ایک کرسی پر فکر مند سی بیٹھی تھی۔ ادھیڑ عمر کی گوری چٹی عورت تھی جسے خدمت کا سلیقہ آتا تھا کیونکہ اس نے ڈھلوں صاحب ایسے گھر میں ملازمت کی تھی۔ وہ ہمیں دیکھتے ہی اٹھ بیٹھی۔ میری طرف دیکھ کر بولی۔

"بی بی کو تو نیند آگئی ہے چوہدری صاحب۔ اب درد بھی کم ہو گیا ہے۔" آسیہ ٹیکے کے اثر سے بے ہوش پڑی تھی۔

"ڈاکٹر نے تجھے کیا بتایا ہے خاداں؟"

"وہ کہتی ہے جی کہ بی بی کے گردے میں کچھ گڑبڑ ہے۔"

"اور کیا کہتی تھی وہ؟"

"وہ... وہ بڑی خوفناک بات بتاتی ہے بھائی جی۔ وہ بات میری زبان پر زیب نہیں دیتی۔"

"کیا تجھے یقین ہے کہ وہ سچ کہتی تھی؟"

"میں نے بھی دیکھا ہے بھائی جی! ڈاکٹرنی ٹھیک کہتی ہے پیٹ میں بچہ ڈیڑھ دو ماہ کا تو ضرور ہی ہو گا۔"

آبی چپ ہو گیا۔ آبی کی نظریں بھی اوپر نہیں اٹھ رہی تھیں ہم تینوں کے گرد دکھوں کی منڈی لگ گئی تھی۔ میرا دل نہیں مانتا تھا۔ کہ آسیہ قصوروار ہے۔ ورنہ کوئی اور صورت حال ہوتی اور مقام ہوتا تو میں اب تک اس کے پرچھے ہی اڑا چکا ہوتا اسے زندہ زمین میں گاڑ دیتا۔ مگر وہ جو میرے سامنے آنکھ موندے بے سدھ پڑی تھی۔ اس کے ابرو کی محرابیں اس کے تقدس کی گواہی دیتی تھی۔ اس کے وہ کھلے ہونٹ اس بات کا ثبوت تھے کہ وہ پاکیزہ ہیں۔ ابھی تک اچھوتے ہیں۔ میں کیسے مان لوں میری تقدیر کہ میری بہن گنہ گار ہے۔ تو اپنے ترکش میں میرے خلاف بڑے تیر لیے پھرتی رہی ہے مگر یہ سب سے کاری تیر ہے جو تو نے چلا دیا ہے۔ اب پتہ نہیں کیا ہو گا میرے ہاتھوں کس کس گھر میں تباہی آئے گی۔ کون کون سی گردن کس کس کے کندھوں سے نیچے آ رہے گی۔ کیونکہ اگر ثابت ہو گیا کہ آسیہ کو کسی انجانے میں ناپاک کر دیا ہے، زبردستی اس کے وجود میں وہ زہر اتار دی ہے تو پھر... پھر... میں تو بھیڑیا بن جاؤں گا۔ نہیں جانتی میری حرماں نصیب تقدیر! میں... مر کر بھی ہار نہیں مانوں گا میں آسیہ کے کمرے میں دیوار کے ساتھ لگی کرسی میں بیٹھا ہو گیا۔ مجھے کچھ نہیں سوجھ رہا تھا۔ آبی بھی میرے قریب آبیٹھا بولا۔ "جا خاداں ہمارے لیے چائے بنوا کے لے آ۔"

خاداں اس کی یہ بات سن کر باہر نکلی تو آبی بولا۔

"یہ چکر میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے جیلانی۔ تو بڑا بدنصیب ہے میرے یار۔ اور میں بھی۔ ہمیں یہ دن بھی دیکھنا تھا اس کی تصویر دیکھ کر میرے دل میں کھٹکا ابھرا تھا۔ مجھے یہی ہوا تھا۔"

"تو بہت تجربے کار آدمی ہے مگر تیرا کیا خیال ہے کہ خود گمراہ ہو گئی ہو گی؟"

"نہیں! یہ تو میں نے نہیں کہا ہے جیلانی! میں تو ایسا کبھی نہیں سکتا۔ مجھے وہ تصویر میں بہت مظلوم نظر آتی تھی۔"

"پھر... پھر... یہ ضرور ادھر لاہور کی جیل میں ہی کچھ ہوا ہے۔"

"ہاں میرا بھی یہی خیال ہے۔ اس پر کسی نے ادھر ہی ہاتھ ڈالا ہو گا۔"

"مگر... مگر وہ کون ہو سکتا ہے آبی! وہ کون تھا؟"

"یہ ہوش میں آجائے تو پوچھ اس سے! اگر یہ خود بہک گئی تھی تو اسے زہر کا ٹیکہ لگوا دے۔ اور آج ہی۔" آبی نے یخ بستہ لہجے میں کہا اور پھر سگریٹ سلگا کر اس نے میرے ہونٹوں میں رکھ دیا۔

"تو ٹھیک کہتا ہے آبی! مجھے یہی کرنا پڑے گا۔ میں یہ ذلت سہہ کر نہیں جی سکتا۔ اس کے لیے تو میں نے ایک دنیا چھوڑ رکھ دی ہے میں اس کی یہ ذلت نہیں دیکھ سکتا۔"

"اور اگر یہ بے گناہ ہے اور یوں ہی بے خبری میں تباہ ہو گئی ہے تو پھر پتہ نہیں کیا ہو جائے۔ میرا خون کھول رہا ہے۔" آبی نے چھت کو گھورتے ہوئے کہا۔

"جانتے ہو وہ ڈاکٹر عالیہ اور ڈاکٹر دھمن اس بدنصیب کو بھی ایک گردے سے محروم کر چکے ہیں۔"

"ہاں! میں سمجھ گیا تھا۔ یہ ان کے ہتھے چڑھ گئی تھی۔ اسے اپنے گرگوں کے حوالے کرنے سے پہلے انہوں نے اپنا مقصد پورا کر لیا ہو گا۔"

"مگر ان کا چہرہ تو کراؤ۔ وہ ہیں کون؟ میں بھی تو دیکھوں وہ کیا شے ہیں۔"

"وہ ادھر نہیں ہیں۔ ملک سے باہر گئے ہوئے ہیں مگر اب میں انہیں واپس آنے پر مجبور کر دوں گا۔ میں اب مزید انتظار نہیں کروں گا۔"

"ان کا پتہ معلوم ہے تمہیں؟ وہ جہاں کہیں بھی ہوں، ہم انہیں جا پکڑیں گے۔"

"نہیں یار! باہر جانے میں کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ ویسے ان کا تازہ پتہ بھی معلوم ہو سکتا ہے۔"

"تو ٹھیک ہے ان کے ٹھکانے پر چلو آج رات ان کے کسی آدمی پر ہاتھ ڈال دو، جو ہو گا دیکھا جائے گا۔" آبی نے فیصلہ کن انداز سے کہا۔

اتنے میں خاداں چائے کی ٹرے ایک لڑکے کے ہاتھ پر رکھوا کر اندر آگئی۔ میرا خیال ہے کہ وہ اس کلینک کے ماحول کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔ ڈاکٹر حسن علوی اور ڈاکٹر عذرا اس سے بہت مانوس لگتے تھے۔ غالباً ڈھلوں صاحب اپنے علاج کے لیے اکثر وہاں جاتے رہتے تھے۔

آسیہ کو کوئی دو گھنٹے بعد ہوش آیا۔ اس کا درد بڑی حد تک کم ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق ہم نے اسے پھلوں کا رس پلایا۔ جب ڈاکٹر عذرا اسے دوا اور ٹیکے لگا کر واپس جا چکی تو میں آسیہ کے پاس ہو کر بیٹھ گیا۔ آسیہ نے بڑی محبت سے میرے رخسار تھپتھپائے، بولی۔

"بھیا! تم نے میرے لیے کتنے دکھ جھیلے ہیں۔ میں ادگن ہاری مر بھی تو نہیں چکتی۔"

"ایسی بات نہ کہہ میری بہن! میں تو زندہ ہی تیرے لیے ہوں۔ تیرے دکھ بانٹنے کے لیے مارا مارا پھرتا ہوں آسیہ! تو نہ ہو گی تو پھر میرے لیے باقی کیا رہے گا؟"

"امی جان کہاں ہیں؟"

"میں بھی ان سے بہت دنوں سے نہیں ملا ہوں مگر وہ خیریت سے اپنے بھائی کے پاس ہیں ہمارے ماموں کے گاؤں میں۔"

"مجھے بھی وہاں لے چلیں۔"

"ہاں کیوں نہیں! ہم اکٹھے چلیں گے اور وہیں رہیں گے۔"

آبی کچھ سوچ کر کرسی پر سے اٹھا اور بولا۔ "میں ابھی واپس آ رہا ہوں جیلانی! ادھر تک جا رہا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ خاداں آسیہ کے پاؤں دبانے لگی تھی۔ اس سے تو کوئی بھی بات مخفی نہیں تھی۔ میں نے آسیہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور اپنے رخساروں سے لگا کر کہا۔

"ایک بات پوچھوں آسیہ، وعدہ کرو تم سچ سچ بتاؤ گی۔"

"میں نے تم سے کبھی جھوٹ بولا ہے بھیا۔ میرا کوئی جھوٹ بتا دو۔"

"نہیں! مگر وہ بات بڑی نازک ہے میں اسے زبان پر لا بھی نہیں سکتا مگر مجبوری ہے۔"

وہ ذرا سنبھل کر تکیے سے سر اونچا کر کے بولی۔

"تو پوچھ لو نا! تم سے میری کون سی بات چھپی ہے بھیا۔"

"دیکھو! اگر تمہیں اس کا پتہ نہیں ہے اس بات کا جس کی وجہ میں پوچھنا چاہتا ہوں تو گھبرا مت جانا۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

"تم نے پہیلی تو مجھ سے کبھی نہیں بجھوائی تھی بھیا۔" اس کی آواز بہت ہی کمزور تھی۔

"ڈاکٹر عذرا نے بتایا ہے کہ تمہارا ایک گردہ نکالا جا چکا ہے۔ تمہیں اس کا علم ہے؟"

"نہیں بھیا۔ یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟ ہماری جیل میں چار عورتیں تھیں۔ انہیں پیٹ میں درد کی شکایت رہتی تھی۔ وہاں کے ڈاکٹروں نے کہا تھا کہ شاید ہمارے گردے میں پتھری ہے۔ اس کے علاج کے لیے ہمیں سرکاری ہسپتال بھیجا گیا تھا۔ وہاں سے جب ہم واپس آئیں تو میرا، بشیراں اور مختاراں کا پیٹ کٹا ہوا تھا۔ ان پر ٹانکے لگے تھے۔ وہ کہتے تھے آپریشن کر کے پتھری نکالی گئی ہے۔ بس اتنی بات مجھے یاد ہے۔ ہمارے ساتھ چوتھی عورت حسنہ تھی، وہ بیچاری آپریشن کے دوران ہی مر گئی تھی۔ مگر ہمیں کسی نے نہیں بتایا کہ ہمارا گردہ خراب تھا اور نکال دیا گیا ہے۔"

"ہوں! ٹھیک! وہ کون ڈاکٹر تھا جس نے تمہارا آپریشن کیا تھا؟"

"وہاں کئی ڈاکٹر تھے ہسپتال میں مگر مجھے ایک نرس نے بتایا تھا کہ ہمارا آپریشن ڈاکٹر دھمن نے کیا ہے۔ وہ وہاں کا بڑا ڈاکٹر ہے۔"

"ہوں۔ دھمن! میں سمجھ گیا ہوں۔ بہر حال تمہارا ایک گردہ انہوں نے نکال دیا تھا۔" اس کا رنگ ہلدی ہونے لگا۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے مگر میں نے اسے رونے نہیں دیا۔

"میں تمہیں روتے نہیں دیکھ سکتا آسیہ مت رو میرے سامنے، ورنہ میں سر پھوڑ لوں گا۔ میری ایک بات کا جواب دو۔ ڈاکٹر عذرا نے بتایا ہے تمہارے پیٹ میں ڈیڑھ دو ماہ کا بچہ ہے۔"

میری بات سن کر وہ ششدر رہ گئی۔ حیرت سے اس کی آنکھیں

پھیلنے لگیں۔ بدن اُس کا یخ ہونے لگا۔

"پریشان نہ ہو آسیہ میری بہن! یہ بھی ہماری بدنصیبی کا حصّہ ہے۔ یہ دن بھی ہمیں دیکھنا تھا۔ یہ کوئی عجوبہ بات نہیں ہوئی۔ اس سے میں تمھیں جو کچھ معلوم ہے مجھے بتا دو۔"

مگر اس کی تو زبان ہی گنگ ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے کی رنگت پیلی پڑ گئی تھی۔ میں نے اُسے دونوں کندھوں سے پکڑ کر جھنجوڑ دیا تو وہ بستر پر ڈھے سی گئی۔ میں نے اس کی نبض پر ہاتھ رکھا تو معلوم ہوا کہ بس دو چار لمحوں کی مہمان ہے۔

"خاداں! جا ڈاکٹر عذرا کو بلا لا۔ بھاگ کے جا۔" یہ کہہ کر میں نے پانی کے چھینٹے اس کے منہ پر مارے مگر وہ صدمے کی شدت سے نڈھال ہوئی جاتی تھی۔ ڈاکٹر عذرا فوراً ہی آ گئی اس نے آسیہ کو دیکھا تو بولی۔ "آپ نے اچھا نہیں کیا۔ آپ اس کی صحت کے دشمن ہو رہے ہیں۔ براہِ کرم آپ باہر چلے جائیں۔ نرس کو بُلا خاداں۔" اس نے بڑے تلخ لہجے میں کہا اور میں شرمندہ ہو کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

دو نرسیں بھاگتی ہوئی خاداں کے پیچھے آسیہ کے کمرے میں داخل ہوئیں تو میں آبی کے پاس جا ٹھہرا۔ وہ کلینک کے وسطی ہال میں رکھے صوفوں کے ایک طرف دبک کے بیٹھا تھا۔ اس تھوڑے سے عرصے میں کتنے ہی سگریٹ سُلگا کر آدھ جلی صورت میں مسل کر پھینک چکا تھا۔ میری طرف دیکھے بغیر بولا۔

"کیا بتایا ہے اُس نے؟"

"گردہ تو اس کا ڈاکٹر دھمن نے ہی نکال لیا تھا۔"

"اور وہ دوسری بات؟ اس کے بارے میں کیا کہا ہے اُس نے؟"

"وہ یہ خبر ہی سُن کر بے ہوش ہو گئی ہے۔ اب ڈاکٹر عذرا اُسے سنبھال رہی ہے۔"

"اس سے کیا اندازہ لگایا ہے تم نے؟"

"میرا خیال ہے کہ وہ بے گناہ ہے۔"

"میرا دل بھی یہی کہتا ہے، اُسے بے خبری میں ذلیل کیا گیا ہے۔"

"ہاں، میں بھی اسی نتیجے پر پہنچا ہوں، ورنہ یہ خبر یوں اُسکے دماغ کو سُن نہ کر دیتی۔"

"اب اس سے اور کچھ نہ پوچھنا۔"

"نہیں! اُسے کچھ نہ کچھ تو معلوم ہوگا۔ کسی نہ کسی کا نام تو اُسے یاد ہوگا۔ جو اس کے قریب رہا ہوگا۔ جس سے اُس کا واسطہ تھا، قریبی واسطہ۔"

"ہاں! مگر۔۔۔ وہ۔۔۔ یہ سب کچھ برداشت نہ کر سکے گی۔ ڈاکٹر عذرا سے کہو، وہ اُس سے پُوچھ سکتی ہے۔ تم سے غلطی ہو گئی۔ یہ کام تمھیں ڈاکٹر عذرا کے سپرد کرنا چاہیے تھا۔"

"ہاں میرا بھی یہی خیال ہے آبی! وہ میری بہن ہے۔ میرے سامنے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے شرمندہ ہو گئی ہے۔"

"اس سے یہ لیا ڈگی مت کھیل۔ اس کا ذہن بہت نازک ہے۔ اُس نے بہت دُکھ جھیلے ہیں جیلانی! اسے خوشی کی، آرام کی، بے فکری کی ضرورت ہے۔"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ میں اُسے پھولوں سے لاد دینا چاہتا ہوں۔"

"میں خود ڈاکٹر عذرا سے بات کرتا ہوں۔ تم ادھر ہی بیٹھو۔ ایک دم احمق آدمی ہو تم۔ کوئی اپنی بہن سے ایسی بات یُوں منہ پھاڑ کے پُوچھ سکتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ صوفے پر سے اٹھا اور دُوسری طرف نکل گیا اور میں اندھا ببلُوس سا بنا اس ہال میں بیٹھا خلاء میں گھورتا رہا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ میری آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا۔ اپنے اردگرد کی ہر شے مجھے لال نظر آتی تھی۔ زندگی نے مجھے ایک اور امتحان میں ڈال دیا تھا۔ تقدیر نے ایک اور طمانچہ میرے منہ پر دے مارا تھا۔ میرے دل میں ساری دنیا کے خلاف نفرت اور انتقام کی آگ بھڑکنے لگی تھی۔ اور آبی کہتا تھا کہ میں احمق ہوں۔ وہ یہی کہہ کر گیا تھا۔ میں اب عقل و خرد کا مظاہرہ کہاں سے کرتا۔ وہ جس کے لیے میں ہواؤں سے لڑتا رہا۔ یوں ذلیل و خوار ہو کر رہ گئی تھی کہ میں اُس کی ذلتوں کا کوئی تدارک بھی نہیں کر سکتا تھا۔

آبی کوئی آدھ گھنٹے بعد میرے پاس واپس آیا۔ وہ بہت بُجھا ہوا تھا۔ چہرہ اُس کا یُوں سُتا ہوا تھا جیسے اُس نے کوئی بہت ہی بھیانک خواب دیکھا ہے میرے قریب بیٹھ کر بولا۔ "ڈاکٹر عذرا نے اُس سے پُوچھ لیا ہے۔"

"کیا بتایا ہے اُس نے؟"

"آسیہ کو اپنی اس ذلت کا قطعاً کوئی علم نہیں ہے۔ اُس نے ڈاکٹر عذرا سے کہا کہ جیل میں عورتوں کے علاج کے لیے ایک ڈاکٹر موجود تھا۔ دو قیدی ڈسپنسر کا کام جانتے تھے وہ اس کے ساتھ رہتے تھے۔ اُس نے بتایا کہ لیڈی ڈاکٹر چھٹی پر گئی تو وہ ڈاکٹر مقبول احمد عورتوں کا علاج کرتا تھا اور قیدی ڈسپنسروں میں سے ایک کا نام رحیم تھا اور دوسرے کا حبیب۔ اُسے اتنا یاد ہے کہ ایک دن اس کے معدے میں شدید درد اُٹھا تھا جس کی وجہ سے اسے جیل کے ڈاکٹر نے اپنے کمرے میں لے جا کر ٹیکہ لگا دیا تھا۔ جس سے وہ سو گئی تھی۔ اس کے علاوہ اُسے کوئی ایسا واقعہ یاد نہیں ہے۔"

"اور کچھ نہیں بتایا اُس نے؟"

"عورت کی چھٹی حس ایسے معاملوں میں بہت کام کرتی ہے۔ آسیہ نے بتایا ہے کہ اُس کے ساتھ جو ظلم ہوا ہے اُس کا ذمے دار ڈاکٹر مقبول ہے، کیونکہ وہ اس سے بہت عجیب عجیب باتیں کرتا تھا۔ اُس کے حُسن کی تعریف بھی کرتا رہتا تھا اور اس سے پہلے بھی وہ اس کے علاج میں گہری دلچسپی لیتا رہا تھا۔ جیل میں کئی اور لڑکیاں بھی تھیں اور وہ اُن پر بہت مہربان تھا۔ کئی لڑکیاں جیل کے افسروں کے گھروں تک بھی ہو آتی تھیں اور انھیں جیل کے اندر ہر قسم کا آرام میسّر تھا۔"

"اُن کے نام نہیں پُوچھے اُس نے؟"

"یہ ہم خود معلوم کر سکتے ہیں۔ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" آبی نے کہا

"مگر اس مصیبت سے چھٹکارا کیسے پایا جائے؟"

"میں نے ڈاکٹر عذرا سے کہہ دیا ہے کہ وہ آسیہ کے پیٹ سے یہ غلاظت نکال دے۔ میں اُسے ایک ہزار روپیہ دے آیا ہوں۔"

"کیا کہتی ہے وہ؟"

"اس کا خیال ہے کہ گردے کی سوزش ٹھیک ہو جائے تو پھر وہ سارا معاملہ ٹھیک کر دے گی۔"

میری رگ رگ پے میں زہر سرایت کرتا جا رہا تھا۔ تقدیر نے میرے آگے جو گڑھا کھود دیا تھا، میں اُس میں گرنے سے پہلے اپنے انتقام کی آگ بُجھا لینا چاہتا تھا۔ اب مجھے اِن لوگوں سے بھی نمٹنا تھا جنھوں نے آسیہ کے کوٹلے کو مسمار کر دیا تھا۔ اس کی ساری تب و تاب ہی ختم ہو گئی اور مجھے یہ احساس ہونے لگا تھا کہ وہ مرن سیج پر پڑی ہے۔ اُس کو پھر سے اُٹھنا نصیب نہ ہو گا۔

دوپہر کا کھانا ہم نے وہیں کلینک کے کچن سے منگوا کر کھایا۔ اُس وقت تین بج رہے تھے کہ اچانک ڈاکٹر عذرا بدحواس ہو کر ہمارے پاس آ پہنچی۔ اس کو دیکھ کر ہم دونوں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ "خیر تو ہے ڈاکٹر!"

"آپ فوراً اس کے لیے کسی صحت مند گُردے کا بندوبست کریں۔ اُس کا گُردہ ناکارہ ہوتا جا رہا ہے۔"

"اُف میرے خدا!" ڈاکٹر عذرا کی یہ بات سُن کر میرا مغز اُلٹنے لگا۔ میں کس کوٹھی والے کے پاس جاؤں اُسے کیا پیش کروں کہ وہ مجھے اپنے خزانے سے ایک گُردہ نکال کر دے دے۔

"مگر گردے کا بندوبست ہم کیسے کر سکتے ہیں ڈاکٹر!"

"اس دُنیا میں کوئی بھی بات ناممکن نہیں ہے۔ میرے کمرے میں آئیں، میں آپ کی مدد کرنا چاہتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ دائیں ہاتھ مُڑ گئی ہم دونوں اس کے پیچھے چلتے ہوئے ایک بڑے ہی آراستہ پیراستہ کمرے میں جا پہنچے۔ وہ کمرہ اپنے طول و عرض میں اگرچہ چھوٹا سا تھا، مگر ڈاکٹر عذرا نے وہاں اپنی آسائش کی ہر شے جمع کر رکھی تھی۔ جب وہ اپنی آرام دہ کرسی پر بیٹھ چکی تو بولی۔

"مجھے کل بارہ بجے تک ایک صحیح و سالم گُردہ مل جانا چاہیے ورنہ آسیہ کی زندگی کی میں ضمانت نہیں دے سکتی۔"

"مگر یہ گردہ ہم کہاں سے لائیں گے؟"

"دیکھیں مستونگ روڈ پر ایک کلینک ہے۔ شفا یار کلینک۔ یہ میں آپ کو راز کی بات بتا رہی ہوں، وہاں آج کل ڈاکٹر انصاری اور ڈاکٹر عرفان کام کرتے ہیں۔ وہ ڈاکٹر دھمن کا کلینک ہے وہ آج کل باہر گئے ہوئے ہیں۔ آپ کو میں رقعہ لکھ دیتی ہوں آپ ڈاکٹر عرفان سے جا ملیں وہ گُردہ فراہم کر دیں گے مگر آپ کو اُس کے لیے انہیں ایک لاکھ روپیہ دینا پڑے گا۔"

"ایک لاکھ روپیہ!" آبی اپنی جگہ سے اُچھل سا گیا۔ میں نے اُس کا کندھا دبا کر اُسے نیچے بٹھا دیا۔

"آپ کھُل کر بات کریں ڈاکٹر۔ اُن کے پاس گُردے کہاں سے آتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"یہ میں نہیں جانتی۔ کچھ ضرورت مند لوگ اُن کے پاس اپنے گُردے بیچ جاتے ہیں۔ اور وہ کسی کی زندگی بچانے کے کام آ سکتے ہیں۔"

"آپ کو اس بات کا کیسے علم ہے۔ کیا کسی ڈاکٹر کو اس بات کی اجازت ہے؟"

"اجازت! میں نہیں کہہ سکتی کہ اس میں کسی قانونی اجازت کی ضرورت ہے کیونکہ کئی لوگ اپنی آنکھیں بھی تو خیرات کر دیتے ہیں!"

"مگر وہ تو مرنے کے بعد ہی لی جا سکتی ہیں۔"

"ہاں، لیکن جہاں کوئی کسی کے لیے ایثار کرتا ہے تو پھر زندہ حالت میں بھی اپنی ایک آنکھ دے سکتا ہے۔"

"مگر گردہ! یہ تو بہت اہم عضو ہے۔"

ڈاکٹر عذرا سنبھل کر بیٹھ گئی، بولی۔

"ایک گُردے پر بھی اِنسان ایک بھرپور صحت مند زندگی گزار سکتا ہے۔"

"آسیہ کا ایک گُردہ تو پہلے ہی نکالا جا چکا ہے، دوسرا گُردہ بدلنے سے کیا وہ زندہ بچ جائے گی؟"

"مجھے یقین ہے کہ اُسے مرنے سے بچایا جا سکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے ڈاکٹر! آپ بے فکر رہیں۔ اگر ہمیں اُن سے گُردہ نہ مِلا تو ہماری شرط یہ ہے کہ ہم جس آدمی کو بھی یہاں لائیں، آپ اُس سے کوئی بات پُوچھے بغیر اس کا گردہ نکال دیں گی۔ اُسے یہ خبر نہ ہونے دیں کہ آپ کون ہیں اور وہ آدمی کس جگہ پڑا ہے۔ اپنا چہرہ اُس سے چھُپائیں اور اُس کا علاج کسی ایسے کمرے میں کریں جہاں وہ براہِ راست آپ کی نگرانی میں رہے۔ اس کام کے لیے وہ ایک لاکھ روپیہ میں آپ کو دوں گا نقد۔ کل دس بجے سے پہلے پہلے یہ دونوں کام ہو جائیں گے۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔" میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

اُس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"میں۔۔۔ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔"

"دیکھیں، جب آپ گُردہ لگا سکتی ہیں تو نکال بھی سکتی ہیں۔ اس کام کا معاوضہ ایک لاکھ روپیہ میں آپ کو دے دُوں گا۔ ایک زندگی بچ جائے گی اور آپ کو رقم مِل جائے گی۔ شرط صرف رازداری کی ہے۔ ہم کسی زندہ آدمی کو یہاں لے آئیں گے۔"

"مگر وہ آدمی کون ہو گا؟ کیسے لائیں گے آپ اسے یہاں؟"

"آپ یہ نہیں پُوچھیں گی۔ اُس آدمی کو آپ جانتی ہوں تو بھی گریز نہ کریں۔ بس ہمارے کہنے کے مطابق اس کا ایک گردہ نکال لیں، آدمی ہم فراہم کر دیں گے۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ میں اُسے جانتی ہوں گی۔ وہ آدمی میرے حلقے ہی میں سے ہوگا؟"

"یہ میں نہیں کہہ سکتا۔ یہ امکان البتہ رد نہیں کیا جا سکتا ہے۔" میں نے اپنا سارا منصوبہ ذہن میں مرتّب کرتے ہوئے کہا۔

اُس کی حیرت دیدنی تھی، پھر بھی ایک لاکھ روپے کا لالچ اور ایک نئے تجربے کی آرزو نے اُسے دبوچ لیا تھا۔ وہ مسکراتی اور دانتوں میں خلال پھیرتی ہوئی بولی۔

"ٹھیک ہے صاحب! مجھے منظور ہے۔ میں اپنی ذاتی نرس کو اُس کی نگرانی پر لگا دُوں گی۔ دو چار ہزار روپیہ آپ اُسے بھی دے دیں۔"

"اس کا بھی بندوبست ہو جائے گا۔" آبی نے کہا۔ مگر پھر میری طرف جُھک کر سرگوشی کے لہجے میں بولا "یہ لاکھ روپیہ تم کہاں سے لاؤ گے؟ آج کل تو میری جیب بھی خالی ہے۔ پیسے کا پیسہ بھی سارے کا سارا تایہ کے پاس ہے۔"

"بہت پیسہ ہے میرے پاس، تو فکر نہ کر۔" میں نے اُس کا ہاتھ دبا دیا۔

"کیا سوچا ہے پھر آپ نے۔" ڈاکٹر عذرا نے پوچھا۔

"وہی جو ایسے موقعے پر ہمیں سوچنا چاہیے۔ آپ بس ہمیں ڈاکٹر انصاری کے نام رقعہ لکھ دیں۔"

"مگر آپ تو کسی اور ہی آدمی کا کہہ رہے تھے جسے آپ خود میرے پاس لے آئیں گے۔"

"کوشش تو ہم یہی کریں گے ڈاکٹر صاحب! مگر ہمیں مطلوبہ پکرانہ ملا تو پھر تو انصاری کے پاس جانا ہی پڑے گا۔"

"ٹھیک ہے میں رقعہ لکھ دیتی ہوں۔" یہ کہہ کر اُس نے اپنا پیڈ نکالا اور اُس پر ایک تعارفی رقعہ لکھ کر اُس نے مجھے تھما دیا۔

"اب ہمیں اجازت دیں اور اس کا دھیان رکھیں کہ آسیہ کی حالت بگڑنے نہ پائے۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ اُسے دو تین دن تک تو میں سنبھال سکتی ہوں بہرحال کل صبح آپ مجھے صحیح صُورتِ حال بتا دیں۔"

ہم دونوں اس کے کمرے سے نکل کر سیڑھیوں کی طرف بڑھے اور کلینک کے اُس حصّے میں جا پہنچے جہاں برکی کار لیے کھڑا تھا۔ اُس نے بڑے مؤدّب انداز سے دروازہ کھولا اور بولا۔

"اب کدھر چلنا ہے جناب!"

"ہمیں ڈھلوں صاحب کے پاس لے چلو۔"

"کیوں؟ اُدھر کس لیے؟" آبی نے حیران ہو کر کہا۔

"ہمیں اُن سے اپنے ہتھیار واپس لینے ہیں۔" میں نے دبی زبان میں کہا۔

"ہاں یار! اس کا تو مجھے خیال ہی نہیں رہا۔ مگر اُن کی کیا ضرورت ہے ابھی؟"

"مجھے شفا بار جانا ہے نا! اس لیے۔"

"ہاں۔ اب سمجھا۔" پھر وہ بلند آواز سے بولا "چل بھئی۔ ہمیں پھر واپس بھی آنا ہے۔" آبی نے کمبل کی بُکل درست کرتے ہوئے کہا۔

پون گھنٹے میں ہم ڈھلوں صاحب کے ڈیرے پر جا پہنچے۔ وہ اُس وقت زنان خانے میں تھے۔ برکت اپنی رائفل پھڑکاتا ڈیوڑھی میں کھڑا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ قطعًا خوش نہیں ہوا۔ اس کے ماتھے پر چڑھی تیوری مجھے بتاتی تھی کہ اُسے میرے وجود سے نفرت ہو گئی تھی۔ بہرحال اُس نے طوعًا کرہًا ہمارا پیغام ڈھلوں صاحب تک پہنچا ہی دیا۔ وہ بیچارے لپکتے ہوئے باہر آئے اور ہمیں اُس مہمان خانے میں لے گئے جہاں سے ہم صبح نکلے تھے۔

"ہم اپنے ہتھیاروں کے لیے آئے ہیں ڈھلوں صاحب! اُن کی ہمیں سخت ضرورت ہے۔"

میری یہ بات سُن کر وہ دَنگ رہ گئے۔ بولے۔

"کوئی پھڈا ہو گیا ہے کہیں۔ آخر اچانک ان کی ضرورت کیوں آ پڑی ہے آپ کو؟"

"کچھ ایسی ہی بات ہے ڈھلوں صاحب! بس آپ نہ ہی پُوچھیں تو بہتر ہے ویسے ہم واپس آ کر آپ کو سب کچھ بتا دیں گے۔" میں نے فیصلہ کُن انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہے حضرت! جا برکت اِن کے ہتھیار انھیں واپس لا دے۔ آپ ابھی شہر جائیں گے؟"

"جی ہاں! آپ سے ان شاء اللہ ہماری ملاقات چند دن بعد ہوگی۔"

"وہ راز کی بات... آپ مجھے بتا دیتے تو میں مطمئن رہتا۔"

"ہم ابھی کچھ نہیں بتا سکتے ہیں ڈھلوں صاحب! ہماری کامیابی کی دُعا کریں، ویسے ہم سے کسی کی جان کو کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ ہتھیار صرف اپنی حفاظت کے لیے ہم لے جا رہے ہیں۔"

"مجھے افسوس ہے میں نے آپ سے ہتھیار لے کر اچھا نہیں کیا۔ مگر آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ اپنے ہتھیاروں پر اور اپنے دل پر آپ کو بڑا قابو ہے۔"

"اس کی تو فکر ہی نہ کریں۔ قتل و غارت گری ہمارا پیشہ نہیں ہے ڈھلوں صاحب۔ بس تقدیر کے چکر نے ہمیں اس راہ پر ڈال دیا ہے ورنہ ہم ایسے نہیں تھے۔" آبی نے ذرا جَھجک کر بات کی۔ اتنے میں برکت ایک لمبے سے خاکی رنگ کے تھیلے میں رکھے ہمارے ہتھیار لے آیا۔ میں نے آبی کا پستول اُسے دے دیا اور گولیاں بھی۔ اپنی مشین گن اور پستول بھی میں نے

سنبھال لیے۔ گولیوں سے ہم نے اُسے ٹھسا ٹھس بھر لیا تھا۔

جب ہم ڈھلوں صاحب سے مصافحہ کر کے باہر جانے لگے تو وہ بولے۔ "مجھے کار کی ضرورت ہے بہتر ہوگا کہ آپ بڑی سڑک پر جا کر کوئی ٹیکسی لے لیں اور کار واپس بھیج دیں۔"

"ہاں، یہ بہتر رہے گا۔ ہم برکی کو واپس بھیج دیں گے۔" یہ کہہ کر میں آبی کو تیز بھگاتا ہوا باہر نکلا اور کار میں بیٹھ کر بڑی سڑک پر جا پہنچا۔ "بس بھئی برکی میاں، اب تم جاؤ۔ ڈھلوں صاحب کار واپس مانگ رہے تھے۔ ہم ٹیکسی میں شہر چلے جائیں گے۔" وہ خوش ہو کر بولا۔ "آپ کی بڑی مہربانی ہے چوہدری صاحب! مجھے بھی انھوں نے یہی کہلا بھیجا تھا مگر میں نے سوچا تھا دیر ہی کتنی لگے گی آپ کو لاہور تک چھوڑ آتا ہوں۔"

"نہیں، اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" یہ کہہ کر ہم گاڑی سے اُتر کر سڑک کے کنارے جا ٹھہرے ہمیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ایک ٹیکسی ہمیں جلد ہی مل گئی جس میں بیٹھ کر ہم سیدھے لاہور جا پہنچے۔

ڈاکٹر عذرا نے بتایا تھا کہ ڈاکٹر عرفان آج کل لاہور میں ہی ہے۔ ہم نے ٹیکسی ایک ہوٹل کے سامنے پہنچ کر چھوڑ دی۔

"میرا خیال ہے کہ ہم ایک رات کے لیے اِدھر ایک کمرہ کرائے پر لے لیتے ہیں۔" تک نے تجویز پیش کی۔

"یار خواہ مخواہ لفڑا نہ ہو جائے۔ پولیس اِدھر ہوٹلوں پر گہری نظر رکھتی ہے۔"

"تو پھر یہ رات ہم کہاں گزاریں؟ میں اُس عرفان کو پکڑ کر لانا چاہتا ہوں۔"

"اُس کے گھر کا پتہ ہے تمھیں؟"

"فون کر کے پتہ معلوم کر لیتے ہیں۔"

"میرا یہ خیال ہے کہ وہ مجھے تو نہیں پہچان سکے گا نا! میں اُس کے کلینک میں جا پہنچتا ہوں، اُس سے کہوں گا کہ وہ میرے ساتھ چلے میرا بوڑھا والد سخت بیمار ہے لمبی فیس کے لالچ میں وہ آ جائے گا۔"

"ہاں یہ بہتر رہے گا لیکن اگر وہ اپنی کار میں آیا اور ڈرائیور اس کے ساتھ ہوا تو؟"

"تو کیا ہے؟ اس سالے کا بھی گُردہ نکلوا دیں گے اور پھر دیکھا جائے گا۔"

"تو پھر دیر نہ کر آبی! جا اُس ذلیل کو پکڑ لا۔ میں وہاں گیا تو وہ مجھے پہچان لے گا۔"

"بس ٹھیک ہے تم اُدھر شملہ پہاڑی کے پاس میرا انتظار کرو گے۔" یہ کہہ کر اُس نے مجھے ایک ٹیکسی میں بٹھایا اور پھر وہ مجھے شملہ پہاڑی کے پاس اُتار کر شفا بار کلینک کی طرف چل دیا۔

وہ مجھ سے جُدا ہوا تو میرا کلیجہ کٹنے لگا۔ وہ کام میرے کرنے کا تھا جس کے لیے آبی نے اپنے حوصلے کو آزمانے کی ٹھان لی تھی۔ وہ ذہنی اور قلبی اعتبار سے کس قدر میرے قریب آ چکا تھا، اس کا صحیح اندازہ مجھے اُسی دن ہوا۔ میں کمبل کی بُکل کو ذرا پھیلا کر شملہ پہاڑی کے ایک عمودی راستے پر جا چڑھا۔ دائیں ہاتھ ایک بینچ پڑی تھی۔ میں اُس پر جا بیٹھا۔ وہاں سے میں سڑک کو نگاہ میں رکھ سکتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ آبی کو اس کام میں کتنی دیر لگے گی اور سُورج غروب ہونے کو تھا۔ کچھ ہی دیر بعد اُس کی کرنیں واپس مُڑنے لگیں، اُن کا رُخ کسی اور برِّاعظم کی طرف پھر گیا تھا۔ شفق لہو رنگ ہوئی تو شملہ پہاڑی کے مختلف حصّوں میں سناٹا سا چھا گیا اور پھر دیکھتے دیکھتے وہاں تاریکی نے ڈیرہ جما لیا۔ سُورج زوال کی منزلوں میں ہو تو اس کی رفتار کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ اس سناٹے سے میں اُلجھنے لگا۔ سردی کی وجہ سے لوگ اس موسم میں وہاں رات کے وقت بہت کم جاتے ہیں اور جہاں میں بیٹھا تھا، وہاں سے تو کوئی بھی نہیں گزرا۔ سامنے سڑک پر ٹریفک رواں دواں تھی اور ایسے ہی طرح طرح کے خیالات کا ایک رَواں دَواں میلہ میرے دماغ میں بھی لگا تھا۔ مجھے آج اس گُردے کی ضرورت تھی جس سے اُنھوں نے اپنی طبعی سفاکی اور قزاقی کی راہ سے آسیہ کو محروم کر دیا تھا۔ کسی دن میرا بھی یہی حال ہو سکتا تھا۔ پھر میرے لیے کون کسی کو پکڑ کر لائے گا۔ یہ میرا اور آسیہ کا مقدّر تھا لوحِ محفوظ پر یہ بات لکھی تھی کہ ہم یہ زندگانیاں یُوں ہی بے سکوں گزاریں گے۔ نہیں میرا دل اس ابتری، اس بے انصافی اور اندھی تقدیر کو تسلیم نہیں کرتا تھا۔ یہ لوحِ محفوظ کا فیصلہ نہیں تھا۔ یہ دھمّن اور عرفان اور عالیہ ایسے لوگوں کا وہ ظلم تھا جس کی آندھی اب بھی زور شور سے چل رہی تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس ڈاکٹر عذرا کو کیسے معلوم ہوتا کہ اسی لاہور شہر میں جہاں جان بچانے والی دوائیں بھی کالے نرخوں پر بکتی ہیں وہاں کسی مرنے والے آدمی کو کسی زندہ سلامت آدمی کا گُردہ بھی مہیا... کیا جا سکتا ہے۔ یہ اندھیر نگری۔ اور یہ اندھیر۔ اس کے باوجود وہ شہر سلامت تھا۔ اپنی بنیادوں پر کھڑا تھا تو یہ معجزے ہی کی بات تھی۔ ورنہ خدا نے بستیاں محض اس لیے بھی تہہ و بالا کر دی تھیں کہ وہاں لوگ کم تولتے تھے، اُن کا اتنا سا جرم بھی میرے پروردگار نے برداشت نہیں کیا تھا۔ مگر یہاں، اس اُونچے بُرجوں والے شہر میں جہاں عالمگیری مسجد میں ہزاروں لاکھوں جبینیں خدا کے حضور میں پانچ وقت بڑے خضوع و خشوع سے سجدے میں پڑ جاتی ہیں، اسی شہر میں ایسا اندھیر بھی مچا ہے۔ یہاں تو کم تولنے ہی کو لوگوں نے رزق کی برکت کا ذریعہ سمجھ لیا ہے اور یہ وہ شہر ہے جس کا حال سدُوم کے شہر سے بھی ابتر ہے۔ اگر یہاں کوئی حضرت لُوط نہیں اُترا ہے تو اس کا یہ مطلب کہاں ہے کہ خدا نے اس شہر کو اپنے مواخذے سے بری الذمہ قرار دے رکھا ہے۔ اسی شہر میں وہ لوگ باوقار اور معزز، بالا بلند اور شہ نشین ہیں جو لوگوں کے مجبور و بے بس، بے آسرا اور بے نوا لوگوں کے اعضا کی تجارت میں

لگے ہیں مگر کوئی نہیں پوچھتا کہ میاں یہ تم کس لیے اور کس کی اجازت سے کر رہے ہو خدا کی طرف نہیں لوٹو گے؟ کیا تمھیں یقین ہے کہ تم ہمیشہ ہی یہاں رہو گے تمھاری اپنی یہ پُرآسائش زندگیاں لازوال ہو جائیں گی۔ کیا تم نوحؑ کی کشتی میں سوار ہو؟ یا اُن لوگوں کی قطار میں کھڑے ہو جو سیلاب کی وعید سے مُنکر تھے اور پھر تباہ ہو گئے۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ مجھے ابھی وہاں بیٹھے بیس ہی منٹ گزرے تھے کہ مجھے اپنی بنچ سے چند ہاتھ دور گھنی جھاڑیوں میں کسی عورت کی چیخ سنائی دی۔ مگر وہ ایک لمحے کے لیے اُبھری اور پھر سناٹا چھا گیا۔ میں یونہی تجسس کا مارا وہاں سے اُٹھا اور دبے پاؤں چلتا ان اونچی جھاڑیوں کے پاس جا پہنچا۔ اندھیرا اتنا دبیز نہیں تھا۔ سڑک کی روشنیاں کسی حد تک نظر کی معاونت کرتی تھیں۔ میں نے ذرا غور سے دُوسری طرف دیکھا تو لرز کر رہ گیا۔ ایک گینڈے جیسے قد کا آدمی ایک برقعہ پوش عورت کو بے بس کر کے اُس کی عزت سے کھیل رہا تھا۔ اس نے بڑی سختی سے اُسے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ کچھ یوں کہ اس بیچاری کے منہ میں ایک رُومال ٹھونس کر اس کے دونوں ہاتھ اپنے پنجے میں جکڑ کر اُسے بے لباس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ عورت بچنے کے لیے زبردست جدّوجہد میں مصروف تھی مگر اُس کے آگے اُس کی کوئی پیش نہیں چلتی تھی۔

پتہ نہیں مجھے کیا ہوا میں اس اونچی جھاڑی کی باڑھ میں سے گزر کر اُن کے سر پر جا پہنچا اور جاتے ہی میں نے پُوری قوت سے اپنے بھاری بھرکم بُوٹ کی ٹھوکر اس وحشی کی پیٹھ پر کچھ اس طرح ماری کہ وہ منہ کے بل آگے جا پڑا۔ عورت اُس کے وزن کے نیچے دب کر رہ گئی۔ ابھی وہ اُٹھ ہی رہا تھا کہ میں نے کھڑے ہاتھ کی ایک ضرب اُس کی بھینسے ایسی موٹی گردن پر لگائی۔ وہ اُلٹ کر عورت کے اُوپر سے ہٹ گیا۔ وہ بچاری بمشکل تمام اُٹھی۔ منہ سے اس نے کھینچ کر رُومال نکالا اور سسکنے لگی۔ وہ آدمی اس اثنا میں مجھے نگاہوں میں تول چکا تھا۔ اس نے تیزی سے ایک پتھر اُٹھا کر میری طرف کچھ ایسی برق رفتاری سے پھینکا کہ اگر میں سر کو جھٹکا نہ لیتا تو اس نے میرا ماتھا پھاڑ دیا ہوتا۔ میں جھکائی دے کر ایک طرف ہٹا تو مجھ سے گتھ گیا۔ بڑی جان تھی اُس میں اور اکھاڑے کا منجھا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ وہ مجھے دھکیل کر اس جگہ تک لے گیا جہاں سے وہ مجھے دھکا دیتا تو میں سر کے بل لڑھکتا ہوا دوسری طرف گہرائی میں جا گرتا، مگر میں اس کا ارادہ بھانپ چکا تھا۔ میں نے پوری قوت سے اس کی گردن کو پنجے میں لے کر اُس کی رگِ احساس دبائی تو وہ میری باہوں میں جھول گیا۔ میں نے خود کو سنبھال کر اُسے نیچے دھکیل دیا کہ جا بیٹے تو بھی کیا یاد کرے گا۔

وہ نیچے لڑھکا تو میں اس عورت کی طرف بڑھا۔ وہ برباد ہونے سے بچ گئی تھی۔ بس بال بال بچنے والی بات سمجھیں۔ اپنا لباس اُس نے درست کر لیا تھا۔

"کون تھا یہ بدمعاش؟"

"یہ میرا بہنوئی ہے مجھے ادھر ڈاکٹر کو دکھانے لایا تھا۔ میرے بازو پر چنبل ہے اس کے علاج کے لیے یہ مجھے ادھر لایا تھا کہتا تھا ڈیوس روڈ پر ایک اچھا ڈاکٹر ہے میں چلی آئی۔ یہ میرا سگا بہنوئی ہے۔ تین بچے ہیں اس بدمعاش کے اور مجھے ادھر لا کر اس نے پکڑ لیا۔" اب وہ اپنے حواس مجتمع کر چکی تھی خاصی حوصلہ مند عورت تھی۔

"تیری شادی ہو چکی ہے؟"

"ہاں، میں ادھر شیخوپورہ میں بیاہی ہوئی ہوں، ایک بچہ ہے میرا چار سال کا، اُسے میں بہن کے پاس چھوڑ آئی تھی۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ اس بدبخت کی نیت خراب ہے۔"

"رہتی کہاں ہو؟"

"میں اِدھر میکلوڈ روڈ کے پیچھے کچے نسبت روڈ پر رہتی ہوں۔ اس کا گھر وہیں ہے۔"

"کیا کام کرتا ہے یہ؟"

"یہ لوہار کا کام کرتا ہے نعلیں اور تانگے کے دُھرے بناتا ہے۔"

"کیا نام ہے اس کا؟"

"لبھا۔"

"اور تمھارا؟"

"میرا نام ناظمہ ہے۔"

"یہ لے دس روپے اور رکشے میں بیٹھ کر گھر چلی جا میری بہن یہ تو اب صبح سے پہلے تک ہوش میں نہیں آئے گا۔"

"میں گھر جا کر اس کے بارے میں کیا بتاؤں گی یہ کہیں مر تو نہیں گیا؟"

"نہیں یہ مرا نہیں زندہ ہے مگر اسے یہاں پڑا رہنے دے۔ اور صبح سویرے تو اپنے گھر شیخوپورہ چلی جانا۔"

وہ رونے لگی۔ شاید اُسے اپنی بے بسی اور ذلت کے احساس نے شرمندہ کر دیا تھا۔ میں نے دس کے بجائے سو کا نوٹ اس کی طرف بڑھایا۔

"جا میری بہن یہ لے یہ سو روپیہ رکھ لے۔ جا اور پھر کبھی اس مردود کے گھر قدم نہ رکھنا۔ اپنی بہن کو ویسے بتا جانا کہ تیرے سانڈ اس لبھے نے کیا حرکت کی ہے یہ بھی صبح تک گھر آ جائے گا۔"

اُس نے سو روپیہ میرے ہاتھ سے لے لیا۔ غریب سی عورت تھی، لباس بھی اُس نے یونہی سا پہن رکھا تھا مگر جوانی اس پر ٹوٹ کر آئی تھی اور وہی اس کے لیے مصیبت کا باعث بن گئی تھی۔ حیرت یہ ہوئی کہ دس کے نوٹ کی طرف اُس نے ہاتھ نہیں بڑھایا۔ مگر میرا خیال ہے کہ اپنی پریشانی میں وہ میری پہلی بات غور سے نہ سن سکی تھی۔ وہ بوجھل بوجھل قدموں سے دوسری طرف اُتری اور کچھ دیر بعد میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

میں پھر اپنی جگہ پر جا بیٹھا۔ میں نے داتا کی نگری کا ایک اور رنگ دیکھ لیا تھا۔ سو روپے میں وہ تماشا مہنگا نہیں تھا۔ میری نگاہیں سڑک پر جمی تھیں۔ اچانک مجھے ایک رکتی ہوئی ٹیکسی کے کھلتے دروازے میں سے آبی اُترتا نظر آیا۔ میں دوڑ کر اُس کے پاس جا پہنچا اس کا چہرہ لٹکا ہوا تھا۔ وہ ٹیکسی سے خاصا آگے بڑھ کر مجھے ملا۔

"کیا ہوا بھئی! کہاں ہے خنزیر؟"

"وہ مجھے نہیں ملا۔ کسی بڑے آدمی کی دعوت میں گئے ہوئے ہیں وہ دونوں۔ ڈاکٹر انصاری بھی اور ڈاکٹر عرفان بھی۔"

"کسی اور کو لے آئے ہوتے۔"

"نہیں یار، جن لوگوں کا تم ذکر کرتے رہے ہو، اُن میں سے وہاں ایک بھی نہیں تھا۔"

"اور عالیہ؟"

"وہ بھی نہیں ہے۔ وہ تو معلوم ہوا ہے کہ جدّہ میں بیٹھی ہے آجکل اور دھمن بھی وہیں ہے۔"

"مگر ہماری ضرورت کا کیا بنے گا۔"

"ہیں انہی میں سے کسی کو پکڑنا ہے جنھوں نے تمھارے ساتھ زیادتی کی ہے۔ اُس حیدر کی کتنی عمر ہے؟"

"وہ... وہ یہی کوئی تیس پینتیس سال کا آدمی ہو گا۔"

"تو چلو اُسے پکڑ لیتے ہیں۔"

"نہیں میں اس سؤر کا گردہ تو بھوننے کے لیے بھی نہیں نکالوں گا۔"

"کیا حرج ہے گُرگے تو سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔"

"اچھا تم کہتے ہو تو پھر ٹھیک ہے چلو اُدھر ہی چلتے ہیں۔" یہ کہہ کر میں اُس کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھا اور ہم گلبرگ میں ڈاکٹر عالیہ دھمن کی کوٹھی پر جا پہنچے۔

بڑا گیٹ عمارت سے خاصا دُور تھا۔ پھر بھی اطلاعی گھنٹی کے زیرِ زمین بچھے تار نے ہماری مشکل آسان کر دی۔

ہمیں دیکھنے کے لیے ایک عورت لان عبور کر کے گیٹ پر آئی۔

"کیہہ گل اے پائی جی؟" وہ اُن کی وہی "ملیجماں" تھی جس سے میں ایک بار فون پر بات کر چکا تھا۔ دُہرے بدن کی خاصی ہٹی کٹی عورت تھی اور عمر ساز بھی بالکل صحیح معلوم ہوتا تھا۔ بڑی دبنگ آواز تھی اس کی۔ ہم نے ٹیکسی چھوڑ دی اور گیٹ کے اندر داخل ہو کر اُس کے سامنے جا پہنچے۔

"ہم ڈاکٹر عالیہ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"اوہ تے جدّے گئیاں ہوئیاں نیں۔"

"ڈاکٹر دھمن تے گھر وچ ہون گے۔" میں نے اُسی کے لب و لہجے میں پوچھا۔

"نئیں، گھر وچ تے کوئی وی نئیں۔ بس اوہ بکرا حیدر ای بیٹھا اے۔ اوہدا ای راج اے ایتھے تے۔"

"چلو اسیں اوہنوں ای مل لینے آں بی بی۔ توں تے گھر دی مالکن جاپدی ایں۔ کِڈا رُعب داب اے تیرا۔" میں نے اُس کو تھوڑا خوش کرنے کی کوشش کی۔

"او جی میں نمانی کس طراں مالکن لگنی آں۔ مینوں تے اوتر جانیاں نیں دو مہینیاں دی تنخواہ وی نئیں دِتی پتہ نئیں کتھے اُجڑ پُجڑ گئے نیں اوہ غرق جانے۔" وہ ہمارے ساتھ چلتی ہوئی عمارت کی طرف بڑھی۔

"معلوم ہوتا ہے حیدر تمھیں بہت تنگ کرتا ہے۔" آبی نے کہا۔

"اوس لنگے نے تے جان کھا ماری اے میری۔ ساری کوٹھی روز میرے کولوں صاف کروانداے۔ دفع دُور کرو اوس نوں۔"

"تم کہو تو ہم اُسے 'پھینٹی' لگا دیں۔ اغوا کر کے لے جائیں۔"

"ضرور مارو جی اوس نوں۔ لے جاؤ اوہنوں ایتھوں۔ بکرا منڈی لے جاؤ۔ چھُری تھلے دے دیو، مینوں کیہہ اے۔"

"تمھارا کیا نام ہے؟"

"میرا نام سرداراں ہے جی۔"

اب ہم عمارت کے بڑے دروازے کے سامنے جا پہنچے تھے۔ سرداراں نے اشارے سے ہمیں بتایا... کہ حیدر اپنے کمرے میں ہے۔ اور اس کا ایک دروازہ دُوسری طرف سے بھی ہے مجھے تو سارے راستوں کا علم تھا۔ میں آبی کو ساتھ لے کر حیدر کے کمرے کے پچھلے دروازے پر جا پہنچا تھا۔

وہ سامنے ہی چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ اس حال میں کہ چھوٹا سا ٹرانسسٹر اس نے سینے پر دھر رکھا تھا۔ کسی اسٹیشن سے کوئی بڑا دردیلا پہاڑی گیت نشر ہو رہا تھا۔ اور حیدر کی آنکھیں مُندی ہوئی تھیں۔

"السّلام علیکم یا حیدر" میں نے کمرے میں قدم رکھ کر بلند آواز سے اُسے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ آبی بھی میرے پیچھے ہی اندر آ گیا تھا۔

میری آواز سُن کر حیدر اس کُتّے کی طرح چارپائی سے اچھلا جس کے سینے میں گولی لگ گئی ہو۔ ٹرانسسٹر نیچے گر گیا۔ وہ بلب کی تیز روشنی میں مجھے دیکھ کر سُن ہو گیا۔

"تم اُستاد، تم غلام جیلانی! تم ابھی زندہ ہو؟"

"ہاں بیٹے کیا خیال ہے، ہم تیرے بغیر ہی مر جاتے۔ تجھے تو ساتھ لینا ضروری تھا نا۔ کیا حال ہیں تمھارے۔"

"میں... میں بالکل ٹھیک ہوں۔ اور۔ آؤ اِدھر کرسی پر بیٹھو۔ پر... پر اُستاد خیر تو ہے نا؟" اس کا رنگ پیلا پڑنے لگا۔

"ہم تمھیں لینے آئے ہیں بیٹے! میں تمھارا قرض اتارنا چاہتا ہوں۔"

"مذاق نہ کر استاد! یہ بتا میں تیری کیا خدمت کروں" اس کی صحت پہلے سے کہیں زیادہ بہتر تھی۔ وہ موٹا بھی ہو چکا تھا اور سُرخ بھی۔ چونکیل گیدڑ کی طرح کبھی مجھے دیکھتا تھا اور کبھی آبی کو۔

"میں تمھارے لیے چائے لاتا ہوں استاد! سرداراں ابھی تیار کر دے گی" وہ پچھلے دروازے کی طرف کھسکنے لگا۔

میں نے پستول سیدھے ہاتھ میں لے کر اُس کو رُک جانے کا اشارہ کیا۔ "یہ دیکھ رہا ہے نا تو حیدر! بیٹے میں تجھے ساتھ لینے آیا ہوں۔ مجھے تم سے ایک بہت ضروری کام ہے"

اُس کا رنگ اور زیادہ پیلا ہونے لگا۔ "استاد مذاق نہ کر میرے ساتھ۔ میں تو پہلے ہی بہت دُکھی ہوں۔ تیرے ساتھ اگر کوئی زیادتی ہوئی تھی تو اُس کا میں ذمّے دار ہرگز نہیں تھا"

"مجھے معلوم ہے مگر تمھیں ہمارے ساتھ چلنا ہو گا۔ ابھی اور اسی وقت"

وہ خوفزدہ ہو کر پھر دروازے کی طرف لپکا تو آبی نے اُسے بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ کر تڑاخ سے اُلٹے ہاتھ کا ایک تھپڑ اُس کے منہ پر دے مارا۔ حیدر بلبلا اُٹھا۔

"چل ہمارے آگے لگ کُتّے کی اولاد" پھر میں نے آبی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "ادھر زیادہ دیر ٹھہرنے کا کوئی فائدہ نہیں"

آبی نے اُسے اور زیادہ خوفزدہ کرنے کے لیے ایک اور تھپڑ اُس کے منہ پر مار دیا۔ وہ بیچارا ہکا بکا سا ہو کر رہ گیا۔

چل لے چل اسے" آبی نے اسے میری طرف دھکیل دیا اور میں اُس کو گھسیٹ کر عمارت سے باہر لے آیا۔ گھر کی ملازمہ وہ سرداراں شاید یہی چاہتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ دروازے کے دُوسری طرف رُک کر اس نے ساری کارروائی دیکھ لی ہو گی مگر وہ بالکل چُپ رہی۔ اِس امکان کو میں رد نہیں کر سکتا تھا کہ ہمیں حیدر کے کمرے میں بھیج کر وہ مطمئن ہو گئی ہو اور اپنے ہی کسی دھندے میں لگ گئی ہو۔ بہر حال اِتنی بات ظاہر تھی کہ اُس نے ہم سے کوئی تعرض نہیں کیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ ہم حیدر کو گھسیٹ کر بڑے اطمینان سے لان میں سے گزار کر باہر لے آئے تھے۔ ہم اُسے کھینچتے ہوئے ڈاکٹر عالیہ کی کوٹھی سے خاصی دور لے گئے تو اچانک مجھے یہ احساس ہوا کہ وہ کسی بھی وقت شور مچا کر ہمارے لیے مصیبت کھڑی کر سکتا ہے اگرچہ سڑک سنسان ہی تھی پھر بھی میں نے حیدر کی گردن پر ہاتھ مار کر اس کی رگ مسل دی اور وہ دھپ سے زمین پر گر گیا۔

"یار یہ کام اچھا نہیں کیا ہے تو نے۔ اس جنازے کو ہم کہاں لیے پھریں گے"

"کوئی ٹیکسی دیکھ یار۔ اُس میں لاد دیں گے ہم اسے" میں نے حیدر کو سڑک کے ایک طرف ڈالتے ہوئے کہا۔

ہمیں وہاں کھڑے کوئی تیس منٹ گزر گئے مگر ٹیکسی نظر ہی نہیں آ رہی تھی۔ اور کسی سواری کے بغیر ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔

اچانک دائیں ہاتھ کی کوٹھی کے بند گیٹ کے سامنے ... کار رُکتی نظر آئی۔ ڈرائیور دروازہ کھلوانے کے لیے ہارن دینے لگا ... تیزی سے اُس کے پاس جا پہنچا۔ کار کا مالک خود ہی ... رہا تھا۔ وہ کوئی بہت ہی نیک دل اور خوش اخلاق آدمی تھا ... قریب دیکھ کر بولا۔

"فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"میں معذرت چاہتا ہوں آپ کو زحمت دے رہا ... میرا بھائی چلتے چلتے بے ہوش ہو گیا ہے اور اسے فوری طبی امداد ... ضرورت ہے"

"اوہ، ویری سیڈ۔ مگر خیر کوئی بات نہیں آپ انہیں ... میں آپ کو ہسپتال لے چلتا ہوں"

"آپ کی بڑی مہربانی ہو گی جناب" یہ کہہ کر میں پیچھے ... تو اس اثنا میں اس کی کوٹھی کا گیٹ بھی کھل گیا۔

اس کا کوئی بوڑھا ملازم سامنے کھڑا تھا۔ اُس آدمی نے ... گیٹ بند کر لینے کے لیے کہا بولا۔

"میں اِن صاحب کے ساتھ ذرا ہسپتال جا رہا ہوں ... بھائی بے ہوش ہو گئے ہیں" اس کے ملازم نے گیٹ بند کیا تو ... آبی کی مدد سے حیدر کو اُٹھا کر گاڑی کے اندر ڈالا اور ہم اُسی وقت ... آدمی کی مہربانی کی بدولت مال روڈ پر محسن کلینک کے اندر جا ... اپنے مریض کو ہم نے کلینک کی عمارت کے بڑے دروازے کے ... گاڑی سے اتار کر اس آدمی کا شکریہ ادا کیا تو وہ "مینشن نات ... ناٹ" کہتا ہوا واپس چلا گیا۔

آبی نے حیدر کو کندھے پر ڈالا اور اُسے کلینک کے اندر ... ایک بینچ پر ڈال دیا۔ اپنا کمبل وہ پہلے ہی حیدر کو اڑھا چکا ... میں ڈاکٹر عذرا کے کمرے میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ گھر جا چکی ... میں پھر آبی کے پاس آ گیا۔ "یار وہ ڈاکٹر تو گھر جا چکی ہے"

"اُسے فون کر دے یار۔ بُلا اُس ... کو ادھر۔ ایک ... دینا ہے اُسے"

"تو بات کر یار اُس سے۔ میں ادھر ٹھہرتا ہوں" ... حیدر کے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ وہ کسمسا رہا تھا اور مجھے ... تھا کہ کہیں وہ ہوش میں نہ آ جائے۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ یا تو ... پر ہاتھ ہلکا ڈالا تھا یا اس کے اندر کوئی ایسی قوت تھی جو اس کو ... ہوش میں لانے کے لیے مصروفِ کار تھی۔ میں کچھ ڈر سا گیا ... وہ اب ہوش میں آ جاتا تو آسمان سر پر اُٹھا لیتا۔ آبی میرا ...

دُوسری طرف نکل گیا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ واپس آیا تو بولا۔

"چل اسے اِدھر ڈاکٹر عذرا کے کمرے میں لے چل وہ ابھی آ رہی ہے"

"کیا کہتی ہے وہ؟"

"کہتی ہے کہ اُس کا کمرہ کھلوا کر مریض کو وہاں لٹا دو"

"مگر چابی؟"

"وہ اس کی نرس کے پاس ہے خورشید نام بتا رہی تھی اس کا وہ سامنے کے کمرے میں موجود ہو گی"

ہم کلینک کے بڑے ہال کے ایک کونے میں کھڑے تھے۔ اس وقت مریضوں کی وہاں وہ بھیڑ بھاڑ نہیں تھی جو دن میں ہوتی تھی۔ میں نے حیدر کو کمبل میں لپیٹ کر کندھے پر اٹھایا اور ڈاکٹر عذرا کے کمرے کے سامنے جا پہنچا۔ آبی نے اس کی نرس خورشید کو سامنے کے کمرے سے بلایا تو وہ گھبرا سی گئی۔ کسی مریض کو جب وہ لوگ ایسی حالت میں دیکھتے ہیں تو ایک مصنوعی سی ہمدردی اور گھبراہٹ اُن کی ہر اضطراری اور غیر اضطراری حرکت میں نمایاں نظر آنے لگتی ہے۔ وہ ادھیڑ عمر کی نرس بھی یہی کر رہی تھی۔ اس نے ڈاکٹر عذرا کا دروازہ کھول کر بڑی احتیاط سے دائیں ہاتھ کے چھوٹے کمرے میں رکھے پلنگ کی چادر درست کی اور حیدر کو نہایت آہستگی سے اُس پر لٹا دیا۔ وہ سالا اب گہرے گہرے سانس لے رہا تھا اور میرا یہ خیال تھا کہ وہ اندر سے بیدار ہو چکا ہے اور اب محض ہمارے خوف کی وجہ سے اس نے آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ یہ بڑی خوفناک بات تھی کیونکہ ایسی صورت میں وہ ہر اُس مرحلے سے واقف ہو سکتا تھا جس میں سے ہم اُسے گزار رہے تھے۔

نرس اس کی نبض ٹٹولنے لگی۔

"آپ اب جائیں ڈاکٹر عذرا انہیں خود دیکھ لیں گی، وہ آ رہی ہیں" میں نے اُسے کمرے سے نکالنے کے لیے کہا۔ اس نے حیدر کا بازو چھوڑ دیا اور عجیب سی نظروں سے ہمیں دیکھتی ہوئی اپنے کمرے میں جا گھُسی۔

ڈاکٹر عذرا کوئی بیس منٹ بعد وہاں آ پہنچی۔ اپنی نسائیت کو اُس نے اس گھڑی پوری طرح صیقل کر رکھا تھا۔ اُن عورتوں کی طرح جو شام ہوتے ہی اپنے چاہنے والوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے خود کو پوری طرح سجا سنوار لیتی ہیں۔ وہ بھی شاید رات کے کسی سفر پر روانہ ہونے کے لیے تیار ہو کر بیٹھی تھی کہ آبی نے اُسے ہسپتال آنے کے لیے کہہ دیا تھا حالانکہ وہ پینتیس چالیس سال سے کسی بھی طرح کم نہیں تھی۔ پھر بھی اس میں زندگی پوری تب و تاب سے نظر آتی تھی۔ وہ جینے کا قرینہ جانتی تھی۔

"ڈاکٹر عرفان سے ملے تھے آپ؟" اس نے آتے ہی پوچھا۔

"جی نہیں۔ وہ کسی دعوت میں گئے ہوئے ہیں، اور آدھی رات سے پہلے واپس نہیں آئیں گے"

"پھر کیا بندوبست کیا ہے آپ نے؟"

"ہم ایک ایسا آدمی لے آئے ہیں جس کا گردہ ہم پر حلال ہے" آبی نے مُسکراتے ہوئے کہا۔ وہ کُرسی پر بیٹھ کر سگریٹ سُلگا چکا تھا۔ ڈاکٹر عذرا بھی اس عرصے میں اپنی کرسی میں دھنس چکی تھی۔ پہلو کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔

"کیا وہ ابھی تک بے ہوش ہے؟" اُس نے دبے لہجے میں پُوچھا۔

"ہاں! وہ کم از کم دو ڈھائی گھنٹے تک بے ہوش رہے گا مگر اس کی تصدیق کر لیں۔ آدمی سخت جان ہے ہو سکتا ہے وہ ہوش میں آ رہا ہو" میں نے اس کے قریب ہو کر کہا۔

وہ اُٹھی اور اپنا اسٹیتھ سکوپ ہاتھ میں جھُلاتی ہوئی پہلو کے کمرے میں جا گھُسی۔ سب سے پہلے اس نے حیدر کے مُنہ پر سے کمبل ہٹا کر اُس کا چہرہ دیکھا اور پھر ایک دم پیچھے ہٹ کر بولی۔

"یہ ۔۔۔ یہ تو ڈاکٹر دُشمن کا ملازم ہے حیدر" وہ ششدر رہ گئی تھی۔

"جی ہاں، آپ ٹھیک سمجھی ہیں" میں نے اُس کے پاس پہنچ کر کہا۔ یُوں کہ میرا شانہ اُس کے جسم سے مَس کر رہا تھا۔ وہ ذرا پیچھے ہٹ گئی، بولی "اس کا گُردہ! آپ کہہ رہے تھے کہ اس کا گُردہ آپ پر حلال ہے"

"جی ہاں! یہ ۔۔ یہ دیکھیں۔ یہ زخم دیکھ رہی ہیں نا آپ!" میں نے اپنی قمیص کا دامن اس کے سامنے اٹھا دیا تھا۔ وہ میرے پیٹ پر ایک نظر ڈال کر بولی۔

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی، کیا نام ہے آپ کا؟"

"میرا نام ہاشم خان ہے اور میرا یہ گردہ ڈاکٹر دُشمن نے میرے جسم سے دھوکے سے نکال لیا تھا"

"میرا خیال ہے کہ آپ اُن پر الزام لگا رہے ہیں"

"اس میں بحث کی کوئی گنجائش نہیں ہے ڈاکٹر۔ ہمارے درمیان جو معاہدہ ہوا ہے اس پر عمل درآمد شروع کر دیں" آبی نے بڑے بھاری بھر کم لہجے میں کہا۔

"میں ابھی تک اس معاہدے کی پابند نہیں ہوں جناب! مجھے کون سی فیس دے دی ہے آپ نے؟"

"فیس تو ہم صبح تک ضرور دے دیں گے یہ دس ہزار آپ پیشگی رکھ لیں" یہ کہہ کر آبی نے میرے کوٹ کی جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر اس کے سامنے کر دی۔

"لے لیں اس کے بغیر تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ ہمارا، آپ کا بلکہ سب کا مذہب ایک ہی ہے پیسہ اور صرف پیسہ" آبی نے ایک کی

بار اور سخت لہجے میں یہ بات کہی۔

عذرا نے وہ نوٹ لے لیے اور انہیں میز کی دراز میں مقفل کر کے وہ حیدر کی طرف متوجہ ہوئی۔ اُس نے حیدر کے پیٹ پر سے کپڑا اُٹھایا تو ہم سب دنگ رہ گئے۔ اُس کا بھی پیٹ وہیں سے کٹا ہوا تھا جہاں سے میرا کٹا تھا۔ ڈاکٹر عذرا نے اُسے ٹٹول کر دیکھا اور پھر مختلف زاویوں سے اُس کا جائزہ لے کر بولی۔

"حیرت ہے۔ اس آدمی کا گردہ بھی نکالا جا چکا ہے" ہم تو گنگ ہو کر رہ گئے۔ اس کا اخذ کردہ نتیجہ صد فی صد درست تھا۔ حیدر کا گردہ بھی ڈاکٹر دھمن اور عالیہ نے بیچ کھایا تھا۔ ہماری ساری محنت اَدھڑ کر رہ گئی تھی۔ حیدر ہمارے کسی بھی کام کا نہیں تھا۔ مُردار برابر وقعت نہیں تھی اُس کی ہمارے سامنے۔ ڈاکٹر عذرا واپس اپنی کرسی میں جا دھنسی۔

"آسیہ کا کیا حال ہے اب ؟" میں نے پوچھا۔

"آپ نے اسے دیکھ لیا ہوتا۔"

"مجھ سے اس کی پریشانی نہیں دیکھی جاتی۔ اس لیے ادھر نہیں گیا۔"

"اس کی زندگی سخت خطرے میں ہے۔ کل تک اسے ایک گردہ تو ضرور مل جانا چاہیے۔"

"آپ ہی کوئی تدبیر کریں ڈاکٹر۔ ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔" میں نے اپنی ہار مانتے ہوئے کہا۔

"اس آدمی کو فوراً آپ اس کے ٹھکانے پر چھوڑ آئیں۔ میں کسی قسم کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتی۔"

"ہم اسے ابھی لے جائیں گے مگر آپ ہمیں کوئی راستہ دکھائیں۔"

"میں۔۔۔ اچھا میں دیکھتی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے میز پر رکھے فون کو چابی لگا کر کھولا اور کوئی نمبر گھمانے لگی۔ اس وقت رات کے نو بج رہے تھے۔

"ہیلو ڈاکٹر عرفان۔"

"اوہ اچھا ہوا آپ مل گئے۔ میرے پاس ایک مریض ہے اس کے گُردے کام نہیں کر رہے ناکارہ ہو گئے ہیں کوئی ری پلیسمنٹ کا بندوبست ہو سکتا ہے۔"

"آپ کے لیے کیا مشکل ہے ؟"

"اچھا! کوئی بھی ڈونر نہیں ملے گا اس وقت ؟"

"مگر وہ۔۔۔ مریض کی زندگی خطرے میں ہے۔"

"آپ کہاں گئے ہوئے تھے۔ میں نے پہلے بھی معلوم کیا تھا، آپ کے کلینک سے۔"

"اچھا اچھا سردار صاحب کے ہاں دعوت تھی۔ دیکھیں مریض کے وارث ایک لاکھ روپیہ دینے کو تیار ہیں۔"

"یہ تو بہت بُرا ہوا کچھ نہ کچھ تو اسٹاک میں رکھا کریں۔"

"ہاں ہے تو یہ انمول شئے ڈاکٹر۔ اگر دھمن یہاں ہوتا تو پرابلم نہ ہوتی۔"

"اچھا خدا حافظ۔" یہ کہہ کر ڈاکٹر عذرا نے فون بند کر دیا۔

"اُن کا فون نمبر مجھے لکھا دیں۔" آبی نے کہا۔ ڈاکٹر عذرا نے عرفان کا فون نمبر اُسے دے دیا، بولی۔

"آپ کیا کریں گے یہ فون نمبر لے کر ؟"

"کبھی ضرورت پڑ ہی جاتی ہے نا جناب ڈاکٹر صاحب" آبی نے کاغذ کے ایک پُرزے پر وہ نمبر لکھ کر جیب میں رکھ لیا۔ ڈاکٹر عذرا کو ہمارے رویّے پر حیرت ہو رہی تھی۔ بولی۔

"کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ نے اس آدمی کو بے ہوش کس طرح کیا تھا ؟"

"بس اس کے سر میں ایک دھپ سی مار بیٹھا تھا۔ بس اس سے یہ بے ہوش ہو گیا۔" میں نے کہا

"ہو سکتا ہے اب یہ مکر کر رہا ہو۔" آبی نے خدشہ ظاہر کیا۔

"جی نہیں، میں نے اس کا اندازہ لگا لیا ہے وہ پوری طرح بے ہوش ہے مگر اسے آپ نے کیوں چُنا ہے اس کام کے لیے یہ بات مجھے پریشان کر رہی ہے۔"

"یہی مجھے ڈاکٹر دھمن کے پاس دھوکے سے لے گیا تھا۔" میں نے وضاحت کرنے کی کوشش کی۔ وہ مسکرا دی۔ معلوم ہو رہا تھا کہ وہ ڈاکٹر دھمن اور ڈاکٹر عالیہ کے بہت قریب رہی ہے اور اُن کے تمام راز اُسے معلوم ہیں مگر ظاہر یوں کر رہی تھی جیسے میری بات پر اعتبار نہیں آیا ہے۔

"کیا آپ کو یقین ہے کہ ڈاکٹر دھمن کے ہاتھ صاف ہیں؟ ہم اس کو بلا وجہ الزام دے رہے ہیں ؟"

"جی ہاں! وہ ایسے آدمی ہرگز نہیں ہیں۔ ہاں اُن کے پاس ضرورت مند لوگ آتے ہیں جن سے وہ دوسروں کے لیے ایک گردہ گراں قیمت پر خرید لیتے ہیں۔"

"بس ہم بھی آج رات ایک گُردے کی تلاش میں ہیں خواہ وہ کسی کا بھی ہو۔"

"اچھا ٹھیک ہے آپ اس سلسلے میں اب مجھے اُس وقت ملیں جب آپ کسی مناسب آدمی کو اس کام پر رضامند کر لیں کیونکہ آسیہ کی زندگی کا انحصار اسی بات پر ہے۔" یہ کہہ کر اُس نے گھنٹی بجائی تو اس کی نرس فوراً اندر آ گئی۔

"آسیہ کا کیا حال ہے اب ؟"

"میں اس کو صرف لیکوئڈ دے رہی ہوں۔ ڈاکٹر صاحب اور اب وہ پھر سو چکی ہے۔"

"نیند کا ٹیکہ لگایا ہے ؟"

"جی نہیں! اس کی ضرورت نہیں پڑی۔"

"دیکھیں! میری ضرورت پڑے تو مجھے فوراً اطلاع دیں۔ وہ ڈھلوں صاحب کی عزیزہ ہے مجھے شرمندہ نہ ہونا پڑے۔ اس کی ذمّے داری مجھ پر ہے۔ شام کو ڈھلوں صاحب نے مجھے پھر فون کیا تھا اور قریشی صاحب کو بھی تاکید کی تھی۔

"آپ بالکل فکر نہ کریں میں بارہ بجے تک اِدھر ہی رہوں گی۔ پھر وہ خالدہ آ جائے گی تو میں اُسے بھی تاکید کر دوں گی۔" خورشید نے کہا۔

اُس کی یہ بات سن کر ڈاکٹر نے اُسے باہر جانے کا اشارہ کیا۔ جب وہ کمرے سے باہر نکل گئی تو ڈاکٹر عذرا بولی۔

"تو پھر یہ بات طے رہی کہ آپ اپنی ہمشیرہ کے لیے گُردے کا انتظام کر لیں گے۔ اور باقی رقم مجھے کل دس بجے تک دے دیں گے۔ میں صاف سیدھی بات کرتی ہوں۔ آپریشن میں کر دوں گی مگر اس وقت جب آپ باقی رقم مجھے دے چکے ہوں گے۔"

"آپ مطمئن رہیں ڈاکٹر صاحب ہم اپنے وعدے کے پابند ہیں۔ آپ یہ نہیں پوچھیں گی اور یہ نہیں سوچیں گی کہ آپ کس کا گردہ نکال رہی ہیں، یہ بات بھی طے ہے۔" میں نے اُسے ایک بار پھر سمجھوتے کی اوّلین شرط یاد دلائی۔

"مجھے معلوم ہے اور میں اپنے وعدے پر قائم ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھی اور ہم دونوں پر اچٹتی سی نظر ڈال کر باہر نکل گئی۔

ہم بھی اُس کے پیچھے ہی چل دیے۔ برآمدے میں آبی نے اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

"اپنے کمرے کی چابی ہمیں دے دیں ہم جس مہربان کو بھی لائیں گے اُسے وہیں بٹھا دیں گے۔"

"ہاں! یہ رہی چابی۔ ایک چابی میری نرس کے پاس ہے۔ وہ موجود نہ ہو تو آپ میرا کمرہ کھول سکتے ہیں۔ اس لنگڑے کو بہرحال ابھی یہاں سے لے جائیں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے بیگ میں سے نکال کر ایک چابی میرے ہاتھ میں تھما دی۔

ہم اس کمرے میں لوٹ گئے اور حیدر کو کمبل میں لپیٹ کر باہر لے آئے۔ واپسی پر بھی اُسے آبی نے ہی کندھے پر اٹھایا تھا۔

"یار! اس جانور کو ہم کہاں لیے پھریں گے۔ پھینک کسی کنوئیں میں اس خبیث کو۔"

"نہیں آبی! اس بیچارے کا کیا قصور ہے۔ اس پر تو مجھے ترس آتا ہے۔ ان لوگوں نے اُسے بھی زندگی بھر کے لیے تباہ کر رکھا ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے۔ تو پھر ڈال اسے کسی ٹیکسی میں۔"

"ہم اِسے چھوڑ آتے ہیں واپس، مگر تو ٹھہر جا کہیں اُس مصیبت بانو نے کوئی مصیبت نہ کھڑی کر دی ہو۔ میں پہلے فون پر بات کر لوں اُس سے۔" یہ کہہ کر میں نے کلینک کے اندر ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر شکیل کے سامنے رکھا فون سنبھال لیا۔ اُس سے میرا تعارف پہلے ہی ہو چکا تھا۔ میں نے نمبر گھمائے تو فون سرداراں نے ہی اُٹھایا۔

"ہیلو۔ میں سرداراں بول رئی آں۔"

"وہ حیدر کہاں ہے ؟"

"اوہ تے جی اپنے یاراں نال کدرے منڈوے شنڈوے گیا ہویا اے۔"

"تمھیں بتا کر گیا تھا وہ ؟"

"وہ جی دو آدمی آئے سن اوہدے یار بیلی اوہناں نال میں اوہنوں باہر جاندیاں ویکھیا سی۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ وہ آئے تو اُسے ہمارا سلام بولو۔ کہو سلام صاحب اُسے یاد کرتے ہیں۔" یہ کہہ کر میں نے ٹیلیفون بند کر دیا۔ اب خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ عورت اصل صورتِ حال سے بالکل ہی بے خبر تھی۔

میں عمارت سے باہر نکلا تو اس عرصے میں آبی حیدر کو ایک ٹیکسی میں ڈال چکا تھا۔ ہم فوراً ہی اُسے لے کر گلبرگ کی طرف چل دیے۔ ڈاکٹر دھمن کی کوٹھی سے ذرا دُور ہم نے ٹیکسی چھوڑی اور حیدر کو کندھے پر ڈال کر آبی اندھیرے میں چلتا ہوا اُسے کوٹھی کے دروازے کے اُوپر سے اندر لان میں پھینک آیا۔ "خس کم جہاں پاک۔ اِس سالے نے خواہ مخواہ ہمارا اِتنا وقت ضائع کرا دیا تھا۔"

"چل اب اُدھر ڈاکٹر عرفان کی طرف چل۔ اس سے کم پر اب میری تسلّی نہیں ہو سکتی۔" میں نے آبی کو نیا راستہ سجھایا۔

"میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ تجھے یقین ہے نا کہ تمھارے ساتھ جو زیادتی ہوئی ہے اُس میں وہ بھی شامل تھا۔"

"ہاں بھئی میں اسے کیسے بھول سکتا ہوں۔"

"بس ٹھیک ہے! میں اُس سے تمھارے ایک ایک بال کا حساب لوں گا۔ دیکھتا رہ میں کیا کرتا ہوں آج۔" ہم پیدل چلتے ہوئے گلبرگ کی مارکیٹ میں پہنچے۔ اور وہاں ایک ہوٹل سے میں نے ڈاکٹر عرفان کے ہاں فون کیا۔ ریسیور میں کسی کی بڑی ہی خوشبودار آواز اُبھری۔ ایسی آواز جو کسی ایسی مدھ ماتی عورت کا تصوّر ذہن میں اُبھارتی تھی جسے اپنے حُسن اور اپنے حُسنِ تکلم پر بے حد ناز ہو۔

"مجھے ڈاکٹر عرفان سے ملائیں۔"
"وہ تو شاید سو گئے ہیں۔"
"وہ صبح کس وقت بیدار ہوتے ہیں؟"
"بس چھ بجے اُٹھ جاتے ہیں۔"
"آپ اُن کی مسز ہیں؟"
"جی ہاں فرمائیے۔"
"دیکھیں میں صبح اُن کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔ ایک مریض کو اُن کی خدمت میں لاؤں گا۔ آپ کی رہائش کہاں ہے؟"
اس نے ماڈل ٹاؤن کے ایک بنگلے کا نمبر مجھے بتایا، بولی۔
"آپ آٹھ بجے سے پہلے پہلے آجائیں تو پھر شاید وہ آپ کو گھر پر دیکھ لیں ورنہ آپ کلینک چلے جائیں۔" یہ کہہ کر اس نے فون بند کیا اور پھر ہم وہاں بیٹھ کر چائے پینے لگے۔
وہ کوئی پاکستانی خاتون تھی جس کے لب و لہجے پر انگریزی طرزِ تکلم غالب تھا۔ کوئی ایک گھنٹہ ضائع کر کے میں وہاں سے آبی کو اپنے ساتھ لے کر باہر نکلا اور سامنے کھڑی ایک ٹیکسی میں جا بیٹھا۔ اب ہماری منزل ہمارے سامنے تھی۔ میرے انتقام کا پہلا مرحلہ شروع ہو چکا تھا اور وہ بھی محض اس لیے کہ مجھے اس کی اشد ضرورت تھی۔ آسیہ جاں بہ لب وہاں میری منتظر تھی۔ وہاں جہاں موت اُس کی بالیں پر کھڑی تھی۔
ڈاکٹر عرفان کا بنگلہ ماڈل ٹاؤن کے مشرقی حصے میں واقع تھا۔ اس کا رقبہ بھی ڈاکٹر عالیہ کے بنگلے کی طرح بہت وسیع تھا اور اس نے اپنی حفاظت کے لیے ایک مسلح پہریدار گیٹ پر ٹھہرا رکھا تھا۔ کوٹھی کے لان میں اِدھر اُدھر بڑے قرینے سے جا بجا بتیاں جل رہی تھیں۔ بڑے بڑے خوبصورت لوہے کے ستون اس نے ایک خاص تقویم سے اپنے وسیع و عریض لان میں گاڑ رکھے تھے جس پر لگے مرکری بلب رات میں دن کا سماں پیدا کر رہے تھے۔ ہم نے کوٹھی کے سامنے سے اجنبیوں کی طرح دو بار گزر کر ساری صورتِ حال کا جائزہ لے لیا۔ تو آبی مجھے ایک جگہ اندھیرے میں روک کر بولا۔
"یار! اس پہریدار نے تو مجھے چکر میں ڈال دیا ہے۔" وہ گیٹ کے اندر بنے ایک بُرج میں کھڑا تھا اور بہت چوکنا نظر آ رہا تھا۔
"ابے ہم کوئی چور ہتھوڑی ہیں۔ چل سیدھی طرح اُس سے بات کر لیتے ہیں۔" یہ کہہ کر میں اُسے اپنے ساتھ کھینچ کر ڈاکٹر عرفان کے اُس آہنی دروازے تک لے گیا جس کے اندر دائیں ہاتھ بنے بُرج میں کھڑا وہ پہریدار ہمیں دیکھ رہا تھا۔
ہم دونوں گیٹ پر پہنچے تو اپنی جگہ سے سرکتا ہوا آگے آگیا۔ گیٹ کی سلاخوں کے ساتھ لگ کر بولا۔
"کیا بات ہے بھائی جی؟"
"السلام علیکم جناب کیا ڈاکٹر عرفان صاحب کا بنگلہ یہی ہے؟"

یہ کہہ کر میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ اُس کی طرف بڑھا دیا۔
"جی ہاں، یہی بنگلہ ہے اُن کا۔" یہ کہہ کر اُس نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ ہتھیلی اُس کی پسینے سے بھیگی ہوئی تھی۔
"دیکھیں جناب ہمیں ایک مریض کے لیے ڈاکٹر صاحب سے مشورے کی ضرورت ہے۔" میں اس کا ہاتھ تھامے کھڑا تھا۔ اس نے اپنی رائفل بائیں کندھے پر ڈال لی تھی۔ وہ بہت ہی چاق و چوبند آدمی معلوم ہوتا تھا۔ چہرے مہرے سے وہ کوئی چھپا چھپی دکھائی دیتا تھا۔
"وہ تو سو چکے ہیں بھائی صاحب، اب تو وہ صبح ہی ملیں گے۔"
آبی نے اس اثنا میں جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔
"پیو لالہ! یہ اچھا سگریٹ ہے۔"
"بڑی مہربانی جی!" وہ آدمی سگریٹ لے کر خوش ہو گیا۔ تیلی جلا کر سلاخوں کے اندر ہاتھ ڈالنے کے بجائے ذرا سا باہر کو ہوا۔ وہ سادہ لوح سگریٹ سُلگانے کے لیے ذرا سا نیچے جھکا تو میں نے پوری قوت سے اس کی گردن پکڑ کر اُس کی رگِ احساس مسل دی۔ وہ جب زمین پر گرا تو اس کی کھلی آنکھوں سے جھانکتی حیرت نے مجھے بہت کچھ بتا دیا۔ اُس بیچارے کو کیا معلوم تھا کہ وہ کن لوگوں سے ہمکلام ہے۔
وہ نیچے گرا تو ہم گیٹ کی سلاخوں میں پاؤں پھنسا کر اور دُوسری طرف اُتر گئے مگر ابھی ہم سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ ایک خونخوار کُتا اس بُرج کی پچھلی طرف سے نکلا اور اُچھل کر آبی پر جا پڑا۔ آبی کمبل اوڑھے ہوئے تھا۔ کُتے نے جب اس کے بائیں بازو پر منہ مارا تو موٹا کمبل آبی کی ڈھال بن گیا۔ ایک لحظے کے لیے تو آبی چکرا گیا۔ مگر میں نے کُتے کو مہلت نہیں دی، اپنے چپُ شاہ سے میں نے ایک گولی اُس کی نذر کی۔ وہ وفا شعار اُس کے سینے میں اُتری تو وہ کُتا ایک بھیانک چیخ مار کر وہیں ڈھے گیا۔ اب ہمارا کام قدرے آسان ہو گیا تھا۔
ہم نے عمارت کی طرف جانے والی بڑی روش چھوڑ دی اور بائیں ہاتھ قدرے اندھیرے میں چلتے ہوئے ہم عمارت کے بڑے دروازے تک جا پہنچے۔ پورچ میں دو گاڑیاں کھڑی تھیں۔ یہ لمبی لمبی گاڑیاں لوگ گزوں سے ناپ کر محض اُن کی لمبائی کی وجہ سے... حمزید اگیا
ہم عمارت کے سامنے کے حصے سے ہٹ کر عقب میں آئے۔ اِدھر بھی ایک خوبصورت لان بنا ہوا تھا جس میں جانے کے لیے ایک راستہ نکل کر آدمی برآمدے میں پہنچتا تھا۔ ہم دبے پاؤں چلتے ہوئے برآمدے میں ٹھہرے۔ روشن بتیاں وہاں بھی اندھیر مچا رہی تھیں۔
ہم دونوں نے اپنے چہروں پر رُومال باندھ لیے اپنی شناخت ہمیں بہر حال اُن سے بچانی تھی۔ عمارت کے اندر جانے کے سارے دروازے بند تھے۔ اس وقت رات کے بارہ بج رہے تھے۔ ہمارے سامنے کھڑکیاں تھیں جن پر لوہے کی موٹی جالی لگی تھی۔ اُن سے ذرا آگے ایک ... ہم ... نوں دیوار سے لگے کھڑے تھے۔ اچانک مجھے اپنے قریب

خوفناک کُتے کے بھونکنے کی آواز سُنائی دی۔ میں سمٹ کر اُچھلا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ وہ آواز آبی کے مُنہ سے نکل رہی تھی۔ اُف میرے خدایا۔ وہ بالکل کُتے کی طرح بھونک رہا تھا یوں جیسے وہ کسی کو پھاڑ دینے کے لیے اُس پر جا پڑا ہو۔ پھر اس کے مُنہ سے ویسی ہی بھیانک چیخ نکلی تھی۔ وہ بڑی طویل اور بھیانک چیخ تھی۔ چند ہی ثانیوں بعد آبی مجھے کھینچ کر دائیں ہاتھ کے ایک پیڑ کی اوٹ میں لے گیا۔
آبی کی اس خوفناک آواز کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا تھا۔ اس طویل عقبی برآمدے کا وسطی دروازہ کھلا اور ایک جوان آدمی اپنے گاؤن کے تسمے بند کرتا ہوا باہر نکلا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ وہ بو فر بو فر کہتا ہوا تیزی سے برآمدے سے نکلا اور اِدھر اُدھر دیکھتا برآمدے سے اُتر کر دائیں ہاتھ جانے لگا۔ اب وہ قدرے تاریکی میں تھا۔ اُس کی پُشت ہماری طرف تھی اور وہ اپنے کُتے کی آواز سننے کے بعد اُس کی وجہ معلوم کرنے کے لیے آگے جا رہا تھا۔
آبی نے مجھے آگے دھکیلا۔ میں اُس کا مطلب سمجھ کر... پھرتی سے گھاس پر بے آواز دوڑا اور پیشتر اس کے کہ وہ آدمی دائیں بائیں دیکھ سکتا میں نے اس کی گردن پر کھڑے ہاتھ سے ضرب لگا کر اُسے اوندھے منہ گرا دیا۔ وہ بے سُدھ نہیں ہوا مگر پستول والا ہاتھ سینے کے نیچے آنے کی وجہ سے وہ ایک لحظے کے لیے سُن سا ہو کر رہ گیا۔ شاید پستول کا دستہ اُس کے سینے میں لگ گیا تھا۔ میں نے اُسے اُٹھنے کی مہلت نہیں دی۔ بلکہ آناً فاناً میں نے اس کی رگِ احساس مسل دی اور اس کا پستول اُٹھا کر جیب میں رکھتے ہوئے میں تیزی سے برآمدے کی طرف لپکا۔ آبی اس دوران میں برآمدے کی نکڑ پر آ چکا تھا۔ ہم بے آواز آگے بڑھے۔ پاؤں کی چاپ کو ہم جس قدر دبا سکتے تھے دبا گئے۔ وسطی دروازہ ابھی تک کھلا تھا۔ ہم بڑی احتیاط سے اُس میں داخل ہوئے تو ہمیں اُس کمرے میں ایک چھوٹا سا سبز بلب جلتا نظر آیا۔ وہ کمرہ اس آدمی کی خوابگاہ نہیں تھا بلکہ اسٹڈی رُوم تھا۔ وہاں بیٹھ کر وہ اُس وقت کسی کتاب کے مطالعہ میں محو تھا کیونکہ دائیں ہاتھ رکھی میز پر ایک بہت خوبصورت سا ٹیبل لیمپ جل رہا تھا۔ میز کے سامنے ایک بہت ہی آرام دہ کرسی پڑی تھی جس میں ایک کمبل اس طرح دھرا تھا جیسے وہ ابھی کسی کے جسم سے الگ ہوا ہے۔
اس کمرے کا ایک دروازہ آگے کھلتا تھا۔ وہ بھڑا ہوا تھا۔ ہم اُس میں داخل ہو گئے۔ وہاں عجیب سا الف لیلوی ماحول ہمیں نظر آیا۔ ایک بڑا وسیع پلنگ وہاں بچھا تھا۔ کمرے کے عین وسط میں۔ بلاشبہ وہ ڈبل بیڈ تھا جس پر ایک جوان عورت محوِ خواب تھی کہ اُس کے بدن کا آدھا حصہ لحاف کے اندر تھا اور آدھا باہر تھا۔ کمرے میں نیلے رنگ کا زیرو پاور کا بلب روشن تھا۔ کمرے کا ماحول بڑا خوابناک سا تھا۔ وہاں شاید کچھ ہی دیر پہلے خوشبو بکھیری گئی تھی۔ کمرہ معطر ہو رہا تھا۔ سوئی گیس کا ایک بہت ہی نفیس ہیٹر ایک کونے میں دھیمی آنچ دے رہا تھا۔

آبی کی نظریں اس عورت پر جم کر رہ گئیں۔ اُس کی عمر یہی کوئی پچیس سال ہو گی۔ اُس نے بڑی آہستگی سے آگے بڑھ کر اُس خاتون کے رُخسار تھپتھپائے۔ اُس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ آبی نے ایک بار پھر بڑی نرمی سے اُس کے شانے پر سے اُس کی پریشان زلفیں ہٹا کر اُسے تھپکی دی۔ تو اُس نے مسکرا کر آنکھیں کھول دیں۔ ہم دُوسری طرف کھڑے تھے وہ ہمیں دیکھ نہ سکی تھی، پھر اُس نے لحاف اپنے اُوپر اوڑھنے کے لیے سر کو ذرا سی جنبش دی تو اُس کی نظر منجمد ہونے لگی۔ اُس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ وہ لرزنے لگی تھی دہشت سے اُس کی سُرمہ سا آنکھیں پھیلنے لگیں۔ لحاف اُس کی کیوٹیکس لگی لانبی لانبی اُنگلیوں سے جہاں تک کھنچا تھا وہیں رُک گیا۔ میرے پستول کی نال اُس کے سینے کی طرف تھی۔ خوف نے اُس کو اس حد تک مغلوب کر دیا تھا، کہ وہ اپنا سر تکیے تک بھی نہ لے جا سکی۔
آبی نے آگے بڑھ کر اُس کے مُنہ پر کس کر ہاتھ رکھ دیا، یوں کہ اُس کی گردن کے نیچے شانے تک کا حصّہ اُس کے بائیں بازو کے حلقے میں آگیا تھا۔ آبی نے اپنا شکنجہ سخت کرتے ہوئے کہا۔
"گھبراؤ مت بی بی! یہ بتاؤ ڈاکٹر عرفان کدھر ہے؟"
اُس نے دلآویز ناخن والی اُنگلی سیدھی کر کے اندرونی دروازے کی طرف اشارہ کیا۔
میری نظر کرسی پر دھرے دوپٹے پر پڑ گئی۔ اُسے میں نے تین حصّوں میں بڑی احتیاط سے لمبائی میں پھاڑا اور ایک حصّے سے اُس کی دونوں ٹانگیں کس کر باندھیں۔ دُوسرے سے اُس کی بانہیں کمر کے پیچھے جکڑ دیں۔ آبی نے مُنہ سے ہاتھ ہٹا کر اُس پر دوپٹے کا تیسرا حصّہ یوں باندھا جیسے گھوڑی میں گنوار لگام دیتے ہیں۔ وہ بھی ایسی اصیل نکلی کہ اس نے ذرا سی بھی مزاحمت نہیں کی۔ اس کو لحاف کے نیچے دبا کر ہم اندرونی دروازے میں گھسے۔ سامنے ایک راہداری تھی۔ اس عورت نے جو اشارہ کیا تھا اُس سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ ڈاکٹر عرفان سامنے کے کمرے میں ہے۔ آبی نے دائیں ہاتھ کی کھڑکی کو ذرا سا دبایا تو اس کا پٹ کھل گیا۔ اُس کھڑکی پر کوئی جالی نہیں تھی۔ کھڑکی چونکہ اندر کے حصّے میں تھی اِس لیے محفوظ سمجھی جاتی تھی۔ پٹ کھلنے سے ہم بڑی آسانی سے اندر داخل ہو... سکتے تھے۔ اس کمرے میں بھی ہلکی سبز روشنی کا بلب جل رہا تھا۔ میں نے پردہ سرکا کر دیکھا۔ ڈاکٹر عرفان اور اس کی بیوی محوِ خواب تھے۔ عرفان کے چہرے پر میری نظر پڑی تو میرا خون کھول اُٹھا۔ اس کی وہ باتیں میرے ذہن میں گونجنے لگیں جو اُس نے میرا گردہ نکال دینے کا فیصلہ صادر کرتے ہوئے کہی تھیں۔
آبی نے اُس بڑے سے فوم بیڈ کے دائیں ہاتھ قالین پر ڈھیر ساڑھی اُٹھا کر جیب سے اپنا شکاری چاقو نکالا اور اس کے دو حصے کر دیے پھر اُس نے اُن دو حصّوں کو چار حصّوں میں بانٹ دیا۔ ایک ٹکڑا ہاتھ میں

پکڑ کر وہ اس عورت کی طرف بڑھا... دائیں ہاتھ تپائی پر جو سامان دھرا تھا اس سے یہی ثابت ہوتا تھا کہ وہ شراب کے بھی عادی ہیں اور وہ اس لگ کو حلق سے نیچے اتار کر سوئے تھے۔ آبی نے ساڑھی کا ٹکڑا پوری سختی سے نہایت ہی آمرانہ انداز میں کچھ اتنی تیزی سے اس سوتی ہوئی بیگم عرفان کے منہ پر باندھ دیا کہ جب اس کی آنکھیں کھلیں تو اس کی زبان بند ہو چکی تھی۔ اس کے دونوں پاؤں میں نے ایک ٹکڑے میں جکڑ دیے تھے۔ ہم نے اس پر ریشمی لحاف ڈال دیا۔ آبی نے تیسرے ٹکڑے سے اس کے دونوں بازو اس کی کمر کے پیچھے یوں باندھے کہ وہ اب صرف پہلو کے بل ہی لیٹ سکتی تھی۔

ادھر سے فارغ ہو کر میں نے ڈاکٹر عرفان کو پوری قوت سے گھسیٹ کر بستر سے نیچے پھینک دیا۔ وہ قالین پر گرا تو ہڑبڑا کر نیند کے حلقے سے باہر نکل آیا۔ میں پستول تانے اس کے سامنے ہی کھڑا تھا۔

"کیا حال ہیں بھائی گردہ فروش؟" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "پہچانا مجھے؟"

اس کی پتلیاں پھیلنے لگیں وہ دونوں کہنیوں کو کمر کے پیچھے رکھ کر ذرا اوپر اٹھا تو آبی نے پوری قوت سے اس کی کمر میں ٹھوکر ماری۔ عرفان کی قوتِ گویائی شاید سلب ہو گئی تھی۔ اس کے منہ سے چیخ بھی نہیں نکلی۔ وہ تڑپ کر سیدھا ہوا اور آبی کو دیکھنے کے لیے گردن موڑنے لگا۔ مگر آبی نے اس کے حیرت سے کھلے منہ میں ساڑھی کا ٹکڑا کپاری کی طرح ڈال کر گدی پر کس کر باندھ دیا۔ دونوں باہیں اس کی میں نے جکڑ کر پیچھے کس دیں۔

"تجوری کہاں ہے عرفان بیٹے!" آبی نے اس کے دونوں کان اینٹھتے ہوئے پوچھا۔ "ہمیں چابیوں کے درشن کراؤ۔ تیرے گردے پر خاصی چربی ہو گی ڈاکٹر! بہت پلا ہوا سؤر ہے تو — چابیاں کہاں رکھی ہیں بچے!" یہ کہہ کر اس نے پستول کی نال اس کے سینے سے لگا دی۔ اب اس کی بیگم پہلو بدل کر منہ ہماری طرف کر چکی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بڑے بڑے آنسو ابل آئے تھے۔

"چابیاں کہاں ہیں؟" آبی نے اب کی بار بائیں ہاتھ کا ایک الٹا جھانپڑ عرفان کے منہ پر دے مارا۔

عرفان تڑپ کر ایک طرف جھکا اور اس نے آنکھوں کے اشارے سے ہمیں میز تک جانے کے لیے کہا۔ میں نے لپک کر ان کے سرہانے کے قریب رکھی میز کی درازیں کھولیں۔ چابیوں کا ایک گچھا وہاں موجود تھا، وہ میں نے اٹھا لیا۔

آبی اسے دھکیل کر آگے لے آیا تھا۔

"مال کہاں ہے بیٹے جلدی کر، ہمیں اور بھی کئی کام ہیں۔" آبی نے اب کی بار اس کے کان کے قریب منہ لے جا کر کہا۔

وہ کوک بھرے کھلونے کی طرح آگے ہو لیا۔ دائیں ہاتھ اندر سا دروازہ تھا۔ وہ اس کے سامنے جا ٹھہرا۔ میں نے اندازے سے نکال کر اس دروازے کے خفیہ تالے میں لگائی تو وہ دروازہ کھل گیا۔ آبی نے عرفان کو اس کمرے میں دھکیل دیا۔ وہاں دو سیف رکھے تھے۔ میں ایک ایک کر کے ان پر چابیاں آزمانے لگا مگر وہ کھل نہیں رہے تھے اور میں اب کی بار کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا کیونکہ دو تجوریوں کے ہاتھوں مرتے مرتے بچا تھا۔ اور عرفان عالیہ کا سودا... چابیاں میرے ہاتھ سے آبی نے جھپٹ لیں اور پھر بڑی احتیاط سے عرفان کو سیف کے قریب کر کے اس کی دونوں... ساڑھی کے ایک ٹکڑے سے جکڑ دیں جب اسے اطمینان ہو گیا... اپنے پاؤں پر کھڑا رہ سکتا ہے تو اس نے اس کے دونوں ہاتھ کھول... "اپنی اس ماسی کو خود کھول بیٹے اور ہمارا وقت ضائع نہ کر۔"

عرفان نے اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے دونوں سیف کھول دیے۔ ان کے اندر جھانک کر ہماری تو عید ہو گئی۔ وہاں ساڑھے چھ لاکھ روپے ہمیں ملے۔ اور کوئی سیر بھر طلائی زیور۔ وہ سب کچھ آبی نے ایک تھیلے میں بھرا اور پھر دونوں تجوریوں کو پہلے کی طرح عرفان کے ہاتھوں بند کروا کے اسے کھینچ کر پہلے کمرے میں لے آیا... کی بیگم کے آنسوؤں سے تکیہ بھیگ گیا تھا۔

آبی نے خود عرفان کو اس کی قمیص پہنائی اور اس کے اوپر ایک نرم سی شال بھی ڈال دی۔ جب وہ اسے سلیپر بھی پہنا چکا تو بولا۔

"اس کے ہاتھ باندھ دے بھائی، ان کی ضرورت نہیں رہی۔ ممکن ہو تو کاٹ ہی دے۔" یہ کہہ کر وہ اس کی بیگم کے پاس پہنچا اور... "مجھے افسوس ہے میڈم مگر یہ اس کے جرائم کی کم سے کم سزا ہے۔ اسے چند دن بعد واپس بھیج دیں گے لیکن اگر آپ نے شور کیا اور... کا چکر لگایا تو پھر یہ کبھی واپس نہیں آسکے گا یہ گردہ فروش قصائی..." پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "چل بھئی ہمیں دیر ہو رہی ہے۔ چل اس سؤر کو۔"

میں نے عرفان کو کندھے پر ڈال لیا اور آبی اپنا بھاری بھرکم تھیلا اٹھا کر کمروں کی بتیاں بجھاتا ہوا میرے پیچھے آنے لگا۔ دوسرے کمرے میں سے گزرتے ہوئے میں نے اس نائٹ گاؤن والی کو دیکھا۔ وہ بڑے صبر سے اس اذیت کو سہہ رہی تھی اور اس کی آنکھیں خشک تھیں۔ اس نے عرفان کو میرے کندھے پر لٹکتے دیکھا تو تڑپ کر اٹھنے لگی مگر آبی نے اسے گھسیٹ کر بستر سے نیچے گرا دیا۔ اور پھر بتی... بجھا کر وہ بھی برآمدے میں نکل آیا۔

"یار گاڑی کی چابی کا تو مجھے خیال ہی نہیں رہا۔"

آبی نے ایک چھلّہ میرے سامنے لہرا دیا۔ "یہ میں نے ادھر عرفان کی سنگار میز پر سے اٹھالی تھیں۔"

"تو سمجھ دار آدمی ہے یار! ہر بات پر نگاہ رکھتا ہے۔"

پورچ میں پہنچ کر آبی نے سفید گاڑی پر چابی آزمائی تو وہ کھل گئی۔ میں نے عرفان کو اس کی پچھلی سیٹ پر ڈال کر اس کی رگ احساس پوری طاقت سے مسل دی۔ اب ہم اس کی طرف سے بالکل بے فکر ہو گئے تھے۔ "اب جا کر گیٹ کھول دے۔ چابی اس پہریدار کے پاس ہو گی۔" آبی میرے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

"چل تو ہی اب پیدل چلنا بیکار ہے۔" میں نے گاڑی پیچھے ہٹا کر گیٹ کی طرف بڑھا دی۔ گیٹ واقعی اندر سے مقفل تھا۔ آبی نے اتر کر اس پہریدار کی جیبیں ٹٹولیں تو وہاں سے چابی برآمد ہو گئی۔ اس نے گیٹ کھول دیا تو میں نے گاڑی باہر نکال لی میرے پیچھے اس نے گیٹ بڑی احتیاط سے بند کر کے اندر سے اس کا ارل چڑھا کر تالا لگا دیا اور چابی اس نے پہریدار کی طرف پھینک دی جسے اس نے گھسیٹ کر برج کے قریب ڈال دیا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم محسن کلینک جا پہنچے۔ عرفان کو کمبل میں لپیٹ کر آبی نے ڈاکٹر عذرا کے کمرے میں ڈال دیا اور پھر کمرے کو مقفل کر کے میرے پاس آ گیا، بولا۔

"اب اس گاڑی کا کوئی بندوبست کرو۔ یہ ہمارے لیے مصیبت بن سکتی ہے۔"

"اس کو ہم واپس نہیں کریں گے۔ وہ تین گیراج دیکھ رہے ہو نا وہ بالکل خالی ہیں۔ میں اسے وہاں بند کر دیتا ہوں صبح دیکھ لیں گے۔"

"نہیں یہاں نہیں میرے ساتھ چلو۔ میں اسے ابھی اپنے ایک دوست کے گیراج میں رکھتا ہوں۔ صبح اس کا رنگ بھی وہ بدل دے گا اور نمبر پلیٹ بھی۔"

"اچھا! ایسا کرنی والا کون ہے وہ بزرگ؟"

"چل، میں تجھے اس سے ملواتا ہوں۔ وہ ادھر ہال روڈ کے پیچھے رہتا ہے۔"

میں نے گاڑی گھما کر کلینک کے احاطے سے نکالی اور اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلتا ہال روڈ پر جا پہنچا۔ اس نے دکانوں کے درمیان سے گزرتی ایک خاصی چوڑی گلی عبور کی تو ہم ایک کھلے سے احاطے میں جا پہنچے۔

"لے بھئی تو ذرا ادھر ٹھہر میں ابھی آتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ نیچے اتر گیا۔ نوٹوں سے بھرا تھیلا میرے پاؤں میں پڑا تھا وہ میں نے اوٹ میں رکھ دیا۔ آبی جب واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک گرانڈیل جُثے کا آدمی تھا۔ شکل صورت سے ہی وہ مستری نظر آتا تھا گاڑی کو آگے پیچھے سے دیکھ کر بولا۔

"سیٹھ گاڑی تو زبردست ہے مرسیڈیز ہے۔" وہ شاید بستر سے اٹھ کر آیا تھا۔ آنکھیں اس کی نیند سے مندی جا رہی تھیں۔

"ہاں! اس پر کل کالا رنگ پھیر کر اس کی نمبر پلیٹ، اس کی ولدیت مادریت بلکہ اس کا سارا شجرۂ نسب ہی بدل دو۔"

"روپے پانچ ہزار لگیں گے۔"

"پھجے! ہم دس ہزار دیں گے۔ بس اس کا حلیہ ایسا کر دو کہ اس کی ماں بھی نہ پہچان سکے۔"

"ایسا ہی ہو گا سیٹھ۔ کچھ پیشگی ملتا ہے؟"

"ہاں — یہ دو ہزار تو ابھی لے لو۔" آبی نے میری جیب سے نوٹ نکال کر اسے دے دیے۔

"بس ٹھیک ہے۔ کل اسی وقت آ کر لے جائیں۔"

"نہیں اس وقت نہیں اسے رات نو بجے تک تیار کر دو — بس نئی نویلی دلہن بنا دو۔"

"ایسا ہی ہو گا سیٹھ۔" پھجا بولا۔

"تو پھر کل تک ہمیں کوئی گاڑی دے دو ہمیں ضرورت ہے۔"

"ہاں! یہ میں کر سکتا ہوں بھروسے کی چیز ہے مزدا۔"

"تو پھر ادھر لے آؤ۔" آبی نے کہا۔ پھجا نوٹ گنتا ہوا واپس چلا گیا۔ تو میں نے نوٹوں کا تھیلا آبی کو تھما دیا۔

پھجا مستری پانچ ہی منٹ بعد احاطے کے دوسرے حصے سے ایک چمکتی چلکتی خوبصورت مزدا گاڑی لے کر آ گیا۔ بولا۔

"یہ گاہک کی ہے۔ وہ دس دن کے لیے کراچی گیا ہے۔ ہوائی جہاز میں — جتنی چاہو چلاؤ۔"

"نہیں، بس ہمارا کام کل تک تم مکمل کر دو، یہ ہم واپس کر دیں گے۔" آبی نے کہا اور پھر وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر اس میں جا بیٹھا۔ پھجے نے اسی وقت عرفان کی گاڑی چلائی اور آگے لے گیا۔ مزدا اچھی تھی۔ بالکل نئی معلوم ہوتی تھی۔ میں اسے بھگاتا ہوا اسی وقت محسن کلینک جا پہنچا۔ رات کا تیسرا پہر بھی کھسک چلا تھا اور ہم تھکن سے چور ہو رہے تھے۔ ہم نے گاڑی کلینک کے ایک گیراج میں رکھی اور ڈاکٹر عذرا کے کمرے سے گزر کر آسیہ کے کمرے میں جا پہنچے۔ خاداں ایک کونے میں فوم کا گدا ڈال کر سو چکی تھی۔ لحاف اس کے پاس کوئی نہیں تھا دو کمبل اس نے اوڑھ رکھے تھے۔ اور وہ گہری نیند میں تھی۔ میں نے آسیہ پر نگاہ ڈالی تو اس کی پیلی رنگت اور سوکھا سا چہرہ دیکھ کر میرا دل بھر آیا۔ وہ آدھی بھی نہیں رہ گئی تھی۔ درد نے اسے مروڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ بھی سوئی ہوئی تھی۔ اس کی سانس کی آمد و رفت مجھے یہ احساس دلاتی تھی کہ وہ بہت کمزور ہو چکی ہے۔

انھیں جگانا ہم نے مناسب نہ سمجھا۔ آبی میرے کندھے تھپتھپاتا ہوا مجھے باہر لے آیا اور ہم دونوں ڈاکٹر عذرا کے کمرے میں جا کر قالین پر لیٹ گئے۔ دو گھڑی آرام ہمارے لیے بہت ضروری تھا۔ عرفان پہلو میں پڑے بیڈ پر ابھی تک بے سدھ پڑا تھا۔ ہم نے

اس پر بھی کمبل ڈال دیا تاکہ وہ سردی سے محفوظ رہے۔ ڈاکٹر عذرا کی دُوسری نرس اپنا کمرہ مقفل کر کے سو چکی تھی، اُسے بھی ہم نے جگانا مناسب نہ سمجھا اور سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ ہم دونوں بھوکے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ نہ مجھے نیند آئی نہ آبی کو۔ بس یوں ہی آنکھیں موندے کوئی ایک دو گھنٹے تک ہم نیند سے اُلجھتے رہے۔ پانچ بجے تو آبی اُٹھ بیٹھا۔ بولا۔

"چل یار! میرا تو بھوک کے مارے بُرا حال ہو رہا ہے۔"

"اس وقت تو شہر میں کچھ بھی نہیں مل سکے گا۔"

"ہم اسٹیشن پر سے کچھ کھا آتے ہیں۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر میں بھی اُٹھ بیٹھا۔ سب سے زیادہ تشویش ہمیں اس تھیلے کے بارے میں تھی۔ اُس کو کسی جگہ محفوظ کر لینا بہت ضروری تھا مگر ہمارا کوئی ٹھکانا نہ ہی کہاں تھا کہ ہم اس کو رکھ سکتے۔۔۔ ہم اسے ساتھ لے کر گاڑی میں جا بیٹھے۔

اسٹیشن پر پہنچ کر ہم نے گاڑی سائیکل اسٹینڈ کے قریب ایک محفوظ جگہ پر کھڑی کر کے لاک کی اور اسٹینڈ کے ٹھیکیدار کو دو روپے دے کر اس کی نگرانی پر مامور کر دیا۔ کھانا ہمیں اسٹیشن پر بہت ہی عُمدہ مل گیا۔ ہماری پسند کی ساری ہی چیزیں وہاں موجود تھیں۔ جب ہم پیٹ بھر کر باہر نکلے تو آبی ایک لمبی سی خوشحالی بھری ڈکار لے کر بولا۔

"جیلانی! تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔"

"ہاں یار! ہم ہی ناشکرے اور بے صبرے ہیں ورنہ وہ تو ہم ایسے کُتوں پر بھی اپنا کرم جاری رکھتا ہے۔"

"بس اتنی بات یاد رکھ۔ اور کبھی کسی کی دلآزاری نہ کیا کر۔ بچے! تو کبھی اُن کے ہاتھ آ گیا نا تو قسم اللہ کی تجھے وہ شاہی قلعے کے دروازے پر لٹکا کر گولی ماریں گے۔"

"خدا ہر بلا سے محفوظ رکھے آبی! تو کیسی گندی گندی باتیں سوچا کرتا ہے یار! ہم نے بھلا کسی کا کیا بگاڑا ہے۔ گُردہ دیا ہے گُردہ لے رہے ہیں۔ بس اتنی سی بات تو ہے۔"

"چل اب سیدھا کلینک چل۔ وہ مال بھی گاڑی میں پڑا ہے۔" تھیلا ہمیں یاد آیا تو ہم بھاگ کر کار تک پہنچے۔ ہمارا مال بالکل محفوظ پڑا تھا۔ سیٹ کے نیچے۔

کچھ ہی دیر بعد ہم کلینک جا پہنچے۔ سُورج نکلنے سے پہلے پہلے ہم منہ ہاتھ دھو کر تازہ دم ہو چکے تھے۔

آبی ٹھہر ٹھہر کر عرفان کو دیکھنے جا رہا تھا۔ تیسری بار وہ تیزی سے باہر نکلا اور بولا۔

"میرا خیال ہے وہ ہوش میں آ رہا ہے۔" اس کی یہ بات سُنتے ہی میں عرفان کے پاس جا پہنچا۔ میں نے اس کو ہلا جُلا کر دیکھا تو مجھے آبی کا خدشہ بے بنیاد معلوم ہوا۔ ہوش کی سرحد سے ابھی وہ بدبخت بہت دُور تھا۔ میں اُس پر کمبل ڈال کر واپس آیا تو آبی بولا۔

"تجھے معلوم ہے کہ ہم کتنی بڑی غلطی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ پھر اس ڈاکٹر عرفان پر کبھی ہاتھ نہیں ڈالے گی۔"

"مگر اس نے وعدہ کر رکھا ہے۔"

"کچھ بھی ہو جائے وہ یہاں اپنے کلینک میں یہ کام نہیں

"تو پھر کیا کریں؟"

"اُس دُوسری نرس کو بُلاؤ، کیا نام ہے اُس کا۔۔۔ ہاں اُسے اُٹھا دو۔"

"کیا کرو گے اُسے اٹھا کر؟"

"اُس سے پوچھو کہ یہ ڈاکٹر کون ہے، شادی شدہ ہے کے شوہر کا کیا نام ہے اور اس کے بچے بھی ہیں کہ نہیں۔"

"یہ کون سی مشکل بات ہے۔ میں اُس سے فون پر بات کر یہ کہہ کر میں نے ٹیلیفون کے نمبر گھما دیے۔ ریسور ڈاکٹر عذرا نے ہی

"ہیلو۔"

"میں ہاشم خان بول رہا ہوں ڈاکٹر صاحب! کیا حال ہے آپ

"میں تو ٹھیک ہوں خان صاحب! آپ سُنائیں کوئی بندوبست

"جی ہاں۔ ہم نے پُورا انتظام کر لیا ہے۔"

"گڈ! اور ہماری فیس؟"

"اُس کا بھی ہم نے بندوبست کر لیا ہے بس اب آپ تیار آ جائیں مگر آپ کو ابھی بچے ہی نہیں چھوڑ رہے ہوں گے۔"

"ارے بچے ہی کتنے ہیں میرے۔ ایک دس سال کی بیٹی اور ایک بارہ سال کا بیٹا۔ وہ آج اسکول بھی نہیں جا رہے۔ ٹی وی کرکٹ میچ آ رہا ہے وہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ میں اُنہیں آیا کے پاس چھوڑ دوں گی۔"

"چلیں اچھا ہے مگر آپ کے شوہر کو بھی تو کوئی ذمّے داری سنبھالنی چاہیے۔"

"ارے آپ کو نہیں پتہ؟ کمال ہے میرے شوہر بیچارے دو سال پہلے کار کے ایک حادثے میں فوت ہو گئے تھے۔ اصل یہ کلینک انھوں نے ہی قائم کیا تھا اور اب وہی ہمارے کام آ رہا

"مجھے افسوس ہوا یہ سن کر ڈاکٹر صاحب۔ آپ واقعی بہت بہادر خاتون ہیں۔"

"زندگی تو گزارنی ہی ہے نا خان صاحب۔ اچھا میں بس آٹھ بجے پہنچ رہی ہوں۔ ڈونر صحت مند ہے نا؟"

"جی ہاں اس کی آپ فکر نہ کریں۔"

"پہلے جیسا تو نہیں؟"

"ہم نے ٹھوک بجا کر دیکھ لیا ہے۔"

"گڈ! تو پھر اطمینان رکھیں سب ٹھیک ہو جائے گا۔" یہ کہہ کر

فون بند کر دیا۔

"سن لیا تم نے۔ اس کے دو بچے ہیں۔ ایک بیٹی اور ایک بیٹا اور وہ دونوں آج ٹی وی پر کرکٹ میچ دیکھنے کے لیے گھر پر رہیں گے آیا کی نگرانی میں۔"

"ہوں! تو گویا یہ بیچاری بیوہ ہے۔ پھر بھی مجھے ڈر ہے یار۔ عرفان اس کا ہم پیشہ بھی ہے اور ان لوگوں سے اس کے تعلقات بھی ہیں۔"

"کچھ بھی نہیں ہو گا یار۔ وہ ایک لاکھ یُوں ہی تو نہیں لے رہی ہے جانے دے اُسے۔"

"اور اگر اُس نے کوئی گڑبڑ کر دی تو؟"

"تو۔۔۔ تو اس کا علاج یہ ہے کہ اگر اس نے انکار کر دیا تو تم فوراً اس کے گھر پہنچ کر اس کے دونوں بچوں کو آیا سمیت اغوا کر لو۔ اُس کا گلا ہم دبائیں گے تو خود سیدھی ہو جائے گی۔"

"یہی میں تمھارے منہ سے سننا چاہتا تھا۔ اب فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔"

"خدا خیر کرے۔ اُسے کوئی گڑبڑ نہیں کرنی چاہیے یہ آسیہ کی زندگی کا سوال ہے۔"

میرا دل ڈوبنے لگا تھا۔ آبی کے خدشے اپنی جگہ درست تھے صُورتِ حال بڑی ہی نازک تھی اور آسیہ کا حال دم بدم پتلا ہوتا جا رہا تھا۔ ڈاکٹر عذرا کی طرف سے کسی قسم کی چُناں وچُنیں کے ہم متحمل ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ وہ چمکتو اگر کوئی آں ہاں شاں کرتی ہے تو پھر تو خدا ہی جانتا ہے کہ وہاں کیا ہو گا۔ آسیہ تو موت سے کھٹم کھٹا ہو رہی تھی۔ اُس کے علاج میں ذرا سا توقف مُہلک ثابت ہو سکتا تھا۔ اُس کی زندگی کا انحصار ڈاکٹر عذرا کے مکمل تعاون پر تھا جس کے بارے میں مجھے آبی کے خدشوں نے وہم میں ڈال دیا تھا۔

بہر حال ڈاکٹر عذرا ٹھیک آٹھ بجے کلینک میں آ پہنچی۔ وہ بہت خوش تھی۔ اُسے لباس پہننے کا سلیقہ آتا تھا۔ اس روز بھی وہ اپنی عمر سے بہت کم نظر آنے کی کوشش کر کے آئی تھی۔ وہ ہم سے بڑے تپاک سے ملی اور بولی۔

"کہاں ہے وہ آپ کا ڈونر؟"

"وہ اِدھر ہی ہے ساتھ کے کمرے میں۔ آپ پہلے یہ اپنی فیس لے لیں۔" یہ کہہ کر میں نے نوّے ہزار روپے اس کے سامنے ڈھیر کر دیے۔ وہ تو خوش ہو گئی۔ اُس کی آنکھوں کی چمک اس کی دلی کیفیت کی چغلی کھا رہی تھی۔ دس دس ہزار کے نئے کڑکڑے نوٹوں کی نو گڈیاں اس نے تول تول کر اپنے سامنے رکھیں اور بولی۔

"کمال ہے ہاشم صاحب میں تو سمجھی تھی کہ آپ بھاگ جائیں گے اتنے مہنگے علاج کا نام سن کر بڑے بڑے لوگ اپنے پیاروں کو قبروں میں اتر جانے دیتے ہیں مگر آپ نے تو مجھے حیران کر دیا۔"

"میری ایک ہی بہن ہے ڈاکٹر اور میں اُس پر اپنا سب کچھ لُٹا کر بھی سمجھوں گا کہ میں نے کچھ نہیں کیا۔ اُس کی زندگی مجھے سارے جہاں سے زیادہ عزیز ہے۔" میں نے بڑے ہی آزردہ لہجے میں کہا۔ قبر کا ذکر سُن کر میری روح کانپ گئی تھی۔ موت کے تصوّر نے مجھے نڈھال کر دیا تھا۔ میری دل گیر آواز سُن کر وہ بھی متاثر ہوئی۔ بولی۔

"میں آپ کی پریشانی کو سمجھتی ہوں ہاشم صاحب، دعا کریں اللہ بہتر کرے گا۔ میں نے اس آپریشن کی تربیت ڈاکٹر دھمن سے لی تھی۔ اس سے بڑا سرجن یہاں اور کوئی نہیں ہوتا تھا۔ اب تو خیر بہت سے لوگ اعضا کی پیوندکاری باہر سے سیکھ آئے ہیں۔"

"آپ کی بڑی مہربانی ہے ڈاکٹر! اب آپ اس آدمی کا معائنہ کر لیں وہ بے ہوش ہے۔"

"اسے بھی آپ بے ہوش کر کے لائے ہیں۔ یہ قصہ کیا ہے اور آپ لوگوں کو بے ہوش کیسے کر لیتے ہیں۔"

"یہ ایک خاص نسخہ ہے۔ ایک خاص عمل ہے جو ہم خاص خاص لوگوں پر آزماتے ہیں۔ جن کے نصیب اچھے ہوں وہی یہ نعمت پاتے ہیں، خود فراموشی کی۔۔۔ بہر حال آپ اس ڈونر کو دیکھ لیں مگر آپ کو اپنی شرط پر قائم رہنا ہو گا۔"

"وہ کیا؟"

"یہی کہ آپ کو اس بات سے کوئی غرض نہیں ہو گی کہ وہ آدمی کون ہے اور ہم اسے کس طرح لائے ہیں؟"

"کوئی خطرے کی بات تو نہیں ہے؟"

"یہ سب کچھ آپ ہم پر چھوڑ دیں خطرے ہمارے فیس آپ کی۔" آبی نے بڑی جرأت سے اس کا کندھا تھپتھپایا۔ وہ سمٹ کر پیچھے ہٹی اور مسکراتی ہوئی اس دروازے کے اندر جا گھسی جہاں ڈاکٹر عرفان کو ہم نے لٹا رکھا تھا۔

میں نے آگے بڑھ کر اس کے مُنہ پر سے کمبل ہٹا دیا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر ڈاکٹر عذرا یُوں پیچھے ہٹی جیسے اس نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔ اس کا رنگ فق ہو گیا۔ آبی کا خدشہ درست ثابت ہو رہا تھا۔ وہ پیچھے ہٹی تو آبی سے ٹکرا گئی۔

"نہیں نہیں۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں۔ یہ تو ڈاکٹر عرفان ہے۔"

آبی نے اس اثنا میں اس چھوٹے سے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ ڈاکٹر عذرا کا دم پھولنے لگا، یوں جیسے وہ کڑے کوسوں کی مسافت طے کر کے وہاں پہنچی ہو۔

"آپ تو گھبرا ہی گئی ہیں۔ ہوا کیا ہے آخر؟" آبی نے بڑے جمے ہوئے لہجے میں کہا۔

"یہ۔۔۔ یہ ڈاکٹر عرفان ہے جناب! ڈاکٹر دمن کے کلینک کا سب سے بڑا ڈاکٹر۔"

"جی ہاں ہمیں معلوم ہے اور یہ اس شہر کا سب سے بڑا چور ہے۔ یہی وہ آدمی ہے جس نے میری کسی بھی فریاد پر کان نہیں دھرا تھا۔ اسی نے فیصلہ دیا تھا کہ میرا گردہ کسی شیخ کے ہاتھ بڑی آسانی سے پانچ لاکھ ریال میں بیچا جا سکتا ہے کیونکہ اُسے کسی ایسے ہی گردے کی ضرورت ہے۔"

میں نے ڈاکٹر عذرا کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"کچھ بھی ہو ہاشم صاحب مجھے معاف رکھیں میں یہ کام نہیں کر سکتی۔"

"ہمارے درمیان معاہدہ ہو چکا ہے ڈاکٹر! اور ہم آپ کو فیس دے چکے ہیں۔"

"میں وہ فیس آپ کو واپس کر دیتی ہوں آپ اپنی مریضہ کو یہاں سے کہیں اور لے جائیں۔ میں یہ آپریشن نہیں کروں گی اور میں آپ کو ڈاکٹر عرفان کے ساتھ کوئی زیادتی کرنے کی بھی اجازت نہیں دے سکتی۔"

"آپ ایسا نہیں کریں گی ڈاکٹر۔"

"کیوں نہیں، میں آپ کی نوکر نہیں ہوں۔ میرا راستہ چھوڑ دیں۔ آپ زبردستی مجھ سے کوئی کام نہیں کروا سکتے۔ ہٹ جائیں دروازے سے۔" وہ بدک گئی تھی۔ اس کے خوف نے اس کی زبان کو دودھاری خنجر بنا دیا تھا۔

آبی نے دروازہ کھول کر اُسے اپنی نشست پر بیٹھنے کے لیے راہ دے دی۔ راہداری میں کھلنے والا دروازہ بہرحال اندر سے بند تھا۔ وہ اپنی بڑی سی آرام دہ کرسی پر بیٹھ گئی تو ہم بھی اُس کے دائیں بائیں رکھی کرسیوں میں دھنس گئے۔ وہ شدید ذہنی کش مکش میں مبتلا تھی۔ نوٹے ہزار کے نوٹ ابھی تک اس کی میز کی نچلی دراز میں مقفل پڑے تھے۔ اور وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ اُسے کیا کرنا چاہیے۔ میں نے اس کی طرف جھک کر بڑی لجاجت سے کہا۔

"آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہیں ڈاکٹر اور وقت تیزی سے گزرتا جا رہا ہے آسیہ کی زندگی خطرے میں ہے۔"

"کچھ بھی ہو، میں یہ کام نہیں کروں گی۔" یہ کہہ کر اُس نے دراز کھول کر نوٹ ہمارے سامنے رکھ دیے۔ "یہ لے جائیں اور ڈاکٹر عرفان کو جہاں سے لائے ہیں وہیں چھوڑ آئیں ورنہ مجھے کوئی اور اقدام اٹھانا پڑے گا۔"

"ہمیں آپ کے پاس ڈھلوں صاحب نے بھیجا ہے۔" آبی نے اُسے یاد دلایا۔

"میں جانتی ہوں مگر۔۔۔ مگر میں ڈاکٹر عرفان کو برباد نہیں کر سکتی۔"

"وہ زندہ رہے گا اسے کچھ بھی نہیں ہو گا۔ جس طرح میں زندہ ہوں جس طرح حیدر زندہ ہے۔ اسی طرح وہ بھی ایک گردے پر بڑے اطمینان سے زندگی گزار سکتا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے مگر وہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہے بڑا [illegible] ڈاکٹر ہے اور ہم پر بھی اُس کے احسانات ہیں۔"

"اچھی طرح سوچ لیں ڈاکٹر! یہ وہ آدمی ہے جس [illegible] سے لوگوں کو دھوکے سے اُن کے گردوں سے محروم کر دیا ہے [illegible] کو پچاس ہزار روپے اور دے دیں گے ڈیڑھ لاکھ لے لیں۔"

"مجھے کسی رقم کی ضرورت نہیں ہے میں جا رہی ہوں [illegible] ابھی انہیں یہاں سے لے جا کر وہیں چھوڑ دیں جہاں سے آپ اٹھا کر لائے ہیں۔ میں جانتی ہوں آپ نے انہیں اغوا کیا ہے" وہ بڑے ہی تپے ہوئے دبنگ لہجے میں بول رہی تھی۔

"آپ ہمیں نہیں جانتی ہیں ڈاکٹر! بہرحال آپ [illegible] میں ابھی آ رہا ہوں۔" یہ کہہ کر آبی اپنی جگہ سے اُٹھ گیا [illegible] دھیان رکھیں ہاشم صاحب میں ذرا ڈھلوں صاحب سے بات کر [illegible] اس کے بعد یہ جو چاہیں کریں۔" آبی مجھے گہری گہری نظروں [illegible] دیکھتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا تو میں بھی اس کے پاس [illegible] اس نے اپنا منہ میرے کان کے قریب کر کے کہا "میں اس [illegible] جا رہا ہوں تم سے فون پر بات کروں گا اسے یہاں سے ہلنے [illegible]"

یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔ اس ذرا سی مہلت سے فائدہ اٹھا [illegible] ڈاکٹر عذرا نے فون پر کوئی نمبر گھمانا شروع کر دیا۔ میں نے جلدی [illegible] ریسیور اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔

"مجھے آپ سختی پر مجبور نہ کریں ڈاکٹر۔ یہاں سے اُٹھ جا[illegible]" میں نے پستول کی نالی اس کی کنپٹی پر لگا دی۔ وہ تھر تھر کانپ [illegible] "اُٹھو بہت نخرے کر چکی ہو تم۔ اٹھو۔" یہ کہہ کر میں[illegible] اُسے بازو سے پکڑ کر اُس کی کرسی میں سے نکال کر اُسے میز [illegible] ایک اور کرسی پر بٹھا دیا۔

"دیکھو ڈاکٹر! اپنی ضد چھوڑ دو۔ تمھیں پتہ نہیں ہم کون [illegible] تمھیں ہر حال میں یہ آپریشن کرنا ہو گا۔ تمھاری یہ بے وقت [illegible] اصول پرستی تمھیں لے ڈوبے گی اور یاد رکھو میرا یہ پستول بے [illegible] چلتا ہے اور اس کی گولی آر پار سوراخ کر دیتی ہے۔" یہ کہہ کر [illegible] اُسے اور خوفزدہ کرنے کے لیے سامنے کی دیوار میں ٹنگے ایک [illegible] سنگے کے حنوط شدہ سر پر گولی چلا دی۔ گولی اس کی آنکھ میں لگی [illegible] سی ٹھک ایسی آواز پیدا ہوئی، اور وہ سر اپنی کیل سے اچھل کر [illegible] آ رہا۔ ڈاکٹر عذرا کا رنگ فق ہو گیا مگر ابھی تک وہ اپنی [illegible] جم کر بیٹھی تھی۔ اس کا عزم متزلزل نہیں ہو پایا تھا۔ خاصی [illegible] دل و دماغ کی عورت تھی وہ۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر اس [illegible] میری بات مان بھی لی تو وہ ڈاکٹر عرفان کو تو شاید گزند نہ پہنچ [illegible] دے۔ اُس کا گردہ بھی شاید نکال دے مگر اس بات کی کیا ضمانت [illegible] کہ وہ آسیہ کے علاج میں جان بوجھ کر کوئی خرابی پیدا نہیں کر[illegible]

وہ نازک آپریشن تھا۔ اس میں اس کی ذرا سی بدنیتی آسیہ کو موت کے منہ میں ڈال سکتی تھی اور یہ ایسی گرہ تھی جسے کھولنا میرے لیے کسی بھی طرح ممکن نہ تھا۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی میں نے عذرا کو اس کی جگہ سے اٹھا کر باتھ روم میں دھکیل دیا۔ اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ دائیں ہاتھ پٹیاں باندھنے کا ایک گولہ سا دھرا تھا۔ میں نے وہ اُٹھا لیا۔

"مجھے افسوس ہے ڈاکٹر عذرا! میں تمھیں باندھ دینے پر مجبور ہوں۔ ذرا سی بھی تم نے گڑبڑ کی تو میں تمھیں اور اس عرفان کو گولی مار کر یہاں سے نکل جاؤں گا۔"

میری یہ دھمکی کارگر ثابت ہوئی۔ میں نے اُس کے دونوں بازو کمر پر باندھے اور پھر ایک کرسی وہاں لے جا کر اُسے میں نے اُس پر بٹھا دیا۔ اُس کے پاؤں بھی میں نے کرسی کے پایوں سے جکڑ دیے اور پھر باتھ روم کی الماری سے ایک ٹیپ نکال کر اُس کے منہ پر لگا دیا۔ اُس کی آواز سے اب میں نفرت کرنے لگا تھا۔

دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ میں نے آگے بڑھ کر چٹخنی نیچے گرا دی۔ سامنے خورشید کھڑی تھی۔

"ڈاکٹر صاحب کہاں ہیں؟"

"وہ تو یہاں نہیں ہیں کوئی دس منٹ پہلے باہر نکلی تھیں۔" میں نے بڑے ہی مطمئن لہجے میں کہا۔ "کیا بات ہے خیر تو ہے؟ آسیہ کا کیا حال ہے؟"

"درد تو اب نہیں رہا۔ ناشتے میں میں نے اُسے دودھ ہی دیا ہے۔ ٹیکہ بھی میں نے لگا دیا ہے مگر اُن کے پیشاب میں خون آنے لگا ہے۔ یہی میں انہیں بتلانے آئی ہوں۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ وہ آتی ہیں تو میں انہیں بتاتا ہوں۔" میری یہ بات سُن کر وہ پیچھے ہٹی تو میں دروازہ بند کر کے باتھ روم میں جا گھسا۔ میں نے ڈاکٹر کے منہ پر سے ٹیپ اُتار دیا۔

"میری بات غور سے سنو ڈاکٹر۔ آسیہ کے پیشاب میں خون آ رہا ہے اُس کی حالت بگڑتی جا رہی ہے خون خرابے سے بچنا چاہتی ہو تو یہ آپریشن فوراً کر دو۔"

"نہیں! میں تمھاری کوئی بات نہیں سنوں گی۔ آسیہ مرتی ہے تو اُسے مرنے دو۔"

وہ ابھی تک اپنے فیصلے پر قائم تھی۔ میں اُسے کوئی اذیت نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس کے دل میں اپنے خلاف نفرت پیدا کر کے میں کچھ بھی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ ورنہ میرے دل میں آئی تھی کہ اُسے اتنا ماروں کہ اُس کی ہڈیاں چٹخ جائیں۔ اس نے مجھے اس مرحلے پر اپنی ضد کی وجہ سے بے بس کر دیا تھا۔ میں نے ایک بار پھر ٹیپ اس کے ہونٹوں پر چپکا دی۔ اور عرفان کے پاس جا پہنچا۔ وہ بدبخت ہوش میں آ چکا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں ابھی تک بندھے تھے۔ میں نے ٹیپ لے جا کر اُس نے منہ پر لگا دی۔ وہ ٹک ٹک مجھے دیکھ رہا تھا۔ ابھی تک مجھے وہ پہچان نہیں سکا تھا مگر خوف اور دہشت کی وجہ سے اس کے منہ سے کوئی بات نہیں نکل رہی تھی اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ اور یہ سب کچھ اس کے ساتھ کیوں ہو رہا ہے حالانکہ میں نے اس کو اشارۃً رات ہی سمجھا دیا تھا کہ اس کا گردہ صحت مند ہو گا۔ وہ مجھے پہچان نہ سکا تھا تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ جس طبقے سے تعلق رکھتا تھا وہاں پہنچ کر آدمی خاص خاص چہروں کو ہی یاد رکھتا ہے۔ وہ بورژوا نظر کسی عام آدمی کو ذہن میں داخل ہی نہیں ہونے دیتی۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس عرفان کی تجوری سے کوئی رقم بھی مل سکے گی کیونکہ بینک اُن کی دولت کے دارالامان ہیں مگر میں سمجھتا ہوں کہ وہ ڈاکٹر بینک سے بھی خوفزدہ تھا اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ روپیہ اس کے پاس جائز طریقوں سے نہیں آیا تھا۔ عین ممکن ہے کہ اس نے ڈاکٹر دمن کو اُس کی غیر حاضری میں اُس کے حصے سے بھی محروم رکھا ہو۔ صورتِ حال کچھ بھی رہی ہو۔ آبی نے رات اُس تجوری پر ہاتھ مار کر اچھا ہی کیا تھا۔ اُن کا سارا اثاثہ وہ اٹھا لایا تھا۔ اگر وہ نہ بھی ملتا تو کوئی فکر کی بات نہیں تھی۔ کیونکہ میرے پاس بینک میں خاصی رقم محفوظ تھی۔ اُسے میں اپنے استعمال میں لا سکتا تھا مگر خدا جانے کیا بات تھی۔ میں اُس رقم کے لیے بینک میں جانے سے اب تک گریزاں تھا۔ خوف مجھے یہی تھا کہ میں اُن کے سامنے ہوا تو وہ لوگ مجھے کسی نہ کسی مخمصے میں ضرور پھنسا دیں گے۔

آبی کو کلینک سے نکلے پون گھنٹہ ہو چکا تھا کہ اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ میں نے ریسیور اُٹھایا تو مجھے دُوسری طرف سے آبی کی آواز سُنائی دی۔

"کیا حال ہے یا حضرت؟"

"ٹھیک ہوں کہو کیا خبر ہے؟"

"خبریں اچھی ہیں۔ وہ ڈاکٹر کہاں ہے؟"

"ادھر ہی ہے۔"

"اُسے فون پر لاؤ۔"

"مجھے بھی تو کچھ بتاؤ۔"

"وہ تینوں میرے قبضے میں ہیں۔ یہ خبر میں خود اُسے سناؤں گا۔"

میں نے ریسیور میز پر رکھا اور باتھ روم سے ڈاکٹر عذرا کو اٹھا لایا۔

"یہ تمھارا فون ہے ڈاکٹر! اسے غور سے سنو۔" یہ کہہ کر میں نے ٹیپ اُس کے مُنہ سے اتار کر ریسیور اس کے کان سے لگا دیا۔ میں نے بھی اپنا کان قریب کر لیا۔ آبی نے بڑی بھاری بھر کم آواز میں کہا۔

"سنو ڈاکٹر! تمہارے دونوں بچے میں نے قبضے میں لے لیے ہیں اور آپا بھی۔ اگر اُن کی زندگی چاہتی ہو تو ہاشم صاحب کے کہنے پر عمل کرو۔ ورنہ میں ذمے دار نہ ہوں گا۔" میں نے پستول اس کی کنپٹی سے لگا رکھا تھا۔

"نہیں نہیں۔ خدا کے لیے انہیں کچھ نہ کہنا۔"

"تو پھر اپنا فیصلہ مجھے سُنا دو۔" آبی نے کہا۔

"میں آپریشن کر دیتی ہوں۔ جو تم کہو گے میں کر دوں گی۔ مگر میرے بچوں کو کچھ نہ کہنا۔" ڈاکٹر عذرا نے ہتھیار ڈال دیے۔

"تم جب تک اس کام سے فارغ نہیں ہو جاتی ہو، یہ سب میری تحویل میں رہیں گے انھیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی مگر اس وقت تک جب تک تم ہم سے تعاون کرتی رہو گی۔ کیونکہ جس آدمی کو ہم تمہارے پاس لائے ہیں وہ بدترین قسم کا مجرم ہے۔ اُس کے پاس کوئی باقاعدہ ڈاکٹری کی سند نہیں ہے۔ سمجھتی ہو کہ نہیں۔ اس نے صرف اپنی بے مثال ذہانت سے یہ سب کچھ سیکھ لیا ہے ورنہ وہ ایف ایس سی میں فیل ہو گیا تھا۔ پھر وہ ڈسپنسر بنا اور ڈاکٹر دمن کا وہ آہستہ آہستہ دستِ راست بن گیا۔ اگر یقین نہیں آتا تو اس سے پوچھ لو۔ اب فون ہاشم صاحب کو دے دو۔" ڈاکٹر عذرا نے کان پیچھے ہٹا لیا۔

"ہیلو۔"

"دیکھو اس عرفان سے سچ اس کے سامنے اگلوا دو تاکہ اُس کی اصلیت کا اسے علم ہو جائے۔"

"تمھیں کیسے پتہ چلا ہے اس بات کا؟"

"رات کو جو کچھ ہم وہاں سے اُٹھا لائے ہیں اس میں چند خطوط بھی ہیں۔ وہ میں نے اب پڑھے ہیں، وہیں سے ایک ڈائری بھی مجھے ملی ہے۔ وہ ڈاکٹر عرفان کی ذاتی ڈائری ہے۔ یہ سالا کافی دن سعودی عرب میں رہا ہے۔ رہنے والا یہ واں رادھا رام کا ہے وہ جو چھانگا مانگا کے پاس ہے۔ اُس نے اس ڈائری میں بڑی تفصیل سے اپنے سارے حالات قلمبند کیے ہیں اور اُس میں اُس نے تمھارا اور آسیہ کا ذکر بھی کیا ہے۔"

"یہ تو بہت ہی اچھا ہوا ہے یار۔ میں اب زیادہ دل جمعی سے بات کر سکوں گا۔ تم اپنی جگہ ڈٹے رہو۔" یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔

ڈاکٹر عذرا رونے لگی تھی۔ میں نے بڑی احتیاط سے اس کے آنسو پونچھ کر اس کے جکڑے بند کھول دیے۔

"میرے دل میں آپ کا بہت احترام ہے ڈاکٹر۔ آپ کے بچے بالکل محفوظ ہیں۔ میں آپ کو دو لاکھ روپیہ دوں گا۔ آسیہ کے علاج میں تاخیر نہ کریں۔ جو کچھ ہوا ہے اس کی میں آپ سے معذرت چاہتا ہوں۔ مگر آپ کو حالات سے سمجھوتہ کرنا ہو گا۔"

وہ اب بہت حد تک صورتِ حال کو اس کے اصلی رنگ میں دیکھ چکی تھی۔ وہ کرسی سے لڑکھڑاتی ہوئی اُٹھی اور بولی۔

"ٹھیک ہے خان صاحب میں۔۔۔ یہ آپریشن کر دوں گی۔"

"آپ کو میں آخری بار خبردار کر رہا ہوں کہ آپ کے بچوں کی سلامتی کا انحصار آپ کے اپنے رویے پر ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔"

"تو پھر اس عرفان سے پہلے اس کی حقیقت ... جاننا چاہو گی؟"

"نہیں، یہ کام بعد میں بھی ہو سکتا ہے۔" وہ اب کی بار دلجمعی سے بولی۔

"آپ یہ نوٹ دراز میں رکھ لیں ایک لاکھ میں آپ کو اور دے دوں گا۔ اپنا کام شروع کریں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں ذرا منہ ہاتھ دھو لوں پھر کچھ کرتی ہوں" یہ کہہ کر وہ باتھ روم میں جا گھسی۔ میں نے اسے دروازہ بند نہیں کرنے دیا۔ اُس نے منہ ہاتھ دھو کر آئینے کے سامنے جا کر اپنا حُلیہ درست کیا اور پھر بڑی سنجیدہ سی صورت بنا کر اپنی کرسی پر جا بیٹھی۔ نوٹ اُس نے دراز میں رکھ کر مقفل کیے اور پھر فون کے نمبر گھمانے لگی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"کہاں فون کر رہی ہیں؟"

"گھر پر۔ اپنے سعدی بیٹے سے بات کروں گی۔"

"ٹھیک ہے۔ ملائیں نمبر۔"

جب وہ فون ملا چکی تو بولی۔ "ہیلو۔ دیکھیں جناب میرے بیٹے سے میری بات کروا دیں۔" میں نے اپنا کان ریسیور کے ساتھ لگا دیا تو آبی کی دھیمی سی آواز مجھے سنائی دی۔

"لیں بات کریں۔ چل بھئی سعدی بہادر اِدھر آ۔ اپنی امی سے بات کر۔"

"ہیلو ممی۔" ایک بچے کی قدرے گھبرائی ہوئی آواز مجھے سنائی دی۔

"کیسے ہو بیٹے؟"

"ٹھیک ہوں ممی۔ پر۔۔۔ وہ کہتا ہے جان سے مار دوں گا۔"

عذرا کا رنگ پھر اُڑنے لگا۔

"ایسے ہی مذاق کرتے ہیں وہ تمھارے انکل ہیں، بس چپ چاپ بیٹھے رہو۔ میں شام کو آؤں گی۔ وہ تمھیں کچھ نہیں کہیں گے۔ ٹی وی دیکھ رہے ہو نا؟"

"جی ممی! ویسے تو وہ بہت اچھے ہیں، پر انھوں نے آپا کو غائب کر دیا ہے۔"

"یہ غلط کہہ رہا ہے ڈاکٹر! آپا اُدھر اپنے کمرے میں بالکل محفوظ ہے۔" آبی کی آواز آئی۔

"ٹھیک ہے۔ اُن کو کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہیے۔"

"آپ بالکل مطمئن ہو کر آسیہ کا علاج کریں۔" یہ کہہ کر آبی نے فون بند کر دیا۔

کچھ ہی دیر بعد ڈاکٹر عذرا نے عرفان کے چہرے پر پٹیاں کچھ اس طرح لپیٹ دیں کہ اُس کی اب صرف ناک ہی نظر آتی تھی۔ آنکھیں ناک منہ کان سب اس نے پٹیوں سے ڈھانپ دیے اور پھر وہ نرسوں کی مدد سے اُسے اسٹریچر پر ڈال کر باہر لے گئی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس نے عرفان کا چہرہ کیوں اتنی پٹیوں سے ڈھانپ دیا ہے۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی اسے شناخت کر سکے۔ ڈاکٹر عرفان بھی اسے پہچان نہیں سکا تھا کیونکہ اُس کے سامنے وہ اپنا منہ لپیٹ کر گئی تھی۔

اُس نے بالآخر ہتھیار ڈال دیے تھے۔ میں تین بجے تک اُس کے کمرے میں بند ہو کر بیٹھا رہا۔ اس دوران آبی سے میں نے فون پر رابطہ قائم رکھا۔ اور سارے معاملات ہماری منشا کے مطابق طے پا رہے تھے۔ ڈر مجھے یہ تھا کہ بیچ میں کسی طرف سے کوئی ناگہانی آفت نہ آ جائے۔ اگرچہ ہم نے ہر طرح احتیاط سے کام لیا تھا مگر اس کے باوجود میں بہت فکرمند تھا۔

ڈاکٹر عذرا ساڑھے تین بجے اپنے کمرے میں واپس آئی۔ وہ بہت ہی تھکی ہوئی تھی اور پژمردہ سی نظر آ رہی تھی۔ وہ تنہا تھی۔ اُسے دیکھتے ہی میں اپنی جگہ سے اُٹھ بیٹھا۔

"کیا خبر ہے ڈاکٹر؟"

"سب ٹھیک ہے۔ میں نے ڈاکٹر عرفان کو بے ہوش کر رکھا ہے، اُسے آپ لے جا کر شفا بار کلینک میں چھوڑ آئیں اور اپنی طرف سے کوئی رقعہ بھی وہاں رکھ آئیں۔ تاکہ ڈاکٹر انصاری اس کو سنبھال سکے۔ میں نے اس کا ایک گردہ نکال کر آسیہ کے جسم میں لگا دیا ہے اور وہ اُسے قبول بھی کر چکی ہے۔ اس کا زخم مندمل ہونے میں دو ہفتے لگیں گے۔ میں کسی طرح ڈاکٹر عرفان کے سامنے نہیں آنا چاہتی۔"

"میں آپ کا بے حد شکرگزار ہوں ڈاکٹر۔ جو زحمت ہم نے آپ کو دی اس کی میں معذرت چاہتا ہوں۔"

"نہیں! درمیان میں دو لاکھ روپیہ موجود ہے۔ معذرت کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ نے میرے گھر پر فون کیا تھا؟"

"جی ہاں! وہاں سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے۔ بیشک آپ فون پر معلوم کر لیں۔ ڈاکٹر عرفان کو رات کے وقت یہاں سے نکال لیں گے۔ آسیہ اس وقت کہاں ہے؟"

"وہ اپنے بیڈ پر ہے اور شام سے پہلے ہوش میں نہیں آئے گی۔ آپ کل تک اس سے کوئی بات نہ کریں اور اس کے بارے میں آپ اب بالکل فکرمند نہ ہوں۔"

"ٹھیک ہے، اب آپ گھر جانا چاہتی ہیں؟"

"ہاں، میں اپنے بچوں کو دیکھوں گی۔"

میں نے اس کے گھر فون کر کے آبی سے رابطہ قائم کیا۔ جب میں نے اُسے بتایا کہ سارے مراحل بخیر و خوبی طے ہو گئے ہیں تو وہ خوش ہو گیا، بولا۔ "ٹھیک ہے پیارے! مگر اس بات کی اپنے طور پر تصدیق تو کر لو۔"

"اس کا میرے پاس کوئی طریقہ نہیں ہے۔ دونوں کے پیٹ سلے ہوئے ہوں گے میں وہاں کیا دیکھوں۔"

"ہاں۔ یہ تو ہے بہرحال اب ڈاکٹر کو گھر بھیج دو۔"

"میں خود اس کے ساتھ آ رہا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔

ڈاکٹر عذرا ایک بار پھر باہر نکلی اور نرسوں کو ضروری ہدایات دے کر کوئی بیس منٹ بعد واپس آئی۔ اس نے مجھے بتایا کہ عرفان کو اس نے اپنے خاص مریضوں کے کمرے میں رکھا ہے اور وہ اسی کی نگرانی میں رہے گا۔ یہ اچھی بات تھی۔ وہ کچھ دیر مزید بیٹھ کر اس روز کے کاغذات مکمل کرتی رہی۔ کاغذات اور نوٹ ہزار کے نوٹ اپنے پرس میں ڈال کر گھر جانے کی تیاری کر رہی تھی کہ اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ ریسیور میں نے اٹھایا۔ دوسری طرف سے کسی آدمی کی بھاری بھرکم آواز سُنائی دی۔ "ڈاکٹر عذرا سے بات کرائیں میں تھانیدار غضنفر علی بول رہا ہوں۔"

"جی وہ باتھ روم میں ہیں، کہیے خیر تو ہے؟ میں اُن کا اسسٹنٹ نور احمد ہوں۔"

"دیکھیں نور صاحب کوئی آدھ گھنٹہ پہلے اُن کی آپا برادُنی نے تھانے میں اطلاع دی تھی کہ کسی نے اُن کے گھر میں گھس کر ڈاکٹر عذرا کے بچے یرغمال بنا لیے ہیں۔ ہم نے اُن کے گھر کا محاصرہ کر لیا۔ مگر جب ہم گھر میں داخل ہوئے تو وہ بدمعاش وہاں سے بھاگ چکا تھا۔ ڈاکٹر عذرا سے کہیں وہ فوراً گھر پہنچیں۔"

"جی بہتر! میں ابھی اُن کو بتا دیتا ہوں۔"

صورتِ حال ایک دم خراب ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر عذرا کی آپا برادُنی کسی نہ کسی طرح گھر سے فرار ہو کر تھانے پہنچنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ مگر کس طرح؟ اس سوال کا جواب مجھے نہیں سوجھ رہا تھا۔ ابھی میں نے ریسیور رکھا ہی تھا کہ کمرے کا دروازہ دھڑ سے کھل گیا۔ آبی پاگلوں کی طرح اندر داخل ہو رہا تھا وہ پولیس کی وردی میں ملبوس تھا۔ اسے دیکھ کر میں حیران ہی رہ گیا۔ اُس کا حُلیہ ہی بدلا ہوا تھا۔

اس کی وحشت دیدنی تھی وہ بہت بپھرا ہوا تھا۔ اس نے دروازہ تیزی سے اپنے پیچھے بند کیا اور پھر لعنت بھیجتا ہوا ڈاکٹر عذرا کی طرف بڑھا اور بولا۔

"تم نے اچھا نہیں کیا ڈاکٹر۔ پولیس کو خبردار کر کے تم نے بدترین قسم کی وعدہ خلافی کی ہے۔" اس نے پستول سیدھے ہاتھ میں تھام لیا تھا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو یار! تمھیں سخت غلط فہمی ہوئی ہے ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔" میں نے اسے روکتے ہوئے کہا۔ وہ ڈاکٹر عذرا کے اوپر

ہی جا چڑھا تھا۔ اور وہ بیچاری خوف سے پیلی پڑ گئی تھی۔

"تمھیں کیا پتہ اس نے کیا کر دیا ہے۔ اس نے پولیس کو اپنے گھر بھیج دیا تھا حالانکہ میں نے اس کے بچوں کو کوئی تکلیف نہیں دی۔"

"اِن کا کوئی قصور نہیں ہے میرے بھائی۔ ابھی ابھی انسپکٹر غضنفر کا فون آیا تھا۔ اُسے اِن کی آیا نے تھانے جا کر اطلاع دی تھی۔"

"آیا؟ مگر وہ تو دوسرے کمرے میں بندھی پڑی تھی۔ وہ تھانے کس طرح جا سکتی تھی؟"

"یہ تو مجھے پتہ نہیں مگر اُس تھانے والے نے یہی بتایا ہے۔ اُس آیا کا نام براؤنی ہے نا؟"

"ہاں،" آبی حیرت زدہ سا ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔

"وہ کسی طرح وہاں سے نکل بھاگی ہو گی،" میں نے اس کو ڈاکٹر عذرا سے دُور ہٹاتے ہوئے کہا۔

"اب سمجھا! اس نے اپنے جکڑ بند کھول لیے ہوں گے۔ مجھے افسوس ہے ڈاکٹر کہ میں نے خواہ مخواہ آپ کو پریشان کر دیا ہے، میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔" آبی نے پستول پتلون کی جیب میں ٹھونس کر بڑے ہی مضحکہ خیز انداز میں اپنے دونوں ہاتھ ڈاکٹر کے سامنے جوڑ دیے مگر وہ بہت زیادہ پریشان ہو چکی تھی، بولی۔

"آپ یہاں سے نکل جائیں ورنہ اچھا نہیں ہو گا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرا واسطہ مجرموں سے ہے جو اپنے مطلب کے لیے دوسروں کے بچوں پر بھی ہاتھ ڈال سکتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ سسکنے لگی۔ میں نے اٹھ کر اسے سنبھالنے کی کوشش کی۔ مگر جونہی میں نے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھا اُس نے تڑاخ سے ایک تھپڑ میرے منہ پر دے مارا۔

"ہٹ جاؤ پیچھے اپنے یہ ناپاک ہاتھ مجھ سے دور رکھو۔ جو ہو چکا ہے وہی بہت کافی ہے دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"

"ہمیں معاف کر دیں ڈاکٹر! مگر جو کچھ ہوا ہے مجبوری کی وجہ سے ہوا ہے۔" آبی نے پھر بڑے ہی ملتجیانہ لہجے میں کہا۔ اس کا سارا طنطنہ ختم ہو گیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر ڈاکٹر کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

اچانک میز پر رکھے ٹیلیفون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اب کی بار ریسیور ڈاکٹر نے اٹھایا۔

"ہیلو ڈاکٹر عذرا اسپیکنگ۔" اس نے اپنے لہجے کو بڑی حد تک متوازن کرتے ہوئے کہا۔ مگر اُس کی آواز ابھی تک خوف میں سکڑی ہوئی تھی۔ دوسری طرف سے جو آدمی بول رہا تھا، اُس کی گھٹی گھٹی آواز بازگشت کی صورت میں مجھے سنائی دے رہی تھی۔

"انسپکٹر غضنفر آپ سے ملنے آئے ہیں انھیں بھیج دوں؟" یہ کلینک کے استقبالیہ میں بیٹھے آدمی کی آواز تھی۔

ڈاکٹر عذرا نے استفہامی نظروں سے ہمیں دیکھا۔ میں نے ریسیور کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"ان سے کہیں کہ آپ ابھی مصروف ہیں۔"

میری یہ بات سن کر اُس کی آنکھوں سے شعلے سے نکلنے لگے۔

"ہاں! یہی بہتر ہے، اُسے ٹال دیں۔" یہ کہہ کر میں نے ریسیور پر سے ہاتھ اُٹھا لیا۔

"میں آپریشن روم میں جا رہی ہوں، اُن سے کہیں میرا انتظار کریں۔ میں آدھ گھنٹے تک فارغ ہو جاؤں گی۔" یہ کہہ کر ڈاکٹر عذرا نے فون بند کر دیا۔ اور پھر کرسی کی پشت سے اپنا سر لگا کر ہمیں غور سے دیکھنے لگی۔ اس کا چہرہ غصے کی شدت سے تمتما اُٹھا تھا۔ اُس کا ردِعمل بہت ہی شدید تھا۔ اپنے بچوں کے یرغمال بن جانے کے سارے سلسلے نے اس کے دماغ میں افراتفری مچا رکھی تھی حالانکہ اب اُس کے بچے بالکل محفوظ تھے اور انھیں کسی بھی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن وہ ہمیں ہمارے اصلی روپ میں دیکھ کر تلملا اٹھی تھی۔ اسی ذہنی اضطراب کی حالت میں اُس نے آپریشن بھی کر دیا تھا اور مجھے ڈر تھا کہ اُس نے عمداً کیس کو خراب نہ کر دیا ہو۔ اگر ایسا نہیں ہوا تھا تو وہ ایسا اب کر سکتی تھی۔

میں نے کمرے کے دروازے کی دونوں چٹخنیاں اوپر چڑھا دیں۔ میری اس حرکت پر وہ سٹپٹا سی گئی۔ بولی۔ "یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟"

"ہمیں کسی فیصلے پر پہنچنے دیں ڈاکٹر! ہم آپ کے باقی ایک لاکھ بھی ابھی دے دیں گے رقم نیچے کار میں رکھی ہے۔" آبی نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اور کیا چاہتے ہیں آپ مجھ سے؟"

"آسیہ کتنے دِن میں صحتیاب ہو گی؟"

"میرا خیال ہے اسے پندرہ دِن تو ضرور ہی لگیں گے۔"

"یہی حال ڈاکٹر عرفان کا ہو گا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں! شاید وہ جلدی صحتیاب ہو جائے کیونکہ اس کی صحت بہت اچھی ہے۔" اس نے بڑے جھلاتے ہوئے انداز سے کہا۔

"ٹھیک ہے میڈم! آپ یوں کریں کہ اُن دونوں کو کسی اور جگہ منتقل کر دیں کسی ایسی جگہ جہاں ہم اطمینان سے اُن کی دیکھ بھال کر سکیں۔" میں نے ساری صورت حال پر غور کرتے ہوئے کہا۔ ہم وہاں محفوظ نہیں تھے ڈاکٹر عذرا کا بھی اب کوئی اعتبار نہیں تھا۔

"عرفان کو اُدھر پھینکو۔ اس کے اپنے کلینک میں۔ اس سے اب کیا لینا ہے ہمیں۔" آبی نے کہا۔

"میں اسے ابھی نہیں چھوڑوں گا۔"

"اِس وقت اُسے روکنا اچھا نہ ہو گا۔ اسے ہم آج ہی شفاخانہ کلینک میں پھینک دیں گے۔" آبی نے اصرار کیا۔

"اچھا ٹھیک ہے ڈاکٹر۔ آپ بتائیں آسیہ کو ہم کہاں داخل کرائیں؟"

"یار تو پاگل ہو گیا ہے۔ یہ بات ان سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟" آبی نے مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ میں خاموش ہو گیا۔ صورتِ حال ایسی پیچیدہ ہو گئی تھی کہ مجھے اس کا کوئی حل نظر نہیں آتا تھا۔ ڈاکٹر عذرا پر اعتبار کا اب کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور پولیس وہاں الگ منڈلانے لگی تھی۔

اچانک آبی اپنی جگہ سے اُٹھا مجھے بازو سے گھسیٹ کر دروازے کے پاس لے گیا اور دبی زبان میں بولا۔

"دیکھ، تو اس گنتی کو ادھر روک کر رکھ۔ اِس کے تیور مجھے بگڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ میں آسیہ کو اسٹریچر پر ڈال کر ادھر ایمبولینس تک پہنچاتا ہوں۔ اُسے میں ابھی بخاری کلینک میں لے جاؤں گا۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر اس عذرا نے ذرا بھی حرکت کی تو پولیس فوراً ہمیں دھر لے گی۔ وہ غضنفر تو آ ہی چکا ہے۔ اگر ہم یہاں سے بھاگ بھی جائیں تو بھی آسیہ اب اس کے ہاتھوں میں محفوظ نہ ہو گی۔"

"ٹھیک ہے میں بھی آدھے گھنٹے تک وہاں پہنچ جاؤں گا۔ مگر ان کی ایمبولینس وہاں گئی تو انہیں ہمارے نئے ٹھکانے کا تو پتہ چل ہی جائے گا۔"

"میں راستے میں کار روک کر ایمبولینس کے ڈرائیور کو اس میں بٹھا دُوں گا اور ایمبولینس خود لے جاؤں گا۔"

"ہاں یہ بہتر رہے گا۔ بس تم جلدی نکل جاؤ۔ میں بھی جلدی پہنچ رہا ہوں، وہ رقم کہاں ہے؟"

"وہ کار میں رکھی ہے۔ پچھلی سیٹ کے نیچے تھیلے میں پڑی ہے۔ مگر اُس کی تم فکر نہ کرو کسی کو اس کی خبر نہیں ہو گی۔ اب تم اس کو سنبھالو" یہ کہہ کر وہ دروازہ کھول کر تیزی سے باہر نکل گیا۔ ڈاکٹر عذرا اس عرصہ میں کرسی پر بُت بنی بیٹھی رہی۔ یوں جیسے اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفقود ہو چکی تھیں۔ میں دروازہ بند کر کے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا اس کے پاس جا پہنچا اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔

"پوچھیں اس سے کون ہے؟" میں نے ڈاکٹر عذرا سے کہا۔

"یار، دروازہ کھول۔ ڈاکٹر صاحب سے ایک بات کرنی ہے۔" آبی کی گھٹی گھٹی آواز مجھے سنائی دی۔ میں نے اُٹھ کر فوراً ہی دروازہ کھول دیا۔ آبی نے ڈاکٹر عذرا سے کہا۔

"ایمبولینس کے لیے آپ کے آرڈر کی ضرورت ہے جناب! میں آسیہ کو یہاں سے لے جا رہا ہوں۔"

ڈاکٹر عذرا نے فوراً ہی کچھ کہے بغیر میکانکی انداز میں ایک سفید کاغذ پر ایمبولینس فراہم کرنے کا حکم لکھ دیا۔ آبی نے وہ کاغذ اس سے جھپٹا اور بولا۔

"یار اپنے یہ کپڑے تو مجھے دیدے، وہ پولیس والا نیچے بیٹھا ہے کہیں کوئی فساد ہی نہ کھڑا نہ کرے۔ یہ وردی تو بالکل اوپری نظر آتی ہے۔"

آبی ٹھیک کہہ رہا تھا۔ "آپ کی کوئی سفید شلوار تو یہاں ہو گی؟" میں نے عذرا سے پوچھا۔

"ہاں! اُدھر الماری میں دیکھیں۔ لٹھے کی کئی شلواریں وہاں ہوں گی۔" اُس نے بڑی بددلی سے کہا۔ میں نے دائیں ہاتھ کی الماری کھولی۔ تو اس میں مجھے کئی استری شدہ صاف ستھری شلواریں نظر آئیں۔ اِن سب میں ربڑ کے ازار بند پڑے ہوئے تھے۔ پھر بھی میں نے ایک شلوار نکال لی۔ غسل خانے میں جا کر میں نے ڈاکٹر عذرا کی شلوار خود پہنی اور اپنی شلوار وہیں چھوڑ کر باہر نکل آیا۔ باہر آ کر میں نے آبی سے غسل خانے میں جانے کے لیے کہا۔ وہ میرا مطلب سمجھ کر غسل خانے میں گیا اور شلوار بدل کر باہر آ گیا۔ اُس نے میرا کمبل بھی اُچک لیا۔ قمیص اس نے نہیں بدلی۔ اس کے اوپر کمبل اوڑھ کر وہ اسی وقت باہر نکل گیا۔ جب میں دُوسری بار دروازہ بند کر کے ڈاکٹر عذرا کی طرف متوجہ ہوا تو وہ ٹیلیفون کے نمبر گھما رہی تھی اور بڑی تیزی میں تھی۔

میں نے جاتے ہی ریسیور اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ "اِسکی ضرورت نہیں ہے ڈاکٹر! آپ کو ہم کوئی نقصان نہیں پہنچا رہے ہیں۔" اس کا چہرہ ایک بار پھر غصے سے تمتما اُٹھا۔ بولی۔

"میں تمھاری غلام نہیں ہوں۔ میں گھر پر فون کر رہی تھی میں براؤنی سے بات کروں گی۔"

"براؤنی سے بعد میں بھی باتیں ہو سکتی ہیں۔" میرے کندھے پر لٹکی اسٹین گن اب صاف نظر آ رہی تھی۔ وہ کوٹ کے نیچے بھی چھپائے نہ چھپتی تھی میرے اس جملے نے ڈاکٹر عذرا کو بہت زیادہ پریشان کر دیا تھا۔ میں جب دوبارہ اس کے سامنے کرسی پر بیٹھا تو وہ بولی۔ "مجھے نہیں معلوم تھا کہ ڈھلوں صاحب نے ایسے مجرموں کو پناہ دے رکھی ہے۔"

"نہ تو ہم مجرم ہیں نہ ہم اُن کی پناہ میں ہیں۔ یہ تو محض اتفاق ہے کہ وہ ہماری مدد پر آمادہ ہو گئے کیوں کہ وہ ہمارے گاؤں کے مالک ہیں۔"

"آپ جھوٹ بول رہے ہیں، بہرحال اب آپ تشریف لے جائیں یہی آپ کے لیے بہتر ہے اور اپنا یہ روپیہ بھی لے جائیں۔ پتہ نہیں کس کی گردن ماری ہو گی آپ نے۔" یہ کہہ وہ اپنی دراز کھولنے لگی۔

"یہ دراز بند ہی رکھیں ڈاکٹر اور بھول جائیں کہ ہم کیا ہیں اور آپ کیا کر چکی ہیں۔ وہ عرفان ہوش میں آ جائے تو اُسے بتا دیں کہ ابھی ہم ڈاکٹر دھمن اور عالیہ کو بھی اس راہ سے گزاریں گے۔"

وہ کچھ نہیں بولی، ٹکٹک میرا منہ تکتی رہی۔ یوں جیسے اس کا تحیر کبھی ختم نہ ہو گا۔

"آپ نے کہا تھا کہ گردے کی منتقلی کا کام آپ نے عملی طور پر

ڈاکٹر دھمن سے سیکھا تھا۔ کیا آپ کو معلوم تھا کہ وہ لوگ کس طرح دوسروں کو بے بس کر کے اپنی تجارت کو فروغ دیتے ہیں۔"

"مجھے اس بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔" وہ بڑی بجھی ہوئی آواز میں بولی۔

"آپ جھوٹ بول رہی ہیں ڈاکٹر عذرا۔ آپ کو علم تھا کہ ڈاکٹر دھمن اور عالیہ اس بدترین جرم کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ وہ جیل سے قیدیوں کو اس مرض میں مبتلا ظاہر کر کے لے جاتے تھے اور ان کو ایک گردے سے محروم کر دیتے تھے۔"

"مجھے اس بارے میں کوئی علم نہیں ہے۔" وہ اب بھی بہت سنجیدہ تھی۔

"کیا آپ کو اب بھی یقین نہیں آیا کہ میری بہن آسیہ بھی انہی کی بھینٹ چڑھ چکی ہے۔"

"میں نے کہا ہے نا کہ مجھے اس بارے میں قطعاً کوئی علم نہیں۔" اس نے میز پر اپنی کہنیاں ٹکا دیں۔ اب مجھے اپنی اس سنہری فریم کی عینک کے پیچھے سے بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے آگے جھک کر اس کی کلائی پکڑ کر اپنی گرفت میں لے لی اور اسے ہلکا سا جھٹکا دے کر اپنی طرف کھینچا۔

"تم مسلسل میرے سامنے جھوٹ بول رہی ہو ڈاکٹر عذرا۔ مجھے اپنے خاوند کی کوئی تصویر دکھا سکتی ہو۔ یاد رکھو میں نے اپنے دشمنوں کو معاف کرنا نہیں سیکھا ہے۔"

"یہاں میرے پاس ان کی کوئی تصویر نہیں ہے۔" اس نے اپنی کلائی مجھ سے چھڑانے کی کوئی کوشش نہیں کی البتہ رنگ اس کا فق ہو چکا تھا۔

"تم پھر جھوٹ بول رہی ہو۔ محسن نام بتایا ہے نا تم نے اپنے خاوند کا؟"

"ہاں! ان کا نام محسن رضا تھا۔"

"یہ تمہارے پیچھے جو تصویر لگی ہے دیوار پر، اس میں ڈاکٹر دھمن بھی موجود ہے اور عالیہ بھی۔ ان کے دائیں ہاتھ ڈاکٹر عرفان کھڑا ہے، یہ بائیں ہاتھ کون ہے؟"

میں نے سامنے کی دیوار پر ٹنگی تصویر کی طرف اسے متوجہ کیا۔ اسے میں نے چند ہی منٹ پہلے دیکھا تھا اور اسی لیے میں نے وہ سوال اس سے پوچھا تھا۔ جس آسانی سے وہ ایک لاکھ روپیہ لے کر کسی کا گردہ آسیہ کے بدن میں لگانے پر آمادہ ہو گئی تھی اس سے میں یہی نتیجہ اخذ کر سکا تھا کہ وہ اس کاروبار سے آشنا ہے۔ اس نے انکار کیا تھا تو محض اس لیے کہ وہ ڈاکٹر عرفان پر ہاتھ نہیں ڈالنا چاہتی تھی کیونکہ وہ اس کے کلینک میں کام کر چکی تھی۔ ان کی شاگرد ہونے کا دعویٰ کرتی تھی ورنہ اگر میں اس کی جگہ وہاں کسی اور آدمی کو لے جاتا تو بغیر کسی ہچکچاہٹ کے وہ اس کے حقّے بخرے کر دیتی۔ جتنے بڑے کلینک کی وہ تنہا مالک تھی وہ کوئی عام سا ڈاکٹر تعمیر کر ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کے کلینک میں میں جدید ترین سازو سامان دیکھ چکا تھا اور وہ سب بلاشبہ زرِ کثیر صرف کیے بغیر حاصل نہیں کیا جا سکتا تھا۔

میرا یہ سوال سن کر وہ دہشت زدہ سی ہو گئی۔ میری آنکھوں میں ابھرتے ہوئے اس سفاک جذبے کو وہ محسوس کر چکی تھی جو کسی بے کس و مظلوم آدمی کی آنکھوں میں اس وقت ابھرتا ہے جب اُسے ظالم پر برتری حاصل ہو جاتی ہے جب وہ اس قابل ہوتا ہے کہ دشمن کے سینے پر پیر رکھ کر خوشی کا نعرہ لگا سکے۔ اس نے خوفزدہ نظروں سے مڑ کر تصویر کو دیکھا اور بولی۔

"اس تصویر میں میرے مرحوم "ہزبینڈ" موجود نہیں ہیں۔"

وہ پھر بڑی دل جمعی سے جھوٹ بول رہی تھی اور اس بڑے ہی خوفناک موڑ پر سے سلامت روی کے ساتھ گزر جانا چاہتی تھی۔ میرا دل یہ کہتا تھا کہ وہ تصویر وہاں پر بے وجہ نہیں ٹنگی تھی۔ اس کا ڈاکٹر عذرا کی زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ میز پر ڈاکٹر عذرا کا بڑا سا ہینڈ بیگ پڑا تھا۔ میں نے وہ اُچک کر اپنے سامنے کیا اور پھر اس کی زپ کھول کر اُسے میز پر الٹ دیا۔

میری اس حرکت پر ڈاکٹر نے میز کے ساتھ لگی گھنٹی پر انگلی رکھ دی۔

"اس کا کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ میں یہ تار الگ کر چکا ہوں ڈاکٹر!" اب میں نے اپنا چپٹا سا پستول جیب سے نکال کر بائیں ہاتھ میں پکڑ لیا۔ ہم اپنے اپنے دائروں میں اچھی طرح گھوم لیے تھے اور اب ہم کسی بھی لمحے رو برو ہونے کو تھے۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش میں ہے۔ میں نے بیگ میں سے صرف اس کی ڈائری الگ رکھی اور باقی چیزیں دوبارہ اس میں ٹھونس دیں۔ وہ اپنی ڈائری لینے کے لیے پاگل کتیا کی طرح مجھ پر جھپٹی مگر ڈائری پر میری گرفت بہت مضبوط تھی۔ اس نے اپنی عینک الگ رکھی اور غراتے ہوئے بولی۔

"اسے مت کھولیے، یہ مجھے اپنی زندگی سے بھی زیادہ عزیز ہے۔" یہ کہہ کر وہ کرسی پر سے اٹھی اور میز کے اوپر پاؤں رکھ کر مجھ پر آ پڑی۔ میز کا صاف ستھرا شیشہ اس کے پاؤں تلے کرچی کرچی ہو گیا۔ وہ میرے اوپر آ گری تھی۔ یوں کہ اس نے میری بائیں کلائی کو جھٹکا دے کر میرے ہاتھ سے پستول نیچے گرا دیا۔ جوشِ غضب نے اس کے بدن میں بے پایاں طاقت پیدا کر دی تھی۔ اس نے میز کے کنارے پر اپنے پاؤں جما کر کچھ اس طرح کرسی پر بوجھ ڈالا کہ وہ الٹ گئی اور کرسی پشت کی جانب فرش پر یوں گری کہ ہم دونوں الٹ گئے۔ اس کی قوت کا میں اندازہ ہی نہ کر پایا تھا۔ میری بائیں کلائی ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی اور وہ میری ناک پر ٹکر مار کے مجھے پریشان کر چکی تھی۔ میں ابھی

تک کرسی میں پھنسا تھا اور وہ پوری کی پوری میرے اوپر آ پڑی تھی یوں کہ اس کے دونوں گھٹنے میرے پیٹ میں دھنسے تھے۔ میں نے اب تک صرف مدافعت ہی کی تھی۔ میں اس کے اس خونخوار بلی ایسے حملے کی ماہیت کو سمجھ ہی نہیں سکا تھا۔ میرا دایاں ہاتھ ابھی تک آزاد تھا لیکن میں نے اس سے اب تک کوئی کام نہیں لیا تھا مگر جب وہ میرے ماتھے پر ٹکر مار چکی تو میں نے دائیں ہاتھ سے اس کے بال پکڑ کر جھٹکا جو دیا تو اس نے میری کلائی چھوڑ کر اپنی انگلیاں میری آنکھوں میں مارنے کی کوشش کی۔ اس کے ترشے ہوئے نوکدار ناخنوں کو اپنی آنکھوں سے اتنا قریب دیکھ کر میں نے دونوں ہاتھوں سے اُسے پیچھے ہٹا کر اس کے پیٹ پر دونوں پاؤں رکھ کر اسے ہوا میں اچھال دیا۔ وہ دھپ سے فرش پر میرے بائیں ہاتھ گری تو میں نے کرسی سے نکل کر اس کے دونوں بازو مروڑ کر اس کی کمر سے لگا دیے۔ حیرت مجھے یہ تھی کہ اس نے اب تک کوئی چیخ کیوں نہیں ماری۔ یہی مجھے دھڑکا بھی لگا تھا مگر محسوس مجھے یہ ہوا کہ اسے اپنی قوتِ بازو پر ناز تھا۔ اور وہ مجھے زیر کر لینے کا حوصلہ بھی رکھتی تھی۔ میں نے اس کے بازو کمر سے لگائے تو اس وقت میں اس پر کچھ اس طرح جھکا ہوا تھا کہ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی مگر میرے سارے اندازے غلط نکلے۔ اس نے ایک گھٹنے پر اپنا وزن سنبھالتے ہوئے پوری قوت سے دوسرا پاؤں ایڑی کی طرف سے میری ناف کے نیچے کچھ اس طرح دے مارا کہ میں سُن ہو کر رہ گیا۔ درد کی کٹیلی لہر کچھ اس طرح میرے بدن میں چلی کہ اس کے بازوؤں پر میری گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ اس ذرا سی مہلت سے فائدہ اٹھا کر ایک دم پہلو کے بل الٹی اور ایک بار پھر اس نے اپنے بائیں پاؤں کی ٹھوکر میرے پاؤں میں دے ماری۔ میں نے ایسی خونخوار عورت زندگی میں پہلی بار دیکھی تھی اور مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اس قسم کی دست بدست جنگ میں خاصی مہارت رکھتی ہے۔ اگر مجھے اس بات کا علم ہوتا تو میں پہلے ہی حملے میں اس کی بتی گل کر دیتا مگر اس کو تولنے میں مجھے دیر ہوئی۔ ویسے بھی میں اسے بے ہوش نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ جب دوسری ٹھوکر مجھے مار چکی تو میں نے پوری قوت سے الٹے ہاتھ کا ایک تھپیڑا اس کے منہ پر دے مارا۔ وہ نڈھال سی ہو کر ہاتھ پاؤں چھوڑ بیٹھی۔ میں نے اُسے دونوں بانہوں میں بھر کر فرش پر سے اٹھایا اور کرسی سیدھی کر کے اس پر ڈال دیا۔ میرے تھپڑ نے اُسے سن کر دیا تھا۔ اس کی قوت کو میں کئی بار آزما چکا تھا۔ میں اس کی کلائی پر ذرا سا زور دیتا تو وہ تڑاخ سے ٹوٹ جاتی۔ اس کی گردن دبا دیتا تو وہ کئی گھنٹوں کے لیے بے ہوش ہو جاتی مگر میں اُسے کوئی گزند نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ اسی لیے میں اس سے خود کو بچانے میں مصروف رہا مگر وہ سمجھ ہی نہیں رہی تھی۔ وہ کرسی پر بیٹھی تو گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ اس کی ایک آنکھ سوج گئی تھی میرے ہاتھ کی ضرب وہیں پڑی تھی۔ میں نے جان بوجھ کر کرسی کا ایک بازو جھٹکا دے کر الگ کر لیا۔

"یہ... یہ دیکھ رہی ہیں ڈاکٹر! آپ مجھے غلط سمجھی ہیں۔ یہ دیکھو کوئی مرد ہوتا تو میں اسے یوں توڑ دیتا۔" یہ کہہ کر میں نے اس کی آنکھوں کے سامنے لے جا کر کرسی کا وہ شکستہ بازو دونوں ہاتھوں میں لے کر ایک جھٹکے سے توڑ دیا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلنے لگیں۔

"آپ کو یقین نہیں آتا ہے تو یہ دیکھیں۔" یہ کہہ کر میں نے کمرے میں دائیں ہاتھ کی میز پر رکھی۔ ایک لوہے کی نالی ہاتھ میں پکڑ لی۔ یونہی میں بڑ نہیں ہانک رہا تھا۔ میں نے پوری قوت سے اس نالی... کو دونوں ہاتھوں میں لے کر دبایا۔ تو وہ درمیان میں سے دہری ہو گئی۔ یہ تجربہ میں کئی بار لوہے کی تین سوت موٹی سلاخوں پر پہلے بھی کر چکا تھا۔ اس نے اس نالی کو یوں میرے ہاتھوں میں مڑتے دیکھا تو اور زیادہ حیران ہوئی۔ پھر وہ اپنی سوجی ہوئی آنکھ ٹٹولنے لگی۔

"چوٹ زیادہ تو نہیں لگ گئی؟" میں نے اس کے بکھرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں میرے ہاتھ کا لمس اس پر اپنا اثر دکھانے لگا تھا۔ اس کی نرم ریشمی زلفیں بلاشبہ بڑی دل کش تھیں ان میں اس نے بہت بڑھیا قسم کی خوشبودار کریم لگا رکھی تھی۔ بالوں سے انگلیاں نکال کر میں اُسے غور سے دیکھنے لگا۔ وہ مجھے اچھی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ بہادر تھی دل میں جرأتوں کے طوفان لیے پھرتی تھی۔ اس نے مجھے چند ہی لمحوں میں بے حد متاثر کر لیا تھا۔ وہ میری زندگی کی پہلی عورت تھی جو خطرے کو سامنے دیکھ کر سکڑی نہیں تھی بلکہ اس کا جرأت اور دلیری سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ رکھتی تھی۔ اس کی آنکھیں ابھی تک مُندی ہوئی تھیں۔

"مجھے افسوس ہے کہ میرا ہاتھ کچھ زیادہ ہی بھاری پڑا۔ میں آپ سے شرمندہ ہوں ڈاکٹر۔ میں نے اس کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ وہ ڈائری ابھی تک میز پر کھلی پڑی تھی جس کو چھیننے کے لیے وہ مجھ پر جھپٹی تھی۔ میز کا شیشہ کچھ اس طرح ٹوٹا تھا کہ اس کا کوئی بھی حصّہ سلامت نہیں رہا تھا۔ اس نے ایک ایک کر کے ساری چیزیں میز پر سے اتاریں تو ڈائری بھی اس کے ہاتھ آ گئی۔ میں نے تیزی سے ڈائری اس کے ہاتھ سے جھپٹ لی مگر اب کی بار اس نے تعرض نہیں کیا۔ اس نے میز کے شیشے کے نیچے بچھے کپڑے میں وہ ٹکڑے بھر لیے اور بولی۔

"آپ اسے ہرگز نہیں پڑھیں گے یہ میری ذاتی ڈائری ہے۔"

"اسی پر تو ہماری جنگ ہوئی ہے اور میں آپ کو شکست دے چکا ہوں یہ تو میں ضرور پڑھوں گا۔"

"میں پھر کہتی ہوں کہ اسے مت پڑھیں، میں اس کی کسی کو بھی اجازت نہیں دے سکتی۔"

میں نے وہ ڈائری اُسے واپس کرنے کے بجائے جیب میں رکھ لی۔

مجھے ضد ہو گئی تھی اور اس ڈائری کو جس انداز سے اس نے میرے لیے پُراسرار بنا دیا تھا، اس کا تقاضا یہ تھا کہ میں اسے ضرور پڑھوں۔ مگر وہ اس میں کسی کی شراکت رفاقت پسند نہیں کرتی تھی۔ میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ اس بات پر خوش نہیں ہے۔ میرا دل چاہا کہ میں اسے وہ ڈائری واپس کر دوں مگر مجھے نہیں معلوم کہ میں کیوں اس کے اس مطالبے پر چڑ سا گیا تھا۔ میں نے وہ ڈائری اسے لوٹا دینے سے قطعی انکار کر دیا۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی تو وہ سنبھل کر بیٹھ گئی بولی۔

"کون ہے؟"

"میں انسپکٹر غضنفر ہوں ڈاکٹر صاحب! آپ فارغ نہیں ہوئیں ابھی تک؟"

"ہاشم صاحب! آپ ادھر ساتھ کے کمرے میں بیٹھ جائیں میں اُس سے بات کر لوں۔" اس نے سرگوشی میں کہا۔

"نہیں۔ آپ اس سے نیچے جا کر مل لیں میں کسی جگہ بند نہیں ہونا چاہتا۔"

"اچھا ٹھیک ہے، آپ اِدھر ہی بیٹھیں۔ میں تھوڑی دیر میں واپس آ جاؤں گی۔ مگر پلیز یہ ڈائری مجھے دے دیں۔"

"لیں اسے دراز میں بند کر لیں آپ خواہ مخواہ ہی اسے اتنی اہمیت دے رہی ہیں۔" یہ کہہ کر میں نے وہ ڈائری اسے واپس کر دی اُس نے بلند آواز میں کہا۔

"ذرا ٹھہریں انسپکٹر صاحب میں ابھی آتی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے وہ ڈائری میز کی دراز میں بند کر کے تالا لگا دیا۔ پھر اس نے باتھ روم میں جا کر نئی قمیص پہنی۔ ہر طرف سے مطمئن ہو کر جب چٹخنی نیچے گرا کر اس نے دروازہ کھولا تو میں کواڑ کی اوٹ میں تھا وہ بولی۔ "مس مریم! آپ دروازہ بند کر لیں میں ابھی آتی ہوں۔" وہ انسپکٹر پر ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی کہ اندر کوئی مرد بیٹھا ہے۔ اپنی آنکھ کی چوٹ چھپانے کے لیے اس نے اپنا رومال ... ابرو پر رکھ لیا تھا۔

وہ باہر نکلی تو میں نے بڑے اطمینان سے دروازے کی چٹخنی چڑھا دی۔ جب میں کرسی پر دوبارہ بیٹھ چکا تو ڈاکٹر عذرا کی پُرپیچ شخصیت کا تمام تر اسرار میرے ذہن کے منہ پر جالے بُننے لگا۔ وہ کچھ ہی دیر پہلے میرے خون کی پیاسی ہو رہی تھی۔ مجھ سے وہ یوں گتھ گئی تھی جیسے وہ مجھے اُدھیڑ کر رکھ دے گی۔ اس کے بدن میں اس گھڑی بے پناہ طاقت آ گئی تھی کہ میری آنکھیں نوچ لینے سے بھی وہ نہیں ہچکچائی تھی۔ وہ مجھے جان سے مار دینے سے بھی دریغ نہ کرتی مگر جب میں نے اس پر ذرا سخت ہاتھ ڈالا، اس کی ہڈیوں پر ضرب لگائی اور توانا اور آبرومند مرد کی طرح اسے زیر کر لیا تو وہ موم ہو گئی۔ ایک دم پگھل کر میرے سانچوں میں ڈھلنے لگی۔ میں نے ایسی عورتوں کے بارے میں سُنا تو تھا کہ وہ ایسی اذیت پسند ہوتی ہیں کہ محبت کے مختلف مراحل گزرنے سے پہلے شدید جسمانی اذیت سہنا پسند کرتی ہیں۔ اُن کی جب تپ ہوتی ہے عذرا بھی ایسی عورتوں میں سے تھی۔ میں نے جب اس کے چہرے پر کاری ضرب لگائی تو وہ میرے سامنے جھک گئی۔ سجدہ ریز ہو گئی۔ اس حد تک وہ میری طرف بڑھی کہ میرے اور اُس کے درمیان کوئی بھی پردہ حائل نہ رہا۔ یہ اس کی شخصیت کا ایک ایسا طرفہ تماشا پہلو تھا کہ میں کئی دیر تک کرسی پر سسکنے کے عالم میں بیٹھا رہا۔ ایسی تو میں نے کوئی عورت نہ دیکھی تھی جو دُکھ سہہ کر سُکھ حاصل کرے۔ میں نے ملنگ فرقے کے فقیروں کو دیکھا تھا وہ اپنے جسم کو بڑی اذیت ناک سزائیں دیتے تھے۔ بڑے بڑے خوفناک مراحل سے وہ گزرتے تھے مگر اُن کے چہروں پر لمحۂ وصال جیسی سرخوشی و سرمستی چھائی رہتی تھی۔ ایسی ہی کیفیت اس عورت پر طاری تھی۔

میں چند لمحوں تک اسی ادھیڑ بُن میں رہا اور پھر میں نے اُٹھ کر اس کی دراز کا تالا کھول دیا۔ وہ کوئی زیادہ مشکل کام نہیں تھا۔ لوہے کا ایک چھوٹا سا تار کام آ گیا۔ مجھے اس کی ڈائری چاہیے تھی جس کو میری نظر سے بچانے کے لیے وہ مجھ پر حملہ آور ہو گئی تھی۔ وہ ڈائری کھول کر میں اس کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ اُس کی اپنی ڈائری تھی اور کسی ایک سال سے متعلق نہیں تھی۔ اس نے دراصل ڈھیر سارے صاف ستھرے خوبصورت کاغذوں کی جلد بندی کرا رکھی تھی اور اُن پر وہ تاریخ وار اپنی یادداشتیں لکھتی رہتی تھی۔ وہ ڈائری اس نے یہی کوئی چھ سال پہلے شروع کی تھی اور ابھی تک وہ اسے مسلسل لکھے جا رہی تھی۔ اس میں آخری عبارت اس نے چھ دن پہلے لکھی تھی مگر وہ ابھی نامکمل تھی اور اسے مکمل کرنے کیلئے ہی وہ ڈائری کو اپنے بیگ میں ڈالے ہوئے تھی۔ ورنہ اُسے وہ بڑی حفاظت سے گھر میں سنبھال کر رکھتی تھی۔

میں نے اسے جستہ جستہ پڑھا تو معلوم ہوا کہ وہ کسی زمانے میں ڈاکٹر دھمن کے کلینک میں کام کرتی رہی تھی۔ وہ اُس سے بہت زیادہ متاثر تھی۔ اور اسے ملک کا بہترین سرجن سمجھتی تھی۔ اس نے گردے کی پیوند کاری کا عملی تجربہ ڈاکٹر دھمن ہی کے کلینک میں کیا تھا۔ اس کا شوہر ڈاکٹر محسن بھی شفا بار کلینک جایا کرتا تھا اور ڈاکٹر عذرا کو تب اس بات کا علم نہ تھا کہ ڈاکٹر دھمن کس قسم کے مکروہ کاروبار میں مصروف ہے۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کلینک میں جن لوگوں کو ایک ایک گردے سے محروم کر دیا جاتا، ان کے وہ گردے کس کام آتے تھے۔ عالیہ کی تعریف و توصیف میں بھی وہ بہت زیادہ رطب اللسان تھی۔

مگر ڈاکٹر دھمن کا اصلی چہرہ بعد میں اُس پر بے نقاب ہو گیا۔ اس نے بڑے دُکھ کے ساتھ لکھا تھا۔

"میں ڈاکٹر دھمن کو اپنا بہت بڑا محسن و مشفق سمجھتی تھی۔ وہ بہت بڑا سرجن ہے۔ میں اسے ڈاکٹر برنارڈ سے بڑا سرجن سمجھتی تھی۔ اس کے ہاتھ مجھے دکھتے تھے۔ وہ مُردوں کو زندہ کر دینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ مگر پھر ایک دن وہ سب کچھ تاریکی میں ڈوب گیا۔ اس کو میں نے جس روپ میں دیکھا ہے وہ میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ میرے شوہر محسن کو بھی اُس کی شخصیت کے اس پہلو کا عِلم ہو گیا ہے اور ہم دونوں نے شفا بار کلینک میں پھر قدم نہ دھرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

میں اور محسن شاید کبھی بھی ڈاکٹر دھمن کے اصل راز سے واقف نہ ہو سکتے تھے مگر یہ محض اتفاق تھا کہ ہم پر اچانک ہی وہ سب کچھ آشکار ہو گیا۔ اس روز سنٹرل جیل کے چار قیدی جو میو ہسپتال میں زیرِ علاج تھے، شفا بار کلینک میں منتقل کیے گئے۔ اُن میں سے دو تو مثانے کے مرض میں مبتلا تھے اور دو گردے کے شدید درد کے شکار تھے۔ اس وقت رات کے دس بجے رہے تھے۔ مجھے اور محسن کو ڈاکٹر دھمن نے شام ہی کو اپنے کلینک میں بُلا لیا تھا اور اس وقت ہم دونوں اُس کے کمرے میں بیٹھے تھے۔ میو ہسپتال سے ڈاکٹر اختر اُن مریضوں کے ساتھ آیا تھا۔ اُن کے چارٹ ہم نے دیکھے تو ڈاکٹر دھمن بولا۔

"ڈاکٹر محسن! آپ کو آج رات چار آپریشن کرنے ہیں — میں آپ کا ساتھ نہ دے سکوں گا کیونکہ میرا ہاتھ زخمی ہے۔" اس نے اپنا دایاں ہاتھ ہمارے سامنے پھیلاتے ہوئے کہا۔ اُس کی ہتھیلی زخمی تھی اور وہاں پر اس نے پٹی باندھ رکھی تھی۔

"مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے ڈاکٹر صاحب یہ تو ہماری خوش قسمتی ہے کہ آپ اب ہم پر اعتماد کرنے لگے ہیں۔"

"آپ ماہر بن چکے ہیں ڈاکٹر محسن! مجھے خوشی ہے کہ آپ دونوں نے یہ کام بڑی مہارت سے سیکھا ہے۔ آپ یوں کریں کہ ان چاروں کا ایک ایک بایاں گردہ نکال دیں۔"

"میں سمجھا نہیں... ڈاکٹر صاحب! کیا اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں ہے، میرا مطلب ہے کہ ان کا بایاں گردہ ہی کیوں؟"

ڈاکٹر دھمن کی نظروں میں اچانک بڑی ہی پُراسرار قسم کی چمک ابھری بولا۔ "سوال نہ پوچھیں ڈاکٹر! آپ بہت دنوں سے ایک اپنا کلینک کھولنے کا سوچ رہے ہیں۔"

"جی ہاں! یہ تو میری زندگی کی سب سے بڑی آرزو ہے۔" میرے شوہر نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ وہ مال روڈ پر ایک وسیع و عریض عمارت بنانے کا خواب دیکھا کرتے تھے۔ جس میں وہ اپنی پسند کے مطابق ایک کلینک کھول سکتے۔ اُن کی یہ بات سُن کر ڈاکٹر دھمن بولا۔

"آپ کو کتنی رقم درکار ہو گی اس کام کے لیے؟"

"میرا خیال ہے کہ اس منصوبے پر اگر اسے ہر طرح سے مکمل کرنا ہے تو کوئی بارہ لاکھ روپے ضرور صرف ہو جائیں گے۔"

"آپ نے اب تک کتنے گردوں کا آپریشن کیا ہے ڈاکٹر محسن!"

"میں آٹھ آپریشن کر چکا ہوں ڈاکٹر۔ اُن میں سے تین تو پیوندکاری کے تھے اور پانچ صرف ناکارہ گردے الگ کرنے کے۔"

"ہوں! دیکھو ڈاکٹر، تم یہ چار آپریشن آج رات ہی کر دو ان مریضوں کو صبح ہونے سے پہلے پہلے ہم میو ہسپتال میں منتقل کر دیں گے اور دیکھو تمھیں یہ سُن کر خوشی ہو گی کہ میں نے تمھیں پندرہ لاکھ روپے دینے کا فیصلہ کیا ہے۔"

"پندرہ لاکھ!" میرے شوہر کرسی پر سے اچھل پڑے۔ انہیں اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں خود بڑی حیران ہو رہی تھی کہ یہ ڈاکٹر دھمن کیا کہہ رہا ہے۔ میں سمجھی وہ پاگل ہو گیا ہے۔ پندرہ لاکھ روپے ایک بہت بڑی رقم تھی۔ اتنی بڑی رقم کہ اس کو جمع کرنے کے لیے مجھے اور محسن کو چار زندگیاں چاہیے تھیں۔ ہم چار جنم اس دُنیا میں لیتے — پائی پائی جوڑتے، ہر شے سے منہ موڑتے، مُنہ کو دِل کو آرزوؤں کے کیسے کو مضبوط گرہ لگاتے تب کہیں جا کر ہم پندرہ لاکھ روپے جمع کر سکتے تھے۔ مگر وہاں تو ہماری زندگی کی سب سے بڑی آرزو کا تاج محل اچانک اپنی ہتھیلی پر سجا کر ڈاکٹر دھمن نے ہمارے سامنے رکھ دیا تھا۔ اس کا چہرہ تمتمانے لگا۔ بولا۔

"حیران نہ ہو ڈاکٹر! تمھیں ہمارے کاروبار کا اچھی طرح عِلم ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ تم نے آج تک ہمارے کسی معاملے میں دخل نہیں دیا۔ مجھے معلوم ہے تم لالچی آدمی نہیں ہو لیکن چونکہ ایک عرصے سے تم ہم سے تعاون کر رہے ہو اس لیے ہم پر لازم ہے کہ ہم اس معاملے میں تم سے انصاف کریں۔ وہ آٹھ گردے ہم نے پیوندکاری کے لیے مشرقِ وسطیٰ بھجوا دیے تھے۔ اور ہمیں چالیس لاکھ روپے وصول ہوئے تھے۔ اس رقم میں سے پندرہ لاکھ میں تمھیں دے رہا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے دراز میں سے پندرہ لاکھ روپے کا چیک نکال کر میرے شوہر کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ وہ چیک ایک غیر ملکی بینک کے نام تھا۔ جس کی ایک بہت بڑی شاخ لاہور میں موجود تھی۔

وہ چیک محسن نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے پکڑا اور پھر میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "یہ لو عذرا میری جان یہ دیکھو ہمارا اپنے کلینک کا خواب حقیقت بن گیا ہے۔"

میں نے چیک اُس کے ہاتھ سے لیا تو میری اپنی حالت بھی دگرگوں ہونے لگی تھی میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ کسی دن اچانک اتنی بڑی رقم ہمیں مل جائے گی۔ ہمارا حق تو صرف اس تنخواہ پر تھا جو ہمیں ہر ماہ ڈاکٹر دھمن کے کلینک سے مل جاتی تھی۔ دو ہزار روپے وہاں سے مجھے ملتے تھے اور ڈھائی ہزار محسن کو اور یوں ہمارے گھر کا گزارہ بہت عمدہ طریقے سے چل رہا تھا مگر یہ... یہ عنایتِ خسروانہ تو میں نے کبھی خواب

میں بھی حاصل نہیں کی تھی۔ محسن کو اُسی لمحے ڈاکٹر دھمن نے بتایا کہ ڈاکٹر عرفان کے ذریعے وہ گردے مشرقِ وسطیٰ کے مریضوں کے لیے بھیجے جاتے ہیں اور وہاں ڈاکٹر سالومن کا یہ خیال ہے کہ وہ آٹھ آپریشن جو آپ نے کیے، سب سے زیادہ اطمینان بخش تھے۔

میں اور میرے شوہر نے ڈاکٹر دھمن کی بیوی ڈاکٹر عالیہ کے ساتھ مل کر اُسی رات ان چاروں قیدیوں کے جسموں سے ایک ایک گردہ نکال کر اسے محفوظ کر لیا۔ صبح پانچ بجے تک وہ سب کے سب سرکاری ہسپتال میں منتقل کیے جا چکے تھے۔

ہماری مسرتوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ ہم نے چند ہی دن میں مال روڈ پر ایک پلاٹ خرید کر اپنے کلینک کی تعمیر شروع کر دی۔ ہم اس کے بعد بھی بہت عرصے تک ڈاکٹر دھمن کے کلینک میں کام کرتے رہے اور ہمیں ان سے ہر آپریشن کا ایک لاکھ روپیہ ملتا رہا۔ ہماری زندگی کا سارا چلن ہی بدل گیا ۔۔۔ ہم ایک طرح سے ڈاکٹر دھمن کے اس کاروبار میں تین آنے کے حصہ دار تھے۔"

میں اس ڈائری کو پڑھ رہا تھا اور مجھ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے ۔۔۔ اس داتا کی نگری میں ان بھیڑیوں نے اندھیر مچا رکھا تھا۔ اُن کا طریقِ کار پیچیدہ اور گنجلک تھا۔ اس دوران ان لوگوں نے ایک نیا ناٹک رچایا۔ اُس کی تفصیل پڑھ کر میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ انہیں اچانک پندرہ صحت مند گُردوں کی ضرورت پڑ گئی تھی۔ ڈاکٹر عذرا نے لکھا تھا کہ وہ ڈیمانڈ ڈاکٹر دھمن کے پاس ڈاکٹر خرطومی کے ذریعے آئی تھی۔ اس نے لکھا تھا کہ پندرہ گردے جس قدر جلدی ممکن ہو سکے انہیں فراہم کر دیے جائیں۔ وہ ایک گردے کے دس لاکھ روپے دینے پر آمادہ تھا۔

مگر یہ بہت ہی ٹیڑھی کھیر تھی، اتنے سارے صحت مند آدمیوں کو کہاں سے حاصل کیا جا سکتا تھا۔ ڈاکٹر دھمن بہت فکر مند تھا۔ آخر ایک دن اس نے سوات خان کو اپنے کمرے میں بلوایا۔ میں اور عالیہ بھی اُس وقت ڈاکٹر دھمن کے کمرے میں موجود تھے۔ عالیہ کی بے مثال ذہانت سے وہ بے حد متاثر تھا اور شاید اسی لیے اس نے عالیہ سے شادی کر رکھی تھی۔ سوات خان کے سامنے اُس نے اپنا مسئلہ رکھا، اور کہا کہ وہ کسی طرح شہر کے جرائم پیشہ لوگوں سے رابطہ قائم کر کے اُن میں یہ بات مشہور کر دے کہ سمن آباد کی ایک کوٹھی میں دو سیف ہیں جن کے اندر چالیس لاکھ روپیہ ہر وقت جمع رہتا ہے۔ اس کوٹھی کا نمبر اور حدود اربعہ بھی ڈاکٹر دھمن نے سوات خان کو سمجھا دیا۔ بولا

"تم اگلے پانچ دنوں میں ہر رات کم از کم پانچ آدمیوں کو اُس سیف میں سے روپیہ چرانے کے لیے وہاں بھیجو گے۔ ہم اُن کو وہاں بے ہوش کر کے پکڑ لیں گے اور اپنی مطلوبہ شے اُن سے حاصل کر لیں گے۔"

سوات خان تو شاید ڈاکٹر دھمن کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ادھار کھائے ہوئے تھا۔ بولا۔

"صاب جی آپ فکر ہی نہ کریں۔ یہ کام تو میں چٹکی بجا کر دوں گا مگر ان لوگوں کو آپریشن کے بعد کہاں رکھیں گے؟"

"یہ بات تم ہم پر چھوڑ دو۔ انہیں ہم بے ہوش کر کے اپنے کلینک میں لے آئیں گے اور اُن کو ایسے ٹیکے لگا دیں گے جن سے ان کے پیٹ میں شدید درد اُٹھے گا۔ ہمارا کوئی ڈاکٹر انہیں یقین دلائے گا کہ اُن کا کوئی گردہ خراب ہو گیا ہے۔ اس تشخیص کے بعد وہ ہمارے ساتھ پورا پورا تعاون کریں گے۔ انہیں ہم یہ بھی بتا دیں گے کہ انہیں کس نے پکڑ کر ہسپتال پہنچایا تھا۔ کیونکہ وہ بے ہوش تھے، صورت ایسی ہوگی کہ علاج کے بعد جب وہ باہر بھیج دیے جائیں گے تو انہیں کبھی بھی نہیں ہوگا کہ وہ کس راہ سے کہاں پہنچے تھے۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے ڈاکٹر صاب۔"

"اور ہر کیس پر ہم تمہیں دس ہزار روپے انعام دیں گے اور تم اپنی طرف سے اُن میں سے ہر آدمی کو امداد کے طور پر پانچ ہزار الگ دو گے۔ اس کا بھی ہم بندوبست کر دیں گے تاکہ اُن پر تمہارا رعب بھی رہے اور احسان بھی۔"

"ہاں! یہ بہت ضروری ہے ڈاکٹر صاب۔ آپ اب بالکل فکر نہ کریں۔" سوات خان نے ہامی بھر لی اور پھر چند ہی دن بعد وہ کام کیا جس کا اُس نے وعدہ کر لیا تھا۔

ڈاکٹر دھمن نے سمن آباد میں ایک کوٹھی کسی محمد اشرف انصاری کے نام پر کرائے پر لی۔ اور اس میں ضرورت کی تمام چیزیں رکھوا دیں۔ اس میں رہائش کے لیے اُس نے ڈاکٹر عالیہ اور دو نرسوں کو بھیج دیا۔ چوروں سے نمٹنے کے لیے ڈاکٹر دھمن نے سوات خان کے چار ساتھی ٹھہرا دیے۔ ان کا کام یہ تھا کہ جیسے ہی وہ چور بے ہوش ہوں انھیں گاڑی میں ڈال کر شفا بار کلینک پہنچا دیں۔

سوات خان نے اس سارے دھندے میں انتہائی رازداری سے کام لیتے ہوئے ہر تیسری رات چار آدمی وہاں بھیجے۔ یہ سلسلہ چھ دن چلتا رہا۔ اس کے دوران میں ڈاکٹر دھمن نے جو بیس پرندے پکڑے، وہ انہیں پرندے ہی کہا کرتا تھا۔ انھیں چند روز میں اُن کے ایک گردے سے محروم کر کے سرکاری ہسپتالوں میں پھینکوا دیا گیا اور یوں پندرہ دن کے اندر اندر ڈاکٹر دھمن نے اس ڈاکٹر خرطومی سے ڈیڑھ کروڑ روپے ہتھیا لیا۔ مجھے افسوس ہوا کہ اس سارے سلسلے میں چار آدمی آپریشن ٹیبل پر ہی مر گئے تھے۔ اُن میں سے ایک کا نام علیا تھا ۔۔۔ دوسرا کا خادم ۔۔۔ تیسرے کا نام کاجو تھا اور چوتھے کا اصغر۔ اُن کی موت نے ڈاکٹر دھمن کو بہت زیادہ سراسیمہ کر دیا تھا۔ مگر پھر بھی اُس نے صورتِ حال پر قابو پا ہی لیا۔ اُن کو آپریشن ٹیبل سے اُتار کر اسی حالت میں ڈاکٹر دھمن کے کہنے کے مطابق شفا بار کلینک کے لان کی جنوبی دیوار کے ساتھ گڑھے کھود کر دفن کر دیا گیا تھا۔ اس ساری کارروائی کا ڈاکٹر عالیہ، ڈاکٹر دھمن، سوات خان، ناظر علی اور میرے سوا کسی اور کو کوئی علم نہیں ہے۔ اب اُن کی گلی سڑی لاشوں کو قیامت تک کوئی نہ دیکھ سکے گا۔

آگے چل کر ڈاکٹر عذرا نے اپنی ڈائری میں لکھا تھا کہ میں ساری یادداشتیں اس لیے محفوظ کر رہی ہوں کہ میرا دل کبھی کبھی بہت زیادہ پریشان ہو جاتا ہے۔ کوئی ایسا نہیں جس کے سامنے میں ان تمام باتوں اور ڈاکٹر دھمن کے ان جرائم کا اعتراف کر سکوں۔ محسن نے بھی اس معاملے میں چپ سادھ رکھی ہے۔ وہ مجھ سے کسی بھی لمحے اس موضوع پر بات نہیں کرتا۔ مجھے معلوم ہے کہ ایک مرحلے پر وہ خود کو بہت زیادہ خطاوار سمجھنے لگا تھا۔ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں تو وہ اتنا پریشان، اتنا آزردہ خاطر اور اس قدر بجھا بجھا رہتا تھا کہ میں بھی لرز جاتی تھی۔ اس نے بعد میں ڈاکٹر دھمن سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ اس کا ضمیر اسے مسلسل کچوکے دیتا رہتا تھا۔ میرا اپنا حال بھی اُس سے مختلف نہیں تھا۔ مگر میں تو اس راہ پر اتنا آگے جا چکی تھی کہ واپسی ناممکن تھی۔ یہ ڈاکٹر دھمن ہی کی نوازش تھی کہ اس نے ہمیں اتنے بڑے عظیم الشان کلینک کا مالک بنا دیا تھا۔ ہم نے اپنے اس شفا خانے میں ایسا کوئی دھندا نہ کرنے کا عہد کر رکھا تھا مگر اس کے باوجود محسن خوش نہیں تھا۔

میں وہ دن کبھی نہیں بھول سکوں گی جس کی صبح تو بے حد اُجلی اُجلی اور مسرت آگیں تھی مگر جس کی شام کفن بردوش ہو کر میرے آنگن میں اُتری تو سب کچھ ہی بھسم ہو کر رہ گیا۔ لوگ ڈاکٹر محسن کی لاش وحدت کالونی کی کسی ویران سڑک پر سے اُٹھا کر میرے گھر لے آئے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ محسن کی کار سے کوئی ٹرک ٹکرا گیا ہے۔ مگر میں جانتی تھی کہ یہ حادثہ اتفاقی نہیں تھا۔ محسن نے اپنے ضمیر کی خلش سے تنگ آکر عمداً اپنی کار کسی تیز رفتار ٹرک سے ٹکرا دی تھی ۔۔۔ وہ اپنے وجود میں بھڑکتے جہنم سے گھبرا کر موت کے منہ میں کود گیا تھا۔ اُسے ان دنوں کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ بار بار مجھے دھمکی دیتا تھا کہ وہ کسی دن اس کلینک کو آگ لگا دے گا۔ وہ خوش نہیں تھا ۔۔۔ وہ اس کلینک سے نفرت کرنے لگا جس کی تعمیر میں اُس نے انتہائی جوش و خروش کا مظاہرہ کیا تھا مگر ایک دن اس نے موت سے سمجھوتہ کر لیا اور خود کو اس عذاب سے چھڑا کر میرا گھر ویران کر گیا جس میں ہمارے بچے تو شگفتہ پھولوں کی طرح ہر سو اپنی خوشبو بکھیرتے تھے۔ وہ بچے بھی اب اپنے باپ کے بغیر بے حد اُداس اور بڑے ہی افسردہ و مضمحل رہتے ہیں۔ مگر میں کیا کر سکتی ہوں۔ میں تو یہ سب کچھ چھوڑ کر اُس کی راہ پر نہیں چل سکتی۔ میں بھی ایک جہنم سے گزر رہی ہوں۔ چین مجھے بھی نہیں ملتا۔ ان کے اوراق ہیں جن کو کھول کر میں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتی ہوں مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ میری رُوح پر جو بوجھ ہے وہ تو کبھی ہلکا نہیں ہو سکتا۔ میں حیران ہوں کہ ڈاکٹر دھمن اور ڈاکٹر عالیہ کس مٹی کے بنے ہوئے ہیں۔ وہ اپنے کسی بھی فعل پر کبھی نادم نہیں ہوئے۔ انہوں نے یورپ میں کئی جگہوں پر جائداد خرید لی ہے یہاں تک کہ سوئٹیزرلینڈ کے شہر برن میں بھی انھوں نے ایک بنگلہ خرید لیا ہے۔ امریکہ میں بھی اُن کا گھر ہے۔ اِدھر مشرقِ وسطیٰ کی ریاستوں میں بھی اُن کا طوطی بولتا ہے وہ اپنے کاروبار میں مگن ہیں۔

حیرت مجھے یہ ہے کہ اب تک وہ کسی بھی پیچیدگی سے دوچار نہیں ہوئے۔ محسن کی موت سے کچھ عرصہ پہلے ایک شخص غلام جیلانی نے کچھ مردانگی دکھائی تھی۔ اُس نے تو شفا بار کلینک کے سب لوگوں کو مار دینے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ وہ کوئی بڑا ہی غیرت مند اور جی دار آدمی تھا ڈاکٹر دھمن نے اُسے بھی اُس کے ایک گردے سے محروم کر دیا تھا۔ وہ بدنصیب اپنی شامتِ اعمال کی بدولت ایک رات ڈاکٹر دھمن کی کوٹھی جا پہنچا تھا وہاں سے وہ روپیہ چرانا چاہتا تھا مگر اس آفت کی پرکالہ عالیہ نے اُسے سیف کے سامنے لے جا کر بے ہوش کر دیا اور پھر اسے بھی انہوں نے نہایت ہی بے دردی سے اُس کی متاعِ عزیز سے محروم کر دیا۔ اُس جوان کو میں نے بھی دیکھا ہے۔ مجھے اس کے حوصلے کی داد دینا پڑتی ہے۔ وہ بہت ہی خوبرو جوان تھا مگر اسے انہوں نے خاک کر کے رکھ دیا۔ اگر میں اُس کا علاج کرتی تو شاید میرا ہاتھ اس کے گردے تک کبھی نہ پہنچ پاتا۔ میں نے صرف اس کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ وہ پہلا آدمی تھا وہاں جس پر مجھے بے حد ترس آیا تھا۔ بعد میں جب اس نے عالیہ کو اغوا کر لیا تھا تو مجھے دلی خوشی محسوس ہوئی تھی مگر وہ بے چارہ ناکام ہو گیا۔ اُسے سوات خان کے ساتھیوں نے غلام جیلانی کے پنجے سے چھڑا لیا تھا۔ کچھ ہی دنوں بعد معلوم ہوا کہ سوات خان نے اس غلام جیلانی کی بہن کو بھی اغوا کر لیا ہے۔ مگر آسیہ اس کے چنگل سے نکلنے کی کوشش میں اپنے ہاتھ خون سے رنگ بیٹھی اور گرفتار ہو کر جیل چلی گئی ۔۔۔ مگر ڈاکٹر دھمن نے جوڑ توڑ کر کے اسے جیل کی چار دیواری سے تین دوسری عورتوں کے ساتھ اپنے کلینک بلوا لیا جہاں وہ چاروں اپنا ایک ایک گردہ گنوا کر جیل واپس چلی گئیں۔ ایک لڑکی کا آپریشن محسن نے کیا تھا اور وہ آسیہ تھی۔ محسن اس رات گھر آیا تو بے حد پریشان تھا۔ آسیہ کی بھی زندگی خطرے میں پڑ گئی تھی مگر ڈاکٹر دھمن نے خود اس میں دلچسپی لی اور کئی دنوں کی دوڑ دھوپ کے بعد وہ صحتیاب ہوئی۔ محسن نے بتایا تھا کہ اُس لڑکی کا جو گردہ جسم میں رہ گیا ہے وہ اتنا صحت مند نہیں ہے۔ اُسے یقین تھا کہ وہ لڑکی زیادہ دن زندہ نہ رہ سکے گی مگر یہ ڈاکٹر دھمن کے فن کا اعجاز تھا کہ وہ لڑکی اپنے پاؤں پر کھڑی ہو گئی۔ آسیہ کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا اس کی وجہ سے محسن کے ذہن پر جو بوجھ تھا وہ اور زیادہ بڑھنے لگا تھا۔

کیونکہ اس لڑکی پر محسن کو بہت ترس آیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس معصوم کے بدن کی قطع برید کر کے ڈاکٹر دھمن نے اپنی تباہی کو آواز دی ہے مگر وہ شاید نہیں جانتا تھا کہ ڈاکٹر دھمن کی رسّی خدا نے دراز کر رکھی ہے۔

جس دن غلام جیلانی نے لوٹ کر شفا بار کلینک پر حملہ کیا تھا اُس دن میں اور محسن وہاں موجود تھے مگر جب چاروں طرف شور مچ گیا تو میں محسن کو ساتھ لے کر گاڑی میں بیٹھی اور گھر چلی آئی۔ محسن بہت خوش تھا۔ وہ دل سے چاہتا تھا کہ وہ غلام جیلانی اُن سب کو بے دردی سے قتل کر دے مگر اس کی مایوسی کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس کو معلوم ہوا کہ پولیس نے غلام جیلانی کو گرفتار کر لیا ہے۔ یہ اچھی خبر نہیں تھی۔ نہ میرے لیے نہ محسن کے لیے۔ ڈاکٹر دھمن اور اُس کے تمام گرگے صاف بچ گئے تھے۔

ڈاکٹر عذرا نے اپنی ڈائری بڑی خلوص سے قلمبند کی تھی۔ کسی بھی معاملے میں اُس نے کسی کو بچانے یا چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

ابھی میں وہ ڈائری پڑھ ہی رہا تھا کہ دروازے پر بڑی نرم سی دستک ہوئی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ یا تو آپی ہے یا پھر ڈاکٹر عذرا ہوگی۔ میں نے دروازہ کھولا تو عذرا سامنے کھڑی تھی۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ خلافِ توقع وہ مجھ سے ناراض نہیں تھی۔ اُس نے کمرے میں داخل ہو کر خود چٹخنی چڑھائی اور بولی۔

"میں نے اگر آپ سے ایک لاکھ روپیہ وصول نہ کیا ہوتا تو میں ابھی آپ کو پولیس کے حوالے کر سکتی تھی۔"

"روپے میں واقعی بڑی طاقت ہے ڈاکٹر! مگر مجھے بتائیں یہ قصہ کیا ہے۔ وہ تھانیدار کیا کہہ رہا تھا؟"

"وہ مجھے بتانے آیا تھا کہ کسی شخص نے میرے بچوں کو گھر میں آیا برادُنی کے ساتھ یرغمال بنا لیا تھا مگر برادُنی نے اس کا منصوبہ ناکام بنا دیا۔ وہ اپنے جگر بند کھول کر کھڑکی کی راہ سے باہر نکل گئی، اور سیدھی تھانے جا پہنچی۔ انسپکٹر غضنفر نے اسی وقت نہایت ہی عجلت میں میرے مکان کو گھیرے میں لے لیا مگر وہ آپ کا دوست بڑی عیاری سے اُن کی گرفت سے بچ نکلا۔"

"وہ ایسا ہی ہے ڈاکٹر! ہوا کو کوئی پکڑ نہیں سکتا ہے کیونکہ وہ اس زمین پر زندگی کی نمو کے لیے بہت ضروری ہے۔" یہ کہہ کر میں نے اس کی ڈائری اس کے سامنے میز پر رکھ دی۔

"میں نے اسے پڑھ لیا ہے ڈاکٹر! اور آپ کو شاید علم نہیں کہ وہ مظلوم لڑکی جس پر ڈاکٹر محسن صاحب کو بہت ترس آیا تھا، میری بہن آسیہ تھی جو اب آپ کے کلینک میں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے۔"

اُس کی آنکھیں حیرت سے پھٹنے لگیں۔ اشارۃً میں [illegible] بھی یہ بات بتا چکا تھا مگر اس وقت شاید وہ بات اُس نے جان [illegible] سُنی اَن سُنی کر دی تھی۔

"میں... میں اسی لیے نہیں چاہتی تھی کہ آپ یہ ڈائری [illegible] آپ کا نام غلام جیلانی ہے۔"

"جی ہاں! میں ہی وہ بدنصیب آدمی ہوں جس کی زندگی [illegible] دھمن نے تباہ کر دی ہے۔"

"اوہ! میں سمجھی! مجھے بہت افسوس ہے جیلانی صاحب! [illegible] اپنا نام ہاشم خان بتایا تھا میرے ذہن میں یہ بات بھلا کیسے [illegible] تھی کہ آپ غلام جیلانی ہیں۔ میں تو بس آپ کو صرف ایک بار [illegible] سکی تھی۔"

وہ اپنی کرسی سے اٹھی اور ڈائری پر ہاتھ پھیرتے ہوئے [illegible]

"میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں جیلانی صاحب مگر [illegible] معلوم ہو چکا ہوگا کہ اس سارے معاملے میں میرا یا محسن کا قصور [illegible]"

"مجھے معلوم ہے اور یقین کریں میں آپ سے کوئی شکایت [illegible] رکھتا۔ یہ ڈائری نہ پڑھ کر میں بہت سے حقائق سے بے خبر رہتا۔"

"یہ میں آج اس لیے اپنے ساتھ لائی تھی تاکہ اگر کچھ وقت [illegible] اس میں میں اب تک کے سارے واقعات اور اپنے محسوسات کو [illegible] کر سکوں مگر یہ بہت ہی خطرناک ثابت ہوئی ہے میں اب اسے پھاڑ [illegible]"

"ہاں! مگر میری مانیں تو اسے محفوظ رکھیں۔ اس میں ڈاکٹر [illegible] کے خلاف زبردست شہادت موجود ہے۔"

"ٹھیک ہے میں اس کے بارے میں سوچوں گی۔" یہ کہہ کر اُس [illegible] ڈائری میز پر سے اٹھا کر دراز میں ڈال دی پھر کچھ سوچتے ہوئے [illegible]

"آپ نے اچھا کیا ہے کہ آسیہ کو یہاں سے اٹھا لیا ہے [illegible] کلینک میں لے کر گئے ہیں اُسے؟"

"مجھے وہ بتا کر نہیں گیا ابھی واپس آئے گا تو معلوم کر [illegible] مگر میرا خیال ہے کہ وہ راوی روڈ پر بخاری کلینک میں گیا ہوگا۔"

"یہ آپ نے بہت اچھا کیا ہے وہاں ڈاکٹر غیاث [illegible] آسیہ کا علاج کر سکتے ہیں بس آپریشن کے بعد کے حالات کو [illegible] ہے انھیں میں نے اطمینان کر لیا تھا آسیہ کے گُردے پر تا دیر زندہ [illegible]"

"میں آپ کا شکرگزار ہوں ڈاکٹر اور آپ سے معذرت خو[illegible] کہ میری وجہ سے آپ کو اتنی ذہنی اور جسمانی اذیت برداشت کر[illegible]"

"معذرت کی کوئی ضرورت نہیں جیلانی صاحب! اسی بہانے [illegible] ہو گئی ہے۔"

اچانک دروازے پر تابڑ توڑ قسم کی دستک ہوئی۔

"کون ہے؟" اُس نے تیز لہجے میں پوچھا۔

"میں ہوں ڈاکٹر صاحب! نسرین۔ وہ چودہ نمبر کے مریض کی حالت بہت خراب ہے ڈاکٹر صاحب!" نرس کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

"چودہ نمبر! تم چلو ادھر میں آتی ہوں۔"

"یہ تو ڈاکٹر عرفان کا کمرہ ہے، اُسے کیا ہو گیا ہے؟"

"آپ ادھر ہی بیٹھیں میں ابھی آتی ہوں، اس دراز کا خیال رکھیں۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

میری اس خود نوشت میں طب کے پیشے سے متعلق کئی لوگوں کا ذکر آیا ہے اُن کو میں نے جس رنگ میں دیکھا، اُسے یہاں پیش بھی کر رہا ہوں۔ انہی کے وسیلے سے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ بنیادی طور پر تمام انسان ایک جیسے ہیں۔ ایک جیسے حریص، ایک جیسے خلیق، ایک جیسے سفّاک اور ایک جیسے بے رحم۔ وہ سب کے سب پیٹ اور نفس کی بھوک میں مبتلا ہیں۔ جلب زر نے ہر آدمی کو روگی بنا رکھا ہے اور اس میں کسی بھی اچھے بُرے، کالے گورے کی کوئی تمیز نہیں ہے۔ وہی آدمی جو میرے سامنے فرشتہ بن جاتا ہے کسی اور کے لیے ابلیس ثابت ہوگا۔ میں یہاں اگر کسی کے آگے بچھ جاتا ہوں تو اگلے لمحے میں کسی اور کے سامنے بدترین سفاکی کا مظاہرہ کروں گا اور یہی وہ معمّہ ہے جسے میں سمجھ نہیں سکا اور یہ اسی معمے کا سبب ہے کہ زندگی میں اتنی ساری بوقلمونی اور اتنی ساری ہماہمی موجود ہے، اس پر ہمیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ ہم متحرک ہیں ایک دوسرے سے ٹکرا جانے کی صفت ہمارے اندر موجود ہے۔

ڈاکٹر عذرا پندرہ منٹ بعد واپس آئی تو اُس کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ بڑی ہی وحشت زدہ آواز میں بولی۔

"جیلانی صاحب! وہ... وہ ڈاکٹر عرفان تو مر گیا ہے اور بہتر ہے سارے شہر میں یہ بات گشت کر رہی ہے کہ کسی نے عرفان کے گھر ڈاکہ ڈال کر سات لاکھ روپیہ اور زیورات لوٹنے کے علاوہ ڈاکٹر عرفان کو بھی اغوا کر لیا ہے کسی نے ادھر ضمیمہ بھی شائع کر دیا ہے۔ پولیس نے یہ خبر چھپالی تھی مگر کسی اخبار والے کو اس کا علم ہو گیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ڈاکو تعداد میں دو تھے۔ انہوں نے چوکیدار کو بے ہوش کیا اور پھر عرفان کے بھائی کو بھی انھوں نے بے ہوش کر دیا۔ عذرا [illegible] کو رسیوں میں باندھ کر وہ گھر کو لوٹتے رہے۔"

یہ کہہ کر وہ میری آنکھوں میں جھانکنے لگی جیسے کہہ رہی ہو... کہ یہ سب کچھ تم نے کیوں کیا اور کیسے کر لیا؟ میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

"آپ کیوں اتنی پریشان ہو رہی ہیں ڈاکٹر عذرا؟"

"بات ہی ایسی ہے عرفان کا نام ہمارے مریضوں کے رجسٹر میں درج نہیں ہے۔ اس کی حیثیت یہاں لاوارث مریض جیسی ہے۔ میں اُسے... [illegible] رکھوں، کہاں بھیجوں، کس کے سپرد کروں میں اُسے؟" یہ کہہ کر وہ نڈھال سی ہو کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

"معاملہ خاصا پیچیدہ ہے ڈاکٹر! اِس عرفان کا کیا کریں گی اب آپ؟"

"یہی بات تو میری سمجھ میں نہیں آتی۔ مجھے معلوم ہے اُسے کس نے لوٹا ہے اور وہ کس راہ سے یہاں پہنچا ہے مگر اب آپ ہی کو اُسے ٹھکانے بھی لگانا ہوگا کیونکہ پولیس اس کی تلاش میں ہے۔"

"اُس انسپکٹر غضنفر کا کیا کیا ہے آپ نے؟"

"اُس کا مجھے کیا کرنا تھا۔ میں نے اُسے ٹرخا دیا۔ میں نے کہہ دیا کہ اُس کی بڑی مہربانی ہے کہ اس نے میرے بچوں کی حفاظت کی ہے۔ انعام کے طور پر... میں نے اُسے دو ہزار روپے بھی دیئے تھے۔ اب وہ میرے گھر کی نگرانی کر رہا ہوگا۔ اُس نے کہا تھا کہ وہ سادہ کپڑوں میں اپنے سپاہی وہاں اردگرد کھڑے رکھے گا۔"

"ہوں! یہ تو گڑبڑ کی بات ہے۔ میں... میرا خیال تھا کہ ہم عرفان کو آپ کے گھر کے لان میں دفن کر دیتے ہیں۔"

"نہ بابا نہ! میں باز آئی۔ یہی ایک لاکھ میرے لیے کافی ہیں۔ میں باقی ایک لاکھ آپ سے نہیں لیتی۔ آپ اس مصیبت کو یہاں سے اٹھائیں اور لے جا کر اس پر پٹرول چھڑک دیں۔ میں اسے زیادہ دیر اِدھر نہیں رکھ سکتی۔"

"مگر وہ مر کیسے گیا ڈاکٹر! ایسا نہ ہو میری بہن کا آپریشن بھی ناکام ہو جائے۔"

"ایسا نہیں ہوگا جناب! وہ اس خطرے کے مرحلے سے گزر چکی ہے۔ اس عرفان کو تو میں نے جان بوجھ کر مرنے دیا ہے۔ اس کا زندہ رہنا میرے لیے خطرناک ثابت ہوتا کیونکہ مجھے یقین ہے کہ وہ مجھے پہچان چکا تھا۔"

"یہ بات آپ کس طرح کہہ سکتی ہیں؟"

"جب وہ ادھر میرے کمرے میں تھا تو اس وقت وہ ہوش میں آ گیا تھا اور اُس نے ہماری باتیں سُن لی تھیں۔ ایک بار اُس نے نیم بے ہوشی کے عالم میں میرا نام بھی لیا تھا۔"

"اوہ! تو یہ بات ہے۔ ابھی وہ میرا دوست آ جائے تو پھر کچھ سوچتے ہیں۔ عرفان کی لاش تو یہاں نہیں رہنی چاہیے۔"

"ہاں، میں نے نسرین کو بھی سمجھا دیا ہے۔ اب اس کا کمرہ مقفّل پڑا ہے ادھر کوئی نہیں جا سکے گا مگر پلیز! اِس مصیبت کو یہاں سے اُٹھاؤ۔ اس کا مر جانا ہی بہتر تھا۔ اسی لیے میں نے جان بوجھ کر اس کے آپریشن میں خرابی پیدا کر دی تھی۔"

"یہ آپ نے بہت اچھا کیا ہے ڈاکٹر! یقین رکھیں ہم آپ کو باقی ایک لاکھ بھی دے کر جائیں گے۔ ہمیں کون سا اپنے پلّے سے دینا ہے۔

یہ سارا مال ہم عرفان کے گھر سے لائے تھے۔"
"وہ کون سی اس کی حلال کی کمائی تھی مجھے معلوم ہے وہ بہت موٹی اسامی تھا۔ اس نے بینک میں بھی بڑی رقم جمع کر رکھی ہوگی۔"
"حیرت مجھے یہ ہے کہ عرفان نے اتنی بڑی رقم گھر میں کیوں ڈال رکھی تھی؟"
"انکم ٹیکس سے بچنے کے لیے سبھی ایسا کرتے ہیں جناب! یہ خفیہ دولت لوگ ظاہر کر دیں تو پھر اور کیا چاہیے۔ قوم کی قسمت نہ سنور جائے۔"
"ہاں یہ تو ہے بہرحال عرفان کی موت کا مجھے بھی دکھ ہوا ہے۔"
"اس پر لعنت بھیجیں، ڈاکٹر دھمن کو اس کاروبار میں اس نے ہی ڈالا تھا۔ مجھے اس سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔"
"آپ بہت سنگدل ہیں ڈاکٹر! آپ نے جان بوجھ کر اس کا کیس بگاڑ دیا۔"
"میں ایسا نہ کرتی تو وہ مجھے زبردست مصیبت میں پھنسا دیتا۔"
"ایک بات بتائیں ڈاکٹر! ابھی تھوڑی دیر پہلے اس ڈائری کے معاملے میں آپ مجھ سے گتھم گتھا ہو گئی تھیں۔ آپ کو معلوم تھا کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا، پھر بھی آپ ۔۔۔"
"میں وہ ڈائری کسی کو پڑھنے کی اجازت نہیں دے سکتی تھی پھر بھی آپ نے پڑھ لی۔ یہ تو اچھا ہے کہ آپ اِن معاملات سے بڑی حد تک پہلے سے باخبر تھے ورنہ میں تو کہیں کی نہ رہتی۔"
"پھر بھی آپ اسے ساتھ لیے پھرتی ہیں۔"
"نہیں، میں تو اسے بہت محفوظ رکھتی ہوں مگر آج میں اس عرفان اور اس لڑکی کے بارے میں لکھنا چاہتی تھی اور اس رقم کے بارے میں بھی جو آپ نے مجھے دی ہے۔"
"آپ اتنی امیر ہیں پھر بھی آپ کا لالچ ختم نہیں ہوا۔"
"یہ بات نہیں ہے جناب! مجھے یہاں چند مشینوں کی ضرورت ہے۔ خون کو صاف کرنے کی ایک مشین میں منگوا رہی ہوں وہ بہت مہنگی آتی ہے وہ دراصل ایسے لوگوں کے لیے ہے جن کے گردے ناکام ہو جاتے ہیں ایسی چیزوں کے لیے تو رقم کی ہر وقت ضرورت رہتی ہے۔"
"ہاں یہ تو ہے۔ میں آپ کو ایک لاکھ اور دوں گا۔"
"اب مجھے یاد پڑتا ہے کہ آپ کے بارے ہی میں وہ خبریں چھپی تھیں جن میں بتایا گیا تھا کہ آپ جیل سے بھاگ نکلے تھے۔ کچھ انعام بھی مقرر ہے آپ کی گرفتاری پر۔"
"جی ہاں آپ سچی ہیں۔ میں وہی آدمی ہوں۔"
"اچھا ہوا آپ انسپکٹر غضنفر کے سامنے نہیں گئے ورنہ خواہ مخواہ مصیبت پڑ جاتی۔ آپ نے اگر میرے بچوں کو نہ پکڑا ہوتا تو شاید یہ آپریشن میں ہرگز نہ کرتی۔"
"مجھے معلوم تھا۔ اِسی لیے اپنے دوست کو آپ کے گھر بھیج دیا تھا۔"
"آپ نے میرے لیے زبردست مصیبت پیدا کر دی تھی۔ بہر خدا کا شکر ہے کوئی ناخوشگوار حادثہ نہیں ہوا۔" ہم یونہی کوئی ایک گھ... تک آپس میں ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر اچانک دروازے ... ہوئی۔ عذرا خود دروازے پر گئی، بولی۔ "کون؟"
"دروازہ کھولیں ڈاکٹر! میں ہوں ہاشم خان کا دوست۔"
وہ آبی کی آواز تھی۔ ڈاکٹر عذرا نے دروازہ کھولا تو آبی اندر آ گیا۔ مگر اب کی بار وہ ایک خوبصورت قسم کے ولایتی سوٹ میں ... تھا اور ہاتھ میں اس نے ایک ہلکا سا اٹیچی کیس تھام رکھا تھا۔ خوبصورت سا پائپ بنائے ہوئے تھا۔ بالکل کسی نجیب الطرفین انگ... بچہ نظر آ رہا تھا۔ وہ اس گھڑی بہت اچھے موڈ میں تھا، بولا۔
"ویل! ہاؤ ڈو یو ڈو جنٹلمین۔" وہ خالص انگریزی لہجے...
"ابے یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے تو نے؟"
ڈاکٹر عذرا بھی اسے اس حلیے میں دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔
"یار! میں اُدھر ذرا شاپنگ کے لیے نکل گیا تھا تیرے لیے ... لایا ہوں۔ لے یہ، اور اتار دے یہ دیسی وردی اور زنانہ شلوار۔"
یہ کہہ کر وہ کرسی میں دھنس کر بیٹھ گیا۔
"آسیہ کو کہاں پہنچا آئے ہو؟"
"اُدھر بخاری کلینک میں۔ یار بہت اچھے لوگ ہیں وہ۔ وہ ریٹا بھی مل گئی تھی وہیں۔ اِسی نے سب سے پہلے آسیہ کو دیکھا ... اس کا نام لیا تو میں اسے پہچان گیا، اسے میں نے الگ لے جا کر ... میں بتایا تو وہ خوش ہو گئی۔ اس نے آسیہ کو بہت عمدہ کمرے ... پہنچا دیا۔ وہ مریض کا پچھلا ریکارڈ مانگتے تھے۔ اُن ... سے ... کہہ کہ وہ کہیں کھو گیا ہے اس کے گردے کا آپریشن ہوا ہے اور ... کے لیے تمہارے پاس لے آیا ہوں۔ پانچ ہزار میں نے اُن کے ... تھمائے تو وہ سارے سوال بھول گئے، بولے روز کا پانچ سو روپیہ ... میں نے کہا پروا نہیں ہے... ہم ہزار روپیہ روز دیں گے ہمیشہ ... علاج ہونا چاہیے بس وہ تو لٹو ہو گئے۔ بہت خاطر مدارات کی ... نے میری ... ریٹا تو ناچتی پھرتی تھی۔ اس نے تمہیں بلا بھیجا ہے۔"
"میں ملوں گا اس سے، ویسے کہتے کیا ہیں؟ آسیہ کا حال ..."
"وہ بالکل ٹھیک ہے یار! میرا خیال ہے کہ آپریشن بہت ... رہا ہے۔ دو لیڈی ڈاکٹروں نے اس کا معائنہ کیا ہے۔ وہ دونوں مطمئن ہیں۔"
"اِن کو باقی ایک لاکھ بھی دے دو۔"
"ہاں، اب اس کی یہ حقدار بھی ہیں۔ یہ لو بی بی۔" یہ کہہ کر ... نے دس دس ہزار کی دس گڈیاں اس اٹیچی کیس سے نکال کر ڈاکٹر کے سامنے رکھ دیں، وہ خوش ہو گئی اور کسی حریص مرغی ...

اس نے دونوں ہاتھوں سے وہ نوٹ اٹھا کر دراز میں ڈال لیے، بولی۔
"میں آپ کی شکرگزار ہوں جیلانی صاحب! یہ رقم میرے بہت کام آئے گی۔"
"جیلانی صاحب! یہ... یہ میں کیا سن رہا ہوں؟" آبی نے حیران ہو کر کہا۔
"میں نے اِن سے اپنا تعارف کرا دیا ہے یار! یہ اپنی ہی قسم کی خاتون ہیں، بڑی مہربان بڑی مشفق، بڑی محبت کرنے والی۔"
"محبت کرنے والی! یعنی؟ یہ میں کیا سن رہا ہوں بھئی؟"
"میری بات سے غلط مطلب نہ لو۔ محبت بھی تو کئی قسم کی ہوتی ہے مگر تمہارا اپنا دماغ اور اپنا کردار داغدار اور گندا ہے اس لیے تم ہر شے میں گندگی دیکھتے ہو۔ اِن کو سلام کرو یہ ہماری محسن ہیں انھوں نے آسیہ کی جان بچا کر ہم پر احسان کیا ہے بچے!"
"اور جو ہم نے دو لاکھ پانی کر دیا ہے، وہ!"
"وہ! ابے چوری کے کپڑے، لاٹھی کے گز۔ مالِ حرام بود بجائے حرام رفت۔"
"نو سر! اگر یہ سب کچھ تم اِن کے سامنے کیوں بک رہے ہو؟" آبی حیرت زدہ ہو گیا تھا۔
"میں نے انھیں سب کچھ بتا دیا ہے یار! معلوم یہ ہوا ہے کہ کسی زمانے میں یہ بھی ڈاکٹر دھمن کے ٹولے میں شامل رہی ہیں۔"
"انا للہ و انا الیہ راجعون۔ یعنی یہ بھی! لا ہاتھ استاد! خدا نے ہماری لاج رکھ لی۔" یہ کہہ کر آبی نے مجھ سے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا، تو میں نے انگلی کے ایک خاص اشارے سے اسے بتا دیا کہ میں ڈاکٹر عذرا سے کس حد تک بے تکلف ہو چکا ہوں۔
"اچھا؟ تو نوبت بایں جا رسید۔ یار بڑی تیز قسمت ہے تیری۔ اور بڑا حرام لکھا ہے تیرے ماتھے پر، میرا مطلب ہے حرام مال۔" یہ کہہ کر اس نے ایک عمدہ قسم کا خوبصورت، گرم کلیجی رنگ کا سوٹ میرے آگے رکھ دیا۔ اٹیچی کیس میں اس نے بہت کچھ بھر رکھا تھا ضرورت کی بہت سی چیزیں وہ خرید لایا تھا۔
میں نے سوٹ اور سفید قمیص باتھ روم میں لے جا کر پہنی تو معلوم ہوا کہ وہ بالکل میرے ناپ کی چیزیں خرید کر لایا تھا۔ مجھے آئینے میں خود کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔ وہ سوٹ میرے بدن پر سج گیا تھا۔
میں جب باتھ روم سے باہر نکلا تو وہ دونوں ستائش بھری نظروں سے مجھے دیکھنے لگے، عذرا بولی۔
"چشم بد دور۔ آپ کسی ضلع کے سی ایس پی افسر نظر آتے ہیں۔"
"جی ہاں! بس بیگم کی کمی ہے ورنہ میری تکمیل میں کوئی کسر نہیں رہ گئی ہے۔"
آبی نے ایک پائپ، ایک لائیٹر اور تھری فائیو کے تمباکو کا ڈبا میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ پھر اس نے دس ہزار روپے کی ایک گڈی میری جیب میں ڈال دی۔ "یہ تمہارا جیب خرچ ہے۔" اس کے بعد اس نے پرفیوم کی شیشی نکالی اور میرے سارے لباس پر خوشبو کا اسپرے کیا پھر ایک رومال میری جیب پر سجا کر بولا۔ "اب کیا خیال ہے آپ کا؟ بالکل ولایتی چیز بن گیا ہے آپ۔" یہ کہہ کر اس نے طلائی رنگ کی ایک گھڑی بھی میری کلائی پر باندھ دی اور میری پرانی گھڑی اتار کر اس نے عذرا کے سامنے رکھ دی، بولا۔
"یہ ہماری طرف سے حقیر سا تحفہ سمجھ کر رکھ لیں۔"
عذرا نے وہ گھڑی لے لی، بولی۔
"میں اسے سنبھال کر رکھوں گی، دو بہت اچھے لوگوں سے ملاقات کی نشانی سمجھ کر۔"
"ہم اچھے نہیں ہیں بی بی! اُدھر تمہارے بچوں پر جب میں حاوی تھا اس وقت آپ نے مجھے دیکھا ہوتا۔"
"وہ مرحلہ بھی بہرحال گزر گیا، مجھے آپ سے کوئی شکوہ نہیں ہے۔"
"پر اس برائی کو میں نہیں چھوڑوں گا۔ اس نے تو مروا ہی دیا تھا مجھے آج۔"
"یہ اس کا فرض تھا اور میں آج اسے پانچ ہزار روپے انعام دوں گی اس کی بہادری اور حاضر دماغی کا۔"
"ہاں! ہے وہ واقعی انعام کے قابل ڈاکٹر صاحب! بہرحال میں آپ سے شرمندہ ہوں مگر اس کے بغیر آپ بھی شاید کچھ نہ کرتیں۔"
"ہاں! ان کام نے اچھا علاج ڈھونڈا تھا۔ مگر یار خبر اچھی نہیں ہے، وہ عرفان مر گیا ہے۔"
"اوئے مارے گئے۔ یار یہ تو بہت برا ہوا۔"
"برا تو خیر نہیں ہوا۔ اس کا زندہ رہنا ہمارے لیے نقصان دہ ہی تھا۔ بہرحال اب تم یوں کرو کہ اس کی لاش ٹھکانے لگانے کا کوئی بندوبست کر دو۔"
"آپ اسے ہماری کار میں ڈلوا دیں ڈاکٹر! پھر ہم جانیں اور ہمارا کام۔" آبی نے بڑی دلچسپی سے کہا۔
"میں یہی کر رہی ہوں، آپ نیچے کار میں بیٹھیں میں اسٹریچر پر ڈال کر لاش باہر بھیجتی ہوں، اس کا منہ سر سارا کپڑے میں لپٹا ہوگا۔"
"ٹھیک ہے اب ہمیں اجازت دیں اور ہمارے یہ کپڑے جلا دیں۔" یہ کہہ کر آبی نے اٹیچی کیس میں سے اپنے پرانے کپڑے ڈاکٹر کے سامنے رکھ دیے۔
"میرے کپڑے اُدھر اندر پڑے ہیں۔ ہم کسی دن پھر حاضر ہوں گے ڈاکٹر عذرا، اگر آسیہ کو کوئی مشکل پیش آئی تو آپ بخاری کلینک جا سکیں گی نا؟"
"جی کیوں نہیں! اس میں حرج ہی کیا ہے؟ میں خود بھی صبح

شام اس کے بارے میں پوچھتی رہوں گی۔ آپ نے انھیں بتایا تو نہیں تھا کہ مریضہ کس جگہ سے وہاں منتقل ہوئی ہے؟"

"نہیں میں نے یہ بات انھیں نہیں بتائی تھی۔" آبی نے کہا۔

"وہ ن ہو گئی تو میں نے کہا۔ "اچھا اب اجازت دیں جناب! خدا حافظ۔" یہ کہہ کر میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اس کے ہاتھوں کے لرزاں گداز میں ایک پُراسرار پیغام تھا۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے چھڑایا تو اُس نے میری چھنگلیا میں اپنی انگوٹھی چڑھادی اور حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ انگوٹھی میری چھنگلیا میں پوری آگئی۔ وہ اُس نے اپنے دائیں ہاتھ کی تیسری اُنگلی میں پہن رکھی تھی۔ میرا سیروں خون بڑھ گیا۔

ہم دروازے سے نکلنے لگے تو اس نے میرے پہلو میں بڑی شوخی سے چٹکی لی، بولی۔

"ڈاکو مہاراج! کسی دن داسی کے گھر ضرور آئیے گا۔"

میں نے پیچھے پلٹ کر دیکھا تو وہ میری اسٹین گن پکڑے ہوئے تھی۔ وہ پہلا دِن تھا کہ میں اپنے اس ہتھیار سے غافل ہو گیا تھا۔ ہم پھر میز کی طرف پلٹ آئے۔

"یار اس مصیبت کو کہاں رکھیں؟" میں نے کہا۔

"ارے اس کو ادھر اٹیچی کیس میں بند کرے۔ یہ خاصا لمبا ہے۔" یہ کہہ کر آبی نے اسٹین گن اٹیچی کیس میں رکھی۔ بولا۔ "اس کی گولیاں میں نے تیرے کوٹ سے نکال کر ادھر رکھ لی تھیں۔ چل اب نکل چل۔"

کچھ ہی دیر بعد ہم گاڑی میں جا بیٹھے۔ باہر مطلع صاف ہی تھا خطرے کی کوئی علامت نظر نہیں آتی تھی۔ کوئی دس منٹ بعد دو آدمی سٹریچر پر ڈال کر عرفان کی لاش باہر لے آئے۔ اس پر انھوں نے کمبل ڈال رکھا تھا۔ لاش ایک چادر میں لپٹی تھی اسے انھوں نے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر جُوں توں کر کے ڈالا اور کمبل نکال کر واپس جانے لگے۔ آبی نے سو روپے کا ایک نوٹ ان کی طرف بڑھایا تو وہ خوش ہو گئے اور دعائیں دیتے ہوئے پیچھے ہٹ گئے۔

آبی نے گاڑی اسٹارٹ کر دی اور ہم کچھ ہی دیر بعد شہر سے نکل کر اس سڑک پر جا نکلے جو واہگہ کی طرف جاتی تھی۔ جب ہم سلامت پورہ کے سامنے سے گزرے تو آبی بولا۔

"یار مجھے لگتا ہے تم نے اس ڈاکٹرنی پر کوئی جادو کر دیا ہے کون سی گیدڑ سنگی ہے تیرے پاس؟"

"یہ بات نہیں ہے سیلے! وہ یوں ہی مہربان ہو چکی تھی۔"

"وہ تو میں دیکھ ہی رہا تھا۔ تیری آنکھ میں کوئی سحر ہے جیلانی! بڑا لا سا ہے تیرے وجود میں ورنہ وہ ایسی نظر نہیں آتی تھی۔"

"نہیں یار۔ وہ خواہ مخواہ رلیشہ خطمی ہو گئی تھی۔" یہ کہہ کر میں نے اُسے سارے واقعات سے آگاہ کیا تو وہ بولا۔

"پر یار۔ اس عرفان کو تو اُس نے ایک طرح خود مار دیا ہے کیسی دلیر عورت ہے یہ عذرا۔"

"ہاں! اپنی جان بچانے کے لیے اُسے یہ سب کچھ کرنا پڑا۔ بہر حال اب ہم اِسے کہاں پھینکیں؟"

"میرے پاس پٹرول کا بھرا ڈبہ موجود ہے لگا دیتے ہیں آگ اِسے کسی جگہ ڈال کر۔"

"ہاں! پر اسے دبا دینا بھی ضروری ہے۔"

"وہ تو ظاہر ہے مگر اس کے لیے بیلچے کی ضرورت ہو گی، خیر دیکھتے ہیں، اس کی قسمت میں کیا لکھا ہے۔"

کچھ ہی دیر بعد اُس نے گاڑی ایک کچی سڑک پر اُتاری اور کوئی دو ڈھائی میل آگے لے جا کر ایک پُرانے متروک بھٹے کے قریب کھڑی کر دی کسی زمانے میں اینٹوں کا وہ بھٹہ چالو رہا ہو گا مگر اب وہ ویران پڑا تھا۔ ہم دونوں نے چاروں طرف اچھی طرح دیکھ بھال کر عرفان کو گاڑی میں سے نکالا اور بڑی احتیاط سے اُٹھا کر اسے بھٹے کے اندر لے گئے۔

ہوا اس گھڑی بہت تیز چل رہی تھی۔ ہم نے کلمۂ شہادت پڑھ کر عرفان کی میت بھٹے کی سُرخ دیوار کے ساتھ رکھی میرے دل میں اُس وقت کھلبلی سی مچی تھی۔ اُس کے مرنے کے دن تو نہیں تھے مگر موت بڑی ہی پُرپیچ راہ سے اس پر وارد ہو گئی تھی اور میں جانتا تھا کہ وہ بہت بڑا ماہر سرجن تھا۔ بڑی دھاک جمی تھی اُس کی، اپنے شعبے میں وہ ایک مستند آدمی سمجھا جاتا تھا مگر اب۔۔۔ اب وہ کچھ بھی نہیں تھا۔ آبی نے گاڑی سے پٹرول کا ڈبا لا کر اس کے جسم پر چھڑکا تو مجھے جھرجھری سی آگئی۔ موت کیسے کیسے لوگوں کو 'لاشے' میں بدل دیتی ہے۔ عرفان کا منہ کھلا رہ گیا تھا، یوں جیسے موت کو اپنے اُوپر وارد ہوتا دیکھ کر اس کے وجود پر بے پناہ حیرت طاری ہو گئی ہو۔ اس کی آنکھیں بھی کھلی رہ گئی تھیں۔ اُن سے بھی تحیّر ہویدا تھا جیسے اسے یقین نہ آیا ہو کہ اتنی جلدی اور اس قدر بے بسی کے عالم میں وہ موت کے منہ میں جا گرے گا۔ چاروں طرف اذیت ناک خاموشی طاری تھی۔ ہم نے اپنے طور پر اطمینان کر لیا تھا کہ ارد گرد کوئی آدمی موجود نہیں ہے۔ بادل بہت نیچے جھک آئے تھے۔ بارش کا امکان قوی تھا۔ آبی پٹرول چھڑک کر الگ کھڑا ہو گیا۔ وہ بہت سنجیدہ ہو گیا تھا، یوں جیسے وہ کسی عزیز کے جنازے کے سرہانے کھڑا ہو۔

"اسے آگ دکھا دے یار اور آجا۔ میں یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتا۔"

"مگر اس کو یوں چھوڑ جانا تو اچھا نہ ہو گا۔ اس کا ڈھانچہ تو باقی رہ جائے گا۔"

"میں کیا کروں گڑھا تو اِدھر کوئی بھی نہیں ہے اور مٹی کے بیلچے کہاں سے لوں؟" آبی نے منہ بھینچ کر کہا۔ وہ دم بدم پریشان ہوتا جا رہا تھا۔ ماحول بہت ہی ماتمی سا ہو گیا تھا۔ اس عذرا نے عرفان کی لاش ہمارے سپرد کر کے ہمیں زبردست آزمائش میں ڈال دیا تھا۔

میں نے بہر حال جی کڑا کر کے عرفان کے مُنہ پر چادر ڈالی اور اس کے پاؤں کی طرف ہو کر پٹرول سے بھیگی چادر کو تیلی دکھا دی۔۔۔ آگ نے اُسے ایک دم سر سے پاؤں تک اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

عین اُسی وقت دیوار کے اُوپر سے بہت سی سُرخ مٹی اور چند اینٹیں نیچے گریں۔ ہم نے سٹپٹا کر اُوپر کی طرف دیکھا تو ہمیں ایک آدمی پیچھے ہٹتا نظر آیا۔ ہم تیزی سے پیچھے ہٹے اور بھاگ کر اس بھٹے کے کھلے در میں سے گزر کر باہر نکلے۔

"اوئے ان کو پکڑو سیلے! کسی آدمی کو انہوں نے جلا دیا ہے۔" کسی آدمی کی بھیانک آواز ہمیں اپنے پیچھے سُنائی دی۔ یہ وہی شخص تھا جس کا پاؤں الٹنے سے نیچے عرفان پر مٹی گر گئی تھی۔ ہمارے سامنے تین آدمی کھڑے تھے۔ وہ سب کے سب دیہاتی تھے۔ انھوں نے کھبسوں کی بکّل مار رکھی تھی۔ ایک کے ہاتھ میں لاٹھی تھی دوسرے نے ہاتھ میں درختوں کی ٹہنیاں کاٹنے والا لمبا سا بانس اُٹھا رکھا تھا۔ اُس کے ایک سرے پر ہلال جیسی شکل کا ایک تیز دھار پھل لگا تھا۔ تیسرے نے کسّی کندھے پر لٹکا رکھی تھی۔ انھوں نے اپنے ساتھی کی للکار سُنی تو وہ بڑے غور سے ہمیں دیکھنے لگے۔ وہ آدمی ایک دم بھاگ کر اُن کے پاس جا پہنچا، بولا۔

"اوئے ان کو پکڑو۔ انھوں نے ایک آدمی پر تیل ڈال کر اُسے آگ لگا دی ہے، وہ بے چارہ ادھر جل رہا ہے۔"

ہم اس کی بات سُنی اَن سُنی کر کے گاڑی کی طرف بڑھے تو ان میں سے ایک بولا۔

"اوئے باؤ۔ ٹھہر جاؤ۔ اوئے ادھر کس لمے کو آگ لگا آئے ہو؟ ٹھہر جاؤ۔"

اس کا لہجہ ایسا کرخت اور پُراعتماد تھا جیسے ساری دُنیا کا کاروبار اُسی کے اشارے پر چل رہا ہے۔ وہ ہمیں یونہی سے سُوٹڈ بُوٹڈ باؤ سمجھ رہے تھے۔ آبی نے مجھے گاڑی سے ذرا اِدھر ہی روک لیا۔

"یار یہ تو سر پر ہی آ چڑھے ہیں۔"

وہ واقعی ہماری طرف بھاگ رہے تھے اور اُن کے تیور یہ بتا رہے تھے کہ وہ ہمیں ایک قدم بھی آگے نہیں جانے دیں گے۔ ہم اپنی جگہ جم کر کھڑے ہو گئے۔ ہمارے وہ خوبصورت سے ولایتی سُوٹ اور وہ کار اس ویران اداس پرانے بھٹے کے پس منظر میں عجیب سا تضاد پیدا کر رہے تھے وہ چاروں ایک دم ہمارے پاس آ پہنچے۔

"اوئے تم اُدھر کس کو آگ لگا آئے ہو؟" ایک آدمی نے آگے بڑھ کر بڑے طمطراق سے پُوچھا۔

"تم کون ہوتے ہو پوچھنے والے؟" آبی نے بڑے نرمے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"اوئے سوچ کر بات کر اوئے باؤ! یہ چوہدری سیلا صاحب ہیں۔ چوہدری محمد اسمٰعیل صاحب۔ اس گاؤں کے مالک۔ کیا کر آئے ہو تم اُدھر۔ چلو واپس ورنہ تمہاری جان نکال لیں گے ہم!" یہ اُس آدمی کا طرزِ گفتگو تھا جس نے ہمیں بھٹے کے اندر عرفان کو آگ لگاتے دیکھا تھا۔

"چلو ہم خود تمھیں دکھا دیتے ہیں کہ وہ کون ہے۔" اور میں نے اُسے ہاتھ کے اشارے سے بھٹے کی طرف چلنے کو کہا۔

"وہ تو میں دیکھ ہی چکا ہوں پکڑو ان کو سیدھا تھانے لے چلو۔"

اس کی یہ بات سُنتے ہی میں نے اُلٹے ہاتھ کا ایک جھانپڑ جو اُس کے مُنہ پر مارا تو وہ اُلٹ کر دُور جا گرا۔ اس کا جبڑا اپنی جگہ سے ہل گیا تھا۔ آبی نے سامنے کھڑے سیلے کے کندھے سے کسّی دستے سے پکڑ کر یُوں گھسیٹ کر کھینچی کہ وہ مُنہ کے بَل نیچے آ رہا۔ اتنے میں تیسرے آدمی نے پیچھے ہٹ کر بانس پر لگا وہ ہلالی پھل آبی کی گردن کے گرد ڈالنے کی کوشش کی مگر میں نے وہ بانس درمیان سے پکڑ کر کچھ اس طرح کھینچا کہ وہ آدمی اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ چوتھا آدمی ابھی خاموش کھڑا تھا اُس نے بانس پر میری گرفت اتنی مضبوط دیکھی تو وہ ایک دم مجھ سے گتھم گتھا ہو گیا۔ اس نے میری کمر مضبوطی سے پکڑ کر مجھے پاؤں سے اکھاڑنے کی کوشش کی تو میں نے کہنی کی ضرب اُس کے سینے میں کچھ اس طرح لگائی کہ وہ درد سے نڈھال ہو کر نیچے بیٹھ گیا۔ ان کو برداشت کرنا اب میرے بس میں نہیں تھا۔ آبی نے سیلے کو کسّی کے ساتھ لگے دستے سے دُھن ڈالا۔ میں نے دو آدمیوں کو کچھ اس طرح رگیدا کہ ایک کی ناک سے نکسیر بہہ نکلی اور دُوسرا اپنی گردن ملتا رہ گیا۔ میں نے ہلکا سا ہاتھ اس کی گردن پر مار دیا تھا۔ چوتھا آدمی ابھی تک زمین پر پڑا تھا اس کا جبڑا ہی سیدھا نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے اس کی تکلیف کم کرنے کے لیے دائیں ہاتھ سے ایک گھونسہ اس کے مُنہ پر مارا تو اس کا جبڑا اپنی جگہ پر آ گیا مگر وہ اصل ضرب سے بلبلا کر بالکل ہی ڈھے گیا۔

وہ چاروں کچھ اس طرح زخمی ہو چکے تھے کہ اب وہ ہم سے جان چھڑانے کی فکر میں تھے۔ میں نے سیلے کو ایک بار پھر گردن سے پکڑنے کی کوشش مگر وہ گھبرا کر ایک دم بھاگ نکلا۔ وہ بھاگا تو دوسرے دو بھی اس کے پیچھے لپکے۔ چوتھا بے چارا کچھ زیادہ ہی پریشان تھا، وہ نڈھال سا ہو کر جہاں بیٹھا تھا وہیں بیٹھا رہ گیا۔

ہم دونوں نے گہری نظر سے ایک دُوسرے کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ ہم بالکل محفوظ رہے ہیں۔ البتّہ اُن کے میلے گرد آلود ہاتھوں سے ہمارے کپڑے کسی حد تک خراب ہو گئے تھے اُن پر لگی گرد جھاڑ کر ہم گاڑی میں جا بیٹھے۔ بھٹے کے اندر سے دھواں اٹھنے لگا تھا اور عرفان کی لاش کے جلنے سے چاروں طرف عجیب سی بدبُو پھیل رہی تھی

”جلدی نکل چل یار، اِن خبیثوں نے تو ہمیں اُس غریب کی آخری رسُومات بھی ادا نہیں کرنے دی ہیں۔“ آبی نے مجھے اسٹیرنگ سنبھالتے دیکھ کر کہا۔ میں نے گاڑی کا رُخ بدلا اور اُسی راستے لاہور کی طرف چل دیا جس راستے سے ہم عرفان کو اُس ویرانے تک لے گئے تھے۔

میں نے آخری بار بھٹے سے اُٹھتے دُھوئیں کو دیکھا اور پھر گاڑی کی رفتار تیز کر دی۔ مگر وہ چاروں آدمی اپنے تین اور ساتھیوں کو بُلا لائے تھے اور اب وہ سب کے سب تیزی سے ہماری طرف بھاگے آ رہے تھے جب ہم آگے نکل گئے تو وہ حیران پریشان سے ہو کر بھٹے کے اندر جا گھسے وہاں انہوں نے جو کچھ دیکھا ہو گا وہ اُن کے لیے مدّتوں باعثِ عبرت بنا رہے گا۔

اچانک آبی نے مجھے گاڑی کا رُخ موڑنے کے لیے کہا۔

”مگر کیوں؟“

”یار وہ اس کی آگ بجھا دیں گے۔ اس خبیث کا چہرہ محفوظ رہ گیا تو پولیس اُسے پہچان لے گی۔“

بات وہ ٹھیک کہہ رہا تھا مگر پیچھے مُڑنا کسی بھی طرح سُود مند نہ تھا۔ اب وہ تعداد میں سات ہو چکے تھے اور انہیں وہاں سے خون خرابے کے بغیر ہٹا دینا کسی طرح بھی ممکن نہیں تھا۔

میں نے کار کی رفتار اور زیادہ تیز کر دی۔

”ہمیں واپس نہیں جانا ہے آبی! کیا کریں گے وہ۔ یہاں سے بھاگ جانا ہی بہتر ہے۔“

”ٹھیک ہے بھائی۔ تُو نے آج اپنے ایک دشمن کو تو ٹھکانے لگا ہی دیا ہے تیرے گُردے کے آپریشن میں اس کا بھی ہاتھ تھا؟“

”ہاں! اِسی نے تو میرا معائنہ کیا تھا مگر دیکھ تو ذرا! کیسی لرزہ خیز موت مَرا ہے یہ۔ کتنا روپیہ جمع کر رکھا تھا اس نے۔“

میں نے بڑے ہی اداس اور مضمحل لہجے میں کہا۔ عرفان کے اس انجام نے مجھے دہلا کر رکھ دیا تھا اور میں سمجھتا تھا کہ اس میں تقدیر کا عنصر بھی شامل تھا ورنہ اُس نے تو اپنے گرد بہت اُونچی فصیل تعمیر کر رکھی تھی۔ اُس نے تو کبھی سوچا بھی نہ ہو گا کہ وہ اس عورت کے نشتر سے ہلاک ہو جائے گا جسے اُس نے گُردے کی پیوند کاری کا فن خود سکھایا تھا۔

ہم شہر کی مختلف سڑکوں سے گزرتے ہوئے کچھ ہی دیر بعد بخاری کلینک جا پہنچے۔ مگر جونہی ہم پورچ میں گاڑی کھڑی کر کے باہر نکلے، ہمیں محسوس ہوا کہ کلینک کی فضا بہت زیادہ بوجھل اور پُراسرار ہو چکی ہے وہاں دائیں بائیں کئی سپاہی رائفلیں لیے کچھ ایسے زاویوں پر کھڑے تھے کہ اُن کو ہم پہلی ہی نظر میں دیکھ ہی نہ سکے تھے۔ میری چھٹی حِس نے مجھے شدید خطرے کا احساس دلایا۔ آبی بھی ٹھٹک سا گیا۔ کلینک کو پولیس نے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ سامنے کے بڑے ہال میں بیٹھے مریض بالکل خاموش اور حیرت زدہ سے نظر آتے تھے۔

اچانک مجھے محسوس ہوا کہ بالکل بائیں ہاتھ کھڑے تین سپاہی آہستہ آہستہ ہماری طرف بڑھ رہے ہیں۔ رائفلیں انھوں نے سیدھی ہاتھوں میں یوں تھام لی تھیں کہ وہ ذرا سے اشارے پر فائر کھول سکتے تھے۔ آبی نے مجھے کار کی طرف دھکیل دیا دبی زبان میں بولا۔

”ادھر پولیس کھڑی ہے بھاگ چل یہاں سے۔“

یہ کہہ کر اس نے کار کا دروازہ کھول کر مجھے بھی اپنے ساتھ اندر کھینچا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ پیچھے مڑنے لگا مگر عین اُس وقت دو آدمیوں نے کلینک کا بڑا سا گیٹ بند کر دیا مگر آبی رُکا نہیں اس نے گاڑی برق رفتاری سے گھما کر سیدھی کی اور بند ہوتے دروازے سے کار کی ٹکّر مار کر کھولتے ہوئے وہ باہر سڑک پر جا نکلا۔ ابھی ہم کسی طرف مڑنے بھی نہ پائے تھے کہ پیچھے سے کسی سپاہی نے گولی چلا دی۔ وہ ہمارا ٹائر پھاڑ دینے کی کوشش کر رہا تھا مگر کوئی گولی نشانے پر نہ لگی اور آبی گاڑی کو بالکل بائیں ہاتھ راوی کے پُل کی طرف بھگانے لگا۔ مگر ابھی ہم کچھ ہی دُور گئے تھے کہ پولیس کی ایک جیپ تیزی سے ہمیں اپنے پیچھے آتی نظر آئی۔ کلینک میں کوئی زبردست قسم کی گڑبڑ ہو گئی تھی۔ یا تو کسی نے آسیہ کو پہچان لیا تھا اور اس کو گرفتار کرانے کے لیے اس نے پولیس کو وہاں بُلا لیا تھا یا پھر اس عذرا نے کوئی منتر پڑھا تھا اور اس نے ہماری گرفتاری کے لیے جال پھینک دیا تھا۔ کچھ نہ کچھ ہوا ضرور تھا۔ پولیس کے سپاہیوں کو اُن کے کسی افسر نے ہمیں نرغے میں لے کر گرفتار کرنے کے لیے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا تھا مگر آبی نے اپنی بے مثال حاضر دماغی سے کام لے کر اُن کے جال کو پھاڑ دیا تھا مگر اب وہ جیپ جو کلینک سے چند قدم دُور سڑک پر کھڑی تھی ہمارے تعاقب میں آ رہی تھی اور ہمیں معلوم تھا کہ راوی کے پُل پر ان لوگوں نے رکاوٹیں کھڑی کر دی ہوں گی وہ ہمیں کسی بھی طرف نکلنے کا موقع دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔

آبی نے راوی روڈ پر سیدھا جانے کے بجائے کار بند روڈ پر ڈال دی۔ بولا،

”یار کسی نے مخبری کر دی ہے میرا خیال ہے کہ وہ ایمبولینس کا ڈرائیور ہمیں لے ڈوبا ہے۔“

”اُسے کیا پتہ ہم کون ہیں؟“

”اُسے میں نے راوی روڈ جانے سے روک دیا تھا۔ جب وہ نول روڈ پر پہنچا تو میں نے اپنی کار خراب ہونے کا بہانہ کر کے اسے ایمبولینس روک لینے کے لیے کہا۔ میں اس کے پیچھے کار میں آ رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ کار کی حفاظت کرے اتنے میں میں مریضہ کو لیڈی ولنگڈن ہسپتال چھوڑ آتا ہوں مگر وہ میری بات ماننے پر آمادہ نہیں تھا۔ میں نے اُسے زبردستی روکا تو وہ بہت پریشان ہو گیا۔ وہ کسی طرح بھی ایمبولینس میرے حوالے نہیں کر رہا تھا۔ بالآخر اس کو پستول کی نالی دکھا کر ایمبولینس سے اتار کر کار میں بٹھانا پڑا مگر کار کی چابی میں نے اپنے پاس رہنے دی۔ وہ کار میں بیٹھا تو میں ایمبولینس چلا کر بخاری کلینک لے گیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ خود ایمبولینس ڈرائیور میری کار میں بیٹھنے کے بجائے ٹیکسی لے کر میرا پیچھا کرتا رہا ہے کیونکہ جب میں ایمبولینس لے کر واپس کار تک پہنچا تو وہ کار کے اندر نہیں تھا بلکہ بائیں ہاتھ فٹ پاتھ پر چلتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ اس نے دیکھ لیا ہو گا کہ مریضہ کو کس کلینک میں پہنچا رہا ہوں۔“

”تمہارا خیال ٹھیک ہے آبی! یہ ساری مصیبت اِسی وجہ سے آئی ہے۔ اس نے محض شک کی بنا پر پولیس کو خبردار کر دیا ہو گا مگر۔۔۔ مگر میں تو تباہ ہو گیا آبی! وہ آسیہ کو پھر گرفتار کر چکے ہوں گے۔“

”میں کچھ کہہ نہیں سکتا صورتِ حال بہت ہی خراب ہو گئی ہے۔“

”وہ بدمعاش بہت قریب ہو گئے ہیں یار، ذرا تیز چل۔“

یہ کہہ کر میں نے اٹیچی کیس میں سے اسٹین گن نکال کر اس میں لبالب گولیاں بھر لیں میرا دماغ الٹنے لگا تھا۔ پولیس کی جیپ بلاخیز رفتار سے ہمارے پیچھے دوڑ رہی تھی اور وہ بھیجے مستری کی دی ہوئی کار ہمیں تحفظ دینے میں ناکام ہوئی جاتی تھی۔ اس کی رفتار ساٹھ سے اوپر اُٹھ ہی نہیں رہی تھی اور ہمارے اور موت کے درمیان فاصلہ دم بدم کم ہوتا جا رہا تھا۔ اس جیپ پر وائرلیس لگی تھی اور معلوم یہ ہوتا تھا کہ انہوں نے باغبانپورہ تھانہ کی پولیس کو خبردار کر دیا ہو گا۔

آبی اپنے اعصاب پر ضبط کا کوڑا برساتا ہوا پوری رفتار سے آگے بڑھ رہا تھا اور ہم چاہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح بند روڈ عبور کر کے اُدھر واہگہ کی سرحد عبور کر کے نکل جائیں مگر وہ گاڑی ہمیں لے ڈوبی تھی۔ اس کی رفتار کسی بھی طرح ساٹھ سے اوپر نہیں ہوتی تھی۔

ابھی ہم محمود بوٹی گاؤں سے آگے نکلے ہی تھے کہ سامنے ہمیں ایک ٹریکٹر ٹرالی سڑک کے بیچ پھیل کر کھڑی نظر آئی۔ دائیں ہاتھ پولیس کی ایک جیپ موجود تھی۔ اور ٹرالی کے اس طرف ہمیں کئی سپاہی صاف دکھائی دے رہے تھے۔ انھوں نے رائفلوں کی نالیں ہماری سمت میں سیدھی کر رکھی تھیں۔ ان کو سامنے دیکھتے ہی آبی نے کار کا رُخ بائیں طرف موڑا اور ایک بند کے ساتھ ساتھ لگے مٹی کے اُونچے ٹیلوں پر جا چڑھا۔ اس کے ساتھ ہی کئی گولیاں کار سے ٹکرائیں۔ ان لوگوں نے ہم پر فائر کھول دیا تھا مگر وہ اتنے فاصلے پر تھے کہ ٹھیک سے وہ کسی چیز کا نشانہ نہ لے سکتے تھے۔ آبی نے گاڑی بڑی مہارت سے ان ٹیلوں پر سے اُتاری اور سامنے کے کھیتوں میں جا گھسا۔ وہ بَرسیم کے کھیت تھے اور فصل کا آخری ٹوکٹنے کا منتظر تھا۔ وہ جیپ جو ہمارے پیچھے تھی ٹیلے پر رُکی اور پھر چند ہی لمحوں بعد انہوں نے ہمارے تعاقب میں جیپ کھیتوں میں اُتار لی۔ کچھ ہی دیر بعد ہم رکڑ پر جا چڑھے۔ وہاں کیکر، ببول، پھلاہی اور شیشم کے درخت اُگے تھے۔ اُن کے درمیان میں سے گزرتے ہوئے ہم بلاخیز رفتار سے آگے نکلے۔ آبی انھیں بڑی بڑی وزنی گالیاں دے رہا تھا۔ جیپ اب بھی ہمارے تعاقب میں تھی مگر فاصلہ اتنا تھا کہ وہ ہم پر کوئی کاری گولی نہیں چلا سکتے تھے اچانک ہمیں دائیں ہاتھ سے ایک جیپ اپنی طرف بڑھتی نظر آئی۔ یہ وہی جیپ تھی جو ٹریکٹر ٹرالی کے پاس کھڑی تھی۔

میں نے اسٹین گن کی نال کھڑکی میں رکھ کر گولی داغ دی اور اُس کے ساتھ ہی اس جیپ کا شیشہ ٹوٹ گیا۔ گولی اُس کے ڈرائیور کے سینے میں لگ گئی تھی۔ جیپ لڑکھڑائی اور بائیں ہاتھ کے ایک درخت سے ٹکرا گئی۔ یہ ننھا سا لمحہ ہمارے لیے بہت غنیمت تھا۔ آبی کار کو گھنی جھاڑیوں میں ڈال کر پچھلی جیپ کی زد سے بچنے کے لیے دریا کی طرف لپکا۔ اب میں کار کی پچھلی نشست پر بیٹھ کر پچھلی جیپ کو بے کار کرنے کی فکر میں تھا کہ اچانک زبردست دھماکے کی آواز پیدا ہوئی کسی سپاہی نے اُس جیپ سے نکل کر ہماری کار کا ٹائر پھاڑ دیا تھا جو چند لمحے پہلے درخت سے ٹکرا گئی تھی۔ پچھلی جیپ جو بخاری کلینک سے ہمارے تعاقب میں آ رہی تھی، اندھے ہاتھی کی طرح بڑھتی چلی آ رہی تھی مگر اس کا ڈرائیور عقل مند تھا اُس نے کار کے ٹائر کا دھماکہ سُنا تو اس نے جیپ روک لی مگر میں اُن کو جیپ سے اُترنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ میں نے اسٹین گن کا فائر اُن پر کھول دیا۔ جیپ کا اگلا شیشہ کرچی کرچی ہو گیا مجھے نہیں معلوم کہ اُن میں سے کون کون زخمی ہُوا۔ آبی مجھے کار سے نکلنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا تو وہ اٹیچی کیس اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس وقت تک سورج ہمت ہار بیٹھا تھا اور اپنی روشنی سمیٹنے لگا تھا۔

اب ہم دونوں کار کی اوٹ میں کھڑے تھے۔ اور پولیس کے سپاہی ہمیں تین اطراف سے نرغے میں لینے کی کوشش کر رہے تھے۔ اچانک ایک بھاری بھرکم آواز ہماری سماعت سے ٹکرائی۔ وہ کوئی پولیس افسر تھا۔ اُس نے ہمیں للکارتے ہوئے کہا۔

”اپنے ہتھیار پھینک دے جیلانی! میرے پاس تجھے زندہ یا مُردہ ہر حال میں گرفتار کرنے کا حکم ہے۔“

اس دبیز بھیانک سناٹے کو چیرتی ہوئی وہ آواز میرے دل میں کھن ڈال گئی۔ میں نے آبی کا ہاتھ پکڑ کر دبایا تو وہ بولا۔

”اس کو جواب دے جیلانی!“

میں نے آواز کی سمت کا اندازہ کر کے یکے بعد دیگرے دو گولیاں چلائیں۔ شام کے جھٹپٹے میں میں نے دُوسری گولی پر ایک آدمی کی لرزہ خیز چیخ سُنی اور پھر مختلف سمتوں سے ہم پر گولیوں کی بوچھاڑ

ہونے لگی۔ موت وہاں اس گھڑی گھنگھرو بجا رہی تھی اور ہمیں نہیں معلوم تھا کہ ہم میں سے کون زندہ واپس جائے گا۔ ہم کار کی اوٹ میں تھے۔ پولیس کی گولیوں نے کار کے شیشے چکنا چور کر دیے۔ اب وہ ہماری چوتھی سمت بھی سنبھال بیٹھے تھے۔ اور آہستہ آہستہ اپنا گھیرا تنگ کرنے کی فکر میں تھے۔ آبی نے میرا ہاتھ پکڑا اور بولا۔

”چل اُدھر دریا زیادہ دُور نہیں ہے۔“

یہ کہہ کر وہ مجھے اپنے ساتھ زمین پر لٹا کر آگے کی طرف گھسٹنے لگا۔ اب سورج نے اپنی نگاہیں دُوسری طرف پھیر لی تھیں اور دھرتی لحظہ بہ لحظہ اندھیرے میں ڈوبنے لگی تھی۔ ہم گھنی...... جھاڑیوں میں رینگتے ہوئے آگے بڑھے تو اُن میں سے ایک سپاہی درخت پر جا چڑھا۔ ہوش مجھے اس وقت آیا جب آبی کی دبی گھٹی چیخ میرے کانوں سے ٹکرائی۔ اس سپاہی نے درخت پر چڑھ کر گولی چلا دی تھی جو آبی کی ران اُدھیڑ گئی تھی۔ ایک لمحے کے لیے تو میں پاگل ہی ہو گیا۔ میں نے چت لیٹ کر اس کی سمت کا اندازہ کیا۔ شام کے ملگجے اندھیرے میں مجھے ایک درخت کی دو موٹی شاخوں پر ایک ہیولا سا نظر آیا۔ اُسے تاک کر میں نے گولی داغ دی۔ ایک دلدوز چیخ درخت کے پتوں سے ٹکرائی چاروں طرف گونجی اور اس کے ساتھ ہی وہ سپاہی دھڑام سے زمین پر آ گرا۔ وہ نیچے گرا تو میں نے آبی کو سہارا دے کر آگے بڑھایا۔ ابھی اُس کے بدن میں بڑی طاقت موجود تھی۔ وہ اپنے زخم سے لاپروا ہو کر تیزی سے آگے سرکا مگر اُس سے اٹیچی کیس نہیں سنبھل رہا تھا۔ وہ میں نے اس سے لے کر اپنے بائیں ہاتھ رکھا اور پھر ہم تیزی سے رینگتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ اب ہم ایک کماد کے کھیت میں جا گھسے تھے اور وہ سپاہی اپنے ساتھی کے زخمی ہونے کی وجہ سے ہمارے قریب آنے سے کنی کترا رہے تھے۔ اس سے پہلے میں اُن کے ایک ڈرائیور کو بے کار کر چکا تھا۔ کماد کا وہ کھیت بس ہتھیلی بھر چوڑا تھا۔ جلدی ہی ہم اس میں سے گزر کر کھلی جگہ پر جا پہنچے تھے۔

”اس کھیت کو گھیرے میں لے لو۔ وہ بچ کر نکل گئے تو پھر لعنت ہے ہماری نوکری پر۔“ ایک پولیس افسر نے بڑے غضبناک لہجے میں کہا۔ وہ اپنے ساتھ ٹارچ لائے ہوتے تو شاید انہیں ہمیں ڈھونڈنے میں کوئی دقت نہ ہوتی مگر اندھیرا ہمارا ابھی تو ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ اس پولیس افسر کے حکم پر سپاہیوں نے کماد کے اس کھیت کے گرد پھیلنا شروع کیا تو اچانک ہم انہیں نظر آ گئے۔ میں نے آبی کو بڑی مشکلوں سے اس کے پاؤں پر کھڑا کیا تھا مگر اب پھر ہم دونوں کو زمین [illegible] پڑا۔ اُن لوگوں نے اندھا دھند ہم پر فائرنگ شروع کر دی تھی [illegible] ہٹانے کے لیے میں ایک بار پھر اسٹین گن سیدھی کر کے [illegible] پر دو گولیاں چلائیں۔ اور اُن گولیوں نے ہمیں جو چند لمحوں کی مہلت دی اس سے فائدہ اٹھا کر ہم اندھیرے کی اوٹ میں وہاں سے جا کر دریا میں کود گئے۔

پانی یخ ہو رہا تھا۔ آبی کے زخم پر شاید اس پانی کی برودت نے اچھا اثر ڈالا تھا۔ وہ میرے ساتھ بڑی دل جمعی سے تیر کر دریا عبور کرنے لگا۔ پولیس کے سپاہی ابھی تک ہمارے پیچھے تھے۔ وہ [illegible] گرد گھوم پھر کر آگے نکلے تو اچانک کسی نے بلند آواز سے کہا۔

”اوئے وہ تو دریا میں کود گئے ہیں۔“

اُس کی یہ آواز میں نے بھی سُنی اور آبی نے بھی۔ ہم دونوں نے اپنی رفتار تیز کر دی میرے لیے مشکل یہ تھی کہ مجھے وہ اٹیچی کیس بھی سنبھالنا تھا اور اسٹین گن بھی۔ اس اسٹین گن کو تو میں نے پتلون کی [illegible] کے نیچے دبایا اور پھر اٹیچی کیس کو کمر پر لاد کر تیرنے کی کوشش کی مگر مجھ سے وہ بوجھ سنبھل نہیں رہا تھا۔ اچانک وہ اٹیچی کیس میری کمر پر سے پھسلا۔ میں نے اُسے پکڑنے کی کوشش کی مگر وہ ایک دم پانی میں ڈوب گیا۔ یہی حال آبی کا تھا۔ اگر میں اس کو چھوڑ دیتا تو شاید وہ بھی دریا کی تہہ میں جا پہنچتا۔ اُس کے زخم سے بہت زیادہ خون بہہ گیا اور وہ دم بدم نڈھال ہوا جاتا تھا۔ میں نے بہرحال اُسے سنبھالنے کی کوشش کی۔ راوی دریا کا پاٹ وہاں کچھ اتنا زیادہ چوڑا نہیں تھا مگر اس کی گہرائی کا مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا۔ میں نے اٹیچی کیس پر لعنت بھیجی اور آبی کو دونوں ہاتھوں میں سنبھالتے ہوئے میں بہرحال تیرتا ہوا دریا کے دُوسرے کنارے جا پہنچا۔

حیرت مجھے یہ ہوئی کہ پیچھے سے ان لوگوں نے ہم پر کوئی گولی نہیں چلائی تھی حالانکہ انہیں کسی نے خبردار بھی کر دیا تھا کہ ہم دریا میں کود چکے ہیں۔ تب مجھے احساس ہوا کہ شاید میری گولی نے اُن کے کسی [illegible] ہی اہم افسر کو گھائل کر دیا ہے۔

دریا کے دُوسرے کنارے پہنچتے پہنچتے آبی بہت زیادہ نڈھال ہو چکا تھا۔ میں نے اُسے کمر پر اٹھا کر دریا کے رستے کو عبور کیا اور [illegible] فاصلے پر جا کر گھاس پر لٹا دیا۔ اُس کی بائیں ران کا گوشت [illegible] چکا تھا۔ گولی کچھ ایسی کاری لگی تھی کہ آبی کا وہاں تک پہنچ جانا بھی معجزے سے کم نہیں تھا۔ میں نے اس کی پتلون پھاڑ کر زخم کو غور سے دیکھا تو میرا کلیجہ کٹنے لگا۔ گولی ران میں ٹھہری نہیں تھی بلکہ آر پار سوراخ کر کے دُوسری طرف نکل گئی تھی اور میں نہیں جانتا تھا کہ ہڈی بچ گئی تھی کہ نہیں۔

”مجھے جلدی کسی ڈاکٹر کے پاس لے چل جیلانی! زخم بہت لگ گیا ہے میرے یار!“ آبی نے بڑے ہی نحیف و نزار لہجے میں کہا تھا۔

میں نے اُسے کمر پر لادا اور دریا کے کنارے اُگے جھاڑ [illegible] سے اُلجھتا بچتا اُن روشنیوں کی طرف چل دیا جو مجھے کچھ [illegible]

جلتی نظر آ رہی تھیں۔ وہ کوئی گاؤں تھا اور میں یہ چاہتا تھا کہ جلد از جلد وہاں پہنچ کر کسی سواری کا انتظام کر کے آبی کو فوری طبی امداد فراہم کر دوں۔ ہم دونوں کے کپڑے پانی میں بھیگ کر ہمارے لیے مصیبت بن گئے تھے۔ ہوا بھی بہت ٹھنڈی چل رہی تھی اور ہماری بدنصیبی یہ کہ ہم اس روز کچھ بھی کہیں سے نہ کھا سکے تھے۔ موقع ہی نہیں بن سکا تھا۔ وہ پہلا دن تو نہیں تھا، ایسے اَن گنت دن ہم پر بیت چکے تھے جن میں ہم بھری جیبوں کے باوجود کچھ بھی نہ کھا سکے تھے مگر اُس وقت مجھے کچھ اتنی بھوک محسوس ہو رہی تھی کہ دو قدم چلنا دوبھر معلوم ہوتا تھا۔ پھر بھی میں جی کڑا کر کے آگے بڑھتا رہا۔

دریا سے کچھ ہی دُور جا کر میں نے دم لینے کے لیے آبی کو کمر سے اُتار کر زمین پر بٹھایا تو یہ دیکھ کر میرا دل لرز اٹھا کہ آبی کی حالت لحظہ بہ لحظہ خراب ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی ٹانگ سے خون کچھ اس تیزی سے بہہ رہا تھا کہ اُس کے بدن سے ساری سکت سلب ہونے لگی تھی۔

میں نے بڑی ہی بے بسی سے چاروں طرف نگاہ ڈالی مگر وہ گاؤں کی روشنیاں بھی وہاں سے کم از کم ڈیڑھ میل دُور دکھائی دیتی تھیں۔ میں نے ایک بار پھر اُسے کمر پر لادا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ میرے اس جگری دوست کی زندگی کا چراغ بس چراغ سحری ثابت ہو رہا تھا۔ میں اسے کسی قیمت پر موت کے منہ میں جاتے نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ میری رفتار خاصی تیز تھی اور مجھے اُس کی ٹانگ سے بہتے خون سے اپنے کپڑے بھیگتے محسوس ہو رہے تھے۔ ایسی بے چارگی اور بے بسی میرے اوپر زندگی بھر طاری نہ ہوئی تھی۔ میرا دیر مسمار ہوا جاتا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں۔ آبی کو میں بیدار رکھنے کی کوشش کرتا تھا مگر وہ نقاہت کی وجہ سے بس ہُوں ہاں کر کے رہ جاتا تھا۔ میرا تحمل ایک بار پھر خالی ہوا جاتا تھا۔ اس میں آبی کی بے مثال دوستی کے چند دانے تھے وہ بھی گرتے جا رہے تھے۔

سامنے گندم اور چنے کے کھیت تھے، میں اُن میں سے گزرتا ہوا بے تحاشا آگے بڑھ رہا تھا کہ مجھے اس جھاڑ جھنکاڑ میں ایک جھونپڑی نظر آئی۔ وہ جھونپڑی مالٹوں کے باغ کے کنارے کھڑی تھی۔ اس کے دروازے پر ایک لالٹین لٹک رہی تھی۔ میں پاگلوں کی طرح اس جھونپڑی تک جا پہنچا۔ وہاں دو نوجوان بیٹھے تھے وہ اس باغ کی چوکیداری پر مامور تھے۔

مجھے [illegible] میں بھیگا ہوا اور اتنی بے سروسامانی میں ایک آدمی کو کمر پر لادے دیکھ کر وہ گھبرا کر اٹھے اور یک زبان ہو کر بولے۔

”کیا بات ہے بھاجی خیر تو ہے کیا ہوا ہے اس آدمی کو؟“

”یہ میرا بھائی ہے اسے کسی نے گولی مار دی ہے۔ خدا کے لیے کوئی سواری کا بندوبست کر دو میں اسے ہسپتال لے جاؤں گا۔“

”اوہ! یہ تو بہت بُری طرح زخمی ہے اسے ادھر لٹا دیں بھاجی!“ انھوں نے جھونپڑی کے اندر پڑی چارپائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں نے آبی کو بڑی احتیاط سے اُس کھرّی چارپائی پر ڈالا۔ تو وہ ذرا سے کراہا۔ اُس نے کچھ ایسی محبت سے میرا ہاتھ پکڑا کہ میرے آنسو بہہ نکلے۔ وہ آبی میرا جگری دوست وہ میرے دُکھ درد کا بے لوث ساتھی اس زخم کے ہاتھوں نڈھال ہو گیا تھا۔ اور میری نامردی اور نامرادی کا یہ عالم تھا کہ میں رات کے اس ہولناک ویران حصے میں اس کی کوئی بھی مدد نہ کر سکتا تھا۔ میں نے جیب سے آبی کا دیا ہوا دس ہزار روپیہ نکالا۔ نوٹ بھیگ گئے تھے پھر بھی اُن کی تہ تک پانی اثرانداز نہیں ہوا تھا۔

میں نے وہ بھیگے ہوئے نوٹ کھولے اور سو روپیہ الگ کر کے اُن کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”جاؤ بھائی کسی طرح کی سواری کا بندوبست کر دو۔ کوئی گھوڑا کوئی تانگہ ادھر لا دو۔“

”اوئے کھادو! جا یار وہاں سے الّسی کا تانگہ لے آ۔ وہ نہ آئے تو مخدوم سے گھوڑا ہی پکڑ لا۔ ان کی مدد کرنی چاہیے۔“ یہ کہہ کر اس نے نوٹ میرے ہاتھ سے لے کر کھادو کو دے دیا۔ وہ اسی لمحے اُٹھا اور بولا۔

”ٹھیک ہے داؤد میں ابھی گاؤں جاتا ہوں جو کچھ بھی ملا لے آؤں گا۔ ادھر وہ ڈاکٹر سلیم بھی تو ہو گا۔“

”وہ مل جائے تو اُسے ضرور ساتھ لے آئے۔ کہو کہ مرہم پٹی کا سامان بھی وہ ساتھ لیتا آئے، اُسے ضرور لے آنا میرے بھائی۔“ میں نے کھادو کی منت کی۔

”آپ فکر نہ کریں بھاجی! بس میں ابھی آیا۔ رُکھ پور کون سا دُور ہے۔“ یہ کہہ کر وہ جھونپڑی سے نکلا اور اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

”پانی تو ہو گا آپ کے پاس؟“ میں نے داؤد سے پوچھا

”ہاں! یہ لیں نہیں پلائیں میرے پاس دُودھ بھی ہے۔ ہم چائے کے لیے ادھر لائے تھے۔“

”دُودھ مل جائے تو اور بھی اچھا ہے بھائی۔“ میں نے گلوگیر آواز میں کہا۔ اس نے ایک گڑوی میں سے دُودھ انڈیل کر گلاس میں بھر لیا اور اس میں شکر ملا کر مجھے دیا۔ وہ گرم نہیں تھا پھر بھی غنیمت تھا۔ وہ میں نے آبی کے مُنہ سے لگا دیا۔ اُسے بھی شاید بھوک نے نڈھال کر رکھا تھا۔ وہ ایک ہی سانس میں سارا گلاس پی گیا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ چند ہی لمحوں بعد اُس کے بدن میں توانائی پیدا ہوئی اُس نے آنکھیں کھول کر گرد و پیش کا جائزہ لیا، بولا۔

”مجھے سردی لگ رہی ہے جیلانی میرے یہ کپڑے اتار دے بہت گیلے ہیں یہ۔“

”ہاں! میں اتار دیتا ہوں مجھے خیال ہی نہیں آیا۔“ میں نے ایک ایک کر کے اس کے کپڑے اُتار دیے۔ اس کے کوٹ میں بیس ہزار کے نوٹ ایک بٹوے میں بھرے تھے۔ وہ بٹوا میں نے اپنی جیب

میں رکھ لیا۔ کچھ اور چیزیں بھی اس میں پڑی تھیں۔ کوٹ کے بعد میں نے اُس کے باقی کپڑے بھی اتارے اور اُس آدمی سے لے کر ایک بُوسیدہ بازو کا میلا سا سویٹر آبی کو پہنا دیا۔ ایک بوسیدہ سی چادر اُس کے پاس کونے میں دھری تھی، وہ میں نے آبی کی کمر پر باندھ دی۔ اس نے اپنا بدن بالکل ڈھیلا چھوڑ دیا تھا۔

داوَد نے ایک پرانے کپڑے کی پٹی مجھے پھاڑ کر دے دی۔ تو میں نے اس کا ایک حصّہ کس کر آبی کی ران پر باندھا اور اس کے زخم سے بہتے خون کو روکنے کے لیے اس پر لکڑیوں کی راکھ ڈالنے لگا تو داوَد بولا

"یہ راکھ نہ ڈالو بھاجی! وہ ڈاکٹر آ گیا تو خواہ مخواہ بکواس کرے گا کہ تم لوگ جاہل ہو اَن پڑھ ہو میرے ایک بھائی کو زخم لگا تو میں نے ایسا ہی کیا۔ اس پر اُس نے میری بڑی بے عزّتی کی تھی کہتا تھا کہ اس طرح زخم خراب ہو جاتا ہے۔" میں نے اُس کی بات سُنی اَن سُنی کر کے زخم پر راکھ ڈال دی۔ جھونپڑی کے کونے میں ایک لحاف رکھا تھا۔ وہ انہوں نے اُسی وقت چارپائی سے اُتارا تھا۔

"یار وہ لحاف اس پر ڈال دے، اسے سردی لگ رہی ہے۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔ ذرا اسے اُٹھائیں یہ گدّا بھی اس کے نیچے بچھا دیتا ہوں۔ خون لگنے کے ڈر سے میں نے یہ بستر اُدھر ڈال دیا تھا۔ پر اب فکر نہیں۔ میرا خیال ہے اس کا خون بہنا بند ہو گیا ہے۔"

داوَد نے یہ کہہ کر گدّا بڑی احتیاط سے چارپائی پر بچھا دیا۔ اس طرح کہ آبی نے بھی اس کام میں ہماری مدد کی۔ وہ جو پہلے ہی نیچے ڈوبتا جا رہا تھا اب سنبھلنے لگا تھا۔

داوَد نے گڑوی میں سے نکال کر باقی دودھ بھی گلاس میں ڈال کر اسے پلا دیا۔ آبی نے وہ بھی غٹا غٹ چڑھا لیا۔ اس کی بھوک زوروں پر تھی مگر میں کیا کر سکتا تھا۔ میرا اپنا حال بہت ہی دِگرگوں ہونے لگا تھا۔ میرا وہ بھیگا ہُوا لباس اب مجھے بھی زیر کرنے لگا تھا۔ میں نے کوٹ قمیص اور بنیان اتار کر نچوڑے اور پھر انہیں جھونپڑی میں سوکھنے کے لیے ڈال دیا۔

"تمہارے پاس کوئی کھانے کی چیز نہیں ہے داوَد؟"

"روٹی بھی ہے اور ساگ بھی۔ پر آپ کو ہماری روٹی پسند نہیں آئے گی۔"

"نہیں یار بھوکے آدمی کی بھی کوئی پسند ہوتی ہے۔ تو لا جو کچھ بھی ہے۔"

اس نے لکڑی کے ایک ... میں سے رومال میں لپٹی ہوئی روٹیاں نکالیں۔ مکئی کی چھ روٹیاں اور اُن پر رکھا ساگ دیکھ کر میرے مُنہ میں پانی آ گیا۔ میرے لیے وہ ایسی نعمت غیر مترقبہ تھی کہ احساسِ تشکّر سے ایک بار میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ آدمی کی بے بسی اسے کیسے کیسے دن دکھاتی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہمارے پاس لاکھوں روپے موجود تھے۔ وہ سب کے سب اس اٹیچی کیس کے ساتھ دریا بُرد ہو گئے۔ اب بھی ہمارے پاس تیس ہزار روپے باقی تھے یہ حالت تھی کہ ہم اپنی بھوک مٹانے کے لیے اس ویرانے میں کچھ ... تھے۔ کچھ ہی دیر پہلے تک ہم بااختیار تھے۔ ایسے بااختیار کہ ... پر اپنی دسترس سمجھتے تھے مگر اب ایسی بے سروسامانی میں ہم اس ... میں جا گرے تھے کہ مجھے آبی کی زندگی کا چاند ڈوبتا نظر آتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اگلی صبح کا سُورج مجھے کس حال میں دیکھے۔

"آبی میرے یار کچھ کھا لے۔ یہ دیکھ مکّی کی روٹی ہے۔"

آبی نے میری آواز سُن کر آنکھیں کھول دیں۔ وہ اپنی کراہوں کو ہونٹوں تلے دبائے لیٹا تھا۔ لحاف اس کو سر تک ... ہوئے تھا۔ اب اس کی رنگت جو تیزی سے پیلی ہو رہی تھی قدرے ... ہونے لگی تھی مگر زخم نے اُس کے جسم میں درد کا جو میلا سا لگا رکھا تھا وہ کسی طرح ختم ہونے میں نہیں آتا تھا۔ بڑے ہی نحیف لہجے میں ...

"لا اِدھر! کچھ کھا پی کر مروں گا تو مجھے افسوس نہیں رہے گا۔"

"تو نہیں مرے گا میرے بھائی! یہ لے۔" یہ کہہ کر میں نے سہارا دے کر چارپائی پر بٹھایا۔

"یار یہ جگر بند اِتنا سخت باندھا ہے تم نے کہ میری ٹانگ ... گئی ہے۔"

"تیرے لیے یہی اچھا ہے آبی! ورنہ خون بہت بہہ جاتا اور تو ... کر رہ جاتا۔ لے کھا لے۔" یہ کہہ کر میں نے چنگیر میں دھری روٹیاں اس کے سامنے رکھ دیں۔ سرسوں کا ساگ لذیذ تھا۔ اُس میں مکھن کا ... اور لہسن کسی سگھڑ بی بی نے بہت عُمدگی سے مرچ کر کے اس میں ڈالا ... آبی اپنا دُکھ بھول کر روٹی پر پل پڑا۔ ہم نے دو دو روٹیاں پیٹ میں ... تو معلوم ہوا کہ اب مزید کسی چیز کی گنجائش نہیں ہے۔ وہ خاصی ... بھاری بھرکم روٹیاں تھیں۔ داوَد خوش ہو گیا۔ بولا۔

"مجھے کیا پتہ تھا باؤ جی کہ آپ کو اتنی بھوک لگی ہے۔ کچھ ہی دیر پہلے وہ روٹیاں لایا تھا۔" یہ کہہ کر اس نے میری ... ہاتھ میں پکڑ لی، اسے میں نے یوں ہی بے خیالی میں آبی کی چارپائی کے ساتھ ڈال رکھا تھا۔

"ارے یہ بھری ہوئی ہے میرے یار! اسے رکھ دے۔" غصیلے ... ہے ... کے رکھ دیتی ہے۔"

"اور سوروں کو بھی؟" اس نے حیرت سے کہا۔

"ہاں! سور کیا شے ہے اس کے آگے۔ کیا یہاں بہت ہوتے ہیں؟"

"جی ہاں! جان عذاب میں ڈال رکھی ہے انھوں نے۔ ... ہمارے پاس ایک بھی نہیں ہے حالانکہ میرا نشانہ بہت اچھا ہے۔ میں نے ... پکی رفل بھی چلائی ہے۔"

"فکر نہ کر میرے یار! کسی دن میں پھر اِدھر آیا تو تیرے لیے بندوق لے آؤں گا اور گولیاں بھی۔"

"سچ؟ بندوق لا دیں گے آپ مجھے؟" وہ خوش ہو گیا۔

"کیوں نہیں! یہ کون سی مشکل بات ہے۔" یہ کہہ کر میں نے سٹین گن اس کے ہاتھ سے لے کر اُس کے چیمبر میں سے ساری گولیاں نکال کر ... میں گھسا پانی صاف کیا۔ پھر اُس کی نال بھی اندر سے خشک کی۔ اسے تو ہر دم رواں دواں رہنا چاہیے تھا۔ یہی حال میرے جیب شاہ کا تھا، اسے بھی میں نے کپڑے سے مانجھ مانجھ کر صاف کیا اور پھر دونوں میں گولیاں بھر کر میں نے داوَد سے نظر بچا کر انہیں جھونپڑی کے باہر پڑے گھاس پھوس کے نیچے چھپا دیا۔

آبی بڑے حوصلے سے درد کی ٹیسوں کا مقابلہ کر رہا تھا۔ اس کے چہرے کے بدلتے رنگ مجھے اس کی اذیت کا احساس دلا رہے تھے مگر میرے بس میں تھا ہی کیا۔ میں بس اسے تک تک دیکھتا تھا۔ ہمارے سگریٹ بھی بھیگ چکے تھے مگر وہ ایسے پیکٹوں میں بند تھے کہ سگریٹوں کے گودے تک پانی نے اثر نہیں کیا تھا۔ جھونپڑی کے باہر داوَد نے آگ جلا دی تھی۔ میں نے اپنے کپڑے آگ کے الاؤ کے قریب گڑے بانس پر لٹکا دیے اور پھر سگریٹ بھی آگ کے سامنے رکھ کر سُکھا لیے۔ جب میں نے ایک سگریٹ آبی کو دیا تو وہ خوش ہو گیا مسکراتے ہوئے بولا۔

"یار! اُدھر جنّت میں سگریٹ بھی ملا کریں گے کہ نہیں؟"

"ابھی سے تجھے جنّت کی فکر کیوں لگی ہے؟ ارے تو نیک ہی کب رہا ہے؟"

"زندگی کا کیا بھروسہ ہے جیلانی۔ تو نے دیکھا نہیں، وہ گولی ران سے ذرا اُوپر کمر میں لگ جاتی تو پیٹ میں سے گزر کر مجھے خدا حافظ کہہ جاتی۔"

"ہاں! یہ تو ہے آبی بھائی! زندگی کا واقعی کوئی بھروسہ نہیں ہے ابھی اُس غرقی ہی کو دیکھو۔"

"اسی لیے تو کہتا ہوں آدمی کو جنّت دوزخ کے حالات کا بھی علم ہونا چاہیے۔"

"مگر تم تو صرف جنّت کی بات کرتے ہو حالانکہ تمہارا اُدھر جانے کا کوئی امکان نہیں ہے۔"

"ایسا نہ کہو یار! ورنہ تو ہمارے دونوں جہان برباد ہو جائیں گے اِدھر کون سا سُکھ دیکھا ہے ہم نے۔"

"ایسی باتیں مت سوچ یار! جینے کی بات کر۔ تو تو حوصلہ ہارتا جا رہا ہے۔"

"بھاجی آپ نے یہ ہتھیار کیوں اُٹھا رکھے ہیں۔ کوئی خطرہ ہے آپ کو؟"

"نہیں یار! ہم شکار کے لیے نکلے تھے مگر کسی دشمن نے میرے یار پر چھُپ کر وار کر دیا۔ بڑی مشکلوں سے ہم جان بچا کر اِدھر آئے ہیں۔ ہماری گاڑی بھی تباہ ہو گئی۔ اِس میں آگ لگ گئی تھی۔" میں نے داوَد کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

وہ مسکراتا ہوا جھونپڑی سے باہر نکل گیا، بولا "میں ابھی آتا ہوں۔"

وہ باہر نکلا تو آبی بولا "بھئی وہ اٹیچی کیس کہاں ہے؟" اُس نے گرد و پیش پر نظر ڈال کر اندازہ لگا لیا تھا کہ اٹیچی کیس وہاں نہیں ہے۔

"وہ تو یار دریا میں گر گیا۔ میں تجھے سنبھالتا کہ اس اٹیچی کیس کو۔"

آبی نے زہرِ خند کیا، بولا۔

"چلو اچھا ہوا ہماری ذمّے داری ختم ہُوئی۔ تجھے ذرا ملال نہیں ہوا اُس کے دریا بُرد ہونے سے؟"

"ہوا تو تھا مگر میں تجھے چھوڑ دیتا تو اُسے سنبھالتا اور تجھ سے زیادہ کوئی چیز قیمتی نہیں ہے میرے بھائی۔"

آبی نے ایک بار پھر میرے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیا۔ اُس کا بدن ایک بار پھر ٹھنڈا ہونے لگا تھا۔ زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے اس کی حالت بہت ہی پریشان کُن تھی اور وہ محض اپنی قوتِ ارادی کی وجہ سے اب تک خود کو سنبھالے ہُوئے تھا۔

اچانک ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے جھونپڑی میں بھونچال آ گیا ہے۔ شاید کوئی جانور اس سے ٹکرا گیا تھا۔

"خبردار! اگر کسی نے حرکت کی تو گولی مار دی جائے گی۔" کسی نے جھونپڑی کے پچھلے حصے سے بڑی لرزہ خیز آواز میں کہا۔ یہ اُسی پولیس افسر کی آواز تھی، جو میں دریا کے پار سُن چکا تھا۔ میں نے گھبرا کر اردگرد نظر ڈالی تو یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ جھونپڑی کے تینوں اطراف سے تین رائفلوں کی نالیں ہماری طرف اُٹھی تھیں اور جھونپڑی کے دروازے پر ایک پولیس افسر پستول تانے کھڑا تھا۔ اس کے دائیں بائیں دو سپاہی تھے ان کے ہاتھ میں رائفلیں تھیں وہ اچانک ہی ہم پر آ چڑھے تھے۔

میں بے بس ہو کر رہ گیا۔ کئی راستے میرے ذہن میں اُبھرے مگر اُن میں سے کوئی بھی سلامتی کی طرف نہیں جاتا تھا۔ آبی کا رنگ فق ہو گیا۔ میری اپنی فیصلے کی قوّت مفلوج ہونے لگی۔ وہ لوگ شاید بہت آگے جا کر کشتی میں بیٹھ کر دریا عبور کر آئے تھے۔ میں اُن کی طرف سے غافل ہی ہو چکا تھا مگر میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ سب سے اہم بات تو یہ تھی کہ مجھے آبی کی زندگی کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ اس کو فوری طور پر کسی محفوظ جگہ کی ضرورت تھی۔ میں جھونپڑی کو غنیمت سمجھ کر وہاں رک گیا تھا مگر مجھے یہ خیال ہی نہیں آیا کہ وہ لوگ ہمارا

تعاقب کرتے ہوئے دریا کے پار بھی آسکتے ہیں۔
"اپنے ہاتھ اوپر اٹھا لو جیلانی! تمھاری رسّی ختم ہو گئی ہے۔"
اس پولیس افسر نے بڑے تحکم آمیز لہجے میں کہا۔
"آپ کو سخت غلط فہمی ہوئی ہے جناب! میرا نام غلام جیلانی نہیں ہے۔" میں نے بستر سے اٹھتے ہوئے کہا۔
"بکواس مت کر جیلانی! میں تجھے اچھی طرح جانتا ہوں تو نے ہمارے دو آدمی مار دیے۔ اور سمجھا کہ تو ہم سے بچ نکلے گا۔" یہ کہہ کر وہ آدمی پستول لہراتا ہوا میرے سامنے آ ٹھہرا۔ اس کے اشارے پر سپاہیوں نے آبی کے بدن پر پڑا ہوا لحاف نوچ لیا۔
"تو یہ ہے تمھارا ساتھی! یہ زخمی ہو گیا تھا فرید کی گولی سے مگر تو نے فرید کو مار دیا۔ تو سمجھتا تھا ہم سب بزدل ہیں تیرا پیچھا نہیں کریں گے۔ مگر میرا نام دلاور نہیں اگر میں نے تجھ سے اپنے آدمیوں کا بدلہ نہ لیا تو۔" یہ کہہ کر اس نے الٹے ہاتھ کا ایک زوردار جھانپڑ میرے منہ پر دے مارا۔ وہ بہت زیادہ تپا ہوا تھا۔ جھونپڑی کے ارد گرد کھڑے تین سپاہی بھی اب سامنے آ گئے تھے۔ اور ان کی رائفلوں کا رخ میرے سینے کی طرف تھا۔ جس پر میں نے داؤد کا ایک کھیس لپیٹ رکھا تھا۔
"ڈال دو ہتھکڑی اس خبیث کو اور اسے بھی باندھ لو۔"
دلاور نے اپنے سپاہیوں کو بڑے طنطنے سے حکم دیا۔ وہ بڑا جی دار اور بہادر افسر تھا۔ اس نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ اپنے چند ساتھیوں کو ہمراہ لے کر اس نے ہمارے تعاقب میں دریا عبور کرنے کا فیصلہ کر کے صحیح سمت میں قدم اٹھایا تھا۔ اس کی فرض شناسی کی مجھے داد دینی چاہیے۔ اس جیسے سرپھرے اگر پولیس میں موجود نہ ہوں تو پھر شاید کوئی بھی شہر آباد نہ رہ سکے۔ یہ اس جیسے جاں فروشوں ہی کا کرشمہ تھا کہ مجرم منہ چھپائے پھرتے تھے اور قانون سے لرزتے تھے۔ ورنہ تو کوئی طاقت ایک غلط کار آدمی کو اس کی راہ سے ہٹا نہیں سکتی ہے۔
میرے لیے فرار کی ساری راہیں مسدود ہو کر رہ گئی تھیں۔ ایک لمحے کے لیے تو میں سُن ہو کر رہ گیا۔ وہ دلاور اگر چاہتا تو ہم دونوں کو وہیں گولی مار سکتا تھا۔ بعد میں کہہ دیتا کہ ہم دونوں کو اس نے پولیس مقابلے میں مار دیا ہے ایسا تو سیکڑوں بار ہو چکا ہے۔ جب پولیس کسی نامی گرامی مجرم کی حرکتوں سے عاجز آ جاتی ہے اور اس کے وجود کو ہر ایک کے لیے خطرہ سمجھتی ہے تو وہ لوگ در پردہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ جیسے ہی اس مجرم سے آمنا سامنا ہوگا وہ اسے جان سے مار دیں گے۔ اس کی انہیں اجازت نہیں ہے مگر ایسے مجرم سے مجرم بن کر نمٹا جا سکتا ہے۔ سو وہ اپنا ہاتھ اور لمبا کر لیتے ہیں مگر دلاور نے ایسا نہیں کیا تھا۔ وہ ہمیں باندھ کر قانون کے حوالے کر دینا چاہتا تھا۔

"آخر آپ کس جرم میں ہمیں پکڑ رہے ہیں جناب! میں جیلانی نہیں ہوں آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔" اس کے ہاتھ کی ضرب نے مجھے چکرا کر رکھ دیا تھا اور میں ابھی تک اس کے سامنے کھڑا اپنا گال سہلا رہا تھا۔ ایک سپاہی نے میرے ہاتھ میں ہتھکڑی ڈالنے کے لیے زنجیر سیدھی کی۔ دوسرے نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اچانک جھونپڑی کے باہر کوئی شیر کی طرح گرجا اور اس کے ساتھ ہی ڈھب ڈھب دو گولیاں چلیں۔ ایک دلاور کے سینے میں لگی اور ایک اس کے ساتھ کھڑے سپاہی کے پہلو میں۔ یہ ایک لمحے کی مہلت بہت کافی تھی۔ میں نے بجلی کی سی تیزی سے ان کی رائفلیں چھین لیں۔ جھونپڑی میں افراتفری مچ گئی۔ ایک سپاہی کی ٹانگ پکڑ کر آبی نے اسے چارپائی کے پاس گرا لیا اور اس کی رائفل چھین لی۔ دلاور کے ہاتھ سے پستول گر گیا اور وہ دلدوز چیخ مار کر جھونپڑی کی دیوار کے ساتھ ڈھے گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی داؤد میرا پستول ہاتھ میں لیے جھونپڑی کے دروازے پر تین سپاہیوں کو زد میں لیے کھڑا تھا۔ سپاہی کی کمزوری یہ ہے کہ وہ بغیر حکم کے کوئی کام نہیں کرتا۔ ان بے چاروں میں سے کسی کو گولی چلانے کا حکم نہیں ملا تھا اس لیے وہ بس دیکھتے ہی رہ گئے حالانکہ وہ اگر کوئی قدم اٹھاتے اور رائفلیں لاٹھیوں ہی کی طرح گھماتے تو ہمیں وہ بڑے آرام سے چت کر سکتے تھے۔ داؤد نے اپنے منہ پر ڈھاٹا باندھ لیا تھا تاکہ کوئی اسے پہچان نہ سکے۔ میں نے بھی دو سپاہیوں سے رائفلیں چھین کر انہیں بے بس کر دیا تھا۔ داؤد کو اپنے پیچھے دیکھ کر ان تینوں سپاہیوں نے اپنے ہتھیار نیچے گرا دیے۔ وہ تعداد میں چھ تھے، ساتواں ان کا افسر تھا دلاور اور اس کی حالت سب سے زیادہ خراب تھی۔ جس سپاہی کو آبی نے نیچے گرایا تھا وہ وہی تھا جس کے پہلو میں گولی لگ چکی تھی۔
"ان کو باندھ دو باؤ جی! یہ کسی کو چین نہیں لینے دیتے۔"
داؤد نے اپنی آواز بدل کر کہا۔ وہ زبردست قسم کا جنگجو آدمی ثابت ہوا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ میں نے اپنے دونوں ہتھیار لوڈ کر کے کہاں چھپائے ہیں مگر مجھے نہیں معلوم کہ اس نے کس جذبے کے تحت ان سپاہیوں پر یوں اچانک حملہ کر دیا تھا۔ اس کا وہ احسان میں زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔ اس نے ایسی جرأت سے ہماری جان بچائی تھی کہ اگر ہم شیر دل بھی اپنی حفاظت پر مامور کرتے تو بھی ہم محفوظ نہیں رہ سکتے تھے۔ اس کا حکم سنتے ہی میں نے ایک ایک کر کے تمام سپاہیوں کو جھونپڑی میں رکھے ایک موٹے رسّے سے جکڑ کر ڈال دیا۔
جب میں ان کو باندھ کر ڈال چکا تو داؤد مجھے کھینچ کر جھونپڑی سے باہر لے گیا اور خاصے فاصلے پر پہنچ کر بولا۔
"لو بھاجی! میں نے اپنا کام پورا کر دیا ہے۔ آپ میرے مہمان ہیں۔ آپ کی جان بچانا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ اگر آپ ادھر کوئی واردات کرنے آئے تھے تو اس کا خیال چھوڑ دیں اور یہاں سے

نکل جائیں۔ میں پہلی ہی نظر میں آپ کی ذات کو پہچان گیا تھا۔ اور آبی کو تو میں اچھی طرح جانتا ہوں مگر میں نے جان بوجھ کر آپ کو نہیں بتایا۔ یہ ہریکے کا رہنے والا ہے نا؟"
"ہاں یار! تم تو بڑے چھپے رستم نکلے ہو۔ کمال کر دیا ہے تم نے۔ ہم تمھارا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھول سکتے۔"
"احسان کی بات نہیں ہے بھاجی۔ وہ تاسیا ہے نا، وہ میرا یار ہے۔ اس کے ساتھ میں نے بہت دن پہلے شہر کے ایک ہوٹل میں آبی کو دیکھا تھا۔ یہ مجھے بالکل نہیں جانتا اور میرا خیال ہے کہ تاسیے نے بھی میرا ذکر اس سے نہیں کیا ہوگا کیونکہ میں تو بہت ہی معمولی آدمی ہوں۔"
"تو بہت بڑا آدمی ہے داؤد! تو انسان نہیں فرشتہ ہے۔" یہ کہہ کر میں نے اسے فرطِ مسرت سے گلے لگا لیا۔ وہ تو اس گھڑی میرے لیے سارے جہاں سے زیادہ قیمتی انسان تھا۔
"دیکھو اب تم ان کے سامنے مجھے بھیا کہہ کر پکاروگے، سمجھے! میں ان کی نظر میں نہیں آنا چاہتا۔ تم نے اچھا کیا کہ اپنے ہتھیار گھاس پھوس میں جھونپڑی کے نیچے رکھ دیے تھے ورنہ تو میں کچھ بھی نہ کر پاتا۔"
اچانک دور سے کسی گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز سنائی دی۔
"لیں وہ شاید تانگہ آ گیا ہے۔ میں اسے ادھر ہی روکتا ہوں۔ میں سیٹی ماروں تو آبی کو اٹھا کر ادھر لے آئیں۔" یہ کہہ کر وہ مالٹے کے باغ میں بھاگتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔ ابھی چند ہی منٹ گزرے تھے کہ ایک پراسرار سیٹی کی آواز گونجی۔
میں تیزی سے جھونپڑی میں پہنچا اور اپنے کپڑے پہن لیے۔ میں نے ہتھیار سمیٹے اور پھر آبی کو کمر پر لاد کر تیزی سے باغ میں سے بھاگتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔ وہاں کھادو تانگہ لیے کھڑا تھا کوچوان ساتھ نہیں آیا تھا۔ داؤد نے کہا۔ "وہ ڈاکٹر نہیں ملا بھاجی۔ وہ بہلولپور گیا ہوا ہے۔ وہ ایسی بھی بیمار تھا۔ اس نے بیس روپے دے کر تانگہ دے دیا ہے۔ آپ اس میں بیٹھیں ہم شاہدرہ جا کر اس کا علاج کراتے ہیں۔"
یہ کہہ کر اس نے سہارا دے کر آبی کو بڑی احتیاط سے اگلے حصے میں بٹھایا۔ اس طرح کہ اس کی زخمی ٹانگ اٹھا کر میں نے اپنی گود میں رکھ لی۔ آبی کے نیم خشک کپڑے بھی میں ساتھ لے آیا تھا۔ ان کی پوٹلی داؤد نے پکڑ لی اور پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر بولا۔
"چل خادم حسینا! اب شاہدرے چل میرے یار! اس سواری کی حالت خطرناک لگتی ہے سمجھے۔"
"یار ان کا کیا بنے گا داؤد صاحب؟"
میرے اس سوال پر وہ بولا۔
"میں نے کھادو کو سب کچھ بتا دیا ہے یہ واپس آ کر ان سے نبٹ لے گا۔ انہیں یہی معلوم ہوگا کہ تم دو نہیں تین تھے۔" داؤد نے کہا "ان کو یہ پتہ ہے کہ ہم دو ہیں۔ وہ ہمارے پیچھے شہر سے لگے تھے، سمجھ جائیں گے کہ ہمارا تیسرا ساتھی ہمیں راستے میں مل گیا ہوگا۔ اتنے کم عقل بھی نہیں ہوتے ہیں یہ پولیس والے۔ بہت سی چیزیں فرض بھی تو کر لیتے ہیں۔" میں نے داؤد کو سمجھاتے ہوئے کہا۔
وہ موٹی سی بڑی ہی رنگین گالی دیتے ہوئے بولا۔
"کہیں وہ تھانیدار مر ہی نہ جائے گولی اس کے سینے میں ماری تھی میں نے۔"
"نہیں۔ گولی اس کے کندھے میں لگی تھی مرے گا نہیں۔"
تانگہ کچھ ہی دیر بعد شاہدرہ جا پہنچا۔ اب سوال یہ تھا کہ ہم اس گھڑی آبی کو کس کے پاس لے جاتے۔
داؤد سوچ میں گم تھا، بولا۔
"کوئی تدبیر سوچو بھاجی۔ ان کا علاج کیسے ہوگا۔ ادھر تو کوئی ڈاکٹر میرا واقف نہیں ہے اور دکانیں بھی ساری بند ہو چکی ہیں۔"
"ہم شہر چلتے ہیں۔ تم بھی میرے ساتھ چلو اور یہ تانگہ واپس بھیج دو۔"
"چلو یہ بھی ٹھیک ہے۔ کوئی ٹیکسی روک لو پھر بھاجی۔" یہ کہہ کر اس نے خود ہی ایک ٹیکسی کو رکنے کا اشارہ کیا اور ہم نے آبی کو اس میں ڈال کر تانگہ واپس بھیج دیا۔ کھادو نے اپنا رخ موڑا تو داؤد بولا۔
"اوئے کھادو باقی پیسے تم رکھ لینا تیرا حقہ پانی چل جائے گا چار دن۔"
"ٹھہر جا یار! یہ کچھ اور پیسے لیتا جا۔" یہ کہہ کر میں نے سو سو کے دو نوٹ کھادو کے حوالے کر دیے۔ وہ خوش ہو گیا، بولا۔
"تھینک یو مہربانی مائی باپ اللہ خوش رکھے۔" یہ کہہ کر اس نے گھوڑے کو تھپکی دی اور آگے بڑھ گیا۔
مجھے حالات کے صحیح رخ کا کوئی علم نہیں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میرے خلاف جو پولیس اس طرح حرکت میں آ گئی ہے تو اس کی وجہ ڈاکٹر عذرا نہیں ہو سکتی تھی۔ اسے ہم روپیہ دے آئے تھے۔ وہ کسی بھی طرح ہمارے خلاف پولیس کو اطلاع نہیں دے سکتی تھی لیکن اس بات کا امکان قوی تھا کہ بخاری کلینک میں سے کسی نے آسیہ کو پہچان کر پولیس کو اطلاع کر دی ہوگی۔ آبی کا خیال یہ تھا کہ یہ ساری مصیبت اس ایمبولینس کے ڈرائیور نے کھڑی کی تھی مگر یہ بات قرینِ قیاس معلوم نہیں ہوتی تھی کیونکہ ایسا کوئی قدم اٹھانے سے پہلے وہ ڈاکٹر عذرا سے مشورہ ضرور کرتا کیونکہ ایمبولینس کو اس نے ڈاکٹر عذرا کے حکم پر ہی کلینک سے باہر نکالا تھا۔ اب یہ جو پولیس کے سپاہی ہمارے پیچھے لگ گئے تھے تو اس کی وجہ کوئی اور ہی تھی۔ یہی سبب تھا کہ مجھے شہر میں بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ آبی اس زخم کا پہلا وار بڑی ہمت سے سہار چکا تھا اور اب نہ تو جریانِ خون باقی رہا تھا نہ درد کی وہ پہلی سی کیفیت باقی تھی۔ وہ چپ تھا

اور بڑے صبر سے اُس نے اس ابتلا کو سہنا سیکھ لیا تھا لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں تھا کہ وہ علاج کے بغیر جانبر ہو سکتا تھا۔ اس کی نبض پہلے سے بہت آہستہ چل رہی تھی اور اسے فوری علاج کی سخت ضرورت تھی مگر میں اسے لے کر کہاں جاتا۔ سرکاری ہسپتال بھی اچھی جگہ ہے مگر مجھے وہاں بھی کسی نہ کسی پولیس والے سے ٹکرا جانے کا سخت خطرہ تھا کیونکہ ہسپتالوں کے ہنگامی وارڈوں میں تو وہ آتے ہی رہتے ہیں۔ ڈاکٹر عذرا کا کلینک بھی مجھے محفوظ نظر نہیں آتا تھا۔ چار و ناچار میں آبی کو اس کی کوٹھی پر لے گیا۔ اس وقت رات کے گیارہ بج رہے تھے۔

اس کی ملازمہ براؤنی نے دروازہ کھولا تو میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب سے کہو ہاشم خان آیا ہے۔"

وہ الٹے قدموں لوٹ گئی۔ دوسری بار جب وہ نمودار ہوئی تو ڈاکٹر عذرا اس کے ساتھ تھی۔ وہ نیند سے اٹھ کر آئی تھی۔ ایک بڑی سی بادامی رنگ کی گرم چادر اس نے اوڑھ رکھی تھی۔ وہ حیرت زدہ سی ہو کر بولی۔

"آپ! کیا بات ہے خیر تو ہے؟"

"آپ کے پاس اسٹریچر ہوگا، وہ منگوائیں میرے دوست سخت زخمی ہیں۔" یہ کہہ کر میں نے سرگوشی میں کہا۔ "ٹیکسی میں آبی لیٹا ہے اسے گولی لگ گئی ہے۔"

"براؤنی جاؤ اسٹریچر باہر لے آؤ اور جلدی کرو۔"

اس کی وہ اینگلو انڈین ملازمہ الٹے قدموں واپس ہوئی اور کچھ ہی دیر میں وہ اسٹریچر لے آئی۔

آبی کو اس پر ڈال کر جب میں اور داؤد ڈاکٹر عذرا کے خاص کمرے میں پہنچے تو اس نے استفہامی نظروں سے مجھے دیکھ کر پوچھا۔

"یہ کون ہے؟" اس کا اشارہ داؤد کی طرف تھا جس کا دیہاتی لباس اس ماحول سے قطعاً کوئی لگا نہیں کھاتا تھا۔

"یہ ان کا دوست ہے داؤد۔ اس نے ہماری بہت مدد کی ہے ڈاکٹر۔ یہ اس کا احسان ہے کہ ہم یہاں تک آ پہنچے ہیں۔"

"اچھا ان کو دوسرے کمرے میں بٹھائیں۔ براؤنی! ان کے لیے عمدہ سی چائے بناؤ۔ کھانا کھائیں گے کہ نہیں؟"

"ہاں کھانا بھی منگوالیں مہربانی ہو گی۔" میں نے عذرا کی دی ہوئی انگوٹھی کو اس کے سامنے نمایاں کرتے ہوئے کہا۔ وہ مسکرا دی بولی۔

"ٹھیک ہے براؤنی ان کے لیے کھانا بھی لگا دو۔ فریج میں رکھا ہوگا" یہ کہہ کر اس نے ہمیں کمرے سے نکال کر ایک چھوٹی سی راہداری میں سے گزارا اور پھر تیسرے کمرے میں داخل کر کے داؤد سے بولی۔

"آپ یہاں بیٹھیں۔ میں ذرا مریض کو دیکھ لوں۔ آپ میرے ساتھ آئیں ہاشم صاحب۔"

میں نے داؤد کو اس کے سجے سجائے ڈرائینگ روم میں بٹھایا اور پھر اس کے پیچھے میں آبی کے پاس جا پہنچا۔

"ہوا کیا تھا؟ یہ زخم کیسے آیا ہے انہیں اور یہ اوپر [illegible] نے ڈالی تھی۔"

"یہ میں نے ہی ڈالی تھی ڈاکٹر۔ خون بند نہیں ہو رہا تھا ران ادھڑ گئی ہے۔" یہ کہہ کر میں نے مختصر الفاظ میں اس کو واقعات بتلائے تو وہ آبی کی نبض ٹٹول کر بولی۔

"آپ نے اچھا کیا کہ زخم پر راکھ ڈال دی تھی۔ ان کے [illegible] گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ آپ البتہ یہ ضرور معلوم کریں کہ پولیس کس نے آپ کے پیچھے لگایا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں پولیس [illegible] کلینک میں نہ آدھمکے۔ عرفان کی موت نے مجھے اور زیادہ پریشان کر دیا ہے۔ یہ سارا سلسلہ ہی غلط ہو گیا ہے۔ آپ ابھی آسیہ کے پاس جائیں۔ آپ کسی ذریعے سے معلوم کریں کہ اصل بات کیا تھی۔"

آبی کا زخم صاف کر کے اس نے مرہم پٹی کی اور پھر انجکشن لگا کر اس نے اسے وہیں سلا دیا۔

میں داؤد کو زیادہ دیر تک اپنے ساتھ نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ وہ کھانا کھا چکا تو میں نے اسے دو ہزار روپے دیے اور کہا کہ وہ ٹھکانے پر واپس چلا جائے۔

وہ مان گیا اور ساڑھے بارہ بجے کے قریب وہ مجھ سے [illegible] ہو کر باہر نکل گیا۔ اس کے گاؤں کا نام بکروال تھا۔ مجھ سے [illegible] گیا کہ اگر کبھی اس کی ضرورت پڑے تو میں اسے وہاں سے بلوا [illegible] وہ خلوص کا بندہ بڑا ہی جی دار آدمی تھا۔ اس نے جس جرأت سے میری گردن نئے پھندے سے بچائی تھی، اس کی تعریف کے لیے [illegible] پاس الفاظ نہیں تھے۔

ڈاکٹر عذرا کے رویے میں وہ پہلی سی گرم جوشی نہیں تھی [illegible] کی وجہ بھی میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اس کی گفتگو کا انداز کاروباری تھا۔ اس نے مجھے اپنے گھر میں رات گزار لینے کے لیے نہیں کہا۔ جب میں داؤد کو رخصت کر کے ڈرائنگ روم میں [illegible] گیا تو وہ سامنے کھڑی تھی۔ بڑی سنجیدہ اور بڑی ہی متین سی [illegible] بنائے ہوئے۔

"کیا بات ہے آپ میرے یہاں آنے پر خوش نہیں ہوئیں؟"

"اتنے سارے پیچیدہ حالات میں آپ ادھر آتے ہیں، مجھے خوشی ہو سکتی ہے؟ اور پھر ایسی صورت میں جب کہ عرفان موت کے گھاٹ اتر گیا ہے پولیس میرے گھر کے سو چکر لگا چکی ہے، کلینک بھی گئے تھے۔ انہیں ٹالنا میرے لیے مشکل ہو رہا ہے۔ وجہ پوچھتے ہیں۔ میں نہیں کیا بتاؤں کہ ..... میرے بچوں نے کس لیے یرغمال بنایا تھا۔"

اس کی صورت اجڑی اجڑی سی نظر آتی تھی۔ کسی غا[illegible]

[illegible] آرائش کے بغیر وہ مجھے ایک دم بوڑھی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ بھی [illegible] عورتوں ایسی تھی۔ جب تک وہ اپنے بہترین بھڑکیلے لباس میں رہتی [illegible] سرخی غازے کا اہتمام قائم رکھتی ہیں وہ دلکش اور حسین نظر [illegible] ہیں [illegible] تی ہیں۔

"میں نے آپ کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے ڈاکٹر۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ مجھ سے نفرت کرنے لگیں۔"

"یہ تو میں نے نہیں کہا۔" وہ چونکی۔

"ٹھیک ہے آپ ادھر بخاری کلینک سے معلوم کریں کہ آسیہ کا کیا حال ہے؟"

"نہیں۔ میں وہاں کس حیثیت سے فون کروں؟"

"اپنے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتائیں۔"

"اگر کسی نے میری آواز پہچان لی تو؟"

"تو اچھا ٹھیک ہے۔ میں خود فون کرتا ہوں۔"

یہ کہہ کر میں ٹیلیفون کی طرف بڑھا۔ اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ میں نے جب بخاری کلینک کے لیے نمبر گھمانے شروع کیے تو مجھے خیال آیا کہ وہ ڈھلوں صاحب کی ملازمہ بھی تو ان کے ساتھ تھی۔ میں نے ہاتھ روک لیا۔

"دیکھیں، وہ ڈھلوں صاحب کی ملازمہ بھی تو وہاں ہوگی ــــ میں اس سے پوچھ لیتا ہوں۔"

"نہیں اسے میں نے صبح واپس بھیج دیا تھا۔"

"کیوں؟ واپس کیوں بھیج دیا؟"

"بس ایسے ہی! وہ کسی کام بھی تو نہیں آ رہی تھی اور پھر میں چاہتی تھی کہ آسیہ کے بارے میں مزید کوئی بات کسی کو معلوم نہ ہو سکے۔"

"کمال کرتی ہیں آپ! ارے بھئی اسے تو ڈھلوں صاحب نے خود ہمارے ساتھ بھیجا تھا۔"

"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ آپ فون کر کے کسی بھی آدمی سے بات کر سکتے ہیں۔" وہ الجھی ہوئی تھی۔

میں نے ایک بار پھر نمبر گھما دیے۔

"ہیلو"۔ کسی خاتون کی آواز مجھے سنائی دی۔

"دیکھیں جناب مجھے اس مریضہ سے بات کرنی ہے جو آج صبح وہاں داخل ہوئی تھی اس کا نام آسیہ ہے اس کی ملازمہ سے ملوا دیں۔"

"آسیہ! آپ کون ہیں؟"

"میں اس کا ماموں بول رہا ہوں۔"

"دیکھیں جناب اسے تو سرکاری ہسپتال میں بھیج دیا گیا ہے۔"

"سرکاری ہسپتال میں! کس نے بھیجا ہے اسے؟"

"دو آدمی آئے تھے، وہ اسے ایمبولینس میں ڈال کر لے گئے۔"

"کس کی اجازت سے؟"

"ڈاکٹر بخاری کی اجازت سے۔"

"یہاں ایک نرس رہتا ہوگی آپ اس سے مجھے ملوا دیں۔"

"وہ بھی اس کے ساتھ ہی گئی ہے اور اب تک واپس نہیں آئی۔"

"کس ہسپتال میں ہوں گے وہ لوگ؟"

"اس کا تو مجھے علم نہیں ہے جناب۔" وہ عورت بولی۔

"مجھے ڈاکٹر بخاری سے ملوا دیں۔"

"وہ تو اپنی کوٹھی پر ہوں گے۔ اور اس وقت غالباً سو چکے ہوں گے۔"

یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

میرا دماغ الٹنے لگا

"آپ نے سنا وہ کیا کہہ رہی تھی۔ اسے ان لوگوں نے سرکاری ہسپتال میں داخل کرا دیا ہے۔"

"وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ خدا ہی خیر کرے۔ اگر آسیہ نے انہیں بتا دیا کہ اس کا علاج کس کلینک میں ہوا ہے تو میں تباہ ہو جاؤں گی۔"

"مگر وہ تو زیادہ عرصہ نیم بے ہوشی میں پڑی رہی، اسے کس نے بتایا ہوگا کہ وہ کہاں اور کس کے زیرِ علاج رہی ہے۔"

"بس یہی ایک موہوم سا اطمینان ہے ورنہ سب کچھ میرے خلاف ہی جاتا ہے۔"

اس کی یہ بات سن کر میں نے ڈاکٹر بخاری کا نمبر ڈائریکٹری میں سے دیکھ کر اسے فون کیا تو کوئی پانچ منٹ بعد کسی کی بہت زیادہ جھنجھلائی ہوئی آواز مجھے سنائی دی۔

"کون ہے؟"

"میں آسیہ کا ماموں ہاشم خان بول رہا ہوں جناب! مجھے بتائیں کہ آسیہ کہاں ہے اسے تو کل صبح آپ کے کلینک میں داخل کیا گیا تھا۔"

"او ہیل ودات! میری بات غور سے سنیں ہاشم صاحب! وہ لڑکی جیل سے بھاگی ہوئی پرانی قیدی تھی۔ ہمارے کلینک میں ایک لیڈی پولیس انسپکٹر سلمیٰ اس وقت اپنی کسی عزیزہ سے ملنے آئی تھی۔ اس نے آسیہ کو پہچان لیا اور اپنے طور پر اس نے پولیس کو اطلاع دے دی۔ اس لڑکی کی تو تصویر بھی..... اخبار میں چھپی تھی۔ اس اطلاع پر پولیس نے ہمارے کلینک کو گھیرے میں لے لیا۔ وہ اس کے بھائی جیلانی کو بھی گرفتار کرنا چاہتے تھے۔ جیلانی آیا بھی تھا سہ پہر کو مگر پولیس کو دیکھ کر وہ بھاگ نکلا۔ وہ کار میں تھا اپنے ساتھی کے ہمراہ، پولیس ان کے پیچھے بھاگی مگر وہ ہاتھ نہیں آیا۔ مجھے کسی نے بتایا ہے کہ اس کا پولیس سے مقابلہ بھی ہوا ہے۔ رات کو دس بجے پولیس کے سپاہی خاموشی سے آسیہ کو گرفتار کر کے لے گئے تھے۔ اب بھی میرا خیال ہے کہ خفیہ پولیس کے لوگ میرے کلینک کے

اردگرد موجود ہیں۔ وہ ریٹا کو بھی ساتھ لے گئے کیونکہ مجھے کسی نے بتایا ہے کہ اس کا بھی ان لوگوں سے گہرا تعلق ہے۔ سمجھے آپ! ہم تو اس لڑکی کی وجہ سے ذلیل ہو کر رہ گئے، سمجھے آپ!" وہ بہت ہی تپا ہوا تھا۔

"بالکل سمجھ گیا جناب! وہ کس ہسپتال میں ہو گی اس وقت؟"

"اس کے گردے کا آپریشن کس نے کیا تھا اس ڈاکٹر کے بارے میں مجھے ابھی تک پتہ نہیں چلا۔ اسے فوری علاج کی ضرورت تھی۔ میرا خیال ہے وہ جنرل ہسپتال میں ہو گی یا پھر میو ہسپتال میں۔"

"آپ نے بتایا نہیں انہیں کہ اتنی سخت بیمار ہے اسے وہ ابھی وہاں سے نہ لے جائیں۔"

"میں کیسے روک سکتا تھا انہیں۔ وہ تو بہت دنوں سے اس کی تلاش میں تھے۔ اس کے بھائی کی گرفتاری پر انہوں نے پچاس ہزار روپے انعام مقرر کر رکھا ہے۔ مجھے انھوں نے بتایا کہ وہ پھانسی کی کوٹھری سے بھاگا ہوا مجرم ہے۔"

"وہ ٹھیک کہتے ہیں آسیہ کا بھائی ایسا ہی ہے براہِ کرم آپ مجھے معلوم کر کے بتا سکتے ہیں کہ آسیہ کہاں ہو گی؟"

"یہ میرا کام نہیں ہے جناب! میرا خیال ہے کہ وہ جیلانی ہی تھا جو صبح اسے ہمارے کلینک میں داخل کرا گیا تھا۔ اس نے پیشگی ہمارے کیشیئر کے پاس پانچ ہزار روپیہ بھی جمع کروا دیا تھا۔"

"اس کے بارے میں بھی آپ نے پولیس کو بتا دیا ہو گا۔"

"نہیں! وہ آدمی واپس آئے گا تو ہم اسے وہ روپیہ دے دیں گے۔"

"وہ ضرور آئے گا، اس کی رقم تو اسے ضرور ملنی چاہیے۔" یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔

سب کچھ ہی تباہ ہو کر رہ گیا تھا۔ روشنی کی کوئی بھی رمق باقی نہ رہی تھی میرے چہرے پر کھنڈی زردی کو دیکھ کر ڈاکٹر عذرا بولی۔ "وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ ادھر میرے کلینک میں بھی یہ حادثہ پیش آ سکتا تھا۔ اسی خطرے سے بچنے کے لیے میں نے آسیہ کو اُدھر بھیج دیا تھا مگر... مگر اب وہ پھر مصیبت میں پھنس گئی ہے۔ وہ جیل سے کیسے فرار ہوئی تھی؟"

"آپ میرے اس دوست کا علاج کریں ڈاکٹر! اور اسے ادھر ہی رکھیں اپنی کوٹھی میں۔"

"ہوں! جانتے ہیں آپ کہ براؤنی اسے پہچان گئی ہے اور وہ بہت تیز ہوتی ہے۔ اسے میں نے بڑی مشکلوں سے روکا ہے۔ وہ میرے منع کرنے کے باوجود اسے پولیس کے حوالے کرا دے گی۔ میں اس کی ذمے داری کیسے لے سکتی ہوں۔"

"اسے آپ ہی سمجھا سکتی ہیں۔"

"نہیں، پولیس کل بھی میرے گھر کا چکر لگائے گی۔ وہ غضنفر معلوم کرنا چاہتا ہے کہ وہ آدمی کون تھا اور کیوں اس نے ... یرغمال بنایا۔ اس مصیبت سے بچنے کے لیے تو میں نے آسیہ کو ادھر منتقل ہونے دیا ورنہ میں اس کا علاج خود کرتی۔"

"پھر؟... پھر میں کیا کروں؟ میرے دوست کی زندگی کا..."

"اب یہ خطرے سے باہر ہے جناب ہاشم صاحب! آپ اسے ساتھ لے جائیں۔ آٹھ دس دن میں اس کا زخم بھر جائے گا۔ میں نے اسے ایسا ٹیکہ لگایا ہے کہ زخم کے خراب ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہڈی بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔"

"میں... اس وقت اسے کہاں لے جاؤں؟ خدا کے لیے مدد کریں میں بہت پریشان ہوں میری زندگی پھر عذاب ... ہو گئی ہے۔ میری بدنصیبی دیکھیں میں آسیہ کی حفاظت بھی نہ کر سکا" میں نے گلوگیر آواز میں کہا۔ میری اتنی ساری دگرگوں حالت کے باوجود اسے مجھ پر ترس نہیں آ رہا تھا۔ کہاں تو وہ میری محبت میں آگے بڑھ آئی تھی کہ اس نے اپنی انگوٹھی میری انگلی میں پہنا دی تھی اور کہاں وہ اب ذہنی اور قلبی سطح پر... مجھ سے اتنی دور ہو چکی تھی۔ میرے لیے آبی کو بھی چند دن اپنے گھر میں رکھنے پر آمادہ نہ تھی۔ اس کے اپنے خدشے لاکھ درست سہی مگر ہم جس مصیبت میں گرفتار تھے اس کے ازالے کے لیے اسے کچھ تو کرنا ہی چاہیے تھا۔ میں خجل ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ میری طرف بڑھی اور میرا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں تھام کر اس نے بڑی احتیاط سے اپنی انگوٹھی میری انگلی سے اتاری پھر مسکراتی ہوئی بولی۔

"اسے آپ کے ہاتھ میں نہیں رہنا چاہیے مسٹر جیلانی! میں اپنی اس بھول پر شرمندہ ہوں۔ میں عاقل بالغ عورت ہوں مگر اس گھڑی میں بالکل ہی احمق بچی بن گئی تھی۔"

"وہ اس لیے ڈاکٹر کہ اس وقت ہم نے آپ کو دو لاکھ روپے دیے تھے۔ ان کی گرمی سے آپ پگھل رہی تھیں۔ وہ اتنی بڑی رقم تھی کہ آپ کبھی تصور بھی نہیں کر سکتی تھیں۔" میں نے اس انگوٹھی سے ... ہو کر کہا۔

وہ میری یہ بات سن کر پیچھے ہٹ گئی اور کرسی پر بیٹھ کر بولی۔

"اگر آپ چاہیں تو میں وہ رقم آپ کو واپس دے سکتی ہوں۔ وہ چوری کا مال ہے اور میں اس میں حصے دار نہیں بننا چاہتی۔" وہ ... تھی۔ وہ مجھے بالواسطہ چور اور ڈاکو ہونے کا طعنہ دے رہی تھی۔ میں کیا کہتا اس نے مجھے لاجواب کر دیا تھا۔

"یہ قطعی کاروباری بات ہے ڈاکٹر۔ آپ نے آسیہ کا مکمل علاج ... اس لیے بہتر ہے کہ آپ ہمیں آدھی رقم واپس کر دیں۔" میں نے نہایت ... سے کہا۔

"مجھے منظور ہے جیلانی صاحب۔" یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھی

... کمرے سے رومال میں باندھ کر وہ ایک لاکھ روپیہ لے آئی۔ بولی۔ "... دیے ہیں۔ اب میرے ذہن پر بوجھ بھی نہیں رہے گا۔ یہ سنبھالیں ایک لاکھ روپیہ۔"

میں نے وہ رقم لے کر اپنی گیلی جیبوں میں ٹھونس لی۔ "آپ کا بہت بہت شکریہ ڈاکٹر، ہمیں اس کی سخت ضرورت ہے۔ اب اتنا کرم کریں کہ اگر آپ کے پاس دو جوڑے کپڑوں کے ہوں تو مجھے دے دیں۔ میں اور میرا دوست پہن لیں گے۔ یہ کپڑے خراب ہو گئے ہیں۔" میں نے اپنے لباس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میری پتلون اور کوٹ ابھی تک خشک نہیں ہوئے تھے۔ اور آبی تو پھٹے حالوں میں تھا۔

"ہاں یہ میں کر سکتی ہوں میرے مرحوم شوہر کے بہت سے جوڑے محفوظ ہیں۔" یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکلی اور میں اس کی طبیعت کے بدلتے رنگوں پر غور ہی کرتا رہ گیا۔ اس کے تلون نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ میں آج تک نہیں سمجھ سکا ہوں کہ وہ اس روز اپنے کلینک میں دو گھڑی کے لیے مجھ پر اتنی مہربان کیوں ہو گئی تھی۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں وہ اس وقت کسی لمحاتی جوش سے مغلوب ہو گئی تھی۔ مگر جب وہ لمحہ گزر گیا تو وہ اپنے مقام کی طرف لوٹ گئی۔ اپنے آپ کو پہچان گئی۔ اسی لیے اس نے مجھے اس رات جھٹک دیا تھا اور میرا خیال ہے کہ دانشمندی کا تقاضا بھی یہی تھا۔ وہ حلقۂ ادراک میں واپس آ گئی تھی تو اس کی خرد نے اسے اپنی اس نادانی کا احساس دلا دیا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ دو سوئیٹر اور دو جوڑے قمیص شلوار کے لے کر کمرے میں آ گئی۔ وہ بہت عمدہ قسم کی دو گھوڑا بوسکی کے جوڑے تھے۔ بولی۔ "یہ لیں جیلانی صاحب ایک آپ پہن لیں ایک اپنے دوست کو دے دیں اور اسے لے جا کر کسی اور کلینک میں داخل کرا دیں۔ مجھے افسوس ہے مگر میں اسے یہاں نہیں رکھ سکتی۔ آپ کے لیے یہی بہتر ہے۔"

میں نے پہلو کے چھوٹے کمرے میں جا کر لباس تبدیل کیا اور اپنے گیلے کپڑوں کو ہاتھ میں لے کر باہر نکل آیا۔ سوئیٹر اور وہ قمیص شلوار میرے بدن پر پورے آ گئے تھے۔ وہ پریشان سی ہو گئی جیسے کسی پرانی یاد کا کھرنڈ اس کے مندمل زخم پر سے اکھڑ گیا ہو۔ اس کی آنکھیں بہہ نکلیں۔ "کیا ہوا آپ تو رونے لگی ہیں۔"

اس نے سینے میں دبی ایک آتش بداماں آہ کھینچی اور نڈھال سی ہو کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

"یہ لباس محسن کو بہت پسند تھا جیلانی صاحب۔ میں نے بڑی چاہت سے یہ جوڑے اس کے لیے سلوائے تھے مگر وہ ان کو صرف دو بار پہن سکا۔ پھر انہی دنوں وہ حادثے میں ہلاک ہو گیا۔"

میں آہستہ آہستہ چل کر اس کے قریب جا پہنچا۔ اس کے زخمی جذبے اسے ایک بار پھر کسی سمت دھکیلنے لگے تھے۔ میں ایسی کیفیتوں کا اچھی طرح اندازہ کر سکتا تھا۔ غم میں ڈوبی عورت وہ تنکا ہوتی ہے جسے حالات کی لہر کسی بھی طرف بہا کر لے جا سکتی ہے۔ اسے خود پر اختیار نہیں رہتا۔

"آپ کے غم کا مجھے اندازہ ہے ڈاکٹر عذرا مگر مرے ہوؤں کے ساتھ مرا نہیں کرتے۔ میری طرف دیکھیں۔"

نہ جانے کیوں وہ بدک کر کرسی پر سے اٹھی اور بڑے غصے سے میری طرف دیکھتی ہوئی بولی۔

"آپ کو بہت دیر ہو چکی ہے کوئی ٹیکسی لائیں اور اپنے مریض کو جلدی یہاں سے لے جائیں۔"

"بہت بہتر جناب! ہم ابھی یہاں سے چلے جائیں گے۔" یہ کہہ کر میں نے اپنے گیلے کوٹ میں سے ساری چیزیں نکال کر قمیص کی دونوں جیبوں میں ڈالیں اور تیز تیز قدم اٹھاتا باہر نکل گیا۔ اس عورت نے مجھے حیران کر دیا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد آبی کو میں نے ٹیکسی میں ڈالا اور ڈاکٹر عذرا کو خدا حافظ کہہ کر وہاں سے چل دیا۔ اس نے بڑے روکھے لہجے میں مجھے خدا حافظ کہا اور دروازہ بند کر کے واپس چلی گئی۔ اس سے میں نے اس کی وہ بادامی رنگ کی گرم چادر بہرحال لے لی تھی کیونکہ اس کے بغیر میں باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ وہ شاید میری مجبوری کو سمجھتی تھی۔ اس نے کوئی تعرض نہیں کیا۔

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اس گھڑی آبی کو لے کر کہاں جاؤں۔ وہ غنودگی کے عالم میں تھا۔ ڈاکٹر نے اسے جو خواب آور ٹیکہ لگایا تھا اس کا اثر ابھی تک قائم تھا۔ میں نے اسی حالت میں اس کو نیا لباس پہنا دیا تھا۔ اس کی آستینیں آبی کے لیے ذرا لمبی تھیں مگر وہ میں نے الٹ کر سوئیٹر کی آستین کے نیچے ڈال دیں۔ باقی سب کچھ ٹھیک تھا اور ہم اب دونوں خاصے اُجلے اُجلے نظر آ رہے تھے۔

جب مجھے کچھ نہ سوجھا تو میں آبی کو لے کر گنگا رام ہسپتال جا پہنچا اور ہنگامی وارڈ کے مختلف مراحل سے گزار کر میں اس کے لیے ایک پرائیویٹ کمرہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ بائیس نمبر کمرہ تھا اور اس میں دو بیڈ بچھے تھے۔ ایک پر میں نے آبی کو لٹایا اور دوسرے پر میں خود لیٹ گیا۔ باقاعدہ طبی امداد کا اس وقت سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا یہی کیا کم تھا کہ ایک صاحب کو رات کے اس حصے میں ایک سو روپیہ دے کر میں نے کمرہ حاصل کر لیا تھا۔

آبی کی حالت پہلے سے بہتر تھی اور اس کے رخساروں پر ہلکی ہلکی سرخی اس بات کا پتہ دے رہی تھی کہ وہ سنبھل رہا ہے اور لوٹ آیا ہے ورنہ وہ تو آگے ہی آگے جا رہا تھا۔ وہ جنت دوزخ کے بارے میں بھی سوچنے

لگا تھا۔ وہ تو داؤد کی مہربانی تھی کہ ہم دونوں اُس رات بچ گئے تھے ورنہ میرے ساتھ تو اُس لمحے آپی بھی پس گیا تھا۔ میری تو خیر قسمت ہی میں خرابی لکھی تھی۔ مجھے تو اپنی کوئی فکر نہیں تھی مگر آپی اگر دھر لیا جاتا تو مجھے زندگی بھر بے حد قلق رہتا۔ آدمی کو اپنے دوست کبھی داؤں پر نہیں لگانے چاہئیں کہ دوست تو خدا کے عطیہ ہوتے ہیں۔ رشتے تو آدمی عمداً اور ارادتاً استوار کرتا ہے۔ ان رشتوں کی کرشمہ سازیوں میں آدمی کے اپنے عمل کو بہت کچھ دخل حاصل ہے۔ بیٹی بیٹا باپ ماں بہن بھائی یہ سب رشتے ایک خاص زاویے سے ایک خاص عمل میں سے گزرنے کے بعد، آپ ہی آپ وجود میں آجاتے ہیں مگر دوست؟ — دوست کوئی کہاں سے کس ماں کی کوکھ سے پیدا کر سکتا ہے۔ یہ تو خدا کی نوازش ہے جسے کوئی مخلص دوست مل گیا اُس کی زندگی لہلہا اُٹھی۔ ورنہ تو ہزاروں لاکھوں یہاں ایسے ہیں جن کی یہ کِشتِ ویران کبھی ہری نہیں ہوتی — ہو ہی نہیں سکتی کہ... اپنی فطرت کی کجی انہیں کسی کا اعتماد حاصل کرنے ہی نہیں دیتی۔ یہی وجہ تھی کہ آپی کو اس حال میں دیکھ کر میرا دل کٹتا تھا۔ اس نے اتنا سارا رنج و محن صرف میرے لیے اور میرے ہی لیے سہا تھا۔ اِس میں اُس کی کوئی غرض پوشیدہ نہیں تھی۔ پھر — پھر — میں اُسے کیسے حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا۔ یہ میں کر ہی نہیں سکتا تھا۔

میں بستر پر بیٹھا تو حالات کے اس نئے رُخ نے میرا خون پھر سے منجمد کرنا شروع کر دیا۔ مجھے آسیہ کی تقدیر پر رونا آ رہا تھا۔ اُس روز میں اُسے عذرا کے کلینک ہی میں رہنے دیتا تو شاید وہ اس نئی اذیت کے ریلے سے بچ جاتی مگر کوئی کیا کرے۔ ایک ہی تو چیز ہے جسے خدا نے آدمی کے بس میں نہیں دیا۔ اور وہ ہے اُس کا اگلا لمحہ — اِس اخفا ہی کا نتیجہ ہے کہ بڑے بڑے سانحے وجود میں آتے ہیں اور آدمی کو توڑ کر رکھ دیتے ہیں۔

اب وہ الم نصیب آسیہ خدا جانے کہاں ہو گی۔ کس حال میں ہو گی۔ پولیس نے بلاشبہ اُسے کسی نہ کسی ہسپتال میں رکھا ہو گا۔ کیونکہ وہ تو بستر سے بندھی پڑی تھی اور اب کی بار وہ تنہا نہیں گئی تھی بلکہ وہ ریٹا کو بھی اُس کے ساتھ باندھ کر لے گئے تھے۔ اس کی وجہ میری سمجھ میں یہ آئی تھی کہ پہلے بھی وہ ریٹا کو میرے حوالے سے پہچانتے تھے۔ اس نے ایک بار باغِ جناح میں پہنچ کر میری جان بچائی تھی۔ اب جو اس نے دیکھا کہ جیلانی کی ماں جائی بہن اس حال میں اُن کے کلینک میں پہنچی ہے تو وہ اس پر دیوانہ وار نثار ہوتی رہی ہو گی۔ ہو سکتا ہے اس نے آسیہ سے کچھ راز کی باتیں بھی کہہ دی ہوں — ایسی ہی جذباتی لڑکی ہے ریٹا — وہ سب کام چھوڑ کر آسیہ کی تیمارداری میں لگ گئی ہو گی — اور وہ لیڈی پولیس انسپکٹر سلمیٰ جو وہاں آسیہ کو دیکھ کر پہچان گئی تھی کہ وہ کون ہے۔ وہ ریٹا کے رنگ ڈھنگ بھی دیکھتی ہو گی پھر اُس نے پولیس کو جب بُلایا ہو گا تو انھوں نے ریٹا کو وہاں آسیہ کے اس قدر قریب دیکھ کر ساتھ لے لیا ہو گا۔ وہ کام جو وہ لوگ نہ کر سکے تھے اب کر گئے تھے۔ پولیس کو ہم دونوں بہن بھائیوں کی آنکھ مچولی... پہلے ہی حیران کیے ہوئے تھی۔ اب ایک تیر بھی اُن کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ اور اب وہ ریٹا کو بھی ازروئے تیال جنتر پر چڑھا چکے ہوں گے۔ وہ اُس سے پوچھتے ہوں گے بی بی! بتا تیرا اس جیلانی اور اُس کی بہن آسیہ سے کیا رشتہ ہے۔ جیلانی کہاں ہے جس نے اتنے عرصے سے پولیس کو حیران کر رکھا ہے؟ اس کا اتا پتا بتا کہ ہم تو اس کے بغیر مدتوں سے پھر رہے ہیں۔

میرے منہ سے ایک بار پھر اُن پولیس والوں کے لیے گالی نکل گئی۔ ان ظالم خانوں نے میری بھی زندگی اجیرن کر رکھی تھی اور اس سے پہلے تو اس ڈاکٹر نفیسہ نے آسیہ کو قانون کے اس اژدہے کے منہ سے نکال لیا تھا مگر اب ایسا کون تھا جو اس اندھے غار میں اُس کا کون آسرا دے گا اب کی بار؟ میری بہن آسیہ کو جس کی زندگی کا چراغ ہی اب مریض کے دمِ واپسیں کی طرح ٹمٹما رہا تھا۔ اس کے بدن میں گردے کی پیوند کاری خدا جانے اُسے راس بھی آئی تھی کہ نہیں کیونکہ اب تک جو اطلاعات مجھے ملی تھیں اُن سے تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ اُس کی حالت بہتر ہے۔ اس ڈاکٹر بخاری نے بھی اس کی صحت کے بارے میں کسی قسم کے تردد کا اظہار نہیں کیا تھا۔ مگر کون کہہ سکتا ہے کہ مناسب آرام نہ ملنے اور اچھی طرح دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے اُس کے زخم کے ٹانکے اُدھڑ نہیں جائیں گے۔ وہ سفاک لوگ، وہ پولیس کے اہلکار تو نہ جانے اُسے کیسے کچوکے دے رہے ہوں گے۔

"اوہ میرے خدا! ایسا نہیں ہو سکتا کہ تو اُس غم نصیب کو موت دے دے۔" پہلی بار اپنی بہن آسیہ کے لیے میرے دل سے اُس کی موت کی دعا نکلی تھی۔ وہ... وہ... آسیہ تو پہلے ہی کسی بد طینت انسان کی خباثت کا بوجھ بھی اُٹھائے ہوئے ہے۔ ڈاکٹر عذرا نے کہا تھا کہ وہ حاملہ ہے۔ میرا دل لہو لہو ہونے لگا۔ یہ خیال اِتنا اذیت ناک اور سوہانِ روح تھا کہ میرا سارا بدن غصے سے تپنے لگا۔ میں نے بہت چاہا تھا کہ اس بارے میں کچھ نہ سوچوں۔ جب بھی میرے ذہن میں یہ خیال آتا تھا، میں اپنا سر جھٹک کر خود کو کسی اور طرف متوجہ کر لیتا تھا۔ گنگا رام ہسپتال کے پرائیویٹ وارڈ کے اس کمرہ نمبر بائیس کے بستر پر بیٹھے لیٹے اس منحوس رات کے پچھلے پہر جب میرے خیال بدحال کا قافلہ اس نکتے پر پہنچا تو میں تلملا اُٹھا۔ میں بستر سے نیچے اُتر گیا۔ میرے پستول میں صرف چار گولیاں باقی تھیں اور اسٹین گن بھی آدھی خالی ہو چکی تھی۔ اُن کی تمام گولیاں اُس اٹیچی کیس میں تھیں جو رات دریا کی تہہ میں جا ٹھہرا تھا۔ اس میں اتنی بڑی رقم تھی... بھتیجے متیری کی وہ قیمتی کار بھی وہیں تباہ ہو گئی تھی۔ اب ڈاکٹر عرفان کی مرسیڈیز بھی واپس نہیں مانگ سکتے تھے۔ رات جو ہم پر آفت آئی تھی وہ پتہ نہیں کس کی دُعا سے ہماری جانیں ہمیں بخش گئی تھی ورنہ ہماری موت میں تو کوئی شُبہ ہی باقی نہیں رہ گیا تھا۔ آپی کی عقلمندی کی وجہ سے وہ تھوڑی سی تیس ہزار کی رقم ہمارے پاس بچ رہی تھی۔ ورنہ اگر وہ بھی اُس نے سب کچھ اٹیچی کیس ہی میں بند کیا ہوتا تو پھر پتہ نہیں ہمارا کیا حال ہوتا۔ میں نے بھی ٹھیک وقت پر ٹھیک قدم اٹھا کر عذرا سے ایک لاکھ روپیہ واپس لے لیا تھا۔ وہ نہ ملتا تو میرا بینک میں موجود تھا۔ مزید رقم میں وہاں سے بھی لے سکتا تھا مگر میں ابھی تک کسی انجانے خوف کے تحت اُدھر کا رُخ نہیں کر سکا تھا۔

ہسپتال کے احاطے کے قریب ہی کسی مسجد سے موذن کی آواز فضا میں گونجی تو میں نے منہ ہاتھ دھو کر بوٹ کے تسمے باندھ لیے۔ میرے لیے ایک ایک گھڑی عذاب بن کر گزر رہی تھی۔ مجھے جلد از جلد آسیہ تک پہنچنا تھا۔ ایک بار پھر میرے اور اُس کے درمیان کرۂ ارض کے ایک نقطے سے دوسرے نقطے تک کی مسافت حائل ہو گئی تھی اور یہ کوئی نیک شگون نہیں تھا۔ ایک بار پھر مجھے انہی سنگلاخ راہوں سے گزرنا تھا جن پر چل چل کر میں اب تک شل ہو چکا تھا۔

وہ موذن پھر کہہ رہا تھا کہ الصلوٰۃ خیرٌ من النوم — وہ مجھے شرمندہ کر رہا تھا حالانکہ اُس کو معلوم تھا کہ میری نماز کیا ہے۔ میری کفا جفا کیسی ہے اور میں کس قبلہ رُو ہو کر اپنی نماز ادا کرتا ہوں۔ وہ آدمی جس کے گلے میں اتنے سارے غموں کا طوق ڈال دیا گیا ہو، جس کی راہیں اتنی پُرخار اور مشکل ہوں جیسے شہر کے لوگ بھی قتل کرنے کی قسم کھائے بیٹھے ہوں اس آدمی کی نماز کیا ہو گی۔ میں اتنا جوکھم کسی شہزادی کے عشق میں اُٹھاتا، کسی سلطنت کو فتح کرنے کے لیے اتنی ذلتیں سہتا تو مجھے یقین ہے کہ میں اس شہزادی کے وصل سے شادکام ہو چکا ہوتا۔ میں نے اس سلطنت کو اپنے زیرِ نگیں کر لیا ہوتا مگر میں اپنی بہن کے لیے وہ سُکھ ابھی تک مہیا نہ کر سکا تھا جس کے لیے میں نے اتنے دُکھ اٹھائے تھے۔

میں نے اسٹین گن آپی کے کمرے میں چھپا کر رکھی اور پستول کو قمیص کے نیچے ٹکا لیا۔ ڈاکٹر عذرا کی وہ خوبصورت سی بادامی رنگ کی چادر کو لاہوری انداز سے اوڑھ کر میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ ڈیوٹی پر موجود نرس سے میں نے کہہ دیا کہ وہ میرے مریض کا خیال رکھے اور جب وہ بیدار ہو تو اسے بتا دے کہ میں ایک کام سے باہر جا رہا ہوں، جلدی واپس آ جاؤں گا۔ سب سے زیادہ مشکل مجھے اُن نوٹوں کی وجہ سے پیش آ رہی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں؟ قمیص کی دونوں جیبیں ناکافی تھیں۔ اچانک مجھے اس پتلون کا خیال آیا جو آپی نے پہن رکھی تھی — اس کا ایک پائنچہ میں نے ران تک پھاڑ دیا تھا اور وہ اب تک خشک ہو چکی تھی۔ نرس کے کمرے سے نکل کر میں آپی کے پاس پہنچا اور اُس کی اُتاری ہوئی پتلون کے دونوں پائنچے کاٹ کر میں نے اسے شلوار کے نیچے پہن لیا۔ اس پتلون کی جیبیں خاصی کھلی تھیں اُن میں رقم بھر کر مجھے اطمینان ہو گیا اور میں آپی کے کمرے کا دروازہ بھیڑ کر باہر نکل گیا۔

شہر کی تمام سڑکیں سنسان پڑی تھیں اور کھمبوں کی روشنیاں بہ ان آنکھوں ایسی نظر آتی تھیں جو کسی کی راہ تکتے تکتے پتھرا گئی ہوں۔ سردیاں کی شدت دم توڑ رہی تھی۔ ہوا کے خرام میں شرابی کے قدموں ایسی لڑکھڑاہٹ تھی۔ فضا میں رچی نمی مشامِ جاں کو تازہ کرتی تھی۔ صبح کروٹ لے کر اُٹھنے کو تھی۔ میں سمجھا کہ خدا بیزار آدمی کا ایمان بھی ہو تو پھر وہ اُس وقت اٹھ کر اگر قدرت کے نیم خوابیدہ حسن کو دیکھے تو خدا کے وجود پر آپ ہی آپ اُس کا ایمان پختہ ہونے لگے گا۔ شب زندہ داروں کی سب سے بڑی خوشی طلوعِ صبح کا دیدار ہوتی ہے۔ وہ اِسی لمحۂ کُن کے منتظر رہ کر ساری رات آنکھوں میں گزار دیتے ہیں۔ وجودِ حق کا اِس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو گا کہ تاریکی میں اجالا، تاریکی کو آہستہ آہستہ تحلیل کرنے لگتا ہے جیسے بکھری ہوئی زلفیں آہستہ آہستہ کسی گلبدن کے چہرے سے ہٹتی چلی جائیں۔ میں اُس صبح کے طلوع کے الف لیلوی رنگوں سے لطف اندوز ہوتا ہوا آگے بڑھتا چلا گیا۔ چند ساعتوں تک تو میں بھول ہی گیا کہ میں کس کام کے لیے باہر نکلا ہوں۔

چیئرنگ کراس پر پہنچ کر مجھے اسٹیشن کی طرف جاتی ہوئی ایک ٹیکسی مل گئی۔ کوئی صبح خیز ڈرائیور اس وقت آنے والی گاڑی کے مسافروں کے لیے اسٹیشن کی طرف بھاگ رہا تھا۔ یہی اُس کا معمول ہو گا کیونکہ وہ رُکا تو اس نے کہا کہ وہ تو مجھے سیدھا اسٹیشن تک لے جا سکتا ہے۔

"اُدھر کیا ہے بھئی کوئی آگ شاگ تو نہیں لگ گئی وہاں؟"

"جناب! مجھے گاڑی سے کوئی سواری لینی ہے۔"

"تمھاری اپنی سواری ہے کوئی؟"

"نہیں جی، کوئی مسافر مل جائے گا تو دہاڑی اچھی بن جائے گی۔"

"لعنت بھیج مسافر پر یار! میں تجھے خوش کر دوں گا۔ چل مجھے اِدھر راوی روڈ تک لے چل۔"

"نہیں جناب! آپ کو میں اسٹیشن لے چلتا ہوں۔ وہاں سے آپ کوئی اور ٹیکسی پکڑ لیں۔"

"چل بھئی! تیری مرضی۔" یہ کہہ کر میں اُس ٹیکسی میں بیٹھ کر اسٹیشن جا پہنچا۔ میری داڑھی بڑھ آئی تھی اور میرا بدن بھی لجلجا سا ہو رہا تھا۔ اسٹیشن کے سامنے میں نے ایک حمام میں جا کر پہلے تو شیو بنوائی اور پھر حمام میں غسل کرنے کے بعد میں ناشتے کے لیے ایک ہوٹل میں جا گھسا۔ کل رات کی بھوک نے مجھے یہ سبق دیا تھا کہ آدمی کی ٹنکی اگر فل نہ ہو تو وہ... کتے کی موت مرتا ہے۔ تگڑا سا ناشتہ کر کے میں ہوٹل سے باہر نکلا تو پونے چھ بج چکے تھے اور ابھی سورج طلوع ہونے میں پون گھنٹہ باقی تھا۔

ہیں پھر اندھیروں میں گم ہو گیا تھا۔ میری ساری محنت ہی اُدھڑ کر رہ گئی تھی۔ دُکھوں کی سوئیاں چلتے چلتے اب میرے دل تک آ پہنچی تھیں اور میں اپنی تقدیر کی ہاتھ چھٹی پکڑے راہ میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ میں وہ کس کے گھر کے اندر پھینکوں۔ کس سے کہوں کہ یہ میری نہیں تیری چھٹی ہے۔ مصیبتیں میرے اردگرد دف بجاتی پھرتی تھیں۔ اُن کے سفاک ناچ نے مجھے پاگل کر دیا تھا۔ میرے ترکش میں ابھی بہت سے تیر تھے مگر میرے اردگرد گھنا اندھیرا تھا اور دشمن سامنے نظر نہیں آتا تھا۔

مجھے معلوم تھا کہ کل آسیہ کے خلاف جو کارروائی کی گئی تھی، وہ کسی پولیس سٹیشن کے ذریعے عمل میں لائی گئی ہوگی۔ وہاں کے ڈی ایس پی منان خان کا نام میں نے سُن رکھا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اسے ساری صورتِ حال کا علم ہوگا مگر اس کے گھر کا پتہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ میں نے اپنے پاگل پن میں یہ طے کیا کہ میں اس تک جا پہنچوں تو شاید مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ آسیہ کو اُن لوگوں نے کہاں رکھا ہے۔ میں سامنے کے ایک چار منزلہ ہوٹل میں جا گھسا۔ استقبالیہ پر ایک خاتون ٹیلیفون کے قریب بیٹھی تھی۔ میں نے اپنا لہجہ بدل کر اس کو مخاطب کیا۔

"خاتون! کیا میں یہاں سے ایک فون کر سکتا ہوں۔ میں سی آئی ڈی انسپکٹر علیم الدین ہوں۔"

میری یہ بات سُن کر اس خاتون نے فون میرے آگے کر دیا۔ بولی۔

"بصد شوق! جناب میں نمبر ملا دوں؟"

"اگر آپ ڈائریکٹری مجھے دے دیں تو میں نمبر معلوم کر لوں۔"

اُس نے میری درخواست منظور کر لی، ڈائریکٹری میں عبدالمنان خان کا نمبر واضح طور پر لکھا تھا۔ میں نے وہ نمبر خود ہی گھما دیے۔

اُدھر سے فوراً ہی کسی نے فون اُٹھا لیا۔ ایک بھاری بھر کم آواز مجھے سُنائی دی "منان"۔

"السلام علیکم خان صاحب! دیکھیں، علیم الدین بول رہا ہوں، انسپکٹر سی آئی ڈی۔"

"میرے پاس جیلانی کے بارے میں ایک خبر ہے مگر میں فون پر آپ کو نہیں بتا سکتا۔"

"کون جیلانی؟"

"آسیہ کا بھائی جسے کل آپ نے گرفتار کیا تھا۔"

"اوہ! گڈ! کیا خبر ہے وہ؟"

"فون پر کچھ بتانا اچھا نہیں ہوگا۔ میں آپ سے فوری طور پر ملنا چاہتا ہوں کہیں تو گھر آ جاؤں؟"

"کوئی مضائقہ نہیں! آ جائیں۔"

"آپ کا گھر مزنگ روڈ پر ہے نا؟"

"جی نہیں فیروز پور روڈ پر سترہ بی نمبر کے مکان میں رہتا ہوں۔"

"مگر ڈائریکٹری میں تو ۔ ۔ ۔"

"وہ گھر میں نے تین ماہ پہلے چھوڑ دیا تھا۔"

"جی بہت بہتر۔ میں ابھی آ رہا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔

مجھے یہی ڈر تھا۔ ڈائریکٹری میں لکھا گھر کا پتہ غلط تھا مگر فوراً منان کے گھر جانا مناسب نہیں۔ عین ممکن ہے وہ حفظ ماتقدم کے طور پر کوئی ایسا انتظام کیے بیٹھا ہو جو میرے لیے نقصان دہ ثابت ہو کیونکہ اُس نے میرا نام سُننے پر کسی گرم جوشی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔

میں نے ایک بار پھر اُس کے نمبر گھما دیے۔

"کون؟" اُس نے فوراً ہی ریسیور اُٹھا لیا۔

"میں معذرت چاہتا ہوں خانصاحب! علیم بول رہا ہوں، وہ لڑکی میو ہسپتال میں ہے نا!"

"آپ کیوں پُوچھ رہے ہیں؟"

"میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ اُس کے گرد پہرہ سخت کر دیں کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے میری اطلاع یہ ہے کہ وہ لوگ وہاں سے لڑکی کو اُٹھانے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔"

"یہ بات آپ نے پہلے ہی بتا دی ہوتی۔"

"دیکھیں، میں ادھر اتنی دُور کھڑا ہوں کہ مجھے کوئی سواری نہیں مل رہی۔ آپ کو خبردار کرنا میں ضروری سمجھتا ہوں۔"

"آپ بے فکر رہیں" اسے ہم نے ایسی جگہ رکھا ہے کہ اُس کے فرشتے بھی وہاں نہیں پہنچ سکتے۔"

"مگر میو ہسپتال میں ۔ ۔ ۔"

"براہِ کرم ایسی باتیں فون پر نہ کریں میرے پاس آ جائیں" کہہ کر اُس نے فون رکھ دیا۔

میں مایوس سا ہو کر ہوٹل سے باہر نکل آیا۔ وہ منان ایک کائیاں آدمی تھا۔ اُس نے اشارۃً بھی مجھے نہیں بتایا کہ اُسے اُن لوگوں نے کہاں رکھا ہے اگر مجھے معلوم ہو جاتا کہ وہ کہاں ہے تو ہر قیمت پر وہاں پہنچ کر اُسے اُن کی گرفت سے چھڑا لیتا۔ مجھے معلوم تھا۔

منان سے میں نے اپنی آواز اور لب و لہجہ بدل کر بات محض اس لیے کہ جب میں اس سے ملوں تو وہ مجھے کسی طرح بھی فون پر بولنے والے علیم الدین کے حوالے سے نہ جان سکے۔

میں نے ٹیکسی پکڑی اور اسی وقت فیروز پور روڈ کی طرف چل دیا۔ منان کا بنگلہ سڑک سے ہٹ کر تیس فٹ چوڑی گلی کے سرے پر تھا۔ بنگلہ کیا تھا، بس ایک چھوٹا سا مکان تھا جس کے طرزِ تعمیر میں یار لوگوں نے کچھ نئے گل کھلا دیے تھے۔

میں نے اطلاعی گھنٹی بجائی تو ایک ادھیڑ عمر کے

آدمی نے دروازہ کھولا۔

"دیکھیں میاں جی میرا نام ہاشم خان ہے۔ میں منان صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"ذرا ٹھیریں جناب! میں انہیں اطلاع دیتا ہوں۔"

بڑے میاں فوراً ہی دروازہ بند کر کے پیچھے ہٹا۔ ابھی دو منٹ ہی گزرے تھے کہ منان خان دروازے پر آ گیا۔ وہ چھ فٹ اُونچا سانولے رنگ کا بڑا ہی بارعب جوان تھا۔ اس کی آنکھوں میں عقاب ایسی چمک تھی۔ وہ اُس وقت وردی میں ملبوس تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میرا صفاچٹ چہرہ دیکھ کر وہ مجھے پہچان نہیں سکے گا۔ میری دو ہی تصویریں اُن کے ریکارڈ میں موجود تھیں۔ ایک وہ تھی جس میں میں نے مونچھیں بال رکھی تھیں اور ایک وہ تھی جس میں میرے چہرے پر گھنی داڑھی تھی۔

علیک سلیک کے بعد وہ مجھے مکان کی بیرونی دیوار سے دس فٹ دُور بنے چھوٹے سے ڈرائینگ روم میں لے گیا۔ وہاں دُنیا بھر کی خوشنما چیزیں اِدھر اُدھر سجی ہوئی تھیں۔ تین تین تو وہاں الارم کلاک دھرے تھے۔ ایک چھوٹا رنگین ٹی وی اس نے عمدگی سے کونے میں سجا رکھا تھا۔ اس سے دُگنے سائز کا ایک ٹی وی دوسرے کونے میں میز پر رکھا تھا۔ صوفے ایسے تھے کہ اُن پر بیٹھ کر آدمی کو آغوشِ یار کا احساس ہوتا تھا۔ فرش پر سُرخ قالین اتنا دبیز تھا کہ اس میں پاؤں دھنسے جاتے تھے۔ چاروں دیواروں پر مزیّن مصوّری کے شاہکار ٹنگے تھے۔ میں اس صوفے میں دھنس کر بیٹھا جو دروازے کے دائیں ہاتھ رکھا تھا۔ منان میرے پاس ہی بیٹھ گیا۔ اُس کے رویّے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ مجھے کوئی بہت بڑی اسامی سمجھ رہا تھا اور میرے گنتے سے اُسے ڈھیر سارا رس نکلنے کی توقع تھی۔ بڑے ہی متواضع لہجے میں بولا۔

"کہیے جناب! کیسے آنا ہوا۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" یہ کہہ کر اُس نے پھر تھری کیسل کے سگریٹوں کا پیکٹ میرے سامنے رکھ دیا۔ "چائے تو پئیں گے نا آپ؟"

"جی نہیں، خانصاحب! چائے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں آپ سے ایک بہت ہی اہم کام کے سلسلے میں ملنے آیا ہوں۔"

"حکم کریں آپ! آپ نے ابھی تک اپنا تعارف نہیں کرایا ہے۔"

"دیکھیں میرا نام ہاشم خان ہے میری ایک ماموں زاد بہن ہے آسیہ۔ میں اُس کے سلسلے میں آپ سے مدد لینے آیا ہوں۔ اُس کے بھائی نے اُس کی زندگی تباہ کر دی ہے۔ خود تو وہ پتہ نہیں کہاں خوار ہوتا پھر رہا ہے مگر اپنے ساتھ اُسے بھی لے ڈوبا ہے۔" اُس کے ردِّ عمل پر کڑی نظر رکھے ہوئے میں نے بہت دھیمی آواز میں بات کی، یوں جیسے کوئی سرگوشی کر رہا ہے۔ اُس کے چہرے پر بلا کا تحیّر اُتر آیا۔ اُس نے اپنے پستول پر اپنا ہاتھ مضبوطی سے جما لیا تھا۔

"ہوں! تو آپ آسیہ کے لیے آئے ہیں۔ میں کیا کر سکتا ہوں آپ کے لیے؟" اس کا لہجہ بڑا ہی سفاک ہو گیا تھا۔ پیچھے ہٹ کر اُس نے سر اپنا صوفے کی پشت سے لگا لیا۔ وہ مجھے بڑی ہی مشکوک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"دیکھیں، وہ بے گناہ ہے، اپنی عزت کے تحفظ کے لیے اُس نے اگر کسی کو مار دیا تھا تو یہ اس کا حق تھا جسے عدالت میں پیش کی گئی غلط گواہیوں کی بنیاد پر تسلیم نہ کیا گیا۔ وہ خاصے طویل عرصے تک جیل میں رہی ہے مگر اب وہ بیمار ہے۔ میں نے معلوم کر لیا ہے کسی نے اس کے پیٹ کا آپریشن کیا ہے۔ اُس کی حالت بہت مخدوش ہے۔"

"یہ باتیں آپ مجھ سے کیوں کر رہے ہیں۔ کیا چاہتے ہیں آپ؟" اُس نے بڑے ہی کاٹ دار لہجے میں کہا۔

"آپ مجھ سے سودا کر لیں۔ میں آپ کو اس کی رہائی کے عوض ایک لاکھ روپیہ دے سکتا ہوں، ابھی اور اسی وقت۔"

میری یہ بات سُنتے ہی اُس نے بجلی ایسی سُرعت سے اپنا پستول خول سے نکالنا چاہا مگر میں اس کے ارادے کو بھانپ چکا تھا۔ میں نے اپنا چپٹا سا کمبل سے نکال کر اُس کے سینے پر رکھ دیا اور بائیں ہاتھ سے اُس کی دائیں کلائی پکڑ کر اس کا ہاتھ پیچھے ہٹا دیا۔ اس کا رنگ فق ہو گیا۔

"میرا خیال ہے ہمیں ایک دوسرے کے خلاف ہتھیار نہیں اُٹھانے چاہییں۔ یہی ہمارے لیے بہتر ہے۔" یہ کہہ کر میں نے اُس کی پیٹی میں سے پستول نکال لیا۔ "یہ لیے آواز چلتا ہے خان صاحب! آپ براہِ کرم میری بات غور سے سنیں میرے لیے یہاں سے نکل جانا کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔" یہ کہہ کر میں نے اپنا پستول اُس کے سینے سے پیچھے ہٹا لیا مگر نال کا رُخ اب بھی اس کی طرف تھا۔

"آپ کو معلوم ہے آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" اُس نے بڑے جھلّائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"جی ہاں! میں یہ کہہ رہا تھا کہ میں ہسپتال سے کسی بہانے آسیہ کی رہائی کے عوض آپ کو ایک لاکھ روپے دے سکتا ہوں۔ یہ بڑی رقم ہے، اس سے آپ پانچ مربع زمین خرید سکتے ہیں، ایک بہت عمدہ کوٹھی تعمیر کر سکتے ہیں۔"

"جی نہیں، مجھے یہ سودا منظور نہیں ہے۔ میں اپنا فرض نہیں بیچ سکتا۔" اب کی دفعہ اُس کی آواز معمول پر آ چکی تھی۔

کمرے کا دروازہ اُس نے خود ہی بند کیا تھا اور مجھے یقین تھا کہ اُس کے کہنے کے بغیر کوئی دُوسرا آدمی اندر نہیں آ سکتا تھا۔

"اُسے کہاں رکھا ہے آپ نے؟"

"اوّل تو مجھے اس کا پتہ ہی نہیں ہے اور معلوم بھی ہو تو بھی میں آپ کو نہیں بتا سکتا۔ ویسے بھی یہ کیس اب میرے ہاتھ میں نہیں ہے سپیشل اسٹاف کے پاس ہے۔"

"مجھے بتائیں خان صاحب کہ آسیہ کو آپ نے کہاں رکھا ہے؟" میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔
وہ چند لمحے مجھے گہری گہری نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا "اس معاملے پر آپ مجھ سے سودا کرلیں۔ آپ مجھے جیلانی کا پتہ بتا دیں۔ اُسے گرفتار کروا دیں تو میں آسیہ کو رہا کروا دوں گا۔"
اب کی بار اس نے زیادہ کھل کر بات کی اور ایک سگریٹ سلگا کر گہرے گہرے کش لینے لگا۔ میرے چپ شاہ کا رُخ اب بھی اُس کے سینے کی طرف تھا۔ ذرا رک کر وہ پھر بولا، کہنے لگا "آسیہ کی گرفتاری یا قید سے ہمیں کوئی خاص غرض نہیں ہے۔ ہمیں جیلانی کا پتہ چاہیے۔"
"یہ میرے بس میں نہیں ہے ہم تو خود اس جیلانی سے تنگ آئے ہوئے ہیں۔ وہ مجھے مل جائے تو میں خود اسے گولی مار دوں۔"
"یہ غلط ہے۔ آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔"
میں مسکرا دیا۔ یوں جیسے کوئی آدمی اپنے جھوٹ کی قلعی کھل جانے پر شرمسار ہو کر مسکراتا ہے۔ ایسا میں نے عمداً کیا تھا۔
"کیا آپ وعدہ کرتے ہیں کہ اگر میں اس وقت آپ کو جیلانی کا پتہ بتا دوں تو آپ مجھے آسیہ کا پتہ بتا دیں گے؟"
"نہیں! وہ گرفتار ہو جائے تو پھر میرا آپ سے قرآن پر وعدہ ہے کہ میں خود آسیہ کو کسی نہ کسی طرح رہا کروا دوں گا۔ اگرچہ وہ غیر قانونی رہائی ہو گی مگر جیلانی کی گرفتاری کے بدلے میں یہ بھی کر گزروں گا۔"
تب مجھے یقین ہو گیا کہ ملتان خان کو اچھی طرح علم تھا کہ انہوں نے آسیہ کو کہاں رکھا ہے۔ اتنا مجھے یقین تھا کہ وہ لوگ آسیہ کو کسی سرکاری ہسپتال نہیں لے گئے ہوں گے۔ کسی غیر سرکاری جگہ پر رکھ کر اس کا علاج کروا رہے ہوں گے۔
"کیا آپ کو یقین ہے کہ اُسے باقاعدہ طبی امداد مل رہی ہے؟"
"ہاں۔ یہ حکومت کا فرض ہے۔ اس ڈاکٹر بخاری نے اس کی کیفیت ہمیں بتا دی تھی۔ اس کے علاج کے لیے ماہر ڈاکٹر کا بندوبست کر دیا گیا ہے مگر آپ ہمیں یہ بتائیں کہ اس کا آپریشن کس نے کیا تھا؟"
"اس کا تو مجھے قطعاً علم نہیں ہے۔"
"پھر آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ وہ بخاری کلینک میں سے گرفتار کر لی گئی ہے؟"
"میرے ایک دوست نے رات ہی مجھے بتایا تھا کہ وہاں سے آسیہ نام کی لڑکی گرفتار ہوئی ہے۔ میری تو اس بے چاری سے ایک عرصہ سے ملاقات نہیں ہوئی ہے اور میں اب تک اس کے لیے کچھ نہیں کر سکا تھا۔ مگر اب میں خاموش نہ رہ سکا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ جیلانی کو کہاں پکڑا جا سکتا ہے۔ میں اُسے گرفتار بھی کروا سکتا ہوں مگر آپ کی طرف سے مجھے اطمینان ہونا چاہیے۔"
"میں آپ سے قرآن پر ہاتھ رکھ کر وعدہ کر سکتا ہوں جیلانی

ہاتھ نہ آیا تو ہم میں سے بہت سے برطرف کر دیے جائیں گے۔ پہلے مقابلے میں ہمارے دو سپاہی شدید زخمی کر دیے۔ پھر وہ دریا کے بھی ہمارے آدمیوں پر حملہ آور ہوا۔ وہاں اس نے چھ سپاہیوں اور تھانیدار کو باندھ کر بے بس کر دیا۔ تھانیدار سخت زخمی ہے۔ یہی حال کا ہے۔ اُسے تو ہم ہر قیمت پر گرفتار کریں گے۔"
اب وہ زیادہ دلجمعی سے بات کر رہا تھا مگر میرے پستول پر اس کی نظریں برابر جمی تھیں۔ ظاہر وہ یہ کر رہا تھا کہ جیسے وہ مجھ سے خوفزدہ نہیں ہے۔ اُسے میں غیر مسلح تو کر چکا تھا مگر مجھے ابھی تک علم نہیں تھا کہ اس کے گھر میں کتنے آدمی ہیں اور اس کے کتنے دانت زہریلے ثابت ہو سکتے ہیں۔ سب سے زیادہ خطرہ مجھے اس کی آواز سے تھا۔ اس نے اپنا پستول چھن جانے پر ابھی تک کوئی شدید ردعمل نہیں کیا تھا مگر اتنا مٹی کا مادھو تو وہ ہرگز نہیں تھا کہ اس آسانی سے میرے سامنے اپنی شکست مان لیتا۔
"ٹھیک ہے خان صاحب! میرے پہلے اطمینان کے لیے آپ یہ بتا دیں کہ آسیہ کو کہاں رکھا ہے۔ پھر میں آپ کو جیلانی تک لے جاتا ہوں، اُسے گرفتار کرنے کے بعد آسیہ کی رہائی میں آپ کے دین ایمان پر چھوڑتا ہوں۔"
"نہیں! سب سے پہلے آپ مجھے جیلانی کے ٹھکانے تک لے چلیں۔ میں تھانے سے گارد منگوا لیتا ہوں۔ اُسے ساتھ لے کر ہم وہاں پہنچتے ہیں۔"
"نہیں جناب خان صاحب! پہلے آپ کو بتانا ہو گا کہ آسیہ آپ نے کہاں رکھا ہے۔"
"میں آپ کو اب تک بہت برداشت کر چکا ہوں ہاشم صاحب یہ پستول اُدھر رکھ دیں اور یہاں سے تشریف لے جائیں ورنہ اچھا نہ ہو گا۔" اس کا لہجہ ایک دم تپ گیا۔ سگریٹ۔۔ بڑے غصے سے ایش ٹرے میں بجھاتی اور بلند آواز سے چیخا "کرم دین! ادھر آؤ۔"
اس کی یہ بات سنتے ہی میں نے پستول اس کے سینے سے لگا دیا۔ مگر اس نے شاید میری آنکھوں سے جھانکتے میرے ارادے بھانپ لیا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں گولی نہیں چلاؤں گا۔ وہ ایک بار پھر چیخا "کرم دین" اور یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ جونہی وہ اُٹھا میں بھی اس کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہوا اور پھر میں نے فوراً ہی اس کی گردن پر ہاتھ رکھ کر پوری قوت سے اُس کی رگِ احساس مل دی۔ وہ میرے ہاتھوں میں جھولا تو میں نے اُسے قالین پر گرا دیا۔
اُسی لمحے دروازہ کھلا۔ اس کا زنگی کا نوکر ایسا ملازم کرم دین آ گیا۔ میں نے اس وقت تک پستول جیب میں ڈال لیا تھا۔ جونہی وہ داخل ہوا میں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا "اوہ دیکھیں میاں جی

دیکھیں صاب کو کیا ہو گیا یہ ایک دم کھڑے کھڑے بے ہوش ہو گئے۔"
اُس کے تو اوسان خطا ہونے لگے وہ جھک کر ملتان کی نبض دیکھنے لگا تھا۔
"جاؤ پانی لاؤ۔" میں نے اُسے جھنجھوڑا۔ وہ پاگلوں کی طرح دوڑ کر کمرے سے نکلا اور پلک جھپکتے میں پانی لے آیا۔
میں نے گلاس ملتان کے ہونٹوں سے لگایا مگر وہ بیچارا تو وہاں تھا ہی نہیں، وہ پانی کیسے پیتا۔
"ان کی بیوی کو بلاؤ میاں جی! دیکھو تو انہیں کیا ہو گیا ہے۔"
"صاب جی ان کے بچے تو پرسوں سے گاؤں گئے ہوئے ہیں۔ ٹھہریں میں ڈاکٹر کو بلاتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ فون کی طرف بڑھا۔ ابھی وہ نمبر گھما ہی رہا تھا کہ میں نے بڑے ہی غیر محسوس طریقے سے آگے بڑھ کر پلگ میں سے تار کھینچ کر الگ کر دیا۔
"کیا ہوا؟"
"یہ تو خراب معلوم ہوتا ہے صاب جی کچھ کریں۔ ان کی حالت تو بہت خراب ہو رہی ہے۔"
"تم بھاگ کر کسی ڈاکٹر کو بلا لاؤ۔ کتنی دور جانا ہو گا تمہیں؟"
"وہ جی ڈاکٹر مختار ہے ادھر مزنگ چونگی پر رہتا ہے۔ میں اُسے بلا لاتا ہوں۔"
"ٹھیک ہے، تم سائیکل پر نکل جاؤ۔ خدا خیر ہی کرے۔ پہلے بھی کبھی ایسا دورہ پڑا تھا انہیں؟"
"نہیں جی! ایسا تو کبھی نہیں ہوا۔"
"تو پھر جاؤ۔ زیادہ وقت ضائع نہ کرو۔ میں ان کے پاس ٹھہرتا ہوں۔ یہ تو ایک دم چکرا کر بے ہوش ہو گئے۔ پتہ نہیں کیا ہوا ہے۔" میں اُس کے سامنے جان بوجھ کر ملتان خان کے بوٹ اُتار کر اس کے تلوے سہلانے لگا۔
کرم دین بہت ہی گھبرا گیا تھا۔ وہ اُسی وقت سائیکل پر بیٹھ کر باہر نکل گیا۔
وہ ابھی بڑی سڑک پر پہنچا ہی تھا کہ میں نے باہر نکل کر گلی کی پچھلی طرف سے گزرنے والی بڑی سڑک پر سے ایک ٹیکسی پکڑی، اور اُسے لا کر ملتان خان کے دروازے پر کھڑا کر دیا۔ اب مشکل یہ تھی کہ ملتان وردی میں تھا۔ میں نے دوسرے کمرے میں گھس کر ایک الماری میں ٹنگی اس کی قمیص شلوار نکالی اور لے جا کر اُس کو لیٹے لیٹے پہنا دی۔۔ یہ بڑا مشکل کام تھا مگر میں نے اُسے افراتفری میں کر ہی ڈالا۔ پھر میں نے اس کی وردی الماری میں رکھ کر اُسے کندھے پر اُٹھایا اور باہر لے جا کر ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر ڈال دیا۔
"جلدی چل میرے یار! یہ میرے بھائی صاحب ہیں۔ پتہ نہیں انہیں کیا ہو گیا ہے۔ بس انہیں جلدی کسی ہسپتال میں لے چل۔"

اس نے فوراً ہی ٹیکسی اسٹارٹ کی اور پچاس میل کی رفتار پر وہ ہمیں وہاں سے لے اُڑا۔ میری نظریں اُس وقت گلبرگ کے ایک کلینک پر جمی تھیں۔ وہاں میں ایک کمرہ عارضی طور پر لے کر ملتان کو ایک دو دن رکھ سکتا تھا۔ میں نے ٹیکسی اُدھر موڑی اور کچھ ہی دیر بعد میں ملتان کو لے کر اختر علی ہسپتال جا پہنچا۔ وہ بھی ایک کلینک ہی تھا۔ میں ٹیکسی کو اُس کے گیٹ کے اندر لے جا کر ملتان کو اُتارنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ مجھے عمارت کے برآمدے میں سے ایک عورت تیزی سے باہر آتی دکھائی دی۔ اُسے میں پہلی ہی نظر میں پہچان گیا تھا۔ وہ ماجدہ تھی۔ وہ وہی ماجدہ تھی۔ وہی ماجدہ جس سے میں کنجاہ میں مل چکا تھا اور جو شگری کے مکان سے رات کے وقت مجھے سوتا چھوڑ کر فرار ہو گئی تھی۔
وہ برآمدے سے نکل کر ٹیکسی کی طرف بڑھی، اسے سواری کی ضرورت تھی۔ سورج اُس وقت تک طلوع ہو چکا تھا۔ ماجدہ ٹیکسی کے قریب پہنچی تو میں نے ڈرائیور کی طرف سے اوٹ کر کے دونوں ہاتھ پھیلا کر چادر کو یوں کھول لیا کہ اب ڈرائیور نہ مجھے دیکھ سکتا تھا نہ ماجدہ کو۔ مجھے یوں ایک دم پر پھیلا کر سامنے آتا دیکھ کر ماجدہ ٹھٹکی اور جوں ہی اُس کی نظر میرے چہرے پر پڑی، اس کی آنکھیں حیرت کی فراوانی سے پھیلنے لگیں۔
"ماجدہ! آپ! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟"
"جیلانی صاحب! آپ؟ میں تو آپ کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئی، آپ کا کچھ پتہ ہی نہیں چلا؟"
"کیوں جھوٹ بولتی ہیں آپ؟ خود آپ راہ میں چھوڑ کر بھاگ نکلی تھیں۔ یہاں کیا کر رہی ہیں آپ؟"
"میری ایک سہیلی یہاں داخل ہے۔ میں رات اُس کے پاس بیٹھی رہی۔ بہت بیمار ہے بیچاری۔ میں اس کے لیے کچھ چیزیں لینے جا رہی تھی۔"
"اس سہیلی پر لعنت بھیجیں۔ اور مجھے اپنے گھر لے چلیں۔ کہاں رہتی ہیں آپ؟" میں نے اسے ٹیکسی سے دُور لے جا کر کہا۔
"میں اُدھر شاہ نور اسٹوڈیو کے قریب رہتی ہوں ملتان روڈ پر۔"
"تو پھر چلیں ٹیکسی میں بیٹھیں مجھے ابھی آپ کے گھر جانا ہے ایک بہت ضروری کام ہے مجھے آپ سے۔"
وہ کچھ ہچکچائی مگر پھر بولی "اچھا چلیں، مگر کوئی گڑبڑ کی بات تو نہیں ہے؟"
"ہے بھی اور نہیں بھی۔ ساری بات میں آپ کو گھر چل کر بتا دوں گا، جلدی کریں۔" یہ کہہ کر میں اُسے لیے ٹیکسی میں جا بیٹھا۔
"چل بھئی! اِدھر تو کوئی ڈاکٹر ہی نہیں ہے، تو اب ہمیں اُدھر ملتان روڈ پر لے چل۔" میں نے ڈرائیور سے کہا۔ میں ملتان کے پاؤں کی طرف پچھلی نشست پر بیٹھ گیا تھا۔ "ڈاکٹر صاحب اب آپ

ہی اس کا علاج کردیں۔" میں نے ڈرائیور کی سوالیہ نظروں سے بچنے کے لیے کہا۔ ماجدہ دہشت زدہ سی ہوگئی تھی۔ پچھلی سیٹ پر لیٹے تڑپتے منان خان کو یوں بے ہوش دیکھ کر اس کی سٹی گم ہوگئی تھی اور وہ سمجھ گئی تھی کہ میں اُسے ایک نئے چکر میں ڈال رہا ہوں۔

اُس کا گھر بڑی سڑک کے قریب ہی تھا۔ اس کے گیٹ پر پہنچ کر اُس نے ٹیکسی رکوائی تو میں نے منان خان کو ٹیکسی سے نکال کر کندھے پر ڈال لیا۔ گیٹ ایک بوڑھی عورت نے کھولا۔ سامنے چھوٹا سا دس فٹ چوڑا صحن تھا۔ اس کو عبور کر کے ماجدہ نے مجھے ایک کمرے میں پہنچا دیا۔ وہاں دو بیڈ بچھے تھے۔ میں نے منان کو بستر پر ڈالا تو وہ بولی۔

"آپ پہلے اس ٹیکسی والے کو فارغ کر آئیں۔" یہ کہہ کر وہ منان کی نبض ٹٹولنے لگی۔ میں نے تیزی سے باہر نکل کر ڈرائیور کو بیس روپے تھمائے اور پھر گیٹ بند کر کے اندر چلا آیا۔

"بھاماں! ہمارے لیے ناشتہ تیار کرو۔" ماجدہ نے باہر صحن میں کھڑی ملازمہ کو کھڑکی میں سے پکار کر کہا۔ وہ عورت فوراً ہی عمارت کے اندر چلی گئی۔

"یہ مکان آپ نے خریدا ہے؟"

"نہیں، ابھی تو میں یہاں کرائے دار ہوں، ویسے میرا ارادہ ہے کہ میں اسے خرید لوں۔ مالک ڈھائی لاکھ مانگ رہا ہے۔"

"ہوں۔ تو یہ ٹھاٹھ ہیں گویا!"

"یہ کون ہے؟"

"یہ بھی ایک درویشِ خدا مست ہے۔"

"خاکی ہے کہ نوری؟"

"نہ خاکی نہ نوری بلکہ ناری ہے۔" یہ کہہ کر میں نے مختصر الفاظ میں منان کے بارے میں ساری بات بتا دی۔ اُس کا رنگ ہلدی ہونے لگا۔

"آپ نے سخت حماقت کی ہے۔ آسیہ کا پتہ کسی اور طریقے سے بھی معلوم کیا جا سکتا تھا۔"

"میں سارے حربے استعمال کر چکا ہوں۔ ان لوگوں نے اُسے کسی خفیہ جگہ پر منتقل کر دیا ہے اور مجھے ڈر ہے کہ وہ بے علاج مر جائے گی۔ وہ اُس پر تشدد کریں گے تو وہ کیسے سہہ سکے گی؟"

"مگر مجھے آپ نے خواہ مخواہ مصیبت میں پھنسا دیا ہے — وہ ٹیکسی ڈرائیور ہمیں بہت ہی شبہے کی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ وہ نہ سوچتا ہوگا کہ آپ نے اس آدمی کو اس مکان سے اٹھا کر ادھر کیوں پہنچا دیا۔ یہاں کون سا علاج مل سکتا ہے اِسے؟ کوئی ہسپتال تو نہیں ہے یہ۔"

"زیادہ باتیں مت بنائیں ماجدہ! میں خود افراتفری کا شکار ہو رہا ہوں۔ ڈرائیور کو صرف اپنی مزدوری سے غرض تھی وہ میں نے اُسے دے دی ہے۔"

"اب میں یہاں کیا کروں؟ میں یہاں اکیلی نہیں رہتی ہوں میرے ساتھ نصیر صاحب بھی رہ رہے ہیں۔"

"وہ کون ہیں؟"

"ایک صاحب ہیں وہ فلموں میں کام کرتے ہیں، وہ اب آنے ہی والے ہوں گے۔ میں انھیں کیا جواب دوں گی۔"

"کیا آپ نے اس سے شادی کر لی ہے؟"

"نہیں، وحید سے جان چھوٹے تو میں کچھ سوچ سکوں۔"

"ہوں، کیا اس مکان میں نصیر صاحب کا بھی حصّہ ہے کیا کرایہ دیتی ہیں آپ اس کا؟"

"نہیں! اس کا کرایہ پانچ سو روپے ہے اور وہ میں خود ادا کرتی ہوں۔"

"تو پھر وہ کس حیثیت سے رہ رہا ہے؟"

"میں تنہا عورت ہوں جیلانی صاحب یہ بات آپ بھول رہے ہیں۔"

"اچھا؟ تو وہ آپ کا محافظ بھی ہے اور خدمت گار بھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ اتنی سستی ہو جائیں گی۔"

"آپ مجھے غلط نہ سمجھیں! مجھے بہرحال کسی نہ کسی کو ساتھ رکھنا ہی تھا۔"

"آپ کو پتہ ہے آہو نے آپ پر اُس کی الماری سے ہیرے چُرانے کا الزام لگایا ہے، وہ کہتا ہے کہ اُن کی مالیت بائیس لاکھ روپے ہے۔"

"ہو سکتا ہے وہ درست کہہ رہا ہو کیونکہ میں نے صرف چند دانے بیچ کر ڈیڑھ لاکھ روپیہ حاصل کیا تھا۔ وہ واقعی قیمتی ہیرے ہیں۔ بہرحال میں وہ ہیرے کل آپ کو واپس کر دوں گی۔"

"انھیں وہاں سے چُرا کر آپ نے میرے لیے زبردست مصیبت کھڑی کر دی۔ آہو میری جان کا دشمن ہو رہا ہے اور میرے سوا اس شہر میں آپ کو اور کوئی نہیں پہچانتا ہے۔"

"آپ کی مشکل کا اندازہ ہے مجھے، مگر آپ کے سامنے جھوٹ نہیں بولوں گی۔ میں نے صرف چار دانے بیچے تھے، باقی میرے پاس محفوظ ہیں۔ کل آپ مجھ سے لے لیں۔"

"ٹھیک ہے کل آپ وہ ہیرے مجھے واپس دے دیں، میں آہو کو لوٹا دوں گا۔ ابھی تو آپ اس نصیر کو یہاں سے بھگائیں کیوں کہ میں یہاں آپ کے ساتھ ٹھہرنا چاہتا ہوں۔" میں نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

"میں اسے مجبور نہیں کر سکتی، وہ میرا بہت خیال رکھتا ہے۔"

"یہ بات آپ میرے سامنے اتنی دلیری سے کہہ رہی ہیں۔ آپ جانتی ہیں میرے ساتھ آپ نے کیا وعدہ کیا تھا؟"

"مجھے معلوم ہے مگر آپ کے ساتھ کوئی کہاں رہ سکتا ہے آپ کا نہ گھر نہ گھاٹ، نہ آپ کی زندگی کا کوئی بھروسہ۔"

"آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ کہاں ہیں وہ نصیر صاحب اس وقت؟"

"وہ رات بھر اسٹوڈیو میں رہتے ہیں۔ دس گیارہ بجے دن کو واپس آتے ہیں۔"

"ہوں، مجھے ایک الگ کمرہ دے دیں۔ میں منان کو وہاں رکھوں گا اس سے مجھے بہت کچھ پوچھنا ہے۔"

"دیری مانیں تو اسے یہاں سے لے جائیں ورنہ آپ کی وجہ سے ہم بھی مصیبت میں پھنس جائیں گے۔"

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ اتنی بدل جائیں گی۔ بہرحال اب تو مجبوری ہے۔ میں یہاں سے نہیں جا سکتا۔" یہ کہہ کر میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ سامان وہاں بڑا ہی مختصر تھا۔ یہی حال دوسرے دو کمروں کا تھا۔ مکان میں ایک ڈرائنگ روم بھی تھا مگر وہ بھی بس خالی خالی سا نظر آ رہا تھا۔ اُس نے میرے ساتھ گھوم پھر کر مجھے اپنا سارا مکان دکھا دیا، تو بولی۔ "دیکھا آپ نے یہاں ایک بھی کمرہ محفوظ نہیں ہے۔"

"جی ہاں دیکھ رہا ہوں۔ بہرحال آپ ابھی اسٹوڈیو جائیں اور نصیر کو لے کر دو دن کے لیے کہیں دفع ہو جائیں۔ سمجھی ہیں آپ! اپنی یہ منحوس صورت مجھے دو دن تک آپ نہیں دکھائیں گی۔" میں نے بڑے ہی غضبناک لہجے میں کہا۔

"آپ ناراض ہو گئے۔ اپنی ماجدہ سے بھی ناراض ہو گئے؟" یہ کہہ کر اُس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ بڑی رسان سے مُسکرا رہی تھی، یوں جیسے میرے غصّے نے اُسے دہلا دیا ہو۔

"اور کیا کروں؟ آپ وہ پہلی سی ماجدہ ہی نہیں رہی ہیں — اتنی بے گانہ تو آپ کبھی بھی نہیں تھیں۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ میں نصیر کو دو دن کے لیے کراچی یا کسی اور جگہ بھیج دیتی ہوں کوئی بہانہ کر دوں گی اُس سے۔"

"ہاں یہی بہتر ہے۔ میں بس دو دن یہاں رہوں گا۔ مجھے اس سے معلوم کرنا ہے کہ آسیہ کہاں ہے؟ مجھے یقین ہے کہ وہ کسی بھی ہسپتال میں داخل نہیں ہے۔ جب یہ ہوش میں آ جائے تو اس کے سامنے مجھے آپ ہاشم خان کے نام سے پکاریں۔ میں نے اُسے یہی بتایا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ آئیں ناشتہ کریں۔ پھر میں اسٹوڈیو چلی جاؤں گی۔ اچھا ہُوا آپ نے اُسے اپنا اصلی نام نہیں بتایا۔"

ہم دونوں نے ایک ہی میز پر بیٹھ کر ناشتہ کیا۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم تھی اور مجھے اس کا یہ رویّہ دیکھ کر سخت طیش آ رہا تھا۔ اس نے مجھے بالکل ہی کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ پھر بھی وہ مجھ سے کوئی بات چھپا نہیں رہی تھی۔ وہ اُن ہیروں کے بارے میں لاعلمی کا اظہار بھی کر سکتی تھی۔ مگر مان ہی گئی کہ ہیرے اس نے وہاں سے اٹھائے تھے۔ اُن میں سے جو اُس نے بیچ دیے تھے ان کے بارے میں بھی اس نے سچ سچ بتا دیا تھا اور میں نہیں سمجھتا تھا کہ وہ سب کچھ اس نے خوف کے زیرِ اثر کیا تھا۔

ناشتے سے فارغ ہوتے ہی وہ اپنی ملازمہ بھاماں کو ساتھ لیکر باہر نکل گئی۔ میں نے مکان کے تمام دروازے اندر سے بند کر کے منان کی مشکیں کس کر اس کو ہوش میں لانے کی تدبیریں شروع کر دیں — کوئی بیس منٹ بعد اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ مجھے سامنے دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں ایسا تحیّر اُترا کہ بس شاید۔

"کہیے کیا حال ہیں خان صاحب! اب طبیعت کیسی ہے آپ کی؟"

"تم! تمہاری یہ جرأت!" یہ کہہ کر اس نے ایک بڑی غلیظ گالی مجھے دی۔ بولا۔ "یہ کہاں لے آئے ہو تم مجھے؟" اُس نے گرد و پیش کو بغور دیکھ کر کہا۔

"یہ میرا گھر ہے خان صاحب! آپ میرے لیے بہت ہی قابلِ احترام ہیں مجھے صرف یہ بتا دیں کہ آسیہ کو کہاں رکھا گیا ہے تو میں آپ کو چھوڑ دوں گا۔ ورنہ میرا یہ پستول بے آواز چلتا ہے۔"

"میں تمھیں کتوں کے آگے ڈال دوں گا ہاشم خان تم مجھے نہیں جانتے ہو شاید!"

"مجھے معلوم ہے خان صاحب مگر وہ میری ماموں زاد بہن کا معاملہ ہے۔"

"میں مر جاؤں گا مگر کچھ نہیں بتاؤں گا۔ تم سمجھتے ہو میں کوئی یوں ہی سا مٹی کا مادھو ہوں؟ میں بدترین حالات میں بھی اصولوں پر سمجھوتہ نہیں کر سکتا۔"

"مجھے معلوم ہے آپ بہت بڑے ہیں خان صاحب مگر یہ میری ماموں زاد بہن کا سوال ہے مجھے سختی پر مجبور نہ کریں۔" میں نے بڑے جمے ہوئے لہجے میں کہا۔ اُس کی آنکھیں شعلے اُگلنے لگیں۔ وہ اپنے ہاتھ پُشت پر بندھے دیکھ کر تلملا رہا تھا۔ اُس کے پاؤں میں نے پائینتی سے باندھ دیے تھے اور وہ پلنگ پر اس طرح بیٹھا تھا کہ اس کی پشت کے ساتھ میں نے ایک بڑا سا گاؤ تکیہ لگا دیا تھا۔ بدن اُس کا ایک لحاف سے ڈھکا تھا۔ بظاہر اسے کوئی تکلیف نہیں تھی اور میں اسے کوئی غیر ضروری تکلیف دینا بھی نہیں چاہتا تھا۔

وہ ایک جھٹکے سے آگے بڑھا اور پائینتی سے بندھے پاؤں رسّیوں سے چھڑانے لگا مگر وہ گرہ بہت مضبوط تھی۔ اس زور آزمائی سے اس کا چہرہ سُرخ ہونے لگا۔ میں نے سگریٹ سلگا کر گہرا کش لیا، اور اس کا جلتا ہوا حصّہ اس کی کلائی سے لگا دیا۔ اُس کے منہ سے دبی دبی چیخ نکلی مگر پھر وہ بھی اُس نے دبا لی۔ کلائی پر چھالا سا نظر آنے لگا تھا۔

"اگر آپ نے تعاون نہ کیا تو مجھے ہاتھ سخت کرنا پڑے گا خان صاحب!" وہ گندی گالیاں بکنے لگا، بولا۔ "میں کسی قیمت پر تمھیں نہیں بتاؤں گا کہ وہ لڑکی کہاں ہے۔"

"کیا وہ کسی ہسپتال میں ہے؟"

"نہیں، ہم اس کے نوکر نہیں کہ اس ملکہ کو ہسپتال کی عیاشی مہیا کریں۔"

"ہوں! کیا وہ شاہی قلعے میں ہے؟"

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کہاں ہے۔ تم جو چاہتے ہو کر لو۔"

اُس کے ارادے کی پختگی نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ میں نے بڑے حربے آزمائے دو گھنٹے تک میں اُسے مختلف طریقوں سے منہ کھولنے پر مجبور کرتا رہا۔ مگر وہ ارادے کا ایسا دھنی آدمی تھا کہ اس نے بالکل ہی کچھ نہ بتایا کہ آسیہ کو انھوں نے کہاں رکھا ہے۔ میں یہ کہنے میں شرم محسوس نہیں کرتا کہ بلاشبہ وہ قول و فعل کا پکّا سچا آدمی تھا۔ وہ اپنے محکمے کے لیے ایک بے مثال افسر تھا۔ میں نے جب دیکھا کہ اُس پر میری کسی بات کا اثر نہیں ہوتا اور اپنی جگہ اٹل کھڑا ہے۔ حالانکہ اس کے بدن کے کئی نازک اور سخت حصوں کو میں زخمی کر چکا تھا مگر اُس کی بے پناہ قوتِ برداشت نے مجھے یہ احساس دلا دیا کہ میں اُس پر غالب نہیں آسکوں گا۔

ساڑھے دس بجے اچانک بڑے دروازے پر دستک ہوئی، معلوم ہوا کہ ماجدہ واپس آگئی ہے۔ اس کی ملازمہ پھاماں بھی اُس کے ساتھ تھی۔ پھاماں کو باورچی خانے کی طرف بھیج کر ماجدہ میرے کمرے میں آگئی۔ اُس نے منان کی وہ خستہ حالت دیکھی تو بڑے رُوکھے لہجے میں بولی۔

"یہ سراسر زیادتی ہے۔ میں یہ ظلم اپنے گھر میں نہیں ہونے دوں گی۔"

اُس کی یہ بات سُنتے ہی میں نے اُسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔ میں اس گھڑی پاگل ہو رہا تھا۔

"اتنا ہی اس پر رحم آتا ہے تو اس سے پوچھیں کہ انھوں نے میری بہن کو کہاں رکھا ہے۔"

"یہ بتا دیں گے مگر اس طرح نہیں۔ آپ اِن کو اِن کے حال پر چھوڑ دیں۔ میں اِن سے خود پوچھ لوں گی، آپ انھیں پریشان نہ کریں۔" میری آنکھوں میں اُبلتے غصّے کو دیکھ کر وہ بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ میری گھن گرج کا اس پر اچھا اثر ہوا تھا۔

"سختی سے تو کوئی کام نہیں ہوتا ہے ہاشم صاحب! آپ یہ کام مجھ پر چھوڑ دیں، آپ جو کچھ کر رہے ہیں میں اسے پسند نہیں کرتی۔"

"آپ خود کوشش کر دیکھیں۔ اگر اس نے مُنہ نہ کھولا تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ آسیہ کو اِسی نے گرفتار کیا تھا اور اسی نے اُسے کسی جگہ بند کیا ہے۔"

"ٹھیک ہے آپ طیش میں نہ آئیں سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

یہ کہہ کر اُس نے اپنے رُومال سے منان کے ہونٹوں سے بہتا خون صاف کیا۔ پھر اُس نے اُس کے اُلجھے ہوئے بال اپنے ہاتھوں سے درست کیے، اور لحاف کو ٹھیک طریقے سے اس کے اُوپر دے کر اُس نے اُسے پہلو کے بل اِس طرح لٹا دیا کہ اُس کا سر گاؤ تکیے پر ٹِک گیا۔

چند ہی لمحوں بعد اُس نے منان کو پانی کا گلاس دیا، بولی۔

"آپ یہ پانی پی لیں اور میری مانیں تو آسیہ کا پتہ انھیں بتا دیں، آپ کا اس میں کیا ہرج ہے۔ یہ اُسے وہاں سے رہا تو نہیں کروا سکتے۔ پولیس کا مقابلہ کون کر سکتا ہے۔"

اُس نے پانی پیا اور بولا۔ "مجھے یہی حکم ملا ہے کہ اُس کے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتایا جائے۔ متعلقہ تھانے کے لوگوں کو بھی علم نہیں ہے کہ وہ کہاں ہے۔"

"مگر آپ جانتے ہیں۔" ماجدہ نے اُس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

"میں نے اُسے اسپیشل سٹاف کے ڈی ایس پی کے حوالے کر دیا تھا، اس کے بعد مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے۔"

"کیا نام ہے اُس ڈی ایس پی کا؟"

"اس کا نام فرہاد شنواری ہے، اُسے معلوم ہوگا کہ وہ لڑکی کہاں ہے۔" منان نے اب کی بار ماجدہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ماجدہ کی محبت کے دو بول اس پر اثر کر گئے تھے اور وہ اُس کی طرف بڑے ہی ممنون انداز سے دیکھ رہا تھا۔

میں ماجدہ کو کمرے سے باہر لے گیا۔ "دیکھیں اسے آپ سنبھال رکھیں میں فرہاد شنواری کا پتہ کرتا ہوں۔ اُس سے مل کر ہی میں اس آدمی کے بارے میں کوئی فیصلہ کر سکتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے آپ جائیں اور شنواری صاحب سے مل لیں۔ رشوت سے کام چلے تو مجھ سے پچاس ہزار روپیہ لے جائیں، میں آپ کو دے دیتی ہوں۔"

یہ کہہ کر اُس نے اپنے بڑے سے پرس میں سے دس دس ہزار کی پانچ گڈیاں نکال کر مجھے دے دیں۔ اُس کے پرس میں اب بھی ڈھیر ساری گڈیاں موجود تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ابھی ابھی رقم لے کر لوٹی ہے۔ میں ان گڈیوں کو تحیر آمیز نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ میرے خیالات کا جائزہ لے کر بولی۔

"یہ روپے رکھ لیں، یہ آپ ہی کے ہیں۔ آپ ہی کی دُعا برکت کا نتیجہ ہیں۔ میں آپ ہی کے لیے بینک سے لاتی ہوں۔ مجھے یقین تھا کہ آپ کو ضرورت ہوگی۔"

میں نے وہ روپے شلوار کے نیچے پہنی پتلون کی جیب میں ڈال لیے۔ مجھے اعتراض کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی تھی۔ بڑا مال تھا اُس مال زادی کے پاس۔

"نصیر صاحب کا کیا بنا، وہ ابھی تک نہیں آئے۔" میں نے اس کے قریب ہو کر پوچھا تو وہ بدک کر پیچھے ہٹ گئی، بولی۔

"میں نے انھیں ایک ضروری کام کے لیے پشاور بھیج دیا ہے پانچ چھ دن سے پہلے وہ نہیں آئیں گے اتنے میں آپ کسی نتیجے پر پہنچ ہی جائیں گے۔"

"ہاں! یہ بہت اچھا کیا ہے آپ نے۔ میں اُسے پچھلے کمرے میں ڈال دیتا ہوں اُسے کھانے پینے کے لیے کچھ نہ دیں۔ ممکن ہے آدمی جھوٹ بول رہا ہو۔ میں شام کو واپس آؤں گا تو پھر اس سے بات کروں گا۔ اُس کی نگرانی آپ کے ذمّے ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ اُسے اُدھر ڈال جائیں، میں اُس کے کمرے کی کنڈی لگا دوں گی۔" وہ اب پہلے جیسی سراسیمہ نظر نہیں آتی تھی۔ میں نے منان کو مکان کے پچھلے کمرے میں ایک پلنگ پر ڈال کر اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر مضبوط کر دیے اور پھر اُس کے مُنہ پر کپڑا باندھ دیا تاکہ وہ شور نہ مچا سکے۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں باہر نکلا اور ٹیکسی میں بیٹھ کر گنگا رام ہسپتال جا پہنچا۔ میں اس سلسلے میں آبی سے مشورہ کرنا ضروری سمجھتا تھا۔

وہ اس وقت تک ہوش میں آچکا تھا اور پہلے سے اُس کی طبیعت بہت بہتر نظر آتی تھی۔ ڈاکٹر اُسے دیکھ کر اور اُس کے زخم پر اپنی پٹی لگا کر واپس جا چکا تھا۔

مجھے دیکھتے ہی آبی بولا۔ "آ بھی جگے! کدھر چلا گیا تھا۔ تو مجھے یہاں پھینک کر۔ وہ نرس محمدی بیگم مجھے نہ بتاتی تو میں چکرا ہی گیا تھا۔"

"میں آسیہ ہی کا پتہ کرنے گیا تھا یار! مگر معاملہ سیدھا ہوتا نظر نہیں آتا۔" یہ کہہ کر میں نے اپنی اس روز کی کارروائی اُسے بتا دی۔ وہ مسکراتا رہا۔ جب میں چپ ہوا تو وہ بولا۔

"یار! آدمی تو بہت تیز ہے مگر یوں ہوا میں تو کب تک تلوار چلاتا رہے گا۔ وہ منان تجھ سے سچ نہیں بول رہا۔ آسیہ کو اُس نے ہی کسی عقوبت خانے میں ڈال رکھا ہے۔"

"اِسی لیے تو میں اُس کی کھوج چھان کر رہا ہوں مگر وہ کچھ بکتا ہی نہیں ہے اور تیرا ایک ٹانکا الگ پھٹا پڑا ہے۔"

وہ ہنس دیا، بولا۔ "یہ بھی تیری ہی نوازش ہے میرے یار! شکر کر اُن دیہاتیوں نے ہمیں بچا لیا ورنہ تو ہماری لاشیں بھی وہ غائب کر دیتے۔ یہ لے یہ اخبار پڑھ۔ تیرے کارناموں کا اس میں ذکر ہے۔ مجھے ایک ہاکر دے گیا تھا یہ اخبار۔ یہ اچھا ہسپتال ہے یار، تو بھی اِدھر ہی داخل ہو جا۔"

میں نے اخبار اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔ اس کو پڑھ کر میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے لگے۔ معلوم یہ ہوا کہ اُن دیہاتیوں نے عرفان کی لاش کو جلنے سے بچا لیا تھا۔ اور وہ اس کی آگ بجھا کر اسی وقت پولیس کے پاس جا پہنچے تھے۔ پولیس نے عرفان کو پہچان لیا تھا، اور انھوں نے یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ کسی نے اس کا پیٹ چاک کر کے اس کا ایک گردہ نکال لیا تھا اور اب پولیس مختلف ہسپتالوں، کلینکوں اور ڈاکٹروں سے پوچھتی پھر رہی تھی کہ عرفان پر کس نے نشتر چلایا تھا۔ انھوں نے بخاری کلینک سے آسیہ کی برآمدگی کا ذکر نہیں کیا تھا۔ اُس کے بارے میں کوئی خبر اخبار میں موجود نہیں تھی۔ حالانکہ وہ بہت بڑی خبر تھی۔ انھوں نے ہمارے پولیس مقابلے کی خبر بھی چھپا لی تھی۔ اس کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ پولیس نے ایک خاص رویّہ اختیار کر لیا تھا اور اب وہ ہر قیمت پر مجھے گرفتار کرنے پر تُلے بیٹھے تھے۔ عین ممکن ہے کہ پولیس کی سُبکی اور بدنامی کے ڈر سے راوی دریا پر ہمارے مقابلے کی خبر انھوں نے عمدًا اخفا میں رکھی ہو۔ بہرحال معاملہ کچھ بھی تھا نہایت ہی پیچیدہ ہو چکا تھا۔

"اس میں راوی دریا پر ہمارے پولیس مقابلے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔" آبی نے کہا۔

"ہاں، یہ بڑی حیرت کی بات ہے۔"

"وہ لوگ کہیں سونگھتے سونگھتے یہاں تک آ پہنچیں۔"

"اللہ مالک ہے یار۔ تمھارا علاج بھی بہت ضروری ہے۔"

"ہاں وہ تو ہے مگر ہماری قسمت ہمارا ساتھ نہیں دے رہی ہے جیلانی! ہم سخت گردش میں ہیں۔ میرا نام محمد افضل ولد محمد شبیر لکھوایا تھا تم نے یہاں؟"

"اور کیا کرتا میں، اپنا اصلی نام تو ہم کہیں بھی ظاہر نہیں کر سکتے۔"

"یہ اچھا کیا تھا تم نے مگر جب وہ محمدی بیگم 'افضل صاحب، افضل صاحب' کہتی اندر آئی تو میرا اُس سے زبردست قسم کا ڈائیلاگ ہو گیا۔ وہ میرے سامنے یہاں پلنگ کے قریب آ کھڑی اور بولی۔

"جناب آپ کا نام افضل ہی ہے نا! آپ بولتے کیوں نہیں۔"

میں تو بس اُسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ یار بہت پلی ہوئی لڑکی ہے وہ محمدی بیگم۔ میں نے اُس سے کہا۔

"جناب آپ کو دیکھ کر کوئی بولنے کے قابل کہاں رہتا ہے۔"

وہ ہنس دی، بولی۔ "آپ بہت شریر ہیں۔ محمد افضل نام ہے نا آپ کا؟"

"جی افضل کہاں، میں تو اسفل ہوں اسفل السافلین والا اسفل۔"

"اوہ، نو سر! آپ تو بہت اچھے ہیں اتنے ہینڈسم، اتنے اسمارٹ اور اتنے تگڑے۔ آپ کو یہ زخم کیسے لگا؟" وہ میری ران کھول کر پٹی دیکھنے لگی۔

"ایک گاڑی نے ٹکر مار دی تھی۔ میں اُچھل کر سڑک پر لگے لوہے کے جنگلے پر گرا اور ایک سلاخ میری ران میں گھس گئی۔ بس اتنا سا افسانہ ہے میرا۔"

"یہ اچھا افسانہ ہے۔ پکڑا نہیں آپ نے اُس کار والے کو؟"

اُس نے پٹی کی گرہ کھول دی۔

"اب دیکھیں ناجی آدمی کس کس کو پکڑ سکتا ہے، اُسے پکڑوں کہ آپ کو؟ آپ نے بھی تو مجھے زخمی کر دیا ہے۔" میں نے اُسے چھیڑا، وہ ایک دم تن کر سیدھی کھڑی ہو گئی اور اپنی تراشیدہ زلفوں کو جھٹکا دے کر بولی۔

"مجھے تو آپ بخش ہی دیں تو اچھا ہے جناب محمد افضل فضول صاحب! ذرا سیدھے ہو کر پٹی بندھوا لیں۔"

یار جیلانی! اس لڑکی پر مجھے پیار آنے لگا تھا۔ اب تو وہ چلی گئی، رات کو دس بجے پھر آئے گی۔ تو نے نہیں دیکھا اُسے، بہت

خوبصورت ہے وہ۔"

"تجھے ہرا ہرا سوجھ رہا ہے بچے! اور میری جان پر بنی ہے۔"

"لعنت بھیج۔ دو گھڑی تو کوئی خواب دیکھ لینے دیا کر مجھے۔"

"تو اگر افراتفری نہ مچاتا اور وہ ڈاکٹر عذرا بندے کی پتر ہوتی تو نہ وہ آسیہ کو بخاری کلینک بھیجتی اور نہ یہ مصیبت کھڑی ہوتی۔ اب میں اُسے کیسے رہا کروا سکوں گا۔"

"میں ذرا چلنے پھرنے کے قابل ہو جاؤں تو پھر یہ مشکل بھی حل کر لیں گے۔ اس مثال کو بہر حال تم باندھ کر رکھو ذرا فاقے دو اس کو۔ یہ پولیس والے بھوک پیاس برداشت نہیں کر سکتے۔ یہ ان کی سب سے بڑی کمزوری ہے اور تو کہتا ہے کہ وہ ماجدہ... اُسے پانی پلا رہی تھی۔"

"ہاں یار! وہ تو بہت ہمدردی دکھا رہی تھی اُس سے۔ ایک تو اُس عورت کی مجھے سمجھ نہیں آئی۔ اب وہ اپنے کسی نئے دوست نصیر کے ساتھ وہاں بیٹھی ہے۔ اُس نے مجھے پچاس ہزار روپے بھی دیے تھے۔ یہ دیکھ۔"

"اچھا؟ بہت اچھا کیا یہ اُس نے۔ ہمیں روپے کی اشد ضرورت تھی۔ اپنا خزانہ تو تُو نے دریا برد کر دیا تھا۔"

"میں کیا کر سکتا تھا یار۔ وہاں تو اپنی جان کے لالے پڑے تھے۔ تیرا پہیہ الگ پنکچر ہو رہا تھا۔"

"میں تو بس دو چار دن میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔ یہ ہاتھی کا زخم ہے۔ یہ تیری جیبیں بھی بھری لگتی ہیں۔ کیا ہے ان میں؟"

"یہ ایک لاکھ روپیہ ہے پیارے! میں نے عذرا سے دھروا لیا تھا میں نے کہا کہ بندے کی پتر! تُو نے جب کام پورا نہیں کیا، تو پوری رقم کیسے لے لے گی ہم سے۔"

"گڈ! آدمی تو بہت کام کا ہے جیلانی! یہ بہت اچھا کیا، وہ اس کی کسی بھی طرح حقدار نہیں تھی میرا خیال ہے پولیس اس تک ضرور جا پہنچے گی۔"

"ہو سکتا ہے مگر اُس نے چالاکی یہ کی کہ ڈھلوں صاحب کی ملازمہ کو اُس نے چلتا کر دیا۔ وہ اگر اسکے ساتھ ہوتی تو پولیس اُس سے سب کچھ معلوم کر لیتی۔"

"اب وہ آسیہ سے بھی تو پوچھ سکتے ہیں؟"

"نہیں یار! وہ بیچاری تو سارا عرصہ نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑی رہی جب تُو اُسے لے کر گیا تھا بخاری کلینک تو وہ ہوش میں تھی؟"

"نہیں، وہ بالکل بے ہوش تھی اور یہ بات اس کے حق میں جاتی تھی۔" آبی نے کہا۔

"اب پتہ نہیں اس بے چاری کا کیا حال ہوگا۔ میرا تو کلیجہ دکھنے لگا ہے۔"

"گھبرا نہ یار! حوصلہ ہارنے سے کیا ہوگا۔ جو اُس کی قسمت میں ہوگا وہ تو اُسے بھگتنا ہی ہوگا۔"

"ایک صرف میری ہی بہن رہ گئی ہے تقدیر کے تھپیڑے سہنے کو؟ کسی اور کو کیوں نہیں پکڑ لیتے؟" میں نے بہت ہی [illegible] لہجے میں کہا میرے دل میں پھر سے ٹیسیں اُٹھنے لگی تھیں۔

"زیادہ پریشان نہ ہو جیلانی! تو یہ معلوم کر وہ شنوری کون ہے۔ اُس سے بھی اس کے گھر پر مل۔ گھونٹ دے گلا اس کا بھی، خود ہی بتا دے گا کہ اصل قصہ کیا ہے۔" آبی نے بڑے غصے سے کہا۔

"ہاں میں آج ملتا ہوں اُس سے بھی۔ گھر کا پتہ معلوم ہے۔ میں آج ہی جاؤں گا اُس کے پاس۔ یہ گھی اب سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلے گا۔ دو چار کی موت آئی ہے میرے ہاتھوں۔" میرا خون پھر اُبلنے لگا تھا۔

دوپہر کا کھانا میں نے آبی کے ساتھ ہی کھایا۔ ہسپتال کے کیشیئر کے پاس میں نے آبی کے علاج کے لیے ایک ہزار روپیہ جمع کروا دیا۔ وارڈ کے خاکروب اور دوسرے خدمت گاروں کو بھی میں نے بیس بیس روپے تھما دیے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ آبی کا بہت زیادہ خیال رکھنے لگے۔ ایک ڈاکٹر تھا وہاں عبدالغنی بلغار۔ وہ شاعری بھی کرتا تھا۔ بلغار تخلص تھا وہ آبی کا علاج کر رہا تھا، اسے میں نے پانچ سو روپے الگ تھما دیے۔ وہ بیچارا خوش ہو گیا۔ سادہ لوح سا آدمی تھا۔ اُس نے بڑی فراخ دلی سے وعدہ کر لیا کہ وہ بس چار چھ دن میں ہی افضل کا زخم ٹھیک کر دے گا۔

ان سب کاموں سے فارغ ہو کر میں ڈھائی بجے سر پر نماز والی سفید کپڑے کی بنی ٹوپی پہن کر ہسپتال سے باہر نکل آیا۔ وہ ٹوپی ملازم آبی کو نماز پڑھنے کے لیے دے گیا تھا۔ اس کو پہن لینے کا یہ فائدہ ہوا کہ میں پہلی نظر میں جیلانی نظر نہیں آتا تھا۔ ویسے بھی میرے جاننے والے بس خاص خاص لوگ ہی تھے۔ مجھے تو صرف پولیس کی نظروں سے بچنے کی فکر لاحق رہتی تھی۔ اور میرا خیال تھا کہ عذرا کی اس بادامی رنگ کی گرم چادر اور اُس ٹوپی نے میری اس سلسلے میں خاصی مدد کی تھی مگر تھوڑی ہی دور جانے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ اُس ٹوپی نے مجھے اور زیادہ نمایاں کر دیا ہے۔ لوگ مجھے راہ میں یوں گھور کر دیکھتے تھے جیسے کوئی عجوبہ شے ہوں۔ میں نے گھبرا کر وہ ٹوپی اتاری اور نیفے میں اُڑس لی۔ کبھی کبھی آدمی اپنے آپ سے اتنا خوفزدہ ہو جاتا ہے کہ ہر آنکھ میں اپنا عکس بگڑتا نظر آتا ہے۔

میں اُس وقت چیرنگ کراس کے بس اسٹاپ کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ اچانک میری نظریں ایک چہرے پر جم کر رہ گئیں۔ فٹ پاتھ پر ایک شخص کھڑا تھا جسے میں نے ایک طویل مدت بعد دیکھا تھا۔ اس کا نام گل محمد تھا۔ وہ میرے ساتھ کسی زمانے میں پولیس کے محکمے میں کام کرتا رہا تھا۔ وہ بھی اس وقت سپاہی تھا میرے تھانے کا آدمی تھا وہ اور ہم نے بہت دنوں تک مغل پورہ تھانے میں

گزارا تھا۔ وہ اُس وقت وردی میں نہیں تھا۔ اُس نے مجھے دیکھا تو مسکرا کر میری طرف بڑھا۔ مجھے اُس نے پہچان لیا تھا۔ وہ بہت عمدہ قسم کا ولایتی سوٹ پہنے ہوئے تھا۔

"اوئے بھونڈو! تُو کدھر پھر رہا ہے میرے یار۔" یہ کہہ کر وہ مجھ سے لپٹ گیا جیسے وہ میری یاد میں صدیوں سے تڑپ رہا تھا۔

"اوئے گل تُو! یہ تیری صورت کیسے نظر آ گئی؟ میں تو سمجھا تھا تجھے کسی نے گولی مار دی ہوگی۔" اُس کے خلوص نے مجھے بہت زیادہ متاثر کیا۔ اس کا انداز اتنا والہانہ تھا کہ میں بھی کتنی ہی دیر اُسے باہوں میں لے کر گھماتا رہا۔

"یار میں نے وہ دھندا چھوڑ ہی دیا۔ لعنت بھیج دی تھی میں نے پولیس کی نوکری پر۔" اس کا جوش ذرا تھما تو وہ مجھ سے الگ ہو کر بولا "چل تجھے اچھی سی چائے پلاتا ہوں۔ آخری بار تو نے مجھے سموسے کھلائے تھے نا! یار اُدھر 'اندھوں کے موڑ پر' تم نے مجھے چھ سموسے کھلائے تھے اور پکوڑے بھی۔"

"ہاں مجھے یاد ہے گل جی! تم میرے بہت اچھے دوست تھے، پر پھر تم کبھی ملے ہی نہیں۔"

"بس یار میں اِدھر اُدھر بہت خوار ہوتا رہا۔ جب کچھ نہ بن سکا، تو میں نے کباڑیے کا کام شروع کر دیا۔ اُدھر لنڈے بازار میں دکان ہے میری۔ تیری دُعا سے روٹی مل رہی ہے عزت سے۔" اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا "چل کہیں بیٹھ کے باتیں کرتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ مجھے بیڈن روڈ پر ایک چائے خانے میں لے گھسا۔ وہ مجھے دیکھ کر بے حد خوش ہوا تھا۔ اُس کے ساتھ میں نے کچھ بڑے ہی اچھے دن گزارے تھے اور بھولی بسری یادیں دونوں کے ذہنوں میں پھر سے تازہ ہونے لگی تھیں۔

"اوئے کاکے! اِدھر آ میرے یار چائے اور پیسٹری کباب اور سموسے۔ جو کچھ ہے لے آ میرے یار کے لیے۔" بیرے کو آرڈر دینے کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہوا "تُو کہاں ہوتا ہے جیلانی بھائی آج کل؟ تیری پھر صورت ہی نظر نہیں آئی۔ تیری وہ نوکری چھوٹی کہ نہیں؟"

"وہ تو میں نے بہت دن پہلے چھوڑ دی تھی گل جی! اُس سے بنتا کیا تھا؟"

"یاد ہے تجھے ہم دونوں پھل فروٹ اور سگریٹ پان تو بس مفت مُنہ ہی کھایا پیا کرتے تھے کھوکھے اور ریڑھی والوں سے۔"

"ہاں تمہارے چالان کی دھمکی کام کر جاتی تھی گل جی! ویسے تھے تم بہت کانٹا آدمی۔"

"بس یار! اُس نوکری میں دھکے بہت کھانے پڑتے تھے۔ سر! سر! ہر وقت سر سر۔ اٹین شن سلوٹ۔ سر! بہت تیری کی... تو بتا آج کل تیرا دھندا کیا ہے؟"

"بس یار! میری کچھ زمینیں تھیں، پھر اُدھر انڈیا سے میرا کلیم منظور ہو کر آ گیا۔ میں نے اُدھر لیہ کی طرف چھ مربع زمین لے لی بس اُسی پر گزارا ہے آج کل۔" میں نے اپنے آپ کو چھپاتے ہوئے کہا۔

"یہ بہت اچھا کیا تو نے۔ کلیم جعلی تو نہیں تھا؟" وہ مسکرایا۔

"نہیں یار! ایسا بھی بے ایمان نہ سمجھ مجھے۔ آج دکان پر نہیں گیا تو؟"

"نہیں۔ میں نے چھوٹے بھائی کو وہاں بٹھایا ہے۔ آج میرا ذرا عیاشی کو دل چاہ رہا تھا۔ چلے گا میرے ساتھ؟"

"کہاں؟"

"وہیں بھئی! کچھ نئی لڑکیاں آئی ہیں وہاں اُس موجم دار کے پاس، تُو تو جانتا ہے اُسے۔ وہ ابھی تک اپنی جگہ پر جم کر بیٹھا ہے۔"

"اُس گندے بازار کی بات کرتا ہے تُو؟"

"وہاں نہیں رہتا ہے آج کل۔ اُس نے اُدھر کینال پارک کے پیچھے ایک مکان لے رکھا ہے بلکہ خرید لیا ہے۔ اُس نے وہیں سے وہ لال پیلی سانولی گوری مالٹے ایسی سیب ایسی انار ایسی بوتلیں سپلائی کرتا ہے خریداروں کو۔ پیسے ہیں میرے پاس۔ یہ دیکھ پانچ ہزار روپیہ لایا ہوں۔ چل ذرا موج میلا کر آئیں۔" گل محمد نے ایک ہی سانس میں سارے شہر کا نقشہ میرے سامنے کھول کر رکھ دیا۔

"نہیں گل جی! میں ایک اور ہی مشکل میں پھنسا ہوں اور اچھا ہوا تم مل گئے ہو۔ میرا ایک کام کر دو تو تمہاری بڑی مہربانی ہوگی۔"

"ہزار کام کہہ یار تُو! تیرے لیے تو میری جان حاضر ہے۔ موجم دار پر میں ابھی لعنت بھیجتا ہوں۔"

"دیکھ میری ایک بہن ہے آسیہ۔ وہ اُدھر بخاری کلینک میں زیر علاج تھی، راوی روڈ پر۔"

"پھر؟ پھر؟" یہ کہہ کر اُس نے دو سگریٹ سلگا کر ایک میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ اُس کے لبوں کی نمی سگریٹ کے فلٹر پر لگ گئی تھی۔ مجھے بڑی کراہت محسوس ہوئی۔ میں نے جان بوجھ کر سگریٹ نیچے گرا دیا۔ فرش پر پانی بکھرا ہوا تھا۔ سگریٹ اس میں گر کر ناقابل استعمال ہو گیا۔ میں نے سامنے دھرے پیکٹ میں سے ایک اور سگریٹ نکال کر سلگا لیا۔

"پھر؟ پھر کیا ہوا؟"

"بس کسی شبہے میں اُسے پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔ یہ کل کا واقعہ ہے اس کے ساتھ وہ ایک نرس ریٹا کو بھی لے گئے ہیں اور مجھے پتہ نہیں چل رہا کہ اُسے انہوں نے کہاں رکھا ہے۔ آسیہ کا گردے کا آپریشن ہوا ہے اور میں اس کے بارے میں سخت فکرمند ہوں۔"

"اچھا! یہ تو بہت بُرا ہوا مگر کس جرم میں پکڑا ہے اُس بیچاری کو؟"

"یہی تو مجھے علم نہیں ہے۔ تم یوں کرو کہ لوہاری تھانے اور پھر راوی روڈ کے تھانے سے کسی طرح معلوم کر دو کہ انہوں نے اسے کہاں رکھا ہے۔"

"پھر؟ پھر؟ کیا کرے گا تُو؟"

"پھر میں کسی نہ کسی طرح متعلقہ پولیس افسر کو کچھ دے دلا کر اُس

کی جان چھڑا لوں گا۔ تیرے ملنے سے مجھے ڈھارس ملی ہے۔"

"یہ تو ہے مگر تو خود کیوں نہیں جاتا ہے وہاں اُن کے پاس — وہ خود بتا دیں گے کہ آسیہ کہاں ہے۔"

"نہیں، میں خود چکر میں ہوں میرا خیال ہے کہ میری وجہ سے ہی انھوں نے آسیہ کو پکڑا ہے مجھ پر ایک قتل کا الزام ہے اور پولیس میری تلاش میں ہے۔ ایک آدمی اُدھر زمینوں پر میرے ہاتھ سے مارا گیا تھا۔"

"تو یہ قصہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ تیری وجہ سے ہی انھوں نے آسیہ کو پکڑا ہے مگر خیر، تو میرا جگری یار ہے جیلانی! میں تیرے لیے وہاں ضرور جاؤں گا۔ چل لعنت بھیج چائے پر میں ابھی اُدھر جاتا ہوں۔"

"دیکھ اُدھر ایک ڈی ایس پی ہے خفیہ پولیس کا زباد شنواری۔ کہتے ہیں کہ اُس نے ہی کہیں اُسے چھپا رکھا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اُس بیچاری پر تشدد کر رہے ہوں گے۔"

"تو فکر ہی نہ کر یار۔ کتنی ایک رشوت دے سکے گا تو؟ تاکہ میں اگر کسی سے بات کروں تو سارا معاملہ طے ہی کر کے واپس آؤں۔"

"جتنی وہ مانگیں۔ دس بیس تیس پچاس ہزار تک میں اُس کی رہائی کے پیسے دے دوں گا۔"

"شاباش بھئی! بڑا مال ہے تیرے پاس۔ لے وہ چائے لے ہی آیا۔ اسے پی لے۔ پھر میں تیرے ساتھ چلتا ہوں۔"

"میں تیرے ساتھ نہیں جا سکتا۔ ان کے سامنے میں نہیں جانا چاہتا۔"

"ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے۔ بس تو اُدھر چل کر میری دکان پر بیٹھ۔ میں بس جیسے ہی کوئی خبر ملی تیرے پاس پہنچ جاؤں گا۔" اتنے میں بیرے نے میز پر چائے رکھ دی۔ وہ ڈھیر ساری چیزیں ساتھ لے آیا تھا۔

"اتنی ساری ماکولات لے آیا ہے یہ۔ یاد ہے نا تجھے وہ تھانیدار انیس محمد یہی کہا کرتا تھا۔"

جس کا وہ ذکر کر رہا تھا، وہ بہت ہی زندہ دل تھانیدار تھا، وہ انیس محمد۔ اور پیٹو ایسا کہ چھ چھ چرغے وہ ایک ہی 'اجلاس' میں ہڑپ کر جاتا تھا۔

"وہ بیچارا مر گیا ہے، اُسے کسی ڈاکو نے گولی مار دی تھی۔ بڑا ہنس مکھ آدمی تھا یار وہ۔" یہ کہہ کر گل محمد نے چائے بنا کر میرے سامنے رکھ دی۔

چائے خانے سے نکل کر اس نے مجھے ٹیکسی میں ڈالا اور اسی وقت وہ مجھے اپنی دکان پر لے گیا۔ لنڈے بازار کے پہلو میں برانڈرتھ روڈ کی طرف آنے والی ایک سڑک پر اس کی دُکان خاصی بڑی نظر آتی تھی — وہ سریا بھی بیچتا تھا اور لوہے کا پرانا سامان بھی۔ کاؤنٹر اس نے بہت عمدہ بنا رکھا تھا۔ اور وہاں ٹیلی فون بھی لگا تھا۔ اپنے بھائی سے بولا۔

"اوئے چوہدری امول احمد۔ یہ میرے دوست ہیں جیلانی صاحب! یہ ادھر بیٹھیں گے، انھیں باپ جیسی عزت دینا۔ میں ایک کام کر کے ابھی واپس آ رہا ہوں۔ لے بھئی تو اُدھر بیٹھ میں دیکھتا ہوں وہ کیا کہتے ہیں۔"

"اُن کو میرے بارے میں کچھ نہ بتانا۔ ورنہ میں مارا جاؤں گا۔"

"تو فکر ہی نہ کر، میں کہہ دُوں گا کہ یہ اُس کا ماموں زاد بھائی ہوں 'فردوس خان'۔"

"ہاں۔ بس یہ ٹھیک ہے۔ جا تیرا رب راکھا۔"

یہ کہہ کر میں امول احمد کے قریب پڑی کرسی پر جا بیٹھا۔ وہ نظروں سے اوجھل ہوا تو امول احمد بولا۔

"آپ کے لیے چائے منگواؤں؟"

"نہیں بھائی چائے تو ہم ابھی پی کر آئے ہیں، تیری مہربانی۔" یہ کہہ کر میں اس کے سامنے رکھے اخبار کا مطالعہ کرنے لگا۔ وہ کوئی بیس سال کا بڑا ہی کم گو لڑکا تھا وہ امول احمد۔ چائے سے میرے انکار پر اُس نے چُپ سادھ لی اور پھر کاؤنٹر سے اُٹھ کر وہ گاہکوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

میرا ذہن بھٹی کی طرح سُلگ رہا تھا۔ اَن گنت سوال تھے جن کا کوئی جواب نہیں ملتا تھا۔ میرا دل کہتا تھا کہ انھوں نے آسیہ پر بے پناہ تشدد کیا ہوگا۔ آسیہ کے ساتھ ریٹا بھی پس گئی ہوگی۔ وہ ان سے ہر طرح میرے بارے میں پوچھتے ہوں گے مگر ان دونوں میں سے کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں۔ مجھے یہ ڈر تھا کہ آسیہ کہیں سب کچھ ہی اُن کے سامنے نہ اُگل دے۔ اسے اگر ڈاکٹر عذرا کے کلینک کے بارے میں کچھ معلوم تھا تو وہ بھی پولیس اس سے اُگلوا لے گی۔ یہ امکان اپنی جگہ موجود تھا کہ چونکہ عذرا کے کلینک میں قیام کے دوران وہ زیادہ عرصے بے ہوش ہی رہی تھی اس لیے وہ اس کے بارے میں کسی کو کچھ نہ کہہ سکے گی لیکن اُس نے ڈھلوں صاحب کے بارے میں پولیس کو کچھ بتا دیا تو پھر کیا ہوگا۔ ایک معزز آدمی کی پگڑی خواہ مخواہ اُچھل جائے گی۔ ڈھلوں صاحب کو میں کسی بھی طرح کسی معاملے میں ملوث نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ میرے محسن تھے اور انھیں میں کوئی دکھ نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ لوگ ڈھلوں صاحب تک پہنچے تو بلاشبہ وہاں سے وہ تک واقعات کی ساری کڑیاں ملا لیں گے۔ عین ممکن ہے کہ آہستہ آہستہ اگر معاملہ طول کھینچ گیا تو وہ پھر بالکل ہی خاموش ہو جائیں اور آسیہ کو ایک بار پھر جیل میں ڈال کر مطمئن ہو جائیں مگر یہ میری سوچ کا غلط بھی تو ہو سکتا ہے اگر وہ کسی طرح عذرا کو پکڑنے میں کامیاب ہو گئے تو وہ عورت عرفان کے بارے میں بھی سب کچھ بتا دے گی اور ایک بار پولیس میری تلاش میں شہر کا کونا کونا چھان مارے گی مگر ان تمام دم کا اثر تو آسیہ پر پڑے گا وہ تو اس کو نہیں بخشیں گے۔ میں نے چاہا وہاں سے اُٹھ کر سیدھا پولیس اسٹیشن جا پہنچوں اور اُن کے سامنے ہاتھ اُٹھا کر کہہ دوں کہ لو میں آ گیا ہوں میں غلام جیلانی ہوں مجھے پکڑ لو مگر جتنی جلدی یہ خیال میرے ذہن میں اُبھرا، اتنی ہی تیزی سے غائب ہو گیا — میں اپنا سر کندھوں پر اس لیے نہیں لیے پھرتا تھا کہ کوئی

یوں اتنی آسانی سے اُتار کر الگ پھینک دے مگر جس مشکل میں میں اور آسیہ پھنس گئے تھے اس کا کوئی حل تو مجھے ملنا ہی چاہیے تھا۔

شام ہو گئی، ساڑھے چھ بج گئے۔ دکانیں بند ہونے لگیں۔ مگر گل محمد واپس نہیں آیا۔ وہ کسی لمبے چکر ہی میں پڑ گیا تھا۔ اس کی راہ تکتے تکتے میری آنکھیں پتھرانے لگیں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں پھنس کر بیٹھ گیا۔ امول احمد بھی پریشان ہونے لگا سات بجے تک بیشتر دکانیں بند ہو گئیں مگر وہ نہیں آیا۔ امول احمد بولا۔

"بھائی جان کو آپ نے کسی کام سے بھیجا ہے؟"

"جی ہاں! میرا ہی ایک کام تھا مگر گل کو اتنی دیر نہیں لگنی چاہیے تھی۔"

امول نے پھر چُپ سادھ لی۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ بغیر کسی مطلب کے دن میں پانچ سات بار ہی منہ کھولتا ہوگا۔ گاہکوں سے البتہ خاصی مغز ماری کر لیتا تھا۔ اس نے دکان کے باہر رکھا مال اندر ڈلوانا شروع کر دیا۔ اب وہ بھی گھر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں۔ کدھر جاؤں۔ میں ڈرا کہ کہیں میں نے گل محمد پر اعتماد کر کے غلطی تو نہیں کی۔ ایسا دھوکے باز قسم کا آدمی کسی وقت بھی دھوکا دے سکتا ہے۔ اُس کے کردار کی تو کوئی بھی کل سیدھی نہیں تھی۔ ایسے شرابی کبابی اور زانی آدمی پر کوئی کیسے بھروسہ کر سکتا ہے۔ گل محمد میں خدا جانے کتنی تبدیلیاں پیدا ہو چکی ہیں۔ جب میں اس کے ساتھ تھا تو وہ اپنے وعدے کا پابند تھا اور کیا معلوم کہ وہ کیا سے کیا بن چکا ہے اس کا مجھے پہلے اندازہ کر لینا چاہیے تھا۔ خواہ مخواہ میں نے اپنی جان اپنے بھید کی پوٹلی میں باندھ کر اس کی مٹھی میں دے دی۔ وہ کہیں مجھے بے موت ہی نہ مروا دے۔ وہ پولیس کا سابقہ ملازم گل محمد۔

یہ خدشے میرے ذہن میں جڑ پکڑنے لگے تو میں کرسی سے اُٹھ کر دکان سے باہر نکل آیا۔ میرا خیال تھا کہ میں امول احمد سے خدا حافظ کہہ کر نکل چلوں۔ ابھی میں یہ اندازہ باندھ ہی رہا تھا کہ ایک ٹیکسی دکان کے سامنے آ ٹھہری۔ اُس میں گل محمد سوار تھا۔ کلے میں اس نے پان دبا رکھا تھا اور سگریٹ وہ بڑے ہی بازاری انداز سے پھونک رہا تھا۔ وہ ٹیکسی سے اُترتے ہی بولا۔

"یار جی معاف کر دینا مجھے بڑی دیر لگ گئی وہ کام ہی ایسا تھا۔" یہ کہہ کر اُس نے ٹیکسی ڈرائیور کو فارغ کیا اور بولا۔

"برادرِ خورد امول احمد، تو چل بچّے اب گھر چلا جا۔ بہت تھک گیا ہوگا۔ میں دُکان بند کروا لیتا ہوں۔ جا میرا ویر، اتنا سا منہ نکل آیا ہے تیرا۔ یہ لے بیس روپے اپنے خرچ مرچ کے لیے رکھ لے۔" یہ کہہ کر اُس نے بیس روپے امول احمد کو تھما دیے۔

وہ بولا "بھائی جان! بکری کی رقم اُدھر رکھی ہے، دو ہزار تین سو پچاس روپے ہیں وہ سنبھال لیں۔"

"ٹھیک ہے یار۔ میں دیکھ لیتا ہوں۔" یہ کہہ کر گل محمد نے کاؤنٹر کے اندر رکھے گلّے میں سے رقم نکال کر گنی اور اُسے جیب میں رکھ کر بولا۔

"جا تو اب، اسی ٹیکسی میں بیٹھ جا۔ تجھے بھوک لگی ہوگی۔ میں بھی بس ابھی آ رہا ہوں۔"

امول احمد وہاں سے ٹلا تو گل محمد نے کرسی گھسیٹ کر مجھے اپنے پاس بٹھا لیا، بولا۔ "یار شنواری نام کا کوئی پولیس افسر اُدھر نہیں ہے۔"

"اچھا! مگر مجھے تو کسی نے یہی بتایا تھا کہ وہی آسیہ کو گرفتار کر کے لے گیا ہے۔"

"تیری اطلاع غلط تھی مگر یار جی! تو تو بہت نامی گرامی آدمی بن چکا ہے خواہ مخواہ ہی میرے سامنے جاگیردار کا سالا بن رہا تھا تو۔ تیرے دھندے کی خبر مجھے مل گئی ہے۔"

"دفع کر یار! میری بات چھوڑ! یہ بتا آسیہ کا کچھ پتہ چلا کہ نہیں۔"

"اُس کا تو کچھ پتہ نہیں چل رہا ہے۔ انھوں نے اسے بہرحال گرفتار ضرور کیا ہے مگر بہانہ بنا کر کوئی لیڈی پولیس انسپکٹر سلمیٰ بخاری کلینک میں موجود تھی۔ اُس نے آسیہ کو پہچان کر اعلیٰ حکام کو اطلاع دے دی۔ انھوں نے یوں کیا کہ تمھاری گرفتاری کے لیے وہاں پولیس متعین کر دی۔ اُن سے تمھارے مقابلے کی ساری کہانی میں سُن آیا ہوں جب تم ہاتھ نہ آئے تو رات کو دس گیارہ بجے تین آدمیوں کو انھوں نے بڑی خاموشی سے ہسپتال بھیجا۔ اُن میں سے ایک نے خود کو آسیہ کا بھائی ظاہر کیا اور کہا کہ وہ آسیہ کو کسی اور ہسپتال میں داخل کروائیں گے کیونکہ وہ مطمئن نہیں ہیں۔ ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر نے ڈاکٹر بخاری سے فون پر اجازت لیکر آسیہ کو کاغذوں پر ڈسچارج ظاہر کر دیا۔ اب وہ پولیس والے گرفتاری کے وارنٹ لے کر چپکے سے آسیہ کے کمرے میں جا گھسے۔ وہ بیچاری تو پہلے ہی خوفزدہ تھی، چوں بھی نہ کر سکی۔ وہ اُسے اسٹریچر پر ڈال کر باہر لائے اور پھر ایمبولینس میں بٹھا کر وہاں سے لے بھاگے۔ ایک چالاکی انھوں نے یہ کی کہ ریٹا نامی نرس کو بھی وہ اس کے کمرے سے گرفتار کر کے لے گئے۔ اُس پر انھیں شک تھا کہ وہ بھی شاید تم سے ملی ہوئی ہے۔ اتنا تو مجھے سپاہیوں نے بتایا ہے کہ وہ دونوں راوی روڈ کے تھانے میں دیکھی گئی تھیں۔ ایمبولینس کے اندر مگر پھر وہ ایمبولینس فوراً ہی وہاں سے کسی نامعلوم سمت کی طرف روانہ ہو گئی۔ میں نے بہت دوڑ دھوپ کی ہے مگر جن لوگوں سے میں مل سکا ہوں انھیں بالکل خبر نہیں ہے کہ ان دونوں کو اُن لوگوں نے کہاں رکھا ہے۔"

"یہ تو بہت بُرا ہوا ہے گل جی! پتہ نہیں اس بیچاری کا کیا حال ہوا ہوگا۔"

"ویسے میں ایک بات تمھیں بتا دوں اُستاد تیرا حلیہ بہت ہی بدل چکا ہے۔ جب ہی وہ تجھے پہچان نہیں سکے ہیں ورنہ وہ تجھے تلاش کرنے کے لیے سرتوڑ کوشش کر رہے ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔"

"تیری کہانی سن کر تو میں حیران رہ گیا ہوں جیلانی تو نے تو کمال کر دیا ہے۔ میری مان، تو یہ شہر چھوڑ دے۔ تو کسی بھی وقت اُن کے شکنجے میں پھنس سکتا ہے۔"

"اللہ مالک ہے یار! مگر میں کیا کروں۔ آسیہ کا پتہ نہیں کیا حال ہوگا۔"

"رات جو تیرا اُدھر دریا پر مقابلہ ہوا ہے نا، اُس پر وہ بہت زیادہ طیش میں ہیں۔ اخبار میں بھی وہ کوئی خبر چھپنے نہیں دیتے کیونکہ یہ اُن کی بے عزتی اور بدنامی کی بات ہے۔"

"میں کیا کروں گل جی! میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا ہے۔"

"ہاں ایک اور بات سنو۔ وہ ایک ڈی ایس پی ہے ملتان خان — اُس کو کسی بھتے نے آج گھر سے اغوا کر لیا۔"

"کیا؟ اسے کس نے اغوا کر لیا ہے۔ کوئی لڑکی ہے وہ۔"

"نہیں یار! کوئی تیرا ہی بھائی بند ہوگا۔ اس کا ملازم کرم دین اُدھر تھانے میں بند ہے۔ پولیس والے اُسی پر شک کر رہے ہیں اور وہ بے چارا رو رہا ہے کہ میں بے گناہ ہوں۔"

یہ کہہ کر اُس نے مجھے وہ کہانی سُنائی جو اس کرم دین نے لوگوں کو بتائی تھی۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ میرے صاحب کمرے میں بے ہوش ہو گئے تو وہ اُن کے مہمان کے کہنے پر ڈاکٹر کو بلانے گیا مگر جب واپس آیا تو خان صاحب بھی غائب تھے اور مہمان صاحب بھی۔ گل محمد ہنس رہا تھا، بولا۔

"یار پولیس والوں کی مونچھیں نیچی ہو گئیں۔ اُوپر سے نیچے تک شور مچا ہے ٹیلیفون پر ٹیلیفون کھڑک رہے ہیں۔ وہاں تو عذاب آیا ہوا ہے مگر وہ خان صاحب کا کوئی اتا پتہ ہی نہیں مل رہا۔"

"تیرا کیا خیال ہے انھوں نے آسیہ کو کہاں رکھا ہوگا؟"

"میرا اندازہ یہ ہے کہ وہ کسی ہسپتال میں ہرگز نہیں ہوگی۔ بہرحال میں کل پھر کوشش کروں گا۔ تم کل شام کو چھ بجے مجھ سے مل لو شاید میں کوئی سراغ لگا سکوں۔ اور دیکھ جیلانی! تیرے بارے میں مجھے ساری باتیں معلوم ہو گئی ہیں کہ تو کس طرح جیل سے بھاگا اور کس طرح اب اپنی بہن کے لیے مارا مارا پھر رہا ہے مگر یقین رکھ میں تیرا دوست ہوں اور تیرے بارے میں اگر میں کسی کو کچھ بتاؤں تو۔۔۔۔" یہ کہہ کر اس نے خود کو بڑی ہی غلیظ سی قسم دے دی۔

"نہیں گل جی! مجھے تم پر پورا اعتماد ہے۔ مجھے معلوم ہے تم یار مار نہیں ہو۔"

"اچھا یہ بتا کہ تیرا کوئی ساتھی داؤد بھی ہے۔ پولیس نے ایک آدمی کو پکڑ رکھا ہے اُس کا نام کھاڈو ہے وہ کہتا ہے کہ اُدھر دریا کے پار اُس کی جھونپڑی میں اُس وقت داؤد ٹھہرا ہوا تھا جب تم وہاں پہنچے تمہارے ساتھ کوئی اور آدمی بھی تھا جو سخت زخمی تھا۔"

"ہاں، وہ میرا دوست تھا اور اب وہ گوجرانوالہ کے ایک ہسپتال میں ہے۔ اور جس جوان نے ہمیں بچایا اور پولیس پر گولی چلائی اس کا نام داؤد ہی ہے۔ یہ اس کی مہربانی تھی کہ ہم زندہ بچ گئے۔"

"وہ کہاں ہے اب؟"

"اس کا مجھے کوئی پتہ نہیں۔ میں تو اُسے جانتا بھی نہیں تو میرا دوست بھی اُس سے ناواقف تھا۔ اس بچارے نے تو بس خدا ہی ہماری مدد کر دی تھی۔ ویسے تھا وہ بھی اپنی ہی برادری کا آدمی۔"

"میں نے سُنا ہے کہ پولیس نے اس داؤد کے باپ اور شاہدرہ تھانے میں بند کر رکھا ہے۔ مگر وہ بھی نہیں جانتے کہ داؤد"

"چل لعنت بھیج اس قصّے پر، اب میں چلا۔ کل شام کو آؤں گا۔ کوئی اور بات معلوم ہو تو مجھے بتا دینا۔"

"اچھا بھئی خدا حافظ۔ تم سے مل کر جتنی خوشی ہوئی تھی وہ کہانی سُن کر ملیامیٹ ہو گئی۔ بہرحال میں اپنی سی پوری کوشش کروں اپنا خیال رکھو وہ بہت تپے ہوئے ہیں۔" یہ کہہ کر اُس نے میرا کندھا اور میں اُسی وقت اُس سے رخصت ہو کر آگے نکل گیا۔

میری یہ کوشش بھی ناکام ہو گئی تھی۔

میرا ایک اور تیر ضائع ہو گیا تھا۔

غصّہ مجھے اُس ملتان پر آ رہا تھا۔ اس نے مجھے ٹالنے کے لیے بولا تھا اور میری سادگی کی انتہا یہ تھی کہ میں نے اس پر اعتبار کر لیا تھا۔ میرا حال شب دیجور میں بھٹکے ہوئے پرندے کا سا تھا۔ مجھے کوئی سجھائی نہیں دیتا تھا۔ میں ایک بار پھر غضبناک ہو رہا تھا۔ لنڈے سے نکل کر میں ٹیکسی میں بیٹھا اور ملتان روڈ پر جا پہنچا مگر اچانک مجھے محسوس ہوا کہ مجھے ماجدہ کے گھر کا راستہ یاد نہیں رہا۔ دراصل وہ کالونی ایسی ہی تھی کہ ساری گلیاں سارے چوراہے ایک جیسے نظر آتے تھے۔ کو چند منٹ تک اِدھر اُدھر بھٹکنے کے بعد میں نے ڈرائیور کو فارغ اور پیدل ماجدہ کے گھر کا راستہ تلاش کرنے لگا۔ کتنی ہی دیر تک اِدھر اُدھر بھٹکتا رہا۔ ایک گلی کے موڑ پر دو آدمی گپ شپ میں مصروف تھے۔ روشنی کا اس ساری کالونی میں کوئی انتظام نہ تھا۔ ساری ہی گلیاں میں ڈوبی تھیں۔ اُن آدمیوں کے پاس پہنچ کر میں رُک گیا۔ مجھے پوچھے بغیر ماجدہ کا گھر نہیں مل سکتا تھا۔

"جناب آپ کو زحمت ہوگی، میں نصیر صاحب کے گھر جانا چاہتا ہوں وہ جو فلموں میں کام کرتے ہیں۔"

"نصیر گنجے کے گھر جائیں گے آپ؟ وہ جو فلموں میں مار پیٹ کا"

"جی ہاں ——— انہی کے گھر۔"

"مگر حضرت وہ لوگ تو آج دوپہر کو اپنا مکان خالی کر گئے۔"

"خالی کر گئے؟ یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ! مجھے تو انھوں ملنے کا وقت دیا تھا۔" میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

"اگلی گلی میں رہتے تھے وہ۔ مگر اب تو بھائی جی اُدھر کا پہرہ ہے۔ وہ دو بجے مکان خالی کر کے نکلے تو کوئی تین بجے آ دھمکی۔ وہ اُن دونوں کو گرفتار کرنا چاہتے تھے۔"

"تو کیا وہاں پولیس نے قبضہ جما رکھا ہے مکان پر؟"

"جی ہاں، سُنا ہے اُدھر وہ دیا قوزہ بیچتی تھی وہ نصیر کی بیوی۔" ایک آدمی نے کہا۔

"ارے بیوی کہاں تھی وہ اس کی۔ ایسے ہی ڈھونگ رچا رکھا تھا انھوں نے۔ دونوں بدمعاش تھے۔" دوسرے نے کہا۔

"دیا قوزہ کیا ہوتا ہے جناب میں سمجھا نہیں۔"

وہ آدمی ہنسنے لگا، بولا۔ "یہ بھی ہوتا ہے جناب! شربتِ وصل پیا ہے کبھی آپ نے! وہ گنجا اسے دیا قوزہ کہا کرتا ہے۔ بڑی گندی شے ہے وہ۔"

اس آدمی کی باتوں نے مجھے حیران کر دیا۔ میں اُن کو خدا حافظ کہہ کر تیزی سے دُوسری طرف نکلا اور پھر اندھا دھند آگے ہی بڑھتا چلا گیا۔ وہ ماجدہ مجھے پھر دھوکہ دے گئی تھی۔ اس نے ملتان کو رہا کر کے اسی وقت مکان سے سامان اُٹھا لیا تھا اور اب وہ کسی اور طرف نکل گئی تھی۔ اُس نے ملتان کو بھی ممنون کر لیا تھا اور آسیہ کے بعد بھی وہ مجھے بچا کر لے گئی تھی۔ اُس پر اعتبار کر کے میں نے اپنی زندگی کی بدترین غلطی کی تھی۔ میں خلوص کا بندہ یونہی ہر جگہ اپنی محبت کا چراغ جلا کر بیٹھ جاتا تھا۔ ماجدہ نے میرے منہ پر ایسی چپت ماری تھی کہ میں اُسے تا دیر سہلاتا ہی رہ گیا تھا۔ اگر میں چند قدم اس رات اور آگے بڑھ جاتا اور وہ دو آدمی مجھے وہاں نہ مل جاتے تو میں اسی رات اُن کے جال میں پھنس گیا تھا۔ وہ میرے ہی انتظار میں وہاں کھڑے تھے۔ ملتان خان کو جب ماجدہ نے رہا کیا تو خدا ہی جانتا ہے اُس نے اس سے کیا وعدہ لیا ہوگا۔ اُن کے درمیان کچھ نہ کچھ تو ضرور ہی طے ہوا ہوگا۔ ماجدہ نے عین ممکن ہے ملتان خان کے کہنے پر ہی مکان چھوڑ دیا ہو۔ سارے ہی امکانات موجود تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ میں اس مکان پر ضرور واپس آؤں گا۔ ابھی مجھے ملتان سے حقیقت اُگلوانی تھی۔ مگر۔۔۔ مگر اس ماجدہ نے میری ساری ہی دیپ مالا پھونک مار کر بجھا دی تھی۔ میں تقدیر کی دو دستی کا شکار ہو گیا تھا۔ میرے سارے ہی منصوبے خاک میں ملتے جا رہے تھے اور مجھے یوں لگتا تھا جیسے پولیس میرے ارد گرد اپنا گھیرا تنگ کرتی جا رہی ہے۔ میں ہانکے کی زد میں آئے ہوئے شکار ایسی حالت میں پھر رہا تھا۔ میرے لیے کوئی بھی راستہ کھلا نہیں رہ گیا تھا۔ میرا دم زندگی سُن سا گیا تھا۔ ہر شے دِگرگوں ہوتی نظر آ رہی تھی۔ سب سے زیادہ سوہانِ روح بات یہ تھی کہ آسیہ اُن کی گرفت میں تھی۔ اور وہ اتنی بیمار تھی کہ ذرا سی اونچی آواز بھی اس کا دم برابر کرنے کے لیے کافی تھی اور وہ جن لوگوں کے ہاتھ میں تھی وہ بہت بپھرے ہوئے تھے۔ اس کے خلاف نہیں بلکہ وہ اس کے بھائی جیلانی کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔

دُکھوں کے دَل بادل میرے ارد گرد ڈیرہ جمائے بیٹھے تھے۔ میں بستی سے نکل کر بڑی سڑک پر پہنچا اور ٹیکسی میں بیٹھ کر گنگا رام ہسپتال جا پہنچا۔ میرے دل میں اَن گنت خدشے سر اُٹھا رہے تھے۔ اگر میں داغی نہ ہوتا، میرا اپنا دامن صاف ہوتا تو میں عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاتا مگر میں تو خود پولیس سے منہ چھپاتا پھرتا تھا۔ میں نے چاہا کہ کسی وکیل کے ذریعے پولیس کے خلاف عدالت سے رجوع کروں مگر اس میں بھی مجھے سو خطرے نظر آتے تھے۔ کوئی بھی تو راستہ کھلا نہیں رہ گیا تھا میرے لیے۔ میں کس طرح کس منہ سے کس کے ذریعے اور کس برتے پر وکیل کے ذریعے عدالت سے استدعا کرتا کہ وہ آسیہ کی برآمدگی کے لیے چارہ جوئی کرے۔ پولیس والے تو آسیہ کو اب میرے خلاف دشمنی ہنڈی کے طور پر استعمال کرنا چاہتے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ میں اب بھڑک کر اُن کے سامنے آ جاؤں گا اور وہ فوراً ہی میری گردن ناپ لیں گے۔ اُن کی صفوں میں میں نے اپنا ایک اور خونخوار دشمن پیدا کر لیا تھا — اور وہ تھا ملتان خان۔ اُسے ماجدہ نے بتا دیا ہوگا کہ جو آدمی اُسے اغوا کر کے اس کے مکان پر لے گیا تھا، اس کا نام غلام جیلانی ہے۔ اُس کے غم و غصے اور حیرت کا تو اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ تو کسی قیمت پر بھی مجھے چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوگا۔

میں انہی خیالات میں گم تیز تیز چلتا ہوا آبی کے کمرے کے سامنے جا پہنچا۔ اُس وقت رات کے ساڑھے نو بج رہے تھے۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ آبی کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ یہ بڑی غیر معمولی بات تھی۔ کیونکہ آبی خود اُٹھ کر دروازے تک نہیں آ سکتا تھا۔ میں نے بڑی آہستگی سے دستک دی تو اندر سے مجھے آہنی پلنگ کا پایہ فرش پر گھسٹتا سنائی دیا۔

"کون ہے؟" یہ آبی کی آواز تھی۔

"بھئی یہ دروازہ کیوں بند کر رکھا ہے۔"

چند ہی ثانیوں کے بعد کسی نے دروازے کی چٹخنی نیچے گرا دی۔ میں تیزی سے دونوں پٹ کھول کر اندر گھسا تو دیکھا کہ آبی کمبل تان کر لیٹا ہوا تھا۔ میں کواڑ بند کرنے لگا تو ایک تختے کے پیچھے مجھے ایک اُونچی لمبی سرو ایسی لڑکی کھڑی نظر آئی۔ اُس نے پوری آستین کا تنگ سویٹر پہن رکھا تھا۔ میں سمجھ گیا۔۔۔۔ وہ محمدی بیگم تھی۔ اسی کا ذکر آبی نے کیا تھا۔ وہ میری غیر حاضری میں آبی کی تیمارداری کرتی رہی تھی۔

"بھئی اِن سے تعارف تو کراؤ۔ پتہ تو چلے یہ ہیں کون۔"

"بُوجھ تو چکے ہو۔ آ جائیں اِدھر میم بیگم صاحبہ! یہ خوک لباڑیا میرا یار ہے۔ جگری یار۔ اس سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"اچھا تو یہ محمدی بیگم ہیں۔ اب تمہارا زخم جلدی مندمل ہو جائے گا بچے۔ مرہم تجھے اچھی مل گئی ہے۔" میں نے دوسرے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ وہ ابھی تک دروازے کے پاس کھڑی تھی سہمی ہوئی سمٹی ہوئی۔ جیسے وہ زمین میں جذب ہو جانے کو بے قرار ہو۔

”لعنت ہے تیری صورت پر ہاشم خان! خواہ مخواہ ڈرا دیا ہے تُو نے انھیں۔ اِدھر آ جائیں جناب!“

وہ اپنی بڑی بڑی سرمہ سا آنکھیں جھپکاتی ہوئی پیچھے ہٹی اور سر جھکا کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

”یہ آپ کی بڑی تعریف کر رہا تھا، یہ محمد شریف زخمی۔ سمجھتی ہیں نا آپ! زخمی اس کا تخلص ہے۔ آپ کا بھی کوئی تخلص ضرور ہوگا۔“

”ہاں اِن کا تخلص غریب پرور ہے۔ ابے تیرے خاندان میں تو پیدا ہی یا بھانڈ ہوتے یا شاعر۔ مگر ہر ایک کو اپنے جیسا تو نہ سمجھ۔ یہ میرے دوست ہیں ہاشم خان اور یہ واقعی محمدی بیگم ہیں۔ اِنہی کا ذکر میں تم سے کر رہا تھا۔“ آبی نے کہا۔ وہ آہستہ آہستہ سنجیدہ ہو گیا۔

”آپ سے مل کر مجھے بڑی خوشی ہوئی جناب! ان کے زخم کا کیا حال ہے؟“

”اچھا ہے۔ بس تین چار دن میں ہیل اپ ہو جائے گا۔“ وہ بالآخر بول ہی پڑی مگر یوں جیسے کسی نے کوئی مدھر تان چھیڑ دی ہو۔ بڑی نغمگی تھی اس کی آواز میں۔ اور گوہر کانِ حیا بنی بیٹھی تھی۔ مجھے افسوس ہوا کہ میں نے خواہ مخواہ اتنے بے تکلف لہجے میں اس سے بات کر کے اُسے پریشان کر دیا تھا۔ وہ بہت ہی سلجھی ہوئی کم گو اور آہستہ رُو لڑکی نظر آتی تھی۔ اپنی زیادتی کا مجھے احساس ہوا تو میں نے کہا۔

”مجھے افسوس ہے سسٹر کہ میں نے خواہ مخواہ ایسے بے تکلف لہجے میں آپ سے بات کی۔ اب آپ چاہیں تو جا سکتی ہیں۔“

وہ ایک دم اُٹھی اور لڑکھڑاتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ مگر وہ ناراض نہیں تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک موہوم سی مسکراہٹ نے مجھے مطمئن کر دیا تھا۔

”یہ تجھ پر کیسے مہربان ہو گئی آبی! یہ تو عرق النسا قسم کی چیز نظر آتی ہے مجھے! ایسی سنجیدہ طبع اور چپ چاپ لڑکیاں چمٹ جائیں، تو جان نہیں چھوڑا کرتی ہیں۔“

”مجھے معلوم ہے اور میں اپنی جان چھڑانا بھی نہیں چاہتا، مگر یار تُو نے بڑی زیادتی کی۔ میری جیب میں ایک بھی پیسہ نہیں چھوڑا تُو نے اور میں اُسے کچھ دینا چاہتا تھا۔“

”پیسے مانگتی تھی وہ محبت کے؟“

”ابے نہیں — یہ بات نہیں ہے۔ میں بس ویسے ہی ذرا رُعب ڈالنا چاہتا تھا اس پر۔ مجھے یہ لڑکی پسند آ گئی ہے۔“

میں نے ماجدہ کے دیے ہوئے پچاس ہزار اس کے سامنے ڈھیر کر دیے۔ ”یہ لو بھاجی! مجھے کیا پتہ تھا تمھاری ہانڈی اتنی ہی اُبل جائے گی، کہو تو میں اُسے سونے کا ہار بنوا دوں۔“

”یہ تمھارے سوچنے کی باتیں نہیں ہیں۔ شریف لوگ دوسروں کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہیں کیا کرتے۔ اب یہ بتا کہ تُو کیوں سے خوار ہوتا آ رہا ہے؟“

”کچھ نہ پوچھ یار! وہ ماجدہ ایک دفعہ پھر مجھے غچہ دے گئی۔ اُس نے ملتان کو رہا کر کے اپنا مکان ہی بدل لیا اور اب وہاں پولیس پہرہ دے رہی ہے۔“

”نہیں یار! ایسی بھی نہیں ہے وہ۔“

”کچھ اس سے بھی زیادہ ہی ہے یار!“ یہ کہہ کر میں نے روز کے تمام واقعات اسے سُنائے تو وہ بولا۔

”جیلانی! یہ تو بہت ہی بُرا ہوا۔ وہ ملتان اپنی اس ذلت کا سارا انتقام آسیہ سے لے گا۔ اب اُس کی کارروائی سرکاری نہیں، ذاتی رنگ اختیار کر جائے گی۔“

”یہی تو میں ڈرتا ہوں۔ وہ گل محمد بھی میرے کسی کام نہیں آ سکا ہے۔“

”وہ مجھے مخلص آدمی نظر آتا ہے بہرحال تجھے بہت ہی محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ اگر آہو ہمارے خلاف نہ ہوتا اور ہمارے تعلقات اس سے درست رہتے تو وہ ہماری بہت مدد کر سکتا تھا۔ اگر وہ ہیرے تیرے ہاتھ آ جاتے تو انھیں واپس کر کے ہم اس کو راضی کر سکتے تھے۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو مگر وہ عورت مجھے پھر دھوکہ دے گئی ہے۔ ہیرے اس کے پاس موجود ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ اس نے کسی لاکر میں رکھے ہوں گے۔ اُن کو واپس کر دینے کا اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔“

”تم یوں کرو کہ ٹیلی فون پر جا کر آہو سے بات کرو اسے بتاؤ کہ ہیرے ماجدہ کے پاس ہیں اور ماجدہ کو اُس نصیر گنجے کے حوالے سے ڈھونڈا جا سکتا ہے۔“

”مگر وہ نصیر تو اب یہاں نہیں ہے۔ اُسے ماجدہ نے کسی اور جگہ بھیج دیا ہے۔“

”آج نہیں تو کل۔ دس دن بعد یا مہینے بعد کسی نہ کسی جگہ تو ہوگا ہی وہ نصیر۔ پھر آہو اس سے خود نپٹ لے گا۔“

”مگر آہو میری بات سُن کر پھر طیش میں آ جائے گا۔“

”نہیں! اُسے اطمینان سے سمجھاؤ کہ جو کچھ ہو چکا ہے وہ بھول جائے۔ اور ہم سے صلح کر لے۔ وہ اس کی بیوی بھی میرا خیال ہے اُسے تمھارے حق میں ہموار کر چکی ہوگی۔“

”تم مجھے تھوک چاٹنے کا مشورہ دے رہے ہو۔“

”نہیں! بلکہ دانشمندی کا تقاضا یہی ہے۔ تم نے آسیہ کو جس مصیبت میں ڈال دیا ہے اس کا اب یہی حل ہو سکتا ہے۔“

”ٹھیک ہے میں فون کرتا ہوں۔“

”محمدی بیگم سے کہو وہ نمبر ملا دے گی۔ فون اس کے پاس ضرور ہوگا۔“

اُس کی یہ بات سُن کر میں کمرے سے نِکلا اور نرسوں کے کمرے میں جا پہنچا۔ وہاں ایک ادھیڑ عمر کی نرس فون پر کسی سے بات کر رہی تھی۔ محمدی بیگم ایک رجسٹر پر جھکی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے دیکھا تو کرسی سے اُٹھ کھڑی ہوئی، بڑے تپاک سے بولی۔

”فرمایئے، کیسے آنا ہوا؟“ اس کا لہجہ بہت ہی شُستہ اور مہذب تھا۔ آنکھیں اس کی حسبِ معمول جھکی ہوئی تھیں۔

”میں ایک فون کرنا چاہتا ہوں۔“

”کرلیں مسز خان! انہیں فون کرنے دیں۔“ اس نے ادھیڑ عمر کی نرس سے کہا۔ ابھی میں ریسیور اٹھانے ہی کو تھا کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ مسز خان نے ریسیور اُٹھا لیا۔

”ہیلو گنگا رام ہسپتال۔“

— — — — — —

”ارے تُو ہے چھیمو! کیا حال ہیں تیرے؟“ اس نے بڑی محبت سے کہا۔ پھر اس کے چہرے کے رنگ بدلنے لگے۔ بولی۔

”یہ کیا کہہ رہی ہے تو؟ محسن کلینک پر چھاپہ پڑا ہے کب؟“

— — — — — —

”آج شام؟ اچھا! تو کیا وہ ڈاکٹر عذرا کو پکڑ کر لے گئے ہیں؟“

— — — — — —

”ہائے، یہ تو بہت بُرا ہُوا۔ کیا کہا؟ اس ڈاکٹر عرفان کے سلسلے میں؟ مگر اس کا ڈاکٹر عذرا سے کیا تعلق ہے؟“

— — — — — —

”کیا کہا؟ ڈاکٹر عرفان کا گردہ نکال لیا تھا ڈاکٹر عذرا نے! نہیں چھیمو! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

— — — — — —

”ہائے یہ تو بہت ہی بُرا ہوا۔ ایسی ایسی حرکتیں کرتی تھی وہ؟ مگر پولیس کو یہ سب کس نے بتایا ہے؟“

— — — — — —

”ہاں، ساری بات معلوم کر کے مجھے بتاؤ۔ عذرا تو ایسی نہیں لگتی تھی۔ ہائے یہ تو زبردست اسکینڈل بن جائے گا۔“

— — — — — —

”اچھا میں تیرے فون کا انتظار کروں گی۔ میں بھی صبح آٹھ بجے تک ہوں یہاں۔“ یہ کہہ کر مسز خان نے فون بند کر دیا ہانپتی ہوئی بولی۔ ”تم نے کچھ سُنا ہے محمدی بیگم! وہ ڈاکٹر عذرا تھی نا! اُسے پولیس نے پکڑ لیا ہے چھاپہ پڑا ہے اس کے کلینک پر۔“

”وہ کیوں، اس نے کیا جرم کیا ہے؟“

”اُس نے سُنا ہے ڈاکٹر عرفان کا پیٹ چاک کر کے اُس کا گردہ نکال لیا تھا۔ وہی ڈاکٹر عرفان جو شفا بار کلینک میں کام کرتا تھا۔ سُنا ہے عرفان مر گیا تھا اُس آپریشن سے اور اس کی لاش عذرا نے اُدھر شہر سے باہر پھنکوا کر اُسے آگ لگا دی تھی — مگر وہاں کچھ لوگوں نے وہ آگ بجھا کر اس کی میت تھانے پہنچا دی۔ پولیس نے اُسے پہچان لیا اور تفتیش شروع کر دی ہے۔ ڈاکٹر عرفان نے جو کپڑے پہن رکھے تھے اُن کی وجہ سے پولیس کو معلوم ہو گیا کہ وہ محسن کلینک میں زیرِ علاج رہا ہے۔ بس اسی سراغ پر انہوں نے ڈاکٹر عذرا کو پکڑ لیا ہے۔ اب وہ یہ معلوم کر رہے ہیں کہ عرفان کا گردہ عذرا نے نکال کر کس کو دے دیا اور کیوں۔ ادھر بڑی افراتفری مچی ہے۔ کئی نرسوں کو ڈاکٹر عذرا اور ڈاکٹر مسز کیانی سمیت انہوں نے گرفتار کر لیا ہے۔“

مسز خان نے جو کچھ فون پر سُنا تھا، حرف بحرف محمدی بیگم کو ایک ہی سانس میں بتا دیا اور پھر وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر تیزی سے باہر نکل گئی، بولی۔ ”میں ذرا ڈاکٹر مسز قیصرانی کو بتا آؤں وہ تو ڈاکٹر عذرا کی پکی سہیلی ہے۔“

مسز خان کی باتیں سُن کر میں تو سُن ہو کر رہ گیا۔ پولیس نے میری تلاش میں جو یلغار شروع کر رکھی تھی وہ اب اُس میں ایک منزل اور آگے بڑھ آئے تھے۔ انھوں نے مجھے گرفتار کرنے کے لیے شاید لوٹے میں نمک ڈال لیا تھا۔ وہ اب چاروں طرف سے میری سمت بڑھ رہے تھے اور اب اُن کا ہر قدم صحیح سمت میں اٹھنے لگا تھا۔ ڈاکٹر عذرا جیسی نرم و نازک عورت سے وہ پلک جھپکتے میں سب کچھ اُگلوا سکتے تھے۔ اور مجھے معلوم تھا کہ بلا پس و پیش اُس نے کہہ دیا ہوگا کہ اس کے بچوں کو جیلانی نے پستول کی زد میں لے کر یرغمال بنا لیا تھا اور اُس کی دھونس دھاندلی سے ڈر کر اس نے اپنے بچوں کی جان بچانے کے لیے عرفان کا گردہ نکال کر آسیہ کے پیٹ میں منتقل کر دیا تھا۔ وہ ان سے کوئی بھی بات چھپا نہ سکے گی۔ اس کے پاس ایک بڑا ٹھوس ثبوت اور واضح جواز موجود تھا۔ وہ برادَنی کی شہادت، غضنفر کی دوڑ دھوپ اور دوسرے تمام شواہد اپنے حق میں پیش کر کے اپنی بے گناہی ثابت بھی کر سکتی تھی۔ اگر وہ لوٹنی بھی لیتی تو وہ اپنے اس فعل کے جواز میں صرف جیلانی کا نام استعمال کر کے اپنا پنڈ چھڑا سکتی تھی۔ ڈر مجھے یہ تھا کہ اگر اُس نے ڈھلوں صاحب کا نام لے دیا اور یہ کہہ دیا کہ آسیہ کو اس کے پاس انھوں نے بھیجا تھا تو ڈھلوں صاحب پر خواہ مخواہ کیچڑ اچھل سکتا تھا۔

میرے چہرے پر کھنڈی زردی دیکھ کر محمدی بیگم بڑی حیران ہو رہی تھی۔ میں بھول ہی گیا تھا کہ میں وہاں کس کام سے آیا ہوں۔ وہ بڑے ہی متین لہجے میں بولی۔ ”آپ فون کر لیں۔“

اُس کی یہ بات سُن کر میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا جیسے میں اُس کی یاد دہانی پر اس کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ میں نے نمبر گھما کر آہو کے گھر سے رابطہ قائم کر لیا۔

فون سروری بیگم نے اُٹھایا۔ جیسے ہی اُس نے ہیلو کہا، میں نے

اُس کی آواز پہچان لی۔

"کیا حال ہیں آپ کے جناب! میں آپ کا خادم بول رہا ہوں میرا نام ہاشم خان ہے۔"

"اوہ آپ! تو اب آپ ہاشم خان بن گئے ہیں مگر یہ ہمارا نمبر آپ کو کیسے یاد آ گیا جناب۔" وہ انبساط بھرے لہجے میں بولی۔ میری آواز پہچان کر وہ خوش ہو گئی تھی۔

"میں آہو صاحب سے بات کرنا چاہتا تھا۔ مجھے ایک ضروری کام ہے اُن سے۔"

"وہ تو تُورا آدمی ہیں جناب! کبھی ٹک کر گھر نہیں بیٹھتے۔ کل صبح سے وہ کراچی گئے ہوئے ہیں۔"

"اوہ! تو یہ بات ہے۔ انہیں میرا سلام کہیں۔ کب تک واپس آئیں گے؟"

"شاید پرسوں تک۔ کوئی خاص کام ہو تو مجھے بتا دیں۔"

"اُن ہیروں کے بارے میں میں انہیں کچھ بتانا چاہتا تھا۔ وہ جس عورت کے پاس ہیں نا اُسے میں نے ڈھونڈ تو لیا تھا مگر وہ پھر میرے ہاتھ سے نکل گئی ہے۔ بہر حال ہے وہ اسی شہر میں۔ اسی کے بارے میں اُن سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔"

"ارے! اُس کے بارے میں تو ضرور ہمیں بتا دیں۔ ہماری تو جان مصیبت میں پھنسی ہے۔ وہ کسی کی امانت تھی ہمارے پاس۔"

"میں اسی کوشش میں ہوں خانم کہ آپ کی امانت آپ کو مل جائے۔ میں پرسوں پھر فون کروں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ آہو صاحب کے دل سے میرے خلاف جو غلط فہمیاں ہیں وہ دُور کر دیں۔ میں اُن کا دشمن نہیں ہوں۔ اُن کے مجھ پر بڑے احسانات ہیں۔ مجھے اُن کی مدد کی اشد ضرورت ہے۔"

"میں نے انہیں بڑی حد تک نرم کر لیا ہے۔ آپ پرسوں شام کو آ جائیں تو وہ گھر پر ہی ہوں گے۔ مگر جناب ہاشم خان صاحب اگر آپ آج ہی ادھر آ جائیں تو مجھے زیادہ خوشی ہو گی۔ آپ کو پتہ ہے میرے دل میں کتنی قدر ہے آپ کی۔"

"میں آپ کا شکر گزار ہوں خانم۔ مجھے موقع مِلا تو میں ضرور حاضر ہوں گا بہر حال انہیں میرے بارے میں سمجھائیں۔ خدا حافظ۔"

"خدا۔۔۔ حا۔۔۔ فظ مسٹر کرُوئل ہاشم خان۔"

میں نے اُس کی یہ بات سُن کر فون بند کر دیا، اور محمدی بیگم کا شکریہ ادا کر کے آبی کے کمرے میں جا پہنچا۔ اُسے میں نے ڈاکٹر عذرا کی گرفتاری کے بارے میں بتایا تو وہ ہنسنے لگا۔ بولا۔

"لے بھئی، پولیس کا مالیخولیا اُس کے کام آ ہی گیا۔ اُس عرفان نے مر کر بھی اپنے قاتل کی نشان دہی کر دی۔ بہت ظالم آدمی ثابت ہوا ہے وہ۔"

"یار مجھے ڈر ہے کہ اُن کی تفتیش کہیں چلتے چلتے ہم تک ہی نہ آ پہنچے۔ مجھے ٹیکسی ڈرائیوروں سے خوف آتا ہے۔"

"نہیں بھائی! تُو اپنی مامتا ٹھنڈی رکھ۔ اِس مُلک میں ہر آدمی پولیس سے ڈرتا ہے۔ چور بھی خوفزدہ ہے اور سادہ بھی۔ چور اپنے جرم کی سزا سے اور سادہ بھلے تھانے کچہریوں کے دھکوں سے۔ پتہ ہے وہ لوگ گواہ کو بھی اتنا ہی ذلیل کرتے ہیں جتنا کسی چور کو۔"

"وہ تو ٹھیک ہے، مگر اس چکر میں آسیہ کو تو وہ رگید کر رکھ دیں گے اُس کے ساتھ وہ ریٹا بھی خواہ مخواہ تلی گئی۔"

"کچھ نہیں ہوتا اُسے۔ وہ صحت یاب ہو گئی تو پھر وہ اُسے جیل بند کر دیں گے۔ یہی کریں گے نا زیادہ سے زیادہ۔ تُو خواہ مخواہ پریشان ہو رہا ہے۔"

"میری زندگی تباہ ہو گئی ہے اس چکر میں اور تُو اسے خواہ مخواہ کی پریشانی کہہ رہا ہے۔"

"یہ بات نہیں ہے جیلانی! صبر بھی تو کوئی چیز ہے آخر! تُو لوٹ لوٹ کر شیر پر حملہ آور ہوتا ہے، کبھی کسی سے بھڑ جاتا ہے کبھی کسی سے اور وہ تیرے مامے تیرے پیچھے لگے ہیں۔ کسی اڑنگے میں تو آ گیا تو پھر تیرا بچنا محال ہو جائے گا۔ میں نے تیرے لیے بھی بندوبست کر رکھا ہے۔ ذرا اپنے اعصاب کو آرام دے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب کہ ایک نرس ہے یہاں مینی نام ہے اُس کا۔ وہ دوپہر کے وقت ادھر آئی تھی۔ وہ اپنی سہیلی کے ساتھ آج رات بارہ بجے اپنی ڈیوٹی پر یہاں پھر آئے گی۔"

"مگر تُو تو بیمار ہے یار! اور پھر وہ محمدی بیگم بھی یہاں ہے۔"

"اُس سے تو میں سچا اور حقیقی عشق کر رہا ہوں۔"

"میں اُن دونوں کو گولی مار دوں گا۔ یہ عیاشی نہیں چلے گی اِدھر۔ تُو علاج کے لیے آیا ہے یا پیچ لڑانے؟"

اُس کی باتیں مجھے اُس رات حیران کیے دیتی تھیں۔ اُس نے نیا ڈھنگ ہی اختیار کر لیا تھا۔ وہ وہی آبی تھا جو مجھے عورتوں کے چکر سے دور رہنے کی تلقین کیا کرتا تھا۔

"دو گھڑی رات باقی ہے یار! یہ جو گولی مجھے لگی ہے اس نے مجھے اندر سے نڈھال کر دیا ہے۔ یہ دو ڈھائی روپے کی گولی ذرا اُوپر لگ جاتی تو میری یہ کروڑوں روپے سے زیادہ قیمتی زندگی بھک سے اُڑ جاتی۔ ختم ہو جاتی کہ نہیں؟ اور میں اسے بہت سینت سینت کر رکھتا تھا۔ بہت سی خوبرو عورتوں کا ہاتھ میں نے جھٹک دیا۔ مگر اب۔۔۔ اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں نے عمر عزیز ضائع کر دی۔ میں محبت سے بھی محروم رہا۔ یہ کتنی بڑی بدنصیبی ہے جیلانی اور۔۔۔ اور میں اسے سمجھ ہی نہیں سکا تھا۔ عورت کا لمس تو اس دنیا کی حسین ترین مسرت ہے۔ اس کے سوا تو یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ اور میں۔۔۔ میں اس سے دور بھاگتا رہا۔"

"تیری باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں آبی! تو یہ

ہرگز نہیں تھا۔"

وہ مسکرایا، بولا "بات یہ ہوئی ہے جیلانی کہ میری آنکھوں پر جو پردہ پڑا تھا نا، وہ اُتر گیا ہے۔ اب مجھ پر زندگی کی اصل حقیقت روشن ہوگئی ہے۔ میں نے محمدی بیگم کی آنکھوں میں ایسے حسین رنگ دیکھے ہیں کہ اب میں کہیں کا بھی نہیں رہا۔ میں یہ راستہ چھوڑ دوں گا جیلانی! میں محمدی بیگم کو لے کر کسی جنگل میں جا بسوں گا یہی کروں گا اب۔"

"تو پاگل ہوگیا ہے میرے یار! تیرے دماغ کا فصد کھلوانا پڑے گا مجھے۔"

"دیکھ، رنگ میں بھنگ مت ڈال۔ یہ ساتھ کا کمرہ خالی ہے۔ میں نے محمدی بیگم سے کہا تھا۔ وہ یہ کمرہ کھلوا دے گی۔ تم اُدھر سو رہو۔ باقی میں جانوں اور میرا کام۔ تو نے کھانا کھا لیا ہے کہ نہیں؟"

"نہیں، موقع ہی نہیں ملا۔"

"ٹھیک ہے، میں کھانا منگوا دیتا ہوں تو پیٹ بھر کر اُدھر چلا جا۔ میرا زخم بڑی حد تک ٹھیک ہوگیا ہے۔ ایسا معجزہ دکھایا ہے ان لوگوں نے کہ میں حیران رہ گیا ہوں۔ میرا خیال ہے سائنس... بہت ترقی کر گئی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے دیوار کے ساتھ لگی گھنٹی بجا دی۔

"تیرا دماغ بھی تو بہت ترقی کر گیا ہے۔" میں نے جل کر کہا۔ اُس کی باتیں سُن کر میں حیران رہ گیا تھا۔ اُس محمدی بیگم نے اس کی کایا ہی پلٹ دی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد میں کھانا کھا کر پہلو کے کمرے میں جا لیٹا۔ اُس کا دروازہ محمدی بیگم نے میرے لیے کھول دیا تھا مگر میرے ساتھ کمرے میں داخل نہیں ہوئی۔ دروازے سے ہی پلٹ گئی۔

میں بستر پر لیٹا تو آبی کی باتیں مجھے یاد آنے لگیں۔ وہ ایسی مسرتوں کی تلاش میں چل نکلا تھا جو انسان کو اُس کے لامتناہی غموں سے نجات دلا سکیں۔ مگر کوئی ایسی دائمی خوشی کہاں ملتی ہے۔ کہیں بھی نہیں کہ آدمی کی راہ میں تو قدم قدم پر غم کی بارودی سُرنگیں بچھی ہیں۔ اُن پر پاؤں پڑتا ہے تو وہ ایسے دھماکے سے پھٹتی ہیں کہ آدمی کی شخصیت کے پرخچے اڑ جاتے ہیں۔ اُن سے بھاگ کر کوئی کہاں جا سکتا ہے اور یہ جو آدمی مسقط کا حلوا کھانے کی آرزو میں مبتلا ہوتا ہے تو اس کی یہ اشتہا اُسے بالآخر ذلیل و خوار کر کے رکھ دیتی ہے۔ زُلف کا کنڈل جب اپنا حلقہ تنگ کرتا ہے تو آدمی کا دم گھُٹ کر رہ جاتا ہے۔ اُس کے وجود سے سارا حوصلہ، ساری ہمت اور اُس کی ساری توانائیاں نچڑ کر رہ جاتی ہیں۔ یہی تو وجہ ہے کہ جب کوئی جوان بہت مُنہ زور اور خودسر ہو جاتا تھا تو بزرگ یہی کیا کرتے تھے کہ اس کی وہ شادی کر کے اُسے بستر پر گرا دیتے تھے۔ ایسے بستر پر جہاں سے پھر وہ کبھی سیدھا ہو کر نہیں اُٹھ سکا۔ بڑے بڑے جوانوں کو منہ زوروں کو میں نے اُس بستر پر زندگی ہارتے دیکھا ہے۔ پھر آبی کس فریبِ نظر میں مبتلا ہو رہا تھا۔ وہ کس سراب کے پیچھے چل نکلا تھا۔

مجھے اُس کی مَت ماری گئی نظر آتی تھی۔ وہ عقلِ سلیم سے محروم ہوگیا تھا۔ اُس نے اِن لڑکیوں کو دینے کے لیے مجھ سے پچاس ہزار روپے لیے تھے اور میں جانتا تھا کہ وہ صبح تک اُسے بے ارادہ کر کے چھوڑ جائیں گی مگر میں نے اسے سختی سے روکنا مناسب نہیں سمجھا۔ میں نے سوچا کہ کچھ تجربے ایسے ہوتے ہیں جن سے گزر کر ہی آدمی عافیت کی قدر پہچانتا ہے۔ اس کو ان کانٹوں پر گھسٹ ہی لینے دو۔

آبی کا خیال ذہن سے جھٹک کر میں نے سونے کی کوشش کی مگر نیند مجھ سے کوسوں دُور تھی۔ آسیہ کی دم بہ دم بگڑتی صورت مجھے ایک بار پھر نڈھال کرنے لگی تھی۔ ہزاروں لاکھوں وسوسے میرے دل میں ابھرتے چلے آ رہے تھے۔ حالات نے میرے نتھنوں میں ایسا تیر ڈے رکھا تھا کہ میری جان ضیق میں تھی۔ منان میرے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ ماجدہ بھی میری دست بُرد سے دور جا پہنچی تھی اور مجھے یہ ڈر تھا کہ منان لوٹ کر جب مجھے ڈسے گا تو اُس کا ڈنک میرے لیے بہت ہی زہریلا ثابت ہوگا۔ آبی نے صحیح مشورہ دیا تھا۔ مجھے آہو سے صلح کر لینی چاہیے تھی مگر جب تک میں اس کے بیٹے اُسے نہ لوٹاؤں وہ میری صورت دیکھنے کا روادار نہ ہوگا۔ اگر وہ سیدھی راہ پر ہوتا اور مجھ سے تعاون کرتا تو اس کے لیے آسیہ تک جا پہنچنا کچھ مشکل نہ تھا۔ مگر آہو سے بارسوخ تو وہ ڈھلوں صاحب تھے۔ میں اُن کے پاس کیوں نہ پہنچوں۔ وہ کوئی نہ کوئی راستہ ضرور تلاش کر لیں گے۔ یہ بات سوچ کر مجھے کچھ اطمینان ہونے لگا اور میں ایک بار پھر آنکھیں موند کر لیٹ گیا۔ کچھ دیر بعد نیند مجھ پر مہربان ہوگئی اور میں بھول ہی گیا کہ آبی نے میرے لیے کیا بندوبست کیا تھا۔

صبح چھ ہی بجے اُٹھ کر میں آبی کے کمرے میں جا گھسا۔ وہاں کا منظر دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ وہ دونوں [illegible] ہاں ابھی تک اس کے کمرے میں موجود تھیں۔

"آج دو بجے سے میری ڈیوٹی ہے۔ میں اُدھر بچوں کے وارڈ میں ہوں گی۔" یہ کہہ کر وہ دونوں تیزی سے باہر نکل گئیں۔ سورج ابھی نہیں نکلا تھا اور باہر ہسپتال کے تمام برآمدوں اور راہداریوں میں سناٹا پھیلا ہوا تھا۔

"لوگ سمجھتے ہیں آپ بیمار ہیں آپ کا ٹائر پھٹا ہوا ہے اور یہاں یہ حال ہے۔"

"ارے کہاں یار! میں بھی بس تمھاری طرح ہی ہوں۔ ذرا گپ شپ ہوگئی اِن سے، وقت اچھا گزر گیا۔"

"میں آج ڈھلوں صاحب کے پاس جا رہا ہوں، اُن سے کہتا ہوں کہ وہ آسیہ کے بارے میں کھوج لگائیں۔ یار اس بے چاری کی جان مصیبت میں پھنسی ہے۔"

"ہاں یہ بہتر رہے گا۔ میں اِدھر ہی لیٹتا ہوں۔ ڈھلوں صاحب کو ساری بات بتا دینا۔ میرا خیال ہے وہ کوئی راستہ ضرور نکال لیں گے۔"

وہ اسٹین گن بھی لے جا۔ ادھر الماری کے پیچھے ڈال دی تھی میں نے۔"

اُس کی یہ بات سُن کر میں نے الماری کے عقب سے اپنی اسٹین گن نکال لی۔

"ٹھیک ہے یار! تو ادھر ہی رہ۔ یہاں کوئی خطرہ کی بات نہیں ہے۔ ویسے بھی اُن میں سے کوئی بھی آدمی تجھے نہیں پہچانتا ہوگا۔" میں نے اسٹین گن چادر کے نیچے چھپاتے ہوئے کہا۔

"ہاں یہ بات میرے حق میں جاتی ہے۔ کب واپس آئے گا تو؟"

"میرا خیال ہے آج شام تک لوٹ آؤں گا۔ رات میں بہرحال نہیں گزاروں گا۔ آہو سے تو رابطہ قائم نہیں ہو سکا وہ کراچی گیا ہوا ہے۔"

"ہاں تم نے رات بتایا تھا مجھے۔ اب تم نہا دھو کر ناشتہ کرو، اور پھر اُدھر چل دو۔ آسیہ تک جلدی پہنچنا تمھارے لیے ضروری ہے۔"

میں کوئی پون گھنٹے بعد نہا دھو کر اور ناشتہ کر کے ہسپتال سے باہر آگیا۔ بڑی سڑک پر پہنچ کر ٹیکسی میں بیٹھ کر ڈھلوں صاحب کی طرف چل دیا۔

میرا سفر چوگوٹھ کی طرف جاری تھا۔ میں لمحہ بہ لمحہ لاہور سے دُور ہوتا جا رہا تھا اور میری آنکھوں کی روشنی آہستہ آہستہ کم ہوتی جا رہی تھی۔ دل میرا لہو روتا تھا۔ بدنصیبی ابھی تک میرے تعاقب میں تھی۔ میں دربدر کا کتا ہو کر رہ گیا تھا۔ اب جو زخم میرے سینے پر لگا تھا اتنا گہرا تھا کہ اُس کے اندمال کی مجھے کوئی امید نظر نہیں آتی تھی۔ وہ ذات دنی، وہ میری ماں جائی بہن آسیہ ایک نئے گرداب میں پھنس گئی تھی۔ میں وہیں تھا۔ اُس سے دو چار ہاتھ دُور بیٹھا تھا میرے اور اس کے درمیان کوئی دیوار ہی تو حائل تھی مگر نہ میں اس کی آواز سُن سکتا تھا نہ میری پکار اُس تک پہنچ سکتی تھی۔ اب کی بار وہ جس جال میں پھنسی تھی، اس کے تار کاٹ لینا میرے بس میں نہیں رہا تھا۔ اپنی ساری حماقتیں مجھے اپنے سامنے پر پھیلائے کھڑی نظر آتی تھیں۔ اپنی غلطیوں پر میں نادم تھا، بے حد نادم۔ مگر یہ جو آخری غلطی مجھ سے ہوئی اور جس کی وجہ سے میں نے آسیہ کو ڈاکٹر عذرا کے کلینک سے اٹھا کر دوسرے کلینک میں منتقل کروا دیا تھا، وہ ایسی تھی کہ اس کے ازالے کے لیے مجھے ایک بار پھر اپنا سب کچھ داؤ پر لگانا پڑ رہا تھا۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب کچھ میری تقدیر میں تھا۔ یہ لوحِ محفوظ تھی جو آہستہ آہستہ میرے اور آسیہ کے سامنے کھُلتی جا رہی تھی۔ اس کا ہر حرف ہر لفظ ہمارا منہ چڑا رہا تھا۔ اور ہم بے بس تھے۔ لاچار محض تھے۔ کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اب ڈاکٹر عذرا بھی ہماری تقدیر میں شامل ہوگئی تھی۔ اسے بھی وہ لوگ پسِ دیوارِ زنداں لے جا کر اذیتوں کے آرے پر چڑھا چکے تھے، محض اِس لیے وہ ماری گئی تھی کہ میں اُس کے پاس سے ہو کر گزر گیا تھا۔ اپنی مقدر کی نحوست کا گلہ وہ ڈاکٹر نفیسہ بھی کرتی تھی مگر میں تو اُس سے [illegible] منحوس تھا کہ جو بھی میرے ساتھ دو قدم چلا، ریزہ ریزہ ہو کر راہ میں گر گیا۔

جب میں چوگوٹھ پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ڈھلوں صاحب کی حویلی کے باہر جشن کا سا سماں بندھا تھا۔ وہاں شامیانے لگے تھے، جن کے نیچے یہاں سے وہاں تک کرسیاں بچھی تھیں۔ دائیں ہاتھ کھلی جگہ پر پندرہ سولہ دیگیں آگ پر رکھی تھیں اور علاقے کے دیہاتی جوق در جوق وہاں پہنچ رہے تھے۔ ڈھلوں صاحب کے کامے بہت مصروف تھے۔ برکت نے مجھے دُور سے آتے دیکھا تو سیدھا میری طرف لپکا۔

"جی آئیاں نوں ہاشم صاب۔ کیا حال ہے اب بی بی کا؟"

"اچھا ہے، علاج ابھی ہو رہا ہے پہلے سے وہ بہت بہتر ہے۔" میں نے اسے مطمئن کرتے ہوئے کہا۔

"چلو شکر ہے۔ اِدھر تو آج لمبی دیگیں چڑھی ہیں۔ ووٹنگ ہونے والی ہے نا!"

"اچھا اچھا۔ ووٹروں کو پھانسنے کا جال بچھا ہے۔ ڈھلوں صاحب کہاں ہیں؟"

"وہ گھوڑی لے کر باہر نکلے ہیں۔ میرا خیال ہے ابھی آ جائیں گے۔ چوہدری عارف بھی اُن کے ساتھ ہے وہ سلّاں والی کا مالک۔"

"اچھا چل، مجھے کہیں بٹھا۔ میں ڈھلوں صاحب سے بات کروں گا۔"

"اُدھر آ جائیں۔ سب کرسیاں آپ ہی کے لیے ہیں۔" یہ کہہ کر اُس نے مجھے شامیانے کے نیچے ایک کونے میں بٹھا دیا۔ کچھ ہی دیر بعد اُس نے ایک ملازم کے ہاتھ میرے لیے چائے اور بسکٹ بھیج دیے۔ میں وہاں تنہا بیٹھا سگریٹ پھونکنے لگا۔ میری نظریں مہمانوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ارد گرد کے دیہات سے ڈھائی تین سو آدمی اب تک وہاں پہنچ چکے تھے۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ اُدھر تقریریں بھی ہوں گی کیوں کہ شامیانے کے ایک حصے میں اُونچا سا ڈائس بھی تیار کیا گیا تھا جس پر لاؤڈ اسپیکر کا انتظام موجود تھا۔ یہ میرے لیے ایک نیا تجربہ تھا۔ ایسے جلسے میں نے زندگی میں بہت کم دیکھے تھے۔ سیاسی ہاؤ ہو سے مجھے کبھی بھی کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔

میری نظریں برابر گرد و پیش کا جائزہ لے رہی تھیں۔ میرے بائیں کرسیوں کی لمبی قطار میں بیٹھے مہمان خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ وہ سب کے سب بس ایسے ہی مرفع الحال قسم کے دیہاتی تھے جو ڈھلوں صاحب کے ہاں دعوت اڑانے اور اُن کے سامنے اپنی وفاداری کے اظہار کے لیے وہاں آ بیٹھے تھے۔ وہ سب کے سب حقے لے کر آئے تھے۔ چند ایک اُن میں ایسے بھی تھے جو سستے قسم کے لیپ تار کے سگریٹ پھونک رہے تھے۔

اچانک میری نگاہ ایک چہرے پر جم کر رہ گئی۔ وہ تیس پینتیس سال کا ایک کڑیل جوان تھا۔ رنگ اس کا سانولا تھا، بال گھنے آنکھیں کسی ایک نکتے پر ٹھہری ہوئی۔ داڑھی مونچھ صفاچٹ

وہ سیاہ رنگ کی لوئی اوڑھے ہوئے تھا۔ اُسے دیکھتے ہی میرا ذہن قلا بازی کھا گیا۔ اُسے میں اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ جیل میں میرے ساتھ ہی تھا۔ اس کا نام شوکت تھا اور کسی پولیس افسر کی مہربانی کی بنا پر چھ مہینے کے لیے بند کر دیا گیا تھا، یوں جیسے کسی آوارہ جانور کو یار لوگ پھاٹک بند کر لیتے ہیں۔ تاکہ وہ دوسرے کے کھیت میں مُنہ نہ مار سکے۔ وہ بلا کا بہت چھٹا ہوا آدمی تھا۔ اس کی دو تین جھڑپیں میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ وہ مجھے نہیں جانتا تھا کیونکہ میری اس سے براہِ راست کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ مگر اس کے قصے میں نے بہت سُن رکھے تھے۔ کسی نے مجھے بتایا تھا کہ چند سال پہلے گوجرانوالہ شہر میں جو ڈاکہ پڑا تھا وہ اس میں شامل تھا مگر اس پولیس افسر نے اُسے بچانے کے لیے ڈاکے کی رات اُسے حوالات میں بند ظاہر کر کے اُسے بچا لیا تھا۔ پھر اپنی کارروائی کو مزید مستحکم کرنے کے لیے اس نے شوکت کو چھ ماہ کے لیے جیل بھجوا دیا تھا تاکہ کوئی اس پر ملبا یا شک نہ ڈال سکے۔ اُس رازدان نے مجھے یہ بھی بتایا کہ اس پولیس افسر کی شوکت نے بہت خدمت کی تھی۔ اُسے لاکھوں روپے کا فائدہ وہ پہنچا چکا تھا۔

معلوم یہ ہوتا تھا کہ شوکت وہاں تنہا آیا ہے کیونکہ اس کے اردگرد جو آدمی بیٹھے تھے، وہ اُن سے بالکل بے تعلق تھا۔ جس انداز سے وہ لوئی کی بُکل مار کر چپ چاپ بیٹھا تھا، اُس سے میرے دل میں کئی طرح کے شبہات اُبھرنے لگے۔ میں کتنی ہی دیر تک اس کا گہری گہری نظروں سے جائزہ لیتا رہا مگر میں اپنے کسی بھی شبے کے لیے کوئی ٹھوس جواز تلاش نہ کر سکا۔

آدھ گھنٹہ گزر گیا۔ ڈھلوں صاحب کے ایک ملازم نے فلمی گانوں کی ریکارڈنگ شروع کر دی جس سے گرد و پیش میں زندگی کی لہر دوڑنے لگی۔ گیت بے ہنگم سے تھے پھر بھی وہ دیہاتی اُن گیتوں کو سُن کر چہکنے لگے۔ کچھ ہی دیر بعد ڈھلوں صاحب دو خوش پوش آدمیوں کے ہمراہ وہاں آ پہنچے۔ برکت نے آگے بڑھ کر شاید انھیں میری آمد کی اطلاع دی تھی۔ انھوں نے میری طرف دیکھ کر اُسے قریب کھینچ کر اُس کے کان میں کوئی بات کی جسے سُن کر برکت دیگوں کے اوپر سے گھوم کر کچھ ہی دیر بعد میرے پاس آ پہنچا اور اپنا منہ میرے کان کے قریب لا کر بولا۔

"ڈھلوں صاحب کو میں نے آپ کے بارے میں بتا دیا ہے۔ وہ جلسہ ختم ہونے کے بعد آپ سے بات کریں گے۔"

یہ کہہ کر وہ اُسی وقت پیچھے لوٹ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد علاقے کے معززین بھی وہاں پہنچ گئے۔ وہ سب اُس جلسے کو کامیاب بنانے کے لیے وہاں آئے تھے کیونکہ الیکشن کے دن بہت قریب تھے۔ ٹھیک گیارہ بجے جلسے کی کارروائی شروع ہوئی۔ تب میں نے محسوس کیا کہ جب ایک بادامی رنگ کی جیپ منڈیری کے ڈیوں کے قریب آ کر رُکی تو شوکت نے بڑی بے چینی سے پہلو بدلا اور وہ اپنی کرسی سے اُٹھ کر شامیانے کی دیوار کے ساتھ ساتھ اس جیپ کے پاس جا پہنچا جیپ کے تمام پردے گرے ہوئے تھے۔ اس سے تھوڑی ہی دیر پہلے پولیس کی ایک گاڑی شامیانے کے دوسری طرف آ گئی تھی۔ اس میں سے پولیس کے آٹھ سپاہی اور دو تھانیدار اُتر کر بڑی خاموشی سے ادھر اُدھر بیٹھ گئے تھے۔ انھیں ڈھلوں صاحب نے کسی ممکنہ فساد کو فرو کرنے کے لیے چنوکی تھانے سے بلایا تھا۔

کچھ دیر تک جیپ کے پاس رُکنے کے بعد شوکت پچھلا دروازہ کھول کر جیپ کے اندر بیٹھ گیا۔ اس کی حرکات و سکنات مجھے بڑی پُراسرار نظر آ رہی تھیں۔ جیب انھوں نے شامیانے کے کھلے حصے کے سامنے ایسی جگہ کھڑی کی تھی کہ وہاں سے ڈائس کا تمام منظر صاف نظر آتا تھا۔ تین آدمی پارٹی کے حق میں دھواں دھار تقریریں کرنے اور لوگوں کو اپنے قیمتی ووٹ علاقے کے سب سے بڑے چوہدری اور عظیم رہنما مختار ڈھلوں صاحب کو دینے کی سفارش کر کے ڈائس سے اُتر گئے۔ ہر طرف مکمل خاموشی طاری تھی۔ جلسہ کا ماحول بڑا پُرامن تھا مگر شوکت کی وہاں موجودگی مجھے کھل رہی تھی۔ پولیس کے تمام آدمی بالکل بے فکر تھے۔ اور بظاہر اُن کو کسی تردد کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر شامیانے کی دیوار کے ساتھ چلتا ہوا ایک ایسی جگہ جا ٹھہرا جہاں سے میں اُس جیپ کو زیادہ قریب سے دیکھ سکتا تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ جیپ میں ڈرائیور اور شوکت کے علاوہ بھی کچھ لوگ موجود ہیں۔ مگر اس کی علت و غایت مجھے سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ جلسے میں شرکت کے لیے آئے تھے تو باہر نکل کر شامیانے کے اندر بیٹھتے مگر وہ جیپ کے تمام پردے گرا کر وہاں چپ چاپ بیٹھے تھے۔

تین مقرر لوگوں سے خطاب کرنے کے بعد الگ ہو کر بیٹھے تو ڈھلوں صاحب تقریر کرنے کے لیے ڈائس پہ پہنچے۔ عین اس وقت جیپ کے ڈرائیور نے انجن اسٹارٹ کر دیا۔ مگر اُس کی گھر گھر ڈھلوں صاحب کی لاؤڈ اسپیکر پہ گرجتی آواز میں دب کر رہ گئی۔ میری نظریں برابر اُس جیپ پر جمی تھیں۔ ڈھلوں صاحب کے دائیں ہاتھ اُن کا اسٹیج سیکرٹری عاشق علی کھڑا تھا۔ اُن سے ذرا اِدھر برکت کا ساتھی گن مین شفیع موجود تھا۔ وہ سب لوگ ڈھلوں صاحب کی حفاظت کے لیے ہمہ وقت چوکس رہتے تھے۔ ڈائس سے ہٹ کر برکت بھی اپنی بندوق سنبھالے چاق و چوبند کھڑا تھا۔

پولیس کی جیپ جلسہ گاہ سے کافی دور کھڑی تھی۔ ڈھلوں صاحب کی دھواں دھار تقریر نے ہر طرف سناٹا طاری کر دیا تھا۔ اس روز پہلی بار مجھے معلوم ہوا کہ وہ لفظوں سے کھیلنا جانتے ہیں۔ ان کا اب و لہجہ بہت ہی جاندار تھا۔ لوگ بڑی محویت سے اُن کی تقریر سُن رہے تھے۔ مگر میرے دل میں کھد بد ہو رہی تھی۔ اس جیپ میں شوکت کا سوار

ہونا میرے لیے اچنبھے سے کم نہیں تھا۔ وہ بہت ہی گندی ذہنیت کا آدمی تھا۔ جیل میں اُس نے اپنے بے شمار ساتھیوں کو پریشان کر رکھا تھا۔ اپنے مطلب کے حصول کے لیے وہ حیوانی سطح پر اُتر آتا تھا۔ بہت ہی شاطر اور عیار آدمی تھا۔ بدترین قسم کا فریب کار اور جھوٹا۔ جیل میں میرے ایک ساتھی قیدی کے ہاتھوں وہ پٹ بھی چکا تھا۔ میرا اندازہ یہ تھا کہ وہ مجھے دیکھنے کے باوجود پہچان نہیں سکا ہے۔ مگر حقیقت یہ تھی کہ اس نے مجھے غور سے دیکھا ہی نہیں تھا بس یونہی ایک اچٹتی سی نظر میرے چہرے پر ڈال کر اس نے رُخ بدل لیا تھا، اور اب وہ بڑے ہی پُراسرار طریقے سے اس جیپ میں جا بیٹھا تھا جس کا انجن ڈرائیور نے چلا رکھا تھا۔

شوکت کو اس جیپ میں بیٹھے چند ہی لمحے گزرے تھے کہ جیپ ذرا سی سرک کر آگے بڑھ گئی۔ اب وہ ایسے رُخ پر تھی کہ ڈائس بالکل اُس کے سامنے تھا۔ سب لوگ اپنی اپنی جگہوں پر چپ بیٹھے ہوئے تھے۔ پولیس کے سپاہی اس وقت جلسہ گاہ کے پچھلے حصے میں کھڑے لوگوں کو دری پر بیٹھ جانے کے لیے کہہ رہے تھے۔ اچانک جلسہ گاہ میں بیٹھے لوگوں کے دائیں ہاتھ جھولداری کے عین پردے کے قریب پٹاخوں کی آواز گونجی۔ ایک لحظے کے لیے میری نظر اُدھر پھری اور اس کے ساتھ ہی وہاں کئی لوگ اپنی جگہ سے اُٹھ کر شور مچانے لگے پولیس کے تین سپاہی تیزی سے اُدھر بڑھے اور عین اس وقت مجھے گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر اُس جیپ پر نظر ڈالی۔ جس پر شوکت سوار ہوا تھا، تو میرا معز اُلٹ گیا۔

جیپ کے پردے میں سے ایک نال موت اُگل رہی تھی۔ اُس کا رُخ ڈائس کی طرف تھا۔ میں نے اسٹین گن سیدھی کی اور اس پردے کو تا نا نا چھلنی کر دیا۔ ابھی میں نے چار ہی گولیاں چلائی تھیں کہ جیپ برق رفتاری سے آگے بڑھی۔ میں پاگلوں کی طرح اس کے پیچھے لپکا مگر وہ ڈرائیور لوگوں کی بھیڑ کو کاٹتا ہوا نکلتا چلا گیا۔ میں نے جیپ کے ٹائر کو تاک کر پھر ایک گولی چلائی مگر وہ کارگر نہ ہوئی میں نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں قریب ہی پولیس کی جیپ کھڑی تھی۔ اندھا دھند بھاگتا ہوا اُس میں جا بیٹھا۔ پولیس کے سپاہی جلسہ گاہ کے ڈائس کی طرف دوڑ رہے تھے۔ جیپ کی چابی اگنیشن ہی میں تھی۔ میں نے جیپ اسٹارٹ کی اور ہوا جیسی رفتار سے اسے چلاتا ہوا میں اُس جیپ کے پیچھے لپکا جس میں شوکت سوار تھا۔ وہ اُس وقت تک خاصا آگے نکل چکا تھا مگر میں نے اسے مہلت نہیں دی۔ جیپ کو میں نے پوری رفتار سے آگے بڑھا کر فاصلہ کم کیا پھر جونہی وہ کچی سڑک کا موڑ کاٹنے لگے میں نے چلتی جیپ میں سے اسٹین گن سیدھی کر کے ڈرائیور پر گولی چلا دی۔ وہ نشانے پر بیٹھی اور ڈرائیور اسٹیرنگ وھیل پر قابو نہ رکھ سکا تھا۔ گولی اس کی گردن میں لگی تھی۔ جیپ نے قلا بازی کھائی

اور لڑھک کر ایک درخت میں جا لگی۔

اُس سے کچھ فاصلے پر اپنی جیپ روک کر میں اُترا اور اسٹین گن سیدھے ہاتھ میں لے کر اُن کی طرف دوڑا۔ جیپ کے پچھلے حصے میں تین آدمی اوندھے پڑے تھے۔ شوکت کے ماتھے میں گولی لگی تھی اور وہ زندگی کے عذاب سے چھوٹ چکا تھا۔ دوسرے دو آدمی زخمی تھے اُن پر ایک نظر ڈال کر میں ڈرائیور کی طرف بڑھا۔ وہ بھی جان ہار چکا تھا۔ جیپ کے اندر ہر جگہ خون ہی خون تھا۔ میں ابھی انہیں دیکھ ہی رہا تھا کہ پولیس کے سپاہی اور ڈھلوں صاحب کے چار گن مین بہت سے لوگوں کے آگے آگے بھاگتے ہوئے میرے قریب آ پہنچے۔

آتے ہی برکت نے مجھے کھینچ کر اپنے قریب کیا اور سرگوشی میں بولا "ہاشم صاحب! آپ اُدھر چلے جائیں ڈھلوں صاحب بچ گئے ہیں۔ آپ فوراً اُدھر چلے جائیں یہ اُن کا حکم ہے۔"

اس کی یہ بات سنتے ہی میں لوگوں کی بھیڑ کو چیرتا ہوا جلسہ گاہ کی طرف دوڑا۔ ڈھلوں صاحب اس وقت اسٹیج سیکرٹری عاشق علی پر جھکے ہوئے تھے اور وہ بیچارا زندگی ہار چکا تھا۔ دائیں ہاتھ دو اور آدمی شدید زخمی پڑے تھے اُن کی کراہیں سُنی نہیں جاتی تھیں۔

"یہ کیا ہو گیا ڈھلوں صاحب، یہ کون صاحب ہیں؟"

میری یہ بات سنتے ہی ڈھلوں صاحب اچھل کر سیدھے ہوئے اور مجھ سے لپٹ گئے۔ "اوہ ہاشم صاحب آپ نے آج ہماری زندگی بچا لی ہے میں کس مُنہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔"

"یہ میرا فرض تھا مجھے افسوس ہے کہ میں اِن لوگوں کو نہ بچا سکا۔"

"اُن کا نشانہ یہ نہیں تھے میں تھا، میں۔ اُن کی اگلی گولی شاید مجھے ہی لگتی۔" وہ تشکر سے لبریز لہجے میں بولے، پھر اچانک فاصلے پر کھڑی دونوں جیپوں کو دیکھ کر بولے "آپ اندر چلے جائیں۔ اوئے داؤ! انہیں مہمان خانے میں پہنچا دے فوراً اور کسی کو ان کے پاس پھٹکنے نہ دو۔ آپ جائیں میں سب کچھ سنبھال لوں گا۔"

داؤد بھی اُن کا گن مین تھا وہ مجھے اسی وقت اپنے ساتھ لے کر حویلی میں جا گھسا اور پھر کچھ ہی دیر بعد میں اسی کمرے میں جا بیٹھا تھا جہاں اُن لوگوں نے مجھے پہلے دن ٹھیرایا تھا۔

"آپ نے کمال کر دیا صاب جی! اگر آپ نہ ہوتے تو آج چوہدری صاحب زندہ نہ بچتے۔" داؤد نے میرے قریب دری پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کون لوگ تھے وہ؟ انہیں جانتے ہو تم؟"

"پتہ نہیں جی۔ میں نے اُن کی شکلیں بھی نہیں دیکھیں۔"

"ڈھلوں صاحب کے کوئی مہربان ہی ہوں گے۔"

"بالکل جی۔ ہیں وہ اِن کے ہی دشمن! ابھی پتہ چل جائے گا۔ ڈھلوں صاحب انہیں معاف تھوڑی کریں گے۔"

"وہ تو شاید مر چکے ہیں۔ میں نے انہیں بھون ڈالا ہے۔ ایک بھی صحیح سالم نہیں ہے۔"

"کتنے آدمی تھے وہ؟"

"چار۔"

"سب مر گئے؟"

"نہیں، دو مرے ہیں۔ دو شاید زخمی ہیں۔ پر داؤد! یہ قصّہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔"

"او جی لعنت بھیجو اس قصّے پر۔ یہ سیاسیات ایسی ہی ہوتی ہے۔ یہ پارٹی بازی کی لعنت ہے۔"

"تیرا کیا خیال ہے یہ آدمی کس نے بھیجے تھے؟"

"او جی میں نے کہا نا کہ ڈھلوں صاحب کے کسی دشمن نے ہی یہ کام کیا ہوگا۔ تھوڑے کتے بلّے موجود ہیں یہاں۔ وہ ممبری مانگتے ہیں جن کو ماں نہ پہچانے وہ لیڈر بن جاتا ہے پر ووٹ کوئی کھمبوں کو تو نہیں مل سکتے ہیں نا جی! کوئی آدمی ہو، کوئی تگڑی پگڑی والا بندہ ہو۔ کوئی رُعب ہو کوئی دولت ہو تو آدمی ممبری کے لیے کھڑا بھی ہو اب چوہے بھی کہیں ہیں لیڈر مانو یہ بات کہاں چل سکتی ہے۔" داؤد فلسفہ بگھار رہا تھا۔

"یار تو جا میرے لیے چائے لا۔ میں بہت تھک گیا ہوں۔ یہ چکر بھی دیکھنا تھا مجھے۔"

"اچھا صاحب جی! چائے میں ابھی لا دیتا ہوں آپ کو، آپ ادھر ہی بیٹھیں۔ اور باہر مت نکلیں۔ وہ علی زئی بھی پہرے پر آ بیٹھا ہے۔" یہ کہہ کر داؤد کمرے سے باہر نکل گیا۔ علی زئی واقعی مہمان خانے کے صحن کی چار دیواری کے چھوٹے سے دروازے پر آ بیٹھا تھا۔ اُسے کسی نے خاص طور پر وہاں بھیج دیا تھا۔ اور یہ میں تسلیم نہیں کر سکتا تھا کہ اُسے ڈھلوں صاحب نے اس افراتفری میں میری ناکہ بندی کے لیے وہاں کھڑا کر دیا تھا۔ داؤد باہر نکلا تو میں نے اپنی اسٹین گن کا چیمبر کھول کر صاف کیا اور پھر اس میں ٹھساٹھس گولیاں بھر کر اُسے بستر پر پڑے گدّے کے نیچے رکھ دیا۔

داؤد چائے بھی لے آیا۔ وہ میں نے پی بھی لی مگر ڈھلوں صاحب واپس نہیں آئے۔ علی زئی بڑی معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ جب داؤد چائے کے برتن اُٹھا کر واپس گیا تو علی زئی میرے کمرے میں آ گیا، بولا۔ "سلام ہاشم صیب۔"

"کیا حال ہے خان تگڑے؟"

"بالکل تگڑے ہاشم صیب! ذرا سنبھل کر بیٹھو وہ شاید پولیس والا ادھر آ رہا ہے۔"

"پولیس والا؟ کون ہے اُن کے ساتھ؟"

"وہ اُدھر سامنے ڈیوڑھی کے پاس کھڑی ہے تھانیدار اور سپاہی۔ ذرا چوکس بیٹھو۔"

یہ کہہ کر وہ اُسی وقت باہر نکل گیا۔ اُس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ پولیس کے دو سپاہی اور ایک تھانیدار کچھ ہی دیر بعد وہاں آ گئے۔ ڈھلوں صاحب اُن کے ساتھ تھے۔ میں نے ان لوگوں کو پہلی بار غور سے دیکھا۔ ان میں ایک سپاہی رستم خان بھی موجود تھا اور اُسے میں نے کچہریوں میں پیشی کے دوران کئی بار دیکھا تھا۔ ایک دفعہ وہ مجھے مجسٹریٹ کے پاس لے کر گیا تھا۔ وہ اس زمانے میں سپاہی تھا اور اب ہیڈ کانسٹیبل بن چکا تھا۔ وہ سب ایک ساتھ کمرے میں داخل ہوئے تو میں کرسی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"جمیل صاحب یہ ہیں میرے محسن ہاشم خان۔ دیکھیں یہ میرے مہمان ہیں میں انھیں کسی مصیبت میں نہیں پھنسانا چاہتا۔"

جمیل اُس تھانیدار کا نام تھا جو ڈھلوں صاحب کو مجبور کر کے مجھ تک آ پہنچا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی کرنجی رنگ کی آنکھیں سفّاکی اور عیّاری کی مظہر تھیں۔ اس نے بڑی گرمجوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا تو اس کے پنجے کی گرفت نے مجھے چونکا دیا۔ اس کی ہتھیلی سرد اور سخت کھُردری تھی۔

"ان سے ملنا تو بہت ضروری تھا ڈھلوں صاحب! میں سمجھتا ہوں انھوں نے بڑی جرأت کا مظاہرہ کیا ہے مگر ادھر دو آدمی مر گئے ہیں، دو شدید زخمی ہیں۔"

"میرا بھی تو ایک آدمی مر گیا ہے عاشق علی اور دو شدید زخمی ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے مگر یہ میرا فرض ہے کہ اس فساد کے سارے حقائق سامنے رکھوں۔" یہ کہہ کر جمیل احمد کرسی پر بیٹھ گیا۔

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں جمیل صاحب!"

"آپ کی پریشانی میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔ ہاشم صاحب پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔"

"یہ میرے گن مین نہیں ہیں، میرے مہمان ہیں۔"

"میں سمجھتا ہوں مگر مقدّمے میں اُن کا نام تو ضرور ہی آئے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ جرم ان لوگوں نے کیا ہے۔ حملہ انھوں نے کیا ہے مگر آپ کو بچانے والے اور اُن کے دو آدمی مارنے والے کا نام ہم مقدمے سے کیسے نکال سکتے ہیں؟"

وہ سپاہی رستم خان مجھے گہری گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا اور مجھے احساس ہو رہا تھا کہ وہ مجھے بڑی حد تک پہچان چکا ہے مگر وہ ابھی تک کچھ نہیں بولا تھا۔ میں نے عمداً منہ نہیں کھولا۔ اُن کے سامنے چپ بیٹھا رہا کیونکہ میری آواز سُن کر رستم خان کا شک اور زیادہ پختہ ہو جاتا اور وہ مجھے پوری طرح پہچان لیتا۔ میں اپنی شناخت کو اس سے بچانے کے لیے میں خاموش رہا۔ ڈھلوں صاحب سخت متذبذب تھے، بولے۔

"میں کہتا ہوں کہ ان لوگوں پر گولی میرے گن مین شفیع نے چلائی تھی۔ دس آدمی گواہی دیں گے کہ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ پھر۔۔۔ پھر کیا کریں گے آپ؟"

جمیل احمد اُن کی یہ بات سُن کر بڑی عیاری سے مسکرایا۔۔۔ بولا۔ "اسے بچوں کا کھیل نہ سمجھیں یہ بڑی خوفناک بات ہے آپ قانون کے ساتھ کبڈی نہیں کھیل سکتے۔"

ڈھلوں صاحب نے اُس کی یہ بات سُنی تو جیب سے سگریٹ نکال کر بولے۔ "میں اپنے اس مہمان کو کسی چکر میں نہیں پڑنے دوں گا۔ قطعاً قطعاً نہیں۔ آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔ بس یہ سارا قصہ آپ شفیع گن مین کے کھاتے میں ڈال دیں۔"

"یہ نہیں ہو سکتا ڈھلوں صاحب! میں نے اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا ہے اور پھر جب ان پر کوئی حرف نہیں آ سکتا ہے تو آپ کیوں اتنے پریشان ہیں؟"

"میں نے کہا نا کہ یہ میرے مہمان ہیں اپنی جان پر کھیل کر انھوں نے میری جان بچائی ہے میں کیسے انہیں کچہری تھانے کے چکر میں ڈال دوں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔"

اچانک رستم خان نے جھک کر جمیل احمد کے کان میں کچھ کہا۔ جمیل احمد ایک دم سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اس کی نظروں میں ایسی چمک ابھر آئی تھی کہ مَا یَد و شَاید۔ اُس نے اپنا دایاں ہاتھ پستول پر رکھ لیا تھا اور رستم خان اب پھر تن کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اپنی رائفل اُس نے کچھ اس انداز سے پکڑ لی تھی کہ وہ اُسے ایک ثانیے کے ہزارویں حصے میں مجھ پر تان سکتا تھا۔ یہ بڑی ہی خوفناک صورتِ حال تھی۔ ڈھلوں صاحب کی ساری پیش بندیاں رائیگاں جا رہی تھیں ۔۔۔ میری شناخت کو چھپا لینے کے لیے وہ جتنے بھی حیلے بروئے کار لا سکتے تھے لا چکے تھے مگر اب تک انہیں مسلسل ناکامی کا منہ دیکھنا پڑ رہا تھا۔

"آپ کا کیا نام ہے جناب!" جمیل احمد نے بڑے ہی اپنائیت بھرے لہجے میں مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ وہ یوں میری آنکھوں میں جھانک رہا تھا جیسے وہ میرے دروں بروں کو کھنگال کر رکھ دے گا۔

"ان کا نام ہاشم خان ہے یہ جھنگ سے آئے ہیں۔" ڈھلوں صاحب نے تیزی سے کہا۔ یہ غالباً ان کی زندگی کا پہلا موقع تھا کہ وہ ایک چھوٹے سے پولیس اہلکار کے سامنے اپنی تمام تر شان و شوکت اور دبدبے کے باوصف بے بس ہو گئے تھے۔

"انھیں بات کرنے دیں نا، میں ان سے مخاطب ہوں۔"

ڈھلوں صاحب ایک دم تاؤ کھا گئے اور کرسی پر سے اٹھ کر بولے۔ "براہِ کرم آپ یہاں سے چلے جائیں۔ میں اپنے مہمان کی توہین برداشت نہیں کر سکتا۔"

اُن کی یہ بات سُنتے ہی جمیل احمد کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ نئی نسل کا نمائندہ کوئی بہت ہی سرپھرا اور راستباز قسم کا تھانیدار تھا۔ ڈھلوں صاحب سے وہ شمّہ بھر مرعوب نہیں ہو رہا تھا، بولا۔

"آپ مجھے دھونس نہیں دے سکتے ہیں ڈھلوں صاحب! میں نے بڑی پگڑیاں اور بڑے شملے دیکھے ہیں۔ میں جانتا ہوں یہ آدمی کون ہے اور میں اسے گرفتار کر کے رہوں گا۔"

"یہ میری حویلی ہے کسی مزارع کا گھر نہیں، سوچ کر بات کرو۔ تمھاری لاشیں بھی یہاں نظر نہیں آئیں گی۔"

یہ کہہ کر ڈھلوں صاحب نے دیوار میں لگے ایک سوئچ کو دبا دیا۔ چاروں طرف خوفناک قسم کی سیٹی بجنے لگی اور ابھی انھوں نے اس سوئچ پر سے ہاتھ نہیں اُٹھایا تھا کہ دس آدمی خوفناک قسم کی ٹامی گنیں اور اسٹین گنیں لے کر علی زئی کو دروازے سے اچھال کر پرے پھینکتے ہوئے برآمدے میں آ گئے۔ جمیل احمد نے یہ صورتِ حال دیکھی تو گھبرا گیا۔ وہ تو خیر ہوئی کہ اس نے پستول خول میں سے نہیں کھینچ لیا تھا۔ ورنہ میں اپنے کوٹ کی جیب میں رکھے کمانی دار چاقو کو اندر ہی اندر کھول کر ہاتھ میں لے چکا تھا۔

"کیا خیال ہے پھر؟ اپنی ضد سے باز نہیں آئیں گے آپ؟" ڈھلوں صاحب نے بڑے ہی گمبھیر لہجے میں کہا۔ رستم خان اور اس کے ساتھ کھڑے سپاہی کا رنگ بھی فق ہو گیا تھا۔ جمیل احمد بہرحال اپنی جگہ ڈٹ کر بیٹھا رہا۔ برآمدے میں کھڑے وہ مسلح آدمی ان لوگوں سے بالکل مختلف تھے جو میں نے وہاں اِدھر اُدھر پھرتے دیکھے تھے۔ وہ سب کے سب ایک ہی طرح کے سیاہ لباس پہنے ہوئے تھے۔ کُرتے اور شلواریں اُن کے چپل بھی سیاہ تھے اور انھوں نے سروں پر جو سیاہ پگڑیاں باندھ رکھی تھیں اُن کے لڑ انھوں نے اس طرح منہ پر باندھ رکھے تھے کہ ان کی صرف آنکھیں ہی نظر آتی تھیں جو اتنی خوفناک اور برمے کی طرح اندر دھنسی ہوئی نظر آتی تھیں کہ میں سمجھا وہ ابھی وہاں لاشیں ڈال دیں گے۔ اُن سب کی آنکھوں میں خون اُترا ہوا تھا۔ وہ ڈھلوں صاحب کے کسی خاص خفیہ مسلح دستے کے آدمی تھے جن کو کسی ایسی ہی ہنگامی حالت میں باہر بلایا جاتا تھا اور مجھے نہیں معلوم تھا... کہ وہ حویلی کے کس حصے میں رہائش پذیر تھے۔

"ٹھیک ہے ڈھلوں صاحب! اب آپ ایسے سرکردہ لوگ قانون کو یوں مذاق بنا لیں تو پھر باقی کیا رہ جاتا ہے۔" جمیل احمد کا لہجہ شکست خوردہ تھا۔

"میں آپ سے ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں میرے چار آدمی پکڑ کر لے جائیں مگر میں اپنے مہمان کو آپ کے حوالے نہیں کر سکتا۔ آپ اپنی کاغذی کارروائی مکمل کریں میں دستخط

کر دیتا ہوں۔"

اُن کی بات سن کر جمیل احمد نے رستم خان سے کہا کہ وہ کاغذات تیار کر دے۔ رستم خان نے کاغذ قلم کی فرمائش کی اور پھر وہ واقعے کی تفصیلات لکھنے بیٹھ گیا۔ اس عرصے میں وہ دس آدمی ٹکڑیوں کی صورت میں سامنے صحن میں جم کر کھڑے رہے۔ اُن کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ ڈھلوں صاحب کے ذرا سے اشارے پر اپنے سامنے کی ہر شے تباہ کر دیں گے۔ میں نے اُن جیسی خوفناک صورتوں کے لوگ زندگی میں بہت کم دیکھے ہیں۔ رستم خان ایک طرف چھوٹی سی میز کے سامنے بیٹھا کارروائی قلمبند کر رہا تھا اور ڈھلوں صاحب تن کر جمیل احمد کے ساتھ۔۔۔ بیٹھے تھے۔ جمیل احمد کے چہرے پر عجیب سی طنز بھری مسکراہٹ اُبھر آئی تھی۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر مجھے یوں دیکھ رہا تھا جیسے کوئی شکاری اپنی بندوق کی زد میں آئے شکار کو دیکھتا ہے۔ اس سے رہا نہ گیا۔ گلا کھنکار کر صاف کرتے ہوئے بولا۔ "یہ کب سے ٹھہرے ہوئے ہیں آپ کے یہ مہمان؟"

"میں ان کے بارے میں آپ سے کوئی بات نہیں کر سکتا۔ ان کا احسان ہے کہ میں اس وقت زندہ سلامت آپ کے سامنے بیٹھا ہوں۔"

"بجا فرمایا آپ نے! یہ واقعی بڑے کمال کے آدمی ہیں اُن کے بہت سے قصے میں پہلے بھی سن چکا ہوں۔" جمیل احمد نے بڑے ہی جمے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟ کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟" ڈھلوں نے پھر بڑے ہی بپھرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں انہیں پہچان گیا ہوں، ڈھلوں صاحب میرا منہ نہ کھلوائیں۔" جمیل احمد نے بڑے صبر سے کہا۔ "میں نہ آپ سے ڈرتا ہوں نہ آپ کے ان مسلح آدمیوں سے۔ میں بہرحال اپنے فرض کو اہمیت دیتا ہوں۔"

"بہت دیکھے ہیں میں نے آپ جیسے فرض شناس۔ اوئے علی زئی اِدھر آ۔"

اُن کی یہ بات سنتے ہی وہ پٹھان پہریدار رائفل لیے اندر آ گیا۔

"ہاشم صاحب! آپ اس کے ساتھ جائیں اور دیکھ اوئے اِن کو اُدھر دوسرے مہمان خانے میں بٹھا دے۔ آپ جائیں ہاشم صاحب۔"

ڈھلوں صاحب کی یہ بات سنتے ہی جمیل احمد نے شکرے سے ایسی تیزی سے پستول نکال کر میرے سینے سے لگا دیا۔

"یہ یہاں سے نہیں جائے گا ڈھلوں صاحب یہ غلام جیلانی اب کہیں نہیں جا سکتا اگر آپ کے کسی آدمی نے کوئی حرکت کی تو میں اسے یہیں گولی مار دوں گا۔"

میں تو سن ہو کر رہ گیا۔ اس پولیس والے نے ہمیں چکرا کر رکھ دیا تھا۔ ابھی تو میں اور ڈھلوں صاحب سمجھ رہے تھے کہ وہ راہِ راست پر آ گیا ہے مگر اُس نے ہمارے سارے اندازے غلط ثابت کر دیے۔ رستم خان نے کاغذ چھوڑ کر رائفل سنبھال لی تھی اور اس کی نال کا رخ ڈھلوں صاحب کی طرف تھا۔ دوسرے سپاہی نے بھی کمرے کے ایک کونے سے رائفل کا رُخ ہماری طرف پھیر لیا تھا۔ ڈھلوں صاحب کا رنگ پہلی بار اُڑتے دیکھا۔ اُن کی بےبسی دیدنی تھی۔ باہر کھڑے ڈھلوں کے مسلح آدمی صورتِ حال کو سمجھ کر تیزی سے برآمدے کے ستونوں کی آڑ لے کر اپنی ٹامی گنیں ہماری سمت پھیر کر چوکس کھڑے ہو گئے۔

"تم۔۔۔ تم کیا کرنا چاہتے ہو جمیل احمد خان۔"

"میں اسے اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔" جمیل نے بڑے سفاک لہجے میں کہا۔ "اس غلام جیلانی کو تو ہم مدت سے ڈھونڈ رہے ہیں یہ ہمارے لیے زندگی اور موت کا سوال بن چکا تھا۔ میں اسے ساتھ لے جا رہا ہوں۔ اُٹھو جیلانی اب تم کسی اور کو بےوقوف بنا سکو گے۔" یہ کہہ کر اس نے پستول کی نال کچھ اور زیادہ گہری میرے سینے میں دھنسا دی اور اتنی آگے دبا دی کہ مجھے اپنی پسلیوں پر بوجھ محسوس ہونے لگا۔ اندازے کی ذرا سی غلطی سے وہاں ہر طرف خون ہی خون بکھر سکتا تھا۔ کئی جانیں تلف ہو سکتی تھیں۔ ان تینوں پولیس والوں سے نپٹنا ڈھلوں صاحب کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں تھا مگر پستول کی نال جو میرے سینے پر ٹھہری تھی۔ تو انہیں یقین تھا کہ میرے دل اور جمیل احمد کی گولی کے درمیان فاصلہ بس چند انچ کا ہی باقی رہ گیا ہے اور یہی وجہ تھی کہ وہ کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھے۔

"اپنے اِن آدمیوں سے کہو وہ یہاں سے چلے جائیں ورنہ میرے لیے فرض پر مر مٹنا کچھ بھی مشکل نہ ہو گا ڈھلوں صاحب!" یہ کہہ کر اُس نے گرجتی ہوئی آواز میں مجھے للکارتے ہوئے کہا۔ "اُٹھ اوئے بازی گر میں دیکھتا ہوں تو کتنے پانی میں ہے۔" یہ بات کہتے ہوئے اُس نے پستول کی نال عین میرے دل کے اوپر رکھ دی۔ اس کا یہ توہین آمیز رویہ دیکھ کر میرا دماغ اُلٹ گیا اور میں کرسی سے اٹھ بیٹھا۔ یوں کہ اٹھتے اٹھتے میں نے دایاں ہاتھ تیزی سے کمبل سمیت جمیل احمد کے پستول پر مارا اور اس کی کلائی پکڑ کر کچھ اس طرح جھٹکا دیا کہ اس کی ہڈی تڑاخ سے ٹوٹ گئی۔ ایک بھیانک چیخ اُس کے منہ سے نکلی اور وہ بائیں ہاتھ سے اپنی جھولتی کلائی پکڑ کر وہیں دوزانو ہو گیا۔ اس ذرا سی مہلت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ڈھلوں صاحب کے آدمی اندر آ گئے اور انھوں نے رستم خان اور اس کے ساتھی سے رائفلیں چھین لیں جمیل احمد کی چیخ نے انہیں خوف سے منجمد کر دیا تھا۔ وہ یہ فیصلہ ہی نہ کر پائے تھے کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ اُن کی مشکل یہ ہوتی ہے کہ جب تک انہیں حکم نہ ملے نہ بندوق کی لبلبی دبتی ہے نہ اُن کے قدم کسی طرح حرکت کرتے ہیں۔ اپنے طور پر ان چند ثانیوں میں یہ فیصلہ ہی نہ کر سکے کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ جمیل احمد اس عرصے میں درد سے نڈھال ہو کر سُدھ بُدھ کھو بیٹھا تھا۔

"اِن کو دوسرے کمرے میں بند کر دو۔" ڈھلوں صاحب نے مسلح آدمیوں کو حکم دیا۔ پھر انہوں نے جمیل احمد کا زمین پر پڑا پستول اٹھا کر اس میں سے تمام گولیاں نکال دیں۔ اُن گولیوں کو ہتھیلی پر رکھ کر میری طرف مسکراتے ہوئے بڑھے۔

"اِن میں سے کوئی گولی آپ کے لیے نہیں بنی ہے ہاشم صاحب!" وہ بہت ہی مطمئن نظر آ رہے تھے چہرہ اُن کا اتنی ساری ذہنی اذیت سہنے کے بعد پھر سے معمول پر آ گیا تھا اور ان کی بشاشت لوٹ آئی تھی۔

"کوئی نہ کوئی گولی میرے لیے بہرحال بنی ہو گی ڈھلوں صاحب۔"

"نہیں! مجھے یقین ہے ایسا نہیں ہو گا۔ مگر حیرت مجھے یہ ہے ہاشم صاحب کہ آپ نے اس کی کلائی کیسے دو ٹکڑے کر دی۔"

"مجھے سخت ہاتھ ڈالنا ہی پڑا۔ یہ حد سے بڑھ گیا تھا ڈھلوں صاحب بہرحال میں آپ کی اس محبت کے لیے شکر گزار ہوں۔"

"مجھے یہاں دس آدمی مارنے پڑتے تو میں آپ کی خاطر مار دیتا ہاشم خان! آپ نہیں جانتے کہ آپ کی جان میرے لیے کتنی قیمتی ہے۔"

"یہ آپ کی نوازش ہے اس کا علاج کروائیں یہ لمبے چکر میں پڑ گیا ہے یہ جمیل احمد۔"

"اب میں اس سے نمٹ لوں گا۔" یہ کہہ کر انہوں نے جمیل احمد کو اپنے آدمیوں کے ذریعے وہاں سے اٹھوا دیا۔ پھر اُن کے ہتھیار علی زئی کو دے کر بولے۔ "اِن کو اِدھر سنبھال کر اسلحہ خانے میں رکھوا دے اور دیکھ ان کا خیال رکھ۔ میں ذرا ایک کام کر آؤں۔"

"مجھے کب تک یہاں ٹھیرنا ہو گا۔ میں ایک ضروری کام سے اِدھر آیا ہوں۔"

"میں بس آدھے گھنٹے تک آ جاؤں گا میرا ملازم آپ کو کھانا لا دے گا۔ میرا انتظار کریں۔"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے نکل گئے۔ میں چاہتا تھا کہ اُن سے آسیہ کے بارے میں بات کروں اُن کو بتاؤں کہ آسیہ پھر بگولوں کی زد میں ہے اس کی زندگی کا چراغ بس بھڑک کر بجھ جانے کو ہے، اسے بچا لینے کی کوشش کریں مگر میں اُن سے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ وہ بہت جلدی میں تھے۔ اُن کے مسائل کا مجھے اندازہ تھا۔ باہر تین آدمیوں کی لاشیں پڑی تھیں کئی آدمی شدید زخمی تھے اور پولیس نے الگ اُن کو حیران کر رکھا تھا۔ ان سب باتوں پر انہیں فوری توجہ دینے کی ضرورت تھی۔ انہیں یہ بھی معلوم کرنا تھا کہ اس شوکت کو کس نے وہاں بھیجا تھا۔ کس کے نام کی گولیاں وہ کس لیے اپنی بندوق میں بھر کر وہاں لایا تھا۔ اس کے مقاصد کیا تھے۔ یہ سب کچھ انہیں معلوم کرنے کا حق تھا مگر اس جمیل احمد نے یا مخمصہ پیدا کر کے انہیں دوسرے ہی چکر میں ڈال دیا تھا۔ ایسے چکر میں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ میں ایک بار پولیس کی داڑھ کے نیچے آ جاتا۔ وہ ریٹا یہی کہتی تھی۔ آبی نے مجھے یہی کہا تھا۔ ریٹا کا نام ذہن میں ابھرا تو میرا دل بھر آیا۔ وہ جان ہار لڑکی ایک بار پھر میرے لیے آسیہ کے ساتھ اس گھر میں ماری گئی تھی لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ اب وہ کس حال میں ہو گی۔ اِن لوگوں نے اس سے سچ اگلوانے کے لیے خدا جانے اُسے کن کن اذیت ناک مرحلوں سے گزارا ہو گا۔ وہ اس ایذا کو برداشت بھی کر سکی ہو گی کہ نہیں۔ وہ جو میری محبت میں جان ہتھیلی پر لیے پولیس کی اتنی ساری گارد کو نظر انداز کر کے جناح باغ میں مجھ تک آ پہنچی تھی جس نے اپنی ایک خوابناک جیت کے بعد پولیس کے ہاتھوں بےحد و حساب پریشانی اٹھائی تھی۔ اس نے ایک بار پھر میرے لیے صلیب اٹھائی تھی۔ میری آنکھیں بہہ نکلیں۔ آسیہ کی تقدیر کی سیاہی نے ریٹا کو بھی آ لیا تھا اور اب خدا ہی جانتا تھا کہ اُن کے بدن کے لعل و گہر کس چکی میں پس رہے ہوں گے۔ وہ اُن سے رو رعایت تو نہیں کریں گے۔ وہ پولیس کے مستقل اہلکار اور اگر کہیں ان خفیہ پولیس کے ڈی ایس پی منان نے انہیں اپنے تیروں کی زد میں لے لیا تو پھر تو ان کا زندہ سلامت بچ نکلنا ناممکن ہو گا۔ ان گنت وسوسے میرے ذہن میں اُبھر رہے تھے اور میری سمجھ میں نہیں آ تا تھا کہ میں کیا کروں۔ زندگی ایسی خارزار وادی میں اُتر آئی تھی کہ ہر قدم پر مجھے اپنا دامن تار تار ہوتا نظر آتا تھا۔ اِدھر جلسہ گاہ میں اس صبح موت کی گرم بازاری نے ڈھلوں صاحب کے لیے جو نئے مسائل پیدا کر دیے تھے وہ میرے لیے سدِّراہ بن گئے تھے۔ میں تو آسیہ کے لیے وہاں تریاق ڈھونڈنے آیا تھا مگر۔۔۔ مگر۔۔۔ میرے ہاتھوں وہ لوگ موت کے منہ میں جا گرے۔ کیا یہ سب کچھ لوحِ محفوظ پر کندہ تھا۔ کیا میں اپنی موت کی سوداگر اسٹین گن میں اُن کے نام کی گولیاں لیے پھرتا تھا۔ کیا میری اس بندوق کی تڑا تڑ اُن کے لیے تھی۔ اس صبح کے تِسار میں جو اندھیرا تھا کیا وہ اس بات کا غماز تھا کہ میرے ہاتھوں اس روز کسی کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے مُند جائیں گی۔ اس شوکت کو مار دینے کا تو میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ اُس کی کمینگی کو تو میں نے جیل میں سو بار نظر انداز کیا تھا۔ پھر۔۔۔ پھر۔۔۔ کیا یہ بھی تقدیر کا کرشمہ ہے کہ اُسے ایک دن میرے ہی ہاتھوں لہولہو ہو کر گزر جانا تھا میرے ہاتھ میں وہ اسٹین گن کا بٹر کسی نے اسی لیے تھما رکھا تھا کہ ایک مقام پر میرا اس شوکت سے آمنا سامنا ہو گا اور میں اس شوکت کا بدن یوں چیر ڈالوں گا کہ اس شہر کا کوئی پرسانِ حال بھی نہ ہو گا۔ اور اب یہ جو جمیل احمد پستول کو تاگڑی کی طرح کمر پر باندھ کر میرے سامنے آیا تھا تو یہ بھی اس کی تقدیر تھی کہ اُس کی کلائی یوں کانچ کی چوڑی کی طرح میرے ہاتھ میں آ کر تڑاخ سے ٹوٹ جائے گی۔ یہ کیسا گورکھ دھندا ہے میرے پروردگار! میں تو کچھ بھی نہیں سمجھ سکا ہوں نہ میری زبان تالو سے لگتی ہے نہ ذہن سوچ کے تارِ عنکبوت سے آزاد ہوتا ہے۔ اور نہ میرے قدم ہی کہیں رکتے ہیں۔ میں کب تک یوں مرا مرا زبان لٹکائے سکون کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہوں گا۔ میری تاسیس میں میرے خدا تو نے یہ کیسی خرابی رکھ دی ہے کہ میرا ہر قدم اُلٹا پڑتا ہے۔ جا بجا میں تال سے بےتال ہو جاتا ہوں میرے لیے جگہ جگہ ہم رنگِ زمیں

دام بچھے ہیں۔ ہر آدمی میرے خون کا پیاسا ہے۔ ہر جا میرے لیے زنجیریں ہنستی ہیں میرے تالم کی کوئی تو حد ہونی چاہیے میرے پروردگار۔ میں وہ تاق گھوڑا تھا جسے ہر قدم پر نحوستوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ شاہ گام بھی ہو تو منحوس ہی ثابت ہوتا ہے اور یہ اس کی تقدیر ہے۔

وہ پولیس والے مجھے جیلانی ہونے کے ناتے سے ہی ہر جگہ گھیر بیٹھتے تھے۔ نام میرے لیے بیفارہ بن گیا تھا۔ میں ہاشم خان بن کر بھی جیلانی ہی رہتا تھا۔ میری پیلی اشرفیاں ہر جگہ کھوٹی ثابت ہوتی تھیں۔ یہ میری تقدیر تھی جو ہر جگہ پھپٹ بائی بن کر مجھے لے تو جاتی تھی مگر پھر وہاں مجھے کسی نہ کسی انبوہِ جانبازاں میں پھنسا کر بھاگ جاتی تھی۔

میں کتنی ہی دیر تک ڈھلوں صاحب کے مہمان خانے میں پڑا اپنے آپ سے الجھتا رہا اور پھر ڈھلوں صاحب کی جگہ شفیع گن مین اندر آ گیا بولا۔

"صاب جی! میں کھانے کے لیے کہہ آیا ہوں بی بی لے کر آ رہی ہوگی سنا ہے اُدھر بڑا یدھ ہو گیا۔"

"کس نے بتایا ہے تجھے؟"

"نیاز علی نے بتایا ہے۔ وہ جو ڈھلوں صاب کے دستے کا خاص آدمی ہے۔"

"ٹھیک کہا ہے اُس نے۔ تم یہ بتاؤ کہ اس جیپ میں کون لوگ سوار تھے جنہوں نے ڈھلوں صاحب پر گولی چلائی تھی؟"

"وہ جی وہ پلید ملک رحمت علی ہے نا وہ بیر آباد کا نیا غنڈہ۔ اس نے بھیجا تھا انہیں۔"

"مگر یار اُسے تو میں نے ڈھلوں صاحب کے حوالے کیا تھا۔ خود وہاں سے پکڑ لایا تھا میں اُسے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر چوتھے روز ڈھلوں صاحب نے اُسے اُدھر جنگل میں چھوڑ دیا تھا۔ وہ مقابلے پر کھڑا تھا نا، اس کا پٹڑہ تو ہو چکا ہے مگر اب وہ اس کمینگی پر اُتر آیا ہے۔" شفیع نے کہا۔

"ہوں! تو یہ بات ہے۔ کون کون تھا وہاں جیپ میں؟"

"وہ جو مر گئے ہیں نا! ان میں سے ایک کا نام شوکت ہے، دوسرے کا لبھا، وہ ڈرائیور تھا۔ تیسرے کا نام حلیم ہے۔ وہ جو چوتھا ہے نا وہ باگھی ہے۔ شوکت کے سوا یہ سب جنت آباد کے رہنے والے ہیں۔"

"وہ کہاں ہے؟"

"یہ گاؤں اُدھر چونیاں کے پاس ہے۔"

"اور وہ شوکت؟"

"اُس کا مجھے معلوم نہیں۔ باگھی نے اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ لبھا اور شوکت مر چکے ہیں۔"

"ہاں! باگھی اور حلیم زخمی تھے۔ یہ سب باتیں انہوں نے ہی بتائی ہیں۔"

"اب کہاں ہیں وہ؟"

"پولیس ان سب کو لے گئی ہے۔"

"عاشق علی کو بھی؟"

"ہاں۔ صابر اور ولی محمد بھی ہسپتال جا بیٹھے ہیں۔"

"کیا ان کے زخم زیادہ گہرے ہیں؟"

"نہیں! وہ بچ جائیں گے۔ یہ چاروں بچ جائیں گے بلکہ ... یہ بتائیں کہ کیا اس تھانیدار کا بازو آپ نے توڑا تھا؟"

"ہاں! مجھے مجبوراً اس پر ہاتھ اُٹھانا پڑا۔"

"وہ آپ کو پہچان گیا ہوگا۔"

"ہاں! اسی وجہ سے۔ اب کیا حال ہے اس کا؟"

"ڈھلوں صاحب نے ان کو راضی کر لیا ہے۔ دس ہزار روپیہ ... انہوں نے اُن کا منہ بند کر دیا ہے ان تینوں کا۔"

"ہوں! بہت اکڑتا تھا وہ جمیل احمد۔"

"وہ تو اب بھی بہت اکڑا ہوا ہے، اُس نے تو ایک پائی ... مگر سنا ہے ڈھلوں صاحب اس کا تبادلہ کروا رہے ہیں اُدھر بھکر کی ... وہاں ریت پھانکا کرے گا بیٹھ کر۔"

"یہ کام کیسے کر لیا ڈھلوں صاحب نے؟"

"لو جی یہ کون سی مشکل بات ہے۔ وہ تحصیلدار اور ڈی سی ... چلتا کر دیتے ہیں۔ کیا کچھ نہیں ہے اُن کے ہاتھ میں۔"

"پر یار، وہ آدمی پھر بھی خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔"

"زیادہ گڑبڑ کریگا تو تو اسے نوکری ہی سے نکلوا دیں گے۔ یہ اُن کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔"

"ٹھیک ہے ادھر جو سپاہی بند تھے وہ شاید چلے گئے ہیں۔"

"انہی کی تو بات کر رہا ہوں وہ دس ہزار لے کر نکل گئے۔ پھیرا تو ان کے لیے فائدے مند رہا۔"

"ڈھلوں صاحب کہاں ہیں اب؟"

"وہ اپنے دوستوں کے ساتھ باہر بیٹھے ہیں کھانا کھلا رہے ہیں انہیں۔ کچھ ہی دیر بعد وہ آپ کے پاس آئیں گے۔"

"ٹھیک ہے تم ذرا کھانا بھجوا دو۔"

ابھی میں یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ ایک عورت بڑا سا طشت ... اندر آ گئی۔ وہ میرے لیے کھانا لائی تھی شفیع نے بڑے ادب سے وہ ... میرے آگے رکھا اور پھر خود ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا۔ میں کھانا کھا ... تھا کہ وہ بولا۔

"ہاشم صاحب آپ کو دیکھ کر مجھے جنگل کے بادشاہ کا خیال ... بڑا دل دیا ہے آپ کو خدا نے۔ آپ جیسا جی دار جوان میں نے ... نہیں دیکھا۔" اس کا لہجہ اس کی عقیدت کا پتہ دیتا تھا۔ میں ... اس مورکھ نے مجھے بہت اونچے سنگھاسن پر بٹھا دیا تھا۔

"کہاں یار! میں چوہے مار آدمی بھلا کیا کر سکتا ہوں۔"

"نہیں صاب جی! آپ فائر نہ کھولتے۔ بس اللہ نے ... غلطی کر جاتے تو یہ محل تباہ ہو گیا تھا۔ کچھ بھی نہ بچتا۔ ...

... خانہ۔ آلو بول جانتے یہاں ڈھلوں صاب اکیلے وارث ہیں ... کے۔"

"... ان کا بیٹا کوئی نہیں ہے؟"

"ابھی تک تو ایک ہی بیٹا ہے ان کا۔ یہ اتنی ساری بیبیاں بھی ... نہیں دکھاتیں۔ بڑے پاپڑ بیلتے ہیں ڈھلوں صاب، پر ... بیل نہیں ہوتی۔"

میں پھر ہنس دیا۔ وہ خلوص کا بندہ ڈھلوں صاحب کا ذہنی طور پر ... ہو چکا تھا۔ اور ان کا نام لے کر جیتا تھا۔

... کھانے کے برتن اُٹھوا کر نکلا تو کچھ ہی دیر بعد ڈھلوں صاحب وہ ... دوستوں کے ساتھ میرے کمرے میں آ دھمکے، بولے۔

"او چوہدری ان سے ملو، یہ ہیں میرے محسن ہاشم خان صاحب ... گولی تھی جو آج مجھے زندگی دے گئی۔"

میں ان کے استقبال کیلئے پلنگ سے اُتر گیا۔

"یہ ہیں چوہدری امتیاز۔ واں رادھا رام کے زمیندار۔" میں نے ... بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا۔ وہ ادھیڑ عمر دوہرے بدن کا ... تھا اور سیاہ شیروانی اس کے فربہ بدن پر ناکافی معلوم ہوتی تھی۔

"آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی چوہدری صاحب۔" میں نے اُسے ... پیش کرتے ہوئے کہا۔

"اور ان سے ملو۔ یہ ہیں چھانگا مانگا کے رئیس چوہدری سردار خان بڑے سخی، بڑے غریب پرور۔"

"چھانگا مانگا کے چوہدری سردار خان۔" میں نے یہ الفاظ اپنے ... دہرائے میرے سامنے ایک تیس پینتیس سال کا بہت خوبرو اور ... تنومند جوان کھڑا تھا جس نے کندھے پر پستول کی پیٹی لٹکا رکھی تھی۔ اس ... پٹی لاچا باندھ رکھا تھا جس پر چمکتی ہوئی سیاہ شیروانی بہت ہی بھلی معلوم ہوتی تھی۔ اس کی مونچھیں پنسل کی لکیر ایسی تھیں چہرہ گورا چٹا۔ آنکھیں بڑی بڑی۔ فراخ پیشانی۔ بنسری ایسی ناک اور بال گھنگھریالے تھے۔ اُسے اپنی مردانہ وجاہت کا احساس بھی تھا۔ اس نے بڑی گرمجوشی سے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا تو میرا مغز ایک دم الٹنے لگا۔ میرے ذہن ... گھما کا سا ہوا اور میری روتی بلکتی منہ بولی بہن مجیدن میرے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ سردار خان کا ہاتھ میرے ہاتھ میں آیا تو میں نے کچھ ایسی سختی سے اُسے آگے کھینچ کر دبایا کہ وہ بلبلا اُٹھا۔ اُس نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچنا چاہا مگر میں نے اپنی گرفت ڈھیلی نہیں کی۔

"تو آپ ہیں چھانگا مانگا کے رئیس سردار خان بڑے سخی، بڑے غریب پرور۔ یہی تعریف کی ہے نا آپ نے ان کی ڈھلوں صاحب۔"

سردار خان حیرت زدہ سا ہو کر میرے تمتماتے چہرے کو دیکھ ... تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ بولا۔

"معلوم ہوتا ہے آپ کو اپنی قوتِ بازو کے مظاہرے کا کچھ زیادہ ہی شوق ہے۔"

"جی ہاں! آپ ایسا جوان سامنے ہو تو یہ شوق زیادہ ہی ہو جاتا ہے۔ باقی تعریفیں نہیں بتائی ہیں آپ نے اِن کی۔"

"ارے بھئی! یہ ہماری برادری کے ہی آدمی ہیں۔" ڈھلوں صاحب نے میرے چہرے پر اُبھرتے ہوئے غصے پر حیران ہو کر کہا۔ میں نے سردار خان کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"جی ہاں! وہ تو اِن اچکن ہی سے ظاہر ہے یہ آپ کی برادری کا خاص یونیفارم ہے۔"

"کیا بات ہے آپ کچھ ناراض معلوم ہوتے ہیں۔ ہمارا یہاں آنا آپ کو پسند نہیں آیا؟" امتیاز صاحب نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔

"جی نہیں! یہ تو اچھا ہوا کہ آپ آ گئے ہیں اور اِن کو بھی ساتھ لے آئے۔ اِن سے تو ملنے کو میں بہت دنوں سے سوچ رہا تھا۔"

میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر میں نے اپنے چپ شاہ کو مٹھی میں لے لیا تھا اور میرے وجود میں دبی ہوئی غصے اور نفرت کی چنگاریاں بھڑکتی جا رہی تھیں۔ مجھے وہ بندوخان یاد آ رہا تھا جس کے دروازے میں سے نکل کر مجیدن نتھ اتروائی کی ذلت سہنے کے لیے سردار خان کی ڈیوڑھی میں جا گری تھی۔

"مجھ سے ملنے کے لیے؟ یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ میں نے تو آج آپ کو پہلی بار دیکھا ہے۔" وہ ابھی تک اپنا پنجہ سہلا رہا تھا۔ جو میری گرفت میں آ کر چیخ گیا تھا۔

"جی ہاں! آپ سے میرا بہت پرانا اور غائبانہ تعارف ہے۔ آپ کے اوصافِ حمیدہ کی وجہ سے آپ کو دیکھنے کا مجھے بہت اشتیاق تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ مل گئے۔" میں نے ڈھلوں صاحب کے طلائی سگریٹ کیس سے نکال کر سگریٹ منہ میں دبا لیا۔

"یہ میری خوش نصیبی ہے صاحب کہ آپ ایسے بہادر آدمی سے میں غائبانہ متعارف تھا مگر میں ابھی تک معمہ بوجھ نہیں سکا ہوں۔"

"بوجھ بھی لیں تو اس پر انعام کوئی نہیں ملے گا۔ لیں ۔۔۔ یہ سگریٹ پئیں اور خدائے حمید و مجید کو یاد کریں جس نے آپ کو یہ عزت دی اور رئیس بنا دیا۔" میں نے اس کی طرف سگریٹ بڑھایا مگر وہ میرے لہجے کے طنز کو محسوس کر چکا تھا، بولا۔

"ڈھلوں صاحب یہ کیسی گفتگو سے نواز رہے ہیں مجھے آپ کے یہ معزز مہمان۔ میں اسے طنز سمجھوں یا تعریف۔"

"ارے نہیں چوہدری صاحب! یہ ایسے ہی مذاق کر رہے ہیں آپ کے ساتھ۔ اِن کی باتوں کا برا نہ منائیں۔ اوئے علی نبی ذرا چائے کے لیے کہہ دے اُدھر برکتے سے۔"

وہ پٹھان پیر بدلہ اسی وقت دروازے سے اُٹھ کر دوسری طرف نکل گیا۔

میرا دل چاہتا تھا کہ میں اسی وقت اس سردار خان کا حساب
کتاب برابر کر دوں مگر میں نے ہاتھ روک لیا۔ ڈھلوں صاحب درمیان
میں تھے۔ وہ ان کا گھر تھا۔ میں ان کے لیے کوئی بدمزگی پیدا نہیں کرنا
چاہتا تھا۔ ورنہ میری مٹھی میں دبا چپ شاہ مجھے اپنی دھات کی
سرد سفاکی سے یہ احساس دلاتا تھا کہ جس سمت میں اسے چلا دوں گا وہ
مجھے مایوس نہیں کرے گا۔ وہ دکھوں کی پوٹ وہ مفلسی کے خونی پنجوں
میں جکڑی ہوئی نازک اندام مجیدن ٹھہر ٹھہر کر میری آنکھوں میں ابھرتی
تھی سبھی مجھے ابھی اس جونا منڈی کے غنڈے شرفو سے بھی نمٹنا تھا۔
جس نے دام کھرے کر لیے تھے۔ مگر وہ سردار خان، اس سے پہلے ہی
میری راہ میں آ گیا تھا۔ میرا برا ہو، اپنی سگی بہن کی خاطر میں بھول
ہی گیا تھا کہ میں نے کسی منہ بولی بہن سے بھی قول ہار رکھا ہے۔ مجھے
اس کی راہ کے کانٹے بھی چننے ہیں۔ یہ حقیقت میں فراموش ہی کر بیٹھا
تھا۔ اور اب مجھے اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا۔ میری بہن اب بھی رنج و
محن کے انہی مراحل میں تھی۔ میں اس کے لیے سب کچھ کرنے کے باوجود
کچھ نہ کر سکا تھا۔ کہیں اس کی وجہ مجیدن تو نہیں تھی۔ کہیں اس مظلوم
کی بددعا تو مجھے نہیں کھا گئی تھی؛ اس نے کہیں آسمان کو تو نہیں پکار
لیا تھا؛ میں جو اب تک اتنی ساری محنت کے باوجود بے نیل مرام
پھر رہا تھا تو اس کا سبب وہ مجیدن تو نہیں تھی جس کے دکھوں کے
ازالے کے لیے میں اب تک کچھ بھی نہ کر سکا تھا۔ میں جو اب تک
ڈھول کی رسی بٹتا رہا تھا تو اس کی وجہ یہ تو نہیں تھی کہ میں نے جتنے
بھی زخم دیکھے تھے اس کے اندمال کے لیے میں کچھ بھی نہیں کر سکا تھا۔

"آپ جانتے ہیں کہ وہ لوگ کون تھے جو چوہدری صاحب
کی جان لینا چاہتے تھے۔" چوہدری امتیاز نے پوچھا۔

"جی مجھے ایک آدمی نے بتا دیا ہے مجھے امید ہے ڈھلوں صاحب
ان کی اچھی طرح مالش کر دیں گے۔"

"ان کا تخم ہی ختم کر دیں گے ہاشم صاحب! وہ ملک رحمت علی
تو چیز ہی کچھ نہیں ہے وہ بنیے کی اولاد۔" امتیاز نے بڑے
دبنگ لہجے میں کہا۔

"یہ سب کام ہاشم صاحب ہی کریں گے جناب! اور کس میں اتنا
دم خم ہے۔" ڈھلوں صاحب نے کہا۔ میں چپ رہا۔ ان کے منصوبے کی
سنگینی میں سمجھ رہا تھا۔ وہ پھر مجھے کسی اپنے نسخے میں استعمال کرنے
کا سوچ رہے تھے۔

"ہاں صاحب ایسا ہیرا آدمی آپ کو مل گیا ہے، اب آپ کو
بھلا کیا فکر ہو سکتی ہے۔" سردار خان نے کہا۔

"جی ہاں! اس میں کیا شک ہے بھلا۔" ڈھلوں صاحب نے
بڑی انکساری سے کہا۔ وہ میرے بارے میں یوں باتیں کر رہے تھے
جیسے کوئی چوگان کا کھلاڑی اپنے نئے خرید کردہ گھوڑے کے بارے
میں اونچا بول بولتا ہے یا کوئی کسان اپنے بیل کے اوصاف
کرتا ہے۔

"سردار صاحب! کتنی عمر ہو گی آپ کی؟" میں ...
چوہدری سردار کے دماغ پر ضرب لگانے کی کوشش ...

"میری عمر! جی بس یہی کوئی پینتیس سال عمر ہو گی ..."

"آپ نے پہلی شادی کب کی؟" میں بہت سنجیدہ ...
میرے لہجے کی چبھن محسوس کر گیا۔

"کیوں؟ کوئی شادی کا دفتر کھول رکھا ہے ..."
میں تپ سا گیا۔" یہ میرے سوال کا جواب نہیں ...
سردار خان!"

"کیا آپ کے سوال کا جواب لازمی ہے؟"

"ہاں! یہ بہت اہم سوال ہے۔ اس سوال کے جواب ...
باتوں کا انحصار ہے سردار صاحب! آدمی کی زندگی اور موت کا ...
ہوتا ہے ایسے سوال پر۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"مطلب تو کوئی بھی نہیں ہوتا۔ میں نے تو یہ پوچھا ...
پہلی شادی کب کی؟"

"ایک ہی تو شادی کی ہے ہم نے زندگی میں۔ وہی پہلی
آخری ہو گئی ہے۔"

"آپ کو سن سال یاد ہو گا؟" میں نے ایک سگریٹ ...

"میری شادی اٹھارہ سال کی عمر میں ہوئی تھی۔" اب ...
اس نے بغیر کسی ہیر پھیر کے بات کی۔

"پہلی اولاد لڑکی تھی یا لڑکا؟"

"لڑکی۔" اب وہ براہ راست میری باتوں کا جواب ...
تھا۔ اور یہ معلوم کرنے کی کوشش میں تھا کہ میں اسے ہانک کر
کس نکتے پر لے جانا چاہتا ہوں۔ وہ میرا مافی الضمیر سمجھنے میں معذور ...
میری تمام باتوں نے اب تک اس پر جو حیرت طاری کی تھی وہ ...
بوجھ سے بچنا چاہتا تھا۔

"کتنی عمر ہو گی اب اس بچی کی؟"

"بس یہی کوئی سولہ سال ہو گی۔"

"ہوں! گڈ! آپ کی بیٹی خاصی خوبصورت ہو گی ..."
اپنے چپ شاہ پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔

وہ ایک دم طیش میں آ گیا۔ "یہ کیا بکواس کر رہے ہیں؟ ...
کیا سن رہا ہوں ڈھلوں صاحب! یہ کس پاگل سے ملوایا ہے آپ ...
یہ کہہ کر وہ کرسی سے اٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں غصہ ابلنے لگا ...
وہ مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"آپ ہوش میں تو ہیں نا بھائی جی! پتہ بھی ہے آپ ...

... رہے ہیں؟" چوہدری امتیاز نے بڑے کٹیلے لہجے میں کہا۔ وہ
... غضبناک ہو گیا تھا۔

"... میں بالکل ہوش میں ہوں چوہدری امتیاز صاحب! سردار خان
... یہ بات پوچھنے کا حق حاصل ہے۔"

"... میں تمہارا دماغ پھاڑ دوں گا۔ تم نہیں جانتے ہو میں کون ہوں؟"
... غراتے ہوئے بولا۔

"... یہ کیا ہو رہا ہے بھئی! میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا۔ ہاشم صاحب
... بات کریں یہ ہمارے معزز مہمان ہیں۔ علاقے کے سب سے
... زمیندار ہیں یہ۔"

"... آپ سے بھی بڑے؟" میں اب بھی بالکل مطمئن بیٹھا تھا اور
... چہرے پر پھیلی ہوئی اطمینان کی رو انہیں حیران کیے دیتی تھی۔

"یہ بڑے چھوٹے کی بات نہیں ہے ہاشم صاحب! یہ ہمارے مہمان
... ہمارے گھر آئے ہوئے ہیں یہ۔"

"... میں سمجھ رہا ہوں ڈھلوں صاحب! میں نے کوئی شراب نہیں
... رکھی ہے مجھے ان سے کچھ پوچھ تو لینے دیں۔"

"کیا پوچھنا چاہتے ہو تم! آخر تم ہو کون؟ ہمارے منہ لگنے
... تمہیں جرأت کیسے ہوئی؟ ہم تو تم ایسوں کی آنکھیں نکلوا دیتے
... تم نے سمجھا کیا ہے مجھے۔"

"آپ نے اچھی سزا تجویز کی ہے میرے لیے اور مجھے بھی اچھا راستہ
دکھایا ہے آپ نے، مگر میں پوچھتا ہوں کہ آپ کی بیٹی خوبصورت ہے نا!"
میری یہ بات سنتے ہی اس نے اپنے پستول کی طرف ہاتھ بڑھایا
لیکن میں نے اس سے پہلے ہی اپنا چپ شاہ اس پر تان لیا۔

"اتنی تیزی ٹھیک نہیں سردار خان! بہتر یہی ہے کہ میری بات
کا اطمینان سے جواب دو۔ یاد رکھو میرا نشانہ کبھی خطا نہیں جاتا اور یہ
... کو بے آواز مارتا ہے۔"

سردار خان کا ہاتھ جہاں تھا وہیں رک گیا۔ امتیاز کی حیرت سے
... آنکھیں پھٹی جاتی تھیں اور ڈھلوں صاحب تو یوں ہو گئے جیسے
... ان پر سکتہ طاری ہے۔

"یہ سراسر زیادتی ہے ڈھلوں صاحب! میں آپ کی وجہ سے
... کچھ نہیں کہہ رہا ورنہ ۔۔۔۔۔"

میں کرسی سے اٹھا اور تن کر اس کے سامنے جا کھڑا۔ اس کا
پستول میں نے خول سے نکال لیا۔

"ورنہ کیا؟ ۔۔۔ ورنہ کیا کرتے تم سردار خان۔ بیٹھ جاؤ اور
... بات کا جواب دو۔ جو پوچھتا ہوں وہ بتاؤ۔ بیٹھ جاؤ۔"
... کہہ کر میں نے اس کا پستول جیب میں رکھ کر اسے گریبان سے
... اور جھٹکا دے کر کرسی میں دھنسا دیا۔

"آپ بھی بیٹھ جائیں چوہدری امتیاز صاحب! کبھی کبھی
آدمی کے حساب کتاب کی گھڑی اچانک ہی سر پر آ پہنچتی ہے
بیٹھ جائیں۔"

"یہ ڈرامہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے ہاشم صاحب مجھے کوئی
غلط قدم اٹھانے پر مجبور نہ کریں یہ میرے معزز مہمان ہیں۔"

"مجھے افسوس ہے ڈھلوں صاحب! مگر میں صبر نہیں کر سکتا۔
یہ فیصلے کی گھڑی اچانک میرے سامنے آ گئی ہے میں رک نہیں سکتا۔
آپ سے میں صرف انصاف چاہتا ہوں۔"

ڈھلوں صاحب میرے پہلو کی کرسی پر بیٹھے تھے انہوں نے
سامنے بیٹھے اپنے دونوں مہمانوں کو بڑی بے بسی کی نظر سے دیکھا
ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا تلملا کر بولے۔

"آخر کس گھڑی کی بات کر رہے ہیں آپ؟ کیا قصور کیا
ہے انہوں نے آپ کا؟ آتے ہی آپ نے انہیں ذلیل کرنا شروع کر
دیا۔ ان کا ہاتھ اتنا دبایا کہ چیخ اٹھے۔ پھر ان پر آپ نے طنز
شروع کر دیا۔ آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟" ڈھلوں صاحب بہت
پریشان تھے۔

"میں ۔۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ میرے سیدھے سادے
سوالوں کا سیدھا سادا جواب دیتے جائیں۔"

"آپ کا سوال کسی بھی شریف آدمی کے لیے قابل برداشت نہیں ہے۔"

"مگر ان کے لیے ہونا چاہیے میرے بادشاہ! یہ اس کتاب
کو خود کھول چکے ہیں جس میں یہ سوال سب سے پہلے پوچھا جاتا ہے۔"

"کیا مطلب؟ میں اب بھی کچھ نہیں سمجھا ہوں۔ آپ کب سے
جانتے ہیں انہیں؟"

"انہیں میں بہت دنوں سے جانتا ہوں ڈھلوں صاحب!
ان کی یہ نورانی صورت البتہ میں نے آج دیکھی ہے اور آج ہی وہ
فیصلے کی گھڑی بھی آ گئی ہے مجھے ان سے بات کر لینے دیں۔"

"میں اس لب و لہجے میں آپ کو اپنے معزز مہمانوں سے
کوئی بات کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔" ڈھلوں صاحب نے
فیصلہ کن انداز سے کہا۔ پھر میرے کوٹ کی دائیں جیب میں ہاتھ
ڈال کر انہوں نے سردار خان کا پستول نکال لیا۔ بولے "کسی
شریف آدمی کو اس کے ہتھیار سے محروم کرنا مردانگی نہیں ہے۔
یہ پستول میں انہیں واپس دے رہا ہوں۔"

یہ کہہ کر انہوں نے سردار خان کو اس کا پستول دے دیا۔
وہ اپنے ہتھیار کو اس کے خول میں رکھ کر اٹھا اور بولا۔

"چلیں چوہدری صاحب میں یہاں ایک منٹ بھی نہیں بیٹھنا
چاہتا۔" امتیاز صاحب بھی اپنی جگہ سے اٹھ گئے اور پھر
میں نے اپنا فیصلہ بدل دیا۔ کیونکہ میں ڈھلوں صاحب کو کسی بھی طرح
پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ بلاشبہ ان کا گھر تھا اور وہ

ان کے معزز مہمان تھے۔ وہاں کسی بھی قسم کا ہنگامہ ڈھلوں صاحب کی آزردگی کا سبب بنتا۔ اس لیے میں چپ رہا اور ڈھلوں صاحب ان دونوں کو ساتھ لے کر اسی وقت باہر نکل گئے۔

جب سردار خان برآمدے میں پہنچا تو میں نے سنا، وہ کہہ رہا تھا۔ "یہ تو مجھے کوئی پاگل معلوم ہوتا ہے چوہدری صاحب! یہ اپنے حواسوں میں نہیں ہے۔"

مگر ڈھلوں صاحب اس کا ہاتھ دبا کر اسے آگے لے گئے۔ وہ اسے سمجھا رہے تھے کہ اب وہ میرے بارے میں کوئی تبصرہ نہ ہی کرے تو بہتر ہے۔

وہ علی زئی کے پاس سے گزر کر باہر چلے گئے تو میں نے اپنا چپ شاہ پھر سے جیب میں رکھ لیا۔ اس کے لبوں تلے آئی گولی نیچے چلی گئی تھی۔ میں نے اسے سردار خان کے بدن میں اترنے سے روک دیا تھا۔ اس کی زندگی کو میں نے کچھ اور ڈوز پلا دی تھی کہ یہ اس کی تقدیر تھی۔ کیونکہ وہ اس روز میرے ہاتھوں سے بچ کر نکل گیا تھا۔ کیا چیز تھی وہ جس نے اس کو یوں وہاں سے زندہ سلامت اٹھ جانے کا موقع فراہم کر دیا تھا؟ اس سوال کا جواب مجھے نہیں مل رہا تھا۔ اور مجیدن مجھے اس کمرے کے ہر ہر ذرّے کے آئینے میں ہر سُو فریاد کناں نظر آتی تھی۔ میں نے بہت رُخ بدلے۔ ذہن کو بہت موڑا، ہر شے سے اپنی آنکھیں بند کر لیں مگر وہ ہر طرف تھی، ہر سُو تھی اور اس کی وہ اندھی یلغار مجھ پر مسلسل جاری تھی۔ مجھے فرار کی کوئی راہ نہ ملی تو میں بے بس ہو کر بستر پر ڈھے گیا

میرے دل میں شکستہ اور پا بریدہ آرزوؤں نے دھومک دھیّا مچا رکھا تھا۔ یہ کیسی بے بسی تھی کہ وہ سردار خان میرے سامنے بھی آیا مجھ سے ایک تلخ ترش مکالمہ بھی کر گیا مگر میں اسے سمجھا بھی نہ سکا کہ اس نے مجھے جو زخم دیا ہے اس نے مجھے کس حد تک اذیت پہنچائی ہے۔ میں ایک بار پھر بستر سے تڑپ کر اٹھ گیا۔ غسل خانے میں جا کر میں نے اپنی جلتی ہوئی آنکھوں پر پانی کے چھینٹے مارے، اپنے الجھے ہوئے بالوں میں کنگھی کی میرے وہ گھنگھریالے بال تیل کو بھی ترس گئے تھے۔ کتنی تابانی تھی ان میں، مگر اب وہ بجھے بجھے سے نظر آتے تھے۔ میں کنگھی کر رہا تھا کہ مجھے اپنے بالوں میں ایک دھولا نظر آیا۔۔۔ وہ بالکل عیاں تھا اور میری کنپٹی سے ذرا اوپر تھا۔ میرے دل سے ہوک سی اٹھی۔ عمر کچھ ہاتھ اور نیچے ڈوب گئی تھی۔ غموں نے مجھے ڈھا دیا تھا۔ اتنی ساری اذیتوں کو سہہ جانے کے بعد بھی کسی سر میں سفیدی نہیں جھلکے گی تو اور کیا ہوگا۔ نہ زندگی میں کوئی آرام باقی رہا تھا نہ باقاعدگی۔ وقت پر کھانا بھی تو نہیں ملتا تھا۔ بدن اتنے سارے بچوکے کہاں تک سہہ سکتا تھا۔ میں نے کنگھی الگ رکھی اور غسل خانے سے نکل کر برآمدے میں جا پہنچا۔

علی زئی سامنے ہی تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔ بیٹھنے کے لیے پٹھے نے دروازے کے پاس ایک اسٹول ڈال رکھا تھا۔

"وہ کدھر گئے ہیں خان؟" وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا، چوہدری،

"وہ ادھر دوسرے مہمان خانے کی طرف گئی ہے صیب! کام ہے؟"

"کوئی اور بھی مہمان خانہ ہے ادھر؟"

"جی! بڑی بڑی لوگ آتی نا تو وہ ادھر بیٹھتی ہے۔ پر ادھر تو بڑی بڑی لوگ آتی ہی رہتی ہے۔"

"وہ برکت یا شفیع ادھر سے گزرے تو اسے میرے پاس بھیجو۔" یہ کہہ کر میں پھر کمرے میں جا بیٹھا۔ مقدر کا بیٹا جیسے اس روز بھی اتنا ہی بے بس تھا۔ جتنا وہ پہلے روز تھا۔ تقدیر کے دھموکے اسے لے ڈوبے تھے۔ کون کہتا ہے آدمی اپنے حال و مستقبل کا خود مالک ہے۔ یہ کیسی خود مختاری تھی جس کے فریب میں انسان صدیوں سے مبتلا چلا آ رہا ہے۔ ابھی وہ عاشق علی زندہ تھا اور ابھی نہیں تھا۔ کس کو خبر تھی کہ یہ صبح اتنی لہو رنگ ہوگی۔ میں تو اس خون خرابے کے لیے چوگوٹھ نہیں آیا تھا۔ وہ شخص جسے میں نے جیل کے اندر کئی بار نظر انداز کر دیا تھا، جس کی ان گنت زیادتیاں لوگ اس لیے سہہ گئے کہ وہ بہت ہی چھٹا ہوا اور منہ زور بدمعاش تھا اور سب کی اس سے کور کسر دبتی تھی۔ اس نے جیل کے اندر دہشت پھیلا رکھی تھی۔ میں نے بھی اسے للکارنے سے ہمیشہ گریز کیا تھا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ اگر وہ میرے سامنے آ گیا تو اس کا وہ سارا رعب دبدبہ، اس کی وہ دادا گیری سب کی سب ختم ہو جائے گی، اور یہی میں نہیں چاہتا تھا۔ اسی لیے میں اسے نظر انداز کرتا تاکہ اس کی ساکھ نہ بگڑے اور اس کا دھندا چلتا رہے مگر مجھے کیا خبر تھی کہ وہ یوں اس اداس ویران صبح۔۔۔ پردے کے پیچھے بیٹھا گولی کی زد میں آ جائے گا۔ میں نے تو اس بارے میں کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ میرے دل میں تو اس کے خلاف کوئی نفرت نہیں تھی۔ ایسی نفرت ہرگز نہیں تھی جو مجھے اس کی جان لینے پر اکساتی۔ اور اب وہ لاش کی صورت میں کسی ٹھکانے کے کسی آسیب زدہ کمرے میں ٹھنڈے فرش پر پڑا ہوگا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ وہ جو ڈھلوں صاحب کے ساتھ میرے لیے آیا تھا، خود اپنے پاؤں سے چل کر واپس نہیں جا سکے گا۔ کیا یہ سب تقدیر کے فیصلوں کا نتیجہ نہیں تھا؟ اس شوکت کو آج ہی مرنا تھا اور وہ بھی میری ہی گولی سے؟ کیا اس کی ماں نے اسے اس روز کے لیے جنا تھا؟ کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی اور میں بستر پر بیٹھا سگریٹ پر سگریٹ پھونکتا چلا جا رہا تھا کہ اس سے ذہن پر پڑی سوچ کی دھول تحلیل ہو جاتی تھی۔

شفیع کوئی ڈیڑھ گھنٹے بعد میرے پاس آیا۔

"یار تو کدھر نکل گیا تھا۔ وہ ڈھلوں صاحب کہاں ہیں؟"

"وہ تو صاحب جی پتوکی گئے ہیں۔ وہ بندے جو مارے گئے تھے تو ان کے سیاپے کے لیے انہیں ادھر جانا پڑا۔"

"ہوں! وہ سردار خان کہاں ہے؟"

"وہ چھانگا مانگا کا چوہدری چھٹّہ، وہ تو ادھر دوسرے مہمان خانے میں بیٹھا ہے۔ پر صاب جی میں ادھر گیا تھا وہ آپ کو بہت گالیاں دے رہا تھا۔"

"کیا کہہ رہا تھا وہ؟"

"پتہ نہیں! کوئی رگ دبائی ہوگی آپ نے۔ وہ بہت تپا ہوا بیٹھا تھا۔ ڈھلوں صاحب نے بڑی مشکل سے اسے لگام دی۔ کوئی جھگڑا ہو گیا تھا آپ کا اس سے؟"

"ہاں! کچھ ایسی ہی بات تھی۔ امتیاز بھی اس کے پاس بیٹھا ہے؟"

"ہاں میرا خیال ہے کہ وہ اب تک وہاں سے چلے گئے ہونگے وہ کھانے کا انتظار کر رہے تھے۔"

"ذرا پتہ کرو کہ وہ وہاں موجود ہے کہ نہیں۔"

"ٹھیریں! میں برکت سے پوچھتا ہوں کھانا دے کر آیا تھا انہیں۔"

یہ کہہ کر شفیع وہاں سے اٹھا اور باہر نکل گیا میرے ذہنی خلجان کو راہ نہیں مل رہی تھی۔ سردار خان میرے راستے میں نہ ہی آتا تو اچھا تھا۔ میں تو اپنے ایک اور ہی مخمصے میں پھنسا تھا مگر اب اس کے راکھن گول کو توڑنا میرے لیے بہت ضروری ہو گیا تھا۔ میں مجیدن سے شرمسار ہو رہا تھا۔ وہ کچھ اس طرح میرے حواس پر طاری ہو گئی تھی کہ مجھے کسی بھی پہلو چین نہیں تھا۔ میں جب ہی رانگ ہو سکتا تھا جب سردار خان سے میں مجیدن کی ذلت کا انتقام لے لیتا۔ اس سے کم پر میری تسلی نہیں ہو سکتی تھی مگر بیچ میں وہ ڈھلوں صاحب آ کھڑے ہوئے تھے۔ اور وہ اس کو راہ چھینی دیتے جا رہے تھے۔ ورنہ تو میں اب تک اس کا دم برابر کر چکا ہوتا۔

شفیع کوئی پانچ ہی منٹ بعد واپس آ گیا۔ بولا "صاب جی وہ تو کار میں بیٹھ کر لاہور جا چکے ہیں۔"

"لاہور! ادھر کیا لینے گئے ہیں وہ؟"

"یہ سیاپا جو پڑ چکا ہے صاب جی! اس ملک رحمت علی کو بھی باندھنا ہے نا۔ سنا ہے پولیس اسے گرفتار کر کے لے گئی ہے ہیرا آباد سے۔"

"اچھا! ٹھیک ہے ڈھلوں صاحب واپس آئیں تو مجھے ان سے ملوا دو۔ میں یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتا۔"

"ٹھیک ہے صاب جی! وہ آتے ہیں تو میں ان کو ادھر ہی لے آؤں گا اب آپ آرام کریں۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔

میں نے لحاف سیدھا کیا اور اس میں سر دے کر لیٹ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد مجھے نیند آ گئی۔ آنکھ میری جب ہی کھلی جب میں نے علی زئی کی آواز سنی۔ کمرے کا دروازہ بند تھا اور علی زئی برآمدے میں کھڑا بول رہا تھا۔

"وہ سو گئی ہے چوہدری صیب! ابھی نہیں جاگی ہے۔"

"تم ادھر بیٹھو میں اس سے کوئی بات کرنا چاہتا ہوں۔" یہ سردار خان کی آواز تھی۔ میں تڑپ کر بستر سے اٹھ بیٹھا۔ میرا کوٹ کرسی پر پڑا تھا۔ وہ میں نے پہن لیا اور کمبل اوڑھ کر کرسی پر جا بیٹھا۔ عین اس وقت دروازہ کھلا۔ سردار خان بڑے طنطنے سے کمرے میں داخل ہوا۔ دو آدمی اس کے پیچھے تھے۔ وہ خاصے مضبوط جثّے کے لوگ تھے۔ سردار خان کی بھویں تنی ہوئی تھیں۔ اور اس کا چہرہ یہ بتا رہا تھا کہ وہ اپنے غیظ و غضب کو بڑی مشکل سے روکے ہوئے ہے۔ اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے وہ آگے بڑھا۔ وہ تہمد اتار کر شلوار پہن آیا تھا۔ پاؤں میں اس نے بہت ہی چمکدار سیاہ رنگ کا بوٹ پہن رکھا تھا۔

"اچھا ہوا تم جاگ گئے ہو۔ میں تم سے بات کرنے آیا ہوں۔"

"میں خود تمہاری طرف جانے والا تھا۔ بیٹھو۔" میں نے اسی تنے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تمہاری یہ اکڑفوں میری سمجھ میں نہیں آئی ہے آخر تم ہو کیا شے؟ اس لہجے میں مجھ سے بات نہ کرو ورنہ اچھا نہ ہوگا۔"

"بیٹھ جاؤ سردار خان! اور اپنے ان چمچوں کو باہر بھیج دو۔ ورنہ تم بہت پچھتاؤ گے جس بات کا انہیں علم نہیں ہے وہ بھی یہ جان جائیں گے۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟ میرے دوستوں کے سامنے آج تم نے جو بکواس کی تھی میں اس کی وجہ پوچھنے آیا ہوں ورنہ میں واپس نہ آتا۔" یہ کہہ کر وہ بڑی رعونت سے میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے دونوں ساتھی مسلح تھے پستول ان کے کندھوں پر لٹک رہے تھے۔ اور مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اس کے ذرا سے اشارے پر مجھے گولی مار سکتے تھے۔ میں نے اپنے چپ شاہ پر اپنی گرفت مضبوط کر لی تھی۔ اور سردار خان کو علم تھا کہ میں نہتا نہیں ہوں پھر بھی وہ عجیب قسم کی ابلہانہ خود پسندی اور خود آرائی میں مبتلا تھا۔

"تم نے یہ حساب کتاب خود ہی کھولا تھا سردار خان! مت سمجھو کہ تم مجھے دھونس دھاندلی سے زیر کر لوگے۔ تم مجھے نہیں جانتے ہو۔ تم باہر چلو اوئے کیا ٹکر ٹکر منہ دیکھ رہے ہو چلو باہر یہ تمہارے باوا کا گھر نہیں ہے انہیں باہر بھیج دے سردار خان ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔"

"یہ میرے ساتھ ہی رہیں گے تم کیا پوچھنا چاہتے تھے مجھ سے؟"

"بندو خان کو جانتے ہو۔ میں نے اس کے منہ سے تمہارا نام سُنا تھا۔"

"بندو خان! وہ چیکلا چوہدری! تم اُدھر دلالی کرتے ہو؟"

"زیادہ چالاک بننے کی کوشش نہ کرو۔ بندو خان سے تم نے جو کچھ خریدا تھا وہ کہاں ہے؟"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے کہ تم کیا بک رہے ہو۔"

"میں مجیدن کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔ سردار خان وہ میری بہن ہے تم نے اسے کہاں رکھا ہے میں اُس کے بارے میں پوچھتا ہوں۔"

سردار خان کے لبوں پر بڑی ہی غلیظ مسکراہٹ اُبھری۔ وہ کرسی سے اُٹھ گیا اور بولا۔

"چلو بھئی! اب یہاں ٹھہرنا بیکار ہے یہ تو اپنا سالا نکلا رشتے میں حد ہو گئی۔ میں معافی چاہتا ہوں بھائی غلطی ہو گئی۔"

یہ کہہ کر وہ کھل کر مسکرایا اور دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ میرے ضبط کے سارے ہی بند ٹوٹ گئے۔ میں نے چپ شاہ سیدھے ہاتھ میں لے کر اس کی پگڑی پر گولی چلا دی جس کا شملہ خاصا اونچا تھا۔ پگڑی اچھل کر نیچے گری تو وہ تینوں سن ہو کر جہاں کھڑے تھے وہیں کھڑے رہ گئے۔ وہ تینوں میری زد میں تھے۔

"تم یوں نہیں جا سکو گے سردار خان! یوں بالکل بھی نہیں۔ بیٹھ جاؤ اِدھر۔"

اُس نے ایک نظر۔ ایک بڑی ہی بے بسی کی نظر سے اپنے ساتھیوں کو دیکھا اُن کے ہاتھ پستولوں تک نہیں پہنچ سکے تھے۔ حیرت انھیں یہ تھی کہ میرے پستول سے جو گولی چلی اس کا دھماکا نہیں گونجا تھا۔ سردار خان بڑے ہی بجھے ہوئے انداز سے کرسی... پر بیٹھا تو میں نے ان دونوں کے کندھوں پر لٹکتی ہوئی پیٹیاں اُتار لیں۔

"لاؤ پستول اِدھر رکھ دو یہ تمھارے کام نہیں آ سکتے۔"

اُن کے پستول بستر پر پھینک کر میں نے سردار خان کا پستول بھی اس کے کندھے سے اُتار کر اپنے گلے میں ڈال لیا۔

"اب جاؤ تم باہر بیٹھو۔ یہ تمھارے بس کا روگ نہیں ہے۔ بیلوں سے شیر نہیں مارے جا سکتے۔"

وہ دونوں چپ چاپ سر جھکا کر کمرے سے باہر نکل گئے۔ سردار خان کا رنگ فق ہونے لگا تھا صورتِ حال کی سنگینی نے اسے کھل کر رکھ دیا تھا۔

"ہاں اب بتاؤ کہ اس مجیدن کو تم نے کتنے روپوں میں خریدا تھا؟"

"بیس ہزار روپے میں۔"

"نتھ اُتروائی کے لیے؟"

"یہی سمجھ لو۔" اس کا لہجہ بہت ہی بجھا ہوا تھا۔ وہ اپنے سارے طمطراق سے دست کش ہو چکا تھا۔

"اسی لیے میں پوچھ رہا تھا کہ تم اپنی بیٹی کی نتھ اُتروائی کے کتنے ہزار لو گے۔ بہت پیسہ ہے میرے پاس۔ لاکھ دو لاکھ چار لاکھ۔ بولو کیا لو گے؟"

"مجھے ذلیل نہ کرو میں بہت عزت دار آدمی ہوں۔"

"عزت؟ یہ عزت ہے تمھاری۔ بتاؤ وہ میری بہن کہاں ہے؟"

"وہ اب میرے پاس نہیں ہے۔"

"کہاں ہے؟"

"اسے میں نے اپنے نوکر کے حوالے کر دیا تھا۔"

"کیا نام ہے اس کا؟"

"اس کا نام مبشر ہے۔"

"کہاں ہے وہ؟"

"باہر کھڑا ہے میرے ساتھ ہی آیا تھا۔"

"اُسے اندر بلاؤ۔ مگر ٹھہرو۔ مجیدن تمھارے پاس کتنے دن رہی؟"

"دس دن۔"

"ہوں تمھیں بتایا تھا اس نے کہ وہ کون ہے؟"

"مجھے یہ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔"

"وہ تمھاری بیٹی کی عمر کی تھی۔ تمھیں شرم نہیں آئی۔"

"میں نے دام خرچ کیے تھے اور اسے میں ایک کوٹھے پر سے خرید کر لایا تھا۔ یہ ہم ہمیشہ سے کرتے رہے ہیں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ میرے باپ نے انبالہ سے ایک لڑکی خریدی تھی۔ پچاس ہزار روپے میں۔ یہ ہماری روایت ہے۔"

"ٹھیک کہتے ہو تم مگر تم نے یہ تو سوچا ہوتا کہ وہ کسی کی بیٹی کسی کی بہن ہے۔"

"یہ بیکار بات ہے بازار میں ہر شے بکتی ہے اور جو خرید سکتا ہے وہ خرید لیتا ہے۔"

"میں نے تمھیں بتایا ہے کہ اُس سے میرا کیا رشتہ ہے۔"

"میں نہیں مانتا تم ایسا خونخوار آدمی ایسی لڑکی کا بھائی نہیں ہو سکتا یا پھر میں سمجھوں کہ تم بے غیرت تھے بہن کی حفاظت نہ کر سکے کیونکہ چکلے میں بے غیرتوں کی ہی بہو بیٹیاں بکتی ہیں۔"

"مجھے طیش نہ دلاؤ سردار خان! اس مبشر کو اندر بلاؤ۔"

"ادے لبشری اندر آ ذرا۔" اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے آواز دی۔ لبشری تیزی سے اندر آیا تو میں نے اُن تینوں کے پستول

اُٹھائے اور غسل خانے میں پھینک کر اس کا دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ میرا چپ شاہ ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا۔

"جی چوہدری جی! حکم۔"

اُس کی یہ بات سنتے ہی میں نے اُلٹے ہاتھ کا ایک جھانپڑ اُس کے منہ پر دے مارا، وہ دیوار میں جا لگا۔

"تجھے میں نے بلایا ہے سوّر! وہ مجیدن کہاں ہے؟"

"وہ... وہ... اس کو تو میں نے آگے 'ٹور' دیا تھا۔"

اس کی یہ بات سنتے ہی میں نے چپ شاہ جیب میں رکھ کر اس کو گریبان سے پکڑ کر آگے کھینچا اور زمین سے اٹھا کر پلنگ پر پھینک دیا۔ غصّے میں میرے منہ سے گندی گالیاں نکل رہی تھیں۔

"اپنی بہن کو تم نے کس کے آگے ڈالا تھا خنزیر! بتا کہاں ہے وہ؟"

وہ چند لمحے سُن ہو کر پلنگ پر پڑا رہا۔ پھر اس کی نظریں دروازہ پر پڑیں۔ اس کا ساتھی بڑے ہی خوفناک تیور لیے اندر آ رہا تھا۔ ایک کمانی دار چاقو اس کے ہاتھ میں تھا۔ اور دستے پر اس کے ہاتھ کی گرفت بتاتی تھی کہ چاقو زنی پر دو چار باب پڑھ چکا ہو گا۔

"اوئے کتّے کی دُم! تو سمجھتا ہے ہم سب زنخے ہیں۔ ہمت ہے تو اِدھر آ میرے سامنے میں تیری آنتیں کاٹ دوں گا..!"

اس کی یہ بات ابھی منہ میں ہی تھی کہ میں نے پُورے قد سے اُچھل کر اس کے سینے میں دونوں پاؤں سے کچھ اس زور سے ٹھوکر ماری کہ وہ تو چت ہو ہی گیا تھا میرے بھی حواس گم ہونے لگے تھے۔ پختہ فرش پر اپنے زور میں گرتے وقت میں خود کو سنبھال نہ سکا تھا۔ ایک عرصے بعد تو میں نے بدن کو اس آزمائش میں ڈالا تھا۔ وہ پہلے ایسی چستی میرے وجود میں باقی نہیں رہی تھی۔ یا تھی تو اسے برابر کچوکے دے کر صیقل کرنے کی ضرورت تھی۔ میں ابھی اُٹھ نہ سکا تھا کہ سردار خان نے اپنا بھاری بھرکم بوٹ میری کمر میں دے مارا۔ میں نے تلملا کر پہلو بدلا اور پھر دیوار کا سہارا لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ان کا ساتھی ابھی تک چاقو پر بھروسہ کیے ہوئے تھا۔

"ادے علوی کاٹ دے اس کی شاہ رگ اِس کتّے کو مزہ چکھا دے۔" سردار خان نے للکارتے ہوئے کہا۔ وہ علوی چاقو سیدھے ہاتھ میں لے کر پھر اٹھا اور بائیں ہاتھ سے مجھے اوٹ میں لیتے ہوئے بڑے مشاق انداز سے میری پسلی میں چاقو اُتار دینا چاہا۔ مگر اسے دیر ہو گئی۔ میں نے بائیں ہاتھ کی کھڑی ضرب اس کی دائیں طرف جھکی گردن پر مار دی وہ تیورا کر دائیں طرف گرا تو میں نے فرش سے لگی اس کی کلائی پر بوٹ رکھ کر اس کی گردن پر ہاتھ ڈال کر اس کی رگِ احساس مَل دی۔ وہ اسی لمحے فرش پر جھول گیا۔ آنکھیں اس کی کھلی کی کھلی ہی رہ گئی تھیں۔ عین اس وقت مبشر نے مجھے پیچھے سے بڑھ کر کمر سے پکڑنے کی کوشش کی مگر میں نے اس کی کلائی دائیں ہاتھ میں لے کر انگوٹھے کے دباؤ سے جھٹکا دے کر جھکائی تو وہ میری توقع کے عین مطابق تڑاخ سے ٹوٹ گئی۔ وہ بھیانک چیخ مار کر دو زانو ہوا اور پھر دیوار کے ساتھ ڈھے گیا۔ اس کے ہوش برقرار تھے مگر آنکھوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اب دنوں تک اٹھ سکے گا۔

"کیا خیال ہے، میں تمھارا بھی ایک آدھ جوڑ کھول ہی دوں تو اچھا ہے۔" میں نے سردار خان پر غراتے ہوئے کہا۔

وہ کونے میں جا کھڑا اور بہت بُری طرح سہم چکا تھا۔

"تم کیا چاہتے ہو؟"

"میں... میں تو یہ چاہتا ہوں بیٹے... یہ چاہتا ہوں کہ تمھاری بیٹی کو چھانگا مانگا سے جا کر بندو خان کے حوالے کر دوں اور وہ اس کی نتھ اُترائی کے بیس ہزار روپے لے کر اسے میرے حوالے کر دے۔ یہی میں چاہتا ہوں۔"

"میں پھر کہتا ہوں ہاشم خان مجھے ذلیل نہ کرو یہ سودا تمھیں بہت مہنگا پڑے گا۔"

"تیری دُم ابھی تک نیچی نہیں ہوئی۔" یہ کہہ کر میں نے سردار خان کو گریبان سے پکڑ کر کھینچا اور اس کا سر دیوار میں دے مارا۔ وہ بلبلا اُٹھا۔ اس کا رنگ ہلدی ہونے لگا تھا۔ سر میں شدید چوٹ لگنے سے اُس کی آنکھیں پھیل رہی تھیں۔

"بتاؤ مجیدن کہاں ہے ورنہ تم تینوں کو یہیں ختم کر دوں گا۔"

"وہ... اُسے مبشر نے سندھ کے ایک آدمی کے ہاتھ بیچ دیا تھا۔"

"کتنے میں؟"

"دس ہزار میں۔"

"کس کے پاس ہے وہ اب؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ مبشر اس کا نام جانتا ہے۔"

"ٹھیک ہے اس سے پوچھو اور میری بات یاد رکھو۔ اگر اگلے سات دن کے اندر اندر مجیدن کو تم نے دھلوں صاحب کے پاس واپس نہ پہنچایا تو میں تمھاری بیٹی کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کروں گا اور یہ محض دھمکی نہیں ہے۔"

وہ چپ رہا۔ ٹکر ٹکر میرا منہ تک رہا تھا۔

"بولو! جواب دو! کب واپس لا سکو گے اسے؟" یہ کہہ کر میں نے مبشر کو بالوں سے پکڑ کر اُوپر اٹھا دیا۔ "وہ کس کے پاس ہے وہ مجیدن؟"

"وہ ادھر ایک ہاری کے پاس ہے شکار پور میں۔" مبشر نے بڑی ہی مُردہ آواز میں کہا۔ وہ درد سے مرا جا رہا تھا۔

"ٹھیک ہے بچّے! اگر مجیدن کو تم ایک ہفتے تک واپس نہ لائے تو پھر میں ذمہ دار نہ ہوں گا۔ تم تینوں کی میں آنکھیں نکال لوں گا یاد رکھو وہ میری بہن ہے اور تم میرے مجرم ہو۔"

یہ کہہ کر میں نے مبشر کو پلنگ پر گرا دیا۔ درد سے اس کی آواز

بیٹھی جاتی تھی۔ سردار خان کسی حد تک سنبھل گیا تھا اور وہ دیوار کے ساتھ لگا بڑی بے بسی سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔

"جاؤ اب تم تینوں یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ سات دن کے بعد سردار خان میں تم سے ملوں گا۔ یہیں اسی جگہ ورنہ یاد رکھو میرا انتقام تم زندگی بھر نہیں بھول سکو گے۔"

یہ کہہ کر میں نے اُن تینوں کے پستول خالی کر کے مبشر کے کمبل کی جھولی میں ڈال دیے۔ وہ بستر سے اُٹھ گیا تھا اور اپنی ٹوٹی ہوئی کلائی کو بائیں ہاتھ سے تھامے ہوئے تھا۔ سردار خان کی نظریں علوی پر جمی تھیں وہ فرش پر چیت پڑا تھا، اور بے ہوش تھا۔ عین اس وقت شفیع گن مین اندر آ گیا۔ اسے علی زئی حویلی سے بُلا کر لایا تھا۔ شفیع نے کمرے کے اندر کا منظر دیکھا تو اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔

"کیا ہوا سائیں! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟"

"تم ٹھیک دیکھ رہے ہو شفیع! یہ آدمی بے ہوش ہے، اور اس کی کلائی ٹوٹ گئی ہے، سردار خان کے سر میں چوٹ آئی ہے۔ یہ لڑ پڑے تھے آپس میں۔ انہیں یہاں سے اٹھواؤ جلدی کرو۔"

شفیع سٹپٹا کر پیچھے ہٹا اور علوی کی نبض ٹٹولنے لگا۔

"اوئے کھان! جا کر بشیر صاب کو بلا لا۔"

"وہ کون ہے؟"

"وہ جی ڈاکٹر ہے ادھر گاؤں کی ڈسپنسری میں کام کرتا ہے۔"

"اِن کو اُن کے پاس لے جا، اُٹھا اس کوڑے کرکٹ کو۔ یہ سب کچرا ہے پھینک دے باہر اسے۔"

شفیع اور زیادہ پریشان ہو گیا۔ اس نے علی زئی کی مدد سے علوی کو وہاں سے اٹھایا اور باہر لے چلا۔ سردار خان اور مبشر اُن کے پیچھے تھے اور یوں چل رہے تھے جیسے وہ کسی جنازے کے ساتھ ہوں۔

"سات دن کی مہلت ہے سردار خان یاد رکھنا۔" میں نے برآمدے میں نکل کر انہیں للکارتے ہوئے کہا۔ کسی نے بھی مڑ کر نہیں دیکھا وہ سب کے سب چپ چاپ باہر چلے گئے۔

ڈھلوں صاحب ابھی تک واپس نہیں آئے تھے اور سورج نے شام کی دہلیز پر سر رکھ دیا تھا۔ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگا۔ میں جس کام کے لیے وہاں آیا تھا اس کے بارے میں ابھی تک ڈھلوں صاحب سے کوئی بات ہی نہ کر سکا تھا اور وقت دغا دے رہا تھا۔ آسیہ کسی نئے ڈگن میں جا پھنسی تھی۔ اذیتوں کا ایک نیا باب اُس پر کھل چکا تھا اور میرے ہاتھ میں میری ناکامیوں کا بس ایک ڈنڈ دکا ہی پکڑا رہ گیا تھا۔ وہ ڈنڈ دکا جس کی دستگی میرے ہی ہاتھ کی زنجیر بنتی جا رہی تھی۔ زندگی کی ساری چمک دمک ساری رونق ساری جھلملاہٹ ماند پڑتی جا رہی تھی۔ اس کی تمام نر جھلاّ بور چکا جو ند ختم ہو گئی تھی شاید میرے حوصلے پست ہو چکے تھے۔ میں اپنے ہی آپ سے شرمسار ہو گیا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ شام مجھے اتنی اداس، اتنی مضمحل اور اتنی بے رنگ نظر نہ آتی۔ میں خود کو اتنا زیادہ پر بریدہ محسوس نہ کرتا۔

رات کا کھانا کھا کر میں ابھی لیٹا ہی تھا کہ ڈھلوں صاحب اپنے گن مین برکت کے ساتھ تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے میرے کمرے میں آ گئے۔ وہ بہت پریشان دکھائی دیتے تھے۔ برکت کو برآمدے میں روک کر وہ اندر آئے اور بولے۔ "اوہ ہاشم خان یہ کیا غضب کر دیا آپ نے۔ میں نے روکا بھی تھا آپ کو۔ ان سے جھگڑا نہیں کرنا چاہیے تھا آپ کو۔"

"میں نے تو آپ کے سامنے انہیں جانے دیا تھا مگر وہ سردار خان اپنے مسلح آدمی لے کر آ گیا تھا۔ وہ... میں اُسے بُلانے نہیں گیا تھا ڈھلوں صاحب۔" میں نے لحاف اپنے گرد لپیٹتے ہوئے کہا۔

"پھر بھی بندۂ خدا! کچھ تو سوچا ہوتا۔ یہ میرا گھر ہے وہ میرے مہمان ہیں میرے لیے کام کر رہے ہیں میرے سامنے انتخابات کا مسئلہ ہے میری عزت داؤ پر لگی ہوئی ہے۔ یہ کیا کر دیا ہے آپ نے!"

وہ بہت زیادہ تلملا رہے تھے۔

"مجھے افسوس ہے ڈھلوں صاحب! مگر اس سردار خان نے بتایا نہیں آپ کو کہ اس نے کیا کیا ہے کس طرح وہ مجھ پر چڑھ دوڑا تھا۔ وہ پستول لے کر آئے تھے۔"

"مجھے یہ سب کچھ نہیں سُننا ہے ہاشم خان! میرا ایک پہلو مفلوج کر دیا ہے آپ نے۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں مگر سردار خان نے وہ وجہ نہیں بتائی آپ کو۔ میں نے تو آپ کی وجہ سے اسے چھوڑ دیا ورنہ گردن تو اس کی بھی توڑنا چاہتا تھا۔"

"آپ کے پاس کوئی جواز ہو گا مگر میرے پاس کیا رہ گیا ہے معذرت کے لیے مناسب الفاظ بھی مجھے نہیں مل رہے۔"

"میری بات سُنیں ڈھلوں صاحب! میری بہن مجیدن کو اس سردار خان نے ذلیل کرنے کے بعد اپنے نوکر کے حوالے کر دیا۔ اُس نے آگے اسے سندھ کے کسی ہاری کے ہاتھ بیچ دیا۔ بتائیں... میری جگہ بیٹھ کر بتائیں میں کیا کروں۔ اس سردار خان کو میں نے آپ کی وجہ سے زندہ جانے دیا۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ کتنی بہنیں ہیں آپ کی جو یوں خوار ہو رہی ہیں۔ یہ کس بہن کا ذکر کر رہے ہیں آپ۔"

"وہ... وہ میری منہ بولی بہن ہے ڈھلوں صاحب! مجیدن نام ہے اُس کا اور میں اس کی عزت کو سگی بہن سے زیادہ اہمیت دیتا ہوں۔ سردار خان نے سات دن کے اندر اندر مجیدن کو ادھر آپ کے پاس نہ پہنچایا تو میں نے قسم کھائی ہے کہ میں اُس کی اور مبشر کی آنکھیں نکال لوں گا۔ یہ بات میں نے اُسے بتا دی ہے۔ یہ آپ کی حویلی ہے۔ اور اسی لیے میں نے ان کو مہلت بھی دے دی... ورنہ میں ان کی گردن دبا کر انہیں ساتھ لے کر وہاں جاتا جہاں مجیدن

(یہاں) ہو رہی ہے۔ بغیر نکاح کے وہ کسی شہدے کے گھر پڑی سسک (رہی) ہے۔" میں نے بستر سے اُتر کر بوٹ پہنتے ہوئے کہا۔ جب میں (اوور) کوٹ پہن کر کمبل بھی اوڑھ چکا تو ڈھلوں صاحب بڑے ہی مضطرب لہجے میں بولے۔ "یہ تیاری کس لیے کر رہے ہیں آپ؟"

"میں واپس جا رہا ہوں۔ میں تو اپنی ہی ایک بپتا لے کر آپ کے پاس آیا تھا مگر آپ کو میری بات سُننے کی فرصت ہی نہیں ملی — یہاں اور ہی پیچ شروع ہو گیا۔" یہ کہہ کر میں نے گدے کے نیچے سے نکال کر اپنی اسٹین گن کندھے پر لٹکائی۔

"مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو وقت نہیں دے سکا۔ سارا دن صبح کے خونی ڈرامے کے چکر میں پھرتا رہا۔ آپ مجھے بتائیں کہ معاملہ کیا ہے؟"

"نہیں! میرا خیال ہے مجھے آپ کو مزید پریشان نہیں کرنا چاہیے۔"

"یہ کیا کہتے ہیں آپ! میری تو جان بھی حاضر ہے آپ کے لیے، بس اس سردار خان کی ناراضگی میں مول نہیں لینا چاہتا تھا، پر خیر دیکھا جائے گا۔ آپ مجھے بتائیں کہ آپ کس بپتا کی بات کر رہے ہیں؟"

یہ کہہ کر انھوں نے مجھے بڑی رسان سے دوبارہ پلنگ پر بٹھا کر سگریٹ پیش کیا۔ میرا غصّہ قدرے ڈھلا تو میں نے آسیہ کے بارے میں ساری بات انہیں بتا دی۔ وہ حیرت زدہ سے ہو کر وہ سارا قصہ سُنتے رہے جب میں خاموش ہوا تو وہ برآمدے میں بیٹھے ملازم کو پکار کر بولے۔

"اوئے برکت چل اُس برکی سے کہہ وہ ہماری گاڑی باہر نکالے۔" برکت وہاں سے بہت بہتر سائیں کہہ کر ٹلا تو وہ بولے۔

"آپ نے صبح آتے ہی مجھے یہ سب کچھ کیوں نہیں بتا دیا میں جلسے کو چھوڑ کر آپ کے ساتھ چل دیتا۔ یہ معاملہ تو بہت ہی سنگین معلوم ہوتا ہے۔ اب کی بار پولیس شاید اس بات کو کچہری تک بھی نہیں جانے دے گی۔ اُن کے اپنے بھی تو حربے ہوتے ہیں۔" پھر کچھ سوچ کر بولے۔ "آسیہ کو تمھارے کسی ٹھکانے کے بارے میں کچھ معلوم ہے کہ نہیں؟"

"نہیں! نہ وہ کچھ جانتی ہے اور نہ رشیدہ ہی کو میں نے کچھ بتایا ہے۔"

"یہ بہت اچھی بات ہے اور آپ کے حق میں جاتی ہے۔ مجھے یہ ڈر تھا کہ وہ لوگ کہیں آپ کی بو سونگھتے سونگھتے آپ تک نہ پہنچیں اب ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔"

"مجھے اپنا کوئی ڈر نہیں ہے چوہدری صاحب میں تو آسیہ کے بارے میں فکر مند ہوں۔ وہ بیمار ہے اور اُس کا آپریشن کیا گیا ہے۔"

"مجھے احساس ہے۔ اسی لیے تو ہم ابھی لاہور جا رہے ہیں۔ پھر بھی آپ فکر مند نہ ہوں۔ انشاء اللہ وہ دونوں صحیح سلامت ہوں گی۔ اور آسیہ کو تشنۂ علاج نہیں چھوڑ سکتے۔ پولیس کے ہاتھ میں کسی شخص کا مر جانا اُن کی اپنی موت کے مترادف ہوتا ہے — وہ اتنے بے وقوف نہیں ہیں۔ آئیں میرے ساتھ۔"

یہ کہہ کر وہ میرا کندھا تھپتھپاتے ہوئے مجھے حویلی میں سے اپنے ساتھ لے کر باہر نکل آئے۔ ڈیوڑھی کے بڑے دروازے کے سامنے برکی کار لیے کھڑا تھا۔ ڈھلوں صاحب نے پچھلی نشست پر مجھے اپنے ساتھ بٹھایا اور ہم اسی وقت لاہور کی طرف چل دیے۔ گاڑی ذرا سنبھل کر پکی سڑک پر چڑھی تو وہ بولے۔

"اس جمیل احمد کا منہ میں نے بڑی مشکلوں سے بند کیا ہے۔ تبادلے کے خوف سے وہ چپ ہوا ورنہ آپ کی جان نہ چھوڑتا۔"

"وہ اچھا پولیس افسر ہے اپنے فرض کو پہچانتا ہے۔ پھر بھی اگر وہ بہت شور مچاتا تو میں اِدھر اُدھر کھسک جاتا۔" میں نے اس احسان کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا جو ڈھلوں صاحب غیر محسوس طریقے پر جتلا رہے تھے۔

"سردار خان کا آدمی بڑی دیر بعد ہوش میں آیا، اُسے کیا کر دیا تھا آپ نے؟" اُن کے لہجے میں حیرت نمایاں تھی۔

"اُس کے سر پر چوٹ لگ گئی تھی۔" میں نے معاملے کی اصل نوعیت کو اُن سے چھپاتے ہوئے کہا۔

"ہاشم خان! آپ نے ذرا سی دیر میں کئی لوگوں کو اپنا دشمن بنا لیا۔ سردار خان سے آپ کی نفرت کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"انھوں نے کچھ نہیں بتایا ہے آپ کو، اُس سردار خان نے کچھ نہیں کہا آپ سے؟"

"نہیں! وہ تو کہتا ہے کہ آپ خواہ مخواہ اس سے اُلجھ پڑے تھے۔"

"یہ بات نہیں تھی ڈھلوں صاحب! اصل مسئلہ وہی مجیدن کا ہے جو میں آپ کو بتا چکا ہوں۔"

وہ بڑی محویت سے میری بات سنتے رہے۔ جب میں خاموش ہوا تو میرا کندھا تھپتھپا کر بولے۔ "برخوردار! میری مانیں تو اس قصے کو چھوڑ دیں۔ اب مجیدن کی واپسی آپ کو کوئی خوشی نہ دے سکے گی۔"

"یہ آپ کہہ رہے ہیں! مجیدن مجھے آسیہ جتنی ہی عزیز ہے ڈھلوں صاحب! سردار خان نے میری بات نہ مانی تو اسے میں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

وہ میرے لہجے کی تیزی پر سٹپٹا سے گئے بولے۔ "ابھی تو اس بے چاری آسیہ کا مسئلہ حل کرنا ہے ہمیں میری سمجھ میں نہیں آتا میں کس سے بات کروں۔"

"اگر یہ بات ہے تو پھر لاہور آپ کس لیے جا رہے ہیں؟"

"میرا خیال ہے کہ میں ڈی آئی جی سے بات کرتا ہوں۔ مجھے

امید ہے لودھی صاحب اس معاملے میں ہمارے بہت کام آسکتے ہیں ۔"

"ٹھیک ہے۔ میں اسی لیے تو آپ کے پاس آیا تھا" یہ کہہ کر میں نے کار کے بند شیشوں میں سے باہر افق تا افق پھیلی رات کے ہولناک منظر پر نظر جما دی۔ کار بڑی ہی سبک رفتار تھی۔ اور ہموار سڑک پر وہ تیرتی چلی جا رہی تھی۔ ڈھلوں صاحب کسی گہری سوچ میں گم تھے۔ کتنی ہی دیر تک وہ کچھ نہیں بولے۔ جب لاہور سامنے نظر آنے لگا تو وہ ڈرائیور سے کہنے لگے۔ "بھئی ہمیں ادھر شاہ جمال روڈ پر لے چل لودھی صاحب کے ہاں ۔"

"ٹھیک ہے چوہدری صاحب میں اُدھر ہی جا رہا ہوں ہاشم صاحب بھی آپ کے ساتھ جائیں گے؟" برکی نے پوچھا۔

"نہیں، میں انہیں اُن کے سامنے نہیں لے جاؤں گا۔ ہمیں کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہیے ۔"

کچھ ہی دیر میں برکی نے شاہ جمال روڈ پر پہنچ کر کار ایک چھوٹے سے بنگلے کے سامنے کھڑی کر دی۔

"آپ ادھر ہی ٹھہریں ہاشم صاحب! میں ان سے بات کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ بنگلے کے کھلے گیٹ میں داخل ہو گئے۔ برکی نے کار ذرا آگے بڑھا کر درخت کے قریب اندھیرے میں کھڑی کر دی۔ میں چاہتا تھا کہ ڈھلوں صاحب مجھے بھی اپنے ساتھ اندر لے جاتے۔ تاکہ میں بھی جان سکتا کہ اس پولیس افسر کی پوٹ میں کیا ہے۔ اور وہ میرے معاملے پر کیا رائے رکھتا ہے مگر ڈھلوں صاحب کے مغز میں یہ بات آ ہی نہ سکی۔ وہ اپنی احتیاطوں کی اوٹ لیے اندر چلے گئے۔ میری بے کلی ایک دم حد سے بڑھ گئی۔ اور میں برکی سے پچھ کہے بغیر کار سے اتر گیا۔

بنگلے کا دروازہ ابھی تک کھلا تھا معلوم یہ ہوتا تھا، کہ لودھی صاحب کے ہاں کوئی ایسا ملازم نہیں ہے جو دروازے پر پہرہ دے سکے۔ میں اپنے تجسس کی طغیانی میں بہتا ہوا گیٹ کے اندر جا گھسا ڈھلوں صاحب عمارت کے اندر جا چکے تھے۔ میں صحن عبور کر کے بنگلے کے برآمدے میں جا پہنچا۔ وہاں دو بتیاں جل رہی تھیں اور ان کی روشنی مجھے ہولاتے دیتی تھی۔ عمارت کا صدر دروازہ اندر سے بند تھا میں برآمدے سے نکل کر دائیں طرف بڑھا وہاں روشنی نہیں تھی۔ میں دبلے پاؤں چلتا ہوا ذرا آگے بڑھا تو ایک کمرے میں سے مجھے.... ڈھلوں صاحب کے قہقہے کی آواز سُنائی۔ میں وہیں رک گیا۔ حیرت مجھے یہ تھی کہ کوٹھی میں لودھی صاحب نے کوئی کتا بھی نہیں چھوڑ رکھا تھا۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں ڈھلوں صاحب! میں ملنگ آدمی ہوں مجھے گرد و فرد کھانے کا کوئی شوق نہیں۔ خواہ مخواہ سنتریوں کو ادھر باندھ رکھنا مجھے اچھا نہیں لگتا ۔"

"پھر بھی لودھی صاحب کچھ تو کرنا چاہیے آپ کو۔ گیٹ بھی آپ کا کھلا رہتا ہے ۔"

"وہ میرا ملازم ہے نورا۔ وہ کسی کام سے باہر گیا ہے اس نے کھلا چھوڑ دیا ہو گا۔ وہ ابھی آئیگا تو بند کر دے گا۔ آپ یہ بتائیں کہ آپ اس قصے میں کیوں دلچسپی لے رہے ہیں ۔"

"بس ایسے ہی یار! وہ آہو صاحب ہیں نا وہ راوی روڈ والے میں اُن کی وجہ سے یہاں آیا ہوں ۔"

"وہ تو آج کل گاؤں گیا ہوا ہے۔ ہادی علی کی زمینوں کا جھگڑا تو اب وہی ہے نا۔" لودھی نے کہا۔

"مجھے اس نے ہی پیغام بھیجا تھا پرسوں، کہ جیسے بھی ہو سکے میں آسیہ کو پولیس کی حراست سے چھڑا دوں ۔"

"بات یہ ہے ڈھلوں صاحب کہ مجھے ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ دونوں لڑکیاں کس ایجنسی کی تحویل میں ہیں سُنا یہ بھی ہے کہ غلام جیلانی کی گردن اُن کے ہاتھ میں آ گئی ہے اور اب وہ کسی بھی وقت اُسے گرفتار کر لیں گے۔ اُس بدمعاش نے ہم سب کو ذلیل کر دیا ہے بہت ہی عیار آدمی ہے وہ ۔"

"وہ تو صحیح ہے مگر وہ بیچاری بہت زیادہ بیمار ہے۔ اس کا آپریشن ہوا تھا مجھے تو اس کی زندگی کی فکر ہے ۔"

"اس کا مطلب ہے کہ آپ کو اس کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہے؟"

"جو کچھ مجھے معلوم ہے وہ میں آپ کو بتا چکا ہوں ۔"

"آپ بھی کمال کرتے ہیں ڈھلوں صاحب! ہمیں آپ غلام جیلانی دے دیں۔ ہم آپ کو وہ لڑکیاں واپس کر دیں گے، کرتے ہیں یہ سودا ہم سے؟"

"ارے یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ مجھے غلام جیلانی کے بارے میں کچھ معلوم ہوتا تو میں آپ کو بتا نہ دیتا۔" ڈھلوں صاحب نے لودھی کا وار بچاتے ہوئے کہا۔

"اتنا احمق نہ سمجھیں ہمیں! اس آدمی کو ہم ہر قیمت پر پکڑ کر رہیں گے ہیں۔ اس نے ڈی ایس پی ملتان کو بھی ذلیل کر دیا تھا۔ وہ تو اس عورت ماجدہ نے مہربانی کی اور اسے رہا کروا دیا ورنہ وہ تو شاید زندہ سلامت کبھی ہمارے پاس واپس نہ آتا۔" لودھی نے بڑے ہی غضبناک لہجے میں کہا۔ اس کے بعد اس نے ملتان کا سارا قصہ ڈھلوں صاحب کو بتا دیا۔ اس پر وہ بولے۔

"اس ماجدہ کے بارے میں تو مجھے آپ نے بتایا ہے ورنہ اس کے متعلق تو مجھے کچھ بھی معلوم نہیں تھا مگر آپ کو پتہ ہے کہ بڑے صاحب جیلانی کے بہت زیادہ مداح ہیں ۔"

"ہاں! یہ بات بھی ہے۔ وہ بدمعاش اسی لیے بچ نکلتا ہے جیلانی اور میرا خیال ہے کہ پولیس کے کچھ افسر ایسے بھی ہیں جو در پردہ جیلانی کی مدد کرتے ہیں ورنہ ایسا اندھیر کبھی نہ مچتا ۔"

"تو پھر میں کیا سمجھوں؟ مجھے تو اس لڑکی کی زندگی عزیز ہے بیچاری بالکل بے گناہ ہے اسے قید کی سزا بھی بلاوجہ دی گئی تھی ۔"

"مجھے افسوس ہے ڈھلوں صاحب! میں اس بارے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکوں گا کیونکہ اب یہ سارا معاملہ نئے آئی جی صاحب کے ہاتھ میں ہے اور میں قسم کھا سکتا ہوں کہ مجھے نہیں معلوم وہ لڑکیاں کہاں رکھی گئی ہیں ۔"

"آپ معلوم تو کریں۔ ٹیلیفون آپ کے سامنے ہے، مجھے مایوس نہ کریں۔ یہ واقعی بہت پیچیدہ معاملہ ہے۔ اتنا تو آپ بتا سکتے ہیں کہ ہم اس سلسلے میں کس سے بات کریں ۔"

"ٹھیریں۔ میں ایک صاحب سے بات کرتا ہوں شاید وہ ہماری کچھ مدد کر سکیں ۔" یہ کہہ کر لودھی صاحب نے فون کے نمبر گھمائے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ کہہ رہے تھے۔

"ہیلو ارشد صاحب کیا حال ہیں مولانا! یار! وہ جیلانی کی بہن کا کیا بنا، کہاں رکھا گیا ہے اُسے؟ سُنا ہے وہ بہت بیمار تھی ۔"

- - - - - - - - - -

"اچھا! اتنی سخت نگرانی ہے اس کی! مگر اب ہو گا کیا؟ وہ کچھ بتا بھی دے گی کہ نہیں؟"

- - - - - - - - - -

"ہاں! اُسے معلوم تو ہونا چاہیے کہ اس کا بھائی کہاں ہے اس کا اڈہ کون سا ہے ۔"

- - - - - - - - - -

"اچھا ٹھیک ہے۔ مجھے کل بتانا کہ اسے کہاں رکھا گیا ہے اور اس سے کوئی سراغ ملا بھی ہے کہ نہیں۔ جیلانی ہاتھ نہ آیا تو پھر پولیس کو اپنی مونچھیں منڈوانی پڑیں گی۔ قسم اللہ کی۔ بہت ذلیل ہو گئے ہیں یار ہم۔ اچھا مولانا! کل مجھے فون پر اطلاع دو۔ ساری بات معلوم کر کے مجھے ضرور بتاؤ۔" یہ کہہ کر لودھی نے فون بند کر دیا بولا "ڈھلوں صاحب! کل آپ دوپہر کو مجھے ملیں پھر میں شاید آپ کو کچھ بتا سکوں ۔"

"ٹھیک ہے لودھی صاحب اب مجھے بڑے صاحب سے ہی ملنا پڑے گا۔ اس بیچاری کو خواہ مخواہ یہ مصیبت جھیلنا پڑ رہی ہے ۔"

"آپ کی ہمدردیاں میری سمجھ میں نہیں آئیں۔ بہرحال آپ ہو سکے تو آہو کو میرے پاس بھیجیں ۔"

"میں اس سے کہہ دوں گا کہ وہ آپ سے مل لے مگر یہ بتائیں وہ عورت ماجدہ اب کہاں ہے جس نے ملتان کی جان چھڑا دی تھی ۔"

"وہ ادھر ہی ہے، اِسی شہر میں مگر وہ بہت پہنچی ہوئی عورت ہے ڈھلوں صاحب! ملتان کی جان چھڑا کر وہ بھی روپوش ہو گئی اور آہو نے ہمیں بتایا ہے کہ وہ اس کے گھر سے قیمتی زیورات چرا کر بھاگ گئی تھی ۔"

"اور آپ اسے بھی نہیں ڈھونڈ سکے ہیں۔ یہ حالت ہے آپ کی کارکردگی کی ۔"

"ہمیں شرمندہ نہ کریں ڈھلوں صاحب! وہ عورت جیلانی کے گروہ میں شامل ہے ہمیں امید تھی کہ جیلانی اس کے گھر واپس آئے گا۔ وہ سارا قصہ تو آپ کو بتا چکا ہوں۔ بس جیلانی خطرے کی بو سونگھ کر عین اس وقت بھاگ نکلا جب وہ ماجدہ کے گھر سے آٹھ دس مکان دور تھا۔ اُس کی قسمت اچھی ہے ڈھلوں صاحب ورنہ وہ یوں ہر بار بچ نہ سکتا تھا ۔"

ڈھلوں صاحب کچھ حیرت زدہ سے ہو کر بولے۔

"اس ماجدہ کے بارے میں تو مجھے کچھ بھی پتہ نہیں تھا جیلانی کے کارنامے مجھے آہو صاحب نے تفصیل سے بتا دیے تھے اور یہ آہو کی اپنی ہی غرض ہے کہ وہ آسیہ کے بارے میں اتنا پریشان ہے ۔"

"خیر لعنت بھیجیں اس ماجدہ پر۔ اسے تو ہم جلدی ہی پکڑ لیں گے اس کا یار تو ہم نے باندھ لیا ہے وہ فلموں میں کام کرتا ہے آج ہی وہ ہمارے ہتھے چڑھا ہے صبح تک وہ سب کچھ بتا دے گا ۔"

"تو پھر یہ بات طے رہی۔ کل دوپہر کو آپ مجھے کچھ بتا سکیں گے ۔"

"بشرطیکہ آپ کو جیلانی کے بارے میں جو کچھ معلوم ہے وہ آپ مجھے بتا دیں گے ۔"

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ جیلانی سے میرا کیا واسطہ؟ میں نے تو اس کی صورت بھی نہیں دیکھی ۔"

"آپ بھی بہت پہنچے ہوئے بزرگ ہیں ڈھلوں صاحب! بہرحال آپ کل مجھے ملیں۔ میں دیکھوں گا کہ کیا ہو سکتا ہے۔ آسیہ کو چھوڑا جا سکتا ہے مگر اس شرط پر کہ وہ جیلانی کے بارے میں پولیس کو سب کچھ بتا دے ۔"

"اچھا لودھی صاحب اجازت دیں، اب مجھے کوئی اور دروازہ دیکھنا پڑے گا۔ پولیس یا تو اس لڑکی کو عدالت میں پیش کر کے جیل بھیج دے یا پھر اسے چھوڑ دے۔ اس کو یوں بلا اجازت کسی جگہ بند رکھ کر پولیس والے اچھا نہیں کر رہے ۔"

"آپ میرے دوست ہیں ڈھلوں صاحب مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ میں ایک پولیس افسر بھی ہوں اور میری کچھ ذمے داریاں بھی ہیں۔ آپ آسیہ کے پیچھے آ کر اپنی حیثیت بھی مشکوک بنا رہے ہیں ۔"

"آپ کا مطلب میں سمجھ رہا ہوں۔ میری بات غور سے سنیں اس لڑکی کی ماں میرے پاس آئی تھی۔ اس کا دکھ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔ آہو کے بارے میں میں نے جو کچھ کہا وہ غلط تھا اور اب میں اُس بدنصیب ماں کی وجہ سے آسیہ کی پیروی کروں گا۔ ہو سکتا ہے میں کل ہائیکورٹ سے رجوع کروں۔ میں پولیس کو اس دھاندلی کی اجازت نہیں دے سکتا۔ ابھی بڑے راستے کھلے ہیں۔ وہ جیل

سے بھاگی ضرور ہے مگر اسے دوبارہ جیل بھیجا جا سکتا ہے، اس کا مقدمہ دوبارہ عدالت میں پیش کیا جا سکتا ہے مگر یوں کسی پولیس افسر کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ اُسے بے موت مار دے۔"

ڈھلوں صاحب طیش میں آ گئے تھے۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ بہرحال آپ اپنی مرضی کے مالک ہیں۔ جو چاہیں کریں۔" لودھی نے بڑے ہی سرد لہجے میں کہا۔ ان دونوں میں بڑا بُعد پیدا ہو چکا تھا۔

"اچھا خدا حافظ۔" یہ ڈھلوں صاحب کی آواز تھی جس میں ان کی تلملاہٹ بہت واضح تھی۔

میں فوراً ہی وہاں سے پیچھے ہٹا، مگر ابھی میں روشنی کے دائرے میں آیا ہی تھا کہ ایک لمبا تڑنگا چاق و چوبند آدمی برآمدے سے نکلا۔ میں اس کی نظر سے بچنے کے لیے پیچھے ہٹا مگر وہ مجھے دیکھ چکا تھا۔ ڈھلوں صاحب اس کے پیچھے تھے۔

"کون ہو تم؟" اس آدمی نے مجھے للکارتے ہوئے کہا اور پھر وہ کچھ سوچے سمجھے بغیر ہی بلا خیز رفتار سے میری طرف لپکا۔ وہ گولی سے زیادہ تیز دوڑا۔ اس سے بچنے کے لیے میں کمبل سنبھالتا ہوا گیٹ کی طرف لپکا مگر مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میرے اور اس کے درمیان فاصلہ بہت کم رہ گیا ہے۔ اس حقیقت کا احساس کرتے ہی میں گیٹ سے نکل کر بائیں ہاتھ بھاگ لیا۔ یہی میری سب سے بڑی غلطی تھی۔ ڈھلوں کی کار دوسری سمت میں تھی۔ وہ آدمی سدھائے ہوئے شکاری کتے کی طرح فاصلے کو نگلتا ہوا کوئی تین سو گز دوڑ کے اندر ہی اندر مجھ تک آ پہنچا۔ سامنے کھلی سڑک تھی اور میرے لیے چھپنے یا اس کی نگاہ سے اوجھل ہو جانے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ اس عرصے کے دوران میں دو بنگلے عبور کر گیا تھا۔ ان کے اونچے اونچے گیٹ بند تھے ورنہ میں ان میں سے کسی ایک کے اندر گھس جاتا۔

"رُک جاؤ ورنہ گولی مار دوں گا۔"

لودھی نے مجھے للکارتے ہوئے کہا مگر مجھے معلوم تھا کہ وہ نہتا ہے۔ اب وہ مجھ سے صرف چند قدم دور تھا۔ میں چاہتا تو اپنے چپ شاہ سے اس کی ساری تگ و تاز ختم کر سکتا تھا مگر میرا دل نہیں چاہتا تھا کہ میں خواہ مخواہ اُسے کوئی گزند پہنچاؤں۔ وہ ایسا حوصلہ مند آدمی تھا کہ کسی خطرے کو خاطر میں لائے بغیر وہ مجھ پر چڑھا چلا آ رہا تھا۔ وہ مجھ سے اب دو قدم دور تھا کہ میں نے فیصلہ کن انداز سے اپنے پاؤں روکے اور اپنے کمبل کا پلو جو اس کے ہاتھ میں آ چکا تھا، ایک جھٹکے سے چھڑا کر ..... الٹے ہاتھ کا ایک جھانپڑ دیا تو وہ اپنی بلا خیز جھونک میں آگے نکلا اور پہلو کے بل زمین پر گر گیا مگر دوسرے ہی لمحے وہ پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے کچھ اتنی تیزی سے اٹھتے ہوئے میری ٹانگ کھینچی کہ میں توازن برقرار نہ رکھ سکا اور اس کے اوپر جا پڑا۔ اس کے بدن میں بلا کی پھرتی تھی۔ دوسرے ہی لمحے اس نے میری ٹانگ دوہری کر کے میرے گھٹنے کو ... میری دوسری ران پر میرا پاؤں رکھ دیا۔ میں سمجھا وہ میرا گھٹنا تو... میرے دونوں ہاتھ آزاد تھے اور میری اسٹین گن میری کمر سے ... گئی تھی۔ وہ میرے گھٹنے پر برابر دباؤ ڈال رہا تھا۔ اچانک ... پر کھمبوں کی بتیاں بجھ گئیں۔ برقی رو معطل ہو گئی تھی۔ اس نے ... میرا پاؤں اور مروڑ دیا۔ میں کچھ اور بے بس ہو گیا تو میں نے ... سے فائدہ اٹھا کر اپنے کوٹ کی جیب سے بڑے ہی غیر محسوس طریقے ... اپنا چپ شاہ نکال لیا۔ اس کی مہلت مجھے اس اندھیرے ... سے مل گئی تھی۔ جو چند لمحوں تک اِردگرد پھیل گیا تھا کہ بتیاں جل گئیں ...

"پیچھے ہٹ جا ذلیل ورنہ تیرے سر میں سوراخ ڈال دوں گا۔"

اپنے سامنے تنا ہوا پستول دیکھ کر لودھی بھونچکا سا رہ گیا۔ اس کے تو شاید ہوش ہی اڑ گئے تھے۔ اس نے فوراً ہی میرا گھٹنا چھوڑ دیا۔ میں نے بڑی مشکلوں سے اپنی ٹانگ سیدھی کی مگر جب میں پستول اس پر تان کر اٹھا۔ تو مجھے یوں لگا جیسے میرا گھٹنا ... جواب دے گیا ہے۔ وہ بوجھ ہی نہیں سہار رہا تھا۔ اس اذیت کو میں آج تک نہیں بھول سکا ہوں۔ پھر بھی میں نے لودھی پر ... وہ بلا خیز تکلیف ظاہر نہیں ہونے دی۔

"بہتر یہ ہے جوان تو واپس چلا جا۔ یہی بہتر ہے میں تجھ پر وار نہیں کروں گا۔ جا لوٹ جا اور مت سمجھ کہ میں تجھے یا تیرے گھر کو کوئی نقصان پہنچانے آیا تھا ___ میں بس اپنا راستہ اور ... مقصد بھول گیا تھا۔ اس کے لیے میں تجھ سے معافی چاہتا ہوں۔"

وہ سیدھا میری آنکھوں میں جھانک رہا تھا، یوں جیسے مجھے ... پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

"تو اِدھر کیا لینے آیا تھا؟ تجھے پتہ ہے میں کون ہوں؟ ڈی آئی جی لودھی ہوں میں۔"

"تو لاٹ صاحب کا سالا بھی ہوتا تو بھی میں تجھ کو کچھ نہ کہتا۔ جا، چلا جا۔ میرا مغز الٹ گیا تو اچھا نہ ہوگا۔ تو حوصلہ مند جوان ہے اور مجھے خوشی ہے کہ مجھ پر کوئی کتا نہیں شیر جھپٹا تھا۔ جا میرا دیر ..."

یہ کہہ کر میں دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ وہ میرے لہجے سے ذرا بھی مرعوب یا متاثر نہ ہوا تھا۔ میں پیچھے ہٹا تو وہ بھی دو قدم مجھ سے پرے ہو گیا۔ میں پلٹ کر وہاں سے ہٹنا ہی چاہتا تھا۔ اس جھگڑے کو بڑھانا میں کسی طرح بھی سود مند نہ سمجھتا تھا۔ اس کی جوانی پر مجھے ترس آ رہا تھا۔ مگر ابھی میں ایک قدم اور پیچھے ہٹا ہی تھا کہ وہ شکرے کی طرح بازو کھول کر ہوا میں اچھلا اور دونوں پاؤں اس نے میرے سینے پر دے مارے۔ اس کی وہ شجاعت وہ موت سے آنکھ لڑانے کی ہمت مجھے حیران کر گئی۔ میں لبلبی دبا سکتا تھا مگر میں ایسا نہ کر سکا۔ پستول میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور میں لڑھکتا ہوا گرا اور چت ہو گیا۔

میرے اوپر آ چڑھا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی گرفت میری گردن پر مضبوط ہو رہی تھی۔ میں نے خود کو بچانے کے لیے اپنے دونوں پاؤں اس کے پیٹ میں دھنسا کر اسے اپنے سر کے اوپر سے اچھال دیا۔ وہ دائیں ہاتھ گرا تو عین اس وقت وہ ایک کار کی تیز روشنیوں میں نہا سا گیا۔ میری بھی آنکھیں چندھیا گئیں اور ... اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ کار اس کی دونوں ٹانگوں پر سے گزرتی ہوئی آگے نکل گئی۔ لودھی کی بھیانک چیخ فضا میں ابھری تو میں گھبرا کر زمین سے اٹھا اور دو ہاتھ دور پڑا اپنا چپ شاہ اٹھا کر اس کار کو دیکھنے لگا مگر میرے اعصاب چیخ کر رہ گئے۔ وہ کار چند گز دور جا کر رک گئی تھی۔ اور وہ کسی اور کی نہیں ڈھلوں صاحب کی کار تھی جس کے دروازے کو ذرا سا کھول کر وہ مجھے اپنی طرف آنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ انہوں نے میری جان خطرے میں دیکھ کر لودھی کو روند ڈالا تھا۔ میں بھاگ کر کار تک پہنچا، تو پچھلا دروازہ ایک دم کھل اٹھا۔ جب میں اس کے اندر گھسا تو ڈھلوں صاحب نے مجھے اپنے پاس کھینچ کر بانہوں میں لیا اور برکی نے گاڑی بلا خیز رفتار سے آگے بڑھا دی۔

"آپ کو چوٹ تو نہیں آئی؟" ڈھلوں صاحب نے کوئی چار سو گز آگے نکل کر پوچھا۔ "نہیں۔ میں تو بچ گیا ہوں مگر آپ نے یہ کیا کر دیا۔ وہ بہادر آدمی تھا۔"

"اوہ! اسے دفع کریں۔ میں کسی قیمت پر آپ کو اس کے پنجے میں چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ آپ کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ اس نے آپ کو بے بس کر دیا تھا۔ پستول بھی آپ کے ہاتھ سے چھوٹ چکا تھا۔ میں دور کھڑا دیکھ رہا تھا۔"

"اس نے آپ کی کار دیکھ لی ہوگی۔"

"نہیں، اس کے سامنے کے حصے پر کوئی نمبر نہیں ہے اور جب گاڑی اس کی ٹانگوں پر سے گزر گئی تو پھر اسے کچھ بھی نظر نہ آیا ہوگا۔" ڈھلوں صاحب نے بڑے وثوق سے کہا۔

"آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا ڈھلوں صاحب! وہ مجھے زیر نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے بہت افسوس ہو رہا ہے۔"

"زیر تو وہ آپ کو کر چکا تھا۔ آپ بے بس ہو چکے تھے۔"

"نہیں! میرا خدا مجھے کبھی بے بس نہ کرتا۔ ابھی میرے پاس بہت حربے باقی تھے۔ میں نہتا ہو کر بھی دس آدمیوں پر بھاری ہوتا ہوں۔ آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ تباہ ہو گیا ہوگا۔ وہ پھر کبھی اپنی ٹانگوں میں پہلی سی قوت نہ پا سکے گا۔" میرا دل دکھ رہا تھا اور میرا لہجہ اتنا غم انگیز اور اتنا زخمی تھا کہ ڈھلوں صاحب حیرت زدہ ہو کر مجھے دیکھنے لگے۔ ان سے بات بنائے نہ بنتی تھی۔

"میں آپ کو نہیں سمجھ سکا ہوں ہاشم صاحب! وہ آپ کو پکڑ لیتا تو سیدھا پھانسی کے تختے پر لے جاتا۔ وہ آپ کو بالآخر پہچان لیتا۔"

"مجھے معلوم ہے۔ میں اس پر گولی بھی چلا سکتا تھا مگر میں نے لبلبی نہیں دبائی۔ میں ... میں ایسے بہادر آدمی کو یوں آٹھ آنے کی گولی سے مرتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ یہ کمینگی ہوتی۔"

"اب تو جو ہونا تھا سو ہو چکا۔ آپ کی جان بچانے کے لیے مجھے یہی کرنا چاہیے تھا۔"

"ہو سکتا ہے اس کے گھر والوں میں سے کسی نے آپ کی کار کو اس پر سے گزرتے دیکھ لیا ہو۔"

"نہیں، میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ اس کے بیوی بچوں میں سے کوئی آدمی باہر نہیں نکلا تھا۔"

"چلیں۔ ٹھیک ہے۔ خدا کرے وہ اپاہج نہ ہو جائے۔ اس کی ٹانگیں سلامت رہ جائیں۔" میں نے بڑے ہی کرب آمیز لہجے میں کہا ___

ڈھلوں صاحب خاموش ہو گئے۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے تھے۔ ہم مال روڈ پر چڑھے تو وہ بولے۔

"اب آپ کہاں جائیں گے؟ میں بڑے صاحب سے مل لیتا ہوں۔"

"آپ مجھے یہیں اتار دیں میں کل صبح پھر آپ کے پاس آ جاؤں گا۔"

"کہاں ٹھہریں گے آپ؟"

"میرا ایک دوست رہتا ہے اُدھر بیڈن روڈ پر۔ میں اس کے پاس جا رہوں گا۔"

"دیکھیں، آپ کل صبح دس بجے ادھر شیزان ہوٹل میں بیٹھ کر میرے فون کا انتظار کریں انہیں اپنا نام ہاشم خان بتا دیں۔ میں آپ سے وہیں بات کروں گا۔"

"ٹھیک ہے میں وہاں جا بیٹھوں گا۔"

"اور دیکھیں اپنا حلیہ بھی بدل لیں آپ کا لباس بہت میلا ہو رہا ہے۔"

"ہاں۔ میں اس کا بھی بندوبست کرتا ہوں۔"

یہ کہہ کر میں نے ان سے مصافحہ کیا اور پھر گاڑی سے اتر گیا ___

ڈھلوں صاحب کے چہرے پر گھٹا ٹوپ سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ جب ان کی گاڑی میری نظروں سے اوجھل ہو گئی تو میں نے ایک ٹیکسی روکی اور اس میں بیٹھ کر گنگا رام ہسپتال جا پہنچا۔ آبی اپنے کمرے میں بستر پر لیٹا ہوا تھا مجھے دیکھتے ہی وہ کھل اٹھا۔

"اوئے تو کدھر نکل گیا تھا میرے یار! میں تو ادھر لیٹ لیٹ کر تنگ آ گیا ہوں۔"

"میں بتا کر تو گیا تھا تجھے، ڈھلوں صاحب سے مل کر آ رہا ہوں۔" میں نے اس کے قریب بستر کے اوپر آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"تیرا مانجھا کچھ بہت ہی ڈھیلا ہو رہا ہے۔ کیا کہتے ہیں وہ تیرے ڈھیلوں صاحب؟" وہ اپنی زخمی ٹانگ سنبھال کر اٹھ بیٹھا۔ اور بستر کے ساتھ لگی گھنٹی بجا کر بولا "میں تیرے لیے کھانا منگواتا ہوں۔"

"ہاں منگوا لے بہت بھوک لگی ہے مجھے۔ پر یار! ان پیڑوں کا

کیا کروں؛ دیکھ تو کتنا میلا ہو رہا ہوں میں۔"

"فکر نہ کر یار۔ میں نے تیرے لیے قمیص شلوار کے دو جوڑے اور ایک جرسی منگوائی تھی، الماری میں دیکھ۔ یہ کمبل تو اتار دے اب۔ سردی تو اب ختم ہو رہی ہے۔"

"یہ بڑے کام کی چیز ہے یہ کمبل یار جی! گرمیوں میں تو بڑی مصیبت ہوگی۔ میں اس بانکی کو کہاں چھپا سکوں گا؟"

"بس وہ پستول ہی بہت کافی ہے۔ اسٹین گن ساتھ لے کر چلنے کی کیا ضرورت ہے تو یہ بتا کہ وہ ڈھبلوں صاحب کہتا کیا ہے کوئی کام بھی کیا اُس نے؟"

"وہ میرے ساتھ ہی آیا ہے آبی بھائی! یہ دن میرے لیے بہت ہی منحوس چڑھا ہے کئی جانیں ضائع ہو گئی ہیں۔"

آبی اور زیادہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ بولا "کیا کہہ رہا ہے تو! کہیں مقابلہ ہو گیا تھا تیرا؟" اُس نے سگریٹ میری طرف بڑھایا۔ آبی کے ہاتھ سے سگریٹ لے کر میں نے سلگایا تو وارڈ کا ملازم اندر آ گیا۔

"اوئے! جا ذرا دو پیالے کافی کے لے کر آ۔ اور پھر کوئی آدھ گھنٹے بعد کھانا بھی لے آنا۔"

وہ ملازم کھلکھلا کر ہنس دیا بولا "ابھی لو چوہدری صاب!"

"کافی ذرا عمدہ لانا ایک نمبر اے ون۔ جا اب شکل غائب کر اپنی اور یہ دروازہ بند کر جا۔" آبی اس سے بہت زیادہ بے تکلف ہو رہا تھا وہ ملازم باہر نکلا تو میں نے اس روز کے سارے واقعات آبی کو سُنا دیے۔ وہ سناٹے میں آ گیا۔ بولا۔

"کمال ہو گیا یار جیلانی! یہ دن تو واقعی بڑا خوفناک تھا یار اب کیا سوچا ہے تو نے؟"

"میں کیا کروں آبی! کہاں جاؤں؟ اس آسیہ کی اس نئی مصیبت نے مجھے حیران کر دیا ہے۔ میں پھر وہیں آ ٹھیرا ہوں جہاں سے میں پہلے دن روانہ ہوا تھا۔"

"یہ تو ہے۔ اب تو ہم بالکل ہی اندھیرے میں کھڑے ہیں۔ کام کے سارے پتّے اُن کے ہاتھ میں چلے گئے ہیں۔"

"نہیں آبی نہیں! ابھی میرا خدا میرے ساتھ ہے۔ میں نے اگر کسی کے ساتھ زیادتی کی ہے تو خدا مجھے معاف کرے۔ میں نے عمداً کسی کو نقصان نہیں پہنچایا ہے آبی! میں اتنی بڑی سزا کا مستحق نہیں ہوں۔ جو کچھ میں نے کیا ہے، صرف اپنی اس بے بس بے گناہ بہن کے لیے کیا ہے خدا گواہ ہے میں نے اپنے ذاتی مفاد کے لیے کبھی کسی پر ہاتھ نہیں اُٹھایا ہے۔"

آبی میری یہ بات سُن کر عجیب سے طنز بھرے انداز میں مُسکرایا، یوں جیسے میری پاک بازی کے دعوے پر ہنس رہا ہو۔ میری آنکھوں میں میں جھانک کر بولا "دل چھوٹا نہ کر یار! یہ اونچ نیچ تو ہوتی ہی رہتی ہے یہ زندگی کا حصّہ ہے۔ جا اندر نہا کر یہ کپڑے بدل لے۔"

اُس کی یہ بات سُنتے ہی میں نے الماری میں سے سفید پاپلین کا ایک جوڑا نکالا اور غسل خانے میں جا گھسا۔ کوئی پندرہ منٹ بعد جب میں نہا کر اور لباس تبدیل کر کے باہر آیا تو میری طبیعت پہلے سے بہت بہتر تھی۔

"اب تو ذرا بندے کا پتّر نظر آ رہا ہے۔ اچھا کیا تو نے شیو بھی بنا لی ہے؟ لے، یہ کافی پی۔ میں نے ہیٹر پر رکھوا دی تھی تاکہ گرم رہے۔"

میں ایک بار پھر اس کے پلنگ پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ کافی گرم بھی تھی اور مزہ دے رہی تھی۔ اُسے حلق سے نیچے اتار کر میں سگریٹ پھونکنے لگا۔ کرنے کے لیے کوئی بھی کام باقی نہیں رہ گیا تھا۔

وہ رات میں نے آبی ہی کے کمرے میں گزاری ہسپتال کا عملہ اُس پر بہت مہربان تھا۔ کیونکہ پیسہ اُس نے اِن پر دل کھول کر خرچ کیا تھا۔ حالت یہ تھی کہ دو نئی نرسیں الگ بھنورے کی طرح ہمارے کمرے کے پھیرے پھاڑ رہی تھیں۔ اُن کی وہ دیدہ دلیری دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ اُن میں ایک کا نام سلونی تھا۔ رنگ رُوپ بھی اس کا سلونا تھا۔ اور اسی مناسبت سے کسی نے اُسے وہ نام دے دیا تھا۔ وہ اسی روز تبدیل ہو کر اس وارڈ میں آئی تھی۔ دوسری کا نام عرشی تھا۔ نام اس کا والدین نے عرشِ منیر رکھا تھا مگر پھر وہ گھستے گھستے عرشی۔۔ ہو کر رہ گئی۔ وہ بھی جوان عورت تھی مگر بڑی ہی چلبلی اور بہت ہی نٹ کھٹ۔ عمر اُس کی بھی کوئی تیس سال ہو گی۔ آبی نے اسی کے ہاتھ اس روز انار کلی سے اپنے اور میرے لیے چار جوڑے کپڑوں کے منگوائے تھے۔ وہ اور بھی کئی چیزیں خرید لائی تھی۔ کنگھی تیل شیشہ کریم شیونگ کا سامان خوشبو اور خشک پھل کا ٹوکرا۔ سونے سے پہلے اس نے خود پلیٹوں میں ڈال کر ہمارے سامنے بادام گری میوے چلغوزے اور پستہ رکھ دیا۔ وہ بڑے دھڑلے سے سگریٹ پیتی تھی اور تھری کیسل سے کم پر منہ نہیں ڈالتی تھی۔ پان نے الگ اس کی جان کھا رکھی تھی مگر اتنی بات ضرور ہے کہ پان بڑے سلیقے سے کھاتی تھی۔

آبی اُس سے بہت ہی بے تکلف ہو چکا تھا۔ وہ جب خشک پھل سے بھر کر پلیٹیں ہمارے سامنے رکھ چکی تو آبی نے کہا۔

"بیٹھ جا عرشی! تم نے بتایا نہیں کہ تم اُدھر نرسوں کے ہاسٹل میں کیوں نہیں رہتی ہو۔"

"پہلے میں اُدھر ہی رہتی تھی مگر کوئی دو مہینے پہلے مجھے راج گڑھ میں اپنی ایک سہیلی کے گھر میں رہنا پڑا۔ اس کا دراصل گوجرانوالہ تبادلہ ہو گیا تھا۔ وہ لیڈی ڈاکٹر ہے۔ اس کے تین بچوں کی دیکھ بھال کے لیے مجھے اس کے پاس رہنا پڑا۔"

"تم اس کے بچوں کی آیا بن گئی تھیں؟"

"جی نہیں؛ وہ میری سہیلی ہے نا! اُس کی پریشانی تو دُور کرنی ہی تھی اُس کے میاں نیوی میں ہیں۔ اور ہمیشہ باہر رہتے ہیں۔"

"تو تم اب تک اُن کے بچوں کی دیکھ بھال کر رہی ہو؟ اپنی اس ننھی منی جان کے ساتھ اِتنا ظلم کرتی ہو تم۔"

"نہیں جی! ایسا نہ کہیں۔ وہ میری بہت پیاری سہیلی ہے فرخندہ یاسمین

ہے اُس کا۔ اب تو خیر وہ اپنے بچوں کو گوجرانوالہ لے گئی ہے۔"

"اچھا! تو پھر اب کیوں رہ رہی ہو وہاں۔ اکیلی جوان خوبصورت عورت تو فرشتوں کے لیے بھی افراتفری کا سبب بن جاتی ہے۔"

"آپ بڑے وہ ہیں۔ ذرا شرم نہیں ہے آپ کو۔ مگر میں آپ کی باتوں میں نہیں آنے کی۔ ویسے آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ڈاکٹر فرخندہ نے اپنا مکان کرائے پر نہیں دیا ہے وہ اسے بیچنا چاہتی ہیں اور مجھے وہ سجا سجایا گھر حفاظت کے لیے دے گئی ہیں۔"

"ہاں! تم ایسا پہریدار تو خدا ہر کسی کو دے مگر نہ خنجر اُٹھے گا نہ تلوار اُن سے۔ یہ بازو میرے آزمائے ہوئے ہیں۔" یہ کہہ کر آبی نے عرشی کی کلائی پکڑ لی۔ اُس نے کسمساتے ہوئے کلائی چھڑائی اور بولی۔

"میں حفاظت کیوں نہیں کر سکتی جناب! اور پھر میں اب اکیلی نہیں ہوں۔ میری ایک سہیلی ہیں ماجدہ۔ وہ پرسوں سے میرے ساتھ رہ رہی ہیں۔"

"کیا؟ کیا کہا آپ نے؟ ماجدہ؟" بے ساختہ میرے مُنہ سے یہ الفاظ نکل گئے۔

"جی ہاں! آپ کیوں حیران ہو گئے؟ کوئی انوکھا نام ہے ماجدہ۔ پہلی دفعہ سُنا ہے آپ نے؟ مگر جناب! وہ کوئی ایسی ویسی نہیں ہیں۔ میری سہیلی بہت امیر ہیں۔ لاکھوں روپیہ ہے اُن کے بینک میں۔ وہ کچھ دن پہلے راولپنڈی سے آئی ہیں۔"

"راولپنڈی کی رہنے والی ہیں وہ؟"

"نہیں! پہلے تو اُدھر کنجاہ میں رہتی تھیں پھر اُن کا شوہر ولایت چلا گیا تو میری سہیلی نے کراچی میں رہائش اختیار کر لی۔ آج کل وہ سنگِ مرمر کا کاروبار کرتی ہیں اور اسی سلسلے میں یہاں آئی ہیں۔"

"آپ کی وہ کیسے دوست بن گئیں؟"

"مجھے اُن کا تعارف اپنی اُستانی حمیدہ کے ذریعے ہوا تھا۔ کئی دن پہلے میں اُن کے گھر گئی تو ماجدہ بھی وہیں بیٹھی تھیں۔ انہوں نے حمیدہ کو ڈھیر سارے روپے بھی دیے۔ حمیدہ بے چاری اندھی ہو چکی ہیں نا اس لیے ماجدہ اُن کی مدد کرتی رہتی ہیں۔ بس وہیں سے میری اور اُن کی دوستی پکی ہو گئی۔"

"اور آپ انہیں ڈاکٹر فرخندہ کے گھر لے گئیں۔" میں نے مزید استفسار کیا۔

"جی نہیں! وہ تو پرسوں مجھے یہاں ملنے آ گئی تھیں۔ میں نے کہا کہ ہوٹل میں ٹھہرنے کے بجائے آپ میرے پاس رہ لیں۔"

اب یہ بات مجھ پر عیاں ہو چکی تھی کہ عرشی نے جس ماجدہ کا ذکر کیا ہے وہ وہی میری اپنی مُہربان ماجدہ ہے اور اس کا سراغ مجھے بس اتفاقاً ہی مِل گیا تھا۔ اس عرشی کی آبی کے وارڈ میں ڈیوٹی نہ لگتی تو میں کبھی بھی نہیں جان سکتا تھا کہ وہ ماجدہ بیگم کہاں جا بیٹھی ہے۔ قیامت تک بھی ہم براہِ راست اس کا پتہ نہ ڈھونڈ سکتے تھے۔

وہ ہم سے باتیں بھی کر رہی تھی اور گلہری کی سی رفتار سے وہ خشک پھل بھی کچر کچر کھائے جا رہی تھی۔ میرا اندازہ ہے کہ آدھی سے زیادہ پلیٹیں تو اس نے ہی صاف کر دی تھیں۔ آبی بڑی ہی معنی خیز نگاہوں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

"یار! تیرا بستر دوسرے کمرے میں نہیں لگ سکتا۔ میں ذرا تنہا سونے کا عادی ہوں۔"

"نک نیں اوئے! میں یہ گرم کمرہ چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا۔۔۔ ویسے آپ کی ڈیوٹی کس وقت ختم ہوتی ہے عرشی بیگم؟" میں نے پوچھا۔

"جی بس صبح سات بجے تک میں یہاں ہوں۔"

"راج گڑھ میں کہاں رہتی ہیں آپ؟ میرے بھی ایک عزیز اُدھر ہی رہتے ہیں۔"

"وہ جی ڈاکٹر فرخندہ کی کوٹھی کا نمبر دو سو چوبیس ہے۔ وہ جو بڑی سڑک اُدھر کرشن نگر کو جاتی ہے نا بس اُس پر ہے وہ کوٹھی۔ آپ کے عزیز کہاں رہتے ہیں؟"

"وہ۔۔۔ وہ اُدھر چوبرجی کی طرف کرپا رام اسٹریٹ میں رہتے ہیں۔" میں نے اُس کے جوابی حملے سے جان چھڑاتے ہوئے کہا۔ آبی مجھے قہر آلود نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"آپ ہی کچھ مدد کریں نہ ہماری۔ یہ ساتھ والا کمرہ بھی آپ نے کسی مریض کو دے دیا۔ انہیں بھی کسی اچھے سے کمرے میں سُلا دیں نا! میں ان حضرات کے بیمار طبیارے جیسے خراٹوں سے نہ سو سکوں گا۔"

آبی کی یہ بات سُن کر عرشی مسکرائی۔ بڑے رنگا رنگ مفہوم پنہاں تھے اس کی مُسکراہٹ میں، بولی۔ "آپ کے دوست کو ادھر ہی سونا چاہیے آپ کے پاس۔"

"لعنت بھیجیں جی! آپ کوئی اچھا سا معقول بندوبست کر دیں میں تو اس کا وجود برداشت نہیں کر سکتا۔" آبی نے بڑے ہی دبنگ لہجے میں کہا۔ وہ اُٹھ گئی ہنستی ہوئی۔ پھر وہ ایڑی پر گھومی اور پھر وہ باہر نکل گئی۔ ہوا چاک جھونکے کی طرح۔ اپنے پیچھے وہ خوشبو کی ہلکی سی لہر چھوڑ گئی تھی۔

"ہوں! تو یہ رنگ ڈھنگ ہیں تیرے۔"

"خیر دفع کر۔ تو یہ بتا کہ وہ عورت جو اس کے ساتھ رہتی ہے اس کے بارے میں کیا سوچا ہے تو نے؟"

"اُس سے تو میں کل کسی وقت ملوں گا۔ بھئی اس سے حساب لینا ہے ہمیں، اس گشتی سے۔"

"ہاں، مگر ہاتھ ذرا ہلکا رکھنا، اسے قلاش نہ کر دینا ورنہ وہ گلی گلی بکنے لگے گی۔"

"تو ٹھیک کہتا ہے آبی! یہ بات میرے بھی دل کو لگتی ہے اُس نے ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔"

"ہاں! وہ سب کچھ اس کے اپنے ہاتھ اور ہمت کی کمائی ہے پیارے

اسے عیش کرنے دے کیونکہ اس کی جان کے ، مجھے لگتا ہے تو اس نے تجھے آرام بھی بہت پہنچایا ہے۔"

"تو ٹھیک کہتا ہے یار! میں اس سے کوئی انٹ شنٹ بات نہیں کروں گا۔"

"میری مان! تو اُسے مِل کر سہارا دے، اس کا حوصلہ بڑھا، اُسے جینے کی آرزو دے ورنہ وہ تباہ ہو جائے گی۔ وہ ہیرے، وہ موتی نہ میرے تھے، نہ تیرے۔ وہ آہو۔ وہ ہرن کا بچہ حرام کا مال دبائے بیٹھا تھا۔ ماجدہ اسے لے اُڑی تو اچھا ہوا۔ ہمیں کیا لینا دینا ہے اُس سے۔"

"تیری بات میری سمجھ میں آتی ہے آبی مگر میں اس سے ملوں گا ضرور۔ اس کی جان خطرے میں ہے اس کا یار پکڑا گیا ہے۔"

"یہ بات تو دھی نے بتائی تھی نا؛ تو اچھا ہے تو ماجدہ کو خبردار کر دے۔ تاکہ وہ اِدھر اُدھر سرک جائے۔ اس کے لیے یہی بہتر ہے۔" آبی نے مجھے راستی کی راہ دکھائی۔ اتنے میں عرشی لوٹ آئی بولی۔

"چلیں جناب کمرہ نمبر بارہ آپ کے لیے کھول دیا گیا ہے۔"

"مجھے وہ کمرہ دکھا دیں۔"

عرشی میرے ساتھ ہی باہر آگئی اور جب وہ مجھے کمرے میں پہنچا کر لوٹنے لگی تو بولی۔

"میں اِدھر ہی ہوں اور سلونی بھی یہاں ہی رہے گی۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو یہ گھنٹی بجا دیں آپ کو کوئی دقت نہیں ہو گی۔"

"بڑی مہربانی مس عرشی! آپ کا بہت بہت شکریہ۔" یہ کہہ کر میں نے دروازہ کھول دیا۔ وہ باہر نکلی تو میں اندر سے چٹخنی لگا کر بستر پر جا گرا۔ میرا بند بند دُکھ رہا تھا۔ اُس روز جن اذیت ناک مراحل سے میں گزر گیا تھا وہ میرے لیے شدید ذہنی عذاب کا سبب بن گئے تھے میرے گھٹنے میں ابھی تک ہلکا ہلکا درد باقی تھا اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں۔ اپنے سارے نوٹ میں نے سنبھال کر کوٹ کی اندرونی جیبوں میں رکھ لیے تھے۔ اسٹین گن میں آبی کے کمرے میں چھپا آیا تھا۔ ایک صرف میرا چپ شاہ میرے ساتھ تھا اور اس کی چند گولیاں ان گولیوں سمیت جو میں نے سردار خان اور اس کے ساتھیوں کے پستولوں سے نکالی تھیں۔ وہ سب کچھ میں نے سنبھال کر گدے کے نیچے رکھا اور پھر کمبل اوڑھ کر منہ اس میں ڈال لیا۔

اس کمرے میں ہیٹر موجود نہیں تھا پھر بھی وہ صاف ستھرا کمرہ تھا۔ مگر سرد بے حد تھا۔ چھتیں اس کی اونچی تھیں اور روشن دان بس یونہی سے تھے جن میں سے رات کی بھیگی ہوئی سرد ہوا دراتا نہ اندر گھستی چلی آتی تھی وہ ایسا موسم تھا کہ دن تپنے لگے تھے مگر راتیں ابھی تک بہت ٹھنڈی تھیں میں نے سارے وسوسے، ساری کلفتیں، ساری ناکامیاں ذہن سے جھٹک کر آنکھیں بند کر لیں، اور پھر کچھ ہی دیر بعد میں گہری نیند میں کھو گیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں کتنی دیر سو سکا تھا کہ دروازے پر عجیب سی تیز تیز دستک نے میری نیند کے سارے شیشے توڑ دیے۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

کوئی میرے کمرے کا دروازہ پیٹ رہا تھا۔ "کون ہے؟"

"میں ہوں سلونی! جناب دروازہ کھولیں۔"

"کیوں دروازہ پیٹ رہی ہیں آپ؛ میں نے کسی کو نہیں بلایا۔"

"آپ دروازہ تو کھولیں۔ آپ کے دوست بلا رہے ہیں آپ کو۔ اُدھر کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے۔"

میں نے کمبل اوڑھ کر تیزی سے چٹخنی کھول دی سلونی فوراً ہی اندر گھس آئی۔ وہ بہت پریشان تھی، بولی "وہ۔۔۔ وہ خان صاحب اُدھر میٹرن نے عرشی کو پکڑ لیا ہے۔ آبی صاحب کے کمرے سے۔ وہ کہتی ہے کہ وہ پولیس کو بلائے گی۔"

"اوہ مائی گاڈ! یہ کیا مصیبت ہے، چلو میں دیکھتا ہوں۔"

یہ کہہ کر میں نے اپنا کوٹ پہنا اور کمبل اوڑھ کر سلونی کے ساتھ آبی کی طرف دوڑا۔ میرا کمرہ وہاں سے خاصا دور تھا پھر بھی میں نے وہ فاصلہ پلک جھپکتے میں طے کر لیا۔

آبی کے کمرے کا دروازہ کھول کر جب میں اندر پہنچا تو دیکھا کہ آبی کمبل اوڑھے پلنگ پر تکیے کے سہارے بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا مگر کوئی پریشانی اس کے چہرے پر ظاہر نہیں ہو رہی تھی۔ اس کی پائنتی عرشی سر جھکائے بیٹھی تھی۔ کرسی پر ایک عورت بیٹھی تھی، جس نے گھٹنوں تک لمبا سفید فراک اور موٹی اونی جرابیں پہن رکھی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک آدمی گاؤن پہنے کھڑا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ابھی ابھی بستر سے اُٹھ کر وہاں پہنچا ہے اور حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کے دائیں ہاتھ میں ایک چھوٹا سا خوبصورت پستول بھی تھا۔ وہ بھی بہت ہی غضبناک دکھائی دے رہا تھا۔

"کیا بات ہے میڈم خیر تو ہے؟ کیا ہوا اِدھر؟"

"یہ آپ کے دوست ہیں؟"

"جی دوست کیا معنی! یہ میرے بھائی ہیں، یہاں میں انہیں علاج کے لیے لایا ہوا ہوں۔"

"اور یہ ہماری نرس ہے مس عرشی۔ یہ دونوں یہاں اس کمرے کو باوا کا گھر سمجھ کر فیصلہ کھائے تھے مجھے کسی نے ابھی بتایا ہے اور ہم نے انہیں ننگے ہاتھوں پکڑا ہے۔" میٹرن نے کہا وہ بہت زیادہ طیش میں تھی۔

"دیکھیں جناب! میں اس ہسپتال کا ایڈمنسٹریشن افسر ہوں۔ ہم ان دونوں کو پولیس کے حوالے کر رہے ہیں۔ یہ ہمارے ہسپتال کی عزت کا سوال ہے ہم یہاں ایسی بدمعاشی کی اجازت نہیں دے سکتے۔"

"اگر آپ فیصلہ ہی کر چکے ہیں تو مجھے بلوانے کا کیا فائدہ ہے؟" میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"وہ مس سلونی مصر تھی کہ آپ کو اطلاع دینی چاہیے۔" میٹرن نے کہا۔

"آپ کا اسم گرامی؟"

"میرا نام ملک عبیداللہ ہے۔" وہ آدمی بولا۔ اس کا لہجہ بڑا ہی بھاری تھا۔

بڑا نفرت انگیز تھا۔

"آپ نے پولیس کو اطلاع دے دی ہے؟"

"نہیں، ابھی تو نہیں۔ میں نے تو ابھی اپنے آدمیوں کو بلوایا ہے۔"

"ہوں! یہ آپ کے ہسپتال کی پرانی ملازمہ ہیں مس عرشی۔ آپ کو ان کی نوکری کا بھی خیال کرنا چاہیے یہ تباہ ہو جائے گی۔"

"میں کچھ نہیں جانتا ہوں جناب! یہ بات ہسپتال کے قانون کے خلاف ہے اور میں یہاں ایسی گندگی برداشت نہیں کر سکتا۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں مگر آپ کو معلوم ہے کہ ہم اسے نوکری سے ہمیشہ کے لیے بے نیاز کر سکتے ہیں، لاکھوں روپیہ دے سکتے ہیں، نہ صرف اسے اور یہ چوہدری ڈھلوں صاحب کے بھائی ہیں۔ آپ جانتے ہیں انہیں۔ اس ہسپتال کے لیے وہ اب تک لاکھوں روپیہ دے چکے ہیں۔ وہ جناب عبیداللہ صاحب آپ کی اور ان میٹرن صاحبہ کی صرف ایک ٹیلیفون کر کے ہمیشہ کے لیے چھٹی کرا سکتے ہیں سمجھتے ہیں نا آپ؟"

"یہ ڈھلوں صاحب کے بھائی ہیں؛ انہوں نے پہلے نہیں بتایا ہے ہمیں۔" عبیداللہ کا لہجہ ایک دم بدل گیا۔ یوں لگا جیسے وہ دہشت زدہ سا ہو گیا ہو۔ میٹرن کی بھی شاید ہوا سرک گئی تھی۔ وہ پریشان ہو کر کبھی مجھے دیکھتی تھی کبھی آبی کو، اور وہ بدمعاش اب تک آنکھیں موندے بڑے ہی اطمینان سے سگریٹ پھونک رہا تھا۔

"آپ کو بتانے کی کیا ضرورت تھی ملک صاحب! یوں آپ میرے ساتھ چلیں تو اس شہر کے ہر بڑے ہوٹل کے بستر میں آپ کو دو دو ملیں گے۔ اُن کے لیے کیا سزا تجویز کریں گے آپ۔ چلیں میں آپ کو ابھی دکھا دیتا ہوں۔ ایسا ہی ایک پستول میرے ہاتھ میں دے دیں، پھر دیکھیں۔"

"مسز ولسن! میرا خیال ہے یہ صاحب ٹھیک کہتے ہیں۔ اور پھر یہ بھی تو دیکھیں کہ یہ ڈھلوں صاحب کے بھائی ہیں۔"

"نہیں یار چل۔ تُو مجھے لے ہی چل پولیس کے پاس۔ چل میرے ساتھ چل میں تیرے ساتھ اسی طرح چلتا ہوں چھوڑ سب باتوں کو۔" یہ کہہ کر آبی کمبل الگ پھینک کر بستر سے اتر کر عبیداللہ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ملک صاحب وحشت زدہ سے ہو کر پیچھے ہٹ گئے۔

"چلو نا لے چلو مجھے۔ بارات بنا کے لے چلو۔ چاہے اپنے ہی گھر لے چلو۔ میں تیار ہوں جانے کے لیے۔" آبی نے دبنگ لہجے میں کہا۔ وہ طیش میں آ چکا تھا۔

"انہیں سمجھائیں جناب! ہم اس معاملے کو یہیں ختم کرتے ہیں۔ بس ختم کریں، آئیں مسز ولسن، انہیں آرام کرنے دیں۔"

"جس آدمی نے ہماری مخبری کی تھی نا ملکا، اسے ذرا ہوشیار کر دینا۔" آبی نے اب کی بار اور زیادہ غضبناک لہجے میں کہا۔

بیچارے ملک عبیداللہ اور مسز ولسن ہیکڑی بھول کر اسی وقت کمرے سے باہر نکل گئے۔ انہیں سوجھ ہی نہیں رہی تھی کہ وہ ہمیں کیا جواب دیں۔ ڈھلوں صاحب کا نام اُن کے لیے چھو منتر ثابت ہوا تھا۔ وہ باہر نکلے تو آبی بولا۔

"آ گئے تھے وہاں سے تفتیش خاں بن کر تم نہ آتے نا تو میں ان دونوں کی گردن مروڑ دیتا یہاں۔ اوئے چل بھئی تو لعنت بھیج اس ظالم سماج پر جو دو دلوں کو ملنے بھی نہیں دیتا۔" آبی نے مس عرشی کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔

"تیرے زخم کا کیا حال ہے اب؟"

"وہ تو ٹھیک ہی ہو گیا ہے شاید مگر یہ زخم جو وہ لگا گئے ہیں بہت دِنوں میں بھرے گا۔"

باقی رات میں نے آبی ہی کے کمرے میں گزاری مگر نہ وہ سو سکا نہ میں۔ وہ مس عرشی کے بارے میں فکرمند تھا اور میں اپنے دُکھوں کی پوٹ کھول کر بیٹھا رہا۔ اس کا غم تو ایک لمحے کی قسمیں دے کر ختم ہو گیا تھا۔ عرشی گھر چلی گئی تھی مگر میں تو پورا کٹ کر رہ گیا تھا۔

صبح سویرے میں نے بستر چھوڑ دیا اور نہا دھو کر باہر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ آبی ابھی تک آنکھیں موندے پڑا تھا۔

"کدھر کا ارادہ ہے آج؟"

"تم کب تک یہاں لمبے لیٹے رہو گے؟"

"آج میں ڈاکٹر سے معلوم کرتا ہوں میرا خیال ہے میرا زخم بھر چکا ہے۔"

"اس سے پوچھو اور یہ جگہ چھوڑ ہی دو۔ کوئی نئی مصیبت نہ آ جائے۔ وہ عبیداللہ تمہیں نگاہ میں رکھے گا۔"

"یہ تو ہے۔ میرا خیال ہے میں کسی اور ہسپتال میں جا لیٹتا ہوں رہنے کے لیے اچھی جگہ ہے تم بھی رات کو میرے ساتھ ٹھہر سکو گے۔" آبی نے نئی تجویز پیش کی۔

"تم ٹھیک کہتے ہو یار! ہوٹل میں ٹھہرنے سے تو ایسی جگہ ہزار بہتر ہے۔ کوئی اور اچھا سا ہسپتال دیکھو۔ زخم اچھا ہو گیا تو میں کسی اور بہانے وہاں رہ تو لوں گا۔"

"ناشتہ تو منگواؤ اور سلونی کا پتہ کرو۔ اس نے ہمیں کچھ نہیں بتایا۔"

آبی نے پلنگ سے لگی گھنٹی بجا دی تھوڑی ہی دیر بعد ایک نرس اندر آ گئی۔

"جی فرمایئے۔"

"وہ مس سلونی کہاں ہے؟"

"وہ رات مس عرشی کے ساتھ گھر گئی تھی پھر اس نے فون کیا کہ مس عرشی کی طبیعت خراب ہے وہ واپس نہیں آ سکے گی۔"

"ہمیں کیوں نہیں بتایا کسی نے؟"

"اس نے یہ نہیں کہا تھا کہ آپ کو بتا دیا جائے۔" وہ نرس بولی۔

"ہوں ٹھیک ہے۔ ہمارے لیے ناشتہ بھجوا دو۔"

یہ کہہ کر آبی بستر سے اُٹھا اور جلدی جلدی منہ ہاتھ دھو کر اس نے

کپڑے بدل لیے۔ جب وہ بالوں میں کنگھی پھیر کر میرے سامنے کرسی پر آ بیٹھا تو بولا۔

"ہمیں ابھی اور اسی وقت مس عرشی کے ہاں چلنا چاہیے۔ مجھے ڈر ہے کہ اس کی طبیعت زیادہ خراب نہ ہو گئی ہو۔"

"ہاں میرا بھی یہی خیال ہے۔"

"یہ ناشتہ بھی چھوڑ دو لعنت بھیجو۔ تم چلو کوئی ٹیکسی ادھر لے آؤ۔"

"تم چل سکو گے؟"

"ہاں دو چار قدم تو چل ہی سکتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ تم بیٹھو میں ٹیکسی پکڑتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں کمرے سے باہر نکلا۔ ہسپتال کے احاطے میں کئی ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ میں نے ایک ڈرائیور کو اشارے سے قریب بلایا۔ اور اُسے ٹیکسی برآمدے میں لانے کے لیے کہہ کر آبی کے پاس جا ٹھہرا۔ اس نے اپنی ضرورت کی تمام چیزیں ٹرنک میں بند کر کے اسے تالا لگا دیا۔ اور پھر کمرے میں موجود نرس سے بولا۔

"سسٹر! ہم ایک بہت ضروری کام سے جا رہے ہیں۔ دن میں کسی بھی وقت واپس آ جائیں گے۔"

"جی بہت بہتر۔"

"ادھر کوئی کھسر پھسر تو نہیں ہو رہی؟ رات آپ بھی ادھر ڈیوٹی پر تھیں۔"

"جی میں بھی ادھر ہی تھی۔ بات شاید زیادہ لوگوں تک نہیں پھیلی۔" اس نے فرش کو تکتے ہوئے کہا۔

"دیکھو بہن! ہم انسان ہیں فرشتے نہیں ہیں۔ اور وہ عرشی تمھاری ہی برادری کی ایک لڑکی ہے۔ مسز ولسن اور عبیداللہ سے کہہ دینا کہ وہ منہ بند رکھے ورنہ اچھا نہ ہوگا۔ ہمارا یہ پیغام اُسے دے دینا۔" آبی نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"جی میں انھیں کہہ دوں گی، آپ بے فکر رہیں۔ ہم خود نہیں چاہتے کہ یہاں کوئی اسکینڈل پھیلے۔"

"ٹھیک ہے اب آپ جائیں اور آپ یہاں نہ ہوں تو کسی سے کہہ دیں کہ کمرے کا خیال رکھے۔ بہتر ہوگا آپ اسے تالا لگا دیں۔" یہ کہہ کر آبی میرا سہارا لے کر کمرے سے باہر نکلا اور ٹیکسی میں جا بیٹھا۔

مس عرشی کا گھر ہم نے جلدی ہی ڈھونڈ لیا۔ دروازے پر لگی گھنٹی بجی تو کنڈی سلونی ہی نے کھولی۔ وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی ہمیں دیکھتے ہی بولی۔

"اوہ آبی صاحب! اچھا ہوا آپ آ گئے۔ عرشی بہت سخت بیمار ہے اور وہ ہسپتال جانے کے لیے تیار نہیں دوا بھی نہیں کھائی۔"

"کہاں ہے وہ؟" یہ کہہ کر ہم دونوں اندر داخل ہو گئے۔ آبی کا رنگ اُڑنے لگا تھا۔ اُسے میں نے اس سے پہلے کبھی اتنا پریشان نہیں دیکھا تھا۔ سلونی ہمیں ایک کمرے میں لے گئی۔ مس عرشی سامنے تھی۔ پلنگ پر وہ چت لیٹی تھی۔ ہمیں اس نے دیکھا تو ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"اپنا یہ کیا حال کر لیا ہے آپ نے! ایسی کون سی مصیبت آ گئی تھی۔ اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے آخر؟"

عرشی نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے آبی کو دیکھا اور پھر وہ لحاف میں منہ ڈال کر زار زار رونے لگی۔ آبی اس کے بستر سے اُٹھا، سلونی کے کندھے پر ہاتھ رکھتا ہوا میری طرف جھکا اور سرگوشی کے لہجے میں بولا۔

"یار! اسے تو سخت بخار ہے تم سلونی کو بھیجو، وہ کسی ڈاکٹر کو بلا لائے۔ اپنے ہسپتال میں ہی کسی کو فون کر دے۔"

سلونی نے یہ بات سن لی میرے قریب ہو کر بولی۔

"کہیں تو میں ہسپتال سے ایمبولینس منگوا لوں۔ اس نے ہی مجھے روک رکھا ہے۔"

"نہیں، کسی پرائیویٹ ڈاکٹر کو بلا دو ہسپتال پر لعنت بھیجو۔" میں نے اُسے سختی سے منع کر دیا۔ وہ اسی وقت باہر نکل گئی۔ آبی پھر عرشی کے پاس جا بیٹھا۔ اس کی حالت واقعی بہت خراب ہو رہی تھی۔

"میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی آبی صاحب! سب لوگ میری عزت کرتے تھے۔ میں تباہ ہو گئی ہوں چوہدری صاحب!"

"کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔ چاند پر کوئی نہیں تھوک سکتا ہے جندا۔ میں تمھارے ساتھ ہوں تم بالکل فکر نہ کرو۔ تمہیں نوکری کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تم چاہو تو میں تم سے شادی کرنے کو تیار ہوں۔ عرشی! مجھے تمھاری عزت ہر شئے سے زیادہ عزیز ہے۔" آبی نے بڑے ہی دو ٹوک لہجے میں کہا۔ میں بھی اس کی یہ بات سن کر حیران رہ گیا۔ عرشی اس کو یوں دیکھ رہی تھی جیسے اُسے اپنے کانوں پر اعتبار نہ آ رہا ہو۔

"مجھ پر بھروسہ رکھو عرشی! تمہیں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں اُس کی آنکھیں نکال دوں گا مجھے نہیں جانتی ہو تم، اپنے آپ کو سنبھالو۔"

آبی کی اتنی ساری تسلیوں کے باوجود عرشی کو کسی پہلو چین نہیں آتا تھا۔ وہ بستر پر اپنے غم کی فراوانی میں اوندھے منہ لیٹ گئی اور پھر اُس نے پلنگ کی پٹی پر اپنا سر دے مارا۔ وہ شاید پاگل ہو گئی تھی۔ آبی نے اسے بڑی مشکلوں سے سنبھالا۔ وہ ایسی صورت حال سے کبھی دوچار ہوا ہوتا تو اُسے معلوم ہوتا کہ ایسی صورت میں لوگ کیا کرتے ہیں وہ سہم گیا تھا۔

ہم صبح ہی صبح وہاں جا پہنچے تھے اور مجھے حیرت تھی کہ ابھی تک میں نے وہاں ماجدہ کی صورت نہیں دیکھی تھی۔

"یہ رونا دھونا بند کرو مس عرشی لعنت بھیجو اس مسز ولسن پر، یہ تو ہم گاڑی کے پہیّے کچل دیں گے۔ اُس عبیداللہ کو بھی ۔۔۔ یہ بتاؤ وہ ماجدہ کہاں ہے تمہاری سہیلی۔"

عرشی نے میری یہ بات بھی سنی اَن سنی کر دی، اسے کسی بات کا دھیان نہیں تھا۔ وہ رہ رہ کر بڑی سختی سے مٹھیاں بھینچتی تھی۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا۔ ورنہ وہ اپنے بال اور منہ بھی نوچ کھسوٹ لیتی۔ آبی اُسے بڑی ہی مشکلوں سے سنبھالے ہوئے تھا اور میں اُسے ہاتھ لگاتے ڈر رہا تھا۔ کیونکہ آبی اپنے پاگل پن میں شہنشاہی دکھا گیا تھا۔ اس نے اُسے شادی کی پیش کش کر دی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ مرد... بھی کتنا احمق جانور ہے۔ عورت کے آنسو دیکھ کر ہی اس کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں۔ حالانکہ وہ مردوں کے حلقے میں لوگوں کی گردنیں کاٹ کر بھی پریشان نہیں ہوتا۔

سلونی بہت تیز نکلی۔ وہ اسی علاقے کے کسی ڈاکٹر کو اس کے بستر سے نکال لائی تھی۔ وہ کوئی ادھیڑ عمر کا آدمی تھا، آتے ہی بولا۔

"میں ڈاکٹر سلیم اختر ہوں ایم بی بی ایس ہوں میں نے سنا ہے کہ مریضہ ہسپتال میں نرس ہیں۔"

"جی ہاں اور اِن کی حالت بہت ہی خراب ہو رہی ہے۔"

ڈاکٹر سمجھدار آدمی تھا۔ اُس نے تین چار منٹ تک عرشی کے معائنے کے بعد کہا۔ "مریضہ کسی شدید ذہنی صدمے سے دوچار ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ بخار تو ملیریا ہے نہ کوئی اور۔ غصّہ، غم، طیش، صدمے جیسے حادثے اس قسم کے بخار کا سبب بنتے ہیں حالانکہ ان کی جسمانی حالت بہت اچھی ہے پھر بھی انھیں بخار ہو گیا بہرحال آپ فکرمند نہ ہوں شام تک سنبھل جائیں گی۔"

یہ کہہ کر اس نے سب سے پہلے تو شاید بخار دور کرنے کا عرشی کو ٹیکہ لگایا جس کے لیے وہ کسی بھی طرح رضامند نہیں ہو رہی تھی۔ کوئی دس منٹ بعد ڈاکٹر نے عرشی کی نس میں کوئی ٹیکہ گھونپ دیا اور اس کے ساتھ ہی اُس نے اسے چار گولیاں بھی کھلا دیں۔ وہ کوئی بیس منٹ تک اس کام میں مصروف رہا۔ اور پھر وہ یہ دیکھ کر مطمئن ہو گیا کہ عرشی کو نیند آ گئی تھی۔ وہ بے سُدھ ہو کر ہر شے سے غافل ہو گئی۔ ڈاکٹر نے اس کی نبض دیکھی، اسی حالت میں اس کے فشارِ خون کا جائزہ لیا اور پھر اپنا سامان سمیٹ کر بولا۔ "انشاءاللہ یہ شام تک سنبھل جائے گی۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔"

"آپ کی بڑی مہربانی ڈاکٹر! ان کی زندگی اور صحت ہمیں بہت عزیز ہے، یہ لیں۔ یہ رہی آپ کی فیس۔" یہ کہہ کر آبی نے جیب سے سو کا نوٹ نکال کر ڈاکٹر کو دے دیا۔ وہ تو ایک دم خوش ہو گیا، بولا۔

"میری فیس اتنی زیادہ تو نہیں، آپ پچاس روپے دے دیں۔"

"رکھ لیجئے ڈاکٹر صاحب! آپ کا اس وقت آ جانا ہی ہمارے لیے باعثِ عزت ہے۔ ہم آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھول سکتے۔"

آبی واقعی شہنشاہ ہو گیا تھا۔ اُس نے عرشی کو خدا جانے کس حال میں دیکھا تھا کہ وہ اسی کا ہو کر رہ گیا تھا۔

ڈاکٹر باہر نکلا تو میں نے سلونی سے کہا کہ وہ ہمارے لیے ناشتے کا بندوبست کرے۔

"میں تو خود چائے کے ایک کپ کو ترس گئی ہوں۔ یہ تو ٹی بی رانی بخار اوڑھ کر لیٹ گئی اور وہ دوسری کہیں نظر ہی نہیں آئی جس کا یہ ذکر کرتی تھی۔"

"وہ ماجدہ گھر میں نہیں ہے؟"

"میں نے تو دیکھا نہیں اسے۔ دروازے کی چابی تو عرشی نے اپنے پرس میں سے نکالی تھی۔"

"اچھا تم دیکھو تو سہی شاید باورچی خانے میں کچھ مل جائے۔ اِن دو بلبلوں کا گھونسلا اتنا بھی خالی نہیں ہو سکتا۔" میں نے اسے گھر کے حالات کی چھان بین پر اکسایا۔

وہ گئی تو میں نے آبی کو عرشی کے پلنگ پر ہی بٹھا دیا۔

"ادھر بیٹھ جا لیکن یار اپنی زوجہ کے پاس۔ اب یہی تیرا اوڑھنا بن جائے گی۔ تیرے ستو بک گئے سمجھے۔"

وہ ہونٹ ٹیڑھا کر کے اپنے مخصوص انداز سے مسکرایا اور عرشی کے پاؤں کی طرف بیٹھ کر اس کا لحاف اپنے گھٹنوں پر ڈالتے ہوئے بولا۔ "تیرا کیا خیال ہے میں نے کوئی غلط پیش کش کی ہے؟"

"یہ پیش کش نہیں ہے بچے، پیچ کش ہے۔ میں تیری سب چالیں سمجھتا ہوں۔"

"یہ چال نہیں ہے یار! میں نے بہت خلوص سے یہ بات کہی ہے۔"

"وہ تو میں سمجھ ہی رہا ہوں۔ کوئی بہت ہی گہری بات ہے تیری اس "خلوصیت" میں۔"

وہ اب کی بار آنکھ دبا کر بڑی شرارت سے مسکرایا، بولا۔ "یار مجھے یہ پسند آ گئی ہے۔ روتی ہے نا تو بھی یہ اچھی لگتی ہے اور ہنستی تو ایسے ہے کہ اس کے دانت گنے جا سکتے ہیں۔"

"ہاں! میں دیکھ رہا ہوں بچے! کوئی خاص ہی پرزہ لگا ہے اس کے اندر ورنہ تو ایسے پنجرے میں پھنسنے والا آدمی ہے نہیں۔"

"مجھے اس پر ترس آ گیا ہے یار! اس کی تو ساری ساکھ شہرت عزت ہی ختم ہو گئی۔ اپنی ہم چشموں میں یہ نکّو بن گئی ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے مگر اس کو گٹھری میں باندھ کر کندھے پر لٹکانے کی کیا تک ہے۔ ہم شادیاں کرتے پھریں گے اب ہر عروس یک شب ہے۔"

"تیری فارسی بھی نکھر آئی ہے جیلانی تیرا لہجہ بالکل ایرانی ہو گیا ہے، چل یوں کرتے ہیں، تو سلونی سے شادی کر لے، میں اس سے نکاح پڑھوا لیتا ہوں پھر ہم پہاڑوں پر جا چڑھیں گے۔"

"وہاں اذانیں دیا کریں گے جاکر۔ راتوں کو اٹھ اٹھ کر چیخیں مارا کریں گے کہ دیکھو لوگو ہمارے انجام سے عبرت پکڑو۔ ہے نا یہی بات ؟"

وہ ہنس دیا، بولا "یار مجھے یہ مکان پسند آگیا ہے۔ کوٹھی کی طرز کا ہے ہر سہولت یہاں موجود ہے کیوں نہ ہم اسے خرید لیں ؟"

"یہ ہوش میں آتی ہے تو اس سے بات کر۔ میرا خیال ہے رجسٹری تو اس کے نام ہی کروائے گا۔"

"پتہ نہیں یار۔ اب میرا دل چاہتا ہے کہ میرا بھی ایک گھر ہونا چاہیے۔ اس نے پتہ نہیں میرے اندر کا کوئی پرزہ توڑ دیا ہے۔ میرا دل بہت ہی نرم ہوتا جا رہا ہے۔"

"خدا تیرے حال پر رحم کرے۔ عورتوں کی صحبت کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ اچھے بھلے جری مرد کو راتوں رات زنخہ بنا دیتی ہیں۔" میں نے اس کی باتوں سے چڑ کر کہا۔

کوئی بیس منٹ بعد سلونی ہمارے لیے ناشتہ تیار کر لائی۔ وہ انڈے توس مکھن اور چائے تیار کر کے لے آئی تھی۔

"یہ سب چیزیں موجود تھیں یہاں ؟" آبی نے حیران ہو کر پوچھا۔

"جی نہیں۔ میں بھاگ کر دکان سے لے آئی۔ ایک صرف آگ اور برتن موجود تھے یہاں۔"

"گڈ! تو خاصی سلیقہ شعار ہے اور امورِ خانہ داری میں ماہر نظر آتی ہے مجھے۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔

"اور اگر کبھی اس نے شادی کی تو اس کا سب سے پہلا انتخاب تم ہو گی مس سلونی۔"

وہ جھینپ سی گئی۔ کم گو لڑکی تھی پھر بھی اکڑ کر بولی۔ "جی نہیں! اتنی بھولی نہیں ہوں میں، اور نہ اتنی سلیقہ شعار کہ آپ کے امتحان میں پاس ہو جاؤں۔"

"ذرا پتہ تو کرو بی بی کہ وہ ماجدہ ہے کہاں ؟" میں نے اسے پھر یاد دلایا۔

"میں نے اسے دیکھا ہو تو کچھ بتاؤں۔ پتہ نہیں وہ حور پری ہے کون جس کا آپ بھی بار بار ذکر کرتے ہیں کوئی خاص ہی چیز ہو گی وہ"

"اسے دیکھ لو گی نا تو پھر دیکھنا ہی بھول جاؤ گی تم مس سلونی! اس کا سلسلۂ نسب شہنشاہ بابر سے جا ملتا ہے۔" آبی ترنگ میں تھا اور دور کی کوڑی لا رہا تھا۔

"ابھی تو آپ بس یہ غریبانہ سا ناشتہ کریں۔ اس پر جو پیسے خرچ ہوتے ہیں وہ آپ ہی کے تھے۔ رات پچاس روپے دیے تھے نا آپ نے مجھے۔ یہ اسی سلسلے کی کڑی ہے۔" سلونی پھر چہک رہی تھی۔

"ایک بات بتاؤ مس سلونی! اس عرشی کے گھر کے حالات کیسے ہیں ؟"

"یہ قصور کے قریب کسی گاؤں کی رہنے والی ہے اور تنخواہ ملتے ہی یہ اپنی ماں کو رقم منی آرڈر کر دیتی ہے کبھی بتایا تو نہیں اس نے کہ اس کے گھر کے حالات کیا ہیں مگر میں اندازہ لگا سکتی ہوں کہ وہاں بھی بھوک بھنگڑا ڈال رہی ہو گی۔"

"مس سلونی! تم نے خود بھی ناشتہ کر لیا ہے کہ نہیں ؟" آبی نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ وہ سلونی کی باتیں سن کر پریشان ہو گیا تھا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر ہم نے دو دو سگریٹ پھونکے۔ آبی ابھی تک اپنی جگہ پر جم کر بیٹھا تھا۔

"اب کیا سوچا ہے تم نے ؟" میں نے اس سے آگے کی بات پوچھی۔ سلونی کمرے سے باہر جا چکی تھی۔

"یار! اگر میں یہاں رہ سکوں تو یہ ڈاکٹر سلیم اختر میری مرہم پٹی کر دیا کرے گا۔ تم میرا سامان وہاں سے منگوا دو۔ اور ان کے بل کی ادائیگی کر دو۔ میں یہاں رہنا زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔"

"تیرا بھی جواب نہیں ہے پیارے۔ پر خیر، میں سلونی سے کہتا ہوں وہ تمھاری تمام چیزیں ادھر لا دے گی۔"

"خدا تیرا بھلا کرے جیلانی! آدمی تو بہت نیک دل ہے یار! ہم یہ مکان بھی خرید لیتے ہیں۔ اس ماجدہ کو تھوڑو بہت رقم ہے اس کے پاس"

"پہلے تو تم کچھ اور ہی نصیحت کر رہے تھے۔"

"وہ میری آخری نصیحت نہیں تھی۔ میرا خیال ہے وہ عورت یہ مکان لاکھ سوا لاکھ میں دے دے گی۔"

"امید تو ہے۔ خیر یہ تمھاری دوست ہوش میں آجائے تو اس سے بات کرو، شاید کام بن جائے۔" یہ کہہ کر میں اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

"اب کہاں کا ارادہ ہے ؟"

"میں ڈھلوں صاحب سے ملنے جا رہا ہوں، دیکھتا ہوں وہ کیا کہتے ہیں۔ انسپیکٹر سے میرا آج ملنا بہت ضروری ہے میرا دل لرز رہا ہے پتہ نہیں وہ کس حال میں ہو گی۔"

"ہاں، اس کا پتہ کرو۔ میں ادھر ہی بیٹھا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے ایک اور سگریٹ سلگا لیا۔ اتنے میں سلونی اندر آگئی۔ آبی نے اسے دیکھے بغیر کہا۔

"تم کہاں رہتی ہو مس سلونی ؟"

"میں تو جی ادھر ہسپتال میں نرسوں کے ہاسٹل میں رہتی ہوں۔"

"ٹھیک! تم بھی دس دن کی چھٹی لے لو۔ ادھر اس عرشی کی تیمارداری کرو اور ادھر ہی رہو۔ میں کہاں اس کو سنبھالتا پھروں گا۔ اس کام کے ہم تمہیں پچاس روپے روزانہ دیں گے کہو منظور ؟"

"منظور ہے جناب! مگر اس میں اور کچھ شامل نہیں ہو گا۔" وہ بہت ہی تیز جا رہی تھی۔

"ایگریڈ مس سلونی! کوئی اور خدمت اس میں شامل نہیں ہو گی بس باورچی خانہ تمہیں سنبھالنا پڑے گا۔"

"وہ میں جانتی ہوں۔"

"بس ٹھیک ہے کہہ دو مسز ولسن سے کہ تم بھی بیمار ہو۔ کسی دن تو میں کسی دن ٹانگیں چیر دوں گا۔" یہ کہہ کر میں مسکراتا ہوا باہر نکل آیا۔ آبی نے زندگی کا ایک اور راز پا لیا تھا۔ وہ خوش تھا بے حد خوش۔

فرخندہ کے مکان سے نکل کر میں سڑک پر پہنچا تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ کمبل میرے بدن پر بہت ہی اوپرا سا لگ رہا تھا۔ لوگوں نے ٹیڈی تک اتار دیے تھے۔ کئی بانکے تو راہ میں مجھے ایسے ملے جنہوں نے ململ کے کرتے پہن رکھے تھے اور میں اپنے اونچے لمبے مضبوط قد پر کمبل اوڑھے جا رہا تھا۔ اپنی شناخت کے خوف نے الگ مجھے دبوچ رکھا تھا۔ مجھ پر لازم تھا کہ اس شہر میں گھومنے پھرنے کے لیے اپنے حلیے میں کچھ تو تبدیلی پیدا کر لیتا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہاں ایک دو نہیں بے شمار ایسے پولیس والے موجود تھے جو میری صورت سے پوری طرح آشنا تھے۔ وہ میرے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ ان کی نظروں سے بچنا میرے لیے بے حد ضروری تھا۔ میرا خیال ہے کہ ان کو یہ بھی علم تھا کہ میں ہمیشہ کمبل اوڑھے رہتا ہوں اور اپنی خدشوں کی زد میں چلتا ہوا میں ایک ٹیکسی میں بیٹھا اور انار کلی جا پہنچا۔ وہاں سے میں نے ایک تیار شدہ کپڑوں کی دکان سے ایک بہت ہی خوبصورت قسم کا ولایتی سوٹ خرید کر پہن لیا۔ آگے چل کر میں نے ایک بریف کیس لیا اور اس میں آبی کا خرید کردہ جوڑا جو میں نے اتارا تھا بند کر لیا۔ میرے بوٹ بھی مجھے بہت ہی بے ہنگم سے نظر آ رہے تھے۔ وہ بھی میں نے بدل ڈالے اور پرانے اتار کر ایک فقیر کو دے ڈالے۔ راستے میں میں نے ایک قراقلی ٹوپی بھی خریدی اور پھر ایک سیاہ عینک آنکھوں پر لگا کر میں ایک بالکل ہی نئے اور قابلِ احترام روپ میں شیزان ریسٹورنٹ کی طرف چل دیا۔ ٹیکسی نہیں مل رہی تھی۔ مجبوراً میں نیلا گنبد کی طرف سے نکلا اور میو ہسپتال کے قریب سے گزر کر آگے بڑھ گیا۔

ابھی میں کچھ ہی دور گیا تھا کہ مجھے بائیں ہاتھ بہت سے لوگوں کی بھیڑ نظر آئی۔ میں سمجھا کوئی حادثہ ہو گیا ہے۔ اس بھیڑ کی وجہ معلوم کرنے اور حادثے کے شکار آدمی کی صورت دیکھنے کے لیے میں نے لوگوں کو ادھر ادھر ہٹا کر سامنے نظر ڈالی تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہاں ایک جوان عورت اوندھے منہ پڑی تھی۔ اس کا لباس جگہ جگہ سے پھٹ چکا تھا۔ اس عورت کو دیکھ کر مجھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ میں نے اسے کہیں دیکھا ہے۔ میں نے ذرا آگے بڑھ کر اس کے چہرے پر نظر ڈالی تو میرا دل بیٹھنے لگا میرے سامنے ریٹا تھی۔ وہ ریٹا جو سارے جہان سے اچھی وہ میری محبت میں غلطاں رہنے والی ریٹا میرے سامنے بے گور و کفن پڑی تھی۔ وہ زندگی سے منہ موڑ چکی تھی۔ اس کے ننگے بازوؤں اور ٹانگوں پر جا بجا نیلے نیلے چکتے سے نظر آ رہے تھے۔ وہ اذیتوں کے بے پناہ سیلاب میں سے گزر کر دم توڑ گئی تھی۔ اس کی وہ نیم برہنہ لاش دیکھ کر میرا ذہن الٹنے لگا۔ میرے دشمنوں نے میرے دل کے سب سے نازک مقام پر خنجر گھونپ دیا تھا۔ میرے بریف کیس میں میرا کمبل بند تھا۔ میں نے وہ نکال کر فوراً ہی عظیم ریٹا پر ڈال دیا جس کے مجھ پر ان گنت احسانات تھے۔

"جاؤ، چلے جاؤ یہاں سے دفع ہو جاؤ تم سب لوگ اس بدنصیب عورت کی اور زیادہ بے حرمتی نہ کرو جاؤ۔" میں نے چیخ کر ان بھیڑیوں کی بھیڑ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

وہ وہاں سے ایک ایک کر کے کھسکنے لگے۔ تین چار آدمی عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ "یہ آپ کی عزیزہ ہیں ؟" ایک آدمی نے پوچھا۔ بڑے ہی اجنبیت بھرے اور بڑے ہی بیگانہ لہجے میں اس کا یہ سوال سن کر میں نے تڑاخ سے ایک تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا۔ وہ تیورا کر پیچھے گرا۔ "چلا جا یہاں سے، یہ تیری ماں ہے تیری بہن ہے۔ کیوں کھڑا ہے تو یہاں، چلے جاؤ یہاں سے۔ ورنہ میں ایک ایک کو مار دوں گا۔"

میری آواز کی گھن گرج سے سہم کر وہ آدمی تیزی سے اٹھا اور اپنی سائیکل پکڑ کر وہاں سے بھاگ نکلا۔ باقی آدمی بھی بڑبڑاتے ہوئے وہاں سے کھسکنے لگے۔

قریب ہی سے ایک خالی ٹیکسی گزر رہی تھی۔ میں نے اسے روکا۔ ڈرائیور نے سڑک کے کنارے کمبل میں لپٹی لاش دیکھی تو فوراً ہی نیچے اتر آیا۔ ہم ہسپتال کے قریب ہی کھڑے تھے۔ وہ بولا۔

"کیا یہ... کوئی آدمی مر گیا ہے بھائی جی! کون ہے یہ ؟"

"یہ کوئی بدنصیب عورت ہے۔ خدا جانے کس طرح مر گئی ہے۔ اسے یہاں سے اٹھائیں۔ بیچاری کی لاش کی بے حرمتی ہو رہی ہے۔" میں نے گلوگیر آواز میں کہا۔ اس نے ٹیکسی کا پچھلا دروازہ کھولا تو میں نے ریٹا کو کمبل میں لپٹا کر اٹھایا اور ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر ڈال دیا۔ ابھی تک سڑک کے دوسرے کنارے تین آدمی ہمیں بڑے غور سے دیکھ رہے تھے جو یونہی شہدے سے نظر آ رہے تھے۔ میں نے انہیں نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "چلو ادھر مال روڈ کی طرف چلو وہاں میں اپنے ایک عزیز کو ساتھ لے لوں گا۔"

ڈرائیور نے ریٹا کا چہرہ دیکھ لیا تھا، بولا۔ "یہ کون ہیں ؟ بیمار تھیں کیا ؟"

"میں اسے نہیں جانتا ہوں بھائی! مگر کسی کی تو کچھ لگتی ہو گی یہ بدنصیب عورت۔"

"پھر آپ اسے تھانے کیوں نہیں لے جاتے۔ خدا جانے اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے اس کے ساتھ کسی نے بہت زیادتی کی ہے۔"

"مجھے کچھ پتہ نہیں ہے بھائی۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اسے کیا ہوا ہے۔" میں نے اپنی آنکھوں میں ابھرتے ہوئے آنسوؤں کو

بڑی مشکلوں سے پیتے ہوئے کہا۔ میرے دماغ میں کھلبلی مچی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس ریٹا کے ساتھ کیا کچھ ہو چکا ہے۔ وہ سیدھی کھڑی سوئیوں بھرے تختے پر سے گھسیٹ کر اتار دی گئی تھی۔ اسے انہوں نے بدترین ذلتوں سے دوچار کر رکھا ہوگا۔ وہ اس سے میرا نام پوچھتے ہوں گے میرا پتہ معلوم کرتے ہوں گے مگر وہ چپ رہی ہوگی۔ کچھ بھی انہیں میرے بارے میں نہ بتا سکی ہوگی۔ اور اپنی اس چپ پر وہ ان کے ظلم سہتی رہی ہوگی۔ وہ بہت روئی ہوگی بہت چلائی ہوگی ہر ہر سانس پر اس نے میرا نام لیا ہوگا مگر وہ الم نصیب نہیں جانتی تھی کہ میں کہاں ہوں۔ اسے میرے ٹھکانے کا قطعاً کوئی علم نہیں تھا اور اگر ہوتا بھی تو وہ انہیں کسی قیمت پر کچھ نہ بتاتی۔ وہ بے موت ماری گئی تھی۔ سارے جہاں کے دکھ درد سہہ کر وہ زندگی سے منہ موڑ گئی اور وہ۔۔۔۔ وہ آسیہ کے ساتھ نکلی تھی میری بہن کے ساتھ۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے دماغ کی رگ پھٹ جائیگی۔ میں ریٹا کے سر کی طرف سمٹ سمٹا کر بیٹھا تھا۔ ایک بار پھر میں نے اس کے چہرے پر سے کمبل ہٹا کر اسے دیکھا۔ اس کے رخساروں پر ان آنسوؤں کی لکیریں صاف نظر آ رہی تھیں جو بہہ کر خشک ہو چکے تھے۔ اس کے گالوں پر نشان یہ بتاتے تھے کہ اسے ہوس کی سُولی پر بھی لٹکایا گیا ہے اور اس کے سونا بدن کو غلاظتوں میں ڈبو دیا گیا تھا۔ اس کی انگلی میں وہ انگوٹھی بھی نہیں تھی جو میں نے خود اسے پہنائی تھی۔ میرا کچھ بھی تو اس کے پاس نہیں تھا۔ ہاں! اس کے ذہن کے نہاں خانوں میں میری جو تصویر کندہ تھی، وہ اس کے طاق بند کر کے اسے بچا لاتی تھی۔

ٹیکسی میں نے شیزان ریسٹورنٹ کے سامنے روکی تو میں نے دیکھا کہ ڈھلوں صاحب کی کار پہلے سے ہی وہاں کھڑی تھی اور وہ اس کی پچھلی نشست پر بیٹھے تھے۔ اس وقت دس بج رہے تھے۔ انہوں نے اپنے وقت کا احترام کیا تھا۔ ان کی کار سامنے دیکھ کر میں سسکتا ہوا ان کی طرف لپکا۔ اس حلیے میں وہ پہلی نظر میں مجھے پہچان ہی نہ سکے مگر پھر انہوں نے میری وہ بھیگی ہوئی آنکھیں دیکھیں میرے چہرے پر غور کیا، پھر گھبرا کر کار سے باہر نکل آئے۔

"کیا بات ہے خان صاحب خیر تو ہے؟"

"خیر نہیں ہے ڈھلوں صاحب! اس شہر نے پھر مجھے لوٹ کر کنگال کر دیا ہے، اُدھر ٹیکسی میں ریٹا کی لاش پڑی ہے ڈھلوں صاحب میں برباد ہو گیا ہوں۔"

وہ ہکا بکا رہ گئے "یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ اسے کس نے مار دیا ہے اس ریٹا کو؟" انہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں انہیں کھینچ کر ٹیکسی کے پاس لے گیا اور ریٹا کے منہ پر سے کمبل ہٹا کر میں نے انہیں اس ہستی کی صورت دکھائی جس کے خلوص نے مجھے اپنا بے دام غلام بنا رکھا تھا جس پر میں کسی بڑے سے بڑے جری مرد سے کہیں زیادہ بھروسا کرتا رہا تھا۔

اس کی صورت دیکھ کر ڈھلوں صاحب حیران رہ گئے "بہت برا ہوا۔ خان! اس ٹیکسی کو سیدھا پولیس سرجن کے پاس لے چلیں۔" یہ کہہ کر وہ اپنی کار میں جا بیٹھے۔ انہیں پولیس سرجن کے دفتر کا راستہ معلوم تھا۔ وہ میرے آگے نکلے تو میں نے ٹیکسی ان کے پیچھے لگا دی مگر مجھے ان کی وہ تجویز بہت کھل رہی تھی۔ اب ریٹا کی وہ لوگ اور زیادہ بے حرمتی کریں گے۔ کیا وہ چھریوں کی زد میں جا پڑے گی۔ نہیں نہیں۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ کسی طرح بھی نہیں۔

ڈھلوں صاحب کی کار پولیس سرجن کے دفتر کے اندر جا کر رکی تو میں نے ٹیکسی ان کے پہلو میں ٹھہرا دی۔ وہ دفتر ان دنوں انارکلی کے علاقہ میں تھا۔

"ڈھلوں صاحب! خدا کے لیے! مجھے اس کے پوسٹ مارٹم کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے ان کے پاس جا کر دبی آواز میں کہا۔

"پاگل ہیں آپ! میں اس کے قاتلوں کی بوٹیاں اُڑوا دوں گا۔ جیل میں سڑا دوں گا انہیں۔ سمجھا کیا ہے انھوں نے! اسے آپ اٹھا کر اندر لے آئیں میرے پیچھے چلے آئیں۔" یہ کہہ کر وہ بڑے غصے سے کار کا دروازہ اپنے پیچھے بند کر کے پولیس سرجن کے کمرے میں جا گھسے۔ میں بھی ریٹا کو کمبل میں لپیٹ کر ان کے پاس جا پہنچا۔ پولیس سرجن کا نام بخشیش سنگھ تھا۔ ڈھلوں صاحب کو دیکھتے ہی بولا

"یا وحشت! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ آپ نے کیسے زحمت فرمائی چوہدری صاحب۔ آیئے آیئے ادھر میرے سامنے تشریف رکھیے"

"میں ایک لاوارث عورت کی لاش لایا ہوں بخشش صاحب اور آپ کو اس کا معائنہ کر کے تفصیل سے سب کچھ لکھ کر دینا ہوگا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔"

"اوہ! آئی سی۔ یہ لاش کہاں سے ملی ہے آپ کو؟"

"یہ اُدھر میو ہسپتال سے ذرا آگے سڑک پر پڑی تھی۔" ڈھلوں صاحب نے بہت ہی بجھے ہوئے دل سے کہا۔ میرے چہرے کے تاثرات میرے دل کے زخموں کی غمازی کر رہے تھے۔ سب کچھ ہی بھسم ہو کر رہ گیا تھا۔

"ہوں! آپ اسے ادھر اس کمرے میں میز پر ڈال دیں۔ میں ابھی دیکھتا ہوں۔ یہ کون صاحب ہیں چوہدری صاحب؟"

"یہ ۔۔۔۔ انہوں نے ہی تو وہاں سے لاش اٹھائی ہے۔ میں ... نہیں جانتا ہوں۔" ڈھلوں صاحب نے کہا۔

میں نے ریٹا کو پہلو کے کمرے میں پچھلی لمبی سی میز پر لٹا دیا اور ٹیکسی ڈرائیور کو فارغ کرنے کے لیے برآمدے میں جا نکلا۔ اس نے انجن اسٹارٹ کر دیا۔ وہ جانے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ میں ڈرائیور کو کرایہ ادا کر رہا تھا تو مجھے محسوس ہوا کہ تین آدمی غیر محسوس طریقے پر میرے گرد اپنا حلقہ تنگ کر رہے ہیں۔ وہ بڑے ہی غیر محسوس انداز میں میری طرف بڑھ رہے تھے اور ان میں ایک آدمی وہی تھا جسے میں نے اس

طرف کھڑے دیکھا تھا جہاں سے میں نے ریٹا کی لاش اٹھائی تھی۔ ایک لمحے کے لیے میرا ذہن جھنجھنا کر رہ گیا۔ وہ مجھے پہچان چکے تھے۔ کوندے کی طرح یہ احساس میرے ذہن میں ابھرا کہ میں نرغے میں پھنسا ہوں۔ ڈرائیور اس وقت اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھا تھا۔ میں نے اسے دھکیل کر دوسری سیٹ پر گرا دیا اور بلا خیز رفتار سے ٹیکسی کو گھما کر بڑے دروازے کی طرف لپکا۔ بس میرے اور ان تین آدمیوں کے اندازوں میں ایک لمحے کا فرق پڑ گیا تھا۔

"یہ کیا کرتے ہو بھا جی۔ گاڑی مجھے دے دو۔"

"ذرا چپ رہ میرے یار! میری زندگی خطرے میں ہے۔" میں نے ٹیکسی کو گیٹ میں سے گزارتے ہوئے کہا۔

وہ تینوں ہمارے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ ایک نے پستول نکال کر ٹیکسی کا بایاں عقبی ٹائر پھاڑ دیا۔ زبردست دھماکے کے ساتھ ہی ٹیکسی لڑکھڑائی۔ میں نے دروازہ کھولا اور بازار کی بھیڑ میں جا گھسا۔ وہ تینوں باہر گیٹ پر پہنچ چکے تھے میرے سامنے اب کئی راستے کھلے تھے مگر وہ تینوں شکرے میری طرف لپکے چلے آ رہے تھے۔ میں بلا خیز رفتار سے لوگوں کی بھیڑ کو چیرتا ہوا انارکلی کے چوک کی طرف بڑھا۔ عین اس وقت ایک رکشہ میرے قریب سے گزرا۔ وہ بالکل خالی تھا۔ میں غڑاپ سے اس کے اندر جا بیٹھا۔

"جلدی چل یار! مجھے گاڑی پکڑنی ہے۔ بس دس منٹ باقی ہیں"

ڈرائیور میری بے چینی کو سمجھتا ہوا اسنبھل کر بیٹھا اور رکشہ کا ہینڈل گھماتا ہوا بھیڑ کو کائی کی طرح کاٹنے لگا۔ اب میں پھر اس سڑک پر سے گزر رہا تھا جہاں سے کچھ دیر پہلے میں نے ریٹا کی بے گور و کفن لاش اٹھائی تھی۔ زندگی قدم قدم پر چیر کے دیے جاتی تھی۔ رکشہ ذرا کھلی سڑک پر پہنچا تو اس کی رفتار دوگنی ہو گئی۔ ڈرائیور میرے حال حلیے سے دگنا کرائے کی توقع رکھتا تھا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو میرا دل بیٹھنے لگا۔ ایک ٹیکسی بلا خیز رفتار سے ہمارے پیچھے بڑھی آ رہی تھی۔ اور سامنے ایک سوار کھڑکی میں سے سر باہر نکال کر مجھے دیکھ رہا تھا۔

ہمارا رکشہ بتی والے چوک میں سے گزرا ہی تھا کہ اشارہ بدل گیا اور پیچھے آتی ٹریفک سرخ نشان کے اس طرف جام ہو کر رہ گئی۔ وہ ذرا سی مہلت میرے لیے بہت کافی تھی۔

"تیز چلو یار میں تمہیں ڈبل کرایہ دوں گا۔"

ڈرائیور نے رفتار اور بڑھا دی۔ وہ میری مشکل کو اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔ وہ میکلوڈ روڈ پر چڑھ کر اسٹیشن کی طرف لپکا۔ ٹیکسی اب بھی ہمارے پیچھے آ رہی تھی مگر فاصلہ بڑھ گیا تھا۔ میں نے اگلے چوک میں پہنچتے ہی رکشے کو ہال روڈ کی طرف گھما دیا۔ اور پھر لوگوں کی بے پناہ بھیڑ میں رکشے کی رفتار مدھم ہوئی۔ میں نے دس روپے ڈرائیور کو تھمائے۔ میں اس سے اتر کر ایک دفتر کے کھلے دروازے میں جا گھسا۔ وہ عمارت انسپکٹر آف اسکولز کے پاس تھی۔ میں اس میں دور اندر تک

گھستا چلا گیا اور دفتر کے مختلف کمروں میں سے گزرتا ہوا عمارت کے پچھلے حصے میں جا پہنچا۔ وہاں کوئی بھی آدمی موجود نہ تھا۔ اس عمارت کی پچھلی دیوار تک جب میں جا پہنچا تو میں نے محسوس کیا کہ اب وہ شکاری کتے میری بو نہیں سونگھ سکیں گے۔ میں ان کی دستبرد سے بچ نکلا تھا۔ وہ دیوار بہت ہی بوسیدہ ہو رہی تھی۔ پرانی نانک شاہی اینٹوں سے بنی تھی اور اونچائی اس کی یہی کوئی تین ہاتھ تھی۔ میں نے بڑی احتیاط سے گرد و پیش کا جائزہ لیا اور پھر دو مضبوط اینٹوں پر ہاتھ رکھ کر میں دیوار پھاند گیا۔ اب پچھلے مکروہ منظر سے میں لاتعلق ہو گیا تھا۔ وہ لوگ وہاں تک میرے پیچھے نہیں آ سکے تھے۔ رکشے والے کو پکڑ کر بیٹھے ہوں گے کہ بیٹے! بتا وہ سواری تو نے کہاں 'خلاص' کی۔

میں ایک مہیب خطرے سے بچ نکلا تھا مگر اس حال میں کہ اپنی جان بچانے کے لیے میں ریٹا کو سرجن کی میز پر لاوارث چھوڑ آیا تھا۔ یہ ایسی بات تھی جس سے میں اپنے آپ سے شرمندہ ہونے لگا۔ بہت دم بھرتا تھا میں اس کی محبت کا۔ بڑی قدر تھی میرے دل میں اس لبِ لعلین کی جو موت کی بے پناہ اذیتوں کے سیلاب میں کھلے رہ گئے تھے۔ ان آنکھوں کے کواڑ موت کی ہیبت ناک صورت دیکھ کر کسی حرماں نصیب مجبور کی آنکھوں کی طرح بس دیکھتے ہی رہ گئے تھے۔ اور مندنا بھول گئے تھے۔ بڑا بہادر بنتا تھا میں۔ بڑا مان تھا مجھے اپنی سماعت پر، اپنی دلیری پر، اپنے بازوؤں کی پھڑکتی مچھلیوں پر اور اپنی ذہانت پر۔ مگر میں اس کی لاش کی اس مزید بے حرمتی کے وقت بھی ریٹا کے پاس نہ رک سکا تھا۔ کیونکہ مجھے اپنی جان عزیز تھی۔ میں پولیس کی آندھی سے اپنی زندگی کے چراغ کی لَو ہر قیمت پر بچا لینا چاہتا تھا۔ لیکن اگر ریٹا کی جگہ آسیہ ہوتی تو کیا میں پھر بھی اسی طرح وہاں سے دُم دبا کر بھاگ نکلتا۔ جونہی یہ سوال میرے ذہن میں ابھرا میں نے اپنا سر اس وحشی کی طرح جھٹکا جس کے ماتھے میں گولی لگ گئی ہو۔ وہ مجھ پر بڑا ہی کڑا وقت تھا۔

ایک لحظے کے لیے میری سوچ کے دھارے بدلے تو میں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ میں ایک ہرے بھرے چھوٹے سے لان میں کھڑا تھا۔ جو کسی پرانی کوٹھی کا پائیں باغ تھا۔ اس لان میں ایسی عمدہ ہری گھاس اُگی تھی کہ آدمی اس پر لیٹ کر لہکتی بہشتوں کے تصور میں کھو جائے۔ اس لان کے چاروں طرف روشیں تھیں۔ جن کے کناروں پر کسی نے بڑے سلیقے سے سرخ گلاب اگا رکھے تھے اور وہ بہار کے دن تھے۔ اس بہار کے دن جس کے تصور میں ڈوب کر خزاں نصیب دو گھڑی جی بہلا لیا کرتے ہیں۔ میں گھاس کو اپنے پاؤں سے بچاتا ہوا گلابوں کی روش کے ساتھ ساتھ چلتا آگے بڑھا۔ عمارت کے پچھلے حصے میں چار کھڑکیاں تھیں جن کے عین وسط میں ایک دروازہ تھا۔ اس دروازے پر ایک انگور کی بیل محیط تھی اور بہت ہی بھلی معلوم ہوتی تھی۔ وہ کسی کا گھر تھا کسی ایسے آدمی کا جس کو میں نہیں جانتا تھا۔ میں اس کی چار دیواری کی بے حرمتی کا مرتکب ہوا تھا مگر میرے پاس

اس کے سوا اور کوئی راستہ تھا بھی تو نہیں۔ میں کیا کرتا۔

میں نے عمارت کے عقبی دروازے پر پہنچ کر ایک بار پھر اُس دیوار پر نظر ڈالی جسے میں پھاند آیا تھا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ ادھر سے اطمینان کر لینے کے بعد میں دروازے کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ اُدھر بھی چار ہی کھڑکیاں تھیں جو اس بات کا پتہ دیتی تھیں کہ اس طرف بھی چار ہی کمرے بنے ہوئے ہیں۔ وہاں بھی اُن چار کھڑکیوں کے عین وسط میں ایک دروازہ تھا۔ میں اس کے سامنے پہنچا تو مجھے وہاں سے کسی کے کراہنے کی آواز سنائی دی۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی شخص درد کی شدت سے بہت زیادہ پریشان ہو رہا ہے۔ اپنے اردگرد مجھے کوئی ذی روح نظر نہیں آتا تھا۔

اچانک مجھے اس عمارت کے وسطی حصے سے دو بچوں کی آواز سنائی دی وہ یک آواز ہو کر کہہ رہے تھے۔

" امی جان امی جان! دادا جی مر گئے۔"

" بکواس بند کرو۔ وہ بڈھا کبھی نہیں مرے گا۔ ہم سب کو لے کر مرے گا۔" کسی عورت نے کرخت لہجے میں بچوں کو ڈانٹ دیا۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ وہ فرش پر تیز تیز چلتی ہوئی اندر کی طرف جا رہی ہے۔ میں چند لمحوں کے لیے وہاں ٹھٹکا اور دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ پھر مجھے کوئی دروازہ ٹھک سے کھلنے کی آواز سنائی دی۔ وہ عورت شاید اس کمرے میں جا پہنچی تھی جس میں سے میں نے وہ کراہیں سنی تھیں بوڑھا شاید بے ہوش ہو چکا تھا۔ ان کے اس قطعی ذاتی مسئلے کو نظر انداز کر کے میں نے قدم آگے بڑھایا ہی تھا کہ کمرے کی کھڑکی پر لگی جالی میں سے اس عورت نے مجھے دیکھ لیا۔ وہ چیخ کر بولی۔

" منیغم! یہ دیکھ باہر کون ہے۔ ان سے پوچھ وہ کس سے ملنا چاہتے ہیں۔" پھر وہ بڑبڑائی " پر یہ اندر کیسے آیا؟ میں نے تو اسے نہیں دیکھا۔"

ایک آٹھ نو سال کا بچہ دوڑتا ہوا باہر نکلا اور مجھ سے ٹکرا سا گیا، ہانپتے ہوئے بولا " آپ۔۔۔ آپ کو کس سے ملنا ہے؟"

ابھی میں اسے کچھ کہہ بھی نہ پایا تھا کہ ایک دوہرے بدن کی گوری چٹی عورت بڑی بے باکی سے تھلتھلاتی ہوئی باہر آ گئی۔ اس نے ہلکا سا بہت ہی عمدہ قسم کا گلابی سوئیٹر پہن رکھا تھا اور اسے اپنے آپ کو سنوارنے کا سلیقہ آتا تھا مگر اس لمحے اس کی آنکھوں میں حیرت اور استعجاب ایسا تھا کہ اس کے چہرے کی دلکشی ماند پڑ گئی تھی۔

" آپ کو کس سے ملنا ہے اور آپ کس راستے سے اندر آئے ہیں؟"

" جی! مجھے بیگم نجمہ سے ملنا ہے۔ نجمہ وحید سے۔" میں نے اپنی جان چھڑانے کے لیے ایک جھوٹ گھڑ لیا۔

" نجمہ وحید سے! وہ کون ہیں؟" وہ بڑی ہی ترشروئی سے بولی اس کی بھاری بھر کم چوٹی جو کمر تک لہرا رہی تھی، آپ ہی آپ اس کے پہلو پر آ لگی۔ یہ اُس کے سر کی حرکت تھی جو چوٹی کو قرار نہیں لینے دیتی تھی۔

" جی وہ جو پروفیسر ہیں کو پر روڈ والے کالج میں ہیں ہسٹری کی پروفیسر ہیں۔"

" اوہ سمجھی! اُن کا نام نجمہ نہیں ہے جناب سلمیٰ ہے آپ کو کسی نے غلط بتایا ہے مگر وہ تو پندرہ نمبر کوٹھی میں کرائے دار ہیں وہاں۔ اوپر کے حصے میں رہتی ہیں وہ۔ یہاں آپ کو کس نے بتا دیا؟" اس کی آواز اب اعتدال پر آتی جا رہی تھی۔

میں نے اس گھڑی خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ اس نے اُس بھڑکی ہوئی غصیلی عورت کے قہر و غضب سے بچا لیا تھا۔

" ایک صاحب مجھے آپ کے دروازے میں دھکیل گئے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ وہ پروفیسر اس کوٹھی کے پچھلے حصے میں رہتی ہیں۔"

" کون تھا وہ ذلیل جس نے آپ کو یوں میرے گھر میں دھکیل دیا۔ میں تو ڈر ہی گئی تھی۔ دیکھیں نا میں بیوہ عورت ہوں اپنے سے بھی خائف رہتی ہوں۔" وہ اب بڑی رسان سے مسکرا رہی تھی اس کے چہرے کی دلکشی عود کر آئی تھی۔ اس کے وہ قندھاری سیب رخسار دہکتے نظر آ رہے تھے۔ اور جب وہ مسکرائی تو مجھے یوں محسوس ہوا خوبصورت دانت خدا کی بہت بڑی عنایت ہے صاف شفاف دانت کسی کی شخصیت میں مسحور کن دلکشی پیدا کر دیتے ہیں۔

" میں معافی چاہتا ہوں خاتون! آپ کو میں نے بلاوجہ پریشان کیا۔ دراصل میں جہلم سے آیا ہوں۔ میں وہاں کا ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر ہوں پروفیسر سلمیٰ سعید سے مجھے بہت ہی ضروری کام تھا۔" میں نے اپنے نئے عہدے سے ترتیب دے کر اس کے سامنے رکھ دیے۔ وہ مرعوب سی ہو کر بڑے نرم اور شیریں لہجے میں بولی۔

" آپ جہلم کے ڈپٹی کمشنر ہیں؟"

" جی ہاں۔ سرکاری ملازم ہوں بدقسمتی سے۔"

" جی نہیں! ایسا کیوں کہتے ہیں آپ! میرے مرحوم شوہر بھی سول افسر تھے۔ اُن کا زیادہ وقت ملتان ڈویژن میں گزرا۔ وراثت علی نام تھا اُن کا۔"

" اوہ! تو یہ وراثت علی صاحب کا دولت خانہ ہے؟ میرا خیال ہے کہ آپ کبھی اُن کے ساتھ وہاں نہیں رہی ہیں ورنہ تو میری سرکاری کام کے سلسلے میں کئی بار ملاقات بھی ہوتی تھی مگر بات کو بھی تو خاصا عرصہ گزر گیا ہے اور آپ اب انہیں مرحوم بتا رہی ہیں۔"

" جی ہاں، دو سال پہلے وہ ہسپتال میں ایک آپریشن کے دوران میں مر گئے تھے حالانکہ اُن کے والد ہمت علی ابھی تک زندہ ہیں۔"

" اوہ! مجھے اُن کی موت کا سن کر بہت افسوس ہوا ہے خیر میں انشاء اللہ کسی وقت پھر حاضر ہوں گا تعزیت کے لیے۔ اب تو ایک اپنے ہی کام سے ادھر آ نکلا تھا۔ مجھے تعزیت کے لیے تو الگ حاضر ہونا چاہیے نا۔" میں نے وہاں سے نکلنے کے لیے قدم آگے بڑھا دیے مگر وہ میرا راستہ روکتی ہوئی بولی۔

" جی نہیں! اب آپ ایسے بھی تو نہ جائیں نا۔ یہ آپ کے مرحوم دوست کا گھر ہے۔ چائے تو پیتے جائیے۔ چلیں اندر، میں آپ کو یوں نہیں جانے دوں گی۔"

" جی نہیں! یہ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ مجھے بہت ضروری کام ہے اور وقت بہت تھوڑا ہے میرے پاس۔ میں پھر حاضر ہوں گا۔" میں نے نہایت ہی سنجیدگی سے کہا۔ میں اس عورت سے اپنی ملاقات کو طول نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ کسی اور مرحلے پر مجھے ملی ہوتی تو میں اس کی بہت ہی سلجھی ہوئی نستعلیق قسم کی گفتگو سے ضرور لطف اندوز ہوتا اسے بات کرنے کا سلیقہ آتا تھا۔ وہ ترش رُو بھی تو بہت ہی ترش رُو تھی۔ اب وہ نرم گفتاری پر اتری تو سارے جہان کی حلاوت اُس کے لہجے میں گھل گئی کسی نے سچ ہی تو کہا ہے کہ ہر عورت میں خدا نے کوئی نہ کوئی خوبی کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے اور وہی خوبی اُس کی کامیابی کی ضامن بنتی ہے۔

وہ کچھ مایوس سی ہو گئی میرے لہجے کی قطعیت نے اسے پیچھے ہٹا دیا۔ بولی " ٹھیک ہے صاحب! میرا نام غزالہ ہے کبھی وقت ملے تو ضرور تشریف لائیں مجھے خوشی ہو گی مگر آپ نے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں ہے۔"

" جی میرا نام ہاشم خان ہے، ہاشم آفریدی۔"

" آپ سے مل کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ مجھے امید ہے آپ کسی وقت ضرور آئیں گے۔ ہو سکے تو رات کا کھانا میرے ساتھ کھائیے۔ وراثت علی اپنے دوستوں کے انتخاب میں واقعی لاجواب تھے۔"

" یہ آپ کی نوازش ہے کہ آپ ایسا سمجھتی ہیں۔ میں کسی وقت ضرور حاضر ہوں گا۔ شام کا وعدہ میں بہرحال نہ کر سکوں گا، اچھا، خدا حافظ۔" یہ کہہ کر میں نے اُس کے گول مٹول سے ضیغم کے گال تھپتھپائے اور وہاں سے چل نکلا۔ جب میں گیٹ پر پہنچا تو میں نے دیکھا کہ وہ دونوں بڑے غور سے مجھے دیکھ رہے تھے اور غزالہ کے لبوں پر بڑی ہی دلفریب مسکراہٹ پھول کھلا رہی تھی۔ میں ان سے صرف نظر کر کے باہر نکل گیا۔ مجھے اپنے ہی زخم کسی اور سمت دیکھنے کی مہلت نہیں دیتے تھے۔

ریٹائر منے مر کر میرے وجود کی ساری توانائیاں سلب کر لی تھیں۔ وہ نہیں، میں مر گیا تھا۔ اس روز میرا آدھا حصہ مفلوج ہو گیا تھا۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا سڑک پر نکلا اور فوراً ہی ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر ڈاکخانے کے صدر دفتر جا پہنچا۔ سامنے ہی ایک پیلے رنگ کا ٹیلیفون کیبن تھا۔ میں اس میں جا گھسا۔ فوراً ہی میں نے ایکسچینج کی خاتون سے پولیس سرجن کا نمبر معلوم کر کے ڈائل گھما دیا۔

" ہیلو! میں پولیس سرجن بنگش صاحب سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

" جی میں بول رہا ہوں۔"

" اخاہ حضرت! مجھے نہیں پہچانا ہے آپ نے۔ میں کچہری سے خاقان احمد مجسٹریٹ بول رہا ہوں۔ یہ آپ کی آواز کچھ بدلی بدلی سی ہے زکام ہو رہا ہے آپ کو۔" میں نے بات بنائی۔ مجھے یاد تھا کہ ضلع کچہری میں خاقان احمد نام کا ایک مجسٹریٹ پچھلے تین سال سے ان گنت لوگوں کو لمبی لمبی سزائیں سنا رہا ہے اس کے بارے میں بہت سی باتیں مجھے آپی نے بتائی تھیں۔

" جی خاقان صاحب! کچھ زکام ہو رہا ہے مجھے۔ کہیے کیسے یاد فرمایا ہے آپ نے؟"

" ادھر انارکلی میں آج کوئی ۔ ۔ ۔ گولی چلی ہے کیا؟ مجھے کسی نے بتایا ہے کہ کسی ٹیکسی ڈرائیور پر کسی ڈاکو نے فائر کھول دیا ہے۔"

" نہیں جی! یہ واقعہ میرے دفتر کے سامنے ہی پیش آیا ہے۔ وہ دراصل ایک اشتہاری مجرم ہے غلام جیلانی۔ آپ نے نام تو سنا ہو گا اس کا۔"

" جی ہاں! میں نے بڑے تذکرے سنے ہیں اُس کے۔ وہ جو پھانسی کی کوٹھری سے فرار ہو گیا تھا؟ وہی نا؟" میں نے بڑے ہی پُراعتماد لہجے میں کہا۔

" بس وہی۔ دراصل اس کے گروہ کی ایک عورت کو کسی نے ہلاک کر کے سڑک پر پھینک دیا تھا۔ اُسے جو آدمی اٹھا کر میرے پاس پوسٹ مارٹم کے لیے لایا۔ وہ جانتے ہیں کون تھا؟ وہ غلام جیلانی ہی تھا۔"

" اچھا؟ کمال ہے بنگش صاحب! دزدے چہ دلاور است!"

" ہاں! یہی تو حیرت ہے مجھے۔ گاڈ ڈیم ہم۔ اور پتہ ہے اُس عیار نے کیا کیا؟ راستے سے کہیں وہ چوگوٹھ کے مشہور زمیندار، ڈھلوں صاحب کو بھی پکڑ لایا۔ وہ بیچارے سادہ لوح آدمی اس کی باتوں میں آ گئے۔ اور اس کے ساتھ میرے پاس چلے آئے۔ وہ سفارش کر رہے تھے کہ بنگش بڑا ظلم ہوا ہے اس عورت کے ساتھ کسی نے سراسر زیادتی کی ہے اس کا پوسٹ مارٹم کر کے ایک "آئی او پنر" قسم کی رپورٹ لکھ دو۔ گورنر کے سامنے رکھوں گا۔"

" اچھا! تو یہ بات ہے کمال کر دیا ہے صاحب اس غلام جیلانی نے۔ ذرا نہیں گھبرایا۔" میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

" نہیں بھئی! اس کو آپ دیکھیں تو حیران رہ جائیں۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ ہالی وُڈ کی فلموں کا ہیرو ہے۔ سپاٹ لیس قسم کا خوبصورت سوٹ پہنے ہوئے تھا وہ۔ میں تو بہت ہی مرعوب ہو گیا۔"

" ہاں ظاہر ہے۔ کیا وہ بہت ہی جامہ زیب اور طرحدار جوان ہے؟" میں نے بات آگے بڑھائی۔

" پوچھیں کچھ نہیں خاقان صاحب آدمی تو اس کے سامنے خواہ مخواہ فرش ہو جاتا ہے۔ سر پر وہ قراقلی رکھے ہوئے تھا۔ ہزار روپے سے کم کی تو کسی طرح نہیں تھی۔"

" ہاں جی! اس کو پیسوں کی کیا کمی! سارا شہر اُس کے سامنے۔ تجوریاں اس کی، سونا اُس کا۔" میں نے بنگش کو اور آگے گھسیٹا۔

"ہاں! یہی تو میں کہہ رہا تھا خاقان بھائی اور وہ بدمعاش کہہ رہا تھا کہ وہ اس عورت کو ازراہ ہمدردی سڑک سے اُٹھا لایا تھا۔ اس کی لاش اس نے کمبل میں لپیٹ رکھی تھی۔"

"حد ہو گئی! اور تھی وہ اس کے ہی گروہ کی۔"

"ہاں! مگر پتہ ہے ہوا کیا۔ اس کے پیچھے پولیس کے آدمی لگے ہوئے تھے سادہ کپڑوں میں۔ جب وہ لاش میری ٹیبل پر ڈال کر ٹیکسی والے کو کرایہ دینے نکلا تو ان سپاہیوں نے اُسے گھیرے میں لے لیا۔ مگر وہ بھی صاحب بلا کا آدمی تھا۔ خطرے کو بھانپ کر اس نے فوراً ہی ڈرائیور کو پرے دھکیل کر اسٹیئرنگ پر قبضہ کیا اور بھگا کر باہر لے گیا۔"

"اچھا؟ کمال ہے بنگش صاحب! حد ہو گئی۔ یہ باتیں تو مجھے آپ ہی سے معلوم ہو سکتی تھیں۔"

"سُنیں تو سہی!" بنگش نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ "سپاہی اس کے پیچھے دوڑے۔ سب انسپکٹر عرفان بھی اُن کے ساتھ تھا۔ اس نے پستول نکال کر گولی چلا دی اور ٹیکسی کا ٹائر دھماکے سے پھٹ گیا۔ ٹیکسی لڑھک کر دیوار میں جا لگی تو غلام جیلانی اس میں سے اُتر کر بھاگ نکلا اور پھر بھیڑ میں گم ہو گیا۔"

"انہوں نے پیچھا نہیں کیا اس کا؟"

"کیا تو! مگر وہ کہاں ہاتھ آتا۔ بیچارے منہ لٹکا کے واپس آ گئے۔"

"کس غضب کا آدمی ہے یہ غلام جیلانی۔ آپ جیسے زیرک افسر کو بھی بچّہ دے گیا۔" میں نے بنگش کے مکھن لگایا۔

"میں نے تو کبھی اس کی صورت ہی نہیں دیکھی تھی۔ آج وہ سامنے آیا تو سچی بات یہ ہے کہ میرے دل سے اس کے لیے دعا نکلتی ہے۔ خدا اُسے زندگی دے۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہیں بنگش صاحب! وہ تو بہت ہی خطرناک مجرم ہے۔"

"ہے تو۔ مگر وہ بہت رعنا جوان ہے۔ مجھے اس پر ترس آتا ہے بہت ترس آتا ہے خاقان بھائی۔ پولیس میں ہوتا تو تنہا پورے شہر کو نتھ ڈال دیتا مگر اب وہ جس فورس میں ہے نا وہ تباہی اور بربادی کی فورس ہے اور یہی مجھے افسوس ہے۔"

"میں آپ کی "فیلنگز" کو سمجھتا ہوں بنگش صاحب۔ اس عورت کا کیا کیا پھر آپ نے؟"

"میں کیا کرتا۔ میں نے اُسے لوہاری تھانے والوں کے سپرد کر دیا۔"

"پوسٹ مارٹم نہیں کیا اس کا؟"

"کیا تھا؟ بھائی! اور اس عورت کی حالت دیکھ کر میرا دل سہم گیا تھا۔"

"وہ مری کس طرح؟"

"کسی نے اس کو بڑی شرمناک قسم کی جسمانی اذیتیں دی تھیں۔ اس کے سارے بدن پر جلتے سگریٹوں کے نشان تھے۔ یہ بڑے بڑے نیل پڑے تھے۔ اسے کسی نے بہت زیادہ تشدد کا نشانہ بنایا تھا۔ اور ۔۔۔ اور کیا بتاؤں خاقان بھائی! بس اللہ ہمارے گناہ معاف کرے۔"

"اس کے نام کا پتہ نہیں چلا آپ کو؟"

"نہیں! اس کے کٹے ہوئے بالوں سے پتہ چلتا تھا کہ وہ کسی بہت ہی ماڈرن گھرانے سے تعلق رکھتی ہے اور اس کے نرم ہاتھ یہ بتلاتے تھے کہ اس نے زندگی میں محنت مشقت کا کوئی کام نہیں کیا ہے۔"

"مگر آپ تو کہتے ہیں کہ وہ غلام جیلانی کے گروہ میں شامل تھی!"

"وہ لایا تھا نا اُسے۔ میں اسی وجہ سے یہ بات کہہ رہا ہوں۔ ممکن ہے میرا یہ اندازہ غلط ہو۔"

"اخبار والے اس کی تصویر لے گئے ہوں گے تھانے سے؟"

"نہیں! میں نے ڈی ایس پی منان سے بات کی تھی۔ وہ اس بات کے حق میں نہیں ہے بلکہ وہ تو پریشان ہی ہو گیا کہہ رہا تھا کہ تصویر چھپنے سے شہر میں خوف و ہراس پھیلے گا۔"

"خوف و ہراس تو بنگش صاحب خبر چھپنے سے بھی پھیل سکتا ہے" میں نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"میرا خیال ہے کہ انتظامیہ اس خبر کو اخبار میں شائع نہیں ہونے دے گی۔ یہ بڑی ہی زلزلہ خیز خبر ثابت ہو سکتی ہے۔ لوگ سڑکوں پر نکل آئیں گے۔ سیاسی پارٹیاں اس بہانے یہاں ہر طرف ہنگامہ برپا کر دیں گی۔ کون پوچھے گا کہ وہ ایک مجرم کی ساتھی تھی۔"

"ہاں یہ تو ہے! منان صاحب ٹھیک کہتے ہیں۔ یہ خبر تو دبا ہی دینی چاہیے۔ اب وہ لوہاری تھانے والے کیا کریں گے۔"

"وہ آج رات اُسے خاموشی سے کسی جگہ دفن کر دیں گے۔ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ اُس کا کوئی والی وارث تو سامنے آیا نہیں آیا بھی تو اسے کون پاس پھٹکنے دے گا۔"

"مگر بنگش صاحب! یہ تو معلوم ہونا چاہیے کہ اس پر یہ ظلم کس نے کیا ہے۔"

"وہ تو ہونا ہی چاہیے۔ پولیس نے مقدمہ درج کر لیا ہے۔ تفتیش وہ ضرور کریں گے۔"

"جی ہاں! مجرموں کو پکڑنا تو چاہیے ورنہ اس طرح تو ہر روز کوئی نہ کوئی لاش سڑک پر پڑی ملے گی۔ وہ ڈھلوں صاحب کیا کہتے تھے۔"

"ارے وہ تو بس پریشان ہی ہو گئے۔ یہ موٹی موٹی گالیاں دے رہے تھے اس غلام جیلانی کو۔" یہ کہہ کر بنگش صاحب ہنسے۔

"ہاں وہ تو بے خبری میں ہی مارے گئے تھے نا۔ کوئی پوچھتا کہ ڈھلوں صاحب آپ کا کیا ناتا ہے غلام جیلانی سے تو وہ کیا جواب دیتے۔"

"وہ بہت ہی پریشان ہو گئے تھے خاقان بھائی۔ مجھے اپنا فون نمبر دے گئے کہ کوئی ایسی ویسی بات ہو تو میں انہیں بتا دوں گا۔"

"اچھا؟ اُن کا فون نمبر ذرا مجھے بتا دیں اُن سے دل لگی رہے گی۔ میں پوچھتا ہوں اُن سے کہ حضرت آپ غلام جیلانی کے پشت پناہ کب سے بنے ہیں؟"

"ارے نہیں خاقان صاحب! وہ کہیں ناراض ہی نہ ہو جائیں بابا! وہ بہت بڑے اور بہت ہی بارسوخ آدمی ہیں۔ ہمیں اپنی نوکری کا بھی تو خیال رکھنا ہے نا۔ وقت دیکھیں نا کون سا جا رہا ہے۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ وہ مجھے جانتے ہیں بس ذرا اُن کا نمبر مجھے بتا دیں۔" میں نے اصرار کیا۔

بنگش نے کمال سادگی سے مجھے ڈھلوں صاحب کا فون نمبر بتا دیا وہ میں نے اچھی طرح ذہن نشین کر لیا۔ "اچھا بنگش صاحب! خدا حافظ! آپ نے آج ہماری ساری بوریت دور کر دی۔ آپ کی باتیں بہت دلچسپ ہوتی ہیں۔"

یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔ میں نے تو یونہی اٹکل پچّو ہاتھ مارا تھا مگر پنجہ بہت ہی اچھا رہا۔ چند لمحوں تک میں کیبن میں کھڑا اس صورتحال پر غور کرتا رہا اور پھر میں نے وہ نمبر گھما دیے جو مجھے بنگش نے بتائے تھے۔ وہ کسی کا گھر تھا۔ فون کسی خاتون نے اُٹھایا میرے استفسار پر وہ بولی۔ "ٹھہریں، میں انہیں اطلاع دیتی ہوں۔"

کچھ ہی دیر بعد مجھے ڈھلوں صاحب کی آواز سنائی دی۔

"ہیلو چوہدری صاحب! کہاں بیٹھے ہیں آپ اس وقت؟"

انہوں نے میری آواز پہچان لی، بڑے مسرور لہجے میں بولے۔

"اوئے ہاشم یار! خدا کا شکر ہے کہ تمہاری آواز پھر سننے کو مل گئی ہے۔ میں تو سمجھا تھا بیڑہ غرق ہو گیا مگر پھر وہ لوگ جلدی واپس آ گئے۔ وہ خالی ہاتھ تھے۔ اچھا ہوا آپ بھاگ نکلے تھے۔"

"ابھی میری رسّی اتنی تنگ نہیں ہوئی ہے۔ میں آپ سے فوراً ملنا چاہتا ہوں چوہدری صاحب۔"

"تم اس وقت کہاں ہو؟"

"یہ تو میں نہیں بتا سکتا۔ ٹیلیفون محفوظ نہیں ہے۔"

"اوئے لعنت بھیج اس احتیاط پر۔ مگر خیر، تم ادھر شاہ نور اسٹوڈیو کی طرف آ جاؤ۔ میں سڑک پر ہی گاڑی لے کر کھڑا ہوں گا۔ ٹھیک ایک بجے آ جاؤ۔ اب ساڑھے بارہ بج رہے ہیں۔"

"بہت بہتر! میں ابھی آ رہا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا اور سر پر ٹوپی اچھی طرح جما کر میں کیبن سے باہر نکل آیا۔ سامنے کی ایک ٹیکسی خالی ہو رہی تھی۔ میں بھاگ کر اس میں جا بیٹھا۔

"چل یار! مجھے ادھر شاہ نور اسٹوڈیو لے چل۔"

ڈرائیور نے گہری گہری نظروں سے مجھے دیکھا۔ وہ سمجھا شاید میں بھی۔۔۔ فلموں میں کام کرتا ہوں۔ اس نے گاڑی بڑی سڑک پہ ڈالی اور ہوا ہو گیا۔

کوئی آدھ فرلانگ کا فاصلہ طے کر کے وہ بولا۔ "ادھر آپ فلموں میں کام کرتے ہیں؟"

"نہیں بھائی! میں ڈسٹری بیوٹر ہوں تقسیم کار۔ کوئی فلم خریدنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔"

"اچھا اچھا! ڈسٹری بیوٹر ہیں آپ! یہ بھی اچھا کاروبار ہے آپ کی تو پھر اُدھر بڑی واقفیت ہو گی؟"

"ہاں! کیوں نہیں! مگر میں اس دھندے میں زیادہ پرانا نہیں ہوں۔" میں نے اس کی گفتگو کا مقصد سمجھتے ہوئے کہا۔

"صاب جی! کوئی چھوٹا موٹا پارٹ مجھے بھی دلا دیں کسی فلم میں۔ بڑا شوق ہے مجھے اداکاری کا۔"

میں نے اس کے چہرے پر پہلی بار ناقدانہ نگاہ ڈالی۔ بس یونہی سا ان گھڑ آدمی تھا وہ۔ نہ منہ نہ ماتھا مگر شوق کی بات ہے۔ اس کی کوئی بہت پرانی آرزو ایک دم ابھر کر اس کے ماتھے میں گولی کی طرح آ لگی تھی۔ سو وہ میرے پیچھے ہی پڑ گیا کہ جس طرح بھی ہو سکے میں اُسے فلموں میں کام دلا دوں۔ جب میں کسی طرح بھی اس سے پنڈ نہ چھڑا سکا تو میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے یار! تم کل مجھے شام کو پانچ بجے ادھر شاہ نور اسٹوڈیو میں ملو۔ میرا نام ہاشم علی ہے میں تمہیں کسی پروڈیوسر سے ملا دوں گا۔"

"آپ کی بڑی مہربانی ہو گی جناب! میں آپ کا احسان عمر بھر نہ بھول سکوں گا۔"

اس وقت تک ہم شاہ نور اسٹوڈیو کے قرب و جوار میں پہنچ چکے تھے۔ اچانک مجھے ڈھلوں صاحب کی کار بائیں ہاتھ کھڑی نظر آئی۔

"مجھے یہاں اتار دے بھائی! میرے ایک دوست کھڑے ہیں میں اُن سے بات کروں گا۔" یہ کہہ کر میں نے گاڑی سے اتر کر اُسے کرایہ دینا چاہا مگر وہ اللہ کا بندہ تو مجھ سے پیسے لینے پر آمادہ نہ تھا، بولا۔

"مجھے کیوں شرمندہ کرتے ہیں آپ! یہ گاڑی آپ ہی کی تو ہے۔ میں کل شام کو پانچ بجے ادھر آ جاؤں گا۔" یہ کہہ کر اس نے ٹیکسی آگے بڑھا دی۔

ڈھلوں صاحب مجھے دیکھ چکے تھے۔ انہوں نے کار کا پچھلا دروازہ کھولا تو میں اُن کے پاس جا بیٹھا۔ کار ایک دم آگے چل دی۔ اس کی رفتار پچاس ساٹھ میل سے کسی طرح کم نہیں تھی۔

"اتنی تیزی کی کیا ضرورت ہے بری، کدھر کا ارادہ ہے؟"

"ہم ادھر کوٹ لکھپت کی طرف جا رہے ہیں۔ تمہاری وجہ سے تو میں بھی مشکوک ہو گیا ہوں ہاشم خان۔"

"مجھے افسوس ہے چوہدری صاحب! پر۔۔۔ پر۔۔۔ یہ کیسی آندھی چلی ہے۔ ریٹا کے ساتھ آسیہ بھی تو تھی۔"

"مجھے افسوس ہے ہاشم خان! ہمارا دارا اوچھا پڑا ہے۔ رات بڑے صاحب نے پولیس کی کھنچائی کی۔ اور حیرت کی بات ہے کہ انہوں نے ان دونوں لڑکیوں کے بارے میں انہیں بھی کچھ نہیں بتایا۔ وہ لاعلمی کا

اظہار کیے تے رہے۔ اس پر بڑے صاحب نے اس متان کو خوب گالیاں دیں میرے سامنے کی بات ہے۔ میرا خیال ہے کہ اپنی نوکری بچانے کے لیے انہوں نے ریٹا کو لب سڑک پھینک دیا تھا۔ وہ بچاری پہلے ہی ادھ موئی ہو چکی ہوگی۔"

"یہی ہوا ہے۔ اس کا درد حد سے بڑھ کر دوا ہو گیا۔ وہ اُن کے تشدد سے جب مر گئی تو انہوں نے گھبرا کر اُسے سڑک پر پھینک دیا۔ مگر وہ آسیہ کہاں ہے۔ مجھے تو اب اس کی فکر مار رہی ہے۔"

"یہی تو رونا ہے وہ لوگ بڑے صاحب کو بھی دھوکا دے گئے۔ میرا خیال ہے کہ آج دو چار اور پولیس افسر معطل ہو جائیں گے۔ بڑے صاحب بڑے ناراض ہو رہے تھے۔"

"مگر اُن کے غم و غصے کا ہمیں کیا فائدہ پہنچا چوہدری صاحب، اُن لوگوں نے تو طیش میں آ کر ریٹا کو ختم کر دیا، اب کیا ہوگا میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا ہے۔ میں کیا کروں چوہدری صاحب! وہ تو اسے بھی جان سے مار دیں گے، وہ یہی کریں گے۔"

"میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ ہو سکتا ہے وہ بالکل محفوظ ہو۔ وہ بیمار بھی تو بہت تھی۔ عین ممکن ہے وہ ابھی تک کسی ہسپتال میں ہو۔"

"وہ کون سا ہسپتال ہو سکتا ہے ڈھلوں صاحب مجھے بتائیں۔ میں اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا مجھے بتائیں میں کیا کروں۔" میں نے بلکتے ہوئے کہا۔ میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا رہا تھا۔ ہر شے مجھے تاریکی میں ڈوبتی دکھائی دے رہی تھی۔ وقت میرے ساتھ ایک اور چال چل گیا تھا۔ آسیہ کے سوا مجھے کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ میری ساری بھاگ دوڑ رائیگاں جا رہی تھی۔

"ہمت نہ ہارو ہاشم خان! یہ بھی تو دیکھو ایک طرف تم ہو یک و تنہا اور دوسری طرف وہ ہزاروں کی تعداد میں ہیں اور قدم قدم پر وہ تمہارا کھُرا ناپ رہے ہیں۔ بڑی ہمت ہے تمہاری کہ تم نے اتنے سارے شکروں کو بے بس کر دیا ہے۔ تمہیں یُوں اب دل چھوٹا نہیں کرنا چاہیے۔" یہ کہہ کر انہوں نے میرا کندھا تھپتھپا کر اپنا طلائی سگریٹ کیس میرے آگے کر دیا۔

"ادھر کوٹ لکھپت کیوں جا رہے ہیں آپ؟"

"میں وہاں سے جو گوٹھ چلا جاؤں گا۔ وہاں کئی کام ادھورے پڑے ہیں۔"

"میرے لیے کیا حکم ہے پھر؟"

"میں کل صبح پھر آؤں گا۔ تجھے اس فون نمبر پر مل لینا۔ مجھے یقین ہے کہ بڑے صاحب آج کچھ نہ کچھ ضرور کریں گے۔ وہ آسیہ کو برآمد کر لیں گے۔"

"بشرطیکہ وہ زندہ ہوئی تو۔"

"وہ زندہ ہے، وہ زندہ رہے گی۔ تم پریشان نہ ہو ہاشم خان وہ اس پر ہاتھ نہیں اٹھائیں گے۔"

"یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں ڈھلوں صاحب؟"

"مجھے یقین ہے۔ اس کی بیماری ہی اس کی ڈھال بن گئی ہو گی۔" یہ کہہ کر انہوں نے باہر بھاگتے منظر پر نظر جما دی۔ کچھ دیر بعد ہم کوٹ لکھپت جا پہنچے۔ ڈھلوں صاحب نے ایک بنگلے کے سامنے کار رکوائی اور بولے۔ "برکی! اِن کو شہر چھوڑ آ اور اِن کا ٹھکانا بھی دیکھ آ۔ کسی وقت بھی ان کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔"

"میرا کوئی ٹھکانا نہیں ہے ڈھلوں صاحب! میں تو ہر رات نئے بستر میں سوتا ہوں۔ ہر صبح میری آنکھ اجنبی گھر کے اجنبی تکیے پر کھلتی ہے میرے ٹھکانے کی کیا بات کرتے ہیں۔ میں ٹیکسی میں چلا جاتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں اُن کی کار سے اُتر گیا۔

ڈھلوں صاحب میری یہ بات سن کر پریشان ہو گئے بولے۔ "میں کیا کروں ہاشم خان! خدا کی قسم میں نے اپنا پورا زور لگا دیا ہے۔ اللہ پر بھروسہ رکھیں۔ اور ٹھہریں، آپ کو روپوں کی ضرورت ہوگی۔" یہ کہہ کر انہوں نے اپنا بریف کیس کھول کر نوٹوں کی ایک گڈی میرے آگے کر دی۔

"جی نہیں! بہت پیسے ہیں میرے پاس۔ ضرورت پڑی تو میں آپ سے مانگ لوں گا۔"

"پھر بھی یہ میری طرف سے رکھ لو ہاشم خان! تم مجھ پر اپنے سگے بھائی کی طرح بھروسہ کر سکتے ہو میرے دل میں تمہاری اتنی قدر ہے کہ میں بتا نہیں سکتا۔ یہ رکھ لو۔"

"نہیں! مجھے ابھی ضرورت نہیں ہے۔ بہت روپیہ ہے میرے پاس، اچھا خدا حافظ۔" یہ کہہ کر میں وہاں سے پیچھے ہٹ آیا اور پھر قریب سے گزرتی ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر میں اسی وقت راج گڑھ جا پہنچا۔

دروازہ سلونی نے کھولا۔ مجھے دیکھ کر وہ کھِل اُٹھی، بولی۔ "اچھا ہُوا آپ جلدی آ گئے۔ وہ آپ کی ماجدہ کچھ دیر پہلے واپس آ گئی ہے۔"

"وہ اکیلی ہے یا کوئی اور بھی اس کے ساتھ ہے؟"

"نہیں، وہ تنہا ہے۔ ایک پورا کمرہ اس نے سنبھال رکھا ہے۔ ویسے وہ عرشی پر بہت جان چھڑکتی ہے۔"

"ہوں! کیا حال ہے اب اس کا؟"

"بہتر ہے۔ بخار بھی اب کم ہے۔ اب وہ جاگ رہی ہے۔"

"اور وہ ہمارا یار؟"

"وہ تو عرشی کی پائینتی بیٹھا ہے صبح سے۔ اس کے پاؤں دباتا رہا ہے۔ بڑی خدمت کر رہا ہے اس کی، جیسے کوئی زن مرید ہوتا ہے نا، ویسی ہی اس کی حالت ہے۔ عرشی کی ذرا سی 'ہائے' پر گھبرا جاتا ہے اور مجھے دوڑانے لگتا ہے۔ یہ کرو سلونی، وہ کرو سلونی۔ اسے تو عرشی نے اپنی انگلی پر لپیٹ لیا ہے۔" وہ دبے لہجے میں مجھے سب

تنی کا بگر عورت ہے وہ! اُس کا تو میں بھُرکس نکال تیں اتنی زن مریدی راس نہیں آ سکتی۔" یہ کہہ کر میں کمرے میں جا گھسا۔ سلونی ٹھیک کہتی تھی۔ آبی ابھی تک عرشی کی پائینتی بیٹھا تھا اور عرشی رانی بنی پلنگ تھی کہ اپنے سر کے نیچے وہ یہ بڑا سا گول تکیہ رکھے ہوئے نشیلی نظروں سے آبی کو دیکھ رہی تھی۔ مجھ پر نظر پڑتے دونوں سنبھل کر بیٹھ گئے۔

"اچھا تو تم ابھی تک صبح سے اس کی پائینتی بیٹھے ہو۔ اتنے گزار ہو گئے ہو مس عرشی کے!" میں نے بریف کیس کرسی پر رکھتے ہوئے کہا۔

آبی کچھ جھینپ گیا۔ عرشی بھی خجل ہو گئی۔ اس نے لحاف ناک تک اونچا کر لیا۔

"اس کی طبیعت بھی تو بہت خراب تھی۔"

"ہاں یہ تو ہے اب کیا حال ہے مس عرشی؟"

"اچھی ہوں جی! اب تو بخار بھی کم ہو گیا ہے۔"

"جیتا رہ سیکھو مس عرشی! مگر مس عرشی کیوں، میں تمہیں مسز آبی کیوں نہ کہوں۔"

"بک نہیں اوئے۔ ہماری پاک محبت کا مذاق نہ اڑا۔ یہ بتا کہاں سے ہے؟ اور یہ تو اتنی جلدی ولایتی سوٹ کیسے بن گیا؟" آبی نے سگریٹ میری طرف اچھالا۔

"آج تو یار جی بہت خوار ہوا ہوں میں۔ ابھی بتاتا ہوں بس میں نے انارکلی سے خریدا تھا کپڑے بہت ہی خراب ہو رہے تھے۔"

"یہ اچھا کیا تو نے۔ ویسے بھی ہمارے لیے بار بار لباس تبدیل کرنا بہت ضروری ہے۔" اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"بھئی ان کے لیے کھانا تو لے آؤ مس سلونی! دیکھتی نہیں ہو کتنے تھکے ہوئے اور بھوکے دکھائی دیتے ہیں ہاشم خان صاحب۔"

"خدا تمہارا بھلا کرے۔ تم نے میرے منہ کی بات چھین لی۔ میں کہنے والا تھا۔" میں نے اپنے غم کی بھڑکتی آگ پر صبر کا چھینٹا دیتے ہوئے کہا۔ ان کے سامنے میں منہ لبسور کر بیٹھتا تو یہ بات کچھ اچھی نہ لگتی تھی۔ سلونی ابھی وہیں کھڑی تھی کہ میری آواز سن کر ماجدہ کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کو سامنے دیکھتے ہی میں کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"ارے ماجدہ آپ! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں، رات کہاں تھیں آپ؟" وہ کچھ نہیں بولی۔ سامنے کھڑی برابر مسکراتی رہی۔ وہ یوں شرمائے جا رہی تھی جیسے اس کے سوا وہاں اور کوئی بھی نہیں تھا۔

"رات کہاں تھیں آپ، صبح بھی ہم نے نہیں دیکھا آپ کو۔"

"آپ تو رات یہاں نہیں آئے تھے۔ آپ کا قافلہ تو یہاں صبح اُترا تھا۔ مجھے سب کچھ معلوم ہو گیا تھا۔ آبی صاحب کا نام سن کر میں سمجھ گئی تھی کہ کون کون سے بزرگ یہاں آئیں گے۔"

"آپ ٹھیک کہتی ہیں، بیٹھیں۔ آپ کی سہیلی تو بہت بیمار ہو گئیں۔"

"آپ کے ساتھ رہ کر کوئی کیسے تندرست رہ سکتا ہے جناب۔۔۔"

"جناب ہاشم صاحب۔" میں نے اس کو اپنے اصلی نام سے مخاطب کرنے سے روک دیا۔ وہ کچھ حیران تو ہوئی مگر جلدی ہی سنبھل گئی۔

"آئیں ذرا آپ کے کمرے میں چلتے ہیں مجھے آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔" یہ کہہ کر میں تیزی سے اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہ میرے کمرے میں ٹھہری ہوئی تھی۔ جب میں اس دروازے میں داخل ہُوا تو اس نے دروازہ اپنے پیچھے بند کر کے کچھ ایسی والہانہ وارفتگی کا اظہار کیا کہ میں حیران رہ گیا۔

"آپ کو میں بہت یاد کرتی رہی ہوں جیلانی آپ بہت ظالم ہیں۔"

"اُس روز کی اتنی ساری رکھائی کے بعد یہ سلوک مجھے حیران کرتا ہے۔"

"اس دن میں بہت الجھی ہوتی تھی جیلانی! آپ کے سامنے خود کو میں مجرم سمجھتی تھی۔ مجھے آپ سے خوف آ رہا تھا۔ مجھے معاف کر دیں۔"

"میں نے آپ سے کہا بھی تھا کہ وہ میرا مال نہیں تھا جسے آپ آہو کے گھر سے لے آئی تھیں۔"

"پھر بھی آپ کی حیثیت مشکوک ہو گئی، آہو آپ کا اور زیادہ دشمن بن گیا۔"

"ہاں یہ تو ہے۔ مگر میرا تو سارا زمانہ دشمن ہو رہا ہے۔ بنو! بیٹھیں میں آپ کو بتاؤں کہ مجھ پر کیا بیت گئی ہے۔" یہ کہہ کر میں نے اسے اپنے قریب ہی بستر پر بٹھا لیا۔ مگر وہ فوراً ہی اُٹھ گئی، بولی۔ "آپ کا سوٹ خراب ہو رہا ہے۔ آپ کپڑے بدل لیں۔"

"اتنے زیادہ کپڑے نہیں ہیں میرے پاس۔"

"مگر میرے پاس ہیں۔ میں نے آپ کے لیے کچھ ہی دن پہلے تین جوڑے خریدے تھے۔"

"میرے لیے! یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟"

"مجھے موہوم سی امید تھی کہ آپ کسی دن مجھے اچانک ہی مل جائیں گے۔" یہ کہہ کر اُس نے ایک ٹرنک کھولا اور اس میں سے ایک بوسکی کا سُوٹ نکال کر میرے آگے رکھ دیا اور کمرے سے نکل گئی۔ میں نے وہیں کھڑے کھڑے وہ کپڑے بدلے اور پھر کمرے کی ٹھنڈک سے بچنے کے لیے لحاف اوڑھ کر لیٹ گیا۔ وہ کمرے میں آ کر میرا سوٹ تہ کرنے لگی۔ تو اس کی جیبوں میں بھری نوٹوں کی گڈیاں ٹٹول کر بولی۔ "اتنے روپے ساتھ لیے پھرتے ہیں آپ! کوئی جیب کترا مل گیا تو جان ہی لے جائے گا آپ کی۔"

"سب چلتا ہے ماجدہ جی! ہمیں تو اپنا 'من مین' ساتھ ہی

رکھنا پڑتا ہے نا! سوٹ کو سنبھال کر الماری میں رکھیں اور تالا لگا دیں"۔
اس نے میرے کہنے کے مطابق عمل کیا اور پھر وہ سنبھل کر میرے پاس بیٹھ گئی۔
"ہاں اب بتائیں کہ آپ پر کیا بیتی ہے؟"
"پہلے مجھے یہ بتائیں کہ اس روز منان ڈی ایس پی کو آپ نے کیوں چھوڑ دیا؟"
"وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ دراصل میں بہت زیادہ خوفزدہ ہو گئی تھی۔ جیلانی صاحب! پہلے تو وہ میری منت سماجت کرتا رہا، پھر اس نے مجھے ایسی ایسی دھمکیاں دیں کہ میں ڈر گئی اور میں نے اس کو رہا کرنے کے بجائے مکان سے سامان اٹھایا اور وہاں سے نکل گئی۔"
"اچھا پھر؟ وہ وہاں سے کیسے نکلا؟"
"میں نے جب اپنا سامان ایک اور مکان میں منتقل کر کے نصیر صاحب کی نگرانی میں دے دیا تو پھر میں نے پولیس اسٹیشن فون کر کے ان سے کہہ دیا کہ وہ منان صاحب کو وہاں سے نکال لیں۔"
"آپ کو یہ خیال نہ آیا کہ مجھے آپ کے پاس واپس آنا تھا؟"
"مجھے معلوم تھا، اور اسی لیے میں نے سارا دن گزار کر شام کے ساڑھے چار بجے انہیں اطلاع دی تھی کہ اس عرصے میں آپ وہاں سے ہو کر واپس جا چکے ہوں گے۔"
"آپ کو معلوم ہے کہ نصیر صاحب گرفتار ہو چکے ہیں؟"
"مجھے پتہ ہے انہیں گرفتار ہوئے چار دن ہو چکے ہیں اسی لیے میں یہاں مس عرشی کے پاس آ گئی تھی۔"
"اور آپ کا سامان؟"
"وہ اسی مکان میں ہے اور وہ مکان اُدھر نور کالونی میں ہے مگر میری کوئی کام کی چیز وہاں نہیں تھی۔"
"آپ کا مطلب روپے پیسے سے ہے؟"
"ہاں، وہ میں نے پہلے ہی بینک میں رکھ دیا تھا۔"
"یہ اچھا کیا ہے آپ نے۔ اب میری سنیں کہ میں کن حالات سے گزرا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے وہ تمام واقعات اسے بتا دیے جو اب تک مجھے پیش آ چکے تھے۔ وہ بڑے غور سے میری باتیں سنتی رہی جب میں خاموش ہوا تو وہ بولی۔
"اس کا تو یہ مطلب ہے کہ آسیہ کے بارے میں منان سے بہت کچھ معلوم کیا جا سکتا ہے، وہ سب کچھ جانتا ہو گا اس کا معطل ہونا بلا وجہ نہیں ہے۔"
"میں بھی یہی محسوس کرتا ہوں۔ میں اس چوہے کو پھر پکڑ سکتا ہوں مگر اس کا کوئی فائدہ نہ ہو گا وہ کبھی مان کر نہیں دے گا کہ آسیہ کے بارے میں اسے کچھ معلوم ہے۔"
میری یہ بات سن کر وہ کسی گہری سوچ میں کھو گئی۔ مجھ سے اب وہ نظریں نہیں ملا رہی تھی۔

"کیا سوچ رہی ہیں؟"
"کچھ نہیں! میں منان سے سب کچھ اگلوا سکتی ہوں۔"
"کیا مطلب؟ آپ کا کیا اثر ہے اس پر؟"
"بس کسی طریقے سے میں اس پر اثر انداز ہو سکتی ہوں۔"
"عجب بات کرتی ہیں آپ! اگر ایسا ہے تو آپ نے خود کو کیوں نہیں چھڑایا ہے اب تک؟"
"وہ کوئی اتنا اہم آدمی نہیں ہے۔ وہ تو ہر قدم پر کسی کا محتاج رہا ہے۔ وہ کچھ بھی نہیں ہے حالانکہ میں اس کی طرف بڑھی تھی کہ وہ مجھے تحفظ دے گا۔"
"کیا کیا ہے اس نے؟"
"کچھ بھی نہیں! وہ مجھے بس مایوس ہی کرتا رہا۔ وہ انتہائی ... آدمی ہے۔ اس کو میں نے خود گرفتار ہونے دیا ہے۔ وہ مجھ سے ساری دولت چھین لینا چاہتا تھا اور میری عزت بھی ..."
"کیا مطلب؟ یعنی آپ کا اس سے کوئی تعلق قائم ..."
"نہیں! میں اس شہدے کو اتنی آزادی نہیں دے سکتی ..."
"پھر؟ ... پھر وہ کیسے آپ کے ساتھ چپکا رہا؟"
"بس ایسے ہی۔ مجھے ایک نام نہاد شوہر کی ضرورت تھی ... پر اس کے نام کا بورڈ لگا کر میں وقت گزارتی رہی۔ ورنہ تنہا ... تو اس شہر میں دعوت سمجھی جاتی ہے۔"
"ہوں! تو یہ بات ہے! مگر اس منان کا کیا قصہ ہے ... کیسے کھلوا سکتی ہیں آپ؟"
"دیکھیں منان پر میرا یہ احسان ہے کہ میں نے اس کی ... جان چھڑا دی تھی۔ بعد میں میں نے اس کو اپنی سہیلی کے ذریعے ... کچھ بتا بھی دیا تھا۔ دراصل نصیر صاحب کی وجہ سے فلمی اداکارہ ... بھی بہل تعارف ہو چکا ہے اور وہ مجھ پر بہت ہی مہربان ہے ... میں نے منان سے اپنی جان بھی بچائی تھی۔ وہ الماس مجھے اتنی ... اسے تحفوں سے لاد دیا تھا۔ اس کے گھر میرا آنا جانا تھا۔ پھر مجھے ... کہ اس منان سے اس کا گہرا یارانہ ہے اس الماس کا، اور منان ... کوئی بات ٹال نہیں سکتا۔ الماس سے کہہ کر ہی میں نے نصیر کو ... چکر میں گرفتار کروا دیا ہے اور اب منان مجھ پر ہاتھ نہیں ڈال ..."
"اچھا پھر؟ اس سے میں کیا نتیجہ نکالوں؟"
"نتیجہ تو آپ نکال چکے ہیں۔ اب تو نتیجہ آپ کو نکا... وہ الماس اس منان سے آج ہی معلوم کر لے گی کہ آسیہ کہاں ..."
"اچھا؟ پھر تو یہ معاملہ بہت ہی آسان ہو جاتا ہے کیا کچھ ... ابھی اس کے پاس جائیں۔"
"ابھی نہیں! میں رات کو دس بجے آپ کو اس کے پاس لے کر چلوں گی۔ بہت خوش ہو گی وہ آپ سے مل کر۔"
"نہیں یار جی! یہ پھر میں نہ اٹھا سکوں گا کوئی اور خدمت ..."

... نے ہنستے ہوئے کہا۔ وہ بھی کھلکھلا کر ہنس دی۔ عین ... ہوئی دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔
"... گئی ہیں جناب عالی!"
"... خاتونِ محترم! بندہ حاضر ہے۔ آئیں ماجدہ آپ بھی ... دیں۔"
"... تو کھا چکی ہوں پر خیر، چلیں میں آپ کا ساتھ دوں گی۔"
... میرے ساتھ ہی کمرے سے باہر آ گئی اور ہم دونوں طعام ... سلونی نے بہت عمدہ انتظام کر رکھا تھا۔ کھانے ... چیز موجود تھی جسے میں پسند کرتا تھا۔
... کھانے سے فارغ ہو کر میں پھر عرشی کے کمرے میں جا گھسا ... اپنی ٹانگ پھیلاتے اس کے پلنگ کی پائنتی ...
"... یار تو ادھر ہی نتھی ہو کر بیٹھ گیا ہے۔ اب اٹھ بھی جا۔ تجھے ... مجھے غصہ آنے لگا ہے۔" میں نے آبی کو ذرا سخت لہجے میں کہا۔
"... بھی یہ کیا طریقہ ہے بات کرنے کا۔ دیکھتے نہیں ہو عابد کی ... ہے۔" وہ ایک آنکھ بڑی عیاری سے دبا کر مسکرا رہا تھا۔
"... عابد کون ہے الو کا چرخہ! یہ کہاں سے آ گیا ہے بیچ میں۔" ... نے غصے سے کرسی پر بیٹھ کر کہا۔
"... وہ بھی آ جائے گا۔ بس تو کسی مولوی کو بلا اور ہمارا نکاح پڑھا ... لیے ادھر جم کر بیٹھا ہوں۔ سہرا بھی بننا ہے۔"
"... پھا تو نوبت بایں جا رسید! یہ میں کیا سن رہا ہوں۔" مس ... وہ اس وقت لحاف میں منہ ڈھانپ کر لیٹی تھی حیرت ... کہ اس نے صبح سے پاؤں پلنگ سے نیچے نہیں اتارا تھا۔ مجھے ... پر طیش آ رہا تھا۔ وہ مثل صادق آتی تھی کہ آگ لینے آئی ... مالک بن بیٹھی۔ کوئی اس سے پوچھے کہ تو کہاں کی مغل زادی ہے ... کوئی اپسرا شیپسرا ہے کہ آبی پر قبضہ جما بیٹھی ہے ... سیکڑوں عروسانِ شب یہاں پھرتی ہیں۔ تو کس چکر میں ... میرے یار کو۔ مگر وہ تو ٹس سے مس نہیں ہو رہی تھی۔
... نے کوئی جواب نہ دیا۔ آبی بولا۔ "یہ بیمار ہیں ... یہ نو ڈگری بخار ہے انہیں، کچھ شرم کرو۔"
"... اسی حالت میں شادی کرنا چاہتے ہو؟"
"... کیا مضائقہ ہے۔ یہ ایجاب و قبول تو کر سکتی ہیں نا!"
... کچھ عف عف کرنے لگیں۔
... وہ سب کی سب بڑی ہی شیطان ... ان میں سے ایک کے ساتھ چہل فرما رہے تھے۔
... خیر یہ تمہارا ذاتی مسئلہ ہے مگر بندۂ خدا کچھ پتہ بھی ... حال ہو رہا ہے۔"
"... حال تو اچھا بھلا ہے۔ خیر چل میں تیری بھی رام کہانی

سن ہی لوں۔ مجھے پتہ ہے تو میرے بغیر کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ پھونک کیوں نہیں دیتا ہے اس شہر کو جو تجھے لے ڈوبا ہے۔"
یہ کہہ کر وہ عرشی کے پلنگ سے اترا اور سلونی کو بلا کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔
"مجھے ذرا ڈرائیونگ روم میں بٹھا دو مس سلونی!"
وہ ایک بار پھر کھلکھلا کر ہنس دی۔ "اسے ڈرائیونگ روم نہیں ڈرائنگ روم کہتے ہیں جناب عالی!"
"پتہ نہیں کیا کہتے ہیں اسے۔ دراصل میری ٹانگ زخمی ہے نا! اس لیے میں کوئی بات صحیح طور پر سمجھ نہیں سکتا ہوں۔"
"تیرا دماغ تیری ٹانگ میں فٹ ہے؟ یہ کیا بکواس کر رہا ہے تو۔" میں نے سلونی کو ہٹا کر خود اسے سہارا دیتے ہوئے کہا۔
"بس کچھ ایسی ہی بات ہے۔ یار میری ٹانگ میں درد جگر ہو رہا ہے۔ بڑی مصیبت میں ہوں۔" سلونی نے اس کی رہنمائی کر کے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ وہ بہت ہی سجا سجایا کمرہ تھا جس کی آرائش پر کسی نے واقعی اپنے حسنِ ذوق کا مظاہرہ کیا تھا۔
"یہ دروازہ بند کر دے کڑیے اور تو جا ادھر بیٹھ۔ میں اس سے کچھ ٹاکس کروں گا۔"
"کیا کریں گے؟ ٹالکس نہیں جناب عالی ٹاکس کہیں ٹاکس۔"
سلونی نے پھر اس کی غلطی پکڑی مگر میں جانتا تھا کہ وہ جان بوجھ کر ...
میں نے سلونی کو کمرے سے دھکیل کر باہر نکالا اور دروازہ بند کر کے آبی کے پاس صوفے پر بیٹھ گیا۔
"یہ ناٹک بند نہیں کرے گا تو؟ یہ سوجھی کیا ہے تجھے اس کے ساتھ بندھ کر بیٹھنے کی۔"
"وہ مجھے اچھی لگتی ہے یار! پر دفع کر۔ تو کیوں غم کرتا ہے پیارے! ہم تو سفر میں ہیں۔ یہ دو گھڑی کی چھاؤں ہے۔ اس کے تلے بیٹھ کر آگے چل دیں گے۔"
"مگر تو تو اس مکان کو خریدنے کی کہہ رہا تھا۔"
"اس بارے میں میں بہت سنجیدہ ہوں، ہو سکے تو اس کا سودا کر لے۔ ہمیں شہر میں رہنے کے لیے مکان کی سخت ضرورت ہے کسی ملازم کو ادھر بٹھا دیں گے۔"
"مگر وہ فروخت بیچے گی تو جب ہی خریدیں گے نا۔"
"اچھا خیر اب یہ بتا کہ معاملہ کیا بنا ہے؟ اس آسیہ کا کچھ پتہ چلا؟"
"نہیں یار! ابھی تو رونا ہے۔" یہ کہہ کر میں نے۔۔۔۔ اسے بھی تمام واقعات سے آگاہ کر دیا۔ وہ ٹک ٹک میرا منہ تکتا رہا۔ میں چپ ہوا تو وہ بولا۔ "یار اتنا کچھ ہو گیا اور تو نے مجھے اب یہ سب کچھ بتایا ہے۔ اس ریٹا کی بے مثال وفا کا یہ انعام دیا ہے تو نے اسے۔"
"میں کیا کر دوں؟ میرے بس میں کیا تھا آبی! وہاں حالات

ہی ایسے ہوگئے تھے۔"

"دیکھ! میرے لیے ایک ٹیکسی روک۔ ادھر نولکھا چرچ کا پادری پیٹر۔ مجھے جانتا ہے۔ میں ایسے ہی ایک دن ایک دوست کے ساتھ اُدھر چلا گیا تھا۔ اپنا نام میں نے اسے ایڈورڈ بتایا تھا۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں عیسائی ہوں میں اس کے پاس جاتا ہوں۔ وہ ریٹا کی لاش لے گا۔ میں نے چرچ کے لیے دس ہزار روپیہ بھی دیا تھا۔"

"اچھا! اگر یہ بات ہے تو تم ابھی چلے جاؤ اور جس طرح بھی ہو سکے اس بدنصیب کی لاش اُن سے لے لو۔ اُسے کوئی قبر بھی ڈھنگ کی نہ ملی تو مجھے زندگی بھر افسوس رہے گا آبی! وہ اسے لاوارث سمجھ کر کسی گڑھے میں دبا دیں گے۔"

"ہاں۔ وہ تو یہی کریں گے۔ تو کوئی ٹیکسی روک۔ میں ابھی کپڑے بدل کر آتا ہوں۔"

"کوئی فالتو کپڑے ہیں تیرے پاس؟"

"اوہ! یہ تو مجھے یاد ہی نہیں رہا۔ میرا بھی دماغ خراب ہوگیا ہے۔ سامان تو ہم اُدھر ہسپتال میں چھوڑ آئے ہیں۔"

"ٹھیرو! تجھے ماجدہ سے ایک جوڑا لے دیتا ہوں۔"

کچھ ہی دیر بعد آبی اپنا بھرا ہوا پستول قمیص کے نیچے کمر سے باندھ کر ٹیکسی میں جا بیٹھا اور نولکھا چرچ کی طرف چل دیا۔ وہ مجھے عمداً اپنے ساتھ نہیں لے گیا تھا۔

وہ نظروں سے اوجھل ہوا تو میرے ذہن پر ایک بار پھر سناٹا چھا گیا۔ میں لڑکھڑاتے قدموں سے مکان میں داخل ہوا اور ڈرائنگ روم میں جا بیٹھا۔ مجھے کوئی شے اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ مصیبتیں "مجلسِ حیراں" بن کر میرے اِرد گرد پرے باندھ کر کھڑی تھیں۔ میری مٹی تو خراب ہو ہی گئی تھی۔ اب ریٹا بھی اس راہ سے گزر رہی تھی۔ مگر۔۔۔ مگر اس کا قصور کیا تھا۔ یہی ناکہ وہ میرا نام لے کر چلتی تھی اور آسیہ کو شناخت کر لینے کے بعد وہ اس سے، ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہ ہو سکی تھی۔ صرف میری وجہ سے۔ اس نے یہی سوچا ہوگا کہ یہ آسیہ غلام جیلانی کی بہن ہے۔ وہ اُسے اُن پھنکارتے ہوئے سانپوں سے بچانے کے لیے اس کے ساتھ چلی گئی تھی۔ مگر۔۔۔ مگر وہ سانپ اُسے ہی ڈس گئے۔ وہ بگش کہتا تھا کہ اس کی بہت سے لوگوں نے آبرو ریزی کی تھی۔ اس کے جسم پر جگہ جگہ تشدد کے نشانات موجود تھے۔ مگر میری کتنی بڑی بدنصیبی تھی یارو کہ میں۔۔۔ میں کسی کے خلاف اس کے قتل کے سلسلے میں دعویٰ بھی دائر نہ کر سکتا تھا۔ میں تو خود ہی گر گیا تھا۔ میرے پیڑ کا مُنڈلا ہی کٹ گیا تھا۔ سب کچھ بھسم ہوتا جا رہا تھا۔ وہ ریٹا باقی نہیں رہی تھی اور مجھے یقین آنے لگا تھا کہ آسیہ بھی اس دنیا میں موجود نہیں رہی۔ انہوں نے اُسے بھی موت کے گھاٹ اتار دیا ہوگا۔ وہ گروہ در گروہ میرے خلاف سازش کیے بیٹھے تھے۔ انہوں نے بڑے صاحب کی بات بھی نہیں مانی تھی۔ بلکہ اس قصے کو مختصر کرنے اور اپنے جرائم کے تمام ثبوت زائل کرنے کے لیے انہوں نے رات کو ہی۔۔۔ تاکہ اگلی صبح تک بڑے صاحب اپنے انتظامی اختیارات کو روبہ۔۔۔ اُن بدنصیب لڑکیوں تک نہ آ پہنچیں۔ یہ بات ان کے لیے آسان بھی تھی۔ کسی بےبس و لاچار آدمی کے خلاف اُن کا یہ اقدام۔۔۔ ہے۔ انسانی زندگی پر کسی قانون کا اطلاق اُن کے لیے۔۔۔ انہیں صرف اپنی ضد، اپنی انا اور اپنے حکم کی تعمیل عزیز ہے۔ عقوبت خانوں میں صلیبیں گاڑ کر بیٹھتے ہیں اور کسی کو۔۔۔ کو جب اپنے سامنے اپنے حق سچ کا ہاتھ بلند کرتے دیکھتے ہیں۔۔۔ بھنا اُٹھتے ہیں پھر وہ کچھ نہیں سوچتے۔ اسے صلیب پر۔۔۔ ہیں۔ وہ یہی کرتے آئے ہیں۔ ریٹا اُن کا پہلا شکار نہیں تھی۔

میں کتنی ہی دیر تک اس نیم تاریک ڈرائنگ روم میں۔۔۔ لہو روتا رہا۔ اس عرصہ میں نہ ماجدہ وہاں آئی نہ سلونی۔ میں جب۔۔۔ میں سے گزرا تھا تو انہوں نے میری آنکھوں میں وہ بہیمیت۔۔۔ جو دم بدم مجھے اور زیادہ خونخوار بنا رہی تھی۔ میرا ہر شے پر سے۔۔۔ اٹھتا جا رہا تھا۔ اور اب میں اس الاس سے ساری امیدیں وابستہ۔۔۔ تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ عورت وہ عشوہ طراز اداکارہ نہیں۔۔۔ ملنسا دیوی ثابت ہوگی۔ میں اُسی سے اس زہر کا تریاق مانگ۔۔۔ رہا تھا جس نے ریٹا کو جھیر جھیر جلا ڈالا تھا۔ وہ موہ روپی الاس۔۔۔ ایک نئی راہ پر ڈال سکتی تھی۔ ایسی راہ جو روشنی کے منبع تک۔۔۔ اور میرے دل میں پھر سے جینے کا حوصلہ پیدا کرے کیونکہ۔۔۔ تدبیریں اُلٹ ہو گئی تھیں۔ میں بےبس سا ہوکر وہاں آ۔۔۔ پرُے شہر میں چڑ مڑ ہوا بیٹھا تھا۔ میں نت نیا کنواں کھود۔۔۔ اور ہر بار ناکام و نامراد لوٹتا تھا۔ بہت سے لوگوں کا خون میری۔۔۔ بڑی جانیں میرے ہاتھوں ضائع ہو گئی تھیں مگر کسی ایک کی۔۔۔ آسیہ کو راس نہیں آئی تھی۔ وہ اس گرداب میں ایسی پھنسی تھی۔۔۔ وہ میری آنکھوں سے اوجھل ہوتی چلی گئی۔ اور اب تو شاید وہ۔۔۔ جا پہنچی تھی۔ اس پاتال میں جس تک میں جیتے جی پہنچ ہی نہیں۔۔۔ میری عاجزی انکساری۔ میری آہیں میرے آنسو کسی کام۔۔۔ اور میرا تمرد، میرا حوصلہ، میری جواں مردی آسیہ کو اور زیادہ۔۔۔ پھنسانے کا سبب بنی تھی۔ میرا ذہن سُن ہوتا جا رہا تھا۔ سوچ۔۔۔ تمنے بانے بُری طرح اُلجھ چکے تھے جب افق تا افق اندھیرا۔۔۔ روشنی کی کوئی رمق بھی کہیں نظر نہ آئے تو پھر ایسے میں آدمی۔۔۔ سے ہی مایوس ہو جاتا ہے۔ میرا بھی یہی حال تھا۔

میں کتنی ہی دیر تک وہاں بیٹھا سوچتا رہا مگر اپنے۔۔۔ بارے میں میں کوئی بھی قطعی فیصلہ نہ کر سکا۔ ڈاکٹر فرخندہ کا۔۔۔ ڈرائنگ روم میں میں تو مٹی کا ارت بن کر رہ گیا تھا۔ میرا۔۔۔ کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ مکان واقعی بہت خوبصورت تھا۔۔۔ مرلے رقبہ تھا اس کا۔ تین بیڈ روم اور ایک ڈرائنگ روم۔۔۔ صحن۔۔۔ گئے پیچھے۔۔۔ آدمی کی ساری ہی ضرورتیں وہاں پوری۔۔۔ تھیں اور وہ آبی اسے دیکھتے ہی خرید لینے کا فیصلہ کر بیٹھا تھا۔ اس۔۔۔ بُری نہیں تھی۔ ہمیں رہنے کے لیے ڈھنگ کا ٹھکانا مل سکتا۔۔۔ وہ کوئی وقت تھا ایسی باتیں سوچنے کا۔ ہم تو اپنی ہی لوٹنی۔۔۔ بیٹھے تھے۔ پھر بھی آبی بضد تھا اور بہت مارا ماری کرتے تو۔۔۔ وقت ڈیڑھ دو لاکھ جمع کر سکتے تھے۔ یہی کچھ ہماری جیبوں میں۔۔۔ اگر وہ فرخندہ مان جائے تو ہم اسے ڈیڑھ لاکھ تو دے ہی سکتے تھے۔ اس بات کی کیا ضمانت تھی کہ وہ اُسے بیچ دے گی۔ اگرچہ عرشی نے۔۔۔ یہی بتایا تھا۔

مجھے وہاں بیٹھے پون گھنٹہ گزر گیا۔ اس عرصے میں ماجدہ دو۔۔۔ بار کھڑکی میں سے اندر جھانک کر واپس چلی گئی تھی۔ وہ بھی میری۔۔۔ سبب بےچین ہوگئی تھی میرے اس خوفناک موڈ کو وہ اچھی۔۔۔ سمجھتی تھی۔ جب میں وہاں سے کسی طرح بھی نہ اٹھا تو اس نے سلونی۔۔۔ اندر دھکیل دیا۔ وہ مسکراتی ہوئی آگے بڑھی اور میرے سامنے قالین۔۔۔ پر دوزانو ہوکر بیٹھ گئی۔

"آپ کیا سوچ رہے ہیں جنابِ عالی! میں نے آپ کے لیے کافی۔۔۔ بنائی ہے حکم ہو تو لے آئیں۔"

"اوہ! چلیں میں آپ کے ساتھ بیٹھ کر پیتا ہوں۔" یہ کہہ کر۔۔۔ کمرے سے باہر نکل آیا۔

ماجدہ صحن میں کھڑی تھی، بولی: "آپ زیادہ پریشان نہ ہوں۔۔۔ جب آدمی بےبس ہو جائے تو اُسے اپنے معاملات خدا کے سپرد کر دینے چاہئیں۔"

"وہ تو میں کر ہی چکا ہوں ماجدہ میرے ہاتھ میں تو کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ عرشی کا کیا حال ہے اب؟"

"اس کا بخار اب اتر گیا ہے۔ ڈاکٹر نے اچھی دوا دی تھی اُسے۔" اس نے کہا اور میرے ساتھ ہی ہیلڈ میں آ گئی۔ کافی ہم تینوں نے ڈائننگ روم کی خوبصورت میز پر بیٹھ کر پی۔

"اس مکان کے کتنے پیسے مانگتی ہے وہ ڈاکٹر فرخندہ؟ عرشی نے بتایا تھا کہ وہ بیچ رہی ہے۔"

"پندرہ دو لاکھ۔ مگر آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟" ماجدہ نے حیران ہوکر پوچھا۔

"ہم اسے خریدنا چاہتے ہیں۔"

"ارے! میں بھی یہی ارادہ کر رہی تھی۔ کمال ہے کہ یہ مکان آپ کو بھی پسند آ گیا ہے۔"

"تو پھر آپ خرید لیں۔ ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

"سمجھیں آپ نے یہ مکان خرید لیا۔ میں رجسٹری آپ کے نام کی لکھوا دوں گی۔" ماجدہ نے فراخدلی سے کہا۔

"نہیں، اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آپ تو بہت عرصے سے مکان خریدنے کا سوچ رہی تھیں۔ یہ اچھا موقع ہے اسے آپ خرید لیں۔"

"میں عرشی سے بات کروں گی۔ سمجھ لیں کہ یہ آپ کا ہو گیا۔۔۔۔ مگر جنابِ عالی! وہ آبی صاحب تو اسے عرشی کے لیے خریدنا چاہتے ہیں۔"

"بالکل پاگل ہے وہ! ایسا عشق میں دھنس گیا ہے وہ کہ اُسے کسی بات کا ہوش ہی نہیں رہا۔ آ جانے دو اسے۔ اتنے جوتے لگاؤں گا کہ دماغ درست ہو جائے گا اس کا۔ مجنوں ہی بن گیا ہے بدمعاش۔" میں نے بدمزہ ہوکر کہا۔

آبی کا ذہنی توازن مجھے درست معلوم نہیں ہوتا تھا۔ پتہ نہیں اس عرشی میں اُسے کیا بات نظر آئی تھی۔ ایک ہی رات میں آبی کی کایا پلٹ گئی تھی۔ ہمیں اپنی جان کے لالے پڑے تھے اور وہ پڑاؤ ڈال رہا تھا۔ پیر پسار کر لیٹنا چاہتا تھا۔ اور حالت یہ تھی کہ پولیس ہمارا کھرا ناپتی پھرتی تھی۔

آبی کوئی چار گھنٹے بعد واپس آیا۔ سلونی نے دروازہ کھولا تو وہ اس وقت ٹیکسی میں بیٹھا تھا بولا: "ہاشم صاحب کو باہر بھیجو۔"

میں اس وقت مکان کے صحن میں کھڑا تھا۔ اس کی آواز سُن کر میں دروازے میں جا ٹھیرا۔ میں نے اس کے چہرے پر پھیلی ویرانی دیکھی تو میں وہیں رک گیا۔ "اندر آ کر مجھے بتاؤ تو سہی کہ ہوا کیا ہے۔ ٹیکسی کوئی بھاگی نہیں جاتی۔"

میری یہ بات سُن کر وہ ٹیکسی سے نکلا اور لنگڑاتا ہوا اندر آ گیا۔ میں اسے سہارا دے کر نشست گاہ لے گیا اور تمام دروازے کھڑکیاں بند کر کے اس کے پاس بیٹھ گیا۔

"کیا بنا پھر؟ وہ پادری ملا کہ نہیں؟"

"مل گیا تھا اور وہ تھانے سے لاش لے آیا ہے۔ اس کی بات وہ ٹال نہیں سکے۔ اُن کے پاس کوئی بہانہ بھی تو نہیں تھا اور اب وہ اُسے قبرستان میں رات کو دفن کریں گے۔"

"کیا ہم قبرستان نہیں جا سکتے؟"

"نہیں۔ کم از کم تم تو بالکل نہیں جا سکو گے کیونکہ وہاں سادہ کپڑوں میں پولیس کے سپاہی موجود ہوں گے۔ انہیں یقین ہے کہ تم وہاں ضرور جاؤ گے۔"

"ہوں! پادری نے کچھ نہیں پوچھا اُن سے کہ وہ بیچاری اس حال کو کس طرح پہنچی؟"

"پاگل ہو گئے ہو، وہ کیسے پوچھ سکتا تھا۔ اس نے پوچھا بھی ہوگا تو وہ بتا تھوڑی دیتے؟ پولیس کے تمام لوگوں کو تو علم نہیں ہے کہ ریٹا کے ساتھ یہ ظلم کس نے کیا ہے۔ وہ تو چند آدمی ہیں اور ہمیں اُن کا پتہ خود کرنا پڑے گا۔"

"مجھے اُن تک ہر حال میں پہنچنا ہے آبی! میں نے قسم کھائی ہے کہ اُن میں سے ایک ایک کو چُن چُن کر ماروں گا۔"

"غصّہ تو مجھے بھی بہت آ رہا ہے جیلانی! مگر اتنا تیز نہ چلو۔ ہمیں سب سے پہلے تو یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ لوگ تھے کون؟ سب سے بڑا سوال یہی ہے۔"

"ہاں، وہ بھی میں معلوم کر کے رہوں گا۔ میں ریٹا کے قتل کا انتقام لے کے رہوں گا۔ اگر میں انتقام نہ لے سکا تو میں اپنی زندگی ختم کر لوں گا آبی! میں یہ ذلّت برداشت نہیں کر سکتا ہوں۔"

"میں نے پادری سے کہا ہے کہ وہ آسیہ کے بارے میں کچھ معلوم کر سکے تو مجھے بتلائے۔ میں نے اسے صرف اتنا بتایا ہے کہ آسیہ میرے ایک دوست کی بہن بخاری کلینک میں زیرِ علاج تھی۔ وہاں سے پولیس اُسے اور ریٹا کو گرفتار کر کے لے گئی۔ حالانکہ اُن کے پاس اختیار کوئی نہ تھا۔ اور وجہ اس کی یہ تھی کہ آسیہ کے بھائی کے خلاف کچھ مقدمے درج ہیں اور وہ فرار ہو چکا ہے۔ بس اسی سلسلے میں انہوں نے آسیہ اور ریٹا کو گرفتار کر لیا تاکہ وہ اُن سے اس آدمی کا پتہ پوچھ سکیں۔ پادری میری یہ باتیں سُن کر بہت متاثر ہوا۔ اس نے کہا ہے کہ وہ بھی اپنے طور پر کوشش کرے گا تاکہ آسیہ کا پتہ مل سکے۔"

"وہ بیچارا کیا کر سکے گا۔ ناممکن ـــ یہ اُس کے بس کی بات نہیں ہے۔ ڈھلوں صاحب یہاں آ کر ہار گئے۔ انہوں نے بڑے صاحب کی پیش نہیں چلنے دی۔ بھلا وہ بیچارا پیٹر کس شمار قطار میں ہے آبی بھائی! بات بہت آگے نکل گئی ہے۔"

"نہیں یار ایسا نہ سمجھو۔ وہ پادری تو کہہ رہا تھا کہ اگر وہ صحیح بات نہیں بتائیں گے تو وہ کل صبح ہائی کورٹ میں رٹ دائر کر دے گا۔"

"رٹ؟" میری ہنسی چھوٹ گئی۔ "بھائی انہوں نے کسی بات کو کسی کاغذ پر درج ہی نہیں ہونے دیا۔ اس معاملے میں انہوں نے وہی راستہ پکڑا ہے جو ہمارا راستہ ہے جس طرح ہم عرفان کو اٹھا لائے تھے نا اسی طرح وہ ان دونوں کو لے گئے ہیں۔"

"مگر وہ بخاری کلینک والے تو اس بات کے گواہ ہیں۔" آبی نے بڑے وثوق سے کہا۔

"وہ بول ہی نہیں سکتے ہیں۔ ہاں، اُن کی کیا مجال ہے جو وہ یہ کہہ سکیں کہ ہاں اُن کے ہاں سے پولیس اُن لڑکیوں کو لے گئی تھی، ناممکن ہمیں کوئی اور ہی دروازہ دیکھنا پڑے گا۔"

"یہ معاملہ تو پھر بہت ہی خوفناک ہو گیا ہے جیلانی! آسیہ کی زندگی سخت خطرے میں ہے۔ وہ جیل میں تھی تو محفوظ تو تھی۔"

"کیا محفوظ تھی وہ بدنصیب وہاں۔ دیکھا نہیں اُسے جیل میں کسی بدمعاش نے کس ذلت سے دوچار کر دیا تھا۔ اس کا ثبوت اُس کے پیٹ میں موجود ہے۔" میں نے زہرخند کیا۔

آبی خالی خالی نظروں سے چھت کو گھورنے لگا پھر سنبھل کر بولا۔

"اس سلونی سے کہہ اس ٹیکسی والے کو فارغ کر دے۔" یہ کہہ کر اس نے دس دس کے دو نوٹ میری طرف بڑھا دیے میں نے باہر نکل کر وہ نوٹ سلونی کو دے دیے۔

شام بہت نیچے اُتر آئی تھی۔ آبی پانچ دس منٹ کے لیے عرشی کے کمرے میں گیا اور پھر باہر نکل آیا۔ میں ابھی تک نشست میں بیٹھا تھا اور بتیاں بھی نہیں جلا سکا تھا۔ اس نے ٹیوب لائٹ جلا کر بولا۔ "وہ عرشی اب بہتر ہے بالکل ٹھیک نظر آ رہی ہے۔"

"تو پھر کب شادی کر رہے ہو اس سے؟"

"تُو ہوش میں تو ہے میرے یار! اس سے شادی کروں گا؟" وہ تو ایسے ہی مذاق کر رہا تھا میں "چہ نسبت خاک را بہ عالمِ پاک" کہا ہے نا بزرگوں نے؟"

"خاک کون ہے اس جملے میں؟"

"خاک تو میں ہی ہوں تمہارا یہ خاکسار۔ بہرحال یہ بتا کہ اب کیا کرنا چاہتا ہے؟"

"تیری ٹانگ کا کیا حال ہے اب! تیرا ٹائر نہ پھٹتا تو میں زیادہ تیز دوڑ سکتا تھا۔"

"میرا خیال ہے میں اب ٹھیک ہو چکا ہوں۔ ذرا دیکھ تو میرا زخم اب بڑی حد تک بھر چکا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے ٹانگ پر بندھی پٹی کھول دی۔ زخم اس کا واقعی مندمل ہو گیا تھا۔

"یہ پٹی اتار ہی دے اب بس وہ دوا کھاتا رہ۔"

"دوائیں تو سب ادھر ہسپتال میں ہی رہ گئی ہیں۔ اس سلونی کو بھیج دو، ہمارا سامان لے آئے۔"

"نہیں، یہ کام وہ کل کر لے گی۔ ابھی میں ڈاکٹر سلیم کو بلوا دیتا ہوں وہ تمہیں اور عرشی کو دیکھ لے گا۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔ اگر اجازت دو تو میں عرشی کے پاس جا بیٹھوں۔"

"ادھر ریٹا کے جنازے پر نہیں جاؤ گے؟"

"میں عرشی کو ساتھ لے کر جاؤں گا اور سلونی کو بھی۔ کیا خیال ہے تمہارا؟"

"جیسے تمہاری مرضی! میں اور ماجدہ شاید واپسی پر تمہیں گھر نہ ملیں، ہمیں دس بجے ایک جگہ جانا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ ایک چابی میں ساتھ لے جاؤں گا، کوئی خاص پروگرام ہے؟ ویسے میں خوش ہوں کہ ماجدہ تمہارے ساتھ ہیرا پھیری نہیں کر رہی ہے، وہ مخلص عورت ہے یہ بات میں دیکھ چکا ہوں۔"

"ہاں میرا بھی یہی خیال ہے کہ وہ کسی بھی مرحلے پر مجھے دھوکا نہیں دے گی اور سنو وہ یہ مکان ہمارے نام پر خرید رہی ہے۔"

"نہیں یار! اسے کیا پڑی ہے کہ ہمارے نام پر یہ مکان خریدے۔"

"میں نے اس سے بات کی تھی۔ بہت روپیہ ہے اس کے پاس۔"

"ارے تو ہمارے نام کی کیا ضرورت ہے؟ وہ اسے خریدے اپنے نام پر۔ وہ چھڑی چھانٹ عورت ہے۔ ہم جب بھی آتے یہاں

رہتے اور کیا کرنا ہے ہمیں۔"

"میں نے یہی سوچا ہے۔ عرشی ذرا ٹھیک ہو جائے تو پھر اس کے بارے وہ بات کرے گی۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ میں ان دونوں کو ساتھ لے کر باہر جا رہا ہوں جنازے پر۔"

"پہلے اس ڈاکٹر سے مل لو سلونی سے کہو وہ اُسے بُلا لاتے۔"

آبی کوئی آدھ گھنٹے بعد ڈاکٹر سلیم سے دوا لینے کے بعد عرشی اور سلونی کو ساتھ لے کر باہر چلا گیا تو ماجدہ نے بھی لباس تبدیل کر لیا۔ مجھے اس نے میرا ولایتی سوٹ پہنا دیا۔ اور پھر ٹھیک نو بجے وہ مکان مقفل کر کے میرے ساتھ باہر چل دی۔ وہ مجھے الماس کے پاس لے جا رہی تھی۔ اس عورت کے پاس جس کی آواز اور جس کے حسن کا ڈنکا سارے ملک میں بج رہا تھا۔

⭘

الماس شاہ نور اسٹوڈیو کے عقب میں بڑی سڑک سے بہت آگے ایک وسیع و عریض کوٹھی میں مقیم تھی اور اس کے دروازے پر بھی دن رات ایک دربان کھڑا رہتا تھا۔ وہ ماجدہ کو جانتا تھا اور اسے دیکھتے ہی اس نے اسے اندر جانے دیا۔ میں نے ماجدہ سے کہہ دیا کہ وہ میرا تعارف ہاشم خان کی حیثیت سے کروائے۔ کیونکہ میرا نام میرے لیے باعثِ ننگ ہو چکا تھا۔ میں اب اس کا متحمل ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ دن بھی مجھے دیکھنا تھا یارو کہ مجھے اپنے ہی نام سے خوف آنے لگا تھا۔ میں اپنے ہی آپ سے لرزاں ترساں رہنے لگا تھا۔ ایک وہ ہیں جو ہر جگہ اپنے نام کا جھنڈا فخر سے اونچا کیے پھرتے ہیں اور مخدوم بن جاتے ہیں۔ مگر میری بدنصیبی یہ تھی کہ میرا نام میرے لیے گالی بن چکا تھا۔ میں نے ماجدہ سے کہہ دیا کہ وہ مجھے سرگودھا کے زمیندار کی حیثیت سے الماس کے سامنے پیش کرے میرے لیے یہی بہتر تھا۔ دراصل میرے مخطورات مجھے کہیں چین نہیں لینے دیتے تھے۔ میری گردشوں نے مجھ سے میرا سایہ بھی جدا کر رکھا تھا۔

کوٹھی کے لان میں روشِ بہار کے نوشگفتہ پھولوں نے قیامت مچا رکھی تھی۔ فضا میں عجیب سی بھیدوں بھری دلوں پر دستک دیتی ہوئی خوشبوئیں رچی تھیں۔ مگر میں مفقود النسل کتے کی طرح قدم قدم پر سونگھتا ہوا یوں آگے بڑھ رہا تھا جیسے میں کسی سینڈھ کے منہ کے آگے کھڑا ہوں۔ ماجدہ میرے ساتھ ساتھ قدم بڑھا رہی تھی، بولی۔

"ذرا جم کر ڈٹ کر اُن کے سامنے بیٹھیے گا۔ یوں جیسے آپ ہفت اقلیم کے بادشاہ ہیں۔ حیران پریشان اُلجھے ہوئے ہر روگ اپنے لیے کہیں کوئی جگہ نہیں بنا سکتے۔"

"شکریہ استانی صاحبہ! مگر میں یہاں اپنے لیے کوئی مقام پیدا کرنے نہیں آیا ہوں۔"

"یہ بات نہیں ہے جناب۔۔۔۔"

"ہاشم صاحب۔"

"ہاں جناب ہاشم صاحب! ہمیں اس الماس سے بہت بڑا کام لینا ہے سمجھتے ہیں نا آپ! ضرورت پڑے تو اس پر آپ عاشق بھی ہو سکتے ہیں، اسے شیشے میں آپ ہی کو اتارنا ہو گا۔"

"اگر ایسا ہے تو پھر آپ کی سفارش کی کیا ضرورت ہے؟"

"عین ممکن ہے کہ وہ آپ پر اس رُخ سے نظر نہ ڈالے۔ کیونکہ اسے عاشقوں کی کمی نہیں ہے۔ آپ بہرحال بہت ہی منفرد نظر آنے کی کوشش کریں۔ بہت پُر وقار، بہت ہی بھاری بھرکم۔"

"ہاں یہ تو بہت ضروری ہے لیکن اگر اس منان نے مجھے یا آپ کو پہچان لیا تو؟"

"مجھے تو وہ بہت پہچانتا ہے مگر آپ اُس دن بہت ہی مختلف حلیے میں تھے اور آج آپ کی صورت ہی اور ہو گی اب تو وہ سوچ بھی نہ سکے گا کہ آپ یوں کھلے بندوں الماس کے ہاں بھی آ سکتے ہیں۔"

"اچھا دیکھتے ہیں کہ پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔"

میں نے ماجدہ کا ہاتھ دبا کر اُسے چپ ہو جانے کا اشارہ کیا۔ اب ہم عمارت کے قریب جا پہنچے تھے۔ دروازے میں کوئی ملازمہ کھڑی تھی۔ وہ ماجدہ کو دیکھ کر مسکرائی اور ہمیں خوش آمدید کہتی ہوئی ایک طرف ہٹ گئی، ماجدہ بولی۔

"الماس کہاں ہیں اس وقت ناز گل؟"

"اندر ہی ہیں۔"

"اور کون کون ہے یہاں اس وقت؟"

"کوئی بھی نہیں، وہ منان صاحب کا انتظار کر رہی ہیں وہ جو پولیس افسر ہیں۔"

"اچھا۔ کب آ رہے ہیں وہ؟"

"بس آنے ہی والے ہیں، اُن کا فون آیا تھا۔ انہوں نے میڈم کے لیے ایک کار لانے کا وعدہ کر رکھا ہے۔" ناز گل نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ ماجدہ سے بہت ہی کھل کر بات کر رہی تھی اور اس کی مسکراہٹ میں طنز نمایاں تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ماجدہ نے اس ملازمہ کو بھی رام کر رکھا تھا تحفے تحائف دے کر۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اسے درونِ خانہ کی بات بھی بتا دیتی تھی۔

ناز گل ہمارے آگے آگے راہداری میں ٹھمک ٹھمک چلتی ہوئی آگے بڑھی اور پھر ایک دروازہ کھول کر بولی۔

"میڈم ماجدہ آئی ہیں آپ سے ملنے کے لیے۔" یہ کہہ کر وہ دروازے سے ہٹ گئی۔ میں ماجدہ کے پیچھے پیچھے اندر داخل

ہوا تو چکا چوند مجھے نظر آئی جسے الماس کہتے تھے۔ وہ سرخ گلاب کے پھولوں ایسی ساڑھی پہنے ہوئے تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ صوفے سے لہرا کر اٹھی۔ بلاشبہ وہ حسین عورت تھی۔ اور اس کی آواز کی نغمگی سماعت کو حیران کرتی تھی۔

"آؤ ماجدہ کیسی ہو۔ تم نے اپنے آنے کی اطلاع تو کر دی ہوتی۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا بے آستین کا بازو پھیلا کر ماجدہ کا ہاتھ تھام لیا۔

"یہ ہاشم خان ہیں، سرگودھا کے زمیندار۔ آپ سے ملنے کے لیے بے تاب تھے۔ ان کو آپ سے ملوانے آئی تھی۔"

"اوہ گڈ! ان کی ذرہ نوازی ہے۔ آیئے تشریف رکھیے اے آمدنت باعث آبادی ما۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنا دوسرا بازو رقص ایسے انداز میں پھیلا کر صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ اس کی مقناطیسی شخصیت نے مجھے ایک لمحے کے لیے تو مسحور کر دیا۔ ایسی بھی عورتیں موجود ہیں اس دُنیا میں جن کے گرد خوشیوں اور خوشبوؤں کا ہجوم رہتا ہے اور دنیا کی ہر شے جن کی دسترس میں ہے۔ کمرے میں اس وقت ہلکی ہلکی موسیقی پھیل رہی تھی جیسے خوشبو اپنے مخرج سے اُٹھ کر گرد و پیش کو مہکاتی ہے۔ وہ ریکارڈ پلیئر اس کی نشست کی دائیں جانب ایک خوبصورت میز پر دھرا تھا۔ وہ اس نے بیٹھتے ہی بند کر دیا۔

"کیا پئیں گے آپ؟ ہارڈ ڈرنک کہ سافٹ؟"

"یہ کچھ نہیں پیتے۔ بس کسی خوبصورت شے کو دیکھتے ہیں تو خدا کی حمد و ثنا میں لگ جاتے ہیں۔" ماجدہ نے میرے اور اس کے درمیان صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"تو شرارت کرنے سے باز نہیں رہتی ہے ماجاں۔ تیری یہی ادا مجھے اچھی لگتی ہے۔ آپ کے ہاشم صاحب کیا کرتے ہیں؟"

"میں نے کہا نا کہ یہ زمیندار ہیں اور زمیندار کیا کرتے ہیں؟ مجھے کیا پتہ کیا کرتے ہیں؟"

"یہی نا کہ زمینیں کاشت کروا دیں فصلیں تیار ہوئیں تو ان کو اٹھوا لیا۔ کسی مزارع کی کوئی اچھی تصنیف دیکھی تو اسے پڑھ لیا۔ بہت گھبرائے تو شکار پر نکل گئے۔ شہر میں آئے تو لاکھوں سے لمبائی ناپ کر کاریں خرید لیں۔ کسی کے حسن کی شہرت سنی تو وہاں جا پہنچے۔ اِدھر گرمی نے بہت ستایا تو یورپ چلے گئے۔ اور کیا کر سکتے ہیں یہ بیچارے زمیندار۔"

ماجدہ کی زبان کی فصاحت و بلاغت نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ میں اس ماجدہ سے تو واقف ہی نہیں تھا جو اس رات میرے اور الماس کے درمیان بیٹھی تھی۔ اس کی یہ باتیں سن کر الماس بے ساختہ ہنس دی، بولی۔ "کسی زمیندار کی اس سے اچھی تعریف اور ہو نہیں سکتی۔ مگر۔۔۔ یہ تو مجھے بہت ہی سنجیدہ [illegible] ہیں، کچھ بولتے ہی نہیں۔"

"میرے لیے ماجدہ نے گنجائش ہی کہاں رکھی [illegible] کی بہت عزت افزائی فرمائی ہے انھوں نے میری۔"

"یہ بہت شیطان ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ آپ [illegible] بہت زیادہ بے تکلف ہے۔"

اتنے میں نازگل پھر دروازے پر آ ٹھہری۔

"وہ منان صاحب آئے ہیں میڈم۔"

"ارے تو انہیں اندر لے آؤ نا، کھڑی منہ کیا تک رہی [illegible] میں تو انہی کے انتظار میں بیٹھی ہوں۔"

"تو یہ بات ہے! ہمارے لیے کیا حکم ہے پھر؟" ماجدہ [illegible]

"تم بھی بیٹھو جانِ الماس! وہ کوئی ہوّا تھوڑی ہیں۔ بہت کلچرڈ آدمی ہیں وہ۔ تم تو جانتی ہی ہو اُسے۔"

آنے والے لمحوں کے تصور نے مجھے پریشان کر دیا۔ [illegible] نے اگر مجھے پہچان لیا تو وہاں خدا معلوم کیا ہو جائے۔ میں [illegible] ہاتھ جیب میں ڈال لیا۔ بایاں ہاتھ اپنے جیب شاہ پر میں [illegible] گرفت ایک دم مضبوط ہو گئی۔ چند ہی لمحوں بعد منان دروازے پر آ پہنچا۔ وہ بہت نفیس قسم کا ولایتی سوٹ پہنے ہوئے تھا [illegible] میں اس نے سفید نوٹ ڈاٹ رکھے تھے۔ اس کی مسکراہٹ [illegible] بلا کا اعتماد تھا۔

"اوہ آئی ایم ساری۔ آپ تو مہمانوں میں گھری بیٹھی ہیں [illegible] آپ کا کیا حال ہے ماجدہ بیگم؟"

اس نے کچھ اس انداز سے یہ بات کہی جس سے یہی ثابت ہوتا تھا کہ وہ ماجدہ کو اچھی طرح جانتا ہے۔ ماجدہ "جی بہت [illegible] ہوں" کہہ کر چپ ہو گئی۔

"تشریف لائیے منان صاحب! یہ آپ کا اپنا گھر ہے مہمان کوئی نہیں ہے یہاں۔" یہ کہہ کر الماس اٹھلاتی ہوئی اس کی طرف بڑھی۔ منان نے ایک اچٹتی سی نظر ماجدہ پر ڈالی [illegible] اس نے مجھے دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے تو میں سن ہو کر رہ گیا [illegible] سمجھا وہ مجھے پہچان گیا مگر جس سیاق و سباق میں وہ مجھے دیکھ رہا تھا وہ بالکل ہی مختلف تھا۔ وہ مجھے بالکل ہی نہ پہچان سکا۔ اس [illegible] آگے بڑھ کر مجھ سے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا تو میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ چونک سا گیا ہے۔ میرا ہاتھ ٹھنڈا یخ ہو رہا تھا اور میری ہتھیلی کا لمس میرے دل کی بے چینی کا غماز تھا۔

"مجھے منان کہتے ہیں۔"

"میرا نام ہاشم خان ہے۔ ہاشم خان آف سالار پور۔"

"اوہ گڈ! وہ جو سرگودھا میں ہے؟ آپ چوہدری رضا [illegible] بھائی تو نہیں ہیں؟"

"جی ہاں! آپ ٹھیک سمجھے ہیں۔" [illegible] ایس پی ہوں۔ اپنی پوسٹنگ کے دوران ان سے میری ملاقات سرگودھا میں ہوئی تھی۔ آپ سے مل کر بہت [illegible] ہوئی۔"

"میری ایک بات سنیں گی آپ۔ بہت ضروری بات ہے۔" ماجدہ نے اچانک الماس کا ہاتھ پکڑ کر اسے وہاں سے [illegible] اٹھاتے ہوئے کہا۔

وہ اس کے ساتھ پہلو کے کمرے میں جا گھسی۔ منان نے میرے [illegible] بیٹھنا مناسب سمجھا۔ وہ کمرے کے بڑے دروازے میں جا ٹھہرا۔ [illegible] گل شاید راہداری میں تھی، اس کو مخاطب کر کے بولا۔

"نازگل میں اس کمرے میں بیٹھتا ہوں میڈم کو ادھر ہی بھیج [illegible]" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔ حیرت مجھے یہ تھی کہ اس نے ماجدہ [illegible] بے مروت بھرے لہجے میں اس کا حال پوچھا تھا۔ اس کا [illegible] مطلب یہ تھا کہ وہ ماجدہ اسے اپنا احسان مند بنا چکی تھی۔ اور اس کو [illegible] بارے میں اس نے جو کردار ادا کیا تھا وہ اس سے بہت متاثر تھا۔ [illegible] گر یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ مجھے ماجدہ کے ساتھ دیکھ کر [illegible] کے ذہن میں کوئی جھماکا کیوں نہیں ہوا تھا۔ کیا یہ صحیح ہے کہ [illegible] چیزیں اپنے سیاق و سباق میں ہی صحیح طور پر پہچانی جا سکتی ہیں۔

کچھ ہی دیر بعد وہ دونوں پہلو کے کمرے سے باہر نکل آئیں۔ [illegible] ماجدہ تو میرے پاس بیٹھ گئی اور الماس اپنی ملازمہ کے اشارے پر باہر نکل گئی۔

"میں نے مس ریٹا کے بارے میں الماس کو بتا دیا ہے۔ اور [illegible] اپنے کے بارے میں بھی۔ وہ کہہ رہی ہے کہ ابھی شراب کی محفل جمے [illegible] اور وہ منان سے ساری باتیں معلوم کرے گی۔"

"یہ بہت اچھا رہے گا۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔

"مجھے یقین ہے کہ منان کو ساری بات کا علم ہے اور ریٹا پر جو کچھ گزری ہے وہ سب کچھ اسی کے ایما پر ہوا ہے۔"

"آپ ٹھیک کہتی ہیں ماجدہ! مگر اس نے آپ کو کیسے نظر انداز [illegible] کر دیا۔ آپ بھی تو ہماری ساتھی ہیں اور یہ بات اس پر ثابت [illegible] ہو چکی ہے۔"

"میں نے اسے اپنی مظلومیت کی لمبی کہانی سنا دی تھی۔ ستم کھا [illegible] گئی تھی میں اس کے سامنے کہ مجھے آپ کے بارے میں کوئی علم نہیں [illegible] اور جلتے ہیں آپ اپنی گلو خلاصی کے لیے مجھے اس کو بیس [illegible] روپے دینے پڑے تھے۔"

"کمال کرتی ہیں آپ! یہ سب کچھ پہلے آپ نے کیوں نہیں [illegible] بتایا مجھے۔ لاحول ولا قوۃ۔"

"میں بس ایسے ہی ڈرتی رہی کہ کہیں آپ مجھ سے بدظن نہ [illegible] ہو جائیں۔ مجھ پر آپ کا اعتبار اگر نہ رہتا تو میں بہت دکھی ہو جاتی۔"

"چلو دفع کرو، اب کسی طرح اس پرندے کو پکڑو۔ اگلواؤ اس کے منہ سے کہ آخر ہوا کیا ہے۔"

"آپ فکر نہ کریں اور دیکھیں اگر شراب کی محفل میں کوئی اونچ نیچ آپ کو نظر آئے تو اس پر سیخ پا نہ ہو جائیں۔ ہمیں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔"

"بہت بہتر استانی جی! آپ کے حکم پر حرف بحرف عمل کروں گا۔"

اس کے بارے میں میرے اور آپ کے سارے اندازے غلط ہو گئے تھے۔ وہ ہر حال میں میری بہتری چاہتی تھی اور اب وہ مجھے میرے مقصد کی طرف گام گام آگے بڑھا رہی تھی۔

ہم آدھے گھنٹے تک اس نشست گاہ میں تنہا بیٹھے رہے۔ اس عرصے میں نازگل چائے ہمارے آگے رکھ گئی۔ اس کے بعد وہ پان بھی لے آئی۔ وہ برابر ہماری خاطر داری میں لگی رہی۔ بتاتی وہ کچھ بھی نہیں تھی کہ الماس اس گھڑی کہاں ہے اور منان صاحب کیا ہوئے۔ آدھا گھنٹہ اور گزرا تو نازگل نے اندر آ کر کہا۔

"چلیں، میڈم آپ کو بلا رہی ہیں۔ آپ دونوں ہی آ جائیں۔"

ہم فوراً ہی اس کے پیچھے چل دیے۔ وہ راہداری میں سے گزرتی ہوئی کوٹھی کے عقبی حصے تک جا پہنچی اور پھر اس نے ایک کمرے کا دروازہ آہستگی سے کھول دیا۔

"یہ باتھ روم ہے اس کے اندر چلے جائیں میڈم خود نہیں پی رہی ہیں آپ اندر سے سب کچھ دیکھ سکتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ پیچھے ہٹ گئی۔ کمرے میں جو منظر میں نے دیکھا، وہ کسی الف لیلوی داستان سے مختلف نہیں تھا۔ کمرے کے عین وسط میں دو نوخیز لڑکیاں رقص کر رہی تھیں۔ ناچ کی دھن انہیں ریکارڈ پلیئر سے مل رہی تھی۔ لڑکیاں مجھے نشے میں دھت نظر آتی تھیں۔ دائیں ہاتھ صوفے پر منان بیٹھا تھا جام بدست۔ شراب نے اس کے دل و دماغ پر مکمل قبضہ کر رکھا تھا۔ اس کے پاس ہی الماس بیٹھی تھی مگر ذرا فاصلے پر۔ درمیان میں اس نے دو فوم کی موٹی گدیاں ڈال رکھی تھیں وہ بھی بھرا ہوا نازک سا بلوری جام تھامے ہوئے تھی۔ مگر اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ ہوش میں ہے۔ وہ واقعی پی نہیں رہی تھی مگر ظاہر وہ یہ کر رہی تھی کہ وہ بھی نشے میں ہے۔ ہم اس کھلے سے باتھ روم میں داخل ہوئے تو الماس نے ریکارڈ پلیئر پر کوئی بہت ہی اداس اور حزن و ملال سے معمور دھن لگا دی۔ لڑکیاں اکھڑنے لگیں۔ اس باتھ روم سے ہم سب کچھ دیکھ اور سن سکتے تھے۔

اچانک الماس نے گھنٹی بجا دی۔ دونوں لڑکیاں رک کر حیرت زدہ سی نظروں سے اسے دیکھنے لگیں۔ اتنے میں کمرے کا دروازہ بھی کھل گیا۔ سامنے نازگل کھڑی تھی۔ الماس نے اسے اشارہ کیا کہ وہ ان کو باہر لے جائے مگر جونہی نازگل ان کی طرف بڑھی وہ دونوں لڑکیاں بھاگ کر منان کے پاس جا بیٹھیں۔ ایک اس کے

پاؤں کے قریب قالین پر اور دُوسری صوفے پر۔
منان اپنے آپ میں نہیں تھا۔ میں ڈرا کہ کہیں وہ حد سے بڑھ نہ جائے۔
" ارے منان! یہ ریٹا نہیں ہے مائی ڈیئر! یہ وہ لڑکی نہیں ہے۔" الماس نے بلند آواز سے ہنستے ہوئے کہا۔
" اُس گستاخ کا نام مت لو۔ اسے تو میں نے غنڈوں کے آگے ڈال دیا تھا۔ وہ چھ کے چھ اس کو لے گئے تھے۔"
" کہاں لے گئے تھے؟ کون تھے وہ! مجھے تو بتایا ہی نہیں تم نے۔"
" اوہ مائی ڈیئر! گاڈی کو نہیں جانتی ہو تم۔ گاڈی لوہار کو۔ اس کے ساتھ وہ ناتھو بھی تھا اور ستی بھی۔ میں سب کو جانتا ہوں۔"
" وہ بے چاری تو مر گئی ہو گی منان! اتنے ظالم ہو تم؟"
" ہاں وہ مر ہی گئی تھی، ادھر گاڈی کے ڈیرے پر ہی مر گئی تھی۔ وہ نسبت روڈ پر رہتا تھا نا! میں نے کہا پھینک دو اس کو اُدھر سڑک پر۔ میں بادشاہ ہوں اس شہر کا۔ وہ بتاتی ہی نہیں تھی۔ جیلانی میرے ہاتھ آ جائے تو میں اس کی گردن ہی مروڑ دوں۔ یوں۔" یہ کہہ کر اس نے سامنے بیٹھی لڑکی کی گردن دونوں ہاتھوں سے پکڑ لی۔
" ارے کیا کرتے ہو، مر جائے گی یہ! پھر کیا کرو گے تم، لو یہ پیو، شراب تو بس بنی ہی تمھارے لیے ہے۔ میں بھی پی رہی ہوں تمہارے نام کا ایک جام۔" یہ کہہ کر الماس نے اسے ایک گلاس اور دے دیا۔
" یہ جیلانی کون ہے؟ اس پر بہت غصہ آتا ہے تمہیں۔" الماس نے پوچھا۔
" وہ اس چھوکری آسیہ کا بھائی ہے۔ اس نے پولیس کو ذلیل کر دیا ہے مجھے بھی باندھ لیا تھا اُس نے۔۔۔" اس نے مجھے بڑی ہی فحش گالی دی۔ میرا خون کھولنے لگا مگر ماجدہ نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اب الماس منان کے پہلو میں جا بیٹھی تھی۔ بولی۔" یہ آسیہ کون ہے کہاں ملی تھی یہ تمہیں؟"
" وہ بدمعاش کبیر شاہ ایس ایچ او۔ وہ اسے یُو سی ایچ میں داخل کرا آیا۔ وہ بیمار ہے اس کا آپریشن ہو چکا ہے۔ وہ کبیر شاہ اُسے لے آتا تو میں اسے بھی گاڈی کے حوالے کر دیتا۔ سارا بدلہ ہی چکا دیتا، پر خیر۔۔۔ وہ مجھ سے بچ نہیں سکتی ہے الماس! مجھ سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ رات اس نے مجھے بہت گالیاں دی تھیں فون پر۔"
" کس نے؟ یہ کیا بک رہے ہو تم؟"
" بڑے صاحب نے۔ سب بدمعاش ہوتے ہیں۔۔۔ کہتا تھا میں تیری پیٹی اُتروا دوں گا۔ تو۔ منان سے یہ بات کہہ رہا تھا

کتنی اچھی ہے تو الماس! میں نے آج تجھے کار دی ہے! نشانی سنبھال کے رکھنا۔ تیرے لیے میں اپنی جان بھی دے دوں میری ڈولی!" یہ کہہ کر اس نے الماس کو بانہوں میں لینا چاہا مگر وہ تیزی سے پیچھے ہٹ گئی۔ دونوں لڑکیاں اس سے ذرا ہٹ کر بیٹھ گئیں۔ منان نے محسوس بھی نہیں کیا۔
" تم بڑے ظالم ہو۔ ریٹا کو تم نے خواہ مخواہ مروا دیا۔"
" او ڈیم ہر۔ میرا دل اس سے بھر گیا تھا۔ اور وہ تینوں بالکل بے کار تھے، ڈرتے تھے۔"
میرا دل چاہا کہ میں اس کی گردن توڑ دوں۔ اس کی بکواس میرے لیے ناقابلِ برداشت ہو گئی تھی مگر مجھے ماجدہ نے روک دیا۔ وہ میرے چہرے پر ابھرتی درندگی کو محسوس کر رہی تھی۔ میرا بازو پکڑ کر وہ مجھے باتھ روم سے نکال کر راہداری میں لے آئی۔
" اچھا تم بیٹھو۔ یہ تمھارے پاس رہیں گی، میں بھی ابھی آتی ہوں۔" یہ کہہ کر الماس بھی وہاں سے اُٹھ گئی۔ وہ اُسے ایک اور بھر کر دے آئی تھی۔ اس نے اپنے پیچھے دروازہ بند کیا اور سامنے دیکھ کر بولی۔
" چلو ماجدہ! اُدھر میرے کمرے میں چلو۔" یہ کہہ کر وہ دونوں کو اپنی مہکی ہوئی خواب گاہ میں لے گئی۔ دائیں ہاتھ ایک صوفہ بھی وہاں دھرا تھا، ہمیں اس پر بٹھا کر بولی۔
" سُن لیا ماجدہ! کتنے ظالم لوگ ہیں یہ۔ مگر تم نے بتایا کہ تم یہ سب کچھ کیوں معلوم کرنا چاہتی تھیں۔ کیا ملے گا اس چکر سے؟"
" مجھے اس آسیہ سے بہت ہمدردی ہے الماس! تمہیں بتایا تو تھا میں نے کہ وہ میرے بھائی کے دوست کی بہن ہے۔ وہ بہت بیمار ہے مجھے اس پر بہت ترس آتا ہے اور وہ ریٹا خواہ مخواہ ہی ماری گئی۔ میں نے اُس کی لاش سڑک پر پڑی دیکھی تھی، اسے جس کسی نے بھی دیکھا وہ رو دیا تھا۔ اتنی بری حالت بے چاری کی۔"
" اس پر تو بہت ہی ظلم ہوا ہے۔ اب تم یُو سی ایچ جا کر اُس سے مل لو۔ پتہ نہیں اس کی دیکھ بھال وہاں کون کر رہا ہے۔ اس نے وہاں بھی کوئی پہرہ بٹھا رکھا ہو گا۔"
" نہیں میرا خیال ہے کہ وہ کبیر شاہ ایس ایچ او ہے نا! اُس کی تحویل میں ہو گی۔"
" تمہاری بڑی مہربانی الماس! تم نہ ہوتیں تو ہمیں کچھ بھی معلوم ہو سکتا تھا۔"
" مجھے خوشی ہے کہ میں تمہارے کسی کام آ سکی۔ تم میری بہن ماجدہ! مگر مجھے افسوس ہے کہ میں ان کی کوئی بھی خدمت نہ کر سکی۔"
" جی کوئی بات نہیں! آپ نے ماجدہ پر جو احسان کیا ہے،

ی خدمت ہے۔ آپ کی قیمتی شراب البتہ ضائع ہو گئی، مجھے بہت افسوس ہے۔" میں نے اُسے مطمئن کرنا چاہا۔ وہ دلفریب انداز سے مسکرائی، بولی۔" یہ کیا فرماتے ہیں جناب پھر کسی وقت آئیں دن کے وقت مگر ایک ہفتے بعد اگلے سات دن بہت ہی مصروف گزریں گے مجھے ایک فلم کی شوٹنگ کے لیے ہرات جانا پڑے گا۔"
" ٹھیک ہے میڈم ہم اگلے ہفتے کسی دن حاضر ہوں گا اب اجازت دیں، بہت دیر ہو گئی۔"
" ہاں! اب آپ جائیں مجھے منان صاحب کو بھی سنبھالنا ہے ان سے تو مجھے بہت سے کام لینے پڑتے ہیں۔"
یہ کہہ کر وہ ہمیں دروازے تک چھوڑنے آئی۔ ناز گل نے ہمیں خدا حافظ کہا اور ہم اس کے مہکتے ہوئے باغ کی روش پر سے گزرتے ہوئے بڑے گیٹ تک جا پہنچے۔
چند قدم آگے چل کر ہمیں ٹیکسی مل گئی اور میں اسی وقت ماجدہ کو اپنے ساتھ لے کر یُو سی ایچ جا پہنچا۔ میرا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ آسیہ مجھ سے اب زیادہ دور نہیں رہ گئی تھی۔ میں کبیر شاہ کا بال بال مقروض تھا جس نے اُس منان جیسے بھیڑیے سے بچا کر میری بہن کو ہسپتال میں داخل کروا دیا تھا۔ وہ کوئی بہت ہی بڑا آدمی ہو گا جس نے منان کی بات کو رد کر کے آسیہ کو ہر بلا سے محفوظ کر دیا تھا۔
میں ماجدہ کو ساتھ لے کر سیدھا استقبالیہ پر جا پہنچا۔ اُن کے رجسٹروں میں تمام مریضوں کے کوائف درج ہوتے ہیں۔ وہاں ایک عیسائی خاتون بیٹھی تھی۔ بڑی ہی مہذب بڑی ہی شیریں گفتار۔ ہمیں سامنے دیکھ کر انگریزی میں بولی۔
" فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟"
" ہمیں ایک مریضہ کے بارے میں معلوم کرنا ہے کہ وہ کس کمرے میں ہے۔ اس کا نام آسیہ ہے۔" میں نے اسی زبان میں کہا۔
" آسیہ؟ صرف آسیہ! میرا مطلب ہے باپ یا کسی اور کا نام شامل نہیں ہے اس کے نام میں؟"
" جی نہیں۔ یا ہو سکتا ہے ہو۔ آپ دیکھ دیں کہ وہ کہاں ہیں۔" میں نے اُس کے سوال کی نوعیت پر پریشان ہو کر کہا۔
وہ رجسٹر دیکھنے لگی۔
" کب داخل ہوئی تھیں وہ؟"
" جی یہی کوئی چار پانچ دن پہلے یا ہو سکتا ہے اس کے بعد ہوئی ہوں۔"
اس نے سارے ہی رجسٹر دیکھ لیے عام اور خاص مریضوں کے سارے ہی نام اس نے پڑھ لیے مگر آسیہ نام کی کسی مریضہ کا اس میں کوئی ذکر نہیں تھا۔

" مجھے افسوس ہے جناب! کہ اس نام کی تو کوئی مریضہ پچھلے دس دن کے دوران یہاں داخل نہیں ہوئی۔"
" نہیں! یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ! ہماری اطلاع غلط نہیں ہو سکتی۔" میں نے بڑی بے صبری سے کہا۔ میں اس کے منہ سے یہ بات سننے کے لیے تو وہاں نہیں پہنچا تھا۔
" میں کیا کہہ سکتی ہوں جناب! ہمارا ریکارڈ تو یہی بتاتا ہے۔"
" کوئی مریضہ ایسی بھی ہے جس کی نگرانی پر پولیس متعین ہو۔" ماجدہ نے بڑی ذہانت کا ثبوت دیا۔ جو بات مجھے بھول رہی تھی وہ اس نے کہہ دی۔
" پولیس! میرا خیال ہے کہ ایسے تو چار مریض یہاں ہیں اور اُن میں ایک عورت بھی شامل ہے۔" یہ کہہ کر وہ خاتون ایک بار پھر رجسٹر دیکھنے لگی۔ چند ہی لمحوں بعد وہ بولی۔" جی اس مریضہ کا نام فاطمہ ہے۔ فاطمہ ولد نامعلوم، یہی لکھا ہے اس میں اور اُس کی نگرانی پر دو سپاہی مامور ہیں۔"
" کس کمرے میں ہے وہ؟"
" وہ زنانہ وارڈ کے کمرہ نمبر پندرہ میں ہے۔" یہ کہہ کر اس خاتون نے رجسٹر بند کر دیا۔
" آپ کا بہت بہت شکریہ خاتون! مگر مجھے ڈر ہے کہ یہ وہ عورت نہیں ہے جس کے لیے ہم آئے ہیں۔ ہمیں پتہ چلا تھا کہ وہ بہت بیمار ہے۔ وہ ہماری ماموں زاد بہن ہے۔"
" دیکھ لیں۔ میں نے تو جو کچھ مجھے معلوم تھا آپ کو بتا دیا ہے۔"
" ٹھیک ہے خاتون! بہت بہت شکریہ!
یہ کہہ کر میں اور ماجدہ وہاں سے ہٹ گئے۔ اب ہم زنانہ وارڈ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ راستے میں ایک ملازم نے ہماری رہنمائی کی اور ہم عیسائی مشنری کے اس خوبصورت ہسپتال کی پُرسکون فضا پر اپنے قدموں کی مدھم چاپ سے کوئی خراش ڈالے بغیر کمرہ نمبر پندرہ تک جا پہنچے۔ استقبالیہ کی خاتون نے ٹھیک کہا تھا دروازے کے سامنے ایک مسلح سپاہی اسٹول پر بیٹھا پہرہ دے رہا تھا۔ بلاشبہ اس کمرے کی مریضہ پولیس کی حراست میں تھی۔ اس وقت بارہ بج رہے تھے۔ سپاہی نے آدھی رات کو یوں ایک خوبصورت جوان اور سجی سنوری عورت کو سامنے دیکھا تو اس کی تمام حسیات بیدار ہو گئیں۔ وہ ماجدہ کو یوں نظریں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا جیسے وہ اُسے نظروں ہی نظروں میں کھا جائے گا۔ اس کی گرسنگی دیدنی تھی۔
" ادھر کیوں بیٹھے ہو جوان! کوئی شیر بند ہے ادھر؟" میں نے اس کے قریب ہو کر کہا۔ وہ میری آواز سن کر ہوش میں آ گیا۔
" شیر نہیں جناب ایک شیرنی بند ہے۔ خاوند کو قتل کر آئی ہے بیمار ہے۔"

"اتنے اونچے ہسپتال میں کیسے رہ رہی ہے؟"

"بڑی امیر عورت ہے جناب! ادھر اپنے خرچ پر پڑی ہے۔"

"کیا نام ہے اس کا؟"

"فاطمہ۔"

"فاطمہ؟ جائیں ماجدہ دیکھیں تو کون ہے یہ۔ ہمیں بھی دراصل ایک قیدی مریضہ کی تلاش ہے اس کا نام عاصمہ ہے۔"

"دیکھ لیں جناب وہ اس وقت سو رہی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے آہستگی سے دروازہ کھول دیا۔ میں بھی ماجدہ کے ساتھ اندر جانے لگا تو اس نے مجھے روک لیا۔

"آپ ادھر ہی رہیں جناب! بس آپ دیکھ لیں ایک نظر بی بی۔" ماجدہ نے دروازے میں رک کر سامنے نظر ڈالی۔ وہاں پلنگ پر ایک ادھیڑ عمر عورت لیٹی تھی، آسیہ کا وہاں نام و نشان بھی نہیں تھا۔ ماجدہ فوراً ہی پلٹی اور بولی۔

"یہ تو کوئی اور ہی ہے، آئیں واپس چلتے ہیں۔" یہ کہہ کر ماجدہ استقبالیہ کی طرف چلدی۔ چند قدم آگے جا کر بولی۔ "بیچاری کو ہتھکڑی ڈال رکھی تھی انہوں نے۔ پتہ نہیں کون بدنصیب ہے۔"

"مگر وہ آسیہ کہاں گئی۔ منان غلط نہیں کہہ سکتا ہے۔ وہ اس وقت آفاق ترنگ میں تھا۔"

"اس سے میں پھر پوچھتی ہوں، دیکھا نہیں ہونٹ سکوڑ کر کیسے عجیب لہجے میں بات کرتی ہے۔"

"وہ تو بہت ہی خوش گفتار لڑکی ہے۔"

"ہاں! آپ تو ایک اور ہی معیار سے لڑکیوں کو دیکھتے ہیں نا جیسے قربانی کے بکرے کو دیکھتے ہیں کہ اس میں کوئی جسمانی عیب تو نہیں ہے۔"

"یہ بھی ٹھیک کہا ہے آپ نے، بہت سمجھدار ہو گئی ہیں آپ۔"

"اب میں کنجاہ میں... نہیں لاہور میں رہتی ہوں، ایک سے ایک پنگا پڑا ہے یہاں۔"

"ادھر کنجاہ میں کون سے حاجی رہتے ہیں پتہ ہے کیا حال ہو رہا تھا وہاں آپ کا۔"

وہ گھور کر مجھے دیکھنے لگی پھر سٹپٹا کر آگے چل دی۔ اب ہم استقبالیہ کی خاتون کے پاس جا پہنچے تھے۔

"دیکھیں بی بی! یہ عورت فاطمہ یہاں کب آئی ہے؟" ماجدہ کا لہجہ بہت ہی روکھا تھا۔

"یہ... یہ تو آج شام ہی ادھر آئی ہے۔" وہ خاتون بولی۔

"تو یوں کہیں نا کیا کوئی عورت یہاں سے آج واپس بھی گئی ہے؟"

"تو یہ پوچھیں نا۔ ٹھہریں میں دیکھ کر بتاتی ہوں۔" اس خاتون نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

ایک بار پھر اس نے رجسٹر کھولا اور بولی۔ "ہاں ایک عورت یہاں سے آج صبح دس بجے گئی ہے مگر وہ کسی کی قیدی نہ تھی۔ اسے ایک آدمی کریم حسن یہاں سے لے گیا ہے۔ وہ اس کا بھائی تھا۔ عورت کا نام فریدہ تھا اور اس کی عمر چوبیس سال لکھی ہے یہاں۔"

"کیا تکلیف تھی اسے؟"

"اس کے گردے کا آپریشن ہو چکا ہے اور وہ آپریشن کے مناسب علاج کے لیے یہاں لائی گئی تھی۔" وہ خاتون بولی۔

"وہ کتنے دن یہاں داخل رہی؟" ماجدہ نے پوچھا۔

"چار دن۔" یہ کہہ کر اس خاتون نے رجسٹر ٹھپ کر کے کر دیا۔

"کوئی پتہ لکھوایا ہے انہوں نے یہاں؟"

خاتون نے پھر بڑی بے زاری سے رجسٹر کھولا کہنے لگی۔ "پتہ اس میں جو درج ہے وہ بھی سن لیں۔ فریدہ خواہر کریم حسن ساکنہ سانده کلاں مکان نمبر ۶ سانده روڈ۔"

"یہاں سے نام خارج کروانے کی کیا وجہ لکھی ہے؟"

"مریضہ کے وارث ہمارے علاج سے مطمئن نہیں ہیں۔" خاتون نے وہ عبارت پڑھی جو وہاں درج تھی۔

"اس کی صحت کی اور بیماری کی حالت کے بارے میں کیا لکھا ہے؟" ماجدہ کسی ماہر وکیل کی طرح جرح کر رہی تھی۔

"چارٹ بھی یہ رکھا ہے۔" اس خاتون نے ہم سے بھرپور تعاون کرتے ہوئے میز کے ایک خانے سے ایک چارٹ نکال کر سامنے رکھ لیا۔

"ڈاکٹر ہربرٹ کی رپورٹ یہ ہے کہ گردے کے آپریشن کا زخم بڑی حد تک مندمل ہو چکا ہے بہرحال مکمل صحت یابی میں ابھی ایک ہفتہ اور لگے گا۔ بس کہ اور کچھ؟"

"جی نہیں! آپ کا بہت بہت شکریہ! ہم نے آپ کی بہت سمع خراشی کی ہے اس کی معافی۔" میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

وہ خاتون کھل کر مسکرائی۔ بولی۔ "آپ کی مسز کو تو وکیل ہونا چاہیے ایسی باتیں آج تک کسی نے نہیں پوچھی تھیں۔"

"اس کی بھی معافی! اچھا خدا حافظ۔" یہ کہہ کر میں ماجدہ کو گھسیٹتا ہوا ہسپتال کی عمارت سے باہر آ گیا۔ اب یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ کوئی کریم حسن تھا جس نے آج آسیہ کو کسی سنگین خطرے کے پیش نظر ہسپتال سے نکال کر کہیں اور پہنچایا تھا۔ وہ اس کا ہمدرد تھا کہ دشمن، اس بات کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا اتنی بات ظاہر تھی کہ وہ ابھی تک یعنی اس دوپہر تک زندہ سلامت تھی اور کسی نے اس کے علاج کے لیے شہر کے سب سے مہنگے اور پُرآسائش ہسپتال میں رکھ کر اس پر بہت سا روپیہ خرچ کر دیا تھا۔ اس ہسپتال میں مریض کے اخراجات کا مجھے اچھی طرح اندازہ تھا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ کیا وہ پتہ درست تھا جو ہسپتال کے رجسٹر میں درج کروایا گیا تھا۔ یہ بہت اہم سوال تھا۔ میں نے جب ماجدہ سے اس بارے میں سوال کیا تو وہ بولی۔ "ہو سکتا ہے یہ پتہ درست ہو۔ سانده جانے میں کیا حرج ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ وہ آسیہ ہی تھی، اس کا نام غلط لکھوایا گیا ہے۔"

"آپ ٹھیک کہتی ہیں چلیں اس ٹیکسی میں بیٹھیں۔ ہم ابھی اُدھر چلتے ہیں۔" میں نے ماجدہ کو سامنے کھڑی ایک ٹیکسی میں دھکیل دیا۔

ہم دونوں ایک بار پھر چھلنی لے کر ہوا کو پکڑنے کے لیے دوڑ اٹھے تھے۔ کوئی بیس منٹ بعد ہم سانده جا پہنچے۔ وہ مکان سانده روڈ پر ہی ہونا چاہیے تھا۔ رات بہت گہری ڈوب چکی تھی۔ چاروں طرف سناٹا طاری تھا۔ ٹریفک بھی معدوم ہو چکی تھی آبادی کے لوگ گہری نیند میں کھو چکے تھے۔ اور ہمارے لیے یہ معلوم کرنا بہت دشوار تھا کہ وہ چھ نمبر مکان کہاں ہے۔ بتانے والا کوئی نظر ہی نہیں آتا تھا۔ پھر بھی ہم ٹامک ٹوئیے مارتے آگے بڑھتے چلے گئے۔ ٹیکسی کو ہم نے فارغ نہیں کیا۔ آخر ایک چوکیدار نے ہمیں اس مکان تک پہنچایا۔ وہ لب سڑک ہی بنا تھا۔ دو منزلہ مکان تھا وہ۔ اس کے سامنے پہنچ کر ہم ٹیکسی سے اتر گئے۔ مکان کی ساری بتیاں بجھی ہوئی تھیں میری بے تابی حد سے بڑھ گئی تھی۔ میں نے جاتے ہی دروازہ پیٹ ڈالا۔

کوئی پانچ منٹ بعد ایک آدمی کمرے سے باہر نکلا اور وہیں سے بولا۔ "کیہڑا اے بھئی؟ کیوں بوہا توڑ رہے او بھاجی؟" یہ کہہ کر اس نے دروازہ کھول دیا۔ وہ سردی سے بچنے کے لیے کمبل اوڑھ آیا تھا۔ "کیہہ گل اے بھاجی! خیر اے نا کتے گولی تے نئیں چل گئی؟ اگ تے نئیں لگ گئی؟" وہ بہت جھلایا ہوا تھا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے پہلوان! مکان نمبر چھ یہی ہے نا؟"

"ہاں جی چھ نمبر مکان تے ایہو ای اے۔"

"بات یہ ہے پہلوان کہ ہمیں کریم حسن سے ملنا ہے۔"

"اوئے بیڑہ غرق۔ اوس سپاہیے نوں تے ایتھوں گئیاں اک ورا ہو گیا اے بھاجی! اوس نے تے سانوں چھ مہینیاں دا کرایہ وی نئیں دتا سی۔ اپرلی منزل پیو دی سمجھ کے بیٹھا رہیا اوتھے۔ پر ہویا کیہہ اے جے اوہ قید ہو گیا اے تے مینوں دسو۔ کجھ مینوں وی خوشی ہو جائے گی۔"

وہ بہت ہی ستم ظریف آدمی تھا اور کھلے دل سے بات کرتا تھا۔ کریم حسن کے خلاف اس کے دل میں جتنا بھی غبار تھا، وہ اس نے ایک ہی سانس میں نکال لیا۔ وہ خالص لاہوری لہجے میں بات کر رہا تھا۔

"ہمیں تو کسی نے اس کا یہی پتہ بتایا تھا بھائی جی، اگر اس کا اور ٹھکانہ ہو تو ہمیں بتائیں۔" میں نے اس کی منت کی۔

"مجھ کو کچھ پتہ نئیں ہے بھاجی! کسے نے مجھ کو دسیا سی کہ اوہ ڈس مس ہو گیا ہے۔ پر ڈس مس نال تے اوہدا کجھ نہیں بنتا۔ اس کو تو قید ہونا چاہی دا ہے اوس چوہڑے کے پتر کو۔" اب وہ گلابی اردو بولنے لگا تھا۔

"اچھا وہ نوکری پر نہیں ہے کسی اس کے عزیز وغیرہ کا پتہ ہو تو وہی ہمیں بتا دیں۔"

"نئیں سر جی! مینوں کجھ پتہ نہیں۔ جے تسیں اس کو پکڑ لو تاں مجھ کو بھی بتا دینا۔ ایک سال کا کرایہ لینا ہے اس کولوں مجھ کو پورے باراں سو روپے۔"

"اچھا میاں جی! خدا حافظ۔" میں نے اس کوڑھ مغز کی باتوں سے زچ ہو کر کہا۔ وہ کوئی بھی بات ہمیں بتا نہیں رہا تھا۔ اپنی جگہ وہ سچا بھی تھا۔ ہو سکتا ہے کریم حسن سپاہی نے اپنے بارے میں اسے کچھ بھی نہ بتایا ہو تا کہ کوئی اس کا پیچھا ہی نہ کر سکے۔

ہم دوبارہ ٹیکسی میں جا بیٹھے۔

"چل یار ہمیں ادھر راج گڑھ لے چل۔" میں نے ڈرائیور سے کہا۔

"ایک بات تو ثابت ہو گئی ہے ماجدہ کہ کریم حسن کسی جعلی آدمی کا نام نہیں ہے اور آسیہ کو ہسپتال سے وہی لایا ہے۔"

"ہاں! اب یہ معلوم کریں صبح اٹھ کر کہ وہ کبیر شاہ کون ہے۔ کس تھانے کا ایس ایچ او ہے وہ؟"

"یہ تو بڑی آسان بات ہو گی، ہم ابھی معلوم کر سکتے ہیں۔"

"ہاں چلو! اُدھر کسی ہوٹل میں رک کر فون پر پتہ کر لیتے ہیں۔"

"ہمیں اُدھر بھاٹی گیٹ لے چل یار۔" میں نے ٹیکسی کا رخ موڑ دیا۔ وہ بھلا آدمی اُدھر کو چل دیا اور ہم کچھ ہی دیر بعد بھاٹی دروازے کے ہوٹل میں جا گھسے۔

ماجدہ نے کھڑے کھڑے چائے کے دو پیالے منگوا لیے۔ اتنے میں میں نے ایکسچینج سے نمبر لے کر راوی روڈ کے تھانے میں فون کر دیا۔ میرا اندازہ یہی تھا کہ بخاری کلینک میں اسی تھانے کا کوئی آدمی گیا ہو گا۔

"ہیلو! دیکھیں جناب مجھے ایس ایچ او کبیر شاہ صاحب سے بات کرنی ہے۔"

"او جی شاہ صاحب تو ایک مہینے کی چھٹی پر چلے گئے۔ ان کے دادا فوت ہو گئے ہیں۔"

"کب گئے ہیں وہ چھٹی پر؟"

"وہ آج شام کو چھٹی لے کر گاؤں چلے گئے تھے۔ اُنہیں ٹیلیفون پر ساہیوال سے اطلاع ملی تھی۔" کوئی ہیڈ کانسٹیبل بول رہا تھا، بڑے ہی مہذب اور مؤدب لہجے میں۔ یہ بات اُنکی تربیت کا حصّہ تھی۔ اس کی بات سُن کر مجھے خوشی ہوئی کہ وہ اچھے خوشگوار انداز میں بول رہا تھا۔

"آپ بتا سکیں گے جناب کہ اُن کے گاؤں کا پتہ کیا ہے میں بھی اُن کے دادا کے جنازے میں شامل ہونا چاہتا ہوں۔"

"کیوں نہیں جناب! اُن کے گاؤں کا نام ترن تارن ہے وہ سکھوں والا مشہور ترن تارن نہیں جو امرتسر کے پاس ہے کہیں آپ بارڈر ہی کراس نہ کر جائیں۔ یہ مسلمانوں کا ترن تارن ہے۔ ساہیوال سے جو بسیں جاتی ہیں وہ اس گاؤں کے قریب سے گزرتی ہیں۔"

"آپ کی بڑی مہربانی ہے جناب! بہت بہت شکریہ۔"

ماجدہ نے چائے کا کپ میرے آگے کاؤنٹر پر رکھ دیا تھا وہ میں نے حلق سے نیچے اُنڈیلا اور پھر ماجدہ کو ساری بات بتا کر ٹیکسی میں بیٹھ کر اسی وقت راج گڑھ جا پہنچا۔ ایک دن اور... اندھیروں میں ڈوب کر ناکامی کا ایک اور چرکا میرے دل پر لگا گیا۔ جب ہم بوجھل بوجھل قدموں سے چلتے ہوئے دروازے پر پہنچے تو مجھے یوں معلوم ہوا جیسے میری کمر جھک گئی ہے اور میں اپنی زندگی کے چند اور سال اس ایک دن کی جھولی میں ڈال آیا ہوں میں شاید وقت سے بہت پہلے بوڑھا ہو رہا تھا۔ وقت میرے ساتھ بڑی ہی ظالمانہ آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ پھر بھی مجھے اطمینان تھا کہ اب کی بار آسیہ کسی بہت ہی محفوظ ہاتھ میں ہے۔ میں سمجھ رہا تھا کہ کبیر شاہ نے اتنی لمبی چھٹی کیوں لی ہے۔ وہ کسی اَن جانی وجہ سے آسیہ کو تحفظ دے رہا تھا، اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ یوں اتنے پُراسرار طریقے سے اُسے ہسپتال سے نہ اُٹھواتا۔ اس نے کسی خاص مقصد کے تحت ہی وہ سب کچھ کیا تھا مگر وہ مقصد کیا تھا، یہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

ماجدہ نے میری وہ کیفیت بھانپ لی تھی بولی۔ "پریشان کیوں ہو رہے ہو، وہ ہر خطرے سے محفوظ ہو گئی ہے میرا دل کہتا ہے کہ وہ جہاں بھی ہے بالکل ٹھیک ٹھاک ہو گی۔"

"مگر وہ اسے کیوں اٹھائے پھرتا ہے بھلا اسے کیا مطلب ہے اس بدنصیب سے؟" میں نے بلکتے ہوئے کہا۔

"کیا کرتے ہیں جیلانی! آپ سے مجھے یہ اُمید نہیں تھی۔ کیوں ہمّت ہارتے ہیں، چلیں اندر، یہ آنسو پونچھ دیں۔ آپ بھی کمال کرتے ہیں، اب تو اس کا واضح سُراغ مل گیا ہے ہم کل ہی کبیر شاہ کے گاؤں جا پہنچیں گے۔" یہ کہہ کر اس نے دروازہ کھٹکھٹایا کنڈی سلونی نے کھولی وہ لوگ واپس آ چکے تھے۔

"تم لوگ کب واپس آئے ہو؟" ماجدہ نے پوچھا۔

"ہم بس تھوڑی دیر پہلے واپس آئے ہیں۔"

میں سلونی کی بات سُنی اَن سنی کر کے سیدھا عرشی کے کمرے میں جا گھسا۔ آبی اس وقت کرسی پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا، مجھے دیکھ کر بولا۔ "یار بڑی دیر لگا دی تم نے، کہاں گئے تھے؟"

"میں آسیہ ہی کی تلاش میں گیا تھا۔ تم کہو اُس بدنصیب پر مٹی ڈال آئے؟"

"ہاں یار، میں نے اس کا آخری دیدار بھی کر لیا ہے۔ وہ بہت عظیم عورت تھی جیلانی! اس نے بہت ظلم سہا ہے۔"

"وہ چیٹ کپڑے والے بھی وہاں پہنچے ہوں گے۔"

"ہاں! کئی تھے مگر وہ ہمیں تو نہیں جانتے تھے۔ تمھاری تلاش میں وہ البتّہ سب طرف دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔"

"اسی لیے میرا وہاں جانا درست نہیں تھا ورنہ میں ضرور جاتا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اس کی آخری منزل بھی نہ دیکھ سکا۔"

"وہ بیرٹ بھی بہت پریشان تھا۔ بڑا ہی ہمدرد آدمی ہے وہ بیچارے نے اپنی بیٹی ایسا سلوک کیا ہے ریٹا سے۔" آبی یہ کہہ کر پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ عرشی اس وقت شاید باورچی خانے میں تھی وہ مجھے کہیں نظر نہیں آئی۔

"تم کہو کچھ پتہ چلا آسیہ کا؟"

"ہاں بہت کچھ معلوم ہوا ہے۔" یہ کہہ کر میں نے سارے واقعات آبی کو بتا دیے۔ اس کے چہرے کا رنگ تانبے ایسا ہوتا چلا گیا جب میں خاموش ہوا تو وہ قہر آلود نگاہوں سے گرد و پیش کو زخمی چیتے کی طرح دیکھتے ہوئے بولا۔

"اپنے ہتھیار سنبھال لے جیلانی! مجھے حیرت ہے تو واپس کس طرح آ گیا۔ تمہیں اس گاڈی کو پکڑنا چاہیے تھا۔"

"اس کا پتہ تو میں صبح ہی معلوم کر سکتا تھا۔ اس کا انجام تو ایک دنیا کو دیکھنا چاہیے آبی! میں اسے کسی بل میں بند کر کے نہیں ماروں گا۔"

"اس سے تو ابھی اور اسی وقت ہمارا پیچ ہو گا جیلانی!"

"یار، تو زخمی ہے میں تجھے ساتھ نہیں لے جا سکتا۔"

"جیلانی! مجھے ماں کے دُودھ کی قسم ہے۔ میں اس گاڈی کو زمین پر اُتار کر ہی سر تکیے پر رکھوں گا۔ میں تو قبرستان سے چپ چاپ واپس آ گیا تھا کہ ریٹا کے اصل مجرم کا مجھے پتہ ہی نہیں مگر اب نہیں۔" یہ کہہ کر اس نے بوٹ پہن لیے پستول اس نے قمیص کے نیچے باندھا اور کمبل اوڑھ کر وہ مجھے دھکیلتا ہوا صحن میں لے گیا۔ مغز میرا بھی اُلٹ چکا تھا۔ جب سے میں نے منّان کی باتیں سُنی تھیں میرا دل لہو رو رہا تھا۔ میں نے بھی قسم کھائی تھی کہ میں ریٹا

کے دشمنوں کو معاف نہیں کروں گا۔ منّان کو البتّہ میں نے فہرست میں سب سے نیچے جگہ دی تھی کیونکہ اس ظلم کا اصل ذمّے دار وہی تھا۔ اور میں اُسے بدترین سزا دینا چاہتا تھا۔ یہ وہی تھا جس نے ذرا سا سُراغ ملنے پر ان دونوں کو بخاری کلینک سے اٹھوا کر کسی ایسی جگہ پہنچا دیا تھا کہ ان کے بارے پولیس کے چار یا پانچ آدمیوں کے سوا کسی کو کچھ علم نہیں تھا۔ وہ اُسے اپنی انا اور وقار کا مسئلہ بنا کر حد سے تجاوز کر گئے تھے۔ اُن کے پیشِ نظر قانون کے تقاضے نہیں تھے بلکہ وہ تو انتقامی کارروائی پر اُتر آئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے میرے بارے میں ریٹا سے مکمل معلومات حاصل کرنے کے لیے اُسے بدترین مراحل سے گزار دیا تھا۔ اور یہ منّان ہی تھا جس نے میرے تُوچن تُوچن سوئی چبھو دی تھی۔ اور اب میں اندھا ہوا پھرتا تھا۔ مجھے کچھ بھی نہیں سوجھ رہا تھا۔ ہم سڑک پر نکلے تو آبی بولا۔

"تم نے سٹین گن ساتھ نہیں رکھی؟"

"نہیں، میں نے کمبل اوڑھنا چھوڑ دیا ہے موسم بدلتا جا رہا ہے۔"

"تم بھول گئے ہو اپنا کمبل تو تم نے ریٹا پر ڈال دیا تھا مجھے بھی یہ کمبل اوپرا ہی نظر آتا ہے مگر خیر یہ ابھی کام دے گا۔"

"تمہیں پتہ ہے وہ گاڈی کہاں رہتا ہے؟" میں نے آبی کے قریب ہو کر پوچھا۔

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کا زخم اب بھی اُسے درد کا احساس دلاتا تھا۔ وہ پُوری طرح مندمل نہیں ہوا تھا۔ اور وہ لنگڑا رہا تھا، بولا۔ "وہ اُدھر کمہار پورہ میں رہتا ہے مگر اڈہ اس کا اُدھر منشی لدّھے کے باغ کے پیچھے ہے کوئی ٹیکسی پکڑ۔"

میں نے چند قدم آگے جا کر ایک ٹیکسی روکی مگر ابھی ہم اس میں بیٹھے بھی نہیں تھے کہ اس نے ٹیکسی آگے بڑھا دی اور پھر وہ اُسے دوڑاتا ہوا آگے نکل گیا۔ آبی نے اُسے یہ موٹی سی گالی دی بولا۔

"اس بدمعاش کمینے کو کیا نظر آیا ہے کیوں بھاگ گیا ہے یہ؟"

"تیرے حلیے اور تیرے کمبل سے ڈر گیا ہے یہ۔"

"ہم شکل سے چور نظر آتے ہیں کیا؟ اس نے سمجھا کیا ہے ہمیں؟"

آبی نے اُسے ایک اور گالی لڑھکا دی۔

"یہ بات نہیں ہے آبی۔ رات بھی تو دیکھ کتنی گزر چکی ہے ایک بج رہا ہے، پولیس نے گشت شروع کر دی ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے، اپنے پاس ایک کار ضرور ہونی چاہیے جیلانی ہمیں بڑی مشکل پیش آتی ہے۔"

"اس مستری بھجے کی کار ہم نے تباہ نہ کی ہوتی تو اس سے عرفان کی مرسیڈیز لے لیتے مگر اب وہ بھی نہیں ہو سکتا۔"

"ہاں یار! اس کو بھی بڑی مہنگی کار دے آئے ہیں ہم۔"

"کسی دن چلیں گے اس کے پاس! اس وقت جو مسئلہ ہے اس کا کوئی حل سوچ۔"

"دیکھ وہ ایک رکشہ آ رہا ہے اُسے روک۔" اس نے دائیں ہاتھ دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ رکشہ میرے اشارے پر رُکا اور ہم اس میں دھنس کر بیٹھ گئے۔

"چل یار ہمیں تُو اُدھر راوی روڈ کی طرف لے چل مگر دیکھ بڑی سڑک چھوڑ کر چل اندر اندر سے۔" آبی نے اسے راستے کے بارے میں بتایا۔ وہ کچھ گھبرا سا گیا۔

ہمیں اس نے بڑے غور سے دیکھا۔ اور بولا۔ "ٹھیک ہے بھا جی! ویسے خیر ہے نا! کوئی پولیس شولیس کا معاملہ تو نہیں ہے؟"

"بات کچھ ایسی ہی ہے پیارے! ذرا بچ بچا کر چل۔ تیرے لیے اور ہمارے لیے یہی بہتر ہے۔" میں نے بڑے بھاری بھرکم لہجے میں کہا۔ اس نے رکشہ راج گڑھ کے اندرونی حصے کی طرف بڑھایا اور بڑے ہی اعتماد سے وہ مختلف گلیوں میں سے ہوتا ہوا دیو سماج روڈ پر جا پہنچا۔ وہاں سے اس نے پھر ایک موڑ کاٹا اور گھوڑا ہسپتال کے پیچھے سے گزرتا ہوا وہ بلال گنج جا پہنچا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم باغ منشی لدّھا جا پہنچے۔ ڈرائیور کو ہم نے بیس روپے تھما دیے وہ خوش ہو گیا، بولا۔ "تھینک یو صاب جی! ذرا بچ بچا کر چلیں اِدھر وہ بہت تیز چلتے ہیں۔"

"تو فکر ہی نہ کر پیارے ہمیں راستہ معلوم ہے۔" یہ کہہ کر آبی میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر آگے چل دیا۔

وہ گلی بالکل سنسان تھی مگر ابھی ہم چند قدم ہی چلے تھے کہ ہمیں اپنے اِرد گرد قدموں کی چاپ سُنائی دینے لگی۔ دو آدمی پہلو کی گلی سے تیز تیز چلتے ہمارے قریب سے گزر گئے۔ وہ دس قدم چلے تھے کہ ایک نے دائیں ہاتھ رُک کر ہلکی سی سیٹی بجا دی۔ وہ سیٹی بہت ہی پُراسرار تھی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے آبی؟"

"یہ پاکٹ مار ہیں بدمعاش، ہمیں شکار سمجھ رہے ہیں۔"

سیٹی پھر بجی اور اس کے ساتھ ہی دو آدمی اور گلی میں آ پہنچے۔ وہ وہیں کسی اوٹ میں چھپے بیٹھے تھے۔ اُن کے ہاتھوں میں سگریٹ تھے جن کی بدبو ہی کہتی تھی کہ وہ چرس سے بھرے سگریٹ ہیں۔ اب وہ چار تھے۔ ہم اُن کے پاس سے گزرنے لگے تو اُن میں سے ایک بولا۔ "پرندہ زخمی لگتا ہے مجھے۔"

"ہاں لنگڑا کر چلتا ہے۔" دوسرے نے پوچھا۔ "کدھر جانا ہے باؤ جی!"

ہم اُن کے سامنے جا کر رُک گئے۔ اُن چاروں کے تیور بہت ہی بگڑے ہوئے تھے۔ ایک نے سگریٹ کا دھواں میرے منہ پر پھینکا، بولا۔ "یہ دیکھتے ہو باؤ جی! یہ ..." اس نے ایک

چمکتا ہوا کمانی دار چاقو کھول کر میری آنکھوں کے سامنے لہرا دیا۔ اُن میں سے دو ایک دم سرک کر ہمارے دائیں بائیں آ ٹھہرے، انہوں نے بھی چاقو ہماری پسلیوں سے لگا دیے تھے۔

"باؤ جی کو صاف کرنے جاکھی بہت میلے ہو رہے ہیں۔"

"فکر ہی نہ کرو پاپے جی۔" یہ کہہ کر سامنے کھڑے آدمی نے سگریٹ کا ایک کش لگا کر دھواں میرے منہ پر مارا۔ جاکھی اس کے پہلو میں کھڑا تھا۔ اس نے ایک دم بائیں ہاتھ سے میری ٹائی پکڑ کر اپنا دایاں میری جیب میں ڈال دیا۔

"یارو! یہ سودا مہنگا پڑے گا تمہیں۔" آبی نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"مہنگائی واقعی بہت ہو گئی ہے باؤ جی!" جاکھی کے ساتھ کھڑے آدمی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ جونہی جاکھی نے میری ٹائی پکڑی میں نے اس کی بائیں کلائی پر ہاتھ ڈال کر ذرا سا جھٹکا دیا اور پوری قوت سے اس کی کلائی دبا دی میرے انگوٹھے کا دباؤ اس کی ہڈی پر کچھ ایسا آناً فاناً بڑھا کہ اس کی کلائی تڑاخ سے ٹوٹ گئی۔

"اوہ تیرے بدمعاش کی ایسی تیسی۔۔۔" درد سے پاگل ہو کر اس نے مجھے گالی دی، میں نے اس کو ساتھ کھڑے پاپے کی طرف دھکیل کر دائیں ہاتھ کھڑے اُن کے ساتھی کی گردن پکڑ کر اسے کچھ اتنی تیزی سے گھمایا کہ جب اُس کی رگِ احساس دبی تو اس وقت تک وہ زمین پر گر چکا تھا اور اس کا چاقو دور جا پڑا تھا۔ اس عرصے میں آبی نے چوتھے آدمی کا چاقو والا ہاتھ پکڑ کر اسے دہرا کر دیا تھا۔ چند ہی لمحوں میں وہ مروڑا آبی نے کچھ اتنا بڑھایا کہ اس آدمی کا بازو شانے سے نکل گیا اور دھڑام سے زمین پر اوندھے منہ جا گرا۔

"اوئے پاپے میرا باجو ٹوٹ گیا، اوئے میں مر گیا پاپے"۔ جاکھی زمین پر پڑا کراہ رہا تھا۔ پاپا حیران پریشان ہو کر پیچھے ہٹ گیا تھا۔ چاقو اس نے کچھ اس طرح پکڑ لیا تھا کہ جیسے وہ ہم سے اپنے ساتھیوں کی اس ذلت کا انتقام لینے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دے گا۔ اس کی وہ بھینسے ایسی موٹی گردن بڑی ہی مضحکہ خیز نظر آتی تھی۔

"کیا خیال ہے اُستاد! قریب نہیں آؤ گے ہمارے؟" میں نے اپنا چپ شاہ بجلی کے جھپاکے کی طرح جیب سے نکال کر اس کے سامنے کر دیا۔ پاپا لرز کر دو قدم اور پیچھے ہٹا اور دبے لہجے میں غرا کر بولا "ہمت ہے تو یہ پستول چھوڑ کر آ...... میں تیرا خون پی لوں گا۔"

اس کی بات سنتے ہی میں نے اپنا چپ شاہ جیب میں رکھا اور آبی کے کندھے سے کمبل جھپٹ کر میں نے اس کا پلہ پوری قوت سے پاپے کے منہ پر مارا۔ وہ گھبرا کر دائیں ہاتھ سرکا تو میں نے کمبل دونوں ہاتھوں میں پھیلا کر اس کے اوپر ڈال دیا۔ وہ پاگل ہو کر میری طرف بڑھا یوں کہ اس نے اپنے چاقو کی باریک نوک سے کمبل چیر کر اپنا ہاتھ اس سوراخ میں سے گزار لیا تھا مگر اس کا منہ سر کمبل میں چھپا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کا ہاتھ کس طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے اس کی کلائی کو شکرے ایسی تیزی سے پکڑ کر مروڑ دیا۔ چاقو اس کے ہاتھ سے گرا، میں نے اس کی کلائی کو شیر شاہی جھٹکا جو دیا تو وہ بھی تڑاخ سے ٹوٹ گئی۔ ایک دبی گھٹی بھیانک چیخ اس کے منہ سے نکلی اور وہ وہیں دوزانو ہو گیا۔ اس نے کمبل اپنے منہ پر سے نوچ کر الگ پھینکا اور بائیں ہاتھ سے کلائی کو پکڑ کر اس نے دونوں رانوں میں دبا لیا۔ وہ خاصے کسرتی بدن کا آدمی تھا وہ پاپا، مگر بیچارا نہیں جانتا تھا کہ اس کی بھی کلائی ٹوٹ سکتی ہے۔ وہ شاید اس کی زندگی کا سب سے بڑا صدمہ تھا جو اسے پہنچا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں ہو گی کہ وہ باؤ جن کو وہ صاف کرنے نکلے تھے، یوں پلٹ کر ان کی دھلائی کر دیں گے۔ حیرت مجھے یہ تھی کہ انہوں نے وہاں کوئی واویلا نہیں مچایا تھا۔ اُن کے منہ سے چیخیں بھی دبی گھٹی ہی نکل رہی تھیں۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ وہ ایک آباد محلے کے چوک میں کھڑے تھے۔ اُن کے شور شرابے سے سب لوگ جاگ سکتے تھے اور یہی وہ مصیبت تھی جس سے وہ بچنا چاہتے تھے۔ کوئی اور قدرے ویران جگہ ہوتی تو شاید وہ بے چارے کھل کر روتے بلند آواز سے آہ و زاری کرتے، مگر وہ ایسی جگہ کھڑے تھے جہاں وہ آہ و فریاد بھی نہ کر سکتے تھے۔ اور اُن کے صیاد کی یہ مرضی تھی کہ وہ بے چارے گھٹ کے مر جائیں۔

"مجھے افسوس ہے پاپے! ہاتھ کچھ زیادہ ہی سخت پڑ گیا۔" اُس نے پھر اپنی بکواس شروع کر دی۔ وہ ابھی تک ہوش میں تھا۔ جاکھی بھی درد سے بلبلا رہا تھا مگر اس میں اب ہمیں گالی دینے کی ہمت نہیں رہی تھی۔ دوسرے دو آدمی اوندھے منہ پڑے تھے۔ ایک کو میں نے بے ہوش کر دیا تھا اور دوسرے کو آبی نے۔

"اچھی بوہنی کرائی ہے ان کمینوں نے! چل یار ہمیں بہت دیر ہو گئی ہے۔" آبی نے بدمزہ ہو کر کہا۔

جاکھی ہمیں پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ بڑے ہی مضحکہ خیز لہجے میں بولا "بھاجی کچھ علاج کے لیے دیتے جاؤ۔ میں تو گیا تین مہینے کے لیے۔ بڑا خرچہ اُٹھے گا باجو پر بھاجی! کچھ ترس کھاؤ۔"

"اوئے ترس کی ایسی تیسی! مذاق کرتا ہے... ہم سے! کیا دیتے جائیں تجھے؟"

"بھاجی! بہت مندہ رہے گا ادھر۔ ہمارے تین آدمی پھڑکا دیے آپ نے۔"

"بک نئیں اوئے جاکھی۔ جاؤ اوئے دفع ہو جاؤ یہاں سے، میں پھر نبڑوں گا تم سے۔" پاپے نے جاکھی کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"ہاں جب تیرے چپ "ٹھیک ہو جائیں تو پھر آ جانا پاپے ویسے مجھے بہت ترس آتا ہے تم پر، یہ لو دو سو روپے رکھ لو۔ کچھ ہلدی پھٹکری کا خرچہ نکل آئے گا۔" یہ کہہ کر میں نے سو سو کے دو نوٹ دوہرے کر کے پاپے کے منہ پہ دے مارے۔ وہ بھنا کر رہ گیا۔

آبی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور پاپے کے قریب پڑا کمبل اٹھا کر آہستہ آہستہ وہ میرے ساتھ چل دیا۔

"یہ جمپر نگ کون تھے یار! یہ بٹ مار؟" میں نے آبی سے پوچھا۔

"یہ بھی ادھر پائے جاتے ہیں۔ یہ نئی فصل ہے اور پک چکی ہے۔ ان کا دھندا ہی یہی ہے۔"

"یہ بھی گاڈی کے چیلے چانٹے ہوں گے۔"

"نہیں! میرا خیال ہے کہ وہ اتنا رذیل نہیں ہو سکتا ہے مگر ایسوں سے کچھ بھی بعید نہیں۔" آبی نے بڑے ہی خیال انگیز لہجے میں کہا۔

کوئی آدھ فرلانگ آگے جا کر آبی ایک عمارت کے سامنے رک گیا۔ اس کا پرانی حویلیوں ایسا اونچا دروازہ خاصا بھاری بھرکم تھا۔ اس دروازے میں ایک کھڑکی لگی تھی۔ آبی نے اس کھڑکی پر دستک دی مگر دوسری طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔ آبی نے ایک بار پھر دستک دی۔ اب کی ایک نیند میں اٹی ہوئی آواز ابھری "کون ہے؟"

"دروازہ کھول بھئی! ہم بہرام پورے سے آئے ہیں۔"

"بہرام پور؟ ادھر سے تم دھنیے کا تیل لائے ہو، یہ کوئی وقت ہے آنے کا؟ کیا نام ہے تمہارا؟" اس آدمی نے نہایت ہی بیزار لہجے میں پوچھا۔ وہ ابھی تک اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوا تھا۔

"اوئے دروازہ کھول! کیا بک بک لگا رکھی ہے تم نے ہمیں گاڈی سے ملنا ہے۔"

آبی کا دبنگ لہجہ اسے متاثر کر گیا۔ دوسری طرف کوئی چارپائی چرچرائی اور پھر کچھ ہی دیر بعد کسی نے دروازہ کھول دیا۔ وہ کوئی بڑا ہی دیوہیکل آدمی تھا۔ نیند اس کی آنکھوں سے اُبلی پڑتی تھی۔ وہ بنیان پہنے ہوئے تھا اور تہمد کی گرہ کس رہا تھا۔ اس نے ہمیں غور سے دیکھا اور بولا "آؤ اندر آ جاؤ۔ کیا مصیبت پڑ گئی ہے اس وکھت۔ گاڈی پہلوان سے ملنے کا اچھا 'ٹیم' دیکھا ہے تم نے۔"

"تیری کیوں پسلی میں درد ہے پہلوان! تو میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے بالکل بھی۔" آبی نے مجھے اپنے آگے اس کھڑکی میں سے گزارتے ہوئے کہا۔ سامنے ایک وسیع ڈیوڑھی تھی جس کی ایک دیوار کے ساتھ اس آدمی نے اپنی چارپائی ڈال رکھی تھی۔ لحاف اس کا کھلا پڑا تھا۔ ہم اس کے ساتھ اندر پہنچے تو وہ ہمیں گہری گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"یہ بہرام پور کہاں ہے جس کا تم نام لے رہے تھے؟"

"تمہیں پتہ تو ہے وہاں کا دھنیے کا تیل بہت مشہور ہے تم ہی بیچتے ہو نا تم!" آبی نے بڑی بے تکلفی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ وہ پہلوان بھی مسکرا دیا۔

"مسخری نہ کرو جوان! یہ بتاؤ تم ہو کون اور گاڈی پہلوان سے اس وقت کیوں ملنا چاہتے ہو؟"

"یہ اڈہ اسی کا ہے نا!" میں نے آبی کو چارپائی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ آبی بڑی بے فکری سے وہاں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

"ہاں تمہیں شک ہے کوئی؟"

"ہم یہ اڈہ اس کے وجود سے پاک کرنے آئے ہیں پہلوان! اس بدمعاش سے کہہ دو کہ اس کے دو جوائی آئے ہیں۔" میں نے بہت ہی تپے ہوئے لہجے میں کہا۔

"منہ سنبھال کر بول باؤ! تو جانتا نہیں کہ گاڈی کون ہے۔"

"میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں، بھلا اس بدمعاش کے بچے کو، کیا نام ہے تیرا؟" میں نے پھر اسی جارحانہ لہجے میں کہا۔ وہ پہلوان حیرت زدہ سا ہو کر ہمیں یوں دیکھنے لگا جیسے اسے اپنی سماعت پر اعتبار نہ آ رہا ہو۔

"میرا نام جتل ہے باؤ جی! اور میں آدمی کو پرزے پرزے کر دیا کرتا ہوں۔ سمجھے ہو نا! اٹھو اس منجی سے اٹھو۔" وہ غراتا ہوا ہماری طرف بڑھا اور چارپائی کو الٹنے کے لیے نیچے جھکا۔ میں نے فوراً ہی اس کی وہ سنڈھی بانسے ایسی موٹی کلائی دائیں ہاتھ میں پکڑ کر اسے پیچھے کی طرف جھٹکا جو دیا تو وہ منہ کے بل چارپائی کی پٹی پر آ لگا۔ اور اس کے وہ بھاری بھرکم گھٹنے زمین پر ٹک گئے۔

"ادب سے بات کر ڈنگر دین! جل اسے بتا دے کہ اس کے دو جوائی آئے ہیں۔ سن رہا ہے تو کہ نہیں؟"

وہ کچھ سٹپٹا سا گیا۔ اس کی کلائی میں نے چھوڑ دی تھی۔ اپنی... بڑی بڑی سرخ آنکھیں پٹ پٹا کر وہ ہمیں یوں گھورنے لگا جیسے وہ ہمیں تول رہا ہو۔

"حد ہو گئی بھئی، حد ہو گئی۔ ذات کی چھپکلی اور شہتیروں سے جپھے۔ میرا خیال ہے کہ تمھاری موت تمہیں ادھر لے آئی ہے۔ اوئے ٹونکی، اوئے دمی ادھر آؤ ذرا، دیکھ تو یہ کون ہیں۔" یہ کہتا ہوا وہ صحن میں جا ٹھہرا۔ عمارت اس صحن کے ارد گرد بنی تھی اور دو منزلہ تھی میرا اندازہ ہے کہ وہاں اوپر نیچے چھ چھ کمرے تو ضرور ہی ہوں گے۔

جتّل کی آواز کے ساتھ ہی سامنے کا ایک دروازہ کھلا اور اس میں سے دو آدمی تیزی سے باہر نکلے۔ اس کمرے میں پہلے سے بتی جل رہی تھی اور معلوم یہ ہوتا تھا کہ وہ لوگ ابھی جاگ ہی رہے تھے۔ وہ دونوں پتلونیں پہنے ہوئے تھے اور اُن کی سفید براق قمیصوں کے گریبان کھلے تھے۔

"کیا بات ہے پہلوان! کیوں چیخ رہے ہو؟"

"اوئے ادھر تو آکر دیکھو۔ یہ نئے تیس مار خان آئے ہیں ـــ اڈے پر دعویٰ جتلا رہے ہیں۔"

"تو دے دو اِن کو ایک اڈہ لکڑی کا۔ اڈہ مانگتے ہیں نا!" ایک آدمی نے وہیں سے پکار کر کہا۔ دونوں ڈیوڑھی میں پہنچے تو ہم اس وقت بھی جتّل کی چارپائی پر بیٹھے تھے۔ ہمارے چہروں کا جائزہ لے کر اُن میں سے ایک بولا۔

"کیا بات ہے بھئی! پہلوان کو کیوں ستا رہے ہو؟ کس سے ملنا ہے تمہیں؟"

"ہمیں گاڈی لوہار سے ملنا ہے۔"

"اُستاد تو اس وقت سویا ہوا ہے تمہیں صبح آنا چاہیے تھا۔"

"کیا نام ہے تمہارا میرے یار! تیری آواز بڑی کراری ہے۔"

"میرا نام دھمی ہے اور میرے اس یار کا نام ٹونکی ہے ـــ تم کہیں کلاونت تو نہیں ہو؟ آوازوں کی بڑی پہچان ہے تمہیں۔" اُس نے بڑے تیز لہجے میں کہا۔

"ہمیں گاڈی سے ابھی اور اسی وقت ملنا ہے اُستاد! اس کو بتا دو کہ ہم آئے ہیں۔" میں نے اُن کے سامنے تن کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا میرے دونوں ہاتھ پتلون کی جیبوں میں تھے۔ میری یہ بات سن کر وہ تینوں مسکرائے۔ بڑا طنز تھا ان کی مسکراہٹ میں۔

"ایسا کیا کام ہے باؤجی! گاڈی پہلوان اس وقت کسی سے ملنے کا روادار نہیں ہوتا۔ وہ تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکے گا۔"

یہ بات دھمی نے کچھ ایسے لہجے میں کہی کہ مجھے طیش آگیا۔ میں نے کھڑے ہاتھ کی ایک زوردار ضرب اُس کی گردن پر لگائی۔ وہ اُلٹ کر دھڑام سے زمین پر جا گرا۔ جتّل کے لیے شاید یہ سب کچھ بالکل ہی غیر متوقع تھا، وہ پاگلوں کی طرح آگے بڑھ کر مجھ سے گتھ گیا۔ کوشش اس کی یہ تھی کہ وہ ... میری کمر دونوں ہاتھوں میں لے کر میری پسلیاں اتنی دبا دے کہ میرا دم گھٹ جائے مگر میرے دونوں ہاتھ آزاد تھے۔ میں نے پوری قوت سے اس کی گردن دونوں ہاتھوں میں لے کر اس کی رگ مسل دی اور وہ رگ دبتے ہی اس کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔

دھمی ابھی تک نہیں سنبھل سکا تھا۔ وہ زمین پر پڑا گردن مل رہا تھا۔ ٹونکی آگے نہیں بڑھا۔ جونہی جتّل نیچے گرا وہ ٹونکی تیزی سے صحن کی طرف بھاگا اور سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ ھٹپ ھٹپ کر سیڑھیوں پر پڑتے اس کے تیز تیز قدم اس کے خوف کا ڈھنڈورا پیٹ رہے تھے۔

"بیٹھ جا یار! تو بہت تھک گیا ہوگا۔ اس بیل کا بستر تو کتنی بدبو ہے اس میں۔" آبی نے جتّل پہلوان کے لحاف کو زمین پر پھینکتے ہوئے کہا۔ وہ لحاف جتّل کے منہ پر جا کر گرا۔ دھمی ابھی تک زمین پر پڑا تھا اور اُس سے گردن ہلائی نہیں جاتی تھی۔ اُس کے بدن کے سارے اعصاب جیسے کر رہ گئے تھے۔ ضرب جو اسے لگی وہ بالکل ہی غیر متوقع اور بے حد سخت تھی۔ کوئی اور ہوتا تو شاید اُس کا منکا ہی ٹوٹ جاتا مگر وہ اُسے سہار گیا تھا۔

کوئی دس منٹ بعد صحن میں دو بتیاں جل اٹھیں وہ خاصے بڑے بلب تھے جو انہوں نے جلا دیئے تھے۔ صحن روشنی سے لبالب بھر گیا۔ اس حویلی کی دوسری منزل میں ہلچل سی مچ گئی تھی۔ ہم ابھی تک جتّل کے بستر پر بیٹھے تھے۔ نظریں ہماری سیڑھیوں کی طرف ہی تھیں۔

چند ہی لمحوں بعد سیڑھیوں میں بہت سے قدموں کی چاپ سنائی دی اور پھر سیڑھیوں کا دروازہ کسی جوان کے وجود سے لبالب بھر گیا۔ وہاں ایک ساڑھے چھ فٹ اونچا جوان کھڑا تھا۔ اس کا رنگ گندمی تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی، مونچھیں پہلوانوں ایسی۔ چوڑے چکلے شانے۔ وہ بوسکی کا کرتہ، سفید شلوار اور کھسّا پہنے ہوئے تھا۔ بڑے تحکم آمیز انداز سے سیڑھیاں اُترا اور بڑے کرّوفر سے چلتا ہوا صحن عبور کر کے ڈیوڑھی میں داخل ہوا۔ چار آدمی اس کے پیچھے تھے۔ اُن میں ٹونکی بھی شامل تھا۔ اور مجھے یقین تھا کہ وہ سب کے سب مسلح ہیں۔ ٹونکی نے تو پستول سیدھے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔

"اوئے آبی پہلوان تو؟ تو کیسے آیا ہے میرے یار! یہ کیا تماشا دکھایا ہے تم نے؟" یہ کہہ کر گاڈی پہلوان نے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔ اس کی آواز میں بلا کا تحکم تھا۔

"میں تم سے مصافحے کے لیے نہیں آیا ہوں گاڈی پہلوان! ہمیں وہ آدمی دے دو جن کے لیے ہم یہاں آئے ہیں۔" آبی نے بڑے طنطنے سے کہا۔

"کیسے آدمی! یہ کیا کہہ رہے ہو؟ کون سے آدمی؟"

"وہ آدمی جنہوں نے ریٹا کی عزت لوٹ کر اسے جان سے مار دیا۔ اس سے کم پر بات نہ ہوگی۔ ہمیں وہ آدمی دے دو۔" یہ کہہ کر آبی پلنگ سے اُتر گیا جس پر وہ بوٹوں سمیت چڑھ بیٹھا تھا۔ میں بھی اس کے پہلو میں تن کر کھڑا ہو گیا۔

گاڈی کا چہرہ ایک دم بدلنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی

چمک ابھر آئی۔

"تمہارا کیا تعلق تھا اس لڑکی سے؟"

"تعلق تھا ہی تو آیا ہوں اور اسے دیکھ لو۔ تم نے اس کا نام سنا ہوگا یہ جیلانی ہے غلام جیلانی۔"

"اُف میرے خدا!" گاڈی یوں بدک کر پیچھے ہٹا جیسے اس نے کوئی خوفناک اژدھا دیکھ لیا ہو مگر یہ کیفیت اس کے چہرے پر صرف ایک لمحے کے لیے اُبھری اور پھر اس نے فوراً ہی خود پر قابو پا لیا۔ ٹونکی کے ہاتھ سے پستول جھپٹ کر بولا۔ "مجھے بتاؤ آبی! اس گشتی سے تمہارا کیا تعلق تھا؟"

"اُسے گالی مت دے گاڈی! ورنہ وقت سے پہلے تمہارا وقت ختم ہو سکتا ہے۔" میں نے اپنا چپ شاہ بجلی ایسی سرعت سے نکال کر گاڈی کے دائیں ہاتھ پر گولی چلا دی۔ وہ بے آواز بے زبان گولی اس کی درمیانی انگلی پر لگی اور پستول اس کے ہاتھ سے نیچے گر گیا۔ میں نے دوسرے لمحے اس پستول پر پاؤں رکھ کر چپ شاہ کی نالی گاڈی کے پہلو سے لگا دی۔

"بتا دے میرے ویر! کہ وہ شہدے کون تھے؟ ابھی میں تم کو بولنے کا موقع دے رہا ہوں گاڈی پہلوان! پھر یہ موقع بھی نہیں رہے گا۔" وہ اپنا زخمی ہاتھ دوسرے ہاتھ میں پکڑ کر درد کو برداشت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آبی نے بھی اس قیامت خیز لمحے میں اپنا پستول دوسرے تین آدمیوں پر تان لیا تھا۔ انہوں نے اپنے چاقو نکال لیے تھے مگر اب وہ بے بس نظر آتے تھے۔

"تم بتاؤ ٹونکی وہ کون تھے؟" آبی نے بائیں ہاتھ سے ٹونکی کے لمبے لمبے بال پکڑ کر اسے گھسیٹتے ہوئے کہا۔

"وہ... وہ میں بتاتا ہوں بھاجی! ایک تو اُستاد تھا ـــ وہ لڑکی ایک دن اس کے پاس رہی اور پھر رات کو وہ لڑکی ان کے پاس تھی اُسے گلا گھونٹ کر اس نے مارا تھا۔" اس نے اپنے پیچھے کھڑے تین ساتھیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"کیا نام ہیں اِن کے؟"

"اس کا نام غوث ہے بھاجی! اُس نے ہی اسے مارا تھا۔ یہ زیلدار ہے اور یہ ہے کرونڈا۔ یہ پولیس کا ٹاؤٹ بھی ہے۔"

"وہ لڑکی ان کے ہاتھ کیسے آئی تھی؟"

"وہ جی منان صاحب ہیں نا! انہوں نے خود ریٹا کو اُستاد کے حوالے کیا تھا۔" ٹونکی نے لرزتے ہوئے کہا۔ اس کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔

"وہ خود اسے لے کر یہاں آیا تھا؟"

"جی ہاں! وہ صبح چار بجے اسے لے کر ادھر آیا تھا۔ اس کے ساتھ دو سپاہی بھی تھے۔"

"اُن کے کیا نام تھے؟" آبی نے اُسے ایک جھٹکا اور دیا۔

"جی بھاجی! اُن کا مجھے پتہ نہیں ہے۔"

"ہوں! تو سب سے پہلا نمبر گاڈی پہلوان کا ہے، اس شہدے کا۔" میں نے غرّاتے ہوئے کہا اور پھر میں نے غیر محسوس طریقے سے اپنی جیب میں سے نکال کر کمانی دار چاقو کھول لیا۔ کڑک ایسی آواز پیدا ہوئی تو گاڈی بدکا۔

"کھڑا رہ ـــ ذرا ہلا تو میرا ہاتھ اُلٹ جائے گا۔" یہ کہہ کر میں نے تیزی سے چاقو کی نوک اس کے نیفے میں ڈال کر اس کا ازار بند کاٹ دیا۔ گاڈی فوراً ہی نیچے بیٹھنے لگا تو میں نے چاقو کی نوک اس کی بغل میں دھنسا دی۔ اس کے منہ سے بھیانک چیخ نکلی اور وہ فوراً ہی سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس کے زخمی ہاتھ سے ابھی تک خون بہہ رہا تھا۔ شاید اُس کی کوئی رگ کٹ گئی تھی۔ آبی نے ابھی تک اُن چاروں کو پستول کی زد میں لے رکھا تھا۔ گاڈی کے حوصلے جواب دے چکے تھے۔

میں نے چاقو کی نوک بغل میں سے نکال کر اس کے ریشمی کرتے پر اس طرح چلائی کہ گلے سے لے کر دامن کے آخری تسمے تک اس کا کرتہ کٹ کر دائیں بائیں جھول گیا۔ گاڈی کی بغل سے بھی اب خون رسنے لگا تھا۔ اندھے بھینسے کی طرح ایک دم مجھ سے ٹکرا کر صحن کی طرف بھاگا مگر... مگر وقت نے اُسے مہلت نہیں دی میرے چپ شاہ کے لبوں تلے دبی ہوئی گولی اُس کی پیٹھ میں جا دھنسی۔ وہ جان ہار گولی اپنی ساری توانائیاں صرف کر کے گاڈی کو منہ کے بل گرا گئی۔ آبی نے ابھی تک اُن چاروں کو اپنی زد میں لے رکھا تھا اور ٹونکی کے بال اس کی مٹھی میں جکڑے ہوئے تھے۔

میں نے آگے بڑھ کر گاڈی کو بالوں سے پکڑا اور جھٹکا دے کر اوپر اُٹھا دیا مگر اب اُس سے کھڑا نہیں ہوا جاتا تھا۔ گولی اپنا کام کر گئی تھی ـــ وہ اس کے پھیپھڑوں میں جا رکی تھی۔ اور گاڈی کا سانس اکھڑنے لگا تھا۔ میں نے اسے چھوڑ دیا، وہ دھڑام سے زمین پر چت گرا۔ اس کی آنکھیں ابھی تک میرے چہرے پر جمی تھیں۔ ان میں ایسی نفرت تھی کہ میں اور زیادہ برداشت کی سکت ہی نہیں رکھتا تھا۔ میں نے تاک کر دو گولیاں چلائیں اور پھر تیسری گولی اس کے دل میں اُتار دی۔ اُس کی آنکھیں آپ ہی آپ مندنے لگیں ـــ وہ پلٹ کر اوندھا ہو چکا تھا۔

اُس کے منہ پر تھوک کر میں پہلے ایسی تیزی سے پیچھے مڑا۔ اور ٹونکی کو جا پکڑا۔

"ہوں! ریٹا کا گلا کس نے گھونٹا تھا ٹونکی بیٹے۔" میں نے اس کا گریبان پکڑ کر اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"اِس نے بھاجی! اس غوث نے۔" وہ بلبلایا۔

"یہ جھوٹ بولتا ہے جناب! میرا کوئی قصور نہیں ہے ـــ یہ کرونڈا اور یہ دیقا اس کو ساری رات خراب کرتے رہے۔ اس کرونڈے نے ہی اگلی صبح اس کو تین بجے ادھر ہسپتال کے سامنے والی سڑک پر پھینکا تھا

میں بے گناہ ہوں بھاجی!" غوث نے تلملاتے ہوئے کہا۔ وہ دیوار کے ساتھ جا لگا تھا اور ہاتھ اس نے اپنے کسی اندرونی خوف سے عاجز آ کر اوپر اُٹھا لیے تھے۔

"تمھارا کیا خیال ہے کرونڈے! یہ سچ کہہ رہا ہے غوث؟"

وہ کچھ نہیں بولا۔ میری بات سنتے ہی وہ لرزنے لگا تھا۔

"منّان کو کس نے بتایا تھا کہ ریٹا مر چکی ہے؟" میں نے ٹونکی سے پھر پوچھا۔

"اُسے وہاں پھینک کر یہ غوث ہی منّان کے پاس گیا تھا بھاجی! اس نے خود مجھے بتایا تھا۔" ٹونکی فر فر بول رہا تھا۔ آبی نے اسے بچوڑ کر رکھ دیا تھا۔

"چل اوئے کرونڈے! چل اُدھر غوث کے پاس کھڑا ہو جا۔ تو بھی چل دیلقے۔ شراب بھی پی ہو گی تم نے اُس روز، کیوں دیلقے؟"

"جی باؤجی! یہ غوث ہی لایا تھا دو بوتلیں۔"

"اور اُس کے جسم پر جلتے سگریٹ کس نے لگائے تھے؟"

دیلقا منمنایا۔ "وہ تو باؤجی منّان ہی نے لگائے تھے ہمیں کچھ پتہ نہیں ہے باؤجی۔"

"خدا کے لیے ہمیں معاف کر دیں باؤجی!" یہ کرونڈے کی آواز تھی۔

اب وہ تینوں دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے تھے۔ ان کی وہ مکروہ صورتیں دیکھ کر میرے دل میں غیظ و غضب کی آگ بھڑکتی جا رہی تھی۔ میں نے سب سے پہلی گولی غوث کی کنپٹی پر ماری۔ وہ جڑ سے کٹے درخت کی طرح گرا تو دوسرے دونوں گھگھیانے لگے۔ میرا دماغ الٹنے لگا تھا۔ میں اُن کے پرخچے اُڑا دینا چاہتا تھا مگر دھمی عین اس گھڑی فرش سے اُٹھ کر صحن کی طرف بھاگا۔ آبی نے ٹونکی کو چھوڑ کر دھمی کی ٹانگوں میں ٹانگ اڑا دی۔ وہ منہ کے بل کچھ اس طرح گرا کہ اس کی ناک سے خون بہنے لگا۔ اس ذرا سی مہلت سے فائدہ اُٹھا کر دیلقا اور کرونڈا ڈیوڑھی سے نکل کر دروازے کی طرف بھاگے مگر میں نے انہیں مہلت نہیں دی۔ پہلی گولی میں نے کرونڈے کی گدّی میں ماری اور . . . . .

دوسری دیلقے کی کمر میں۔ اُن پر مجھے قطعاً رحم نہیں آتا تھا۔ وہ اس سے بھی زیادہ خوفناک موت کے مستحق تھے۔ میں انہیں کسی بھی طرح معاف نہیں کر سکتا تھا۔ وہ میری زندگی کے بھی چند بہت ہی المناک لمحات تھے۔ میں اُن کی زندگیوں سے کھیل گیا تھا مگر میں اپنے بس میں نہیں تھا۔ ریٹا مجھے ہر طرف سے نرغے میں لیے ہوئے تھی میرے پستول کی لبلبی پر اُسی کی وہ حنائی انگلی تھی جس میں مَیں نے ایک انگوٹھی پہنائی تھی اور وہ انگلی کبھی میرے بالوں میں بھی پھر چکی تھی۔ دھمی اور حنجل دونوں فرش پر گرے تھے، اور اُن کے چار ساتھی زندگی کی سرحد سے باہر جا چکے تھے۔ وہ ایسی ہی سزا کے مستحق تھے۔ میں انہیں کیسے بخش دیتا۔ میری نس نس میں زہر بھر گیا تھا۔ میں اُن پر ہاتھ نہ اُٹھاتا تو کیا کرتا۔ میں اپنے آپ میں تو اس وقت ہرگز نہیں تھا۔ میں نے دھمی کو ناکارہ کرنے کے لیے اُس کی بھی رگِ احساس کچل دی۔ میں نہیں

چاہتا تھا کہ ہم باہر نکلیں تو وہ شور مچا کر کوئی ہنگامہ کھڑا کر دے۔

میرے چپّ شاہ نے کوئی شور مچائے بغیر میری خدمت کی تھی اور اب وہ پھر میری جیب میں آ لیٹا تھا۔ آبی نے پلنگ پر سے اٹھا کر کمبل اوڑھا اور بولا۔ "چل اب جلدی نکل چل یہاں سے تیرا یہ چپّ شاہ تو ان کے لیے تریاق ثابت ہوا ہے، چل جلدی نکل۔" یہ کہہ کر اس نے حویلی کے اس اونچے دروازے کی کھڑکی کھولی اور مجھے اپنے ساتھ لے کر وہ اپنے مندمل زخم کا درد سہتا ہوا گلی میں جا نکلا۔ باہر چاروں اور سناٹا طاری تھا۔ ہم جان بوجھ کر اُدھر کو نہیں نکلے جدھر ہم پر وہ پاکٹ مار جڑھ دوڑے تھے۔

کچھ ہی دیر بعد ہم سنسان گلیوں میں سے گزرتے ہوئے اس علاقے سے نکل کر بلال گنج جا پہنچے۔ ہم گشتی پولیس سے ہر حال میں بچنا چاہتے تھے۔ یہی ہمارے لیے بہتر تھا۔ اس وقت ہم کسی نئے چکر میں نہیں پڑنا چاہتے تھے۔ ہم گھوڑا ہسپتال کے عقب سے ہوتے ہوئے سنت نگر کی گلیوں میں داخل ہو گئے۔ کسی سواری کا رات کے اُس سناٹوں سے لبریز پہر میں مل جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ آبی ایک نیم تاریک گلی میں سے گزرتے ہوئے بولا۔ "دامن میں کوئی چھینٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ

تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو"

وہ مجھے کسی اُستاد کا شعر سنا رہا تھا۔ طبیعت اُس کی اس گھڑی مجھے بہت ہی رواں معلوم ہوتی تھی۔

"کیا مطلب ہے تمھارا مائی ڈیئر آبی صاحب؟"

"دیکھو نا کون تمہیں دیکھ کر کہہ سکتا ہے کہ تم چار آدمیوں کو قتل کر آئے ہو۔ لگتا ہے تم کسی دفتر سے اُٹھ کر آئے ہو ابھی ابھی قلم ہاتھ سے رکھ کر۔"

"لعنت بھیج دفتر پر اور قلم پر۔ وہ ہمارے بس کی بات نہیں ہے پیارے! تو کوئی سگریٹ نکال۔ یہ بڑے ثواب کی بات ہو گی اس وقت!"

"بہت سوہنا جوان تھا یار وہ گاڈی، پر وہ ایسی ہی سزا کا مستحق تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ تیرا ہاتھ ایسے موقعوں پر بالکل نہیں لرزتا۔" یہ کہہ کر اس نے مجھے سگریٹ پیش کیا۔ اُس کے گہرے گہرے کش لے کر مجھے کچھ فرحت محسوس ہوئی۔

"آبی! میرا ہاتھ تو نہیں لرزا، پر... پر میرا دل لرزنے لگا ہے یار! کیا یہ سب کچھ بہت ضروری تھا؟"

"ہاں! ورنہ اور خدا معلوم کون کون اُن کے بستروں پر ذلیل ہو کر موت کی گود میں جا گرتیں۔" آبی نے بڑے فلسفیانہ انداز سے کہا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو یار! مگر... وہ چاروں کے چاروں جوان آدمی تھے۔ ایک نہتی بے بس عورت کو اس حد تک ذلیل کرتے ہوئے انہیں قطعاً یہ احساس نہ ہوا تھا کہ وہ بھی خدا رکھتی ہے، وہ خدا جو انتقام لے سکتا ہے۔"

"جب ایسی حسین عورت سامنے ہو اور بوتل کا کاگ اُڑ چکا ہو تو پھر کسے ہوش رہتا ہے میرے یار!"

اب ہم سنت نگر میں سے گزر کر کرشن نگر کے چوک میں پہنچ چکے تھے۔ ہمیں اب اُس آبادی کے بیچ میں سے ہو کر راج گڑھ پہنچنا تھا۔ کرشن نگر کا بازار ہمارے سامنے تھا۔ ہم نے کوئی بیس قدم آگے بڑھ کر بائیں ہاتھ مڑنا چاہا تو کسی نے کڑکتی آواز میں ہمیں للکارا۔ "ٹھیرو!"

وہ کوئی سپاہی تھا جو اس علاقے میں گشت کرتا پھر رہا تھا۔ وہ اچانک ہی کسی اوٹ سے نکل کر ہمارے سر پر آ پہنچا تھا۔ ہم دونوں نے مڑ کر اُدھر دیکھا تو وہ ہم سے کوئی چار ہاتھ دور رائفل کا رُخ ہماری طرف کیے کھڑا تھا۔

"کیا بات ہے سنتری بادشاہ، خیر تو ہے! کیسی نوکری ہے تمھاری۔ رات کو بھی چین نہیں ہے تمہیں۔" آبی نے دو قدم اس کی طرف بڑھ کر کہا۔

"جی ہاں ڈیوٹی تو ایسی ہی ہے ہماری۔ آپ کہاں سے آ رہے ہیں اس وقت؟"

"ہم داتا دربار سے آ رہے ہیں جناب! آج جمعرات ہے نا! ہم ہر جمعرات وہاں جاتے ہیں اور تہجد پڑھ کر واپس آتے ہیں۔" آبی نے بڑے ہی صاف ستھرے لہجے میں کہا۔

"کہاں رہتے ہیں آپ؟"

"ہم اُدھر ریواز گارڈن میں رہتے ہیں دو سو تین نمبر کوٹھی میں۔ مگر آپ کیوں پوچھ رہے ہیں، خیر تو ہے!"

"اس وقت؟ یعنی اس وقت آپ داتا دربار سے آ رہے ہیں۔ آپ ذرا ہمارے انچارج صاحب سے مل لیں، چلیں۔ یہ ہمارا فرض ہے جناب۔"

"کچھ ہوش کی دوا لیں سنتری بادشاہ! لینے کے دینے نہ پڑ جائیں کہیں۔ پتہ ہے یہ کون ہیں؟ خاقان احمد مجسٹریٹ ہیں۔" آبی نے بڑے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ سنتری نے بڑے غور سے مجھے دیکھا اور پھر یوں مسکرایا جیسے کہہ رہا ہو کہ یہ غچّہ کسی اور کو دینا میاں! ایسے ریبٹے میں بہت کھیل چکا ہوں اپنے گاؤں میں، بولا۔

"یہ تو اور بھی اچھا ہے جناب! ان کو معلوم تو ہونا چاہیے کہ پولیس کتنی چوکس رہتی ہے رات دن۔"

مجھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ یا تو وہ سپاہی خاقان احمد کو جانتا ہے اور میرا پول اُس کے سامنے کھل چکا ہے یا پھر وہ ہماری بات پر اعتبار نہیں کرتا۔ اُس نے آبی کو اب تک راہ نہیں دی تھی حالانکہ وہ بڑے ہی میٹھے لہجے میں بات کر رہا تھا۔

"میرا خیال ہے سنتری بادشاہ! ہمیں دیر ہو رہی ہے ہمیں جانے ہی دو تو اچھا ہے ویسے ہم تمھاری فرض شناسی پر بہت خوش ہوئے ہیں۔" میں نے اور زیادہ نرم لہجے میں کہا۔

"اوئے بند کر یہ مکھّن بازی! بڑا آیا خاقان احمد مجسٹریٹ کا بھتیجا۔ میں انہیں جانتا ہوں بچّو! چلو آگے لگ جاؤ۔" وہ اور زیادہ برہم ہو رہا تھا۔ وہ ابھی ہم سے تین قدم دور تھا اور رائفل اُس نے ہم پر یوں تان رکھی تھی جیسے وہ ہمیں بھون کر رکھ دے گا۔

"یار اس مکھّی کو ہٹا۔ خواہ مخواہ وقت خراب کر رہا ہے یہ!" میں نے آبی سے دبے لہجے میں کہا۔

"سن بھائی سنتری! ہمیں جانے دے، یہ لے اپنا چائے پانی کا خرچ اور موج کر۔" یہ کہہ کر آبی نے سو کا ایک نوٹ اس سنتری کی طرف بڑھایا، اور سرک کر اُس کے بالکل قریب جا پہنچا، اب وہ سنتری کی رائفل کی زد میں نہیں تھا۔

"اوئے مجھے رشوت دیتے ہو تم! پتہ نہیں کیسی واردات کر کے آئے ہو، میں تو نہیں چھوڑوں گا تمہیں خواہ دس ہزار بھی میرے آگے رکھ دو۔" اسکی بات سنتے ہی آبی نے پوری قوت سے کھڑے ہاتھ کی ضرب اُس کی گدّی پر لگائی اور ایک جھٹکا دے کر اُس نے سپاہی سے رائفل چھین کر دیوار کے اوپر سے ملحقہ مکان کے اندر پھینک دی سپاہی منہ کے بل گرا تو ہم دونوں نے وہاں سے دوڑ لگا دی اور مختلف گلیوں سے ہوتے ہوئے راج گڑھ جا پہنچے۔

آبی کی ٹانگ کا درد اسے بے چین کر رہا تھا اس لیے خطرے کی زد سے نکل کر اور بڑی سڑک پر پہنچتے ہی ہم نے اپنی رفتار کم کر دی۔ اب فکر کی کوئی بات نہیں تھی۔ مگر جب ہم اپنے ٹھکانے پر پہنچے تو اچانک مجھے محسوس ہوا کہ کوئی آدمی ہمارا پیچھا کر رہا ہے، یونہی ایک موہوم سا احساس میرے دل میں جاگا۔ آبی اُس وقت دروازہ کھٹکھٹا چکا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ دبا کر سرگوشی کے لہجے میں کہا۔

"آبی! کوئی ہمارا تعاقب کر رہا ہے پیچھے!" میں نے دو مکان دور ایک شیشم کے پیڑ کے نیچے سایہ سا آتا دیکھتے ہوئے کہا۔

آبی بھی میری نظروں کا تعاقب کر رہا تھا۔ درخت کے نیچے سایہ گھنا تھا مگر آبی کی نگاہ تو دل و جود کو چیر جاتی تھی، بولا۔ "تو ٹھیک کہتا ہے یار! کوئی آدمی تو ہے۔ اس تنے کے پیچھے کھڑا ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے مجھے اپنے ساتھ گھسیٹا اور ہم بلاخیز رفتار سے اُس درخت کی طرف بڑھے مگر جب ہم وہاں پہنچے تو تنے کی اوٹ میں کچھ بھی نہیں تھا۔ اوپر دھورے بھی ہم نے دیکھ لیا مگر ہمیں کچھ بھی نظر نہیں آیا۔

"یہ کیا بات ہوئی؟ اسے دیکھ یار! کوئی گشتی کا بچّہ ضرور ہمارے پیچھے لگا تھا۔" آبی نے بھنا کر کہا۔

"کہاں دیکھوں بھئی! یہ چکرات، میری سمجھ میں نہیں آتے۔ کوئی چھلاوہ ہو گا۔"

"ابے یہ چکرات! ہمیں نئی فکرات میں ڈال دیں گے اور کوئی چپکے سے ہماری گردنات کاٹ ڈالے گا۔" آبی نے میرا قافیہ تنگ کرتے ہوئے کہا۔

"چل دفع کر۔ ہو گا کوئی سؤر کے پسرات میں سے لعنت بھیج۔"

یہ کہہ کر میں پیچھے مڑا تو اچانک آبی درخت کی ٹہنیوں کا جائزہ لینے لگا۔ اس کی شاخیں کوٹھی کی دیوار کے اندر تک پھیلی تھیں۔

"اوئے دیکھ اُدھر۔ وہ اپنا چپّ شاہ اِدھر لا۔" آبی نے اپنی آواز

دباتے ہوئے کہا۔

تیزی سے پیچھے مُڑ کر میں نے ابھی اپنا پستول نکالا ہی تھا کہ وہ آدمی جو درخت کی ٹہنیوں میں چھپا بیٹھا تھا ہمارے ارادے کو سمجھ کر تیزی سے کوٹھی کے صحن میں کُود گیا۔ وہ کسی بندر کی اولاد معلوم ہوتا تھا۔۔۔ درخت کی ٹہنیاں تو ہلیں مگر وہ۔۔۔ بے آواز کُود گیا۔ آبی ٹھیک کہتا تھا وہ شخص خدا معلوم کہاں سے ہمارے تعاقب میں چلا آ رہا تھا۔ اور یہ بڑی ہی خطرناک بات تھی۔ آبی نے بڑی ہی بے بسی سے میری طرف دیکھا۔ بولا۔

"یار! یہ ہڈی کباب میں کہاں سے آگئی۔ اس نے ہمارا ٹھکانا بھی دیکھ لیا ہے۔"

"اب کیا ہو سکتا ہے؟"

"پاگل ہے تو۔" یہ کہہ کر آبی پھدک کر اس دیوار پر جا چڑھا جس کی دُوسری طرف وہ آدمی کود گیا تھا۔ میں نے بھی آبی کی پیروی کی اور درخت کے تنے پر پاؤں جما کر اس کی شاخوں میں جا دھنسا۔ اب میں سرکتا ہُوا درخت کی موٹی شاخ کے ذریعے اس جگہ جا پہنچا تھا جہاں سے وہ آدمی نیچے کُودا تھا۔ عین اس وقت کسی بہت ہی شہ زور قسم کے کُتّے کے بھونکنے کی آواز سُنائی دی۔ وہ کتا اس کوٹھی کے دائیں حصے میں تھا اور یُوں لگتا تھا کہ وہ کسی کے پیچھے تیزی سے بھاگ رہا ہے۔ عین اُس وقت ٹُز کی آواز اُبھری اور اُس کے ساتھ ہی کتے کی ہولناک چیخ گرد و پیش میں تھرتھری سی پیدا کرنے لگی۔ اس آدمی نے کتے کو گولی مار کر اپنی جان چھڑا لی تھی۔

گولی کی آواز کے ساتھ ہی کوٹھی کے اندر کی بتّیاں جل اُٹھیں۔ اس کے مکین جاگ گئے تھے۔ یہ بہت ہی خطرناک مرحلہ تھا۔ آبی نے فوراً ہی پیچھے چھلانگ لگائی۔ اور میں بھی تیزی سے درخت کی شاخوں سے لپٹا ہوا سڑک پر اُتر آیا۔ اور پھر دیوار کی اوٹ میں بھاگتے ہوئے ہم ڈاکٹر فرخندہ کی کوٹھی کی طرف لپکے۔

"میرا خیال ہے وہ کوئی وارداتیا تھا۔" آبی نے آسودگی بھرے لہجے میں کہا۔ میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

دروازہ ابھی تک کھلا تھا اور ہمارے سامنے ماجدہ کھڑی تھی۔ اُس نے ہاتھ میں ٹارچ سنبھال رکھی تھی۔

اُسے پیچھے دھکیل کر ہم دونوں دروازے میں گھُسے۔ ماجدہ نے ہمارے تیور دیکھ کر کوئی بات نہیں پوچھی۔ دروازہ اپنے پیچھے مقفل کر کے وہ پلٹی تو میں نے اس کے کندھے تھپتھپا دیے۔ "آپ ابھی تک جاگ رہی تھیں؟"

"مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ دستک سُن کر باہر نکلی، دروازہ کھولا، مگر آپ نظر ہی نہیں آ رہے تھے۔"

"ہم سمجھے کہ کوئی بُڑھوا ہمارے پیچھے لگا ہے مگر وہ جوانا مرگ بھاگ ہی گیا۔" آبی نے خالص زنانہ لہجے میں بات کو لٹکا کر کہا۔

"ہائے میں مر گئی! کسی نے چھیڑا تو نہیں تمہیں میری مر۔۔۔ جا۔۔۔ نہ" میں نے آبی کی نقل اتارتے ہوئے کہا۔

"چل اوئے زیادہ مسخری نہ کر۔ میں ذرا عابد کی ماں سے مل لوں" یہ کہہ کر وہ سامنے کے کمرے میں جا گھُسا۔

ماجدہ استفہامی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی جیسے پوچھ رہی ہو کہ تم کہاں سو ؤ گے جیلانی!

میں اُس سے کچھ کہے بغیر اس کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس نے اندر آ کر دروازے پر چٹخنی چڑھائی تو وہ کسی گہری سوچ میں گم تھی۔

"کہاں سے آ رہے ہیں آپ؟"

"ایک بہت ضروری کام تھا ہمیں، وہ بھگتا کر آ رہے ہیں۔"

"آپ بہت افراتفری میں نکلے تھے یہاں سے میرا دل جب سے اب تک ٹھکانے پر نہیں آیا۔"

"یہ گھر گھر ستنوں والا لہجہ اختیار نہ کریں میرے سامنے۔ اس میں بڑھاپے تھکن اور جھلاہٹ کی بُو آتی ہے۔" میں نے بوٹ اتار کر پلنگ پر لیٹتے ہوئے کہا۔

"آپ کب تک یوں مارے مارے پھرتے رہیں گے جیلانی صاحب"

"میں کیا کہوں ماجدہ! میری تقدیر کے راستے ہی اتنے ٹیڑھے میڑھے ہیں کہ میں سیدھی راہ پکڑ ہی نہیں سکتا۔"

"نہیں! میری مانیں تو یہ راستہ چھوڑ دیں۔ یہ آپ کو کہیں نہیں لے جائے گا۔"

"آبیہ کو بھول جاؤں! اُسے میں ان کتّوں کے منہ میں رہنے دوں جو اس کی بوٹی بوٹی نوچ لیں گے۔"

"یہ تو میں نہیں کہتی! مگر۔۔۔ مگر یہ بھی تو دیکھیں کہ اب تک آپ کچھ بھی حاصل نہیں کر سکے۔"

"اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ میری کوشش مؤثر نہیں تھی۔ مگر اسے ناکامی تو نہیں کہا جا سکتا۔" وہ مجھ سے پرے ہٹ کر کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ پلنگ اس کمرے میں ایک ہی تھا۔

"میں آپ کے لیے بہت فکرمند ہوں جیلانی صاحب! میں یہ نہیں کہتی کہ مجھے آپ سے بہت محبت ہے نہیں! میرے لیے یہ جذبہ آپ کے دل میں بھی نہیں ہے پھر میرا خیال ہے کہ میں ہر قدم پر آپ کا بھلا چاہتی ہوں۔"

"میں آپ کا شکرگزار ہوں مگر مجھے اس نصیحت کی ضرورت نہیں ہے مجھے نیند آ رہی ہے۔" یہ کہہ کر میں نے اس کا لحاف اوڑھ لیا۔ اس میں ماجدہ کی خوشبو بسی تھی۔ اس خوشبو نے میرے ذہن میں کئی یادیں تازہ کر دیں۔ ماجدہ مجھ سے زیادہ دُور نہیں بیٹھی تھی مگر پھر بھی میرے اور اس کے درمیان عجیب سی اجنبیت در آئی تھی۔ میرے ذہن پر گاڈی اور اس کے ساتھیوں کی آڑی ترچھی لاشیں عجیب سی دہشت طاری کر رہی تھیں۔ میں چاہتا تھا کہ اس رات کے سارے واقعات بھول کر سو جاؤں مگر نیند مجھ سے کوسوں دُور تھی۔

میرے ہاتھ بہت سے لوگوں کے خون سے رنگ چکے تھے اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا یا رو کہ میں اتنے خون کے دریا کو کس پیمانے سے ناپ سکوں گا۔ اس کا کفارہ میں کس طرح ادا کر سکوں گا۔ عجیب سی ضیق کی کیفیت مجھ پر طاری ہوتی جا رہی تھی۔ لحاف منہ پر ڈالے میں آنکھیں موند کر اپنی سوچوں میں گم ہوتا جا رہا تھا کہ ماجدہ کے ہاتھوں کا لمس مجھے محسوس ہوا۔ میں تڑپ کر اُٹھ بیٹھا۔ "آپ یہاں سو جائیں ماجدہ! میں دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہوں۔"

وہ بڑی بے چارگی سے مجھے دیکھنے لگی۔ اُس کی حیرت اور خجالت دیدنی تھی۔ میرے دل میں اس کے لیے چاہت کی رو نہیں اُٹھ رہی تھی۔ میں شاید مُردوں کی اُس پنگت میں جا کھڑا تھا جن کو جسموں سے خون نچوڑ کر مار دیا جاتا ہے۔

میرا یہ رویّہ دیکھ کر وہ پلنگ سے اُتر گئی، بولی۔ "مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں آپ کے دل سے اُتر چکی ہوں۔"

"یہ بات نہیں ہے ماجدہ! میں بہت دکھی ہوں۔ اتنا دکھی کہ کسی خوشی کا میں اب تصور بھی نہیں کر سکتا۔ میرے پُور پُور جسم اب تاریک ہو چکے ہیں مجھے کچھ سجھائی نہیں دیتا۔"

"آپ مجھ سے ناراض ہیں۔ آہو کے اُن ہیروں کی وجہ سے یہی بات ہے نا!"

"پتہ نہیں! مگر وہ ہیرے آپ کو واپس دے دینے چاہئیں اُن پر ہمارا کوئی حق نہیں ہے۔"

"آہو کا بھی اُن پر کوئی حق نہیں تھا میرے لیے تو وہ مضبوط سہارا ہیں مگر اس کے لیے وہ عیاشی، بدمعاشی، غنڈہ گردی اور خونریزی کا ذریعہ۔ میں وہ ہیرے اسے واپس نہیں کروں گی۔"

"آپ کی مرضی۔ میں آپ کو مجبور نہیں کروں گا۔ میں نے آپ سے دوستی نباہنے کا وعدہ کر رکھا ہے۔"

"تو پھر اُن ہیروں کا ذکر مجھ سے نہ کریں۔ وہ میں نے لا کر میں سنبھال رکھے ہیں۔ اور انہی کے سہارے زندگی گزار دوں گی۔"

"پھول کا پَون کبھی دیکھا ہے آپ نے۔ وہ پتیوں پر سے اُتر جائے تو پتیاں بے رُوح ہو جاتی ہیں۔ یہی حال ہمارے تعلق کا ہے کہ پرے بھی وہ رنگِ گل اُتر چکا ہے ماجدہ! میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنے شوہر کے پاس ڈنمارک چلی جائیں آپ کے لیے یہی بہتر ہے۔"

"میں خوب سمجھتی ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے۔" وہ میرے لہجے کی شکستگی پر جھنجھلا کر کرسی سے اُٹھی اور دروازہ کھول کر باہر جانے لگی۔

"میں دوسرے کمرے میں سو جاتی ہوں۔"

"نہیں! وہاں بستر لگا ہے میں اُدھر سو جاتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے اپنے بوٹ اٹھائے اور دوسرے کمرے میں جا گھُسا۔

ماجدہ نے مجھے روکنے کی کوشش نہیں کی جس پر ملال سے اُس نے میرے نفس کے سرکش گھوڑے کو باندھنے کی کوشش کی تھی وہ ٹوٹ چکا تھا اور اب میری اس کی سمت مراجعت ناممکن تھی۔ وہ خدا معلوم کس کس گندے جوہڑ میں نہا چکی تھی۔ وہ فلمی اداکار نصیر اُس کا پالن ہار بن چکا تھا۔ وہ اسے نہ جانے کن کن خوفناک مراحل سے گزار چکا تھا۔ میں بھلا اُس کے پتیا مبر میں اب کیسے گھُس سکتا تھا۔ مجھے اس سارے سلسلے سے ہی گھن آنے لگی تھی۔

دُوسرے کمرے میں بچھے بستر پر لیٹتے ہی میرا دھیان پھر گاڈی کی طرف منتقل ہو گیا۔ پتہ نہیں کیا بات تھی مجھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ میں نے باغ منشی لدھا کی اس حویلی کی ڈیوڑھی میں گاڈی اور اس کے ساتھیوں پر اپنے چپ شاہ کو بے دریغ استعمال کر کے اچھا نہیں کیا۔ اس آدمی کا خیال بھی میرے دل میں وسوسے پیدا کر رہا تھا جسے ہم نے تھوڑی ہی دیر پہلے پُراسرار حالات میں درخت پر سے کوٹھی کے اندر کودتے دیکھا تھا۔ یُوں لگتا تھا جیسے میں اور آبی تیغ کوہ پر کھڑے ہیں اور ذرا سی تیز ہوا ہم دونوں کو اس بلندی سے یوں نیچے گرا دے گی کہ ہماری ہڈیاں سُرمہ بن جائیں گی میرے حوصلے کے آبِ ریزوں کی راہ سے میرا سارا خون بہہ نکلا تھا۔ نیند مجھ سے کوسوں دُور ہوتی جاتی تھی۔ میری بھٹانی تقدیر کو میرے انہدام اور میری تباہی کے سوا ان دنوں شاید اور کوئی کام تھا ہی نہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مجھے یوں قدم قدم پر اپنا ہتھیار نہ آزمانا پڑتا۔ میرے اِردگرد یوں جھڑ بدلی خون نہ بہتا۔ میں لاکھ کہوں یارو کہ میں برحق تھا۔ میرے پاس ایک جواز تھا۔ میں نے جو کچھ کیا ٹھیک کیا۔ مگر۔۔۔ مگر۔۔۔ نہیں میں پھر بھی حق پر نہیں تھا۔ یہ خیال میرے دل میں گہرا اترتا جا رہا تھا۔ تو مجھے جھرجھری سی آگئی۔ میرا ذہن متضاد وسوسوں کا اکھاڑہ بنتا جا رہا تھا۔ اس اکھاڑے کے عین بیچ میں مجھے ایک ہجوم میں گھری ریٹا کی لاش نظر آئی۔ اُسے ان لوگوں نے چو گڈی گاڑ کر پکڑا اور پھر اس کی گردن مروڑ ڈالی۔ میں اُس کے خونِ ناحق کا بدلہ کس سے لیتا؟ متان سے کہ گاڈی سے۔ وہ دونوں ہی گردن زدنی تھے۔ میں نے گاڈی کی کونپیں کاٹ ڈالیں ٹھیک کیا۔ اب جو کچھ بھی ہو گا دیکھا جائے گا۔ میں نے ریٹا کی اس بے حُرمتی کا انتقام لے لیا تھا۔ اس کی مدد کو کوئی قانون نہ پہنچ سکا تھا وہ اس گوہار میں تنہا ماری گئی تھی۔ مگر میں بھی اس کے لیے کچھ نہ کر سکا۔

میں انہی سوچوں میں غلطاں تھا کہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی صحن میں دبے پاؤں چل رہا ہے۔ کسی جوتے کی ہلکی سی رگڑ مجھے سُنائی دی۔ میں سمجھا آبی یا کوئی اور کسی کام سے صحن میں نکلا ہو گا مگر ابھی میں اس خیال کو بہلا ہی رہا تھا کہ مجھے یوں لگا جیسے کوئی صحن میں دھم سے کُود گیا ہو۔ دھپ ایسی سُنائی دی۔ میں نے بستر چھوڑ دیا اور چپ شاہ کو ہاتھ میں لے کر دروازے کی طرف بڑھا مگر جب میں نے چٹخنی نیچے گرا کر کواڑ کو اندر کی طرف کھینچا تو یہ دیکھ کر میرا مغز اُلٹنے لگا کہ دروازہ باہر سے بند ہو چکا تھا۔

"یہ دروازہ کس نے بند کیا ہے... ماجدہ!" میں نے بڑے غصے سے دروازے پر ٹھوکر ماری میرے بوٹوں کے تسمے کھلے ہوئے تھے۔ اور وہ پیروں تلے دبتے تھے۔ میں نے دروازے کے پاس بیٹھ کر تیزی سے تسمے باندھے۔

"اوئے دروازہ کھول آبی! یہ کیا تماشا ہو رہا ہے؟"

"یہ جیلانی کی آواز ہے اُستاد!" مجھے کسی کی سرگوشی سُنائی دی۔ میں تڑپ کر پیچھے ہٹا۔ میں شاید ان جانے دشمنوں کے نرغے میں پھنس چکا تھا۔

"کون ہو اوئے! دروازہ کھول کر ملو۔" میں نے کڑکتے ہوئے لہجے میں اُن کو للکارا اور دروازے سے پیچھے ہٹ کر اپنے چپ شاہ کے سارے خانے گولیوں سے بھر لیے۔

"یہ بھی کڑکی میں پھنس گیا ہے استاد! میری مانو تو پولیس کو بلا لو۔"

"بکو مت۔ یہ میرا مجرم ہے۔ میں اپنے یاروں کے خون کے ایک ایک قطرے کا حساب اِس سے لوں گا۔" ایک پاٹ دار آواز میرے کانوں تک پہنچی۔ میرا بدن غصے کی شدت سے آگ کی طرح تپنے لگا۔ میں نے کمرے میں گھوم کر دیواروں پر نظر ڈالی۔ کمرے کی عقبی اور دائیں بائیں کی دیواروں میں نہ کوئی کھڑکی تھی نہ روشندان۔ باہر نکلنے کا راستہ بس ایک ہی تھا اور وہ تھا دروازہ۔ میں ایک بار پھر دروازے کے پاس جا ٹھہرا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ تعداد میں کتنے ہیں مگر وہ ایک دو تو ہرگز نہیں تھے۔ وہ تیار ہو کر آئے ہوں گے۔ جس آدمی کو ہم نے درخت پر سے کود کر کوٹھی کے احاطے میں اُترتے دیکھا تھا وہ وارداتیا نہیں تھا، وہ بدمعاش ہمارے ہی تعاقب میں چلا آیا تھا۔ اور وہیں سے ہمارے پیچھے لگا تھا جہاں ہم نے گاڈی اور اس کے ساتھیوں کو خون میں نہلا دیا تھا۔ میرے حساب کی گھڑی سر پر آ پہنچی تھی۔

اچانک مجھے ماجدہ کی جگر پاش چیخ سُنائی دی۔ انہوں نے اُسے کمرے سے نکال لیا تھا اور اب وہ صحن میں کھڑی تھی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے یوں لگا جیسے کسی نے اُس کے منہ پر طمانچہ مار کر اُس کا منہ بند کر دیا ہے۔ ماجدہ کی آواز پھر نہیں اُبھری۔ وہ سُن ہو کر رہ گئی تھی۔ پھر مجھے پہلو کے کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز سُنائی دی اور اُس کے ساتھ ہی صحن میں کسی کی بھیانک چیخ اُبھری۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے وہ آبی کی چیخ تھی۔ مگر وہ تو ایسا نہیں تھا۔ وہ مر جاتا پر اُف نہ کرتا۔ چیخنا تو بڑی بات تھی۔ میں نے اپنا دروازہ دھڑ دھڑ پیٹ ڈالا۔

کسی نے دروازے کے پاس آ کر پھر بڑی ہی پاٹ دار آواز میں کہا۔ "تیرا بھی پٹ کھولتا ہوں کُتّے! حساب تو مجھے تجھ سے ہی لینا ہے ذلیل کے بچے!"

میرے اور اس کے درمیان پلائی ووڈ کا ایک کھوکھلا دروازہ حائل تھا اور وہ میرے اندازے کے مطابق بالکل میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی گالی سُنتے ہی میں نے لکڑی پر چپ شاہ کی نال رکھ کر گولی چلا دی۔ جان کنی کے عالم میں ایسی ایک وحشتناک غرغراہٹ میرے کانوں میں پڑی اور اس کے ساتھ ہی بہت سے قدموں کی چاپ صحن میں گونج گئی۔ چپ شاہ کے لبوں سے نکلی گولی تختے میں سے گزر کر سامنے کھڑے آدمی کے جسم میں اُتر گئی تھی۔ مگر وہ آدمی وہ نہیں تھا جس کی گالی کا جواب میں نے دینے کی کوشش کی تھی۔ کیونکہ اگلے ہی لمحے مجھے اس کی پاٹ دار آواز پھر سُنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"اوئے جاکھی دروازہ کھول دے مگر اپنا آپ بچا کر۔"

اُس کے ساتھ ہی کسی نے دروازے کے وسط میں لگے ہینڈل پر ہاتھ ڈال دیا۔ صورتِ حال کی نزاکت کو سمجھتے ہی میں نے دروازے پر اندر سے دونوں کواڑوں کی چٹخنیاں چڑھا کر اسے مضبوطی سے بند کر دیا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ باہر کتنے آدمی میرے لیے کتنی توپیں گاڑ کر کھڑے ہیں۔ مجھے نہ آبی کی آواز سُنائی دے رہی تھی نہ ماجدہ کی سلونی اور آبی کی وہ محبوبہ جسے وہ عابد کی ماں کہتا تھا ان کی بھی کوئی خبر نہیں تھی۔ اور میں اندازہ کر سکتا تھا کہ وہ لوگ انہیں پوری طرح بے بس کر چکے ہیں۔ پہلو کے کمرے سے بھی کسی کشمکش کی صدائے بازگشت نہیں اُبھر رہی تھی۔ اور محسوس مجھے یہ ہو رہا تھا کہ ان لوگوں نے مکان کے مکینوں کو مکمل طور پر اپنے شکنجے میں جکڑ لیا ہے۔

"اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا ہے دانی صاحب۔" یہ جاکھی جیب کترے کی آواز تھی جسے ہم اسی رات گاڈی کی پناہ گاہ سے ادھ بے لبس کر کے ڈال آئے تھے۔

"میں اس کمرے کو آگ لگا دوں گا۔ پانی چھوڑ دوں گا۔ اس چوہے کو باہر نکالنے کے لیے۔" دانی نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ہائے کتنا جی چاہ رہا تھا اُس وقت میرا کہ وہ آدمی میرے سامنے ہوتا۔ جس کے گلے سے وہ اتنی مکروہ مگر تحکم آمیز آواز نکلتی تھی۔ اس کا نام میں نے پہلی بار سُنا تھا اور اُسے جاکھی نے گاڈی کے قتل کی اطلاع دے کر ہمارے ٹھکانے پر پہنچا دیا تھا۔

میں واقعی 'کڑکی' میں پھنس گیا تھا۔ وہ مجھے کمرے سے باہر نکالنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا چکے تھے۔ اس وقت صبح کے چار بج رہے تھے۔ باہر پو پھٹ رہی تھی۔ طلوعِ آفتاب کچھ زیادہ دُور نہیں تھا۔ وہ جسے نور کا تڑکا کہتے ہیں۔ چاروں طرف عیاں ہونے لگا تھا اور دانی کی بے چینی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔

"اوئے بکیر شاہ! جا۔ وہ پٹرول کا ڈبہ ادھر لا، گاڑی میں دھرا ہے۔" یہ دانی کی آواز تھی۔ "دونوں کمروں کو آگ لگا دے۔ سالے خود ہی باہر آ جائیں گے۔ میں انہیں ترسا ترسا کر ماروں گا۔"

صحن میں بہت سے قدموں کی آواز گونجی۔ کوئی پانچ منٹ بعد میں نے دیکھا کہ کسی نے ڈھیر سارا پٹرول دروازے کے نچلے حصے کی راہ سے کمرے میں انڈیل دیا ہے۔ اُس پٹرول کی بو کمرے میں پھیلنے لگی میں نے اس کو خشک کرنے کے لیے بستر پر سے روئی کا گدا فرش پر ڈالا مگر مجھے دیر ہو چکی تھی۔ بکیر شاہ نے جلتی ہوئی تیلی اندر پھینک دی اور پھر وہ فرش پر بہتا ہوا پٹرول شعلوں کی صورت اختیار کر گیا۔

میں نے گدا فوراً ہی پیچھے ہٹایا مگر وہ بھی آگ پکڑ چکا تھا۔ پٹرول بہتا ہوا دروازے سے تین فٹ پیچھے بچھی دری تک آ پہنچا تھا اور آگ تیزی سے کمرے میں پھیلنے لگی میرے لیے اُن لوگوں نے کوئی راستہ کھلا نہیں چھوڑا تھا۔ میں باہر نکلتا تو تاک کر میرے سینے میں گولی دے مارتے۔ میں کمرے میں محصور رہتا تو وہیں جل کر بھسم ہو جاتا کیونکہ آگ برابر اپنا کام دکھا رہی تھی۔ دروازے پر لگے پردے بھی جل اُٹھے تھے۔ میری زندگی میں اس سے زیادہ مشکل لمحہ اور کوئی نہیں آیا تھا۔

اچانک مجھے محسوس ہوا جیسے عقبی دیوار پر دوسری طرف سے کوئی آدمی ہتھوڑے سے ضربیں لگا رہا ہے۔ میں اسی دیوار کے ساتھ کھڑا تھا۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ مجھے اب اس طرف سے زندہ پکڑنے کے لیے دیوار میں نقب لگا رہے تھے۔ ابھی میں کچھ سوچ بھی نہ سکا تھا کہ اس عقبی دیوار کی ایک اینٹ میرے قدموں میں گری۔ وہ چار انچ موٹا پردہ تھا۔ جونہی وہ اینٹ دیوار سے نکلی۔ میں پستول سیدھے ہاتھ میں لے کر اوٹ میں ہو گیا۔ ایک اور اینٹ گری۔

"اوئے جیلانی! یہ اینٹیں کھینچ دے۔" یہ آبی کی آواز تھی۔ اس کی آواز مجھے یوں لگی جیسے صدیوں کا فاصلہ طے کر کے مجھ تک پہنچی ہے میں نے فوراً ہی سوراخ میں ہاتھ ڈال کر کئی اینٹیں اپنی طرف گرا دیں۔ کوئی ڈھائی فٹ مربع راستہ دیوار میں بن گیا تھا۔ اس دوران کمرے میں آگ ہر طرف پھیل چکی تھی۔ اور میرا دم گھٹنے لگا تھا۔ دھواں ناقابلِ برداشت ہو گیا تھا۔ میں پاگلوں کی طرح اس سوراخ میں سے گزر کر دوسرے کمرے میں جا پہنچا۔ آبی نے اس طرف رکھی چوبی الماری کو پیچھے کھینچ کر اس دیوار کی موٹائی کا اندازہ کر لیا تھا۔ پھر اس نے میری کیفیت کو سمجھ کر وہ دیوار کاٹ ڈالی تھی۔

مجھے اس نے اپنے سامنے دیکھا تو وہ ایک دم مجھ سے لپٹ گیا۔

"یہ گاڈی کے حمایتی ہیں جیلانی! انھوں نے ہر طرف سے ہمیں گھیر رکھا ہے۔"

"یہ کون سا کمرہ ہے؟"

"ہم مکان کے پچھلے حصے میں ہیں۔ یہ دیوار... ساتھ کے مکان کی ہے۔"

"مگر ہم تو یہاں بھی بند ہو کر رہ گئے۔"

"یہ اس مکان کا اسٹور روم ہے اس کا دروازہ اس بیڈ روم میں نکلتا ہے۔"

"وہ تمھاری جیپتی کہاں ہے؟"

"وہ اُن کے ہتھے چڑھ گئی ہے جب وہ اندر آئے تو دروازے پر دستک سُن کر کنڈی اسی نے کھولی تھی۔"

"تم کیسے بچ گئے؟"

"میں خطرہ سونگھتے ہی اس کمرے میں آ گیا تھا۔ یہ الماری ہٹانے پر پتہ چلا کہ یہ ایک اینٹ کی دیوار ہے۔ ایسے میں نے توڑ دیا۔ انہوں نے ہمارے کمرے میں بھی آگ لگا دی ہے۔"

"یہاں سے ہم نکلیں گے کیسے؟ ادھر بھی کوئی کھڑکی نہیں ہے۔"

"جلدی کر، ہم اس دیوار کو پھاڑ دیتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ وحشیانہ غیظ و غضب سے اس کمرے کی عقبی دیوار پر ہتھوڑا چلانے لگا۔ کمرے میں ایک گینتی بھی دھری تھی۔ وہ میں نے اُٹھا لی۔ کوئی پانچ منٹ کی جنون خیز محنت کے بعد ہم نے وہ دیوار بھی کاٹ ڈالی جو عقبی مکان کے کسی کمرے میں کھلی تھی۔ اتنا سا راستہ ہی بنا تھا کہ ہم دونوں اس میں سے بہ دقت پھنس کر آگے نکل گئے مگر جونہی ہم دوسری طرف پہنچے، ہمیں دو دہشت زدہ عورتوں کی چیخیں سُنائی دیں۔ وہ ہماری صورتیں دیکھتے ہی اس کمرے سے بھاگ نکلیں جس کی دیوار پھاڑ کر ہم دوسری طرف نکلے تھے۔ آبی نے شکرے الیسی تیزی سے اُن کے پیچھے بھاگ کر انہیں دوسرے کمرے میں جا لیا۔ میں بھی اس کے پیچھے تھا۔ وہ دونوں معمر عورتیں مکان کی دیوار کی دوسری طرف اینٹوں پر پڑنے والی ضربوں سے حیرت زدہ سی ہو کر پہلے تو کھڑی دیکھتی رہیں مگر جب دیوار کٹی اور ہم اُن کے سامنے پہنچے تو وہ خوفزدہ ہو کر چیختی ہوئی باہر کی طرف بھاگیں۔

آبی نے انہیں روک کر کہا۔ "اماں جی! پریشان نہ ہوں۔ ادھر ڈاکٹر فرخندہ کے مکان پر ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا ہے۔"

"یار دفع کر انہیں آگے نکل۔" میں نے آبی کو اُن گیگلی عورتوں سے صرفِ نظر کرنے کے لیے کہا۔ ہم اس وقت اُن کے بیڈ روم میں کھڑے تھے۔ اچانک اُن کے صحن میں کئی آدمیوں کی آوازیں سُنائی دیں۔ ایک بچہ شور مچاتا ہوا ہماری طرف آ رہا تھا۔

"انکل یہ دیوار دیکھیں، یہ کٹی ہوئی ہے۔"

برآمدے میں بھاگتے ہوئے بچے کی یہ آواز سنتے ہی میں اور آبی کمرے کے عقبی دروازے سے ہوتے ہوئے دوسری طرف نکلے اور دو کمروں میں سے گزر کر مکان کے پچھلے حصے میں جا پہنچے۔ اندھیرا چھٹنے لگا تھا۔

"اِدھر سے نکل چل۔" میں نے آبی کو اپنے ساتھ کھینچا اور گراج میں سے بھاگ کر مکان کے کھلے صحن میں جا پہنچا۔ تین آدمی اُس وقت برآمدے میں سے بھاگتے ہوئے کمرے میں داخل ہو رہے تھے

اُن میں سے ایک کی نظر ہم پر پڑی تو وہ چلّایا۔ "یہ کون ہیں؟ پکڑو انہیں۔" اُس کی یہ آواز سُنتے ہی ہم دونوں بلا خیز رفتار سے گیٹ عبور کر گئے۔ اب وہ تینوں ہمارے خلاف شور مچاتے ہوئے ہمارے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ اِن میں سے ایک کی رفتار نے تو مجھے حیران کر دیا تھا۔ وہ سو گز کے اندر اندر ہماری ایڑی تک آپہنچا۔ وہ کوئی بہت ہی بے ڈھالا آدمی تھا۔ اس کا ہاتھ آبی کے کالر پر پڑا اور پھر اُس نے آبی کو کمر سے دبوچ لیا۔

"اوئے بیڑہ غرق! تیری موت آئی ہے سالے۔" آبی غرّایا۔

اُس کی آواز سُن کر وہ ایک لمحظے کے لیے رُک کر اپنے جیب شاہ کا دستہ پوری قوت سے اس جوان کے سر میں دے مارا۔ آبی نے اُس کے دونوں ہاتھ کمر سے کھینچ کر الگ کیے تو وہ جوان تیورا کر پیچھے گرا، اور ہم پھر بھاگ نکلے۔ اندھیرا کچھ اور پھیکا پڑ چکا تھا مگر سڑک پر ابھی تک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس جوان کے پاس پہنچ کر دُوسرے دو آدمی ذرا دیر کے لیے رُکے اور پھر چلاّتے ہوئے وہ ہماری طرف لپکے مگر اتنے میں دائیں ہاتھ ایم او کالج تک جا پہنچے تھے۔ درختوں کی اوٹ میں بھاگتے ہوئے ہم آگے نکلے اور پھر میں اللہ کا نام لے کر اُس قدِ آدم دیوار کو پھلانگ کر دُوسری طرف جا پہنچا۔ میرے پیچھے آبی نے بھی دیوار کو یوں عبور کیا جیسے وہ گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہو رہا ہے۔ ہمارا تعاقب کرنے والے بہت پیچھے رہ گئے تھے۔

ہم دونوں بُری طرح ہانپ رہے تھے۔ آبی نے میرے کندھے پہ ہاتھ رکھ دیا۔ اور اپنا سانس دباتے ہوئے بولا "یہ کیا ہو گیا ہے جیلانی! ہم تو بہت بری طرح پٹ گئے۔ یہ صابن دانی ہمارے پیچھے کس نے لگا دی؟"

"یہ وہی آدمی تھا جو رات ہمارا پیچھا کر رہا تھا۔ وہی گاڈی کے ساتھیوں کو لے کر آیا ہے۔"

"یہ دانی جو ہے نا یہ اچھی گوجر کی پارٹی کا آدمی ہے۔"

"اچھا؟ اس نے تو مار ہی دیا تھا ہمیں بڑی پلید شے ہے یہ گینڈے کی اولاد۔ وہ ہماری عورتیں تو ماری جائیں گی ان کے ہاتھوں۔ تیرے عابد کی ماں بھی وہیں رہ گئی۔"

"بہت برا ہوا یار! ہم تو اُن کی نظروں میں ہمیشہ کے لیے ذلیل ہو گئے۔"

"میرا یہ کوٹ بھی وہیں رہ جاتا مگر جب کمرے میں آگ بھڑک اُٹھی تو اُسے میں اٹھا کر سٹور روم میں جا گھسا۔"

"تو دیوار نہ کاٹتا تو میں شاید کچھ بھی نہ کر سکتا۔"

"وہ تو میں نے جب الماری پیچھے ہٹا دی اور دروازے کے سامنے رکھ دی تاکہ وہ اِدھر سے نہ آسکیں تو مجھے محسوس ہوا کہ جہاں الماری رکھی تھی وہاں دیوار زیادہ موٹی نہ ہو گی۔"

اب ہم آہستہ آہستہ کالج کے ہوسٹل کی طرف بڑھ رہے تھے۔

"یار! اِدھر میرے گاؤں کا ایک لڑکا رہتا ہے اس ہوسٹل میں، چل ہم اس کا پتہ کرتے ہیں، دو گھڑی بیٹھ تو لیں گے وہاں۔"

"ہاں! یہ بہتر رہے گا' ویسے ہوتی ہمارے ساتھ بہت بُری ہے آبی! ایسی رگڑائی تو ہماری کبھی نہ ہوئی تھی۔" میں نے زہرخند کیا آبی بھی مسکرا دیا بولا "چل دفع کر۔ مٹی ڈال اس قصے پر آگے کی سوچ۔"

"کیا سوچوں یار! اس گاڈی کو مار کر ہم نے اپنے لیے زبردست مصیبت پیدا کر لی ہے، بڑا غلط حساب کھول لیا ہے۔"

"یہ تو ہے۔ یہ گوجر پارٹی تو ہمیں چیر کر رکھ دے گی۔" آبی بھی اندر سے ٹوٹ رہا تھا۔

"اُن کے ساتھ کوئی لکیر شاہ بھی تھا، اس کی بھی آواز بہت کراری ہے۔"

"پتہ نہیں کس کس کو ننگا کر دیا ہے تو نے مگر جیلانی تو بھی بہت کُتّی شے ہے یار! اب اس شہر میں رہنا ہمارے لیے ممکن نہیں رہے گا۔"

"کچھ بھی نہیں ہو گا آبی! کیا نام ہے اُس لڑکے کا؟"

"اس کا نام انور ہے وہ اِدھر بی اے میں پڑھتا ہے۔"

اب ہم ہوسٹل کی عمارت میں داخل ہو چکے تھے۔

"یار ہمارا حلیہ کچھ عین غین ہو رہا ہے۔" آبی نے ایک جگہ رُک کر کہا۔

"ہم کوئی بر دکھوے کے لیے تو نہیں آئے۔ پوچھ کسی سے کہ وہ انور کس کمرے میں رہتا ہے؟" میں نے اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

آبی نے قریب سے گزرتے ہوئے ایک لڑکے کو آواز دی۔ وہ لوٹا اُٹھائے ہوئے چلا جا رہا تھا۔

"بھائی جی! ہم انور صاحب سے ملنا چاہتے ہیں، کس کمرے میں رہتے ہیں وہ؟"

"وہ۔۔۔ اُدھر سامنے کے کمرے میں رہتا ہے۔ انور پھاڑی سے ملنا ہے نا آپ کو۔"

"ہاں! وہی۔" آبی نے کہا۔ "مگر وہ پھاڑی کب سے ہو چکا ہے؟ یہ تخلص ہے اس کا؟"

"بس ایسے ہی نام پڑ گیا ہے اُس کا۔ اس کونے والے کمرے میں چلے جائیں۔" یہ کہہ کر وہ لڑکا آگے بڑھ گیا۔

ایک دروازے پر ہمیں انور علی کا نام لکھا نظر آیا۔ تو آبی نے اس پر ہاتھ مار دیا۔ چند ہی ساعتوں بعد دروازہ کھُل گیا۔ سامنے ایک لمبے قد کا دُبلا پتلا لڑکا کھڑا تھا۔ وہ بنیان پہنے ہوئے تھا اور اپنے

تہمد کے لڑ کس کے باندھ رہا تھا۔ آنکھیں اس کی نیند سے بھری ہوئی تھیں، اُس کا دماغ ابھی تک نیم خوابیدہ تھا۔

"اوئے انور، بھوتنی کے تو ابھی تک سویا ہوا ہے تو۔"

"آپ! آبی صاحب! آئیے آئیے! یہ صبح صبح آپ کے نیاز کیسے حاصل ہو گئے جناب۔" وہ ایک دم زنغے سے باہر نکل آیا اور آگے بڑھ کر آبی سے لپٹ گیا۔

آبی اُسے باہوں میں بھر کر کمرے میں داخل ہوا اور اس کو پلنگ پر ایک طرح سے پٹختے ہوئے بولا۔ "تیری پڑھائی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے ابھی تک بچے اور پاکستان نے پتہ ہے ہائیڈروجن بم بھی بنا لیے ہیں۔"

"آپ کو کس نے بتایا کہ پاکستان نے ہائیڈروجن بم بنا لیا ہے؟"

"میں نے جالندھر ریڈیو سے یہ خبر سُنی ہے۔" آبی نے اُسے ستاتے ہوئے بڑے وثوق سے کہا۔

"اچھا؟ یہ تو بہت اچھا ہوا، اِن لالوں کی دھوتیاں کھُل کھُل جائیں گی۔ سالے اُدھر نیپال کی طرف بھاگ جائیں گے سب کے سب۔ پھر میں لدھیانے ضرور جاؤں گا۔"

"وہاں تیری پھوپھی رہتی ہے کلونت کور؟" آبی بہت اچھے موڈ میں تھا۔

"نہیں آبی صاحب مذاق نہ کریں۔ میں آپ کے لیے چائے بنواتا ہُوں۔ جالندھر ریڈیو ہمیشہ غلط خبریں دیتا ہے۔ انہیں بس ہمیشہ ایسے ہی بُرے بُرے خواب نظر آتے ہیں کہ پاکستان نے یہ کر لیا پاکستان نے وہ کر لیا۔"

"یار تیرے پاس سگریٹ تو ہوں گے بھائی ہاشم خان؟"

میں نے پیکٹ نکال کر آبی کے سامنے رکھ دیا، وہ خوش ہو گیا۔

"میں آپ کے لیے سگریٹ بھی منگواتا ہوں میرے پاس ہیں تو سہی مگر وہ بگلے کے ہیں۔"

"تو ذرا چائے کے لیے کہہ دے اور پھر ہمارے لیے غسل کا انتظام کر ہم بہت میلے ہو رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے جناب! میں ابھی آتا ہوں۔" یہ کہہ کر انور تیزی سے باہر نکل گیا۔

"اس کی حالت مجھے کچھ زیادہ ہی پتلی نظر آتی ہے آبی تیرے اس اسٹوڈنٹ کی۔"

"اس کی بہت سی چیزیں پتلی ہیں بڑے بھائی۔ یہ سالا ایسے ہی پڑھائی میں پھنسا ہے اور گھر میں اس کے بھوک بھنگڑا ڈال رہی ہے۔"

"اب کرنا کیا چاہیے ہمیں؟ یہ چوٹ تو ہمیں بہت گہری لگ گئی ہے۔" کچھ پہلے کے واقعات پھر میرے ذہن میں سرسرانے لگے تھے۔

"اس انور کو آنے دے، میں اسے ڈاکٹر فرخندہ کے مکان پر بھیج کر معلوم کرتا ہوں کہ وہاں ہمارے بعد کیا ہُوا۔"

"یار! اس کرسی کے احمق سے کچھ نہ ہو سکے گا مجھے تو یہ واقعی عقل سے بھی "پھاڑی" نظر آتا ہے۔ دنیا کہاں سے کہاں جا پہنچی ہے اور یہ ابھی تک پڑھائی میں پھنسا ہے۔"

آبی ہنس دیا، بولا "تو آدمی سمجھ دار ہے جیلانی! مگر تیرا ایک خیال ہے کہ یہ بھی دتّے کا پستول یا کوئی خنجر لے کر رات کو کسی چوراہے پر ٹھہر جایا کرے تیری طرح! ہائیں! کیا خیال ہے تیرا؟"

"میرا مطلب ہے کہ کسی ڈھنگ کے آدمی کو وہاں بھیج۔"

"کرنا کیا ہے ہمیں۔ کیا لینا دینا ہے ہمیں اس تفتیش سے 'رات گئی بات گئی۔'"

"تیرے عابد کی ماں' بھی وہیں رہ گئی ہے۔"

"وہ خراسانی گھوڑی! اب وہ خود اپنی تقدیر کی مالک ہے میرے بھائی! پولیس اُن سے پُوچھے گی تو وہ کوئی بیان شیان دے دیں گی۔ بہت چلتی رقم ایسی عورتیں ہیں۔ وہ اُن کی فکر مت کر۔ یہ ایسا طلسم خانہ ہے جیلانی کہ جو کوئی یہاں پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے نا! وہ پتھر ہو جاتا ہے۔"

آبی ٹھیک کہتا تھا۔ ہمیں اس گھر کو بھُول جانا چاہیے تھا۔ مگر ابھی تک ہم موقعہ واردات کے نواح میں بیٹھے تھے۔ اور میں اُس دانی سے دو دو ہاتھ ضرور کرنا چاہتا تھا۔ اس نے تو مُوتر سے ہماری مونچھیں مونڈ دی تھیں۔ وہ نادر شاہی انداز میں بات کرتا تھا وہ بھینسے کی اولاد۔ اور میں اس کرکنا تھ کو بتانا چاہتا تھا کہ اُس نے کن لوگوں پر ہاتھ ڈالا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد انور نے ہمارے لیے غسل کا انتظام کر دیا۔ ہم ناشتہ بھی کر چکے تو وہ بولا "آبی صاحب! آپ شاید بہت دنوں سے گھر نہیں گئے۔ میں ماسی سے ملا تھا۔ وہ کہتی تھی کہیں آپ مل جائیں تو میں آپ کو گھر بھیج دوں۔"

ماں کے ذکر سے آبی ایک دم ہڑ کنے لگا، بولا "اماں سے ملا تھا تو، کیا حال ہے اُس کا؟"

"ٹھیک ہے پر وہ آپ کے بغیر بہت اداس رہنے لگی ہے ماسی کہتی تھی کہ اب وہ آپ کی شادی کر دے گی۔ میرا خیال ہے کہ وہ خرچ سے بھی تنگ رہتی ہے۔"

"اچھا؟ یہ تجھے کیسے پتہ چلا؟"

میری بے جی نے بتایا تھا کہ وہ منزلہ کی گھر والی سے کوئی پندرہ دن پہلے پانچ سو روپے مانگنے گئی تو اس نے انکار کر دیا۔ ماسی بہت پریشان ہوئی اور سیدھی ہمارے گھر آئی۔"

"پھر؟ پھر کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں! بے جی کے پاس کسی کی امانت رکھی تھی ہزار روپے اُس میں سے انہوں نے ماسی کو پانچ سو نئے دیئے۔" انور نے کہا۔

"ہوں! تو یہ بات ہے۔ اس نمبردار کی موت آئی ہے میرے ہاتھوں اُس کی "رن" اتنا بھی لحاظ نہیں کرتی ہے میری اماں کا۔"

"اس کے پاس روپے نہیں ہوں گے آبی صاحب! پر آپ بھی تو ماسی کا خیال نہیں کرتے۔" انور نے اپنے دل کی بات کہہ ہی دی۔ اُس کا لہجہ بہت ہی دلگیر سا تھا۔ اسے آبی کی والدہ سے بہت ہمدردی تھی۔

"دیکھ انور! تو آج رات میرے گاؤں چلا جا۔ میں تجھے دس ہزار روپے دیتا ہوں" یہ اماں کو دے دینا۔" یہ کہہ کر آبی نے جیب سے پانچ پانچ ہزار کی دو گڈیاں نکال کر انور کے ہاتھ پر رکھ دیں۔

"ارے آپ کے پاس اتنے سارے پھاڑی نوٹ ہیں اور ماسی کو قرض لینا پڑ رہا ہے۔" انور آبی کے ہاتھ پر نوٹوں کی گڈی دیکھ کر حیرت زدہ ہو گیا تھا۔

"یہ لے یہ ہزار روپیہ تو بھی رکھ لے۔"

"ادھر میں کچھ پھاڑی سا ہو رہا ہوں آبی صاحب! پیچھے سے خرچ پورا نہیں مل رہا ہے مگر میں یہ نوٹ کیوں لے لوں، یہ آپ کی چیز ہے۔"

"نہیں یار! تو میرے چھوٹے بھائی ایسا ہے، رکھ لے ضرورت پڑی تو کچھ اور بھی دے دوں گا۔ پر تو یہ پڑھائی سڑھائی چھوڑ کر کوئی کام کیوں نہیں کر لیتا۔"

"نہیں جی! میں بی ایس سی کر رہا ہوں۔ اب کی بار میرے بہت زیادہ نمبر آئیں گے اور میں میڈیکل کالج میں داخلہ ضرور لے لوں گا۔ میں ڈاکٹر بن گیا نا تو پھر میں پھاڑی نہیں رہوں گا۔" اس نے آبی کے دیے ہوئے سارے ہی نوٹ اٹھا لیے تھے آخری ہزار روپے سمیت۔

آبی ہنس دیا۔ وہ انور سالا پنجابی کے لفظ "پھاڑی" میں ہر بار نیا مفہوم بھر دیتا تھا۔ بڑی کاٹ تھی اس کی باتوں میں، اور اس کے گرد جو کتابیں بکھری تھیں اُن سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ اسے اپنی پڑھائی کے سوا دنیا کی کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ وہ دن دُور نہیں تھا، جب اس کے دروازے پر ڈاکٹر انور علی ایم بی بی ایس کا بورڈ آویزاں ہو گا۔ وہ اپنی اس منزل کی طرف تیزی سے دوڑ رہا تھا اور میرا تجربہ مجھے بتاتا تھا کہ کامیابی ایسے ہی جنونی لوگوں کی کنیز بن جاتی ہے۔ اپنے حواسوں میں رہ کر تو آدمی کچھ بھی نہیں کر سکتا۔

"ہمارا ایک کام کرو انور ــــ اور وہ یہ ہے کہ آج رات اُدھر راج گڑھ میں ڈاکٹر فرخندہ کے مکان پر ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا ہے۔ وہاں کچھ عورتیں تنہا رہتی تھیں۔ تم وہاں جا کر یہ معلوم کرو کہ وہاں اب کیا ہو رہا ہے۔ ہمیں اُن عورتوں کی بڑی فکر ہے وہ ڈاکٹر فرخندہ کی رشتے دار ہیں۔ اور وہ بلے چاری آج کل گوجرانوالہ میں ہے۔"

انور کچھ حیران سا ہو کر بولا۔ "آپ کو کس نے بتایا ہے کہ وہاں ڈاکہ پڑا ہے۔"

"ہم ادھر آ رہے تھے تو کسی آدمی نے ہمیں راستے میں یہ بات بتائی تھی۔"

"آپ خود کیوں نہیں چلے گئے وہاں؟"

"کچھ ایسی ہی بات ہے انور میاں کہ ہم دونوں ادھر نہیں جانا چاہتے۔ ہمارے کچھ دشمن ہیں اس محلے میں، اُن کی وجہ سے ہم وہاں نہیں جائیں گے۔"

"کوئی گڑبڑ تو نہیں ہے وہاں؟ کہیں میں خواہ مخواہ ہی پھاڑی نہ ہو جاؤں اُدھر جا کر۔"

"ایسے ہی کسی راہگیر کی طرح وہاں سے معلوم کر لینا۔ اپنے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتانا۔ مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ وہ حملہ دانی بدمعاش نے کیا ہے۔"

"دانی! اُس کا نام تو اکثر اخباروں میں آتا رہتا ہے! اچھی گوجر کا ساتھی ہے وہ۔"

"ہاں! ذرا معلوم تو کرو کہ ہوا کیا ہے؟"

"ٹھیک ہے آبی صاحب! میں ابھی جاتا ہوں مگر میں کسی چکر میں تو نہیں پڑ جاؤں گا نا؟"

"نہیں، کچھ بھی نہیں ہو گا۔ ذرا سوچ سمجھ کر کسی سے بات کرو گے تو سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔"

آبی کی یہ بات سُن کر انور نے لباس تبدیل کیا اور پھر سائیکل کے پیچھے اپنی کتابیں رکھ کر وہ اُسی وقت کمرے سے باہر جانے لگا۔

"تمہارے آنے تک ہم یہاں نہ ہوئے تو اس کمرے کی چابی ہم اُدھر دروازے کی چوکھٹ میں پھنسا جائیں گے یا دھاگے سے باندھ کر اندر ڈال جائیں گے۔ دھاگے کا سرا دلیز کے باہر ہو گا دائیں ہاتھ۔" آبی نے کچھ سوچ کر کہا۔

"ٹھیک ہے۔ مگر آپ ادھر ہی بیٹھیں نا۔"

"ہمیں کوئی کام ہے۔ ذرا دیر کے لیے باہر جائیں گے بہرحال آج شام کو تم گاؤں ضرور جاؤ گے۔"

"فکر ہی نہ کریں یہ سارے پھاڑی کام تو میں آج ہی کر دوں گا۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔

اُس کی صورت نظروں سے اوجھل ہوئی تو آبی بولا۔ "اُٹھ یار! ہمارے لیے یہاں بیٹھنا خطرناک ہو گا۔" ابھی وہ یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ انور تیزی سے واپس آتا نظر آیا، بولا۔

"آبی صاحب! اگر آپ یہاں نہ ہوئے تو آپ مجھے کہاں ملیں گے؟"

"تم سیدھے اُدھر سٹی ہوٹل پہنچ جاؤ انارکلی میں۔ ہم گیارہ بجے وہاں تم سے مل سکتے ہیں۔"

"یہ بڑی ضروری بات تھی، مجھے گیٹ سے واپس آنا پڑا۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکلنے لگا تو بولا۔ "یہ بالکل پھاڑی بات لگتی ہے۔ آپ یہ ایک چابی اپنے پاس رکھیں۔ دُوسری میں۔ میں جاتا ہوں، جب کبھی آپ کو ضرورت ہو یہاں آ کر بیٹھ جایا کریں۔ اسے آپ اپنا کمرہ سمجھیں۔" یہ کہہ کر اس نے ایک چابی ہمیں دے دی اور ایک اس نے اپنی جیب میں ڈال لی۔

اس کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد آبی نے مجھے وہاں سے اُٹھایا، کمرے کو مقفل کر کے بولا۔ "چل یہاں سے نکل چل۔ ہم کوئی بھی خطرہ مول نہیں لے سکتے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"میرا خیال ہے کہ دانی اتنی کچی گولیاں نہیں کھیلا ہے وہ اپنے کسی آدمی کو اس انور کے پیچھے ضرور لگا دے گا ہمیں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔"

"ہاں یار! یہ معاملہ کچھ زیادہ ہی ٹیڑھا ہے۔ اور مجھے آسیہ کی فکر مارے دیتی ہے۔"

"گیارہ بجے انور سے مل کر ہم آج ہی ساہیوال چلتے ہیں۔ اُس لیر شاہ سے ملنا بہت ضروری ہے۔"

"پتہ نہیں! اس شریف آدمی نے آسیہ کو کیوں ہسپتال سے اٹھوا لیا ہے، میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔"

"میں بھی حیران ہوں جیلانی! یہ کچھ لمبی گڑبڑ نظر آتی ہے۔ ریٹا کو پولیس نے جان بوجھ کر مروا دیا اور اب ہم بس ٹاپتے ہی رہ گئے۔"

"اس دانی کی تو میں مونچھیں اکھاڑ لوں گا آبی۔ بہت ذلیل کر دیا ہے اس بدمعاش نے ہمیں۔"

"اس کو گالی مت دے جیلانی! وہ بہادر دشمن ہے۔ دوست کی خاطر اس نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا۔ مجھے وہ کوئی معمولی آدمی نظر نہیں آتا۔" آبی نے میرے ساتھ تیز تیز چلتے ہوئے کہا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم کالج کے بڑے گیٹ سے نکل کر ایک ٹیکسی میں بیٹھ چکے تھے۔ آبی مجھے سیدھا نعمت کدہ میں لے گیا۔ انور کے دیے ہوئے ناشتے سے اس کی تسلی نہیں ہوئی تھی۔ چائے بھی کڑوی کسیلی تھی اور توس ایسے جلے بھنے تھے کہ حلق سے نیچے نہیں اُترتے تھے۔

اس طعام خانے میں بیٹھ کر ہم دونوں نے خاصا تگڑا ناشتہ کیا۔ ایک طرح سے دن بھر کے لیے ٹینکیاں ہم نے پوری طرح بھر لی تھیں۔ وہاں سے اٹھا کر آبی مجھے ایک ریڈی میڈ کپڑوں کی دُکان پر لے گیا اور ہم نے اپنے لیے تین تین جوڑے کپڑوں کے خرید لیے موسم اتنا بدل گیا تھا کہ اب کوئی گرم کپڑا بدن پر برداشت ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ کھلے کھلے دو بریف کیس خرید کر ہم نے ایک بار پھر ضرورت کی تمام چیزیں ان میں بھر لیں۔ اب ہم کسی سچے سوہنے انگریز کی اولاد نظر آ رہے تھے۔ اینگلو انڈین قسم کے فضول قسم کلے گورے۔

اپنی کینچلی بدل کر آبی مجھے کھینچتا ہوا مال روڈ پر لے گیا جب ہم رکشے سے اُترے تو وہ بولا۔ "یار! اس مستری بھتیجے سے ہمیں اپنی کار لے لینی چاہیے اُس کا رنگ اس نے بدل دیا ہو گا۔"

"کوئی پھڈا نہ پڑ جائے آبی! آج کل ہماری قسمت کچھ زیادہ ہی خراب جا رہی ہے۔"

"کچھ نہیں ہو گا۔ ہم بھتیجے کی مزدا کے پیسے دے دیتے ہیں۔"

"چل بھائی! دیکھتے ہیں کیا کہتا ہے وہ بھتیجا۔" میں نے بڑے ہی بجھے دل سے کہا۔ مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ نعمت کدہ میں ہم نے اپنے اردگرد بیٹھے لوگوں کی جو باتیں سنی تھیں وہ ہمیں بدحواس کر دینے کے لیے بہت کافی تھیں۔ سارے شہر میں گاڈی اور اس کے ساتھیوں کے قتل کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی تھی اور اس ہوٹل میں جو گاہک بیٹھے تھے وہ اس خبر پر بڑے زور شور سے بحث کر رہے تھے۔

بھتیجے کی ورکشاپ پر جب ہم پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ کسی گاڑی کی ٹرائی لینے کے لیے باہر نکلا ہے ہم دونوں خاموشی سے ایک طرف ہو کر بینچ پر بیٹھ گئے۔ دھوپ کی تمازت بڑھ گئی تھی اور سائے میں بھی آدمی کو بے چینی محسوس ہوتی تھی۔

"ہماری مرسیڈیز تو وہ سامنے کھڑی ہے جیلانی! وہ دیکھ۔ بھتیجے نے اس کی صورت ہی بدل دی ہے۔"

میں نے دائیں ہاتھ برآمدے میں نظر ڈالی تو میں نے وہ گاڑی دیکھی جس طرف آبی اشارہ کر رہا تھا۔ "تو نے کیسے پہچان لی یہ گاڑی۔ اس کا تو نمبر بھی بدل چکا ہے۔"

"ہاں! اور یہی ہم نے بھتیجے سے کہا بھی تھا۔ بس اسے لے کر ساہیوال کی طرف نکل چلتے ہیں۔ پیدل کہاں خراب ہوتے پھریں گے۔" آبی اُٹھ کر گاڑی کا معائنہ کرنے لگا۔ میرے ذہن میں ایک بار پھر دھائیں دھائیں ہونے لگی۔ مجھے وہ گالیاں یاد آ رہی تھیں جو ہوٹل میں گاہکوں کے منہ پر تھیں۔ وہ قاتلوں کو بے نقط سُنا رہے تھے۔ آبی گاڑی دیکھ کر جلدی ہی واپس آ گیا، بولا۔ "یار! کام اس نے بہت عمدہ کیا ہے ٹیوننگ شیوننگ بھی کر رکھی ہے اس نے۔ وہ چھوکرا بتا رہا ہے کہ بھتیجا روز ہمارا انتظار کرتا ہے۔"

"اور کچھ نہیں بتایا اس نے مزدا کے بارے میں کیا کہتا ہے وہ؟"

"اسے کچھ پتہ نہیں! مستری آئے تو پتہ چلے۔"

"وہ باتیں سنی تھیں تم نے ہوٹل میں بیٹھے گاہکوں کی؟"

"ایسے ہی بکواس کر رہے تھے وہ! میں نے دھیان بھی نہیں دیا۔"

"میرا خیال ہے کہ اخبار میں خبر کل چھپے گی؟"

"ہاں! ہم نے اُن کو "کرش" کرنے میں کچھ دیر لگا دی ــ خبر چھپوانی ہو، تو آدمی کو چاہیے کہ واردات شام کے آٹھ بجے تک کر ڈالے، ورنہ پھر مشہوری میں دیر لگ جاتی ہے۔" آبی بڑی ڈھٹائی سے مسکرا رہا تھا۔ اس نے اپنے لیے سفید براق شرٹ، اور سفید پتلون کا انتخاب کیا تھا اور اب وہ مجھے کرکٹ کا کھلاڑی نظر آ رہا تھا۔ بُوٹ بھی اس نے سفید خرید لیے تھے۔ میں البتہ کُرتا شلوار پہنے ہوئے تھا۔ اور میرا چپ شاہ

بنیان کے نیچے کمر کے ساتھ بندھا تھا، اور میں نے اس کے سارے خانے کسی کے نام کی گولیوں سے لبالب بھر لیے تھے۔

کچھ ہی دیر بعد بھجا ورکشاپ میں داخل ہوا۔ وہ گاڑی میں واپس آیا تھا۔ ہمیں دُور ہی سے دیکھ کر اُس نے گاڑی روکی اور دوڑتا ہُوا ہمارے پاس آ پہنچا۔

"یار آبی سیٹھ کہاں چلے گئے تھے آپ! المبی ڈز دیدی مجھے آپ نے۔"

"کہیں الگ بیٹھ کر ہم سے بات کرو مستری جی اپنے حجرے میں چلو۔"

آبی نے اُس کے دونوں ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ وہ معاملے کی نوعیت کو سمجھا تھا۔ ہمیں فوراً ہی ورکشاپ سے ذرا دُور ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گیا۔ جب ہم اطمینان سے بیٹھ چکے تو وہ بولا۔

"آبی سیٹھ! وہ بدمعاش مزدا کا مالک آ گیا تھا۔ ہم نے کہہ دیا گاڑی نہیں ہے چوری ہو گئی ہے وہ بہت چیخا چلایا۔ دھمکی دینے لگا۔ ہم بہت پریشان ہوئے۔ اپنی ایک فیئٹ اُسے دی اور ساتھ بیس ہزار بھی دیا، تب جا کر اُس نے جان چھوڑی۔ ہم کو چالیس ہزار کی چپت پڑ گئی آبی سیٹھ! بہت گندہ کیا تم نے۔"

"مجھے افسوس ہے مستری جی! بہت افسوس ہے۔ یہ لو یہ چالیس ہزار رکھو۔ یہی ہے اس وقت میرے پاس، اور وہ گاڑی ہمیں دے دو۔ وہ مرسڈیز۔" آبی نے اپنی جیب سے سارے نوٹ نکال کر بھجے کے آگے دھر دیے۔

وہ ایک دم خوش ہو گیا، بولا "تم معاملے کا کھرا آدمی ہو سیٹھ۔ پر ہم دھوکا نہیں دیں گا۔ وہ فیئٹ ہم نے خود کھڑی کی تھی۔ کل دس ہزار ہمارا اُس پر لگا تھا۔ بس ہمیں تم پینتیس ہزار دے دو بہت کافی ہے۔"

"چلو یہی سہی۔ ہماری گاڑی تیار ہے نا؟" آبی نے پانچ ہزار واپس جیب میں ڈال لیے۔

"ہاں! ایک دم تیار۔ چھوکری مافق تیار۔ نئیں نکور ہو گئی ہے۔" وہ اچھل کر اٹھا اور بولا "میں نے اس میں نئی بیٹری رکھ دی ہے، روز چلاتا ہوں میں اُسے۔ نمبر پلیٹ کاغذ واغذ سب بدل دیا۔ کوئی لاٹ کا بچہ تمہیں پوچھ نہیں سکتا۔ ٹوکن بھی دے دیا۔ ایک دم سارے جھگڑے سے خلاص۔"

ہم نے گاڑی ورکشاپ سے نکالی اور اس کی ٹینکی پوری طرح بھروا کر اسی انارکلی جا پہنچے۔ گاڑی سٹی ہوٹل سے ذرا دور کھڑی کر کے ہم ہوٹل کے سامنے والی ایک گھڑیوں کی دکان میں جا ٹھہرے۔ اُس وقت پونے گیارہ بج رہے تھے۔ گھڑیاں ہم دونوں کے پاس موجود تھیں مگر دونوں ہمیں پرانی نظر آتی تھیں۔ اس دکان سے ہم نے نئی گھڑیاں خرید کر باندھیں اور پرانی بریف کیس میں ڈال لیں۔ آبی کی گھڑی چھ سو میں ملی اور مجھے اس نے آٹھ سو والی خرید کر دی، بولا "وقت بڑی قیمتی شے ہے برادر! اور آدمی کے پاس گھڑی، گھوڑی اور گھڑا ہمیشہ نئے ہونے چاہئیں۔"

"گدھی کا ذکر نہیں کیا تم نے؟"

"اُس کی قدر صرف پنڈی کے راجہ ہی کر سکتے ہیں۔"

آبی نے یہ کہہ کر سٹی ہوٹل کے دروازے پر نظر ٹکا دی۔ ہمیں انور کا انتظار تھا۔ گیارہ بجنے میں ابھی پانچ منٹ باقی تھے کہ ہمیں انور نظر آیا۔ وہ سائیکل بھگاتا ہُوا وہاں پہنچا تھا۔ اس نے سائیکل مقفل کر کے ایک طرف کھڑی کی۔

آبی نے کار کی چابیاں مجھے دے دیں، بولا "تم تو خود کار میں بیٹھو میں اُسے لے کر ابھی آتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ بازار کی بھیڑ کو چیرتا ہوا ہوٹل میں جا گھسا مگر کوئی دو منٹ بعد ہی وہ واپس آ گیا۔ میں ابھی تک وہیں کھڑا تھا۔ وہ مجھے دیکھے بغیر کار کی طرف بڑھا تو میں نے دیکھا کہ انور بھی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ بازار میں اس وقت اتنا اژدہام تھا کہ کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ میں دکان سے نکلا اور اُس بھیڑ کو چیرتا ہوا آبی سے پہلے کار میں جا بیٹھا۔

جب ہم گاڑی کو انارکلی سے نکال کر مال روڈ پر پہنچے تو آبی نے گاڑی جناح باغ کی طرف موڑ دی۔

"کیا خبر لائے ہیں انور صاحب!" میں نے پوچھا، مگر آبی عقب نما آئینے میں گھور رہا تھا، بولا۔

"ذرا پیچھے دیکھو، کوئی ہمارا تعاقب تو نہیں کر رہا؟"

"تجھے وہم ہو گیا ہے یار! کسی کو کیا پتہ ہے کہ کار کس کی ہے؟"

میں نے اُسے تسلی دی۔

"ہاں دُنیا کی جو فطرت ہے تجھے کیا معلوم! ہاں انور بھائی کیا خبر لائے ہو؟"

"میری تو سائیکل ہی وہاں رہ گئی انارکلی میں۔ میں اپنی ہی پریشانی میں مبتلا تھا۔"

"ابے وہ کونسی کیڈلک ہے! دو سو کی نئی لے دوں گا میں تجھے ہمیں بتا تُو نے وہاں کیا دیکھا؟" آبی نے اُسے کاٹتے ہوئے کہا۔

"میں جب وہاں پہنچا آبی صاحب تو میں نے دیکھا کہ وہاں لوگوں کی بھیڑ لگی تھی۔ میں بھی اُن میں شامل ہو کر اندر چلا گیا۔ یوں نظر آتا تھا جیسے وہ گھر کھنڈر ہو چکا ہے۔ اُس کے تین کمرے جل چکے تھے اور فائر بریگیڈ کے لوگ ابھی تک ادھر اُدھر پانی ڈال رہے تھے۔"

"اچھا! وہ لوگ آگ بجھا چکے تھے جب تم وہاں پہنچے؟"

"ہاں! پولیس بھی اندر موجود تھی۔ تین سپاہی اور ایک تھانیدار۔ لوگوں کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ ڈاکوؤں نے وہاں صبح اذان سے پہلے حملہ کیا اور وہاں سے تین عورتوں کو اٹھا کر لے گئے۔"

"کوئی مرد نہیں تھا گھر میں؟"

"نہیں۔ پچھلے ہمسائے کی دو بوڑھی عورتیں بھی وہاں کھڑی تھیں

انہوں نے اُن کی طرف بھی دیوار پھاڑ دی اور دو آدمی اس راستے سے ہو گئے۔"

"اچھا! پھر؟"

"ایک آدمی بتا رہا تھا کہ جب اُس نے ایک عورت کی چیخ سُنی سڑک پر رُک گیا۔ وہ اس وقت مسجد کی طرف جا رہا تھا۔ اُس نے اس کے دیکھتے دیکھتے آٹھ آدمی اس مکان سے نکلے۔ وہ تین عورتوں کو کندھوں پر اُٹھائے ہوئے تھے۔ اُن کو باہر لا کر انہوں نے کار میں ڈالا اور بھاگ نکلے۔ چار آدمی ایک اور کار میں بیٹھ گئے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ وہ سب بندوقوں اور پستولوں سے مسلح اور انہوں نے منہ پر سیاہ نقاب سے ڈال رکھے تھے۔ وہ ایسے نقاب جن میں اُن کا سر منہ گردن تک چھپے تھے۔ ایک صرف اُن کی آنکھیں ہی نظر آتی تھیں۔"

"اچھا، پھر؟"

"پھر کیا آبی صاحب وہاں تو قیامت مچی تھی۔ میں نے سب لوگوں کی باتیں بڑے غور سے سنیں۔ ایک آدمی نے تو مجھے بڑی تفصیل سے سب کچھ بتایا۔ وہ میرا دوست بن گیا۔ اُس نے مجھے مکان سے باہر لا کر ایک دکان سے کوکا کولا بھی پلایا اس کا نام پرویز ہے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ وہ اسی محلے میں رہتا ہے مگر ایسی دلیری آج تک کسی نے نہیں دکھائی۔ ڈاکو ڈنکے کی چوٹ پر عورتوں کو اٹھا کر لے گئے۔ گھر کا بھی وہ صفایا کر گئے ہوں گے۔"

"اچھا! اور اُس پرویز سے تمہاری دوستی ہو گئی۔ اور کیا کہا اُس نے؟"

"وہ مجھے کالج میں میرے کمرے تک چھوڑنے آیا تھا آبی صاحب! بہت ہی اچھا آدمی ہے وہ۔ کہہ رہا تھا کہ وہ دو سو باون نمبر کوٹھی میں رہتا ہے۔ بڑی محبت دکھا رہا تھا وہ بے چارہ مجھ سے۔"

"ہاں! تمہاری عمر بھی تو ابھی محبت کے لائق ہے بچے! بڑے کام آ سکتا ہے وہ تم سے۔" آبی نے جل کر کہا۔ وہ انور کوئی مکھی اپنے ساتھ لگا لایا تھا۔

انور تپ سا گیا۔ بولا "یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ! وہ بہت ہی شریف آدمی تھا جناب! اس کے پاس بی ایس سی کے نوٹس بھی ہیں، مجھے دے دے گا۔"

"ہاں کیوں نہیں! وہ تمہیں بندے جھمکے اور چوڑیاں بھی بنوا دے گا۔ ابے! وہ بھی ڈاکوؤں کا ساتھی ہوا تو پھر؟ پھر کیا ہو گا؟"

"خواہ مخواہ ہی! ایسا پھاڈی آدمی نہیں تھا وہ جناب! میں لوگوں کے چہرے پہچان سکتا ہوں۔"

"کیوں نہیں! کیوں نہیں! تیرے باپ دادا پولیس میں رہ کر ہی سیکھے ہیں نا۔" آبی بہت غصے میں تھا۔ اس نے باغ جناح......

کے اندر گاڑی لے جانے کے بجائے اُس کا رُخ گورنر ہاؤس کے قریب سے گزر کر ڈیوس روڈ کی طرف موڑ دیا، بولا "چل انور میں تجھے ابھی اپنے گاؤں لے چلتا ہوں۔ وہ رقم ہے تیرے پاس؟"

"ہاں! میری جیب میں دھری ہے یہ دیکھیں۔" اُس نے نوٹ جیب سے نکال کر آبی کو دکھلائے۔

"بس ٹھیک ہے یہ رقم تو میری والدہ کو دے کر فوراً واپس آ جا۔ میں کچھ ہی دیر بعد تجھے انارکلی لے آؤں گا اپنی سائیکل پھر وہاں سے لے لینا۔"

"مگر وہ تو وہاں لاوارث پڑی ہے کسی کی ذمے داری میں تو نہیں ہے آبی صاحب۔"

"تالا تو لگا دیا تھا نا۔ بس وہی کافی ہے۔"

انور کا چہرہ لٹک سا گیا، ایک لمحے کے لیے اُس نے آگے جھک کر آبی کا چہرہ دیکھا، پھر بولا "وہ گھر نہیں دیکھا آپ نے جو رات ڈاکوؤں نے جلا کر وہاں کی عورتوں کو اغوا کر کے لے گئے ہیں۔"

"وہ بھی کوئی تم ایسا ہی ہو گا جو چڑھ دوڑا رات اس گھر پر۔ وہ عورتیں پاکستان میں ہوں گی ایکسپورٹ تو نہیں ہو گئی ہوں گی۔" آبی نے کار کا رُخ اب اپنے گاؤں کی طرف موڑ دیا۔ نظر اُس کی عقب نما آئینے پر جمی تھی۔ اور مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ مطمئن نہیں ہے۔ انور نے جس آدمی کو اپنا کمرہ دکھایا اور جس سے اُس نے اتنی ساری باتیں کر لی تھیں، اُس کا حدود اربعہ خدا معلوم کیا تھا۔ کسی کا یوں کسی اجنبی سے اس قدر اچانک کُھل جانا نہ میری سمجھ میں آتا تھا نہ آبی ہی اس کی غرض و غایت کو سمجھ پا رہا تھا۔

میں نے دو تین بار پیچھے نظر ڈالی مگر سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہی نظر آ رہا تھا۔ ہمارے پیچھے کوئی بھی نہیں تھا بس تانگے ریڑھے۔ موٹر سائیکل اور کاریں تو سڑکوں پر چلتی ہی رہتی ہیں۔ ہم چونکہ اپنے ہی ضمیر کے مجرم تھے اس لیے ہمیں اپنے ہی سائے سے خوف محسوس ہوتا تھا۔

آبی کا گاؤں ابھی کافی دُور تھا۔ اُس نے کار بائیں ہاتھ اُس بھٹے کی طرف موڑی جہاں میں نے دلجلی خان چوکیدار کے حجرے میں ایک رات آبی کے ساتھیوں کو جمع دیکھا تھا تو میرے ذہن میں اس رات کی کئی یادیں تازہ ہو گئیں۔

اچانک انور بول اٹھا "آبی صاحب! یہ کار آپ کی ہے؟"

"یہ کار؟ نہیں بھئی یہ میرے دوست ہیں نا ہاشم صاحب یہ ان کی کار ہے۔"

"کیا کام کرتے ہیں یہ؟"

"یہ... یہ بہت بڑے زمیندار ہیں سرگودھا ضلع میں ان کی بہت زمینیں ہیں۔"

"اور آپ کا اپنا کیا شغل ہے آج کل؟"

"میرا؟ میں نے ان سے چار مربعے ٹھیکے پر لے رکھے ہیں آج کل۔

بس یہی دھندا ہے میرا۔" آبی نے کہا اور پھر اُس نے کار کی رفتار ایک دم مدھم کر دی۔ کچی سڑک پر آگے پیچھے دو بیل گاڑیاں یوں کھڑی تھیں جیسے کسی نے سڑک بند کر دی ہو۔ وہ بیل گاڑیاں ہم سے بس کوئی سو ہاتھ دُور رہ گئی ہوں گی کہ آبی نے ایک جھٹکے سے گاڑی روک کر اس کا رُخ پیچھے کی طرف موڑ دیا۔ مگر ابھی وہ گاڑی سیدھی نہیں کر سکا تھا کہ دائیں ہاتھ درختوں کے جھنڈ میں سے ایک جیپ نکلی اور سڑک کے عین بیچ میں آڑی ترچھی آ کھڑی۔ اُس میں پولیس کے سپاہی بیٹھے تھے۔ اور اُس کی اگلی نشست پر ڈرائیور کے جو آدمی بیٹھے تھے اُن میں سے ایک کو دیکھتے ہی انور چیخا۔

"ارے یہ تو پرویز صاحب ہیں یہ یہاں کیا کر رہے ہیں؟"

"تمھاری ماں کو رو رہے ہیں یہ۔ ہزار لعنت تیری شکل پر۔"

آبی نے یہ کہہ کر کار کو بلاخیز رفتار سے اُس جیپ کے پہلو سے گزارنے کی کوشش کی۔ وہ پلک جھپکنے میں آگے نکلا تو جیپ میں سے بیک وقت کئی گولیاں کار پر برس گئیں مگر آبی کے سر پر تو جنون سوار تھا۔ اُس نے کار کو ستر اسی میل کی رفتار سے آگے نکالا اور پھر وہ بڑی سڑک پر پہنچتے ہی جلو موڑ کی طرف روانہ ہو گیا

ہم بدترین صورت حال سے دوچار ہو چکے تھے۔ انور کی حماقت ہمیں لے ڈوبی تھی۔ پولیس کی جیپ سے پہلی تین گولیاں گاڑی کی باڈی پر لگیں مگر شیشے بچ گئے تھے۔ دُوسری بوچھاڑ تک آبی کار کو بہت آگے نکال چکا تھا اور اب وہ اسی نوّے میل کی رفتار سے کار کو جلو موڑ کی طرف اُڑا رہا تھا۔ پولیس کی جیپ بھی ہمارے پیچھے لپکی چلی آ رہی تھی مگر کچھ ہی دیر بعد ہمیں محسوس ہُوا کہ ہمارے تعاقب میں ایک نہیں، دو جیپیں دوڑ رہی تھیں۔

"اِس کو پھینک دے گاڑی سے باہر، اِس چرنے کو۔ اِس کی حماقت نے ہمیں تباہ کر دیا ہے۔"

وہ دہشت سے ہنس رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ پولیس کی دونوں جیپیں نئی تھیں اور اُن کی رفتار کسی طرح بھی ہماری رفتار سے کم نہیں تھی۔ ہم شاید کلومیٹر کے حساب سے دوڑ رہے تھے تو وہ میلوں کا فاصلہ ہوا چاک رفتار سے طے کر رہے تھے۔ ایک آندھی تھی جو ہم دونوں کے ذہنوں کو مفلوج کرتی جا رہی تھی۔ ہماری گردنوں پر بہت سے لوگوں کا خون تھا بڑے سنگین الزامات تھے ہمارے سر۔ پولیس ہمارے خون کا بھاؤ ایک عرصے سے پوچھتی پھرتی تھی اور اب ہم دونوں اُن کے نرغے میں تھے۔

بی آر بی نہر عبور کر کے آبی نے گاڑی بائیں ہاتھ موڑی — اور اب وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ اس کی تمام تر کوشش یہ تھی کہ وہ جس قدر جلدی ہو سکے پولیس کی بندوقوں کی زد سے نکل جائے کیونکہ ہمیں معلوم تھا کہ وہ سب کے سب مسلح ہیں۔ اُن کی زد میں آنے کی دیر تھی وہ ہمیں ہمارا نام نسب پُوچھے بغیر قتل کر دیتے۔ وہ اس معاملے میں قطعی آزاد تھے۔ ہم ابلیسوں کی جان لینا اُن کے لیے ایسی صورت حال میں بھی آسان تھا جیسے زمیندار اپنی فصلوں میں پھرتے سوروں کو ہلاک کرنے میں حق بجانب ہوتے ہیں۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟ پتہ ہے یہ راستہ کدھر جاتا ہے؟"

"جہنم کی طرف۔ مگر میں اُن کے نرغے سے ہر قیمت پر نکل جانا چاہتا ہوں۔" آبی نے غراتے ہوئے کہا۔

انور کا رنگ ہلدی ہو چکا تھا۔ وہ پچھلی نشست پر میرے قریب بیٹھا بُری طرح لرزنے لگا تھا۔ اس کے مُنہ سے بات نہیں نکل رہی تھی۔ پولیس کی دونوں جیپیں اس سڑک پر چڑھنے تک تو ہم نے اپنے پیچھے دیکھیں مگر پھر دُوسری جیپ ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ وہ شاید خراب ہو گئی تھی۔ آبی کی نظریں عقب نما آئینے پر جمی تھیں۔ اب ایک ایک لمحہ بہت قیمتی تھا، بے حد قیمتی تھا۔ اس کو ہم اونچی سے اونچی بولی پر خرید لینا چاہتے تھے۔

مجھے افسوس یہ تھا کہ میری اسٹین گن فرخندہ کے کمرے ہی میں رہ گئی تھی۔ وہ میرے پاس ہوتی تو بھی ایک بات تھی۔ آبی کی جیب میں بھی صرف ایک ننھا سا پستول تھا۔ وہ بہت کاری تھا مگر اتنی دُور سے تو ہم پولیس کو بے اثر نہ کر سکتے تھے۔ اور وہ ہم پر چڑھے چلے آتے تھے۔ ہماری مرسیڈیز اُن کچی سڑکوں کے لیے نہیں بنی تھی۔ مگر اُن کی جیپ ہر جھٹکا برداشت کرتی چلی آ رہی تھی۔

سڑک کا وہ حصّہ جس پر اب ہم چل رہے تھے، کچھ زیادہ ہی خراب تھا۔ نہر کی وہ پٹری ہمیں بہت پریشان کر رہی تھی۔ آبی نے ایک بار پھر پیچھے دیکھا اور گاڑی کو دائیں ہاتھ کے بیلے پر ڈال لیا۔ گاڑی دُھول اُڑاتی ہوئی فصلوں کے بیچوں بیچ گزرتے اس راستے پر دوڑنے لگی تھی۔

میں نے اندازہ لگایا کہ ہمارے اور جیپ کے درمیان فاصلہ کم ہو رہا ہے۔ اچانک سامنے سے ہمیں دائیں ہاتھ کے کھیتوں میں اُدھر گندم کی تا کمر اونچی فصل کی اوٹ میں سے ایک جیپ نظر آئی۔

"لو یہ لوگ تو اِدھر سے نکل آئے، یہ دُوسری جیپ ہے آبی۔"

"ہاں! اس گامڑ کو ان کے آگے ڈال دے، یہ مہرے گا اُن کا، طرح کا دار۔ ہر کام کے لیے موزوں ہے اُن کے لیے یہ......"

"میرا کیا قصور ہے آبی صاحب! مجھے کیوں گالی دیتے ہو۔"

"بک نہیں اوئے! میں تمھیں گولی مار دوں گا کتے کی دُم۔"

آبی نے بہت ہی بھنّائے ہوئے لہجے میں کہا۔ پولیس کی جیپ سامنے سے پوری رفتار سے ہماری طرف بڑھ رہی تھی۔ آبی شاید پاگل ہو گیا تھا۔ اُس نے پچھلی جیپ بھی عقب نما آئینے میں دیکھ لی تھی۔ وہ بھی قریب ہوتی جا رہی تھی۔ بائیں ہاتھ گنّے کا کھیت تھا۔ آبی اُن میں رہتی بستی ہوئی جان کو بچانے کے لیے کار گنّے کے کھیت میں دھنسا کر اندھا دُھند آگے نکلا۔ ہم اس وقت کھیت کے وسط میں پہنچ چکے تھے کہ گاڑی ایک دم بند ہو گئی۔ آبی نے سٹارٹ کرنے کی کوشش کی مگر اُس نے صاف جواب دے دیا۔ پاگلوں کی طرح آبی گاڑی سے نکلا اور چیخ کر بولا۔

"اوئے انور تو اندر بیٹھا رہ — میرے یار میری ماں کو کچھ نہیں بتانا ورنہ میں تیرا قیمہ کر دُوں گا۔ باہر آ اور دیکھ یہ روپے اُسے ہر حال پہنچا دینا۔"

انور کی رگوں میں تو شاید لہو منجمد ہو چکا تھا۔ اُس کی آنکھیں یوں پھیلی تھیں جیسے وہ اپنے خانوں سے باہر نکل پڑیں گی۔ میں نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور آبی کے ساتھ گنّوں میں گھستا ہُوا آگے چل دیا۔ اب ہم دونوں پوری رفتار سے دوڑ رہے تھے۔ اپنے اپنے بریف کیس ہم دونوں نے گاڑی سے نکال لیے تھے۔

اچانک ہمیں پیچھے سے گولیاں چلنے کی آوازیں سُنائی دیں۔ پولیس والوں نے ہماری گاڑی کو دیکھ کر دُور سے اس پر فائر کھول دیا تھا۔ انہیں گنّوں میں نظر آ رہا ہو گا۔ کوئی دس منٹ تک ہم اس کھیت میں بھاگتے رہے۔ اب محسوس مجھے یہ ہو رہا تھا کہ وہ کار تک پہنچ کر صورت حال سمجھ چکے تھے اور ایک دوسرے کو پکار پکار کر پھیل جانے کے لیے کہہ رہے تھے۔ آبی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا بڑے ہی کربناک لہجے میں بولا۔

"جیلانی! شاید تیری میری زندگی ایک ساتھ ختم ہونے کو ہے۔"

وہ اب میرے ساتھ ساتھ بھاگ رہا تھا۔ ہم دو گن کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رکھتے تھے۔ ناممکن تھا کہ اتنے سارے سپاہیوں سے ہم بچا رکھا سکتے۔ کوئی صورت باقی نہیں رہ گئی تھی۔

"مجھے افسوس ہے آبی! میں یہ نہیں چاہتا تھا۔"

اچانک گولیوں کی بوچھاڑ ہمارے چاروں طرف پھیل گئی۔

"نہیں افسوس مت کر۔ میں کسی مرد کے ساتھ ہی مرنا چاہتا تھا۔ بہت اچھا ہے جیلانی! میں مر گیا تو یاد رکھنا میں تجھے بہت چاہتا تھا۔ تیری پوجا کرتا ہوں۔" وہ بُری طرح ہانپ رہا تھا۔ گنّے کا کھیت بہت گھنا تھا اور ہماری رفتار بڑھنے نہیں دیتا تھا۔ وہ نہیں کہاں تک پھیلا ہوا تھا۔ گولیوں کی ایک اور بوچھاڑ کھیت میں گونجی۔ وہ ابھی تک ہمارے پیچھے تھے۔ اور اُن میں سے کوئی بھی ہم سے آگے نہیں نکل سکا تھا۔ کھیت میں حبس کی وجہ سے ہمارے بدن پسینے میں بھیگ گئے تھے۔ حالت ہماری یہ تھی کہ ہمیں وہ اپنے بریف کیس بھی بہت بھاری معلوم ہوتے تھے۔

ایک جیپ کے انجن کی آواز ہمیں پھر سے دہلانے لگی۔ وہ کھیت کے دائیں ہاتھ سے ہو کر شاید اس سمت جا رہے تھے جدھر ہم آگے نکلنا چاہتے تھے۔ ہم کوئی بیس منٹ تک اندھا دُھند اس کھیت میں دوڑتے رہے۔ میں بھی آدھے بازو کی بشرٹ پہنے ہوئے تھا۔ گنّے کے تیز نوکیلے پتوں نے ننگے بازو زخمی کر دیے تھے۔ اور اُن زخموں پر پسینہ لگنے سے درد کی ٹیسیں اُٹھنے لگی تھیں۔

اب ہم کھیت کے دُوسرے کنارے کے قریب پہنچ چکے تھے۔ ایک جگہ آبی نے مجھے روک کر کہا۔ "یہاں ٹھہرو میں دیکھتا ہوں، وہ بدمعاش کس طرف ہیں۔" اور پھر وہ بڑی احتیاط سے چلتا ہوا کھیت کے کنارے جا پہنچا اور دونوں طرف کھیت میں سے سر باہر نکالے بغیر دیکھتے ہوئے دبی آواز میں بولا۔ "آ جا بھئی! جو اللہ کو منظور۔"

اس کی یہ بات سنتے ہی میں اس کے پاس جا پہنچا۔ اس کھیت کے سامنے گندم کی فصل کھڑی تھی اور پولیس کی جیپ کھیت کی نکڑ پر ہماری تاک میں تھی۔ وہ بڑا ہی جان لیوا لمحہ تھا۔ اس ایک لحظے کی غفلت ہمیں چھری تلے دے سکتی تھی۔ پولیس کے سپاہی بہت چوکنے تھے۔ وہ کوئی بھی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھے۔ انہیں معلوم تھا ہم کون ہیں۔ ہماری گولیوں کی تیزی بھی وہ دیکھ چکے تھے اور شاید یہی وجہ تھی کہ بڑی احتیاط سے ہمیں نرغے میں لینے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر ابھی تک اُن میں سے کوئی بھی اپنی وردی کو اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے پر آمادہ نہیں ہوا تھا۔ وہ حساب کتاب میں مصروف تھے۔

"کیا کریں، نکل چلیں آگے؟"

"وہ ادھر بندوقیں تان کر کھڑے ہیں آبی!"

"دیکھی جائے گی، آؤ۔" اس نے قدم آگے بڑھایا۔ مگر میں نے اُسے پیچھے کھینچ لیا۔

"یوں خودکشی نہ کر آبی! ذرا دم لے دیکھ وہ کیا کرتے ہیں۔"

"تو اسٹین گن وہاں کیوں چھوڑ آیا۔ میں ان سب کو بھون دیتا۔" وہ تلملا کر اپنا پستول بار بار چوم رہا تھا۔

جیپ کے انجن کی آواز پھر ابھری، اب اس کا رُخ ہماری طرف تھا۔ وہ لوگ کھیت کے کنارے کنارے آگے بڑھتے آ رہے تھے۔ چند ہی منٹ بعد ہمیں جیپ نظر آئی۔ اس کے اندر صرف ایک تھانے دار اور ایک ڈرائیور موجود تھا۔ سپاہیوں کو وہ اِدھر اُدھر پھیلا کر کھڑا کر کے آئے تھے۔ پچھلے حصے کے پردے اُٹھے ہوئے تھے۔ اور وہاں کوئی سپاہی موجود نہیں تھا۔ ہم گنّوں کے ایک بڑے پولے کے پیچھے کھڑے تھے۔ تھانیدار پستول ہاتھ میں لیے بہت چوکنا بیٹھا تھا — جیپ ایک قدم آگے نکلی تو میں نے آبی کا ہاتھ چھوڑا اور ایک لحظے کے ہزارویں حصے میں بجلی ایسی تیزی سے جیپ کے پچھلے حصے میں کود کر جا چڑھا اور جاتے ہی پستول ڈرائیور کی گدّی پر رکھ کر تھانیدار کی رگ احساس

مسل دی۔ وہ ایک دم جھول کر ڈیلیش بورڈ سے ٹکرایا۔

"گاڑی روک دے بھئی!" ڈرائیور میری آواز سُن کر مفلوج سا ہو گیا۔ اس نے فوراً گاڑی روک لی۔ عین اس وقت ایک سنسناتی ہوئی گولی آئی اور میرے دائیں کندھے کے اوپر سے نکل گئی۔ وِنڈ اسکرین میں سوراخ ہو گیا تھا۔ آبی نے جیپ کے اندر کی صورتِ حال دیکھی تو وہ اچھل کر اس بے ہوش تھانیدار کے ساتھ آ بیٹھا۔

گاڑی دائیں ہاتھ موڑ۔" میں نے ڈرائیور کو للکارا۔ جونہی اس نے گاڑی کا رُخ بدلا۔ کئی گولیاں جیپ کے اندر سے گزر گئیں۔ آبی نے تھانیدار کو تھم کر کے سیٹ کے اگلے حصے میں ڈالا اور ڈرائیور کو پوری قوت سے دھکیل کر اس نے باہر پھینک دیا۔ جیپ ذرا دیر کے لیے ڈگمگائی مگر آبی نے فوراً ہی اسے سنبھال لیا۔ اب اسٹیئرنگ اس کے ہاتھ میں تھا۔ اور وہ جیپ کو گندم کے کھیت میں سے بلا خیز رفتار سے آگے بڑھا رہا تھا۔ میرا سارا وجود اٹک کر رہ گیا تھا۔ جیپ کی رفتار کا میں اندازہ ہی نہیں لگا سکا۔ وہ ہوا میں اُڑی جا رہی تھی۔ بہت سی گولیاں سپاہیوں کی بندوقوں سے نکل کر ہماری طرف لپکیں مگر ہم لحظہ بہ لحظہ اُن کی دسترس سے دُور ہوتے جا رہے تھے۔

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ پولیس کی دُوسری جیپ میں اِدھر اُدھر بکھرے سپاہی بیٹھ رہے تھے اور پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ ہمارے پیچھے لپکی لیکن اس عرصے میں ہم کوئی دو فرلانگ آگے نکل چکے تھے۔ گندم کا کھیت ختم ہوا تو سامنے بنجر زمینوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ پولیس کی جیپ ابھی تک ہمارے تعاقب میں تھی، مگر اب ہمارے کسی جگہ رک جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ آبی ہر شے سے بے نیاز اور سمتوں کے احساس سے عاری ہو کر جیپ کو بلا خیز رفتار سے اس ریگزار بنجر زمین پر دوڑا رہا تھا۔ پولیس کی جیپ اب ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو چکی تھی۔

"یار کسی جگہ رُک کر راستہ تو دیکھ لے۔"

ابھی میں یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ دائیں ہاتھ سے ایک جیپ ہمیں اپنی طرف بڑھتی نظر آئی۔ میری تو جان ہی نکل گئی۔ میں سمجھا تھا کہ وہ پیچھے رہ گئے ہیں۔ جو اپنی تلواریں صیقل کر کے ہمارے پیچھے لگے ہیں مگر نہیں، وہ ابھی تک ہمارے تعاقب میں تھے۔ آبی نے اس جیپ کو دیکھتے ہی اپنی رفتار ایک بار پھر تیز کر دی۔ یہ بلّی چوہے کا کھیل کوئی آدھ گھنٹے تک جاری رہا۔ آبی کسی حالت میں بھی اس جیپ کو اپنے قریب آنے کی اجازت نہیں دے رہا تھا کیونکہ اُس میں بیٹھ کر تو ہماری موت ہمارا تعاقب کر رہی تھی۔ ہم کوئی تین فرلانگ آگے نکلے تو مجھے محسوس ہوا کہ ایک اور جیپ بائیں ہاتھ سے ہماری طرف بڑھتی چلی آ رہی ہے اور اس کا رنگ کچھ عجیب سا دکھائی دے رہا تھا۔ آبی کو میں نے کہا بھی کہ اس صورتِ حال پر غور کرے مگر وہ کچھ بھی سننے پر آمادہ نہیں تھا۔

کچھ ہی دیر بعد ہمیں ایک پختہ ہموار سڑک نظر آئی۔ آبی نے اسے غنیمت سمجھ کر جیپ اس پر چڑھا دی۔ اب وہ ایک بار پھر ہموار سڑک سے فائدہ اٹھا کر گاڑی کی رفتار آخری ہندسے تک پہنچا رہا تھا مگر وہ جیپ جس کا رنگ مجھے کسی حد تک جگہ جگہ سے سرخ نظر آ رہا تھا، ہماری سمت میں متوازی ہو کر دوڑنے لگی اور پھر اُس جیپ کے پچھلے حصے میں بیٹھے ہوئے دو آدمیوں نے ہماری جیپ پر گولیاں برسائیں۔ دونوں گولیاں جیپ کے ٹائروں پر لگیں اور ہم غش ہو کر رہ گئے۔ دونوں ٹائر پھٹ گئے تھے۔ جیپ ذرا دیر کے لیے خطرناک انداز میں لڑکھڑائی مگر آبی نے اسے سنبھال کر بریک لگا دیے۔

دُوسری جیپ اس ذرا سی فرصت سے فائدہ اٹھا کر ہمارے اوپر آ چڑھی تھی۔ اور۔۔۔ اور ہم یہ دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے کہ اُس جیپ میں سوار تمام سپاہی سکھ تھے۔ اُن کی گاڑی رُکی تو وہ چھوٹی چھوٹی سٹین گنیں لہراتے ہوئے نیچے اُترے۔ وہ تعداد میں آٹھ تھے اور بھارتی فوج کا حصہ نظر آتے تھے۔ میں اور آبی توسن ہو کر رہ گئے۔

اُن لوگوں نے ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔ وہ بہت مشتعل نظر آتے تھے۔ "اوئے یہ تو پاک پولیس کی جیپ ہے۔ کون ہو تم اوئے، اور اسے کیا ہو گیا ہے؟ یہ تو کوئی تھانیدار لگتا ہے ہیں؟" اُن میں سے ایک نے ہم پر پستول تان کر جیپ کے اندر جھانکتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں چپ تھے، اُن کے سوال کا جواب کیا دیتے۔ وہ مدن شنکر کی اولاد ہمیں یوں گھور رہے تھے جیسے ہم کسی اور ہی سیارے کی مخلوق ہیں اور اُن کے دیش کو اجاڑنے کے لیے وہاں جا اُترے ہیں۔ ان کی نظروں سے اُن کا ایسا ہی معلوم ہوتا تھا۔

"اوئے تم بولتے کیوں نہیں ہو۔۔۔ ہتھیار ہیں تمہارے پاس تو ادھر رکھ دو۔" اُن کو بس یہی فکر لگی رہتی ہے کہ کوئی سرحد کے اس پار سے آنے والا ہتھیار بند نہ ہو۔ بیشاب خطا ہوتا رہتا ہے ان کا اسی فکر میں اُن کا۔ ہم دونوں نے بیک وقت اپنے پستول اس شخص کے سامنے کر دیے، نالیوں سے پکڑ کر۔ جو عہدے کے اعتبار سے کیپٹن نظر آتا تھا۔ وہ پستول ہم سے جھپٹ کر بولا۔

"ثابت یہ ہوا کہ تم سُن بھی سکتے ہو، پر ادھر کیا بیساکھی دیکھنے آئے ہو؟"

"نہیں سردار جی! یہ رام باغ کی سیر کے لیے آئے ہیں، دیکھو تو کتنے پیلے ہوئے نظر آتے ہیں یہ دونوں۔"

"اوئے بتاتے کیوں نہیں ہو تم؟ آخر تم ہو کیا شے؟" اس کپتان نے پھر پوچھا۔ وہ اپنی مونچھوں تلے اب مسکرانے لگا تھا۔ ہماری صورتیں شاید اسے مضحکہ خیز نظر آ رہی تھیں۔

جناب یہ میرے دوست ہیں ایس جی ایم پیرزادہ اور میرا نام ترخان مگر ہیں ہم دونوں ہی ہوائی آدمی۔ بس ذرا بے ہوا ہو کر گئے ہیں۔" میں نے اُس سکھ کی مسکراہٹ سے حوصلہ پا کر کہا۔

وہ کھل سا اُٹھا، بولا۔ "یہ ہوائی آدمی کیا ہوتا ہے؟" لہجہ اس کا پنجابی تھا اور بڑا ہی پُرلطف بھی۔

جس کے کوئی پیر نہیں ہوتے ہیں سردار جی! دراصل ہم پولیس کی کراد ھر آ نکلے ہیں اور مروایا میرے اس یار نے ہے مجھے۔ یہ نہیں، بارڈر ہی کراس کر آیا ہے۔"

"راستے میں کسی رینجر والے نے بھی نہیں روکا ہے تمہیں؟"

"کوئی ملا ہی نہیں جی! ہم سمجھے کہ بس "دل کم ہی وِل کم" ہے۔"

پہلی بار منہ کھولا۔ وہ بھی مسکرا رہا تھا۔

"کوئی قتل شتل تو نہیں کر آئے ہو ادھر؟"

"نہیں جی! بہت شریف آدمی ہیں ہم بس ذرا مال شال کی طلب رہتی ہے اور یہ کوئی بُری بات نہیں ہے۔" آبی نے بڑی رسان سے کہا۔

"اور یہ کون ہے؟" اس سردار نے پوچھا۔

"یہ تھانیدار صاحب ہیں، بیچارے ہماری بہت عزت کرتے ہیں دیکھتے ہی آنکھیں بند کر کے سو گئے۔" میں نے اپنے ... پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ جگہ جگہ "پچھ" لگ گئے تھے۔

"یہ سویا تو نہیں، بالکل بے ہوش لگتا ہے مجھے۔"

"ابھی تک روتے روتے سو گیا ہے۔" آبی چہکا۔

"ہاں! سرھانے میر کے آہستہ بولو۔ چلو اوئے لے چلو اِن کو ... بند کر دو۔ یہ تو کوئی بہت بڑے گورو گھنٹال لگتے ہیں۔" سردار ایک دم پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

سپاہیوں نے ہمیں جیپ سے نکال کر اپنی جیپ میں بٹھایا اور وہ سب اسی وقت ہمیں اپنے ساتھ لے کر وہاں سے "مشرقِ بعید" کی طرف چل دیے۔ وہ ہمیں شاید اٹاری لے جا رہے تھے۔ آبی ان کو دیکھ کر یوں مسکرا رہا تھا جیسے وہ اُن سے مِل کر بہت خوش ہُوا ہو۔ وہ سب کے سب سکھ تھے۔ سروں پر اُن سب نے پگڑیاں باندھ رکھی تھیں ... میں کڑے، کچھے بھی انہوں نے پہن رکھے ہوں گے جو اُن کی ... کی وجہ سے نظر نہیں آ رہے تھے۔ ہاں البتہ کرپانیں انہوں نے باندھی تھیں۔ مجھے یقین ہے کہ کنگھے اُن کی پگڑیوں تلے جکڑے ... میں ضرور پھنسے ہوں گے۔ ایک سپاہی آبی کے ساتھ بہت جڑ کر بیٹھا تھا۔ اور میرا خیال ہے کہ وہ ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہو رہا تھا ... پاکستانیوں سے اُس کی ملاقات ہو گئی۔

خدا جانے کیا بات تھی اُن کی گرفت میں آ کر ہم دونوں کچھ ... سے ہو گئے تھے جیسے ہمارے سارے دلدر دور ہو گئے ہوں۔ ... انہوں کے تختۂ دار سے بچ نکلے تھے۔ تھانیدار ابھی تک بے ہوش تھا اور اسے انہوں نے بڑی احتیاط سے جیپ کے فرش پر لٹا دیا تھا۔ اُس کے سر کے نیچے انہوں نے ایک ٹائر رکھ دیا تھا۔ جیپ کئی میل جنوب کی طرف چلی اور پھر میرا خیال ہے کہ اٹاری کے قریب سے گزر کر ہمیں کافی دور عمارتوں کے ایک طویل سلسلے کے اندر لے گئے۔ جیپ رُکی تو چار سپاہیوں نے ہمیں سنگینوں کی زد میں لے کر نیچے اُتارا اور مختلف راستوں سے گزار کر ہمیں ایک ایسے کمرے میں لے گئے جس کے اندر چند لوہے کی کرسیاں ایک بڑی سی میز کے گرد بچھی تھیں۔ ہمارے بریف کیس وہ پہلے ہی کھلوا کر دیکھ چکے تھے میرے بریف کیس میں میری رستم دھری تھی۔ سگریٹ کے چند پیکٹ، میرے کپڑوں کے دو جوڑے اور ضرورت کی کچھ چیزیں بھی اس میں بند تھیں، جو ہم نے انارکلی سے خریدی تھیں۔ ان چیزوں کو اچھی طرح الٹ پلٹ کر دیکھ لینے کے بعد انہوں نے بریف کیس مجھے دے دیا تھا۔ یہی حال آبی کا تھا۔ اس کا بھی بریف کیس انہوں نے اس کے پاس ہی رہنے دیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ سگریٹوں کو تو صاف کر دیں گے یا پھر رقم مجھ سے چھین لیں گے مگر ایسی کوئی بات نہ ہوئی۔ اُن کے کیپٹن دلیپ سنگھ نے البتہ ان چیزوں کی فہرست بنا کر ہم سے اتنا کہا تھا کہ ہم ان چیزوں کو سنبھال کر رکھیں کوئی شے اِدھر اُدھر نہ ہونے دیں اور یہ بڑی اچھی بات تھی۔ سگریٹ کے سارے پیکٹ ایک سپاہی نے اچھی طرح کھول کر دیکھ لیے تھے۔ انہیں یہ ڈر تھا کہ ان پیکٹوں میں ہم نے کوئی بم نہ بند کر رکھے ہوں اپنی طرف سے وہ ساری احتیاطیں بروئے کار لے آئے تھے۔

ہمیں وہاں بٹھا کر سپاہیوں نے اس کمرے کا سلاخ دار دروازہ باہر سے مقفل کیا اور پھر وہ ٹھپ ٹھپ چلتے دور نکل گئے۔ آبی سر جھکا کر چند منٹ تک کسی گہری سوچ میں ڈوبا رہا۔ وہ مجھ سے نظریں نہیں ملا رہا تھا۔ میں نے دو سگریٹ سُلگائے اور ایک اُسے تھما دیا۔ ایک بڑی ہی پھیکی مسکراہٹ اس کے لبوں پر اُبھری، بولا۔

"مجھے افسوس ہے جیلانی! مجھے اندازہ ہی نہ ہو سکا کہ میں جیپ کو کس طرف لیے جا رہا ہوں۔ میں سمجھا کہ میں پاکستان ہی میں ہوں۔"

"یہ بھی پاکستان ہی ہے پیارے! مجھے ایک انگریز شاعر برُوک کی وہ نظم یاد آ رہی ہے جس کا عنوان ہے سپاہی۔ اس نظم میں اس سپاہی نے کہا تھا۔ "اگر میں مر جاؤں تو میرے بارے میں صرف اتنا یاد رکھنا میری جان کہ اس روئے زمین پر کسی جگہ محاذِ جنگ کا کوئی ایسا کونا ہے جہاں میں زخموں سے چُور چُور ہو کر گر گیا وہ جگہ میری جان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے انگلستان بن جائے گی کہ میں وہاں دفن ہوں گا۔"

"تو ٹھیک کہتا ہے جیلانی! کبھی کبھی تو بہت باریک باتیں کرنے لگتا ہے پر تو یہ دیکھ کہ اس چکر میں ہم کہاں سے کہاں آ پہنچے ہیں۔"

"یہ سب تیرے گناہوں کی سزا ہے آبی۔ لگتا ہے کوئی لمبا ہی

گھپلا کیا ہے تو نے۔" یہ کہہ کر میں نے ٹانگیں میز پر پھیلا دیں۔

آبی مسکرایا۔ بولا "مہا گورو تو تم ہو جیلانی! اب تیرے ساتھ وہ میرے بھی چاول چھٹے کر دیں گے۔ ہم بھلے ہی چکر میں پڑ گئے۔"

"تیرا جغرافیہ بہت کمزور ہے آبی! تجھے پاکستان ہندوستان میں کوئی فرق ہی نظر نہیں آیا۔ جیب کی کلی" دباتا ہی چلا گیا۔"

"ادھر کوئی کھائی کھالہ، کوئی دریا سمندر تو بیچ میں حائل نہیں ہے، ہما یاروں نے ایک لکیر ڈال رکھی ہے درمیان میں سے' میں گزر گیا۔"

"اور دشمن دریا برد ہو گئے۔ مگر وہ ہماری جان نہیں چھوڑیں گے۔ گوربانی پڑھایا کریں گے۔"

"گوربانی؟ نہیں یار! کسی مسلمان کو وہ اپنا سبق نہیں پڑھا سکتے، یہ ناممکن ہے۔"

"یہ تم کس طرح کہہ سکتے ہو۔ تمہیں وہ کوئی نہ کوئی ٹیکہ ضرور لگا دیں گے۔ تمہاری شکل ویسے بھی سکھوں سے ملتی جلتی ہے۔" میں نے اس ماتمی فضا کے تکدر کو بدلنے کے لیے آبی کو دلیل کا اڑنگا دیا۔

آبی ہنس دیا، بولا "میرے پاس ایک ایسا پکا نشان اور ایسی پکی مہر ہے جو بدلی ہی نہیں جا سکتی۔ میرے اسلام کو ان سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

"یار یہ رقم انہوں نے ہمارے پاس کیوں رہنے دی۔ اور اس تھانیدار کا کیا کریں گے وہ؟" میں نے اپنا بریف کیس کھولتے ہوئے کہا۔ میرا خیال تھا کہ میں اپنا لباس تبدیل کر لوں۔ اس کمرے کے کونے میں ایک باتھ روم نظر آ رہا تھا۔ اس کے بند دروازے کے پیچھے سے پانی کے قطرے ٹپ ٹپ کسی برتن میں گرتے سنائی دیتے تھے۔

"میرا خیال ہے جیلانی کہ ہمیں اپنا اصل نام پتہ انہیں نہیں بتانا چاہیے ورنہ یہ لوگ ہمیں پاکستان کے حوالے کر دیں گے۔"

"تیرا نام تو میں نے انہیں بتا ہی دیا ہے اور میرا نام جام ہاشم خان ہے۔"

"پتہ بھی سوچ رکھو۔"

"بس جو سمجھ میں آئے انہیں بتا دینا۔ جھوٹ تو بولنا ہی پڑے گا۔"

"تم نے میرا نام کیا بتایا تھا اسے؟ مجھے تو یاد نہیں رہا۔"

"ایس جی ایم ایم پیرزادہ۔"

"ابے تو ہوش میں تو ہے۔ اس اتنے لمبے چوڑے نام کا مطلب کیا ہے آخر؟"

"اس کا مطلب تو کوئی نہیں۔ بس اپنا نام یاد کر لے۔ تو آج سے سید غلام محمد مرشد پیرزادہ ہے۔"

"اچھا؟ مگر یہ شیطان کی آنت اتنا لمبا چوڑا نام کیوں دے رہا ہے تو مجھے۔ میں نے کیا گناہ کیا ہے تیرا۔"

"ذرا تیرا رعب پڑے گا ان پر مسٹر ایس جی ایم ایم پیرزادہ سمجھا کر۔" یہ کہہ کر میں باتھ روم میں جا گھسا۔ نلکے میں پانی کی موٹی دھار آ رہی تھی۔ صابن تو بریف کیس میں موجود تھا اور تولیہ بھی، میں خوب مل مل کر نہایا۔ میں نے سوچا کہ پتہ نہیں ہمیں کس کس کٹھن مرحلے سے گزرنا پڑے۔ ان کے اڈنگے میں آنے سے پہلے میں ذرا تازہ دم تو ہو لوں۔

ابھی میں نہا ہی رہا تھا کہ کمرے سے مجھے کسی کے تیز تیز بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔

"وہ دوسرا آدمی کہاں گیا ہے؟"

"وہ نہا رہا ہے۔" آبی نے جواب دیا۔

"اچھا؟ نہانا اتنا ہی ضروری تھا اس کے لیے۔ اکیلا کیوں نہ ہو تم دونوں؟ اس کے بعد تمہیں بھی غسل کی ضرورت ہو گی۔" یہ اس کیپٹن دلیپ سنگھ کی آواز تھی۔

"جی جناب! دراصل ہم پاک صاف ہو کر آپ کے حضور حاضر ہونا چاہتے ہیں۔"

"پاک صاف ہو کر! تمہارا مطلب ہے کہ تم ادھر کسی مزار پر حاضری دو گے؟ اسے کہو جلدی باہر آئے تمہیں کرنل صاحب کے سامنے پیش ہونا ہے۔"

"میں بھی ذرا نہا لوں تو زیادہ بہتر رہے گا۔ صابن تیل تولیے کا ہمارے پاس انتظام ہے۔"

"یہ آدمی میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ تم سے بہت فری ہو رہا ہے یہ کیپٹن،" کسی اور کی آواز سنائی دی۔

"یہ مجھے جانتا نہیں ہے' اس لیے۔" کیپٹن نے کہا۔

میں نے پھر نلکہ کھول دیا۔ کچھ ہی دیر بعد میں نہا کر باہر نکلا تو میں بہت بہتر محسوس کر رہا تھا۔ کمرے میں ایک میجر اور ایک کیپٹن کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ اور تین سپاہی آبی کے پیچھے کھڑے تھے۔

میجر مجھے بڑی ہی سفاک نظروں سے دیکھ کر بولا "ادے مسٹر کیا نام ہے تمہارا؟"

"جی میرا نام ہاشم خان ہے جام ہاشم خان۔"

اس نے کاغذ پر لکھنا شروع کیا۔

"باپ کا نام؟"

"عمر خان۔"

"کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"ڈیرہ غازی خان کے قریب گاؤں ہے دکھاوا۔ ڈاکخانہ خاص تحصیل و ضلع ڈیرہ غازی خان۔" میں نے جھوٹ کا دفتر کھول لیا۔

"اس کا کیا نام ہے؟"

"ایس جی ایم ایم پیرزادہ۔"

اس نے لکھ تو لیا مگر پھر بدکا۔ اپنی داڑھی اس نے بڑے سلیقے سے رخساروں پر موڑ کر باندھ رکھی تھی۔ عمر اس کی یہی کوئی پینتیس سال ہو گی۔ دوہرے بدن کا وہ سکھ خاصا صحت مند نظر آتا تھا۔ بولا "پورا نام بتاؤ۔"

"پورا نام، سید غلام محمد مرشد پیرزادہ۔"

"ہوں! یہ ایک ہی آدمی کا نام ہے؟"

"جی ہاں! کوئی شک ہے آپ کو؟"

"فقرے بازی مت کرو۔ ادھر تم نے بارڈر کیوں پار کیا؟"

"ہم راستہ بھول گئے تھے' اس دوران وہ تھانیدار بیہوش ہو گیا۔ ہم طبی امداد کے لیے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے کہ ہماری جیپ پر آپ کے سپاہیوں نے گولی چلا دی۔"

"تم سیر کرتے کرتے بارڈر کراس کر آئے۔ گڈ۔ یہی کہا ہے نا تم نے؟" میجر نے بڑے غصے سے کہا۔

"جی ہاں اور حقیقت بھی یہی ہے۔"

"گڈ! اور حقیقت بھی یہی ہے۔ تم اپنے چاچے کے پنڈ میں پھر رہے تھے، کیا سمجھا ہے تم نے ہمارے بارڈر کو۔ کسی نے روکا نہیں تمہارا راستہ؟"

"کسی نے بھی نہیں، ادھر تو کوئی تھا ہی نہیں۔" میں نے جم کر کہا۔

"اس تھانیدار کا نام کیا ہے؟"

"مستقیم علی۔" میں نے دراصل سفر کے دوران اس کی جیب سے کارڈ نکال کر دیکھ لیا تھا۔

میں نے محسوس کیا کہ اس مرحلے پر آبی ایک دم پریشان ہو گیا۔ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا تھا اور خاموش رہنے کا اشارہ بھی کر رہا تھا۔

"اگر آپ اجازت دیں تو میں ایس جی ایم ایم پیرزادہ صاحب کی بات سن لوں۔"

"نہیں اس کی اجازت نہیں جو کہنا ہے سامنے کہو۔" میجر نے تنک کر کہا۔

"وہ تھانیدار صاحب کہاں ہیں اب؟"

"اس کے بارے میں بھی بات کروں گا۔ پہلے تم لوگ ہمیں اپنے بارے میں صحیح صحیح معلومات فراہم کر دو۔"

"پھر آپ چھوڑ دیں گے نا ہمیں۔" آبی نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

"اتنے چوچے تو تم نہیں ہو۔ ہم تمہیں چھوڑیں گے ضرور، مگر شاید سی کے ڈی حالت میں۔" کیپٹن نے پہلی بار مداخلت کی۔ وہ بھی بہت سنجیدہ ہو رہا تھا۔

میں آبی کا مطلب سمجھ چکا تھا۔ وہ مجھے اتنا سارا جھوٹ بولنے سے پہلے سوچ لینے کا مشورہ دے رہا تھا۔

"اس تھانیدار کو کس نے مارا ہے؟" میجر بولا

"کیا وہ مر گیا ہے؟" میں نے حیرت زدہ سا ہو کر پوچھا۔

"زیادہ ایکٹنگ مت کرو۔ کیول پوری بات بتاؤ اور سچ بولو۔"

"کیول میں نے سچ بولا ہے جناب مگر وہ تو بے ہوش تھا۔"

"نہیں وہ مر چکا ہے۔ میں پوچھتا ہوں اسے کس نے مارا ہے؟"

"اللہ نے مار دیا ہو گا جناب! دراصل یہ زندگی اور موت اسی کے ہاتھ میں ہے نا! بندے کے بس میں تو کچھ بھی نہیں۔"

"شٹ اپ! میں پوچھتا ہوں وہ کیسے مر گیا؟"

"وہ... جناب ہو سکتا ہے اس کا کاربوریٹر خراب ہو گیا ہو۔" آبی نے لہک کر کہا۔

"ہاں جی! عین ممکن ہے اس کے رنگ پسٹن ہی بیٹھ گئے ہوں۔" میں نے آبی کو سہارا دیا۔

"یہ کیا بکواس ہے میں پوچھتا ہوں وہ تھانیدار کیسے مر گیا؟"

میجر چیخا۔ کیپٹن مسکرانے لگا مگر پھر فوراً ہی سنجیدہ ہو گیا۔

"دیکھیں جناب! انسانی مشین ہے نا! اس میں کسی بھی وقت خرابی پڑ سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے اس کی "کپلنگ" ہی ٹوٹ گئی ہو ٹائی راڈ کھل گیا ہو، کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔"

"وہ کوئی موٹر تو نہیں تھا، انسان تھا۔" میجر نے میز پر مکا مارتے ہوئے کہا "تم مجھے نہیں جانتے ہو' مذاق کرتے ہو مجھ سے بدمعاشو۔"

"نہیں جناب! یہ کیسے ممکن ہے؟ ہمارے دل میں تو آپ کی بہت عزت ہے۔"

"تو پھر سچ سچ بولو، ورنہ اچھا نہیں ہو گا۔"

"ہمیں نہیں معلوم ہے جناب کہ اس تھانیدار کی فوتیدگی کیسے وقوع پذیر ہوئی۔" میں نے اپنے فقرے کو ذرا گاڑھا کرتے ہوئے کہا۔

"اس کی گردن کی رگ پھولی ہوئی ہے۔ کس نے اس کا گلا گھونٹا تھا؟" "تم نے یا اس نے۔ کیا نام بتایا ہے اس کا تم نے، ایس می ایم ٹی، نہیں نہیں! یہ نام ذرا مختصر نہیں ہو سکتا۔" میجر جھنجھلا سا گیا۔ وہ اب آبی کا نام معلوم کرنے کے لیے کاغذ میں جھانک رہا تھا۔

"ان کو آپ پیرزادہ کہہ سکتے ہیں۔"

"ہوں۔ معلوم ہوتا ہے تم یوں سچ نہیں اگلو گے۔ کیپٹن دلیپ سنگھ ان دونوں کو ادھر امرتسر بھیج دو پولیس کے حوالے کر دو۔"

"ٹھیک ہے سر!" یہ کہہ کر کیپٹن دلیپ سنگھ اٹھا اور اس کے ساتھ ہی باقی لوگ بھی کمرے سے نکل گئے۔ دروازہ انہوں نے باہر سے مقفل کر دیا تو آبی نے نیا سگریٹ سلگا لیا۔ وہ کھل کر مسکرا رہا تھا۔

اسی شام ان لوگوں نے ہمیں اپنے دو سینئر افسروں کے سامنے

پیش کرنے کے بعد گاڑی میں بھر اور امرتسر پہنچا دیا۔ بدمعاشوں نے دوپہر کا کھانا بھی ہمیں نہیں دیا۔ ہم سے دونوں بریف کیس چھین کر انہوں نے سر بہ مہر کر کے ساتھ بھیج دیے۔ ہم سگریٹ سے بھی محروم ہو گئے۔ پھر بھی آبی نے یوں کیا کہ اپنا بریف کیس انہیں دینے سے پہلے ایک جوڑا کپڑے اور ضرورت کی دوسری چیزیں نکال کر رومال میں رکھ لیں۔ سگریٹ اُن لوگوں نے ہمارے پاس ایک بھی نہ رہنے دیا۔ میرا خیال ہے کہ وہ سپاہیوں نے آپس میں بانٹ لیے تھے۔

مجھے نہیں معلوم کہ وہ کون سا تھانہ تھا۔ گاڑی چاروں طرف سے بند تھی اور ہمیں اس میں سفر کے دوران باہر کی کوئی شے نظر نہیں آ رہی تھی۔ صورتِ حال ہم پر جب ہی واضح ہوئی جب گاڑی میں سے اتار کر سپاہیوں نے ہمیں حوالات میں بند کر دیا۔ ہمیں وہاں اتارنے سے پہلے وہ گاڑی کوئی آدھ گھنٹہ کسی جگہ کھڑی رہی۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ تھانے کا احاطہ تھا۔ اس دوران میں دو آدمی ہمیں دیکھنے آئے۔ ایک اُن میں سے تھانیدار تھا اور دوسرا شاید ہیڈ کانسٹیبل۔ وہ گاڑی کی اونچی جالی میں سے اندر جھانک کر ہماری صورتیں ذہن نشین کرتے رہے اور پھر واپس چلے گئے۔

حوالات میں پہنچ کر پہلی بار ہم نے محسوس کیا کہ ہم کتنی سنگین صورتِ حال سے دوچار ہو چکے ہیں۔ اب تک تو ہم اپنی پولیس کے جان لیوا تعاقب سے بچ نکلنے کو ہی بہت غنیمت سمجھ رہے تھے۔ آبی کا خیال تھا کہ وہ امرتسر پہنچ کر پولیس سے یہ کہہ دے گا کہ ہم سیاسی پناہ لینے کے لیے سرحد عبور کر آئے ہیں اور یہ جھوٹ وہ تسلیم بھی کر لیں گے مگر حوالات میں اُتر کر ہمیں معلوم ہوا کہ معاملہ کچھ زیادہ ہی سنگین ہو گیا ہے۔ وہ ہماری کسی بھی بات کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔ تھانیدار کا نام ایشر سنگھ تھا۔ بڑے کلے ٹھلے والا آدمی تھا وہ۔ حوالات سے ہمیں اپنے کمرے میں بلوا کر اس نے ہمیں بہت رگیدا۔ طرح طرح کے سوالات وہ ہم سے پوچھتا رہا۔ مگر ہم نے ہر بار اس سے یہی کہا کہ ہم راستہ بھول کر ادھر آ نکلے ہیں، ہمیں معاف کر دیا جائے مگر وہ بھی کوئی اپنی ہی قسم کا آدمی تھا۔ اُس نے ہماری کسی بھی بات پر اعتبار نہیں کیا۔ یہاں تک کہ وہ ہمارے بتلائے ہوئے ناموں پر بھی شک کر رہا تھا۔ تھک ہار کر بولا۔

"دیکھو بھائی لوگو! پہلا جرم تو تمہارا یہ ہے کہ تم غیر قانونی طور پر بھارت میں داخل ہوئے۔ دوسرا جرم تمہارا یہ ہے کہ تم نے پاکستانی پولیس کے ایک تھانیدار کو قتل کر دیا اور تیسرا جرم یہ کہ تم پولیس کی جیپ بھگا کر بھارت لے آئے۔ اب بولو تمہیں کیا کہنا ہے؟"

آبی نے کھنکار کر گلا صاف کیا، کہنے لگا۔

"سردار صاحب ان میں سے صرف ایک بات سچ ہے کہ ہم بھارتی سرحد عبور کر کے آئے۔ یہ ہماری غلطی ہے۔ تھانیدار کو ہم نے نہیں مارا، وہ بے ہوش ہو گیا تھا اپنے کسی اندرونی مرض کی وجہ سے۔ جیپ البتہ اُس کی تھی اور وہ ہمیں سرحدی علاقے کی سیر کے لیے کر نکلا تھا۔"

ایشر سنگھ کی آنکھوں میں ایک دم غصہ اُبلنے لگا۔ اس کے نتھنے عجیب انداز سے پھڑکے۔ گردن کی رگیں پھلا کر وہ کرسی سے اُٹھا اور فائل میز پر مارتے ہوئے چیخ کر بولا۔

"اوئے مدن لال! لے جا ان کو ادھر ٹکٹکی پر لگا دے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ مزنگ تھانے میں بیٹھے ہیں۔ میں تو بھُس بھر دوں گا ان کی کھال میں، اوئے مدن لال!" دو سپاہی تیزی سے اندر آئے۔

"چلو اوئے! تمہیں اُدھر پھاٹک بند کرتے ہیں۔ تم جیسے آوارہ ڈنگروں کا یہی علاج ہے۔"

ابھی وہ ہم پر ہاتھ ڈال ہی رہے تھے کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔

"یس سر! میں ایشر سنگھ بول رہا ہوں۔"

تھانیدار نے تیزی سے ریسیور اٹھا کر الف ہوتے ہوئے کہا۔

"یہ کچھ نہیں بک رہے ہیں، ہاں مجھے تو کوئی بہت ڈھونگیے نظر آتے ہیں۔"

"کیا کہا سر؟ اچھا! مگر۔۔۔ ان سے پوچھ گچھ تو کرنی ہی پڑے گی۔"

"ٹھیک ہے سر! آپ فکر نہ کریں۔" یہ کہہ کر اس نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور بولا۔

"لے جاؤ اوئے ان کو۔ میری بات سن لو اوئے۔ سیدھی طرح ہمیں سب کچھ بتا دو ورنہ اچھا نہیں ہو گا۔ تمہارا بیان مدن لال لکھے گا۔" یہ کہہ کر وہ اپنا بید لہراتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

مدن لال اور اس کے ساتھی سپاہی نے ہمیں قہر آلود نظروں سے دیکھا۔

"چلو بھئی! دیکھتے ہیں تمہارے پاس کیا کیا مال ہے، چلو اٹھو!"

"وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے۔" مدن لال کے ساتھی نے اپنے ماتھے کی تیوری ختم کرتے ہوئے کہا۔

"کیوں تنگ کرتے ہو بھائی جی! ہم ویسے ہی مصیبت کے مارے ہوئے ہیں، پر خیر چلو! دیکھتے ہیں کیا سلوک کرتے ہو تم ہم سے۔" آبی نے بڑے خوشگوار لہجے میں کہا اور اپنی جگہ سے اُٹھ کر اُن کے ساتھ چل دیا۔

دوسرے نے میرے پہلو میں گھٹنا دے مارا۔ "تو بھی اُٹھ اوئے کیا نام ہے تیرا۔"

میں اپنے پارہ پارہ وجود کو سمیٹ کر اُٹھا اور اس کے ساتھ چل دیا۔ ہمارے حوصلے پست ہوتے جا رہے تھے۔ آبی کی ذرا سی غفلت ہمیں ہماری منزل سے کوسوں دور پھینک گئی تھی۔ وہ سپاہی ہمیں اُس کی تھانے کے پچھلے حصے میں لے گئے۔ اُن کی نیت کو میں سمجھ رہا تھا۔ وہ ہم پر تشدد کرنا چاہتے تھے۔ ہم سے سچ اگلوانے کے لیے وہ وہی حربے برتنے کا ارادہ رکھتے تھے جن کی وجہ سے پولیس بدنام ہے۔ ابھی ہم اس کمرے میں داخل نہیں ہوئے تھے جس کا دروازہ

مدن لال نے کھول دیا تھا کہ سامنے سے ایک تیس بتیس سال کا گورا چٹا دبلا پتلا اونچا جوان تیزی سے ہمیں اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آ رہا تھا۔ اس کی وردی یہ بتاتی تھی کہ وہ بھی تھانیدار ہے۔ وہ اپنے چھوٹے سے بید کو بڑے خوبصورت انداز سے گھماتا ہوا لمبے لمبے قدم اٹھا رہا تھا۔ وہ بلال آغا تھا۔ اس کے سوا وہ کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اُسے میں اچھی طرح جانتا تھا۔ میں جب پولیس کے محکمے میں ملازم تھا تو وہ اُن دنوں نولکھا تھانے میں انسپکٹر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ میں نے اسے دیکھا تو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔

اُس کی نظر مجھ پر پڑی تو ذرا دیر کے لیے ٹھٹکا۔ اس کے چہرے پر تحیر کی ایک واضح رو ابھری مگر فوراً ہی اس کیفیت پر قابو پا لیا۔ ہمیں نظر انداز کر کے وہ ہمارے پاس سے گزر کر آگے بڑھ گیا۔ امرتسر کے اس تھانے میں بلال آغا کی موجودگی میرے لیے حیرت انگیز تھی۔ اس نے سر پر سکھوں ایسی پگڑی باندھ رکھی تھی اور داڑھی اس کے چہرے پر ایسی سج رہی تھی جیسے وہ پیدائشی سکھ ہے مگر میں قسم کھا سکتا تھا کہ وہ بلال آغا ہے۔ نولکھا تھانے کا سب سے زیادہ دلیر اور جی دار تھانیدار۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ لاہور کے اُس تھانے میں اس کی عمدہ کارکردگی پر خوش ہو کر اُسے سب انسپکٹر سے انسپکٹر بنا دیا گیا تھا۔ پھر کچھ ہی عرصے بعد وہ لوگ اُسے خفیہ پولیس میں لے گئے تھے۔ میں نے تو بعد میں نوکری ہی چھوڑ دی تھی مگر وہ ترقی کی منزلیں برابر طے کرتا رہا تھا۔ اُسے یوں ایسی عجیب و غریب حالت میں دیکھ کر میں تو ششدر رہ گیا۔ میں سمجھا کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ مجھے یقین تھا کہ اس نے بھی مجھے پہچان لیا ہے۔ اس کے چہرے پر جو تاثر ایک لحظے کے لیے ابھرا تھا وہ مجھے یہ باور کرانے کے لیے بہت کافی تھا کہ وہ بلال آغا ہی ہے۔ مگر وہ اِدھر کیا کر رہا ہے۔ اپنے سسرال آیا ہوا ہے۔ اُسے ایشر سنگھ کے تھانے میں یہ وردی کس نے پہنا دی ہے کیا اس نے مذہب تبدیل کرنے کے بعد پاکستان کو بھی تیاگ دیا تھا۔

مدن لال نے ہم دونوں کو کمرے میں دھکیل کر دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ اس کمرے کی عقبی دیوار میں ایک دروازہ تھا۔ اُس کی طرف اشارہ کر کے مدن لال بولا۔

"راجندر! ذرا بلا لے ان کے جم دوتوں کو۔ اس کیرن سنگھ اور منتی کو ادھر لے آ۔"

راجندر اس دروازے کو کھول کر دوسری طرف نکلا، تو چند ہی ساعتوں کے بعد دو سپاہی دندناتے ہوئے ہمارے کمرے میں آ گئے۔ اُن کے ہاتھوں میں ڈنڈے تھے اور ہمارا یہ اندازہ صحیح نکلا کہ کوئی اسلحہ اُن میں سے کسی کے پاس بھی نہیں تھا۔ اب وہ تعداد میں چار تھے اور اُن کے تیور یہ بتا رہے تھے کہ ہماری دُھلائی شروع کر دیں گے۔ کمرے کے دونوں دروازے انہوں نے اندر سے بند کر دیے تھے۔

مدن لال اور راجندر نے آگے بڑھ کر آبی کو پکڑ لیا۔ اس کے دونوں بازو انہوں نے کمر کی طرف کھینچے۔ مدن نے پیچھے سے اُس کی کمر میں کہنی کی ضرب لگائی تو آبی نے پوری قوت سے گھوم کر اپنے ہاتھ ان کی گرفت سے چھڑا لیے اور پھر بازو پھیلا کر بڑے سہمے ہوئے لہجے میں بولا۔ "ہمیں یوں ذلیل نہ کرو یارو، ہم تمہارے مہمان ہیں، اور بے قصور ہیں۔" مدن لال اپنی جھونک میں مجھ سے ٹکرا گیا تھا۔

وہ گندی گالیاں بکتا ہوا پھر آبی کی طرف بڑھا۔

میں نے بڑی آہستگی سے اس کا کندھا تھپتھپایا۔

"مجھ سے بات کرو مدن لال! پوچھو کیا پوچھتے ہو۔ کاغذ قلم لے کر بیٹھ جاؤ اور میرا بیان لکھ لو۔"

مگر اُس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا، غراتا ہوا بولا۔ "اس کی تو میں گردن توڑ دوں گا۔ بڑے بڑوں کو سیدھا کر دیا ہے میں نے۔"

دوسرے دو سپاہی اس عرصے میں مجھ تک آ پہنچے تھے۔ ان دونوں نے دیوار پر لٹکی ہتھکڑیاں پکڑ لی تھیں۔

"اپنے ہاتھ آگے کرو۔" ایک نے مجھے حکم دیا۔ دوسرے نے میرا بازو تھام لیا۔ "لگاؤ ہتھکڑی اس بدمعاش کو۔"

وہ بہت تپ گیا تھا۔ اس کی یہ بات سنتے ہی میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر ان دونوں سپاہیوں کی گردنوں پر ہاتھ ڈال کر بہ یک وقت اُن کی رگیں مل دیں۔ دونوں یوں دھپ سے فرش پر گرے جیسے دو درخت جڑوں سے اکھڑ گئے ہوں۔ مدن لال اور راجندر آبی پر ہاتھ ڈال چکے تھے مگر جیسے ہی وہ سپاہی زمین پر گرے، وہ دونوں یوں گھوم کر میری طرف دیکھنے لگے جیسے انہیں اپنی بصارت پر اعتبار نہ آ رہا ہو۔ حیرت سے اُن کی پتلیاں پھیل رہی تھیں۔ میں نے ان کے تحیر کو مہمیز دینے کے لیے مسکراتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ بڑے دوستانہ انداز میں اُن کے کندھوں پر رکھ دیے۔

"یہ تو بے ہوش ہو گئے سردار جی! کیا ہو گیا ہے انہیں؟"

"کیا کر دیا ہے تم نے انہیں؟" ایک سپاہی نے دہشت زدہ لہجے میں پوچھا۔

میں نے ہاتھ سرکا کر اُن کی گردنوں تک پہنچا دیے۔ بڑی ہی آہستگی اور بڑی ہی ملائمت سے، جیسے میں انہیں پچکار رہا ہوں اور پھر فوراً ہی میں نے اُن دونوں کے احساس کی رگیں مسل دیں۔ وہ بھی دیکھتے ہی دیکھتے۔۔۔۔۔ بے سدھ ہو کر زمین پر گر گئے اور کمرے میں گمبھیر سناٹا چھا گیا۔

آبی نے ایک لمبی آہ کھینچی جیسے وہ اپنے سینے پر پڑے بوجھ کو کم کر رہا ہو۔ وہ میرے قریب ہو کر بولا۔ "یہ کیا ہو گیا ہے؟ کسی طرح یہاں سے نکل چل۔ یہ لوگ ہمیں مار دیں گے۔"

اُس کا لہجہ بہت ہی نمناک ہو رہا تھا۔ اس کی وہ یاس سے

لبس نرآواز سن کر مجھے یوں لگا جیسے میرا دل بیٹھ جائے گا۔ آبی کے اندر کا مرد جو ذرا دیر کے لیے اس فرش کے پہلو میں بیدار ہوا تھا مرنے لگا تھا۔ اور اب میرے اور اس کے سینے میں حوادث کی بھال بہت گہری دھنستی جا رہی تھی۔ میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

اُس وقت احاطے میں نکلنا کسی بھی طرح سود مند نہ ہو سکتا تھا۔ تھانے کے عملے کے لوگ اِدھر اُدھر پھر رہے تھے۔ ان کی نظروں سے بچ کر ہم کسی بھی طرف نکل نہیں سکتے تھے۔ وہ تو ہمیں دو قدم آگے نہ نکلنے دیتے۔ ہم دونوں نڈھال سے ہو کر دیوار کے ساتھ ڈھاسنا لگا کر بیٹھ گئے کوئی راستہ ہمیں سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ سب کچھ ہی بھسم ہو کر رہ گیا تھا جس بہن کے لیے میں نے اتنی ساری غارتگری اپنائی جس کے سُکھ کے لیے زندگی کا ہر دُکھ جھیل لیا۔ اپنا سب کچھ تج دیا۔ وہ پھر بھی وہیں کی وہیں تھی۔ اس کی تقدیر کی گردش ابھی تک ختم نہیں رہی تھی۔ اور اب خدا ہی جانتا تھا کہ وہ کس حال میں ہوگی اور اس کبیر شاہ نے اُسے کس نالتے لاہور سے نکال کر اپنے گھر میں پناہ دی تھی اور کیوں؟ وہ معمّہ تو ابھی میں حل کرنا ہی چاہتا تھا کہ میری بدقسمتی نے مجھے اچھال کر اُس ساحل پر پھینک گئی تھی۔ جہاں ہر قدم پر ہماری جان کو ان گنت خطرات لاحق تھے۔ ہم ایسے لوگوں میں جا پھنسے تھے جن کے نزدیک پاکستان سے اُڑ کر آنے والا کوّا بھی گردن زدنی تھا۔ وہ ہمیں کیسے برداشت کر لیتے۔ اُن کی صورتوں سے ظاہر تھا کہ ہمارے لیے کسی قسم کی رُو رعایت ملحوظ نہیں رکھیں گے۔

آبی بھی سُن ہو کر میرے ساتھ یوں بیٹھا تھا جیسے وہ بھی سب کچھ ہار چکا ہے۔ اُسے بھی امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی تھی اور احاطے میں سے سپاہیوں کی آوازیں الگ ہمارا خون خشک کیے دیتی تھیں۔ اُن چار آدمیوں کو بے ہوش تو ہم کر چکے تھے محض اِس لیے کہ وہ ہم سے بدتمیزی نہ کریں ہم اُن کا تشدد سہنے کے لیے کسی بھی قیمت پر تیار نہ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے انہیں لمبا لٹا دیا تھا مگر اب اس عمل کے نتائج کے تصور نے مجھے اور آبی کو پریشان کر دیا تھا۔

کوئی پندرہ منٹ اسی طرح گزر گئے۔ ہماری سگریٹ کی طلب دم بدم بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے اُٹھ کر مدن لال کی وردی ٹٹولی۔ اُس کی جیب میں سگریٹ اور ماچس موجود تھے اور ڈیڑھ سو روپیہ بھی۔ میں نے وہ سب کچھ نکال لیا۔ جب ہم سگریٹ سُلگا چکے تو آبی بولا

"یار ان کی وردیاں اتار، ہم حلیہ بدل کر یہاں سے نکل چلتے ہیں۔"

"اوئے بیڑہ غرق مجھے تو یہ خیال ہی نہیں آیا۔" یہ کہہ کر میں مدن لال کی وردی اتارنے کے لیے اُٹھا مگر عین اُس وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ میں تیزی سے پیچھے مڑا۔ سگریٹ ہم دونوں نے بجھا کر فرش پر مسل دیے۔

"آبی تو بھی یوں لیٹ جا جیسے تو بے ہوش ہو چکا ہے۔"

آبی میرے اشارے کو سمجھ کر آڑا ترچھا ہو کر لیٹ گیا۔ دروازے پر دستک تیز ہو گئی۔ میں آگے بڑھ کر دروازے کے پاس لیٹ گیا جیسے میں بہت ہی زخمی ہو رہا ہوں۔ پھر میں نے فرش پر لیٹ کر اپنے کپڑے گرد آلود کر لیے اور اسی طرح ہائے ہائے کرتے ہوئے میں نے دروازے کے سامنے لیٹ کر کنڈی کھول دی۔ کسی نے تیزی سے کواڑ پیچھے دھکیلا تو میں اور زیادہ بلند آواز سے کراہتا ہوا زمین پر لیٹ گیا۔ کواڑ کو باہر سے کسی نے دھکا دے کر کھولا تو میں اس کے ساتھ ہی گھسٹتا ہوا پیچھے چلا گیا۔

اب میرے سامنے الیشر سنگھ اور بلال آغا کھڑے تھے۔

"ہائیں! یہ کیا ہو گیا ہے۔ یہ تو شاید آپس میں لڑ مرے ہیں!"

میری آنکھیں کھلی دیکھ کر الیشر سنگھ نے پوری قوت سے میرے کولہے پر بوٹ کی ٹھوکر لگائی۔ "اوئے ان سپاہیوں کو کیا ہوا ہے اور تجھے کیا ہو گیا ہے؟"

"انہوں نے ہمیں بہت مارا ہے سردار صاحب! پیرزادہ کو تو بے ہوش ہی کر دیا ہے انہوں نے۔" میں نے بکھرے ہوئے لہجے میں کہا

"اچھا! تو ان کو کیا ہو گیا ہے؟ یہ تو سب مجھے بے ہوش نظر آتے ہیں۔" الیشر سنگھ ایک ایک کی نبض دیکھ رہا تھا۔

"پتہ نہیں جناب! یہ مجھے مار رہے تھے کہ میں بے ہوش ہو گیا۔ جب میرا دماغ ٹھکانے آیا تو یہ سب بے ہوش پڑے تھے۔"

"بلبیر سنگھ جی یہ تماشا تو میں نے زندگی میں پہلی بار دیکھا ہے کچھ سمجھ رہے ہیں آپ؟"

"میں خود حیران ہوں سر! یہ کہیں مر تو نہیں گئے؟"

"نہیں! نبض تو ان کی ٹھیک ہے مگر۔۔۔" فقرہ ادھورا چھوڑ کر اس نے مجھے گریبان سے پکڑ کر جھنجھوڑا اور زناٹے دار تھپڑ میرے منہ پر مار کر بولا۔

"انہیں کیا ہوا ہے ذلیل کمینے۔۔۔! یہ بے ہوش کیسے ہو گئے کیا سنگھایا ہے تم نے انہیں؟"

"کچھ بھی نہیں سردار جی! ہم تو خود پٹ گئے ہیں ان کے ہاتھوں۔ آپ نے ہمارے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔"

"زیادتی تو اب ہوگی بچو! پتہ تو اب چلے گا تمہیں۔ بلبیر انہیں اُٹھوا کر ڈاکٹر کے پاس بھیجو ان چاروں کو بیچارے سدھ بدھ ہی کھو بیٹھے۔"

بلال آغا مجھ سے نظر نہیں ملا رہا تھا مگر جب میرا دھیان الیشر سنگھ کی طرف ہوتا تو وہ گہری گہری نظروں سے مجھے دیکھ لیتا تھا۔ وہ فوراً باہر نکلا اور کئی سپاہیوں کو اندر بُلا لایا۔ وہ سب لوگ اندر کی صورتِ حال دیکھ کر تصویرِ حیرت بن رہے تھے۔ بے ہوش سپاہیوں کو چارپائیوں پر ڈال کر جب وہ باہر گئے تو الیشر سنگھ

[...]نے ان کی نبض ٹٹولی، وہ ابھی تک دم روک کر لیٹا ہوا تھا۔ بلبیر بولا۔

"اس کو بھی اٹھوا کر ہسپتال بھیج دیں۔"

"نہیں! اسے ادھر ہی مرنے دیں۔ یہ سگریٹ مجھے نکال دیں [...]اس کی جیب سے۔" الیشر سنگھ نے میری بشرٹ کی جیب میں [...]سے جھانکتے ہوئے پیکٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

بلال آغا نے پیکٹ نکال کر سگریٹ کو منہ میں لیے بغیر [...]نہیں دکھائی۔ وہ خاصا سُلگ گیا تو الیشر سنگھ نے اس کا جلتا ہوا سرا [...]بی کے ہاتھ کی پشت سے لگایا۔ آبی نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھول دیں [...]اور وہ کسمساتا ہوا اُٹھ بیٹھا اور ہائے ہائے کرنے لگا۔ وہ پیٹ پکڑ کر یوں [...]ا رہا تھا جیسے کسی نے اس کی ناف بھاڑ ڈالی ہو۔

"یہ ڈراما بند کر اوئے دلیپ کمار کی اولاد! کیا ہوا ہے تجھے؟" [...]لیشر سنگھ دہاڑا۔

آبی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ پھر نڈھال سا ہو کر لیٹ گیا۔ [...]ں تو پہلے ہی فرش پر فرش ہو رہا تھا اور میرے وجود کا سارا ڈابک [...]انی خشک ہوتا جا رہا تھا۔ ابھی اس ساری اداکاری سے مجھے گھن آ [...]رہی تھی۔ ہم دونوں عورتوں کی طرح ٹسوے بہا رہے تھے۔ محض اس لیے [...]کہ جس طرح بھی ممکن ہو سکے ان لوگوں کے تشدد سے بچ جائیں۔ آبی [...]کی کمر میں زوردار ٹھوکر مار کر الیشر سنگھ بولا۔

"ان دونوں نے مجھے حیران کر دیا ہے، ان کو اُدھر حوالات میں [...]ال دو بلبیر جی! مجھے ان کے بارے میں کچھ اور سوچنا پڑے گا۔"

"ٹھیک ہے سر! ان کے لیے ابھی تو یہی کریں پھر میں بھی دیکھتا [...]ہوں ان کا منہ کیسے کھلوایا جا سکتا ہے۔" یہ کہہ کر بلبیر نے دو سپاہیوں [...]کو بلوایا جو ہمیں کھینچتے ہوئے حوالات کی طرف لے چلے۔

وہ بھی اپنے ہاں کے تھانوں جیسی حوالات تھی اور سہولت [...]نام کی کوئی شے وہاں موجود نہیں تھی۔ البتہ کونے میں ایک کھُرا [...]سا بنا تھا جس میں ایک باٹ دھرا تھا اور اُس کو ان لوگوں نے ایک [...]لکڑی کے تختے سے ڈھانپ رکھا تھا یہی وجہ تھی کہ وہاں وہ عفونت مفقود تھی [...]جو عام حوالاتوں میں آدمی کو زندگی سے متنفر کر دیتی ہے۔

وہاں پہنچنے کے کچھ ہی دیر بعد ہم سنبھل کر بیٹھ گئے۔ میری [...]جیب میں سے الیشر سنگھ نے سارے سگریٹ نہیں نکالے تھے اور یہ [...]اس کی بڑی مہربانی تھی مگر جب مجھے یہ خیال آیا کہ جب مدن لال [...]ہوش میں آئے گا تو جیب میں نقدی اور سگریٹ نہ پا کر اس کا کیا [...]حال ہوگا۔ تو مجھے وحشت ہونے لگی کیونکہ اس کا انتقام خوفناک [...]ہی ہو سکتا تھا۔ ان لوگوں نے ایک نوازش ہم پر یہ کی تھی کہ دو گھڑی [...]کے لیے جو ہتھکڑیاں ہمیں لگائی تھیں وہ انہوں نے ہمیں حوالات [...]میں بند کرنے سے پہلے اتار لی تھیں۔

کوئی بیس منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ ایک سپاہی ہمارے لیے چائے اور بسکٹ لے آیا۔ ایک بڑے سے تھال میں اُس نے سگریٹ کے دو پیکٹ بھی ڈال رکھے تھے۔

چائے کی چینک اور پیالیاں سلاخوں کی راہ سے ہمیں تھما کر وہ سپاہی بولا۔ "یہ سردار بلبیر صاحب نے بھیجی ہے یہ چائے اور یہ سگریٹ بھی۔"

"اچھا! اسے ہمارا خیال کس طرح آ گیا، اُس تارا سنگھ کو۔" آبی نے حیران ہو کر کہا۔

اُس کی بات سپاہی نہ سن سکا تھا۔ میں نے آبی کو کہنی ماری کہ وہ چپ رہے۔

"بلبیر صاحب کا ہماری طرف سے شکریہ ادا کرو، یہ اُن کی مہربانی ہے۔" میں نے اس سپاہی سے کہا۔

"انہوں نے کہا ہے کہ خود ہی سیدھے ہو جاؤ، وہ تمہیں سوچنے کا موقع دے رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم سوچ لیں گے بھائی جی! ہماری طرف سے انہیں سلام بولو۔" یہ کہہ کر میں نے چائے پیالیوں میں انڈیل دی۔ بسکٹ خستہ تھے اور لذیذ بھی چائے بھی مزہ دے رہی تھی۔ ہم اسے نعمتِ غیر مترقبہ سمجھ کر گھونٹ گھونٹ پینے لگے۔

سپاہی لوٹ گیا تو آبی بولا "یار! یہ بلبیر سنگھ ہم پر اتنا مہربان کیسے ہو گیا ہے؟" آبی نے پوچھا۔

"یہ بڑا گہرا راز ہے آبی! تو سُنے گا تو حیران رہ جائے گا۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب ہے آبی بیٹے! کہ یہ بھی اپنا مختون بھائی ہے۔"

"مختون بھائی! یہ کیا ہوتا ہے۔ پشتون بھائی تو خیر سُنا ہے مگر یہ تم نئی بات بتا رہے ہو یہ تیری کوئی اپنی برادری ہوگی۔"

"مختون کے معنی ہیں ختنہ کیا ہوا، کیا سمجھے۔"

"نہیں یار! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ایسے ہی "یکڑ" نہ مار۔"

"ابے یہ "یکڑ" نہیں ہے۔ اس بلبیر کو میں پہچان گیا ہوں۔ اس کا اصلی نام محمد بلال آغا ہے۔ اسے میں نے نولکھا تھانے میں دیکھا تھا میرے ساتھ یہ کام کرتا رہا ہے۔ میں سپاہی تھا اور یہ تھانیدار۔" میں نے دبی آواز میں کہا۔

"میرا خیال ہے کہ تو نے بوجھ لیا ہے کہ آبی ذرا احمق ہے۔"

"یہ بات نہیں ہے آبی! یہ لے سگریٹ پی اور یاد کر اس وقت کو جب تو دوزخ کی آگ میں ڈال دیا جائے گا اُس آگ میں جو دھواں نہیں دیتی۔"

"مجھے صحیح صحیح بات بتا جیلانی! یہ چکر نہ دے۔ میں پہلے ہی بہت دکھی ہوں۔"

"ابے تو اس دُکھ کا بھاؤ تو تم خود پوچھتے پھر رہے تھے۔ میں

خود نہیں سمجھ سکا ہوں کہ یہ شخص یہاں کیا کر رہا ہے۔ اتنا بھی مجھے ضرور یاد ہے کہ یہ بلال آغا خفیہ پولیس میں چلا گیا تھا۔"

"ہوں تو یہ بات ہے' اس کا مطلب ہے کہ یہ بھی... کوئی لمبا ہاتھ مار کر بارڈر کراس کر گیا تھا۔"

"ہو سکتا ہے یہی بات ہو مگر وہ مجھ سے آنکھ نہیں ملا رہا ہے اس نے کیس بھی رکھ لیے ہیں اور داڑھی بھی۔ چال ڈھال سے پورا سکھ نظر آتا ہے مگر ہے یہ اپنا پاکستانی بھائی۔"

"اسے مسلمان بھائی کیوں نہیں کہتا۔"

"مسلمان اب کہاں رہ گئے ہیں۔ وہ کیا کہہ گیا ہے شاعرِ مشرق کہ مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے۔ تو یہ بات صدفی صد سچی ہے۔"

"اگر تیرا خیال درست ہے تو پھر مجھے تو یہ کوئی لمبا ہی چکر نظر آتا ہے جیلانی۔"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں' وہ الگ کہیں ملے تو اس سے بات کروں۔"

"دیکھ وہ سکھڑا ادھر ہی آ رہا ہے۔" آبی نے ایک رائفل بردار سپاہی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ حوالات کے دروازے سے ذرا دور آ ٹھہرا تھا۔ ہم خاموشی سے چائے پینے لگے۔ ہمیں ہر معاملے میں بڑی احتیاط کی ضرورت تھی۔ اتنی احتیاط کہ ہمارے دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ کی خبر نہیں ہونی چاہیے تھی۔

سائے لمبے ہو گئے تھے۔ تھانے کا احاطہ آہستہ آہستہ اندھیرے میں ڈوب گیا۔ پھر حوالات کی بتی جل اٹھی۔ ایک سپاہی ہمیں چار کمبل دے گیا۔ ایک ہم نے نیچے بچھایا اور تین اوڑھ کر بیٹھ گئے۔ دن تو گرم تھا مگر رات ٹھنڈی ہوئی جاتی تھی۔

کوئی ساڑھے آٹھ بجے کے قریب ان لوگوں نے ہمیں بھوجن دیا۔ دال اور چپاتیاں ایسی چپاتیاں کہ بس پھونک سے اڑی جاتی تھیں۔ پوچھا ہم سے کسی نے نہیں کہ ہمارے منہ میں کتنے دانت ہیں۔ سپاہی جو دروازے سے ذرا دور کھڑا تھا ہمیں بہت غضبناک نگاہوں سے دیکھتا تھا۔ اس سے صرفِ نظر کر کے ہم سگریٹ پھونکتے رہے۔ ہمارا خیال تھا کہ ان میں سے کوئی نہ کوئی آدمی تو ہمارے پاس آئے گا ہی۔ وہ چاروں سپاہی اب تک ہوش میں آ چکے ہوں گے۔ ان کی وجہ سے وہ ایشر سنگھ سکھڑا ہم سے کوئی دھول دھپا کرے گا مگر وہاں کچھ بھی نہ ہوا۔ وہ بلبیر بھی ہمیں کہیں نظر نہیں آیا۔ لگتا تھا ان گدھوں کی میا ہی مر گئی ہے۔

کھانا کھا کر ہم سروں کے نیچے بانہیں رکھ کر لیٹ گئے' اب تو بس فرصت ہی فرصت تھی۔ سب کچھ حد کے اس طرف رہ گیا۔ ہمارے غم ہمارے خوشیاں ہمارے رشتے ناتے سب کے سب پیچھے رہ گئے تھے مگر آسیہ نے پھر میرے دھیان کی سیڑھیوں پر قدم دھر دیے اور میرا دل ڈوبنے لگا۔

"یار اس چکر سے کسی طرح نکل جا ہاشم خان! ورنہ ہم تلے جائیں گے۔"

"تلے تو جا ہی چکے ہیں الیس جی ایم ایم پیرزادہ صاحب! اب کیا دیکھنے کو باقی ہے۔"

"ہاں! آپ سے دل لگا کے دیکھ لیا۔ یہ شعر مجھے یاد ہے۔ مگر پر یار اب ہم کریں گے کیا یہ تو ہماری مومیائی نکال لیں گے۔"

"صبر کرو پیرزادہ جی صبر! خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"

"پر یہ ہمیں پھر ملے کیوں نہیں؟ ان میں سے کوئی ادھر آیا ہی نہیں۔" آبی کمبل الگ ڈال کر اٹھ بیٹھا۔

"وہ ایشر سنگھ ہمارے لیے نئی ٹکٹکی تیار کروا رہا ہوگا۔"

"چپ کر کے لیٹ رہو اوئے۔ کیا بک بک لگا رکھی ہے تم نے۔ سو جاؤ اب ماں کو یاد کر کے۔" دروازے پر کھڑے سپاہی نے ہمیں ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"تسیں کون او بھاجی! اپنی پچھان تے کراؤ۔" آبی نے بڑے دبنگ لہجے میں پوچھا۔

"مجھے مدن لال نہ سمجھو اوئے تمھارے ٹکڑے تو ہم کل کریں گے۔"

"بھائی جی ناراض نہ ہو۔ ان سپاہیوں کا کیا بنا جو بے ہوش ہو گئے تھے۔"

"مجھے نہیں پتہ! چپ کر کے لیٹ جاؤ۔" یہ کہہ کر وہ دروازے سے ہٹ گیا۔

وہ رات ہم نے فرش پر یوں گزاری کی صبح تک ہماری پسلیاں دکھنے لگیں۔ بدن اکڑ کر تختہ ہو گئے۔ ان سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ وہ ہمیں ایک تکیہ ہی دے دیتے۔ میری تو نیند ہی کھل کھل جاتی تھی۔ ایسے خفتے تو ہم کبھی نہیں بنے تھے۔ آبی کا بھی یہی حال تھا کہ ان خوش فکر اور خوش غلاف عورتوں کے جھرمٹ سے نکل کر اس حوالات کی کڑکی میں آ پھنسا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ بھی ساری رات جاگتا رہا ہے مگر ہم دونوں اپنی اپنی جگہ دم سادھے لیٹے رہے اور باہر رات کا سارا قافلہ ہمارے اوپر سے یوں گزر گیا کہ میں نے اس کے ایک ایک پل کے طاق میں آسیہ کیلئے دعائیں رکھ دیں۔ میں اور کر ہی کیا سکتا تھا اپنی اس بدنصیب بہن کے لیے کہ مجھے میری بدنیت تقدیر کہیں سے اٹھا کر کہیں پھینک گئی تھی۔

صبح وہ ہمیں ہاتھ منہ دھونے کے لیے پانی صابن اور تولیے دے گئے۔ یہ اچھی بات تھی۔ کوئی وہاں ایسا ضرور تھا جو ہمارے لیے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتا تھا۔ یہ ہمارا خیال تھا۔ ہم منہ ہاتھ دھو کر بیٹھے تو ایک بھنگی پاٹ اٹھا کر لے گیا۔

کچھ ہی دیر بعد جب وہ کھرا اچھی طرح دھو کر واپس چلا گیا تو ہمیں ایک سپاہی چائے اور کشمیری کلچے دے گیا۔ آبی نے سپاہی کو بڑی دعائیں دیں۔

ہماری حیرت اور ذہنی اذیت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب ہمیں حوالات میں بند ہوئے اڑتالیس گھنٹے گزر گئے اور کسی نے جھانک کر [illegible] دیکھا کہ ہم وہاں کیوں پڑے ہیں۔ دو دن اور دو راتیں گزر گئیں۔ دانہ [illegible] ہمیں باقاعدگی سے دیے رہے تھے لیکن۔ تو ہمیں ایشر سنگھ [illegible] نہ بلبیر سنگھ کا ہی ادھر سے گزر ہوا۔ ہم سمجھے وہ ہمیں حوالات [illegible] کر ماردیں گے۔ ان کا رویہ ناقابلِ فہم تھا۔ انہوں نے اپنے سپاہیوں [illegible] بنتے دیکھ لی تھی۔ وہ اب تک ہوش میں بھی آ چکے ہوں گے۔ [illegible] ہمارے خلاف کوئی انتقامی کارروائی بھی نہیں کر رہے تھے۔ [illegible] بے یقینی کی ناقابلِ یقین کیفیت ہمارے اعصاب کو مونج کی رسی کی طرح کوٹ رہی تھی۔

مگر نہیں۔ آخر انہیں ہمارا خیال آ ہی گیا۔ تیسرے دن صبح ہم [illegible] کر چکے تو دو سپاہیوں نے ہمیں ہتھکڑیاں پہنا کر حوالات سے [illegible] اور تھانیدار کے کمرے میں لے گئے۔ ایشر سنگھ جم کر اپنی کرسی پر [illegible] تھا اور اس کے سامنے دھری میز کی دوسری جانب بلبیر سنگھ اور ایک اور [illegible] بیٹھا تھا۔ اس کے لباس سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ شہر کا کوئی [illegible] ت بڑا رئیس ہے۔ تمول اس کے چہرے سے بھی عیاں تھا۔

دو خالی کرسیوں کی طرف اشارہ کر کے ایشر سنگھ بولا۔ "بیٹھ جاؤ۔" [illegible] تھانیدار چھپاسے کی طرح رنگ بدلتا تھا۔ ابھی سنجیدہ ہوتا تھا اور [illegible] مسکرانے لگتا تھا۔ ہم دونوں جم کر کرسیوں پر بیٹھ گئے تو ہمارے [illegible] ساتھ ٹنگے سپاہی ہتھکڑی کی زنجیروں کی وجہ سے ہمارے دائیں بائیں کھڑے [illegible] رہ گئے۔

"ہوں! تو پھر تم اپنے بارے میں ہمیں کچھ نہیں بتاؤ گے؟" مجھ سے [illegible] مخاطب ہو کر ایشر سنگھ نے گفتگو کا آغاز کیا۔

"ہم کیا عرض کریں جناب! سب کچھ تو ہم آپ کو بتا چکے ہیں۔"

"دیکھو ہمیں تمھارے بارے میں سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ ہمیں تمھاری مکمل رپورٹ مل گئی ہے۔ اب بھی اگر تم جھوٹ بولو گے تو مجبوراً [illegible] ہمیں تمھاری "چھترول" کرنی پڑے گی۔ اوئے چلو تم دونوں باہر [illegible] بیٹھو اور ان کی یہ ہتھکڑیاں کھول دو۔" ایشر سنگھ نے اچانک یہ حکم دے کر ہمیں حیران کر دیا۔

سپاہیوں نے حکم کی تعمیل کی اور پھر وہ دونوں اسی وقت باہر نکل گئے۔ بلبیر نے اٹھ کر دروازہ بند کر دیا۔ ایشر سنگھ کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔ "تمھارا نام غلام جیلانی ہے نا؟"

میں اپنی جگہ سے اچھل سا گیا۔ وہ انکشاف میرے اعصاب پر بجلی بن کر گرا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں ان کے سامنے ننگا ہو گیا ہوں مگر اب انکار سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر میں نے کہا۔ "جی ہاں! میرا یہی نام ہے۔"

"تمھاری ایک بہن بھی ہے آسیہ۔ اسے تم جیل سے نکال لائے تھے۔"

"جی ہاں یہ بھی درست ہے۔"

"تم نے بہت سے لوگوں کو قتل بھی کیا ہے جن میں اکبر کوٹ کا زمیندار ہادی علی بھی شامل تھا؟"

"یہ سب کچھ آپ کو کس نے بتایا ہے؟" میں نے احمقوں کی طرح اپنی آنکھیں گھماتے ہوئے پوچھا۔

ایشر سنگھ مسکرا دیا۔ بولا۔ "ہم ادھر یوں ہی نہیں بیٹھے ہیں۔ سرحد پار کی ہر خبر ہمیں معلوم ہوتی ہے۔ یہاں آنے سے پہلے تم نے لاہور میں چار آدمی مار دیے تھے۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ آپ کے سامنے میں کسی بھی بات سے انکار نہیں کروں گا۔ ہاں مگر لاہور میں ان کے سامنے میں کوئی بھی اعتراف نہ کرتا۔ کسی بھی قیمت پر نہیں۔"

"تمھارے اس دوست کے بارے میں ابھی ہماری معلومات مکمل نہیں ہیں حالانکہ اس کا بھی فوٹو ہم نے ادھر بھیج دیا تھا۔"

"آپ نے ہمارے فوٹو کب اتارے ہیں؟"

"ارے تمھارے تو کئی فوٹو ہم اتار چکے ہیں مگر تمھاری بے خبری میں۔ مجھے تو تم یہ بتاؤ کہ اس تھانیدار مستقیم کو کیا ہوا تھا؟"

"وہ مجھ سے الجھ گیا تھا۔ میں نے کھڑے ہاتھ کی ایک ضرب اس کی گردن پر ماری اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ اس کے مرنے کا مجھے بہت افسوس ہے' یہ میں نہیں چاہتا تھا۔"

"میرا خیال ہے کہ ویسی ہی ضرب تم نے مدن لال' راجندر' اور دوسرے سپاہیوں پر بھی لگائی تھی۔"

"نہیں جناب۔ مجھے نہیں معلوم کہ انہیں کیا ہوا ہے۔"

میری اس بات پر وہ تینوں کھلکھلا کر ہنس دیے۔ ایشر سنگھ بولا۔ "وہ بدمعاش خود ہمیں بتا چکے ہیں کہ تم نے ان سے کتنی محبت دکھائی۔ وہ تمھارے شاگرد بننا چاہتے ہیں۔"

"ان کا وہم ہے جناب! ورنہ انہوں نے تو ہمیں ادھیڑ کر رکھ دیا تھا۔"

"یہ بھی جھوٹ ہے۔ انہوں نے تو تمہیں چھوا بھی نہیں اور پتہ ہے وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔ میں نے چاروں کو ایک ایک ماہ کی چھٹی دے دی ہے تاکہ وہ کچھ آرام کر لیں۔"

"میرا تو خیال ہے سردار صاحب کہ دفع کریں۔ ہم پر لعنت بھیجیں اور ہمیں واپس جانے دیں۔"

"ناٹ دیٹ ایزی مائی ڈیئر۔ یہ ملہوترہ صاحب ہیں۔ تم ان کے ساتھ چلے جاؤ اور جو کچھ یہ کہیں اس پر دھیان دو۔ پھر ہم دیکھیں گے کہ کیا ہو سکتا ہے۔"

"اور وہ ہماری فردِ جرم؟"

"وہ تو موجود ہے۔ تم کوئی بھاگے کھوتڑی جانتے ہو۔ مگر یاد رکھو ایک داؤ ملہوترہ صاحب بھی جانتے ہیں۔"

"مجھے آپ شرمندہ کرتے ہیں سردار صاحب ورنہ میرے پاس کوئی داؤ

ہوتا تو یہاں کیسے آ پھنستا۔"

میں نے ملہوترہ صاحب کی طرف معذرت خواہانہ نظر سے دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ اکہرے بدن کا چھ فٹ لمبا جوان تھا۔ اس کی آنکھیں اور انگلیاں ہمہ وقت حرکت میں رہتی تھیں۔ وہ صفاچیٹ ہندو تھا اور اس کی رنگت کشمیری برہمنوں ایسی تھی۔ مجھے اس کی شخصیت بہت ہی پُراسرار نظر آ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ایسا اعتماد تھا کہ میں نے ایسے لوگ زندگی میں بہت کم دیکھے ہیں۔ اس ساری گفتگو میں وہ شامل بھی تھا مگر پھر بھی الگ تھلگ بیٹھا رہا۔ اپنے منہ سے اس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔

"ٹھیک ہے ملہوترہ صاحب! اب آپ جائیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ کو کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی اور یہ بھی ہم سے ہر طرح سے تعاون کریں گے۔"

میں اور آبی کرسیوں سے اُٹھے تو الیشر سنگھ بولا۔ "مسٹر سید غلام محمد مرشد پیرزادہ تم ابھی اِدھر ہی بیٹھو۔ تمھارے بارے میں رپورٹ آ جاتے تو پھر ہم کوئی فیصلہ کر سکیں گے۔"

"نہ ... نہیں سردار صاحب ایسا نہ کریں میں اپنے دوست سے الگ نہیں رہ سکتا۔"

"مجبوری ہے مسٹر جیلانی! اگر حوالات میں سڑنا چاہتے ہو تو پھر ٹھیک ہے اس کے ساتھ ہی پڑے رہو۔"

"یہ زیادتی ہے جناب! میں اس کے بغیر باہر نہیں جاؤں گا۔"

میں پھر سے کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کوئی بات نہیں الیشر سنگھ! اسے بھی میرے ساتھ آنے دو۔ یہ کوئی بڑا پرابلم نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے اگر آپ ذمے داری لیتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"مجھے منظور ہے، آئیں مسٹر پیرزادہ! تم بھی میرے ساتھ آ جاؤ۔"

ملہوترہ ہمیں اپنے ساتھ لے کر احاطے میں نکلا۔ ایک لمبی سی سیاہ رنگ کی گاڑی سامنے کھڑی تھی۔ ہم دونوں کو ملہوترہ نے پچھلی نشست پر بٹھایا۔ اور ڈرائیور کے ساتھ والی نشست پر وہ خود بیٹھ گیا۔ اس کا ڈرائیور کوئی بہت ہی عقاب صفت آدمی تھا۔ چاق و چوبند۔ اس کی بھی نگاہوں کو قرار نہیں تھا۔ وہ بھی چھ ہاتھ اونچا جوان تھا مگر فرق صرف یہ تھا کہ وہ سکھ تھا اور داڑھی اس کی اتنی گھنی تھی کہ اس میں سے پانی بھی مشکل سے گزرتا ہو گا۔

"چلو بلونت! ہمیں بنگلے پر لے چلو۔" ملہوترہ نے بڑی دھیمی آواز میں کہا۔ یوں جیسے وہ کسی گہری سوچ میں گم ہو۔

گاڑی مختلف سڑکوں پر چلتی ہوئی ایک وسیع و عریض باغ سے گرد گھوم کر شہر کے مشرقی حصے میں ایک کوٹھی کے اندر داخل ہو گئی۔ کوٹھی کی بیرونی دیوار کے عین عقب میں ایک بہت خوبصورت باغ تھا جس کی روش روش پھولوں سے سجی نظر آتی تھی۔ عمارت کی سمت وہ باغ قوس کی صورت میں کٹا تھا۔ سرو کے درخت اس میں کچھ ایسے قرینے سے لگائے گئے تھے کہ آنکھوں کو تراوت بخشتے تھے۔

گاڑی پورچ میں رُکی تو ایک باوردی ملازم نے آگے بڑھ کر اس کے دروازے کھول دیے۔ ملہوترا ہمیں اپنے ساتھ لے کر عمارت کے اندر داخل ہو گیا۔ ڈرائیور بلونت بھی ہمارے پیچھے تھا۔ اور اس کا وہ ڈھیلا ڈھالا کھدر کا سفید لمبا کرتا اور تنگ پاجامہ دیکھ کر مجھے سکھوں کے گیانی دھیانی لوگ یاد آئے۔ بلونت کی کرپان اس کے پہلو سے لٹک رہی تھی اور اندازہ میرا یہ تھا کہ اس نے اپنی صدری کے نیچے پستول بھی باندھ رکھا ہے۔ وہ شکرے ایسی تیزی سے نظریں گھماتا تھا۔ ملہوترا نے ہمیں عمارت کے وسطی حصے میں لے جا کر ایک نشست گاہ میں بٹھا دیا۔ بلونت کو اشارہ کر کے بولا۔ "پانڈے سے کہو ان کے لیے ناشتہ لائے وہاں انہیں کیا ملا ہو گا۔"

"جی شکریہ ملہوترا صاحب! ناشتہ تو جیسا بھی تھا ہم کر ہی آئے ہیں۔"

"نہیں جیلانی صاحب! اب آپ میرے مہمان ہیں اور آپ کی خدمت میرا فرض بھی اور سرکاری ذمے داری بھی۔"

"اپنے بارے میں ابھی تک آپ نے ہمیں کچھ بھی نہیں بتایا ہے ملہوترا صاحب!"

"پولیس میں ایک عہدہ ہے میرے پاس۔ بس سمجھیں کہ ڈی آئی جی کے برابر عہدہ ہے میرا اور میری ذمے داریاں کچھ بہت ہی خفیہ اور نازک قسم کی ہیں۔ بہر حال آپ سے میں یہ عرض کر دوں کہ اس کوٹھی کے یہ تین کمرے آپ کے ہیں۔ دو بیڈ روم اور یہ ڈرائنگ روم۔ آپ کی ضرورت کی ہر شے یہاں آپ کو ملے گی۔ آپ صرف اتنی کرپا کریں کہ یہاں سے بھاگنے کی کوشش نہ کریں۔"

"ہمیں یہاں رکھنے کا مقصد آپ نے ابھی تک نہیں بتایا ہے۔"

"یہ بھی ہم آپ کو بتا دیں گے۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کے ہم وطنوں نے آپ کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا ہے حالانکہ آپ "فائینسٹ فائبر" کے آدمی ہیں۔ آپ دونوں۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ میرے اور الیشر سنگھ کے ذرا سے اشارے پر آپ کو پھانسی کی سزا دی جا سکتی ہے۔ پھانسی نہیں تو عمر قید میرا خیال ہے بڑی معمولی بات ہے۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"دیکھیں جس مقصد کے لیے آپ نے سرحد کے اس پار اتنی مصیبتیں اٹھائی ہیں وہ اگر ہم یہاں بیٹھ کر پورا کر دیں تو کیسا ہے۔"

"یعنی؟ آپ؟ میں اب بھی کچھ نہیں سمجھا ہوں ملہوترا صاحب۔"

"میرا مطلب ہے اگر آپ ہم سے تعاون کریں تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ وہاں کی جنتا ہمارے ہی جسم کا حصہ ہے ہمیں ان سے گہری ہمدردی ہے۔"

آبی سنبھل کر بیٹھ گیا۔ پتہ نہیں اُسے کیا ہو گیا تھا۔ ملہوترا کے سامنے وہ پاکستان کی پولیس کو گالیاں دینے لگا۔ سو کیڑے اس نے اپنے وطن میں وہیں بیٹھے بیٹھے ڈال دیے۔ ملہوترا تو خوش ہو گیا۔ عمدہ قسم کے امریکی سگریٹ الماری میں سے نکال کر اس نے ہمارے سامنے رکھ دیے، بولا۔

"آپ نے ست بچن بات کی ہے میرا من موہ لیا ہے آپ کی باتوں نے۔ بڑی کھری اور سچی بات کی ہے آپ نے، واہ صاحب واہ یہ لیں سگریٹ پئیں۔"

ہم نے ایک ایک سگریٹ سُلگا لیا۔

آبی بولا۔ "بات یہ ہے ملہوترا صاحب کہ میں تو حق سچ بات کرتا ہوں۔ غریبوں کا یار لوگوں نے خون چوس لیا ہے۔" میں نے بڑے غیر محسوس طریقے سے اُسے آنکھ ماری کہ اپنی یہ بکواس بند رکھے مگر مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ملہوترا ہم سے ایسی ہی باتیں سننا چاہتا تھا اور آبی اُسے خوش کرنے کے لیے اُسی کے ردیف قافیے میں اپنی غزل سُنا رہا تھا۔

اِتنے میں ملہوترا کا ملازم پانڈے چائے کے سامان سے لدی پھندی ٹرالی دھکیلتا اندر آ گیا۔ ڈھیر سارے پھل اور بیکری کا سامان ٹرے میں ڈال کر اس نے ہمارے آگے رکھ دیا۔ اور پھر وہ چپ چاپ واپس چلا گیا۔ ملہوترا خود چائے تیار کرنے لگا۔

"پیرزادہ صاحب نے بات دُوسری طرف موڑ دی ہے۔ میں یہ عرض کر رہا تھا ملہوترا صاحب کہ آپ ہم سے کس قسم کا تعاون چاہتے ہیں؟" میں نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ارے اس بارے میں بعد میں بات کریں گے ابھی آپ اپنی تھکن تو اُتاریں مجھے افسوس ہے پولیس نے آپ جیسے اچھے اور اسٹرانگ قسم کے لوگوں سے اچھا سلوک نہیں کیا ہے میں اس کے لیے چھما چاہوں گا۔"

"کوئی بات نہیں جناب! وہ صورت حال ہی ایسی تھی۔" آبی نے کشمیری سیبوں پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔ اس کا منہ اور ہاتھ دونوں بہت تیزی سے چل رہے تھے۔

"آپ کے بریف کیس ہم نے اُن سے لے لیے تھے۔ آپ کی کل رقم نوّے ہزار روپے تھی اس کے بدلے میں آپ کو ایک لاکھ دوں گا۔"

"آپ کی بڑی مہربانی ہے ملہوترا صاحب! ہمیں نہیں پتہ تھا کہ یہاں آپ ایسے فرشتہ سیرت لوگ بستے ہیں۔" میں نے کہا۔

"ارے بھائی ہندوؤں کے ہاں فرشتے تو ہوتے ہی نہیں کوئی اور مخلوق اُن کے معاملات طے کرتی ہو گی۔" آبی نے پیسٹری پر ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔

"دیوی دیوتا ہوتے ہیں جناب! بہر حال یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں۔ فرشتے کا لفظ زیادہ "کمیونیکیٹو" ہے، زیادہ وسیع ہے۔" ملہوترا نے یہ کہہ کر مہکتی چائے کی پیالیاں میرے آگے رکھ دیں۔

کچھ ہی دیر بعد جب ہم چائے سے فارغ ہو گئے اور پانڈے برتن اٹھا کر اندر لے گیا تو ملہوترا بولا۔ "میں ذرا بینک تک ہو آؤں آپ کی رقم تبدیل کروانی ہے۔ اتنے میں پریتما آپ کا خیال رکھے گی۔ رشتے میں وہ میری چھوٹی بہن ہے۔ اس کی سہیلی بھی آئی ہوئی ہے شکنتلا۔ دونوں بہت پڑھی لکھی لڑکیاں ہیں امید ہے آپ ان سے مل کر خوش ہوں گے۔" یہ کہہ کر وہ اٹھا اور تیز تیز قدم اٹھاتا نشست گاہ سے باہر نکل گیا۔

"یہ کیا طلسم ہے بھئی! میں کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں ذرا چٹکی لینا میرے بازو پر۔" آبی نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا کر کہا۔ آنکھیں اس نے یوں موند لی تھیں جیسے وہ واقعی کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔

"اوئے خواب کے گھوڑے! تو نے پاکستان کے بارے میں کیوں اتنی بکواس کی ہے اس کے سامنے؟"

آبی نے آنکھیں کھول لیں، بڑی عیّاری سے مسکرایا اور میری طرف جھک کر بولا۔ "سمجھا بھی کر مسٹر لائینحل! وہ یہی چاہتا ہے وہ 'ما را چہ ازیں کہ گاؤ آمد و خر رفت'، یہ بات میں نے کسی فارسی کی کتاب میں پڑھی تھی۔ موقعہ محل کے مطابق ہے کہ نہیں؟"

"کیا مطلب ہے تیرا؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"بھئی کیا لینا دینا ہے ہمیں پاکستان سے اور ہندوستان سے کہ لینا ہے کچھ؟ ہمارے لیے یہ آرڈر بارڈر بیکار شے ہے۔ فنکار کا کوئی ملک کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ بس یہی مجھے کہنا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں اپنی تقریر ختم کرتا ہوں آگے تو جان اور تیرا کام۔" آبی نے نیا سگریٹ سُلگا لیا مگر اس کے چہرے پر وہ گھنی سی مسکراہٹ ابھی تک قائم تھی۔

"تو اسے گویا بے وقوف بنا رہا تھا۔"

"وہ خود بن رہا ہے بلکہ بن رہے ہیں۔ اِن گدھوں کا کوئی کام پھنسا ہے اُدھر سرحد کے اُس پار اور ہمیں یہ قربانی کا بکرا بنانا چاہتے ہیں۔"

"یار آدمی تو بہت سمجھ دار ہے آبی۔ اِک ذرا تیری دُم نکل آئے تو تجھے یہ ہنومان جی سمجھیں۔"

"میری توبہ بھائی! میں بندر بن گیا تو یہ مجھے کسی ڈاکٹر کی میز پر تجربے کے لیے امریکہ ایکسپورٹ کر دیں گے اور وہ مجھے چیر پھاڑ کر دیکھیں گے کہ میرے گردے کلیجی کیسے ہیں اور میرے جسم کا نظام کس طرح ورک کرتا ہے۔ نہ میری جان! میرے بارے میں ایسی بات مت سوچ۔"

ابھی وہ یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ دو اپسرائیں ہوا کے دوش پر لہراتی ہوئی کمرے میں آدھمکیں۔ ہم دونوں ان کو دیکھتے ہی الف ہو گئے۔ اُن دونوں نے رقص کے رسیلے زاویوں میں بدن کو ذرا سا خم دے کر ہمیں نمستے کہا۔ ہاتھ انہوں نے یوں جوڑ لیے تھے جیسے وہ ہماری پوجا کر رہی ہوں۔ ہمیں یوں اچھل کر اٹھتے دیکھ کر ایک بولی۔ "براجیے مہاراج براجیے۔ ہم تو آپ کی سیوا کے لیے آئی ہیں۔"

"بڑی کھوشی" ہوئی آپ سے مِل کر۔" آبی نے جان بوجھ کر خوشی کی خ کو گھونٹ کر "کھ" بناتے ہوئے کہا۔ رنگ اس کا ایک دم سرخ ہو گیا، جیسے اس کی بوتل کا شربت کسی نے پوری طرح چھلکا دیا ہو۔ وہ آئیں اور ہمارے دائیں بائیں بیٹھ گئیں۔ یوں جیسے وہ اپنی پھوپھیوں تائیوں کے پاس آکر بیٹھی ہوں۔ دونوں مہک رہی تھیں دونوں عطر میں بسی ہوئی تھیں۔ ایک نے سفید ساڑھی پہن رکھی تھی، اور اس کی نک سے سلیپروں تک ہر شے سفید تھی۔ دوسری آکاش رنگ کی نیلگوں ساڑھی میں ملبوس تھی۔ دونوں بغیر آستینوں کے بلاؤز پہنے ہوئے تھیں اور اپنے جوڑوں میں انہوں نے بڑی خوبصورتی سے پھولوں کی مالائیں باندھ رکھی تھیں۔

میں کسمسا کر ہٹا اور صوفے میں آبی کے بالکل ساتھ جا لگا۔ مگر آبی نے مجھے دھکیل کر پرے ہٹا دیا اور خود سرک کر اس کے قریب ہو گیا جو اُس کے بائیں ہاتھ بیٹھی تھی۔

"آپ کا شبھ نام؟" آبی بہت ہی لُچا آدمی ثابت ہو رہا تھا۔ نام وہ یوں پوچھ رہا تھا جیسے وہ کسی سے خزانے کا پتہ پوچھ رہا ہو۔ آنکھیں اُس کی مدھ سے بھر سی گئی تھیں اور حالت اُس کی یہ تھی کہ وہ مجھے ہمیشہ عورتوں کی صحبت سے دُور رہنے کی تلقین کیا کرتا تھا۔

اپنے نام کے بارے میں آبی کا سوال سُن کر وہ خوش غلاف یوں ہنسی جیسے چوڑیاں کھنک رہی ہوں۔

"آپ تو ہنسنے لگیں، کیا آپ کا نام ہنسی ہے؟"

وہ اور زیادہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

"یہ ہنستی ہی رہتی ہے ہر وقت! ویسے اس کا نام شکنتلا ہے۔" میرے دائیں ہاتھ بیٹھی کانِ حیا نے سرگوشی کی۔ وہ مجھ سے بڑی ہی اپنائیت کے لہجے میں بات کر رہی تھی، یوں جیسے وہ صدیوں سے میری آشنا ہو۔

"میرا نام شکنتلا ہے۔"

"بہت پیارا نام ہے شکنتلا۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ ادھر امرتسر میں آپ ایسی شیریں لب اور شیریں گفتار ہستیاں رہتی ہیں۔"

"آپ بنائیں نہ مجھے۔" وہ پھلوں سے لدی اس شاخ کی طرح لچک رہی تھی جسے ہوا ٹھہر ٹھہر کر گدگداتی ہے۔

"آپ تو ویسے بنی بنائی ہیں۔ پرمیشور کا شاہکار ہیں آپ۔ ایک دم پرکالہ ایسی۔" آبی اس کے چاروں طرف لفظوں کی آگ دہکا رہا تھا اور وہ لجونتی بنی جا رہی تھی حالانکہ وہ تھی نہیں۔

آبی نے ایک قدم آگے بڑھایا، بولا "یہ کمرے نہیں دکھائیں گی آپ۔ ملہوترا صاحب کہہ رہے تھے یہ ہمارے بیڈ روم ہوں گے۔"

"ضرور دیکھیں۔ بہت آرام دہ کمرے ہیں یہ آئیں۔" شکنتلا ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر وہ دونوں نشست گاہ کے پہلو کا دروازہ کھول کر دوسرے کمرے میں جا گھسے۔ دروازہ کھٹک سے بند ہوا تو میرا رکا ہوا سانس سینے سے یوں نکلا جیسے کوئی بوجھ اُتر گیا ہو۔

دُوسری لڑکی مجھے غور سے دیکھ رہی تھی، بولی "آپ کچھ تھکے تھکے نظر آتے ہیں آپ بھی لیٹ جائیں کچھ دیر آرام کر لیں۔"

"آرام ہی آرام ہے بی بی۔ آپ نے اپنا تعارف نہیں کروایا۔"

"میرا نام پریتما ہے۔"

"ملہوترا صاحب کی بہن ہیں آپ؟"

"ہاں، مگر سگی نہیں، آپ پاکستان سے آئے ہیں نا؟"

"ہاں! بس ایسے ہی ایک تھپیڑے نے بے ارادہ لگا دیا ناؤ کو کنارے۔ جب آگے بڑھے تو دیکھا ہم بھارت ورش میں پہنچ چکے ہیں۔"

"آپ تو کوی معلوم ہوتے ہیں۔"

"شکر ہے میں آپ کو کوا نہیں لگتا۔"

وہ ہنس دی، بولی "بڑے شریر ہیں آپ! ملہوترا صاحب بڑی تعریفیں کر رہے تھے آپ کی کہتے تھے آپ بڑے سورما ہیں۔ ہزاروں کو نیچا دکھا دیتے ہیں۔"

"وہ مجھے جب اونچا دکھاتے ہیں تو پھر مجھے بھی تو کچھ کرنا ہی پڑتا ہے نا مس پریتما۔"

وہ پھر ہنس دی "یہ اونچا دکھانا تو کوئی محاورہ نہیں ہے اردو میں۔ میں نے بڑی کتابیں پڑھی ہیں اردو کی۔"

"کچھ محاورے بنا بھی لینے چاہئیں۔ مثلاً اگر اونچا سُننا ہے تو نیچا سُننا بھی ہو سکتا ہے کیا خیال ہے؟"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ ویسے مجھے نہیں پتہ تھا کہ پاکستان میں آپ ایسے ذہین اور خوبصورت لوگ بھی رہتے ہیں۔"

"آپ کیا سمجھتی تھیں کیسے لوگ رہتے ہیں وہاں؟"

"کچھ نہیں! وہ میرے پتا ہیں نا! لالہ کیدار ناتھ شرما۔ وہ ادھر جالندھر کے خالصہ کالج میں انگریزی پڑھاتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ --- بس رہنے ہی دیں۔" وہ کچھ ڈر سی گئی۔

"نہیں نہیں! کھل کر بات کریں نا۔ کیا کہتے ہیں شرما جی؟"

میں نے اُسے آگے آنے کا اشارہ کیا۔

"وہ... وہ کہتے ہیں کہ اُدھر بڑے خونخوار لوگ بستے ہیں انسان کو کچا چبا جاتے ہیں اور پتہ نہیں کیا کیا بتاتے رہتے ہیں۔"

"آپ ہمارا ٹیلیویژن نہیں دیکھتیں ہیں روز۔"

"ہائے آپ کا ٹی وی تو اتنا اچھا ہے' اتنا اچھا ہے کہ بس دیکھتے رہو۔ بہت سُندر پروگرام آتے ہیں آپ کے ٹی وی پر۔"

"اُن کو دیکھ کر بھی آپ کے پتا یہی کہتے ہیں؟"

"وہ... وہ کہتے ہیں کہ ٹی وی پر اپنے اصلی لوگوں کو آپ پیش نہیں کرتے۔"

"آئیں ذرا آپ کے باغ کو دیکھتے ہیں۔"

"چلیں، مگر نہیں۔ ملہوترا صاحب کی تاکید ہے کہ آپ اِن کمروں سے باہر نہیں جا سکتے ہیں۔"

"کیوں؟ کیا حرج ہے اس میں؟"

"باہر کچھ آدمی آپ کی نگرانی کر رہے ہیں شری جیلانی صاحب! مجھے دُکھ ہے کہ آپ مہمان ہیں مگر پھر بھی کڑے پہرے میں رہیں گے" وہ کچھ اُداس سی ہو گئی "یہ تو اچھی بات نہیں۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے مگر دیکھیں نا! آخر وہ چاہتے کیا ہیں؟"

"میں ان سے پوچھوں گی۔ میں تو رہتی ہی یہیں ہوں نا۔ میں آج ان سے معلوم کروں گی۔" وہ میرے دونوں ہاتھوں کو پکڑ کر میری لکیروں پر غور کرنے لگی۔ اس کے نرم کومل ہاتھوں سے نکلتی ہوئی برقی رو میرے بدن میں سنسناہٹ پیدا کر رہی تھی۔

آبی ابھی تک پہلو کے بیڈ روم کے معائنے سے فارغ نہیں ہوا تھا اور پریتما کی نگاہیں بار بار اُس کمرے کے بند دروازے پر پڑ رہی تھیں۔ اچانک وہ کچھ سوچ کر اٹھی اور اپنی ثمربار شاخ ایسی کمر کو لچکاتی ہوئی دیوار میں لگے قدِ آدم آئینے کے سامنے جا ٹھہری۔ اُس کی گفتار بھی نازک تھی اور رفتار بھی۔ اس کے خرام میں جو ہلکی سی لہک تھی وہ میرے دل میں ہلچل مچاتی تھی مگر میں نے اپنے ضبط کے بندھن کس رکھنے ہی میں عافیت سمجھی۔ مجھے حافظ کا وہ شعر بے طرح یاد آ رہا تھا جس میں اس نے کہا ہے کہ

چوں خانہ خالی او معشوق مستِ ناز بُوَد
تونگر نیست ہر آں کس کہ پاک باز بُوَد

آئینے کے سامنے رُک کر اُس نے اپنے سراپا پر نظر ڈالی اور پھر سنبھل کر دوبارہ صوفے پر جا بیٹھی۔

"مس پریتما! آپ مجھے بتائیں گی کہ ملہوترا صاحب نے ہمیں کس مقصد کے لیے یہاں ٹھہرایا ہے۔ ہم ناجائز طور پر غلطی سے بارڈر کراس کر آئے ہیں۔"

"میں ضرور معلوم کروں گی۔ مجھے پیاس لگ رہی ہے۔ آپ کے لیے بھی شربت منگوا لوں؟"

"ہاں کیا حرج ہے موسم تپتا جا رہا ہے اب تو ٹھنڈے میٹھے شربتوں کا موسم آ ہی گیا ہے اور شربتی آنکھوں کا بھی۔" میں نے اس کی آنکھوں کے رنگ کی مناسبت سے بات کی۔ وہ خوش ہو گئی بولی "میری سہیلیاں بھی یہی کہتی ہیں کہ میری آنکھیں شربتی ہیں۔"

"مگر یہ گڑ اور شکر کے شربت کی بات ہے۔ اس کا رنگ آپ کی آنکھوں ایسا ہوتا ہے۔"

وہ ہنس دی ایک دم خوش ہو گئی، بولی "سفید چینی کا شربت بھی کوئی شربت ہوتا ہے میرے پتا جی تو ہمیشہ شکر کا شربت پیتے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے صوفے کے ساتھ رکھی چھوٹی میز میں لگی برقی گھنٹی پر انگلی رکھ دی۔ پانڈے پھر حاضر ہو گیا اور پریتما سے شربت لانے کا حکم سن کر واپس چلا گیا۔

پانڈے باہر نکلا تو میں نے وہ دروازہ کھولنے کی کوشش کی جس سے وہ باہر نکلا تھا مگر معلوم یہ ہوا کہ وہ دروازہ صرف باہر سے ہی کھل سکتا ہے یا پھر اندر لگے لٹو پر لکھے کسی خاص نمبر کو گھمانے سے اسے کھولا جا سکتا ہے اور وہ نمبر ایک سے دس تک تھے۔

کچھ ہی دیر بعد شکنتلا اور آبی باہر آ گئے۔ ان کے چہرے دیکھ کر پریتما مسکرائی، بولی "لگتا ہے آپ کی دوستی بہت پکی ہو گئی ہے۔"

"آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں۔" آبی نے ہنستے ہوئے کہا۔

پانڈے کچھ ہی دیر بعد شربت لے آیا، اُسے ہم پی چکے تو آبی بولا "مہیلاؤ اب تم چلو ہم ذرا آرام کریں گے، بہت نیند آ رہی ہے۔"

"ٹھیک ہے مہاراج ادھیراج! داسیاں آگیا چاہتی ہیں۔" شکنتلا نے نہایت ہی شوخ لہجے میں کہا۔ وہ ذرا سی جھک بھی گئی تھی۔ اُس کا چہرہ گلنار ہو رہا تھا۔ وہ پریتما کو اپنے ساتھ لے کر ہنستی ہوئی کمرے سے باہر نکلنے لگی تو قفل کا لٹو پریتما نے گھمایا۔ میں نے چاہا کہ اُس نے جو نمبر گھمائے ہیں میں انہیں سمجھ لوں مگر وہ دروازہ پلک جھپکتے میں کھلا۔ لٹو پریتما نے اپنے ہاتھ کی اوٹ میں رکھ کر کھولا تھا۔ وہ باہر چلی گئیں اور دروازہ پہلے کی طرح بند ہو گیا تو میں نے اُن نمبروں پر طبع آزمائی شروع کر دی مگر ایک ایک کر کے دو دو کر کے سارے ہی نمبر گھما لینے کے باوجود وہ دروازہ نہ کھُلا۔

آبی میری اس کوشش کو بڑی گہری دلچسپی سے دیکھ رہا تھا، بولا۔ "کیا کر رہے ہو پنڈت کرپا رام جی!"

"کیا مطلب؟ ابے یہ نام تو نے مجھے کیسے دے دیا؟"

وہ ہنس کر بولا "یہ شکنتلا کے پتا جی کا نام ہے۔"

"دُر فٹے مُنہ! ابے تو میرا داماد بنے گا؟"

میری اس بات پر وہ کچھ جھینپ سا گیا، بولا "اس پریتما

سے تیرے رویّے کو میں پدری رویّہ ہی کہہ سکتا ہوں۔"
"تجھے کیسے پتہ چلا؟"
"بس پتہ چل گیا مجھے۔" وہ پھر صوفے پر بیٹھ کر مہکتا ہوا سگریٹ پھونکنے لگا۔
میں بھی اس کے پاس جا بیٹھا۔ "کوئی گرہ کھُلی کہ نہیں؟"
"مجھ پر تو چودہ طبق روشن ہو گئے ہیں۔ بڑے بھائی یہ ہمیں کسی ملبے ہی چکر میں ڈالنا چاہتے ہیں۔" اس نے آواز دبالی۔
"کیا مطلب؟"
"میں نے اس ناری سے پُوچھ لیا ہے' اُسے ٹھیک سے تو کوئی بات معلوم نہیں ہے مگر اندازہ اس کا یہی ہے اس کا خیال یہ ہے کہ وہ کام جو یہ لوگ ہم سے لینا چاہتے ہیں پاکستان میں ہے۔"
"اچھا! یار یہ تو بہت گڑبڑ کی بات ہے ہم تو بہت بُری طرح پھنس گئے ہیں۔"
"اور دیکھ! دنیا میں کیسے کیسے عجوبے ہوتے ہیں۔ وہ بلال آغا ہے نا! اس کے بارے میں یہاں سب لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ وہ سکھ ہے۔"
"اچھا! اس کے بارے میں بھی پوچھا تھا تُو نے؟"
"ہاں! میں نے شکنتلا سے کئی باتیں پوچھ لیں۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ یہ بلبیر سنگھ یہاں اے ایس آئی بھرتی ہوا تھا، پھر یہ دیکھتے دیکھتے انسپکٹر بن گیا۔"
"تُو نے شکنتلا کے دل میں اس کے بارے میں کوئی شک تو نہیں ڈال دیا؟"
"نہیں یار ایسا بھی کا کا نہ سمجھ تو مجھے' آخر کو تیرا شاگرد ہوں جیلانی۔"
"بہت سوچ سمجھ کر پاؤں دھر آبی! یہ بڑی خوفناک دلدل ہے جس میں ہم پھنس چکے ہیں۔"
"تو فکر ہی نہ کر بس ذرا مجھے 'گیڈ' کرتا رہ۔"
"گائیڈ لفظ ہے میاں جاہل پھنسانوی صاحب!"
"اچھا چل اب ذرا آرام کریں' میں تو بہت تھک گیا ہوں۔"
"تجھے پتہ ہے ہم یہاں بند کر دیے گئے ہیں؟"
"نہیں یار! دروازہ تو کھلا معلوم ہوتا ہے۔"
"نہیں! وہ خاص منتر سے کھُلتا ہے اس پر نمبر لگے ہیں اس ہینڈل کے لٹو پر۔"
"اچھا؟ تو تُو نمبر ہی تلاش کر رہا تھا کہ اصلی کون ہے۔ یہ خبر میں شکنتلا سے پوچھ لوں گا۔"
"اسے کیا پتہ؟ وہ کہیں اور رہتی ہے خاص مقصد کے لیے بُلائی گئی تھی۔"
یہ کہہ کر ہم بیڈ رُوم میں جا گھُسے اور فوم کے ڈبل بیڈ پر پھیل کر لیٹ گئے' ایک پہلو وہ تھا دوسرے پہلو میں۔ دروازہ ہم نے اچھی طرح اندر سے بند کر لیا۔ میری جب آنکھ کھُلی تو اُس وقت پانڈے دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ میں نے کواڑوں کی دونوں چٹخنیاں نیچے گرائیں تو وہ اندر آ کر بولا۔ "صاب جی اُٹھ جائیں بھوجن تیار ہے کھائیں۔"
"اوئے ہم تین گھنٹے تک سوتے رہے؟ وہ ملہوترا صاحب کہاں ہیں؟"
"وہ آپ کا انتظار کر رہے ہیں اب اُٹھ جائیے۔"
جب ہم پانڈے کے ساتھ گھر کے طعام خانے میں داخل ہوئے تو ملہوترا پرمیتا، اور شکنتلا کے ساتھ بیٹھا ہمارا انتظار کر رہا تھا۔
"بڑی گہری نیند ہے آپ کی جیلانی صاحب! اُدھر کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ انہی کپڑوں میں سو گئے تھے آپ؟"
"اور کیا کریں ملہوترا جی! کپڑے ہوتے تو بدل بھی لیتے۔" آبی نے شکنتلا کے پہلو والی کُرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
"میں آپ کے لیے کُرتے پاجامے لے آیا ہوں وہ پہن لیجئے گا اب کھانا شروع کریں۔"
میز پر ساگ بھاجی اور آلو کچوریاں اور دالیں ہی چاروں طرف نظر آ رہی تھیں۔۔۔ چٹنی دہی اور سبز مرچیں وافر تھیں۔ ہم نے وہ سب کچھ کھا تو لیا مگر گوشت کے بغیر وہ سب کچھ ہمیں زہر لگتا تھا۔ آبی رہ نہ سکا، بولا۔ "شام کو گوشت پکوائیں ملہوترا جی، ورنہ ہم تو بیمار پڑ جائیں گے۔"
"شام کو میں آپ کو ہوٹل لے جاؤں گا۔ یہاں تو یہ چیز آپ کو کبھی نہ مل سکے گی۔" ملہوترا کچھ جز بز ہو کر بولا۔ یوں لگتا تھا جیسے ہم نے اُس کا "ایمان" کر دیا ہے۔ آبی نے بات وہیں ختم کر دی۔
ہم کھانے سے فارغ ہوئے تو ملہوترا نے لڑکیوں کو وہاں سے ٹہلا دیا اور ہمیں اپنے ساتھ لے کر پھر نشست گاہ میں جا بیٹھا۔
ایک بار پھر اُس نے پاکستان کے بارے میں باتیں شروع کر دیں آبی برابر اس کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ ملہوترا کے دل میں پاکستان کے خلاف جو نفرت ہے اس کا عکس وہ ہمارے دلوں میں بھی دیکھنا چاہتا تھا۔ آبی میں اُسے وہ آدمی نظر آ گیا تھا جس کو وہ اپنے ڈھب میں لا سکتا تھا بولا۔
"دیکھیں جیلانی صاحب! کمشنر صاحب بہت زور دے رہے ہیں کہ ہم آپ پر مقدمہ چلائیں اور فردِ جرم کے مطابق آپ کو سزا دلوائیں مگر میں نہیں چاہتا کہ آپ کی زندگی بھارتی جیلوں میں سڑ جائے۔"
"جی میں سمجھ رہا ہوں۔ یہ آپکی مہربانی ہے کہ ہم ابھی تک محفوظ ہیں۔"
"ہاں! مگر میں بھی یہ کام بلا وجہ نہیں کر رہا ہوں میرے پیشِ نظر بھی ایک مقصد ہے۔"
"وہی تو میں آپ سے پوچھ رہا تھا۔"

"دیکھیں جو کام میں آپ کو بتا رہا ہوں وہ پاکستانی عوام کی بھلائی کے ہے وہاں انتخابات ہونے والے ہیں۔"
"جی میں سمجھ رہا ہوں آپ بات کریں۔"
"ہماری اطلاع کے مطابق جو پارٹی کامیاب ہونے والی ہے وہ بھارت مخالف ہے ہم یہ چاہتے ہیں کہ آپ اس پارٹی کے چند سرکردہ ں کو منظر سے ہٹا دیں۔ اس طرح ایک صحیح اور نمائندہ لوگوں کی حکومت ہو سکے گی۔ جو اس وقت بہت دبی دبی نظر آتی ہے۔"
"آپ کو اس سے کیا فائدہ ہوگا؟"
"ہمارا تو کوئی فائدہ نہیں۔ ہمیں تو پاکستان کے عوام کا مفاد عزیز ہے جنگ کی نفرت کی گرد وہ اور تعصب کی فضا ختم ہو جائے اور دونوں اپنی اپنی حکومتوں کی کوششوں سے ایک دوسرے کے قریب آ ں۔ محبت اور میل جول بڑھے تجارت ہو، بھائی چارہ پیدا ہو کیونکہ بات دونوں مُلکوں کے مفاد میں ہے۔"
"آپ کا مقصد تو بہت نیک معلوم ہوتا ہے ملہوترا صاحب! یہ آپ نے کیسے فرض کر لیا کہ میں ہی اس کام کیلئے موزوں ترین آدمی ں؟"
"دیکھیں' یہ کام آپ وہاں کرتے آئے ہیں۔ ہادی علی کو آپ نے سلسلے میں ختم کیا تھا۔ ہماری اطلاع کے مطابق ڈھلوں صاحب کے مخالف ہدوار ملک رحمت علی کو بھی آپ نے ہی اغوا کیا تھا۔ یہ ساری معلومات ہمیں حاصل ہو چکی ہیں اور آپ انکار نہیں کر سکتے۔"
"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ آپ کی معلومات حیرت انگیز حد تک درست ہیں مگر یہ سب کچھ آپ نے اتنی محنت سے کیوں کر معلوم کیا۔ میں تو۔۔۔ میں تو بہت ہی گمنام سا آدمی ہوں۔"
"دیکھیں ہمیں آپ کے معاملے میں بڑی دوڑ دھُوپ کرنی پڑی ہے تب جا کر یہ سب کچھ معلوم ہوا ہے اور میرا خیال ہے آپ کی پولیس بھی اس معاملے میں بے خبر نہیں ہے۔ وہاں بھی کچھ لوگ آپ کو در پردہ ڈھیل دیتے رہے ہیں۔"
"ہو سکتا ہے آپ کا خیال درست ہو مگر اب آپ فرمائیں کہ آپ ہم سے کیا چاہتے ہیں؟"
"ہم کچھ آدمیوں کی فہرست آپ کو دیں گے۔ اگر آپ انہیں انتخابات کے منظر سے عارضی طور پر یا ہمیشہ کے لیے ہٹا دیں تو ہم آپکی ساری مشکلات دور کر دیں گے۔"
"کیا مطلب؟ کون سی مشکلات؟"
"مثلاً یہ کہ ہم آسیہ کو بحفاظت تمام بھارت لے آئیں گے۔ آپ کے کوئی اور عزیز ہوں تو انہیں بھی ہم یہاں بُلوا لیں گے۔ اور آپ کو اس کام کے مکمل ہونے پر ہم یہاں نہری مربعے دلوا دیں گے۔ نقد میں تو پچاس لاکھ روپے تک ہم انعام دلوا دیں گے۔"
ملہوترا بہت زیادہ سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ ایک لحظے کے لیے تو یہ خیال میرے دل میں گزرا کہ یہ شخص کہیں پاگل تو نہیں ہو گیا ہے مگر نہیں وہ بقائمی ہوش و حواس سب کچھ کہہ رہا تھا اور اُس کی باتوں پر میرے لیے یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔
وہ ایک بہت بڑے منصُوبے اور سازش کے تحت پاکستان میں کوئی ایسی کٹھ پتلی حکومت قائم کرانے کے درپے تھے جسے وہ اپنے اشاروں پر نچوا سکیں۔ جس سے وہ اپنی من مانی پر انگوٹھا لگوا سکیں۔ وہ در پردہ اس سازش میں مصروف تھے کہ پاکستان کو مکمل طور پر اپنی من پسند اور اپنی پروردہ اور خود ساختہ حکومت کے ذریعے مفلوج کر دیں۔
"کیا آپ کے اس منصُوبے کو نئی دہلی کی حمایت حاصل ہے؟"
"نہیں! ہمارے ہاں بھی انتخابات ہونے والے ہیں اور ہمیں معلوم ہے کہ یہاں کس پارٹی کی حکومت قائم ہوگی۔ اس پارٹی کا یہ منصوبہ ہے جسے وہ لوگ انتظامیہ کے ایک خاص طبقے کی مدد سے مکمل کرنا چاہتے ہیں اور اُن میں میرے سمیت اور بہت سے لوگ شامل ہیں۔"
"لیکن آپ تو سرکاری آدمی ہیں؟"
"مگر میں بھارت کا ایک عام شہری بھی تو ہوں جیلانی صاحب!"
"آپ کے پاس اتنے سارے ذرائع موجود ہیں۔ آپ نے پاکستان میں جاسوسی کا ایک ایسا جال پھیلا رکھا ہے کہ میرے جیسے حقیر آدمی کے بارے میں بھی آپ کو مکمل معلُومات حاصل ہیں' اس کے باوجود آپ یہ کام مجھ سے کروانا چاہتے ہیں، آخر اسکی کیا وجہ ہے ملہوترا صاحب!"
"اس کی بہت سی وجوہات ہیں مگر وہ میں آپ کو بتانا ضروری نہیں سمجھتا۔ بس یہی بتا دینا کافی ہوگا کہ آپ کی بہادری، ذہانت اور جرأت مندی نے ہمیں آپ کے انتخاب پر مجبُور کر دیا ہے۔"
"کیا بھارت میں سُورما پیدا نہیں ہوتے؟"
"ہوتے ہیں۔ وہ پاکستان کے چپے چپے پر نگاہ رکھتے ہیں۔ مگر کوئی دو ماہ پہلے ہمارے بہت سے آدمی ادھر پکڑے گئے تھے۔ کچھ مار دیے گئے۔ کچھ جیلوں میں ہیں۔ پاکستانی پولیس بھی تو بڑی دہشتناک تنظیم ہے اسی لیے اب ہم پاکستانی جنتا کے فائدے کے اس منصُوبے کو آپ کے ہاتھوں مکمل کروانا چاہتے ہیں۔"
"ہُوں! اگر میں انکار کر دُوں تو؟"
"تو پھر آپ کی مرضی۔ مگر مجھے یقین ہے کہ آپ خودکشی کرنا پسند نہیں کریں گے۔"
"کیا مطلب؟"
"مطلب یہ ہے کہ۔۔۔ سب کچھ آپ کے سامنے ہے۔ ہماری بات نہ ماننے کی صُورت میں آپ کو جان سے ہاتھ دھونے پڑیں گے بصورت دیگر آپ کو یہاں اونچا مقام حاصل ہو جائے گا۔ ہم آپ کو قومی ہیرو بنا دیں گے۔"

"ان آدمیوں کی فہرست آپ مجھے دے سکتے ہیں۔ کتنے آدمی ہیں وہ کُل ؟"

"وہ چھ آدمی ہیں ایک اُن میں سے بہت بارسوخ اور مشہور ہے باقی لوگ بھی بہت اہم ہیں۔ نظریاتی اعتبار سے وہ ہمارے لیے قابلِ قبول نہیں ہیں۔"

"وہ فہرست مجھے دے سکتے ہیں آپ ؟"

"ابھی نہیں! آپ کو سوچنے کے لیے تین دن دیتا ہوں، اپنے فیصلے سے آپ مجھے پیر وار تک آگاہ کر دیں۔"

"سوچنا کیا ہے ملہوترا صاحب! آپ وہ فہرست ہمارے حوالے کریں اور بے فکر ہو جائیں ہم اُن لوگوں کا جھٹکا کر دیں گے۔"

ملہوترا مُسکرا دیا، بولا "نہیں، آپ اچھی طرح غور کر لیں ہو سکتا ہے آپ کے دوست ہماری تجویز سے اتفاق نہ کرتے ہوں۔" یہ کہہ کر ملہوترا اٹھا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر نکل گیا۔

کچھ ہی دیر بعد پانڈے ہمارے لیے کپڑوں کے نئے جوڑے لے آیا۔ آبی تو خوش ہو گیا۔ ایک جوڑا اٹھا کر وہ اسی وقت باتھ روم میں جا گھسا پانڈے واپس گیا تو میں صوفے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

میرے گیان دھیان کے راستے پیچدار ہوتے جا رہے تھے۔ ملہوترا مجھ سے جو کچھ طلب کر رہا تھا وہ ہمالہ سے بھی زیادہ وزنی تھا۔ میں کسی بھی قیمت پر اس کے ہاتھ اس مقصد کے لیے آلۂ کار نہیں بن سکتا تھا۔ میرا ضمیر ہی یہ بات گوارا نہیں کرتا تھا کہ میں پاکستان کے خلاف اس کے منہ سے ایک بھی لفظ سنوں۔ آبی نے بھی جو بکواس کی تھی وہ محض ملہوترا کو خوش کرنے کے لیے تھی۔ ورنہ مجھے معلوم تھا کہ وہ ایسا بے ضمیر اور وطن فروش آدمی ہرگز نہیں تھا۔ میری مشکل یہ تھی کہ میں منافقت سے کام نہیں لے سکتا تھا۔ میں نے سوچا میں لگی لپٹی رکھے بغیر ملہوترا سے صاف صاف کہہ دُوں گا کہ میں اس کی تجویز پر تھوکتا بھی نہیں ہوں خواہ میرے سامنے دلّی شہر کی کنجیاں بھی کیوں نہ رکھ دے، مجھے یہ سودا منظور نہیں ہے۔

آبی غسل خانے سے نکلا تو میری صورت دیکھ کر بولا "کیا سوچ رہے ہو ملّا جی! خیر تو ہے پندرہ سولہ بج رہے ہیں تمہارے چہرے پر۔"

"کچھ نہیں آبی! یہ چکر میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ ہماری رہائی کی وہ بہت بڑی قیمت مانگ رہے ہیں۔"

"آہستہ بول! ستیا بھی کوئی چیز ہوتی ہے جھلّے! یہ تیری پھوپھی کا گھر نہیں ہے۔" وہ تولیے سے بال خشک کر کے میرے پاس آ بیٹھا۔

"تُو تو ویسے ہی بے پیندے کا آدمی ہو چکا ہے۔"

"او ستیا بیڑہ غرق!" یہ کہہ کر اس نے مُنہ پر انگلی رکھ دی۔ پھر میرے قریب ہو کر بولا "بگنگ" کا مطلب سمجھتا ہے نا تُو؟ مجھے میرے ایک یار نے بتایا تھا کہ لوگ اس طرح دوسروں کی باتیں سن لیتے ہیں۔"

"ہاں! مگر... کیا مطلب ہے تیرا؟"

"ٹھہر جا!" یہ کہہ کر وہ کمرے میں چاروں طرف نظریں گھمانے لگا۔ پھر وہ ایک دم اٹھا اور چاروں دیواروں کے پاس سے گزر گیا۔ جگہ جگہ وہ ہاتھ مارتا جا رہا تھا۔ پھر وہ صوفے کے پیچھے جا ٹھہرا اور میرے کان پر منہ رکھ کر بولا۔

"اُٹھ ذرا اس صوفے کو سرکا کر دیکھتے ہیں۔" میں نے صوفہ چھوڑ دیا تو اس نے اُس کو ہلانے کی کوشش کی مگر وہ بہت وزنی تھا۔ ہم دونوں نے مل کر اس کو ذرا سا اٹھا کر اس کی پشت کو آگے جھکایا تو میرا دماغ سُن ہونے لگا۔ صوفے کے نیچے ایک بہت خوبصورت سا ٹیپ ریکارڈر رکھا تھا اور اس کا مائیک عین صوفے کی پشت کے وسط میں اس طرح لگا تھا کہ اُس کو جالی دار غلاف نے ڈھانپ رکھا تھا۔ ہم دونوں نے صوفے کو اس کی اصلی حالت پر رکھ کر سیدھا کیا۔ آبی مجھے کھینچتا ہُوا دوسرے کمرے میں لے گیا اور بڑی دھیمی آواز میں بولا "دیکھا تم نے! یہ ملہوترا ہماری غیر حاضری میں بھی ہماری باتیں سُن رہا ہے اپنے کان وہ یہاں چھوڑ گیا ہے۔"

"یہ تو بہت بری بات ہے آبی! میں اس ٹیپ ریکارڈر کو توڑ دوں گا۔"

"نہیں پگلے! لوگ یوں ڈھگے نہیں بن جاتے۔ ہمیں صوفے پر بیٹھ کر ملہوترا کے مطلب ہی کی بات کرنی ہو گی تاکہ اسے یقین آ جائے کہ ہم اس کی ہر بات ماننے کو تیار ہیں۔ وہ جیسے کہے گا ہم مار دیں گے۔"

"اچھا پھر؟ ہم نے وعدہ بھی کر لیا، پھر کیا ہو گا؟"

"پھر یہ ہو گا کہ ہم سرحد پار کر کے ان کی ایسی تیسی کر دیں گے"

"مگر کس طرح؟ اِن کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ مجھے جیل میں ایک بڑے ہی نامی گرامی پولیس افسر نے بتایا تھا کہ لیاقت علی کے قتل کی سازش نئی دہلی میں تیار ہوئی تھی۔"

"وہ پولیس افسر کیا کرتا تھا وہاں؟"

"وہ بس اینٹی کرپشن والوں کے ہتھے چڑھ کر وہاں قید بھگت رہا تھا۔"

"کیا کہا تھا اُس نے؟"

"وہ کہتا تھا کہ خان نے بھارت کو جو مُکا دکھایا تھا تو اُس سے گھبرا کر ان لوگوں نے اسے سرِعام مروا دیا۔"

"بکتا تھا وہ..... پاکستان میں اور تو کسی کو خبر نہیں ہو سکی کہ خان کو کس کی سازش سے مروایا گیا مگر اس پولیس افسر کو پتہ چل گیا، جھُوٹ بولتا تھا۔"

"مگر میری بات سمجھنے کی کوشش کر۔ ہم اُن سے وعدہ کر کے اُدھر نکل گئے اور اُن کے لیے کام نہ کر سکے تو یہ ہمارا جینا حرام کر دیں گے

کے ہاتھ بڑے لمبے ہیں۔"

"کچھ بھی نہیں ہو گا۔ ہمیں اپنی پولیس نہیں پکڑ سکی تو یہ کیا [illegible]ں گے۔"

"اچھا، خیر یہ بتا کہ تُو چاہتا کیا ہے؟"

"میں یہ چاہتا ہوں کہ ملہوترا کی ہاں میں ہاں ملاتے جاؤ۔ [illegible]فے پر بیٹھ کر آج ہم کسی وقت اپنی حکومت کو خوب گالیاں [illegible]گے تاکہ یہ لوگ ہمیں اپنا ہی آدمی سمجھیں۔"

"اچھا بھئی یونہی سہی مگر میرا دل نہیں مانتا ہے۔" میں نے [illegible]ت ہی بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ستیا! بچہ جی ستیا! ان گدھوں کو ان کے گھر میں گھس [illegible] مارو۔ یہ حالاتِ حاضرہ کا پروگرام ہم آج شام پانچ بجے ریکارڈ [illegible]وائیں گے۔" آبی نے یہ کہہ کر بستر کی شکنیں درست کیں اور [illegible]ر کمبل اوڑھ کر لیٹ گیا۔ میری بھی طبیعت بوجھل ہو رہی تھی [illegible]ں بھی دوسرے بیڈ پر جا پڑا کرنے کو ہمارے سامنے کوئی بھی کام [illegible]یں تھا۔

رہ رہ کر مجھے آسیہ کی مصیبتوں کا خیال آتا تھا مگر اب تو میں [illegible]یوار کی اس طرف بیٹھا تھا اور وہ اِتنی موٹی، اتنی اونچی اور اتنی سنگین [illegible]یوار تھی کہ میں اسے کسی بھی طرح پھلانگ نہ سکتا تھا۔ حالات نے [illegible]یری مٹی پلید کر دی تھی۔ تقدیر نے اپنے مار تول سے میرے گھٹنے ہی [illegible]وڑ دیے تھے اور میرے ماس کبار کا ایک ایک پرت مجھے یہ بتاتا تھا [illegible]یں سراسر نقصان میں جا رہا ہوں۔ ملہوترا نے ہم پر دو آندھیاں بھی [illegible]سلط کر دی تھیں۔ ایک شکنتلا تھی اور ایک پریتما۔ مجھے اُس پریتما [illegible]کی گھنشیام ایسی لانبی لانبی زُلفیں یاد آئیں تو میرا دل اپنی دھڑکنیں بھول [illegible]گیا۔ سر میں عجیب سی گھمیری پیدا ہونے لگی۔ مسند آراء کے بعد وہ [illegible]دوسری عورت تھی جس نے میرے دل کی گھر نائی پر پاؤں رکھ کر [illegible]اسے آگے دھکیل دیا تھا۔ وہ مجھے مہا ساگر میں ڈال گئی تھی۔ آدمی میں [illegible]ادی کی چنبک پیدا کر کے فطرت نے بڑے رسیلے رنگیلے سامان [illegible]پیدا کر دیے ہیں۔ اور اس کی وجہ سے زندگی ایک مہکتے ہوئے جھونکے [illegible]سی لگتی ہے۔ میں نے شکنتلا کو شہہ نہیں دی تھی۔ پھر بھی مجھے محسوس [illegible]ہو رہا تھا کہ میری زندگی کے اس تاریک سیارے میں وہ اگر اُتر آئے [illegible]تو وہ بڑی روشنی دے سکتی ہے۔ میں کتنی ہی دیر تک اُس کے تصور [illegible]سے کھیلتا رہا۔ پھر مجھے آبی کے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز سُنائی دینے [illegible]لگی اور میں بھی چادر اوڑھ کر سو گیا۔

میری آنکھ کھلی تو آبی پلنگ پر موجود نہیں تھا۔ تپائی پر [illegible]سے پیکٹ اُٹھا کر میں نے سگریٹ سُلگایا اور بالوں میں کنگھی کر کے [illegible]میں نشست گاہ میں داخل ہو گیا۔ آبی اس وقت صوفے کے پیچھے [illegible]بیٹھا ٹیپ ریکارڈر میں رکھے ٹیپ سے اُلجھ رہا تھا۔

"این چہ بوالعجبی است۔"

"میں نے اس ٹیپ کو صاف کر دیا ہے تمہاری کئی باتیں مجھے پسند نہیں تھیں۔"

"تجھے یا ملہوترا صاحب کو؟"

"ایک ہی بات ہے۔ وہ میرا برادرِ نسبتی بن چکا ہے۔ اب بیٹھ جا ادھر اور یہ پروگرام ریکارڈ کرا۔ پہلے نہ نہ، پھر ہاں ہاں۔ پروگرام کے دو حصے ہوں گے۔"

میں صوفے پر بیٹھا تو آبی نے بات چیت شروع کر دی — ہم کوئی دس منٹ تک اس موضوع پر بات چیت کرتے رہے جس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ بالآخر میں نے ہتھیار ڈال دیے ہیں اور میں اپنے کسی اندرُونی کرب کی وجہ سے پاکستان واپس جا کر وہ سب کچھ کر ڈالوں گا جو ملہوترا صاحب چاہتے ہیں۔

آبی مطمئن ہو گیا تو اس نے موضوع بدل دیا۔ ہم موسم کی، بھارت کے لوگوں کی، امرتسر کی، البشر سنگھ کی اور اُس کے عملے کی باتیں کرنے لگے اور مجھے یقین ہے کہ ٹیپ برابر چلتی رہی ہو گی۔

کوئی پانچ بجے کے قریب شکنتلا اور پریتما آ چکیں۔ وہ چائے کی ٹرالی دھکیلتی ہوئی اندر داخل ہوئیں تو مجھے محسوس ہُوا کہ کمرے میں بہار آ گئی ہے میرے دل میں پریتما کے لیے جذبوں کے پودے جوان ہو چکے تھے اور جب میں نے اُسے دیکھا تو وہ میرے ذہن میں ڈنک مارنے لگے۔ میں اس کو دیکھ کر مسحُور سا ہو گیا۔ اس کی آنکھیں، اس کی زلفیں، اُس کے رخسار کا وہ تِل، اس کی وہ بھیدوں بھری مسکان مجھے مسند آراء کی یاد دلا رہی تھی۔ شکنتلا نے آتے ہی ہمیں پہلے نمستے کہا، اور پھر آبی سے مخاطب ہو کر بڑے ہی رسیلے انداز سے بولی۔

"کیا حال ہے پوجیہ جی!"

"پوجیہ جی؟ یہ کیا ہوتی ہے دیوی جی؟"

"نہیں جانتے؟ ہائے ایشور! پارسے تو ہندی کا بولو رام ہی کر دیا ہے آپ لوگوں نے حالانکہ یہ اِتنی میٹھی بولی ہے۔"

"مطلب سمجھا دیں تو یہ لفظ میں بھی پلّے باندھ لوں گا۔"

"اِس کے معنی ہیں وہ آدمی، وہ مرد جو پوجا کے لائق ہو۔"

"لے بھئی! تیرے درجات تو بہت ہی بلند ہو گئے بھائی پیرزادہ صاحب!"

آبی ہنس دیا، بولا "میرا خیال ہے کہ ہمیں چائے اپنے بیڈ روم میں بیٹھ کر پینی چاہیے ——" وہ موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا اور مجھے بھی خلوت فراہم کر رہا تھا۔

"کیا حال ہے آپ کا؟" پریتما نے میرے لیے چائے بناتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہوں۔ آپ سُنائیں۔"

"کرپا ہے آپ کی۔ میرا آنا آپ کو اچھا نہیں لگتا؟"

"یہ کیسے کہہ سکتی ہیں آپ! اُس وقت میں کچھ اپنی ہی سوچوں میں گم تھا، بعد میں مَیں آپ کو بہت یاد کرتا رہا۔ آپ کی سندرتا کی تو قسم کھائی جا سکتی ہے مس پریتما۔"

"آپ مجھے "فلیٹر" کرتے ہیں، بس چائے پئیں۔"

میں نے پیالی اس کے ہاتھ سے لے کر اُس کی دل کھول کر تعریف کی۔ وہ بھونچکا سی رہ گئی۔ اُس کے تلوار کے گھاٹ ایسے ابرو مجھے محرابوں کی یاد دلاتے تھے۔ وہ کھل اُٹھی۔ ہم چائے پی چکے تو وہ بولی۔

"مجھے ملہوترہ صاحب نے بتایا ہے کہ وہ کوئی کام آپ کے سپرد کر رہے ہیں۔"

"جی ہاں! میری بات ہوئی ہے اُن سے۔"

"پھر کیا سوچا ہے آپ نے؟"

"اِن کی بات ماننا ہی پڑے گی مس پریتما۔ دیکھیں نا ہمارے لیے اور کوئی چارۂ کار بھی تو نہیں ہے۔ ایک طرف کھائی دوسری طرف شیر۔"

"میری مانیں تو اُن کے کہنے پر عمل کرتے جائیں، اس میں آپ کے سو فائدے ہیں پھر سب سے بڑا فائدہ تو مجھے ہوگا۔"

"آپ کو کیا فائدہ ہوگا؟"

"آپ ہمیشہ کے لیے میرے سامنے رہیں گے میں آپ کی داسی بن جاؤں گی۔"

"اوہ! تو یہ بات ہے مگر کہاں میں کہاں آپ! چہ نسبت خاک را بہ عالمِ پاک۔"

"مجھے فارسی نہیں آتی ہے جیلانی صاحب! یہ میری بدقسمتی ہے۔ اور آپ فرفر بول لیتے ہیں۔ کیا مطلب ہے ان لفظوں کا؟"

میں نے اُسے معانی بتلائے تو وہ نارمل ہونے لگی میرے پاؤں چھو کر بولی: "آپ کے یہ پاؤں میرے لیے پوجیہ پاد ہیں مسٹر جیلانی! آپ ایسی باتیں نہ کیا کریں۔"

"یہ ایک ہی دن میں کیا ماجرا ہوگیا مس پریتما! آپ میرے اتنا قریب آگئی ہیں کہ مجھے حیرت ہے۔"

"بجلی کو بادل سے زمین تک پہنچنے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے شری مہاراج!"

"اچھا یہ بتائیں کہ اگر میں ملہوترا صاحب کی بات نہ مانوں، انکار کر دُوں تو کیا ہوگا؟"

"میں کچھ کہہ نہیں سکتی مگر میرا خیال ہے کہ وہ آپ کو لمبی مدت کے لیے جیل میں ڈال دیں گے اور کچھ نہیں تو جاسوسی کے الزام میں وہ آپ کو پھانسی بھی لگوا سکتے ہیں۔ میرا تو اس خیال سے ہی دل ڈُوبتا ہے مگر آپ کی فردِ جرم اُن کے ہاتھ میں ہے۔"

"ہوں! ٹھیک ہے مس پریتما! ہمیں یہ زہر پھانکنا ہی پڑے گا۔" میں نے بہت ہی بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

کوئی ایک گھنٹے بعد شکنتلا اور آبی خواب گاہ سے نکلے، تو پریتما بھی میرے پاس سے اُٹھ گئی اور وہ ٹرالی کو دھکیلتی ہوئی باہر نکل گئی۔

اس رات کے پچھلے پہر میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں جس طرح بھی ممکن ہو سکا وہاں سے آبی کو لے کر نکل جاؤں گا۔ ملہوترا ہمیں دوبارہ نظر نہیں آیا۔ رات کا کھانا بھی ہم نے اس کی عدم موجودگی میں کھایا۔ شکنتلا اور پریتما البتہ حاضر تھیں۔ وہ رات دیر تک ہمارے پاس کھانے کی میز پر بیٹھی رہیں۔ حیرت مجھے یہ تھی کہ جن چھ آدمیوں کی نگرانی کی بات ہمیں سُنائی گئی تھی وہ ہمیں عمارت میں کہیں نظر نہیں آئے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ بھی تھی کہ ہم باہر نکلے ہی نہیں تھے اور اس کی ہمیں اجازت بھی نہیں ملی تھی مگر ان کی آواز پاؤں کی چاپ کوئی کھانسی کھنکار کچھ بھی تو ہمیں سنائی نہیں دی۔

رات کو دس بجے جب ہم طعام گاہ سے نکل کر اپنے بیڈروم کی طرف چلے تو آبی نے صوفے کے پیچھے بیٹھ کر ٹیپ ریکارڈ کھول کر دیکھا تو اس میں وہ ٹیپ موجود نہیں تھی جس میں ہماری گفتگو ریکارڈ ہوئی تھی۔ اس کی جگہ نئی ٹیپ رکھ دی گئی تھی۔ اور ہمیں یقین تھا کہ وہ کام پانڈے کے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا۔ کوئی پانچ منٹ کے لیے شکنتلا بھی کھانے کی میز سے غائب رہی تھی۔ عین ممکن تھا کہ وہ ٹیپ اُسی نے وہاں سے ہٹائی ہو۔

اس رات ہم بارہ بجے تک بستروں میں آنکھیں موند کر لیٹے رہے۔ آبی بھی اس بات پر ہم سے متفق تھا کہ ہمیں وہاں سے فرار ہو جانا چاہیے امکان غالب یہ تھا کہ ہم اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو جائیں گے۔

بنگلے میں ہر طرف جب سناٹا چھا گیا تو ہم دونوں خواب گاہ سے نکلے مصیبت یہ تھی کہ دونوں خواب گاہوں کے دروازے نشست گاہ میں کھلتے تھے۔ دوسری خواب گاہ تو ہم نے استعمال ہی نہیں کی تھی۔ اُن کی شمالی جنوبی اور عقبی دیواریں بالکل اندھی تھیں۔ صرف ایک ایک روشندان اُن میں لگا تھا۔ میں آبی کے کندھوں پر چڑھ کر اُدھر جھانک چکا تھا۔ وہ دونوں روشندان تاریک کمروں میں کھلتے تھے۔ وہاں اتنا اندھیرا تھا کہ اندر کوئی شے ہمیں نظر نہیں آتی تھی۔ نشست گاہ میں پہنچ کر ہم نے بتی جلائی اور پھر دروازے میں لگے ہینڈل کے لٹو کو گھمانے میں جُت گئے۔ ایک سے دس تک کے نمبر ہمارا منہ چڑا رہے تھے۔ سارے ہی جفت طاق نمبر ہم نے ملا کر گھما کر دیکھ لیے مگر دروازہ نہ کھلا۔ آبی بے صبر ہو رہا تھا بولا۔

"یار ہم کس مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔ صوفے کے پیچھے جو کھڑکی ہے وہ بھی نہیں توڑ سکتے۔ اس میں لوہے کا جنگلہ سلاخیں اور جالی ایسی لگی ہیں کہ آری کے بغیر کٹ نہیں سکتی ہیں۔"

"گویا یہ بات بھی مجھے بتانے کی ضرورت ہے۔"

آبی مسکرا دیا۔ "تیری عقل ذرا موٹی ہے نا اس لیے مجھے مغز کھپانا پڑتا ہے۔"

"تیرا کیا خیال ہے ہم یہاں سے نکل نہیں سکتے؟"

"نہیں! کوشش تو فرض ہے نا کر دیکھو۔"

"تم نے شکنتلا سے پوچھ لیا ہوتا کہ یہ کس نمبر سے کھلتا ہے؟"

"اس سے بہت پوچھا تھا میں نے مگر وہ... کچھ بتاتی ہی نہیں تھی۔ کہتی تھی کوئی اور سیوا! بتاؤ پیر جادہ جی یہ کام نہیں کر سکوں گی۔"

"دیکھ وہ جو خواب گاہ میں روشندان ہے اس میں صرف لکڑی کا روشندان ہے۔"

"اچھا پھر؟"

"میرا خیال ہے کہ میں اوپر چڑھ کر اُسے توڑ دیتا ہوں۔ اس میں سے ہم آسانی سے گزر سکتے ہیں۔"

"چلو گزر گئے مگر اس بات کی کیا ضمانت ہے جناب کہ آگے راستہ کھلا ہوگا۔"

"کوشش تو کرو۔" میں نے اسے خواب گاہ کی طرف گھسیٹا اور نشست گاہ کی بتی بجھا دی پھر ہم بیڈروم میں جا گھسے۔ دروازہ ہم نے اندر سے اچھی طرح بند کر لیا۔ آبی دیوار کے قریب ہو کر اکڑوں بیٹھا تو میں اس کے کندھوں پر چڑھ کر اوپر اٹھا۔ میرا سر روشندان سے اوپر ہو رہا تھا۔ میں نے اس کے چوکھٹے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر تھوڑا سا زور لگایا تو اس کی لکڑی تڑاخ سے ٹوٹ گئی۔ وہ آواز اس سناٹے میں دھماکے کی طرح پھیلی۔ میں سُن ہو کر رہ گیا۔ لکڑی کے ساتھ شیشہ بھی ٹوٹ گیا تھا۔ چند لمحوں تک میں آبی کے کندھوں پر ساکت جامد ہو کر کھڑا رہا تو وہ بولا "ابے جلدی کر میرے کندھے توڑے گا کیا؟"

"ذرا چھری تلے دم لے۔ ابھی تو تم پر سواری کا موقع ملا ہے میرے یار۔" یہ کہہ کر میں نے روشندان کے چوکھٹے کو کھینچ کر باہر نکال لیا۔

اب سوال یہ تھا کہ ہم اس طرف اُتریں تو کس طرح؟ روشندان فرش سے دس فٹ اونچا تھا۔ میں سر کے بل اُدھر لڑھکتا تو کھوپڑی تڑوا بیٹھتا میرے لیے مصیبت دوہری تھی۔ میرا وزن زیادہ تھا اور سینہ آبی سے مقابلے میں زیادہ چوڑا چکلا ہونے کی وجہ سے اس روشندان میں سے میرا گزرنا زیادہ دشوار تھا۔

"نیچے بیٹھ جا اوئے کھوتے۔" میں نے دبی آواز میں کہا۔

آبی خوش ہوگیا۔ یوں نیچے بیٹھا جیسے اسی انتظار میں تھا۔ میں گرتے گرتے بچا۔ وہ اپنے کندھے دونوں ہاتھوں سے دباتے ہوئے بولا: "یار گناہ گار کی میت جتنا بھاری ہے تو۔ قسم اللہ کی، کوئی نیک آدمی اتنا وزنی نہیں ہو سکتا۔"

"بکواس نہ کر۔ روشندان میں سے پہلے تجھے گزرنا ہوگا۔ اس کے بعد میں کوشش کروں گا۔"

"تو پھر جلدی کر۔ کوئی جاگ جگا گیا تو مارے جائیں گے۔" یہ سنتے اسے کندھوں پر اٹھا کر ابھی اُوپر اٹھایا ہی تھا کہ خواب گاہ کی طرف کھلنے والے دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔

"اوئے نیچے اتار مجھے، جلدی کر۔" آبی نے دبی گھٹی آواز میں کہا۔

دستک سُن کر میرا دم خشک ہوگیا تھا۔ میں فوراً نیچے بیٹھا، تو آبی اُچھل کر میرے کندھوں سے اُترا اور بستر میں جا گھسا۔

دروازے پر دستک تیز ہوگئی تھی۔

"کون ہے بھئی؟" میں نے بڑے جمے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں ہوں پانڈے، دروازہ کھولیں۔"

"کھولتا ہوں ذرا ٹھہرو۔" یہ کہہ کر میں نے اپنے بال بکھیرے اور پھر جُوتے گھسیٹتے ہوئے میں دروازے تک پہنچا اور چٹخنی کھول دی۔ پانڈے نے کواڑ کو بڑے زور سے پیچھے دھکیلا۔ وہ سیدھے ہاتھ میں ڈنڈا لیے کھڑا تھا اور اس کی آنکھیں کمرے کا یوں جائزہ لے رہی تھیں جیسے ساری صُورتِ حال کو پہلے ہی سمجھ چکا ہو۔

"یہ آواز کیسی تھی؟" اس نے روشندان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہم خود حیران ہیں کسی نے روشندان کا چوکھٹا توڑ کر اُدھر پھینک دیا۔" آبی نے بڑے ہی سہمے ہوئے لہجے میں کہا جیسے وہ اس واقعے پر... خود حیران ہو رہا ہو۔

"اچھا! یہ کیسے ہوگیا؟ اُدھر سے تو سارے دروازے بند ہیں!"

میری نگاہ اچانک نشست گاہ کے دروازے پر جا پڑی۔ وہاں ملہوترا کا وہ بانکا ڈرائیور بلونت کھڑا تھا۔ اپنے بالوں کو اس نے ایک جال دار ٹوپی میں باندھ رکھا تھا۔ وہ اس وقت صرف کچھا اور بنیان پہنے ہوئے تھا۔

پانڈے ہمارے قریب نہیں ہو رہا تھا اور میں سمجھ رہا تھا کہ وہ جان بُوجھ کر ہمارے درمیان فاصلہ قائم رکھنا چاہتا ہے۔ اس نے بائیں ہاتھ میں ایک بڑا سا سُرخ رُومال پکڑ رکھا تھا جس کے ایک کونے میں شاید اس نے کچھ سکے باندھ رکھے تھے وہ گرہ نیچے لٹک رہی تھی۔

"سچ کہا ہے کسی نے کہ ترک تمنا طوطڑا نہ یہ کسی کے میت۔" اُس کے چہرے پر عجیب سا طنز اُبھر آیا تھا۔

"کیا مطلب ہے تمھارا؟" میں نے ذرا تیز لہجے میں پوچھا۔

"مطلب یہ کہ بھیڑ پڑت منہ پھیر لیں راکھیں نا ہیں پیت۔"

"ہم ایسے نہیں ہیں پانڈے جی! تم پر کوئی آفت آئی تو ہم تمہیں بچائیں گے۔"

"ہمیں جُل نہ دو مہاراج! ہم سب سمجھت ہیں۔"

"کیا سمجھت ہو تم؟" آبی نے بھاری بھر کم آواز میں کہا۔

"اِدھر تم لوگوں نے یہ روشن دان توڑ مارا پہ پُھرائے نہ ہو سکو گے۔

"کیا بکتے ہو تم؟ ہماری بات پر یقین نہیں کرتے ہو؟"

"زادہ اکڑ پھکڑ نہ دکھاؤ میاں جی! میرا نام پانڈے ہے۔ مالک کے لیے کتا ہوں پر اس کے دشمن کے لیے شیر بن جاتا ہوں۔"

"پتہ نہیں کیا بک رہے ہو تم؟"

"گالی نہ دو۔ یہ بتاؤ یہ روشندان کیوں توڑا ہے؟" اب کی بار اس کا لہجہ تلخ ہو گیا تھا۔

"چل اوئے شکل غائب کر اپنی۔ ملہوترا صاحب کو بلا۔ ہم اُن سے بات کریں گے۔" آبی نے اسے بازو سے پکڑ کر دروازے کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔

بس اتنی سی بات پر پانڈے کا مغز اُلٹ گیا۔ پیشتر اس کے کہ میں صورتِ حال کو سمجھ سکتا۔ پانڈے نے پلٹ کر آبی کی پسلی میں کہنی ماری اور ایک مشاق پٹے باز کی طرح وہ گھوم کر پیچھے ہٹا اور اس رومال کو سر کے اوپر سے لہرا کر اس نے کونے میں کھڑے آبی کے ٹخنے پر کچھ اس تیزی اور قوت سے مارا کہ آبی پھڑک کر اچھلا اور زمین پر دھم سے گر گیا۔ اس کی آواز تک نہیں نکلی تھی اور وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ یہ سب کچھ چشم زدن میں وقوع پذیر ہو گیا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آرہا تھا۔

"اسے سنبھال کر رکھو مہاراج! کہیں یہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا یہ گنج پال کا لونڈا۔" وہ اپنے رومال کو پھر ہاتھ میں پکڑ کر یوں جھٹکا دے رہا تھا جیسے وہ اس میں لگی گرد جھاڑ رہا ہو۔ اس رومال کی گرہ میں اس نے سکے نہیں بلکہ لوہے کی کوئی چیز باندھ رکھی تھی۔ گول سی چھٹانک ٹکے جیسی۔ وہی اس نے گھما کر آبی کے ٹخنے پر ماری اور اس کی رگوں کو اس طرح سُن کر دیا کہ وہ بے سُدھ ہو گیا۔

پانڈے مجھے یوں دیکھ رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو کہ کیا خیال ہے تم بھی چکھو گے اس گرہ کا مزہ۔ میرا دل چاہتا تھا کہ اس سے بھڑ جاؤں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ میں بس ہکا بکا سا ہو کر رہ گیا تھا۔ ایسا تماشا میں نے برپا تو بار بار کیا تھا مگر اپنی آنکھوں کے سامنے کسی اور کو یوں ہاتھ کا کمال دکھاتے نہیں دیکھا تھا۔

"تم نے اچھا نہیں کیا ہے پانڈے جی! بڑا غلط حساب کھول لیا ہے تم نے میرے ساتھ۔" میرے لہجے میں ایکدم وہ زہر اُبھر آیا جو میرا مغز اُلٹنے سے میرے رگ رگ میں بھر جاتا تھا۔

پانڈے مجھ سے ایک لیٹے آدمی جتنا دور کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایکدم شعلہ سا چمکا۔ میں اس کی نیت سمجھ رہا تھا۔ اسے یہ یقین ہونے لگا تھا کہ میں اس پر حملہ کر دوں گا۔ میری رگیں تن سی گئی تھیں۔ اس نے مجھے پہل سے محروم کرنے کے لیے ایک قدم بڑھایا ہی تھا کہ میں نے پورے قد سے اچھل کر دونوں پاؤں کی ٹھوکر اس کے سینے میں دے ماری۔ میں اُلٹ کر اٹھا تو وہ اوندھے منہ گر چکا تھا مگر پھر وہ بجلی ایسی تیزی سے اٹھا۔ اسے رومال گھمانے اور اس میں گونج ایسی تیزی پیدا کرنے کے لیے تھوڑی سی جگہ کی ضرورت تھی، وہ میں اس سے چھین چکا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھ پھیلا کر پوری قوت سے اس کی گردن پر یوں دے مارے کہ میرے دائیں ہاتھ تلے اس کی رگ احساس دبی اور اس کا سارا بدن ذرا دیر کے لیے تڑپ کر بے جان ہو گیا۔ وہ ریت کی دیوار کی طرح ڈھے سا گیا۔ اب اسے دیوار سہلا دے رہی تھی۔

میری نظر پھر دروازے پر جا پڑی۔ وہاں ملہوترا اپنے ڈرائیور بلونت کو بڑی مشکلوں سے پیچھے ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس کی آنکھوں میں بھیڑیے ایسی سفاکی مجھے یہ احساس دلا رہی تھی کہ وہ پانڈے کی شکست کا مجھ سے بدلہ ضرور لے گا۔ اچانک ملہوترا نے چیخ کر کہا۔

"پیچھے ہٹ جاؤ بلونت! ہٹ جاؤ۔ میں کہتا ہوں یہ میرا حکم ہے باہر چلے جاؤ۔"

بلونت نے ایک لحظے کے لیے کھا جانے والی نظروں سے مجھے دیکھا اور پھر پیچھے ہٹ گیا۔ ملہوترا کو اندر آنے کی راہ مل گئی تھی وہ آگے بڑھا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ "یہ کیا ہو گیا ہے جیلانی صاحب؟"

"میں پانڈے جی کو تھوڑا سبق سکھا رہا تھا کہ مہمانوں سے کس طرح پیش آتے ہیں۔" میں نے بڑے ہی تلخ لہجے میں کہا۔ پانڈے کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ اور سانس کی آمد و رفت مدھم پڑ چکی تھی۔

"آخر یہ جھگڑا کیوں ہوا؟"

میں نے اسے روشندان کا ٹوٹا جو کھٹا دکھاتے ہوئے وہی بات بتائی جو میں پانڈے سے کہہ چکا تھا۔ ملہوترا اب کی بار کھل کر مسکرایا۔ بولا۔

"اوئے بلونت اُٹھا پانڈے کو ادھر سے۔ خواہ مخواہ بھڑ گیا یہ ان سے۔ میں نے منع بھی کیا تھا۔"

بلونت پھر دروازے میں نمودار ہوا اور کسی طرف دیکھے بغیر پانڈے کو کمر پر لاد کر باہر لے گیا۔

"پیرزادہ صاحب کے منہ پر پانی کے چھینٹے ماریں یہ ٹھیک ہو جائیں گے۔" یہ کہہ کر ملہوترا باہر نکل گیا۔

میں ٹھگ مارے مفلس کی طرح چند ثانیوں تک بے سُدھ آبی کا چہرہ دیکھتا رہا۔ مجھے اس پر بہت ترس آرہا تھا۔ اس پر زندگی بھر ایسی افتاد کبھی نہ پڑی ہو گی۔ پانڈے نے اسے پلک جھپکتے میں بیکار کر کے رکھ دیا تھا۔ اس گھٹے سر والے رسوئیے نے اس کی پت اتار کر رکھ دی تھی۔

اس کو جب میں نے اٹھا کر بستر پر ڈالا تو میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے مجھے اس دن شعر سنایا تھا کہ تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو۔ اب وہ پانڈے جی اس کو اپنی کرامت دکھا گیا تھا۔ ہمیں یہ دن بھی دیکھنا تھا۔ آبی کی صورت دیکھ دیکھ کر مجھے ہنسی آرہی تھی مگر اس کا بایاں ٹخنہ سوج گیا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں۔

آبی کا سانس تو ٹھیک چل رہا تھا۔ دل کی دھڑکن بھی ٹھیک تھی مگر رنگ اس کا کچھ پیلا پڑ گیا تھا۔ مجھے ایشر سنگھ نے بتایا بھی تھا کہ ایک داؤ ملہوترا بھی جانتا ہے مگر یہ نہیں معلوم تھا کہ اس کا اشارہ ملہوترا کی طرف نہیں بلکہ اس کے خانسامے کی طرف تھا۔ اگر وہ صحیح بات اور صحیح آدمی کا نام لے دیتا، تو میں پانڈے کو گھمیری لینے کا موقع ہی نہ دیتا۔ مگر وہ میری بے خبری میں اپنا ہاتھ دکھا ہی گیا تھا اور یہ میرے لیے ایک نیا تجربہ تھا میرے لیے بھی اور آبی کے لیے بھی۔ میرا خیال ہے کہ یہ آبی تو اب زندگی بھر کسی رومال والے پر بھروسہ نہیں کرے گا۔ مجھے یاد آیا کہ ادھر وطن میں تو مولوی اکثر کندھے پر ایسے رومال دھرے پھرتے ہیں۔ آبی ان کو دیکھ کر بھڑکا کرے گا۔ حالانکہ وہ پھکیت نہیں ہوتے، سیدھے سادھے مولانا ست لوگ ہوتے ہیں۔

میں نے آبی کے چہرے پر ڈونگے میں پانی بھر کر چھینٹے مارے پانی قدرے سرد تھا۔ چند ہی منٹ بعد آبی نے جھرجھری لی۔ پانی کی برودت اپنا اثر دکھا گئی تھی۔ اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں یوں جیسے کوئی خوفزدہ بچہ نیند میں کھو جانے سے پہلے کا خوفناک منظر دوبارہ دیکھنے کے خیال سے ڈر رہا ہو۔ میں اس کی بصارت میں اترا تو اس نے آنکھیں پوری طرح کھول دیں اور پھر وہ تڑپ کر اُٹھ بیٹھا۔ اس کا ہاتھ سیدھا ٹخنے پر گیا۔

"کیا حال ہے تیرا بھائی پخنے!"

میری یہ بات سن کر اور میرے لبوں پر مسکراہٹ دیکھ کر اس نے موٹی سی گالی پانڈے کو دی

میں بے اختیار ہنس دیا۔

"اوئے تجھے ہنسی آرہی ہے میرا اس نے بیڑا کر دیا۔ کیا مارا تھا اس نے میرے گٹے پر؟"

میں کھلکھلا کر ہنس دیا۔

آبی چڑ سا گیا اور بستر سے اُتر کر یہ دیکھنے لگا کہ وہ چل پھر بھی سکتا ہے کہ نہیں۔ اسے یہی شک تھا کہ اس پانڈے نے اس کی ٹانگ بیکار کر دی ہے۔ دو چار قدم اِدھر اُدھر پھر کر جب اس نے دیکھ لیا کہ اس کی ٹانگ اس کا بوجھ سہار رہی ہے تو ایک بار پھر پلنگ پر اپنا پاؤں رکھ کر وہ بلب کی روشنی میں اپنا ٹخنہ دیکھنے لگا۔ "یار اس لالے نے کیا کیا ہے؟ میرا تو گٹہ سوج گیا ہے۔"

"اس نے بانک ماری تھی تیری ٹانگ پر۔"

"نہیں اوئے وہ کوئی رومال گھما رہا تھا وہ ——— وہ کیا چیز تھی اس کے پاس؟"

"پتہ نہیں! بہرحال وہ بھی یہاں سے بے ہوشی کی حالت میں ہی واپس گیا ہے۔"

"کوئی بے ہوش ہو کر کیسے چل سکتا ہے؟"

"وہ بلونت اور ملہوترا آگئے تھے۔"

"مارا نہیں ان لوگوں کو تم نے! کیسا خطرناک باورچی بھرتی کر رکھا ہے اس سلوترے کی اولاد نے۔" آبی ابھی تک بڑے انہماک سے اپنے ٹخنے کا معائنہ کر رہا تھا۔

"چل دفع کر۔ مٹی ڈال اس بات پر۔ ہم آج انہیں زیر نہیں کر سکے۔ پھر سہی سہی۔"

"اوئے میں تو اس کی مشکیں کس دوں گا۔ سمجھا کیا ہے اس نے مجھے۔ اس لالے نے۔"

"وہ پھر تجھے مارے گا۔ چل اب سو جا۔"

مگر آبی بہت تپا ہوا تھا۔ اس نے بڑے غصے سے سگریٹ منہ میں لے کر سلگایا اور بولا۔ "چل اس بنگلے کو آگ لگا دیں میں یہاں ایک منٹ نہیں رُک سکتا۔"

"پاگل ہو گیا ہے تو۔ وہ بہت محتاط ہیں اور راستے انہوں نے بند کر رکھے ہیں سارے۔" ابھی میں یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ مجھے نشست گاہ کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ میں تڑپ کر باہر نکلا۔ سامنے شکنتلا کھڑی تھی اور وہ دروازہ اپنے پیچھے بند کر آئی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرا دی۔ بولی۔ "سنا ہے پیرزادہ صاحب زخمی ہو گئے ہیں؟"

"ہاں! تم لڈو بانٹو۔ تمہارا وہ خانساماں مجھے سنہ مات دے گیا ہے۔" آبی نے میرے پیچھے آکر بڑے ہی جلے کٹے لہجے میں کہا۔ اس کی یہ بات سن کر شکنتلا کھل کر مسکرائی۔ بولی۔

"آپ کو اس سے الجھنا نہیں چاہیے تھا مہاراج ادھیراج وہ بہت بڑا پھکیت ہے وہ پانڈے جی۔"

"تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا مجھے۔ خواہ مخواہ مروا دیا۔ مجھے پتہ ہوتا تو اسے ایک قدم نہ چلنے دیتا۔" آبی نے بڑے غصے سے کہا۔

"میں آپ کے لیے دوا لائی ہوں ٹخنے پر مَل لیں سوجن ختم ہو جائے گی۔" اس نے ایک چھوٹی سی شیشی آبی کے آگے رکھ دی۔ آبی بستر پر بیٹھ گیا اور شکنتلا اس کے دوا لگانے لگی۔

میں نشست گاہ میں بیٹھ کر سگریٹ پھونکنے لگا معاملات میرے بس سے نکلتے جا رہے تھے۔ ہمارا حال اس بچے کا سا ہو رہا تھا جو پھلیاں دھر رہا ہو۔ کوئی چیز اس بیچارے سے چبائی ہی نہیں جا سکتی خواہ وہ کتنی ہی نرم کیوں نہ ہو۔ ہم نے ایک بھن مار کر دیکھ لیا تھا مگر ہمیں منہ کی کھانی پڑی تھی۔ شکنتلا کا دم غنیمت تھا کہ اس کے سینے میں اتنا سارا "بہن" اتر آیا تھا اور وہ رات کے سناٹوں سے بے نیاز ہو کر اس کے پاس اس کی تیمار داری کے لیے پہنچی تھی ورنہ اس پانڈے نے تو اس بیچارے کا تسمہ کھینچ ہی دیا تھا۔ وہ مرتے مرتے بچا تھا۔ میں یہی سمجھ رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ جس رگ کو اس نے تاکا وہ اگر زیادہ ہی دب جائے تو آدمی مر بھی سکتا ہے۔

پھر مجھے یہ احساس ڈسنے لگا کہ یہ شکنتلا ملہوترا کے کہنے پر آنے کے لیے کہیں چارہ تو نہیں بن رہی ہے۔ وہ اس سے خدا جانے کیا کیا کچھ معلوم کر کے دوسری طرف جا انڈیلتی ہو گی۔ ہماری ساری کمزوریوں اور خامیوں کا علم ان لوگوں کو شکنتلا کے ذریعے ہو چکا ہو گا اور یہ آبی عشق کی نادانی میں سب کچھ اسے بتا دیتا ہو گا۔ اور یہ بہت ہی خوفناک بات تھی۔ میں نے سوچا کہ یہ باہر نکل جائے تو میں آبی کو سختی سے روکوں گا کہ وہ اس ناری کے ہاتھوں میں یوں کھلونا نہ بن جائے ورنہ ہم دونوں ہی مارے جائیں گے۔ یہ لوگ ہمیں ناکوں چنے چبوا دیں گے۔

شکنتلا کوئی آدھ گھنٹے بعد واپس چلی گئی تو میں آبی کے پاس جا پہنچا۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم تھا اور تکیے پر سر ڈالے سگریٹ پھونک رہا تھا۔

"کیا بات ہے طبیعت تو ٹھیک ہے نا! وہ تمہارے علاج کے لیے آئی تھی۔"

"ہاں اسے ملہوترا نے مرہم دے کر بھیجا تھا۔ ٹخنے کا درد کچھ تھم گیا ہے۔"

"ناراض ہو مجھ سے؟" اس کے چہرے پر پھیلی سنجیدگی دیکھ کر میں الجھنے لگا تھا۔

"نہیں یار! تیرے ساتھ میں کیسے ناراض ہو سکتا ہوں۔ مجھے اس شکنتلا کی سمجھ نہیں آتی۔ وہ رونے لگی تھی۔ اسے میری اس تکلیف پر سخت صدمہ پہنچا ہے۔"

"رونے لگی تھی! تجھ سے محبت ہو گئی اسے؟ یہ جذبہ بانس کی طرح راتوں رات اونچا اٹھ جاتا ہے۔"

"ہاں راتوں رات۔" وہ بستر پر اٹھ بیٹھا اور مسکرانے لگا۔

"اسی لیے تو حکما نے کہا ہے کہ مستورات سے بچنا چاہیے ان کے ساتھ تخلیے میں تو جانا ہی نہیں چاہیے۔"

وہ کھلکھلا کر ہنس دیا۔ اتنا ہنسا کہ اس کی آنکھوں میں پانی آ گیا، پھر بولا۔ "آ جیل اب سو جا۔ میں بہت تھک گیا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے سگریٹ بجھایا اور کمبل اوڑھ کر لیٹ گیا۔ میں بھی بہت زیادہ تھکن محسوس کر رہا تھا۔ اس روز کی ساری غارت گر مشقت کا حساب لگاتے ہوئے میں بھی جلدی ہی نیند میں کھو گیا۔

میری جب آنکھ کھلی تو یہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا کہ آبی اپنے بستر پر موجود نہیں تھا۔ اس وقت رات کے آٹھ بج رہے تھے بھارتی وقت کے مطابق ساڑھے سات ہوں گے۔ وقت کا یہ گھپلا میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں سمجھا وہ باتھ روم میں ہو گا۔ سگریٹ کی طلب نے مجھے بستر سے اٹھا دیا مگر میز پر نہ سگریٹ موجود تھے نہ لائیٹر۔ میں نے ادھر ادھر غور سے دیکھا تو میرا دماغ الٹنے لگا۔ آبی کی کوئی بھی شے وہاں موجود نہیں تھی۔ اس کے علاوہ نئے کپڑوں کے جوڑے بھی وہاں نہیں تھے جو ملہوترہ نے اسے دیے تھے۔ اس کے بوٹ البتہ پلنگ کے نیچے دھرے تھے۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ ملہوترا صاحب کے دیے ہوئے چپل پہن کر باہر نکلا ہے۔ میں نے باتھ روم پر نظر ڈالی مگر اس کا دروازہ باہر سے بند تھا۔ اور آبی کہیں بھی نہیں تھا۔

ابھی میں کچھ سمجھ بھی نہیں پایا تھا کہ نشست گاہ کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ کوئی بہت تیزی سے میری طرف آ رہا تھا پھر خوابگاہ کا دروازہ دھڑ سے کھلا۔

سامنے ملہوترا صاحب کھڑے تھے۔ حیران پریشان، سانس پھولا ہوا! آنکھیں غیظ و غضب کی مظہر۔ ان کے ہاتھ میں ایک کھلا کاغذ تھا۔

"یہ کمینگی کی حد ہے جیلانی صاحب مجھے نہیں امید تھی کہ آپ ہمیں یوں ذلیل کر دیں گے۔"

"کیا ہوا ملہوترا صاحب! خیر تو ہے۔"

"خیر ہی تو نہیں ہے! آپ کا وہ بدمعاش دوست شکنتلا کو لے بھاگا ہے۔"

"نہیں! یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔ اس نے شکنتلا کو ورغلا کر گھر سے بھگا لیا ہے، یہ دیکھیں۔ وہ بے شرم لڑکی یہ رقعہ چھوڑ گئی ہے۔

دیکھیں۔ میں اس پیرزادہ کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ یہ دیکھیں۔" وہ غصے سے یوں لال پیلا ہو رہا تھا جیسے وہ زمین آسمان ایک کر دے گا۔ میں نے رقعہ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ اسے پڑھ کر میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ میں نے سوچا میں تو تہی ہاتھ میں لے کر جنگلوں میں نکل جاؤں۔ فقیر بن جاؤں۔ ہر شے پر سے میرا اعتماد اٹھ گیا۔ آبی مجھے اس صحرا میں یک و تنہا چھوڑ کر واقعی شکنتلا کے ساتھ فرار ہو چکا تھا۔ وہ رقعہ شکنتلا لکھ کر چھوڑ گئی تھی، اس نے لکھا تھا۔

"ملہوترا جی! میں آپ سے شما چاہوں گی اور پتا جی سے بھی۔ مجھے اپنی منزل مل گئی ہے۔ میری زندگی میں اچانک ایسے پھول کھل گئے کہ ان کی مہک سے میں سرشار ہو گئی ہوں۔ میں اس موقعے کو کھونا نہیں چاہتی۔ مسٹر ایس جی ایم پیرزادہ کی محبت نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں انہیں اپنا جیون ساتھی بنا لوں۔ وہ میرے لیے اپنا مذہب تک چھوڑ دینے کو تیار ہیں میں ان کے ساتھ جا رہی ہوں مجھے ڈھونڈنے کی کوشش بیکار ہی ہو گی کیونکہ میں کل ان سے شادی کر چکی ہوں گی۔ مجھے نہیں معلوم کہ میری منزل کہاں ہے پھر بھی مجھے یقین ہے کہ پیرزادہ کی بے پناہ محبت میرے آخری سانس تک میرے جیون کو سورگ بنا دے گی میرے پتا جی کو میرے اس فیصلے سے آگاہ کر دیں مجھے امید ہے وہ مجھے معاف کر دیں گے۔

آپ کی قصوروار
شکنتلا"

تو یہ بات ہے۔ وہ شکنتلا محبت کی زنجیر میں بندھی آبی کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ اس نے اپنا گھر بار عزیز رشتے دار ہر شے آبی پر قربان کر دی تھی۔ مگر۔۔ مگر اس آبی کو کیا سوجھی۔ اس کا دماغ کس طرح خراب ہو گیا۔ وہ کیوں اس کے ساتھ چل دیا کونسی گیدڑ سنگھی سنگھائی تھی اس شکنتلا نے اسے۔ اسے یہ احساس نہ ہوا کہ میں پیچھے اس گو ہار میں تنہا مارا جاؤں گا۔

"دیکھا آپ نے! آپ کے دوست نے کئی گھروں کو تباہ کر دیا ہے شکنتلا کی منگنی ہو چکی تھی اور وہ نمک حرام اسے لے بھاگا۔"

"اسے ڈھونڈیں ملہوترا صاحب۔"

"میں کہاں ڈھونڈوں! آپ کو بتانا ہو گا کہ وہ کہاں چلا گیا ہے۔ میں شکنتلا کو آپ سے لوں گا۔ اسے آپ اتنا آسان نہ سمجھیں وہ آپ کے علم اور اطلاع کے بغیر کہیں نہیں جا سکتا۔"

"ایسا نہ کہیں ملہوترا صاحب! مجھے نہیں معلوم کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا ہے۔"

"اتنے بھولے نہ بنیں! یہ ہماری عزت کا سوال ہے شکنتلا میرے دوست کی بیٹی ہے میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں، مگر یہ ذلت! اف میرے بھگوان! میں آپ کو ہر طرف سے بچا کر آپ کے لیے عزت کا سامان بنا رہا تھا۔ مگر آپ نے ہمارے ساتھ یہ سلوک کیا۔"

"میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں ملہوترا صاحب مجھے اس بارے میں کوئی علم نہیں ہے۔ میں ابھی اٹھا ہوں تو یہ بستر خالی تھا۔"

"میں کیسے مان لوں! مجھے پاگل سمجھتے ہیں آپ! اوئے پانڈے! ادھر ایشر سنگھ کو فون کرو۔ کہو وہ فوراً یہاں پہنچیں۔" ملہوترا نے کمرے سے باہر نکل کر بڑے غضبناک لہجے میں کہا۔

پانڈے نشست گاہ میں کھڑا تھا اور اس کے تیور یہ بتا رہے تھے کہ وہ ملہوترا کے ذرا سے اشارے پر مجھ سے الجھنے کے لیے تیار تھا۔ بلونت بھی صوفے کے ایک کونے میں بیٹھا مجھے عجیب سی نظروں سے گھور رہا تھا۔

پانڈے اسی وقت باہر نکل گیا۔

"چلو بلونت ابھی ادھر بیٹھو اور دھیان رکھو یہ صاحب کہیں کوئی نیا گل نہ کھلائیں۔" یہ کہہ کر ملہوترا بھی نشست گاہ سے اپنے ڈرائیور کو اٹھا کر باہر لے گیا۔ دروازہ پھر بند ہو گیا۔ پھر اس کے منہ غار کے منہ پر بھاری چٹان کی طرح کواڑوں پر چھا گئے۔ میرے اندر اور نشست گاہ کے اندر پھر تیرگی پھیل گئی۔

میں نڈھال سا ہو کر صوفے پر گر گیا۔ ملہوترا کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ اپنی اس بے عزتی کا مجھ سے انتقام لے گا۔ جب ہی تو وہ مجھ پر اتنے تبرے بھیج رہا تھا اور میں اف تک نہ کر سکا۔ آبی نے مجھے تباہ کر کے رکھ دیا تھا۔ میرے پاس اس کی اس مکروہ حرکت کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس نے سنگدلی اور بے وفائی کی انتہا کر دی تھی۔ وہ شکنتلا کے تبرج پر اتنا ہی فدا ہو گیا کہ اپنے جگری

یار کو بھی بھول کر آگے نکل گیا۔ اُس نے دوہرا فائدہ اٹھایا تھا۔ ایک تو اسے وہ خوبصورت ناری ہاتھ آگئی تھی اور دوسرا فائدہ اُس نے یہ پایا کہ وہ بھارتی پولیس کے ہر الزام سے بچ نکلا تھا۔ صاف بچ نکلا تھا۔ اس پر عائد ساری فردِ جرم ہی ختم ہوگئی تھی۔ مگر میرے بارے میں اس نے کیا سوچا تھا۔ مجھے وہ کس کے بھروسے پر اُس ملہوترا کی قید میں بے یار و مددگار چھوڑ گیا تھا۔

اور اب وہ لوگ الیشر سنگھ کو بلوا رہے تھے۔ ملہوترا کی نیت مجھے نیک نہیں معلوم ہوتی تھی۔ وہ یہ بھی بھول گیا تھا کہ کل تک وہ مجھے اپنے کسی نسخے میں استعمال کرنے کی سوچ رہا تھا اور کسی اور حلقے میں کسی اعلیٰ سطح پر ان لوگوں نے کس طرح سے اور کس رُوپ میں مجھے واپس بھیجنے کا انتظام کر رکھا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ آبی کے چلے جانے کے بعد میں خود کو بہت زیادہ بے بس محسوس کر رہا تھا۔ میں نے خواب گاہ میں جا کر کپڑے پہنے۔ بوٹوں کے تسمے کسے اور پھر آنے والی ہولناک گھڑیوں کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کرنے لگا۔ میں نے طے کر لیا کہ اگر ان لوگوں نے میری گردن کے گرد ذرا بھی اپنی رسّی تنگ کی تو میں اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دوں گا۔ اب کھو دینے کے لیے باقی کیا رہ گیا تھا۔ شکنتلا تو تریا چلتر سے میرے عزیز ترین دوست کو مجھ سے چھین لے گئی تھی اور اب یہ لوگ اس کا انتقام مجھ سے لینے پر آمادہ تھے۔ افسوس مجھے یہ تھا کہ میرے پاس ہتھیار نام کی ایک سُوئی بھی نہیں رہ گئی تھی۔ وہی میرا توسّل تھا وہ میرا چپ شاہ۔ اور وہ کیپٹن دلیپ سنگھ نے مجھ سے دھروا لیا تھا۔ اور اب ایک میری جان تھی جس کو وہ میز پر بچھا کر اپنے انتقام کی تپت بجھانا چاہتے تھے۔ میں مٹی ہوا جاتا تھا۔ مگر پھر آہستہ آہستہ میرے اندر کا خونخوار جیلانی پھر سے بیدار ہونے لگا۔ آبی نہیں تھا تو بھی میں اپنے راستے کے سارے کانٹے تنہا ہی چنتا چلا گیا تھا۔ اب وہ جا چکا تھا تو کیا ہوا۔ میں اب بھی وہی جیلانی ہوں۔ میں اُن سے تنہا بھی نپٹ سکتا ہوں میرے دونوں بازو سلامت ہیں اور میرے ساتھ ہیں۔

الیشر سنگھ کوئی بیس منٹ بعد ہی وہاں آ پہنچا۔ نشست گاہ کے سامنے کی راہداری میں اُس کے بولنے کی آواز مجھے سُنائی دی تو میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ کسی ایسی چیز کے لیے میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی جسے میں ہتھیار کے طور پر استعمال کر سکتا مگر وہاں میرے مطلب کی کوئی بھی شے نہیں تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ کچھ ہی دیر بعد نشست گاہ میں آ جائیں گے۔ دروازے پر میں نے نگاہ ڈالی تو مجھے معلوم ہوا کہ اس کے ایک کواڑ کے نچلے حصے میں ایک عمودی چٹخنی لگی ہے۔ اس کو میں نے اٹھ کر نیچے گرایا تو اس کا سرا فرش میں بنے سوراخ میں جا دھنسا۔ ان کی نیت معلوم کرنے سے پہلے میں نے دروازہ نہ کھولنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ کوئی آدھ گھنٹے تک میں وہاں بیٹھا شدید ذہنی دباؤ سہتا رہا۔

جب دروازے کے ہینڈل پر کسی کا ہاتھ پڑا اور کواڑ کو اندر کی طرف دھکیلا گیا تو میں تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔

"یہ دروازہ تو اندر سے بند ہے بابو جی۔" یہ بلونت کی آواز تھی۔

"میرا خیال ہے انہوں نے اندر سے چٹخنی لگا لی ہے۔" الیشر سنگھ اس کے قریب ہی کھڑا تھا اس نے بڑی متانت سے مجھے پکارا۔ "جیلانی صاحب!"

میں دروازے کے ساتھ بھڑ کر کھڑا تھا۔

"جی سردار صاحب کیا حکم ہے؟"

"ارے آپ نے دروازہ کیوں بند کر لیا ہے؟"

"آپ کو سارے حالات کا علم ہو گیا ہوگا۔"

"کیسے حالات؟ آپ دروازہ تو کھولیں۔"

"نہیں! میرا خیال ہے کہ میں کسی کے گناہ کی سزا بھگتنے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوں۔"

"کیسی سزا؟ یہ آپ کیا کہتے ہیں جیلانی صاحب! بھول جائیے اس قصّے کو۔ میں نے ملہوترا صاحب کو سمجھا دیا ہے۔ اس میں آپ کا کیا قصور۔ اُن کے پاپ اُن کے ساتھ گئے۔ آپ کیا کر سکتے ہیں بھلا۔ دروازہ تو کھولیں۔" الیشر سنگھ کی آواز میں کوئی جھنجھلاہٹ یا غصہ نہیں تھا۔

"مجھے معلوم ہونا چاہیے جناب کہ آپ میرے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہتے ہیں۔ میں جان دے دوں گا مگر سہتے مجرموں کی طرح آپ کے جوتے نہیں سہہ سکتا۔ میں اپنی عزت کو ہر شے سے زیادہ عزیز سمجھتا ہوں۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوتے کہا۔

"مجھے احساس ہے جیلانی صاحب! آپ کی طبیعت کو بھی میں سمجھتا ہوں۔ ہمارے دل میں آپ کی بہت عزت ہے میرے بھائی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہم اتنے بڑے معاملے پر آپ کو یوں اعتماد میں نہ لیتے۔ واہگورو کی سوگند آپ کے خدشات بے بنیاد ہیں۔" الیشر سنگھ نے بڑے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں آپ پر اعتبار کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے دروازہ کھول دیا۔ سامنے الیشر سنگھ کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس نے مصافحے کے لیے بڑے تپاک سے ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔ اور پھر اندر آکر اس نے میرے دونوں کندھے تھپتھپائے۔

"آپ تو خواہ مخواہ ہم سے ناراض ہو گئے۔ اندر آئیں ملہوترا صاحب! ایسے سونا آدمی کو آپ نے چکر میں ڈال دیا۔"

اس کی یہ بات سنتے ہی ملہوترا صاحب بھی اندر آگئے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولے۔ "ابھی تک انہوں نے ناشتہ بھی نہیں کیا۔"

"ہاں یہی کریں گے آپ! او بے پانڈے، لے آ اِدھر بھانڈے" الیشر سنگھ نے وہیں سے بیٹھے بیٹھے ہانک لگائی۔ پھر بولا۔ "ملہوترا صاحب میرا خیال ہے کہ وہ چھوکری پیرزادہ پر کچھ زیادہ ہی مہربان ہو گئی ہوگی، یہ بڑی مصیبت کی بات ہے جیلانی صاحب۔"

"میں کہتا ہوں کہ ان دونوں کو پکڑ کر واپس لائیں۔ میں اس پیرزادہ کو کبھی معاف نہیں کر سکتا۔ اس کا باپ سُنے گا تو بے موت مر جائے گا۔" ملہوترا سٹپٹا کر بولا۔

"وہ پنڈت کرپا رام! اب ہم کیا کر سکتے ہیں ملہوترا جی۔ میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی ہا ہا! ویسے رپورٹ میں درج کر دوں گا۔ شکنتلا کی کوئی فوٹو ہو تو دے دیں ہم اخبار میں چھپوا دیں گے۔"

"جی نہیں! مجھے کرپا رام کو اور ذلیل نہیں ہونا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم اپنے طور پر پوری کوشش کریں گے ویسے ہوا بہت ہی بُرا ہے مگر آپ کا جیلانی صاحب سے 'بدجن' ہونا درست نہیں ہے۔"

"وہ تو میں نے اپنا من صاف کر لیا ہے ان کی طرف سے یہ تو میرا بھی خیال ہے کہ یہ بس سوتے ہی رہ گئے ہیں۔ آپ سے 'شما' چاہتا ہوں بھائی جی۔ امید ہے آپ مجھے معاف کر دیں گے۔" ملہوترا نے ایک دم نرم ہوتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں ملہوترا صاحب! اب میرے لیے کیا حکم ہے۔"

"آپ کو ملہوترا صاحب نے ساری بات سمجھا دی ہوگی۔"

"جی ہاں! ان سے بات ہوئی تھی۔"

"تو پھر کیا ارادے ہیں آپ کے؟"

"میں تیار ہوں۔" بے ساختہ یہ بات میرے منہ سے نکل گئی۔

"آپ نے بہت اچھا فیصلہ کیا ہے۔ آج شام کو میں پھر آؤں گا وہ فہرست بھی آپ کو دے دوں گا۔ میرے ساتھ کیدار ناتھ بھی ہوں گے وہ اس 'آپریشن' کی تفصیل آپ کو سمجھا دیں گے۔"

"وہ کون ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"وہ بھی ہیں ایک صاحب۔ آپ بہرحال اس مہم میں تنہا نہیں ہوں گے۔ ہم نے اس مہم کا نام 'آپریشن جے' رکھ دیا ہے آپ کے نام پر۔"

یہ کہہ وہ اُٹھا اور مجھ سے ہاتھ ملا کر باہر چلا گیا۔ ملہوترا بھی اس کے پیچھے تھا۔ کچھ ہی لمحوں بعد پانڈے میرے لیے ناشتہ لے آیا۔ میں تو ابھی منہ ہاتھ بھی نہ دھو پایا تھا۔ بہرحال باتھ روم میں جا کر کلّی کرنے کے بعد میں ناشتے کی میز پر بیٹھ گیا۔ پانڈے ایک کونے میں بہت محتاط ہو کر کھڑا رہا۔ رات کے تجربے نے اسے بہت زیادہ سنجیدہ بنا دیا تھا۔

جب پانڈے برتن اٹھا کر باہر نکلنے لگا تو کواڑ کھلتے ہی میں نے اسے گردن سے پکڑ کر پیچھے کھینچ لیا۔ برتن چھن چھن کر کے اس کے ہاتھ سے گرے۔ اُس نے یوں کیا کہ میرے پنجے۔۔۔۔ کی گرفت توڑنے کے لیے ایسی الٹ بازی لگائی کہ وہ میرے سر کے اوپر سے اچھل کر میرے پیچھے آ گرا۔ میرے ہاتھ سے اس کی گردن چھوٹ گئی تھی اور دروازہ ازخود بند ہو چکا تھا۔ میں اپنے مقصد میں قطعی ناکام ہو گیا۔ میں چاہتا تھا کہ جونہی دروازہ کھلے میں پانڈے کو پچھاڑ کر باہر نکل جاؤں مگر پانڈے نے میری یہ کوشش ناکام بنا دی۔

جونہی وہ میرے پیچھے گرا میں نے گھوم کر اس کا بازو پکڑ کر کمر کے پیچھے لگا کر اس کی دوسری بغل میں بایاں ہاتھ ڈال دیا۔ وہ مجھے کمر پر سے کر پٹخنی دینے کے لیے جھک ہی رہا تھا کہ میں نے دونوں ہاتھ اس کی بغلوں میں سے گزار کر اس کی گردن پر ہفتے کی گانٹھ لگا دی مگر وہ بہت ہی ہیر کاریگر آدمی تھا۔ ذرا سا آگے جھک کر پوری قوت سے سیدھا ہو کر کمر کی طرف کمان ہونے لگا اور پھر یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اس نے اپنے نیفے میں ہاتھ ڈال کر ایک پنجہ سا انگلیوں پر چڑھا لیا تھا جس پر لوہے کے تیز ناخن چڑھے ہوئے تھے۔ وہ پنجے اُس نے دونوں ہاتھوں پر پہن لیے تھے۔ ایک لحظے کے ہزارویں حصے میں اُس نے وہ تیز دھار ناخن میرے دونوں ہاتھوں کی پشت پر مار کر اپنی گردن میری گرفت سے آزاد کروا لی۔ ان ناخنوں سے میرے ہاتھوں کی جلد چھل سی گئی تھی۔

اس مہلک ہتھیار سے اس کو مسلح دیکھ کر میں ایک دم پیچھے ہٹا۔ اپنے اور اس کے درمیان اب میں آٹھ ہاتھ کا فاصلہ پیدا کر چکا تھا۔ ایک بڑی ہی سفاک مسکراہٹ اس کے لبوں پر ابھر آئی تھی اور اس کی بوٹی ایسی سرخ آنکھیں یہ احساس دلا رہی تھیں کہ میرا مدمقابل کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ حیرت مجھے یہ تھی کہ برتنوں کے ٹوٹنے کی بازگشت دُور تک سُنی گئی ہوگی مگر کسی نے بھی اندر جھانک کر نہیں دیکھا تھا۔ اس صورتِ حال نے مجھے یہ احساس دلایا کہ اس وقت بنگلے میں پانڈے کے سوا اور کوئی آدمی موجود نہیں ہے۔

اگر میں اسے پہلی ہی ضرب میں زیر کر لیتا تو میرے لیے وہاں سے نکل جانا بے حد آسان تھا مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ ایک اور بات بھی مجھے حیران کیے دیتی تھی اور وہ یہ تھی کہ پانڈے اب تک بالکل خاموش تھا۔ اس نے کسی کو بھی اپنی مدد کے لیے نہیں پکارا تھا۔ اس سے بھی یہی ثابت ہوتا تھا کہ پانڈے کے سوا وہاں اس وقت، اور کوئی نہیں ہے ورنہ وہ سب لوگ برتنوں کی آواز یا پانڈے کی ذرا سی للکار پر دندناتے ہوئے اندر گھس آتے اور میرا سینہ گولیوں سے چھلنی کر دیتے۔

پانڈے میری ایک ایک حرکت پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ اس کی ان سفاک آنکھوں کی گردش مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں پر چڑھے وہ تیز فولادی ناخنوں والے پنجے میرے بس سے باہر تھے۔ وہ دائیں ہاتھ سرک کر میرے قریب ہونے لگا تو میں بائیں ہاتھ تیزی سے آگے بڑھ کر صوفے کے پیچھے جا ٹھہرا مگر اس نے صوفے کی پشت پر شکرے ایسی جست لگا کر کچھ اس طرح میری ٹانگوں سے صوفے کا پچھلا حصہ دے مارا کہ میں دیوار سے جا لگا۔ عین اس وقت جب وہ اچھل کر صوفے پر سے اٹھ رہا تھا میں نے اس کی دونوں ٹانگیں پکڑ لیں اور اسے گھما کر میں صوفے کی پشت کے عقب سے نکل کر سامنے آ گیا۔ اس کی دونوں ٹانگیں میرے ہاتھ میں تھیں میں نے اسے کھینچ کر صوفے کے نیچے گرایا تو اس کے سر کا پچھلا حصہ فرش سے ٹکرا گیا۔ ڈھم ایسی آواز پیدا ہوئی میں اسے کھینچ کر کمرے میں لے گیا اور پھر اس کی ایک ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر میں نے اس کا پاؤں کچھ اس طرح مروڑا کہ وہ درد سے بلبلانے لگا۔ اس کا چہرہ بگڑتے دیکھا تو میں نے پاؤں کو کچھ اور زور سے مروڑ دیا۔ میرا دوسرا پاؤں اس کی ران پر دھرا تھا۔ اس نے اپنے دونوں پنجے میرے بدن تک پہنچانے کی کوشش کی مگر میں اپنا آپ بچا گیا۔ میں نے ایک اور جھٹکا دیا تو وہ الٹ گیا۔ اب وہ اوندھے منہ پڑا تھا۔ میں نے اس کی دونوں ٹانگیں سیدھی کر کے اوپر اٹھائیں۔۔۔ میں چاہتا تھا کہ اس کی کمر توڑ ڈالوں۔ یہ بات میرے لیے کچھ بھی مشکل نہیں تھی میرے ارادے کو بھانپ کر اس نے گوریلے ایسی خوفناک آواز منہ سے نکالی اور اپنے وجود کی ساری قوت صرف کر کے وہ ایک دم الٹ کر سیدھا ہو گیا۔ میں نے ایک بار پھر اس کی ران پر پاؤں رکھ کر اسکا دایاں پاؤں مروڑ دیا۔ مگر اس کی چیخ اپنا مقصد پورا کر گئی تھی دو آدمی ایک دم دروازہ کھول کر اندر آ گئے۔ ایک بلونت تھا اور دوسرے کو میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ اس کا سر بھی پانڈے کی طرح گھٹا ہوا تھا دونوں کے ہاتھوں میں پستول تھے۔

"اسے چھوڑ دو۔" بلونت کی چابک ایسی آواز میری سماعت پر برسی۔۔۔۔ دوسرا آدمی ایک دم میرے سر پر آ پہنچا۔

"کتے تیری یہ مجال! چھوڑ دے اسے ورنہ۔۔۔۔۔۔۔"

اس کی آواز بلونت سے کہیں زیادہ بھاری بھرکم تھی۔ میں نے پانڈے کا پاؤں زمین پر پٹخ دیا۔ میرے دونوں ہاتھوں کی پشت سے خون رس رہا تھا۔

پانڈے کی قوت برداشت کی کوئی حد نہیں تھی۔ میں نے اسے رگید ڈالا تھا مگر جونہی میں نے اس کی ٹانگیں آزاد کیں، وہ اچھل کر اٹھا اور اپنی ٹانگیں ہلا ہلا کر اپنے خون کی روانی درست کر کے میری طرف جھپٹا مگر بلونت نے اس کا راستہ روک لیا۔

"بس کر پانڈے! بہت ہو گئی۔ دیکھ لیا تیرا جیون۔ ہٹ جا پیچھے۔" پانڈے کے قدم وہیں رک گئے۔ "جا ادھر چپاتیاں گھڑ۔ نکل جا کمرے سے۔" بلونت نے اسے پھر ڈانٹا۔ پانڈے پر اس کے لفظوں کا خاطر خواہ اثر ہوا اور وہ سر جھکا کر ہاتھوں پر سے وہ چرمی پنجے آتارتا ہوا باہر نکل گیا جو دستانے کی طرح اس نے انگلیوں پر پہن رکھے تھے۔

"آپ پھر اس سے بھڑ گئے، کیا ہوا تھا اب۔" بلونت نے مجھ سے بڑی رسان سے پوچھا۔

"یہ اپنی رات کی شکست کا مجھ سے بدلہ لینا چاہتا تھا۔"

"ایک دم بے کار ہے یہ ذلیل۔ مرد ہوتا تو آپ کی قدر کرتا آپ کو پرنام کہتا۔ آپ کے ہاتھ زخمی کر دیے، چل اوئے دیپک دوا لا اندر سے۔" یہ کہہ کر اس نے مجھے صوفے پر بٹھا دیا۔ میں نے وہاں دھرے پیکٹ میں سے سگریٹ نکال کر سلگا لیا۔

کچھ ہی دیر بعد دیپک کچھ روئی اور مرہم لے آیا اور میرے زخموں کو اسپرٹ سے صاف کر کے اس نے مرہم لگا دیا۔

"ملہوترا صاحب کہاں ہیں؟"

"وہ باہر گئے ہوئے ہیں آپ کے لیے بہتر یہ ہے کہ پھر کبھی اس کے منہ نہ لگیں، بالکل پاگل ہے یہ۔۔۔ کسی بات کی سمجھ نہیں ہے اسے۔"

میرے ہاتھوں پر دوا لگا کر دیپک نے ٹوٹے ہوئے برتن اکٹھے کیے اور باہر چلا گیا۔ بلونت کچھ دیر تک بیٹھا مجھے تسلیاں دیتا رہا۔ پھر اس نے مجھے آرام کرنے کے لیے کہا اور بڑے محتاط طریقے سے مجھے خواب گاہ میں پہنچا کر باہر نکل گیا۔

وہاں سے بھاگ نکلنے کی میری یہ کوشش بھی بیکار ہو گئی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں۔ میں اس نئے محبس میں زندگی ضائع نہیں کر سکتا تھا۔

پچھلے کمرے سے اٹھ کر میں ایک بار پھر نشست گاہ میں آ بیٹھا۔ میری نظریں ایک بار پھر اس کمرے کی ایک ایک چیز کا جائزہ لینے لگیں۔ سنگار میز کے قد آدم آئینے میں اچانک مجھے سامنے کا

منظر نظر آیا۔ صوفے کے بائیں پہلو سے ذرا پرے ایک سلیپر پڑا تھا۔ کمرے کے الٹے ہوئے کونے کے قریب۔ میں بھاگ کر اس تک پہنچا۔ ذہن کے ذرا میرا دماغ سن ہونے لگا۔ وہ آبی کا سلیپر تھا۔ اس میں شک کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ کل وہ وہی پہنے ہوئے تھا۔ اس کے بوٹ کمرے میں دھرے تھے۔ میرا دھیان ہی اس بات کی طرف نہیں گیا تھا کہ اگر آبی شکنتلا کے ساتھ جاتا۔ تو اپنے بوٹ پہن کر ان کے تسمے کس کر باہر نکلتا۔ اور اب اس کا ایک سلیپر میرے سامنے پڑا تھا اور میرا منہ چڑا رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ آبی از خود نہیں گیا تھا بلکہ اسے وہاں سے زبردستی لے جایا گیا تھا۔ کسی نے بے ہوش کر کے یا سوتے میں اس کا منہ بند کر کے اسے کمرے سے اٹھا لیا تھا۔

جونہی یہ خیال میرے ذہن میں آیا میں تڑپ کر دروازے پر جا پہنچا اور اس کو دھڑ دھڑ پیٹ ڈالا۔

چند ہی لمحوں بعد مجھے بلونت کی آواز سنائی دی۔

"کیا بات ہے مہاراج!"

"دروازہ کھول کر اندر آئیں ذرا۔"

"کیوں خیر تو ہے؟"

"خیر ہی ہے آپ اندر آئیں ذرا۔ مجھے آپ سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔"

وہ چند لمحوں کے تامل کے بعد بولا۔ "ٹھیک ہے میں ابھی دروازہ کھولتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ پیچھے چلا گیا۔ اس کے پاؤں کی چاپ دور ہوتی گئی۔ کوئی پانچ منٹ بعد مجھے دروازے پر کھڑ کھڑ سنائی دی۔ وہ باہر سے نمبر گھما کر دروازہ کھول رہے تھے اور پھر کواڑ بڑی آہستگی سے وا ہو گیا میرے سامنے بلونت اور دیپک پستول لیے کھڑے تھے۔

"کیا بات ہے جناب، مجھے بلا رہے تھے آپ؟"

میں پیچھے ہٹ کر صوفے کے پاس جا ٹھہرا تو وہ دروازے کو اپنے پیچھے بند کر کے اندر آ گئے۔ بلونت سہمی سہمی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ دیپک اس کے قریب سے ہٹ کر آئینے کے پاس جا ٹھہرا۔

"یہ۔۔۔ یہ سلیپر دیکھ رہے ہیں آپ۔"

"یہ۔۔۔ جی دیکھ رہا ہوں۔"

"یہ میرے دوست پیرزادہ کا سلیپر ہے۔"

"اچھا! مجھے تو اس بارے میں کچھ پتہ نہیں۔"

"تو پھر ملہوترا صاحب کو بلائیں میں ان سے بات کروں گا۔"

"وہ تو پتہ نہیں کہاں گئے ہوئے ہیں۔"

"ٹھیک ہے وہ آئیں تو انہیں بتا دیں کہ یہ میرے دوست کا سلیپر اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اسے یہاں سے سوتے میں اغوا کیا گیا ہے اور یہ شکنتلا کا خط محض ڈھونگ ہے مجھے بے وقوف بنانے کے لیے، ان سے کہہ دیں بلونت صاحب کہ ساری بات میری سمجھ میں آ گئی ہے میرا دوست جب تک واپس نہیں آتا ان سے میں کوئی تعاون نہیں کر سکتا خواہ میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ سمجھ رہے ہیں نا آپ! شکنتلا میرے دوست کے ساتھ بھاگی نہیں وہ کسی جگہ بھیج دی گئی ہے اور یہ خط اس سے لکھوا کر میری آنکھوں میں دھول جھونکی گئی ہے۔ یہ بات انہیں فون پر بتا دیں تو زیادہ اچھا ہو گا۔" میں نے جمے ہوئے لہجے میں پوری بات بلونت پر واضح کر دی۔ وہ کھسیانی سی ہنسی ہنستا ہوا بولا۔

"آپ کا وہم ہے صاحب! میرا خیال ہے کہ یہ پانڈے کا سلیپر ہے۔"

"جی نہیں! میں اچھی طرح جانتا ہوں میرا دوست کل اسے پہنے ہوئے تھا۔ یہاں سے یہ ٹوٹا ہوا ہے۔"

"کیا بات کرتے ہیں آپ! اگر اسے اغوا کیا جاتا تو اسے ایک ہی سلیپر پہنانے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا خیال ہے آپ کا؟"

"ہو سکتا ہے آپ کا خیال درست ہو لیکن یہ ایک سلیپر ہی یہاں کیوں رہ گیا؟ میرا خیال ہے کہ دستک دے کر اسے باہر بلوایا گیا اور جب وہ سلیپر پہن کر اس کمرے میں آیا تو اسے پکڑ کر اٹھا لیا گیا۔ یہ۔۔۔ یہ دیکھیں یہ۔۔۔ اُف میرے خدایا! یہ آبی کے سر کے بالوں کا گچھا بھی یہاں پڑا ہے یہ دیکھیں۔" میں نے دری کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ بالوں کا ایک گچھا جڑ سے اکھڑ کر وہاں گرا تھا اس کا صاف مطلب تھا کہ وہاں شدید کشمکش ہوئی تھی۔

بلونت لاجواب سا ہو گیا، بولا۔ "یہ تو بڑی عجیب بات بتائی ہے آپ نے۔ ملہوترا صاحب ملتے ہیں تو میں ان کو یہ سب کچھ بتاتا ہوں۔ اطمینان رکھیں اگر کوئی زیادتی ہوئی ہے تو اس کو ختم کیا جائے گا۔ آؤ دیپک!" اور یہ کہہ کر وہ مجھ سے کوئی اور بات کیے بغیر باہر نکل گئے اور میں ایک بار پھر مہیب سناٹوں میں گھر گیا۔

مجھے یقین ہو چکا تھا کہ آبی کے ساتھ زبردستی کی گئی ہے ایسے شواہد موجود تھے جن کو جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا۔ انہوں نے بڑی صفائی سے ہم دونوں کو ایک دوسرے سے پھاڑ کر الگ کر دیا تھا اور نام وہ شکنتلا کا دھر رہے تھے۔ وہ پری چہرہ بھی مجھے دوبارہ نظر نہیں آئی تھی۔ ان دونوں کو ان لوگوں نے وہاں سے ٹہلا دیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ مجھے ذہنی طور پر اس حد تک زیر کر لینا چاہتے تھے کہ میں نیم دلی چھوڑ کر مکمل طور پر خود کو ان کے حوالے کر دوں اور ان کے منصوبے کا حصہ بن جاؤں۔ میرا خیال ہے کہ انہوں نے پانڈے کو

کو جان بوجھ کر ہم پر پھینکا تھا تاکہ وہ ہمارے داؤ پیچ ہماری قوت برداشت اور قوت ارادی کا اچھی طرح امتحان لے لیں۔ وہ تصویر کے دونوں رُخ ہمیں دکھا کر چاہتے تھے کہ ہم بس موم کی ناک بن جائیں۔ اپنی باگ ڈور مکمل طور پر اُن کے ہاتھ میں دے دیں۔ وہ ملہوترا بھی اِس وقت میرے سامنے ہوتا تو میں اس کے دانت توڑ دیتا۔ یہ سب کچھ اسی کے ایما پر ہوا تھا۔ وہ ہماری مزاحمت کو ختم کرنے کے درپے تھا۔

اس سے تو بہتر تھا کہ ہمیں وہ وہیں حوالات میں باندھ رکھتے۔ اکٹھے ہم ان کی ہر سزا بخوشی سہہ جاتے۔ اُف تک نہ کرتے۔ عدالت میں پیش کر کے وہ ہمیں طویل مدت کی سزائیں دلوا دیتے تو بھی ہم مزاحمت نہ کرتے مگر اب وہ جس پیچ میں ہماری گردنیں باندھ رہے تھے وہ ہمارے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ آپی الگ کسی مصیبت میں پھنسا ہو گا اور میں الگ اپنی جگہ لہو رو رہا تھا اور یہ بات اُن کے منصوبے کا حصہ ہی تھی۔ جب ہی وہ سب کچھ ہو رہا تھا۔

ملہوترا واپس نہیں آیا بلکہ اس کی جگہ پولیس آ دھمکی۔ انہوں نے دروازہ جب دوبارہ کھولا تو چھ مسلح سپاہی دندناتے ہوئے اندر آ گئے۔ اُن کے ساتھ جو افسر تھا اُسے بھی میں نے پہلی بار دیکھا۔ بلونت نے اُنگلی کے اشارے سے انہیں میرے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔

"جناب! یہ ہے وہ پاٹے خاں جس کا نام غلام جیلانی ہے۔"

پولیس افسر نے جو عہدے کے اعتبار سے انسپکٹر نظر آتا تھا۔ تین سپاہیوں کو بندوقیں تان لینے کا حکم دیا اور پھر تین سپاہیوں کو اشارہ کر کے بولا۔ "اریسٹ دی اسکاؤنڈرل۔ لگا دو ہتھکڑی اسے۔"

بڑے بہادر لوگ تھے وہ۔ ہمارے ساتھ بلّی چوہے کا کھیل کھیل رہے تھے اور مجھے مرزا جٹ یاد آ رہا تھا جس نے کہا تھا۔

"میں باہج بھراواں ماریا میری ننگی ہو گئی کنڈ"

وہ بھی میری ہی طرح مجبور و بے بس ہو گیا تھا کہ اُس کی صاحباں نے اس کے تیروں سے اپنے بھائیوں کو بچانے کے لیے اس کا ترکش درخت پر جا لٹکایا تھا۔ اتنا اونچا کہ وہاں سے مرزا اُسے اُتار تو سکتا تھا مگر اسے اتنی مہلت ہی کہاں تھی جب ہی تو اس نے دہائی دیتے ہوئے کہا تھا کہ

ع "بُرا کیتا ای صاحباں میرا ترکش ٹنگیو ای جنڈ"

مگر۔ میرے ساتھ تو کوئی "رن" نہیں تھی۔ میرے ساتھ پریتما یہ ہاتھ کرتی تو میں سمجھتا میں اپنے نفس کی بوقلمونی کی وجہ سے مارا گیا ہوں میرے ساتھ تو کچھ اور ہی بیت گئی تھی۔

میں نے ہاتھ آگے بڑھا دیے۔ میں اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ دو سپاہیوں نے نہایت ہی حقارت آمیز انداز سے میرے ہاتھ آگے کھینچ کر مقفل کر دیے اور پھر انہوں نے مجھے کشاں کشاں اس بنگلے میں سے نکال کر پورچ میں کھڑی ایک بند جیپ میں بٹھا دیا۔ یوں کہ مسلح سپاہیوں نے مجھے چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا اور وہ اس قدر محتاط نظر آتے تھے جیسے وہ بارود کے ڈھیر کے سامنے بیٹھے ہوں۔ ایسے بارود کے سامنے جو کسی بھی لمحے پھٹ سکتا ہے۔

راستے میں وہ کہیں نہیں ٹھہرے۔ جب جیپ کا پچھلا دروازہ کھلا تو مجھے معلوم ہوا کہ ہم کسی جیل کی ڈیوڑھی کے اندر کھڑے ہیں۔ سپاہیوں نے مجھے گھسیٹ کر جیپ میں سے اُتارا اور جیل کے سپرنٹنڈنٹ کے حوالے کر دیا۔

وہ بھی کوئی سکھ ہی تھا اور میرا خیال ہے کہ اُسے میرے بارے میں وہ لوگ پہلے ہی بہت کچھ بتا چکے تھے۔ اس نے سر سے پاؤں تک یوں میرا جائزہ لیا جیسے وہ "جھٹکے" کے لیے کوئی جانور خرید رہا ہو۔ پھر اپنی مونچھوں کو پھڑکاتے ہوئے وہ مسکرایا، بولا۔

"ٹھیک ہے انسپکٹر منوہر! گڈ ریسونڈ۔"

مختلف مراحل سے گزار کر انہوں نے مجھے اسی حالت میں لے جا کر جیل کی ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں ڈال کر باہر سے دروازہ بند کر دیا۔ یوں کہ میں سمجھا مجھے وہ دفن کر گئے ہیں۔ مجھ پر مٹی ڈال گئے ہیں اور اب وہ میری قبر کی پائنتی کھڑے میرے لیے دعائے مغفرت مانگ رہے ہوں گے۔

وہ واپس گئے تو اس کوٹھری کی دلگیر تنہائی مجھ سے لپٹ گئی۔ روشنی وہاں دھبے کی صورت میں عقبی روشندان میں سے اندر آ رہی تھی۔ میری جیب میں تھا تو کچھ بھی نہیں۔ وہ جو سگریٹ اور لائیٹر تھے، وہ بھی انہوں نے جامہ تلاشی کے دوران مجھ سے چھین لیے تھے۔

اُس روز اس تنہائی اور قبر ایسے جانگسل سناٹے نے میرے سینے پر اتنا بوجھ ڈال دیا اور میں کچھ اس حد تک ٹوٹ پھوٹ گیا کہ اپنے زانوؤں میں سر دیے میں بڑی دیر تک پھوٹ پھوٹ کر روتا رہا۔ میں نے بڑی گریہ زاری کی۔ پتہ نہیں کس کے سامنے میں کس لیے رو رہا تھا۔ میں نے پرانے میرپور شہر کو ایک بار منگلا جھیل میں ڈوبتے دیکھا۔ وہ بڑا دلخراش منظر تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک پورے کے پورے آباد، سنسان اور ویران شہر کو پانی نے ہڑپ کر لیا تھا۔ ہر شے لحظہ بہ لحظہ آنکھوں سے اوجھل ہوتی چلی گئی تھی۔ انہوں نے منگلا بند بنا لیا تھا۔ وہ نئی زمینوں کو سیراب کرنے چلے تھے، وہ بھی ہو گئی ہوں گی۔ مگر میں اس دن بہت رویا تھا، اتنا رویا تھا کہ میری ہچکی بندھ گئی تھی۔ وہ شہر، وہ آنے سارے لوگوں کا صدیوں پرانا مامن جدید دور کی بڑھتی ہوئی جدید ضرورتوں کی بھینٹ چڑھ گیا۔ کتنے لوگ وہاں سے اٹھ گئے تھے۔ کتنے لوگوں کے ہاتھوں نے کتنی صدیوں اس شہر کی تعمیر میں خون پسینہ ایک کیا تھا۔ اس کے گھر کے ہر کمرے میں نسل ہا نسل محبتوں کے چراغ جلائے ہوں گے، ایک ایک اینٹ اُن کے ہاتھوں کے لمس سے ابھی تک گرم تھی کہ اچانک اُن سب کو پانی نے نگل لیا تھا۔ کچھ ویسا ہی حال اس روز میرا بھی ہو رہا تھا۔ مجھے بھی حادثات کے سیل بے پناہ نے اچانک آ لیا تھا۔ اور میرا بھی شہر آرزو یک لخت پانی میں ڈوب گیا تھا۔ کوئی تقدیر کے اس بسولے کو کیسے بدن پر گرنے سے روک سکتا ہے۔ مجھے وہ دن بھی دیکھنا تھا۔ وہ کال کوٹھری بھی میرے نصیب میں تھی جہاں کوئی پرندہ

بھی دو گھڑی دم لینے کے لیے نہیں ٹھہرتا ہو گا۔ شاید میرا عیب انجام قریب آ پہنچا تھا۔ میں نے تھوڑے سے عرصے میں اس شہرِ اغیار میں اپنے لیے بھی تو بہت پیدا کر لیے تھے اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپی کن بلاؤں میں گھر چکا ہے۔ اس پر بھی زندگی بوجھ بن چکی ہو گی۔ اسے بھی وہ کروٹ کروٹ خنجر مارتے ہوں گے۔ وہ بے چارا بھنگ کے بھاڑے میں مارا گیا تھا۔ وہ میرے ساتھ چلتا اس انجام کو پہنچتا۔ اس نے میری دوستی سے کیا نفع کمایا تھا مگر ہم جس راہ کے مسافر تھے وہاں ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ وہ اندھوں کی راہ ہے جہاں کوئی جس کسی کو اپنے جیسا ملتا ہے وہ اس کے ساتھ چل دیتا ہے اور دنیا کے آخری کونے تک ساتھ چلنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ آپی بھی یہی کہتا تھا۔ شاید ہماری تقدیر ہماری نئی کتر بیونت میں مصروف ہو گئی تھی۔ ہمیں وہ کسی نئے سانچے کسی نئے قالب میں ڈھالنے پر آمادہ تھی ورنہ اس شہر کی اس کال کوٹھری کے بارے میں تو ہم نے کبھی سوچا تک نہیں تھا۔ ہمیں واقعی اک تھپیڑے نے بے ارادہ اس کنارے پر لا پھینکا تھا جہاں مصیبتیں ہمارا نام پوچھتی پھرتی تھیں اور ہم منہ چھپا کر بھی کسی طرف نکل نہ سکے تھے۔

پھر اسی گردش لیل و نہار نے مجھے آ گھیرا تھا۔ پھر وہی ایک خاموش سا پُراسرار آدمی آیا۔ پھر وہی کڑوی کسیلی کنکر کوکڑ والی دال اور وہی چمڑے ایسی سیاہی مائل روٹیاں مجھے تھما گیا جن سے بہت عرصہ پہلے لاہور کی جیل میں میرا تادیر واسطہ رہا تھا۔ فرق کچھ بھی نہیں تھا وہی حالات تھے ویسے ہی جرائم اور ویسی ہی تعزیریں۔ ویسی ہی جیلیں تھیں اور ویسے ہی داروغے۔ وہاں بھی آدمی کی غلاظت کال کوٹھریوں میں اس کا دم گھونٹتی تھی اور یہاں بھی آدمی کی پائنتی اس کی عفونتیں جمع رکھی جاتی تھیں تاکہ اس کا سفر مختصر ہو جائے۔ جتنی زندگی وہ حوادث کے طوفان سے بچا کر لے آیا تھا وہ گاڑھے غلیظ بدبو سے اٹے ہوئے ہوا کے بوجھل جھونکے کی طرح ختم ہو جائے۔

جتنا آدمی باقی بچ کر وہاں پہنچا ہے وہ بھی جلدی جلدی اس دُکھ کی چتا میں جل کر جلدی بھسم ہو جائے۔ اس کی عزتِ نفس اِس حد تک مجروح ہو جائے کہ وہ اپنے آپ سے شرمندہ ہونے لگے۔ اسے اپنے دل و دماغ اور ہاتھوں سے نفرت ہو جائے جو اس کو وہاں تک لانے کا سبب بنتے ہیں۔ اس انتظام کا مقصد یہی نظر آتا تھا۔

مجھے انہوں نے قیدِ تنہائی میں ڈال دیا تھا۔ میرے خلاف انہوں نے نہ کوئی کلندرا تیار کیا نہ مقدمہ بنایا۔ بس مجھے کوڑھی سمجھ کر غار میں ڈال دیا تھا۔ کسی طرف سے مجھے کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ صرف جیل کا گھڑیال ٹھن ٹھن کر کے اُٹھتا تھا تو مجھے محسوس ہوتا تھا کہ وقت آگے سرک رہا ہے۔ ٹھہر ٹھہر کر مجھے آسیہ کی تقدیر کا المیہ ہولاتا تھا۔ میں نے بہت سوچا مگر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ پولیس انسپکٹر کبیر شاہ اسے اپنی تحویل میں لے کر کس مقصد کے لیے لاہور سے نکل گیا تھا۔ اسے کیا دلچسپی تھی۔ میری بہن کے پور پور کٹے ماضی حال اور مستقبل میں ہمارا اس سے کوئی بھی تو رشتہ نہیں تھا پھر اُسے کیوں آسیہ سے اتنی ہمدردی ہو گئی تھی؟ یہ ایسے سوالات تھے جن کا کوئی حل مجھے نظر نہیں آتا تھا۔

میرے اور اس کے درمیان تو وقت اور فاصلے نے نئی دیواریں چن دی تھیں، ایک کے پیچھے ایک۔ اور میرا خدا ہی جانتا تھا کہ میں کب اپنے حصے کی وہ اذیتیں حد کے اُس پار سہہ کر اس تک واپس جا سکوں گا۔

سات دن گزر گئے۔ سات بڑے ہی افسردہ و مضمحل اور اذیت ناک دن میرے وجود میں سے آرے کی طرح گزر گئے۔ میں بہت عادی تھا ان جیلوں کا اور وہاں کے ماحول کا۔ میں بدترین حالات میں بھی زندگی سے سمجھوتہ کر سکتا ہوں۔ ایسی صورتِ حال میں میرے اندر کوئی ایسا زہر پیدا ہو جاتا ہے، انتقام کا، نفرت کا، غصے کا اور گرد و پیش کی ہر شے کو تہس نہس کر دینے کا جذبہ میرے دل میں کچھ اتنی شدت سے ابھر آتا ہے کہ میں اس کے سہارے ہر اذیت ہنسی خوشی سہہ جاتا ہوں۔ وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ محبت کے سہارے ہی زندگی گزر سکتی ہے شاید نہیں جانتے ہیں کہ نفرت بھی اتنا ہی منہ زور جذبہ ہے۔ جو آدمی میں آدمی کو زیر کر لینے اور اس سے اپنی بات منوا لینے کا جنون پیدا کرتا ہے۔ یہ مقابلے یہ مسابقتیں یہ دھکم پیل ساری کی ساری کیفیتیں ایک دوسرے سے نفرت کی بنیاد پر قائم ہیں۔ آپ ایک آدمی کے دل سے یہ جذبہ فنا کر دیں کہیں کہ تو صرف اور صرف محبت ہی کرتا رہے گا تو وہ آدمی ختم ہو جائے گا۔ بہت جلدی فنا کے گھاٹ اُتر جائے گا۔ نہیں! یہ نفرت مظلوم کے دل میں سلگتی چنگاری کو زندہ رکھنے کے لیے تیل کا کام دیتی ہے۔ یہ بھی زندگی کے قیام و انصرام کے لیے بے حد ضروری ہے۔ آپ نے مداری کے تھیلے میں سانپ دیکھے ہوں گے۔ وہ سانپ کہاں ہوتے ہیں مُردہ لکیریں سی باقی رہ جاتی ہیں۔ وہ تو رینگنے والا حقیر کیڑا ہوتا ہے کیونکہ اس کے وجود سے زہر نچوڑا جا چکا ہوتا ہے اور وہ محض ایک مُردہ علامت بن کر رہ جاتا ہے۔ اس کا سارا بانکپن اس کی ساری حیاتیاتی نمو اور اس کی ہیبت و دہشت تو اس زہر کی وجہ سے قائم رہتی ہے جو ایک خاص مقدار میں پیدا ہو ہو کر اس کے جسم میں نئی چمک چلک پیدا کرتا ہے۔ اسے اپنی خوبصورت پوشاک وہ کینچلی پرانی ہو جانے پر بدل لینے میں مدد دیتا ہے اور وہ ایک نئی کرنوں ایسی چمک کے ساتھ پھر آگے چل دیتا ہے۔ یہی حال انسان کا ہے۔ اَن گنت لوگوں کو میں نے جیلوں میں صرف اس نفرت کے سہارے بدترین صورتِ حال میں بھی مسکراتے دیکھا ہے۔

اور یہی وجہ تھی کہ مجھے وہ نفرت بھی عزیز تھی جو میرے دل میں اُن لوگوں کے خلاف ہمہ وقت ابھرتی رہتی تھی جنہوں نے مجھے اور آسیہ کو اس حال تک پہنچا دیا تھا۔ میں اپنے پتے کو مرتا نہیں دیکھ سکتا اور یہی وہ قوت تھی جس کی بدولت اس کال کوٹھری کے سارے رنج و محن میں نے بڑے صبر و سکون سے جھیل لیے اور سات دن میرے وجود کو

پھیرتے ہوئے مجھے کن جہتیں سمجھاتے ہوئے گزر گئے۔

آٹھویں دِن صبح ہی صبح کوئی آٹھ بجے کے قریب کوٹھری کا دروازہ کھلا تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میرے سامنے بلبیر سنگھ کھڑا تھا۔ کبھی کا بلال آغا جس کے ساتھ میں نے نوکھا تھانے میں بہت اچھے دِن گزارے تھے۔

وہ سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا، اُسے دیکھ کر میں سنبھل کر اٹھا۔ تو وہ اندر آ گیا مگر کوٹھری میں پھیلی بدبو سے گھبرا کر وہ پھر باہر نکل گیا۔ جیل کے عملے کو موٹی سی گالی دے کر بولا۔

"اوئے تم سے اس کوٹھری کی صفائی بھی نہیں ہو سکی جاؤ بھنگی کو بُلا کر لاؤ۔" اس نے پیچھے کھڑے کسی سپاہی کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

"باہر آ جائیں جیلانی صاحب! ان بدمعاشوں کو تو گولی مار دینی چاہیئے"

دروازہ کھلا تھا۔ میں آہستہ آہستہ چلتا باہر نکلا۔ سامنے کوئی دس فٹ مربع کھلی جگہ تھی۔ اور اُس کی دیوار کے ساتھ ساتھ کسی قیدی نے اپنے ایامِ اسیری کے دوران وہاں بڑے قرینے سے پھول اُگا رکھے تھے مگر اُن سے خدا سمجھے۔ مجھے انہوں نے اس صحن میں بھی نہیں نکلنے دیا تھا دھوپ کا رنگ میں نے اِتنے دنوں بعد دیکھا تھا کہ میری آنکھیں چندھیائی جاتی تھیں۔ کوئی حجام بھی انہوں نے میری طرف نہیں بھیجا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ میری داڑھی بھی خاصی بڑھ آئی تھی ناخنوں میں میل پھنسی تھی اور میرا لباس میلا چکٹ ہو رہا تھا۔ میری وہ حالت دیکھ کر بلبیر سنگھ نے بڑی محبت سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور میری آنکھوں میں جھانک کر بولا۔

"خود کردہ را علاجے نیست! آپ نے سلامتی کی قدر پہچانی ہوتی تو اس مصیبت میں نہ پھنستے۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں بلا۔۔۔ بلبیر سنگھ جی! مگر آپ کس کس کو گولی ماریں گے یہاں۔"

"میں آپ سے کچھ باتیں کرنے آیا ہوں جیلانی صاحب! مگر پہلے آپ اپنا حُلیہ درست کر لیں۔ میں حجام کو بھی بھیجتا ہوں اور آپ کے غسل کا بھی بندوبست کرتا ہوں، کپڑوں کے بھی دو جوڑے لایا ہوں آپ ذرا تازہ دم ہو لیں پھر میں آپ سے بات کروں گا۔"

اتنے میں دو سپاہی ایک بھنگی کو لے کر وہاں آ گئے۔ انہوں نے میری کوٹھری کی صفائی شروع کی تو بدبو کے بھبکے باہر تک آنے لگے۔ بلبیر نے ناک پر صاف ستھرا معطر رُومال رکھا اور بولا۔

"میں کوئی ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد پھر آؤں گا ابھی میں اُدھر سپرنٹنڈنٹ کے پاس بیٹھتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدم اٹھاتا باہر چلا گیا۔

سپاہیوں نے کوئی پندرہ منٹ بعد میرے لیے نہانے کا انتظام کر دیا۔ بلبیر سنگھ میرے استعمال کے لیے صابن تیل، ٹوتھ پیسٹ، برش، خوشبو، تولیے، بنیان اور دو جوڑے کپڑوں کے لے آیا تھا۔ وہ مجھے غسلخانے جانے سے پہلے سپاہی نے لا دیے۔ حجام کوئی بہت ہی سمجھ دار آدمی تھا۔ اس نے بڑے قرینے سے میرے بال کاٹے اور داڑھی بھی صاف کر دی۔ میں نے ایک گھنٹے بعد جب ان مراحل سے گزر کر خود پر نظر ڈالی تو خدا کا شکر ادا کیا کہ میں ابھی تک زندہ تھا، اور کسی کو میرا خیال بھی تھا۔

بلبیر سنگھ کچھ ہی دیر بعد واپس آ گیا۔ اس نے اونچی دیوار کے سائے میں کمبل بچھایا اور میرے پاس بیٹھتے ہوئے اس نے جیب سے سگریٹ کے دو پیکٹ اور ماچس کی ڈبیا نکال کر مجھے دے دی بولا۔

"مجھے افسوس ہے آپ کو سگریٹ بھی نہیں مل سکے ہوں گے"

"ان کے لیے تو میں ترس ہی گیا تھا۔ آپ نے بڑی مہربانی کی ہے سردار جی کہ میرے لیے اتنی تکلیف اٹھائی ہے۔"

"نہیں جیلانی صاحب! ایسا نہ کہیں یہ میرا فرض تھا۔ جب مجھے ادھر آنا ہی تھا تو یہ چیزیں میں کیوں نہ لاتا؟" اچانک اس نے محسوس کیا کہ صحن میں بیٹھنا مناسب نہ ہو گا۔ بولا۔

"میرا خیال ہے ہم اندر جا بیٹھتے ہیں۔ ہماری باتیں کسی کے کان میں نہیں پڑنی چاہئیں۔"

یہ کہہ کر اس نے مجھے وہاں سے اُٹھایا اور ہم دونوں کوٹھری کے اندر جا بیٹھے۔ وہاں کی فضا اب صاف ہو چکی تھی۔ میں نے اب تک اپنی کسی بھی حرکت سے اس پر یہ بات ظاہر نہیں کی تھی کہ میں اسے پہچان چکا ہوں۔ چند لمحے پہلے میرے مُنہ سے بلال کا لفظ نکلتے نکلتے رہ گیا۔ اگر میں اُس کو بلال کہہ کر مخاطب کر بیٹھتا تو صورتِ حال بہت مختلف ہوتی

"میرے دوست پیرزادہ کا کیا حال ہے کچھ پتہ چلا آپ کو کہ اُسے ان لوگوں نے کہاں رکھا ہے؟" میں نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر اُس سے پوچھا۔ سگریٹ سرور دینے لگا تھا۔ اتنے دنوں بعد تو وہ مجھے میسّر آیا تھا۔

بلبیر نے میرے سوال پر ناک بھوں نہیں چڑھایا، بولا "آپ کا خیال ٹھیک ہے جیلانی صاحب! اُسے ملہوترا نے وہاں سے خود ہی اٹھوا دیا تھا۔"

"وہ تو میں خود ہی سمجھ گیا تھا مگر مجھے انہوں نے یہاں کیوں ڈال دیا؟"

"وہ آپ سے مایوس ہو گئے تھے۔ آپ نے بلونت سنگھ سے جو کچھ کہا وہ اس نے فون پر انہیں بتایا تو طے یہ پایا کہ آپ کی تھوڑی کپڑ چھان کر دی جائے۔"

"وہ تو میں بھی سمجھ رہا ہوں مگر وہ پیرزادہ کہاں ہے اب؟"

"وہ بھی اسی شہر میں ہے اور اب تک بالکل محفوظ ہے۔ اُس کی سلامتی کا انحصار آپ کے رویّے پر ہے۔"

"میرا رویہ تو بالکل ٹھیک ہے۔"

"نہیں! انہیں آپ اپنی نیّت کے بارے میں کوئی یقین دہانی نہیں ...سکے ہیں۔"

"مگر وہ کون لوگ ہیں؟ کتنے لوگ شامل ہیں اس سازش میں؟"

میرے اس سوال پر وہ بولا "یہ بات صرف چھ سات آدمیوں ...محدود ہے۔"

"اچھا پھر؟ اب کیا چاہتے ہیں وہ؟"

"وہ آپ سے بہرحال یہ کام لینا چاہتے ہیں اور اس مقصد ...لیے انہوں نے آپ کو بیس ہزار روپے ماہانہ کی پیش کش کی ہے"۔

میں نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر اس کے سامنے فرش پر رکھ دیے۔ "یہ ہاتھ دیکھتے ہیں آپ؟ یہ بڑے روزی رسان ہاتھ ہیں راتوں ...ت چاہیں تو کروڑوں روپے پیدا کر سکتے ہیں مجھے کسی تنخواہ کی ضرورت ...نا ہے۔"

"بہرحال آپ کا انعام بہت بڑا ہے جو عزّت آپ کو یہاں ...ے گی اس کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

"وہ تو سب ٹھیک ہے۔ میں نے ہاں بھی کر دی تھی۔ میں اپنے ...بت آپی کی رہائی اور اپنی باعزت وطن واپسی کے لیے یہ کام کر دوں ...چند ایک آدمیوں کو صاف کرنا کچھ مشکل نہ ہو گا مگر اس سے آگے ...نہیں جا سکتا۔ اس کام کے مکمل ہو جانے کے بعد وہ بھول جائیں کہ ...یلانی بھی کوئی تھا۔"

"اس بات پر بھی غور ہو چکا ہے میرا خیال ہے کہ آپ کو ہمیشہ ...کے لیے ادھر منتقل ہونا پڑے گا۔"

"یہ زیادتی کی بات ہے۔"

"کوئی زیادتی نہیں ہے یہ۔ آپ کو نہیں معلوم کہ وہ آپ کے ...ہے آپ کی وفاداریاں خریدنے کے لیے کیا کچھ کر چکے ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ ہے جیلانی صاحب کہ وہ آپ کی بہن آسیہ کو پاکستان ...ے اغوا کر کے یہاں لا چکے ہیں۔"

اُس کی یہ بات سن کر میں پاگل ہو گیا۔ میں نے اس کو دونوں ...دھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔

"یہ۔۔۔ یہ کیا کہہ رہے ہو بلبیر سنگھ! میں اس شہر کی اینٹ ...ے اینٹ بجا دوں گا۔ ان کی یہ جرأت!"

وہ میری یہ کیفیت دیکھ کر ذرا نہیں گھبرایا البتہ پستول کے ...تے پر اُس نے اپنا ہاتھ رکھ لیا تھا مسکراتے ہوئے بولا "یہ قدم آپ کے ...نہیں جاتا ہے جیلانی صاحب انہوں نے آپ کے معاملے پر بہت محنت ...کی ہے۔"

"مگر وہ تو بیمار تھی، بسترِ مرگ پر پڑی تھی وہ۔"

"نہیں! اب اس کی حالت بہت بہتر ہے اور وہ شہر کے سب سے اچھے ہسپتال میں وہاں کے بہترین ڈاکٹروں کی نگرانی میں ہے۔"

"یہ سب کچھ میرے لیے حیرت انگیز ہے۔ انہیں میری بہن کا اتا پتہ کس نے بتایا؟ اس کے ٹھکانے کا تو مجھے بھی علم نہیں تھا۔"

"میں نے کہا نا! کہ اُن کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔"

"اور ان لمبے ہاتھوں کے خونی پنجہ کی ایک تیز نوکیلی اُنگلی تم بھی بن چکے ہو بلال آغا! تم نے بھی خود کو بیچ دیا ہے ذلیل!" میں نے اپنے وجود کی ساری نفرت ان لفظوں میں سمو دی۔

وہ ایک لحظے کے لیے منجمد ہو کر رہ گیا۔ اس کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ مجھے چند لمحوں تک ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے ہوئے یہ موٹی سی گالی دے کر دبی زبان میں بولا۔ "بدمعاش! میں بھی تجھے پہچان گیا تھا پہلے ہی دن۔ اور اسی لیے تیرے پاس آیا ہوں۔" اس نے فوراً ہی اعتراف کر لیا۔

"مگر تو یہاں کیا کر رہا ہے آغا جانی!" میں نے سرگوشی کی۔

"دیکھ! مجھے تو کبھی اس نام سے نہیں پکارے گا۔ یہ پہلا اور ضروری سبق ہے۔"

"ہاں! تو ٹھیک کہتا ہے مگر تو اِن کے پاس کیا کر رہا ہے اس کُفر گڑھ میں۔"

"میں۔۔۔ میں بھی سرکاری ڈیوٹی پر ہوں! مجھے ایک خاص مقصد کے لیے یہاں بھیجا گیا تھا اور میں چاہتا ہوں کہ تو ان کے بتائے ہوئے رستے پر چل کر فوراً پاکستان چلا جا اور ان لوگوں کو خبردار کرنے کے علاوہ اُن کی حفاظت کا بھی انتظام کر۔"

"مگر۔۔۔ یار تم مجھے کیا سمجھتے ہو۔ میں کہاں کا افلاطون ہوں۔ یہ سوال مجھے حیران کرتا ہے۔"

"اِن کی نظرِ انتخاب تم پر ہی پڑی ہے۔ پتہ نہیں انہیں یہ کیوں توقع ہے کہ تم اِن کے بہت کام آ سکتے ہو۔"

"مگر میں اپنے وطن سے غداری نہیں کر سکتا۔"

"مجھے معلوم ہے مگر مصلحتاً تو تمہیں اِن کی ہاں میں ہاں ملانی ہی ہو گی۔"

"اور وہ جو تم کہتے ہو کہ آسیہ کو یہ لوگ یہاں لا چکے ہیں؟"

"وہ بات صحیح نہیں ہے مگر وہ اس تک پہنچ چکے ہیں۔ جبھی تو میں نے کبیر شاہ کا نام لیا تھا، اس ایس ایچ او کا۔"

"یہ کرنا کیا چاہتے ہیں سردار جی؟"

"مجھے سب کچھ معلوم ہے اور ہم اُن کو ایسی پٹخنی دیں گے کہ یہ دیکھتے ہی رہ جائیں گے۔"

"مگر تم کیسے اِن کے درمیان رہ کر اپنی شناخت چھپا سکے ہو؟"

"یہی تو میرا کمال ہے مجھے بھی انہوں نے اسی طرح پھانسا تھا۔ پھر میں نے ان کے درمیان رہ کر اپنے مُلک کی خدمت شروع کر دی۔۔۔

بہرحال یہ باتیں پھر ہوں گی۔ میں تمہیں آج سہ پہر کو یہاں سے نکال لوں گا۔ جو کچھ وہ کہیں اس کے مطابق تم عمل کرو اور فوراً پاکستان پہنچ جاؤ۔"

"فرض کرو، میں ان لوگوں کو خبردار کر دیتا ہوں تو پھر کیا ہوگا؟ انہیں ہم بچا تو لیں گے مگر یہ ہمیں چین نہیں لینے دیں گے۔"

"یہ خطرہ تو ہے مگر اپنی جان سے زیادہ ہمیں ان کی فکر ہے جو بے خبر ہیں، اُن کے لیے تمہیں مرنا بھی پڑے تو یہ مہنگا سودا نہیں ہے۔" بلبیر سنگھ بولا۔ میں نے پھر اسے اسی نام سے یاد کیا تاکہ اس کا بھید کھلے۔

"مگر آسیہ کو میں کوئی نقصان پہنچتے نہیں دیکھ سکتا۔"

"وہ عورت ہے اسے کسی محفوظ جگہ۔ پر چار دیواری میں ڈال دو تو یہ وہاں تک کبھی نہ پہنچ سکیں گے۔"

"مشکل ہے۔ میں اس سے ملوں گا تو یہ میرے حوالے سے وہاں تک جا پہنچیں گے۔"

"پریشان نہ ہو۔ میں کوئی راستہ نکال لوں گا۔"

"جیسے تمہاری مرضی! میری سمجھ میں تو یہ گورکھ دھندا نہیں آرہا ہے۔"

"جو بھی آدمی ملے اس کے سامنے اپنے لوگوں کو خوب گالیاں دو تاکہ یہ تمہیں اپنا ہی آدمی سمجھیں۔"

"ہاں یہ تو کرنا ہی ہوگا مگر اپنے دوست کے بارے میں کیا کروں؟"

"اُسے یہ لوگ یہاں سے تھوڑی دُور ادھر حوالات میں بند کر چکے ہیں شریف پورہ تھانے میں۔ بہرحال میں کوشش کروں گا کہ اُسے بھی یہ لوگ تمہارے ساتھ بھیج دیں۔"

"مشکل ہے، اُسے تو یہ لوگ یرغمال بنا کر رکھیں گے اور میری بہن کو بھی۔"

"آثار تو یہی نظر آتے ہیں مگر انہیں کوئی بات مت سمجھاؤ۔۔۔ تمہارے لیے یہی بہتر ہے ورنہ یہ تمہیں اُدھر جیل میں سڑا دیں گے۔"

"اس ساری سازش کا سربراہ کون ہے؟"

"اُس سے آج تمہاری ملاقات ہوگی۔ دراصل یہ سارا منصوبہ یہاں کی ایک کٹر دہشت پسند مسلم آزار پارٹی نے بنایا ہے وہ نہیں چاہتے کہ پاکستان میں کبھی صحیح قسم کے لوگ سامنے آئیں۔"

"گویا اس میں حکومت کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔"

"نہیں!"

"مگر یہ پولیس والے! یہ کیا ڈرامہ کھیل رہے ہیں؟"

"اس کام میں سب کا ہاتھ نہیں ہے۔ چند لوگ ہیں، جو پارٹی کے خفیہ رُکن ہیں اور حکومت کو کچھ بتائے بغیر یہ اپنا منصوبہ چلا رہے ہیں۔"

"درپردہ انہیں حکومت کی حمایت حاصل ہوگی۔"

"نہیں! حکومت کو کچھ خبر نہیں ہے اور اگر خبر مل بھی گئی تو وہ کسی کے خلاف کوئی کارروائی بھی شاید ہی کرے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو یار! بہرحال اِس صحرا میں تمہاری ذات میرے لیے نخلستان ثابت ہوئی ہے میں یہاں سے رہائی کا منتظر ہوں۔"

"بس تم چار بجے تیار رہنا۔ میں سپاہیوں کو بھیج دوں گا۔" یہ کہہ کر وہ اٹھا اور مجھ سے ہاتھ ملا کر بڑے اطمینان سے باہر نکل گیا۔

میرا وطن واپس جانا بے حد ضروری ہوگیا تھا۔ مجھے آسیہ کی سلامتی خطرے میں نظر آتی تھی۔ وہ لوگ بدترین حربے بروئے کار لانے پر تُلے ہوئے تھے اور محسوس مجھے یہ ہو رہا تھا کہ وہ اپنا سارا زور پنجاب کے صوبے پر صرف کر رہے ہیں کہ اس کی حیثیت میرے وطن کے دل ایسی ہے۔

بلبیر سنگھ نے اپنا وعدہ نبھا دیا۔ دوپہر کو کھانا مجھے بہت عمدہ ملا۔ وہ سب کچھ انہوں نے کسی کشمیری مسلمان کے ہوٹل سے منگوایا تھا اہم بات یہ تھی کہ اس میں بھُنا ہوا گوشت وافر مقدار میں موجود تھا۔

ٹھیک چار بجے جیل کے سپاہی میرے پاس آئے اور مجھے بڑی خندہ پیشانی سے یہ مژدہ سُنا گئے کہ مجھے رہا کیا جا رہا ہے۔ کچھ ہی دیر بعد ان لوگوں نے مجھے جیل پر کھڑی جیپ کے پچھلے حصے میں بٹھا دیا جہاں چار مسلح سپاہیوں نے مجھے فوراً ہی نرغے میں لے لیا۔ جیپ کے اگلے حصے میں بلونت اور ملہوترا بیٹھے ہوئے تھے۔ جیپ چاروں طرف سے بند تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کن کن راستوں سے گزری۔ جب اس کا دروازہ کھلا تو ہم پھر کسی کوٹھی کے پورچ میں کھڑے تھے جب میں جیپ سے اُترا تو پولیس انسپکٹروں نے مجھے گھیر لیا۔ ایک میرے دائیں ہاتھ تھا، دُوسرا بائیں اور تیسرا میرے عقب میں۔ اُن کی صورتیں میں نے پہلی بار دیکھی تھیں۔ تینوں ہی بہت سنجیدہ نظر آرہے تھے۔ ملہوترا اور بلونت مجھ سے کوئی بات کیے بغیر جیپ کو دوڑا کر آگے نکل گئے۔ بلبیر مجھے کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ مگر جب میں عمارت کے اندر داخل ہوا تو وہ اس وقت سامنے کے بڑے سے دروازے میں سے باہر آرہا تھا۔ پولیس کے تینوں افسر اس کو دیکھ کر مودّب ہو گئے۔

"ٹھیک ہے اس کو اِدھر اس کمرے میں بٹھاؤ میں آرہا ہوں۔" پھر تیسرے آدمی کو مخاطب کر کے بولا۔ "ٹھاکر! تم بھنڈاری صاحب کو اطلاع دو۔ کہو کہ ہم قیدی کو لے آئے ہیں۔"

بلبیر مجھ سے آنکھ نہیں ملا رہا تھا اور بے حد سنجیدہ صورت بنائے کھڑا تھا۔ ٹھاکر مجھ سے الگ ہوا تو وہ جوان مجھے اپنے ساتھ لے کر سامنے کے کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ ایک وسیع و عریض ہال کمرہ جس کی دائیں بائیں کی دیواروں میں تین تین دروازے لگے تھے۔ اس کمرے کا طول عرض تیس میں سے کسی طرح بھی کم نہ ہوگا۔ درمیان میں ایک میز بچھی تھی جس کے گرد سولہ کرسیاں لگی تھیں، ان تھانیداروں نے مجھے کرسی پر بٹھا دیا۔ تینوں کے تینوں پستولوں سے مسلح تھے اور اُن کی پیٹیاں گولیوں سے اَٹی ہوئی تھیں۔

اُن میں سے دو ڈٹ کر میرے سامنے یوں بیٹھے جیسے میری

ت پر وہ مجھے بھُون کر رکھ دیں گے۔ تیسرا آدمی میرے بائیں بیٹھ گیا مگر پھر چند ہی منٹ بعد وہ کسی کام سے باہر نکل گیا اور پھر نہیں آیا۔

ابھی کوئی پانچ ہی منٹ گزرے تھے کہ ایک گندمی رنگ کا بھر کہ ادھیڑ عمر آدمی کھدر کے کرتے پاجامے میں وسطی دروازے سے داخل ہوا۔ اس نے بڑھیا قسم کے ولایتی تمباکو کا ڈبہ پکڑ رکھا تھا اور لمبا سا پائپ اس کے دانتوں تلے دبا تھا۔ وہ نپے تلے قدم اٹھاتے بڑھا، اُس کی نظریں مجھ پر جمی تھیں۔ وہ تینوں تھانے دار اُنہیں دیکھتے ہی مودّب کھڑے ہو گئے۔ اس آدمی نے میرے قریب آ کر بے تپاک سے ہاتھ بڑھایا اور بولا۔

"میرا نام ایس کے بھنڈاری ہے۔"

"اوہ! بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" میں نے اُٹھ کر اس سے مصافحہ کیا۔ ابھی وہ بیٹھا بھی نہ تھا کہ وسطی دروازہ پھر کھلا۔ ایک دھان پان سی عورت جو سفید ساڑھی میں ملبوس تھی ہماری طرف لپکی۔ وہ بھی بے آواز چل رہی تھی۔ میرا خیال ہے اس کے جوتوں تلے ربڑ لگا تھا۔ بھنڈاری بھی بیٹھا نہیں تھا کہ وہ اس کے پاس آ پہنچی۔

"یہ میری پتنی ہے، آپ کو دیکھنا چاہتی تھیں۔"

میں نے اسے ہاتھ ماتھے پر لے جا کر سَلام کیا۔ اس ہڈیوں کے ڈھانچے نے ہاتھ جوڑ دیے۔ وہ بھنڈاری صاحب کے مقابلے میں بہت ناکمزور نظر آ رہی تھی۔ وہ دونوں بیٹھے تو وسطی دروازہ پھر کھُلا۔ ایک لڑکی جو بش شرٹ اور پتلون میں ملبوس تھی تیزی سے اندر داخل ہوئی۔ اس کی تراشیدہ زلفیں کندھوں پر جھول رہی تھیں۔

"پتاجی میں بھی آگئی۔"

"اوہ! بہت اچھا کیا۔ یہ ہیں ہمارے مہمان جیلانی صاحب لاہور سے آئے ہیں۔"

"ہائے ڈیڈی! کتنے ہینڈسم ہیں یہ! پٹھان ہوں گے۔"

"پتہ نہیں! یہ میری بیٹری ہے پتا۔ بی اے میں پڑھ رہی ہے اسے بھی آپ کو دیکھنے کا شوق تھا۔" بھنڈاری نے اس کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

میں نے اُسے بھی اُٹھ کر سلام کیا۔ اس نے اپنے گلاب کے پھولوں سے ہاتھ بڑی دلفریب شوخی سے جوڑ دیے۔ وہ بلاشبہ بے حد حسین تھی۔ سر سے پاؤں تک نور کے سانچے میں ڈھلی ہوئی۔ میرا خیال ہے مسز بھنڈاری نے اپنی ساری شوخی چنچلتا شباب اور اسکی رعنائیاں اس میں منتقل کر دی تھیں۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد بھنڈاری صاحب میری طرف جھکے اور جیب سے ایک سفید کاغذ نکال کر دبی آواز میں بولے۔ "یہ ہے وہ فہرست۔ یہ آپ رکھ لیں۔ آج رات کو ہمارے آدمی آپ کو بارڈر کراس کرا دیں گے۔ یہاں سے دو آدمی آپ کے ساتھ جائیں گے۔"

میں نے وہ کاغذ کھول کر دیکھا، پڑھا اور میری آنکھیں بس کھُلی کی کھُلی رہ گئیں۔ اس فہرست میں جن لوگوں کے نام لکھے تھے اُن کو اگر ابدی نیند سُلا دیا جاتا تو پھر سارے ملک میں سناٹا ہی سناٹا پھیل جاتا۔ وہ ایسے نام تھے کہ میرے دل میں ہمیشہ سے اُن کے لیے احترام کے جذبات فراواں رہے تھے۔ میں نے اپنا ردِعمل ظاہر کیے بغیر وہ فہرست جیب میں ڈال لی میرے پیٹ میں عجیب بل پڑنے لگے تھے اور اُن کے عزائم کو سمجھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ میں نے بڑی متوازن آواز میں کہا۔ "میں معافی چاہتا ہوں یہاں کوئی باتھ روم ہوگا؟"

"کیوں نہیں۔ یہ چھوٹا دروازہ باتھ روم میں کھُلتا ہے۔"

بھنڈاری نے میرے عقب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں اُدھر جانے کے لیے اٹھا تو وہ دونوں تھانیدار بھی میرے پیچھے لپکے وہ سائے کی طرح میرا تعاقب کر رہے تھے انہیں یہی حکم ملا ہوگا۔

میں نے باتھ روم کا دروازہ کھولا تو وہ بھی اندر جھانکنے لگے۔ اُس دروازے کے سامنے چھ فٹ مربع کھُلی جگہ تھی جس کی دائیں دیوار میں ایک بیسن لگا تھا۔ وہ دونوں میرے ساتھ ہی اندر آگئے۔ میرے سامنے دو باتھ روم تھے۔

"آجاؤ۔ اِدھر اکٹھے ہی بیٹھتے ہیں۔ وہاں صحیح پہرہ دے سکو گے۔" میں نے اُن دونوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ میں اُن کے بیچ میں پھنس کر کھڑا تھا وہ کچھ جھینپ سے گئے۔ ایک لحظے کے لیے میرا مغز اُلٹ گیا۔ میری رسّی انہوں نے اتنی تنگ کر دی تھی کہ میں جھڑ گیا۔ میں نے شکرے ایسی تیزی سے دونوں کی گردنوں میں پوری قوت سے اپنے پنجے گاڑ دیے۔ اور اپنا سارا فن اُن پر خرچ کر دیا بس پانچ سیکنڈ کی بات تھی، وہ دونوں میرے کندھوں پر جھول گئے۔ میں نے وقت ضائع کیے بغیر اُن دونوں کے پستول پیٹیوں سمیت ان کی وردیوں سے اُتار لیے۔ ایک پستول میں نے کُرتے کے اوپر لٹکا لیا۔ دونوں پستول گولیوں سے لبالب بھرے تھے۔

کوئی پانچ منٹ تک وہاں کھڑا میں اپنے اس غیر اضطراری عمل کے منطقی نتیجے پر غور کرتا رہا۔ اور پھر ایک واضح منصوبہ ذہن میں مرتب ہوگیا۔ میں اُن کی شرائط پر وطن واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ یہ بدترین قسم کی سودے بازی ہوتی جو میرے ضمیر کے خلاف تھی۔ میں نے دروازہ کھولا اور سیدھے ہاتھ میں پستول لے کر ایک ہی جست میں بھنڈاری تک جا پہنچا۔ پستول میں نے اس کی گدی سے لگا لیا۔ اس کی بیوی اور بیٹی کے رنگ یوں اُڑے جیسے اُن کا سارا ہی خون خشک ہوگیا ہے۔

"مسٹر بھنڈاری! میں ابھی اور اسی وقت اپنے دوست مسٹر پیرزادہ کو یہاں مانگتا ہوں۔ اگر تم نے میرا حکم نہ مانا تو تم تینوں زندہ نہیں جا سکو گے۔"

اس عرصے میں اُن کا ملازم میز پر چائے کے برتن لگا گیا تھا۔

وہاں ڈھیر سارے پھل بسکٹ اور خشک میوہ طشتریوں میں دھرا تھا۔ میں نے کرتے کے نیچے سے دوسرا پستول بھی نکال لیا اور اسے الٹے ہاتھ میں تھام کر اس کی نال کا رُخ پنّا اور اس کی ماں کی طرف کر دیا۔ بھنڈاری کا سارا بدن لرزنے لگا۔

"اٹھو اور دروازے پر جا کر انہیں میرا حکم سناؤ۔ اپنے چمچوں کو۔ تم دونوں بھی اُٹھ جاؤ۔" میں نے اپنے وجود کا سارا تحکّم ان پر چابک کی طرح برسا دیا۔ وہ بھی لرزتی ہوئی اٹھیں۔ بھنڈاری پہلے ہی غیر ارادی طور پر اپنے ہاتھ اوپر اُٹھا کر کھڑا ہو چکا تھا۔ ان تینوں کو ایک قطار میں رکھ کر میں نے انہیں اس ہال کمرے کے بڑے دروازے کی طرف دھکیلنے سے پہلے میز پر سے چھری اُٹھا لی اور پھر بہت سے بسکٹ اپنے کُرتے کی جیبوں میں بھر لیے۔ مجھے زادِ راہ کی ضرورت تھی۔

مجھے معلوم تھا کہ پورچ میں پولیس کے لوگ کھڑے ہیں۔ بند دروازہ پر ان تینوں کو روک کر میں نے بھنڈاری کی گردن میں پستول کی نال دھنسا دی۔

"ان کو میرا حکم سُناؤ۔"

بھنڈاری نے ایک زبردست قسم کی جھرجھری لی اور لرزتی، کانپتی آواز میں بلک کر بولا۔

"ناتھو جی، ارے ناتھو جی! ہم تو برباد ہو گئے۔ ان کی بات سنو"

اُس کی یہ بات سنتے ہی سامنے برآمدے میں کھڑا ایک پولیس افسر ایڑی پر گھوما اور دروازے کے قریب آ کر شیشوں میں سے اندر جھانکنے لگا۔ اس نے ان تینوں کو میرے سامنے یوں لرزتے دیکھا تو ساری صورت حال سمجھ گیا۔

"کیا ہوا بھنڈاری صاحب! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟"

"ان کا حکم سنو لے ناتھو جی! یہ کہتے ہیں کہ ان کے دوست پیرزادہ کو ابھی ادھر لاؤ۔"

"صرف اُسے ہی نہیں۔ میری بات غور سے سنو ناتھو جی! میرے دوست پیرزادہ کو ابھی یہاں منگواؤ۔ مجھے ایک ہیلی کاپٹر بھی چاہیے۔ میں آج اور ابھی پاکستان پہنچنا چاہتا ہوں۔ اس کام کے لیے میں تمہیں صرف ایک گھنٹہ دیتا ہوں ورنہ میں ان تینوں کو قتل کر دوں گا۔"

شیشے میں سے ناتھو جی کا بگڑتا چہرہ دیکھ کر مجھے بہت اطمینان ہوا۔ میری بات اُس نے سُن لی تھی۔ وہ تیزی سے پیچھے مڑا اور دوسرے سپاہیوں کو اِدھر اُدھر دوڑانے لگا۔ اُس کے منہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

میں اُن تینوں کو پستولوں کی زد میں لے کر دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ میرے چہرے کی درشتی اور سفاکی اپنا اثر دکھا رہی تھی۔ اُن تینوں کا رُخ میں نے سامنے کی طرف موڑ دیا تھا۔

ایک ایک لمحہ بے حد قیمتی ہو گیا تھا۔ میں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہاں سے یوں نامردوں کی طرح باہر نہیں نکلوں گا۔ بس میں کسی کر مروں گا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ کوٹھی کے وسیع و عریض لان میں ہیلی کاپٹر بڑے اطمینان سے اُتر سکتا ہے۔ میرے مطالبات مان لینے میں بھی زیادہ دیر نہیں لگ سکتی تھی۔ آبی میرے پاس آ پہنچتا تو میری طاقت دُگنی ہو سکتی تھی۔ میں نے یہ قدم اٹھایا بھی صرف اس کی رہائی کے لیے تھا۔ میں اُسے بھارتی جیلوں میں سڑنے کے لیے کبھی راضی نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے اس بلبیر کی نیت پر بھی شبہ تھا وہ جھوٹ بول رہا تھا کہ وہ اپنے وطن کی خدمت ہی کے لیے وہاں بیٹھا ہے۔ وہ غدار اُن کے ہاتھوں میں کھلونا بنا ہوا تھا۔ اسے بھی ان لوگوں نے پاکستان کے خلاف اپنی سازشوں میں مہرہ بنا لیا تھا۔ میری چھٹی حس مجھے یہی بتا رہی تھی۔ ورنہ وہ اس کے معنی سے کیسے بے خبر رہ سکتے تھے۔

کوئی دس منٹ کے اندر اندر مجھے محسوس ہوا کہ کوٹھی کے اندر کئی گاڑیاں شوں شوں کرتی گھس آئی ہیں۔ سامنے پولیس کی گارد ٹھہری وہ سب کے سب افراتفری میں تھے۔ میں نے ہال کمرے کے چاروں طرف ایک بار پھر نظر ڈالی وہاں روشندان ایک بھی نہیں تھا۔ اس ڈر سے کہ کہیں کوئی سامنے سے مجھ پر گولی نہ چلا دے میں نے پنّا کو اپنی ڈھال بنا لیا تھا۔ بھنڈاری کے دل کا نازک ترین گوشہ ہونے کی وجہ سے مجھے یقین تھا کہ وہ اپنی بیٹی۔۔۔ کو یوں گولی سے مرتے نہیں دیکھ سکے گا۔

میرا خیال ہے کہ شہر کی ساری پولیس ہل کر رہ گئی تھی۔ مجھے ان کو یرغمال بنائے پندرہ منٹ گزر چکے تھے اور وقت تیزی سے گزرتا چلا جا رہا تھا۔ پنّا کی ماں اچانک سسکنے لگی۔ اس کا کمزور سا جسم اتنی ساری اذیت کیسے سہہ سکتا تھا، اُسے واقعی رو دینا چاہیے تھا۔

"ٹسوے مت بہا بڑھیا۔ سیدھی طرح کھڑی رہ۔" میں نے نہایت ہی اکھڑ لہجے میں اُسے خبردار کیا۔ وہ سہم کر ایک دم تن کر کھڑی ہو گئی۔ اس لمحے پنّا کے بے قرار ہاتھ اس کے پہلوؤں سے جھول کر کچھ ایسے انداز میں میری طرف بڑھے کہ میں اس کی نیت کو فوراً ہی سمجھ گیا۔ میں نے بائیں ہاتھ کی کہنی اس کی کمر میں دے ماری۔

"ذلیل! بدمعاش سیدھی کھڑی رہ۔" کہنی کی ضرب کچھ ایسی گہری لگی کہ وہ درد سے نڈھال ہو کر دوہری ہونے لگی۔ میں نے بالوں سے پکڑ کر اسے کھینچ کر سیدھا کیا اور ذرا فاصلے پر رکھ کر پستول پھر اس کی پسلی سے لگا دیا۔

اچانک دروازے پر دو باوردی پولیس افسر آ دھمکے۔ میں شیشے میں سے اُن کی شکلیں دیکھ رہا تھا۔ وہ بہت طیش میں تھے۔ ایک نے مجھے للکار کر کہا۔

"میں تمہیں پانچ منٹ دے رہا ہوں، ان کو چھوڑ کر الگ ہو جاؤ ورنہ ہم تمہیں یہیں مار دیں گے۔"

بک نہیں ادئے! میں مرنے سے نہیں ڈرتا میرے دوست
...ور نہ یہاں بڑا خونی ڈرامہ ہوگا۔ میری شرطیں ایک گھنٹے
...اندر پوری کر دو۔ سترہ منٹ گذر چکے ہیں۔" میں نے اپنی آواز
...میں گرج پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"کیا چاہتے ہو تم؟" وہ پھر چیخا۔

"اپنے دوست پیرزادہ کی رہائی، ایک ہیلی کاپٹر اور پاکستان
...بارڈر کا وٹ سفر کی سہولت۔"

وہ دانت پیستا ہوا پیچھے ہٹا اور پورچ میں جا ٹھہرا۔ وہاں پانچ
...افسر اور بھی موجود تھے۔ وہ کچھ دیر آپس میں کھسر پھسر کرتے رہے،
...پھر اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ میں نے بھنڈاری کو دائیں ہاتھ کے
...پستول کی زد میں لے رکھا تھا۔ پنّا میرے سامنے کھڑی تھی اور اس
...کی ماں اس کے آگے تھی۔ اُن تینوں کی حالت دم بدم غیر ہوتی جا رہی
...تھی۔ وہ اذیت ان کے لیے ناقابلِ برداشت تھی اور میں یہی چاہتا
...تھا۔ اُن کی بنیادیں متزلزل کر دینے سے ہی میں اپنی باتیں منوا سکتا تھا۔

کوئی دس منٹ اور گزر گئے۔ اُن کو گولی کی زد میں لیے
ستائیس منٹ ہو چکے تھے کہ اچانک مجھے شیشے کی راہ سے برآمدے
...میں چار سپاہی نظر آئے۔ اُن کے درمیان میرا جگری یار آبی چل
...رہا تھا۔ اُس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور معلوم یہ ہوتا تھا کہ اس کا
...چہرہ بہت اُترا ہوا ہے۔ آنکھیں سوجی سوجی سی نظر آتی تھیں اور لباس
...کا بے حد میلا ہو چکا تھا۔ اس کے چہرے پر بشاشت نام کی کوئی
...شے نظر نہیں آتی تھی۔

برآمدے میں آ کر سپاہی دروازے سے چند قدم دور رُک گئے
...انہوں نے آبی کی ہتھکڑی میرے سامنے کھولی اور اُسے آگے
...بڑھنے کا اشارہ کیا۔ آبی بہت پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ داڑھی
اُس نے بھی کئی دِن سے نہیں مونڈی تھی۔ وہ سہما سہما سا دروازے کی
...طرف بڑھا تو میں نے ذرا سا آگے سرک گیا۔ اُن تینوں کو بھی میں نے
...آگے دھکیل دیا۔ آبی نے بڑے ہی غیر یقینی انداز سے کواڑ کھولا تو
...میں نے بلند آواز سے کہا۔ "بے فکر ہو کر اندر آ جاؤ پیرزادہ۔"

میری آواز سنتے ہی اُس کی جان میں جان آئی۔ وہ کوک
بھرے کھلونے کی طرح اندر داخل ہوا۔ مجھ پر اُس کی نظر پڑی تو صورتحال
...کو سمجھ کر اس نے بڑے ہی عجیب انداز سے زہر خند کیا۔

"چٹخنی چڑھا کر ادھر آ جاؤ۔"

اس نے فوراً ہی دروازے پر اوپر نیچے سے چٹخنیاں چڑھا
...دیں اور کچھ گھبرائے ہوئے انداز سے اُن تینوں کو دیکھتا ہوا میرے
پاس آ ٹھہرا اور دیوار کے ساتھ پشت لگا کر کھڑا ہو گیا۔

میں نے غیر محسوس طریقے سے ایک پستول اس کے ہاتھ میں
تھما دیا۔ اس طرح کہ پنّا کی پسلی سے لگی نال ایک لحظے کے لیے بھی
پیچھے نہیں ہٹی۔

"اِن سے مِلو، یہ بھنڈاری صاحب ہیں، ایس کے بھنڈاری۔ اور یہ ہیں ان کی پتنی مسز بھنڈاری۔ اور یہ ہیں ان کی بیٹی۔۔۔ پنّا۔ یہ ابھی زیرِ تعمیر ہیں۔"

"زیرِ تعمیر؟" آبی نے یہ لفظ دہرائے۔ وہ اب مسکرانے لگا تھا۔

"ہاں! عمر ان کی بہت کم ہے یہی برس سولہ یا سترہ کا سن ہے، اس لیے کہتا ہوں کہ زیرِ تعمیر بھی ہیں اور زیرِ تعلیم بھی۔"

"یہ چکر کیا ہے یار!" آبی نے سرگوشی کی۔

"تمہیں کچھ پتہ نہیں! سیدھا کھڑا رہ لالے! تیرا مار کھانے کو دِل چاہتا ہے۔" میں نے بھنڈاری کو خبردار کیا۔ وہ بایاں ہاتھ نیچے لے آیا تھا۔ "ہاتھ اوپر رکھ۔ تیری کھاج میں بعد میں مٹا دوں گا۔"

میری آواز سن کر وہ لرز کر پھر سیدھا ہو گیا۔

"تم کیا کام کرتے ہو بھنڈاری؟"

"میں پارٹی کی صوبائی شاخ کا صدر ہوں۔" بھنڈاری نے بڑی بجھی ہوئی آواز میں کہا۔ دھیان اس کا سامنے کی دیوار کی طرف تھا۔

"کس پارٹی کا؟"

"آر۔ ایس۔ ایس۔"

"دھندا کیا کرتے ہو؟"

"میرا ایک سیمنٹ کا کارخانہ ہے، اور ایک بوتل سازی کا۔"

"سُن لیا تم نے پیرزادہ بھائی!"

"مگر یہ چکر کیا ہے؟" آبی نے پھر سرگوشی کی۔

"تیری رہائی کے لیے میں نے انہیں یرغمال بنا لیا ہے۔"

"تو چل پھر نکل یہاں سے۔" اُس نے بے صبری سے کہا۔

"میں نے ہیلی کاپٹر مانگا ہے ان سے۔"

"اوہ! تو یہ بات ہے اچھا کیا تم نے۔ یہ جوتوں کے یار ہیں یہ سب۔ شرافت کی زبان نہیں سمجھتے۔" آبی نے خوش ہو کر کہا اور میرے کُرتے کے سامنے کی جیب میں سے سگریٹ نکال کر سلگانے لگا۔

کوئی دس منٹ اور گزر گئے۔ کوٹھی کے چاروں طرف پولیس کے سپاہی افراتفری میں بھاگ رہے تھے۔ اچانک سامنے کے دروازے کا شیشہ چھن سے ٹوٹا اور ایک گولا سا کمرے میں آ گرا۔ اس میں سے بڑا کثیف سا دھواں نکل رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک اور گولا اندر آ پھٹا۔ اس میں سے بھی دھواں اُٹھ رہا تھا۔ وہ دھواں تیزی سے کمرے میں پھیلنے لگا تو میں نے محسوس کیا کہ ہمیں وہاں چند ساعتوں بعد سانس لینا بھی دشوار ہو جائے گا۔

"چلو اوئے بدمعاشو! اس دروازے میں جا گھسو۔" آبی نے پنّا اور اس کی ماں کو دھکا دے کر آگے بڑھایا اور میں بھنڈاری کو دھکیلتا ہوا قریب ترین دروازے میں جا گھسا۔ وہ کمرہ اس کوٹھی میں کسی

خاتون کی خواب گاہ تھا۔ اس کا دروازہ اندر سے مقفل کر کے ہم نے ان تینوں کو پلنگ پر بٹھا دیا۔

آبی نے پولیس کو زبردست قسم کی بڑی ہی بیہودہ گالی دی اور کرسی کھینچ کر ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ دوسری کرسی میں نے لے لی۔

"بھنڈاری! اس کھڑکی میں سے انہیں کہہ دے کہ وہ ہمیں ہیلی کاپٹر منگا دیں ورنہ تم تینوں کی خیر نہیں۔ ہم تو اپنی فاتحہ پڑھ ہی چکے ہیں۔"

یہ کہہ کر میں نے اسے خوفزدہ کرنے کے لیے اس کے منہ پر الٹے ہاتھ کا جھانپڑ دے مارا۔ وہ تیورا کر بائیں ہاتھ گرا، تو اس کی بیٹی گھگھیانے لگی۔

"پرماتما کے لیے انہیں کچھ نہ کہو۔"

"تو پھر بول دو اپنے ان لوگوں سے کہ اس ایک گھنٹے میں سے پینتالیس منٹ گزر چکے ہیں۔"

اچانک آبی نے بھنڈاری کو تاک کر اس کے سر کے اوپر سے گولی چلا دی ڈز کی سی آواز پیدا ہوئی۔ بھنڈاری تڑپ کر بستر پر اوندھا ہو گیا۔

"اٹھ جا اوئے مکار بوڑھے، اٹھ۔" آبی نے اس ڈرامے میں اپنا پارٹ ادا کرنا شروع کر دیا تھا۔ بھنڈاری لرزتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ خوف سے اس کی پتلیاں پھیل گئی تھیں اور اس کی پتنی آنکھیں بند کیے کوئی پرارتھنا کرنے لگی تھی اپنے بھگوان سے۔

اچانک اس کمرے کی کھڑکی پر برآمدے کی طرف سے دو پولیس افسر آ ٹھہرے۔ ایک چیخا۔ "بھنڈاری صاحب!"

"ہمیں بچا لو ناتھو جی! بھگوان کے لیے ان کو جو یہ چاہتے ہیں دے دو، دیر نہ کرو ناتھو جی۔" بھنڈاری نے کھڑکی کی طرف بھاگتے ہوئے کہا۔ میں نے پھر اٹھ کر اس کی پسلی کے ساتھ پستول لگا دیا۔ کھڑکی کی جالی میں باہر سے ناتھو کو بھنڈاری کی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ اس کی آواز ہی سے اندازہ لگا رہا تھا کہ اندر کی صورتِ حال کیا ہے۔

"پیچھے ہٹ جا اب کچھوکتے کی اولاد بیٹھ جا ادھر۔" میں نے بلند آواز سے کہا تاکہ ناتھو بھی سن لے۔ وہ سامنے ہی کھڑا تھا۔ دانت پیستے ہوئے بولا۔

"ان کو ذلیل نہ کر جیلانی ورنہ میں تیرا خون پی لوں گا۔"

"خون سے پہلے میں کچھ اور نہ پلا دوں تجھے ناتھو! تیرے دھرم میں تو جائز ہے وہ چیز، کیا خیال ہے؟"

اس نے مجھے یہ موٹی سی گالی دی جس کا جواب میں نے ترکی بہ ترکی دیا۔ وہ میرے شعر کا جواب نہ پا کر پیچھے ہٹنے لگا تو میں نے کہا۔ "سن ناتھو! میں ان کو پاکستان پہنچ کر رہا کر دوں گا اور یہ ہیلی کاپٹر میں واپس آ جائیں گے، یہ میں تجھے یقین دلاتا ہوں۔"

اتنے میں مجھے کسی ہیلی کاپٹر کی آواز بہت قریب آتی سنائی دی۔ ناتھو بولا۔ "تمھاری شرط مان لی گئی ہے بھنڈاری صاحب کو کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔"

"بالکل بے فکر رہو۔ ہیلی کاپٹر میں پائلٹ کے سوا اور کوئی آدمی موجود نہیں ہونا چاہیے۔"

"ایسا ہی ہو گا۔" ناتھو نے بڑے ہی مایوس لہجے میں کہا۔

"تم نے پھر یہ دھواں پیدا کرنے کی کوشش کی تو پہلی گولی میں بھنڈاری کی کمر پر مار دوں گا۔"

"تو بہت رذیل آدمی ہے شرافت تجھے چھو کر بھی نہیں گئی۔" ناتھو نے بھنا کر کہا۔

"سن اوئے کسی شریف خان بٹالوی کی اولاد! پولیس کا کوئی آدمی ہمیں نظر نہیں آنا چاہیے۔"

"ایسا ہی ہو گا۔" ناتھو ابھی تک سامنے کھڑا تھا اور دھیان اس کا ہیلی کاپٹر کی طرف لگا تھا۔

کوئی پانچ منٹ بعد ناتھو کو دور سے کسی نے اشارہ کیا اور وہ ادھر جانے لگا تو میں نے کہا۔ "یہ ہیلی کاپٹر کس کا ہے ناتھو جی؟"

"یہ سول ایوی ایشن والوں کا ہے۔"

"تو پھر جلدی کرو۔ ہیلی کاپٹر کو سامنے لان پر لے آؤ۔"

"وہ کھلی جگہ پر کھڑا ہے، تم باہر آ جاؤ۔" ناتھو نے اب کی بار لہجے کو پرسکون بناتے ہوئے کہا۔

خواب گاہ کا ایک دروازہ برآمدے میں کھلتا تھا۔ میں نے آبی سے کہا کہ وہ دونوں عورتوں کو لے کر باہر نکلے۔ آبی نے ان کو جانوروں کی طرح آگے ہانکا۔

"چلو آگے لگو۔ کوئی گڑبڑ کی تو گولی آر پار گزار دوں گا۔" یہ کہہ کر آبی نے ان کو پستول کی زد میں لے کر دروازے میں سے نکالا اور خود بھی تیزی سے ان کے ساتھ جا ٹھہرا۔ نال اس نے مسز بھنڈاری کی کمر سے لگا رکھی تھی اور پتنا کو اس نے اپنی ڈھال بنا لیا تھا۔

اس کے پیچھے میں بھی بھنڈاری کو پستول کی زد میں لے کر برآمدے میں نکلا۔ ناتھو وہاں سے ہٹ کر سامنے پورچ میں جا ٹھہرا تھا اس کا چہرہ اس گھڑی دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ اب ہمارے سامنے بھی پولیس تھی اور پیچھے بھی۔ مگر ان میں مجھے نہ البشر سنگھ نظر آیا نہ بلبیر۔

ہم نے ان تینوں کو بہت محتاط انداز سے برآمدے میں سے اتارا۔ ہیلی کاپٹر کوئی سو گز کے فاصلے پر کھڑا تھا۔

میرے ایک ہاتھ میں پستول تھا اور دوسرے ہاتھ میں وہ چھری، جو میں نے بھنڈاری کی میز پر سے اٹھائی تھی۔ ایک ایک لمحہ قیامت بن کر گزر رہا تھا۔ دائیں ہاتھ گھاس سے بھرے ہوئے قطعے میں بھی کوٹھی کی دیوار کے ساتھ اگے سرو کے درختوں کے ساتھ ساتھ پولیس کے مسلح سپاہی کھڑے تھے مگر وہ کچھ بھی نہیں کر سکے۔

...بھی چھین سکتے تھے۔ بھنڈاری ان کے لیے بہت اہم آدمی تھا۔ وہ ...ن کی زندگی کے لیے بڑی سے بڑی ندامت جھیلنے پر تیار تھے ورنہ ...اگر کھلے ہوتے تو وہ بڑے شہ زور جوان تھے ہمیں لمحوں میں ...پکڑ سکتے تھے۔

"تیز چلو بھنڈاری جی! تیز چلو۔" میں نے انہیں ڈانٹتے ہوئے کہا۔ اس نے اچھل کر دوڑنا چاہا تو میں سمجھا کھیل بگڑ گیا مگر فوراً ہی میں نے اس کا کرتا پکڑ کر اسے روکا اور پھر میں اس کے ساتھ بھڑ کر آگے بڑھنے لگا۔

ہم چند ہی منٹوں میں ہیلی کاپٹر کے پاس جا پہنچے۔ آبی سمیت ان چاروں کو اوپر چڑھا کر میں نے چاروں طرف نظر ڈالی اور پھر میں بھی ہیلی کاپٹر میں جا بیٹھا۔ اس کا انجن گھر گھر کرنے لگا تھا اور پنکھے ہوا کاٹ رہے تھے۔ چند ہی لمحوں بعد ہیلی کاپٹر اوپر اٹھنے لگا۔ انہوں نے اپنا وعدہ اور ہمارا مطالبہ پورا کر دیا تھا۔ ہیلی کاپٹر میں ایک پائلٹ کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ ان تینوں کے چہروں پر موت ایسی زردی کھنڈی تھی۔ آبی نے سکھ کا گہرا سانس لے کر سگریٹ سلگا لیا۔ بولا "بھنڈاری جی آنند سے بیٹھیں مہاراج! اب فکر کی کوئی بات نہیں ہے تو بھی خوش ہو جا مس انڈیا، ساری فکریں دور کر دے۔" آبی نے اپنے پستول کا رخ پائلٹ کی طرف پھیر لیا تھا۔

"بھنڈاری صاحب بہت اچھے آدمی ہیں پیرزادہ جی! کہتے تھے میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں۔" میں نے چٹکی لی۔

بھنڈاری کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا مگر وہ منہ سے کچھ نہیں بولا۔ ہیلی کاپٹر امرتسر شہر کے اوپر سے اڑتا ہوا جنوب کی طرف بڑھنے لگا۔ سمتوں کا نہ مجھے اندازہ تھا نہ آبی کو ہمیں کیا پتہ کہ ہوائی سفر کے دوران کوئی کس طرف جائے تو کیا ہوتا ہے۔ ہم سمجھتے تھے کہ ہیلی کاپٹر واہگہ کی طرف جا رہا ہے۔ طے ہم نے یہ کیا تھا کہ کسی ویران جگہ پر ہیلی کاپٹر کو نیچے اتار کر ہم کسی طرف نکل جائیں گے اور یہی بات سب سے اچھی تھی۔

اچانک آبی بولا۔ "اوئے بھائی پائلٹ صاحب! آپ نے تو پاکستانی حکام کو بھی باخبر کر دیا ہو گا۔"

"نہیں! انہیں کچھ علم نہیں ہے۔" پائلٹ نے کہا۔

"آپ کا شبھ نام کیا ہے؟"

"سریندر بھاٹیہ۔" اس نے مختصر سا جواب دیا۔

"کیا حکم ملا ہے آپ کو؟"

"یہی کہ میں آپ کو پاکستان کے علاقے میں کسی جگہ اتار کر بھنڈاری فیملی کو واپس لے آؤں، یہی طے پایا ہے نا آپ کے درمیان؟"

"ہاں! اب آپ ہمیں کہاں اتاریں گے؟"

"دیکھیں میں آپ کو ادھر حد پر کسی جگہ اتار دوں گا۔ ادھر آبادی نہیں ہے اور ایسا راستہ مجھے معلوم ہے جہاں رینجرز بھی زیادہ نہیں گھومتے۔ سیدھا پاکستان میں جا گھسا تو وہ آپ کو بھی پکڑ لیں گے اور مجھے بھی۔"

آبی بولا۔ "آپ کو بھی وہ ضرور پکڑیں گے اور پھر چھوڑ بھی دیں گے کیونکہ آپ مجبوراً آئے ہیں۔"

"اس سے بہتر ہے کہ میں اپنی حد کے اندر کسی پاکستانی گاؤں کے سامنے آپ کو اتار دوں۔" پائلٹ اچھا آدمی تھا اور اسے ہم سے کوئی ضد نہیں تھی مگر وہ اتنا سہما ہوا تھا کہ یوں لگتا تھا جیسے وہ ابھی رو دے گا۔

ہیلی کاپٹر کا سفر جاری تھا اور وہ ابھی تک بھارتی علاقے میں اڑ رہا تھا۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی بیس منٹ گزر چکے تھے۔

"کتنی دور اور جانا ہو گا ہمیں؟" آبی نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"ابھی کوئی آدھ گھنٹے کا سفر باقی ہے۔"

یارو! یہ جو آج میں آپ کے سامنے اپنے غموں کی پوٹ کھول کر بیٹھا ہوں اور آپ کو بھی میں اپنے ساتھ رلا رہا ہوں تو اس سارے اذیت ناک سلسلے میں کچھ میری نادانیوں ہی کو دخل نہیں ہے بلکہ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ جس طرح حسین عورت کو دیکھ کر ہر ایک کی رال ٹپکنے لگتی ہے، راہ چلتے بڈھے جھرڈوس بھی ٹھوکر کھا جاتے ہیں تو بالکل اسی طرح کسی بڑے مجرم کے چلتے سکے سے متاثر ہو کر غرض مند لوگ اسے اپنے جال میں پھانسنے کی کوشش میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ سرحد کے اس پار جا کر میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا۔ وہ لوگ یار کو یار کے ہاتھوں مروا دینے کے لیے مجھے بدترین مراحل سے گزار دینا چاہتے تھے۔ مجھے دیکھ کر میری کارگزاری کا احوال اپنے ذرائع سے معلوم کر کے انہوں نے مجھے ایک ایسی مہم پر بھیجنا چاہا تھا جس میں اگر میں ان کے اشاروں پر عمل کرتا ہوا آگے بڑھتا تو خدا جانے میرے وطن کی صورت کیا سے کیا ہو جاتی کہ ملک سرحدوں کے اندر سمٹے لوگوں کے اجتماعی شعور کے نمائندوں کی بے لوث خدمت ہی سے آگے بڑھتے ہیں۔ اور ان لوگوں نے ہمارے انتخابات کو سبوتاژ کرنے اور اپنے مطلب کی کٹھ پتلی حکومت کو میرے وطن پر مسلط کرنے کا جو منصوبہ بنا رکھا تھا، اگر وہ کامیاب ہو جاتا تو میں قیامت تک خود کو معاف نہ کر سکتا تھا۔ انتخابات کی اہمیت کو میں سمجھ چکا تھا۔ مجھ سے جا بجا میرے اپنے لوگ کئی غلط کام کروا چکے تھے مگر ادھر امرتسر میں بیٹھے ہمارے ان "محسنوں" کی نگاہیں بھی ادھر ہی لگی تھیں اور وہ اس سلسلے میں میرے کندھے پر بندوق رکھ کر مجھے بدترین قسم کی غداری پر آمادہ کر رہے تھے۔

بھاٹیہ کی نیت مجھے نیک معلوم نہیں ہوتی تھی۔

اس نے ہیلی کاپٹر کا کوئی واضح رخ ابھی تک متعین نہیں کیا تھا اس کے چہرے پر جمی سنجیدگی مجھے یہ احساس دلاتی تھی کہ وہ ہمیں کسی ایسی جگہ مارے گا جہاں ہمیں پانی بھی نہ مل سکے۔ وہ کسی بھی لمحے ہمیں کسی بہت ہی خوفناک صورت حال سے دوچار کر سکتا تھا۔ اگر وہ اپنے منصوبے میں کامیاب ہو جاتا تو ہم بے موت ہی مارے جاتے۔ کیونکہ ابھی تک ہم بھارتی سرحد ہی میں ٹامک ٹوئیے مار رہے تھے۔ اس کی نیت کے فتور کو سمجھتے ہوئے میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"آبی اسے کہو یہ ہمیں سیدھا لاہور لے چلے۔"

"یہ کیا کہتے ہو یار! مصیبت کو خواہ مخواہ نہ بڑھاؤ۔ وہ ہمیں فوراً گولی مار دیں گے۔" آبی نے مجھے سمجھایا۔

"ایسا نہیں ہوگا، تم ادھر ہی چلو بھاٹیہ! ہمیں چکر مت دو سیدھے لاہور لے چلو۔" میں نے ساری صورت حال پر غور کرتے ہوئے کہا۔

بھاٹیہ کا منہ بگڑنے لگا۔ وہ کوئی اپنا ہی منصوبہ بنائے بیٹھا تھا۔ اس نے ہیلی کاپٹر کا رخ لاہور کی طرف موڑ دیا اور پھر جب وہ اپنی سرحد سے آگے نکلا تو اس نے وائرلیس پر لاہور ایئرپورٹ سے رابطہ قائم کر لیا۔ کسی نے دوسری طرف سے اسے خبردار کیا تو وہ بولا

"میں انڈین سول ایوی ایشن کا پائلٹ سریندر بھاٹیہ ہوں۔ دو پاکستانی مجرم زبردستی ہمارے تین آدمیوں کو اغوا کر کے میرے ہیلی کاپٹر میں لاہور آ رہے ہیں۔ ایک مجرم کا نام......"

"بکواس بند کرو۔" میں نے چیخ کر کہا اور اٹھ کر اسکے ریسیور پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ ان لوگوں کو ہمارے نام بتا کر مصیبت میں پھنسانا چاہتا تھا۔ "ان سے کہو کہ وہ لاہور ایئرپورٹ پر اتریں گے اور اپنی مرضی کے آدمی سے بات کریں گے۔"

بھاٹیہ نے میری بات دہرا دی، بولا۔

"ہیلو! میری بات سن رہے ہیں، دہشت پسندوں کا مطالبہ ہے کہ وہ لاہور میں اپنی پسند کے آدمی سے بات کریں گے۔"

میں نے پھر ریسیور پر ہاتھ رکھ دیا۔

"ان سے کہو کہ ان کے پاس کچھ اہم معلومات ہیں جو وہ حکام تک پہنچانا چاہتے ہیں۔"

"کیا کرتے ہو جیلانی! اپنے پتے ابھی انہیں مت دکھاؤ ہیلی کاپٹر کو وہاں اترنے دو۔"

"بس ٹھیک ہے بھاٹیہ انہیں کچھ اور بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان سے کہدو کہ وہ ہمارے بارے میں کچھ جاننا چاہیں، تو امرتسر پولیس سے فون پر بات کریں۔"

بھاٹیہ نے میری بات دہرا دی۔

کچھ ہی دیر بعد اس نے اپنا ہیلی کاپٹر لاہور ایئرپورٹ کے ایک ویران کونے میں اتار دیا۔ ہم ہوائی اڈے کی بھیڑ سے بہت دور تھے۔ اور ہماری پولیس کے "شارپ شوٹر" ہمیں چاروں طرف سے گھیرے میں لے چکے تھے۔

پنا شاید بہت ہی عاجز آ چکی تھی، اس کے اعصاب جواب دے گئے تھے، وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"شٹ اپ! یہ رونا دھونا بند کرو۔ یہ تمہارے پتا جی کا گھر نہیں ہے۔ تمہیں ہم کوئی تکلیف نہیں دیں گے۔ ہمیں اپنا بھائی سمجھو۔" آبی نے غراتے ہوئے کہا۔ اس نے ابھی تک اپنا پستول بھاٹیہ پر تان رکھا تھا۔ پنا پر اس کے لفظوں کا اچھا اثر پڑا وہ جیب سے رومال نکال کر اپنی آنکھیں خشک کرنے لگی۔ بھائی کے لفظ نے اسے بڑی ڈھارس دی تھی، اس کی ماں نے اس کا سر گود میں لے لیا۔

میں نے سگریٹ سلگایا تو ایک سگریٹ بھنڈاری کے منہ میں ڈال دیا۔ وہ تو شاید یہی چاہتا تھا، خوش ہو گیا۔

میں نے اٹھ کر مائیک اپنے ہاتھ میں لے کر وائرلیس پر حکام سے بات کرنی چاہی۔ دوسری طرف سے ڈی آئی جی منہاس بول رہا تھا۔

"دیکھیں منہاس صاحب! میں تین آدمیوں کے سوا اور کسی سے بات نہیں کروں گا میرے پاس ایک بہت ہی اہم راز ہے۔ وہ یا تو گورنر صاحب کو بتا سکتا ہوں یا پھر ان تینوں میں سے کسی ایک کو۔ بہتر ہے کہ انہیں بلوا دیں۔"

جن آدمیوں کا میں نے نام لیا، ان میں ڈھلوں صاحب کا نام بھی شامل تھا اور بھنڈاری کی فہرست میں ان کا نام پانچواں تھا۔

"مگر تم ہو کون؟" منہاس کا لہجہ بڑا ہی حاکمانہ اور حقارت آمیز تھا۔

"مجھ سے تمیز سے بات کرو۔ میں تمہارے باپ کا غلام نہیں ہوں نہ مجھے تم تنخواہ دیتے ہو۔ جو میں کہتا ہوں اس پر عمل کرو اور بات کو پیچ مت دو۔"

اس کے ہونٹوں سے سیٹی سی نکل گئی۔ میری بات کا اس پر خاطر خواہ اثر ہوا تھا۔ فوراً ہی سنبھل کر بولا۔

"جناب عالی! فدوی آپ کے حکم کی تعمیل میں کوتاہی نہیں کرے گا۔" ان لفظوں کا طنز میں نظر انداز نہ کر سکا مگر پھر بھی میں نے بڑے محتاط لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے میں انتظار کر رہا ہوں، یاد رکھو میرے قبضے میں چار بھارتی ہیں اور وہ بہت اہم لوگ ہیں۔ تم نے میری بات نہ مانی تو یہ لوگ جان سے ہاتھ دھو لیں گے اور ادھر شہر میں کئی آدمی بے موت مارے جائیں گے۔"

"اچھا؟ معاملہ اتنا سنگین ہے۔ ٹھیک ہے، میں ابھی تم سے بات کروں گا کوئی آدھ گھنٹے بعد۔"

میں نے جیب سے بھنڈاری صاحب کی میز سے اٹھائے ہوئے بسکٹ سب لوگوں میں بانٹ دیے مگر بھاٹیہ نے انہیں قبول نہیں کیا۔

"یہ کہاں سے مل گئے تھے تمہیں؟" آبی نے پوچھا۔ وہ بھی ایک لمحے کے لیے بھاٹیہ کی طرف سے غافل نہیں تھا۔

"یہ بھنڈاری صاحب کا بھنڈارہ ہے ان کی میز پر سے میں نے اٹھا لیے تھے بیچاروں نے بڑی پرتکلف چائے منگوائی مگر میں نے انہیں مصیبت میں ڈال دیا۔"

بھنڈاری کچھ نہیں بولا۔ وہ کوئی بہت ہی گہرا اور گھنا آدمی تھا اپنے پتے وہ کسی طرح نہیں کھولتا تھا۔ ویسے وہ اب بڑی حد تک اپنے خوف کی طغیانی پر قابو پا چکا تھا۔ میں نے اسے دوسرا سگریٹ دیا، تو اسے بھی وہ بڑے پرشوق انداز سے پھونکنے لگا۔

وہ آدھ گھنٹہ گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ پولیس ہم سے صرف اتنی ہی دور تھی کہ وہ لوگ اگر چاہتے تو ہم پر براہ راست گولیاں برسا کر ہمیں موت کی نیند سلا سکتے تھے۔

منہاس نے ٹھیک آدھ گھنٹے بعد ہم سے رابطہ کیا، بولا۔

"آپ نے ابھی تک اپنا نام نہیں بتایا ہے مسٹر مگر ہم امرتسر پولیس سے معلوم کر چکے ہیں۔"

"بہت اچھا کیا آپ نے، اب کیا حکم ہے؟"

"حکم یہ ہے کہ تم دونوں خود کو پولیس کے حوالے کر دو۔ تمہاری وہ راز کی بات ہم نہیں سننا چاہتے۔ اس جھوٹ سے ہمیں کوئی سروکار نہیں ہے ہیلی کاپٹر کے پائلٹ سمیت چاروں آدمیوں کو ہم آج ہی باعزت طریقے سے بھارت واپس بھیجنا چاہتے ہیں۔ سن رہے ہو نا، یہ ہمارا فیصلہ ہے۔"

"تم جیسا گدھا آدمی میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ میں ان چاروں کو مار دوں گا اور پھر ہیلی کاپٹر کے دروازے بند کر کے ہم دونوں ایک دوسرے پر گولی چلا دیں گے مگر یہ لوگ تمہارے ہاتھ نہیں آئیں گے اگر تم سیدھی راہ پر نہیں آتے تو یونہی سہی، سن رہے ہو نا یہ ہمارا فیصلہ ہے۔" میں نے غراتے ہوئے کہا۔

منہاس سن ہو کر رہ گیا چند لمحوں کے توقف کے بعد بولا۔

"ہم تمہارا کوئی مطالبہ نہیں مان سکتے گورنر صاحب کا یہی حکم ہے۔"

"تمہارا دماغ کام نہیں کر رہا تو بہتر ہے تم مجھے کسی اور ذمے دار آدمی سے بات کر لینے دو۔"

منہاس کے ساتھ شاید کوئی اور آدمی بھی بیٹھا ہماری باتیں سن رہا تھا، اس نے منہاس کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "خواہ مخواہ معاملے کو خراب مت کرو۔ وہ بدحواس ہو کر کوئی غلط قدم اٹھا لیں گے۔" یہ کہہ کر اس نے وائرلیس بند کر دیا۔ چند منٹ بعد ان لوگوں نے پھر ہم سے رابطہ قائم کیا۔ اب کی بار کسی اور آدمی کی آواز مجھے سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "میں عظم بول رہا ہوں، گورنر کا اے ڈی سی۔ آپ سے بات کے لیے وہ تینوں آدمی ہوائی اڈے پر پہنچ چکے ہیں۔"

"ٹھیک ہے انہیں ہمارے پاس بھیج دیں۔" یہ کہہ کر میں نے فون کر دیا۔

چند ہی منٹ بعد ایک سفید رنگ کی کار ہیلی کاپٹر کی طرف بڑھتی نظر آئی۔ میں نے آبی کو اشارہ کیا کہ وہ ان چاروں کو اپنی تحویل میں لے لے۔ اس نے بھاٹیہ کو بھی بھنڈاری کے پاس بٹھایا اور ان سب کو پستول کی زد میں لے کر ذرا فاصلے پر بیٹھ گیا۔

کار کوئی سو قدم دور رکی اور اس کے تین دروازے کھل گئے اب میرے سامنے وہ آدمی تھے جن کا نام فہرست میں لکھا تھا۔ وہ تینوں بہت ہی مشہور اور معزز لوگ تھے۔ ڈھلوں صاحب ان کے درمیان میں چل رہے تھے۔

میں ہیلی کاپٹر سے نیچے اتر آیا اور آگے بڑھ کر ان سے بڑے تپاک سے ملا۔ ڈھلوں صاحب کی حیرت دیدنی تھی۔ وہ ظاہر یہ کر رہے تھے جیسے وہ مجھے نہیں جانتے ہیں، بولے۔

"تمہارا کیا نام ہے برخوردار! یہ کیسا ڈرامہ کھیل رہے ہو تم؟"

"جناب اگر آپ الگ ہو کر میری بات سن لیں تو یہ آپ کی مہربانی ہوگی۔"

"کیوں نہیں! ہم آخر آئے کس لیے ہیں۔" یہ کہہ کر ڈھلوں صاحب ان لوگوں سے الگ ہو کر میرے ساتھ چل دیے۔ کوئی بیس گز دور لے جا کر میں نے انہیں الف سے ی تک ساری کہانی سنائی تو وہ ٹک ٹک میرا منہ تکنے لگے، بولے۔

"ہاشم خان! ایک لحاظ سے آپ کا وہاں جانا اچھا ہی ثابت ہوا مگر آپ جس مصیبت میں پھنس گئے ہیں اس کا تمہیں اندازہ نہیں ہے۔"

"آپ کا مطلب ہے وہ مجھے گرفتار کر لیں گے؟"

"ہاں! بہت برے چکر میں آ گئے ہو تم۔"

"مگر آپ لوگوں کی جان بھی تو سخت خطرے میں ہے۔"

"نہیں۔ میرا خیال ہے کہ اب بھارت کی وہ جماعت اپنا یہ منصوبہ ترک کر دے گی ان کا راز جو فاش ہو گیا ہے اس وجہ سے۔ وہ اب یہ چکر خود ہی ختم کر دیں گے۔ میرا ذہن تو یہی کہتا ہے ویسے ہم اپنی جگہ بہت محتاط ہو جائیں گے۔"

"مگر وہ بھارتی مجھے تو کبھی معاف نہیں کریں گے۔"

"وہ تو آتے ہی آئیں گے آپ کے پیچھے۔ اصل مصیبت تو اپنوں کی ہے۔ آپ کا نام سن کر پولیس کے لوگ دانت پیس رہے ہیں — وہ آپ کو فوراً دبوچ لیں گے۔"

بہر میں کیا کروں، میں تو اس مصیبت میں نہیں پڑنا چاہتا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر۔۔۔ ہاشم خان آپ نے مجھے بھی اور میری دوستی کو بھی آزمائش میں ڈال دیا ہے میں آپ کو کیسے بتاؤں، یہ بڑا ٹیڑھا سوال ہے۔"

"کوئی تدبیر سوچیں ڈھلوں صاحب! ہم نے بڑی مصیبتیں اٹھائی ہیں۔" میں نے گلوگیر آواز میں کہا۔ میں واقعی پریشان ہو گیا تھا۔ مجھے کوئی راستہ سجھائی نہیں دیتا تھا۔

"میں سمجھ رہا ہوں۔ یہاں ایک بڑا پھنّے خان تھانیدار آیا ہوا ہے کلیم خان۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو وہی گرفتار کرے گا۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"فرق تو کوئی نہیں پڑتا مگر میں یہ کہہ رہا ہوں کہ جب وہ آپ دونوں کو ہتھکڑی لگا کر کار میں بٹھائے تو میں اپنے آدمیوں سے کہہ دونگا کہ وہ راستے میں کار پر حملہ کر دیں مگر اس طرح خون خرابے کا اندیشہ ہے کئی بے گناہ جانیں ضائع ہوں گی۔"

"کوئی اور طریقہ سوچیں ڈھلوں صاحب ہم پولیس کے ہتھے چڑھ گئے تو کبھی زندہ واپس نہ آ سکیں گے۔"

"دیکھیں ہاشم خان! جو راز آپ معلوم کر کے آئے ہیں۔ اس کی تصدیق یہ بھنڈاری کرے گا۔ یہ خود بولے گا کہ ہاں یہ سچ ہے ورنہ "چھتر" کھائے گا، ٹھیک ہے نا! آج رات میں بڑے صاحب کے ساتھ بات کروں گا۔ وہ آپ کی اس خدمت کے صلے میں کسی سے کہہ کر خفیہ طور پر آپ کو پولیس کی حراست سے نکل جانے کا موقع فراہم کر دیں گے۔"

"ہاں! اگر ایسا ہو جائے تو پھر ہمارا کام آسان ہو جائے گا۔"

"ہاں! آپ ادھر ہی بیٹھیں۔ اگر بھنڈاری سے پولیس نے یہاں ہی سب کچھ اگلوا لیا تو میں کوشش کروں گا کہ کلیم خان آپ کو ہتھکڑی نہ لگائے، آپ سے باعزت طریقے سے پیش آئے۔ ایک ترکیب یہ بھی ہو سکتی ہے۔"

"اس سے کیا ہو گا، میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"ہو گا یہ کہ ان کی حراست سے نکل جانے کے لیے آپ کے ہاتھ آزاد ہوں گے۔" ڈھلوں صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا، پھر وہ سرگوشی کے انداز میں بولے۔ "وہ فہرست کہاں ہے جس میں ان کے معتوب لوگوں کے نام لکھے ہیں؟"

"ہاں یہ رہی فہرست۔ اس میں آپ کا نام بھی شامل ہے۔"

ڈھلوں صاحب اس فہرست کو دیکھ کر چند لمحوں تک دم بخود کھڑے رہے ان کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ اندر سے لرز گئے ہیں کسی بڑی حکومت کی طرف سے چند افراد کو ختم کر دینے کے ارادے کا علم ہو جانے کے بعد کوئی بھی شخص ذہنی توازن کھو سکتا ہے اور یہاں تو مقابلہ ایک ایسی حکومت کا تھا جس سے ہماری ہمسائیگی ان دو آدمیوں جیسی ہے جو پائنتی سرہانے ہو کر ایک ہی پلنگ پر سو رہے ہوں اور نیند میں وحشت کبھی ایک آدمی دوسرے کے سینے میں لات دے مارتا ہے تو کبھی دوسرا اس کی ناک پر ایڑی دے مارتا ہے۔ ڈھلوں کے چہرے پر عجیب سی سوچ طاری تھی۔ وہ کسی فیصلے پر نہیں پہنچ رہے تھے۔ وہ میری مدد تو کرنا چاہتے تھے مگر راستہ انہیں سجھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ کبھی بڑے صاحب کا نام لیتے تھے اور کبھی کلیم خان کا کبھی وہ مجھے فرار ہو جانے کا مشورہ دیتے تھے اور کبھی بڑے صاحب کے ذریعے میری رہائی کی تدبیر بتاتے تھے۔ مجھے اپنی طرف یوں خالی خالی نظروں سے دیکھتے دیکھ کر اچانک ان کے ذہن میں کوئی خیال ابھرا اور وہ رازدارانہ لہجے میں بولے۔ "یوں کریں ہاشم خان! ہیلی کاپٹر لے کر نکل جائیں اور کسی ویران جگہ اتر کر روپوش ہو جائیں۔ میں بڑے صاحب سے بات کرتا ہوں کہ آپ کا تعاقب نہ کیا جائے مگر یہاں سے رات کو نکلیں اور ادھر دہشتناک دھمکیاں دیتے رہیں، جائیں اب۔"

"میں آدھ گھنٹے بعد پھر آپ سے رابطہ قائم کروں گا لیکن بہت سوچ سمجھ کر چلنا ہو گا جائیں۔"

"ٹھیک ہے، ڈھلوں صاحب آپ انہیں ہمارا اصل نام ہرگز نہ بتائیں۔ ہم ان کے ہاتھ نہیں آئیں گے۔"

میری یہ بات سن کر وہ دوسرے لوگوں کی طرف بڑھ گئے اور میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہیلی کاپٹر میں جا بیٹھا۔ میں نے دروازہ بند کیا تو آبی نے مجھے اپنے پاس بیٹھنے کے لیے کہا پھر بولا۔

"یار مجھے یاد ہی نہیں رہا۔ یہ رقعہ مجھے تمہارے لیے بلبیر سنگھ نے دیا تھا۔"

اس نے تمام یرغمالیوں کو ایک ہی جگہ بٹھا کر انہیں پستول کی زد میں لے رکھا تھا اور اس کی آنکھوں سے ہلاکو خان جیسی سفاکی جھلک رہی تھی۔

میں نے رقعہ اس کے ہاتھ سے لیا تو میرا دماغ سن ہونے لگا اس بلبیر سنگھ نے اس کسی مسلمان کے مُوتر آغا نے میرے پاؤں تلے سے زمین ہی کھسکا دی تھی۔ اس نے لکھا تھا:

"مسٹر ہاشم خان! آپ نے بھنڈاری صاحب پر ہاتھ ڈال کر اچھا نہیں کیا۔ ایک سنہری مستقبل سے خود کو محروم کر لیا ہے۔ اب آپ آسیہ کی امید نہ رکھیں آپ کے اس تک پہنچنے سے پہلے ہمارے آدمی اُسے امرتسر لا چکے ہوں گے۔ آپ نے ہمارے ساتھ بڑا غلط حساب کھول لیا ہے جو آپ کی اور آپ کی بہن آسیہ کی مکمل تباہی پر ہی "کلوز" ہو گا۔ بہتر ہو گا کہ آپ شری بھنڈاری سے فوراً دستبردار ہو جائیں اور خود کو پولیس کے حوالے کر دیں

آپ کا متر۔۔ بلبیر سنگھ"

یہ اسی بلال آغا کا رقعہ تھا جسے میں دیکھتے ہی پہچان گیا تھا۔ نولکھا تھانے کے ایک اہلکار کی امرتسر پولیس میں موجودگی ابھی تک میرے لیے معمّہ بنی ہوئی تھی۔

"یار! یہ رقعہ تم نے مجھے وہیں دکھا دیا ہوتا۔ اسے پڑھا بھی ہے تم نے؟"

"نہیں! مجھے افراتفری میں کچھ یاد ہی نہیں رہا۔ ان پر نظر رکھو، میں اسے پڑھتا ہوں۔"

یہ کہہ کر آبی نے وہ رقعہ مجھ سے لے لیا۔ اس کے الفاظ آبی کی آنکھوں میں شاید چبھنے لگے تھے، بڑے غضبناک لہجے میں بولا

"اوئے بھنڈاری! یہ رقعہ دیکھ رہا ہے تو! اس بلبیر نے کیا بکواس کی ہے، پڑھ اسے۔" آبی نے وہ رقعہ بھنڈاری کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اسے جلدی جلدی پڑھ کر بھنڈاری نے زہرخند کیا۔ بڑے تمسخر بھرے لہجے میں بولا۔

"یہ تو ہو گا ہی میاں جی! اتنا بے سینگ بیل بھی نہ سمجھو ہمیں۔ آگے پتہ نہیں کیا کچھ ہو گا۔"

"بڑا خوش ہو رہا ہے نا تو! مگر اپنی اس چھوکری کو دیکھ رہا ہے؟ بہت مہنگا پڑے گا یہ سودا لالہ جی ہاں!"

بھنڈاری نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور ہم دونوں اپنی اپنی جگہ ان لوگوں پر پستول تان کر بیٹھ گئے۔ کتنی ہی دیر گزر گئی مگر ہوائی اڈے پر موجود حکام نے دوبارہ ہم سے کوئی رابطہ قائم نہیں کیا یہاں تک کہ رات کے نو بج گئے۔ ہر بار بھاٹیہ کو یہی جواب ملا کہ وہ غور کر رہے ہیں۔ پھر مجھے ڈھلوں صاحب کی آواز سنائی دی۔ انہوں نے ایک سفاک اجنبی کی طرح مجھے بڑے جمے ہوئے لہجے میں بتایا کہ گورنر صاحب شہر میں موجود نہیں ہیں وہ صبح واپس آئیں گے تو پھر ہی کوئی فیصلہ ہو سکتا ہے۔

"ٹھیک ہے ہم یہاں سے نکل رہے ہیں کسی نے ہمارا پیچھا کیا تو ہم ان چاروں کو ختم کر دیں گے۔" یہ کہہ کر میں نے وائرلیس بند کر دیا۔

"بھاٹیہ جی! اس چرخے کو اٹھاؤ یہاں سے۔ ہم ادھر لاہور سے کوچ کرتے ہیں۔" میں نے پائلٹ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"اٹھو اور سنبھالو اس مشین کو۔ ہمیں اب یہاں نہیں اترنا ہے اٹھو!"

میں نے بھاٹیہ کو دہشت زدہ کرتے ہوئے کہا وہ مسمسی سی صورت بنا کر بھنڈاری کے قریب سے اٹھا اور پائلٹ کی نشست پر جا بیٹھا۔

"ان لوگوں کو بتا دو کہ ہم واپس امرتسر جا رہے ہیں یہ ہمارا حکم ہے۔"

"کیا کرتے ہو یار، خواہ مخواہ مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔" آبی نے دبی زبان میں کہا اور مجھے اپنی جگہ سے اٹھا کر دروازے کے قریب لے گیا بولا۔

"وہ بلبیر جھوٹ بول رہا ہے اُسے کیا پتہ آسیہ کہاں ہے؟"

"مجھے یقین ہے کہ اس کے ہاتھ بہت لمبے ہیں آبی! میری تقدیر مجھے بہت غلط راستے پر ڈال گئی ہے۔"

"اگر ہم یہاں سے جان چھڑا سکیں تو آج ہی ہم اس کبیر شاہ کو پکڑ سکتے ہیں۔" آبی نے اپنے یرغمالیوں پر کڑی نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

"یہاں سے بچ نکلنا بھی ممکن نہیں ہے۔ وہ ڈھلوں صاحب کچھ بھی نہ کر سکیں گے۔ وہ کس کس کا ہاتھ روکیں گے؟ ان کا اپنا سانس پھول گیا ہے۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"تو ٹھیک ہے پھر جو تمہاری سمجھ میں آیا ہے کرو۔ اوئے بھاٹیہ ان کو بتا دو کہ ہم جا رہے ہیں کسی نے ہمارا راستہ روکا تو ہم ان سب کو یہیں ختم کر دیں گے۔" یہ کہہ کر آبی نے آگے بڑھ کر بھاٹیہ کی گردن پر پستول کی نال رکھ دی۔ بھاٹیہ نے ایک بار پھر ہوائی اڈے سے رابطہ قائم کیا اور بولا۔

"مجھے وہ حکم دے رہے ہیں کہ میں یہاں سے نکل چلوں۔"

ادھر سے پتہ نہیں چند لمحوں کے توقف کے بعد بھاٹیہ سے کیا کہا گیا۔ وہ ہماری طرف دیکھ کر بولا۔

"وہ ہمیں یہاں سے اڑنے نہیں دیں گے یہ معاملہ فوجی نوعیت اختیار کر گیا ہے۔"

"تم اسے اٹھاؤ یہاں سے، دیکھتا ہوں وہ کیا کرتے ہیں۔ اُن سے کہو وہ کوئی گڑبڑ کی گئی تو بھارت کا یہ لیڈر ہوا میں پرزے پرزے ہو جائے گا۔"

بھاٹیہ نے انہیں میرا پیغام دے کر ہیلی کاپٹر کے انجن چلا دیے۔ ہمارے چاروں طرف پولیس کی گاڑیاں کھڑی تھیں اور مجھے یقین تھا کہ وہ لوگ کسی نہ کسی مرحلے پر ضرور مداخلت کریں گے پنا کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ یہی حال بھنڈاری اور اس کی بیوی کا تھا۔ ان کی حالت پر مجھے بہت ترس آ رہا تھا۔ دل سے میں نہیں چاہتا تھا کہ انہیں میرے ہاتھوں کوئی تکلیف پہنچے۔ مگر میں اپنی اس کیفیت کا اظہار ان سے نہیں کر سکتا تھا۔ بھنڈاری کی بیوی منہ ہی منہ میں کوئی دعا مانگ رہی تھی۔ وہ تھر تھر کر لرز رہی تھی اور بار بار پنا کو اپنی گود میں گرا کر اسے تسلیاں دیتی تھی جو سراسر جھوٹی تسلیاں تھیں کیونکہ ہماری آنکھوں سے جھانکتی ہوئی سفاکی اسے وحشت زدہ کیے دیتی تھی۔

چند ہی لمحوں بعد ہیلی کاپٹر زمین سے اٹھ گیا۔ بھاٹیہ نے ہیڈ فون ایک طرف ہٹاتے ہوئے کہا۔

"تمہیں میرا مشورہ یہ ہے کہ کسی غیر آباد جگہ پر اتر جاؤ۔ ایسی جگہ جہاں پولیس تم تک نہ پہنچ سکے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" آبی نے پوچھا
"میں تمہیں کسی ویران جگہ پر اتار دیتا ہوں۔ کسی جنگل میں سرحد کے اس طرف پاکستان میں۔ پھر تم جدھر چاہو نکل جاؤ اور ہمیں امرتسر جانے دو۔"
"مگر وہ لوگ ہمارا پیچھا کر رہے ہوں گے۔"
"نہیں! ان کو چکر دیا جا سکتا ہے میری مانو تو ادھر چولستان میں اُتر جاؤ۔"
"تو پھر کیا وہ تمہیں حد پار کرنے دیں گے؟"
"میں کہہ دوں گا کہ میں تمہارے حکم کا پابند ہوں۔"
"کیا خیال ہے خان؟"
"ٹھیک ہے تم ہمیں ادھر ساہیوال کے اِدھر اُدھر کہیں اتار دو۔"
"چھانگا مانگا ٹھیک رہے گا۔ جنگل میں تم روپوش ہو سکتے ہو۔"
"نہیں اُدھر ہم نہیں اُتر سکتے۔ وہاں فوج موجود رہتی ہے۔" آبی نے کہا۔

اس وقت تک ہم ہوائی اڈے سے نکل کر جنوب کی طرف بڑھ چکے تھے۔ بھاٹیہ اچانک پریشان ہو کر بولا۔
"ان لوگوں نے شاید ہمارے پیچھے ہیلی کاپٹر لگا دیے ہیں۔ میں ان کی آواز سن رہا ہوں۔"
"انہیں کہو وہ واپس چلے جائیں ورنہ اُن پر ہم گولی چلا دیں گے۔" آبی نے یونہی جوش میں کہہ دیا۔ بھاٹیہ ہنسا۔
"کوئی مشین گن ہے تمہارے پاس! یہ پستول تمہارے کام نہیں آ سکتے۔"
"تم یہ بلی چوہے کا کھیل ختم کرو، اور ہمیں چھانگا مانگا کے جنگل ہی میں اتار دو۔" آبی سٹپٹا گیا۔
"اب مشکل ہے وہ لوگ ہمارے تعاقب میں ہیں۔"
"پھر کیا کرو گے تم؟"
"میں حد پار کر سکتا ہوں وہ مجھے روک نہیں سکتے۔ مگر خیر میں تمہیں کسی محفوظ جگہ پر۔۔۔ اتار دوں گا۔ ان سب کو تو واپس جانے دو گے۔"
"ہاں! ہمیں ان سے کیا لینا ہے۔ بھنڈاری صاحب ہم معافی چاہتے ہیں۔ آپ کو ہم نے بہت تکلیف دی ہے۔" آبی نے پہلی بار بڑی رسان سے اُن لوگوں کو مخاطب کیا۔ بھنڈاری نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ پیاس نے اسے بھی نڈھال کر دیا تھا اور ہمیں بھی مگر پانی کی ہمارے پاس ایک بُوند بھی نہیں تھی۔

بھاٹیہ نے چھانگا مانگا کا جنگل پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ چٹکی ہوئی چاندنی میں نیچے کا سارا ماحول بہت ہی پُراسرار اور خواب ایسا نظر آتا تھا۔
"یہاں اترو گے تو مارے جاؤ گے اور ہمیں بھی لے ڈوبو گے۔ میں تمہیں اُدھر چولستان میں اتار دوں گا۔ چھانگا مانگا محفوظ جگہ نہیں ہے۔" بھاٹیہ نے کہا۔ اُسے بھی احساس ہو چکا تھا کہ اس علاقے میں پاک فوج موجود ہو گی۔

اتنے میں دو ہیلی کاپٹر ہمارے دائیں بائیں ذرا بلندی پر اُڑتے ہوئے آگے نکل گئے۔ بھاٹیہ بہت سراسیمہ ہو رہا تھا۔ وہ اپنے ہیلی کاپٹر کو ایک دم نیچے لے گیا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم چھانگا مانگا سے بہت آگے نکل چکے تھے۔ وہ جنگل یہاں سے وہاں تک یوں پھیلا تھا کہ اسکے اندر ایک پوری فوج سما سکتی تھی مگر اس میں میرے اور آبی کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ کیونکہ جا بجا ہمیں وہاں فوجی گاڑیاں اور ساز و سامان اِدھر اُدھر پڑا نظر آ رہا تھا۔ بھاٹیہ جنگل سے ہٹ کر آگے نکلا اور پھر اُس نے پرندے کی پرواز پر چل کر ہیلی کاپٹر کا رُخ ہارون آباد کی طرف موڑ دیا۔ وہ مجھے یہی بتا رہا تھا۔ اس نے ہیلی کاپٹر کی تمام بتیاں بجھا دی تھیں۔

ہمارے تعاقب میں جو ہیلی کاپٹر آ رہے تھے وہ ہماری نظروں سے اب اوجھل ہو چکے تھے۔ اچانک کسی نے بھاٹیہ سے فون پر رابطہ قائم کیا۔ ملتان سے کوئی اس سے مخاطب تھا۔ بھاٹیہ نے کہا کہ وہ دہشت پسندوں کے حکم سے مجبور ہو کر بھارتی سرحد کی طرف بڑھ رہا ہے اگر کسی نے ہیلی کاپٹر کو روکنے کی کوشش کی تو بھنڈاری خاندان موت کے گھاٹ اتر جائے گا۔ بھنڈاری اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ بھر کر بیٹھا تھا اور اب وہ قدرے مطمئن نظر آتے تھے۔

بھاٹیہ کافی دیر تک ایک ہی سمت میں آگے بڑھتا رہا اور پھر اس نے اچانک لق و دق صحرا پر سے پرواز کرتے ہوئے ہیلی کاپٹر کو ایک ویران جگہ پر اتار دیا۔ یہاں سے وہاں تک چاروں طرف ریت ہی ریت پھیلی نظر آتی تھی۔ آبی پریشان سا ہو کر اُس صورتِ حال کا جائزہ لے رہا تھا۔ بولا۔
"بھاٹیہ تیرا کیا خیال ہے ہم یہاں اتر جائیں گے، اپنے اس ماے کو کسی آبادی کے قریب لے چل۔ یہاں تو نہ پانی ملے گا، نہ سایہ۔"
"دیکھیں یہاں سے بھارتی حد پندرہ میل دُور ہے۔ آپ یہاں اُتر کر کسی بھی طرف نکل سکتے ہیں۔ پولیس اس جگہ تک آپ کا پیچھا نہیں کرے گی۔ ہمارے تعاقب میں آنے والے ہیلی کاپٹر پیچھے رہ گئے ہیں آپ صبح تک کسی محفوظ مقام پر آسانی سے پہنچ سکتے ہیں۔" بھاٹیہ نے کہا۔ ہیلی کاپٹر کا انجن اُس نے بند کر دیا تھا۔
"ٹھیک ہے! میری بات غور سے سنو۔ اس بلبیر سے کہہ دینا کہ اگر اُس نے آیسہ پر ہاتھ ڈالا تو ہم واپس امرتسر آ کر اس کی ماں بہن کو اٹھا لائیں گے یہ اس کو بتا دینا۔"

یہ کہہ کر میں نے آبی کو اپنے ساتھ لیا اور ہم دونوں اُسی وقت ہیلی کاپٹر سے باہر نکل گئے۔ کچھ ہی دیر بعد بھاٹیہ اپنا وہ آسمانی چرخہ اڑا کر آگے نکل گیا۔

ریت ٹھنڈی تھی اور تھکے ہارے بدنصیبوں کو پاؤں پسار کر سو رہنے کا اِذن دیتی تھی۔ سناٹا ایسا تھا کہ اسے لفظوں میں بیان کیا ہی نہیں جا سکتا۔ بھاٹیہ کو وہاں سے اٹھے ابھی پانچ منٹ ہی گزرے تھے کہ ہمیں فضا میں دو ہیلی کاپٹر پرواز کرتے نظر آئے اُن کی رفتار بہت تیز تھی۔ اُن میں سے ایک تو ہمارے اوپر سے گزر کر آگے نکل گیا اور دُوسرا کوئی پانچ سو گز دور جا کر نیچے اُترنے لگا۔
آبی کے منہ سے یہ موٹی سی گالی نکل گئی، بولا۔
"یار! یہ تو ہمارے لیے ہی یہاں اُتر گئے ہیں۔"
"نظر تو یہی آتا ہے کسی طرف جلدی نکل چلو۔" میں نے صحرا کی اس بیکراں وسعت پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔

ہیلی کاپٹر میں سے چھ آدمی نکلے۔ ان کو دیکھتے ہی میں اور آبی تیزی سے ریت میں دھنسنے لگے۔ اس کے سوا کوئی چارہ کار ہی نہیں تھا۔ وہ ہماری ہی تلاش میں وہاں اُتر رہے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ بھاٹیہ نے وہاں جو پاؤں لگایا تھا تو اس کی وجہ یہی ہو گی وہ ہمیں اس ویرانے میں اتارنے کے لئے ہی آگے نکلا ہو گا۔ آبی زیادہ تیز نکلا۔ اس نے خود کو کچھ اس طرح ریت میں دبا لیا کہ اب اس کی صرف ناک ہی باہر نظر آ رہی تھی۔ میں نے بھی جوں توں کر کے خود کو اُس پردے میں چھپا لیا جو ذرہ ذرہ ہو کر صحرا بن چکا تھا۔ روشنی کا تیز دھار نیزہ اب چاروں طرف گھوم رہا تھا۔ وہ لوگ پھیل کر ہمیں ڈھونڈ رہے تھے۔ آبی کے مشورے ہمیشہ ہی میرے لیے مفید رہے ہیں۔ اس نے جلدی جلدی گڑھا کھود کر خود کو اس میں گرا لیا تھا۔ میں نے بھی اُس کے نقشِ قدم پر چل کر ریت اپنے اوپر اس طرح ڈالی کہ ہم صحرا کا حصّہ بن گئے تھے سانس لینے کے لیے اک مجھے اپنی ناک ہی ننگی رکھنی تھی اور وہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔

ہیلی کاپٹر میں سے لاہور پولیس کے اہلکار اُترے تھے۔ وہ وہیں سے ہمارا پیچھا کرتے چلے آ رہے تھے۔ اب وہ چاروں طرف پھیلنے کے لیے آہستہ آہستہ ہمارے قریب ہو گئے تھے۔ ایک آواز میرے کانوں میں پڑی۔
"اگر کوئی یہاں اُترا ہے تو اُسے ادھر ہی ہونا چاہیے۔"
"جناب ہو سکتا ہے وہ ریت میں دب گئے ہوں۔"
"نہیں! دو منٹ کے اندر وہ ریت میں کیسے گھس سکتے ہیں، ان کو ڈھونڈو، یہ ٹارچ مجھے دے دو۔" وہی بھاری بھرکم آواز پھر مجھے سُنائی دی۔ وہ مجھ سے زیادہ دُور نہیں تھے۔ آبی نے اپنی قبر مجھ سے کوئی دس ہاتھ پرے بنائی تھی۔ میں نے ان آدمیوں کو اس قدر اپنے قریب دیکھا تو اپنا سر میں نے ریت میں اور زیادہ گہرا دبا کر ناک بند کر لی۔ اب میں پُورے کا پورا ریت میں دبا پڑا تھا۔ وہ دونوں آدمی مجھ سے کوئی پانچ قدم دُور تھے۔ پھر اُن کی آوازیں معدوم ہو گئیں۔ میں نے اپنی ناک پھر ریت سے اونچی کر کے چند گہرے گہرے سانس لیے۔

اچانک کسی طرف سے ایک بھیڑیے کی ہولناک چیخ فضا میں ابھری اور اس کے ساتھ ایک غول کا غول چیختا چنگھاڑتا سنائی دیا۔ وہ آوازیں آہستہ آہستہ میری سمت چلی آ رہی تھی۔ وہ ایک دو نہیں تھے۔ اُن کی تعداد بہت زیادہ تھی۔
"اوئے! یہ تو بھیڑیے ہیں سب ہیلی کاپٹر کی طرف دوڑو۔" ایک آدمی نے بلند آواز سے اپنے ساتھیوں کو خبردار کیا اور پھر تڑاتڑ گولیاں چلنے لگیں۔ اُن لوگوں نے بھیڑیوں کے غول پر گولی چلا دی تھی۔ کئی بھیڑیوں کی دلدوز چیخیں فضا میں بکھر گئیں۔۔۔ انہوں نے چند بھیڑیوں کو گرا تو لیا تھا مگر وہ شاید درجنوں کی تعداد میں تھے۔ ان کی ہولناک غراہٹ چاروں طرف گونج رہی تھی۔ پھر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ غضبناک ہو کر اُن لوگوں پر پل پڑے تھے۔ گولیوں کی آواز پھر فضا میں اُبھری، چند اور دلدوز چیخیں مجھے سنائی دیں اور پھر یوں لگا جیسے بہت سے درندے میرے اوپر سے گزر گئے ہیں۔ وہ جوشِ انتقام میں اندھے ہو کر ان پولیس کے سپاہیوں پر پل پڑے تھے میرے اُوپر سے کئی اور بھیڑیے گزر گئے۔

اور میرے بدن پر پڑا ریت کا پردہ اُدھڑنے لگا کوئی دس سیکنڈ تک تو میں یہی سمجھا کہ کوئی بھیڑیا اپنے پنجوں کے نیچے میرا جسم محسوس کر کے مجھے ادھیڑ ڈالے گا مگر نہیں وہ گزرتے چلے گئے۔ میں شاید اُن کی راہ میں لیٹا تھا۔ دُوسری طرف سے گولیاں مسلسل چلائی جا رہی تھیں۔ پھر مجھے کسی آدمی کی بھیانک چیخ سنائی دی۔ بھیڑیوں نے کسی سپاہی کو اُدھیڑ ڈالا تھا۔ میں نے سر اوپر اُٹھا کر دیکھا، تو میرے اوسان خطا ہونے لگے۔ وہ بھیڑیے میرے اوپر سے گزر کر آگے نکل چکے تھے اور اب وہ ہیلی کاپٹر کے اردگرد پھیلے سپاہیوں پر درجنوں کی تعداد میں یکجا ہو کر حملہ آور ہو رہے تھے۔ چاندنی سے بھرے صحرا میں مَیں نے دیکھا کہ وہ بہت سے بھیڑیے کسی انسانی جسم کو نرغے میں لے کر جھنجھوڑ رہے تھے۔ گولیاں مسلسل چل رہی تھیں۔ وہ مر بھی رہے تھے مگر ان کی اس وحشیانہ یورش میں کوئی کمی نہیں آ رہی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد ہیلی کاپٹر کا انجن چلنے کی آواز میں اُبھری وہ ایسی ہیبت آواز تھی کہ سارا صحرا دم بخود رہ گیا۔ بھیڑیوں کا وہ غول وہ کسی کے گرد جمع تھا۔ پھیل کر تیزی سے ہیلی کاپٹر کی طرف لپکا۔ وہاں سے پھر گولیوں کی بوچھار اُن پر پڑی۔ میں نے پانچ چھ بھیڑیوں کو اچھل اچھل کر زمین پر گرتے دیکھا اور پھر فوراً ہی ہیلی کاپٹر اُوپر اٹھ گیا۔ بھیڑیے ایک لمحے کے لیے ٹھٹک کر اپنی تھوتھنیاں اُوپر اٹھا کر دیکھنے لگے اور پھر پلٹ کر اس بدنصیب پر جھپٹے جسے وہ لوگ اپنے پیچھے چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ اب شاید اس کشتۂ ستم کے جسم میں کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا۔ وہ بھوکے بھیڑیے اب اپنے ساتھیوں کی لاشوں پر پل پڑے۔ میں ان کی گنتی سے قاصر تھا۔ وہ تمام اطراف سے لپکتے چلے آ رہے تھے۔ ان کی تعداد میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔

اچانک مجھے دائیں ہاتھ سے گیدڑوں کی بھیانک آوازیں سُنائی دینے لگیں۔ اُن کا رُخ بھی اسی طرف تھا جہاں وہ بھیڑیے یکجا ہو رہے تھے اور اپنے ساتھیوں کی لاشوں کو پھاڑ رہے تھے۔ اُن کی اس نئی یلغار کو اپنے اس قدر قریب محسوس کر کے میں نے اپنا سر ایک بار پھر ریت میں دبا لیا تھا۔ مجھے اپنی جان بچانی مشکل نظر آ رہی تھی۔ آبی مجھے کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ چوہے کی اولاد پوری طرح خود کو ریت میں دفن کیے لیٹا تھا۔ چند ہی لمحوں بعد ایک بار پھر میں اپنی زندگی کی بدترین آزمائش میں سے گزر گیا۔ درجنوں گیدڑ میرے اوپر سے گزر گئے۔ میری رگوں میں خون منجمد ہوا جاتا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ اُن کا ریلا جلدی ہی گزر گیا۔ وہ سب بھی اس دعوت میں شریک ہو گئے جس کا اہتمام سپاہیوں کی گولیوں نے وہاں اُن کے لیے کر دیا تھا۔ کوئی آدھ گھنٹے تک میں اسی طرح سُن ہو کر ریت میں دبا رہا۔ پھر کسی بھیڑیے کی ہولناک آواز فضا میں اُبھری جیسے وہ صورِ اسرافیل پھونک رہا ہو۔ اس کے ساتھ ہی تمام بھیڑیے ایک دوسرے سے ٹکراتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ کوئی پندرہ منٹ بعد وہ سب میری نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔ صحرا ایک بار پھر سناٹے کی لپیٹ میں آ گیا۔ میں نے ریت میں سے سر نکال کر چاروں طرف نظر دوڑائی۔ اب مجھے دور دور تک کسی درندے کا نشان دکھائی نہیں دیتا تھا۔

"اوئے غلام جیلانی کے گھوڑے تو بچ تو نہیں گیا کہیں اپنے اُن رشتے داروں سے؟"

مجھ سے چند قدم دور آبی ریت کی قبر میں سے اٹھ کر اپنے کپڑے جھاڑ رہا تھا۔ اس نے مجھے سالم دیکھ لیا تھا اور اب وہ میدان صاف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ میں بھی ریت میں سے باہر نکل آیا۔ حلیہ ہم دونوں کا بری طرح بگڑ چکا تھا۔ صحرا میں چلتی ہوئی ٹھنڈی ہوا بہت ہی بھلی محسوس ہوتی تھی۔ کپڑے تو ہم نے جھاڑ لیے مگر ہمارے بالوں میں جو ریت پھنسی تھی وہ نکل نہیں رہی تھی۔ منہ میں بھی کرکرا ہو رہی تھی۔ ریت شاید ہمارے گلے تک اتر گئی تھی۔

"ابے تو چاہتا تھا کہ میں اُدھر ان کا لقمہ بن جاتا، اُن ذلیل کے بچوں کا؟"

"اچھا تھا یار! تیرا زیرِ زمین چلا جانا ہی اچھا تھا۔ خلقِ خدا تیرے فساد سے تو بچ جائے گی؟"

"اور تو رہ جائے اُدھر پرائی عورتوں کے ساتھ عیش کرنے کے لیے۔"

"ایک دم احمق آدمی ہے تو۔ اُس پنّا کو اُدھر روک لیتا تو روٹی پانی کا تو آرام رہتا۔ کتنی سُندر ناری تھی یار وہ۔ مجھے اُدھر ریت میں لیٹے وقت وہ بہت یاد آئی؟"

"شٹ اپ! پرائی عورتوں پر بری نظر نہیں ڈالنی چاہیے۔"

"اچھا اب چل کسی طرف نکل چل۔"

"مجھے تو یہاں کوئی آبادی دور دُور تک نظر نہیں آتی۔"

"اُدھر کوئی چار میل پیچھے ایک جگہ ہم نے روشنی سی دیکھی تھی نا اُدھر چلتے ہیں۔"

"یار اُن بھیڑیوں نے ایک آدمی کو پھاڑ کھایا تھا۔ اُسے تو دیکھ ذرا۔"

"ہاں! کچھ چیخیں تو میں نے بھی سُنی تھیں۔ چل اُدھر دیکھتے ہیں۔"
یہ کہہ کر آبی تیزی سے اُدھر کو لپکا۔ جہاں اُن بھیڑیوں نے گولیاں کھائی تھیں وہاں جب ہم پہنچے تو یہ دیکھ کر ہمارا دل لرزنے لگا کہ اس سپاہی کا شکستہ ڈھانچہ بھی وہاں پڑا تھا۔ اس کا سر کہیں نظر نہیں آتا تھا۔ اس کے اردگرد پندرہ بھیڑیوں کے ڈھانچے بھی اُدھڑے پڑے تھے۔ وہ ان کی ہڈیوں سے گوشت کا ایک ایک تسمہ اُدھیڑ کر لے گئے تھے۔ ہم اس میدانِ کارزار میں اِدھر اُدھر گھوم پھر رہے تھے کہ اچانک ہمیں گولیوں سے بھری پیٹی اور ایک رائفل نظر آئی۔ کوئی بیس قدم دُور اس کی تار تار وردی بھی پڑی تھی۔ آبی نے وہ چیزیں اٹھا لیں۔ چند قدم اُدھر اس سپاہی کا بٹوا بھی پڑا تھا، وہ میں نے اُٹھا لیا۔ اس میں ایک شناختی کارڈ رکھا تھا جس سے معلوم ہوا کہ اس سپاہی کا نام شیر محمد تھا۔ اور وہ لاہور پولیس کا ہیڈ کانسٹیبل تھا۔ اس کے بٹوے میں پینتیس روپے بھی موجود تھے۔ آبی بڑی افسردہ نگاہ سے اس بٹوے کو دیکھ رہا تھا۔ چٹکی ہوئی چاندنی میں اس نے بھی کارڈ کے مندرجات پڑھ لیے تھے بولا۔

"اوہ جیلانی! یہ۔۔۔ تو جانتا ہے کہ یہ سب کچھ کس کی وجہ سے ہوا۔ ایک زندہ آدمی کیسے ان بھیڑیوں کے منہ میں جا گرا۔"

"اور اُن بزدلوں کو دیکھو، وہ اسے یہاں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ حالانکہ اُن کے پاس ہیلی کاپٹر تھا۔"

"وہ بھی مجبور تھے کیونکہ بھیڑیوں کی تعداد سیکڑوں سے کم نہیں تھی۔ وہ اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔" آبی نے بڑے ہی زخم خوردہ لہجے میں کہا۔

"یہ بہت ہی بُرا ہوا ہے آبی! میں اس آدمی کی موت کو کبھی نہ بھُول سکوں گا۔"

"اس کا پتہ تو درج ہو گا اس کارڈ میں؟"

"ہاں۔ اس کا پتہ تو لکھا ہے اس میں۔"

"اِسے بھلا نہ دینا۔ یہ اپنا فرض ادا کرتا ہوا مارا گیا ہے۔ وہ اس کی بیوہ کو زیادہ سے زیادہ دس ہزار روپے اور ایک تعریفی سند دے دیں گے اور بس۔"

"ہاں یہ تو ہے اور کیا کر سکتے ہیں وہ۔"

"مگر اس سے کیا ہو گا۔ تم لاہور پہنچتے ہی اس کی بیوہ کو کم از کم پچاس ہزار روپے دو گے۔ ناجدہ سے بھی یہ رقم لی جا سکتی ہے۔"

"نہیں میں خود یہ رقم دوں گا بنک سے نکلوا دوں گا۔"

"ہاں یہ بھی ہو سکتا ہے۔ وہ بڑا خوفناک منظر تھا جیلانی! وہ بلاؤں کی طرح اُن پر پل پڑے تھے۔ خدا کی قسم میں نے ایسا منظر کبھی نہیں دیکھا۔"

آبی بہت پریشان تھا۔ میں سمجھا وہ خوفزدہ ہو چکا ہے، حالانکہ خوف کے نام سے وہ آشنا نہیں تھا۔ مگر اس کے چہرے پر ٹھہر ٹھہر کر جو پیلاہٹ اُبھرتی تھی، اُس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ آبی اندر سے ٹوٹ گیا ہے۔ شاید زندگی کی بے ثباتی کا راز اُس پر آشکارا ہو گیا تھا۔ وہ میرے ساتھ یوں بھڑک کر کھڑا تھا جیسے وہ مجھ سے دو قدم آگے نکلا تو بے ہوش ہو کر گر پڑے گا۔
اچانک ہم دونوں نے ایک دوسرے کو یوں دیکھا جیسے ہمارا خواب چکنا چُور ہو گیا ہو۔ بہت دُور کہیں صحرا کی دُور پار وسعتوں میں اُفق کے قریب سے ہمیں کئی گاڑیوں کی گھوں گھوں سُنائی دے رہی تھی۔

"یہ تو۔۔۔ یہ تو موٹروں کی آواز ہے یار! کہیں وہ لوگ پولیس کی بڑی نفری لے کر تو اِدھر نہیں آ رہے؟" آبی نے کہا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے جلدی کسی طرف نکل چلو۔"

"مگر اب ہم پیچھے نہیں جا سکتے۔ آواز اُدھر سے ہی آ رہی ہے"

"تو پھر اِدھر کو نکلو، چلو اور اس رائفل کو لوڈ کر لو۔" میں نے رائفل آبی کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔
اس نے رائفل کا چیمبر کھول کر دیکھا تو بولا۔

"اس جوان نے اپنی ساری گولیاں ختم کر لی تھیں۔ وہ کئی ایک کو مار کر مرا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے چیمبر پھر سے لوڈ کر لیا اور رائفل کندھے پر لٹکا کر میرے ساتھ تیز تیز چلنے لگا۔ ریت میں ہمارے پاؤں دھنس دھنس جاتے تھے۔ ہم دوپہر کے کھانے سے بھی محروم رہے تھے اور شام کے کھانے سے بھی۔ یہی وجہ تھی کہ ہمیں جلدی ہی تھکن کا احساس ڈسنے لگا۔ مگر ہمارے لیے رکنے کی تو کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ اور وہ موہوم سی موٹروں کی گھوکر اب زیادہ واضح ہوتی جا رہی تھی۔ ہم نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ ہمیں جلد از جلد کسی جگہ پہنچ جانا چاہیے۔
کوئی چار فرلانگ آگے نکل کر ہمیں محسوس ہوا کہ وہ موٹریں کسی اور سمت مڑ گئی ہیں۔ ان کی آوازیں اب دُور ہوتی جا رہی تھیں ہم صحرا کے ایسے حصے میں تھے جہاں دور دُور تک نہ کوئی درخت نظر آتا تھا نہ جھاڑی سبزے کا کہیں نام و نشان موجود تھا۔

"یار! مجھے یہ بتا کہ ہم کب تک یوں خوار ہوتے رہیں گے" آبی نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"تو چیتے کی کمر پر چڑھ بیٹھا ہے بیٹے! اب کبھی نہیں اُتر سکتا۔"

"یہ بھی ٹھیک ہی کہا تو نے، پر یار مجھے وہ۔۔۔ وہ شکنتلا بہت یاد آ رہی ہے۔"

"اس نے خط لکھ کر چھوڑ دیا تھا کہ میں ایس جی ایم ایم پیرزادہ کے ساتھ جا رہی ہوں۔"

"اچھا؟ مجھے نہیں بتایا تم نے۔ بالکل بکواس کی ہے اس نے۔ مجھے تو وہ لوگ رات کو سوتے میں سے اٹھا کر لے گئے تھے۔ میں نے بڑے ہاتھ پاؤں مارے مگر میری کوئی پیش نہ چلی۔ بس بدن پر نیند ہی نیند طاری تھی۔"

"انہوں نے تجھے کوئی نیند آور شے کھلا دی ہو گی۔ تیرا ایک جُوتا میں نے وہاں نشست گاہ میں دیکھ کر یہ نتیجہ نکالا تھا کہ وہ تجھے زبردستی لے گئے ہیں ورنہ وہ تو مجھے شکنتلا کا خط ہی دکھا رہے تھے۔"

"بڑے ذلیل ہیں وہ! مجھے تو انہوں نے لے جا کر پتہ نہیں کس کال کوٹھری میں بند کر دیا۔ بہت بُرا حال ہوا میرا وہاں۔"

"مجھے بھی کئی دن جیل میں رہنا پڑا تھا۔ وہاں وہ تو بلبیر نے میں نے چکر دے کر اپنی جان چھڑائی تھی ورنہ تو وہ مجھے کبھی نہ بخشتے۔"

"تو نے کہہ دیا ہو گا کہ تو مار دے گا جس جس کا بھی نام وہ لیں گے۔"

"ہاں تو اور کیا کرتا میں؟"

"ویسے یہ ہیلی کاپٹر کی تجویز تجھے خوب سُوجھی۔ اب ہم پاکستان میں بھی ہیں اور آزاد بھی۔" آبی نے مجھے شاباش دیتے ہوئے کہا۔

"اب ہم کسی صحیح راستے پر چڑھ گئے تو سب سے پہلے ہم اس کبیر شاہ کے پاس چلیں گے۔"

"میرا خیال ہے کہ وہ اچھا آدمی ہے اس نے ازراہِ ہمدردی اسے کو بچا لیا ہے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے پولیس میں سب کے سب شیطان تو نہیں ہوتے ہیں یار۔ اچھے لوگ بھی وہاں مل جاتے ہیں۔"

"یہ تو ہے، بس دعا کریں کہ ہم کسی اور چکر میں نہ پڑ جائیں۔ ورنہ قسمت تو ہماری آج کل بہت خراب جا رہی ہے۔"

"یار! قسمت نے تو ذلیل کر دیا ہے ہمیں۔ کہاں وہ شکنتلا اور اس کی ہندی میں گندھی ہوئی نرم نرم محبت اور کہاں یہ بھیڑیے اور یہ ڈرا ڈرنہ۔ حد ہو گئی جنّت سے نکل کر جہنم میں آ گرے ہیں ہم لوگ۔"

آبی کو اب اُس مس عرشی کے بجائے شکنتلا کے گردن توڑ بخار نے آ لیا تھا۔

"ابے تو دھنیا پیا کر دھنیا۔ ایسے ہی آج کل سرکاری سانڈ بن رہا ہے تو خواہ مخواہ۔"

آبی ہنس دیا، کچھ نہیں بولا۔ آسمان پر درخشاں ستاروں کے جھُرمٹ میں چودھویں پندرھویں کے چاند کو دیکھ کر اس نے سینے پر دو ہتّڑ ماری اور کان پر ہاتھ رکھ کر لمبی آواز میں بولا۔

"ٹھنڈا پانی منکیاں دا
اسیں بالو دے سہتر جانا

کیہ بھاڑ اسے کیّاں دا "

"اوئے منہ بند رکھ۔ عاشقوں کو ہمیشہ ٹیکسی تانگے کے کرائے نے پریشان کیا ہے تو کوئی نئی بات نہیں کہہ رہا ہے۔"

میری یہ بات سُن کر وہ کھلکھلا کر ہنس دیا۔

"ایسا کیوں ہوتا ہے جیلانی! یہ عاشق بیچارے واقعی اسی چکر میں مارے جاتے ہیں۔ معاشی بدحالی انہیں لے ڈوبتی ہے۔"

"اس لیے کہ وہ حرامکاری کے مرتکب ہوتے ہیں اور خدا حرام کاروں کو پسند نہیں کرتا۔"

"مجھے پتہ ہے تو بڑا نیک ہے کتنے بندے مار چکا ہے تو اب تک۔"

"بندے مارنا تو اچھی بات ہے۔ میں تو برائی کے خلاف جہاد کر رہا ہوں۔"

"اچھی رہی! تیری یہ دلیل اللہ میاں سُننے لگا نا، تو حکم دے گا فرشتوں کو کہ اس کی میرے سامنے ٹانگیں چیر دو۔"

اچانک ہمیں کچھ فاصلے پر اونٹوں کے بلبلانے کی آواز سُنائی دی۔ اس وقت ہم ایک ٹیلے کی اوٹ میں تھے۔ ہم دونوں بھاگ کر دُوسری طرف پہنچے تو ہمیں وہاں دو اونٹ سوار نظر آئے۔ وہ اپنے اونٹوں کو بھگاتے ہوئے ٹیلے کے پاس سے گزر رہے تھے۔

"او بھائیو! ذرا ٹھہرو۔" میں نے ان کو دیکھتے ہی بلند آواز سے انہیں پکارا۔

ان دونوں نے ہمیں سر گھما کر دیکھا اور پھر چند قدم آگے بڑھ کر اپنے اونٹوں کو موڑتے ہوئے بولے۔

"کیا بات ہے بھائی جی! کدھر جانا ہے تمہیں؟"

ہم دونوں بھاگ کر ان کے پاس جا پہنچے۔ وہ ہمیں گھور گھور کر دیکھنے لگے۔ آبی کے کندھے سے لٹکتی رائفل پر نظر پڑتے ہی ان میں سے ایک بولا۔

"کون ہو بھئی تم لوگ، ادھر کیا کر رہے ہو؟"

"مسافر ہیں بھائی! راستہ بھول گئے ہیں۔ بھوکے بھی ہیں اور پیاسے بھی۔" آبی نے سارے جہان کا درد اپنی آواز میں بھرتے ہوئے کہا۔ حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ ان کے اونٹوں کے گلے میں کوئی گھنٹی تھی نہ گھنگھرو۔ وہ بے آواز چلتے تھے اور یوں لگتا تھا جیسے وہ منزلوں پر منزلیں مارتے چلے آ رہے ہیں۔ ان کے اونٹ ہانپ رہے تھے۔

"ہم تمھاری کوئی مدد نہیں کر سکتے بھائی جی ہم خود مسافر ہیں۔" ایک آدمی نے اونٹ کو پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"نہیں یار! اتنے بے رحم نہ بنو۔ ہمیں راستے کا بھی علم نہیں ہے۔"

"یہاں سے کوئی چھ کوس دُور ایک پنڈ ہے گلو چک۔ وہاں چلے جاؤ۔"

"چھ کوس! پر ہم تو بہت تھک چکے ہیں یار۔ کچھ رحم کرو۔ ہم پر۔ اپنے پیچھے بٹھا کر وہاں چھوڑ آؤ ہمیں۔" آبی نے اس آدمی کے قریب ہو کر کہا۔

وہ عجیب سے کھردرے انداز میں ہنسا، بولا۔

"اوئے بلھے کاکے ہیں یہ۔ تھک گئے ہیں گود میں اٹھا لے انہیں۔"

"انہیں گولی مار دبڑو۔ پینڈا کھوٹا نہ کر۔ چل نکل آگے۔" یہ کہہ کر بلھے نے اپنا اونٹ موڑ لیا۔ دبڑو بھی اس کے پیچھے مڑا، تو آبی نے ایک دم اس کا پاؤں پکڑ کر اسے اُونٹ سے نیچے کھینچ لیا۔ مگر وہ آدمی بہت جی دار تھا۔ گرا بھی تو آبی کے عین اُوپر گرا۔ اس طرح کہ اپنا چمکتا ہوا خنجر اس نے ہاتھ میں لے لیا تھا۔

"پیچھے ہٹ جا اوئے بدمعاش! نہیں تو چیر کے رکھ دوں گا۔"

آبی کی حماقت پر مجھے غصّہ آ رہا تھا۔ وہ اپنی رائفل بھی الگ نہ پھینک سکا تھا۔ اس نے بلھے کے ہاتھ میں خنجر دیکھا تو اپنا بدن بچا کر اس نے بلھے کی کلائی دونوں ہاتھوں میں پکڑ لی مگر وہ آدمی تو بلا کا تیز تھا۔ پیشتر اس کے کہ آبی اس کی کلائی مروڑ سکتا، وہ پُورے قد سے پھرکی کی طرح گھوما اور آبی کے سینے پر دونوں پاؤں مار کر اسے چت گرا دیا۔ میں نے صورتِ حال کو یوں بگڑتے دیکھا تو جیب سے پستول نکال ایک دم بلھے پر جا چڑھا۔ اس کے پاس پہنچتے ہی میں نے پوری قوت سے لات اس کے سینے میں ماری تو وہ آبی کے اوپر سے اچھل کر پرے جا گرا۔ اس کا خنجر ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا جیسے اس نے اپنی بیش بہا قوتِ ارادی سے ابھی تک مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔

اچانک مجھے دبڑو کے اونٹ پر سے ایک شعلہ سا لپکتا نظر آیا۔ اس نے رائفل تان کر مجھ پر گولی چلا دی تھی مگر اس کا نشانہ چُوک گیا۔ میں نے ایک دم زمین پر بیٹھ کر یکے بعد دیگرے تین گولیاں اس پر چلا دیں۔ اس کے پاس پرانی طرز کی رائفل تھی جس میں دوسری گولی بھرنے کی اسے مہلت ہی نہ ملی۔ اور وہ اونٹ سے لڑھک کر ریت پر گر گیا۔ رائفل اس کے ہاتھ سے گر چکی تھی۔ بلھا سُن سا ہو کر ابھی تک ریت پر پڑا تھا۔ آبی بڑے اطمینان سے اٹھا تو اس آدمی نے اسے اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر اپنا خنجر دُور پھینک دیا۔

"اُٹھ جا میرے یار! تو سمجھدار آدمی ہے، لے اپنا خنجر، اسے کیوں پھینک دیا ہے تو نے۔"

یہ کہہ کر آبی نے اس کا خنجر ریت پر سے اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ مگر وہ تو مفلوج ہو چکا تھا۔ بڑے ہی مُردہ انداز سے اٹھا اور بوجھل بوجھل قدم اٹھاتا دبڑو کے پاس جا ٹھہرا۔ میں نے کوشش کی تھی کہ میری کوئی گولی اس کے بدن میں ایسی جگہ نہ لگے کہ وہ جانبر

نہ ہو سکے۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ دبڑو کی کلائی زخمی تھی۔ ایک گولی اس کی بائیں ران پر لگی تھی اور تیسری ضائع چلی گئی تھی۔ اس کے زخموں سے خون رسنے لگا تھا۔ آبی نے اس کو بغور دیکھا تو بولا۔

"اوئے لے جا اِسے اُونٹ پر بٹھا کر۔ اس کا علاج کروا۔ کوئی شہر ہے ادھر قریب۔"

"جی وہ بہاولنگر یہاں سے پچیس کوس ہے۔"

"اور کوئی جگہ نہیں ہے یہاں۔"

"ایک گاؤں ہے جی! بٹالہ وہاں ایک ڈاکٹر بیٹھتا ہے۔"

"تو اسے بٹالہ لے جا مگر ایک اونٹ تجھے یہاں چھوڑنا ہو گا۔"

"ٹھیک ہے جی، اب تو آپ کی مرضی چلے گی۔" یہ کہہ کر اس نے اونٹ کو نیچے بٹھایا اور بڑے ماہرانہ طریقے سے اس نے دبڑو کو اس کے اگلے حصے پر بٹھایا اور پھر دُوسرے اونٹ پر سے دو تھیلے اتار کر اپنے سامنے رکھتے ہوئے وہ بھی سوار ہو گیا۔

"یہ رائفل لے جا۔ ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے لے جا، یہ تیرے کام آئے گی۔" میں نے یہ کہہ کر رائفل کو دیکھ بھال کر اس کے حوالے کر دیا۔

اونٹ کو ایک قدم آگے بڑھا کر بولا۔

"اگر میرا یار مر گیا تو تم کہیں بھی ہو گے میں تمہیں ڈھونڈ کر خوفناک بدلہ لوں گا البتہ زخموں کی قیمت میں چھوڑ دوں گا۔"

"جا یار دیر جلدی چلا جا اور غصّہ تھوک دے۔" آبی نے پچکارتے ہوئے کہا۔

اس نے اونٹ کی لگام اکسائی اور وہاں سے چھوٹتے ہی بھاگ نکلا۔

"اگر یہ مر جاتا تو مجھے افسوس ہوتا آبی!"

"رہنے دے یار! تو بے درد آدمی تیرے دل میں افسوس کا کیا کام، پر یہ بتا اس جہاز کو چلائے گا کون؟"

"اس پر تو میں بھی کبھی نہیں بیٹھا۔" میں نے اونٹ دوسرے سوار کے پیچھے بھاگنے سے روکتے ہوئے اس کی مہار پکڑ لی۔

"اس کا تو نہ کوئی کلچ ہوتا ہے نہ بریک اسٹیئرنگ تو خیر یہ ہوا نا، یہ مہار۔"

"اسے نیچے تو بٹھا اپنے اس رشتے دار کو۔"

"یار! اس مصیبت کو بٹھاؤں کیسے؟ چل اوئے اونٹ کی اولاد، سِٹ ڈاؤن۔" یہ کہہ کر آبی نے بڑے ماہر شتربانوں کی طرح اونٹ کے اگلے گھٹنے پر پاؤں مار کر اس کی مہار نیچے کھینچی مگر اس نے بیٹھنے کے بجائے بدک کر منہ کو جھٹکا جو دیا تو مہار آبی کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور اونٹ سرپٹ بھاگ نکلا۔

"اوئے آبی پکڑ اوئے اپنے اس مامے کو۔ یار سواری ہاتھ سے نکلی جا رہی ہے۔"

آبی اس کے پیچھے بھاگا تو سہی مگر اونٹ کی چار ٹانگیں تھیں اور اُسے آدمی پر ہمیشہ سے فضیلت حاصل رہی ہے۔ وہ اس کے پیچھے بھاگتا ہوا چل دیا۔

"اوئے کچھ کر یار! اس کو روک۔ آواز ہی دے اسے اس کی زبان میں پکار۔"

"اوئے عبدالکریم رک جا پُتر اوئے تیرا ابا نجا تیرے پیچھے بھاگ رہا ہے۔" میں نے آبی کے پیچھے بھاگتے ہوئے کہا۔

آبی ایک لمحے کے لیے رکا اور ہانپتے ہوئے بڑے غصے سے بولا۔ "تجھ پر لعنت ہے یار۔ ایک ذرا سا اونٹ نہیں روک سکتا ہے تو۔"

"یہ ذرا سا اونٹ ہے۔ ابے یہ ذرا سا نظر آتا ہے تجھے۔"

"رو پھر اپنے نصیب کو بیٹھ کر۔ اب یہ ہاتھ نہیں آنے کا۔"

آبی نے ریت پر زانو ٹکا دیے۔ وہ بالکل مایوس ہو چکا تھا۔ اونٹ ابھی میرے سامنے تھا، یہی کوئی سو گز کے فاصلے پر۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ اس کی رفتار میں کمی آ گئی ہے اور وہ رک رک کر بھاگ رہا ہے جیسے اس کے کاربوریٹر میں کہیں کچرا پھنس گیا ہو۔ میں تیزی سے اس کے پیچھے بھاگا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا، کہ میرے اور اس کے درمیان فاصلہ فوراً ہی کم ہو گیا۔ دراصل وہ لمبی سی مہار کی رسّی اس کی اگلی ٹانگوں میں اس طرح الجھ گئی تھی کہ اس سے قدم کھولا نہیں جاتا تھا۔ میں نے جاتے ہی اس کی مہار پکڑ کر اسے پوری قوت سے جھٹکا جو دیا تو وہ ایک دم نیچے بیٹھ گیا۔ آبی نے یہ صورتِ حال دیکھی تو بھاگتا ہوا میرے پاس آ پہنچا، بولا۔

"یا حضرت! اس جن کو آپ نے کیسے قابو کر لیا ہے؟"

"اپنی کرامت ہے بچہ جی! چلو اب اس پر بیٹھ جاؤ۔ اس کا ارادہ بدل گیا تو ہم پھر کچھ بھی نہ کر سکیں گے۔"

میری یہ بات سن کر آبی جلدی سے اُونٹ پر سوار ہو گیا، بولا "بھئی میں فرنٹ سیٹ پر نہیں بیٹھ سکتا۔ اسے تم ہی ڈرائیو کرو گے۔"

"چل بھئی یہ کام بھی مجھے ہی کرنا تھا ایک دن۔" یہ کہہ کر میں نے اونٹ پر بیٹھ کر اسے کھڑا کیا تو میری نظر دُور دُور تک پہنچنے لگی۔

"یار! اس بلندی پر تو منظر اور واضح ہو گیا۔" میں نے آبی سے خوش ہو کر کہا۔

"اللہ جسے چاہتا ہے رفعت عطا کرتا ہے بیٹے۔ اب ذرا یہ دیکھ کہیں کوئی بستی نظر آتی ہے تجھے؟"

"تو بھی تو دیکھ سکتا ہے۔ میں ڈرائیونگ کروں گا کہ بستیاں

دیکھوں گا۔"

"میری نظر ذرا کمزور ہو گئی ہے جیلانی! کہیں کوئی بتی شتی نظر نہیں آتی۔"

"آ رہی ہے یار! چل ہم ادھر ہی چلتے ہیں۔" یہ کہہ کر میں نے اونٹ کو صحرا کی وسعت میں اس سمت بڑھایا جہاں مجھے بس تارا سی ایک روشنی جھلملاتی نظر آ رہی تھی۔

اونٹ کے بارے میں ہمارے تمام اندازے غلط ثابت ہوئے۔ وہ بڑی ثابت قدمی سے دوڑ رہا تھا اور آبی نے مجھے کمر سے پکڑ رکھا تھا دونوں ہاتھوں سے۔

"ابے ذرا اپنے حصے میں رہ! کوہان پکڑ لے۔ ڈرائیور کو جکڑ کر جہاز گرائے گا۔"

"نہیں یار! میں پیچھے لڑھک گیا تو مارا جاؤں گا۔ اس کی ڈگی بھی کوئی نہیں بنائی ہے اللہ میاں نے، ورنہ میں اس میں بیٹھ جاتا۔"

"یہ در اصل اللہ تعالیٰ کے تجریدی آرٹ کا نمونہ ہے یہ اونٹ بس ایسے ہی ایبسٹریکٹ آرٹ کے سلسلے میں وجود میں آ گیا تھا۔"

"شکر کرو یہ میسر آ گیا ہے ورنہ بھٹکتے پھرتے تم ادھر ریت میں۔"

اچانک میں نے محسوس کیا کہ اونٹ جھرجھری سی لے رہا ہے اس کی رفتار بھی مدھم پڑتی جا رہی تھی۔ اور یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی تکلیف میں مبتلا ہے۔

"ابے اس کی بیٹری پھر ڈاؤن ہو گئی۔ کیا کر رہا ہے تو اسے؟" آبی نے مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

ابھی میں کچھ کہہ بھی نہ پایا تھا کہ اونٹ بس آپ ہی آپ ریت پر بیٹھ گیا، یوں جیسے ڈھے گیا ہو۔ ہم دونوں اس پر سے اچھل کر اترے اور چاروں طرف گھوم کر اسے دیکھنے لگے۔ آبی ایک دم بول اٹھا۔

"اوئے بیڑا غرق! اس کی تو یہ دیکھو پچھلی ران کے قریب سے خون بہہ رہا ہے، یہ کیا ہوا اسے؟"

میں نے غور سے دیکھا۔ اونٹ کی پچھلی بائیں ران سے ذرا اوپر پیٹ میں سے خون بہہ رہا تھا۔

"یہ تو بہت برا ہوا آبی میرے پستول کی تیسری گولی تو اسے جا لگی تھی۔"

"یہ تمھاری گولیاں پتہ نہیں کیا کر کے رہیں گی؟ خواہ مخواہ بے زبان کو مار دیا تم نے جیلانی! یہ بہت برا کیا ہے تم نے۔"

"مگر میں نہیں چاہتا تھا یار۔" میں نے بڑے ہی افسردہ لہجے میں کہا۔ اونٹ نڈھال ہوا جاتا تھا۔

"کیا ضرورت تھی اندھا دھند گولیاں چلانے کی۔ مگر تمہیں تو خبط ہے ڈز ڈز کرنے کا۔ اب بھگت اس مصیبت کو۔" آبی نے اونٹ کے پیٹ سے بہتے خون کو دیکھتے ہوئے بڑے ہی تاسف بھرے لہجے میں کہا۔ وہ بہت زیادہ پریشان ہو گیا تھا، میری اپنی ذہنی حالت بہت ہی دگرگوں ہو رہی تھی مگر ہمارے پاس اس مصیبت کا کوئی علاج نہیں تھا۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اونٹ نے گردن ڈال دی۔ ہمارے پاس اس کی اس بے پناہ اذیت کا کوئی دارو ہوتا تو ہم سو جان سے وہ اس پر آزماتے مگر ہماری بے سرو سامانی تو ہم پر بھی خندہ زن تھی۔

ہم کوئی آدھ گھنٹے تک وہاں بیٹھے اس اونٹ کی لمحہ بہ لمحہ دگرگوں ہوتی حالت کو دیکھتے رہے۔ جب اس کی اذیت حد سے بڑھی تو میں نے چاہا کہ میں پستول کی گولی اس کے سر میں مار کر اس کی ساری مشکلیں آسان کر دوں مگر آبی نے سختی سے مجھے روک دیا، بولا۔

"میں تمہیں بھی جان سے مار دوں گا جیلانی! اس پر گولی مت چلانا۔ مجھے بہت ترس آ رہا ہے اس بے زبان پر۔" یہ کہہ کر اس نے میرے ہاتھ سے پستول جھپٹ لیا وہ اپنی جگہ سچا تھا اور میں اپنی جگہ۔

"تو چل پھر اسے خدا کے حوالے کر دے۔" میں نے مایوس ہو کر کہا۔

"ہاں ادھر چل، اس روشنی کی طرف۔ شاید کوئی شخص وہاں سے آ کر اس کو سنبھال سکے۔" آبی نے کہا اور ہم دونوں لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ وہ روشنی کوسوں دور تھی یا پھر ریت پر ہماری رفتار ہی سست تھی ——

ہم جب وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ آدھی سے زیادہ رات گزر چکی ہے ہمارے سامنے تین نہایت ہی صاف ستھرے بڑے ہی جدید قسم کے خیمے لگے تھے، جن کے باہر ایک بانس پر لالٹین لٹک رہی تھی۔ اور ایک مسلح آدمی خیموں کے سامنے کرسی پر بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ خیموں کی دوسری طرف دو جیپیں اور ایک بڑی پک اپ کھڑی تھی۔ یہ سب کچھ ہمیں اس وقت ہی نظر آیا جب ہم اس پہرے دار کے بالکل سامنے پہنچ چکے تھے۔ آبی ٹھٹک کر رہ گیا۔ دبی آواز میں بولا۔ "یار! یہ پولیس کے لوگ تو نہیں ہیں کہیں۔"

"پہریدار تو سپاہی نہیں لگتا۔ عام سے کپڑے پہنے بیٹھا ہے۔ چل تو سہی پتہ کرنے میں کیا حرج ہے۔" میں نے آبی کو کہنی مار کر آگے بڑھایا۔

ہمیں سامنے دیکھ کر وہ آدمی دونالی بندوق تان کر ہماری طرف لپکا اور ہم سے چند قدم دور رک کر بولا۔

"کون ہو تم؟" اس کا لہجہ بہت ہی کھردرا تھا۔ کچھ آدمی بولتے ہیں تو جی چاہتا ہے ان کے منہ پر جھانپڑ مار دیا جائے۔ ایسا ہی

بدگفتار آدمی تھا وہ۔

"کیا بات ہے؟ بولتے کس طرح ہو تم۔ کوئی جن بھوت نظر آتے ہیں ہم تمہیں؟" آبی نے اسے ذرا کرخت لہجے میں کہا۔ آبی نے دراصل اپنی آواز کا سارا تحکم اس کی طرف غیر محسوس طریقے سے منتقل کر دیا تھا۔ وہ فوراً ہی سنبھل گیا، نرم ہو کر بولا۔

"دیکھیں ناجی، یہ میرا فرض ہے۔ میں اسی لیے ادھر بیٹھا ہوں اور یہ جنگل بیابان کا معاملہ ہے۔"

"تو یوں کہو نا کہ تمہاری اپنی ہوا سرک رہی ہے۔ کون لوگ ٹھہرے ہیں ان خیموں میں؟"

"یہ ایک فلم یونٹ ہے جی! فلم 'سسّی تے قتل' کی شوٹنگ کے لیے آئے ہیں ہم لوگ۔"

"اوئے میں صدقے جاواں! کون کون آیا ہے ادھر۔" آبی نے ایک دم خوش ہو کر کہا۔

"وہ جی میڈم الماس آئی ہیں۔ پروڈیوسر عبدالحیٔ ہیں، ہیرو صاحب بھی ہیں۔"

"کیا نام ہے ہیرو کا؟"

"وہ نیا چہرہ ہے جی! سلیم ساہو۔"

الماس کا نام سن کر میرا دل خوش ہو گیا۔ ہم اتفاقاً ایک نخلستان میں آ پہنچے تھے۔ الماس ہمارے لیے اس بیابان میں ایک زبردست پناہ گاہ ثابت ہو سکتی تھی۔ اس کی وہاں موجودگی ہمارے لیے بڑی ہی نیک فال تھی۔

"یہ تو بہت اچھا ہے یار! ہم لاہور سے ادھر شکار کے لیے آئے تھے۔ ایک اونٹ ہم نے کرائے پر لیا۔ وہ اُدھر راستے میں بیمار ہو کر گر پڑا اور ہمیں یہاں تک پیدل آنا پڑا۔ بُرا حال ہو گیا ہے ہمارا۔ کیا نام ہے تمہارا؟"

"جی میرا نام خورشید ہے۔"

"خورشید یعنی سورج! یہ تو بہت اچھا نام ہے بھئی۔ الماس تو مجھے بہت اچھی طرح جانتی ہیں۔ سو رہی ہیں اس وقت؟"

"جی ہاں! رات کے دو بج رہے ہیں جی۔" خورشید نے کہا۔ وہ ہم سے خاصا مرعوب ہو چکا تھا۔ آبی نے اس کے پہیے سے ہوا بالکل ہی خارج کر دی تھی۔

"ادھر کوئی دری شری نکال دو۔ رات ہم ادھر ہی گزار لیتے ہیں۔ شہر تو یہاں سے بہت دور ہو گا۔"

"جی ہاں۔ بہاول نگر یہاں سے ساٹھ میل دور ہے۔ میں آپ کو ادھر ایک فولڈنگ بیڈ نکال دیتا ہوں۔"

"تمہاری مہربانی ہو گی بھئی۔ کچھ کھانے کو بھی دے سکتے ہو؟"

"جی ہاں، کچھ روٹیاں بچ گئی تھیں اور سالن بھی۔ میں وہ آپ کو لا دیتا ہوں۔"

"اور پانی۔"

"اس کا بھی انتظام ہے۔ ہم لوگ پرسوں یا کل شام کو واپس چلے جائیں گے۔"

جب وہ ہمارے ہاتھ دھلا کر رات کا بچا کھچا کھانا کھلا چکا تو دائیں خیمے سے وہ ہمارے لیے فولڈنگ بیڈ نکال لایا اور دری بچھا کر اس نے ہمیں دو چادریں دے دیں جنھیں اوڑھ کر ہم اطمینان سے سو سکتے تھے۔ خیموں کے اندر خموشی چھائی ہوئی تھی۔ خورشید نے ہمیں عمدہ قسم کے سگریٹ بھی اندر سے لا کر دیے تھے۔ ہم تو اتنے خوش ہو گئے جیسے ہم کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں جا ٹھہرے تھے۔ یہ فنکار لوگ، یہ فلم ساز، اداکار، سازندے کارندے بھی عجیب پاگل ہوتے ہیں فن کی تلاش میں حسن اور خوبصورتی کے تعاقب میں صحراؤں کی خاک چھان آتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ ازلی ابدی حقیقت کا سراغ نہیں پا سکتے۔ کوئی شاہکار تخلیق نہیں کر پاتے مگر کوشش تو وہ کرتے ہی ہیں یہ روپے کی محبت نہیں ہے جو انہیں صحرا صحرا جنگل جنگل لیے پھرتی ہے۔ فنانسر کو تو یہی جلبِ زر ہی آگے بڑھاتی ہے مگر وہ لوگ جو فن کو سمجھتے ہیں ان کے سامنے ایک کہیں زیادہ ارفع و اعلیٰ مقصد ہوتا ہے اور میں خوش تھا کہ میں نے اس سناٹوں سے لبریز ویران اداس اور افسردگی سے لتھڑی ہوئی رات کے پچھلے پہر الماس کا نام ایک مدھر گیت کی طرح سنا تھا۔ اس نے فن کی جس معراج کو چھو لیا تھا اس سے میں بہت متاثر تھا۔ اور وہ فن اس کی روح کی معراج تھا۔ جسم کے آئینے میں اس کی روح فن میں ڈھل کر باہر جھانکتی تھی تو شاہپارے جنم لیتے تھے۔ اور الماس کی شہرت کا سبب اس کی روح کی یہی انوکھی اڑان تھی۔

خورشید نے ہمیں سگریٹ پیش کرنے کے بعد ہم سے لاہور کے بارے میں ہمارے کام اور ہمارے مرتبے کے بارے میں کئی سوالات پوچھے۔ اُسے شک تھا کہ وہ کہیں صحرائی لیٹروں کو تو اپنے خیموں کے دروازے پر نہیں سُلا رہا ہے مگر آبی نے اپنی چرب زبانی سے کچھ اس طرح مطمئن کیا کہ وہ خوش ہو گیا۔ وہ سمجھا اس کی یہ محنت رائیگاں نہیں گئی۔

صحرا کی رات ٹھنڈی تھی اور پُرسکون بھی۔ وہاں کسی مچھر مکھی کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ہوا چھن چھن کر جنت کے کسی لہلہاتے گوشے سے نیند کے جھونکے چرا چرا کر زمین پر اُتر رہی ہے۔ ہم اپنے ہتھیاروں کو اچھی طرح سنبھال کر بستر پر لیٹے تو کچھ ہی دیر بعد میں گہری نیند میں کھو گیا مگر آبی آنکھیں کھولے لیٹا رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ اُسے اتنے تنگ بستر پر میری موجودگی میں نیند نہیں آئے گی۔ میں نے دل ہی دل میں اس کی نازک مزاجی پر لعنت بھیجی اور بے سُدھ ہو کر سو گیا۔

جب میری آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ آبی نے جان بوجھ کر مجھے جگا دیا ہے۔ اس وقت سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا تھا۔ خورشید

اس گھڑی اپنے اسٹول پر موجود نہیں تھا۔

"کیا بات ہے۔ مجھے کیوں جگا دیا ہے تم نے اتنی جلدی؟"

"ابے تو سالس کی کھاٹ پر نہیں لیٹا ہے پیارے! ان کے اٹھنے سے پہلے اپنا حلیہ درست کر لے۔ خورشید کہہ رہا ہے کہ قریب ہی ایک تالاب ہے وہاں چل کر نہا لیتے ہیں۔"

"ہاں یار! یہ تو بہت ضروری ہے ورنہ وہ لوگ تو پتہ نہیں کیا تاثر لیں ہم سے۔" یہ کہہ کر میں نے بستر چھوڑ دیا۔ ایک دری کے نیچے سے اپنے ہتھیار اٹھا کر ہم اسی وقت دائیں جانب چل دیے۔

"خورشید ادھر ہی گیا ہے کہہ رہا تھا ہم بھی وہاں آ جائیں وہ صابن تولیہ ساتھ لے گیا ہے۔"

ہم کوئی تین فرلانگ دور نکلے تو ریتلی زمین ختم ہو گئی۔ اب ہم ایک رگڑ پر چل رہے تھے۔ کوئی دو فرلانگ آگے پہنچ کر ہمیں ایک تالاب نظر آیا۔ خورشید اس کے کنارے کھڑا نماز ادا کر رہا تھا۔ جب ہم اس کے قریب پہنچے تو وہ سلام پھیر کر بولا۔ "آپ ادھر نہا لیں بھاجی، تازہ دم ہو جائیں گے۔"

تالاب دو حصوں میں منقسم تھا۔ ایک حصہ حیوانوں کے لیے تھا اور دوسرا انسانوں کے لیے اور وہ ہمارے لیے نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں تھا۔ معلوم یہ ہوا کہ وہ بائیس چوبیس فٹ گہرا ہے۔ جب اس علاقے میں بارش برستی ہے تو ادھر اُدھر سے بہہ کر آنے والا پانی اس تالاب میں جمع ہو جاتا ہے وہاں سے لوگ اپنی ضرورت کے مطابق اونٹوں اور خچروں پر لاد کر پانی گھڑوں کو لے جاتے ہیں۔ وہاں سے جب ہم نہا کر خیموں میں واپس پہنچے تو الماس کھلے ہوئے تازہ گلاب ایسی صورت سامنے کھڑی تھی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی پہچان گئی۔ اس وقت تک اُسے خورشید نے کچھ نہیں بتایا تھا۔ مجھے دیکھ کر کچھ حیران سی ہوئی پھر مسکراتی ہوئی دو قدم آگے بڑھ آئی، بولی۔ "ارے ہاشم صاحب آپ! یہاں آپ کیسے آ گئے؟"

"بس آپ کی کشش کھینچ لائی ہے میڈم! میں نے سنا تھا کہ آپ شوٹنگ پر آئی ہوئی ہیں میں بھی شکار کے بہانے ادھر آ گیا۔"

"یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے، کس وقت آئے تھے آپ یہاں؟"

"ہم رات کے دو بجے یہاں پہنچے تھے۔ بس ایسے ہی پریشان ہو گئے۔" یہ کہہ کر میں نے اپنی گاڑی کی خرابی اور پھر اونٹ کی بیماری کے بارے میں اسے جھوٹی سچی ایک کہانی گھڑ کر سنا دی۔

وہ خیمے کے سامنے بچھے ہمارے بستر پر بیٹھ گئی، بولی۔ "مجھے رات ہی یہ خورشید جگا دیتا تو میں آپ کے لیے تازہ کھانا بنوا دیتی۔ انتظام ہم پورا کر کے یہاں آتے ہیں۔" پھر وہ بولی "یہ صحرا کی صبح کتنی حسین اور خوابناک ہے۔"

"میں بھی یہی کہنے والا تھا میڈم مگر اس کو محسوس کرنے کے لیے شاعر کا دل چاہیے۔" آبی نے پہلی بار اس گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں میں سرخ ڈورے ابھر آئے تھے۔ الماس کی خیرہ کن شخصیت نے اس پر بہت ہی گہرا اثر کیا تھا۔

"جی ہاں! آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" وہ بولی اور پھر مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "ان سے تعارف نہیں کرایا آپ نے۔"

"یہ اسلم آبی ہیں میرے دوست۔ یہ بھی شاعر ہیں آبی تخلص کرتے ہیں علاقے کے بہت بڑے زمیندار ہیں۔"

"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر آبی صاحب! ابھی سورج نکلنے میں آدھ گھنٹہ باقی ہے کیوں نہ ذرا سیر کر لی جائے۔"

"میں بھی یہی کہنے کو تھا میڈم! اس سے اچھی تجویز کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔" آبی نے پھر ایسی بات کی جس کا الماس کے ذہن پر کچھ تاثر مرتب نہیں ہوا۔

وہ ہمارے ساتھ چلتی ہوئی تالاب کی سمت نکلی۔ آبی اس کے بائیں ہاتھ تھا اور میں دائیں ہاتھ۔

"یہ پتھریلی زمین مجھے پسند نہیں ہے ہاشم صاحب! اس نرم ریشمی ریت پر چلتے ہیں۔"

آبی نے اس موقعے پر ہاتھ مار دیا، چہک کر بولا ——————

"یہ دن کے وقت جہنم بن جاتی ہے اس کا حال بالکل عورت ایسا ہے۔"

الماس رک گئی اس نے پہلی بار آنکھیں جھپک جھپک کر یوں دیکھا جیسے وہ اس کی تصویر ذہن میں محفوظ کر رہی ہو۔

"عورتوں کے بارے میں آپ کے اس بیش بہا علم پر مجھے حیرت ہے۔"

آبی ہنس دیا، بولا۔ "یہ میرا احساس ہے، اپنا احساس۔"

"تجربہ نہیں؟" الماس نے گویا اسے گردن سے پکڑ لیا۔

"نہیں! اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میں کہوں گا کہ آپ کو دیکھ کر ہی یہ احساس میرے دل میں پیدا ہوا تھا۔"

"اب؟ اس وقت؟" الماس اس کی باتوں میں دلچسپی لے رہی تھی۔ آبی سٹپٹا سا گیا بولا۔

"ابھی تو دن نہیں نکلا، یہ احساس میرے دل میں ایک بار آپ کو لاہور کے شاہ نور اسٹوڈیو میں دیکھ کر پیدا ہوا تھا۔ اس وقت دن کے بارہ بج رہے تھے۔" الماس ہنس دی، بولی۔

"شاید میرے بھی اس وقت بارہ بج رہے تھے۔"

"نہیں! بس آپ کو دیکھ کر لوگ آپ ہی آپ مرنے کی طرح سکڑ سمٹ کر مودب ہو جاتے تھے۔ اس وقت میں نے یہی محسوس کیا کہ آپ کے دن اگرچہ ایسے ہیں مگر راتیں ایسی نہیں ہوں گی۔" آبی نے الماس کو اپنے صحن میں کھینچ لیا تھا۔

"آپ کی باتیں خوبصورت بھی ہیں اور مزیدار بھی۔"

"ہر مزیدار چیز خوبصورت ہوتی ہے۔"

"مگر ہر خوبصورت چیز مزیدار یا مفید نہیں ہوتی۔"

"یہ آپ کیسے کہہ سکتی ہیں؟"

"مور بہت خوبصورت پرندہ ہے۔ سوسن کے پھول بہت خوبصورت ہوتے ہیں مگر ان کی کوئی افادیت نہیں۔ خوبصورت ترین چیزیں سب سے زیادہ بے مصرف ہوتی ہیں آبی صاحب!"

الماس کی اس پُرمغز بات نے مجھے حیران کر دیا۔ آبی بھی لاجواب سا ہو گیا۔ وہ یوں الماس کو دیکھ رہا تھا جیسے وہ ابھی اس کے سر پر پاؤں رکھ دے گا، بولا۔

"مجھے آپ کی شخصیت کے اس پہلو کا علم نہیں تھا میڈم! میں نے حسین عورتوں کو بالعموم بے مغز ہی پایا ہے مگر آپ ذہانت اور حاضر جوابی میں خیزراں سے بھی بڑھی ہوئی ہیں۔ خدا آپ کو نظرِ بد سے بچائے۔"

اُجالے نے ہر شے کو اس گھڑی دلکشی سے نواز دیا تھا اور میں خوش تھا کہ آبی نے اس حسین و جمیل عورت کی صبح کو اور زیادہ۔۔۔ فرحت بخش بنا دیا تھا۔ ایک اچھا بول، تعریف و توصیف کا ایک جملہ ماحول کو یوں اجال دیتا ہے کہ آپ زندگی بھر اس لمحے کی چمک دمک کو نہیں بھول سکتے۔ آبی نے ایک ہی جست میں الماس کی شخصیت کے گرد بنی اونچی فصیل میں کئی جگہ شگاف ڈال دیے تھے اور اب وہ اس کے حجلۂ محسوسات کی سمت بڑھ رہا تھا۔

سورج کے طلوع کی رفتار کا ہم صحیح اندازہ نہ کر سکے تھے۔ ابھی ہم تالاب سے ادھر ہی تھے کہ صحرا کا منظر بدل گیا۔ ہر شے سورج کے اجالے میں نہا گئی یوں لگتا تھا جیسے الماس اس سورج کی کرن بن کر زمین پر اتر آئی ہے۔ وہ گلابی رنگ کی ساڑھی پہنے ہوئے تھی۔ اور اس کے بلاؤز کا رنگ بھی گلابی ہی تھا۔ ناخنوں پر لگی کیوٹیکس بھی ویسی ہی تھی اور جس انداز سے اپنے وجود کو اس نے لباس کے اندر بے لباس کر رکھا تھا وہ ایسا تھا کہ الماس بس آنکھوں میں کھبتی چلی آتی تھی۔ اس کی شخصیت کا سحر اس کی بڑی بڑی صاف شفاف آنکھوں اور گلاب کی پتیوں جیسے ہونٹوں میں ہی پنہاں نہیں تھا بلکہ وہ ساری کی ساری نور کے سانچے میں ڈھلی نظر آتی تھی۔ اسے قریب سے دیکھ کر اس کی باتیں سن کر مجھے یقین ہونے لگا تھا کہ لوگ غلط کہتے ہیں کہ وہ اونچی قیمت پر اپنا آپ بیچ دیتی ہے کسی بھی عورت میں اتنی ساری مسحور کن قوت خود کو کسی بھی اونچی سے اونچی قیمت پر بیچ دینے کے بعد باقی نہیں رہتی مگر وہ اتنی ساری سحر خیز شخصیت کو یوں یکجا کیے بیٹھی تھی کہ یہ کسی اخلاق باختہ عورت کا کمال تو نہیں تھا۔

سورج نکلا تو وہ پلٹ کر خیموں کی طرف چل دی

آبی بولا۔ "اگر آپ کی یہ بات مان لی جائے کہ خوبصورت ترین چیزیں سب سے زیادہ بے مصرف ہوتی ہیں تو پھر آپ کو ہم کس زمرے میں رکھیں گے؟"

الماس نے ایک بار پھر وہ اپنی مسحور کن آنکھیں اس کے چہرے پر جما دیں، بولی۔ "مبارک ہو آپ کا تیر نشانے پر بیٹھا ہے آبی صاحب! میرا مصرف تو لوگوں نے تلاش کر لیا ہے پس ثابت ہوا کہ میں خوبصورت نہیں ہوں۔"

"جی نہیں! ویسے ہر عورت یہی سمجھتی ہے کہ اس نے اپنے مخالف مرد کو مسحور کر لیا ہے۔ اس کے تحت الشعور میں یہ بات ہمہ وقت موجود رہتی ہے کہ میری قوتِ رعنائی کی فتوحات جاری ہیں۔ آئینہ دیکھ کر وہ خود سے یہی سوال کرتی ہے کہ کیا میں حسین ہوں؟"

"جیسے ہر تھانے کی ڈیوڑھی میں لگے قدِ آدم آئینے پر لکھا ہوتا ہے "کیا میں قابلِ عزت ہوں؟" اس میں سپاہی جھانکتا ہی اس لیے ہے پھر وہ اپنی مونچھ کو مروڑا دے کر تھانے سے باہر نکلتا ہے۔" میں نے لقمہ دیا۔

الماس بے اختیار ہنس دی، بولی۔

"مجھے نہیں پتہ تھا کہ آج صبح میری ملاقات آپ ایسے دلچسپ لوگوں سے ہو جائے گی۔" اب اس نے اپنی رفتار تیز کر دی تھی۔ اور میں عمداً اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا اور اس کی فسوں ساز چال پر واری صدقے جا رہا تھا۔ خیموں کے سامنے دو آدمی کندھوں پر تولیے رکھے اپنے دانتوں پر برش پھیر رہے تھے۔ الماس نے بڑے پھنکارتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"اوہ وٹ اے ڈرٹی سین! میں نے کتنی بار کہا ہے سلیم صاحب کہ یہ ابکائی پردے میں کیا کریں۔ یوں سب کے سامنے غلاظت بکھیرنے سے آپ کو کیا مزہ ملتا ہے؟"

"آپ ہیروئن ہیں اس فلم کی مس الماس! میری استانی ہوتیں تو ایک بات بھی تھی۔" سلیم صاحب نے کہا۔ وہ خاصا بھرے بدن کا گورا چٹا جوان تھا مگر میں سمجھا کہ الماس اس سے قطعاً متاثر نہیں تھی۔ اسے میں نے پہلی بار دیکھا تھا اور میرا یہی تاثر تھا کہ وہ الماس ایسی عورت کے سامنے بالکل ایک کھلونے کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ الماس نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ سیدھی خیمے میں داخل ہوئی اور بولی۔

"اندر آ جائیں ہاشم صاحب! آپ بھی آبی صاحب پلیز۔ اِٹ از اے پلیژر ٹو میٹ یو۔"

ہم خیمے کے اندر داخل ہوئے تو اس نے ہمیں بڑے تپاک سے سرخ رنگ کے قالین پر بٹھا دیا جس کے کناروں پر خوبصورت گاؤ تکیے بڑے سلیقے سے رکھے تھے۔ خیمہ خاصا کھلا تھا اور وہاں

دو نوجوان لڑکیاں خیمے کی دوسری دیوار کے ساتھ ابھی تک بے سُدھ پڑی تھیں۔ ایک بوڑھا سا آدمی خیمے کے دروازے پر آ ٹھہرا بولا۔

"چائے لے آؤں میڈم؟"

"ہاں، لے آؤ۔ میرے ساتھ دو مہمان بھی ہیں۔ تم اب اُٹھ جاؤ بھئی روبی اینڈ کمپنی۔ بس آٹھ بجے تک تیار ہو جاؤ۔ ہمیں آج کام مکمل کر لینا ہے۔"

"شوٹنگ کے لیے کدھر جائیں گی آپ؟"

"حسن صاحب نے کوئی جگہ تجویز کی ہے ہم جیپوں پر وہاں جائیں گے۔ آپ چلنا چاہیں تو چلیں۔"

"نہیں ہم ادھر آپ کے خیمے میں آرام کریں گے کئی دنوں سے ہم ادھر خوار ہو رہے ہیں پھر آج شام آپ کے ساتھ ہی لاہور چلے چلیں گے۔" میں نے الماس کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"جیسے آپ کی مرضی۔ یہ سین بھی کوئی ایسے دلچسپ نہیں ہیں میں پسینے میں نہا جاؤں گی تپتی ریت پر میرے کباب بن جائیں گے اور آپ سنائیں وہ ماجدہ کہاں ہے؟ مجھے بہت دنوں سے نہیں ملی ہے وہ۔"

"آپ آج اپنا کام ختم کر لیں تو پھر میں آپ کو اس کے بارے میں بھی بتاؤں گا۔ وہ کسی پریشانی میں مبتلا ہے آج کل۔ اور مجھے امید ہے آپ اس کی مشکل دور کر سکتی ہیں۔"

"ہاں! مجھے ضرور بتائیے گا وہ میری بہت پکی اور سچی سہیلی ہے ہاشم صاحب جیسے یہ آبی صاحب آپ کے ہیں۔"

"جی شکریہ! مجھے ان کی سہیلی تو نہ بنائیں۔ اگر میں ان کی کلائی پکڑ لوں تو ان کے بابا جان بھی نہیں چھڑا سکتے۔"

"آپ سے میں مل چکا ہوں آبی صاحب! خدا آپ کی حسرتیں پوری کرے۔"

"یہ آپ کے سامنے ایسے ہی اونچا بول بول رہے ہیں میڈم! خیر آپ خود سمجھ دار ہیں سورج کو چراغ دکھانے سے فائدہ؟" آبی نے دونوں طرف اپنی تلوار چلائی۔ الماس مسکرا کر رہ گئی۔

دوسری لڑکیاں اس اثنا میں اٹھ کر جلدی ہی باہر نکل گئیں۔ خیمے کا ماحول آسودہ اور پُرسکون تھا۔ آرام کی ساری ہی چیزیں میسر تھیں۔ یہاں تک کہ تیل سے چلنے والا ٹیبل فین بھی۔ چائے بڑی ہی پُرتکلف تھی۔ ان لوگوں نے جنگل میں منگل رچا رکھا تھا۔ الماس نے شوٹنگ کے لیے صحرا کی طرف جانے سے پہلے پروڈیوسر، ڈائریکٹر اور مختلف اداکاراؤں سے ہمارا تعارف کروایا مگر میں نے محسوس کیا کہ وہ ہمیں کوئی اہمیت نہیں دے رہے تھے۔ ان کی سرد مہری نے الماس کو بھی چونکا دیا۔ مگر وہ کیا کر سکتی تھی صحرا کی طرف جانے سے پہلے وہ آبی سے مخاطب ہو کر بولی۔

"مجھے افسوس ہے ان لوگوں کا رویّہ بڑا ہی روکھا سا ہے۔ آپ کو یہ بن بلائے مہمان سمجھتے ہیں آپ بہرحال یہاں آرام کریں ہم سہ پہر تک لوٹ آئیں گے۔"

"ان کی ذہنیت کو میں اچھی طرح سمجھتا ہوں میڈم! آپ کی نوازش ہے کہ آپ توجہ فرماتی ہیں۔"

"اگر آپ مجھے میڈم نہ کہیں تو یہ آپ کی مہربانی ہو گی۔"

"آپ میری عزت بڑھاتی ہیں مگر آپ کا احترام ہم پر لازم ہے میڈم۔ وہ انجیل کا ایک بڑا مشہور فقرہ ہے: اپنے ہمسائے سے محبت کرو مگر درمیان میں جنگلہ مت توڑو۔"

"اور آپ فقرے کے پہلے حصے پر عمل کرتے ہیں کہ دوسرے حصے پر؟" الماس نے آبی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"دونوں پر۔ آسمانی صحیفوں پر میرا ایمان بہت پختہ ہے۔" آبی نے کہا۔ الماس ہنستی ہوئی باہر نکل گئی۔

کچھ ہی دیر بعد وہ لوگ دو جیپوں میں لد کر صحرا کی طرف کوچ کر گئے۔ خیموں میں وہ اپنے پیچھے خورشید کو نگرانی کے لیے چھوڑ گئے۔ ایک جوان لڑکی صابراں اور ایک ادھیڑ عمر عورت کریم بی صفائی ستھرائی اور باورچی خانے کے کام کے لیے وہاں موجود تھیں۔ الماس اُن سے کہہ گئی تھی کہ ہمارے کپڑے دھو ڈالیں۔ صابراں نے ہم سے کپڑے لے لیے اور ہمارے پہننے کے لیے وہ دو صاف ستھرے تہمد اور دو ململ کے کُرتے ہمیں دے گئی۔

وہ دن ہم نے الماس کے خیمے میں عمدہ قسم کے سگریٹ پھونکنے کے بعد سو کر گزارا۔ کریم بی نے ہمیں دو بجے کھانا کھلا دیا۔ تو ہم پھر لمبی تان کر سو گئے۔

الماس کا فلم یونٹ شام کو چھ بجے واپس آیا۔ وہ سب بے حد تھکے ماندے نظر آ رہے تھے۔ مرد تو نہانے کے لیے اُدھر ڈابر پر چلے گئے۔ الماس اور دوسری لڑکیاں نم آلود تولیوں سے غسل کر کے باہر آ گئیں۔ اتنا پانی وہاں دستیاب بھی نہیں تھا کہ وہ باقاعدہ نہا سکتیں وہ لوگ اس روز اپنا صحرا کی شوٹنگ کا کام ختم کر آئے تھے اور اب ان کا پروگرام یہ تھا کہ وہ اگلی صبح ناشتہ کر کے وہاں سے چل دیں گے۔

الماس اپنے کام سے بے حد مطمئن تھی۔ جب ہم کھانے سے فارغ ہو کر بیٹھے تو وہ امریکن سگریٹ ہمارے سامنے رکھ کر بولی۔

"میری یہ فلم یادگار ثابت ہو گی۔ سلیم نے بھی اپنا کام خوش اسلوبی سے کیا ہے اس میں بڑا ٹیلنٹ ہے۔"

"ٹیلنٹ تو ہم میں بھی بہت ہے۔ بس اک ذرا آپ جیسی شریکِ حیا۔ میرا مطلب ہے شریکِ کار کی ضرورت ہے۔"

آبی نے الماس کو ہر قدم پر اپنی تعریف و توصیف کا ایک مہکتا ہوا پھول پیش کرنے کی ٹھان رکھی تھی۔ اور حیرت مجھے یہ تھی

کہ الماس کو اس کی باتیں بہت اچھی لگتی تھیں۔
"آپ اپنی زمینیں بیچ کر فلم سازی شروع کر دیں، پروڈیوسر، ڈائریکٹر، ایکٹر خود ہی بن جائیں گے آبی صاحب! کوئی ہیروئن بھی آپ مارہی لیں گے۔"
آبی کچھ خفیف سا ہو گیا۔ الماس کو وہ بس یوں ہی سی عورت سمجھا تھا جسے وہ اپنی چکنی چپڑی باتوں میں الجھا لینے کی امید رکھتا تھا مگر ذہنی طور پر اتنی بالغ عورت تھی کہ اس پر فتح پانے کے لیے ذہنی لحاظ سے ایک بڑے ہی قوی تر مرد کی ضرورت تھی۔ ہم گئی رات تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے یہاں تک کہ گیارہ بج گئے۔ میں اور آبی اسے شب بخیر کہہ کر خیموں کے باہر بچھے فولڈنگ پلنگ پر جا لیٹے۔
صحرا کی ہوا ٹھنڈی بھی تھی اور خنک بھی۔ ہمیں جلد ہی نیند آ گئی خورشید رائفل لوڈ کر کے کچھ فاصلے پر بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا۔
نیند تو ہماری بہت گہری تھی مگر اس کا شیشہ اچانک میرے میرے سر میں ٹوٹ گیا۔ میرے ارد گرد عجیب سا ہنگامہ شروع ہو رہا تھا۔ میں نے آبی کو جھنجھوڑ کر جگا دیا مگر ابھی میں کچھ سمجھ نہ پایا تھا کہ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میری پسلیاں توڑ ڈالی ہیں۔ کوئی ہم پر اندھا دھند لاٹھی برسا رہا تھا۔ میں تڑپ کر بستر سے گرا اور اس آدمی کی دونوں ٹانگوں کو جکڑ کر میں نے اُسے نیچے گرا لیا۔ اس نے بندوق کے دستے سے ہم پر حملہ کر دیا تھا۔ اسے نیچے گراتے ہی میں نے اس سے بندوق چھیننا چاہی مگر وہ کوئی بہت ہی گرانڈیل آدمی تھا۔ اس نے پشت کے بل لیٹ کر اپنے پاؤں میرے پیٹ میں دے کر مجھے الٹانا چاہا تو میں نے بندوق چھوڑ کر اس کی گردن دونوں ہاتھوں سے دبوچ کر دبا دی۔ وہ لمحوں میں جھول گیا۔ ایک نالی بندوق دستے پر سے ٹوٹ چکی تھی۔ میں نے پلٹ کر آبی کی طرف دیکھا وہ حملہ آور کے ہاتھ سے خنجر چھین کر اس کی شہ رگ کاٹ چکا تھا۔ ایک بھیانک آواز اس مردود کے گلے سے نکلی تو آبی اچھل کر پیچھے ہٹا۔ خیموں میں ہر طرف افراتفری مچی تھی۔ فلم یونٹ کے مرد جس خیمے میں سوئے تھے وہ الٹ چکا تھا اور تین آدمیوں نے اُن لوگوں کو سوتے میں مار مار کر ادھ موا کر دیا تھا۔
وہ اُن پر اب بھی بندوقوں کے دستے مار رہے تھے کہ آبی نے ایک پستول میرے ہاتھ میں دے کر اپنی رائفل کا رُخ ان کی طرف کر دیا۔ تین گولیاں تڑ تڑ اس کی رائفل سے نکلیں اور وہ تینوں آدمی پاگل کتوں کی طرح اچھل اچھل کر گرے۔ کچھ فاصلے سے اچانک دو عورتوں کی چیخیں سُنائی دیں ان کو چار آدمی گھسیٹ کر جیپ کی طرف لے جا رہے تھے جس کا انجن چل رہا تھا۔ ایک چیخ بلاشبہ الماس کی تھی۔ میں تڑپ کر ادھر بڑھا تو ایک دم سی گولیاں ہماری سمت تڑاں تڑاں کرتی آئیں۔ ہم دونوں نیچے لیٹ گئے۔ رائفل آبی کے ہاتھ میں تھی اور ہم پر گولیاں جیپ کی سمت سے برسائی گئی تھیں۔ جونہی ہم ریت پر گرے جیپ نے زقند بھری اور وہ چیختی چلاتی عورتوں کو لے کر تالاب کی طرف بڑھ گئی۔ الماس کی جیپ دوسری طرف کھڑی تھی۔
"اٹھ آبی! وہ تو الماس کو لے گئے، چل۔" میں نے جیپ کی طرف بھاگتے ہوئے کہا۔ چند ہی لمحوں بعد ہم اس بینڈ رودر میں بیٹھ کر ان لوگوں کا تعاقب کرنے لگے۔ صورت حال بہت ہی الجھی ہوئی تھی۔ ہمیں نہیں معلوم تھا کہ حملہ آور کون ہیں ان کے دو آدمی پیچھے رہ گئے چار کو آبی نے مار دیا تھا اور ایک کو میں نے بے ہوش کر دیا تھا۔ مگر پھر بھی ہمیں پتہ نہیں تھا کہ حملہ آوروں کی تعداد کتنی ہے۔ ایک بات البتہ ظاہر تھی کہ وہ سب کے سب ایک ہی جیپ میں سوار ہو کر آئے تھے۔ انہوں نے اچانک ہی خیموں میں موجود لوگوں کو بے بس کر دیا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ خورشید سمیت گیارہ آدمیوں کو ادھ موا کر گئے تھے۔ ہم پر انہوں نے شاید سب سے آخر میں ہاتھ ڈالا تھا کیونکہ اگر ہماری آنکھ پہلے کھل جاتی تو وہاں شاید صورتِ حال مختلف ہوتی میری پسلی میں جو بندوق کا دستہ لگا تھا کام دکھا گیا تھا۔ مجھے بائیں طرف شدید درد محسوس ہو رہا تھا۔ چوٹ گہری لگ گئی تھی۔
آبی نے جیپ کو اُن کے پیچھے پوری رفتار سے دوڑایا، تو وہ لوگ خبردار ہو گئے۔ وہ تالاب کے پاس سے گزر کر دائیں جانب مڑے اور اپنی جیپ کو ایک ٹیلے کی اوٹ میں لے گئے۔ ہم بھی ان کے پیچھے لپکے مگر اس طرح کہ آبی ٹیلے کے پاس سے گزرنے کے بجائے جیپ کو تالاب کے مشرقی کنارے پر دوڑا کر ٹیلے سے آگے نکل گیا۔ وہ لوگ شاید ہمارے ہی منتظر تھے۔ جونہی ہماری جیپ انہیں نظر آئی انہوں نے ہم پر گولی چلا دی۔ آبی نے جیپ کی ونڈ اسکرین کو بچانے کے لیے جیپ کا رُخ دوسری طرف پھیرا اور کوئی سو قدم آگے جا کر ہم دونوں اس میں سے کود کر نیچے اُتر گئے گولیاں تھم تھم کر چل رہی تھیں۔ وہ لوگ ٹیلے کی اوٹ میں تھے۔ اور اندازہ ہمارا یہ تھا کہ ہم پر دو بندوقوں سے فائر ہو رہا ہے۔ ان میں سے ایک کے پاس رائفل تھی اور دوسرے کے پاس دو نالی۔ دھماکے مختلف قسم کی آوازیں پیدا کر رہے تھے۔ ہم دونوں نے ریت میں دھنس کر صورتِ حال کا جائزہ لیا۔ آبی کے پاس خدا کا شکر ہے کافی گولیاں تھیں۔ اس نے گلے میں سے پیٹی اتار کر مجھے دے دی۔ اس کے اپنے چیمبر میں ابھی آٹھ گولیاں بھری ہوئی تھیں۔ مخالف سمت سے ایک گولی اور سنسناتی ہوئی ہمارے اوپر سے گزری تو آبی نے اس کے شعلے کو تاک کر گولی چلا دی۔ کوئی آدمی ٹیلے پر کئی فٹ اُوپر اچھل کر نیچے لڑھک گیا۔ آبی کا نشانہ کام کر گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی یکے بعد دیگرے گولیاں ہم پر برسائی

گئیں۔ اب ہم آہستہ آہستہ آگے کی طرف رینگنے لگے تھے۔ اچانک ٹیلے کی کمر پر ہمیں ایک آدمی کا ہیولا سا نظر آیا۔ آبی نے یہ موٹی سی گالی دے کر اس پر گولی چلا دی۔ مگر وہ ضائع چلی گئی اور پھر ہمیں وہ آدمی تیزی سے بھاگتا نظر آیا۔ وہ اپنی جیپ کی طرف لپک رہا تھا۔ میں نے آبی کے ہاتھ سے رائفل جھپٹ لی۔ وہ آدمی اچھل کر جیپ میں بیٹھا تو اس کی رفتار ایک دم تیز ہو گئی۔ میں نے اس جیپ کو روکنے کے لیے اس کے ٹائروں کو تاک کر دو گولیاں چلائیں دو دھماکے ہوئے جیپ کے ٹائر پھٹ گئے تھے۔ وہ کوئی بیس قدم تک لڑکھڑاتی ہوئی چلی اور پھر اس کے پچھلے حصّے میں سے ہم پر گولیاں چلنے لگیں۔ ہم پھر ریت میں دھنس کر لیٹ گئے۔ صحرا چاندنی میں نہایا ہوا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میں جیپ کے پچھلے حصّے پر گولی چلاؤں مگر اب اس کے سوا کوئی چارۂ کار باقی نہیں رہا تھا۔ الماس وہیں تھی اور اس کی وہ ایکسٹرا لڑکیاں بھی وہیں بیٹھی تھیں۔ اُن لوگوں نے ان تینوں کو بے بس کر دیا تھا مگر جب ایک بار مجھے اس آدمی کا پردے کے باہر نکلا ہوا سر نظر آیا جو اس نے رائفل کے دستے پر جما رکھا تھا تو میں نے اللہ کا نام لے کر ایک گولی اس کی طرف بھی ارسال کر ہی دی اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ زخمی کتّے کی طرح چیخ کر اپنی رائفل سمیت جیپ میں سے باہر گر گیا۔ اس کے گرتے ہی تین آدمی جیپ میں سے چھلانگیں لگا کر اس کی اوٹ میں جا چھپے۔ ہم اپنی جگہ سے اُٹھے اور دوڑتے ہوئے ٹیلے تک جا پہنچے۔ اب ہم نسبتاً اونچی جگہ پر لیٹے تھے مگر یوں کہ اگر کوئی سامنے سے گولی چلاتا تو ہم بچ نہیں سکتے تھے۔ آبی نے کہا۔
"رائفل لوڈ کر لو۔" میں نے چیمبر نکال کر اُسے دے دیا۔ اس نے بڑی تیزی سے گولیاں چیمبر میں بھریں اور رائفل میرے ہاتھ سے لے کر اس کو پھر سے لوڈ کر دیا۔ بولا۔
"میرا خیال ہے ان کا سودا بِک گیا ہے۔"
"لگتا تو یہی ہے۔ یہ پستول لے کر تو ٹیلے کے اس طرف جا کر دیکھ۔ وہ لوگ جیپ کے اگلے حصے میں کھڑے ہوں گے۔"
آبی نے پستول مجھ سے لے لیا اور پھر ٹیلے کی پشت پر سے گھوم کر دوسری طرف جا نکلا۔ پھر اس کی آواز مجھے سُنائی دی، وہ کہہ رہا تھا۔
"یار وہ تو بھاگ نکلے، ادھر تو کوئی بھی نہیں ہے۔"
میں نے اس کی بات سنی تو دوڑ کر جیپ کے پاس جا پہنچا۔ جیپ کے پچھلے حصے میں الماس گٹھڑی سی بنی ہوئی تھی، یوں کہ اس کے ہاتھ پیر ایک مضبوط رسّی سے اس کے زانوؤں میں گزار کر باندھ گئے تھے اور منہ پر کپڑا تھا۔ دو لڑکیاں اور بھی اس کے ساتھ پڑی تھیں۔ اوندھی ترچھی۔ وہ بھی اسی طرح باندھ کر ڈال دی گئی تھیں جیپ میں کوئی مرد باقی نہیں تھا۔ میں سب سے پہلے الماس کو ہاتھوں میں بھر کر جیپ سے نیچے اتارنے لگا۔ آبی سامنے آ ٹھہرا تھا۔ اس نے تیزی سے الماس کو اپنے بازوؤں میں بھرا اور اسے ریت پر ڈال کر اس کے جکڑ بند کھولنے لگا۔ میں نے اس عرصے میں دونوں لڑکیوں کی رسّیاں کھول دیں۔ وہ جب جیپ سے اُتریں تو بُری طرح سسک رہی تھیں اور الماس کا یہ حال تھا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ میں نے اسے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔
"گھبرائیں نہیں میڈم! اللہ نے آپ کو بچا لیا ہے۔"
"ہم نے اُن کے بہت سے آدمی مار دیے، ان کو دیکھ کر بتائیں وہ کون لوگ تھے۔"
"وہ بہاولپور کے ایک رئیس کے غنڈے ہیں اس کا نام غریب نواز ہے۔"
"خان غریب نواز خان؟" میں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔
"اس آدمی نے ایک دفعہ میرے سامنے بینک میں اٹھارہ لاکھ روپے جمع کروائے تھے۔ اس بینک میں جہاں میں کبھی کام کیا کرتا تھا۔ مینجر نے مجھے بتایا تھا کہ وہ بہاولپور کا بہت بڑا رئیس ہے۔"
"ہاں وہی۔ اس نے تین دن پہلے مجھے اپنے محل میں آنے کی دعوت دی تھی مگر میں نے اُسے سختی سے ڈانٹ دیا تھا۔ یہ غنڈے اسی نے بھیجے تھے۔"
"مگر وہ کیا چاہتا تھا آپ سے؟" آبی نے الماس کی ساڑھی کے

پلّو سے اُس کے چہرے کو صاف کرتے ہوئے کہا۔ وہ اس مصیبت کی گھڑی سے فائدہ اٹھا کر اس کی لانبی لانبی ریشمی زلفوں کی ابتری پر بھی قابو پا رہا تھا۔ آبی اب اُس کی ساڑھی کو پٹخ پٹخ کر اس کی ریت جھاڑ رہا تھا۔ وہ پاؤں سے بھی ننگی تھی اور سر سے بھی۔

"وہ ۔۔۔ بہت عرصے سے میرے پیچھے لگا ہوا تھا۔ لاہور میں بھی وہ چھ سات مرتبہ میرے پاس آیا تھا۔ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا وہ خبیث۔ مگر میں نے ہر بار انکار کر دیا۔ مجھے اس کی صورت سے نفرت ہے۔ اس کا بس نہیں چلا تو اب اس نے دہشت گردی شروع کر دی ہے۔"

"ہوں! تو یہ بات ہے، کوئی بات نہیں میڈم۔ آپ کو بھی اس کے خلاف موقع ملے گا۔ ہم اس کی ماں بہن اٹھا لائیں گے، آپ اٹھیں تو سہی۔ اٹھیں بہت سے کام ہیں۔"

آبی نے بڑے ہی گمبھیر لہجے میں کہا، یوں جیسے ساری کائنات کا نظام اسی کے ہاتھ میں ہو۔

"چلیں، میں آپ کو جیپ تک لے چلتا ہوں، آپ سے تو چلنا بھی ممکن نہ ہو گا۔ اتنی تو نڈھال ہو گئی ہیں آپ۔ آ جاؤ لڑکیو! تم بھی آ جاؤ۔ میں اُن میں سے ایک ایک کا خون پی لوں گا۔" وہ بڑا ہی غضبناک ہو رہا تھا۔ الماس کو اس نے یوں بازوؤں میں اٹھا لیا تھا، جیسے وہ کوئی چھ برس کی بچی ہو۔

میں ان لڑکیوں کو اپنے ساتھ لے کر آہستہ آہستہ اُس جیپ کی طرف بڑھنے لگا جو ہم تالاب کے کنارے چھوڑ آتے تھے مگر جب ہم وہاں پہنچے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ جیپ وہاں سے غائب ہو چکی تھی۔

"اوئے بیڑہ غرق، یار وہ جیپ کہاں چلی گئی ہے؟" آبی نے الماس کو اس کے پاؤں پر کھڑا کرتے ہوئے کہا۔

"وہی لے گئے ہوں گے وہ تمہارے رشتے دار جو اس پنکچر جیپ میں سے نکل بھاگے تھے۔" میں نے گرد و پیش پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"یہ تو بہت برا ہوا یار! اب کیا ہو گا؟"

اچانک ہمیں خیموں کی طرف سے کسی موٹر کی آواز سنائی دی۔ خیمے وہاں سے خاصے فاصلے پر تھے۔ ہم تیزی سے اُدھر لپکے مگر وہ عورتیں بھی ننگے پاؤں تھیں ہماری طرح اور ان کے لیے اُس دکڑ زمین پر چلنا دو بھر ہو رہا تھا۔

"ان کو ساتھ لے کر آؤ آبی صاحب! میں پتہ کرتا ہوں وہ موٹر کس کی تھی۔" یہ کہہ کر میں پوری رفتار سے خیموں کی طرف دوڑا۔ مگر وہاں پہنچ کر میرا مغز الٹنے لگا۔ فلم یونٹ کے پروڈیوسر ڈائریکٹر عبدالحئی صاحب شدید زخمی تھے۔ اُن کے سر میں چوٹ لگی تھی۔ یہی حال دونوں کیمرہ مینوں کا تھا اور ہیرو سلیم تو ابھی تک بے ہوش تھا۔ اُس کے سر میں انہوں نے بندوق کا دستہ جو مارا تھا۔ وہ کچھ زیادہ ہی گہرا اثر دکھا گیا تھا۔ خورشید البتہ ہوش میں تھا۔ صابراں اور کریم بی ایک طرف بیٹھیں ان ڈاکوؤں کو بد دعائیں دے رہی تھیں۔ اور سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اُن سب آدمیوں کی لاشیں وہاں سے غائب تھیں جنھیں آبی نے مار ڈالا تھا اور جن میں سے ایک کو میں بے ہوش کر گیا تھا۔

"یہ کیا ہوا خورشید! وہ تمہاری جیپ کہاں گئی؟"

"وہ ۔ وہ تو میاں جی ڈاکو لے گئے وہ اپنے آدمیوں کی لاشیں اس میں بھر کر ابھی بھاگے ہیں۔"

"اور تم دھنیا پی کر بیٹھے تھے یہاں! تمہیں پتہ ہی نہیں چلا کہ تمہارے چاچے آ گئے ہیں۔"

"میاں جی بس بھاڑ کر کے ایک "سٹ" پیچھے سے کسی نے میری کنپٹی پر ماری اور میں الٹ گیا۔ پھر پتہ ہی نہیں چلا کہ ہوا کیا ہے۔"

"اچھا تم اب اٹھو اور ان سب کو بھی دوسری جیپ میں بٹھا کر ہسپتال پہنچاؤ اُدھر بہاولنگر میں، باقی باتیں ہم دیکھ لیں گے۔"

"میرا تو "ڈماک" ہل گیا ہے میاں جی! وہ اشرف لے جائیگا، جیپ کو چلا کر۔ اپنا یہ جلال بھی ڈلیور ہے جی۔" وہ دونوں ہوش میں تھے اور اب خیمے کے الٹے ہوئے بانس اوپر اٹھانے میں مصروف تھے۔

میں نے تمام زخمیوں کو دوسری جیپ میں بٹھایا اور اشرف سے کہا کہ وہ انہیں فوراً ہسپتال لے جائے۔ عبدالحئی، پروڈیوسر، کیمرہ مین اکمل اور عاطف کے علاوہ میں نے سلیم کو بھی جیپ میں ڈال دیا تھا، انہیں فوری طبّی امداد کی ضرورت تھی۔ اتنے میں الماس بھی وہاں آ پہنچی۔ اس نے ہسپتال کی بات سنی تو بولی۔

"ٹھیک ہے ان کو تو فوری علاج کی ضرورت ہے۔ اف میرے اللہ! میرا تو دماغ سن ہو رہا ہے۔" یہ کہہ کر وہ اپنے الٹے ہوئے خیمے کے سامنے ہی ریت پر ڈھے سی گئی۔ صابراں اور کریم بی اُس کے پاس جا بیٹھیں۔ وہ دونوں ایکسٹرا لڑکیاں روبی اور لیلی اس کے لیے دری اور تکیہ اٹھا لائیں اور اسے ریت پر بچھا کر انہوں نے الماس کو اس پر لٹا دیا۔

"ان کے لیے چائے بناؤ کریم بی یہ بہت تھک گئی ہیں۔" روبی نے الماس کا سر دباتے ہوئے کہا۔

اشرف اسی وقت جیپ کو اسٹارٹ کر کے بہاولنگر کی طرف چلنے لگا تو میں بھی اس کے ساتھ جا بیٹھا۔ میں ان دونوں آدمیوں کو اٹھا کر لانا چاہتا تھا جو اُدھر ٹیلے کے پاس ہماری گولیوں سے مر گئے تھے آبی بھی میرے ساتھ آ گیا، بولا۔

"اُن کی لاشیں ادھر لے آنی چاہیئں۔ پتہ تو چلے گا کہ وہ ہیں کون؟ یہ لوگ اُن کو پولیس کے سامنے تو رکھ سکیں گے۔"

"میں اسی لیے ادھر جا رہا ہوں۔ تم یہ بات الماس کو بتا دو۔"

"میں اُسے کہہ آیا ہوں۔"

کچھ ہی دیر بعد جب ہم ٹیلے کی دوسری طرف پہنچے تو یہ دیکھ کر ہم حیران رہ گئے کہ اُن دونوں آدمیوں کی لاشیں وہاں سے غائب تھیں۔ وہ لوگ فلم یونٹ کی جیپ کو لے کر جب ادھر سے نکلے تو اُن آدمیوں کو بھی اٹھا کر لے گئے۔ وہ اس ہولناک واردات کے سارے نشان مٹا گئے تھے اور یہ اچھی بات نہیں تھی۔

"ہمیں اُدھر کیمپ تک واپس چھوڑ آؤ اشرف یہ معاملہ تو الٹا نظر آ رہا ہے۔"

اشرف نے جیپ کا رخ موڑ دیا۔ جب ہم خیموں تک واپس پہنچے تو الماس جو ابھی تک دری پر لیٹی تھی، اٹھ بیٹھی۔

"کیا ہوا؟ واپس کیوں آ گئے ہو اشرف؟"

"میں انہیں چھوڑنے آیا ہوں میڈم۔" اتنے میں ہم دونوں جیپ سے اتر گئے۔

"وہ دونوں لاشیں بھی وہاں سے غائب ہیں میڈم! انہیں موقع مل گیا ہے واردات کے نشان مٹانے کا۔ تم جاؤ یار! اشرف ان کو ہسپتال لے جاؤ۔" آبی نے کہا۔

"میں اُن سے کیا کہوں گا میڈم، وہ پوچھیں گے کہ یہ زخمی کیسے ہوئے؟"

الماس نے استفہامی نظروں سے ہمیں دیکھا، پھر کہنے لگی۔

"ہمارا کوئی آدمی مارا تو نہیں گیا ہے نا؟ کہہ دینا کہ یہ لوگ حادثے میں زخمی ہو گئے ہیں۔ تم ٹھہرو اشرف! میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔ میں اُن کو ساری بات بتا دوں گی۔ آپ تیار ہو جائیں۔"

"ٹھیک ہے میڈم۔" یہ کہہ کر وہ جیپ سے اتر گیا۔ یونٹ کے لوگوں نے مل جل کر خیمے پھر سے استادہ کیے تو ہم دونوں الماس کے ساتھ خیمے میں جا گھسے۔ اس کی سراسیمگی دیدنی تھی اور ہم اپنی جگہ پریشان تھے کہ اگر وہ معاملہ پولیس تک پہنچ گیا تو کیا ہو گا۔ ہم تو کسی بھی صورت میں اُن کے سامنے نہیں جانا چاہتے تھے اور وہ خان غریب نواز خان اپنے اتنے سارے آدمی گنوا کر خاموش نہیں رہ سکتا تھا۔ آبی اپنی جگہ تپا ہوا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ بہاولپور جا کر اس رئیس کے پرزے اڑا دے جس نے یوں بے سر و سامانی کے عالم میں

الماس کو اپنے آدمیوں کے ذریعے اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔ عبدالحئی تو اس وقت ہوش میں نہیں تھا۔ وہ اگر اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکتا تو اسی وقت پولیس تک جا پہنچتا۔

"میں آپ کا کس منہ سے شکریہ ادا کروں آبی صاحب۔ آپ دونوں نہ ہوتے تو آج میں تو تباہ ہو گئی تھی میرے ساتھ وہ خدا جانے کیا سلوک کرتا؟"

"اُسے یہ جرأت ہوئی کس طرح؟"

"بس جاگیر دارانہ مزاج ہے اُس کا ہاشم صاحب! انکار سننے کا عادی نہیں ہے۔ اپنی طاقت کا مظاہرہ اس نے کر ہی دیا۔"

"وہ تو آپ کو لاہور میں بھی چین نہیں لینے دے گا۔" میں نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

"بات تو یہی نظر آتی ہے ہاشم صاحب بمجھے یہ معاملہ پولیس تک ضرور لے جانا ہو گا مگر مشکل یہ ہے کہ وہ ہر نشان مٹا گئے ہیں۔"

"آپ فکر نہ کریں میڈم ہم نمٹ لیں گے اس رئیس زادے سے۔" آبی نے قالین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کیا کریں گے آپ؟ وہ اپنی جگہ پر تو بے تاج بادشاہ بنا بیٹھا ہے۔ پولیس اس کے ساتھ ہے۔ اہلکار اس کی مرضی کے خلاف نہیں چلتے۔ کمشنر، ڈپٹی کمشنر، ایس پی اور دوسرے افسروں کو وہ اپنی مٹھی میں رکھتا ہے۔" الماس نے اپنی بے بسی کا موازنہ کرتے ہوئے کہا۔

آبی نے اپنا پستول الماس کے گورے گورے نرم و نازک پاؤں کے قریب رکھ دیا، بولا۔

"اس بے رحم لوہے کی قسم، میں اس کا سر کاٹ کر آپ کے قدموں میں ڈال دوں گا۔ میڈم یہ میرا آپ سے وعدہ رہا۔" وہ بہت زیادہ سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ اس کی بات میں مجھے اس کی فولادی قوتِ ارادی کی ساری آن بان صاف جھلکتی نظر آ رہی تھی۔ وہ بات کا دھنی آدمی تھا وہ آبی اور اُس نے اب بڑی سنجیدگی سے ایک پتنگیا مان لی تھی۔ الماس نے آبی کا پستول اُسے واپس کرتے ہوئے کہا۔

"اس کے کتنے آدمی مر گئے تھے آبی صاحب! اس خبیث کے؟ مجھے تو کچھ ہوش ہی نہیں رہا۔"

"چھ آدمی۔ ہم نے اس کے چھ آدمی مار دیے تھے اور وہ سب کے سب میری گولیوں سے ہلاک ہوئے۔"

"مگر چھٹا آدمی میری گولی سے مرا تھا۔ مگر اس کے بغیر کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا میڈم۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں مگر بات تھانے کچہری تک پہنچی تو کیا ہو گا، وہ تو آپ کو گرفتار کر لیں گے۔"

"مگر ہم نے تو اپنی حفاظت میں گولی چلائی تھی، سارا یونٹ گواہ ہے۔" آبی نے کہا۔ وہ مجھے آنکھوں ہی آنکھوں میں سمجھا رہا تھا کہ معاملے کے اس پہلو کو بھی نگاہ میں رکھو۔

"آپ ٹھیک کہتی ہیں میڈم میرا خیال ہے ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے تھا۔"

"میں بھی یہی چاہتی ہوں۔ آپ میرے محسن ہیں۔ میں آپ کا یہ احسان کبھی نہ بھول سکوں گی۔ پک اپ یہاں موجود ہے۔ میں کسی کو آپ کے ساتھ بھیج دیتی ہوں، آپ یہاں سے فوراً نکل جائیں۔" وہ خوفزدہ تھی۔ رنگ اس کا ٹھہر ٹھہر کر بدلتا تھا۔ ایسی ہولناک صورتِ حال تو اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی تھی۔

"ہاں میرا خیال ہے ہم یہی کرتے ہیں لیکن ابھی ہم بہاولپور کا رُخ کریں گے۔ معلوم تو ہونا چاہیے کہ وہ رئیس کیا کر رہا ہے۔"

"اگر آپ ایسا کر سکیں تو اور کیا چاہیے مجھے۔ ٹھہریں میں آپ کو سفر خرچ کے لیے کچھ رقم دے دیتی ہوں، ہو سکتا ہے آپ کو ضرورت ہو۔" یہ کہہ کر وہ اٹھی اور ایک اٹیچی کیس میں سے پانچ ہزار روپے نکال کر اس نے آبی کے سامنے رکھ دیے۔

"یہ اپنے ساتھ رکھ لیں۔ بُرا نہ مانیں آپ سفر میں ہیں اس لیے یہ حقیر سی رقم پیش کر رہی ہوں۔"

"اس کی کیا ضرورت تھی میڈم۔ پیسہ بہت ہے، ہمارے پاس ہم شہر پہنچتے ہی اپنے بینک سے منگوا سکتے ہیں۔"

"پتہ نہیں کتنی دیر لگے۔ یہ آپ بہرحال رکھ لیں اور مجھے پرسوں آپ میرے گھر بربلیں خان صاحب میں رات کو نو بجے آپ کا انتظار کروں گی۔"

"ٹھیک ہے میڈم۔ ہم پرسوں نہ آ سکے تو کسی اگلے دن ضرور حاضر ہوں گے۔ بہرحال فون پر تو آپ سے بات کر ہی لیں گے۔"

"ہاں یہ میرا نمبر بھی رکھ لیں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے نرم و ملائم پرس میں سے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر مجھے دے دیا۔

کچھ ہی دیر بعد اس نے ہمیں اپنی پک اپ میں بٹھا کر خورشید کے ہمراہ وہاں سے روانہ کر دیا۔ وہ چاہتی تھی کہ اگر اس رئیس نے اپنی اس گھناؤنی واردات کے تمام نشان مٹا دیے ہیں تو وہ بھی اپنے ہاں سے ہمیں ٹہلا دے تاکہ کوئی کچھ نہ جان سکے کہ وہ دو آدمی کون تھے اور ہم بھی یہی چاہتے تھے۔ اسی میں ہماری بہتری تھی۔

خورشید نے پک اپ کو ایسے ریتیلے راستے پر ڈالا کہ اسکی رفتار کسی بھی طرح بڑھ نہیں رہی تھی۔ پھر بھی جوں توں کر کے وہ ہمیں ایک پکی سڑک تک لے گیا۔ وہ بھی ڈھینچوں ڈھینچوں کے بعد پک اپ بار بار ہانپ جاتی تھی۔ ریت اسے راستہ ہی نہیں دیتی تھی۔

پکی سڑک پر پہنچتے ہی اس کی رفتار تیز ہو گئی اور کوئی آدھ گھنٹے بعد ہمیں اُس نے ایک ایسی جگہ اتار دیا جہاں بسیں ٹھہر کر آگے گزرتی ہیں۔ اس جگہ ایک بڑا سا چائے خانہ بنا ہوا تھا۔ ہم نے اندر جا کر ایک پیالی چائے کی پی تو معلوم ہوا کہ وہاں سے بسیں بہاولپور کے لیے بھی مل سکتی ہیں اور ہارون آباد کے لیے بھی۔ تھوڑے سے انتظار کے بعد ہمیں بہاولپور کے لیے بس مل گئی۔ اور ہم اس میں جا بیٹھے۔ بس میں بیٹھتے ہی آبی کو اونگھ آ گئی اور وہ آنکھیں بند کر کے ہر شے سے بے خبر ہو گیا۔ میرا خیال ہے کہ وہ الماس کے خواب دیکھنے لگا تھا۔ اس کا ذکر وہ بڑے والہانہ انداز سے کرتا چلا آیا تھا۔ مگر دبی زبان سے تاکہ کہیں خورشید اس کی باتیں نہ سُن لے۔ ایسے حال ہی میں عورتوں کا جو بیکا پڑا تھا وہ اب اسے بے چین کیے رکھتا تھا۔ اس کا ہر وقت یہی دل چاہتا تھا کہ اس کا تصور عرش پر ہو اور سر پائے ساقی پر۔ وہ میرا جیتی ستی یار ایسا بدل گیا تھا، کچھ ایسا پٹڑی سے اتر گیا تھا کہ اب اسے ہر طرف ہرا ہرا ہی سوجھتا تھا۔ اور میں ڈرتا تھا کہ کہیں اس کی موت کے دن قریب تو نہیں آ گئے ہیں۔ اس پر ایسی مرن ستی چڑھی تھی کہ کیکر پر ٹنگا سُرخ چیتھڑا بھی اسے کسی مٹیار کا لہنگا ہی معلوم ہوتا تھا۔ الماس کی طرف وہ جس تیزی سے بڑھا تھا اس پر میں حیران رہ گیا تھا۔ یہ اسی کے عشق کی تپش تھی جس سے پاگل ہو کر اس نے بے دریغ اتنے سارے آدمیوں کو مار ڈالا تھا۔ اگرچہ اس سارے مہیب المیے میں وقت کی نزاکت اور حالات کے تقاضے کا بھی بڑا دخل تھا مگر آبی کی ہر گولی کے پیچھے بلبلی اسی جذبے نے دبائی تھی جو اچانک ہی اس کے دل میں ابھر کر بے کراں ہو گیا تھا۔ اور اب وہ اپنے ہتھیار کی قسم کھا کر اس سے وعدہ کر آیا تھا۔ کہ وہ اس رئیس کا سر اس کے قدموں میں لا ڈالے گا۔ اور مجھے معلوم تھا کہ اس نے الماس کے گلے میں محض ایک برن مالا ہی نہیں ڈالی قدیم مصریوں کی طرح وہ اپنے سلب کی قسم کھا کر وہاں سے باہر نکلا تھا۔ وہ اُسے اپنی مطلب براری کے لیے بڑی ہی میٹھی بُرکی ڈال آیا تھا۔ الماس نے بھی ایسا آدمی کبھی نہ دیکھا ہو گا۔

میرا ذہن بہت بُری طرح الجھا ہوا تھا۔ اس بلبیر سنگھ کا رقعہ ابھی تک مجھے دہشت زدہ کیے ہوئے تھا۔ اور میں جلد از جلد آسیہ تک پہنچنا چاہتا تھا۔ ڈر مجھے یہی تھا کہ کہیں وہ لوگ اپنی دھمکی کو عملی جامہ نہ پہنا گئے ہوں۔ ایسی صورت میں تو میں کہیں کا بھی نہ رہتا۔ اس بلبیر کا وہ رقعہ اس بات کا غماز تھا کہ وہ پاکستان میں اپنے آدمیوں کے ذریعے میرے حالات و کوائف سے پوری طرح آگاہ ہو چکے ہیں۔ اُن چند الفاظ نے میرے منصوبوں کے پرخچے اُڑا دیے تھے۔ اور وہ میرے لیے بڑی کڑاک دار آگہی ثابت ہوا تھا وہ رقعہ۔ میری بازی پٹتی ہوئی جاتی تھی۔ مجھے جلد از جلد اس کبیر شاہ تک پہنچ جانا چاہیے جس نے خدا جانے کس ناتے سے آسیہ کو اُن بھیڑیوں کے منہ سے چھڑا کر اپنے گھر میں پناہ دے دی تھی۔ کوئی تو تعلق ہو گا اس کا آسیہ سے۔ ورنہ یوں اندھے گوہار میں کسی تن تنہا لڑکی کی دستگیری کون کرتا ہے۔ ایسے بھنور میں پھنسی کشتی کو اس کا ملاح بھی چھوڑ جاتا ہے۔

جب ہم بہاولپور پہنچے تو صبح کے سات بج چکے تھے۔ سورج نے طلوع ہونے کے بعد ہی اپنا رنگ دکھانا شروع کر دیا تھا۔ اور ہمارے کپڑے بہت ہی بے رنگ ہو رہے تھے۔ وہ کریم بی نے دھو تو دیے تھے مگر ان کی آب ہی ماری گئی تھی۔ بس سے اترتے ہی ہم دونوں بازار کی طرف چل دیے۔ آبی کو میں اپنے ساتھ گھسیٹ رہا تھا۔

"یار کدھر جا رہے ہو مجھے اس رئیس سے تو مل لینے دو۔"

"پہلے ڈھنگ کے کپڑے تو پہن لو۔ بر دکھوے کے لیے جانا ہے تو ذرا آدمی کے حلیے میں جاؤ۔"

"ہاں یہ تو بہت ضروری ہے مجھے تو بس یہی افسوس ہے ہم اس الماس کے سامنے بہت ہی گندی حالت میں گئے وہ کیا سوچتی ہو گی۔"

"تیرا میوزک اس پر جما نہیں ہے پیارے! تیرے جیسے تو کئی اُس نے چٹکی میں مسل کر ڈال دیے ہوں گے۔"

"نہیں یار ایسا بھی گھسیارا نہ سمجھ مجھے۔ اس کے گلنار چہرے کا زرِ گل اب میرا ہے۔"

"یہ کیا بلا ہے یہ زرِ گل؟"

"بلا نہ کہہ اسے۔ تُو بس ہے سدا کا کوڑھ مغز آدمی تیری پڑھائی میں کسر رہ گئی ہے پیارے۔"

"تو بات ہی ایسی کرتا ہے یار! کبھی کبھی تو بالکل ہی چکرا دیتا ہے مجھے۔ بتانا یہ کیا چیز ہوتی ہے؟"

"یہ بھی ہوتی ہے۔ پھول کی پتیوں پر وہ خوش رنگ غبار دیکھا ہے کبھی۔ اسے زرِ گل کہتے ہیں میرے بھائی۔ لیاقت تو تیرے پاس سے چھو کر نہیں گئی۔"

"اچھا اچھا! پنڈت دیا رام کے بالک، مگر یاد رکھ وہ تیرے گھسے میں نہیں آئے گی۔"

"آئے گی ضرور آئے گی۔ میں اس کے نام پر اتنے سارے کافروں کو مار آیا ہوں۔ وہ مجھے کبھی نہیں بھول سکے گی۔"

"ہاں بڑا جہاد کیا ہے تو نے۔ خدا ہی خیر کرے۔ پتہ نہیں حالات کیا سے کیا ہو جائیں۔"

"کچھ بھی نہیں ہو گا۔ تو کوئی دو چار کرتے شلوار خرید دے مجھے۔"

میں اسے لے کر ایک دکان میں جا گھسا۔ وہاں سے ہم نے چار چار ململ کے کرتے، شلواریں، بنیانیں، زیر جامے، ٹوتھ برش اور ضرورت کی دوسری چیزیں خرید کر ایک اٹیچی کیس میں بند کیں اور ایک مسجد میں جا کر ہم نے کپڑے تبدیل کیے۔ مسجد سے باہر آ کر

پرانے کپڑے ایک فقیر کو تھما دیئے۔ وہ بیچارا دعائیں دیتا ہوا آگے نکل گیا۔

پیاس سے ہمارا دم نکلا جا رہا تھا۔ آبی نے ایک حلوائی کی دکان پر دہی کا کونڈا دیکھا تو لسی پینے کے لیے اندر جا گھسا۔ دکان خاصی صاف ستھری تھی اور اس کے پچھلے حصے میں نشستیں بڑی آرام دہ تھیں۔ ہم وہاں پاؤں پسار کر بیٹھے تو آبی بولا۔

"اس رئیس کا پتہ کرو۔ اس غریب نواز خان کا۔"

"اس کا خیال چھوڑ دے آبی۔ یوں سمجھ کہ کچھ ہُوا ہی نہیں۔ ہمیں اس چکر میں نہیں پڑنا ہے۔"

"نہیں یار، یہ آختہ خان جیسی باتیں نہ کر مجھ سے۔ میں اُس سے وعدہ کر آیا ہوں۔"

اتنے میں حلوائی کا ملازم ہمارے لیے لسی کے دو گلاس لے آیا۔ آبی نے اس کو روک لیا، بولا۔

"منڈھے! تجھے پتہ ہے خان غریب نواز خان کی حویلی کدھر ہے؟"

"وہ.... تو صاب جی اُدھر کچہری کے قریب ہے۔ یہ جیل ایسی لمبی چوڑی حویلی ہے اُس کی۔"

"وہ نواب صاحب کا رشتے دار ہے؟"

"یہ مجھے پتہ نہیں ہے جناب! رشتے داری کا معاملہ ذرا خفیہ ہوتا ہے نا جی۔"

"کیا مطلب؟ خفیہ کیسے ہوتا ہے؟"

"وہ جی بس میرا اپنا کھیال ہے کہ یہ نیفے کا چاقو ہوتا ہے یہ رشتے داریاں اور رات کو یہ چاقو زیادہ چلتا ہے۔"

"چل اوئے بڑا آیا افلاطون کا بچہ۔ دیکھ تو یار یہ بات کس طرح کرتا ہے یہ سانڈے کا بھانجا۔" آبی نے ایک دم بدمزہ ہو کر کہا۔ دراصل وہ آدمی یوں سیدھا کھڑا ہوا تھا کہ آبی کو خواہ مخواہ ہی وہ بات سوجھ گئی جس پر وہ شخص تاؤ کھا گیا بولا۔

"مجھ سے تمیز سے بات کرو بھائی جی! ہاں، کوئی تمہارا نوکر نہیں ہوں۔"

"اوئے گنڈے شاہ! خدا کا واسطہ ادھر آ جا۔ پھر پھڈا ڈالے گا تو ہم لوگ ان کے ساتھ بھی۔" مالک نے اپنے ملازم کی للکار سن کر اسے دُور سے للکارا۔ گنڈے شاہ پر اس کی ڈانٹ کا خاطر خواہ اثر ہوا اور وہ سر جھکا کر باہر نکل گیا۔

"ہوں! تو پھر کیا خیال ہے چلیں اُدھر ذرا اس کے درشن تو کریں۔"

"چل بھئی، تیرے ساتھ تو قبر تک بھی جانا پڑے گا تو میں جاؤں گا، پر میرا خیال ہے پہلے ہم "شیو" کروا لیں۔ داڑھیاں بڑھ گئی ہیں۔"

"ہاں یہ تو بہت ضروری ہے۔" آبی مطمئن ہو گیا، ورنہ میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ اسے یقین نہیں تھا کہ میں اس کے ساتھ چلوں گا۔ لسی پی کر ہم وہاں سے اٹھے اور پھر ایک حجام سے اپنا حلیہ درست کروا کے ایک رکشہ میں بیٹھے اور غریب نواز کی حویلی کی طرف چل دیے۔

اُس نے ایک کوٹھی کے سفید گیٹ کے سامنے رکشہ روک لیا تھا۔ ایک بڑی سی تختی پر سنہری حرفوں میں خان غریب نواز خان لکھا تھا۔ ہم اپنی منزل پر جا پہنچے تھے۔ رکشہ واپس چلا گیا تو میں نے کہا۔

"اس سے اپنا تعارف کیسے کراؤ گے؟"

"میں بُرہان الدین ہوں اور تم سیف علی خان، ہم دونوں ہی مظفر گڑھ کے زمیندار ہیں۔"

"ٹھیک ہے یہ گھنٹی بجا دو۔" میں نے دروازے کے پہلو میں لگی اطلاعی گھنٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ہماری دستک فوراً ہی مستجاب ہوئی۔ ایک چھریرے بدن کے آدمی نے دروازہ کھول دیا۔

"ہم مظفر گڑھ سے آئے ہیں۔ یہ چوہدری برہان الدین ہیں اور میرا نام چوہدری سیف علی خان ہے۔" میں نے آگے بڑھ کر تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"ہمیں خان صاحب سے ملنا ہے۔" آبی بولا

وہ ہمارے لباس کی تراش خراش اور ہمارے حلیوں کا بنظرِ غائر جائزہ لے کر بولا۔ "میں خان صاحب کو بتا دیتا ہوں جناب! آپ اندر آ کر مہمان خانے میں بیٹھیں۔"

یہ کہہ کر وہ ہمیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے کوٹھی کی طرف لوٹا۔ ہم گیٹ میں داخل ہوئے تو ہمیں اپنے سامنے پختہ اینٹوں کا ایک وسیع صحن نظر آیا جس کے عین وسط میں بیرونی دیوار تک قوس کی صورت میں سرسبز و شاداب لان تھا۔ اُس ملازم نے ہمیں عمارت کے اندر لے جا کر ایک آرام دہ کمرے میں بٹھا کر دو پنکھے چلا دیے، بولا۔

"میں بس ابھی آتا ہوں، خانصاحب شاید اس وقت غسلخانے میں ہیں۔" یہ کہتے ہوئے وہ باہر نکل گیا۔ ہم نے خاندانی رئیسوں کی طرح پانچ سو پچپن کے سگریٹ سے بھرے گول ڈبے اپنے سامنے میز پر رکھے اور پھر ٹانگ پر ٹانگ دھر کر یوں بیٹھ گئے جیسے وہ پُرشکوہ عمارت ہمارے لیے کوئی وقعت نہیں رکھتی ہے۔

وہ ملازم جلدی ہی لوٹ آیا، بولا۔ "خان صاحب غسل خانے میں ہیں۔ آپ کو آدھا گھنٹہ انتظار کرنا پڑے گا۔ وہ لباس تبدیل کریں گے پھر ناشتے کی میز پر بیٹھیں گے، اخبار پڑھیں گے اور پھر کسی اور طرف دھیان دیں گے۔"

"کوئی بات نہیں بھائی! کیا نام ہے تمہارا؟"

"جی میرا نام تفضل حسین ہے۔"

"اچھا اچھا۔ بیٹھ جاؤ نا۔ لو یہ سگریٹ پیو۔"

یہ کہہ کر آبی نے ڈبہ اس کی طرف کھسکا دیا۔ اس سے اپنا وہ ہلکا سا اٹیچی کیس نہیں سنبھل رہا تھا۔ کبھی اسے دائیں طرف رکھتا تھا، کبھی بائیں طرف۔ میں نے اس کی اس حرکت سے زچ ہو کر اسے اٹھایا، اور تپائی سے ذرا دُور رکھ دیا۔

"سامان انسان کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔" آبی میری اس حرکت سے بڑے معنی خیز انداز سے مسکرایا۔

"حیوانوں کی سب سے بڑی نشانی یہی ہے کہ اُن کے پاس سامان نہیں ہوتا۔ کیوں تفضل حسین؟"

"جی چوہدری جی آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ یہ سامان ہی ہے جو غریب نواز کو خان غریب نواز خان اور تفضل حسین کو پھجا بنا دیتا ہے"

"تو سمجھدار ہے یار، پر یہ بہت بُری بات ہے کوئی تجھے پر بھی اپنا روغنی نسخہ آزما ڈالا۔ کوئی شیشی نہ کھلتی ہو تو وہ اس پر فوراً ہی تھوک لگانے لگتا تھا جس سے اس کے پیچ نرم ہو جاتے تھے۔

تفضل خوش ہو گیا، بولا۔ "اتنی طاقت کہاں سے لاؤں چوہدری جی! نوکر آخر نوکر ہی ہے۔ کسی دن مجھے بھی مالک کی خاطر گولی کھانی پڑ جائے گی۔"

"کیا وہ نوکروں کو شوٹ کر دیتا ہے وہ خان غریب نواز خان؟" آبی نے پوچھا۔

"نہیں جی! بلکہ ہمیں جب اپنے دشمنوں کے خلاف بھیجتا ہے تو اُن میں سے دو ایک ہمیشہ ضائع ہو جاتے ہیں۔"

ابھی وہ پھجا یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ ایک تیس پینتیس سال کا دراز قد جوان کمرے میں داخل ہوا۔ وہ سفید واش اینڈ وئیر سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ بُوٹ بھی اس کے سفید تھے مگر وہ بہت ہی بجھا بجھا نظر آتا تھا، جیسے کسی گہری سوچ میں گم ہو۔ پھر بھی وہ ہم سے بڑے تپاک سے ملا اور مصافحے کے بعد ہاتھ پھیلا کر بولا۔

"تشریف رکھیں جناب! آپ پنجاب سے تشریف لائے ہیں نا یہ میری عزت افزائی ہے۔"

"غریب نواز خان آپ ہی کا اسم گرامی ہے؟"

"جی ہاں! جا بھئی پھجے اِن کے لیے کوئی شربت لے آ۔ موسم ایک دم تپ گیا ہے۔" پھجا فوراً ہی وہاں سے ٹل گیا۔

"جی ہاں! اس کا حال بھی آدمی ایسا ہے۔ آدمی بھی تو ایک دم گرم ہو جاتا ہے کبھی اپنے دشمنوں پر کبھی کسی خوبصورت چہرے پر۔"

"یہ خوب کہی آپ نے۔" یہ کہہ کر وہ جیب سے پیکٹ نکال کر سگریٹ سلگانے لگا۔

"آپ نے غریب خانے پر آنے کی کیسے زحمت فرمائی؟ مظفر گڑھ سے آئے ہیں نا آپ؟"

"جی ہاں۔ یہ میرے دوست ہیں چوہدری بُرہان الدین ان کا فلم ایکٹرس الماس سے عرصے سے افیئر چل رہا ہے اسی سلسلے میں یہ اِدھر چولستان کی طرف گئے ہوئے تھے۔"

الماس کا نام سنتے ہی اس نے کان کھڑے کیے۔

"اچھا، یعنی آپ کا مطلب ہے کہ...."

"جی ہاں بڑے گہرے تعلقات ہیں ان کے۔ وہ تو ان کا نام لے کر جیتی ہے۔ اسی نے بلایا تھا انہیں، کہتی تھی شوٹنگ دیکھ جاؤ۔" میں نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ اس کا تجسس اور بڑھ گیا۔

بولا "کمال ہے صاحب! بڑے خوش قسمت آدمی ہیں یہ۔ اس کے لیے لوگ تو دعائیں مانگتے ہیں کہ

وصل اُس کا خدا نصیب کرے
میرؔ جی چاہتا ہے کیا کیا کچھ"

یہ شعر اس نے بڑے ہی حسرت بھرے لہجے میں پڑھا۔

"آپ کا مزاج بڑا ہی شاعرانہ ہے خان صاحب! واقعی بڑا حسبِ حال شعر پڑھا ہے آپ نے" میں نے اسے بھرپور داد دیتے ہوئے کہا۔

"کیا کہوں صاحب! ہاں تو پھر ان کا معاملہ کہاں تک پہنچا ہے؟"

"معاملہ تو بہت دور تک پہنچ گیا تھا مگر کسی۔۔۔۔ نے رات اس کو اغوا کرنے کی کوشش کی اور اس چکر میں الماس شدید زخمی ہو گئی" آبی نے بڑی پُرپیچ گالی دیتے ہوئے کہا۔

غریب نواز کا رنگ فق ہو گیا، بولا "یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ اس سوال کا جواب نہیں چاہتا ہے۔

"آپ کو تو پتہ ہی ہوگا خان صاحب آپ کو تو وہ لوگ بتا کر صحرا کی طرف نکلے تھے" آبی اب اس سے بڑے ہی خشمگیں لہجے میں مخاطب تھا۔

"جی نہیں! مجھے اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔ میں دراصل ایسے لوگوں سے دور ہی رہتا ہوں"

"کمال ہے۔ حالانکہ ہمیں الماس نے ہی بھیجا ہے، اسے ہم ابھی ہسپتال میں داخل کروا کر آئے ہیں۔ اس کے پیٹ میں گولی لگی ہے جب اُسے ہوش آیا تو اس نے مجھ سے کہا کہ ہم آپ کو بلا لائیں"

"اچھا! کہاں ہے کس ہسپتال میں ہے وہ؟ میں فون پر معلوم کرتا ہوں"

"اس کی حالت بہت نازک ہے ویسے جس شخص نے اُن پر حملہ کروایا، اُس کے چھ آدمی وہاں صحرا میں مارے گئے ہیں"

اتنے میں پھجا بلوریں جگ میں شربت بھر کے لے آیا۔ اُس نے ایک ایک گلاس بھر کر ہمیں دیا۔ تو خان بولا۔

"تم چلو ادھر بیٹھو۔ اس اللہ یار سے کہو گاڑی نکالے"

یہ کہہ کر غریب نواز نے گلاس منہ سے لگا لیا۔ وہ ہم سے آنکھ نہیں ملا رہا تھا جب وہ گلاس حلق میں اتار چکا تو رومال سے ہونٹ صاف کر کے سگریٹ کے گہرے کش لینے لگا۔ میں نے براہ راست مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

"برہان الدین صاحب نے آپ کو صحیح بات نہیں بتائی ہے خان صاحب دراصل آپ نے جن لوگوں کو الماس کے اغوا کے لیے بھیجا تھا، اُن میں سے چھ آدمی وہاں مارے گئے تھے اور ہم آپ سے یہ پوچھنے آئے ہیں کہ اب آگے آپ کا کیا پروگرام ہے"

میری یہ بات سن کر وہ آدمی ایک دم کرسی پر سے اٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ کڑکتے ہوئے لہجے میں بولا۔

"مجھ سے یہ بات پوچھنے کا حق آپ کو کس نے دیا ہے؟ کون بدمعاش کہتا ہے کہ میں نے الماس کے پیچھے آدمی بھیجے تھے؟"

"شانتی خان جی شانتی۔ ہم سے کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں ہے میرے ویر! ہم تو یہ پوچھنے آئے ہیں کہ اب الماس کے لیے آپ اور ہمیں کیا کرنا ہے۔ کیا ہم یہ معاملہ پولیس تک لے جائیں؟"

"آپ جو جی میں آئے کریں، میرا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں نے اپنے کسی آدمی کو صحرا کی طرف نہیں بھیجا تھا"

"چند دن پہلے آپ الماس کو یہی دھمکی دے کر آئے تھے نا، کہ آپ انکار سننے کے عادی نہیں ہیں"

ابھی وہ یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ پھجا بھاگتا ہوا اندر آ گیا، بولا۔

"خان جی! وہ۔۔۔ وہ پولیس"

"کیا بکتے ہو؟" غریب نواز کڑک کر بولا۔

"وہ تیغ علی نے دروازہ کھول دیا تھا خان جی"

"انہیں دوسرے کمرے میں بٹھاؤ۔ میں ابھی آتا ہوں"

غریب نواز نے رومال سے اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

"آپ کا نقصان زیادہ ہوا ہے خان جی! ذرا دبنگ ہو کر جائیں ہم آپ کا یہیں بیٹھ کر انتظار کریں گے" میں نے صورتحال کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے بڑے نرم لہجے میں کہا۔

"آپ فکر نہ کریں ہم آپ کے دشمن نہیں دوست ہیں" آبی نے اٹھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

وہ کچھ مطمئن سا ہو گیا، بولا۔

"یوں لگتا ہے جیسے اس معاملے کی ساری تفصیل آپ کے علم میں ہے۔ آپ نے ہی تو پولیس کو۔۔۔"

"نہیں واللہ! اس میں ہمارا کوئی ہاتھ نہیں ہے آپ بہرحال جائیں اور یاد رکھیں وہ الماس زندہ سلامت ہے۔ اسے کوئی گولی نہیں لگی تھی۔ پولیس کو اُسی نے ادھر بھیجا ہوگا" میں نے غریب نواز کو مزید مطمئن کرتے ہوئے کہا۔

"یہ بات بتا کر آپ نے میرے دل سے بہت بڑا بوجھ اتار دیا ہے بہرحال میں دیکھتا ہوں آپ ادھر ہی تشریف رکھیں" یہ کہہ کر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ ہم نے فوراً ہی اندر سے کنڈی چڑھا لی۔ ہم بہاول پور پولیس کے سامنے بھی نہیں جانا چاہتے تھے۔ کیا پتہ انہیں بھی بار لوگوں نے ہماری تصویریں بھجوا

رکھی ہوں۔"
کوئی بیس منٹ بعد پہلو کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ "دروازہ کھولیں چوہدری صاحب میں بھیجا ہوں۔" آبی نے اٹھ کر وہ دروازہ کھول دیا۔ تو خان کا ملازم تیزی سے اندر آ گیا بولا "چوہدری جی! یہ قصّہ کیا ہے؟ خان صاحب تو پولیس کے ساتھ باہر چلے گئے ہیں۔ مجھے کہہ گئے ہیں، میں آپ کی ہر ضرورت کا خیال رکھوں اسی لیے میں اِدھر آ گیا ہوں۔ یہ دروازہ باہر سے خان صاحب خود بند کروا گئے ہیں۔
"وہ کیوں؟ ہمیں باندھنا چاہتے ہیں وہ؟"
"نہیں بلکہ وہ پولیس کو یہ بتانا چاہتے تھے کہ اس کمرے میں کوئی نہیں ہے۔"
"اچھا! پولیس نے کیا کہا ہے اُن سے؟"
"وہ تو جی کہہ رہے ہیں کہ کسی فلم ایکٹرس پر خان صاحب نے حملہ کروایا ہے۔ اس نے بہاول نگر جاکر دہائی مچا دی ہے۔"
"ہوں! وہ تو یہی کرے گی۔ غریب نواز اسے اغوا کرنا چاہتا تھا۔"
"صبح سویرے دو بندوں کی لاشیں آئی تھیں جی۔ نذیرے اور شادو کی۔ انہیں گولی لگ گئی تھی خان صاحب نے فوراً انہیں گاؤں بھیج دیا۔ کمال پور۔"
"کیوں وہاں کیوں بھیج دیا؟"
"اُدھر وہ کہیں راستے میں دفن کر دیں گے نہیں اور کس لیے۔
پر چوہدری جی ہوا کیا تھا؟"
"جن پر ان لوگوں نے حملہ کیا، انہوں نے ہی انہیں مار دیا ہو گا۔"
"یہی ہوا ہو گا چوہدری جی! دونوں میرے پکے یار تھے۔ پر بے موت مارے گئے، اب اُن کے گھر والوں کو پانچ پانچ ہزار روپے مل جائیں گے اور سال بھر کا دانہ پھکّا۔"
"کون دے گا یہ رقم؟"
"خان صاحب دیں گے، اور کون دے گا۔ خرچہ نذیرے کی بیوی کو ملے گا اور شادو کی ماں کو۔ بیچاری دونوں برباد ہو گئیں۔"
"ایسی نوکری میں تو یہی کچھ ہو گا۔ پر یہ غریب نواز چاہتا کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔
"وہ جی بس اس ایکٹرس کو گھر میں ڈالنا چاہتے ہیں، پر وہ مانتی ہی نہیں۔ مگر مجھے یہ پتہ نہیں تھا کہ یہ اُسے اٹھوا ہی لیں گے۔"
"وہ اٹھنے والی آسامی نہیں ہے بھیجے! دیکھ، جیسے ہی وہ خان صاحب واپس آئیں، اُن سے ہمیں ملواؤ۔"
"وہ خود آ جائیں گے جی اِدھر! بہت پریشان ہو گئے ہیں وہ۔"
"کوٹھی میں اُن کے بیوی بچے بھی ہوں گے؟"
"نہیں جی! وہ تو اُدھر گاؤں میں رہتے ہیں پنجند کے پاس اُن کی جاگیر ہے۔" بھیجے نے کہا۔
میں کرسی سے اٹھ گیا۔ مجھے وحشت ہونے لگی۔ احساس مجھے یہ ہو رہا تھا کہ وہ آدمی ہمیں وہاں مقفل دروازے کے پیچھے چھوڑ کر بے مقصد نہیں گیا ہے۔
"اٹھ جائیں صاحب! ہمیں یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرنا ہے دیکھ بھیجے میری بات غور سے سن۔ خان صاحب واپس آئیں تو انہیں بتا دینا کہ اگر وہ اپنی جان کی خیر چاہتے ہیں تو الماس کا پیچھا چھوڑ دیں ورنہ ہم اس کے پورے خاندان کو ختم کر دیں گے۔ یہ بات اس کو بول دو۔ رات اس کے چھ آدمی مارے گئے۔ اب زیادہ مریں گے سمجھتے ہو۔ اب یہ دروازہ کھول کر ہمیں باہر کا راستہ دکھاؤ۔" یہ کہہ کر میں نے پستول بھیجے پر تان لیا۔
وہ مفلوج ہو کر رہ گیا، ہکلاتے ہوئے بولا۔
"ٹھیک ہے چوہدری جی میں اس کو بول دوں گا، بالکل بول دوں گا مگر میرا کوئی قصور نہیں ہے جناب! آپ آ جائیں میرے پیچھے آ جائیں۔"
یہ کہہ کر وہ پہلو کے دروازے کو کھول کر آگے بڑھا اور ایک چھوٹے سے بیڈ روم میں سے گزار کر راہداری میں جا پہنچا۔ ہم دونوں اس کے ساتھ بھڑ کر چل رہے تھے۔ وہ دائیں ہاتھ مڑا اور ایک آہنی جالی والے بڑے سے دروازے کو کھول کر برآمدے میں جا پہنچا وہاں چار مسلح آدمی چارپائیوں پر بیٹھے تھے۔ وہ اس کوٹھی کا عقبی حصہ تھا۔
"ہمیں بڑے دروازے تک لے چل بھیجے اور سیدھا ہو کر چل۔" میں نے بھیجے کے کان میں سرگوشی کی پستول میں نے اس کی لمبی سی قمیص کے پچھلے دامن کے نیچے چھپا کر اس کی کمر سے لگا رکھا تھا۔ بھیجا پھرکی کی طرح گھوما اور عقبی حصے سے گزار کر ہمیں بڑے گیٹ تک لے گیا۔ میں نے پستول پیچھے ہٹا کر نیفے میں اُڑس لیا۔
"ناراض نہ ہونا بھیجے۔ تمہاری نیت کا ہمیں پتہ نہیں تھا بہرحال خان کو ہمارا سلام بولو اور ہمارا پیغام اس کے دماغ میں اچھی طرح اتار دو۔"
"ٹھیک ہے چوہدری جی! میں انہیں بتا دوں گا۔" اس نے تیزی سے گیٹ کھول دیا۔ اور ہم سڑک پر پہنچتے ہی تانگے میں بیٹھ کر اسٹیشن کی طرف چل دیے۔
"یار اتنی جلدی وہاں سے نکلنے کی کیا ضرورت تھی؟" آبی نے اٹیچی کیس مجھے دیتے ہوئے کہا۔ وہ اسے سیٹ پر بھی رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ مرضی اس کی یہی تھی کہ وہ بوجھ میں اٹھاؤں۔
"یہی بہتر تھا بچے! وہ خان ملیامیٹ خان اگر پولیس کو ہم پر سوار کر دیتا تو؟"
"ایسا کرنا ہوتا تو اس کے لیے بڑا موقع تھا۔"
"نہیں! اس وقت وہ اپنے حواسوں میں نہیں تھا۔ پولیس اچانک

ہی آ پہنچی تھی۔"
"ہاں یہ بھی ہو سکتا ہے، چل دفع کر۔ میں الماس سے اب لاہور ہی میں مل لوں گا۔"
"اس پر لعنت بھیج۔ ہمیں کیا لینا ہے اس عشوہ فروش سے۔"
"ایک تو تیری یہ فارسی مجھے لے ڈوبی ہے۔ وہ رشکِ جہاں مہتاب ہے بیٹے وہ الماس۔"
"وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر یہ پاگل پن ہے آبی! میری مصیبتوں کا ہی تو اندازہ کر۔"
"ہم سیدھے ساہیوال ہی جا رہے ہیں یار! اس کبیر شاہ کو آج ہی پکڑتے ہیں۔"
"یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔ میں آسیہ کو آج ہی اس کے ہاں سے لے کر کسی محفوظ جگہ پر پہنچانا چاہتا ہوں۔"
"فکر ہی نہ کر، اور ہمیں کرنا ہی کیا ہے ایک ہماری بہن اس عذاب سے چھوٹ جائے، پھر عیش ہی عیش ہے۔ میں الماس سے یہ اداکاری تو فوراً ہی چھڑوا دوں گا۔"
"تیرا بھی جواب نہیں ہے یعنی تو انڈوں کی ٹوکری سر پر رکھے بغیر ہی خواب دیکھ رہا ہے۔ تیرے نکاح میں آ جائے گی وہ؟"
"بالکل! مجھ سے اچھا شوہر اسے کہاں مل سکتا ہے؟"
"اور وہ تیرے عابد کی ماں! اس کا کیا ہوا؟"
"وہ تو بس 'اینویں' ہی تھی۔ اصل چیز تو اب نظر آئی ہے مجھے۔ کیڈلک کار ایسی ہے یار، یہ الماس۔ اس کے پرزوں کا جواب نہیں، کیسی چمکارے مارتی ہے۔ اللہ اللہ وہ مجھ سے۔۔۔ ہوئے۔۔۔ ہم۔۔۔ کلام۔۔۔ اللہ اللہ۔"
آبی کا موڈ عجیب و غریب ہوتا جا رہا تھا۔ وہ سنجیدگی ۔۔۔ وہ متانت جو اس کے کردار کا طرۂ امتیاز تھی ختم ہوتی جا رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ اس کی یہ ماہیتِ قلب کہیں میری راہ کی رکاوٹ نہ بن جائے۔
"تیرا دماغ خراب ہوتا جا رہا ہے آبی! یہ راستے ہمیں راس نہیں آئیں گے۔"
تانگہ ہمیں لے کر اسٹیشن پہنچا تو معلوم ہوا کہ لاہور کے لیے گاڑی بس چند منٹ تک پہنچنے والی ہے۔ ہم نے ٹکٹ خریدے اور پلیٹ فارم کی طرف بڑھے مگر آبی کی نگاہ سامنے کی سڑک پر جا پڑی تو مجھے اس کی پتلیوں میں عجیب سی حیرت ابھرتی نظر آئی میں نے رک کر سامنے نظر ڈالی تو آبی کا تحیّر میری سمجھ میں آنے لگا۔ سامنے پولیس کی ایک جیپ رک رہی تھی جس کی اگلی نشست پر سے ایک پولیس افسر اچھل کر باہر نکلا۔ خان غریب نواز خان اس کے پیچھے تھا جیپ کے پچھلے حصے میں دس بارہ سپاہی رائفلیں ہاتھوں میں لیے لپکا ہوتی ہوئی فوج کی طرح اُترے۔ انہوں نے اسٹیشن کی عمارت کے اندر ہمیں

دیکھ لیا تھا۔ ارد گرد مسافروں کا اژدھام مچا تھا۔ غریب نواز انگلی کے اشارے سے پولیس افسر کو ہمارے بارے میں کچھ بتا رہا تھا۔

میں نے آبی کو اپنے ساتھ گھسیٹا اور ہم برق رفتاری سے پلیٹ فارم کی طرف دوڑے۔ گاڑی اس وقت تک اسٹیشن پر پہنچ چکی تھی اور اب چلنے ہی والی تھی بہاولپور کے مسافر اس میں بیٹھ چکے تھے اور جن کو اترنا تھا وہ اتر چکے تھے۔ گارڈ نے وسل بجائی جب ہم گاڑی تک پہنچے تو وہ چل چکی تھی۔ ہم بھاگتے ہوئے گاڑی کے آخری سے پہلے ڈبے میں سوار ہوئے تو اس وقت پولیس انسپکٹر پلیٹ فارم کے دروازے پر کھڑے ٹکٹ کلکٹر کو دھکا دے کر آگے آ چکا تھا۔ اس نے لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی ہوئی گاڑی میں سوار ہونے کی بہت کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ غریب نواز اس کے ساتھ تھا اور پولیس کے سپاہی اس کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ ان کے سامنے سے ساری گاڑی گزر گئی اور وہ ہاتھ ہی ملتے رہ گئے۔

خطرہ وقتی طور پر ٹل گیا تھا مگر میں جانتا تھا کہ ہم ابھی تک ان کی زد سے باہر نہیں نکلے۔ اگلے اسٹیشن پر گاڑی رکوا لیں گے۔ ہمارے وہاں پہنچنے سے پہلے وہ پولیس کو خبردار کر کے ہمارے پیچھے لگا دیں گے ریلوے پولیس بھی ان کے اشارے پر حرکت میں آ سکتی تھی۔ گاڑی کے ساتھ بھی تو بہت سے سپاہی سفر کر رہے ہوتے ہیں سارا علاقہ ہی مجھے زیر و زبر نظر آتا تھا۔ ہم ایک الگ تھلگ نشست پر بیٹھے تو آبی نے ایک گالی اس غریب نواز خان کو دیتے ہوئے کہا

"یار تو نے اچھا کیا وہاں سے نکل آیا۔ ورنہ تو وہ ہمیں چوہے کی موت مار دیتا۔"

"ہم ابھی تک ان کی زد میں ہیں آبی! آگے چل کر کسی جگہ گاڑی روک! ہم راستے میں اتر جائیں گے۔"

"ہاں یہ بہت ضروری ہے۔ وہ لوگ ہمارے تعاقب میں ہیں یار کیسی رذی قسمت ہے ہماری۔ ہر جگہ پھڈا۔ ہر جگہ لفڑا!"

"اس کے تو چھ آدمی مار آیا ہے بیٹے! وہ تجھے کیسے چھوڑ دے گا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے پر اس طرح کسی شریف آدمی کو تنگ کرنا کہاں کی انسانیت ہے۔ لے یہ سگریٹ پی۔ میں اس کو پھنساتا ہوں اس فقیر کو۔ زنجیر یہ کھینچے گا۔"

آبی نے پچھلی نشست پر بیٹھے ایک حال مست فقیر پر نگاہ ڈال کر کہا۔ وہ بڑی رحم طلب نظروں سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ آبی نے ایک سگریٹ اسے دیا تو وہ خوش ہو گیا۔ آبی نے کہا۔

"ادھر آ جاؤ سائیں جی ہمارے پاس بیٹھو۔ بڑے اللہ والے نظر آتے ہو مجھے۔" اس کی بات سنتے ہی وہ فقیر کود کر ہمارے پاس ڈبے کے فرش پر آ بیٹھا۔

"کیا نام ہے سائیں جی تمہارا؟"

"میرا نام چاندی سائیں ہے جی! بابا فرید کا منگتا ہوں۔"

"بڑی کرنی والا نظر آتا ہے تو مجھے۔"

"اللہ! اللہ کرنی والا ہے بابا! میں کتا کون؟"

"کیوں نہیں تم چاہو تو اپنی کرامت سے گاڑی روک سکتے ہو روک سکتے ہو نا؟"

"بس جی! میرا مولا جو چاہے کر سکتا ہے۔ میں کتا کون۔"

"لے یہ پکڑ یہ سو کا نوٹ! میں نے گاڑی رکتے کبھی نہیں دیکھی۔ بس یہ زنجیر کھینچ دے کسی جگہ۔ اگلا اسٹیشن آنے سے پہلے روک دے۔"

"وہ ماریں گے جی مجھے۔ سپاہی ساتھ چلتے ہیں گڈی کے۔"

"کچھ نہیں کریں گے۔ جرمانہ دے دینا۔ یہ رہے جرمانے کے پچاس روپے بھی۔"

"پھر تو کوئی مشکل نہیں ہے بابا لوگ! ذرا مسخری کرو گے؟"

"ہاں! ہمارا نام مت لینا۔ ذرا رونق ہی دیکھ لیں گے!"

"ٹھیک ہے بابا لوگ ایسا ہی ہو گا۔ مجھے اشارہ کر دینا جہاں چاہو گڈی روک دوں گا پر وہ قید تو نہیں کر دیں گے؟"

"نہیں سائیں جی! تم اللہ والے آدمی ہو۔ تمہیں کون قید کرے گا۔ بس سو تمہارے اور پچاس جرمانے کے۔"

"فکر ہی نہ کرو بابا جی روک دوں، اب کھینچ دوں رسی؟" وہ اٹھنے لگا۔

"ابھی نہیں! جب ہم اشارہ کریں تب۔"

آبی اپنی قسم کا واحد بدمعاش آدمی تھا۔ وہ اس بیچارے سائیں کو خواہ مخواہ اس چکر میں پھنسا رہا تھا حالانکہ وہ خود بھی اس زنجیر کو کھینچ سکتا تھا مگر اسے مزہ آ رہا تھا اس سائیں کو مصیبت میں پھنسا کر۔ وہ خود چپ چاپ اترنے کی فکر میں تھا۔

✿✿✿

اس مقبول سلسلے کے بقیہ واقعات تیسرے حصے میں ملاحظہ کیجیے۔

اسوسی ڈائجسٹ کا مشہور سلسلہ
گمراہ
حصہ سوم

عرضِ ناشر

جاسوسی ڈائجسٹ کے مقبول ترین سلسلے گمراہ کا تیسرا حصّہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ ہم معذرت خواہ ہیں کہ اس حصّے کے لیے آپ کو انتظار کی خاصی زحمت اٹھانا پڑی۔ دراصل ڈائجسٹوں کے سلسلے کتابی شکل میں تیار کرنا بڑا پیچیدہ اور وقت طلب کام ہے اور اس سلسلے میں اندازے اکثر غلط ثابت ہو جاتے ہیں۔

"اندازے" دونوں طرح کے! وقت کے سلسلے میں بھی اور ضخامت کے سلسلے میں بھی۔

ہم نے اپنے اشتہارات میں گمراہ کو چار حصّوں میں پیش کرنے کا اعلان کیا تھا لیکن چار حصّے تیار ہونے کے بعد بھی دو حصّوں کے مزید صفحات ابھی موجود ہیں۔ نیز جاسوسی ڈائجسٹ میں بھی یہ کہانی ابھی جاری ہے۔ اس لیے ابھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ کہانی کب ختم ہوگی اور کتنے حصّوں میں آئے گی۔

صرف یہ ہی عرض کر سکتے ہیں کہ تیسرا اور چوتھا حصّہ تو آپ کے ہاتھوں میں ہے (کیونکہ دونوں حصّے ایک ساتھ شائع ہو رہے ہیں۔)

بہت جلد پانچواں اور چھٹا حصّہ بھی پیش کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد دیکھیں کہ بقیہ کہانی کتنے حصّوں میں آتی ہے۔

ڈائجسٹوں کے شوقین قارئین کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ پچھلے دنوں ہمارے ادارے نے سسپنس ڈائجسٹ کا ایک انتہائی دلچسپ اور اپنے وقت کا نہایت مقبول سلسلہ "طالوت" بھی کتابی شکل میں شائع کیا ہے۔ یہ مکمل کہانی صرف ۳ حصّوں میں ہے۔ اس کہانی کے بارے میں صرف اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ ماضی میں لوگ سسپنس کا انتظار صرف اس کہانی کے لیے کرتے تھے۔

بہت سے حضرات نے ہماری توجہ اس امر کی طرف بھی دلائی ہے کہ چھوٹے چھوٹے شہروں میں ہماری کتابیں جلد ختم ہو جاتی ہیں اور ہم سے براہِ راست کتابیں منگوانے میں ڈاک خرچ بھی خریدار کو دینا پڑتا ہے۔ اس طرح کتاب کافی مہنگی پڑتی ہے۔

اس سلسلے میں ہم پہلے بھی اعلان کر چکے ہیں اور اب پھر یہ وضاحت کرنا چاہتے ہیں کہ کم از کم ۲ عدد کتابیں جن کی قیمت ۸۰ روپے سے کم نہ ہو، منگانے پر ڈاک خرچ ادارہ ادا کرے گا۔

اس لیے اس پیشکش سے فائدہ اٹھائیں اور براہِ راست کتابیں ہم سے طلب فرمائیں۔

جبار توقیر

گاڑی بہاول پور سے کوئی سات آٹھ میل آگے نکلی تو اس نے اس الجھے ہوئے بالوں والے میلے کچیلے خارش زدہ سائیں کو اشارہ کر دیا کہ وہ زنجیر کھینچ دے۔ سائیں اٹھا اور چور نگاہوں سے تمام بے خبر مسافروں کو دیکھتا ہوا دروازے تک جا پہنچا۔

اب اس کا ہاتھ زنجیر پر پڑ چکا تھا۔ آبی نے مجھے کہنی ماری اور ہم دونوں اٹھ کر اس بڑے سے چار کمروں اتنے لمبے ڈبے کو عبور کر کے دوسرے دروازے پر جا ٹھہرے۔ ہماری نظریں سائیں پر جمی تھیں۔ اس نے حق ہُو کا نعرہ لگایا اور زنجیر کھینچ دی۔ چناب ایکسپریس کی ہوا سرک گئی۔ اور اس کی رفتار ایک دم مدھم پڑنے لگی۔ کچھ ہی دور جا کر گاڑی رک گئی تو ہم تیزی سے اتر کر یوں چلنے لگے جیسے ہمارا اس سے کوئی واسطہ ہی نہیں ہے۔ آخری ڈبے کے قریب سے گزر کر ہم نے ریلوے لائن عبور کی اور سامنے اُگے سرکنڈے اور کیکر کے جنگل میں جا گھسے۔ مجھے معلوم تھا کہ وہاں سے کچھ فاصلے پر پختہ سڑک گزرتی ہے۔ میں آبی کو اپنے ساتھ لے کر دوڑتا ہوا تیزی سے اُدھر چل نکلا۔

"تیرے ساتھ پتہ نہیں کہاں کہاں خوار ہونا پڑے گا جیلانی تو بہت گندی قسمت لکھوا کر لایا ہے۔"

"میری ماں بھی یہی کہا کرتی تھی۔ پتہ نہیں وہ بیچاری کس حال میں ہو گی۔" مجھے اپنے دل پر گھونسہ سا لگتا محسوس ہوا۔ وہ بدنصیب مجھے کیسی بے سروسامانی کے عالم میں یاد آئی تھی۔

"تو اس کے لیے کوئی رقم شکم بھی چھوڑ آیا تھا کہ نہیں؟"

"ہاں! لمبے ہی پیسے دے آیا تھا میں اسے۔ پر یار اس پچھاڑی نے تیری ماں کو رقم کہاں پہنچائی ہو گی۔"

"مجھے بھی شک ہی ہے۔ میں لاہور پہنچ کر سب سے پہلے ماں سے ملوں گا۔ وہ تو میرا فاتحہ پڑھ بیٹھی ہو گی۔"

اچانک ہمیں گاڑی کی لمبی ہولناک سیٹی سنائی دی۔ ڈرائیور نے اس سائیں سے نپٹ کر گاڑی چلا دی تھی اور کسی کو ہمارے تعاقب میں آنے کی توفیق نہیں ہوئی تھی کیسی کے وہم و گمان میں یہ بات نہ ہو گی کہ گاڑی کس نے کس مقصد سے رکوائی تھی۔

جب ہم پختہ سڑک پر پہنچے تو تھکن سے دونوں نڈھال ہو رہے تھے۔ پیاس نے جان الگ شکنجے میں ڈال رکھی تھی۔ صحرا کا سورج بھی شاید سوا نیزے پر آ ٹھہرا تھا۔ ہم دونوں کے کپڑے پسینے میں بھیگ گئے تھے۔ سڑک پر کھڑے ہوئے ابھی ہمیں دس منٹ ہی گزرے تھے کہ ایک بس ہمیں رحیم یار خاں کے لیے مل گئی اور ہم اس میں سوار ہو کر آگے چل دیے۔

ہمیں جو نشست ملی اس کے دائیں ہاتھ کی نشستوں پر تین برقعہ پوش خواتین بیٹھی تھیں۔ انہوں نے پانی ایک صراحی میں بھر کر آگے رکھا تھا۔ صراحی پر دھرا شیشے کا گلاس ہمارے صبر کا امتحان لینے لگا۔ آبی سے نہ رہا گیا۔ ایک خاتون کے ہاتھ میں کھجور کا پنکھا دیکھ کر بولا" باجی ذرا یہ پنکھا ہمیں دے دیں۔ ہم تو ہاف بوائل ہو گئے اس دھوپ میں۔"

اس خاتون نے ہمیں یوں پسینے میں نہائے ہوئے دیکھا تو ازراہِ ہمدردی وہ پنکھا فوراً ہی آبی کو تھما دیا اور وہ تیزی سے اپنا گریبان کھول کر پنکھا جھلنے لگا۔ بڑی ہی دارالعرفانی زبان میں بولا۔

جزاک اللہ بی بی جزاک اللہ۔ مرحبا میدانِ جنگ میں زخمی مجاہدوں کو پانی پلانے سے کہیں زیادہ ثواب بارک تعالےٰ آپ کو اس پنکھے کے لیے دے گا۔ جو آپ نے ہمیں عطا فرمایا۔“ وہ تینوں خواتین برقعوں میں چوڑیاں توڑنے لگیں۔ وہ کھنک کھنک ہنس رہی تھیں۔

میں نے اس کی پسلی میں کہنی ماری ”ابے تو خاموش نہیں رہ سکتا! زبان بند رکھ اپنی۔“ کئی مسافر بھی سر گھما گھما کر ہمیں دیکھنے لگے تھے۔ ہمارے تمتماتے چہروں پر پسینے کی لکیریں خود بولتی تھیں کہ ہمیں پنکھے کی ضرورت ہے مگر یوں مولوی قدرت اللہ ہزاروی بننے سے فائدہ ہی کیا تھا۔ اس نے خواہ مخواہ لوگوں کو متوجہ کر لیا تھا۔

”یار کبھی مجھے آزادی سے بھی بات کر لینے دیا کر۔ تیرا یہ سنسر ایک دم واہیات ہے۔“ پھر ذرا بلند آواز میں بولا ”بہن جی اگر ہمیں پانی پلا دیں تو پروردگار بڑا رحیم و کریم ہے آپ کو اس کا بڑا اجر دے گا۔“

درمیانی خاتون نے فوراً ہی ایک گلاس بھر کر آبی کے ہاتھ میں تھما دیا۔ آبی کی پیاس بجھی تو اس خاتون نے مجھے بھی سیراب کر دیا۔

عین اس وقت اُن کے سامنے کی نشست کے دو آدمیوں نے سگریٹ سلگا کر دھوئیں کا ایک زبردست طوفان جو اٹھایا تو خواتین تیزی سے اپنے برقعے پھڑپھڑانے لگیں۔ وسطی خاتون کے دائیں بائیں کی خواتین نے اس تگ و دو میں ہمیں اپنے چہرے بھی دکھا دیے۔ وہ چھنا ہوا شربتِ دیدار آبی نے پیا تو میری پسلی میں کہنی مار کر بلند آواز سے بولا۔

”بھائی! یہ حقے بازی بند کر دیں کیوں بیچاری خواتین کو عذاب میں ڈالتے ہو۔ تمہارے گھر میں بھی مائیں بہنیں ہوں گی جو حقے سگریٹ پر لعنت بھیجتی ہوں گی۔“

ان دونوں آدمیوں نے سر گھما کر آبی کو بڑی قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ وہ اس کے دبنگ لہجے سے جل بھن کر رہ گئے تھے۔ ان میں سے ایک تنک کر بولا۔

”بڑا خیال ہے آپ کو بیبیوں کا تو ان کے لیے علیحدہ بس کروا دی ہوتی۔“

”بس تو میں آپ کو کروا سکتا ہوں بڑے بھائی! پر میں سفر میں ہوں۔ دوسرے مسافروں کا تو سکھ بھی خیال کرتے ہیں۔ آپ کیسے مسلمان ہیں۔ کیسے کلمہ گو ہیں آپ۔ پروردگار سے کچھ تو ڈریں۔ عنداللہ انہیں معاف کر دیں۔ اس بس میں سوار ہونے کا گناہ بخش دیں کیوں جناب میں ٹھیک عرض کر رہا ہوں؟“ آبی نے سامنے کی نشست پر بیٹھے ایک باشرع آدمی سے پوچھا۔

اس کی مشت بھر لمبی داڑھی اور کندھے پر پیلا صافہ سر پر سفید پگڑی یہ بتاتی تھی کہ وہ آدمی صوم و صلوٰۃ کا پابند اور شرع کا شعور رکھتا ہے وہ بولا۔ ”ماشاءاللہ صاحبزادے آپ کے نیک خیالات نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ بلاشبہ اللہ دوسروں کے لیے آزار بننے والوں کو پسند نہیں کرتا۔“

”تو اور کیا ہم آزار بند بن جائیں مولانا! کوئی شراب تو نہیں پی رہے ہیں ہم۔ ایک ذرا سا سگریٹ ہی ہے نا۔ لو بجھا دیتے ہیں۔“ یہ کہہ کر اس آدمی نے اپنا سالم سگریٹ بڑے غصے سے جوتے تلے دے کر مسل ڈالا۔ دوسرے نے اپنا سگریٹ کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔

اس پر وہ وسطی خاتون اپنا باریک نقاب ذرا سا سرکا کر آگے جھکتی ہوئی بولی ”آپ کا بہت بہت شکریہ بھائی جان ورنہ ہمارا تو دم گھٹ رہا تھا۔ یہ پنکھا بھی لے لیں۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک اور کھجور کا پنکھا ہماری طرف بڑھا دیا۔

”باجی پوچھتی ہیں آپ کہاں جا رہے ہیں بھائی جان!“ نشست کے کنارے پر بیٹھی ہوئی چھریرے بدن کی خاتون نے نقاب کو ذرا سا کھول کر آبی سے پوچھا۔ اس کی آواز بہت مدھم تھی اور سوال کرنے کا انداز ایسا تھا جیسے وہ دوسروں سے اپنی بات مخفی رکھنا چاہتی ہو۔

”خانم ہم رحیم یار خاں جا رہے ہیں میرے یہ دوست مال افسر ہیں اور میں تحصیلدار ہوں بہاول پور کا۔“

وہ خاتون یہ بات سن کر وسطی خاتون سے کھسر پھسر کرنے لگی۔ کوئی دس منٹ تک دونوں طرف خاموشی چھائی رہی۔ بس نئی تھی اور اس کی نشستیں آرام دہ تھیں۔ آبی نے میرے کان کے قریب منہ لا کر کہا۔

”یار! مجھے یہ سب عورتیں اتنی اچھی کیوں لگنے لگی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں عشقِ حقیقی کی طرف جا رہا ہوں۔“

”تو پاگل خانے کی طرف جا رہا ہے تیرا دماغ چل گیا ہے بچے! کسی جگہ تو اتنے جوتے کھائے گا کہ سر گنجا اور ناک چپٹی ہو جائے گی۔“

”تیرے خیالات بہت ہی گھٹیا ہو گئے ہیں آبی۔ مجھے پتہ نہیں تھا تو اتنا لچر اور اتنا لچا ثابت ہو گا۔“

”یار ابھی تو میں نے کچھ کیا ہی نہیں تو خواہ مخواہ ہی مولوی اتقاءاللہ متقی بنا جا رہا ہے۔“

کچھ ہی دیر بعد ان خواتین نے اپنا بڑا سا ٹفن کیریئر کھول لیا۔ وہ اپنے ساتھ پراٹھے، بھنا ہوا گوشت، اچار چٹنی اور کوٹے باندھ لائی تھیں۔ آبی کے منہ میں پانی بھر آیا۔ بھوک نے

مجھے بھی اچانک پریشان کر دیا مگر ہم دونوں نے منہ پھیر کر پیچھے بھاگتے منظر پر نظریں جما دیں۔

”یہ لیں بھائی جان کھانے کا وقت ہو چکا ہے۔“ اُس چھریرے قد کی خاتون کے حنائی ہاتھ آبی کی طرف بڑھے ہوئے تھے۔ اور ان پر رکھ کر ایک ایک پراٹھا ہمیں وہ پیش کر رہی تھی۔ آبی کے چند میٹھے بول اپنا اثر دکھا گئے تھے۔ اس کی جیبھ کی لپالپ ہر جگہ اپنا کام دکھا جاتی تھی۔

”اس کی کیا ضرورت تھی خانم! بہر حال آپ کا شکریہ۔ میں اِس عزت افزائی کے لیے آپ کا ممنون ہوں۔“

پراٹھے بہت خستہ اور دیسی گھی میں بنے ہوئے تھے۔ گوشت بکرے کا تھا اور پتہ دیتا تھا کہ اُن خواتین کو اس سے انصاف کرنا آتا ہے۔ یہی حال اچار کا تھا۔ آبی خوش ہو گیا دبی زبان میں بولا۔

”ابے پلید آدمی کبھی کلمۂ شکر بھی ادا کر دیا کر۔ تیرے لیے اللہ نے کیسی کیسی نعمتیں پیدا کی ہیں۔“

”تو واقعی خدا کا خاص بندہ بن چکا ہے آبی لیکن تیری آنکھ میں سوٗر کا بال اُگ آیا ہے۔“

”نہیں یار! میں دراصل اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ بھئی وہ اپنا اقبال بھی کہہ گیا ہے کہ محبت فاتحِ عالم۔ یہ کائنات کشش باہمی ہی کی بدولت قائم ہے نا اور مجھے ان کی طرف کشش محسوس ہوتی ہے، ان خواتین کی طرف۔“

”پراٹھا ختم ہو گیا ہے۔ دیکھ تو ادھر کوئی گنجائش ہے کہ نہیں“

”حرص آدمی کو تباہ کر دیتی ہے ہاشم خان! اپنے نفس کے کتے کا گلا گھونٹ۔ باری تعالیٰ حریص آدمی کو پسند نہیں فرماتے۔“ آبی نے سامنے کے مولانا کو یہ بات سناتے ہوئے کہا۔ خواتین کے نقاب ذرا سرکے ہوئے تھے۔ ان پر میری نظر پڑی تو وہ مجھے مسکراتی دکھائی دیں۔ آبی نے بڑی خوبصورتی سے اُن کو ایک ایک پراٹھا اور ہماری طرف سرکانے پر مجبور کر دیا تھا۔

دو دو پراٹھے پیٹ میں اُترے تو ہماری آنکھیں کھل سی گئیں سفر مزہ دینے لگا تھا۔ گاڑی ایک گاؤں کے سامنے سے گزری تو ہمارے سامنے کی نشست پر بیٹھے مولانا اپنے ساتھی کے ہمراہ اتر گئے۔ اُن کے اٹھتے ہی وہ خواتین جن کو سگریٹ کا دھواں برا لگتا تھا۔ اُٹھ کر خالی نشستوں پر بیٹھ گئیں مگر وہاں جگہ صرف دو کے لیے بن سکتی تھی۔ تیسری خاتون شاید اُن کے ساتھ نہیں تھی۔ وہ اپنی جگہ تنہا بیٹھی رہ گئی۔ آبی تو اس تبدیلی پر خوش ہو گیا۔ اب وہ ان سے زیادہ کھل کر بات کر سکتا تھا۔ معلوم یہ ہوا کہ وہ دونوں بہنیں ہیں۔ بڑی کا نام انوری بیگم اور چھوٹی کا اکبری خانم۔ دونوں رحیم یار خاں میں رہتی تھیں۔ انوری بیگم کا خاوند صراف تھا اور اس روز وہ

اپنے ماموں سے مل کر بغداد الجدید سے واپس آ رہی تھیں۔ آبی کا خیال غلط نکلا کہ وہ ”سہل الحصول“ ہیں۔ یہ لفظ بھی اسی کا ہے۔ ہر ایسی عورت سے جس سے وہ ربط و ضبط بڑھا سکتا تھا وہ ”سہل الحصول“ کا نام دے دیتا تھا۔ آبی کی بڑھتی ہوئی پیش رفت سے گھبرا کر وہ دونوں خواتین سنبھل کر بیٹھ گئیں۔ میرا خیال ہے کہ اس نے کوئی بہت ہی غلط حرکت کی تھی جب ہی وہ بہت سنجیدہ ہو گئیں۔ یہاں تک کہ چھوٹی نے تو آبی کو قدرے سرزنش بھی کر دی۔ وہ اُن کی نشست کی پشت پر عمداً ہاتھ رکھ کر اکبری بیگم کو چھونے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس نے بڑے رُوکھے لہجے میں کہا۔

”بھائی جان یہ ہاتھ پیچھے ہٹا لیں۔“

آبی پر تو گھڑوں پانی پڑ گیا۔ وہ اُن کی ذرا سی توجہ پر سمجھتا تھا کہ وہ اس کے شیشے میں اتر آئی ہیں مگر حالت یہ ہوئی کہ رحیم یار خاں پہنچنے تک وہ بالکل ہی بند ہو کر رہ گئیں۔ آبی کے رویے نے انہیں خوفزدہ کر دیا تھا۔ وہ جب اُتریں تو انہوں نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا کہ ہم کس کھیت کی مُولی ہیں۔ آبی تلملا کر رہ گیا۔ گالیاں بکنے لگا تھا۔

”پانی پی لے بچے! زیادہ گرمی نہ کھا ورنہ تیرا پتا پھٹ جائے گا۔“

”تو بھی انہی جیسا ہے یار! ادھر میری اتنی بے عزتی ہو گئی ہے اس نے سلام تک کہنا گوارا نہیں کیا حالانکہ غیر شادی شدہ تھی۔ اور سہل الحصول بھی۔“

”تیرے جیسے المجہول کو ہر لڑکی سہل الحصول ہی نظر آیا کرتی ہے چل اُٹھ نیچے اُتر۔“ یہ کہہ کر میں نے اسے بس سے اتار لیا۔ وہ بہت تپا ہوا تھا جیسے کسی گیدڑ کے منہ سے شکار پانی میں جا گرا ہو۔ بولا

”اب کسی بس میں نہیں بیٹھیں گے ہم۔ میں کوئی کار کرائے پر لے لیتا ہوں۔ زیادہ سے زیادہ تین سو روپے لے گا۔“

”ہاں! اور تیرے پاس حرام کا مال ہے، چل جلدی کر۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔“

آبی ان لوگوں میں سے تھا جو اپنے وجود میں منصوبے اور وسائل سموئے پھرتے ہیں۔ اس نے فوراً ہی اِدھر اُدھر گھوم پھر کر ایک ٹیکسی کار کا بندوبست کر لیا۔ ساہیوال تک کے لیے اس نے مالک سے سو روپے طے کیے اور مجھے اس میں بٹھا کر وہ ساہیوال کی طرف چل دیا۔

اُسے بلبیر سنگھ کے رُقعے کا ایک ایک حرف یاد تھا اور وہ میرے خدشوں کو بے بنیاد نہیں سمجھتا تھا۔ جب ہم ساہیوال پہنچے تو رات کے دس بج چکے تھے۔ اس وقت آبی میرے ساتھ اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر بحث کر کر کے تھک چکا تھا۔ ڈرائیور کو اس نے سو روپے دے کر فارغ کر دیا اور مجھے وہ اپنے ساتھ لے کر ایک چھوٹے سے

ہوٹل میں جا ٹھہرا۔ طے یہ پایا تھا کہ ہم کبیر شاہ کے گاؤں کی طرف کوچ کریں گے۔ راہ راستے کا ہمیں علم نہیں تھا اور وہ علاقہ ہم نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ رات جوں توں کر کے ہم نے وہاں کاٹی۔ آبی نے مجھے صبح سویرے جگا دیا۔ بولا

"یار تو ذرا تیار ہو جا۔ ادھر ناشتے کا آرڈر دے۔ میں کسی سواری کا بندوبست کرتا ہوں۔" وہ منہ ہاتھ دھو کر سفر کے لیے تیار کھڑا تھا۔

"ٹھیک ہے کوئی کار لے آ۔ ہم کہاں پیدل مارے مارے پھریں گے۔ پتہ نہیں کیا حالات پیش آئیں۔ راستہ بھی پوچھے کسی سے اس گاؤں کا۔"

"ہاں اسی لیے میں جا رہا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس وقت صبح کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ سورج کچھ زیادہ دور نہیں تھا۔ آبی کوئی آدھ گھنٹے بعد لوٹا۔ وہ اپنے ساتھ ایک نئی نویلی کار لے آیا تھا میرے ساتھ ناشتے کے لیے بیٹھا تو بولا۔

"میں نے اس کے ساتھ چوبیس گھنٹے کے ڈیڑھ سو روپے طے کیے ہیں۔ زیادہ تو نہیں ہیں وہ ڈھائی سو مانگ رہا تھا۔"

"نہیں ڈیڑھ سو ٹھیک ہیں کچھ پتہ چلا کہ گاؤں کس طرف ہے۔"

"اُدھر ہڑپہ کی طرف ہے۔ خیر ڈھونڈ لیں گے ہم فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔"

ناشتہ کر کے ہم کار میں بیٹھے اور کبیر شاہ کے گاؤں کی طرف چل دیے۔ ڈرائیور ایک ادھیڑ عمر کا آدمی تھا اور اس علاقے کے چپے چپے سے واقف تھا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ ترن تارن بالکل سڑک کے کنارے واقع ہے مگر جب کچی دھول سے اَٹی سڑک پر اس نے ہمیں چڑھایا تو معلوم ہوا کہ اس مصیبت کو وہ سڑک کہتا تھا جس پر کار کو زبردست جھٹکے قدم قدم پر لگتے تھے اور کار چونکہ مالک کی تھی اس لیے ہمارا ڈرائیور کو جس کا نام عمر دین تھا، وہ راستہ جرنیلی سڑک نظر آتا تھا۔

ترن تارن گاؤں پختہ سڑک سے ہٹ کر کوئی نو دس میل شمال کی جانب تھا۔ وہاں پہنچ کر کار ہم نے بوڑھے برگد کے نیچے کھڑی کر دی۔ کبیر شاہ کے بارے میں ایک آدمی سے بات کی تو وہ بولا۔

"کبیر شاہ چیمہ صاحب! وہ تو ہسپتال میں ہیں جناب! آپ کو پتہ نہیں کل رات کیا ہوا تھا یہاں۔"

"نہیں یار! ہم تو ابھی آ رہے ہیں کیا ہوا کل رات؟"

"ان کے گھر ڈاکہ پڑا تھا جی! ڈاکو ان کی دو عورتوں کو بھی اٹھا کر لے گئے۔ مگر اس کے گھر کی کسی شے کو انہوں نے ہاتھ نہیں لگایا۔"

"نہیں یار یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ شاہ جی تو خود تھانیدار ہیں۔ اُن پر کون ہاتھ ڈال سکتا ہے۔"

"بس یہی ہو گیا ہے بھائی جی! شاہ جی نے اُن کو پکڑنا چاہا تو انہوں نے ان کو گولی مار دی۔ گولی پیٹ میں لگی تھی۔ اُن کو اسی وقت ساہیوال ہسپتال پہنچایا۔ کل آپریشن کر کے ان کے پیٹ سے گولی نکال لی گئی تھی۔"

"اچھا! ان کے گھر میں تو کوئی ہوگا۔" آبی نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"شاہ جی کی دادی شاہ مراد گھر میں ہے۔"

"ہمیں ان کے گھر لے چلو یار! معلوم تو ہو کہ قصہ کیا بنا ہے؟" آبی نے اس آدمی کو اپنے ساتھ کھینچتے ہوئے کہا۔

"کچھ ہی دیر بعد جب ہم کبیر شاہ کے دروازے پر پہنچے تو ہمیں اس کے تموّل کا احساس ہونے لگا۔ کبیر شاہ نے گاؤں کی شمالی نکڑ پر پختہ حویلی تعمیر کر رکھی تھی۔ وہ آدمی جس کا نام مہر دین تھا ہمارے بارے میں کبیر شاہ کی دادی کو اطلاع دینے کے لیے کسی دستک کے بغیر ہی اندر چلا گیا اور جب باہر آیا تو ایک بڑی ہی صحت مند معمر عورت اس کے پیچھے تھی۔ اس کی عمر ستر پچھتر سال سے کسی طرح کم نہ ہوگی مگر وہ ابھی تک تندرست و توانا نظر آتی تھی۔

علیک سلیک کے بعد وہ ہمیں اپنی بیٹھک میں لے گئی۔ ہمیں کرسیوں پر بٹھا کر بولی۔

"تم کہاں سے آئے ہو پتر؟ میرا کبیر شاہ تو ہسپتال میں پڑا ہے۔"

"ہمیں بڑی حیرانی ہے ماں جی! پر اُن پر گولی کس نے چلائی؟"

"پتہ نہیں پتر! شاہ جی کی گولی سے ایک ڈاکو یہاں ہی ڈھیر ہو گیا تھا اور جب لوگوں نے اُسے دیکھا تو پتہ چلا کہ وہ ہندو ہے۔"

"اچھا! ہندو تھا وہ! یہ کیسے معلوم ہوا آپ کو؟"

"اس کے بازو پر ہندی میں اس کا نام لکھا تھا پرکاش چندر۔" شاہ مراد نے بڑے یقین سے کہا۔

میرا مغز الٹنے لگا۔ کبیر شاہ کے گھر پر ڈاکہ ڈالنے والوں میں سے ایک شخص ہندو تھا۔ آبی نے مجھے استفہامی نظروں سے دیکھا، کہنے لگا۔

"وہ لڑکیاں آپ کی بیٹیاں تھیں ماں جی؟"

"نہیں پتر! بس یہی تو سارا جھگڑا ہے۔ ان میں سے ایک لڑکی کا نام آسیہ ہے۔ وہ چار دن پہلے نشتر ہسپتال ملتان سے تندرست ہو کر یہاں آئی تھی۔ کبیر شاہ نے اُسے اپنی بیٹی بنا لیا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی کوئی سہیلی بھی تھی۔ اس کا نام سلیمہ ہے۔ وہ بیچاری بے سہارا یتیم لڑکی تھی ہسپتال سے اُسے کبیر شاہ آسیہ کی خدمت کے لیے ساتھ لے آیا تھا۔ پتہ نہیں ان کے پیچھے کون لوگ لگے ہوئے تھے۔ کل آدھی رات کو چار آدمی اچانک اندر گھس آئے تھے اور صحن میں لیٹی لڑکیوں کو دبوچ کر نکل گئے۔ وہ جیپ پر سوار تھے میرے کبیر شاہ کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے انہیں للکارا اور سرھانے تلے رکھا پستول نکال کر ایک گولی چلا دی جواب میں انہوں نے کبیر شاہ پر فیئر کر دیا۔ گولی کبیر شاہ کے پیٹ میں لگی۔ وہ تو گر گیا مگر باقی لوگ ان لڑکیوں کو جیپ میں ڈال کر بھاگ گئے۔ شکر ہے کبیر شاہ کے دونوں بیٹے بچ گئے۔ وہ ملازمہ کے ساتھ چھت پر سوتے ہوئے تھے ورنہ پتہ نہیں کیا ہو جاتا۔ کبیر شاہ کی بیوی مرگی کی مریض ہے۔ گولی کی آواز سے اتنی ڈری کہ شہدی بے ہوش ہو گئی۔ صبح سے وہ تینوں اسپتال گئے ہوئے ہیں۔"

"یہ تو بہت بُرا ہوا ماں جی! اب کیا حال ہے شاہ صاحب کا؟"

"آج ہمارا ملازم بتا گیا ہے کہ اس کی حالت خطرے سے باہر ہے۔ میں اس کے ساتھ نہیں جا سکی۔ گھر میں کس کو چھوڑ کر جاتی۔ بس اللہ پر ڈوری چھوڑ رکھی ہے میں نے۔ پر یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اب کبیر شاہ ہی یہ گتھی کھولے گا۔" شاہ مراد نے کہا۔ وہ اتنا بڑا سانحہ بڑے صبر اور تحمل سے سہہ گئی تھی۔ میری نبضیں ڈوبنے لگی تھیں میرے بدترین خدشے صحیح ثابت ہونے لگے تھے۔ بلبیر سنگھ نے مجھے ایک نئے دوزخ میں جھونک دیا تھا۔ بلبیر سنگھ نے میرے خلاف اپنے منصوبے کے پہلے حصے پر عمل کرتے ہوئے آسیہ کو یرغمال بنا لیا تھا۔

"اُٹھ جا آبی! ہم تو ایک نئی مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔ وہ... وہ آسیہ میری سگی بہن ہے ماں جی! اور میں اسی کے پیچھے یہاں آیا تھا، اس بدنصیب کے پیچھے۔"

"اچھا! کیا نام ہے تمہارا بیٹے؟"

"میرا نام غلام جیلانی ہے ماں جی! مگر میرا ذکر کسی سے نہ کریں میں خود شاہ صاحب سے مل کر ساری بات معلوم کرتا ہوں۔ میں اُن ڈاکوؤں کو تلاش کر لوں گا اور باندھ کر آپ کے پاس لاؤں گا۔"

شاہ مراد حیرت زدہ سی ہو کر کرسی سے اُٹھی۔ مجھے بڑے غور سے دیکھ کر بولی۔ "تو سچ کہہ رہا ہے نا بیٹے؟"

"ہاں ماں جی! مجھے آپ کے سامنے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔ اب ہمیں اجازت دیں۔"

"پر بیٹے! تمہاری بہن تم سے بچھڑی کس طرح؟ کبیر شاہ کو اس سے اتنی ہمدردی کیوں ہو گئی تھی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔"

"میں خود پاگل ہو رہا ہوں ماں جی! بس اب اجازت دیں ہمیں دیر ہو رہی ہے پتہ نہیں میری وہ بدنصیب بہن اب تک کہاں سے کہاں جا پہنچی ہوگی۔" میرا گلا رندھ گیا تھا اور میری آنکھیں بہہ نکلی تھیں۔ آبی نے مجھے باہوں میں لے لیا۔ بولا۔

"حوصلہ کر یار! رونے سے کیا ہوگا۔ چل ہم کبیر شاہ سے پوچھتے ہیں۔ پتہ تو چلے کہ معاملہ کیا ہے۔"

"اچھا ماں جی خدا حافظ۔" یہ کہہ کر آبی مجھے اپنے ساتھ لے کر شاہ مراد کی حویلی سے باہر نکلا اور ہم اسی وقت کار میں بیٹھ کر ساہیوال کی طرف چل دیے۔ میرا دل ریزہ ریزہ ہو رہا تھا۔ میں نے اس بلبیر کا کیا نقصان کیا تھا۔ میں اپنی اور آبی کی جان بچا کر وہاں سے نکل آیا۔ اُن کے کسی آدمی کو زک نہیں پہنچائی۔ یہاں تک کہ بھنڈاری خاندان کو صحیح سالم واپس جانے دیا۔ اس کے باوجود اس نے مجھے رقعے میں جو دھمکی دی اُس پر اس نے عمل بھی کر ڈالا میرے اس سارے المیے میں سب سے زیادہ جو ہستی رگیدی گئی وہ آسیہ تھی۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں کنپٹی پر پستول رکھ کر خود کو ختم کر لوں کہ میری وجہ سے آسیہ اتنے سارے اندوہناک ستم سہتی چلی آ رہی ہے۔ میں کیا کروں میرے پروردگار میں کہاں جاؤں کس طرف نکلوں کہ مصیبتیں آسیہ کا پیچھا چھوڑ دیں۔

"وہ بلبیر مجھ سے کیا چاہتا ہے آبی! یہ سب کچھ اس نے کیوں کیا ہے؟" میں نے پچھلی نشست کی پشت سے سر پٹختے ہوئے کہا۔ میری آنکھیں بہہ نکلی تھیں میری تقدیر ہمہ وقت میان سے کھنچی رہتی تھی۔

"تجھے کیا ہوتا جا رہا ہے یار! سنبھلنے کی کوشش کر خدا کے ہر کام میں مصلحت ہے۔"

"کیا مصلحت ہے؟ میں ناسک تھا ناستک بن گیا ہوں۔ بتا مجھے میری بہن کا کیا قصور ہے۔ وہ کیوں در در خوار ہو رہی ہے۔ ذرا سوچ تو کن لوگوں میں جا گری ہے وہ۔"

"وہ اسے کچھ نہیں کہیں گے جیلانی! انہیں صرف تیری ضرورت ہے۔"

"مگر میں... مجھے وہ کس شکنجے میں ڈالیں گے۔ میں وہ سب کچھ نہیں کر سکتا جو وہ چاہتے ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔"

ڈرائیور نے میری یہ بات سنی تو سر گھما کر اس نے مجھے بڑے غور سے دیکھا۔ آبی نے میری پسلی میں چٹکی بھری دبی زبان میں بولا۔

"موقع محل بھی دیکھ لیا کر یار۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے مجھے کسی موقع محل کی۔ میں پاگل ہو جاؤں گا آبی! اتنی ساری اذیت میں نہیں سہہ سکتا۔"

"صبر کر یار! تو تو بچہ بنتا جا رہا ہے۔"

"کیا ہوا باؤ جی خیر تو ہے؟" ڈرائیور نے عقب نما آئینے میں جھانکتے ہوئے کہا میرے آنسو اس نے رخساروں پر بہتے دیکھ لیے تھے۔

"کچھ نہیں میاں جی! ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ مرض کا دماغ پر اثر ہے۔" آبی نے ڈرائیور کو مطمئن کرتے ہوئے کہا۔

"لو سگریٹ پیو۔ اس طرح چوہے کی طرح چوں چوں کرو گے تو پھر کچھ بھی نہ کر سکو گے۔ ابھی تو پتہ نہیں ہمیں کہاں تک جانا ہوگا۔"

آبی نے سگریٹ میرے منہ میں دے دیا۔ میری آنکھوں میں آہستہ آہستہ خون اُتر آیا تھا۔ آبی نے میرے چہرے پر نظر ڈالی تو گھبرا سا گیا میرے قریب منہ لا کر بولا۔ "کیا بات ہے؟ تیری آنکھیں

کیوں مُرخ ہوتی جا رہی ہیں۔ اپنی راسیں ڈھیلی چھوڑ دے یار! میں تجھے ایک خاص راستے سے امرتسر لے چلوں گا۔ مگر میرا دل کہتا ہے کہ یہ کام بلبیر کا نہیں ہے۔"

"یہ تو کیسے کہہ سکتا ہے۔ وہ آدمی تو شاہ مراد نے خود دیکھا ہے وہ ہندو تھا۔ اس کی ساری علامتیں ہندوؤں ایسی تھیں۔"

"اوئے ملیے! آہستہ بول۔ ڈرائیور سن رہا ہے۔"

"تو ٹھیک کہتا ہے یار! میں واقعی اب ملیہ ہی بن چکا ہوں پر تیرے اس نئے مفروضے کی بنیاد کیا ہے؟"

"پتہ نہیں! میرا دل کہتا ہے کہ وہ بدمعاش اتنا اونچا نہیں اُڑ سکتا۔"

"کیوں نہیں اُڑ سکتا۔ اس نے خود میرے سامنے کبیر شاہ کا نام لیا تھا۔ اُن کی سی آئی ڈی نے انہیں سب کچھ بتا دیا تھا۔"

"ہاں یار تم بتا تو رہے تھے۔ کمال ہے، اتنی مکمل معلومات ہوتی ہیں۔ اُن کے پاس ہم ایسے لوگوں کے بارے میں بھی۔"

"تو کیا سمجھتا ہے تو! ہم کوئی یونہی سے غیر معروف آدمی ہیں؟ فوٹو تیرا بھی تھانوں میں لگ چکا ہوگا۔" میں نے اب کی بار اپنی آواز دباتے ہوئے کہا۔

آبی ہنس دیا۔ "بس اس طرح ذرا جم کر بات کر۔ میں کسی رُوں رُوں کرتے زنخے جیلانی کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ مرد بن۔"

"تیری کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آتی ہے آبی۔"

"ویسے تو خواجہ سراؤں نے بھی تاریخ میں بڑے بڑے کارنامے سرانجام دیے ہیں مگر وہ پانی کا بلبلا تھے۔ یہ دنیا مردوں کی ہے صرف مردوں کی۔"

"بک نئیں اوئے زن مرید خان! تو مجھے رونے بھی نہیں دیتا۔ بس یہی تیری سب سے بڑی خرابی ہے ذرا گاڑی تیز کرو باباجی! یہ گدھے کی چال کام نہیں دے گی ہمیں بڑے کام کرنے ہیں ابھی۔" میں نے آنکھیں پونچھ کر سگریٹ کے دو چار گہرے کش لیتے ہوئے ذرا دبنگ لہجے میں کہا۔

"ہاں ذرا چابک مارو اس کی پیٹھ پر میاں جی!" آبی نے میرے چہرے کے بدلتے رنگ پر خوش ہو کر کہا۔ جانے یہ احساس میرے دل پر کیسے دفعتًا اُتر آیا کہ یوں رو کر، منہ بسور کر نالہ و شیون کر کے میں اپنی مصیبتیں تو ختم نہیں کر سکتا۔ پھر... پھر ان رکاوٹوں کا مردانہ وار مقابلہ کیوں نہ کروں۔ مجھے تو اپنی صلیب خود ہی اٹھانا ہو گی۔ میں سنبھل کر بیٹھا تو ڈرائیور نے بھی گاڑی کی رفتار تیز کر دی۔

جب ہم نے ساہیوال پہنچ کر گاڑی سرکاری ہسپتال کے اندر لے جا کر کھڑی کر دی تو آبی نے اردگرد کا بڑی گہری نظر سے جائزہ لیا اور بولا "میاں جی تم ادھر ہی ٹھہرو۔ ہم ایک مریض سے مل کر جلدی واپس آجائیں گے۔" یہ کہہ کر اس نے مجھے اپنے قریب کیا اور میرے کان پر منہ رکھ کر بولا۔ "ہمیں یہاں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے جیلانی اگر وہ کام بلبیر کے آدمیوں نے کیا ہے تو وہ کبیر شاہ کے اردگرد منڈلا رہے ہوں گے۔"

"تو ٹھیک کہتا ہے یار! ہم کچی گھڑالی پر بیٹھے ہیں۔ بڑی احتیاط کی ضرورت ہے ہمیں۔" یہ کہہ کر میں آبی کے پیچھے پیچھے کار سے نکلا۔ ہسپتال کے برآمدے میں اور برطانیہ سے سبزہ زاروں میں بہت سے لوگ اِدھر اُدھر گھوم پھر رہے تھے۔ مگر ان میں سے کوئی بھی ہمیں اپنی طرف متوجہ نظر نہیں آتا تھا۔

کبیر شاہ کا پتہ ہمیں جلدی ہی معلوم ہو گیا۔ وہ ہسپتال کے جنرل وارڈ میں لیٹا تھا مگر ہم اسے بالکل ہی نہیں جانتے تھے۔ وارڈ کے ایک ملازم سے آبی نے پوچھا تو اس نے وارڈ کے آخری کونے کی طرف اشارہ کیا، بولا۔ "اٹھارہ نمبر بیڈ پر چلے جائیں۔"

ہم دونوں اس طرف بڑھے تو ہمیں ایک ایسا آدمی بستر پہ تکیے کے سہارے لیٹا نظر آیا جس کے چہرے پر بڑی ہی خوبصورت سی سیاہ داڑھی تھی اور صحت اُس کی بہت ہی قابلِ رشک نظر آتی تھی۔ وہ پولیس کا آدمی تو کسی بھی طرح دکھائی نہیں دیتا تھا۔ سر پر اس نے بلوچوں ایسے لمبے لمبے پٹے رکھے تھے۔ اس کے سامنے چادر میں لپٹی ایک عورت بیٹھی تھی اور نو نو دس دس سال کے دو لڑکے بھی تھے۔

ہم بےدھڑک کبیر شاہ کے پاس جا پہنچے۔

"السلام علیکم شاہ جی!" آبی نے نہایت بے تکلفی سے کہا۔ یوں جیسے وہ اس کا لنگوٹیا یار ہو۔

"وعلیکم السلام۔ فرمائیے۔" کبیر شاہ نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"ہم آپ کو دیکھنے آئے ہیں شاہ جی! آپ کے پرانے خادم ہیں ہم ذرا تخلیہ کر لیں تو نوازش ہو گی۔"

"بڑی مہربانی ہے جناب آپ کی۔ تم چلو زہرہ بچوں کو لے کر ذرا باہر ٹہل آؤ، بیٹھے بیٹھے تھک گئی ہو گی۔"

وہ عورت چادر سے اپنا منہ سر لپیٹ کر اٹھی اور دونوں بچوں کو ساتھ لے کر باہر چلی گئی۔ ہم نے کبیر شاہ کے سامنے بیٹھ کر سگریٹ سلگا لیے۔

"میں معافی چاہتا ہوں میں آپ کو پہچان نہیں سکا۔"

"ہمیں آپ کے زخمی ہونے کی خبر ملی تو بھاگے چلے آئے۔ آپ کی دادی جان نے بتایا کہ آپ کے پیٹ میں گولی لگی ہے۔"

"جی ہاں! الحمدللہ کہ گولی سینے میں نہیں لگی۔ ورنہ میں تو گیا تھا کام سے۔ پر آپ نے مجھ پر اتنی مہربانی کیسے کی؟"

"وہ دراصل شاہ جی وہ لڑکی آسیہ ہے نا! وہ ہماری چچازاد بہن ہے اپنے سگے بھائی کے کرتوتوں کی وجہ سے اس حال کو پہنچ گئی کہ اسے دربدر خوار ہونا پڑ رہا ہے۔" آبی نے اپنا تعارف کرایا۔

"اوہ! تو یہ بات ہے۔" کبیر شاہ ایک دم سنبھل کر چادر کو اپنے سینے تک لے گیا۔ اس نے اپنی نظریں میرے چہرے پر جما دی تھیں۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد بولا۔

"میں شدید زخمی ہوں صاحب! اور اگر میں زخمی نہ بھی ہوتا تو بھی آپ سے تعرض نہ کرتا۔ کبھی نہ کرتا۔"

"ہم آپ کا مطلب نہیں سمجھے ہیں شاہ جی۔" میں نے پوچھا۔

"میرا کوئی مطلب نہیں ہے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ میں نے آپ کو پہچان لیا ہے آپ غلام جیلانی ہیں نا؟"

میں اس کی یہ بات سن کر سن سا ہو کر رہ گیا۔ اس نے نیزہ سیدھا میرے سینے میں دے مارا تھا۔ اپنا تکیہ اس نے ذرا سا اٹھا دیا۔ وہاں ایک خوبصورت سا پستول دھرا تھا۔

"یہ ہر وقت میرے ساتھ رہتا ہے مگر یہ آپ کے لیے نہیں ہے جیلانی صاحب! وہ ہتھکڑی لگا کر بھی آپ کو میرے سامنے لے آتے تو میں آپ کو موقع ملتے ہی بھگا دیتا۔ خواہ میری پیٹی ہی کیوں نہ اُتر جاتی۔"

"میں آپ کا شکرگزار ہوں شاہ جی کہ آپ ایسا سمجھتے ہیں مگر... مگر اس کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی، میں تو بہت گنہگار آدمی ہوں، پولیس سے قانون سے خدا سے رسولؐ سے ہر ایک کے آگے شرمندہ اور بے آبرو۔" میرا گلا رندھنے لگا تھا۔

"وجہ بھی بتانا پڑے گی مجھے۔ میرا خیال ہے کہ وجہ نہ ہی پوچھیں تو اچھا ہے۔ احسان ضائع ہو جانے کا خدشہ ہے۔"

"نہیں شاہ صاحب! ہم بات کسی اور طرف سے شروع کرنا چاہتے تھے مگر بیچ اور ہی آ پڑا۔ اب تو آپ کو بتا ہی دینا چاہیے کہ ہم پر اتنی نوازش کا آخر سبب کیا ہے؟"

کبیر شاہ نے اپنے گدے کے نیچے رکھا پیکٹ اٹھا کر ایک سگریٹ سلگا لیا اور گہرے گہرے کش لے کر بولا۔

"کچھ احسانات ایسے ہوتے ہیں جیلانی صاحب کہ آدمی انہیں کبھی نہیں بھول سکتا۔ آپ کو یاد ہو گا آپ نے ایک ڈی ایس پی ایس کے چیمہ کو دشمنوں کی گولیوں سے بچا کر اسے شدید زخمی حالت میں ہسپتال پہنچایا تھا۔"

"اوہ! وہ ایس کے چیمہ! ہاں میرے ساتھ میری دوست ریٹا بھی تھی مجھے یاد آ گیا شاہ جی، خوب یاد ہے مجھے۔"

"وہ میرا سگا بھائی ہے جیلانی صاحب! اب وہ ریٹائر ہو چکا ہے اُس نے خود ہی نوکری چھوڑ دی تھی اور آج کل وہ مانچسٹر میں اپنا کاروبار کرنے کی سوچ رہا ہے۔"

"مگر وہ چیمہ ہیں اور آپ سیّد؟"

"میں سیّد کہاں ہوں! بس ایسے ہی محکمے میں میرا نام کبیر شاہ مشہور ہو گیا۔ میری داڑھی کی وجہ سے شاید، ورنہ ہم بھی جاٹ ہیں اور چیمہ ہماری ذات ہے۔"

"اچھا تو یہ بات ہے مگر شاہ جی وہ سب کچھ تو اندھیرے میں ہوا تھا۔ میں نے تو کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا کہ میں کون ہوں؟"

"ایک آدمی آپ کے پیچھے بھیج کر آپ کی کار کا نمبر ڈاکٹر نے نوٹ کر لیا تھا۔ وہی کار جب ڈاکٹر دھمن کے کلینک سے آپ کی گرفتاری کے بعد ملی تو چیمہ صاحب کو اس وقت معلوم ہوا کہ اس کا محسن کون تھا۔ ڈاکٹر نے جو حلیہ بتایا تھا وہ بھی آپ سے ملتا جلتا تھا۔ چیمہ صاحب شاید آپ کی بہت مدد کرتے مگر بدقسمتی سے ان کا تبادلہ ہو گیا اور وہ بے بس ہو کر رہ گئے لیکن وہ آپ کا احسان کبھی نہ بھول سکے۔"

"وہ احسان کہاں تھا۔ اُن کی جان سخت خطرے میں تھی میں اُن سمگلروں پر گولی نہ چلاتا تو وہ انہیں وہیں ختم کر دیتے۔"

"ہاں! یقینی بات یہی تھی۔ وہ انگلینڈ جاتے وقت بھی مجھ سے یہی کہہ گئے تھے کہ آپ کو جب بھی کسی مدد کی ضرورت ہو میں دریغ نہ کروں۔"

"مگر شاہ جی! آپ کو کیسے پتہ چلا کہ آسیہ ------"

"آپ کی بہن ہے۔ ارے بھولے بادشاہ آپ تو شیطان کی طرح مشہور ہیں اور آپ کی وجہ سے ہی آسیہ کا نام بھی ہم سب کو معلوم تھا۔ مجھے ملتان کی نیت معلوم ہو چکی تھی۔ اسی لیے میں نے موقع ملتے ہی آسیہ کو ان کی نگاہوں سے دُور کر دیا۔"

"کاش آپ ریٹا کو بھی بچا سکتے۔"

"وہ بات میرے لیے ممکن نہ تھی۔ مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے ریٹا پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔ اسے انہوں نے خوب مارا۔ میں تو جب سے اب تک ٹینشن پر ہوں۔ وہ میرے پیچھے لگے رہے اور اب میرا خیال ہے کہ اسی ملتان کے آدمیوں نے آسیہ کو میرے گھر سے اٹھوایا ہے۔"

"وہ آپ سے آسیہ کا براہِ راست بھی مطالبہ کر سکتے تھے...؟"

"ہاں یہ تو ہے مگر بیچ میں ریٹا کا معاملہ آ پھنسا تھا۔ مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ انہوں نے ریٹا کو غنڈوں کے حوالے کر کے قتل کروا دیا۔"

"ریٹا میری بہن پر قربان ہو گئی تھی شاہ جی! مجھے اس بےچاری کی موت کا بہت دُکھ ہے۔"

"آپ نے اس کی موت کا بدلہ بھی تو لے لیا۔ اتنے آدمی مار

ڈالے تھے اس روز آپ نے۔ مجھے سب باتوں کا علم ہے جیلانی!"

"ہم تو اس روز شاید سارا شہر ہی جلا دیتے۔ ہم بہت بھٹکے ہوئے تھے شاہ جی۔"

"مجھے معلوم ہے۔ انہوں نے آسیہ کو بھی خاموشی سے ٹھکانے لگا دینے کا فیصلہ کر رکھا ہو گا کیونکہ اگر وہ براہِ راست مجھ سے آسیہ کو طلب کرتے تو میں اُن کا پردہ چاک کر دیتا۔ بتا دیتا سب کو کہ ریٹا کو موت کے گھاٹ کس نے اتارا ہے۔ اسی لیے ملتان نے یہ گندی حرکت کی ہے۔"

"مگر میں نے تو سنا ہے کہ جو حملہ آور آپ کے ہاتھوں مارا گیا، وہ ہندو ہے؟"

"ہاں حیرت کی بات یہی ہے۔ یہ ایسا نکتہ ہے جو میری سمجھ میں نہیں آتا۔"

"ہو سکتا ہے انہوں نے اس آدمی کو سندھ سے منگوا لیا ہو، اس واردات کے لیے، وہاں تو بہت ہندو مل جاتے ہیں۔"

"مگر میں نے اسے دیکھا ہے وہ سندھی نہیں تھا۔ وہ ہمارے ہی علاقے کا رہنے والا نظر آتا ہے۔ اس کے بازو پر نام گورمکھی میں لکھا ہوا تھا۔ اور یہ زبان سکھوں کی ہے۔" کبیر شاہ نے کہا۔

"کیا نام تھا اس کا؟"

"پرکاش چندر۔ عین ممکن ہے کہ وہ بھی کوئی سکھ ہو، مونا سکھ۔ مگر اُسے بھلا آسیہ سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ ایک یتیم لڑکی سلیمہ کو میں اس کی خدمت کے لیے ملتان سے لے آیا تھا۔ وہ اسے بھی لے اُڑے ہیں اور میں زخمی ہو کر یہاں آ پڑا ہوں۔"

"آپ کو کتنے دن لگ جائیں گے یہاں؟"

"کم از کم پندرہ دن تو مجھے یہاں رہنا ہی پڑے گا۔"

"کوئی خطرے کی بات تو نہیں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں! گولی نکال لی گئی ہے زخم بھی بھر جائے گا۔"

"تو پھر ہم آسیہ کو اب کہاں تلاش کریں۔"

"پہلا امکان تو یہ ہے کہ وہ ملتان کے علم میں ہو گی۔ آپ اس تک ضرور پہنچیں وہاں وہ نہ ہوئی تو پھر مجھے نہیں معلوم کہ وہ کون تھے جو ان لڑکیوں کو لے گئے۔"

"خدا ہی بہتر کرے شاہ جی میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔"

"آپ کی بہن کے بارے میں ایک خاص بات جس کا شاید آپ کو علم ہو۔"

"جی نہیں! کون سی خاص بات؟"

"اس کے گردے کا آپریشن ہوا تھا۔ ایک گردہ اس کے جسم میں پہلے سے ہی نکال لیا گیا تھا اور دوسرے کی پیوندکاری کی گئی تھی۔"

"کیا وہ اب صحتیاب ہو چکی ہے پوری طرح؟"

"ہاں صحت تو اس کی بالکل ٹھیک ہو چکی ہے مگر۔ ۔ ۔"

"مگر کیا شاہ جی؟ مجھ سے کوئی بات نہ چھپائیں۔"

"نہیں! چھپانے کی بات بھی نہیں ہے۔ شاید آپ کو علم ہو کہ آپ کی بہن حاملہ ہے۔"

"اوہ! مجھے معلوم ہے کبیر شاہ جی! مگر مجھے نہیں پتہ کہ اس کا ذمے دار کون ہے؟"

"یہی بات آپ کی بہن نے بھی کہی ہے اور ڈاکٹر نے میرے کہنے کے باوجود اس حمل کو ضائع نہیں کیا۔ وہ کہتی تھی کہ ایسا کرنے سے آسیہ مر بھی سکتی ہے کیونکہ دو گردوں کے آپریشن نے جسم میں کوئی ایسی ہی پیچیدگی پیدا کر دی ہے کہ بچہ قدرتی طور پر پیدا ہو جائے تو ٹھیک ہے ورنہ اچھا نہ ہو گا۔"

میں نے سر جھکا لیا۔ کبیر شاہ میری بہن کے تمام حالات سے پوری طرح آگاہ ہو چکا تھا۔

"جس کسی نے بھی وہ زیادتی کی ہے اس کا سر اس کے کندھوں سے ضرور اُترے گا شاہ جی۔ ہم اسے معاف نہیں کریں گے۔" آبی نے بڑے غضبناک لہجے میں کہا۔

کبیر شاہ پہلی بار اس کی طرف متوجہ ہوا۔ "آپ نے ان سے میرا تعارف نہیں کروایا۔ باتوں باتوں میں ان کے بارے میں پوچھنا ہی بھول گیا۔"

"یہ میرے دوست ہیں ایس جی ایم ایم پیرزادہ منڈی بہاؤالدین کے زمیندار ہیں۔"

"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر جناب! آپ کا جذبہ قابلِ ستائش ہے مگر معاف کیجیے آپ کے لہجے سے زمینداری کم، اور ان کے پیشے کی بُو زیادہ آ رہی ہے۔ آپ نے ان کا مجھ سے صحیح تعارف نہیں کروایا ہے جیلانی صاحب۔" وہ کبیر شاہ بندوں کو نظروں میں تولنا جانتا تھا۔

آبی سکڑ کر رہ گیا، پھر کھنکار کر بولا "مجھے بس آپ ایس جی ایم ایم پیرزادہ ہی سمجھیں شاہ جی۔ باقی سب خیریت ہے بس دیگر حوال نہ پوچھیں۔"

کبیر شاہ ہنس دیا، بولا۔ "میں فال رمل نجوم تو نہیں جانتا ڈیوٹی پر جا کر دیکھوں گا جیلانی صاحب کہ آپ کے ساتھ یہ درویش کون ہیں۔ میری مانیں تو سب سے پہلے ملتان کے پیچھے جائیں۔"

"یہی کروں گا شاہ جی۔"

"سارے امکانات نگاہ میں رکھیں خدا کرے وہ آپ کو جلدی مل جائے۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں شاہ جی! خدا ہی جانتا ہے کہ آسیہ کس جہنم میں جا اتری ہے۔"

"اٹھ یار! ہمیں ان سارے امکانات پر غور کرنا ہو گا۔ اچھا شاہ جی آپ کی بڑی مہربانی۔ آپ نے ہماری بہن کے لیے اتنی تکلیف اُٹھائی۔" آبی نے بنچ پر سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"یہ میرا فرض تھا پیرزادہ صاحب! بہرحال میں یہاں سے اُٹھتے ہی ڈیوٹی پر چلا جاؤں گا اور جو خدمت مجھ سے ہو سکی، میں کروں گا۔"

"آپ کا یہ ہم پر بہت بڑا احسان ہے شاہ صاحب، خدا حافظ۔"

میں نے بڑی عقیدت سے کبیر شاہ کا ہاتھ چوم لیا۔ اور پھر ہم دونوں وہاں سے باہر آنے لگے تو اس نے ہمیں آواز دے کر روک لیا، بولا۔

"سنیے ذرا پیرزادہ صاحب!"

ہم دونوں حیرت زدہ سے ہو کر پیچھے مڑے تو وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ "جیلانی صاحب! ایک بڑا ذاتی سا سوال میں پوچھوں گا آپ بُرا تو نہ مانیں گے؟"

"جی نہیں! حکم کریں؟" میں نے اس کے سامنے دوبارہ بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اُن دو سمگلروں میں سے ایک کا نام یونس تھا اور دوسرے کا سخی محمد۔ یونس زندہ بچ گیا تھا۔ اس نے ہمیں بتایا تھا کہ اُن کی کار میں ایک بریف کیس تھا جس میں سونے کی اینٹیں بھری تھیں۔ مگر وہ بریف کیس کار میں موجود نہیں تھا۔"

"اس کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں ہے شاہ جی۔ اگر وہ مجھے مل جاتا تو میں دشمن کے خلاف خود کیوں اپنے آپ کو مصیبت میں ڈالتا۔ کسی کو دس بیس ہزار دے کر اس کا قصہ پاک کروا دیتا؟"

میں نے بے ساختہ کہا۔ میری چھٹی حس نے مجھے خبردار کر دیا تھا کہ کبیر شاہ کی وہ ساری مہربانیاں شاید اس سونے کے حصول پر مرکوز تھیں۔

کبیر شاہ نے مجھے یوں دیکھا جیسے وہ میرے اندر جھانک رہا ہو۔ "میرا بھی یہی خیال تھا۔ بعد میں بھائی صاحب بھی یہی سمجھتے رہے کہ کسی نے موقع پا کر اس لاوارث کار میں سے وہ بریف کیس نکال لیا ہو گا۔"

"مجھے تو اس وقت کسی بات کا ہوش ہی نہیں تھا۔ میں تو اس عالیہ کو لے کر بھاگ رہا تھا۔"

"ہاں! یہ سوال میں نے ریٹا سے بھی پوچھا تھا مگر اس نے بھی لاعلمی ظاہر کی تھی۔ میں معافی چاہتا ہوں دراصل یہ بڑا اہم سوال تھا۔"

"یہ آپ کا حق ہے شاہ جی! بحیثیت پولیس افسر آپ یہ بات پوچھ سکتے ہیں۔ مگر کاش وہ سونا میرے ہاتھ لگ گیا ہوتا۔ مجھے اپنی حماقت کا اب احساس ہو رہا ہے۔" میں نے بات کو اور واضح کرتے ہوئے کہا۔ اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا اور پھر ہم فوراً وارڈ سے نکل کر باہر آ گئے۔

آبی میرے ساتھ بھڑک کر بولا۔ "اس شخص کے داؤ پیچ کو سمجھ رہے تھے تم! اس کی نظر اس سونے پر لگی ہے جس کے بارے میں اُسے اور چیمہ کو یقین تھا کہ وہ تمہارے پاس ہو گا۔"

"ہاں یار! ویسے دیکھو کتنا بگلا بھگت بنا بیٹھا ہے یہ۔"

"یہ بات تو خیر ظاہر ہے یار کہ اس نے آسیہ کو ملتان سے چیمہ پر تمہارے احسان کی وجہ سے بچا لیا مگر دوسرا مقصد اس کے سامنے اس سونے کا حصول بھی تھا۔"

"ہاں! میں فوراً ہی سمجھ گیا تھا مگر میں نے بھی ٹھیک جواب دیا ہے نا اُسے۔ وہ روپیہ میرے پاس نہ رہا تو پھر میں تو دو کوڑی کا نہیں رہوں گا۔"

"ہاں اسے سنبھال کر رکھو یار! ایسی رقم بار بار کہاں ہاتھ لگ سکتی ہے۔ تو جب اس چکر سے نکل جائے تو امریکہ جا کر آباد ہو جانا۔ رقم وہاں کام آ جائے گی۔"

"امریکہ میں کیوں؟ کسی اور مُلک میں کیوں نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"وہ اس لیے میرے بچے! کہ ہمیشہ سے امریکہ میں قاتل خونی ڈاکو، چور لٹیرے اور جیب کترے ہی آباد ہوتے چلے آئے ہیں۔ اپنے اپنے ملکوں کا گندا خون یورپ والے ادھر منتقل کرتے چلے آ رہے تھے جو بعد میں اُنہی کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔"

"اقوامِ عالم کی تاریخ پر آپ کی اتنی گہری نظر حیرت انگیز ہے ڈاکٹر ایس جی ایم ایم پیرزادہ صاحب!" میں نے اسے روک کر غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ ہنس دیا۔

"چل اُدھر جا کے بیٹھ جا۔ وہ ڈرائیور انتظار کر رہا ہے۔"

"اب کدھر چلنا ہے ہمیں؟"

"لاہور، اور کہاں جائیں گے ہم۔ میں رات بھر کے لیے اپنی ماں سے مل آؤں گا۔ اتنے میں تم کسی ہوٹل میں آرام کر لینا۔"

"ٹھیک ہے یار! پر تیرے پاس ماں جی کے لیے رقم بھی تو نہیں ہو گی۔"

"رقم اُسے مل چکی ہو گی۔ وہ ماہیا اکثر اُس کے پاس جاتا رہتا ہے، تو اس کی فکر نہ کر۔"

"میں صبح بینک سے تجھے ایک لاکھ روپیہ نکلوا دیتا ہوں آبی! وہ لے کر چلے جانا۔ رات ہم دونوں ادھر ہی بسر کر لیتے ہیں۔"

"تو نوٹوں کا رعب لالچ نہ دیا کر مجھے۔ وہ روپیہ بنک میں پڑا رہنے دے، کام آئے گا۔"

"کسی چوراہے میں کسی روز مجھے گولی لگ چکی ہو گی تو پھر وہ روپیہ کس کام آئے گا میرے۔ ایک رات کے لیے رُک جا۔ میں

صبح تجھے رستم دے دوں گا۔"

"ارے مجھے تو آج رات الماس سے بھی ملنا ہے، اُس جانِ جہاں سے چل بس سیدھا لاہور چل۔" یہ کہہ کر آبی مجھے گھسیٹتا ہوا کار تک لے گیا۔

"ہو سکتا ہے وہ لاہور ابھی نہ پہنچی ہو۔" میں نے کار میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

"نہیں یار! وہ پہنچ گئی ہوگی میرے لیے خواہ مخواہ بے چین ہوگی۔ میں اُسے مایوس نہیں کر سکتا۔" آبی نے بڑے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ شکل اُس کی اس گھڑی دیکھنے کے لائق تھی۔

"ایک تم ہی نہیں رہ گئے ہو را نجھے اس شہر میں۔ وہاں ایک سے ایک مختون بھائی پڑا ہے اس کی خدمت کے لیے۔"

"نہیں یار! وہ کسی اور طرف نظر نہیں اُٹھا سکتی۔ اس کی قسمت میں میرے گھر کا دانہ پانی لکھا ہے۔"

مجھے ہنسی آ گئی ـــــ وہ بے پر کی ہانکنے پر آتا تھا تو نہ کھائی دیکھتا تھا نہ کھڈا۔

"تو اُسے بیاہ کر اپنے گاؤں لے جائے گا؟"

"ہاں بھئی! کیا ہرج ہے اس میں۔ میں اس کو ایک چرخہ لے دوں گا۔ وہ کاتا کرے گی بیٹھ کر اور گایا کرے گی کہ ـــ

چرخہ گل کردا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چرخہ گل کردا"

"صبح سویرے ایک بار شیشے میں اپنی شکل ضرور دیکھ لیا کر پیارے! آدمی کی دماغی صحت قائم رہتی ہے۔" یہ کہہ کر میں نے دو سگریٹ سلگا کر ایک اُسے دے دیا۔

"ایک تو تو میری ذرا سی بھی خوشی برداشت نہیں کر سکتا۔ تیری اپنی نیت تو خراب نہیں ہے اُس پر؟"

"نہیں بھئی! مجھے کیا ضرورت ہے۔ مجھے اللہ نے اور بہت سی چیزیں دے رکھی ہیں۔"

"اچھا خیر دفع کر۔ ویسے یہ بتا کہ اُس جیسی سوہنی کوئی اور ہے لاہور شہر میں؟"

"یہ بات تو میں بھی تسلیم کرتا ہوں۔ شاہ جہاں کے غسل خانے ایسی خوبصورت ہے۔"

"کیا مطلب؟ یعنی یہ بھی کوئی مثال ہوئی۔ گھاس کھا گیا ہے تو!"

"اس میں میں نے سُنا ہے چاروں طرف آئینے لگے تھے۔ یہاں تک کہ فرش پر بھی اور چھت پر بھی۔"

"تو سمجھ دار آدمی ہے ویسے، پر ہماری اس الماس کا اس سے کیا تعلق؟"

"اس کا بھی شیشے کا بدن ہے پیارے! اور اُس کے بدن کا رُواں رُواں آنکھ بن جاتا ہے۔ تجھے وہ جکڑ کر رکھ لے گی اور تو سارا دن اس کی آنکھوں میں ہی خود کو دیکھتا رہے گا۔"

"تیری زبان مبارک ہو جیلانی! ہائے! وصل اُس کا خدا نصیب کرے۔ میرا جی چاہتا ہے کیا کیا کچھ۔" پھر قدرے توقف سے بولا "یار یہ میر بھی کوئی مجھ جیسا آدمی ہوگا۔ بڑی بڑی گڑبڑ گھوٹالے کی باتیں کر جاتا تھا۔"

"ہاں! وہ شعر بھی تو اسی کا ہے نا کہ لین دین پر خاک محبت پاک بڑے فرما گئے ہیں۔" میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔

"بالکل کنگال آدمی ہوگا پھر وہ۔ پر یار کیوں اُلو بناتے ہو مجھے۔ یہ گانا تو میں نے ایک فلم میں سُنا تھا۔"

"وہ فلمی گانے بھی تو لکھا کرتا تھا۔ فی لفظ دس پیسے لیتا تھا وہ۔"

"تو ایک نمبر کا پھاڈی آدمی ہے یار۔ اس کے زمانے میں فلمیں کہاں بنتی تھیں، کسی نے اس کے دیوان میں سے چُرا لیا ہوگا یہ گانا۔ ادھر چوری ڈکیتی بھی تو بہت ہو گئی ہے نا پاکستان میں۔"

"آپ جیسے درویشوں کی وجہ سے ہی یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔"

ڈرائیور ہماری باتیں سن رہا تھا، بے ساختہ ہنس دیا۔ ہم فوراً ہی سنبھل کر بیٹھ گئے۔ گاڑی کا رُخ اس نے لاہور کی جانب پھیر دیا تھا۔ اور آبی کے دل میں پکڑ دھکڑ ہو رہی تھی۔ وہ دعائیں مانگ رہا تھا کہ الماس لاہور پہنچ چکی ہو۔ میرا خیال ہے کہ وہ مجھ سے ایک لاکھ روپے لینے پر اس لیے آمادہ ہو گیا تھا کہ عین اسی لمحے اُس کے ذہن میں الماس کا تصور اُبھر آیا تھا۔ میں نے دل میں کہا ٹھیک ہے بچے رقم میں تجھے دے دوں گا۔ تو جا کر خواہ اُسے کنوئیں میں ڈال دے مجھے کیا۔ میں تو تیری ماں کے نام پر تجھے دینا چاہتا ہوں کہ وہ میری بھی ماں ہے کہ اس نے تیرے جیسا جگری یار پیدا کر دیا۔ تو نہ ہوتا تو میرے دن کتنے بوجھل، کتنے افسردہ اور کتنے بے رنگ گزرتے۔

بظاہر تو میں آبی کے ساتھ بیٹھا ہنس بول رہا تھا مگر میرے دِل کے نہاں خانوں میں حشر بپا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کِس طرف نکلوں۔ میں ایسے ویران چوراہے پر کھڑا تھا جہاں سے یہ معلوم کرنا میرے لیے ناممکن تھا کہ آسیہ کی نئی کال کوٹھری کی طرف کون سا راستہ جاتا ہے۔ میرے ذہن میں بہت سی صورتیں اُبھر رہی تھیں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ بلبیر سنگھ نے جو دھمکی دی ہے اُسے اتنی جلدی عملی جامہ بھی پہنا سکے گا۔ دوسرا نام میرے تصور میں ملتان کا اُبھرتا تھا۔ صرف اُسے ہی معلوم تھا کہ آسیہ کو اس کی گرفت سے کس نے چھڑا لیا ہے۔ پھر۔۔۔ پھر اس سے آگے کیا ہُوا یہ سوال مجھ سے کسی بھی طرح حل نہیں ہو رہا تھا۔ ملتان کا تعلق گاڈی سے تھا اور گاڈی کے خون کا بدلہ لینے کے لیے شہر کا مشہور غنڈہ

دانی ہم پر چڑھ دوڑا تھا۔ دانی کا خیال میرے ذہن میں اُبھرا تو میں نے آبی کو متوجہ کرتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"یار! یہ کام کہیں اس دانی نے نہ کر دیا ہو۔ اس کو ملتان نے بتا دیا ہوگا کہ میری بہن اس کے قبضے سے نکل کر کبیر شاہ کے پاس جا پہنچی ہے۔ اس نے ہی تو کبیر کو ہسپتال میں داخل کروایا تھا۔"

"ہاں! تمھارا یہ خیال صحیح نظر آتا ہے۔ مگر دانی نے اگر یہ سب کچھ کیا ہے اور وہ تمھاری گردن مروڑنے کے لیے اسے اٹھا لایا ہے تو یہ بات بھی ہم ملتان سے معلوم کر سکتے ہیں۔ اس کے اشارے کے بغیر تو یہ سب کچھ نہ ہوا ہوگا۔"

"تو پھر تم الماس سے کہو کہ وہ ملتان سے اس بارے میں بات کرے، اس کے بعد ہی ہم کوئی فیصلہ کر سکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے ہم آج وہیں تو جا رہے ہیں۔ تمھارے ذہن میں اگر اس بلبیر کا وہم ہے تو نکال دو۔ مجھے یقین ہے کہ اس نے یونہی بڑ ہانکی ہے۔"

"ہاں! میرا بھی یہی خیال ہے انہیں مجھ سے کیا حاصل ہو سکے گا۔"

"تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو میاں جی! یہ چکر مجھے ختم ہوتا نظر نہیں آتا۔ پتہ نہیں ہمارے ہاتھوں کس کس کی موت آئی ہے۔" آبی نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"اور سن! یوں کھلے منہ شہر میں نہیں جا سکتے، اپنا حُلیہ ہمیں بدلنا پڑے گا۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو میرا خیال ہے ہم سروں پر وہ پگڑیاں باندھ لیتے ہیں جو ہم خرید کر لائے ہیں۔" وہ ابھی تک سرگوشی میں بات کر رہا تھا۔

"ہاں عینکیں بھی چڑھا لیتے ہیں۔" میں نے اس کی تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم نے اپنے اٹیچی کیس میں سے یہ سامان نکال کر زیب تن کر لیا۔ ڈرائیور ہماری یہ حرکتیں بڑے غور سے دیکھ رہا تھا، بولا "یہ پگڑیاں آپ کو بہت سجتی ہیں۔"

"اسی لیے تو پہنی ہیں میاں جی! میں اپنے سسرال جا رہا ہوں، مجھے باادب باملاحظہ ہونا چاہیے۔" آبی نے کہا۔

راستے میں پولیس نے کئی جگہ ہماری کار کے اندر جھانک کر دیکھا مگر ان میں سے کسی کو بھی یہ گمان نہ گزرا کہ ہم کون ہیں۔ وہ اس روز کسی اور ہی چکر میں تھے۔ اور ڈیوٹی پر متعین سپاہی اس نئی نویلی کار اور ہماری وہ جاگیرداروں ایسی پگڑیاں دیکھ کر کچھ ایسے مرعوب ہوتے رہے کہ ان میں سے کسی نے بھی نہ پوچھا کہ ہم کون ہیں اور کہاں جا رہے ہیں۔

کار میں نے الماس کے گھر کی طرف موڑ دی تو آبی بولا۔

"ہمیں پہلے اس سے فون پر بات کر لینی چاہیے میرا خیال ہے کہ ہم سیدھے کسی ہوٹل میں جا ٹھہرتے ہیں۔"

"تو ٹھیک ہے ادھر انٹر کانٹینینٹل میں جا ٹھہرتے ہیں۔"

"نہیں یار! اتنی اونچی مصیبت مول لینے کی کیا ضرورت ہے لاہور ہوٹل ٹھیک رہے گا۔"

"نہیں! میرا دل نہیں مانتا ہے وہ بھی محفوظ جگہ نہیں ہے۔"

آبی نے میرا ہاتھ دبایا، بولا "آہستہ بول یار! اس ڈرائیور کے کان ادھر ہی لگے ہیں۔" پھر بلند آواز سے بولا "چل بھئی! ہمیں ادھر تو انٹر کانٹینینٹل میں لے چل۔"

کچھ ہی دیر بعد ہم شہر کے اس سب سے اونچے ہوٹل کے ایک خوبصورت کمرے میں جا اُترے۔ گاڑی کو ہم نے صبح تک کے لیے روک لیا۔ اسے ہم چوبیس گھنٹے کے لیے اپنے ساتھ رکھ سکتے تھے۔

رات کو کھانا کھانے سے پہلے آبی نے الماس کے گھر فون کیا۔ اس کی کسی ملازمہ نے بتایا کہ وہ واپس آ چکی ہے، یہ بڑی خوش کُن خبر تھی۔ ملازمہ ریسیور میز پر رکھ کر اسے اطلاع دینے گئی تو آبی بولا "یار! اس سے تم بات کرو۔ میرا دل بیٹھ جائے گا اُس کی آواز سن کر۔" اس کا چہرہ تمتما اٹھا تھا۔ اس وقت مجھے یہ احساس ہوا کہ الماس نے آبی کے دل میں گھر کر لیا ہے۔ وہ اس کے اندر کچھ زیادہ اتر گئی تھی۔

میں نے آبی سے ریسیور لے لیا۔

"ہیلو کون؟"

"میں آپ کا خادم ہاشم خان بول رہا ہوں۔ آبی میرے پاس ہی بیٹھے ہیں۔"

"ارے آپ میرے گھر کیوں نہیں آئے ابھی تک! میں آپ کا انتظار کر رہی ہوں۔"

"دیکھیں ہمیں آپ سے بہت ضروری باتیں کرنی ہیں آپ ابھی ادھر انٹر کانٹینینٹل میں پہنچ جائیں۔" یہ کہہ کر میں نے اسے کمرہ نمبر بتا دیا۔

وہ بولی "بہت بہتر میں ابھی آ رہی ہوں۔ میرا انتظار کریں آدھ گھنٹے تک میں وہاں پہنچ جاؤں گی۔" یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

"وہ آدھ گھنٹے تک یہاں پہنچ جائے گی۔ اتنے میں ہم کھانا کھا لیتے ہیں۔" میں نے آبی کو خوشخبری سُنائی۔ وہ ایک دم خوش ہو گیا، پھر کچھ سوچ کر بولا۔

"مگر میں اس سے کیا بات کر سکوں گا یار! یہاں تو کوئی تخلیے کا انتظام بھی نہیں ہے۔"

"بک نہیں اوئے! اسے بھی شکنتلا سمجھ لیا ہے تو نے — ذرا کھانے کے لیے کہہ دے۔"

اس نے انٹرکام پر ضروری ہدایات دیں اور پھر غسل خانے میں جا گھسا۔ جب وہ باہر آیا تو معلوم ہوا کہ اس نے رگڑ رگڑ کر منہ دھو رکھا تھا۔ اور وہ دانت بھی خوب اچھی طرح مانجھ کر نکلا تھا۔

الماس ٹھیک آدھ گھنٹے بعد ہمارے پاس آ پہنچی۔ وہ تنہا آئی تھی اور کیلے کے پتوں ایسی سبز ساڑھی پہنے ہوئے تھی — وہ برقعہ پہن کر آئی تھی کیونکہ اس کے لیے اپنی وہ بے پایاں شہرت مصیبت بن چکی تھی۔ وہ کسی بھی جگہ کھلے منہ باہر نہیں نکل سکتی تھی۔ آبی نے اسے بڑے مہذب طریقے سے خوش آمدید کہا۔ وہ جب اطمینان سے ہمارے سامنے صوفے پر جم کر بیٹھ چکی تو آبی بولا۔

"میں تو ایک لمحے کے لیے بھی آپ کو نہیں بھول سکا ہوں ہر وقت آپ کی صورت نگاہوں میں پھرتی ہے۔"

"جی ہاں! یہ مرض بہت عام ہے آبی صاحب! یہ مرض شدت سے حملہ کرتا ہے۔ حکماء صبح شام مریض کے سر پر سات جوتے لگانے کا مشورہ دیتے ہیں۔"

آبی نے اس کی یہ بات سن کر اپنی دم سکیڑ کر ٹانگوں میں دبالی۔ اس کی حالت دیدنی تھی۔ الماس نے ایسا جھانپڑ دے مارا تھا اس کے منہ پر کہ وہ بیچارا بس بغلیں ہی جھانکتا رہ گیا چند لمحوں کے توقف کے بعد بولا۔

"میرا خیال ہے کہ اس مرض کے جراثیم جو لوگ پھیلاتے ہیں انہیں قرنطینہ میں ڈال دینا چاہیے۔"

"میں تو اسی لیے برقعہ پہن کر نکلتی ہوں جناب! اپنی طرف سے تو ہم ہر احتیاط بروئے کار لاتے ہیں۔"

"اس کی باتوں پر نہ جائیں میڈم مجھے یہ بتائیں کہ آپ خیر خیریت سے واپس آ گئی تھیں۔"

"ہاں! آ تو گئی ہوں مگر حیرت مجھے یہ ہے کہ اس غریب نواز نے اپنے آدمی کے ہلاک ہو جانے کے بارے میں پولیس کو کچھ نہیں بتایا مگر میں اس کے خلاف پرچہ کٹا آئی ہوں۔ صبح بہاولپور جا کر میں کمشنر سے بھی ملی تھی۔ اس نے ایس پی کو ہدایت کر کے اسی وقت غریب نواز کو تھانے بلا لیا ہو گا۔"

"آپ کو وہاں ٹھہر کر اس کے سامنے بات کرنی چاہیے تھی۔"

"وہ عبدالحئی اور دوسرے لوگ وہیں ہیں۔ مسٹر عبدالحئی کو ہوش آ گیا تھا اور وہ بہت تپا ہوا تھا۔ میں نے لاہور واپس پہنچ کر ایک فلمی وفد بھی گورنر کے پاس بھیجا ہے۔ کل سارے اسٹوڈیوز میں ہڑتال ہو جائے گی۔ میں اس معاملے کو چھوڑ نہیں سکتی۔"

"مگر اس کے جو آدمی مر گئے ہیں وہ کس کھاتے میں جائیں گے؟"

"یہی تو میں پوچھتی ہوں مگر اس کے آدمیوں نے ہی ان کی لاشیں وہاں سے اٹھا لی تھیں۔ ہم کیا کر سکتے ہیں۔ اب وہ کسی پر دعویٰ نہیں کر سکتا۔"

"ہاں یہ تو ہے۔ اسے یہ سودا بہت مہنگا پڑا ہے میڈم! اب آپ کا وہ اور زیادہ دیوانہ ہو جائے گا۔"

"میں اس پر تھوکتی بھی نہیں ہوں ہاشم صاحب! میں نے اسے قید نہ کروایا تو میرا نام نہیں۔"

"ہاں! یہ تو آپ کر سکتی ہیں اور کرنا بھی چاہیے کیونکہ وہ کسی ایسے ہی سلوک کا مستحق ہے۔ منان سے نہیں ملی ہیں آپ؟"

"نہیں! اسے میں فون پر ڈھونڈتی رہی مگر وہ ملا ہی نہیں۔"

"میری بات سنیں میڈم! ہم اس شخص کی وجہ سے زبردست مصیبت سے دوچار ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ آپ اس سلسلے میں ہماری مدد کریں۔"

"آپ حکم کریں ہاشم صاحب آپ کے لیے اور آپ کے دوست کے لیے میری جان بھی حاضر ہے۔ آپ نہ ہوتے تو کل رات میں تباہ ہو چکی ہوتی۔"

آبی نے کان کھڑے کیے۔ بولا "یعنی میرے لیے بھی آپ کی جان حاضر ہے؟ یعنی یہ میں کیا سن رہا ہوں؟" وہ مسکرا رہا تھا۔ کرسی سے اٹھ کر وہ الماس کے سامنے پڑی تپائی پر جا بیٹھا تھا۔

"آزما کر دیکھ لیں۔ میں غلط نہیں کہہ رہی ہوں۔ میں نے آپ جیسے جی دار لوگ کہیں نہیں دیکھے۔" الماس نے بڑی رسان سے کہا۔

"سنیں میڈم ہماری مشکل یہ ہے کہ ــــــــ" یہ کہہ کر میں نے ماجدہ، عرشی، سلونی اور اپنی بہن آسیہ کا قصہ ضرورت کے مطابق اسے سنا دیا۔ ریٹا کی موت کی بات بھی میں نے اسے بتا دی۔

وہ تو دنگ رہ گئی، بولی "کمال ہے ہاشم صاحب! اب میں سمجھی ہوں کہ ماجدہ نے اس روز مجھے منان سے وہ سوال کرنے پر کیوں مجبور کیا تھا۔ ٹھہریں میں ابھی منان کو یہاں بلواتی ہوں وہ کتے کی طرح دوڑا آئے گا آپ ادھر پلنگ کے پیچھے چھپ کر خود اس کی باتیں سن لیں۔"

"یہ تو بہت ہی اچھا ہو گا۔ آپ اسے فون کر کے یہاں بلوائیں۔"

الماس نے ہمارے کہنے پر عمل کرتے ہوئے منان کو فون کر دیا۔ وہ اس وقت گھر پر ہی تھا۔ اس کی بات سن کر فوراً ہی

ہوٹل پہنچنے پر آمادہ ہو گیا۔

وہ شاید ادھر ہی اور آر اسٹیٹ میں رہتا تھا۔ کوئی پندرہ ہی منٹ بعد ہمیں دروازے پر دستک ہوئی۔ معلوم ہوا کہ باہر منان کھڑا ہے۔ ہوٹل میں میں نے اپنا نام چوہدری عبدالغنی زندہ دلا لکھوایا تھا اور یہ اچھی بات تھی کیونکہ ہمارے اصلی ناموں یا کسی حد تک دوسرے معروف ناموں کی بھنک پولیس کے کانوں تک پہنچ سکتی تھی۔ میں اور آبی اپنے اپنے پستول سنبھال کر پلنگوں کے پیچھے لیٹ گئے۔ قالین وہاں تک بچھا تھا۔ اس لیے ہمیں فرش پر لیٹنے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی۔ الماس نے بڑے اطمینان سے دروازہ کھول دیا۔ منان عمدہ قسم کی بوسکی رنگ کی شیروانی اور براق سفید لٹھے کی شلوار پہنے ہوئے تھا۔ خود کو وہ خوشبو میں بھگو کر لایا تھا۔ اس کے آتے ہی کمرہ مہک اٹھا مگر الماس بڑے لیے دیے انداز سے پیچھے ہٹ کر صوفے پر بیٹھ گئی بولی۔

"میں بہت پریشان تھی منان تم سے کچھ ذاتی باتیں کرنے کے لیے میں نے تمہیں یہاں بلوایا ہے۔"

"تم حکم کرو الماس! تمہارے بغیر تو یہ شہر ویران ہو گیا تھا۔ اتنے دن کیوں رہ گئی تھیں تم وہاں؟"

"بس کام ہی اتنا تھا منان! اور پھر وہاں کے رئیس غریب نواز نے مجھے بہت پریشان کیا۔"

"کیا ہوا تھا وہاں! مجھے تھوڑی دیر پہلے کسی نے فون پر بتایا تھا کہ نگار خانوں میں بڑی افراتفری مچی ہے کل فلمی حلقے ہڑتال بھی کر رہے ہیں۔"

"وہ سب کچھ اس بہاولپور کے رئیس کی وجہ سے ہوا ہے۔ اس نے کل آدھی رات کو مجھے صحرا میں سے اٹھوانے کی کوشش کی۔ اس وقت وہاں دو اجنبی رات گزارنے کے لیے آ ٹھہرے تھے۔ اور وہ دونوں مسلح تھے۔ ان کی مداخلت پر غریب نواز کے آدمی ناکام ہو گئے وہاں گولی چل گئی تھی۔ ان بدمعاشوں نے میرے فلم یونٹ کے تمام آدمیوں کو بندوقوں کے دستے مار مار کے زخمی کر دیا۔ مجھے بھی وہ جیپ میں ڈال کر لے چلے تھے مگر ان دو اجنبیوں کا بھلا ہو انہوں نے مجھے چھڑا لیا۔"

"وہ اجنبی کون تھے؟"

"میں نہیں جانتی۔ وہ اندھیرے میں ہی ہمارے پاس آئے تھے اور حملے کے بعد وہاں سے چپ چاپ نکل گئے مجھے تو ان کے نام بھی یاد نہیں ہیں۔"

"ہوں، اب کیا چاہتی ہو تم؟"

"کچھ بھی نہیں! بس کسی طرح اس رئیس کو جیل بھجوا دو۔ ورنہ وہ میری جان نہیں چھوڑے گا۔"

"اس کا تو میں پکا بندوبست کروں گا خواہ مجھے حوالات میں سے کسی آدمی کو وہاں بھیج کر اسے گولی مروانی پڑے اس نے سمجھا کیا ہے خود کو۔" یہ کہہ کر وہ اپنے بارے میں اونچی اونچی بڑ ہانکنے لگا۔ آخر الماس اسے گھیر گھار کر ماجدہ کے ذکر پر لے آئی، بولی۔

"میں نے سنا ہے کہ اس ماجدہ کا کسی ڈاکو غلام جیلانی سے گہرا تعلق ہے؟"

"ہاں ہے تو سہی! مگر اب اسے یہ معلوم نہیں ہے کہ غلام جیلانی کہاں ہے۔"

"ماجدہ کہاں ہے آج کل؟"

"اسے ہم نے دوسری دو لڑکیوں کے ساتھ جیل بھیج دیا ہے۔"

"کیوں؟ اسے کیوں پکڑ لیا آپ نے؟"

"اس کے ساتھ دو لڑکیاں تھیں نا سلونی اور عرشی وہ بھی جیلانی کی رکھیل ہیں۔ چند روز پہلے جیلانی نے گاڈی اور اس کے تین آدمیوں کو قتل کر دیا تھا اس کا بدلہ لینے کے لیے گاڈی کا یار دانی کسی نہ کسی طرح غلام جیلانی کے ٹھکانے پر پہنچ گیا وہاں جیلانی تو نہیں ملا البتہ اس کی وہ تین داشتائیں مل گئیں۔ ان کو پکڑ کر دانی نے ہمارے حوالے کر دیا۔"

"سنو منان! تم نے آسیہ کے بارے میں مجھے کچھ نہیں بتایا وہ کہاں ہے آج کل؟"

"اسے وہ کبیر شاہ میری آنکھوں میں دھول جھونک کر لے گیا تھا۔ میں پوری تفتیش کر چکا ہوں مگر کبیر شاہ اعتراف نہیں کرتا۔ میں دوبار اس کے گاؤں جا چکا ہوں۔ جہاں وہ چھٹی لے کر جا بیٹھا ہے۔"

"تو تم نے اس کے پیچھے آدمی لگا دیے ہوئے ہیں۔ اگر آسیہ کو اس نے کہیں رکھا ہے تو کبھی نہ کبھی وہ اس سے ملتا ہی ہو گا۔"

"وہ بھی میں کر چکا ہوں مگر وہ بہت گھنا ہے وہ کبیر شاہ گھر سے کسی بھی طرف نہیں نکلتا۔ آج صبح مجھے کسی نے بتایا ہے کہ آسیہ اس کے پاس گاؤں پہنچی تھی مگر پرسوں رات اسے کسی نے وہاں سے اغوا کر لیا۔ وہاں بھی گولی چل گئی تھی۔ کبیر شاہ نے حملہ کرنے والوں کا ایک آدمی بھی مار ڈالا تھا۔ خود کبیر شاہ گولی سے زخمی ہو کر ہسپتال میں جا پڑا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تمہارے آدمیوں نے آسیہ کو وہاں سے اڑا لیا ہے۔"

"نہیں نہیں! میرے کسی آدمی میں اتنی جرأت نہیں ہو سکتی اور پھر میں نے انہیں ایسا کرنے کے لیے نہیں کہا تھا۔ یہ کام کسی اور آدمی نے کیا ہے۔"

"وہ کون ہو سکتا ہے؟" الماس نے پوچھا۔

"میں خود حیران ہوں الماس! اب میں صبح خود ساہیوال

جا کر کبیر شاہ سے ملوں گا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تمہیں آسیہ کے بارے میں اس وقت کچھ معلوم نہیں ہے۔"

"نہیں بھئی! میں اگر کچھ جانتا تو میں اس لڑکی کو پکڑ کر اُس کی گردن دباتا۔ اسے معلوم ہے کہ اس کے بعد تی کا اصل ٹھکانا کہاں ہے بیں اس سے سب کچھ اگلوا لیتا۔ میری تو نوکری پر حرف آرہا ہے اپنی اس ناکامی پر میرے ساتھ کئی اور بھی پولیس افسر سخت پریشان ہیں۔"

"تمھارا کیا خیال ہے آسیہ کو کس نے اٹھوایا ہے کبیر شاہ کے گھر سے؟"

"یہی تو میں حیران ہوں الماس! آج دن بھر مجھے دانی نہیں مل سکا۔ مجھے تو یہ شک ہے کہ اس نے ہی آسیہ پر ہاتھ ڈالا ہے۔ وہ اپنے دوست کی موت کا بدلہ لینے کے لیے قرآن کی قسم کھائے بیٹھا ہے وہ دانی۔"

"ہوں ہو سکتا ہے یہ کام اسی نے کیا ہو مگر اُسے کس نے بتایا ہوگا کہ آسیہ کبیر شاہ کے پاس ہے؟"

"اس کے بھی ہاتھ بہت لمبے ہیں بھئی! اسے ایک آدمی نہ سمجھو ایک پورا بدمعاشی کا محکمہ کھول رکھا ہے اُس نے۔"

"اچھا! اتنا خوفناک آدمی ہے؟"

"ہاں! مگر وہ پولیس سے بھی بہت تعاون کرتا ہے اور اس نے غلام جیلانی کی گرفتاری میں ہماری مدد کا بھی پکا وعدہ کر رکھا ہے۔"

"اچھا دفع کرو اس ذکر کو متان! چلو ادھر چل کر ڈانس دیکھتے ہیں ابھی گیارہ بجے ہیں مس ڈورتھی آئی ہوئی ہے یہاں ساڑھے گیارہ بجے اس کا شو شروع ہوگا۔"

"نہیں بھئی! ادھر ہم اپنا ڈانس کیوں نہ شروع کریں۔ یہ رات پھر کب آئے گی الماس!"

"تم لوگوں میں یہی خرابی ہے گلئے کے دودھ کی قدر نہیں کرتے ہو اسے ذبح کرنے پر تلے رہتے ہو تاکہ اس کے کباب کھا سکو۔"

"یہ کیا کہتی ہو الماس! میری محبت کا یوں مذاق نہ اڑایا کرو۔ تمھاری قربت کے لیے میں پاگل ہوا پھرتا ہوں۔ اپنی ساری کمائی میں نے تمھارے قدموں تلے ڈال دی مگر تم آج بھی مجھ سے اتنی ہی دور ہو جتنی پہلے دن تھیں۔" متان نے بڑے ہی فسردہ لہجے میں کہا۔

"لعنت بھیجو اس پر، تمھاری وہ کون سی حلال کی کمائی تھی۔ مال حرام بود بجائے حرام رفت۔"

"ایسا نہ کہو الماس! تمھارے لیے میں نے اپنی نو بیاہتا بیوی کو طلاق دے دی۔ چار لاکھ روپیہ تمھاری نذر کر دیا مگر... مگر مجھے کیا ملا تم سے؟"

"یہ بڑی گھٹیا بات ہے۔ روپے پیسے کا ذکر مجھ سے مت کیا کرو متان! تمہیں خود مجھے تحفے دینے کا خبط ہے ورنہ مجھے تمھاری کسی شے کی ضرورت نہیں سوائے تمھارے خلوص کے۔"

"خلوص! خلوص! خلوص! اس سے آگے بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے الماس۔" متان نے چیختے ہوئے کہا۔

اس پر الماس بولی "اس سے آگے خلوص کی بہن خلاصی کھڑی ہے آؤ اس سے ملتے ہیں ادھر ڈورتھی کے ڈانسنگ فلور پر۔ اٹھو بھی خواہ مخواہ جذباتی نہ ہو جایا کرو۔"

"میں تمہیں آج تک نہیں سمجھ سکا ہوں الماس! میں سمجھا تھا کہ آج تم مہربان ہو گئی ہو۔ مگر نہیں! میں جا رہا ہوں الماس! مجھے نہیں دیکھنا ہے کوئی ڈانس۔"

"ارے بھئی سمجھنے کی کوشش کرو متان! میں پاکستان اور بھارت کی مشہور ترین اداکارہ ہوں میری ساکھ شہرت دیکھو۔ اس مرحلے پر تم سے شادی کر کے تو میں صفر ہو جاؤں گی۔ کیا کہیں گے لوگ کہ الماس نے ایک بیچیچرے پولیس افسر سے شادی کر لی۔"

"تم بکتی ہو مجھے ذلیل کرتی ہو۔ میں یہ توہین برداشت نہیں کر سکتا۔ میں جا رہا ہوں۔" یہ کہہ کر متان پیر پٹختا ہوا تیزی سے آگے بڑھا، اور دروازہ اپنے پیچھے دھڑام سے بند کر کے باہر چلا گیا۔

میں اور آبی ہاتھ جھاڑتے ہوئے پلنگوں کے نیچے سے نکل آئے۔ آبی سے اپنی ہنسی دبائے نہیں دبتی تھی۔ یہی حال میرا تھا مگر پھر بھی ہم دونوں اپنا سانس دبا کر نیچے لیٹے رہے تھے اور ہماری پردہ داری کے لیے پلنگ پر پڑی فرش بوس حاشیے والی چادریں ہماری حفاظت کرتی رہیں۔ الماس ہمیں دیکھ کر مسکرائی، بولی۔

"سن لیا آپ نے اس جغد کو آسیہ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔"

"وہ تو آپ کو بھی نہیں جانتا کہ آپ نے اسے اغوا کر کے کہاں پھینک رکھا ہے میڈم۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔

آبی ایک بار پھر صوفے پر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ الماس سرک کر کونے کی طرف ہٹ گئی۔ بولی۔ "پتہ نہیں عورت کو یہ مرد کیا سمجھتے ہیں ہر کوئی دیکھتے ہی ایپلیکیشن داغ دیتا ہے الاٹ منٹ کی۔ میرا تو کم از کم یہی تجربہ ہے۔ فوراً ہی دم ہلانے لگتے ہیں۔ معاف کیجیے میں آپ کا ذکر نہیں کر رہی ہوں۔"

الماس نے ایک اور زوردار طمانچہ آبی کے منہ پر دے مارا۔

"بھئی اب تو تسلی ہو گئی نا تمھاری! یہ بھی ایپلیکیشن ٹاپ کروا رہا ہے آج کل آپ کی الاٹ منٹ کی۔"

"ان کا کیس کانسڈر ہو سکتا ہے ہاشم صاحب! یہ بہت مختلف آدمی ہیں۔ ان کی گولیوں اور گالیوں کا اثر میں دیکھ چکی ہوں۔" الماس نے بڑے ہی غیر متوقع انداز سے آبی کا ہاتھ

اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر آنکھوں سے لگا لیا۔ الماس کے چہرے پر ایسی، افسردگی اتر آئی تھی کہ میں حیران ہو کر رہ گیا۔ اس کا گلا اچانک ہی رندھ گیا، بولی۔

"میری عصمت اور درندے کے دانتوں کے درمیان کچھ بھی فاصلہ نہیں رہ گیا تھا آبی صاحب! میں ایک رات کے لیے بھی اس خبیث کے حجرے میں جا پہنچتی تو زندگی بھر کے لیے خود سے متنفر ہو جاتی۔ میں آپ کا یہ احسان کبھی نہ اتار سکوں گی آبی صاحب مر کر بھی نہیں۔"

آبی اپنے ہاتھ کی بھیگی ہوئی پشت کو دیکھتے ہوئے ایک دم قالین پر بیٹھا اور میری عقل و خرد کے سارے خانے بند ہوتے چلے گئے۔ آبی نے ایک مجہول معمول کی طرح ایک دم نیچے جھک کر اپنے ہاتھ الماس کے پاؤں پر رکھ دیے، بولا۔

"میں نے سالہا سال آپ کی خوابوں میں پرستش کی ہے الماس! میرا صندوق آپ کی تصویروں سے بھرا پڑا ہے مگر میں نے یہ راز کسی پر ظاہر نہیں کیا تھا۔ آپ کے لیے تو میں سارے شہر کو جلا سکتا ہوں۔" اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

اس کی شخصیت کے اس رخ نے مجھے پاگل کر دیا۔ الماس نے تڑپ کر اس کے ہاتھ اپنے پاؤں سے ہٹائے اور اُسے کندھوں سے پکڑ کر اٹھاتی ہوئی بولی۔

"مجھے شرمندہ نہ کریں آبی صاحب! سارے جہان کا حسن اور فن آپ کی اس بہادری اور جرأت کے سامنے ہیچ ہے۔ مجھے آپ کبھی اپنے سے دُور نہیں پائیں گے۔"

وہ رقت آمیز منظر دیکھ کر میں نے باہر جانے کے لیے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا تو وہ دونوں ایک دم سنبھل گئے۔ آبی نے اپنے ہاتھ کی پشت سے آنکھیں پونچھ کر مجھے کھا جانے کے سے انداز سے دیکھا اور بولا۔

"تو کہاں جا رہا ہے مولوی اتقاء اللہ متقی! ہمارا نکاح یہاں تیرا باپ پڑھائے گا۔ ایجاب قبول تو ہم نے خود ہی کر لیا ہے۔"

اس کی یہ بات سُن کر الماس بے ساختہ ہنس دی۔

"ابھی سال دو سال تک منگنی کے چھوہارے بانٹتے رہیں۔ لڑکی بالغ ہوگی تو نکاح بھی ہو جائے گا۔ چلیں ہاشم صاحب ہم ڈورتھی کا ناچ دیکھتے ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ چند لمحوں کے لیے غسل خانے میں جا گھسی۔ اس کا خوبصورت سا پرس اس کے ہاتھ میں تھا۔ آبی نے اس کے غائب ہوتے ہی مجھے باہوں میں بھینچ لیا۔ میں نے بڑی مشکلوں سے خود کو اس سے الگ کیا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا ورنہ وہ... چیخ چیخ کر اپنی اس فتح کا اعلان کرتا جو اسے اس لمحے الماس پر حاصل ہو گئی تھی۔

میں نے دل میں کہا کہ اس ناری کا بھی کوئی بھروسا نہیں — پل میں تولہ ہوتی ہے تو پل میں ماشہ۔ اس کی ہاں اور نہیں میں بلاشبہ بال برابر فرق نہیں ہوتا ہے۔ ابھی یہ طوبیٰ کو چھو رہی ہوتی ہے تو ابھی تحت الثریٰ میں جا گرے گی۔ بھلا اس آبی مچھندر میں کیا خوبی نظر آگئی ہے اسے۔ مگر وہ اس کی بے دریغ ڈزا ڈز پر ہی قربان ہو گئی ہے۔ متان ایسے سانڈ کو رد کر کے آبی ایسے چور کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گئی تھی۔

چند ہی منٹ بعد جب الماس غسل خانے سے باہر نکلی تو اس کا چہرہ آنسوؤں کی آلائش سے پاک ہو چکا تھا اور وہ ہمیشہ ایسی ترو تازہ نظر آ رہی تھی۔ آبی نے برقعہ اس کی طرف بڑھایا جسے اس نے بڑی دلفریب ادا سے اپنے بدن کو رقص کے زاویوں میں بل دیکر اوڑھ لیا۔ جب وہ دبیز نقاب گرا کر ہمارے ساتھ باہر نکلی تو آبی کی شملے دار پگڑی سے وہ صدیوں سے بیاہی نظر آتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ واقعی کسی جاگیردار کی بیوی ہے اور میں اُن کا منہ بولا بنا ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

عینکیں ہم دونوں نے آنکھوں پر لگا رکھی تھیں۔ الماس کو کار تک چھوڑنے کے لیے ہم ہوٹل سے باہر کار پارک تک جا پہنچے الماس واقعی آبی کو بڑی سنجیدگی سے اپنے لیے منتخب کر چکی تھی، بولی۔ "آبی صاحب کل شام آٹھ بجے میرے گھر آئیے۔ آپ بھی ہاشم صاحب مجھے معلوم ہے آپ دونوں کا ماضی اور حال کیا ہے۔ مستقبل پر بھی میری نظر ہے مگر میں نے واقعی ایک فیصلہ کر لیا ہے۔ آپ ضرور ان کے ساتھ آئیے۔" یہ کہہ کر اس نے آبی کا ہاتھ برقعے کے اندر چھپا کر اس سے مصافحہ کیا اور کار میں بیٹھ کر اسی وقت باہر نکل گئی۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہوئی تو آبی بولا۔

"میرے ساتھ چل جیلانی! میں ابھی اور اسی وقت اپنی ماں سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں نے الماس سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے یار! مگر اس وقت گاؤں جا کر کیا کریں گے۔"

"میں اپنا یہ فیصلہ ماں کو سنانا چاہتا ہوں ابھی اور اسی وقت مجھے اس کے پاس لے چل جیلانی تیری بڑی مہربانی ہوگی۔"

"یار تو کیا کر رہا ہے۔ دیکھتا نہیں ہم کس چکر میں پھنسے ہیں اور تجھے شادی کی سوجھ رہی ہے۔"

"ہم ایسوں کی شادیاں یونہی گولیوں کی بوچھاڑ میں ہوا کرتی ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ موقعہ پھر ہاتھ نہیں آئے گا میرے ساتھ چل جیلانی دیر نہ کر۔"

"ٹھیک ہے بھئی! میں اپنی چیزیں سمیٹ لاؤں پھر چلتے ہیں۔"

"میں تالا لگا آیا تھا کمرے کو۔ کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ کمرہ میں نے ایک ہزار روپے دیکر پانچ دن کے لیے بک کرایا تھا۔ وہ

سامنے ہی پاس رہے گا۔"

"تو ٹھیک ہے، چل بیٹھ جا گاڑی میں مگر میں چاہتا تھا کہ صبح ہم بینک سے کچھ رقم لے کر کسی طرف نکلتے بالکل قلاش ہو گئے ہیں ہم۔"

"پیسے بہت ہیں میرے پاس۔ کچھ رقم میں نے بہت دن ہوئے گھر میں ایک جگہ دبا دی تھی۔ وہ نکال لیں گے۔ پورے ساٹھ ہزار روپے ہیں۔ ڈبے میں بند کر کے دفن کیے تھے وہ نوٹ میں نے۔" یہ کہہ کر وہ مجھے کار تک لے گیا اور ہم اسی وقت آبی کے گاؤں ہریکا کی طرف چل دیے۔ اس وقت رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ ہوا خنک تھی۔ اور جب کار کے ہوادانوں میں سے منہ پر پڑتی تو سرور دیتی تھی۔ آبی خوش بھی تھا اور پریشان بھی۔ ماں کی یاد نے اسے بے چین کر دیا تھا۔ بڑے جھنجھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"میاں ذرا جلدی چلو۔ ہمیں بڑی دیر ہو گئی ہے۔ اس ڈاچی کی رفتار ذرا تیز کر دو۔"

"پہنچ جائیں گے بھئی! تمہارے گاؤں ہی تو جانا ہے کون سا دور ہے وہ۔" میں نے اسے سگریٹ سلگا دیا۔ وہ گہرے گہرے کش لینے لگا۔ بولا۔

"یار میرا حال گھر سے بھاگے ہوئے اس بچے ایسا ہے جسے والدین کی طرف سے ساری معافیاں ملنے کے باوجود گھر یاد نہیں آتا۔"

"میرا اپنا حال بھی یہی ہے آبی! پتہ نہیں میری ماں جی کس حال میں ہوں گی۔"

"تمہیں ان کے ہاں ضرور جانا چاہیے۔ وہ تو رو رو کر آنکھیں کھو بیٹھیں گی۔ پرسوں میں تیرے ساتھ اُدھر جاؤں گا۔"

ڈرائیور اب بھی ہماری باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا مگر میں اس کی طرف سے بے فکر ہو چلا تھا۔ وہ تو ہر قسم کے لوگوں کو اِدھر سے اُدھر لیے پھرتا تھا۔ اسے ہم تھوڑا بہت انعام دے کر اپنی باتیں اس کے ذہن سے کھرچ سکتے تھے۔

یہ شالامار باغ سے آگے نکل کر جب داروغہ والا پہنچے تو آبی کے ماضی کی یادیں اس کے ذہن میں کلبلانے لگیں۔ بولا۔ "یار! اپنے بچپن سے ہم کتنی دور نکل آئے ہیں۔ یہاں سے ہم ٹولیاں بنا کر میلہ چراغاں دیکھنے جایا کرتے تھے۔ کیا دن تھے وہ بھی۔ ادھر تو اب بہت آبادی ہو گئی ہے۔ ان دنوں یہاں دور دور تک ہرے بھرے کھیت ہوا کرتے تھے۔"

"آدمی اپنے آپ کو بھلا نہیں سکتا۔ دراصل آدمی صحیح معنوں میں اگر جیتا ہے تو وہ بچپن ہی کے دور میں جیتا ہے۔ اس کے بعد تو بس لعنتیں ہی لعنتیں حصے میں آتی ہیں۔"

"اس کی وجہ یہ تو نہیں ہے جیلانی کہ ابھی آدمی خدا کے گھر سے زیادہ دور نہیں نکلا ہوتا ہے اور اس میں عدم کی خوشبو ابھی باقی ہوتی ہے۔"

"ہو سکتا ہے یہی وجہ ہو مگر میں سمجھتا ہوں کہ دنیا کی ہر شے سے آدمی کی آشنائی نئی نئی ہوتی ہے جیسے تمہاری ابھی الماس سے ہے۔ اس کے پنجوں کے ناخن بھی تمہیں ہلال نظر آتے ہیں۔"

"ہاں یار! یہ بات کہی ہے تم نے۔ جب مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ پھول میں عجیب سی دل کش خوشبو ہے تو میں ڈھیر سارے خوشبو توڑ کر اپنی جھولی میں بھر لیے اور انہیں یوں سونگھتا رہا جیسے میں ان سے کبھی جدا نہ ہوں گا اور وہ کبھی نہیں مرجھائیں گے مگر پھر وہ پھول جب مر گئے تو میں بے تحاشا رونے لگا۔ میری ماں نے مجھے بڑی مشکلوں سے سمجھایا کہ ٹوٹا ہوا ہر پھول ڈالی سے ہٹتے ہی آدھا مر جاتا ہے اور آدھا تمہارے ہاتھ میں مرتا ہے۔"

آبی پر عجیب سی فلسفیانہ کیفیت طاری تھی۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر ایسی آہ بھرتا تھا جیسے اس کا سانس کسی زخم سے مس ہو کر نکلتا ہو۔ الماس کی محبت نے اس پر بے پناہ حزن و ملال طاری کر دیا تھا۔ وہ ابتدا کی بے یقینی کے بعد اس کی ہاں کے پیدا کردہ جوش و خروش نے اب دل میں اتر کر اسے اس دہشت میں مبتلا کر دیا تھا کہ کہیں وہ خواب تو نہیں دیکھ رہا۔ کیا وہ چاند اس کے آنگن میں اتر آئے گا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ الماس تک پہنچنے کے لیے جس گہری اور وسیع خلیج کو عبور کرنا وہ ناممکن سمجھتا تھا اسے وہ ایک ہی جست میں پیچھے چھوڑ جائے گا۔ بلاشبہ الماس نسائیت کا شاہکار تھی۔ کسی مرحلے پر اسے آبی نے خیزران جیسی کہا تھا۔ اس کے تخیل نے اسے خدا جانے کس کس رنگ میں دیکھا تھا اور اب وہ مجھے یہ کہہ آیا تھا کہ اس کے صندوق میں اس کی ان گنت تصویریں محفوظ ہیں۔ میں جانتا تھا کہ وہ گپ ہانک رہا ہے۔ اس نے تو کبھی اس الماس کا مجھ سے ذکر تک نہیں کیا تھا۔ وہ پچھلے تین چار سال سے پردۂ اسکرین پر تہلکہ مچاتی چلی آ رہی تھی۔ آبی اس کی فلمیں بھی دیکھتا رہا تھا مگر اس نے کبھی سوچا بھی نہ ہو گا کہ ایک دن وہ اس کے اس حد تک قریب ہو جائے گا کہ اسے اپنے دل کی دھڑکنیں بھی اجنبی لگنے لگیں گی۔ اور اپنے وجود میں وہ صرف اس کے تصور ہی کی سنسناہٹ محسوس کر سکے گا۔

جب ہم ہریکا پہنچے تو رات اپنے انجام کے کچھ اور زیادہ قریب جا پہنچی تھی۔ کتے کار کو نہیں پہچانتے تھے۔ ہم اس بے آواز گاڑی کو آبی کی گلی کے سامنے روک کر اترے تو آبی کو دیکھ کر کتوں نے اسے پہچان لیا۔ اس کی آشنا بو نے انہیں پیچھے ہٹا کر مودب کھڑا کر دیا۔ آبی نے ایک بڑے سے کتے کو پچکارا تو وہ یوں دم ہلاتا اس کے پاؤں پہ لوٹنے لگا جیسے وہ صبح شام اس کے ہی پاس رہتا چلا آ رہا ہو۔

"اوئے ڈگن بگے تو مجھے ابھی تک نہیں بھولا۔" آبی نے اس قدآور کتے کے بدن پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ اس نے ہلکی سی عف کی جیسے کہہ رہا ہو کہ کیوں بھول جاتا میں تجھے میرے گاؤں کے چھتنار پیڑ۔

"یار! تیرے تو بڑے برادرانہ تعلقات ہیں ان سے، ہائیں؟"

"بک نہیں اوئے! یہ میرے گاؤں کے چوکیدار ہیں — رکھوالی کرتے ہیں یہ ہماری۔ ان بلاؤں سے جو زمین پر چل کر ادھر آتی ہیں۔" آبی نے بڑے ہی شکایت بھرے لہجے میں یوں کہا، جیسے کہہ رہا ہو کہ ان کا مذاق نہ اڑا جیلانی۔ یہ آدمی سے بہرحال بہتر ہوتے ہیں۔ وہ وفاداری جو ان کی سرشت میں ڈال دی گئی ہے۔ وہ جو ایک ہی چوکھٹ پر منہ رکھ کر زندگی گزار دینے کا حوصلہ دیا گیا ہے وہ ہر آزمائش میں پورا اترا ہے۔ ان کے خدا نے کسی دوزخ کی خبر نہیں دی ہے۔ انہیں جنت سے بھی کوئی غرض نہیں ہے کیونکہ ان کے اعمال میں اُم الخبائث جھوٹ کا کوئی عنصر شامل نہیں ہے۔ یہ ہماری ریاکاری اور مکاری نہیں جانتے اور یہی وجہ ہے کہ ایٹم بم کا دور گزر جانے کے بعد بھی یہ زندہ رہیں گے اور انسان سے اپنی وفاداری کا عہد نبھاتے رہیں گے۔

ڈرائیور کو کار میں چھوڑ کر ہم تیز تیز قدم اٹھاتے آبی کے گھر جا پہنچے۔ دروازے پر آبی نے دستک دی تو خدا جانے اس میں ایک کون سا لاسلکی پیغام تھا کہ کھلے ویران صحن کے ایک کونے میں بچھی چارپائی پر لیٹی اس کی منڈ میلڑ رخت ایسی ماں وہیں سے پکار کر بولی۔

"ابھی آئی بیٹے ابھی آئی۔ ماں صدقے تو نے بڑی راہ دکھائی ہے اسلم۔" وہ بھاگتی ہوئی دروازے پر پہنچی اور کنڈی کھولتے ہی اس نے بیٹے کو باہوں میں جکڑ کر اندر کھینچ لیا۔ وہ بری طرح بلکنے لگی تھی۔ بولی۔

"آج میرا دل کہتا تھا کہ تو ضرور آئے گا بیٹے ساری رات میں نے آنکھوں میں کاٹ دی ہے مجھے یقین تھا میرا چاند ضرور آئے گا۔"

آبی بھی پھوٹ بہا۔ وہ سسکنے لگا تھا۔

"یہ تجھے کیا ہو گیا ہے ماں! تو اتنی دبلی کیوں ہو گئی ہے؟"

"کچھ نہیں! بیٹے میں تو ٹھیک ہوں پتر۔ تو بھی بیٹھ جا ادھر چارپائی پر۔" ماں جی نے اپنا چشمہ الگ رکھتے ہوئے کہا۔ اس کی چلم ابھی تک سلگ رہی تھی۔

"میں نے تمہارے لیے کھانا بھی پکا لیا تھا بیٹے۔ بیڑے دے گیا تھا مجھے تیرا یار تابیا۔"

"وہ کب آیا تھا ماں! جلدی جلدی آیا کرتا تھا وہ! میں اسے کہہ گیا تھا۔"

"وہ تو آتا ہی رہتا ہے ہر دوسرے تیسرے ہفتے۔ میرا بہت خیال رکھتا ہے وہ۔ کئی دن پہلے وہ مجھے دس ہزار روپے دے گیا تھا کہتا تھا مجھے اسلم نے بھیجا ہے۔"

"ہاں! وہ میں نے بھیجا تھا ماں! میں خود مصروف تھا اس لیے نہ آ سکا۔ کھانے کی ہمیں ضرورت نہیں ہے اس وقت تو بس بیٹھ جا۔"

"اچھا! تو پھر دودھ پی لو۔ بھوری بڑا گاڑھا دودھ دے رہی ہے آج کل۔ اتنی موٹی موٹی بالائی آتی ہے دودھ پر۔ میں بس وہی لے آتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ بھاگتی ہوئی گئی اور ایک چھینکے پر سے دودھ کی بڑی سی ہانڈی اتار لائی اور پھر اس میں سے اس نے دو گلاس بھر کر ہمیں تھما دیے وہ ان میں چینی بھی ملا لائی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ دودھ کے نہیں بالائی کے بھرے ہوئے گلاس ہیں۔ اس دودھ کی لذت میں آج تک نہیں بھول سکا ہوں۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس میں ماں کی ممتا گھلی ہوئی تھی۔

"ماں! میں نے سنا ہے کہ تم نے نمبردار نی سے پانچ سو روپے مانگے تھے کیا ضرورت تھی تمہیں؟"

"بیٹے وہ سقا ہے نا اسمٰعیل! اس کی بیٹی کی شادی تھی، وہ آزردہ ہو کر میرے پاس آیا مگر میرے پاس اس وقت پیسے نہیں تھے۔ میں نے پھر انور کی ماں سے لے کر اسے روپے دے دیے۔ اس بیچارے کی ضرورت پوری ہو گئی۔ تجھے کس نے بتایا ہے؟"

"مجھے انور نے ہی بتایا تھا۔ اس کے ہاتھ میں نے تمہارے لیے دس ہزار روپے بھیجے تھے۔"

"وہ تو اس سے پولیس نے چھین لیے۔" ماں جی نے کہا۔

معلوم یہ ہوا کہ وہ ایم اے او کالج کا طالب علم انور علی بھاڈی اس کے پاس کبھی نہیں آیا تھا بلکہ وہ گرفتار ہو گیا تھا۔ دو غنڈے اسے اغوا کر کے انڈیا لے جانا چاہتے تھے مگر پھر وہ پولیس سے ڈر کر اسے بارڈر پر چھوڑ گئے اور خود انڈیا چلے گئے یہ کہانی ہمیں ماں جی نے سنائی۔ ظاہر ہے ادھر اُدھر یہی بات مشہور ہو گئی ہو گی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انور علی بھاڈی نے ہمارے بارے میں اصل بات پولیس کو نہیں بتائی تھی۔ وہ ہمارے نام اور ٹھکانے کو بڑی کامیابی سے اخفا میں رکھ گیا تھا۔ یہ بہت بڑی بات تھی اور اس طالب علم کے کردار کی پختگی کا پتہ دیتی تھی۔ ماں جی نے یہ بھی بتایا کہ پولیس نے انور علی کے والدین کو بھی تھانے طلب کیا تھا۔ وہ بچارے اُدھر کئی دن تک خوار ہوتے رہے مگر انہیں کیا معلوم تھا جو وہ کسی سے کہتے۔ وہ تو انور کے بارے میں قسم کھا کر کہہ سکتے تھے کہ ان کا بیٹا بے گناہ ہے اور کسی چور ڈاکو کا کبھی بھی ساتھی نہیں رہا ہے مگر پولیس نے ان پر بھی بہت تشدد کیا۔ وہ غریب لوگ ہیں بس بس کر رہ گئے۔

آبی باہر نکلا اور ڈرائیور کو کار سمیت اپنے مرحوم دوست بہادر علی کی حویلی میں تھلا آیا۔ اب اس کی روٹی پانی کا بندوبست انہی کے ذمے تھا۔ وہ واپس آیا تو پھر کچھ ہی دیر بعد ہم صحن میں

الگ الگ بستر ڈال کر سو گئے۔ آنکھ ہماری جب ہی کھلی، جب سورج نے دیوار کے ساتھ بکائن اور کچنار کے درختوں کے اوپر اٹھ کر صحنوں میں تانک جھانک شروع کر دی۔

جب ہم نہا دھو کر اطمینان سے صحن میں بکائن کے سائے تلے چارپائی ڈال کر بیٹھ گئے تو ماں جی ہمارے لیے ناشتہ لے آئیں۔ رات کے بھنے ہوئے بٹیر ابھی باسی نہیں ہوئے تھے۔ خالص گھی میں پکے پراٹھے، لسی اور مکھن دیکھ کر آبی کھل اٹھا۔ اور ناشتے پر وہ یوں پل پڑا جیسے مجھے وہ کوئی "بہٹ" نہیں لگنے دے گا۔ گیند اپنی ہاکی تلے ہی رکھے گا۔

"ابے اتنا لالچ نہ کر دھرتیچے مارا جائے گا میرے ہاتھوں۔"

میری یہ بات سن کر آبی چونکا، بولا "نہیں اوئے! یہ دھرتیچے کیا ہوتا ہے۔ تیری یہ لیاقت مجھے کبھی کبھی بہت خراب کرتی ہے۔"

"بیوہ ہندو عورت کا دوسرا شوہر دھرتیچا کہلاتا ہے پتّے!"

"بھئی یہ بات میں برداشت نہیں کر سکتا ہوں جیلانی! قسم اللہ کی۔ تیرا مطلب میں سمجھ گیا ہوں مگر وہ تو اللہ رکھے ابھی کنواری ہے، دوشیزہ ہے۔ کلی ہے مسکانے کی منزلوں سے کوسوں دور۔ اور یہ اس کی پہلی شادی ہوگی۔"

"اللہ رکھے سے کیا مراد ہے تیری! یعنی خدا اسے کنواری ہی رکھے، ہائیں؟"

"شٹ اپ! دیکھ ماں آ رہی ہے میں اس سے الماس کی بات کرتا ہوں۔ ذرا سوچ سمجھ کے نکتے ڈالنا۔"

اتنے میں ماں جی لسّی کا جگ اٹھائے ہمارے پاس پڑی چارپائی پر آ بیٹھیں۔

"ماں یہ بٹیرے تو زبردست پکائے ہیں تم نے۔ پیٹ میں اترتے ہی اپنا کام دکھا گئے ہیں۔"

"کچے رہ گئے ہیں کیا؟"

"نہیں! ماں ہاں محسوس یہ ہوتا ہے کہ ایک دم بدن میں جان آ گئی ہے۔ کیوں بھئی کچھ موٹا نہیں ہو گیا میں؟"

"کام کر اپنا کام! سبق میں دھیان رکھ ورنہ یہ سب کچھ مت چٹم کر جاؤں گا۔"

"یار! اس ڈرائیور کو بھی یہی ناشتہ ملنا چاہیے تھا۔ کوئی ایک آدھ بٹیر اور ہے ماں ہانڈی میں؟"

"ہاں ہے کیوں نہیں۔ وہ تو کوئی بیس بٹیر دے گیا تھا وہ نابینا۔ بہت خیال رکھتا ہے میرا وہ بچہ۔"

آبی نے ناشتہ کیا اور پھر ایک چنگیر میں روٹیاں اور سالن رکھ کر وہ بہادر علی کی حویلی میں ڈرائیور کو بھی ناشتہ کھلا آیا۔

جب وہ واپس آیا تو بولا "ماں میں تجھ سے ایک مشورہ کرنے آیا ہوں۔"

ماں جی ابھی تک وہیں بیٹھی تھیں۔ بولیں "کیسا مشورہ! کوئی خاص بات ہے کیا؟"

"ہاں بڑی ہی خاص بات ہے ماں! ایسی خاص بات کہ اس کا اثر ہماری آئندہ نسلوں تک جائے گا۔"

"اچھا! کوئی زمین لے رہا ہے تو؟"

"نہیں ماں زمین نہیں، میں زن کی بات کر رہا ہوں۔ میں نے تیرے لیے ایک بہو ڈھونڈ لی ہے اور وہ بھی تیرے گھر آنے کے لیے بالکل تیار ہے"

"بہو ڈھونڈ لی ہے تیرا دماغ تو ٹھیک ہے! میں اپنے بھائی کو کیا منہ دکھاؤں گی۔"

"وہ جو پنڈی بھٹیاں میں رہتا ہے۔ لعنت بھیج اس قصے پر ماں۔ تو نہیں جانتی میرا نصیب کہاں جا لڑا ہے۔ اس جیسی تو ایشیا میں کوئی نہ ہوگی۔"

"یہ کون سی جگہ ہے ایشیا۔ میں نے تو آج ہی نام سنا ہے اس کا۔ کوئی گاؤں ہے یہ؟"

"تو نہیں سمجھے گی ماں! یہ ایک براعظم ہے پر تو یہ بھی نہیں سمجھے گی۔ دیکھ یہ جغرافیے کی بات ہے۔ سارا ہندوستان، سارا پاکستان سارا ایران، افغانستان سمرقند و بخارا اور ترکستان جمع کر لیں تو یہ سارا علاقہ براعظم ایشیا کہلاتا ہے۔ اور وہ جو تیری بہو ہوگی نا وہ اس سارے علاقے کی تمام عورتوں سے زیادہ خوبصورت، زیادہ سوہنی زیادہ مشہور اور زیادہ مالدار ہوگی بس ایسی جگہ ہاتھ مارا ہے میں نے۔"

ماں جی حیرت زدہ سی ہو کر مجھے دیکھنے لگیں، بولیں۔

"یہ کیا کہہ رہا ہے بیٹے اسے تو نے کسی ڈاکٹر کو دکھایا ہوتا کیا سنگھالایا ہے تو اسے۔ خدا تباہ کرے ان کو جنہوں نے میرے بیٹے پر جادو ٹونا کیا ہے انہیں ڈھائی گھڑی کی آئے ان کلموہیوں کو۔ آبی! میں تیرے لیے آج ہی کدو منگواتی ہوں یہ بال کٹوا، میں تیرے سر پر کدو ملوں گی۔"

ماں جی کی یہ بات سنتے ہی میں کھلکھلا کر ہنس دیا۔ آبی کا بھی یہی حال ہوا ہنس ہنس کر ہمارے پیٹ میں بل پڑ گئے مگر ہم نے اپنے قہقہے اتنے ضرور دبا لیے کہ باہر تک آواز نہ جا سکی۔ ماں جی نے ہم دونوں کو بڑے غصے سے دیکھا، بولیں۔

"چپ ہو جاؤ بدمعاشو! مجھ سے مذاق کرتے ہو۔ دیکھتی ہوں میری بھانجی کے سوا کون کمینی یہاں آتی ہے۔ میں اس کا جونڈا نہ کاٹ دوں گی۔ جیتی رہے میری زلیخا۔"

آبی ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

"اب تو زلیخا شلیخا کی بات نہ کر ماں! میری بات پر غور کر۔ فلم دیکھی ہے تو نے کبھی؟"

"ہاں دیکھی ہے۔ اللہ بخشے تیرا باپ مجھے دو تین بار لے گیا تھا منڈوا دکھانے۔ ایک منگنی دیکھی تھی اور ایک فلم دیکھی تھی سسّی پنوں۔ پھر اس نے مجھے سوہنی مہینوال بھی دکھائی تھی۔ بھلے وقتوں کی بات ہے۔"

"بس بس۔ اچھا یہ بتا کہ وہ لڑکی جو فلم میں سسّی بنی تھی وہ کیسی تھی؟"

"ہائے! وہ تو اتنی سوہنی تھی بیٹے! کہ میں تو بس دیکھتی ہی رہ گئی۔ نور کی بنی لگتی تھی وہ۔"

"ہاں ہاں! بس یہ سمجھ لے ماں کہ اب جو تیری بہو بنے گی نا، وہ اس سسّی سے بھی زیادہ سوہنی ہوگی۔ وہ بھی فلموں میں کام کرتی ہے۔ اور اس کا نام ہے الماس۔ میری اس سے 'یس' ہو گئی ہے۔ اور پتہ ہے اس کے پاس کم سے کم تیس سیر سونا تو ضرور ہی ہوگا، کیوں جیلانی! ٹھیک کہا نا میں نے؟"

"ہائے! تیس سیر سونا اور وہ لے آئے گی تیرے جیسے بدھو کے لیے یہاں! رہنے بھی دے اسلم تو مجھے یہ خواب دکھا۔ ایسی کون ہوگی بے وقوف جو اس رانڈے کے گھر نور جیسی صورت اور من بھر سونا لے آئے گی۔"

"تجھے کس بات کی کمی ہے ماں! اتنی تو تیری خدمت کرتا ہوں میں۔ کوئی بھوکی ننگی ہے تو؟"

آبی کو ماں کی بات سن کر دلی صدمہ پہنچا تھا۔

"تجھے خدا سلامت رکھے بیٹا۔ میں یہ بات نہیں کہنی۔ پر تجھے زمین پر رہنا چاہیے۔ یہ چاند والیاں ہمارے لیے نہیں ہیں بیٹے! ہم پھر بھی غریب لوگ ہیں پینڈو، جاہل، جٹ، گنوار۔"

"زیادہ باتیں نہیں چلیں گی ماں! تو اٹھ ذرا کپڑے بدل اور میرے ساتھ چل۔ میں آج ہی تجھے تیری بہو سے ملواؤں گا، چل اٹھ تو بھی اٹھ یار! تیرے جیسے دکیل ہوں تو بس پہلی پیشی پر ہی بیڑا غرق ہو جائے۔ اٹھو تم دونوں چلو میرے ساتھ۔"

یہ کہہ کر آبی چارپائی سے اتر گیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا کمرے میں جا گھسا۔ جب وہ باہر نکلا تو اس کی ماں دوسرے کمرے میں شہر جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ آبی کے ہاتھ میں ایک ڈبہ تھا۔ وہ اسے زمین سے کھود کر نکال لایا تھا۔ میرے پاس آ کر بولا۔

"لے یار! گن۔ اس میں پورے ساٹھ ہزار روپے ہیں۔" اس نے ڈبہ میرے سامنے رکھ کر کھولا۔ وہ نوٹوں سے لبالب بھرا تھا۔

"تو مجھ سے گالی کھا کر رہے گا آبی! یہ وہیں دبا آ۔ ہم ابھی جا کر بنک سے نکلوا لیں گے۔ چل واپس اسے وہیں رکھ آ۔"

"نہیں یار اس کی ضرورت پڑے گی۔ میں اسے منگنی پر سونے کا ایک قیمتی سیٹ دینا چاہتا ہوں۔"

"وہ ہم دے لیں گے مگر یہ روپیہ یہیں پڑے رہنے دے۔ یا پھر ماں کو دے دے، وہ اسے سنبھال لیں گی۔"

"میں۔۔۔ میں۔۔ یار تو بالکل فضول آدمی ہے۔ اب میں کیا کہوں ماں سے۔"

"جو تو پہلے کہا کرتا تھا۔ بس پکڑا دے یہ رقم ان کو۔"

اتنے میں ماں جی باہر نکل آئیں۔ وہ لباس تبدیل کر آئی تھیں اور اب خاصی بدلی بدلی سی نظر آتی تھیں۔ آبی نے وہ ڈبہ ان کے آگے کر دیا۔

"ماں! یہ روپیہ رکھ لے یہ ساٹھ ہزار ہے کاروبار ذرا مندہ رہا ورنہ میں ایک لاکھ تجھے لا دیتا۔"

"نظر بد دور! لگتا ہے تیرا کاروبار اچھا چل رہا ہے۔ پر یہ روپیہ تو بنک میں کیوں نہیں رکھتا۔ میرے پاس ابھی بڑے پیسے ہیں، وہ جو تو نے نائیے کے ہاتھ بھیجے تھے۔"

"اچھا دیکھ یہ بیس ہزار تو رکھ لے ٹھیک ہے باقی میں ادھر کمرے میں دبا دیتا ہوں اس ڈبے میں رکھ کر۔"

"ہاں یہ بہتر رہے گا۔ چل میں تجھے جگہ بتا دوں میرے نواڑی پلنگ کے پلنگ تلے دبا دے اسے۔" یہ کہہ کر ماں جی اسے اپنے ساتھ لے کر کمرے میں چلی گئیں۔ جب وہ دونوں باہر آئے تو آبی نے مجھے اشارہ کر کے کمرے میں بلا لیا۔ ماں جی باہر جا بیٹھی تھیں۔

آبی مجھے اپنے ساتھ لے کر ایک صندوق کے پاس بیٹھ گیا۔ اس کا تالا کھول کر اس نے ایک بڑا سا موٹے پلاسٹک کا لفافہ نکالا اور اسے میرے آگے فرش پر الٹ دیا۔ اس میں سے چھوٹی بڑی بے شمار تصاویر میرے سامنے کھل گئیں، بولا۔

"یہ دیکھ۔۔۔ یہ ہے وہ آگ جس کی میں چپکے چپکے پوجا کرتا رہا ہوں۔ میں نے الماس سے غلط نہیں کہا تھا۔"

میں نے وہ تصویریں سیدھی کر کے دیکھیں تو مجھے اس کی دیوانگی پر اعتبار آنے لگا۔ میرے سامنے الماس کی کم و بیش سو تصویریں کھلی پڑی تھیں۔

"مجھے حیرت ہے آبی! تم نے مجھ سے کبھی الماس کا ذکر نہیں کیا تھا۔"

"میں کیسے ذکر کرتا۔ تو سمجھتا میں پاگل ہوں، تیسرے درجے کا بازاری آدمی ہوں۔ نہیں یار! وہ سہل الحصول تو نہیں تھی نا۔ یہ تو پتہ نہیں تقدیر نے مجھے کیسے اس تک پہنچا دیا ہے اور وہ موم بھی ہو گئی ہے حالانکہ اسے یقین ہے کہ ہم اچھے لوگ نہیں ہیں۔"

"نہیں! میرا خیال ہے کہ اسے ابھی تک ہماری اصلیت کا

علم نہیں ہے بہرحال مبارک ہو تمھاری آرزو پوری ہوتی نظر آ رہی ہے۔ ان تصویروں کا کیا کرو گے تم؟"

"یہ دیکھو میں نے ان کی پشت پر وہ تاریخیں بھی لکھی ہیں جب میں نے یہ خریدیں، یہ سب میں اسے دکھاؤں گا اور دیکھو میں نے ایک مصور سے بھی اس کی تصویر بنوائی تھی۔ اسے میں نے ماں سے چھپا کر رکھا تھا۔" یہ کہہ کر اس نے ٹرنک کی تہہ پر پڑا ایک موٹا سا گتہ اٹھایا اور اس کے نیچے سے الماس کی ایک بہت ہی خوبصورت تصویر نکال کر اس نے میرے سامنے رکھ دی۔۔۔ پس منظر میں ایک دریا بہہ رہا تھا۔ کنارے پر ایک کشتی کھڑی تھی جس کی پتوار الماس کے ہاتھ میں تھی۔ سارے منظر پر الماس چھائی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر گہری سوچ اور ایک عجیب سا عزم ظاہر کیا گیا تھا۔ جیسے وہ دریا میں کشتی ڈالنے سے کسی اہم فیصلے پر پہنچنا چاہتی ہو۔

"یہ تصویر میں نے پانچ سو روپے میں خریدی تھی جیلانی اور مجھے یقین ہے مصور کے پاس صرف یہی تھی۔ اس کی نقل اس نے تیار نہیں کی ہوگی نا۔ اسے میں ساتھ لے جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے آبی! اب اٹھ جا ہمیں دیر ہو رہی ہے۔"

آبی نے وہ تمام تصویریں سنبھالیں اور کوٹھری میں سے ایک بریف کیس نکال کر اس میں بھر لیں۔

ماں نے گھر کا سارا کام ہمسائی کو سونپا بھینس کی ذمے داری لینے کے لیے ان کے گاؤں کا ایک بوڑھا آدمی بھی وہاں آ پہنچا تھا۔ اس سے ماں جی نے کہہ دیا کہ اگر وہ رات کو نہ آسکیں تو وہ ادھر ہی ان کے گھر میں سو رہے۔

جب ہم کار میں بیٹھ کر لاہور کی طرف چلے تو ہم دونوں نے پٹھانوں ایسی لنگیاں سر پر باندھ لی تھیں۔ وہ آبی نے گھر میں کہیں سنبھال کر رکھی تھیں۔ ماں جی نے ایک بار بڑے غور سے ہمیں دیکھا۔ بولیں۔

"دونوں پکے پٹھان نظر آ رہے ہو۔ خدا تمہیں نظر بد سے بچائے۔"

ہم مسکرا کر رہ گئے۔ انہیں کیا پتہ کہ وہ حلیہ ہم نے کیوں اپنا لیا ہے۔ ہمیں تو قدم قدم پر اپنی جان کے لالے پڑے رہتے تھے۔

آبی نے لاہور پہنچ کر بھی مجھے بنک کی طرف نہیں جانے دیا۔ سیدھا ہمیں صرافہ بازار لے گیا۔ ماں جی کے مشورے سے اس نے الماس کے لیے دس ہزار روپے میں کئی قسم کے زیورات خریدے۔ سونا ان دنوں ابھی اتنا مہنگا نہیں ہوا تھا اور روپے میں بڑی طاقت تھی۔ ماں جی اوّل اوّل تو ان زیورات کی خریداری پر راضی نہ ہوئیں مگر جب آبی نے ضدی بچے کی طرح ان کو آنکھیں دکھائیں تو انہوں نے سپر ڈال دی۔ وہاں سے نکل کر آبی انار کلی میں جا گھسا۔ اس سجے سنورے بازار سے اس نے الماس کے لیے پانچ بہت ہی خوبصورت ساڑھیاں خریدیں۔ پھر وہ ایک ایسی دکان میں جا گھسا جہاں زنانہ آرائش و زیبائش کی ہر شے مل سکتی تھی۔ جب وہ باہر نکلا تو چیزوں سے بری طرح لدا ہوا تھا وہ سب کچھ اس نے ماں جی کے حوالے کیا اور ڈرائیور سے بولا۔

"چل بھئی اب ذرا ادھر شاہ نور اسٹوڈیو کی طرف چل۔"

"مجھے بینک سے رقم لے لینے دے آبی یہ بہت ضروری ہے۔"

آبی میری طرف جھکا اور سرگوشی کے لہجے میں بولا۔

"آج نہیں، ماں ساتھ ہے ادھر کوئی گڑبڑ بھی ہو سکتی ہے پھر کسی دن دیکھ لیں گے۔ میں گھر سے چالیس ہزار ساتھ لے آیا ہوں۔"

"اچھا بھئی تمھاری مرضی! میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ مگر میں بہت پریشان ہوں آبی! تم مجھے تنہا چھوڑ دو۔"

"نہیں یار یہ کیا بات ہوئی! یہ کہاں کی شرافت ہے تمھاری۔ یہ بڑا اہم مرحلہ ہے میری زندگی کا۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو آبی! مگر میرے دل پر جو بیت رہی ہے اس کا تم اندازہ نہیں کر سکتے۔"

"سب ٹھیک ہو جائے گا اسے کوئی آنچ نہیں آئے گی خدا اس کی حفاظت کرے گا، اس مظلوم کی۔"

ماں جی اگلی نشست پر بیٹھی تھیں اور ہم دبے لہجے میں یوں بات کر رہے تھے کہ ہماری کوئی بات ان کے کانوں تک نہ پہنچ سکی۔ آبی اپنے ہی ذہنی اور قلبی ہیجان میں مبتلا تھا۔ وہ بھول ہی گیا تھا کہ میں کس اذیت سے دوچار ہوں۔ اس کے سر پر عشق کا بھوت سوار تھا جیسے میری اس مزاولت سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ وہ اپنے نفس سے اس حد تک مغلوب ہو چکا تھا کہ ہر چھلکے پر اس کا پاؤں پھسل جاتا تھا۔ اور اب تو اس کے سامنے الماس آ گئی تھی، جس کے لیے وہ دنیا کی ہر شے تیاگ دینے پر آمادہ تھا۔

اس وقت دن کے پونے بارہ بج رہے تھے۔ الماس گھر پر ہی موجود تھی۔ اس کی ملازمہ کے ذریعے ہم نے اندر پیغام بھجوایا تو وہ لپکتی ہوئی باہر چلی آئی۔ آبی کو اپنے سامنے پٹھانوں ایسی پگڑی کے نیچے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئی۔

"واؤ ونڈرفل!! ایکسٹریم ہینڈسم لگتے ہیں آپ اس لباس میں۔ میں آپ کو خوش آمدید کہتی ہوں۔"

"کار میں میرے ساتھ میری والدہ آئی ہیں۔ ان کو میں آپ سے ملوانا چاہتا تھا۔" آبی کے ان الفاظ پر الماس ایک دم سنجیدہ ہو گئی اور اپنی ساڑھی کو بڑے سلیقے سے سنبھالتی ہوئی آگے بڑھی ساڑھی کا پلو اس نے اترا کر سر پر ڈال لیا تھا۔

"آداب ماں جی! میری خوش نصیبی ہے کہ آپ میرے گھر

آئی ہیں، آئیے۔" اس کا لہجہ ایک دم حیرت انگیز حد تک مودب ہو گیا تھا۔ اس نے ماں جی کو بڑی محبت سے کار میں سے اتارا۔ اور پھر اپنے ساتھ لے کر عمارت کے اندر چلی گئی۔ آبی ان کے پیچھے تھا۔ اس نے وہ تمام چیزیں اٹھا رکھی تھیں جو وہ اس روز بازار سے خرید کر لایا تھا۔ وہ الماس کی کوٹھی کے اونچے اونچے شیشوں سے مزین دروازے میں داخل ہوئے تو میں نے ڈرائیور سے کہا۔

"میاں جی! مجھے ذرا باہر سڑک تک لے چلیں، وہاں مجھے ایک ضروری کام ہے۔"

وہ بے چارہ حکم کا بندہ کار کو پیچھے ہٹا فوراً ہی الماس کی کوٹھی سے نکالا اور بڑی سڑک پر جا پہنچا۔

"میں یہاں اتر رہا ہوں میاں جی! میرے دوست سے کہہ دینا کہ میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں شام تک واپس آ جاؤں گا۔"

"میں کہہ دوں گا میاں جی! آپ کو میں چھوڑ نہ آؤں جہاں آپ جانا چاہتے ہیں۔"

"نہیں! آپ فوراً واپس جائیں انہیں آپ کی ضرورت ہوگی۔"

یہ کہہ کر میں نے گاڑی چھوڑ دی۔ ڈرائیور مجھے متحیر سا ہو کر چند لمحے بڑے غور سے دیکھتا رہا اور پھر اپنی کار کو گھما کر الماس کے گھر کی طرف چل دیا۔

میرے ذہن کے ایوانوں میں عجیب سی طرح دھول اڑ رہی تھی۔ سامنے کی کوئی چیز مجھے صاف سیدھی نظر نہیں آتی تھی۔ میں نے ایک ٹیکسی روکی اور ڈرائیور سے کہا کہ وہ مجھے بنک تک لے چلے۔ مجھے اپنے اخراجات کے لیے روپے کی سخت ضرورت تھی۔ اس وقت دن کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ بنک بند ہونے میں ابھی کچھ وقت باقی تھا۔

جب میں ٹیکسی سے اتر کر مینجر کے کمرے میں داخل ہوا، تو میرے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو رہی تھیں۔ پھر بھی میں نے بڑے پراعتماد اور مرعوب کن انداز میں کسی لکھ پتی کی طرح کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کھلے کواڑ پر ہلکی سی دستک دے کر مینجر کو متوجہ کر لیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے استفہامی انداز سے مجھے دیکھا اور بولا۔

"آئیے خان صاحب آئیے، تشریف رکھیے۔"

"جی شکریہ۔" یہ کہہ کر میں اس کے دائیں ہاتھ صوفے پر بیٹھ گیا۔

"کہیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"دیکھیں ایک عرصے بعد وطن واپس آیا ہوں۔ یہاں آپ کے پاس میرا اکاؤنٹ ہے اور اس میں سے مجھے پچاس ہزار روپے کی ضرورت ہے۔"

"تو چیک کاٹ دیجئے میں ابھی رقم پیش کر دیتا ہوں۔"

"میرے پاس چیک بک نہیں ہے اور اکاؤنٹ نمبر بھی میرے حافظے سے اتر گیا ہے، نام میرا غلام جیلانی خان ہے آپ معلوم کر لیں اپنے دفتر سے۔"

"کتنے روپے جمع کرائے تھے آپ نے اپنے اکاؤنٹ میں؟"

اس نے سرد مہری سے پوچھا۔ میں نے بھی اسی انداز سے کہا۔

"میرا خیال ہے گیارہ لاکھ سے کچھ اوپر رقم تھی۔" میری یہ بات سنتے ہی مینجر کرسی سے اچھل سا گیا۔ اٹھا اور اپنے اضطراب پر قابو پانے کے لیے سگریٹ سلگانے لگا۔ اس نے فوراً ہی زور سے گھنٹی بجائی۔ چپراسی اندر آیا تو وہ تیزی سے بولا۔

"خان صاحب کے لیے ٹھنڈی بوتلیں لاؤ برف میں لگی ہوئی۔"

"کتنی لاؤں صاحب؟"

"چھ۔ ہاں چھ بوتلیں لے آؤ کوکا کولا کی۔ جگ، برف گلاس سب کچھ لے کر آنا۔ جلدی کرو۔" یہ کہہ کر وہ میرے ہی صوفے پر آ بیٹھا۔

"میں۔۔۔ میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں خان صاحب! آپ کو پہچان نہ سکا۔ آپ ایسے مہربانوں ہی کی وجہ سے یہ بنک چل رہا ہے۔"

"نہیں بھئی! یہ کیا بات ہوئی۔ آپ تو امانت دار ہیں روپیہ ہماری جیب میں انڈے تو نہیں دے گا۔ آپ کے کام آتا ہے یہ بڑی اچھی بات ہے میں تو بیس تیس لاکھ اور ادھر ڈال دیتا مگر میرا ادھر آنا ہی نہیں ہوا۔"

"ہاں صاحب! میں تو خود حیران تھا آپ کے روپے پر منافع تو ہم بہرحال دیتے ہی رہے ہیں بس ایک غلطی آپ سے ہو گئی۔"

"وہ کیا؟"

"آپ نے میعادی کھاتے میں وہ رقم ڈالی ہوتی تو وہ ڈیڑھ گنا ہو چکی ہوتی۔ آپ نے بچت کے کھاتے میں رقم ڈال رکھی ہے۔"

"تو اس کھاتے میں ڈال دیں مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے بھلا۔"

"اس میں آپ ہی کی بہتری ہے بہرحال اب بھی منافع آپ کو معقول ہی ادا کیا گیا ہے میعادی کھاتے میں کتنی رقم ڈال سکتے ہیں آپ؟"

"کل رقم مجھے بتائیں کتنی ہے؟"

اس نے اپنے سامنے رکھے ایک رجسٹر کو کھولا اور اس میں دیکھ کر کہنے لگا۔ "ساڑھے تیرا لاکھ۔"

"ٹھیک ہے دس لاکھ میعادی کھاتے میں ڈال دیں۔ میں کاغذ پر کر دیتا ہوں۔"

"آپ پہلے چیک بک لے لیں۔"

کچھ ہی دیر بعد اس نے کاغذی خانہ پُری کے بعد دس لاکھ روپیہ میعادی کھاتے میں ڈال دیا۔ میں نے پچیس ہزار روپیہ اپنے بقیہ حساب میں سے نکالا اور منیجر سے مصافحہ کرکے باہر نکل آیا۔ وہ بیچارا میری رُوپے سے اتنی ساری بے نیازی اور میرے اس بیس تیس لاکھ کے مزید ڈپازٹ کے وعدے سے اتنا مرعوب ہوا کہ وہ مجھے خود دروازے تک چھوڑنے آیا۔

اس کا نام عبور احمد تھا۔ اپنا کارڈ بھی اس نے مجھے دینا چاہا مگر میں نے نہیں لیا۔ وہ اسے بھی میری ادائے بے نیازی سمجھا میرے تموّل کا ادنیٰ سا کرشمہ۔ وہ مجھے خدا حافظ کہہ کر پیچھے ہٹا تو میں ٹیکسی میں جا بیٹھا۔

وہ مرحلہ جسے میں اتنی مدت سے اتنا مشکل تصور کرتا چلا آیا تھا یوں چٹکیوں میں گزر جائے گا، اس کا تو مجھے اندازہ ہی نہیں تھا۔ منیجر نے بس اک ذرا میرے دستخطوں کے سلسلے میں چھان بین کی مگر میرے دستخطوں میں تو کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہ فوراً ہی مطمئن ہوگیا اور اُس نے چیک بُک میرے آگے رکھ دی۔ اس میں سے بھی صرف ایک چیک کاٹ کر میں نے باقی چیک بُک پھاڑ کر اس کے سامنے ردّی کی ٹوکری میں پھینک دی۔ وہ بہت حیران ہوا بولا۔ ”یہ کیوں کیا آپ نے؟“

”نہیں بھئی! یہ چیک بُک کون ساتھ لیے پھرے۔ یہ پاس ہوگی تو دماغ میں کھلبلی ہوگی کہ اور رقم نکلوا لو خان۔ اس طرح تو یہ سب مال کھُر جائے گا۔“

وہ بہت خوش ہوا، بولا۔

”خان صاحب بہت سنہری اصول ہے آپ کا۔ قسم خدا کی، آپ کی دولت ہمیشہ بڑھتی رہے گی آدمی کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔“

میں بنک سے نکل کر ٹیکسی میں جا بیٹھا۔ تو ایک بار پھر میرے ذہن پر دھند سی چھا گئی میرے پروردگار! میں کیا کروں کس طرف نکلوں میری دستگیری فرما میرے خالق میرے مالک! مجھے آسیہ تک پہنچ جانے دے۔ تیرے سوا میری کوئی بھی رہنمائی نہیں کر سکتا۔ میں اندر ہی اندر رو رہا تھا بلک رہا تھا میرے وجود کی بنیاد کھوکھلی ہوئی جاتی تھی۔ میں اسی لیے آپی کو الماس کے گھر میں چھوڑ کر چلا آیا تھا۔ میں اس کے رنگ میں بھنگ نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ میری آہوں سے، میرے لحظہ بہ لحظہ ٹوٹتے حوصلوں سے اس کا عیش منغض ہو جاتا میرے اندر کا مرد تو ابھی زندہ تھا پھر بھی اپنے دوست کی خوشیوں کی راہ میں کشمکش بن کر کیسے کھڑا ہو جاتا۔

اچانک مجھے لب سڑک ایک ٹیلیفون بوتھ نظر آیا۔ میں ٹیکسی روک کر اس کے اندر جا گھسا میرے دل کے نہاں خانے میں یہ خیال گھرا جا گزیں ہو چکا تھا کہ آسیہ پر اب کی بار ہاتھ دانی ہی نے ڈالا ہے۔ اس کے سوا اور کوئی اس سے تعرض نہیں کرسکتا تھا۔ اس کے پاس ایک ٹھوس جواز موجود تھا مجھے ذلیل کرنے کا۔ میں نے اس کے یار گاڈی کو اس کے عملے سمیت مار دیا تھا۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔ منان بھی دبی زبان سے یہی کہہ رہا تھا کہ ہو سکتا ہے یہ کام دانی کے آدمیوں ہی نے کیا ہو۔ تاکہ میں آسیہ کے لیے تپ کر اپنی پھار میں سے باہر آؤں۔ وہ یہی چاہتا ہوگا۔ دانی شہر کے بڑے بڑے قد آور مجرموں کو مات کرتا تھا اور اس کی ساکھ شہرت بھی یہی تھی کہ اپنے پیچھے جرم کا کوئی ثبوت چھوڑ کر نہیں جاتا تھا۔ میں نے ریسیور اٹھایا تو معلوم ہوا کہ لائن ہی خراب ہے۔ اُسے جھولتا ہوا چھوڑ کر میں بوتھ سے باہر نکل آیا۔ میں دراصل آپی کو بتانا چاہتا تھا کہ میں دانی کی طرف جا رہا تھا۔ اور اس کی مسرتوں کے ان ہنگامے میں میں اسے پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسی لیے میں الماس کے ہاں سے چپ چاپ باہر نکل آیا ہوں۔

مجھے دانی کے اڈے کا علم تھا۔ ٹیکسی میں نے لاری کے اڈے کی طرف موڑ دی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کے آدمی بس مالکوں سے حیلے بہانے سے رقمیں اینٹھتے ہیں۔ ان کے تعاون کے بغیر کوئی بس چل ہی نہیں سکتی تھی۔

لاری اڈے پر پہنچ کر میں نے ٹیکسی چھوڑی اور تانگوں کی قطار کے قریب سے گزر کر اڈے کے اندر ایک چائے خانے میں جا بیٹھا۔ مجھے دانی کے کسی ایسے آدمی کی ضرورت تھی جو مجھے براہِ راست اس کے پاس لے جائے۔ چائے خانے میں دو شہدے سے جوان بیٹھے گپ بازی میں مصروف تھے۔ میں ان کے دائیں ہاتھ کی چھوٹی سی میز کے سامنے جا بیٹھا۔ ان کی باتیں میرے لیے دلچسپی کا باعث بن گئیں۔

ایک بولا۔ ”اوئے سمی! وہ سوّر کا بچہ ابھی تک نہیں آیا۔ اپن اس کی بس کو آگ لگا دے گا اس راؤ صاحب کی ایسی تیسی۔“

”آجائے گا ڈگی وہ ضرور آئے گا۔ اودھر ہم اس کو چیلنج کر چکا ہے۔ سالا تین بسیں روڈ پہ لے آیا ہے وہ۔“

”اکڑتا بہت ہے وہ۔“ ڈگی نے بھی کسی راؤ صاحب کو بڑی غلیظ گالی دی۔ دونوں بڑے گندہ ذہن تھے بات بات پر گالی بکتے تھے۔ عمریں ان کی بھی بائیس پچیس کے درمیان ہوں گی۔ ان کی باتوں سے صاف ظاہر تھا کہ وہ دانی کے گرگے ہیں اور کسی سے خراج وصول کرنے کے لیے وہاں بیٹھے ہیں۔

”لے بھئی وہ آ رہا ہے وہ راؤ۔“ ڈگی نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ میں نے سامنے نظر ڈالی۔ ایک دوہرے جسم کا آدمی دکان کے دروازے پر کھڑا تھا۔ وہ ابھی وہاں رکا ہی تھا کہ اس کو ایک طرف ہٹا کر چار جوان تیزی سے دکان کے اندر آ گئے۔ ان میں سے ایک نے آتے ہی ڈگی سے غضبناک لہجے میں پوچھا۔

”ہاں تو بچھے کتنی رقم چاہیے بیٹے! میں نوٹ لے آیا ہوں ہمت ہے تو اٹھا لے۔“ یہ کہہ کر اس نے سو کا ایک نوٹ

ڈگی کے سامنے رکھ دیا۔ ڈگی ایک دم اپنی جگہ پر کھڑا ہوگیا۔

”اُستاد ہم سے اس طرح بات کرے گا تو! جانتا ہے ہم کون ہیں۔“ اس کے لہجے کی کڑک حیران کن تھی۔

اس کی یہ بات سنتے ہی اس آدمی نے ڈگی کو کھلونے کی طرح دونوں ہاتھوں میں دبوچ کر دکان سے باہر پھینک دیا یوں کہ ڈگی سامنے کھڑے راؤ صاحب کے قدموں میں جا گرا مگر اس نے گرتے ہی اپنے گریبان کے اندر ہاتھ ڈال کر بغل کے نیچے دھرا پستول نکال لیا چھوٹا سا کھلونے ایسا پستول تھا وہ مگر اس کو چلانے کی حسرت اس کے دل ہی میں رہ گئی۔ راؤ صاحب کے پاس کھڑے دو آدمیوں نے اس کی دونوں کلائیاں پیچھے سے دبوچ کر پستول اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور پھر ان میں سے ایک نے خنجر نکال کر کھینچ کر کے ڈگی کے پہلو میں گھونپ دیا۔ وہ اُسے جان سے مار دینا چاہتے تھے۔ ان کی نیت سمجھتے ہی میں تڑپ کر اٹھا اور ایک دم دونوں پر جا پڑا۔ میں نے بائیں ہاتھ کا ایک جھانپڑ ایک آدمی کے منہ پر مارا اور پھر پیشتر اس کے کہ وہ آدمی دوسری بار خنجر ڈگی کے جسم میں اتارتا میں نے اس کی کلائی پکڑ کر جھٹکا جو دیا تو اس کی ہڈی کڑک کر کے ٹوٹ گئی۔ ڈگی اور اس کی چیخیں بیک وقت فضا میں بلند ہوئیں۔ سمی نے بھاگ کر ڈگی کو سنبھال لیا۔ اس کے پہلو میں خنجر شاید پتلون کی بیلٹ سے ذرا نیچے لگا تھا جسے ڈگی سہہ گیا تھا مگر پھر بھی اس کے جسم سے خون بہہ نکلا تھا۔

”اوے سمی! ڈال اس لڑکے کو ٹیکسی میں۔“

سمی نے میری یہ بات سنتے ہی ڈگی کو اٹھا کر سامنے کھڑی ویگن میں ڈالا تو میں نے دائیں بائیں کھڑے راؤ۔۔۔۔ کے آدمیوں کو دو تین جھانپڑ دے مارے۔ ایک ہاتھ راؤ کے منہ پر بھی جا پڑا۔ عین اسی وقت میں نے دیکھا کہ ڈگی کا پستول ایک آدمی زمین پر سے اٹھا رہا ہے۔ میں نے اس کے پہلو میں زوردار ٹھوکر ماری وہ الٹ کر گرا تو پستول میں نے نیچے جھک کر اٹھا لیا اور بھاگ کر ویگن میں جا بیٹھا۔ یہ سب کچھ بس آناً فاناً ہی ہوگیا۔ دو آدمی تیزی سے ویگن کے دروازے میں ہمارے پیچھے داخل ہونے لگے۔ ان دونوں نے لمبے لمبے خنجر ہاتھوں میں پکڑ رکھے تھے۔ اور وہ گندی گالیاں بک رہے تھے۔ مگر ڈرائیور نے فوراً ہی ویگن چلا دی۔ ایک آدمی نیچے لڑھک گیا۔ مگر دوسرا ابھی تک کھلے دروازے کو پکڑ کر جھول رہا تھا۔ میں نے ڈگی کا پستول سیدھے ہاتھ میں لے کر اس کی ران پر گولی چلا دی اس نے بھیانک چیخ ماری۔ دروازے پر سے اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ اور وہ اپنی زخمی ران پر مزید بوجھ نہ ڈال سکا۔ دھڑام سے نیچے جا گرا۔ سمی نے فوراً ہی دروازہ بند کر دیا۔ ویگن بلا خیز رفتار سے چلتی ہوئی اڈے سے باہر نکلی اور کچھ ہی دیر بعد بادشاہی مسجد کے قریب ایک تین منزلہ عمارت کے سامنے جا کھڑی۔ سمی پھلانگ کر ویگن سے باہر نکلا اور عمارت کے بڑے دروازے میں جا گھسا۔ دو منٹ بعد پانچ آدمی بھاگتے ہوئے ویگن کے پاس پہنچے۔ اور ڈگی کو باہوں میں اٹھا کر اندر چلے گئے۔

میں ابھی تک ویگن میں بیٹھا تھا کہ سمی بھاگتا ہوا میرے پاس پہنچا۔ تیزی سے بولا۔ ”خان! آپ اندر آجائیں استاد صاحب آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتے ہیں۔“

”کون استاد؟ اب ہم چلتا ہے بھئی ہمارا ساتھی کا جان بچ گیا۔ یہی بہت ہے۔“ میں نے اپنی زبان کو پشاوری انداز میں بل دے کر کہا۔

”نہیں خان! اُستاد آپ سے ملنا مانگتا ہے۔ اندر آجائیں۔“ اس کی یہ بات سن کر میں ویگن سے اتر کر اس کے ساتھ ہولیا۔ وہ مجھے عمارت کی نچلی منزل کی ڈیوڑھی میں سے گزار کر عقبی حصے میں لے گیا اور ایک کمرے کے بند دروازے کے سامنے پہنچ کر بولا۔

”اندر آجائیں۔“ یہ کہہ کر اس نے کواڑ کھول دیے۔

سامنے چاندنی بچھی تھی اور کمرے کی عقبی دیوار کے ساتھ گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے ایک گورا چٹا قوی ہیکل جوان بیٹھا تھا۔ عمر اس کی یہی کوئی تیس بتیس سال ہوگی۔ سر گھٹا ہوا، کان پہلوانوں کی طرح پھٹے ہوئے، بڑی بڑی غلافی آنکھیں، ستواں ناک، داڑھی مونچھ صفاچٹ۔ گردن بیل کی گردن ایسی۔ وہ باریک ململ کا کُرتہ اور تہمد باندھے ہوئے تھا۔ اور اس کے بائیں ہاتھ میں ایک بٹیر تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے بٹیر اپنے قریب بیٹھے ایک آدمی کے ہاتھ میں دے دیا اور خود تکیے کے ساتھ زیادہ جم کر بیٹھ گیا۔

”آؤ خان جی آؤ۔ جی آیاں نوں۔“

”السلام علیکم پہلوان صیب!“ میں نے خالص پشاوری لہجے میں کہا میرے سر پر بندھی وہ پشاوری لنگی مجھے سچ مچ کا پٹھان ثابت کرتی تھی۔ میری پاٹ دار آواز سن کر وہ اپنی جگہ سے اٹھا مجھ سے بڑے تپاک سے ہاتھ ملا کر اس نے دوسرا گاؤ تکیہ میری طرف سرکا دیا۔ میں چاندنی پر تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھا تو میں نے دیکھا کہ اس کی نظریں میرے بوٹوں پر جم سی گئی تھیں۔ میں فوراً چوکڑی مار کر بیٹھ گیا۔ وہ مسکرا دیا، بولا۔

”ہم آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں خان! آپ نے ہمارے ڈگی کو بچا لیا کیا نام ہے آپ کا؟“

”رستم خان! ام اُودھر بیٹھا تھا کہ پاگل کا مافق اُس بدبخت نے ڈگی پر خنجر چلا دیا۔ ام سے صبر نہ ہو سکا پہلوان۔“

”اسی لیے ہم نے آپ کو اندر بلایا ہے خان صاحب! جاؤ اوئے خان کے لیے کوکا کولا لاؤ۔“

دانی کے قریب بیٹھا آدمی اسی وقت باہر چلا گیا۔ بائیں ہاتھ دو اور جوان بھی بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک بولا۔

"استاد! میں دیکھ کر آیا ہوں۔ خان نے یوں چٹکی بجاتے میں اس جوان کی کلائی توڑ دی تھی، یوں کڑک کر کے۔"

"اچھا! سوہنا جوان ہے مرد بچہ ہے خان۔"

"چائے والے بڈھے نے بتایا کہ خان بجلی کی طرح ان پر جا پڑا وہ سالے چکرا کر رہ گئے، پر ڈگی کو زخم لگ ہی گیا۔"

"ڈگی ہمارا بھتیجا ہے خان صاب۔ بڑا جی دار نڈھا ہے پر ابھی کچا ہے۔ تمہارا ہم پھر شکریہ ادا کرتے ہیں کب آیا تم پشاور سے؟"

"ادھر آج ہی آیا۔ کچھ مال لایا ہے ام ادھر بیچنے کو ٹرک آتا ہو گا۔"

"کیا مال بیچتے ہو؟"

"ڈرائی فروٹ! اخروٹ بادام اور دوسرا چیز۔"

اِتنے میں اس کا آدمی کوکا کولا کی چھ بوتلیں لے آیا۔ وہ ہم پی ہی رہے تھے کہ دانی بولا۔

"اِدھر کوئی خدمت میرے لائق ہو تو بتاؤ سب تمہارے غلام ہیں خان! کوئی کرچ شرچ والا معاملہ ہو تو بتا دو۔"

"انہیں بابا لوگ! ہم شریف آدمی ہے۔ ادھر کسی سے امارا جھگڑا مگڑا نہیں ہے۔ پر ایک بات ہم تم کو ضرور بولینگا۔"

"ہاں ضرور بولو۔" دانی نے میری طرف ہوتے کہا۔

میں نے ایک نظر اس کے آدمیوں پر ڈالی۔ وہ میری نظر کا مفہوم سمجھ کر بولا۔ "چلو اوئے تم ادھر باہر بیٹھو۔ دیکھو ڈگی کا کیا حال ہے۔"

وہ تینوں فوراً ہی وہاں سے اٹھ کر باہر نکل گئے۔ دانی سرک کر میرے قریب ہو گیا اور کوکا کولا کی دو ادھ بوتلیں کھول کر اس نے درمیان میں رکھ دیں۔

"اب کہو خان! تمہارا ہم پکا خادم ہے مرد آدمی کا تو ہم پکا غلام ہے۔" میں نے ایک نظر پھر کمرے کی دیواروں پر ڈالی وہاں سے باہر نکلنے کا ایک ہی راستہ تھا اور وہ تھا دروازہ۔ جس میں سے میں گزر کر اندر آیا تھا۔ کمرے کی چھت سے لگا پنکھا پوری رفتار سے چل رہا تھا اور ٹھنڈک کا احساس دیتا تھا۔

میں نے پگڑی اتار کر الگ رکھ دی اور سگریٹ سلگا لیا۔ وہ بڑی گہری گہری نظروں سے میرے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔

"تم مجھے غلط سمجھے ہو دانی! میں پشاوری پٹھان نہیں ہوں اور نہ میرا نام ہاشم خان ہے۔" ایک لحظے کے لیے تو وہ بھونچکا سا رہ گیا۔ فوراً ہی سنبھل کر اس طرح بیٹھ گیا کہ اس کا دایاں ہاتھ قمیص کے دامن تلے جا پہنچا تھا۔ میں اس کی ایک ایک حرکت کا جائزہ لے رہا تھا۔ ہزارہا شکوک اس کی ان بڑی بڑی غلافی آنکھوں میں تیر گئے۔ نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر بولا۔

"اچھا! تو پھر اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"فرق تو کوئی نہیں پڑتا۔ میں تم سے ایک درخواست کرتا ہوں۔ ویسے ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں۔ مگر ذرا دیر کے لیے میری جگہ پر بیٹھ کر سوچنا۔ اور جو کچھ میں تم سے مانگ رہا ہوں مجھے دے دینا، کہو وعدہ کرتے ہو؟"

"سیدھی بات کرو، اور مجھے بتاؤ تمہارا اصلی نام کیا ہے؟ مجھے یقین ہے تم بلّے نہیں کھیل رہے ہو۔"

"غلام جیلانی کو جانتے ہو؟"

"غ۔ لا۔۔۔ م۔ جی۔۔۔ لانی۔۔ ہوں ہوں! کوئی پیغام لائے ہو اس کا؟"

"ہاں! اس نے درخواست کی ہے کہ تم اس کی بہن آسیہ کو واپس کر دو، جسے تم گورالی سے اٹھا لائے ہو۔"

"کیا کہتے ہو تم! میں کسی آسیہ کو نہیں جانتا میرا کیا واسطہ ہے اس سے؟"

"غلام جیلانی کو کسی نے یہی بتایا ہے کہ آسیہ کو گورالی گاؤں سے تم نے اٹھوا لیا ہے۔"

"سن بھائی میرے! یہ بات بالکل غلط ہے میں کوئی کنجر نہیں ہوں نہ شوربا پیتا ہوں۔ غلام جیلانی کا تو میں جانی دشمن ہوں مگر اس کی بہن پر دانی ہاتھ ڈالے تو اپنی بہن پر ہاتھ ڈالے۔ نہیں یار! اسے کہنا مجھے اتنا کمینہ نہ سمجھے۔ ہاں اس میں اگر مردانگی ہے تو اسے کہنا وہ میرے سامنے آ جائے۔ میں نے قرآن پہ ہاتھ رکھ کر قسم کھائی ہے کہ گاڈی کے خون کا بدلہ اس سے ضرور لوں گا۔"

اس کے چہرے کا اتار چڑھاؤ اس کی سچائی کا مظہر تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ آسیہ پر دانی نے ہاتھ نہیں اٹھایا ہے۔ وہ کسی اور کی بھینٹ چڑھ گئی ہے۔

"مجھے تمہاری باتوں پر اعتبار ہے دانی! مجھے یقین آ گیا ہے کہ غلام جیلانی کا خیال غلط ہے۔"

"اسے کہہ دینا میرے دل میں اس کی بڑی عزت ہے۔ وہ جی دار آدمی ہے۔ ایسا مرد ہے جو کہیں صدیوں میں پیدا ہوتا ہے میں اس پر چھپ کر وار نہیں کروں گا۔ وہ جب میرے سامنے آ گیا، تو اسے بتا کر، اسے للکار کر اس پر وار کروں گا۔۔۔ مگر میں اسے معاف نہیں کر سکتا، نہیں! گاڈی گاڈی میرا 'پے وٹ' بھائی تھا۔"

"میں اسے کہہ دوں گا۔ میرا نام آصف ہے۔ میں اسے تمہاری ساری باتیں بتا دوں گا مگر میری مانو تو یہ قسم توڑ دو۔ گاڈی نے بڑی کمینی حرکت کی تھی۔ ایک بے بس عورت کو وہ ذلیل کرتا رہا۔ اور پھر اس نے اس غریب کو اپنے گرگوں کے آگے ڈال دیا۔"

"مجھے پتہ ہے، مجھے سب پتہ ہے پر میں گاڈی کو قیامت

کے دن کیا جواب دوں گا۔ نہیں میں اپنی قسم نہیں توڑ سکتا۔ کاش میں تمہیں مجبور کر سکتا کہ تم مجھے غلام جیلانی کا ٹھکانہ بتا دو۔"

"میں بتا بھی سکتا ہوں مگر وہ کسی ایک جگہ کسی ایک دن کے لیے بھی نہیں ٹھہرتا۔"

"ہاں! یہی چکر ہے ورنہ میرے آدمی اب تک اسے ڈھونڈ چکے ہوتے۔ میں تمہیں اپنے یار سے غداری کرنے کو نہیں کہوں گا۔ تم نے ہم پر بڑا احسان کیا ہے میرے بھتیجے کو بچا لیا ہے۔ اس سے مجھے بڑی امیدیں ہیں اس ڈگی سے۔" ابھی دانی یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ کمرے کا دروازہ دھڑ سے کھل گیا۔ اس کے دو آدمی تیزی سے اندر آ گئے بولے۔

"استاد! تھانے سے سپاہی آئے ہیں وہ آپ کو بلاتے ہیں۔"

"ان سے کہو میں ابھی آتا ہوں۔ جاؤ ان کو بیٹھک میں بٹھاؤ، اچھا آصف! فی امان اللہ۔ میرا پیغام اسے دے دینا۔ مجھے کوئی جلدی نہیں ہے مگر گاڈی کو میں نے اپنے حساب میں لکھ رکھا ہے۔ غلام جیلانی سے کہہ دینا کہ اس کی بہن کا مجھے کوئی علم نہیں ہے۔"

یہ کہہ کر دانی اٹھ گیا اور تہمد کے لڑ کس کر باندھتا ہوا اپنا سنہری طلّے میں مڑھا کھوسا پہننے لگا۔

"آؤ میں تمہیں باہر تک چھوڑ آؤں۔" یہ کہہ کر وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر عمارت کے بڑے دروازے تک جا پہنچا۔ اپنے ایک آدمی سے کہہ کر اس نے ٹیکسی رکوائی۔ میں اس سے مصافحہ کر کے ٹیکسی میں بیٹھا ہی تھا کہ کسی طرف سے اس کا گرگا جاکھی وہاں آ دھمکا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی پہچان لیا، ہیجخ کر بولا۔

"استاد! یہ غلام جیلانی واپس جا رہا ہے۔" وہ ایک دم ٹیکسی تک آ پہنچا۔ دانی نے زقند بھری اور اس کے اٹھتے ہوئے ہاتھ میں دبا پستول کلائی سمیت نیچے جھکاتے ہوئے کڑک دار آواز میں بولا۔

"خبردار جاکھی! تیری میں آنکھیں نکال دوں گا۔ مجھے پتہ ہے یہ غلام جیلانی ہے مگر اس وقت میرا مہمان ہے تو دفع ہو جا یہاں سے۔"

یہ کہہ کر اس نے حیرت زدہ جاکھی کے ہاتھ سے پستول چھین لیا اور اسے پیچھے دھکیل کر خود دروازے کی طرف منہ کر کے یوں کھڑا ہو گیا جیسے وہ مجھ سے نظریں نہ ملانا چاہتا ہو۔ وہ یوں ظاہر کر رہا تھا جیسے اس نے نہ تو کچھ دیکھا ہے اور نہ ہی کچھ سنا ہے۔

"چل بھئی! ادھر مناواں تک لے چل۔" میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔ اس نے گاڑی تخ سے پہلے گیئر میں ڈالی اور آگے بڑھ گیا۔ میں نے کھڑکی میں سے سر باہر نکال کر دانی کے دروازے پر نظر ڈالی۔ وہ ابھی تک سڑک پر پیٹھ کیے کھڑا تھا اور جاکھی ہکا بکا سا ہو کر مجھے دور ہوتے ہوئے یوں دیکھ رہا تھا جیسے اس نے کوئی ہولناک خواب دیکھا ہو۔

ٹیکسی دو موریہ پل کے نیچے سے گزر کر باغبانپورہ کی طرف چل دی تو میں پچھلی نشست پر پھیل کر بیٹھ گیا۔ میرے ذہن میں کھلبلی مچی تھی۔ دانی نے مجھ سے ایک اچھے میزبان کا سا سلوک کیا تھا۔ حالانکہ وہ سمجھ چکا تھا کہ وہ کس سے مخاطب ہے۔ وہ اس وقت مجھے پہچان گیا تھا جس وقت میں نے اس کے سامنے غلام جیلانی کا نام لیا تھا۔ اس کی آنکھوں کی چمک ایک دم تیز ہو گئی تھی۔ بار بار اس کا ہاتھ اپنی ڈب کی طرف بڑھتا تھا۔ اس کے حساس نتھنے ٹھہر ٹھہر کر پھڑکتے تھے۔ تیتر کو اس نے پنجرے میں ڈال دیا تھا۔ حالت اس کی یہ تھی کہ وہ کوکا کولا کی بوتل میں لگی نالی کے ذریعے شربت بھی حلق تک نہ لے جا سکتا تھا۔ اس کا سارا وجود تپنے لگا تھا۔ پھر بھی وہ صبر و استقامت کی چٹان بنا بیٹھا رہا۔ وہ اپنی کسی بھی حرکت سے یہ ظاہر نہیں کر رہا تھا کہ وہ مجھے پہچان چکا ہے میں بھی اپنی جگہ اسی غلط فہمی میں مبتلا رہا کہ میرا بھید اس پر ظاہر نہیں ہوا ہے مگر میرا وہ اندازہ کتنا غلط تھا۔

اس نے اپنا سینہ کھول کر میرے آگے رکھ دیا تھا۔ آسیہ کو اس نے اپنی بہن کہہ دیا تھا اور مجھے یقین کرتے ہی بنی تھی کہ میری بہن کے بارے میں اسے کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا مگر میرا سوال تو لاینحل ہی رہا۔ اگر دانی قصوروار نہیں تھا، تو پھر آسیہ کہاں گئی۔ وہ کون لوگ تھے جو اسے لے اڑے۔ کس مقصد کے لیے انہوں نے اسے کبیر شاہ کے ہاں سے اغوا کر لیا ہے میرا دماغ چٹخنے لگا تھا اور اب میں نے امرتسر جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں نے اس بلبیر سنگھ سے نپٹنے کا تہیہ کر لیا تھا جس نے میری بے قصور بہن کو اذیتوں کے ایک نئے بے ستون کو کاٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔ بلبیر سنگھ اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنا چکا تھا۔ وہ مجھے اپنے ہی وطن کے لوگوں کے خلاف آلہ کار بنانا چاہتے تھے۔ اور میں اس ارادے سے اب مناواں کی طرف بڑھ رہا تھا کہ میں رات کے اندھیرے میں سانپ کا روپ دھار کر سرحد عبور کر جاؤں گا اور پھر ان سب لوگوں کو چن چن کر مار دوں گا جو میری بہن کو رنج و محن کے تپتے جہنم میں ڈال چکے تھے۔ اور جو مجھے اپنے ہی لوگوں کے خلاف گولی کی طرح استعمال کرنا چاہتے تھے۔ میں انہیں بدترین انجام سے دوچار کرنے کے ارادے سے مناواں کی طرف بڑھ رہا تھا اور مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔

میرے سارے اندازے اور اندیشے غلط ثابت ہوئے تھے۔ دانی قطعاً گردن زدنی نہیں تھا اور اس کی ملاقات نے میرے ذہن پر یہ اثر مرتب کیا تھا کہ اب میں لاہور شہر میں ایک نرمرد پر بھروسا کر سکتا تھا۔ وہ میرا دشمن تو تھا مگر میری کسی ذلت آمیز شکست کا وہ حامی نہیں تھا۔ میں اس پر آنکھیں بند کر کے بھروسا

کرسکتا تھا۔ اس نے مجھے مار ڈالنے کی قسم کھائی تھی مگر وہ مجھے کسی اپنے ہی انداز سے قتل کرنا چاہتا تھا۔ چاقو کے پستول پر وہ جس طرح شکرے کی طرح جھپٹا تھا اس انداز نے مجھے حیران کردیا تھا۔ دانی واقعی بہت بڑا آدمی تھا۔ اور سینے میں دردمند دل بھی رکھتا تھا۔ آسیہ کے ذکر پر وہ تڑپ اٹھا تھا اور خود کو اس نے کئی گندی گالیاں دے ڈالی تھیں — ورنہ کوئی اور اتھلا شہدا سطحی آدمی ہوتا تو وہ اس رنگ میں مجھ سے کبھی بات نہ کرتا۔

ٹیکسی شالامار باغ کے قریب سے گزری تو اچانک مجھے شیر دل آہو کی بیوی سروری خانم ایک کار سے اترتی نظر آئی۔ کبری بھی اس کے ساتھ تھا اُن کے پیچھے دو برقعہ پوش خواتین بھی کار سے نکل آئیں۔ سروری خانم بے پردہ تھی۔ وہ اپنا پرس جھلاتی ہوئی اردگرد نظریں گھما کر دیکھ رہی تھی معلوم یہ ہوتا تھا وہ عورتیں اس کی مہمان تھیں جنھیں وہ باغ کی سیر کے لیے ساتھ لے آئی ہے۔ میں نے ٹیکسی وہیں روک کر ڈرائیور کو فارغ کردیا۔ سروری کو میں نے بہت دنوں بعد دیکھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اَن گنت باتیں میرے ذہن میں کھلبلی مچانے لگیں میرے خوابوں کا شیشہ ایسا دھندلا گیا تھا۔ کہ وہ مسند آراء بھی اب تک مجھے نہیں ملی تھی۔ شاید وہ بھی اپنے حافظے کی لوح پر سے میرا نام مٹا بیٹھی تھی۔ ورنہ وہ اس کا حسین سراپا تو بار بار میرے ذہن میں اترا کرتا تھا مگر اس آسیہ کی اذیتوں نے مجھے کہیں کا بھی نہیں رکھا تھا۔ اب جو سروری خانم مجھے نظر آئی تو میں بے اختیار اس کی طرف لپکتا چلا گیا۔

وہ اُن عورتوں کو ساتھ لے کر باغ کے اندر اتری تو کبری اُن کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ میں بھاگ کر اُن تک جا پہنچا۔ کبری اس وقت دروازے کے اندر اتر رہا تھا کہ میں نے اُسے جا لیا۔ سروری خانم اس سے کوئی چھ قدم آگے چل رہی تھی۔ کبری نے مجھے دیکھا تو سہی مگر میری پگڑی اور عینک کی وجہ سے مجھے پہچان نہیں سکا۔ میں چند قدم اس کے ساتھ چلتا رہا پھر میں نے جان بوجھ کر اس کو کندھا مارا۔ وہ لڑکھڑا سا گیا۔ بڑی تُن بھُن سے بولا۔

"اوئے پگڑی خان دیکھ کے نہیں چلا جاتا تجھ سے — مونڈھے کیوں مارتا ہے نظر نہیں آتا تو یہ عینک اتار دے۔"

میں اس کی بات سُنی اَن سنی کر کے دو قدم آگے نکل گیا وہ میرے پیچھے تیز تیز قدم چلا تاکہ آگے بڑھ کر معلوم تو کرے کہ میں نے اسے مونڈھا کیوں مارا ہے۔ میں اس کے ایک ایک قدم کو ناپ رہا تھا۔ جب وہ میرے بالکل قریب پہنچا تو میں قدم روک کر ایک دم یوں پیچھا ہٹا جیسے میں چھینک مار رہا ہوں۔ "ہینچھ" میں نے جان بوجھ کر آواز پیدا کی۔ وہ سالا اپنی جھونک میں آیا اور سیدھا مجھ سے ٹکرا گیا۔ میں نے ایک دم گھوم کر اس کو کندھوں سے پکڑ لیا۔ "اوئے پدر سوختہ! اب کیوں ٹکراتی ہے تم ام سے چیر پھاڑ نا طبئے"

کبری پھر بھی کچھ نہ سمجھا سہم کر بولا
"معاف کردو خان غلطی ہوگئی۔"

دو قدم آگے چلتی سروری خانم نے اس کی آواز سُن لی وہ تیزی سے پلٹی اور بولی۔ "کیا ہوا؟ کیوں مارتے ہو لڑکے کو۔" اس نے مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ میں ہنسی ضبط نہ کرسکا۔

"یہ لڑکا ہے سالا، یہ بڈھا اونٹ۔"

"ارے آپ! ہائے میں مر گئی۔ میں تو آپ کو پہچان ہی نہ سکی جیلانی صاحب۔" سروری نے حیرت اور مسرت کے ملے جلے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے میرا ہاتھ یوں ہی پکڑ لیا۔ جیسے کسی نے اپنے کسی بچھڑے ہوئے عزیز کو اچانک پا لیا ہو۔ کبری بھی مجھ سے بے اختیار لپٹ گیا۔

"استاد! خدا کی قسم میں تمہیں پہچان نہیں سکا تھا۔ کتنی مدت بعد ملے ہو۔"

"اوئے آہستہ بول تیرا کوئی رشتے دار سُن لے گا چل کہیں سائے میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔ آپ سنائیں کیا حال ہے آپ کا خانم!" میں نے عینک اُتار کر سروری کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ مجھ سے یوں سرِراہ مل کر اُسے جو خوشی ہوئی تھی وہ اس کے چہرے سے ہی عیاں تھی۔ اس کے ساتھ جو برقعہ پوش عورتیں تھیں، وہ بھی ہمارے قریب آگئیں۔

"یہ ہماری مہمان ہیں، راولپنڈی سے آئی ہیں۔ میں اُن کو سیر کے لیے ادھر لے آئی تھی۔" یہ کہہ کر وہ اور کبری مجھے اپنے نرغے میں لے کر ایک درخت کے گھنے سائے تلے جا بیٹھے۔

"کبری! جاؤ ذرا انہیں باغ کا آخری حصہ دکھا لاؤ۔ جلدی آجانا اور دیکھو، اس کینٹین والے سے کہو ہمارے لیے کوکا کولا لے آئے۔"

کبری اُسی وقت اُن عورتوں کو اپنے ساتھ لے کر آگے نکل گیا۔ جاتے ہوئے مجھے کہہ گیا۔

"استاد! چلے نہ جانا۔ تم سے بڑی باتیں کرنی ہیں مجھے۔ ہم آدھ گھنٹے تک آجائیں گے۔" یہ کہہ کر وہ بارہ دری کی طرف بڑھ گیا۔

"کیسے جیلانی صاحب کہاں ہوتے ہیں آپ؟ آہو صاحب کو آدھا مال تو آپ نے دلا ہی دیا۔ یہی آپ کی بڑی مہربانی ہے۔"

"آدھا مال! میں سمجھا نہیں۔"

"آپ کو پتہ ہونا چاہیے بھئی! ماجدہ نے ہمیں سب کچھ بتا دیا ہے وہ جب پچھلے دنوں پکڑی گئی تھی نا تو اس نے حوالات سے آہو صاحب کو پیغام بھیجا کہ وہ اسے مل لیں۔ آہو صاحب وہاں گئے تو اس نے کہا کہ وہ ہیرے جو ہمارے گھر سے اس نے چرائے تھے ان میں سے آدھے اس کے پاس محفوظ ہیں۔ اگر وہ اُسے حوالات سے چھڑا دیں

تو وہ اُن کے آدھے ہیرے واپس کردے گی۔ آہو بہت حیران ہوئے، پہلے تو وہ سمجھے کہ وہ اسے چکر دے رہی ہے مگر جب اس نے کہا کہ آدھے ہیرے جیلانی کا ایک دوست قادر اس سے چرا کر لے گیا ہے اور اب جو باقی اس کے پاس ہیں وہ انہیں اس شرط پر واپس کرسکتی ہے کہ آہو اُسے پولیس کے پنجے سے چھڑا دے۔ آہو نے یہ سودا کر ہی لیا اور ماجدہ کے ساتھ اس سلونی اور عرشی کو بھی کل صبح رہا کروا دیا۔ رات ہونے سے پہلے ماجدہ نے نو لاکھ کے ہیرے آہو کو واقعی واپس کر دیے۔ یہ قادر کون ہے آپ ہمیں اب اس کا پتہ بتا دیں۔"

"ایسے ہی ایک بہت گھٹیا آدمی تھا۔ دو دن وہ میرے ساتھ ادھر ڈاکٹر فرخندہ کے مکان پر رہا۔ اس دوران وہ ماجدہ کے زیور اور آپ کے ہیرے چرا کر لے گیا، آج تک اس کا پتہ نہیں چلا۔" میں نے ماجدہ کی بات رکھنے کے لیے جھوٹ بول دیا۔

"ماجدہ بھی یہی بتا رہی تھی۔ آہو صاحب نے تو خدا کا شکر ادا کیا کہ انہیں آدھا ہی سہی، مال مل تو گیا، ورنہ جو لوگ وہ امانت ان کے پاس رکھ کر گئے تھے انہیں بہت شرمندہ کرتے تھے۔"

"کون لوگ ہیں وہ؟"

"وہ اُدھر انڈیا سے اِدھر آتے ہیں۔"

"اب بھی اِدھر ہی ہیں وہ؟"

"نہیں وہ کل پھر آئیں گے، اُن کا پیغام آیا تھا۔ سردار جسونت سنگھ اور کاہام سنگھ دونوں آئیں گے۔"

"وہ رہتے کہاں ہیں اُدھر انڈیا میں؟"

"وہ فتح گڑھ چوڑیاں کے رہنے والے ہیں۔"

"وہ تو بہت بڑا قصبہ ہے۔"

"اور وہ دونوں وہاں کے بہت مشہور آدمی ہیں۔ صراف ہیں دونوں۔ اُن کی امرتسر میں بھی ایک دکان ہے ہال بازار میں۔"

"ایسا ہوسکتا ہے خانم کہ آپ میری ان سے ملاقات کرادیں"

"کیوں؟ کوئی کالا دھندا شروع کریں گے ان کے ساتھ مل کر؟"

"نہیں! بلکہ میں اُن کے ساتھ انڈیا جاؤں گا میرے لیے یہاں زندہ رہنا مشکل ہوگیا ہے۔"

"ہاں آہو نے بتایا ہے مجھے کہ پولیس آپ کی تلاش میں ہے۔"

"میرے لیے یہی سب سے بڑی مصیبت ہے خانم! وہ کسی بھی دن مجھے جکڑ لیں گے۔"

"ہاں یہ تو ہے۔ آپ کی بہن کہاں ہے آج کل؟ آپ نے اُسے ڈھونڈ نکالا تھا۔"

"ہاں! وہ بھی کسی جگہ محفوظ بیٹھی ہے اب۔ مجھ پر مہربانی کریں خانم! مجھے اس جسونت سنگھ سے ملا دیں۔ اس سے کہیں وہ کسی خفیہ راستے سے مجھے بارڈر کراس کرا دے۔"

"یہ کون سی مشکل بات ہے۔ آپ آجائیں کل میرے پاس۔ آہو آج صبح کراچی گئے ہیں وہ ایک ہفتے بعد واپس آئیں گے۔ آپ بس کل رات نو بجے ہمارے گھر آجائیں۔"

"کوئی خطرہ تو نہیں ہوگا وہاں؟"

"نہیں جناب! میرے ہوتے ہوئے وہاں آپ کو کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہ عورتیں بھی آج شام کی گاڑی سے پنڈی چلی جائیں گی۔"

"یہ گاڑی آپ کی ہے جس میں سے آپ اتری ہیں؟"

"ہاں! ڈرائیور بھی اپنا ہی ہے۔ تین سو روپے ماہوار پر ملازم رکھا ہے میں نے۔"

"پھر تو بڑے ٹھاٹھ ہیں آپ کے۔ وہ ہادی علی کی جاگیر تو اب آپ کے قبضے میں ہوگی؟"

"ہاں! ہم ان کے جائز وارث ہیں جیلانی صاحب!"

"مسند آراء کہاں ہیں آج کل؟" میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی پوچھ ہی لیا مگر اس طرح جیسے کوئی جاں بلب مریض یہ پوچھے کہ بہار کب آئے گی؟

"وہ.... وہ گاؤں میں ہے، اکبر کوٹ میں اور مزے میں ہے اصل جاگیردارنی تو وہی ہے۔"

"اچھا! تو پھر یہ بات طے رہی کہ میں کل رات نو بجے آپ کے پاس آؤں گا۔"

اتنے میں کوکا کولا کی بوتلیں آگئیں اور ہم پیاس بجھانے لگے۔ وہ اپنے دل میں کچھ اٹل فیصلے کیے بیٹھی تھی جن کے پیچ در پیچ مراحل کو میں اچھی طرح سمجھتا تھا۔ وہ مجھے ابھی تک نہیں بھولی تھی۔ جب وہ بوتل خالی کر چکی تو بولی۔

"آپ بڑے ہی کٹھور ہیں جیلانی صاحب میں آپ کو روز یاد کرتی تھی۔ ڈھلوں صاحب کے ہاں ہی آپ سے میری آخری ملاقات ہوئی تھی نا؟"

"ہاں! کیا وہ نہیں آتے ہیں آپ کے گھر؟"

"نہیں! بس آہو صاحب اُن سے جا کر مل لیتے ہیں، ورنہ وہ خود کبھی ہمارے ہاں نہیں آتے۔ میں تو بہت پریشان ہوں جیلانی صاحب! میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا، میں کیا کروں؟"

"کیوں! ایسی کیا پریشانی ہے آپ کو؟ اب تو آپ کو جاگیر بھی بلا شرکت غیرے مل چکی ہے۔"

"وہ.... بس کل آپ آئیں گے نا تو پھر آپ کو تفصیل سے بتاؤں گی۔" سروری خانم نے کبری کو تیزی سے اپنی طرف آتے دیکھ کر کہا۔ مہمان خواتین اس کے پیچھے تھیں۔

کبری آیا اور مجھے اُن عورتوں سے ذرا پرے ہٹا کر بولا،
"استاد! تم ہمیں بالکل ہی بھول گئے نا آخر! ادھر بڑا گھپلا سننے میں

آرہا ہے۔"

"کیسا گھپلا! کسی اور مجیدن کو کسی کے ہاں بیچ دیا ہوگا تم نے۔"

"نہیں یار! وہ دھندا میں نے چھوڑ دیا ہے ایک دم کنجروں والا دھندا تھا وہ۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ اس ماجدہ کو کیوں تم نے مجبور کیا کہ وہ ہیرے آہو کو واپس کر دے۔ ہاتھ آیا مال کیوں چھوڑ دیا تم نے؟ مجھے دے دیا ہوتا، میں سنبھال لیتا۔"

"یار! اس ماجدہ سے میری ملاقات ہو تو میں بتاؤں کہ اس نے کیا کیا ہے کل سے وہ رہا ہو چکی ہے مگر مجھے ابھی تک نہیں ملی۔"

"دیکھ! وہ تینوں مجھے معلوم ہے کہاں ٹھہری ہیں۔ اُدھر سمن آباد میں لڑکیوں کا ایک ہاسٹل دارالنساء ہے، وہ اس میں جا ٹھہری تھیں۔ ماجدہ نے اپنا پتہ میرے کان میں بتایا تھا۔ اس کو رہا کروانے کے لیے میں جیل گیا تھا۔ اس ڈرائیور کو لے کر۔ آہو بھی ہمارے ساتھ تھا، اسی نے ماجدہ کو چھڑایا ہے۔"

"وہ ہیرے اس نے کب واپس کیے؟"

"وہ اس نے بنک کے لاکر میں رکھے تھے جیل سے واپسی پر وہ سیدھی وہاں گئی اور لاکر سے نکال لائی مگر آہو کہتا ہے کہ وہ آدھے ہیں۔"

"بکتا ہے وہ! ماجدہ سے میں نے کہا تھا کہ وہ اس کو تمام ہیرے واپس کر دے۔"

"پر یار! ہے وہ بڑی جید اور نہیں میں کیا کہوں، کیا ضرورت تھی اس کی بھلا۔ وہ کاٹ آتی اُدھر سال چھ مہینے۔"

"تیرے لیے تو یہ کوئی بات ہی نہیں مگر وہ شریف عورت ہے۔"

"بڑی شریف! بڑی ہی شریف عورت جلیبی ایسی سیدھی۔ ابے استاد تو نے ہمیشہ گھاٹے کا سودا کیا ہے۔"

"اچھا دفع کر اب کیا ہو سکتا ہے۔ یہ بتا کہ ماجدہ پریشان تو نہیں تھی؟"

"نہیں، بلکہ وہ تو بہت خوش تھی کہ ہیرے دے کر اس کی جان چھوٹ گئی۔ تم سناؤ آج کل کیا کرتے ہو؟ تمہاری بہن مل گئی تھی نا!"

"ہاں! مل گئی تھی۔" میں نے بات کو مختصر کرتے ہوئے کہا۔

وہ میرے لہجے کی سرد مہری سے کچھ بجھ سا گیا، بولا۔

"میں بالکل پھانک ہو رہا ہوں آج کل مہنگائی نے کمر توڑ دی ہے۔"

"ابے تیرے کون سے بچے بھوکے سوتے ہیں تو چھڑا چھانٹ آدمی ہے۔"

"یار! وہ... وہ سالی افیون بہت مہنگی ہو گئی ہے۔ دیکھ کوئی ہزار پانچ سو اپنی نیک کمائی میں سے مجھے بھی دے دیا کر۔ اللہ برکت دے گا۔"

"بہت گندی شے ہے تو سالے! ہمیشہ منہ کھولے رہتا ہے۔ یہ لے پانچ سو روپے رکھ لے۔ تیرے منہ کی کالک ہے یہ۔" میں نے جیب کے اندر ہاتھ ڈال کر پانچ سو روپے نکالے اور اس کی مٹھی میں دے دیے۔

"اللہ بھلا کرے تیرا... جتنے بھی نامی گرامی ڈاکو گزرے ہیں وہ سب غریبوں کا بہت خیال رکھتے تھے جیلانی! تجھے ان کے نقش قدم پر چلتے دیکھ کر میرا سر فخر سے تن جاتا ہے۔"

"بک نئیں اوئے!" میں نے کہا۔ "میں شریف آدمی ہوں دیکھ میں کل شام کو نو بجے تیرے پاس آؤں گا۔ زیادہ دستک نہ دینی پڑے مجھے۔"

"فکر ہی نہ کر۔ پھاٹک کھلا ملے گا تجھے پر تیرا شکار وہ آہو گھر پر نہیں ہوگا۔"

"کوئی بات نہیں! تجھ سے ذرا گپ شپ رہے گی۔"

"کسی عروس یک شب کی ضرورت ہو تو میں تیار کر رکھوں؟"

"پھر وہی بکواس! ابے ابھی تو تو کہہ رہا تھا کہ یہ کنجروں والا دھندا ہے۔"

"ہے تو سہی پر دیکھ نا تیری خدمت تو میرا فرض ہے نا۔"

"اور یہ عروس یک شب کا لفظ تو نے کہاں سے سیکھا ہے؟"

"ادھر ایک شاعر میرے چڑھ گیا تھا۔ اس کی کتاب کی "ریالیٹی" اسے ملی تھی دس ہزار روپے۔ وہ کسی اسی چکر میں گنوا گیا میرے ہاں رہ کر۔ بڑی شراب پیتا تھا وہ سالا۔ پر بھئی شاعر بھی وہ بہت اچھا ہے وہ۔ ایسی ایسی شاعری چھوڑتا ہے کہ بس آگ لگا دیتا ہے۔" کبری کی زبان قینچی کی طرح چلتی تھی۔ وہ اب بھی پہلے جیسا تھا نٹ کھٹ۔ گرہ کٹ۔

"چل کبری اب ہمیں ذرا جناح باغ بھی دکھا لاتے ہیں اور یہ چڑیا گھر بھی۔"

"اسے تو وہیں کسی پنجرے میں بند کروا دیں خانم! اس کبری کو لوگ اسے دیکھ دیکھ کر خوش ہوا کریں گے۔"

سروری کھلکھلا کر ہنس دی، بولی۔

"مجھے یہی کرنا پڑے گا ایک دن مگر وہاں اسے افیون کون دے گا۔ دسویں دن یہ مر جائے گا۔" یہ کہہ کر وہ میرے قریب سے گزرتے ہوئے سرگوشی کرتے ہوئے بولی۔

"کل رات نو بجے میں آپ کا انتظار کروں گی۔"

یہ کہہ کر وہ ان عورتوں کے ساتھ چلتی ہوئی باغ سے باہر نکل گئی۔

میں کوئی دس منٹ تک وہیں سائے میں بیٹھا سوچتا رہا۔ پھر میں نے سوچا کہ رات مجھے ڈھلوں صاحب کے ہاں گزارنی

چاہیے۔ عین ممکن ہے انہیں سرکاری ذریعوں سے بھنڈاری کے متعلق یا ہیروں کے متعلق کوئی بات معلوم ہو چکی ہو۔

میں جب باغ سے باہر نکلا تو اس وقت تک سروری خانم واپس جا چکی تھی۔ میں ایک ٹیکسی میں بیٹھا اور اسی وقت ڈھلوں صاحب کے گاؤں کی طرف چل دیا۔ ٹیکسی والا پچاس روپے طلب کر رہا تھا میں نے کہا دے دوں گا بابا۔ میں اس گھڑی بھلا مول تول کہاں کر سکتا تھا۔ میں تو اپنی منزل کی سمتیں ہی بھول چکا تھا۔ میرا حال اس وحشی ایسا تھا جس کی آنکھوں میں تیر پرو دیے گئے ہوں۔ حیرت مجھے ماجدہ کی تیز روی پر تھی۔ وہ پولیس کے ہتھے چڑھی بھی مگر پھر بلیدان دے کر چھوٹ بھی گئی۔ اور وہ بھی آہو کے ذریعے، جسے اس نے ان ہیروں میں سے آدھے واپس کر دیے جو اس نے آہو کے گھر سے چرائے تھے۔ یہ سب کچھ اس نے کیسے کر لیا ہوگا۔ ماجدہ کا خیال آتے ہی میں نے ٹیکسی کا رخ سمن آباد کی طرف موڑ لیا۔ ڈھلوں صاحب کے گاؤں چوگوڑھ جانے کے لیے ابھی میرے پاس بڑا وقت تھا۔

دارالنساء کی عمارت میں نے جلدی ہی ڈھونڈ لی۔ معلوم یہ ہوا کہ وہ ملازمت پیشہ خواتین کی ایک نجی اقامت گاہ ہے۔ چوکیدار کے ذریعے میں نے اندر سے معلوم کروایا تو پتہ چلا کہ ماجدہ نام کی خاتون وہاں سولہ نمبر کمرے میں مقیم ہے۔ اس کے لیے میرا پیغام سن کر چوکیدار ایک دم اکڑ گیا۔ بولا۔

"خان جی! یہاں باہر کا کوئی آدمی کڑیوں سے نہیں مل سکتا کوئی رشتے دار ہے وہ آپ کی۔"

"ہاں بھئی! وہ ہمارے ماموں کے بھانجے کا بھتیجی ہے وہ بی بی پشاور سے اس کے لیے عیدی لایا ہے ام۔"

"کیا نام ہے آپ کا خان جی؟"

"اوئے ام ہاشم خان ہے بھئی۔ یہ تم کیا بولتا ہے ام کو۔ کھوپڑی تڑوائے گا ام سے۔"

"ادھر کوئی ہم چوڑیاں نہیں پہنتا ہے۔ لڑکیوں کی حفاظت کرنا ہماری ذمے داری ہے خان! رشتے داری کا ثبوت دو۔"

"وائے ام کیا ثبوت دے بھئی! یہ دیکھو یہ امارا شناختی کارڈ اے۔ ادھر ام تمہارا خدمت کرتی۔" یہ کہہ کر میں نے پانچ روپے کا نوٹ چوکیدار کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ وہ ایک دم نرم پڑ گیا۔ وہ کرنسی نوٹ میری شناخت کے لیے بہت کافی تھا، بولا۔

"تم ادھر ٹھہرو خان جی ہم بی بی کو ادھر ہی بلائیگا۔" یہ کہہ کر وہ اندر چلا گیا اور کچھ دیر بعد ماجدہ گیٹ پر آ پہنچی۔ چوکیدار اس کے ساتھ تھا۔ وہ بچاری پہلی نظر میں مجھے پہچان نہ سکی۔ ٹکر ٹکر دیکھنے لگی۔

"دیکھو بی بی یہ کہتا ہے کہ تم اس کے ماموں کے بھانجے کی بھتیجی ہے، یہ ٹھیک کہتا ہے یہ پٹھان؟"

میں نے عینک اُتار کر ماجدہ کو دیکھا تو وہ مسکرا دی، بولی۔

"ہاں بھئی! ٹھیک ہی کہتے ہیں خان صاحب۔"

"دیکھو بی بی ام تمہارا واسطہ پشاور سے عیدی لایا، ملنا مانگتا پر یہ سور روکنا مانگتا۔"

"اب گالی تو نہ دو خان جی! جاؤ اندر بیٹھ کر عیدی دے لو۔"

ماجدہ مجھے ساتھ لے کر اپنے کمرے میں جا پہنچی۔ عرشی اور سلونی دونوں وہاں موجود تھیں اور بہت ہی شکستہ حال نظر آ رہی تھیں۔

"کیا ہوا بھئی ان لوگوں کو، یہ تو بہت پریشان نظر آتی ہیں۔"

"پریشان نہ ہوں تو کیا کریں! ان کی تو نوکریاں چھوٹ گئیں۔ یہ گھر کی رہیں نہ گھاٹ کی۔"

"ارے باپ رے باپ! اس کا تو ہمیں دھیان ہی نہیں رہا۔ مگر تم فکر نہ کرو مس عرشی میں کل تم دونوں کو نوکری پر بحال کروا دوں گا۔"

"واقعی؟" ماجدہ نے پوچھا۔

"ہاں بھئی! یہ تو بہت آسان بات ہے ہمارے لیے، بالکل مت گھبراؤ مس عرشی! یہ تو کوئی بات ہی نہ ہوئی۔"

"اور وہ آپ صاحب کہاں ہیں ان کے دشمن؟" سلونی نے پوچھا۔

"وہ... وہ کراچی گئے ہیں۔ ایک مہینے بعد آئیں گے۔ پولیس ان کے پیچھے لگ گئی تھی۔"

سلونی نے عرشی کے کان میں کچھ کہا اور دونوں کمرے سے باہر چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد ماجدہ بولی۔

"ہائے جیلانی صاحب ہم تو مارے ہی گئے تھے اس دن وہ موا دانی ہمیں گاڑی میں ڈال کر ایک مکان میں لے گیا۔ وہ ہم سے آپ کے بارے میں پوچھتے تھے۔ ہمیں ان کے آدمیوں نے مارا بھی مگر ہم کیا بتاتے کہ آپ کہاں ہیں۔ کوئی دو گھنٹے بعد دانی نے ہمیں پولیس کے حوالے کر دیا۔ وہ تو خوش ہو گئے دانی نے پتہ نہیں ان سے کیا کہا تھا۔ ان لوگوں نے ہمیں اسی وقت گرفتار کر کے حوالات میں بند کر دیا۔ پھر انہوں نے ہمارا ریمانڈ لیا تین دن کے لیے۔ وہ ہم سے آپ کا پتہ پوچھتے تھے مگر ہم کیا بتلاتے۔ ہم نے قرآن پر ہاتھ رکھ کر قسمیں کھائیں کہ ہمیں کچھ پتہ نہیں ہے کہ آپ لوگ کون ہیں اور کہاں ہیں مگر انہوں نے پھر بھی ہمارا اعتبار نہ کیا...."

"اور جیل بھجوا دیا۔" میں نے سر پر سے پگڑی اتار کر الگ رکھ دی۔

"ہاں! پھر مجھے آہو صاحب کا خیال آیا اور میں نے ان کو پیغام بھیجا کہ وہ مجھ سے مل لیں۔"

"وہ اچھا خیال تھا۔ میرا خیال ہے اس نے ہی تمہیں رہا کروایا ہوگا۔"

"ہاں وہ مجھے جیل میں ملا تو میں نے علیحدگی میں اس سے کہا کہ میرے پاس اس کے آدھے ہیرے موجود ہیں۔ اگر وہ ہمیں اس مصیبت سے چھڑا دے تو میں وہ ہیرے اسے دے سکتی ہوں مگر وہ طیش میں آگیا۔ کہنے لگا کہ میں تو پورے ہیرے لوں گا جتنے تم نے وہاں سے اٹھائے تھے مگر میں ایسا نہیں کر سکتی تھی جیلانی! پھر میرے پاس کیا بچتا۔ میں نے کہہ دیا کہ آدھے مجھ سے جیلانی کے ایک دوست عبدالقادر نے چرا لیے تھے۔ وہ مطمئن تو نہیں ہوا پر اس سودے پر راضی ہو گیا۔ اس نے اپنے طور پر پتہ نہیں کہاں کہاں زور لگایا۔ بہرحال کل صبح ہم جیل سے رہا ہو ہی گئے۔"

"اور پھر وہ ہیرے تم نے واپس کر دیے؟"

"ہاں، اور کیا کرتی میں۔ ان کی مالیت بھی آٹھ لاکھ سے کم نہیں ہے اور ابھی دس گیارہ لاکھ کے ہیرے میرے پاس بینک میں محفوظ ہیں۔"

"دیکھو ماجدہ! میری مانو تو یہاں کوئی ڈھنگ کا مکان لیکر تم اطمینان سے زندگی بسر کر سکتی ہو۔"

"میں تو یہی سوچ رہی تھی مگر درمیان میں یہ مصیبت آ پڑی اب تو میں یہ شہر ہی چھوڑ رہی ہوں۔ دو چار روز میں اسلام آباد چلی جاؤں گی۔"

"ہاں یہ زیادہ بہتر ہے۔ کوئی ڈھنگ کا مکان اور ڈھنگ کا آدمی ڈھونڈ لو۔ اس طرح تم کبھی چین نہ لے سکو گی۔ یہ ہیرے تمہارے بہت کام آسکتے ہیں۔"

"مگر آپ کا ڈالا ہوا وہ پیچ مجھے بہت مہنگا پڑا ہے جیلانی میں گرفتار نہ ہوتی تو آہو کو کبھی پھوٹی کوڑی نہ دیتی اور یہ سارا قصور آپ کا ہے اس کی ذمے داری آپ پر آتی ہے۔"

وہ بہت سنجیدہ ہو گئی تھی اور بڑے بھاری بھرکم لہجے میں بات کر رہی تھی۔ ایسے میں اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی تھی۔ سفیدی نمایاں ہونے سے سیاہی ماند پڑنے لگی تھی۔ قدرے توقف کے بعد بولی۔

"اگر ان چار پانچ دنوں تک آپ ان کی نوکری بحال نہ کروا سکے۔ اور مجھے امید بھی نہیں ہے تو میں انہیں اپنے ساتھ اسلام آباد لے جاؤں گی۔ ایسی دس بیس لڑکیوں کا بوجھ میں آسانی سے برداشت کر سکتی ہوں۔"

"کیوں نہیں! بڑی رقم ہے آپ کے پاس!"

اس نے میرے طنز کو محسوس کر لیا۔ دم بدم اس کا پارہ اوپر چڑھ رہا تھا بڑے زہریلے انداز میں بولی۔

"ہاں! اور یہ آپ کی مہربانی کا نتیجہ نہیں ہے۔ مجھے یہ سب کچھ اچانک ہی مل گیا تھا اب میں اس میں سے ایک پائی بھی کسی ایرے غیرے کو نہیں دوں گی۔"

"یہ بات مجھے کیوں سنا رہی ہیں آپ! میں نے آپ سے رقم تو نہیں مانگی۔"

"یہ بات آپ کے لیے بھی ہے۔ اس دن ہی میں نے آپ کو اتنی بڑی رقم دے دی تھی۔"

"وہ بھی میں نے نہیں مانگی تھی۔"

"میں سمجھی تھی، میں سمجھی تھی کہ آپ میرے ہیں۔"

"اب کیا نتیجہ اخذ کیا ہے آپ نے؟"

"اب؟... اب؟... آپ کسی کے بھی نہیں جیلانی صاحب! آپ کو بہن کی محبت نے ذہنی طور پر مفلوج کر دیا ہے اور قلبی طور پر بھی۔"

"آپ ٹھیک کہتی ہیں ماجدہ! پھر بھی کوئی تو ہے جس کی محبت میرے دل میں ہے۔"

"آپ کو یہاں کا پتہ کس نے دیا ہے؟"

"یہ بس کسی نہ کسی طرح مل ہی گیا۔ میں آپ کے بارے میں بہت فکر مند تھا ماجدہ۔"

"جب ہی آپ نے لوٹ کر یہ تک نہیں دیکھا کہ آپ کے پیچھے ان تین بے بس عورتوں پر کیا بیتی؟ یہ مردانگی ہے آپ کی!"

"مجھے افسوس ہے مگر میرے بس میں کچھ بھی نہیں تھا۔ ہم خود ایک مصیبت میں پھنس گئے تھے۔"

"جی ہاں! اب ہم آزاد ہو گئی ہیں تو آپ کی وہ مصیبت بھی ختم ہو گئی۔ سنیں جیلانی صاحب! براہ کرم اب آپ کبھی میرے پیچھے نہیں آئیں گے۔ میں آپ کو خوش آمدید نہ کہہ سکوں گی آپ چاہیں ناراض ہوں یا راضی میرا آپ کا حساب ختم ہو چکا ہے!"

"آپ ٹھیک کہتی ہیں مجھے یہاں واقعی نہیں آنا چاہیے تھا۔"

یہ کہہ کر میں نے پگڑی سر پر رکھی اور سگریٹ سلگا کر اس کے گہرے گہرے کش لیتا ہوا اس عمارت سے باہر آگیا۔ ماجدہ نے مجھ سے سارے ہی تعلق توڑ لیے تھے۔ اس نے مجھے خدا حافظ بھی نہ کہا۔ بس اس کے رگ و پے میں سرایت بیزاری اور نفرت ایک دم اُبل پڑی۔ میں سڑک پر پہنچا تو وہ ٹیکسی والا ابھی تک سامنے کھڑا تھا اور میں بھول ہی گیا تھا کہ اُسے میں نے چوگوٹھ جانے کے لیے ساتھ لیا تھا۔

"چل بھئی! اب تو مجھے سیدھا چوگوٹھ لے چل۔" یہ تو کی طرف سے۔"

وہ بیچارا جہنم کا بندہ انجن کی گرمی میں جھلستا ہوا اسی وقت چوگوٹھ کی طرف چل دیا۔ وہ علاقہ اس کا دیکھا بھالا تھا مجھے راستہ سمجھانے کی ضرورت نہیں پڑی۔

ڈھلوں صاحب کا وہ ہم پر بہت بڑا احسان تھا کہ انہوں نے مجھے ہیلی کاپٹر کو لاہور کے ہوائی اڈے سے اٹھا لے جانے کا مشورہ دیا تھا۔ وہ ان کی دانش مندی اور معاملہ فہمی کا کھلا ثبوت تھا کیونکہ اگر کسی طرح ہم دونوں خود کو بھنڈاریوں کے ساتھ لاہور پولیس کے حوالے کر دیتے تو وہ تو ہمیں دوسرا دن نہ دیکھنے دیتے اور کہہ دیتے کہ جناب یہ تو پولیس مقابلے میں مارے گئے ہیں۔ وہ یہی کرتے۔ مجھے اپنی عقل پر بھی اس روز سے اعتماد نہیں رہا تھا۔ کیونکہ آبی کی مخالفت کے باوجود میں بھائیہ کو مجبور کر کے لاہور ایئرپورٹ پر جا اترا تھا مگر ڈھلوں نے نہ صرف یہ کہ مجھے وہاں سے نکل جانے کا مشورہ دیا بلکہ مجھے یقین ہے کہ انہوں نے انتظامیہ کو بھی کسی نہ کسی طرح ہمارے تعاقب سے باز رکھا تھا ورنہ اگر وہ لوگ سنجیدگی سے ہمارا تعاقب کرتے تو صحرا میں ہمیں پکڑ لینا ناممکن نہیں تھا۔ ایک ہیلی کاپٹر تو انہوں نے وہاں اتار ہی دیا تھا دوسرا بھی پیچھے آسکتا تھا مگر وہ صرف ڈھلوں صاحب کی وجہ سے زیادہ سرگرمی نہ دکھا سکے۔ ورنہ ہم تک پہنچ جانا ان کے لیے کچھ بھی مشکل نہ تھا۔ وہ صحرا کے چپے چپے پر پولیس اور رینجرز کے آدمیوں کو کھڑا کر سکتے تھے۔ اُن کے بس میں کیا نہیں تھا۔

چوگوٹھ پہنچ کر میں نے ڈرائیور کو فارغ کر دیا۔ اس وقت دن ڈھل رہا تھا میں ڈھلوں صاحب کی حویلی کے دروازے پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ چوہدریوں کا چوہدری گھر پر ہی تھا۔ اُن کے ملازم نے میرے بارے میں اندر جا کر اطلاع دی تو ڈھلوں صاحب کا گن مین برکت فوراً ہی گھر سے باہر آگیا۔ وہ مجھ سے بڑے تپاک سے ملا۔ یوں جیسے وہ میرا کوئی بچھڑا ہوا بھائی ہے۔ اس نے اندر جا کر مجھے مہمان خانے کے اسی حصے میں بٹھا دیا جہاں میں پہلے دن ٹھہرا تھا۔ علی زئی مجھے کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔

"وہ تڑاموشے کہاں ہے وہ پشاوری نڈھا۔ میرا پہرے دار؟"

"وہ دفع ہو گیا ہے یہاں سے۔ بڑا فساد مچا اس کے جانے سے۔" برکت نے میرے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کیسا فساد؟ کوئی گولی چل گئی تھی یہاں؟"

"نہیں! وہ ڈھلوں صاحب کی ایک ملازمہ تھی نذیراں۔ وہ اسے بھگا کر لے گیا ہے۔ وہ عورت تھی بھی بہت تیز۔ اب اس کا باپ روتا پھر رہا ہے۔"

"اچھا! ایسا تیز آدمی تھا وہ۔ پکڑا نہیں ڈھلوں صاحب نے اُسے؟" میں نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"وہ علاقہ غیر میں چلا گیا ہے اُدھر خیبر ایجنسی میں ہے۔ جلاتی ہوئی آگ میں مصیبت یہ آپڑی کہ وہ نذیراں ڈھلوں صاحب کے بیس ہزار روپے بھی لے بھاگی۔ بس یہی غصہ ہے انہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ حویلی کی کوئی اور عورت بھی اس نذیراں کے ساتھ ملی ہوئی تھی۔ شک وہ میری بیوی پر کرتے تھے۔ بڑی مشکلوں سے میں نے انہیں یقین دلایا ہے کہ میری بیوی ایسا نہیں کر سکتی۔" برکت نے بڑے دکھی لہجے میں کہا۔

"تمہاری بیوی بھی ادھر ہی کام کرتی ہے؟"

"جی ہاں! وہ بیچاری بھی یہاں ہی رہتی ہے۔ ہم تو ان کے پرانے خادم ہیں صاحب جی!"

اتنے میں ڈھلوں صاحب اندر آگئے وہ مجھ سے بڑی محبت سے ملے، بولے "بڑی عمر ہے آپ کی ہاشم خان! میں آج صبح ہی آپ کو یاد کر رہا تھا۔"

"یہ عمر آپ ہی کی دی ہوئی ہے ڈھلوں صاحب! ورنہ اس روز تو ہم مارے ہی گئے تھے۔"

ڈھلوں صاحب نے برکت کو گھور کر دیکھا، بولے "جا اوئے ان کے لیے شربت لا۔ دیکھ تو گرمی کتنی زیادہ ہو گئی ہے۔"

برکت اسی وقت وہاں سے نکل گیا تو وہ میرے قریب ہی بیٹھ گئے، بولے "آپ نے میرے مشورے پر عمل کر کے بہت اچھا کیا ورنہ وہ آپ کو پکڑ لیتے تو کبھی نہ چھوڑتے۔"

"دو ہیلی کاپٹروں نے ہمارا پیچھا تو کیا تھا۔"

"وہ راڈ کا بچہ اڑ گیا اور پھر معاملہ کچھ فوجی نوعیت اختیار کر گیا تھا۔ پھر بھی میں نے اپنے اثر و رسوخ سے اُن کو فوراً ہی پیغام دلوایا کہ وہ بھائیہ کے ہیلی کاپٹر کو واپس جانے دیں۔ سنا ہے ادھر بھیڑیوں نے حملہ کر دیا تھا پولیس گارد پہ۔"

"جی ہاں! ہم نے وہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔" یہ کہہ کر میں نے تعاقب کے واقعات انہیں تفصیل سے بتا دیے۔

"آپ کی قسمت اچھی تھی ہاشم صاحب! آپ کا اب یہی نام میرے منہ پہ چڑھ گیا ہے بہرحال شکر کریں آپ بچ گئے۔"

ڈھلوں صاحب ہوائی اڈے سے میرے اس بڑے ہی ڈرامائی فرار پر بہت خوش تھے اور انہیں یقین تھا کہ وہ سب کچھ اُن کی درپردہ کوششوں ہی کا نتیجہ تھا کہ ہم صحرا میں اترنے کے بعد اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ بلاشبہ ہماری اس کامیابی کا سہرا ایک حد تک اُن کے سر بھی بندھتا تھا مگر وہ میرے زخم کو فراموش کر بیٹھے تھے۔

"میں بچ تو گیا ہوں مگر میں آسیہ تک پھر بھی نہ پہنچ سکا ڈھلوں صاحب! وہ دھند میں پھر کھو گئی ہے۔ مجھے اس کا کوئی سراغ نہیں

"ہاں! پھر؟"

یہ تو ہونا ہی تھا۔" میں نے اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے کہا۔ دکھ مجھے یہ ہو رہا تھا کہ ڈھلوں صاحب اپنے طور پر اس معاملے کو ختم سمجھ رہے تھے حالانکہ اُن کے پاس اس کا کوئی جواز نہیں تھا۔ انہیں احساس ہونا چاہیے تھا کہ میری آخری ملاقات اُن سے کن حالات میں ہوئی تھی اور اس سے پہلے میں کن اذیتوں سے دوچار تھا۔

میرے لہجے کی کاٹ کو محسوس کرتے ہوئے وہ بولے "ہُوا کیا ہے آخر؟ وہ کہاں ہے اس وقت! میں تو سمجھا تھا کہ آپ اس تک پہنچ چکے ہیں؟"

"بس یہی میری بدنصیبی ہے ڈھلوں صاحب! اب وہ میرے نئے دشمنوں کے ہاتھ آ گئی ہے۔ میرا نصیب پھر سو گیا ہے۔"

"نہیں خان جی! ایسا نہ کہیں۔"

"یہی ہوا ہے ڈھلوں صاحب! یہ دیکھیں یہ بلبیر سنگھ کا رقعہ، یہ اس نے میرے دوست اسلم آبی کو اس وقت دیا تھا جب میں ان سے بیلی کا پیڑے چکا تھا۔"

ڈھلوں صاحب نے وہ رقعہ پڑھا تو حیرت زدہ ہو کر بولے "یہ تو بہت بُرا ہوا ہے خان! آپ کے اندیشے درست معلوم ہوتے ہیں مگر یہ سب ہوا کیسے؟"

میں نے وہ تمام حالات انہیں بلاکم و کاست بتا دیے جواب کی بار آسیہ کو مجھ سے اتنی دُور لے گئے تھے کہ وہاں تک میرا تصوّر بھی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ ڈھلوں صاحب میری باتیں بڑے غور سے سنتے رہے۔ جب میں چپ ہوا تو وہ بولے "ان کا مقصد یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ بھڑک کر سامنے آ جائیں اور اُن سے جا بھڑیں، یہ بہت ہی خطرناک بات ہو گئی ہے اور ہمیں جو اطلاعات ملی ہیں، اُن سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اُن لوگوں نے اپنا منصوبہ ترک نہیں کیا ہے۔ ہم لوگوں کی زندگیاں واقعی خطرے میں ہیں۔"

"یہی تو میں سوچ رہا ہوں ڈھلوں صاحب! میں اتنے سارے لوگوں کے خلاف تنہا کیا کر سکوں گا؟"

"مجھے اس بات کا بھرپور احساس ہے خان! اُس بھنڈاری کے ایک رسالے میں تو انھوں نے صاف لکھا ہے کہ وہ پاکستان میں ہونے والے انتخابات پر گہری نظر رکھے ہوئے ہیں۔ اس کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟"

"مطلب تو صاف ظاہر ہے مگر ایک فہرست میں نے بھی تیار کر رکھی ہے ڈھلوں صاحب! میں وہاں پہنچ گیا تو ان سب کو چن چن کر ماروں گا۔ میں انہیں بھی چین سے نہیں بیٹھنے دوں گا۔ مجھے آسیہ کے لیے اُدھر جانا ہی پڑے گا۔"

"دیکھیں، اگر اُن کے آدمی اِدھر پھرتے ہیں اور یہاں وارداتیں کر سکتے ہیں تو ہم بھی بے خبر نہیں ہیں۔ آپ یہ رات اِدھر ہی گزاریں۔ میں ابھی شہر جاتا ہوں۔ آٹھ نو بجے تک واپس آ جاؤں گا۔ آپ کو میں چند ایسے لوگوں کے پتے لا دوں گا جو امرتسر اور جالندھر میں آپ کے بہت کام آ سکتے ہیں۔ وہ فہرست جو آپ نے تیار کی ہے اس میں چند نام میری طرف سے بھی شامل کر لیں۔ بھنڈاری پارٹی پر ایک وار ہم بھی کریں گے۔" یہ کہہ کر ڈھلوں صاحب نے اپنا طلائی سگریٹ کیس میرے آگے رکھ دیا۔

"یہ تو بہت ہی اچھا ہوگا میرے لیے آپ بہرحال کوئی بندوبست کریں۔ میں کسی خفیہ راستے سے بارڈر کراس کرنا چاہتا ہوں، تاکہ گرفتار سے بچ کر آگے نکل سکوں۔"

"یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ آپ کو ہم کوئی نہ کوئی راستہ ضرور بتائیں گے۔ اسمگلر تو آر پار بڑے اطمینان سے دندناتے پھرتے ہیں۔ آپ کے لیے بھی کوئی راستا نکل ہی آئے گا۔ ہمیں اُقتل الموذی قبل الایذا پر عمل کرنا ہوگا۔"

"ہم اپنے اس اقدام میں حق بجانب ہوں گے ڈھلوں صاحب! انھوں نے آسیہ پر ہاتھ ڈال کر میرے لیے زبردست مصیبت کھڑی کر دی ہے۔" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ڈھلوں صاحب کے چہرے پر تشویش کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔ انہیں اپنی جان کی فکر لگی ہوئی تھی۔ انھیں یقین ہو چکا تھا کہ جن لوگوں کے نام میں نے انہیں بتائے ہیں اُن میں سے کسی نہ کسی کا سر آج کل میں اُتر جائے گا۔ ہندوؤں کے تعصّب سے وہ پوری طرح آگاہ تھے۔

کچھ ہی دیر بعد برکت ایک ملازم سے اٹھوا کر عمدہ قسم کے شربت کی بوتل برف گلاس اور جگ اندر لے آیا۔ میں دوپہر کے کھانے سے بھی اس روز محروم رہ گیا تھا مگر دن ایسے آ گئے تھے کہ بھوک کے بجائے پیاس آدمی کو نڈھال کر دیتی تھی۔ میں کئی گلاس بھر بھر کر پی گیا۔ پیاس جان کا آزار بن گئی تھی۔ ملازم برتن اٹھا کر واپس گیا تو برکت بولا۔

"چوہدری صاحب! وہ نذیر بیگم آ گئی ہے مجرے کے لیے۔ میں نے انھیں اندر بٹھا دیا ہے۔"

"لو بئی! وہ آ گئی ہے۔ یہ تو بہت اچھا ہوا۔ خان آپ کے موج میلے کا بندوبست ہو گیا۔ میرے کچھ مہمان آتے ہیں سرگودھا سے، اُن کے لیے میں نے نذیر بیگم کو بلوایا تھا۔ اس کا گانا سن کر آپ خوش ہو جائیں گے۔"

"دل پر اتنا سارا بوجھ ہو ڈھلوں صاحب تو کوئی بھی شے اچھی نہیں لگتی۔ بہرحال آپ ساتھ ہوں گے تو میں بھی دو گھڑی بیٹھ لوں گا۔"

"ارے اپنا دل اتنا چھوٹا نہ کریں مجھے تو یہ سب کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ اس میں خدا کی کوئی مصلحت ہے کہ یہ پیچ آ پڑا ہے۔ ہو سکتا ہے قدرت آپ سے کوئی بڑا کام لینا چاہتی ہو، ورنہ وہ بھنڈاری اس پیچ میں کبھی نہ پھنستا۔"

"ہاں! ممکن ہے یہی بات ہو۔ بڑے بڑے لوگوں کو پھانسی دینے کے لیے چھوٹے بڑے مقرر کیے جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے مجھ سے بھی خدا کو کوئی ایسا کام لینا منظور ہو۔"

"ایسا نہ کہیں ہاشم صاحب! آپ تو ہمت ہارنے والے آدمی نہیں ہیں یہ باتیں آپ کو زیب نہیں دیتی ہیں۔ بہرحال نذیر بیگم کا اس وقت آنا نیک فال ہے۔ آپ کو دیکھ کر وہ یہی سمجھے گی کہ کسی حیدری خان کے سامنے گا رہی ہے۔" ڈھلوں صاحب نے میری پگڑی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"مجھے اپنا حلیہ بار بار بدلنا پڑتا ہے جناب! ورنہ وہ مجھے پہچان کر کسی بھی جگہ پکڑ کر خراب کر سکتے ہیں۔"

"ہاں یہ تو ہے۔ بہرحال آپ آرام کریں۔ میں کوئی دو تین گھنٹے بعد واپس آ جاؤں گا۔ آپ کا امرتسر جانا بہت ضروری ہو گیا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئے۔ انہیں اسی شام میری خاطر شہر جانا تھا۔ وہ میرے معاملات کو ہمیشہ ہی بہت اہمیت دیتے آ رہے تھے۔ اور یہ میری خوش نصیبی تھی کہ وہ میرا اتنا خیال رکھتے تھے۔ مگر میرے لیے جو مجرا وہ تجویز کر گئے تھے، اس کی سمجھ مجھے نہیں آ رہی تھی۔ میں سمجھا شاید وہ مجھے اس رُخ سے آزمانا چاہتے ہیں۔ جس قسم کی زندگی میں بسر کر رہا تھا وہ ایسی تھی کہ اس میں میانہ روی اختیار کی ہی نہیں جا سکتی تھی۔ وہ آدمی جسے ہر گھڑی کسی انگلی بھر لمبی گولی میں پروئے جانے کا خطرہ لاحق ہو۔ بڑی برق رفتار زندگی گزارتا ہے، اُسے اپنے ہر محفوظ و مامون لمحے کو مسرّتوں سے بھر لینے کا جنون ہوتا ہے۔ شراب اور عورت میں اُسے بے انتہا کشش محسوس ہوتی ہے۔ وہ کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ اُن کے دن رات گولیوں کی تڑوں تڑوں میں گزرتے ہیں تو وہ جب بھی کسی سایۂ دیوار میں بیٹھتا ہے، اپنا سر کسی کے نرم و گداز زانو پر رکھ کر سو رہنے کا متمنی ہوتا ہے۔ میرے بارے میں ڈھلوں صاحب نے بہت سوچا ہوگا۔ مگر وہاں سے اب تک انہیں میرے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا ہوگا۔ ماسوائے اس کے کہ پاگلوں کی طرح اپنے زخموں کی دوا ڈھونڈتا پھرتا تھا۔ میری زندگی کا دوسرا رُخ ابھی تک اُن سے مخفی تھا اور حالت میری یہ تھی کہ میں اب بھی کسی رات سکون کی نیند سوتا تھا تو میرے اندھے گونگے خواب کے پردوں پر اب بھی وہ نور کا پیکر وہ مسند آرا آہستہ آہستہ اترنے لگتی تھی جیسے ٹی وی کی اسکرین پر تصویروں کا نزول ہوتا ہے۔ مگر میں اپنے اس پاگل پن کا کسی سے بھی ذکر نہیں کرتا تھا۔ اپنے ہر ایسے خواب کو میں صبح اٹھتے ہی ذہن سے جھٹک دیتا تھا کیونکہ مجھے مسند آرا کی وہ بے التفاتی اور بے رُخی یاد تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میں اس کے بارے میں سوچتے ہوئے بھی ڈرتا تھا۔ اپنے منہ زور جذبوں کی طغیانی کا مجھے علم تھا۔ میں اگر اپنے اُن خوابوں کے تعاقب میں چل دیتا تو پھر آسیہ کو تو میں زندگی بھر نہ ڈھونڈھ سکتا تھا۔ کوئی اس کا پُرسانِ حال نہ ہوتا اور وہ میرے اور اپنے دشمنوں کی جلائی ہوئی آگ میں گر کر بھسم ہو جاتی۔ میرے اور اس کے درمیان مسند آرا حائل ہو سکتی تھی مگر میں نے اُسے ہمیشہ اپنے دھیان کی سیڑھیوں سے نیچے گرا دیا تھا کیونکہ وہ مجھے میری منزل سے بھٹکا سکتی تھی۔ وہ میری گمرہی کا سبب بن سکتی تھی اور حاصل مجھے کیا ہوتا، کچھ بھی نہیں۔ کیونکہ اُس کی آخری ملاقات کا تاثر ابھی تک میرے ذہن پر قائم تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے سرداری خانم سے بھی بہت محتاط ہو کر مسند آرا کا ذکر کیا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ میری اس کمزوری سے آگاہ ہو جائے اور سمجھ جائے کہ میں ابھی تک اسی خبط میں مبتلا ہوں۔ وہ کہتی تھی کہ مسند آرا جاگیردارنی بن کر بیٹھی ہے تو یہ بات اس امر کا ثبوت مہیا کرتی تھی کہ مسند آرا نے اب میرے خواب دیکھنے ترک کر دیے ہیں۔ اب اس کے کینوس پر میری کوئی تصویر نہیں ابھرتی تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو سرداری خانم مجھے اس کا پتہ ضرور دیتی۔ کہتی کہ مسند آرا تمہیں نہیں بھول سکتی ہے جیلانی۔ تمہارے اور اُس کے درمیان لاسکی تعلق جو کبھی قائم تھا، ابھی تک باقی ہے۔

ڈھلوں صاحب کے پیچھے برکت بھی باہر نکل گیا تھا۔ میں اٹھ کر غسل خانے میں جا گھسا۔ تپتے موسم نے موسموں کے لیے پانی میں بے انتہا کشش پیدا کر دی تھی۔ میں کتنی دیر تک نل کے نیچے بیٹھا اپنا سر ٹھنڈا کرتا رہا۔ کہ اس میں سارے جہان کی گرمی اور گرد و غبار جمع ہو چکا تھا۔ جب میں نہا کر باہر نکلا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میرے سامنے ایک اونچی لمبی شہتوت کی ٹہنی ایسی لچکتی مٹیار کھڑی تھی۔ وہ سیاہ رنگ کا لاچا اور اسی رنگ کی لیڈی ہملٹن کی قمیص پہنے ہوئے تھی۔ اور اس کا دوپٹہ بھی کالی آنکھ ایسا تھا جس کے نیچے جنگلوں کی سائیں سائیں کرتی رات ایسے لانبے لانبے سیاہ بال یوں کھلے تھے کہ اس کے کندھوں پر بدلی کی طرح چھا گئے تھے۔ اس کا گورا چِٹا دمکتا رنگ، اس کی شربتی آنکھیں، تلوار کے گھاؤ ایسا دہن اور لانبی گردن مجھے مبہوت کر گئی۔ وہ اچانک ہی میرے سامنے آ گئی تھی جیسے تپتے ہوئے صحرا میں چلتے چلتے آدمی ایک دم کسی نخلستان میں جا پہنچے۔

مجھے دیکھ کر وہ بڑی ادا سے مسکرائی، بولی "سلام خان جی میں آپ کے لیے کپڑے لائی ہوں ڈھلوں صاحب نے بھیجے ہیں۔" اس کی آواز میں بڑی نغمگی تھی۔ "یہ لان کا کرتا ہے آرام دے گا۔ اور یہ شلوار بالکل نئی ہے۔" اس نے پلنگ پر سے یہ سب چیزیں اٹھا کر میرے آگے کر دیں۔ اس کا انداز بڑا ہی دلفریب تھا۔ وہ مجھے یوں دیکھ رہی تھی جیسے وہ مجھ سے صدیوں سے آشنا ہے۔

"کیا نام ہے تیرا؟"

"جی میرا نام سمبل ہے۔"

"کیا کرتی ہو تم یہاں؟"

"میں... میں بڑی بی بی کے پاس ہوتی ہوں۔ یہ کپڑے بدل لیں نا آپ! اور میں خوشبو بھی لائی ہوں۔"

"بڑی مہربان ہو رہی ہو۔ پہلی بار دیکھ رہا ہوں تمہیں۔"

"میں ادھر نہیں آیا کرتی۔ اب اُن کا حکم ہوا ہے تو آئی ہوں۔"

اس کی مسکراہٹ بڑی دلفریب تھی۔ اس سے کپڑے لے کر میں ایک بار پھر غسل خانے میں جا گھسا۔ کپڑے بدل کر میں باہر آیا، اور اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا تو وہ بولی۔

"آپ کو پتہ ہے ڈھلوں صاحب نے مجھے آپ کے پاس کیوں بھیجا ہے؟"

"مجھے کیا معلوم! خدا کی باتیں خدا جانتا ہے اور ڈھلوں صاحب کی خود ڈھلوں صاحب۔"

"وہ کہتے تھے کہ آپ بہت تھکے ہوئے ہیں۔"

میں نے سگریٹ منہ سے لگا لیا۔ اس نے بڑے سلیقے سے آگے بڑھ کر تیلی جلا کر اسے سلگا دیا۔ اسے دیکھ کر آدمی کا دماغ خواہ مخواہ خراب ہونے لگتا تھا۔ پتہ نہیں وہ کس گھر کا چراغ تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے فطرت نے اسے بڑی فیاضی سے نسائیت کا ہر ہتھیار مہیا کر دیا تھا مگر اتنی زیادہ مسلح ہونے کے باوجود وہ تیسری دنیا کے بے بس دبے کچلے ملکوں ایسی بن کر رہ گئی تھی محکوم و معمول ــ وہ ہمیشہ ڈھلوں صاحب ایسی سپر پاور کے ہی زیرِ نگیں رہی ہوگی۔ اسے وہ عروج، وہ اختیار وہ کُن کی طاقت کبھی حاصل نہ ہو سکی ہوگی جس کی وہ ہر لحاظ سے اہل تھی۔ وہ دلوں پر حکومت کرنے کے لیے پیدا ہوئی تھی مگر اس پر دالوں کی حکومت تھی۔ کسی ایسے ہی وسیلے سے وہ وہاں آ پہنچی تھی کہ وہ ابھی تک ڈھلوں صاحب کے حکم کی پابند تھی۔

مجھے گہری سوچوں میں غرق دیکھ کر وہ بولی۔ "آپ کیا کرتے ہیں؟ سنا ہے آپ کا نشانہ بہت تیز ہے۔"

"میں... میں نالائی کرتا ہوں کھیتوں کی میرا یہی کام ہے۔"

وہ میری یہ بات سن کر ہنسی ــ ہائے اس کے وہ سچے موتیوں ایسے چمکدار صاف شفاف دانت اور اس کی ہنسی کی وہ مترنم کھنک اُسے بات کرنے کا سلیقہ آتا تھا۔ اور مجھے یقین تھا کہ وہ سب کچھ اس نے کسی مدرسے میں نہیں سیکھا تھا۔ اس کی تہذیب و تربیت فطرت خود بخود کرتی چلی آئی تھی۔

چند لمحے بعد وہ بولی۔ "آج یہاں مجرا ہے دکا۔ نذیر بیگم آئی ہے لاہور سے۔"

"کیسی ہے وہ۔ تم نے دیکھی ہے؟"

"ہاں! بڑی خوبصورت ہے۔"

"کتنی خوبصورت ہوگی وہ تمہارے خیال میں؟"

"پتہ نہیں! پر اسے دیکھ کر بھی دیکھتے رہنے کو جی چاہتا ہے۔"

"پھر بھی کیسی ہے وہ؟"

"وہ... وہ سُلفے کی لاٹ ایسی ہے بہت سج بن کر آئی ہے۔ آپ مجھے کوئی خدمت بتائیں۔"

"مشکل ہے بی بی! تم جاؤ اور اس برکت کو ادھر بھیج دو۔ میں نے سنا ہے کہ عورتوں کی صحبت میں آدمی بیٹھے تو اس کے کان دُکھنے لگتے ہیں اور مجھے نیند آ رہی ہے۔ بہتر ہے تم چھٹی کرو۔ میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔"

یہ کہہ کر میں برآمدے میں جا ٹھیرا۔ میری چھٹی حس مجھے خبردار کر رہی تھی کہ اس عورت کو میری آزمائش بنا کر بھیجا گیا ہے۔ ڈھلوں صاحب میرے کردار کا یہ رُخ دیکھنے کے متمنی ہیں۔ وہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ میری قیمت کیا ہے۔ ایک عورت، ایک کروڑ روپیہ یا ایک جان کا نذرانہ۔ پتہ نہیں انہیں مجھے اس آزمائش میں ڈالنے کا خیال کس طرح آیا۔ میں کچھ بھی نہ سمجھ سکا مگر اندر سے میں لرزنے لگا تھا۔ وہ ہمرنگِ زمیں دام مجھے کسی نئے چکر میں ڈال سکتا تھا۔ سمبل مایوس سی ہو کر کمرے سے نکلی اور چپ چاپ واپس چلی گئی۔

اسے وہاں سے نکلے کوئی پندرہ ہی منٹ گزرے تھے کہ برکت تیز تیز قدم اٹھاتا میرے پاس آ پہنچا۔ بولا۔ "خان جی! وہ... وہ سمبل سے کیا کہہ دیا آپ نے۔ وہ تو بری طرح رو رہی ہے۔ کچھ بتاتی ہی نہیں ہے۔ بڑی مشکلوں سے میں نے اسے ادھر آنے دیا تھا۔"

"کیوں بھیجا تھا تم نے میرے پاس اسے؟ کیا کام تھا اسے مجھ سے؟"

"وہ جی... آپ بھی بہت بھولے بادشاہ ہیں خان جی! کچھ بتایا نہیں آپ کو اس نے؟"

"نہیں! وہ بس ایسے ہی بہکی بہکی باتیں کر رہی تھی۔ میں نے کہا جا بی بی میں اس گاڑی کا بیل نہیں ہوں اور وہ چلی گئی۔"

"خان جی! یہ عورت جو ہوتی ہے نا! اُلٹی کھوپڑی کی ہوتی ہے یہ سمبل خود کئی بار مجھے کہہ چکی تھی کہ میں اسے آپ سے ملواؤں۔"

"مگر کیوں! میں تو اسے جانتا بھی نہیں۔"

"دلوں کے بھید تو خدا جانتا ہے خان جی! پر اس نے آپ کو آج دیکھ لیا تھا، اسی وقت سے ہی وہ آپ سے ملنے کے لیے بے چین تھی۔"

"اچھا! مگر برکت بھائی! وہ ڈھلوں صاحب کی منظورِ نظر ہے، کیوں ذلیل کرواتے ہو مجھے ان سے؟"

"نہیں جی! وہ بڑی بی بی کی حفاظت میں ہے، انہی کی خدمت کرتی ہے اور ڈھلوں صاحب کے لیے وہ بالکل غیر ہے۔ نہیں نہیں، مجھے معلوم ہے وہ بہت بھولی لڑکی ہے خان جی۔"

"کمال کرتے ہو یار! وہ کچھ بھی ہو مجھے اس سے کیا واسطہ!"

برکت کچھ سٹپٹا سا گیا۔ بولا۔ "وہ کہتی تھی یہ لڑکی سمبل جو ہے نا قصور کے قریب تارہ پور کے ایک مزارع کی بیٹی ہے۔ اس نے دسویں جماعت پاس کی تو اس کا باپ مر گیا۔ ماں پہلے ہی مر چکی تھی۔ پہلے یہ کسی اور گھر میں تھی۔ اب ادھر بڑی بی بی کے پاس ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ اب آپ کو پسند کرتی ہے۔ وہ خود ضد کر کے ادھر آئی تھی۔"

"ہوں! مگر وہ بڑی غلط باتیں کرتی ہے یار!"

"وہ ایسے ہی آپ کو آزما رہی ہوگی۔ ورنہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔"

"یہاں آنے سے پہلے اس نے کسی اور گھر میں بھی کام کیا ہے؟"

"ہاں! وہ حشمت رانی کے گھر میں کام کرتی تھی۔ وہ جیا بگا کی زمیندارنی ہے۔ اسی کی سفارش پر ڈھلوں صاحب نے اسے یہاں رکھ لیا تھا۔"

"اچھا ٹھیک ہے! مگر برکت میں خواہ مخواہ ذلیل ہو گیا۔ یار وہ بڑی بی بی اور ڈھلوں صاحب اور حویلی کے اتنے سارے لوگ کیا سوچیں گے؟ کیسی پاگل لڑکی ہے یہ!"

"کسی کو کچھ معلوم نہیں ہے خان جی! وہ خود ادھر آئی تھی۔ وہ بڑی ہی دُکھی لڑکی ہے اس کو تسلی تو دے دیں۔ وہ اچانک ہی آپ پر ریجھ گئی ہے۔"

"پر وہ مجھ سے ایسی انٹ شنٹ باتیں کیوں کرتی تھی؟ کہتی تھی مجھے ڈھلوں صاحب نے بھیجا ہے۔"

"ڈھلوں اسے کیوں بھیجتے؟ بہرحال شام کو کھانا لے کر وہی آپ کے پاس آئے گی۔ آپ اس سے نرمی سے بات کریں۔ وہ بہت ہی آزردہ ہو رہی ہے۔"

"اچھا بھائی! میں یہ بھی کر دیکھوں گا مگر یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی ہے۔"

"کوئی چکر والا معاملہ نہیں ہے خان! لڑکی الھڑ ہے بس۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔

میری سوچ کے تانے بانے الجھ سے گئے تھے۔ اس لڑکی کو میں سمجھ نہیں سکا تھا۔ وہ کسی کو بتلائے بغیر بھی میرے پاس چھپ چھپا کر آ سکتی تھی۔ اسے اتنا سارا فتور مچانے کی کیا ضرورت تھی۔ مرد کے دل اور دروازے پر تو کوئی بھی عورت بے دھڑک دستک دے سکتی ہے۔ اسے تو ہر جگہ داخلہ مل سکتا ہے۔ کون ہے جو سمبل ایسی لڑکی کو دھتکار دے۔ وہ مجھے اس رنگ میں نہ ملتی تو شاید میں اس کی ساری ہی باتیں مان لیتا۔ شام آہستہ آہستہ حویلی پر اتر رہی تھی۔ میں اپنی فطری ضرورت کے لیے غسل خانے میں داخل ہوا تو مجھے اپنے اتارے ہوئے کپڑے آڑے ترچھے ٹنگے نظر آئے۔ میں ان کو سیدھا کر کے باہر لانے لگا تو مجھے معلوم ہوا کہ کچھ کھلے نوٹ اس کرتے کی جیب میں رہ گئے تھے جسے میں نے اتار دیا تھا۔ وہ نوٹ میں نے کرتے میں سے نکالے تو اچانک مجھے یاد آیا کہ بلبیر سنگھ کا رقعہ بھی میں نے کچھ دیر پہلے کرتے کی جیب میں رکھا تھا۔ ڈھلوں کو پڑھا دینے کے بعد مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ وہ رقعہ میں نے اسی جیب میں ڈالا تھا۔ مگر اب وہ اس میں نہیں تھا۔ میں نے اسے وہاں سے غائب دیکھا تو پریشان ہو کر نئے کرتے کی جیبیں بھی دیکھ لیں مگر وہ ان میں بھی نہیں تھا۔ شلوار میں اندر کی طرف نیفے کے ساتھ دو جیبیں لگی تھیں وہ نوٹوں سے تو بھری تھیں مگر رقعہ ان میں بھی نہیں تھا۔ میں نے غسلخانے اور کرتے کی ہر شے الٹ پلٹ کر دیکھ لی مگر وہ رقعہ کہیں بھی موجود نہیں تھا۔ یہ بڑی ہی اچنبھے کی بات تھی۔ میں سمجھا کہ ہو سکتا ہے وہ رقعہ ڈھلوں صاحب نے بے خیالی میں اپنی جیب میں ڈال لیا ہو۔ رات کو وہ ملیں گے تو میں ان سے معلوم کر لوں گا۔

آٹھ بجے کھانا میرے لیے سمبل نہیں بلکہ برکت خود لے کر آیا۔

"وہ کیوں نہیں آئی بھئی! تم تو کہتے تھے کہ وہ خود کھانا لائے گی۔" میں نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔

"پتہ نہیں کیسی پاگل لڑکی ہے۔ بس نہیں آئی۔ آپ سے کچھ ڈر گئی ہے، کہتی ہے کہ آپ بہت جنگلی ہیں۔"

اچھا! یعنی یہ خطاب بھی ہمیں ملنا تھا۔ یار بڑی تیز لڑکی ہے یہ۔ کتنی عمر ہوگی اس کی؟"

"وہ تو اٹھارہ سال بتاتی ہے ویسے لگتی زیادہ عمر کی ہے۔"

"کب سے رہ رہی ہے یہ یہاں؟"

"وہ دس دن پہلے ادھر آئی تھی۔ کام کاج میں بہت ہوشیار ہے۔ بڑی بی بی تو اس کا نام لے کر جیتی ہے۔" یہ کہہ کر برکت نے کھانا میرے سامنے کھول دیا، بولا۔ "یہ جو فرنی ہے نا یہ اسی نے پکائی ہے کہتی تھی اس جنگلی کو بتا دینا۔ میں معافی چاہتا ہوں خان جی۔ یہ اس کا اور آپ کا معاملہ ہے۔"

میں سٹپٹا کر رہ گیا۔ "یار خواہ مخواہ فساد میں نہ ڈال دینا۔ ان عورتوں سے بہت ڈر لگتا ہے مجھے۔"

"ہاں جی! وہ جٹ وبخل بھی تو کہہ گیا ہے کہ ـــ

جٹا بھٹ رناں دی دوستی نے کھری جنہاں دی مت
پہلاں ہس ہس لاون یاریاں پچھوں رو کے دیندیاں دس"

برکت نے مجھے یاد دلایا۔

"تو ٹھیک کہتا ہے یار! اور وہ جٹ وبخل بھی تجربے کی بات کہہ گیا ہے۔ پر میں پہلے یہ فرنی تو سیدھی کر لوں۔"

یہ کہہ کر میں نے سب سے پہلے فرنی پر ہاتھ ڈالا۔ میں نے بڑی سی ڈونگی طشتری پر رکھا رومال اٹھایا تو معلوم ہوا کہ فرنی پر بڑے قرینے سے نقرئی ورق لگائے گئے ہیں اور اس ورق کے ایک کونے پر کاغذ کا ایک چھوٹا پرزہ بھی دھرا ہے جس پر لکھا تھا 'جنگلی صاحب کے لیے'، تو یہ قصہ ہے۔ میں نے وہ پرزہ برکت کی

نظروں سے بچا کر الگ رکھ لیا۔ فرنی واقعی مزیدار تھی۔ اس کے دو ایک لقمے منہ میں ڈالنے کے بعد میں رکابی چھوٹی سی میز کے ایک کونے پر رکھنے لگا تو میرا اندازہ غلط ہو گیا۔ شاید میرا ہاتھ ہل گیا تھا۔ رکابی فرش پر گری اور چھناکے سے ٹوٹ گئی۔ فرنی فرش پر بکھری تو برکت بولا۔ "ہت تیرے کی۔ پتہ نہیں کس نیت سے بھیجی تھی اس پاگل نے، خان جی یہ آپ کی قسمت میں نہیں تھی "

"ہاں یار! پر خیر، جو کچھ ہوتا ہے اچھا ہی ہوتا ہے۔ لا میں پہلے اس بھنے ہوئے مرغے سے مذاکرات کرتا ہوں"

برکت نے فرش صاف کیا اور رکابی کا چورا اٹھا کر باہر کوڑے کے ڈرم میں پھینک دیا۔

ڈھلوں صاحب ساڑھے آٹھ بجے واپس آئے اور کھانا کھاتے بغیر میرے کمرے میں آ پہنچے، بولے۔ "آپ کے لیے میں دو اعتباری آدمیوں کے پتے لے آیا ہوں۔ وہ آپ کو امرتسر ہی میں ملیں گے۔ ایک تو بالک رام ہے وہ ادھر گلی ڈبگراں میں رہتا ہے۔ اس نے رتنا میوزک ہال کھول رکھا ہے۔ ایک بالنا تھ ہے۔ وہ ہال بازار میں فوٹو گرافی کی دکان کرتا ہے "۔ یہ کہہ انہوں نے مجھے ایک کاغذ تھما دیا جس پر ان دونوں کے پتے درج تھے۔

"مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

"آپ اُن سے ملیں۔ شناخت تعارف کے لیے اپنا کوئی بھی نام اُسے بتا دیں مگر اپنے ہر فقرے میں سرگباشی ضرور کہیں پہلے پانچ فقروں میں "۔

"وہ کس طرح؟ یہ تو خواہ مخواہ کا ڈرامہ بن جائے گا "

"نہیں۔ ڈرامے کی کیا بات ہے مثلاً آپ اُس کے پاس جائیں تو پوچھیں کہ وہ سرگباشی کیا نام ہے اُن کا بالنا تھ سرگباشی صاحب آپ ہی ہیں۔ وہ جواب دے گا کہ میں تو ابھی جندہ ہوں جو۔ آپ کہیں گے کہ میرا نام سرگباشی کیور داس ہے۔ میں سرگباشی اس شہر میں نووارد ہوں پر کوئی سرگباشی یار بیلی مل ہی نہیں رہا۔ آپ سرگباشی راما ئن داس کو جانتے ہیں۔ وہ جو سرگباشی ترن تارن میں رہتا ہے۔ بس اس طرح آپ اس سے بات کریں گے تو وہ آپ کو شناخت کرے گا "

"یہ تو بہت اچھا نسخہ ہے "

"ہاں! اصل بات اس سے علیحدگی میں کریں بڑا جی دار آدمی ہے وہ۔ اس کا اصلی نام شیر بہادر ہے۔ وہ تلہ گنگ کا رہنے والا ہے"

"اور دوسرا؟ اس سے میں کس طرح بات کروں گا؟"

"دو جمع آٹھ سولہ! ہاں مجھے یہی بتایا گیا ہے۔ اس سے بات کریں تو کہیں کہ شری بالک رام جی آپ ہی ہیں بھگوان کی کرپا سے دو جمع آٹھ سولہ" وہ کہے گا نہیں شری جی دو ضرب آٹھ سولہ ہوتے ہیں۔ آپ کہیں کہ شری بالک جی کبھی تو دو جمع آٹھ سولہ ہو ہی جائیں گے وہ یوں آپ کو شناخت کر لے گا "

"مگر وہ میرے ساتھ تعاون کیوں کریں گے؟"

"وہ اسی لیے وہاں بیٹھے ہیں۔ بالک رام کا اصل نام خوشی محمد ہے"۔

"مگر میں بارڈر کیسے پار کروں گا "

"اس کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔ آپ کو بھارتی پولیس کی وردی کل مل جائے گی وہ پہن کر گھس جائیں اُدھر "

"ہاں یہ ٹھیک رہے گا مگر اُدھر بھی تو رینجرز ہوتے ہیں۔ اُن کی وردیاں مختلف ہوتی ہیں "

"جناب! یہ تو میں یوں ہی کہہ رہا ہوں آپ کو دو تین دن تک پاسپورٹ اور ویزا وغیرہ مل جائے گا۔ آپ ٹرین پر سوار ہو کر جائیں گے۔ نام میں نے آپ کا وہاں عبداللہ خان اور ک زئی لکھوا دیا ہے "

"وہ تو ٹھیک ہے جناب مگر میرا چوکھٹا کون بدلے گا "

"اب کی بار آپ انڈیا پٹھانوں کے لباس میں جائیں گے آپ کی بغل میں بیساکھی ہوگی۔ ہم آپ کے چہرے کی مرمت بھی کر دیں گے "

"اچھا؛ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ منصوبے کی ساری تفصیلات طے کر آئے ہیں "

"ہاں اور یہ رہی فہرست۔ ان لوگوں کو مارنا نہیں ہے۔ زندہ حالت میں اغوا کر کے پاکستان لانا ہے۔ یہ سب کے سب بھنڈاری پارٹی کے چیلے ہیں "

"مگر میں تو آسیہ کے لیے وہاں جاؤں گا "

"وہ کام مقدم رکھیں۔ ساتھ کے ساتھ یہ سلسلہ بھی مکمل کر دیں "

"ڈھلوں صاحب! آپ کے ذرائع سے معلوم نہیں ہو سکتا، کہ آسیہ کو اُن لوگوں نے کہاں پہنچایا ہے؟"

"نہیں، اس کے بارے میں ہمیں کوئی اطلاع نہیں مل رہی ویسے میں اُن کو خبردار کر آیا ہوں وہ دو تین دن تک کوئی نہ کوئی خبر ضرور دیں گے "

"ٹھیک ہے ڈھلوں صاحب ابلبیر سنگھ سے تو میں بہر حال بہت کچھ معلوم کر سکتا ہوں "

"آپ کا اندازہ غلط ہے مجھے یقین نہیں آتا کہ وہ آدمی آغا بلال ہے کیونکہ ریکارڈ سے ثابت ہے کہ وہ ایک پولیس مقابلے میں ڈاکوؤں کی گولی سے مر گیا تھا "

"نہیں ڈھلوں صاحب یہ کس نے بتایا ہے آپ کو؟"

"میں نے اس معاملے پر خاص طور پر معلومات حاصل کی ہیں۔ وہ لوگ مجھے یہی بتاتے ہیں "

"اس بارے میں اب مجھے بلبیر سے براہ راست سوال کرنا پڑے گا"

"اب ان سب باتوں کو الگ رکھیں اور میرے ساتھ اب اُدھر چلیں ہم لوگ مجرا دیکھیں گے "۔ یہ کہہ کر ڈھلوں صاحب مجھے اپنے ساتھ لے کر حویلی کے دوسرے حصے میں جا پہنچے۔

گھاس کے ایک خوبصورت قطعے پر جو چار دیواری کے اندر بنا ہوا تھا، بڑے قرینے سے صوفے اور کرسیاں لگی تھیں۔ جن کے درمیان ایک جانب چاندنی پر سازندوں کے عین بیچ میں نذیر بیگم بیٹھی تھی۔ وہ بلاشبہ حسین عورت تھی۔ ڈھلوں صاحب کو دیکھتے ہی وہ اپنی جگہ سے اُٹھی۔ یوں کہ وہاں سرو سا اُگ آیا۔ اُس نے جھک کر، ڈھلوں صاحب کو یوں آداب کہا جیسے تیز ہوا نے سرو کو ذرا سا جھکا دیا ہو۔ وہ چوڑی دار پاجامہ اور پشواز پہنے ہوئے تھی۔ بال اس کے لمبے تھے۔ اور کمر تک لہرا رہے تھے۔ اُن ساہنوں کو اس نے گردن کے پیچھے موتیے کے ایک ہار سے باندھ رکھا تھا۔ ڈھلوں صاحب مجھے ساتھ لے کر صوفوں کی طرف بڑھے۔ وہاں پانچ آدمی اونچے سفید شملوں والی مغلئی طرز کی پگڑیاں باندھے بیٹھے تھے۔ جیسے وہ خود کو بے وقعت سمجھ کر سب سے اپنے آپ کو چھپا لینے میں مصروف ہوں۔ ڈھلوں صاحب اُن کے قریب پہنچے تو بولے۔ "یہ بھی ہمارے دوست ہیں ہاشم خان! آج ہی آئے ہیں "

اُن سب کے چہروں پر مسکراہٹ سی آئی اور پھر وہ مجھے نظر انداز کر کے ڈھلوں صاحب سے گپ شپ میں لگ گئے۔

کچھ ہی منٹ بعد انہیں سازندوں نے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ نذیر بیگم اپنے فن کے مظاہرے کیلئے اپنی جگہ سے اُٹھ گئی تھی۔ اس نے پنڈلیوں تک گھنگرو باندھ رکھے تھے۔

خدا نے شیر کو ہیبت، لومڑی کو مکاری، صاحب زر کو بخیلی، زرگر کو عیاری اور کنجروں کو عورت عطا نہ کی ہوتی تو وہ سب کے سب بھوکوں مر جاتے۔ سازندے نذیر بیگم کے ہر ہر قدم پر نہال ہوئے جاتے تھے۔ میں نے ہوٹل میں مس ٹڈو دھتی کا ناچ بھی دیکھا تھا۔ میرے لیے وہ بالکل نئی چیز تھی۔ اس میں فن کم تھا عریانیت زیادہ تھی۔ مگر نذیر بیگم کے ہاں فن تھا۔ اُس نے اُٹھ کر گھنگھروؤں کے منہ میں زبان رکھ دی۔ وہ پکار پکار کر کہہ رہے تھے ہمیں دیکھو ہماری تقدیر کو دیکھو ہم کہاں جا پہنچے ہیں۔ پاؤں میں ہیں، پنڈلیوں تک اُٹھے ہیں بہت پستی میں ہیں پھر بھی ہماری رونقیں دیکھو کہ ہم نذیر بیگم کے جنوں خیز بدن کا حصہ بن گئے ہیں۔ نذیر بیگم کا کمال یہ تھا کہ وہ گاتی تھی اور ناچتی بھی تھی۔ نہ اس کا دم پھولتا تھا نہ آواز کا لوچ ٹوٹتا تھا۔ مگر جو غزل اس نے چھیڑی وہ اُسے ناچنے نہیں دیتی تھی۔ وہ قدم لے کر پیچھے ہٹتی تھی تو فضا اس غزل کے ماتمی پیرہن کو دیکھ کر سوگوار ہی ہو جاتی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

قریب موت کھڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ
قضا سے آنکھ لڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ

ڈھلوں صاحب کے مہمان کوئی بڑے ہی صاحب ذوق لوگ تھے۔ وہ اس مطلع پر پھڑک اُٹھے اور انہوں نے اپنے بٹوؤں کے منہ کھول دیے وہ ہر تان پر سو سو کے نوٹ لٹانے لگے۔

پھر اس کے بعد کبھی ہم نہ تم کو روکیں گے
لبوں پہ سانس اڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ

اس شعر پر ڈھلوں صاحب بھی بے قرار ہو گئے۔ ان کی بھی جیب کھل گئی۔ اُن کی آنکھوں میں عجب سی سرمستی در آئی تھی یہی حال اُن کے مہمانوں کا تھا۔

نہیں امید کہ ہم آج کی سحر دیکھیں
یہ رات ہم پہ کڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ

نذیر بیگم کی آواز نے گرد و پیش کو مسحور کر دیا میرے اپنے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئیں۔ ڈھلوں صاحب نے اسے بلا وجہ نہیں بلایا تھا وہ تو تخت طاؤس کی حقدار تھی۔ کسی کی جیب سے کسی ایسی کے لیے پیسہ نکلوا لینا کچھ بھی مشکل نہیں کہ وہ آنکھ ملاتی تھی تو دل کی دیواروں کے اندر کھلبلی مچ جاتی تھی مگر نذیر بیگم نے تو اُن کو رُلا دیا تھا۔ بڑے نوٹ اُن مہمانوں نے اُس پر لٹا دیے۔ پر وہ غزل ایسا طوفان تھا جو ٹھہر ٹھہر کر مڑ مڑ کر حملہ کرتا تھا۔

دم فراق میں جی بھر کے تم کو دیکھ تو لوں
یہ فیصلے کی گھڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ

یہ شعر گا کر وہ پیچھے ہٹی تو رنگ اس کا اپنا بھی زرد ہو رہا تھا، یوں جیسے وہ بھی اپنی آواز سن کر سناٹے میں آ گئی ہو۔ اُن مہمانوں میں سے ایک کا نام جہانگیر تھا اُسے مخاطب کر کے ڈھلوں صاحب بولے

"کیوں جہانگیر صاحب کیا خیال ہے، گا سکتی ہے نا؟"

"کیا کہوں چوہدری میں تو یہ گلا ہی خرید لوں گا ایسی کوئی اس جیسی بھلا کہاں مل سکتی ہے آپ کا انتخاب لاجواب ہے "

"آپ کو قرعہ اندازی کرنی ہوگی ڈھلوں صاحب!" جہانگیر کے ساتھی نے کہا۔ وہ ولایتی سوٹ پہنے ہوئے تھا۔

"اوئے ڈاکٹر جہاں زیب! تو کمال کی بات کرتا ہے یار اس پونے دو گز قد کی قیمت دو ہزار مربعے زمین ہے "۔ ڈھلوں صاحب نے کچا پکا اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔ وہ سب ہنسنے لگے۔

نذیر بیگم نے دو غزلیں اور گائیں وہ ناچنے پر آئی تو کسی کو ہوش ہی نہیں رہا کہ وہ کہاں ہے دو ناچ اُس نے پیش کیے۔ دو طوفان اٹھائے تیسرا جھیلنے کی کسی میں ہمت نہیں تھی۔

میں حیرت زدہ سا ہو کر تھکے تھکے قدموں سے چلتا ڈھلوں صاحب کے ساتھ اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ دنیا کا ایک رنگ یہ بھی تھا۔ کون بدنصیب ہے جو کہتا ہے دنیا بے ثبات ہے، بے رنگ ہے بے نور ہے، فنا ہونے والی ہے۔ نذیر بیگم تو اس ہائے وائے کا واضح بطلان

تھی۔ تب مجھے اچانک ہی بلبیر کا وہ رقعہ یاد آیا جس کے بارے میں میں ڈھلوں صاحب سے پوچھنا بھول گیا تھا۔ انہوں نے میرا سوال سُنا تو بولے۔ "وہ تو ہاشم خان آپ نے جیب میں ڈال لیا تھا۔ میں نے پڑھ کر آپ کو وہ رقعہ واپس کر دیا تھا۔"

"مجھے بھی یہی خیال پڑتا ہے مگر وہ مِل ہی نہیں رہا۔"

"یہیں کہیں ہو گا وہ کہاں جا سکتا ہے کہیں غسل خانے کے اندر باٹ میں تو نہیں گر گیا؟"

"وہاں میں دیکھ چکا ہوں۔"

"ارے تو اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے۔ مِل جائے گا وہ' اچھا خدا حافظ۔" یہ کہہ کر وہ بوجھل بوجھل قدموں سے چلتے مہمان خانے کے صحن سے واپس لوٹ گئے۔

میں بھی جلدی ہی بستر پر لیٹ گیا۔ تازہ ٹھنڈی ہوا کے آر پار گزر کے لیے میں نے کھڑکی کے سامنے کا دروازہ کھلا ہی چھوڑ دیا۔ اگرچہ کمرے میں پنکھا بھی لگا تھا مگر دروازہ بند کرنے سے تازہ ہوا کا گزر ناممکن ہو جاتا میرے لیے ڈھلوں صاحب کی اس قلعہ نما حویلی میں کسی ڈر خطرے کی کوئی وجہ ہی نہیں تھی۔ میں وہاں ہر لحاظ سے محفوظ تھا۔

کچھ ہی دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ کھلے دروازے میں سے مچھر موج در موج اندر آنے لگے ہیں۔ یہ دخل درمعقولات میرے لیے ناقابل برداشت تھا۔ میں نے اُٹھ کر دروازہ اندر سے بند کیا اور پھر گہری نیند میں کھو گیا۔ نذیر بیگم کا فن بڑا ہی سکون پرور ثابت ہوا تھا۔

پتہ نہیں وہ رات کا کون سا پہر تھا کہ میری آنکھ کھل گئی۔ دروازے پر کوئی بڑی احتیاط سے ٹھک ٹھک کر رہا تھا۔ میں ہڑبڑا کر بستر سے اٹھ گیا۔ پستول میں نے سیدھے ہاتھ میں تھام لیا۔ شاید میری آزمائش کی ایک اور گھڑی سر پر آن پہنچی تھی۔

"کون ہے؟"

"میں سمبل ہوں جنگلی صاحب!" ایک دبی گھٹی سرگوشی ایسی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔ سامنے واقعی سمبل کھڑی تھی۔ وہ اب بھی اُسی سیاہ کُرتے لاچے میں ملبوس تھی اور اس کے وجود سے خوشبو کا طوفان اٹھ رہا تھا۔

"کیا بات ہے۔ تم یہاں اس وقت کیا کر رہی ہو؟"

اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ بلکہ میرے پاس سے گزری اور کمرے میں گھس کر میرے پلنگ پر جا بیٹھی۔ "یہ دروازہ بند کر دیں جنگلی صاحب! لیڈیز سے اس طرح بات کرتے ہیں۔"

"تم کہاں کی لیڈی ہو — اور مجھ سے تمھارا کیا واسطہ ہے؟"

"میں نے آپ کے لیے فرنی بھیجی تھی۔" میری کسی بھی بات کا وہ سیدھی طرح جواب نہیں دیتی تھی۔ "بتایا نہیں آپ نے فرنی کھائی تھی آپ نے؟"

"نہیں! وہ رکابی ٹوٹ گئی تھی۔"

"بس یہی آپ کی نالائقی ہے' حالانکہ میں نے خاص طور پر آپ کے لیے بنائی تھی۔"

"یہ کیا بکواس ہے تم یہاں اس وقت کیوں آئی ہو؟"

"میں نے سوچا آپ تنہائی میں ڈرتے ہوں گے۔"

"کیا؟ میں کوئی بچہ ہوں؟"

"لگتا یہی ہے۔"

"تم کیا چاہتی ہو سمبل؟"

"ڈھلوں صاحب نے بتایا ہے کہ امرتسر گئے تھے۔"

"تمہیں کیسے بتا دیا انہوں نے؟ کیا رشتہ ہے تمھارا اُن سے؟"

"وہ بڑی بی بی سے باتیں کر رہے تھے۔ میں نے وہ سن لی تھیں۔ پر یہ آپ اتنے روکھے لہجے میں کیوں بول رہے ہیں مجھ سے؟ میرا آنا ناگوار گزرا ہے آپ کو؟"

"ہاں! میں گیا تھا امرتسر مگر تمہیں کیا دلچسپی ہے اس بات سے؟"

"میں امرتسر میں پیدا ہوئی تھی' وہ میرا اپنا شہر ہے۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے اور مجھے کیوں بتا رہی ہو تم۔ بہتر تم یہاں سے چلی جاؤ۔ مجھے دحشت ہو رہی ہے میرا مغز الٹ گیا تو اچھا نہ ہو گا۔"

میری یہ بات سن کر وہ تڑپ کر اٹھی اور بولی۔ "تمہیں میں اچھی نہیں لگتی۔ میری طرف دیکھو۔" یہ کہہ کر اس نے ایک دم میرا سر اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ یوں کہ اُس کے دونوں ہاتھ میرے کانوں پر تھے۔ اس کا بایاں ہاتھ میرے دائیں کان پر آیا ہی تھا کہ میرے دماغ میں عجیب سی ٹھنڈی ہوا پھیلنے لگی اور اس کے ساتھ ہی میں حواس کھو بیٹھا۔ سمبل کا وجود میری نظروں میں ایک لحظے کے لیے بنا اور پھر معدوم ہونے لگا۔ مجھے کسی بھی بات کا ہوش نہ رہا۔ سب کچھ آناً فاناً ہوا کہ میں کسی طرح بھی اس کا ادراک نہ کر سکا اور پھر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں سب کچھ دیکھ رہا ہوں میری آنکھیں کھلی تھیں مگر مجھے اپنے جسم پر اختیار نہیں رہ گیا تھا۔ میں ہاتھ پیر ہلانے کی سکت کھو بیٹھا۔ ذہن ماؤف نہیں ہوا تھا۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت موجود تھی مگر حالت میری یہ ہو گئی تھی کہ اپنے کے لیے میں انگلی بھی نہیں ہلا سکتا تھا۔ اب میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ سمبل نے ہاتھ میں کوئی چھوٹی سی چوسنی جیسی شے تھام رکھی تھی جو کو کان پر رکھ کر اُس نے دبایا تو اس میں سے کوئی ایسی گیس نکلی جو کی راہ سے دماغ تک پہنچی اور میرے اعصابی نظام کو کرش کر گئی۔ صرف یہی نہیں بلکہ میری قوتِ گویائی بھی سلب ہو گئی تھی۔

سمبل نے مجھے بے بس ہوتے دیکھا تو وہ یوں مسکرائی جیسے

جیتے کو مار لیا ہے۔ اُس نے مجھے فرش پر گرنے دیا۔ میں لڑھکا تو کرسی الٹ گئی جسے اُس نے اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا۔ عین اس وقت مجھے دروازے میں سے ایک آدمی اندر آتا دکھائی دیا۔ اُسے میں پہچانتا تھا اس کا نام مالو تھا اور وہ ڈھلوں صاحب کے خاص ملازموں میں شمار ہوتا تھا۔ علی زئی سے اس کا بڑا گہرا دوستانہ تھا۔ اُسے میں نے اس حویلی میں کئی بار ادھر اُدھر پھرتے دیکھا تھا مگر وہ کسی سے بہت کم بات کیا کرتا تھا۔ وہ دُہرے جثے کا بڑا ہی کڑیل جوان بلی ایسی احتیاط سے اندر آیا اور بولا۔ "یہ تم نے بہت اچھا کیا ہے سمبل۔ میں صندوق لے آؤں؟"

"ہاں جلدی کرو' اس مصطفےٰ کا بڑا صندوق لانا۔"

"میں ابھی لایا۔" یہ کہہ کر مالو تیزی سے باہر نکل گیا۔ سمبل اطمینان سے کرسی پر بیٹھ گئی۔ اُس کے لبوں پر بڑی ہی فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ مالو کوئی دس منٹ بعد ایک ساڑھے چار فٹ لمبا لکڑی کا صندوق اندر لے آیا۔ اس میں کپڑے بھرے ہوئے تھے۔ وہ انھوں نے نکال کر الگ رکھ لیے۔ پھر ان دونوں نے مل کر میرے مُنہ کو کھول کر اس میں رومال ٹھونسا اور اس پر کس کر پٹی باندھ دی۔ وہ پٹی انہوں نے بستر کی چادر پھاڑ کر بنائی تھی۔ اسی چادر سے اُن لوگوں نے کچھ اور ٹکڑے پھاڑے اور میرے ہاتھ پیر باندھ کر مجھے انہوں نے اٹھا کر صندوق کے اندر پہلو کے بل لٹا دیا۔ اس طرح کہ میرے گھٹنے میرے پیٹ کو چھو رہے تھے۔ وہ صندوق ڈھائی فٹ چوڑا تھا جس میں انہوں نے مجھے جبر مُرکر کے یوں ڈال دیا کہ میں کوشش کے باوجود اُس میں ہِل نہیں سکتا تھا۔ میں صندوق میں لیٹا تو تو مالو بولا۔ "ڈھلوں کا کیا کرنا ہے اب؟"

"اُس کو میں نے تہہ خانے میں ڈال دیا ہے کل رات اُسے وہاں سے نکال لیں گے۔"

"یہ ٹھیک رہے گا۔ وہ مصطفےٰ صبح چار بجے یہاں سے تانگے میں جائے گا۔ اس صندوق کے علاوہ اُس کے پاس ایک اٹیچی کیس بھی ہو گا اور بستر بھی۔"

"اسے اسٹیشن تک پہنچنے سے پہلے ہی تم اُس سے پتوکی موڑ پر یہ صندوق لے لو گے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے' پر وہ کار کہاں ملے گی؟"

"وہ پتوکی سے ذرا ادھر کھڑے ہوں گے۔ کار سفید رنگ کی ہے۔ ایل ای پی دو سو اکیاون نمبر ہے اس کا۔ تم صندوق اس کی چھت پر رکھ دینا اور بس۔"

"یہ سب کچھ تم پہلے بھی بتا چکی ہو' یہ بتاؤ کہ صندوق میں ہوا کہاں سے ملے گی اُسے؟"

"یہ دیکھو میں اس میں پہلے ہی سوراخ ڈال چکی ہوں۔" اس نے صندوق کی عقبی دیوار پر ہاتھ مار کر کہا۔ میرا مُنہ اسی طرف تھا وہاں چھوٹے چھوٹے پانچ چھ گول گول سوراخ تھے جو شاید کسی برمے سے ڈالے گئے تھے۔

"اس کا مطلب ہے کہ دن کے وقت تم بہت مصروف رہی ہو۔"

"ہاں! اب اس پر کپڑے ڈال کر صندوق کو تالہ لگا دو۔ مجھے یقین ہے مصطفےٰ اسے نہیں کھولے گا۔ پتوکی موڑ پر ہمارے آدمی یہ صندوق زبردستی اتار لیں گے۔"

مالو نے اس کے کہنے کے مطابق میرے اوپر ڈھیر سارے کپڑے اس طرح ڈال دیے کہ میں اُن میں بالکل چھپ گیا۔ اگر میری ناک کے سامنے صندوق کے تختے میں وہ سوراخ نہ ہوتے تو میں دم گھٹ کے وہیں مر گیا ہوتا۔ مالو نے صندوق کو ایک طرف سے پکڑا اور سمبل نے دوسری طرف سے۔ وہ اسے اٹھا کر مہمان خانے سے پتہ نہیں کہاں لے جا رہے تھے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ مصطفےٰ کون ہے جسے صبح سویرے وہاں سے رخصت ہونا ہے۔

صندوق کو ایک جگہ رکھ کر مالو نے ایک اٹیچی کیس اُٹھا کر اس پر ڈال دیا۔ بولا "بستر بھی بندھا ہوا ہے۔ میں خود اسے چار بجے تانگے میں بٹھا کر اسٹیشن کی طرف لے چلوں گا۔"

"ہاں باقی کام وہ لوگ خود کریں گے' اب تم جاؤ میں بھی اندر جا رہی ہوں۔" یہ کہہ کر سمبل وہاں سے باہر نکل گئی۔ مالو اس کے پیچھے تھا۔ ان کے قدموں کی چاپ دُور ہوتی ہوئی مجھے واضح طور پر سُنائی دے رہی تھی۔ میری جو حالت ہو رہی تھی اس کا اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ یوں لگتا تھا جیسے میرے اعضاء نے میرا حکم ماننے سے انکار کر دیا ہے۔ میں سب کچھ سمجھ رہا تھا دیکھ رہا تھا مگر گیلے آٹے کی طرح میں وہاں بے بس ہو کر بندھا پڑا تھا۔ وہ کیفیت میں کبھی نہیں بھول سکوں گا میرے بدن پر کپڑوں کے انبار نے میری جان الگ گھلا دی تھی — محسوس یہ ہوتا تھا کہ میں نزع کے عالم میں ہوں۔ مجھے ابھی تک وہ سب کچھ خواب ایسا معلوم ہوتا تھا۔ میں نہیں جان سکا تھا کہ اس سمبل کا اصل روپ کیا ہے۔ کیوں اور کس مقصد کے لیے اس نے مجھے یوں بے خبری میں مار گرایا ہے۔ میں تو اسے مدھ ماتی عورت سمجھ رہا تھا، جو پاگل ہو کر کسی بھی گڑھے میں جا گرتی ہے۔

میں نے عالیہ کے ہاتھوں بھی شہ مات کھائی تھی مگر جب اس کی تجوری کے سامنے گرا تو گرتے ہی بے ہوش ہو گیا تھا۔ میری پانچوں اندریاں مفلوج ہو گئی تھیں۔ میں ہر شے سے بے خبر ہو کر بہت سی اذیتوں سے بچ گیا تھا جو احساس کی لَو کے تابندہ ہونے سے آدمی کو ایسی صورت میں سہنا پڑتی ہیں مگر یہاں تو میں سب کچھ دیکھ رہا تھا، سب کچھ سُن رہا تھا۔ ایک بار پھر میں عورت ہی کے ہاتھوں مارا گیا تھا حالانکہ میں نے اس عورت کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ میں

اس کی طرف راغب نہیں ہوا تھا۔ پھر بھی وہ مجھے مار گئی تھی۔ میری ایک لمحے کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر وہ مجھ پر حاوی ہو گئی تھی۔

اُن دونوں کو وہاں سے نکلے کوئی دس منٹ گزرے تھے کہ ڈھلوں صاحب کے گن مین زاہد اور شفیع تیزی سے اس کمرے میں داخل ہوئے جہاں میں سمبل کے تیار کیے ہوئے تابوت میں بند پڑا تھا۔

شفیع کہہ رہا تھا۔ "وہ تو یہاں بھی نہیں ہے یار! اس سمبل سے تیرا عشق میری سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ بڑی بی بی کے کمرے میں ہو گی۔"

"نہیں بھئی! میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں نے اس کے کمرے میں جانے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے وہاں میں گیا تو دیکھا کہ اس کا کمرہ خالی پڑا تھا۔ وہ اپنے بستر میں نہیں تھی۔ میں اس سے ملنے کے لیے بہت بے چین ہو رہا تھا۔ مجھے نیند ہی نہیں آ رہی تھی۔"

"یہ زبردستی کا عشق ہے پیارے! مگر ہو سکتا ہے وہ کسی اور کے کمرے میں سو گئی ہو۔"

"نہیں! اس کی خوشبو بتا رہی تھی کہ وہ ادھر آئی ہے اسی لیے میں تمہیں ساتھ لایا ہوں۔ وہ ضرور ہاشم خان کے پاس ہو گی۔"

"مگر وہ بھی تو نظر نہیں آ رہا ہے!"

"اس کی خوشبو اس کمرے میں بھی پھیلی ہوئی ہے۔" زاہد نے کہا۔ پھر وہ صندوق کو ٹھوکر مار کر بولا۔ "یہ صندوق کس کا ہے بہت وزنی معلوم ہوتا ہے۔"

"یہ مصطفےٰ کا صندوق ہے۔ وہ فارسٹ آفیسر ہے یہاں کا پنکھا خراب ہونے کی وجہ سے وہ دوسرے مہمان خانے میں سویا ہوا ہے۔ صبح چار بجے یہاں سے جائے گا مگر شام کو میں نے اسے دیکھا تھا تو یہ بہت ہلکا تھا۔"

"ہلکا تھا تو اب اتنا بھاری کیسے ہو گیا؟" زاہد کی حیرت بھری آواز سنائی دی۔

"یار مجھے کیا پتہ اس نے اس میں کیا بھر لیا ہے؟" شفیع نے بیزاری سے کہا۔

"کہیں وہ تمہارا فارسٹ آفیسر ڈھلوں صاحب کا مال لے کر تو یہاں سے نہیں جا رہا ہے؟"

"مال؟ کیسا مال؟" شفیع ایکدم چونکتا ہو کر بولا۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں؟ آؤ اسے کھول کر دیکھتے ہیں۔ وہ سریا لا ادھر۔ وہ کونے میں پڑا ہے توڑ دے یہ تالا۔"

"یار کچھ گڑبڑ نہ کرا دینا تم۔" شفیع محتاط ہو کر بولا۔

"گڑبڑ کچھ نہیں ہو گی۔ تو بلاوجہ پریشان نہ ہو۔"

انہوں نے سریے کو تالے میں پھنسا کر جھٹکا جو دیا تو تالا ٹوٹ گیا۔ زاہد نے فوراً ہی ڈھکنا کھول دیا۔ اور کپڑے الگ پھینک کر یوں بولا جیسے اس نے کوئی بھیانک خواب دیکھا ہو۔

"اوئے! یہ تو ہاشم خان صاحب ہیں۔ انہیں کس نے بند کر دیا ادھر، جلدی نکال یار انہیں، ڈھلوں صاحب تو گولی مار دیں گے ہمیں" یہ کہہ کر اس نے شفیع کی مدد سے مجھے صندوق سے نکال کر پلنگ پر ڈال دیا۔ میرے جکڑ بند کھول کر وہ میرے ہاتھ پیر سہلانے لگے۔

"ہاشم صاحب! ہاشم صاحب! یار شفیع! جا ڈھلوں صاحب کو جگا لا۔ یہ تو بہت گڑبڑ کی بات لگتی ہے مجھے۔"

"پہلے انہیں ہوش میں تو لا۔ ٹھہر میں پانی لاتا ہوں۔" یہ کہہ کر شفیع تیزی سے غسل خانے میں جا گھسا اور وہاں سے جگ میں پانی لے کر دوڑتا ہوا میرے پاس پہنچ گیا۔

"خان جی! خان جی! کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ یہ شیر کس نے گرا لیا۔" وہ بڑے ہی متاسف لہجے میں بولا اور پھر اس نے پانی کا جگ میرے منہ پر انڈیل دیا۔ مجھے جھرجھری سی آئی مگر میرے جسم میں سکت پیدا نہیں ہو رہی تھی۔

"اوئے ٹھہر! میں ان کے منہ پر منہ رکھ کر ان کو ہوا دیتا ہوں" یہ کہہ کر زاہد نے میرے کھلے منہ پر اپنی پگڑی کا باریک پلو رکھ کر اپنے منہ سے اس نے زوردار طریقے سے میرے پھیپھڑوں میں ہوا بھری۔ اس کا میرے بدن پر معجزنما اثر ہوا اور مجھے یوں لگا جیسے میرے ہاتھوں کی انگلیاں اور زبان حرکت میں آ رہی ہیں۔ میں نے سر گھما کر نظریں شفیع کے چہرے پر جما دیں۔

"خان جی! یہ کیا ہو گیا ہے آپ کو سرکار! ہم تو بے موت مارے جائیں گے خان جی!" وہ بہت ہی پریشان ہو رہا تھا وہ گن مین تھا۔ اس نے افراتفری میں زاہد کو غسل خانے سے اور پانی لانے بھیجا۔ وہ بھاگ کر پانی کا جگ بھر لایا تو شفیع نے مجھے سہارا دے کر پلنگ پر بٹھاتے ہوئے پانی میرے منہ سے لگا دیا۔ میں غٹاغٹ آدھا جگ پی گیا۔ یوں لگا جیسے میرے جسم سے پانی خشک ہو چکا تھا۔ اس پانی کا یہ اثر ہوا کہ میری طبیعت سنبھلنے لگی۔ اب میرا گلا خشک اور سُن نہیں تھا اور میں اپنی زبان زیادہ آسانی سے ہلا سکتا تھا۔ میں اپنے دونوں ہاتھوں پر زور ڈال کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔ شفیع میرے قریب ہی بیٹھا تھا۔ اپنا ایک ہاتھ اٹھا کر میں نے اس کے کندھے پر رکھ دیا۔

"اب کیا حال ہے خان جی!"

"ٹھیک ہوں۔ ہاں میں ٹھیک ہوں شفیع۔ تم۔۔۔۔ نہ آتے تو میرا قصہ ختم ہو چکا تھا۔" میں نے بڑی مشکلوں سے اپنی قوت گویائی بروئے کار لاتے ہوئے کہا۔ مگر آواز میری یوں نکل رہی تھی جیسے میں کئی سال سے بیمار ہوں اور اب اتنا نحیف و نزار ہو چکا ہوں کہ بات بھی ڈھنگ سے نہیں کر سکتا۔ کوئی پندرہ منٹ اور گزر گئے میرے جسم پر چھایا وہ بے پایاں اضمحلال آہستہ آہستہ

ختم ہو رہا تھا میرے ہاتھ پاؤں سے جان جو نکلی سی نظر آتی تھی، اب لوٹ رہی تھی مگر سانس اب بھی میرے قابو میں نہیں تھا۔

"مجھے دودھ کا ایک گلاس لا دو شفیع! لگتا ہے میرے اندر کچھ بھی باقی نہیں رہا۔"

"دودھ تو میں آپ کے سرہانے رکھ گیا تھا اور ابھی تک وہیں پڑا ہے۔" یہ کہہ کر وہ بھاگتا ہوا میرے کمرے کی طرف گیا۔ جب وہ لوٹا تو اس نے ہاتھ میں دودھ کا بھرا ہاتھ بھر لمبا گلاس اٹھا رکھا تھا۔ وہ میں نے ایک ہی سانس میں حلق سے نیچے اتار لیا۔ وہ بہت ہی گاڑھا اور بہت ہی لذیذ دودھ تھا جس میں شکر میرے مزاج کے مطابق ڈالی گئی تھی۔ پانچ منٹ اور گزر گئے۔ دودھ سے میری طاقت بڑی حد تک بحال ہونے لگی۔ میرا جو سانس میرے قابو میں نہیں تھا اب باقاعدہ ہو رہا تھا۔

"آپ کو ہوا کیا ہے خان جی! اس صندوق میں آپ کو کس نے بند کیا تھا۔"

"بتاتا ہوں شفیع۔ بتاتا ہوں کیا وقت ہوا ہے تیری گھڑی میں؟"

"دو بج رہے ہیں خان جی! پر بات کیا ہے؟ کچھ بتائیں تو سہی!"

"شفیع! ڈھلوں صاحب کی زندگی سخت خطرے میں ہے۔ وہ۔۔۔ وہ سمبل ہم سب کو تباہ کر دے گی۔"

"کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" اس کا منہ حیرت کی فراوانی میں پورا کھل گیا۔ میں نے اس کا گریبان پکڑ کر اسے بستر سے کھینچ لیا۔

"مجھے فوراً اس سمبل کے کمرے تک لے چل۔ وہی مجھے بے ہوش کر کے اس صندوق میں ڈال گئی تھی۔ میں بوٹ پہن لوں، میرا پستول بھی اٹھا دے مجھے۔" یہ کہہ کر میں اسے کھینچتا ہوا اپنے کمرے میں لے گیا۔ میں نے جنوں خیز تیزی سے بوٹ پہنے اور پستول سیدھے ہاتھ میں لے کر ان دونوں کو گھسیٹتا ہوا مہمان خانے کے صحن میں جا نکلا۔

"مجھے فوراً اس کمینی کے کمرے تک لے چل شفیع! ورنہ وہ ڈھلوں صاحب کو مار دے گی۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے خان جی!" شفیع کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

"یہ ہو چکا ہے شفیع! اس حویلی میں کوئی تہہ خانہ بھی ہے؟"

"ہاں ہے تو سہی خان جی! پر میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔"

"مجھے تو سمبل کے کمرے تک لے چلے گا کہ نہیں؟" میں نے اسے پھر گریبان سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"مگر وہ تو زنان خانے میں رہتی ہے۔"

"مجھے وہیں جانا ہے پاگل کے بچے! جلدی کر۔" میں نے اسے پھر اپنی طرف گھسیٹا۔

"چلیں، ڈھلوں صاحب ناراض ہوئے تو میرا کوئی ذمہ نہ ہو گا۔"

"تو بحث نہ کر مجھ سے میرے آگے لگ۔"

میں یہ کہہ کر احاطے سے نکلا تو شفیع تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا آگے چل دیا۔ حویلی کی عقبی عمارت میں پہنچ کر اس نے ایک دروازے کے سامنے کھڑے گن مین سے کہا۔ "کرملی! دروازہ کھول! ہم سمبل کے کمرے تک جائیں گے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے شفیا! آرڈر نہیں ہے۔"

"بک نئیں اوئے یہ ہماری زندگی اور موت کا سوال ہے۔ تو بھی ہمارے ساتھ آ۔" میں نے کرملی پر برستے ہوئے کہا۔

"یہ بہت ضروری ہے کرملی! ڈھلوں صاحب کی زندگی خطرے میں ہے۔" شفیع نے میری کہی ہوئی بات کرملی کو بتا دی۔ اس نے فوراً ہی دروازہ کھول دیا۔ اور رائفل سیدھے ہاتھ میں لے کر ہمارے پیچھے لپکا۔ شفیع مجھے دائیں ہاتھ کی ایک چھوٹی راہداری میں سے گزار کر ایک دروازے کے سامنے لے گیا۔

"سمبل اس کمرے میں ہے۔"

"اس کمرے میں! مگر یہ زاہد یہاں تک کیسے پہنچا تھا؟" میں نے حیران ہو کر دبی آواز میں پوچھا۔

زاہد نے منہ میرے کان کے قریب لا کر کہا۔ "میں دوسرے راستے سے اندر گیا تھا خان جی! مگر اس کا ذکر کسی سے نہ کریں۔"

میں نے دروازے پر دستک دی تو میرے ہاتھ لگنے سے کواڑ فوراً ہی کھل گیا۔ کرملی کے ہاتھ میں ٹارچ تھی۔ وہ اس نے روشن کر کے مجھے کمرے کا اندرونی منظر دکھایا۔ پنکھا چل رہا تھا۔ اور بستر یوں بچھا تھا کہ اس کی چادر پر ایک سلوٹ تک موجود نہیں تھی، اور سمبل کمرے سے غائب تھی۔

"دیکھا! وہ یہاں نہیں ہے۔ مجھے ڈھلوں صاحب کا کمرہ دکھاؤ۔" میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"آخر ہوا کیا ہے خان جی!" کرملی نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔

"چپ رہو! تم سب نکمے ہو۔ مالک برباد ہو رہا ہے اور تمہیں خبر تک نہیں، کہاں ہے ڈھلوں صاحب کا کمرہ؟"

"وہ ادھر ہے۔ بڑی بی بی کے کمرے کے ساتھ والا کمرہ ہے ڈھلوں صاحب کا۔" شفیع نے کہا اور وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر عمارت کے اور زیادہ عقبی حصے میں لے گیا۔ ایک بڑی سی خوبصورت سفید ٹائلوں سے مزین راہداری میں سے گزر کر وہ پھر ایک دروازے پر جا رکا۔ میں نے تیزی سے دروازے کو پیچھے دھکیلا۔ میرا اندازہ

درست تھا۔ڈھلوں صاحب کمرے میں موجود نہیں تھے۔اُن کی شیروانی اور پگڑی کرسی پر پڑی تھیں۔

"حویلی کا تہہ خانہ کدھر ہے؟"

میرا یہ سوال سُن کر کرملی بولا۔"خان جی! اس کی چابی تو ڈھلوں صاحب کے پاس ہوتی ہے۔"

"مجھے چابی نہیں چاہیے مجھے راستہ دکھاؤ اور ڈھلوں صاحب کی زندگی کی دعا مانگو۔" میں نے غرّاتے ہوئے کہا۔

اچانک پہلو کے کمرے سے کسی کی بڑی ہی تحکم آمیز آواز ابھری "یہ کیا ہو رہا ہے ادھر؟ یہ کون بول رہا ہے؟" وہ کسی خاتون کی آواز تھی جو جالی دار دروازے کے پیچھے سے آ رہی تھی۔

"بی بی جی! یہ ہاشم خان ہیں کہتے ہیں ڈھلوں صاحب کی زندگی خطرے میں ہے۔ یہ تہہ خانے میں جانا چاہتے ہیں۔"

"کیا بکتے ہو، چوہدری صاحب تو اپنے کمرے میں سو رہے ہیں۔"

"وہ ادھر نہیں ہیں بہن جی! آپ کا سہاگ خطرے میں ہے، کسی نے ان کو تہہ خانے میں ڈال دیا ہے۔" میں نے اس آواز کے قریب ہو کر کہا۔

"یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔کرملی! یہ لو چابی۔ان سے کہو یہ آگے چلیں، میں بھی آ رہی ہوں۔" یہ کہہ کر اس خاتون نے دروازے میں سے ہاتھ باہر نکالا۔ایک بڑی سی چابی کرملی کو تھما دی۔اور وہ ہم سب کو اپنے ساتھ لے کر آگے بڑھ گیا۔کوئی بیس قدم آگے جا کر وہ ایک چھوٹے سے کمرے میں جا گھسا اور پھر اُس نے اس کمرے کی سامنے کی دیوار کے عین وسط میں دیوار کے ساتھ لٹکتی ایک تصویر کو نیچے اتار دیا۔اس تصویر کے پیچھے ایک چوبی تختہ لگا تھا جس کے عین وسط میں ایک سوراخ بنا ہوا تھا۔کرملی نے اس سوراخ میں چابی ڈال کر گھمائی تو کڑاک ایسی آواز پیدا ہوئی اور اُس کے ساتھ ہی صاف سیدھی دیوار میں خلا پیدا ہو گیا۔یوں جیسے دو کواڑ کھل کر تیزی سے دیواروں میں غائب ہو گئے ہوں۔کرملی نے کمرے کی بتیاں داخل ہوتے ہی جلا دی تھیں۔اُن کی روشنی میں ہمیں دروازے کے سامنے سیڑھی نظر آئی۔اُس کے زینے سیاہ پتھروں کو تراش کر بنائے گئے تھے۔کرملی نے زینے پر پاؤں رکھ کر دائیں ہاتھ کی دیوار میں لگا سوئچ دبا دیا۔جس سے سیڑھی کا تمام ماحول روشن ہو گیا مگر روشنی ہوتے ہی ڈز کی سی آواز پیدا ہوئی اور کرملی کے منہ سے بھیانک چیخ نکل گئی۔کسی نے تہہ خانے میں سے اُس پر گولی چلا دی تھی۔کرملی کے ہاتھ سے رائفل نہیں چھوٹی مگر اُس کا اپنے اوپر جو اختیار تھا وہ اس سے چھن گیا۔وہ تیورا کر سیڑھیوں میں گرا اور پھر لڑھکتا ہوا نیچے چلا گیا۔ہم سب سن سے ہو کر رہ گئے۔

مجھے معلوم تھا کہ اس پر گولی کس نے چلائی ہے۔میں نے شفیع اور زاہد کو پیچھے ہٹا دیا۔سفید چادر میں لپٹی بڑی بی بی اس چھوٹے سے کمرے کے دروازے میں کھڑی تھی۔گولی کی آواز اور کرملی کی بھیانک چیخ سُن کر اس کا رنگ فق ہو گیا۔ان کے بائیں ہاتھ میں ایک ہلکا سا پستول تھا۔وہ انھوں نے مضبوطی سے سیدھے ہاتھ میں تھام لیا۔اپنے اُس بے پناہ تحیر پر قابو پا کر وہ بڑے مضبوط لہجے میں بولیں۔

"مجھے بتائیں ہاشم صاحب! یہ کیا ہو رہا ہے؟" میں نے اپنے مُنہ پر انگلی رکھ کر انہیں خاموش رہنے کے لیے کہا اور پھر ان سب کو راہداری میں لے جا کر میں نے کہا۔

"بی بی جی! وہ سمبل ہے نا! اُس نے ڈھلوں صاحب کو بے ہوش کر کے نیچے تہہ خانے میں ڈال دیا ہے۔وہ انہیں کل رات یہاں سے باہر نکال کر کسی ایسی جگہ پہنچانا چاہتی ہے جس کا مجھے کوئی علم نہیں اس نے مجھے بھی بے ہوش کر کے صندوق میں بند کر دیا تھا۔ وہ آپ کی ملازمہ نہیں، آپ کے کسی جانی دشمن کی بھیجی ہوئی خوفناک عورت ہے۔"

بڑی بی بی نے یہ بات بڑی ہمت اور تحمل سے سُنی، بولیں "پھر تو ہمیں بہت سوچ سمجھ کر کام کرنا ہو گا۔اس کے پاس پستول ہے۔وہ ڈھلوں صاحب کو بھی گولی مار سکتی ہے۔"

"ہاں! یہی تو ڈر ہے مجھے بی بی جی! ڈھلوں صاحب کی زندگی سخت خطرے میں ہے۔"

"ہوں! شفیع جاؤ۔چھ کتے ادھر لے آؤ۔اور اس کتی پر چھوڑ دو۔اس کے پستول میں زیادہ سے زیادہ چھ گولیاں ہوں گی۔"

"نو بھی ہو سکتی ہیں۔" شفیع نے کہا۔

"ٹھیک ہے، تم دس کتے ادھر لے آؤ۔اور چار دوغلی نسل کے لے آنا۔جلدی جاؤ۔آپ سب لوگ ادھر آ جائیں۔"

"وہ کتے کہیں ڈھلوں صاحب کو نقصان نہ پہنچا دیں۔" میں نے اپنے خدشے کو اُن پر ظاہر کر دیا۔

"نہیں! وہ تو اُن پر جان دیتے ہیں۔وہ صرف اس کُتّی سے بات کریں گے۔"

"مگر اس کو تو زندہ پکڑنا چاہیے بی بی جی! وہی بتا سکتی ہے کہ یہ سب کچھ کیوں ہوا ہے۔" اچانک میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا "اوئے زاہد! جا اُس مالو کو پکڑ۔اس سے رائفل چھین کر اسے رسیوں سے باندھ لا۔مجھے یاد ہی نہیں رہا۔"

"وہ کیوں؟ اس کا کیا قصور ہے؟" بڑی بی بی نے پوچھا۔

"وہ بھی اس کے ساتھ ملا ہوا ہے مجھے صندوق میں اسی نے بند کیا تھا۔"

"اُف میرے خدایا! جلدی جا زاہد اور اُن مستوں کو جگا دے

جتنے گن مین ہیں اُن سے اسلحہ چھین لو۔میر بخش کو کہہ کہ مالو جس حال میں بھی ہے اُسے باندھ کر یہاں لے آئے۔ہاشم خان! میں کس مُنہ سے تمہارا شکریہ ادا کروں۔"

"نہیں بی بی جی! ابھی نہیں۔خدا سے ڈھلوں صاحب کی زندگی کی دعا مانگیں، وہ بہت بڑے شکنجے میں پھنس گئے ہیں۔"

چند ہی لمحوں بعد شفیع دس خونخوار کتوں کی زنجیریں ہاتھ میں پکڑے وہاں آ پہنچا۔کتے بہت بے چین ہو رہے تھے۔

اُن کو دیکھ کر بڑی بی بی بڑے ہی غضبناک لہجے میں بولیں۔

"ان کو تہہ خانے میں اتار دے شفیع اور اپنی رائفل یہاں رکھ دے۔"

شفیع نے تحیر آمیز نظروں سے بڑی بی بی کو دیکھا۔ اور سب سے پہلے اس نے کندھے پر سے رائفل اتار کر بڑی بی بی کے قدموں میں رکھ دی۔

"اب یہ کتے تہہ خانے میں اتار دے۔" شفیع نے ان کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے پہلے دائیں ہاتھ میں تھامی ہوئی پانچ کتوں کی زنجیریں انہیں تہہ خانے کے پاس لے جا کر کھول دیں۔وہ اس کے اشارے پر گرجتے دھاڑتے ہوئے تہہ خانے میں اتر گئے۔شفیع نے دوسرے پانچ کتوں کو بھی اُن کے پیچھے چھوڑ دیا۔تہہ خانے میں اترتے ہوئے ان کتوں نے کچھ ایسی غضبناک آوازیں نکالیں کہ میرے اپنے حواس گم ہونے لگے۔

میری توقع کے عین مطابق اندر سے یکے بعد دیگرے گولیاں چلنے لگیں۔ایک گولی اور ایک کتے کی بھیانک چیخ۔چھ گولیاں چلیں اور کتوں کی چھ طویل بھیانک چیخیں چاروں طرف پھیل گئیں۔مگر باقی ماندہ چار خونخوار کتوں کی خوفناک یلغار میں اچانک شدت آ گئی اور پھر اُس کے ساتھ ہی کسی عورت کی چیخیں فضا میں دہشت پیدا کرنے لگیں۔

"جائیں ہاشم صاحب! اب نیچے اُتریں اور اُسے زندہ پکڑ لائیں۔جاؤ شفیع تم بھی جاؤ۔" ابھی وہ یہ بات کہہ ہی رہی تھی کہ بارہ دیو ہیکل قسم کے سیاہ پوش جوان چیتے ایسی تیزی سے اُن کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔

"ٹھہریں ہاشم خان یہ بھی آپ کے ساتھ جائیں گے۔صرف چار آدمی نیچے اُتریں۔تم ادھر ہی ٹھہرو۔شفیع جائیں جلدی کریں۔"

میں پستول سیدھا ہاتھ میں لے کر تیزی سے تہہ خانے کی سیڑھیوں میں اُترا۔چار سیاہ پوش میرے پیچھے تھے۔اُن کے ہاتھوں میں ہلکی پھلکی اسٹین گنیں تھیں۔تہہ خانے میں چار کتے سمبل کے گرد موت کا ناچ ناچ رہے تھے۔انہوں نے سمبل کا لاچا نوچ لیا تھا اور اس کا کرتا جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا۔اُس کی ٹانگیں بھی لہولہان ہو رہی تھیں۔اور بازو بھی۔مگر وہ دونوں ہاتھوں میں خنجر لیے اُن پر دیوانہ وار حملہ کر رہی تھی۔اس کی ہمت اور استقلال نے مجھے حیران کر دیا۔ہمیں سامنے دیکھتے ہی وہ پیچھے ہٹی اور اوندھے منہ پڑے ڈھلوں کے سر پر جا کھڑی ہوئی مگر ایک کتے نے اچھل کر اس کی گردن منہ میں کچھ یوں دبائی کہ وہ اُسے ڈھلوں صاحب کے قریب سے کھینچ کر ہمارے پاس لے آیا۔میں نے بھاگ کر سمبل کے جھولتے ہوئے ہاتھ پکڑ کر مروڑ دیے۔شفیع نے کتوں کو چمکار دیا تھا اور وہ سمبل کی گردن اور ٹانگ سے دانت ہٹا کر پیچھے ٹھہر گئے تھے۔

سمبل کے ہاتھوں سے دونوں خنجر نیچے گرے تو وہ بھی جھولنے لگی۔اس کی حالت بہت ہی ناگفتہ بہ ہو چکی تھی اور چھ کتوں کی۔ڈھلوں صاحب کے چھ جاں نثاروں کی لاشیں ہمارے اردگرد یوں بکھری تھیں، جیسے میدانِ جنگ میں سپاہیوں نے مادرِ وطن پر اپنے لہو کی اشرفیاں بے دریغ لٹا دی ہوں۔

اتنا سارا خون بہہ جانے کے باوجود سمبل ابھی ہوش میں تھی۔میں نے اس کے لہولہان بازو کمر کے پیچھے مروڑ کر اس کو آگے دھکیلا تو اُس نے اپنے حواس مجتمع کر کے سر اونچا کر لیا اور پھنکارتے ہوئے لہجے میں دانت پیس کر بولی "تو پھر بچ گیا ہے جیلانی مگر اگلی بار ایسا نہیں ہو گا۔"

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔اُس کے بازوؤں کو اور زیادہ مروڑتے ہوئے میں اس کو سیڑھی تک لے گیا۔اور پھر اُسے قدم قدم چلاتا آگے بڑھنے لگا مگر تیسرے زینے پر پہنچنے سے پہلے ہی اس کی ہمت دم توڑ گئی۔وہ بے ہوش ہو کر میرے اوپر گری تو میں نے اُسے باہوں میں بھر کر اوپر اٹھا لیا۔جب میں تہہ خانے سے نکلا تو وہ سیاہ پوش ڈھلوں صاحب کو لے کر میرے پیچھے آ رہے تھے۔وہ بالکل بے سُدھ ہو چکے تھے۔یوں لگتا تھا جیسے اب وہ کبھی ہوش میں نہیں آئیں گے۔اُن کو دیکھتے ہی بڑی بی بی نے سمبل پر سے توجہ ہٹا لی۔اور بولیں "شفیع ان کو کمرے میں لے جا کر ڈاکٹر جہاں زیب کو بُلا لو۔اِس کو بھی اس کے سامنے رکھو۔" انہوں نے سمبل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

سیاہ پوشوں نے اُن کو اُٹھایا اور تیزی سے راہداری عبور کرنے لگے۔بڑی بی بی عجیب سے آفاقی استقلال سے میرے ساتھ کھڑی تھیں۔بولیں "اِن زخمی کتوں کو لے جا کر ادھر باندھ دے شفیع اور گورے سے کہہ ان کا علاج کرے۔"

شفیع تہہ خانے کی طرف بڑھا مگر پھر رُک گیا۔

"وہ کرملی بی بی جی؟"

"ہاں اُسے کیوں باہر نہیں لائے ہو؟" وہ کڑک کر بولیں۔

"جاؤ اس کو تو دیکھو پہلے۔"

دو سیاہ پوش شفیع کے ساتھ اسی وقت تہہ خانے میں اُترے

گئے۔ وہ کرملی کو اُوپر تو لے آئے مگر وہ تو وہاں تھا ہی نہیں سمبل کی گولی سیدھی اس کے دل میں جا دھنسی تھی اور اس نے گولی لگتے ہی دم توڑ دیا تھا۔ اس کی موت پر شفیع کی آنکھیں بہہ نکلیں۔ بڑی بی بی نے ایک نظر اس پر ڈالی تو ان کے دل میں بھی کھلبلی سی مچ گئی مگر وہ اپنے اضطراب کو ظاہر کیے بغیر بولیں۔ " ہم اس کی جان نثاری کو کبھی نہیں بھول سکیں گے۔ اسے اُدھر لے جا کر اس کے کمرے میں ڈال دو۔"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے اس کمرے کی طرف بڑھیں جس کمرے میں اُن لوگوں نے ڈھلوں صاحب اور سمبل کو پہنچا دیا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد ڈاکٹر جہاں زیب اپنا چھوٹا سا ڈبہ لے کر وہاں آ گیا۔ وہ سب لوگ اندر چلے گئے تو میں نے شفیع سے کہا۔" وہ مالو کہاں ہے؟ زاہد ابھی تک واپس نہیں آیا۔"

ابھی میں یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ زاہد بھاگتا ہوا ہمارے پاس آیا۔ بولا۔" خان جی مالو تو حویلی میں نہیں ہے۔ ہم نے کونا کونا چھان مارا ہے"۔

" دیکھا! میں پہلے ہی سمجھ چکا تھا۔ اُسے ڈھونڈو زاہد! وہ ہاتھ سے نکل گیا تو ہمیں کوئی بڑا نقصان پہنچا سکتا ہے۔"

" میں نے مستوں سے کہہ دیا ہے کہ وہ مالو کو ہر قیمت پر ڈھونڈیں۔"

" یہ مست کون ہیں؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

" یہ سیاہ پوش جو ہیں نا خان جی! ان کو ڈھلوں صاحب مست کہتے ہیں۔"

" ہوں! اور وہ مصطفےٰ کس وقت جا رہا ہے؟"

" وہ چار بجے جائے گا۔ مگر اس کا کیوں پوچھ رہے ہیں آپ؟"

" وہ کس کے تانگے میں جائے گا؟"

" وہ روشن دین کا تانگہ ہے۔ اب تو وہ آ چکا ہو گا۔ باہر پھاٹک پر کھڑا ہو گا۔" شفیع نے گھڑی پر نظر ڈال کر کہا۔

" ٹھیک ہے، اپنے چار مستوں کو میرے ساتھ کر دے شفیع۔ ابھی مجھے اس سمبل کے ساتھیوں سے بھی نمٹنا ہے۔"

" وہ کیسے؟ کون لوگ ہیں وہ؟"

" مجھے نہیں پتہ وہ کون ہے۔ وہ اس صندوق کو لینے کے لیے پتو کی موڑ پر کھڑے ہوں گے سفید کار میں۔ مالو یہ صندوق انہی کو دینا چاہتا تھا۔"

" اچھا! حد ہو گئی۔ چلیں میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔" فیض! اپنے تین آدمی لے کر میرے پیچھے آ جا۔ میں جیپ نکالتا ہوں خان جی! پتہ نہیں یہ اندھیر مچ رہا ہے۔" یہ کہہ کر شفیع تیزی سے دوسری طرف جانے لگا۔ فیض نے تین دُوسرے سیاہ پوشوں کو اشارہ کیا اور وہ میرے ساتھ ساتھ حویلی کے زنان خانے سے نکل کر پھاٹک کی طرف چل دیے۔

کچھ ہی دیر بعد شفیع نے بڑی رازداری سے مصطفےٰ کا سامان کمرے سے اٹھوا کر تانگے میں رکھوا دیا۔ وہ کوئی ادھیڑ عمر کا فارسٹ رینجر تھا جس کو ڈھلوں صاحب نے اپنی میزبانی کا اعزاز اس لیے بخشا تھا کہ جنگل کے وسیع رقبے کی لکڑی کی دولت پر ان کا قبضہ و تصرف سرکاری عملداری کے باوجود قائم رہے۔ وہ اسی طرح مختلف محکموں کے عہدیداروں کو اپنی مٹھی میں رکھتے تھے۔ اور اس سے ان کو ہزار فائدے حاصل ہوتے تھے۔

تانگہ جوگوٹھ سے نکلا تو ہم نے کچھ فاصلہ بیچ میں رکھ کر جیپ اس کے پیچھے ڈال دی۔ اس طرح کہ اس کی اگلی پچھلی بتّیاں بجھی ہوئی تھیں اور رفتار اتنی مدھم تھی کہ اس کی آواز زیادہ دور تک پھیل نہیں سکتی تھی۔

تانگہ پتوکی کی طرف جانے والی سڑک کے موڑ پر پہنچا تو مجھے یہ دیکھ کر حیرت نہیں ہوئی کہ وہ سفید کار وہاں موجود نہیں تھی۔ اسے وہاں ہونا بھی نہیں چاہیے تھا کیونکہ مالو نے انہیں پہلے ہی خبردار کر دیا تھا وہ حویلی کے اندر کے واقعات کی بھنک لیتے ہی وہاں سے باہر نکل گیا تھا۔ تانگہ آگے بڑھا تو ہم نے جیپ حویلی کی طرف موڑ دی۔ شفیع بہت جھلّایا ہوا تھا فیض سے مخاطب ہو کر بولا۔

" اوئے تم اُدھر خواہ مخواہ مکھیاں توڑتے رہتے ہو۔ اتنا راشن پانی کھا جاتے ہو فائدہ کیا ہے تمھارا؟"

" ہم کیا کرتے شفیع صاحب! ہمیں پتہ ہی نہیں چلا۔ ہم تو پردے میں بیٹھتے ہیں حکم ہوتا ہے تو باہر نکلتے ہیں۔" فیض نے اپنی بڑی بڑی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا۔

شفیع کو اس کی یہ ادا پسند نہیں آئی بڑے قہر آلود لہجے میں بولا۔" یہ مونچھیں اب منڈوا ہی دو۔ کوئی فائدہ نہیں اس جعلی عکر کا۔ اوئے تیز چلا اس ماہی کو۔ پتہ نہیں اُدھر کیا ہو جائے۔"

ڈرائیور نے اس کی یہ ڈانٹ سنی تو اس نے جیپ کی رفتار تیز کر دی۔ جب ہم حویلی میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ ڈھلوں صاحب کو ہوش آ چکا ہے مگر سمبل ابھی تک بے سُدھ ہے۔ شفیع مجھے ساتھ لے کر ڈھلوں صاحب کے کمرے میں جا پہنچا۔ وہ اس وقت تکیے کی ٹیک لے کر پلنگ پر لیٹے تھے۔ رنگ اُن کا ہلدی ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔

" آئیں ہاشم خان! آپ نے پھر مجھے خرید لیا ہے۔ میں یہ احسان کیسے اتار سکوں گا۔"

کمرے میں جہانگیر، جہاں زیب اور اُن کے ساتھی بھی موجود تھے اور وہ سب کے سب ہی بڑے کبیدہ خاطر نظر آتے تھے نذیرہ بھی کونے میں بچھی کرسی پر بیٹھی تھی۔ میں نے ڈھلوں صاحب کا ہاتھ پکڑ کر رخسار سے لگا لیا۔" مجھے شرمندہ نہ کیا کریں ڈھلوں صاحب یہ میرا فرض تھا خدا کا شکر ہے آپ کی جان بچ گئی۔ مگر وہ لوگ

نہیں آئے جو مجھے صندوق میں بند کر کے لے جانا چاہتے تھے۔"

ڈھلوں صاحب سنبھل کر اُٹھ بیٹھے۔ اور مجھے اپنے پاس بٹھا کر بولے۔" میں نے مالو کو سمجھنے میں سخت غلطی کی ہے خان جی! مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ بک چکا ہے۔ بہرحال میں نے آدمی بھیج دیے ہیں وہ اس کے گھر کے سب آدمیوں کو ابھی لے آئیں گے۔"

" کہاں کا رہنے والا ہے وہ؟"

" شادی وال کا۔ یہ گاؤں یہاں سے پانچ چھ میل دُور ہے۔"

" سمبل کا کیا حال ہے؟ اس کا علاج بہت ضروری ہے۔ وہی ہمیں بتا سکتی ہے کہ یہ سب کچھ کس کے اشارے پر ہوا ہے۔"

" جہاں زیب نے اسے دیکھا ہے مجھے امید ہے یہ اسے بچا لے گا، کیوں ڈاکٹر؟"

" ہاں! زخم گہرے نہیں ہیں، پھر بھی اُسے سنبھلنے میں کئی دن لگیں گے۔" جہاں زیب نے کہا۔

" اب آپ لوگ آرام کریں۔ میں ہاشم صاحب سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

ڈھلوں صاحب کی یہ بات سن کر وہ سب لوگ اُسی وقت باہر چلے گئے۔

" آخر ہوا کیا تھا ڈھلوں صاحب! مجھے بتائیں تو سہی یہ لڑکی ہے کون؟"

" کیا کہوں ہاشم خان! میں دھوکا کھا گیا۔ اس لڑکی کو یہ مالو ہی لے کر آیا تھا۔ بہت پھٹے حالوں میں تھی یہ۔ کوئی دس بارہ روز پہلے اُسے ساتھ لے کر مالو میرے پاس آیا، کہنے لگا کہ یہ یتیم مسکین لڑکی ہے۔ پہلے اُدھر جیا بگا میں حشمت رانی کے گھر میں کام کرتی تھی۔ مگر وہ اس پر بہت ظلم کرتی تھی۔ آپ اُسے اپنی سرپرستی میں لے لیں۔ مالو پر اعتبار کر کے میں نے اسے یہاں رکھ لیا۔ گھر کے کام کاج میں یہ بہت ہوشیار ثابت ہوئی۔ جوان بھی ہے اور خوبصورت بھی ہے میرے کمرے میں یہ آنے بہانے آ جاتی تھی۔ کل رات بھی یہ میرے کمرے میں تھی۔ آج رات جب میں مجرا دیکھ کر واپس آیا تو یہ پھر میرے کمرے میں آ گئی، بولی۔" ادھر بڑا حبس ہے چوہدری صاحب چلیں اُدھر کھلی فضا میں چلتے ہیں۔ میں تو شاید پاگل ہی ہو چکا تھا۔ اُسے ساتھ لے کر حویلی کے پچھلے باغ میں جا بیٹھا۔ پھر اچانک ہی اس نے میرے کانوں پر ہاتھ رکھ دیے۔ کوئی ٹھنڈی ہوا میرے دماغ میں چڑھی اور میں سمجھا مجھے فالج ہو گیا ہے۔ میں سب کچھ دیکھ اور سن سکتا تھا مگر ہاتھ پاؤں ہلا نہیں سکتا تھا۔ اُس نے مجھے اسی چادر میں لپیٹ کر ڈال دیا۔ پھر مجھے محسوس ہوا کہ کسی مرد نے مجھے باہوں میں اُٹھا لیا ہے وہ لوگ مجھے باغ سے اٹھا کر اس تہہ خانے میں ڈال گئے۔ میں سب کچھ سن رہا تھا۔ سمجھ رہا تھا مگر نہ میں بول سکتا تھا نہ ہل سکتا تھا۔ یہ لڑکی مجھے تہہ خانے میں بند کر کے باہر نکل گئی۔ پھر کچھ ہی دیر بعد یہ لوٹ آئی۔ اس نے میری جیبوں سے ساری چیزیں نکال لیں اور میرے ہاتھ پاؤں رسّی سے جکڑ کر باندھ دیے۔ پھر اس نے میرا منہ کھولا اور اس میں رومال ٹھونس کر ایک بار پھر اس نے میرے منہ پر پٹی باندھ دی۔ اس طرح کہ میری آنکھیں بھی پردے میں آ گئیں۔ ابھی یہ اس کام سے فارغ ہی ہوئی تھی کہ تہہ خانہ کھلنے کی آواز آئی۔ پھر گولی چلی کسی کی چیخ مجھے سنائی دی اور پھر میرے کتے دندناتے ہوئے اندر آ گئے۔ میں تو حیران رہ گیا ہوں ہاشم خان! مجھے یقین ہے کہ یہ سب کچھ ہیرآباد کے رحمت علی کے ایما پر ہوا ہے۔ یہ لڑکی انہی کی بھیجی ہوئی ہے۔"

" ہو سکتا ہے آپ کا خیال صحیح ہو ڈھلوں صاحب! اصل بات تو یہ لڑکی ہی بتا سکتی ہے، وہ ساتھ کے کمرے میں ہے نا؟"

" ہاں! آپ دیکھیں جا کر میں نے دو مستوں کو اس کی نگرانی پر لگا دیا ہے۔" یہ کہہ ڈھلوں صاحب نے اپنا سگریٹ کیس میری طرف بڑھا دیا۔

" میں اُسے دیکھ کر آتا ہوں۔" میں نے سگریٹ سلگا کر وہاں سے اٹھتے ہوئے کہا۔

جب میں دوسرے کمرے میں پہنچا تو سمبل کے بستر کے سامنے بیٹھے دونوں مسلح سیاہ پوش اپنی جگہ سے اُٹھ گئے۔ سمبل کی گردن بازو اور ٹانگیں پٹیوں میں جکڑی ہوئی تھیں اس کے چہرے پر البتہ کوئی خراش نہیں آئی تھی۔ وہ آنکھیں بند کیے لیٹی ہوئی تھی۔ میں نے اس کی نبض پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے کسمسا کر آنکھیں کھول دیں۔ اس کی نبض معمول کے مطابق چل رہی تھی۔ کُرتہ اس کا جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ جسے کسی نے بھی بدلنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ میری نظر اس کے بائیں بازو پر پڑی تو میں حیران رہ گیا۔ وہاں بہت باریک حرفوں میں ساوتری لکھا تھا گودا ہوا تھا۔ میں نے اس کا بازو دیکھ کر چھوڑ دیا اور پھر اس پر گردن تک چادر ڈال دی۔ اس کا چہرہ غصے سے سُرخ ہو گیا تھا مگر وہ اس گھڑی بالکل بے بس تھی کیونکہ ناظر اس کی دونوں ٹانگیں پلنگ کی پٹیوں سے کس کر باندھ چکا تھا۔ اور زخموں نے اس کی حالت بہت ہی ناگفتہ بہ کر رکھی تھی۔

" ہوں، تو تم دراصل ساوتری ہو۔ بڑی خوشی ہوئی تم سے مل کر۔"

میری بات کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مجھے خون آلود نگاہوں سے گھورتی رہی۔

" بولتی کیوں نہیں ہو؟" یہ کہہ کر میں نے تڑاخ سے اُلٹے ہاتھ کا تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا۔ مگر وہ میری اس ضرب کو بھی سہہ گئی۔ منہ سے کچھ نہیں بولی۔ اس کی قوتِ برداشت نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ اس کی آنکھیں یہی کہتی تھیں کہ تم۔۔۔ تم کچھ بھی نہیں ہو۔ میرا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے۔ بلاشبہ وہ یہی کہتی سنائی دیتی تھی۔

"میرے پاس بیٹھ جاؤ جیلانی! تم مجھے اچھے لگتے ہو۔ میرے بدن پر کوئی ایسا زخم نہیں لگا جو مجھے مار دے یا مجھے بدصورت بنا دے۔ بیٹھ جاؤ۔" وہ یوں کہہ رہی تھی جیسے وہ کسی بچے سے مخاطب ہو۔ وہ اپنی شکست تسلیم نہیں کر رہی تھی، کسی بھی قیمت پر نہیں۔

"نہیں، مجھے تمہارے وجود سے نفرت ہے، اور میں دیکھوں گا کہ تم کیسے منہ نہیں کھولتی ہو۔ تمہیں بتانا ہوگا کہ تم نے کن لوگوں کے لیے یہ کام کیا ہے، کون ہیں وہ۔" یہ کہہ کر میں نے اُسے بالوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ دیا۔ میں غصے سے پاگل ہوا جا رہا تھا۔ وہ بڑا شدید جھٹکا تھا۔ کئی بال جڑوں سے اکھڑ گئے۔ ایک گچھا میرے ہاتھوں میں رہ گیا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اس کی بے پناہ قوتِ ارادی ابھی تک غیر متزلزل تھی۔ میں نے اس کا سر تکیے پر پٹخ دیا تو وہ پھر مسکرائی، بولی۔ "یوں نہیں جیلانی! یوں نہیں! میرے زخم اچھے ہو جانے دو۔ پھر مجھ سے بات کرنا، ابھی نہیں۔ میں ابھی کچھ نہ بتا سکوں گی۔"

"کیا کہتی ہے یہ!" ڈھلوں صاحب کی آواز سنائی دی۔ وہ کمرے میں داخل ہو چکے تھے۔ دونوں سیاہ پوش مؤدب ہو کر دیوار کے ساتھ لگ گئے۔

"اوئے اس کے ہاتھ کیوں نہیں باندھے تم نے؟ یہ کسی گوریلے کی اولاد تمہارے ہی ہتھیار سے تمہیں مار دے گی۔"

ناظر نے اسٹین گن الگ رکھ کر فوراً ہی سمبل کے ہاتھ پلنگ کی دونوں پٹیوں سے کس کر باندھ دیے۔ وہ پیچھے ہٹا تو میں یہ دیکھ کر سٹپٹا سا گیا کہ وہ ابھی تک مسکرا رہی ہے۔ جیسے وہ ہماری بے بسی پر ہنس رہی ہو۔ ڈھلوں صاحب بھی اس کی یہ حرکت دیکھ کر سکتے میں آ گئے۔ اُن کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ آ سکتی تھی کہ اس لڑکی نے اپنے گرد اتنا مضبوط حصار تعمیر کر رکھا ہے۔ وہ کسی بھی حملہ آور کو آگے نہیں آنے دیتی تھی۔ اور ہم بہت عجلت میں تھے۔ ہمیں معلوم ہونا چاہیے تھا کہ وہ کہاں سے آئی ہے اور کن کے لیے کام کرتی ہے۔ ہمارے لیے وہ ابھی تک معمہ بنی ہوئی تھی۔

"ہوں! ٹھیک ہے۔ ناظر! اس راغب علی کو ادھر لے آ۔ مگر نہیں یہ پلنگ اٹھا اور اسے اُدھر مستوں کے ڈیرے پر پہنچا دے۔ راغب سے کہہ کہ ہمیں اس کی اصلیت معلوم کر دے۔ لے جاؤ اسے اُدھر۔"

ناظر علی اور اس کے ساتھی نے سمبل کا پلنگ دونوں طرف سے پکڑ کر اٹھایا اور اُسے دروازے میں سے گزار کر باہر نکل گئے۔

"اس کا نام سمبل نہیں ہے ڈھلوں صاحب! یہ ساوتری ہے۔ اس کے بازو پر یہ نام لکھا ہے۔"

"اچھا!" وہ بہت زیادہ حیران نظر آتے تھے۔

"اب مجھے یقین ہو چلا ہے کہ بلبیر سنگھ کا رقعہ بھی میری جیب سے اسی نے نکالا تھا۔"

"ارے! یہ بات تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔ حد ہو گئی۔ یہ کہیں امرتسر سے تو نہیں بھیجی گئی ہے؟"

"مجھے یہی معلوم ہوتا ہے۔ اس کا تعلق انہی لوگوں سے ہے، جب ہم امرتسر میں تھے تو بھنڈاری یا اس کے ساتھیوں نے اسے آپ پر مسلط کر دیا ہوگا۔"

"میں تو پھر بے موت ہی مارا گیا تھا خان جی! اس کُتیا سے پوچھو کہ یہ ہے کون۔ میرا خیال ہے مالو جھوٹ بکتا تھا۔ جیا بگا میں حشمت نام کی بھی کوئی عورت نہ ہوگی۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ یہ لوگ آپ تک آ ہی پہنچے تھے مگر اس کو کارروائی کا حکم آج یا کل ملا ہوگا۔ انہوں نے میرا نام بھی اُسے بتا دیا ہوگا۔ وہ مجھے اور آپ کو امرتسر منگوانا چاہتے ہیں۔"

ڈھلوں صاحب پریشان ہو کر کرسی پر ڈھے گئے اور نیا سگریٹ سلگا کر بولے۔

"یہ تو بہت برا ہوا خان جی! ہمیں سرکاری طور پر اس معاملے کو بھارتی حکومت کے سامنے رکھنا ہوگا۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں مگر مجھے یقین ہے کہ حکومت کو بھی شاید اس کا علم نہ ہو۔ یہ متعصب ہندو فرقہ پرستوں کا منصوبہ ہے جو پاکستان کو ہر طرف سے نقصان پہنچانے پر تلے ہوئے ہیں۔"

"ہوں! یہ ذلیل ابھی دس منٹ میں سب کچھ بک دے گی۔ راغب اس کی بوٹیاں نوچ لے گا۔"

"ہمیں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے، ڈھلوں صاحب آپ کی زندگی سخت خطرے میں ہے۔"

"مجھے احساس ہے، میں اپنے تمام ملازمین کی نئے سرے سے چھان بین کروں گا۔"

"ہو سکتا ہے آپ کے سیاہ پوشوں میں بھی کوئی آدمی بک چکا ہو۔"

میری یہ بات سن کر وہ گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد بولے۔

"میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہوگا، بہرحال میں اس معاملے پر غور کروں گا۔ آئیں ذرا باغ میں چلتے ہیں۔ مجھے یہاں سخت وحشت ہو رہی ہے۔" یہ کہہ کر وہ اٹھے اور مجھے اپنے ساتھ لے کر حویلی کے مردانہ حصے کے وسط میں دور دور تک پھیلے گھاس کے قطعوں پر جا پہنچے۔ رات دم توڑ رہی تھی۔ ستارے ٹمٹما رہے تھے۔ اور اندھیرا پھیکا پڑنے لگا تھا۔ بے خوابی کی وجہ سے ڈھلوں صاحب کی آنکھیں سوجی سوجی سی نظر آتی تھیں۔ میرا بھی یہی حال تھا مگر جس سناٹے میں جس اذیت ناک پیچ میں ہم پھنس چکے تھے۔ اس کا کوئی حل ہماری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ ڈھلوں صاحب نے زندگی بھر ایسا چرکا نہیں کھایا تھا۔ یہی وجہ تھی

کہ ٹھہر ٹھہر کر گہری سوچ میں ڈوب جاتے تھے۔ کہنا کچھ چاہتے تھے مگر کہہ کچھ اور جاتے تھے۔ ان کا ذہنی اضطراب دم بدم بڑھتا جا رہا تھا۔ ہم کوئی آدھ گھنٹے تک گھاس کے قطعوں پر اِدھر اُدھر پھرتے رہے۔ کئی سگریٹ ہم نے پھونک ڈالے مگر ڈھلوں صاحب کا یہ حال تھا کہ اُن کا سارا اعتماد بے کار جا رہا تھا۔ یہ امکان اُن کے پیش نظر تو تھا کہ وہ سب کچھ بھنڈاری جیسے لوگوں کی وجہ ہی سے ہوا ہے میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔ ثبوت صاف سامنے دھرا تھا۔ میری جیب سے اس رقعے کو جس طرح سمبل نے اڑایا تھا۔ اس سے تو صاف ظاہر تھا کہ وہ کن کے لیے کام کر رہی تھی مگر ڈھلوں صاحب کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس سازش کے خلاف اپنا دفاع کیسے کریں۔ یہ بلاشبہ بڑا اہم سوال تھا کیونکہ دشمن چھپ کر گھات میں بیٹھ کر وار کر رہا تھا۔ میرے وجود کا ایک حصہ وہ پہلے ہی کاٹ چکے تھے۔ آسیہ کو کبیر شاہ کے گھر سے اٹھوا کر وہ مجھے مجبور کر رہے تھے کہ میں اپنی بہن کے تعاقب میں بھڑک کر سرحد پار کر جاؤں۔ اور اُن سے جا بھڑوں۔ وہ مجھ سے خدا جانے کس بات کا انتقام لینا چاہتے تھے۔ میں نے ان کا تو کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ یہی حال ڈھلوں صاحب کا تھا۔ انہیں بھی خدا معلوم کس جرم کی سزا دے رہے تھے۔

ابھی ہم باغ ہی میں پھر رہے تھے کہ ناظر بھاگتا ہوا ہمارے پاس آ گیا۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا۔ ڈھلوں صاحب بڑی بے تابی سے ان کی طرف بڑھے۔

"کچھ بتایا اس نے! کیا بتاتی ہے کمینی؟"

"اس نے سب کچھ بتا دیا ہے ڈھلوں صاحب! اس کا نام ساوتری ہے۔ وہ تارہ پور کی رہنے والی نہیں ہے۔ اس کا گھر دینانگر کے پاس سرنا میں ہے۔ گورداسپور ضلع میں۔ مگر خود وہ امرتسر میں رہتی ہے۔ اس کو کوئی بارہ دن پہلے پاکستان بھیجا گیا تھا۔ تاکہ وہ آپ کے گھر کے سارے حالات معلوم کرے اور آپ کو اغوا کر لے۔ وہاں کوئی پرتاپ سنگھ راٹھور نام کا آدمی رہتا ہے۔ ساوتری کو اسی نے بھیجا تھا۔ وہ بھنڈاری کا نام بھی لے رہی تھی۔ اس نے بتایا ہے کہ مالو کو اس نے یہاں آتے ہی رام کر لیا تھا۔ اور وہ اس کے لیے ہر کام کرنے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ اُن کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ آج رات جیلانی صاحب کو اغوا کر کے اٹاری پہنچا دیں گے۔ کل رات آپ کی باری تھی اسی لیے وہ آپ کو تہہ خانے میں ڈال آئی تھی۔ تہہ خانے کا راز اسے مالو ہی نے بتایا تھا۔ اس کی چابی بھی اسے مالو نے ہی مہیا کر دی تھی۔"

"مگر وہ مجھے امرتسر کیوں لے جانا چاہتے تھے؟"

"وہ کہتی ہے کہ ایک ڈھلوں صاحب ہی نہیں، آٹھ آدمی اور بھی ہیں جنہیں وہ یہاں سے اٹھوا لینا چاہتے ہیں۔ اُن کے نام بھی اس نے بتا دیے ہیں۔ یہ دیکھیں یہ ہیں اُن کے نام۔" یہ کہہ کر راغب علی نے ایک کاغذ ڈھلوں صاحب کے آگے پھیلا دیا۔ صبح کی ملگجی سی روشنی کام نہیں دیتی تھی۔ ناظر نے دیا سلائی جلا کر کاغذ پر روشنی ڈالی۔ اس میں جو نام لکھے تھے وہ وہی تھے جو مجھے بتائے گئے تھے۔ البتہ اس میں تین نام اور شامل ہو گئے تھے۔ وہ کاغذ تہہ کر کے ڈھلوں صاحب نے جیب میں ڈال لیا۔ میں نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ "یہ سب کچھ تم نے اس سے کیسے اُگلوا لیا۔ وہ تو بولتی ہی نہیں تھی۔"

راغب نے اپنی بڑی بڑی خوفناک آنکھیں پوری طرح کھول دیں، بولا۔ "میں پتھر سے پانی نچوڑ لیتا ہوں بھائی صاحب! وہ تو شے ہی کچھ نہیں تھی۔ میری مار کوئی نہیں سہہ سکتا ہے۔"

"یہ ٹھیک کہتا ہے خان جی! اس سے میں نے پولیس کی نوکری چھڑوا کر اسے اپنے پاس رکھ لیا ہے۔ ہماری بڑی گتھیاں سلجھائی ہیں اس نے۔"

"راغب علی! ایک لڑکی آسیہ نام کی ساہیوال کے گاؤں ترن تارن سے اغوا ہوئی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بھی اس ساوتری کے ساتھیوں کا کارنامہ ہے۔ اگر اس کے بارے میں تم اس سے پوچھ سکو تو تمہاری بڑی مہربانی ہوگی۔"

"میں یہ بھی پوچھ لیتا ہوں۔ آئیں، اپنے کانوں سے اس کی باتیں سن لیں۔" یہ کہہ کر وہ ہمیں اپنے ساتھ اس حصے میں لے گیا جہاں سیاہ پوش مقیم تھے۔ پانچ چھ کمرے وہاں ایک قطار میں بنے تھے۔ جن کے آگے خاصا کھلا برآمدہ بنا ہوا تھا۔ برآمدے کے سامنے گھاس کا ایک قطعہ تھا ویسا ہی جیسا اس مہمان خانے کے سامنے تھا جس میں وہ لوگ مجھے ٹھہراتے تھے۔ راغب علی نے ہمیں ایک دروازے کے سامنے روکا اور بولا۔ "آپ یہاں ٹھہریں اور اس کھڑکی میں سے اس کی باتیں سن لیں۔" یہ کہہ کر اس نے ایک مسلح مست کو دروازے سے پرے ہٹایا اور خود اندر چلا گیا۔ کواڑ اس نے اپنے پیچھے بند کر دیے۔ مگر وہ جتنی جلدی سے اندر گیا تھا، اتنی ہی تیزی سے باہر آ گیا۔ وہ غضبناک ہو کر دروازے پر کھڑے ہوئے سیاہ پوش پر جھپٹ پڑا اور ... اس کا گریبان پکڑ کر بولا۔

"اسے شیشے کے گلاس میں پانی کس نے دیا تھا؟"

"وہ ... میں نے دیا تھا راغب علی! پیاس سے وہ مری جاتی تھی۔"

اس کی یہ بات سن کر راغب علی نے تڑاخ سے ایک تھپڑ اس کے منہ پر مار کر اسٹین گن اس کے ہاتھ سے جھپٹ لی اور اُسے بڑی ہی گندی گالی دے کر بولا۔

"وہ تیری ماں مر گئی ہے بدمعاش! اس نے شیشے سے اپنے حلق کو کاٹ لیا ہے۔ میں تجھے گولی مار دوں گا چوہڑے!"

وہ بہت زیادہ طیش میں آچکا تھا۔ ڈھلوں صاحب نے آگے بڑھ کر اس سیاہ پوش کو راغب علی کے پنجے سے چھڑایا، بولے "اس کا کیا قصور ہے راغب علی! اس کو یہی کچھ کرنا تھا، اسے چھوڑ دو" یہ کہہ کر وہ کمرے میں جا گھسے۔ میں بھی ان کے پیچھے تھا۔ سادتری بستر پر لہولہان پڑی تھی۔ یوں کہ ایک شیشے کا نوکدار ٹکڑا اس کی گردن میں دھنسا تھا۔ اس کی سانس کی نالی کٹ چکی تھی اور اس کے جسم سے خون ابھی تک یوں بہہ رہا تھا جیسے کوئی ذبح شدہ بکری گردن کے آزار سے آزاد ہو رہی ہو۔ اس کی کھلی آنکھیں یہ کہہ رہی تھیں کہ تم ۔۔۔ تم میرا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے جیلانی کچھ بھی نہیں۔

ڈھلوں صاحب نے چادر کھینچ کر اس کے منہ پر ڈال دی اور مجھے اپنے ساتھ لے کر حویلی کے اس حصے سے باہر نکل آئے۔ ان کے چہرے پر ایسا حزن طاری تھا کہ میں اسے بیان ہی نہیں کر سکتا۔ وہ میرے ساتھ چلتے ہوئے میرے کمرے میں جا پہنچے اور کرسی پر بیٹھ کر بولے "ہاشم خان جی! ایسی بھی عورتیں ہوتی ہیں ؟"

"ہاں! ہوتی ہیں ڈھلوں صاحب! کسی کو پاگل پن کا ٹیکہ لگا دیا جائے تو وہ ایسے ہی کام سرانجام دیتا ہے۔ اسے بھی کوئی لمبا سا لالچ دیا ہوگا۔ کاش! میں اس کے ماں باپ تک پہنچ سکتا۔"

"خان جی! مجھے یہ معاملہ پولیس اور حکومت کے علم میں لانا ہوگا۔ میری مانیں تو آپ یہاں سے ادھر اُدھر ہو جائیں۔ میں تین دن بعد آپ کو پاسپورٹ وغیرہ لا دوں گا۔ ہمارے دشمنوں کی گردن آپ ہی دبوچ سکتے ہیں۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں میں ابھی لاہور چلا جاتا ہوں اور دو تین دن بعد آکر آپ سے ملوں گا" یہ کہہ کر میں نے اس ہوٹل کا کمرہ نمبر اور جس نام سے ہم وہاں ٹھہرے تھے، وہ سب کچھ نہیں بتا دیا۔

"ٹھیک ہے ہاشم صاحب! میں ابھی ڈرائیور کو آپ کے ساتھ بھیج دیتا ہوں۔ اپنا لباس بھی تبدیل کریں۔ میں ایک جوڑا بھجوا دیتا ہوں۔ پشاوری واسکٹ بھی پہن لیں مگر بہتر ہے ٹھنڈی شیروانی پہن لیں۔ سفید رنگ کی ہے میرے پاس۔"

"تو پھر بھیج دیں شیروانی ہی بھیج دیں میں وہی چڑھا لوں گا۔"

ڈھلوں صاحب نے کوئی آدھ گھنٹے میں تیار کر کے کار میں بٹھا دیا۔ میں نے شیو بھی کر لی تھی اور غسل بھی۔ شیروانی جو انھوں نے مجھے دی بہت ہی خوبصورت تھی۔ موتیے کے رنگ کی بس بس کرتی ۔۔۔ اور مجھے بالکل پوری تھی۔ سب سے بڑی مہربانی انہوں نے یہ کی کہ مجھے انہوں نے ایک چھوٹا سا بلجیم کا بنا ہوا پستول دیا جس پر سائلینسر بھی لگا ہوا تھا۔ وہ سائلینسر بھی کوئی زیادہ بڑا نہیں تھا اس میں بھرنے کے لیے انہوں نے گولیوں کا ایک ڈبہ بھی میرے ساتھ کر دیا۔ اس میں کم و بیش سو گولیاں تو ضرور ہی تھیں۔ میں نے بہت انکار کیا مگر انہوں نے میری جیب میں بیس ہزار روپے بھی ڈال دیے حالانکہ مجھے ان کی قطعاً ضرورت نہیں تھی۔

بر کی مجھے اسی وقت کار میں بٹھا کر شہر لے آیا۔ ہوٹل کا کمرہ ابھی تک ہمارے قبضے میں تھا جب میں وہاں پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ کمرے میں آبی موجود تھا۔ اس نے میری دستک پر جب پوچھا کہ کون ہے تو میرا دل باغ باغ ہو گیا۔ اس کی آواز مجھے عجیب طرح کی ڈھارس دیتی تھی۔

"بوہا کھول اوئے مہینوال کی اولاد۔"

"جا اوئے دفع ہو جا، غدار آدمی! بوہا نہیں کھل سکتا۔"

"دروازہ کھول دے بیٹے! بیوی کا منہ دیکھتے ہی باپ سے بغاوت کر بیٹھا ہے۔"

"تو بالکل کھوتا آدمی ہے یار! عین وقت پر دغا دے گیا" یہ کہہ کر اس نے دروازہ کھول دیا۔ کمرہ خوشبو سے مہک رہا تھا میں نے یوں آبی کو سینے سے لگا لیا جیسے وہ مجھ سے سالہا سال بعد مل رہا ہو۔ مگر وہ بہت ناراض نظر آرہا تھا۔ مجھ کو خود سے چھڑا کر وہ پلنگ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ منہ اس کا یوں پھولا ہوا تھا جیسے وہ مجھ سے کبھی نہیں بولے گا۔

"معاف کر دے یار! غلطی ہو گئی مجھے وہاں سے جانا نہیں چاہیے تھا۔"

"پر وجہ کیا تھی گندے آدمی! تو جل گیا تھا میری اس ذرا سی خوشی پر ؟"

"نہیں یار! یہ بات نہیں تھی۔ بس میں ۔۔۔ میں اندر سے خوش نہیں تھا آبی! میں تمھاری خوشی کو اپنی کسی انٹ شنٹ بات سے تباہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔"

"ایک دم فٹے منہ تیرا۔ وہ بہت پوچھ رہی تھی تجھے۔ اتنا کہ میں سمجھا وہ تجھ سے اپنی منگنی کروانا چاہتی ہے۔"

"بس میں اسی ڈر سے چلا آیا کہیں وہ ہار، وہ سوئمبر کا ہار میرے گلے میں نہ ڈال دے۔ تجھ سے تو زیادہ خوبصورت ہوں میں" میں نے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"گولی نہ مار دیتا اسے میں۔ ہاں! پر یار دیکھ بہت دغا باز تو نے۔ منگنی پھر بھی ہو ہی گئی۔"

"اچھا ؟ ماں جی کیا کہتی تھیں ؟"

"وہ بہت خوش ہیں۔ کل شام میں انہیں گاؤں چھوڑ آیا تھا۔"

"شادی کب ہوگی ؟"

"یہی کوئی چار ماہ بعد! اس کی زیر تکمیل فلمیں کسی طرف لگ جائیں تو پھر شادی کرے گی وہ۔"

"اس الماس نے تو دھماکا کر دیا ہے یار! کسی کو تیرے کرتوتوں کا علم ہو گیا تو کیا ہوگا ؟"

"یہی میں ڈرتا ہوں یار! منگنی تو اس نے بڑی خاموشی سے کی مگر خبر پھر بھی چھپ گئی، یہ دیکھو، اخبار میں چھاپ دیا ہے، انہوں نے کہ الماس نے منگنی کر لی" یہ کہہ کر اس نے دو اخبار میرے آگے ڈال دیے۔ وہ درست کہہ رہا تھا۔ اخبار نے لکھا تھا کہ مشہور فلمی اداکارہ الماس نے ڈیرہ غازی خان کے زمیندار محمد اسلم سپرو سے اپنی منگنی کا اعلان کر دیا۔"

"یہ سپرو تو کب سے ہو گیا ہے ؟"

"یہ ہماری ذات ہے یار! میں نے اسے یہی بتایا ہے کہ میری اُدھر ڈیڑھ مربع زمین ہے۔"

"ہوں تو یہ بات ہے۔ اب یہ ثابت کیسے کرو گے کہ تمھاری اپنی کوئی زمین ہے۔"

"مجھے ثابت کرنا ہی پڑے گا جیلانی! اور اس کام کے لیے مجھے پچاس لاکھ روپوں کی ضرورت ہے۔"

"کیا مطلب ؟"

"مطلب ہے کہ میرے پاس زمین ہونی چاہیے۔ میں الماس کے سامنے جھوٹا نہیں ہونا چاہتا" آبی بہت سنجیدہ تھا۔

"تو پھر کیا سوچا ہے تم نے، کوئی بینک لوٹو گے ؟"

"پتہ نہیں میں کیا کروں۔ مگر میں زمین ضرور خریدوں گا۔"

"میرے لیے کیا حکم ہے پھر۔"

"میں تمھارا مطلب سمجھ گیا ہوں جیلانی! مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس کام میں تو میرا ساتھ نہیں دے گا۔ یہ تیرا راستہ نہیں ہے اس لیے مجھے مجبوراً تم سے ایک مہینے کی چھٹی کی درخواست کرنی پڑے گی۔"

"تم مجھ سے الگ ہونا چاہتے ہو ؟"

"ہاں! مگر ایک تعمیری مقصد کے لیے۔ الماس نے مجھے زبردست آزمائش میں ڈال دیا ہے جیلانی!"

"مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے تم اپنی مرضی کے مالک ہو۔"

"وہ مر گئے انگریز اپنی مرضی والے سمندر پار چلے گئے۔ اب تو میں تمھارا غلام ہوں جیلانی! مجھے معلوم ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے صرف ایک مہینے کی چھٹی مجھے دے دے۔ تیرے دکھ کا مجھے احساس ہے تو انڈیا جانا چاہتا ہے نا! میں وہیں تیرے پاس آ جاؤں گا۔ آج اتوار ہے بس دو اتوار بیچ میں چھوڑ کر تیسرا اتوار میں تجھے امرتسر میں دربار صاحب کے دروازے پر کھڑا ملوں گا۔"

میں ہنس دیا۔ وہ سالا خواب دیکھ رہا تھا۔

"اگر میں اتنے دن وہاں نہ رہ سکا تو ؟"

"تو پھر بتا میں تجھے کہاں ملوں۔ میرا دوسرا پتہ الماس ہے۔"

"ٹھیک ہے تم مجھے آج سے ٹھیک پندرہ دن بعد اتوار کے دن صبح نو بجے امرتسر میں دربار صاحب کے سامنے ملو گے۔ ہو سکے تو اگلی اتوار کو وہاں پہنچ جانا۔ میں اس روز بھی نو بجے صبح وہاں ہوں گا۔"

"مجھے منظور ہے۔ لے اب تھوڑا شربت پی، یہ بیئر ہے فرانس کی بنی ہوئی۔"

"یہ تجھے مبارک ہو۔ یہ بتا کہ کل شام کو ماں جی کے ساتھ تو گاؤں چلا گیا تھا پھر اتنی جلدی واپس کیسے آگیا ؟"

"الماس نے رات گیارہ بجے یہاں آنے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ ایک بجے تک یہاں رہی اور پھر گھر چلی گئی۔"

"واپس جانے کی اسے اتنی جلدی کیا تھی ؟"

"وہ بھی ایک عدد ماں رکھتی ہے۔ اس کا نام صاعقہ ہے، بچارن لگتی ہے سالی۔ الماس کی اس منگنی پر وہ ذرا خوش نہیں ہے بری طرح گھور رہی تھی مجھے۔ جیسے اس کا بہت بڑا نقصان کر دیا ہو میں نے۔"

اس کی یہ بات سن کر مجھے ہنسی آگئی۔ آبی کسی کا بھی لحاظ نہیں کرتا تھا۔

"یار وہ تیری ساس بن چکی ہے آبی! بہت خبیث آدمی ہے تو۔"

"یہ آنڈ گوانڈ، یہ آس پاس یا ساس واس سب آدمی کے ستیاناس کا ذریعہ ہیں۔ وہ تو مجھے بہت پرانی بدمعاش لگتی ہے نام پتہ نہیں اس کا کیا ہوگا جی کہ پھبتی مگر وہ صاعقہ بن بیٹھی ہے اس سے میں تجھے ملاؤں گا۔ تو اپنی ساس بنا لے اسے۔"

"وہ کیسے! کوئی اور لڑکی بھی ہے اس کی ؟"

"ہے تو نہیں مگر اللہ کے گھر میں کس چیز کی کمی ہے۔ وہ اسے ایک اور لڑکی دے سکتا ہے۔"

"نہیں یار! اتنی بھی فراوانی نہیں ہے اس کے ہاں کہ اس بیوہ کے ہاں لڑکی دے دے اور میں بیس سال تک اسی طرح جوان رہوں۔ یہ کھیلے کی بات ہے۔"

"ارے تو منہ بولی ساس بنا لے تو اسے جس طرح منہ بولی ماں بن جاتی ہے کیا حرج ہے اس میں۔"

"ہوں! اس کی لڑکی تیرے نکاح میں رہے اور ساس وہ میری بن جائے، یہ خوب ہی۔ اب کیا پروگرام ہے تیرا ؟"

"میں ۔۔۔ میں بس ابھی تیار ہو کر تایا جی کی طرف جا رہا ہوں مجھے پچاس لاکھ کی اشد ضرورت ہے بھائی! میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔"

"یہ نکاح کی شرط ہے ؟"

"نہیں بلکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھ سے شادی کر کے

فخر کرے پچھتائے نہیں سر اونچا کر کے چلے کہ اُس نے ٹھیک مرد کا انتخاب کیا ہے۔"

"ٹھیک ہے تم ادھر جاؤ۔ میں ذرا آرام کروں گا یہاں۔ بہت تھکا ہوا ہوں۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ وہ اور کرایہ مانگیں تو دے دینا۔ میں بہرحال یہاں واپس نہیں آؤں گا۔"

"تو پھر میرا خیال ہے کہ میں آج رات کو چابی واپس کردونگا۔"

"ہاں کل صبح تک بہرحال تم یہاں رہ سکتے ہو اتنا کرایہ میں نے دے دیا تھا۔" یہ کہہ کر وہ غسل خانے میں جا گھسا۔ کچھ ہی دیر بعد اُس نے تیار ہو کر ناشتہ منگوایا۔ جب ہم اس سے فارغ ہوئے تو آبی بولا۔ "اچھا جیلانی! بشرطِ زندگی میں تجھے اوّل تو اگلے اتوار کو دربار صاحب کے سامنے ملوں گا ورنہ اس سے اگلے اتوار کو نو بجے صبح تو میں ضرور ہی پہنچ جاؤں گا۔" وہ یوں کہہ رہا تھا جیسے حسد پر تنی توپیں تو کوئی معنی ہی نہیں رکھتی ہیں۔

"ٹھیک ہے یار! جو کرے کرتار۔" یہ کہہ کر میں نے اس کے بستر پر قدم دھر دیا۔

آبی وہاں سے نکلا تو میں دروازہ اندر سے بند کر کے چادر تان کر سو گیا۔ مجھے نیند نے بے بس کر رکھا تھا۔ میری آنکھ کھلی تو سہ پہر کے تین بج رہے تھے ابھی دوپہر کے کھانے کا وقت نکلا نہیں تھا۔ میں ہوٹل کے سجے سنورے غسل خانے میں جا کر خوب مَل مَل کر نہایا پھر وہیں بیٹھے بیٹھے میں نے اپنے لیے کھانا منگوا لیا۔ وہ لوگ ہر شے بہت مہنگی بیچتے تھے۔ میں نے دل میں کہا ٹھیک ہے بھائی لوگو اتار لو کھال ان لوگوں کی جو یہاں آتے ہیں یہ بھی تو کسی کی کھال اتار کر ہی یہاں ٹھہرنے کے قابل ہوتے ہیں۔

مجھے اس شام ہر حال میں سروری بیگم سے ملنا تھا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ اس کے جو آدمی حد پار سے آتے ہیں وہ بھی میرے بہت کام آ سکتے تھے۔ آبی اس کمرے سے ساری چیزیں اٹیچی کیس میں بھر کر باہر لے جا چکا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر جھانک کر دیکھا، وہاں ہماری ایک بھی چیز باقی نہیں تھی۔ یہ عجیب سانحہ تھا کہ ہر چوتھے روز مجھے اور آبی کو اپنی ضرورت کی اشیا نئی خریدنی پڑتی تھیں مگر وہ کسی نہ کسی طرح ہر بار غارت ہو جاتی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ہم پھر لنڈورے سے ہو جاتے تھے۔ اس وقت پھر میرا یہ حال تھا کہ میرے پاس ایک ٹوتھ برش تک باقی نہیں رہ گیا تھا۔ ایسی بے سروسامانی کی زندگی کسی کی نہ ہوگی۔ ہم سے ہر شے آپ ہی آپ منہ موڑ لیتی تھی جیسے ہم اس کے لائق ہی نہ تھے۔ یہی قیاس مجھے الماس کے معاملے پر بھی منطبق ہوتا نظر آ رہا تھا۔ آبی ہوا کے ایک آوارہ جھونکے کے پیچھے بھاگ نکلا تھا۔ اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ الماس کو کیسے اپنے قبضے کی بوتل میں بند کر سکے گا اور وہ پچاس لاکھ روپے کی تلاش میں چل نکلا تھا وہ پگلا۔ تب بات میرے ذہن میں آئی کہ عین ممکن ہے الماس نے اس سے کہا وہ حق مہر کے طور پر اپنی ساری زمین اس کے نام لکھوا دے اس نے یہی مانگا ہوگا اپنی محبت کا معاوضہ۔ وہ اس سے کم پر بات کر ہی نہیں سکتی۔ اور آبی کو یوں اپنے شکنجے میں کس کر وہ اس کا لہو نچوڑ لینے پر آمادہ تھی۔ میں نے اس مسئلے پر بہت سوچا بہت سر پٹخا مگر اس کا کوئی حل مجھے نظر نہیں آیا۔ میں آبی کو جانتا تھا۔ اس کے سر میں جو سودا سما جاتا تھا وہ اس کی کھوپڑی کھولے بغیر باہر نہیں نکلتا تھا۔ یہی اس کی سب سے بڑی خوبی اور سب سے متعفن خرابی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ پیچھے نہیں ہٹے گا۔ اس الماس کے لیے اس نے میرا بھی ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ حالانکہ اسے معلوم تھا کہ میں کس طوفان کی زد میں ہوں اور میرے راستے میں کیسے کیسے مہیب غار منہ کھولے پڑے ہیں۔ وہ ایسے غار تھے کہ میں اپنی منزل کی طرف اندھا دھند بھاگتے ہوئے کسی بھی لمحے اُن میں گر سکتا تھا مگر آبی نے میری کسی بھی مشکل کا احساس نہیں کیا تھا۔ اور میں جو اسے کہتا کہ آبی یہ راستہ چھوڑ دے یہ الماس تجھے لے ڈوبے گی۔ تو وہ یہی کہتا کہ جیلانی تو میری ذرا سی خوشی بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ تو جلتا ہے حسد کرتا ہے۔ اور یہ بات تو وہ کہہ بھی گیا تھا مگر میں نے وہ سب کچھ ہنسی میں ٹال دیا۔ میں اس پاگل سے کہتا بھی تو کیا کہتا۔

میں دیر تک ہوٹل کے اس کمرے میں کرسی پر بیٹھا صورتِ حال پر غور کرتا رہا۔ جب سوچ کے تانے بانے بہت طویل ہو گئے تو میرے ذہن پر دھند چھانے لگی۔ مجھے سروری بیگم کا خیال آیا۔ اس کے عقب میں کھڑی مسند آرا مجھے نظر آئی۔ وہ دن یاد آیا جب بخاری کلینک میں اسے آخری بار دیکھا تھا۔ وہ بیمار تھی مضمحل تھی۔ افسردگی کی تصویر بنی ہوئی تھی اور اسے منظور نہیں تھا کہ میں آہو کے خلاف اس کے سامنے کوئی بات کروں۔ وہ مکمل طور پر خود کو اُن لوگوں کے حوالے کر چکی تھی جو اسے ریزہ ریزہ کر دینے پر تلے ہوئے تھے۔ وہ اُن کی چال کو سمجھ نہیں سکی تھی۔ اس نے سروری بیگم پر بھی اعتماد کر رکھا تھا اور اپنے بہنوئی پر بھی۔ اور اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ لوگ اسے کس قسم کے زہریلے دام میں پھانس چکے ہیں۔ اس سے ملنے کو میرا دل بار بار چاہتا تھا مگر ہر بار آسیہ نے مجھے اپنے پیچھے آنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے مسائل اتنے گمبھیر اور اتنے مہیب تھے کہ اُن کے تدارک کے لیے میں پاگل ہوا جاتا تھا۔

اب جو نئی افتاد اس پر پڑی تھی، وہ سراسر میری دی ہوئی

تھی۔ کبیر شاہ نے اگرچہ اس سونے کے لالچ میں ہی اسے پناہ دی تھی۔ وہ اس کی سرپرستی میں رہ کر ہسپتال سے صحتیاب ہو کر نکلی تھی مگر وہ پھر کھو گئی تھی اور اب وہ جس ڈھول میں گم ہوئی تھی وہ میرے ہی اعمال کی پیدا کردہ تھی مگر میری بے بسی بھی تو دیدنی تھی۔ میں نے ہر قدم پر امرتسر میں کوشش کی تھی کہ میرے ہاتھوں کسی آدمی کا خون نہ ہو جائے۔ میں نے اپنے ہاتھ کو بہت روکے رکھا اور یہی وجہ تھی کہ میں وہاں کسی کو گزند پہنچائے بغیر صحیح سالم اُن کے جال سے باہر نکل آیا تھا مگر وہ جب سے اب تک میرے تعاقب میں لگے تھے۔ اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ اب مجھ سے اور کیا چاہتے ہیں۔ نہیں معلوم ہو چکا تھا کہ میں اُن کے منصوبے کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتا۔ کسی طرح بھی میں ان کا آلۂ کار نہیں بن سکتا۔ اُن کی ہولناک سازش میں میں شریک ہونے کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اپنے ہم وطنوں پر میں کیسے ہاتھ اٹھا سکتا تھا یہ سب کچھ اُن کے علم میں تھا۔ اس کے باوجود وہ میرے تعاقب میں تھے اور چاہتے تھے کہ میں اُن کے سامنے جا پہنچوں۔ اُن پر اپنا آپ ظاہر کر دوں۔ اپنی شکست تسلیم کر کے اُن کا حکم بے چون و چرا مان لوں۔ کیسے احمق تھے وہ لوگ۔ مگر نہیں وہ احمق نہیں تھے۔ اب کی بار وہ مجھے میری اس گستاخی اور دیدہ دلیری کی سزا دینا چاہتے تھے۔ یہی اُن کا منشا تھا۔ بھنڈاری مجھ سے انتقام لینا چاہتا تھا۔ ببیر نے یہی کہا تھا اور اس نے اپنی دھمکی کو سچ کر دکھایا تھا۔ انہوں نے آسیہ کو بالآخر میرے وہاں پہنچنے سے پہلے اٹھوا لیا تھا۔ اور اب خدا ہی جانتا تھا کہ وہ حرماں نصیب میری وہ بے بس مظلوم بہن کس حال میں ہوگی۔

میں نے بہت سوچا ہوٹل کے اس سنّاٹے سے بھر پور کمرے میں بیٹھ کر شام تک بہت سگریٹ پھونکے۔ زندگی کے سارے نشیب و فراز کو کھنگال ڈالا مگر اپنے مسائل کا حل کوئی بھی نظر نہیں آیا۔ باہر شام کے سائے گہرے ہونے لگے تو میں نے چائے منگوا کر دو پیالیاں حلق سے اتاریں اور پھر ہوٹل کا تمام حساب بے باق کر کے کوئی آدھ گھنٹے بعد باہر نکل آیا۔

میں جب ٹیکسی میں بیٹھ کر آہو کے دروازے پر پہنچا تو رات کے نو بج چکے تھے۔ میری پہلی ہی دستک پر کبری نے دروازہ کھول دیا۔

"اوستاد! مجھے معلوم تھا تم ٹھیک نو بجے یہاں پہنچ جاؤ گے۔"

"تجھے الہام ہوتا ہے؟ کیسے پتہ چل جاتا ہے تجھے؟" میں نے اندر صحن میں پہنچ کر کہا۔

"وہ۔۔۔ وہ ڈاکوؤں کا ٹائم تو مشہور رہا ہے استاد۔"

"بکواس نہ کیا کر کبری! میں شریف آدمی ہوں سالے میرا بیان نہیں سمجھ رہا تو۔"

"اس میں تو تم بالکل سر چھوٹو رام لگتے ہو استاد۔ وہ پنجاب کا گورنر ہوا کرتا تھا۔"

"گورنر کہ وزیرِ اعلیٰ؟ تیرے ساتھ پڑھا کرتا تھا وہ کچی پہلی میں۔"

"نہیں یار! اس کی خالہ سے میرا وہ چل رہا تھا، کیا کہتے ہیں اسے لو افیئر۔ ہاں پر بیچ میں اُن کا ہندوستان بن گیا اور وہ ہمارا عشق چھپکلی کی دُم کی طرح کٹ کے رہ گیا۔"

"اچھا! اتنی اونچی جگہ ہاتھ مارا تھا تم نے، ابے وہ تو تجھ سے تیس سال بڑی ہو گی۔"

"وہ دراصل بچوں کی شوقین تھی، اس لیے۔۔۔"

"دُر فٹے منہ تیرا! تیرے ساتھ ہر مکالمہ غلط ہو جاتا ہے۔"

"تو فلم بھی تو غلط ہی بنا رہا ہے نا اوستاد! دیکھ آج۔۔ بیگم صاحبہ تیرے انتظار میں ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"ذرا بچ کے جانا! تیرے دشمن کی بیوی ہے کہیں کسی چکر میں نہ ڈال دے وہ تجھے۔ میں ایک چوہا پکڑ دیتا ہوں کوئی چیز کھانے سے پہلے اس کو چکھا دینا۔"

"نہیں یار! ایسا بھی اندھیر نہیں مچا ہے، بہرحال انہیں بتا کہ ہم آئے ہیں۔"

"جا چڑھ جا سیڑھی اللہ کا نام لے کر۔ رام بھلی کرے گا۔" یہ کہہ کر اس نے سیڑھی کا دروازہ کھول دیا۔ میں زینے پر احتیاط سے قدم دھرتا ہوا اوپر پہنچا تو ہلکی سی کھنکار پر سروری خانم لپک کر سامنے آ گئی۔

"ارے آپ؟ جیلانی صاحب میں بس آپ ہی کے انتظار میں کھڑی تھی یہ کبری کیا کہہ رہا تھا آپ سے؟"

"ایسے ہی ذرا خوش آمدید کہہ رہا تھا۔ پرانا مہربان ہے نا!"

"ہاں! آپ کی بڑی تعریفیں کرتا رہتا ہے۔ اللہ! آج کتنے سج رہے ہیں آپ اس لباس میں۔"

"آپ کی مہربانی ہے خانم! ورنہ من آنم کہ من دانم۔"

وہ مجھے نشست گاہ میں پہنچا کر بولی۔ "واقعی میں جھوٹ نہیں کہہ رہی۔ یہ آپ کے نظر لگ جانے کے دن ہیں۔"

"اور آپ کے؟ آپ کے تو شاید کلیجے میں اُتر آنے کے دن ہیں۔"

وہ جھینپ سی گئی۔ اٹھی اور فریج میں سے میرے لیے برف میں لگی کوکا کولا کی بوتلیں نکال لائی۔ اُن دنوں ہر جگہ مجھے اسی مشروب سے واسطہ پڑتا تھا۔ اسے بہرحال میں نے پی لیا۔ اس کا ذائقہ کچھ زیادہ ہی غیر مانوس تھا۔ اس نے مجھے ٹھہر ٹھہر کر چار گلاس

پلا دیے۔

"آپ کے وہ آدمی نہیں آئے، بارڈر پار والے آدمی؟"

"نہیں جیلانی صاحب! ان میں سے تو آج کوئی بھی نہیں آیا۔ مگر اُن کا کوئی ٹھیک وقت نہیں ہے، ہو سکتا ہے ابھی آ جائیں۔"

"ہاں! میں دراصل انہی کے لیے آیا ہوں۔"

"کام نہیں بتائیں گے مجھے؟"

"کیا کہوں خانم! میری زندگی عذاب بن کر رہ گئی ہے۔ مجھے آپ کے لیے بہت خوار ہونا پڑ رہا ہے۔"

"آخر ہوا کیا ہے۔ اب کہاں چلی گئی ہے وہ؟" یہ کہہ کر سروری صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ بھی اس رات شیشہ اوڑھ کر بیٹھی تھی۔ وہ چار گلاس کوکا کولا پینے کے بعد سروری مجھے بے حد حسین نظر آنے لگی تھی۔ یارو! یہ تمہارا گنہ گار، یہ جیلانی بھی اُن دنوں عجیب پاگل تھا پھسلتا تھا تو کیلے کے بے وقعت چھلکے پر سے پھسل جاتا تھا اور جو کہیں رکتا تھا، سنبھلتا تھا، دامن بچا کر چلتا تھا تو بڑی سے بڑی پھسلن پر سے بھی صحیح سالم گزر جاتا تھا۔ میرے ذہن کی حالت کچھ عجیب و غریب ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے بے کم و کاست اُسے پاگلوں کی طرح وہ ساری باتیں بتا دیں جن کو میں عام حالات میں شاید اسے کبھی نہ بتاتا۔ یہ بات مجھ پر بہت بعد میں عیاں ہوئی کہ کوکا کولا کی ان بوتلوں میں اُس نے وہسکی ملا رکھی تھی۔ جو اس برقِ رقصاں نے مجھے بڑے قرینے سے بھر بھر کر پلا دی۔ اثر اس کا ظاہر ہونے لگا تھا میری باتیں سن کر وہ رونے لگی تو آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ میں نے جیب سے دُھلوں کا دیا ہوا صاف سفید رومال نکالا اور اس کے آنسو پونچھنے لگا میں اس کا وہ گریہ کسی بھی طرح برداشت نہیں کر رہا تھا۔ ہاں میری ذہنی اور قلبی کیفیت ایسی رقت آمیز ہو گئی تھی کہ میں بھی اُس کے ساتھ ہی رونے لگا۔ اب مجھے وہ سب کچھ یاد آتا ہے تو میں بے اختیار ہنس دیتا ہوں۔ اس بدبخت نے شاید بوتلوں میں چغتائی دور کے نسخوں کے مطابق تھوڑی بھنگ بھی ملا دی تھی۔ کوئی پندرہ بیس منٹ بعد اس نے تین تین گلاس اور بھر لیے جن کو میں نے بڑے شوق سے حلق میں انڈیل لیا۔ تین گلاس وہ چڑھا گئی۔۔

وہ بہت خوش تھی میرے لیے اس نے ڈھیر سارے کھانوں کا انتظام کر رکھا تھا جس میں سب سے فراواں چیز کباب تھے۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ وہ آدھی رات تک مجھے 'کوکا کولا' بھی اٹھ اٹھ کر پلاتی رہی اور کباب بھی کھلاتی رہی۔ اُس نے بالآخر مجھے شکار کر لیا تھا۔ خدا میرے گناہ معاف کرے میں اس دلدل سے بچتے بچتے بھی ہزار کوشش کے باوجود بے ارادہ اس میں جا گرا تھا۔

آپ کو شاید یقین نہ آئے یارو۔ مگر حقیقت یہی ہے میں سروری خانم کے گھر میں کافرستان کے بودلک کی طرح تین دن بند پڑا رہا۔ وہ مجھے ہوش و خرد کے حلقے میں آنے ہی نہ دیتی تھی۔ اُس نے مجھے کچھ ایسے مشروبات پر ڈال دیا تھا کہ ان کے لیے میرے دل سے میری زبان سے ہَل من مزید کی صدا اٹھتی تھی۔ اُن مشروبات کی خمار آگیں لذت مجھے اتنی بھا گئی، اتنی مرغوب ہو گئی کہ میں بھول ہی گیا کہ میں کون ہوں میرا مقصد کیا ہے۔ وہ سروری کون ہے اور اس کا مقام کیا ہے۔ میں سب کچھ ہی فراموش کر بیٹھا میری زندگی سے وہ تین دن نکال دیے جائیں تو میں سمجھوں گا کہ میں بہت ہی نیک اور پارسا آدمی ہوں مگر سروری خانم کا ارادہ میرے لیے باغِ ارم کا سانپ بن گیا تھا۔ تین دن گزر گئے تین بڑے ہی ہیجان خیز اور مسرت آگیں دن۔ ان کا ایک ایک لمحہ مجھے عزیز ہو گیا تھا۔ میں مآل و انجام سے بے خبر ہو کر سروری کے اشاروں پر ناچتا رہا۔ یوں جیسے میرا اپنا کوئی ارادہ ہی نہیں۔

وہ چوتھے دن کی صبح تھی کہ اچانک سیڑھیوں کے دروازے پر بڑے زور کی دستک ابھری ہم دونوں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔

"یہ کون بدتمیز ہے؟ کبری ہے تو اُسے شوٹ کر دو۔" میں نے مطلق العنان حکمراں کی طرح تکیے میں سر دیتے ہوئے کہا۔

"نہیں! یہ کبری نہیں ہے جیلانی یہ۔۔۔ میرا خیال ہے آہو ہے۔"

"آہو! وہ تمہارا شوہر۔ بلاؤ اس بے غیرت کو۔ کیا سمجھتا ہے وہ اپنے آپ کو۔ تم اس کی بیوی ہو نا سروری خانم!" میں اپنے حواسوں میں نہیں تھا۔ شراب مجھ پر ابھی تک طاری تھی۔ مجھ سے "ر" کا لفظ صحیح طور سے ادا نہیں ہو رہا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے میں یہی کہہ رہا تھا۔ یا دلیوں ہے کہ میرے ذہن کا کوئی نہ کوئی حصہ اس وقت بھی صحیح کام کر رہا تھا۔

دستک میں اچانک شدت پیدا ہو گئی۔ اس نے جا کر بوجھ کر پانی کا نل کھول کر اپنے ہاتھ بھگوئے اور پھر تولیہ ہاتھ میں لے کر بولی۔ "تم اُدھر اس کمرے میں چلے جاؤ۔ میں اسے سنبھالتی ہوں۔"

"دروازہ کھولو سروری! کیا کر رہی ہو اندر؟" آہو بہت طیش میں تھا۔ میں اسے منہ ہی منہ میں بے نقط سناتا ہوا اٹھا اور پستول سیدھے ہاتھ میں لے کر اسی طرف چل دیا۔ جدھر سے دستک کی آواز آ رہی تھی۔ مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔

سروری نے اچانک مجھے پیچھے کھینچا اور اپنی خواب گاہ کے عقبی کمرے میں لے گئی، بولی "اس کمرے کا پچھلا دروازہ کھول کر دوسری طرف نکل جاؤ۔" وہ مجھے اِن تین دنوں میں آپ سے

تُو کہنے لگی تھی۔ مجھے وہ پانی کا ایک جگ بھی دے گئی۔ بولی۔ "یہ پانی پی کر منہ پر دو چھینٹے بھی مار لو تم ہوش میں نہیں ہو۔" یہ کہہ کر اس نے کمرے کا دروازہ دوسری طرف سے مقفل کر دیا۔ میں نے منہ پر دو چھینٹے مارے۔ وہ یہی کہہ گئی تھی۔ اور میں پچھلے تین دن سے یہی کرتا آیا تھا جو وہ کہتی تھی۔

منہ پر پانی کے چھینٹے ڈالنے سے اچانک مجھے گرد و پیش کی سنگینی کا احساس ہونے لگا تھا۔ وہ گھُپ اندھیرا کمرہ تھا۔ جس میں ایک روشندان لگا تھا۔ اور اس کے نیچے ایک دروازہ تھا۔ اب مجھے نہ تو آہو کی آواز سنائی دے رہی تھی نہ سروری کی۔ میں نے پیچھے ہٹ کر دروازے کی دونوں چٹخنیاں کھول دیں۔ دروازے کے دونوں کواڑ کھلنے لگے۔ عین اس وقت سروری کی خواب گاہ میں سے مجھے آہو کی غضبناک آواز سنائی دی۔

"کہاں ہے وہ؟ میں کہتا ہوں کہاں چھپایا ہے تم نے جیلانی کو، بتاؤ؟"

"کون کہتا ہے کہ جیلانی یہاں ہے کس نے بتایا ہے آپ کو؟"

"مجھے کبری نے بتایا ہے، وہ کہتا ہے کہ جیلانی تین دن سے تمہارے پاس ہے۔"

"بکواس کرتا ہے وہ۔ اس کا دماغ چل گیا ہے، بلاؤ اسے میرے سامنے۔"

"وہ مجھ سے جھوٹ کیوں بولتا۔ کیا ضرورت ہے اُسے بہتان لگانے کی؟ مجھے سچ سچ بتلا دے سروری ورنہ اچھا نہ ہوگا۔" آہو نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"میں کہتی ہوں وہ جھوٹ بولتا ہے، بلاؤ اُسے۔ اس کے سر پر قرآن رکھو۔ اگر وہ کہہ دے کہ جیلانی یہاں آیا تھا تو جو چور کی سزا وہ میری۔"

"تم جھوٹ بولتی ہو۔ یہ اتنی ساری وہسکی ملی کوکا کولا کی بوتلیں کیسے بکھر گئی ہیں۔ یہاں کون پیتا رہا ہے یہ؟"

آہو کی یہ بات سنتے ہی میں کمرے سے نکلا۔ راستہ مجھے معلوم تھا۔ میں دبے پاؤں عقبی سیڑھیاں اُترا اور آہو کی اس بیٹھک کے دروازے پر جا پہنچا جہاں میں نے پہلے دن قیام کیا تھا۔ دروازہ اندر سے کھلا تھا۔ میں کواڑ کھول کر آگے بڑھا تو کبری مجھے غسلخانہ صاف کرتا نظر آیا۔ میں نے پستول سیدھے ہاتھ میں لے کر اندر سے بیٹھک کے دونوں دروازے تیزی سے بند کر دیے۔ کبری مجھے حیرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے جاتے ہی دو ہزار کے نوٹ اس کے سامنے بیسن پر رکھ دیے۔

"یہ کیا ہے اوستاد؟"

"یہ تیرا انعام ہے کبری! تو اوپر جا۔ آہو کے سامنے کہہ دے کہ تو نے تھوڑی دیر پہلے میرے بارے میں جو کچھ کہا تھا وہ جھوٹ ہے۔"

"اوئے! یہ تو دو ہزار ہے۔ آج تو حد کر دی ہے تم نے۔ پر یار میرے منہ سے ایسے ہی وہ بات نکل گئی آہو تو بس پاگل ہی ہو گیا۔ پر خیر، میں قسم کھاؤں گا۔ یہ کون سی مشکل بات ہے۔"

"بس پھر جا جلدی جا۔ میں ولنگٹن ہسپتال کے دروازے کے اندر تیرا انتظار کرتا ہوں۔ آدھ گھنٹے میں وہاں پہنچ جا۔"

"ٹھیک ہے میں سودا لینے کے بہانے ابھی آتا ہوں تو چل۔"

یہ کہہ کر وہ دروازہ کھول کر صحن میں نکلا تو مجھے آہو کی آواز سنائی دی۔ وہ بڑے دروازے کے قریب سیڑھی میں کھڑا تھا۔

"اوئے کبری بدمعاش! ادھر آ۔ تو کیسے کہتا تھا کہ جیلانی ادھر آیا بیٹھا ہے کہاں ہے وہ۔ بتا مجھے دکھا مجھے۔"

میں ایک لحظے کے لیے رک گیا۔ کبری اوّل درجے کا عیار آدمی تھا۔ اور وہ رشوت اس پر اثر کر چکی تھی۔ بڑی مسمسی آواز میں بولا۔ "میں نے بتایا تو تھا آہو صاحب کہ جیلانی یہاں آیا تھا وہ آپ کی تلاش میں تھا۔ مجھے بھی مار دینے کی دھمکیاں دیتا تھا۔"

"تو تو یہ بکواس کر رہا تھا کہ وہ اُدھر اوپر کی منزل میں سروری کے پاس ہے۔"

"وہ اوپر بھی گیا تھا آہو صاحب! پر بی بی جی تک وہ نہیں پہنچ سکا۔ انہوں نے سیڑھیوں کا دروازہ بند کر لیا تھا۔ صحن میں اس کی آواز سنتے ہی وہ سہم گئی تھیں۔" کبری کی یہ بات سنتے ہی آہو نے ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا۔

"سالے بدمعاش! ایمبی! کبھی کچھ کہتا ہے کبھی کچھ۔ میں تجھے قرآن اٹھواؤں گا۔ قسم کھا میرے سامنے اٹھائے گا قرآن؟"

"اٹھاؤں گا صاب جی! میں سچ کہہ رہا ہوں میں نے یہی بتایا تھا آپ کو۔"

"ٹھیک ہے چل اوپر۔ تم دونوں کو قرآن اٹھانا پڑے گا۔ میں یوں نہیں بخشوں گا۔۔۔ مجھے پہلے ہی شک تھا۔ یہ سروری بہت تعریفیں کرتی رہتی تھی اس ڈاکو کی۔ اب اُسے گھر میں بلا لیتی ہے۔" وہ بہت طیش میں تھا اور یوں بول رہا تھا جیسے وہ اپنی بات پورے محلے کو سنا کر دم لے گا۔ میرے لیے اب وہاں مزید ٹھہرنا بیکار تھا۔ میں دبے پاؤں آہو کے عقبی لان میں نکلا اور اس کے مکان کا پچھلا چھوٹا سا دروازہ بے آواز کھول کر دوسری طرف نکل گیا۔ جب میں اس کے گھر سے کافی دُور جا پہنچا تو اچانک یہ احساس انبساط کی اونچی اٹھتی لہر کی طرح میرے دل میں ابھرا کہ میں اپنے رذیل ترین دشمن کو پامال کر آیا ہوں۔ یہ بڑا ہی فرحت بخش احساس تھا۔ آہو کو میں بدترین چرکا لگا آیا تھا اور اُس کی نوعیت اور سنگینی کا اُسے بڑی حد تک اندازہ بھی ہو گیا تھا اور یہ میرے لیے بڑی ہی

خوشی کی بات تھی۔ میں اس کے سامنے ہو جاتا، اپنا آپ اس پر ظاہر کر دیتا تو وہ شاید طیش میں آ کر سروری کو اسی وقت جان سے مار دیتا۔ یا وہ کوئی ایسا ہی قدم اٹھا لیتا جس سے وہ ذلت کا داغ فوراً ہی اس کے ذہن سے دھل جاتا۔ مگر اب صورتِ حال بالکل ہی مختلف تھی۔ میں اسے شک کی نوک میں پرو آیا تھا۔ جو زندگی بھر آہستہ آہستہ اسے موت کی طرف دھکیلتا رہے گا۔ وہ خواہش کے باوجود مر نہ سکے گا۔ اور جینا تو اس کے لیے دوبھر ہو ہی جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ سروری کے ہاں میں نے جو وقت گزارا تھا اس میں شراب کے خمار کے علاوہ میرے ارادے کو بھی بڑا دخل حاصل تھا۔ آدمی کمینگی پر اتر آئے تو کیا نہیں کر سکتا ہے۔

میں نے ہسپتال کے احاطے میں رُک کر کبری سے ملنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اور ٹیکسی میں بیٹھ کر سیدھا ڈھلوں صاحب کی طرف چل دیا۔ مجھے معلوم ہونا چاہیے تھا کہ میرے لیے انہوں نے سرحد پار کرنے کے لیے کیا کچھ کیا ہے۔ میں چوگوٹھ پہنچا تو معلوم ہوا کہ ڈھلوں صاحب حویلی میں موجود ہیں۔ انہوں نے فوراً ہی مجھے اپنی نشست گاہ میں بلوا لیا۔ وہ اس وقت تنہا تھے اور بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ وہ مجھ سے بڑے تپاک سے ملے علیک سلیک کے بعد بولے۔

”خان صاحب! آپ کا یہاں سے چلا جانا ہی بہتر تھا۔ میں نے وہ معاملہ پولیس کے حوالے کر دیا ہے۔ وہ ساوتری امرتسر ہی سے آئی تھی اسے پرتاپ سنگھ نے خاص مقاصد کے لیے ہی میرے ہاں مالو کے ذریعے ملازم رکھوایا تھا۔ میں پاگل تھا جو مالو کی باتوں میں آ گیا۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود میں نے پیر آباد کے رحمت علی کو گرفتار کروا دیا ہے۔ اس الزام میں کہ وہ مجھے اس عورت کے ذریعے مروانا چاہتا تھا۔“

”مگر ثبوت کیا تھا آپ کے پاس؟“

”شہادتیں میرے ملازموں نے دی ہیں پھر وہ میرے مہمان بھی گواہ ہیں۔ ڈاکٹر جہاں زیب بھی یہاں موجود تھا ساوتری کے نزعی بیان کا گواہ میں نے انہیں بنا دیا ہے۔“

”ہوں! اس کا مطلب ہے کہ ایک تیر سے آپ دو شکار کر رہے ہیں مگر پرتاپ سنگھ کو آپ سے کیا ضد ہے؟“

”اسے معلوم ہے کہ میں موجودہ حکمراں پارٹی کا خاص آدمی ہوں۔“

”ہوں! مگر اس عورت نے یہاں آتے ہی آپ پر ہاتھ کیوں نہیں ڈالا؟“

ڈھلوں صاحب مسکرائے بولے ”معلوم یہ ہوا ہے کہ اسے دو دن پہلے ہی یہ حکم ملا تھا کہ وہ مجھے اور غلام جیلانی کو زندہ گرفتار کر کے امرتسر پہنچا دے۔“

”مجھ سے کیا ضد ہے انہیں؟“

”یہ تو آپ کو وہی بتا سکتے ہیں۔ بہرحال یہ رہا آپ کا پاسپورٹ۔ آج شام کو ایک سرجن ڈاکٹر کو بلوا رہا ہوں۔ وہ آپ کے چہرے کی ہلکی سی مرمت کر دے گا۔ پھر کوئی فکر کی بات ہی نہیں رہے گی۔ کل آپ گاڑی میں بیٹھ کر امرتسر چلے جائیں۔“

”ٹھیک ہے میں تیار ہوں جناب! مجھے تو ہر حال میں آسیہ تک پہنچنا ہے اسے وہی اٹھا کر لے گئے ہیں مجھے ذلیل کرنے کو۔“

”خدا انہیں ذلیل کرے گا۔ وہ یہاں اپنی مرضی کی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ مگر مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی اس سازش میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔“ ڈھلوں صاحب نے بڑے پُرعتماد لہجے میں کہا۔ پھر انہوں نے میری آنکھوں کی سرخی اور سوجن پر غور کرتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے آپ رات سو بھی نہیں سکے۔ بہتر ہے آپ آرام کر لیں آپ سے اب شام کو ملاقات ہو گی۔“ یہ کہہ کر انہوں نے شفیع کو بلوایا۔ اور اسے میرے آرام کا ہر طرح سے خیال رکھنے کا حکم دے کر بولے۔ ”وہ... کیا نام ہے اس کا ادھر آ ذرا۔“

یہ کہہ کر انہوں نے شفیع کے کان میں کچھ کہا تو وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”ٹھیک ہے چوہدری صاحب آپ فکر ہی نہ کریں۔ آؤ خان جی! میں آپ کو کمرے میں پہنچا دوں۔“

کچھ ہی دیر بعد میں ڈھلوں صاحب کا فراہم کردہ ایک نیا جوڑا پہن کر بستر پر لیٹ گیا۔ مسلسل بے خوابی کی وجہ سے میری آنکھیں جل رہی تھیں تھکن سے میرا بند بند دکھ رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ میں سو جاؤں مگر جیسے ہی میں آنکھیں موندیں، میری پتلیوں پر مسند آراء اتر آئی۔ میں نے سروری بیگم سے بار بار اس کے بارے میں پوچھا تھا۔ اور ہر بار اس نے مجھے یہی جواب دیا تھا کہ وہ اکبر کوٹ میں بہت مطمئن اور خوشحال زندگی بسر کر رہی ہے میرے ایک سوال پر اس نے زہرخند... کرتے ہوئے کہا تھا۔

”مجھ سے تو اس نے کبھی آپ کا ذکر نہیں کیا ہے جیلانی صاحب!“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے میں تو ہر روز خواب میں اس سے باتیں کرتا رہتا ہوں۔“

”یہ مرض اکثر لوگوں کو اس عمر میں ہو جاتا ہے اور اس کا علاج یہ ہے کہ آدمی فسد کھلوائے۔“ یہ کہہ کر وہ کھلکھلا کر ہنس دی تھی۔ میں شرمندہ سا ہو کر اس کا منہ تکتا رہ گیا۔

وہ چند لمحوں تک مجھے بڑے غور سے دیکھتی رہی پھر بولی۔ ”ہم اس کی منگنی کرنے کی سوچ رہے ہیں سخی احمد سکھیرے سے۔ اور شاید اس کی نومبر دسمبر میں شادی کر دیں۔“

”یہ کون صاحب ہیں یہ سخی احمد سکھیرا؟“

”یہ منڈی بہاؤالدین کے زمیندار ہیں اور وکالت کرتے ہیں۔“

”آپ ایسا نہیں کر سکیں گی سروری خانم۔ اس آدمی کی زندگی کو کیوں مختصر کر رہی ہیں آپ؟“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ میں مسند آراء کو اپنانے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔“

”آپ؟ کیا کہنے ہیں آپ کے! وہ آپ کا نام تک سننا گوارا نہیں کرتی اور آپ اسے اپنانا چاہتے ہیں۔“ وہ بہت سنجیدہ ہو گئی تھی اور مجھے یقین تھا کہ وہ عورت جھوٹ نہیں بولتی ہے۔ اس نے کٹھن سے کٹھن حالات میں بھی مجھ سے کسی معاملے میں غلط بیانی نہیں کی تھی۔ اس کی یہ بات سن کر میں خاموش ہو گیا کہنے کے لیے میرے پاس رہ ہی کیا گیا تھا۔ سروری خانم کی باتوں پر اعتبار مجھے کرنا ہی پڑا۔ کیونکہ مسند آراء کا رویہ بھی ابھی تک میرے ذہن میں تازہ زخم کی طرح محفوظ تھا۔ اس کی سرد مہری نے مجھے بجھا ڈالا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں اب تک اس کی طرف جانے سے گریزاں رہا تھا ورنہ وہ زیادہ دور تو نہیں تھی۔ اس تک جا پہنچنا کچھ بھی مشکل نہیں تھا۔ بس بیچ میں اس کا وہ بے مہر انداز حائل ہو گیا تھا۔

میں کتنی ہی دیر تک بستر میں لیٹا مسند آراء کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کے لیے میرے دل میں بڑے طوفان اٹھتے تھے۔ بارہا راتوں کو آپ ہی آپ میری نیند ٹوٹ جاتی تھی یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کسی نے میرے رخساروں پر اپنا نرم و گداز ہاتھ پھیر کر مجھے جگا دیا ہے۔ ایسے میں مسند آراء کی وہ تصویر جو میرے خوابوں میں رنگ بھرا کرتی تھی عجیب سی مرئی صورت میں مجھے اپنی طرف بڑھتی نظر آتی مگر جب میں ہاتھ بڑھاتا۔ اس کو اپنے لمس کی راہ سے دل میں اتارنے کے لیے بستر سے اٹھنے لگتا تو وہ تصویر اچانک غائب ہو جاتی میرے ساتھ ایک عرصے سے یہی ہوتا آیا تھا۔

ڈھلوں صاحب کے اس مہمان خانے میں اس روز بڑی دیر تک میں مسند آراء کے خیالوں سے الجھتا رہا۔ افسوس مجھے یہ تھا کہ میں ابھی تک اسے اپنی اس ذہنی اور قلبی کیفیت سے آگاہ نہیں کر سکا تھا اور یہ میری بڑی غلطی تھی۔ میں اس کی سوتے جاگتے پرستش تو کرتا تھا، مگر... مگر... اس کو احساس تک نہ دلا سکا کہ میں اسے کس نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ میں نے دل سے کہا ناداں اک ذرا صبر کہ ہجر کے دن تھوڑے ہیں۔ میں آسیہ کو امرتسر سے واپس لے آؤں پھر میں تیری ساری باتیں مان لوں گا۔ وہ میری تعمیلوں کا موسم ہو گا اور تیرے فرمانوں کا دور۔ پھر مسند آراء کے وجود سے میں تیرا دامن ضرور بھر دوں گا پگلے کہ پھر مجھے اور کرنا ہی کیا ہے سوائے تیری خاطر داری کے۔

مسند آراء کے خیالوں میں کھو کر میں آہستہ آہستہ نیند کی آغوش میں جا گرا۔ جب میری آنکھ کھلی تو سورج شام کی دہلیز پر سر رکھ چکا تھا۔ میں تولیے کر غسل خانے میں جا گھسا۔ موسم کی تپش بڑھتی جا رہی تھی اور اسی حساب سے میری ذہنی اذیت میں بھی اضافہ ہو رہا تھا آسیہ کے پیچھے بھاگ بھاگ کر میں تھکتا جا رہا تھا۔ وہ سراب بنتی جا رہی تھی میرا حال اس بدنصیب ایسا ہو رہا تھا جو اپنے ناگفتنی زخموں سے نڈھال ہو کر بیٹھا مکھی ملاتا رہتا ہے۔ اس کے سوا میں ابھی تک کچھ بھی نہیں کر سکا تھا۔ دل کی حالت کبھی تو ایسی ہو جاتی تھی جیسے اسے پنکھے لگ گئے ہوں مسلسل نارسائی نے مجھے ہر طرف سے مایوس کر دیا تھا اب تو آسیہ میری نگاہوں میں تھی، اسے جیل خانے سے نکال لینے کے بعد میں مسلسل اس کے بارے میں باخبر رہتا تھا مگر اس کبیر شاہ نے درمیان میں افراتفری مچا دی تھی کہ اب میں آسیہ کے سراغ سے بھی محروم ہو چکا تھا اور اب یہ حال ہوتا جا رہا تھا کہ مصیبتوں نے میرے دروازے کی مٹی لے ڈالی تھی۔ مجھے کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا میرے نصیب کی دُرگا بڑا بلیدان مانگتی تھی۔ شاید میں اپنی جان دے کر ہی راضی کر سکتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میری خم بادہ تقدیر ذوخصمی ہے وہ مجھے کبھی سیدھی راہ نہیں چلنے دے گی مگر مجھے کسی نہ کسی طرح تو اس تیرگی کے بیکراں جال کو کاٹنا ہی تھا۔

غسل خانے سے میں نہا کر نکلا تو بدن میں تازگی محسوس کرنے کے بجائے میرا اضمحلال کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ میں نے کسی ملازم کو بلانے کے لیے گھنٹی بجائی تو چند ہی لمحوں بعد شفیع میرے پاس آ پہنچا۔

”کیا حکم ہے خان جی! ڈھلوں صاحب ادھر ہی آ رہے ہیں۔ آپ بہت دیر تک سوتے رہے جانے کا وقت بھی نکل گیا۔“

”مجھے پیاس لگی ہے شفیع کسی کے ہاتھ ٹھنڈا پانی بھیج دے اور ڈھلوں صاحب سے کہہ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے خان جی! میں ابھی کسی کو بھجواتا ہوں شربت دے کر۔“ یہ کہہ کر وہ واپس چلا گیا۔

کوئی دس منٹ بعد ڈھلوں صاحب وہاں آ گئے۔ ان کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا اس نے ہاتھ میں ایک بڑا سا بریف کیس اٹھا رکھا تھا۔

”لیں ہاشم صاحب! میں ڈاکٹر افضل کو لے آیا ہوں۔ یہ آپ کا حلیہ تبدیل کر دیں گے۔“ میں نے ان دونوں سے مصافحہ کیا تو ڈاکٹر بولا۔ ”آپ زیادہ خوبصورت بننا پسند کریں گے کہ زیادہ بدصورت؟“

”آپ کا مطلب ہے کہ میں پہلے ہی بدصورت ہوں؟“

ڈاکٹر ہنس دیا۔ بولا۔ ”نہیں میرا یہ مطلب نہیں ہے ہاشم صاحب بلکہ ڈھلوں صاحب نے جس ضرورت کا ذکر کیا ہے اس کے مطابق تو میں آپ کو ایسی صورت دے دوں گا جس سے آپ کو کوئی پہچان نہ سکے۔ آپ کو نمایاں نظر نہیں آنا چاہیے۔“

”ہاں یہ بہتر رہے گا۔“ ڈھلوں صاحب نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اتنے میں ان کا ایک ملازم ہمارے لیے شیشے کے خوبصورت جگ میں شربت لے آیا۔ میں نے تین گلاس بھر بھر کر حلق سے نیچے

اتار لیے۔ میری پیاس کسی طرح بجھتی ہی نہیں تھی۔

ڈاکٹر افضل اپنے کام کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اس نے سب سے پہلے میرے سر کے بال مونڈ دیے پھر اس نے اوپر کے میرے جبڑے کے اندر مسوڑھوں کے برابر ہموار کر کے ایک نرم و ملائم اور سفید، مگر ٹھوس ہڈی ایسی آدھ بالشت لمبی ایسی پٹی سی دانتوں کے ساتھ تار سے باندھ دی کہ میرا دایاں جبڑا بہت ابھرا ابھرا سا نظر آنے لگا۔ اس کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ میرا اوپر کا ہونٹ بھی بڑی حد تک اوپر اٹھ گیا۔ یہی عمل اس نے نچلے جبڑے پر بھی دہرایا۔ جب میں نے آئینے میں اپنی شکل دیکھی تو میں پریشان ہو گیا۔ میری شکل واقعی بدل چکی تھی اور جبڑے کا دایاں حصہ بائیں حصے کے مقابلے میں سوجا ہوا تھا۔ اور بہت ہی بدنما نظر آتا تھا۔ وہ عمل ایسا تھا... کہ مجھے قطعاً کوئی درد محسوس نہیں ہوا تھا۔ وہاں تک تو خیر غنیمت تھا مگر اس بدبخت نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور میرا نچلا ہونٹ دوا سے سُن کر کے اس نے اندر کی طرف ایک ٹانکا اس طرح لگا دیا کہ میرے ہونٹ پر سلوٹ سی پڑ گئی۔ ایسی سلوٹ جس میں سے میرے نچلے دانت صاف نظر آنے لگے تھے۔

"یہ زیادتی ہے ڈاکٹر! میرے دونوں ہونٹ آپس میں نہیں مل رہے ہیں اور مجھے بات کرنے میں دقت محسوس ہوتی ہے۔" میں نے احتجاج کیا۔

"آپ جلد ہی اس کے عادی ہو جائیں گے ہاشم صاحب یہ بہت ضروری ہے۔ آپ کا حلیہ اسی طرح بدل سکتا ہے۔ اب آپ کو کوئی بھی پہچان نہیں سکتا ہے۔"

ڈاکٹر نے مجھے بڑے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ میں واقعی بالکل بدل چکا تھا۔ اور میری گفتگو کا انداز بھی وہ نہیں رہا تھا۔ یہ بڑا ہی مکروہ عمل تھا جس میں سے ان لوگوں نے مجھے گزار دیا تھا۔ اور میں اس پر قطعاً خوش نہیں تھا۔

ڈاکٹر بولا۔ "آپ بائیں ہاتھ کے دانتوں سے کام لیں گے۔ دائیں طرف نوالہ کبھی مت ڈالیں۔"

"وہ تو میں دیکھ ہی رہا ہوں مگر یہ سراسر زیادتی۔ کیوں ڈھلوں صاحب؟"

وہ ہنس رہے تھے، بولے۔ "آپ کا چہرہ اور دہشتناک ہو گیا ہے ہاشم صاحب ذرا سیدھے کھڑے ہو جائیں ڈاکٹر صاحب آپ کا فوٹو لیں گے۔"

اُن کی یہ بات سُن کر ڈاکٹر نے بریف کیس سے کیمرہ نکال کر میری تین تصویریں اتاریں، بولا۔ "اب مجھے اجازت دیں ڈھلوں صاحب۔ کل شام تک ان کے کاغذات مکمل کر کے میں آپ کو بھجوا دوں گا۔ ان کا نام کیا ہوگا پاسپورٹ پر؟"

"نام؟ انہیں ہندی زیادہ نہیں آتی پشتو لب و لہجہ بھی یہ اختیار نہیں کر سکتے ورنہ میں نے سوچا تھا کہ ان کا نام عبداللہ خان اوڑک زئی رکھ دیں۔"

"میری مانیں تو ان کا نام وریام سنگھ رکھ دیں سر منڈے سکھ بھی تو ہوتے ہیں آج کل۔ یہ پگڑی باندھ کر اور کچھ کڑا کرپان لیکر باہر نکلیں گے تو بالکل وریام سنگھ نظر آئیں گے۔ ان کے سر پر پگڑی باندھ کر بھی دو فوٹو اتارتا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے ڈھلوں صاحب کی پگڑی کھول کر میرے سر پر باندھی اور میری تین تصویریں اس نے اور اتار لیں۔

ڈھلوں صاحب بولے۔ "نام کے بارے میں اب یہی طے رہا کہ ہم انہیں وریام سنگھ بنا دیں گے کل شام تک کاغذ یہاں پہنچا دیں۔"

"بے فکر رہیں مجھے اپنا فرض یاد ہے۔" یہ کہہ کر ڈاکٹر افضل اسی وقت مجھ سے مصافحہ کر کے ڈھلوں صاحب کے ہمراہ حویلی سے باہر نکل گیا۔

میں نے ایک بار پھر آئینے میں اپنی صورت دیکھی۔ ڈاکٹر نے مجھے ذلیل کر دیا تھا۔ میں بڑی حد تک بدصورت بن چکا تھا میرا نچلا ہونٹ کچھ اس طرح ٹانکے کی وجہ سے ٹیڑھا ہو گیا تھا کہ مجھے اپنا وہ روپ کسی بھی طرح پسند نہیں تھا مگر اس کے باوجود مجھے اپنے اس نئے چہرے سے سمجھوتہ کرنا پڑ رہا تھا کہ اس کے سوا کوئی چارہ کار ہی نہیں تھا۔

کوئی دس منٹ بعد شفیع گن مین میرے کمرے میں داخل ہوا اس کی نظر مجھ پر پڑی تو عجیب سی احمقانہ قسم کی حیرت اس کے چہرے پر ابھر آئی۔ اس نے فوراً ہی اپنی بندوق مجھ پر تان لی۔ میں اس وقت بھی سکھوں کی طرز ایسی پگڑی سر پر جمائے بیٹھا تھا۔ شفیع بڑے کڑکتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "کون ہے تو اوئے ادھر کیسے گھس آیا ہے، وہ ہاشم خان کہاں ہے؟" اس کے چہرے کا تحیّر دیدنی تھا۔ میں نے مسکرانے کی کوشش کی مگر محسوس یہ ہوا کہ میری مسکراہٹ بھی بدنما ہو گئی ہے۔

"دانت کیا نکوس رہا ہے بندر کی اولاد، تو ہے کون؟ کس کے ساتھ اندر آیا ہے تو؟" وہ مجھے قطعاً نہیں پہچان رہا تھا۔

"اوئے شفیعا گولی نہ چلا دینا کہیں خواہ مخواہ مار دے گا تو مجھے۔" میں نے بڑی مشکلوں سے اپنی آواز کا توازن برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ اس نے میری آواز سنی تو اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیلنے لگیں۔ اس نے آگے بڑھ کر بندوق کی نال میرے سینے پر رکھ دی۔

"اوئے تو میرا نام کس طرح جانتا ہے تو ہے کون؟"

"یار میں ہاشم خان ہوں، کچھ خدا سے ڈر مجھے بھی نہیں پہچانتا ہے تو نے؟"

"تم بکواس کرتے ہو، میں کیسے مان لوں کہ تم ہاشم خان ہو۔" اتنے میں باہر برآمدے میں قدموں کی چاپ ابھری اور پھر

ڈھلوں صاحب دروازے پر آ پہنچے۔ انہوں نے مجھے یوں بکری بنے دیکھا تو قہقہہ لگا کر بولے۔ "اوئے شفیع! یہ کیا کر رہا ہے تو! سردار وریام سنگھ کو مار دے گا تو، ہٹا بندوق پیچھے۔" یہ کہہ کر انہوں نے تیزی سے آگے بڑھ کر بندوق کی نال میرے سینے پر سے ہٹا دی۔

شفیع اب بھی کچھ نہیں سمجھ رہا تھا، بولا۔ "یہ پتہ نہیں کون ہے، چوہدری جی! ہاشم خان بھی یہاں نہیں ہیں۔"

"وہ ادھر ہی ہیں بھائی! اور ان کو اچھی طرح دیکھ یہ تمہارے ہاشم خان ہی ہیں، یہ دیکھ۔" یہ کہہ کر انہوں نے میرے سر پر بندھی پگڑی اتار دی میرے بال اور میری آنکھوں کے رنگ اور میری آواز پر غور کر کے شفیع بولا۔

"یہ... یہ کیا ہو گیا ہے انھیں چوہدری جی! یہ ان کی صورت کیسے بدل گئی؟"

"یہ بھی ایک راز ہے شفیع! ان کو اس حلیے میں ہم ایک خاص کام سے باہر بھیج رہے ہیں۔" ابھی وہ یہ بات کہہ ہی رہے تھے کہ ڈھلوں صاحب کی ڈیوڑھی کا ایک ملازم بھاگتا ہوا اندر آیا بولا۔ "چوہدری صاحب باہر ایک آدمی آیا ہے وہ ان سے ملنا چاہتا ہے۔" اُس نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا مگر پھر میرے چہرے پر غور کر کے کہنے لگا۔ "میرا مطلب ہے وہ غلام جیلانی سے ملنا چاہتا ہے کہاں ہیں وہ؟" وہ بھی مجھے دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا تھا میری آنکھیں اور میرے بال تو اسے یہ احساس دلاتے تھے کہ میں غلام جیلانی ہوں مگر جب اس نے میرے ہونٹ اور پھولا ہوا دایاں جبڑا دیکھا تو میری بگڑی ہوئی صورت نے اسے چکرا کر رکھ دیا۔

ڈھلوں صاحب مسکراتے ہوئے بولے۔ "کیا نام بتاتا ہے وہ آدمی؟"

"اس کا نام تاہیا ہے۔"

یہ نام سنتے ہی میں اچھل سا گیا۔ تاہیے کا وہاں تک آنا خالی از علت نہیں تھا۔

"اسے اندر لے آؤ بھئی جلدی جاؤ۔ مجھے یقین ہے ڈھلوں صاحب کہ وہ کوئی اچھی خبر نہیں لایا ہے۔"

"وہ کون سی خبر لا سکتا ہے آپ کا کیا تعلق ہے اُس سے؟"

"یہ تاہیا میرے دوست آبی کا جوڑی دار ہے۔ اس کا گزارا بھی ہوائی رزق پر چلتا ہے۔"

ڈھلوں صاحب مسکرا دیے، بولے۔ "ان لوگوں سے آپ کا میل جول مجھے حیران کرتا ہے آپ کا گزارا تو اس رزق پر نہیں ہے۔"

"مجھے ایسے لوگوں کی ضرورت رہتی ہے چوہدری صاحب! یہ درویش صفت لوگ ہوتے ہیں سر ہتھیلی پر لیے پھرتے ہیں۔ یہ نہ ہوں تو امیروں کے دل سے غریب کی دہشت ختم ہو جائے اور پرانے ٹھاکروں کی طرح غریبوں کی بیٹیاں آج بھی ان امیروں کی حویلیوں میں رات گزار کر سسرال جایا کریں۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"میرا مطلب صاف ظاہر ہے ڈھلوں صاحب! کسی بستی میں جس طرح امیر بھی دو چار ہی ہوتے ہیں، جو ہزاروں لاکھوں لوگوں کو افلاس اور احتیاج میں مبتلا رکھتے ہیں، اسی طرح وہاں ڈاکو بھی دو چار ہی ہوتے ہیں جو امیر آدمی کو اس خوف میں مبتلا رکھتے ہیں کہ وہ اُن کی دولت چھین بھی سکتے ہیں۔ اسی خوف کی وجہ سے ہمارے امرا ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھتے۔ ورنہ تو مجھے یقین ہے کہ اگر امیروں کو یہ خوف نہ ہو تو وہ خدا جانے غریبوں کو کس ذلت سے دوچار کر دیں۔ آدمی کی حرص کی کوئی حد ہی نہیں ہے اسی لیے اسے اسفل السافلین کہا گیا ہے۔"

"آپ کی گفتگو مجھے حیران کرتی ہے۔" وہ کچھ سنجیدہ سے ہو گئے۔

"آپ کو تو بالکل حیران نہیں ہونا چاہیے ڈھلوں صاحب! یہ اتنا بڑا وسیع و عریض علاقہ بلا شرکت غیرے آپ کی ملکیت ہے۔ آپ کچھ نہیں کرتے، ایک دانہ تک آپ خود نہیں اگاتے۔ ایک تنکا دہرا نہیں کرتے پھر بھی آپ شہنشاہوں ایسی زندگی گزار رہے ہیں یہ حق آپ کو کس نے دیا ہے؟ اتنے سارے گن مین اور خونخوار مستوں کی ایک فوج آپ نے بھرتی کر رکھی ہے محض اس لیے کہ کوئی ڈاکو آپ سے یہ آسائشیں چھین نہ لے کیونکہ آپ جانتے ہیں دل کی گہرائیوں سے سمجھتے ہیں کہ اس شہنشاہی کے آپ حقدار نہیں ہیں۔"

"یہ بہت ادق فلسفہ ہے ہاشم خان! آپ اپنا قیمتی دماغ ان باتوں پر نہ کھپایا کریں۔ ورنہ آپ کمزور ہو جائیں گے، لیں، یہ سگریٹ پئیں یہ امریکن ہے۔" انہوں نے اپنا طلائی سگریٹ کیس میرے آگے رکھ دیا۔ میں ابھی سگریٹ سلگا ہی رہا تھا کہ تاہیا، شفیع گن مین کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ وہ بہت پریشان تھا۔ پہلی نظر میں وہ بھی مجھے نہ پہچان سکا، بولا۔ "میں جیلانی صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔"

میں نے اُٹھ کر اسے بڑی محبت سے گلے لگایا۔ "میں ہی جیلانی ہوں یار، ذرا حلیہ بدل لیا ہے۔"

اسے یقین آ گیا۔ "کمال کا حلیہ بدلا ہے آپ نے میں تو حیران رہ گیا ہوں۔ آپ ذرا باہر چل کر میری بات سن لیں جیلانی صاحب! مجھے امید تھی آپ یہاں ہی ہوں گے۔"

"تمہیں کس نے بتایا کہ میں یہاں ہوں؟"

"مجھے آبی نے کہہ رکھا ہے کہ اگر اُس کے لیے یا آپ کے لیے

کوئی پیغام ہو تو میں یہاں پہنچ جاؤں۔"

"گڈ! یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ اِن سے ملو یہ ڈھلوں صاحب ہیں۔"

تاہیا بڑے پُروقار انداز سے آگے بڑھا اور مصافحے کے لیے ہاتھ پھیلا کر بولا۔

"آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی ڈھلوں صاحب ہم ایک بڑی مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔" یہ بات آپ ہی آپ اس کی زبان پر آگئی۔ ڈھلوں صاحب سے وہ بہت متاثر نظر آتا تھا۔

"کیا ہوا ہے مجھے بتاؤ معاملہ کیا ہے آبی تو خیریت سے ہے نا؟" میں نے اسے اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں! مگر وہ مجھے ملا ہی نہیں۔ میں اسے ہی ڈھونڈ رہا ہوں۔ بات یہ ہوئی ہے کہ آبی کی والدہ کو پولیس نے گرفتار کر لیا ہے۔"

"یہ ۔ ۔ ۔ یہ کیسے ہو گیا تاہیے انہیں کیوں پکڑ لیا ہے پولیس نے۔"

"وہ انور ہے نا! وہ جو کالج میں پڑھتا ہے اس نے پولیس کو سب کچھ بتا دیا۔ وہ کہتا ہے کہ جیلانی کے ساتھ جو آدمی کام کرتا ہے اس کا نام آبی ہے۔"

"مگر انور کو کیسے پتہ چلا کہ میرا نام غلام جیلانی ہے؟"

"پولیس نے آپ کی کچھ تصویریں اسے دکھائیں تو اس نے آپ کو پہچان لیا پھر اس نے انہیں یہ بھی بتا دیا کہ آبی کی والدہ کہاں رہتی ہے؟ اب پولیس آبی کو بھی گرفتار کرنا چاہتی ہے۔ اس کا سراغ لگانے کے لیے انھوں نے اس کی والدہ کو پکڑ لیا ہے گاڑی اور اس کے ساتھیوں کے معاملے میں بھی وہ آبی کو گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔"

"بیٹھ جا یار! یہ کوئی ایسی مشکل بات نہیں ہے ڈھلوں صاحب اس معاملے پر غور کریں۔ آبی کی والدہ کی فوری رہائی بہت ضروری ہے۔"

"کس تھانے میں رکھا ہے پولیس نے اسے؟" ڈھلوں صاحب نے پوچھا۔

"اسے انہوں نے شاید قلعے میں پہنچا دیا ہے مجھے ڈر ہے کہ وہ اس پر تشدد ضرور کریں گے۔"

"ہاں وہ چور کی ماں جو ٹھہری! کیا خیال ہے ہاشم صاحب مجھے اس معاملے میں دخل دینا چاہیے۔"

"یہ تو بہت ضروری ہے ڈھلوں صاحب! وہ مجھے اپنی سگی ماں کی طرح عزیز ہے۔ وہ اُن کے قبضے میں رہی اور وہ اسے ذلیل کرتے رہے تو پھر ۔ ۔ ۔ پھر ۔ ۔ ہم کیوں جئیں گے ڈھلوں صاحب! ہم ہم پتہ نہیں کیا کر دیں۔ یہ ناقابلِ برداشت بات ہے۔"

ڈھلوں صاحب مسکرا دیے بولے۔ "ٹھیک ہے۔ آپ فکر نہ کریں میں اسے رہا کروا دوں گا۔ آج رات میں شہر میں رہوں گا مگر اس کی رہائی کے بعد آپ اسے کسی اور جگہ منتقل کر دیں، یہ بہت ضروری ہے ورنہ وہ لوگ بار بار اسے پریشان کرتے رہیں گے۔"

"اس کی آپ فکر نہ کریں ڈھلوں صاحب! تاہیے! تم آبی کے ساتھ چلے جاؤ۔ ماں جی رہا ہو جائیں تو ان کو ساتھ لے کر تم میری والدہ کے پاس چھوڑ آؤ۔ پتہ میں تمہیں دے دوں گا! یہ کام ہو جانا چاہیے۔"

"مگر آبی سے مشورہ کیے بغیر تو ماں جی کو کسی جگہ نہیں بھیجنا چاہیے۔" تاہیے نے متذبذب لہجے میں کہا۔

"تم اپنے گھر جا کر دیکھو آبی وہیں ہوگا۔ وہ تم سے ملنا چاہتا تھا۔"

"ٹھیک ہے جیلانی صاحب میں تو اس وقت چوہدری صاحب کے ساتھ جاؤں گا۔ ماں جی رہا ہو لیں تو میں انہیں اپنے گھر لے جاؤں گا۔"

"میں کھانا بھجوا دیتا ہوں۔ وہ آپ کھا لیں پھر میں تمہیں ساتھ لے جاؤں گا تاہیے۔ کسی نہ کسی چکر میں تم مجھے پھنسا ہی دیتے۔"

"یہ آپ کا ہم پر بہت بڑا احسان ہوگا ڈھلوں صاحب۔"

"زیادہ باتیں نہیں کیا کرتے ہاشم صاحب! اطمینان سے بیٹھیے ہمارے دکھ سکھ سانجھے ہو چکے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئے۔

تاہیا بہت ہی پریشان تھا۔ اس کا آبی کے لیے وہ بے پایاں خلوص مجھے حیران کرتا تھا۔ وہ میرے سامنے کرسی پر بیٹھ کر بولا۔

"میرا آبی سے ملنا بہت ضروری ہے جیلانی صاحب! بتائیں وہ کہاں ہوگا۔"

میں نے اسے الماس کا پتہ بتا دیا۔ کچھ پریشان سا ہو گیا، بولا۔

"ادھر وہ کیسے جا پہنچا، وہ تو اسے نچوڑ کے رکھ دے گی۔ بہت ہائی کلاس عورت ہے وہ۔"

"نہیں یار! وہ آرٹسٹ ہے، ملک کی نامور اداکارہ ہے۔"

"دفع کریں جی! اداکاری بھی کوئی فن ہے؟ اگر ہے تو فن ہے۔ پہلے یہ کام بھانڈ کیا کرتے تھے اب وہ اتنے معزز بن گئے ہیں کہ اداکار اور آرٹسٹ کہلاتے ہیں۔ میں آبی کو اس چکر میں نہیں پڑنے دوں گا۔"

"خیال تو میرا بھی یہی تھا مگر وہ باز ہی نہیں آتا۔ اس نے باقاعدہ منگنی کر لی ہے اس سے۔"

"آبی کا دماغ خراب ہو گیا ہے اسے بیوی کی ضرورت نہیں کشتی کی۔ میں کل ہی اس سے ملوں گا۔ الماس کو تو میں خود گولی مار دوں گا۔ وہ تو خود کہا کرتا تھا ۔

پھل کھائیے تے باغوں کھائیے تے قاتل زہر نہ کھائیے
نیوں لائیے تاں تھاویں لائیے ایویں عزت فرق نہ پلے سے

وہ خود مجھے سمجھایا کرتا تھا، وہ عورت نہیں ہوائی جہاز ہے۔ آبی تو اس کے پٹرول کا خرچ بھی پورا نہیں کر سکتا۔" تاہیا بہت چراغ پا ہو رہا تھا۔

"وہ تو کہہ رہا تھا کہ میں اس کے لیے ڈیڑھ سو مربع زمین خرید دوں گا۔"

میری یہ بات سن کر تاہیا بے اختیار ہنسنے لگا، بولا۔ "اس ساڑھے پانچ فٹ کی زنانی کے لیے وہ ڈیڑھ سو مربع زمین خریدے گا۔ وہ اسلم دا بڑی۔ مجھے ذرا مل لینے دیں اس سے۔ حد ہو گئی ۔۔۔ یہ نہیں ہو سکتا جیلانی صاحب! میں اُسے سمجھاؤں گا۔"

اتنے میں کھانا آ گیا۔ تاہیا شاید بہت بھوکا تھا دسترخوان پر بڑھ بڑھ کر ہاتھ مارتا رہا۔ مجھ سے تو کچھ کھایا ہی نہیں جاتا تھا۔ ہونٹ کا ٹانکا درد پیدا کرتا تھا اور میرا دایاں جبڑا ابھی جام ہو رہا تھا۔

"آپ کی تو ادھر جوائیوں کی طرح خاطرداری ہوتی ہے جیلانی صاحب! کیا سنگھایا ہے آپ نے اس شملے خان کو؟"

"سنگھانا کیا تھا یار! بس یہ قدرداں آدمی ہے یہ ڈھلوں۔ اور میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں۔"

"ایک بات کہوں جیلانی صاحب! اپنا یہ حلیہ ختم کر دیں۔ آپ کو ان لوگوں نے بہت بدصورت بنا دیا ہے میں تو آواز سن کر اور آپ کی آنکھیں اور بال دیکھ کر ہی پہچان سکا تھا۔ یہ بڑی زیادتی ہوئی ہے آپ کے ساتھ۔"

"نہیں یار! مجھے کچھ عرصہ اسی طرح رہنا ہوگا، مجبوری ہے۔"

کھانا ختم کر کے ہم نے سگریٹ سلگا لیے۔ تاہیے کو میں کوشش کے باوجود آبی کا نعم البدل نہ سمجھ سکا۔ وہ بہت اچھا آدمی تھا۔ بڑا ہمدرد، بڑا مخلص، یاروں کا یار، مگر میں اپنے سارے دکھ اس کے سامنے کھول کر نہیں رکھ سکتا تھا۔ اور یہی میری سب سے بڑی غلطی تھی۔ کیونکہ بعد کے واقعات نے یہ بات ثابت کر دی تھی کہ اس پر اس رات اپنے منصوبے کو ظاہر نہ کر کے میں اس کے بڑے ہی قیمتی اور ٹھوس تعاون سے محروم رہ گیا تھا۔

کوئی آدھ گھنٹے بعد وہ ڈھلوں صاحب کے ساتھ شہر روانہ ہوا تو میں بتی بجھا کر لیٹ گیا۔ نیند کی وہ جھپکی بڑی غنیمت تھی۔ کیونکہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ کل کی رات مجھے کس جگہ اور کن حالات میں کہاں ملے گی۔ میرا حال تو اس پرندے کا سا تھا۔ جو رات کی تاریکی بے اتھاہ ہونے کے بعد آسمان سے اترا اور بھول گیا کہ اس کا گھونسلا کہاں ہے۔

دوسرے دن ڈھلوں صاحب عصر کے قریب شہر سے واپس آئے۔ تاہیا اُن کے ساتھ نہیں تھا۔ وہ گاڑی سے اترے اور سیدھے میرے پاس آ پہنچے۔ چھوٹتے ہی بولے۔ "آبی کی والدہ کو تو میں نے رہا کروا دیا ہے جیلانی صاحب اور اب تاہیا اسے اپنے ساتھ لے گیا ہے۔"

"یہ تو بہت ہی اچھا ہوا ڈھلوں صاحب بیچاری بہت پریشان ہو گئی ہو گی۔"

"ہاں! بہت بُری طرح رو رہی تھی وہ بیچاری۔ میرا خیال ہے کہ اُسے اپنے بیٹے کے کاروبار کے متعلق کچھ بھی پتہ نہیں ہے۔"

"ہاں! یہ درست ہے، آبی نے اسے کبھی کچھ نہیں بتایا۔ وہ کبھی گرفتار بھی نہیں ہوا بہت کاریگر آدمی ہے۔"

"مجھے بھی یہی احساس ہوتا ہے۔ اگر ممکن ہوتا تو اُسے آپ کے ساتھ انڈیا بھیج دیتا۔"

"وہ خود وہاں پہنچ جائے گا، اس نے مجھ سے وعدہ کر رکھا ہے۔"

"یہ بہت اچھا ہوگا جیلانی صاحب! مجھے یقین ہے کہ وہ آپ کے بہت کام آ سکتا ہے بہرحال یہ لیں، یہ رہا آپ کا پاسپورٹ یہ رہے دوسرے کاغذات۔ یہ ہے وہ فہرست۔ یہ چار آدمی ہیں آپ اِن کو کسی طرح ادھر پہنچا دیں۔ اِن لوگوں کو ہم انہی کے ہتھیار سے ماریں گے۔"

"آپ کو پتہ ہے کہ وہ لوگ اس کام کے لیے اپنے ماہر جاسوس ادھر بھیج دیتے ہیں؟"

"مجھے معلوم ہے مگر ہم بھی تو اپنا ایک بہترین آدمی اُن پر مسلط کر رہے ہیں۔ یہ چار انگوٹھیاں ہیں خالص سونے کی ہیں یہ پہن لیں کسی بھی وقت آپ کو ضرورت پڑ سکتی ہے۔" یہ کہہ کر انہوں نے مجھے چار طلائی انگوٹھیاں دے دیں۔ وہ میں نے پہنیں تو معلوم ہوا کہ وہ میرے ہی لیے بنائی گئی تھیں وہ میرے دونوں ہاتھوں پر سج گئیں۔

ڈھلوں صاحب کافی دیر تک مجھے مختلف ہدایات دیتے رہے معلوم یہ ہوا کہ پاسپورٹ میں میرا نام رمیش مہتہ لکھوایا، بولے "آپ ہندو کی حیثیت سے وہاں جائیں گے۔ سکھ بننے کے لیے آپ کے لمبے بال ہونے ضروری تھے۔ آپ ایک آزاد خیال ہندو کی حیثیت سے زیادہ بہتر طور پر کام کر سکیں گے۔"

"آپ نے جو کام میرے سپرد کیا ہے ڈھلوں صاحب وہ میں آسیہ کی رہائی کے بعد ہی شروع کر سکوں گا۔ وہ پھانس میرے دل میں چبھی رہی تو میں کچھ بھی نہیں کر سکوں گا۔"

"ہاں میں سمجھتا ہوں۔ اور مجھے امید ہے کہ آپ اس تک جلدی پہنچ جائیں گے۔ اس بلبیر سنگھ کو پکڑ لیں وہاں جاکر۔"

"میں سب سے پہلے یہی کروں گا۔" میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا، اور پھر تمام چیزیں میں نے سنبھال کر رکھ لیں۔

اگلے دن صبح دس بجے ڈھلوں صاحب کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے میں لاہور سے امرتسر جانے والی گاڑی میں جا بیٹھا جو گوٹھ سے میں تنہا ہی باہر نکلا تھا۔ اس روز ڈھلوں صاحب نے مجھے اپنی گاڑی بھی فراہم نہیں کی۔ ڈر انہیں یہ تھا کہ کوئی اُن کے حوالے سے مجھے پہچان نہ لے۔ اس نئے حلیے میں تو بہر حال مجھے بہت محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ کاغذات میرے سب کے سب جعلی تھے۔ اُس ڈاکٹر نے میرے نچلے ہونٹ پر ٹانکا لگا کر مجھے مصیبت میں ڈال دیا تھا۔ اوپر کے جبڑے پر دائیں طرف کی ڈاڑھوں کے ساتھ اُس نے جو سفید سا نرم نرم جوڑ لگا دیا تھا اُس کی وجہ سے میں اُن ڈاڑھوں کو استعمال نہیں کر سکتا تھا مگر اتنی ساری اذیت میں نے آسیہ کی خاطر بخوشی سہہ لی۔ اُس کے لیے تو مجھے اپنی آنکھیں بھی بیچنا پڑتیں تو میں بیچ دیتا۔ میں اُسے کسی بھی قیمت پر دشمنوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ مجھ سے بلاشبہ بہت بڑی غلطی ہوگئی تھی۔ میں اس بھنڈاری کی بیٹی کو صحرا میں اتار لیتا تو انہیں آسیہ پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ ہوتی۔ انہوں نے مجھے میری روشنی طبع کی سزا دینے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ وہ اپنی اس شکست کا بدلہ لینا چاہتے تھے۔ انہیں غصہ یہی تھا کہ میں اُن کے ہاتھ سے بچ کر کیسے نکل گیا۔ میں نے ان کی بات کیوں نہیں مانی حالانکہ مجھے وہ بہت بڑا لالچ دے چکے تھے، میں اُن کے بھرے میں کیسے آجاتا۔ میں اپنے ہم وطنوں کا سودا اُن سے کیسے کر لیتا۔ کیسے میں اپنے ملک کے مفاد کو اُن کے ہاتھ بیچ دیتا۔ یہی وجہ تھی کہ میں جوں توں کر کے وہاں سے نکل آیا تھا مگر اب وہ ایسے بے وقوف نہ ہو سکتے تھے کہ پھر سے مجھے وہ اسی راہ پر چلنے کی دعوت دیتے۔ انہوں نے آسیہ کو اس لیے اٹھایا تھا کہ میں اس کے تعاقب میں حد عبور کر کے ان کے سامنے جا پہنچوں وہ یہی چاہتے تھے اور مجھے یقین تھا کہ اب کی بار وہ مجھے زندہ واپس نہیں آنے دیں گے وہ میرے خون سے کم پر راضی نہیں ہوں گے اور میں آسیہ کی رہائی کے لیے اپنی جان بھی ہار دینے کے لیے تیار تھا۔ بلبیر سنگھ نے اپنی دھمکی پر عمل کر کے دکھا دیا تھا اور میرے ذہن میں جب بھی اس کا نام ابھرتا تھا میرا سارا جسم بھٹی کی طرح دہکنے لگتا تھا۔ اگر مجھے معلوم ہوگیا بلبیر سنگھ کہ تم میں سے کسی نے آسیہ کی طرف میلی آنکھ سے دیکھا ہے تو میں وہ آنکھ خانے ہی سے نکال دوں گا۔ میں تم میں سے کسی کو بھی معاف نہیں کروں گا کیونکہ میں نے تمہارا کوئی نقصان نہیں کیا۔ تمہارے خلاف کچھ بھی تو نہیں کیا ہے میں نے۔

میں تو راستی پر اس حد تک قائم رہا کہ بھنڈاری کی اس خوبصورت اکیلی بیٹی کو بھی بلا گزند واپس جانے دیا اس سے زیادہ تمہیں میری اور میری شرافت کا ثبوت اور کہاں مل سکتا تھا۔

سات ڈبوں کی وہ گاڑی جب لاہور سے چلی تو میرے مشکوٰۃ کی ساری شمعیں فروزاں تو تھیں مگر اُن کی لویں لرز رہی تھیں۔ امید و بیم کی عجیب سی کیفیت میرے ذہن پر طاری تھی۔ سب سے زیادہ پریشانی مجھے یہ تھی کہ اگر کسی مرحلے پر میرے وہ جعلی کاغذات کسی نے پہچان لیے تو کیا ہوگا مگر نہیں۔ ڈھلوں صاحب نے اپنا گوہرپن بہت سوچ سمجھ کر تیار کیا تھا۔ میری اس بھارت یاترا میں اُن کی اپنی غرض بھی پھنسی تھی۔ اور مجھے معلوم تھا کہ جو انہوں نے کیا ہے اس میں بڑے صاحب کی رضا بھی شامل تھی۔ تقدیر مجھ سے لاپرواہی نہیں کر سکتی تھی اب میں آسیہ کو بلا آخر آفت سے محفوظ کر لینے کے آہنی عزم سے بھارت کی طرف جا رہا تھا اور مجھے یقین تھا کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ میں تو کسی کو اجاڑنے کے لیے نہیں جا رہا تھا۔ وہ کام جو مجھے ڈھونڈنا تھا اس کا گناہ ثواب اُن کے سر تھا۔ وسیع تر ملکی مفاد پیشِ نظر میں نے ہامی بھر لی تھی ورنہ میں اس بکھیڑے میں نہیں چاہتا تھا۔

اس روز گاڑی میں کابل سے آئے ہوئے سکھوں کی کافی تعداد تھی۔ مگر وہ اتنا عرصہ اُن افغانوں کے درمیان رہنے کے باوجود سکھ ہی رہے تھے۔ اُن کی بول چال اُن کا اندازِ نشست و برخاست سب کا سب بولتا تھا کہ وہ سکھ ہیں۔ اُن کے لباس اور اُن کا پھیلا ہوا سامان یہ بتاتا تھا کہ وہ خاصے متمول لوگ ہیں۔ کابل میں اُن کے کاروبار بڑے متنوع قسم کے تھے۔ ملازمت پیشہ وہ ہرگز نہ تھے۔ اُن کی گفتگو سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کابل میں خاص مقاصد کے تحت در گروہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ ہندو اُن میں خال خال ہی تھے۔ عزیز و اقارب کاروں میں سوار ہو کر واہگہ سے آگے جا چکے تھے جو کاروں میں نہ سما سکتے تھے، گاڑی میں سفر کر رہے تھے۔

میرے قریب ایک ادھیڑ عمر کا سکھ بیٹھا تھا۔ اس کی داڑھی ناف تک لٹکی ہوئی تھی۔ سر پر اس نے کیسری رنگ کی پگڑی باندھ رکھی تھی۔ سفید چوڑی دار پاجامہ اور کھلی آستین کا کرتہ اس کے دُہرے بدن پر خوب سج رہا تھا۔ اُس کے پسینے سے عجیب سی ایسی ٹھنڈی ٹھنڈی بُو اٹھ رہی تھی۔ وہ اپنے قریب بیٹھے ضعیف العمر سکھ سے باتیں کرتے کرتے ایک دم رونے لگا۔ موٹے موٹے آنسو اس کی آنکھوں میں اُبل پڑے بولا۔ "بھائی سب تقدیر کی مار ہے میرے مکھن سنگھ کے مرنے کے دن"

"مگر سردار جی ہوا کیا تھا اُسے وہ تو بہت سوہنا جوان

دیتا نہیں یار! میری بیٹی کا خط آیا پہلے اس نے تار دیا تھا مگر وہ مجھے ملا ہی نہیں۔ خط میں اس نے لکھا کہ مکھن سنگھ کو کسی ڈاکو نے مار دیا ہے۔ وہ سب انسپکٹر تھا اور اب انسپکٹر ہونے والا تھا۔"

"کوئی پولیس مقابلہ ہوا تھا؟"

"نہیں بھائیا جی! اُدھر بھنڈاری صاحب کی کوٹھی پر وہ ڈیوٹی دے رہا تھا۔ اُسے نہ گولی لگی نہ چاقو۔ بس کہتے ہیں کہ ڈاکو نے اُس کا گلا گھونٹ دیا مگر یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی ہے سرجیت میاں! کوئی بچہ تھا وہ۔ بڑا گبھرو جوان تھا وہ میرا جوائی۔ اس کا گلا کون گھونٹ سکتا تھا۔"

"پر سورن سنگھ جی خط میں اور بھی تو کچھ لکھا ہوگا؟"

"اس نے لکھا تھا کہ وہ ڈاکو کوئی پاکستانی اسمگلر تھا۔ وہ اسی دن بھنڈاری کو اغوا کر کے پاکستان لے گئے تھے ایک ہیلی کاپٹر میں۔ اور بھائیا جی وہ ہیلی کاپٹر بھی اِن نامردوں نے خود اُسے دیا۔ ہاں! یہ بندر کی اولاد، یہ لالے بڑے سُور ملتے ہیں۔ اِن اسمگلروں نے بھنڈاری، اس کی بیوی اور بیٹی کو پستولوں کی زد میں لے کر کہا۔ ہمیں ہیلی کاپٹر سپلائی کرو ورنہ ہم اِن کو جان سے مار دیں گے اور اُن کی دھوتیاں ڈھیلی ہوگئیں۔"

"اچھا اچھا یہ وہی کیس ہے۔ میں نے اخبار میں تفصیل پڑھی تھی سورن سنگھ جی! وہ مکھن سنگھ آپ کا داماد تھا۔ حد ہوگئی بھائی جی۔ تو اب آپ اسی سلسلے میں امرتسر جا رہے ہیں۔" سرجیت سنگھ نے بات سمجھتے ہوئے کہا۔

"ہاں بھائیہ جی! اب کوشلیا کو میں اپنے ساتھ ہی کابل لے جاؤں گا اس کی تو جندگی برباد ہوگئی۔"

سورن سنگھ نے یہ کہہ کر اپنے کیسری رنگ کے پرنے سے آنکھیں پونچھیں اور میرے سگریٹ کے دھوئیں سے بیزار ہو کر بولا۔

"لالہ جی! ہم پر کرپا کریں اور یہ سرگٹ بازی بند کر دیں۔" یہ کہہ کر وہ اپنی کرپان کے چمکتے ہوئے چرمی غلاف پر پرزنا پھیرنے لگا۔ میں نے سگریٹ بجھا دی۔ مجھے اس سے الجھنا نہیں تھا۔ سگریٹ سے اُس کی نفرت میری سمجھ میں آ رہی تھی۔

"مجھے شما کریں سردار جی! مجھے یاد نہیں رہا تھا۔ آپ کا داماد تھا وہ مکھن سنگھ؟ آپ کی باتیں سن کر مجھے بہت افسوس ہوا ہے۔"

"ہاں مہاراج! بس ہونی اپنا کام دکھا گئی کوئی کیا کر سکتا ہے۔"

"گھر کہاں ہے آپ کا؟"

"ہم اُدھر امرتسر میں مہان سنگھ کے کٹڑے میں رہتے ہیں میں نے اپنا جدی پشتی مکان اپنی بیٹی کو دے رکھا ہے۔"

"اس بھنڈاری کو تو مار دیا ہوگا اُن لوگوں نے۔" میں نے جان بوجھ کر پوچھا۔

"نہیں جی! وہ سالا اُن کی منت سماجت کر کے بچ نکلا۔ ایسی مضبوط رشوت تھی اس کے پاس کیسے نہ بچتا؟" سرجیت سنگھ نے بڑے جلے بھنے لہجے میں کہا۔

"مگر وہ اُسے کیوں لے گئے، کیا چاہتے تھے وہ اُس سے؟"

"کیا پتہ کیا چاہتے تھے۔ اپنی جان بچانے کے لیے وہ اس کو باندھ کر لے گئے اور گورنمنٹ اُن کے آگے بے بس ہوگئی۔"

یہ کہہ کر وہ اُٹھا اور بیت الخلاء میں جا گھسا۔

اُس کی باتیں مجھے حیران کر گئی تھیں۔ وہ اس انسپکٹر کا خسر تھا جسے میں نے اس روز بھنڈاری کی کوٹھی کے غسل خانے میں دوسرے انسپکٹر سمیت بے ہوش کر دیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میرا ہاتھ کچھ زیادہ ہی سخت پڑ گیا تھا۔ اور میں نے اس کی رگِ احساس ہی نہیں ملی بلکہ اس کی سانس کی نالی بھی کچل دی تھی۔ وہ حبسِ دم کی وجہ سے وہیں مر گیا تھا۔ یہ بڑی ہی خوفناک بات تھی۔ اس کی وہ المناک موت ہی امرتسر کی پولیس کو پاگل کر گئی تھی۔ یہ نہی کا اشارہ تھا جس پر عمل کر کے وہ سمبل حرکت میں آگئی تھی اور وہ لوگ اب سر کے بدلے میں سر کا مطالبہ کر رہے تھے۔ وہ اس بات کا تہیہ کیے بیٹھے تھے کہ جس طرح بھی ہو سکا وہ جیلانی کو پکڑ کر مکھن سنگھ کی موت کا اس سے انتقام ضرور لیں گے میری بہن آسیہ کو بھی اُن لوگوں نے اسی لیے کبیر شاہ کے گھر سے اٹھوا لیا تھا۔ انتقام کی آگ نے انہیں اس حد تک اندھا کر دیا تھا کہ انہوں نے وہاں اپنا ایک آدمی ضائع بھی کروا لیا مگر وہ اپنے منصوبے کو ترک کرنے پر آمادہ نہ ہو سکے۔ مجھے یقین تھا کہ اس ہولناک صورتِ حال میں سب سے زیادہ اہم کردار یا تو اس بھنڈاری نے ادا کیا ہے یا بلبیر سنگھ نے جسے میں بلال آغا کے روپ میں بہت عرصہ پہلے نولکھا نہانے میں دیکھ چکا تھا۔

مجھے اس بوڑھے سورن سنگھ کے غم کی فراوانی نے پریشان کر دیا تھا۔ اسے بیٹھے بٹھائے ایک ایسا زخم لگ گیا تھا جس کا اندمال کسی طرح ممکن نہیں تھا مجھے اپنے اناڑی پن پر بھی غصہ آنے لگا تھا۔ میں نے پولیس کے اُن دونوں آدمیوں کی گردنوں پر شاید بہت ہی غلط ہاتھ مار دیا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے تو ایسا کبھی نہ ہوا تھا۔ میرا گرایا ہوا آدمی مر مرا کر پھر اُٹھ جاتا تھا۔ کسی کو ضیقِ دم کی شکایت نہ ہوئی تھی سیکڑوں لوگوں پر میں اپنا وہ حربہ استعمال کر چکا تھا۔ پھر... پھر ایسی کیا بات تھی کہ مکھن سنگھ جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ لاشعوری طور پر میرا دھیان اپنی انگلیوں پر مرکوز ہو گیا۔ میں نے اپنی ہتھیلی پھیلا کر اپنے سامنے رکھ لی یوں جیسے میں اپنی تقدیر پڑھنے کی کوشش کر رہا ہوں مگر میرا ہاتھ تو ذرا بھی نہیں بدلا تھا۔ میری انگلیاں تو ویسی ہی تھیں۔

سورن سنگھ واپس آکر اپنی نشست پر بیٹھا تو بڑی حد تک

اپنے غم پر قابو پا چکا تھا۔ اس کی داڑھی بھیگی ہوئی تھی جس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ منہ دھو کر باہر نکلا ہے۔ میں نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔ "میرا نام رمیش مہتہ ہے سردار جی! آپکی دُکھ بھری کہانی سُن کر مجھے بہت افسوس ہُوا ہے۔ میں آپ کی کوئی سیوا کر سکوں تو مجھے خوشی ہوگی۔"

"نہیں کاکا جی! واہگورو کا دیا میرے پاس سب کچھ ہے۔ بڑی دَیا ہے مجھ پر واہگورو کی۔ بس یہ جخم جو لگ گیا ہے نا یہ مٹ نہیں سکتا۔ وہ مُسلا مِل جائے تو میں اُس کا "کھون" پی لوں۔"

"میرا گھر سری گوبند پور میں ہے سردار جی! میں دھلگے کا کاروبار کرتا ہوں مہینے میں بیس دن میرے امرتسر میں گزرتے ہیں۔"

"بڑی کھوشی ہوئی آپ سے مِل کر۔ میں اب دس پندرہ دن ادھر رہ کر واپس چلا جاؤں گا۔ پیچھے میں اپنے چندر سنگھ کو چھوڑ آیا ہوں۔ میری وہاں منیاری کی دکان ہے کابل میں۔ چندر سنگھ میرا بیٹا ہے اور وہی میرا سب کچھ ہے۔"

"مہان سنگھ کے کٹڑے میں آپ کس مکان میں رہتے ہیں؟"

"پانچ سو گیارہ نمبر مکان ہے جی ہمارا۔ تین سال پہلے کوشلیا کی ماں کا بھی اُدھر دیہانت ہو گیا تھا۔ اب مکھن سنگھ بھی چل بسا بھگوان کی یہی اِچھا تھی۔"

یہ کہہ کر وہ اپنے دائیں ہاتھ بیٹھے آدمی سے ٹوٹی پھوٹی پشتو میں باتیں کرنے لگا۔ میں نے اُن کی طرف سے توجہ ہٹا لی۔ مجھے ڈر تھا کہ میری کسی بات سے سورن سنگھ پر کہیں یہ ظاہر نہ ہو جائے کہ اس کے داماد مکھن سنگھ کی موت کا اصل ذمہ دار میں ہوں۔ میری ذہنی حالت بہت ہی ابتر تھی۔ کئی اندیشوں نے مجھے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ صورت حال اتنی غیر یقینی سی تھی کہ میری ذرا سی غلطی مجھے کسی زبردست مصیبت میں پھنسا سکتی تھی۔

کوئی دو ڈھائی گھنٹے میں ہم امرتسر پہنچے۔ اس گاڑی کے تمام مسافروں کے کاغذات کی وہاں بھی پڑتال کی گئی۔ اس امتحان سے سرخرو ہو کر جب میں اسٹیشن سے باہر نکلا تو میں نے تہہ دل سے خدا کا شکر ادا کیا کیونکہ یہ قانونی موشگافیاں میرے بس کا روگ نہیں تھیں۔ سب سے بڑی مشکل مجھے یہ درپیش تھی کہ ٹانکے کی وجہ سے میرا نچلا ہونٹ کچھ سُوج گیا تھا۔ ڈاکٹر نے مجھے درد کے لیے جو مرہم دی تھی وہ میں نے دوبار لگائی۔ اس سے درد کا احساس تو ختم ہو جاتا تھا مگر ٹانکا میرے گوشت میں فساد پیدا کر رہا تھا۔ اسٹیشن سے باہر نکل کر میں نے ڈاکٹر کی دی ہوئی دو گولیاں نگل لیں وہ اینٹی بائیاٹک تھیں اور زخم میں پیپ پیدا نہیں ہونے دیتی تھیں۔

اسٹیشن سے باہر نکل کر میں نے ایک ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا کھایا کھانے کے بعد میں نے چائے منگوائی تو میرا میرے ارد گرد عجیب پُراسرار انداز میں منڈلانے لگا۔ وہ کوئی کشمیری چھوکرا تھا۔ بڑا ہی نٹ کھٹ، بڑا تیز طرار۔ کپڑے اس نے بہت صاف ستھرے پہن رکھے تھے۔ اور اس کی آنکھوں میں کاجل مجھے حیران کرتا تھا۔ عمر اُس کی یہی کوئی سولہ سال ہوگی، بولا "بابو جی میرا نام پرشوتم ہے کوئی ہم بتائیں ہم آپ کا دِل خوش کرے گا۔"

"تو کیسے دل خوش کرتا ہے بھئی! کوئی خاص مشین ہے تیرے پاس دل خوش کرنے کی۔"

"ابے جا چائے لا میرے لیے اور مجھے یہ بتا کہ وہ رتنا میوزک ہال کدھر ہے؟"

"ہائے! میرا اندازہ درست تھا بابو جی! آپ موج میلے کے شوقین ہیں۔ بالک رام جی سے میں نے بھی چھ مہینے تک گانا سیکھا ہے۔"

"پھر تو اِدھر کیا کر رہا ہے؟"

"بس وہ دھندا چل نہیں سکا۔ مجھے تھرکنا نہیں آیا۔ دو اُلٹے سیدھے ہاتھ مار لیتا ہوں۔ گانا بھی میں نہ سیکھ سکا۔" وہ اداس ہونے لگا۔

"چل تو مجھے بالک رام سے ملوا دے۔ تیرا تو وہ بڑا گہرا دوست ہوگا۔"
اس کی آنکھوں میں چمک سی ابھری اور میری طرف جُھک کر بولا

"ہاں تھا وہ میرا بہت ہی گہرا دوست مگر بہت بدمعاش نکلا۔ لاہور اسٹیشن میرے ساتھ چلنے کے بعد اس نے ڈبہ بدل لیا۔ بہرحال میں آپ کو اس سے ملوادوں گا پہلے چائے پی لیں۔" یہ کہہ کر وہ دوسری طرف نکل گیا۔

کوئی دس منٹ بعد وہ اپنے مالک سے اجازت لے کر میرے ساتھ ہوٹل سے باہر نکلا اور اسٹیشن سے کوئی چار فرلانگ دور جا کر ایک بڑی سی تین منزلہ عمارت کے اندر داخل ہو گیا۔ اسی کی نچلی منزل کے ایک دروازے پر رتنا میوزک ہال کا بورڈ لگا تھا۔ پرشوتم میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اس دروازے میں لے گھسا۔ اس کی ہر حرکت مجھے احساس دلاتی تھی کہ وہ مجھے کسی خاص بات پر اُکسا رہا ہے۔ اسے دیکھ کر مجھے پشاوری نخیتیے یاد آ رہے تھے۔ وہ کچھ زیادہ ہی قریب ہونے لگا کیونکہ جس راہداری میں سے وہ مجھے گزار رہا تھا وہ بہت ہی تاریک تھی اور وہ اُن لوگوں میں سے تھا جنھیں اندھیرا زندگی بخشتا ہے۔ میں نے اُسے ایک جگہ روک کر دونوں شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔

"دفع ہو جاؤ یہاں سے میں ایک قدم تمھارے ساتھ نہیں چل سکتا۔ چل بھاگ جا اِدھر سے جاتا ہے کہ نہیں۔" میرے لہجے کی گرج نے اسے مفلوج کر دیا۔ وہ میرے رویے سے لرزنے لگا۔ "جاتے ہو کہ نہیں۔" میں نے پھر اُسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ میری آ[illegible]

ایک دروازہ کھُلا تو راہداری میں روشنی پھیل گئی۔ ایک گھٹے ہوئے ٹھگنے قد کا آدمی باہر نکل آیا تھا۔ وہ سفید کھدر میں ملبوس تھا۔ آنکھوں پر اپنی سنہری فریم کی عینک درست کرتے ہوئے بولا۔

"کیا بات ہے مہاراج خیر تو ہے! ارے تو؟ پرشوتم یہاں کیسے آیا تو؟"

"یہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں بالک صاحب! ہمارے ہوٹل میں آپ کا پتہ پوچھ رہے تھے۔"

"اچھا! پر یہ تمھیں کیوں ڈانٹ رہے ہیں خیر تو ہے، کیسا بات ہے مہاراج؟"

"بہت خبیث لڑکا ہے یہ! دفع ہو جا اوئے یہاں سے خواہ مخواہ دو جمع آٹھ سولہ بتا رہا تھا مجھے۔"

میری یہ بات سنتے ہی بالک رام نے اپنی عینک اتار کر مجھے بڑے غور سے دیکھا اور بولا

"تو جا پرشوتم! اور دیکھ دو جمع آٹھ سولہ نہیں بلکہ دو ضرب آٹھ سولہ ہوتے ہیں۔"

"مجھے گنتی آتی ہے بابو جی! البتہ ان کو گنتی سکھلانے کی ضرورت ہے۔" یہ کہہ کر وہ لڑکا تیزی سے پیچھے ہٹا اور پھر ایڑی پر گھوم کر دوسری طرف بھاگ نکلا۔

بالک رام نے میرے کندھے پر بڑی رسان سے ہاتھ رکھا اور بولا۔ "یہ سالا بہت بدمعاش ہے! اپنی پاکٹ دیکھ لیں کہیں یہ واقعی دو جمع آٹھ سولہ نہ بنا چکا ہو۔"

میں نے احتیاطاً اپنی جیبیں ٹٹول لیں میری رقم بہت مختصر سی تھی محفوظ ہی تھی اور کاغذات بھی۔ لاہور سے روانہ ہونے سے پہلے میں نے اپنی جیب میں موجود تمام روپے بینک میں جمع کروا دیے تھے۔ مجھے زادِ سفر کے لیے اتنی ہی رقم ساتھ رکھنی چاہیے تھی، جتنی قانونی طور پر مجھے دی گئی تھی۔

"نہیں بالک رام جی! میری ساری چیزیں میرے پاس محفوظ ہیں۔"

"تو پھر آئیے! پدھاریے! آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔"
یہ کہہ کر وہ مجھے سامنے کے کمرے میں سے گزار کر عقبی کمرے میں لے گیا۔ وہ کمرہ ٹھنڈا تھا۔ لُو کا اثر وہاں تک نہیں پہنچ رہا تھا۔ چھت میں پنکھا لگا تھا جس کے عین نیچے ایک پلنگ بچھا تھا۔

بالک رام نے دائیں ہاتھ دیوار کے ساتھ لگی کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تشریف رکھیں مہاراج! یہ سارا جھگڑا دو ضرب آٹھ سولہ کا ہے آپ اس لڑکے سے بچ نکلے ورنہ یہ اپنے شکار کو ذلیل کر دیتا ہے۔ آدمی کے ساتھ چلتے چلتے اچانک بھرے بازار میں شور مچا دیتا ہے اور اس کا شکار اپنی جان چھڑانے کے لیے سب کچھ اس کے سپرد کر کے بھاگ نکلتا ہے۔ یہ آدمی کی عزت پر حملہ کرتا ہے۔"

"میں اس سے پھر ملوں گا بالک رام جی! کوئی سبق تو اسے ملنا ہی چاہیے۔"

"خیر، دیکھا جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ وہ اب آپ کا راستہ نہیں کاٹے گا۔ آپ سُنائیں کیسے زحمت فرمائی آپ نے؟"

"میں کوئی پیشہ ور آدمی نہیں ہوں بالک رام جی! اور مجھے امید ہے کہ آپ مجھے پہچان گئے ہوں گے۔"

بالک رام نے مجھ سے چند مخصوص قسم کے سوالات پُوچھے۔ جن کا مقصد یہ تھا کہ میں خود کو اُن پر پوری طرح ظاہر کر دوں۔ مجھے اچھی طرح شناخت کر لینے اور امرتسر میں میرے کام کی نوعیت سمجھ کر وہ بولا۔ "آپ نے کمال کر دیا ہے مہتہ صاحب! ادھر تو کھلبلی مچ گئی تھی اس ہیلی کاپٹر کی وجہ سے۔ تمام خبریں حکومت نے دبا دیں پھر بھی لوگ سمجھ گئے کہ ہُوا کیا ہے اور اب وہ آپ کا سر طلب کرتے ہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ ساوتری کو انھوں نے اسی مقصد کے لیے وہاں بھیجا تھا۔"

"ہاں! مگر اس کے بارے میں میری معلومات بالکل صفر تھیں ورنہ میں چوہدری صاحب کو خبردار کر دیتا۔ آپ نے اس معاملے میں بھی انھیں زبردست چوٹ دی ہے۔"

"میرا تو خیال ہے کہ اس قصے میں بھنڈاری اور اس کے ساتھیوں کو حکومت کی اعلیٰ سطح سے مکمل تعاون حاصل ہے۔ یہ منصوبہ محض ایک متعصب جماعت کا منصوبہ نہیں ہے۔"

"میں کچھ کہہ نہیں سکتا مگر مجھے کوئی ٹھوس ثبوت نہیں مل سکا ہے۔ ایک بات آپ مجھے بتائیں آپ نے اپنا حلیہ تبدیل کر رکھا ہے یا آپ کی صورت ہی ایسی ہے کیونکہ وہ لوگ یہی کہتے رہے ہیں وہ دونوں جوان بڑے خوبرو ہیں۔"

"نہیں! میں نے حلیہ تبدیل کر رکھا ہے۔"

"یہ آپ نے بہت اچھا کیا۔ آپ کا خیال یہ ہے کہ آپ کی بہن کو بلبیر سنگھ کے اشارے پر اغوا کیا گیا ہے۔"

"ہاں! میں دراصل اسی کے لیے اِدھر آیا ہوں دوسرا کام تو بالکل اضافی ہے۔"

"یعنی آپ اسے کوئی اہمیت نہیں دیتے؟"

"یہ بات نہیں ہے میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ کوئی ایسا مشکل کام نہیں ہے۔"

"آپ کا حوصلہ قابلِ داد ہے، آپ سب سے پہلے بلبیر سے مل لیں مگر میرا خیال ہے وہ آپ کو صحیح بات کبھی نہیں بتائے گا۔"

"اس کا باپ بھی بتائے گا بالک رام جی! آپ مجھے اُس کے گھر کا پتہ بتا دیں۔"

"کوئی ہتھیار ہے آپ کے پاس؟"

"نہیں، میں تو ایک سوئی تک ساتھ نہیں لا سکا ہوں کسی طرح ممکن ہی نہیں تھا۔ وہ دو جگہ تلاشی لیتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں ایک پستول آپ کو دے دیتا ہوں۔ اُس پر سائیلنسر چڑھا ہوگا۔"

"مجھے ایسے ہی چپ شاہ کی ضرورت ہے جو بے آواز کام کرے۔ میرا پہلا چپ شاہ ادھر پولیس نے چھین لیا تھا۔ دوسرا اب میں وہیں چھوڑ آیا ہوں۔"

بالک رام نے میری یہ بات سُن کر مجھے اس کمرے میں رکھے سیف میں سے ایک ہلکا پھلکا سا ولایتی پستول دے دیا۔ اس پر سائیلنسر کی نال بھی زیادہ طویل نہیں تھی۔ پستول کے ساتھ انھوں نے مجھے دو ہزار روپے بھی تھما دیے۔

"یہ رقم ساتھ رکھ لیں کسی بھی جگہ ضرورت پڑ سکتی ہے۔ ویسے آپ میری مانیں تو سب سے پہلے ان آدمیوں کو یہاں سے اٹھوائیں، اور میرے پاس پہنچا دیں میں انہیں ایکسپورٹ کر دوں گا۔"

"کس لئے سے؟"

"یہ بات آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ میری مشکل یہ ہے کہ میں یہاں اب تنہا رہ گیا ہوں۔"

"وہ بالناتھ کہاں رہتا ہے؟"

"اسے پرسوں رات کسی نے رام باغ میں گولی مار دی تھی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ دراصل ایک طوائف کے چکر میں پھنس گیا تھا۔ شراب وہ بے تحاشہ پینے لگا تھا۔ اگر وہ چند دن اور زندہ رہتا تو شاید میں بھی تباہ ہو جاتا۔"

"کیوں؟ کیا وہ بھروسے کا آدمی نہیں تھا؟"

"تھا تو وہ بہت ہی بھروسے کا آدمی مگر شراب اور عورت کے پیچھے وہ کچھ اس طرح بھاگنے لگا تھا کہ وہ کسی بھی وقت ہمارے راز بیچ سکتا تھا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ آپ نے خود اسے۔۔۔"

"ہاں! مجھے افسوس ہے مگر مجھے مجبوراً ایسا کرنا پڑا۔ اس کے سپرد بڑی اہم ذمے داری تھی مگر وہ لاپروا ہو گیا تھا۔" بالک رام کے اس تخ لبستہ لہجے نے مجھے حیران کر دیا۔ وہ بالناتھ کے قتل کا ذکر یوں کر رہا تھا جیسے اُس نے کسی باؤلے کُتے کو مار دیا ہو۔ وہ پانچ فٹ قد کا بالک رام جس کی چھوٹی چھوٹی تیز تیز آنکھیں برمے کی طرح مخاطب کے وجود میں دھنس جاتی تھیں مجھے عجیب سا معلوم ہوا۔

"مجھے حیرت ہے بالک رام جی! بڑے دل گردے کے آدمی ہیں۔ دیکھنے میں تو آپ واقعی میوزک ماسٹر لگتے ہیں۔"

میری یہ بات سن کر وہ کچھ تپ سا گیا۔ دائیں ہاتھ میز پر ایک لوہے کی دو فٹ لمبی سلاخ رکھی تھی۔ وہ دراصل ایک ہتھوڑا تھا جس میں سر لوہے کی سلاخ لگا دی گئی تھی۔ بالک رام نے وہ ہتھوڑا اٹھا کر اُس کے دونوں سرے اپنے ہاتھوں میں لیے اور مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

"ذرا دیکھیں یہ لوہا کتنی طاقت مانگتا ہے اس سلاخ کو دیکھیں۔"

میں نے ہتھوڑا دونوں ہاتھوں میں لے کر تولا۔ اس کی سلاخ خاصی موٹی تھی۔ ہتھوڑا بھی خاصا وزنی تھا۔

"اسے موڑ کر دکھا سکتے ہیں آپ؟ جوان آدمی ہیں، اسے دہرا کر دیں۔"

میں نے نیم دلانہ کوشش تو کی مگر میں جانتا تھا کہ اس کا مطالبہ احمقانہ ہے۔ آدھ انچ موٹی لوہے کی دو فٹ لمبی سلاخ کو موڑ لینا ناممکن تھا مگر بالک رام تو شاید ضد میں آ گیا تھا میرے ہاتھ سے ہتھوڑا لے کر بولا "میں میوزک ماسٹر ہی نہیں ہوں مسٹر مہتہ! یہ دیکھیں ان ہاتھوں سے میں کیا نہیں کر سکتا۔" یہ کہہ کر اس نے ہتھوڑے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اپنے دونوں انگوٹھے سلاخ کے وسط میں رکھ کر جھٹکا جو دیا تو وہ سلاخ تڑاخ سے ٹوٹ گئی۔ وہ شعبدہ تھا کہ کرامت، میں اپنی جگہ سے اچھل سا گیا۔ بالک رام نے سلاخ کے دونوں ٹکڑے بڑے اطمینان سے میز پر رکھ دیے، بولا۔ "آپ کی میں نے ادھر بڑی شہرت سُنی ہے۔ میں پانڈے سے بھی مل چکا ہوں مکھن سنگھ تو خیر مر ہی گیا تھا۔ اس کا ساتھی انسپکٹر سنہرا ابھی زندہ ہے، اُس نے آپ کے فن کی بڑی تعریف کی تھی۔ وہ آپ کی طاقت کا لوہا مانتے ہیں مگر مجھے آپ محض میوزک ماسٹر نہ سمجھیں مسٹر! میں ادھر یوں ہی نہیں بیٹھا ہوں۔"

"مجھے افسوس ہے بالک رام جی! میری بات کا آپ نے برا مانا میں معافی چاہتا ہوں۔ بہادر آدمی کا تو میں سیوک ہوں۔"

وہ مسکرانے لگا، بولا۔ "میں پیچک شودر ہوں نہ ہندو نہ مسلمان۔ کبھی میں ہندو تھا مگر اب میں اُن سے نفرت کرتا ہوں۔ میں نے اپنے اندر یہ شکتی ورزش سے پیدا نہیں کی۔ یہ میری قوت ارادی کا اعجاز ہے۔ ہاں! منش جو چاہے کر سکتا ہے۔"

"مجھے حیرت ہے، کوئی اور شخص یہ بات کرتا تو کہتا کہ اس نے ایک جن کو مسخر کر رکھا ہے کسی دیوی کو زیر کر لیا ہے۔"

"میں یہ پاکھنڈ نہیں رچا سکتا۔ میں ٹھوس دنیا میں رہتا ہوں، مسٹر مہتہ! منش کے اندر پانچویں شکتی پیدا ہو جائے تو وہ ناقابلِ تسخیر قوت کا مالک بن جاتا ہے۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا ہوں بالک رام جی! مجھے آپ کی صحبت میں حیرت انگیز خوشی محسوس ہو رہی ہے آپ سرحد اس طرف ہوتے تو میں سمجھتا آپ ولی ہیں۔"

"نہیں! یہ بات نہیں ہے مسٹر مہتہ۔ بھگوان سے میں اتنا دور ہوں جتنا زمین سے سورج۔ میں آگ پانی ہوا اور مٹی کے بعد جس پانچویں شکتی کی بات کرتا ہوں وہ ہے آتما کی شکتی۔ منش اگر اپنے ارادے کی انی کو تیز کرے تو وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ آپ کے اقبال نے قہاری وغفاری وقدوسی وجبروت کی بات کہی ہے تو وہ میرے دل کو لگتی ہے۔ میں استری سے دور رہتا ہوں۔ لذتوں سے متنفر ہوں۔ میں نے سالہا سال سے نمک نہیں کھایا میں ٹھوس تختے پر سوتا ہوں اور ہر صبح آدھ گھنٹے تک اُلٹا لٹکتا ہوں آپ کے خدا کی قہاری اور جبروت کو میں نے اپنا لیا ہے مگر یہ غفاری و قدوسیت میرے کام کی چیزیں نہیں ہیں۔ منش پاک ہو ہی نہیں سکتا اور چونکہ وہ پشو ہے اس لیے وہ غفاری بھی اپنا نہیں سکتا۔"

"میرا خیال ہے ہم اپنے موضوع سے بہت دور نکل آئے ہیں۔" میں نے اُس کی پُرپیچ گفتگو سے بیزار ہو کر کہا۔ وہ خواہ مخواہ خود کو پُراسرار بنانے کی کوشش کر رہا تھا اور مجھ پر اپنی علمیت کا بھی رعب ڈالنے میں مصروف تھا ایک شعبدہ اُس نے کیا دکھا لیا تھا وہ سمجھتا تھا، مجھے اُس نے بالکل ہی اندھا کر لیا ہے۔ ایسے ایسے تو کئی تیس مار خان میں نے مسل کر پھینک دیے تھے۔ اکبر کوٹ کی رکھ میں جس فقیر سے میں ملا تھا اس نے مجھے زیادہ قائل اور متاثر کیا تھا اور میرا خیال ہے کہ میری کلائی کی کسی رگ پر اس نے جو عمل کیا تھا اس کی وجہ سے میرے بازو میں ایسی قوت پیدا ہو گئی تھی کہ میں بڑے سے بڑے شاہ زور کی بانہہ توڑ سکتا تھا اور توڑتا آیا تھا۔ اس بالک نے لوہے کی سلاخ دو ٹکڑے کر دی تھی اور اب وہ زمین پر پاؤں ہی نہیں دھرتا تھا۔ میرے ٹوکنے پر وہ ایک دم سنبھل گیا۔ بولا۔ "ہاں! آپ ٹھیک کہتے ہیں یہ بڑا ہی نازک مسئلہ ہے، خیر یہ رہا بلبیر کے گھر کا پتہ، وہ رات کو دیر سے گھر آتا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے مجھے بلبیر سنگھ کا پتہ ایک کاغذ پر لکھ دیا۔

"اچھا بالک صاحب! اب میں چلتا ہوں آپ سے ملاقات ہوتی رہے گی۔"

"آپ کی رہائش کا بندوبست میں بلیو برڈ ہوٹل میں کر دوں گا۔ آپ شام کو سیدھے وہاں چلے جائیں میرا فون نمبر یہ ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنا ملاقاتی کارڈ مجھے دے دیا۔ میں بالک رام سے ہاتھ ملا کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ اس آدمی سے مل کر مجھے کوئی خوشی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ وہ خود پسندی اور خود فریبی میں مبتلا تھا۔ اُس نے شیر بہادر کو قتل کر دیا تھا۔ وجوہات سے میں بالکل بے خبر تھا اور مجھے یقین تھا کہ وہ مجھے صحیح صورتِ حال سے آگاہ نہیں کر رہا تھا۔ شیر بہادر امرتسر میں بالناتھ کے نام سے رہ رہا تھا۔ اُس کے ذمے جو کام لگایا گیا تھا، اس کے فرائض کی جو نوعیت تھی اس سے ڈھلوں صاحب بھی پوری طرح آگاہ نہیں تھے اور اب بالک رام کہہ رہا تھا کہ اس نے خود اسے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اور وہ اس پر ذرہ بھر پشیمان نہیں تھا یہ معاملہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں جس ذہنی خلفشار میں مبتلا تھا اس کا بھی کوئی حل بالک رام نے مجھے نہیں بتایا تھا۔ آسیہ کے معاملے کو اس نے کوئی اہمیت ہی نہیں دی تھی۔ وہ مجھے شاید تیسرے درجے کا جرائم پیشہ آدمی سمجھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اپنی جگہ جم کر بیٹھا رہا۔ جب میں عمارت سے باہر نکلا تو اس بالک رام پر مجھے بہت غصہ آ رہا تھا مگر میں نے اس سے کوئی تعرض کرنا مناسب نہ سمجھا۔ کیونکہ میں اس کو پوری طرح سمجھ ہی نہیں سکا تھا۔ اس گھڑی میرا حال اس ترمتی ایسا تھا جو فضا میں اڑتے اڑتے اچانک اندھی ہو کر سمتوں کے تعین سے قاصر رہ جاتی ہے۔ بلبیر سنگھ کا گھر کمپنی باغ کے عقب میں تھا۔ میں نے ٹیکسی سڑک پر روکی اور ڈرائیور کو انتظار کرنے کا کہہ کر مکانوں کی ایک قطار کے سامنے سے گزرنے لگا۔ گلی تنگ تھی، ورنہ میں ٹیکسی اندر لے جاتا۔ مگر جب میں ہیسٹم اسٹریٹ کے آخری کونے میں جا پہنچا تو مجھے محسوس ہوا کہ بلبیر سنگھ کے گھر کے دروازے پر ٹیکسی دوسری سمت سے لائی جا سکتی ہے میرے ذہن میں بیک وقت کئی منصوبے جنم لے رہے تھے مگر میں کسی ایک کے بارے میں بھی وثوق سے کچھ نہ کہہ سکتا تھا۔ بلبیر سنگھ کا گھر اس گلی کے آخری کونے میں تھا ٹیکسی کو دوسری سڑک پر سے گزار کر میں وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ ایک کنال کے قطعے پر بنا مکان خاصا خوبصورت ہے۔ عمارت اس قطعے کے عین وسط میں بنی تھی۔ صدر دروازے میں سے گزرتے ہی

ڈیوڑھی کے دائیں طرف کمرے شروع ہو جاتے تھے

"آپ کو کہاں جانا ہے لالہ جی!" ڈرائیور نے پوچھا۔ اُس کا لب و لہجہ خاصا پڑھے لکھے لوگوں ایسا تھا۔

"میں انسپکٹر بلبیر سنگھ سے مل کر ابھی آتا ہوں تم میرا انتظار کرو۔"

"ٹھیک ہے لالہ جی! مگر یہ بڑا کڈھب تھانیدار ہے ذرا بچ بچا کر جائیں۔ رشوت تو یہ لمبی لیتا ہے آپ کا کوئی خاص کام ہی پھنس گیا ہے اس سے؟"

"نہیں بھئی! یہ میرا دوست ہے۔ بڑے دنوں بعد میں اس کے درشن کے لیے آیا ہوں۔" یہ کہہ کر میں بلبیر سنگھ کے دروازے کی طرف لپکا۔ میری دستک پر ایک بڑھیا دروازے پر نمودار ہوئی۔ ساڑی اس کے بدن پر جھول رہی تھی۔

"نمستے ماں جی! مجھے بلبیر سنگھ نے بھیجا ہے۔ اُن کی پتنی کے لیے ایک ضروری سندیسہ لایا ہوں۔" میں نے ہاتھ جوڑ کر اسے نمسکار کیا۔

"کہاں سے آئے ہو تم؟"

"میں بمبئی سے آیا ہوں ماں جی! اُن کی پتنی گھر پر ہوں گی۔ میرا نام رمیش مہتہ ہے میں ان سے ایک بہت ضروری بات کہنا چاہتا ہوں۔"

"رمیش مہتہ! ذرا ٹھہرو۔ میں سیتا سے بات کرتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ پیچھے ہٹ گئی۔ جب وہ دوسری بار دروازے پر آئی تو بولی۔ "اندر آجاؤ بیٹا۔" یہ کہہ کر اس نے دونوں کواڑ کھول دیے۔ مگر ابھی میں دروازے میں داخل نہیں ہوا تھا کہ مجھے اپنے قریب ایک موٹر سائیکل کی آواز سنائی دی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا، تو سامنے بلبیر سنگھ کھڑا تھا۔ میں وہیں رُک گیا۔

"کس سے ملنا ہے آپ کو؟" وہ بڑے گمبھیر لہجے میں بولا، وہ اپنی سرکاری وردی میں ملبوس تھا اور پستول اُس کے پہلو سے بندھا مجھے یہ احساس دلاتا تھا کہ اس کے لہجے کے اس تکبر میں اس ہتھیار کا بڑا عمل دخل ہے جسے وہ قرینے سے استعمال کرنا جانتا تھا۔ موٹر سائیکل اس نے بڑی احتیاط سے اسٹینڈ پر کھڑی کی اور پھر وہ میرے سامنے پورے قد سے تن کر کھڑا ہو گیا۔

"میرا نام رمیش مہتہ ہے مجھے شری بلبیر سنگھ سے ملنا ہے۔" میں نے اپنی آواز بدلتے ہوئے کہا۔

"میرا نام بلبیر سنگھ ہے کیا کام ہے آپ کو مجھ سے؟" اُس نے مجھے بنظرِ غائر دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ بہت چوکنا دکھائی دے رہا تھا۔

"دیکھیں! میں بمبئی سے آیا ہوں مجھے ورسٹو ناتھ شرما نے آپ کے پاس بھیجا ہے اگر کہیں بیٹھ کر آپ میری بات سن لیں تو بڑی کرپا ہوگی۔"

وہ میرے گھٹے ہوئے سر، کھدر کے کُرتے اور چوڑی دار پاجامے پر غور کرتے ہوئے بولا۔ "میں تو کسی شرما صاحب کو نہیں جانتا، بہرحال آئیے، میں بیٹھک کھولتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اندر چلا گیا۔ چند ہی لمحوں بعد اُس نے گلی میں کھلنے والا اپنی بیٹھک کا دروازہ کھول دیا۔

"آئیے! کیا نام بتایا آپ نے اپنا؟" یہ کہہ کر اس نے اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے میری طرف بڑھایا مگر میں نے دیکھا اَن دیکھا کر دیا۔ ہاتھ سے ہاتھ ملتا تو شاید وہ مجھے فوراً ہی پہچان جاتا۔ "رمیش مہتہ" یہ کہہ کر میں کمرے میں داخل ہو گیا۔

اُس نے گلی کا دروازہ بند کر دیا۔ اور پھر مجھے دیوار کے ساتھ لگی ایک بڑی سی فوم کی کرسی پر بٹھا کر بولا۔ "یہ شرما صاحب کون ہیں؟" وہ میرے سامنے ذرا فاصلے پر کرسی رکھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی گردن پسینے سے بھیگ رہی تھی۔ جیب سے رومال نکال کر اس نے گردن پر پھیرتے ہوئے ایک بار پھر میرا سر سے پاؤں تک گہری نظر سے جائزہ لیا مگر اس کے چہرے کے تاثرات سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ ابھی تک وہ مجھے کسی خانے میں رکھ نہیں سکا تھا۔ اس کا حافظہ بہت تیز تھا مگر وہ مجھے پہچاننے میں سخت مشکل کا سامنا کر رہا تھا۔

"دیکھیں! وہ اُدھر سینٹ پال ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہیں، آپ کو تو یاد ہوگا وہ اپنی بہن ساوتری کے بارے میں پوچھ رہے تھے انہوں نے کہا ہے کہ ساوتری کا انہیں ایک عرصے سے کوئی خط نہیں ملا ہے۔ اور وہ اُس کے بارے میں پریشان ہیں۔"

"ساوتری؟ وہ لیڈی پولیس انسپکٹر؟ ...... مگر جہاں تک مجھے یاد ہے اُس نے تو کبھی نہیں بتایا تھا کہ اُس کا کوئی بھائی بھی موجود ہے۔" یہ کہہ کر وہ کمرے کے اندرونی دروازے تک جا پہنچا اور پکار کر بولا۔ "سیتا جی! ذرا اسکواش کے دو گلاس تو بنا دیں۔" چند لمحوں تک اسے کوئی جواب نہ ملا تو وہ بولا۔ "شما کیجیے مہتہ جی! میں ابھی آیا۔" یہ کہہ کر وہ مکان کے اندر چلا گیا۔ کوئی دس منٹ بعد وہ واپس آیا تو اس نے ایک ٹرے پر دو گلاس اور شربت کا ایک جگ اٹھا رکھے تھے، وہ لا کر اس نے کچھ فاصلے پر رکھی ہوئی تپائی پر رکھ دیے۔

"لیں، یہ پئیں۔" یہ کہہ کر اس نے گلاس اُٹھایا اور بڑی مروت سے میرے پاس آ ٹھہرا۔ وہ میرے دائیں ہاتھ کھڑا تھا۔ گلاس اُس نے سیدھے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ اپنا بایاں ہاتھ اُس نے یونہی بے خیالی میں کرسی کی پشت پر رکھ دیا۔ میں نے گلاس اس کے ہاتھ سے لیا۔ کڑک ایسی آواز کرسی کی پشت کی طرف سے اُبھری۔ وہ فوراً ہی پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے گلاس ابھی آدھا بھی نہیں پیا تھا کہ کرسی کے دونوں بازو ایک دم شکنجے کی طرح مجھے دائیں بائیں طرف سے گرفت میں لے ... میں نے گلاس پھینک کر اٹھنے کی کوشش کی مگر اس بھاری بھر ...

کرسی کے دونوں بازو میرے دونوں کولھوں کو جکڑ چکے تھے اور اُن کا دباؤ اب دونوں سمتوں سے میری کمر پر بڑھ رہا تھا۔ یوں کہ مجھے سانس لینا بھی دشوار نظر آتا تھا۔ بلبیر سنگھ سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ کرسی کے دونوں بازو اب ایک حلقے کی صورت اختیار کر چکے تھے۔ اور میں خود کو بے بس محسوس کر رہا تھا۔ میرا پستول جو میں نے قمیص کے نیچے کمر کے گرد بندھی پٹی کے ساتھ لٹکا کر نیفے میں اڑس رکھا تھا، میری پہنچ سے باہر ہو چکا تھا۔ بلبیر سنگھ عجیب سے ابلیسانہ انداز سے ہنسا۔ یوں جیسے اُس نے ہاتھی مار گرایا ہے۔ کرسی کے بازو جو حلقے کی صورت اختیار کر گئے تھے ابھی تک حرکت میں تھے اور اُن کی گرفت اور زیادہ تنگ اور سخت ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے پاگلوں کی طرح اپنے دونوں ہاتھ سر سے اُوپر اٹھا کر کرسی کی نشست پر رکھے عین اس وقت وہاں مجھے ایک چھوٹے سے دستے کی موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ بائیں طرف حرکت کر رہا تھا۔ میں نے اس دستے کو فوراً ہی روک کر دائیں طرف کھینچا تو بلبیر نے پستول نکال لیا۔ کرسی کے دونوں بازو اب کھلنے لگے تھے۔

"ہاتھ اوپر اٹھا لو مسٹر مہتہ! ورنہ میں ذمے دار نہ ہوں گا۔"

کرسی کے بازو کھل کر فوراً ہی اپنی جگہ پر چلے گئے تھے۔ میں نے چہرے پر زمانے بھر کی بے بسی ظاہر کر کے ہاتھ اوپر اٹھا لیے، اور اس کے ساتھ ہی میں کرسی پر سے اُٹھ گیا۔

بلبیر سنگھ کے چہرے پر اب بلا خیز سنجیدگی چھا گئی تھی، اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں اس کرسی کی گرفت سے اتنی جلدی آزاد بھی ہو سکتا ہوں، بڑے ہی گمبھیر لہجے میں بولا۔ "تم میرے گھر میں ہو مسٹر مہتہ! میں تمہیں شوٹ بھی کر دوں تو مجھ پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔ بہتر ہے تم اپنا اصلی نام اور کام مجھے خود ہی بتا دو اور سیدھے کھڑے رہو۔ میں تمھاری تلاشی لوں گا۔" یہ کہہ کر اُس نے پستول کی نال میری کنپٹی سے لگا کر جیبوں سے کاغذات اور نقدی نکال لی پھر اُس نے میرے نیفے میں اُڑسا پستول نکالنے کے لیے پیٹی کھولنی چاہی تو میں نے بجلی ایسی سُرعت سے اُس کی دائیں کلائی پکڑ کر اُونچی اٹھا دی۔ لبلبی پر اس کی انگلی دبی اور کمرے میں گولی کی آواز گونج گئی میں نے اُسے پھر سنبھلنے کی مہلت نہیں دی۔ اُس کی کلائی پر میرا ایک اور جھٹکا بہت کافی ثابت ہوا پستول دری پر گرا اور میں نے اس کا بازو مروڑ کر کمر سے لگا دیا۔ عین اس وقت کمرے کا عقبی دروازہ کھلا بلبیر کی بیوی سیتا اور اُس کی ماں چیختی ہوئی اندر آ گئیں۔ میں نے بلبیر کی کمر میں بائیں کہنی مار کر اسے پیچھے جھٹکایا اور پھر اس کے ساتھ ہی نیچے جھک کر فرش پر پڑا اُس کا پستول اُٹھا لیا۔

"بھگوان کے لیے میرے بیٹے کو چھوڑ دو۔" بلبیر کی ماں ہذیانی کیفیت میں بولی۔

میں نے بلبیر کا بازو چھوڑ دیا۔

"بہتر یہی ہے بلبیر سنگھ تم اطمینان سے بیٹھ کر میری بات کا جواب دو۔ اور مجھے اپنا دشمن نہ سمجھو، میں تمہیں کوئی نقصان پہنچانے نہیں آیا ہوں۔" اَب کی بار بھی میں نے عمداً اپنی آواز کا تغیر برقرار رکھا۔ وہ اپنی کلائی کو کہنی تک ملتا ہوا دیوار سے جا لگا۔

"اسے سمجھائیں ماں جی! گھر آئے ہوئے مہمان سے یہ سلوک کرتے ہو تم لوگ۔" میں نے اَب کی بار اس منحوس کرسی کے عقب میں کھڑے ہو کر اپنا وہ پستول نکال لیا جس پر بالک رام نے سائلنسر بھی لگا دیا تھا میرے دائیں ہاتھ میں پکڑے بلبیر کے پستول کا رُخ بھی اس کے سینے کی طرف تھا۔

"بیٹھ جائیں شری بلبیر سنگھ جی اور اطمینان سے میری بات کا جواب دیں۔ میں ساوتری کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔ آپ بھی بیٹھ جائیں ماں جی! بہن جی آپ بھی اِدھر تشریف رکھیں۔" میں نے سیتا اور اس کی ساس سے مخاطب ہو کر کہا۔

میری بات کا اُن پر خاطر خواہ اثر ہوا اور وہ تینوں سامنے کی دیوار کے ساتھ لگی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

"مجھے بتائیں بلبیر سنگھ جی! میری بات کا جواب دیں۔ میں یہاں خون خرابے کے لیے نہیں آیا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے تپائی پر رکھے اپنے کاغذات بلبیر کی طرف بڑھائے اور نقدی جیب میں ڈال لی۔

"میں آج ہی لاہور سے واپس آیا ہوں اپنے پرانے دوستوں سے ملنے کے لیے وہاں گیا ہوا تھا۔ میں نے شرما کو فون کیا تو اس نے مجھے تاکید کی کہ میں آپ سے مل کر اس کی بہن کے بارے میں معلوم کر دوں مجھے بتائیں وہ کہاں ہے؟"

"وہ مر چکی ہے، اُسے ایک خاص مشن پر ہم نے پاکستان بھیجا تھا مگر وہ وہاں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔"

"کس مشن پر بھیجا تھا آپ نے اُسے؟"

"اس کی تفصیل میں آپ کو نہیں بتا سکتا۔"

"مجھے سختی پر مجبور نہ کریں بلبیر سنگھ جی! ساوتری میری منگیتر بھی تھی۔ میں اس کے بارے میں کوئی جھوٹ برداشت نہیں کر سکتا۔ ابھی بھی موقع ہے اپنی یہ اکڑ فوں ختم کر کے مجھ سے سیدھی طرح بات کریں۔"

"انھیں بتا دو کاکا جی! آخر اس میں ہرج ہی کیا ہے۔"

"میں اس مشن کی کوئی بات انھیں نہیں بتا سکتا۔ یہی بہت کافی ہے کہ وہ مر چکی ہے اور محکمے کی طرف سے پچاس ہزار کا چیک اُس کے پتا کو بھیجا جا رہا ہے۔"

دائیں ہاتھ کی دیوار میں ایک چھوٹا سا دروازہ تھا۔ میں نے پستول کا رُخ بلبیر کی طرف رکھ کر اسے کھولا تو معلوم ہوا کہ وہ ایک

چھوٹے سے کمرے میں کھلتا تھا جسے وہ باتھ روم کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ میں نے پلٹ کر تحکم آمیز لہجے میں کہا "ماں جی! مجھے شما کریں، آپ ذرا دیر کے لیے بہن جی کے ساتھ اُدھر بیٹھ جائیں۔ میں ان سے کچھ ذاتی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے اپنی شان میں کسی گستاخی پر مجبور نہ کریں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ انھیں میں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔" مجھے اپنی آواز کا تغیر برقرار رکھنے میں شاید ناکامی ہو رہی تھی۔ اس کا ثبوت بلبیر سنگھ کے چہرے پر پھیلے تحیر سے مل رہا تھا۔

"اُٹھیے۔" میں نے ان دونوں کو متذبذب دیکھ کر ڈانٹتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں با دلِ ناخواستہ اپنی جگہ سے اٹھیں اور لرزتی ہوئی اُس دروازے میں داخل ہو گئیں جس کو میں نے فوراً ہی باہر سے بند کر دیا۔ اس اسٹور روم میں نہ کوئی اور دروازہ تھا نہ روشن دان۔ مگر مجھے یقین تھا کہ وہ وہاں دم گھٹ کر مر نہیں جائیں گی۔

"ہاں تو شری بلبیر سنگھ جی! اگر میری معلومات درست ہیں تو مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ کسی زمانے میں آپ کا نام آغا بلال احمد بھی تھا۔"

میری یہ بات اس کے کانوں میں گولی کی طرح لگی۔ اُس کی آنکھیں حیرت کی فراوانی میں یوں کھل گئیں جیسے وہ پھر کبھی بند نہیں ہوں گی۔ اس کا سرخ و سفید چہرہ ایک دم پیلا پڑ گیا تھا۔

"دیکھو میرے سامنے تم جھوٹ نہیں بولو گے بتاؤ میں صحیح کہہ رہا ہوں نا!"

اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے وہ بڑے مضمحل لہجے میں بولا "یہ درست ہے مگر یہ ایسا راز ہے جسے میرے محکمے کے چند اعلیٰ افسروں کے سوا کوئی نہیں جانتا ہے تمہیں یہ بات کس نے بتائی ہے؟"

"تمہارا وہ نام اصلی تھا کہ یہ؟"

"نہیں میرا اصلی نام بلبیر سنگھ ہی ہے اور مجھے ایک خاص مشن پر لاہور بھیجا گیا تھا کیونکہ میں پشتو بھی جانتا ہوں اور پنجابی کے علاوہ اردو بھی میں لکھنوی انداز میں بول سکتا ہوں۔"

"وہ کون سا مشن تھا جس پر تمہیں بھیجا گیا تھا؟" میں نے اس کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

وہ ذرا دیر کے لیے گہری سوچ میں ڈوب گیا جب اس کے لب کھلے تو جس حقیقت کا انکشاف اس نے کیا وہ مجھے سُن کر گئی۔ اس نے پاکستان کی ایک اعلیٰ شخصیت کو بڑے ہی ڈرامائی انداز میں لاہور کی ایک کھلی سڑک پر گولی مار دی تھی۔

"ہوں! تمہارا یہ اعتراف میرے لیے حیرت انگیز ہے بلبیر سنگھ مگر ریکارڈ سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ تم وہاں پولیس مقابلے میں مارے گئے تھے؟"

میری یہ بات سُن کر وہ اچھل سا گیا، بولا "تمہیں یہ بات کس نے بتائی ہے؟ اپنے بارے میں تم مجھ سے اب تک جھوٹ بولتے آ رہے ہو۔"

"اپنا لب و لہجہ درست رکھو بلبیر سنگھ! اور مت سمجھو کہ میں یہاں بر دکھوے کے لیے آیا ہوں۔ مجھے بتاؤ تم کس کو گولی مار کر اس کی لاش مسخ کر کے وہاں سے فرار ہو گئے تھے۔ یہ بڑا اہم سوال ہے بلبیر سنگھ! اور تم جھوٹ نہیں بولو گے میں تمہیں خبردار کر رہا ہوں۔"

وہ چُپ رہا۔ وہ میری بات کا جواب دینے پر قطعاً آمادہ نظر نہیں آتا تھا۔ میں تپ کر اپنی جگہ سے اُٹھا اور تڑاخ سے میں نے بائیں ہاتھ کا ایک تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا۔ اس کی پگڑی فرش پر گر گئی۔ "اٹھو اور اس کرسی پر بیٹھو۔ ذرا تم بھی اس کا مزہ چکھ لو۔" یہ کہہ کر میں نے اس کے بکھرے کیس بائیں ہاتھ میں لیے اور اسے جھٹکا دے کر اٹھا دیا۔

"میرے کیس چھوڑ دو، ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔"

"کیا اچھا نہیں ہوگا سور کی اولاد!" یہ کہہ کر میں نے اس کی کمر پر گھٹنا دے مارا۔ وہ تیورا کر آگے کی طرف گرا تو میں نے پھر اس کے بال بائیں ہاتھ میں پکڑ کر اسے گھسیٹا اور آگے لے جا کر زبردستی اُس جادوئی کرسی میں دھنسا دیا۔ وہ اُٹھنے کے لیے زور لگانے لگا تو میں نے ایک اور جھانپڑ اس کے منہ پر دے مارا۔ اس کا اگلا دانت شاید میرے ہاتھ کی ضرب سے ٹوٹ گیا تھا اس کے ہونٹوں سے خون رسنے لگا تھا۔ میں نے فوراً ہی اس کرسی کے عقب میں لگے سوئچ کو دبا دیا۔ کرسی کے بازو تیزی سے اندر کی طرف دبنے لگے اور چند ہی لمحوں میں بلبیر سنگھ کمر تک کرسی کے قوم میں چھپے آہنی بازوؤں کی گرفت میں پھنس چکا تھا۔ اس نے بھیانک چیخ مارنا چاہی مگر جُونہی اس نے منہ کھولا میں نے بائیں ہاتھ میں اس کا پستول لے کر اس کی نال اُس کے حلق میں اتار دی۔ وہ مفلوج ہو کر رہ گیا۔ اُس کی آنکھیں اُبل کر باہر آنے لگیں۔

عین اس وقت کسی نے گلی کے دروازے پر دستک دی۔ وہ آ...

"لالہ جی! اگر آپ نہیں جانا چاہتے تو مجھے چلتا کر دیں۔" وہ ٹیکسی کا ڈرائیور تھا جسے میں باہر ٹھہرا آیا تھا۔

"تم ٹھہرو میں ابھی آ رہا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے بلبیر کی گری ہوئی پگڑی سے اس کا منہ کس کر باندھا اور پھر اُس کے دونوں ہاتھ بھی کرسی کی پُشت سے جکڑ دیے۔ اب بلبیر سنگھ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے دونوں پستول نیفے میں اڑسے اور گلی کا دروازہ کھول کر ڈرائیور کے پاس جا پہنچا۔

وہ مسکراتے ہوئے بولا "بڑی دیر کر دی لالہ جی میں تو سمجھا کہ آپ گئے۔"

"گئے کیسے؟ کوئی بے ایمان سمجھا ہے تم نے مجھے! یہ لو کرایہ" کہہ کر میں نے اسے دس روپے کا نوٹ تھما دیا۔

"کافی ہیں کہ کچھ اور؟"

"نہیں لالہ جی بہت کافی ہیں، میں جاؤں؟"

"ہاں! جاؤ، میں بھی ادھر ٹھہروں گا۔"

اس نے ٹیکسی اسٹارٹ کی اور اسی وقت دوسری طرف نکل گیا۔

گلی اس گھڑی بالکل سنسان پڑی تھی۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ایک بار پھر بلبیر کے مکان تک پہنچا اور اُس کا مقفل موٹر سائیکل پچھلے پہیے کی طرف سے اٹھا کر ڈیوڑھی میں لے گیا جب میں دوبارہ بیٹھک میں داخل ہوا تو اسٹور روم کے دروازے کو دونوں عورتیں بُری طرح پیٹ رہی تھیں۔ ان کے واویلا کے پڑوس تک پہنچ جانے کا خدشہ قوی تر ہوا تو میں نے آگے بڑھ کر دروازے کی چٹخنی کھول دی۔ وہ دونوں پاگلوں کی طرح منہ کھولے کھڑی چیخ رہی تھیں۔ میں نے اُن کی گردنیں ہاتھوں میں لے کر بیک وقت دونوں کی احساس کی رگیں مسل دیں ان سے چھٹکارا حاصل کرنا لازم ہو چکا تھا۔ وہ فوراً ہی دائیں بائیں جھول گئیں تو میں نے ان کو باری باری اٹھا کر مکان کے عقبی حصے میں پہنچایا۔ اور الگ الگ بستروں پر ڈال دیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ شام سے پہلے ہوش میں نہیں آئیں گی۔

اُن کی طرف سے مطمئن ہو کر میں پھر بلبیر کے پاس جا پہنچا اور اس کے منہ پر سے پٹی ہٹا کر میں نے جگ میں سے شربت نکال کر گلاس میں ڈالا اور اُس کے منہ سے لگا دیا۔ وہ ایک ہی گھونٹ میں سارا گلاس چڑھا گیا۔ پیاس نے اُسے نڈھال کر رکھا تھا۔ میں نے ایک گلاس اسے اور دیا۔ وہ بھی اس نے غٹاغٹ پی لیا۔ اس کے چہرے پر پھیلا بیکراں تحیر کسی بھی طرح ختم ہونے میں نہیں آتا تھا۔ وہ بیٹا اور اپنی ماں کو نیم مردہ حالت میں میرے کندھوں پر لد کر مکان کے عقبی حصے میں جاتے دیکھ چکا تھا تو وہ بڑی بے چارگی سے کرسی کے شکنجے کی طرف اشارہ کر کے بولا "میرا دم گھٹ رہا ہے، یہ کرسی کھول دو۔"

"نہیں! ابھی نہیں شری بلبیر سنگھ جی! یہ آپ ہی کا بنایا ہوا شکنجہ ہے آپ کو تو پہچانتا ہوگا۔ آپ کے ساتھ تو یہ زیادہ سختی سے پیش نہیں آ سکتا۔"

وہ بڑی بے بسی سے دائیں بائیں سر پٹخنے لگا۔ شکنجہ اب مزید تنگ نہیں ہو سکتا تھا وہ اپنی آخری حد تک اندر کو سمٹ چکا تھا۔ اور بلبیر سنگھ کی چیتے ایسی پتلی کمر کو مزید نہیں دبا سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مجھے اس کی طرف سے اب کوئی فکر نہیں تھی۔ میں کرسی گھسیٹ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا اور سگریٹ سلگا کر دھواں اس کے منہ پر ڈالنے لگا مگر چھت پر لگا پنکھا اس دھوئیں کو مرکوز نہیں ہونے دیتا تھا۔

"ہاں تو بلبیر سنگھ تم نے بتایا نہیں کہ وہ کون بدنصیب تھا جس کو قتل کر کے تم نے پولیس مقابلہ ظاہر کیا تھا۔"

"اس کا نام علی بخش بھٹی تھا۔"

"علی بخش بھٹی! اُف میرے خدایا! تو... تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے اُس نمازی، پرہیز گار ہیڈ کانسٹیبل کو خود مار دیا تھا۔ کیونکہ وہ قد کاٹھ اور رنگ ڈھنگ میں تم سے ملتا جلتا تھا۔" بیساختہ یہ بات میرے منہ سے نکل گئی۔

"تم اُسے کس طرح جانتے ہو؟" اُس نے اپنا سر جھٹکتے ہوئے کہا۔ اچانک میں نے محسوس کیا کہ اس کرسی کے اگلے پایوں کے ساتھ دو نواڑ کی ایسی پٹیاں لٹک رہی ہیں جن کے سروں پر کمبسوئے سے لگے تھے ان کی ماہیت میری سمجھ میں نہیں آئی پھر بھی میں نے ایک پٹی کو ہاتھ میں لے کر غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ اُس میں بجلی کے باریک تاروں کا جال سا بنا ہے۔

"یہ پٹیاں کس کام آتی ہیں؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ یہ شکنجہ کھول دو ورنہ میں مر جاؤں گا۔" اس نے ایک دم سراسیمہ ہو کر کہا۔ میں ایک دم اپنی جگہ سے اُٹھ گیا۔ اور اس کرسی کا بغور معائنہ کرنے لگا۔ اس کے عقب میں پچھلے پائے کے ساتھ ایک بجلی کا موٹا سا تار لگا تھا جس کے دونوں سرے ننگے تھے۔ اس تار کو پھیلا کر میں پچھلی دیوار تک لے لیا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ تار وہاں لگے سوئچ بورڈ کے ایک خانے تک پہنچ سکتا ہے۔ میں نے وہ تار ایک ساکٹ میں لگا دیا۔ اور پھر اس کا اثر دیکھنے کے لیے بلبیر کے سامنے جا ٹھہرا۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ وہ پٹیاں کرسی کے شکار کو برقی جھٹکا دینے کے لیے لگائی گئی ہیں۔ بلبیر سنگھ کا رنگ ہلدی ہونے لگا تھا۔ اس کا منہ کھلا تھا مگر اب وہ اس حد تک خوفزدہ ہو چکا تھا کہ اس کے منہ سے چیخ بھی نہیں نکل رہی تھی۔ میں ایک بار پھر اُس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

"تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ سب کچھ تم نے کس طرح کر لیا تھا؟ تم نے اس علی بخش بھٹی کو کیوں مار دیا تھا؟"

"میں اسے اپنے راستے سے ہٹانا چاہتا تھا" وہ بڑی ہی مریل سی آواز میں بولا۔

"کیوں ہٹانا چاہتے تھے۔ تم اسے اپنے راستے سے؟ کیا ضد تھی تمہیں اس سے؟"

"میں..... میں سیتا کو حاصل کرنا چاہتا تھا"

"سیتا کو؟ یہ جو تمہاری بیوی ہے۔ علی بخش کا کیا تعلق تھا اس سے؟"

"اسے اس نے یونہی گھر میں ڈال لیا تھا اور مجھے اس سے محبت ہو گئی تھی"

"ویری گڈ! ویری گڈ، بلبیر سنگھ! تم بڑے مہم جو آدمی ہو۔ پھر..... پھر کیا کیا تم نے.....؟"

"یہ شکنجہ کھولو، مجھ سے بات نہیں ہو رہی ہے" وہ درد سے نڈھال ہونے لگا۔

"اگر تم یہ بکواس بند نہیں کرو گے تو میں یہ پٹیاں تمہارے بازو پر باندھ دوں گا"

"نہیں، نہیں واہگورو کے لئے ایسا نہ کرنا۔ یہ..... یہ آدمی کو الیکٹرو کیوٹ کر دیتی ہیں یہ پٹیاں۔ مجھے اس شکنجے سے نکال دو۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں" اس کی آنکھوں میں آنسو اُبل آئے۔ وہ دم بدم نڈھال ہوتا جا رہا تھا۔

"یوں نہیں بچے! ابھی تو تمہیں بہت کچھ بتانا ہوگا۔ پولیس مقابلہ کیسے ثابت کر دیا تم نے؟"

"میں..... میں علی بخش کو اپنے ساتھ لے کر ادھر فیروزوالا کی طرف چلا گیا تھا۔ روزنامچے میں میں نے لکھ دیا کہ ہم چوروں کے تعاقب میں اور ایک ڈکیتی کی تفتیش کے سلسلے میں میت پور جا رہے ہیں۔"

"اچھا پھر؟ مجھے بتاؤ۔ اس کا شکنجہ نرم کس طرح سے ہو سکتا ہے؟"

"سوئچ کو پیچھے ہٹا کر تین نمبر پہ روک دو" اس نے خوش ہو کر کہا۔

"نہیں بیٹے! اتنا بدھو نہ سمجھو مجھے۔ اپنا بیان جاری رکھو۔ بتاؤ تم نے وہاں جا کر کیا کیا؟" میں نے اپنا چیپ شاہ ایسا پستول اس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔

"جب ہم میت پور پہنچے تو جن چار ڈاکوؤں کی ہمیں تلاش تھی وہ ہماری بھنک پا کر گاؤں سے نکل بھاگے۔ اور راجباہ کے کنارے اُگے درختوں کے ایک جھنڈ میں جا گھسے۔ میں علی بخش کو ساتھ لے کر اُدھر چل دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ ڈاکو اس جھنڈ کی آڑ لے کر آگے نکل چکے ہوں گے۔ پھر بھی میں اُدھر جا نکلا اور پھر علی بخش کو دوسری طرف بھگا کر میں نے اس پہ گولی چلا دی۔ یکے بعد دیگرے میں نے اس کے بدن میں سے چار گولیاں گزار دیں۔ پھر میں نے اپنی وردی اُسے پہنائی۔ اپنے کاغذات اس کی جیب میں رکھے اور اس کے بدن کو اس کے چہرے کو اس حد تک مسخ کر دیا کہ کوئی اسے پہچان ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ علی بخش ہے۔ میں نے اس کی وردی پہن کر اسی رات علی بخش کی محبوبہ کو اپنے ساتھ لیا اور اپنے منصوبے کے مطابق سرحد عبور کر کے امرتسر آ گیا۔ یہاں پہنچ کر میں نے سرکار سے دو مربع زمین انعام میں حاصل کر کے پولیس میں ملازمت اختیار کر لی۔ مجھے جو فرض سونپا گیا تو اسے میں نے تن تنہا سرانجام دے دیا۔ یہی میری سب سے بڑی کامیابی ہے" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

"ہوں! بڑے سورما ثابت ہوئے ہو تم بلبیر سنگھ، تمہیں یاد ہے تم نے اس غلام جیلانی کو ایک رقعہ لکھا تھا جس نے بھنڈاری فیملی کو ہار سے اغوا کیا تھا"

"تمہارا کیا تعلق ہے اس سے؟ مجھے بتاؤ تم کون ہو؟"

"میں تمہارے بہنوئی غلام جیلانی کا ادنیٰ غلام ہوں میرے بچے! بتاؤ، تم نے اس رقعے میں دی گئی دھمکی پر کس طرح عمل کیا تھا! غلام جیلانی کی بہن آسیہ کو تم نے کہاں رکھا ہے؟"

"تو یہ بات ہے۔ تمہیں اس بدمعاش نے میرے پاس بھیجا ہے۔ میں بھی سوچ رہا تھا کہ اس سے کم تر درجے کا کوئی آدمی یوں مجھ تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ تم اس کے بھائی ہو؟ تمہاری آنکھیں اس سے کس حد تک ملتی جلتی ہیں۔ تمہارا رنگ، تمہارا ماتھا، تمہارے ہاتھ کا لمس سب کچھ مجھے یہی بتاتا تھا کہ تم غلام جیلانی ہو مگر وہ تم جیسا بیذر کا نہیں رکھتا ہے۔ وہ خوبصورت جوان ہے"

"ہاں! میں اس کا بدصورت بھائی ہوں۔ مجھے بتاؤ، آسیہ کہاں ہے۔ اگر اسے تم میرے حوالے کر دو تو میں تمہارے ماضی پہ مٹی ڈال کر واپس چلا جاؤں گا"

"تمہیں یقین ہے کہ میں نے اب تک تم سے جھوٹ نہیں بولا ہے؟"

"ہاں! اب تک تم سچ بولتے آ رہے ہو۔ مجھے تم پر اعتبار ہے مگر میں آسیہ کے بارے میں تمہارا کوئی جھوٹ برداشت نہ کر سکوں گا لبلبی پر میرا زور ایک دم بڑھ جائے گا"

"میں سچ کہتا ہوں۔ مجھے آسیہ کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔ میں نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہے؟"

"اچھی طرح سوچ لو بلبیر سنگھ! یہ بڑا اہم سوال ہے۔ آسیہ کے لئے ہمیں ایک ہزار آدمی بھی مارنا پڑے تو ہم مار دیں گے"

"میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں مسٹر مہتہ! تمہارا اصل نام کیا ہے؟"

"یہی میرا نام ہے۔ مجھے بتاؤ آسیہ کہاں ہے؟"

"میں واہگورو کی سوگند کھا کر کہتا ہوں مسٹر مہتہ! مجھے اس کے بارے میں کوئی علم نہیں ہے"

"وہ ساوتری کون تھی؟ کس نے بھیجا تھا اسے؟ غلام جیلانی اور ڈھلوں صاحب کے پیچھے؟"

"وہ بہت عرصے سے پاکستان میں ہمارے لئے کام کر رہی تھی۔ جب غلام جیلانی بھنڈاریوں کو لے کر پاکستان چلا گیا اور انہیں اس نے اسی روز واپس بھی بھیج دیا تو اسی دن ہم نے ساوتری سے کہہ دیا تھا کہ وہ جس طرح بھی ممکن ہو غلام جیلانی اور اس کے سب سے بڑے پُشت پناہ مختار ڈھلوں کو زندہ سلامت گرفتار کر کے امرتسر پہنچا دے مگر ہمارا وہ منصوبہ غلام جیلانی نے ناکام بنا دیا اور ساوتری اسی کے ہاتھوں ماری گئی"

"تو تم یقین کے ساتھ کہہ رہے ہو کہ آسیہ کے بارے میں تمہیں کوئی علم نہیں ہے"

"ہاں! میں نے تمہارے سامنے قسم کھائی ہے۔ اُف..... یہ شکنجہ ڈھیلا کر دو۔ میری پسلیاں ٹوٹ جائیں گی" وہ پھر درد سے بلبلایا۔

"نہیں بلبیر سنگھ ابھی نہیں! مجھے بتاؤ کہ تم غلام جیلانی اور ڈھلوں صاحب کو یہاں لا کر کیا کرتے؟ کیا منصوبہ تھا تمہارا؟"

"میں یہ نہیں کہہ سکتا۔ اس کا فیصلہ بھنڈاری ہی کر سکتا تھا۔ اور اس کی پارٹی کے آدمی۔ وہ یہ کام غلام جیلانی سے لینا چاہتے تھے اس کام کے لئے انہوں نے ساوتری کو آگے لگا لیا۔ میں تم سے سچ کہہ رہا ہوں مسٹر مہتہ! مجھے اور ذلیل نہ کرو، یہ شکنجہ کھول دو"

"یہ تمہارا اپنا ہی کھودا ہوا کنواں ہے بلبیر سنگھ! ایسی خطرناک کرسی کیوں لگا رکھی ہے تم نے اپنے گھر میں؟"

"مجرموں سے راز اگلوانے کے لئے میں انہیں اسی کرسی پر بٹھایا کرتا ہوں۔ میری شہرت اور کامیابی کا راز اسی کرسی میں پنہاں ہے"

"اور اب یہ تمہاری سب سے بڑی شکست کا سبب بن گئی ہے مگر اب بھی تم سچ نہیں بول رہے ہو۔ کسی کبیر شاہ کو جانتے ہو؟"

"وہ تھانیدار ہے۔ اُدھر ترن تارن میں رہتا ہے ساہیوال کے قریب میں نے اس کے بارے میں غلام جیلانی کو بتا دیا تھا۔ ہمارے اپنے ذرائع نے ہمیں بتا دیا تھا کہ جیلانی کی بہن اس کے قبضے میں ہے مگر یقین کرو مسٹر مہتہ! ہم نے اس کے خلاف کچھ نہیں کیا۔ دوسرے مرحلہ میں ہم البتہ اس پر ہاتھ ضرور ڈالتے۔ غلام جیلانی سے انتقام لینے کا ایک ذریعہ آسیہ بھی تھی۔ اس نے پولیس انسپکٹر مکھن سنگھ کو گلا گھونٹ کر مار دیا تھا۔ میں جیلانی کو ادھر لا کر پھانسی چڑھوا دیتا۔ ہم نے یہی سوچ رکھا تھا"

وہ فر فر بول رہا تھا۔ کرسی کے شکنجے نے اسے بے بس کر دیا تھا اور اسے امید تھی کہ اگر وہ میرے سامنے سچ بولتا رہا تو میں اسے چھوڑ دوں گا۔ حیرت مجھے یہ تھی کہ وہ آسیہ کے بارے میں اپنی قطعی لاعلمی کا اظہار کر رہا تھا۔ جس پر مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ حالات واقعات ایسے تھے کہ مجھے آسیہ کے اس اغوا میں انہی کا ہاتھ نظر آ رہا تھا۔ مجھے پچھلی بار بلبیر سنگھ نے سمجھا دیا تھا کہ وہ آسیہ کو اٹھوا لے گا۔ اس نے کبیر شاہ کا نام بھی لیا تھا۔ اس کے گھر میں ایک ہندو کی موت اس بات کا ثبوت تھی کہ وہ سب کچھ اب کی بار انہی لوگوں کے ایما پر کیا گیا ہے۔ مگر بلبیر سنگھ صاف انکار کر رہا تھا حالانکہ وہ اتنی شدید اذیت میں مبتلا تھا اور باقی تمام حقائق اس نے بے کم و کاست مجھ پر منکشف کر دیئے تھے۔ اگر آسیہ کے بارے میں اسے کچھ معلوم ہوتا تو یقیناً وہ بھی سب کچھ اگل دیتا۔ مگر وہ اس مرحلے پہ پہنچ کر ہر شے سے منکر ہو رہا تھا۔

اس کے جھوٹ سچ کو پرکھنے کے لئے میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کرسی کو کمرے کے اندرونی دروازے کی طرف گھسیٹا تو معلوم ہوا کہ اس کے نیچے لٹو سے لگے ہیں جن پہ چلا کر اس کرسی کو بڑے آرام سے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جا سکتا تھا۔ کرسی کو دھکیل کر جب میں مکان کے اندرونی حصے میں جانے لگا تو بلبیر سنگھ دہشت زدہ ہو کر بولا "یہ کیا کر رہے ہو؟ تم سمجھتے ہو مجھے ذلیل کر کے تم بچ جاؤ گے یا جن لوگوں نے تمہیں بھیجا ہے انہیں ہم معاف کر دیں گے"

"بکواس بند کرو۔ تم سے تو ہم ایک ایک بات کا حساب لیں گے بچے ——— ہر آدمی اپنے ہی اعمال کا حساب دیتا ہے۔ اس کا اپنا ہی جال اس کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے" یہ کہہ کر میں نے اسے مکان کے عقبی حصے کے ایک کمرے میں پہنچا کر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ وہ کمرہ شاید اس کی خواب گاہ تھی۔ وہاں دیوار پر سیتا اور اس کی تصویریں ٹنگی ہوئی تھیں۔

میں نے کرسی برقی سوئچ بورڈ کے سامنے دیوار کے قریب رکھ دی اور پھر اس کی دونوں برقی پٹیاں بلبیر سنگھ کی کلائیوں پر کس کر باندھ دیں۔ وہ گھگھیانے لگا۔ اس اذیت کا تصور ہی اسے مارے ڈالتا تھا جو اس کا مقدر بن چکی تھی۔ وہ اپنے اس حربے کو خدا جانے کتنے بدنصیبوں پر آزما چکا تھا اور اس گھر کی دیواروں میں کس کس مظلوم کی چیخیں گھٹ کر رہ گئی تھیں۔ اب وہ خود کو اس مرحلے میں سے گزرتے دیکھ کر سہم گیا تھا۔ مگر مجھے اس پر کوئی ترس نہیں آتا تھا۔ مجھے آسیہ کے بارے میں اس کے منہ سے حقیقت اگلوانی تھی۔ میں کسی قطعی نتیجے پر پہنچے بغیر وہاں سے واپس نہیں لوٹ سکتا تھا۔

"اب بھی وقت ہے بلبیر سنگھ! مجھے بتاؤ آسیہ کہاں ہے؟ اسے تم نے کن لوگوں کے ذریعے ترن تارن سے اٹھوایا اور اب وہ

کہاں ہے؟"

"میں سچ کہہ رہا ہوں مہتہ جی! مجھے کچھ پتہ نہیں ہے۔ بھگوان کی سوگند، میں کچھ نہیں جانتا۔ ہمارا کوئی آدمی اس تک نہیں پہنچا۔"

وہ بلبلایا۔ میں نے بجلی کا تار سوئچ میں لگا دیا۔ جونہی میں نے بٹن دبایا بلبیر سنگھ کے منہ سے فلک شگاف چیخ نکل گئی۔ کرسی میں زبردست برقی رَو دوڑ گئی تھی۔ میں نے بٹن بند کر دیا۔ بلبیر سنگھ کی آنکھیں ابل کر باہر آنے لگی تھیں۔ رنگ اس کا اس حد تک سفید ہو گیا تھا جیسے کسی نے اس کا سارا خون نچوڑ لیا ہو۔ جب میں نے بجلی کی رَو روکی، تو اس نے گردن ڈال دی۔ وہ بالکل ہی نڈھال ہو گیا تھا۔ سانس اس کا بہت آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ مجھے اس پر اس گھڑی ترس آ گیا۔ میں نے شربت کا ایک گلاس بیٹھک میں رکھے جگ میں سے بھر کر اسے پلایا تو وہ قدرے سنبھلا۔ روتے ہوئے بولا "مجھے اور زیادہ ذلیل نہ کریں مہتہ جی! واہگورو کی قسم میں آسیہ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ مجھے چھوڑ دیں۔ میں آپ کے بہت کام آ سکتا ہوں۔ جو سیوا آپ کہیں گے، میں کرنے کو تیار ہوں۔"

میں نے اس کی کلائیوں پر سے وہ برقی پٹیاں کھول دیں۔ مجھے اس کی باتوں پر اعتبار آ گیا تھا۔ بلاشبہ وہ آسیہ کے بارے میں لاعلم تھا مگر سوال یہ تھا کہ وہ گئی کہاں؟ وہ کن لوگوں کے ہتھے چڑھ گئی ہے میرے وہ کون سے والے دشمن تھے جو میری شہ رگ پر اتنا دباؤ ڈال رہے تھے کہ میں تڑپ تڑپ کر بے جان ہوا جاتا تھا۔ اس دشمن کو سامنے آنا چاہئے تھا۔ میں اس کے بارے میں اب تک کوئی صحیح اندازہ کیوں نہیں لگا سکا؟ میں کیوں پاگل پن کی سرحد عبور کر آیا؟ کیا ملا مجھے یوں اندھیرے میں چھلانگ لگا کر۔ وہاں رہ کر تو میں آسیہ کے لئے سوکنویں جھانک سکتا تھا مگر اب تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ آسیہ خدا جانے کس مصیبت سے دوچار ہے، میرے دشمنوں نے تو اس پر بے پناہ مظالم ڈھائے ہوں گے۔ وہ اتنی ساری اذیت کہاں سہہ سکے گی۔ میں تو سمجھا تھا کہ بلبیر کے پاس پہنچ کر میں آسیہ کو سارے جہان کی مصیبتوں سے ہمیشہ کے لئے بچا لوں گا مگر وہاں تو کچھ بھی نہیں تھا۔

اپنی اس ناکامی پر میں کتنی ہی دیر تک وہاں کھڑا جھنجھلاتا رہا۔ اس کرسی کا خودکار شکنجہ ابھی تک بلبیر کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے تھا اس کی اتنی ساری فرعونیت اذیت کو کم کرنے کے لئے اور اپنے دوسرے منصوبے پر عمل کرنے کے لئے میں نے آگے بڑھ کر تیزی سے اس کی رگ احساس مل دی۔ وہ نڈھال تو ہو ہی رہا تھا فوراً ہی کرسی پر جھول گیا۔ چند ہی لمحوں بعد میں نے شکنجے کی گرفت ڈھیلی کر کے اسے کرسی میں سے نکال کر بستر پہ ڈال دیا۔ میں اسے ہر قیمت پر پاکستان پہنچانا چاہتا تھا تاکہ اس کے ساتھ انصاف تو کیا جا سکے۔ میرے دل میں آئی کہ میں سیتا کو بھی ساتھ لے چلوں مگر وہ محض ایک بوجھ ثابت ہوتی کیونکہ اس سارے خونی ڈرامے میں اس کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ علی بخش سے بے وفائی کر کے بلبیر کے جال میں پھنس گئی۔ عورت سدا سے فساد کی وجہ بنتی رہی ہے مگر اس کا حال تو زمین اور زر ایسا ہے، وہ تو کبھی نہیں کہتے کہ ہماری خاطر ایک دوسرے کا سر قلم کر دو۔ وہ تو اپنی جگہ بے ضرر، بے قصور اور معصوم بنے رہتے ہیں۔ زمین تو بہرحال زمین رہتی ہے اور اس کی ہو جاتی ہے جو اس میں ہل جوتتا ہے۔ یہی حال زر اور زن کا ہے۔ سارا قصور تو اُن لوگوں کا ہوتا ہے جو ان کی آرزو میں دوسروں کی جڑیں کاٹنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ سیتا کو کسی عدالت میں گھسیٹا بھی گیا تو وہ رو دھو کر اپنی جان چھڑا لے گی وہ یہی کہے گی کہ وہ بے گناہ ہے اور قانون اس بات کو تسلیم بھی کرے گا۔ پھر..... پھر میں اسے کیوں بلبیر کے ساتھ لئے پھروں۔ ضرورت ہی کیا ہے۔ ہاں البتہ بلبیر کے خلاف وہ ایک ٹھوس گواہ بن سکتی ہے اور یہ بات قانونی ضرورت پورا کرنے کے لئے ناگزیر نظر آتی تھی۔

میں کتنی ہی دیر تک گھر کے مختلف کمروں کا جائزہ لیتا رہا۔ کے گھر میں ایک چار فٹ اونچا سیف بھی موجود تھا۔ اس کی چابیاں سیتا کی سنگار میز کے نچلے خانے میں سے مل گئیں۔ میں نے وہ سیف کھولا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس میں دو لاکھ بہتر ہزار کے کرنسی نوٹ موجود تھے۔ اس کے علاوہ سیتا کے طلائی زیورات بھی تھے جن کا وزن ایک سیر سے تو کسی بھی طرح کم نہیں تھا۔ وہ تمام چیزیں میں نے ایک بریف کیس میں بھر لیں۔ بلبیر کی ماں کی ضرورت کا خیال کرتے ہوئے میں نے کوئی پچاس ہزار روپے سیف میں چھوڑ دیئے۔ بلبیر کو سرکار کی طرف سے انعام میں دی گئی دو مربع زمین اس کی کفالت کے لئے بہت کافی تھی۔ سیتا کو بھی میں نے پاکستان پہنچانے کا فیصلہ کر لیا۔

میں نے بریف کیس میں تمام نقدی اور زیورات محفوظ کرنے کے بعد ان کی ایک جستی پیٹی خالی کر لی۔ اس کی تہہ میں ایک لحاف بچھا کر بلبیر اور سیتا کو اس پر لٹا دیا۔ اور ان کے ہاتھ پیر اور منہ اس طرح کس کر جکڑ دیئے کہ وہ سانس تو لے سکتے تھے مگر اپنے بدن کے کسی حصے کو جنبش نہیں دے سکتے تھے۔ پیٹی کے تین اطراف میں میں نے ان کے منہ کے سامنے ایک نوکدار سلاخ سے کئی کئی سوراخ ڈال دیئے ہیں سے ہوا کا گزر ہوتا ہے۔

اس کام سے فارغ ہو کر میں نے پیٹی کو تالہ لگا دیا۔ میں اس کو اب بالک رام کے اڈے پہ پہنچانا چاہتا تھا کیونکہ اس نے یہی کہا تھا جس آدمی کی برآمد ضروری ہو میں اسے اس کے پاس پہنچا دوں۔ پہلا شکار بلبیر اور اس کی گشتی بیوی سیتا تھے۔ ان کے بارے میں ایک رقعہ ڈھلوں صاحب کے نام لکھ کر میں نے بلبیر سنگھ کی جیب میں ڈال دیا۔

ہر طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں نے وہاں غسل کیا اور پھر کوئی شام کے چھ بجے میں بلبیر کے مکان سے نکلا اور بڑی سڑک پہ سے گزرتا ہوا ایک منی ٹرک پکڑ کر گلی میں لے آیا۔ ٹرک میں دو آدمی سوار تھے ایک ڈرائیور اور ایک مزدور۔ جستی پیٹی میں نے پہلے ہی ڈیوڑھی میں رکھی ہوئی تھی۔ مزدور کی مدد سے میں نے وہ ٹرک میں رکھوائی اور مکان کو باہر سے تالہ لگا کر میں اسی وقت بالک رام کے اڈے پہ جا پہنچا۔ وہ اس وقت اپنی شاگردوں کو ناچ سکھا رہا تھا اور موسیقی کی آوازوں سے عمارت لبالب بھری ہوئی تھی۔ میں نے وہ پیٹی ٹرک سے اس عمارت کے بڑے دروازے پر اتروائی تھی اور وہ ٹرک واپس جا چکا تھا۔ میرے آنے کی اطلاع پا کر بالک رام جب باہر نکلا تو مجھے یوں معلوم ہوا جیسے وہ شراب پی کر آیا ہے۔ آنکھیں اس کی سرخ ہو رہی تھیں، بولا "کہئے مہتہ جی! کیا خبر ملی ہے۔"

"خبریں تو بہت اچھی ہیں بالک رام جی، مگر ریڈیو کے ساتھ کان لگانے پڑیں گے۔ ذرا ادھر آ جائیں الگ ہو کر میری بات سن لیں۔" یہ کہہ کر میں نے اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ معاملے کی نوعیت سمجھ کر مسکرایا اور میرے شانے سے شانہ ملا کر عمارت کے صدر دروازے تک جا پہنچا۔

"ہاں! تو اب بتائیں معاملہ کیا ہے؟"

"معاملہ یہ ہے شری بالک رام جی! کہ میں مال لے آیا ہوں اس پیٹی میں بند ہے۔ یہ جو باہر رکھی ہے۔ آپ اسے آج ہی ٹھکانے لگا دیں۔"

"مائی گڈنیس! ہاؤ فاسٹ یو آر؟ مال کس حالت میں ہے؟"

"سی کے ڈی حالت میں ہے حضور! اس کو کس جگہ رکھوائیں؟"

"کون کون سا جانور بند ہے اس میں؟"

"بلبیر سنگھ اور اس کی پتنی۔"

"وہ مارا۔ مہتہ جی! حیرت ہے، حیرت ہے۔ کہاں پہنچانا ہے اس مال کو؟"

"چوگوٹھ میں ڈھلوں صاحب کی حویلی پر۔ ان کے نام میں نے ایک رقعہ لکھ کر بلبیر سنگھ کی جیب میں ڈال دیا ہے۔"

"آپ فکر ہی نہ کریں مہتہ جی! کوئی ٹیکہ لگایا ہے انہیں۔"

"میں نے سر پہ ضرب لگا کر انہیں بے ہوش کیا ہے اور ہاتھ پیر کس کے باندھ دیئے ہیں۔ دونوں کے منہ بھی بند ہیں۔ پیٹی میں ہوا کے لئے آر پار سوراخ ہیں۔ نیچے گدّا بچھا ہے۔"

"ہوں! آدمی آپ خاصے ایکسپرٹ ہیں۔ پیکنگ کا بھی کورس پاس کر رکھا ہے آپ نے۔ آپ یوں کریں کہ اب اندر جا کر ڈانس دیکھیں مراری جی انہیں سبق دے رہے ہیں۔ اتنے میں یہ پیٹی میں کسی جگہ پہنچا دیتا ہوں۔ آپ اندر بیٹھیں۔ مراری جی سے کہہ دیں کہ میں نے آپ کو بھیجا ہے۔" یہ کہہ کر وہ عمارت کے صدر دروازے سے باہر نکل گیا اور میں پیٹی پر ایک نظر ڈال کر اندر چلا گیا۔

موسیقی کی آواز دائیں ہاتھ کے ایک کمرے سے آ رہی تھی۔ میں اس کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو میری نظر پھسلنے لگی۔ مراری جی دیوار کے ساتھ گاؤ تکئے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے قریب ہی ایک آدمی ہارمونیم بجا رہا تھا، دوسرا اپنے سامنے دو خوبصورت طبلے رکھے ہوئے تھا اور ان کے سامنے تین لڑکیاں ناچ رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی وہ تینوں یکدم اپنی اپنی جگہ رُک گئیں۔ چھت میں لگا پنکھا پوری رفتار سے بے آواز چل رہا تھا۔ فرش پر صاف ستھری چاندنی بچھی تھی۔ مراری جی نے مجھے دیکھا تو سنبھل کر بیٹھ گیا۔ پان کی پیک اگالدان میں ڈال کر اپنے سفید رومال سے ہونٹ صاف کر کے بولا "فرمائیے جناب! کس سے ملنا ہے آپ کو؟"

"مراری جی آپ ہی ہیں؟"

"جی ہاں، فرمائیے!"

"مجھے بالک رام جی نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ میں ان کی واپسی تک یہاں بیٹھوں گا۔"

"اوہ! یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ تشریف رکھئے۔ ناچ رنگ سے دلچسپی تو ہو گی آپ کو؟ ادھر میرے پاس آ جائیں۔" یہ کہہ کر وہ ذرا سا پرے کھسک گیا۔

"شکریہ مراری جی! بڑی گرم محفل سجا رکھی ہے آپ نے؟"

"جی ہاں! بڑھاپا تو موت کی پہلی سیڑھی ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ بستی شہر کی، دھوپ دوپہر کی، مستی لہر کی اور نیند پچھلے پہر کی۔"

"کمال کی بات کی ہے آپ نے مراری جی! دل خوش کر دیا ہے آپ نے۔ یہ بیبیاں کہ سجن لگتی ہیں۔"

"جی نہیں! یہ گیتا ہے، یہ تپتیا ہے اور یہ پدمنی۔ تینوں ہندو ہیں بڑا شوق ہے انہیں ناچ کا۔ اب تو بہت نکھر گئی ہیں۔ بھگوان نے بڑا لوچ دیا ہے انہیں۔ ان کے لئے ٹھنڈا لاؤ پربھو، دودھ سوڈا ملے تو زیادہ بہتر ہے۔" مراری جی نے طبلچی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ اسی وقت اٹھ کر باہر نکل گیا۔

"مسلمان لڑکیاں بھی آپ کی شاگرد ہوں گی؟"

"نہیں، مہاراج! ہم وہ ٹنٹا نہیں پالتے۔ شور مچ جاتا ہے۔ ویسے بھی وہ ماس خور قوم ہے۔ ان کی عورتیں بہت موٹی اور قد آور ہوتی ہیں وہ رقص نہیں سیکھ سکتی ہیں۔ آپ کہاں سے آئے ہیں مہاراج؟"

"میں..... میرا نام رمیش مہتہ ہے۔ میرا زیادہ وقت بمبئی میں گزرتا ہے۔"

اتنے میں پربھو دودھ سوڈے کی چھ بوتلیں لے آیا۔ مراری جی نے سب کو وہ مشروب پلایا اور پھر اس نے لڑکیوں سے کہا کہ وہ اپنا سبق شروع کر دیں۔ میں پنکھے کی ہوا تلے غنودگی سی محسوس کر رہا تھا میں نے

کہا: "مرار جی! میں ذرا آرام کروں گا۔ مجھے بالک رام کے کمرے تک پہنچا دیں۔ بہت تھکا ہوا ہوں۔"

مرار جی نے مجھے اسی وقت پہلو کے کمرے میں پہنچا دیا، بولا۔
"آپ آرام کریں مہاراج! استاد صاحب بس آتے ہی ہوں گے۔"
میں نے بالک رام کے بستر پر لیٹتے ہی آنکھیں موند لیں۔ بلبیر سنگھ کے قصے میں پڑ کر میرے اعصاب کھنچ گئے تھے۔ بستر پر لیٹتے ہی مجھے نیند آ گئی۔

جب میری آنکھ کھلی تو رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ اور کمرے میں بتی جل رہی تھی۔ پہلو کا دروازہ کھلا تھا۔ میں اٹھ کر اس دروازے میں پہنچا تو مجھے وہاں بالک رام ایک کتاب کے مطالعہ میں محو نظر آیا میری آہٹ پا کر اس نے سر اٹھایا اور بولا: "آئیے آئیے مہتہ جی! میں آپ ہی کا منتظر تھا۔ کہئے نیند تو اچھی آئی نا؟"

"جی ہاں! کمرہ ٹھنڈا ہے اور آپ کا بستر نرم نرم ہے۔"
"میں نے آپ کو اسی لئے نہیں جگایا۔ آپ بہت تھکے ہوئے تھے۔ آئیں ادھر میرے پاس بیٹھیں۔" میں جب اس کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا تو وہ بولا: "مہتہ جی! میں نے ان دونوں کو اسی وقت ایک افغان ٹرک میں لدوا کر واہگہ روانہ کر دیا تھا۔ پیٹی سے نکال کر میں نے چھوٹے چھوٹے دو صندوقوں میں انہیں الگ الگ ڈال دیا تھا اور ٹیکہ بھی لگا دیا تھا۔ آج رات وہ چوگومڑ پہنچ جائیں گے۔"

"بڑی مہربانی ہے آپ کی، یہ بہت ضروری تھا۔"
"میں اس دھندے کو سمجھ نہیں سکا ہوں۔ بلبیر سنگھ کیا فائدہ دے سکتا ہے انہیں۔"
"آپ کو بعد میں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ وہ بہت خطرناک آدمی ہے بالک رام جی! بہر حال اب مجھے دوسرے لوگوں پر توجہ دینی ہوگی۔"
"ایک تو میرا خیال ہے بھنڈاری آپ کا شکار بنے گا۔"
"ہاں! وہ ایسا آدمی ہے جسے میں جانتا ہوں۔ بلبیر اور اس کی بیوی کو تو میں نے ایک اور وجہ سے اٹھایا ہے۔"
"اچھا وہ فہرست میں نہیں تھا۔"
"نہیں! اور مجھے امید ہے کہ آپ مجھ سے ناراض نہیں ہوں گے۔"
"نہیں مجھے ناراض ہونے کی کیا ضرورت ہے مسٹر مہتہ۔ بہر حال آپ اگلا قدم بڑی احتیاط سے اٹھائیں کیونکہ بھنڈاری کی وہ زبردست حفاظت کر رہے ہیں۔"
"کیوں اسے کیا خطرہ ہے؟" بالک رام ہنس دیا۔ بولا "خبریں انہیں بھی مل چکی ہیں۔ ساوتری کی موت نے انہیں بہت پریشان کیا ہے۔"
"آپ اس معاملے میں میری کوئی مدد نہیں کریں گے۔"
"یہی کیا کم ہے مہتہ جی کہ ہم مال دساور بھیج دیں گے۔ ورنہ یہ چوہے پکڑنے کا کام تو کوئی بھی کر سکتا ہے۔"

"آپ کی نظر میں یہ چوہے پکڑنے کا کام ہے۔" میں نے تیز ہو کر کہا۔
"منوسمرتی میں لکھا ہے کہ پھل سے لدے پھندے درخت پر ہی پتھر مارنے سے کام بن جاتا ہے۔ یہ سنسار منش جنگل ہے اس میں گھس کر جسے چاہو پکڑ لو۔"
"مجھے حیرت ہے بالک رام جی! میں ایک لاکھ روپے کی شرط لگاتا ہوں۔ بھنڈاری کو کل شام تک پکڑ لائیں تو یہ روپیہ میں آپ ہی کو دے دوں گا۔"
ایک عجیب سا زہریلا طنز اس کے چہرے پر ابھرا۔ آنکھیں پھیر کر عجیب سے انداز سے ہنس کر بولا۔
"ایک لاکھ؟ آپ نے تو شری مہتہ جی ایک لاکھ پیسہ بھی نہیں دیکھا ہوگا۔ اس کام کا کیا معاوضہ ملے گا آپ کو؟ جس کے لئے آپ نے اپنی جان اور صورت داؤ پر لگا دی ہے؟"
"مجھے لگتا ہے بالک رام جی! آپ کو میرا یہاں آنا پسند نہیں۔ آپ چاہتے تھے کہ یہ کام وہ آپ کے سپرد کر دیتے۔ آپ اس جگہ میری موجودگی کو اپنی توہین سمجھ رہے ہیں۔"
وہ میری یہ بات سن کر ایک دم سنبھل گیا، بولا۔
"یہ بات نہیں ہے شری مہتہ جی! آپ سے اس ایک دن میں بھی بہت سی غلطیاں ہو چکی ہیں۔ آپ بلبیر سنگھ کی والدہ کو کھلا چھوڑ آئے ہیں۔ وہ اجیت سنگھ ٹیکسی ڈرائیور بھی آپ کو پہچانتا ہے جو آپ کو وہاں لے کر گیا تھا۔ منی ٹرک کے ڈرائیور سوہن لال اور اس کے مزدوروں نے بھی آپ کو دیکھ کر یاد رکھا ہے۔ تھانوں میں بلبیر سنگھ اور اس کی بیوی کے اغوا سے کھلبلی مچ گئی ہے۔ بلبیر کی ماں نے ہوش میں آنے پر واویلا مچا دیا ہے آپ کی خوش نصیبی ہے کہ وہ پیٹی آپ نے باہر نکال کر ٹرک پر اتار دی۔ پولیس اس عمارت میں کئی بار جھانک چکی ہے۔ آپ نے بڑا "کرڈ" کام کیا ہے یہ ..... یہ فنکاری نہیں ہے دھکا ہے ..... دھکا۔"
"آپ مجھے خوف زدہ کرنے کی کوشش فرما رہے ہیں؟"
"نہیں! یہ میری ذمہ داری ہے کہ آپ کی ہر حال میں حفاظت کروں۔ آپ پر لازم ہے کہ اپنے پیچھے کوئی لکیر نہ چھوڑیں۔ آپ کو شاید یہ معلوم نہ ہوگا کہ بلبیر سنگھ نے آپ کی دو تصویریں بھی اتار لی تھیں۔ جو کیمرہ اس کے گھر سے ملا ہے اس سے وہ تصویریں برآمد ہوئی ہیں۔ بلبیر سنگھ بہت ہوشیار آدمی تھا۔ بس مار کھا گیا اپنی بدقسمتی کی وجہ سے۔ بہر حال آپ باہر نکلیں تو بہت محتاط ہو کر۔"
"یہ تو بہت برا ہوا بالک رام جی! وہ تصویریں کب اتاری گئیں؟ مجھے تو احساس تک نہیں ہوا۔"
"اس نے کوئی موقعہ دیکھ لیا ہوگا۔ بہر حال اب آپ یہ داڑھی

لیں اور سر پر یہ کیس بھی رکھ لیں۔ کچھ کڑا اور کرپان بھی آپ کے لئے ضروری ہوگئی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے الماری میں سے میرے لئے مصنوعی داڑھی اور لمبے سیاہ بالوں کی ایک وگ نکال کر میرے سامنے رکھ دی دونوں چیزیں میں نے اپنے چہرے پر سجالیں تو وہ بولا۔
"اب آپ کی زندگی کی کچھ امید کی جا سکتی ہے۔ یہ لیں یہ کرپان باندھیں اور یہ کڑا ابھی پہن لیں۔" یہ دونوں چیزیں بھی اس نے اپنی الماری میں سے نکال کر میرے آگے رکھ دیں۔ جب میں اپنا حلیہ تبدیل کر چکا تو اس نے الماری کا پٹ پوری طرح کھول دیا۔ اس کے اندرونی حصے میں ایک قدِ آدم آئینہ لگا تھا۔ میں نے اس میں جھانک کر اپنا جائزہ لیا تو میرے دل پر بوجھ سا پڑ گیا۔ میں نے ایسی صورت اختیار کر لی تھی جسے میں نے ہمیشہ باعثِ ننگ سمجھا تھا۔ مجھے سکھ نہیں بننا تھا۔ ان لوگوں کے خلاف میرے دل میں بہت سی گرہیں بیٹھی تھیں۔ سن سینتالیس کے ان گنت واقعات مجھے یاد تھے۔ میرے عزیز و اقارب، میرے دوست احباب مجھے بتایا کرتے تھے کہ من حیث القوم ان لوگوں نے مسلمانوں سے کیسا وحشیانہ سلوک کیا تھا۔ ان کے ظلم و بربریت کی ان گنت کہانیاں میرے وطن کے گلی کوچوں میں بکھری پڑی ہیں۔ مگر میری بدنصیبی کی انتہا یہ تھی کہ اس روز میں انہی لوگوں کے بھیس میں چھپ کر اپنی زندگی بچانا چاہتا تھا۔
میرے چہرے کی پژمردگی کو بالک رام نے محسوس کر لیا، بولا: "کیا بات ہے آپ اس لباس میں خوش نہیں ہیں؟"
"نہیں بالک رام جی! یہ ..... یہ میری نظر میں بھیڑیوں کا لباس ہے ان لوگوں کا جنہوں نے ہر اخلاقی قدر پاؤں تلے روند ڈالی تھی۔"
"چھوڑیں مہتہ جی! قومیں بار ہا پاگل ہوتی ہیں۔ آپ نے پسیپے کے دو منڈو والی کہانی بھی سنی ہوگی۔ میری شودر قوم ہزارہا سال سے پاؤں تلے روندی جا رہی ہے۔ کون سنتا ہے یہاں۔ مرض منش پر جب ہی غالب آتا ہے جب منش اندر سے کمزور ہو جاتا ہے۔ آپ بہر حال بہت محتاط رہیں۔ یہ لباس آپ کی حفاظت کرے گا۔"
"ٹھیک ہے بھائی جی! مگر میں یہ مصنوعی داڑھی اور کیس دن رات تو نہیں پہن سکتا۔"
"اسے آپ اپنی یونیفارم سمجھیں۔ جو آپ اپنے فرض کی ادائیگی کے دوران پہنا کریں گے۔ بھنڈاری کے گھر اور دفتر کا تو آپ کو علم ہوگا؟"
"نہیں۔ مجھے تفصیل بتا دیں۔ میں اس کے گھر گیا تو تھا مگر راستہ مجھے یاد نہیں ہے، اس سڑک کا نام بھی معلوم نہیں ہے۔"
بالک رام نے مجھے ایک کاغذ پر بھنڈاری کا پتہ لکھ دیا، بولا "میری مانیں تو اپنا کام کل شروع کریں۔ آج کی رات یہیں گزاریں۔ اب آپ کا ہوٹل میں ٹھہرنا مناسب نہ ہوگا، وہ آپ کو پہچان لیں گے۔"
وہ رات میں نے بالک رام کے ساتھ اسی عمارت میں گزاری۔ صبح میں چھ بجے بستر سے اٹھا تو بالک رام کمرے میں موجود نہیں تھا۔ میں خوابگاہ سے نکل کر اگلے کمرے میں گیا تو بالک رام اس وقت اخبار پڑھ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا: "اناڑیوں کے کام اسی طرح کے ہوتے ہیں۔ یہ دیکھیں آپ کی تصویر اخبار میں چھپ گئی ہے۔ پولیس نے آپ کا پتہ بتانے والے کے لئے دس ہزار روپے انعام مقرر کیا ہے۔" اس نے اخبار میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ بالک رام ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اخبار میں واقعی میری تصویر چھپی تھی مگر اس میں صرف میرا چہرہ اور کندھے نظر آ رہے تھے۔ تصویر کو اس کے سارے سیاق و سباق سے الگ کر کے شائع کیا گیا تھا۔ لکھا تھا کہ یہ شخص ہمسایہ ملک کا جاسوس ہے کل نہایت ہی پراسرار طریقے سے پولیس افسر بلبیر سنگھ اور ان کی پتنی کو ان کے مکان سے اغوا کر کے لے گیا ہے۔ جو شخص اس آدمی کے بارے میں پولیس کو اطلاع دے گا۔ اسے دس ہزار روپے انعام دیا جائے گا خبر میں کچھ زیادہ ہی نمک مرچ ڈال دیا گیا تھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ پولیس بہت زیادہ چوکس ہو چکی ہے۔
"یہ تو بہت ہی برا ہوا ہے بالک رام جی! میرے لئے تو یہاں چلنا پھرنا بھی مشکل ہو جائے گا۔"
"اسی لئے تو میں نے کہا تھا کہ آپ فنکار نہیں ہیں۔ مگر آپ ناراض ہو گئے تھے۔"
"میرے الفاظ آپ کو یاد نہیں رہے بھائی جی! میں نے آپ سے کہہ دیا تھا کہ میں کوئی پیشہ ور آدمی نہیں ہوں اور اس شہر میں مجھے ہر قدم پر آپ کی رہنمائی کی ضرورت ہوگی۔"
بالک رام کی چھوٹی چھوٹی سانپ ایسی آنکھوں میں چمکارا سا ہوا۔ سینے میں گنجائش سے کہیں زیادہ سانس بھر کر بولا۔ "میرا یہ خیال ہے کہ آپ چند دن کے لئے ادھر ادھر ہو جائیں، کسی گاؤں میں جا ٹھہریں۔"
"میں خواہ مخواہ وقت ضائع نہیں کر سکتا ہوں بالک رام جی! مجھے اپنی بہن کی تلاش ہے۔ اس کی زندگی خطرے میں ہے۔ میں یہاں اپنا کام ختم کر کے جلدی واپس جانا چاہتا ہوں۔"
"سوچ لیں! آپ کے گرد وہ کسی بھی وقت اپنا حلقہ تنگ کر سکتے ہیں۔ اس عمارت میں بہت سے لوگ آپ کو پہچان سکتے ہیں۔"
"تو پھر میں کیا کروں؟ میں آج ہی لاہور واپس چلا جاتا ہوں۔"
"یہ کام بھی اتنا آسان نہیں ہے۔ بہر حال مجھے کچھ سوچنے کا موقعہ دیں اور آج دوپہر تک تو کسی طرف بھی نہ نکلیں۔ فراق نے آپ ہی جیسے لوگوں کے لئے کہا تھا کہ ؎

کس طرف نکلیں کہاں جائیں کہ تم رسوا نہ ہو
ہم تو دیوانے ہیں اور دیوانوں سے دنیا آشنا

"آپ کا حسنِ انتخاب قابلِ داد ہے بالک رام جی! مگر مجھے بتائیں میں کیا کروں؟"
"نہا دھو کر آپ فوراً وہ داڑھی اور کیس لگا لیں اور یاد رکھیں کہ

آپ کا نام گیانی فتح سنگھ ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ مرارجی یا اس کے طلبچی وغیرہ آپ کو پہچان لیں، بہت محتاط رہیں۔ ذرا سی غلطی سے سارا کھیل بگڑ سکتا ہے۔ میں بھی خواہ مخواہ مارا جاؤں گا۔" یہ کہہ کر اس نے اخبار اٹھایا اور اس کے مطالعے میں محو ہو گیا۔

اس کی ہدایت کے مطابق میں نے نہانے کے بعد سکھوں کا لباس پہنا اور گیانی فتح سنگھ بن کر بیٹھ گیا مگر میں مطمئن نہیں تھا۔ میری اس مصنوعی ڈاڑھی کا راز کسی بھی وقت طشت از بام ہو سکتا تھا۔ مگر اپنی اس فکر کو میں نے بالک رام پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ وہ میرے دل میں کوئی اور وسوسے ڈال سکتا تھا۔ اس کی تشویش برحق تھی مگر میرے مسئلے کا کوئی شافی حل وہ مجھے نہیں بتا رہا تھا۔ ناشتے کے بعد اس نے لباس تبدیل کیا اور بولا "میں ذرا باہر جا رہا ہوں۔ آپ اسی کمرے میں بیٹھے رہیں مرارجی یا کوئی اور آدمی ادھر آئے تو اس سے زیادہ بات نہ کرنا۔ آپ کی آواز بھی وہ کُتّے کے بچے سن سکتے ہیں۔" اس نے اپنا کمرہ مقفل کر دیا اور چاروں طرف کا تنقیدی جائزہ لینے کے بعد وہ باہر نکل گیا۔

میرے دل و دماغ میں کھلبلی مچی تھی۔ کئی خدشے مجھے نرغے میں لئے ہوئے تھے۔ اخبار میں اپنی تصویر دیکھ کر میں لرز گیا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ میں کہیں بے خبری ہی میں نہ مارا جاؤں۔ خطرے کی کوئی سمت واضح نہیں تھی اور مجھے معلوم تھا کہ وہ ہر طرف سے مجھ پر یلغار کر سکتے ہیں۔ لیکن سوال یہ تھا کہ میں کہاں جاؤں۔ میری بہترین پناہ گاہ تو بالک رام کا وہ کمرہ ہی تھی۔ مگر وہ عمارت پولیس کی نظروں میں کسی بھی وقت مشتبہ ہو سکتی تھی ـــــ اور میرا حلیہ بھی جیسے نیا رنگ دے دینے کے باوجود میں مطمئن نہیں تھا کیونکہ میرا وہ ٹیڑھا نچلا ہونٹ اور اس کی درز میں سے جھانکتے ہوئے میرے دانت اور پھر دائیں جبڑے کا وہ نمایاں ابھار میری شناخت کے لئے بہت کافی تھا۔ میں نے ایک بار پھر آئینے میں اپنی صورت کا جائزہ لیا۔ جس نے مجھے کل دیکھا تھا۔ وہ مجھے آج اس مصنوعی داڑھی کے باوجود بڑی آسانی سے پہچان سکتا تھا۔ میں نے اپنے نچلے ہونٹ کے اندر لگے ٹانکے کو بالک رام کے شیونگ باکس میں سے ایک بلیڈ نکال کر کاٹ دیا۔ ٹانکا کٹا تو سہی مگر جب میں نے موچنے کے ساتھ اسے اپنے گوشت میں سے باہر کھینچا تو درد سے میری جان ہوا ہو گئی۔ ٹانکے کلوہ دھاگا سا باہر آیا تو اس کے ساتھ ہی میرے ہونٹ سے خون بہنے لگا۔ میں اس نئی مصیبت کے لئے بالکل تیار نہیں تھا۔ میں نے بالک رام کے واٹر کولر میں رکھی برف کی ایک ڈلی لے کر منہ میں رکھ لی۔ مگر درد کسی بھی طرح رُک نہیں رہا تھا۔ البتہ چند ساعتوں کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ خون رسنا بند ہو گیا ہے۔ یہ بڑی اچھی بات تھی۔ برف اثر کر گئی تھی۔ بالک رام نے وہاں ایک شیشی غسل خانے میں رکھی ہوئی تھی جس پر "ماؤتھ وش" لکھا تھا۔ وہ غالباً منہ کی بدبو دُور کرنے کی دوا تھی۔ میں نے اس کا ایک چمچہ گلاس میں ڈالا اور اس میں پانی ملا کر میں کلیاں کرنے لگا۔ وہ پانی بہت ہی مفید ثابت ہوا۔ ٹانکے کے زخم سے خون بہنا بند ہو گیا۔ اس مرحلے سے گزر کر میں نے بالک رام کی قینچی لے کر جبڑے کے ساتھ لگائی گئی اس نرم و ملائم سفید سنگِ مرمر کی پٹی کے تار بھی کاٹ ڈالے۔ جب میں اس پٹی کو جبڑے میں سے نکال چکا تو یوں محسوس ہوا۔ جیسے میں بالکل ہلکا پھلکا ہو چکا ہوں۔ میری اصلی صورت مجھے واپس مل گئی تھی۔ اب میں پہلا سا غلام جیلانی بن گیا تھا اور آئینہ جھوٹ نہیں بولتا تھا۔ اس میں واقعی میں خوبصورت جوان نظر آ رہا تھا۔

جانے کیا بات تھی مجھے یہ احساس ڈسنے لگا تھا کہ بالک رام مجھے وہاں بٹھا کر جان بوجھ کر وہاں سے ٹل گیا ہے۔ یا تو وہ میرا ردِعمل دیکھنا چاہتا تھا یا خود کو اس سارے قصے سے الگ تھلگ ظاہر کرنے میں مصروف تھا۔ اس کے رویّے نے مجھے پریشان کر دیا تھا ـــــ پندرہ منٹ تک میں وہیں بیٹھا صورتِ حال پر غور کرتا رہا۔ اب جو میں نے سگریٹ سلگانے کے لئے ہونٹوں میں لیا تو مجھے یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ میرا نچلا ہونٹ سُوج گیا تھا۔ یہ بڑی خطرناک بات تھی۔ مجھے فوری طور پر کسی ڈاکٹر سے مشورہ کرنا چاہئے تھا۔ ورنہ وہ زخم اذیّت ناک صورت اختیار کر سکتا تھا۔ مگر میں بالک رام کے گھر کو کھلا چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا تھا۔ میں تالا لگا دیتا تو دروازہ بند ہو جاتا۔ اس کا کوئی آدمی یا وہ خود لوٹ آتا تو چابی کہاں سے لیتا؟ میں ابھی اس پریشانی کا حل سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔

"اِدھر کون رہتا ہے؟" کسی نے تحکّم آمیز لہجے میں پوچھا۔

"یہاں بالک رام رہتے ہیں، ڈانس ماسٹر!" کسی نے جواب دیا۔

یہ بات سنتے ہی میں ہائے ہائے کرنے لگا۔ ہاتھ میں نے منہ پر رکھ لیا۔ یوں جیسے میں درد سے مرا جا رہا ہوں۔ عین اسی وقت کسی نے دروازہ دھکیل کر کھول دیا اب میرے سامنے الشیر سنگھ تھا اور اس کے پیچھے ملہوترہ، پانچ چھ سپاہی ان کے عقب میں چلے آئے۔ الشیر سنگھ نے مجھے غور سے دیکھا اور پھر کمرے میں اِدھر اُدھر نظر دوڑاتا اندر آ گیا۔ میں ہائے ہائے کرتا کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اندر سے خود کو زیادہ سے زیادہ پرسکون رکھنے کے لئے میں نے منہ ہی میں "یا حفیظ" کا ورد شروع کر دیا۔

الشیر سنگھ بولا "ست سری اکال سردار جی! ہم بالک رام سے ملنا چاہتے ہیں۔ آپ کچھ بیمار نظر آتے ہیں۔"

ملہوترہ، الشیر سنگھ کے قریب سے گزر کر کمرے کے درمیان آ ٹھہرا۔ وہ بڑے ہی خوبصورت انداز سے اپنی چھڑی کو دائیں بائیں حرکت دے رہا تھا۔ نظریں اس کی میرے چہرے پر جمی تھیں۔

"وہ ابھی ابھی باہر گئے ہیں مہاراج جی! کوئی دو گھنٹے بعد آئیں گے۔" میں نے بڑے مؤدب لہجے میں کہا ـــــ داڑھی میری سینے تک آئی ہوئی تھی اور میری آواز کے ساتھ ہلتی تھی۔ ہاتھ میں نے ابھی تک منہ پر رکھا ہوا تھا۔

"آپ یہاں کیسے بیٹھے ہیں؟ کیا تکلیف ہے آپ کو؟"

"بالک رام جی میرے مِتر ہیں۔ میں ان سے ملنے آیا ہوں میرے منہ میں بہت درد ہے۔"

میری پوری کوشش یہ تھی کہ میری آواز کا اصل رنگ ان پر ظاہر نہ ہو۔ الشیر سنگھ نے دروازے میں کھڑے تین آدمیوں کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ اس میں سے ایک اس منی ٹرک کا ڈرائیور تھا جسے میں نے بیٹی کو بالک رام کے اڈے پر پہنچانے کے لئے کرائے پر لیا تھا۔ الشیر سنگھ بولا۔ "کیوں جے رام کسی کو پہچانتے ہو یہاں؟"

"نہیں مہاراج! وہ آدمی تو نظر نہیں آیا ہے۔ میں اوپر بھی دیکھ آیا ہوں، کمروں کے اندر گھس کر تو آپ ہی دیکھ سکتے ہیں۔"

"سردار جی! یہ آپ کا منہ کیوں سوجا ہوا ہے؟" ملہوترہ نے اچانک مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"میرے منہ میں زخم ہے مہاراج!" میں نے اندر سے لرزتے ہوئے کہا۔

ملہوترہ میری طرف بڑھ آیا، بولا۔

"معلوم ہوتا ہے آپ کو بہت زیادہ تکلیف ہے۔ دکھائیں تو اپنا منہ کھولیں ذرا۔" اس نے اپنا ہاتھ میرے منہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"درد بہت زیادہ ہے مہاراج! منہ کھولنا مشکل ہو گیا ہے۔"

میں نے اس کا ہاتھ اپنے چہرے تک آنے سے پہلے ہی منہ کھول دیا۔ مگر یوں جیسے مجھے منہ کھولتے ہوئے شدید درد محسوس ہو رہا ہو۔ ملہوترہ کسی اور ہی سوچ میں گم تھا۔ اس نے اپنی ساری توجّہ میری آنکھوں پر مرکوز کر دی تھی۔ بڑا زیرک افسر تھا وہ اور مجھے تو وہ اس وقت لے ڈوبا تھا مگر عین اس وقت بالک رام تیز تیز قدم اٹھاتا کمرے میں داخل ہوا۔ یوں کہ اس نے ایک کواڑ بڑے زور سے دیوار میں دے مارا۔ ملہوترہ اور الشیر سنگھ فوراً ہی اُدھر متوجّہ ہو گئے۔ بالک رام شاید ملہوترہ کی نیت سمجھ گیا تھا۔ آتے ہی بولا "دھن بھاگ ہمارے دھن بھاگ مہاراج! یہ کیٹری کے گھر نارائن کیسے آ گئے؟ بیٹھئے نا مہاراج۔ یہ کرسیاں آگے کرو گیانی جی!" یہ کہہ کر اس نے دو کرسیاں گھسیٹ کر ان کے آگے رکھ دیں پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا "گیانی جی! آپ فوراً ڈاکٹر کے پاس چلے جائیں۔ یہ سوجن تو بڑھتی جا رہی ہے۔ مرارجی! انہیں ٹیکہ لگوا لاؤ۔ یہ بہت ضروری ہے۔"

"یہ ہوا کیا ہے انہیں! چہرہ کیسے سوج گیا ان کا؟"

"بس گیانی جی دانتوں میں خلال کرتے ہیں پن کے ساتھ۔ وہ پن ان کے منہ میں دھنس گئی تھی۔ اس کا زہر اب منہ میں پھیل رہا ہے۔ جاؤ مرارجی! ان کو لے جاؤ۔ یہ زہر گلے تک سوجن پیدا کر سکتا ہے۔ انہیں خناق بھی ہو سکتا ہے۔" بالک رام نے مجھے بازو سے پکڑ کر دروازے کی طرف دھکیلا۔ میں نے منہ پر رومال یوں رکھ لیا تھا جیسے میرا درد ناقابلِ برداشت ہو چکا ہو۔ پیشتر اس کے کہ ملہوترہ کوئی قطعی فیصلہ کر سکتا، میں دروازے سے نکل کر بالک رام کے موٹر سائیکل پر مرارجی کے پیچھے بیٹھ چکا تھا اس نے فوراً ہی موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور بلاخیز رفتار سے مجھے وہاں سے لے اُڑا ـــــ بالک رام نے اچانک ہی ملہوترہ کی سوچ کا رُخ بدل کر مجھے ایک بہت بڑی مصیبت سے بچا لیا تھا۔ اتنی بڑی مصیبت سے کہ میں اس کے تصوّر سے ہی لرز رہا تھا۔

بڑی سڑک پر پہنچ کر مرارجی نے موٹر سائیکل کی رفتار اور تیز کر دی۔ کوئی بیس منٹ بعد ہم دربار صاحب کے عقب میں پہنچ چکے تھے مرارجی نے موٹر سائیکل ایک تنگ سی گلی میں ڈالی اور پھر کوئی دس مکان آگے جا کر وہ رُک گیا۔ مکان کے کھلے دروازے میں موٹر سائیکل تیزی سے گزار کے وہ بولا "آئیں سردار جی اندر آ جائیں۔" وہ بڑے معنی خیز انداز سے مسکرا رہا تھا۔

میں جب ڈیوڑھی میں داخل ہوا تو اس نے فوراً ہی دروازے پر کنڈی چڑھا دی۔ پھر وہ بڑی رسان سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا "آدمی کی بیماری بھی کبھی کبھی نعمت بن جاتی ہے۔"

"ہاں مرارجی! لگتا تو ایسا ہی ہے۔ مگر مجھے تو ڈاکٹر کے پاس جانا تھا؟"

"آپ کو اپنی جان ہی کا خطرہ تھا نا۔ سو وہ تو میں بچا لایا! اور کیا چاہئے آپ کو؟"

"یہ کس کا مکان ہے؟"

"یہ میرا مصیبت خانہ ہے مہتہ جی! مگر یہاں آپ بالکل محفوظ ہیں۔ آپ کو تو فلموں میں کام کرنا چاہئے تھا۔"

"وہ کیوں اور کس طرح شری مرارجی صاحب! میں تو بہت ہی بے وقوف آدمی ہوں۔"

مرارجی بڑے زور سے ہنسا۔ اس وقت تک ہم ایک خاصے سجے سجائے کمرے میں پہنچ چکے تھے۔ بولا "آپ جیسے دو چار مُورکھ اور ہوں نا، تو اِدھر ایک اور دربار صاحب کھڑا کر دیں۔ وھسکی پسند کریں گے یا بیئر! برف اور سوڈا بھی موجود ہے۔" اس نے فریج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں مرارجی! میں آپ خور آدمی ہوں مہاراج! یہ آگ میرے بس کا روگ نہیں ہے۔"

"مگر اُدھر تو سنا ہے بہت چلتی ہے اور رنگا رنگ کی چلتی ہے میں وہاں ہوٹل میں بھی رہ چکا ہوں۔"

"یہ..... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ آپ کو شاید کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔"

اس نے بڑی لاپرواہی سے وھسکی کا ایک بڑا سا جام تیار کر کے

پیے سامنے میز پر رکھ لیا۔ دوسرا اس کے سامنے خالی دھرا تھا۔ بولا "بھگوان کا شکر ادا کریں سردار جی! آپ بچ کے نکل آئے ہیں" یہ کہہ کر اس نے گلاس منہ سے لگا لیا۔ پھر ہاتھ کی پشت سے ہونٹ پونچھ کر ہانپتے ہوئے بولا "میں..... میں آج اس نرم سے بچ کے چلا آیا ہوں ــــــ بچ کے چلا آیا ہوں....."

"مرار جی! آپ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے جاتے تو میرا علاج ہی ہو جاتا"

"وہ ڈاکٹر سالا تو آپ کی نبض تک ہاتھ ڈال ہی چکا تھا... سردار جی! ڈاڑھی کو جھٹکا دیتا تو آپ کا یہ چھلے گونگلو' ایسا منہ میں ننگا ہو جاتا" یہ کہہ کر اس نے میری ڈاڑھی کو جو ہلکا سا جھٹکا دیا تو وہ اس کے ہاتھ میں کھنچی چلی گئی۔ میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ ہاتھ میرا غیر ارادی طور پر اپنے پستول کے دستے تک جا پہنچا تھا۔

"بالک رام جی آپ کی حفاظت کا پابند ہے مہتہ جی! وہ مر جاتا مگر آپ پر آنچ نہ آنے دیتا"

"وہ بہت دانا آدمی ہے مرار جی! ایک ہی ساعت میں وہ اندر کی ساری صورتِ حال کو سمجھ گیا۔ آپ کو بھی میں سلام کرتا ہوں۔ بالک رام سے آپ کے ذہنی رابطے کی داد دیتا ہوں"

"ہاں! ہم ایک دوسرے سے کچھ کہے بغیر ہی سب کچھ سمجھ لیتے ہیں"

"آپ کہاں سے آئے تھے اس وقت؟"

"مجھے بالک رام یہاں سے اٹھا کر لے گیا تھا۔ اسے یہی ڈر تھا کہ کہیں آپ پر آنچ نہ آئے۔ آپ سے کل بلبیر کے قصے میں کئی لاپرواہیاں سرزد ہو چکی ہیں"

"اب کیا ہوگا؟ وہ لوگ تو یہاں بھی پہنچ سکتے ہیں"

"نہیں! میں یہاں نہیں رہتا ہوں۔ میرا ٹھکانہ سرکاری طور پر کہیں اور ہے"

"محلے والے تو آپ کو جانتے ہوں گے؟"

"ان کے لئے میرا نام کرشن چندر ہے۔ آپ بہرحال یہاں بالکل محفوظ ہیں"

"وہ..... وہ سالے "تف، طیش" کر رہے تھے۔ سمجھتے ہیں نا آپ؟ یہ ایک نئی چیز نکلی ہے۔ سب کو گھیر لو، سب کو جوتے مارو، چور آپ ہی سامنے آ جائے گا"

"وہ مجھے یوں دیکھ لیتے تو وہیں جان سے مار دیتے۔ مجھے وہ اس حلیے میں بھی پہچانتے ہیں۔ اس چھلے گونگلو ایسی حالت میں"

مرار جی ہنسا۔ بڑا تلخ گھونٹ حلق سے نیچے اتار کر بولا "یہ ملہوترہ بڑا چالاک ہے۔ آپ کی قسمت آج کل یاور ہے، ورنہ آپ بچ نہیں سکتے تھے۔ لیں یہ مرہم ہونٹ پر مل لیں، سوجن ختم ہو جائے گی اور یہ کیپسول بھی کھا لیں یہ ٹیٹرا سائیکلین کے کیپسول ہیں" وہ میں نے لے لئے۔ مرہم بہت مفید معلوم ہوتا تھا۔

"مجھے ڈر ہے مرار جی! وہ لوگ بالک رام کو پکڑ لیں گے"

"نہیں! جتنے کورس ملہوترہ نے پاس کئے ہیں۔ وہ بالک رام بہت پہلے کھا پی لئے تھے۔ وہ اس کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس کے لئے آپ کو دو لاکھ روپے تو ضرور ہی ملے ہوں گے؟"

"نہیں مرار جی! میں تو اپنی ہی ایک مصیبت میں پھنس کر یہاں آ پہنچا ہوں۔ کوئی مجھے کیا دے سکتا ہے؟"

"آپ کی بہن کی بازیابی کا معاملہ ہے نا مجھے بالک رام نے بتا دیا تھا مگر اس مچھر کو پکڑنے کا قصہ بھی تو آپ کے ساتھ ہے اس بھنڈاری کا"

"ہاں! وہ ایسا ہی ہے جیسے شہر جانے والے کسی آدمی سے کوئی بڑھیا کہہ دے کہ بھائیا! میرے لئے سُرمہ بھی لیتے آنا۔ ورنہ میرا مقصد یہ نہیں تھا"

"آپ نے بلبیر کے معاملے میں بڑی جیداری دکھائی ہے۔ کوئی ویسا مائی کا لال اس پر یوں ہاتھ نہیں ڈال سکتا تھا۔ اس نے تو گرد ایک شکنجہ کر رکھی ہوئی تھی۔ بڑے بڑے سانڈ اور بھینسے اس سے پناہ مانگ گئے۔ آپ نے تو کمال کر دیا ہے مہتہ جی!"

"آپ میرے بارے میں سب کچھ جاننے کے باوجود بھی کہیں گے؟"

"یہی بہتر ہے، بڑے بھائی! یہی اچھا ہے۔ ورنہ آدمی کسی وقت چوک سکتا ہے"

"میں واپس نہ گیا تو وہ بالک رام سے سوال کریں گے"

"کچھ بھی نہیں ہوگا مہتہ جی! بالک رام سب کچھ سنبھال لے گا۔ آپ اب یہاں بیٹھ کر اپنا اگلا پروگرام بنائیں۔ اتنا میں آپ کو بتا دیتا ہوں کہ آپ کی فہرست کے دو آدمی بھنڈاری اور کیدار ناتھ پرسوں فتح گڑھ جوڑیاں جا رہے ہیں۔ وہ صبح آٹھ بجے روانہ ہوں گے کار کے ذریعے۔ ان کے ساتھ ان کی پارٹی کے بیس بائیس آدمی بھی ہوں گے۔ وہ بھی کاروں میں جائیں گے۔ ایک کار ہم بھی آپ کو فراہم کر سکتے ہیں"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے مرار جی! میں اس کا دہیں تیا پانچا کر دوں گا"

"تیا پانچا نہیں مہتہ جی! پانچ تیا پندرہ بنانا ہے۔ آپ کو انہیں صحیح سالم حالت میں پکڑ کر ایکسپورٹ کرنا ہے۔ یہی حکم ہے نا آپ کو؟"

"جی ہاں! مگر میں حیران ہوں مرار جی! آپ تو ہندو ہیں، اس ملک کے باسی ہیں۔ آپ میرے ساتھ اتنا تعاون کیوں کر رہے ہیں؟"

"دیکھو مہتہ جی! کسی سکھ کو تو ہم یہاں سے نہیں اٹھنے دیں گے۔ کسی اصل سکھ کو۔ بلبیر سنگھ بدمعاش تھا۔ اس کی بات اور ہے ہندو تم جتنے چاہو یہاں سے اٹھا کر لے جاؤ"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کا اصلی نام مرار جی نہیں ہے؟"

"نہیں! میں بھیم سنگھ ہوں اور میں بھی ذات کا ڈھلوں راجپوت ہوں۔ اپنے مختار ڈھلوں کا بھائی بند ہی سمجھیں مجھے۔ میں نے بھی سکھ قوم کے عشق میں کام پھڑوا رکھے ہیں۔ ہم ادھر خالصتان بنا رہے ہیں۔ بس یہ قصہ ہے سارا"

"اور وہ بالک رام؟"

"وہ سالا پیچک شودر ہے۔ صدیوں سے ظلم سہہ رہا ہے۔ اس کی تو نسلیں پیچک کر رہ گئی ہیں۔ وہ اس اونچی جاتی سے اپنی ہزاروں سال کی غلامی کا انتقام لے رہا ہے۔ اس کے سامنے بھی ایک آدرش ہے ایک بہت اونچا آدرش"

"اسے آپ شودر دیش بنا دیں گے!"

"پتہ نہیں کیا ہو جائے ــــ پھر یہ سمجھا اس نے تربوز کا بیجا نکال دیا ہے۔ مگر تربوز ٹوٹا تو چاروں طرف تربوز کے بیج پھیل کر ایک نیا کھیت اُگا گئے۔ بس آپ تیل دیکھیں اور اس تیل کی دھار دیکھیں"

"آپ سے مل کر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے مرار جی! آپ اور بالک رام واقعی بہت بڑے آدمی ہیں"

"مکھن بازی منع ہے مہتہ جی! آپ سے زیادہ بڑے نہیں ہیں ہم۔ وہ بالک رام سالا احمق ہے۔ جو کہتا ہے کہ آپ اناڑی ہیں۔ وہ آپ کی طرح پچھلی بار اگر ملہوترہ کی کڑاہی میں خود پھنسا ہوتا تو لنڈورا ہو کر بھی باہر نہ آ سکتا تھا۔ بہرحال اس فریج میں کھانے کی ہر شے موجود ہے جھٹکے کا گوشت بھی ہے۔ دودھ، انڈے، مکھن، دہی اور سبزیاں بھی رکھی ہیں۔ جب تک چاہیں یہاں رہیں۔ کوئی پوچھے تو آپ کہہ دیں کہ آپ کرشن چندر کے دوست ہیں۔ اور بس۔ میں اب چلتا ہوں"

"ٹھیک ہے مرار جی! پرسوں کار مجھے کس وقت مل سکے گی؟"

"کار پرسوں صبح چھ بجے یہاں ہوگی۔ اس کے ڈرائیور کا نام کرم چند ہے ہم کرمو کہہ کر پکارتے ہیں اسے۔ وہ آپ کے اشارے پر کام کرے گا"

"کوئی اور بات اس بارے میں معلوم ہو سکے تو مجھے بتا دیں۔ میں پرسوں صبح پانچ بجے بالکل تیار ہوں گا"

"فکر نہ کریں۔ راستہ آپ کو صاف ملے گا۔ اچھا نمستے" یہ کہہ کر اس نے مجھ سے مصافحہ کیا اور پھر وسکی کی ایک چوتھائی خالی بوتل فریج میں رکھ کر وہ اسی وقت باہر نکل گیا۔

جب اس کے موٹر سائیکل کی آواز دور ہو گئی تو میں مکان کے صدر دروازے کو اندر سے مقفل کر کے پھر نشست گاہ میں جا بیٹھا۔ میرے دل میں سینکڑوں وسوسے سنپولیوں کی طرح رینگنے لگے تھے۔ لیکن ایک بات میرے لئے بے حد اطمینان بخش تھی کہ ڈھلوں صاحب نے مجھے جن لوگوں سے متعارف کروایا تھا وہ بڑے ہی بھروسے کے آدمی تھے۔ ان کی حاضر دماغی ان کی چستی چالاکی اور ان کے وسائل کی فراوانی نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ اپنے جال کی ہر پیٹڑھی انہوں نے مضبوطی سے بُن رکھی تھی اور وہ اس کے کسی بھی تار کو اپنی جگہ سے کھسکنے نہیں دیتے تھے۔

میرے سامنے ایک اور پہاڑ ایسا بے آب و گیاہ دن تھا۔ جو کراں تا کراں خالی اور ویران تھا۔ اس روز بھی کرنے کے لئے میرے پاس کوئی کام نہیں تھا اور میں دیکھ رہا تھا کہ کوئی مہیب طاقت ہے جس نے بگولوں کو غضبناک قوت دے کر گردش میں مبتلا کر دیا ہے۔ اور ان بگولوں کی زد میں پھنسی آسیہ مجھ سے لحظہ بہ لحظہ دور ہوتی جا رہی ہے۔ میرے اور اس کے درمیان صدیاں حائل ہو گئی ہیں، جنہیں میں پاٹ نہیں سکتا۔ کہ درمیان کی خلاسات آسمانوں کی رفعتوں سے زیادہ گہری اور گھمبیر ہے۔ میری وہ ماں جائی بہن پتہ نہیں اس گھڑی کس حال میں ہوگی؟ کاش اس کی زندگی کے صدقے میں خدا مجھے کوئی ایک ہی لمحہ ایسا عطا کر دیتا جسے میں اپنے خون سے تر کر کے اس کی نذر کر دیتا مگر وہاں تو حالات نے مجھے بے بس کر کے لنگوٹی بندھوا دی تھی۔ ایک سے ایک بڑا بر چھیت میرے سامنے تن کر کھڑا تھا۔ اور اب صورتحال ایسی بدمنع ہو گئی تھی کہ مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔

میں ڈھلوں صاحب کے لئے وہاں سے اتنے سارے آدمی کیوں اٹھواؤں؟ یہ سوال بار بار میرے ذہن میں اُبھر رہا تھا۔ مجھے کوئی تمغہ تو نہیں مل سکتا تھا ــــ وہ میرا راستہ ہی نہیں تھا۔ جب آسیہ اس شہر میں نہیں تھی اور اس کو کبیر شاہ کے گھر سے اغوا کرنے میں بلبیر سنگھ یا کسی اور کا ہاتھ نہیں تھا۔ تو پھر میں کیوں وہاں اپنی جان ہلکان کروں۔ مجھے یقین تھا کہ بلبیر سنگھ نے جھوٹ نہیں بولا ہے۔ آسیہ کے بارے میں وہ بالکل بے خبر تھا۔ اس نے بدترین اذیت میں مبتلا ہو کر اپنے اندر کچھ بھی بچا کر نہیں رکھا تھا ــــ میں تو وہاں آیا ہی آسیہ کے لئے تھا۔ مگر اب میری حیرت فزوں تر ہوتی جا رہی تھی۔ یہ بات مجھے معلوم ہونی چاہئے تھی کہ آسیہ اب کی بار کن کالی آندھیوں کی زد میں آ گئی ہے۔ معاملہ اب اتنا زیادہ پُرپیچ اور گھمبیر ہو گیا کہ میری سوچ کے سارے آئینے بھی کور ہو گئے تھے۔ مجھے کچھ بھی سجھائی نہیں دیتا تھا لیکن میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر تو نہیں بیٹھ سکتا تھا۔

میں بڑی دیر تک وہاں بیٹھا سوچتا رہا۔ میرا اضطراب دم بدم بڑھتا جا رہا تھا ــــ باہر چاروں اور آگ برس رہی تھی۔ وہ تپتی سلگتی دوپہر میں نے اسی مکان میں گزار دی۔ فریج میں رکھی چیزیں میرے بہت کام آئیں جو کچھ بھی مجھے پسند آیا، میں نے حلق سے نیچے اتار لیا ــــ چار بجے تک

میرے نچلے ہونٹ کی سوجن بڑی حد تک کم ہو گئی ـــ میں نے آئینے میں اپنی صورت دیکھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں اب پہلا سا جیلانی نظر آ رہا ہوں تولیہ لے کر میں غسل خانے میں جا گھسا۔ وقت گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ کتنی ہی دیر تک میں نل کے نیچے سر ڈال کر بیٹھا رہا۔ جب نہا کر باہر نکلا تو خود کو تازہ دم محسوس کر رہا تھا۔

میں نے ایک بار پھر ڈاڑھی اور کیس اوڑھے اور پھر مرار جی کے مکان کو تالا لگا کر ہاتھ میں اپنا بریف کیس جھلاتے ہوئے... گلی سے باہر نکل آیا ـــ دھوپ کی تمازت ماند پڑ چکی تھی۔ سورج نے اپنے کچھ تور بند کر دیئے تھے ـــ مجھے سروری خانم نے گورداسپور کے قریب ایک گاؤں ٹھکرا کا پتہ دے رکھا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہاں ایک شخص رہتا ہے ارجن سنگھ، وہ چاندی اور سونے کی اسمگلنگ کرتا ہے اور جب بھی لاہور آتا ہے وہ آہو کے پاس ٹھہرتا ہے اس نے کہا تھا کہ میں اگر کبھی کسی وجہ سے سرحد پار جا نکلوں تو ضرورت کے وقت میں سیدھا ارجن سنگھ کے پاس چلا جاؤں، یہی اس کا مشورہ تھا۔ وہ ارجن سنگھ کو بہت اچھا آدمی سمجھتی تھی اور اس کا خیال تھا کہ وہ میری کسی بھی مشکل میں میرے بہت کام آ سکتا ہے۔ اگرچہ آہو میرا دشمن تھا مگر سروری خانم میری بھلائی چاہتی تھی۔ یہ خیال ذہن میں ابھرا تو میں رکشے میں سوار ہو کر سیدھا اسٹیشن جا پہنچا۔

اس وقت پٹھانکوٹ کے لئے گاڑی تیار کھڑی تھی۔ میں نے گورداسپور کا ٹکٹ خریدا اور گاڑی میں جا بیٹھا۔ پالکے رام نے مجھے جو حلیہ دے دیا تھا۔ وہ میرے بہت کام آ رہا تھا ـــ جو کوئی بھی مجھے دیکھتا بڑے ادب سے پیش آتا۔ گاڑی امرتسر سے ساڑھے چھ بجے روانہ ہوئی تو میں نے سکھ کا سانس لیا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جس طرح بھی ہو سکا میں اسی رات پاکستان کے لئے روانہ ہو جاؤں گا اور یہ ایسا کام تھا جس کے لئے مجھے ارجن سنگھ کے تعاون کی ضرورت تھی کیونکہ ان خفیہ راستوں کا اسے بخوبی علم ہو گا جن پر چل کر وہ آئے دن سرحد کے آر پار پھرتا رہتا تھا۔

رات کے ساڑھے نو بجے میں ننگل کوٹلی اسٹیشن پر جا اترا۔ ٹھکرا گاؤں کا پتہ میں نے اسٹیشن سے باہر نکل کر ایک کوچوان سے معلوم کیا۔ گاؤں وہاں سے پانچ میل دور تھا۔ کوچوان سکھ تھا، بولا۔ "سردار جی! حکم ہو تو میں آپ کو ٹھکرا لے چلتا ہوں۔ میرا گھر بڑنالہ میں ہے اور میں اُدھر ہی جا رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے یار! تو مجھے لے ہی چل۔ میں کہاں پیدل خوار ہوتا پھروں گا۔ چل میرا وِیر، کتنے پیسے لے گا تو؟"

"بس دس روپے دے دیں سردار جی!"

"مجھے منظور ہے یار!" یہ کہہ کر جب میں تانگے میں بیٹھا تو وہ بولا "دو زنانہ سواریاں ہیں۔ انہیں سادھو چک جانا ہے۔ اگر آپ کہیں تو میں انہیں بھی بٹھا لوں۔... اُدھر وہ مٹھائی خرید رہی گئی ہیں۔"

"بٹھا لے بھائی! مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟"

"بڑے دھی وان ہیں آپ! اس کی گوڈی میں ادھر کر لوں گا۔" یہ کہہ کر وہ ان سواریوں کو لینے کے لئے دکانوں کی طرف نکل گیا۔ جب وہ واپس آیا تو اس کے ساتھ دو اونچی لمبی عورتیں تھیں وہ ہنستی ہوئی آ رہی تھیں۔ دونوں نے شلواریں پہن رکھی تھیں سروں پر دوپٹے آدھے ہاتھ کی بکل سے اوڑھ رکھے تھے۔ انہوں نے مجھے پچھلی نشست پر پھیل کر بیٹھے دیکھا تو ایک دم سنجیدہ ہو گئیں ان میں ایک بڑے دبنگ لہجے میں بولی "وے! ہم نے تو تانگے کا کرایہ طے کیا تھا تجھ سے؟"

"یہ سالم ہی ہے بی بی! اگلے حصے میں آپ بیٹھ جائیں۔ سردار صاحب ٹھکرا جا رہے ہیں۔"

"پر کیوں بیٹھ جائیں ہم! تو اس سے بھی کرایہ لے گا اور ہم سے بھی۔ کتنے پیسے طے کئے ہیں تو نے بھائی؟"

"دس روپے۔"

"بس ٹھیک ہے۔ وہی دس روپے اسے ملیں گے۔ کیوں تو ڈبل کمائی کرے گا بکرے؟"

"یہ بات نہیں ہے بی بی! نہیں 'منجور' نیئں ہے تو پیدل جاؤ۔ میں تو تم سے بھی دس لوں گا۔"

"چل ستونتی! دفع کر۔ دیر ہو رہی ہے۔ اس کے منہ پر کالا مل دیں گے ہم۔ بہت لالچی ہو گیا ہے یہ کوچوان!"

"اس کو میں چھینٹی ضرور لگواؤں گی اپنے وِیر سے۔ ذرا لحاظ نہیں کرتا ہے یہ۔ کیوں وے کہہ دوں جگت سنگھ سے؟"

"نئیں بی بی! ایسا 'جلم' نہ کرنا۔ دیکھ نا یہ میری 'روجی' کا ہے۔ پیٹ میرے ساتھ بھی لگا ہے۔" ستونتی اُچک کر تانگے کے اگلے حصے میں بیٹھ گئی۔ پھر اس نے دوسری عورت کو بھی اپنے پاس بٹھا لیا۔ تانگہ ان کے بوجھ سے دبنے لگا۔

"تیرے پیٹ میں چاقو لگوا دیتی ہوں نا، نہ رہے پیٹ نہ نوبت۔" کلونتی نے بڑے ہی سنجیدہ لہجے میں کہا۔ وہ خاص [illegible] کلے ٹھلے کی عورت تھی اور اس کے بدن سے صندل ایسی مہک [illegible] تھی۔ دوسری عورت بالکل خاموش تھی۔

کوچوان کچھ گھبرا سا گیا، بولا۔ "کیوں میرا 'ہارٹ' [illegible] ہو۔ جگت سنگھ کا میں ویسے ہی ہاتھ بندھا داس ہوں۔ پر دیکھو بی بی! یہ کرایہ تو میرا حق ہے نا؟"

"یہ جگت سنگھ کون ہے پہلوان! کوئی بدمعاش ہے علاقے کا؟" میں نے کوچوان کو متوجہ کرتے ہوئے پوچھا۔

ستونتی نے ایک دم گھوم کر مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ چمک کر بولی "بدمعاش ہو گا تو! بدمعاش ہوں گے تیرے ہوتے سوتے۔ میرا وِیر تو انیائے کرنے والوں کا دشمن ہے۔"

"جب ہی تو تم کوچوان کو اس کی مزدوری نہیں دیتی ہو؟"

وہ کچھ طیش میں آ گئی، بولی "تو کون؟ میں خواہ مخواہ۔ تیری داڑھی میں کیوں کھارش ہو رہی ہے؟ این۔ یہ کیسی سواری لاد لی ہے تو نے چرن سنگھ؟"

"چپ رہ بی بی! یہ ٹھکرا کے ارجن سنگھ کے مہمان ہیں۔"

"ہائے میں مر گئی! وہ جو اسمگلر ہے۔ وہ ارجن سنگھ نا! جیسا وہ خود ہے ویسے ہی اس کے مہمان ہوں گے۔ کیا ناؤں ہے تیرا سردار جی؟"

"میرا نام؟ شیر سنگھ ہے بی بی! تمہارا شبھ نام کیا ہے۔ باتیں تو بہت زور دار کرتی ہو ـــ جیسے تو یہاں کی جاگیردارنی ہو۔"

"ہاں یہی سمجھ! میرا ناؤں کلونتی ہے۔ ادھر چھ مربعے 'جمین' ہے میرے باپو کی۔ اور وِیر میرا سفید پوش ہے علاقے کا۔ چھمب تک پھیلی ہیں ہماری جمینیں۔"

"نرڑا اگتا ہو گا اُن میں چھمب کی یہی فصل مشہور ہے۔"

"تو تو مجھے معاف ہی کر سردارا! تیرا مغز کچھ زیادہ ہی پھرا ہوا ہے۔ جنانیوں سے سوچ سمجھ کر بات کرتے ہیں۔ نرڑ کیسے اُگ سکتا ہے وہاں؟ بڑی 'جرخیج' جمین ہے ہماری۔"

"بہت بہتر! استانی جی! مگر تانگہ دب رہا ہے آگے کو تم دونوں ذرا پیچھے ڈھاسنا لگا کر بیٹھو۔ تم دونوں بہت وزنی بوریاں ہو۔"

"بڑا ہی 'کپتا' آدمی لگتا ہے تو مجھے سردارا۔ مگر شکل تو نے گیانیوں ایسی بنا رکھی ہے۔ کیا دھندا ہے تیرا؟ گرنتھ وغیرہ بیچتا ہو گا تو؟"

"تیرا اندازہ صحیح ہے بی بی!" میں نے اپنی کمر پر اس کی کمر کا بوجھ بڑھتے دیکھ کر ذرا سا پیچھے سرکتے ہوئے کہا۔ وہ جان بوجھ کر اتنی پیچھے جھک گئی تھی کہ اس کا بوجھ بڑھتا جا رہا تھا۔ میں پیچھے ہٹا تو اس نے اپنی دونوں کہنیاں درمیان کے پھٹے پر ٹکا دیں۔ پھر بولی "ستونتی! 'جرا' مٹھائی کا ڈبہ کھول ـــ اس کپتے آدمی کو بھی کھلا دے۔ تو بھی کھا چرن سنگھ۔"

"یہ مٹھائی کس خوشی میں بانٹ رہی ہے، تمہارے بیل نے کٹا دیا ہے؟"

وہ کھلکھلا کر ہنس دی، بولی "تو بڑا منہ پھٹ آدمی ہے میں نے پاکستان کی ایک 'فلم' دیکھی تھی ٹی وی پر۔ اس میں وہ لوگ بھینے کٹے کا 'حقیقہ' کر رہے تھے۔ تو نے بھی ویسی ہی بات کی ہے سردارا! میرے وِیر کو واہگورو نے دو لڑکے دیئے ہیں۔"

"اکٹھے دو لڑکے! یہ کیسے ہو سکتا ہے میرا مطلب ہے بی بی کہ ایسا کبھی ہوا نہیں۔"

"بکواس نہ کر سردارا! یہ لے، یہ لڈو کھا۔ اور 'جنانیوں' سے سوچ سمجھ کر بات کیا کر۔"

"تو تو اپنے آپ کو بھی 'جنانی' سمجھتی ہے ابھی تک۔ ایک صرف مونچھوں کی کسر ہے ورنہ، تو کسی مرد سے کم نہیں ہے۔" میں نے پچھلی نشست پر سنبھل کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

وہ اپنی کہنی میری پسلیوں میں چبھوتی چلی جا رہی تھی "تو مار کھائے گا سردارا! زیادہ ہی پی رکھی ہے تو نے۔ میں تجھے مرد نظر آتی ہوں؟" یہ کہہ کر اس نے دائیں ہاتھ سے دو لڈو میری طرف بڑھائے اس کی وہ بھری بھری بوتل ایسی گول سڈول کلائی اس چٹکی ہوئی چاندنی میں مجھے بہت ہی دلفریب نظر آئی۔ وہ تانگے والے سے بولی "چرن سنگھ تانگہ اتنا تیز نہ چلا۔ کوئی پٹہ ڈھرا ٹوٹ گیا تو سیاپے میں پڑ جائیں گے ہم سب۔"

"بھگوان سے خیر مانگو بی بی! اب تو یہ گولہ سڑک بن گئی ہے رام پور تک۔ اب تانگہ چلتا نہیں اڑتا ہے۔" چرن سنگھ نے گھوڑے کو پچکارتے ہوئے کہا۔

"بی بی! لڑکے تو تمہارے بھائی کے گھر پیدا ہوئے مگر تم یہ مٹھائی لے کر کہاں سے اس کے گھر جا رہی ہو؟"

"یہ میری بہن ہے ستونتی! میں اس کے گھر دھاری وال گئی ہوئی تھی۔ آج وِیر کا 'کھت' پڑھ کر ہم وہاں سے چل دیں۔ کوئی 'اِتراج' ہے تمہیں سردارا؟"

"یار تیرے تانگے میں شاید کھٹمل ہیں۔ میرا تو بدن کاٹ کھایا ہے انہوں نے۔"

"حال میرا بھی یہی ہے چرن سنگھ! پر ستونتی کچھ نہیں بول رہی ہے۔ اسے نہیں کاٹتے ہیں کھٹمل، کیوں وِیدی؟"

"اس کا خون کڑوا ہو گا نا ـــ کیوں چرن سنگھ! تجھے بھی کوئی کھٹمل پسو کچھ نہیں کہتا؟"

"میں 'گریب' آدمی ہوں سردار جی! اس لئے وہ مجھ سے رعایت کرتے ہیں۔" چرن سنگھ نے کہا۔

"گیانی جی! میری مانو تو رات اِدھر ہمارے گھر گزار لو ـــ 'سملگنگ' پھر کر لینا۔" کلونتی نے میرے پہلو میں انگلی چبھوتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟ وہاں کوئی مجرا ہو رہا ہے آج رات؟"

"مجرا ابھی کروا دیں گے، یہ کون سی مشکل بات ہے۔ میرا وِیر تم سے مل کر خوش ہو گا۔ کہاں کے رہنے والے ہو تم؟"

"میں..... میں لدھیانہ کا رہنے والا ہوں۔ دھنّی پور گاؤں ہے میرا۔"

"یہ ارجن سنگھ کیا لگتا ہے تمہارا؟"

"وہ میرا دوست ہے۔ کبھی کبھار میرے گاؤں آ جاتا ہے۔ اب تو میں ایک کام سے اُدھر جا رہا ہوں۔"

تھوڑی دیر بعد وہ بولی "لے سردارا! اب تیار ہو جا، میرا پنڈ زیادہ دُور نہیں ہے۔"

"میں اُدھر نہیں اتروں گا۔ مجھے ارجن سنگھ سے ملنا ہے۔"

"اس کی فکر نہ کر۔ میں اسے اپنے گھر بُلوا لوں گی۔ وہ میرے ویر کا بڑا جگری یار ہے۔"

"اچھا؟ پھر تو میں تیرے گھر ضرور اُتروں گا۔"

وہ خوش ہو گئی اور میرے پہلو میں چٹکی بھر کر بولی "پھر اس خوشی میں ایک اور لڈّو کھا۔"

یہ کہہ کر اُس نے دو لڈّو میرے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ وہ کوئی پانچ کلو مٹھائی لے کر واپس جا رہی تھی۔

برنالہ پہنچ کر ہم تینوں تانگے سے اُتر گئے۔ میں نے چرن سنگھ کے ہاتھ پر بیس روپے دھر دیئے۔

"لے بھائی چرن سنگھ! اِن کا بھی کرایہ میں دے رہا ہوں۔" میں نے جان بوجھ کر کلونتی کو سنانے کے لئے بلند آواز سے کہا۔

"ہلا سردار جی! ہمارا کرایہ بھی تم دو گے۔ واپس کر دے چرن سنگھ اس کے دس روپے۔"

"نہیں یار! تو جا عیش کر۔ یہ دس اور لے جا۔ تیری وجہ سے اتنی اچھی سواریاں مل گئیں۔ چل بی بی! کہاں ہے تیری حویلی؟ نکال اپنے جگت سنگھ کو باہر۔ دیکھوں کتنے پانی میں ہے وہ؟"

"اسے دیکھے گا نا تو تیری نیند حرام ہو جائے گی سردارا۔ چل میری ماتا جی نے کباب تل رکھے ہوں گے۔ تو خوش ہو جائے گا کھا کر۔"

ستونتی ہمارے آگے آگے چل رہی تھی۔ اس کی اتنی ساری خموشی میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ بہت دُکھی ہے اور دنیا کی کسی بات میں اُسے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

"کیا بات ہے تمہاری بہن بہت چُپ چُپ ہے؟"

"یہ بیچاری بے اولاد ہے۔ اٹھراہ کا مرض ہے اِسے۔"

"پھر تو اسے نہیں بلانا چاہیئے تھا۔ سوتک والے گھر میں ایسی عورت کا آنا منحوس سمجھا جاتا ہے۔"

"میں نہیں مانتی ان باتوں کو۔ زندگی موت تو واہگورو کے ہاتھ میں ہے۔ یہ سب بکواس ہے۔"

"اچھا؟ یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ میں سمجھا کہ میں کسی بہت ہی پُرانی وہمی قسم کی عورت سے بات کر رہا ہوں۔ پر تم تو بڑی تیز ثابت ہو رہی ہو۔"

اس وقت ہم تربوز کے کھیت میں سے گزر رہے تھے۔ دُور تک پھیلی بیلوں کے ساتھ دس دس سیر کا ایک بڑا بڑا تربوز لگا تھا۔ ستونتی نے ایک تربوز توڑ کر بغل میں دبا لیا۔ بولی "راکھو اگر کچھ کہے تو اُسے ذرا ڈانٹ دینا۔ ویسے وہ بھونکے گا ضرور۔"

"یہ تمہارا کھیت نہیں ہے؟"

"نہیں! یہ سُرمیتے کا باڑہ ہے۔ بہت بھٹّی سڑنا آدمی ہے وہ۔" یہ کہہ کر وہ میری اوٹ میں دب کر یوں چلنے لگی کہ کھیت کے کونے میں کھڑی راکھے کی جھونپڑی میں سے اس کی نظر نہیں پڑ سکتی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد ہم گاؤں میں داخل ہو گئے۔ پکّی گول سڑک گاؤں کے عین وسط میں سے گزرتی تھی۔ چرن سنگھ کا تانگہ دوسری طرف مڑ گیا تھا۔ ہم وہ سڑک پار کر گئے تو وہ بولی "یہ گیدڑ ونڈی پہلے مسلمانوں کا گاؤں تھا۔ ہم "پناہ گیر" ہو کر شکر گڑھ سے یہاں آ گئے تھے۔ یہ گیدڑ ونڈی کا حصہ ایک ہی آدمی کی ملکیت تھا۔ اب یہ سُرمیت سنگھ کے قبضے میں ہے۔" اب ہم ایک پُرانی مسجد کے قریب سے گزر رہے تھے۔

اس کو دیکھ کر وہ بولی "یہ مسجد تھی۔ اب تو ویران پڑی ہے۔ اِس میں کوئی نہیں رہتا۔ اب جگت سنگھ کہتا ہے کہ وہ اس کو گوردوارہ بنا دے گا۔ وہ اینٹ سیمنٹ لے آیا ہے۔ کہتا تھا کہ بھگوان نے اسے پُتر دیا تو وہ یہ کام شروع کر دے گا۔"

"اب تو اُسے دو پُتر مل گئے۔"

"ہاں! اور تو مسخری کرتا تھا سردارا۔ پتہ ہے میری دادی نے اکھٹے تین بیٹوں کو جنم دیا تھا۔ یہ بات ہمارے خون میں شامل ہے۔"

ستونتی اس عرصے میں خاصی آگے نکل گئی تھی۔ "ایک بات بتا کلونتی! تو مجھ سے ایک دم اتنی بے تکلف کیسے ہو گئی ہے اور میں بھی ایسا پاگل ہوں کہ بے سوچے سمجھے تیرے ساتھ چلا آیا۔"

"تو اچھا آدمی ہے سردارا۔ تیرے جیسا بندہ کسی بھاگوان کو ہی ملتا ہے۔ پر میں تیرے ساتھ چلتی تیری نوکرانی لگتی ہوں۔" وہ کچھ پشیمان سی ہو گئی۔

اِس دوران ہم اس کے مکان پر پہنچ گئے۔ اس کے ویر کا مکان پختہ تھا اور باہر سے حویلی ایسا نظر آتا تھا۔ کالی شیشم کا بڑا سا دروازہ بہت خوبصورت نظر آتا تھا۔ اس وقت رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ سارے گاؤں پر خموشی طاری تھی اور چاندنی نے نیچے اتر کر اس سناٹے سے لبریز ماحول کو بہت ہی پُراسرار بنا رکھا تھا۔ یوں جیسے کوئی چاند کی ٹارچ ہاتھ میں لے کر تاریکی سے لبریز کمرے کے عین وسط میں کھڑا کچھ ڈھونڈ رہا ہو۔ ستونتی ہم سے پہلے دروازے کے اندر داخل ہو چکی تھی۔

کلونتی بولی "تو یہاں ٹھہر جا سردارا۔ میں جگت سنگھ کو باہر بھیجتی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ اندر چلی گئی۔ کوئی دس منٹ بعد ایک بَرچھے جیسے اونچے لمبے قد کا جوان باہر نکلا۔ وہ بنیان اور ڈھیلا ڈھالا تہبند پہنے ہوئے تھا۔ مجھے سامنے دیکھ کر بولا۔

"ست سری اکال سردار جی! جی آئیاں نوں۔ آؤ اندر آ جاؤ۔" یہ کہہ کر اس نے مصافحے کے لئے میرا ہاتھ اپنے چوڑے چکلے ہاتھوں میں لے لیا۔ میرے پنجے کی گرفت میں اپنے ہاتھ کو دیکھ کر بولا "تم سے مل کر بڑی خوشی ہوئی شیر سنگھ جی! اسے ارجن سنگھ کا ہی گھر سمجھو، آؤ۔" یہ کہہ کر وہ مجھے بڑی سی ڈیوڑھی میں سے گزار کر صحن میں لے گیا۔ وہاں دو لالٹینیں جل رہی تھیں۔ سُرخ اینٹوں کے کھلے صحن کے ایک حصّے میں تین چار چارپائیاں بچھی تھیں۔ دُوسرے حصّے میں کلونتی نے فوراً ہی دو چارپائیاں بچھا دیں۔ مجھے جگت سنگھ نے ایک خالی چارپائی پہ بٹھا دیا، بولا۔

"بھوجن تو ضرور کریں گے آپ! میں نے تلیئر پکوائے تھے۔ ماتا جی! ہانڈی ذرا گرم کر دو۔" یہ کہہ کر وہ میرے پاس ہی بیٹھ گیا، بولا "ارجن سنگھ سے کیا کام پڑ گیا آپ کو؟ میرا تو وہ بہت پُرانا بیلی ہے۔ کوئی مال آر پار کرنے کی بات ہے؟"

"نہیں۔ میں ویسے ہی اس سے ملنے چلا آیا ہوں جگت سنگھ جی! آپ کی بہن نے میری بڑی عزّت بڑھائی کہ وہ مجھے یہاں لے آئی۔ کہتی تھی اِسے بھی ارجن سنگھ کا گھر سمجھو۔"

"وہ ٹھیک کہتی ہے" وہ کلونتی۔ ہمارے یاروں کو وہ بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ ویسے کوئی مشکل ہو تو مجھے بتاؤ سردار جی! مجھے اپنا داس ہی سمجھو۔"

"بڑی کرپا ہے آپ کی جگت سنگھ جی! کچھ تھک گیا تھا، سوچا تھا کہ میں صبح چلا جاؤں گا۔ کتنی دُور ہے وہ گاؤں یہاں سے؟"

"یہی کوئی پانچ میل دُور ہو گا۔ پر فکر نہ کرو۔ میں صبح تمہیں گھوڑی دے دوں گا۔ ہوائی جہاز کی طرح اُڑتی ہے وہ۔ رات ادھر ہی آرام کر لو۔"

میں نے اپنا بریف کیس کلونتی کو دے کر کمرے میں رکھوا دیا تھا۔ تلیئر اُن لوگوں نے ڈھیر سارے پکا رکھے تھے۔ میں اُن پر پل پڑا۔ جگت سنگھ کی ماں انہیں سلیقے سے پکانا جانتی تھی۔ بلاشبہ وہ بھُنے ہوئے تلیئر بہت ہی لذیذ تھے۔

میں کھانے سے فارغ ہوا تو کلونتی بولی "ویر جی! سردار کا بستر میں نے چھت پر لگا دیا ہے۔ یہ کھلی ہوا میں آرام سے سو سکے گا۔"

"ہاں! یہ اچھا کیا تو نے۔ سنجے تو اِدھر اس ضلع کا ڈپٹی کمشنر ہونا چاہیئے تھا۔ انتظام تو اچھا کر لیتی ہے۔ چلو شیر سنگھ جی اوپر جا لیٹو۔ اِنہیں سیڑھیاں دکھا دے کلونتی!"

"آؤ سردار جی سیڑھیاں اِدھر ہیں۔" یہ کہہ کر وہ مجھے اپنے یہاں سے وہاں تک پھیلے کھُلے آنگن میں سے گزار کر سیڑھیوں تک لے گئی، بولی "کسی چیج کی جرورت ہو تو مجھے آواز دے لینا۔ ڈر تو نہیں جاؤ گے اکیلے؟"

"ڈر تو آئے گا ہی! دیکھو نا میری عمر بھی تو بہت چھوٹی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں چُوسنی بھیج دوں گی۔ جاؤ اب سو جاؤ۔" یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدم اٹھاتی واپس چلی گئی۔ ابھی میں سیڑھیوں میں ہی تھا کہ اس نے دونوں لالٹینیں گُل کر دیں۔

چاند بہت نیچے جا چکا تھا اور دھرتی آہستہ آہستہ بے نور ہوتی جا رہی تھی۔ میں بستر پر لیٹا تو سگریٹ کی اشتہا نے مجھے پاگل کر دیا مگر میں کسی بھی طرح وہاں سگریٹ نہیں پی سکتا تھا۔ پیتا تو ان کی خفگی مول لے لیتا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے راستے ہی میں اپنی جیب سے سگریٹ اور ماچس نکال کر باہر پھینک دیئے تھے۔ مجھے اپنی شناخت کے سلسلے میں بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔

میری وہ داڑھی اور کیس میرا بھرم رکھ رہے تھے۔ میں نے اپنی جیب سے سفید رومال نکال کر اس کو دو حصوں میں پھاڑا اور پگڑی اتار کر وہ لمبی سی پٹی اپنی داڑھی اور کیسوں پر کنپٹی کے اوپر سے یوں کس کر باندھی کہ نیند میں ان دونوں چیزوں کے میرے جسم سے الگ ہو جانے کا امکان ختم ہو گیا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ فضا آئینے کی طرح صاف شفاف دکھائی دیتی تھی۔ آسمان یہاں سے وہاں تک کھلا اور بے کراں نظر آتا تھا۔ رات ٹھنڈی تھی اور مچھر کا کہیں نام و نشان بھی نہیں تھا۔ میں کھدر کی کھُلی چادر اوڑھ کر تکیئے پر سر رکھتے ہی گہری نیند میں کھو گیا۔ اپنے تمام ضروری کاغذات میں نے پُوری طرح محفوظ کر لئے تھے۔ پتہ نہیں میں کتنی دیر تک سوتا رہا تھا کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ کلونتی چارپائی کے قریب کھڑی میرے چہرے کو گھُور رہی تھی۔ بے اختیار میرا ہاتھ اپنے چہرے کی طرف اُٹھ گیا۔ میرے چہرے سے وہ داڑھی الگ ہو چکی تھی۔ میری ساری احتیاط دھری رہ گئی تھی۔ وہ اس ملگجی روشنی میں دیدے پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگی اور پھر دھب سے اوندھے منہ تکیئے میں سر دے کر بولی "یہ..... یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں؟ تو..... تو کوئی بہروپیہ ہے۔" اُس کا لہجہ بہت زخمی تھا۔

"یہ بہت لمبی کہانی ہے کلونتی! میرے ایک دشمن نے مجھے بے خبری میں پکڑ کر میرے کیس اور میری داڑھی مونڈ دی تھی۔ مجبوراً مجھے یہ کام کرنا پڑا۔ مگر تجھے اتنی فکر کیوں ہے؟"

مگر میری اس بات کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شک کا ناگ اُسے ڈس چکا تھا۔ اور..... اور جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ میرا پیدائشی

مذہب کونسا ہے۔ وہ سٹپٹا سی گئی۔ یہ بات تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔ اس پر وہ لمحہ قیامت بن کر بیت گیا ــــ وہ اچھل کر پلنگ سے اتری۔ یوں جیسے وہ نیچے جا کر جگت سنگھ کو میری حقیقت سے آگاہ کر دے گی۔ وہ سب کچھ اس کے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔

ابھی وہ بستر سے اتر ہی رہی تھی کہ میں نے اسے باہوں سے پکڑ کر پیچھے کھینچ لیا۔ وہ پوری قوت سے اپنا بازو چھڑا کر اٹھنا چاہتی تھی غصے سے وہ پاگل ہو رہی تھی۔ دانت پیس کر بولی۔ "تو..... تو مسلمان ہے اور جگت سنگھ کے گھر میں اس کی بہن سے فریب کھیلنا چاہتا تھا اور تجھے پتہ ہے میرے پتا آسا سنگھ کو مسلمانوں نے اس کے تین بھائیوں سمیت قتل کر دیا تھا۔ وہ ستونتی کو اغوا کر کے لے گئے تھے۔ اسے ہم بڑی مشکلوں سے سیالکوٹ سے واپس لائے تھے۔ اور..... اور اب تو سمجھتا ہے کہ زندہ واپس چلا جائے گا۔ میں تیرے ٹکڑے کر دوں گی کتے کے بچے! چھوڑ دے میرا ہاتھ۔" یہ کہہ کر اس نے میری کلائی پر دانت گاڑنے چاہے تو میں نے اس کو بالوں سے پکڑ کر زبردست جھٹکا دے کر اپنی ٹانگوں میں دبا لیا۔

"چھوڑ دے مجھے تیرا ستیاناس ہو جائے، چھوڑ!" وہ نرغے میں پھنسی لومڑی کی طرح غرائی مگر میں نے اس کی آواز بلند ہونے سے پہلے ہی اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"تو ٹھیک سمجھتی ہے کلونتی! مگر میں تیرا دشمن نہیں ہوں۔ تو خود مجھے یہاں کھینچ لائی تھی۔ میں ابھی یہاں سے نکل جاتا ہوں لیکن اگر تو سمجھتی ہے کہ تیرا بھائی جگت سنگھ یا کوئی اور میرا رستہ روک سکتا ہے تو یہ تیری بھول ہے۔ مجھے تو ہمالہ پہاڑ بھی نہیں روک سکتا۔ تو نہیں جانتی میں کون ہوں۔" میں نے دبی آواز میں اپنا مافی الضمیر اس کے کانوں تک پہنچایا ــــ وہ بری طرح تڑپ رہی تھی۔ میں اس پر ہاتھ نہیں اٹھانا چاہتا تھا مگر وہ کسی بھی طرح اپنے غصے پر قابو نہیں پا رہی تھی اس کے شاید کوئی بہت ہی سہانے خواب چکنا چور ہو گئے تھے۔ وہ سمجھتی تھی کہ اس نے اپنی منزل پا لی ہے اور وہ آدمی اسے مل گیا ہے جس کے انتظار میں اس نے اتنی عمر دہلیز پر کھڑے کھڑے گزار دی تھی مگر جس حقیقت کا اس پر انکشاف ہوا تھا وہ اس کے لئے ایسی تلخ تھی کہ وہ اسے کسی بھی طرح نگل نہیں رہی تھی۔ اپنے باپ اور چچاؤں کی ہلاکت اور ستونتی کی ذلت کے احساس نے پہلے ہی مسلمانوں کے خلاف اس حد تک اس کے دل میں زہر بھر رکھا تھا کہ میری شناخت پر وہ ایک دم بھڑک اٹھی۔ اور اب وہ کسی بھی طرح قابو میں نہیں آ رہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر زور لگایا مگر جب میری گرفت سے وہ نہ نکل سکی تو اس نے دونوں ہاتھوں سے میرا منہ نوچنا چاہا تو میں نے اس کے ہاتھ گرفت میں لے کر اس کے کان میں کہا: "میں تجھ سے محبت کرتا ہوں کلونتی! میں تیری خاطر اپنا مذہب بھی چھوڑ سکتا ہوں۔ مجھے غلط نہ سمجھو، میں اپنی منزل کھوٹی کر کے یہاں خواہ مخواہ نہیں بیٹھ گیا ہوں۔"

"تو بکواس کرتا ہے۔ میں تجھے یہاں سے بچ کر نہیں جانے دوں گی۔ جگت سنگھ ــــ وے جگت سنگھ!" اس کی آواز شاید ہر طرف گونج جاتی مگر میں نے اس کا پیٹ کچھ اتنی سختی سے دبا دیا کہ اس کی آواز نہ نکل سکی۔ اس کی ہٹ دھرمی حد سے بڑھتی دیکھ کر میں نے چاہا کہ میں اس کی رگ مسل دوں مگر ابھی میں کوئی فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ صحن میں کسی کی کڑکدار آواز گونجی۔

"اٹھ اوئے جگت سنگھ! تیرے بہنوئی آئے ہیں۔ اٹھ اور باہر دیکھ۔" اس کے ساتھ ہی مجھے یوں لگا جیسے کئی آدمی کسی کو مار رہے ہوں۔

"یہ..... یہ کون ہیں کلونتی؟" میں نے اپنی آواز دباتے ہوئے کہا۔ وہ تڑپ کر مجھ سے الگ ہو گئی اور دہشت زدہ لہجے میں بولی۔

"یہ تو میرے ویر کے دشمن لگتے ہیں کسی پرانی دشمنی کا بدلہ لینے آئے ہیں۔" اس کا لہجہ اس کے شدید ذہنی اضطراب کا پتہ دے رہا تھا ــــ

صحن میں دو عورتوں کی چیخیں ابھریں۔ تو وہ کڑک دار آواز پھر مجھے سنائی دی۔

"واویلا بند کر مائی! ہم جگت سنگھ سے حساب لینے آئے ہیں۔ اسے باندھ کر لے چلو اوئے۔"

میں اور کلونتی اب منڈیر کے ساتھ چھت پر لیٹ کر نیچے دیکھ رہے تھے۔ وہ تعداد میں چھ تھے اور انہوں نے جگت سنگھ کو رسیوں میں باندھ کر لٹکا رکھا تھا۔ جگت سنگھ پر اب وہ لاٹھیاں برسا رہے تھے۔ میرا سائیلنسر لگا پستول میرے سیدھے ہاتھ میں تھا۔ میرے بائیں چھت پر لیٹی کلونتی بری طرح لرز رہی تھی۔

"ذرا پیچھے ہٹ جا کلونتی! تیرا بھائی میرا بھائی ہے۔"

یہ کہہ کر میں نے تاروں کی ملگجی روشنی میں دو آدمیوں کو تاک کر تیزی سے یکے بعد دیگرے دو گولیاں چلائیں۔ دونوں نشانے پر بیٹھیں۔ پستول میرے چپ شاہ کی طرح کام کرتا تھا۔ وہ دونوں گولیاں ان کی پیٹھ میں لگیں۔ وہ تڑپ کر اچھلے اور اوندھے منہ گر گئے۔ اس کے ساتھ ہی دو آدمی بھاگ کر نلکے کے گرد بنی چار دیواری کی اوٹ لینے کے لئے بھاگے ــــ وہ دونوں بندوقوں سے مسلح تھے مگر میں نے انہیں وہاں پہنچنے کی مہلت نہیں دی۔ دو گولیاں میں نے ان کی طرف روانہ کر دیں مگر ایک آدمی دیوار کے پیچھے پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ دوسرا شدید زخمی ہو کر گرا تو ان کے باقی دو ساتھی سیڑھیوں کی طرف لپکے۔ نلکے کی دیوار کی اوٹ میں پہنچتے ہی اس آدمی نے سر ذرا سا اوپر اٹھا کر شست باندھنی چاہی مگر میں نے اسے بھی مہلت نہیں دی۔ میری گولی سیدھی اس کے ماتھے میں جا لگی۔ اس کی ہولناک چیخ ایسی تھی کہ میں اسے آج تک نہیں بھول سکا۔ اتنے میں دو آدمی سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے اوپر آ گئے مگر اس طرح زینے میں مورچہ بند ہو کر انہوں نے ہم دونوں کو تاک کر گولیاں چلا دیں۔ مگر ہم کچھ اس طرح لیٹ گئے تھے کہ گولیاں ہمارے اوپر سے گزر گئیں۔ عین اس وقت مجھے سیڑھیوں کے عقب سے گولی چلنے کی آواز سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی ایک بھیانک چیخ فضا کو چیرتی چلی گئی۔ وہ دو آدمی جو چھت پر پہنچ کر آخری زینے میں مورچہ بند ہوئے تھے، بری طرح زخمی ہو چکے تھے اور شاید لڑھک کر نیچے گر گئے تھے۔ کیونکہ ان کی چیخیں اب بہت نیچے سے اوپر آ رہی تھیں میں بھاگ کر سیڑھی تک پہنچا تو معلوم ہوا کہ صحن میں سیڑھی کے پہلے قدم پر کوئی عورت کھڑی ہے۔ اس کے ہاتھ میں دونالی بندوق تھی۔ اس نے سر پر پٹی کی طرح دوپٹہ کس کر باندھ رکھا تھا۔ دو آدمی لڑھکتے ہوئے اس تک پہنچے تو اس نے بندوق کو لاٹھی کی طرح برسانا شروع کر دیا۔ میں بھاگتا ہوا اس تک جا پہنچا۔ کلونتی میرے پیچھے تھی۔ میں نے اس عورت کا ہاتھ روک دیا۔

"انہیں جان سے تو نہیں مارنا ہے بی بی! چلو نیچے۔ جگت سنگھ کو کھولو۔" یہ کہہ کر میں نے بندوق اس کے ہاتھ سے لے لی۔

"یہ میری بھابی ہے سیوتی! چلنے میں ہے بیچاری۔" یہ کہہ کر کلونتی نے اسے باہوں میں لیا اور آہستہ آہستہ اسے قدم قدم چلاتی صحن میں اس کے بستر تک جا پہنچی۔ وہاں دو نومولود بچے بری طرح بلک رہے تھے اور جگت سنگھ کی ماں انہیں رو رو کر سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جگت سنگھ رسیوں میں جکڑا اوندھے منہ فرش پر پڑا تھا۔ مگر اتنی ساری لاٹھیاں کھانے کے باوجود ہوش میں تھا۔ ہمیں اپنے پاس دیکھ کر وہ بڑی ہی دہشت ناک آواز میں بولا۔

"مجھے کھول دے کلونتی! میں ان کا خون پی لوں گا اس لوٹا سنگھ کا۔"

میں نے آگے بڑھ کر جگت سنگھ کے سارے جکڑ بند کھول دیئے۔ اس کے کیس کھل کر گلے میں لٹک گئے تھے اور اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ اپنے بدن کو جھٹکتا ہوا اٹھا اور اپنے سامنے اوندھے منہ پڑے تنومند جوان کو دیکھ کر غرایا "ــــ میں تیرا خون پی جاؤں گا۔ لوٹا سنگھ! اس زخم کی تجھے بڑی قیمت دینی پڑے گی۔" یہ کہہ کر اس نے لوٹے سنگھ کو جھٹکا دے کر اٹھا دیا۔ لوٹا سنگھ بہت بری طرح زخمی تھا۔ میری گولی اس کے شانے میں لگی تھی اور زخم میں سے خون برابر رس رہا تھا۔ اسے اتنا شدید زخمی دیکھ کر جگت سنگھ نے باری باری تمام حملہ آوروں کو دیکھا۔ دستی نلکے کی چار دیواری کے اندر پڑا آدمی ماتھے میں گولی لگنے سے مر چکا تھا۔ سیڑھیوں میں جو دو آدمی پڑے تھے وہ بھی زخمی تھے مگر ان کے جسموں میں چھرے لگے تھے جو اتنے مہلک نہیں تھے۔

"جوان! میں تیرا کس منہ سے شکریہ ادا کروں۔ تو تو میرے لئے دیوتا بن کر آیا ہے۔" جگت سنگھ نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑے ہی ممنونیت سے لبریز لہجے میں کہا۔

"یہ میرا فرض تھا جگت سنگھ جی! ان کمینوں نے چھپ کر وار کیا ہے۔"

"ہاں! یہ تو بڑا نرم مرد ہے شیر سنگھ! تیرا یہ احسان میں عمر بھر نہ بھول سکوں گا۔"

"ان کا کوئی بندوبست کرو جگت سنگھ جی! یہ معاملہ بہت خطرناک ہو گیا ہے۔"

"میں ان سب کو مار بھی دوں تو مجھے کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔" اس نے کلونتی کے ہاتھ سے وہ ہتھیار لے کر چارپائی پر ڈال دیئے جو وہ زخمیوں کے پاس سے اٹھا کر وہاں لے آئی تھی۔

اچانک جگت سنگھ چونک کر بولا۔ "یار! یہ..... یہ تیری ڈاڑھی مونچھیں کیا ہوئیں، ہائیں؟"

"مجھے خود پتہ نہیں ہے جگت سنگھ جی! کسی نے سوتے میں مونڈ دی ہیں شاید۔"

جگت سنگھ اپنے سر کا خون کرتے کے دامن سے پونچھ کر ہنسا اور بولا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ..... ادھر تمہاری حجامت کرتے رہے ہیں یہ، نائی کے پتر۔"

"یہ مجھے انہی کی شرارت لگتی ہے۔ کوئی آدمی پہلے ان میں سے اوپر چڑھ گیا ہو گا۔"

کلونتی نے کہا۔ "یہ تو بہت برا ہوا ہے شیر سنگھ! باہر لوگ جمع ہو گئے ہیں۔"

"تم اندر جا بیٹھو! جا کلونتی! شیر سنگھ کو اندر لے جا۔ میں لوگوں کو بتاتا ہوں کہ کیا ہوا ہے۔"

کلونتی مجھے بڑے عجیب سے انداز سے گھورتی ہوئی ایک سجے سجائے کمرے میں لے گئی۔ وہاں تیل سے چلنے والا ایک پیڈسٹل فین رکھا تھا۔ مجھے پلنگ پر بٹھا کر اس نے وہ پنکھا چلا دیا۔

بولی: "بہتر ہے یہ کیس بھی الگ کر دو۔ کوئی پوچھے گا تو کہہ دینا کہ تم مونے سکھ ہو۔" وہ بہت سنجیدہ ہو چکی تھی۔

"ہاں! یہ ٹھیک رہے گا۔" اس کی بات پر عمل کر کے میں نے اپنے وہ مصنوعی کیس بھی ــــ اتار کر الگ رکھ دیئے: "مگر جگت سنگھ کیا سوچے گا؟"

"اسے تو اصل بات بتا دے گا تو وہ تجھے کچھ نہیں کہے گا۔ تو بڑا بلوان آدمی ہے۔ تو نے آج میرے ویر کی جان بچائی ہے۔ اس کا بدلہ میں جان دے کر بھی چکا نہیں سکتی۔ ویسے تو بہت سوہنا مرد ہے۔ میں تجھے معاف کر سکتی ہوں۔"

"یہ ملہار راگ نہ ہی رکھو تو اچھا ہے۔ مجھے اپنی تعریف سن کر سخت غصہ آ جاتا ہے۔ مجھے یہ بتاؤ کہ یہ لوٹا سنگھ کون ہے؟ کیوں

چڑھ دوڑا ہے یہ جگت سنگھ پر۔"

"یہ لالہ دھن رام کا آدمی ہے۔ وہ کھٹولی گاؤں کا مالک ہے جگت سنگھ نے چھ مہینے پہلے دھن رام کی تجوری لوٹ لی تھی۔ مگر ثبوت کوئی بھی نہیں تھا۔ جگت سنگھ پکڑا بھی گیا مگر پولیس کو بیس ہزار دے کر اس نے اپنی جان چھڑا لی۔ مقدمہ ختم ہو گیا مگر دھن رام اپنی چوٹ نہیں بھول سکا۔ یہ لوٹا سنگھ کا میرے ویر پر دوسرا ہلّہ ہے پہلے ان کا مقابلہ اُدھر روہی میں ہوا تھا۔"

"اس کا کیا نتیجہ نکلا تھا؟"

"دو آدمی لوٹا سنگھ کے مارے گئے تھے اور میرے ویر کا ایک ساتھی اندھا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں چھرّے لگ گئے تھے۔"

"ہوں، آج تو وہ جگت سنگھ کو مار ہی گئے تھے۔ اچھا ہوا میں یہاں رُک گیا۔"

"ہاں! تیرا پستول عجیب ہے۔ ذرا آواز نہیں دیتا اور بندے کو مار دیتا ہے۔"

"اس پر میں نے منتر پھونک رکھا ہے۔"

"جیسا مجھ پر پھونک دیا تھا تو نے تانگے میں بیٹھتے ہی۔ مجھے اندھی کر لیا تھا۔"

"تو خود سوچ، کیا تو سچ کہہ رہی ہے۔ بین سانپ کو کھینچتی ہے سانپ کو دیکھ کر تو بین نہیں بجتی۔"

"تو بہت خراب آدمی ہے مُسلے! تو نے مجھے بھرشٹ کر دیا ہے۔ اب مجھے دربار صاحب جا کر فریاد کرنی پڑے گی۔"

"تجھے میں پنجہ صاحب نہ لے چلوں جو تو وہاں اشنان کر لے گی تو تیرے سارے پاپ دُھل جائیں گے۔"

"سچ؟ تو مجھے لے چلے گا پنجہ صاحب! ہائے میں تو وہیں رہ جاؤں گی۔ جھاڑو دے لیا کروں گی وہاں حسن ابدال کی گلیاں ہونج دیا کروں گی۔"

"تو تیار ہو جائے تو میں تجھے لے چلوں گا۔ ارجن سنگھ ہمیں کسی خفیہ راستے سے باڈر پار کرا دے گا۔"

"یہ کون سی مشکل بات ہے۔ جگت سنگھ تو نت وہاں جاتا ہے اُدھر پشاور۔ لاہور تک پھر آتا ہے۔ بڑے یار ہیں اس کے اُدھر۔"

"لاہور میں کون یار ہے اس کا؟"

"وہاں؟ مجھے یاد کرنے دو۔ ہاں ہاں، اُدھر بادامی باغ کوئی جگہ ہے وہاں ایک آدمی رہتا ہے جس کا نام شیر دل آہو ہے جگت سنگھ اکثر اس کا ذکر کیا کرتا ہے۔ کہتا ہے وہ بڑا سا ہُو بندہ ہے۔" آہو کا نام اُس دورافتادہ گاؤں میں رہنے والی اُس تشنہ لب مٹیار کے منہ سے سن کر میرا دل رُکنے لگا۔ ماضی کی بہت سی یادیں میرے ذہن میں اُبھر آئی تھیں۔

وہ میرے چہرے کے اتار چڑھاؤ پر غور کر رہی تھی، بولی "کیا بات ہے تو کچھ پریشان ہو گیا ہے، کیا ناؤں ہے تیرا؟ اپنا اصلی ناؤں بتا نا مجھے۔"

"میرا نام؟ تم مجھے خان بدنصیب خان کہہ سکتی ہو کلونتی! جو آدمی اندر سے دُکھی ہو اس کا کیا نام ہو سکتا ہے؟" میں نے چھت کو گھورتے ہوئے کہا۔

"کوئی ایسا تمہیں ملا ہے کبھی جو دُکھی نہ ہو؟ میں نے سرگئے کو زمین پر منہ رگڑ کر اپنا لقمہ ڈھونڈتے دیکھا ہے۔ منش کا بھی یہی حال ہے۔ تو مجھ سے پوچھ، دُکھ کسے کہتے ہیں۔"

"تو مجھے اگر ایک سگریٹ پلا دے کلونتی، تو یہ تیری بڑی مہربانی ہو گی۔" میں نے صحن میں کھڑے لوگوں کے شور سے پریشان ہو کر کہا۔ اس کی بات کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

"یہ ہو تو نہیں سکتا۔ حُقّے تمباکو پر تو یہاں ہندو سکھ فساد ہو جاتا ہے۔ پر میں تیرا کہا نہیں ٹال سکتی۔ میرے ویر کے یار سرحد پار سے آتے ہیں تو وہ یہاں بیٹھ کر سگریٹ پیتے رہتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھی اور ایک الماری میں سے پاکستانی برانڈ کے سگریٹ نکال لائی۔ ان کو دیکھ کر مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ کلونتی سگریٹ کی بُو سے متنفّر تھی، وہ گھبرا کر باہر نکل گئی۔ مگر جانے سے پہلے جس عقبی کمرے میں ہم بیٹھے تھے، اس کے پچھلی تین کھڑکیاں کھول گئی۔ تا کہ دُھواں اُس طرف نکل جائے۔

صحن میں کھڑے لوگوں کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ جگت سنگھ نے پستول اور بندوق چلانے کی تمام تر ذمے داری کلونتی اور اپنی بیوی پر ڈال دی تھی۔ حیرت مجھے یہ تھی کہ ستونتی کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ شاید اس گھر میں سوئی ہی نہیں تھی۔ اس کی آمد کو بدشگونی سمجھ کر جگت سنگھ کی ماں نے اسے کسی دوسرے کے گھر میں سُلا دیا تھا۔ حملہ آوروں میں سے صرف ایک آدمی ہلاک ہوا تھا۔ باقی پانچ زخمی تھے اور ان کے جانبر ہو جانے کی امید تھی۔ طے یہ پایا تھا کہ وہ لوگ اسی وقت گورداسپور جا کر تھانے میں اطلاع کر دیں گے۔ اپنی جگہ ان کی سوچ بالکل درست تھی مگر میری اس گھر میں موجودگی میرے اپنے لئے بے حد خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ انہوں نے گاؤں کے دو آدمیوں کو اسی وقت شہر کی طرف دوڑا دیا۔ جب صحن میں ذرا ٹھنڈ ٹھنڈا ہوا تو جگت سنگھ کلونتی کے ساتھ میرے پاس آ گیا۔ کلونتی نے شاید میرے بارے میں اُسے یہ بتا دیا تھا کہ میری داڑھی شاڑھی سب مصنوعی تھی اور یہ کہ میں دھرم کے اعتبار سے مونا سکھ ہوں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ جب اندر آیا تو مجھے دیکھ کر وہ قطعاً حیران نہیں ہوا۔ بولا "مجھے کلونتی نے بتایا ہے کہ تو مونا سکھ ہے یار! پھر یہ بھیس بدلنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"میں بس پولیس سے بچنے کے لئے یہ سب کچھ کر رہا تھا۔ میں بھی ایک لمبے چکّر میں پھنسا ہوا ہوں سردار جی! اب میرا یہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں ہے۔ پولیس کے آنے سے پہلے مجھے نکل جانا چاہئے۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔ کہاں جاؤ گے؟"

"تم اگر مجھے پاکستان پہنچا دو، تو یہ تمہاری بڑی کرپا ہو گی۔" میں نے داڑھی کو اپنے چہرے پر جماتے ہوئے کہا۔ کیس میں پہلے ہی سر پہ باندھ چکا تھا۔

"یہ کونسی مشکل بات ہے۔ میری گھوڑی لے کر ابھی نکل جاؤ۔ اُدھر ترمیوں روڈ پر ایک گاؤں ہے بھیری والا۔ وہاں تم میرے یار ست پال سنگھ سے مل لو۔ وہ تمہیں صبح ہونے سے پہلے راوی پار کرا دے گا۔"

"یہی کر دو جگت سنگھ جی! گھوڑی میں ست پال سنگھ کے پاس چھوڑ دوں گا۔ مجھے ابھی نکل جانے دو۔"

"ارجن سنگھ سے نہیں ملو گے؟"

"نہیں! میری یہی ضرورت تھی۔ وہ تم پوری کر دو گے تو پھر اُس کے پاس میں کیوں جاؤں؟"

"تم نر آدمی ہو شیر سنگھ جی! اور کلونتی چاہتی ہے کہ تم اُسے حسن ابدال لے جاؤ۔"

"یہ ایسے ہی خواب دیکھنے کی عادی لگتی ہے مجھے۔ اس کو باقاعدہ پاسپورٹ بنوا کر وہاں بھیجو ورنہ خواہ مخواہ پریشان ہو گی۔"

"ہاں یہ تو ہے۔ بالکل جھلّی کُڑی ہے یہ۔ میں یہی کروں گا۔ تم کب تک واپس آ جاؤ گے؟"

"میں بس دس دن بعد واپس آ جاؤں گا اور سیدھا یہاں آؤں گا۔"

"ہاں، مجھ سے ضرور مل لینا۔ تمہارا وہاں پر ڈیرہ کہاں ہو گا؟"

"تم اُدھر آ جاؤ تو مجھے شاہدرہ میں چوہدری کریم بخش کے ہاں مل لینا۔ اس نے وہاں باغ اُگا رکھے ہیں۔ وہ بھی یہی کام کرتا ہے۔" میں نے یونہی ایک نام لے دیا۔

"چوہدری کریم بخش! ٹھیک ہے میں اس کو ڈھونڈ لوں گا مگر ابھی تو شاید میں نہ جا سکوں۔ تم یوں کرو۔ یہ بیس ہزار روپے ساتھ رکھ لو، ضرورت میں کام آئیں گے۔ یہ پاکستانی کرنسی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے ایک ٹرنک میں سے بیس ہزار کے نوٹ نکال کر میرے آگے رکھ دیئے۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے جگت سنگھ۔ تیری دعا سے بہت روپیہ ہے میرے پاس۔ تم شاید میری گولیوں کی قیمت ادا کر رہے ہو مگر مجھے اتنا سفلہ نہ سمجھو۔" یہ کہہ کر میں نے نوٹ پرے سرکا دیئے۔

"نہیں یار جی! یہ میری خوشی ہے۔"

"اسے سمجھا کلونتی! یہ میرے منہ پر ایسی کالک نہ ملے۔ مجھے سمجھنے کی کوشش کرو، جگت سنگھ جی! ہر بندہ بکاؤ نہیں ہوتا۔ میں نے تیرا نمک کھایا ہے۔ اس گھر سے محبت ملی ہے مجھے۔ یہ ایک رات میری ہزاروں راتوں پر بھاری ہو گئی ہے۔ تجھے بچانے کے لئے تو میں اپنی جان بھی دے سکتا تھا۔ کیونکہ میں.... میں تیرا مہمان ہوں جگت سنگھ!"

میری یہ بات سُن کر جگت سنگھ شرمندہ سا ہو گیا۔ حیرت بھی اس کی آنکھوں میں نمایاں ہونے لگی تھی، بولا "اچھا بھئی! تیری مرضی ــــ تو اِدھر ہی بیٹھ۔ میں خود تجھے سرحد پار کروا دیتا ہوں۔ ذرا منہ ہاتھ دھو لوں۔ کلونتی! میرے زخم پر ذرا مرہم لگا دے۔" یہ کہہ کر وہ اپنی بہن کے ساتھ صحن میں نکل گیا۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد وہ واپس آیا تو میرے ساتھ باہر جانے کے لئے بالکل تیار تھا، بولا "چل جوان! پتہ نہیں تجھے پاکستان جانے کی کیا سُوجھ رہی ہے۔ پر خیر میں بارڈر تک تیرا ساتھ دوں گا۔"

میں اپنا بریف کیس اٹھا کر جگت سنگھ کے ساتھ کمرے سے باہر نکلا تو کلونتی بولی "تو واپس آئے گا تو میں تیرے ساتھ پنجہ صاحب ضرور جاؤں گی۔ کیوں ویر جی! جانے دو گے نا مجھے؟"

"ہاں ہاں! چلی جانا۔ ابھی تو اِدھر کا سیاپا نمٹا۔ اس لالے کی گردن کاٹنی پڑے گی مجھے۔ آج تو مروا ہی دیا تھا اس نے۔"

"اِدھر پولیس آ گئی تو کیا ہو گا؟"

"کچھ نہیں ہو گا۔ وہ "سوہرے" صبح سے پہلے نہیں آئیں گے۔ میں گھنٹے ڈیڑھ تک واپس آ جاؤں گا۔ آ جوان! میں تجھے کسی اور کے حوالے نہیں کر سکتا۔" یہ کہہ کر اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور گلی میں جا نکلا۔ دائیں ہاتھ ایک باڑہ سا بنا تھا۔ اس کے اندر جا کر جگت سنگھ نے ایک چتکبری گھوڑی پر زین کسی۔ اور پھر وہ مجھے اپنے پیچھے بٹھا کر گاؤں سے باہر نکل آیا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم برنالہ سے نکل کر سادھو چک کے قریب سے گزر رہے تھے۔ مغرب کی سمت اشارہ کر کے اس نے مجھے بتایا کہ سامنے ٹھکرا گاؤں ہے۔ اس سے آگے آلے چک تھا مگر وہ اُدھر نہیں نکلا، بولا "اُدھر آلے چک سے آگے ترمیوں روڈ ہے۔ مگر اُدھر سے جانا ٹھیک نہیں۔ فوج دُور دُور تک پھیلی رہتی ہے۔"

"ان سے بچ کر نکلنا مشکل ہو گا۔"

"اسی لئے تو میں اُدھر نہیں جا رہا ہوں۔ ہم بہرام پور سے آگے مراڑہ گاؤں کے پیچھے سے راوی پر جا پہنچیں گے۔"

سامنے کیشوپور کی جھیل تھی۔ جس پر ایک بند بندھا تھا اور اس بند کے عین وسط میں ایک چھوٹا سا پُل بنا ہوا تھا۔ اس پُل پر سے گزر کر ہم ایک کھلے میدان میں جا پہنچے۔ گھوڑی بہت تیز طرار تھی۔ پُل عبور کر کے جونہی وہ میدان میں پہنچی، جگت سنگھ نے اسے ایڑ دی۔ اور وہ ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ میرا خیال ہے کہ وہ راستہ اس گھوڑی

کا دیکھا بھالا تھا۔ وہ تاروں کی چھاؤں میں یوں بھاگ رہی تھی جیسے وہ راہ کے ایک ایک چپے سے واقف ہے۔

ہم نومنی کی ندی عبور کر کے آگے نکلے اور پھر مراڑہ گاؤں کے بائیں ہاتھ سے گزرتی پگڈنڈی پر چلنے لگے۔ راستے کے ہر نشان کے بارے میں مجھے جگت سنگھ بتاتا جا رہا تھا اور مجھ سے وہ یوں بات کر رہا تھا جیسے وہ صدیوں سے مجھے جانتا ہو۔

بالآخر ایک گھنے جنگل سے سے گزر کر ہم دریا پر جا پہنچے۔ کنارے پر گھوڑی روک کر جگت سنگھ بولا۔

"تمہیں تیرنا آتا ہے؟"

"ہاں! میرا خیال ہے میں تیر سکتا ہوں۔"

"خیال کی بات نہیں ہے جوان! ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔ دریا میں پانی زیادہ ہے۔"

"تم فکر نہ کرو۔ میں تیر لوں گا۔" میں نے دریا کے پھیلے ہوئے پاٹ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ پانی اس میں واقعی بہت چڑھا ہوا تھا۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔ دریا کے اُس پار پانچ چھ گاؤں ہیں۔ پہلا گاؤں مٹیال ہو گا۔ پاکستانی فوج اس علاقے میں زیادہ نہیں ٹھہرتی ہے۔ دریا پار کرتے ہی آگے نکل جانا۔"

"میں یہی کروں گا جگت سنگھ جی! اچھا مجھے اب اجازت دو۔ رب راکھا۔" یہ کہہ کر میں نے اس سے مصافحہ کرنا چاہا تو وہ مجھ سے لپٹ گیا، بولا۔

"واپسی کے لئے بھی یہی راستہ بہتر ہو گا۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔"

"میں جب واپس آیا تو سیدھا تمہارے گھر آؤں گا جگت سنگھ جی! میں آپ لوگوں کو کبھی نہ بھول سکوں گا۔"

"اگر تم اپنا اصلی نام مجھے بتا دیتے تو بہت خوشی ہوتی۔" اُس نے اچانک سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب؟ نام تو میں نے تمہیں اپنا بتا دیا تھا۔ تمہیں شک ہے کوئی؟"

"تو مسلمان ہے میرے یار! تیرے رنگ ڈھنگ، تیری بول چال، تیرے سگریٹ کا دھواں، میں سب سمجھ گیا تھا مگر تو مجھ سے اب بھی چھپا رہا ہے۔ یہ اچھی بات ہے مگر اب تو تو رخصت ہو رہا ہے۔" وہ اب بھی بہت سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

میں نے فوراً ہی ایک فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔ "تو پھر سن! جگت سنگھ! میرا نام غلام جیلانی ہے۔ وہی غلام جیلانی جس نے امرتسر سے ایک ہیلی کاپٹر میں بھنڈاری کو اغوا کیا تھا۔"

"اوئے میں تیرے صدقے جاواں! میں پہلے ہی سمجھ رہا تھا کہ تو کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ جا تیرا رب راکھا۔ تیرا ذکر میں نے آپ بھی سُن رکھا تھا۔" یہ کہہ کر وہ ایک بار پھر مجھ سے لپٹ گیا، بولا "اُس سُؤر کے پُتر سے بچ کے رہنا۔ بہت بدمعاش شے ہے وہ۔ اوئے تو وہ خون کا پیاسا ہے۔ میرے بہت قیمتی ہیرے وہ ہضم کر چکا ہے اور نام وہ تیرا لے رہا تھا۔"

"بکتا ہے تو۔ اس کی الماری سے وہ ہیرے ماجدہ نامی ایک عورت نے چرائے تھے مگر اس میں سے آدھا مال اس نے کچھ عرصہ پہلے اسے واپس کر دیا تھا۔"

"اچھا! مجھے تو اس نے کچھ نہیں بتایا۔ مجھے ذرا اس معاملے کی تفصیل بتاؤ، میں اس سے وہ سارا مال اگلوا لوں گا۔" جگت سنگھ نے حیران ہو کر کہا۔

میں نے تمام واقعات اسے مختصراً بتائے تو وہ بولا۔ "تو یہ قصہ ہے۔ خیر میں دس پندرہ دن تک اس کے پاس جاؤں گا۔ پھر دیکھوں گا کہ وہ کیا کہتا ہے۔"

"اچھا اب میں چلتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں بریف کیس کمر کے ساتھ باندھنے لگا تو وہ بولا۔

"ٹھہر جا یار! شاید ادھر ہمیں چھوٹی کشتی مل جائے۔ ایک ڈاکو سادھرا رہتا تھا یہاں۔" یہ کہہ کر وہ مجھے دریا کے کنارے آگے گھنے جنگل میں لے گیا اس کا خیال درست نکلا۔ ایک چھوٹی کشتی وہاں اوندھے منہ پڑی تھی اور چپو اس کے نیچے دبے تھے۔ اس کشتی کو بڑی مشکلوں سے دھکیل کر ہم دریا تک لے گئے۔

"یہ تو بڑی مضبوط کشتی ہے جگت سنگھ جی؟"

"ہاں میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ تمہیں پار اتار کر اسے میں واپس لے آؤں گا۔"

یہ کہہ کر اس نے چپو سنبھالے اور مجھے کشتی میں بٹھا کر دوسری طرف لے چلا۔ وہ اچھا کشتی ران تھا اور پانی کے تیز بہاؤ سے نپٹنا جانتا تھا۔ گھوڑی اس نے جنگل میں ایک درخت سے باندھ دی تھی۔ ڈر مجھے یہ تھا کہ دوسری طرف پاکستان کی فوج کا کوئی دستہ اگر گشت پر اس طرف نکل آیا تو ہم دونوں ہی مارے جائیں گے۔ مگر میرے خدشے بے بنیاد ثابت ہوئے۔ ہم بڑے اطمینان سے دوسری طرف جا پہنچے۔

ابھی کشتی کنارے پر نہیں لگی تھی کہ جگت سنگھ نے مجھے اُتر جانے کے لئے کہا۔ بولا۔

"یہاں پانی بس گھٹنے گھٹنے گہرا ہو گا۔ میں کشتی واپس لے جا رہا ہوں۔ تم کنارے پر پہنچتے ہی تیزی سے کسی طرف نکل جاؤ۔"

"ٹھیک ہے یار! میں اُتر رہا ہوں۔"

"رب راکھا!" یہ کہہ کر میں کشتی میں سے اچھل کر پانی میں کُود گیا۔ جگت سنگھ کا اندازہ درست نکلا۔ پانی وہاں زیادہ گہرا نہیں۔ میں گائے کے پیچھے بھاگنے والے کی طرح اچھلتا ہوا کنارے پر جا پہنچا۔ اب میں پاکستان میں داخل ہو چکا تھا۔ مگر ابھی میں دریا کے ریتیلے کنارے پر چند ہی قدم آگے بڑھا تھا کہ مجھے یہ احساس ہوا کہ میرے ہاتھ میں جو اٹیچی کیس ہے وہ میرا نہیں ہے اس کا حجم، اس کی ساخت —————— تو میرے بریف کیس ایسی تھی مگر وہ پھر بھی میرا بریف کیس نہیں تھا۔ اس کا رنگ سیاہ نہیں تھا بلکہ سیاہی مائل تھا اور اس کا وزن بھی کم تھا —— جونہی یہ احساس میرے ذہن میں اُبھرا میں تیزی سے دریا کی طرف پلٹا مگر اس عرصے میں جگت سنگھ کشتی کو دریا کے وسط تک لے جا چکا تھا۔ میں پاگلوں کی طرح اس کے پیچھے پانی میں اترا اور اتنی دُور تک آگے نکل گیا کہ پانی میری کمر تک پہنچنے لگا مگر جگت سنگھ نے نہ تو میری آواز سنی اور نہ ہی اس نے پیچھے نظر ڈالی۔ میں سٹپٹا کر رہ گیا۔ اتنی بڑی رقم میں اپنے بریف کیس میں بند کر کے اس کے گھر چھوڑ آیا تھا اور وہ رقم میرے لئے گرنگے کا خواب ہوئی جاتی تھی۔ میں اس سے کسی بھی طرح ہاتھ دھونا نہیں چاہتا تھا۔

احساس مجھے یہ تھا کہ میرے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ کلونتی نے عمداً مجھے میرے بریف کیس کے بجائے اس جیسا کوئی اور بریف کیس تھما دیا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ اس نے یہ سب کچھ جان بُوجھ کر کیا ہے۔ رقم کے لالچ نے اس نیم آدمی کو راستی کی راہ سے ہٹا دیا اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ میرے ساتھ ایسا ہاتھ کبھی نہ کرتی۔ وہ مجھے نیلی گھوڑی بنا کر نچا گئی تھی۔ میں وہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اس بریف کیس کو کُنڈے پر سے دانتوں میں پکڑا اور جگت سنگھ کے تعاقب میں پانی کی پُشت پر سوار ہو گیا۔ پانی کا بہاؤ تیز تھا مگر میرے دماغ میں آگ کچھ ایسی ہی سوا چکی تھی کہ مجھے کلونتی پر بھی طیش آ رہا تھا، اور جگت سنگھ پر بھی —— میرا دل چاہتا تھا میں ان دونوں کو پکڑ کر نیل کی سلائیاں ان کی آنکھوں میں پھیر دوں۔ وہ مجھ سے بہت بڑی زیادتی کر چکے تھے۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے انہوں نے میرے بدن پر گہرا گھاؤ لگا کر اس میں نمک بھر دیا تھا۔ پانی راستہ نہیں دیتا تھا اور منہ میں گُتے کی ہڈی کی طرح اٹکا ہوا بریف کیس میری گردن کا ناقابل برداشت بوجھ بننے لگا تھا۔ اور جگت سنگھ مجھ سے لمحہ بہ لمحہ دُور ہوا جاتا تھا۔ اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ میں اس کے پیچھے لپکا چلا آ رہا ہوں۔ وہ رقم مجھے ہر قیمت پر واپس ملنی چاہئے تھی۔ کیونکہ وہ ایک گھر کی مکمل بربادی کا عکس تھی۔ جس بلبیر سنگھ کو میں پاکستان روانہ کر چکا ہوں وہ رقم میں نے اس کی رگوں سے نچوڑی تھی۔ اور اس رقم سے میں بڑے کام لے سکتا تھا مگر اب وہ پانی میں نمک ہوئی جاتی تھی۔ میرے اور جگت سنگھ کے درمیان فاصلہ بڑھتا ہی چلا گیا۔ جب میں ہانپتا کانپتا دوسرے کنارے پر پہنچا تو اس وقت تک جگت سنگھ کشتی کو جنگل میں اوندھا ڈال کر گھوڑی بھگاتا ہوا واپس جا چکا تھا اور اب میرے سامنے ایک طویل تھکا دینے والی مسافت تھی۔ مجھے ایک بار پھر گیدڑ ونڈی تک پیدل سفر کا مرحلہ درپیش تھا اور بدن میرا اس دریا کی مشقت نے اتنا تھکا دیا تھا کہ میرا دل چاہتا تھا میں وہیں کہیں ہاتھ کا سرہانہ بنا کر لیٹ جاؤں۔ لیکن وہ سائیں سائیں کرتا جنگل، وہ یہاں سے وہاں تک پھیلی مرطوب زمین مجھے کہاں راہ دیتی تھی۔

میں جگت سنگھ کے تعاقب میں لپکتا چلا گیا۔ مگر ابھی میں آدھا راستہ ہی طے کر پایا تھا کہ اچانک مجھے سامنے سے ایک گھڑسوار اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ اس کی بلاخیز رفتار نے مجھے پگڈنڈی چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا۔ آناً فاناً وہ میرے سامنے سے گزرا تو میرے منہ سے ایک چیخ سی نکل گئی۔

"کلونتی!" یہ نام آپ ہی آپ میرے سینے میں دبی آہ بن کر ابھرا اور چاروں طرف پھیل گیا۔ گھڑسوار نے میری آواز سن لی تھی۔ اس نے گھوڑے کی راسیں کھینچ لیں اور کوئی پندرہ قدم آگے جا کر وہ میری طرف لوٹا۔ "شکر ہے واہگورو کا تم مل گئے ہو۔ ورنہ میں ساری عمر پچھتاتی رہتی" وہ میرے پاس آ کر عجیب سے دلفریب انداز سے اچھل کر گھوڑے سے اتری اور کاٹھی کے ساتھ بندھے ایک بریف کیس کو اتار کر میری طرف لپکی —— بولی "یہ..... یہ تمہارا بریف کیس تو اُدھر ہی رہ گیا تھا اور اسے میں نے کھول کر دیکھا تھا۔ اس میں تو بہت بڑی رقم ہے۔ تم تو شاید ساری حیاتی مجھے معاف نہ کرتے۔"

"نہیں کلونتی! ایسا نہ کہو۔ یہ رقم تم سے اچھی نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے تم نے خواہ مخواہ میرے پیچھے دوڑ لگائی۔"

"نہ بیبا نہ! یہ لو سنبھالو اپنا یہ مال۔ مگر تم ابھی تک راستے میں ہی ہو اور وہ میرا ویر کہاں ہے؟ اور تمہارے کپڑے بھی بھیگے ہوئے ہیں۔"

"ہاں! وہ مجھے دریا تک پہنچا کے لوٹ گیا تھا مگر پھر مجھے ایک کام یاد آ گیا اور میں لوٹ آیا۔"

"کام؟ اس بریف کیس کے سوا تمہیں اور کیا کام ہو سکتا ہے؟ بہرحال میرے دل میں کوئی چور نہیں تھا جیسے ہی مجھے پتہ چلا میں جگت سنگھ کی دوسری گھوڑی لے کر بھاگ نکلی۔ اس نے مجھے بتا دیا تھا کہ وہ تمہیں کس راستے بارڈر تک لے جائے گا۔"

"تمہاری مہربانی ہے کلونتی! مگر یہ رقم اب مجھے نہیں چاہئے۔"

"یہ نخرا نہیں چلے گا، مُسلنٹے! ہاں، پکڑ یہ مال اپنا اور بیٹھ میرے ساتھ گھوڑی پر، تجھے دریا تک پہنچا دیتی ہوں۔"

"نہیں! میں صبح امرتسر جانا چاہتا ہوں۔ مجھے یاد ہی نہیں رہا تھا میرا ایک دوست وہاں میرا انتظار کر رہا ہو گا۔"

"اچھا! تو ٹھیک ہے۔ میرے ساتھ بیٹھو۔ میں تمہیں اُدھر دینا نگر پہنچا دیتی ہوں۔ یہاں سے زیادہ دُور نہیں ہے۔ گاڑی میں بیٹھ کر تم

امرتسر چلے جاؤ۔"

"ہاں یہ بہتر رہے گا۔" یہ کہہ کر میں گھوڑی کی لگام تھام کر اس پر سوار ہو گیا۔ وہ ذرا سا فاصلہ رکھ کر میرے پیچھے بیٹھی تو بولی۔

"چل راستہ میں تجھے بتاتی چلوں گی۔ پر دیکھ اب کوئی شرارت نہیں چلے گی، سمجھ رہا ہے نا تو۔"

"فکر نہ کر۔ تیرے میرے بیچ دو جُوتے۔" یہ کہہ کر میں نے اپنا اور اس کا بریف کیس درمیان میں رکھ لئے۔ وہ مطمئن سی ہو گئی۔

"میں نے سنا ہے کوئی مہاندی ہے جس میں دو طرح کے "جل" بہتے ہیں۔ پر ایک جل دوسرے جل میں داخل نہیں ہو سکتا۔ ہمیں اب اس مہاندی ایسا بن جانا چاہئے۔"

"کس سے سنا ہے یہ تم نے؟"

"وہ جگت سنگھ کا ایک استاد آیا کرتا ہے ہمارے گھر وہ گیانی اوتار سنگھ، وہ بتاتا تھا۔ اس نے تو کہا تھا کہ تمہارے قرآن شریف میں بھی اس مہاندی کا ذکر ہے۔"

"ہاں تم ٹھیک کہتی ہو۔ اللہ نے اپنی نعمتوں کے ذکر کے سلسلے میں سورۂ الرحمٰن میں اس سمندر کے بارے میں بتایا ہے۔"

"گیانی اوتار سنگھ پتہ ہے کیا کہتا ہے؟"

"کیا کہتا ہے وہ؟"

"کہتا تھا کہ اگر دھرم بدلنا اس کے بس میں ہوتا تو وہ کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو جاتا۔ وہ کہتا ہے کہ قرآن شریف واقعی واگورو کی کتاب ہے۔"

"اور تمہارا گرنتھ! اس کے بارے میں کیا کہتا ہے وہ؟"

"وہ بھی کہتا ہے کہ واگورو کی بانی ہے۔ پر وہ کہتا ہے وہ گیانی کہ ہر کتاب کی اصل قرآن ہے۔"

"اس گیانی سے میرا سلام کہنا کلونتی! وہ کسی دن ضرور مسلمان ہو جائے گا۔ اس کے دل میں اللہ نے بڑی روشنی پیدا کر دی ہے۔"

"ہاں! وہ بڑی بڑی کھری اور سچی باتیں کیا کرتا ہے۔ بس اب تو بائیں ہاتھ ہو جا۔ یہ راستہ سیدھا اسٹیشن کی طرف جاتا ہے۔" ایک چوراہے پر پہنچ کر کلونتی نے مجھے رکتے ہوئے کہا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم دینا نگر اسٹیشن پر پہنچ گئے۔ کلونتی نے میرا بریف کیس خاص طور پہ الگ کر کے مجھے دیا اور بولی "اسے کھول کر دیکھ لو، اپنی رقم بھی گن لو۔"

"مجھے تم پر بھروسہ ہے کلونتی! کاش میں زندگی بھر کے لئے تمہیں اپنے ساتھ رکھ سکتا۔ تم بہت مہان ہو۔ میں تمہیں کبھی نہ بھلا سکوں گا۔" میرا گلا رُندھنے لگا۔ اک ذرا سے تعلق نے میرے سامنے کتنی عظیم عورت کو لا کھڑا کیا تھا۔ میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ڈیڑھ لاکھ روپے پہ تھوک گئی تھی اور بریف کیس میرے پیچھے لے کر یوں بھاگی تھی جیسے میں زہریلے سانپوں کی پٹاری اس کے گھر میں بھول آیا تھا۔ وہ چاہتی تو اس رقم کو صفاچٹ ہضم کر سکتی تھی۔ میں اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ میری تمام تر مجبوریاں اس کے سامنے سر نیہوڑائے کھڑی تھیں۔ مگر وہ ان سے صرفِ نظر کر کے مجھے میری رقم لوٹا دینے کے لئے ان کی تاریکی کو چیرتی ہوئی اس راستے پر آندھی طوفان کی طرح بڑھتی چلی گئی جس پر سے گزر کر میں سرحد پار کر گیا تھا۔

جب میں دینا نگر اسٹیشن پر سے گاڑی پر بیٹھا تو اس وقت پو پھٹ رہی تھی اور میرے کپڑے بڑی حد تک سوکھ چکے تھے۔ کلونتی مجھ سے ہاتھ ملا کر اور میرے ہاتھ کی پُشت کو اپنے آنسوؤں سے تر کر کے جب رُخصت ہوئی تو مجھے اس کی ذہنی اور قلبی کیفیتیں بہت ہی زیادہ زیر و زبر ہوتی نظر آتی تھیں مگر پھر اس نے ایک زوردار جھٹکے سے اپنی نظریں چھڑائیں اور گھوڑی کو شاہوار ایسے انداز سے ایڑ دے کر لوٹ گئی تھی۔ وہ واقعی جگت سنگھ ایسے جری مرد کی بہن کہلانے کی حقدار تھی۔ اس میں سُندرتا بھی تھی۔ اس کی جمال آفرینی کے رنگ تو میں دیکھ چکا تھا مگر اس کے جلال کے بھی کئی پَرتو مجھے اس رات حیران کر گئے۔

میں نے گاڑی میں بیٹھنے کے بعد غسل خانے میں جا کر اٹیچی کیس کھول کر نوٹ گنے رقم پوری تھی۔ اور مجھے اپنی ہی نظروں میں ذلیل کرنے کے لئے بہت کافی تھی۔ میں نے جب لوٹ کر راوی میں چھلانگ لگائی اور جگت سنگھ کے تعاقب میں پیچھے لپکا تو میرے ذہن میں یہی وسوسہ تھا کہ وہ لوگ مجھ سے ہاتھ کر گئے ہیں۔ ایک رات کے لئے مجھے اپنے ہاں ٹھہرا کر انہوں نے مجھے پوری طرح صاف کر دیا ہے۔ وہ رقم اگر کوئی یونہی ہزار دو ہزار تک ہوتی تو میں صبر بھی کر جاتا۔ میں سمجھتا کھو گئی ہے۔ میں اور پیدا کر لوں گا مگر...... وہاں تو صورتِ حال ہی مختلف تھی۔ کچے گولر ایسی وہ چیز میرے بریف کیس میں بند تھی۔ بڑے بڑوں کا ایمان ایسی رقمیں خراب کر دیتی ہیں۔ وہ تو پھر کلونتی تھی۔ جگت سنگھ کی بہن۔ ان لوگوں کی یکتا یان ہی یہی تھی کہ جس طرح بھی ہو سکے، دولت اکٹھی کر لو۔

لیکن ان سب باتوں کے باوجود جب میں نے کلونتی کو اپنی شاہ گام گھوڑی پر اپنے پیچھے یوں دوڑتے دیکھا تو پھر میں اپنی ہی نظروں میں ذلیل ہو کر رہ گیا۔ وہ میرے وسوسوں کو کفنانے کے لئے پڑیا کا لٹھا لئے چلی آئی تھی۔

غسل خانے سے نکل کر میں بڑے اطمینان سے اپنی نشست پر جا بیٹھا۔ مجھے اس پسند سے آپی سے ملنا تھا۔ اس نے مجھ سے یہی کہا تھا کہ وہ مجھے امرتسر میں دربار صاحب کے سامنے ملے گا۔ دن اور تاریخ بھی اس نے مجھے بتا دیئے تھے مگر مجھے اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ کس دن وہاں پہنچ سکے گا۔ پھر بھی میں نے طے کر لیا تھا کہ میں چند دن امرتسر میں رہ کر اس کا انتظار کروں گا۔

یہ بات تو اب ثابت ہو چکی تھی کہ اس حرماں نصیب بہن کے نئے زخم میں سرحد کے اس پار کے کسی آدمی کا ہاتھ نہیں تھا۔ نہ بلبیر کا نہ بھنڈاری کا۔ وہ ابھی اس سمت کوئی قدم نہیں اٹھا سکے تھے کہ کسی نے اس کو کبیر شاہ کے گھر سے اٹھوا لیا۔ میری جہاں دیدہ تقدیر مجھے ٹھہر ٹھہر کر رُسوا کرتی تھی۔ مجھے پروا نہیں تھی کسی چیز کی۔ کوئی چاہے امرتسر شہر کو آگ لگا دیتا، کوئی ڈھلوں صاحب کے گاؤں کو مسمار کر دیتا۔ میرے لئے سب برابر تھا۔ میں تیغ و کفن گھر سے باندھ کر نکلا تھا اور اب میں نے طے کر لیا تھا کہ میرے سامنے جو بھی آیا، میں اسے تہس نہس کر دوں گا۔ میں اپنی ماں جائی بہن آسیہ کو مزید ذلیل و خوار ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میرے صبر کے سارے پیمانے لبریز ہوئے جاتے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ میری قبر میرے انتظار میں ہے مجھے کوئی اور زیادہ دن نہیں جینا ہے۔ ایک احساس تھا جو مجھے رہ رہ کر ڈستا رہتا تھا کہ جیلانی، زندگی کی چند ہی ساعتیں باقی رہ گئی ہیں اور بقول کسے اب تیری عمر کی نقدی ختم ہوتی جاتی ہے۔ اب تجھے اُدھار کی حاجت ہے وہ بھی شاید تجھے نہ مل سکے۔ اور زاں پیشتر کہ بانگ برآید کہ جیلانی نہ ماند، تیرے لئے بہتر یہی ہے کہ تو آسیہ کو اس ہولناک دلدل سے نکال لے۔ تیرے بعد تو پھر وہ کسی چکلے میں پور پور تباہ ہو گی یا پھر وہ خون تھوک تھوک کر کسی گھپ اندھیری کوٹھڑی میں بے یار و مددگار مر جائے گی۔

امرتسر تک کا وہ سفر میرے لئے سوہانِ رُوح بن گیا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں اپنے راستے سے بھٹک چکا ہوں۔ منزل میری نگاہ سے اوجھل ہے اور میں بھول ہی چکا ہوں کہ آسیہ اس نئے برزخ میں سے گزر کر کسی جہنم میں جا گری ہو گی۔ مجھے اپنی ساری دوڑ دھوپ، ساری تپس تپسیا اکارت نظر آ رہی تھی۔ کیونکہ...... کیونکہ میں تو اب تک اس بدنصیب کو اس کی صلیب سے ایک قدم بھی پیچھے نہ کھینچ سکا تھا اور تقدیر اس کی ہتھیلیوں میں مسلسل میخیں گاڑتی چلی جا رہی تھی۔ میں تو شاید پاگل ہو چکا تھا۔ کس نے یہ بات میرے ذہن میں پختہ کر دی تھی کہ اسے بلبیر نے اٹھوا لیا ہے اور کیسے میں نے اس پر یقین کر لیا۔

میں اپنے آپ سے ہی شرمسار ہوا جاتا تھا۔ جب میں امرتسر پہنچا تو میرے اندر ایک عجیب سی دہائی ایک عجیب سی ماتمت مچی تھی۔ جیسے میرے وجود کی ہر اکائی، سچائی کفنائی جا چکی ہو۔

میں دل سے چاہتا تھا کہ جس طرح بھی ممکن ہو مجھے آپی اسی روز دربار صاحب کے سامنے مل جائے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ میرے پیچھے امرتسر ضرور پہنچے گا۔ وہ مجھے میری اس نئی راہ میں فراموش نہیں کر سکے گا۔ مگر میرا حساب غلط تھا۔ آپی نے اس روز تو مجھے وہاں ملنے کا وعدہ نہیں کیا تھا میں لوٹ کر بالک رام کے پاس بھی نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس کو پہلے ہی میں نے پولیس کی نظروں میں سنسنایاں کر دیا تھا اور ڈر مجھے یہ تھا کہ اگر میں اس کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کئے بغیر وہاں جا پہنچا تو پولیس کہیں میری ہی گردن میں رسّی نہ ڈال لے۔ گاڑی سے اتر کر میں اسٹیشن سے باہر نکلا، تو میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کہاں جاؤں، کس طرف نکلوں کہ میں ان لوگوں کی نظروں سے بچ جاؤں جو مجھے پہچانتے تھے۔

میرے ہونٹوں کی سوجن مکمل طور پر ختم ہو چکی تھی اور اب کوئی بھی شخص مجھے دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں کوئی بہروپیا ہوں۔ داڑھی مجھے سجتی تھی اور سر پہ رکھی پگڑی مجھے سچا اور پکا سکھ ثابت کرنے کے لئے بہت کافی تھی۔

اگلے چار دن میں نے ایک دوسرے درجے کے ہوٹل میں یوں گزار کہ میں دن رات کمرے میں بند ہو کر پڑا رہتا تھا۔ اس دوران میں نے وہاں کے کسی بھی آدمی سے کوئی رابطہ قائم نہ کیا۔ یہاں تک کہ میں نے بالک رام کے بارے میں بھی سب کچھ فراموش کر دیا۔ دراصل میرا دل کچھ اس حد تک افسردگی اور مایوسی کی زد میں آ چکا تھا کہ مجھے کسی بھی چیز سے دلچسپی باقی نہیں رہی تھی۔ میں شاید ذہنی طور پر مفلوج ہوتا جا رہا تھا۔ اپنی شکستوں اور آزردگیوں کا جب میں حساب لگاتا رہا تو میرا دل ڈوبنے لگتا تھا۔ جیسے کسی نے مجھے پیار میں جکڑ کر نیفا باندھ دیا ہے۔ مجھ سے زیادہ بے ہنر اور کون ہو سکتا تھا۔ وہ دن دراصل میں نے اپنے حساب کتاب میں صرف کر دیئے تھے اور میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ وہ زخم جو آدمی کی تقدیر میں لکھ دیا جاتا ہے اسے لگ کر رہتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کسی ماں کا بچہ کبھی یوں بگولوں کی زد میں نہ آتا اور آسیہ کو تو گرم ہوا چھو بھی نہ سکتی تھی کہ اس کو حوادث سے بچانے کے لئے میں نے اپنی پوری قوت صَرف کر دی تھی۔ اس کے باوجود میں اس کے لئے کچھ بھی نہ کر سکا تھا۔ اس سے زیادہ بڑی بدنصیبی اور کیا ہو سکتی ہے؟ بلاشبہ آدمی تقدیر کا زندانی ہے۔

پانچویں دن میں آپی کی تلاش میں ہوٹل سے نکلا اور سیدھا دربار صاحب جا پہنچا۔ اگر اس نے مجھ سے امرتسر آنے کا وعدہ نہ کیا ہوتا تو میں اس وقت پاکستان میں پھر رہا ہوتا۔ اور شاید آسیہ کے لئے کوئی مثبت کام بھی کر چکا ہوتا۔ مگر آپی نے مجھے باندھ لیا تھا اور خدا کا شکر میں یوں ادا کرتا تھا کہ مجھے اس کا وعدہ یاد آ گیا تھا اور وہ بھی اس وقت جب میں راوی کو دوبارہ عبور کر کے جگت سنگھ کی طرف جا رہا تھا۔ اس ساری بھاگ دوڑ کا انعام آپی سے ایک ملاقات کی صورت میں مل سکتا تھا اور میں اسی کی امید پہ دربار صاحب کے سامنے جا پہنچا تھا۔

اس وقت وہاں کسی دوسرے شہر سے آئے ہوئے نہنگوں نے اودھم مچا رکھا تھا۔ وہ لمبے لمبے نیزے ہاتھوں میں لئے دربار صاحب کے دروازے کے سامنے کھڑے تھے۔ ان کی تعداد ڈیڑھ سو سے تو کسی بھی طرح کم نہیں تھی۔ اور وہ سب کے سب کیسری رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ بازار

میں سے گزرتے لوگ انہیں بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ میرے لئے بھی وہ عجوبے سے کم نہیں تھے۔ میرے اردگرد کھڑے لوگوں کی باتوں سے مجھے معلوم ہوا کہ وہ سکھوں کا بازوئے شمشیر زن ہے۔ نہنگوں کا وہ حرفہ سکھ پنتھ کی خاطر لہو بہانے کے لئے تیار کیا گیا ہے اور ہندو ان سے بہت زیادہ خائف ہیں میرے پاس دو لالے کھڑے انہی کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔ وہ ہر لفظ پر انہیں گالی دیتے تھے۔

وہ نہنگ کچھ ہی دیر بعد دربار صاحب کے اندر داخل ہو گئے تو چاروں طرف خموشی سی چھا گئی۔ میں اپنے سامنے سے گزرنے والے ہر چہرے کو نظروں میں ٹٹول رہا تھا مگر آبی مجھے کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ سگریٹ کی طلب نے بھی مجھے پریشان کر رکھا تھا مگر سکھوں کے حلیئے میں وہاں پھرنے کا سب سے بڑا نقصان یہی تھا کہ میں سگریٹ نہیں پی سکتا تھا۔ بلکہ میں نے محسوس کیا کہ دربار صاحب کے اس سارے علاقے میں حقے سگریٹ کی بو بالکل نہیں تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ اس علاقے میں سے گزرتے وقت ہندو بھی سگریٹ سے دستکش ہو جاتا تھا یہ بات تو میں نے اس شہر میں کسی سے سنی تھی کہ سکھوں کا ایک مطالبہ بھارتی حکومت سے یہ بھی ہے کہ امرتسر کی حدود میں حقے اور سگریٹ نوشی کی قطعی ممانعت کر دی جائے۔ مجھے اس مطالبے پر ہنسی آتی تھی مگر اس روز میں اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ لوگ اپنی اس مذہبی پابندی کو بڑی لگن سے نہ صرف خود نبھاتے ہیں بلکہ دوسروں سے بھی توقع رکھتے ہیں کہ وہ اس پر عمل کریں ان کا مذہب پر اتنا گہرا یقین اور عمل میرے لئے باعث حیرت بھی تھا اور باعث عبرت بھی اور یہی وجہ تھی کہ وہ نہنگ وہ اپنے مذہب پر جان وار دینے کا عزم رکھنے والے دیوانے مجھے بہت پسند آئے۔ وہ میری نظروں سے اوجھل ہوئے تو اچانک میری کمر پر کسی نے تھپکی سی دی۔ میں تڑپ کر پیچھے مڑا، تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میرے سامنے ایک ہیجڑا کھڑا تھا، بڑا ہی نٹ کھٹ قسم کا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے تالی بجا کر بولا۔

"ہائے نیں میں واری صدقے جاواں! تسیں کیڈے سوہنے لگدے اوئے سردار جی!"

"بک نئیں اوئے! دفع ہو جا ادھر سے۔ یہ لے اپنے منہ کی کالک۔" میں نے جیب سے دو روپے نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے

"اوئے! تو اگر آج بھی مجھے ادھر نہ ملتا تو میں تیری نسل ختم کروا دیتا۔" اس ہیجڑے نے اچانک اپنی آواز دباتے ہوئے کہا۔

اب جو میں نے غور سے دیکھا تو معلوم یہ ہوا کہ وہ سالا اسلم آبی تھا جو کہیں سے ہیجڑوں کے قافلے میں شامل ہو کر امرتسر آ پہنچا تھا۔ اس سے کوئی دس قدم دور دو بڑی عمر کے ہیجڑے اور بھی کھڑے تھے۔

"یہ کیا پاکھنڈ ہے بھئی! تجھے کس نے ہیجڑا بنا دیا۔" میں نے سرگوشی کے لہجے میں پوچھا۔ آبی نے مجھے حیران کر دیا تھا۔

"بس یہ سب تقدیر کے چکر ہیں پیارے، میرے پیچھے" یہ کہہ کر اس نے بلند آواز سے کہا۔ "میں صدقے جاواں! دو چھیڑاں میرا کیہ دینے گا؟"

"دُر فٹے منہ! چمبڑ ای گیا ایں! ایہہ لے دو روپے ہور۔" میں نے تپے ہوئے لہجے میں گرجتے ہوئے کہا اور دو روپے اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ آبی خالص بازاری چال چلتا ہوا دوسرے کے پاس جا پہنچا اور وہ تینوں "گدا" بجاتے ہوئے دوسری طرف چل دیئے۔ ان کا رخ کرمو ڈیوڑھی کی جانب تھا۔ میں بھی چند لمحے کے توقف کے بعد ان کے پیچھے ہو لیا۔ کوئی تیس قدم آگے نکلنے کے بعد اچانک آبی نے اپنے دونوں ساتھیوں کو ایک رکشے میں سوار کرا دیا۔ لوگ وہاں سے غائب ہوئے تو آبی نے ایک ٹیکسی روکی اور اس پر سوار ہو کر وہ تیزی سے میرے پاس آ ٹھہرا، بولا۔

"آؤ سوہنیو! اندر بیٹھو، کچھ اپنی داسی نوں وی سیوا موقع دیو۔" اس کی آواز میں ایسا کرارا پن تھا کہ وہ سکھ ڈرائیور بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

میں ٹیکسی کی عقبی نشست کے کونے میں دبک کر بیٹھ گیا۔ آبی کی یہ حرکت مجھے قطعاً پسند نہیں آئی تھی۔ آدمی جس صحبت میں بیٹھے ویسا ہی ہو جاتا ہے اور اسے خدا جانے کس وجہ سے یوں زنخہ بننا پڑ رہا تھا۔

آبی نے ٹیکسی کوئی دو میل آگے جا کر ایک پارک کے پاس چھوڑ دی۔ جب وہ ڈرائیور کو فارغ کر چکا تو مجھے وہ گھماتا ہوا ایک صاف ستھرے چائے خانے میں لے گھسا۔ اس کے اندر فیملی کیبن بنے تھے۔ آبی نے بائیں ہاتھ کے کیبن کا دروازہ کھولا اور مجھے ساتھ لے کر اندر جا بیٹھا۔ میں اس کی حرکتیں بڑے غور سے دیکھ رہا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ یہ سب کچھ کیوں کر رہا ہے۔ جب وہ چائے کے لئے کہہ چکا تو بولا۔

"یار! میں پچھلے تین دن سے یہاں خوار ہو رہا ہوں، کہاں تھا تو؟"

"اچھا؟ میں ادھر ایک ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ تمہارا وعدہ آج ہی کے دن کا تھا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ پر پتہ تو کر لیا ہوتا۔"

"وہ تو خیر شکر ہے تم مل گئے ہو۔ مگر تمہیں یہ کیا ہو گیا؟"

آبی معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ بولا "یار! میرے ساتھ دو آدمی اور بھی بارڈر کراس کر آئے تھے۔ ہم امرتسر پہنچے تو پولیس ہمارے پیچھے لگ گئی۔ ان آدمیوں نے مجھے بابے بخشے کے ڈیرے پر پہنچا کر ہیجڑا بنا دیا۔ اگر ہم ہیجڑے نہ بنتے تو سارا شہر میں چلنا پھرنا مشکل ہو جاتا۔"

"لاحول ولا قوۃ! میں سمجھا کسی نے تمہیں غیر جانبدار بنا دیا

تاکہ تو گلی گلی پھر کر پوچھا کرے کہ کس کے گھر مونڈا جا ماریے؟"

"نہیں یار! ایسا بھی اندھیر نہیں مچا ہے ابھی۔ مونچھوں کا البتہ مجھے بہت افسوس ہے۔"

"کوئی بات نہیں! ویسے تو اس حلیے میں بڑا خوبصورت نظر آ رہا ہے۔ ایک دفعہ تو تو دیکھنے والے کا دل پشاوری کر دیتا ہے۔ اب یہ بتا کہ تو نے اتنی مصیبت اٹھائی کس لئے ہے؟"

"اچھا! تو یہ بھی مجھے بتانا پڑے گا۔ یار، کیا ہو گیا ہے تجھے؟ میں تو اس لئے ادھر آیا ہوں کہ اگر تو کسی چکر میں ہے تو تیری کچھ مدد کر سکوں۔"

"مجھے کوئی چکر آ جاتا تو پھر میں تجھے ادھر کیسے نظر آ سکتا تھا پیارے۔ ویسے میں بارڈر کراس کر گیا تھا، دوسری طرف سے۔"

"وہ کس طرح؟ یعنی تو دوبارہ ادھر آیا ہے؟"

"ہاں! آہستہ بولو۔ کوئی سن نہ لے۔" یہ کہہ کر میں نے اسے راوی پار کرنے کا سارا قصہ بتا دیا۔ وہ بہت حیران ہوا بولا۔

"یار! ایسی بھی کوئی اللہ کی بندی رہتی ہے ادھر! جس نے ڈیڑھ لاکھ روپے کی رقم تجھے دوڑ کر لوٹا دی۔ مجھے یقین نہیں آتا۔"

"ہوا یہی ہے آبی! اور یہ بات بڑی حیرت انگیز ہے بہرحال اب ہمیں فوراً لاہور پہنچنا چاہیئے۔"

"یہ بریف کیس وہی ہے؟" آبی کا ذہن ابھی تک اس رقم پر مرکوز تھا۔

"ہاں! اور اس کو میں ساتھ ساتھ لئے پھرتا ہوں۔ کوئی ایسی صورت کر آبی! کہ ہم آج رات واپس جا سکیں۔"

"یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ یہ بارڈر تو شریف لوگوں کے لئے ہے، یا پھر پولیس یا فوج کے لئے، ورنہ تو ہر شے ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر آتی جاتی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"ہاں یار! ہم تو خواہ مخواہ ہی اس میلی کا پتر کو اغوا کر کے بدنام ہوئے۔ یار لوگوں نے بڑے خفیہ راستے کھول رکھے ہیں۔ ہم آج ہی رات واپس چلے جائیں گے۔"

"میں یہی چاہتا ہوں آبی! آسیہ کے بارے میں میں بہت زیادہ پریشان ہوں۔"

"ہاں! وہ تو میں تمہیں بتانا ہی بھول گیا۔ یار! اس کبیر شاہ کے مکان پر ترن تارن میں جس آدمی کی لاش رہ گئی تھی۔ اس کی ایک تصویر میں نے حاصل کر لی تھی۔"

"اچھا پھر؟"

"تمہیں پتہ ہے اس کا، کیا نام تھا اس آدمی کا؟"

"وہ کوئی ہندو تھا۔ اور اس کا نام تھا پرکاش چندر۔"

"ہاں! اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا دماغ بالکل ٹھیک ہے۔" آبی نے بڑے معنی خیز انداز میں کہا۔

"تو تیرا کیا خیال ہے میں پاگل ہو چکا ہوں، ہائیں! یہ کس نے کہا ہے تجھ سے؟"

"کسی نے بھی نہیں!" آبی نے بڑی عیاری سے ایک آنکھ دبا کر کہا۔ "بس ایسے ہی میرا خیال تھا کہ تیرا دماغ سینٹر میں نہیں ہے۔ خیر اب میرا یہ شک بالکل رفع ہو گیا ہے۔ قسم اللہ کی میں تیری دماغی صحت کی 'سالمیت' تصدیق کرتا ہوں۔"

"بک نہیں اوئے! تیرا میں مغز کھول دوں گا ابھی۔ کیا بک رہا تھا تو کہ اس کی تصویر حاصل کی تھی تو نے، اس ہندو کی؟"

"ہاں یار! اور میرے ایک دوست عزیز احمد کے پاس سندھی کے اخبار آتے ہیں اوکاڑہ میں۔ ایک رات میں نے اس کے گھر میں گزاری۔ میں سندھی زبان بہت اچھی طرح پڑھ سکتا ہوں۔ میں نے عزیز احمد کی الماری سے کئی ماہ کے اخبار یونہی جستہ جستہ دیکھے تو ایک اخبار میں مجھے ایک تصویر نظر آئی جو مرے ہوئے پرکاش چندر سے ہوبہو ملتی تھی۔"

"اچھا؟ وہ تصویر پولیس نے چھپوائی ہو گی۔"

"نہیں یار! وہ تصویر کسی نہال چند نے چھپوائی تھی۔ وہ ادھر سکھر میں رہتا ہے۔ اس نے لکھا تھا کہ اس کا بھائی مہیش چند کئی روز سے لاپتہ ہے۔ اس کے بارے میں خبر دینے والے کو ایک ہزار روپے انعام دیا جائے گا۔"

"اچھا وہ تصویر ہے تیرے پاس؟"

"ہاں! مگر یہاں نہیں اسے میں اوکاڑہ ہی چھوڑ آیا تھا عزیز احمد کے پاس۔"

"تو کہنا کیا چاہتا ہے یار؟"

"میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم یہاں سے پاکستان جا کر سیدھے سکھر جائیں گے۔ اور نہال چند سے مل کر پوچھیں گے کہ اس کا بھائی کن لوگوں میں اٹھتا بیٹھتا تھا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر یار اس کا نام تم نے مہیش چند بتایا ہے" میں نے آبی کو یاد دلا دیا۔

"ہاں! یہ بھی ایک اہم سوال ہے۔ عین ممکن ہے اس آدمی نے اپنے بازو پر غلط نام کھدوا رکھا ہو۔ لوگوں کو دھوکا دینے کے لئے یا پھر پولیس نے وہ نام ہی غلط پڑھا ہو۔"

"ہاں! یہ ہو سکتا ہے۔ ہمیں اس نہال چند سے ضرور ملنا چاہیئے اگر ہمیں معلوم ہو جائے کہ وہ مہیش چند ہی ہے جس کی اسے تلاش ہے تو پھر مجھے یقین ہے کہ ہم کبیر شاہ پر حملہ کرنے والوں تک بڑی آسانی سے پہنچ سکیں گے۔"

"ہاں! میں یہی چاہتا ہوں اور مجھے اللہ کے گھر سے پوری

امید ہے کہ اب کی بار ہم اپنی بہن کو مصیبتوں کے منہ سے ضرور نکال لیں گے۔ یار! کیا سوچتی ہوگی وہ! لعنت ہے ہماری زندگی پر بھی!" آبی نے بڑے ہی متاسف لہجے میں کہا۔ اس کی آواز گلوگیر ہو گئی تھی۔

"اس سے تو میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے شرمسار ہو گیا ہوں آبی! اور اب تو وہ بچے کی ماں بننے والی ہوگی اور میں بے غیرت بن کر ابھی تک جی رہا ہوں۔"

"یہ کالک اور بھی ناقابلِ برداشت ہے یار!"

"جس کسی نے بھی یہ حرکت کی تھی وہ... میں اس کا جوڑ جوڑ کھول دوں گا! تر ساتر سا کر ماروں گا میں اس بدمعاش کو" آبی نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"یار تو اپنا یہ حلیہ بدل! ورنہ میں تجھے بہت ماروں گا۔ اٹھ ابھی کسی جگہ سے ولایتی سوٹ خرید لیتے ہیں۔ ریڈی میڈ" میں نے آبی کے چہرے پر چھپے اس میک اپ، اس کے کندھوں پر پھیلے جدید طرز کے بالوں کی وگ پر تبراء پا ہو کر کہا۔ میں اسے اس حلیہ میں برداشت کر ہی نہیں سکتا تھا۔ اور شلوار اس نے ایسی ریشمی پہن رکھی تھی کہ بس دیکھتے رہیئے۔ جب وہ کمر کو خالصتاً زنخوں کے انداز میں بل دے کر چلتا تھا تو مجھے طیش آنے لگتا تھا مگر مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کے اندر ایک اداکار بھی موجود ہے۔ وہ ہر قسم کے کردار ادا کر سکتا تھا۔

چائے خانے کے اس چھوٹے سے کیبن سے اٹھ کر ہم ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر بازار جا پہنچے۔ وہاں سے میں نے اپنے اور آبی کے لئے دو دو ولایتی سوٹ خریدے۔ رقم میں نے خود ادا کی۔ کیونکہ آبی کی جیب آج کل خالی تھی۔ اس کا بٹوا کسی جیب کترے نے دو دن پہلے اڑا لیا تھا۔ اس میں کوئی پندرہ سو روپے رکھ کر وہ گنوا چکا تھا سوٹ کے باقی لوازمات خرید کر میں آبی کو اپنے ہوٹل میں لے گیا۔ جب ہم لباس تبدیل کر چکے تو ایک دوسرے کو دیکھ کر خدا کا شکر بجا لائے کہ ہم ابھی تک اپنی اصل حالت میں موجود تھے — اور ہماری صورتیں شکست و ریخت کا شکار نہیں ہوئی تھی۔ سب سے زیادہ خوشی مجھے یہ تھی کہ آبی کی مردانگی برقرار تھی۔ ورنہ اس کو جس حلیئے میں میں نے اس روز دیکھا تھا۔ اس سے مجھے وحشت ہونے لگی تھی عین ممکن تھا میں اس کا نام پھوپھی کریم بخش رکھ دیتا۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔ آبی کے گال تھپتھپا کر میں نے کہا۔ "اوئے جھانویں شکر کہ تو واقعی خواجہ سرا نہیں بن گیا۔ ورنہ میں تیری دُم کے ساتھ ٹین باندھ دیتا۔"

"یار! میں خود بور ہونے لگا تھا اس حلیے سے، مگر مجبوری ہی ایسی تھی۔ اب تو بس کوئی ٹیکسی پکڑ اور اس میں بیٹھ کر یہاں سے نکل چل۔" آبی نے سکھوں کی طرح اپنی مصنوعی ڈاڑھی پر لمبا رومال باندھتے ہوئے کہا۔ سر پر پگڑی اس نے وگ کے اوپر بہت کس کر پہلے ہی باندھ لی تھی۔ اور موتیئے رنگ کے ٹھنڈے ولایتی تھری پیس سوٹ میں وہ کوئی بہت پڑھا لکھا آدمی نظر آ رہا تھا۔ میں بھی کچھ کم شاندار نہیں لگ رہا تھا۔ دیوار میں لگا قدِ آدم آئینہ ہمارا حوصلہ بڑھاتا جاتا تھا — وہ خوشامد کرتا نظر آ رہا تھا۔

"جانا کس طرف ہے؟"

"کھیم کرن کی طرف جائیں گے — استاد نے مجھے وہی راستہ دکھایا تھا۔"

"ٹھیک ہے۔ اپنی چیزیں سنبھال کر ہم اکٹھے ہی باہر نکلتے ہیں۔"

کچھ ہی دیر بعد ہم ہوٹل کا حساب بے باق کر کے ایک ٹیکسی پر بیٹھ چکے تھے جس کا رُخ کھیم کرن کی طرف تھا۔ آبی نے راستے میں مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کرتا میں اس خاموشی سے تنگ آ گیا تھا کہ ایک جگہ ڈرائیور نے رفع حاجت کے لئے سڑک کے کنارے ٹیکسی روک دی اور کھیت میں جا گھسا۔

"یار یہ کیا مصیبت ہے تو میرا منہ کیوں بند کرتا آ رہا ہے۔ ایسا کیا بلا ہے یہ ڈرائیور!"

"پاگل نہ بن جیلانی! امرتسر کی خفیہ پولیس کے آدھے آدمی ٹیکسی چلاتے ہیں۔ یہ بھی انہی کا رشتہ دار نکلا تو کھیم کرن سے باندھ کر ہمیں واپس لے آئے گا، اس لئے چپ رہنا بہتر ہے۔"

"آج تو میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے آبی بالکل بھی! ہماری چپ اس کے دل میں کئی شبہے پیدا کر سکتی ہے۔"

"ہاں یہ تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اب ہم موسم شوسم کی بات ضرور کرتے چلیں گے۔ یہ بھی ضروری ہے۔" آبی نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا مگر مجھے اطمینان نہیں ہو رہا تھا۔ آبی کے چہرے پر بے یقینی کی بہت سی پرچھائیاں منڈلا رہی تھیں۔ وہ اندر سے پُرسکون نہیں تھا۔ اس کے دل کا اضطراب ٹھہر ٹھہر کر اس کی آنکھوں میں اُبھر آتا تھا۔

"کوئی گڑبڑ کی بات ہے تو مجھے ابھی بتا۔ میں اس کی ہتی گُل کر کے ٹیکسی اپنے قبضے میں لے لیتا ہوں۔"

"یار! تو اس کی کل مروڑ ہی دے۔ مجھے اس سے ڈر آنے لگا ہے یہ ہمیں کسی چکر میں نہ ڈال دیئے۔" آبی نے کھیت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ڈرائیور اونچے سرکنڈے کی باڑھ کے پیچھے بیٹھا تھا۔ اپنے حلیے سے وہ سکھ ہی معلوم ہوتا تھا۔ مگر میں ابھی تک اس گڑبڑ کی اصل کو نہ سمجھ سکا اور آبی کے خدشے اپنی جگہ بڑے محکم تھے۔ کوئی دس منٹ بعد وہ ڈرائیور ٹیکسی میں آ کر بیٹھا تو گاڑی کے سیلف سے الجھنے لگا۔ وہ یوں ظاہر کر رہا تھا جیسے وہ سٹارٹ نہیں ہو رہی ہے۔ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑ کرتا وہ ٹیکسی سے اترا اور اس کے انجن کا پردہ اٹھا کر پُرزوں پر ہاتھ مارنے لگا۔

"دیکھ رہے ہو نا! میرا خیال ہے کہ اس سالے کے پاس کوئی چھوٹا سا وائرلیس ہے۔ وہ اس کی پتلون کے ساتھ بندھا ہے اور اس نے ہمیں شہر سے باہر لا کر اس وائرلیس پر کسی سے ہمارا سودا کر لیا ہے۔" آبی نے میرے قریب ہو کر سرگوشی کی۔

"بات تو کچھ ایسی ہی نظر آتی ہے آبی! مگر اسے مہلت نہیں ملنی چاہیئے۔" میں نے اس ڈرائیور کے رشتے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا عین اس وقت شاں شاں ایسی آواز ہمارے کانوں سے ٹکرائی۔ معلوم یہ ہوا کہ گاڑی کے اگلے پہیئے کی ہوا نکل گئی ہے۔ ڈرائیور تیزی سے نیچے جھکا اور پھر فوراً ہی پیچھے آ کر ڈگی کھولنے لگا۔

"کیا ہوا سردار جی!" آبی نے گاڑی سے باہر نکل کر پوچھا۔

"ادجی ہوا ہی نکل گئی ہے پہیئے سے — اس کے سیلف میں بھی گڑبڑ نظر آتی ہے مجھے۔ آپ کو ذرا رُکنا پڑے گا۔ میں اسے ابھی ٹھیک کر لوں گا۔"

"لائیں میں آپ کا ہاتھ بٹاتا ہوں۔ جیک لگائیں ہمیں بہت جلدی ہے بھائی جی! اور آپ ہیں اپنے ہی چکر میں ڈال رہے ہیں۔" آبی کی یہ بات سنتے ہی میں نے سٹیئرنگ پر قبضہ کر کے چابی گھما دی۔ گاڑی کا سیلف بالکل ٹھیک تھا۔ انجن چلنے لگا۔

ڈرائیور تیزی سے میری طرف لپکا اور بڑے تلخ لہجے میں بولا۔ "گڈی بند کر دیں بھائی جی! کوئی اور "پنڈ" نہ چڑھا دیں میرے لئے۔ میں پہیہ بدل کر ابھی چل دوں گا۔"

اس کی بات سنتے ہی میں نے اس کی آگے بڑھی گردن پر ہاتھ رکھ کر اس کی رگ دبا دی وہ انہی قدموں لڑھک کر دھڑام سے ٹیکسی کے کھلے دروازے میں سے میرے اوپر آ گرا۔

"اُسے پچھلی سیٹ پر ڈال دے یار اس چمرنگ کو۔ پتہ نہیں کس کو یہ ہمارے پیچھے آنے کی دعوت دے آیا ہے؟"

آبی نے اس اکہرے بدن کے ڈرائیور کو اٹھا کر گاڑی کی پچھلی نشست پر ڈال دیا اور پھر اس کی تلاشی لینے کے لئے وہ اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ آبی کا شبہ درست نکلا۔ اس ڈرائیور کے پاس ایک بہت ہی زود حس وائرلیس سیٹ تھا۔ جو اس نے پتلون کی پیٹی کے ساتھ باندھ رکھا تھا۔ اور وہ پیٹی ہی کی صورت میں اس کی کمر سے لپٹا تھا۔ اس کو آبی نے کھول کر الگ کیا اور پھر وہ اس کے بٹن دبانے لگا۔ اس میں تین چھوٹے چھوٹے ناب لگے تھے۔ ایک بٹن دبا تو ہلکی ہلکی آوازیں اُبھرنے لگیں۔ کوئی کہہ رہا تھا۔

"ہیلو ہیلو! کیا بات ہے مورتی؟ ہم نے جیپ روانہ کر دی ہے تم یہاں سے پچیس میل دور ہو۔ بس وہ پہنچ ہی رہے ہوں گے؟"

"جیپ میں کون کون ہے؟" آبی نے دبے لہجے میں پوچھا۔

"سب انسپکٹر مہندر سنگھ اور چار سپاہی ہیں۔" آبی کو جواب ملا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ہاتھ بڑھا کر اس وائرلیس سیٹ کو بند کر دیا۔

"اس کی جیبیں دیکھ آبی! یہ تو واقعی ان کا رشتے دار نکلا۔ ہمیں یہ ٹیکسی چھوڑ دینی چاہیئے۔" آبی نے اس کی جیبوں کی تلاشی لی تو معلوم ہوا کہ اس کا نام کے ایس مورتی ہے۔ وہ امرتسر کی خفیہ پولیس کا اہلکار ہے۔ اس کا عہدہ اس کے شناختی کارڈ پر نہیں لکھا تھا۔ ڈرائیونگ لائسنس اس کے پاس موجود تھا۔ اس میں اس کا نام کیسر سنگھ لکھا تھا۔ اس کی جیب سے باسٹھ روپے بھی آبی نے نکال لئے — اسے پوری طرح صاف کرنے کے بعد آبی نے تیزی سے ٹیکسی میں نیا پہیہ چڑھایا یہ کام اس نے صرف نو منٹ میں مکمل کر لیا۔

وہ ڈگی میں بے ہوا پہیہ بند کر کے میرے پاس آ کر بیٹھا تو میں اس پر بہت خوش تھا۔ میں نے کہا۔ "شاباش آبی! لگتا ہے تیرے استاد نے آٹو ورکشاپ کا سارا علم آخری ہفتے تک بڑی محبت سے تیری طرف منتقل کر دیا تھا۔" یہ کہہ کر میں نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

وہ میری بات کا مفہوم سمجھ کر جھنجھلا سا گیا بولا۔ "بکواس نہ کر اوئے! ایسے کئی استاد میں نے ٹانگ کے نیچے سے گزار دیئے۔ تیری طرح میں گدھے نہیں ہانکتا رہا۔ گاڑیاں میرے آگے پیچھے پھرتی رہی ہیں۔"

"تو ٹریفک پولیس میں کام کرتا رہا ہے۔" میں نے ایک چٹکی اور بھری۔

"یار! تجھے مذاق سوجھ رہا ہے اور وہ لوگ جیپ لے کر چڑھے آ رہے ہیں — کسی طرف نکل چل۔"

"کھیم کرن کا راستہ تو مجھے نہیں معلوم۔"

"مجھے بھی اندھا ہی سمجھ۔ پر اس کی رفتار تو بڑھا۔ اور دیکھ' دائیں بائیں جو بھی سڑک کچی پکی تجھے نظر آئے اس پر چڑھ جانا۔"

"یار! تو واقعی ہیجڑا ہو چکا ہے۔ اُن کی صحبت تجھے لے ڈوبی۔ دو ہی دن میں وہ تجھے اپنے رنگ میں رنگ گئے۔"

"کیا مطلب؟ تو آخر چاہتا کیا ہے۔ ہم دونوں قید ہو جائیں یہاں؟ ہمیں کسی جھگڑے میں پڑے بغیر آج رات اوکاڑہ پہنچ جانا چاہیئے۔"

"میں بھی تو یہی چاہتا ہوں۔ مگر یوں ہاتھ پاؤں پھلانے سے کچھ نہ ہوگا۔ تو بس میرا یہ اٹیچی کیس سنبھال رکھ۔ باقی سب کچھ میں خود دیکھ لوں گا۔"

"جیلانی! تو ہے آدمی بے تدبیرا۔ گاڑی یہاں روک کر اس مورتی کو سڑک پر ڈال دے۔"

"اس سے کیا ہوگا؟"

"ہو گا یہ کہ وہ جیپ والے کوئی آدھ گھنٹے تک اس پر یہاں بیٹھ کر ماتم تو کریں گے۔ پھر وہ سوچیں گے کہ آگے کیا کرنا ہے ہمیں کچھ اور مہلت مل سکتی ہے۔"

"ہاں! تو ٹھیک کہتا ہے آبی! اس کا مطلب یہ ہے کہ ابھی تیرا دماغ کام کر رہا ہے۔" میں نے اس کا ایک فقرہ اسے لوٹاتے ہوئے گاڑی روک دی۔ آبی نے تیزی سے مورتی کو پچھلی نشست پر سے کھینچ کر باہر نکالا اور اسے کندھے پر ڈال کر ـــــ سڑک کے کنارے ایک درخت کی گھنی چھاؤں تلے ڈال دیا۔ پھر اس نے بڑے ہی مضحکہ خیز انداز سے اس کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑے اور تیزی سے پلٹ کر گاڑی میں آبیٹھا۔ بولا "چل بھئی اب بھاگ لے یہاں سے اب تو چاہے تو سگریٹ بھی پی سکتا ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے دو سگریٹ سلگائے اور ایک میری طرف بڑھاتے ہوئے کہنے لگا۔ "ہمیں یہ گاڑی بھی اب چھوڑ دینی ہو گی۔ اس پر ہم زیادہ دیر بھروسہ نہیں کر سکتے۔"

"یہی میں سوچ رہا تھا آبی! آگے بھی تو وہ کسی پولیس چوکی کو خبردار کر سکتے ہیں۔" آبی نے گاڑی کا ڈیش بورڈ کھول دیا۔ اس میں مورتی کی کئی ذاتی چیزیں پڑی تھیں۔ گھڑی تھی۔ ایک قلم تھا ایک رومال پلاسٹک کے ایک لفافے میں بھنے ہوئے چنے۔ گاڑی کی رجسٹریشن بک بھی وہیں دھری تھی۔ آبی نے وہ کھول کر دیکھی تو اس میں سے مشرقی پنجاب کے تمام سرحدی اضلاع کا ایک مفصل نقشہ مل گیا۔ وہ نقشہ ہمیں اس گھڑی نعمتِ غیر مترقبہ نظر آیا۔ آبی کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی، بولا۔ "اسے کہتے ہیں تائیدِ ایزدی۔ خدا کو یہ منظور نہیں ہے کہ ہم بارڈر کے اِدھر ذلیل و خوار ہوتے پھریں۔ ذرا اس میں دیکھ، کھیم کرن کو راستہ کدھر سے جاتا ہے۔ تو تو پولیس میں رہ چکا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے نقشہ میرے سامنے پھیلا دیا۔ میں نے گاڑی روک کر اس پر نظریں جما دیں۔ کھیم کرن کا راستہ بہت واضح تھا مگر وہ پرندے کی پرواز ایسا نہیں تھا۔ سڑک پر سے اکا دکا گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ ان میں بسیں بھی شامل تھیں اور ٹرک بھی۔ کبھی کبھار کوئی کار بھی نظر آجاتی تھی، مگر بہت کم کم۔ میں نے راستے کا اندازہ کر کے نقشہ تہہ کر کے اپنی جیب میں ڈالا اور گاڑی سٹارٹ کر دی۔

"کیا ارادے ہیں اب؟"

"ہمارے لئے دُہری مصیبت ہے آبی! اس مورتی نے ہمارا حلیہ بھی اپنے لوگوں کو بتا دیا ہو گا۔ انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ ہم کھیم کرن جا رہے ہیں۔ ٹیکسی کا نمبر بھی انہیں یاد ہے۔ میرا خیال ہے ہم کسی مناسب جگہ پر اس ٹیکسی کو چھوڑ دیتے ہیں۔"

"میں تو کتنی دیر سے یہی بکواس کر رہا ہوں مگر تم سمجھ ہی نہیں رہے ہو۔"

"اب میں یہی کرتا ہوں۔ تم ایک سگریٹ اور سلگاؤ۔ اگر سکھو... کبھی اپنا الگ ملک بنا لیا نا، تو یاد رکھنا کہ ایک دوسرے کو کرپانیں گھونپ... پھریں گے۔"

"وہ کیوں؟ پاگل تھوڑی ہیں۔ بڑے تیز لوگ ہیں یہ، ہر... میں ماہر ہیں۔"

"ابے جہاں حقے تمباکو کی بھی پابندی ہو وہ جگہ بھی کوئی رہنے... قابل ہوتی ہے۔ وہاں کے لوگ جلدی پاگل ہو جاتے ہیں۔"

"ہاں یار! تو ٹھیک کہتا ہے۔ ان کے ساتھ بھی یہی ہو گا۔ عورتیں... کے ہاں ویسے ہی کم پیدا ہوتی ہیں۔ شراب یہ زیادہ کشید کرتے ہیں اور... سگریٹ منع۔ لعنت بھیج ان پر۔ وہ کیا کہہ گیا ہے ہمارا کوئی ملنگ/

بھنگ سبز رنگ کہ دل تنگ نہ باشد

آں ملک بیاباں در آں بھنگ نہ باشد"

"یہ سچ کہا ہے کسی نے! آبی تجھے ایسی ایسی اچھی باتیں ایسے... بُرے وقتوں میں کیسے یاد آجاتی ہیں؟ کیا نام تھا تیرے استاد کا؟" میں... نے اس کے سلگائے ہوئے دوسرے سگریٹ کا گہرا کش لیتے ہوئے کہا۔

"وہ آٹھ درکشائی استاد؟ اس کا پوچھ رہا ہے نا تُو؟"

"چل دفع کر۔ دیکھ میں یہ درختوں کی اوٹ میں لے جا کر یہ گاڑ... چھوڑ دیتا ہوں۔"

"ہاں! یہ بہتر رہے گا۔ موڑ دے اس طرف لے۔"

کچھ ہی دیر بعد میں نے گاڑی درختوں کی آڑ میں لے جا کر چھوڑ... اور اپنی تمام چیزیں سنبھال کر ہم وہاں سے چل کر سڑک پر جا ٹھہرے۔ کچھ... دیر بعد ہمیں ایک بس مل گئی۔ وہ فیروز پور جا رہی تھی۔ ہم اس میں سوار ہو... آگے چل دیئے۔ فیروز پور پہنچ کر ہم نے ایک ٹیکسی کرائے پر لی اور شام... سات بجے کے قریب ہم کھیم کرن جا پہنچے۔ مگر آبی نے اس قصبے کے... جانے کے بجائے ٹیکسی کا رُخ ایک گاؤں کی طرف موڑ دیا۔ اس گاؤں... پتہ اس نے دو راہگیروں سے پوچھا تھا۔ اس گاؤں کا نام مستم... اچھی طرح یاد ہے۔ کھیم کرن سے وہ کوئی چھ سات میل دُور تھا۔ جب... وہاں پہنچے عشا کا وقت گزر چکا تھا۔ آبی نے ڈرائیور کو کرائے کے علا... بیس روپے انعام کے طور پر بھی تھما دیئے۔ وہ بیچارا دعائیں دیتا ہوا... ہو گیا۔ گاؤں کے گرد اونچے اونچے درختوں نے گھیر ڈال رکھا تھا... سب کے سب درخت آم اور شہتوت کے تھے۔ جن سے گاؤں... لوگ پھل اور سایہ دونوں کام لیتے تھے۔

آبی نے گاؤں میں داخل ہوتے ہی ایک آدمی سے تیج رام... گھر کا پتہ پوچھا۔ وہ ستم ظریف ایسا مسافر نواز تھا کہ ہمیں تیج رام کے... تک پہنچانے کے لئے ہمارے ساتھ ہی چل دیا۔ عاجزی اور انکساری... کوئی بے مثال نمونہ تھا وہ آدمی۔ وہ کوئی دو سو قدم ہمارے ساتھ چلا... مگر میں آج تک اس کی زبان کی مٹھاس اور اس کے لہجے کی فروتنی...

بھول سکا ہوں۔ وہ بس ہمارے قدموں میں بچھا جاتا تھا۔ اپنی باتوں سے اس نے ہمیں موہ لیا تھا۔ بات بات پر وہ ہمیں سرکار، حجور، مہاراج، سردار جیب اور خدا جانے کیا کچھ نہیں کہہ رہا تھا۔ وہ ہمیں بتا رہا تھا کہ تیج رام ان کے گاؤں کا ساہوکار ہے۔ بڑا کاروبار ہے اس کا۔ علاقے کے سات گاؤں کی ہر فصل وہ خرید لیتا ہے، پوری کی پوری ـــ خواہ گندم ہو، خواہ کپاس۔ کسانوں کو وہ سرکاری شرح کے مطابق رقم ادا کرتا ہے۔ اس میں اسے کئی بار نقصان بھی ہو جاتا ہے۔ مگر وہ پرواہ نہیں کرتا۔ گاؤں کی کئی بیواؤں کا خرچ اس نے اٹھا رکھا ہے۔ ایک سکول اس نے وہاں قائم کیا۔ اب اس نے وہاں ریشم کے کیڑے پالنے کا کام بھی شروع کر دیا ہے۔ اس کی وجہ سے تو اس علاقے میں امن سا بستا ہے۔ وہ آدمی جس کا نام گردھاری لال تھا، ہمیں یہی بتا رہا تھا۔

جب وہ شخص ہمیں تیج رام کے دروازے پر لے کر پہنچا تو بولا۔

"مہاراج! اِدھر اس حویلی میں میری جیا جنت بند ہے۔ میری سہائیتا کریں حجور! میری استری مجھے واپس دلا دیں۔" وہ رونے لگا تھا۔

"کیا؟ یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟ تمہاری استری کو کیا ہوا؟ اِدھر کس نے بند کیا ہے اسے؟" میں نے گردھاری لال کو اندھیرے میں بازو سے پکڑ کر تیج رام کے دروازے سے دور لے جا کر پوچھا۔

"حجور! کیا عرج کروں! بہن کی شادی پہ میں نے لالہ تیج رام سے پانچ ہجار روپے قرج لئے تھے، بس وہ اتار نہ سکا۔ اور اب میری استری کملا دیوی کو لالہ جی نے اپنی سیوا میں رکھ لیا ہے۔ وہ اصل بھی ادا کر رہی ہے اور بیاج بھی، دو سال ہو گئے مہاراج ـــــــ پر سرکار! وہ میری کملا دیوی کو واپس نہیں آنے دیتے۔ کہتے ہیں ابھی ڈھائی ہجار ہی وصول ہوا ہے۔"

"اوئے بیڑہ غرق! ایسا کتے کا پُتر ہے یہ لالہ۔ یار یہ کیسی دنیا ہے حد ہو گئی۔" آبی تلملا اٹھا۔

"دیکھ گردھاری لال! تو ابھی ایک گھنٹے بعد اِدھر آجا اور ہمارے سامنے ہمیں مخاطب کئے بغیر لالہ سے کہنا کہ وہ تمہاری کملا دیوی تمہیں لوٹا دے۔ وہ روپیہ مانگے گا تو ہم چپکے سے تین ہزار تیرے ہاتھ پر رکھ دیں گے۔"

"بھگوان آپ کا بھلا کرے مہاراج! واہگورو آپ کا جھنڈا اونچا رکھے۔ میں آجاؤں گا حجور، میں ایک گھنٹے بعد آجاؤں گا۔" اس نے ہمارے آگے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ چاند بہت اُوپر آگیا تھا۔ کئی میلے آنسو وہ ہمیں گردھاری لال کے رخساروں پر بہتے دکھا گیا۔

"ٹھیک ہے اب تم جاؤ۔ یہ رات ہم اِدھر گزاریں گے۔" آبی نے اسے دلاسہ دے کر وہاں سے رخصت کر دیا۔ ہم اب کی بار ایک نئے اور بڑے ہی خوفناک ارادے سے تیج رام کے دروازے پر جا پہنچے۔ تیسری دستک پر کسی نے دروازہ کھول دیا۔ وہ کوئی کالا بھجنگ سا ادھیڑ عمر آدمی تھا جس نے ہاتھ میں لالٹین اٹھا رکھی تھی۔

"لالہ جی گھر پہ ہیں؟ ان سے کہو امرتسر سے پریتم سنگھ کا بھائی آتما سنگھ آیا ہے۔" آبی نے بڑے دبنگ لہجے میں کہا۔

"اچھا سرکار! میں لالہ جی کو بتا دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ دروازہ بھیڑ کر پیچھے مڑ گیا۔

"یہ تم آتما سنگھ کب سے ہو گئے ہو؟"

"وہ جو میرے ساتھ دو بہروپئے تھے نا۔ ان میں سے ایک کا نام پریتم سنگھ تھا۔ یہ سب گُر مجھے اس نے ہی سکھائے تھے۔ تم اپنا نام جو پسند کرو، اسے بتا دو۔"

"میرا نام شیر سنگھ ہے۔"

"گیدڑ سنگھ نہیں! ہمیشہ اونچی جگہ ہاتھ مارتے ہو۔ کوئی شیری دلیری دکھاؤ تو مانوں۔" آبی نے دبے لہجے میں کہا۔ وہ خوشگوار موڈ میں تھا۔

"دکھاؤں کچھ دلیری!" میں نے اس کی گردن پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ اس نے تیزی سے ہاتھ جوڑ دیئے۔

"نہیں یار! ابھی تو معاف ہی کر۔ تو تو منکا ہی توڑ دے گا میرا۔" اتنے میں دروازہ پھر کھلا۔ وہ آدمی لالٹین ہمارے چہروں تک اونچی لا کر بولا "آجائیں سرکار! لالہ جی نے کہا ہے کہ میں آپ کو اندر لے آؤں۔"

ہم اس آدمی کے پیچھے دروازے میں داخل ہو گئے۔ سامنے ایک چھوٹی سی ڈیوڑھی تھی جس کے دائیں بائیں کوئی ڈھائی فٹ اونچے چبوترے سے بنے تھے۔ گزرنے کا راستہ دہلیز کے متوازی تھا۔ ڈیوڑھی سے گزر کر ہم صحن میں پہنچے تو دائیں ہاتھ چار پانچ چارپائیاں بچھی تھیں۔ ان کے پاس ہی میز پر ایک بڑی سی لالٹین دھری تھی۔ تیج رام کے ملازم نے ہمیں ان چارپائیوں پر بٹھا دیا بولا۔ "ادھر بیٹھیں سرکار! لالہ جی ابھی آتے ہیں۔"

صحن کے وسط میں ایک دیوار کھینچی تھی اور لالہ جی کی رہائش دراصل اس دیوار کی دوسری طرف تھی۔ کچی دیوار پر کوئی گھنی سبز بیل چڑھی بیٹھی تھی۔ جس نے اسے کم و بیش نیچے سے اوپر تک ڈھانپ رکھا تھا۔

"یار! تو اس لالے کے پاس کس لئے آبیٹھا ہے؟ یہ پیر تجھے "منڈا" نہیں دے سکتا۔" میں نے صورتِ حال کے سارے پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"میری اطلاع غلط نہیں ہو سکتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ مجھے لانے والا بھی اسی راستے سے لایا تھا۔ اسے میں نے بارڈر پار کرانے کے لئے دس ہزار روپے دیئے تھے۔"

"تو جاگ رہا ہے نا ویسے! ابے یہ خیال کی باتیں تو مجھے کیوں

بتا رہا ہے اور وہ دس ہزار کس کو دیئے تھے تو نے ؟"

"وہ اُدھر اپنی طرف بھی ایسا ہی ایک گاؤں ہے۔ مجھے وہاں میرا دوست تاہیا لے گیا تھا۔ اس گاؤں کا نام فرید پور ہے۔ وہاں حاکم علی نام کے ایک آدمی نے مجھ سے دس ہزار روپے لئے اور اپنے گھر سُلا دیا۔ بولا: میرے بادشاہ! بے فکر ہو جاؤ۔ صبح تم انڈیا میں ہو گے۔ میں اور تاہیا وہاں سو گئے۔ صبح جب میں اٹھا تو میں اس پریتم سنگھ اور اس کے ساتھی ارجن داس کے ساتھ ایک سڑک کے کنارے گھاس پر لیٹا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ سڑک فیروزپور جاتی ہے۔ انہی کے ساتھ میں ایک بس میں بیٹھ کر پہلے فیروزپور پہنچا اور وہاں سے امرتسر چلا گیا۔ مجھے خود نہیں معلوم کہ میں راتوں رات انڈیا کس راستے سے پہنچا ؟"

"کمال کرتے ہو یار! تجھے بھنگ تو نہیں پلا دی تھی اُس حاکم علی نے ؟"

"بات کچھ ایسی ہی ہوئی ہے۔ شک مجھے بھی یہی ہے جیلانی! مجھے انہوں نے کوئی شے دُودھ میں ڈال کر پلا دی اور میں سو گیا۔ پھر مجھے نہیں معلوم کہ میرے ساتھ کیا ہوا ؟"

"اس پریتم سنگھ سے پوچھا ہوتا۔"

"وہ سالے کچھ نہیں بتا رہے تھے۔ دراصل انہیں بھی بیچ کی بات کا کچھ علم نہیں تھا۔ دس دس ہزار وہ بھی دے آئے تھے۔"

"اچھا؟ یہ تو عجیب قصّہ سنا رہا ہے مجھے۔ ذرا سنبھل کے رہ۔ یہاں، رقم بہت تگڑی ہے ہمارے پاس۔"

"مجھے بھی اسی رقم کی فکر لگی ہے۔ وہ تو دوبئی کے دینے سے زیادہ بڑی رقم لے گیا وہ سالا حاکم علی مجھ سے۔ البتہ جب میں یہاں ہوش میں آیا تو میری جیب میں وہ دو ہزار روپیہ موجود تھا۔ جو بھارتی کرنسی کی صورت میں حاکم علی نے مجھے دیا تھا۔ وہ رقم تاہیئے نے بدلوا کر دی تھی مجھے اخراجات کے لئے۔"

ابھی وہ یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ ایک آدمی تنگ چوڑی دار سفید پاجامہ اور سفید ململ کا کُرتہ پہنے ہماری طرف آیا۔ وہ بڑے ہی گٹھے ہوئے بدن کا مالک تھا۔ عمر اس کی یہی کوئی پینتیس چالیس کے لگ بھگ ہو گی۔ رنگ اس کا سانولا سا تھا اور سر کے بال اس نے پہلوانوں کی طرح گھوٹ کر مُنڈوا رکھے تھے۔

"ست سری اکال سردار صاحب! جی آیاں نوں!"

"ست سری اکال، لالہ جی! میرا نام آتما سنگھ ہے اور یہ میرے دوست ہیں شیر سنگھ۔"

"جی آیاں نوں۔ جی آیاں نوں!" یہ کہہ کر اس نے چارپائی پر چھلانگ لگا دی۔ میں تو سمجھا کہ وہ کھاٹ ٹوٹ گئی ہو گئی مگر وہ اس کا بوجھ برداشت کر گئی۔

"کیسے آنا ہوا سردار صاحب! کیا سیوا کروں میں آ...
اس نے ہم دونوں کے چہروں کا بغور جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"ہم دراصل پاکستان جانا چاہتے ہیں لالہ جی! پریتم سنگھ مجھے آپ سے ملنے کا مشورہ دیا تھا۔" آبی نے کہا۔

"اُدھر کیوں جائیں گے؟ کیا کام ہے وہاں آپ کا..."

"بس ایسے ہی ایک کاروباری معاملہ ہے۔ پہلے ہم اُدھر... بابا نانک کے راستے جاتے تھے۔ پر اب اُدھر فوج نے پہرہ... سخت کر دیا ہے۔ اس لئے آپ کے پاس آئے ہیں۔"

"پریتم سنگھ نے بارڈر کا ریٹ بھی بتایا ہو گا آپ..."

"نہیں! اس نے تو ہمیں کچھ نہیں بتایا۔ بہرحال آپ... ہم حاضر ہیں۔"

"دس اور دس، بیس ہزار روپے لگتے ہیں سردار جی! ...سے اُدھر کرنے کے ــــ رقم دے دو تو میں یہ سیوا کر دوں گا۔"

"دس دس ہزار! ہمیں منظور ہے لالہ جی، مگر صبح تک ہم پاکستان پہنچ جانا چاہئے۔"

"اس کی تو فکر نہ کریں سردار جی! کام ہم پکّا کرتے ہیں... کو ہمارے آدمی کے ساتھ یہ رات رام تلائی میں گزارنی ہو گی... کے لئے سونے کا انتظام وہیں ہو گا۔ رات کو تین بجے ہمارا آدمی... کو بارڈر پار کرا دے گا۔" تیج رام کے کھرے سچے لہجے میں... پریتم سنگھ کا نام سن کر اس کے سارے شکوک رفع ہو گئے... ہم پر مکمل اعتماد کرنے لگا تھا۔

"ہمیں منظور ہے لالہ جی! رقم ابھی دے دیں کہ آپ... آدمی لے گا؟"

"نہیں رقم تو آپ مجھے دے دیں۔ باقی کام ہمارا ہے... کر دے گا۔ یہ گوئیاں!" لالہ جی نے اپنے اس کالے بھجنگ آ... طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ جو اسی وقت گھر کے اندر سے باہر آیا تھا۔

میں نے آبی کے اشارے پر اپنا بریف کیس کھولا اور... کے بھارتی نوٹ گن کر لالہ تیج رام کے حوالے کر دیئے۔

وہ رقم ہاتھ میں لے کر خوش ہو گیا، بولا "بس اب... بے فکر ہو جائیں۔ جل بھوجن کر لیں تو پھر ہمارا آدمی آپ... لے جائے گا۔ کیوں اوئے گوئیاں! ان کی سیوا کرے گا تو سچا..."

"میں حاضر ہوں سرکار۔" گوئیاں نے سینے پر ہاتھ ر...

"اس کو بھی سو سو روپیہ فی آدمی کے حساب سے د... اس کو بھی بڑی محنت کرنی پڑتی ہے۔"

میں نے دو سو روپیہ نکال کر گوئیاں کے ہاتھ پر...

"اور کچھ؟" آبی نے پوچھا۔

"جی نہیں! بس ایک رازداری ہمارا سب سے بڑا مسئلہ ہے اور مجھے پکا وشواش ہے کہ پریتم سنگھ نے آپ کو ساری بات سمجھا دی ہو گی۔"

"جی ہاں! اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔ بس ایک رقم کا ذکر اس نے نہیں کیا اور شکر ہے کہ رقم ہمارے پاس موجود ہے۔ ورنہ بہت پریشان ہونا پڑتا۔"

"پریتم سنگھ کی ایک بڑی رقم میرے پاس پڑی ہے۔ ہو سکتا ہے وہ اس کی وجہ سے آپ کو اس بارے میں کچھ نہ بتا سکا ہو۔ بہرحال آپ اب بے فکر ہو جائیں۔ جا اوئے گوئیاں! ان کے لئے بھوجن لے آ۔"

"اچھا لالہ جی! میں ابھی جاتا ہوں۔" یہ کہہ کر گوئیاں صحن کی دسطی دیوار میں لگے دروازے کی طرف بڑھا تو اچانک باہر کسی نے زوردار طریقے سے بڑا دروازہ کھٹکھٹایا۔

گوئیاں تیزی سے اُدھر لپکا۔ جب وہ تین چار منٹ بعد لوٹا تو بولا "لالہ جی!... وہ... گردھاری لال آیا ہے کہتا ہے آپ سے مل کر ہی جاؤں گا۔"

"اچھا! مجھ سے کیا کام ہے اُسے؟ بلا اندر اسے ڈیوڑھی میں، بات کرتا ہوں میں اس سے۔" یہ کہہ کر تیج رام اچھل کر چارپائی سے اترا اور رقم کرتے کی جیب میں ٹھونس کر ڈیوڑھی کی طرف لپکا۔

اس عرصے میں گوئیاں گردھاری لال کو ڈیوڑھی میں لا چکا تھا۔ گردھاری وہاں رکنے کے بجائے سیدھا صحن میں نکل آیا اور تیج رام کو سامنے دیکھ کر بولا "لالہ جی! میری دھرم پتنی پر کب تک ظلم کرو گے، اسے واپس کر دو۔ اسے کب تک باندی بنا کر رکھو گے۔"

"بکواس نہ کر گردھاری! تو پھر زیادہ پی آیا ہے اسے باہر نکال دے گوئیاں دھکے مار کر۔ اور صبح تھانیدار جسونت سنگھ سے کہہ کر وہ ذرا اس کا دوبارہ مکو ٹھپ دے۔" یہ کہہ کر تیج رام ہماری طرف لوٹنے لگا تو گردھاری لال ہاتھ جوڑتا ہوا ہماری طرف لپکا بولا "میری سہائتا کرو مہاراج! انیائے ہو رہا ہے۔ میری دھرم پتنی کو لالہ جی نے گروی رکھا ہوا ہے۔"

"کیا بات ہے بھائی جی! کچھ ہمیں بھی بتاؤ۔ یہ کون آدمی ہے لالہ جی! یہ تو بڑا ہی دُکھی منش نظر آتا ہے ہمیں۔" آبی نے گردھاری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ایسے ہی پاگل ہو رہا ہے یہ سالا۔ اس نے ہم سے پانچ سال پہلے پانچ ہزار روپے قرض لیے تھے۔ پرونوٹ میں یہ بات اس نے لکھ دی تھی کہ اگر تین سال کے اندر یہ رقم نہ دے سکا تو پھر ہمارے گھر میں سیوا کے لیے یہ اپنی پتنی کو پانچ سال کے لیے بھیج دیگا سو اس کی پتنی ہمارے گھر میں کام کرتی ہے۔ اب تک وہ ڈھائی ہزار کا کام کر چکی ہے۔ باقی ڈھائی ہزار کی وہ سیوا کر دے گی تو ہم اسے واپس کر دیں گے۔ یہ رسم تو ہمارے پُرکھوں سے چلی آ رہی ہے اور یہ سالا شور مچاتا رہتا ہے۔"

"یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں لالہ جی! پتہ ہے آپ کو یہ کونسی صدی ہے؟"

"دفع کریں جی! اس قصّے پر مٹی ڈالیں۔ گوئیاں نکال دے اس گردھاری کو۔ مار جوتے اس کے سر میں۔" یہ کہہ کر تیج رام حویلی کے اندر کی طرف جانے لگا تو میں نے رقم نکال کر آبی کو دے دی۔ وہ اُٹھ کر گردھاری کے پاس جا پہنچا۔ رقم گردھاری کی ہتھیلی سے لگی ہی تھی کہ اس کے لہجے میں بلا کا عزم جھلکنے لگا۔ وہ چیخ کر بولے "اوئے لالے! یہ لے اپنے منہ کی کالک یہ تین ہزار روپیہ اور کملا دیوی کو ابھی اور اسی وقت باہر لے آ سُن رہا ہے تو کہ نہیں؟"

تیج رام وہیں رُک گیا۔ وہ حیران رہ گیا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ آ سکتی تھی کہ ہم نے وہ رقم اسے مہیا کی ہے، بے یقینی کے سے انداز میں بولا "رقم تیرے پاس کہاں سے آئی بدمعاش! تو اتنا ہی غیرت مند ہوتا تو اتنے سال نہ گزر سکتے تھے۔ دیکھ گوئیاں اس کے پاس کیا ہے؟" یہ کہہ کر تیج رام چارپائی پر بیٹھ گیا۔ گوئیاں نے گردھاری کے ہاتھ سے لے کر رقم گنی اور بولا "یہ تین ہزار روپے ہیں لالہ جی!"

"ٹھیک ہے جاؤ کملا کو دوسرے دروازے سے نکال کر اس کے حوالے کر دو۔ لے جاؤ اسے اپنے ساتھ۔"

گوئیاں اس آدمی کو ساتھ لے کر مکان کے اندر چلا گیا۔ وہ دروازے میں غائب ہوا تو تیج رام بھی اس کے پیچھے لپکا۔ اب ہم دونوں وہاں تنہا رہ گئے تھے۔ آبی بھی حیران ہو رہا تھا اور میں بھی۔ ہم دونوں پاگلوں کی طرح ایک دوسرے کو یوں تک رہے تھے جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں۔ آبی سر کو جھٹکا دے کر بڑے ہی حسرت بھرے لہجے میں بولا "یار ایسے ایسے چکرات بھی اس دنیا میں چلتے رہتے ہیں، اللہ معافی دے۔"

"ہاں بچے! مفلسی بہت بڑی لعنت ہے۔ کھکھ آدمی کو تو خربوزے کے عوض خرید سکتا ہے۔ تو مار دھاڑ پر کیسے اتر آیا تھا، کبھی سوچا ہے تم نے کہ مجھے اس حال کو کس نے پہنچایا ہے۔ مجھ سے میری بہن کے بر کی قیمت کس نے مانگی تھی۔ ہمارے تایا جی نے جہیز میں ایک لاکھ روپیہ نقد مانگا تھا ہم سے۔ بس میں اسی دن مٹنے سے اُکھڑ گیا تھا۔ یہ کملا دیوی تو تو نے صرف تین ہزار میں چھڑا دی ہے۔"

"اس سے لالے کا دل بھر چکا ہو گا۔ ورنہ وہ اتنی جلدی اُسے داگزار نہ کرتا۔" آبی نے کہا۔ وہ ابھی تک کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد گوئیاں واپس آ گیا۔ وہ ہمارے لیے ایک

بڑے سے تھال میں رکھ کر کھانا لے آیا تھا۔ اس میں تین قسم کی سبزیاں تھیں۔ بیسن کی پھلکیاں الگ تھیں اور گندم کی الگ۔ سبز مرچ، کھیرا اور کئی قسم کی چٹنیاں بھی تھال میں رکھی تھیں۔ آم اور لیموں کا اچار بھی گوئیاں ساتھ رکھ لایا تھا۔ وہ سب کچھ بڑے قرینے سلیقے سے پکایا گیا تھا جس سے پتہ چلتا تھا کہ لالہ تیج رام کے گھر کی اندرونی حالت بہت مستحکم ہے اور وہاں کوئی ایسی افراتفری، اور ابتری نہیں ہے۔"

"یہ سب کچھ کس نے پکایا ہے گوئیاں؟"

"لالہ جی کی ایک نوکرانی ہے جسونتی۔ رسوئی خانے کا کام وہی کرتی ہے۔"

"اس نے کمال کر دیا ہے گوئیاں کیا خوب پکاتی ہے وہ۔"

آبی نے ہر شے کو باری باری چکھتے ہوئے کہا۔ ہم دونوں کو بھوک نے نڈھال کر رکھا تھا۔ وہ کھانا ہم نے خوب پیٹ بھر کر کھایا۔ پہلی بار مجھے یہ احساس ہوا کہ اگر ڈھنگ سے کھانا پکایا جائے تو ضروری نہیں کہ ہر دسترخوان پر گوشت موجود ہو۔ اس کے بغیر بھی کام و دہن کی تواضع ہو سکتی ہے۔

جب ہم کھانا کھا چکے اور گوئیاں برتن اندر پہنچا کر واپس آیا تو بولا "اب آپ چلو مہاراج میں آپ کو رام تلائی پہنچا دوں۔ دو گھڑی آرام کریں تو پھر پچھلے پہر آپ کو ہم منزل پر پہنچا دیں گے۔"

"لالہ جی سے ملاقات نہیں ہو سکے گی اب؟"

"نہیں وہ تو اب بستر پر لیٹ گئے ہیں۔ آپ فکر نہ کریں چلیں میرے ساتھ۔"

ہم اپنے آپ کو سنبھالتے سمیٹتے ہوئے وہاں سے اٹھے۔ اور گوئیاں کے ساتھ تیج رام کے گھر سے نکل کر کھیتوں کی طرف چل دیے۔ رام تلائی مغربی سمت میں کسی جگہ کا نام تھا۔

آبی نے دبی زبان میں پوچھا "تیرا وہ چُپ شاہ ہے نا تیرے پاس؟"

"ہاں! اس کی فکر نہ کر۔ وہ میرے پاس ہے، اُدھر جگت سنگھ کے ہاں بہت کام لیا میں نے اس سے۔"

گوئیاں ہمارے آگے آگے چل رہا تھا۔ آبی میرے جواب سے مطمئن ہو کر بولا "یار گوئیاں! تو کسی توپ میں رکھ کر اُدھر پہنچائے گا۔ ایسا کون سا گُر ہے تیرے پاس؟ آدمی کو مکھی تو نہیں بنا دیتا تو؟"

گوئیاں آبی کی یہ بات سن کر ہنسا، بولا "یہ بات نہیں ہے مہاراج! یہ بارڈر کی لکیر ایسی چلی ہے کہ رام تلائی جو دراصل ایک چھوٹا سا مندر ہے بارڈر سے بس صرف آدھ میل ادھر رہ گیا ہے۔ اس مندر کے ساتھ ایک مسافر خانہ بنا ہوا ہے۔ یاتری لوگ دُور دُور سے یہاں آتے ہیں کیونکہ مندر کے ساتھ جو تلاؤ ہے نا اس میں نہانے سے پرانی سے پرانی داد، چنبل، خارش دُور ہو جاتی ہے۔ [illegible] کا پانی ایک اونچے حوض میں بھر کر یاتری سامنے بنے غسل خانوں میں ٹونٹی کے نیچے بیٹھ کر نہاتے ہیں۔"

"مگر یہ میری بات کا جواب تو نہیں! ہمیں تو کوئی خارش کھجلی نہیں ہوتی۔" آبی نے چڑ کر کہا۔

"آپ کے مرض کا علاج دُوسری طرح سے ہوگا۔ بس یہ [illegible] کچھ آپ پچھلے پہر خود دیکھ لیں گے میں اپنے منہ سے کیا بتاؤں" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

کوئی آدھ گھنٹے کے بعد ہم رام تلائی مندر کے سامنے کھڑے تھے۔ گوئیاں نے مندر کے مسافر خانے کا ایک کمرہ ہمارے لیے کھلوا دیا۔ اس میں مسافروں کی سہولت کے لیے ڈھائی ڈھائی فٹ چوڑی ہلکی چارپائیاں بچھی تھیں۔ دائیں ہاتھ ایک صاف ستھرا گھڑا گھڑونچی پر دھرا تھا۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ وہاں چاند کی آخری [illegible] میں مسافروں کا تانتا بندھتا تھا۔ عام دنوں میں ادھر کوئی کوئی آتا تھا۔ اس دن بھی وہاں بہت کم لوگ آتے ہوئے تھے۔ گوئیاں کو مندر کے سبھی لوگ جانتے تھے اور سب سے وہ بڑی عزت سے آ رہے تھے۔ ہمیں تو اس نے کسی سے نہیں ملایا۔ ہمارے لیے [illegible] کا انتظام بھی اس نے خود ہی کیا مگر کمروں میں حبس کی وجہ سے وہاں سونا مشکل نظر آ رہا تھا۔ اس پریشانی کا حل گوئیاں نے یہ [illegible] کہ اس نے ہلکی ہلکی تین چارپائیاں اس کمرے کے سامنے کھلی جگہ پر [illegible] دیں۔

ہم جب اپنی اپنی چیزیں پوری طرح سنبھال کر بستر پر [illegible] تو محسوس یہ ہوا کہ تھکن سے ہم چُور چُور ہو رہے ہیں لیکن میں سو کر گزارنا نہیں چاہتا تھا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ میرے پاس ایک معقول رقم موجود تھی جسے میں کسی معقول وجہ کے بغیر ہاتھ سے [illegible] نہیں چاہتا تھا۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ میں وہ رقم پاکستان پہنچ کر آبی کے حوالے کر دوں گا۔ اس بچارے کے پاس ان دنوں کچھ نہیں تھا۔ میری وجہ سے وہ بہت عرصے سے اپنے اصل پیشے سے بھی دُور ہو چکا تھا اور یُوں اس کی آمدنی کے سارے ہی ذرائع [illegible] چکے تھے۔ اب اس کی ساری ضرورتیں تا بہا ہی پوری کرتا [illegible] اور مجھے اسی وجہ سے آبی سے شرمندگی سی محسوس ہونے لگی تھی۔

ابھی ہمیں چارپائیوں پر لیٹے پندرہ بیس منٹ ہوئے تھے کہ گوئیاں جو مندر کے اندر جا کر کسی سے گپ شپ لڑا رہا [illegible] بھاگتا ہوا ہمارے پاس پہنچا اور بولا "مہاراج آپ کمرے [illegible] جائیں یہی بہتر ہے کسی کی نظر میں آئے بغیر ہی پچھلے پہر ہم چلیں گے۔"

"ٹھیک ہے بھائی! چل ہمیں تو کمرے ہی میں [illegible] تیرے ہاتھ جو آ گئے ہیں آج۔" آبی نے زچ ہو کر کہا۔

کمرے میں جا کر گوئیاں بھی ہمارے پاس ہی لیٹ گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہم آپس میں کوئی بات بھی کھل کر نہ کر سکے۔

ابھی دس منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ آبی گہری نیند میں کھو گیا۔ میرا بھی یہی حال ہو رہا تھا۔ میری آنکھیں مُندی جا رہی تھیں مگر میں کسی بھی طرح نیند سے مغلوب نہیں ہونا چاہتا تھا۔ میں نے گوئیاں کو آواز دی تو معلوم ہوا کہ وہ بھی سو چکا ہے۔ کمرے میں سرسوں کے تیل کا دیا جل رہا تھا۔ اسے بجھا دینا ہی ہم نے بہتر سمجھا۔ اس کے بعد میں بڑی آہستگی سے کمرے سے نکل کر مندر کے اس حصّے میں جا پہنچا جہاں مسافروں کے لیے بھوجن پکتا تھا۔ رسوئی خانہ خاصا کشادہ اور صاف ستھرا تھا۔ دو آدمی وہاں بیٹھے چائے پی رہے تھے دن بھر کا کام انہوں نے ختم کر لیا تھا۔ مجھے سامنے دیکھ کر ایک آدمی بولا "آؤ سردار جی! کیا حکم ہے، کوئی سیوا بتائیں۔ آپ گوئیاں کے ساتھ آئے ہیں۔"

"ہاں یار! مجھے دراصل چائے کی طلب ہے۔ سارا بدن دُکھ رہا ہے۔ مل سکتی ہے چائے؟" میں نے ان کے پاس ایک مونڈھے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کیوں نہیں! چائے تو ہم نے ابھی بنائی ہے، ہم بھی بہت تھک گئے تھے۔"

"بھئی ایشرے ایک پیالہ سردار صاب کو بھی بھر دے۔" اس آدمی نے اپنے ساتھی سے کہا۔

میں چائے پی کر دراصل نیند سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ گوئیاں نے جو کھانا ہمیں کھلایا ہے اس میں کوئی نیند آور شے اس نے خاصی مقدار میں ملا رکھی تھی جو آہستہ آہستہ آدمی کو اپنے شکنجے میں جکڑ تی تھی۔ میرا بھی یہی حال ہو رہا تھا وہ بہت میٹھی سہانی نیند تھی جو میری آنکھوں پر جھکی چلی آتی تھی مگر میں اسے گلے سے نہیں لگا سکتا تھا۔ سینکڑوں وسوسے میرے دل میں ابھر رہے تھے، اور محسوس یہ ہو رہا تھا کہ ہم وہاں محفوظ نہیں ہیں۔

رسوئی خانے سے چائے کے دو بڑے بڑے پیالے پی کر میں جب کمرے میں واپس پہنچا تو گوئیاں کی آواز مجھے سنائی دی "آپ سوئے نہیں ابھی تک سردار جی! کہاں نکل گئے تھے؟"

"بس ایسے ہی یار! یہاں دم گھٹ رہا تھا۔ ہوا خوری کے لیے میں باہر چلا گیا تھا مگر اب تو نیند نے جکڑ لیا ہے۔" میں نے بستر پر دھم سے گرتے ہوئے کہا۔

گوئیاں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ کوئی دس منٹ بعد اس نے بستر سے اُٹھ کر دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ رات گہری ہوئی تو کمرے کا حبس کسی حد تک کم ہو گیا۔ روشندانوں اور کھڑکیوں کی راہ سے تازہ ہوا برابر آ رہی تھی۔ میں نیند کی راہ میں جتنے بند باندھ سکتا تھا، باندھ کر سختی سے خود کو بے سُدھ ہونے سے روکتا رہا۔

رات کے اس وقت دو بج رہے تھے کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ گوئیاں جاگ ہی رہا تھا۔ اس نے اُٹھ کر کنڈی کھول دی۔ کوئی آدمی تیزی سے اندر آ گیا، بولا "سواریاں تیار ہیں کہ نہیں؟"

"بالکل تیار ہیں مگر مایہ! ان کے پاس رقم بہت تگڑی ہے۔"

"یہ بے اصُولی کی بات نہ کر گوئیاں! ان کی رقم ان کے ساتھ ہی جائے گی۔ جب ہم دس ہزار لے چکے ہیں تو اور کیا چاہیے ہیں۔" اس آدمی نے تلخ لہجے میں کہا۔

گوئیاں منجمد ہو کر رہ گیا، بولا "ٹھیک ہے مول چند جی! میرا کیا ہے میں تو تمھارے ہی فائدے کی کہہ رہا تھا۔ سویا ہویا برابر ہوتا ہے۔ میں نے رات کے بھوجن میں ان کا کام برابر کر دیا تھا۔"

"بس ٹھیک ہے، ان کو ٹرالی میں لٹا دے۔"

"یار پہلے تو سرنگ کا دروازہ تو کھول، ایسے ہی بونگی مارتا جا رہا ہے۔ ٹرالی کہاں ہے یہاں؟" گوئیاں نے چڑ کر کہا۔ وہ مول چند سے خوش نہیں ہو رہا تھا۔ مول چند نے ماچس کی تیلی جلا کر سامنے کی دیوار کے وسط میں لگا دروازہ کھول دیا۔ پھر وہ ہم دونوں کو اچھی طرح ہلا جُلا کر دیکھنے کے بعد بولا۔

"دونوں نیند میں دُھت ہیں، لے یہ دیا سلائی اندر لے جا کر بڑی لالٹین جلا دے۔"

گوئیاں نے اس کے حکم کی تعمیل کر دی تو وہ دونوں پہلے تو آبی کو چارپائی سمیت اٹھا کر اگلے کمرے میں لے گئے۔ چند ہی لمحوں بعد ایک خالی چارپائی لا کر گوئیاں نے اس کی اصل جگہ پر ڈال دی۔ اس کے بعد وہ دونوں میری طرف بڑھے اور میری چارپائی کو سرہانے پائینتی سے اُٹھا کر وہ اگلے کمرے میں لے گئے۔ انھیں میرے سانس کی ڈھیلی ڈھالی آمد و رفت اور میرے نیند میں لڑھکتے بدن کو دیکھ کر یقین ہو گیا تھا کہ میں گہری نیند میں ہوں۔ گوئیاں نے مجھے جان بوجھ کر چارپائی سے اٹھانے سے پہلے ٹوہنے کی کوشش کی۔ میں نے بریف کیس کا دستہ رُومال سے کس کر گردن کے ساتھ باندھ رکھا تھا۔ پستول میں نے نیفے میں اُڑس لیا تھا۔ جوں ہی گوئیاں نے میری جیب میں ہاتھ ڈالنے کے بعد دوسرا ہاتھ نیفے کی طرف بڑھایا، مُول چند نے اُسے ٹوک دیا، بڑے غصّے میں بولا "اوئے چمار کی اولاد! تو ذلیل کرائے گا ہمیں۔ مجھے بھی اور لالہ جی کو بھی۔ پتہ ہے اُدھر سرنگ کی دوسری طرف کون بیٹھا ہے اور آدمی ہمیشہ نیند میں نہیں رہتا۔ تو یہ دھندا ٹھپ کروائے گا۔"

"اچھا بابا اچھا۔ اُٹھا پھر اسے لٹا دے ٹرالی میں۔" گوئیاں نے جل بھُن کر کہا۔

چند ہی لمحوں بعد اُن دونوں نے مجھے چارپائی پر سے اٹھا کر ایک لوہے کی چادر پر لٹا دیا۔ میرے پہلو میں آبی لیٹا ہوا تھا۔

اور وہاں شاید دو سے زیادہ آدمیوں کے لیے گنجائش ہی نہیں تھی میرا چہرہ ابھی تک روشنی میں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں ایک ساعت کے لیے اپنی بند آنکھوں میں جھری تک نہ بنا سکا۔ مجھے نہیں معلوم ہو سکا تھا کہ مُول چند کی صُورت کیسی ہے اور وہ میرا محسن تھا۔ میں اُسے دیکھ لینا چاہتا تھا۔ چند ہی ساعتوں کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ لوہے کی اس ٹھنڈی چادر کے نیچے گھمر گھمر ہونے لگی ہے۔ وہاں کوئی پہیے لگے تھے جو کسی آہنی پٹڑی پر آگے سرکنے لگے تھے۔

"اچھا بھئی گوئیاں! میں جا رہا ہوں اب لالہ جی سے کہنا کہ میں کل شام کو واپس آؤں گا ادھر سے سواریاں لے کر۔"

چند ہی لمحوں بعد ٹرالی پٹڑی پر چلتی ہوئی اندھیرے میں گم ہونے لگی۔ اور پھر میرے سامنے ہر شے تاریکی میں ڈوب گئی۔ مگر یہیں ٹرالی میں کوئی بہت ہی جدید قسم کا ہلکا پھلکا انجن لگا تھا جسے مُول چند نے چلا دیا۔ تو ایک بار پھر مجھے ہر طرف روشنی سی پھیلتی محسوس ہوئی مُول چند ہم دونوں کے وسط میں اوندھے منہ لیٹ کر ٹرالی کو آگے بڑھا رہا تھا۔ اس کی رفتار اگرچہ بہت آہستہ تھی مگر اس میں مخصوص قسم کا تواتر اور باقاعدگی پائی جاتی تھی۔ اس وقت تک میرا اندازہ ہے کہ وہ ٹرالی کوئی ڈیڑھ فرلانگ تک آگے بڑھی تھی۔ میں نے اس دوران یہی کوشش کی کہ اپنی کسی حرکت سے یہ ظاہر نہ ہونے دوں کہ میں جاگ رہا ہوں۔ مگر وہ ہم دونوں کے بیچ میں اوندھے منہ لیٹا ہوا تھا۔ یا تو اس کی چھٹی حس بہت تیز تھی یا پھر میرے سانسوں کی رفتار سے وہ چونک گیا۔ اس نے ٹرالی ایک دم روک دی۔ میں اس کوشش میں تھا کہ خود کو نیند میں دھت ظاہر کروں مگر میرے حساب کی یہی غلطی میرے لیے مہلک ثابت ہوئی۔ میری آنکھیں مُندی تھیں مگر ٹرالی پر لگے بلب کی روشنی پپوٹوں کے اندر دھنسی آتی تھی۔ میں نے سوچا بھی کہ آنکھیں کھول کر مول چند سے نمٹ لوں مگر میں ابھی کوئی فیصلہ بھی نہ کر پایا تھا کہ میرے بازو میں کوئی تیز دھار چیز یوں اُتری جیسے کسی نے خنجر سے مارا ہو اور اُس کے چند ہی ثانیوں بعد میں مکمل طور پر بے سُدھ ہو چکا تھا۔ اس مُول چند نے اپنے ذہن میں الجھتے ہوئے تمام خدشات کو ختم کر دینے کے لیے مجھے بھی بے ہوشی کا ٹیکہ لگا دیا تھا اور آبی کو بھی۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں اس وقت مکئی کے ایک کھیت کے کنارے گھاس پر پہلو کے بل بیٹھا تھا۔ یوں کہ میرا بریف کیس میرے لیے تکیہ بنا ہوا تھا اور میرا سارا بدن تھکن سے چور ہو رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں ہلانے کی بھی سکت نہیں رہ گئی تھی۔ یہ بھی پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ شام کا جھٹپٹا ہے کہ صبح کا ملگجا اندھیرا۔ فضا سرمئی سرمئی سی نظر آ رہی تھی۔ میں نے بڑی مشکلوں سے خود کو سنبھال کر پہلو بدلا۔ تو دائیں ہاتھ مجھے آبی نظر آیا۔ وہ مجھ سے چند قدم دُور گھاس پر اوندھے منہ لیٹا تھا۔ اسے اس حال میں دیکھ کر میرا دماغ الٹنے لگا۔

میں تڑپ کر اس کے پاس جا پہنچا۔ وہ ابھی تک بے سُدھ پڑا تھا اور لباس اُس کا بھی میری طرح میلا چکٹ ہو رہا تھا۔ اسے ہوش میں لانے کے لیے میں نے بڑے جتن کیے مگر وہ تو مُردوں سے شرط باندھ کر سویا تھا۔ اُسے ہوش ہی نہیں آ رہا تھا اور ہمارے گرد پیش اندھیرا دبیز ہونے لگا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ شام ہو رہی تھی اور ہم پر سے ایک صبح مکمل طور پر گزر چکی تھی۔ سرنگ سے نکال کر اس مُول چند اور اس کے گرگوں نے ہمیں وہاں پھینک دیا تھا۔ ہمارے ساتھ وہی کچھ ہوا تھا جو آبی کو حد کے اس پار پیش آ چکا تھا۔

چند قدم کے فاصلے پر پانی کا ایک کھالا بہہ رہا تھا۔ میں آبی کو گھسیٹ کر اس کے کنارے تک لے گیا۔ اور پھر ٹھنڈے پانی سے جب میں نے اس کا منہ دھو ڈالا اور سر بھی پانی میں ڈبو دیا تو اس نے جھرجھری لے کر آنکھیں کھول دیں۔

"اوئے جھانویں! تو اٹھ بھی جائے گا اب کہ نہیں۔ تو تو بار بار کراس کروا رہا تھا مجھے۔"

"یہ کونسی جگہ ہے بھئی! یہ کیا ہو رہا ہے ہمیں؟ تیرا بھی حلیہ بگڑ رہا ہے اور یہ کھیت کہاں سے آ گئے ہیں؟"

"ذرا ہوش میں آ جائیے! ادھار ہمارے ساتھ پتہ نہیں کیا کیا ہو گیا ہے۔"

"نہیں یار! ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ بتا تُو ادھر کیا کر رہا ہے؟ تجھے تو میں نے رام تلائی کے مندر میں سُلایا تھا۔ وہ گوئیاں کہاں ہے؟" آبی نے پانی اپنے بالوں سے نچوڑتے ہوئے کہا

میں نے وہ سب کچھ آبی کو بتا دیا جو مجھے معلوم تھا وہ حیرت زدہ سا ہو کر میرا منہ تکتا رہا۔ چاندنی اس گھڑی کھیت کرنے لگی تھی۔

"یار! اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمیں بھی اُس روز اسی سُرنگ کی راہ سے اُس حاکم علی نے بے ہوش کر کے پار لگا دیا تھا۔"

"یہ حاکم علی کون ہے؟ مجھے تو ابھی اس کے پاس لے چل۔"

"فرید پور میں رہتا ہے مگر تو نے اپنا کھیسا دیکھ لیا ہے؟ رقم تو نہیں لے گئے وہ۔"

اُس کی یہ بات سنتے ہی میں نے بریف کیس کھول دیا۔ اس میں جوں کی توں موجود تھی البتہ اُس میں ایک رُقعہ کسی نے ڈال دیا تھا۔ آبی نے اُسے دیکھتے ہی جھپٹ لیا، بولا "ذرا تیلی جلا دیکھوں تو کیا لکھا ہے اس میں۔"

میں نے جیب سے ماچس نکال کر ایک تیلی سلگا کر دی۔ آبی رقعے کی عبارت پڑھنے لگا، لکھا تھا "مترو! تہاڈے نال نیکی کیتی اے۔ ثابت سالم تہانوں تہاڈے گھر پُچا دتا اے۔ ہن تسیں اگے دا دھیان کر دے بُھل جاؤ جے تسیں کیہڑے رستے ایتھے پہنچے او۔ ایہہ تہاڈا ساڈے تے ای نئیں بہت

تہاڈے جیہے لوکاں تے احسان ہوئے گا۔ تہاڈا کوئی پائی پیسہ اسیں نہیں چھیڑیا تے تسیں وی ساہنوں نہ چھیڑو۔ تہاڈے ہوش وچ آون تک ساڈے آدمی تہاڈی راکھی کردے رہے نیں تاں جے تہاڈا کوئی نقصان نہ ہو وے۔"

آبی نے رقعہ لپیٹ لیا۔ تیلی بھی جل کر میرا ہاتھ جلانے لگی تھی۔ اُسے میں نے دُور پھینک دیا۔ حالت ہماری یہ تھی کہ نہ میرے سر پر کیس تھے نہ مُنہ پر ڈاڑھی۔ یہی حال آبی کا تھا۔ اس کے بہروپ کا سارا چھلکا وہ اُتار کر لے گئے تھے سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ میری جیب میں پاکستانی برانڈ کے سگریٹوں کے دو پیکٹ موجود تھے۔ وہ بھی میرا خیال ہے کہ ان لوگوں نے ہماری سہولت کے لیے وہاں رکھ دیے تھے۔

"یہ رقعہ اس مول چند نے لکھا ہو گا۔" آبی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"یہ پنجابی کا ٹانکا وہی لگا سکتا تھا۔ مگر یار ہم تو بدھو بن کر رہ گئے۔" میں نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگاتے ہوئے کہا۔

آبی نے وہ سگریٹ دیکھا تو خوش ہو گیا۔ اس کا چہرہ کھل اٹھا بولا "یار! یہ بادِ بہاری پہلے میرے سینے میں چلا۔ میں تو ادھر ترس گیا تھا اس نعمت کو۔" اس نے پیکٹ مجھ سے چھین کر سگریٹ سلگا لیا اور تین چار گہرے گہرے کش لے کر بولا "یار جیلانی! وہ اچھے لوگ ہیں ضرورت مندوں کے کام آتے ہیں۔ ہمیں اُن کے کام میں پھڈا نہیں ڈالنا چاہیے اُن کی ایمانداری بھی تو دیکھو۔۔۔ وہ معاملے کے کھرے لوگ ہیں۔"

"نہیں آبی! یہ راستہ بند ہونا چاہیے بھئی! یہ تو ہمارے مُلک کی حفاظتی دیوار میں نقب لگانے والی بات ہے۔"

"اُن کے مُلک پر بھی تو نقب کا اثر ہو رہا ہے میرا خیال ہے کہ یہ خفیہ راستہ خفیہ ہی رہنے دے کیا لینا دینا ہے ہمیں۔۔۔ خواہ مخواہ ان کو چھیڑ کر۔"

"تیرا کیا خیال ہے تو اُن کے ٹھکانے تک پہنچ سکتا ہے؟"

"کیوں نہیں! رام تلائی مندر کی وہ سرنگ فرید پور گاؤں کے اندر یا باہر کسی جگہ پہنچ کر کھلتی ہے اور اس کے دروازے پر میں حاکم علی کے ذریعے پہنچ سکتا ہوں۔" آبی نے بڑے پُریقین لہجے میں کہا۔

"تو پھر میری مان! جس قدر جلدی ہو سکے پولیس کو اس بارے میں خبردار کر دے۔ یہ سرنگ ہمارے لیے، ہم سب کے لیے زبردست تباہی کا سبب بن سکتی ہے۔"

"کیا کہتے ہو یار! وہ کوئی ٹینک تو نہیں گزار لیں گے اُس میں سے۔ ایسے ہی گناہ گاروں نے دوزخ کی سختی سے بچنے کے لیے جنت تک سرنگ کھود لی ہے۔ لعنت بھیج میں نہیں پسند کرتا ایسی حُبّ البطونی۔"

"حُبّ الوطنی کہ حُبّ البطونی؟" میں اس کے لفظوں پر چونکا آبی مسکرا دیا، بولا "جب یہ اس قسم کے پھڈے پر اکسائے نا تو یہ حُبّ البطونی ہو جاتی ہے یعنی اپنے پیٹ کی محبت۔ انھوں نے ہمیں سرحد پار کرا دی۔ بس یہی کافی ہے۔"

"تو اگر کچھ نہیں کرے گا نا آبی تو میں خود پولیس کو خبر دے دوں گا یہ بہت ضروری ہے۔"

"اس بحث پر لعنت بھیج یار! پھر بھی ہمیں ان لوگوں سے کام پڑ سکتا ہے تو یہاں سے کسی طرف نکلنے کی سوچ! یہاں تو نہیں بیٹھے رہیں گے ہم۔" آبی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

اس کا بریف کیس بھی اُس کے پاس محفوظ تھا۔ میں بھی اُس کے ساتھ وہاں سے اٹھ گیا۔ ہمارے چاروں طرف دُور دُور تک کھیت ہی کھیت تھے۔ اُن کے بیچوں بیچ ایک پگڈنڈی گزرتی تھی۔ اُس پر چلتے ہوئے ہم خاصے دُور نکل گئے مگر راستے میں ہمیں کوئی آدمی نہ ملا۔ یہ بڑی حیران کن سی بات تھی کیونکہ کھیتوں کو نہری پانی پہنچ رہا تھا اور کسی نہ کسی جگہ تو کسی لاوے کی کسی کھیت مزدور کی جھلک ہمیں نظر آنی ہی چاہیے تھی۔

پگڈنڈی سے اُتر کر ہم ایک کچی سڑک پر جا چڑھے تو وہاں ہمیں لوگوں کی آمد و رفت نظر آئی۔ بیل گاڑیوں کا بھی وہاں سے گزر ہو رہا تھا اور ڈھور ڈنگر بھی۔۔۔ اس سڑک پر پہنچ کر ہم نے ایک آدمی سے پوچھا کہ وہ علاقہ کون سا ہے تو اس نے ہمیں بتایا کہ ہم للیانی قصبے سے دو ڈھائی میل دُور ہیں۔ اس قصبے کا نام سن کر ہم ششدر رہ گئے کیونکہ ہمارا اندازہ تو اس سے بالکل ہی مختلف تھا۔ ہم سمجھتے تھے کہ ہم کہیں قصور کے آس پاس ہوں گے۔ مگر نہیں معلوم یہ ہوتا تھا کہ وہ لوگ ہمیں کسی کار ٹیکسی میں ڈال کر سرنگ کے مُنہ سے بہت دُور پھینک گئے تھے۔

"یار! یہ تو بہت بُرا ہوا ہے آبی! کرنسی بھی ہمارے پاس بھارتی ہے۔"

"فکر نہ کر! ہم ابھی قصور جا کر کرنسی بدلوا لیں گے۔ ایسے کئی لوگ مل جاتے ہیں وہاں بلکہ دو چار پیسے وہ زیادہ ہی دے دیں گے۔"

"کیا مطلب! تیرا خیال ہے کہ وہاں یہ کرنسی کا کاروبار ہوتا ہے؟"

"بس چھپ چھپا کے یہ دھندا چلتا ہی رہتا ہے وہاں۔ میرا ایک شخص واقف ہے قصور شہر میں، وہ یہی کام کرتا ہے۔ بورڈ اس نے دکان پر صرافی کا لگا رکھا ہے۔"

"اچھا ٹھیک ہے پہلے تو یہ کرنسی بدلوا پھر میں کوئی اور بات سوچ سکوں گا۔"

ابھی ہم وہاں سے کوئی دو فرلانگ آگے آئے تھے کہ ہم پختہ سڑک پر جا چڑھے۔ وہاں سے بسیں گزرتی تھیں جو مسافروں کو لاہور، رائے ونڈ اور قصور کی طرف لے جاتی تھیں۔ میں نے آبی کو بس میں بیٹھنے سے منع کر دیا کیونکہ جیب میں پاکستانی کرنسی نام کی ایک اٹھنی بھی نہیں تھی۔ وہاں کھڑے ہم ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ اس بے سروسامانی کا علاج کیا کریں کہ ایک ٹیکسی کار ہمارے پاس آ ٹھہری معلوم یہ ہوا کہ اللہ کا بندہ قصور ہی جا رہا تھا۔ ہم شکر کرتے فوراً ہی اس میں بیٹھے اور قصور کی طرف چل دیے۔ ان تمام مراحل کا ذکر میں اس لیے کر رہا ہوں کیونکہ وہ بڑے ہی جاں گسل لمحے تھے جن سے ہمیں بار بار گزرنا پڑ رہا تھا۔ آدمی بھٹک جائے تو اُسے سیدھی راہ پر آنے کے لیے عمریں گزر جاتی ہیں۔ ہمارا حال بھی ایسا ہی تھا۔

آبی نے قصور پہنچ کر رات کے گیارہ بجے سے پہلے پہلے بھارتی کرنسی کے بدلے میں پاکستانی نوٹ حاصل کر لیے۔ مجھے اُس صراف کے پاس وہ عمداً نہیں لے کر گیا تھا، اسے ڈر تھا کہ میں وہاں بھی کوئی فساد کھڑا کر دوں گا۔ حاکم علی کے خلاف وہ مجھے ایک قدم نہیں اٹھانے دیتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ہمیں اس جھگڑے میں نہیں پڑنا چاہیے۔ بالآخر مجھے خاموشی اختیار کرنی پڑی کیونکہ وقت مجھے کسی بھی طرف ہلنے کی مہلت نہیں دے رہا تھا۔ پاکستانی نوٹ ہاتھ آتے ہی ہم نے ایک دوسری ٹیکسی کرائے پر لی اور اسی وقت اوکاڑہ کی طرف چل دیے۔ آبی مجھے وہ اخبار دکھانا چاہتا تھا جس میں اُس پرکاش چند کی تصویر چھپی تھی جو کبیر شاہ کے مکان پر مارا گیا تھا۔

آبی کا دوست عزیز احمد گھر پر ہی تھا۔ رات کے ڈیڑھ بجے وہ ہمیں اپنے دروازے پر دیکھ کر بہت حیران ہوا مگر آبی کچھ اس سے زیادہ ہی بے تکلف تھا۔ جب ہم بیٹھک میں بیٹھ چکے تو وہ عزیز احمد کو مخاطب کر کے بولا "تو حیران کیوں ہو رہا ہے عزیز القدر! یہ رات تو ہم تیرے گھر ہی گزاریں گے۔ وجہ یہ ہے کہ ہم سفر میں ہیں صبح اٹھتے ہی ہم سندھ کی طرف چل دیں گے۔"

"یہ تمھارا اپنا ہی گھر ہے آبی بھائی! مگر اس وقت تم آ کہاں سے رہے ہو، اپنا حلیہ بھی دیکھا ہے تم نے؟"

"سفر میں یہی حال ہو جاتا ہے عزیز بھائی! تمھاری مہربانی ہو گی اگر تم ہمیں ایک ایک جوڑا کپڑوں کا بھی دے دو۔"

"وہ بھی مل جائیں گے میرا خیال ہے کہ تم ادھر ہی پنکھے کے نیچے قالین پر لیٹ جاؤ اور اپنے یہ کپڑے اتار دو۔ میں دھنی سے کہہ کر مشین میں دھلوا دیتا ہوں۔"

"اچھا! تمھارے پاس گویا واشنگ مشین بھی ہے معلوم ہوتا ہے آج کل بلیا ہی مال کما رہے ہو۔" آبی نے بیٹھک میں بچھے نرم ملائم قالین پر پھیل کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"بس یہی سمجھ لو۔ کھانے کی ضرورت ہو تو بتا دو۔ وہ بھی کہہ دیتا ہوں دھنی سے کہہ کر۔"

"نہیں یار! کھانا ہم کھا آئے ہیں مگر یہ دھنی کون ہے؟ ہر شے کا حل ہے اس کے پاس۔"

"یہ ہماری نوکرانی ہے۔ بہت محنتی عورت ہے تمھارے ... میں اُسے جگا دیتا ہوں۔"

ہم نے اپنے کپڑے اتار کر عزیز احمد کو دے دیے۔ اس نے باندھنے کے لیے ہمیں دو تہمد مہیا کر دیے تھے۔ جب وہ کپڑے باہر گیا تو آبی نے ایک الماری میں سے اخباروں کا ایک پلندہ نکال کر سامنے رکھ دیا۔ پرکاش چند کی تصویر دیکھ کر میرا دماغ الٹنے لگا۔ آدمی کو شاید میں نے اپنے ایامِ اسیری کے دوران لاہور جیل میں دیکھا۔

"یار میرا خیال ہے کہ یہ آدمی میرے ساتھ لاہور جیل میں قید کاٹ چکا ہے۔ اس شکل صورت کا ایک شخص وہاں گھوما کرتا تھا۔"

"اچھا! تو پھر کیا خیال ہے پہلے اس کے بارے میں ہم لاہور جیل سے معلومات حاصل نہ کریں؟"

"وہ کیسے؟ ادھر ہمارا جانا بہت خطرناک ہو گا۔"

"نہیں بابا! رشوت کے تو بہت ہی شوقین ہوتے ہیں لوگ۔ کسی کے منہ میں یہ خنزیر ڈالا جا سکتا ہے مگر پہلے تسلی کر لو کہ یہ وہی آدمی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم وہاں خواہ مخواہ ہی کذا و لذا کرتے پھریں۔"

"مجھے یقین ہے بھائی، یہ وہی آدمی ہے۔ یہ وہاں مالی کا کام کیا کرتا تھا۔ اب مجھے بہت سی باتیں یاد آ رہی ہیں۔ اس کے تین آدمی اور بھی کیاریوں میں پھرا کرتے تھے اور اُن کی مشقت معاف تھی۔"

"اچھا! اُن کے نام تو یاد ہوں گے تمھیں؟"

"ان میں سے ایک آدمی کو میں نہیں بھولا ہوں۔ اس کا رنگ سانولا تھا۔ بر چھا ایسا جوان تھا یار وہ۔ اس نے ایک دن ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کی پٹائی کر دی تھی۔ اُس کی کسی بات پر سانول بگڑ گیا تھا مگر بھئی بڑا دبدبہ تھا اس شخص کا۔ جیل میں پتہ نہیں اسے کوئی سزا ملی کہ نہیں مگر اس کے بعد وہ مجھے نظر نہیں آیا۔ نہ وہ سانول اور نہ اُس کے دوست۔ اور یہ شخص بھی اُس کے بعد جیل میں مجھے دکھائی نہیں دیا۔"

"اب دیکھ یہ ہے اُس مردہ پرکاش چندر کی تصویر جو میں نے پولیس سے حاصل کی تھی۔" آبی نے الماری کے نچلے خانے میں رکھی ایک کتاب میں سے تصویر نکال کر مجھے دکھائی۔ وہ آدمی وہی تھا جس کی تصویر اخبار میں چھپی تھی۔ وہ دونوں تصویریں میرے ذہن میں ان گنت دسوسوں کے ناگ پھن پھیلانے لگے۔ آسیہ کراڑے سے نیچے گرتی نظر آ رہی تھی۔ کوئی ہاتھ ایسا نہیں اُسے بچا سکتا۔ اگر وہ پرکاش چندر جس کا نام اخبار میں مہیش چند لکھا تھا سانول کا ساتھی تھا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ۔۔۔۔ آسیہ پر تقدیر نے کوئی نئی کدال چلا دی تھی۔ اگر۔۔۔۔ اگر۔۔۔۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھے بلاوجہ تو اپنا ایک آدمی خرچ نہیں کر گئے تھے۔ اُن کے پیشِ نظر کوئی بڑا مقصد ہو گا۔۔۔۔ کوئی بہت بڑا مقصد۔ ورنہ وہ اتنا بڑا قدم کبھی نہ اٹھاتے۔

"یہ سب کچھ تہ کر کے رکھ لے اپنے پاس رکھ لے آبی! کپڑے دھل جائیں تو ہم راتوں رات لاہور چلے جائیں گے۔"

"وہاں کیا کرنا ہے اب؟"

"میں معلوم کروں گا کہ وہ مالی یہ پرکاش چندر اور سانول لاہور جیل سے کہاں منتقل ہوئے تھے لمبی قید کاٹ رہے تھے وہ۔"

"اس سے کیا ہو گا؟"

"مجھے معلوم ہونا چاہیے آبی کہ پرکاش چندر کن لوگوں کے ساتھ کبیر شاہ کے گھر پر حملہ آور ہوا تھا۔ مجھے آسیہ تک ہر قیمت پر پہنچنا ہے میرے بھائی!"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر میرا خیال یہ ہے کہ جس شخص نے یہ اشتہار دیا ہے اُس سے ہمیں زیادہ معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔"

"وہ تو خود کوئی احمق آدمی نظر آتا ہے مجھے۔ اُسے یہ بھی پتہ [نہیں] کہ اس کا بھائی کس قماش کا آدمی ہے۔ اگر اسے معلوم ہوتا کہ پرکاش چندر داغی ہے جیل جا چکا ہے، اس کا بدمعاشوں سے میل جول ہے تو وہ کبھی اتنی سادگی سے اخبار میں اس کی تصویر نہ چھپواتا۔"

"عین ممکن ہے کہ اسے سب کچھ معلوم ہو اور خود کو بھائی سے بالکل الگ اور بے گناہ ثابت کرنے کے لیے اس نے یہ اشتہار چھپوا دیا ہو۔" آبی نے کہا۔ اس کی دلیل میں وزن تھا۔

"تو ٹھیک کہہ رہا ہے یار! صبح سویرے کی گاڑی سے ہم سکھر کی طرف چل دیں گے، مجھے یقین ہے کہ صحیح سراغ ہمیں اس مہیش چند ہی سے مل سکے گا۔"

عزیز احمد نے ہمیں اُس وقت پکوا کر کھانا بھی کھلایا، اور ہمارے کپڑے دھلوا کر دھنی سے استری بھی کروا دیے۔ وہ کوئی بہت ہی خلیق اور مہمان نواز آدمی تھا۔ اس کی وہ مروت، وہ محبت اور وہ انکساری میں کبھی نہ بھول سکوں گا۔ پیشے کے اعتبار سے وہ دکاندار تھا۔ آڑھت کا کاروبار کرتا تھا اور اپنے اس دھندے میں کامیاب تھا مگر وہ بات جو نہ آبی مجھے بتا رہا تھا اور نہ ہی عزیز احمد کی طرف اشارہ کرتا تھا وہ یہ تھی کہ عزیز احمد کسی زمانے میں بہت بڑا جعل ساز بھی رہ چکا تھا۔ اس نے جعلی کلیموں کے ذریعے اوکاڑہ میں بہت جائیداد ہتھیا لی تھی۔ یہ سب باتیں مجھے آبی نے اس وقت بتائیں جب ہم کھانا کھا کر عزیز احمد کے گھر سے دھلے اور استری شدہ کپڑے پہن کر اطمینان سے قالین پر لیٹ چکے تھے۔

"تو نے اچھا نہیں کیا ہے آبی! اس آدمی کے بارے میں میرے دل میں جتنے اچھے اچھے خیالات تھے، وہ سب تو نے ختم کر دیے مجھے اس کے ماضی کے بارے میں تم کچھ نہ بتلاتے تو بہت اچھا ہوتا۔"

"بیٹھ اوئے خان دیانت خان بددیانت، تجھے پتہ ہونا چاہیے تھا کہ میرے اور اس کے درمیان قدرِ مشترک کون سی ہے۔ اس کے آڑھت کے کاروبار میں میں نے بہت عرصہ پہلے نوے ہزار روپیہ لگایا تھا۔ اس کا منافع ملا کر اب یہ مجھے دو لاکھ دینے کو تیار ہے۔"

"اچھا! یہ تو بہت اچھی بات ہے یار! اس کا مطلب ہے کہ تیرے بارے میں میری رائے بالکل غلط نکلی۔"

"کیا رائے تھی تمھاری یعنی تم بھی کوئی رائے دے سکتے ہو؟"

"یہی کہ تمھارا انجام مجنوں سے بھی زیادہ عبرتناک ہو گا، اُسے تو لوگ پتھر مارتے تھے تمھارے پیچھے کتے چھوڑیں گے۔"

"اچھا! یعنی یہ رائے حضور نے کیسے قائم کی میرے بارے میں؟"

"اُس الماس کے قصے کو دیکھ کر۔"

"یار! اس بیچاری کا کیا قصور ہے، مجھ سے منگنی اس نے کر دی۔ ابھی ذرا وہ فلموں میں مصروف ہے۔ وہاں سے فارغ ہو کر وہ مجھ سے شادی بھی کر لے گی۔"

"اچھا خیر اب سو جا، صبح چھ بجے کی گاڑی سے سکھر جانا ہے ہمیں۔"

"اچھا گڈ نائٹ۔"

صبح سویرے اُٹھ کر ہم عزیز احمد کو خدا حافظ کہہ کر گاڑی میں جا بیٹھے۔ ہم اس روز دونوں ہی پریشان تھے۔ دل ہمارے بجھے بجھے سے تھے۔ وہ راہ راستے جو ہمارے وہم و گمان اور خواب و خیال میں بھی نہیں تھے ابتی اُس بدنصیب بہن کے لیے دیکھنے پڑ رہے تھے۔ مجھے ڈھلوں صاحب سے فوراً ہی مل لینا چاہیے تھا مگر آبی نے آسیہ کا ایسا سراغ میرے آگے رکھ دیا تھا کہ میں کسی اور طرف دیکھ ہی نہ سکا۔ میرے لیے ڈھلوں صاحب پریشان ہو رہے ہوں گے کیونکہ ان کے سامنے بلبیر سنگھ ہو گا۔ وہ آغا بلال جسے میں نے علی بخش بھٹی ہیڈ کانسٹیبل اور پاکستان کی ایجنسی علی شہنیت کو قتل کر دینے کی سزا بھگتنے کے لیے جو گودھ بھیجا تھا۔ ڈھلوں صاحب اُسے دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہے ہوں گے۔ میرا وہاں جانا بہت ضروری تھا مگر مجھے ایک اور ہی سمت نظر آ گئی تھی۔ امید کی ٹوٹتی لو کو ایک نئی زندگی مل گئی تھی۔ آبی اس وقت سے اور زیادہ پریشان ہو گیا جب سے میں نے اُسے یہ بتا دیا تھا کہ اُس کی والدہ کو پولیس نے انور پھاڈی کے حوالے سے گرفتار کر لیا تھا اور اُسے

بعد میں ڈھلوں صاحب نے رہا کر دا کر تاہیے کے ساتھ واپس بھیج دیا تھا۔ یہ ساری تفصیل اُسے تاہیے سے پہلے ہی معلوم ہو چکی تھی مگر میرے منہ وہ ساری رُوداد سن کر وہ بہت زیادہ دکھی ہو گیا تھا۔ اس نے بس چُپ ہی سادھ لی تھی۔ میں سمجھا کہ وہ میرا ساتھ دینے کے اُس سارے جانکاہ سلسلے میں پریشان ہے۔ یہ خیال میرے ذہن میں جیسے ہی آیا میں نے آبی کو جھنجھوڑ ڈالا۔

”دیکھ آبی! میری تقدیر تو خدا جانے مجھے کہاں کہاں ذلیل کرواتی پھرے گی، تو کیوں میرے ساتھ خوار ہو رہا ہے؟ یہ دیکھ یہ روپیہ میں تیرے لیے ہی لایا تھا یہ لے جا یہ سارا بریف کیس لے جا اور جا کر ماں جی کے پاس بیٹھ جا وہ بہت پریشان ہوں گی۔“

”تم کیا بکتے ہو یار! تمھارے ساتھ سے میں پریشان نہیں ہوں میں۔۔۔ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ۔۔۔ ہم کیسی کالی تقدیر لے کر پیدا ہوئے ہیں، ہمارے لیے واپسی ممکن نہیں ہے جیلانی! اور اس سے بڑی بدنصیبی اور کیا ہو سکتی ہے۔“

”مجھے معلوم ہے۔ ابھی تم ملتان میں اتر جاؤ اور یہ روپیہ ساتھ لے جاؤ۔ اور اسے اپنے کام میں لاؤ۔ تم زمین خریدنا چاہتے ہو نا! یہ لے جاؤ۔ بینک میں میری جو رقم پڑی ہے وہ بھی میں تمھیں دے دوں گا۔ میں تمھیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں آبی۔“

”یہ روپے کا رعب نہ دیا کر مجھے جیلانی! یہ تو میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ ایسی باتیں نہ سوچ تو حساب کرنے بیٹھ جاتا ہے پاگل ہو جائے گا۔ میں تیرا دوست نہیں تیرے وجود کا حصہ ہوں جیلانی! آسیہ تجھے مل جائے تو پھر میں اطمینان سے کسی طرف نکل جاؤں گا۔“ یہ کہہ کر وہ تیز رفتار گاڑی کی کھڑکی سے باہر پیچھے بھاگتے منظر کو دیکھنے لگا۔ سگریٹ اس کی انگلیوں میں سلگ سلگ کر اُس کی جلد تک جا پہنچا تھا۔ اس کی جلن محسوس کرتے ہی آبی نے ٹکڑا باہر پھینکا، بولا ”یار! ہمیں کیا ہو گیا ہے اتنے پریشان تو ہم کبھی نہ ہوئے تھے۔ لا ایک سگریٹ اور نکال۔۔۔ ہماری یہ مشکلیں ختم ہو گئیں تو پھر زندگی میں دلچسپی ہی کیا رہ جائے گی۔“ ایک پھیکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر ابھر آئی۔ اس مسکراہٹ میں آہستہ آہستہ زندگی کے سارے رنگ لوٹ آئے۔

ہم فرسٹ کلاس میں سفر کر رہے تھے۔ ہمارے ڈبے میں دو اور مسافروں کی گنجائش تھی۔ جب گاڑی ملتان پہنچی تو وہ نشستیں بھی پُر ہو گئیں۔ دو عورتیں وہاں سے گاڑی میں سوار ہوئیں اُن میں سے ایک تو جوان تھی یہی کوئی چوبیس پچیس سال کی ہو گی۔ وہ جدید طرز کا چست لباس پہنے ہوئے تھی۔ اس کے ساتھ جو عورت تھی اُس کی عمر اس کا راستہ روکتی تھی۔ وہ کوئی پینتیس کے پیٹے میں تو ضرور رہی ہو گی۔ ذرا سی فربہی مائل تھی۔ رنگ دونوں کا گورا تھا اور بال انھوں نے کچھ اس طرح ترشوا رکھے تھے کہ بے ساختہ دل اُن میں الجھنے لگتا تھا۔ یہ ضروری نہیں زلف گرہ گیر ہو، پاؤں تک پھیلی رہو۔ اس کا ایک ہی دل کو قابو کر لینے کے لیے بہت کافی ہوتا ہے۔ اس روز مجھے معلوم ہوا کہ میرے حافظے میں بہت سی صورتیں محفوظ رہتی ہیں۔ میں تو ان دونوں کی ملکوتی صورتیں دیکھتے ہی کائنات کی صناعی پر حیران ہی ہو رہا تھا اور میرا جی میں ہاتھ بڑھا کر اُس فتنۂ نوخیز کے کندھے پر رکھ دوں اور پوچھوں کہ تجھے اتنے سارے حسین رنگ کہاں سے ملے میری نظروں کی اس وارفتگی کو محسوس کر کے جھینپ سی گئی اچانک آبی نے میری پسلی میں چٹکی بھری، وہ میرے قریب منہ لا کر بولا ”یہ۔۔۔ یہ جانتے ہو یہ کون ہے؟“

”نہیں یار! مجھے کوئی الہام تو نہیں ہوتا، مجھے کیا معلوم کون ہے؟“

”تو بالکل گھامڑ آدمی ہے یار! یہ۔۔۔ اس لڑکی کو ڈاکٹر عرفان کے گھر میں دیکھا تھا۔“

”اوئے تیرا بیڑا غرق آبی!۔۔۔ تو۔۔۔ تو ٹھیک کہہ رہا ہے یار“ میں نے سنبھلتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں سنبھل کر بیٹھ گئے۔ آبی کی یادداشت بھی نشست پر بیٹھتے ہی ادھیڑ عمر کی خاتون نے اپنے پاؤں اٹھائے اور آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ شلوار اس کی اور مختصر تھی کہ میں سمجھا اگر اس نے ذرا بھی ہاتھ پیر پھیلائے شفاف کپڑا جگہ جگہ سے مسک جائے گا۔ یہی حال دوسری کا تھا جسے ہم نے ماڈل ٹاؤن میں ڈاکٹر عرفان کے گھر پر دیا تھا۔

”اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو یہ پنکھا ذرا تیز کر دیں“ خاتون نے بڑے ہی کھنکتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”نہیں جی زحمت کیسی! یہ تو عین راحت ہے“ پنکھا تیز کر دیا۔ جب وہ دوبارہ نشست پر بیٹھا تو بولا میں نے کہیں دیکھا ہے، لاہور سے آئی ہیں آپ؟“

اُس عورت نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں یوں اپنی سماعت پر اعتبار نہ آ رہا ہو۔ ”جی۔۔۔ جی۔۔۔ آپ پہچان لیا کہ ہم لاہور سے آئی ہیں۔ ہمارا منہ کہیں کالا تو وہ بڑی بے ساختگی سے بولی مسکرا وہ یوں رہی تھی اندھیرے میں شمع جلا کر اس کی روشنی میں راستہ تلاش بلاشبہ وہ بہت حسین اور طرحدار عورت تھی، اور کہتے ہیں نا کہ ایک حُسن آدمی، ہزار حسن کپڑا، لاکھ حسن

حُسن نخرہ، تو وہ بات اُس برقِ تپاں پر ہر لحاظ سے صادق آتی تھی۔ اُس کے ناز و انداز نے مجھے مسحور کر دیا تھا۔

”اور پیر نیلے ہو رہے ہوں“ دُوسری عورت نے اپنے سجے سنورے پاؤں کھول کر دیکھتے ہوئے کہا۔ دونوں کھل کر مسکرا رہی تھیں۔

”جی نہیں! نہ آپ کے منہ کالے ہیں نہ پیر نیلے۔ دراصل کچھ چہرے ایسے ہوتے ہیں کہ آدمی انہیں بھلا ہی نہیں سکتا۔ ایسی صورتیں حافظے میں کھُب کر رہ جاتی ہیں۔ کچھ ایسی ہی صورت آپ کی بھی ہے۔ میں اس بے تکلفی کے لیے آپ سے معافی چاہتا ہوں۔“ آبی نے لاسہ لگا دیا تھا۔

وہ کچھ سٹپٹا سی گئی، آنکھیں پوری طرح کھول کر اس نے آبی پر جما دیں، یوں جیسے وہ اس طرزِ تکلم سے قطعاً نا آشنا ہو۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد بولی ”آپ نے کہاں دیکھا تھا مجھے؟“ اب کی بار اس کا لہجہ سنجیدہ اور بھاری بھرکم ہو گیا تھا۔ بنا پرس اور بریف کیس اس نے سنبھال کر دائیں ہاتھ رکھ لیے تھے۔

”مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ دیکھا میں نے آپ کو صرف ایک بار تھا، ماڈل ٹاؤن میں، کوئی صاحب ڈاکٹروں ایسا کوٹ پہنے ہوئے آپ کے ساتھ کار میں جا رہے تھے۔ بڑی سڑک پر چڑھنے سے پہلے ذرا دیر کے لیے انہوں نے گاڑی روکی تھی۔ کہ ٹریفک گزر جائے۔ میں نے آپ کو پہلی بار وہیں دیکھا، اور آج دوسری بار دیکھ رہا ہوں۔“

آبی نے بڑے ہی ڈرامائی انداز سے اُس خاتون کی کمر میں ڈال لیا تھا۔ کسی کو یہ کہہ دیا جائے کہ تیری صورت بے مثال ہے، تجھے ایک بار دیکھ لینے کے بعد کوئی بھلا ہی نہیں سکتا، تو بات اس کی انا کے گھوڑے کو فوراً ہی شاہ گام کر دے گی۔ یہی حربہ آبی نے اُس خاتون پر آزما ڈالا تھا۔ اُس نے ایسا لاسا لگایا کہ وہ بس پھنس کر رہ گئی تھی۔ بڑے ہی افسردہ لہجے میں بولی ”وہ۔۔۔ وہ میرے ہزبینڈ تھے ڈاکٹر عرفان! انہیں کسی دشمن نے اغوا کر کے مار دیا تھا۔“

”اوہ۔۔۔ ویری سیڈ۔ یہ کیسے ہو گیا۔ ایسی ہی دشمنی تھی کسی کو اُن سے۔ ڈاکٹروں کے بھی لوگ دشمن ہو جاتے ہیں۔۔۔“ میں نے اُن کی گفتگو میں شامل ہوتے ہوئے کہا

اُس نے ایک اچٹتی ہوئی نظر میرے چہرے پر ڈالی، اپنی ساتھی خاتون کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگی ”آپ لیٹ جائیں خالہ جان! ذرا کمر سیدھی کر لیں تھک گئی ہوں گی۔“

وہ عورت شاید واقعی تھکی ہوئی تھی ہماری باتوں میں دلچسپی لینے کے بجائے وہ آنکھیں موند کر پیچھے جھک رہی تھی۔

اپنی بھانجی کی یہ تجویز سن کر وہ واقعی پہلو کے بل لیٹ گئی۔ اپنا یہ موٹا سا بازو اس نے سر کے نیچے رکھ لیا تھا۔

”ڈاکٹر عرفان نام تھا آپ کے ہزبینڈ کا۔ یہ وہی تو نہیں جن کے اغوا اور قتل کی خبر اخبار میں بھی چھپی تھی۔“ آبی نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہوئے کہا۔

”جی جی۔۔ معلوم ہوتا ہے آپ نے وہ خبر پڑھی تھی۔“

”جی ہاں! بڑی لرزہ خیز خبر تھی وہ۔ اُس میں آپ کا بھی نام لکھا تھا مگر میں وہ نام بھول رہا ہوں اس وقت۔“

”میرا نام وردہ ہے۔ وردہ عرفان۔“ وہ کچھ اور سنجیدہ ہو گئی تھی۔ مرحوم خاوند کے ذکر نے اُسے بے حد دکھی کر دیا تھا۔

”مجھے افسوس ہے خاتون! میں نے آپ کو بلا وجہ پریشان کر دیا۔“ آبی نے بڑے ہی صاف ستھرے لہجے میں کہا اور پھر سگریٹ سُلگانے لگا۔ وردہ کی آنکھوں میں آنسو اُبل آئے تھے جنہیں اُس نے بڑی احتیاط سے اپنے رُومال میں جذب کیا۔

”آپ کہاں جا رہی ہیں اس وقت؟“ آبی نے بات آگے بڑھائی ظاہر وہ یُوں کر رہا تھا جیسے وہ بھی بہت زیادہ زخم خوردہ ہے۔ میں نے کہا نا کہ آبی بہت بڑا اداکار بھی تھا۔ گرگٹ کی طرح رنگ بدل لیتا تھا۔ وردہ کے آنسو ابھی تک خشک نہیں ہوئے تھے۔ آبی جرأتِ رندانہ سے کام لیتے ہوئے اٹھا اور اس کے ننھے منے گداز ہاتھ میں سے رُومال جھپٹ کر خود اُس کی آنکھیں پونچھنے لگا۔ اس عورت کی حیرت دیدنی تھی مگر اس اظہارِ ہمدردی کو وہ رد بھی نہیں کر سکتی تھی۔ آبی کی اس زیادتی کو وہ بادلِ ناخواستہ ہی سہہ گئی۔۔۔ آبی کا خدا بھلا کرے اُس نے آنسو ہی پونچھنے پر اکتفا کی۔ ورنہ میں ڈرتا تھا کہ وہ اُس کا دکھ بانٹتے بانٹتے کہیں اُس کے دل پر ہی ہاتھ نہ رکھ دے۔ اُس سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔

”آپ ایسی ہستی کو میں روتے نہیں دیکھ سکتا خاتون! آپ کو حوصلے سے کام لینا چاہیے۔“

وہ سسکنے لگی۔ ”اُن بدمعاشوں نے میرے ہزبینڈ کو میرے سامنے اغوا کیا اور میں اُن تشددوں کے خلاف کچھ بھی نہ کر سکی۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے خاتون! آپ تو ماشاءاللہ پرسنالٹی کی بہت مضبوط دکھائی دیتی ہیں۔“ آبی نے معنی خیز انداز سے مجھ پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

”بس جی! میں دراصل دھوکا کھا گئی ورنہ میری دراز میں بھرا ہوا پستول رکھا تھا مگر انہوں نے مجھے سوتے میں باندھ دیا۔ وہ بدمعاش دو تھے۔ وہ مجھے باندھ نہ لیتے تو میں اُن کو زندہ نہ جانے دیتی۔“

”آپ کی صحت اور قد کاٹھ کو دیکھ کر تو میں بھی یہی سوچتا

ہوں کہ آپ تو اِن کی گردنیں توڑ سکتی تھیں۔ ذرا دیکھیں ناہاشم صاحب اِن کے یہ ڈنڈ سٹنڈ تو خوب بنے ہوئے ہیں۔" آب ــــ تے یوں ہی رواداری میں اُس خاتون ــــ کے ایک بازو کو ٹٹولتے ہوئے کہا۔ وہ کچھ جھینپ سی گئی۔ میرا خیال ہے وہ آبی کے طریقہ، واردات کو کچھ کچھ سمجھ گئی تھی۔ وہ سمٹ سکڑ کر نشست کے آخری کونے میں دبک گئی۔ وہ بہت زیادہ سنجیدہ ہو گئی تھی۔

آبی نے اس کو یوں پیچھے ہٹتے دیکھا تو وہ بھی اپنی نشست پر جم کر بیٹھ گیا۔ سگریٹ اُس نے نیا سُلگا لیا تھا، بولا۔ "ہاشم صاحب اگر آپ تین لاکھ روپے اور لے آتے تو میرا خیال ہے ہم سارا مال خرید سکتے تھے یہ کتنی رقم ہے ڈھائی لاکھ کہ دو لاکھ؟" اُس نے میرا بریف کیس اپنے دائیں ہاتھ رکھ کر کھول دیا۔ بریف کیس میں بھری رقم اب سب کے سامنے تھی۔

"یہ چار لاکھ ہے۔" میں نے لاپروائی سے کہا، یوں جیسے وہ رقم بے معنی ہو، ہمارے لیے کوئی وقعت ہی نہ رکھتی ہو۔ آبی ــــ نے فوراً ہی ہپ کر کے بریف الگ رکھ دیا۔

"اب مجھے بینک کو فون کرنا پڑے گا کہ وہ تین لاکھ روپیہ فوراً سکھر منتقل کر دیں۔"

"کوئی بات نہیں پیرزادہ سیٹھ! یہ کون سا مشکل کام ہے۔ میں کراچی سے رقم منگوا لوں گا پیسے کی فکر نہ کریں آپ۔"

میں سمجھ رہا تھا کہ آبی اتنی بڑی بڑی رقموں کا ذکر اُس خاتون کو متاثر کرنے کے لیے ہی کر رہا تھا۔ اور آبی کی سوچ کی بلوغت نے اس وقت تو مجھے حیران ہی کر دیا جب میں نے دیکھا کہ وردہ بڑے غور سے ہماری باتیں سن رہی تھی۔ وہ متوجہ ہو رہی تھی۔ اور میرا خیال ہے کہ آبی نے اس کو یہی تاثر دینے کی کوشش کی تھی کہ وہ یونہی بھر بھونجوں سے مخاطب نہیں ہے بلکہ اس کے سامنے بڑے ساہوکار قسم کے لوگ بیٹھے ہیں۔ روپیہ جن کے لیے کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ وہ لاکھوں کی رقمیں یوں اُدھر سے اِدھر کر دیتے ہیں جیسے وہ پیلی کوڑیاں ہوں۔ وردہ کی خالہ بھی ہم دونوں کو اپنے سندھی پلنگ کے پائے ایسی موٹی بانہہ کی اوٹ میں سے بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ میں اُن کی گرسنگی کا اندازہ لگا رہا تھا۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ روپیہ اُن کی بھی سب سے بڑی کمزوری ہے۔

"خاتون! وہ مجرم پکڑے نہیں گئے تھے جنھوں نے آپ کے شوہر کو مار دیا تھا؟" میں نے اب کی بار براہ راست وردہ سے بات کی۔

"جی نہیں! ان کا کچھ پتہ ہی نہیں چلا۔ گھر میں جتنا روپیہ تھا وہ نکال کر لے گئے۔ کوٹھی ہم نے کرائے پر لی ہوئی تھی وہ بھی چھوڑنی پڑی۔ ڈاکٹر صاحب بینک میں کوئی رقم رکھنے کے سخت خلاف تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ میں تو بالکل قلاش ہو گئی۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ڈاکٹر صاحب کے کوئی عزیز کوئی کوئی کاروبار کے ساجھی بھی تو ہوں گے؟"

"جی ہاں! یہ انھی کی مہربانی ہے کہ میرا وقت گزر رہا ہے اب انھی کے پاس جا رہی ہوں۔"

"کون صاحب ہیں وہ! وہ بھی کوئی ڈاکٹر ہی ہوں گے"

"جی ہاں! وہ بہت مشہور ڈاکٹر ہیں ڈاکٹر دھمن ابڑ سرجن ہیں۔ کوئی تین چار دن پہلے وہ جدہ سے واپس آئے ابھی وہ کراچی میں قیام کریں گے۔ میں انھی کے پاس جا رہی"

"ڈاکٹر دھمن؟ ارے! یہ وہی ڈاکٹر تو نہیں ہیں جو گردے کے اپریشن کے ماہر ہیں؟" آبی نے پوچھا۔

"جی ہاں! میرے ہزبینڈ بھی کڈنی اسپیشلسٹ تھے دھمن صاحب کی تو بات ہی اور ہے۔"

"یار! یہ تو بہت ہی اچھا ہوا ہاشم صاحب میں اپنے گردے کی تکلیف کے سلسلے میں اُن سے مشورہ ضرور کروں گا دھمن سے۔" آبی نے خواہ مخواہ ہی اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا، یوں جیسے وہ اِس وقت بھی گردے کے درد میں مبتلا ہو۔

"میرا بھی یہی خیال ہے کہ آپ ڈاکٹر دھمن سے ملیں، یہ گردے کا درد اچھا نہیں ہوتا۔ کیوں خاتون آپ بتا سکتی ہیں کہ ڈاکٹر دھمن کراچی میں کہاں ٹھیرے ہیں؟" میں نے بات آگے بڑھائی۔ اپنے اُس دشمن کے ذکر پر میرا سارا بدن تپ گیا تھا اور سر میں دھماکے سے ہونے لگے تھے، وہ ایک مدت سے دل میں دبی کچلی انتقام کی خواہش ایک دم پورے قد سے اُٹھ کر سامنے آگئی تھی۔ اور مجھے یقین تھا کہ دھمن کے ساتھ اُس سے بھی میری ملاقات ضرور ہو گی۔

"وہ اُدھر اسٹار گیٹ کے قریب ٹھیرے ہیں۔ ... کی طرف مگر اُن کی رہائش کا مجھے صحیح علم نہیں ہے۔ ... ریلوے اسٹیشن پر لینے آئیں گی۔"

"ڈاکٹر دھمن کی بیگم! کیا نام ہے اُن کا؟"

"ڈاکٹر عالیہ۔ وہ بھی بہت اچھی سرجن ہیں۔" ... سیٹ پر رکھے بریف کیس پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ... ان نوٹوں پر مرکوز تھا جس کی جھلک ہم اُسے دکھا چکے تھے۔ جانے آبی نے کیسے یہ جان لیا کہ نوٹ اس عورت کی بڑی کمزوری ہیں۔ یوں تو ہر آدمی نوٹوں کا دیوانہ ہوتا ہے

لوگ ایسے ہوتے ہیں جنھیں وہ کچھ زیادہ ہی مرعوب ہوتے ہیں اور اُن نوٹوں کے لیے وہ بحرِ ظلمات میں بھی پاؤں ڈالنے سے گریز نہیں کرتے، بڑے سے بڑا خطرہ مول لینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں، اور وردہ ایسی عورتیں نوٹوں کے تعاقب میں ہر حد عبور کر سکتی ہیں۔ یہ آبی کا اندازہ تھا جو صد فی صد صحیح ثابت ہو رہا تھا۔

"آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے خاتون! ہم سکھر جا رہے ہیں اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میرے دوست کو اپنے ساتھ کراچی لے جائیں، یہ ڈاکٹر دھمن سے مشورہ کر لیں گے۔"

"مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے میں تو کراچی جا رہی ہوں" وردہ کے چہرے پر مسکراہٹ اُبھر آئی۔ میرا خیال ہے کہ وہ آبی کی آنکھوں میں جھلکتے قوسِ قزح ایسے رنگوں سے اُس کی دلی کیفیت کا اندازہ لگا چکی تھی اور سمجھ گئی تھی کہ اُس نے آبی کو باندھ لیا ہے۔ کبھی کبھی آبی اپنی آنکھ کے ایسے ایسے کرشمے دکھاتا تھا کہ میں اپنی جگہ سُن ہو کر رہ جاتا تھا۔ اس نے اپنا غیر مرئی اور لاسلکی پیغام وردہ کے دل میں اُتار دیا تھا۔ میں اُس روز پہلی بار اس نتیجے پر پہنچا کہ تمام حسین عورتیں اندر سے تھوڑی تھوڑی وہ ضرور ہوتی ہیں۔ اپنی آنکھ کے سحر سے، اپنے چہرے کی صباحت و ملاحت اور اپنے احمریں ہونٹوں کی چھلکتی شراب کی طاقت سے جب وہ کسی مرد کا بُرج اُلٹتا دیکھتی ہیں تو انھیں بے پناہ خوشی حاصل ہوتی ہے

"یہ میری خوش قسمتی ہے خاتون کہ آپ سے ملاقات ہو گئی ورنہ یہ میرا گردہ تو مجھے لے ڈوبا تھا۔ سمجھ دار لوگوں کے دل میں درد رہتا ہے کہ انھیں کسی کی آرزو ہوتی ہے مگر میرے گردے میں درد رہتا ہے۔ اب یہ ٹھیک ہو جائے گا۔" آبی نے بڑے ہی خوشگوار لہجے میں کہا۔

وردہ کچھ اور زیادہ کھل کر مسکرائی اور اپنی خالہ کی طرف دیکھ کر بولی۔ "یہ بیگ سر کے نیچے رکھ لو خالہ یہ تمھاری نازک سی گردن کہیں جھٹکے سے ٹوٹ ہی نہ جائے۔"

خالہ جاگ ہی رہی تھی۔ آنکھیں اُس نے یوں ہی موند رکھی تھیں، وردہ کا چرمی تھیلا سر کے نیچے رکھ کر بڑبڑائی "میرے ساتھ مذاق نہ کیا کر لڑکی! یہ میری اپنی گردن ہے۔"

"تو میں کب کہتی ہوں کہ تم نے کسی بینک سے اُدھار لی ہے ... کا زمانہ ہی نہیں ہے۔" وردہ شرارت سے مسکرائی۔ اُس کی تمام تر توجہ اب آبی پر مرکوز ہو چکی تھی۔

"ان کی گردن کی تو جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے' اس پر ہاتھ رکھ کر یں بالکل صراحی دار لگتی ہے مجھے۔" آبی نے وردہ کی بات آگے بڑھائی۔

وہ عورت ایک جھٹکے سے اُٹھ گئی اور بڑے غصے سے آبی کو دیکھ کر بولی۔ "یہ کیا بک بک لگا رکھی ہے تم نے میری گردن کے بارے میں۔" وہ بہت غصے میں تھی۔

"یہ ایسے ہی بکواس کرتے ہیں خانم! آپ کی گردن تو بھولو پہلوان ایسی ہے، اتنی مضبوط، اور اتنی سڈول گول۔" میں نے بیچ بچاؤ کراتے ہوئے کہا۔

"ہاں اسے تو گنڈاسے سے بھی نہیں کاٹا جا سکتا ہے اتنی مضبوط گردن ہے یہ۔" آبی نے دبی زبان میں کہا مگر اس عورت نے وہ لفظ سُن لیے۔

وہ ایک دم طیش میں آگئی، بولی۔ "یہ... یہ تم مجھے کس لیے ذلیل کر رہے ہو؟ یہ کیا معاملہ ہے لڑکی؟ انہیں کس نے یہ حق دیا ہے؟"

"یہ ایسے ہی دل لگی کر رہے ہیں خالہ! ہر بات کا اتنا بُرا نہیں مانا کرتے، آپ لیٹ جائیں آرام سے اب آپ اِن کے بارے میں کوئی بات نہیں کریں گے جناب!" وردہ نے ہمیں خبردار کرتے ہوئے کہا۔

"یہ لیں خالہ جان! مٹی ڈالیں اپنی گردن پر۔ یہ لیں سگریٹ پئیں۔" آبی نے اچانک بڑے ہی ڈرامائی انداز میں اس عورت کے پاس بیٹھ کر سگریٹ پیش کرتے ہوئے کہا اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس عورت نے ذرا سی پس و پیش کے بعد سگریٹ قبول کر لیا تھا۔

وردہ بھی حیرت زدہ سی ہو کر آبی کو دیکھ رہی تھی، بولی۔ "آپ نے کمال کر دیا ہے صاحب! آپ کو کیسے پتہ چل گیا کہ میری خالہ سگریٹ بھی پیتی ہیں۔"

"دل را دلی می شناسد۔ میرا دل کہتا تھا کہ خالہ جان کوئی نہ کوئی کام ضرور کرتی ہوں گی۔"

"کام کرتی ہوں گی! یہ اچھی رہی۔ آپ کے انداز سے حیران کن ہیں سیٹھ صاحب اب انہیں آرام کرنے دیں۔"

میں نے آبی کو اپنی جگہ پر واپس آنے کا اشارہ کیا مگر وہ وہیں جم کر بیٹھ گیا۔ بولا۔ "نہیں میں یہیں ٹھیک ہوں خالہ جان کے پاس، ان کی خدمت کرتا جاؤں گا۔" اچانک اس نے وردہ کے چرمی تھیلے کی جیب میں ہاتھ ڈال دیا اور وہاں سے تاش نکال کر بولا۔ "اب تو مزہ ہی آ جائے گا، آئیں مس وردہ! ہم تاش کھیلتے ہیں۔"

"ان کا نام جمیلہ ہے یہ میری منہ بولی خالہ ہیں۔ جب سے میرے ہزبینڈ کا انتقال ہوا ہے یہ میرا بہت خیال رکھتی ہیں۔"

"یعنی؟ آپ کے ہزبینڈ کی جگہ انھوں نے لے لی ہے؟" آبی نے کہا۔

"بس کچھ ایسی ہی بات ہے آؤ خالہ تاش کھیلتے چلتے ہیں۔ یہ

اچھے لوگ ہیں، اِن سے کیا تکلف کرنا۔" وردہ نے بڑے ہی بے ساختہ لہجے میں کہا۔ وہ آبی کی کسی بھی بات کا برا نہیں مان رہی تھی۔

مجھے بھی آبی کی وہ تجویز پسند آئی۔ ہم ایک ہی نشست پر بھر کر بیٹھ گئے۔ میرے حصے میں خالہ جمیلہ آئی۔ وہ میری ہانی بن گئی تھی۔ آبی نے وردہ کو اپنے 'عقد' میں لے لیا مگر ابھی ہم کھیل کے بارے میں فیصلہ نہیں کر پائے تھے کہ خالہ جمیلہ نے ترتیب بدل دی۔ اب اس کی پارٹنر وردہ تھی اور میرا شریکِ کار آبی۔ اس دھڑے بندی کے بعد جمیلہ بولی "گیم کون سی ہوگی؟"

"جو آپ پسند فرمائیں۔" آبی نے کہا۔

"میں تو فلیش کھیلتی ہوں اور رُوکھی سوکھی نہیں، نوٹ لگا کے کھیلنا پسند کرتی ہوں۔ منظور ہے تو کھیلیں ورنہ دفع کریں۔" آبی نے بڑے معنی خیز انداز سے میری طرف دیکھا۔ وردہ بولی "کیا ہرج ہے دو چار سو تو میں بھی داؤ پر لگا سکتی ہوں۔"

"ہمیں منظور ہے آپ پتے تقسیم کریں۔" آبی نے ان کے سامنے ہی بریف کیس کھول کر اس میں سے دو ہزار روپے نکال کر میرے آگے رکھ دیئے اور آدھے اس نے اپنے سامنے ڈال لیے۔

"خالہ جمیلہ نے ایک نرم سا بٹوہ نکال کر اس میں سے سو سو کے پانچ نوٹ الگ کر لیے۔ بولی "میں بس پانچ سو سے کم نہیں کھیلا کرتی کیوں لڑکی! تیرے پاس کیا ہے؟"

"میں یہ چار سو روپے قربان کر سکتی ہوں آپ پر خالہ جان!"

خالہ مُسکرا دی کھیل شروع ہوگیا۔ مجھے یہ محسوس ہوا کہ وہ دونوں اس کھیل میں بہت ہی ماہر ہیں۔ انہیں پتوں پر مکمل اختیار حاصل تھا۔ وہ اُن کی تقسیم سے لے کر اُن کے خرچ کے آخری مرحلے تک ہر معاملے میں بڑی باریک بینی کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ کچھ ہی دیر بعد مجھے محسوس ہوا کہ اُن کا پلڑا بہت بھاری ہے اور وہ مختصر سے عرصے میں ہم دونوں سے سات سو روپے جیت چکی تھیں، اور بے حد خوش تھیں خالہ جمیلہ تو بہت ہی چہکنے لگی تھی۔ تاش بار بار تقسیم ہو رہی تھی۔ میں اور آبی سات سو روپے ہار چکے تو ایک بازی شروع ہوگئی اور یہ دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ اِس بازی میں ہم نے نو سو روپے جیت لیے جس کا مطلب تھا کہ ہم نے اپنے سات سو تو واپس لے ہی لیے تھے، دو سو روپے اور بھی ان کے ساتھ آ ملے تھے۔ آبی کے تو سوکھے دھانوں پانی پڑ گیا، ورنہ وہ سمجھ رہا تھا کہ وہ دونوں عورتیں دہیں بیٹھے بٹھائے ہمارا ایشا اتار لیں گی۔

میں نے آبی کے پہلو کی جیب پر نظر ڈالی، وہ نوٹوں سے لبالب بھری تھی۔ اس نے دراصل جوش میں آکر بریف کیس سے پندرہ بیس ہزار کے نوٹ نکال کر کھیلنے کے لیے جیب میں ڈال لیے تھے۔ جب ہم نے نو سو روپے جیتے تو آبی نے تین سگریٹ سُلگا کر ایک مجھے اور ایک جمیلہ کو دے دیا۔ وہ پرانی پاپی بدمعاش عورتوں کی انگلیوں کی بنیادی پوروں میں سگریٹ پھنسا کر کش لینے لگی۔ تب مجھے یہ احساس ہوا کہ اگر وہ دونوں کسی بھی طور رشتے دار ہیں تو اُن کی سماجی سطح بہت ہی ادنیٰ اور ارذل، کسی اچھے خاندان یا طبقے سے تعلق نہیں رکھتی تھیں۔ وردہ کی میں کبھی کبھی عجیب سا بازاری عامیانہ پن جھلکنے لگتا تھا۔ یہی حال مگر حیرت مجھے یہ تھی کہ وردہ کو عرفان ایسا آدمی کہاں سے اس سوال کا ایک ہی جواب تھا کہ حسین عورت فی نفسہ اپنی سفارش ہوتی ہے وہ کسی بھی مقام پر پہنچ سکتی ہے کیونکہ مبتلا کر کے حسین عورت مرد کو اس کے مرکز سے اپنی مرضی جتنی دُور چاہے لے جا سکتی ہے اور اس وردہ نے عرفان یہی کیا ہوگا۔

کچھ ہی دیر بعد ڈائننگ کار کا بیرا ڈبے کے دروازے آ لٹکا۔ وہ کچھ دیر تک تو ہمیں بڑے غور سے دیکھتا رہا پھر بڑے ادب سے پوچھا کہ ہم چائے پئیں گے یا ٹھنڈا مشروب وردہ نے فوراً کہا "ہمارے لیے چائے لے آؤ بھیا ایک دم تازہ۔"

بیرے نے ہتھیلی پر مٹھی جما دی۔ وہ ڈبے کے سے ہٹا۔ اور کوئی دس منٹ بعد چائے لے آیا۔ بڑے خالہ جمیلہ اپنی جگہ وہ۔ بیرا بھی خاصا تیز گام تھا اس کی صورت کا ہلکا مجھے یاد رہ گیا۔ "لائیں میں چائے بناتی ہوں۔"

"یہ چائے کے برتن اِن کو دے دیں، یا اُم الصبیان حسین لوگوں کو ہی زیب دیتی ہے۔" آبی نے یونہی ترنگ بات کہہ دی مگر اس ایک لفظ نے سارا نقشہ ہی بدل دیا۔

خالہ آگ بگولہ ہو کر بولی "یہ کیا کہا ہے تم نے۔ اُم ہوگی تمہاری ماں، اُم الصبیان ہوگی تمہاری بہن، بدتمیز کہیں سمجھا کیا ہے تم نے مجھے، سارا راستہ مجھے تم ذلیل کرتے یہ نام بھی رکھ دیا ہے میرا، بدذات کہیں کا۔"

مگر آبی اور وردہ کا یہ حال تھا کہ ہنس ہنس کر اُن بھی دُکھنے لگی تھیں اور میں ہونقوں کی طرح کبھی اس موڈ دیکھتا تھا اور کبھی اُن دونوں کو جو تھوڑی سی مدت دُوسرے کے لیے تھی شکر ہوگئے تھے۔ وہ ہنستے ہی چلے خالہ جمیلہ نے وردہ کو ڈانٹتے ہوئے کہا "چپ ہو دوں ایک طمانچہ تیرے مُنہ پر۔" مگر وردہ پر کوئی اثر نہ ہوا۔

"آخر ہوا کیا ہے خالہ جان! یہ کیوں ہنس رہے ہیں اس طرح؟" میں نے اُن کی بے تُکی ہنسی سے عاجز آکر کہا۔

وردہ نے میری بات سنتے ہی کہا "جناب لطیفہ ایک زبردست لطیفہ! کچھ پتہ بھی ہے آپ کو کہ اُم الصبیان کسے کہتے ہیں؟" "بچوں کی ماں کو اُم الصبیان کہتے ہیں۔" میں نے لفظوں کی ساخت پر غور کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں جناب! اس کا مطلب ہے بچوں کی مرگی۔ اور خالہ جان عربی بہت اچھی طرح سمجھتی ہیں اس لیے ناراض ہوگئی ہیں۔"

"بہت ذلیل آدمی ہے یہ میرا دوست پیرزادہ۔ میں آپ سے معافی چاہتا ہوں خالہ جان۔" میں نے صورتِ حال کا اندازہ کرتے ہوئے فوراً بیچ بچاؤ کرانا چاہا۔

آبی نے خالہ جمیلہ کے آگے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ ہنستے ہنستے اس کی آنکھیں بہہ نکلی تھیں۔ اسی طرح وردہ نے بھی نہایت ہی معصومانہ انداز سے اپنے دونوں ہاتھ اپنی خالہ کے آگے جوڑ دیے مگر وہ بہت ہی بگڑی ہوئی تھی منہ سے کچھ نہیں بولی۔ بھوں بھوں کرتی ہوئی غسل خانے میں جا گھسی۔

"یار! یہ کیسی کیسی بے ہودگی سوجھ جاتی ہے تجھے، کیا ضرورت تھی تجھے اُن کو یہ خطاب دینے کی۔" میں نے آبی کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ہمارے پیشِ نظر جو مقصد ابھرا تھا اس کی لن ترانیوں کی وجہ سے اوجھل ہوا جاتا تھا۔ آبی میری طرف پلٹا اور بولا "یار ایسے ہی وہ لفظ میرے مُنہ سے نکل گیا پر وہ تو پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے ہی پڑ گئی وہ اِن کی لاڈلی خالہ جان۔" اس نے وردہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا وہ اُس وقت چائے بنانے میں مصروف تھی اور بہت سنجیدہ ہو گئی تھی۔

ابھی وردہ ہمیں چائے کی پیالیاں دے ہی رہی تھی کہ جمیلہ غسل خانے سے باہر نکل آئی۔ اس کی صورت پہلے ایسی غضبناک نہیں رہی تھی۔ وہ آئی اور نشست پر بیٹھ کر چپ چاپ چائے پینے لگی۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ مُنہ پر چھینٹے مار آئی ہے اس کے رخسار دھلے دھلے سے اور تر و تازہ نظر آ رہے تھے۔

چائے پی کر ہم ایک بار پھر تاش کھیلنے میں مصروف ہوگئے مگر کوئی پانچ ہی منٹ بعد مجھے محسوس ہُوا کہ میری آنکھیں مُندی جا رہی ہیں۔ سر بوجھل بوجھل سا لگنے لگا تھا۔ یوں جیسے نیند غالب آتی جا رہی تھی۔ بھلا وہ کون سا وقت تھا سونے کا اور پھر ابھی کوئی چند ہی منٹ پہلے ہم نے اتنی کڑک چائے پی تھی مگر میں نے دیکھا کہ وردہ بھی جھومنے لگی تھی۔ اس کی بھی آنکھیں مُندنے لگی تھیں۔

"یہ کیا ہو رہا ہے، آپ کو نیند آ رہی ہے؟" میں نے وردہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"پتہ نہیں مجھے کیا ہو رہا ہے، ارے یہ خالہ جان کو سنبھالیں، ہاشم صاحب!"

مگر ابھی میں کچھ نہ کر پایا تھا کہ وہ اُم الصبیان آبی کی گود میں گر گئی۔ وہ بالکل بے سُدھ ہو چکی تھی اور آبی بھی اپنے بس میں نہیں تھا وہ بھی آنکھیں میچ کر پیچھے جھول گیا تھا۔

"اِن کو سنبھالیں خانم۔۔۔۔۔ یہ۔۔۔" مگر ابھی میں اپنا فقرہ مکمل نہ کر سکا تھا کہ وردہ سیٹ سے لڑھک کر فرش پر جا گری لیکن اُس کو اٹھانے کے لیے سیٹ سے اُترا تو مجھے اب ہر شے گھومتی نظر آ رہی تھی۔ میں اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہو سکتا تھا۔ میں نے کوشش تو کی کہ خود کو سنبھال سکوں مگر پھر میری آنکھوں میں ترمرے سے ناچ گئے اور میں بے سُدھ ہو کر اوندھے منہ سامنے کی نشست پر جا گرا۔

جب میری آنکھ کھلی تو مجھے معلوم ہُوا کہ میں مُنہ کے بل گھاس پر پڑا ہوں اور میرے ارد گرد اونچی اونچی جھاڑیاں اُگی ہیں۔ میرے سر میں شدید درد اُٹھ رہا ہے اور بدن بالکل بھربھری مٹی کی طرح بے جان ہو چکا ہے۔ میں کتنی ہی دیر تک اسی طرح پڑا گرد و پیش کا جائزہ لیتا رہا، اور ماحول کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔

اچانک مجھے اپنے عقب میں زبردست شور اُبھرتا سنائی دیا۔ میں وحشت زدہ ہو کر اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ مجھ سے کوئی دس پندرہ قدم دور ایک ریل گاڑی پوری رفتار سے گزر رہی تھی۔ اس کے ہیبت ناک شور نے میرے اعصاب مسل کر رکھ دیے سورج غروب ہونے میں ابھی کچھ وقت باقی تھا۔

میرا ذہن آہستہ آہستہ صورتِ حال کو سمجھنے کے قابل ہو رہا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ آبی بھی میرے ساتھ تھا اور ایک خوبصورت عورت وردہ بھی میری ہم سفر تھی۔ اس کے ساتھ ایک فربہ اندام خاتون بھی تھی جسے آبی اُم الصبیان کہتا تھا۔ ہمارے پاس نوٹوں سے بھرا ہوا ایک بریف کیس بھی تھا، اور ہم چائے پی کر دوبارہ تاش کھیلنے لگے تھے اور ابھی ہم پتے سیدھے بھی نہ کر پائے تھے کہ ہم سب بے ہوش ہو گئے تھے۔ میرا سارا بدن پھوڑے کی طرح دُکھ رہا تھا۔ میرے سر میں یہ بڑا سا گومڑ اُبھر آیا تھا جو اس بات کی گواہی دیتا تھا کہ میرے سر میں کوئی شدید ضرب لگی ہے۔ میرا گھٹنا بھی زخمی تھا، جلد چھل چکی تھی اور اس میں سے خون رس رس کر خشک ہو گیا تھا۔ میری کہنی بھی کسی چیز سے رگڑی گئی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ سب کچھ ہوا کیسے۔ سب سے زیادہ پریشانی مجھے آبی کے بارے میں لاحق تھی وہ کہیں بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ گاڑی کا وہ آرام دہ ڈبہ خواب و خیال معلوم ہوتا تھا اور میری جو حالت تھی وہ میرے لیے معمہ بن گئی تھی۔

گاڑی گزر گئی تو ایک بار پھر اس ویرانے کے وجود پر یہاں سے

وہاں تک سناٹا چھا گیا۔ کئی سوال میرے ذہن میں اُبھرتے تھے مگر اُن کا کوئی جواب مجھے نہیں مل رہا تھا۔ نہ میرے پاس وہ بریف کیس تھا جس میں اتنی بڑی رقم میں بھارت سے اٹھا کر لے آیا تھا۔ میری اپنی جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی یہاں تک کہ سگریٹ کے لیے چار آٹھ آنے میسر نہ تھے۔ میں عرش سے فرش پر جا گرا تھا اس طرح کہ مجھ سے ہر شے چھن گئی تھی، یہاں تک کہ شاید ہوش و خرد بھی۔ کیونکہ مجھے کسی بھی معاملے کا صحیح اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔

میں جوں توں کر کے اپنی جگہ سے اُٹھا اور جھاڑیوں سے نکل کر ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ وہ علاقہ بہاولپور کے آس پاس ہی ہے اور مجھے وہ جگہ اپنی دیکھی بھالی نظر آتی تھی مگر کوئی بھولی بسری یاد میرے ذہن کو تازہ کر سکتی، مجھے کوئی ایسی شے نہ ملی۔ میں جوں توں کر کے اپنے پاؤں گھسیٹتا ہوا آگے بڑھا تو کوئی دو سو قدم دُور جا کر مجھے کسی کے کراہنے کی آواز آئی۔ کوئی شخص گھنی جھاڑیوں میں پڑا ہائے ہائے کر رہا تھا۔ میں لڑکھڑاتا ہوا اس کے پاس پہنچا تو میرا دل بیٹھنے لگا۔ میرے سامنے آبی اوندھے منہ پڑا تھا۔ یوں کہ اس کا سر زخمی تھا اور خون سے اس کے بال تر ہو رہے تھے۔ اس سے ذرا فاصلے پر ایک پتھر پڑا تھا اور اس کی ایک نوک پر خون کے دھبے نظر آ رہے تھے۔ معلوم یہ ہوا کہ آبی گاڑی سے گرا تو اس کا سر اس پتھر پر جا لگا۔ جس کی وجہ سے وہ شدید زخمی ہو گیا۔

”آبی! یہ کیا ہو گیا ہے تجھے؟“ میں نے اسے باہوں میں بھر کر کہا۔ میرے سامنے وہ آدمی نیم بے ہوش پڑا تھا جو مجھے سارے جہان سے زیادہ عزیز تھا۔

میری آواز سن کر آبی نے آنکھیں کھول دیں، یوں لگا جیسے اُس کی جان میں جان آ گئی ہو۔ اس نے مجھے دیکھا اور ایک بار دیکھ لینے کے بعد پھر آنکھیں موند لیں میرے بازو پر اس کی گرفت مضبوط ہو گئی بڑی ہی نحیف آواز میں بولا ”پانی۔ مجھے تھوڑا پانی پلا جیلانی!“ وہ مجھے پہچان چکا تھا اور ابھی اس کا ذہن اندھیروں کی نذر نہیں ہوا تھا۔ وہ خود کو سنبھالے ہوئے تھا۔

”ذرا دم لے، میں ابھی پانی لاتا ہوں۔“

یہ کہہ کر میں نے اسے بڑی احتیاط سے گھاس پر لٹایا اور اپنی کلفت بھول کر میں نے دُور دُور تک نگاہ دوڑائی۔ کچھ ہی فاصلے پر مجھے بکریوں کا ایک ریوڑ گزرتا نظر آیا۔ چرواہا ان بکریوں کو واپس لے جا رہا تھا۔ میں نے بلند آواز سے اسے پکارا اور جتنی تیزی سے ممکن تھا میں بھاگتا ہوا اس کی طرف لپکا۔ چرواہے نے میری تیسری آواز سُن لی اور بکریوں کو روکے بغیر وہ خود ٹھہر گیا۔ میں اس کے پاس پہنچا تو میرا دم بہت بُری طرح پھول رہا تھا۔ اس نے اپنا لمبا سا ”ڈانگا“ شانوں پر یوں ڈال رکھا تھا کہ اس کے دونوں بازو اس کے دائیں بائیں ٹنگے تھے۔

”کیا بات ہے جوان! خیر تو ہے!“

”خیر نہیں ہے بھائی! میرا دوست سخت زخمی ہے ہمیں کسی نے بے ہوش کر کے گاڑی سے باہر پھینک دیا ہے میرے دوست کو سخت پیاس لگی ہے اس کی کچھ مدد کرو“

”پانی تو یہاں آس پاس کہیں بھی نہیں ہے میری بکریاں پیاسی ہیں۔“

”تو پھر یوں کرو کہ کسی بکری کا دودھ ہی میرے دوست کو پلا دو۔ اُس کی پیاس بجھ جائے گی۔“

”ہاں یہ میں کر سکتا ہوں۔ تم مجھے مصیبت زدہ لگتے ہو“ یہ کہہ کر اس نے دوڑ کر ایک بکری روکی اور اُسے کھینچ کر ساتھ آبی کی طرف چلنے لگا۔ بکری کے تھن دُودھ سے اٹے تھے اور شام سر پر آ گئی تھی۔

جب آبی بکری کا آدھا دُودھ دھاروں کی صورت پی چکا تو اس کی آنکھیں کھل آئیں دودھ نے اس کے جسم پر معجزنما اثر کیا تھا۔ پہلو کی جیب سے ہاتھ ڈال کر آبی نے سو کی ایک گڈی باہر نکالی اور سو کا ایک نوٹ الگ کر کے اُس نے بکروان کی طرف بڑھا دیا۔ بولا ”جوان تیری یہ نیکی ایسی ہے کہ موتیوں سے تلنی چاہیے پر میری طرف سے یہ قبول کر لے ایک غریب بھائی کی طرف سے۔“ آبی کا لہجہ بہت ہی گلوگیر اور تشکر کے جذبات سے نم ہو رہا تھا۔

”نہیں یار! اس کی کیا ضرورت ہے، بکری کا دودھ حد سے ایک روپے کا ہو گا جو تو نے پیا ہے۔“

”رکھ لے جوان! ہمارا دل نہ توڑ۔ تیرے دودھ نے نئی زندگی دی ہے۔“ میں نے آبی سے لے کر نوٹ چرواہے کی جیب میں ڈال دیا۔

وہ خوش ہو گیا۔ اس وقت سو روپے کا نوٹ دیکھنے کی اُسے توقع ہی نہیں تھی مگر وہ اُسے مل گیا تھا۔ بڑے ہی میٹھے میں بولا ”جوان! تمھاری حالت اچھی نہیں ہے بہت زخمی ہو۔ چل سکو تو میرے ساتھ چلو میرا گاؤں اس ٹیلے کے پیچھے اُبھرا بھی۔ وہاں حکیم سے دوا بھی مل سکتی ہے۔“

”تو چلو پھر اسے ہم وہاں لے چلتے ہیں اس کا علاج بہت ضروری ہے تم چل سکتے ہو نا آبی!“

”ہاں یار! کوشش کرتا ہوں پر میرا سر ٹھہر نہیں رہا“

”ٹھہر جائے گا ذرا ہمت کر۔ جوانوں کو زخم تو لگا ہی کرتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

چرواہے نے آبی کو سہارا دے کر اپنے ساتھ لیا اور ہم آہستہ آہستہ ریوڑ کے ساتھ اُبھری گاؤں کی طرف بڑھنے لگے۔

راستے میں چرواہے نے ہمیں بتایا کہ اُس کا نام جعفر ہے اور اس نے جب سے ہوش سنبھالا ہے وہ اس جنگل میں بکریاں ہی چراتا آیا ہے۔ نسل در نسل اس کا یہی پیشہ ہے۔ اُس کی زبانی ہمیں اندازہ ہوا کہ ہم سمہ سٹہ سے کوئی بیس میل دُور ہیں۔ آبی کے سر کی چوٹ اُسے سنبھلنے نہیں دیتی تھی۔ حالت میری بھی بڑی ابتر تھی مگر مجھ سے کہیں زیادہ گہری چوٹیں آبی کے لگی تھیں۔ اگر اسے دودھ نہ ملتا تو شاید اس کے وجود کا نظام اندر سے درہم برہم ہو چکا ہوتا۔ آبی نے میری دوستی کی اس روز واقعی بہت بھاری قیمت ادا کی تھی۔ ایسے دیوانے بھلا کہاں ملتے ہیں جو اپنے یار کی خاطر اتنی ساری صعوبتیں سہہ کر بھی کہیں کہ اُن سے کچھ نہ ہو سکا۔ آبی میرے لیے تسلی کا پودا بنتا جا رہا تھا۔ گاؤں پہنچنے تک اُس نے خود کو بڑی حد تک سنبھال لیا تھا۔ اس کے وجود کی خفتہ توانائیاں اس کے کام آ گئی تھیں۔

جعفر ہمیں کھینچ کھانچ کر اپنے گھر لے گیا۔ ریوڑ اس نے گھر کے کھلے آنگن کے عین وسط میں بنی باڑھ کے حلقے میں داخل کیا اور ہمیں شام کے جھٹپٹے میں اپنی بیوی کے حوالے کر کے بولا ”ان کو ذرا پانی دھانی پلا شرفیے! میں حکیم صاب کو پکڑ لاؤں۔ یہ دونوں بھائی بہت زخمی ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ تیزی سے نکل گیا۔ سو کے نوٹ نے اُسے پگھلا کر رکھ دیا تھا۔

شرفی سر سے پاؤں تک کوئی بہت ہی میلی کچیلی دلدر عورت تھی۔ ایک پاؤں اس کا اندر کو مُڑا ہوا تھا۔ اس نے دیوار کے ساتھ لگی ایک جھلنگا سی چارپائی ہمارے لیے صحن میں ڈال دی وہ اتنی گندی تھی کہ دُور سے ہی اس کے کپڑے عجیب قسم کی بدبو پھیلاتے تھے۔ ہم دونوں سخت بدمزہ ہوئے۔ آبی نے تو منہ پر ہی کہہ دیا ”میری بڑی بہن! کبھی اپنے ان کپڑوں میں بھی پانی ڈال لیا کر۔ تیرا شوہر تو کتنا صاف ستھرا ہے پر تو کیوں گوبر میں بسی رہتی ہے؟ جا اندر بیٹھ۔“

آبی سے اس کے کپڑوں کی بساند برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ یوں منہ بنا رہا تھا جیسے ابھی ابکائی کر دے گا۔ طبیعت میری بھی مالش کرنے لگی تھی۔ ایسی بھی عورتیں اس دنیا میں موجود ہیں جن کو اپنے تن بدن کا بھی ہوش نہیں۔

شرفی نے آبی کی وہ پھٹکار سُنی تو جل بھن کر بولی ”تو کہاں کا بانکا شوکا آ گیا ہے میرے لیے سہرا باندھ کر۔ اٹھ دفع ہو یہاں سے۔ میں تیرے لیے سک سُرمہ لگا کر بیٹھی ہوتی تو تو خوش ہوتا۔ آنے دے اس بدمعاش کو، پوچھتی ہوں کس لیے لایا ہے تمھیں اور کتنے پیسے لیے ہیں اس نے ”جن پھروٹی“ (زن فروشی) کے۔“ وہ ایک دم آگ بگولا ہو گئی۔ وہ ہمارے سامنے ہی کھڑی تھی رنگ اس کا ہلدی ہو رہا تھا۔

آبی نے خدا جانے اس کے مرض کو کیسے پہچان لیا جل کر بولا ”جا اُدھر مٹی کھا بیٹھ کر۔ چولھے کی چکنی مٹی غلیظ عورت تجھے دیکھ کر قے آتی ہے مجھے۔ اس کے پیٹ میں لمبے لمبے کیڑے ہیں۔ پاؤ بھر مٹی کھا جاتی ہے یہ دن میں۔“ آبی کا شاید مغز پھر گیا تھا۔ وہ سمجھ ہی نہیں رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ وہ بس اچانک ہی بگڑ گیا تھا جیسے اُس نے کوئی بہت ہی ناقابلِ برداشت شے دیکھ لی ہو۔ حالانکہ ایسی گندی اور میلی کچیلی عورتیں ہمارے دیہات میں جا بجا ملتی ہیں۔ وہ خود فراموشی میں مبتلا عورتیں خاوندوں کی بے توجہی کی ماری ہوئی، اُن میں کچھ ساس گزیدہ ہوتی ہیں اور کچھ آس گزیدہ۔ ایسی آس گزیدہ جن کی اُمید کبھی بار آور نہیں ہوتی۔ اُن کی کوکھ انہیں بار بار مایوس کرتی ہے، ایسے میں وہ عورتیں ہر شے سے بے نیاز ہو جاتی ہیں یہاں تک کہ شام و سحر کی گردش سے بے خبر رہنے لگتی ہیں۔ اپنے وجود سے وہ یوں اپنی محرومیوں کا انتقام لیتی ہیں کہ وہ اس کی ہر ضرورت سے منہ پھیر لیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک مرحلے پر ایسی بن جاتی ہیں جیسی وہ شرفی ہمارے سامنے کھڑی تھی۔

آبی کی وہ لتاڑ شرفی سے سہی نہ گئی۔ اس کی آنکھوں میں یہ بڑے بڑے آنسو اُبل آئے اور وہ ہمیں گندی گالیاں دیتی ہوئی کوٹھری میں جا گھسی۔ میرا خیال ہے اُسے کسی نے آج تک یوں پہلے ہی مرحلے میں اس قدر ذلیل نہیں کیا ہو گا۔ مگر وہ سب کچھ بس لمحے کی نوک پر چڑھ کر ہو ہی گیا۔ ہمارے اور اُس کے درمیان نفرت کی کھولتی خلیج حائل ہو گئی۔ ہمیں کوئی حق نہیں پہنچتا تھا کہ اس کی عیب جوئی میں لگ جائیں مگر آبی کو خدا جانے کیا سوجھی وہ بس اسے دیکھتے ہی برافروختہ ہو گیا تھا۔

”تم نے اچھا نہیں کیا ہے آبی! کیا ضرورت تھی اس بچاری کو یوں پریشان کرنے کی؟“

”میں... میں ایسی عورت کا وجود برداشت نہیں کر سکتا ہوں جیلانی! میری... میری ایک پھوپھی تھی ایسی ہی۔ اس کے انجام کو میں آج تک نہیں بھول سکا ہوں، اسے بالآخر طلاق ہو گئی تھی۔ وہ بھی اتنی ہی بھوتنی بنی رہتی تھی۔ طلاق لے کر وہ ہمارے گھر واپس آئی تو اللہ بخشے میرے باپ نے اُسے بہت سمجھایا کہ وہ یوں گندی نہ رہا کرے مگر وہ کچھ نہیں سُنتی تھی۔ گھر میں جھگڑا اتنا بڑھا کہ ایک دن میرے جنتی باپ نے اُسے بہت مارا۔ اتنا مارا کہ وہ لہولہان ہو گئی پھر وہ اسی حالت میں گھر سے نکل گئی کوئی

چھ دن بعد پتہ چلا کہ اس نے نہر میں کود کر جان دے دی ہے۔ میں... میں ایسی عورت کے سائے سے بھی سمجھوتہ نہیں کر سکتا ہوں جیلانی!" آبی ابھی تک بڑے طیش میں تھا اور مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی طبیعت پہلے سے بہت بہتر ہو چکی ہے، اس کے سر سے خون اب نہیں بہہ رہا تھا بلکہ زخم پر ایک کھرنڈ سا بن گیا تھا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو آبی! مگر ہمیں یہاں رات کاٹنی ہے۔"

"لعنت بھیج! رات کون کاٹتا ہے یہاں، ہمیں وہ گاڑی پکڑنی ہے اُستاد! جس میں سے ہمیں باہر گرا دیا گیا ہے۔"

"وہ کس طرح؟ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا ہے یار!"

"اس میں نہ سمجھنے کی کیا بات ہے پیارے۔ میرا خیال ہے کہ اس بیرے نے چائے میں کوئی نیند آور شے ملا دی تھی۔ چائے پیتے ہی ہم چاروں خانے چت ہو گئے۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں ہمارے ساتھ اس بیرے نے ہی بدمعاشی کی ہے۔"

"ہاں بھئی! مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ کئی بار اس دروازے کے سامنے سے ہٹک کر گزرا تھا وہ بیرا۔ اور بار بار وہ ہمیں بڑے غور سے دیکھتا رہا۔ اس کو تو میں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے ایک منصوبے کے تحت ہمیں بے ہوش کیا تھا۔"

"ہاں بھئی! بریف کیس میں بھرے نوٹ اس نے دیکھ لیے ہوں گے۔ یہ تو خدا کا شکر ہے کہ دو گڈیاں میں نے پہلو کی جیب میں ڈال لی تھیں۔ اور اس نے افراتفری میں میری تلاشی نہیں لی۔ ورنہ تو ایک دھیلا بھی پاس نہ ہوتا اس وقت۔"

"یار! یہ تو ہمارے ساتھ بہت ہی بُری ہوئی۔ ایک تو وہ عرفان کی بیوی ہمارے ہاتھ سے نکل گئی۔ اس کے ذریعے ہم اس دشمن تک پہنچ سکتے تھے اور دوسری طرف ہم رقم بھی گنوا بیٹھے۔ کیا کہتے ہیں اس فعل کو جو ہمارے ساتھ ہو گیا ہے۔"

آبی مسکرا دیا۔ ماتھے کو دونوں ہاتھوں سے دباتے ہوئے بولا۔ "یار! یہ میرے سر میں ٹھہر ٹھہر کر درد سا اٹھتا ہے اور وہ حکیم ابھی تک نہیں آیا۔"

"آ جائے گا! آتا ہی ہو گا ویسے اب تیری حالت پہلے سے بہتر ہے دودھ نے بچا لیا تجھے۔"

"بکری کا دودھ میرے لیے اکسیر ہے یار! بچپن میں میں چار چار بکریوں کا دودھ ایسے ہی دھاروں دھار پی جایا کرتا تھا۔ میرا یار تھا نا وہ بہادر علی، اس کے باپ نے ایسے ہی شوقیہ طور پر پندرہ بیس بکریاں پال رکھی تھیں۔ میں اور بہادر ان میں سے چار کا دودھ بالٹی میں نہیں اترنے دیتے تھے۔ ہائے! کیا دن تھے وہ بھی جیلانی۔" اس نے اپنا سر ایک بار پھر پوری قوت سے دبایا پھر جیب میں ڈال کر بولا "اوئے ادھر تو سگریٹ بھی موجود ہیں۔ اس خنزیر کی اولاد نے میری جیب مجھے بخش دی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے ایک سگریٹ مجھے دے کر ایک اپنے منہ میں رکھ لیا۔ اب سوال ماچس کا تھا وہ اس کی جیب میں موجود نہیں تھی۔

"سگریٹ سلگائیں کیسے؟" وہ بڑبڑایا۔

"اس شرفی سے کہہ، آگ تو ہو گی اس کے گھر میں۔"

"میں اس چڑیل کی صورت نہیں دیکھنی چاہتا۔ وہ دیکھ… کے پاس دیوار کے طاق میں ماچس رکھی ہے وہ اٹھا لا۔" صحن… ہوئی شام کی سرمئی سی روشنی میں اس نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا… نے اٹھ کر وہ ماچس اٹھائی تو اتنے میں جعفر ایک سکول ماسٹر قسم… آدمی کو لے کر اندر آ گیا۔ وہ شلوار قمیض پہنے تھا اور سر پر اس… سفید ململ کی دستارِ فضیلت بڑے اہتمام سے باندھ رکھی تھی… اس آدمی کی یہی کوئی پچاس پچپن کے قریب ہو گی مگر اس کی… قابل رشک تھی۔ اس نے ہاتھ میں ایک چرمی تھیلا پکڑ رکھا تھا۔

جعفر نے اس کی سہولت کے لیے سرسوں کے تیل کا چراغ جلا کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔ شام کا اندھیرا آہستہ آہستہ روشنی کے… کو مٹاتا جا رہا تھا۔ اس آدمی نے جس کا نام دیدار علی تھا آبی کے… کا معائنہ کیا۔ اور پھر اس کو صاف کر کے اس پر سرخ رنگ کا… چھڑک کر اس پر پٹی باندھ دی۔ اس دوا کی تاثیر حیرت انگیز تھی۔ آبی کے چہرے پر پھیلی وہ انقباض کی کیفیت… ختم ہو گئی۔ حکیم نے وہیں کھڑے کھڑے ایک گلاس میں گھول… کوئی دوا آبی کو پلا دی۔ پھر وہ میری طرف متوجہ ہوا۔… وہ آدمی بہت ہی کم کرتا تھا۔ اپنے مریض سے منکر نکیر ایسے سوال… بھی وہ نہیں پوچھتا تھا۔ مرض اور اس کے سبب کو وہ خود… کوشش کرتا تھا۔ میری چوٹیں اتنی ظاہر نہیں تھیں۔ سر کے… پر البتہ اسے تشویش ہوئی۔ علاج کے طور پر اس نے مجھے… پانی میں حل کر کے ایک دوا پلا دی۔ کسی حکیم کے دستِ شفا کا… میرا پہلا تجربہ تھا۔ یہ دیکھ کر تو میں ششدر رہ گیا کہ اس معجزہ… نے میرے جسم پر تریاق ایسا اثر کیا۔ سر میں ٹھہر ٹھہر کر درد کی… چنگاری سی سلگتی تھی وہ ایک دم بجھ گئی مجھے اپنے بدن میں… طرح کا سکون پھیلتا محسوس ہوا۔ حکیم دیدار علی کی اس… ہم کبھی نہ بھول سکیں گے۔ اکھڑ بخی کا وہ گاؤں ہمیشہ میرے… کے تاریک گوشوں میں تابناک جزیرے کی طرح محفوظ… کہ اس دور افتادہ گاؤں کے گوشۂ گمنامی میں ایک گوہر… بڑی خاموشی سے اپنے گرد و پیش کو منور کیے ہوئے تھا…

آبی کا جذبۂ تشکر حد سے بڑھ گیا تھا، بولا "ہم آپ کا کس منہ سے شکریہ ادا کریں۔ حکیم صاحب! آپ صاحبِ کمال آدمی ہیں آپ کی دوا تریاق کا اثر رکھتی ہے۔"

"یہ میرے پروردگار کی نوازش ہے جناب کہ اس نے آپ کو شفا بخش دی۔ ان دواؤں میں اثر اسی نے رکھا ہے میں تو محض ایک ذریعہ ہوں جناب! ایک وسیلہ ہوں۔ باری تعالیٰ کی رحمت دراصل آپ پر ہے کہ اسے آپ کی صحت منظور ہے۔"

"آپ بجا فرماتے ہیں حکیم صاحب! اللہ آپ کو خوش رکھے یہ لیں یہ حقیر سی رقم میری طرف سے بطور نذرانہ رکھ لیں۔" یہ کہہ کر آبی نے پانچ سو روپے کے پانچ نوٹ جیب سے نکال کر حکیم صاحب کی مٹھی میں دے دیے۔

حکیم صاحب نے وہ رقم دیکھی تو گھبرا گئے، بولے "جناب! میں صرف پانچ روپے لے سکتا ہوں۔" حکیم صاحب نوٹ واپس کرنے لگے۔

"نہیں جی ایسا نہیں ہو گا یہ لیں یہ پانچ سو اور رکھ لیں، اور اسے غریبوں کے دوا دارو پر صرف کر دیں، مجھے حیرت ہے کہ آپ ایسے پڑھے لکھے اور اتنے مہذب آدمی کا یہاں کیسے گزارا ہوتا ہے۔" یہ کہہ کر آبی نے ایک ہزار کے نوٹ حکیم صاحب کی جیب میں ڈال دیے۔ وہ بیچارے دیے کی نحیف و نزار روشنی میں ہمیں بس دیکھتے ہی رہ گئے۔ کوٹھری کے دروازے پر شرفی بھی عجیب سی نظروں سے ہمیں دیکھ رہی تھی جیسے اسے اپنی سماعت اور بصارت پر اعتبار نہ آ رہا ہو۔

"آپ نے میری جو عزت افزائی ہے اس کو میں کبھی نہ بھول سکوں گا، زحمت نہ ہو تو اس وقت کا کھانا آپ میرے غریب خانے پر کھا لیں۔"

"حکیم صاحب ٹھیک بولتے ہیں بھائی جی! آپ کے لائق کھانا تو ان کے گھر ہی مل سکتا ہے۔ میری بیوی تو بس گزارے کا ہی پکا سکتی ہے۔" جعفر نے ہماری میزبانی سے دستکش ہوتے ہوئے کھری بات کہی۔ اسے 'شرفی' کی سلیقہ شعاری کا بھرپور احساس تھا۔

ہم اسی وقت اٹھ کر حکیم دیدار علی کے ساتھ اس کے گھر پہنچ گئے اس کا گھر بھی عام دیہاتی گھروں ایسا کچا گھر تھا مگر وہ سلیقے سے لپا پتا نظر آتا تھا۔ صحن بھی ایسا تھا کہ اس کے چاروں طرف ہری ہری گھاس نظر آتی تھی جیسے حکیم صاحب نے وہاں اپنی کسی بہت بڑے لان کی آرزو پوری کر رکھی ہو۔ ان کے گھر میں بڑی بڑی لالٹینیں جلتی تھیں۔ بچے ان کے چار تھے اور سب سے بڑے لڑکے کی عمر یہی کوئی چودہ سال ہو گی۔ ان کے گھر میں آسودگی اگر نہیں تھی تو اتنی عسرت بھی نظر نہیں آتی تھی۔

حکیم صاحب نے ہمارے لیے ایک مرغی ذبح کروا لی۔ جب ہم کھانے سے فارغ ہوئے تو آبی بولا "حکیم صاحب زخم پر لگانے کے لیے دوا ہمیں دے دیں۔ ہم آج ہی سمہ سٹہ جانا چاہتے ہیں اور ابھی۔"

"مگر کیسے؟ کوئی سواری تو ہونی چاہیے آپ کے پاس۔"

"کوئی سڑک تو ہو گی ادھر ہم بس میں بیٹھ جائیں گے۔"

"اگر آپ کو ایسی ہی جلدی ہے تو میں آپ کو گھوڑی لے دیتا ہوں آپ اس پر بیٹھ کر چلے جائیں۔"

"مگر وہ گھوڑی ہم واپس کیسے کریں گے حکیم صاحب؟"

"مالک اپنی گھوڑی پر آپ کے ساتھ جائے گا۔ شہر پہنچ کر سواری اُسے دے دیں۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے آپ اس کا بندوبست کر دیں۔"

رات کو دس بجے کے قریب ——— جب ہم اکھڑ بخی سے نکلے تو ہمیں شدت سے یہ احساس ہو رہا تھا کہ ہم دو نہایت ہی مخلص اور مہمان نواز آدمیوں کی صحبت سے محروم ہو رہے ہیں۔

سمہ سٹہ پہنچ کر ہمیں معلوم ہوا کہ تیز گام کو وہاں سے نکلے پانچ گھنٹے گزر چکے ہیں۔ وہ گاڑی بعض نامعلوم وجوہ کی بنا پر سمہ سٹہ اسٹیشن پر کئی گھنٹے کھڑی رہی۔ گاڑی کے بارے میں یہ سب معلومات اسٹیشن سے باہر ایک ریلوے ملازم سے حاصل کر رہے تھے۔ اس اسٹیشن پر گاڑی اتنی دیر ٹھہرنے کے اصل سبب کا اس بابو کو بھی علم نہیں وہ ہم سے پلا چھڑا کر آگے بڑھ گیا۔ اس وقت اسٹیشن کا ایک قلی ہمارے قریب ہی کھڑا ہماری باتیں سن رہا تھا۔ وہ بابو جونہی آگے نکلا وہ قلی بولا "ادھر آئیں بابو جی! میں بتاتا ہوں آپ کو کہ اصل وجہ کیا ہے۔" یہ کہہ کر وہ ہمیں ایک بینچ پر بٹھا کر بڑے غور سے دیکھتے ہوئے بولا "بابو! اس گاڑی میں سے ایک عورت کی لاش برآمد ہوئی ہے وہ فسٹ کلاس کے ڈبے میں سفر کر رہی تھی۔"

"لاش! یہ تم کیا کہہ رہے ہو یار؟"

آبی نے بڑی ہی بے صبری سے پوچھا۔ میں نے اس کا کندھا تھپتھپا کر اسے اطمینان سے بات سننے کی تاکید کی۔

"بڑا ظلم ہوا ہے بابو جی اس عورت کے ساتھ بدمعاشوں نے پہلے تو اس کے ساتھ منہ کالا کیا اور پھر اس کا گلا گھونٹ کر مار دیا۔ اس کی لاش غسلخانے میں سے ملی ہے۔ بھنگی ادھر سمہ سٹہ اسٹیشن پر صفائی کے لیے اندر گیا تو اس نے وہاں اس بدنصیب کو دیکھا تھا۔"

"یہ... یہ تو بہت برا ہوا یار! گاڑیوں میں ایسے ایسے ظلم بھی ہوتے ہیں مسافروں کے ساتھ۔ کوئی جوان اور خوبصورت عورت ہو گی وہ۔"

"نہیں جی! ادھیڑ عمر کی عورت تھی مگر بہت فیشن دار تھی۔

پولیس نے بڑی تفتیش کی ہے مگر مجرم بھلا کہاں ہاتھ آتے ہیں۔ پر آپ کیوں اتنے فکر مند ہو گئے ہیں جناب!" قلی نے ہمیں بڑے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"بات ہی پریشانی کی ہے بھائی! پتہ نہیں وہ بدنصیب عورت کون تھی اور کن کے ہتّے چڑھ گئی۔"

"میرا خیال ہے کہ اس عورت سے آپ کا کوئی بہت قریبی تعلق تھا۔ آپ کا تردّد یہی ظاہر کرتا ہے۔" قلی نے بڑے ہی جمے ہوئے لہجے میں کہا۔

اس کی یہ بات سن کر پہلی بار مجھے اُس قلی کے قلی ہونے پر شک گزرا۔ سمہ سٹہ جیسی جگہ پر اس قلی کی وہ صاف ستھری شستہ سی اردو میرے لیے باعث حیرت تھی۔

"ہاں! وہ میرے ماموں کے بھانجے کے سالے کی سالی تھی قلی مہاراج! اور بھی تعلق بتائیں ہم اپنا اس سے؟ تم خواہ مخواہ ہی افلاطون بن رہے ہو۔" آبی نے تنک کر کہا۔ میں بھی قلی کی طرزِ تکلّم سے چڑ گیا تھا اور میرا دل چاہتا تھا کہ میں اُس کے منہ پر ایک جھانپڑ دے ماروں۔ آبی کی یہ بات سنتے ہی وہ قلی بڑے اعتماد سے مسکرایا اور جیب سے ایک چکنا تعارفی کارڈ ہمارے سامنے کر کے بولا "براہِ کرم میرے ساتھ تھانے چلیے ہمیں آپ سے تفصیلی تعارف حاصل کر کے دلی خوشی ہو گی۔" وہ قلی خفیہ پولیس کا انسپکٹر تھا، اور اُسے اس واردات کا سُراغ لگانے کا فرض سونپا گیا تھا۔

اُس وقت اسٹیشن پر خاصی گہما گہمی تھی۔ ایک گاڑی اندر آ کر مسافروں کو اُگل چکی تھی اور نگل بھی رہی تھی۔ اس قلی کی اصلیت معلوم کر کے تو ہم بھونچکا سے رہ گئے۔ اس نے اپنی سرخ قمیض کا دامن ذرا سا اٹھا کر دکھلاتے ہوئے کہا "یہ بگڑے تگڑے لوگوں کا پیر استاد بھی میرے پاس موجود ہے۔"

اُس نے اپنی کمر سے پستول باندھ رکھا تھا جس کے بارے میں ہمیں یقین تھا کہ وہ گولیوں سے لبالب بھرا ہوا ہو گا۔

"یہ اچھی رہی! کوئی آدمی کسی ایسی خوفناک واردات کے بارے میں پوچھ بیٹھے تو وہ آپ کی نظروں میں مشتبہ ہو جاتا ہے۔" آبی نے یہ بات لفظوں کو بہت چبا چبا کر کہی، وہ قلی ایک جھٹکے سے اُٹھ بیٹھا بڑے ترش لہجے میں بولا "میرے ساتھ چلیں جناب! جو کچھ کہنا ہے تھانے چل کر کہیں۔"

"کیوں نہیں! کیوں نہیں! اپنے سسرال جانا کون پسند نہیں کرے گا میرے بھائی۔ چل دیکھتے ہیں تو نے شرفا کے لیے کون سی توپ گاڑ رکھی ہے وہاں۔" یہ کہہ کر آبی اس کے ساتھ ہو لیا۔ مجھے بھی کوئی اور چارۂ کار نظر نہیں آتا تھا۔ ہم جب اسٹیشن کے بیرونی احاطے کی بائیں سمت قدرے اندھیرے میں پہنچے تو میں نے بڑے ہی غیر محسوس طریقے سے اُس قلی زادے کے کندھے پر رکھ کر کہا "آپ کو ہمارے ساتھ یہ توہین آمیز سلوک بہت مہنگا پڑے گا جناب خفیہ انسپکٹر صاحب! آپ کو پتہ ہے کہ ہم کون لوگ ہیں اور کیا کچھ کر سکتے ہیں۔"

"میں نے اسی لیے تو کہا ہے جناب کہ آپ سے تفصیلی تعارف حاصل کر کے ہمیں دلی خوشی ہو گی۔"

یہ کہہ کر اس نے میرا ہاتھ پرے ہٹانے کے لیے اپنا بازو بلند کیا۔ اس وقت ہم ایک دیوار کی اوٹ میں چل رہے تھے اور پلیٹ فارم وہاں سے خاصے فاصلے پر تھا۔ اس نے بازو اٹھایا ہی تھا کہ آبی نے اس کی گردن پر ہاتھ رکھ کر پوری قوت سے اس کی رگ ابھری مسل دی۔ نتیجہ حسبِ منشا نکلا۔ وہ قلی انہی قدموں ڈھیر ہو گیا۔ چند لمحوں کے لیے اُسے اوٹ میں لیے وہاں کھڑے رہے۔ وہ دیوار کے ساتھ یوں لگا تھا جیسے دم لینے کے لیے کوئی بوجھ تلے مرتا قریب جگہ بیٹھ گیا ہو۔ کچھ ہی فاصلے پر ایک اور قلی گزر رہا تھا میں نے اُسے آواز دے کر بلایا۔ وہ دوڑتا ہوا آیا تو میں نے کہا "دیکھ یہ دیکھ تو، یہ آدمی مجھے کچھ بیمار لگتا ہے، چلتے چلتے بے ہوش ہو گیا ہے تمھارا پیٹی بند بھائی ہے اسے سنبھالو۔"

وہ آدمی فوراً ہی اس قلی زادے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "یہ۔۔۔ اِسے کیا ہو گیا ہے، اوئے کیا نام ہے بھئی تیرا؟ یہ بھی چار سو بیس لٹکا رکھا ہے اس نے۔"

"اسے سنبھال یار! ہم اُدھر سے کسی ڈاکٹر کو بھیجتے ہیں۔" کہہ کر میں نے آبی کو اپنے ساتھ لیا اور انہی قدموں لوٹ کر اسٹیشن کے بیرونی احاطے کی دوسری طرف سے ہوتے ہوئے نکل گئے۔ ہم ہر قیمت پر اس گاڑی کو پکڑنا چاہتے تھے جس سوار ایک بیرے نے ہمیں ذلیل کر کے رکھ دیا تھا۔ ہم بھول گئے کہ ہم کس کام کے لیے کس طرف نکلے تھے۔ سکھر کا نام کچھ دیر کے لیے ہمارے ذہنوں سے بالکل ہی اُتر گیا۔

وہ شہر ہم نے پہلی بار دیکھا تھا۔ کسے معلوم تھا کہ کون سا راستہ کدھر جاتا ہے اور پھر رات کے اس تیرہ بخت لمحے میں ہر قدم پر بہت احتیاط کی ضرورت تھی کیونکہ ہم اپنے پیچھے ایک قلی زادے کو بے ہوش کر آئے تھے۔ ہم کتنی ہی دیر تک اِدھر پھرتے رہے مگر ہمیں کوئی ایسی ٹیکسی کار نہ مل سکی جس سے کہ ہم تیز گام کا تعاقب کر سکتے۔

آبی جھنجھلا سا گیا، بولا "یار! ویسے ہی کوئی گاڑی کسی گراج سے نکال لے۔"

"مگر چابی کہاں سے لیں گے ہم۔ اِدھر وقت بھی تیزی سے گزرتا جا رہا ہے۔"

"یار! میری بات سن، اس ریل گاڑی کو تو رکوا۔ ہمارے پاس بڑا معقول جواز ہے۔" آبی نے اسٹیشن کی طرف اپنا رُخ موڑتے ہوئے کہا۔

"مگر گاڑی ہم کیسے روک سکتے ہیں؟"

"آ اُدھر ہوٹل سے میں فون پر کسی سے بات کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر آبی مجھے اسٹیشن کے قریب ایک ہوٹل میں لے گیا وہاں فون موجود تھا۔ آبی نے فوراً ہی ریلوے پولیس اسٹیشن سے رابطہ قائم کیا اور بڑے پُراعتماد لہجے میں بولا "کیا میں کسی ذمہ دار افسر سے بات کر سکتا ہوں؟"

"اچھا اچھا آپ انسپکٹر ہیں انسپکٹر عارف! دیکھیں میرا نام ایس جی ایم پیرزادہ ہے۔ تیز گام میں سے جو لاش سمہ سٹہ اسٹیشن پر برآمد ہوئی ہے میں اس کے بارے میں کچھ کہوں گا۔"

آبی کی یہ بات سنتے ہی میں نے آبی سے فون جھپٹ لیا۔ وہ اس مسئلے کو پولیس کے ہاتھ میں دے کر رقم سے بھی ہاتھ دھو رہا تھا اور مجھے اس نے انتقام کی سعادت سے محروم کر دیا تھا۔

"دیکھیں انسپکٹر صاحب یہ بہت راز کی بات ہے۔ فون پر ہم نہ کہیں تو بہتر ہے ہم خود آپ کے پاس تھانے پہنچ رہے ہیں۔ آپ بہرحال تیز گام جہاں بھی ہے اسے روک لیں۔ مجرم ابھی تک اس میں موجود ہے اور ایک جوان عورت اُن کے قبضے میں بھی ہے۔" یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔

آبی پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے یوں دیکھ رہا تھا جیسے اس کو اپنی سماعت پر اعتبار نہ آ رہا ہو۔ میں اسے ہوٹل سے گھسیٹ کر باہر لے آیا تو وہ اپنا ہاتھ چھڑا کر بڑے روکھے لہجے میں بولا "تیرا دماغ آج کل کام نہیں کر رہا ہے جیلانی! وہ گاڑی کراچی سے ادھر روک لیں گے تو ہم بیرے کو جا پکڑیں گے۔"

"یہ بات نہیں ہے بچے! پولیس اُسے پکڑ کر رقم برآمد بھی کروا لے گی تو بھی ہم اسے حاصل نہیں کر سکتے۔ ہم کیسے ثابت کریں گے کہ ہم کون ہیں اور اس بریف کیس سے ہمارا کیا تعلق ہے۔ پولیس کے سامنے تو ہم جا ہی نہیں سکتے ہیں آبی اور پھر بیرے کو پولیس نے پکڑ لیا تو ہم اس سے انتقام کیسے لے سکیں گے! یہ بھی تو سوچ۔"

آبی کچھ جھینپ سا گیا، بولا "تو ٹھیک کہہ رہا ہے یار! تیری عقل کے بارے میں میرے اکثر شکوک کچھ بے بنیاد ہی ثابت ہوئے ہیں۔ کیونکہ ابھی تک تیرا دماغ صحیح کام کر رہا ہے۔" آبی میں سب سے بڑی خوبی یہی تھی کہ وہ اپنی غلطی فوراً تسلیم کر لیتا تھا اور جب وہ بہت خوش ہوتا تو نیا سگریٹ سلگا کر خود بھی پیتا تھا اور مجھے بھی پیش کر دیتا تھا۔

ابھی ہم ہوٹل کے سامنے ہی کھڑے تھے کہ ایک سفید رنگ کی کار ٹیونا، وہاں آ ٹھہری۔ اُس میں سے دو آدمی باہر نکلے۔ وہ دونوں کوئی بہت ہی زیادہ پڑھے لکھے آدمی معلوم دیتے تھے آدمی کا چہرہ اور لباس اُسکی شخصیت کے سب سے بڑے آئینہ دار ہوتے ہیں وہ بڑے نپے تُلے قدم اٹھاتے ہوئے ہوٹل کے استقبالیہ میں جا گھُسے تو آبی دبے پاؤں چلتا ہوا کار کے پاس جا پہنچا۔ اُس نے ایک نظر گاڑی کے اندر ڈالی اور مجھے اشارہ کر کے تیزی سے دروازہ کھول کر اس کے قریب جا بیٹھا۔ گاڑی کی چابی اگنیشن میں لگی ہمیں دعوتِ عمل دے رہی تھی۔

اگلے ہی لمحے آبی نے گاڑی اسٹارٹ کر کے پیچھے ہٹائی اور پھر اُسے موڑ کر بلا خیز رفتار سے بڑی سڑک پر جھپٹا۔ کار میں موسیقی کا بھی معقول انتظام تھا۔ آبی نے فوراً ہی ہاتھ مار کر ٹیپ چلا دی۔ ایک بڑی میٹھی ملکوتی سی اشتعال انگیز آواز گا رہی تھی۔

"سانوں کنداں توں ماری آئی اَکھ وے
ساڈے آٹے دے وچ مُٹھ وے
لٹھے دی چادر اُتے سلیٹی رنگ ماہیا
آ بوہ سامنے کولوں دی رُس کے نہ لنگ ماہیا"

"بند کر یار اس بدمعاش عورت کی یہ بکواس۔ دو چار بچے اس کی جھولی میں آ گرے تو پھر اُسے آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔" میں نے صورتِ حال کی سنگینی کا اس گانے سے موازنہ کرتے ہوئے چڑ کر کہا۔ ہم اپنی ہی مصیبت میں پھنسے تھے اور سالی کو یار کی آنکھ مچولی یاد آ رہی تھی اور اپنے آٹے میں پھنسے ہاتھ بھی۔

"یار آبی! اس قلی زادے نے بتایا کہ ڈبے میں سے ایک ہی عورت کی لاش ملی ہے تو دوسری کہاں گئی، وہ وردہ؟"

"میرا خیال ہے کہ وہ انھوں نے اگلے دسمبر کے لیے اسٹور کر لی ہے وہ مارنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ وردہ سردیوں میں انھیں بہت آرام پہنچا سکتی ہے۔" آبی نے گاڑی کو ساٹھ ستّر میل کی رفتار سے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ اب اس کا رخ ہائی وے کی طرف تھا۔

"تھی تو وہ بہت ہی آرام جان قسم کی چیز۔ میرا خیال ہے کہ ہم حیدرآباد تک تیز گام کو جا لیں گے۔"

"اندازہ میرا بھی یہی ہے مگر یہ گاڑی ہمیں چھوڑنی ہو گی وہ لوگ فون پر ہر طرف کے تھانوں کو خبردار کر چکے ہوں گے۔"

"تو پھر اس کا کیا حل ہے؟" میں نے ڈیش بورڈ میں ہاتھ

ڈالتے ہوئے کہا۔ وہاں ایک چھوٹے سے چرمی بیگ میں دو منحنی سے چمکتے جھلکتے خوبصورت پستول دھرے تھے۔ اُن کی خوراک بھی ساتھ تھی۔ کوئی چالیس کے قریب گولیاں بیگ کی تہہ میں پڑی تھیں۔

لے بھئی! تیری سیلف ڈیفنس کے لیے تو اللہ نے بندوبست کر دیا ہے، یہ دو پستول ہیں، ایک تو رکھ لے، ایک میرے کام آئیگا۔"

وہاں پستول دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی تھی۔ دو ہی باتیں تھیں۔ یا تو وہ لوگ کسی ناجائز کام میں ملوث تھے۔ کسی ایسے کام میں جس میں ہتھیاروں کی ضرورت پڑ سکتی ہے اور یا پھر اپنی حفاظت کے لیے اُنھوں نے یہ سامان اکھٹا کیا تھا۔

"یہ تو بہت اچھا ہوا ہے یار، وہ پیچھے دیکھ ایک اٹیچی بھی دھرا ہے وہاں۔" آبی نے پستول لے کر نیفے میں اڑستے ہوئے کہا۔

میں نے وہ اٹیچی کیس اُٹھا کر اپنے زانو پر رکھا اور ــــ پھر ڈیش بورڈ میں رکھے ایک زنگ آلود تار سے اس کو کھول دیا۔ اس میں اُن اصحاب کے پہننے کے کپڑے تھے۔ جینز کی دو دو پتلونیں، ویسی ہی دو جیکٹیں، کچھ بنیانیں، چار قمیضیں، تمباکو کے دو ڈبے، پائپ، کچھ ٹیپ اور روزمرّہ ضرورت کی دوسری کئی چیزیں۔

اس وقت تک ہم سمہ سٹہ سے بہت آگے نکل چکے تھے۔ آبی نے قدرے تاریک جگہ پر گاڑی سڑک سے اتاری اور بولا۔ "میرا خیال ہے کہ ہم یہ کپڑے بدل لیتے ہیں، ہمارا حلیہ کچھ بندے کے پتروں ایسا ہو جائے گا۔ اس حال ہم بالکل بھنگی نظر آ رہے ہیں یار۔"

اس کی تجویز معقول تھی۔ ہم دونوں نے وہ جینز اور جیکٹ پہن لیے۔ وہ سب چیزیں ہمیں یوں پوری آئیں اور اتنی سج گئیں کہ ہم سمجھے وہ ہمارے لیے ہی بنائی گئی تھیں۔

"لے جیلانی! تو کبھی تو خدا کا شکر ادا کر لیا کر۔ اب دیکھ اس نے تجھے نئی کار مہیا عنایت کی سفر کے لیے۔ اندھیرے کی اوٹ اور تیری برہنگی کو ڈھانپنے کے لیے یہ خوبصورت جینز مہیا کی۔ بتا تو خدا کی کس کس نعمت کو جھٹلائے گا ناشکرے آدمی۔" وہ اس لباس میں بالکل ہی ایک نیا اور بدلا بدلا سا بہت ہی پڑھا لکھا اور مہذب آدمی نظر آنے لگا تھا۔

ابھی ہم اس دھندے سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ سمہ سٹہ کی سمت سے ایک تیز رفتار گاڑی ہمارے سامنے سے گزری مگر پھر کوئی سو گز آگے جا کر یوں رُکی جیسے وہ لوگ ہماری ہی تلاش میں وہاں تک پہنچے تھے۔ ابھی ہم کچھ سوچ بھی نہ پائے تھے کہ وہ بیک گیئر میں شور مچاتی ہوئی پیچھے آ گئی۔ اُس کی کھڑکی سے ایک گورے چٹے جلیلے سے نوجوان نے سر باہر نکالا۔

"مین! کوئی پرابلم ہو تو بتاؤ۔ شاید ہم آپ کی ہیلپ کر سکیں۔"

"اس کی گاڑی بیٹھ جا آبی اور یہ کار یہاں ہی رہنے دے۔" آبی نے اپنے اتارے ہوئے کپڑے بریف کیس میں ڈال رہا تھے۔ میری یہ بات سن کر حسب عادت بولا۔ "تو چل پھر تو یہ بریف کیس اور وہ چرمی بیگ بھی، بیٹھ جاتے ہیں اس کی گاڑی میں۔"

اُس نے دونوں چیزیں میرے سامنے رکھ دیں اور خود کمر پر پیٹی کستے ہوئے اس نے قدم سڑک کی طرف بڑھائے۔ دراصل چھوٹی موٹی چیزیں خود اٹھا کر کبھی خوش نہیں ہوا۔ مجھے ملازم کی طرح سب کچھ اٹھوا دیتا تھا۔ میں بھی طوعاً کرہاً اس کے بھرّے میں آ جاتا تھا۔

"ہیلپی ٹو سی یو جنٹلمین!" اُس نوجوان نے ہمارے لیے پچھلی نشست کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

"ہم آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں ینگ مین! ورنہ تو ہماری ادھر ہی گزرتی۔" آبی نے دوسری طرف کھل کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ پچھلی نشست خالی تھی۔ گاڑی اُس جوان آدمی کا ملازم چلا رہا تھا کیونکہ جب وہ اس سے مخاطب ہوا تو ہمیں پتا چلا۔

"چل بھئی منتو! اب تو ہوائی جہاز بنا دے اس گاڑی کو۔"

"کہاں تک جائیں گے جناب!"

"ہمیں دراصل تیز گام پکڑنی ہے جناب! وہ جہاں مل جائے۔ شاید حیدرآباد تک ہم اُسے جا لیں۔"

"اچھا! یہ ارادے ہیں آپ کے؟ کوئی خاص بات ہے گاڑی میں؟"

"جی ہاں! کچھ لوگوں نے ہمارے ساتھ گڑبڑ کر دی۔" کہہ کر میں نے مختصر الفاظ میں وہ تمام واقعات اس نوجوان کو سنائے جو ہمیں پیش آ چکے تھے۔

ہماری کہانی سن کر وہ بڑے جمے ہوئے لہجے میں بولا۔ "ایسے ذلیل کے بچے ہوتے ہیں وہ۔ اُن کی تلاش میں میں آپ کا ساتھ دوں گا۔ گولیاں گزار دوں گا اُن کے مغز میں۔"

"کریں گے تو ہم بھی۔ اگر وہ مل گیا تو اس کی تو کھال اتار کر اُس میں بھس بھر دیں گے۔"

"آپ کا حوصلہ قابلِ داد ہے جناب! مجھے یقین ہے آپ ان بدبختوں کو پکڑنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔" اُس نے کہا اور پھر چند لمحے توقف کے بعد بولا۔ "میرا نام تکریم

احمد ہے۔ میں ہوٹل سے نکلا ہی تھا کہ عجیب و غریب حلیے میں آپ کو اس کار میں بیٹھے دیکھ لیا۔ اس میں سے دو نوجوانوں کو اتر کر ہوٹل میں داخل ہوتے پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس وقت آپ کسی غیر معمولی پریشانی کا شکار ہیں جبھی یہ گاڑی لے اُڑے ہیں۔ دریافتِ حال کے لیے میں آپ کی طرف بڑھا، تو آپ نے گاڑی بھگا دی۔ میں نے بھی گاڑی آپ کے پیچھے بھگا دی لیکن ایک جگہ اچانک گاڑی بند ہو گئی۔ مجھے یہ خیال ہی نہ رہا تھا کہ گاڑی میں پیٹرول قریب الختم ہے۔ جب تک میں پیٹرول کا بندوبست کرتا، آپ غائب ہو چکے تھے۔ پھر بھی اللہ کا نام لے کر میں آپ کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ آپ شاید مجھے نہیں جانتے لیکن میں آپ سے اچھی طرح واقف ہوں۔ میں نے آپ کو ڈھلوں صاحب کے یہاں دیکھا تھا۔ وہ میرے بڑے خیر خواہ ہیں۔ بڑے احسانات ہیں اُن کے مجھ پر۔ انہی کی زبانی میں نے آپ کی تعریفیں سنی تھیں۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ آپ کو بہت عزیز رکھتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ اگر میں آپ کی مدد کر سکا تو شاید اسی طرح ڈھلوں صاحب کے احسانات کا بدلہ اتار سکوں۔"

نوجوان کی بات سن کر ہم دنگ رہ گئے۔ ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اس طرح اچانک ہمیں غیبی امداد مل جائے گی۔

گاڑی کی رفتار خاصی تیز تھی اور آبی کی ذہنی حالت بتدریج بہتر ہو رہی تھی۔ تیز گام ہم نے نواب شاہ میں جا پکڑی۔ اُس نوجوان کا خلوص انمول تھا۔ اس تکریم احمد کا۔ ایسے لوگ زندگی میں خال خال ہی ملتے ہیں۔ اُس نے گاڑی اسٹیشن کے باہر روکی اور ہمیں وہ گھسیٹتا ہوا پلیٹ فارم کی طرف لپکا اور بلند آواز سے اپنے ملازم سے کہنے لگا۔ "تو گاڑی سمہ سٹہ لے جا منتو۔ میں جلدی وہاں پہنچ جاؤں گا۔"

ہم نے فرسٹ کلاس کے تین ٹکٹ خریدے اور ایک چھوٹے سے ڈبے میں بیٹھے۔ گاڑی کو وہاں روک کر بیرے کو تلاش کرنا مناسب معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ تقدیر ہمیں ایک نئی صورت حال سے دوچار کرنے کے لیے ایک اور ہی سمت میں دھکیل رہی تھی۔ اس کے تھنوں میں ہمارے لیے شفقت اور محبت کا دودھ بہت کم اترتا تھا۔ مجھے تو وہ ہر روز نئے پیتھر پر پٹختی تھی یہی حال آبی کا تھا۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی تکریم احمد نے ادھر اُدھر نگاہ دوڑانی شروع کر دی۔ تیز گام کی ڈائننگ کار کے بیرے گلہریوں کی طرح ادھر اُدھر ڈبوں میں تیز تیز نٹکتے پھر رہے تھے۔ اُن کے سفید براق لباس وہ سبز دھاری والی پگڑی وہ اُن کا نیم مہذب لب و لہجہ ہر آدمی کو متاثر کرتا تھا۔

گاڑی چلی تو ہمارے ڈبے کے پہلو کا دروازہ کھول کر ایک بیرا ٹھنڈے مشروب سے بھری بوتلیں بالٹی میں ڈال کر اندر آ گیا۔ گرمی اور حبس اتنا زیادہ تھا کہ اس گھڑی بھی پیاس آدمی کو نڈھال کرتی تھی۔

"کوکا کولا۔ سیون اپ۔ وِمٹو۔ کھاری سوڈا۔" اس کی وہ چیختی ہوئی آواز ڈبے میں پھیلی تو میں نے اسے منہ بند رکھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اوئے ہمارے کان نہ کھا۔ دیکھ اُدھر کوئی چائے والا بیرا ہے۔"

"میرا خیال ہے ہم اُدھر ڈائننگ کار میں جا کر کیوں نہ بیٹھ جائیں۔" تکریم احمد نے تجویز پیش کی۔ ہم یہ بات سنتے ہی اپنی جگہوں سے اُٹھے اور ڈائننگ کار کی طرف چل دیے ڈبوں کے اندر ہی اندر چل کر ہم ڈائننگ کار تک جا پہنچے۔ ڈائننگ کار کا ماحول بہت ہی صاف ستھرا تھا۔ ہم نے ایک میز کے گرد بیٹھ کر چائے کا آرڈر دیا اور پھر گولڈ لیف کے دو پیکٹ لے کر بڑی نوابی شان سے جم کر بیٹھ گئے۔ آبی اپنے نوٹوں کی گڈی کی بار بار یوں نمائش کر رہا تھا جیسے وہ اُس طعام خانے کے ملازمین کو اپنی مالی حیثیت سے مرعوب کرنا چاہتا ہو۔ وہ اس مرحلے میں اپنے مجرم کو پکڑنے کے لیے بڑی سے بڑی رقم اڑانے پر تیار تھا۔ جس بیرے نے ہمیں چائے دی وہ اس آدمی سے بالکل ہی مختلف تھا جس نے ہمیں ملتان اور سمہ سٹہ کے درمیان چھیل کر صاف کر دیا تھا۔

پندرہ بیس منٹ گزر گئے۔ گاڑی ہر لمحے کراچی کے زیادہ قریب ہوتی جا رہی تھی اور ہمیں یقین تھا کہ اگر ایک بار وہ آدمی کراچی کے ساحل پر جا لگا تو پھر ہم اسے قیامت تک ڈھونڈ سکیں گے کیونکہ وہ اپنی ساری دولت کی افسن تین پیٹ میں اتار لینے کے بعد دوبارہ کسی بھی طرح ریلوے کی نوکری نہیں کرے گا۔ اسے ضرورت ہی کہاں رہے گی در در کنڈوں سلاخوں سے ٹلنے کی۔ اتنے سارے افشانی کا غذ جو اُس کے ہاتھ آ گئے تھے۔ اُن کی تو مہک ہی اسے سارے جہاں کی کلفتوں سے بے نیاز کر دے گی۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ آدمی تنہا یہ واردات نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے ساتھ دو چار آدمی اور بھی ہوں گے۔ انہوں نے خانہ جمیلہ کو تو وہیں ختم کر دیا کیونکہ اس کو وہ گلے کی مالا نہیں بنا سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے اس عورت کو وہیں ڈبے کے اندر ہی سگِ ہوس کی تسکین کے بعد موت کے گھاٹ اتار دیا مگر وہ وردہ کو یوں ضائع کر دینے پر متفق نہ ہو سکے۔ عین ممکن ہے اُن کے سرغنہ نے اسے اپنی پناہ میں لے لیا ہو۔ اس سنہری اشرفی کو وہ یوں ہاتھ سے چھوڑ دینے پر آمادہ نہ ہو سکا ہو۔ ہمارے لیے وہ روپیہ بھی اہم تھا اور وردہ بھی۔ میں دونوں کی بازیافت کے لیے اُس

آوارہ ہوا کے پیچھے بھاگا جو تیز گام کے جلو میں چلتی تھی اور سندھ کے ریگزاروں میں خوب خوب ریت اڑاتی تھی۔ یوں کہ کسی کے لیے کھڑکی میں سے منہ باہر نکال کر دیکھ لینا بھی مشکل نظر آتا ہے۔ جینا تو اُن دنوں مجھ پر بس ایک اشلوک ہی بن کر رہ گیا تھا۔ بے ارادہ کوئی تھپیڑا مجھے کسی طرف دھکیل دیتا تھا اور کوئی کسی طرف۔ آسیہ کا سراغ معدوم ہوئے عرصہ گزر چکا تھا اور حالات کے اس استہزا کا میرے پاس کوئی علاج ہی باقی نہیں رہ گیا تھا۔ سکھ ہم پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ اگر یہ افتاد نہ پڑتی، وردہ سے ہماری ملاقات نہ ہوئی ہوتی تو شاید ہم اس بے رحم وقت کے ابتلا کو ختم کرکے اپنی منزل مقصود پر فوراً ہی جا پہنچتے مگر وہ جو ہماری آنکھ پر ہمارے مقدر نے "کھوپا" باندھ کر ہمیں گھما کر چھوڑ دیا تھا۔ اس کی وجہ سے نہ مجھے ہی سمتوں کا شعور باقی رہ گیا تھا نہ آبی کو۔ اس کو میں دیکھتا تھا تو مجھے اپنے اوپر غصہ آنے لگتا تھا کہ وہ اتنا قوی اتنا مخلص، اتنا ہی دار اور اتنا رعنا خوبصورت جوان یوں محض میری دوستی کے لاسلکی رشتے میں بندھا میرے لیے جا بجا ضائع ہو رہا تھا اور اُف تک نہیں کرتا تھا۔ ورنہ کیا ضرورت تھی اسے یوں میرے جیسے ناکارہ آدمی کے ساتھ یوں چپک رہنے کی۔ میری آخر وقعت ہی کیا تھی۔ کیا قدر و قیمت تھی میری کسی کی نظر میں۔ میں تو خود اپنے ہی آپ سے شرمسار رہتا تھا۔ اس گھوڑے کی طرح جس کے زخموں سے پیپ بہتی رہے اور جو استھان پر بندھا رہنے کے سوا مالک کے لیے کچھ بھی نہ کر سکے۔ صورت حال ایسی تھی کہ ہم بس یوں ہی لامتناہی اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے پھرتے تھے۔ کہیں از خرس موئے بس است کے مصداق ہمیں آسیہ کے بارے میں جھوٹی سچی خبر بھی مل جاتی تھی تو ہم پاگلوں کی طرح اس طرف دوڑنے لگتے تھے۔ اس فلکِ ازرق کے نیچے یوں بھاگتے بھاگتے ہم ایک عرصے سے بھول ہی گئے تھے کہ رات کی نیند کیا ہوتی ہے اور دن کا چین کسے کہتے ہیں۔ ہم تو بس از یں سو راندہ وازاں سو راندہ کے مصداق بالکل ہی مجہول و مجبورِ محض ہو کر رہ گئے تھے۔
ابھی ہم چائے پی ہی رہے تھے کہ اس متحرک طعام خانے کا دروازہ کھلا اور وہ آدمی مجھے نظر آیا جس کے تعاقب میں ہم اپنی منزل کو بہت پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ وہ وہی آدمی تھا۔ اس کی ناک پر پھوڑے کا نشان صاف نظر آ رہا تھا اور اس کی شناخت کے لیے وہ علامت بہت کافی تھی۔ آبی نے بھی اسے فوراً ہی پہچان لیا۔ وہ بڑے اعتماد سے ہاتھوں میں پکڑی ٹرے کو گھماتا ہوا ہمارے قریب سے گزرا اس کے پیچھے ایک اور بیرا بھی تھا۔ وہ دونوں عمر کے غلافِ ثانی میں داخل ہو چکے تھے یہی کوئی پچیس چھبیس سال عمر ہو گی جس ... سے آبی اور تکریم احمد کوئی نیا ر... استوار کرنا چاہتے تھے۔
وہ سامنے کاؤنٹر پر ٹرے رکھ کر بڑے اطمینان سے ... طعام خانے میں بیٹھے مسافروں کو دیکھنے لگا۔ وہ ہاتھ پاؤں ... خاصا تگڑا آدمی نظر آتا تھا۔ اس کے ساتھ کھڑا دوسرا بیرا ... سے ہی پہلوان نظر آتا تھا اور معلوم یہ ہوتا تھا کہ اُن دونوں ... گہری چھنتی تھی۔ وہ ایسے اسفنج تھے کہ اُن کی تہوں میں ڈھیر ... پانی جمع ہو جانے کے باوجود معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ اتنے ... بھر کم اور شکم سیر ہو چکے ہیں۔
"بیرا ادھر تین کوکا کولا لاؤ۔" آبی نے بڑے ہی ... لہجے میں کہا۔ نظریں ہم تینوں کی اُن کے چہروں پر جمی ... تکریم نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ہم نے اپنے چور پہچان لیے۔ اُس نے ایک عجیب سا بالشت بھر چاقو جیب سے نکالا ... کوئی کل دبا کر نیچے سے مجھے دکھاتے ہوئے بولا۔
"یہ کرشمہ دکھاتا ہے یہ چاقو۔" اس کا دستہ خالی ...
"یہ کیا چیز ہے بھئی! بظاہر تو معمولی سا چاقو ہی لگ ..."
"یہ ۔۔۔۔۔۔ یہ دیکھیں۔" اُس نے میز کے نیچے ... کی لکڑی کی کرسی کے پائے کو تاکتے ہوئے چاقو کے دستے ... سا دبا دیا۔ اُس میں سے بلا خیز رفتار سے کوئی دو انچ لمبا ... اس کرسی میں جا دھنسا۔ کلک کی سی آواز پیدا ہوئی اور ... وہ پھل اتنی قوت سے دستے میں سے نکلا تھا کہ کرسی کی سخت ... لکڑی میں وہ آدھا جا دھنسا۔
"یہ تو بڑے کمال کی چیز ہے تکریم صاحب کتنے پھل ... اس کے اندر ہیں؟"
"ایسے ایسے دس پھل ہیں اور سب زہر میں بجھے ہوئے ... ضرورت پڑی تو ان دونوں کو مار دوں گا۔ میں ایسے آدمیوں کی ... تاک میں رہتا ہوں یہ میرا مشغلہ ہے۔"
"آپ نے مجھے حیران کر دیا ہے تکریم صاحب! مجھے ... ہے کہ آپ کے ساتھ ہمارا وقت بہت اچھا کٹے گا۔"
"انشاءاللہ! اس کتے کے بچے کو ابھی چھاپ ... بوتلیں لے آیا ہے۔"
تکریم ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ بیرا ہماری میز کے ... پہنچا اور بوتلیں سامنے رکھ کر بولا۔ "اور کچھ جناب!"
میرا وجود اکڑنے لگا تھا۔ میں نے بلا سوچے سمجھے اس کی کلائی پکڑ لی۔ میرا جی چاہا کہ میں انگوٹھے کی ضرب ... وہ کلائی توڑ دوں مگر میں اسے یوں اڑتا گیا نہیں ... تھا۔ "کیا نام ہے تیرا استاد! بڑا کسرتی بدن ہے تیر ..."

"میرا نام؟ مجھے ناظر خان کہتے ہیں باؤ جی! کچھ پنجہ ونجہ لڑانے کا شوق ہے آپ کو؟" وہ میرے دائیں ہاتھ کی خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اسے وہ میری بے تکلفی عجیب سی لگی۔
"ہاں! یہ بہت بڑے پنجہ کش ہیں بھائی حاضر خان! کہاں کے رہنے والے ہو تم؟" آبی نے ہمارے معاملے میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ وہ میری گرفت کے انداز کو سمجھ گیا تھا، اور میرے انگوٹھے کے زاویے نے اسے سمجھا دیا تھا کہ بس ایک ذرا سے دباؤ کی کسر باقی رہ گئی ہے۔
"میں دلی کا رہنے والا ہوں جناب! قسم ہے میر پنجہ کش کی کوئی ہم سے بازی نہیں جیت سکا ہے اب تک۔ اور یہ جوان تو بہت کچا ہے۔ بہت پچھتائے گا اور گھبرا کر آپ سے الگ ہٹے گا۔" یہ کہہ کر اس نے ذرا سا جھٹکا دے کر کلائی میری گرفت سے چھڑالی۔ اس کا بازو کہنی تک چکنا ہو رہا تھا۔
"مجھے تو کسی تم ایسے ہی کی تلاش تھی ناظر خان! ملاؤ تو سہی ہاتھ، دیکھوں تو کتنا کچا سمجھتا ہے تو مجھے۔" یہ کہہ کر میں نے اس کا میز پر دھرا داہنا ہاتھ تیزی سے پکڑ کر پانچ کو پانچ سے ملا دیا۔ یوں کہ اسے اپنی کہنی سیدھی کرکے میز پر رکھنی ہی پڑی۔ وہ بڑے اعتماد سے مسکرا رہا تھا۔ بائیں ہاتھ سے اس نے اپنے دوسرے ساتھی کو قریب بلایا اور بولا "طرّم خان دو سو روپیہ میز پر دھر دے شرط لگ گئی ہے اس لڑکے سے۔"
"دو سو نہیں ناظر خان! انگلیوں کا یہ تداخل لمبی رقم مانگتا ہے جو ہارے وہ ہزار ساتھ ہارے۔" یہ کہہ کر اس نے ہزار روپے کے نئے نئے نوٹ میز پر رکھ دیے۔ آبی نے جیب سے نکال کر ان کے سامنے سو سو کے بیس نوٹ ڈال دیے۔
"ہزار نہیں یارو، دو ہزار! جو ہارے وہ حقے کا پانی بھی پیے۔"
"ہمیں منظور ہے" "ڈال دے طرّم خان دو ہزار روپے۔" ناظر خان نے خوش ہو کر کہا۔ طرّم خان کی جیب نوٹوں سے بھری تھی، اس نے ہزار روپیہ اور باہر نکال دیا۔
اب ہم دونوں کی کہنیاں میز پر جمی تھیں۔ ناظر خان کا پنجہ اندر باہر سے چکنا ہو رہا تھا۔ اس کی وجہ اس کے کام کی نوعیت تھی۔ وہ کبھی چائے بنا رہا ہوتا تھا تو کبھی توسوں پر اسے مکھن لگانا پڑتا تھا۔ جو مکھن اِدھر اُدھر ہاتھ پر رہ جاتا تھا وہ اسے بازوؤں اور منہ پر مل لیتا تھا۔
"سنبھل جا ناظر خان! تیرے لیے یہاں سے صحیح سلامت نکلنا ناممکن ہو گیا ہے۔"
ڈبے میں موجود بہت سے مسافر ہمارے گرد جمع ہو گئے تھے۔ میں نے ابتدا میں اسے موقع دیا کہ وہ میرے پنجے کو کسی حد تک اپنی طرف جھکا لے مگر وہ محض اس کا دل رکھنے کا ایک بہانہ تھا۔ تیسری کوشش میں اس نے اپنی کمر کے آخری حصے تک زور صرف کر لیا مگر میرا بازو ٹس سے مس نہ ہوا۔ میری گرفت اس کی انگلیوں پر کچھ اتنی آہنی تھی کہ اس کی ہمت جواب دینے لگی۔ مگر پھر اُس نے اپنے استاد میر پنجہ کش کا نام لے کر چاہا کہ وہ میرا ہاتھ جھکا کر میز پر دھرے جلتے ہوئے سگریٹوں پر دھر دے کہ میں نے اچانک اپنے پیر دستگیر کو یاد کرکے ہلکا سا دباؤ اس کے پنجے پر بڑھایا اور پھر ذرا سا ہاتھ کو لہرا کر جھٹکا جو دیا تو اس کا ہاتھ بازو کی جڑ سے اکھڑ گیا۔ تڑاخ تڑاخ ایسی دو آوازیں ابھریں اور وہ درد سے نڈھال ہو کر دوسرے ہاتھ کو اپنی کلائی پر لے آیا۔ اس کا پنجہ میں نے جلتے سگریٹوں سے چھو کر چھوڑ دیا۔
ناظر خان کا رنگ ہلدی ہو چکا تھا۔
"اووف میرا۔۔۔ میرا یہ جوڑ ٹوٹ گیا ہے، طرّم خان! مجھے ڈاکٹر کے پاس لے چل۔"
"یہ روپے اٹھائیں پیرزادہ صاحب۔ مجھے افسوس ہے ناظر خان تم نے آج کے سفر میں دونوں سودے غلط کیے۔"
"کیا مطلب؟ دونوں سودے! یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"
"اس کے جوڑ پر پٹی بندھوا دو طرّم خان! پھر اسے اِدھر لے آ۔ ہم یہاں ہی بیٹھے ہیں۔ آپ دونوں سے ہمیں بڑی ضروری بات کرنی ہے۔"
آبی نے ناظر خان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ نوٹ اس نے سمیٹ کر جیب میں پہلے ہی ڈال لیے تھے۔ ناظر خان اپنے درد کی اٹھتی ٹیسوں کو بڑی مشکلوں سے سمیٹتا ہوا اٹھا اور طرّم خان کے ساتھ باہر جانے لگا تو تکریم احمد نے کہا "ٹھہرو! میں تمھارے ساتھ چلتا ہوں تم سے ہمیں کچھ ضروری حساب کتاب بھی کرنا ہے۔"
طرّم خان نے پہلی بار ہم تینوں کو آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ مگر وہ ہم میں سے کسی کو بھی نہ پہچان سکا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ ہم تینوں ہی جدید ترین قسم کے ولایتی لباس میں ملبوس تھے اور یہ بات اُن کے وہم و گمان میں بھی نہ آ سکتی تھی کہ ہم گاڑی سے یوں اتنی بے رحمی سے گرا دیے جانے کے بعد بھی صحیح سالم حالت میں کسی مرحلے پر اُن سے دوبارہ مل سکتے ہیں۔
"جا بھائی اس ناظر خان کا علاج کروا یہ بڑی رقم ہار گیا ہے۔ آپ گواہ ہیں جناب کہ شرط اس نے خود باندھی تھی؟" میں نے اردگرد کھڑے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
"آپ نے بہت اچھا کیا بابو جی! یہ ڈراما اس گاڑی میں

روز ہی ہوتا ہے۔ یہ دونوں اسی طرح لوگوں سے ہزار پانچ سو ہر روز مار لیتے ہیں۔ ان سے کوئی بھی پنجہ آزمائی میں پورا نہیں اترتا تھا۔ آپ نے اچھا کیا ان کا تزار توڑ دیا۔" طعام خانے کے خانساماں نے ہمارے قریب ہو کر کہا۔

"زیادہ بک بک کی ضرورت نہیں ہے خان زمان! ابھی ہم مر نہیں گئے اور ابھی تو بھی یہاں ہی رہے گا۔" طرم خان نے خانسامے کو دھمکاتے ہوئے کہا اور پھر انہیں تکریم خان گارڈ کے ڈبے کی طرف لے گیا۔ کوئی بیس منٹ بعد وہ تینوں واپس آئے تو دو سپاہی اُن کے ساتھ تھے۔ وہ دراصل طرم خاں کے اشارے پر وہاں آ دھمکے تھے اور ڈبے میں آ کر وہ ہمیں گھور گھور کر دیکھ رہے تھے۔ دونوں شکل و صورت سے ہی خرانٹ نظر آتے تھے اور کسی ایسے ہی گل بہار موقع کی تلاش میں تھے جس میں وہ کسی کے دونوں لیموں، دبا کر نچوڑ سکیں۔ ڈبے میں داخل ہوتے ہی ایک نے اپنی بید کی چھڑی لہراتے ہوئے کہا "اوہ کیہڑا ہے بھئی پنجے مار خان! کس نے میرے کا گٹ، توڑ دیا ہے۔" بڑا طنطنہ تھا اُس کے لہجے میں۔

تکریم احمد اس کے ساتھ ہی آگے بڑھ کر بولا "سنتری بادشاہ اس ناظر خان نے خود شرط لگائی تھی میر پنجہ کش کی قسم کھا کر۔"

"یہ ٹھیک کہتے ہیں چوہدری صاحب! یہ سارا قصور اس ناظر خان کا ہے آپ کو پتہ ہی ہے پرسوں بھی ادھر پنجہ آزمائی ہوئی تھی ایک مکرانی کے ساتھ۔ اور وہ تین ہزار ہار گیا تھا سگریٹ کے چھالے الگ پڑ گئے تھے اُس کے ہاتھ پر۔" طعام خانے کے خانسامے خان زمان نے سنتری کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

وہ کچھ سٹپٹا گیا، تڑاخ سے بولا "اوئے توں چپ رہ ماما خاں زمانا! یہ 'قنون' کی بات ہے، اس شہدے کا لاکھ روپے کا 'گٹ' ٹوٹ گیا ہے، کیوں بھئی تو نے کارنامہ دکھایا ہے یہ؟"

"ہاں سنتری جی! آئیں ادھر بیٹھیں میں ساری بات بتاتا ہوں آپ کو" آبی نے اس سپاہی کو اپنے قریب بٹھاتے ہوئے کہا۔ پھر اُس نے میز کے نیچے ہی نیچے خدا جانے اس سنتری کو کتنے سو کا ٹیکہ لگایا کہ اس کا غصہ ایک دم اُتر گیا۔ وہ پہلے سے کہیں ہشاش بشاش نظر آنے لگا، بولا "تو پھر میں سمجھوں کہ یہ کام باہمی صلاح مشورے سے ہی ہوا ہے کیوں جوان ناظر خان! کچھ ہلدی چونے کے سو روپے دلوا دوں میں تمہیں؟"

"نہیں سنتری بادشاہ پیسے بہت ہیں میرے پاس۔ بس یہ چوٹ میری تقدیر میں تھی۔" یہ کہہ کر ناظر خان ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ وہ سپاہی اور طرم خان اسے تسلیاں دے کر باہر نکلے تو تکریم احمد اُس کے پاس جا پہنچا۔ اس وقت تک طعام خانے کی بہت سی میزیں خالی ہو چکی تھیں اور گاڑی پوری رفتار سے اپنی منزل مقصود کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ہم کراچی پہنچنے سے پہلے حقیقت حال سے آگاہ ہونا چاہتے تھے۔ میں اور آبی بھی ناظر خان کے قریب جا پہنچے

"اُٹھ ناظر خان! ہم تم سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔" تکریم نے اپنا چاقو اُس کی پسلی سے لگاتے ہوئے کہا۔

ناظر خان نے ہمارے تیور دیکھے تو پریشان ہو کر ڈائننگ کار کے کچن کی طرف چل دیا۔ تکریم احمد نے اسے ادھر ہی دھکیلا۔ اس حصے میں ایک چوبی تختے کی اوٹ میں باورچی خانے کا سامان رکھا تھا۔ ہم ناظر خان کو نرغے میں لے کر وہاں جا ٹھہرے۔ باورچی خان زمان ہم سب کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا مگر اس نے کوئی تعرض نہیں کیا، وہ ناظر خان سے شاید بہت ہی تنگ آیا ہوا تھا۔

"ہاں استاد صاحب! اب کیسی طبیعت ہے آپ کی۔ ہم دراصل آپ کی زیارت کے لیے بہت دُور سے ادھر چلے آ رہے ہیں۔" تکریم احمد نے بڑے مربیانہ انداز سے کہا۔

"میں تمھارا مطلب نہیں سمجھا ہوں بابو جی۔ میرے میں کیا سرخاب کا پر لگا ہے، کوئی طاقت کی گولیاں بیچتا ہوں کیا چلے بنے ہو مجھ سے؟"

"وہ دراصل۔۔۔ بات یہ ہے پہلوان کہ وہ بریف کیس ہمیں چاہیے تھا جس میں سے تمہیں ڈیڑھ لاکھ روپیہ ہاتھ لگا"

"یہ۔۔۔ یہ کیا پاگلوں جیسی من من کر رہے ہو، کیسا بریف اور کونسا بریف کیس؟ بھنگ تو نہیں پی رکھی ہے تم نے!" ناظر خان نے کھا جانے والی نظروں سے اپنے مخاطب کو دیکھا۔

اس کا یہ انداز دیکھ کر آبی ضبط نہ کر سکا، بولا "گل سن اوئے ناجر کھان! تیری ماں مر جائے تو سمجھتا ہے ہم پاگل ہیں سالے تم نے چائے میں نیند آور دوا ملا کر بہاول پور کے قریب فرسٹ کلاس کے ڈبے کے چار مسافروں کو بے ہوش کیا۔ ان میں دو مرد تھے۔ ان کو تم نے گاڑی کے باہر پھینک دیا پھر تم نے ادھیڑ عمر کی عورت کی عزت خراب کی پھر اسے قتل کر دیا اس کے ساتھ جو جوان عورت تھی اُسے تم نے کہیں غائب کر دیا۔ مسافروں کے بریف کیس میں ڈیڑھ لاکھ روپیہ تھا۔ وہ تم نے ہڑپ کر لیا۔ تم سمجھتے ہو لوگ اندھے ہیں تمھیں پہچانتے ہی نہیں۔ سیدھی طرح بتاتا ہے کہ نہیں کہ وہ روپیہ کہاں ہے اور وہ عورت کہاں رکھی ہے تم نے۔ اس کے ساتھ جو لڑکی کی عورت تھی اسے کیوں قتل کیا تم نے مت سمجھو کہ ہم تمھیں چھوڑ دیں گے۔ تو ہمیں نہیں جانتا۔"

یہ باتیں آبی نے کچھ ایسے دبے گھٹے مگر اس قدر غضبناک انداز سے کہیں کہ اس کے چہرے کی ساری رگیں تن گئی تھیں

اس کا منہ غصے سے سرخ تانبہ ہو گیا تھا۔

"تم بکواس کرتے ہو، پاگل ہو گئے ہو، اوئے طرم خان! ادھر آ ذرا۔ دیکھ یہ تیرے سالے کیا کہتے ہیں۔" یہ کہہ کر ناظر خاں نے بائیں ہاتھ کی کہنی کچھ ایسی تیزی سے آبی کے سینے میں دے ماری کہ آبی ایک لحظے کے لیے توسن ہو کر رہ گیا۔ ناظر خان نے اپنا پٹی بندھا ہاتھ اوپر اٹھا لیا تھا اور اب اس کے بائیں ہاتھ پر ایک آہنی مکہ چڑھا ہوا تھا۔ اس مکے کی ساخت ہی ایسی تھی کہ وہ اگر جسم کو چھو بھی جاتا تو آدھ آدھ انچ گہری گوڈی کر جاتا اور جو کہیں برس جاتا تو وہاں گڑھا ڈال دیتا۔ ناظر خان ہماری توقع سے کہیں زیادہ خوفناک ثابت ہو رہا تھا۔ عین اس وقت تکریم احمد نے اپنا خنجر کچھ اتنی تیزی سے ناظر خان کی ران پر چلایا کہ وہ ڈیڑھ انچ تک اندر دھنس گیا۔ اس کی موٹی سفید زین کی پتلون کو چیرتا ہوا کھرا اندر اتر گیا تھا مگر ان میں دھنسے پھل کو وہ بدمعاش برداشت کر گیا اور غضبناک ہو کر اس نے آہنی مکہ گھما کر تکریم احمد کی کنپٹی پر مارنا چاہا مگر تکریم احمد اس کی نیت کو سمجھ کر فوراً ہی پیچھے ہٹ گیا۔ ناظر خان کا آہنی مکہ اپنے نشانے کو سامنے نہ پا کر اگلی طرف نکلا تو میں نے اس کی کلائی وسط میں سے پکڑ لی اور میں کوشش کے باوجود اپنے ہاتھ کو روک نہ سکا۔ میرے انگوٹھے کا دباؤ اس کی کلائی پر پڑا تو سہی مگر ناظر خان نے اپنا ہاتھ جان بوجھ کر گھوم کر اپنی کمر سے لگا لیا۔ وہ میرے ارادے کو سمجھ گیا تھا۔ طعام خانے میں اس وقت چند ہی آدمی موجود تھے وہ ایک ساتھ مل کر شور مچانے لگے۔ ایک نے آگے بڑھ کے زنجیر کھینچنا چاہی تو تکریم احمد نے ان پر اپنا پستول تان لیا۔

"خبردار! تم میں سے کوئی آدمی اپنی جگہ سے مت ہلے۔ یہ دروازہ اندر سے بند کر دے اوئے! زنجیر خان کی اولاد۔" یہ بات اس آدمی سے مخاطب ہو کر تکریم نے پستول کی نالی لہرا کر کہی، جس نے زنجیر کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا۔ اس نے لرز کر دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ اور زنجیر سے دور ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اس تماشے سے لطف اندوز بھی ہو رہا تھا اور خوفزدہ بھی تھا

"ہاں تو پھر تم نہیں بتاؤ گے کہ تم نے اُن آدمیوں کو مار کر کہاں پھینکا اور روپیہ کہاں رکھا ہے بتاؤ ناظر خان!" میں نے اُلٹے ہاتھ کا ایک زوردار جھانپڑ اس کے منہ پر دے مارا۔ وہ اُلٹ کر ڈبے کی دیوار سے جا لگا۔ میں اُسے گھسیٹ کر طعام خانے کے وسط میں لے آیا۔ اب کسی سے کچھ چھپانے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ تکریم احمد نے وہاں موجود تمام لوگوں کو اپنے پستول کی زد میں لے رکھا تھا اور سب کے سب ـــ زنجیر سے کافی دور سہمے کھڑے تھے۔

میرے طمانچے کی ضرب سے ناظر خان کے حوصلے کا کوٹھا ڈھے گیا تھا۔ آبی نے اس کے دونوں بازو پکڑ کر کمر کی طرف سے اس کی گردن پر شکنجے کی گانٹھ لگاتے ہوئے جھٹکا جو دیا تو وہ بری طرح چیخا۔ آبی نے اس کے ہاتھ پر سے آہنی مکہ اُتار لیا۔ صورت حال کو یوں بدلتے دیکھ کر دبی آواز میں بولا "میں بتاتا ہوں بھاجی میں بتاتا ہوں، وہ عورت ـــ سرونٹ روم میں ہے۔ خدا کے لیے میری گردن چھوڑ دیں بھاجی۔"

"اس کی گردن آزاد کر دیں پیرزادہ صاحب! اور تم سب اُدھر بیٹھو ہم ابھی آتے ہیں۔" میں نے آبی کو مخاطب کرنے کے بعد دوسرے لوگوں کو ہدایت کی

"اور غور سے سن لو۔ میں پولیس انسپکٹر تکریم احمد ہوں شہادت کے لیے تم سب کی ضرورت ہو گی۔ تم میں سے کوئی آدمی یہاں سے باہر نہیں جائے گا۔" اس کے پستول کا رخ اب بھی اُن مسافروں کی طرف تھا جو طعام خانے میں کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے اسے نظر انداز کر کے میں ناظر خان کو دھکیل کر ڈائننگ کار سے باہر لے آیا۔ ڈبے کچھ اس طرح ایک دوسرے سے پیوست تھے کہ ایک غلام گردش میں سے گزرتے ہوئے ہم ایک چھوٹے سے ڈبے میں جا پہنچے۔ اس میں بس یہی کوئی چھ فٹ چوڑی جگہ تھی اور ایک لمبی سی چھ آدمیوں کی نشست یہاں سے وہاں تک خالی پڑی تھی۔ ناظر خان ہمیں اس ڈبے میں لے جا کر بولا "تم وہی تو نہیں ہو جنھیں ہم نے گاڑی سے باہر پھینکا تھا؟"

"شکر ہے تم نے پہچان تو لیا ہے بیٹے! کہ ہم ہی تمھارے والد ہیں مگر وہ دُوسری عورت کہاں ہے؟"

اس نے سر اوپر اٹھا کر ایک چوبی ٹرنک کی طرف اشارہ کیا جو نشست اتنے چوڑے ٹنگنے پر پڑا تھا۔ آبی نے اسے بڑی احتیاط سے نیچے اتارنا چاہا مگر اس سے وہ سنبھل نہ سکا اور اس کی ایک نوک ناظر خان کے سر میں آ لگی۔ ڈبے میں داخل ہوتے ہی میں نے ناظر کی پسلی میں اپنا پنجہ دھنسا دیا تھا، کچھ اتنا گہرا کہ وہ انتہائی کرب کے عالم میں اُدبے اُدبے سانس لے رہا تھا۔ اس کے سر میں ٹرنک کی نوک لگی تو وہ نڈھال سا ہو کر نشست پر گرنے لگا۔ میں دوسرے ہاتھ سے ٹرنک کو سہارا دیا اسے فرش پر اُتارا تو آبی نے فوراً ہی ناظر کی جیب ٹٹول کر اس میں سے چابیوں کا گچھا نکال لیا۔ ٹرنک کو اس نے بڑی افراتفری کے عالم میں کھولا۔ اس کے ہاتھوں کی لرزش مجھے اس کی دلی کیفیت کا پتہ دیتی تھی۔ ٹرنک کا ڈھکنا کھلتے ہی ہمارے اعصاب چٹخنے لگے۔ عرفان مرحوم کی بیوہ مردہ اس ٹرنک میں مُردوں سے شرط باندھ کر لیٹی تھی۔

وردہ

بالکل بے ہوش تھی۔ اس کی وہ ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر آبی کے وجود کا سارا زہر و قہر اس کی آنکھوں میں اُبل آیا۔ اس نے کچھ ایسے وحشیانہ انداز میں ناظر خان کو میرے ہاتھ سے جھپٹا کہ میں سمجھا وہ اس کی گردن توڑ دے گا۔ اُس نے اپنے بائیں ہاتھ کی انگلیاں سیدھی اس کی آنکھوں میں بھونک دیں مگر اس کا نشانہ چُوک گیا۔ انگلیاں خانوں کے اندر نہ جا سکیں ناظر نے اپنا چہرہ عین وقت پر پیچھے ہٹا لیا تھا۔ آبی نے دُوسرے وار پر اس کا نرخرہ اپنی گرفت میں لے لیا۔ "بتا بدمعاش اور کون تھا تیرے ساتھ، کس کس نے اس بدنصیب کو اس حالت میں پہنچایا ہے؟"

"میرے... میرے ساتھ طرّم خان بھی تھا اور وسمہ بھی۔ دو سپاہی بھی تھے، ایک کا نام کرم دین اور دوسرے کا جمال۔"

"یہ وسمہ کون ہے؟" آبی نے اس کی گردن دباتے ہوئے کہا۔

"وہ پولیس کے ڈبے میں بیٹھا ہوا ہے آپ کا روپیہ اُسی کے پاس ہے۔"

"وہ بھی سپاہی ہے؟"

"نہیں! بس ایسے ہی اُن کے ساتھ رہتا ہے وہ۔ گاڑی میں سپاہی چھوٹی بڑی تمام وارداتیں اُسی کے ذریعے کرواتے ہیں۔"

"وہ روپیہ تمہارا خیال ہے کس کے پاس ہوگا؟"

"ابھی اُس نے کسی کو نہیں دیا۔ میں، طرّم خان اور وسمہ اس کو کراچی پہنچ کر بانٹ لیں گے۔"

"وہ روپیہ کہاں ہوگا اس وقت؟"

"وسمے نے وہ رقم سپاہیوں کے ڈبے میں رکھے اپنے صندوق میں ڈال دی تھی۔" ناظر خان نشست پر گرا بُری طرح لرز رہا تھا۔

اچانک اس چھوٹے سے ڈبے کا دروازہ کُھلا طرّم خان اندر داخل ہو رہا تھا۔ اس کو دیکھتے ہی میں نے پوری قوّت سے اُسے گریبان سے پکڑ کر اندر کی طرف کھینچ کر فرش پر دے مارا۔ وہ کھلے ٹرنک کے قریب ہو کر گرا۔

"میری بات غور سے سن طرّم خان! تو ابھی اُس کُتّے کے پلّے وسمے کے پاس جائے گا ابھی اور اسی وقت۔ سپاہی اس وقت سو رہے ہوں گے، اس وسمے سے کہو وہ پوری رقم لے کر ادھر آ جائے۔"

"میں اس کے ساتھ چلتا ہُوں خان صاحب! یہ بڑی کُتّی شے ہے، چل اوئے آگے لگ۔"

آبی نے وردہ کے جسم پر ٹرنک کے اندر رکھے اُس کے پھٹے ہوئے کپڑے ڈالتے ہوئے کہا۔ وہ اُس کی نبض ٹٹول کر اطمینان کر چکا تھا کہ وہ ابھی زندہ تھی۔ میں نے طرّم خان کو اس کے حوالے کیا ہی تھا کہ اس چھوٹے سے ڈبے کا دروازہ پھر کُھلا۔ اب کی بار دروازے میں تکریم احمد کھڑا تھا اس نے صورتِ حال کا اندازہ کرتے ہوئے ٹرنک کے اندر جھانک کر دیکھا تو اُس کا رنگ اُڑنے لگا۔ اس نے ایک بار پستول جیب سے نکال کر سیدھے ہاتھ میں لے لیا، اور پھنکارتے ہوئے وہ ناظر خان کی طرف بڑھا، بولا "اس نے کچھ بتایا بھی کہ نہیں، اس کا منہ کھلوانے کے کئی طریقے مجھے بھی معلوم ہیں۔"

میں نے کسی وسمہ جان اور سپاہیوں کے بارے میں اُسے بتایا تو وہ بولا "اس کا مطلب ہے کہ وہ سپاہی بھی اس واردات میں شامل تھے۔ آپ اس کو ادھر ہی سنبھال کر رکھیں میں ابھی آتا ہوں۔"

یہ کہہ کر تکریم احمد طرّم خان کو ساتھ لے کر انہی قدموں ڈبے سے باہر نکل گیا۔ ناظر خان کی مزاحمت بالکل ختم ہو گئی تھی اور جس انداز میں نے اُس کی پسلیوں کا ایک حصّہ پچکا کر مسل ڈالا تھا، وہ تجربہ کو بُری طرح نڈھال کر گیا تھا۔ ہاتھ اُس کا ویسے ہی بیکار ہو چکا تھا اور اُس پر اب پٹی بندھی تھی۔ اُس کا آہنی مُکّا آبی نے اپنے قبضے میں لے رکھا تھا اور اب مجھے یقین تھا کہ ناظر خان کے پاس چھپانے کو کچھ بھی باقی نہیں رہ گیا تھا میں نے آبی کو اشارہ کیا کہ وہ ناظر کو اپنی تحویل میں لے لے۔

آبی کا غیض و غضب بدنی تھا، اس نے تڑاخ سے ایک زوردار تھپیڑ ناظر کے منہ پر مارتے ہوئے کہا "اس عورت کو کس نے قتل کیا تھا، مجھے سیدھی طرح بتا دے ورنہ اچھا نہ ہوگا۔ تو نہیں جانتا ہم کون لوگ ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے ناظر خان کا ہاتھ پکڑ کر ہلکا سا جھٹکا دے کر کچھ اس طرح مروڑا کہ میں سمجھا اس نے ایک بل اور دے دیا، تو اس کا بازو کندھے سے نکل جائے گا۔ ناظر کا رنگ ہلدی ہو گیا اور وہ اپنے درد سے بھرے بازو پر بایاں ہاتھ رکھ کر مُڑتے ہوئے بولا "اس کو جناب میں نے نہیں مارا ہے میں بالکل بے قصور ہوں جناب۔"

"اُسے کس نے قتل کیا ہے؟ میں یہ پوچھ رہا ہوں اور اس بدنصیب نے کیا بگاڑا تھا تمہارا؟" اس نے اس کے لمبے لمبے چیکٹے بالوں کو بائیں ہاتھ سے کھینچ کر اس کا چہرہ سیدھا کرتے ہوئے کہا۔

"اس کو... اُس کو جمال دین اور وسمہ جان نے گلا گھونٹ کر مارا تھا جناب! وہ اُس سے جان چھڑانا چاہتے تھے۔"

"ہُوں! تو یہ بات ہے مگر یہ بتا کہ تم نے اس بدنصیب کو کیوں نہ مار دیا، اسے کیوں زندہ رہنے دیا؟"

"اسے... اسے طرّم خان اپنے گھر لے جانا چاہتا تھا تاکہ وہ اسے 'کاشتہ' بنا کر رکھے گا۔ وہ یہی کہتا تھا۔"

"یہ 'کاشتہ' کیا ہوتی ہے؟ آنے دے اس طرّم خان کو، جوڑ جوڑ نہ توڑ دیا تو میرا نام نہیں۔" یہ کہہ کر آبی نے اس کو جھنجھوڑتے ہوئے فرش پر گرا دیا۔ آبی کا بس نہ

تھا ورنہ وہ اسے وہیں کاٹ کر رکھ دیتا۔ ناظر منہ کے بل فرش پر گرا تو آبی نے پوری قوّت سے پاؤں کی ضرب اس کی پسلی میں لگائی اور اپنی آواز کو دبا کر بولا "ہمیں چائے میں بے ہوشی کی دوا کس نے گھول کر پلائی تھی؟"

"وہ کام... مجھے اس کے لیے طرّم خان نے کہا تھا جناب! وہ آپ کو تاش کھیلتے دیکھ گیا تھا۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ آپ کے بریف کیس میں بہت بڑی رقم موجود ہے۔"

"ہوں! رقم موجود ہے۔ ہمیں گاڑی سے باہر کس نے پھینکا تھا؟" آبی نے اسے بالوں سے پکڑ کر اُوپر اٹھاتے ہوئے پوچھا۔ اپنا پاؤں اُس نے ناظر کی کمر پر یوں رکھا تھا کہ اگر وہ اس کو بالوں سے پکڑے ہوئے ذرا اوپر اٹھاتا تو ناظر کی کمر ٹوٹ جاتی۔

"وہ... اوہ میں مر گیا مجھے چھوڑ دیں جناب خدا کے لیے مجھے معاف کر دیں وہ کام میں نے وسمہ جان کے ساتھ مل کر کیا تھا۔"

"ہمارے ساتھ اس عورت کو کیوں نہ پھینک دیا باہر تم نے؟ اسے کیوں روک لیا تھا تم لوگوں نے؟"

اب کی بار آبی نے اس کے بال چھوڑ دیے۔ ناظر کا سر دھم سے فرش پر لگا مگر ابھی تک آبی کا پاؤں اس کی کمر پر تھا۔ اپنا بوجھ بڑھاتے ہوئے آبی نے اسے پھر للکارا۔ "میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتے ہو کتّے کے پلّے! ہوا کیا تھا آخر؟"

"وہ جناب مجھے معاف کر دیں جناب! در اصل اُس وقت گاڑی سمہ سٹہ اسٹیشن پر جا پہنچی تھی۔ ہمیں موقع ہی نہ ملا جلدی میں ہم نے اسے اٹھا کر غسل خانے میں ڈال دیا۔ ورنہ ہمیں موقع مل جاتا تو اسے بھی باہر پھینک دیتے۔" ناظر نے بلبلاتے ہوئے کہا۔ وہ اوندھے منہ فرش پر اس طرح پڑا تھا کہ اپنے دونوں ہاتھ اس نے سر پر رکھ لیے تھے۔ جیسے وہ اپنے جسم کے اس حصّے کو آبی کی کسی متوقع ضرب سے بچانے کی کوشش کر رہا ہو۔

عین اس وقت چار آدمی ڈبے میں یوں داخل ہوئے جیسے انہیں کوئی ڈنڈے سے ہانک رہا ہو۔ وہ سب کے سب سخت سراسیمہ تھے۔ طرّم خان اُن سب سے آگے تھا۔ اس کے پیچھے تین آدمی اتنی خوفزدہ حالت میں تھے کہ میں سمجھا وہ دہشت ہی سے مر جائیں گے۔ وہ سب کے سب بہرے تھے اور اُن کے اندر حوصلے نام کی کوئی شے نہیں تھی۔ ایک صرف طرّم خان تھا جس نے انہیں اس واردات پر آمادہ کر لیا تھا۔ وہ تھوڑی سی جی داری دکھا رہا تھا مگر اندر سے اس کا دیا بھی بجھ چکا تھا۔ ان کے پیچھے تکریم احمد ڈبے میں داخل ہوا وہ بہت سنجیدہ نظر آ رہا تھا، اپنا بھرا ہوا پستول اس نے ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔ ڈبے میں داخل ہو کر اس نے اپنے پیچھے دروازہ بند کیا اور بولا "یہ ہیں وہ بدمعاش! میں ان کی ہڈی پسلی ایک ایک کر دوں گا۔ ساری بدمعاشی اِن لوگوں کی ہے، لوگوں سے مال بھی چھینتے ہیں اور اُن کو قتل بھی کر دیتے ہیں۔"

میں نے پوری قوت سے دائیں ہاتھ کی ایک ضرب طرّم خان کے منہ پر لگائی۔ وہ گھوم کر دیوار میں جا لگا۔ اس کا جبڑا اپنی جگہ سے ہل گیا تھا مگر ہاتھ ذرا ٹیڑھا پڑا ورنہ شاید اس کا نچلا جبڑا کچھ زیادہ ہی باہر نکل جاتا۔ وہ درد سے نڈھال ہو گیا تھا۔

"یہ طرّم خان ہے ان کا سرغنہ۔ سارا معاملہ اسی نے چلایا ہے۔ یہ اس عورت کو اپنے گھر میں ڈالنا چاہتا تھا۔ کہتا ہے میں اسے اپنی 'کاشتہ' بنانا چاہتا تھا اس کی صُورت دیکھیں ذرا۔" تکریم احمد نے تلملاتے ہوئے کہا۔

"ظلم کی حد ہے یار۔ اور یہ ہے وسمہ جان۔ اس کے بھی بڑے ٹھاٹھ ہیں۔ رقم اس نے گٹھڑی میں باندھی تھی اور یہ سپاہی جمال خان ہے یہ آج ڈیوٹی پر نہیں ہے ویسے ہی سفر کر رہا تھا۔ یہ بھی اس واردات میں شامل ہے۔ یہ حضرت کرم دین ہیں۔ اُن عورتوں کی عزت لُوٹ کر ان میں سے ایک کو انھوں نے جان سے مار دیا۔ اور آپ کو باہر پھینک کر ہاتھ جھاڑ لیے۔"

میں تکریم احمد کی یہ باتیں سن کر کچھ ایسا مشتعل ہوا کہ میں نے کرم دین اور جمال خان کو بالوں سے پکڑ کر ان کے ماتھے ایک دوسرے سے یوں ٹکرا دیے کہ وہ دونوں بے سُدھ ہو کر فرش پر گر گئے۔ مگر ابھی وہ پُوری طرح بے ہوش نہیں ہوئے تھے۔

"یہ پستول مجھے دے دیں میں ان کو یہیں گولی مار دوں گا، ان بگھیاڑوں کو۔" آبی نے غرّاتے ہوئے کہا۔

"نہیں! میں انھیں پولیس کے حوالے کروں گا۔ خود باندھ کر تھانے لے جاؤں گا، آپ اِدھر آئیں میری بات غور سے سنیں۔" تکریم احمد نے مجھے ایک طرف لے جاتے ہوئے کہا۔

"یہ لیں پستول۔ یہ کوئی گڑبڑ کریں تو میری طرف سے کھلی چھُٹی ہے مگر میرا خیال ہے کہ ان سے یہاں نہیں عدالت میں بات کرنی چاہیے۔" یہ کہہ کر تکریم احمد نے اپنا پستول آبی کے ہاتھ میں تھما دیا۔ میں نے بھی اسے اشارہ کر دیا کہ اِن پر گولی نہ چلائے۔

میں جب ڈبے کے ایک کونے میں ان لوگوں سے ذرا دُور ہُوا تو تکریم احمد بولا "آپ مجھے پولیس انسپکٹر نہ سمجھیں میں در اصل ڈھلوں صاحب کا ایک ادنیٰ خدمت گزار ہوں۔ آپ کو میں نے سمہ سٹہ اسٹیشن کے باہر کسی کی کار لے کر بھاگتے دیکھا تو میں سمجھا کہ آپ کسی سخت مصیبت میں ہیں اسی لیے میں نے اپنی گاڑی آپ کے پیچھے لگا دی۔ ایک جعلی شناختی کارڈ میں نے بنوا رکھا ہے ورنہ پولیس سے اب میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ویسے میں کسی زمانے میں ایس ایچ او رہ چکا ہوں مگر پھر رشوت کے کیس میں پھنس کر میں ایک

سال تک جیل میں رہا۔ نوکری گئی تو میں ڈھلوں صاحب کے پاس جا رہا۔"
"آپ ہمیں کیسے جانتے ہیں ؟" میں نے پوچھا۔ اس نے مجھے حیران کر دیا تھا۔

"میں نے آپ کو ڈھلوں صاحب کی حویلی میں کئی بار دیکھا ہے۔ آپ سے ڈھلوں صاحب کو جو محبت ہے اس کا بھی مجھے علم ہے۔"

"کمال ہے صاحب! میں نے تو آپ کو ایک بار بھی نہیں دیکھا پھر بھی میں آپ کا شکر گزار ہوں، آپ نے جو ہماری مدد کی ہے اس کا تو حق ہی ادا نہیں کیا جا سکتا۔"

"نہیں! یہ میرا فرض تھا ہاشم صاحب! بہرحال آپ پریشان نہ ہوں۔ یہ رقم تو آپ اپنے پاس رکھیں اور گاڑی سے نکل جائیں میں ان سب کو اگلے اسٹیشن پر پولیس کے حوالے کر دوں گا ان کا جرم یہ عورت خود ثابت کرے گی!"

"ہمیں اس عورت سے بھی کام لینا ہے۔ یہ ہمارے دشمنوں کے گروہ کے ایک فرد کی بیوہ ہے اور اگر آپ ہمارا ساتھ دیں اور اس کے ساتھ کراچی تک چلے جائیں تو ہمیں آپ یہ معلوم کر کے دے سکتے ہیں کہ وہ آدمی جو اس کو اسٹیشن پر لینے آئیں گے وہ کہاں رہتے ہیں ان پر آپ نگاہ رکھیں تو آپ کا یہ ہم پر بڑا احسان ہو گا۔"

"کون لوگ ہیں وہ ؟"

"ان میں سے ایک کا نام ڈاکٹر دھمن ہے اور ایک اس کی بیوی ہے ڈاکٹر عالیہ۔ میں اپنے دوست کو آپ کے ساتھ بھیج دیتا ہوں۔"

"نہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے میں خود اس کے ساتھ رہوں گا آپ مجھے اپنا پتہ بتا دیں تو میں وہیں آپ سے رابطہ قائم کر لوں گا۔"

"نہیں! ہمارا کوئی ٹھیک پتہ نہیں ہے کہ ہمیں کہاں کہاں جانا پڑے آپ بہرحال کراچی میں مستونگ کیفے کے مالک مردان شاہ سے ملتے رہیں اور اسے بتا دیں کہ آپ کے بارے میں اگر کوئی پوچھے تو وہ آپ سے کہاں مل سکتا ہے۔"

"یہ کیفے کہاں ہے ؟"

"یہ اُدھر ڈرگ روڈ پہ ہے۔ میں نے مردان شاہ کا نام سن رکھا ہے مگر وہ میرا واقف نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے، رات تو بس گزر ہی چکی ہے صبح سے پہلے پہلے آپ گاڑی سے اُتر جائیں آپ کا ادھر رہنا ٹھیک نہیں ہے۔"

"آپ ہمارے فرار کی کیا وجہ پیش کریں گے ؟"

"میں دیکھ لوں گا، بڑے راستے معلوم ہیں مجھے آپ کا بہرحال پولیس کی نظر میں آنا ٹھیک نہیں ہے۔"

یہ کہہ کر وہ اُن کی طرف لپکا اور آبی کے ہاتھ سے پستول لیکر بولا "ہاں کرم دین جی! اس عورت کو دیکھتے ہو نا تم، اس کو تو اچھی طرح پہچانتے ہو، بہت ذلیل کر چکے ہو تم۔ اور میرا تو یہ ہے کہ میں پنجاب کی خفیہ پولیس کا انسپکٹر ہوں یہ رہا میرا شناختی کارڈ۔ میں تم سب کو اگلے اسٹیشن پر پولیس کے حوالے کر دوں گا، اس کی مشکیں کس دیں بھاجی!" اس نے ہمیں مدد کو پکارا۔

وہ سب کے سب سخت خوفزدہ ہو چکے تھے فرار کا کوئی راستہ اُن کے سامنے کھلا نہیں تھا۔ آبی نے وسمہ جان کے ہاتھ میں پکڑی کی گٹھڑی جھپٹ کر مجھے دیتے ہوئے وردہ کا نائیلون کا دوپٹہ اٹھا لیا اور اس کو کئی ٹکڑوں میں پھاڑ کر بولا "یہ لیں تھانیدار صاحب ان کی مشکیں کس دیں، ان دو کو میں سنبھالتا ہوں۔" دونوں اُن کے ہاتھ پاؤں جکڑنے لگے، اُن میں سے کسی نے بھی ذرا سی بھی مزاحمت نہیں کی۔ اُن کی ہمت ہی جواب دے گئی۔ دو آدمیوں کو آبی باندھ چکا تو تکریم احمد بولا "ان کو بھی رسہ ڈالیں ان جانوروں کو۔ آپ خاصے ماہر معلوم ہوتے ہیں۔" دراصل تکریم احمد اُن پر پستول تان کر کھڑا تھا اور وہ انہیں بھی موقعہ نہیں دینا چاہتا تھا۔ آبی ان کو باندھ رہا تھا کہ میں گٹھڑی اُلٹ کر نشست پر نوٹ بکھیر لیے میں انھیں گن لینا چاہتا تھا۔ ایک ایک کر کے میں نے سارے نوٹ گن لیے تو مجھے اطمینان ہو گیا۔ ہماری رقم بالکل پوری تھی اور ابھی تک اس میں سے انہوں نے کوئی پائی پیسہ خرچ نہیں کیا تھا۔ میں نے وہ نوٹ پھر گٹھڑی میں باندھ کر آبی کے حوالے کر دیے۔

تکریم احمد کو اشارے سے ایک طرف آنے کے لیے کہا اس نے پستول پھر آبی کے ہاتھ میں دے دیا، بولا "ان کا خیال رکھو میں ذرا بھائی صاحب کی بات سن لوں۔" یہ کہہ کر وہ میری طرف آگیا اور سرگوشی کے لہجے میں بولا "آپ اب دیر نہ کریں کسی جگہ گاڑی روک کر نکل جائیں۔"

"میں بس جا ہی رہا ہوں۔ اس عورت کا نام وردہ ہے ڈاکٹر عرفان کی بیوہ ہے اسے کسی نے لاہور میں قتل کر دیا تھا اس کے بارے میں کراچی پہنچ کر پوری معلومات حاصل کریں اور ہم سے رابطہ قائم رکھیں ہم جلد ہی کراچی آئیں گے۔"

"آپ فکر ہی نہ کریں بس جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے نکل جائیں۔ اگر میں آپ کو نہ مل سکا تو ڈھلوں صاحب کے پاس چلے جائیں وہاں میں آپ کو ضرور مل جاؤں گا۔"

عین اسی وقت گاڑی کی رفتار سست ہونے لگی۔ میں نے کھڑکی میں سے سر نکالا تو پتہ چلا کہ گاڑی کسی اسٹیشن کے باہر بیرونی سگنل کے قریب رک رہی تھی کیونکہ سگنل سرخ نہیں ہوا تھا۔ چند ہی ثانیوں بعد گاڑی رک گئی تو میں آبی کو ساتھ لے کر فوراً ہی گاڑی سے اُتر گیا۔ اس وقت پو پھٹ رہی تھی اور اندھیرے میں روشنی کی کلیاں کھلنے لگی تھیں۔ ہم تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے گاڑی سے دُور ہوتے تو کچھ ہی فاصلے پر ہمیں پٹڑی کے ساتھ ساتھ چلتے دو آدمی نظر آئے وہ حلیے کے اعتبار سے ریلوے ملازم معلوم ہوتے تھے، اُن سے پوچھنے پر یہ بات عیاں ہوئی کہ ہم اس وقت پنوں عاقل پہنچ چکے تھے۔

صبح تیزی سے مشرق دریچے کھولتی اوپر اٹھتی چلی آتی تھی اور ہم اس روشنی کی وجہ سے کچھ اور پریشان ہو رہے تھے کیونکہ اجالے ہمیں بسا اوقات راس نہیں آتے تھے۔ گاڑی کوئی پانچ منٹ تک ویرانے میں رکنے کے بعد ہمارے قریب سے گزر کر آگے نکل گئی تھی۔ ہم نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ کچھ ہی دیر بعد ہم شہر میں داخل ہو چکے تھے۔

ریلوے اسٹیشن کے باہر ہم نے ایک ہوٹل میں پہنچ کر ہاتھ منہ دھوئے اور پھر ناشتہ کرنے بیٹھ گئے۔ وہاں سے نکل کر ہم ٹیکسی ڈھونڈنے لگے۔ ہماری وہ ضرورت بھی جلدی پوری ہو گئی کراچی کا کوئی منچلا ڈرائیور کسی سواری کو رات کے بارہ بجے وہاں پہنچا کر ہوٹل میں ٹھہر گیا تھا۔ اس نے اپنی نیند پوری کر لی تھی ایک بیرے نے ہمیں اس سے ملوا دیا اسے جب ہم نے بتایا کہ ہم دو چار دن کے لیے اسے اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہیں اور اسے منہ مانگے دام دیں گے تو وہ خوش ہو گیا اور فوراً ہی ہمارے ساتھ چل دیا۔ آبی نے یوں کیا کہ اپنے لیے ڈھیر سارے سگریٹ اور پھل خرید لیے ناشتے کی چیزیں بھی اس نے گاڑی میں بھر لیں اور سارے جہان کی دولت سمیٹ کر وطن لوٹنے والے سندباد جہازی ایسے بے فکرے لہجے میں ڈرائیور سے بولا "ہمیں سیدھا سکھر لے چل میرے یار، سمجھے ہم منہ مانگا انعام دیں گے۔" اس کے ذہن کا بہت بڑا بوجھ اُتر گیا تھا۔ کار نئی تھی اور ڈرائیور اپنے کام کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اس کی طرف سے مطمئن ہو کر ہم نے ناشتہ کیا اور پھر سگریٹ پھونکنے لگے۔

آبی کار سے باہر بھاگتے ہوئے پراسرار سے منظر پر نظریں جما کر بولا "اُدھر سکھر سے فارغ ہو کر ہم سیدھے کراچی جائیں گے ہاشم خان! اس عورت سے میں پھر ملنا چاہتا ہوں اس کے ساتھ بہت زیادتی ہوئی ہے۔"

اُسے نہیں معلوم تھا کہ میں نے تکریم احمد سے کیا کچھ کہا ہے۔

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ جن لوگوں سے یہ ملنے جا رہی ہے ان سے ملاقات کے لیے میں خود بے تاب ہو رہا ہوں اُن سے میں نے حساب لیا تو پھر میرا جینا بے کار ہو گا میرے بھائی! میں نے تکریم احمد کو سب کچھ سمجھا دیا ہے۔"

"یار! اس تکریم احمد نے تو مجھے حیران کر دیا ہے کیا یہ سچ کہہ رہا تھا ؟"

"بھئی ڈھلوں صاحب کا نام یہ بلاوجہ نہیں لے سکتا تھا۔ کیسی بھولی باتیں کرتے ہو یار، وہ ہمارے بہت کام آیا ہے۔"

"ہاں! جی دار آدمی تھا یار! اس نے کمال کر دیا ہے۔ اگر اسی طرح کسی اصلی پلسیے نے ہمیں کڑکی میں پھانس لیا تو کیا ہو گا تکریم احمد اگر اصلی ہوتا تو وہ ہمیں بُرے کے گھر تک پہنچا سکتا تھا۔"

"ہاں یہ تو ہے مگر ہر کسی کو ڈھلوں صاحب خواجہ خضر بنکر تو نہیں مل سکتے ہیں، بہرحال یہ بات طے ہے کہ یہ نوجوان اُن کا بہت ہی خاص الخاص آدمی ہے۔" آبی نے ادھ جلا سگریٹ باہر پھینک کر ایک اور سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ وہ ان دنوں کچھ زیادہ ہی سگریٹ نوشی کرنے لگا تھا۔ اس پر کبھی کبھی عجیب سی یاس آمیز اور قنوطیت سے لبریز کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ سگریٹ کا ڈھیر سارا دھواں سینے میں کھینچتے ہوئے بولا "یہ دنیا بڑی عجیب شے ہے ہاشم خان! شاید اسی کے بارے میں کسی نے کہا ہے کہ ایں عجوزہ عروس ہزار داماد است۔"

"یہ خیال مقیس کس طرح آیا؟ مجھے تم بڑے مایوس نظر آ رہے ہو۔"

"میں مایوس تو نہیں ہوں مگر آدمی کا حال اس بگینی گائے ایسا ہے جس کے تھنوں میں آہستہ آہستہ دودھ کم ہوتا جاتا ہے میں نے بڑے شوق سے الماس کے ساتھ منگنی کی تھی۔ وہ بھی بہت خوش تھی مگر اس کی خوشی کچھ اس آدمی کی سی تھی جس نے اپنی حویلی کی حفاظت کے لیے ایک بہت چالاک اور چوکس چوکیدار بھرتی کر لیا ہو، وہ مجھے ایسی ہی نظر سے دیکھتی تھی۔" آبی کا لہجہ بہت ہی زخمی محسوس ہو رہا تھا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو یار!"

"میں نے یہی محسوس کیا تھا خان! وہ مجھے دو دو لبالب بھرے ہوئے پستول دے کر اپنے ساتھ اسٹوڈیو لے جاتی تھی۔ میں بس چار دن ہی اس کا ساتھ دے سکا پھر میں اس کے جوئے تلے سے نکل بھاگا اور دربار صاحب جا پہنچا مگر ان چار دنوں میں مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ دراصل اس بہاولپور کے جاگیردار کے حملوں سے خود کو بچانے کے لیے مجھے ڈھال بنانا چاہتی تھی ورنہ وہ جو دلوں کے بیچ کھڑکی سی کھل جاتی ہے وہ نہیں کھل سکی تھی۔"

"یہ تیری خام خیالی ہے یار! وہ ایسی نہیں ہے۔ وہ تو تیری بلائیں لیتی تھی۔"

"نہیں خان! تم نے لبیلا کا نام نہیں سنا، وہ ایسی بھینسی ہے جو

آدمی کی انگلی پر نکل آتی ہے اور اسے کچھ نہیں کرنے دیتی۔ عورت کا بھی یہی حال ہے آدمی کو باندھ کر ڈال دیتی ہے مگر اس کی بانہوں میں وہ سکون آدمی کو نہیں ملتا جس کا تصور اُسے مدہوش کر رکھتا ہے اور میرا بھی یہی حال تھا۔"

"میں تیری بات اب بھی نہیں سمجھ سکا ہوں۔ آخر ہوا کیا ہے؟"

"میں تو میرے بھائی! اس کے سامنے لِبتنی ہو کر رہ گیا۔ مجھے اس نے یہی احساس دلایا۔ وہ جو گہرے احترام خلوص اور محبت کے عنوان ہوتے ہیں وہ مجھے کہیں نظر نہیں آتے تھے۔ سٹوڈیو میں دوسرے دن اس نے مجھ سے اپنے دو پرانے چاہنے والوں کی پٹائی کرا دی۔ یہ کام میں نے کیا تو خلوص کے جذبے سے مگر بعد میں مجھے احساس ہوا کہ میں تو ایسے ہی احمق بن کر رہ گیا ہوں پھر مجھے اپنے آپ سے گھن آنے لگی۔"

"پھر اب کیا سوچا ہے تم نے؟"

"کچھ بھی نہیں یار! بس گزشتہ را صلوٰۃ آئندہ را احتیاط۔"

"اور اگر اس بہاولپوری عاشق نے اس پر پھر حملہ کر دیا یا اسے اٹھوا لیا تو؟"

"اس بدمعاش کو تو میں جان سے ہی مار دوں گا مگر یار وہ جو۔۔۔ وہ جو غیرت کا شعلہ ہے نا وہ میرے دل میں نہیں [illegible]نا۔ مجھے یوں لگتا ہے، جیسے میں نے چوتھے یا پانچویں ہاتھ پر چلی ہوئی گاڑی خرید لی ہے۔ وہ نہ مرجان ہے نہ مونگا، موتی ہے نہ ہیرا۔ بس۔۔ بس ایسے ہی عجیب سے خوبصورت کھلونے جیسی ہے جس کا کوئی بھی مصرف نہیں۔ وہ بس خلا ہی خلا ہے خان! اس کو کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا ہے۔"

"تو پھر لعنت بھیج اس پر۔ تجھے اس کے لیے پریشان ہونے کی ضرورت کیا ہے؟"

"ہاں میں بھی یہی سوچ رہا ہوں میں اس سے شادی نہیں کر سکتا ہوں میں تو مصیبت میں پھنس جاؤں گا۔"

"تمھارا یہ فیصلہ دانشمندی کی دلیل ہے پیارے، اب تو دو گھڑی آنکھیں بند کر کے سو لے، ابھی کافی سفر باقی ہے۔" یہ کہہ کر میں نے نشست کی پشت پر سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ صبح کی ہوا تازہ اور ٹھنڈی تھی مگر لحظہ بہ لحظہ اونچا ہوتا سورج اس میں زہر گھول رہا تھا اور ہم رات بھر سو نہ سکے تھے۔ پلک سے پلک لگی تو میں گہری نیند میں کھو گیا مگر وہ نیند بس جھپکی سی بن کر رہ گئی۔ کوئی جھٹکا سا لگا۔ کار ذرا دیر کے لیے ڈگمگائی مگر پھر سنبھل کر آگے بڑھنے لگی۔ کچھ ہی دیر بعد جھٹکے زیادہ تواتر کے ساتھ لگنے لگے۔ دراصل ہم اس وقت ایسی جگہ سے گزر رہے تھے جہاں سے سڑک ٹوٹ گئی تھی اور اس کی مرمت کے لیے جا بجا روڑی بچھائی جا رہی تھی۔ آبی کی بھی نیند کھل گئی تھی اور وہ جماہیاں لے رہا تھا۔ اس تھکن اور تکدر کو دور کرنے کے لیے ہم نے سگریٹ سلگا لیے، اس کے بعد ہم پھر کر دوبارہ نیند نہ لے سکے۔ اس شہر میں داخل ہونے کے بعد ہی ضرورت کی دوسری چیزیں خریدنے کے علاوہ آبی نے ایک بڑا سا خوبصورت بریف کیس بھی لے لیا جس میں وہ نوٹ بند کیے جا سکتے تھے۔

نہال چند کا پتہ ہمیں معلوم تھا وہ سکھر کے محکمہ جنگلات کے ریسٹ ہاؤس کے عقب میں رہتا تھا۔ اس کی رہائش گاہ پر جب ہم پہنچے تو یہ دیکھ کر ہمیں بڑی حیرت ہوئی کہ نہال چند تو کوئی بہت بڑا آدمی تھا۔ کوٹھی اس نے کوئی چھ کنال رقبے پر تعمیر کر رکھی تھی۔ پرانے لوہے تانبے اور پرانی گاڑیوں کا کاروبار کرتا تھا۔ ہمیں اس وقت گھر پر ہی مل گیا۔ وضع قطع کے اعتبار سے وہ کوئی رئیس معلوم ہوتا تھا۔ اس نے ہمیں بڑے تپاک سے اپنے مہمان خانے میں بٹھایا۔ اُسے یہ معلوم کر کے بے حد خوشی ہوئی کہ ہم اس سے ملنے کے لیے پنجاب سے وہاں تک پہنچے ہیں۔ وہ ٹھیٹھ سندھی تھا۔ جب وہ اردو یا پنجابی بولتا تھا تو اس کا لہجہ بہت ہی شیریں اور دلفریب ہو جاتا تھا۔ ہمیں وہ موسم کی مناسبت سے ٹھنڈا اور کڑوا پلا چکا جس میں اناس اور لیموں شامل تھا تو وہ بولا "سائیں! حکم کریں آپ ادھر مجھ غریب کے پاس کیسے آئے ہیں؟"

"بات یہ ہے نہال چند جی کہ ہم نے سُنا ہے کہ آپ کا ایک بھائی مہیش چند کئی دنوں سے گھر سے غائب ہے؟"

ہماری یہ بات سن کر وہ سراپا اشتیاق بن کر بولا "جی! میں نے تو اس کی گمشدگی کا اخبار میں اشتہار بھی دیا تھا اس کا پتہ بتانے والے کو دو ہزار روپے دینے کا بھی اعلان کر رکھا ہے آپ کو اس کی کوئی خبر ہو تو بتا دیجئے۔"

"ہمارے پاس یہ ایک تصویر ہے نہال چند جی! یہ دیکھیے ہمارا خیال ہے کہ یہ آپ کے بھائی کی ہی تصویر ہے۔ یہ پنجاب کے اخبارات میں چھپی تھی۔" یہ کہہ کر میں نے وہ تصویر نہال چند کے سامنے رکھ دی، جو ہم ادکارہ سے لے کر چلے تھے۔ نہال چند وہ تصویر بڑے غور سے دیکھی پھر وہ کھڑکی کے پاس جا کر اس کا جائزہ لینے لگا۔ جب بھی اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو اس نے عینک لگا کر اس کی ایک ایک تفصیل پر غور کیا۔ چہرہ اس کا یہی بتا رہا تھا کہ وہ کسی فیصلے پر پہنچنے میں شدید دقت محسوس کر رہا ہے۔ بڑی مشکل یہ تھی کہ اس تصویر کے نیچے جو نام لکھا تھا وہ کسی اور کا تھا مگر نہال چند کے بھائی کا نام مہیش تھا۔ وہ کسی قطعی نتیجے پر نہ پہنچ سکا تو عینک اتار کر بڑے ہی سپاٹ لہجے میں بولا:

"یہ میرے بھائی کی تصویر نہیں ہے۔ یہ تو کوئی پرکاش چند ہے جب کہ میرے بھائی کا نام مہیش چند ہے۔" یہ کہہ کر وہ ہم سے ذرا فاصلے پر پڑی کشادہ سی آرام دہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے ماتھے کی لکیریں ایک دوسرے میں گڈمڈ ہونے لگی تھیں، وہ کسی گہری سوچ میں گم تھا اور اس کے چہرے کے تاثرات اس کی اندرونی کش مکش کا پتہ دیتے تھے۔

آبی صوفے پر میرے قریب ہی بیٹھا تھا، دبی آواز میں بولا "یار! یہ آدمی مجھے گڑبڑ گھوٹالہ نظر آتا ہے، یہ مان کیوں نہیں رہا کہ یہ تصویر اس کے بھائی کی ہے۔"

"یہ بولے گا خود بولے گا کہ یہ تصویر کس کی ہے، اسے پہلے اپنے دماغ کی باؤلی صاف کر لینے دے۔" میں نے آبی کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ اس نے صلے میں مجھے ایک سگریٹ سلگا دیا۔ وہ میری کسی بات پر خوش ہوتا تھا تو مجھے نیا سگریٹ پیش کر دیتا تھا۔

"ہمارا تو یہی خیال تھا لالہ جی کہ یہ آپ کے بھائی کی تصویر ہے دیکھیں نا ہم تو انعام کے لالچ میں اتنا سفر کر کے یہاں پہنچے ہیں۔"

"آپ کا اصرار ہے تو میں آپ کو انعام کی محرومی سے بچانے کے لیے مان لیتا ہوں کہ یہ میرا بھائی ہے ورنہ سائیں میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ پتہ نہیں کون ڈاکو ہے اور اس کا نام بھی کوئی اور ہے۔" یہ کہہ کر اس نے نشست گاہ کے دائیں ہاتھ پچھے میز کی دراز میں سے سو سو کے بیس نوٹ نکال کر میری طرف بڑھا دیے، بولا "میں آپ کو مایوس نہیں کرنا چاہتا یہ رکھ لیں، آپ کی ضرورت زیادہ ہی شدید معلوم ہوتی ہے۔"

"یہ بات نہیں ہے جناب! ہم ایسے بھی بھک منگے نہیں ہیں مگر۔۔۔ حیرت ہمیں یہ ہے کہ آپ اپنے سگے بھائی کو بھی تسلیم نہیں کر رہے ہیں۔" آبی نے بڑی رسان سے کہا اور پھر اٹھ کر وہ اس کی خوبصورت میز کے پاس بچھی کرسی پر جا بیٹھا۔ نہال چند اس وقت دو ہزار کے نوٹ دوبارہ دراز میں رکھنے کے لیے اسے کھول چکا تھا۔ ابھی وہ نوٹ رکھ ہی رہا تھا کہ آبی نے دراز میں بجلی ایسی تیزی سے ہاتھ ڈال کر باہر نکال لیا بس ایک لحظے کے لیے میری نظروں کے سامنے جھپاکا سا ہوا اور جب میری نظر ذرا ٹھہری تو میں نے دیکھا کہ آبی کے ہاتھ میں ایک بہت ہی خوبصورت قسم کا ہلکا پھلکا پستول تھا جس کا رُخ اس نے نہال چند کی طرف پھیر دیا تھا۔ "میرا خیال ہے مسٹر نہال چند آپ کو اطمینان سے کرسی پر بیٹھ کر ہمارے چند سوالوں کے جواب دینا ہی چاہئیں کیونکہ ہم یہاں انعام کے لالچ میں نہیں آئے ہیں۔"

نہال چند ایک دم کرسی سے اچھل گیا۔ اس کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے آبی کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے وہ سب کچھ اُسے ناقابلِ یقین نظر آتا ہو۔ اس کے وجود کی ساری بتیاں ماند پڑ گئی تھیں اور اب وہاں کوئی ایسا نہ تھا جو اس کی آواز کے طنطنے کو جھٹکا لگا سکتا۔

"بیٹھ جا بھائی، بیٹھ جا۔ ہمیں تم سے کچھ ضروری باتیں معلوم کرنی ہیں۔" آبی نے اب کی بار اپنی آواز میں بے یقینی اور بد اعتمادی کی لرزش کو ختم کرتے ہوئے کہا۔

نہال چند سمٹ سکڑ کر بیٹھ گیا، یوں کہ آبی کے اشارے پر اس نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے سامنے میز پر رکھ لیے تھے۔

"آپ کیا کاروبار کرتے ہیں لالہ جی؟"

"میں پرانے لوہے تانبے اور پرانی گاڑیوں کا لین دین کرتا ہوں۔"

"کتنا سرمایہ لگا رکھا ہے آپ نے اس کاروبار میں؟"

"یہی کوئی سولہ سترہ لاکھ۔"

"ہوں! بڑی رقم ہے یہ، اس سے پہلے آپ کیا کرتے تھے؟"

"یہ سوال بے معنی ہے۔"

"نہیں! مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ یہ سرمایہ آپ کے پاس کہاں سے آیا۔ میری معلومات کے مطابق تو چند سال پہلے آپ کے پاس رہنے کے لیے ایک کھولی بھی نہیں تھی۔"

"میں پھر کہوں گا کہ آپ کو مجھ سے ایسے نجی سوال پوچھنے کا کوئی حق نہیں ہے۔" یہ کہہ کر اس نے میز کے پہلو میں لگی گھنٹی پر پاؤں رکھنے کی کوشش کی مگر آبی نے اسے گریبان سے پکڑ کر کچھ اتنی تیزی سے اوپر اٹھایا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔

"ہم آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتے ہیں لالہ جی! آپ سے ہمارا کوئی جھگڑا نہیں ہے بہت سی باتیں ہمیں پرکاش چند نے خود ہی بتا دی تھیں مگر آپ اُن سے انکار کر رہے ہیں، کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ یہ سارا سرمایہ آپ کو اپنے بھائی مہیش چند نے مہیا کیا تھا اور وہ کئی سال سے ڈاکوؤں کے گروہ میں شامل تھا؟"

"یہ غلط ہے۔" نہال چند نے اپنا گریبان آبی کی گرفت سے چھڑاتے ہوئے کہا۔ آبی نے کھینچ کر اسے میرے پاس صوفے پر لا گرایا تھا۔ نہال چند کا رنگ لحظہ بہ لحظہ ہلدی ہوا جاتا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا واسطہ کن لوگوں سے ہے اور ہماری اس آڑی ٹیڑھی تفتیش کا مقصد کیا ہے۔

"یہ غلط نہیں ہے نہال چند! تم جاؤ بھاڑ میں ہماری طرف سے تم چاہو تو یہ پورا شہر بیچ کھاؤ ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں ہے ہمیں یہ بتاؤ کہ وہ تمھارا بھائی پرکاش چند کس گروہ کے ساتھ مل کر کام کرتا تھا اور اُس گروہ کا سرغنہ کون ہے ہم اس کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ تمھاری دولت سے تمھاری بے ایمانی اور بدمعاشی سے ہمیں کوئی سروکار نہیں ہے۔" میں نے نہال چند کے بال

پکڑ کر اُسے ہلکا سا جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اپنا تعارف بھی کروا دیا۔ میں نے اُسے بتایا کہ ہمارا دھندا بھی وہی ہے جو مہیش چند کا تھا۔

"اچھا! تو یہ بات ہے۔ میں۔۔ میں سمجھا تھا کہ آپ خفیہ پولیس کے آدمی ہیں۔ دیکھیں سائیں ہم سے آپ شرافت سے بات کریں تو ہم ساری بات آپ کو بتا دیں گے۔" اس نے پہلی بار سُکھ کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں سے خوف کی لہر ذرا دیر کے لیے پیچھے ہٹ گئی تھی۔ میں نے اس کے بال چھوڑ دیے تو وہ صوفے پر پیچھے ہٹ کر ذرا اطمینان سے بیٹھا اور بالوں میں انگلیاں پھیر کر بولا۔

"بات یہ ہے سائیں! کہ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ میرا بھائی مہیش چند اُدھر پنجاب میں ترن تارن گاؤں میں مارا گیا ہے۔ اس کا فوٹو میں نے اخبار میں دیکھ لیا تھا۔ اس کا نام میں نے جان بوجھ کر اس کے بازو پر پرکاش چند لکھوایا تھا۔ بچپن میں ہم اُسے پرکاش ہی کہا کرتے تھے۔ اس نے پچھلے پانچ سال میں مجھے کوئی سات لاکھ روپیہ کما کر دیا ہے ایک بدمعاش ہے سلطان لاکھو۔ وہ شکارپور کا رہنے والا ہے مہیش اس کے گروہ میں شامل ہوا تو میں نے وقفے وقفے سے اخباروں میں اس کی گمشدگی کے تین اشتہارات چھپوائے۔ میں پولیس پر یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ میرا مہیش چند سے کوئی تعلق نہیں رہا اور وہ گھر سے بھاگ چکا ہے حالانکہ وہ باقاعدگی سے رات کے اندھیرے میں میرے پاس آ کر مجھے بڑی بڑی رقمیں دے جاتا تھا جو وہ اُدھر کبھی پنجاب سے اور کبھی کراچی سے لوٹ کر لاتا تھا۔ جب وہ ترن تارن میں مارا گیا تو اس کے فوراً ہی بعد میں نے ایک اور اشتہار چھپوا دیا، تاکہ پولیس کو یہ تاثر دے سکوں کہ مجھے اس کے بارے میں کوئی خبر نہیں ہے۔"

"کیا اس کے گروہ کا کوئی آدمی ترن تارن کی واردات کے بعد آپ کے پاس آیا تھا؟"

"ہاں! لاکھو نے ایک آدمی کو میرے پاس ایک لاکھ روپیہ دے کر بھیجا تھا اور کہا تھا کہ اسے پرکاش کی بے وقت موت کا بے حد افسوس ہے مگر بھگوان کو یہی منظور تھا۔" یہ کہہ کر نہال چند نے ایک مہکتی ہوئی بیڑی سلگا لی۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ پُرسکون نظر آنے لگا تھا مگر خوف کی ایک غیر مرئی سی لہر اب بھی اُس کی آنکھوں میں ٹھہر ٹھہر کر جھلکنے لگتی تھی جیسے وہ اپنے ذہن میں یہ فیصلہ نہ کر سکا ہو کہ اس نے ہمارے سامنے وہ ساری باتیں کر کے کہیں اپنے لیے موت کا سامان تو نہیں پیدا کر لیا ہے۔ اس کی رکاوٹ کا سارا بھات ختم ہو چکا تھا۔ ہم اگر اُسے ایک اور جھٹکا دیتے اور ایک اور نفسیاتی حملہ اس پر کرتے تو میرا خیال ہے کہ وہ وہیں جان دے دیتا۔ اس کے اعصاب آہستہ آہستہ بالکل ہی معدوم ہوتے جا رہے تھے۔

"کیا تم لاکھو سے ہماری ملاقات کروا سکتے ہو؟"

"ہاں! کیوں نہیں مگر اُسے آپ کی نیت پر ذرا بھی شک ہو گیا تو آپ کو وہ زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

"ہمیں بھی زندہ رہنے کی کوئی اتنی خواہش نہیں ہے ہمیں اس کا پتہ بتا دو یا پھر ہمیں اس کے پاس لے چلو۔"

"مگر سائیں! آپ کیا کھود رہے ہیں اس پہاڑ کے تلے سے" اُس نے بیڑی پاؤں تلے مسلتے ہوئے کہا۔

"کچھ ایسی ہی بات ہے لالہ۔ اگر ہمارا مجرم لاکھو نہیں ہے تو اُسے دُور سے سلام کر کے واپس آ جائیں گے، تم یہ بتاؤ کہ وہ جیل گیا ہے؟" آبی نے اس کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ پستول ابھی تک اس کے سیدھے ہاتھ میں تھا۔

"ہاں! ابھی کوئی چار مہینے پہلے وہ راولپنڈی جیل سے فرار نکلا تھا۔"

آبی کے اس سوال نے اچانک ہی میری سوچ کا رُخ بدل دیا آبی کا ذہن جس سمت میں دیکھ رہا تھا وہاں مجھے روشنی کے امید افزا صبح کے طلوع کے کئی نشانات نظر آنے لگے تھے۔

"تو پھر اُٹھ جا نہال چند! ورنہ کرسی ہمیں ہر قیمت پر آج لاکھو تک پہنچنا ہے آج کی رات یا ہمیں زمین کے پیٹ میں آئے گی یا اُسے۔" آبی پھنکارتا ہوا کرسی سے اُٹھ گیا۔ میں نے صوفہ چھوڑ دیا۔ بہت سی باتیں آپ ہی آپ واضح ہوتی جا رہی تھیں جتنی بھی کالک آسیہ کے منہ پر ملی گئی تھی وہ سب کی سب اُسے راولپنڈی جیل ہی میں میسر آئی تھی، اس کی تقدیر کے خشک پوُلے میں کسی نے وہیں آگ لگائی تھی اور وہ آدمی سلطان لاکھو کے سوا اور کوئی نہ ہو سکتا تھا۔

"وہ جیل کس سلسلے میں گیا تھا لالہ جی، کچھ بتا سکتے ہو تم کیا الزام تھا اس پر؟" میں نے نہال چند کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ مجھے وہ آدمی اچھا نظر آنے لگا تھا۔ وہ سادہ لوح بھی ذرا سی دہشت کے سامنے اُس نے ہتھیار ڈال کر ہمیں وہ سب کچھ بتا دیا تھا جو عام حالات میں کسی ڈاکو کی کمائی کھانے والا کوئی آدمی سارا بدن زخمی کروا لینے کے بعد بھی شاید نہ بتاتا۔ میرا خیال تھا وہ سالا سو جوتے بھی کھاتے گا اور سو پیاز بھی مگر وہ دونوں سے بچ کر راستی کی راہ سے بخیر و عافیت آگے نکل چلا تھا۔ میری بات سن کر وہ بولا۔ "وہ تین آدمی تھے۔ لاکھو، پوُرنک اور پانڈے وہ تینوں قتل کے جرم میں عمر قید کاٹ رہے تھے۔ پانڈے لوگ انڈیا سے آئے تھے۔ اُدھر تھرپارکر کے رستے سے مگر پھر وہ تینوں نہ کسی طرح کسی کو کچھ دے دلا کر جیل سے نکل بھاگے۔"

"تو آپ کا کیا خیال ہے لاکھو اب اپنے اڈے پر ہو گا؟"

"نہیں! شکارپور میں اس کا گھر تو ہے مگر وہ وہاں نہیں مل سکتا۔ اس کا سراغ لگانا ہی اصل مسئلہ ہے۔"

"یوں کام نہیں چلے گا لالہ جی! ہمیں لاکھو تک ہر حال میں پہنچنا ہے۔"

"تو پھر۔۔۔ یوں کریں آپ اس کی ماں سے مل لیں۔ اس کا نام بسیح ہے، وہ مائی جیٹونا کے نام سے جانی جاتی ہے۔ آپ اُس کے پاس چلے جائیں وہ اپنی تین بیٹیوں کے ساتھ وہاں رہتی ہے اس سے آپ کو معلوم ہو سکتا ہے کہ لاکھو کہاں ہے مگر یہ کام بہت احتیاط سے کرنے کا ہے۔"

"وہ ہم پر اعتبار نہیں کرے گی لالہ جی! آپ ہمارے ساتھ چلیں۔"

"وہ مجھے بھی نہیں جانتی ہے مہیش چند سے بھی ناواقف تھی اس کو تو آپ خود ہی شیشے میں اُتاریں گے۔"

"ٹھیک ہے اس بڑھیا سے ہم نپٹ لیں گے۔ کیا اس کا خاوند زندہ ہے؟"

"نہیں وہ مر چکا ہے، لاکھو نے وہ جائیداد اس کے مرنے کے بعد بنائی ہے۔"

"ٹھیک ہے لالہ جی! اب ہم چلتے ہیں یہ آپ کا پستول ہمارے پاس نشانی کے طور پر محفوظ رہے گا۔ اُمید ہے آپ بُرا نہیں مانیں گے۔ ہمارا مقصد اگر حاصل ہو گیا تو یہ آپ کو واپس مل جائے گا۔"

"مجھے ڈر ہے آپ لاکھو سے کچھ حاصل نہیں کر سکتے۔۔ وہ ایک آدمی نہیں ہے بہت بڑے گروہ کا سرغنہ ہے۔" نہال چند نے پستول کے بارے میں کوئی بات کہنے سے گریز ہی کیا۔

"یہ تو وقت ہی بتائے گا نہال چند جی! کہ کون کتنے پانی میں ہے! اچھا خدا حافظ۔ ہماری گستاخی معاف کر دینا۔ ہم بندوق پر چڑھے بارُود ایسے لوگ ہیں۔ پتہ نہیں کہاں اور کس وقت ہمارا وجود ریزہ ریزہ ہو جائے۔ ہمیں شما کر دینا۔" آبی نے بڑے ہی بھیگے لہجے میں کہا۔ اس کا ذہن اُس گھڑی خدا جانے کیا کیا تصویریں دکھا رہا تھا۔

گاڑی ہم نے نہال چند کے دروازے پر ہی ٹھہرا رکھی تھی۔ جب ہم اس میں بیٹھے تو آبی کے چہرے کو دیکھ کر میرا دل لرزنے لگا۔ آبی کی آنکھیں آنسوؤں میں ڈوبنے لگی تھیں، اُس نے مُنہ دُوسری طرف پھیر لیا۔ مجھ سے وہ اپنی قلبی کیفیت چھپا لینا چاہتا تھا۔ گاڑی چلی تو میں نے اس کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ "کیا بات ہے یار! تم اتنے آزردہ کیوں ہو رہے ہو؟ مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے؟"

وہ میرا یہ سوال سُن کر بکھرنے لگا۔ آنکھیں اس کی بہہ نکلیں۔ وہ اپنے آنسوؤں پر ضبط نہ کر سکا تھا۔ اُلجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "کچھ نہیں یار! تو بھلا کیا غلطی کر سکتا ہے۔ میں۔۔ میں اُس آسیہ کی تقدیر پر روتا ہوں۔ یار کیسی کالی قسمت لکھوا کر آئی ہے وہ اس دنیا میں۔ اُس کی راہ میں کوئی لاکھو بھی کھڑا تھا۔ سوچ تو ذرا جیلانی یہ۔۔۔ یہ سب کیا ہے؟"

"مجھے معلوم ہے یار جی! مگر۔۔ مگر ہم کر بھی کیا سکتے ہیں؟ ایک کوشش ہے سو وہ ہم کیے جاتے ہیں، اس سے زیادہ ہمارے بس میں کیا ہے میرے بھائی! مجھے تو اس لڑکی کی کم ہمتی پر غصّہ آتا ہے وہ مٹی کی مادھو بنی اللہ میاں کی گائے ایسی ہو کر جس طرف کوئی ہانکتا ہے ہنکتی چلی جاتی ہے۔ جیسے وہ اپنی مرضی سے محروم ہے، نہ اس کا ہاتھ چلتا ہے نہ پاؤں ہے نا حیرت کی بات کوئی ایسی بے زبان لڑکی بھی دیکھی ہے تم نے؟"

"کچھ زیادہ ہی بھلی مانس ہے وہ ہماری بہن مگر یار، اُسے کچھ تو اپنا ڈنک ثابت کرنا چاہیے! چیونٹی بھی پاؤں تلے دبے تو کاٹ لیتی ہے۔" آبی نے میرے اس خیال سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

"وہ ایک بار مل جائے پھر میں اس رُخ کو سامنے رکھ کر اُس کے مُنہ پر گن گن کر طمانچے ماروں گا۔ وہ اس معاملے میں تو کسی بھی رعایت کی مستحق نہیں۔ کوئی دُودھ پیتی بچی تو نہیں ہے وہ کہ جو کوئی چاہتا ہے اُسے لے نکلتا ہے۔"

"کدھر چلنا ہے صاب جی اب؟" ڈرائیور نے شہر کے وسط میں پہنچ کر کہا۔

"یار ہمیں یاد ہی نہیں رہا۔ دیکھ اس کی ٹینکی بھروا لے میرے بھائی اور ہمیں یہاں سے سیدھا شکارپور لے چل۔" آبی نے ڈرائیور کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"کرائے کی بات سوچ لیں سائیں، اُدھر بڑا "ٹیم" لگ جائے گا۔"

"تو فکر ہی نہ کر یار! سو روپیہ دیہاڑی ٹھیک ہے؟"

"جی نہیں سائیں! ڈیڑھ سو لگے گا اُدھر کچے پکے راستے میں گاڑی بہت خراب ہو گی۔"

"تو ٹھیک ہے جتنے دن تو ہمارے ساتھ رہے گا ہم تمہیں ڈیڑھ سو روپیہ روزانہ دیتے رہیں گے، اپنے اڈے پر یہاں سے اطلاع بھجوا دے، کہہ دے کہ تم شکارپور جا رہے ہو۔"

اس نے ہماری ہدایات پر عمل کیا۔ گاڑی کا پیٹ اس نے بھر لیا اور ہم نے اپنا دوپہر کا کھانا کھا کر جب سکھر سے باہر نکلے تو دھوپ کچھ اور زیادہ تیز ہو گئی تھی اور سڑکیں دہکنے لگی تھیں سندھ کا سورج اپنا کام دکھانے لگا تھا۔

ڈرائیور جس کا نام بدنس تھا چائے کا ایسا رسیا تھا کہ اتنی شدید گرمی کے باوجود اس نے لکھی قصبے پہنچ کر کڑک چائے کے دو بڑے بڑے گلاس چڑھا لیے۔ ہم نے بھی اس کا ساتھ دیا مگر اس گرمی

میں وہ چائے پی کر ہماری طبیعت مضمحل سی ہو گئی۔ جب ہم شکارپور پہنچے تو شام کے سات بج رہے تھے۔ شام سر پر آ پہنچی تھی۔ گاڑی ہم نے باہر سڑک پر کھڑا کر ڈرائیور سے کہا کہ ہمارا انتظار کرے اور وہاں سے ہماری واپسی تک کسی طرف نہ جائے۔

اس شہر کے مسقف بازار میں جب ہم شام کے جھٹپٹے میں داخل ہوئے تو مجھے لاہور کا ڈبی بازار یاد آیا۔ آبی ہر طرف بڑی متجسس نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ کوئی آدمی ایسا نظر نہیں آتا تھا جس سے ہم اس آدمی کے بارے میں پوچھ سکیں جس کی بڑی ہیبتناک تصویر ہمارے سامنے نہال چند نے کھینچی تھی۔ آبی ایک پنواڑی کی دکان پر رک کر سگریٹ خریدنے لگا جب اس نے بڑھیا قسم کے سگریٹ کے چھ پیکٹ خریدے تو پان کے لیے بھی اس نے کہہ دیا۔ وہ پنواڑی کوئی خوش ذوق آدمی تھا اور اس کی گفتگو بڑی ہی نستعلیق تھی۔ ہمیں وہ بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ ہمارا لباس اس خوبصورت بریف کیس سے لگا نہیں کھا رہا تھا جو میرے ہاتھ میں تھا۔ آبی کی ٹھیٹ پنجابی سے وہ متاثر ہو رہا تھا۔ بولا "معلوم ہوتا ہے حضور پنجاب سے تشریف لا رہے ہیں؟"

"ہاں بھیا، کچھ تقدیر کا چکر ہے۔ ہمیں اِدھر ایک صاحب کی تلاش ہے نام اُن کا لاکھو ہے۔ پتہ نہیں یہاں وہ کس نام سے مشہور ہے۔"

اس نے ہاتھ روک لیا، بولا "آپ میر ممتاز شاہ کا تو نہیں پوچھ رہے ہیں؟"

"شاید! اُن کا نام میرا مطلب ہے اصل نام یہی ہو۔ ہم نے انھیں کبھی دیکھا نہیں ہے۔"

"کوئی خاص بات اُن کے بارے میں آپ کو یاد ہو تو بتائیں وہ ادھر ہمارے ہی شہر میں رہتے ہیں۔" اس نے ایک ایک گلوری ہمیں الگ الگ تھماتے ہوئے کہا۔

"سنا تو یہی ہے۔ یہ میر ممتاز صاحب کون ہیں؟"

"یہ تعلقہ دار ہیں یہاں کے۔"

"یہاں کوئی مائی جیونا بھی رہتی ہے؟" میں نے نہال چند کی بتائی ہوئی ایک اور نشانی اس کے سامنے رکھی۔

"اس کا تو ہمیں کوئی علم نہیں ہے جناب! میر ممتاز شاہ کا نام البتہ سنا ہے سنگھوٹ گاؤں میں رہتے ہیں۔ یہاں شہر میں بھی اُن کا ایک مکان ہے۔"

"سنگھوٹ کا گاؤں! مگر بھیا! یہ لاکھو کا نام سن کر آپ کو میر ممتاز شاہ کیسے یاد آ گیا۔ ان دونوں ناموں میں تو کوئی بھی چیز مشترک نہیں ہے؟" میں نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔ کوئی ایسی بات ضرور تھی جس کی وجہ سے اس آدمی نے لاکھو کا نام سنتے ہی ہم سے میر ممتاز شاہ کا پوچھ لیا تھا۔ وہ کچھ گھبرا سا گیا، بولا "بس ایسے ہی جناب! سنا ہے میر صاحب کو بچپن میں گھر والوں نے یہ نام دے رکھا تھا۔ بس ایسے ہی میں نے کسی سے سنا تھا۔ اور کوئی خدمت جناب؟"

"نہیں اور کچھ نہیں چاہیے۔ اگر ہمیں اس آدمی کا پتہ آپ [illegible] سکتے تو ہماری مشکل حل ہو جاتی۔" آبی نے دو سگریٹ سلگا کر ایک مجھے دے دیا۔ اس کے نم آلود لبوں سے سگریٹ بھی گیلا [illegible] گیا تھا۔ وہ میں نے مسل کر پھینک دیا۔ وہ سمجھ گیا کہ معاملہ کیا ہے [illegible] معنی خیز انداز میں مسکرا کر اس نے پیکٹ میرے آگے کر دیا [illegible] ساتھ چند قدم چل کر بولا "دراصل میں اس طرح تم سے اپنی [illegible] بڑھانا چاہتا تھا مگر تو ہے ہی ناشکرا آدمی۔ چل اب آگے [illegible]

"یار! یہ کوئی شرافت ہے۔ ہر بار تو سگریٹ گندا کر کے [illegible] تھما دیتا ہے خبردار جو پھر کبھی تم نے میری اس طرح بے حرمتی کی [illegible]

"تو بڑا حسینہ عالم بن چکا ہے کیا تو اور کیا تیری حرمت [illegible] وہ ہنس دیا۔ پھر میرا کندھا تھپتھپا کر بولا "کچھ سمجھا [illegible] تو! میرا یہ خیال ہے کہ لاکھو اور میر ممتاز شاہ ایک ہی آدمی [illegible] دو نام ہیں۔"

"شک تو مجھے بھی یہی ہے مگر کوئی ثبوت ہونا چاہیے ہمارے پاس۔"

"یہ بھیا کچھ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا مگر اس کو اصلی بات [illegible] شاید علم نہیں ہے۔ خیر، اللہ کا نام لے کر آگے نکل۔ اس نہال [illegible] نے لاکھو کے بارے میں اگر صحیح بات بتا دی ہوتی تو بات [illegible] ہو جاتی۔"

"وہ بدمعاش ہم سے بہت کچھ چھپا گیا ہے کسی اور سے [illegible] شاید کچھ معلوم ہو سکے۔"

ہم نے بازار کا آخری کونا چھو لیا مگر کئی آدمیوں سے [illegible] کرنے کے باوجود بھی ہمیں کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ لاکھو نام کے کسی [illegible] سے کوئی بھی واقف نہیں تھا۔ جب ہم بازار سے باہر نکلے تو شام [illegible] ہو چکی تھی۔

"یار! اب کس طرف نکلیں، ہم تو بے وقوف بن کر [illegible]" آبی نے مایوس ہو کر کہا۔

"چل ہم سیدھے سنگھوٹ چلتے ہیں معلوم تو کریں کہ [illegible] ممتاز شاہ ہے کون؟"

"ہاں! دیکھنے میں کیا حرج ہے؟"

میں نے آبی کی ہاں میں ہاں ملائی اور ہم دونوں [illegible] کھانے کے لیے ایک چھوٹے سے ہوٹل میں جا داخل ہوئے [illegible] ابھی ہم دروازے ہی میں تھے کہ دو آدمی بظاہر بڑی لاپروائی [illegible] چلتے ہوئے ہمارے پاس آ پہنچے۔ وہ دونوں ہمیں بڑے غور [illegible] رہے تھے۔ دونوں ملیشیے کی شلوار قمیض میں ملبوس تھے۔ ہم انھیں نظرانداز کر کے ہوٹل کے اندر ایک کونے کی میز کے سامنے جا بیٹھے تو وہ بھی ہماری ہی میز پر آمنے سامنے کی تیسری چوتھی کرسیاں سنبھال کر بیٹھ گئے۔ اُن میں سے ایک نے مجھے بڑی رسان سے دیکھتے ہوئے کہا "آپ نے بُرا تو نہیں مانا؟ دراصل ہمیں آپ سے ملنے کا اشتیاق تھا اسی لیے ہم اِدھر آ گئے۔ آپ پنجاب سے آئے ہیں نا؟"

"جی ہاں! آپ نے کیسے جانا کہ ہم اُدھر سے آئے ہیں؟"

"آپ بازار میں کسی آدمی کا پوچھ رہے تھے تو آپ کی گفتگو سے ہم نے یہی اندازہ لگایا کہ آپ پنجاب سے آئے ہیں کسی کو ڈھونڈ رہے تھے آپ۔ شاید ہم آپ کی کوئی مدد کر سکیں۔"

وہ آدمی بڑی رواں دواں اور شستہ اردو بول رہا تھا۔ عمر اس کی یہی کوئی تیس سال ہو گی۔ لانبے قد کا سانولا سا وہ آدمی اپنے شخصیت کے اعتبار سے خاصا پُرکشش تھا۔ خاص طور پر اس کی مسکراہٹ میں کچھ عجیب سی بے ساختگی اور جاذبیت جھلکتی تھی۔

"آپ کی تعریف؟ میرا مطلب ہے آپ کے اسمائے گرامی۔" آبی نے اس کو ٹٹولتے ہوئے کہا۔

"میرا نام ظفر گھٹارو ہے اور یہ ہیں میرے دوست نصیر دہلوی۔"

"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ میرا خیال ہے ہم آپ کے لیے بھی کھانا منگوا لیتے ہیں کھانے کا وقت بھی ہے رسم دنیا بھی ہے اور موقع بھی۔"

"اور دستور بھی۔" میں نے آبی کا فقرہ پورا کر دیا۔

"ماشاءاللہ آپ خاصے صاحب ذوق معلوم ہوتے ہیں منگوالیں صاحب اگرچہ آپ کی میزبانی کا شرف ہمیں حاصل ہونا چاہیے تھا پر خیر کوئی بات نہیں۔" نصیر دہلوی نے کہا۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ وہ دونوں اہل زبان نہیں ہیں مگر دلی والوں کا لب و لہجہ انھوں نے بڑی محنت سے اپنا لیا تھا۔ وہ دونوں ہی مجھے بھیدوں کی گٹھلی نظر آ رہے تھے مگر پھر میں نے اپنا یہ خیال ذہن سے جھٹک دیا کیونکہ ہر آدمی کو مشکوک سمجھ لینا بھی تو کوئی شرافت نہیں ہوتی۔ کھانا آیا تو وہ بڑی بے رغبتی سے اس پر ہاتھ مارنے لگے۔ انھیں بھوک بالکل نہیں تھی وہ محض ہمارا دل رکھنے کے لیے کھانے میں شریک ہو گئے تھے۔

ظفر نے پانی کا ایک پورا گلاس تیسرے لقمے میں نیچے اتار لیا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ہاتھ کھینچ لینا چاہتا تھا۔ گلاس میز پر بڑی احتیاط سے رکھ کر بولا "آپ کن صاحب کی تلاش میں ہیں؟ ہمیں بتائیں شاید ہم آپ کی کچھ رہنمائی کر سکیں۔"

"دیکھیں ظفر صاحب! ایک آدمی ہے لاکھو پتہ نہیں اسکے نام کے لاحقے سابقے کیا ہیں ہم اس کی تلاش میں اِدھر آئے ہیں۔"

لاکھو کا نام ہماری زبان پر آیا تو ان دونوں نے معنی خیز انداز میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ نصیر نے ایک بوٹی پر دانت مارتے ہوئے ہاتھ روک لیا، بولا "کچھ تفصیل اس بارے میں بتائیں تو شاید ہم بھی کچھ سمجھ سکیں، واللہ آپ کی خدمت کر کے ہمیں بہت خوشی ہو گی۔"

"وہ دراصل پرانا سزا یافتہ ہے۔ پنڈی جیل میں رہ چکا ہے ہم سے وہ ڈیڑھ سال پہلے پچاس ہزار روپے قرضِ حسنہ کے طور پر لے آیا تھا۔ لاہور سے ہم وہ رقم لینے آئے ہیں۔" آبی نے لاکھو کے بارے میں بات بنائی۔

"قرضِ حسنہ! یہ بھی خوب قرض ہے صاحب اور اس کا مطلب ہی یہ ہے کہ جب قرض دینے والا رقم کی واپسی کا مطالبہ کرے تو قرض لینے والا ہنس دے۔ کہ میاں یہ کیا کہہ رہے ہو وہ تو تھا ہی 'قرض ہنسنا'،" نصیر دہلوی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہاں بات کچھ ایسی ہی نظر آتی ہے نصیر صاحب مگر وہ ہمارے سامنے ہنس نہیں سکے گا۔ ہمیں بس وہ نظر آ جائے پھر دیکھیں کیا ہوتا ہے۔"

"ظفر صاحب! یہ لاکھو کو تو ہم بھی جانتے ہیں، وہ جو سنگھوٹ میں رہتا ہے، کہیں یہ وہ تو نہیں ہے۔"

"ہو سکتا ہے یہ وہی ہو۔ ہم آپ کو اُن سے ملوا دیتے ہیں۔"

"کیا وہ جیل جا چکا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ بیچ میں ایک سال غائب بھی رہا ہے ہو سکتا ہے وہ عرصہ اس نے جیل ہی میں گزارا ہو۔" ظفر گھٹارو نے کہا "جب وہ واپس آیا تو خاصا متموّل ہو چکا تھا۔"

"تو پھر ہمیں اس سے ملوا دیں یا ہمیں اس کا پتہ بتا دیں۔"

"یہ تو کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔ ہم آپ کے ساتھ سنگھوٹ چلے چلتے ہیں، کیا خیال ہے دہلوی صاحب!"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ یہ بھلے آدمی ہیں میرا خیال ہے انھیں راستہ بھی معلوم نہیں ہو گا۔"

"جی نہیں! یہ علاقہ ہم نے پہلی بار دیکھا ہے۔" آبی نے کہا۔

وہ اُن کی باتوں پر ہر پہلو سے غور کر رہا تھا مگر اُسے بھی ڈور کا سرا نہیں مل رہا تھا۔

جب ہم کھانا کھا چکے تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ظفر نے تیزی سے اُٹھ کر کھانے کا بل اپنی جیب سے ادا کر دیا۔ ہم اُسے روکتے ہی رہے مگر اُس نے ہوٹل کے مالک کو قسم دے دی کہ وہ ہم سے ایک پائی بھی نہ لے۔ اس کی وضعداری نے ہم دونوں کو بہت متاثر کیا۔

"آپ نے تو ہمیں اپنا گرویدہ بنا لیا ہے ظفر صاحب! آپ ایسے مخلص لوگ بھلا اب کہاں ملتے ہیں۔" آبی نے ظفر کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا یوں جیسے اُسے اپنے کوئی جگری یار مل گئے ہوں۔

ہوٹل سے باہر نکل کر نصیر دہلوی بولا "کیا خیال ہے ظفر صاحب ہم ان کے ساتھ سنگھوٹ نہ چلیں؟ آپ کے پاس سواری کا کیا بندوبست ہے جناب! حد ہو گئی یعنی ابھی تک ہم آپ کے اسمائے گرامی بھی نہ پوچھ سکے۔ کیسی بدتمیزی سرزد ہوئی ہے ہم سے۔"

"میرا نام ایس جی ایم پیرزادہ ہے اور یہ ہیں ہاشم خان۔"

"ماشاء اللہ آپ کے نام تو بہت ہی خوبصورت ہیں۔ چلیں ہم یہاں سے کوئی ٹیکسی لے لیتے ہیں۔"

"آپ فکر نہ کریں ٹیکسی ہمارے پاس موجود ہے۔ آئیں آپ کو زحمت تو ہو گی مگر ہماری مشکل آسان ہو جائے گی۔" آبی نے ان کو اپنے ساتھ لیتے ہوئے کہا۔ اور وہ ازراہِ مروّت ہمارے ساتھ کار میں جا بیٹھے معلوم یہ ہوا کہ سنگھوٹ وہاں سے کوئی گیارہ میل دُور ہے اور ایک کھڑی اینٹوں کی بنی ہوئی پختہ سڑک وہاں تک جاتی ہے۔ راستہ جلدی ہی طے ہو گیا۔ سفر کے دوران بیشتر وقت کار کے اندر خاموشی ہی رہی۔ ہم سب اپنے اپنے خیالوں میں گم تھے۔ نہ آبی کچھ کہہ رہا تھا اور نہ ہی میں اُن سے کوئی بات کر سکتا تھا۔ وہ دونوں ہم سے ایک دو بار کرید کر پوچھتے رہے کہ لاکھو کو ہم سب پہلے کہاں ملے تھے مگر ہم اس سوال کا جواب بس گول ہی کر گئے۔

کار اُن لوگوں کے کہنے پر ہم نے سڑک سے اتار کر ایک کچے راستے پر ڈال دی۔ کوئی دس منٹ بعد ہم ایک چھوٹے سے گاؤں کے پاس جا پہنچے تھے اس وقت رات کے نو بج رہے تھے۔ کار ایک کچی مسجد کے سامنے جا رکی تو ظفر اس میں سے تیزی سے نیچے اُترا اور بولا "آپ ادھر ہی ٹھیریں۔ میں دیکھتا ہوں کہ لاکھو گھر پر ہے کہ نہیں۔"

"ہم بھی آپ کے ساتھ چلتے ہیں میرے خیال میں یہاں کے کتے آپ سے بھی اتنی ہی شناسائی رکھتے ہیں جتنی ہم سے۔" آبی نے اس کے پیچھے باہر نکل کر کہا۔

ظفر کچھ گھبرا سا گیا، بولا "آپ ادھر ہی ٹھیرتے تو اچھا تھا، میں اُسے یہاں ہی بُلا لاتا ہوں۔"

"نہیں جی! یہ کیا بات ہوئی۔ آپ کے ساتھ ہم بھی چلتے ہیں ہمیں اس سے قرض لینا ہے اس بدمعاش سے کوئی بھیک تو نہیں مانگتے ہیں ہم اس سے۔"

یہ کہہ کر آبی نے مجھے بھی کار سے اُتار لیا۔ نوٹوں سے بھرا ہُوا بریف کیس ہم پہلے ہی کار کی عقبی نشست کے نیچے چھپا چکے تھے، نہال چند کا پستول میری جیب میں تھا۔ جب ہم چاروں گاڑی سے کوئی دس قدم آگے نکلے تو میں نے کہا

"آپ ذرا ٹھیریں میں گاڑی میں سے سگریٹ نکال لوں" یہ کہہ کر میں اُنہیں کوئی بات سوچنے کا موقع دیے بغیر پیچھے گیا اور یونس سے میں نے کہا کہ وہ گاڑی میں چوکس ہو کر بیٹھے اور کسی کے بھی کہنے پر گاڑی کو وہاں سے نہ ہٹائے۔

"کوئی خطرے کی بات تو نہیں ہے جناب!" وہ کچھ پریشان سا ہو گیا۔

"خطرے کی بات تو نہیں ہے مگر پھر بھی احتیاط بہت ضروری ہے"

"آپ فکر ہی نہ کریں جناب! مجھے معلوم ہے کہ ایسے موقعوں پر مجھے کیا کرنا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے نیفے میں سے ایک پستول نکال کر مجھے دکھایا۔ وہ اس نے قمیض کے نیچے پیٹی کے ساتھ باندھ رکھا تھا۔

"شاباش! تم آدمی جی دار ہو بھئی!" یہ کہہ کر میں تیزی سے اُن کی طرف نکل گیا۔ وہ چند قدم اور آگے بڑھ چکے تھے۔

ظفر گٹھارو ہمیں اپنے ساتھ لے کر گاؤں کے جنوب میں کھڑی ایک حویلی نما پختہ عمارت کے سامنے لے گیا، بولا "یہ میر ممتاز صاحب کا ڈیرہ ہے جناب! اور یہاں جو بھی کوئی آتا ہے پہلے اسی ڈیرے پر حاضری دیتا ہے ہم آپ کو ادھر اُن کے مہمان خانے میں بٹھاتے ہیں۔ آپ کی رقم میر صاحب ہی آپ کو واپس دلوا دیں گے۔"

یہ کہہ کر اُس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ کچھ ہی دیر بعد دروازے کے دونوں پٹ کھُل گئے۔ ہمارے سامنے ایک پہلوان جیسا شخص کھڑا تھا جس کا پنڈا ننگا تھا اور وہ صرف شلوار پہنے ہوئے تھا۔ معلوم ہوتا تھا وہ ابھی تک جاگ ہی رہا تھا۔

"گٹھارو سائیں آپ؟ اس وقت کیسے آئے ہو خیر تو ہے!"

"خیر ہی ہے پہلوان! یہ میر صاحب کے مہمان ہیں ان کو اندر بٹھاؤ۔ کوئی ضروری کام ہے ان کو میر صاحب سے۔"

"خیر ہوئے سائیں خیر! اندر آ جاؤ، پر میر صاحب سویرے ہی مل سکتے ہیں۔"

"کوئی بات نہیں، صبح کون سی دُور ہے؟"

وہ پہلوان ظفر کی یہ بات سُن کر ایک طرف ہٹا تو ہم دروازے میں داخل ہو گئے۔ پہلوان نے ہمیں اپنے ساتھ لے کر کمرے میں جا بٹھایا۔ اس میں معمولی قسم کی تین چار چارپائیاں تھیں ہم ان پر جا بیٹھے۔ آبی کی چھٹی حس کبھی کبھی اچانک بھڑک اٹھتی ہے اگرچہ ہم جان بوجھ کر خود کو اُن لوگوں کے حوالے کر چکے تھے مگر ابھی تک ہم کسی بھی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے تھے۔ دونوں ایک ہی چارپائی پر بیٹھ گئے تو آبی نے دبی زبان میں

"یار! مجھے تو یہ کوئی لمبا ہی چکر نظر آتا ہے ہمیں بہت چوکس رہنے کی ضرورت ہے، یہ آدمی کھرے نہیں ہیں۔"

میں نے لالٹین کی روشنی سے ہاتھ بچا کر اس کا پہلو دبایا۔ کہ وہ ابھی کوئی بات نہ کرے۔ ہمیں پہلے یہ تو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ دونوں آدمی ہمیں وہاں تک لائے ہیں تو ان کا مقصد کیا ہے۔

پہلوان ہمیں اس کمرے تک پہنچا کر واپس جا چکا تھا اور دروازہ اس نے باہر سے بھیڑ دیا تھا، کوئی پانچ منٹ بعد ظفر بولا "آئیں نصیر صاحب ہم ان کے لیے بستروں کا انتظام کریں۔ اگر میر صاحب جاگ رہے ہیں تو میں اُن سے ملوا دیتا ہوں۔"

نصیر فوراً ہی اُٹھا اور ظفر کے ساتھ ہم سے معذرت کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ اچانک میرے ذہن میں جھما کا سا ہوا مجھے یاد آ رہا تھا کہ اس ظفر گٹھارو کو میں نے اس سے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے اس کی وہ مُسکراہٹ ہی اس کی شخصیت کا تعارف تھی مگر۔۔۔ میں ماضی کے کسی بھی گوشے میں اس کو اپنے تمام تر لاحقوں سابقوں سمیت ذہن کے کسی خانے میں پوری طرح نہ دیکھ سکا۔ میں سمجھا وہ میرا وہم ہے۔ میں نے وہ خیال فوراً ہی ذہن سے اُتار دیا۔

ابھی کوئی پندرہ منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ پہلوان تیزی سے اندر آیا اور بولا "آئیں سائیں! میر صاحب ابھی جاگ رہے ہیں شاید وہ آپ سے ابھی مل لیں، آپ پنجاب سے آئے ہیں نا؟"

"ہاں! وہ ظفر صاحب کہاں ہیں؟"

"وہ میر صاحب کے پاس بیٹھے ہیں آپ جلدی آئیں۔"

پہلوان نے ایک دم افراتفری مچا دی۔ ہم کمرے سے نکل کر اس کے پیچھے چل دیے۔ وہ ہمیں ایک کھلے صحن میں سے گزار کر دائیں ہاتھ بنے کمروں کے عین وسط میں لے گیا۔ اُن کمروں کے آگے برآمدہ تھا۔ جس کے پختہ فرش پر ہمارے قدموں کی چاپ ہمیں بڑی غیر مانوس نظر آتی تھی۔ پہلوان نے ہمیں وسطی کمرے میں بٹھا دیا۔ اس میں چند کرسیاں دیوار کے ساتھ بچھی تھیں۔ فرش پر دبیز گہرے نیلے رنگ کی دری بچھی تھی۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ ہم حویلی کے عقبی حصے میں جا پہنچے ہیں اور میر صاحب کے رہائشی حصے سے کافی دور آ گئے ہیں۔

ابھی ہم وہاں بیٹھے ہی تھے کہ تین بھاری بھرکم آدمی اندر آ گئے اُن میں سے دو کے ہاتھوں میں تیز دھار کلہاڑیاں تھیں ایسی کلہاڑیاں جن کے پھل غیر معمولی حد تک چوڑے اور چمکدار تھے۔ دونوں نے کلہاڑیاں اپنی کلائیوں پر یوں لٹکا رکھی تھیں جیسے وہ اُن کے جسموں کا حصہ بن چکی ہیں۔ وہ دونوں کھدر کے کرتے شلوار پہنے ہوئے تھے۔ ان تینوں کے بدن ایسے وزنی تھے کہ اُن کی ایک ایک بوٹی تڑپتی نظر آتی تھی کمرے کے اندر آ کر اس آدمی نے جس کے ہاتھ

کوئی ہتھیار نہیں تھا ہمیں بڑے بھاری بھرکم لہجے میں السلام علیکم کہا۔ ہمارا جواب سُننے کے بعد وہ کرسی کھینچ کر ہمارے سامنے بیٹھ گیا۔ اور بڑے تحکم آمیز لہجے میں بولا۔ "آپ میر صاحب سے ملنا چاہتے ہیں؟"

"ہم تو لاکھو سے ملنے آئے ہیں بھائی جی! مگر شکار پور سے یہ دو آدمی یہ ظفر گٹھارو اور نصیر صاحب ہمیں یہاں لے آئے ہیں کہ سنگھوٹ میں ہر آنے والا میر صاحب کا مہمان ہوتا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے پر اپنے بارے میں کچھ بتائیں تو سہی، کیا میر صاحب کا یہ خیال درست نہیں ہے کہ آپ خفیہ پولیس کے آدمی ہیں؟"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے بھائی جی، میر صاحب کو تو خوش ہونا چاہیے کہ پولیس والے بھی آتے ہیں تو ادھر ہی آتے ہیں کیا وہ پولیس سے خوش نہیں ہیں؟"

"یہ بات نہیں ہے آپ کو بہرحال اپنا صحیح تعارف کروا دینا چاہیے آپ کا لاکھو تو یہاں کوئی نہیں رہتا۔"

"ظفر گٹھارو نے تو ہمیں یہی بتایا تھا۔ وہ اسی لیے ہمیں ادھر لایا ہے۔"

"ویسے تو لاکھو نام کے دو آدمی یہاں رہتے ہیں ایک بھنگی ہے اور دوسرا ہاری۔ اور ان دونوں کو ہم نے بلوا لیا ہے۔ ان کو اندر بھیج دے ملوانی، اس ہاری کو بھی اور اس بھنگی کو بھی، آپ نے تو اسے قرض دیا تھا، اس کو پہچانتے تو ہوں گے۔"

دروازے میں کھڑے ایک کلہاڑی بردار نے پیچھے ہٹ کر دو آدمی اندر بھیج دیے۔ ایک تو منحنی سے قد کا آدمی تھا۔ ڈرا سہما کچلا ہُوا۔ وہ اس گاؤں کا بھنگی تھا۔ دوسرا آدمی بھی بس یوں ہی سا تھا۔ اکہرے بدن کا دراز قد جوان جس کے گال اندر پچکے ہوئے تھے اور سخت محنت مشقت نے جس کے بدن سے ساری توانائیاں نچوڑ رکھی تھیں وہ آدمی بھی کسی طرف سے اس لاکھو کا پتہ نہیں دیتا تھا جس کی تلاش میں ہم وہاں تک پہنچے تھے۔

"ہم سے مذاق تو نہ کرو سائیں! یہ چرخ باجے ہمیں کیوں دکھا رہے ہو ہمیں لاکھو ڈاکو سے ملواؤ۔ اس لاکھو سے جو پنڈی جیل میں رہ چکا ہے اور جس کا پتہ ہمیں نہال چند نے جس کا بھائی مہیش چند ادھر ترن تارن میں مارا گیا تھا۔ سُن لیے ہو نا!" میں نے غصّے سے بے قابو ہوتے ہوئے کہا۔

"تم باہر چلو بھئی! انھیں واپس بھیج دے ملوانی۔" اس آدمی نے بڑے تلخ لہجے میں کہا۔ وہ دونوں فوراً ہی وہاں سے نکل گئے۔

"پیرزادہ صاحب جائیں اس آدمی کی تصویر گاڑی میں سے نکال لائیں میں انھیں دکھاتا ہوں کہ ہمیں کس لاکھو کی تلاش ہے۔ یہ ظفر صاحب خواہ مخواہ ان کو پریشان کرنے کے لیے ادھر لے آئے ہیں۔" میں نے وہاں سے نکلنے کا بہانہ بناتے ہوئے آبی کو اپنے ساتھ

اٹھا کر کہا۔
"آپ ادھر ہی بیٹھیں، ہمارا آدمی تصویر لے آتا ہے۔"
"نہیں ہمیں خود جانا پڑے گا۔ ہم دو منٹ میں واپس آتے ہیں۔"
"پر سائیں! یہ آپ اتنے غصے میں کیوں ہیں۔ اور کلہاڑیوں والے ادھر کیا کر رہے ہیں، کیا سمجھا ہے آپ نے ہمیں؟" آبی نے اس آدمی سے بڑے گمبھیر لہجے میں پوچھا۔
"آپ کو وہم ہو گیا ہے، یہ سب تو حویلی کے آدمی ہیں۔ کلہاڑیاں ہر وقت اپنے ساتھ لیے پھرتے ہیں۔" آبی کی بات کا جواب دیتے ہوئے وہ آدمی بھی کرسی پر سے اٹھ گیا اور پھر اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "جب تک آپ اپنی شناخت نہیں کرواتے میر صاحب کا حکم ہے کہ آپ یہاں سے باہر نہیں جا سکتے۔"
"یہ کیا بکواس ہے اوئے بشیر خان! تو چاہتا کیا ہے آخر؟" میں نے پستول نکالنے کے لیے نیفے کی طرف ہاتھ اٹھایا مگر اس نے میری نیت بھانپ کر فوراً ہی اپنا پستول نکال لیا۔ کلہاڑی بردار بھی تیزی سے ہمارے دائیں بائیں آ ٹھہرے، اتنے فاصلے پر کہ وہ وار کرنے میں جگہ کی تنگی سے نہ مارے جائیں۔
"تم دونوں ادھر ہی بیٹھو۔ مجھے میر صاحب کو بتانا ہوگا کہ تم نہال چند، ترن تارن اور مہیش چند کی بات کر رہے ہو۔ انھیں شاید معلوم ہو کہ یہ کون لوگ ہیں۔"
"جب ادھر کوئی لاکھو ہے ہی نہیں! جب آپ ہمیں بھی نہیں جانتے تو پھر آپ یوں ہم سے بھڑتے کیوں ہیں؟ کیوں راستہ روکتے ہیں ہمارا؟" میں نے صورت حال کو قطعی طور پر ان کے حق میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ایک بار تو وہ ہمیں بے بس کر ہی چکے تھے، ابھی میں یہ بات کر ہی رہا تھا کہ دروازے میں ایک لمبا تڑنگا گورے چٹے رنگ کا طرحدار آدمی داخل ہوا۔ وہ سفید براق لباس پہنے ہوئے تھا۔ بال اس کے بلوچی انداز میں کٹے ہوئے تھے اس کو دیکھتے ہی وہ تینوں آدمی سنبھل کر کھڑے ہو گئے۔ ظفر اور نصیر اس آدمی کے پیچھے تھے۔
"ارے یہ کیا ہو رہا ہے بھئی! تم نے تو ان بیچاروں پر پستول تان لیا ہے، ہٹاؤ یہ پستول، تم بھی الگ ہو جاؤ۔ بلوانی بھائیوں سے یہ سلوک کرتے ہو تم؟"
وہ تینوں اس کی یہ بات سنتے ہی ہم سے پرے ہٹ گئے۔ مگر تیور ان کے ایسے تھے کہ وہ ایک لحظے کے ہزارویں حصے میں ہم تک پہنچ سکتے تھے۔
"آپ تشریف رکھیں بھائی جی! یہ جھگڑا میری سمجھ میں نہیں آیا ہے؟"
"مگر ہماری سمجھ میں آ چکا ہے جناب! یہ دونوں کوتے ہم[illegible] دھوکے سے پکڑ لائے ہیں۔ آپ اس لاکھو کو ہمارے حوالے کر دیں، اس سے کہیں کہ ہمارے سامنے آ کر ہم سے بات کرے۔ ہمیں معلوم ہو گیا ہے کہ لاکھو آپ کا پروردہ ہے۔" میں نے اس آدمی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔
ظفر نے بڑے ادب سے آگے بڑھ کر کرسی اس کے قریب کر[illegible] بولا "آپ تشریف رکھیں سائیں! یہ ہے وہ آدمی۔ اس کا نام [illegible] ہے، میں نے اسے لاہور جیل میں دیکھا تھا۔ میں اسے کبھی نہیں بھول سکتا ہوں۔ ایک آدمی تھا وہاں کبری، اس جیلانی نے اس کو [illegible] کے لیے جیل میں کئی آدمیوں کی پٹائی کر دی تھی۔ کیا میں جھوٹ [illegible] رہا ہوں خان ہاشم خان جی!"
ظفر گنڈھارو نے مجھے حیران کر کے رکھ دیا۔ اب مجھے محسوس [illegible] رہا تھا کہ میں نے اسے پہچاننے میں کتنی دیر لگا دی تھی۔
"تم ٹھیک کہتے ہو۔ اور میرا خیال ہے کہ تمھیں یہ بھی معلوم [illegible] کہ ہم یہاں لاکھو کی تلاش میں کس لیے آئے ہیں۔"
وہ تنک کر بولا۔ "اس کا مجھے اگر علم ہو جاتا تو میں تمھارا [illegible] شکارپور ہی میں برابر کر دیتا۔" اچانک میری نظر میر ممتاز شاہ کے ٹخنوں پر جا پڑی۔ اس کے دونوں ٹخنے سیاہ ہو رہے تھے [illegible] مطلب یہ تھا کہ کسی زمانے میں بغیر چھوٹی کے اس کے پاؤں میں [illegible] تا دیر پڑی رہی تھیں۔ وہ نشان کسی صاف سیدھے آدمی کے ٹخنوں [illegible] کبھی نہیں ابھرتے۔ میر ممتاز شاہ کو قطعاً احساس نہیں ہو سکا تھا [illegible] میں کیا دیکھ رہا ہوں اور کسی نتیجے پر پہنچ چکا ہوں۔ وہ ظفر گنڈھارو کی باتیں سن کر کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا اور کبھی وہ [illegible] دیکھتا تھا کبھی آبی کو۔
چند لمحوں کی گمبھیر خاموشی کے بعد وہ بولا "تم انتہائی [illegible] آدمی ہو گنڈھارو اور اوّل درجے کے بدمعاش بھی۔ خواہ مخواہ ان شریف آدمیوں کو تم یہاں کھینچ لائے۔ تم نے انہیں جیل میں دیکھا [illegible] شکارپور میں یہ کسی لاکھو کا پوچھ رہے تھے سنگھٹ گاؤں کا [illegible] ہوگی اور تم ان کو یہاں لے آئے۔ کیا واسطہ ہے ان کا ہم سے۔ [illegible] مجھے مار میں انہیں کیا جواب دوں۔ تم ان کو محض اس لیے یہاں لے [illegible] ہو کہ یہ تمھارے ساتھ لاہور جیل میں رہے ہیں یہاں سنگھٹ [illegible] رکھا ہے ان کے لیے، کتے کے بچے! ان کو تم نے خواہ مخواہ الجھن [illegible] ڈال دیا ہے۔" پھر میری طرف متوجہ ہو کر وہ نرم لہجے میں بولا "[illegible] بات غور سے سنیں بھائی جی! آپ کو سخت غلط فہمی ہوئی ہے۔ [illegible] لاکھو نام کا کوئی ایسا آدمی نہیں ہے جسے آپ تلاش کر رہے ہیں۔ [illegible] آپ کا گھر ہے جب تک چاہیں یہاں رہیں ہم خدمت [illegible] کو تیار ہیں مگر ہم شریف آدمی ہیں میر ممتاز علی شاہ میرا [illegible]

ہم ڈاکو ہیں نہ کسی ڈاکو کو پناہ دیتے ہیں آپ غلط جگہ پر آ گئے ہیں۔"
"کیا آپ کی والدہ کا نام مائی جیونا نہیں ہے؟"
"استغفر اللہ! یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ! ہماری والدہ ماجدہ کا نام سطوت بیگم ہے آپ کو ساری معلومات کسی نے غلط فراہم کی ہیں ان کے لیے ہمارا خاص مہمان خانہ کھول دے بلوانی یہ جب تک یہاں ہیں انہیں کوئی پریشانی نہیں ہونی چاہیے۔"
یہ کہہ کر وہ کرسی سے اٹھا اور کڑک کر بولا "تم سب دفع ہو جاؤ یہاں سے، ایک دم رذی آدمی ہو تم خنزیر کے بچے! خواہ مخواہ تماشا بنا دیا ہے۔" پھر وہ ہماری طرف متوجہ ہو کر بولا "میں آپ سے معافی چاہتا ہوں بھائی جی! یہ سارا قصور اس گنڈھارو کا ہے اس حرامزادے کا۔" یہ کہہ کر اس نے تڑاخ سے ایک تھپڑ ظفر کے منہ پر دے مارا۔ وہ خوف زدہ ہو کر جھکا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ دوسرے آدمی بھی ایک ایک کر کے چپ چاپ اس کمرے سے باہر چلے گئے۔ مگر وہ آدمی جو پستول سیدھے ہاتھ میں لیے کھڑا تھا وہیں ڈٹا رہا۔ اس کے ہتھیار کی نال ہماری ہی طرف تھی اور وہ چیتے جیسی چوکسی اور احتیاط کا مظاہرہ کر رہا تھا۔
"آپ آج رات ادھر ہی ٹھہریں۔ میں اپنا مہمان خانہ کھلوا دیتا ہوں۔"
میر صاحب وہاں سے ہٹنے لگے تو آبی بولا "ہم ابھی واپس جا رہے ہیں قبلہ میر صاحب! اب ہم یہاں نہیں ٹھہر سکتے۔ آپ کے حسن سلوک کا بہت بہت شکریہ! مجھے امید ہے کہ اب آپ ہمارا راستہ نہیں روکیں گے۔"
"نہیں بھائی جی! ہمیں آپ کا راستہ روکنے کی کیا ضرورت ہے آپ جانا چاہتے ہیں تو چشم ما روشن دل ما شاد۔ کستوری صاحب ان کو دروازے تک چھوڑ آؤ۔" میر ممتاز علی نے اس آدمی سے مخاطب ہو کر کہا۔ جو ہم پر پستول تانے کھڑا تھا۔
"ٹھیک ہے میر صاحب! چلیں سائیں میں آپ کو باہر چھوڑ آتا ہوں۔" اس کا لہجہ ایک دم نرم ہو گیا تھا۔
اس کی بات سنتے ہی ہم کمرے سے نکلے اور صحن عبور کر کے حویلی سے باہر نکل آئے۔ کستوری ہمارے ساتھ دروازے تک آیا اور ہم جب کوئی دس آگے گز نکل گئے تو اس نے دروازہ بند کر لیا۔
"یار یہ چکر میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اصل آدمی کا چہرہ تو ہم دیکھ ہی نہیں سکے۔" آبی نے پھر دو سگریٹ سلگا کر مجھے دیتے ہوئے کہا۔ اس کا لہجہ نم آلود نہیں تھا۔
"چکر تو سیدھا ہی ہے پیارے! لاکھو اسی میر ممتاز علی کا دوسرا نام ہے اگر ایسا نہیں ہے تو لاکھو اس کا وہ آدمی ہے جسے اس نے پناہ دے رکھی ہے۔ میں تو یہی سمجھ سکا ہوں۔"
"میرا بھی یہی خیال تھا مگر یہ معاملہ سلجھے گا کیسے؟"
"یہ بات تو میری بھی سمجھ میں نہیں آ رہی ہے ہمیں کہیں گھات لگا کر بیٹھنا پڑے گا۔"
"کیا مطلب؟ اس سے کیا فائدہ ہوگا؟"
"حویلی کے معتبر آدمیوں میں سے کوئی آدمی ہمارے ہتھے چڑھ جائے تو اس سے ہم سب کچھ معلوم کر سکتے ہیں۔"
"ایسا ہی کر دیار، اس کستوری ہی کو پکڑ لو، ہاتھ آ جائے تو اس میر ممتاز ہی کو باندھ لو۔"
"ہمیں یہی کرنا پڑے گا مگر سوال یہ ہے کہ ہم ٹھہریں تو کہاں ٹھہریں؟"
"یوں کرو، اس ڈرائیور کو تو آج ہی رخصت کر دو۔ خود ہم کسی قریبی گاؤں میں جا ٹھہرتے ہیں کسی کو بھی سو پچاس روپے دے کر راضی کیا جا سکتا ہے۔"
"ایسا ہی کرتے ہیں اور اس ڈرائیور کو تو میں ابھی فارغ کر دیتا ہوں۔"
ہم گاڑی میں بیٹھے اور اسے سنگھٹ گاؤں سے ایک میل دور لے جا کر ٹھہرا دیا۔ ہمارے پیچھے میر ممتاز شاہ کا کوئی آدمی نہیں آیا تھا۔ میں نے ڈرائیور کو معقول رقم دے کر اسی وقت شکارپور روانہ کر دیا۔ وہ بڑا دلیر اور باہمت جوان تھا۔ رات کا پچھلا پہر بھی اس کا راستہ نہیں روک سکتا تھا۔ وہ ہمیں خدا حافظ کہہ کر اسی وقت واپس چلا گیا اور ہم سنگھٹ گاؤں کی حدود سے بہت آگے نکل کر مشرق کی طرف چل دیے۔ ہمیں نہیں معلوم تھا کہ ہم کس طرف جا رہے ہیں مگر کوشش ہماری یہ تھی کہ ہم جس قدر جلد ممکن ہو سکے وہاں سے نکل کر کسی اور گاؤں میں جا ٹھہریں خواہ رات کا باقی حصہ ہمیں کسی مسجد ہی میں کیوں نہ گزارنا پڑے۔ ہمیں دوبارہ سنگھٹ آنے کی ضرورت پڑتی تو وہ فاصلہ ہمارے لیے کوئی بڑا فاصلہ نہیں تھا اسے ہم دوڑ کر بھی طے کر سکتے تھے۔
ہم دونوں شدید اذیت میں مبتلا تھے۔ پچھلے کچھ عرصے سے ہمیں قدم قدم پر ایسی ہزیمتیں اٹھانی پڑی تھیں کہ ہم دونوں اندر سے پژمردہ ہو کر رہ گئے تھے۔ ہمارے حوصلے ٹوٹنے لگے تھے۔ مجھے یہ احساس ڈسنے لگا تھا کہ میرے ساتھ آبی بھی ان ویرانوں میں بلاوجہ ذلیل و خوار ہو رہا تھا میرے ساتھ خود کو وابستہ کر کے اس نے بھی اپنی زندگی برباد کر لی تھی، اسے میں کیا دے سکا تھا، کچھ بھی نہیں مگر پھر بھی وہ سائے کی طرح میرے ساتھ چل رہا تھا۔ دبیز تاریکی میں بھی وہ میرا ساتھ نہیں چھوڑتا تھا۔ اس کی دوستی میرے لیے نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہ تھی۔ کوئی ایسا ٹوٹ کر محبت کرنے والا دوست

مجھے کہاں مِل سکتا تھا مگر اِس کی بھی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو رہی تھی۔ اُن بیردں نے تو ہمیں مار ہی دیا تھا۔ ابھی شاید ہماری زندگی میں کچھ اور ذِلتیں لکھی تھیں کہ انھوں نے ہمیں بے ہوش کر کے جان سے نہیں مار دیا تھا ورنہ یہ بات اُن کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں تھی۔ اُن کی عقل پر پردہ ہی پڑ گیا تھا کہ انھوں نے ہمیں صحیح سالم حالت میں گاڑی سے باہر پھینک دیا تھا اور ہم کچھ ایسے ڈھیٹ ثابت ہوئے تھے کہ پھر اُٹھ کر بیٹھ گئے تھے۔ اِس گھڑی ہم بکتے پھوڑے ایسے ہو کر رہ گئے تھے سرحد سے اس پار بھی ہمیں کچھ نہ مِل سکا تھا اور سرحد عبور کرتے وقت بھی ہم دشمنوں کے رحم و کرم پر تھے۔ وہ اگر چاہتے تو ہمیں بڑی آسانی سے قتل کر سکتے تھے مگر پھر بھی ہم ابھی تک زندہ تھے اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ زندگی ہمیں یوں کیوں در در لیے پھرتی ہے۔ کِس لیے ہمیں اُس نے اتنے صبر آزما امتحان میں ڈال رکھا تھا۔

ہم دونوں ایک چھوٹی سی پگڈنڈی پر اپنی اپنی سوچ میں گم کسی نامعلوم منزل کی طرف بڑھتے چلے رہے تھے۔ آبی کی ساری بشاشت ختم ہو گئی تھی۔ وہ مجھ سے کوئی بات نہیں کر رہا تھا۔ ایک عجیب سی غیر یقینی کیفیت سے ہم دوچار تھے۔ کہنے سُننے کے لیے ہمارے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔

آبی چلتے چلتے ایک دم رک گیا، بولا "یہ آواز سُن رہے ہو معلوم ہوتا ہے چند گھوڑ سوار ادھر آ رہے ہیں۔"

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ گھوڑوں کے سموں کی آوازیں برابر قریب آتی جا رہی تھیں۔ سامنے کھجوروں کا ایک جھنڈ تھا فاصلہ یہی کوئی ہزار گز کا ہو گا۔ اس کے عین بیچ میں سے اچانک تین آدمی گھوڑے دوڑاتے ہوئے اس پگڈنڈی پر آ چڑھے۔ آبی نے مجھے کھینچ کر پگڈنڈی سے اتار کر جھاڑیوں کی اوٹ میں بٹھا دیا۔ ابھی ہم سے کوئی چار سو گز دُور تھے کہ اُن کے پیچھے ایک گھوڑ سوار برق رفتاری سے لپکا اور پھر فضا میں گولی داغنے کی آواز گونج گئی۔ ایک دو تین اس گھوڑ سوار نے یکے بعد دیگرے پانچ گولیاں ان سواروں پر داغ دیں جو اب ہمارے قریب پہنچ چکے تھے۔ اس کا نشانہ خطا نہیں گیا۔ ایک گھوڑ سوار خوفناک چیخ مار کر گھوڑے سے اُچھلا اور سر کے بل نیچے گر گیا۔ دُوسرا اس سے چند قدم دُور تھا۔ ایک گولی اسے لگی اور وہ بھی گھوڑے کی پیٹھ پر سے اُلٹ کر یوں نیچے گرا کہ اس کا ایک پاؤں رکاب میں پھنس کر رہ گیا۔ دونوں گھوڑے اپنے سواروں کی بے بسی پر ہنہناتے ہوئے وہیں رُک گئے۔ تیسرا سوار گھوڑے سے چھلانگ لگا کر کھیت کی منڈیر کے پیچھے لیٹ گیا اور اُس نے پیچھے آنے والے آدمی پر گولی چلا دی مگر

وہ جوان کچھ زیادہ ہی چوکس تھا۔ گھوڑے کی گردن پر لیٹ گیا۔ اور پیشتر اس سے کہ منڈیر کی اوٹ میں لیٹا آدمی سنبھل سکتا اُس نے گھوڑے سے اچھل کر اس کے اوپر چھلانگ لگا دی۔ لیٹا ہوا آدمی اگر فوراً ہی پلٹنے ایسی پھرتی سے ایک طرف نہ ہو جاتا تو دوسرے آدمی کے ہاتھ میں چمکتا ہوا خنجر اس کی کمر میں اتر گیا تھا۔ وہ دونوں بندوقیں پھینک کر اب اپنے خنجر نکال چکے تھے۔

"میں تجھے گولی سے نہیں اس خنجر سے کاٹوں گا کُتے! تو گھر لوٹ کر زندہ نہیں جا سکتا۔"

اُس آدمی نے غرّاتے ہوئے کہا۔ چاند کچھ اور اوپر آیا تھا اور اس کی روشنی میں دونوں کو ایک دوسرے پر خونخوار انداز میں حملہ آور ہوتے دیکھ کر ہم دونوں کے خون کی گردش تیز ہو گئی تھی۔ آبی میرے بے حد قریب ہو گیا تھا۔

"یار! بڑے جی دار لوگ ہیں یہ۔"

"اپنے ہی بھائی بند لگتے ہیں۔"

"بچ جا مجھ سے سجل! ورنہ میں یہاں تیری لاش ڈال دوں گا۔"

اُن تینوں کے تعاقب میں آنے والے جوان کو مدمقابل نے للکارتے ہوئے کہا۔ وہ کسی پشاوری لختیے کی طرح تیزی سے گھوم کر حملہ آور ہوا تھا مگر سجل طرح دے کر پلٹا اور ۔۔۔ اور پھر ایک بھیانک چیخ ویرانے سے پہلے سناٹے کو درہم برہم کر گئی۔ سجل کا خنجر مدمقابل کے سینے میں اُتر گیا تھا۔ اس نے تیزی سے اس کے سینے سے نکالا تو وہ آدمی دُہرا ہو کر مُنہ کے بل گرنے لگا۔ مگر اس کے زمین پر پہنچنے سے پہلے سجل نے ایک بار پھر اس پر وار کیا اور اپنا خنجر اس کی کمر میں دستے تک دھنسا دیا۔ وہ دشمن کو زمین پر گرا چکا تو بھی اس کے انتقام کی آگ نہیں بجھی۔ اُس نے پے درپے چھ زخم اور اس گھوڑ سوار کے جسم پر لگائے جس نے منڈیر کی اوٹ لے کر سجل پر گولی چلائی تھی۔

وہ اس کو ختم کر کے دُوسرے آدمی کی طرف بڑھا۔ وہ اس کے وار کے لیے باقی نہیں بچا تھا۔ گھوڑے کی رکاب میں ابھی تک اس کا پاؤں پھنسا تھا اور وہ اسی حالت میں مر چکا تھا۔ اس کی طرف سے مایوس ہو کر وہ تیسرے آدمی کے پاس پہنچا۔ وہ بھی ٹھنڈا ہو چکا تھا اور اس کا گھوڑا اس کے پاس کھڑا اپنے سموں سے زمین کاٹ رہا تھا۔ سجل نے باری باری جیبوں کی تلاشی لی، اور پھر دوسرے آدمی کے قریب پڑا تھیلا اس نے اٹھا لیا۔ اُن تینوں کے پاس آتشین اسلحہ تھا مگر اُن کے کسی کام نہ آ سکا۔ جس آدمی کو سجل نے سب سے پہلے گولی ماری تھی اس کے قریب سے اُس نے اسٹین گن اٹھائی۔ ویسی ہی اسٹین گن

آدمی کے پاس بھی تھی جس کو اس نے خنجر سے ہلاک کیا تھا۔ اُن کا اسلحہ اکٹھا کر کے سجل نے اُن کے گھوڑوں کو یکجا کر کے یوں ایک دوسرے کی دم سے باندھا کہ وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر آسانی سے انھیں اپنے ساتھ لے جا سکتا تھا۔

ابھی وہ اُن کو باندھ ہی رہا تھا اور اپنی اسٹین گن اُس نے کندھے سے لٹکا رکھی تھی کہ آبی رہ نہ سکا۔ مجھ سے مشورہ کیے بغیر بلند آواز سے ٹھیٹ پنجابی میں بولا "تیرا جواب نہیں ہے جوان! تیرے ہاتھ میں بڑی کرامت ہے۔ آفرین ہے تیری ہمت پر۔"

وہ آدمی آبی کی آواز سنتے ہی کسی وحشی جانور کی طرح چونک کر گھوڑے کی اوٹ میں ہو گیا۔ کندھے سے اسٹین گن اُتر کر اتنی تیزی سے اُس کے ہاتھ میں آئی کہ میں سمجھا کہ وہ اس جگہ کو بھون کر رکھ دے گا جہاں سے وہ آواز ابھری تھی۔

بڑے ہی گرجتے ہوئے لہجے میں بولا "تم کون ہو؟ سامنے آ کر بات کرو۔"

خدا کا شکر ہے اس نے گولی نہیں چلا دی تھی ورنہ ہم اس رات بے موت مارے جاتے۔

"ہم تو پردیسی ہیں سائیں! پنجاب سے آئے ہیں یہاں سے گزر رہے تھے کہ تمھاری یہ کرامت دیکھنے رُک گئے۔ ہمیں تم اپنا دوست ہی سمجھو۔" آبی نے جان بوجھ کر اب بھی خالص پنجابی لہجے میں بات کی اور بے دھڑک ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اُسے یوں سامنے دیکھ کر وہ آدمی گھوڑے کی آڑ سے نکلا اور اسٹین گن کسی منجھے ہوئے آزمودہ کار سپاہی کی طرح ہاتھوں میں تھام کر یوں آگے آیا کہ اگر ہماری طرف سے اُسے ذرا بھی کسی قسم کی گڑبڑ کا شک پڑتا تو وہ ہمارے پرخچے اڑا سکتا تھا۔ وہ گھیر دار شلوار اور گھٹنوں تک لمبا گیروے رنگ کا کُرتا پہنے ہوئے تھا۔ اور سر پر سندھی طرز کی پگڑی باندھ رکھی تھی۔ آبی اُٹھا تو میں بھی اُس کے ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے چاہا کہ پستول نکال کر سیدھے ہاتھ میں لے لوں مگر پھر میں نے یہ خیال ترک کر دیا۔ ہمارے سامنے ایک ایسا خونخوار جوان تھا جس نے تین آدمیوں کو کتے کی موت مار دیا تھا مگر اس کے حواس اب بھی اُس کے قابو میں تھے۔ وہ ہمارے سامنے آیا تو اس کے قدم یوں اُٹھ رہے تھے جیسے وہ ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں اچھل کر ہم پر آ پڑے گا۔ اسٹین گن کی نال اب تک اس نے ہماری طرف اٹھا رکھی تھی۔ وہ ہم سے کوئی پانچ قدم دُور پگڈنڈی کے عین بیچ میں آ ٹھہرا۔ ہمارے درمیان وہ ٹھگنی ٹھگنی خاردار جھاڑیاں تھیں جو صرف بیٹھے ہوئے آدمی ہی کی اوٹ بن سکتی تھیں۔ سجل کی آنکھوں کی چمک ایسی تھی کہ میں حیران رہ گیا۔ اس جیسے خوفناک جوان میں نے کم ہی دیکھے تھے۔

"ہمیں اپنا دوست سمجھو جوان! تمھاری جوانمردی نے ہمیں حیران کر دیا ہے۔ یہ کون لوگ تھے جن کی مشکلیں آسان کر دی ہیں۔" آبی نے یہ بات پنجابی میں کہی۔

"یہ میرے بیمار بھائی کا گھر لوٹ کر بھاگ نکلے تھے۔ میں ادھر منتھیرو میں رہتا ہوں۔ میرا گاؤں یہاں سے تین کوس دُور ہے۔ مجھے پتہ تو اس وقت چلا جب یہ مال لے کر گھوڑوں پر بیٹھ کر بھاگ رہے تھے، تمھیں کہاں جانا ہے؟"

"ہم پریشان حال مسافر ہیں بھائی جی! سوچ رہے تھے کسی گاؤں کی مسجد میں جگہ مِل جائے تو رات گزار لیں۔"

"اگر تم چاہو تو میں تمھیں اپنے گھر ٹھہرا سکتا ہوں۔ پنجاب کے کِس علاقے سے آئے ہو؟"

"لاہور سے۔ ہم بھی زمیندار ہیں، ہمیں ایک کام سے اِدھر آنا پڑا۔ مگر ابھی تک ہم بھٹک ہی رہے ہیں۔"

"یہاں زیادہ دیر رُکنا اچھا نہیں گھوڑوں پر بیٹھ سکو تو بیٹھ جاؤ، رات تم میرے ہاں ٹھہر سکتے ہو مجھے یقین ہے کہ تم شریف آدمی ہو، آؤ میرے ساتھ۔"

"اِن کی لاشوں کا کیا کرو گے؟"

"یہ ادھر ہی پڑی رہیں گی کِسی کو پتہ نہیں ہے کہ میں اِن کے پیچھے آیا تھا، آؤ۔" یہ بات کہہ کر اُس نے اسٹین گن کی نال کا رُخ زمین کی طرف کر دیا۔ ہم دونوں پگڈنڈی کو عبور کر کے اُس کے آگے آگے گھوڑوں کی طرف بڑھے، تیسرا گھوڑا اس نے اپنے پیچھے باندھ لیا۔ بولا "سیدھے چلے چلو، میں تمھارے پیچھے آ رہا ہوں مجھے یقین ہونا چاہیے کہ تم اُن کے ساتھی نہیں ہو۔"

اُس نے بڑے مشّاق انداز سے گھوڑے کی لگام بائیں ہاتھ میں لے کر اپنی اسٹین گن کچھ ایسے خوفناک انداز میں دائیں ہاتھ کی گرفت میں لی کہ اُس کی انگلی لبلبی پر تھی۔ وہ اب بھی ہمیں بڑے غور سے دیکھ رہا تھا اور یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ ہمیں یوں اپنے ساتھ لے کر اس نے اچھا کیا ہے کہ بُرا۔ ایک عجیب گومگو کی کیفیت اُس پر طاری تھی۔ ہمیں اتنی بے باکی سے گھوڑوں کو اپنے آگے اس نے بھگاتے دیکھا تو اپنی رفتار تیز کر کے وہ ہمارے پہلو بہ پہلو دوڑانے لگا، بولا "سائیں! تم اچھے گھڑ سوار ہو۔ لگتا ہے تم نے بھی گھوڑے پال رکھے ہیں۔"

"نہیں بھائی جی! یہ بات نہیں ہے بس تھوڑا سا ان کی مشینری کو سمجھ لیتے ہیں۔" آبی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"مشینری! ہاں ہوتے تو یہ بھی مشین ہی ہیں پر یہ مالک کو پہچانتے ہیں پھر بھی تم نے انھیں رام کر لیا ہے اور ان کے مالک پیچھے رہ گئے ہیں۔"

"وہ اِن کے مالک ہوتے تو یہ انھیں چھوڑ کر ہمیں جگہ نہ دیتے۔ یہ بھی انھوں نے کہیں سے چرائے ہوں گے۔"

"یہ بدمعاش کامدار کے آدمی ہیں اور میرن شاہ کے غلام۔ ان کا کام ہی یہ ہے سائیں! ادھر بڑا اندھیر مچا رکھا ہے ان لوگوں نے۔"

"اچھا! سندھ میں بھی یہی کچھ ہو رہا ہے جو اُدھر پنجاب میں دن رات ہوتا ہے؟"

"ہاں! وڈیرے ہر جگہ یہی کرتے ہیں اور ان کے کتوں کا گزارا ایسی ہی مار دھاڑ پر چلتا ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور وہ ہم سے آگے نکلنے لگا۔ اُسے موقعۂ واردات سے جلدی دُور ہو جانے کی دُھن تھی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ ایک پختہ سڑک پر جا چڑھا اور گھوڑوں کو کئی میل آگے دوڑانے کے بعد وہ جنوب کی طرف نکلا اور پھر اسی سمت چل دیا جدھر سے ہم واپس آئے تھے۔

"یہ تو تم پھر واپس جا رہے ہو سائیں!"

"اپنا کھرا بھی تو مٹانا ہے مجھے! ورنہ اِن گھوڑوں کے سُموں کے نشان انھیں سیدھا میرے گھر لے آئیں گے۔"

وہ بہت ہی ہوشیار آدمی تھا اور واردات کے بعد اپنے نشانات ختم کرنے کے فن کو جانتا تھا۔ کوئی بیس منٹ تک ایک کچے راستے پر گھوڑے دوڑانے کے بعد ہم ایک گاؤں میں جا پہنچے۔ چاندنی نے ابھی تک منہ نہیں موڑا تھا اور رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ اور گاؤں کے کسی حصے میں سے ایسا شور اٹھ رہا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ بہت سے لوگ کسی جگہ جمع ہیں۔

سچل گاؤں کے مشرقی کونے میں پہنچ کر گھوڑے سے اترا اور بولا۔ "آؤ سائیں! یہ گھوڑے تم ادھر ہی روکو اور اِن آموں کے باغ کے اندر چلے جاؤ۔ میں بھائی کے گھر جا کر اسے اس کا مال تو واپس کر دوں۔"

"ٹھیک ہے یار جی! ہمیں خوشی ہے کہ تمھیں ہم پر اعتبار آ گیا ہے۔ تیرے جیسے شیر مرد کی تو ہمیں کئی دنوں سے تلاش تھی۔" آبی نے اس کو خوش کرنے کے لیے بڑے ہی رسیلے لہجے میں بات کہی۔

وہ واقعی خوش ہو گیا، بولا "سائیں! شیر مردوں کو تو عورتیں ڈھونڈا کرتی ہیں۔ تمھارے پتے میں آ کر دیکھتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ صرف اپنا گھوڑا الگ کر کے گاؤں میں داخل ہو گیا۔ دائیں ہاتھ آموں کا گھنا باغ تھا۔ ہم تینوں گھوڑوں کو ساتھ لے کر اس میں جا گھسے۔ ہوا ٹھنڈی تھی اور ٹھٹک ٹھٹک کر چلتی تھی۔ درختوں کے گھنے سائے کو پھاڑتے ہوئے چاندنی زمین پر اترتی تھی، تو چاروں طرف عجیب سا حیرت انگیز سماں پیدا کرتی تھی۔ سچل جاہرے لیے اس علاقے میں مینارۂ نور ثابت ہو سکتا تھا۔ آبی نے غلط نہیں کہا تھا ——— ہمیں کسی ایسے ہی شیر افگن کی ضرورت تھی جو ہمیں اس علاقے میں ہمارے مقصد کے حصول میں مدد دے سکتا، اور سچل ایسا ہی آدمی تھا۔ اس نے ایک چھن میں ہمارے مُردہ حوصلوں کو نئی زندگی دے ڈالی تھی اور اب ہمیں یقین تھا کہ ہم آبیلہ کو جلد ہی تلاش کر لیں گے۔ اس بات میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ آبیلہ کو اب کی بار لاکھو ہی نے اغوا کیا تھا مگر۔۔۔ مگر۔۔۔ اس کی وجہ ہماری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

باغ کے اندر کوئی سو قدم آگے جا کر ہم ایک جگہ درختوں کے جھنڈ سے ہٹ کر نم آلود گھاس پر بیٹھ گئے۔

آبی نے پھر دو سگریٹ سلگا لیے اور ایک میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا "لے، یہ امرت دھارا پی لے۔ میں نے تھوک نہیں لگایا۔"

"یار! یہ ہماری تقدیر ہمیں کس راستے پر لے آئی ہے ذرا دیکھ کہ ہم کہاں کہاں دھکے کھاتے پھر رہے ہیں۔"

"ہم دراصل نااِس تقدیر کی ایکٹو سروس میں ہیں۔ میری بات سمجھ رہا ہے نا تو۔ اب ذرا دیکھ اس بزرقطونا نے ہمیں کیسا پھنسایا ہے اس میر ممتاز شاہ نے۔"

"یہ بزرقطونا کیا ہوتا ہے؟ یار! مجھے تو تو اپنی اِس لیاقت سے معاف ہی رکھا کر۔"

"وہ اسبغول نہیں دیکھا ہے تو نے! میری ماں کبھی کبھی اسے بزرقطونا بھی کہا کرتی ہے دوسروں پر رعب ڈالنے کے لیے۔"

"حد ہو گئی یار! نام تم نے اس کا ٹھیک رکھا ہے مگر تم بھی تو کسی میرن شاہ کی بات کر رہا ہے۔"

"ہاں بھئی! وہ بڑی اہم بات ہے۔ ہو سکتا ہے اس کا اشارہ میر ممتاز شاہ کی طرف ہو۔"

"یار! اِن وڈیروں نے تو ادھر بھی اندھیر مچا رکھا ہے۔ دے اس سچل کو، پوچھتے ہیں کہ وہ کس میرن شاہ کی بات کر رہا ہے۔"

"میرا تو خیال ہے جیلانی! کہ۔۔۔" یہ کہہ کر وہ ایک دم چپ ہو گیا۔

"کہو! کیا کہہ رہے تھے رک کیوں گئے ہو؟"

"نہیں یار! پتہ نہیں تو کیا سمجھے، چپ ہی بہتر ہے۔"

"نہیں نہیں، بولو تو سہی! تم سمجھتے ہو میں تمھاری بات کا بُرا مان جاؤں گا؟ پاگل ہو تم آبی! تمھارے بغیر میں کچھ بھی نہیں ہوں، مجھے بتاؤ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"میں۔۔۔ میں یہ کہہ رہا تھا جیلانی! کہ آسیہ جس حال میں ہے اُسے ایک بار دیکھ لینے کے بعد تم اسے بھول جاؤ۔ ہمیشہ کے لیے گولی مار دو۔ وہ۔۔۔ وہ اب اس قابل نہیں رہی کہ تمھارے گھر کے یا اپنے ماں باپ کے ہاں واپس جا سکے۔"

"نہیں یار! اتنے ظالم تو نہ بنو۔ آسیہ پر جو مصیبت آئی ہے سب میری وجہ سے آئی ہے، اور اب جو ذلت وہ سہہ رہی ہے اس میں اس بدنصیب کا کوئی قصور نہیں ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو جیلانی! پر ابھی چپ ہی رہو۔ دیکھو حالات کیا کہتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ شاخوں کے عین بیچ میں سے جھکتے چاند کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ وہ اپنے سینے میں ویسا ہی کرب محسوس کر رہا تھا جس نے مجھے ایک عرصے سے نڈھال کر رکھا تھا۔ وہ بھی آسیہ کو اپنی ماں جائی بہن سمجھ رہا تھا اور اس کے محسوسات کبھی اُسے یوں آتش بداماں کر دیتے تھے کہ وہ تلملا اٹھتا تھا۔ وہ لمحہ بھی اس پر ایسا ہی جانگسل ثابت ہو رہا تھا۔ اس علاقے میں پہنچ کر وہ خود کو بہت ہی آزردہ اور بے بس سمجھنے لگا تھا اور سچل ایسی مشعل سے روشنی مستعار لینے میں بھی اسے عار محسوس ہو رہی تھی۔

سچل کوئی ایک گھنٹے بعد واپس آیا۔ اپنا گھوڑا وہ پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ رات کچھ اور آگے کھسک چکی تھی۔ باغ میں ہم دن کے وقت بیٹھتے تو حبس سے ہمارا دم گھٹنے لگتا مگر رات کا وہ پہر مجھے فرحت کا احساس دلاتا تھا۔

سچل آتے ہی بولا "آؤ سائیں! اب گھر چلتے ہیں۔ اِس واردات کے بارے میں کسی کو کچھ خبر نہیں ہے۔ میں نے کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ کسی کو یہ معلوم ہی نہیں کہ میں کدھر گیا ہوں۔ میں پتیر گوٹھ سے چپ چاپ نکل آیا تھا۔ یہ میرے گاؤں کا نام ہے۔"

"کیا مطلب؟ آخر تم کسی نہ کسی کے سامنے تو گھر سے اُن کے پیچھے نکلے ہو گے۔"

"یہ بات نہیں ہے۔ میں دراصل اپنے گھر میں سویا ہوا تھا کہ میری بھابی نے آ کر مجھے بتایا کہ وہ لُٹ گئے ہیں۔ میں اسی وقت گھوڑا لے کر اُن لوگوں کے پیچھے بھاگ نکلا۔ وہ ابھی زیادہ دُور نہیں گئے تھے اور میرا گھوڑا میرا اشارہ سمجھتا ہے۔ جب اُسے اُڑنے کا کہوں تو وہ واقعی اڑنے لگتا ہے۔"

"گاؤں میں شور کی وجہ سے وہ لوگ جاگ گئے ہوں گے۔"

"نہیں، بھابی نے دہشت زدہ ہو کر آواز تک نہیں نکالی تھی۔ میں اُن کے پیچھے دوڑ کر گاؤں سے نکل گیا تو بھی اس نے کسی کو کچھ نہیں بتایا۔"

"پھر یہ شور کیسا تھا؟"

"اُدھر کوئی آدمی مر گیا ہے۔"

"یہ تو بہت اچھا ہُوا۔ اب تو فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔"

"بس یہ ہماری خوش نصیبی ہی سمجھیں سائیں! وہ میری بھتیجی کا پندرہ تولے سونا اور سیر بھر چاندی لے اڑے تھے۔ اس کے جہیز کے کپڑے بھی وہ باندھ کر چل دیے تھے۔" یہ کہہ کر سچل نے ہمیں ساتھ لیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا وہ ہمیں اپنے گھر لے گیا۔ وہ اپنے بھائی کے گھر کے قریب ہی رہتا تھا۔

اُس کا گھر بھی ہمارے گھروں جیسا ہی تھا۔ گھوڑوں کو اندر لے کر اس نے ایک طرف باندھا اور ہمیں صحن کے دوسرے حصے میں لے جا کر چارپائیوں پر بٹھا کر بولا "میری بیوی ادھر بھابی کے گھر گئی ہے، ابھی آتی ہو گی، کیا خاطر کروں تمھاری؟"

"بس ٹھیک ہے یار! خاطر ہی خاطر ہے ہمیں تم تھوڑا پانی پلا دو۔" آبی نے چارپائی پر پھیل کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ وہ بہت تھکا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

سچل نے ہمیں پانی پلایا تو ہماری جان میں جان آئی۔ پیاس نے ہمیں پریشان کر رکھا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد اس کی بیوی واپس آ گئی۔ ہمیں سامنے دیکھ کر اس نے آنچل گرا لیا اور تیز تیز قدم اٹھاتی کمرے میں جا گھسی۔ وہ بھی سچل کی طرح قدآور عورت تھی۔ اس کا حجاب ہمیں بہت اچھا لگا۔ سچل اس کے پیچھے لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہُوا کمرے میں جا گھسا تو میں بھی بوٹ اتار کر چارپائی پر پھیل گیا۔ اچانک سچل کی آواز میرے کان میں پڑی۔ وہ بڑے شکایت بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا "ایک دم بیکار عورت ہو، وہ مہمان ہیں میرے اور بھوکے ہیں۔"

"تو میں کیا کروں، یہ کوئی وقت ہے چولھا تپانے کا۔ بس سُلا دو انھیں دری دے کر۔"

"آ جاؤ سچل سائیں! بھابی ٹھیک کہہ رہی ہے اس وقت تو ماں بچے کو نہیں سنبھالتی تم روٹی پکانے کا کہہ رہے ہو، آ جاؤ دفع کرو۔" آبی نے ذرا دبنگ آواز میں سچل کو بتایا کہ وہ بھابھی کا جواب سُن چکا ہے۔

وہ بچارا کھسیانا سا ہو کر اسی وقت باہر آ گیا، بولا "یہ حال ہے یار جی! بڑے بڑے پناہ مانگتے ہیں مجھ سے پر یہ زنانی قابو میں نہیں آتی۔ کہتی ہے کہ اس وقت چولھا نہیں تپ سکتا۔"

"بڑے آدمی اپنی عورتوں کے سامنے ہمیشہ عاجز رہتے ہیں۔ سچل سائیں! یہ کوئی نئی بات نہیں ہے بیٹھ جاؤ اِدھر۔"

وہ ہمارے پاس ہی جوتی اتار کر چارپائی پر بیٹھ گیا بولا۔ "اب بتاؤ سائیں تم کس لیے اِدھر آئے ہو، کوئی خدمت ہو تو مجھے بتاؤ۔"

"کیا کہیں برادر! ہم بہت خوار ہو رہے ہیں اور ہماری مشکل کا کوئی حل ہمیں نظر نہیں آتا۔" آبی نے سگریٹ جیب سے نکال کر ہمارے آگے رکھ دیے۔ ایک اس نے خود سلگا لیا مگر صرف ایک ہی دو نہیں۔

"پکھ مجھے بتاؤ تو سہی قصہ کیا ہے سائیں؟"

میں نے سجل کے اس سوال پر اسے مختصر الفاظ میں اپنی بپتا سُنائی، وہ بڑے غور سے میری بات سُنتا رہا۔ جب میں خاموش ہوا تو وہ بولا "سائیں! تم میرن شاہ سے بھی مل آئے ہو۔ جس کی وجہ سے میں نے یہ بندوق اُٹھائی ہے۔"

"کیا مطلب؟ پہلے بھی کوئی چوٹ لگ چکی ہے تمہیں؟"

"ایسی ویسی چوٹ! میرے چچا کو یہ لوگ پچھلے مہینے لُوٹ کر تباہ کر چکے ہیں۔ میتھیرو میں میرن شاہ کا کامدار رہتا ہے یہ گاؤں سنگھٹ سے کوئی ڈیڑھ کوس دُور ہے میرا چچا شاہ محمد آباد کار ہے اور وہیں رہتا ہے۔ ہم لوگ دراصل پنجاب سے ہی آئے ہیں میرن شاہ کا تو اس کی بربادی میں شاید کوئی ہاتھ نہیں ہے مگر اس کی وجہ سے کامدار نظامانی کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

"کیوں؟ پولیس کیا کرتی ہے یہاں؟"

"پولیس کو ان وڈیروں نے بے بس کر رکھا ہے۔ شاہ محمد کے گھر رات کو چوری ہُوئی۔ اس کے دو بیل، دو بھینسیں، بیوی کا زیور اور کپڑا لتا وہ چُرا کر لے گئے وہ بیچارا تھانے تو گیا مگر پولیس اس سے 'لاپا' مانگتی ہے۔"

"یہ کیا ہوتا ہے 'یہ لاپا'؟"

"یہ دراصل رشوت ہے مگر وہ اسے لاپا کہتے ہیں۔ شاہ محمد بیچارا تو پیسے پیسے کو محتاج ہو گیا تھا وہ کیا کرتا۔ مجبور ہو کر وہ ہمارے پاس آیا۔ اس کے مسروقہ مال کی کل قیمت چالیس ہزار روپے بنتی تھی، وہ پریشان ہو کر ہمارے پاس آیا۔ اس نے ہم سے دس ہزار روپے قرض مانگے۔ ہم نے وجہ پوچھی تو بولا کہ اس کا مال جو چوری ہُوا وہ اُسے واپس مل سکتا ہے مگر اس شرط پر کہ وہ کامدار کو بھُنگ ادا کر دے۔"

"یہ۔۔۔ یہ کیا مصیبت ہے بھئی یہ بھُنگ؟" میں نے حیران ہو کر پُوچھا۔

"بڑا ظلم ہو رہا ہے سائیں ادھر۔ یہ بھُنگ دراصل مسروقہ مال کی کل قیمت کا ایک چوتھائی ہوتا ہے جو اگر ادا کر دیا جائے تو چوری کا سارا مال مالک کو واپس مل جاتا ہے۔"

"اور یہ وصول کون کرتا ہے یہ بھُنگ؟"

"اس رقم کو تین حصوں میں بانٹا جاتا ہے۔ ایک حصّہ تو سرکاری اہلکاروں کے لیے ہوتا ہے یعنی پولیس کے لیے، اور وہ اسے لاپا کہتے ہیں۔ دُوسرا حصّہ وڈیرے کا ہوتا ہے۔ جو اسے بطور کھیر پیش کیا جاتا ہے اور تیسرا حصّہ ان لوگوں کو ملتا ہے جو چوری کرتے ہیں۔"

"کمال ہے یار! یہ تو تم کوئی الف لیلیٰ کی کہانی سُنا رہے ہو ہمیں۔ ایسا ظلم تو ہم نے کہیں نہیں دیکھا۔" میں نے اس کی باتوں کو ناقابلِ یقین سمجھتے ہوئے کہا۔

"اِدھر یہی ہو رہا ہے میرے بھائی! اور اس میں جھوٹ رتی بھر نہیں ہے جب ہمیں چچا شاہ محمد نے اپنی یہ بپتا سُنائی میں خود دس ہزار روپیہ لے کر نظامانی کے پاس گیا اور تمہیں یقین نہ آئے اس نے دس ہزار لینے سے انکار کر دیا، بولا کہ شاہ محمد سے پندرہ ہزار سے کم ایک پائی نہیں لے گا۔ مجبوراً پانچ ہزار اور خرچ کرنے پڑے۔ کامدار کی دلیل یہ تھی کہ م... بڑھ گئی ہے اس لیے اب وہ مسروقہ مال کی کل قیمت کا ایک چوتھائی نہیں ایک تہائی لے گا کیونکہ اُسے سب کو خوش رکھنا... کارندے الگ پریشان کرتے ہیں اُن کے نشے پانی کا خرچہ بہت بڑھ گیا ہے۔ وہ لوگ بھنگ افیون اور چرس کے عادی ہیں جب اُن کو یہ چیزیں نہیں ملتی ہیں تو وہ کوئی نئی تجویز لے کر کامدار کے پاس جاتے ہیں وہ شکار کی مالی حیثیت دیکھ کر چوری کی اجازت دے دیتا ہے۔ وہ کارندے مال چُرا کر سیدھا کامدار کے گھر پہنچا دیتے ہیں۔ اور جب تک اُن کا ڈسا ہوا آدمی بھُنگ ادا نہیں کر دیتا اُسے مال واپس نہیں مل سکتا۔"

"یہ۔۔۔ میں کیا سُن رہا ہوں ہاشم خان! یہ کس دیس میں آ گئے ہیں ہم۔ کیا ہو گیا ہے یہاں کے بسنے والوں کو۔ تیرے بڑے جوان پیدا نہیں کرتے ہیں یہ؟"

"پوچھو مت یار! یہ پہلے تین آدمی ہیں جو میں نے مارے ہیں ورنہ میں بھی بس دیکھتا ہی رہتا تھا۔ مگر اب مجھے معلوم ہے کہ لڑائی لمبی ہو جائے گی۔"

"وہ کیسے؟"

"وہ یُوں کہ کامدار کو پتہ ہے کہ اس کے آدمی کس جگہ ڈاکہ ڈالنے گئے تھے۔ وہ پولیس کو سیدھا میرے گھر بھیجے گا۔"

"یہ تو بہت بُرا ہُوا ہے سجل! تمہیں تو وہ کل ہی پکڑ لیں گے۔"

"ایسا نہیں ہو گا۔ میں نے اپنے دو آدمیوں کو اُدھر بھیج دیا ہے وہ لاشیں غائب کر دیں گے اور میں اِن گھوڑوں کو بھی ابھی کسی جگہ بھیج دوں گا میرے آدمی آ ہی رہے ہوں گے۔"

"کمال ہے یار! اگر ایسی بات ہے تو ہم پولیس کا سامنا بھی کر سکیں گے۔"

"یہ ضروری نہیں ہے کہ کامدار کو ان لوگوں کے اس ڈاکے کا علم ہو۔ کئی بار یہ اپنی مرضی سے بھی جس طرف چاہتے ہیں نکل جاتے ہیں اور ہلّہ بول دیتے ہیں، اب تم ادھر آرام سے لیٹ جاؤ میں ان گھوڑوں کو ٹھکانے لگا دوں میرے یار ادھر باغ میں میرا انتظار کر رہے ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ اُٹھا اور تینوں گھوڑوں کو لے کر باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد بستروں پر لیٹے تو سہی مگر نیند ہماری آنکھوں

کوسوں دُور تھی۔ وہ سجل کوئی بڑا ہی منصوبہ باز قسم کا آدمی تھا۔ میرن شاہ کے بارے میں اس نے ہماری بات تو سن لی تھی مگر لاکھو کے بارے میں اس نے ایک لفظ نہیں کہا تھا۔ میں نے اُسے آسیہ کے اغوا کا واقعہ نہیں بتایا تھا بلکہ یہی کہا تھا کہ لاکھو ہم سے ایک بڑی رقم لے کر اِدھر آ گیا ہے اور اب ہم وہ رقم اس سے وصول کر کے رہیں گے لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ اس نے لاکھو کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ گھما پھرا کر اپنا سارا زورِ بیان میرن شاہ پر صرف کر دیا تھا۔

سجل کوئی ایک گھنٹے بعد واپس آیا تو بہت مطمئن تھا۔ گھوڑے وہ کسی کے حوالے کر آیا، اُسے دیکھ کر ہم اُٹھ بیٹھے۔ وہ بولا "لیٹے رہو یارو! میں بھی ذرا تھوڑی نیند پوری کر لوں اذان بس ہونے ہی والی ہے۔"

"یار! ہمیں تم نے لاکھو کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا۔" آبی نے نیند کی بے نیازی سے تھک ہار کر سگریٹ سلگا کر پیکٹ میری طرف بڑھا دیا۔ سجل ہمارے قریب ہی بیٹھ گیا، بولا "یہ میرن شاہ کا کارندہ ہے اور کامدار نظامانی کی ماتحتی میں کام کرتا ہے میں نے اُسے دیکھا تو نہیں مگر میرے یاروں نے ابھی مجھے بتایا ہے کہ آج کل وہ ادھر غوث پور کے قریب ایک گاؤں منقل میں روپوش ہے، اگر ہمت ہے تو اِدھر چلے جاؤ۔ تمہیں ملے گا کچھ نہیں۔"

"کیا مطلب؟ تم سمجھتے ہو کہ ہم یوں ہی اِدھر نکل آئے ہیں، جیب میں قلم ڈال کر۔" آبی نے تنک کر کہا۔

"وہ بہت خونخوار آدمی ہے یار جی! اور پولیس بھی اُس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتی۔"

"بس تم اس کا صحیح پتہ ہمیں بتا دو پھر ہم جانیں اور ہمارا کام۔ وہ اسٹین گنیں کہاں ہیں جو تم نے اپنے شکار سے چھینی تھیں دونوں ہمیں دے دو۔"

"تم اسلحہ چلا سکتے ہو؟" وہ قدرے حیران ہو کر بولا۔ اُس کا استعجاب برحق تھا۔ وہ ہمیں جانتا ہی نہیں تھا۔

"کیوں نہیں! ہم تو پتہ نہیں کیا کچھ چلا سکتے ہیں، بس تم وہ دونوں ہتھیار ہمیں دے دو۔"

"ٹھیک ہے تم بس میں بیٹھ کر غوث پور چلے جاؤ۔ منقل گاؤں بگاری نہر کے دوسری طرف ہے۔" یہ کہہ کر وہ اُٹھا اور ہمیں اس نے نظامانی کے مردہ کارندوں کی دونوں اسٹین گنیں لا کر دے دیں۔ ہم نے جس انداز سے اُن کو کھول کر دیکھا وہ سجل کے لیے حیران کن تھا، بولا۔ "میں تو سمجھا کہ یونہی تم شہری تلیئر ہو، پر میرا یہ خیال غلط نکلا۔"

دونوں اسٹین گنیں گولیوں سے لبالب بھری تھیں۔

"تم یوں کرو سجل کہ ہمارے ساتھ چلو۔ راستوں کا ہمیں علم نہیں ہے۔ ہمیں منقل آج ہی پہنچنا ہے۔"

"یہاں پتہ نہیں حالات کیا ہو جائیں۔ بھابی نے ابھی بھی پہلے مجھے بتایا ہے کہ وہ تین آدمی نہیں تھے بلکہ چار تھے۔ مگر چوتھا آدمی مجھے کہیں نظر نہ آیا اور مجھے یہی ڈر ہے کہ اُدھر کوئی زبردست دھماکا ضرور ہو گا۔ ہو سکتا ہے وہ لاکھو کو بدلہ لینے کے لیے یہاں بھیج دیں۔ وہ نظامانی بہت گندی فطرت کا آدمی ہے۔"

"ہم اُن کا یہاں انتظار کریں گے تم بالکل فکر نہ کرو سجل بھائی! ہم تمہارے ساتھ ہیں۔"

"تم کیا کر سکتے ہو یار! انھیں نہیں جانتے ہو تم۔ بڑے لمبے ہاتھ ہیں اُن کے۔"

ابھی وہ یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ کسی نے دروازے پر دستک دی، ٹھک ٹھک ٹھک۔ باہر کھڑا آدمی بڑی عجلت میں تھا۔ سجل نے اپنی اسٹین گن سیدھے ہاتھ میں لی اور دوڑ کر دروازے تک جا پہنچا، اور تیزی سے بولا "کون ہے؟"

"دروازہ کھول سجل، وہ آ گئے ہیں، اِدھر ہی آ رہے ہیں وہ۔"

سجل نے کنڈی کھول دی تو ایک آدمی تیزی سے اندر داخل ہُوا، بولا "میں نے کہا بھی تھا کہ وہ چار آدمی تھے، ایک بچ کر نکل گیا۔ اس نے کامدار کو سب کچھ بتا دیا ہے اور اب وہ جیپ پر اِدھر آ رہے ہیں۔"

"ہُوں! ٹھیک ہے، آؤ میرے ساتھ۔" یہ کہہ اس نے عجیب انداز سے ہماری طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ "مہمان بھی ہُوئے تو کیسے بُرے وقت میں۔"

"ٹھہر جا یار! تُو اکیلا نہیں ہے۔ ہم بھی تمہارے ساتھ چلتے ہیں وہ تو ہمیں تو نہیں لائے ہوں گے نا اپنے ساتھ۔"

میں نے جُوتے پہن کر تسمے کس لیے۔ آبی نے بھی چارپائی چھوڑ دی، دبی زبان میں بولا "یار سجل کو اس مصیبت سے بچا لینا چاہیے۔"

"ہم انھیں گاؤں سے باہر ہی روک لیں گے۔ چلو ہم دیکھتے ہیں وہ کیا کرتے ہیں۔"

میری یہ بات سن کر سجل ہنسا اور بولا "یارو تم میرے مہمان ہو میرے لیے کیوں اپنی جان گنواتے ہو۔"

"ہم تمہارے دوست بھی تو ہیں۔ دیر نہ کرو جلدی نکل چلو۔" یہ کہہ کر میں آبی کو اپنے ساتھ لے کر دروازے سے باہر نکلا تو وہ دونوں تذبذب میں کھڑے ہمیں دیکھ رہے تھے وہ بھی ہمارے ساتھ ہی گھر سے باہر آ گئے۔

"وہ گھوڑے کہاں ہیں؟"

"اُن کو ابھی تک ہم نے باغ میں روک رکھا ہے فیروز کا انتظار کر رہے ہیں ہم۔"

یہ کہہ کر سجل باغ کی طرف لپکا۔ عین اس وقت گاؤں کے مغربی حصے سے ہمیں کسی گاڑی کی آواز سُنائی دی۔ ہم بھاگ کر باغ میں جا گھسے۔ گھوڑے اُن لوگوں نے باغ کے عقبی حصے میں باندھ رکھے تھے۔

"یار! میرا خیال ہے ہم درختوں پر چڑھ کر دیکھ تو لیں کہ وہ ہیں کون۔"

اس کی تجویز معقول تھی۔ ہم چاروں اسی وقت آم کے ایک درخت پر جا چڑھے۔ اب ہم اس گاڑی کی روشنیاں دیکھ سکتے تھے۔ گاڑی اب باغ کے قریب سے گزر کر آگے بڑھ رہی تھی۔

"ارے یہ تو پولیس کی جیپ ہے۔" سجل نے حیران ہو کر کہا۔

"یہ ادھر کیا لینے آئے ہیں۔ کامدار ان کو اتنی جلدی تو نہیں بلوا سکتا تھا۔"

گاڑی سجل کے گاؤں پتیر پور میں ٹھہرنے کے بجائے تیزی سے آگے نکل گئی۔ وہ لوگ کسی اور ہی مہم پر نکلے ہوئے تھے۔ جیپ گاؤں کی حدود سے جب آگے نکل گئی تو ہم درخت سے نیچے اتر آئے۔

سجل بولا "کامران تو ادھر ہی رہ۔ فیروزہ کو بھی اس الّن کے گھر سے لا کر ادھر رکھ۔ میں دو چار دن کے لیے یہاں سے دُور چلا جاتا ہوں۔ کوئی گڑبڑ ہو تو غوث پور میں مجید کے گھر پر اطلاع دو، سمجھے! اسے میں اپنا پتہ بتا دوں گا۔"

"ٹھیک ہے سائیں! وہ گھوڑے ابھی ادھر ہی ہیں وہ آپ سنبھال کر یہاں سے نکل جائیں میں دیکھ لوں گا وہ کامدار کیا کر سکتا ہے۔"

"بھابھی کو صبح سویرے تم شکار پور بھیج دو گے میں اُسے سمجھا آیا ہوں۔ وہ گھر سے سونا نقدی اور کپڑے لتے وہاں اپنے باپ کے لے جائے گی۔ یہاں ہر وقت خطرہ لگا رہے گا۔"

"ایسا ہی ہو گا سائیں! میں اکبر کو اس کے ساتھ بھیج دوں گا مگر تمھارا بھائی بیمار ہے۔"

"اس کی دیکھ بھال میری بیوی کرتی رہے گی۔"

"ٹھیک ہے سائیں آپ نکل جاؤ پو پھٹ رہی ہے، ادھر سے کھسک لینا ہی بہتر ہے۔" کامران نے کہا۔ وہ بھی کوئی بہت ہی پہنچا ہوا بزرگ تھا۔ درخت پر وہ گلہری کی طرح چڑھ گیا تھا۔ اور بدن اس کا ایسا تھا کہ اسے دوہرا کر کے وہ انگوٹھی میں سے گزار سکتا تھا۔ بہت پھرتیلا جوان تھا وہ کامران اور سجل نے اُسے اپنے ساتھ ملا کر اپنی طاقت میں خاطر خواہ اضافہ کر لیا تھا۔ وہ اس پر بھروسا کر سکتا تھا۔

اس سے الگ ہو کر ہم باغ کے عقبی حصے میں گئے۔ سجل کا ایک آدمی شکاری کتے کی طرح وہاں چوکس کھڑا تھا۔ اس نے صبح کے ملگجے اجالے میں سجل کو پہچان لیا، بولا "اور سائیں کیا ہیں وہ فیروزہ ابھی تک نہیں آیا اور گھوڑے مچل رہے ہیں۔"

"بارک اللہ! اسے کہہ دینا کہ وہ سیدھا ہو جائے ورنہ میں مغز پھاڑ دوں گا۔ تم اب جاؤ کامران تمھارا انتظار کر رہا ہے اُسے میں نے ساری بات سمجھا دی ہے۔"

"اچھا سائیں! ادھر کچھ پیسے ویسے کی ضرورت پڑی میرا خیال ہے تم کافی دنوں بعد ہی ادھر آؤ گے۔"

"پیسے کامران کے پاس بہت ہیں۔ وہ خود دیکھ لے گا کیا کرنا ہے میرے بھائی کے دوا دارو کا دھیان رکھنا۔" اس نے بارک اللہ کو وہاں سے دوڑا دیا پھر وہ ہماری طرف ہوا بولا "اور یارو! مجھے افسوس ہے میں تمھاری کوئی خدمت نہ کر سکا اور میں تمھیں متھل لے چلتا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے گھوڑے کی رکاب پر پاؤں رکھ دیا اور گھوڑوں پر ہم بیٹھے اور باغ کے عقبی حصے سے نکل کر آگے گئے۔ صبح کا اجالا چار سو پھیل رہا تھا۔ ہم پوری رات پلک پلک نہ لگا سکے تھے۔ کوئی ایک میل آگے نکل کر ہم ایک راجباہ پر جا پہنچے سجل نے ہمیں وہاں اتر کر منہ ہاتھ دھونے کے لیے کہا آپ کپڑے اتار کر اس میں نہانے لگا۔ میں اور سجل بھی اس کی دیکھا دیکھی پانی میں اتر گئے۔

راجباہ میں سے نہا کر جب ہم دوبارہ گھوڑوں پر سوار ہوئے تو ہم تازہ دم ہو چکے تھے۔ سجل کی راہنمائی میں ہم کوئی تین گھنٹے تک گھوڑے بھگاتے رہے۔ وہ بڑی سڑک سے کنی کترا کر چل رہا تھا اور یہی بہتر تھا کیونکہ راستے میں ہم کسی بھی وقت کسی غلط صورت حال سے دوچار ہو سکتے تھے۔

بگاڑی نہر ہم نے دن کے دو بجے عبور کی۔ راستے میں گاؤں کے قریب سے گزرتی اینٹوں کی پختہ سڑک کے کنارے ہم ایک کھوکھے والے کے ہاں بیٹھ گئے۔ وہ چائے بھی بیچتا تھا اور روٹیاں بھی۔ پکوڑے وہ اُس وقت تل رہا تھا۔ بھوک نے برا حال نکال دیا تھا وہ گرما گرم پکوڑے اور وہ روٹیاں ہمیں اس وقت من و سلویٰ نظر آئیں۔ ہم جب اچھی طرح پیٹ بھر چکے تو غریب نواز دکاندار نے ہمیں دو دو گلاس گرم گرم چائے بھی پلا دیے اس نقل کے دام سجل نے ادا کیے۔ اس کی جیب میں خاصی بڑی رقم موجود تھی۔ پھانک خیر ہم بھی نہیں تھے نوٹوں سے بھرا بریف کیس آپی کے ہاتھ میں تھا جسے وہ ایک لمحے کے لیے بھی خود سے جُدا نہیں کرتا تھا کہ وہ اسے اپنا جیون ساتھی سمجھتا تھا۔ نہر سے آگے نکلتے ہی سجل مغرب کی طرف نکلا۔

"متھل گاؤں اب ہمارے سامنے ہے یہاں کے بیلے بہت

لاکھو کے بارے میں میں نے سُنا ہے کہ وہ لاشاری کی حویلی میں رہتا ہے۔"

"یہ لاشاری کون ہے؟"

"اس گاؤں کا زمیندار ہے مگر اب اُن میں سے کوئی بھی یہاں نہیں رہتا۔ اس نے آگے جیکب آباد کے قریب مولا آباد میں رہائش کر لی ہے وہاں اس نے کچھ نئی زمینیں آباد کی ہیں۔"

"لاشاری کی حویلی گاؤں کے اندر ہے کہ باہر؟"

"حویلی گاؤں سے خاصی باہر ہے اگر میری اطلاع درست ہے تو پھر لاکھو سے ہی ہماری ملاقات ہو جائے گی۔"

"تو چلو پھر۔ ہمیں ابھی وہاں تک لے چلو سجل بھائی! یہ ہماری زندگی کا سب سے زیادہ قیمتی دن ہے۔" آپی نے پرجوش لہجے میں کہا۔

سجل نے گھوڑے کو ایڑ لگائی تو ہم بھی اس کے پیچھے لپکے۔

وہ بے زبان شاہ گام گھوڑے ہمیں تیزی سے اس منزل کی طرف لیے جاتے تھے جہاں بے یقینی تھی جہاں زندگی سے ہمارا رشتہ ٹوٹ جانے کے سارے ہی قوی امکانات موجود تھے۔ کیونکہ لاکھو کے بارے میں ہم جو کچھ سن چکے تھے وہ ہمیں دہشت زدہ کرنے کے لیے بہت کافی تھا مگر اس کے باوجود ہم اس کو معاف کرنے پر آمادہ نہیں تھے کیونکہ میری عزت پر اس نے ہاتھ ڈال رکھا تھا۔ میری بہن کو اس نے ایسی ذلت سے دوچار کر دیا تھا کہ سارے سمندروں کا پانی بھی اس داغ کو دھو نہیں سکتا تھا اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ آسیہ اس کے قریب ہو کر کب اور کیسے گزر گئی تھی۔

گاؤں اور حویلی کے درمیان ایک وسیع و عریض باغ تھا۔ جس کے ایک حصے میں کھجور کے درخت پرے باندھے کھڑے تھے آدھے حصے میں کیلے لگے تھے اور باغ کے عقب میں آموں کے اونچے اونچے درخت تھے۔ وہ بہت ہی سرسبز اور شاداب علاقہ تھا اور نہر کا پانی اسے ہر وقت سینچتا رہتا تھا۔ سجل نے ٹھیک کہا تھا حویلی اس دُور دُور تک پھیلے باغ کے جنوبی حصے میں تھی۔ اور گاؤں سے خاصی دُور تھی۔

مگر وہ کوئی پختہ حویلی نہیں تھی۔ گارے مٹی کی پرانی طرز کی وہ حویلی کوئی چار کنال رقبے پر پھیلی تھی۔ ایک طرف اس کا دروازہ پختہ محرابوں کے نیچے کھڑا اپنی پرانی عظمت کا ثبوت فراہم کر رہا تھا اور وہ دروازہ اس گھڑی کھلا تھا۔

ہم اس کے سامنے جا کر گھوڑوں سے اتر گئے۔ ہمارے ہتھیار ہمارے کرتوں کے نیچے چھپے تھے۔ وہ ہلکی پھلکی اسٹین گنیں ہم نے جان بوجھ کر پردے میں رکھی تھیں تاکہ کوئی ہمیں دیکھ کر خواہ مخواہ بھڑک نہ اٹھے۔ ہم گھوڑوں سے اترے تو دروازے کے اندر چند قدم دور کھڑے دو جوان تیزی سے ہماری طرف بڑھے۔ وہ سندھی میں بات کرتے تھے جس کی ہمیں زیادہ سمجھ نہیں تھی، پھر بھی چند الفاظ جو انھوں نے کہے ہمیں یہ احساس دلا گئے کہ وہ ہمارا نام اور ہماری آمد کا مقصد پُوچھ رہے تھے۔

سجل نے یُوں ہمیں سُنانے کے لیے اردو میں جواب دیا بولا "ہم لاکھو لاشاری صاحب سے ملنا چاہتے ہیں۔ میرا نام سجل ہے اور میں پتیر گڑھ سے آیا ہوں یہ میرے دوست ہیں — یہ ہاشم خان ہے اور یہ پیرزادہ صاحب۔ ہمیں لاشاری صاحب سے ایک بہت ضروری کام ہے۔"

اس کی یہ بات سن کر وہ جوان بولا "تمھیں یہاں کا پتہ کس نے بتایا ہے؟"

"کامدار نظامانی نے۔ ہم اُس کا ایک خاص پیغام لے کر آئے ہیں۔"

"تم اِدھر ہی ٹھہرو۔ میں سائیں سے بات کر کے تمھیں بتاتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ آدمی تیزی سے حویلی کے اندر غائب ہو گیا دوسرے آدمی نے ہمیں دیوار کے ساتھ بچھی چارپائی پر بٹھا دیا۔ وہاں سایہ تو تھا مگر حبس بھی اتنا تھا کہ ہمارا پسینہ بہہ نکلا۔ گھوڑوں کی پیٹھ پر سوار رہ کر ہمیں گرمی اور حبس کا اتنا احساس نہیں ہوا تھا گھوڑے ہم حویلی کے اندر ہی لے گئے تھے اور وہ بھی دھوپ سے پریشان ہو کر سائے میں دبک گئے تھے۔ دیوار کے ساتھ جڑ کر وہ کھڑے تھے۔

وہ آدمی جو ہمارے پاس دُوسری چارپائی پر بیٹھا تھا، بالکل چُپ رہا ہمیں وہ بڑی گہری نظر سے دیکھ رہا تھا جیسے وہ ہماری اصلیت جاننے کی کوشش میں ہو، مگر اس کی بلادت اس کے چہرے سے ہی عیاں تھی۔ تھا بھی وہ پاپ روپ آدمی۔ ایک آنکھ سے بھینگا تھا۔ اور اپنی بے ہنگم شخصیت کا سارا زور اس نے مونچھوں پر صرف کر رکھا تھا۔ میں اس کو دیکھ کر یہی تاثر لے رہا تھا، کہ اچانک چڑیوں کا ایک غول سامنے کے درخت پر آ بیٹھا مگر چند ہی ثانیوں بعد وہ پھر اُٹھ گیا۔ تمام چڑیاں صحن سے نکل گئیں مگر ایک ان میں ایسی تھی کہ وہ لوٹ کر پھر درخت پر آ بیٹھی۔ وہ بہت بے چین ہو رہی تھی وہ شاخ پر بیٹھی اور پھر اڑنے لگی۔ اس آدمی کو خدا جانے کیا سُوجھی، اس نے نیفے میں ہاتھ ڈال کر تیزی سے پستول نکالا اور ابھی میں کچھ سمجھ بھی نہیں پایا تھا کہ اس اُڑتی ہوئی چڑیا پر اس نے گولی چلا دی۔ یُوں کہ بس 'جھک' ایسی آواز پیدا ہوئی اور وہ چڑیا زمین پر دھپ سے گر گئی۔ اس بھینگے نے پستول پر سائلنسر لگا رکھا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ گولی اس نے ہمیں مرعوب کرنے اور ہمارے دلوں پر دہشت طاری کرنے کے لیے چلائی تھی۔ یہ دکھلانے کے لیے کہ وہ کتنا بڑا ماہر نشانہ باز ہے وہ یہی ثابت کرنا چاہتا تھا۔ چڑیا زمین پر گری تو اس نے پستول نیفے میں اُڑس لیا۔ وہاں اس نے بیلٹ باندھ رکھی تھی جو گولیوں سے

آئی ہوئی تھی۔

"تیری کیا بات ہے جوان! تُو نے تو کمال کر دیا ہے حالانکہ تیری آنکھوں میں کوئی اتفاق نہیں ہے۔" آبی نے اُس کو ذلیل کرنے کے لیے اس کی تعریف بھی کر دی اور تنقیص بھی۔

"دوسرے لفظوں میں مجھے بھینگا کہہ رہے ہو۔ کیا مطلب ہے تمھارا کہ میری آنکھوں میں اتفاق نہیں ہے۔" وہ آدمی ایک دم بھڑک اٹھا۔ اُس کی سیاہ رنگت میں ہلکی سی خون کی سُرخی ٹپکنے لگی تھی۔

"تم تو ناراض ہو گئے ہو یار! جاؤ اب اُس چڑیا کے سیری پائے پکا لو، بچاری ضائع جا رہی ہے۔" آبی پھر بھی باز نہیں آیا۔

"چُپ ہو جا سائیں! میں کہہ رہا ہوں بیتہ کسی کی ایسی بات سننے کا روادار نہیں ہے۔"

"اچھا تو تیرا نام بیا ہے جسے چڑا کہتے ہیں جب ہی تو تُو نے چڑیا کو مار دیا ہے۔"

"میرا نام بیا نہیں، بیتہ ہے بیتہ۔ جس کے معنی ہیں سورج۔ تم یہ مذاق بازی بند کرو ورنہ میں تیرا بھی یہی حال کر دوں گا جو اس چڑیا کا کر دیا ہے۔" وہ اور زیادہ غضبناک ہو گیا تھا۔

آبی اس کی تلملاہٹ پر خوش ہو رہا تھا۔ اُسے جانے کیا سوجھی بیتہ اس کے بائیں ہاتھ بیٹھا تھا اور شاید اس کے پستول کا دستہ اُسے نظر آ رہا تھا۔ اس نے یوں کیا کہ جیب سے ایک روپیہ نکال کر ہوا میں اوپر اچھالا اور پھر بلا خیز تیزی سے اس نے بیتہ کے نیفے سے جھانکتا پستول کھینچ کر اس نیچے آتے روپے پر گولی چلا دی۔ اور میں یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ گولی اس روپے میں لگی اور اس میں سوراخ کر کے آگے نکل گئی۔ روپیہ ہم سے خاصی دُور جا گرا تھا۔ بیتہ تو یہ منظر دیکھ کر پاگل ہی ہو گیا۔

"یار! یہ... یہ... کمال کر دیا ہے تم نے۔ ایسے شعبدہ باز آدمی ہو تم۔"

بیتہ سٹپٹا کر چارپائی سے اٹھا۔ وہ چوکڑی بھول گیا تھا۔ ہکلا کر بولا "یہ... یہ میرا پستول اِدھر دے دو۔ ہاں میں کہہ رہا ہوں اس کو اپنے پلید ہاتھ مت لگاؤ۔"

"ابے جا اب یہ تجھے نہیں مل سکتا بول کتنے پیسے دے دوں اس کے؟"

"یہ... یہ تو ڈھائی ہزار میں بھی نہیں ملتا ہے سائیں! لاشاری صاحب نے خاص طور پر مجھے دے رکھا ہے۔ وہ... وہ تو مجھے جان سے مار دے گا، لاؤ یہ مجھے دے دو۔"

مگر آبی نے پستول اپنے نیفے میں اڑس کر جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور سو سو کے تیس نوٹ گن کر بیتہ کی طرف پھینک دیے، بولا "یہ اٹھا لے میاں! یہ تین ہزار ہیں، ہمیں یہ پستول پسند آ گیا ہے تم اور خرید لینا۔"

بیتہ ہکا بکا رہ گیا۔ اس کے منہ میں چھپکلی آ گئی تھی۔ نوٹ بھی اُسے اچھے لگنے لگے تھے۔ اس کی غیر متفق آنکھیں یہی ظاہر کر رہی تھیں مگر وہ پستول سے بھی محروم نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس کے ہونٹ کپکپانے لگے تھے۔ نوٹ اس کے پاؤں میں ڈھیر تھے۔ وہ جھکا اور اُن کو بڑی احتیاط سے اٹھا کر بولا "یہ... یہ زیادتی ہے سائیں! وہ... لاشاری صاحب مجھے بہت ... کرے گا۔"

"جلیل" کرنا تو اور بھی اچھا ہے، اس کے معنی ہیں کہ آدمی کی عزت بڑھ جائے۔ جلال جلیل اجلال سب عزت والے لفظ ہیں پیارے بیتہ صاب! یہ پستول اب ہمارا ہو چکا ہے، نوٹ جیب میں رکھ اور ہمیں دُعا دے کہ ہم نے تجھے دلبر بنا دیا۔" آبی ... بدمعاشی سے باز نہیں آ رہا تھا۔ میں ڈرا کہ وہ بیتہ کہیں اس سے ... ہی نہ جائے کیونکہ وہ اب تک اس صورتِ حال سے سمجھوتا نہیں کر ... تھا کہ عین اُس وقت اس کا ساتھی صحن میں نکلا اور تیز تیز قدم اٹھا ... ہمارے پاس آ پہنچا۔ وہ صحن کے بیچ میں لگی سنبھتے کی اوٹ ... کے اس طرف بیٹھے لاکھو سے مل کر آ رہا تھا، بولا "آؤ سائیں! لاکھو صاب نے آپ کو اندر بلایا ہے۔"

ہم فوراً ہی اُٹھ کر اس کے ساتھ چل دیے۔ بیتہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر نوٹ اس نے جیب میں رکھ لیے تھے۔ وہ دو قدم آ... ساتھ چلا تو آبی رُک کر بولا "دیکھ بیتہ بھائی! کبھی کبھی کچھ باتیں ... وگرنہ قبول کرنی ہی پڑتی ہیں اِدھر بیٹھ کر دھوپ تاپ ... بھائی! ہم جلدی واپس آ کر تم سے بات کریں گے۔"

لفظ "طوعاً وکرہاً" سن کر بیتہ نے ایسے منہ بنایا جیسے ... نے اُسے کوئی گندی گالی دے دی ہو وہ یہی سمجھا تھا مگر جب ... کے ساتھی نے اسے گھور کر دیکھا تو وہ وہیں رُک گیا اور پھر کچھ ... پیچھے چلا گیا۔

ہم چار قدم آگے نکلے تو اس کا ساتھی بولا "کیا کہہ رہا ... بھیا آپ سے؟"

"اِس کا نام بھیا نہیں ہے یار! بیتہ ہے بیتہ۔ جس کا مطلب ہے سُورج۔"

"اس کی تو میں ایسی تیسی کر دوں گا، اس بھینگے کی۔ کوئی ... تو نہیں کی ہے اس نے؟"

"نہیں بھئی! ہمارا حال چال پوچھ رہا تھا۔ بہت بھلا ... ہے بیچارہ تمھاری بڑی تعریف کر رہا تھا، کیا نام ہے تمھارا؟"

"میرا نام سیف علی ہے سائیں! پہلے میں جعفر لاشاری کا ملازم تھا، اب لاکھو صاب کی خدمت کرتا ہوں۔"

اس وقت ہم باڑہ کے پاس پہنچ چکے تھے۔ جب اس میں سے ہم گزرے تو سامنے ہمیں گارے مٹی کے بنے کئی کمرے نظر آئے اُن کے آگے پرانی طرز کا برآمدہ چاروں طرف سے چھتا ہوا تھا۔ ایک دروازے کے سامنے چق پڑی تھی۔ سیف علی نے وہ چق اُٹھا کر ہمیں اندر پہنچا دیا۔ وہ کمرہ غیر معمولی طور پر ٹھنڈا تھا اس لحاظ سے کہ باہر کی تمازت کا وہاں کے ماحول سے کوئی موازنہ ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کمرے میں چھ کرسیاں ایک دیوار کے ساتھ لگی تھیں۔ دائیں ہاتھ ایک پلنگ بچھا تھا۔ موٹے رنگین پایوں کا نواڑی پلنگ جس پر چادر نہیں ڈالی گئی تھی۔ ہم کرسیوں پر بیٹھے تو عقبی کمرے کے دروازے سے ایک ساڑھے چھ فٹ لمبا اور کم از کم دو فٹ عرض کا قوی ہیکل آدمی باہر آیا۔ عمر اس کی یہی کوئی تیس بتیس سال ہو گی۔ وہ ململ کا کرتا اور سفید شلوار پہنے ہوئے تھا۔ کندھے پر اس نے پستول کی بیلٹ لٹکا رکھی تھی۔ جس کے ہر خانے میں گولی موجود تھی اور پستول کے دستے پر اس نے اپنا بایاں ہاتھ بڑے متکبرانہ انداز سے لٹکا رکھا تھا۔ رنگ اُس کا سانولا تھا اور مونچھیں اُس کی بیتہ کی بھاری بھرکم مونچھوں کو مات کرتی تھیں۔ وہ اتنی گھنی اور جھالردار تھیں کہ مذہبی سکھوں کی طرح اُن کے نیچے اس کا مُنہ پوری طرح نظر نہیں آتا تھا۔ وہ شاید الائچیاں چبا رہا تھا کیونکہ جب اُس نے باری باری السّلام علیکم کہہ کر ہم سے ہاتھ ملایا تو الائچی کی خوشبو اُس کے سانس میں رچی نظر آتی تھی۔ ہم سے ہاتھ ملا کر کرسی پر وہ بیٹھا تو میں نے دیکھا سامنے کی دیوار کے عین بیچ میں بنے ایک مربع فٹ روزن پر گرا ململ کا پردہ عجیب انداز سے ہل رہا تھا۔ یوں جیسے کوئی وہاں کھڑا ہماری ہر حرکت کا جائزہ لے رہا ہے۔

"کیسے آنا ہوا سائیں! کامدار صاب نے کیسے بھیجا ہے آپ کو؟" لاکھو نے بڑے بھاری بھرکم لہجے میں پوچھا۔ اس کی آنکھوں کی غیر معمولی سُرخی مجھے یہ احساس دلاتی تھی کہ یا تو وہ شراب پیے ہوئے ہے یا پھر اس کی آنکھوں میں ہر وقت خون اُترا رہتا ہے۔ ہڈ کاٹھ کا وہ بہت ہی مضبوط آدمی نظر آتا تھا اور اس کے بائیں جبڑے پر کان کے قریب ہلکا سا ایک نشان تھا جیسے کسی نے چاقو کی نوک سے وہ جگہ کاٹ دی ہو۔

"بات یہ ہے لاکھو صاحب کہ...؟" یہ کہتا ہوا میں اُٹھ کر اس کے قریب کی کرسی پر جا بیٹھا۔

وہ میری ہر حرکت کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اپنی مونچھوں پر بایاں انگوٹھا پھیر کر بولا "ہاں ہاں! کہو میں سُن رہا ہوں۔"

"بات یہ ہے سائیں کہ آپ سے ہم کچھ پوچھنا چاہتے ہیں اگر آپ ہمیں کسی صحیح نتیجے پر پہنچا دیں تو آپ کی مہربانی ہو گی۔ لاکھو سائیں! ہم بہت دُور سے آئے ہیں، آپ نے ترن تارن کا نام تو سنا ہو گا؟"

میرے مُنہ سے ترن تارن کا نام سن کر ایک دم سنبھل کر بیٹھ گیا۔ پستول اُس کے خول سمیت اس نے کھسکا کر اپنی گود میں رکھ لیا اس طرح کہ اس کا دستہ اب اُس کے دائیں ہاتھ کی زد میں تھا۔

"ترن تارن! یہ تو کوئی قصبہ ہے اُدھر انڈیا میں۔ امرتسر کے پاس۔ کیا ہُوا ہے وہاں؟"

"وہاں تو کچھ نہیں ہوا لاکھو سائیں! ایک اور گاؤں ہے ترن تارن ساہیوال ضلع میں، آپ کو یاد ہو گا آپ کے آدمی وہاں گئے تھے۔"

"میرے آدمی؟ یہ تم کیا کہہ رہے ہو سائیں میرے پلے تو کچھ نہیں پڑ رہا۔"

میری نظر اس وقت آبی پر پڑی وہ شِکرے ایسی تیزی سے اٹھ کر اس روزن کے پاس جا پہنچا اور دیوار کے ساتھ لگتے ہی اس نے بیتہ کا پستول سیدھے ہاتھ میں لے کر پردہ ایک طرف ہٹا دیا، یوں کہ اُس پردے کے پیچھے ایک آدمی اب حیران پریشان کھڑا تھا اُسے آبی نے بے بس کر دیا تھا، اس پر پستول تان کر بولا "تو اِدھر آ جا اوئے! اندر نہ میں تجھے دُوسرا سانس نہیں لینے دوں گا۔"

وہ آدمی فوراً ہی پیچھے ہٹا اور پریشان ہو کر عقبی دروازے سے لاکھو کے پاس آ کھڑا اس کا رنگ زرد ہو گیا تھا۔ آبی کڑک کر بولا۔

"اس سے سیدھی طرح بات کر جیلانی! اس سے پُوچھ کہ آسیہ کہاں ہے؟ ہم اُسے لینے آئے ہیں۔ تم اسے غور سے دیکھ لو لاکھو یہ جیلانی ہے آسیہ کا سگا بھائی۔"

آبی کے یہ لوہے ایسے تیخ بستہ الفاظ سُن کر لاکھو کے چہرے پر ایسا تحیّر اُبھرا کہ باید و شاید۔ اس کی آنکھیں پھیلنے لگیں جیسے زمین اُسے راہ نہ دے رہی ہو ورنہ وہ اس میں دھنس جاتا۔

"ہاں لاکھو! تیری کھوج میں ہم بہت دُور سے چلتے آئے ہیں اور ہمیں آج ابھی اور اِسی وقت آسیہ کو واپس لے جانا ہے۔"

"تم ہی اس کے سگے بھائی ہو؟" لاکھو نے بڑے ہی اداس لہجے میں کہا۔ اس کی نظریں سامنے خلا میں جا اٹکی تھیں۔ سر اس نے کرسی کی پشت سے لگا لیا تھا۔

"ہاں! میرا ہی نام جیلانی ہے شاید یہ نام تم نے سُن رکھا ہو۔"

"ہاں! تیرے نام کے پنجاب میں ہر طرف چرچے ہیں جیلانی مگر... مگر میرے پاس تیرے لیے کچھ اچھی خبر نہیں ہے میرے بھائی!" پھر اچانک وہ گرج کر بولا "پیچھے ہٹ جا بِتّوں! یہ مشین گن پیچھے ہٹا دے۔" وہ اس چوبی روزن کی طرف متوجہ تھا جس میں سے ایک بار پھر بندوق کی نالی ململ کے پردے سے باہر نکل آئی تھی وہاں ایک اور آدمی آ کھڑا تھا۔ اس کا حکم سنتے ہی وہ

نالی کسی نے پیچھے کھینچ لی۔ اور اس کے ساتھ ہی لاکھو نے اپنے کندھے
سے لٹکا ہوا پستول اتار کر زمین پر میرے قدموں میں ڈال دیا۔
بڑے ہی زخمی اور آزردہ لہجے میں بولا۔ "میں تیرا مجرم ہوں بھائی
تو میری بات ان کے سامنے سُنے گا کہ علیحدگی میں کہوں؟"

"نہیں مجھے سب کچھ یہیں سُننا ہے لاکھو! بتاؤ آسیہ
کہاں ہے؟"

"وہ... وہ میری اس حویلی میں نہیں ہے جیلانی! وہ اپنا
کھنب چھڑا گئی ہے۔ میں اُسے یہاں لے آیا تھا۔ میں نے سوچا تھا
میں ساری زندگی اس کی پوجا میں گزار دوں گا مگر جب اس پر
حقیقت کھلی تو اس نے میرے ہی پستول سے میرے دو آدمی مار
دیے اور خود میرے گھوڑے پر بیٹھ کر یہاں سے نکل گئی۔ آج اس
کو یہاں سے گئے ہوئے پندرہ دن ہو چکے ہیں جیلانی! میں
سارے جہان کو اُلٹ کر رکھ دوں تو بھی وہ واپس نہیں آسکتی۔
اُسے مجھ سے نفرت ہو چکی تھی۔ ایسی نفرت کہ میں بیان نہیں کر
سکتا۔"

اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے، وہ بچوں کی طرح پھوٹ
پھوٹ کر رونے لگا تھا۔ اپنا گریاں چہرہ اُس نے اپنے ہاتھوں پر
ڈال لیا۔ وہ بھول ہی گیا تھا کہ آبی اس کے سامنے پستول لیے
کھڑا ہے۔ ایک پستول میری جیب میں بھی تھا اور اس کا اپنا
ہتھیار میرے پاؤں میں ڈھیر تھا۔ اتنی ساری جان لیوا گولیوں
سمیت۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم وہ کہاں چلی گئی ہے وہ میری بدنصیب
بہن۔ تم جھوٹ بولتے ہو لاکھو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اس کے لیے
تو ہم در در کی خاک چھانتے آئے ہیں۔" میں نے اسے دونوں
کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ "میں اُسے تم سے
واپس لوں گا مجھے بتاؤ وہ کہاں گئی ہے۔"

"میرے منہ پر یہی طمانچہ لگا ہے میرے بھائی! تم شاید
یہی خبر سننے آئے تھے۔ اُس نے مجھ سے منہ موڑ کر مجھے تباہ کر دیا ہے
جیلانی! تجھے نہیں معلوم کہ تیرا نام لے لے کر وہ کتنا رویا کرتی تھی۔
میں نے کہا بھی تھا کہ میں اس کو تیرے پاس لے چلوں گا مگر وہ
نہیں سمجھی۔ وہ مجھ سے یوں نفرت کرتی تھی جیسے میں انسان نہیں
کوڑھی کتا ہوں۔"

"مگر تم اسے یہاں کیوں لائے تھے؟ کیا تعلق تھا تمہارا اس سے۔
وہ کہاں ملی تھی تجھے؟"

"اس سے میری ملاقات راولپنڈی جیل میں ہوئی تھی۔ وہ
بیمار تھی اور ڈاکٹر مقبول اس کا علاج کیا کرتا تھا۔ میں نے اُسے
دیکھا تو بس اُسے دیکھتا ہی رہ گیا مگر وہ تو شاید پتھر کی بنی ہوئی تھی۔
کسی طرف نگاہ ہی نہ اٹھاتی تھی۔ مجبور ہو کر میں نے ڈاکٹر مقبول
کو ایک دن پانچ ہزار روپے دیے کہ وہ اس کو علاج کے بہانے
بے ہوش کر کے کسی الگ کمرے میں میرے حوالے کر دے۔ وہ مان گیا
اُس نے ہسپتال کے کمرے میں مجھے موقع فراہم کر دیا اور...
اور... میں تیرا مجرم ہوں جیلانی! میں نے آسیہ کو اس کی بے
خبری میں اس کی بے ہوشی میں لوٹ لیا۔ کچھ ہی عرصے بعد لیڈی
ڈاکٹر خالدہ نے اس کا دُوسری عورتوں کے ساتھ معائنہ کیا تو اس نے
ڈاکٹر مقبول کو بتایا کہ آسیہ حاملہ ہو چکی ہے۔ یہ بات جب مجھے مقبول نے
بتائی تو میں نے تہیہ کر لیا کہ میں اس کو ہر قیمت پر اپنی بیوی
بناؤں گا۔ وہ میرے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ مگر ابھی میری سزا
جاری تھی۔ مجھے ابھی وہاں تین سال رہنا تھا کہ مجھے اس دوران پتا
ہوا کہ کسی نے اُسے جیل سے فرار ہونے کا موقع دے دیا ہے۔ لہٰذا
مجھے پتہ چلا کہ اُسے تم ہی جیل سے نکال کر لے گئے ہو۔ انہی دنوں
ڈاکٹر مقبول کو پچاس ہزار روپے کی ضرورت پڑ گئی۔ مجھ سے
اُس نے اپنی ضرورت کا ذکر کیا تو میں نے کہا ڈاکٹر یہ رقم میں
دے سکتا ہوں مگر شرط یہ ہے کہ تم مجھے جیل سے فرار ہونے میں مدد
دو۔ وہ مان گیا، سودا طے ہو گیا۔ میں نے اُسے رقم منگوا کر ادا کر دی
تو اس نے ایک روز مجھے میرے دو ساتھیوں سمیت جیل سے
بھاگنے کا موقع فراہم کر دیا۔ میں وہاں سے نکل کر سیدھا لاہور پہنچا
مجھے آسیہ کی تلاش تھی۔ انہی دنوں مجھے کسی ذریعے سے معلوم ہوا
آسیہ کو پولیس نے راوی روڈ کے ایک کلینک سے گرفتار کیا
ہے۔ میں اس کی تلاش میں پھر رہا تھا۔ پولیس نے اُسے گرفتار کر کے
لاہور کے کرسچئن ہسپتال میں داخل کروا دیا۔ مگر میں ابھی وہاں
تک نہیں پہنچ سکا تھا کہ تھانیدار کبیر شاہ نے اسے وہاں سے نکال کر
ملتان پہنچا دیا۔ اُسے آسیہ سے کیا دلچسپی تھی یہ معمہ میں آج تک
حل نہیں کر سکا ہوں۔ اگر مجھے بروقت علم ہو جاتا کہ کبیر شاہ نے
اُسے وہاں سے نکالا ہے اور ملتان کے نشتر میڈیکل ہسپتال میں
داخل کروا دیا ہے کیونکہ وہ بچاری بہت بیمار تھی تو میں اُسے
وہیں سے اٹھا لیتا۔ بہت دنوں بعد مجھے معلوم ہوا کہ یہ سب
کبیر شاہ نے کیا ہے اور وہ چھٹی لے کر اپنے گاؤں جا چکا ہے۔ میں
نے سندھ سے اپنے ساتھیوں کو بلوایا اور ان سے کہا کہ وہ ترنت
کبیر شاہ کے گھر سے آسیہ کو اٹھا لائیں۔ وہ گئے تو سہی مگر
واپس نہ آسکے ہلیش چند وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اس تھانیدار نے
اُسے گولی مار دی تھی۔ وہ خود بھی اس مقابلے میں زخمی ہو گیا تھا
پھر بھی میرے آدمی آسیہ کو وہاں سے لے آنے میں کامیاب
ہو گئے۔ اور جب وہ مجھے ملی تو میں سمجھا مجھے دنیا جہان کی دولت مل
گئی ہے۔ میں اُسے اپنے ساتھ لے کر یہاں آ گیا۔ وہ میرے پاس

تو میں ساری دُنیا سے رشتہ توڑ کر اسی کا ہو رہتا۔ کامدار نظامانی
اور میرن شاہ پر لعنت بھیج کر اس کے پاؤں میں پڑا رہتا۔ مگر
جب میں نے اُسے ایک دن اصل واقعات بتائے تو وہ پاگل ہو گئی
اُس نے مجھے اتنی گالیاں دیں، مجھے اتنا ذلیل کیا کہ میں بتا نہیں سکتا۔
اُس کی بددعائیں مجھے آج تک یاد ہیں جیلانی۔ تیری بہن اتنے مضبوط
دل و دماغ کی عورت ہے کہ میں سمجھتا تھا اس جیسی کوئی اور پیدا ہو
ہی نہیں سکتی۔ وہ پاکدامن تھی۔ بڑے سے بڑا لالچ بھی اُسے اس کی جگہ
سے ہلا نہیں سکتا تھا۔ اُس نے مجھے دھمکی دی تھی کہ وہ میرے
بچے کو پیدا ہوتے ہی مار دے گی۔ شاید وہ یہی کرے ۔۔۔ میں
ایک روز کے لیے متھیرو گیا ہوا تھا۔ یہ پندرہ دن پہلے کی بات
ہے کہ میرا ایک پستول اُس کے ہتھے چڑھ گیا۔ وہ گولیوں سے
بھرا ہوا تھا اور میں اُسے خاص خاص موقعوں پر ہی نکالتا تھا۔
اس پستول کو ہاتھ میں لے کر اُس نے میرے صندوق سے تیس ہزار
روپیہ نکالا اور میری ملازمہ اختری کا برقع پہن کر وہ یہاں سے نکل
بھاگی۔ میرے دو آدمی اس کی چال پہچانتے تھے۔ انھوں نے
یہاں باہر صحن میں اُسے چلتے دیکھا تو وہ اُسے روکنے کے لیے آگے
بڑھے مگر اس نے اُن پر بے دریغ گولی چلا دی۔ بڑے دروازے
پر میرا ایک آدمی کھڑا رہتا ہے، اُس نے اُسے بھی زخمی کر دیا اور
پھر باہر درختوں کے نیچے بندھے میرے ایک مہمان کی گھوڑی
پر بیٹھ کر وہ یہاں سے چلی گئی۔ یہاں کوئی مرد کا بچہ ایسا نہ نکلا
جو اس کا راستہ روک سکتا۔ میرے کئی آدمی اس روز میرے
ساتھ متھیرو گئے ہوئے تھے۔ میں رات وہاں گزار کر صبح واپس آیا
تو میری دُنیا ہی اندھیر ہو چکی تھی۔ میں جس سورج کی پرستش
کرتا تھا وہ اندھیروں میں گم ہو چکا تھا۔ میں سارے صوبے میں
اسے ڈھونڈ چکا ہوں مگر وہ مجھے کہیں نہیں ملی ہے اور میں زندہ در
گور ہو گیا ہوں جیلانی۔ تم مجھ پر ایک گولی چلا دو تو یہ تمھارا
احسان ہو گا۔ میں تمھارا مجرم ہوں مگر... میری بدنصیبی دیکھو کہ میں
آسیہ سے بھی محروم ہو گیا اور اپنے بچے سے بھی جس کے بارے میں اُس
نے قسم کھا کر کہا تھا کہ وہ اسے پیدا ہوتے ہی جان سے مار دے گی۔
میں تمھارا قصوروار ہوں، آسیہ کے ساتھ میں نے جیل میں جو
زبردستی کی وہ ایسا جرم ہے جس کے لیے میں بڑی سے بڑی سزا
بھگتنے کے لیے تیار ہوں مگر مجھے وہ واپس تو مل جائے جیلانی!
میں کیا کروں میری زندگی تباہ ہو کر رہ گئی ہے۔ میں اب کچھ بھی
نہیں کر سکتا ہوں۔ یہ کامدار کے کارندوں کی سرداری بھی اب مجھ
سے نہیں چل سکتی۔ میں اندر سے مرتا جا رہا ہوں میرے بھائی ایک
مجھ میں ایک گہرا خلا ہے جس میں میں گرتا جا رہا ہے۔ میں کوئی جاہل ان پڑھ
آدمی نہیں ہوں۔ میں نے گریجویشن کر رکھی ہے مگر میرے اندر ایک دھنی
زندہ تھا۔ وہ مجھے اس راہ پر لے آیا۔ یہ ایسی راہ ہے جس پر چل کر
کوئی واپس نہیں جا سکتا مگر میں اب واپس جانا چاہتا ہوں خود کو
پولیس کے حوالے کر دوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ اب آسیہ سے میں
کبھی نہ مل سکوں گا۔ اس کی نفرت کا مجھے اندازہ ہے میرے جینے کا
اب کوئی مصرف نہیں۔ جب کوئی مقصد ہی نہیں ہے میرے سامنے
تو پھر... پھر... میں تیری منت کرتا ہوں جیلانی! ایک گولی بنام
خدا میرے دل میں اتار دے کہ تو اس کا بھائی ہے جس کے ہاتھوں میں
زہر پی کر مر جانا بہتر سمجھتا ہوں۔ تو بڑا جی دار، بڑا غیرت مند آدمی ہے
جیلانی! تیری آنکھوں کا یہ لہو مجھے بہت سکون دیتا ہے مجھے اپنے
ہاتھوں سے لہولہان کر دے۔ میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں میرے
بھائی!... خدا کے لیے مجھ پر اتنی مہربانی ضرور کر دے۔" یہ کہہ کر اس نے
پاگلوں کی طرح اپنا گریبان پھاڑ کر کھلا سینہ میرے سامنے تان دیا۔
آبی پھٹی پھٹی نظروں سے اُسے یوں دیکھ رہا تھا جیسے اُسے اپنی بصارت
اور اپنی سماعت پر اعتبار نہ آ رہا ہو۔ اس کا وہ ہاتھ جس میں اس نے
پستول تھام رکھا تھا، نیچے جھولنے لگا تھا۔ سجل بھی بُت حیرت
بنا لاکھو کو دیکھ رہا تھا، یوں جیسے اس نے کوئی ماورائی مخلوق دیکھ لی
ہو۔ میں خود سُن ہو کر رہ گیا تھا۔ لاکھو کی سچائی اس کے چہرے سے
عیاں تھی۔ اور وہ جس انداز سے میرے سامنے ہتھیار ڈال رہا تھا، وہ
بھی اسی کا حصہ تھا۔ اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں چھپائی تھی اور میں
سوچ رہا تھا کہ میں اسے کیا کہوں، وہ تو خود ایک گولی کے لیے خون آشام
تیزی سے جسم میں دھنسنے والی گولی کے لیے ترس رہا تھا۔ جو میں اُسے
دے بھی دیتا تو اُس سے مجھے کیا حاصل ہوتا۔ آسیہ تو اُسے روند کر آگے
نکل گئی تھی۔ وہ تو محض ایک لکیر تھا، ایک واماندہ نشان۔ میں اس سے
کیا کہتا۔ وہ میری بدنصیبی میں اضافے کا سبب تو بن گیا تھا مگر وہ خود
بھی ہر شے سے محروم ہو چکا تھا۔ اپنی انا، اپنی عزتِ نفس، اپنے
پیشے کی ہیبت، اپنی دھاک اور اپنے نام کی لاج بھی اس نے تج دی تھی
وہ ہر شے سے بے نیاز ہوتا جا رہا تھا اور یہ زخم اُسے آسیہ نے لگایا
تھا۔ وہ اس کی قید میں رہنے کے باوجود اُس کے سامنے نہیں جھکی
تھی۔ وہ دو آدمیوں کی لاشوں پر چلتی ہوئی آگے نکل گئی تھی اور
مجھے خوشی تھی کہ اس نے ہتھیار نہیں ڈالے تھے شکست نہیں مانی تھی
وہ کسی اور ویران راستے پر جا چڑھی تھی مگر اُس نے اس لاکھو کی
حویلی کے بھرے میلے میں رہنے کی ذلت گوارا نہیں کی۔

میرے چہرے کا رنگ شاید کچھ زیادہ ہی پیلا پڑنے لگا تھا۔
آبی آہستہ آہستہ میرے پاس آیا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔
"تو اندر چلا جا لاکھو! ایسا نہ ہو میں تجھ پر ہاتھ اٹھاؤں۔ ہماری
نظروں سے دُور ہو جا تیرے لیے یہی بہتر ہے۔ تو کتنا بھی کھرا کیوں
نہ ہو ہمارے لیے تو کتے سے بھی بدتر ہے۔" پھر مجھ سے مخاطب ہو کر

بولا "چل جیلانی! اب ہم یہاں ایک منٹ نہیں ٹھہریں گے"۔ یہ کہہ کر اُس نے کرسی پر رکھا اپنا بریف کیس اٹھا لیا۔ لاکھو ایک بار پھر کرسی میں دھنس گیا تھا۔ اور ہمیں وہ یُوں پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا جیسے آبی کے اُن لفظوں نے اُسے اور زیادہ آزردہ کر دیا ہو، روتے ہوئے بالکل بچوں کی طرح بلکتے ہوئے بولا۔

"میں نے اپنے آدمی ترن تارن بھیج کر اُس کے بارے میں معلوم کیا ہے مگر وہ وہاں بھی نہیں گئی۔ اس کا اگر کوئی اور ٹھکانہ ہے تو مجھے بتا دو میرے بھائی میں اس کے پاؤں پڑ کر اُسے مناؤں گا۔ وہ میری زندگی اپنے ساتھ لے گئی ہے، اس کے بغیر میں ۔ ۔ ۔"

"بکواس بند کر لاکھو! تو جانتا ہے ہمارا آبیہ سے کیا رشتہ ہے اور بہن کی عزت کے کیا معنی ہوتے ہیں۔ یہی بہت کافی ہے کہ ہم یہاں سے واپس جا رہے ہیں تمھیں کچھ کہے بغیر" آبی نے اپنی آواز کا زہریلا چابک اُس پر پُوری قوت سے برسا دیا۔ وہ گنگ ہو کر رہ گیا۔ اُس میں اب اتنی بھی ہمت نہیں رہ گئی تھی کہ وہ ہم سے نظر ملا سکتا۔

میں آبی کے کہنے پر کرسی سے اُٹھا۔ میرا ہاتھ نیفے تک اُٹھا میں نے اپنے پستول کے دستے پر ہاتھ بھی رکھ دیا مگر آبی نے میرا ارادہ بھانپ کر مجھے بانہوں میں لے کر پیچھے کھینچ لیا بولا "نہیں جیلانی نہیں! ایسا نہ ہو کہ ہمیں بعد میں پچھتانا پڑے۔ یہ ایک بچے کا باپ بھی تو بن رہا ہے جس کی ماں آبیہ ہو گی اور مجھے معلوم ہے یہ اپنے فعل پر بہت شرمندہ ہے، یہ کھرا اور سچا آدمی ہے جیلانی یہ لاکھو قابلِ معافی ہے۔" آبی کی یہ بات سُن کر لاکھو اٹھا اور ایک سہمے ہوئے خوفزدہ بچے کی طرح میرے سامنے ہاتھ جوڑنے لگا۔ بولا۔

"جیلانی میرے بھائی! یا تو مجھے معاف کر دے یا ایک گولی میرے سینے میں اتار دے میں تیرے آگے ہاتھ جوڑ رہا ہوں۔"

"پیچھے ہٹ جا لاکھو! یہ گولی تجھے آبیہ ہی مارے گی میں اُسے یہاں ضرور لاؤں گا تجھ سے اپنی ذلت کا انتقام وہی لے گی۔ ایک دن ایسا ضرور آئے گا تو اگر بزدل نہیں ہے تو اس دن کا انتظار کر۔ میں اُسے لے کر یہاں ضرور آؤں گا۔" میں نے اپنے غصّے کو دباتے ہوئے کہا۔ اور پھر میں آبی کے ساتھ چپ چاپ اس کمرے سے نکل گیا۔

سچل میرے دائیں ہاتھ چل رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ سب کچھ کیسے ہو گیا اور ہم لاکھو کو زندہ سلامت چھوڑ کر کیوں واپس جا رہے ہیں۔

جب ہم صحن میں نکل کر آگے بڑھے تو ہم نے دیکھا کہ لاکھو کے دس بارہ آدمی سامنے کھڑے ہیں وہ سب کے سب آتشیں اسلحہ سے لیس تھے اور شاید کسی ذرا سے اشارے کے منتظر بھی۔ مگر ہم تو تہیّہ ہی کر چکے تھے کہ ہم وہاں سے بس سر جھکا کر نکل جائیں گے کسی کے خون سے ہم ہاتھ رنگ بھی لیتے تو ہمیں کیا مل جاتا جس کے لیے ہم وہاں پہنچے وہ ہی نکل چکی تھی اور اس نے موقعہ ملنے کے باوجود لاکھو کو موت کے گھاٹ نہیں اتارا تھا تو پھر ہم اسے کیوں مار دیتے۔ آبیہ کی مصلحت کو وہی سمجھ سکتی تھی۔

ہم حویلی سے باہر نکلے اور گھوڑوں پر یُوں سوار ہوئے جیسے ہم اپنا سب کچھ اس حویلی میں ہار آئے ہیں۔ میری اور آبی کی شکستہ دیدنی تھی۔

سچل بالکل خاموش تھا۔ اس کی سوچ اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ حویلی سے ذرا آگے نکلے تو وہ بولا "اس کو معاف کر کے تم لوگوں نے ... نہیں کیا۔ ایسے کُتّے کا زندہ رہنا کسی بھی طرح ٹھیک نہیں ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو سچل مگر پتہ نہیں ہمارا ہاتھ اس پر کیوں نہیں اُٹھ سکا۔ اگر ہماری بہن یہاں موجود ہوتی تو پھر یہ صورت حال نہ ہوتی۔ لاکھو کی زندگی کا فیصلہ آبیہ ہی کرے گی۔" آبی نے بڑے مستحکم لہجے میں کہا۔ اس کی نظریں افق پر جمی تھیں۔

سچل ہمارے پہلو بہ پہلو چل رہا تھا۔ نہر کا پُل عبور کر کے وہ بولا "سائیں اب مجھے اجازت دو، میرا خیال ہے کہ آپ کی اب میں اور خدمت نہ کر سکوں گا مجھے اپنے اس چکر سے بھی نپٹنا ہے۔"

"یار! وہ ۔ ۔ ۔ وہ کہیں تجھ پر بے خبری میں دھاوا نہ بول دیں"

"وہ تو ہو گا ہی مگر نہتا میں بھی نہیں ہوں اور تم پردیسی ہو میں خود ہی دیکھ لُوں گا کہ وہ کیا کرتے ہیں۔ ابھی تو مجھے ایک دوست کے پاس پہنچنا ہے وہ اُدھر گڑھ ماچھی میں رہتا ہے، اچھا خدا حافظ کبھی موقع ملے اور تم اِدھر آؤ تو میرے پاس ضرور آنا۔"

یہ کہہ کر اُس نے گھوڑے کو ایڑ دی اور تیزی سے مشرقی سمت میں بھاگ نکلا۔ میرا خیال ہے وہ ہمیں بہت ہی گھٹیا آدمی سمجھ رہا تھا جس تُن پھُن کا مظاہرہ ہم کرتے آئے تھے اس کا ایک شائبہ تک بھی حویلی میں ہم نہ دکھا سکے تھے اور وہ مایوس ہو کر ہم سے الگ ہو گیا۔ وہ نظروں سے اوجھل ہوا تو آبی بولا "نکل چل یار! ہمیں آج ہی کراچی پہنچنا چاہیے وہ تکریم احمد ہمارا انتظار کر رہا ہو گا۔"

"ہاں آبی! مجھے یقین ہے کہ ڈاکٹر دھمن اور عالیہ کو ہم اب پکڑ سکیں گے۔" میں نے گھوڑے کی رفتار تیز کر دی۔ ایک طرف میں مایوس ہی ہو چلا تھا۔ میرا ذہن کام نہیں کرتا تھا۔ اندازہ ہی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ لاکھو کی حویلی سے نکل کر کس طرف گئی ہے۔ ہم ایسے گھولے میں پڑ گئے تھے کہ نجات کی کوئی راہ نظر نہیں آتی تھی اور ہماری تقدیر ہمارے سامنے کھڑی ہم پر خندہ زن وہ بڑے زور سے ہماری اس مسلسل ناکامی پر کھنجری بجا رہی تھی ہم کوئی سمجھ کر اس کی بانہی پر پہنچے تھے مگر وہ بے چارہ خود ایسا ستم نظر آتا تھا کہ اس پر ہتھیار اٹھانا ہمیں کسی بھی طرح زیب نہیں دیتا آدمی کو اتنی ساری کلنیاں جھپٹ جائیں تو ویسے ہی مکروہ ہو جاتا ہے اس لاکھو کو نظر انداز کر کے مجھے عجیب سا اطمینان محسوس ہو رہا تھا۔ ورنہ اُس کی گھبرنی توڑ دینا ہمارے لیے کچھ بھی مشکل نہیں تھا۔

ہم گھوڑوں پر سرپٹ بھاگتے چلے جا رہے تھے کہ ہمیں کچی سڑک کے کنارے تین آدمی چلتے نظر آئے۔ وہ عام سے دیہاتی تھے اور مخالف سمت سے ہماری طرف آ رہے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی اپنی جگہ رُک گئے۔ جب ہم اُن کے قریب سے گزرے تو اُن میں سے ایک آدمی بلند آواز سے بولا "ابے یہ تو کامدار کے گھوڑے ہیں جو رات سے غائب ہیں۔"

وہ بات میں نے بھی سُنی اور آبی نے بھی مگر ہم رُکے نہیں۔ اچانک ہمیں پیچھے سے گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر انہیں دیکھا تو وہ تینوں ہمارے پیچھے بھاگ رہے تھے اور ایک آدمی نے ہم پر پستول سے گولی داغ دی تھی۔ وہ تینوں کامدار کے کارندے تھے۔ اور انہیں یہ احساس ہو گیا تھا کہ وہ گھوڑے انہی کے ہیں، اُن کو وہ اچھی طرح پہچانتے تھے میں نے چاہا کہ پلٹ کر اُن سے دو ہاتھ کر لوں مگر اتنے میں ہمارے اور اُن کے درمیان فاصلہ اتنا بڑھ گیا تھا کہ اُن کی گولی ہم تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ وہ تھوڑی دُور تک ہمارے پیچھے بھاگے تو سہی مگر کہاں آدمی کہاں گھوڑا۔ اور پھر ہم تو اس گھڑی صبا رفتار ہو رہے تھے وہ ہماری گرد کو بھی نہیں چھُو سکتے تھے۔ آبی دانت پیس رہا تھا، بڑے غضبناک لہجے میں بولا "یہ کم بخت کے بیٹر بھی ابھی ہمارے حلقے میں تھے، حد ہو گئی۔ یار! راستہ بدل کر چل، اپنے گھوڑوں کو وہ پہچانتے ہیں اور ان کی تلاش میں بھی ہیں۔"

"لعنت بھیج اُن پر، راستہ پوچھ کر کسی اسٹیشن پر جا چڑھ آبی! ہم گھوڑے کھلے چھوڑ دیں گے۔"

"یہی کرنا ہو گا ورنہ ہم ان کو کراچی تو نہیں لے جائیں گے۔"

"ویسے یہ کام آ سکتے ہیں وہاں۔ ہم ان پر بیٹھ کر شہر میں پھریں گے۔"

"ہاں! اور لڑکے ہمارے پیچھے تالیاں بجاتے پھریں گے کہ لو وہ آ گئے جن کی ناک میں لونگ ہیں۔"

"تو ٹھیک کہتا ہے یار! دور کیسا بدل گیا ہے اب شہر میں کوئی گھوڑے پر سوار ہو کر نکلے تو بے تکا نظر آتا ہے۔"

"اسی لیے تو میں کہتا ہُوں، اس کو تو اب ٹاپ گیئر میں ڈال دے۔ اس علاقے سے جلدی نکل جانا ہی بہتر ہے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی رفتار کچھ اور تیز کر دی۔ دھوپ نے ہمیں بھون کر رکھ دیا تھا۔ وہ جو کسی گریز نے روہڑی پہنچ کر گرمی سے نڈھال ہو کر کہا تھا کہ "ھذا سقر" کہ یہ تو دوزخ ہے تو یہ بات اس علاقے پر بھی اُس گھڑی صادق آتی تھی۔ سقر بعد میں بدلتے بدلتے سکھر ہو گیا۔ لوگ کہتے ہوں گے کہ وہ سُکھ کی جگہ ہے اس لیے اُسے سکھر کہتے ہیں مگر میرے جی کو تو یہ بات بالکل نہیں لگتی تھی۔ ہم اُس روز واقعی جھلس کر رہ گئے تھے۔

راستے میں دو تین جگہ رُک کر ہم گھوڑوں کو ستانے کا موقع فراہم کیا ورنہ وہ بھی اُس روز نڈھال ہوئے جاتے تھے۔ ہم کوئی پانچ بجے تھکن سے چکنا چُور ہو کر شکارپور پہنچے معلوم ہوا گاڑی وہاں سے رات کو دس بجے نکلے گی۔ ہم نے گھوڑے اسٹیشن سے باہر ایک سرکاری عمارت کے سامنے سائیکل اسٹینڈ کے جنگلے سے باندھ کر چھوڑ دیے اور پھر بازار سے ایک ٹرنک خرید کر ہم نے کُرتوں کے نیچے چھپائی اسٹین گنیں اور پستول اپنے بڑے سے بریف کیس سمیت اُس میں بھر لیے۔ اس کام سے فارغ ہو کر ہم فرسٹ کلاس کی انتظار گاہ میں جا بیٹھے۔ ٹکٹ ہم نے اسی کلاس کے خرید لیے تھے۔ اس انتظار گاہ میں سب سے بڑی سہولت یہ تھی کہ وہاں پانی غسل خانے میں وافر مقدار میں تھا۔ ہم دونوں باری باری اندر جا کر نہائے اور جب سفر کی تکان قدرے کم ہوئی تو ہم نے اس انتظار گاہ کے ملازم کے ہاتھ باہر سے بہت عمدہ قسم کا کھانا منگوا لیا۔

دس بجے ہم گاڑی میں بیٹھے اور سیدھے سکھر جا پہنچے۔ وہاں سے ہمیں کراچی کیلئے جلدی ہی گاڑی مل گئی۔ اور ہم تکریم احمد سے ملنے کے لیے کراچی کی طرف چل دیے۔ ہمیں اُس آدمی سے ملنا تھا، جو ننگِ آدمیت تھا، اس ڈاکٹر دھمن سے جس نے آبیہ کو میرے گھر سے اٹھوا لیا تھا یہ سب اسی کا کیا دھرا تھا کہ ہم دونوں بدنصیبی کی انتہا تک جا پہنچے تھے۔ ہم گاڑی میں بیٹھے تو آبی بولا "یار کراچی پولیس سے بچنا چاہیے، اُن کے پاس ہر علاقے کے گناہگاروں کی تفصیل موجود ہوتی ہے۔"

"فکر نہ کر آبی، ہم وہاں پہنچتے ہی اپنا یہ لباس تبدیل کر لیں گے سب سے بڑی فکر مجھے یہ ہے کہ ہم وہاں اپنے ہتھیار لے کر کیسے چل سکیں گے، ہمارے یہ حلیے بھی مشتبہ سے ہیں اور وہاں کی پولیس بڑی خطرناک ہے۔"

"ولایتی سوٹ خرید لیں گے یار! امید ہے کوئی گاڑی بھی ہمیں مل ہی جائے گی۔ نہ ہوا تو سیکنڈ ہینڈ جیپ خرید لیں گے ہمارے لیے وہاں سواری بہت ضروری ہے۔" آبی نے اپنا آئندہ پروگرام مجھے سمجھایا۔ اپنی اپنی جگہ پر ہم دونوں پریشان تھے لیکن میرے کلیجے میں آگ سی لگی تھی۔ میں آبیہ کو نہیں پا سکا تھا تو مجھے یوں لگتا تھا جیسے اب کچھ بھی باقی نہیں رہا ہے مجھے اپنے ہر دشمن سے حساب چکا کر نکل جانا تھا۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ اس دھمن اور عالیہ سے اپنی ایک ایک ضرب کا بدلہ لے کر میں گوشہ نشین ہو جاؤں گا۔ بھول ہی جاؤں گا کہ میری کوئی بہن بھی تھی۔ وہ اپنی تقدیر کا دکھ سہنے پر

مجبور تھی تو میں کیا کر سکتا تھا۔ آبی بھی مجھے تھکا تھکا سا نظر آرہا تھا۔ اُسے میں نے بلا وجہ ہی اپنے ساتھ باندھ لیا تھا ورنہ میرا اُس سے کیا رشتہ تھا۔ کوئی بھی نہیں مگر وہ میرا بھائی بن چکا تھا۔ میرا بازو، اپنے شب و روز اس نے میرے مقصد کے حصول کے لیے وقف کر دیے تھے۔ یہ اُس کی ایسی مہربانی تھی، ایسی نوازش اور ایسی قربانی تھی کہ جس کا میں کوئی عوض عوضانہ اُسے دے ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ عظیم تھا سارے جہان سے عظیم ـــــ اور میں سوچتا تھا کہ اگر وہ کبھی مرحلے پر مجھ سے میری جان بھی مانگے گا تو میں اُسے پیش کر دوں گا کیونکہ میرے لیے ہر مقام پر وہ سر دھڑ کی بازی لگا دینے پر آمادہ رہتا تھا۔ اس جیسا کوئی بھلا مجھے کہاں سے مل سکتا تھا۔

کراچی پہنچ کر ہم نے صدر کا رخ کیا۔ سب سے پہلے تو ہم نے اپنے لیے عمدہ قسم کے سلے سلائے سوٹ خریدے۔ وہاں بوشرٹ اور پتلون ہی موسم کے مطابق پہنے جا سکتے تھے۔ کئی جوڑے ہم نے اپنے ٹرنک میں بھر لیے مگر وہ ٹرنک اب ہمیں پسند نہیں آرہا تھا۔ آبی نے عمدہ قسم کا ایک بہت خوبصورت بڑا سا سوٹ کیس خرید لیا تھا۔ اسے ساتھ لے کر ہم ذرا باوقار نظر آتے تھے۔ اس کام سے فارغ ہو کر ہم ایک عمدہ قسم کے ہوٹل میں جا ٹھہرے۔ ہمیں اپنے لیے وہاں ایک باقاعدہ اڈے کی ضرورت تھی جہاں ہماری ضرورتیں بھی پوری ہوتی رہیں اور ہم اپنا کام بھی اطمینان سے انجام دے سکیں۔ ہوٹل صدر کے علاقے میں تھا اور وہاں کی بھیڑ بھاڑ نے آبی کو پریشان کر دیا تھا۔ جب ہم اطمینان سے کمرے میں ذرا جم کر بیٹھ گئے تو آبی بولا "یار! جب کسی جنگل میں درندے زیادہ ہو جاتے ہیں تو لوگ سرکار سے کہتے ہیں کہ وہ گولی ماروں کا کوئی دستہ بھیج کر ان کا قلع قمع کرے، ادھر یہ اتنے سارے انسان جمع ہو گئے ہیں کہ زمین ان کے لیے تنگ ہو گئی ہے۔ پھر بھی ادھر سب طرح سے جیت ہی نظر آتی ہے اس کی کیا وجہ ہے؟"

"بکواس نہ کر آبی! یہ بڑا غریب پرور شہر ہے میرے بھائی! جو کوئی بھی ادھر آتا ہے یہ شہر اسے اپنی بانہوں میں بھر کر سینے سے لگا لیتا ہے۔ تجھے کیا پتہ خدا کے کتنے ولی غوث قطب یہاں آ ٹھہرے ہوں گے جو ہر وقت اس شہر کی خیر مانگتے ہوں گے۔"

"ہاں یہ تو ہے، ورنہ اتنے سارے آدمی ایک جگہ پر خود کو برداشت نہیں کر سکتے۔" وہ کچھ کچھ مطمئن سا نظر آنے لگا تھا۔ ہم بہت ہی تھکے ہوئے تھے اور آبی کا مشورہ یہ تھا کہ ہمیں کم از کم ایک رات کی نیند ضرور لے لینی چاہیے ورنہ ہمارا دماغ خراب ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ مشورہ اُس نے صحیح دیا تھا۔ رات ہم نے اندر سے تمام کنڈیاں چٹخنیاں اچھی طرح بند کر کے ائر کنڈیشنڈ کمرے میں یُوں گزاری کہ ہمیں کسی بھی بات کا ہوش نہ رہا۔ جب ہم صبح اُٹھے تو بالکل تازہ دم تھے اور آبی خوش بے حد خوش۔ بستر سے اٹھ کر جب وہ دانت صاف کر چکا تو بولا "یار! یہ ائیر کنڈیشنر کیا کہتے ہیں اسے اُردو میں؟ زخمی نے ایک بھلا سا نام دیا تھا اسے اردو میں۔ ہاں یاد آیا برودت کار تو بڑے کام کی چیز ہے پیارے تو کچھ زیادہ ٹھنڈا تو نہیں ہو گیا؟" وہ میری نبض ٹٹولنے لگا تھا۔

"بک نئیں اوئے! میں زیادہ ہی ٹھنڈا ہو گیا تو پھر تو یتیم ہو جائے گا۔" میں نے بستر چھوڑتے ہوئے کہا۔ پھر غسل خانے میں جا گھسا۔ بولا "میں ذرا اپنی تفصیل سے کر لوں غسل خانہ تو اتنا عمدہ ہے کہ ادھر تنہا نہانا بد ذوقی ہے۔"

"تو اور کیا مُردہ بھی تیرے ساتھ نہلانا چاہیے۔"

"نہیں یار! تو میرا مطلب نہیں سمجھ رہا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

ہم آٹھ بجے ہوٹل سے پرانے خبیث قسم کے آئی ڈی افسروں کی طرح بڑی شان سے لٹک مٹک کر چلتے ہوئے نکلے اور ٹیکسی میں بیٹھ کر ڈگ روڈ پر جا پہنچے مستونگ غریبوں کا ہوٹل تھا۔ تلی کباڑی قسم کے لوگوں کا وہاں رش رہتا تھا۔ مگر مردان شاہ نے اپنے لیے کاؤنٹر شاندار بنوا رکھا تھا۔ اس نے پہلی نظر میں تو ہمیں پہچانا ہی نہیں۔ بولا "آؤ جی آؤ کے خدمت کراں۔ ادھر کرسی صفا کر دے اوئے نڈھے "بریک فاسٹ" کریں گے۔"

"بکواس نہ کر اوئے مردان شاہ! سالے میں تجھے بتاتا ہوں۔"

"اوئے سپ سنگھ جائے تینوں۔ توں تے بڑا کاٹھا بنیا پھرنا ایں، اندر آ جا۔ میں کیہا پتہ نئیں کراچی دا کنٹاے۔" وہ پھڑک کر میری طرف لپکا اور ہمیں بڑی محبت سے ہاتھوں میں لے کر اپنی غار ایسی لمبی دکان کے پچھلے حصے میں لے گیا۔ اُس کی اپنی رہائش وہیں تھی۔ دکان کے چوتھائی حصے کو اپنے لیے اُس نے آٹھ فٹ لمبا اور کوئی بیس فٹ چوڑا خانہ سا بنا رکھا ہے جس میں اُس نے بیڈ بھی عمدہ قسم کا ڈال رکھا تھا اور کرسیاں بھی بہت آرام دہ تھیں۔ ایک چھوٹا سا ریڈیو اور اس کے ساتھ میز پر ایک ریکارڈ پلیئر بھی موجود تھا یہاں تک کہ اس نے ایک کونے میں چھوٹے سائز کا فریج رکھا تھا جب اُس نے اپنے کیبن کا دروازہ بند کر دیا تو

گاہکوں کی چیخا چیخ اور اُن کی سانسوں کی بدبو کا رستہ رک گیا دکان میں پھیلی پیاز اور لہسن کی بُو بھی پیچھے رہ گئی۔ کیبن میں گھستے ہی اُس نے ہوائش پنکھا چلا دیا جو اندر کی کثیف ہوا باہر کھینچتا تھا۔ چھت میں لگا ہوا سُبک رفتار پنکھا اس نے ہمارے آرام کے لیے کھولا تو ہمیں بڑی ہی فرحت محسوس ہوئی۔

"کہو کیسا لگا تمھیں یہ میرا ریذیڈنس؟"

"تم اکیلے رہتے ہو یہاں؟"

"ہاں اور کون نظر آتا ہے تمھیں؟"

"بھابی اور بچے کہاں ہیں؟"

"اس کو میں نے گاؤں بھیج دیا۔ میں نے کہا جا بھلی لوگ میرا کھیڑا چھوڑ کیوں میری جوانی تباہ کر رہی تو کسی غریب کی اولاد پر یوں دھرنا مار کر نہیں بیٹھ جانا چاہیے۔ جا ذرا دھوپ چھوڑ کر کھڑی ہو، مجھے بھی چار دن موج میلا کر لینے دے۔ دنیا میں بار بار تو نہیں آنا ہے تجھے کیا خیال ہے تیرا جیلانی! وہ تو بھئی میرا گلا دبوچ کر بیٹھ گئی تھی۔"

"نہیں یار! اتنی خدمت گزار ہے ہماری بھابی۔ تو دراصل خود بدمعاش ہو گیا ہے پیارے، چار پیسے تجھے ملنے لگے ہیں کراچی میں آکر تیرے پر نکل آئے ہیں۔"

"تو بھی اس کا ہی سبق پڑھا ہوا ہے، یار! یہ بھی تو دیکھ کہ اس رنگ رنگیلی دُنیا پر ہمارا بھی تو کوئی حق ہے کہ نہیں۔ اور وہ مجھے جمبڑ ہی گئی تھی۔ میں نے کہا جا پنڈ میں بیٹھ کر چپڑ چوپڑی کھا گنے چوپ اور دُودھ پی۔ تیری جان بن جائے تو پھر آ جانا۔ دو بھینسیں میں نے اُسے لے دی ہیں بڑے مزے میں ہے وہ۔ چار بچے پیدا کر کے اس کی ہڈیاں نکل آئی تھیں۔"

بوتلیں مردان شاہ نے تپائی پر رکھ دیں جو وہ فریج میں سے نکال لایا تھا، بولا "یہ سیون اپ ہیو یار۔ یہ دراصل سات اپ ہیں اور ون ڈاؤن، بڑے کام کی چیز ہے یہ۔"

"یہ سات اپ کیا ہوتا ہے تجھے باتیں بہت آ گئی ہیں مردان شاہ۔"

"یہ سالی کراچی ایسے لوگوں سے بھری پڑی ہے اور وہ باتوں کے ایسے دھنی ہیں کہ اُن کے آگے کسی کی بتی نہیں جلتی۔ بہت سے تو میرے یار بن گئے ہیں وہ۔ میں نے بھی اُن کی طرح زبان چلانی سیکھ لی ہے بے زبان اور چپ رہنا تو صرف جانور کا کام ہے۔" یہ کہہ کر اس نے بوتلیں کھولیں پھر بولا "لو پیو۔ لوگ اسے سیون اپ کہتے ہیں مگر میں اسے ون ڈاؤن بھی کہتا ہوں۔"

"نہیں یار! عام سی سوڈے کی بوتل ہے یہ۔"

"تم مان ہی نہیں رہے ہو۔ ایمان سے یہ بندے کی ایسی ٹیوننگ کر دیتی ہے یہ بوتل کہ پھر سارا دن اس کے کان پر ٹیڑیں کیچڑ نہیں چھپتا ہاں! سچ کہہ رہا ہوں میں تیرے سر کی قسم۔"

اس کی یہ باتیں سن کر آبی کھلکھلا کر ہنس دیا۔ مردان شاہ ہم سے مل کر خوش ہو گیا تھا، اور ہنسی اس کی پسلیوں سے پھوٹ رہی تھی۔ جب ہم بوتلیں پی کر سگریٹ سلگا چکے تو وہ بولا "یار وہ تیرا ایک آدمی ادھر آیا تھا ترکیم شاہ وہ اپنا پتہ دے گیا تھا مجھے کہ تو ادھر آئے تو میں وہ تجھے بتا دوں۔"

"ترکیم شاہ! نہیں بھئی! اس کا نام تکریم احمد ہے، تو نے اسے بھی شاہ بنا دیا ہے۔"

"میں تو سمجھتا ہوں کہ وہ شہنشاہ ہے، بے تحاشا پیسے خرچ کرتا ہے ایک مٹیار بھی ساتھ لیے پھرتا ہے وہ۔ میرا خیال ہے وہ اس نے ادھر سے ہی ایٹری ہے کہیں سے۔ آدمی وہ ذرا موج بازی والا لگتا ہے مجھے، لے یہ رہا اس کا ہیڈریس۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے بٹوے میں سے ایک پرچی نکال کر مجھے دے دی۔

معلوم یہ ہوا کہ وہ طارق روڈ پر ٹھہرا ہوا تھا۔ اس سے ایڈریس لے کر میں اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

مردان شاہ بولا "اب کہاں جائے گا تو؟"

"میں طارق روڈ جا رہا ہوں جیسے ہی فرصت ملی ہم ادھر آئیں گے۔ ابھی تو تم ہمیں اجازت دو۔"

"ٹھیک ہے! کچھ وقت نکال کر آ جاؤ۔ شام کو فلم بھی دیکھیں گے ذرا گھوم پھر بھی لیں گے۔" یہ کہہ کر وہ ہمیں رخصت کرنے کے لیے باہر سڑک تک آیا اور پھر بڑی محبت سے ہم سے ہاتھ ملا کر واپس چلا گیا۔

ٹیکسی میں جب ہم بیٹھے تو آبی بولا "یار یہ بڑا زبردست آدمی ہے یہ مردان شاہ! لگتا ہے اسے کوئی فکر ہی نہیں۔"

"ہاں! اسے جینا آتا ہے، بڑے پتلے حال میں تھا جب یہ کراچی آیا تھا مگر اب اس نے اپنے پاؤں جما لیے ہیں، اس کا ہوٹل خوب چل رہا ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے، ایک ہم ہیں کہ ہمارے پاؤں کا چکر ہی ختم نہیں ہوتا۔" آبی نے بڑے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔

"اپنی اپنی تقدیر کی بات ہے آبی! تجھے تو خیر میں موت کی طرح چمٹ گیا ہوں ورنہ تیرا راستہ تو بالکل صاف تھا۔"

وہ میری اس بات کا مفہوم سمجھ کر بولا "تو ایسی باتیں نہ کیا کر جیلانی! تو ابھی تک دوستی کا مفہوم نہیں سمجھ سکا۔ اس سے بھی آگے ایک منزل ہے مگر تو اس تک کبھی نہیں پہنچ سکتا، شاید تیرے دل کا شیشہ صاف نہیں ہو سکا۔"

"کیا مطلب ہے تیرا پیارے! کس منزل کی بات کر رہا ہے تو؟"

"سرمد والی منزل، فنا کا مرحلہ، خود کو ملیامیٹ کر دینے کا مقام تیرے لیے میں سب کچھ کر سکتا ہوں پیارے مگر ـ ـ ـ لوگ اسان

سمجھتے ہیں مسلماں ہونا۔"

"ہاں! یہ شہادت گہ اُلفت میں قدم رکھنا ہے' تو ٹھیک کہہ رہا ہے یار! دعا کر ہمارا یہ سفر جلدی ختم ہو جائے۔ اس دشمن سے نبٹ کر جلدی واپس چلے جائیں گے اور پھر سُکھ کی نیند سوئیں گے۔ تم الماس کے پاس جا رہے ہو گے اور میں سیدھا مسند آراء کے پاس چلا جاؤں گا۔ یہ کام مجھے جلدی کرنا ہوگا ورنہ وہ سرداری کسی سکھیرے کی بات کر رہی تھی۔ وہ اُسے اس کے حوالے کر دے گی۔"

آبی نے میری بات سُنی اَن سُنی کر دی۔ الماس کے ذکر پر اُس کی سوچ خدا جانے کدھر سے کدھر نکل گئی تھی جب تک گاڑی رواں رہی وہ خاموش رہا۔ الماس کا نام سُن کر وہ اداس ہو گیا تھا۔ حالانکہ وہ اُسے میرے سامنے گالیاں بھی دیتا رہا تھا۔

اُس کے تعلقِ خاطر کی گہرائی کا میں اندازہ ہی نہ کر سکا تھا۔ وہ الماس کو اپنے قلبی محسوسات میں کچھ اِس طرح گوندھ چکا تھا کہ وہ خود کو اس سے کسی بھی صورت الگ نہیں دیکھ سکتا تھا۔

گاڑی طارق روڈ کے وسطی چوک سے دائیں طرف مُڑی تو ڈرائیور بولا "میرا خیال ہے میں نے آپ کو ٹھیک جگہ پہنچا دیا ہے۔ آپ نے بلڈنگ کا جو نمبر دیا تھا وہ سامنے لکھا ہے۔"

اُس نے کمال کر دیا تھا، وہ کراچی کے چپے چپے سے واقف تھا اور اُس نے آنکھیں بند کر کے ہمیں بڑی آسانی سے ہماری منزل پر پہنچا دیا تھا۔ ہمارے سامنے ایک بڑی سی تین منزلہ عمارت تھی جس میں یہاں سے وہاں تک بہت سے فلیٹ بنے ہوئے تھے۔ گاڑی سے نکل کر ہم اس کی پہلی منزل میں جا گھسے۔ ہمارا مطلوبہ نمبر سامنے ہی تھا۔ دروازے کی گھنٹی پر میں نے ہاتھ رکھا تو چند ساعتوں کے بعد ہی کسی نے دروازہ کھول دیا۔ ہمارے سامنے ایک بہت ہی سجی سنوری دراز قد عورت کھڑی تھی۔ اس نے ہمیں دیکھا تو ساڑھی کا پلّو اپنے سر پر ڈالتی ہوئی بڑے ہی نرم لہجے میں بولی "آپ کو کس سے ملنا ہے؟"

"ہم تکریم احمد صاحب سے ملنا چاہتے ہیں بی بی۔ اگر وہ گھر پر ہیں تو انھیں بتا دیں کہ ہاشم خان آیا ہے۔" میں نے دروازے سے ایک طرف ہٹتے ہوئے کہا۔ آبی بھی اس عورت کو دیکھ کر سٹپٹا سا گیا تھا اور ساتھ ساتھ بنے دوسرے فلیٹوں کے دروازے پر لگی تختی پڑھنے لگا تھا۔ یوں جیسے وہ اپنے چہرے کے تاثرات کو چھپا لینا چاہتا ہو۔

"آپ کا نام ہاشم خان ہے؟"

"جی! یہ میرے دوست ہیں ایس جی ایم ایم پیرزادہ صاحب۔"

"آپ اندر آ جائیں تکریم صاحب باہر گئے ہیں مگر وہ جلدی واپس آ جائیں گے مجھے وہ کہہ گئے تھے کہ آپ آئیں تو آپ کو میں اندر بٹھالوں۔"

"آپ کی بڑی مہربانی ہے بی بی! آئیں پیرزادہ صاحب، کا ہم انتظار کر لیتے ہیں۔" یہ کہہ کر میں آبی کو کھینچ کر اندر لے گیا۔ اس سکھ چین خاتون نے بڑے ہی مہذب انداز سے ہمیں اپنے اس مختصر سے ...... فلیٹ کی آرام دہ نشست گاہ میں بٹھایا۔ بولی "آپ چائے پئیں گے کہ ٹھنڈا؟" اس کے لہجے کی شائستگی مجھے حیران کرتی تھی۔ دراصل کچھ عورتیں اپنے گرد نور کا ایسا ہالہ لیے پھرتی ہیں کہ انھیں دیکھ کر مرد بھونچکا رہ جاتے ہیں۔ ایسی ہی صفات کچھ اس عورت میں کُوٹ کُوٹ کر بھری تھیں۔ اُس کی آواز کی نغمگی سماعت کو سکون پہنچاتی تھی اور میرا تاثر یہ تھا کہ اُسے دیکھ کر آدمی کے دل میں نیکی اور پاکیزگی، عجز اور انکساری کا جذبہ بیدار ہونے لگتا تھا۔ وہ ایسی ہی تھی اور تکریم احمد نے خدا جانے اِسے کہاں سے ڈھونڈ لیا تھا۔ وہ مردان شاہ کو بھی یاد رہ گئی تھی۔ اور میں تو اُسے آج تک نہیں بھولا ہوں۔

"تکلّف کی کوئی ضرورت نہیں بی بی! آپ اطمینان سے کمرے میں بیٹھیں۔ فریج سامنے ہی ہے اور اس کی خوبی یہ ہے کہ اس میں تالا کوئی نہیں ہوتا۔ ضرورت ہوئی تو ہم خود پی لیں گے، اس میں کچھ نہ کچھ تو ضرور ہوگا۔" میں نے اپنائیت سے لبریز لہجے میں کہا۔

"ہاں اس میں ٹھنڈی بوتلیں رکھی ہیں۔ پانی کی بھی اور کوکا کولا کی بھی۔ میں آپ کے لیے کھانا پکا لیتی ہوں۔ دوپہر کا کھانا تو آپ کو اِدھر ہی کھانا ہوگا۔" یہ کہہ کر اس نے چھت کا پنکھا کھول دیا۔

"ہاں یہ اچھی تجویز ہے آپ شوق سے پکائیں۔" آبی نے اپنے حصے کی گفتگو شروع کر دی۔ میرا خیال ہے کہ اسے میری اتنی طولانی گفتگو اس خاتون سے پسند نہیں آئی تھی۔ وہ اپنی طرف سے بھی کچھ اضافہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ اُس کی بات کا جواب دیے بغیر دروازہ اپنے پیچھے بند کر کے دوسری طرف نکل گئی۔

آبی بولا "یہ تم ہر عورت سے نیچا، کیوں لڑانے لگتے ہو۔ ہو سکتا ہے یہ تکریم احمد کی ماں ہو، بہن ہو یا ہو سکتا ہے یہ تکریم کی بیوی ہی ہو۔"

"یہ اس کی کوئی بھی ہو سکتی ہے مگر میں نے اس سے ذرا سی ہی تو کی ہے تم کیوں جل گئے ہو۔ ہائیں! تمھاری بدنیتی کی حد نہیں ہے آبی، تو بہت بدمعاش ہو چکا ہے۔"

وہ ہنس دیا، بولا "یار کچھ عورتوں کو خدا نے اپنی شخصیت میں ایسا جادو پیدا کرنے کا کتنا زبردست سلیقہ عطا کیا ہے یہی عورت اگر باہر ریلوے لائن پر کوئلے چنتی نظر آتی تو کوئی پروا بھی نہ کرتا۔"

"تو یہ باتیں نہیں سمجھ سکتا ہے آبی! تو ٹھہرا موٹی عقل کا آدمی" ...نے بوشرٹ کے بٹن کھول کر پنکھے کی ہوا میں اپنا بدن ڈال دیا۔ ...ج اس روز بھی تاک تاک کر آدمی بھون رہا تھا اور کراچی کی مرطوب ہوا بھی اس کو اس حرکت سے باز نہیں رکھ سکی تھی۔

تکریم احمد کوئی آدھ ہی گھنٹے بعد واپس آگیا وہ سفید ...ٹ سفید پتلون اور سفید چرمی بوٹ پہنے ہوئے تھا اور یوں ...تھا جیسے وہ کسی کرکٹ ٹیم کی کپتانی کر کے آ رہا ہے۔ ہمیں فلیٹ میں دیکھ کر وہ خوش ہو گیا بڑی محبت سے پیش آیا، "یار! تم نہ آتے تو میں بہت پریشان ہوتا۔ تمھاری وجہ سے ہی ...نے یہ گھونسلا ڈھونڈ لیا ہے۔"

"کیا مطلب؟ پہلے یہ فلیٹ نہیں تھا تمھارے پاس؟"

"اب بھی کہاں ہے۔ یہ تو اس مہربان کا گھر ہے اس غمزدہ خانم کا۔"

"یہ نام ہے اس کا؟"

"نہیں یار! اس کا نام تو فردوسی بیگم ہے مگر میں اسے غمزدہ خانم ...ہوں۔ بس ایسے ہی میری قسمت اچھی تھی جو یہ مجھے ایک سینما ہال ...مل گئی اور مجھے یہاں اٹھا لائی۔ یہ ایک سال پہلے کی بات ہے۔ میں ...کے لیے ہر دو مہینے بعد اِدھر آ جاتا ہوں۔"

"کیا؟ یہ... یہ کوئی پیشہ ور ہے؟"

"نہیں یار! ایسا نہ کہو۔ یہ کسی دفتر میں ملازم ہے۔ شارٹ ہینڈ ...لکھتی ہے کہ دل پر نقش ہوتا جاتا ہے۔ آدمی چاہتا ہے کہ خود ...پنسل کے نیچے آ جائے۔ طبیعت کی بھی بہت سخی ہے۔ میں ذرا سیریس ...جاؤں تو کل ہی میں اس سے شادی کر سکتا ہوں۔"

"دریں چہ شک! اب تو ہم بھی آگئے ہیں، اس نیک کام میں ...نہ کرو، آج ہی ہم کسی نکاح خواں کو بلوا لیں گے۔"

"یہی تو نہیں ہو سکتا۔ میری بیوی تو میرے وارنٹ نکلوا ...دے گی۔ آدمی کی یہی بدقسمتی ہے کہ اسے ہمیشہ صحیح عورت غلط وقت ...ملتی ہے اور وہ بس کفِ افسوس بلکہ پائے ندامت ملتا ہی رہ جاتا ہے۔"

"چلو دفع کرو۔ انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھو اور ہمیں ذرا ...تفصیل سے بتاؤ کہ اس وردہ کا کیا بنا اور وہ مقتولہ کیا ہوئی۔"

"ہاں یار! اسی چکر میں تو میں پھر رہا ہوں۔ اُن سب بدمعاشوں کو تو میں نے گاڑی ہی میں پولیس کے حوالے کر دیا تھا۔ ...رم خان نے میرے خلاف بہت زہر اُگلا کہ جناب اس کے پاس ایک ...پستول بھی ہے اور یہ جعلی تھانیدار بنا ہوا ہے لوگوں کو لوٹتا پھرتا ...ہے اور یہ کہ اس قتل کا الزام میں اُن پر بلاوجہ لگا رہا ہوں مگر اُن ...کے خلاف تو سب سے بڑی گواہی وردہ کی تھی۔ اس کے بیان پر وہ ...سب ایسے پھنسے ہیں کہ کوئی اُن کی ضمانت بھی دینے والا نہیں ہے۔"

"مگر یہ بتاؤ کہ اسے اسٹیشن پر کوئی لینے بھی آیا تھا کہ نہیں؟"

"وہاں تو کوئی نہیں آیا۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ وردہ کو پولیس کی حفاظت میں چلتے دیکھ کر وہ لوگ سامنے نہیں آئے۔ میں نے تو کراچی اسٹیشن پر پہنچتے ہی ان لوگوں سے جان چھڑانا چاہی تھی مگر وہ میرے بیان کو بہت اہمیت دے رہے تھے۔ مجبوراً مجھے تھانے جانا پڑا۔ وہاں میں نے جو کچھ ضروری تھا انہیں حلفاً بتا دیا۔"

"مگر ہمارے بارے میں اُن سے تم نے کیا کچھ بتایا؟"

"کچھ بھی نہیں۔ میں نے کہہ دیا کہ ڈبے میں سوار دو آدمیوں کو ان لوگوں نے اُن سے روپے چھین لینے کے بعد گاڑی سے باہر پھینک دیا تھا۔ اُن کا نوٹوں سے بھرا بریف کیس دو اور آدمی لے گئے وہ کہہ رہے تھے انھیں ہی اُن لوگوں نے گاڑی سے پھینکا تھا مگر وہ ٹیکسی میں گاڑی کا تعاقب کر کے پھر سوار ہو گئے تھے اور یہ ہے بھی سچ۔"

"انھوں نے پوچھا نہیں کہ وہ تھے کون؟"

"بہت پُوچھا۔ بہت چکر باز ہوتے ہیں یہ پولیس والے۔ مگر میں نے کہہ دیا کہ جناب اُن کے بارے میں تو مجھے کچھ نہیں معلوم کہ وہ کون تھے۔ طُرم خان اور اس کے ساتھی یہی ثابت کرتے رہے کہ وہ میرے ساتھی تھے۔ میں نے بھی یُوں کیا کہ اپنا نام ولدیت پتہ نشتہ سب کچھ غلط لکھوایا۔ اب میں اُن کے سامنے کبھی جاؤں گا ہی نہیں۔"

"ہوں! تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وردہ ابھی تک اُن کی تحویل میں ہے۔"
"نہیں بھئی! مجھے ابھی ابھی معلوم ہوا کہ آج صبح دو معتبر آدمی اُسے تھانے سے لے گئے ہیں۔"
"کون لوگ تھے وہ؟" میں نے پوچھا۔
"یہ تو مجھے نہیں معلوم۔ تھانے کے ایک سپاہی نے مجھے یہ بات بتائی تھی۔ میرا خیال ہے کہ تھانے میں وہ اپنا پتہ لکھوا گئے ہوں گے۔"
"ہاں اس کے بغیر تو پولیس وردہ کو اُن کے ساتھ نہ جانے دیتی" میں نے اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔
"مگر بھائی جی! وہ بھی تو تھانے میں پتہ غلط لکھوا سکتے ہیں بھائی ہاشم سنگھ جی، اُن کا شجرۂ نسب تو تم جانتے ہی ہو۔" آبی نے یہ کہہ کر سگریٹ کا گہرا کش لیا۔
"بھئی! تھانے والوں نے ان سے کوئی ضمانت بھی تو لی ہوگی۔ کسی تنہا لاوارث عورت کو وہ یوں ہی تو کسی کے حوالے نہیں کر دیتے۔"
"جب وردہ نے خود کہہ دیا ہوگا کہ وہ اُن کے ساتھ جانا چاہتی ہے اور وہ انھیں جانتی ہے تو پھر اسے کون روک سکتا تھا۔ ایسے میں وہ کوئی بھی پتہ لکھوا سکتے ہیں۔" آبی نے میری دلیل کو کاٹ کر رکھ دیا مگر وہ بات درست ہی کہہ رہا تھا۔
"یارو مجھے بتاؤ یہ قصہ کیا ہے، کیا کرنا چاہتے ہو تم اور کس کے ساتھ، تم کس کی تلاش میں ہو آخر؟" تکریم احمد نے الجھتے ہوئے کہا۔
"تمھیں کیا بتائیں تکریم احمد! یہ دیکھو یہ میرے پیٹ پر یہ زخم کا نشان دیکھ رہے ہو نا! ذرا سوچو کہ یہ کس قسم کا زخم ہے۔" میں نے اپنے پیٹ پر سے کپڑا اٹھا دیا۔
"یہ۔۔۔ یہ تو کسی آپریشن کا نشان ہے۔" تکریم احمد نے کہا۔
اس کی یہ بات سن کر میں نے مختصراً اسے اس زخم کی وجہ بتائی۔
وہ پریشان ہو کر بولا "یار! یہ۔۔۔ یہ تو بڑے ظلم کی بات ہے وہ ڈاکٹر اگر آج کل کراچی میں آیا ہوا ہے تو یہاں بھی وہ یہی دھندا کر رہا ہوگا۔ اُسے تو پکڑنا چاہیے۔"
"ہم اسی لیے ادھر آئے ہیں اور وہ وردہ اسی کے گھر گئی ہے۔"
"ٹھہرو میں تھانے والوں سے فون پر بات کرتا ہوں میرا خیال ہے میں اس کا پتہ معلوم کر سکتا ہوں۔"
"یہاں فون بھی ہے؟"
"ہاں فردوسی بیگم کی فرم نے اُسے ٹیلیفون بھی دے رکھا ہے۔ فرم کے جنرل منیجر کی پرسنل سیکرٹری ہے یہ۔" تکریم احمد نے بڑے فخر سے کہا
"ٹھیک ہے پیارے عیش کرو۔ قسمت کے دھنی نظر آتے ہو۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔
وہ مسکراتا ہوا دوسری طرف نکل گیا کوئی دس منٹ بعد واپس آیا تو بولا "تمھارا خیال درست معلوم ہوتا ہے یار۔ وہ لوگ اُسے ... رہے تھے کہ ایک عورت جو اپنا نام ڈاکٹر عالیہ بتاتی تھی اُسے ساتھ لے گئی وہ سپاہی بتا رہا تھا کہ وہ لمبی سی سیاہ رنگ کی کار میں آئی تھی جسے شوفر چلا رہا تھا۔"
"پتہ کیا بتا گئی ہے وہ؟"
"ناظم آباد میں کوئی بنگلہ ہے "الشفق" نام ہے اس کا۔ نمبر ... پانچ لکھوا گئی ہے وہ۔"
"کوئی فون نمبر؟"
"نہیں فون نمبر اس نے اپنا نہیں بتایا نہیں مگر ہم وہ ... تلاش کر سکتے ہیں۔"
"وہ تو ٹھیک ہے مگر اب کی بار ہم کوئی حماقت نہیں کریں گے بہت سوچ سمجھ کر اُن پر ہاتھ ڈالنا ہوگا۔" آبی نے مجھے خبردار کرتے ہوئے کہا۔
اچانک دروازہ کھول کر فردوسی بیگم اندر آ گئی۔ تکریم احمد ... دیکھ کر کرسی سے اُٹھ گیا، بولا "یہ میرے دوست ہیں، آپ نے ... کہ انھیں بٹھا لیا۔"
"یہ تو میرا فرض تھا تکریم صاحب مگر اس وہاب اور عارف کا ... پتہ چلا؟ ان کے گھر سے کئی بار فون آ چکا ہے۔"
"کیا کہوں فردوسی بیگم! میں نے وہ ہسپتال چھان مارے ... وہ کہیں ملے ہی نہیں۔ اتنا مجھے کسی نے بتایا ہے کہ ان دونوں کو ... کی حالت میں دو آدمی ٹیکسی میں ڈال کر لے گئے تھے۔ وہاں تو افرا تفری مچی تھی۔ میں خود حیران ہوں کہ میں کیسے بچ گیا؟"
"یہ کیا قصہ ہے تکریم صاحب؟ کن کا پوچھ رہی ہیں یہ؟"
"کل یہاں ان کے دفتر کے پانچ چھ آدمی آئے تھے۔ ان کی ... تھی کل۔ جس پر ایک چھوٹی سی چائے پارٹی کا انتظام کیا تھا۔ شام کو ... بجے میں ان کے دفتر کے دو آدمیوں عارف اور وہاب کے ساتھ ایک ... میں بیٹھ کر صدر کی طرف گیا مگر اس بدقسمت بس کی راستے میں ایک ... بس سے ٹکر ہو گئی منی بس کے کئی آدمی شدید زخمی ہو گئے۔ آج ... خبر بھی چھپی ہے مجھے بھی نیم بے ہوشی کی حالت میں کسی نے بس ... مگر مجھے اسی وقت ہوش آ گیا تھا۔ زخمیوں کو کئی لوگ کاروں ... میں لاد کر ہسپتال لے گئے۔ ان میں عارف اور وہاب بھی شامل تھے ... خود اُن کو ٹیکسی میں لدتے دیکھا تھا۔ دو آدمی انھیں باری باری اٹھا ... میں ڈال کر آگے چل دیے۔ میں اُس وقت تک مفلوج سا ہو کر ... لوگوں میں دبا کھڑا تھا۔ ایک آدمی نے مجھے سہارا دے رکھا تھا ... چاہا کہ میں بھی ٹیکسی میں بیٹھ کر ہسپتال چلا جاؤں مگر ابھی میں ... بڑھا ہی تھا کہ وہ لوگ ان دونوں کو لے کر تیزی سے نکل گئے۔ ... بھی مجھے یاد نہیں رہا۔ میں نے اس پر غور ہی نہیں کیا لیکن بعد ... چلا کہ وہ دونوں کسی ہسپتال میں موجود نہیں ہیں۔ میں صبح سے اُن کی تلاش میں پھر رہا تھا۔"
"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ ٹیکسی والے انھیں کدھر لے گئے؟ کوئی بڑی رقم تھی اُن کے پاس؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔
"نہیں یار! وہ بابو قسم کے لوگ ہیں اُن کے پاس رقم کہاں سے آتی۔"
"یہ بات تو واقعی ایک معمے سے کم نہیں ہے۔" آبی نے کہا۔ پھر ایک سگریٹ سلگا کر بولا "میرا خیال ہے وہ انھیں کسی بیگار پر لگا چکے ہوں گے، یہ دھندا ابھی تو چلتا ہے اپنے ہاں۔"
"وہ بہت زیادہ زخمی تھے اور ہوش و حواس کھو بیٹھے تھے۔ انھیں کوئی کس بیگار پر لگا سکتا ہے۔"
"میرا خیال ہے کہ کسی نہ کسی ہسپتال میں پڑے ہوں گے مجھے اچھی طرح یاد ہے اُن لوگوں نے دو اور زخمیوں کو بھی ٹیکسی میں ڈال لیا تھا۔ منی بس کا تو کچومر ہی نکل گیا تھا۔ تین آدمی موقعے پر ہی مر گئے تھے۔" تکریم احمد نے کہا پھر فردوسی بیگم سے مخاطب ہوا "وہ اخبار تو لائیں آج کا، مرنے والوں کی اس میں تصویریں بھی چھپی ہیں۔"
وہ آرام جان اٹھی اور دوسرے کمرے سے اخبار لے آئی۔ حادثے کی تفصیلات اس میں درج تھیں اور بڑی ہی دل دوز تفصیلات تھیں تین آدمی جو مر گئے تھے بال بچے دار تھے اور اخبار نے اُن کے لواحقین کے نالہ و شیون کی بھی تصویریں چھاپ دی تھیں مگر یہ کہیں نہیں لکھا تھا کہ کوئی آدمی غائب بھی ہو چکے ہیں۔ یہ تو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ منی بس کے کچھ زخمی لاپتہ بھی ہو سکتے ہیں۔
ہم اخبار دیکھ چکے تو آبی بولا "تکریم صاحب! آپ میرا خیال ہے ابھی تک کچھ نہیں سمجھ سکے ہیں ان کا کوئی دشمن ہی ہو سکتا ہے جو بے بسی کی حالت میں انھیں اغوا کر کے لے گیا۔"
اس پر فردوسی بیگم بولی "نہیں جناب! وہ بے چارے تو بہت ہی سادہ لوح آدمی ہیں، ایک کے تین بچے ہیں اور دوسرے کی ابھی چھ ماہ پہلے شادی ہوئی تھی۔ ان کا کسی سے لڑائی جھگڑا ہونے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"
"شادی شدہ یا بال بچے دار ہونے سے آدمی دوسروں کی دشمنی سے تو بچ نہیں جاتا۔ وہ کوئی تختی تو سینے پر لٹکائے نہیں پھرتے ہوں گے۔ ہم بال بچے دار ہیں ہمیں کوئی کچھ نہ کہے کیا خیال ہے تمھارا ہاشم خان؟" آبی نے یہ کہہ کر ہاتھ کا سگریٹ ایش ٹرے میں مسلا اور ایک نیا سلگا لیا۔
فردوسی بیگم زیرِ لب مسکرائی اور تکریم احمد کی طرف دیکھ کر بولی۔ "آپ نے اُن کے گھر والوں کو بتا دیا تھا نا کہ وہ آپ کے ساتھ منی بس میں بیٹھے تھے صدر کے لیے۔"
"تب کیا بتاتا، وہ یوسف صاحب ہی بہت کافی تھے۔ وہ بارش زدہ جو اِن گلیوں پر ہاتھ کھول کر صاف کر رہا تھا۔ وہ مر جاتا تو مجھے دلی خوشی ہوتی وہ سات سو سے اور تیرہ رس گلے کھا گیا تھا میرے سامنے، ہاں اس نے دونوں گھروں میں جا کر بتا دیا مگر آج صبح رات بھر وہ ہسپتال میں رہا۔ سوچتا ہوگا کہ پورا معائنہ ہو جائے تو وہاں سے اُٹھوں۔ پھر نرسوں کے نرم نرم ہاتھ بھی اُسے روکے رہے ہوں گے آدمی ذرا رنگین طبیعت کا ہے وہ۔"
تکریم احمد نے کسی محمد یوسف کے بارے میں سب کچھ فردوسی بیگم کو تفصیل سے بتا دیا۔ "آپ بھی بہت دور کی کوڑی لاتے ہیں۔ اُن کو ڈھونڈیں جناب اسی میں آپ کی تکریم ہے۔"
"میں کہاں ڈھونڈوں انھیں؟ وہ کوئی بچے تھوڑی ہیں بہر حال آئیں ہاشم صاحب ہم ذرا ناظم آباد تک ہو آئیں دیکھیں تو سہی کہ وہ لوگ ہیں کون۔"
"ہاں! میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔ آئیں پیرزادہ صاحب۔" یہ کہہ کر میں نشست گاہ سے اُٹھ گیا۔
فردوسی بیگم کی چھٹی حس کچھ زیادہ ہی بیدار تھی وہ کچھ پریشان سی ہو گئی، بولی "تکریم صاحب! مجھے نہیں بتائیں گے کہ آپ کہاں جا رہے ہیں؟"
"ہم ذرا ناظم آباد تک جائیں گے ڈیئر۔ ان کے کوئی جاننے والے وہاں رہتے ہیں ان سے مل کر ہم جلدی لوٹ آئیں گے۔"
"ٹھیک ہے مگر کھانے کے وقت تک ضرور واپس آ جائیں۔ میں بس دیکھتی ہی نہ رہ جاؤں۔"
"اللہ کرے آپ ابد آباد تک ان خوبصورت آنکھوں سے بغیر عینک کے دیکھتی رہیں، اتنی فکر مند کیوں ہیں آپ! ہم بقائمی ہوش و حواس باہر جا رہے ہیں۔"
وہ اس کی یہ بات سن کر کچھ خوش نہیں ہوئی اسے بازو سے پکڑ کر اپنے اکلوتے بیڈ روم میں لے گئی۔ تھوڑی دیر بعد تکریم احمد ہمارے ساتھ فلیٹ سے باہر نکلا تو بولا "یار تم ادھر بڑی بے احتیاطی سے باتیں کرتے رہے ہو وہ دروازے کے پیچھے کھڑی سنتی رہی ہے۔"
"اوئے بیڑہ غرق! یہ تو بہت ہی بُرا ہوا ہے سائیں تکریم احمد! ایسی خراب عورت ہے یہ؟"
"میں دراصل اس کو تمھارے بارے میں بار بار کہتا رہا تھا کہ جیسے ہی تم لوگ آؤ وہ تمھیں فوراً اندر بٹھا لے، اب وہ پریشان ہو گئی ہے اس کا خیال ہے کہ آپ کوئی اچھے آدمی نہیں ہیں۔"
"ہمیں اس سے کوئی اپنے چال چلن کا سرٹیفکیٹ نہیں لینا ہے بھئی! تم چاہو تو ہمارے ساتھ ہوٹل میں ٹھہر سکتے ہو۔"
"نہیں یار! ایسی خنک رات جو مجھے ادھر ملتی ہے اور کہاں مل سکتی ہے میں بہر حال اُس کے شکوک رفع کر دوں گا۔" یہ کہہ کر اس نے ایک ٹیکسی روکی اور ہم اس میں بیٹھ کر سیدھے ناظم آباد جا پہنچے۔

انسان نے زمین کی صورت کچھ یوں بدلی ہے اور جا بجا اپنی صناعی سے اس میں ایسا حسن اور ایسی جذباتیت پیدا کر لی ہے کہ آدمی کا یہ دنیا چھوڑ دینے کو دل ہی نہیں چاہتا۔ یہی حال اس ناظم آباد کا ہے۔ میں نے گلبرگ میں بھی پودوں کو آدمی کے ہاتھوں میں آگ کر اونچے برچھ بنتے دیکھا ہے وہاں سے بھی آوارہ ہوائیں جب گزرتی ہیں تو معطر ہونے لگتی ہیں۔ اور ان میں سے جنگل کی بو باس کی جگہ کئی قسم کی بھیدوں بھری جادوئی خوشبوئیں رچنے لگتی ہیں۔ یہاں تک کہ جب وہ معطر ہوائیں پھر کسی کچی آبادی میں داخل ہوتی ہیں تو ان میں پھر عفونت جذب ہونے لگتی ہے۔

جب میں نے ناظم آباد کا وہ سرسبز اور خوبصورت علاقہ دیکھا تو انسان کی صناعی کو میں بے ساختہ داد دینے لگا۔ لوگوں نے زمین پر جنت بنالی تھی۔ اور ایسی زمین پر جو ناظم آباد بننے سے پہلے ایک ہولناک ویرانہ ہوگی۔ ہر کونہ انسان کی عظمت کی گواہی دے رہا تھا۔

الشفق کے بارے میں ہم نے ادھر ادھر سے معلوم کیا مگر کسی نے بھی ہمیں کچھ نہ بتایا۔ اتفاق سے اس گھڑی ایک ڈاکیہ ہمارے پاس سے گزر رہا تھا۔ آبی اس کی سائیکل سے ٹکرا ہی گیا، بولا ”بھائی خطوط خان! ذرا رک کر ہماری فریاد سن لے تیرا بڑا احسان ہوگا۔“

وہ ادھیڑ عمر کا آدمی اپنے اس نئے خطاب پر مسکراتا ہوا بڑی مشکلوں سے سائیکل کی گدی پر سے نیچے اترا، بولا۔ ”جی بھائی شکوک خان جی! منی آرڈر تو میں سب بانٹ آیا ہوں۔ اگر رقم کی ضرورت ہے تو وہ میں اب دینے سے معذور ہوں۔“ اس نے آبی کو ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ وہ سمجھا کہ ہم شاید اسے لوٹ لینا چاہتے ہیں۔ اس بستی کا بھی کمال یہ تھا کہ بھری دوپہر میں سڑکیں ویران نظر آتی تھیں چاروں طرف ویسا ہی سناٹا طاری تھا جیسا جنت میں ہوگا۔ کئی کئی سو مربع گز پر بنی ہوئی کوٹھیاں اپنے معدودے چند مکینوں کو یوں بانہوں میں لیے بیٹھی تھیں جیسے وہ انہیں لوری دے کر گہری نیند سلا چکی ہوں اور ان اداس اور تنہا سڑکوں پر اس ہرکارے کا مل جانا ہمیں غنیمت نظر آتا تھا۔ بڑے آدمیوں کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ عوام الناس کی بھیڑ بھاڑ سے بہت گھبراتے ہیں۔ انگریز تھے تو وہ بھی شہروں سے باہر کنٹونمنٹس بناتے تھے مغل بھی یہی کرتے تھے، انھیں دلی کی بھیڑ بھلی نہ لگی تو آگرہ میں جا بسے۔ انھیں اپنی آخری آرام گاہ میں بھی عام لوگوں کی بھیڑ بھاڑ پسند نہیں آتی تھی یہی وجہ تھی کہ انھوں نے اپنے مقبرے ایسی جگہوں پر بنوائے جہاں تک شہر کی مسجدوں کی اذانیں بھی سنائی نہ دے سکتی تھیں۔ شاہدرہ، لاہور میں جہانگیر کا مقبرہ اور نور جہاں کی آخری آرام گاہ اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔ ورنہ وہ لوگ بھی میانی صاحب میں ہی لیٹ رہتے کہ آدمی کو آنکھیں موند لینے کے بعد کرنا ہی کیا ہوتا ہے مگر اس کا متوّل اسے چین نہیں لینے دیتا۔

”بات یہ ہے بھائی کہ ادھر ایک بنگلہ ہے الشفق۔ اگر ہمیں پتہ بتا دے تو ہم تیری بلا تفتیش مغفرت کی دعا کریں تو قبر کے عذاب سے بھی بچ جائے اور فرشتے تیرے ریکارڈ کی چھان بین بھی نہ کریں۔“

آبی اچھے موڈ میں ہوتا تھا تو ایسے ہی کسی نہ کسی سے لڑا لیتا تھا۔ وہ ہرکارہ ہنس دیا، بولا ”مجھے تو مہربانی کر کے ایسے ہی رہنے دیں جناب ابھی بڑی ڈاک تقسیم کرنی ہے مجھے۔ البتہ اس کا پتہ یہ ہے کہ اس سیدھی سڑک پر جا کر بائیں ہاتھ مڑ جائیں۔ کوٹھی کا نام الشفق ہے۔ اگر وہ نہ ملے تو کسی آئی اسپیشلسٹ سے رجوع کریں یا پھر میرے پاس ڈاک خانے آجائیں۔“ یہ کہہ کر اس نے پیڈل پر پاؤں رکھا اور وعلیکم السلام کہہ کر آگے چل دیا۔

”بہت تیز آدمی ہے بھئی یہ ڈاکیا! قینچی کی طرح زبان چلتی ہے اس کی۔“ آبی اس کے جواب پر خوش ہو گیا۔

”تیرے ساتھ یہی سلوک ہونا چاہیے کیا ضرورت تھی اسے قبر کے عذاب کی دھمکی دینے کی مسٹر غلام محمد مرشد پیرزادہ۔“ میں نے آبی کو ٹوکتے ہوئے کہا۔

وہ ہنس دیا، بولا ”یار تو نے میرا نام کچھ زیادہ ہی لمبا کر دیا۔“

”کیوں تکریم صاحب اب آپ کا نام دیکھیں نا کتنا اچھلا ہے اتنی سی باریک سوئی کی نوک پر بھی لکھا جا سکتا ہے۔“

ابھی وہ یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ ہمارے قریب سے ایک کار تیزی سے گزر گئی۔ وہ ہمارے عقب سے آئی تھی اور اسی طرف جا رہی تھی جدھر ہم جا رہے تھے مگر میں تو اسے دیکھتا ہی رہ گیا، اس میں مردان شاہ سوار تھا اور اس کے ساتھ تین آدمی اور بھی تھے۔ آبی نے بھی اسے دیکھ لیا، بولا ”یار! یہ۔۔۔ یہ مردان شاہ ادھر کیا کر رہا ہے؟“

”پتہ نہیں! کسی کام سے آیا ہوگا ادھر۔ اس نے ہمیں دیکھا نہیں ورنہ ضرور رکتا۔“ ہم تینوں نے اپنی رفتار لاشعوری طور پر تیز کر دی۔ وہ ڈاکیا ٹھیک کہتا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم الشفق کے سامنے کھڑے تھے۔ [illegible] سماں ہی کچھ اور تھا۔ کم و بیش ساٹھ ستر آدمی بنگلے کے کھلے صحن میں کھڑے تھے۔ کچھ دیوار کے سائے میں تھے اور کچھ بنگلے کے برآمدے میں۔ جن کو وہاں جگہ نہیں ملی تھی وہ دھوپ میں کھڑے پسینہ پونچھ رہے تھے۔ مردان شاہ اور اس کے تین ساتھی برآمدے میں پہنچے تھے۔ ہم اس سے بات کرنے کے لیے سیدھے برآمدے میں جا پہنچے۔ مردان شاہ کے تینوں ساتھی پنجابی نظر آتے تھے اور بہت صحت مند۔ برآمدے تک ہم ابھی پہنچے ہی تھے کہ مردان شاہ کی نظر ہم پر پڑ گئی۔ وہ تیزی سے ہماری طرف لپکا، بولا ”یار جی! یہ آپ کدھر نکل آئے ہیں، نارن کے چکر میں تو نہیں ہو؟“

”نہیں شاہ جی! ہم تو ایک آدمی کا پتہ معلوم کرنے آئے ہیں ادھر مگر یہاں اتنے سارے لوگ کیوں کھڑے ہیں؟“

”بھئی! ادھر سعودیہ اور عراق کے لیے بھرتی ہو رہی ہے ہر قسم کا آدمی اٹھا لیتے ہیں یہ۔“

”اچھا! مگر ہم نے تو کچھ اور ہی سنا ہے ریکروٹنگ ایجنٹ کون ہے؟“

”کوئی قربان علوی صاحب ہیں۔ اخبار میں پچھلے منگل کو ایک اشتہار بھی چھپا تھا ان کا۔ اپنے یہ تینوں بندے تو انھوں نے پاس کر دیے ہیں۔ دس دس ہزار روپے لیے ان سے۔“

”کوئی رشتے دار ہیں یہ تمھارے؟“

”ان میں میرا ایک بھتیجا ہے جمیل۔ یہ جو دائیں ہاتھ کھڑا ہے نا۔ ادھر بیکار پھر رہا تھا۔ بہت اچھا موٹر مکینک ہے، اب اگلے دن بھی پھر جائیں گے۔“

”اب کیا کہتے ہیں یہ؟“

”بس ہم یہی پوچھنے آئے ہیں، آپ کو کس سے ملنا ہے؟“

ابھی وہ یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ عمارت کے بڑے دروازے میں سے دو آدمی باہر آئے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں بڑا سا رجسٹر تھا اسے دیکھتے ہی مردان شاہ برآمدے کی طرف لپکا۔ وہ دونوں آدمی صحن میں بکھرے لوگوں سے مخاطب ہو کر بولے۔

”جناب! جن لوگوں کو منتخب کر لیا گیا ہے ہم ان کے نام پڑھ کر سناتے ہیں جس جس کا نام لیا جائے وہ یہاں ٹھہر جائے اور باقی سب لوگ واپس چلے جائیں۔ اور سمجھیں کہ انھیں منتخب نہیں کیا جا سکا ہے۔“

سب لوگ ایک دم خاموش ہو گئے۔ ان کا دھیان اب اس آدمی کی آواز پر لگا تھا۔ اس نے اپنی عینک کا زاویہ درست کیا اور باری باری مختلف لوگوں کے نام پڑھنے لگا۔ معلوم یہ ہوا کہ انھوں نے بائیس آدمی منتخب کر لیے تھے۔ وہ جب خاموش ہوا تو صحن میں عجیب سا بے ہنگم شور مچ گیا۔

اس نے سب کو ڈانٹ کر خاموش کر دیا، بولا ”جن لوگوں کے نام میں نے پڑھ کر سنائے ہیں وہ یہاں رک جائیں اور باقی فوراً یہاں سے چلے جائیں اور اپنا قیمتی وقت برباد نہ کریں۔“

مردان شاہ ہم سے چند قدم دور کھڑا تھا۔ اور بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ بہت سے لوگ مایوس ہو کر بنگلے سے نکلنے لگے تو وہ ہمارے پاس آ گیا بولا ”میرے تینوں آدمی پاس ہو گئے ہیں یار جی! اللہ نے ان کی دعائیں سن لیں۔“

”چلو اچھا ہوا۔ خدا کرے یہ صحیح سلامت واپس آجائیں۔“ میں نے یونہی بے خیالی میں یہ بات کہہ دی۔

مردان شاہ چونک سا گیا میرے چہرے کو بڑے غور سے دیکھ کر بولا ”یہ کیا کہہ رہے ہو یار جی! وہاں کوئی توپ تو نہیں چلانی ہے انھیں۔ محنت مزدوری سے آدمی مر تو نہیں جاتا۔“

”میں بھی یہی کہہ رہا تھا شاہ جی! دور دیس کی بات ہے نا۔ میں نے تو ان کی خیریت کی دعا مانگی ہے۔“ یہ کہہ کر میں تیزی سے ان دونوں آدمیوں کی طرف بڑھا جو اب رجسٹر بند کر کے اپنے منتخب لوگوں کو برآمدے میں ترتیب سے کھڑا کر رہے تھے۔ مردان شاہ کے تینوں آدمی بھی اس قطار میں جا کھڑے تھے۔

”جناب! آپ کو زحمت نہ ہو تو میری ایک گزارش سن لیں۔“ میں نے اس معنک آدمی کے کندھے پر بڑی رسان سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

وہ کچھ بھڑک سا گیا ”کیا بات ہے میاں؟ بھینک سے کھڑے ہو، کیا چاہتے ہو؟“

”تمھارا لہجہ انتہائی گنواروں ایسا ہے۔ سوچ سمجھ کر بولو۔ میں بھرتی ہونے نہیں آیا۔“ میں نے اپنی آواز میں ذرا سی گھن گرج پیدا کرتے ہوئے کہا۔

وہ ٹھٹک سا گیا مگر میری آنکھوں میں ابلتے ہوئے غصے کو دیکھ کر قدرے نرم آواز میں بولا ”فرمایئے آنجناب کی بندۂ حقیر پُرتقصیر کیا خدمت کر سکتا ہے۔ کرسی نکلواؤں بستر بچھوا دوں۔ حکم ہو تو پیچوان بھی حاضر کر دوں۔“

اس کے لفظوں کے اس طنز نے میرا مغز الٹ دیا۔

”تم ابھی تک اپنی کھال میں نہیں آئے ہو مجھے ڈاکٹر عالیہ سے ملنا ہے اور ابھی۔ مجھے امید ہے کہ ڈاکٹر دھمن بھی اندر ہوں گے۔“

”یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ اس نام کے لوگ یہاں نہیں رہتے ہیں۔“

آبی اور تکریم احمد اس عرصے میں ہمارے قریب آ چکے تھے۔ تکریم احمد نے اسے اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا ”دیکھو میاں یہ ناٹک بند کرو۔ ہم اس عورت وردہ سے بھی ملنا چاہتے ہیں، جسے ڈاکٹر عالیہ تھانے سے اپنی ذمے داری پر لے کر یہاں آئی ہیں۔ ہم ان سے کچھ ضروری باتیں معلوم کرنا چاہتے ہیں۔“

اب کی بار وہ آدمی کچھ اور زیادہ سنجیدہ ہو گیا۔ بولا "آپ کو کسی نے غلط بتایا ہے صاحب! یہاں اس نام کے لوگ نہیں رہتے یہ قربان علوی صاحب کی رہائش گاہ ہے اور وہ ریکروٹنگ ایجنٹ ہیں۔"

"ہمیں قربان صاحب سے بلوا دو۔ ہم اُن سے معلوم کر لیں گے کہ یہ کیا چکر ہے؟" تکریم احمد نے بڑے جمے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ان کو علوی صاحب سے بلوا دیں حفیظ صاحب اس میں ہرج ہی کیا ہے؟"

"مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے کمال میاں آپ علوی صاحب کو اطلاع کر دیں۔ کیا نام ہے جناب آپ کا؟"

"میرا نام تکریم احمد ہے۔"

"جائیں کمال میاں علوی صاحب کو بتا دیں۔" یہ کہہ کر وہ آدمی پھر ان لوگوں کی طرف متوجہ ہو گیا جن کو وہ فہرست کے مطابق قطار میں کھڑا کر رہا تھا۔ کمال اندر گیا تو ہم برآمدے کے ایک کونے میں جا ٹھہرے۔ آبی بولا "میرا خیال ہے کہ اندر صرف تکریم صاحب ہی کو جانے دیا جائے۔"

"ہاں! عین ممکن ہے وہاں صورتِ حال کچھ مختلف ہو۔ صرف آپ ہی اندر جائیں تکریم صاحب! ہم یہیں ٹھہرتے ہیں۔" میں نے آبی کی ہاں میں ہاں ملائی۔

تکریم احمد نہیں مانا، بولا "آپ بھی میرے ساتھ چلیں ایک سے دو بہتر ہوتے ہیں۔"

اتنے میں کمال تیزی سے ہماری طرف لپکتا چلا آیا، بولا "آئیں جناب! علوی صاحب آپ سے مل لیں گے۔"

ہم اس کے پیچھے چلتے ہوئے برآمدے کے وسط میں پہنچے تو اُس نے دروازہ کھول دیا۔ سامنے راہداری تھی جس کے فرش پر دبیز مصنوعی ریشے کا قالین سا بچھا تھا۔ اس پر ہم بے آواز چلتے ہوئے چند ہی قدم آگے بڑھے تو کمال نے دائیں ہاتھ کا دروازہ کھول دیا۔ سامنے ایک بڑی سی خوبصورت دفتری میز کے پیچھے ایک ادھیڑ عمر کا بہت ہی صحت مند آدمی بیٹھا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ کرسی سے اُٹھا اور دو قدم آگے آ کر اُس نے ہم سے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا پھر ہمیں کرسیوں پر بٹھا کر بولا۔

"آپ مجھ سے ملنا چاہتے تھے کس نے میرا پتہ دیا ہے آپ کو؟"

"تھانے سے ہمیں آپ کا پتہ ملا ہے جناب! وہاں سے ایک مظلوم عورت وردہ کو ڈاکٹر عالیہ نام کی کوئی خاتون یہاں لائی ہیں اور ہم اُن سے ملنے کے لیے ادھر آئے ہیں۔" تکریم احمد نے بڑے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

"معلوم ہوتا ہے کچھ غلط فہمی ہوئی ہے آپ کو، کیا نام ہے آپ صاحبان کا؟"

"میرا نام تکریم احمد ہے، یہ ہاشم خان ہیں اور یہ ایس جی ایم ایم پیرزادہ۔"

"ہوں! ٹھہریں میں تھانے سے فون پر معلوم کرتا ہوں کہ کیا گھپلا ہے۔ اس نام کے لوگ تو ادھر نہیں رہتے ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور پہلو کے کمرے میں جا گھسا۔ فون اس کی میز پر بھی رکھا تھا مگر جب میں نے اس کا ریسیور اٹھایا تو معلوم ہوا کہ وہ ڈیڈ تھا اور اصل ٹیلیفون کسی خاص مصلحت کی بنا پر دوسری جگہ رکھا ہوا تھا۔ یہ بڑی عجیب سی بات تھی مگر ہمارے پاس اس کا کوئی علاج نہیں تھا۔ کوئی دس منٹ بعد قربان علوی واپس آیا۔ اس کے چہرے پر تشویش کے آثار نمایاں تھے۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ اپنی کرسی پر بڑے متذبذب انداز میں بیٹھ کر ہمیں گہری نظر سے دیکھتے ہوئے بولا "جو میں نے تھانے سے معلوم کیا ہے، وہ تو یہ کہہ رہے ہیں کہ جن خاتون سے ان سے رابطہ قائم کیا۔ اُس نے اپنا پتہ الشمس لکھوایا تھا آپ الشفق جا بیٹھے۔ اور الشمس نام کی کوٹھی ادھر کہیں لیاقت آباد میں ہے مگر آپ ناظم آباد چلے آئے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے علوی صاحب! اجازت دیں تو میں خود فون کر لوں؟ ابھی معلوم ہو جائے گا۔" تکریم احمد نے پریشان ہو کر کہا۔

"آئی ایم ساری جنٹلمین! میں آپ کی کوئی خدمت نہیں کر سکتا۔ یہ بلاوجہ کی الجھن میں مول نہیں لیتا۔ میرا وقت بہت قیمتی ہے۔" آدمی نے ایک دم ہمیں پاؤں سے اکھاڑ دینے کی کوشش کی اور اس کے ساتھ ہی اُس نے میز کے ساتھ لگی گھنٹی دوبارہ بجائی۔ ہمیں اپنے عقب میں دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے پیچھے نظر ڈالی۔ دو آدمی کمرے میں داخل ہو چکے تھے۔ اور دونوں مسلح تھے۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ ہتھیار انہوں نے ہاتھ میں تھام رکھے تھے۔ یہ بات نہیں تھی مگر جس انداز سے وہ چل کر آگے بڑھے اس سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ بلا وجہ ہیبت خان بننے کی کوشش نہیں کر رہے تھے۔ اُن کے لمبے کرتوں کے نیچے سفید چوڑی دار پاجاموں کے نیفوں میں ہلکے پستول اڑسے ہوئے تھے۔ آبی نے بھی اُن کا پہلی ہی نظر میں جائزہ لے لیا تھا۔

"سیفی میاں! تم ذرا اس الماری میں سے ان نئے رنگروٹوں کی فائل نکال دو اور تم انہیں گیٹ تک پہنچا دو اکبر میاں! کسی نے خواہ مخواہ غلط پتہ دے دیا ہے۔"

"آئیے جناب! میں آپ کو گیٹ تک لے چلتا ہوں یا ابھی پکڑ دوں علوی صاحب؟"

"ہاں! یہ بے چارے پردیسی ہیں انہیں لیاقت آباد کے لیے لے دو۔" اس کا وہ روکھا خشک اور لیا دیا لہجہ ہمیں ذلیل کرنے کے لیے بہت کافی تھا۔ آبی کی آنکھوں میں خون اترنے لگا۔ میں نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے اُسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اتنے سارے لوگ جمع تھے اور ہمیں صحیح صورتحال کا ابھی تک علم نہیں ہو سکا تھا۔ تکریم احمد کی جرأت دیدنی تھی، وہ بھی بہت بُری طرح الجھ چکا تھا مگر ہمارے پاس اِس نئی مشکل کا فوری حل کوئی بھی نہیں تھا۔ علوی کے دونوں آدمی میز کے دائیں بائیں یوں آ ٹھہرے تھے جیسے وہ ہماری ذرا سی غلط حرکت پر ہمیں چھاپ لیں گے مگر ان کی غلط فہمی ہم فوراً ہی دور کر سکتے تھے۔ آبی اس کے لیے بالکل تیار تھا۔ ایک بھرا ہوا پستول اس کی جیب میں تھا اور ایک میری جیب میں۔ مگر میں اپنی جگہ سے فوراً ہی اٹھ گیا۔

"ٹھیک ہے علوی صاحب آپ کا بہت بہت شکریہ! ہم سے کوئی گستاخی ہو گئی ہو تو ہم اس کی معافی چاہتے ہیں۔"

آبی نے بندھے چیتے الیسی بے بسی سے میری طرف خون آلود نگاہوں سے دیکھا اور پھر سر جھٹک کر وہ تکریم احمد کے ساتھ کمرے کے دروازے کی طرف لپکا اور دروازے کی دستی کو گھماتے ہوئے بڑے ہی غضبناک لہجے میں بولا "تم سے پھر ملاقات ہو گی قربان میاں! پھر ہمیں تم اتنی آسانی سے دھوکا نہیں دے سکو گے۔"

قربان علوی کے دونوں آدمی مستعد کھڑے تھے مگر اُن میں سے کسی کو بھی ہمیں للکارنے کی جرأت نہ ہوئی۔ قربان بھی منجمد سا ہو کر کرسی پر بیٹھا رہ گیا۔ میں اُن کا ردِ عمل دیکھنے کے لیے دروازے میں رُک گیا تھا میرے بپھرے ہوئے تیور دیکھ کر وہ فوری طور پر کوئی فیصلہ نہ کر سکے کہ آبی کی بات کا انھیں کیا جواب دینا چاہیے۔

ہم جب برآمدے میں نکلے تو ہمارا حال پٹے ہوئے جانوروں ایسا تھا۔ قربان علوی کے دونوں کارندے نئے رنگروٹوں کے بارے میں تفصیلات رجسٹر میں درج کر رہے تھے۔

مردان شاہ اس گھڑی کچھ فاصلے پر دیوار کے سائے میں کھڑا تھا۔ ہمیں باہر آتے دیکھ کر وہ ہماری طرف لپکا اور ہنستے ہوئے بولا۔ "کیا بنا یار جی! وہ بندہ مل گیا کہ نہیں جس کے لیے آپ اِدھر آئے تھے"

"نہیں شاہ جی! وہ ادھر نہیں ہے۔"

"کیا نام ہے اس آدمی کا جس سے آپ ملنا چاہتے ہیں؟"

"ڈاکٹر دھمن نام ہے اس کا۔" آبی نے بے ساختہ کہہ دیا۔

"اوئے بیڑہ غرق! میرا بھتیجا بھی اس کا ہی نام لے رہا تھا۔ اُس نے ہی تو اُن کی ڈاکٹری کی تھی یار جی!" وہ دبے لہجے میں بولا۔

"مگر کس جگہ؟"

"اِدھر ہی! پرسوں کی تو بات ہے، اس نے بتایا تھا کہ ادھر دو ڈاکٹر موجود تھے۔ ایک عربی بولتا تھا مگر لباس اُس نے انگریزی پہن رکھا تھا۔ دوسرا پنجابی میں بھی بات کرتا تھا۔"

"تمھارے بھتیجے کو کیسے پتہ چلا کہ دوسرے ڈاکٹر کا نام دھمن ہے؟"

"اُس کے ساتھ ایک اور امیدوار کھڑا تھا۔ اُس نے جمیل سے کہا تھا کہ یہ ڈاکٹر دھمن ہے اور لاہور کا رہنے والا ہے مگر یار جی عجیب بات یہ ہے کہ جب اس نے ڈاکٹر دھمن سے کہا کہ ڈاکٹر جی! میں آپ کو جانتا ہوں آپ لاہور کے رہنے والے ہیں، میں بھی لاہوری ہوں۔ میرا کام کروا دیں۔ آپ دھمن ہیں اور میں لچھمن ہوں۔ تو وہ ڈاکٹر تپ گیا تھا۔ کہنے لگا کیا بکتے ہو میرا نام انور سیال ہے تمھیں کس نے کہا کہ میں دھمن ہوں، اس کی یہ بات سن کر وہ بے چارا چپ ہو گیا یہ ساری باتیں میرے بھتیجے نے مجھے بتائی تھیں۔ وہ جو عربی ڈاکٹر تھا، اُسے وہ لوگ ڈاکٹر ادیس کے نام سے پکارتے تھے۔ دو نرسیں بھی موجود تھیں یہاں۔" مردان شاہ نے ہمیں حیران کر دیا اپنے بھتیجے کی کہی ہوئی تمام باتیں اُس نے ہمیں بتا دی تھیں۔

"مگر وہ قربان علوی تو کہتا ہے کہ اس نام کا کوئی ڈاکٹر اِدھر نہیں ہے۔"

"بکتا ہے وہ۔" پھر قدرے توقف کے بعد وہ بولا "مگر ہو سکتا ہے کہ جمیل کے ساتھی کو مغالطہ لگا ہو مگر یار جی! یہ کوئی کوئی نوسربازوں کا ٹولہ تو نہیں ہے، ان کے بارے میں اگر آپ کو کچھ معلوم ہے تو بتا دو۔ جب سے آپ نے کہا ہے کہ خدا انھیں صحیح سلامت واپس لائے، تب سے میں بھی سوچ میں پڑا ہوں کیا مطلب تھا آپ کا؟"

"کچھ نہیں مردان شاہ! ہم کسی خاص نتیجے پر پہنچ لیں پھر تمھیں سب کچھ بتا دیں گے مگر اپنے بھتیجے سے کہو کہ وہ ہوشیار رہے۔"

"میں اسے سمجھا دوں گا، کوئی اور رقم ان لوگوں نے مانگی تو میں جوتا دکھاؤں گا انھیں۔ باندھ کر مار دوں گا ان سالوں کو۔"

قربان علوی کے وہ دونوں مسلح آدمی برآمدے میں کھڑے ہمیں گھور رہے تھے۔ مردان شاہ اُن کی تیز تیز نظروں سے گھبرا کر ہم سے الگ ہو گیا اور ہم اسی وقت بنگلے سے نکل کر باہر سڑک پر جا پہنچے۔

"تو بالکل غلط آدمی ہے ہاشم خان! اُس علوی کو خواہ مخواہ چھوڑ دیا تو نے۔ وہ ہمیں ٹرخا گیا ہے۔"

"نہیں بھائی جی! یہ بات نہیں ہے۔ ہم اِدھر ہی کسی جگہ رُک کر ڈاکٹر دھمن کا انتظار کریں گے وہ اس بنگلے پر ضرور آئے گا۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے مگر ہاشم خان جی! ابھی تک آپ نے مجھے اُن کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا ہے۔"

"آپ کو بتایا تو تھا ہم نے گاڑی میں۔ مگر خیر، ہم اب آپ کو سب کچھ تفصیل سے بتا دیتے ہیں۔" یہ کہہ کر میں اُن دونوں کو وہاں سے ہٹا کر الشفق سے ذرا دور ایک سبزہ زار میں لے گیا۔ آبی کا غصہ کسی طرح ڈھل نہیں رہا تھا اور اس کی رائے میرے بارے میں زیادہ ہی خراب ہو گئی تھی۔ مجھ سے وہ بات بات پر الجھنے لگا تھا۔ اور میری کوشش یہ تھی کہ تکریم احمد کے سامنے میرے اور اس کے درمیان کوئی تلخی پیدا نہ ہو جائے۔ وہ میرے گلے کا شریک ہی نہیں تھا بلکہ وہ میرے لہو میں رچ بس گیا تھا۔ جس کاوکاوش میں مبتلا تھا اس کا اسے پوری

طرح احساس تو تھا مگر میرے اس کلیئے کو وہ کسی بھی طرح دُور نہیں کر سکتا تھا اور اب وہ میری مسلسل ناکامیوں کو میری بے تدبیری پر محمول کرنے پر بضد تھا۔ اور یہی تو میں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے تو اپنی زندگی لہولہان کر لی تھی۔ کوئی لمحہ ایسا نہیں تھا جو میں نے اپنے مقصد کے حصول میں صرف نہ کیا ہو۔ پھر بھی وہ اس روز مجھ سے بہت ناراض تھا۔ محض اس لیے کہ میں نے قربان علوی کو وہیں کیوں نہ پکڑ لیا۔ اُس کے جھوٹ کو نگل کر کیوں اتنے اطمینان سے میں اشفق سے باہر آ گیا۔ وہ اُسے میری بُزدلی پر محمول کر رہا تھا۔ تکریم احمد نے بیچ بچاؤ کراتے ہوئے اُسے سمجھایا کہ وہ تحمل سے کام لے اور اپنی طبیعت کے اس جوش پر قابو پائے۔ تکریم احمد کی یہ بات سن کر بھی وہ چپ نہیں ہوا۔ بولا۔ "چھوڑیں جی یہ کوئی طریقہ ہے، اتنے زخم کھانے کے بعد بھی اپنے یار کو سمجھ نہیں آئی۔ آ گئے وہاں سے منہ لٹکا کر۔"

"یار میری بات سمجھنے کی کوشش کر، میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر دھمن سے اس مٹر وے نے بات ضرور کی ہے مگر اُن کو یہ احساس نہیں ہو سکا کہ اُن کے لیے کون پوچھتا پھر رہا ہے اگر وہ ہمیں پہچان کر ہماری اس حماقت سے فائدہ اٹھا کر ہمیں وہیں بٹھا رکھتا اور ڈاکٹر دھمن ہمیں پہچان کر اپنے آدمیوں سے ہمارا گلا کٹوا دیتا تو ہم بے موت مارے گئے تھے۔ اوّل تو یوں منہ اٹھا کر ہمیں وہاں جانا ہی نہیں چاہیے تھا کیونکہ اسی طرح میں پہلے بھی مار کھا چکا ہوں۔ اس حماقت کو میں نے دہرا تو دیا مگر اس علوی سے ملنے کے فوراً ہی بعد مجھے یہ احساس ہوا کہ ہم سے غلطی ہو گئی ہے ہم پھر مصیبت میں پھنس سکتے تھے۔"

"یہ بات تمھیں پہلے سوچنا چاہیے تھی۔ تمھیں معلوم تھا کہ تم ڈاکٹر عالیہ سے ملنے جا رہے ہو اور وہ کس قماش کی عورت ہے اس کا بھی تمھیں علم تھا۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو یار جی! مگر اب شکر کرو کہ ہم کسی چکر میں نہیں پھنس گئے ہیں ہمیں کوئی اور تدبیر سوچنا ہو گی اب مجھے یقین ہے کہ ڈاکٹر عالیہ کی رہائش گاہ کہیں اور ہے۔"

"تمھیں یاد ہے وہ وردہ کیا کہہ رہی تھی، یہی ناکہ ڈاکٹر دھمن اُدھر کہیں اسٹار گیٹ کے پاس رہتا ہے۔" آبی نے مجھے یاد دلایا۔

"ارے پاگل تو نے پہلے کیوں یہ بات مجھے نہیں بتائی۔ میں تو بھول ہی گیا تھا، وہ تو واقعی یہی کہہ رہی تھی۔"

مجھے اپنی حماقت پر اور زیادہ غصہ آنے لگا۔ آبی کی برہمی برحق تھی وہ گڑ بنکھ یونہی شور نہیں مچا رہا تھا۔

تکریم احمد نے اس مرحلے پر مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "آپ مجھے ذرا اس قصے کی تفصیلات بتائیں میرا خیال ہے میں آپ کو کوئی بہتر تجویز پیش کر سکتا ہوں۔"

"ہاں آپ کو اسی لیے میں ادھر لایا تھا بھائی جی!" یہ کہہ کر میں نے اُسے پھر سے اپنی ساری کہانی مختصر الفاظ میں سنا دی حالانکہ بہت سی باتیں میں اسے پہلے بھی بتا چکا تھا مگر وہ جان بوجھ کر تفصیل پوچھ رہا تھا۔

وہ کچھ دیر تک خالی خالی نظروں سے مجھے گھورتا رہا پھر اس کے ذہن میں کوئی بتی سی جل اٹھی چٹکی بجاتے ہوئے بولا۔ "اگر آپ مجھ سے اتفاق کریں تو میں فردوسی بیگم کے ذریعے یہ سارا معاملہ کراچی کے ایک بڑے پولیس افسر کے گوش گزار کر سکتا ہوں۔"

"وہ کس طرح؟"

"وہ یوں کہ فردوسی بیگم کی فرم کا جنرل منیجر کلب عباس [illegible] خان کا جگری یار ہے وہ کبھی کبھار فردوسی بیگم کے فلیٹ کے [illegible] والے فلیٹ میں بھی آ ٹھہرتے ہیں۔ وہ جگہ کلب عباس نے کرائے پر لے رکھی ہے۔"

"بات تو آپ کی ٹھیک ہے مگر ثبوت ہم کہاں سے لائیں گے" آبی نے متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

"ثبوت میں پیش کر دوں گا۔ میں جیسے بھی ہو سکا ڈاکٹر [illegible] کو پکڑ کر اس فلیٹ پر لے آؤں گا۔" میں نے بڑے ہی پُراعتماد لہجے میں کہا۔ آبی کی آنکھوں میں چمک پیدا ہونے لگی، وہ مسکرا دیا، یوں کہ میری جان میں جان آ گئی۔ اس کی برہمی اور پژمردگی نے سب کو پریشان کر دیا تھا۔ اس نے بڑی دیر بعد ایک دم دو سگریٹ نکال کر سُلگائے۔ جو اس نے مجھے تھمایا وہ اُسے جان بوجھ کر گیا کر چکا تھا۔

"پھر میرے منہ پر تھوک رہا ہے تو؟"

"تو ہے ہی اسی قابل کسی دن تجھے کوئی یونہی ناکارہ کر کے سڑک پر پھینک جائے گا جس طرح تو اپنے گردے سے محروم ہوا اسی طرح تیرے باقی پرزے بھی بیچ کھائے گا۔"

"میری تجویز کے بارے میں کیا رائے ہے تمھاری؟"

"اچھی رائے ہے اس پر جتنی جلدی عمل ہو سکے کر گزرو۔ مگر [illegible] شناخت کرائے بغیر تم یہ مرحلہ کیسے طے کر سکو گے؟"

"اس کا بھی میں کوئی نہ کوئی حل ضرور نکال لوں گا۔ اب کی بار میں یہ چاہتا ہوں کہ یہ معاملہ پولیس اور قانون کی نظر میں آ جائے اور اُن لوگوں کو عدالت کی طرف سے سزا ملے۔ میں نے یوں ہی سر راہے اُن لوگوں کو مار دی تو کیا ہو گا، وہ مر جائیں گے اور بس۔ یہ تو کوئی سزا نہ ہوئی وہ تو [illegible] مصیبت سے محفوظ ہو جائیں گے۔"

"تو پھر ٹھیک ہے خان جی آپ ڈاکٹر دھمن کو پکڑ کر لائیں۔ [illegible] کام میں کر دوں گا میرے پیچھے تو پولیس نہیں لگی ہے نا۔" تکریم احمد [illegible]

"ہاں یہ بہتر رہے گا، آپ اب گھر جائیں۔"

"جی نہیں! وہ کھانے پر ہم سب کا انتظار کر رہی ہو گی [illegible]" تکریم احمد نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تو پھر چلیں پہلے ان کی ردیٹیاں تو سونگھ لیں۔" آبی نے [illegible]

بھری گھاس سے اٹھتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر بعد ہم فردوسی بیگم کے فلیٹ پر جا پہنچے۔ اس کا فریج کوکا کولا اور سیون اپ ایسی ٹھنڈی بوتلوں سے اٹا ہوا تھا۔ پہلے تو ہم نے اپنی پیاس بجھائی اور پھر کھانے کا انتظار کرنے لگے کوئی ڈھائی بجے تک ہم شکم سیر ہو چکے تھے۔ کھانا فردوسی بیگم نے واقعی بہت عمدہ پکایا تھا اور اس میں بازار کی تیار کردہ کوئی شے نہیں تھی۔

مگر اس کھانے میں خدا جانے ایسی کیا بات تھی کہ مجھے چار بجے اپنی طبیعت میں عجیب سی گرانی محسوس ہونے لگی اور پھر کچھ ہی دیر بعد مجھے پیچش نے آ دبایا۔ میرا وہ پیٹ جو ہر قسم کی الا بلا چیزیں ہضم کرتا چلا جاتا تھا اس روز میرا ساتھ چھوڑ گیا۔ تکریم احمد نے مجھے پیچش روکنے کی گولیاں بھی دے دیں، جو کچھ بھی اُس سے گھر پر تو بٹنو ہو سکتا تھا، اس نے کیا مگر آٹھ بجے تک میری حالت کچھ اتنی خراب ہو گئی کہ میں سمجھا کہ بدن میں ستیا ہی نہیں رہ گئی تھی۔ بار بار کے مروڑ نے مجھے مروڑ کر رکھ دیا تھا۔ اور پھر مجھ پر نقاہت کے دورے پڑنے لگے۔ آدمی یوں پانی کا بلبلا بھی ثابت ہو سکتا ہے اس کا تو مجھے وہم بھی نہیں تھا۔ میں کو سولہ سترہ دفعہ باتھ روم میں جا چکا تو میری ہمت جواب دے گئی۔ نو بج گئے مگر مجھے آرام نہیں آیا۔ آبی اور تکریم احمد بھی گھبرا گئے۔ اٹھارویں بار تو مجھے بستر ہی پر بے بس ہونا پڑا۔ وہ اور زیادہ پریشان ہوئے تو مجھے رات کے ساڑھے نو بجے وہ اٹھا کر ہسپتال لے گئے۔ مجھے اپنی اس مصیبت کا وہ دن کبھی نہ بھول سکے گا میرے بدن سے پانی بالکل ہی خارج ہو چکا تھا۔

میری اس ابتر حالت پر ڈاکٹر بھی پریشان ہو گئے۔ جو کچھ اُن سے ممکن ہو سکتا تھا وہ رات بھر کرتے رہے مگر مرض کے اصل سبب پر قابو نہ پا سکے۔ میں کیا کہوں یارو! میں اس مرض میں ایسا مبتلا ہوا کہ میرے پندرہ دن اس ہسپتال میں یوں گزر گئے جیسے میں قبر کا عذاب جھیل رہا ہوں۔ آبی دن رات میرے بستر کے ساتھ لگا میری تیمارداری میں مصروف رہا۔ وہ بھول ہی گیا تھا کہ اُسے دنیا میں کوئی اور بھی کام ہے یہی حال تکریم احمد کا تھا۔ وہ بھی صبح سے شام تک میرے سرہانے کھڑا رہتا تھا۔ بیچ میں وہ اپنی ضرورتوں کے لیے اِدھر اُدھر نکلتے تھے ورنہ اُن کے وہ پندرہ دن میرے ہی گرد گھومتے گزرے۔ آبی نے میرے علاج پر بے دریغ روپیہ خرچ کیا میرے لیے اس نے ایک بہت عمدہ نرس کا انگ کرہ لے لیا تھا۔ دن رات وہ ڈاکٹروں کو میرے گرد نچاتا رہا انھیں ایک پل بھی چین سے نہ گزارا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا ورنہ وہ کسی زندہ آدمی کا پیٹ کا پورا کارخانہ نکال کر میرے لیے سب کچھ کر گزرنے پر آمادہ تھا۔

اس دوران وہ میرے علاج کے سوا کسی بھی اور بات پر توجہ نہ دے سکے۔ انھیں ڈاکٹر دھمن یاد رہا نہ ڈاکٹر عالیہ۔ وہ بھول ہی گئے کہ وہ کس لیے کراچی آئے تھے انھیں کچھ یاد تھا تو صرف یہ کہ اُن کا یار بستر مرگ پر پڑا ہے اور اس کو وہ ہر قیمت پر موت کے مُنہ سے چھین لینا چاہتے ہیں سولھویں دن جا کر کہیں میری طبیعت سنبھلی۔ دو ہفتوں کے بعد وہ پہلا دن تھا کہ میرے معدے نے تھوڑا سا دودھ قبول کیا تھا۔ آبی نے اُس روز سارے ہسپتال میں مٹھائی تقسیم کی۔ مجھے بتائے بغیر وہ اس دوران ہسپتال میں آنے والے نادار مریضوں کو ہزاروں روپوں کی دوائیں خرید کر دے چکا تھا۔ وہ ہر ایک سے کہتا تھا میرے بھائی کے لیے دُعا کرو، خُدا سے اس کی زندگی مانگو۔ اور وہ سب مفلس و نادار مریض اس کی آہ و بکا سے متاثر ہو کر، اس کے خلوص کی فراوانی سے متاثر ہو کر اس کے اور میرے حق میں بے تحاشا دعائیں کرتے تھے۔ شاید یہ انھی میں سے کسی کی دُعا کا اثر تھا کہ میں بچ گیا، اور سولھویں دن ۔ ۔ ۔ ۔ میں زندگی کی طرف آہستہ آہستہ لوٹنے لگا تھا۔ کون زندگی پر بھروسا کر سکتا ہے۔ آدمی کا کاربوریٹر تو کہیں بھی خراب ہو سکتا ہے۔ کہیں بھی اس کے رنگ پسٹن بیٹھ سکتے ہیں، آبی یہی کہتا تھا مرض اور اس سے آگے مرگ کے سامنے تو آدمی بالکل ہی بے بس ہے یہ کوئی پستول کی گولی تو نہیں ہے کہ آپ طرح دے کر اُس سے بچ سکتے ہیں مرض تو آدمی کو چیتے کی طرح بے آواز آگے بڑھ کر گردن سے دبوچ لیتا ہے۔ اٹھارویں دن میں نے چاہا کہ میں اس بستر سے اٹھ کر بھاگ نکلوں مگر میری حالت دیدنی تھی۔ بدن یوں گھل گیا تھا جیسے میں بس ایک استخوانی ڈھانچہ ہوں۔ ساری رونقیں ختم ہو گئی تھیں۔ حالت یہ تھی کہ انتیسویں دن آبی نے مجھے آئینہ دکھایا تو میں خود کو پہچان نہیں پا رہا تھا میرے چہرے کی ساری ہڈیاں گل نظر آتی تھیں نہ آنکھوں میں چمک تھی نہ رخساروں پر وہ خون کی لالی ہی باقی رہ گئی تھی۔ اور رگیں ہاتھوں اور گردن پر یوں اُبھر آئی تھیں جیسے میں کوئی ستر سالہ بوڑھا آدمی ہوں اور بے غیرت بن کر جینے کے لالچ میں جی رہا ہوں۔

ڈاکٹروں نے بھی میری حالت کو سمجھتے ہوئے مجھے ہسپتال سے نکلنے کی اجازت نہیں دی۔ یوں بھی میری ہمت جواب دے گئی تھی۔ میں اپنے پاؤں پر چل کر باہر نکلنا چاہتا تھا۔ دس دن اور گزر گئے سب میں ہسپتال سے صحتیاب ہو کر نکلا تو معلوم ہوا کہ میں زندگی کے انتیس دن موت کی نذر کر آیا ہوں۔ میری صحت تو مجھے واپس مل گئی تھی مگر بیچ میں سے جو ایک مہینہ مجھ سے چھن گیا تھا وہ مجھے اور آبی کو ہماری منزل سے کئی کڑے کوس دُور پھینک گیا تھا۔ اس دوران وہ دونوں کچھ بھی نہ کر سکے۔ یہاں تک کہ تکریم احمد کو بھی میرے سوا کوئی اور بات نہ سوجھ سکی فردوسی بیگم بے چاری الگ پریشان رہی۔ اس کا یہ خیال تھا کہ اس نے جو کھانا پکایا اس میں کوئی غلط چیز داخل ہو گئی تھی بڑی مشکلوں سے میں نے اس کے فلیٹ پر واپس پہنچ کر اُسے یقین دلایا کہ

میرے دل میں ایسا کوئی وہم نہیں ہے وہی کھانا آبی اور تکریم احمد نے کھایا تھا اور کلیان ہو گئے تھے۔ یہ تو میری اپنی کلھیا ہی بچی تھی، کہ چھوٹ گئی۔ میں نے اس سے کہہ دیا کہ وہ پشیمان نہ ہو یہ میری خم پارہ تقدیر مجھے یونہی رگیدتی رہتی ہے اس میں کسی دوسرے کا کوئی قصور نہیں ہے۔

وہ میری باتیں بڑے غور سے سنتی تھی مگر جواب بہت کم دیتی تھی۔ یہ بات اس کی صالت اور شرافت کا محکم ثبوت تھی کہ اس نے ہم سے ایک بار بھی بے تکلف ہونے کی کوشش نہیں کی۔ تکریم احمد کی باتوں میں تعلی زیادہ تھی ورنہ میں اور آبی اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ان دونوں میں ایک پاک صاف سا انتہائی خلوص پر مبنی بے لوث دوستانہ تعلق تھا جس میں ان کے درمیان کسی دوسرے تعلق کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ تکریم احمد ہمیں خواہ مخواہ ہی بے وقوف بناتا رہتا تھا کہ اس فلیٹ میں اسے بڑی خنک اور معطر راتیں میسر آتی ہیں۔ فردوسی بیگم بہت ہی سلجھی ہوئی عورت تھی۔ ایسی عورت جو قلعہ بند ہو کر یوں بیٹھی ہے کہ اس کے وجود تک کسی کا تیر نہیں پہنچ سکتا۔ بلاشبہ وہ بہت ہی مدھو ماتی عورت تھی۔ اس کی آواز میں ایسی حلاوت اور ایسا لوچ موجود تھا کہ آدمی کی غنائیت کو ترستی روح سرشار ہو جاتی تھی اور اس کی شائستگی کی تو قسم کھائی جا سکتی تھی۔ اس نے ایک بار بھی ہمیں بھائی کہہ کر مخاطب نہیں کیا مگر ہمارا احترام اس نے بھائیوں سے بھی زیادہ کیا۔ اس ایسی کردار کی بالا حصار عورت میں نے زندگی میں بہت کم دیکھی ہے۔ تکریم احمد بھی کوئی اوچھا آدمی نہیں تھا۔ اگر وہ کسی قسم کے شہدے پن کا مظاہرہ کرتا تو میرا خیال ہے وہ اسے دوسرے ہی لمحے فلیٹ سے باہر نکال دیتی۔ ان دونوں میں کوئی ایسی ہی قدر مشترک تھی اور وہ اپنی اپنی حدود کا کچھ ایسا ہی احترام کرتے تھے کہ ان کو ایک دوسرے سے اتنی محبت ہونے کے باوجود ان کے درمیان موجود جنگلا جوں کا توں قائم تھا۔ اور آبی کا یہ کہنا تھا کہ وہ انجیل کی آیت پر صحیح معنوں پر عمل کر رہے ہیں۔

میں فلیٹ پر پہنچ کر بھی چار پانچ دن تک کسی طرف توجہ نہ دے سکا۔ میرے کل پرزے شاید پوری طرح پھر سے کام کرنے لگے تھے۔ یا پھر وہ لوگ مجھے غذائیں ہی اچھی دے رہے تھے اور فردوسی بیگم کچھ ایسے جی جان سے میری خدمت کر رہی تھی کہ پانچ چھ دن میں میری تندرستی عود کر آئی تھی اور مجھے محسوس ہوا کہ میرے اندر پہلا سا جیلانی پھر سے بیدار ہو گیا ہے۔ مجھے پریشانیوں سے بچانے کے لیے اس سارے اندوہناک عرصے کے دوران میرے ان دوستوں نے ایک بار بھی مجھ سے میرے اصل مسئلے پر کوئی بات نہیں کی۔ ان کی اس چپ سے تنگ آ کر میں نے خود ہی ایک دن بات چھیڑی تو آبی بولا "یار! تو اب کوئی بندے کا پتر بن اب چھوڑ بھی دے یہ بستر۔ بہت ذلیل کر لیا ہے تو نے ہمیں بہت خدمت لے لی ہے ہم سے تو نے کیوں بھائی تکریم احمد!"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں یار جی! اب تو اعلیٰ حضرت کے چہرے پر سرخی لوٹ آئی ہے۔"

"ایک دم نٹے منہ اس کا۔ اگر یہ مر جاتا تو میں ساری عمر اس پر لعنت بھیجتا رہتا کہ سالا ہیضے سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا یہ ہے مردانگی اس کی۔"

"بک نہیں اوئے! کسی دن تیری بڑی آنت ڈھیلی ہو گئی تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔ چل آج ان لوگوں کا پتہ کرتے ہیں لا میرا وہ چپ شاہ مجھے دے۔ حد ہو گئی تو نے سمجھ رکھا ہے مجھے؟" میں یہ کہہ کر بستر سے اٹھ گیا۔ اس وقت فردوسی بیگم دفتر گئی ہوئی تھی۔ تکریم احمد نے میرا وہ دبنگ لہجہ دیکھا تو وہ دوڑ کر میرے لیے رنگلر کی جینز اور ایک خوبصورت قسم کی قمیض لے آیا۔ آبی ٹخنوں سے اونچے بوٹ اور جرابیں اٹھائے ہوئے تھا خود بھی ان لوگوں نے اسی قسم کا لباس چڑھا رکھا تھا۔

"یہ کہاں سے مل گیا ہے تمھیں؟ یہ تو بالکل نیا جوڑا ہے بھئی۔"

"ہم نے بڑی شاپنگ کی ہے تیرے لیے۔ رومال بنیانیں، تولیے، قمیصیں اور ڈھیر ساری ٹافیاں خرید لی تھیں کہ بچہ اٹھے گا تو خوش ہو جائے گا۔" آبی نے جرابوں پر لگی مہریں توڑتے ہوئے کہا۔

"لا بھئی! اچھا اور خوبصورت لباس تو میری خاندانی کمزوری ہے۔" یہ کہہ کر میں نے وہ جدید فیشن کے کپڑے پہن لیے۔

"ہاں کیوں نہیں! بہادر شاہ ظفر کے خاندان کا اصلی اور وارث تو تو ہی ہے ویسے یار! یہ لباس تجھے سج گیا ہے اب تو بندے کا پتر نظر آ رہا ہے۔" آبی نے میرے چاروں طرف گھوم کر مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

تکریم احمد ہنس دیا۔ بولا "اب کدھر کے ارادے ہیں؟"

"اس قربان علوی کا پتہ کرتے ہیں میرا خیال ہے اس عرصے میں آپ لوگوں نے ڈاکٹر دھمن کو بھی ڈھونڈ نکالا ہو گا۔"

"ہاں کیوں نہیں! بچے تو نے تو ہمارے ہوش کے طوطے ہی اڑا دیے تھے۔ ہمیں کسی طرف دیکھنے کی مہلت ہی تو نے دی۔" آبی نے کہا۔ وہ بھی نشست گاہ میں لگے قد آدم آئینے کے سامنے کھڑا اپنا حلیہ درست کر رہا تھا۔

"چلو دفع کرو۔ جو ہونا تھا ہو گیا اب بھی کچھ نہیں گیا وہ لوگ زمین کے اندر بھی ہوں گے تو ہم انھیں نکال لیں گے۔"

کچھ ہی دیر بعد ہم نے فردوسی بیگم کے فلیٹ کو تالا لگایا اور ٹیکسی میں بیٹھ کر قربان علوی کی رہائش گاہ کی طرف چل پڑے۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ اشفق کے گیٹ پر صرف تالا ہی نہیں

بلکہ اس پر کرائے کے لیے خالی ہے کا بھی یہ بڑا سا بورڈ آویزاں تھا۔

"ایں چہ معنی دارد آبی سائیں؟" میں نے ہونقوں کی طرح گرد و پیش پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"..... وہ جو بیچتے تھے دوائے دردِ دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے۔" اس نے پریشان ہو کر کہا۔

"یہ تو بہت برا ہوا ہے یار جی! چلو ذرا ادھر مردان شاہ کے پاس چلتے ہیں اسے معلوم ہو گا کہ یہ لوگ کہاں چلے گئے ہیں۔"

یہ کہہ کر میں پھر ٹیکسی میں جا بیٹھا۔ اسے ہم نے ابھی فارغ نہیں کیا تھا۔ تکریم کے چہرے سے یوں ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ بہت زیادہ پشیمان ہے، بولا "جیلانی صاحب! مجھے افسوس ہے کہ آپ کی بیماری کے دوران میں ان لوگوں پر نگاہ نہ رکھ سکا۔"

"ہاں سائیں! ہم سے واقعی بہت بڑی غلطی ہو گئی ہے مجھے ڈر ہے کہ یہ لوگ پھر اپنا بستر گول کر گئے ہیں۔" آبی نے کہا۔ وہ بھی بہت زیادہ پریشان نظر آ رہا تھا۔ جب وہ کسی کو جناب کے بجائے سائیں کہہ کر مخاطب کرتا تھا تو مجھے بے ساختہ ہنسی آ جاتی تھی یوں لگتا تھا جیسے وہ کہہ رہا ہو سئیس۔

گاڑی ہم نے مردان شاہ کے ہوٹل کے سامنے جا کر کھڑی کر دی۔ وہ اس وقت کاؤنٹر پر موجود تھا اور خود چائے بنا رہا تھا۔ ہوٹل کے اندر باہر کرسیوں پر قلی کباڑی قسم کے بے شمار لوگ بیٹھے وقت کو دھکا دے رہے تھے۔

ہمیں ٹیکسی سے اترتے دیکھ کر مردان شاہ نے کیتلی اپنے ملازم کے حوالے کی اور تیزی سے باہر نکل آیا۔

"آؤ سائیں آؤ۔ آج ہم کیسے یاد آ گیا آپ کو؟ اور اوئے لڑکے ذرا گاہکوں کا دھیان رکھ، میں اندر جا رہا ہوں۔" وہ ہمیں ساتھ لے کر گاہکوں کی بھیڑ میں سے گزرتا ہوا اپنے کیبن میں جا پہنچا۔ جاتے ہی اس نے بتیاں بھی جلا دیں اور پنکھا بھی چلا دیا۔

"یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے بھائی جی! کچھ بیمار شمار رہے ہو؟" اپنے چھوٹے سے فریج میں سے اس نے سوڈے کی تین بوتلیں نکال کر ہمارے سامنے رکھ دیں۔ وہ میرے چہرے کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔

"یہی تو مصیبت رہی ہے شاہ جی! میں ہسپتال میں رہا۔ بڑا سینہ دکھ ہی گزرا۔"

"اچھا! مجھے تو کسی نے بتایا ہی نہیں، آپ ہی ادھر آ جاتے بھلا ہم غریب آدمی کا دارو ہوتا ہے۔"

"اسی لیے تو آئے ہیں یار جی! کچھ پتہ بھی ہے کہ وہ قربان علوی کہاں چلا گیا ہے؟ اس کا بنگلہ تو خالی پڑا ہے۔" میں نے بوتل اٹھاتے ہوئے کہا۔ وہ بھڑکی ہوئی پیاس کے لیے اکسیر ثابت ہو سکتی تھی۔ ..... نے سے تخ کر رکھا تھا۔

"وہ بنگلہ تو چوتھے روز ہی خالی ہو گیا تھا۔ میرے بھتیجے کو دوسرے سات آدمیوں سمیت وہ اسی رات ہوائی جہاز میں بٹھا کر جدہ لے گئے تھے۔ چوتھے روز قربان علوی صاحب بھی وہاں جا پہنچے اور اب تک وہاں ہی ہیں۔"

"اچھا! اب کہاں ہے آپ کا بھتیجا؟"

"اس کا نصیب ہی خراب تھا یار جی! جدہ پہنچنے کے بعد دوسرے ہی دن وہ بیمار پڑ گیا۔ اس کے پیٹ میں ایسا درد اٹھا کہ اسے ایجنٹ کا آدمی ایک ہسپتال میں لے گیا۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ اس کو پتے کا درد ہے علاج کے لیے ان لوگوں نے اسی روز اس کا اپریشن کر دیا۔ اور وہ بیچارا پندرہ دن بستر پر پڑا رہا، جب تک اس کا زخم ٹھیک ہو چکا تھا مگر جب اس نے نوکری پر حاضری کی کوشش کی تو ڈاکٹر نے اسے 'ان فٹ' کر دیا، کہ وہ کوئی سخت محنت مزدوری کا کام نہیں کر سکتا تھا۔ زخم کھل جانے کا خطرہ تھا۔ ڈاکٹر نے جمیل کو یہی بتایا۔ قربان علوی کا خدا بھلا کرے اس نے جمیل کو پچاس ہزار روپے دے کر چار ہفتے بعد کراچی بھیج دیا مگر اس کی صحت ٹھیک نہیں رہی۔ میں نے اسے بندر روڈ پر ایک ورکشاپ کھول دی ہے کام تو اس کا چل نکلا ہے مگر وہ خود بیمار رہنے لگا ہے۔"

مردان شاہ نے اپنے بھتیجے کے بارے میں مجھے جو کچھ بتایا وہ میرے خدشات کی تصدیق کے لیے بہت کافی تھا۔

"اس کے ساتھ جو دوسرے آدمی گئے وہ کہاں ہیں؟"

"وہ تو ادھر ہی ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی واپس نہیں آیا ایک لڑکا اس کے ساتھ گیا تھا بشیر، اس کے بارے میں مجھے کل کسی نے بتایا ہے کہ وہ بھی بیمار ہے اور ہسپتال میں داخل ہے۔ دراصل وہاں کی آب و ہوا کسی کو ہی راس آتی ہے یار جی!

جمیل نے اچھا کیا جو واپس آ گیا اور علوی صاحب کی مہربانی دیکھو کہ انھوں نے اس کو پچاس ہزار روپیہ بھی دے دیا۔"

"کوئی کسی کو مفت پیسہ نہیں دیتا ہے مردان شاہ جی! تمھارے بھتیجے سے انھوں نے کوئی لمبا ہی فائدہ اٹھایا ہو گا۔" میں نے آبی کے پیش کردہ دو میں سے ایک سگریٹ لے کر منہ میں دبا لیا۔

مردان شاہ کے چہرے پر تشویش کی لکیریں ابھر آئی تھیں، بولا "مجھے بتاؤ یار جی! کچھ گڑبڑ تو مجھے بھی لگتی ہے سالوں نے لڑکے کو "داگی" کر کے بھیج دیا۔ روپیہ بھی ساتھ کر دیا پر اصل وجہ مجھے معلوم ہونی چاہیے۔"

"تمھیں وجہ معلوم ہو گئی تو تم بہت دکھی ہو جاؤ گے مردان شاہ! مجھے یہ بتاؤ کہ اس ڈاکٹر دھمن کے بارے میں تمھیں کچھ معلوم ہوا ہے؟"

"نہیں! اُن کا تو پھر میں نے کسی سے ذکر ہی نہیں سُنا۔"
"ہمارے ساتھ چلو مردان شاہ! ہم تمھارے بھتیجے کو ابھی دکھانا چاہتے ہیں، اُن لوگوں نے اس کی زندگی برباد کر دی ہے۔" میں نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

مجھے اپنی بے پناہ اذیتوں کا زمانہ یاد آنے لگا تھا۔ وہ لمحہ میرے ذہن میں پھر سے گزرنے لگا تھا جب اُن بھیڑیوں کے دانت میرے بدن میں پہلی بار دھنسے تھے۔ اُن کے نشتر کی کاٹ مجھے یاد آ گئی تھی اور میرا خون پھر سے کھولنے لگا تھا۔ وہ لوگ ابھی تک اپنی مکروہ تجارت جاری رکھے ہوئے تھے اور میں ایسا بے غیرت تھا کہ ابھی تک جی رہا تھا حالانکہ میں نے اپنے لہو کی قسم کھا رکھی تھی کہ میں انھیں مہلت ملتے ہی صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر دوں گا ــ میں زخمے میں آئے ہوئے زخمی وحشی کی طرح سر جھٹک کر کرسی سے اٹھ گیا۔ میرے ذہن میں پھر ایک سُرخ آندھی چلنے لگی تھی، احتیاط، صبر اور تحمل کا دامن ایک بار پھر میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ آبی کہتا تھا مجھے اسی روز قربان علوی سے بات کر لینی چاہیے تھی۔ خدا جانے میں کیوں اس کی دہلیز سے چپ چاپ اُتر آیا تھا۔ میرے وہ تیرہ تیزی کے دن ابھی تک ختم نہیں ہوتے تھے۔ آبی میرے چہرے کی اس کیفیت کے رموز سمجھتا تھا وہ بھی میرے ساتھ ہی اُٹھ گیا یوں کہ کرسی اُس نے اپنے پیچھے بڑے غضبناک انداز سے گرا دی۔

مردان شاہ ہمارے اس رویے سے کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولا۔
"یہ کیا قصّہ ہے یار جی! تم تو بھڑک ہی اُٹھے ہو۔"
"بات ہی کچھ ایسی ہے مردان شاہ! وہ تیرا بھتیجا نہیں، ہمارا بھی بھتیجا ہے۔ وہ اُسے لُوٹ کر برباد کر چکے ہیں اور تجھے ابھی تک خبر نہیں ہوئی۔"
"مجھے کچھ بتلاتے تو ہو نہیں، خواہ مخواہ تم میری جان نکال رہے ہو۔"
"ڈاکٹر نے جمیل کو دیکھ لیا تو پھر تجھے معلوم ہو جائے گا مردان شاہ کہ ہوا کیا ہے۔"
میں اُسے اپنے ساتھ کھینچتا ہُوا باہر سڑک پر نکلا۔ آبی نے ٹیکسی روکی اور ہم ـــــــ بندر روڈ پر جا پہنچے۔ جمیل ورکشاپ میں موجود تھا مردان شاہ کو دیکھ کر وہ کام چھوڑ کر سڑک پر آ گیا۔
"یہ میرے دوست ہیں بیٹے! تمھیں ہم کسی ڈاکٹر کے پاس لے جا رہے ہیں۔ تیری صحت کے بارے میں یہ بھی بہت فکرمند ہیں۔" مردان شاہ نے علیک سلیک کے بعد اسے اپنی آمد کا مقصد بتایا وہ کچھ حیران سا ہو کر ہمیں یوں دیکھنے لگا جیسے وہ ہمیں پہچان لینے کی کوشش کر رہا ہو۔ "کیا ہوا ہے میری صحت کو چاچا! میں تو بھلا چنگا ہوں۔"
"یار تو اپنے یہ کپڑے بدل کر ہمارے ساتھ چل۔ تیرا ڈاکٹر کے پاس جانا بہت ضروری ہے جا یہ وردی بدل آ۔"
وہ انھی قدموں دکان کے اندر گیا اور اپنے دونوں شاگردوں کو ضروری ہدایتیں دیتا ہُوا کپڑے بدل کر ہمارے ساتھ آ بیٹھا۔ اسی سڑک پر کچھ ہی دور آگے مجھے ایک ڈاکٹر کا کلینک نظر آیا۔ میں نے ٹیکسی وہیں رُک لی۔
ڈاکٹر کا نام ظفر احمد تھا اور وہ دکان کے اندر موجود تھا اور مریضوں کے معائنے میں مصروف تھا۔ خود وہ الگ کیبن میں تھا۔ شیشے کے پردے میں سے اُسے دیکھ کر میں جمیل کو ساتھ لے سیدھا اس کیبن میں جا گھسا۔ مردان شاہ آبی اور تکریم احمد بھی میرے پیچھے آ گئے۔ ایک مریض اسی وقت باہر نکلا تھا۔
ڈاکٹر نے استفہامی نظروں سے ہمیں یوں گروہ کی صورت اندر آتے دیکھا تو وہ کچھ پریشان ہو گیا، بولا "خیر تو ہے بڈ مین! اپنی باری کا بھی انتظار نہیں کریں گے آپ!"
آبی نے جیب سے سو کا نوٹ نکال کر اسکے سامنے رکھ دیا۔ "بہت جلدی ہے ڈاکٹر صاحب اس لڑکے کا ہم ابھی معائنہ کروانا چاہتے ہیں ہمیں بتائیں کہ اس کے پیٹ کے اس آپریشن کا کیا مطلب ہے؟" جمیل کا دامن بنیان سمیت اٹھا کر آبی نے ڈاکٹر کو اُس کا پیٹ دکھا دیا۔
"کیا مطلب؟ یہ ـ ـ ـ یہ ـ ـ ـ میں باقاعدہ معائنے کے بغیر نہیں کہہ سکوں گا۔"
"تو پھر اسے آپ ابھی دیکھیں، یہ بہت ضروری ہے کیا اپینڈے سائٹس کا آپریشن ہے یا کچھ اور بات ہے؟"
"مریض کو تو معلوم ہو گا۔"
"جی نہیں! یہ بے ہوش تھا اسے کیا پتہ اس کے جسم پر پُرزے پر نشتر چلا ہے آپ کی فیس حاضر ہے ہم دُگنی فیس ادا کریں گے۔"
آبی کی یہ بات سن کر ڈاکٹر اُٹھا اور جمیل کو پہلو کے کمرے میں لے گیا۔ کوئی پندرہ منٹ ہم بالکل خاموش بیٹھے سگریٹ پھونکتے رہے۔ مردان شاہ ہمارے چہرے پر پھیلی وحشت دیکھ رہا تھا اور ہم سے بات کرتے بھی ڈرتا تھا۔ ہزاروں وسوسے اس کے دل میں اُٹھتے ہوں گے۔ اس کے وجود کے سارے ہی پتن گیہوں پس گئے اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ ہم اس کے بھتیجے کی صحت کے بارے میں اتنے فکرمند کیوں ہو رہے ہیں۔ مجھے اور آبی کو یقین تھا کہ اس بدنصیب کے ساتھ بھی وہی کچھ ہو چکا ہے جو میرے ساتھ اور میری بدبخت بہن آسیہ پر گزر چکا تھا۔ مردان شاہ کے ماتھے پر ایک شکن سی تھی، وہ بھی اس کی لکیروں کی زد میں آ گئی تھی۔ ان بیس منٹوں میں ہم نے اپنی ذہنی اذیت سے جان چھڑانے کے لیے دس سگریٹ پھونک ڈالے تھے کہ اُن کو آدھے آدھے مسل کر اس نے راکھدان میں

تکریم احمد بالکل خاموش رہا۔ خالی خالی آنکھوں سے وہ کیبن میں لٹکے بدن کے رموز واضح کرتے ہوئے اشتہاروں کو دیکھتا رہا۔ اُسے بھتیجے کی چوٹ کا ابھی تک صحیح اندازہ نہ ہو سکا تھا۔ اگرچہ ہم کچھ بتا چکے تھے مگر میرا یہ خیال ہے کہ اُس فریب کی سنگینی کا وہ احساس وہ نہیں کر سکا تھا۔
ڈاکٹر جب باہر آیا تو وہ کسی قطعی نتیجے پر پہنچ چکا تھا۔ بولا ــ "آپ کا کیا خیال ہے یہ آپریشن کس لیے کیا گیا تھا؟ یہ لڑکا تو کچھ نہیں بتا سکا۔" یہ کہہ کر وہ بڑے اطمینان سے کرسی پر بیٹھ کر سگریٹ سلگانے لگا۔
"اسی لیے تو ہم آپ کے پاس آئے ہیں ڈاکٹر! ہمیں کسی قطعی نتیجے پر پہنچنا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ پتے کا آپریشن نہیں تھا۔" اس نے میز پر کہنیاں ٹکاتے ہوئے کہا۔
"ہاں آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ اس جوان کا دایاں گردہ نکال لیا گیا ہے۔"
یہ بات سُنتے ہی مردان شاہ کی عقل اُڑ گئی۔ وہ میز پر ہاتھ مار کر بولا "یہ کیسے ہو سکتا ہے ڈاکٹر جی! اس کا گردہ خراب ہوتا تو وہ اسے بتا دیتے۔"
"میں کیا کہہ سکتا ہوں جناب! یہ تو آپ جانیں اور آپکا ڈاکٹر۔"
"تھینک یو ڈاکٹر! ہم یہی معلوم کرنا چاہتے تھے۔ کیا اس کا زخم مندمل ہو چکا ہے؟"
"نہیں۔ کوئی خرابی رہ گئی ہے۔ اس کے ٹانکوں سے کچھ مواد خارج ہوتا ہے وہ غالباً اس زخم کی سوزش ہے، ابھی تک اس کا درد بھی پوری طرح دور نہیں ہُوا۔"
"کیا یہ صحیح ہے بیٹے؟"
"ہاں چاچا! کبھی کبھی یہاں ٹیس اُٹھتی ہے مگر میں اسے دبا ہی جاتا ہوں۔"
"آپ اس کا علاج کریں ڈاکٹر! جتنے بھی پیسوں کی ضرورت ہو گی ہم دیں گے یہ پانچ سو تو ابھی رکھ لیں تم ابھی ادھر ہی بیٹھو مردان شاہ! اپنے اس بھتیجے کے ساتھ اور ان سے دوا لے کر واپس آؤ، ہم شام کو تمھیں ورکشاپ پر ملیں گے۔"
مردان شاہ میری یہ بات سن کر اور میرے ہاتھ سے نکل کر ڈاکٹر کے ہاتھ میں جاتے پانچ سو روپے کے نوٹ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا، بولا۔ "یہ تو ـ ـ ـ تم کیوں اتنی تکلیف کرتے ہو میں اس کے علاج کے پیسے خود دوں گا۔"
"کوئی بات نہیں مردان شاہ! یہ ہمارا بھی کچھ لگتا ہے، اچھا خدا حافظ۔" یہ کہہ کر میں نے آبی اور تکریم احمد کو اپنے ساتھ لیا اور اسی وقت سڑک پر پہنچ کر ہم ایک ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔
"تکریم احمد! وہ دو آدمی جو آپ کے جاننے والے تھے، غائب ہو گئے تھے حادثے میں زخمی ہونے کے بعد اُن کا کچھ پتہ چلا آپ کو؟"
"ہاں! وہ تو میں آپ کو بتانا ہی بھول گیا۔ وہ ادھر جناح ہسپتال میں ہیں۔ دونوں کی ٹانگوں پر پلستر چڑھا ہوا ہے اور ان دونوں کے پیٹ پر بھی پٹیاں بندھی ہیں۔ میں تو بتانا ہی بھول گیا۔ کوئی دس دن بعد اُن کے بارے میں ہسپتال والوں نے فردوس بیگم کو اطلاع دی تھی۔"
"کیا مطلب ہے آپ کا؟ کیا وہ دس دن بعد ہسپتال پہنچے تھے؟"
"ہاں! انھوں نے بتایا تھا کہ وہ کسی اور ہسپتال میں زیرِ علاج رہے ہیں مگر وہ اس کا نام نہیں بتا سکتے۔ انھیں کچھ خبر ہی نہیں ہے۔ کوئی ڈاکٹر تھا وہاں۔ اس کا بھی نام وہ نہیں بتا سکے۔ اسی نے اُن کا علاج کیا تھا۔ اس ڈاکٹر نے انھیں بتایا تھا کہ اُن کے پیٹ پھٹے ہوئے تھے۔ حادثے کی وجہ سے وہ سب کچھ ہو گیا تھا۔"
"اُن سے ہمیں ملوا سکتے ہیں آپ؟"
"ہاں، کیوں نہیں! اب تو وہ بیساکھیوں پر چل پھر بھی لیتے ہیں۔ اُن کے پیٹ کے زخم تو بالکل ٹھیک ہو چکے ہیں البتہ ٹانگوں کے پلستر ابھی شاید ایک ماہ تک نہ اُتر سکیں۔"
"تو پھر چلیں ہمیں اُن کے پاس لے چلیں۔"
"ہاں، کیوں نہیں! مگر اُن سے مل کر کیا کریں گے آپ؟"
"چلیں تو سہی۔" یہ کہہ کر میں نے ڈرائیور کو جناح ہسپتال کی طرف چلنے کے لیے کہا۔
کچھ ہی دیر بعد ہم اُن بدنصیبوں کے سامنے بیٹھے تھے جن میں سے ایک کا نام وہاب تھا اور دوسرے کا عارف۔
تکریم احمد نے اُن سے ہمارا تعارف کروایا تو وہ بہت خوش ہوئے وہ سمجھے ہم ازراہِ ہمدردی اُن سے ملنے چلے آئے ہیں۔
عارف بولا "ہم آپ کے شکرگزار ہیں جناب کہ آپ کو ہمارا اتنا خیال ہے۔"
"تکریم احمد آپ کے دوست ہیں عارف صاحب ہمیں بھی آپ اپنا ہمدرد سمجھیں، آپ کی ٹانگ کا کیا حال ہے اب؟" وہ وہاب کے مقابلے میں زیادہ ہشاش بشاش اور صحت مند نظر آتا تھا۔ جُثہ اس کا بھی ایسا ہی تھا۔ خاصا اونچا لمبا جوان تھا وہ اور بے فکر بھی۔ سگریٹ وہ دبا کے پیتا تھا اور ہر وقت مسکرانے کا عادی تھا۔
"ڈاکٹر کا خیال ہے کہ بس ہم پندرہ دن میں یہاں سے فارغ ہو جائیں گے دراصل ہمارے پیٹ میں لوہے کی سبلوں کا ٹوٹا ہُوا اینگل آئرن لگ گیا تھا جس کی وجہ سے میرا دایاں گردہ کچلا گیا تھا اور وہاب کا بایاں۔"
"یہ کیا ـ ـ ـ کیا کہہ رہے ہیں آپ! کیسے معلوم ہوا آپ کو کہ آپ کے گردے کچلے گئے ہیں؟"
"وہ دراصل جس کلینک میں ہمیں پہلی بار حادثے کے بعد لایا گیا

تھا وہاں کے ڈاکٹر نے ہمیں یہی بتایا تھا۔ اس کی تشخیص یہ تھی کہ دونوں گُردے بیکار ہو چکے ہیں ان کا نکال دینا ہی بہتر ہے۔"

"اچھا پھر؟ پھر کیا ہُوا؟" میں نے بے صبری سے پوچھا

"پھر کیا، اب ہم دونوں ایک ایک گُردے پر جی رہے ہیں۔ یہ صاحب بڑے کمال کا ڈاکٹر تھا وہ۔ اُس نے ہمارا ایسا علاج کیا کہ ہمارے آپریشن کے زخم بس دس دن میں مندمل ہو گئے۔"

"اس ڈاکٹر کا نام معلوم ہے آپ کو؟"

"جی نہیں۔ سب اُسے ڈاکٹر ڈاکٹر ہی کہتے تھے۔ ادھیڑ عمر کا آدمی ہے وہ۔" یہ کہہ کر اُس نے جو حلیہ مجھے اس کے بارے میں بتایا وہ صاف طور پر ڈاکٹر دِھن ہی کی عکاسی کرتا تھا۔

"آپ کو یاد ہے کہ وہ کلینک کہاں ہے؟"

"نہیں۔ ہمیں تو اس کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہے جناب! البتہ جب وہ ہمیں وہاں سے نکال کر یہاں لا رہے تھے تو راستہ دیکھ کر مجھے احساس ہُوا تھا کہ وہ کلینک ایک ایسی جگہ پر واقع ہے جس کے قریب سے ریلوے لائن گزرتی ہے۔ گاڑیوں کی چھک چھک کی آوازیں بھی مجھے یاد ہیں۔ وہ کوئی دُکان تو تھی نہیں ایک خاصی بڑی کوٹھی تھی۔ ہمیں وہ جب ایمبولینس میں ڈال رہے تھے تو ان کا خیال شاید یہ تھا کہ ہم ہوش میں نہیں ہیں مگر مجھے کافی ہوش تھا۔ اس کوٹھی کے گیٹ پر سات سو چھیاسی لکھا تھا۔ سفید سنگِ مرمر کی سِل پر یہ حروف لکھے تھے۔ جب ہم باہر نکلے تو کچھ دیر تک ہم سڑک کے ساتھ ساتھ کچھ فاصلے پر کسی ریل گاڑی کے چلنے کی آواز سُنتے رہے۔ پھر کچھ دُور جا کر مجھے ہوائی اڈے کی عمارت نظر آئی۔ میرا خیال ہے کہ ہم ادھر ہوائی اڈے کی طرف کسی جگہ زیرِ علاج رہے تھے۔"

"ہوں! آپ کو رات کے وقت وہاں سے نکالا گیا تھا؟"

"ہاں، شام کا جھٹپٹا پھیل رہا تھا، دو آدمی ہمارے ساتھ آئے تھے۔ وہ ہمیں ایمرجینسی وارڈ میں چھوڑ کر اسی وقت واپس چلے گئے۔ ہماری ٹانگوں پر پہلا پلستر انھوں نے اپنے کلینک میں ہی لگایا تھا مگر یہ بعد میں بدلنا پڑا۔ کیونکہ ہمارا درد ختم نہیں ہوتا تھا۔ ہڈیاں صحیح نہ جڑ سکی تھیں۔" عارف نے اپنی یادداشت پر بوجھ ڈالتے ہوئے کہا۔

"آپ کو کسی نرس، کسی ڈاکٹر، کسی لیڈی ڈاکٹر کا نام تو یاد رہ گیا ہوگا؟"

"ہمیں ان دنوں کی تو کوئی بھی بات یاد نہیں ہے صاحب! ہم پر تو بس ہر وقت نیم بے ہوشی سی طاری رہتی تھی پھر بھی ہم ان کے احسان مند ہیں کہ انھوں نے فی سبیل اللہ ہمارا علاج ایسے وقت میں کیا کہ اگر دیر ہو جاتی تو ہم زندہ نہ بچ سکتے تھے۔"

اس گو کھے کو احساس تک نہ ہو سکا تھا کہ انھیں بے ہوشی کی حالت میں سڑک پر سے اٹھا کر ان بدمعاشوں نے کتنے سنگین مراحل سے انھیں گزار دیا تھا اور وہ اُلٹا اپنے ذہن میں اُن کی نوازشوں کا نقشہ قائم کیے بیٹھا تھا۔ وہاب دُوسرے پلنگ پر بالکل خاموش لیٹا ہماری باتیں سُن رہا تھا۔

اور مجھے یقین ہو چلا تھا کہ صورتِ حال کا اُسے بھی کوئی علم نہیں۔ یہ دونوں گھامڑ تھے مگر جن لوگوں نے اُن کے جسموں پر نشتر چلائے تھے وہ تو مُستند حِیل تھے کہ بڑے بڑوں کے پیٹ وہ چاک کر گئے اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی۔

"آپ سن رہے ہیں نا تکریم صاحب! یہ بھی انہی لوگوں کی چھُری سے کٹے ہیں جن کا شکار وہ جمیل ہو چکا ہے۔" آبی نے بجھی بجھی ہوئی آواز میں کہا۔

"میں سمجھ رہا ہوں بھائی جی! سب کچھ سمجھ رہا ہوں۔ مگر ان لوگوں کا ٹھکانہ بھی تو معلوم ہونا چاہیے۔"

"وہ ہم ڈھونڈ لیں گے آپ تو اپنے فلیٹ پر جائیں اور آرام کریں۔" میں نے تکریم احمد کو اس جھمیلے سے الگ رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ اس ریشے کا نہیں بنا ہوا تھا جو اتنی ساری سختیاں سہہ سکتا۔

"مجھے فکر لگی رہے گی بھائی جی! میرا آپ کے ساتھ جانا ضروری ہے۔"

آبی اپنی جگہ سے اٹھ کر تکریم احمد سے مخاطب ہو کر بولا "نہیں کوئی "چوچے" تھوڑی ہیں ہم۔ اور تم عارف میاں اتنے بدھو ہو۔ تم دونوں کے گردے ان لوگوں نے صحیح سالم حالت میں نکال کر کہیں بیچ لیے ہوں گے وہ جھوٹ بکتے تھے کہ تمھارے گردے بیکار ہو گئے۔ مگر تمھیں احساس ہی نہیں ہو سکا۔ وہ تم جیسے خدا جانے کتنے لوگوں کو برباد کر چکے ہیں۔" آبی نے عارف کے اوپر سے اطمینان کی چادر کھینچتے ہوئے کہا۔

عارف مسکرانے لگا ایسی سادگی سے مسکرانے لگا کہ میں بھی حیران رہ گیا، بولا "آپ کا خیال صحیح نہیں ہے جناب! وہ تو بڑے ہمدرد اور خدا ترس لوگ ہیں۔ انھوں نے ایسے وقت ہمارا علاج کیا جب ہمارے بچ جانے کی کوئی امید نہیں تھی۔"

"بس آپ کی سادگی اُن کے کام آ گئی۔ بہرحال آپ سے جلد ملاقات ہو گی اور ہو سکتا ہے آپ کو ہم دو چار لاکھ روپیہ ان سے دلوا ہی دیں اور خان جی اب ہم چلتے ہیں۔"

عارف کے وجود کی پاسی شاید کٹنے لگی تھی۔ اسے ہماری باتوں پر اعتبار نہیں آ رہا تھا اور مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اندر سے بکھر رہا ہے بولا "خدا کے لیے ہمیں بتائیں کہ یہ بات آپ کس بنا پر کہہ رہے ہیں۔ اگر یہ سچ ہے تو پھر ہم سے زیادہ بدنصیب اور کوئی نہ ہو گا۔"

"پریشان نہ ہوں ایک گُردے پر بھی آرام سے جی لیں گے۔ اُن کے وارے نیارے ہو رہے ہیں۔ ایک گردہ آج کل وہ کم سے کم لاکھ میں بیچتے ہوں گے، بہرحال بے فکر رہیں آپ کا حق ہم آپ کو دلا کر رہیں گے۔" یہ کہہ کر میں اُن دونوں کو حیران پریشان چھوڑ کر پیچھے ہٹا تو آبی نے عارف کے قریب ہو کر کہا۔ "ہماری ان باتوں کا کسی سے ذکر نہ کرنا بہت ضروری ہے ورنہ ہم اُن لوگوں تک کبھی نہ پہنچ سکیں گے۔"

یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ہمارے ساتھ ہسپتال سے باہر آ گیا۔ تکریم احمد کو اس کے اصرار کے باوجود ہم نے اسی وقت فلیٹ پر بھیجنا چاہا، یہ کہہ کر وہ اسی علاقے میں ہمارے لیے کوئی عمدہ سی کوٹھی کرائے پر لے رکھے خواہ اس کا کرایہ دس ہزار روپے مہینہ کیوں نہ دینا پڑے۔ اس نے حیرانی تو بہت ظاہر کی مگر ہم نے اس کی وجہ نہیں بتائی۔

وہ ہمارے ساتھ آگے جانے پر بضد تھا، بولا "یہ کوٹھی آپ کو کس مقصد کے لیے چاہیے؟"

"ابھی تو ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ وہ پرندے ہمارے ہاتھ آ گئے تو پھر ہم کچھ بتا سکیں گے بہرحال وہ کوٹھی آپ اپنے نام پر لے لیں۔ یہ بہت ضروری ہے۔"

آبی نے اس عرصے میں ایک ٹیکسی روک لی تھی۔ "آپ اس میں بیٹھ جائیں تکریم صاحب اور ہمارے لیے دعا کریں۔"

تکریم احمد بادلِ ناخواستہ اس میں بیٹھا اور طارق روڈ کی طرف چل دیا۔ اس کی ٹیکسی نظروں سے اوجھل ہوئی تو ہم کچھ دیر تک یونہی بے خیالی میں سڑک کے کنارے پیدل ہی چلتے رہے۔ آبی کسی گہری سوچ میں گم تھا، بولا "ایک بات پوچھوں جیلانی! تُو نے اس لاکھو لاشاری کی باتیں سن لینے کے بعد سے آسیہ کے بارے میں کوئی بات نہیں کی آخر وجہ کیا ہے تُو اس کے معاملے میں خاموش کیوں ہو گیا ہے؟"

"یہ بات تو تجھے بہت پہلے پوچھنی چاہیے تھی آبی! بہرحال میرا یہ خیال ہے کہ آسیہ کو اب زندہ رہنا آ گیا ہے جب سے میں نے یہ سُنا ہے کہ اس نے لاکھو کے دو آدمی مار کر آزادی حاصل کر لی تھی جب سے میرا دل مطمئن سا ہو گیا ہے اور مجھے یقین ہو گیا ہے کہ اب وہ اپنی حفاظت کر سکتی ہے۔ وہ اب کسی بہت ہی محفوظ جگہ پر ہو گی۔"

"یہ تو کس طرح کہہ سکتا ہے؟ وہ ہے تو بہرحال عورت ذات۔"

"تو ٹھیک کہتا ہے آبی! مگر میرے یار اتنے سارے زخم سہنے کے باوجود اگر اسے عقل نہیں آئی تو پھر کب آئے گی۔ اس نے لاکھو لاشاری کے ہاں پہلی بار اپنے ہاتھوں کی قوت کا تماشہ دیکھا ہو گا۔ لاکھو پہلا آدمی ہے جو اس کی محبت میں گرفتار ہوا، وہ اسے دل سے چاہتا ہے۔ اس کے آنسو مگر مچھ کے آنسو نہیں تھے، اسی لیے میں نے اس پر ہاتھ نہیں اُٹھایا۔ وہ ۔۔۔ وہ مجھے اچھا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ اور ۔۔۔ اور آسیہ کسی دن لوٹ کر اس کے گھر ضرور جائے گی اور میں اُسے وہیں جا ملوں گا۔"

"ہاں میرا اندازہ بھی یہی ہے مگر ہم اس کو یوں غیر یقینی حالات کے سپرد تو نہیں کر سکتے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے آبی! مگر یوں اندھیروں میں بھٹکنے کا فائدہ؟ پہلے ان لوگوں سے نبٹ لوں، پھر میں اپنے ماموں کے پاس جاؤں گا، اس کو اس گاؤں کا راستہ معلوم ہے وہ تین چار دفعہ وہاں جا چکی ہے

میرا اندازہ ہے کہ اپنے اُجڑے گھر میں جھانکنے کے بعد سیدھی وہاں گئی ہو گی اور اسی امید پر میں خاموش ہو گیا ہوں۔"

"خدا کرے وہ ماں جی کے پاس جا پہنچی ہو، بچے کے بارے میں کوئی بھی بات بنا سکتی ہے۔"

"ہاں! اتنی عقل تو اُسے آ گئی ہو گی۔ وہ تو خدا جانے کتنے خوفناک سبق پڑھ چکی ہو گی آبی۔ وہ جیل میں رہ چکی ہے۔ اتنا عرصہ اُس نے بدترین قسم کے لوگوں میں گزار دیا ہے وہ تو خدا معلوم کیا چیز بن گئی ہو گی۔" میں نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ آسیہ کے شب و روز کیوں کر گزرتے ہوں گے۔ وہ ایک موہوم سی آس تھی۔ ایک غالب آرزو کہ وہ اپنی حفاظت کا گُر سیکھ چکی ہو گی۔ اسے وار کرنا اور وار سے بچنے کا طریقہ آ گیا ہو گا۔ میں اُسے ایسی شہ زور عورت کے رُوپ میں دیکھنے لگا تھا جو ہوا کی لہروں میں ابتری پھیلا سکتی تھی۔ میں نے جب سے سُنا تھا کہ اس نے کھلی آنکھوں اپنے پستول کی گولیوں سے لاکھو کے دو آدمی مار دیے تھے اور وہ اس کے ہاں سے تیس ہزار روپے لے کر حویلی سے باہر نکلی تھی اور اسی کے گھوڑے کو اس نے اپنا مرکب بنا لیا تھا تو اس وقت سے میں دل ہی دل میں خود کو بے حد خوش اور مطمئن محسوس کر رہا تھا کیونکہ میں اسے کسی ایسے ہی رُوپ میں دیکھنا چاہتا تھا۔ کوئی تو لمحہ ایسا آنا چاہیے کہ مظلوم پُورے قد سے اُٹھ کر ظالم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُسے للکار سکے۔ مار کھا لینا اور مسلسل مار کھاتے رہنا تو کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔ آدمی بھی زمین بن جائے تو سارا جہان اس کی پُشت پر من مانی کرتا چلا جائے گا۔ اس کو ہر قدم روندتا ہُوا آگے بڑھے گا۔ زمین میں یہ قدرت ہی نہیں ہے کہ پاؤں سے نکل کر آدمی کے سر پر جا چڑھے مگر انسان کی یہ تقدیر نہیں ہے اور یہی میری آرزو تھی کہ آسیہ کسی نہ کسی دن تو اُٹھ کر اپنے دشمن کے گریبان پر ہاتھ ڈال دے کوئی لمحہ تو ایسا آئے کہ وہ اپنے تیز نوکیلے ناخن اس کی آنکھوں میں گاڑ دے اور اب مجھے یقین تھا کہ وہ یہی کچھ کر رہی ہو گی۔"

اس وقت تک ہم لبِ سڑک کھڑے ایک ہاکر کے پاس جا پہنچے تھے۔ آبی نے یُونہی بے ارادہ ایک اخبار خرید لیا۔ قریب ہی ایک بڑھی والا گنّے کا تازہ رس بیچ رہا تھا۔ ٹھنڈا یخ تازہ گنّے کا رس دیکھ کر میں نے دو گلاس بھروا لیے۔ ایک میں نے آبی کو دیا مگر وہ اخبار کے مطالعے میں مصروف تھا۔ میری بات کا اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے کہا "ٹھیک ہے بچے! عیش کر۔" دونوں گلاس میں ہی چڑھا گیا۔ آبی اس وقت کسی خبر کے مطالعے میں کچھ یُوں ڈوبا ہُوا تھا کہ اسے کسی بات کا ہوش ہی نہیں تھا۔ میں نے تیسرا گلاس بھروا لیا اور کہا "آبی! یہ رس تو پی لے یار! کوئی تیرے بارے میں خبر چھپی ہے اس میں؟"

گلاس میں لے کر اس کے پاس جا پہنچا تھا۔ وہ کسی گہرے خیال

میں گم تھا میری طرف دیکھے بغیر بولا "یار! وہ کیا نام تھا اس جھانویں ڈاکٹر کا، وہ جو راولپنڈی جیل میں کام کرتا تھا۔" یہ کہہ کر اس نے اخبار میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ "وہ لاکھو بھی اس کے بارے میں کچھ کہہ رہا تھا۔ یہ خبر تو پڑھ، ذرا یہ والی۔" یہ کہہ کر اس نے کچھ ایسی بے خیالی میں گنے کے رس سے بھرا گلاس میرے ہاتھ سے لیا کہ اس پر سے ہم دونوں کی گرفت بیک وقت ڈھیلی پڑی اور وہ فرش پر گر کر چکنا چور ہو گیا۔

"کیا بکواس ہے یار! یہ گلاس ہی ٹوٹ گیا سالا۔"

"یہ کیا کر دیا بھائی جی! چھ روپے کا گلاس بھی برباد کر دیا آپ نے۔" ریڑھی والا پریشان ہو کر ہماری طرف بڑھا۔

"ابے تیرا رنگ کیوں پیلا ہو رہا ہے میرے یار! گلاس ہی ٹوٹا ہے کوئی تیرا سر تو نہیں ٹوٹ گیا۔" میں نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں بھئی! اور لے آئیں گے بازار سے گر ٹوٹ گیا۔"

"یہ کوئی معمولی گلاس نہیں تھا جناب! فرانس کا بنا ہوا گلاس تھا۔ آپ کو تو اس کے دام دینے ہوں گے۔" وہ ریڑھی والا بڑے ہی تیکھے اور تُرش لہجے میں بولا۔

"اور اگر ہم نہ دیں تو؟" آبی نے اس کو مخصوص نظر سے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ ریڑھی والا شخص کوئی ستم رسیدہ شخص تھا۔ آبی کی بدلی ہوئی خوفناک نظر اسے اندر سے دہلا گئی۔ وہ وہیں رُکا اور پھر بیلن میں گنا پھنسا کر ہتھی چلانے لگا۔ آبی کو اس کی وہ شکست خوردہ مراجعت بھا گئی، بولا "بھیّا یہ لو ناراض نہ ہو، یہ لو ہم تجھے تیس روپے دیتے ہیں۔ یہ لو چھ گلاس خرید لینا۔"

یہ کہہ کر اس نے دس دس کے تین نوٹ اُس آدمی کے سامنے ڈال دیئے، وہ گنگ ہو کر رہ گیا۔ کبھی وہ آبی کو دیکھتا تھا اور کبھی اُن نوٹوں کو۔ اس وقت تک اس نے دو اور گلاس رس سے بھر دیے تھے۔ آبی نے باری باری وہ دونوں حلق سے نیچے اتار لیے اور مونچھوں کو پونچھتا ہوا بولا۔ "آؤ خان جی! اب آگے بھی بڑھو۔"

میں اُس کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا اخبار کو دیکھنے لگا تھا، مگر وہ خبر مجھے ابھی تک نظر نہیں آئی تھی جس کی طرف اُس نے اشارہ کیا تھا۔ بڑے غصے میں بولا "یار! تیرے خاندان میں کبھی کسی نے اخبار پڑھا ہو تو تجھے پڑھنا آئے، یہ دیکھ یہ تین کالمی سُرخی ہے، یہ ۔۔۔۔ اور تصویر بھی چھپی ہے مقتول کی۔"

اب جو اُس خبر پر میری نظر پڑی تو میں حیران رہ گیا معلوم یہ ہوا کہ راولپنڈی جیل کے ڈاکٹر مقبول احمد کو کسی عورت نے شام اُس کے بنگلے پر جا کر گولیاں مار کر ہلاک کر دیا ہے۔ عورت جو سیاہ برقعے میں ملبوس تھی بنگلے کے ایک ملازم کو بھی زخمی کر گئی۔ اس ملازم نے یہ بیان دیا ہے کہ وہ عورت حاملہ تھی، اس کے حلیے اور چال سے یہی معلوم ہوتا تھا۔ وہ ڈاکٹر سے مشورے کے بہانے بنگلے میں آئی اور جب ڈاکٹر کے کمرے میں گھسی اُس نے جاتے ہی مقبول احمد کے سینے میں پستول کی چار گولیاں اتار دیں۔ اور پھر وہ پستول لہراتی ہوئی اطمینان سے واپس چل دی۔ مقبول احمد کے ملازم رسول بخش نے اس کو للکارا تو مڑ کر اُس کی ٹانگ پر گولی چلا دی۔ اُس عورت نے ڈاکٹر کے بنگلے سے کچھ ہی دور ٹیکسی روک رکھی تھی۔ رسول بخش کو زخمی کر کے وہ بھاگتی ہوئی بنگلے سے نکلی اور فاصلے پر کھڑی ٹیکسی میں جا بیٹھی۔ پیشتر اس کے کہ ڈاکٹر مقبول احمد کے بیوی بچے اس بارے میں کچھ جان سکتے، وہ فرار ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر مقبول احمد بہر حال مرنے سے پہلے سامنے پڑے کاغذ پر ایک لفظ لکھ گیا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قاتلہ کا نام آسیہ ہے۔ مقتول نے نزع کے عالم میں بھی حیرت انگیز قوت ارادی سے کام لے کر قاتلہ کا نام بتا دیا تھا۔ پولیس ملزمہ کی تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مار رہی ہے۔ معلوم یہ ہوا ہے کہ ملزمہ وہی آسیہ ہے جو کچھ عرصہ پہلے چند بدمعاشوں کی مدد سے راولپنڈی جیل سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ پولیس کے حکام ابھی تک اس قتل کی وجہ کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ ڈاکٹر مقبول نے اُس عورت سے اُس کی قید کے دوران قریبی تعلق پیدا کر لیا تھا اور اب وہ اپنی ذمے داریوں کو نبھانے سے کترا رہا تھا کیونکہ وہ پہلے ہی شادی شدہ تھا اور تین بچوں کا باپ بھی۔

اخبار نے وہ خبر بڑی تفصیل سے شائع کی تھی اور اس کا ایک ایک لفظ اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ وہ عورت میری آسیہ ہی تھی اور اُس نے اپنی ذلت کے پہلے محرک سے موقع پر ہی خوفناک انتقام لے لیا تھا۔ لاکھو لاشاری کی جھولی میں آسیہ کو اس ڈاکٹر مقبول احمد نے ہی ڈالا تھا۔ اُسی کی مدد سے لاکھو لاشاری کا جیل سے فرار بھی ہو سکا تھا۔

میں اس خبر کو پڑھ کر سڑک کے کنارے اُگے ایک خوبصورت بوتل پام کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ ایک عجیب طرح کا سکون مجھے اپنے سینے میں اترتا محسوس ہو رہا تھا یوں جیسے میری کوئی بڑی آرزو پوری ہو گئی ہو۔ آبی ایک دن پہلے مجھ پر طعنہ زنی کر کے اس بات پر آسیہ کو بھی ہدف تنقید بنا رہا تھا کہ وہ اپنے مخالفین کے خلاف اب تک کسی کے خلاف انگلی تک نہیں اٹھاتی۔ وہ موم کی بنی ہوتی ہے، تو ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ چیونٹی بھی پاؤں تلے آئے تو کاٹ لیتی ہے وہ تو پھر تمہاری بہن ہے جیلانی بدمعاش کی بہن، اُس جیلانی کی جس نے بڑے بڑوں کو نتھ ڈال دی ہے، کچھ بھی ہو پھر وہ کیوں اتنی ساری ذلتیں چپ چاپ سہہ جاتی ہے۔

"یہ بہت اچھا ہوا ہے آبی! پہلی بار آسیہ نے ثابت کیا ہے کہ وہ میری بہن ہے اور ہماری رگوں میں ایک ہی خون جاری ہے۔"

اس نے اب کی بار خود دو سگریٹ سُلگا کر ایک آبی کے حوالے کر دیا۔ سگریٹ کا فلٹر والا حصہ میں نے اچھی طرح گیلا کر دیا تھا۔ کچھ تو بدلہ مجھے چکانا ہی چاہیے تھا۔ مگر وہ بہت کائیاں آدمی تھا۔ سگریٹ کو لیتے ہی میری کارروائی کو سمجھ گیا۔ اس نے یوں کیا کہ اُس کا فلٹر سگریٹ سے علیحدہ کر کے پھینک دیا، بولا "استادوں سے یوں جیت سکو گے۔ برخوردار! بہر حال یہ خبر پڑھ کر مجھے بھی دلی خوشی ہوئی ہے۔ اس نے بہت ہی اچھا کیا ہے اس کو یہی کرنا چاہیے تھا۔"

"آہستہ بول یار! کوئی سن ہی نہ لے۔ چل میں اسی خوشی میں تجھے کسی انٹر نیشنل ہوٹل میں کھانا کھلاتا ہوں۔"

"یہ کون سا ہوٹل ہے؟ تیرے چاچے نے کھولا ہے کہیں؟" اس نے سگریٹ کا گہرا کش لیتے ہوئے نتھنوں سے ڈھیر سارا دود دھار دھواں نکال کر کہا۔

"آج میں بہت خوش ہوں آبی! اتنا خوش کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ وہ جو انتقام لے لیتا ہے وہ بھی فطرت کے مقاصد کی تکمیل ہی کرتا ہے، اللہ کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ منتقم ہے، بہت بڑا اور زبردست منتقم۔ وہ چاہے تو چیونٹی سے ہاتھی کو مروا سکتا ہے۔"

یہ کہہ کر میں نے اخبار لپیٹا اور ایک ٹیکسی رکوا کر آبی کو اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ "ہمیں تو اُدھر ہوٹل لے چل میرے یار! آج ہم ۔۔۔۔ دنیا اپنی دعوت کرنا چاہتے ہیں کیوں پیرزادہ صاحب! اسی اخبار میں اشتہار ہے اُس کا، یہ دیکھیں۔" میں نے ایک بڑے ہوٹل کا نام لیتے ہوئے کہا۔ ٹیکسی ڈرائیور کچھ نہیں بولا۔ اُس کے منہ پر سنجیدگی کی پھٹکار برستی نظر آتی تھی۔ یا تو وہ بیوی سے پٹ کر آیا تھا یا تقدیر کا شاکی تھا۔ وہ قطعاً خوش دکھائی نہیں دیتا تھا۔ آبی نے اخبار میرے ہاتھ سے جھپٹ لیا اور مقبول احمد کی تصویر دیکھنے لگا۔

وہ اس کی میت کی نہیں بلکہ اُس کی زندگی کے دوران کھینچی ہوئی تصویر تھی جس میں وہ خاصا طرحدار اور صحت مند جوان نظر آتا تھا اور آسیہ نے اس کا سینہ اپنے انتقام کی گولیوں سے چھلنی کر دیا تھا۔ وہ سالا پتہ نہیں جیل میں اپنے بے پناہ اختیارات کے بل بوتے پر کس کس کو کس حد تک ذلیل کر چکا تھا۔ کتنی بے بس اور معصوم عورتیں اس نے سفلوں کے حوالے کر دی ہوں گی۔ کتنے بے گناہ اور کچلے قیدیوں کی مجبوریوں سے اس نے کتنے زبردست فائدے اٹھائے ہوں گے۔ وہ ان درندوں میں سے ایک تھا جو جیل کی معمولی نوکریاں کرتے کرتے جب بڑے بڑے ہو جاتے ہیں تو کھ پتی بن چکے ہوتے ہیں۔ مجھے اس کی موت پر دلی خوشی ہو رہی تھی۔ وہ اس سے بھی زیادہ خوفناک سزا کا مستحق تھا۔

جس ہوٹل میں ہم جا بیٹھے تھے وہ خالصتاً سرمایہ داروں کی ذہنی تسکین کے لیے گوشۂ عافیت مہیا کرتے ہیں۔ وہ لوگ جو لمبے پیسے کما کر اپنے گھروں سے باہر نکلتے ہیں تو وہ گھروں کو نہیں لوٹتے، سیدھے ایسے آرام خانوں میں جا بیٹھتے ہیں جہاں چوروں سے کپڑے لاکھیٹوں کے گندوں سے ناپ کرا کے پونے داموں خریدے جاتے ہیں جس حساب سے وہ لوگ سرمایہ داروں سے بل وصول کرتے ہیں اس سے تو میں نے اور آبی نے یہی اندازہ لگایا کہ وہاں پلیٹ میں رکھی ایک مربع انچ بوٹی کئی روپوؤں میں پڑتی ہے۔ الحمدللہ کہ ہم بھی بے دریغ پیسہ خرچ کرنے والوں میں شامل تھے کیونکہ اس کو کمانے میں تو ہم نے ایک تنکا کبھی دُہرا نہیں کیا تھا۔ ہم شاید وہاں بیٹھنے والے تمام لوگوں میں سب سے زیادہ بے فکرے تھے۔ آبی بڑھ بڑھ کر آرڈر دیتا رہا۔ اپنی میز اس نے الا بلا چیزوں سے یوں بھر لی جیسے بھر اس کے بعد ہمیں بس مرجانا ہے اور وہ ہمارے حصے کے رزق کا آخری جُرعہ تھا جو ہم نے اپنے سامنے رکھ لیا تھا۔

ہوٹل کے اندر اس حصے میں جہاں ہم بیٹھے تھے کرشن یکسر ایسا نیم اندھیرا پھیلا تھا چاروں طرف بھینی بھینی صبح کی شبنمی فضا کا احساس دلاتی ہوئی عجیب سی خوشگوار اور سکون پرور خوشبو رچی ہوئی تھی۔ روشنی بڑے بڑے خوبصورت پرتگیزی شمعدانوں سے مستعار لی گئی تھی مگر وہ روشنی اپنے ارد گرد بیٹھے خوبصورت جوڑوں کے دلوں میں اندھیر مچاتی چلی جاتی تھی۔ یخ سازوں نے ماحول کو یوں ٹھنڈا کر رکھا تھا جیسے کسی پری وش نے کسی درد رسیدہ کے دل پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ ہلکی ہلکی موسیقی کی دھن یہ احساس دلاتی تھی کہ ہم برزخ سے نکل کر ابد آباد تک معطر رہنے والی لہلہاتی بہشت میں داخل ہو چکے ہیں۔ گاہکوں کے اُس ذی شان کوچے کو وہاں کے نوکر دوڑ دوڑ کر سلام کرتے تھے۔ اُن کے سامنے بچھے جاتے تھے اور وہ نظر نہ آنے والا موسیقار ٹھہر ٹھہر کر ایسی دلدوز دھن چھیڑ دیتا تھا کہ بڑی بڑی سجی سنوری میزوں کے گرد نیم تاریک روشنی میں بیٹھے جوڑے جدائی کے خیال سے سہم کر ایک دوسرے میں اور زیادہ مدغم ہونے میں مصروف ہو جاتے تھے۔

وہ شہر ایک بہت بڑے سمندر کے کنارے پر آباد ہے۔ وہ کراچی وہ عروس البلاد سارے ملک کی شریانوں کا لہو جس کی جانب رواں رہتا ہے اور جہاں سے سارے ملک کو زندگی بخش خون مہیا ہوتا ہے۔ اُس شہر کے ایک خاموش اور پُرسکون کونے میں آباد اس ہوٹل میں داخل ہونے کے بعد ہم بھول ہی گئے کہ ہمارا حسب نسب کیا ہے۔ ہماری حرکت میں ایک عجیب سا تصنع اور ایک عجیب سی خود فریبی گھر کر گئی۔ ہم گلاس بھی پکڑتے تھے تو یوں جیسے وہ کام ہم زندگی میں پہلی بار کر رہے ہوں۔ ہم بھٹرے چاولوں کو پانچوں انگلیوں سے کھانے والے اور اُدھر جب مجھے اور آبی کو پلاؤ میں بڑی سخت جان بوٹیوں سے چھری کانٹے کے ساتھ جنگ کرنی پڑی تو آبی نے جھنجھلا کر سمجھایا۔

لگ پھینکے اور ہوٹل والوں کو یہ موٹی سی لاہوری قسم کی گالی دے کر اس نے سامنے پڑی پلاؤ کی بھری پلیٹ پر مرغ کا سالن انڈیلا اور پھر اللہ دے اور بندہ لے۔ جب وہ اطمینان سے تین چار لقمے اپنی طبیعت کے مطابق حلق سے نیچے اتار گیا تو بولا "ان انگریزوں کی ایسی تیسی خود چلے گئے مگر اپنی اولادیں یہاں چھوڑ گئے۔"

ابھی وہ یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ ایک شمعدان کی روشنی میں بیٹھا اچانک ایک چہرہ میری نظروں میں آیا تو میں سن ہو کر رہ گیا۔ وہ۔۔۔ چہرہ ڈاکٹر عالیہ کا تھا۔ اور۔۔۔ اس کے پاس جو آدمی بیٹھا تھا، اس کے چہرے پر اگر وہ داڑھی نہ ہوتی۔۔ وہ فرانسیسی وضع کی داڑھی تو بھی میں یہ بات بلا خوفِ تردید کہہ سکتا تھا کہ وہ ڈاکٹر دھمن ہے، اس کی آنکھیں، اس کی ناک کا بانسہ، اس کا ماتھا، اس کے سر کے بال، اس کا دہن سب کچھ اس بات کے گواہ تھے کہ وہ ڈاکٹر دھمن ہے مگر وہ دو نہیں تھے، ان کے ساتھ ایک اور بھی آدمی بیٹھا تھا۔ لمبے لمبے ہاتھ پاؤں والا گورا چٹا آدمی۔ وہ وضع قطع کے اعتبار سے سینڈھرسٹ کے سانچے میں ڈھلا ہوا کوئی بہت بڑا سرکاری افسر معلوم ہوتا تھا۔ اس کی ہر حرکت سے اس کے اختیار کی نخوت پھوٹ رہی تھی وہ ڈاکٹر عالیہ پر بہت زیادہ توجہ دے رہا تھا اور وہ سارے جہان کی چھوٹی پھوپھی کی عورت ابھی تک ویسی ہی تر و تازہ اور جوان نظر آ رہی تھی جیسی میں نے پہلی بار دیکھی تھی بلکہ وہ پرانی شراب کی طرح پہلے سے کہیں زیادہ خوبصورت اور شہد آگیں ہو گئی تھی۔ صحت ڈاکٹر دھمن کی بھی بہت اچھی تھی۔ نگر نہیں، وقت نے اس کے وجود پر اپنی نوبت بجا دی تھی۔ اس کی نظر کنکر سی ٹھنڈی ہوتی جاتی تھی۔ وہ دیکھتا نہیں تھا بس آنکھیں عادتاً کھلی رکھتا تھا اس کے ہاتھ میں ایک لمبا سا ہوانا قسم کا سگار تھا جس کو وہ شاید عمداً پوری طرح نہیں جلا رہا تھا۔ اور وہ بجھ بجھ جاتا تھا۔

وہ اسی وقت یا اس سے چند لمحے پہلے وہاں آئے تھے ہمارے اور ان کے درمیان تین میزیں حائل تھیں۔ ان دونوں کو یوں اپنے سامنے دیکھ کر میرے وجود میں دھماکے ہونے لگے۔ میری آنکھوں کا رنگ بھی بدلنے لگا تھا اور چہرے کا بھی۔

آبی کی نظر میرے چہرے پر پڑی تو میری اس خونخوار کیفیت کو سمجھ کر میری نگاہ کا تعاقب کرنے لگا مگر اس نے نہ تو عالیہ کو کبھی دیکھا تھا نہ دھمن کو۔ وہ میری آنکھوں میں کھولتی نفرت کا سبب نہ سمجھ سکا تو بولا "یار! ایسی ننانوے فیصد عورت تو میں نے آج ہی دیکھی ہے قسم اللہ کی مگر یہ کن بگلوں کے ساتھ بیٹھی ہے۔"

اس کی یہ بات سن کر میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ آبی اپنی قسم کا بہت بڑا پھپکلیاں بدمعاش تھا، وہ بھی مسکرا دیا۔ اس نے نظریں عالیہ کے چہرے پر جما دیں۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد سوڈے کی بوتل گلاس میں انڈیل کر بولا "تیری آنکھوں میں یہ سرخی کی لہر کیوں ابھر آئی ہے؟ اس کے ساتھیوں پر غصہ آ رہا ہوگا، مگر ہو سکتا ہے، اس کے مشترکہ دوست ہوں۔"

"مشترکہ کھاتے دار بھی تو ہو سکتے ہیں۔" میں نے نازک گلاس پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا۔ ماضی کی یادیں میرے دماغ پر تپچھے لگا رہی تھیں۔

"اوئے پوربیے! یہ ٹوٹ جائے گا۔ اس کی کمر بہت نازک ہے گلاس کی۔" دو بیروں نے ان کی میز کو نرغے میں لے لیا تھا وہ مجھے نظر نہیں آ رہے تھے۔ میں نے گلاس میز پر رکھ کر آبی کا ہاتھ لیا اور شمعدان میں جلتی دو میں سے ایک شمع کو بجھا دیا۔

"آبی جانتا ہے تو یہ عورت کون ہے؟ یہ ڈاکٹر عالیہ ہے اس کے دائیں ہاتھ جو آدمی بیٹھا ہے وہ ڈاکٹر دھمن ہے۔"

"نہیں یار! اتنی حسین عورت سے مجھے متنفر نہ کر، یہ عالیہ نہیں ہو۔"

"یہ وہی ہے۔ تم ادھر بیٹھو، میں ابھی واپس آ رہا ہوں، ان پر نظر رکھو۔"

"کسی سیاپے میں نہ پھنس جانا۔ آدمی تو ہے خر مغز۔ ٹھہر میں ساتھ چلتا ہوں۔"

"نہیں! تم ادھر ہی بیٹھو، ان پر نگاہ رکھو، یہ نکلنے نہ پائیں۔"

"تو جال لینے جا رہا ہے! کیسی سر پھری باتیں کرتا ہے تو"

"یہی بہتر ہے میرے کہنے پر عمل کر اور پستول کی لگام کر لے۔" یہ کہہ کر میں اپنی کرسی پر سے اٹھا اور عقبی میز پر بیٹھے لوگوں کی اوٹ میں چلتا ہوا میں تیزی سے باہر گیا، مجھے یقین تھا ان لوگوں کی کار کا سراغ لگا لوں گا۔ اس گلبدن عالیہ کی عادت میں طرح سمجھتا تھا، اسے خوبصورت اور لانبی لانبی کاریں رکھنے کا جنون تھا ڈرائیور بھی وہ چن کر رکھتی تھی۔

باہر کاروں کا ہجوم تھا مگر وہ سب کی سب نئی نویلی چیز نظر آتی تھیں جیسے وہ ابھی شو روم سے نکلی ہوں مگر ان میں سے دھمن کی کار کو پہچان لینا کوئی آسان کام نہیں تھا ان لوگوں کو میں داخل ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی اس لیے میں سمجھتا تھا کہ ان کی کار ان دو قطاروں میں سب سے آخر میں کھڑی ہو گی۔ اسی خیال زیر اثر میں آخری تین کاروں کا جائزہ لینے لگا۔ ان میں سے ایک رنگ کی کیڈلک تھی جس کے شیشے بھی سیاہ تھے۔ اور رنگ ان کا تھا کہ اندر کی کوئی شے ان میں سے باہر نظر نہیں آتی تھی۔ میں نے شیشوں کے ساتھ لگ کر اندر جھانکنے کی کوشش کی اور ہینڈل ہاتھ رکھ کر دروازہ کھولنا چاہا مگر کار مقفل تھی۔ ابھی میں پیچھے تھا کہ کوئی میرے عقب میں بڑے معنی خیز انداز سے کھنکارا۔ میں کسی قسم کی حیرانی ظاہر کیے بغیر کار کے ساتھ ٹیک لگا دی۔ میرے سفید وردی میں ملبوس ایک کرنجی آنکھوں والا جوان کھڑا تھا

تھا۔ وہ بڑے ہی عاشقانہ انداز میں مجھے آنکھ مار کر بولا "کار اڑ پھو کرو استاد! چابی دے دوں؟"

اس کے لہجے میں بلا کا طنز تھا۔ وہ پان کی جگالی کر رہا تھا۔ اور اسے یقین تھا کہ میں کار چرانے کی نیت سے وہاں پہنچا ہوں۔

"یہ ڈاکٹر دھمن کی کار ہے؟" میں نے بڑے جمے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"ہاں ہاں! کیوں نئیں کیوں پوچھتا ہے؟"

"تمہیں ڈاکٹر صاحب نے اندر بلایا ہے۔"

"تو چل بھیا۔ کاہے کو وخت ضایاں کرتا ہے، اپن تو نوکر ہی اُن کا ہے۔" وہ ایک دم مستعد ہو گیا اور ہوٹل کی عمارت کی طرف چلنے لگا مگر یوں کہ وہ میری رہنمائی چاہتا تھا۔ بڑے دروازے کے قریب پہنچ کر بولا "اپن کو رستہ نئیں معلوم۔"

"میرے پیچھے آ جاؤ۔ وہ ادھر لگے ہال میں بیٹھے ہیں۔ کیا نام ہے تمہارا؟"

"اپن کا نام پھلروا ہے۔ واجد پھلروا۔ ڈاکٹر صاب اپن کو پھلر کہوے ہیں۔"

"میرا نام جھومر ہے۔ تم تو اپنے ہی قافیے کے آدمی نکلے۔"

"اپن کا نام اماں نے لاڈ سے رکھ دیا تھا۔ اپن کو بھی یہی پسند ہے۔ پر استاد یہ ہوٹل ہے کہ پری خانہ اپن کو تو جھینپ آوے ہے۔"

"ٹھہر ذرا میں ادھر نمٹ لوں۔ تو بھی آ جا، دیکھ کیسے عالیشان غسل خانے بنے ہیں یہاں۔" میں نے اسے ہوٹل کی راہداری میں چلتے چلتے روک کر ٹائلٹ کی طرف دھکیل دیا مگر اتنی نرمی اور اپنائیت سے کہ اسے میری نیت پر شبہ نہ ہو سکے۔ میں دراصل اس کا حلیہ اپنانا چاہتا تھا۔ ٹوپی سے لے کر پتلون تک میں اس سے چھین لینا چاہتا تھا۔ چکنے چکنے اور سفید ٹائلوں سے مزین ان خوبصورت غسل خانوں کو دیکھ کر وہ بھی تیزی سے ایک غسل خانے میں جا گھسا۔ وہ یوں سیٹی بجانے لگا تھا جیسے وہ سب کچھ اس کے لیے خواب تھا۔ ایسا خواب جو اسے حیران کیے دیتا تھا۔ اس وقت ان غسل خانوں میں اتفاق سے کوئی اور آدمی موجود نہیں تھا۔ جیسے ہی وہ غسل خانے میں گھسا میں اپنی ذہنی جھونجل کو جھٹک کر تیزی سے اس کے عقب میں جا پہنچا۔ میں نے بڑی آہستگی سے اس کی گردن پر ہاتھ رکھا اور پھر اتنی تیزی سے اپنی انگلیوں کی گرفت مضبوط کر کے اس کی رگ احساس مسل دی کہ وہ سلسلہ درمیان ہی میں رک گیا۔ اور وہ بے ہوش ہو کر میرے بازوؤں میں جھول گیا۔ میں نے فوراً ہی اندر سے چٹخنی چڑھائی اور پھر تیزی سے اس کے کپڑے اتار کر پہننے لگا۔ یہ بڑا پریشان کن کام تھا مگر پھر بھی میں نے طوعاً و کرہاً اسے برداشت کر ہی لیا۔ زیادہ مشکل مجھے اس وقت پیش آئی جب میں اپنے کپڑے اسے پہنانے لگا۔ وہ کسی طرح سیدھا ہی نہیں ہو رہا تھا۔ پھر بھی جوں توں کر کے میں نے اسے اپنے لباس میں گھسیڑ ہی دیا۔ سالا گنا بگار کی میت سے بھی زیادہ وزنی تھا اور پھر بے ہوش مردوں سے شرط باندھ کر بے سدھ ہوا تھا۔ اس کام سے فارغ ہوتے ہی میں نے اسے بڑی مشکلوں سے کموڈ کے اوپر بٹھایا تو وہ دیوار کے ساتھ یوں جا لگا جیسے کوئی تھکا ہوا آدمی کسی تپتی دوپہر میں درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ جائے۔ آنکھیں اس کی یوں نیم وا تھیں جیسے وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ اس کے منہ سے عجیب سی پھین نکلنے لگی تھی جسے دیکھ کر میں سمجھا کہ وہ شاید موت کی طرف لڑھک رہا ہے مگر اس کی نبض دیکھنے کی مجھے کہاں فرصت تھی۔ میں نے اس کی ٹوپی سر پر جمائی اور دروازہ بڑی آہستگی سے اپنے پیچھے بھیڑ کر میں باہر نکل آیا تا ٹینوں کی چکا چوند میں جب میں نے اپنا حلیہ دیکھا تو میں سمجھا کہ میں ہی پھلروا ہوں۔ کار کی چابی میری جیب میں تھی اور اپنے لباس کی ہر شے میں نکال لایا تھا۔

غسل خانے سے نکل کر میں اس نیم تاریک ہال کی طرف بڑھا جہاں میں آبی کو تنہا چھوڑ آیا تھا۔ ایک بیرا اس وقت میرے قریب سے گزر رہا تھا، اسے روک کر میں نے اپنے لہجے میں بلا کی شائستگی پیدا کرتے ہوئے کہا کہ وہ سات نمبر میز پر بیٹھے بیرزادہ صاحب کو ذرا دیر کے لیے باہر بھیج دے۔

"ابھی لیو شوہر صاب! انگریزی میں آپ کو شوہر ہی کہتے ہیں۔" وہ میری وردی دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

"شوہر نہیں بڑے بھائی! میں شوفر ہوں شوفر۔ کوئی بھی مجھے شوہر بنا لے تو پھر اور کیا چاہیے مجھے؟" میں نے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ وہ ہنستا ہوا ہال کے اندر چلا گیا۔ ابھی دو منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ آبی دروازے کو جھپٹ کر کھولتے ہوئے باہر آ گیا۔ میں اس کے سامنے ہی کھڑا تھا مگر وہ مجھے نظر انداز کر کے تیزی سے آگے بڑھا اور بدکے ہوئے وحشی کی طرح بڑے غور سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔

"ابے ساون کے اندھے تیری نظر کام نہیں کرتی ہے کیا؟" میں نے اس کے عقب میں پہنچ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دبی زبان میں کہا۔

وہ اچھل سا گیا، اپنے سیدھے ہاتھ میں اس نے رومال میں لپیٹ کر پستول یوں پکڑ رکھا تھا جیسے وہ سامنے کی ہر شے کو بھون کر رکھ دے گا۔ اب وہ گھوم کر میرے حلیے کو یوں دیکھ رہا تھا کہ میں سمجھا اس کے ہوش اسے الوداع کہہ گئے ہیں۔ نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے دبا کر بولا "تو نے تو مجھے پاگل کر دیا ہے یار، یہ کیا چکر ہے؟"

"دیکھ میں باہر ان کا انتظار کر رہا ہوں۔ یہ ہال سے نکلیں تو تو ان کے ساتھ ساتھ باہر آ جائے گا۔ میں آج ہی ان کا جھٹکا کر دوں گا۔ یہ وردی ان کے شوفر کی ہے۔"

"بس ٹھیک ہے۔ تُو چل میں ان کے ساتھ ہی باہر آؤں گا۔"

"ہاں میں تجھے یہی بتانے آیا تھا، اب تُو اندر جاکر ان کو نظر میں رکھ شاباش!" یہ کہہ کر میں تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا باہر نکل گیا۔

وہ لوگ کوئی ڈیڑھ گھنٹے بعد مجھے کار کی طرف آتے دکھائی دیے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اندر سے پی پلا کے باہر نکلے ہیں۔ عالیہ کے قدم بھی اپنے نہیں تھے اور ڈاکٹر دھمن بھی لڑکھڑا رہا تھا، ان کے ساتھ جو آدمی تھا وہ کچھ زیادہ ہی بہک رہا تھا۔ وہ اسی حالت میں کیبڈلک تک آئے، وہ مجھے نہیں دیکھ رہے تھے۔ بس میرا ہیولا انھیں پھیلا ہوا ایسا ہی نظر آتا تھا، اور یہی اُن کے لیے کافی تھا۔ میں نے کار کے بائیں ہاتھ کے دونوں دروازے کھولے تو وہ تینوں پچھلی نشست پر ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو کر بیٹھ گئے۔ عالیہ اُن کے درمیان بھینچ کر رہ گئی تھی۔ ڈاکٹر دھمن اس کا بندۂ بے دام یوں ہی نہیں ہو گیا تھا۔ اس کی وہ کالی برہم زلفیں اس کے چہرے کی صباحت کو اور زیادہ دلکشی بخش رہی تھیں اور مجھے حیرت یہ تھی کہ ڈاکٹر دھمن اس آدمی کا وجود کیسے برداشت کر رہا تھا مگر نہیں، وہ تینوں اپنے حواسوں میں نہیں تھے اور ڈاکٹر دھمن کچھ زیادہ ہی لڑھک چکا تھا۔ اُن کو اس حالت میں دیکھ لینے کے باوجود میں کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ میں پچھلی نشست پر اُن کے ساتھ بھڑ کر جا بیٹھا۔ اور اُن دونوں کی گردنیں ہاتھوں میں لے کر میں نے ان کی رگیں مسل دیں وہ بے سُدھ تو پہلے ہی تھے فوراً ہی جھول گئے۔ عین اُس وقت آبی بائیں ہاتھ کے اگلے کھلے دروازے سے تیزی سے کار میں داخل ہوا پستول اُن پر تان لیا مگر میں نے فوراً ہی اس کا ہاتھ نیچے جھکا دیا اور اُس کے ساتھ ہی میں نے تیسرے آدمی کی بتی بھی گل کر دی۔

"تیزی کارروائی کی ضرورت نہیں ہے، یہ پہلے ہی غٹ ہو رہے تھے۔ بیٹھو۔" وہ میرا اشارہ سمجھ کر نشست کی اونچی پشت کی اوٹ میں چھپ کر بیٹھ گیا، یوں جیسے اُس نے خود کو تہہ کر لیا ہو۔ میں اگلی دو نشستوں کے درمیان سے گزر کر ڈرائیور کی سیٹ پر جا بیٹھا اور کار اسٹارٹ کر کے ہوٹل کے درِ مراجعت سے نکلتا ہوا بڑی سڑک پر جا چڑھا۔

محسوس مجھے یوں ہو رہا تھا کہ وہ بے قابو لوگ نہیں تھے۔ شراب نے انھیں دو گھڑی کے لیے خود سے بے گانہ تو ضرور کر دیا تھا مگر وہ جو اُن کے وجود میں ایک اپنی تہہ در تہہ جمی ضبط کی برف موجود تھی وہ ہنگامہ بن کر ٹوٹ نہیں رہی تھی۔ میں نے شرابیوں کو بدترین قسم کی ذلتوں میں مبتلا دیکھا ہے، وہ نشے میں دُھت ہو کر اپنی شر اور آفت سے لبریز شخصیت کو فوراً ہی آشکارا کر دیتے ہیں۔ مگر وہ تینوں خاموش تھے۔ اپنے اپنے حال میں مست۔ شراب نے انھیں ایسی متانت دے دی تھی کہ غل غپاڑے کی منزلوں سے بہت دُور تھے۔

وہ یہی سمجھ کر گاڑی میں بیٹھے تھے کہ گاڑی اُن کا شوفر چلا رہا ہے۔ آبی نے مجھے دبی زبان میں کہا "ان کو ابھی تم اُدھر جنگل کی طرف لے چلو۔ شہر سے باہر ہم فلیٹ پر گئے تو وہاں فساد برپا ہو جائے گا۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو یار۔" یہ کہہ کر میں نے کار کی رفتار تیز کر دی۔ کراچی میں ٹریفک ایسی ہے کہ آدمی ایک دوسرے کے اُوپر سے گزر جانے کی آرزو کرتا ہے۔ سائیکل سوار کو پیدل راہ گیر سے، سکوٹر سوار سائیکل والے سے متنفر ہے اور وہ جو کار میں بیٹھا ہے اس کا بس نہیں چلتا ورنہ وہ ہر روز دس آدمی مار کر گھر کو لوٹے۔ رہ گئے ٹرک والے اور بس والے۔ تو وہ اپنے ارد گرد کی ہر شے کو حقیر سمجھتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں اُسے روند ڈالتے ہیں۔ اُن میں سے ہر ایک کو سو خون معاف ہیں یہی وجہ تھی کہ مجھے اس بھیڑ میں سے کار کو افراتفری کے عالم میں نکال لے جانے میں خاص دقت پیش آ رہی تھی۔ رفتار کم ہوئی تو آبی کو طیش آنے لگا، بولا "ابے تو جولاہا بنتا جا رہا ہے کوئی کھڈا تو نہیں ہے سامنے جلدی نکل چل بڑی نازک سواریاں بیٹھی ہیں پیچھے۔"

"میں نے ان کا جھٹکا کر دیا ہے اب یہ عالمِ برزخ میں گھوم رہے ہیں، تو کوئی سگریٹ ہی سُلگا دے۔"

"ہاں یہ لے! ابھی لے، تو بھی مجھے ڈاکٹر ہامن کی پھوپھی کی بھانجی کا بھتیجا لگتا ہے۔ سالے! تجھے یہ گُر کس بدبخت نے سکھایا تھا آدمی کو بیٹھے بٹھائے تو ٹھنڈا کر دیتا ہے سینٹ پرسینٹ!" یہ کہہ کر اس نے مجھے بھی ایک سگریٹ سُلگا دیا۔ شکر ہے کہ اُس کے پر اُس نے تھوک نہیں لگایا تھا۔

اس کے سینٹ پرسینٹ پر مجھے عالیہ کے بارے میں اس کی رائے یاد آ گئی میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

"یار! یہ عالیہ تجھے نائنٹی ناین پرسینٹ نظر آئی، ہنڈرڈ پرسنٹ کیوں نہیں؟"

"اس کو تو میں نے بہت اُونچے درجے میں رکھا ہے پیارے ورنہ اکثر عورتیں تو بس ساٹھ فیصد ہی عورت ہوتی ہیں ان کا باقی چالیس فیصد حصّہ مردانہ ہوتا ہے۔"

"تیرے تجربے کی داد دیتا ہوں۔ اکثر عورتوں کو دیکھ کر مجھے بھی یہی احساس ہوتا ہے کہ یہ ساری کی ساری عورت نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم ان سواریوں کو تکریم احمد کے ساتھ والے فلیٹ پر لے جاتے ہیں۔"

"دن کے وقت اُدھر مت جاؤ یار! انھیں کسی جگہ فریج میں لگا دے ابھی۔ ہم ہوٹل میں بھی نہیں جا سکتے۔"

"تو پھر کیا کریں؟ کوئی جگہ تو ہونی چاہیے ان کے آرام کے"

"بس لے چل سیدھا ان کو حیدر آباد کی طرف شام کو د

آجائیں گے۔" آبی نے اپنے ذہنی اضطراب سے جان چھڑانے کے لیے ایک اور سگریٹ سلگا لیا۔ گاڑی سبک رفتار تھی اور بے آواز چلتی تھی۔ کوئی بیس منٹ بعد ہم ہائی وے پر جا چڑھے اب مجھے کوئی فکر نہیں تھی۔ مگر نہیں، عقب نما میں جب بھی نظر ڈالتا تھا، ایک سرخ رنگ کی فاکس ویگن مجھے ایک خاص فاصلے سے اپنے پیچھے چلتی نظر آ رہی تھی۔ شہر کی مختلف سڑکوں پر سے گزرتے وقت بھی وہ مجھے اپنے تعاقب میں آتی محسوس ہوئی مگر میں نے خیال کیا ہی نہیں۔ میں سمجھا کہ یہ بھی کوئی راہگیر ہیں لیکن میرا یہ اندازہ غلط نکلا۔ آبی بھی بائیں ہاتھ کار کے باہر لگے عقب نما کو بڑی دل چسپی سے دیکھ رہا تھا۔ وہ فاکس ویگن اب زیادہ تیز رفتاری سے ہمارے پیچھے آ رہی تھی۔

"یار! یہ کون لوگ ہیں؟ اس گدھا گاڑی میں میں انہیں بڑی دیر سے دیکھ رہا ہوں۔"

"میرا خیال ہے کہ یہ ہمارے تعاقب میں آ رہے ہیں۔ میں گاڑی روک رہا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے گاڑی سڑک سے اُتار کر درخت کے سائے میں روک دی۔ وہ سُرخ رنگ کی گاڑی کوئی چار منٹ بعد ہمارے قریب آ پہنچی اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کا اسٹیرنگ سوات خان کے ہاتھ میں تھا۔ اُس نے گاڑی لا کر ہمارے عقب میں کھڑی کر دی اور پھر دروازہ کھول کر بلند آواز سے بولا۔ "کیا بات ہے پھُلرا! اِدھر کہاں نکل آئے ہو خیر تو ہے، ہم نے تمھیں اسٹار گیٹ کی طرف جانے کے بجائے اِدھر مُڑتے دیکھا تو تمھارے پیچھے چلے آئے تو بولتا کیوں نہیں ہے بھائی!"

یہ کہہ کر وہ گاڑی سے اُتر گیا۔ اس کے پیچھے ہی ایک اور آدمی بھی باہر آ گیا۔ میں انھیں عقب نما میں برابر دیکھ رہا تھا۔ اس سوات خان کی مکروہ صورت پر نظر پڑتے ہی میرا مغز اُلٹنے لگا۔ آسیہ پر پہلا غلط ہاتھ اسی نے اٹھایا تھا۔ اس کو میرے گھر سے اغوا اسی نے کیا تھا۔ میں نے جراب میں اَڑسے پستول کو کھینچ کر نکالا اور جیسے ہی وہ دونوں ہمارے قریب آئے میں نے تیزی سے دروازہ کھول کر پستول اس پر تان لیا۔ وہ تو دنگ رہ گیا۔ اُس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ گاڑی میں پھُلروا نہیں، کوئی اور آدمی سوار ہے مجھے بھی وہ نہ پہچان سکا درمیان میں سے وقت بھی تو بہت نکل چکا تھا۔

"یہ... یہ... کیا ڈرامہ ہے اوئے! کون ہے تو؟ اور پھُلروا کہاں ہے؟" سوات خان نے حیرت کے پہلے ریلے کو برداشت کرتے ہوئے بڑی پاٹ دار آواز میں کہا۔

مجھے یقین تھا کہ وہ دونوں مسلح ہوں گے مگر مجھے یوں اچانک سامنے دیکھ کر وہ کچھ بھی نہ کر سکے۔ اس اثنا میں دوسرا دروازہ کھول کر آبی اُن کے عقب میں آ ٹھہرا اس نے اپنا وہ ننھا سا پستول رومال میں لپیٹ کر دوسرے آدمی کی کمر سے لگا دیا تھا۔

"چلو اُدھر اپنی گاڑی میں بیٹھو چلو۔" آبی نے ان کو پیچھے مڑنے کا اشارہ کیا۔ وہ دونوں تیزی سے گھوم کر گاڑی کی طرف چلے مگر ابھی ہم اُن کے بارے میں کوئی قطعی فیصلہ نہیں کر پائے تھے کہ سوات خان کے اندر کا وحشی ایک دم بے قابو ہو گیا۔ اُس نے پلٹ کر آبی کی دائیں کلائی پر کچھ اتنی تیزی سے کھڑی ضرب لگائی اور اس کا اندازہ اتنا صحیح نکلا کہ آبی کے ہاتھ سے پستول الگ جا گرا۔ اتنا دُور کہ وہاں تک اُن دونوں میں سے کوئی بھی فوراً نہیں پہنچ سکتا تھا۔ دُوسرا آدمی اس پستول کی طرف لپکا تو میں نے پوری قوت سے اس کی پسلی میں ٹھوکر ماری وہ تیورا کر گرا۔ اس ذرا سی مہلت سے فائدہ اٹھا کر سوات خان نے تیزی سے آبی کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنی ڈھال بنا لیا۔ اس کی برق رفتاری نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ اور آبی کو تو وہم تک نہیں تھا کہ بالشیہ یوں بھی پلٹ سکتا ہے۔ میرا دل چاہا کہ میں اُن دونوں کا قصّہ وہیں پاک کر دوں مگر میں اتنی آسانی سے سوات خان کو ہاتھ سے گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ اُسے میں وہیں مار دیتا تو میرے پلّے کیا رہ جاتا۔ میں انتقام کس سے لیتا۔ آسیہ کی آہوں اور سسکیوں کی بازگشت ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ میں نے پستول عمداً جیب میں ڈال لیا۔ میں اُس کا اس ویرانے میں فیصلہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ پستول کو نظروں سے غائب ہوتے دیکھ کر سوات خان نے آبی کو زمین پر پٹخنے کے لیے اوپر اٹھانا چاہا تو عین اس وقت آبی آگے کو جھکا اور پورے قد سے اس نے سوات خان کو اپنے اُوپر سے اچھال کر اپنے سامنے گرایا اور پھر اس کے دونوں پنجے اپنے پنجوں میں پھنسا کر اسے زمین پر سے یوں دہرا ہو کر اٹھنے پر مجبور کیا کہ میں سمجھا اس نے سوات خان کے دونوں ہاتھ توڑ دیے ہیں مگر نہیں اب سوات خان کے دونوں ہاتھ اس کے کندھوں کے اوپر سے کھینچ کر آبی نے پکڑ رکھے تھے۔ اس کو زبردست جھٹکا دے کر اس نے سوات خان کو گاڑی کی طرف دھکیلا اور اسے ایک نہایت گندی گالی دے کر بولا۔ "اندر بیٹھ بیٹے! تجھ سے تو ابھی ہمیں بڑی باتیں کرنی ہیں تو آج ہی مر گیا تو پھر ہمارا جینا کس کام آئے گا۔"

یہ کہہ کر اس نے فاکس ویگن کے کھلے دروازے کے اندر کی کرسی پیچھے ہٹانی چاہی یوں کہ سوات خان کا دایاں پنجہ ابھی تک اُس کے پنجے میں پھنسا تھا۔ ایک ہاتھ واپس ملتے ہی سوات خان نے پلٹ کر آبی کو بالوں سے پکڑ لیا۔ اُس کی یہ حرکت دیکھتے ہی میں نے سوات خان کی گردن پر ہاتھ ڈال دیا۔ اس سے بلا وجہ لب سڑک زور آزمائی کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میری انگلیاں اس کی رگِ حساس کو فوراً ہی مفلوج کر گئیں۔ میں نے اسے بانہوں میں بھر کر فاکسی کی پچھلی نشست پر پھینک دیا۔ مگر وہ آدمی جسے میں بے ہوش سمجھ بیٹھا تھا، ہم سے

ہاتھ کر گیا۔ میری نظر اُدھر اٹھی تو میں نے دیکھا کہ وہ کیڈلک کا اسٹیرنگ سنبھال کر اسے اسٹارٹ کر چکا تھا۔

"ابے پکڑ! ابے اس کو۔ تو بالکل ڈھگا آدمی ہے یار۔" آبی تیزی سے کار کی طرف لپکا۔ مگر اس آدمی نے چھوٹتے ہی کیڈلک کو ایڑ لگا دی تھی۔ وہ اتنی تیزی سے آگے نکلا کہ میں سمجھا ہم بازی ہار گئے۔ کیڈلک کی چابی میں اگنیشن ہی میں چھوڑ آیا تھا، اور اس کا انجن چل ہی رہا تھا کہ وہ آدمی ہماری ایک لحظہ کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر گاڑی پر قبضہ کر کے اسے لے اڑا۔ میں نے فوراً ہی فاکس ویگن میں بیٹھنے کی کوشش کی مگر معلوم ہوا کہ اس کی چابی اگنیشن میں نہیں ہے۔ آبی نے تیزی سے سوات خان کی جیبیں ٹٹولیں تو اس کے نیفے کے ساتھ سلی جیب میں سے چابی مل گئی۔

"اس گدھی کو آگے ہانک یار! مروا دیا تیری بے تدبیری نے، بڑا بہرام ڈاکو بنا پھرتا ہے تو۔" یہ کہہ کر وہ خود ہی اسٹیرنگ پکڑ کر بیٹھ گیا۔ گاڑی فوراً ہی اسٹارٹ تو ہو گئی مگر ان تین منٹوں میں کیڈلک ہماری نظروں سے معدوم ہوتی جاتی تھی۔ آبی بڑے مضبوط اعصاب کا مالک تھا اس نے چھوٹتے ہی گاڑی کی رفتار ساٹھ میل اٹھا دی۔ کچھ ہی منٹ بعد ہمیں کیڈلک نظر آنے لگی۔ اس کی رفتار میں وہ پہلے ایسی تیزی نہیں رہی تھی کیونکہ سامنے سے مال بردار ٹرکوں کا قافلہ چلا آ رہا تھا، اور بسیں الگ ایک مصیبت بنی ہوئی تھیں پھر بھی آبی نے ہمت نہیں ہاری۔ اور اس گاڑی کو جسے وہ گدھی کہتا تھا، سڑک کے کچے حصے پر اتنی برق رفتاری سے بھگاتا چلا گیا کہ کوئی دس منٹ بعد کیڈلک ہم سے صرف ایک فرلانگ دور رہ گئی تھی۔ وہ آدمی ہمیں کار کے عقب نما میں برابر دیکھ رہا تھا۔ وہ کوئی بہت مشاق ڈرائیور نہیں تھا اسے بسوں اور ٹرکوں نے بھی عاجز کر دیا تھا۔ وہ اُسے آگے پیچھے سے دباتے چلے آ رہے تھے۔ اور وہ اس کوشش میں تھا کہ کسی حادثے کے بغیر ہی اپنی گاڑی کو نکال کر کسی محفوظ مقام پر جا پہنچے۔ مگر آبی اس کے ارادوں کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ اس نے ایک لحظے کے لیے بھی گاڑی کی رفتار کم نہیں کی اور وہ فاکس ویگن بھی ایسی شریف نکلی کہ اس کا حکم بے چون و چرا مانتی چلی گئی۔ آبی دانت پیس کر بولا۔ "تجھے تو کچھ دیر عدت میں بیٹھ جانا چاہیے جیلانی! تاکہ تو یہ معلوم کر سکے کہ تیرے ساتھ کوئی اونچ نیچ تو نہیں ہو گئی۔"

"کیا بک رہا ہے یار تو! میرا کیا قصور ہے" وہ بندر کی اولاد میری سمجھ میں ہی نہیں آیا۔" میں نے اُسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ کیڈلک کی رفتار ایک بار پھر تیز ہو گئی تھی کیونکہ ٹرکوں کا قافلہ اس آدمی نے بڑی احتیاط سے گزار لیا تھا۔

"تیری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آتا۔ ہاتھ بھر کا وہ لونڈا تجھے جُل دے گیا۔ تو سمجھا کہ وہ بے ہوش ہو گیا ہے نا؟" آبی نے ایکسلیریٹر پر دباؤ اور بڑھا دیا۔ فاکسی کا انجن اب بُری طرح چیخنے لگا تھا مگر ہم اس کے واویلے پر دھیان نہیں دے سکتے تھے۔

"بات کچھ ایسی ہی تھی مگر یہ بچ کر نہیں جا سکتا ہے آبی۔"

"اس کے ہاں کیڈلک ہے جیلانی! اور تو کھٹارا فرید بوٹی ہے والا آدمی۔ دعا مانگ کہ اس کا ٹائر پھٹ جائے یا اس کا اپنا دم ٹوٹ جائے۔"

آبی کا غصہ کسی بھی طرح کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ اچانک ٹرکوں کا ایک اور قافلہ سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ کیڈلک کو اس جوان نے اب کچے پر اتار لیا تھا مگر اپنی پہلی سی رفتار وہ قائم نہیں رکھ رہا تھا کیونکہ گاڑی کو گزرنے کے لیے پوری جگہ نہیں مل رہی تھی۔ اس موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آبی نے اپنی گاڑی اور زیادہ تیز کر دی۔ سامنے سے ایک بس تیز رفتاری سے ٹرکوں کو پیچھے چھوڑتی ہوئی ہماری طرف بڑھی چلی آ رہی تھی۔ آبی اگر اور زیادہ کچے میں نہ اتر جاتا تو وہ بس ہم سے ٹکرا ہی گئی تھی۔ ہمیں بچانے کے لیے ڈرائیور نے بس کا اسٹیرنگ کچھ زیادہ ہی بائیں ہاتھ موڑ دیا اور وہ سیدھا ایک ٹرک کے عقب سے جا ٹکرایا۔ زبردست دھماکے کی آواز فضا میں گونجی۔ میں نے دیکھا کہ بس کے انجن میں ٹکر لگتے ہی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ آبی نے بھی عقب نما میں یہ منظر دیکھا مگر وہ رکا نہیں۔ ایک بھرپور قسم کی گالی بس ڈرائیور کو دیتے ہوئے وہ بلا خیز رفتار سے کیڈلک تک جا پہنچا جسے گزرنے کے لیے راستہ نہیں مل رہا تھا کیونکہ ٹریفک رکنے لگی تھی۔ آبی نے پاگلوں کی طرح فاکسی کو سڑک کے آخری حصے سے اتار کر کچے میں ڈال دیا اور ایک دائرے کی صورت میں فاصلے کو کاٹتا ہوا وہ کیڈلک کے قریب جا ٹھہرا۔ وہ آدمی فاکسی کو دیکھتے ہی گاڑی سے نکلا اور دہائی دینے لگا۔

"بچاؤ بچاؤ، یہ مجھے مار دینا چاہتے ہیں۔"

مگر آبی نے... بلا خیز رفتار سے آگے بڑھ کر پوری قوت سے ایک تھپیڑ اس کے منہ پر دے مارا اور چیخ کر بولا۔ "بدمعاش! ایک تو ہماری گاڑی لے کر بھاگ رہا ہے اور اُلٹا شور مچاتا ہے۔ تجھے تو ہم ابھی پولیس کے حوالے کریں گے۔"

لوگ اپنی اپنی بسوں کاروں میں بیٹھے ہمیں دیکھ رہے تھے، کسی میں اتنی جرأت نہیں ہوئی کہ وہ اُتر کر پوچھتا کہ میاں جی! کیا ہے۔ آبی نے ایک اور تھپیڑ اس کے منہ پر دے مارا اور اس کے دونوں بازوؤں کو مروڑ کر اُسے دھکیلتا ہوا فاکسی تک لے آیا۔

"اس کو اپنے ساتھ باندھ لے آبی! میں کیڈلک سنبھالتا ہوں۔" اتنے میں ایک بس میں سے تین آدمی باہر نکل آئے۔ وہ مار کٹائی کی وجہ معلوم کرنا چاہتے تھے، ان میں سے ایک بولا۔ "کیا بات ہے بھائی جی! کیوں مارتے ہو اس بے زبان کو؟"

"یہ بے زبان نہیں ہے میاں جی! ہماری کیڈلک لے کر شہر سے بھاگ نکلا تھا۔ ہمارے ملکوں کو راستے ہی میں اس نے کوئی چیز سنگھا کر بے ہوش کر دیا۔ بڑی مشکلوں سے ہم نے اسے پکڑا ہے۔" میں نے ان کو ساری بات تفصیل سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"اچھا! ایسا کاریگر آدمی ہے یہ؟ اور ماریں اس بدمعاش کو۔" اس آدمی نے میری باتوں سے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔

اس عرصے میں آبی جو اسے بے بس کر کے فاکسی کے اندر سوات خان کے پاس بٹھا چکا تھا بلند آواز سے بولا۔ "اس کا بندوبست کر دیں ہاں جی! یہ کہیں بھاگ نہ جائے ہم اسے تھانے ضرور لے جائیں گے۔"

آبی کی یہ بات سنتے ہی میں فاکسی کے اندر جا گھسا۔ اس آدمی کے منہ سے خون بہنے لگا تھا۔ آبی نے ہاتھ اس پر کچھ زیادہ ہی سخت مار دیا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ دبک کر پیچھے ہٹنے لگا تو میں نے اُسے پیار سے پچکارتے ہوئے کہا۔ "بے فکر رہ بچے! اب ہم تجھے اور نہیں ماریں گے۔" یہ کہہ کر میں نے اس کی گردن پر بڑی محبت سے ہاتھ رکھ کر اس کی رگ مسل دی۔ اس وقت بس سے اُترنے والے تینوں آدمی کیڈلک کے قریب کھڑے اس کی خوبصورتی سے محظوظ ہو رہے تھے۔ اگر اس کے شیشے چڑھے ہوئے نہ ہوتے تو انھیں بھی معلوم ہو جاتا کہ اندر بیٹھی سواریاں کس حال میں ہیں۔ جیسے ہی وہ آدمی بے سُدھ ہوا۔ میں فاکسی سے نکل کر کیڈلک میں جا بیٹھا اور پھر ہم نے دونوں گاڑیاں بڑی مشکلوں سے ٹریفک کی بھیڑ میں سے نکال کر ان کا رُخ بدلا اور ان کو کچے پر ڈال کر کراچی کی طرف چل دیے۔ جس بس میں آگ لگی تھی وہ اب تک جل رہی تھی مگر سواریاں اس میں سے لوگوں نے احتیاط سے باہر نکال لی تھیں۔

کچھ ہی دیر بعد ہم پھر پختہ سڑک پر جا چڑھے۔ میں کیڈلک لیے جا رہا تھا اور آبی فاکس ویگن۔ اور حیرت مجھے یہ تھی کہ اتنے سارے لوگوں کی موجودگی میں ہم ان لوگوں کو باندھ کر واپس لے جانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اب کی بار آبی مجھ سے آگے تھا، اسے میری کارکردگی پر اطمینان نہیں رہا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ مجھ سے کوئی حماقت سرزد ہو جائے گی اور پھر ہم کسی نئی مصیبت میں پھنس جائیں گے۔ کبھی کبھی اس کی رائے میرے بارے میں بہت ہی خراب ہو جاتی تھی۔

کوئی پانچ میل آگے بڑھنے کے بعد آبی نے اپنی گاڑی بائیں ہاتھ مڑتی ایک پتلی سی سڑک پر ڈال دی۔ ہم ذرا آگے بڑھے تو ہمیں محسوس ہوا کہ ہم ایک گھنے جنگل کی طرف جا رہے ہیں۔ سڑک اس کے درمیان سے ہو کر نہیں گزرتی تھی بلکہ اس کے کنارے کنارے چلتی تھی۔ گھنے جنگل کے وسط میں جا کر گاڑی سڑک پر سے اتار کر بائیں ہاتھ درختوں کے ایک گھنے جھنڈ تلے کھڑی کر دی۔ اس کے عقب میں میں نے کیڈلک لگا دی۔ اب ہماری پانچوں سواریاں بے ہوش تھیں۔ اور ہم آبادی سے بہت دور ایک ایسی جگہ پر کھڑے تھے جہاں ہم اطمینان سے اپنے چیختے ہوئے اعصاب کو سکون پہنچا سکتے تھے۔

گاڑی سے اتر کر آبی میرے پاس آیا اور بولا۔ "اب اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو میں تجھے نہیں بخشوں گا دیکھ ادھر کوئی پینے پلانے کی چیز بھی ہے کہ نہیں ان گاڑیوں میں؟"

"تو خود نہیں دیکھ سکتا۔ اتنی مشکلات سے یہ شکار مارے ہیں میں نے تو انھیں بھون بھی نہیں سکتا؟"

"ہاں بڑا تیر چلایا ہے تو نے۔ یہ کھنجن مارلی۔ ذرا دیکھ اس کیڈلک میں کچھ نہ کچھ ضرور ہو گا۔"

"ادھر تو کچھ بھی نہیں ہے یار! یہ کوئی جنگل کے سفر پر تو نہیں نکلے تھے۔"

"دراصل مجھے پیاس بہت لگ رہی ہے۔" یہ کہہ کر وہ فاکسی کے اندر جھانکنے لگا۔ جیسے ہی اس نے ڈیش بورڈ کھولا، ایک کلکاری سی اس کے منہ سے نکل گئی۔ وہاں کوکا کولا کی چار بوتلیں رکھی تھیں اور ان کے ساتھ دو بوتلیں بیئر کی بھی تھیں۔

"دیکھا میں نہ کہتا تھا، ادھر ان لوگوں نے کچھ نہ کچھ ضرور ڈال رکھا ہو گا۔" یہ کہہ کر اس نے دانتوں میں دبا کر دو بوتلیں کھول دیں۔ وہ ٹھنڈی تو نہیں تھیں پھر بھی اس وقت ہمیں غنیمت نظر آتی تھیں۔ چاروں بوتلیں ہم خالی کر چکے تو آبی ان گاڑیوں کے کاغذات کی جانچ پڑتال کرنے لگا۔ کیڈلک کسی مسیح الدین کے نام رجسٹرڈ تھی اور وہ جو فاکسی تھی اس کے کاغذات سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی چوہدری مطلوب احمد کی ملکیت ہے۔

اچانک میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا یوں جیسے کسی نے میرے اعتماد پر سے چادر جھپٹ لی ہو۔

"یار! ہمارا زیادہ دیر یہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں ہے آبی! میں ہوٹل میں پھلروا کو چھوڑ آیا ہوں۔ وہ ہوش میں آ گیا تو سب جگہ شور مچ جائے گا۔"

آبی نے میری بات سن کر فوراً ہی کاغذات گاڑیوں میں رکھے اور سگریٹ پاؤں تلے مسل کر بولا۔ "ویسے بھی یہ کراچی شہر ہے پولیس حرکت میں آ گئی تو تھانے کے لوگ سڑکوں پر آ جائیں گے، اور یہ تیسرا آدمی پتہ نہیں کون ہے؟" یہ کہہ کر اس نے کیڈلک کی پچھلی نشست پر پڑے تیسرے آدمی کی جیبیں ٹٹولیں، اور پھر پریشان سا ہو کر کہنے لگا۔ "یار! یہ...... یہ تو محکمہ صحت کا کوئی بڑا افسر ہے جیلانی! یہ مصیبت تو نے خواہ مخواہ مول لے لی۔"

"بڑا افسر! دکھا تو سہی کیا ثبوت ہے تیری اس بات کا؟"

"یہ دیکھ۔ یہ اس کے کاغذات تو دیکھ! ڈاکٹر ترمذی نام ہے

اس کا۔" یہ کہہ کر اس نے چند کاغذات مجھے دکھائے ان میں اس کا شناختی کارڈ بھی شامل تھا جس پر ڈاکٹر ایس ایم ترمذی اور اس کی لمبی چوڑی ڈگریوں کا حساب لکھا تھا۔

"بھاگ ان گُردہ فروشوں سے کہاں کے حاذق
نیچ کھائیں جو یہ ہم ایسا کوئی بکرا دیکھیں"

آبی نے اپنی پتلون کی پیٹی کستے ہوئے کہا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ اور شاید اس بات پر خوش تھا کہ ہم نے ایک بڑی مچھلی پکڑ رکھی ہے، بولا "اب ان گاڑیوں میں ہم سفر نہیں کر سکتے عین ممکن ہے اس سعید والے نے پولیس کو سب کچھ بتا دیا ہو۔"

"نہیں! میرا خیال ہے کہ وہ اتنی جلدی ہوش میں نہیں آسکتا ہے۔ کم از کم چھ گھنٹے تو آدمی کو میرے عمل سے غٹ رہنا چاہیے تم سب کو لے کر واپس چلو۔ ہمیں ادھر آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔"

"اب تو مجھے بھی اپنی غلطی کا احساس ہو رہا ہے مگر پھر بھی ہمیں یہ خطرہ تو مول لینا ہی ہوگا۔ چل تو کیڈلک میں بیٹھ۔" یہ کہہ کر اس نے فاکس ویگن اسٹارٹ کر دی۔ وہ پیچھے ہٹا تو میں نے کیڈلک اس کے آگے لگا دی اور ہم پھر آہستہ آہستہ ہائی وے پر جا چڑھے۔ ہمیں یہ احساس تھا کہ ہم ایک بہت بڑا خطرہ مول لے رہے ہیں اگر پھل والے نے پولیس کو اپنی بپتا سنا دی اور انھیں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ہم ترمذی کو لے اڑے ہیں تو وہ سارے راستوں پر ناکہ بندی کر کے بیٹھے ہوں گے، ایک شے ہے گشتی پولیس۔ اور اس کے طور اطوار ایسے ہوتے ہیں کہ اسے یاروں نے ہر قسم کی سہولت فراہم کر رکھی ہے جیپیں، وائرلیس سیٹ، موٹر سائیکل یہاں تک کہ بعض اوقات انھیں ہیلی کاپٹر بھی مہیا کر دیے جاتے ہیں۔ جتنی زیادہ خوفناک مہم ہوتی ہے اتنی ہی زیادہ سہولتیں اُن لوگوں کو مل جاتی ہیں۔ اور مجھے یہ ڈر تھا کہ ترمذی جیسے آدمی کے اغوا پر تو سارا ایوانِ حکومت ہل کر رہ جائے گا۔ وہ ہم ایسے دو غریب مسکین افراد کے خلاف ایئر فورس کو بھی حرکت میں لا سکتے ہیں۔ چوہا مارنے کے لیے لاہور سے بھنگیوں کی توپ منگوا لیں گے۔ وہ کیا نہیں کر سکتے تھے۔ مجھے آبی کے مشورے پر سخت طیش آرہا تھا۔ ہم شہر سے باہر نہ نکلتے اور ہائی وے پر نہ چڑھتے تو سوات خان ہمارا تعاقب نہ کرتا۔ اگر وہ شہر میں ہمیں کہیں للکارتا تو ہم اس سے وہیں نمٹ لیتے۔ وہ دراصل کہیں بہت دور پہنچ کر ہمارے پیچھے لگا تھا۔ اگر ہم ہوٹل سے سیدھے فردوسی بیگم کی بارگاہ میں جا ٹھہرتے تو ہمارے لیے خطرے کے سارے دروازے آپ ہی آپ بند ہو جاتے۔ مگر اب ہم جس بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا تھے اس کا کوئی حل ہماری سمجھ میں نہیں آرہا تھا اور یہی وجہ تھی کہ ہم بہت محتاط ہو کر آگے بڑھ رہے تھے۔

ڈر مجھے یہ تھا کہ پولیس کے گہرائی والے لوگ ہمیں کہیں اچانک ہی نہ چھاپ لیں۔ وہ بھی اپنی قسم کے بڑے کائیاں ہوتے ہیں۔ اور ہم ایسے عملی آدمی اُن سے خواہ مخواہ ہی پٹ جاتے ہیں، وہ بگلے کو پکڑنے کے لیے پہلے اس کے سر پر موم نہیں پگھلاتے بلکہ اُتر کر اس کی آنکھوں میں جا ٹپکتے۔ اُن کے کچھ اپنے ہی حربے ہوتے ہیں۔ کیڈلک کی خوبی یہ تھی کہ اس کے تمام شیشوں پر اندر کی طرف پردے چڑھے تھے۔ فاکس بھی ایسی ہی پالکی بنی تھی۔ وہ لوگ ان گاڑیوں کو اپنے مخصوص مقاصد کے لیے استعمال کرتے تھے۔ ایسے مقاصد کے لیے سرسراتے ہوئے ریشمی پردے بہت ضروری ہوتے ہیں۔ اور یہ پردے اس روز ہمارے بہت کام آرہے تھے۔ وہ گیان چوسر کھیلتے تھے۔ اور اس میں ماہر تھے۔ ہمیں بھی اس روز وہی کھیل کھیلنا پڑ رہا تھا۔ آبی کا چہرہ مجھے اپنے عقب نما میں نظر آتا تھا۔ وہ گداگر مجذوب کی طرح کسی طرف دیکھے بغیر میرے پیچھے چلا آرہا تھا۔ واپسی پر میں نے مسافت کا اندازہ لگایا تو معلوم ہوا کہ ہم روانگی میں کراچی سے پچاس میل دور نکل گئے تھے۔ آبی اگر مجھے وہ بیش قیمت مشورہ نہ دیتا تو اس وقت تک ہم خود کو بالکل محفوظ کر چکے ہوتے مگر وہ ایسا چور تھا کہ جو دن کی روشنی سے خواہ مخواہ خوفزدہ رہتا ہے۔ اُس کے اندر کے مُبہم وسوسے اسے چین نہیں لینے دیتے اور اب مجھے اپنی مسند پر مُنا رہا تھا۔ اس جنگل میں کہ "بھاگ ان گردہ فروشوں سے کہاں کے حاذق"۔ کسی کے عمدہ شعر کا اس نے اچھی طرح عرق کیا تھا۔

ہم اب کراچی شہر کی حدود میں داخل ہو چکے تھے۔ آبی کو میں نے عقب نما میں پھر بڑے غور سے دیکھا۔ وہ بہت زیادہ ہو رہا تھا، یوں جیسے کسی نشتر نے اس کے سر پر پاؤں جما رکھے اور وہ اس کو اڑا دینے کی سکت سے محروم ہو چکا ہو۔ اس کی رحم حالت پر مجھے ہنسی آرہی تھی۔ اب وہ اپنی گاڑی کو مجھ سے آگے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اسے جان بوجھ کر راستہ نہیں دیا اور اپنی کیڈلک کی رفتار بڑھا کے میں شہر میں جا گھسا۔ ٹریفک اب گھنی اور خطرناک ہو گئی اور مجھے ڈر تھا کہ کسی جگہ ہم اپنی ہی ذہنی ابتری میں مبتلا ہونے کے باعث کسی سے ٹکرا نہ جائیں پھر بھی خدا کا شکر ہے کہ ہمارے وسوسے بے بنیاد ہی ثابت ہوئے اور سیدھے طارق روڈ پر کے فلیٹ کے سامنے جا ٹھہرے۔

گاڑی سے اُتر کر میں نے آبی کو باہر آنے کا اشارہ کیا۔ آبی نے اپنی فاکس ویگن مقفل کی اور میرے پاس آکر بولا "یار! بہت خراب آدمی ہے تو، میرا ہارن سُنائی نہیں دیتا تھا تجھے؟ کسی غسل خانے میں پہنچا میری جان نکل رہی ہے۔"

سالے تو بقول کسے ابھی تک اس انسانی کمزوری ...

... پا سکا۔ میں تو سمجھا تھا کہ تو کوئی ہیرو ہے کوئی سپرمین قسم کی ... ہے۔" مجھے اس لنگڑے حیدر کی باتیں یاد آنے لگیں جو عالیہ کی کوٹھی میں رہتا تھا اور جس نے مجھے جی بھر کر ذلیل کیا تھا۔ آبی نے ... سے فردوسی بیگم کے دروازے پر لگی گھنٹی پر انگلی رکھ دی۔

کچھ ہی دیر بعد دروازہ کھل گیا۔ ہمارے سامنے تکریم احمد کھڑا تھا ... "میں تو آپ ہی کے انتظار میں بیٹھا تھا یار! اچھا ہوا آپ ... آگئے۔"

"پہلے ان کو غسل خانہ دکھائیں تکریم صاحب اور پھر میرے ساتھ ... ہمارے پاس کچھ مال ہے خاص قسم کا۔ بہتر ہوگا کہ آپ یہ ساتھ والا فلیٹ کھول دیں۔"

آبی اسے پرے ہٹاتا ہوا تیزی سے فلیٹ کے اندر چلا گیا۔

"کیوں خیر تو ہے، اس کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے ادھر ایک کوٹھی کرائے پر لے لی ہے، دو مہینے کا ایڈوانس بھی دے آیا ہوں۔"

"اچھا! کمال کر دیا ہے آپ نے، تو چلیں پھر ہم ادھر ہی چلتے ہیں۔"

"ایک دم فرسٹ کلاس کوٹھی ہے اور فرنشڈ ہے۔ ضرورت کی ساری چیزیں وہاں موجود ہیں۔ کرایہ تین ہزار مہینہ ہے۔"

"یہ تو بہت اچھا ہوا۔ آپ کی وہ غمزدہ خانم کہاں ہیں؟"

"وہ دفتر گئی ہوئی ہے ابھی تک نہیں آئی ہیں۔ چلیں میں آپ کو کوٹھی تک لے چلوں۔"

"وہ پیرزادہ صاحب نکلیں تو چلتے ہیں۔" میں نے دروازے سے پلٹتے ہوئے کہا۔

وہ میرے ساتھ ہی باہر آگیا، بولا "مال کس قسم کا ہے آپ کے پاس؟ میں سمجھا نہیں۔"

"آپ کو ہم سب کچھ بتا دیں گے۔ ان آدمیوں کو ہم باندھ لائے ہیں جن کی خباثت سے اتنے سارے لوگ تباہ ہو گئے ہیں۔"

"اچھا! یہ کیسے ہو گیا۔ کوئی جادو کی چھڑی ہے آپ کے پاس؟ وہ تو بہت اونچا اڑنے والے لوگ ہیں۔"

"بس اتفاقاً ہاتھ آگئے۔ ان گاڑیوں میں لدے ہیں۔" یہ کہہ کر میں تکریم احمد کو باہر سڑک پر لے آیا۔ اس نے کیڈلک کے اندر جھانکنا چاہا مگر اس کے اندھے شیشے نظر بند کر دیتے تھے اور سامنے سے پچھلی نشستوں کا منظر دکھائی نہیں دیتا تھا۔

اتنے میں آبی پتلون کی پیٹی کستا ہوا باہر آگیا۔ وہ ابھی تک بہت سنجیدہ نظر آرہا تھا۔

"کیا ہوا مسٹر پانکی! خیر تو ہے آپ کے رُخ روشن پر غصہ کیوں ہے؟"

"بک نہیں اوئے! میں مصیبت میں پھنسا تھا اور تو ذرا سی مدد ... کر مسکرایا۔

"اچھا! یعنی میں کیا مدد کرتا حضور پُرنور کی؟"

"اس سوال کا جواب میں کتاب دیکھ کر بتاؤں گا۔ چلو اب وہ کوٹھی دکھاؤ کہاں ہے جلدی نکل چلو۔" یہ کہہ کر وہ فاکس کے اندر جا گھسا۔ تکریم احمد میرے ساتھ بیٹھا اور ہم اسی وقت طارق روڈ سے آگے نکل کر ٹیلیویژن کی عمارت کے سامنے سے گزرے تو کچھ ہی دیر بعد تکریم احمد نے ہمیں ایک کوٹھی کے سامنے روک دیا۔ وہ دو کنال رقبے پر تعمیر شدہ کوٹھی خاص دیدہ زیب نظر آتی تھی۔ اس کے گیٹ پر لگا تالا کھول کر تکریم احمد نے ہمیں اندر داخل ہونے کا اشارہ کیا۔ چند ہی منٹ بعد ہم کوٹھی کا پوری طرح معائنہ کر چکے تھے بلاشبہ وہ جگہ ہمارے مقاصد کے لیے بہت ہی موزوں تھی۔ یوں کہ اس کے دائیں بائیں کے دونوں پلاٹ ابھی خالی پڑے تھے اور عقب میں بھی کوئی عمارت موجود نہیں تھی۔ وہ علاقہ ابھی آباد ہو رہا تھا۔ تکریم احمد نے بتایا کہ اس کوٹھی کا مالک پندرہ دن پہلے لندن چلا گیا تھا۔ بال بچے سمیت۔ اور گھر کا سارا سامان وہ جوں کا توں چھوڑ گیا تھا۔ اور کرائے میں اس سامان کا کرایہ بھی شامل تھا۔

ہم نے بڑی احتیاط سے وہ پانچوں سواریاں گاڑیوں سے اتار کر ایک کمرے میں بچھے بڑے بڑے پلنگوں پر ڈال دیں۔ تکریم احمد نے عالیہ کو دیکھا تو بہت حیران ہوا۔ اس کی زرد رنگت اسے بہت بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ ان سب میں سے سوات خان کا حال زیادہ پتلا تھا۔ اس کے گلے کی رگ پھول رہی تھی اور وہ علامت اچھی نہیں تھی۔ اسی حالت میں اس کی موت بھی واقع ہو سکتی تھی۔ میں نے اس کی نبض پر ہاتھ رکھ دیا۔ سوات خان مسلسل ڈوبتا جا رہا تھا۔ اس کی گردن پر میرا ہاتھ کچھ زیادہ ہی سخت پڑ گیا تھا اس میں میرا غصہ بھی شامل تھا کیونکہ سوات خان کے خلاف میرے دل میں ایسی نفرت جاگزیں تھی کہ میں اسے کسی بھی صورت معاف نہیں کر سکتا تھا۔ آسیہ اُسی کے ہاتھوں تباہ ہوئی تھی لیکن اسے یوں بے موت مرتے دیکھ کر میں پریشان ہو گیا۔ میں نے فوراً ہی اس کے پاؤں کی رگیں ملنی شروع کر دیں۔ اُستاد نے اپنے اس زہر کا جو تریاق مجھے بتا رکھا تھا وہ میں نے سوات خان پر خلوصِ نیت سے استعمال کیا۔ پاؤں کی مختلف رگیں جب میں ہاتھ کے دباؤ سے حرکت میں لا چکا تھا تو اس کے بعد میں نے اس کی گردن کی رگوں میں خون کی گردش تیز کرنے کے لیے اسے اوندھا لٹا کر اس کی مالش شروع کر دی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کوئی دس منٹ بعد سوات خان کی وہ پھولی ہوئی رگ دبنے لگی وہ معمول پر آرہی تھی اور اب اس کا سانس پہلے کی نسبت بہتر ہو گیا تھا۔ اس کے پھیپھڑے اب زیادہ ہوا کھینچنے لگے تھے اور میں سمجھ رہا تھا کہ وہ جلدی ہوش میں آجائے گا۔

"اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیں پیرزادہ صاحب! یہ ہوش میں آرہا ہے۔" آبی نے میری یہ بات سُنی تو اس نے فوراً ہی عالیہ کے گلے میں پھنسا

نائیلون کا دوپٹہ نکال کر پھاڑ دیا اور اس کی رسیاں بنا کر اس نے سوات خان کے ہاتھ پاؤں اس طرح جکڑ دیے کہ وہ ہوش میں آنے کے بعد کمر کا سارا زور صرف کر دینے کے باوجود وہ رسیاں کھول نہیں سکتا تھا۔

"آپ کرنا کیا چاہتے ہیں بھائی جی؟" تکریم احمد نے پوچھا۔ "ادھر ہم ان چاروں کو چکلے میں بٹھا دیں لگے۔" آبی نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"آپ ادھر ہی بیٹھیں۔ آپ دونوں۔" میں نے آبی کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "کیا یہاں ٹیلیفون بھی موجود ہے؟" میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"ہاں ٹیلیفون تو موجود ہے۔ یہ سہولت میں نے سب سے پہلے اپنے پلیش نظر رکھی تھی۔" تکریم احمد نے پہلو کے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں تیزی سے اُدھر چلا آیا۔ ٹیلیفون واقعی وہاں موجود تھا۔ وہ دونوں میرے پاس آ ٹھہرے۔ وہ کمرہ بھی مکینوں کا آرام دہ بیڈ روم تھا۔ اور ضرورت کی ساری چیزیں وہاں سلیقے سے رکھی گئی تھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی ابھی ابھی وہاں سے اٹھ کر باہر گیا ہے۔ تکریم احمد نے اس کی جھاڑ پونچھ کروا دی تھی۔ اس نے ہمارے کہنے کے مطابق اتنی تیزی سے کام کیا تھا کہ اس کی صلاحیتِ کار کی مجھے داد دینا پڑی۔

آبی ایک پلنگ پر پھیل کر بیٹھ گیا۔ "یہ پنکھا چلا دیں تکریم صاحب اور میری مانیں تو فردوسی بیگم کو فارغ اوقات میں یہاں لے آیا کریں۔ چوری کے کام ایسی ہی ادھر اور خاموش جگہوں پر مزہ دیتے ہیں۔"

"جی شکریہ! اس کا اپنا فلیٹ ہی بہت کافی ہے۔" یہ کہہ کر تکریم احمد آبی کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

میں نے اس ہوٹل کا نمبر آپریٹر سے معلوم کر کے گھما دیا۔

"ہیلو۔۔۔" کسی خاتون کی خمار آلود اور رسیلی آواز مجھے سنائی دی۔

"ہیلو سویٹی! مجھے بتائیں کہ اِدھر کوئی واردات تو نہیں ہو گئی۔ میں صدر تھانے سے بول رہا ہوں۔"

"جی جی۔ یہاں ٹائیلٹ میں ایک آدمی بے ہوش ملا تھا۔"

"میں اسی کے بارے میں پوچھ رہا ہوں کچھ پتہ معلوم ہوا اس کا؟"

"جی نہیں۔"

"حلیہ کیا ہے اُس کا؟"

"وہ جینز پہنے ہوئے ہے جناب! اور منیجر صاحب نے اُسے ہسپتال بھیج دیا ہے۔"

"کس ہسپتال میں؟"

"یہ تو مجھے پتہ نہیں ہے جناب! آپ پھر رنگ کریں، میں پوچھ رکھوں گی۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ میں منیجر سے بات کر لیتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔

"یوں کریں تکریم صاحب! آپ اور پیرزادہ صاحب ادھر بیٹھیں۔ ایک گاڑی تو گیراج میں بند کر دیں اور دوسری جو گاڑی ہے وہ میں لیے جاتا ہوں۔ آپ میرا انتظار کریں۔"

میں کمرے سے باہر نکلا تو آبی بھی میرے پیچھے آ گیا۔ بولا "جلد آ جیلانی! تیرا پروگرام کیا ہے؟"

دیکھ میں کسی سرجن کو پکڑ لاتا ہوں ان سب کے گردے نکال کر میں کتوں کے آگے ڈال دوں گا۔ میں ان سے وہی سلوک کروں گا جو یہ دوسروں سے کرتے رہے ہیں۔"

"نہیں! یہ کام یہاں نہیں ہو سکے گا۔ ایسے آپریشن کے لیے بہت کے سامان کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"ہاں یہ۔۔۔ یہ تو مجھے خیال ہی نہیں رہا۔ ایک پورے آپریشن تھیٹر کی ضرورت ہو گی۔"

"یہی میں کہہ رہا ہوں بہتر یہ ہے کہ تو انھیں قانون کے حوالے کر۔ ان کے بیان ہم ٹیپ کر لیتے ہیں۔ لکھ بھی لیں گے، اس پر انگوٹھے بھی کروا لیں گے کسی معتبر پولیس افسر کو بھی بلایا جا سکتا ہے یہ دو ہی نہیں بے شمار لوگوں کے مجرم ہیں، ان کا فیصلہ ادھر نہیں ہو سکتا۔"

"تیرا خیال درست معلوم ہوتا ہے آبی! مگر یہ بھی تو دیکھ ہم پولیس کے سامنے کس طرح جا سکتے ہیں؟"

"یہ کام تکریم احمد کرے گا۔ تم یہاں ڈھلوں صاحب کو بلوا لو۔ ان کو ساری دنیا کے سامنے بے نقاب کرنا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے ہم یہی کرتے ہیں۔ آ میں ان کو ہوش میں لاؤں" یہ کہہ کر میں کمرے کی طرف لوٹ گیا۔ ہم تینوں نے مل کر ان کو رسیوں سے اس طرح جکڑا کہ وہ کوئی حرکت نہ کر سکیں۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں اُن کو ہوش میں لے آیا مگر اس کام میں مجھے ایک گھنٹہ لگ گیا۔ ڈاکٹر دھمن سب سے پہلے ہوش میں آیا اور وحشت زدہ نظروں سے گرد و پیش کو یوں دیکھنے لگا جیسے وہ سب اُسے خواب میں دھندلا دھندلا دکھائی دے رہا ہو۔ میں اس کے سامنے ہی بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ مجھے پہچان نہیں رہا۔ وقت بھی بہت گزر گیا تھا۔ یہی حال عالیہ کا ہُوا۔ وہ تو خوفزدہ ہو ہی لگی اپنے ہاتھ اور پاؤں کو بندھا دیکھ کر اس پر دہشت طاری تھی۔ ترمذی، سوات خان اور اس کا ساتھی بھی پوری طرح ہوش میں آ چکے تھے۔ اس وقت وہ پانچوں ایک دوسرے کے قریب ایک صوفے پر پھیل کر بیٹھے تھے یوں جیسے وہ کسی دعوت میں شریک ہوں۔

عالیہ اپنی بے بسی پر زیادہ ہی جھلا اُٹھی تھی۔ چیختی ہوئی بولی "یہ۔۔۔ یہ ہمیں کس نے باندھا ہے ہم سے کیا چاہتے ہو تم؟" وہ کھڑے تکریم احمد سے مخاطب تھی۔ وہ مجھے بالکل ہی نہیں پہچان سکی تھی۔

"آپ نے مجھے پہچانا نہیں ہے ڈاکٹر صاحبہ! میں آپ کا بڑا پرانا خادم ہوں غلام جیلانی۔" میں نے اُس کے قریب جا کر قالین پر اپنے زانو رکھتے ہوئے کہا۔

میرا نام سنتے ہی اس کی آنکھوں میں چنگاریاں سی پھوٹنے لگیں۔ اس کا چہرہ ایک دم تمتما اٹھا۔ غصے کی تیز لہر اس کے دماغ تک پہنچی تو اس نے نفرت سے میری طرف تھوک دیا۔

آبی میرے داہنے ہاتھ کھڑا تھا وہ بھی ضبط نہ کر سکا۔ اس نے عالیہ کے نرم ملائم بال ہاتھ میں لے کر اس کا چہرہ اُوپر اٹھایا۔ اور پھر تڑاخ سے ایک کرارا سا تھپڑ اس کے رخسار پر مار کر بولا "مجھے کب تیز تر ہے گی میری جان! ہم لوگوں کو بھی نہیں پہچانتی ہو۔"

"مجھ سے بات کرو میاں کیا چاہتے ہو؟" ڈاکٹر دھمن نے بڑے تحکم آمیز لہجے میں کہا۔

آبی فوراً اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ بولا "اس بھیڑیے کو اپنا پیٹ دکھا جیلانی اور پوچھ اس سے کہ تیرے گردے کے اس نے کتنے دام کھرے کیے تھے؟"

"ہاں ڈنگر ڈاکٹر صاحب! یہ دیکھیں آپ کے نشتر کا کرشمہ" میں نے پیٹ کا مندمل زخم اُسے دکھاتے ہوئے کہا۔

وہ اب مجھے پہچان چکا تھا۔ ایک عجیب سی بے بسی میں بھی طنز بھری مسکراہٹ اس کے لبوں پر اُبھری۔ بولا "میں ڈنگر ڈاکٹر ہوں نا! اسی لیے تم ایسے جانوروں کا علاج جس طرح ہو سکے کر لیتا ہوں۔ کیا چاہتے ہو تم؟"

"تم سے اپنے اور تمام لوگوں کے زخموں کا میں حساب لوں گا اور یہ ایک اچھی بات ہے کہ ڈاکٹر ترمذی آپ کے سامنے موجود ہیں۔" یہ کہہ کر میں ترمذی سے مخاطب ہو گیا۔ وہ تصویرِ حیرت بنا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ میں نے اپنی قمیض پتلون میں اُڑس کر سگریٹ ڈاکٹر ترمذی کے لبوں میں رکھ دیا اور اسے تیلی دکھاتے ہوئے کہا "میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں ڈاکٹر ترمذی مگر یہ اچھا ہے کہ آپ یہاں موجود ہیں۔"

اس نے سگریٹ کا گہرا کش لگایا تو میں نے آگے بڑھ کر اس کے دونوں ہاتھ کھول دیے۔

"ہم آپ کو کوئی گزند نہیں پہنچانا چاہتے ہیں ترمذی صاحب! مگر اس بھیڑیے اور اس کی مادہ کے کرتوت آپ کے علم میں ضرور آنے چاہئیں۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔ ڈاکٹر دھمن تو ہمارے بہت قابلِ فخر سرجن ہیں۔ آپ کو کیا شکایت ہے اُن سے؟"

"صرف مجھے ہی شکایت نہیں ہے اس ابلیس زادے سے ایک دنیا پریشان ہو گئی ہے۔" یہ کہہ کر میں نے وہ سب اُسے بتا دیا جو ان دونوں کے بارے میں مجھے معلوم تھا۔ اُس کی حیرت دیدنی

تھی۔ "یہ۔۔۔ یہ تو۔۔۔ ناقابلِ معافی جرم ہے صاحب! مجھے۔۔۔ یقین نہیں آ رہا ہے۔"

"ہاں اور اسی یقین دہانی کے لیے ہم نے ان کو یہاں باندھا ہے یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ کوئی خون خرابہ کیے بغیر ہم اُن کو یہاں لے آئے ہیں اور یہ خود آپ کو بتائیں گے کہ میں کہاں تک سچ کہہ رہا ہوں۔"

"اگر یہ سچ ہے تو۔۔۔ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں ڈاکٹر دھمن!"

"یہ بکتا ہے یہ شخص جرائم پیشہ لوگوں کا سرغنہ ہے اور پھانسی کی کوٹھری سے مفرور مجرم ہے پولیس اس کی تلاش میں پھر رہی، اور اب یہ ہم سے اس بات کا انتقام لے رہا ہے کہ ہم نے اسے پولیس کے حوالے کیوں کر دیا تھا۔"

اُس کی یہ بات سنتے ہی آبی نے اُسے بالوں سے پکڑ کر صوفے پر سے اُٹھایا اور پھر اُس کی ٹانگوں میں ہاتھ دے کر اُس نے دھمن کو پوری قوت سے بوری کی طرح قالین پر پھینک دیا۔ وہ کئی قلابازیاں کھاتا ہُوا دیوار سے جا لگا تو آبی نے پھر اسے بالوں سے پکڑ کر اُوپر اُٹھایا، بولا "بدمعاش! تو سچ نہیں بولے گا تو یاد رکھ ہم تیرا ایک ایک پرزہ الگ کر دیں گے۔"

یہ کہہ کر وہ اس کا سر دیوار کے ساتھ مار کر تیزی سے کچن کی طرف لپکا جب وہ واپس آیا تو اس کے ایک ہاتھ میں گنڈاسے ایسا چھرا
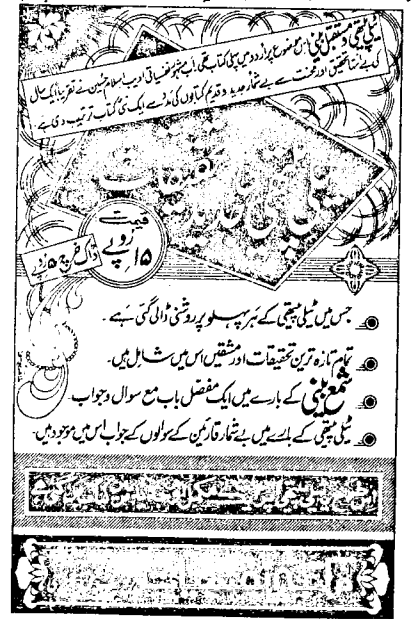
تھا۔ اور دوسرے ہاتھ میں لکڑی کا ایک اڈہ۔ کمرے میں آتے ہی اس نے وہ اڈہ دھمن کے پاؤں کے قریب رکھا اور پھر دھمن کی بندھی ہوئی ٹانگیں پکڑ کر اس کا ایک پیر اس نے اڈے پر چڑھا لیا۔ دھمن دہشت زدہ ہو کر سکڑنے لگا۔ ٹانگیں اس نے فوراً ہی کھینچ کر پیٹ سے لگا لیں تو میں نے اس کی گردن پر اپنا بوٹ رکھ دیا۔ آبی نے ایک بار پھر کھینچ کر اس کا ایک پاؤں لکڑی کے اڈے پر رکھ دیا اور غضبناک لہجے میں بولا۔ "اگر تو ترمذی صاحب کے سامنے سچ نہیں بولے گا کتے کے بچے! تو میں ایک ایک کر کے تیرے ہاتھ پیر کاٹ دوں گا۔"

یہ کہہ کر اس نے وار کرنے کے انداز میں وہ چاپڑ اوپر اٹھایا تو ڈاکٹر دھمن ایک بار پھر لرز کر پیچھے کھسکا اور ایک بار پھر وہ اپنی ٹانگیں آبی کے ہاتھ سے چھڑانے میں کامیاب ہو گیا۔ عین اس وقت مجھے کمرے کے ایک کونے میں بید کی پتلی سی چھڑی نظر آ گئی۔ وہ میں نے لپک کر اٹھالی اور ڈاکٹر دھمن کو بالوں سے پکڑ کر اس چھڑی سے ادھیڑ ڈالا، یوں کہ اس کی کمر سے لہو رس کر قمیص پر اترنے لگا۔ وہ بری طرح چیخ رہا تھا اور عالیہ مسلسل ذبح ہوتی ہوئی بکری کی طرح کراہ رہی تھی مگر مجھے اس پر کوئی ترس نہیں آ رہا تھا۔

"بول بدمعاش! تو زبان کھولے گا کہ نہیں۔ تجھ سے ہم ایک ایک حرف سچ سننا چاہتے ہیں اور ترمذی صاحب کی موجودگی میں۔"

اس کو اب احساس ہو چکا تھا کہ ہم اس کا کوئی نخرہ برداشت نہیں کریں گے۔ سوات خان کا رنگ بھی زرد پڑ چکا تھا اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہمیں یوں دیکھ رہا تھا جیسے تھوڑی ہی دیر بعد ہم اسے بھی انھی مراحل سے گزار دیں گے۔

"بول ڈاکٹر دھمن بول کہ تو کیا کچھ کرتا رہا ہے؟"

"میں بتاتا ہوں۔ خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔ میں سب کچھ بتا دوں گا، سب کچھ۔"

"اسے پانی پلائیں بھائی جی! اس خبیث کو اور دیکھیں ادھر کوئی ٹیپ ریکارڈر بھی ہو گا کہ نہیں۔" میں نے تکریم احمد سے کہا۔ آبی نے اس دوران وہ گنڈاسا اور لکڑی کا اڈہ وہاں سے ہٹا دیا۔

"جی نہیں ایسی کوئی چیز گھر میں نہیں ہے۔ میں البتہ آپ کو لا دیتا ہوں۔"

"جائیں ٹیکسی لے کر ابھی فلیٹ سے ایک ٹیپ ریکارڈر اٹھا لائیں میں اس کھوتے کے پتر کو پانی پلاتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے کچن میں سے لا کر ایک گلاس پانی اس کے منہ سے لگا دیا جسے وہ جانوروں کی طرح غٹا غٹ پی کر ہانپنے لگا، یوں جیسے ہوا اس کے پھیپھڑوں میں داخل نہ ہو رہی ہو۔ تکریم احمد اسی وقت باہر نکل گیا۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہو رہی تھی کہ ڈاکٹر دھمن کے اس علاج کا دوسروں پر خاطر خواہ اثر ہوا تھا۔ وہ سب ہمت ہار گئے تھے اور یہی میں چاہتا تھا۔ ان کے اندر مزاحمت کی تمام دیواریں منہدم ہو جانی چاہییے تھیں۔ اس کے بغیر ہم اپنا مقصد حاصل نہیں کر سکتے تھے۔

"میں آپ کو بھی پانی پیش کروں ترمذی صاحب؟"

"نہیں! میں تمھیں سیون اپ پلاتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ دائیں ہاتھ کے کمرے میں جا گھسا وہاں رکھے فریج میں اس نے کھانے پینے کی چیزیں دیکھ لی تھیں وہ غالباً تکریم احمد نے اسی روز وہاں رکھی تھیں۔ تھوڑے سے وقت میں اس نے ہمارے لیے بہت سا کام کر لیا تھا اور ہماری کسی بھی بات پر شبہ کر کے اس نے کسی قسم کی غفلت کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔

ڈاکٹر ترمذی ہمارے اس مربیانہ سلوک سے متاثر ہو رہا تھا۔ سوڈے کی بوتل پی کر اس نے اپنی جیب سے عمدہ قسم کے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور اسے سلگا کر بولا۔ "مجھے نہیں معلوم تھا اس عظیم پیشے میں ایسے ایسے لوگ بھی موجود ہیں۔ میں تو انھیں اپنے شہر کا نہیں سارے ملک کا معزز ترین ڈاکٹر سمجھتا تھا اور آپ کہتے ہیں کہ الشفق میں بھرتی ہونے والے لوگ ان کا شکار ہو گئے ہیں۔ وہ جو حادثے میں مرتے مرتے بچے وہ بھی گردوں سے محروم کرائے گئے ہیں، مجھے حیرت ہے صاحب۔"

"ہاں! توے پر روٹی بھی پکتی ہے مگر اس کا ایک حصہ سیاہی کا منبع بن جاتا ہے۔" میں نے دیوار کے ساتھ لگے بیڈ پر بیٹھے ہوئے کہا۔

"یہ سوات خان اس شیطان کا گرگا ہے اس سے پوچھیں، کتنی دولت کما چکا ہے، کیوں اوئے بدمعاش کی اولاد! تو سیدھی طرح بولے گا کہ نہیں؟"

"میں تم سے کیا بولوں، میرے ہاتھ تو بندھے پڑے ہیں۔ تم ہمیں بے بس کر چکے ہو۔ جو کہو گے ہم مان لیں گے۔"

"نہیں! اگر تیرے دل میں کوئی حسرت ہے تو میں وہ ضرور پوری کر دوں گا۔ بہتر یہ ہے کہ تو اپنے حصے کی کارروائی ترمذی صاحب کو بتا دے، کیا میں نے جو کچھ کہا ہے جھوٹ ہے؟"

"نہیں، یہ سب کچھ سچ ہے ہم نے ہی ان دونوں آدمیوں کو بے ہوشی کی حالت میں بس سے نکال کر اسٹار گیٹ کے عقب میں بنی کوٹھی پر پہنچایا تھا وہاں ایک بڑا تہہ خانہ ہے جس میں ڈاکٹر صاحب نے آپریشن کا تمام سامان لگوا رکھا ہے۔ ان دونوں کے گردے ڈاکٹر عالیہ نے نکالے تھے۔ یہ بھی اس آپریشن میں ماہر ہو چکی ہیں۔ جب یہ اپنا کام کر چکے تو ہم نے ہی ان دونوں کو ہسپتال پہنچایا تھا۔"

"سن رہے ہیں آپ ترمذی صاحب! یہ ان کا آدمی ہے جنھیں آپ بہت معزز سمجھتے ہیں۔"

"اُف توبہ! یہ تو سیدھا سیدھا پولیس کیس ہے صاحب! آپ جو بھی کر گزریں تھوڑا ہے۔ کوئی بھی شخص انھیں معاف نہیں کر سکتا۔" ترمذی نے اپنے بندھے پاؤں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ اب بڑے تواتر سے سگریٹ پی رہا تھا اور سمجھ چکا تھا کہ اگر اس نے وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی تو وہ بچ کر نہیں جا سکے گا۔ ہمارے ہاتھوں کی کرامت وہ دیکھ چکا تھا اور اپنا پستول بھی میں نے ان سب پر عیاں کر دیا تھا۔ تاکہ وہ اپنی کھال میں رہیں۔

"تیرا کیا نام ہے بچے! تم کیڈلک کے پیچھے کیسے لگ گئے؟" میں نے سوات خان کے ساتھ بیٹھے آدمی سے پوچھا۔ وہ نئی عمر کا چھوکرا تھا۔ لباس اس نے بہت ہی سکن ٹائٹ پہن رکھا تھا۔ اور اپنے سن سال سے وہ ناتجربہ کار لگتا تھا۔ مگر اس کی آنکھوں میں ایسی بہیمیت تھی کہ میں سمجھتا تھا اسے موقعہ ملے تو وہ ہماری شہ رگ پر منہ رکھ کر ہمارا سارا خون پی جائے۔ میرا تاثر اس کے بارے میں یہی تھا۔ بڑے سخت رگ و ریشے کا جوان تھا وہ اور ایسے ہی کاموں کے لیے بنا تھا۔ اسے بے ہوش کرنے میں مجھے خاصی دقت پیش آئی تھی۔ میری بات کا اس نے کوئی جواب نہ دیا تو میں نے بید کی چھڑی تڑاخ سے اس کے کان پر دے ماری۔ میں ان میں سے کسی کے لیے ذرا سی بھی رو رعایت برتنا نہیں چاہتا تھا۔ ہماری دہشت ان کی ہڈیوں میں اتر جانی چاہیے تھی۔ وہ بلبلا اٹھا۔ کان اس کا بری طرح سرخ ہو گیا۔

"تو بولتا کیوں نہیں اوئے! تو سمجھتا ہے ہم تجھے چھوڑ دیں گے بتا کیا نام ہے تیرا؟"

"میرا نام علی مگسی ہے مگر یاد رکھ تیری ایک ایک بات کا ہم تجھ سے خوفناک بدلہ لیں گے۔"

میں نے تپ کر ایک اور ضرب اس کے اسی کان پر لگائی۔ اس نے یوں سر ڈال دیا جیسے اس کے حواس گم ہو گئے ہیں مگر چند ثانیوں بعد وہ میری توقع کے بالکل برعکس بندھی ہوئی حالت میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہو کر اچھلا اور مجھ پر چیتے ایسی پھرتی سے یوں آ پڑا کہ اس کی بندھی ہوئی بانہوں کا حلقہ میری گردن میں تھا اور وہ اب اپنی دونوں کہنیاں میری ہنسلی میں دائیں بائیں دھنسا رہا تھا۔ میں سمجھا وہ میری ہنسلی توڑ دے گا۔ میں نے دونوں ہاتھ اس کی گردن پر جما کر اپنی انگلیاں اس کے نرخرے پر جما دیں۔ اس کا دم گھٹنے لگا تو میری گردن پر اس کا بوجھ چھٹ گیا۔ اس نے آگے جھک کر میرا کان اپنے دانتوں میں لینا چاہا تو میں نے اس کی گردن چھوڑ دی اور اسے کمر سے پکڑ کر ذرا اوپر اٹھا کر پوری قوت سے اچھال کر ڈاکٹر دھمن کے اوپر گرا دیا مگر وہ پلٹ کر دیوار سے لگا اور ایک بار پھر اٹھ گیا اور میں دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس نے اپنی بانہوں پر بندھی رسی اپنی بے پناہ قوت سے توڑ ڈالی تھی اور پاؤں کی بھی۔ اس کی آنکھوں میں خونخوار چیتے ایسی بہیمیت کچھ اور زیادہ چمک گئی تھی۔ آبی صوفے کے کنارے پر ایک طرف ہو کر کھڑا تھا۔ اس نے مداخلت سے گریز کیا البتہ اس کا پستول سیدھے ہاتھ میں آ چکا تھا۔ مگسی نے رسیاں تڑاتے ہی پاؤں بدلے اور کمرے کے کونے کی طرف اتنی برق رفتاری سے گیا کہ میں اس کا ارادہ ہی نہ سمجھ سکا۔ وہ اب ہوا میں گولی کی طرح اڑتا ہوا میری طرف آ رہا تھا۔ ایک جست سے وہ میرے سینے پر دونوں پاؤں مار ہی دیتا مگر عین آخری ثانیے میں میں ایک طرف ہٹ گیا اور وہ سیدھا قوم کے بیڈ پر جا گرا۔ وہ ایسا تماشا دکھا رہا تھا کہ آبی بھی عش عش کر اٹھا۔ اور۔۔۔ اور پھر۔۔۔ مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ ہم ان میں سے کسی کی بھی تلاشی نہ لے سکے تھے۔ میری آنکھوں کے سامنے اب ایک پتلے سے پھل کا تیز دھار خنجر لہرا رہا تھا۔ ایسا خنجر جس کا دستہ ہلکا تھا اور پھل اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ وزنی اور اسے مگسی نے نوک کی طرف سے پکڑ کر اتنی تیزی سے پھینک دیا تھا کہ اگر میری نظر اس کے ہاتھ پر نہ ہوتی تو وہ خنجر سیدھا میرے سینے میں دھنس چکا ہوتا۔ مگر اس کے ہاتھ کی حرکت کے ساتھ ہی میں نشانے سے ہٹ گیا۔ خنجر سیدھا سامنے کی چوبی الماری کے تختے میں لگا۔ وہ اتنی قوت سے پھینکا گیا تھا کہ الماری کے انچ بھر موٹے دستے میں دستے تک دھنس گیا۔ مگسی اپنی اس کوشش کی ناکامی پر تلملایا اور ایک بار پھر وہ پورے قد سے اچھل کر میرے سینے پر ہوائی ضرب لگانے کے لیے میری طرف اڑا مگر میں نے نیچے جھک کر اسے دیوار میں ٹکنے دیا۔ وہ سر کے بل فرش پر گرا تو میں نے اس کی دونوں ٹانگیں پکڑ کر مقفل کر دیں، یوں کہ جوں جوں میرا دباؤ بڑھا اس کی چیخیں زیادہ دلدوز ہوتی گئیں۔ مجھے کچھ اتنا طیش آ چکا تھا کہ اسے کوئی موقعہ دیے بغیر میں نے اس کے زانو پر دباؤ ایک دم اتنا بڑھا دیا کہ کڑ کڑ ایسی آوازوں کے ساتھ ہی اس کے گھٹنے کا جوڑ ٹوٹ گیا۔ اس کی مہیب چیخ کمرے میں گونجی اور پھر وہ درد کی شدت سے نڈھال ہو کر اوندھے منہ پڑا فرش پر سر پٹخنے لگا۔ اس وقت میں نے دل سے چاہا کہ خدا کرے اسے کوئی زیادہ نقصان نہ پہنچ گیا ہو۔ وہ بڑا جی دار جوان تھا اور ابھی وہ ان کے گروہ میں نیا نیا ہی شامل ہوا تھا۔

اس کو یوں بے بس ہوتا دیکھ کر آبی بولا "یار تیرا ہاتھ کچھ زیادہ ہی سخت پڑ گیا ہے یہ بڑا کاری جوان ہے اسے ضائع نہ کر۔" یہ کہہ کر وہ مگسی کے پاس آ بیٹھا اور اسے دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر اس نے بڑی احتیاط سے بیڈ پر ڈال دیا اور پھر اس کا گھٹنا بڑے ہی دردمندانہ انداز سے سیدھا کرنے لگا۔ جونہی اس نے مگسی کے گھٹنے کو پکڑ کر سیدھا کرنے کی کوشش کی۔ اس کی چیخیں اور زیادہ دلدوز ہو گئیں۔ اس کے اس بھیانک انجام پر مجھے افسوس ہونے لگا تھا۔ میں نے بھاگ کر فریج میں سے ایک کوکا کولا کی بوتل نکالی اور اس کے پاس لے جا کر آبی کو تھما دی۔ وہ بوتل آبی نے دانتوں سے کھول کر مگسی کے منہ سے لگا دی۔

"اسے پی جوان! اور درد کو سہہ جا ذرا دیر کے لیے ہم تیرا علاج کروا لیں گے

مجھے تم سے بہت ہمدردی ہے تو حق ادا کر سکتا ہے۔"

آبی کی یہ بات سنتے ہی مگسی کی اُف اُف تھم گئی۔ اس نے متشکر انداز سے بوتل حلق سے نیچے انڈیل لی اور گھٹنے پر اپنا ہاتھ رکھ کر بولا "میں نے ایسا تیز جوان کوئی نہیں دیکھا۔ یہ پہلا آدمی ہے جس نے مجھے زیر کر لیا ہے اور مجھے خوشی ہے کہ یہ کمینہ دشمن نہیں ہے، اسے یہی کرنا چاہیے تھا ورنہ میں اسے مار دیتا۔"

مگسی نے یہ باتیں کچھ ایسے لہجے میں کہیں کہ میں اُن سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ ذرا دیر کیلئے اپنی بے پناہ اذیت کو بھول گیا تھا۔

"اس کو ذرا دیکھیں ڈاکٹر ترمذی صاحب کہیں اس کا زیادہ نقصان تو نہیں ہو گیا ہے۔" میں نے ترمذی کو اس کے پاؤں پر سے اکھاڑ کر باہوں میں اٹھاتے ہوئے کہا، اور پھر اسے لے جا کر مگسی کے پاس بیڈ پر بٹھا دیا۔

ترمذی نے اس کے گھٹنے کو ماہر مشاطہ الیسی لا انبی لا انبی استخوانی انگلیوں سے ٹٹول کر دیکھا اور قدرے توقف کے بعد بولا "ایک یہ۔۔۔ یہ دائیں طرف کا جوڑ متاثر ہوا ہے بہرحال یہ درست ہو جائے گا۔ پلستر میں ٹانگ پندرہ دن رکھنی پڑے گی۔"

"آپ ہماری اس عدالت سے فارغ ہوں تو اس کو اپنے ساتھ لے جائیں اور اس کا علاج کرائیں ہم کسی کو بلا وجہ کوئی زخم نہیں لگانا چاہتے۔"

"عدالت؟ آپ ٹھیک کہتے ہیں کبھی کبھی مظلوموں کی بھی عدالت لگ ہی جاتی ہے مگر میں قسم کھاتا ہوں کہ آپ قانون کے سامنے نہ بھی جائیں تو بھی میں ان خبیثوں کو سزا دلوائے بغیر نہیں رہوں گا۔ میری دوستی اس ڈاکٹر سے بہت پرانی ہے مگر مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ اس پلیٹ کے لیے آستین کا سانپ بن چکا ہے۔"

"اس نے بے شمار دولت جمع کر رکھی ہے ڈاکٹر بے شمار دولت۔ یہاں تک کہ اس کے ہاتھ نیویارک تک پھیلے ہوئے ہیں۔ وہاں کے بینک میں بھی ان کی موٹی رقم جمع ہو گی۔ یہ خود بولے گا ڈاکٹر! نہیں بولے گا تو میں اس کا قیمہ کر دوں گا اور یہ گشتی بھی یہاں سے زندہ نہیں جا سکے گی" میں نے عالیہ کی طرف غضبناک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں سے اب آنسو نہیں بہہ رہے تھے، جو بہہ چکے تھے وہ اس کے زرد رخساروں پر میلی لکیروں کی صورت میں خشک ہونے لگے تھے اور سوات خان کی آنکھیں بھی اب بجھنے کو تھیں وہ ہم سے نظریں نہیں ملا رہا تھا۔ سر جھکا کر وہ اپنے پاؤں پر بندھی رسی کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے وہ یہ سب کچھ اپنی تقدیر سمجھ کر قبول کر چکا ہو۔ ڈاکٹر دھمن بھی اب مکمل طور پر مغلوب ہو چکا تھا، اور اسے یقین آ گیا تھا کہ جس سنگین صورتِ حال سے وہ دوچار ہے اس سے مفر کی کوئی صورت نہیں نکلے گی۔

آبی نے ڈاکٹر ترمذی کو سہارا دے کر اٹھایا اور لے جا کر پھر سوات خان کے پاس صوفے پر بٹھا دیا۔ بولا "آپ سے ہم بہت معذرت خواہ ہیں ڈاکٹر یہ ہماری مجبوری ہے آپ کو ہم ہزار معذرت کے ساتھ گھر چھوڑ کر آئیں گے۔

یہ کیڈلک آپ کی ہے؟"

"نہیں صاحب! یہ بھی اس سرجن کی ہے بلکہ اسے سورجنا کہنا زیادہ صحیح ہو گا۔ استغفر اللہ! میں تو اس کا یہ مکروہ رخ دیکھ کر حیران رہ گیا ہوں۔ یہ پندرہ سال سے میری دوستی کا دم بھر رہا تھا اور کہتا یہ تھا کہ میرے خرچ ہی پورے نہیں ہوتے۔"

"کیڈلک پھر اس نے کیسے خرید لی، اتنی قیمتی گاڑی؟"

"اس نے تو بتایا تھا کہ ایک شیخ نے اسے تحفتاً دی ہے۔ اپنی صحتیابی کی خوشی میں۔ اس کے دونوں گردے بیکار ہو چکے تھے ظاہر ہے اس خبیث نے اس کے پیٹ میں کسی غریب کے گردے سی دیے ہوں گے"

"اس نے یہی کیا ہو گا۔ ہاتھ یہ صرف گردوں پر ہی ڈالتا ہے البتہ اس کی یہ خوبصورت ناگن کبھی کبھی دوسرے آپریشن بھی کر لیتی ہے سارے دھندے کر لیتی ہے یہ کیونکہ ڈاکٹر دھمن اب قدرے بوڑھا ہو چکا ہے۔"

میری اس بات کا ترمذی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بیچارا تو بہت ہی سادہ لوح آدمی تھا اور جانتا تھا کہ عالیہ پر وہ خود بھی ہاتھ صاف کر چکا ہے جس انداز سے وہ ہوٹل سے باہر آیا تھا۔ وہ سارا منظر ابھی تک میری آنکھوں میں تازہ تھا۔ وہ میری اس بات پر کچھ خجل سا ہو گیا۔ سمجھ رہا تھا کہ میں نے اسے جس حال میں دیکھا تھا۔ وہ ایسا نہ تھا کہ اس کی پاکدامنی کا ثبوت بن سکتا اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ ڈاکٹر دھمن نے عالیہ کی کمر میں ترمذی کے بازو کو کیوں قبول کیا۔ وہ ڈائریکٹر ہیلتھ ہونے کی حیثیت سے بڑا صاحبِ اختیار آدمی تھا اور اس کی آڑ میں وہ دونوں اپنا مکروہ دھندا بڑی دلیری سے جاری رکھے ہوئے تھے کہ عالیہ کا سیاں کوتوال تھا۔

"یہ بھی سُورداس بنے رہے ہیں ان کے سامنے۔ اگر یہ اپنی آنکھیں کھلی رکھتے تو ان کے کرتوت ان پر ظاہر نہ ہو جاتے" میں نے آبی کے پیش کردہ ایک گیلے سگریٹ کو رومال سے صاف کرتے ہوئے کہا۔ وہ سالا ہر بار مجھ سے یہی سلوک کرتا رہتا تھا جب اور کچھ نہ سوجھتا تھا تو وہ ایک تھوک آلودہ سگریٹ میرے منہ میں دے دیتا تھا۔ میری بات کا بھی ترمذی نے کوئی جواب نہ دیا۔ کسی گہری سوچ میں ڈوبا رہا۔

آبی نے سگریٹ کا گہرا کش لے کر کہا "ویسے ڈاکٹر صاحب آپس کی بات ہے۔ عالیہ اگر آپ کی سرجری کی زد میں آ چکی ہے تو عین فطرت کے مطابق معاملہ ہے۔ دیکھیں نا ہے تو یہ گل بدن! دیکھ کر تو لب جان مریض بھی اٹھ بیٹھتے ہوں گے، اس مسیحا نفس کو" آبی نے اپنی نظریں عالیہ پر جماتے ہوئے کہا۔

"ڈائریکٹر ہیلتھ کی حیثیت سے تو تمام خوبصورت ڈاکٹروں اور نرسوں پر ان کا حق ہے" میں نے آبی کی بات کو سہارا دیتے ہوئے کہا۔

"مجھے شرمندہ نہ کریں جناب! میں جانتا ہوں آپ مجھے کس حال میں دیکھ چکے ہیں مجھے اپنی اس حرکت پر اب بڑی ندامت محسوس ہو رہی ہے اور۔۔۔ اور میری اس جسارت میں بھی اس عورت کی اپنی پیش قدمی کا دخل تھا" ڈاکٹر ترمذی نے ہماری طرف دیکھے بغیر کہا۔ اسکی نظریں اپنے جکڑے ہوئے پاؤں کی رسی پر جمی تھیں۔ میں نے آبی کو مزید بات کرنے سے منع کر دیا۔ عین اس وقت کریم احمد کمرے میں داخل ہوا۔ وہ ہاتھوں میں ایک بڑا سا ٹیپ ریکارڈر اٹھائے ہوئے تھا۔ اپنے پیچھے وہ کوٹھی کے بڑے گیٹ اور چھوٹے دروازے بند کرتا آ رہا تھا۔

آبی نے اس کے ہاتھ سے ٹیپ ریکارڈر جھپٹ کر اس کو اچھی طرح ٹھوک بجا کر دیکھ لیا۔ اس کو جب یقین ہو گیا کہ اس میں کوئی نقص نہیں ہے اور وہ ٹھیک کام کریگا۔ تو وہ کرسی کھینچ کر ڈاکٹر دھمن کے سامنے جا بیٹھا، بولا "ڈاکٹر دھمن! تمھیں ترمذی صاحب کے سامنے یہاں وہ سب کچھ بتانا پڑے گا جو اب تک تم کر چکے ہو ورنہ یاد رکھو تمھارے سامنے اس عالیہ کو میں ایسا ذلیل کروں گا کہ تم کبھی نہ بھول سکو گے۔ تم پر ہمیں جو اختیار حاصل ہو گیا ہے یہ خدا کی طرف سے ہے بھول جاؤ کہ تمھاری رسی اور دراز ہو سکتی ہے یہ تمھاری فلم کا 'دی اینڈ' ہے سمجھ لے ہو نا! اب بولو تمھیں کیا کہنا ہے؟"

اس کی یہ بات سنتے ہی عالیہ چیختی ہوئی اٹھی مگر پھر لڑکھڑا کر صوفے پر گر گئی، بولی "ہمیں کچھ نہیں کہنا ہے ڈاکٹر! ان کی بکواس مت سنو یہ ہمیں خواہ مخواہ ذلیل کر رہے ہیں" اگر اس کے پاؤں بندھے ہوئے نہ ہوتے تو وہ سیدھی ڈاکٹر دھمن کے پاس جا بیٹھتی۔ وہ ابھی تک کمر پر لگی ضربوں کے اثر سے کراہ رہا تھا اور مگسی کا گھٹنا سوجنے لگا تھا۔

"سوچ لے میں چھمک چھلو! یہ نخرہ بہت مہنگا پڑے گا" آبی نے بڑے ہی بازاری لہجے میں اسے متنبہ کیا۔ وہ ہذیان بکنے لگی آبی نے اٹھ کر اسے بالوں سے پکڑ کر صوفے سے گھسیٹ کر کھڑا کیا۔ اس کے ارادے بھانپ کر دھمن چلایا "خدا کے لیے ہمیں ذلیل نہ کرو۔ میں وہ سب کچھ تمھیں بتا دوں گا جو مجھے معلوم ہے"

آبی نے عالیہ کو پھر صوفے پر دھکیل دیا، بولا "تمھاری معلومات ہمیں نہیں چاہییں۔ ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ تم اب تک کیا کرتے رہے ہو"

"مجھے کسی اور کمرے میں لے چلو اور مجھے یہ گولیاں لا دو۔ درد سے مرا جاتا ہوں"

"یہ درد تمھاری صحت کے لیے اچھا ہے البتہ تمھیں ہم دوسرے کمرے میں ڈال دیں گے" یہ کہہ کر آبی نے ٹیپ ریکارڈر اٹھایا اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولا "اسے اٹھا بھئی، اس میت کو" یہ کہہ کر اس نے ڈاکٹر دھمن کے بندھے پیر رسی کے جکڑ بند سے پکڑ کر اوپر اٹھا لیے۔ دوسری طرف سے میں نے اس کو بازوؤں سے پکڑ لیا۔ جب ہم نے اسے اٹھا لیا۔ تو آبی بلند آواز سے بولا "کلمۂ شہادت" اس کی رگِ ظرافت کچھ زیادہ ہی پھڑک رہی تھی اور وہ اس ڈاکٹر کو قطعی طور پر مردہ سمجھ چکا تھا۔ جب ہم اسے دوسرے کمرے میں قالین پر ڈال چکے تو وہ بولا "اگر تم ہمیں چھوڑ دو تو میں تمھیں منہ مانگی رقم دینے کو تیار ہوں"

"کتنی مثلاً! کچھ اپنی قیمت بھی تو لگا دے"

"میں تمھیں پچاس لاکھ روپیہ دے سکتا ہوں" اس نے آبی سے مخاطب ہو کر کہا۔

آبی کا ذہن ایک بار تو بری طرح سنسنا گیا، بولا "پچاس لاکھ یعنی آدھا کروڑ ہی کہہ رہے ہو نا تم؟"

"ہاں! اتنی بڑی رقم تمھیں کہیں سے نہیں مل سکے گی اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمھارے خلاف پولیس میں کوئی رپورٹ درج نہیں کراؤں گا"

"یعنی تمھارے دل میں یہ حسرت ابھی باقی ہے کہ پولیس آئے اور تمھیں چھڑا کر لے جائے ڈاکٹر دھمن" میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ وہ ہمیں ایک اور ہی چکر میں ڈال رہا تھا۔

"ٹھہر جا یار! ہاں ڈاکٹر تم نے پچاس لاکھ ہی کہا ہے نا!" آبی نے بے صبر ہو کر پوچھا۔

"ہاں! ففٹی لیکس! میں تمھیں اس سے زیادہ بڑی رقم دے سکتا ہوں مگر شرط یہ ہے کہ ہمیں آج ہی رہا کر دو"

"تمھاری چیک بک کہاں ہے؟"

"گاڑی میں پڑی ہے میرے بریف کیس میں، وہ ڈگی میں رکھا ہو گا"

"میرا جی چاہتا ہے تمھارا منہ چوم لوں ڈاکٹر! کتنے بینک ل آدمی ہو تم۔ ذرا ادھر آئیں جیلانی بھائی! میں آپ سے کچھ مشورہ کرنا چاہتا ہوں" یہ کہہ کر آبی مجھے بازو سے پکڑ کر تیسرے کمرے میں لے گیا۔ بولا "دیکھ او ئے وڈ ہیرو! تو یوں ظاہر کر جیسے تو اس پیشکش کو خوشی سے قبول کر لیگا۔ میں اس سے چیک لکھواتا ہوں۔ اگر کل صبح بینک سے ہمیں رقم مل جائے تو وہ ہم لے لیں گے اور اپنا پرنالہ ہم وہیں رکھیں گے"

"وہ اتنا احمق نہیں ہے پیارے! تیرے جیسے کئی اس نے بیچ کھائے ہیں"

"نہیں یار! یہ بہت اچھی پیشکش ہے۔ میں اسے برضا و رغبت اور بقائمی ہوش و حواس قبول کرتا ہوں۔ تو دیکھتا رہ میں اس کے چاول چٹے کر کے رہوں گا چیک میں اس شرط پر لوں گا کہ ان لوگوں کی رہائی رقم ملنے پر منحصر ہو گی۔ میں رقم لے آؤں تو پھر ان کو ہم بیلن میں سے گزار لیں گے"

"و تیری مرضی ہے آبی! مگر اس کا مشورہ بہرحال نہیں دے سکتا۔ ہمیں بہت سوچ سمجھ کر چلنا ہو گا"

"یار! اس میں ہرج ہی کیا ہے ان کو ہم چھوڑیں گے تو نہیں۔

چھتر ول کر کے اُس کا بیان ٹیپ کرو اور ان کو پولیس کے حوالے کر دو۔"
"پولیس سے بھی بچ نکلیں گے کیونکہ مدّعی کوئی نہیں ہو گا۔"
"کیوں نہیں ہو گا؟ وہ عارف ہے وہ دہاب ہے پھر مردان شاہ کا بھتیجا بھی ابھی زندہ ہے ان کو ہم مدّعی بنا دیں گے۔"
"ایک تھانہ ایک لاکھ میں خریدا جا سکتا ہے اور یہ ایسی پلید شے ہے کہ سارے کیس کا رشوت دے کر بیڑہ غرق کروا دے گا۔"
"پھر تیرا کیا خیال ہے؟"
"میں انھیں اپنے ہاتھ سے گولی ماروں گا۔" آبی تو بہر حال رقم نکلوا اس کے گلے پر انگوٹھا رکھ کر۔"
"ٹھیک ہے۔ میں اس سے چیک لکھواتا ہوں۔"
یہ کہہ کر وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر ڈاکٹر دھمن کے پاس جا پہنچا اور پھر مجھے اس کی نگرانی پر مامور کر کے وہ کیڈلک کی ڈگی سے اس کا بریف کیس نکال لایا۔ گاڑی کی چابیوں کے گچھے میں ہی بریف کیس کی چابی موجود تھی۔ اُس کی مدد سے ڈاکٹر دھمن کے کہنے کے مطابق آبی نے بریف کیس کھول کر اس میں سے کئی چیک بُکیں نکال کر سامنے رکھ لیں۔ اُس نے تین بینکوں میں اپنا حساب کھول رکھا تھا اور اُن میں سے ایک بینک بین الاقوامی سطح پر کام کرتا تھا اور ڈالر کے کاروبار کے لیے مشہور تھا۔
"تو پھر ڈاکٹر دھمن صاحب طے یہ پایا کہ آپ ہمیں کم از کم ایک کروڑ روپیہ دے دیں تو ہم آپ کو باعزت رہا کر دیں گے، کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟"
"نہیں! میں آپ کو پچھتر لاکھ روپے دے سکتا ہوں۔ اس سے زیادہ کا میں متحمل نہیں ہو سکتا۔"
"چلیں بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی بھلی۔ آپ چیک لکھیں میرے انتہائی کریم النفس اور مہربان ڈاکٹر دھمن صاحب! پچھتر لاکھ روپے تو لیے آپ کی ایک انگلی کی بھی قیمت نہیں ہے کیونکہ یہ بڑی کارکشا بلکہ قبض کشا انگلی ہے۔ گردے نکال لیتی ہے لکھیں چیک لکھیں۔" یہ کہہ کر آبی نے دھمن کے دونوں ہاتھ کھول دیے اور پستول سیدھے ہاتھ میں لے کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔
دھمن نے اپنے ہاتھ ذرا سیدھے کیے جب اُن میں خون کی گردش صحیح ہوئی تو اس نے بین الاقوامی بینک کی چیک بُک نکالی اور پھر بریف کیس میں سے کئی قسم کی بال پوائنٹس میں سے ایک لے کر چیک لکھنا شروع کیا مگر پھر روشنی کی کمی کا گلہ کرتے ہوئے بولا۔ "یہ بتیاں ذرا جلا دیں مجھے دھندلا نظر آ رہا ہے۔"
میں نے ایک ایک کر کے کمرے کی چاروں بتیاں روشن کر دیں تو وہ زانو کے اُوپر چیک بُک رکھ کر چیک لکھنے لگا، بولا "کس کے نام لکھوں؟"

"بس لکھ دیں کہ حامل رقعہ ہذا مسٹر ایس جی ایم پیرزادہ جو میرے دستخط میں تصدیق کر رہا ہوں۔ بینک کی طرف آپ کے حساب میں سے مبلغ پچھتر لاکھ روپے فوراً ادا کر دیے جائیں۔"
اس کی یہ بات سُن کر ڈاکٹر کے لبوں پر ایک عجیب سی زہریلی مسکراہٹ ابھری اور وہ چیک لکھنے لگا۔ وہ کبھی پنسل کا ایک سرا استعمال کرتا تھا کبھی دُوسرا۔ جب وہ چیک لکھ چکا تو بولا "آپ اس کی پشت پر دستخط کریں میں اس کو اٹیسٹ بھی کر دیتا ہوں۔"
آبی نے فوراً ہی اس کا بال پین لے کر چیک کی پشت پر کرنا چاہے مگر پین لکھ نہیں رہا تھا۔
ڈاکٹر بولا۔ "دوسری طرف سے لکھیں۔ یہ حصّہ شاید خشک ہو چکا ہے۔"
آبی نے دُوسرے سرے کو کاغذ پر رکھ کر اپنے لمبے چوڑے دستخط کر دیے۔ یُوں کہ ہر لفظ الگ پڑھا جا سکتا تھا۔ ڈاکٹر دھمن نے اس کی تصدیق کے ثبوت میں اپنے دستخط ثبت کر دیے۔
آبی نے چیک کو دوبارہ پڑھا۔ ہر لفظ صحیح تھا اس کا چہرہ تمتما اُٹھا بولا "اب ہمارے اور آپ کے درمیان یہ شریفانہ معاہدہ ہے کہ ہمیں یہ رقم مل جائے تو ہم آپ کو فوراً رہا کر دیں گے۔"
"ہاں! اگر آپ نے اس معاہدے کی خلاف ورزی کی تو اس سے زیادہ بڑا ظلم اور کوئی نہ ہو گا۔ خدا کے سامنے آپ دونوں جوابدہ ہوں گے۔"
"کیوں نہیں کیوں نہیں مولانا! اللہ تعالیٰ سے ہمارے تعلقات بھی ویسے ہی ہیں جیسے آپ کے ہیں۔ وہ نہ آپ سے رُو رعایت کرتا ہے نہ ہم سے۔"
"آپ وہاں سیدھے بینک کے مینیجنگ ڈائریکٹر ابوبکر قاسم کے پاس چلے جائیں، وہ آپ کو فوراً ہی رقم دلوا دے گا۔"
"بینک کو نوٹس کی ضرورت ہو گی۔" آبی نے پُوچھا۔
"ہاں! اس کے لیے آپ آج شام چھ بجے اسے فون کر دیں میری طرف سے اُسے کہہ دیں کہ وہ رقم کا بندوبست کر رکھے۔ اپنا نام قربان علی بتائیں وہ میرا مینجر ہے اور ابوبکر اسے جانتا ہے۔"
"اگر اس نے آواز میں فرق محسوس کیا تو؟"
"نہیں! میرا خیال ہے ایسا نہیں ہو گا۔ آپ اس سے اُردو میں بات کریں گے وہ سمجھ لے گا اگرچہ وہ عربی ہے مگر اردو سمجھ لیتا ہے۔" ڈاکٹر دھمن نے بریف کیس بند کرتے ہوئے کہا۔ اس میں خاصی رقم موجود تھی جس پر ہم اپنا ہاتھ بڑی آسانی سے صاف کر سکتے تھے۔
"ٹھیک ہے ڈاکٹر دھمن بگ چمن! اب تم سے صبح پھر بات ہو گی۔ ابھی تم ادھر ہی آرام کرو۔" یہ کہہ کر آبی نے نہایت سنفاک انداز سے اس کے دونوں بازو پکڑ کر ایک بار پھر کس کر باندھ

دیے اور اُسے بازوؤں میں بھر کر اُس نے پلنگ پر ڈال دیا۔ "میں پنکھا چلا دیتا ہوں۔ اب تم تھوڑی دیر آرام فرماؤ۔ بہت تھک گئے ہو گے۔"
"میری کمر میں سخت درد ہے۔" ڈاکٹر نے پہلو کے بل لیٹتے ہوئے تکیے میں سر دے کر کہا۔
"یہ تو ہو گا ہی سالہا لوگوں کے درد کا اندازہ کرو سور جن... تم کچے چبا گئے ہو ڈاکٹر دھمن ڈی کمین اور رشٹ اُپ۔" یہ کہہ کر آبی نے تمام بتیاں بجھا کر پنکھا چلا دیا اور بولا "آ یار! ہم ذرا باہر بیٹھتے ہیں۔ اس بھیڑیے کو آرام کرنے دے۔" یہ کہہ کر اس نے مجھے ساتھ لیا اور کمرے کے دروازے پر باہر سے ارل چڑھا کر دبی آواز میں بولا۔ "یہ قصہ تو ہو گیا ابھی ہم اس ڈاکٹر عالیہ کی سٹیٹ منٹ ریکارڈ کر لیتے ہیں کیا خیال ہے؟" ٹیپ ریکارڈر اس کے ہاتھ میں تھا۔
"ٹھیک ہے، آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ اس فلم کے ڈائریکٹر آپ ہی ہیں قبلہ و کعبہ جناب اسلم آبی اینڈ خشکی صاحب۔"
"یار تو کتنے نام دے گا مجھے۔ وہ سیّد غلام محمد مُرسل پیرزادہ بن گیا کم ہے۔ تیرے کرشموں کے قربان جاؤں۔ تو جس طرح بندے کو ٹھنڈا ٹھار کر دیتا ہے نا اس پر مجھے رشک آتا ہے۔ یہ فن تو مجھے سکھا دے نا تو قسم اللہ کی میں دس دن میں دس کروڑ روپے پیدا کر لوں۔"
"بندے کو لالچ سے بچنا چاہیے پیارے! مجھے تو اس پچھتر لاکھ کے چیک سے بھی وحشت ہوتی ہے اس پر ہمارا کوئی حق نہیں بنتا ہے۔"
"میں اس رقم سے ایک خیراتی ہسپتال بنا دوں گا۔ اور اس کا نام ہو گا نسیم جیلانی ہسپتال۔ انگریزی میں وہ این بی جیلانی اسپتال کہلائے گا۔"
"بکواس نہ کرو یہ! چل اس گشتی کی اسٹیٹ منٹ ریکارڈ کرتے ہیں۔" یہ کہہ کر میں اسے برآمدے میں سے گزار کر اس کمرے میں جا گھسا جہاں باقی سب لوگ بندھے پڑے تھے۔
جب ہم اندر داخل ہوئے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ کریم احمد ہاتھ میں گنڈاسا لیے مگسی کے سرہانے کھڑا تھا۔
"کیا ہوا؟ کوئی گڑبڑ تو نہیں کی اس نے؟" میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔
"یہ مجھے گالیاں دے رہا تھا۔ کہتا تھا کہ میں تم سب کے پیٹ چاک کر دوں گا۔"
"یہ ٹھیک کہتا ہے۔ کتّے کی نسل میں سے ہے جس کی دُم بارہ برس نلکی میں رکھی جائے تو بھی سیدھی نہیں ہو سکتی۔ اس کے ہاتھ پیر کس کر باندھ دو۔ یہ آزادی کے قابل نہیں ہے۔" یہ کہہ کر میں نے

فرش پر پڑی ایک بچی ہوئی رسّی اٹھائی اور آبی کی مدد سے اس کے ہاتھ پاؤں ایک بار پھر کس کر باندھ دیے۔ ہمیں اپنے سامنے دیکھ کر وہ خاموش ہو گیا تھا اور جب ہم اس کے ہاتھ پیر باندھ رہے تھے تو اس وقت اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ آبی نے ڈاکٹر ترمذی کو کسی گہری سوچ میں گم دیکھ کر مجھے آنکھ ماری اور بولا "اپنے ان ترمذی صاحب کو بھی ابھی اتنی کھلی چھٹی راس نہیں آ رہی ہے میں معذرت خواہ ہوں جناب آپ کو زحمت ہو گی مگر یہ ابھی بہت ضروری ہے۔ بندے کے دین ایمان کا کوئی پتہ نہیں کب ڈول جائے۔"
یہ کہہ کر اس نے صوفے پر دھری رسّی اٹھا کر تیزی سے ڈاکٹر ترمذی کے دونوں ہاتھ کمر کے پیچھے کس کر باندھ دیے، وہ بے چارہ جھینپتا ہی رہ گیا کہ اس سے کیا خطا سرزد ہوئی ہے وہ تو اس کارروائی پر خوش ہے اور ہمارا طرفدار ہے مگر آبی نے اس کی ایک نہ سُنی۔ وہ ان میں سے کسی کو بھی کوئی موقعہ نہیں دینا چاہتا تھا۔
اس کو ٹھکانے لگانے کے بعد اُس نے ایک بار پھر عالیہ کو بڑی بے رحمی سے بالوں سے پکڑ کر صوفے پر سے اُٹھایا اور بولا "تو بھی ہمیں بتلائے گی کہ اب تک تو کیا کچھ کر چکی ہے اور تیرا وہ دھمن کیا کرتا رہا ہے تیری اسٹیٹ منٹ بھی بہت ضروری ہے چل اُدھر دوسرے کمرے میں۔"
یہ کہہ کر اُس نے عالیہ کو کپڑے کے تھان کی طرح کندھے پر ڈالا اور بولا۔ "آپ ان پر نظر رکھیں بھائی جی! یہ لیں پستول۔ یہ کوئی گڑبڑ کریں تو گولی مار دیں۔ یہ ٹیپ لے کر تم دوسرے کمرے میں آ جاؤ جیلانی۔" یہ کہہ کر اس نے پستول کریم احمد کو دیا اور خود تیزی سے دُوسرے کمرے میں جا گھسا۔ اور اُسے پلنگ پر پھینک کر اس نے تمام کھڑکیاں اور دروازے اندر سے بند کر لیے۔ عالیہ کے ہاتھ کمر پر بندھے تھے اور وہ پہلو کے بل لیٹنے پر مجبور تھی۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ اندر سے ٹوٹتی جا رہی ہے۔ اب اس میں مزاحمت کی ضد کی خودسری اور خودستائی کی ہمت باقی نہیں رہ گئی تھی۔ حالات کی سنگینی کا اسے احساس ہو گیا تھا آبی نے آگے بڑھ کر بڑی نرمی سے اس کے ہاتھوں کی رسیاں کھول دیں۔ بولا "ذرا ٹھیک ہو کر بیٹھ! نرس زادی تو ڈاکٹر کیسے کہلاتی ہے کوئی ایم بی بی ایس کر رکھا ہے تم نے؟"
"نہیں، یہ بس یم بہ یم دریا بہ دریا پھرتی ایم بی بی ایس بن گئی۔ جس کا مطلب ہے کہ ایم بگ باسٹرڈ سر۔ لفظ آئی ایس ڈگری میں بولا نہیں جاتا۔"
"نہیں یار! یہ بڑی نیک دل اور سخی طبیعت کی خاتون ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر دھمن نے انہیں غلط راہ پر ڈال دیا تھا۔ کیا میں درست کہہ رہا ہوں ڈاکٹر عالیہ۔" آبی نے اپنے لہجے کو ایک دم بدلتے ہوئے کہا۔
وہ اٹھ کر فوم کے بیڈ پر زانو سمیٹ کر یوں بیٹھ گئی جیسے

وہ کوئی غزل گانے چلی ہے حالانکہ وہ خود مرقع غزل تھی۔ آبی کے نفسیاتی جھٹکے اُسے بنیادوں سے ہلا گئے تھے۔

اُس کی آنکھیں بہہ نکلیں بولی: "پھانسی کی کوٹھری تک تم اپنے کرتوتوں سے پہنچے ورنہ میں نے تو تمھیں اپریشن کے بعد جانے ہی دیا تھا۔"

"تم نے جانے دیا تھا کہ میں خود نکلا تھا وہاں سے ریٹا کی مدد سے جھوٹ نہیں چلے گا عالیہ۔ تم نے سوات خان کے ذریعے میری بہن کو اغوا کروایا اور وہ آج تک پتہ نہیں کہاں کہاں ذلیل و خوار ہوتی پھرتی ہے۔ میں تمھیں معاف نہیں کر سکتا ہوں کسی قیمت پر بھی نہیں۔"

"وہ۔۔۔ وہ سب کچھ میری مرضی کے خلاف ہوا۔ میں دراصل ڈاکٹر دھمن کو اس کے کسی ارادے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ وہ بھی کوئی سند یافتہ ڈاکٹر نہیں ہے۔ وہ ایم بی بی ایس کے فائنل میں رہ گیا تھا۔ وہ لاہور کے کنگ ایڈورڈ کالج میں پڑھتا تھا۔ میں ان دنوں میو ہسپتال میں کام کرتی تھی۔ کہ گورا وارڈ میں مریضوں کے معائنے اور دیکھ بھال پر ڈاکٹر دھمن کی ڈیوٹی لگ گئی۔ وہ اُن دنوں فائنل ایئر میں پڑھتا تھا۔"

آبی نے اس کو یوں بولتے دیکھا تو بڑی پھرتی سے اس نے ٹیپ چلا دیا۔ مگر اس طرح کہ عالیہ کو اس کا احساس نہ ہو سکا۔ وہ سامنے خلا میں گھورنے لگی تھی۔ اور اُس کی آواز کسی زخم سے مس ہو کر نکلتی نظر آتی تھی۔

"وہ اچھے دن تھے اور انہی دنوں کی ہماہمی نے مجھے اس کے قریب کر دیا۔ مگر میری قربت اُسے راس نہ آئی۔ وہاں ایک ڈاکٹر تھا علی مراد اساری۔ وہ مجھے اپنے شیشے میں اتار لینا چاہتا تھا۔

جب اُس نے مجھے دھمن کی طرف بڑھتے دیکھا تو مراد اساری نے ہمارے خلاف محاذ بنا لیا۔ وہ کالج میں پڑھاتا بھی تھا۔ اُس نے ایک دن چند آدمیوں کے ذریعے ڈاکٹر دھمن کو کالج میں بُری طرح پٹوا دیا۔ اور پھر الٹا انضباطی کارروائی کے طور پر اس نے دھمن کو ہی قصوروار ثابت کر کے کالج سے نکلوا دیا۔ اس کے ساتھ مجھے بھی وہاں بہت ذلیل ہونا پڑا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ میں نے میو ہسپتال کی نوکری چھوڑ کر ایک پرائیویٹ کلینک میں کام شروع کر دیا۔ اس عرصے میں دھمن نے جعل سازی کر کے کسی نہ کسی طرح اپنے لیے ایم بی بی ایس کی جعلی ڈگری حاصل کر لی اور میرے ساتھ ہی ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے اس کلینک میں کام کرنے لگا۔ سرجری میں اسے بہت مہارت حاصل ہو چکی تھی۔ اس نے کلینک میں بیٹھ کے کئی بہت نازک آپریشن کیے جو بہت کامیاب رہے یہاں تک کہ ایک دن اس نے ایک آدمی کا گلا ہوا گردہ بھی آپریشن کر کے نکال دیا اور وہ آدمی صحت مند ہو کر گھر چلا گیا۔ انہی دنوں ایک غیر ملکی سفارت کار کلینک میں داخل ہوا اُس کے دونوں گردے ناکارہ ہو چکے تھے اس نے ڈاکٹر دھمن سے کہا کہ اگر وہ اس کو کوئی کارآمد گردہ لگا دے تو وہ اس کے عوض اسے بتیس لاکھ روپیہ دینے کو تیار ہے۔ وہ کسی شیخ کا لاڈلا بیٹا تھا اور کروڑوں ڈالر کا مالک۔ ڈاکٹر دھمن نے اتنی بڑی رقم کے لالچ میں آ کر سڑک پر سے ایک بیمار فقیر کو اٹھایا اور اُسے کلینک میں لے جا کر یہ یقین دلا دیا کہ اُس کا ایک گردہ خراب حالانکہ اس بیچارے کو میعادی بخار تھا۔ وہ سادہ لوح آدمی کیا کہہ تھا۔ ڈاکٹر دھمن نے اس کے بخار کا علاج بھی کیا اور ساتھ کے ساتھ پیٹ چیر کر اس کا ایک گردہ بھی نکال لیا۔ کلینک میں ہر قسم کا جدید ترین سامان موجود تھا جس کی وجہ سے پیچیدہ سے پیچیدہ آپریشن بھی کامیابی سے کیا جا سکتا تھا۔ وہ گردہ نکال کر ڈاکٹر نے اس سفارت کار کے پیٹ میں منتقل کر دیا۔ اس کا نام علی وجودی تھا اور اس کے تشکر کو ابھی تک نہیں بھولی۔ اس نے صحتیاب ہونے کی خوشی میں ڈاکٹر دھمن کو پچاس لاکھ روپے کا چیک دے دیا۔ اس کی زندگی نئے سرے سے آباد ہو گئی تھی صرف پچاس لاکھ میں اور یہ رقم اس کے لیے کچھ بھی نہیں تھی۔ رقم ہاتھ میں لیتے ہی ڈاکٹر دھمن نے شفا بار کلینک کی بنیاد رکھ دی۔ گلبرگ میں ہم دونوں نے وہ کوٹھی بھی خرید لی جس میں سے تم ہو کر گزرے ہو جیلانی۔ میں تمھیں کبھی نہیں بھول سکی ہوں میں۔۔۔ میں چاہتی تھی کہ مجھے تمھاری محبت مل جائے۔ مگر میں کچھ بھی تو نہیں کر سکی تمھیں آپریشن سے بھی نہ بچا سکی حالانکہ لاشعوری طور پر میں وہ سب کچھ نہیں چاہتی تھی جب تم ہسپتال سے بھاگے تو ایک طرح سے میرے دل سے بوجھ اتر گیا تھا مگر پھر تم انتقام پر اتر آئے تو مجھے تمھارے بارے میں اپنے سارے خیالات بدلنے پڑے۔ ڈاکٹر دھمن نے وہ کوٹھی لی اور ہم دونوں نے شادی کر لی۔ اس نے مشہور کر دیا کہ اُس نے کراچی سے ڈگری لے لی تھی اور یہ تھا بھی سچ کسی حد تک کیونکہ وہ ڈگری اُس نے کراچی ہی سے حاصل کی تھی۔

علی وجودی سے اُس کے علاج کے بعد ڈاکٹر دھمن کا تعلق بڑھا کہ اُس نے اسے مشرق وسطیٰ میں متعارف کروا دیا۔ وہاں گردوں کا مرض بہت عام ہے اور وہ بیس بیس لاکھ اور چالیس لاکھ تک میں کسی زندہ آدمی کا گردہ خریدنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ علی وجودی کے ذریعے ڈاکٹر دھمن نے وہاں بھی اپنا ایک کلینک کھولا اور یہاں سے گردے چرا کر وہاں پہنچاتا رہا۔ یہ سلسلہ اتنا آگے بڑھا کہ ہم نے اس عرصے میں ستائیس کروڑ روپے جمع کر لیے۔ وہ سب کا سب ایک غیر ملکی بینک میں جمع ہے۔ اُس میں سے صرف چار پانچ کروڑ اس بینک کی ایک شاخ میں جمع ہے جب تم نے عدالت میں وہ خوفناک بیان دیا تو کئی پولیس نے ہم سے بڑی سختی سے پوچھ گچھ بھی کی تھی مگر ڈاکٹر نے انہیں بھی دے کر خاموش کر دیا اور مجبوراً ہمیں اپنی عزت شہرت اور ساکھ کو بچانے کے لیے کچھ عرصے کے لیے ملک سے باہر جانا پڑا۔ اس عرصے میں شفا بار کلینک کا کام ڈاکٹر عرفان اور ڈاکٹر نجدی کرتے رہے اور وہ لوگوں کے گردے کاٹ کر باہر پہنچاتے رہے مگر وہاں مانگ اتنی بڑھ گئی کہ اس کام کے لیے ڈاکٹر دھمن کو لاہور واپس آ کر جیل کے قیدیوں پر ہاتھ ڈالنا پڑا۔ اُن میں عورتیں بھی ہوتی تھیں اور مرد بھی۔ اس کام میں

جیل حکام کو ہم لاکھوں روپیہ ادا کرتے رہے ہیں۔ مجھے معلوم ہے تمھاری بہن آسیہ کا گردہ بھی ہمارے ہی کلینک میں نکالا گیا تھا۔ اُسے بھی جیل کے ڈاکٹر نے پہلے پہل یہی وہم ڈالا کہ اس کے پیٹ میں کوئی رسولی ہے۔ پھر وہ سرکاری ہسپتال میں منتقل ہوئی وہاں سے چوری چھپے ہم اُن قیدی عورتوں کو اپنے ہسپتال میں لا کر کاٹ دیتے تھے اور دوبارہ سرکاری ہسپتال پہنچا دیتے تھے۔ وہاں کے کاغذات میں یہی درج کیا جاتا تھا کہ ان عورتوں کا یا ان مردوں کا اپریشن کے ذریعے علاج کیا گیا ہے۔ کسی کے پیٹ میں سے رسولی نکالی گئی۔ کسی کے پیٹ میں سے پتا۔ کاغذات میں یہی کچھ بتایا جاتا تھا اور ہسپتال کے سرجن اور اُس کے متعلقہ عملے کو ہم خوش کر دیا کرتے تھے مثلاً پچاس ہزار ہم سرجن کو دیتے تھے تو پچاس ہزار اس کے عملے میں بخوشی تقسیم کر دیتے تھے۔ آسیہ کو ابھی تک یہی یقین ہو گا کہ اس کے پیٹ سے رسولی نکالی گئی ہے۔ میں نے اُسے یہی بتایا تھا۔ اس کا اپریشن میں نے خود کیا تھا۔ اس کام میں میری مدد ڈاکٹر عذرا نے کی تھی۔ ان لوگوں نے بھی اپنا کلینک قائم کر لیا تھا۔ اس کا خاوند ڈاکٹر محسن بھی بہت اچھا سرجن تھا۔ اب تو وہ بیچارا اس دنیا میں نہیں رہا۔" یہ کہہ کر عالیہ کچھ پریشان سی ہو گئی۔

"مجھے ڈاکٹر ترمذی نے مجبور کیا ہے کہ میں یہ سب کچھ تم لوگوں کو بتا دوں اس کا خیال ہے کہ اس طرح وہ تم سے میری رہائی کے لیے کہہ سکتا ہے مگر یہ اُس کی خام خیالی ہے میں آج اس بوجھ سے خود چھٹکارا پا لینا چاہتی ہوں۔ ہمارے عروج کا زوال شروع ہو چکا ہے۔ کوئی سگریٹ ہو گا تمھارے پاس؟"

آبی نے فوراً ہی سگریٹ کا پیکٹ اور ماچس اُس کے سامنے رکھ دیے۔ وہ اس کی باتوں سے متاثر ہو رہا تھا۔ اس کے غنچہ سے دہن کو جب اُس نے اتنی زخم خوردگی سے کھلتے سمٹتے دیکھا تو اس کی حسن پرستی عود کر آئی۔ وہ اُس جال میں پھنسی ہرنی کو سمو جانا نگل جانا چاہتا تھا۔ حسین عورت اس کی زندگی کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔

عالیہ نے سگریٹ سلگایا اور دھوئیں کو سینے میں دبا کر چند لمحوں تک آنکھیں موندے کچھ سوچتی رہی پھر اُس نے دھواں اپنے نتھنوں سے خارج کر کے دوسرا کش لیا اور دھوئیں کی زبان میں بولی: "ہم نے ڈاکٹر محسن اور ڈاکٹر عذرا کو اُس رات اپنے اعتماد میں لیا جس رات لاہور جیل سے چار قیدی میو ہسپتال کے ذریعے ہمارے کلینک میں پہنچے۔ ڈاکٹر اختر بھی اُن کے ساتھ تھا اور اس رات ڈاکٹر دھمن کا دایاں ہاتھ زخمی تھا۔ وہ خود کام نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے ڈاکٹر محسن کو پندرہ لاکھ روپے کا چیک دے کر اُسے اس رات چار آپریشنوں کے لیے تیار کر لیا۔ وہ چیک پا کر خوش ہو گئے اور ہمیں اس سودے میں اس رات کوئی اسی لاکھ روپے مل گئے۔ کچھ ہی دنوں بعد ہمیں باہر سے پندرہ صحت مند گردوں کی مانگ آئی۔ وہ مانگ پوری کرنا بہت ضروری تھا کیونکہ اُس سے ہمیں کروڑوں روپے مل سکتے تھے۔ کم سے کم دو کروڑ تو کہیں نہیں گئے تھے۔ ایک گردے کا ہم کم سے کم بیس لاکھ بٹور لیتے تھے۔ مگر اتنے بہت سے آدمی کہاں سے مل سکتے تھے۔ جو لوگ ہمارے اس کام میں شریک ہوئے مثلاً ڈاکٹر محسن اور ڈاکٹر عذرا انہیں ہم نے صحیح رقم کبھی نہیں بتائی تھی۔ ڈاکٹر دھمن نے سوچ سوچ کر اپنا یہ مسئلہ سوات خان کے سامنے رکھا تاکہ وہ کسی نہ کسی طرح پندرہ صحت مند گردوں کا انتظام کر دے۔ سوات خان ہمارا بہت پرانا نمک خوار ہے اس نے یہ کیا کہ شہر کے چوروں میں یہ بات مشہور کر دی کہ سمن آباد کی فلاں کوٹھی کے ایک سیف میں چالیس لاکھ موجود ہیں۔ پھر اُس نے مختلف چوروں سے رابطہ قائم کیا اور ہر رات پانچ آدمی وہاں بھجوائے۔ اُن کو ہم طے شدہ منصوبے کے تحت سوات کے ذریعے سیف کے کمرے میں بھیج دیتے اور انہیں بے ہوش کر کے وہاں سے اٹھوا کر سیدھے شفا بار لے جاتے رہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ چھ دن میں ہم نے بیس گردے بیش قیمت گردے حاصل کر لیے اور اُن چوروں کو یہ احساس تک نہ ہونے دیا کہ ہم اُن کے ساتھ کیا کر چکے ہیں وہ صحتیاب ہو کر اُلٹا ہمارا شکریہ ادا کرتے اور منہ چھپا کر نکل جاتے تھے ڈاکٹر دھمن نے ہر گردہ تیس لاکھ روپے میں فروخت کیا اور یوں ہم نے اس سودے میں سے چار کروڑ روپے کما لیے مجھے سمن آباد کی وہ کوٹھی آج تک نہیں بھولی۔ وہ اشرف انصاری کے جعلی نام پر کرائے پر لی گئی تھی۔ آدھا ڈراما وہاں کھیلا اور آدھا شفا بار میں۔ اور میں خوش تھی بے حد خوش کیونکہ اتنی بے حساب دولت کا تو میں اور ڈاکٹر دھمن کبھی خواب بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ہم نے اسی دوران یہاں کراچی میں بہت بڑی کوٹھی خرید لی۔ یہ اُدھر اسٹار گیٹ کے مغرب میں ہے وہاں بھی ہم نے آپریشن کا جدید سامان تہہ خانے میں نصب کر لیا اور اس شہر میں بھی یہ دھندا شروع کر دیا مگر اس دوران تم ہمارے پیچھے پڑ گئے جیلانی جس کی وجہ سے ہم بہت پریشان ہو گئے اور نتیجہ یہ نکلا کہ ہم کچھ عرصے کے لیے ملک سے باہر چلے گئے اور کبھی کبھار ایک آدھ دن کے لیے ہی ادھر آتے رہے۔ لاہور میں ہمارے معاون ڈاکٹر عرفان اور نجدی نے سوات خان کی مدد سے یہ دھندا بڑی کامیابی سے چلایا مگر پھر کسی نے اُسے قتل کر دیا۔ اس کی لاش تک جلا دی۔ مجھے یقین ہے جیلانی کہ یہ سب کچھ تم نے ہی کیا تھا مگر اس کا ثبوت میرے پاس نہیں ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم جیل سے فرار ہو گئے تھے اور ہم تمھارے خوف کی وجہ سے بھی وہاں لاہور میں جم کر نہیں بیٹھتے تھے۔ ہمیں تمھاری شیطانی قوتوں کا گہرا احساس تھا اور یہی وجہ تھی کہ ہم دونوں کے اعصاب پر تم بُری طرح سوار ہو گئے۔ ہمیں جب حیدر نے بتایا کہ انہیں تم اٹھا کر لے گئے تھے اور پھر اسی رات ڈاکٹر عرفان بھی ماڈل ٹاؤن سے غائب ہو گیا تو ہم سمجھ گئے تھے کہ یہ کام تمھارے سوا کوئی اور نہیں کر سکتا۔ ہم تمھارے خلاف کوئی قانونی یا غیر قانونی

قدم نہیں اٹھا سکتے تھے کیونکہ تم تو کہیں بھی نہیں تھے۔ تمھارا ٹھکانا تو پولیس کو بھی معلوم نہیں ہو سکا تھا حالانکہ ہم نے اس کام کے لیے لاہور کے کئی پولیس افسروں کو لمبی رقمیں بھی دی تھیں کہ وہ جس طرح بھی ہو سکے تمھیں گرفتار کریں مگر تم اُن کے ہاتھ نہیں آئے اور ہم اور زیادہ پریشان ہو کر خود کو اس شہر میں باندھ کر بیٹھ گئے۔ یہاں بھی ہمارا یہ دھندا کامیابی سے چل رہا ہے۔ اس کام کے لیے اب کی بار ہم نے ریکروٹنگ ایجنسی کا ڈراما رچایا۔ اس سلسلے میں ہمارے منیجر قربان علی نے بہت شاندار کام کیا۔ پہلے ہمیں گردوں کو محفوظ کر کے باہر پہنچانے میں بہت دشواری پیش آتی تھی۔ اب ہم اپنے مہربان ڈونر کو سیدھا ہوائی جہاز میں بٹھا کر وہاں لے جاتے ہیں اور جب وہ وہاں پہنچ کر ہماری خاص دواؤں یا غذاؤں کی وجہ سے پیٹ کے درد میں مبتلا ہوتا ہے تو ہم اُسے یہ بتا کر کہ اس کے فلاں حصّے میں خرابی ہے اس کا آپریشن کر کے گردہ نکال لیتے ہیں تو وہ ہمارا ممنون بھی ہوتا ہے مگر چند دنوں بعد ہم اُسے کام کرنے کا نااہل قرار دے کر پچاس ہزار روپیہ دیتے ہیں اور ہوائی جہاز میں بٹھا کر واپس بھیج دیتے ہیں۔ اتنی رقم سے وہ یہاں کوئی دھندا کر لیتا ہے تو ہمیشہ ہمیں اور ہماری انسان دوستی کو دعا دیتا ہے۔ اس ذریعے سے اب تک ہم کوئی ایک سو بارہ آدمیوں سے اُن کے گردے چھین چکے ہیں مگر اُن میں سے ہر آدمی کو ہم نے پچاس ہزار روپے ضرور ادا کر دیے ہیں۔ یہ ہمارا انسانی فرض بھی ہے اور ڈونر حضرات کی طرف سے قرض بھی ۔۔۔ ہم انہیں ڈونر ہی کہتے ہیں۔ وہ بڑی بیش بہا قربانی دیتے ہیں ۔۔۔ ہم غریبوں کے لیے کیا خیال ہے جیلانی! میں اپنی دولت میں تمھیں شریک کر سکتی ہوں؟ چاہو تو اپنی زندگی میں بھی۔ مجھے تم اچھے لگتے ہو۔" یہ کہہ کر اس نے ایک اور سگریٹ سلگا لیا۔ آبی نے ٹیپ روک دیا۔

"یہ کون ذات شریف ہیں تمھارے ساتھ؟ یہ مجھے تمھارے بھی گرو نظر آتے ہیں کیا اسم گرامی ہے ان کا؟"

عالیہ نے آبی کی محویت دیکھتے ہوئے کہا وہ اس کی آنکھوں میں سُرخ ڈورے بھی دیکھ چکی تھی۔ اور اب ایک معنی خیز انداز سے مسکرانے لگی تھی۔ جیسے کہہ رہی ہو تمھارے مطالبات میں سمجھ رہی ہوں میاں! اور ان پر ہمدردانہ غور بھی کر سکتی ہوں۔ وہ یہی کہتی سُنائی دے رہی تھی۔ وہ کسی بھی کام میں بند نہیں تھی اور سارے ہی پتن تیر کر عبور کر چکی تھی۔

"آپ اپنا بیان جاری رکھیں ماہ لقا۔ مجھے آپ کی آواز کا ترنم بہت بھلا لگتا ہے۔ بڑی نغمگی ہے آپ کی آواز میں۔" آبی نے اپنے فقرے کو تیل سے بھگوتے ہوئے اس کے کانوں میں اتار دیا۔ مگر وہ اپنے طنز کو چھپا نہ سکا۔

عالیہ کھل کر مسکرائی بولی۔ "یوں نہیں جناب! کیا اسم شریف ہے آپ کا؟"

"ایس جی ایم پیرزادہ۔" میں نے کہا۔

وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ "یہ ۔۔۔ یہ ۔۔۔ نام آپ نے کہاں سے مارا ہے؟ لقندروں اور قلندروں کو ایسے نام زیب نہیں دیتے۔"

"آپ حد سے بڑھ نہیں رہی ہیں؟" آبی نے مصنوعی غصہ دکھاتے ہوئے کہا۔

"حد ہوتی کہاں ہے؟ مجھے تو آج تک نظر نہیں آئی۔ آپ آج جس لمحے کو حد سمجھ رہے ہیں یہی کسی نئی دنیا کا نکتہ آغاز ہے جو ہماری اس دنیا ہی سے جنم لے رہی ہے۔ حد تو آسمان کی بھی نہیں ہے۔" وہ عورت باتوں میں بھی بڑے بڑوں کے کان کترتی تھی۔ اور عمل تو اس کا جیسا تھا وہ ظاہر ہی تھا۔

"اپنا بیان جاری رکھیں ماہ لقا، ہم ہمہ تن گوش ہیں۔"

"یہ ۔۔۔ یہ آپ نے میرا نام ماہ لقا کیوں رکھ دیا ہے؟ مجھے تعریف سُننے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ شوق ہوتا تو جیلانی کو ممتاز میں اور پھر میلسیاں کے ڈاک بنگلے میں ہی اپنا اسیر بنا لیتی۔"

"دفع کریں اس ذکر کو۔ آپ کو شکست دی ہی نہیں جا سکتی۔ ابھی میں یہی سمجھ رہا ہوں جیسے ہم ہار رہے ہیں۔ دل نظر جگر جان سب کچھ ہاتھ سے دیتے جا رہے ہیں۔" آبی نے کہا۔ وہ اب بھی اسے پاگلوں کی طرح دیکھے چلا جا رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں ویسی ہی کیفیت ابھر آئی تھی جیسی میں نے الماس کے سامنے وہاں دیکھی تھی۔

"آپ مجھے کوئی شاعر صفت آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ کوئی دل کے بارے میں شعر سنائیں مجھے۔ میں ۔۔ میرا خیال ہے کہ یہ سب سوانگ ہے پھر ۔۔۔ پھر زندگی مجھے شاید مہلت ہی نہیں دے گی۔" وہ بڑے ہی دلگیر لہجے میں بولی۔ اس کی آنکھیں چھلکنے لگی تھیں مگر جلد ہی اس نے اپنی اس کیفیت پر قابو پا لیا۔ ہنستی ہوئی بولی "سنا ہے حسین عورتوں کے سامنے تو گدھے بھی شاعری کرنے لگتے ہیں۔"

"ہاں مگر کاش ہم گدھے ہوتے یا گدھے جیسے ہوتے۔ یہ گدھا شعور سے بے نیاز ہوتا ہے اور کبھی گدھی سے یہ نہیں کہتا ؎

ہم نے اُن کے سامنے پہلے تو خنجر رکھ دیا
پھر کلیجہ رکھ دیا دل رکھ دیا سر رکھ دیا

عالیہ نے یہ شعر سُنا تو ایک بار پھر کھلکھلا کر ہنس دی۔ بولی "آپ نے بہت عمدہ شعر سنایا ہے اور بڑے ہی غیر محسوس طریقے سے ۔۔ کبھی سگریٹ پئیں اور بھول جائیں کہ ہم کیا تھے کیا کرتے ہیں کہیں سے شراب مل سکتی ہے؟"

"آپ اس چشمے سے پی کر تو آئی ہیں ماہ لقا!" آبی نے مجھے اسی نام سے پکارا جس سے چونکا تھا۔

"چشمہ؟ اسے آپ چشمہ کہتے ہیں اس عظیم الشان ہوٹل کو۔"

"کیوں نہیں! شہر کے تمام بھیڑیے اور دوسرے خونخوار جانور اپنی پیاس بجھانے کے لیے وہیں تو جاتے ہیں۔ جب وہ ڈھیروں خون پیتے ہیں تو اس سے جو اُن کی نسوں میں آگ بھڑک اٹھتی ہے اُسے بجھانے کے لیے وہ سب وہیں تو جاتے ہیں اور آپ بھی اُن میں شامل ہیں۔" آبی نے ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں مال حرام بود بجائے حرام رفت۔ مجھے اپنی بات پوری کر لینے دیں۔ یہ میری آخری اسٹیٹمنٹ ہوگی، یہی کہتے ہیں آپ اسے؟"

"ہاں! اپنا کلام جاری رکھیں ہم دونوں ہمہ تن گوش ہیں۔"

"اور ٹیپ ریکارڈر بھی ہیں۔ میں یہ کہہ رہی تھی کہ جیلانی! تم پاگل ہو جو بندوقیں چلاتے پھرتے ہو۔ روپیہ کمانے کے اور بھی کئی ڈھنگ ہیں۔ ہماری مثال تمھارے سامنے ہے۔ ان ڈاکٹروں کی مہربانی سے میں خود بھی ماہر سرجن بن چکی ہوں۔ پیٹ کے ہر حصّے کا آپریشن کر سکتی ہوں۔ ادھر کراچی پہنچ کر سوات خان نے ہم سے ایک عجیب و غریب سودا کیا اور وہ یہ کہ وہ بندے مہیا کرے گا۔ خاص قسم کے ٹوٹے پھوٹے بندے۔ اُن کے گردے اگر ہم نکال دیا کریں تو ہم اُسے ہر گردے پر ایک لاکھ روپیہ دے دیں۔ ڈاکٹر دھمن نے اُس سے سودا پکا کر لیا۔ اب سوات خان کا معمول یہ ہے کہ وہ ہر مہینے تین چار آدمی ایسے اُٹھا لاتا ہے جو کسی حادثے میں شدید زخمی ہو جاتے ہیں۔ وہ لوگ جو علاج کے قابل ہوتے ہیں ہم اُن کا علاج بھی کرتے ہیں اور ان سے ایک ایک گردہ بھی لے لیتے ہیں اور پھر اُن کی مرمت کر کے غیر محسوس طریقوں سے ہسپتالوں میں منتقل کر دیتے ہیں جہاں ہمارے خاص آدمی اُن کو مطمئن کر کے اپنے وارڈوں میں ڈال لیتے ہیں۔ اب تک سوات خان ایسے گیارہ آدمی لا چکا ہے۔ آخری دو آدمی جو ہم نے بھگتائے اُن میں سے ایک کا نام عارف تھا اور دوسرے کا وہاب۔ وہ کسی دفتر میں کام کرتے ہیں اور ابھی تک ہسپتال میں زیرِ علاج ہیں۔ اور وہاں ڈاکٹر قادری ہماری طرف سے ان کی پیروی کر رہے ہیں۔ یہ بڑا پیچیدہ کام ہے اور بڑی بے رحمی کا بھی مگر ہمیں کوئی فکر نہیں ہوتی۔ لوگوں کی اکثریت جاہل ہے اور خدا پر ہماری کے سلسلے میں اُن کا اعتقاد اتنا پختہ ہے کہ وہ مہلک حادثوں کو بھی تقدیر سمجھ کر سہہ جاتے ہیں۔ حادثے کے ذمہ دار لوگوں سے کبھی نہیں پوچھتے کہ تم نے ہمیں کیوں تباہ کر دیا ہے۔ ہمارا دھندا ایسے ہی لوگوں کی بدولت چل رہا ہے۔ ہم نے ہر سطح پر اپنے تعلقات قائم کر رکھے ہیں مثلاً ایس پی ترمذی ہی کو دیکھ لیں۔ میں اس کی کمزوری بن چکی ہوں، اور یہی وجہ ہے کہ یہ ہماری مٹھی میں رہتا ہے۔ ایسے ہی پولیس کے اونچے عہدیدار ہیں ان سے بھی ہم نے صاحب سلامت قائم رکھی ہے کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی ۔ مگر ۔۔ مگر جیلانی! اب تم نے ہمیں جس طرح پکڑا ہے، یہ صورت ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔ سوات خان اپنے شکار کی تلاش میں سارا دن گاڑی لے کر شہر میں گھومتا رہتا ہے۔ آج اس نے ہماری کیڈلک یوں شتر بے مہار پھرتی دیکھی تو وہ محض تجسس کا مارا ہمارے پیچھے چل نکلا۔ اس کا شک بہرحال درست تھا مگر وہ بھی ہماری کوئی مدد نہ کر سکا۔ تم نے اسے بھی بے بس کر دیا اور اب سوٗر کی طرح بندھا بیٹھا ہے اور ٹس سے مس نہیں ہو رہا۔ جانتا ہے کہ اس نے ذرا بھی پھوں پھاں کی تو تم لوگ اسے ادھیڑ کر رکھ دو گے۔ موقع شناس ہے اپنی کھال بچانے کا فن اسے آتا ہے۔ میں دھمن خواہ مخواہ ہی تم سے پٹ گئے جس کا مجھے بے حد افسوس ہے کیونکہ میری چھٹی حس مجھے بتا رہی ہے کہ ہم اپنے انجام کو پہنچ چکے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنے اور دھمن اور دوسرے لوگوں کے بارے میں سب کچھ تمھیں بتا دیا ہے۔ اب تم جہنم میں جاؤ مجھے کوئی فکر نہیں ہے جو ہوگا میں بھگت لوں گی۔ جاؤ تم یہ سب کچھ میری طرف سے خدا کے سامنے رکھ دو۔ میں اپنی سزا کے لیے بالکل تیار ہوں۔ جاؤ جو کر سکتے ہو کر لو۔ اینڈ گیٹ آؤٹ آف ہیئر ۔۔۔ مجھے تم دونوں کی صورتوں سے نفرت ہے۔ آئی ہیٹ یو بوتھ ڈرٹی ڈاگز۔" وہ ایک دم طیش میں آ گئی۔ اس کی آنکھوں میں سے شعلے نکلنے لگے۔ اس کا موڈ ایک دم ہی بدل گیا تھا۔ اس پر ایک بار پھر خوفناک قسم کی ہذیانی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔

آبی نے گھبرا کر ٹیپ ریکارڈر پیچھے ہٹا کر بند کر دیا، بولا "نارمن نہ ہوں ماں ڈیئر! یہ ۔۔۔ یہ تو ہوتا ہی آیا ہے، ترازو کے دو پلڑوں میں کبھی باٹ بھاری کبھی مال، اب آپ آرام کریں۔ ہم آپ کے حق میں دعائے مغفرت کریں گے، آؤ جیلانی! مجھے ڈاکٹر نے عورتوں سے سخت پرہیز بتایا ہے۔" آبی یہ کہہ کر معنی خیز انداز سے مسکرایا۔ اور مجھے اپنے ساتھ لے کر کمرے سے باہر آ گیا۔ اس دروازے پر باہر سے کُنڈی چڑھا کر بولا "مجھے یقین ہے کھڑکیوں پر لگی آہنی گرل میں سے یہ باہر نہیں بہہ جائے گی۔"

"ہاں آپ کا خیال درست ہے شری انیا تے داس جی! آئیں اب ترمذی سے ملتے ہیں۔"

"میں بہت تھک گیا ہوں یار! یہ ٹیپ سنبھال کر رکھ دو۔ ذرا نہا کر تازہ دم ہو ہیں تو اچھا ہے اس کریم کو ادھر بلا لو۔" یہ کہہ کر وہ برآمدے میں پڑی بید کی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔

اس وقت تک شام کے چھ بج چکے تھے۔ سورج نے مغربی افق پر سر رکھ دیا تھا اور اب وہ بس لڑھکتا ہی چلا جا رہا تھا۔ وہاں پہنچ کر وہ آدمی کو احساس دلاتا ہے کہ اگر وقت کا سلسلہ اس کی گردش پر منحصر ہے تو انسان کو سمجھ لینا چاہیے کہ وقت سے زیادہ تیز رو شے اور کوئی نہیں ہوتی۔

ہم نہا کر تازہ دم ہوگئے تو کریم احمد نے ہمیں اور ہمارے اسیروں کو عمدہ قسم کی چائے بنا کر پلائی۔ کیڈلک میں ایک ابتدائی طبی امداد کا باکس بھی دھرا تھا ڈگی میں۔ وہ نکال کر آبی نے ڈاکٹر دھمن کی کمر پر عالیہ کے ہاتھوں سے ایک دوا لگوا دی جس سے اس کی کمر پر بید کی چھڑی نے جو آگ لگا رکھی تھی وہ کسی حد تک سرد ہو گئی چائے کے لیے ہم نے ان سب کو

ایک جگہ اکٹھا کر لیا تھا اور اُن کا ایک ایک ہاتھ کھول دیا تھا۔
"کیا خیال ہے ڈاکٹر دھمن آف ڈی پھمن! کر دیں ٹیلیفون تمھارے اس عربی دوست ہو؟"
"یہ تم میرا نام کیوں بگاڑ رہے ہو مجھے اتنا ذلیل نہ کرو۔ میں تم جیسے چار سو آدمیوں کو اُن کے خاندانوں سمیت کھڑے کھڑے خرید سکتا ہوں۔" دھمن نے سخت ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔
"دریں چہ شک! مگر تمھارا نام ہمیشہ کے لیے بگڑ چکا ہے پیارے گردہ فروش! اور ابھی ہم تمھیں کھول کر کے سُرمے کی طرح پیس دیں گے۔ تمھاری اس خوبصورت رشوت سمیت جو تم ترمذی صاحب ایسے نیک نفس آدمی کو پیش کرتے رہے ہو۔ میں اس اُبو بکر سے بھی بات کرتا ہوں۔"
یہ کہہ کر وہ بغلی کمرے میں جا گھسا۔ میں بھی اُس کے پیچھے جا ٹھہرا۔ کچھ دیر بعد اُسے آپریٹر سے اُبو بکر کا نمبر مل گیا اُسے منہ ہی منہ میں دہراتے ہوئے آبی بولا۔ "یار! تو اُس سے بات کر، تیری آواز ذرا رُعب دار ہے۔ وہ تیری آواز کو پہچان نہیں سکے گا۔"
"میں کیا کہوں گا اُس سے! یہ کام تو بہتر کر سکتا ہے۔"
"تو پھر خواہ مخواہ ہی گو گا پیر بنا ہوا ہے پکڑ اِس مصیبت کو، بات کر اس سے تیری انگریزی بھی اچھی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے رسیور میرے ہاتھ میں دے دیا۔
"یوں نہیں بچے! اس دھمن سے کہہ وہ خود اس سے بات کرے پستول لے کر اس کے سر پر جا ٹھہر۔"
"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" آبی نے فون اٹھایا اور لے جا کر دھمن کے سامنے رکھ دیا۔ اور اس پر رکھے فون نمبر پر ہاتھ رکھ کر اُسے دھمن سے چھپاتے ہوئے بولا۔ "پدر سوختہ! اس شخص سے تو خود ہی بات کر۔ اور یہ دیکھ اگر تُو نے کوئی زیر زبر ڈالی تو میں تیرے مغز میں سے گولی گزار دوں گا۔"
یہ کہہ کر آبی نے تکریم احمد کے ہاتھ سے پستول جھپٹ کر دھمن پر تان لیا۔
دھمن نے پریشان ہو کر آبی کے بتاتے ہوئے نمبر گھما دیئے دُوسری طرف سے شاید مطلوبہ شخص ہی نے فون اٹھایا تھا۔
دھمن بولا۔ "ہیلو عجمی! میں ڈاکٹر دھمن بول رہا ہوں۔ میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے ورنہ میں خود آتا۔ ایک پچھتر لاکھ کا چیک میں صبح بھجوں گا تم رقم کا بندوبست کر رکھو گے؟ ...... ہاں! ایک ایسی ہی ضرورت پڑ گئی ہے میں خود آتا مگر میری طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب ہے۔ .... ہاں ٹھیک ہے۔" جونہی یہ بات دھمن نے کہی آبی نے فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ ..... مگر اس کے ساتھ ہی آبی کا رنگ فق ہو گیا۔ اس نے پستول تکریم احمد کے ہاتھ میں دیا اور بولا۔ "اس کی مشکیں کس دیں بھائی جی اچھی طرح۔" پھر اس نے فون اُٹھایا اور پہلو کے کمرے میں واپس جا پہنچا۔ مجھے بھی اُس نے اپنے ساتھ گھسیٹ لیا تھا دروازہ بند کر کے بولا۔ "یار! یہ تو بہت غلط کام ہو گیا۔"

"کیا مطلب؟"
"اس بدمعاش نے اُسے کارروائی کا اشارہ دے دیا ہے۔"
"وہ کس طرح؟"
"جب اس نے کہا کہ اس کی طبیعت خراب ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اب اُبو بکر اس کو آج پھر کسی بھی وقت فون کرے گا اور جب اس کو کوٹھی سے اُسے معلوم ہو گا کہ وہ گھر پر ہی نہیں ہے اور اس کا اتہ پتہ کسی کو معلوم نہیں تو وہ کیا سوچے گا۔ عین ممکن ہے وہ اس کے بارے میں کسی شک میں مبتلا ہو جائے۔"
"تمھارا یہ شک بے بنیاد نہیں ہے مگر وہ ہمیں کسی بھی طرح ڈھونڈ نہ سکیں گے۔"
"وہ تو ٹھیک ہے مگر صبح ہم چیک لے کر جائیں گے تو وہ آدمی پہلے ہی شک میں مبتلا ہو چکا ہو گا ہمیں کسی بھی چکر میں ڈال سکتا ہے۔"
"یہ تو بہت بُرا ہوا آبی! مگر تیر کمان سے نکل چکا ہے اب تو کچھ بھی نہیں کر سکتے۔" میں بھی آبی کی پریشانی میں برابر کا شریک ہو گیا تھا ہم دونوں کمرے میں پڑی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔
آبی نے پنکھا چلا دیا اور سگریٹ سلگا کر بولا۔ "اس کا کوئی حل بھائی گو کھے! اب تو رقم کی مجھے امید ہی نہیں رہی۔" پھر کچھ سوچ کر "ویسے چیک اس نے صحیح لکھا ہے مگر وہ میرے نام ہے اور میرے اُس نے تصدیق کر دیے ہیں۔"
"یار تو فکر نہ کر۔ وہ آدمی اتنی تفتیش نہیں کرے گا۔ صبح تم سیدھے اس کے بینک چلے جاؤ۔"
"ہائے ری قسمت! ابے اس سالے نے ہمیں میخ تو دے دی مینچو نہیں دیا، یہی کہتے ہیں نا ایسے موقعوں پر۔"
"تجھے مینچو بھی مل جائے گا بیٹے! اللہ کے گھر میں کس چیز کی کمی ہے بھلا۔"
"بکواس کرتا ہے تو۔ اُدھر بیڑا میرے ہاتھوں سے نکلا اور تجھے مذاق سوجھ رہا ہے۔" آبی نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔
اُس نے کچھ سوچتے ہوئے فون پر پھر اُبو بکر کے نمبر گھمائے۔
"میں عجمی صاحب سے بات کر سکتا ہوں؟"
فون میں دوسری طرف کی آواز بھی مجھے سنائی دے رہی تھی آبی کے پاس ہی کھڑا تھا، کوئی بولا۔ "ہاں میں عجمی بول رہا ہوں"
"دیکھیں۔۔ عجمی صاحب! میں سوات خان ہوں ڈاکٹر کا ملازم۔"
"جی! ابھی میری اُن سے بات ہوئی تھی مگر سلسلہ ہی میں نے اُن کے گھر فون بھی کیا مگر وہاں سے کوئی فون ہی نہیں"
"ہماری لائن خراب ہو گئی ہے میں باہر آ کر ایک بوتھ سے بات کر رہا ہوں ڈاکٹر صاحب یہ پوچھ رہے ہیں کہ صبح رقم کا

ہیں جی آپ؟"
"ہاں کیوں نہیں! مگر گیارہ بجے وہ اپنا آدمی بینک بھیجیں اُس بینک میں رقم منگوا لوں گا۔"
"ڈاکٹر صاحب یہی پوچھ رہے تھے مگر آپ سے پوری بات نہ ہو سکی" آبی نے کہا۔
"کیا تکلیف ہے انھیں! زیادہ بیمار ہیں کیا؟" عجمی نے پوچھا۔
"ہاں انھیں پیچش لگی ہے آج اُدھر ہوٹل سے کوئی غلط چیز کھا لی ہے ہیں مگر فکر کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"
"بس یہ لال پری ہی اُن کا معدہ تباہ کر رہی ہے بلا نوش ہو گئے ہیں انھیں سمجھایا کریں سوات خان!" عجمی نے ہنستے ہوئے کہا۔ وہ بڑی رواں دواں اُردو میں بات کر رہا تھا، یوں لگتا تھا جیسے وہ پیدا ہی کراچی میں ہوا ہے۔
"اب تو میں انھیں بہت سختی سے روکوں گا عجمی صاحب! آپ کا خیال بالکل صحیح ہے موقع ملتے ہی پورا گھڑا پی جاتے ہیں۔"
"ہاں اُسے گھڑا ہی کہنا چاہیے بہر حال اُن سے کہیں کہ وہ کل گیارہ بجے اپنا آدمی میرے پاس بھیج دیں اچھا خدا حافظ۔" یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔
آبی نے فون کریڈل پر رکھا اور بڑی عیاری سے مسکراتے ہوئے بولا۔ "اب اس جگہ ہر طرح خیریت ہے۔ اور ڈاکٹر دھمن ڈی پھمن کی خیریت خداوند تعالیٰ سے نیک مطلوب ہے۔"
"یہ اچھا کیا ہے تم نے آبی! تیرا دماغ ویسے خوب چلتا ہے ورنہ میں تو سمجھا تھا کہ تم آؤٹ ہو چکے ہو۔"
"نہیں یار! ابھی تو میرے وکیٹ صحیح سلامت ہیں بس اب پچھتر لاکھ تو سمجھو ہم نے مار ہی لیا ہے۔"
"اس سے کیا ہوتا ہے اس کے پاس کروڑوں روپے ہے۔ اُسے کیا فرق پڑے گا۔"
"وہ بھی میں اس سے نکلوا لوں گا۔ ابھی ہم اسے اگلے دروازے میں سے نہیں گزاریں گے ابھی تو مجھے اس کی زندگی بہت عزیز ہے۔"
"ہاں اب تم اپنی اس الماس کے لیے کم سے کم پچھتر مربعے بڑی آسانی سے خرید سکو گے۔"
"ہاں! ایک لاکھ میں ایک مربع زمین تو مل ہی سکتی ہے۔ آدھی زمین تو خرید لو گے اور آدھی میں۔"
"مجھے اس میں سے کچھ نہیں چاہیے پیارے! میرے پیچھے تو کوئی رونے والا نہیں ہے۔"
"یار! تو بالکل کچی بات نہ کیا کر۔ ہم آپ ہی کے علاقے میں زمینیں خریدیں گے۔ ٹیوب ویل لگوائیں گے۔ اطمینان سے حقہ پیا کریں گے۔ پھر ہمارے بچے ہم پر فخر کیا کریں گے کہ کیسے کرنی والے

بزرگ ہیں اُن کے۔" آبی نے سگریٹ کے گہرے کش لگا کر خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔ وہ مستقبل کے بارے میں خدا جانے کیسے کیسے حسین خواب دیکھتا رہتا تھا اور اب وہ رقم اس کی راہ میں آئی تھی تو اس کے اُن رنگین خوابوں کو مہمیز مل گئی تھی۔ اوّل آخر وہ بھی تو انسان ہی تھا اور اس کے دل میں آرزوؤں اور اُمیدوں کی ننھی منی کونپلیں برابر پھوٹتی رہتی تھیں۔ کوئی ان خود رو مُنہ زور جذبوں کو اُوپر اٹھنے سے کیسے روک سکتا ہے۔
عین اس وقت تکریم احمد ہمارے پاس آ گیا، بولا۔ "میرا خیال ہے کہ میں ابھی واپس جاتا ہوں، فردوسی پریشان ہو گی۔"
"ہاں میاں جی! ویسے بھی تم اس کی محبت میں لت پت ہو رہے ہو۔ ہمارا کچھ سامان ہوٹل میں پڑا ہے میرا خیال ہے کہ وہ آپ وہاں سے اٹھوا کر فلیٹ میں لے جائیں۔" آبی نے تکریم احمد کی سنجیدگی کو سمجھتے ہوئے کہا۔ "یہ کام تو ہمیں خود کرنا چاہیے ان کو تو وہ سامان نہیں اٹھانے دیں گے۔"
"ہاں! یہ ٹھیک ہے آیئے تکریم صاحب میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں تم ادھر ذرا آنکھیں کھول کر بیٹھو گے پنچھی سب کے سب بہت تیز ہیں۔"
"تم فکر ہی نہ کرو بھائی ننکن شاہ! یہ میری ذمے داری ہے۔"
آبی مسکراتا ہوا اٹھا اور اپنا پستول کھول کر اس کے اندر کا حال دیکھتے ہوئے باہر نکل گیا۔ اب اُسے بھی ہر وقت ایک ہتھیار کی ضرورت محسوس ہوتی رہتی تھی۔ ورنہ وہ بات اس کی عادت میں شامل نہیں تھی۔
وہ دونوں سوات خان کی واکس ویگن میں بیٹھ کر باہر نکلے تو میں ڈاکٹر دھمن کے پاس جا بیٹھا، وہ سب لوگ شدید ذہنی اذیت میں مبتلا تھے اور اندر سے بُری طرح ٹوٹ پھوٹ چکے تھے، ایک صرف سوات خان تھا جو کچھ نہیں کہتا تھا۔ بس ٹک ٹک اپنے گرد و پیش کو بڑی خاموشی سے دیکھتا چلا جاتا تھا۔ وہ ہم سے بالکل بھی نہیں الجھ رہا تھا اور مجھے یوں لگتا تھا جیسے وہ ہم پر کوئی کاری وار کرنے کے لیے موقعے کی تلاش میں ہو۔ حیرت مجھے یہ تھی کہ نہ اس کے پاس سے کوئی آتشیں ہتھیار نکلا تھا۔ نہ کسی کی جیب سے۔ ایک صرف وہ تیز دھار خنجر تھا جو ابھی تک الماری کے تختے میں دھنسا نظر آتا تھا۔ عالیہ بھی آنکھیں موندے پڑی تھی اور سوات خان بھی کسی نے یوں کیا تھا کہ وہ فوم کے بیڈ پر مُنہ کے بل اُلٹ کر گہری نیند میں کھو گیا تھا۔ اس کے ہاتھ کمر پر باندھے تھے اور میرا خیال ہے کہ اُس کے گھٹنے میں درد کی اب وہ پہلی سی یلغار باقی نہیں رہی تھی۔ اس کا زیادہ نقصان نہیں ہوا تھا ورنہ وہ یوں سو نہ سکتا۔
مجھے سامنے دیکھ کر ترمذی بولا۔ "پھر میرے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے آپ نے؟ میں تو بہر حال گردہ فروش نہیں ہوں۔" وہ مسکرا رہا تھا۔ اس کا حوصلہ قابلِ داد تھا۔ بلاشبہ وہ خود کو کھن سمجھ

رہا تھا جو گیہوں کے ساتھ پس رہا تھا۔ اس کی آواز سن کر دھمن نے بھی آنکھیں کھول دیں اور عالیہ نے بھی اُن دونوں کو ہم نے خاصے فاصلے پر ایک دوسرے سے الگ الگ بٹھا رکھا تھا۔

"میں کیا عرض کروں ڈاکٹر ترمذی! میں آپ کے گھر فون کر دیتا ہوں۔ یہ دھمن اگر اپنا بیان ٹیپ کروا دے تو ہم ان سب کو پولیس کے حوالے کر دیں گے اور آپ چشم دید گواہ ہوں گے کیا آپ اس قانونی کارروائی میں ان کے خلاف عدالت تک جاسکیں گے؟"

"میں ضرور جاؤں گا ان کا وجود ہمارے پیشے کے چہرے پر کلنک کا ٹیکہ ہے مجھے ان سے کوئی ہمدردی نہیں۔"

"سوچ لیں ڈاکٹر عالیہ بھی اس گروہ میں شامل ہے۔"

"یہ محض ایک نرس ہے اس سے زیادہ میری نظر میں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے بہر حال آپ میرے گھر فون کر دیں کہ میں آج رات واپس نہ آسکوں گا۔" یہ کہہ کر اس نے مجھے اپنے گھر کا نمبر بتا دیا۔

"دیکھیں ترمذی صاحب! ان کے بارے میں ہم کل دوپہر کو کوئی فیصلہ کریں گے۔ ہم پولیس سے رابطہ قائم کر رہے ہیں۔" یہ کہہ کر میں نے دوسرے کمرے میں جاکر ترمذی کے گھر پر اس کی بیوی سے بات کر کے اسے بتا دیا کہ اس کے شوہر آج رات گھر نہیں آئیں گے وہ ایک ضروری کام کے سلسلے میں حیدر آباد جا رہے ہیں۔ وہ بیچاری پوچھتی ہی رہ گئی کہ ایسا کونسا ضروری کام پڑ گیا ہے انہیں مگر میں نے جلدی ہی فون بند کر دیا۔

آبی رات کے نو بجے واپس آیا۔ وہ اپنے ساتھ اُن سب لوگوں کے لیے ڈھیر سارا کھانا ہوٹل سے لے آیا تھا اور تکریم احمد بھی اس کے ساتھ تھا۔ ہم نے ان سب کے آگے ایک ہی جگہ رکھ کر راتب ڈال دیا۔ کسی کے گھٹنے کا درد پھر سے جاگ اٹھا تھا۔ اس کے لیے چلنا پھرنا دو بھر ہو گیا تھا۔ پھر بھی اس نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ کچھ ہی دیر بعد آبی نے وہ تمام برتن اٹھا کر گاڑی میں رکھے اور تکریم احمد کو ساتھ لے کر باہر چلا گیا۔

جب وہ واپس آیا تو گیارہ بج چکے تھے۔ ہم نے اُن سب کو اچھی طرح جکڑ کر قالین ہی پر لٹا دیا اور کمرے کو چاروں طرف سے مقفل کر کے ہم دوسرے کمرے میں جا لیٹے۔

آبی کسی گہری سوچ میں گم تھا اور اپنا راستہ مجھے بھی روشن نظر نہیں آ رہا تھا کہنے سننے کے لیے ہمارے پاس اب کچھ بھی نہیں رہ گیا تھا۔ ہم زندگی کے انتہائی خطرناک موڑ پر آ گئے تھے اتنے سارے لوگوں کو ہم نے باندھ تو لیا تھا مگر ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہم اُن کے ساتھ کیا سلوک کریں میں انھیں گولی مارنے کے حق میں نہیں رہا تھا۔ اُن کے خون سے ہاتھ رنگنے کے خیال ہی سے مجھے وحشت ہوتی تھی حالانکہ تھے وہ اسی سزا کے لائق۔ اب تک تو ہم اُن کو صرف لتیاتے آ رہے تھے۔ اُن کے جرائم کی فہرست طویل تھی، بے حد طویل۔ انھوں نے ان گنت لوگوں کو تباہ کر دیا تھا مگر میں سمجھتا تھا کہ اُن تمام لوگوں کا انتقام لینے کا حق مجھے حاصل نہیں تھا قطعاً نہیں تھا۔ یہ بات نہیں ہے کہ میرے وجود میں وہ پہلی سی آگ باقی نہیں رہی تھی بلکہ میں یہ محسوس کرتا تھا کہ اگر وہ قانون کے حوالے کر دیے جائیں تو انھیں یہاں سے زیادہ مثالی اور عبرتناک سزا مل سکے گی، ایسی سزا جو اُن کی بہیمیت کے برابر تل سکے گی

اگلی صبح ہم نے سورج کے طلوع ہونے سے پہلے ہی بستر چھوڑ دیا۔ آبی نے اٹھتے ہی ایک سگریٹ سلگا لیا، بولا۔ "وڈیرے صاحب تم اتنے بے خبر ہو کر نہ سویا کرو مجھے چار دفعہ اٹھ کر ان جانوروں کو دیکھنا پڑا مگر تمھیں کوئی فکر ہی نہیں تھی۔ تم یوں سوتے تھے جیسے تم نے دسویں کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کر لیا ہے۔"

"ابے تو اس میں شک ہے تمھیں! میٹرک میں نے واقعی فرسٹ ڈویژن میں پاس کی تھی۔"

"جا! انھیں دیکھ جا کر۔ تو نہ صرفی بن سکا نہ نحوی، اور عمر عزیز ان گردہ فروشوں سے برباد کروالی۔ جا دیکھ! انھیں میں ذرا ایک ڈبکی لگا لوں۔" یہ کہہ کر وہ باتھ روم میں جا گھسا۔ وہاں ایک بہت بڑا سفید سنگِ مرمر کے رنگ کا باتھ ٹب دھرا تھا اور اس میں لیٹ کر نہانے کا آبی کے دل میں بہت ارمان تھا جو اب پورا ہو رہا تھا۔

ہمارے جانور اپنی اپنی جگہوں پر اطمینان سے لیٹے تھے اور مجھے کسی طرف کوئی گڑبڑ نظر نہیں آتی تھی۔ برآمدے کی گرل لگی کھڑکی کے شیشوں میں سے اندر کے حالات کو اطمینان بخش پاکر میں عقبی لان میں نکل گیا۔ کراچی کے ساحلوں کی ہوا سمندر کی بو باس لیے آہستہ آہستہ شہر میں ٹٹول ٹٹول کر بکھر رہی تھی۔ صبح خنک تھی اور سکون پہنچاتی تھی۔ لان میں کچھ ایسے پھول کھلے تھے جن کی خوشبو گرد و پیش کو مہکا رہی تھی۔ زندگی اپنے تمام تر حسین رنگوں سمیت اپنی جگہ پر کھڑی تھی مگر نہ میں اپنے مقام پر محفوظ تھا نہ آبی۔ ہم دونوں ہی خزاں رسیدہ پتوں کی طرح تیز ہواؤں کی زد میں تھے۔

چھ بجے تکریم احمد وہاں آ پہنچا، وہ ہمارے لیے ناشتے کا سامان لے آیا تھا۔ اس نے باری باری ان سب لوگوں کے منہ ہاتھ دھلائے پھر کہ اُن کو سہارا دے کر اس نے باری باری غسل خانے میں سے گزار دیا اور اس دوران آبی پستول ہاتھ میں لیے اُن کے سر پر کھڑا رہا۔ میرا خیال تھا کہ نے دھمن کو اپنے اعترافات کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ اگر بتا دیا ہوتا تو وہ اتنا مطمئن نظر نہ آتا اور ہم یہ چاہتے تھے کہ بینک سے رقم نکلوانے کے بعد اسے چاقو کی نوک پر رکھ کر اس کا بیان ٹیپ کریں گے۔ تکریم احمد کا خدا بھلا کرے اس نے ہماری بہت سی مشکلیں آسان کر دی تھیں۔ وہ ہمارے لیے تائیدِ غیبی ثابت ہو رہا تھا۔ وہ ہر بات کو سمجھتا تھا مگر ہم سے کچھ نہیں کہتا تھا۔

دوپہر کے کھانے کے لیے بھی وہ سامان لے آیا تھا جسے وہ خود پکانے کا اہتمام کرنے لگا۔ مجھے اس کے اس خیال پر جھنجھلاہٹ ہو رہی تھی مگر وہ شاید بار بار بازار سے کھانا لانے کے جھنجھٹ سے بچنا چاہتا تھا۔ میں نے مزید کچھ کہنے سننے سے احتراز کیا۔

دس بجے ہم سوات خان کی گاڑی میں بیٹھ کر بینک کی طرف چل دیے۔ اپنی اپنی جگہ ہم دونوں ہی مضطرب تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہم ایک دوسرے سے کوئی بات نہ کر سکے۔

بینک کے دروازے پر ہم بیس منٹ میں جا پہنچے مگر ہمیں اس بینکر نے وقت گیارہ کا دیا تھا۔ اس وقت کو کاٹنے کے لیے ہم نے گاڑی ایک چائے خانے کے سامنے جا ٹھہرائی اور خود اندر جا بیٹھے۔

چائے کی پیالیاں ہمارے سامنے آئیں تو پچھلی میزوں سے اٹھ کر ایک آدمی بڑی بے تکلفی سے ہمیں سلام کر کے ہمارے پاس بیٹھ گیا، بولا۔ "صاب جی یہ گاڑی سوات خان کی ہے نا!"

ہم اس کے اس غیر متوقع سوال پر ایک دم چونک اٹھے۔ "تمھیں کیسے پتہ ہے کہ یہ گاڑی سوات خان کی ہے؟ ہائیں! تو کوئی ٹریفک سارجنٹ ہے؟" آبی نے اسے بڑے ہی کاٹ کھانے والے لہجے میں پوچھا۔

"وہ جی۔۔۔ اپنا تو یار بیلی ہے نا! وہ سوات خان ہمیں اس میں وہ سیر بھی کرا دیتا ہے، وہ خود کہاں ہے آج؟"

"اس نے یہ گاڑی کل ہمارے ہاتھ بیچ دی تھی بیس ہزار میں اب یہ ہماری ملکیت ہے۔"

"اوہ اچھا! کچھ ٹربل دینے لگی تھی یہ اسے۔ بہر حال بیس ہزار میں آپ کو سستی مل گئی۔ اس نے پینتیس میں خریدی تھی۔"

"بڑی معلومات ہیں اس کے بارے میں تمھیں! سا جھی معلوم ہوتے ہو اس کے۔"

"نہیں جی! بس وہ اپنے اس ہوٹل میں کبھی کبھی چائے کے لیے آ جاتا ہے۔ اپن کا بہت جگری یار ہے وہ۔ رات وہ اپنے گھر بھی نہیں پہنچا اس کی گھر والی پوچھ رہی تھی۔"

"تم اُس کے قریب ہی رہتے ہو کہیں۔ کیا نام ہے تمھارا؟" آبی نے اپنی تفتیش جاری رکھی۔

"میرا نام کریم ہے صاب جی! اپن آپ جیسے لوگوں کی خدمت کر کے خوش ہوتے ہیں سوات خان بھی ہمارا گاہک ہے۔ ذرا موج میلے کا آدمی ہے آپ بھی جی دار لوگ نظر آتے ہیں کہیں تو دل کی ٹھنڈک کا کوئی بندوبست کر دوں۔ ایک سے ایک طرح دار بندہ ہے میرے پاس۔"

"اچھا اچھا! تو تم دلال ہو، بڑی خوشی ہوئی تم سے مل کر۔ ان طرحداروں میں تمھاری کوئی اپنی رشتے دار بھی ضرور ہو گی۔"

"یہ کیا کہتے ہیں صاب جی! یہ دھندا اپنوں کے لیے تو نہیں ہوتا۔"

"بہتر یہ ہے کہ تم یہاں سے اُٹھ جاؤ ورنہ میں ایک جھانپڑ دے ماروں گا تیرے منہ پر اُٹھ جا یہاں سے۔۔۔" آبی نے ایک دم طیش میں آکر اس خبیث کو میز پر سے ہاتھ پکڑ کر اٹھا دیا۔ وہ دہشت زدہ ہو کر دیکھنے لگا۔ وہ دہشت زدہ سا ہو کر اُٹھا اور اپنی پتلی پتلی ٹانگیں گھسیٹتا ہوا پچھلی کرسیوں کی طرف نکل گیا، اس کا رنگ اڑنے لگا تھا۔

"تم بہت احمق آدمی ہو آبی! اس سے پوچھا تو ہوتا کہ سوات خان کا گھر کہاں ہے۔"

"وہ بھی ہم پوچھ لیں گے مگر دیکھو تو سہی یعنی اس نے ہمیں سمجھا کیا ہے کیا ہم ایسے ہی لچے اور لوباش نظر آتے ہیں یار، حد ہو گئی۔" یہ کہہ کر آبی نے پیالی ہونٹوں سے لگالی۔

"شریف تمھیں کون کہہ سکتا ہے بچے! تیری شکل ہی ایسی ہے اس نے تمھیں سمجھنے میں کوئی غلطی نہیں کی۔"

وہ اتنا تپ گیا تھا کہ میں اپنی ہنسی نہ روک سکا۔ مجھے ہنستے دیکھ کر وہ بھی مسکرا دیا، بولا۔ "یار! ایک تو تجھ سے میں بہت تنگ آ گیا ہوں، میری کوئی بات ہی نہیں سمجھ رہا ہے تو۔ یہ سالا ہمیں کسی کھڈے میں پہنچا کر ہمیں پرکھنا چاہتا تھا کہ کہیں ہم نے سوات خان کو سوات تو نہیں پہنچا دیا۔ یہ بہت گھنا آدمی ہے یہ کریم۔"

"پاگل ہے سالا اس کے فرشتوں کو بھی یہ وہم نہیں ہو گا۔ دراصل تیرے اپنے اندر ایک شک بیٹھ گیا ہے جس کی وجہ سے تجھے اپنے آپ پر اعتبار نہیں رہا۔"

"ایسی تیسی اعتبار کی چل اُٹھ اس عجمی کے بچے سے بات کرتے ہیں۔ پونے گیارہ بج رہے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھا اور کاؤنٹر پر پیسے پھینک کر گاڑی میں جا بیٹھا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم اس بینک کی عالیشان عمارت میں داخل ہو چکے تھے۔ وہ اس بینک کی مرکزی شاخ تھی اور اس کے تمام اہم عہدیدار وہیں بیٹھتے تھے۔

ابوبکر قاسم عجمی کے کمرے کا پوچھ کر ہم پہلی منزل کے ایک وسطی کمرے کے سامنے جا پہنچے۔ اس کی ایک سیکریٹری نے ہمارا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا۔ تھی تو وہ بھی دیسی ہی مگر سنگھار اس نے ولایتی کر رکھا تھا۔ بڑے ہی دل فریب انداز میں آنکھیں جھپکا کر بولی۔ "فرمائیے۔"

"جی ہمیں عجمی صاحب سے ملنا ہے ڈاکٹر دھمن صاحب نے بھیجا ہے ہمیں۔"

"اوہ! ڈاکٹر دھمن دی گریٹ سرجن۔ میں ابھی ملوا دیتی ہوں عجمی صاحب سے۔" یہ کہہ کر اس نے انٹرکام پر ہماری آمد کی اطلاع ابوبکر کو دی تو اس نے ہمیں فوراً ہی اندر بلا لیا۔ ہم سمجھے تھے کہ وہ کوئی عربی ہو گا مگر نہیں، وہ بیش قیمت ولایتی سوٹ میں ملبوس کوئی بہت ہی جدید دور کا آدمی تھا جو باپ یوں بیتا تھا کہ چرچل بھی اس سے سبق سیکھ سکتا تھا۔ اس نے ہمیں بڑے تپاک سے خوش آمدید کہا اور پائپ کو

نئے سرے سے آگ دکھا کر بولا۔ "آپ غالباً ڈاکٹر دھمن کا چیک لے کر آئے ہیں؟"

"جی ہاں! آپ نے گیارہ بجے کا وقت دیا تھا، یہ رہا چیک۔" آبی نے ڈاکٹر دھمن کا بریف کیس کھول کر اس میں سے چیک نکالا اور عجمی کے سامنے رکھ دیا۔ وہ بریف کیس کو خالی کر کے ساتھ لے گیا تھا کہ اس میں وہ رقم ڈال سکے۔

عجمی نے چیک لے کر بڑے غور سے دیکھا، اور پھر وہ ایک تیز روشنی کا بلب جلا کر اس کے آر پار دیکھنے لگا۔ ہم دونوں سنبھل کر بیٹھ گئے کیونکہ اس آدمی کے چہرے پر عجیب سا رنگ آ کر گزر گیا تھا۔ چیک میں کوئی غیر معمولی بات تھی۔

"ایکسکیوز می! میں ابھی آتا ہوں رقم آپ کو ہم یہیں دے دیں گے۔" اس نے اٹھتے ہوئے کہا مگر اس کا لہجہ اس کے اندرونی اضطراب کی چغلی کھا رہا تھا۔ جیسے ہی وہ میز کے حلقے میں سے نکل کر ہمارے قریب آیا میں نے اٹھ کر اپنا پستول اس کے سینے سے لگا دیا۔

"باہر جانے کی ضرورت نہیں ہے مسٹر ابوبکر! یاد رکھو یہ بے آواز چلتا ہے۔ ہمیں بتاؤ اس چیک میں کیا خرابی ہے؟"

"یہ ۔۔۔ یہ کیا کر رہے ہیں آپ! چیک تو بالکل جینوئن ہے۔ میں تو رقم لینے جا رہا ہوں۔" وہ ایک دم دہشت زدہ ہو کر دیوار کے ساتھ جا لگا۔ میں نے چیک اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

"تم یہاں بیٹھ جاؤ مسٹر ابوبکر اور رقم یہاں منگواؤ۔ یہ چیک ان کی سیکرٹری کو دے دیں مسٹر پیرزادہ! یہ انٹرکام پر اسے سمجھا دیں گے۔" میں نے چیک آبی کے ہاتھ میں دے دیا۔

"سیکرٹری سے کہو وہ چیک کی رقم یہاں لا دے مسٹر ابوبکر! اگر مسٹر دھمن نے ہم سے کوئی فریب کیا ہے تو وہ بھی بتا دو۔"

وہ روہانسا سا ہو گیا۔ رومال سے اپنا پسینہ پونچھ کر وہ میز سے دور ہو کر صوفے پر بیٹھ گیا اور بڑی ہی مریل سی آواز میں بولا۔ "ٹھیک ہے صاحب! میں آپ کا راستہ نہیں روکوں گا۔" یہ کہہ کر وہ انٹرکام کے قریب گیا اور بولا۔ "سیطے! ان صاحب کو چیک کی رقم دلا دو ان کے ساتھ جاؤ۔" یہ کہہ کر وہ پیچھے ہٹ کر جیب سے سگریٹ نکال کر سلگانے لگا۔

"مجھے بتاؤ مسٹر ابوبکر کہ اس چیک میں کیا گڑبڑ ہے؟"

"آپ کو معلوم نہیں ہو سکتا۔ چیک پر نادیدہ تحریر میں دھمن نے لکھا ہے کہ ہم آپ لوگوں کو پکڑ لیں کیونکہ آپ نے انھیں اغوا کر لیا ہے۔"

"اوہ! تو یہ بات ہے، وہ بدمعاش ہماری رقم بھی نہیں دینا چاہتا۔ اور ہمیں لمبے چکر میں بھی پھنسا دینا چاہتا ہے۔ سمجھ لیں گے ہم اس سے!" میں نے پستول کی نالی کا رخ ابھی تک اس کے سینے کی طرف کر رکھا تھا اور میری آنکھوں میں بھری درندگی کو وہ بخوبی سمجھ رہا تھا۔

"کیا یہ سچ ہے کہ آپ نے اسے اغوا کر لیا ہے ڈاکٹر دھمن کو؟" وہ لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔

"سچ جھوٹ کا تو اس وقت پتہ لگے گا جب اس خنز... کی لاش کسی چوراہے میں پڑی ہو گی۔ ابھی تک تو ہم نے کچھ نہیں... مگر اب ہم اسے معاف نہیں کریں گے۔"

"قصہ کیا ہے۔ یہ رقم کس سلسلے میں لے رہے ہیں آپ ان..."

"ہم نے ایک ہوٹل بیچ دیا ہے اس کے ہاتھ۔ یہ ہوٹل لاہو... میں ہے مال روڈ پر مگر معلوم یہ ہوتا ہے کہ اس کی موت آئی ہے... ہاتھوں سے، آپ کو پتہ ہے کہ اس کے پاس اتنا روپیہ کہاں سے..."

"بہت پریکٹس چلتی ہے ان کی۔ اپنا کلینک ہے ان کا... ایسٹ میں بھی ایک شاخ ہے ان کے کلینک کی۔ مگر ۔۔۔ مگر آپ کے اس رویّے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ کوئی زبردست... ہو رہی ہے۔" عجمی کی زبان اب تیز چلنے لگی تھی اور دہشت کا پہلا... اس نے گزار لیا تھا۔

"شٹ اپ مسٹر ابوبکر! ورنہ تمھاری زبان کاٹ لوں گا۔ ... ہم نے کوئی بے انصافی نہیں کی اور اب اپنا منہ بند رکھو۔" میں نے اس کو... سے پکڑ کر جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔ وہ تو شکر ہے کہ اس کے کمرے کے تینوں طرف موٹی موٹی دیواریں تھیں اور اس کی سیکرٹری کا کیبن ایسے زاویے... تھا کہ سامنے کی لکڑی کی دیوار میں لگے شیشوں کے پردوں کے پیچھے ہم کسی کو نظر نہیں آتے تھے ورنہ میں اس روز ابوبکر پر اتنی آسانی سے قابو نہیں پا سکتا تھا۔ غصہ مجھے اس دھمن پر آ رہا تھا اس نے ہمیں موت مروا دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اگر نیچے بینک کے عملے... کسی نے اس چیک کو روشنی کا غسل دے دیا تو کیا ہو گا۔ یہ ایسی پریشانی تھی جس کا فوری حل مجھے کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ ابوبکر ہانپنے لگا تھا۔ ... کی گرہ میرے جھٹکے سے تنگ ہو گئی تھی اور میری گرفت ابھی تک... پر بہت مضبوط تھی۔ پستول میں نے اب بھی اس پر تان رکھا تھا۔

آبی کوئی بیس منٹ بعد مسکراتا ہوا واپس آ گیا۔ یوں کہ سیطے... اس کے ساتھ تھی۔ مگر جیسے ہی اس نے بدلی ہوئی صورتِ حال دیکھی... فوراً ہی بریف کیس ٹانگوں میں لے کر سیطے کو بالوں سے پکڑ کر... منہ پر سختی سے ہاتھ رکھ دیا۔ دبی آواز میں بولا۔ "یہ کیا ہو گیا ہے بھئی... خیر تو ہے؟"

"رقم مل گئی ہے؟" میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔ سیطے... کو آبی کی گرفت سے چھڑانے کے لیے زبردست جدوجہد کر رہی تھی۔

"ہاں! مگر ہوا کیا ہے؟"

"بعد میں بتاؤں گا تمھیں! یہ ہمیں پکڑوانا چاہتا ہے۔" ... میں نے عجمی کی ٹائی چھوڑ کر اس کی گردن اپنے پنجے میں لی اور اس کی رگِ احساس مسل دی، وہ فوراً ہی صوفے پر گر گیا۔ اس سے فارغ... میں سیطے کو اپنی گرفت میں لے کر پوری قوت سے اس کی گردن کی...

... میرے قدموں میں جھول کر گری تو میں نے ان دونوں کو ... گھسیٹ کر عقبی باتھ روم میں ڈال دیا۔ عین اس وقت عجمی ... میز پر دھرا ٹیلیفون بج اٹھا تو میں نے اس کال کا سلسلہ کاٹ کر ... فوراً ہی الگ رکھ دیا اور پھر کمرے کا گہری نظروں سے جائزہ لے کر ... نے آبی کو اپنے ساتھ لیا اور ہم دونوں بڑے اطمینان سے بینک کی عمارت سے باہر آ گئے۔

جب گاڑی کو ہیں بینک سے کافی دور لے جا چکا تو آبی بولا۔

"یار! کچھ بتا تو سہی کہ ہوا کیا ہے کیوں جھٹکا کر آئے ہو ان کا؟"

"یہ دھمن بہت حرامی شے ہے آبی! اس سالے نے نادیدہ تحریر میں چیک پر یہ لکھ دیا تھا کہ حامل چیک ہذا کو پکڑ لو اس نے مجھے اغوا کر رکھا ہے۔"

"اچھا! یہ کیسے پتہ چلا تجھے؟"

"جب وہ ابوبکر اٹھ کر جانے لگا تھا تو مجھے اسی وقت شک پڑ گیا تھا، کہ چیک میں کوئی گڑبڑ ضرور ہے تم نیچے گئے تو میں نے اس ابوبکر سے زبردستی یہ بات اگلوائی۔ وہ ہمیں گرفتار کروانے کے لیے پولیس کو اطلاع دینے جا رہا تھا۔"

"اچھا! یار کمال ہو گیا۔ ایسی ذلالت دکھائی ہے اس دھمن نے۔ اور ہم اس سالے کو ناشتے اور ڈنر کھلاتے رہے ہیں۔"

"ابھی دیکھ میں کیا حال کرتا ہوں اس کا۔ ایسی سزا دوں گا کہ یاد ہی رکھے گا وہ ساری عمر۔"

"یار! یہ تو اچھا ہوا، تیری عقل کام کر گئی ورنہ تو ہم بے موت ہی مارے گئے تھے۔"

"رقم تو جلدی مل گئی تھی نا تجھے!"

"ہاں وہ 'زن ہیوا' جو میرے ساتھ تھی، اس کی نظرِ شریں کا کرشمہ ہے۔"

"یہ روپیہ تو آج ہی کسی بینک میں رکھ دے آبی۔ تکریم احمد سے کہہ دہ تیرا حساب کھلوا دے گا۔"

"ہاں کوئی اور کام کرنے سے پہلے ہم یہ روپیہ ٹھکانے لگا دیں تو اچھا ہے۔"

"ہاں میرا بھی یہی خیال ہے ہم اسے کہاں ساتھ ساتھ لیے پھریں گے۔ بینک میں روپیہ ڈالنے کے بعد ہم دھمن سے بات کریں گے۔" آبی نے مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

ہم بھاگم بھاگ اس وقت کوٹھی پہنچے۔ تکریم احمد نے گیٹ کھولا تو میں گاڑی میں سے اتر گیا۔

"تکریم بھائی! آپ ابھی ان کے ساتھ جائیں اور کسی بینک میں ان کا حساب کھلوا دیں۔ ایک لمبی رقم ہے پیرزادہ کے پاس، اس کا محفوظ ہو جانا بہت ضروری ہے۔"

"ٹھیک ہے، میں ان کے ساتھ جاتا ہوں آپ اب چارج سنبھال لیں ان آدمیوں کا۔" یہ کہہ کر تکریم احمد آبی کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر اسی وقت باہر نکل گیا۔

میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس کمرے میں جا گھسا جہاں وہ لوگ بندھے پڑے تھے۔ ہماری غیر حاضری میں تکریم احمد نے حفظِ ماتقدم کے طور پر لمبی رسیاں لے کر ان سب کو کچھ اور زیادہ بری طرح جکڑ دیا تھا۔ دھمن، عالیہ، سوات خان اور مگسی آڑے ترچھے ہو کر قالین پر پڑے ہوتے تھے۔

میں نے جاتے ہی دھمن کو بالوں سے پکڑ کر قالین سے اٹھاتے ہوئے دیوار کے ساتھ لگا کر پوری قوت سے بوٹ کی ٹھوکر اس کے کولھے میں ماری "کتے! بول کیا لکھا تھا تو نے اس چیک پر ہمیں گرفتار کروانا چاہتا تھا تو میں تیرا مغز پھاڑ دوں گا۔" یہ کہہ کر میں نے تڑاخ سے ایک تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا۔ وہ سالا اس قدر بندھا بے بس ہونے کے باوجود اپنا ہاتھ دکھا گیا تھا۔

ایک زہریلی مسکراہٹ اس کے لبوں پر ابھری اور بڑے ہی طنز بھرے لہجے میں بولا۔ "اور کیا توقع رکھتے تھے تم مجھ سے۔ میں تمھیں داماد بنا لوں گا اپنا؟ اب وہ تمھارا یار کبھی باہر نہیں آ سکے گا۔ وہ اس سے یہاں کا ٹھکانا بھی معلوم کریں گے اور پھر دیکھوں گا تم کیا کرتے ہو۔"

"ان کے آنے سے پہلے ہی میں تمھیں چھلنی کر دوں گا، دھمن! مت سمجھ کہ تو یہاں سے زندہ واپس چلا جائے گا۔ اس کی خباثت دیکھیں ترمذی صاحب اس نے بڑی چالاکی سے نادیدہ تحریر میں چیک پر لکھ دیا، کہ چیک لانے والے کو پکڑ لو اس نے ہمیں اغوا کر لیا ہے اور اب میرا دوست ان کے شکنجے میں پھنس گیا ہے۔"

"یہ تو بہت ہی برا ہوا ڈاکٹر دھمن یہ بات تو تم نے مجھے بتائی ہی نہ تھی۔ پچھتر لاکھ میں تمھاری رہائی ہوتی تھی تو اسے کیوں گنوا لیا تم نے؟"

"تم اپنی بکواس بند رکھو ترمذی! تمھاری خصلت میں پہچان گیا ہوں کمینے! تو میری دوستی کا دم بھرتا رہتا تھا کیونکہ میں تیرے منہ میں خنزیر ڈالتا رہتا تھا۔" دھمن نے ترمذی کو لتاڑتے ہوئے کہا۔

ترمذی کھلکھلا کر ہنس دیا۔ بولا۔ "اسی بہانے سہی مجھے تمھاری اصلیت تو معلوم ہو گئی سرجن دھمن! اور یہ بھی پتہ چل گیا کہ تم نے کتنے لوگوں کو برباد کر رکھا ہے۔"

عالیہ پھٹی پھٹی نظروں سے ہمیں دیکھ رہی تھی، بولی۔ "کیا وہ تمھارا دوست پکڑا گیا ہے؟"

"ہاں! اور اب میں تم سب لوگوں کو گولی مار کر یہاں سے بھاگ نکلنے ہی میں اپنی عافیت سمجھتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے جان بوجھ کر دھمن کے سر کا نشانہ لے کر ہاتھ ذرا اوپر اٹھاتے ہوئے گولی چلا دی۔ "ٹھک" ایسی آواز پیدا ہوئی۔ دھمن پاگل ہو کر فرش سے جا لگا۔ سب کے سب دہل کر رہ گئے۔

عالیہ تڑپ کر گھسٹتی ہوئی دھمن کے پاس جا پہنچی مگر جب اُس نے دیکھا کہ گولی اسے نہیں لگی تو وہ بُری طرح بلکنے لگی۔ "تم نے یہ کیا کر دیا دھمن! کیوں وہ لفظ لکھے تھے تم نے چیک پر؟ یہ بہت گھٹیا لوگ ہیں یہ تینوں۔"

"ابھی ہمارا گھٹیا پن تم نے دیکھا ہی کہاں ذلیل عورت! ابھی تو تُو بہت کچھ دیکھے گی اور یہ تیرے چچے بھی۔" یہ کہہ کر میں نے اُن سب پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی۔ وہ سب کے سب صحیح طریقے سے بندھے تھے۔ میں اُن کو اس حالت میں چھوڑ کر دُوسرے کمرے میں جا بیٹھا۔ اب فکر کی کوئی بات نہیں تھی۔ ہمیں خدا نے اس روز ایک بڑی مصیبت سے بچا لیا تھا اور مجھے یقین تھا کہ خدا بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ لوگ ہمارے ہی ہاتھوں کیفرِ کردار کو پہنچیں۔ اُن کی قبر وہ ہمارے ہی ہاتھوں سے کھُدوانا چاہتا تھا۔ وہ مسبب الاسباب، وہ مختارِ کُل۔

آبی دو بجے واپس آیا وہ بہت خوش تھا۔ اتنی بڑی رقم پہلی پہلی بار کسی بینک میں اس کے نام سے جمع ہُوئی تھی۔ وہ قیدیوں کے کمرے میں جھانک کر میرے پاس آ گیا۔ تکریم احمد اس کے ساتھ تھا۔ آتے ہی بولا۔

"بم وارڈ کے باسی ٹھیک ہی لگتے ہیں۔" وہ بڑی بے فکری سے سگریٹ پی رہا تھا۔ کلّے میں اُس نے بھی پان دبا رکھا تھا، اور تکریم احمد نے بھی۔

"تُو کیا کر کے آیا ہے پیارے یہ بتا۔ اِن گردہ فروشوں سے تو میں نپٹ ہی سکتا ہوں۔"

"یہ دیکھ! سیّد غلام محمد مُرسل پیرزادہ کے نام سے اس بینک میں 'خلاص' رقم جمع ہو چکی ہے۔"

"یہ 'خلاص' کیا ہوتی ہے؟"

"خالص ----- ایک دم دن زیرو ون پرسنٹ خالص حلال اور نیک کمائی کی رقم۔"

"ابے تیرے ہوش ٹھکانے ہیں۔ یہ حلال کمائی کیسے ہو گئی؟ تو بھی پیارے سیدھا ان کے ساتھ دوزخ میں جائے گا۔"

"مجھے ڈرامت یار! میرا دل ویسے ہی بہت نازک ہے۔ اس معاملے میں، عاقبت کے ڈر سے تو جلدی مرنا نہیں چاہتا۔"

"کسی نہ کسی دن تو خیر تجھے مرنا ہی پڑے گا بہرحال مبارک ہو اب تو لکھ پتی تو ہو ہی چکا ہے۔"

"اور اب وہ میری لکھ پتنی بھی زیادہ دُور نہیں۔ مجھے انٹروڈیوس تکریم صاحب نے کرایا، اِن کا بھی وہاں حساب ہے۔ اور اس میں دو سو چالیس روپے جمع ہیں۔ میں نے تیری رقم میں سے بیس ہزار رُوپے اُس میں ڈال دیے۔"

"یہ اچھا کیا تُو نے۔ اے خانہ بر انداز چمن کچھ تو ادھر بھی۔"

"میں تو انھیں روک رہا تھا مگر یہ بھائی صاحب ... حاتم طائی ہی بن گئے۔" تکریم احمد نے یوں کہا جیسے وہ بات ... نہ آئی ہو۔

"آپ کے کام آئیں گے وہ پیسے بھائی جی! ہمارا تو ... سلسلہ ہے پتہ نہیں کہاں ہمیں واپسی کا ٹکٹ مل جائے۔ کون سی گولی ہمیں کہاں لگ جائے۔ یہ دُنیا تو آپ جیسے دنیا داروں کے لیے ہے۔"

"ہاں پیر سائیں یہ ٹھیک کہا آپ نے۔ تکریم بھائی کچھ پیٹ پُوجا کا بندوبست کرو بنام خدا بنام سرمایہ داران کراچی۔"

"یا بنام گردہ فروشان لاہور و کراچی۔" میں نے اس فقرے میں قدرے اضافہ کر دیا۔

تکریم احمد ہنستا ہُوا اٹھا اور باورچی خانے میں جا گھسا۔ وہ کسی تنور سے چالیس روٹیاں اٹھوا لایا تھا۔ سالن اور سلاد کا بندوبست اس نے خود کر رکھا تھا۔ اس روز ہم تینوں نے الگ بیٹھ کر کھانا کھایا اور پھر ان کے لیے میں نے آبی اور تکریم کے ذریعے دُوسرے کمرے میں بھجوا دیا۔ ہم سب کھانے سے فارغ ہُوئے تو میں نے آبی سے کہا کہ وہ عالیہ کو بلوا لائے۔ وہ گیا اور اسے بانہوں میں بھر کر میرے کمرے میں اٹھا لایا۔ وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی اور اسے یقین تھا کہ ہم پر اس وقت شیطان سوار ہے۔

فوم کے بیڈ پر آبی نے دھم سے گرایا تو وہ چیخنے لگی، بولی۔ "جیلانی! اگر تم نے میرے ساتھ کوئی زیادتی کی تو اچھا نہیں ہوگا۔ اپنی عزت پر جان قربان کر دُوں گی۔"

"ایسی ستی ساوتری نہیں ہے تو عالیہ بیگم! بہرحال بے فکر رہو۔ میں نے تجھے اس لیے نہیں بلوایا ہے ہم اتنے نیچ نہیں ہیں۔ ہمارے بھی کچھ اصُول ہیں۔ اگر ہم ایسے ہوتے تو اب تک یہ دُنیا ہمیں کھا گئی ہوتی اور ہم کبھی بھی اپنے دشمنوں سے نپٹ نہ سکتے۔"

وہ ٹک ٹک میرا چہرہ تکتی رہی۔

آبی نے دو سگریٹ سلگا لیے جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اس وقت بہت ہی اچھے موڈ میں تھا۔ ایک سگریٹ اس نے پھر مجھے لب آلود کر کے دے دیا، بولا۔ "اس کو ابھی تک وہم ہے کہ یہ خوبصورت ہے اور ہم اس کو مُنہ بھی لگا سکتے ہیں۔"

یہ بات اُس نے اپنے اصل خیالات کے بالکل برعکس کی۔ اور میں جانتا تھا کہ وہ عالیہ کو عمداً اشتعال دلا رہا تھا۔

"چپ رہو یار! یہ عورت جو اتنا اونچا اُڑ سکتی ہے ہو سکتا ہے اپنی جگہ سچی ہو۔ اس کی پاکدامنی پر ہم شبہ نہیں کر سکتے۔ سکتا ہے اس کے کھانے کے دانت اور ہوں دکھانے کے اور۔"

"ہاں! یہ ٹھیک کہا تم نے کہ ہمیں کوا کب کچھ نظر آتے ...

"بھئی میرا اپنا خیال یہ ہے کہ ہر بنی سنوری عورت قحبہ نہیں ہوتی۔"

"آپ کے اس فلسفے کا شکریہ جناب! ذرا بیٹھیں میں عالیہ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔"

"اوہ گڈ! یعنی انویسٹی گیشن یعنی انٹیروگیشن۔ آبی لائیک اٹ۔ ... حاضر ہے مائی لارڈ۔" یہ کہہ کر وہ میرے قریب ہی بیٹھ گیا۔ تکریم احمد اس سے اگلی کرسی پر بیٹھا تھا۔

"مجھے یہ بتاؤ عالیہ کہ وہ وردہ کہاں ہے، ڈاکٹر عرفان کی بیوی۔ اسے تم خود تھانے سے لائی تھیں۔"

"وہ ہمارے منیجر قربان علی کے گھر میں ہے۔"

"اور قربان علی کہاں ہے؟"

"وہ جدّہ میں ہے تین ماہ بعد آئے گا۔"

"اور جدّہ میں آپ کے کلینک کا کیا نام ہے؟"

اس نے مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا مگر جواب دینے میں بُخل نہیں کیا۔ بولی۔ "وہاں بھی ہمارے کلینک کا نام شفا بار کلینک ہی ہے۔"

"گڈ! مجھے بتائیں کہ وردہ نے پولیس میں جو اپنی خالہ کے بارے میں رپورٹ درج کرائی کہ اسے گاڑی میں بیروں نے قتل کر دیا تھا۔ اس کا کیا بنا؟"

"پولیس نے ملزموں کو پکڑ لیا تھا۔ ابھی وہ مقدمہ عدالت میں پیش نہیں کر سکے۔"

"یہ وردہ کس خاندان سے تعلق رکھتی ہے؟"

"وہ لاہور کے ایک بہت ہی غریب خاندان کی بیٹی ہے۔ عرفان کو بس وہ ایسے ہی ایک دن ہسپتال میں پسند آ گئی تھی۔ اس نے اٹھا کر اس سے شادی ہی کر لی۔"

"کیا عرفان کے پاس بھی بہت بڑا بینک بیلنس تھا؟"

"ضرور ہوگا اور اس کا بہت بڑا حصّہ وردہ کو مل بھی چکا ہے مگر ابھی وراثت کے کاغذات مکمل نہیں ہو سکے۔ اس لیے وہ رقم ابھی تک بینک میں پڑی ہے اس سلسلے میں ہم نے اس کی ہر طرح مدد بھی کی ہے۔"

"اچھا یہ بتاؤ کہ اس وقت ڈاکٹر دھمن کے حساب میں مختلف بینکوں میں کتنا روپیہ ہے؟"

اس نے مجھے تین بینکوں کے بارے میں بتایا کہ ان میں دھمن کا حساب چلتا ہے اور اس کا اپنا خیال یہ تھا کہ کُل رقم ساڑھے چار کروڑ بنتی ہے۔

"ساڑھے چار کروڑ! اور بچہ تم دونوں کا کوئی بھی نہیں۔"

"نہیں! یہ ہماری بدنصیبی ہے۔"

"بدنصیبی تو نہیں بلکہ اس دنیا کی خوش نصیبی ہے کہ تم دونوں کی نسل نہیں چل سکی ہے، قدرت کو بھی افسوس ہوگا کہ اس کے ہاتھوں کیسے زہریلے بچھو ایسے انسان پرورش پا گئے۔"

وہ میری یہ بات سن کر چپ رہی، کچھ نہیں بولی۔

"میری بات غور سے سنو عالیہ بیگم! اگر تم سب اپنی رہائی چاہتے ہو تو دو کام کرو۔ پہلا تو یہ کہ وہ تمام روپیہ اپنے مفصل اعتراف کے ساتھ حکومت کے حوالے کر دو تاکہ وہ اُن تمام بدنصیبوں میں تقسیم کیا جا سکے جو تمھارے ظلم کا شکار ہوئے ہیں۔"

"یہ افلاطونیت کی یوٹوپیا کی اور خواب دیکھنے کی باتیں مت کرو جیلانی! یہ کبھی نہیں ہوگا۔"

"تو یوں کرتے ہیں ہم کہ تمھارے اور ڈاکٹر دھمن کے ہاتھ میں ڈاکٹر ترمذی کے ہاتھوں سے کٹوا دیتا ہوں، وہ بھی بہت ماہر سرجن ہے۔ پھر تم زندگی بھر اطمینان سے عیش کرتے رہو۔"

"یہ تم کر نہ سکو گے جیلانی! مجھے معلوم ہے تم ہم سے کھیل رہے ہو بالکل کھیل رہے ہو۔ ہمیں جو گولی تم کل مارنا چاہتے ہو آج مار دو۔ یہ تمھاری مہربانی ہوگی۔ میں اور دھمن ذہنی طور پر اس کے لیے تیار ہو چکے ہیں۔"

"یہ کیسے سوچ لیا تم نے؟ ہم تمھیں پولیس کے حوالے کریں گے تو تم ایک دُنیا کے لیے عبرت کا سامان بن جاؤ گے۔"

"یہ سب کہنے کی باتیں ہیں بہرحال میرا مغز مت چاٹو یُو ڈرٹی ڈاگ۔ مجھے ڈاکٹر دھمن کے پاس پہنچا دو۔ اینف آف یُور رمن اینڈ شٹ اپ۔"

آبی کھلکھلا کر ہنس دیا، بولا۔ "ہے نا انگلش میڈیم کی پڑھی ہوئی۔ ایک دم خوبصورت انگریزی بولتی ہے بیگم ٹروڈو کی طرح جو اپنے حسن پر چوہڑی سے بھی متکبّر ہے۔"

اس کی یہ بات سُن کر میں بھی ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔ کبھی کبھی آبی واقعی بہت پتے کی بات کہہ جاتا تھا۔

"ٹھیک ہے مس ڈیوڈ بھٹّاں کی اولاد، اس کو ادھر اس کے پنجرے میں ڈال دو کھائی! اسے یہی وہم ہے کہ اس پر ہماری نیت خراب ہے۔" یہ کہہ کر میں کمرے سے اُٹھ گیا۔ وہ دوسرے کمرے میں منتقل ہُوئی تو ہم تینوں پنکھے کے نیچے پھیل کر لیٹ گئے۔

کوئی دو گھنٹے بعد اچانک ہمیں دُوسرے کمرے سے کسی کی بھیانک چیخوں کی آواز سُنائی دی۔ میں اور آبی بھاگ کر وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ڈاکٹر دھمن بُری طرح بلک رہا تھا۔

"کیا ہوا ہے تمھیں؟ دہائی کیوں مچا رہے ہو؟"

"میری کمر میں سخت درد ہے۔ وہ میرا فرسٹ ایڈ کا بکس ادھر لاؤ، اور میری کمر پر دوا مل دو۔"

"جا یار وہ بکس اٹھا لا ادھر۔ میں سمجھا اس کی ماں مر گئی ہے۔" میں نے

سخت بدمزہ ہو کر کہا۔ حیرت مجھے یہ تھی کہ ڈاکٹر ترمذی اُن لوگوں کے ساتھ بڑے صبر و استقلال سے وہ اذیت سہہ رہا تھا جو اس کا حصّہ ہرگز نہیں تھی۔ اور اس روز وہ دفتر بھی نہ جا سکا تھا نہ اس نے وہاں کوئی اطلاع ہی بھیجی تھی۔

آبی نے وہ فرسٹ ایڈ بکس لے جا کر دھمن کے سامنے رکھ دیا۔ اسے دیکھ کر وہ بولا۔ "یہ دوا میری کمر پر مل دو عالیہ اور یہ گولیاں بھی مجھے دے دو، ورنہ زخم میں پیپ بھر جائے گی۔"

آبی نے عالیہ کا ایک ہاتھ کھول دیا۔ وہ گھسٹ کر آگے بڑھی اور ڈاکٹر کی کمر پر سے کپڑا اٹھا کر دوا ملنے لگی۔ پھر اس نے بکس میں سے کئی قسم کی بیس کے قریب گولیاں الگ کر لیں بولی۔ "یہ ان کو چار چار کرکے کھانی ہوں گی۔"

ہم نے کوئی اعتراض نہیں کیا، آبی بولا۔ "یار! یہ بکس ان کے پاس ہی رکھ دو، اپنا علاج یہ خود کرتے رہیں گے ڈاکٹر لوگ ہیں کیوں ترمذی صاحب!"

"آپ کی مہربانی ہو گی جناب اگر آپ ہمیں ہر چار گھنٹے بعد غسل خانے میں جانے کی اجازت دے دیں۔ میں ذیابیطس کا مریض ہوں اور سخت اذیت میں ہوں۔"

"آپ سے ہم بہت شرمندہ ہیں ڈاکٹر صاحب آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔" یہ کہہ کر آبی نے ایک دم ترمذی صاحب کے سارے جکڑ بند کھول دیئے بولا۔ "میری طرف سے اجازت ہے آپ صحتیاب ہو چکے ہیں میں آپ کو ابھی ڈسچارج کرتا ہوں۔"

"بیٹھ اوئے ڈسچارج کے پتر! ہم یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ مجھے افسوس ہے ترمذی صاحب مگر مجبوری ہے آپ غسلخانے سے ہو آئیں، میں آپ کو الگ کمرے میں بٹھا دیتا ہوں۔ وہاں آپ کی ضرورت کی ہر شے موجود ہو گی۔"

ایک ایک کرکے ہم نے ان کو بڑی احتیاط سے غسل خانے کی راہ سے گزارا اور پھر ترمذی کو میں نے کوٹھی کے تنگ سے سٹور نما کمرے میں منتقل کر دیا۔ وہاں بھی ملحقہ غسل خانہ موجود تھا اور ایک بیڈ وہاں ایسا بچھا تھا جو ایک آدمی کی بخوبی کفالت کر سکتا۔ وہ خدا کا بندہ اپنے گناہوں کی سزا کے طور پر اس اسیری کو الحمدللہ کہہ کر قبول کرتا جا رہا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس سے کوئی ایسی ہی غلطی سرزد ہوئی ہے جس کی سزا اسے یوں مل رہی ہے ورنہ وہ کہتا تھا کہ زندگی بھر نہ تو کبھی اس کا ایک آنے کا نقصان ہوا تھا اور نہ ہی اس پر کبھی کوئی بیماری حاوی ہو سکی تھی۔ پچھلے چھ ماہ سے البتہ وہ ذیابیطس کے مرض میں مبتلا تھا اور وہ بھی اس کے کسی گناہ کی سزا ہی تھی، جو اسے مل رہی تھی۔ وہ ہر قسم کی صورتِ حال میں اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دے لیتا تھا کہ یہ سب کچھ اس کے اپنے ہی اعمال کا نتیجہ ہے اور خدا اسے فوراً ہی گرفت میں لے لیتا ہے۔ وہ بھی کہتا تھا اس کا خیال تھا کہ پچھلے کئی مہینوں سے وہ جو عالیہ کے چکر میں پھنس کر شراب بھی پینے لگا تھا تو یہ اس کا ہی پھل تھا کہ وہ بھی اُن کے ساتھ پس رہا تھا۔ شام کے کھانے کے بعد ڈاکٹر دھمن نے اپنا بریف کیس ہم سے طلب کیا۔ آبی نے تمام چیزیں دوبارہ اس میں بھر کر اس کے حوالے کر دیا۔ تو وہ بولا۔ "میں کچھ لکھنا چاہتا ہوں میرا یہ ہاتھ کھول دو۔"

اُس کی یہ آرزو بھی ہم نے پوری کر دی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اپنے بارے میں جو باتیں ٹیپ پر نہیں کہنا چاہتا تھا لکھ کر اعتراف کے طور پر ہمارے حوالے کر دے گا۔ جب اس کا ایک ہاتھ کھل گیا تو وہ بولا۔ "بہتر یہ ہو گا کہ آپ مجھے اور عالیہ کو کسی الگ کمرے میں اپنی مرضی کے مطابق بند کرکے چھوڑ دیں مگر ہمارے ہاتھ پاؤں کھول دیں یہ اذیت ہمارے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔"

آبی نے سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھا تو میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے ہم تمہیں پہلو کے کمرے میں ڈال دیتے ہیں۔"

میری یہ بات سن کر آبی اور تکریم احمد نے مل کر ان دونوں کو الگ کمرے میں پہنچا دیا۔ اُن کا فرسٹ ایڈ کا بکس اور بریف کیس بھی ہم نے انھیں دے دیا۔ اب صرف سوات خان اور مگسی باہر رہ گئے تھے۔ مگسی کی ٹانگ اتنی خراب تھی کہ وہ چل نہیں سکتا تھا۔

"اِن کے بھی ہاتھ پاؤں کھول دو، یہ بند کمرے سے باہر نہیں نکل سکیں گے۔ کل تک ان کے بارے میں ہم کوئی قطعی فیصلہ کر لیں گے" یہ کہہ کر آبی اُن کو کھولنے لگا۔ میں نے پستول اُن پر احتیاطاً تان لیا مگر وہ تو شاید بالکل ہی نیست و نابود ہو چکے تھے۔ انھیں یاد بھی نہیں تھا کہ ان کے وجود میں کوئی ڈنک بھی تھا۔

"مجھے یہ دن کبھی نہیں بھولیں گے جیلانی بھائی۔" سوات خان نے پہلی بار بڑے ہی بھیگے ہوئے لہجے میں کہا۔ وہ اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا جن پر رسّی کے نشان رہ گئے تھے۔

"بک نہیں اوئے! میں تیرا بھائی نہیں ہوں، تجھے یاد ہے تو نے میری بہن کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔ یہ دن یاد رکھنے کے لیے تیرے پاس اب زیادہ دن نہیں رہ گئے ہیں۔ اسے بند کر دے یار اس جانور کو، مجھے اس کی صورت سے نفرت ہے۔" یہ کہہ کر میں نے آبی کو ساتھ لیا اور پستول کی نالی کا رُخ اس کی طرف رکھ کر کمرے کے دونوں دروازے باہر سے مقفل کر دیے۔

اس رات میں اور آبی برآمدے میں سوئے۔ ان لوگوں کے بارے میں اس رات ہمیں زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ پنکھا برآمدے کی چھت سے لٹک رہا تھا۔ ایک نہیں بلکہ تین۔ جو دس دس فٹ کے فاصلے پر ٹنگے تھے۔ وہ ہم نے تینوں چلا دیے۔ برآمدے کے ستونوں کے ساتھ بلکی گرل اور مچھر جالی لگی تھی۔ اس لیے ہم بہت ہی آرام سے الگ الگ چارپائیوں پر

لیٹے رہے۔ تکریم احمد دس بجے ہم سے رخصت ہو کر فردوس بیگم کے ہاں واپس چلا گیا۔

دن بھر کی ذہنی کشمکش اور بھاگ دوڑ نے ہمیں اتنا تھکا دیا تھا کہ ہم بستروں پر پڑتے ہی سو گئے۔ صبح جب میری آنکھ کھلی تو ابھی اندھیرا ہی تھا اور شہر کی مختلف سمتوں سے سائرن کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے آبی کو جھنجھوڑ کر جگا دیا۔

"یار! اٹھ یہ دیکھ یہ سائرن کیسے بج رہے ہیں؟"

"تو مسلمان ہو تو تجھے پتہ بھی چلے آج رمضان کی پہلی تاریخ ہے گوگے پیر! کل مجھے تکریم احمد نے بتایا تھا کہ رمضان کل سے شروع ہو جائے گا۔"

"اوئے بیڑہ غرق! ہم تو بڑی آزمائش میں پڑ گئے یار۔ شہر میں تو دن کو نہ سگریٹ ملے گا نہ پانی۔ سنا ہے شیطان بھی قید کر دیا جاتا ہے اس مہینے میں۔" میں نے سراسیمہ ہو کر کہا۔ وہ خبر میرے لیے واقعی پریشانی کا باعث بن گئی کیونکہ ہم تو ننگِ وطن لوگ تھے۔ وطن سے کوسوں دُور اور دنیا میں ہر جگہ ذلیل و خوار۔ میں اندیشے سے لرز کر رہ گیا۔ کیونکہ وہ... وہ مقاصد جن کے لیے وہ مہینہ آتا ہے وہ تو ہم دوبارہ جنم لے کر بھی پورے نہ کر سکتے تھے۔

آبی ہنس دیا۔ بولا۔ "فکر نہ کر تیرے جیسے تلنگے بھی یہ مہینہ گزار ہی لیں گے۔ چل گوگو۔ دیکھ یہ ہم وار ڈیے کیا کر رہے ہیں۔ دھمن کے کمرے کی بتی ابھی تک جل رہی ہے۔" یہ کہہ کر وہ بستر سے اٹھ گیا۔ بدن کو دائیں بائیں جھٹک کر اس نے اپنی کسلمندی دُور کی اور بولا۔ "یار! میں کچھ کمزور تو نہیں ہو گیا۔ بدن تا نرم پڑ گیا ہے شاید۔"

وہ اپنے ڈنٹر ماپنے لگا۔ اسے اپنی صحت کے بارے میں پہلی بار میں نے فکرمند دیکھا تھا۔ اس کے بازو کی مچھلیاں کچھ واقعی نرم پڑ گئی تھیں۔ اسے میں نے بے آرام بھی تو بہت کیا تھا۔ ان گنت راتیں ہم دونوں نے سولی ایسی اذیت میں گزار دی تھیں۔ اُس کے وجود کا وہ گنج شایگاں واقعی لٹتا جا رہا تھا۔ مگر اس کو اور زیادہ فکر میں گھلا ہوا میں دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے بھی بستر چھوڑ دیا۔ وہ اب اپنے بائیں بازو کا معائنہ کر رہا تھا۔

"ابے گوگے! یہ تجھے کیا سوجھ رہی ہے۔ اچھا بھلا پہلوان ہو رہا ہے تو، تیرے وجود میں کوئی کمی نہیں آئی بس ذرا اسمارٹ ہو گیا ہے تو۔"

"نہیں یار! مجھے کمزوری سی محسوس ہونے لگی ہے۔ اب میں ورزش آج سے ڈبل کر دوں گا۔ تیرا تو کوئی فیوچر ہی نہیں ہے پر مجھے تو الماس کے سامنے جوابدہی کرنی پڑے گی اور وہ پوچھے گی کہ کہاں گزاری آئی رات دے، تو میں اُسے کیا جواب دوں گا۔"

"وہاں بھی میں تیری مدد کو حاضر ہوں آبی۔ تو خواہ مخواہ ہی فکر کر رہا ہے یار! آخر میں کس دن تیرے کام آؤں گا۔" میں نے اپنا حلیہ درست کرتے ہوئے کہا۔

وہ تلملا سا گیا، بولا۔ "تجھے تو میں اس کی ہوا ہی نہیں لگنے دوں گا جیلانی! تو آدمی ہے بدنیت اور وہ مادولت کے نام رجسٹر ہو چکی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے پستول کھول کر اس کی گولیاں گنیں۔ میں نے بھی اپنا پستول سیدھے ہاتھ میں لے لیا۔ پستول کا معائنہ کرنے کے بعد آبی بولا۔ "یار! یہ کیسے بے دین لوگ ہیں سحری کے لیے بھی نہیں اٹھے۔ ان کو جگا کر پانی سے روزہ رکھوا دے۔ آدمی کو دین کے معاملے میں ذرّہ بھر رعایت نہیں کرنی چاہیے۔" یہ کہہ کر وہ ڈاکٹر ترمذی کے کمرے کا تالا کھول کر اندر جا گھسا مگر اس کی ایک دم چیخ نکل گئی، بولا۔ "اوئے جیلانی بیڑہ غرق! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔"

میں بھاگ کر اس کے پاس جا پہنچا۔ آبی کا تحیّر دیدنی تھا۔ ڈاکٹر ترمذی کا کمرے میں نشان تک باقی نہیں تھا۔ ہم بھاگ کر غسل خانے میں جا گھسے تو یہ دیکھ کر ہم دونوں کا خون جمنے لگا کہ غسل خانے کی جالی ٹوٹی پڑی تھی اور ڈاکٹر ترمذی اس راستے سے باہر جا چکا تھا۔

"یار! یہ کیا ہو گیا۔ جیلانی! تیری مافت لے ڈوبی ہے۔ اور وہ بیگم ذیابیطس کا پتر بھاگ نکلا۔" یہ کہتے ہوئے آبی پاگلوں کی طرح ڈاکٹر دھمن کے کمرے کی طرف لپکا۔ اس کے تالے پر جو ہم نے ہاتھ ڈالا تو یہ معلوم ہوا کہ وہ بس ایسے ہی وہاں اڑا دیا گیا ہے ورنہ وہ کھلا ہوا تھا۔ مگر جب ہم کمرے میں داخل ہوئے تو یہ دیکھ کر ہماری جان میں جان آئی کہ ڈاکٹر دھمن اور عالیہ گہری نیند میں تھے۔ اُن کو ہم نے آواز دے کر جگانا چاہا تو ہمیں یہ احساس ہوا کہ وہ دونوں نیند میں نہیں بلکہ بے ہوش پڑے تھے۔ اور ان کا وہ فرسٹ ایڈ کا بکس اُن کے قریب رکھا تھا۔

"یہ تو بے ہوش نظر آتے ہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ ان لوگوں نے کوئی دوا کھا رکھی ہے۔ اگر یہ ہوش میں ہوتے تو ڈاکٹر ترمذی انہیں ضرور ساتھ لے جاتا۔ یہ دیکھو اس کے قدموں کے نشان۔ وہ اندر ضرور آیا ہے۔" میں نے صورتِ حال کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے پر وہ بدمعاش تالا کیسے کھول سکا؟ وہ لوہار تو نہیں تھا۔"

"میرا خیال ہے کہ اس تالے میں کوئی نقص ہے۔" میں نے تالے کو چابی لگا کر بند کرکے جب اس کا کنڈا کھینچا تو وہ جھٹکے سے کھل گیا۔

"یار! یہ تالا بھی انھی کا ساتھ دے رہا تھا، اُن کو دیکھ — اُن بدمعاشوں کو۔" یہ کہہ کر آبی سوات خان کے کمرے کی طرف لپکا۔ اُن کے دروازے پر تالا مضبوطی سے جما تھا۔ اسے کھول کر ہم اندر آ گئے تو دیکھا کہ وہ دونوں جاگ چکے تھے ہمیں دیکھتے ہی وہ اُٹھ بیٹھے۔ مگر

آبی نے مجھے پیچھے کھینچ لیا۔
"پڑے رہو۔ ابھی تمہارے جھٹکے کا وقت نہیں آیا، لیٹ جاؤ۔"
آبی نے اپنے لہجے کو کرخت بناتے ہوئے کہا۔ وہ ششدر سے ہو کر ہمیں یوں دیکھ رہے تھے جیسے پُوچھ رہے ہوں کہ اُن کا وقت کب آئے گا۔ کب ہم اُن کی گردنوں پر چھُری پھیریں گے۔ آبی مجھے اپنے ساتھ لے کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ اور دروازے کو مقفّل کر کے بولا "یار! یہ تو بہت ہی بُرا ہُوا، وہ سالا تو اب تک پتہ نہیں کیا کر چکا ہو گا۔"
"میرا خیال ہے کہ اُسے یہاں سے نکلے ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری ہے ورنہ وہ اب تک ہمارا تیا پانچا کر چکا ہوتا۔"
"ہاں، مجھے بھی یہی نظر آتا ہے۔ میرا خیال ہے اِن کو گاڑی میں ڈال کر فوراً یہاں سے نکل چل۔ یہ جگہ محفوظ نہیں رہی ہے۔"
"بہت تیز آدمی تھا وہ ترمذی۔ ورنہ میں تو اسے بہت شریف سمجھتا تھا۔" آبی نے بدمزہ ہو کر کہا۔ "کیسا بگلا بھگت بنا رہا وہ چوڑھا۔"
"چل اُن دونوں کو گاڑی میں ڈالتے ہیں، اُدھر فلیٹ پر لے چل رکھیں۔" میں نے اپنی چیزیں سمیٹتے ہوئے کہا۔
مگر ابھی ہم ڈاکٹر دھمن کا کمرہ کھول ہی رہے تھے کہ ہمیں باہر کسی گاڑی کی آواز سُنائی دی۔ آبی نرغے میں آئے وحشی کی طرح اُچھل کر برآمدے کی طرف لپکا اور آہنی جالی میں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "اوئے یہ تو پولیس کی جیپ ہے جیلانی! خدا ہی خیر کرے۔"
یہ کہہ کر وہ مجھے کھینچتا ہُوا کوٹھی کے عقبی حصے میں لے گیا۔ جیپ کوٹھی کے کھُلے دروازے میں سے گزر کر ابھی رُک ہی رہی تھی کہ ہم عقبی دیوار کے پیچھے پھاند کر کوٹھی سے نکل بھاگے۔ ہمارا شکار ہم سے چھِن گیا تھا۔ عقبی دیوار کے پیچھے کوئی عمارت نہیں تھی اور اب ہم کھُلے میدان میں پاگلوں کی طرح بھاگتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ میرے بائیں ہاتھ میں بریف کیس تھا اور دائیں ہاتھ میں پستول۔ آبی اُس ترمذی کو موٹی موٹی گالیاں دے رہا تھا۔ مگر ابھی ہم سو گز بھی آگے نہیں نکلے تھے کہ پیچھے سے ہم پر گولیوں کی بوچھاڑ آ پڑی۔ ہم فوراً ہی زمین پر لیٹ گئے اور پھر آگے کی طرف رینگنے لگے۔ ابھی پَو پھٹ رہی تھی۔ اندھیرے پر ابھی اجالا غالب نہیں آ سکا تھا۔ گولیوں کی دو بوچھاڑیں ہم نے اپنے اوپر سے گزار لیں تو عین اس وقت ہمیں پیچھے سے کسی گاڑی کی شاں شاں سُنائی دی۔
آبی کے حوصلے کی میں داد دیتا ہوں، وہ اُٹھا اور مجھے پکارتا ہُوا اس بلاخیز رفتار سے میرے آگے بھاگا کہ میرے لیے اس کا ساتھ دینا مشکل ہو گیا۔ مگر وہ بلاخیز دوڑ ہمارے کام آ گئی۔ سامنے ہی ایک پتلی سی سڑک تھی اور اُس پر سے ایک ٹیکسی گزر رہی تھی جب ہم سڑک پر پہنچے تو ہمارے عقب میں آنے والی گاڑی بھی ہم سے زیادہ دور نہیں تھی مگر ٹیکسی ہمارے سامنے آ رُکی۔ ڈرائیور سواری کی تلاش میں تھا ہم نے پاگلوں کی طرح اس کا دروازہ کھولا اور اگلی پچھلی نشستوں پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اسپیڈ ذرا تیز کر پیارے! ہمیں بہت جلدی ہے۔"
ڈرائیور صورتِ حال سے قطعاً بے خبر تھا لیکن پھر بھی اس نے رفتار تیز کر دی۔ عین اسی وقت آبی نے جیب سے سو سو کے نوٹ اس کے سامنے کر دیئے، بولا۔ "رُکنا نہیں ہے اُستاد! بس ہوا بنا دے اس گاڑی کو۔ یہ تیرا انعام ہو گا۔"
"خیر تو ہے باؤ جی! کوئی پیچھے لگا ہے آپ کے؟ ایسی جلدی تو کالے دھندے والوں کو بھی نہیں ہوتی۔"
"بس اب ٹھڈے اپنی اس گدھا گاڑی کو، سوال مت پوچھ!"
عین اس وقت کوئی گولی سرسراتی ہوئی گاڑی کے نیچے گزر کر دائیں ہاتھ کے پچھلے پہیے کو لگی۔ بڑی زوردار آواز پیدا ہوئی مگر گاڑی کی رفتار میں کوئی کمی نہیں آئی۔ پولیس کی گاڑی ہُوتی ہمارے قریب پہنچ رہی تھی اور ڈرائیور دو دلا ہونے لگا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں صاف نظر آ تی تھیں۔ اس نے گاڑی کی رفتار میں بھی کمی کر دی۔
اِس صورتِ حال سے عاجز آ کر آبی نے اسے بڑی بُری قسم کی گالی دیتے ہوئے اس سے اسٹیرنگ چھین لیا۔ اور اُسے چلتی گاڑی میں سے پشت پر سے دھکیل کر دروازے کے ساتھ لگا دیا۔ "خاموش بیٹھا رہ بھیا! ورنہ تیرا بھی مغز کھول دیں گے وہ۔ بارات لے کر پیچھے آ رہے ہیں۔"
ڈرائیور سکڑ سمٹ کر دروازے کے ساتھ لگ گیا۔
عقب میں آنے والی پولیس کی گاڑی ہمارے اوپر چڑھی آتی تھی۔ آبی نے یوں کیا کہ دائیں ہاتھ ذرا سی خالی جگہ دیکھ کر گاڑی کو اتنی تیزی سے گھما کر ایک چھ منزلہ عمارت کے سامنے سے گزارا۔ وہاں سے عام حالات میں دن کے وقت شاید جنازہ بھی نہ گزر سکتا تھا۔ ٹیکسی کے مقابلے میں پولیس کی گاڑی خاصی بڑی تھی اس کے لیے اس تنگ سی گلی میں گزر جانا کسی بھی طرح ممکن نہ تھا۔ پولیس کی ذرا سی مُہلت ہمارے کام آ گئی۔ اُجالا دم بدم بڑھتا جا رہا تھا۔ چھ منزلہ عمارت کے سامنے سے گزر کر ہم اب ایک بڑی سڑک پر پہنچ چکے تھے اور ہمیں نہیں معلوم تھا کہ ہم کس سمت جا رہے ہیں۔ سمت کا تعیّن ایسی افراتفری میں کسی کو بھی نہیں رہتا ہو گا مگر ہمارا تو اس گھڑی دماغ ہی ماؤف ہو رہا تھا۔
آبی نے ڈرائیور سے جگہ تو چھین لی تھی مگر نشست اُسے کوسہارا نہیں دے رہی تھی۔ آبی نے ایک لحظے کے لیے بریک پر پیر رکھ کر دروازہ کھولا اور ڈرائیور کو بڑے زور سے باہر دھکیل کر بولا۔ "اُتر جا او دے کنکتے! یہ گاڑی تجھے شام کو کراچی سمیت طارق روڈ پر مل جائے گی، دُودھ کے چوک پر۔"

ڈرائیور نے دروازے سے لٹکنے کی کوشش کی۔ وہ بُری طرح سہما ہُوا لگتا تھا۔ مگر میں نے پستول اس کے سامنے کر دیا۔
"اُتر جا سالے! کیا بک بک لگا رکھی ہے، جا اللہ تجھے اور بہت دے گا۔" میں نے اس کے ہاتھ پر پستول کا دستہ مار دیا۔
بلند چیخ مار کر اس نے دروازہ چھوڑا اور سڑک پر اُلٹ کر دُور جا پڑا۔ آبی نے اسی گھڑی ایکسیلیریٹر پر پاؤں کا زور دیا اور ٹیکسی کو ستّر میل اوپر اُٹھا کر آگے بڑھنے لگا۔ سڑک اس گھڑی بالکل ہی ویران پڑی تھی۔ کراچی شہر کے لوگوں نے رمضان کے آتے ہی اپنا شیڈول بدل لیا تھا۔ زندگی کچھ تھم سی گئی تھی۔ یوں جیسے اُسے زنگ لگ گیا ہو۔ حالاں کہ اس شہر میں ایسے سناٹے کا کسی بھی گھڑی تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی آدھ میل آگے نکل کر آبی نے ایک جگہ گاڑی روک دی۔ بولا۔ "اب اُتر چل یار! وہ سالے جگہ جگہ ناکہ بندی کر چکے ہوں گے۔ اُن کے پاس وائرلیس بھی تو ہوتی ہے۔"
"ٹھیک ہے۔ یہ گاڑی تو اُدھر کسی اوٹ میں کھڑی کر دے۔ اور اس گلی سے آگے نکل کر۔" میں نے بائیں ہاتھ کی ایک آبادی کی طرف اشارہ کیا۔
آبی نے میرے کہنے پر گاڑی گلی کے کونے میں کھڑی کی، اور پھر اس سے ذرا آگے جا کر حالات کا جائزہ لینے کے بعد جب ہم پیچھے مُڑے تو ہمیں اس وقت پولیس کی گاڑی سامنے کی بڑی سڑک پر دوڑتی نظر آئی۔ وہ کسی طرف دیکھے بغیر آگے بڑھ گئے تھے۔ آبی نے وہاں گاڑی روک کر خود کو ایک بڑی مصیبت سے بچا لیا تھا۔ سورج ابھی تک نہیں نکلا تھا مگر ہمارے اندر آگ بھڑک اٹھی تھی۔ پیاس نے ہم دونوں کو نڈھال کر دیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ ایسی اعصاب شکن افراتفری میں آدمی کے اندر کا ایندھن کچھ زیادہ ہی خرچ ہو جاتا ہے۔
آبی سا اپنے خشک ہونٹوں پر عجیب سی بے بسی سے زبان پھیر رہا تھا۔ وہ ایسا جھٹکا لگا تھا ہم دونوں کو کہ ہمارے حوصلے کی ساری کھری کھوٹی پونجیاں خرچ ہو گئی تھیں۔ پیاس نے میرا بھی بُرا حال کر رکھا تھا۔ مگر پانی ہمیں کہیں سے نہیں مِل سکتا تھا۔ کچھ ہی دُور پر ایک چھوٹی سی مسجد کے مینار دکھائی دیے۔
"چل یار! اس مسجد سے ہی پانی پی لیں۔ میری تو ٹُنکی ہی خالی ہو گئی ہے اس چکر میں۔" یہ کہہ کر آبی نے اپنے قدم تیز کر دیے۔
میں بھی اسی دھن میں تھا کہ کوئی ایسی جگہ ملے جہاں سے ہم دو گھونٹ پانی پی سکیں۔ نل ہمیں مسجد کے باہر ہی مِل گیا۔ ہم نے دیوانوں کی طرح جس انداز سے اس صبح نل کے نیچے اوک لگا کر پانی پیا وہ کبھی نہ بھُول سکوں گا۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ اس روز وہاں سے بچ نکلنا ایک معجزہ ہی تھا۔ ورنہ جس طرح پولیس نے کوٹھی کے سامنے والے حصے میں جال ڈال دیا تھا اس میں سے ہم کسی بھی طرح چھَن کر باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ اُن کی منصوبہ بندی کی ایک ہی خامی تھی کہ کوٹھی کے عقبی حصے کو وہ فوراً ہی نگاہ میں نہ رکھ سکے ورنہ اس ترمذی نے اس علاقے کا نقشہ تو اُنھیں پوری طرح سمجھا دیا تھا۔ مگر اُن سے حماقت یہ سرزد ہوئی کہ وہ ہمیں محض دو ٹُورڈو ہی سمجھ بیٹھے تھے۔ اور اس زعم میں سیدھے کوٹھی کے اندر دھنس آئے کہ وہ ہمیں فوراً ہی بے بس کر لیں گے۔ حالانکہ جب وہ فاختہ کے شکار کو بھی نکلتے ہیں تو شیر مارنے کا سامان لے کر جاتے ہیں۔
پانی پی کر ہماری جان میں جان آئی۔ مگر جوں ہی ہم اوک جھٹک کر سیدھے ہوئے مسجد کا مُلّا اور اس کے ساتھ چند نمازی ہمارے گرد ہو گئے۔
"اتنے ہٹے کٹّے ہو کبھی روزہ تو رکھ لیا ہوتا۔ اور پانی بھی پی رہے ہو تو مسجد کے بالکل سامنے۔"
"مجبوری ہے مولوی صاحب۔ نل آپ نے لگوایا ہی مسجد کے سامنے ہے۔" آبی نے یوں اُن کو ایک دم اتنے سنجیدہ دیکھتے ہوئے کہا۔
"یہ تو عوام الناس کی بھلائی کے لیے ہے برخوردار! روزہ خوروں کے لیے نہیں۔" مولوی صاحب کا لہجہ بگڑنے لگا۔ نمازی بھی ہمیں گھُورنے لگے۔ وہ سب تسبیح بدست تھے اور بڑے ہی عابد و زاہد قسم کے لوگ تھے۔ وہ ہمیں ایسی نظروں سے دیکھ رہے تھے جیسے ہم کوئی بدترین قسم کی مخلوق ہیں۔
آبی کا پارہ بھی آہستہ آہستہ تیز ہونے لگا۔ عین ممکن تھا کہ وہ اُن سے کوئی بڑی ہی تلخ بات کہہ دیتا۔ اس صورتِ حال سے بچنے کے لیے میں نے کہا۔ "بات یہ ہے مولانا کہ ہم سفر میں ہیں اور اس شہر میں بالکل نووارد بھی۔ آپ کو کیا پتہ ہم کس حال میں ہیں۔۔۔ چلیں بھائی جی ہمیں دیر ہو رہی ہے۔" یہ کہہ کر میں نے آبی کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اور ہم آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے آگے نکل گئے۔
اُن لوگوں نے ہماری بات کا جواب نہیں دیا۔ مُنہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے وہ دُوسری طرف نکل گئے۔
ابھی ہم اس گلی سے نکلے بھی نہیں تھے کہ دائیں ہاتھ کا ایک دروازہ کھلا اور اس میں سے ایک بوڑھی عورت کے ساتھ ایک دراز قد بڑی ہی دیدہ زیب عورت باہر آ گئی۔
"ارے یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔" آبی نے قدم روک لیے۔
ہمارے سامنے فردوسی بیگم اس بڑھیا کو سہارا دے کر گلی میں اُتر آئی تھی اور اب وہ دونوں ہمارے آگے آگے چل رہی تھیں۔ اس کو وہاں دیکھ کر میری سانسیں بھی زیروزبر ہونے لگیں۔ وہ کوئی بڑی ہی خستہ حال سی آبادی تھی جس کی پختہ اینٹوں کی گلی میں جا بجا کھڈے سے بنے ہوئے تھے۔
"یار! یہ اِدھر کیا کر رہی ہے یہ فردوسی بیگم؟"

"پتہ نہیں ۔ ہوسکتا ہے یہ عورت اس کی کوئی رشتے دار ہو۔ مگر آبی! یہ تو بہت برا ہوا۔ جلدی سے نکل چل۔ وہ تکریم احمد ہمارے پیچھے کوٹھی پر ناشتے کرجا پہنچا تو وہ بیچارہ خواہ مخواہ ہی مارا جائے گا" میں نے پریشان ہو کر کہا۔

"میرا خیال ہے کہ اس فردوسی بیگم کو نکل جانے دو۔ اور ہم دوسری طرف سے باہر چلے جاتے ہیں" یہ کہہ کر آبی پیچھے مڑنے لگا۔

مگر عین اس وقت فردوسی بیگم کے ساتھ چلتی ہوئی بوڑھی عورت کا پاؤں رپٹا اور وہ لڑکھڑا کر زمین پر بیٹھ گئی۔ اس کو اوپر اٹھانے کے لیے فردوسی بیگم نیچے جھکی تو اچانک اس کی نظر ہم پر پڑ گئی۔ وہ تو حیرت زدہ سی ہو کر اسی جھکی ہوئی حالت میں ہمیں یوں دیکھنے لگی جیسے اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آ رہا ہو۔ بڑے حیرت زدہ لہجے میں بولی "یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ آپ کدھر پھر رہے ہیں اس وقت جناب اس غریب پورہ میں؟"

"یہی سوال میں آپ سے پوچھتا ہوں۔ آپ کو اس وقت یہاں دیکھ کر مجھے حیرت ہو رہی ہے۔"

"یہ میری خالہ ہیں ان کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ میں کل شام سے ادھر ہوں اور اب ان کو ہسپتال لے جا رہی ہوں بیٹھے بٹھائے ان کا دم گھٹنے لگتا ہے پتہ نہیں کیا ہوا ہے انہیں؟"

"تو ادھر ہی رکیں ہم ٹیکسی لے کر آتے ہیں گلی کے کونے پر کھڑی ہے" آبی نے کہا اور بھاگ کر گلی کے دوسرے کونے میں جا پہنچا۔ میں بھی اس کے ساتھ چل رہا تھا مگر جیسے ہی ہم ٹیکسی کے قریب پہنچے ہمیں پولیس کی گاڑی میں سے اترتے سپاہی نظر آئے۔ وہ ٹیکسی ڈرائیور بھی ان کے ساتھ تھا جسے ہم سڑک پر پھینک آئے تھے۔ وہ اپنی گاڑی پہچان کر بولا "وہ رہی جناب وہ میری گاڑی ہے" اور پھر اس کی نظر ہم پر پڑی تو وہ چیخ اٹھا "یہی وہ آدمی ہیں جناب! مجھ سے گاڑی انھوں نے ہی چھینی تھی۔"

وہ پاگلوں کی طرح دوڑتا ہوا گلی کی طرف آ رہا تھا۔

آبی کی حاضر دماغی کی میں داد دیتا ہوں۔ وہ بھاگا نہیں بلکہ مجھے اشارہ کرکے تیزی سے ٹیکسی میں بیٹھا۔ ہمارے پاس بس ایک ہی منٹ کی مہلت تھی۔ آبی نے ٹیکسی اسٹارٹ کی اور پھر بلا خیز رفتار سے اسے آگے بڑھا کر ان لوگوں کے درمیان میں سے یوں نکلا جیسے وہ انھیں کچل کر رکھ دے گا۔ سپاہی ہمارے اس اقدام کی پیش بندی کے لیے شاید ذہنی طور پر تیار ہی نہیں تھے۔ کچھ لوگوں کی دائیں بائیں آمد و رفت بھی بڑھ چکی تھی۔ بندوقیں ان کے ہاتھوں میں تھیں مگر وہ بس دیکھتے ہی رہ گئے۔ آبی نے ٹیکسی کو بلا خیز رفتار سے پولیس کی گاڑی کے قریب سے گزارا اور آگے بڑھ گیا۔

مگر عین اس وقت جب ہم ان کی گاڑی سے دس فٹ آگے نکل چکے تھے کئی گولیاں ٹیکسی پر لگیں۔ پچھلا شیشہ چور ہوا تو گولی اگلے شیشے کو پھاڑتی ہوئی آگے نکل گئی۔ اور پھر ہمیں یہ احساس ہوا کہ ان کی گولیاں ایک ٹائر بھی پھاڑ گئی ہیں۔ زبردست دھماکا ہوا، گاڑی لڑکھڑائی مگر آبی نے اسے روکا نہیں اس کو اسی حال میں بھگاتا چلا گیا مگر اس کی رفتار اب واقعی گدھا گاڑی ایسی ہوگئی تھی۔ اس کے عقب نما میں میری نظر پڑی تو میں سمجھا اب بچنا ناممکن ہے پولیس کی گاڑی اب ہمارے پیچھے دوڑی چلی آ رہی تھی۔ پتہ نہیں وہ کون سا علاقہ تھا جس سڑک پر ہم چڑھے تھے اس پر ٹریفک بہت زیادہ ہو چکی تھی۔

آبی نے عقب نما میں اس مصیبت کو اپنی طرف لپکتے دیکھا تو بولا "جیلانی میں گاڑی چھوڑ رہا ہوں، فوراً اتر کر میرے پیچھے آجاؤ" یہ کہہ کر اس نے ایک عمارت کے سامنے گاڑی روکی اور ہم دونوں دائیں بائیں دروازے کھول کر عمارت کی طرف لپکے۔ پولیس کی گاڑی گھنی ٹریفک کی وجہ سے قدرے سست رفتار ہوگئی تھی۔ ہم دونوں رم خوردہ وحشیوں کی طرح بھاگتے ہوئے اس عمارت کی سیڑھیاں طے کرنے لگے۔ وہ کوئی پانچ منزلہ عمارت تھی۔ اس کی تین سیڑھیاں طے کرنے کے بعد ہم ایک راہداری پر پہنچے تو ہمیں احساس ہوا کہ اس کی ہر منزل پر فلیٹ بنے ہوئے ہیں۔ دائیں ہاتھ کا ایک دروازہ نیم وا دیکھتے ہی ہم اس کے اندر جا گھسے اور اس کی چٹخنیاں چڑھا کر آمنے سامنے کی دیواروں سے لگ کر یوں کھڑے ہوگئے جیسے ہم اپنے وجود ہی سے منکر ہو رہے ہوں۔ چٹخنیاں چڑھنے کی آواز فلیٹ میں گونج گئی تھی۔ اس آواز کو سن کر دو عورتیں سامنے کے لاؤنج میں نمودار ہوئیں۔ وہ دونوں ٹخنوں تک باریک میکسیاں پہنے ہوئی تھیں۔ ہم دونوں کو یوں سامنے دیکھ کر سٹپٹا سی گئیں۔

"کون ہو تم؟ کیا کر رہے ہو یہاں؟" ایک نے بڑے تیز لہجے میں پوچھا۔ اس کی آواز سنتے ہی ہمیں احساس ہوا کہ ابھی ہم زندہ ہیں۔ آبی نے ایک دم پستول نکال کر اس عورت پر تان لیا۔ دوسری بھی اس کی زد میں تھی۔ کیونکہ دونوں اب ساتھ ساتھ کھڑی تھیں۔ پستول دیکھتے ہی ان کی رنگت ہلدی ہونے لگی۔ میں نے بھی پستول نکال لیا۔ اور دوسری عورت کی کنپٹی کے ساتھ اس کی نال لگا دی۔

"ہمارے پیچھے پولیس لگی ہے۔ اگر خون خرابہ نہیں چاہتیں تو ہمیں یہاں ٹھہرنے دو۔ تمھیں ہم کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے ورنہ تم دونوں کی لاشیں ہی یہاں رہ جائیں گی۔ چلو اندر چلو" یہ کہہ کر میں نے ان دونوں کو پیچھے دھکیل دیا۔ وہ لاؤنج واقعی خوبصورت لاؤنج تھا۔ سرخ رنگ کا ایک سستا سا قالین اس کے فرش پر بچھا تھا۔ دائرے کی صورت میں دو صوفے بڑے قرینے سے دیوار کے ساتھ لگے تھے جن کے سامنے دوسری دیوار کے ساتھ ایک بڑا سا ٹی وی رکھا تھا۔ وہ عورتیں لڑکھڑاتی ہوئی الٹے قدموں پیچھے ہٹیں۔ دونوں ہی ننگے پاؤں تھیں۔ اور ان دونوں کی قوتِ گویائی پستولوں کی دہشت نے سلب کرلی تھی۔ وہ جوان تھیں آبی کے دل سے بھی زیادہ جوان۔ رنگت ان کی سانولی تھی نہ گوری۔ ان میں سے ایک گھبرا کر صوفے پر گر گئی۔ نادانستہ طور پر ان دونوں نے ہاتھ اوپر اٹھا لیے تھے۔ اور ان کی وہ ترشی ہوئی زلفیں بڑے دلفریب انداز سے ان کے کندھوں پر ناچ رہی تھیں۔

"تم۔۔۔ تم کیا چاہتے ہو؟"

"ہم پناہ چاہتے ہیں بی بی! ذرا سی پناہ، ذرا سی مہلت۔" میں نے اپنا بریف کیس صوفے پر رکھتے ہوئے کہا۔ لاؤنج میں بھی ان عورتوں نے کوئی خاص قسم کی خوشگوار خوشبو بکھیر رکھی تھی اور معلوم یہ ہوتا تھا کہ وہ دونوں خوش حال عورتیں ہیں۔

"اگر آپ نے شور مچایا تو اس شور میں آپ بھی مریں گی اور ہم بھی۔ ان کو بیڈ روم میں لے چلیں۔" آبی نے صوفے پر گری عورت کو بازو سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا۔

میں نے بریف کیس اٹھایا اور دوسری خاتون کو پستول کی زد میں لے کر سامنے کے کمرے میں دھکیل دیا۔ آبی بھی میرے پیچھے آگیا۔ عین اس وقت باہر راہداری میں آوازوں کا شور اٹھنے لگا۔ پولیس کے سپاہی اس عمارت کے اندر پہنچ چکے تھے۔ بیڈ روم ایسا تھا کہ اس کی دیواروں کے ساتھ فرش سے چھت تک آرائشی تختے لگے تھے۔ وہ سارے کا سارا شربتی رنگ کا ہارڈ بورڈ تھا فرش پر پلاسٹک کا ایک کارپٹ بچھا تھا۔ اور اس میں دو فوم کے بیڈ ساتھ ساتھ لگے تھے۔ ایک طرف عمدہ قسم کی سنگھار میز پڑی تھی۔

"یہ پستول ہٹائیں۔ ہم آپ کو بچالیں گے۔"

دوسری عورت نے اس شور کو سن کر اپنے اٹھے ہوئے ہاتھ نیچے گرا دیے۔ یوں جیسے وہ کسی فیصلے پر پہنچ چکی ہے۔

"شکیلہ! یہ ایک تختہ ہٹا دے۔ یہ والا" یہ کہہ کر اس نے سنگار میز پر پڑے ایک چاقو سے دیوار کے کونے میں لگے دو فٹ تختے کی درز میں دھنسا کر ذرا سا دبایا تو وہ تختہ اپنی جگہ سے ہل گیا۔ اس تختے کے پیچھے خلا تھا۔ اتنا خلا کہ کئی آدمی اس کے پیچھے آسانی سے کھڑے ہو سکتے تھے۔

اس نے تیزی سے وہ تختہ دیوار سے الگ کر دیا۔ وہ نو فٹ اونچا تختہ اس سے سنبھل نہیں رہا تھا۔ آبی نے اسے سہارا دیا تو وہ بڑے سجے ہوئے لہجے میں بولی "جلدی کریں۔ ان کے پیچھے چھپ جائیں۔"

"یہ کیا کرتی ہو نجمہ؟ پتہ نہیں یہ کون لوگ ہیں" صوفے پر گری عورت اپنی میکسی سنبھالتی ہوئی اٹھی۔

"ابھی تو ہم کچھ بھی نہیں ہیں بی بی! اب جان مریض ہی سمجھ لیں" میں نے اس تختے کے پیچھے جھانکتے ہوئے کہا۔

عین اس وقت دروازے پر بڑے زور کی دستک ہوئی تو آپی فوراً ہی اس تختے کے پیچھے جا ٹھہرا۔ مجھے بھی اس کی تقلید کرنی پڑی۔ جیسے ہی ہم دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہوتے ان دونوں عورتوں نے وہ تختہ تیزی سے اس کی پہلی جگہ لگا کر دونوں طرف سے اس کی سطح ہموار کر دی۔ دروازے پر دستک ابھی جاری تھی۔ ہم دونوں دم سادھ کر وہاں کھڑے تھے۔ اور ہمیں نہیں معلوم تھا کہ ہم کتنی بڑی حماقت کے مرتکب ہو چکے ہیں۔ ہم نے مکمل طور پر خود کو ان کے رحم و کرم پر ڈال دیا تھا۔ وہ ہمیں کیڑے مکوڑوں کی طرح مسل سکتی تھیں۔ وہ دونوں گندمی رنگ کی جوان، صحتمند اور دلکش عورتیں ہمیں وہیں سے عالم بالا کی طرف روانہ کر سکتی تھیں۔ میرے ارادے کی گردن ڈھلک چکی تھی اور آپی بھی ملیامیٹ ہو رہا تھا۔

تیسری دستک گونجی تو ایک عورت بولی "جا شکیلہ! میں ادھر بستر میں لیٹی ہوں دیکھ کون ہے دروازے پر۔ شاید گلو بھی آ چکا ہو۔"

"تم نے کوڑھ خرید لیا ہے نجمہ! پتہ نہیں اب کیا ہوگا"۔ یہ کہہ کر وہ وہاں سے باہر نکل گئی۔ کمرے کا دروازہ بند ہونے سے ہم یہی اندازہ لگا سکتے تھے۔ چند لمحوں بعد ہی ہمیں لاؤنج میں کسی کی بھاری بھرکم آواز ابھرتی سنائی دی۔

"ادھر دو مجرم آ گھسے ہیں ہمیں ان کی تلاش ہے۔ ہم آپ کا فلیٹ دیکھیں گے"۔

"دیکھ لیں جناب۔ مگر وہ کون لوگ ہیں، کسی کو جان سے ہی نہ مار دیں پلیز، ان کے پاس تو پستول بھی ہوں گے، ہمارا دروازہ کھلا تھا۔ ہمارا نوکر گلو ابھی باہر گیا ہے پلیز تھانیدار صاحب! میرا تو دل ڈوبنے لگا ہے"۔

"آپ گھبرائیں نہیں۔ یہ آپ کے بیڈ روم ہیں"۔

"جی یہ دو بیڈ روم ہیں اور یہ لاؤنج ہمارا صحن بھی ہے اور ڈرائنگ روم بھی، پلیز آپ دیکھ لیں"۔ شکیلہ کمال کی اداکاری دکھا رہی تھی۔ اور وہ تھانیدار تھا جو اس سے مخاطب تھا، میرا خیال ہے کہ وہ بھی میکسی کے معجزوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ تختے کے پیچھے ہم کھڑے تو تھے مگر ہماری جان ضیق میں پھنس گئی تھی۔ تازہ ہوا کا گزر وہاں ناممکن تھا۔ پھر بھی جتنی ایک آکسیجن وہاں موجود تھی وہ ہمارے کام آ رہی تھی۔ ہماری وہ کوئی تقدیر ہمیں ایسی پھنسا گئی تھی کہ اس کارگہ شیشہ گری میں ہم سانس بھی نہیں لے سکتے تھے۔ چند ہی ساعتوں بعد ہمیں بیڈ روم کا دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ کئی بھاری بھرکم قدم پلاسٹک کے اس فرش پر پڑنے لگے جو بناوٹ کے لحاظ سے سنگ مرمر ایسا نظر آتا تھا۔

"یہ۔۔۔ یہ کون سویا ہوا ہے یہاں؟"

"یہ میری باجی ہیں نجمہ۔ باجی! ذرا اٹھ جائیں یہ پولیس صاحب آئے ہیں"۔

"انسپکٹر؟" نجمہ کی دہشت زدہ سی آواز ابھری "کیا بات ہے خیریت تو ہے! کوئی واردات ہو گئی ہے؟ اور یہ تم انھیں بیڈ روم میں کیوں لیے چلی آ رہی ہو۔ کوئی تمیز ہونی چاہیے تھی" نجمہ نے بڑے ہی غصیلے لہجے میں کہا۔

"میں معافی چاہتا ہوں خاتون! دراصل اس عمارت میں دو مجرم گھس آئے ہیں۔ ہم ان کی تلاش میں ہیں۔ کوئی اور کمرہ بھی ہے آپ کا؟"

"جی یہ ساتھ والا کمرہ ہے، وہ میرا بیڈ روم ہے مگر یہاں کوئی ایسا آدمی آتا تو ہمیں سب سے پہلے گولی مارتا۔ آپ سارا گھر دیکھ لیں"۔

"کیا ہوا بیگم صاب جی کیا ہوا؟" شاید ان کے نوکر گلو کی آواز تھی۔

"یہ کسی ڈاکو کی تلاش میں ہیں گلو! ہمارے گھر کی تلاشی لے رہے ہیں۔ اندھیر مچا ہے شہر میں۔ روز چوری، روز ڈاکے۔" نجمہ نے بڑے ہی دردیلے لہجے میں کہا۔ اس کے چند ہی لمحے بعد شکیلہ اس تھانیدار کو دوسرا کمرہ، دونوں غسل خانے اور فلیٹ کا اسٹور روم دکھا کر رخصت کر چکی تو بولی۔

"گلو جاؤ ادھر اردو بازار یہ کتابیں خرید لانا۔ ان کے نام میں نے لکھ دیے ہیں"۔

"اچھا بی بی جی لائیں۔ پر مجھے وہاں دو گھنٹے لگ جائیں گے، جانا اور پھر آنا۔ بسوں میں دھکے الگ"۔

"دھکے تو لکھے ہیں تیری قسمت میں۔ جا چلا جا زیادہ بک بک نہ کیا کر۔ آدھ گھنٹے کا کام نہیں ہے"۔

"واہ! آدھ گھنٹہ کیسے بی بی جی! ابھی مجھے کھانا بھی پکانا ہے لوگ روزے رکھتے ہیں، آپ وہ بھی گول کر جاتی ہیں"۔

"بکواس نہ کیا کر گلو! میں نے پرچی پر نام لکھ دیا ہے۔ دکاندار کو دکھا دینا، اور بس"۔

"وہ ٹھیک کہہ رہا ہے شکیلہ! یہ چیزیں تم خود بھی خرید سکتی ہو"۔ نجمہ نے بستر سے نکلتے ہوئے کہا۔ ہمارا دم اب کچھ زیادہ ہی گھٹنے لگا تھا۔

دی ہیو گاٹ رڈ آف ہم بیکاز آف یور ہیروز" ...نے بڑے ہی تپے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ہاں! یو آر رائٹ۔ بھاگ کے جا گلو! یہ چیزیں تو بہت ضروری ہیں"۔ نجمہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اچھا بیگم صاب جی! پر آپ میری دوڑیں بہت لگواتی ہیں۔ پرسوں آپ نے "تالمکھانا" خریدنے بھیج دیا وہ میں سب جگہ پوچھتا پھرا۔ کسی جنرل مرچنٹ کے پاس ملا نہ کسی حلوائی کی دکان سے۔ نہ کسی ہارڈ ویئر والے نے دیا۔ ملا تو ایک پنساری کی دکان سے۔ حد ہو گئی"۔

"تو ہے ہی بے وقوف۔ تمھیں کہا بھی تھا کہ یہ کسی پنساری کی دکان سے مل جائے گا شکلی کو پیچش لگی تھی"۔

"میں سمجھا ادھر منیاری کی دکان سے مل جائے گا وہ "تالمکھانہ"۔ بس میں ذرا بوٹ پالش کر لوں پھر جاتا ہوں۔ ادھر پولیس نے بلڈنگ کو گھیر رکھا ہے۔ پتہ نہیں کس کی شامت آئی ہے"۔

وہ گلو اپنی قسم کا ایک ہی بدمعاش تھا سارے شہر میں۔ ہماری جان مصیبت میں پھنسی تھی۔ دم گھٹتا جا رہا تھا اور اس کو بوٹ چمکانے کی پڑی تھی۔ دو عاقل بالغ عورتوں کو اس نے حیران کر رکھا تھا۔ وہ ٹس سے مس نہیں ہو رہا تھا اور وہ شکیلہ ہم پر یہ مہربانی کر رہی تھی کہ اسے وہاں سے ٹہلا کر وہ ہمیں اس عذاب سے نکالنا چاہتی تھی۔ کہ اس گلو کی ہم پر نظر نہ پڑے مگر اس الو نے ہم سب کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔

"تو بر دکھوے کے لیے جا رہا ہے حرام خور! اٹھ دفع ہو جا یہاں سے۔ تجھے نہیں پتہ کہ یہ کتابیں کتنی ضروری ہیں شکیلہ کی صحت کے لیے۔ دیکھ تو اس کا رنگ پیلا پڑتا جا رہا ہے جا جلدی لے آ۔ بدبخت اٹھ جا ورنہ میں جوتا مار دوں گی۔ نکمہ کام چور۔"

"ان گالیوں کے بھی پیسے میں آپ سے تنخواہ کے علاوہ لوں گا بیگم صاب جی! یہ بھی میں آپ کے حساب میں لکھ دوں گا۔ ہاں اب ذرا چمکے ہیں یہ بوٹ۔ لائیں پیسے دیں"۔

"لعنت ہے تیری شکل پر۔ اب دفع بھی ہو جا یہاں سے۔ لے، یہ پچاس روپے لے جا"۔ شکیلہ نے بہت زیادہ تلملاتے ہوئے کہا۔

چند ہی لمحوں بعد گلو ہنستا ہوا باہر نکل گیا۔ بولا "بس اب شام تک میری راہ دیکھیں، اگر میں نہ آیا تو سمجھیں کہ میں کسی بس کے نیچے آ گیا ہوں۔ ایسی نوکری ملی ہے کہ اخ تھو"۔

وہ سالا ان دو تنہا اور بے بس عورتوں کا اچھی طرح قلع قمع کر رہا تھا۔ جانتا تھا کہ ان کا کام اس کے بغیر نہیں چل سکتا ہے وہ باہر نکلا تو ان دونوں نے اندر سے تمام دروازے بند کر کے فوراً ہی وہ تختہ اپنی جگہ سے اکھاڑ کر ہمیں باہر نکالا۔ ہم دونوں حبس دم کی وجہ سے بہت ہی نڈھال ہو رہے تھے۔ تازہ ہوا میں پہنچتے ہی ہم نے گہرے گہرے سانس لیے۔ تب کہیں جا کر ہماری جان میں جان آئی۔

وہ ہماری اس حالت کو سمجھ چکی تھیں، نجمہ بولی "آپ کو تو ہم پستول کے بغیر ہی مار سکتے تھے۔ اندر تو دم لینا بھی ممکن نہ ہوگا"۔

"ہاں! آپ چاہیں تو کیا نہیں کر سکتی ہیں خانم! ہم ہی ڈھیٹ ہیں جو بچ گئے۔ ویسے آپ اطمینان رکھیں ہم نہ قاتل ہیں نہ ڈاکو۔ ایسے ہی چکر میں پھنس گئے تھے۔۔۔ وہ گئے نہیں وہ پلیسیے؟" آپی نے پلنگ پر پھیل کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"وہ یہاں سے ہو کر چلے گئے ہیں ہمیں بہرحال۔۔۔ آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی ہے جناب! فلموں میں تو یہ دیکھا تھا مگر آج اپنے گھر میں ہی یہ سب کچھ ہو گیا۔ اگر آپ اپنا تعارف کروا دیں تو بڑی مہربانی ہو گی"۔ شکیلہ نے اپنی میکسی پر ایک چادر اوڑھتے ہوئے کہا۔

"سارے تعارف اور تعریفیں تو اللہ ہی کو زیب دیتی ہیں خانم! بہرحال ان کا نام ایس جی ایم ایم پیرزادہ اور اس خاکسار کو ہم خان کہتے ہیں"۔

آپی اس وقت اپنے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کو پوری طرح پھیلا کر اپنے گالسنے کو ماپ رہا تھا اور نجمہ اسے بڑے انہماک سے دیکھ رہی تھی۔

"آپ کے انگوٹھے کو کیا ہوا ہے جناب! کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے کیا؟"

"بی بی جب کوئی مصیبت آتی ہے نا ہم پر تو میں اپنے انگوٹھے اور اس انگشت شہادت کا درمیانی فاصلہ ماپ کر کہہ سکتا ہوں کہ مصیبت ٹل جائے گی کہ نہیں۔ اگر وہ ٹلنے کی نہیں ہوتی تو یہ فاصلہ کم ہو جاتا ہے، یہ میرا تجربہ ہے"۔

آپی نے یہ بات بڑے ہی سادھو سنتوں ایسے لہجے میں یوں کہی کہ مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی مگر وہ بہت زیادہ سنجیدہ تھا، بولا۔ "تم ہنس رہے ہو خان! ایسی مصیبت کے وقت آدمی کی بہت سی چیزیں سکڑ جاتی ہیں، کیوں بی بی! میں صحیح کہہ رہا ہوں نا"۔

شکیلہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے مسکرا کر رہ گئی، بولی "یہ علم تو ہم نے نہیں پڑھا ہے پیرزادہ صاحب! مگر آپ کے شائستہ لب و لہجہ سے میں یہی سمجھی ہوں کہ آپ بڑے اونچے معیار کے پڑھے لکھے مجرم ہیں"۔

"جی نہیں! مجرم تو اب ہم نہیں ہیں بلکہ محرم بن چکے ہیں۔ اور آپ کے ہم اس قدر شکر گزار ہیں کہ جی چاہتا ہے کہ ہم آپ کے پاؤں دھو دھو کر پیتا رہوں"۔

"ہاں یہ ضرور کریں۔ اسی بہانے اس کے پاؤں کی میل اتر جائیگی۔ مگر یہ بتائیں کہ ہوا کیا تھا؟" نجمہ نے ایک تپائی کھینچ کر ہمارے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔ دُوسری تپائی پر شکیلہ بیٹھ گئی۔ وہ دونوں ہماری اس افراتفری کے فرار کی کہانی سُننے کو بیتاب نظر آتی تھیں۔

"دراصل ہم نے ایک ٹیکسی والے کو اُدھر چندریگر روڈ پر کچھ زیادہ ہی پیٹ ڈالا تھا۔ شاید وہ مرگیا ہو۔ پولیس کی گاڑی وہاں سے گزر رہی تھی، اُن کو دیکھ کر ہم بھاگے تو وہ لوگ ہمارے پیچھے لگ گئے۔ بس اتنی سی بات تھی جسے ان لوگوں نے افسانہ بنا دیا۔ ورنہ ہم تو کاروبار کے سلسلے میں لاہور سے یہاں آئے ہیں یہ ڈھیر ساری رقم لے کر۔"

یہ کہہ کر میں نے اپنا بریف کیس عمداً اُن کے سامنے کھول دیا۔ اس میں دھری اتنے سارے نوٹوں کی اتنی ساری گڈیاں دیکھ کر وہ دونوں آنکھیں جھپکا کر ایک دوسرے کو یوں دیکھنے لگیں جیسے کہہ رہی ہوں مُرغے تو شیور کے لگتے ہیں، پلے ہوئے اور گوشت سے پُر۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ یہی کہہ رہی تھیں۔ بریف کیس میں دھرے سگریٹ کے پیکیٹوں میں سے ایک پیکٹ نکال کر میں نے کھولا اور بریف کیس کو مقفل کر کے سگریٹ سلگانے لگا مگر ماچس نہ میرے پاس تھی نہ آبی کے پاس۔ وہ اُدھر کہیں کوٹھی میں ہی رہ گئی تھی۔

شکیلہ نے سنگار میز کی دراز میں سے ایک لائیٹر نکال کر ہمارے سگریٹ سُلگا دیئے، بولی "کیا کاروبار کرتے ہیں آپ؟"

"جو بھی مل جائے۔ ویسے تو ہم یہاں سے سکریپ خریدنے آتے ہیں اگر اس دَوران کوئی اور فائدہ مند چیز مل جائے تو وہ بھی لے جاتے ہیں۔"

"خواہ وہ کوئی عورت ہی کیوں نہ ہو۔ خاص کر ٹیکسی والی عورت ہمیں زیادہ پرافٹ ایبل لگتی ہے۔" آبی نے خواہ مخواہ یہ فقرہ کھینچ مارا۔ دراصل اُن کی وہ راز افشا نیکسیاں اس کے دماغ میں گھس کر رہ گئی تھیں۔ وہ کچھ سٹپٹا سی گئیں۔

"اِن کی بات کا بُرا نہ منائیں۔ یُوں ہی مذاق کرتے ہیں، یہ میرے دوست۔ دراصل آپ کے اس خوبصورت لباس سے یہ بہت متاثر ہیں۔" میں نے آبی کی اس بے موقعہ بات کا بھرم رکھنے کے لیے انہیں یکجا کرنا چاہا ورنہ وہ ذہنی طور پر بکھر بھی سکتی تھیں۔

"آپ کی اس تعریف کا شکریہ۔ اب آپ میرا خیال ہے چھٹی کریں، وہ لوگ جا چکے ہوں گے۔" نجمہ نے سنجیدگی سے کہا۔

"اگر آپ ہمیں اس عمر میں مروا دینا چاہتی ہیں تو ضرور ہمیں رخصت کر دیں۔ ورنہ میرا خیال ہے ابھی مطلع صاف نہیں ہوا اور ابھی حالات کی نیت ٹھیک نہیں ہے۔" آبی نے سگریٹ کی راکھ گرانے کے لیے مناسب جگہ دیکھتے ہوئے کہا۔ شکیلہ نے اُس کی مشکل سمجھ کر راکھ دان اس کے آگے رکھ دیا۔

عین اُس وقت کسی طرف سے ٹیلیفون کی گھنٹی کی آواز سُنائی دی۔

"یہ کس کا ٹیلیفون آ گیا اس وقت۔" شکیلہ نے تیزی سے اٹھتے ہوئے کہا اور لپک کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

"آپ کے ہاں ٹیلیفون بھی ہے؟" میں نے حیران ہو کر پُوچھا۔

"جی ہاں! ہم دونوں ٹیلیفون کے محکمے میں کام کرتی ہیں۔ میں سُپروائزر ہوں اور یہ آپریٹر ہے۔" نجمہ نے کہا۔

"تو یہ ٹھاٹھ ہیں آپ کے، محکمے کی طرف سے ملا ہے یہ فون آپ کو۔"

"جی ہاں۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو اپنے بچاؤ کے لیے کوئی اور راستہ دیکھنا چاہیے۔ وہ دوبارہ ادھر آ گئے تو مشکل ہوگی۔" نجمہ اب بھی بہت سنجیدہ تھی۔ اس کی وہ چھوٹی چھوٹی بلوری آنکھیں عجیب سی سرد مہری کا مظاہرہ کرنے لگی تھیں۔

"آپ کو ہمارا یہاں ٹھہرنا اچھا نہیں لگتا، حالاں کہ ہمیں ایسا لگتا ہے جیسے ہم اپنے ہی گھر میں ہیں۔ ایک قلبی سکون سا محسوس ہو رہا ہے آپ کے سامنے بیٹھ کر۔ صرف ہمارے لیے آپ نے اتنی رحمت فرمائی ہے تو ہمیں دو گھڑی اور جی لینے دیں۔" آبی نے زحمت کے بجائے 'رحمت' کا لفظ میرا خیال ہے عمداً استعمال کیا تھا۔

وہ اُس کی یہ بات سُن کر کچھ نرم پڑ گئی، بولی "آپ نے ابھی تک سچی بات نہیں بتائی ہے کوئی مشکل آ پڑی تو ہم کیا جواب دے سکیں گے۔"

"اپنا جرم تو ہم بتا ہی چکے ہیں۔ بہر حال زیادہ نہ کریدیں تو بہتر ہے آپ کے لیے ہم صرف اتنا کہیں گے کہ آپ ہم پر، ہماری شرافت پر ہر طرح سے بھروسہ کر سکتی ہیں کہیں تو میں آپ کو بہن کہہ دوں؟"

وہ ایک بار پھر آبی کے ان لفظوں پر سٹپٹا سی گئی۔

"میرا بھائی ایسا نہیں ہو سکتا کہ اُسے پولیس سے یوں منہ چھپانا پڑے۔" وہ اب بھی بہت لیے دیے انداز میں بات کر رہی تھی اور مجھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ وہ افراتفری کا ہیجان ختم ہونے کے بعد اب اُس نے صورتِ حال کی بدصُورتی پر پُوری طرح غور کرنے کے بعد یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ہمیں وہاں سے فوراً ہی نکال دے مگر ہم اس دُھتکار کے لیے کسی بھی طرح اس وقت تیار نہیں تھے۔ کیونکہ باہر پولیس ابھی تک موجود تھی۔ اُن کے وہاں سے اتنی جلدی چلے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

ابھی ہم اس کو جواب نہ دے سکے تھے کہ شکیلہ ہنستی ہوئی اندر آ گئی، بولی "وہ انور صاحب تھے، یہاں آنے کے لیے پر تول رہے تھے

بن نے کہہ دیا ہے کہ کل دوپہر تک کے لیے بہت مصروف ہیں۔"

"کیوں روکا ہے انھیں تم نے۔ کیا مصروفیت ہے ہمیں یہاں؟"

"یہ کیا کم مصروفیتیں ہیں یہ دو حضرات! ان سے تو منٹ میں پہلے۔"

"یہ تو ہم سے بہت بدظن ہیں مس شکیلہ! اِن کا تو بس نہیں چلتا ورنہ یہ ہمیں ابھی باہر نکال دیں۔" میں نے دُوسرا سگریٹ سُلگاتے ہوئے شکایت کی۔

"پہلے تو میں بھی یہی سوچتی تھی مگر آپ کو پناہ دے چکے ہیں اور اب آپ کو ہر قیمت پر بچانا چاہتی ہوں میرے خاندان کی یہی روایت ہے آپ بے فکر ہو کر بیٹھیں۔" شکیلہ نے بڑے ہی فیصلہ کن انداز سے یہ لفظ کہے۔

میں نے نجمہ کے چہرے پر غیظ و غضب کی ایک لہر سی اُٹھتی دیکھی مگر وہ کچھ کہے بغیر وہاں سے اُٹھ گئی، بولی "میرا خیال ہے آپ نے ابھی ناشتہ بھی نہیں کیا ہوگا۔"

"ہاں! آپ کا اندازہ صحیح ہے۔ ہمیں کچھ کھانے کو مل جائے تو یہ آپ کی مہربانی ہوگی۔"

میری یہ بات سُن کر وہ باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ شکیلہ پھر تپائی پر ہمارے قریب بیٹھ گئی۔

"ہم آپ کے شکر گزار ہیں مس شکیلہ۔ کون سے خاندان سے تعلق رکھتی ہیں آپ؟"

"جی میں پٹھانوں کے سدوزئی قبیلے کی بیٹی ہوں میرے والدین لاہور میں رہتے ہیں۔ مجھے ملازمت کے لیے یہاں آنا پڑا۔ مگر یہ تو کوئی بات نہ ہوئی نا کہ اب ہم آپ کو یہاں ٹھہرا لینے کے بعد دھکا دے کر باہر نکال دیں، یہ نجمہ باجی تو ایسے ہی ڈر جاتی ہیں۔ آپ کو یقین ہے کہ وہ آدمی مر نہیں گیا ہوگا۔"

"جی نہیں! کوئی ایسی ہلکی سی پٹائی سے مر تھوڑی جاتا ہے۔ ذرا اس کے اگلے دو دانت ٹُوٹ گئے تھے۔ سر سے ہلکا سا خون بہہ نکلا تھا اور اُس کا ایک بازو یہاں کندھے سے ہل گیا تھا مگر اس سے کوئی مر تھوڑی جاتا ہے۔" آبی نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

شکیلہ مسکرا دی، بولی "یہ۔۔۔ یہ آپ کے نزدیک گویا مرنے کا سامان نہیں ہے۔"

"ہرگز نہیں مس! آپ میری ٹانگ کاٹ ڈالیں یا بازو توڑ دیں تو اس سے میں مر تو نہیں سکتا۔ مرتا تو آدمی جب ہے جب اُوپر سے آرڈر آتا ہے اور عزرائیل کو بھیجا جاتا ہے کہ جاؤ فلاں ابنِ فلاں کو فلاں وقت پر اتنے بج کر اتنے منٹ اور اتنے سیکنڈ پر پکڑ کر مار دو۔ جب جا کر کہیں آدمی مرتا ہے کوئی معمولی چیز سمجھا ہے آپ نے انسان کو۔ بڑی پلاننگ کرنی پڑتی ہے اُسے مارنے کے لیے۔" آبی خواہ مخواہ اپنی بات کو عاشقانہ طُول دینے جاتا تھا۔

"آپ کو باتیں بہت کرنی آتی ہیں۔"

"باتوں کے سوا آج کل رکھا ہی کیا ہے۔ مس شکیلہ! اگر آپ اجازت دیں تو ہم ایک جگہ ٹیلیفون کر لیں۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں! آئیے میں آپ کو نمبر ملا دیتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھی اور ہم دونوں کو ساتھ لے کر پہلو کے کمرے میں جا گھسی۔ وہاں مینٹل پیس پر فون یوں رکھا تھا کہ نجمہ کی یہ بڑی سی تصویر اُس کے عقب میں ہمیں گھُور رہی تھی۔ وہ بلاشبہ بڑی ہی خوبصورت تصویر تھی اور اُسے دیکھ کر کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ نجمہ اندر سے اتنی سرد مہر اور گُونیا ہو گی۔

"کیا نمبر ہے؟" شکیلہ نے ریسیور اُٹھا لیا۔

"میں خود ملا لیتا ہوں آپ کہاں سر کھپاتی رہیں گی۔" یہ کہہ کر میں نے ریسیور اُس کے ہاتھ سے لے لیا۔

میں نے فردوسی بیگم کا نمبر گھمایا۔ چند ہی ساعتوں بعد کسی نے ریسیور اُٹھا لیا۔ دوسری طرف فردوسی بیگم ہی تھی۔ اس نے جس پژمردہ لہجے میں ہیلو کہا اس سے میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ بہت ہی پریشان ہے۔

"ہیلو۔ میں ہاشم خان بول رہا ہوں۔"

"سوری رانگ نمبر۔" یہ کہہ کر اس نے فوراً ہی فون بند کر دیا۔

میں ریسیور کو گھُورتا ہی رہ گیا۔ وہ میری آواز پہچانتی تھی۔ پھر۔۔۔ پھر۔۔۔ اُس نے فون کیوں بند کر دیا۔

"کیا ہوا؟" آبی نے پوچھا۔

"اس نے فون ہی بند کر دیا ہے۔ میرا خیال ہے وہ بھی کسی پریشانی میں مبتلا ہے۔"

"کسے فون کر رہے تھے آپ؟" شکیلہ نے پوچھا۔

"ایک دوست ہے ہمارا۔ میری آواز پہچانتا ہے مگر اس نے میری بات ہی نہیں سُنی۔"

"ہو سکتا ہے پولیس اس تک جا پہنچی ہو۔" شکیلہ کا ذہن تیز چلتا تھا۔

"کون تھا فون پر؟"

"وہی فردوس خان! مگر پتہ نہیں کیا ہوا ہے اُسے۔" میں نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

"اس سے ذرا ٹھہر کر بات کرو۔ میرا خیال ہے کہ وہاں بھی کوئی گڑبڑ ہے۔" آبی نے دبی آواز میں کہا۔

شکیلہ ہماری یہ گفتگو سن کر پریشان ہو گئی، بولی "کوئی خاص بات ہے تو مجھے بتائیں کسی کے بارے میں معلوم کرنا ہے تو میں پُوچھ دیتی ہوں، میری آواز تو وہ نہیں پہچانتے ہوں گے۔"

ہاں! آپ فون کریں اور پوچھیں کہ تکریم صاحب کہاں ہیں وہ کام پوچھیں تو کوئی بہانہ کر دیں۔" میں نے شکیلہ کو سمجھایا۔ اور اپنے مطلوبہ نمبر گھما دیے۔

ریسیور ہاتھ میں لے کر شکیلہ بولی۔" ہیلو میں نازیہ بول رہی ہوں مجھے تکریم صاحب سے بات کرا دیں ــــ کیا وہ گھر پر نہیں ہیں؟ ــــ جی کیا کہا آپ نے ــــ انھیں پولیس نے پکڑ لیا ہے؟ یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ! ہُوا کیا ہے؟ ــــ آپ کو نہیں معلوم؟ کیا وہ تھانے میں ہیں؟ ــــ کس تھانے میں؟ ــــ صدر تھانے میں ــــ مگر وجہ کیا ہے کچھ بتائیں تو سہی! ــــ کیا آپ کے ہاں پولیس آئی ہے۔ مگر کیوں؟ ــــ اوہ! ویری سیڈ۔ میں اُن کی کزن ہُوں۔ یہاں لاہور سے بول رہی ہوں میرے پاس وہ آپ کا فون نمبر چھوڑ گئے تھے ــ میں۔۔۔ اُن کے گھر والوں کو بتاتی ہوں ــــ میرا فون نمبر کوئی نہیں ہے میں دوبارہ رنگ کروں گی۔" یہ کہہ کر شکیلہ نے فون بند کر دیا۔

اس کی ذہانت مجھے حیران کرتی تھی۔ ہمارے لیے وہ اتنی خوبصورتی سے بات کر گئی تھی کہ کوئی اور ہوتا تو اس بات شان کر کے رہ جاتا۔

"کیا کہا ہے اُس نے؟"

"کوئی عورت بول رہی تھی۔ اس نے کہا ہے کہ تکریم صاحب کو پولیس نے صبح پکڑ لیا تھا۔ وہ اپنی خالہ کے لیے ڈاکٹر کے ہاں سے دوا لے کر گھر آئی تو اس کے دروازے پر بھی پولیس کھڑی تھی اور اب وہ اُسے بھی پریشان کر رہے ہیں۔ تکریم صاحب کو اُن لوگوں نے صدر تھانے میں بند کر رکھا ہے۔ اُس نے کہا ہے کہ میں تکریم صاحب کے گھر والوں کو بتا دوں تاکہ وہ پیروی کریں۔"

"کہاں سے پکڑا ہے انھوں نے تکریم صاحب کو؟" آبی نے پوچھا

"یہ تو اس نے نہیں بتایا۔" شکیلہ نے کندھے اُچکائے۔

"آپ کی بڑی مہربانی مس شکیلہ! آپ نے بڑی حاضر دماغی کا ثبوت دیا ہے۔ آپ کے پاس ٹیلی فون ڈائرکٹری تو ہو گی۔"

میری یہ بات سن کر شکیلہ نے الماری میں سے ڈائرکٹری نکال کر مجھے دے دی۔ میں نے اس میں سے ڈاکٹر ترمذی کا فون نمبر دیکھ کر اس کے دفتر سے رابطہ قائم کیا۔

فون اس کے کسی اہلکار نے اٹھایا۔

"ہیلو کون صاحب؟"

"جی میں قدیر بول رہا ہوں۔"

"ترمذی صاحب دفتر میں ہیں؟"

"جی ہاں کون صاحب بات کریں گے؟"

"میں ڈی ایس پی عبدالقوی بول رہا ہوں۔" یہ نام میں نے تکریم احمد سے سن رکھا تھا اس نے فوراً ہی مجھے ترمذی سے ملا دیا۔

"ہیلو میں ترمذی بول رہا ہوں۔"

"میں عبدالقوی ہوں ترمذی صاحب! کیا حال ہیں آپ کے؟"

"جی آپ کی دعا ہے کیسے کیسے زحمت فرمائی؟"

"میں۔۔۔ آپ کو مبارکباد دینا چاہتا تھا کہ اتنے خطرناک مجرموں سے آپ بچ کر نکل آئے۔"

"او جی! یہ سب اللہ کی مہربانی تھی۔ ورنہ تو میں مارا ہی گیا تھا وہ ایسے ذلیل کے بچے تھے وہ دونوں کہ بس پوچھیں مت۔ وہ پکڑے گئے کہ نہیں؟ میں تو مایوس ہو کر دفتر آ بیٹھا ہوں۔"

"ہم کوشش کر رہے ہیں۔ وہ تکریم احمد۔۔۔"

"ارے وہ بدمعاش تو اُن کے لیے عمدہ عمدہ کھانے لاتا تھا۔ وہ تو اُن کا سرغنہ لگتا ہے مجھے، دیکھنے میں بہت شریف نظر آتا ہے وہ اگر صبح اُن کے لیے ناشتہ لے کر نہ آتا تو پتہ بھی نہ چلتا کہ وہ بھی اُن کے ساتھ ہے۔ میں نے تو دیکھتے ہی کہہ دیا تھا کہ اس کو پکڑ لیں۔ وہ ساری بات بتا دے گا۔"

"اُسے تو ہم نے باندھ رکھا ہے مگر وہ کچھ بتاتا ہی نہیں۔ اور وہ مجرم بھی ہمارے ہتھے نہیں چڑھے۔ ڈاکٹر دھمن اور ڈاکٹر عالیہ تو بچارے شاید بے ہوش تھے۔"

"ہاں! اگر وہ ہوش میں ہوتے تو میں اُن کو ساتھ لے کر نکلتا مگر انھوں نے کوئی نیند آور گولیاں کھا لی تھیں۔ بچاری ڈاکٹر عالیہ سے وہ بڑا ہی غلط قسم کا بیان ٹیپ کروا رہے تھے۔ وہ بیان انھوں نے لکھ رکھا تھا جسے انھوں نے عالیہ سے زبردستی پڑھوا لیا۔ حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ ڈاکٹر دھمن تو بین الاقوامی شہرت کا مالک ہے!"

"وہ ٹیپ کہاں ہے؟"

"وہ میں نے ٹیپ ریکارڈر سے نکال کر انسپکٹر سالم علی کو دے دیا تھا مگر پتہ یہ چلا کہ اسے کسی نے صاف کر دیا تھا۔ پھر بھی اس کا کچھ حصّہ محفوظ رہ گیا لیکن اس سے کسی بات کا پتہ نہیں چلتا تھا۔"

"اس کو آپ نے صاف کر دیا ہو گا۔"

"جی نہیں! یہ کام ڈاکٹر عالیہ نے ہی کیا ہو گا جناب قوی صاحب! اُن بدمعاشوں نے تو ہمارے پیشے کو بدنام کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔"

"ہاں یہ تو ہے ڈاکٹر ترمذی۔ مگر یہ بات تو اب ثابت ہو رہی ہے کہ ڈاکٹر دھمن لوگوں کے گُردے نکال لیتا ہے۔"

"یہ بالکل غلط ہے قوی صاحب! سراسر بہتان ہے میں ان کو ذاتی طور پر جانتا ہوں۔ اگر ایسا ہو تو اس قسم کا الزام ہر سرجن پر لگ سکتا ہے۔"

"میرا یہ خیال ہے ترمذی صاحب کہ تکریم احمد کو ہم چھوڑنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اس کے خلاف کوئی ثبوت ہی نہیں مل رہا۔"

"اُسے مت چھوڑیں جناب! وہ سب کچھ جانتا ہے۔ میں خود ... کو اس سے ملوں گا میرے سامنے وہ انکار کر ہی نہیں سکتا۔"

"خیر دیکھ لیں گے آپ کی ضرورت ہوئی تو آپ کو بلوا لیں گے ... تھانے میں نہ جائیں ورنہ خواہ مخواہ بدک جائے گا وہ۔" یہ کہہ کر ... نے فون بند کر دیا۔

اس اثنا میں نجمہ بھی ہمارے قریب آ کھڑی تھی اور میری ... سے وہ سخت حیرت زدہ تھی۔ بولی۔" جناب خان صاحب! یا تو ... اصل بات بتا دیں ورنہ پھر مجھے مجبوراً پولیس کو اطلاع دینی پڑے گی۔"

"تم ابھی تک اپنی اس اکڑفوں سے باز نہیں آئی ہو مس نجمہ! ... تمھیں پتہ نہیں ہم کون ہیں۔" یہ کہہ کر آبی نے ایک دم غضبناک ہو کر دروازہ اپنے پیچھے بند کر دیا اور بڑے ہی جلے کٹے انداز میں بولا۔ ... میری بات غور سے سنو مس آنیسٹی! یہ تمھارا احسان ہے کہ ہم یہاں ہیں اور محفوظ ہیں۔ مگر اپنے اس احسان کو ضائع نہ کرو، ورنہ اچھا نہیں ہو گا جیسے ہی راستہ صاف ہُوا ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔"

"یہ کیا کرتے ہیں پیرزادہ صاحب! یہ خاتون اپنی جگہ سچی ہیں۔ ان کی پریشانی کی معقول وجہ ہے۔ میں آپ سے معذرت چاہتا ہوں مس نجمہ! آپ پریشان نہ ہوں۔ ہم آپ کو ساری بات بتا دیتے ہیں، آئیں میرے ساتھ ہم دوسرے کمرے میں بیٹھتے ہیں۔"

یہ کہہ کر میں اُن سب کو ساتھ لے کر شکیلہ کے کمرے میں جا بیٹھا۔ اور پھر میں نے بڑے ہی محتاط انداز میں بہت سے واقعات کو حذف کر کے نجمہ کو بتایا کہ کس طرح اَن گنت لوگ ایک آدمی کی درندگی کا شکار ہو رہے ہیں اور کس طرح ہم نے اُس آدمی کو باندھ لیا مگر کس طرح ہماری قسمت ہمارا ساتھ چھوڑ گئی اور ہم اس سے انتقام لیے اور اُسے بے نقاب کیے بغیر ہی اسے چھوڑ دینے پر مجبور ہو گئے۔

وہ بڑے اطمینان سے میری ساری باتیں سنتی رہی جب میں خاموش ہُوا تو وہ بہت زیادہ متاثر نظر آتی تھی، بولی۔" اگر آپ کی یہ باتیں سچ ہیں تو مجھے افسوس ہے کہ میں نے بلاوجہ آپ پر شک کیا۔ آپ کی مجبوری میری سمجھ میں آ گئی ہے۔ اب آپ میری طرف سے مطمئن ہو کر یہاں رہیں، میں کچھ نہیں کہوں گی۔"

"میں آپ سے اپنی اس گستاخی کی معافی چاہتا ہوں مس نجمہ! میں دراصل بہت پریشان ہو گیا تھا۔" آبی نے اپنے لہجے میں متانت اور لجاجت پیدا کرتے ہوئے کہا۔

وہ پہلی بار بڑے ہی دلفریب انداز میں مسکرائی، بولی۔" آپ کا وہ طیش بھی برحق تھا۔ بہرحال آپ میری طرف سے بالکل مطمئن رہیں یہ گھر اور فون آپ کے لیے کھلا ہے۔"

"اور وہ ناشتہ؟"

"وہ بھی تیار ہے، میں ابھی لاتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ شکیلہ کو ساتھ لے کر باورچی خانے میں جا گھسی۔

وہ دونوں ملازمت پیشہ عورتیں تھیں اور اُن میں ایک خاص قسم کی دلیری پیدا ہو چکی تھی۔ ایسی دلیری جو اُن کے دلوں کی صنفی اور خلقی نرمی کو سختی میں بدل گئی تھی۔ وہ بات بات پر اُوئی اوئی، اُف اُف کرنے والی عورتوں میں سے نہیں تھیں۔ سوچ سمجھ کر بات کرتی تھیں اور مدِمقابل کے دانت گن لیتی تھیں۔

ہم دونوں نے غسل خانے میں جا کر مُنہ ہاتھ دھوئے اور پھر کنگھی کر کے اپنے حلیے کو درست کرتے ہوئے ایک بار پھر شکیلہ کے بیڈ رُوم میں جا بیٹھے۔ وہاں سے اُس وقت بھی باہر نکلنا ہمارے لیے ناممکن تھا کیونکہ احساس ہمیں یہی ہو رہا تھا کہ پولیس اب بھی اس عمارت کو نرغے میں لیے ہو گی۔ بیڈ رُوم کی کھڑکیاں کچھ نہیں بتاتی تھیں وہ ایسے رُخ پر کھلتی تھیں کہ وہاں سے عمارت کا سامنے کا حصّہ نظر نہیں آتا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد ناشتے اور دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو چکے تھے۔ نجمہ نے سیدھے سیدھے پراٹھے ہی پکا لیے تھے۔ دہی بھوڑے اور تین قسم کی دالیں ساتھ تھیں۔ ہم نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا تو یہ اُمید پیدا ہوئی کہ ابھی ہم کچھ دیر اور جی سکتے ہیں۔

سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ہم تکریم احمد کی مدد کو کس طرح پہنچیں۔ اور پولیس اب فردوسی بیگم کو بھی پریشان کر رہی تھی سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ وہ فردوسی بیگم تک کیسے جا پہنچے۔ اپنے طور پر تکریم احمد تو انھیں بتا سکتا تھا کہ اس کا ٹھکانا کہاں ہے فردوسی بیگم پر ان لوگوں نے خواہ مخواہ ہی بوہٹ کی چادر ڈال دی تھی۔

جب ہم کھانے سے فارغ ہوئے تو نجمہ بولی۔" اگر آپ اجازت دیں تو میں فردوسی بیگم سے جا ملتی ہوں۔ شاید وہ کوئی کام کی بات بتا سکیں۔"

"نہیں ایسا نہ کریں۔ خدا جانے وہ کس حال میں ہے مجھے ذرا اس کی فرم کے جنرل مینیجر سے بات کرنے دیں۔"

"ہاں ضرور بات کریں اس میں کیا ہرج ہے۔" نجمہ نے مجھے اجازت دے دی۔ میں جب دوسرے کمرے میں پہنچا تو شکیلہ بھی میرے پیچھے پیچھے چلی آئی۔ اور بڑی خاموشی سے میرے قریب آ کھڑی ــــ کلب عباس دفتر ہی میں تھا جب میں نے اسے بتایا کہ میں تکریم احمد کا دوست، اختر علی ہوں۔ تو میری بات سن کر وہ قدرے حیران ہوا۔ بولا۔" فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"وہ دراصل جناب تکریم احمد کی گرفتاری کے بعد پولیس شاید فردوسی بیگم کو پریشان کر رہی ہے میں بس یہی آپ سے عرض کرنا چاہتا تھا۔"

"آپ کہاں رہتے ہیں؟"

"جی میں فردوسی بیگم کا پڑوسی ہوں اسی آبادی میں رہتا ہوں

میری بیوی کا اُن سے ملنا جلنا ہے۔"

"تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ تکریم احمد کو پولیس نے چھوڑ دیا ہے اور اب وہ اُن کے پاس پہنچ ہی رہا ہو گا۔ میں نے مس فردوسی کو تھوڑی دیر پہلے بتا دیا تھا۔"

"یہ تو بہت اچھا ہوا جناب! مجھے معلوم نہیں تھا اس لیے آپ کو زحمت دی، خدا حافظ۔" یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کلب عباس کی سفارش کام کر گئی تھی میرے ذہن سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا۔

میں نے گھوم کر دروازے کا رُخ کیا تو شکیلہ بولی "کیا خبر ملی؟"

"وہ کہہ رہا ہے کہ تکریم احمد رہا ہو گیا ہے یہ بہت اچھی خبر ہے۔"

"مگر آپ کو بہت محتاط رہنا ہو گا۔ جیسے ہی آپ فردوسی بیگم کے فلیٹ پر گئے پولیس آپ کو رسّا ڈال لے گی جناب!"

"مجھے بھی یہی ڈر ہے مگر آپ دونوں کی اس بے لوث ہمدردی کا کس منہ سے شکریہ ادا کروں مس شکیلہ میں تو ایسے سلوک کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا۔"

"کیوں ہم اتنی ہی بُری ہیں۔" اس نے آنکھیں نچاتے ہوئے کہا۔

"نہیں! آپ نہیں بلکہ ہم بہت بُرے ہیں مس! ہم نے آپ کو بہت پریشان کیا ہے۔ خدا کی قسم آپ نے بڑی وسیع القلبی کا مظاہرہ کیا ہے ورنہ ہم تو بدترین سلوک کے مستحق تھے۔" میں نے نہایت ہی سنجیدگی سے کہا میرے چہرے سے شاید بڑی ہی پریشانی ہویدا تھی۔

وہ تیزی سے بولی "آپ خواہ مخواہ محسوس کر رہے ہیں۔ ہماری جان تو آپ نے نکال ہی دی تھی مگر آپ کی باتیں سننے کے بعد ہمیں اطمینان ہو گیا ہے اور اب ہم اس اچھے مقصد کے حصول میں آپ کی جو بھی مدد ہو سکتی ہے ضرور کریں گی۔"

"میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھول سکوں گا مس شکیلہ! کوئی مرد بھی ہوتا تو شاید یوں ہمارا ساتھ نہ دیتا۔" یہ کہہ کر میں پہلے کمرے میں جا پہنچا۔ شکیلہ میرے پیچھے نہیں آئی۔ وہ شاید باورچی خانے میں جا گھسی تھی۔ آبی اور نجمہ اس وقت ایک دوسرے کو پوری طرح معاف کر چکے تھے۔ دونوں کے چہروں پر مسکراہٹ تھی۔

"کیا پتہ چلا ہے وہاں سے؟"

"یار وہ آدمی کام آ گیا، اس نے تکریم احمد کو رہا کروا کے گھر بھیج دیا ہے۔"

"یہ تو بہت ہی اچھا ہوا۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ کلب عباس خاصا بارسوخ آدمی ہے۔" آبی نے خوش ہو کر کہا۔

"ہاں معلوم تو یہی ہوتا ہے۔ بہتر مس نجمہ آپ ذرا اس عمارت سے باہر نکل کر دیکھیں کہ صورتِ حال کیا ہے اگر ممکن ہو ہم ابھی یہاں سے نکل جانا چاہتے ہیں۔"

"نہیں! آپ یہ دن تو ادھر ہی گزاریں۔ دوسرے کمرے میں سوئیں اور شام کے اندھیرے میں باہر نکلیں آپ کو کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے پیرزادہ صاحب! میرا خیال ہے ہم یہ دن ادھر سو کر گزار لیتے ہیں۔" یہ کہہ کر میں نے اپنا بریف کیس اٹھایا اور شکیلہ کے کمرے میں جا کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ آبی کے لیے ان لوگوں نے ایک اور چارپائی ڈال دی اور ہم اندر سے دروازہ بند کر کے ہر شے قدرت کے سپرد کرتے ہوئے اطمینان سے لیٹ گئے۔ ہمیں یہ فکر نہیں رہی تھی کہ وہ عورتیں ہمیں دھوکا دے جائیں گی۔ عورتوں کی سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ وہ حتی الامکان بدی اور تشدد کی راہ پر چلنے سے گریز کرتی ہیں۔ ہاں البتہ انہیں خدا اگر کہیں اقتدار دے دیتا ہے تو اُن میں جو نخوت بھر جاتی ہے وہ ناقابلِ برداشت ہوتی ہے۔ میں نے بعض چھوٹی چھوٹی استانیوں اور نرسوں کو آپے سے باہر ہوتے دیکھا ہے۔ عورتیں پڑھ لکھ کر کچھ اور زیادہ مغرور ہونے لگتی ہیں اور مردوں کو تو وہ اختیار کا چابک ہاتھ میں آتے ہی ذلیل کرنے پر تل جاتی ہیں۔ اُن دو خواتین کو بھی ہم پر اختیار تو حاصل تھا مگر اقتدار حاصل نہیں تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ خود کو اُن کے حوالے کر دینے سے ہم اُن کی دلی ہمدردیاں جیت لینے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ورنہ تو شاید وہ پہلے ہی مرحلے میں ہمارا بیڑہ غرق کر دیتیں کہ پس دیوارِ زنداں تو وہ ہمیں ڈال ہی چکی تھیں۔ تھانیدار کو تو صرف ان کے اشارے کی ضرورت تھی۔

مگر ہم ابھی لیٹے ہی تھے کہ آبی کی تیز سماعت ایک نیا گل کھلا گئی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا، بولا "یار یہ کہیں فون کر رہی ہیں جیلانی! مجھے اب بھی اُن کی نیت پر اعتبار نہیں آ رہا ہے۔" یہ کہہ کر اُس نے تیزی سے دروازے کی چٹخنیاں گرائیں مگر معلوم یہ ہوا کہ دروازہ انھوں نے باہر سے بڑے ہی غیر محسوس طریقے سے بند کر دیا تھا۔ اور ہماری تمام کہانی اُن کے ہاتھ لگ چکی تھی۔

"دیکھا میں نہ کہتا تھا کہ یہ اندھا دھند اعتبار ہمیں ڈبو لے گا۔"

"یہ تم نے کب کہا تھا۔ تم خود اُن دونوں پر ریشہ خطمی ہو رہے تھے۔" میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

آبی پاگلوں کی طرح پیچھے ہٹا اور اُس نے عقبی کھڑکی کھول دی۔ اُس میں گرل تو لگی تھی مگر جالی سے وہ بے نیاز رکھی گئی تھی۔ آبی نے گرل میں سے ہاتھ باہر نکال کر کسی چیز کو اندر کی طرف کھینچا۔ وہ دراصل ٹیلیفون کا تار تھا۔ اسے دیکھتے ہی میں نے سنگار میز پر سے اُن کا ناخن تراش اٹھایا اور اُس کے دانتوں میں رکھ کر کاٹ دیا۔

وقت تک وہ ٹیلیفون کے نمبر ہی گھماتی رہی تھیں۔ آبی کا یہی تھا۔ وہ زینے میں آتے وحشی کی طرح پھر لاؤنج میں کھلنے والے دروازے پر جا کھڑا۔ وہ بُری طرح دانت پیس رہا تھا حالت ایسی تھی جیسے اُس کے پاؤں تلے آئی دُوال ٹوٹ گئی ہو۔ اور اُس کے اختیار سے باہر نکلا جا رہا ہو۔ دروازے کے ساتھ ایک کھڑکی تھی۔ آبی نے بڑی آہستگی سے اس کے ذرا سے پٹ کھول دیے۔ لاؤنج میں کوئی نہیں تھا۔ دیوار کی دوسری طرف سے اب ٹیلیفون کی گھرگھر کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ کھڑکی میں اگر گرل نہ لگی ہوتی تو آبی اس میں سے کود کر باہر نکل جاتا مگر وہ لوہے کی مضبوط گرل ہمارا راستہ روک رہی تھی اور باہر سے دروازے پر چڑھی کنڈی اس بات کا واضح ثبوت تھی کہ وہ عورتیں ہمیں اعتماد میں لے کر ہم سے سب کچھ اگلوا لینے کے بعد اب ہم سے کوئی ہاتھ کرنے جا رہی تھیں۔ اُن کی مذہبیوں کے چھرّے سیدھے ہمارے دل میں اُترے چلے آ رہے تھے۔ اُن کی چکنی چپڑی باتیں، اُن کا پُرتکلف کھانا سب کچھ ہمارے لیے ایک جال ثابت ہو رہا تھا۔ وہ تو شکر ہے کہ اُن کے ہاں کوئی زہریلی دوا نہیں تھی۔ ورنہ وہ ہمیں کھانے میں ڈال کر ہمارا قصّہ پاک کر دیتیں۔ وہ عیار مکار عورتیں ہمیں جھوتیاں کھلا کر تباہ کر سکتی تھیں عین اُس وقت نجمہ بلی ایسی احتیاط سے لاؤنج میں نکلی۔ وہ ننگے پاؤں تھی اور بے آواز چل رہی تھی۔ اُس کا رُخ بڑے دروازے کی طرف تھا۔ جو راہداری میں کھلتا تھا۔ اس کو دیکھتے ہی آبی نے میرا سائلینسر لگا پستول ہاتھ میں لیا اور کھڑکی کے دونوں پٹ کھول کر بولا "تم کہاں جا رہی ہو مس نجمہ!" اُس کا لہجہ اتنا غضبناک تھا کہ نجمہ سُن ہو کر رہ گئی مگر ایک لحظے کے لیے۔ اور پھر وہ اچھل کر دروازے تک جا پہنچی۔ اُس کے ارادے کی خباثت کو سمجھتے ہی آبی نے اس کی پنڈلی کو تاک کر گولی چلا دی اور یہ آبی کی بہت بڑی غلطی تھی۔ نجمہ نے ایسی ہولناک چیخ ماری کہ سارا فلیٹ لرز اٹھا۔ وہ تڑپ کر پیچھے گری تو شکیلہ دوڑتی ہوئی اُس طرف لپکی۔ "یہ دروازہ کھول دے ذلیل ورنہ دوسری گولی تیرے مغز میں لگے گی۔" آبی نے اُسے دبی آواز میں للکارتے ہوئے کہا۔ شکیلہ ابھی لاؤنج کے وسط میں تھی۔ وہ اُن کی آواز سُن کر منجمد ہو کر رہ گئی۔ "یہ دروازہ کھول! ورنہ اچھا نہ ہو گا۔" آبی نے اُسے پھر للکارا۔ شکیلہ کا رنگ زرد ہو گیا تھا۔ وہ لرزتی کانپتی پیچھے ہٹی اور دروازے پر آ کر چٹخنی کھول دی۔ دروازہ کھلتے ہی آبی نے شکیلہ کو کھینچ کر میری طرف پھینکا اور لپک کر نجمہ کے پاس جا پہنچا وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ گولی کا زخم تو پنڈلی چھید گیا تھا مگر اس خوف اور صدمے نے اُسکے ہوش و حواس چھین لیے تھے۔ آبی اُسے کھینچ کر کمرے میں لے آیا، کتے کی لاش کی طرح وہ اُسے گھسیٹ لایا تھا۔ عین اُس وقت بڑے دروازے پر کسی نے بڑی افراتفری میں دستک دی۔

"کیا ہوا ہے بیٹی! یہ چیخ کیسی تھی؟" وہ کسی ہمسائی کی آواز تھی۔ آبی تیزی سے لاؤنج میں نکلا، اور گلو کی آواز کی نقل اتارتے ہوئے بے ساختہ ہنس کر بولا۔

"کچھ نہیں جی! بیگم صاحب پر چھپکلی آ گری تھی۔"

اُس کی اداکاری نے تو مجھے حیران کر دیا۔ اُس کی آواز اور اُس کا لب و لہجہ بالکل گلو ایسا تھا، دستک رُک گئی۔

"ہائے میں تو ڈر ہی گئی تھی گلو۔ ادھر موئی پولیس پھر رہی تھی آج۔ پتہ نہیں کیا ہوا تھا۔" ہمسائی کی آواز پیچھے ہٹتی چلی گئی۔ اس مصیبت کو ٹلاتے ہی آبی کمرے میں گھسا اور شکیلہ کو بالوں سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔ "یہ ٹیلیفون پر کس سے بات کر رہی تھیں تم؟"

"وہ۔۔۔ وہ میرا کوئی قصور نہیں تھا۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ چاہتی تھی کہ پولیس کو خبردار کر دیا جائے۔"

"ہوں! تو یہ بات تھی۔ میرا اندازہ دُرست نکلا۔ کسی سے بات کی تھی تم نے۔"

"ابھی تو ہم نمبر ہی ملا رہے تھے کہ ٹیلیفون 'ڈیڈ' ہو گیا۔"

"جھوٹ مت بول۔ میں تم دونوں کا خون پی لوں گا۔ بتاؤ کس کو اطلاع دی ہے تم نے؟"

"میں قسم کھاتی ہوں جناب! ابھی ہم نمبر ہی ملا رہے تھے مگر نمبر بزی تھا۔ پھر لائن ہی کٹ گئی۔"

"تمھاری لائن بھی اب ہم کاٹ کر ہی جائیں گے۔ یہ باہر کیوں جا رہی تھی؟"

"جب فون کٹ گیا تو نجمہ چاہتی تھی کہ خود باہر جا کر کسی کو بتا دے۔"

"ہمیں گرفتار کرنے کا فیصلہ تم نے کب کیا؟"

"ابھی جب آپ ادھر لیٹ گئے تو نجمہ نے کہا کہ ہمیں چاہیے کہ ہم پولیس کو سب کچھ بتا دیں۔ پتہ نہیں یہ کتنے خوفناک مجرم ہیں۔ ان کو گرفتار کروانا بہت ضروری ہے، نجمہ یہی کہہ رہی تھی۔" شکیلہ نے اپنے بالوں کے ساتھ گھسٹتے ہوئے کہا۔ آبی اُسے اپنے گرد نچانے لگا تھا۔

"یہ کنڈی کس نے چڑھائی تھی؟"

"یہ نجمہ نے ہی چڑھائی تھی جناب! حالانکہ میں اُسے روک رہی تھی۔ میں تو ہر حال میں آپ کو محفوظ رکھنا چاہتی تھی مگر نجمہ نے مجھے ڈانٹ دیا۔"

"اور تم اتنی ... ہو کہ مان گئیں۔ ہماری بھی اب ایک بات مانو اور اپنی یہ میکسی ہمارے سامنے اتار دو۔"

آپی کی یہ بات سنتے ہی اُس لڑکی کے بدن پر ایسا رعشہ طاری ہُوا کہ میں سمجھا وہ وہیں جان دے دے گی۔ اس کی آنکھوں کی وہ دہشت میں آج تک نہیں بھول سکا ہوں۔ وہ بلاشبہ بہت ہی معصوم اور بھولی بھالی عصمت مآب لڑکی تھی۔ وہ آپی کے تعمیلِ حکم کے تصور سے ہی لرزنے لگی تھی۔

"نہیں یار! اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے یہ بالکل بے قصور نظر آتی ہے چھوڑ دے اسے۔ یہ سارا قصور اس بے ہوش بانو کا ہے۔"

یہ بات میں نے بڑے ہی مصالحانہ لہجے میں کہی اور پھر آپی کے ہاتھ سے میں نے شکیلہ کے بال چھڑا دیے۔ وہ بڑی ہی ممنونیت سے بھرپور نظروں سے مجھے دیکھنے لگی مگر رنگ اُس کا اب بھی ہلدی ہو رہا تھا۔

"اطمینان سے بیٹھو بی بی! ہم تمھیں کچھ نہیں کہیں گے۔" یہ کہہ کر میں نے شکیلہ کو پلنگ پر بٹھا دیا مگر آپی کو اطمینان نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے جھپٹ کر دیوار پر لٹکتا ایک دوپٹہ اٹھایا اور اس کے کئی ٹکڑے کر کے اس نے نہایت ہی بے رحمی سے شکیلہ کو جانور ایسی سزا دیتے ہوئے کچھ اس طرح باندھ دیا کہ اب وہ نہ تو بول سکتی تھی اور نہ ہی اپنی جگہ سے ہل سکتی تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں باندھنے کے علاوہ آپی نے اُس کے منہ میں بھی کپاری ڈال دی تھی۔

میری نظریں اب نجمہ پر جمی تھیں۔ گولی اس کی پنڈلی کو چھیدتی ہوئی گوشت میں سے گزر گئی تھی اور اس کے زخم سے ابھی تک خون بہہ رہا تھا۔ میں نے سنگار میز پر پڑے پاؤڈروں کے ڈبوں میں سے ایک ڈبہ اٹھا کر اس کے زخم میں اچھی طرح بھر دیا۔ زخم اُوپر کی تہہ پر آیا تھا اور یہی کوئی آدھ انچ سے بھی کم گہرا تھا۔ پاؤڈر سے وہ زخم بھر کر میں نے اُس پر پٹی اس طرح کس کر باندھی کہ خون کا بہاؤ فوراً ہی رُک گیا۔ نجمہ ابھی تک بے ہوش تھی۔

جیسے ہی میں اس کی مرہم پٹی سے فارغ ہوا، آپی نے پلنگ کے نیچے پڑے دو ٹرنک کھینچ کر کھول لیے۔ دونوں ٹرنکوں میں زنانہ کپڑے بھرے تھے۔ ایک ٹرنک میں سیاہ رنگ کا بڑا ہی خوبصورت سِلا ہوا برقعہ تھا۔ آپی نے اسے دیکھ کر فوراً ہی باہر نکال لیا۔

"یہ کیا کرو گے، کسے پہناؤ گے یہ؟"

"پہنہ نہیں، میرا خیال ہے یہ ہمارے کام آ سکتا ہے۔" اُس نے برقعے کی لمبائی کا اپنے قد سے موازنہ کرتے ہوئے کہا۔ دائیں ہاتھ ایک خوبصورت سی چوبی الماری تھی جس پر تالا لگا ہُوا تھا۔ آپی نے اُس کے کنڈے کے اندر پستول کی نالی ڈال کر ذرا سا جھٹکا جو دیا تو وہ تالا کھل گیا۔ اس الماری میں بھی کپڑے ٹنگے تھے۔ اُس کے ایک حصے میں تین خانے تھے۔ ان کو بھی آپی نے کھول دیا۔ اُن میں سے ہمیں تین ہزار روپے نقد، کچھ زیور اور دو گھڑیاں ملیں، انھیں آپی نے وہیں رکھ دیا۔

"یہ کیا کر رہے ہو تم؟"

"دیکھنا تو چاہیے کہ ان لوگوں کے پاس ہے کیا کچھ؟"

کمرے کی اچھی طرح تلاشی لے کر وہ دوسرے کمرے میں جا گھُسا۔ میں بھی اُس کے ساتھ تھا۔ اس کمرے سے بھی ہمیں ویسی ہی چیزیں ملیں۔ کپڑے ہی کپڑے، رنگ رنگ کی میکسیاں، فراک اور گرم سویٹر۔ وہ نجمہ کا کمرہ تھا۔ وہاں ہمیں نہ تو کوئی زیور نظر آیا اور نہ کوئی نقدی ہی مل سکی۔ البتہ ایک ویسا ہی فاختئی رنگ کا خوبصورت برقعہ ہمیں وہاں سے دستیاب ہو گیا۔ آپی بولا "یار اس مصیبت خانے سے نکل چل۔"

"مگر کس طرح بھئی! ادھر تو وہ ابھی تک ہمارے انتظار میں کھڑے ہوں گے۔"

"اُن کے درمیان سے ہمیں نکلنا ہو گا۔"

نجمہ کی ایک پُس پُس کرتی نرم شلوار پہن کر اُس نے کمر بند کر لیا۔ وہ شلوار اُسے بالکل پوری تھی۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے نجمہ کی قمیص اور اُس کے نیچے پہننے کے کپڑے ٹرنک سے نکالے اور اُن کو باری باری بدن پر چڑھا کر سنگار میز کے سامنے جا کھڑا اور بولا "کہو کیسی لگ رہی ہوں میں؟" وہ مسکرانے لگا تھا۔ اُس کے ذہنی اضطراب میں کچھ کمی آنے لگی تھی۔ "بالکل مِس نجمہ لگ رہی ہوں نا! اور یہ دیکھو یہ رہی وِگ ۔ یہ بھی کام آئے گی۔" اُس نے سنگار میز کے پہلو میں رکھی الماری میں سے ایک لمبے تا بہ کمر لٹکتے بالوں کی خوبصورت وِگ اٹھا کر سر پر رکھ لی۔ اس کے بعد وہ چہرے پر غازے کی تہہ جمانے لگا۔ اب وہ آنکھوں میں کاجل بھی لگا چکا تھا۔ اتنا کچھ کر لینے کے باوجود اُس کی دو دن کی بڑھی ہوئی داڑھی کباب میں ہڈی بن رہی تھی۔

"یار! اِس داڑھی کا کیا کروں؟" وہ سنگار میز کی درازوں میں ہاتھ مارتے ہوئے بولا "لے اس کا بھی حل نکل آیا۔ یہ گلّو کا سیفٹی ریزر ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ لگا داڑھی کو صابن اور پہلے یہ گھاس کاٹ لے۔"

میں نے غسل خانے میں شیونگ کریم اور برش دیکھ رکھے تھے۔ وہ میں اُن کے لیے اُٹھا لایا۔ ہم دونوں نے پہلے تو اپنی داڑھیوں اور مونچھوں کو رگڑ رگڑ کر صاف کیا اور پھر چہروں پر غازہ سُرخی مل کر آنکھوں میں یہ ڈھیر سارا کاجل بھی لگا لیا۔ آپی کی تجویز میں مجھے جان نظر آتی تھی جب ہم اُن عورتوں کے نرم نرم لباس پہن کر برقعے اوڑھ چکے تو احساس ہمیں یہ ہُوا کہ نزاکت بھی اب آ ہی جائے گی۔ ہم نے اُن کی سینڈلیں پاؤں میں پھنسا کر دیکھیں، وہ کام دے گئیں۔ ہمیشہ سے بوٹوں میں بند رہنے کی وجہ سے ہمارے پاؤں میں بھی عجیب سی زنانہ قسم کی نرمی پیدا ہو چکی تھی۔ اور وہ جسم کے مقابلے میں زیادہ چٹّے بھی نظر آتے تھے۔ پوری طرح زنانہ ساز و سامان سے لیس ہو کر ہم نے نجمہ کو بھی کس کر جکڑ دیا اور پھر بڑے اطمینان سے ہم فلیٹ کے بڑے دروازے سے نکل کر برآمدے میں جا پہنچے۔ دائیں بائیں اُس گھڑی ہمیں کوئی آدمی نظر نہیں آ رہا تھا۔

[...]ں کی وجہ سے زندگی میں وہ عام دنوں ایسی ہماہمی نہیں رہتی ہے۔ [...]یسی کیفیت ہی اس وقت اس عمارت پر بھی طاری تھی۔ ہم سیڑھیاں [...] طے کر رہے، یوں جیسے سارے جہان کی نزاکت ہمارے وجود میں سمو [...]ئی ہے۔ آپی کی چال میں اُس کی اداکاری کی بے پناہ صلاحیتوں کی وجہ سے [...]ب سا لوچ اور مدھ بھری تھرکن پیدا ہو گئی تھی۔ اُس نے نوٹوں کیا [...]ان کی چاندی کی لچھیاں بھی پہن آیا تھا اور یوں مٹک مٹک کر [...]ل رہا تھا جیسے کوئی پری وش مشقِ ناز میں محو ہو۔ میں بھی جوں توں [...]ر کے اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ ایک ہاتھ میں میں نے نجمہ کا پرس لٹکا [...]یا تھا اور دوسرے ہاتھ میں بریف کیس تھامے ہوئے تھا۔

عمارت سے باہر نکلنے کا راستہ ایک ہی تھا۔ دوسری اور پہلی منزل کی سیڑھیوں کی چوکیوں پر پولیس کے سپاہی کھڑے نظر آئے۔ مگر ہم نقاب گرائے بڑے ہی لیے دیے انداز میں چلتے ہوئے ان کے قریب سے یوں گزر گئے کہ انھیں احساس تک نہ ہو سکا کہ وہ پرندے اُڑے جا رہے ہیں جن کے لیے وہ وہاں متعیّن ہیں۔ میری رہنمائی آپی کر رہا تھا اور یہ اُسی کا حوصلہ تھا کہ وہ اپنے پیچھے خوشبوؤں کی مہکار چھوڑتے ہوئے بڑے اطمینان سے ان سپاہیوں کے پاس سے گزر گیا تھا۔

ہم نیچے پہنچ کر جب عمارت کے بڑے دروازے میں سے گزرنے لگے تو وہاں بھی ہمیں اِدھر اُدھر چار پانچ سپاہی نظر آئے۔ عمارت سے نکلنے کا صرف ایک ہی دروازہ تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ سپاہی اِدھر اُدھر ہٹ گئے۔ دروازے سے چند قدم دُور ہمیں وہ ٹیکسی بھی نظر آئی جس میں بیٹھ کر ہم وہاں پہنچے تھے۔ ٹیکسی کے قریب وہ ڈرائیور بھی موجود تھا اور ایک تھانیدار بھی۔ اُن کو نظر انداز کرتے ہوئے ہم آگے نکلے تو ایک ٹیکسی ہمارے قریب آ کر آہستہ ہو گئی اور ہم دونوں بھیڑیے کی دھار سے بچ نکلنے والے ڈرے سہمے خرگوشوں کی طرح فوراً ہی اس کے اندر بیٹھ گئے۔

"کہاں چلنا ہے بی بی؟" ڈرائیور کے سوال نے ہمیں مخلوج کر دیا۔ وہ کوئی بڑا ہی میش چینٹم سا آدمی تھا یا شاید ہمیں وہ زنانہ سواریاں سمجھ کر جھینپ رہا تھا۔ بات کرتے وقت نگاہ نہیں اٹھاتا تھا۔ آپی کے قربان جائیے، بڑے خوبصورت نسائی لہجے میں بولا۔ "اسٹار گیٹ۔"

میں تو عش عش کر اُٹھا۔ اُس سالے کو تو کسی سرکس میں ہونا چاہیے تھا۔ دھوپ اُس گھڑی کچھ ماند پڑ گئی تھی۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ اور ہوا میں عجیب سا نم آلود میٹھا گھمر رچا ہوا تھا۔ ٹیکسی چلی تو ہماری جان میں جان آئی۔ میری طبیعت سگریٹ کے لیے بُری طرح مچل رہی تھی۔ مگر ایک برقع ہمارے اوپر تھا اور ایک برقع رمضان نے ہمارے سر پر ڈال رکھا تھا۔

اسٹار گیٹ سے بہت پہلے اس ڈرائیور نے ایک جگہ اچانک بریک لگا دی۔ دو آدمی فٹ پاتھ پر کھڑے تھے۔ ایک نے اگلے حصے کی کھڑکی میں سے سر اندر ڈال کر ہمیں دیکھا اور پھر ڈرائیور کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا "ٹھیک ہے ماموں! سواریاں ٹھکانے پر پہنچا دو۔ پھر بات کریں گے، آج تمھارا بھی روزہ کھلوا دیں گے۔ تمھاری آج کی دونوں رپورٹیں اچھی ہیں۔"

وہ میش چینٹم ڈرائیور مسمسی صورت بنا کر مسکرایا۔ "تم لوگوں کے یار ہو اُستاد! میں وہاں دیکھتا رہ جاؤں اسٹار گیٹ تک ہو کے میں ابھی آیا۔" یہ کہہ کر اُس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ وہ آدمی شہدوں کی طرح ہمیں برقعوں کے اندر نظروں میں ٹٹولتا ہُوا پیچھے ہٹ گیا۔ ایک عجیب سا ہوسناک تاثر اس کے چہرے پر ابھر آیا تھا۔ کوئی بہت ہی سفلہ آدمی تھا وہ اور شکل سے ہی کمینہ نظر آتا تھا۔ میں تو سمجھا وہ سالا کوئی پاکٹ مار ہے۔ یوں چبا چبا کر بات کرتا تھا جیسے اس کے گالوں میں چاول بھرے ہوں۔

کراچی شہر ہم دونوں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ راہ رستے کا ہمیں کوئی علم نہیں تھا۔ ہمیں معلوم ہی نہیں ہو سکا کہ وہ ڈرائیور کس راستے سے ہو کر کس طرف نکل رہا ہے۔ ہم دونوں نقاب گرا کر بڑے اطمینان سے پچھلی نشست پر بیٹھے رہے۔ آپی میرے اندرونی اضطراب سے پوری طرح آگاہ تھا مگر وہ بار بار میرا ہاتھ دبا دیتا تھا کہ میں چُپ رہوں اور بس دیکھتا جاؤں۔ ہمارا خیال یہ تھا کہ ڈرائیور ہم سے زیادہ پیسے وصول کرنے کے لیے خواہ مخواہ گاڑی کو لمبے راستے پر ڈال چکا ہے۔ اچانک مجھے ایک بہت بڑی کوٹھی کے گیٹ پر پگانوالہ ہاؤس کا بورڈ نظر آیا۔ تو میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ یہ نام گجرات سے وابستہ ہے۔ اس شہر کی کئی یادیں میرے ذہن میں کلبلانے لگیں۔ ماضی کبھی کبھی عجیب انداز سے لوٹتی لہر کی طرح آدمی پر حاوی ہونے لگتا ہے۔ گجرات سے آگے کنجاہ ہے اور کنجاہ سے آگے اکبر کوٹ ہے اور وہاں کبھی ایک چوہدری ہادی علی بھی زندہ تھا اور اب اس کی حویلی میں وہ پری وش مسند آرا رہ رہی ہو گی جسے شیر دل آہو اور سروری بیگم اپنے کباب کی ہڈی سمجھتے تھے۔ ماضی کی اَن گنت یادیں بیلی کی تلوار کی طرح میرے دل میں گھاؤ ڈالنے لگی تھیں۔ پگانوالہ ہاؤس میری نظروں سے اوجھل ہُوا تو مجھے محسوس ہُوا کہ ڈرائیور بڑی سڑک سے اُتر کر اس آبادی کے عقبی حصّے میں جا پہنچا ہے۔ اُس کی رفتار کچھ زیادہ ہی تیز ہو گئی تھی۔ ہم سمجھے کہ ہم اسٹار گیٹ کی طرف بڑھ رہے ہیں مگر نہیں۔

ڈرائیور نے اچانک ہی گاڑی ایک تین منزلہ عمارت کے کھلے دروازے میں داخل کر دی۔ اب وہ ایک ڈھلان پر گاڑی دوڑا رہا تھا۔ معلوم یہ ہُوا کہ اس نے جان بُوجھ کر گاڑی اس عمارت کے تہہ خانے میں پہنچا دی ہے۔ تب پہلی بار مجھے اور آپی کو یہ احساس ہوا کہ

وہ سالا جگت ماموں ہمیں اغوا کر لایا تھا۔ جیسے ہی اُس نے گاڑی روکی، تہہ خانے میں کئی بلب ایک دم جگمگا اُٹھے۔ ہمارے سامنے وہی دو لفنگے کھڑے تھے جن سے ماموں نے راستے میں رُک کر بات کی تھی۔ اور جن میں سے ایک نے کہا تھا کہ تمھاری آج کی دونوں رپورٹیں اچھی ہیں۔ اُس نے آج ماموں کا بھی روزہ کھلوا دینے کا وعدہ کیا تھا۔ میرے ذہن میں پہلا جھماکا تو یہ ہُوا کہ ہمیں پولیس کے خفیہ ہاتھوں نے غیر محسوس طریقے سے اپنے جال میں پھانس لیا ہے۔ وہ لوگ ہمیں اس عمارت سے نکلتے ہی پہچان گئے تھے۔ اور کوئی شور شرابا مچائے بغیر انھوں نے وہاں سے ہمیں اپنے منصوبے کے مطابق فرار ہونے کا موقع دیا اور اب اپنے جال کی طرف وہ ہمیں یُوں ہانک لائے تھے کہ ہمیں ہوش ہی جب آیا جب ہم بے بس ہو چکے تھے۔ آبی نے یُوں کیا تھا کہ اپنے برقعے کے دوہرے نقاب کا موٹا حصّہ اپنی ناک کے اُوپر سے گزار کر طرح دار عورتوں کی طرح دوسری طرف کان کے قریب باندھ لیا تھا اور اب اس کے نقاب کے مہین پردے میں سے اُس کی کاجل بھری آنکھیں اور سیاہ ابروئیں یوں نظر آ رہے تھے جیسے وہ کوئی نو گرفتہ غزال ہے۔ اس کی آنکھیں ویسے ہی بہت خوبصورت تھیں مگر سرمئی ہونے سے سیاہ نقاب کے اندر وہ اور بھی غضب ڈھا رہی تھیں۔ اُس کی دیکھا دیکھی میں نے بھی وُہی کچھ کیا تھا اور میری آنکھوں کا تاثر بھی شاید کچھ کم قیامت خیز نہیں تھا۔ میرا احساس یہی تھا۔ اُس حلیے کو اپنا لینے سے ایک خواہ مخواہ کا زنخلا پن ہمارے اندر اُبھرنے لگا تھا۔

تہہ خانہ خاصا وسیع تھا۔ یُوں لگتا تھا جیسے اس عمارت کے نیچے ستونوں کا ایک میلا لگا ہے اور اُن کے بیچوں بیچ راستے بنے ہیں جیسے ہی ماموں نے ٹیکسی روکی اور تہہ خانے کی بتیاں جل اُٹھیں تو سامنے کھڑے دونوں آدمیوں نے بڑے معنی خیز انداز سے ایک دُوسرے کی طرف دیکھا۔ ماموں تیزی سے دروازہ کھول کر اُن کے پاس جا پہنچا۔

"یارا! یہ کیا قصّہ ہے؟ کہیں یہ خفیہ پلسیئے تو نہیں؟" آبی نے میری طرف جُھک کر سرگوشی کی۔

"مجھے بھی یہی شبہ ہے آبی! اُن کی مونچھیں اور بالوں کی وضع قطع تو ویسی ہی ہے۔"

"یہ بافندگی دکھانے کا وقت نہیں ہے جیلانی! ذرا سنبھل کر بیٹھ یار! ہم کہیں خواہ مخواہ ہی نہ تلے جائیں۔" آبی نے اپنی ریشمی قمیص کے نیچے ہاتھ ڈال دیا۔ وہاں اس نے کمر پر پستول باندھ رکھا تھا، پھر آہستہ سے بولا: "لعنت ہے یار ہم پر بھی۔ مجھے تو لگتا ہے میری جنس ہی بدل گئی ہے۔"

ابھی وہ یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ اُن دونوں آدمیوں نے گاڑی کے پچھلے دونوں دروازے کھول دیے۔

"لو بئی ماموں! اپنی ان بھانجیوں کو عزت سے بٹھا کر نہ بٹھا۔ چل اِدھر۔"

"نہیں اوستاد! اب تو جان اور تیرا کام۔ بس اپن کی نیبر اِدھر رکھ دے اپن رستہ ناپتا ہے۔"

"اور وہ تیرا روزہ!" استاد نے آبی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ایک تیز دھار نوکیلا خنجر اس نے بڑی بے پروائی سے بائیں ہاتھ کی دو انگلیوں میں نوک سے پکڑ رکھا تھا۔ ماموں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔

دُوسرے ہاتھ کھڑا آدمی بولا: "مسوُق جی! اب باہر بھی نکل آؤ رنجاں پھر ماؤ۔ اکھیاں دکھاتے ہو جرا چہرہ بھی دکھا دو۔" وہ آبی سے مخاطب تھا اور ایک چمکیلا خنجر اس نے بھی تھام رکھا تھا اپنے سیدھے ہاتھ میں۔

"کیا بات ہے باکھل! یہ کیا ہو رہا ہے یہاں؟" ایک بھاری بھرکم آواز گاڑی کے عقب میں ابھری۔

"کیانی بابا! یہ آپ کے ناشتے اور نظرانے کے لیے کچھ مال لایا ہے ماموں کانجن۔ آؤ جانم اینڈ خانم اب باہر بھی آ جاؤ۔" باکھل نے ہمیں اشارا کرتے ہوئے کہا۔

آبی نے میرے پہلو میں چٹکی لی اور بڑی ادا سے اپنے نیل پالش لگے ناخنوں کی نمائش کرتا ہوا ٹیکسی سے اُترا۔ میں بھی اس کے پیچھے باہر نکل گیا۔

"بھئی واہ ماشاءاللہ! باکھل بڑی سرو قد چیزیں لائے ہو آج تو۔ دیکھو تو اس تہہ خانے میں گلزار کھلا دیا ہے تم نے۔" کیانی ہمیں سر سے پاؤں تک بڑے غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ وہ بھی آبی کی چشم سُرمہ سا کو دیکھ کر بھونچکا سا رہ گیا تھا۔ آبی نے اپنے پاؤں کے ساتھ ساتھ میرے پاؤں کے ناخنوں پر بھی نیل پالش لگا دی تھی اور وہ اُن خوبصورت سے نازک نازک سلیپروں پر فدا ہو رہا تھا۔ کیانی بابا جس کی عمر یہی کوئی چالیس سال ہوگی۔

"اِن کے ساتھ کوئی زیادتی تو نہیں کی تم لوگوں نے؟"

"جی نہیں کیانی بابا! مال جیسا ملا ویسا ہی بغیر ملاوٹ کے آپ تک پہنچا دیا ہے۔" ماموں کانجن نے کہا۔

"یہ اپنی مرضی سے آئی ہیں؟" کیانی بابا نے ہمیں بلبوں کی تیز روشنی میں گھورتے ہوئے کہا۔ ہم دونوں عمداً خاموش کھڑے تھے کہتے تو کیا کہتے۔ اور آبی کئی بار میری پسلی میں انگلی مار کر مجھے جتا چکا تھا کہ ہمیں بالکل خاموش رہنا چاہیے تاکہ معلوم تو ہو سکے کہ سالے چاہتے کیا ہیں اور ہمارے ساتھ کرتے کیا ہیں حالانکہ یہ سوال ہی احمقانہ تھا۔ آبی کو پتہ ہونا چاہیے تھا کہ مغویہ کے ساتھ لوگ کیا کرتے ہیں۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات تو نہیں تھی مگر بعض اوقات آبی کے مشورے ہمیں عملی طور پر لے ڈوبتے تھے اور اس روز بھی یہی ہو رہا تھا۔

کیانی بابا، کچھ حیران سا ہو رہا تھا، بولا: "یہ اپنے مُنہ سے تو کچھ بھی نہیں کہتی ہیں۔ اگر یہ اپنی مرضی سے آئی ہیں تو اِن کو کھاؤ تاؤ کی بات تو کرنی چاہیے۔ ذرا یہ نقاب تو اُتار دو جانِ کیانی!"

اُس بدبخت نے ہاتھ بڑھا کر آبی کے چہرے سے مہین نقاب اٹھا دیا مگر ابھی اس کی ناک پر جما نقاب کان کی ایک لو سے دوسری لو کو چھپائے ہوئے تھا۔ آبی کی وہ چمکتی ہوئی دنبالہ دار سرمے کی زد میں آئی خوبصورت آنکھیں دیکھ کر کیانی بابا کے چہرے پر رونق سی آگئی۔ بولا: "اب یہ پردہ بھی اُتار دو میری جان! اب خود چل کر آئی ہو تو پھر یہ پردہ کیسا؟" یہ کہہ کر اس نے آبی کی ناک پر سے بھی نقاب نوچ لیا۔ آبی نے یُوں کیا کہ بڑے ہی نستعلیق انداز میں مخنثوں کی طرح آنکھیں جھکا کر مؤدب کھڑا ہو گیا۔

اُس کے چہرے کے وہ کھُردرے نقوش دیکھ کر کیانی بابا پر جب حقیقت عیاں ہوئی تو وہ چیخ کر بولا: "یہ تم کن خسروں کو اُٹھا لائے ہو کمینو۔ یہ میں کیا دیکھ رہا ہُوں۔ کون ہو تم بدذاتو!"

کیانی نے میرے برقعے کا گریبان پکڑ کر مجھے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ وہ ایک دم کف دردھن ہو گیا تھا۔ میں نے دائیں ہاتھ میں اس کی کلائی پکڑ کر جوڑ پر انگوٹھے کا دباؤ ڈالا تو اُس کی کلائی کا جوڑ کھُل گیا۔ ہلکی سی کڑک کی آواز اُبھری تو وہ زخمی کُتّے کی طرح چیختا ہُوا وہیں بیٹھ گیا۔ اس کی وہ بے پناہ چیخیں میں آج تک نہیں بھُول سکا ہُوں۔ اپنا دایاں ہاتھ اُس نے دونوں رانوں میں دبا لیا تھا۔ استاد باکھل ماموں کانجن اور اُن کا تیسرا ساتھی اُس سے لپٹ سے گئے۔

"یہ کیا کر دیا ہے تم نے کیانی بابا کو۔" استاد باکھل نے اپنے آقا کی اُن چیخوں پر تلملاتے ہوئے کہا۔ اپنا وہ نوکیلا خنجر اُس نے سیدھے ہاتھ میں لے کر مجھے گریبان سے پکڑ کر جھنجھوڑنا چاہا۔ میرے بائیں ہاتھ میں بریف کیس تھا اور اپنے دفاع میں مَیں صرف دایاں ہاتھ ہی استعمال کر سکتا تھا۔ آبی مجھ سے دو قدم دُور کھڑا تھا۔ جیسے ہی باکھل نے میرے برقعے کو گریبان سے پکڑا۔ میں نے اپنا ہاتھ پیچھے لے جا کر اپنے وجود کی پوری قوت سے اُس کے جبڑوں میں گھونسا کچھ اس طرح مارا کہ وہ لڑکھڑا کر پیچھے کی طرف گرا۔ کانجن اور اس کا دُوسرا ساتھی یہ بگڑتی ہوئی صورت حال دیکھ کر اپنی جگہ منجمد ہو کر رہ گئے۔ ابھی کانجن کا ساتھی خنجر لہرا بھی نہ پایا تھا کہ آبی نے پستول نکال کر اس کے سامنے کر دیا۔ اور اُس کے سر کے اُوپر سے گولی چلاتے ہوئے بولا: "بچّے ذرا سنبھل کر رہ! تیرے تو ابھی دُودھ کے دانت بھی نہیں گرے ہیں۔" یہ کہہ کر آبی نے اس کے ہاتھ سے وہ خنجر یُوں کھینچ لیا، جیسے وہ اس کو مسحور کر چکا ہے۔ کیانی بابا کی دردیلی چیخیں ابھی تک نہیں تھمی تھیں۔

"کیوں ماموں کانجن کیا خیال ہے تیرا روزہ کھُلنا چاہیے کہ نہیں! تجھے زنانے مردانے میں کوئی فرق ہی نہیں لگتا؟" آبی نے یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ کر اس میش چشم ڈرائیور کے مُنہ پر اُلٹے ہاتھ کا ایک ایسا جھانپڑ مارا کہ وہ لڑھک سا گیا۔

گگھیا کر بولا: "مجھے معافی دیں سرکار! یہ ـ ـ ـ یہ سب میں نے باکھل کے کہنے پر کیا تھا۔" وہ ہاتھ جوڑنے لگا تھا۔

"تم اِدھر تہہ خانے میں یہی دھندا کرتے ہو سالے؟ کتنی عورتیں لا چکے ہو یہاں اور کیا کرتے ہو اُنھیں؟" آبی نے اس کو بالوں سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"مجھے کچھ پتہ نہیں سرکار! یہ سارا کام بابا جی کرتے ہیں۔ یہ ٹیکسی انہی کی ہے اور میں اُن کا تنخواہ دار ملازم ہُوں۔"

اس کی یہ بات سنتے ہی آبی تڑپ کر کیانی بابا کی طرف بڑھا اور اس کے سر کے لمبے بالوں کو مٹھی میں لے کر اسے زمین پر سے اٹھا کر بولا: "یہ تُو کتیا کی طرح چیخنا بند کر دے سالے اور یہ بتا کہ یہ چکر کیا ہے؟ تیرے تو ہم یہ دونوں بازو ہی توڑ دیں گے۔ سمجھا کیا ہے تُو نے ہمیں؟"

کیانی بابا اوّل درجے کا عیاش اور زناکار آدمی اندر سے بالکل کھوکھلا ہو چکا تھا۔ اس کی آواز کا وہ تحکم اور اس کے چہرے کی وہ لالی شراب کی مرہونِ منت تھی۔ بدن اُس کا شراب ہی نے کھوکھلا دیا تھا۔ وہ اس ذرا سی کشمکش سے ہانپنے لگا تھا۔ اس کی کلائی کا جوڑ ہی ذرا سا ہل گیا تھا۔ اسے میں نے قتل تو نہیں کر دیا تھا۔ میرا اندازہ تو یہی تھا مگر وہ زیادہ ہی پریشان ہو گیا تھا۔ اُن چاروں کو ہم نے ہانک کر یکجا کیا تو کیانی بابا نے ہمیں اپنی دھندلائی ہوئی آنکھوں سے یُوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ اتنا ظلم تو نہ کرو مجھ غریب پر۔

"کیا خیال ہے کیانی بابا! چلیں ہم تمھارے ساتھ خلوت میں؟" آبی نے اس کو گریبان سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ اُس وقت تک کیانی اپنی کلائی کے درد کو بڑی حد تک سہار چکا تھا۔ ہم دونوں کے ہاتھوں میں پستول دیکھ کر وہ چاروں بُری طرح لرزنے لگے تھے اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اُن کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ کیانی نے اُس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ ایک بار پھر اپنی کلائی کو بغل کے نیچے دے کر دبانے لگا۔

"اوئے ہمیں کوئی ٹھنڈا تتا پانی ہی پلا دو۔ آخر کو ہم تمھارے مہمان ہیں۔" میں نے باکھل کے کھلے مُنہ میں ایک دم پستول کی نالی ڈالتے ہوئے کہا۔ وہ کچھ اس طرح بدک کر پیچھے ہٹا کہ چاروں شانے چت فرش پر گر گیا وہ سالا مٹی مٹی ہوا جاتا تھا۔

"یہ قصہ کیا ہے پیارے تو ہی کچھ بتا دے ہمیں۔" میں نے اکمل کے ساتھی کے سامنے پستول لہراتے ہوئے کہا۔

"ہمیں غلطی لگ گئی ہے بھاجی! ہمیں معافی دے دیں۔"

"تو سالا ہے ہی کسی کی غلطی کا نتیجہ! تیرا نام کیا ہے؟ تجھے یہ جوان 'مسوق' نظر آتا ہے؟" اب کی بار میں نے اس کے پیٹ میں گھٹنا مار دیا۔ وہ دہشت زدہ ہو کر پیچھے ہٹا اور کیانی بابا سے لپٹ گیا۔

"ان کو روکو بابا جی! یہ ہمیں گولی مار دیں گے۔"

ایک بڑی ہی پھیکی سی مسکراہٹ کیانی بابا کے لبوں پر ابھری، اور وہ اس آدمی کو پرے دھکیل کر بولا۔ "یہ تمھیں کچھ نہیں کہیں گے چلو ان کے لیے چائے بناؤ مدنی اور ان کو عزت سے اندر بٹھاؤ۔" وہ شاید اس عرصے میں اندازہ لگا چکا تھا کہ ہم کس قماش کے آدمی ہیں۔

"ہاں اب تم سیدھی راہ پر آئے ہو کیانی بابا! ہم سے وہی سلوک کرو جو شہنشاہ شہنشاہوں سے کرتے ہیں۔ کوئی اور بھی 'مسوق' اندر باندھ رکھے ہیں کہ نہیں؟" میں نے اب کی بار کیانی بابا سے بڑی رسان سے بات کی۔

وہ بہت ہی افسردہ سے لہجے میں بولا۔ "یہ لڑکے کبھی کبھی خرمستی کر جاتے ہیں بھائی جی! مگر آپ نے یہ سوانگ کیوں رچا رکھا ہے؟ پولیس سے منہ چھپاتے ہیں آپ؟"

"ہاں! کچھ ایسی ہی بات ہے بابا جی! اور تم بھڑے بچے ولی۔ جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ولی را ولی می شناسد۔ اپنا مسوق خانہ تو دکھاؤ ہمیں۔" آبی نے باکھل کو زمین پر سے اٹھاتے ہوئے کہا — وہ سالے بالکل ہی بودے ثابت ہوتے تھے۔ تھا ان چاروں کا ساجھا۔ اور اس کاروبار میں ان کے ساتھ کوئی پانچواں شریک نہیں تھا۔ اس تہہ خانے میں تین ٹیکسیاں اور بھی کھڑی تھیں جنھیں باکھل مدنی اور وہ کیانی بابا خود چلاتے تھے۔ وہ ہمیں اپنے ساتھ ایک کونے میں بنے چھوٹے سے کمرے میں لے گئے۔ وہی ان کی رہائش گاہ تھی — اندر پنکھا چل رہا تھا۔ اس کو ذرا تیز کر کے کیانی بابا نے اپنی کلائی ماموں کانجن کے سامنے کر دی۔

"اس پر وہ بجلی کا تیل مل دے ماموں! اگر جوڑ نہیں اکھڑا تو درد ڈنگ جائے گا۔"

"تمھارا جوڑا اکھڑ چکا ہے بابا جی! اب یہ پلستر سے کم پر سیدھا نہیں ہو گا۔" کیانی بابا کی کلائی میں اب بھی ٹیس اٹھتی تھی جس کا چمکارا اس کے چہرے پر پڑتا تھا تو وہ پیلا ہونے لگتا تھا۔ ماموں اس کے ہاتھ پر تیل ملنے لگا۔

کیانی نے اپنے درد کو دباتے ہوئے پھر ہم سے پوچھا۔ "آپ نے ہمیں بتایا نہیں آپ نے یہ زنانہ کپڑے کیوں پہنے تھے؟"

"یہ تمھارے پوچھنے کا سوال نہیں ہے بابا جی! اگر کوئی اور سواری تم نے اندر باندھ رکھی ہے تو ہمیں بتا دو اور یہ دھندا چھوڑ دو۔ یہ ظلم ہے۔ بے خبر زنانہ سواریوں کو تم کب سے ادھر لا کر ذلیل کر رہے ہو؟" آبی نے بڑے جمے ہوئے لہجے میں کہا وہ ابھی تک بہت الجھا ہوا تھا۔

"ایمان سے ادھر اور کوئی سواری نہیں ہے۔ ان سالوں نے تو کوئی تین مہینے بعد یہ حرکت کی ہے۔ بہت سی تو ایسی ہیں جو خوشی خوشی یہاں آ جاتی ہیں۔ یہ سب چھچھڑے ہیں۔ ذرا موج میلا کر لیتے ہیں۔ ورنہ یہ کوئی دھندا نہیں ہے ہمارا۔" کیانی نے بڑے وثوق سے یہ بات کی۔

"میں ذرا کپڑے بدل لوں۔ دوسرے کمرے میں کوئی ہے تو نہیں؟" میں نے اس کی بکواس سے عاجز آ کر کہا۔ ہمیں برقعوں میں دیکھ کر اس کی رال جس طرح ٹپکی تھی وہ ابھی تک میری نگاہ میں تھی۔ وہ سرتاپا جھوٹ بول رہا تھا۔ مگر میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ ہم ان کے اس مسئلے میں اور نہیں الجھیں گے، فائدہ ہی کیا تھا۔ ہماری اپنی جان عذاب میں پھنسی ہوئی تھی۔ شہر میں خدا جانے قدم قدم پر لوگ کیسے کیسے گھپلے کرتے پھر رہے تھے۔ ہم خود بدترین قسم کے جرائم کے مرتکب ہو چکے تھے۔ ہم خواہ مخواہ ہی نصیحت خان بن جاتے تو ہمیں کتنے نفلوں کا ثواب ہوتا۔ ہماری اپنی گردن میں ہڈی پھنس چکی تھی جسے ہم نہ نگل سکتے تھے، نہ اگل سکتے تھے۔

"نہیں دوسرے کمرے میں کوئی نہیں ہے آپ وہاں جا کر کپڑے بدل لیں۔" کیانی نے اپنی کلائی کو کہنی سے دباتے ہوئے کہا۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے بلاوجہ اس آدمی کو اتنے دنوں کے لیے بیکار کر دیا۔ مجھے اس کی کلائی پر زور نہیں ڈالنا چاہیے تھا۔ فائدہ کیا تھا۔ ہم سب ایک ہی گلیم میں لپٹے ہوئے لوگ تھے۔ کوئی زر پرست تھا تو کوئی زن پرست۔ اور ایک دوسرے سے منافقت کی آخری حدوں کو چھوتے ہوئے ہم سب جنگِ زرگری میں مصروف تھے۔

میں نے ساتھ کے کمرے میں جا کر بریف کیس کھولا اور اس پر رکھی جینز اور قمیص نکال لیں۔ ایک جوڑا آبی کا تھا اور دوسرا میرا۔ اپنے بوٹ بھی ہم اس میں باندھ لائے تھے۔ اس بریف کیس کی خوبی تھی کہ اس میں ضرورت کے مطابق جگہ پیدا کی جا سکتی تھی۔ اس کے وسط میں موٹا چمڑا اس طرح لگا تھا کہ اسے بڑی آسانی سے کھول کر بریف کیس میں زیادہ گنجائش پیدا کی جا سکتی تھی۔ میں لباس پہن چکا تو اسی کمرے کے ساتھ بنے غسل خانے میں جا گھسا اور اپنے چہرے پر غلط آلائش دھو ڈالی۔ اس افراتفری میں ہم اپنی مونچھوں سے بھی محروم ہو گئے تھے۔ غصہ مجھے اس ماموں کانجن پر آ رہا تھا۔ اس کی گردن پر کوئی کاری ضرب ہمیں ضرور لگانی چاہیے تھی۔ اس نے ہمیں اس فساد میں مبتلا کیا تھا۔ لباس تبدیل کر کے میں کیانی بابا کے پاس جا پہنچا،

بریف کیس آبی نے اٹھا لیا۔ اور وہ بھی اپنا حلیہ درست کرنے کے لیے دوسرے کمرے میں جا گھسا۔ اتنے میں مدنی ہمارے لیے چائے بنا لایا تھا۔ ایک پیالی وہ سب ہاتھ میں لے کر سڑڑ سڑڑ کرنے لگے۔

کیانی بابا بولا۔ "میرا یہ درد کچھ کم ہو گیا ہے ماموں! یہ تیل بجا ہے۔ میرا خیال ہے کہ میرا جوڑ بچ گیا ہے۔ اس جوان کی گرفت بڑی ایسی ہے؟"

"ذرا سوچ سمجھ کر ہاتھ ڈالا کر کیانی بابا! تو بچ گیا ہے میرے ہاتھ سے ورنہ میں گردن کا منکا توڑ دیتا ہوں۔ ہم کسی دن پھر یہاں آئیں گے۔ اپنا ریکارڈ سیدھا رکھنا۔" یہ کہہ کر میں نے چائے کی پیالی اٹھا لی۔ وہ چاروں اس وقت بہت ہی سنجیدہ اور سہمے سہمے سے نظر آ رہے تھے۔ اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ بلائیں تھیں کیسے چمٹ گئی ہیں۔

جب آبی لباس تبدیل کر کے واپس آیا تو مجھے اس پر بھی ترس آ رہا تھا۔ اس کے ناخنوں پر لگی نیل پالش عجیب سی لگتی تھی اور مونچھوں کے بغیر وہ کوئی جنبی سا لگتا تھا۔ بولا۔ "چل یار اٹھ ان بدمعاشوں نے ہمارا بہت وقت ضائع کر دیا ہے اٹھ۔"

"چائے تو پی لے ذرا۔"

"لعنت بھیج اس چائے پر۔ اور دیکھ لوئے کیانی بابا! تو کسی سکھ گیانی کی اولاد لگتا ہے مجھے۔ ہم کسی دن پھر آئیں گے اور تجھ سے باقاعدہ حساب لیں گے ہم۔ تم چاروں کو گولی مار دوں گا سالو، چاروں کے بال بیئرنگ نکال دوں گا۔"

پستول ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا اور اندر سے بہت ہی تپا ہوا تھا۔ وہ چاروں چپ چاپ بیٹھے اس کی دھمکیاں سنتے رہے۔ لگتا تھا ان کی متیا ہی مر گئی ہے۔ ذرا سا بھی کمر کا زور وہ نہیں دکھا رہے تھے۔

"چل اوئے ماموں کانجن! گیٹ کھول دے ذرا۔ تیری پسلی میں ہم کوئی کراری ضرب نہیں لگا سکے۔ اس کا ہمیں افسوس ہی رہے گا۔"

وہ کل بھرے کھلونے کی طرح اٹھا۔ اور تیز تیز قدموں سے ہمارے آگے چلنے لگا۔ اس کے تینوں ساتھی کمرے میں بس بیٹھے دیکھتے ہی رہ گئے۔ ماموں نے بڑے مودب طریقے سے گیٹ کھولا تو آبی نے زناٹے کا ایک تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا۔ بولا۔ "لعنت ہے تیری شکل پر دیوث کے بچے! تیری ٹیکسی کا نمبر مجھے یاد رہے گا۔"

وہ بیچارا تلملا کر پیچھے ہٹ گیا۔ جیسے ہی ہم باہر نکلے اس نے گیٹ بند کر لیا۔

"یار کس سیاپے میں پھنس گئے تھے ہم! یعنی ہمارے ساتھ یہ کام بھی ہونا ابھی باقی تھا۔"

"تو حسین بھی تو بہت لگ رہا تھا آبی! وہ تجھ پر فریفتہ ہو گئے تھے۔ یہ تیری مدھ بھری آنکھیں یہ گلابی گال، یہ ابرو۔"

"بکواس نہ کر جیلانی! مجھے بہت غصہ آ رہا ہے کوئی ٹیکسی پکڑ۔"

"اب جانا کہاں ہے؟ ابھی تو ہمارے لیے یہاں چلنا پھرنا بھی مشکل ہے۔"

"وہی میں سوچ رہا ہوں۔ میرا خیال ہے ہم ادھر مردان شاہ کے پاس جا بیٹھتے ہیں ابھی تک کریم احمد سے ہمارا رابطہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔"

"ہاں چل، یہ ٹھیک ہے۔ وہ جگہ ہمارے لیے بہت محفوظ رہے گی۔" میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔ مصیبت کی اس گھڑی میں مردان شاہ کے حجرے سے زیادہ بہتر جگہ اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔

چند قدم آگے چل کر ہمیں ایک ٹیکسی مل گئی۔ اور ہم اس میں بیٹھ کر ڈرگ روڈ پر جا پہنچے۔ مردان شاہ ہمیں ہوٹل کے کاؤنٹر پر ہی مل گیا۔ اس نے ہوٹل کے دروازے پر رمضان کی وجہ سے پردہ لٹکا رکھا تھا۔ گاہکوں کی کند استرے سے حجامت بنانے کے لیے۔ وہ سارا دن کاؤنٹر پر کمپا لگا کر بیٹھا رہتا تھا۔ اور یہی اس کی کامیابی کا راز تھا۔ کھانا بہت اچھا پکواتا تھا اور مقابلتاً بہت سستا بیچتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس ہوٹل پر ہر وقت بھیڑ لگی رہتی تھی۔

جب ہم اندر داخل ہوئے تو ہمیں سامنے دیکھ کر بہت خوش ہوا، حق ہو کا نعرہ لگا کر اٹھا اور کاؤنٹر کو اپنے ملازم کے حوالے کر کے ہماری طرف لپکا۔

روزہ خوروں نے ہوٹل کے اندر سگریٹوں کا دھواں بھر رکھا تھا۔ ہمارے پاس پہنچ کر مردان شاہ بولا۔ "آؤ یار جی آؤ — میں بس تمھیں ہی یاد کر رہا تھا آؤ اندر بیٹھتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ ہمیں اپنے حجلۂ خاص میں لے گیا، بولا۔ "یہ کیا ہو گیا ہے تم دونوں کو — وہ مونچھیں کیا ہوئیں؟ خیر تو ہے!"

"خیر نہیں ہے مردان شاہ! بہرحال تو فکر نہ کر، ہم ٹھیک ہی ہیں تمھارے بھتیجے جمیل کا کیا حال ہے اب؟"

"وہ علاج کروا رہا ہے صبح شام ٹیکے لگ رہے ہیں اسے۔ پر یار! اس ڈاکٹر کو تو پکڑنا چاہیے۔"

"ہم اس کے پیچھے ہی پھر رہے ہیں۔ مگر آج ہم بہت تھک گئے ہیں اور دو گھڑی آرام کرنا چاہتے ہیں۔"

"تو اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے؟ ادھر ہی لیٹ جاؤ میں دروازہ بند کر دیتا ہوں۔" اس نے حسب عادت ہمیں سوڈے کی بوتلیں کھول کر تھما دیں۔

"رات ہم ادھر ہی رہیں گے مگر جگہ یہاں کم ہے۔"

"نہیں! جگہ میرے پاس بہت ہے۔ تم بے فکر ہو کر یہاں سو رہو۔

ایک کمرہ میں نے اُدھر سامنے کے مکان میں بھی لے رکھا ہے۔ وہاں میرے دو ملازم سوتے ہیں۔ میں بھی آج اُدھر لیٹ رہوں گا۔"

"جو مرضی ہے کرو۔ ہم کچھ زیادہ ہی تھک گئے ہیں۔" میں نے بستر پر پھیل کر لیٹتے ہوئے کہا۔

مردان شاہ ہمارے پاس کچھ دیر تک بیٹھا رہا اور پھر ہمارے موڈ کو سمجھتے ہوئے وہ دروازہ بھیڑ کر باہر نکل گیا۔ آبی کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ سگریٹ کے گہرے گہرے کش لے کر بولا۔ "یار جیلانی! پتہ نہیں خدا کو کیا منظور ہے، وہ سرتاسر غلط لوگ بھی ہمارے ہاتھ سے بچ نکلے۔"

"ہماری طرح ان کی بھی رسّی دراز ہی لگتی ہے۔ اُس ترمذی کو کھلا چھوڑ کر ہم سے زبردست غلطی ہو گئی۔ ہم بچ نکلے ہیں بس یہی غنیمت سمجھو۔"

"ہمارا حال پُل پر سے گزرتے کتے ایسا ہوا ہے جیلانی جس کے منہ میں بوٹی تھی۔"

"کیا مطلب ہے تیرا؟" میں نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ میں خود کو اتنی ارذل سطح پر گرانے کے لیے کسی بھی طرح آمادہ نہیں ہو سکتا تھا۔

آبی نے زہر خند کیا، بولا۔ "اس کتے نے نیچے پانی میں اپنا عکس دیکھ لیا تھا۔ پانی میں جو کتا اُسے نظر آیا اس کے منہ میں بھی بوٹی تھی۔ وہ کتا سالا ہماری طرح ہی عقل سے پیدل تھا۔ منہ کھول کر دُوسرے کتے پر بھونکا تو اُس کے منہ سے بوٹی گر کر پانی میں جا پڑی۔ ہمارا بھی یہی حال ہُوا ہے۔"

"نہیں یار! اپنے آپ کو اتنا بھی مت گرا۔ ہم نے تو اپنا کوئی عکس نہیں دیکھا۔ ہم تو کسی پر نہیں بھونکے۔" میں نے اس کے ہاتھ سے سگریٹ کا پیکٹ لے کر کھینچتے ہوئے کہا۔ ہمارے مونس و غمخوار ان دنوں وہ سگریٹ ہی تھے۔ جب نفس کی ہمت ٹوٹنے لگتی ہے جب کتے کے منہ سے بوٹی گر جاتی ہے۔ جب تقدیر کسی جھوٹے آدمی کو گولا اٹھانے پر مجبور کر دیتی ہے تو اُسے ایسے ہی نشے کی تلاش ہوتی ہے جو ذہن اور نظر کو دُھندلا دے۔ ہم بھی اُن دنوں بے شمار سگریٹ پھونک رہے تھے۔ ہر لمحے کے حلقے میں دھوئیں کا مرغولہ رکھتے جاتے تھے۔ یہی ہمارا مشغلہ تھا۔ وہ دھواں سکون پہنچاتا تھا۔ آرام دیتا تھا۔ غم رُبا تھا۔ اور ہماری اندرونی اذیتوں پر پھاہے کی طرح جا لگتا تھا۔

آبی نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ اس کا اضطراب کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اُس کے دل پر کوئی بڑی چٹان آ گری ہے۔ وہ ایسا نہیں تھا۔ بدترین حالات میں بھی وہ مسکرانے کی ہمت رکھتا تھا مگر اس روز کوئی ایسا ہی غیر مرئی خدشہ تھا جو اُسے بے چین کیے دیتا تھا۔

"کیا سوچ رہا ہے تُو؟"

"آں۔۔۔ کچھ نہیں یار! مجھے یہ سارا چکر بڑا ہی عجیب نظر آنے لگا ہے تو حساب تو لگا کہ ہم نے اب تک کیا پایا ہے [illegible] کیا کھویا ہے۔"

"پاگل ہو گیا ہے تُو! حساب نہ لگایا کر۔ وہ تو اللہ میاں نے [illegible] ہی کہہ رکھا ہے کہ زمانے کی قسم انسان خسارے میں ہے اور اس پر شک کی تو گنجائش ہی نہیں ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔۔۔ پر جیلانی! یہ ہم کس مشقت میں پھنسے ہیں اور کس لیے؟"

"بُرائی برائی کے تعاقب میں ہے۔ یہی کہنا چاہتا ہے نا تُو [illegible] میں ایسا نہیں سمجھتا۔ آدم خور چیتے سے بستی کو خالی کر کے بھیڑیوں [illegible] نپٹ لینا آسان ہوتا ہے۔ اور ہم تو لوٹ جانا چاہتے ہیں اپنی [illegible] ادنیٰ حیثیتوں کی طرف۔ تو کوئی محل کھڑا کرنا چاہتا ہے۔"

"نہیں جیلانی! میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں۔ مجھے تو [illegible] سے اپنی منگنی بھی اب اچھی نہیں لگتی۔"

"تُو مجھے بتا کہ اس چوری چکاری اور لوٹ مار کے دھندے میں تو کیسے پڑ گیا تھا، صحیح صحیح بتانا۔"

"میں۔۔۔ میں۔۔۔ کیا کہوں یار! مجھے اس بھینس سے نفرت تھی جس کی خدمت میں سارا گھر جُتا رہتا تھا۔ اس امید پر کہ وہ [illegible] شام بالٹی بھر دُودھ دے گی۔ میں تو کسی ایسی عورت سے بھی [illegible] کر سکتا جو سبق ازسبق محبت کی اجرت طلب کرے۔ میں [illegible] کا وجود برداشت نہیں کر پاتا تھا جو میرے گاؤں میں سارا [illegible] پھرتے تھے۔ ایک تنکا دوہرا نہیں کرتے تھے مگر سب سے زیادہ [illegible] چوکھا کھاتے تھے۔ میں نے سب سے پہلے انہی کا بُرج الٹا تھا۔ [illegible] سمجھا نے تھے۔ میں نے اُن کی حویلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی [illegible] تین گاؤں میں اُن کی ملکیت تھی۔ کسی کو سر اُونچا کر کے وہ اپنے سامنے نہیں چلنے دیتے تھے۔"

"یہ تو ہوتا ہی آیا ہے اور ہوتا رہے گا۔"

"اب تو میں بھی اسی نتیجے پر پہنچا ہوں جیلانی کہ ہم تو [illegible] کا ایک بھی راستہ بند نہیں کر سکتے۔ میں نے جو کچھ لوٹا اپنا [illegible] ان گنت غریبوں میں بانٹ دیا مگر اُن کے دُکھ تو ویسے کے ویسے رہے۔ اُن کے زخم تو ہرے کے ہرے رہ گئے۔ سیھرانوں نے نئی [illegible] بنا لیں۔ نئے وارث پیدا کر لیے جو اپنے پیش رؤوں سے کہیں [illegible] ظالم اور سفاک ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ مجھے کیا ملا؟ میں تو [illegible] سکڑ گیا۔ میں جو ایک اکائی تھا اس راہ پر چل کر نقطے کی صورت [illegible] کر گیا۔ اور اب مجھے محسوس ہو رہا ہے جیسے میں مٹنے کی منزل میں [illegible] ہو رہا ہوں۔ جس بُرائی نے مجھے بدی پر اکسایا وہ تو اور اُونچی [illegible]

[illegible] ٹھرا ہو گئی۔" آبی کا لہجہ بہت ہی زخم خوردہ تھا۔ اُسے میں نے [illegible] کبھی دُکھی نہیں دیکھا تھا۔ کبھی بھی نہیں۔

"آج تو کیسی باتیں کر رہا ہے آبی! تیری سوچ میں اتنی مایوسی [illegible] کبھی بھی نہیں تھی۔" مجھے ڈر تھا کہ وہ کہیں دھاڑیں مار مار کر رونے [illegible] لگے۔ اس کے کرب کی کیفیت کچھ ایسی ہی جاں گداز ہو گئی تھی۔ وہ [illegible] اندر سے ٹوٹ رہا تھا، بکھرتا جا رہا تھا۔

میری بات کا جواب دیئے بغیر وہ اُٹھا اور بولا۔ "تو یہاں بیٹھ جیلانی! میں کسی جگہ سے الماس کو فون کرنا چاہتا ہوں۔ میرا دل اس سے ملنے کے لیے بہت بے چین ہو رہا ہے۔"

"یہ تجھے کیا ہو گیا ہے آبی! پاگل یہ کوئی وقت ہے اس سے بات کرنے کا۔ دیکھ تو کتنا آزردہ ہو رہا ہے تو۔"

"اسی لیے تو میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ شاید میرے دل کو اس کا کوئی بول تسکین دے سکے۔ تو اِدھر بیٹھ میں بس ابھی آ جاؤں گا۔"

"تو چل پھر۔ میں بھی تیرے ساتھ چلتا ہوں۔"

"نہیں، تو بہت تھکا ہوا ہے اور پھر پتہ نہیں، میں اس سے کیا کہوں۔۔۔ تو خواہ مخواہ میرا مذاق اڑاتا رہے گا اور ویسے بھی میاں بیوی کی بات میں یہ دخل اندازی ہو گی۔" وہ بہت سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"تو جا پھر گھس جا اس کی بغل میں۔ شاعر نے وہ بات شاید تیرے جیسے کے لیے ہی کہی تھی کہ ہائے کمبخت کو کس وقت خدا یاد آیا۔" میں نے چڑ کر کہا۔

آبی کا مغز خراب ہوتا جا رہا تھا۔ ہم دونوں اتنے سارے جبر کے سہہ کر، اس شاں شاں کرتے مصائب کے دریا کو عبور کرتے ہوئے منجدھار میں پہنچے تھے کہ اس کے حوصلے کی رسی ٹوٹنے لگی تھی۔ اس نے پھیکی مسکراہٹ لبوں پر سجا کر بریف کیس میں سے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور بولا۔ "بُرا نہ منا جیلانی!۔۔۔ میری طبیعت پر عجیب سا بوجھ پڑ رہا ہے میں اس سے بات کر لوں گا، تو ٹھیک ہو جاؤں گا۔ وہ ایسی ہی ہے وہ آرامِ جاں۔" یہ کہہ کر اُس نے کیبن کا دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔

میں ایک بار پھر سناٹے کی زد میں آ گیا۔ کیبن میں چلتا پنکھا مجھے ساکن نظر آیا میں سمجھا وقت نے قدم روک لیے ہیں اس کی چاپ تھم گئی ہے اور وہ کھٹرا بی کر کسی جگہ منہ کے بل گر گیا ہے۔ میری جیب تپ رائگاں چلی گئی ہے میرے سر پر نہ دستار رہ گئی تھی نہ بدن پر جامہ۔ افسردگی اور اعصاب شکنی کی اس جھلس نے آبی کو نہیں مجھے بھی روند ڈالا تھا میرے سر پر تقدیر کو الٹ اور چاک لگانے کی مہلت مل گئی تھی۔

آبی ٹھیک کہہ رہا تھا۔ ہم دونوں سمٹ سکڑ کر نقطوں کی صورت اختیار کر گئے تھے اور اب کوئی دم جاتا تھا کہ ہم معدوم ہونے کو تھے۔ احساس یہی ہو رہا تھا۔ ہمارے پاس تو ایک صرف حوصلے کا ہتھیار تھا، وہی ہم سے چھنتا جا رہا تھا۔

بستر پر لیٹا میں کتنی ہی دیر تک اُس ساکن پنکھے پر نظریں جمائے سوچتا رہا کہ یہ سب کچھ ہو کیسے گیا۔ ہم اپنے اُن بدترین دشمن کو یوں بن لڑے بن مارے کیسے چھوڑ آئے۔ ہمیں تو وہاں سے نکلنے سے پہلے اُن سب کو گولیوں سے چھلنی کر دینا چاہیے تھا۔ میرے انتقام کی آگ تو جب ہی بجھ سکتی تھی مگر ہم دہشت زدہ بچوں کی طرح اپنا سب سے بڑا انعام اس کوٹھی میں چھوڑ آئے تھے۔ ہم نے پیچھے مڑ کر ان کو دیکھ لینے کی بھی ہمت نہیں کی تھی۔ وہ لمحہ کسوٹی بن گیا تھا جس پر ہمارے حوصلے اور ہماری ہمت شاید ہمیشہ کے لیے پرکھی جا چکی تھی۔ میں شاید آبی کی نظروں میں بہت زیادہ گر گیا تھا۔ کیونکہ اُن لوگوں سے انتقام تو صرف مجھے لینا تھا اُن کے دیے ہوئے زخم تو مجھے ہی اُن کو لوٹانے تھے۔ آبی کو تو اُن سے کوئی شکوہ نہیں تھا۔ پھر۔۔۔ پھر۔۔۔ میں نے کوئی فوری فیصلہ کیوں نہیں کیا؟ میں کیا سوچتا رہ گیا؟ یہ بڑا ہی اہم اور اذیتناک سوال تھا۔ میں دُچتی ہو رہا تھا۔ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ کہ اُن کے پشت پناہ اُن کی مدد کو آ پہنچے اور ہم اُن کو یوں چھوڑ آئے جیسے اُن سے ہمیں کوئی واسطہ ہی نہیں تھا۔ غصہ مجھے اُس شکیلہ اور نجمہ پر بھی آ رہا تھا۔ عورتیں اس قدر بھی منافق ہو سکتی ہیں۔ اس کا میں اندازہ ہی نہیں کر سکتا تھا۔ عورت کو تو میں نے ہمیشہ فطرتِ صالح کے مطابق پایا تھا۔ پھر۔۔۔ پھر۔۔۔ وہ دونوں کٹنیاں ہمارے اس قدر قریب آ کر ہم سے ہمارا تمام راز اگلوا لینے کے بعد کیوں اس قدر بدل گئیں کہ وہ ہمیں پولیس کے حوالے کر دینے کے درپے ہو گئیں۔ آخر کیا ہو گیا تھا انھیں؟ ہم انھیں بڑی سے بڑی رقم دے سکتے تھے۔ اُن کے ہزار کام ہم سنوار سکتے تھے۔ ان پر ہم نے اس وقت تک کوئی بے جا سختی بھی نہیں کی تھی اس کے باوجود وہ بدل گئیں، ایسا کیسے ہو گیا؟ اس سوال کا جواب مجھے نہیں مل رہا تھا۔

دلداری کے لیے وہ آدمی جو مجھے خدا نے عطا کیا تھا اب وہ بھی مجھ سے پرے پرے ہٹ رہا تھا۔ آبی کا انداز ایسا ہی تھا۔ اُس کی وہ دُکن ایسی ہی اندوہناک اور لرزہ خیز تھی اور میں اس کی پور پور سے واقف تھا۔ اُس نے شاید اُس روز بہت سوچ سمجھ کر کوئی بڑا ہی اہم فیصلہ کیا تھا ورنہ یوں درمیانِ قعرِ دریا الماس کی یاد اسے کیسے آ جاتی۔ یہ ناممکن تھا۔

ایک مسند آراء کی تصویر تو میں بھی آنکھوں میں لیے پھرتا تھا

مگر کسی سکھر ... نے بڑے خلفشے کو سامنے دیکھنے کے باوجود میں اس کی طرف نہیں لوٹ رہا تھا کیونکہ ابھی میں بالائے بام نہیں پہنچ سکا تھا۔ ابھی تو میں مصائب کے اس ستون کو آدھا بھی نہیں کاٹ سکا تھا۔

شام کا جھٹپٹا چاروں طرف پھیل گیا۔ اس کیبن میں لگے روشن دان کے باہر سرمئی اندھیرا آہستہ آہستہ گہرا ہونے لگا۔ میں نے بتی پھر بھی نہ جلائی اور تواتر کے ساتھ ایک کے بعد ایک سگریٹ پھونکتا چلا گیا۔ کیبن کچھ یوں بنایا گیا تھا کہ ہوٹل کا شور اندر نہیں پہنچ سکتا تھا۔ آبی اپنے پیچھے جس افسردگی کی لہر چھوڑ گیا تھا وہ مجھے بھی شرابور کرنے لگی تھی۔ اس وقت سورج غروب ہو رہا تھا کہ کیبن کا دروازہ یوں کھلا جیسے کسی نے ٹھہرے ہوئے پانی میں اینٹ دے ماری ہو۔

سناٹا تڑاخ سے ٹوٹ گیا۔ مردان شاہ افراتفری میں اندر داخل ہوا اور بولا "یار جی وہ ... وہ آپ کا یار پیرزادہ ..."

"کیا ہوا اسے؟ یہ تیرا رنگ کیوں اُڑ رہا ہے؟" میں نے بستر سے اچھل کر اسے جھنجھوڑ دیا۔

"کچھ نہ پوچھ یار! میں اس کے ساتھ ٹیلیفون کے دفتر تک گیا تھا، اس نے لاہور کسی سے بات کرنی تھی۔ وہاں سے جب ہم واپس آ رہے تھے تو سامنے سے آتی ہوئی ایک گاڑی کی سائڈ اسے لگ گئی۔ پیرزادہ نیم جان ہو کر سڑک پر گرا تو گاڑی والوں نے فوراً ہی اسے گاڑی میں ڈالا اور ایک آدمی بولا "اسے ہسپتال لے چلو۔ اس کو زیادہ ہی چوٹ لگ گئی ہے۔" پیرزادہ بالکل ہی بیہوش ہو گیا تھا۔ میں نے بھی اُن کے ساتھ بیٹھنا چاہا مگر انھوں نے میری بات ہی نہیں سنی اور اسے لے کر بھاگ نکلے۔ میں چند منٹ تک اُن کے پیچھے دوڑا مگر وہ رُکے ہی نہیں۔ جب مجھے ٹیکسی ملی تو اس وقت تک وہ نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔ میں کئی تھانوں سے پوچھ آیا ہوں۔ قریب کے ہسپتال بھی دیکھ لیے مگر پیرزادے کا کہیں کچھ پتہ نہیں چلا۔"

"کیا کہتے ہو مردان شاہ! میرا ایک ہی یار ہے، اسے کچھ ہو گیا تو میں اندھا ہو جاؤں گا۔ یہ کیا کر دیا ہے تم نے؟"

"میں کیا کہوں یار جی! بس میری قسمت میں ہی ہار لکھی تھی۔ میں اُن کے پیچھے بہت بھاگا ... بہت بھاگا۔" مردان شاہ بہت زیادہ پریشان تھا۔

"وہ کس کی گاڑی تھی۔ کوئی نمبر، کوئی رنگ، کوئی بات تو یاد ہو گی تمھیں اس کی؟"

"وہ فاکس ویگن تھی۔ اور نمبر اس کا تھا ... ہاں کے ای سی پندرہ سولہ ... ہاں، یہی نمبر تھا۔" وہ کرسی پر بیٹھ کر بولا۔

"پندرہ سولہ! اوئے مردان شاہ! یہ کیا کر آیا ہے ... اندازہ غلط نہیں ہے تو یہ وہی لوگ ہیں اور میں اُن کو ... مار دوں گا۔" میں نے اپنے پستول میں چارہ ڈالتے ہوئے ... میں پوری گولیاں بھر کر میں نے اسے پتلون کی بیلٹ میں ... لیا کہ وہ چلنے میں بھی نظر نہیں آ سکتا تھا۔ وہ میرا نیا ... پندرہ سولہ نمبر ہی اس فاکسی کا تھا جو ہم نے سوات خان سے ... تھی۔

"تم کن لوگوں کی بات کر رہے ہو! کس پر شبہ ہے تجھ..."

"یہ وہی ہیں جنھوں نے تیرے بھتیجے کا گردہ کھون کر ... ہے مگر تو نہیں سمجھ سکے گا یہ بات ... یہ دیکھ یہ میرا بریف کیس دَھرا ہے یہاں۔ اس میں نقدی اور میری دوسری چیزیں پڑی ... اُن کو سنبھال کر رکھ۔ مجھے ہر قیمت پر آج اور ابھی اپنے یار ... ہے۔"

"کوئی گڑبڑ کی بات تو نہیں ہے۔ میں چلوں تمھارے سا...؟"

"نہیں! تم اِدھر ہی بیٹھو۔ اگر کوئی میرے بارے میں پوچھے تو کچھ مت بتانا اور یہ بریف کیس بھی کسی کے حوالے مت کرنا۔"

"ٹھیک ہے! تم بے فکر رہو۔ اس کو تو میں سنبھال لوں گا۔"

"بس ٹھیک ہے! اپنا کوئی قریب کا فون نمبر بتا دو۔"

"ہاں۔ وہ تو ہے۔ یہ ساتھ کی دکان میں لگا ہے۔" یہ کہہ کر ... نے مجھے ایک نمبر بتا دیا۔

اُسے ذہن میں دہراتے ہوئے میں اس کے ہوٹل سے نکل کر سڑک پر جا ٹھہرا۔ میرے دماغ میں عجیب ہی سرخ رنگ آندھی ... لگی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ آبی انھی لوگوں کے ہتھے چڑھا ہے۔ اسے اچھی طرح پہچان چکے تھے اور انھیں معلوم تھا کہ جیلانی کے ساتھ ... کا کلیہ کیا ہے۔ انھوں نے جان بوجھ کر آبی کو ٹکر ماری اور ... ہی وہ بے ہوش ہو کر گرا وہ اسے ہسپتال لے جانے کے بہانے سڑک ... اٹھا کر اڑتے بنے۔ یہی کچھ ہوا تھا اور میرے دل میں ڈاکٹر ... عالیہ کے خلاف نفرت کا ایک نیا طوفان اٹھنے لگا تھا۔ ڈر مجھے تھا کہ وہ کہیں اپنے طریقۂ واردات کے مطابق آبی کو اپنے مذبح ... لے جا کر فوراً ہی نہ کاٹ ڈالیں۔ اگر ایسا ہو گیا تو آبی بھی ہمیشہ ... لیے ایک گردے سے محروم ہو جائے گا۔ زندگی اس کی بھی اجیرن ... جائے گی۔ وہ بھی میری طرح دو کوڑی کا نہیں رہ جائے گا۔ ایک ... پر آخر کوئی کتنا عرصہ زندہ رہ سکتا ہے۔ اور پھر آبی جیسا حساس ... وہ تو جیتے جی مر جائے گا۔ مجھے اس کی جوانی پر ترس آ رہا تھا۔ وہ ... خوش قسمت تھا کہ ایک بار بھی وہ پولیس کے ہتھے نہیں چڑھا تھا ... گرفتاری سے وہ ہمیشہ ہی بچتا چلا آیا تھا مگر اب وہ جن لوگوں ... پھندے میں جا پھنسا تھا وہ اسے بدترین مراحل سے گزارے بنا چھوڑ...

... تے تھے۔

میں عجیب و غریب قسم کے خیالات و خدشات ذہن میں ... ہو کر سڑک پر نکلا اور ایک ٹیکسی میں جا بیٹھا۔ میرا چہرہ شاید غصے ... کچھ زیادہ تمتما رہا تھا۔ ڈرائیور نے گاڑی کے اندر بتی جلا کر مجھے ... دیکھنے لگے آئینے میں غور سے دیکھا اور بولا "کہاں جانا ہے صاب؟"

"اسٹار گیٹ کی طرف چلو، مگر ذرا جلدی کرو۔ میرے پاس ... وقت کم ہے۔" میں نے نشست کی پشت سے سر لگاتے ہوئے کہا۔ میری جان تو آبی کے سینے میں بند تھی۔ اس کے بغیر تو میں اب جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

ڈرائیور نے میری وہ ابتر حالت دیکھی تو گاڑی کو تیز بھگاتے ہوئے بولا "خیر تو ہے نا صاحب! آپ کچھ پریشان دکھائی دیتے ہیں۔"

"ہاں خیر ہی ہے۔ اپنا دماغ تم ایکسیلیریٹر پر جماؤ۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔" میں نے اس کے سوال کا بڑے ہی روکھے لہجے میں جواب دیا۔ وہ چپ ہو گیا۔ دوبارہ نہیں بولا۔

اسٹار گیٹ سے آگے نکل کر میں نے ٹیکسی چھوڑ دی۔ ڈرائیور مجھے گھور گھور کر دیکھتا ہوا دوسری طرف مڑ گیا۔ میرے چہرے پر نہ جانے کیسی وحشت طاری تھی، ڈرائیور بس حیران ہی ہوتا واپس چلا گیا۔ میری بربادیوں کے لیے اس گھڑی بھی شاید آسمانوں میں منصوبہ سازی ہو رہی تھی۔ میری سوچ کا کوئی بھی زاویہ سیدھا نہیں تھا۔ آبی کے مغلوب ہو جانے کے بعد میں بس دم بدم بکھرتا جا رہا تھا۔ اس روز میں اپنے اس دوست کے لیے واقعی سر کو تیغ باندھ کر نکلا تھا۔ ایک خون آشام تند و تیز نفرت کا ریلا تھا جو مجھے بہائے لیے جاتا تھا۔ میں نے کتنی ہی جگہوں سے سات سو چھیاسی نمبر بنگلے کے بارے میں پوچھا مگر کوئی بھی آدمی مجھے تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔ دو رویہ کھمبوں کی روشن بتیاں مجھے راستہ تو سجھاتی تھیں مگر منزل کا پتہ وہ نہیں دیتی تھیں۔ میں کتنی ہی دیر تک اِدھر اُدھر ٹامک ٹوئیے مارتا رہا مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ اس کے باوجود میں مختلف سمتوں میں وہ کوٹھی تلاش کرتا رہا جس کا نمبر میرے ذہن میں کچوکے لگاتا رہا تھا۔

اُس وقت رات کے ساڑھے نو بج چکے تھے کہ اچانک مجھے ایک ایسا آدمی اپنے سامنے چلتا نظر آیا جس کی صورت مجھے دیکھی پہچانی معلوم ہوتی تھی۔ میں تیزی سے اس کے قریب جا پہنچا۔ وہ ہاتھ میں سائیکل لیے جا رہا تھا۔ جب میں اس کے قریب پہنچا تو مجھے معلوم ہوا کہ اس کے سائیکل کے ٹائر سے ہوا نکل چکی تھی۔ چند قدم اس کے ساتھ چلا تو مجھے یقین ہو گیا کہ اس کا نام حفیظ ہے۔ وہی عینک حفیظ جس کو میں الشفق میں دیکھ چکا تھا۔ وہ اپنی دھن میں مست کسی طرف دیکھے بغیر چلا جا رہا تھا۔ اب میری مشکل آسان ہوتی نظر آ رہی تھی۔ وہ یقیناً سات سو چھیاسی کی سمت رواں

رواں تھا۔ اس کو مخاطب کرنے کے بجائے میں نے اپنی رفتار دھیمی کر لی۔ اب میں اس سے دو قدم پیچھے رہ کر اس کا تعاقب کر رہا تھا۔

وہ آدمی چلتا ہی رہا۔ یہاں تک کہ کوٹھیوں کی قطاریں ختم ہو گئیں۔ سامنے چھوٹے چھوٹے کوارٹر دکھائی دے رہے تھے۔ اور میں اس نتیجے پر پہنچ رہا تھا کہ وہ آدمی وہیں رہائش پذیر ہے۔ وہ ایک تنگ سی گلی میں داخل ہو کر پانچویں دروازے پر رُکا اور اس کے تختے پر سائیکل کا اگلا پہیہ مار کر اندر جا گھسا۔ میں گلی کی نکڑ پر ہی ٹھہر گیا تھا۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد میں گرد و پیش کا جائزہ لیتا ہوا اس دروازے پر جا ٹھہرا۔

میری دستک پر وہ معنک تیزی سے باہر نکلا اور مجھے اپنی دبیز آنکھوں کے شیشوں میں سے گھورتے ہوئے بولا "فرمائیے جناب کس سے ملنا ہے آپ کو؟"

"میں حفیظ صاحب سے ملنا چاہتا ہوں جناب!"

"حفیظ تو میرا ہی نام ہے، فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" وہ مجھے بالکل بھی پہچان نہیں پایا تھا۔

"خدمت کے لیے تو میں حاضر ہوا ہوں جناب! اگر کہیں بیٹھ کر میری بات سن لیں تو نوازش ہو گی۔"

"مگر کام کیا ہے حضور آپ کو؟ کچھ بتلائیے تو سہی۔"

"وہ ریکارڈنگ کا چکر ہے نا جناب! میں اس سلسلے میں حاضر ہوا ہوں۔ آپ کی خدمت کے لیے آیا ہوں۔"

"اوہ! آئیے اندر آ جائیے۔ یہ بڑا ہی ستیاناس قسم کا کام ہے۔ میرا تو دن رات کا چین ختم ہو گیا ہے۔" وہ بڑے ہی جلے کٹے لہجے میں بولا، اور دروازہ کھول کر اندر کو چل دیا۔

اس کا وہ دو کمروں کا کوارٹر خاصا صاف ستھرا تھا اور بیوی اس کی پردے کی قائل نہیں تھی۔ میرا خیال ہے کہ میرے جیسی آسامیاں اس کے پاس پہلے بھی آتی رہی تھیں۔

وہ مجھے کمرے میں لے جا کر کرسی پر بٹھا چکا تو اس کی بیوی دروازے میں آ کھڑی ہوئی "... منے کے ابا! شربت بھجوا دوں؟"

"ہاں دو گلاس بنا دو۔ ذرا برف زیادہ ڈالنا گرمی نے پاگل کر دیا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی عینک کے شیشے رومال سے صاف کیے اور بولا "افطاری کا وقت تو گزر چکا ہے گر آپ پسند فرمائیں تو کھانا کھائیں۔"

"جی نہیں! اتنے تکلف کی ضرورت نہیں ہے حفیظ صاحب! میں دراصل یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کسی اور آدمی کو بھی آپ سعودی عرب بھجوا سکتے ہیں کہ نہیں؟ میں آپ کو منہ مانگے دام دے سکتا ہوں۔"

وہ مسکرانے لگا۔ عینک کو بلب کے رخ پر لا کر اس کے شیشوں کا جائزہ لیتے ہوئے بولا "بڑی مصیبت ہے صاحب۔ میں کس کس کی

سفارش کروں علوی صاحب سے۔ اب وہ کم از کم پندرہ ہزار طلب کرتے ہیں۔ ویسے گنجائش تو ہر کام میں رکھنی ہی پڑتی ہے۔ اگر آپ پندرہ ہزار دے سکیں اور اس میں پانچ ہزار اور جمع کر دیں میرے لیے تو میں آپ کی سفارش کر سکتا ہوں۔"

"مجھے منظور ہے میں یہ رقم دے دوں گا۔ علوی صاحب سے ملاقات ہو سکتی ہے اس وقت؟"

"نہیں وہ تو ادھر نہیں رہتے۔ آج کل وہ سعودی عرب میں ہیں بس دو چار روز میں واپس آ جائیں گے۔"

"میں نے سُنا ہے کہ اُدھر بنگلہ نمبر سات سو چھیاسی میں رہتے ہیں وہ۔"

"جی نہیں! وہاں تو ڈاکٹر انور سیال رہتے ہیں مگر وہ بڑی سخت مصیبت میں ہیں۔ بدمعاشوں نے انھیں اغوا کر لیا تھا۔ ان کی بیگم سمیت۔ آج صبح پولیس نے انھیں بچا تو لیا ہے مگر وہ دونوں سخت بیمار ہیں اور اب جناح ہسپتال میں پڑے ہیں۔"

"زخمی ہو گئے تھے وہ۔"

"نہیں! بدمعاشوں نے انھیں زہر کی گولیاں کھلا دی تھیں، کھانے میں ڈال کر۔ جب پولیس اُن تک پہنچی تو وہ دونوں بے ہوش تھے۔"

"یہ تو بہت برا ہوا حفیظ صاحب سُنا ہے وہ بچارے تو بہت ہی اچھے آدمی ہیں۔ میری طرف سے بہرحال آپ یہ پانچ سو روپے رکھ لیں۔ آپ کے بچوں کے لیے میں مٹھائی نہیں لا سکا۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ میں آپ کے گھر کو ڈھونڈ لوں گا مگر پوچھتا پوچھتا تو آدمی خدا تک بھی جا پہنچتا ہے۔" یہ کہہ کر میں نے جیب سے نوٹوں کی گڈی نکال کر سو سو کے پانچ نوٹ اس کے سامنے تپائی پر رکھ دیے۔

اُس کی بیوی عین اسی وقت کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ ایک ٹرے میں شربت کا جگ اور گلاس دھر لائی تھی۔ اس نے بھی وہ نوٹ دیکھ لیے تو بڑے جھینپے لہجے میں بولی "یہ میں منّے کے ابّا۔۔ پر یہ نوٹ کیسے ہیں؟ یہ تو پرے ہٹاؤ۔"

"یہ صاحب بچوں کی مٹھائی کے لیے دے رہے ہیں۔ سعودی عرب جانا چاہتے ہیں۔"

"اے تو بھجوا دو نا اِن کو منّے کے ابّا! اِتّے سریپھ آدمی نظر آویں ہیں یہ مجھے۔"

"ہاں ہاں! بھجوا دیں گے۔ اب تم بھی سفارش کرتی ہو تو انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ لو یہ نوٹ رکھ لو۔ ان سے میں پانچ ہزار ہی لے لوں گا۔"

حفیظ نے نوٹ اپنی بیوی کے ہاتھ میں تھما دیے وہ فوراً ہی مچلتی ہوئی باہر نکل گئی۔ اس کی تو عید ہو گئی تھی۔ حفیظ بھی بہت خوش اور ممنون نظر آتا تھا۔

"اس کا مطلب یہ ہُوا کہ ڈاکٹر سیال سے ابھی آپ بات نہیں کر سکیں گے۔"

"نہیں جی! یہ کام تو میں قربان صاحب سے ہی کروا لوں گا۔"

"مگر اُن پر حملہ کس نے کیا ہے؟"

"پتہ نہیں! کون بدمعاش تھے وہ، پولیس کو بھی غچّہ دے گئے۔ شام کو ایک اور گل کھلا ہے خدا جانے کیا ہونے والا ہے ہر طرف اندھیر مچا ہے۔"

"اور کیا ہوا ہے؟ ان پر کوئی اور حملہ ہو گیا ہو گا۔"

"جی نہیں! بھلے کا تو سماں ہی نہیں ہے۔ ڈاکٹر سیال کا ایک ملازم ہے اکبر۔ وہ آج اُدھر ڈرگ روڈ پر سے اپنی گاڑی میں جا رہا تھا۔ ایک فاکسی ہے اس کے پاس۔ میں بھی اسکے ساتھ تھا اور سیفی بھی۔ وہ بھی ڈاکٹر صاحب کا ملازم ہے۔ علوی صاحب کے ساتھ کام کرتا رہتا ہے۔ راستے میں ایک جوان ہماری گاڑی سے لگ کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ ہم نے اٹھا کر اُسے گاڑی میں ڈالا کہ ہسپتال پہنچا دیں گے تو اس کا علاج ہو جائے گا۔ اُسے ہم سیدھے یہاں سات سو چھیاسی میں لے آئے۔ ایک چھوٹا سا ہسپتال بنا رکھا ہے یہاں سیال صاحب نے۔ جیسے ہی ہم نے اُسے گاڑی سے نکالا۔ وہ بپھر کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے پاس کھلا ہوا پستول تھا۔ اس نے چھوٹتے ہی اکبر میاں پر گولی چلا دی۔ جو سیدھی اس کی ران میں لگی۔ وہ تڑپ کر گرا تو اس نے ہم دونوں کو پستول کی زد میں لے لیا، بولا "چلو اندر مجھے یہ کوٹھی دکھاؤ۔" بڑی گندی گالیاں بک رہا تھا وہ۔ ایسا گندہ ذہن آدمی میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ سالا جان بوجھ کر ہماری گاڑی سے ٹکرایا تھا۔ اور بے ہوشی کا بہانہ کر کے ہمارے اوپر سوار ہو گیا تھا۔ پستول دیکھ کر میرے تو پسینے چھوٹ گئے صاحب! ایسی مار دھاڑ تو ہم نے کبھی فلموں میں دیکھی تھی۔ سیفی اور میں ہاتھ اٹھا کر اس کے آگے آگے چلتے ہوئے کوٹھی میں جا گھسے۔ اس وقت وہاں ڈاکٹر عالیہ کی ایک سہیلی وُردہ اور دو خادمائیں موجود تھیں۔

وردہ کو اُس بدبخت نے دیکھتے ہی دبوچ لیا، بولا "تیری تلاش میں تو میں بہت دنوں سے پھر رہا تھا۔"

یوں لگتا تھا جیسے وہ اُسے پہلے سے جانتا تھا مگر اس کمینے کو وردہ بالکل ہی نہیں جانتی تھی۔ وہ بیچاری نیم جان ہو گئی۔ ہم سب کو اس بدبخت نے آگے لگا لیا۔ پستول کی دہشت تو آپ جانیں کیسی ہوتی ہے۔ ہماری تو جان ہی نکل گئی تھی۔ اس نے ہمیں یوں بے بس کر کے آگے ہانکا اور ساری کوٹھی کھنگال ڈالی۔ اور پھر اُلٹے ہاتھ کا ایک سیفی کے مُنہ پر دے مارا۔ بولا "وہ کہاں ہے وہ ڈاکٹر دشمن اور عالیہ؟" تب مجھے معلوم ہُوا کہ وہ بدمعاش تو کسی لمبے چکر میں تھا۔

اُس نے بتایا کہ وہ کوٹھی میں نہیں ہیں بلکہ جناح ہسپتال میں ہیں۔ چونکہ وہ دونوں بیمار ہو گئے تھے۔ اس کی یہ بات سنتے ہی اس نے ہم سب کو ایک کمرے میں بٹھایا اور باہر سے کنڈی چڑھا کر وہ وُردہ کو لے اڑا۔ اسی گاڑی میں جس میں بیٹھ کر ہم وہاں پہنچے تھے۔ اس کے جاتے ہی ہم کمرے کے عقبی حصے کی ایک کھڑکی میں سے کود کر باہر نکلے۔ اکبر میاں اس وقت بھی باہر لان میں پڑے تھے۔ گولی اُن کی ران میں دھنس چکی تھی۔ عین اس وقت ڈاکٹر ادیس وہاں آ پہنچے۔ انھوں نے اکبر میاں کا علاج کیا اور پھر اس سارے واقعے کی اطلاع دینے کے لیے وہ پولیس اسٹیشن کی طرف چل دیے۔ مگر ابھی نو بجے ان کا فون آیا کہ میں اور سیفی اب گھر چلے جائیں۔ وُردہ کو وہ آدمی جناح ہسپتال کے گیٹ پر اتار گیا تھا۔ میری تو سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔"

وہ یوں بول رہا تھا جیسے وہ کوئی بھیانک خواب دیکھ رہا ہو۔ اس بیچارے کو اپنے اتنے بڑے گروہ کے کرتوتوں کا اصل میں علم ہی نہیں تھا اور مجھ سے وہ ساری باتیں یوں کہہ گیا تھا جیسے وہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہو۔

"ڈاکٹر ادیس کا فون سننے کے بعد آپ نے اپنی سائیکل اٹھائی اور گھر کو چل دیے۔ یہ اچھا کیا آپ نے، پتہ نہیں وہ کون بدمعاش ہیں۔"

"ہاں جی! میں اور کیا کرتا۔ میں تو آج اپنی بھی زندگی سے مایوس ہو گیا تھا جناب! گولی کا کیا پتہ کب چل جائے۔ اور وہ سؤر کا بچّہ یوں بپھرا ہوا تھا جیسے ہم نے اس کا باپ مار دیا ہو، توبہ توبہ!" وہ دونوں کانوں کو آڑے ہاتھ لگا کر بولا۔ اور پھر گلاس میں کچھ اور شربت ڈال کر کہنے لگا "میری یہ سائیکل بھی جواب دے گئی۔ اس کی ہوا ایسے وقت نکلی کہ مجھے ڈیڑھ میل پیدل چلنا پڑا۔ سچ کہا ہے کسی نے مصیبت تنہا نہیں آتی۔"

"یہ ڈاکٹر ادیس کون ہے؟"

"یہ بہت قابل ڈاکٹر ہے کراچی کا رہنے والا ہے مگر عربی بہت اچھی جانتا ہے۔ پاسپورٹ اس کے پاس سعودی عرب کا ہے۔ نام اس کا حسنین ہے، محمد حسنین۔ ادیس تخلص کرتا ہے۔ چال ڈھال سے بالکل عربی نظر آتا ہے۔ اس نے بھی مجھے حیران کر دیا، فون پر کہنے لگا کہ ہم اس واقعہ کا کسی سے قطعاً ذکر نہ کریں۔ ہے نا پاگل پن کی بات! ایک عورت وہاں سے اغوا ہو گئی، ایک آدمی شدید زخمی ہو گیا اور وہ ہمیں چپ رہنے کی تاکید کر رہا تھا۔"

"کوئی مصلحت ہو گی اس کے سامنے۔"

"کیسی مصلحت جی! غنڈوں سے ڈر گئے ہیں وہ ڈاکٹر صاحب۔ ان کی اپنی ہوا سرک گئی ہے خوفزدہ ہو گئے ہیں وہ۔ ورنہ کوئی بات ہے بھلا۔ پولیس کس لیے ہے آخر؟"

"ہاں یہ تو ہے۔ آپ کا بہت بہت شکریہ حفیظ صاحب! تو پھر میں کب امید رکھوں؟"

"آپ نے اپنا نام پتہ، ہنر پیشہ تو کچھ بتایا ہی نہیں۔ میں بھی کیسا پاگل ہوں، ذرا تفصیل مجھے بتا دیں۔"

"جی میرا نام غلام علی خوبرو ہے۔ خوبرو میرا تخلص ہے۔ والد کا نام حشمت علی ہے، حشمت علی صابری۔ حیدرآباد سے آیا ہوں آپ کی خدمت میں۔ بی اے تک پڑھا ہوں اور بیکنگ کا کام جانتا ہوں۔"

اس نے یہ ساری تفصیلات اپنی ڈائری میں لکھ لیں۔ بولا "آپ ایک ہفتے بعد مجھ سے مل لیں اور رقم ساتھ لیتے آئیں۔"

"جی بہت بہتر! میں ضرور حاضر ہو جاؤں گا۔" یہ کہہ کر میں نے اس سے ہاتھ ملایا اور وہاں سے اُٹھ کر سڑک پر جا پہنچا۔ مجھے بخوبی اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ سات سو چھیاسی نمبر بنگلہ کس طرف ہے۔ وہاں میں اب آنکھیں بند کر کے کسی بھی وقت پہنچ سکتا تھا۔ وہ ایک لجلجی سی اداسی جو میرے ذہن سے چپک کر رہ گئی تھی اب ڈھل چکی تھی۔ میں بڑے پاپی پچ بہادروں کی طرح اکڑ اکڑ کر چلتا ہُوا بڑی سڑک پر پہنچا اور ٹیکسی میں بیٹھ کر سیدھا مردان شاہ کے پاس جا پہنچا۔ اس کا ہوٹل ان دنوں رات کو زیادہ چلتا تھا۔ مگر وہ کاؤنٹر پر موجود نہیں تھا۔ اس کے ملازم نے بتایا کہ وہ کیبن میں بیٹھا ہے۔

اندر جا کر میں نے کیبن کا دروازہ کھولا تو سامنے کرسی پر آبی کو بیٹھے دیکھ کر میری جان میں جان آ گئی۔ وہ اس وقت یہ بڑا سا آم کاٹ کاٹ کر کھا رہا تھا۔ مردان شاہ اس کے قریب ہی دوسری کرسی پر بیٹھا سگریٹ کے مرغولے بنا رہا تھا۔

"یار شکر ہے تو مجھے زندہ سلامت مل گیا ورنہ آج اس سیال کے بنگلے کو آگ ہی لگا دیتا۔"

"تو شجر کاری کے لیے گیا ہوا تھا۔ کہاں سے آ رہا ہے اس وقت؟ لے یہ آم کھا۔ بہت ٹھنڈے ٹھار آم ہیں یہ۔"

"تو یہ آم خریدنے گیا ہُوا تھا۔ تیری ساری کاروائی کا مجھے پتہ چل گیا ہے پر اس حماقت کی کیا ضرورت تھی ملا؟"

"اپنے اِس پیرزادے نے تو میری بھی جان نکال دی تھی یار جی! ابھی تھوڑی دیر پہلے واپس آیا ہے پر مجھے کچھ نہیں بتا رہے ہیں یہ ابھی تک۔"

"میں اس کی ساری باتیں معلوم کر آیا ہوں۔ یار! وہ سالی فاکسی اگر تیرے اوپر چڑھا دیتے تو کیا ہوتا؟"

"نہیں بھئی! میں نے اُن کو پہچان لیا تھا۔ گاڑی کو بھی میں جانتا تھا۔ جیسے ہی وہ مجھے نظر آئی میں جان بوجھ کر بڑی احتیاط سے اُس کے ساتھ جا ٹکرایا۔ سپیڈ اس کی زیادہ نہیں تھی۔ میں نے گرتے ہی یہ ظاہر کیا جیسے میں بے ہوش ہو گیا ہوں۔ تجھے یہ سب کچھ کس نے بتایا ہے؟"

"وہ معنک سالا عبدالحفیظ مجھے مل گیا تھا۔ وہ بھی اسی گاڑی میں تھا۔ وہ تو جل تو جلال تو پڑھ رہا تھا۔ پر وہ وردہ کہاں ہے آپ؟ اسے وہاں سے اٹھانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"بس ایسے ہی یار! میں دراصل اس سے ڈاکٹر دھمن کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا۔ وہ جناح ہسپتال میں پڑے ہیں۔"

"اور اس اکبر کو خواہ مخواہ ہی زخمی کر دیا تم نے۔"

"اس کی نیت میں سمجھ رہا تھا وہ مجھے اسی بے ہوشی کی حالت میں باندھ کر ڈال دیتا۔ مجھے وہ پہچان نہیں سکا تھا گر دے کی اسامی سمجھ رہا تھا۔ اگر وہ میرا علاج کروانا چاہتے تو کسی قریبی ہسپتال میں نہ لے جاتے۔ اس کو مزہ چکھانا بہت ضروری تھا۔"

"وردہ نے کچھ بتایا ہے تمہیں؟"

"ہاں! تکریم کے فلیٹ کی نگرانی کی جا رہی ہے۔ اسے پولیس نے جان بوجھ کر چھوڑا ہے مخض جال ہے کی صورت میں۔ اچھا ہوا ہم اُدھر نہیں گئے۔ وردہ کو میں نے ہسپتال کے گیٹ پر گاڑی کے ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ میں اس کو سوات خان کی ٹاکسی میں ڈال کر لے گیا تھا۔"

"تکریم کو یہاں سے چلے جانا چاہیے اور ہمیں بھی یہ ٹھکانہ چھوڑنا ہوگا۔" میں نے آم کے کتلے پر مُنہ مارتے ہوئے کہا۔ وہ بہت ہی لذیذ آم تھے۔

"نہیں یار! اس جگہ تک وہ نہیں پہنچ سکتے ہیں۔ کسی کو، تکریم کے سوا علم ہی نہیں ہے کہ ہم یہاں ٹھہرے ہیں۔"

آبی کی یہ بات سن کر مردان شاہ بولا۔ "جیلانی ٹھیک کہہ رہا ہے آپ کی باتیں میری سمجھ میں آ رہی ہیں۔ یہ رات آپ کسی اور جگہ گزار لیں۔ پولیس کے لوگ بھی میرے ہوٹل آتے رہتے ہیں۔" اس کے لہجے میں تشویش نمایاں ہو گئی تھی۔ اسی کیفیت میں وہ گھبرا کر اُٹھا اور کہنے لگا۔ "میں باہر بیٹھا ہوں۔ ہمیں بہت چوکس رہنے کی ضرورت ہے تم لوگوں نے میرے ہوٹل کو مشکوک بنا دیا ہے۔" وہ بہت سنجیدہ ہو گیا تھا اسے یہ ڈر تھا کہ ہم اس کو بھی لے ڈوبیں گے۔ اسے اپنا وہ کاروبار ہر شے سے زیادہ عزیز تھا۔ اور ہونا بھی چاہیے تھا۔ وہ اس کی کل کائنات تھی۔ ہم اُس کے لیے کسی بھی لمحے زبردست مصیبت کا سبب بن سکتے تھے۔ ہماری باتوں نے اسے دہلا کر رکھ دیا تھا اور اسے ہم سے اب خوف آنے لگا تھا۔ خلوص کی درمیانی کڑی ایک دم ٹوٹ گئی تھی۔

آبی نے پلنگ کے بستر سے اپنے ہاتھ صاف کیے اور بولا۔ "یہ نامردان شاہ ٹھیک کہہ رہا ہے یہاں سے فوراً نکل چلو جیلانی! ایسے لوگوں کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا اسے ہم کوئی موقع نہ ہی دیں تو اچھا ہے۔" یہ کہہ کر وہ اپنی چیزیں سمیٹنے لگا۔

"الماس سے بات ہوئی تھی تمہاری؟"

"ہاں! وہ پرسوں شام کی فلائیٹ سے کراچی آ رہی ہے۔ میں اُسے ائرپورٹ پر لینے جاؤں گا گیارہ بجے۔"

"ارے یہ کیا کر دیا تم نے؟ کیا ضرورت تھی اُسے یہاں بلانے کی؟"

"میں نے اُسے نہیں بلوایا ہے وہ اپنے ہی کسی کام سے ادھر آ رہی تھی کہ میرا فون اُسے مل گیا۔"

"اُس پر تو لعنت ہی بھیج دے آبی! اس سے ملنے کا موقع نہیں ہے۔"

"حرج ہی کیا ہے میرا دل اداس ہو رہا ہے اسی بہانے میں اس سے مل لوں گا۔"

"تمہاری مرضی۔ بہرحال میں اس کے سامنے نہیں جاؤں گا۔" میں نے اُس کے ساتھ ہی کیبن سے نکلتے ہوئے کہا۔ ہم دونوں نے اُس ہوٹل سے اسی وقت نکل جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

جب ہم باہر نکلے تو مردان شاہ نے ہمیں رکنے کے لیے نہیں کہا۔ وہ یہی چاہتا تھا کہ ہم اُس کا وہ خانہ خالی کر دیں جو ہماری وجہ سے تباہ بھی ہو سکتا تھا۔ وہ اپنی جگہ سچا تھا ہمیں اس سے کوئی گلا نہیں کرنا چاہیے تھا جس مشکل میں ہم پھنسے تھے اُس میں تو آدمی کا سایہ بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے اور وہ تو مردان شاہ تھا جس پر ہمارا کوئی حق ہی نہیں تھا۔

ہوٹل سے نکلتے ہی ہم ٹیکسی میں بیٹھے اور شہر کے بہت اونچے ہوٹل میں جا ٹھہرے اُس کی تجویز آبی نے ہی پیش کی تھی۔ وہ الماس کی پذیرائی کے لیے کسی ایسے ہی بہت شاندار قسم کے انتظام کا خواہاں تھا اور اس بوتل کو وہ کسی خوبصورت کنج تنہائی میں بیٹھ کر گٹ گٹ کرکے پی جانا چاہتا تھا۔ اس پر اچانک ہی ایسی افسردگی چھا گئی تھی کہ اس کے جال کو کاٹنے کے لیے اس کی الماس سے ملاقات ضروری تھی۔ مگر مجھے امید نہیں تھی کہ الماس اسکے دکھوں کا مداوا کر سکے گی۔ اُسے ہم ایسوں کے سائے سے بھی دُور رہنا چاہیے تھا۔ وہ ملک کی ذی وقار اور نامور فنکارہ اپنے جلو میں عزت اور شوکت کے مظہر لشکر لے کر چلتی تھی۔ اُس کے نام کا ہر طرف طوطی بول رہا تھا۔ سکہ اس کے نام پر ڈھلتا تھا جہاں وہ بیٹھ جاتی تھی وہ جگہ طلائی رُوپ دھار لیتی تھی۔ وہ خالی تجوریوں میں بہارلے آتی تھی۔ اس کی نگاہ میں سحر تھا، اور چال میں غزالوں ایسی مستی۔۔۔۔۔ اور اُس کی بدنصیبی یہ تھی کہ وہ آبی کو دل دے بیٹھی تھی اور نہیں جانتی تھی کہ اُس نے کیسے زہریلے سانپ کو آستین تلے چھپا لیا ہے۔ آبی کسی بھی طرح اس کے لائق نہیں تھا۔ تھے تو ہم بھی فنکار مگر ہم موت کا رقص کرتے تھے۔ ہمارے جلو میں شیطان کا جلوس چلتا تھا۔ ہم لاکھ کہیں کہ ہم ایک بڑے اور اعلیٰ ارفع مقصد کے لیے آگے بڑھ رہے تھے مگر تھے تو ہم جیلانی

آبی۔ وہ بہت ہی گھٹیا اور زہریلے سانپ، اژدہوں نے ہمیں ڈس لیا تھا۔ ورنہ تو ہمارے اندر آدمیت کی تو کوئی بات ہی نہیں تھی۔ پھر بھی آبی سمجھتا تھا کہ وہ الماس کی سیج کا اہل ہے۔ تو بہ اُس کی بت ہی طرفہ تماشا سوچ تھی۔ جب اس نے کہا کہ اسے کسی بلوان چوکیدار کی ضرورت ہے شوہر کی نہیں تو بلاشبہ وہ بہت ہی پتے کی بات کہہ رہا تھا مگر اُس سے آگے وہ جو کچھ سوچ رہا تھا وہ سراسر غلط تھا۔

ہم جب اس ہوٹل میں اُترے تو اُس وقت رات کے بارہ بج رہے تھے۔ کمرہ جو ہمیں ملا اُس میں ضرورت کی ہر شے موجود تھی۔

آبی نے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "پرسوں صبح میں ایک اور کمرہ بھی لوں گا۔ الماس کو اس میں ٹھہراؤں گا۔ اب کی بار میں اس سے ڈھیر ساری باتیں کروں گا جیلانی! میرا خیال ہے کہ میں اس سے خوامخواہ ہی بدگمانی کر رہا تھا۔ وہ اچھی عورت ہے یار! کیا خیال ہے تیرا؟"

"ابھی وہ تیرے نکاح میں نہیں آئی، اس لیے میں اُس کے بارے میں تیری رائے خراب نہیں کرنا چاہتا۔ مگر اس سے شادی کرتے ہی تیرے دماغ کے اندر پھنسیاں نکل آئیں گی۔"

"نہیں یار! ایسا بھی کتے کا ہم جنس نہیں ہوں میں۔ تو ادھر بیٹھ میں ذرا نہاؤں میرا خیال ہے صبح ہمیں دو چار جوڑے اور خریدنے چاہئیں۔ کپڑے تو ہم جگہ جگہ پھینکتے چلے آتے ہیں۔"

یہ بات کہہ کر آبی غسل خانے میں جا گھسا۔ وہاں شاور لگا تھا اور پانی کو اس موسم میں خاص طور پر ٹھنڈا کر دیا گیا تھا۔ شاور کھلتے ہی آبی ہاؤ ہو کرنے لگا۔ کبوتر کو اس کا من پسند چوگا مل جائے تو وہ غٹر غوں غٹر غوں کرنے لگتا ہے اُس کا بھی یہی حال تھا۔ کوئی بیس منٹ گزر گئے۔ آبی کا غسل ابھی تک جاری تھا کہ ہمارے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی میں نے اٹھ کر دستی گھما دی۔ سب کے سامنے ایک بیرا کھڑا تھا سفید سفرے سفید رنگ کے لباس میں۔ عمر اُس کی یہی کوئی چالیس سال ہوگی، بولا۔ "صاحب آپ فون کیوں نہیں اٹھاتے ہیں؟"

"کیا مطلب؟ گھنٹی تو بجی ہی نہیں۔"

"میرا خیال ہے ریسیور صحیح نہیں رکھا ہے آپ اٹھا کر دیکھیں۔"

"مگر فون کس کا ہے کون بات کرنا چاہتا ہے ہم سے؟"

"نیچے ٹیلی فون بوتھ کے اندر دو لڑکیاں کھڑی ہیں وہ آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔"

"کون لڑکیاں ہیں، وہ کیسے جانتی ہیں وہ مجھے؟" میں نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

اتنے میں آبی کپڑے پہن کر غسل خانے سے باہر آیا۔

"کیا بات ہے کیا کہتا ہے بہرہ؟" لفظ 'بہرہ' پر اُس نے خاص طور پر زور دیتے ہوئے پوچھا۔

میں نے استفہامی نظروں سے بیرے کو دیکھا تو ایک عجیب دلنوں ایسی مسکراہٹ اس کے لبوں پر آگئی۔ بولا۔ "آپ بات تو کریں اُن سے۔"

آبی نے ریسیور جھپٹ لیا، بڑی ترنگ میں بولا۔ "ہے۔ ہے ہیلے۔۔۔ لو۔۔۔ جی! فرمائیے کس سے بات کرنی ہے آپ کو؟" اُس کا رنگ شہابی ہونے لگا۔ اس کی کچھ حسیات ایسی تھیں جو حظ خوشی اور خطرے کے موقعے پر فوراً ہی بیدار ہو جاتی تھیں۔ "اچھا، اچھا! تو آپ ہمیں ملنا چاہتی ہیں مگر کیوں؟ رات کے ساڑھے بارہ بج رہے ہیں۔۔۔۔" اچھا تو ہمیں کاؤنٹر پر دیکھا تھا۔" یہ کہہ کر اُس نے ریسیور کا ایک کان بند کر دیا۔ بولا۔ "کیا خیال ہے مولانا! ہو جائیں پھر دو دو ہاتھ۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" میں نے اس کے چہرے سے پھوٹتی مسرت دیکھتے ہوئے کہا۔

"بھئی! ہم مردوں کو عورتوں کے ساتھ شانہ بشانہ چلنا چاہیے روز اخبار میں یہی وہ کہتی ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے ریسیور کے منہ پر ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "کم ان سویٹیز کم ان۔" یہ کہہ کر اُس نے فون بند کر دیا۔ بیرا ابھی تک سامنے کھڑا تھا۔

"حضور! کچھ میرا بھی خیال رکھیں، یہ انتظام میں نے ہی کیا ہے۔"

"فکر نہ کر تیرا خیال ہم پہلے کریں گے۔" آبی نے اُسے دروازے سے پیچھے دھکیلتے ہوئے کہا۔ وہ شرمندہ سا ہو گیا، بولا۔ "صاحب! میری فیس تو دینی ہی ہو گی۔ میں صبح آ جاؤں گا۔"

"آ جانا، آ جانا۔ ابھی تو رستہ چھوڑ۔" یہ کہہ کر آبی نے دروازہ بند کر دیا۔

"یار! یہ چکر مجھے اچھا نہیں لگتا۔ پتہ نہیں کون گشتیاں ہیں وہ۔"

"تو چپ رہ کر جیلانی! یہ سب فانی سلسلے ہیں ادھر ہی رہ جائیں گے پتہ نہیں کس گولی سے ہم کہاں گر جائیں۔ جو دم گزر جائے غنیمت سمجھ۔" اس نے بڑے سادھوسنتوں ایسے لہجے میں کہا۔ اور سگریٹ سلگا کر کرسی میں دھنس گیا۔ نگاہیں اس کی دروازے پر لگی تھیں۔ کچھ بیرے اسی کام پر مامور تھے۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ وہ ہوٹل شہر کے اعلیٰ ترین ہوٹلوں میں سے ایک تھا۔ پولیس کے فرشتے بھی وہاں نہیں پہنچ سکتے تھے۔ قانون تو کھدر خانوں میں داخل ہوتا ہے۔ لاٹھی تو اُن سروں پر برستی ہے جو پہلے ہی جھکے ہوئے ہوتے ہیں۔ پولیس کے لوگ چھوٹے چھوٹے مسافر خانوں میں اودھم مچاتے ہیں۔

جہاں کوئی اُن کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات نہیں کر سکتا۔ آبی اُن لوگوں میں تھا جو ہر موقعہ سے فائدہ اٹھانے کے قائل ہوتے ہیں۔ اس کے لیے ہر موقعہ بے مثال تھا۔

کوئی تین منٹ ہی بعد دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی تو آبی نے اٹھ کر دستی گھما دی۔ ہمارے سامنے دو نوعمر لڑکیاں کھڑی تھیں۔ ایک کے بال سنہری تھے دوسری کے سُرخ۔ آدمی کی نظر سب سے پہلے اُن کے بالوں پر پڑتی تھی دونوں ہی جدید تراش خراش کا لباس پہنے ہوئے تھیں۔ وہ دونوں سیدھی آبی کے دل میں اُترتی چلی گئیں۔ وہ ہمیشہ کسی ایسے ہی پارۂ نور کا متلاشی رہتا تھا۔ مجھے اس کی وہ بات اچھی نہیں لگتی تھی۔ پتہ نہیں کیا وجہ تھی میرا دل زندگی کے اِس رُخ سے بیزار ہو چکا تھا۔ مجھے بکتی ہوئی عورت اور نجس کُتیا میں کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا۔

آبی اُن کی خاطر تو منع میں لگ گیا سوڈے کی کئی بوتلیں وہاں چھوٹے سے فرتج میں دھری تھیں۔ شراب بھی وہاں موجود تھی۔ کمرے میں ٹی وی بھی فراہم کیا گیا تھا اور ریڈیو بھی۔ قد آدم آئینہ الگ خوشامد کرتا دکھائی دیتا تھا۔ کمرہ کیا تھا ماں کی گود ایسا مہربان اور مسرت آگیں محسوس ہوتا تھا۔

"آپ کا کیا نام ہے حضورُ! لگتا ہے اللہ میاں نے آپ کو بڑے فرصت کے لمحات میں بنایا ہے اور ان بالوں پر تو اس نے بڑی توجہ دی ہے۔" آبی نے بہکتے ہوئے اس لڑکی سے پُوچھا جو اس کے سامنے دائیں ہاتھ کی کرسی پر بیٹھی تھی۔

"جی میرا نام امتل الحفیظ ہے سب مجھے امتل ہی کہتے ہیں۔" اس پری وش نے لجاتے ہوئے کہا۔

"میں سمجھا آپ کا نام انجل ہے، کچھ ایسا ہی لگ رہا تھا مجھے چلیں امتل بھی اچھا ہے کچھ میوزک ہے اس میں۔"

"میوزک کے بہت رسیا ہیں آپ! کوئی انجل بھی آئی تھی آپ کی زندگی میں؟" اُس غنچہ دہن نے سوڈے کا گلاس منہ سے لگاتے ہوئے کہا۔

"نہیں! میری زندگی میں تو نہیں البتہ وہ میرے گاؤں میں ضرور آئی تھی۔ جب پاکستان بنا تو ایک مہاجر اللہ دتا وہاں آیا۔ اس کی چودہ سالہ بیٹی شریفاں کسی نے فیروز پور سٹر کے باہر قافلے پر سکھوں کے حملے کے دوران اُٹھالی تھی۔ اللہ دتا نے پاکستان آتے ہی اپنا گھاٹا پورا کر لیا۔ اور ہندو کی بیٹی اغوا کر لی۔ اس کا نام انجل تھا وہ انجل ہی رہی۔ اللہ دتا نے اسے بیٹی نہیں بنایا بلکہ بیوی بنا لیا۔ وہ دھان پان سی بے زبان انجل لڑکی سے عورت بنی پھر وہ عورت سے ماں بن گئی۔ کلمہ پڑھ کر ہندو سے مسلمان ہو گئی۔ اب وہ اللہ دتا کے چھ بیٹوں کی ماں ہے مگر ہے وہ ابھی تک انجل۔ کہتی ہے کوئی میرا نام نہ بدلے۔ بس اتنی کرپا تو کرو مجھ پر۔ وہ سب کچھ بدل دینے پر رضامند ہو گئی مگر اپنا نام اس نے ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔"

"عجیب سا نام ہے۔ کیا مطلب ہے اس کا۔ کچھ پتہ ہے آپ کو۔ مجھے پیارا لگتا ہے یہ نام۔" اس لڑکی نے پوچھا۔

"اس کا مطلب ہے پراتھنا یعنی دُعا کے لیے اٹھے ہوئے ہاتھ۔" آبی نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔ گاؤں کی پُرانی یادیں اُس کے ذہن میں ابھرنے لگی تھیں۔ جیسے کسی پرانی چوٹ میں اچانک درد جاگ اٹھتا ہے۔ "اس کا مطلب میں نے خود اُس سے پُوچھا تھا۔ وہ خود بھی دعا ایسی لگتی تھی، دل سے نکل کر دل میں اُترنے والی۔ میں اسے کبھی نہیں بھول سکا ہوں۔" آبی کا لہجہ بہت ہی اداس ہو گیا تھا۔

دوسری لڑکی بالکل خاموش تھی۔ کبھی وہ گہری گہری نظروں سے مجھے دیکھتی تھی اور کبھی آبی کو اور آہستہ آہستہ سوڈا "سپ" کر رہی تھی۔ یہ لفظ میں نے اُس رات اسی کی زبان سے سُنا تھا۔

"آپ نے ان کا نام نہیں بتایا۔ میرا خیال ہے ان کا نام جائزہ خانم ہو گا۔" آبی نے سوڈے کی ایک اور بوتل کھول لی۔

وہ دونوں کھلکھلا کر ہنس دیں۔

"یہ ٹھیک کہا ہے آپ نے۔ یہ جائزہ زیادہ لیتی ہے ویسے ان کا نام راشدہ ہے۔"

"ماشاء اللہ۔ بزرگی تو ان کے چہرے سے ظاہر ہے۔ یہ جائزہ زیادہ ہی لیتی ہیں اور ان کی فیس بھی زیادہ ہو گی مطلب ہے کہ۔۔۔۔"

"جی ہاں! ہم دراصل ایک نفسیاتی معالج کا کام کرتی ہیں الجھے ہوئے زخمی ذہنوں کو مرہم فراہم کرتی ہیں نا ہم۔ اس لیے ہماری فیس واقعی بہت زیادہ ہے۔"

"پیشنٹ پیشنٹ پر ڈیپینڈ کرتی ہو گی آپ کی فیس؟" آبی نے اُسے بڑے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں! زیادہ کمپلیکیٹڈ کیس ہو تو زیادہ فیس چارج کرتے ہیں ہم لوگ۔" راشدہ نے بہت سنجیدگی سے کہا۔

"میرا مطلب ہے کہ آپ کی پُروزٹ کیا فیس ہے؟" آبی نے پھر کج بحثی کا مظاہرہ کیا۔ وہ اُن کی باتوں سے بے حد لطف اندوز ہو رہا تھا۔

آبی نے میرے چہرے کی سنجیدگی کا اندازہ کرتے ہوئے فون پر ہوٹل کے کاؤنٹر پر کھڑے آدمی سے کہا کہ وہ ہمارے لیے ساتھ کا کمرہ مخصوص کر دے۔ وہ اتفاق سے اس وقت خالی تھا۔ کچھ ہی دیر بعد ایک آدمی نے اُوپر آ کر وہ میرے لیے کھول دیا۔ وہ بھی ہر قسم کی آسائش سے مزیّن تھا۔ میں آبی سے کچھ کہے سُنے بغیر اس کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ مسخ سازوں نے ہر کمرے کو اس موسم میں بہشت بنا رکھا تھا۔ نوٹوں سے بھرا بریف کیس میں اپنے ہاتھ میں لے گیا۔ آبی [illegible] خباثت سے باز نہیں رہ سکتا تھا اور میں اندر سے دروازہ بند کر کے بستر پر لیٹ گیا۔

بڑی دیر تک میں بستر پر کروٹیں بدلتا رہا مگر نیند مجھے کسی بھی طرح نہیں آ رہی تھی۔ کچھ عجیب سی ذہنی اذیت نے مجھے آ دبوچا تھا۔ ہر شے بے یقینی کی نذر ہوتی جا رہی تھی۔ وہ انتقام کی آگ جس میں ڈاکٹر دھمن اور عالیہ کو جلا کر بھسم کر دینا چاہتا تھا لوٹ کر مجھے ہی جلاتی چلی جا رہی تھی۔ ایک احساسِ محرومی تھا جو مجھے رہ رہ کر کچوکے دیتا تھا۔ دل میرا یہ چاہتا تھا کہ میں اسی وقت جناح ہسپتال جا پہنچوں اور اُن دونوں کو خنجر سے اتنے زخم لگاؤں کہ اُن کے جسم چھلنی ہو جائیں۔ وہ کٹھ ٹھہر کر مختلف بے گناہ معصوم لوگوں کا لہو چاٹ رہے تھے اور کسی کو احساس تک نہیں تھا کہ وہ کیا ہیں اُن کا دروں کچھ اور تھا برُوں کچھ اور۔ انتظامیہ کی ساری ہمدردیاں اُن کے ساتھ تھیں۔ وہ ظالم تھے بدترین قسم کے جرائم کے وہ مرتکب تھے۔ مگر جیسے ہی ہم نے اُن پر ہاتھ ڈالا وہ مظلوم بن گئے۔

میں نے اپنے کمرے میں لگے فون کا ریسیور اٹھا کر استقبالیہ پر کھڑی خاتون سے کہا کہ وہ مجھے جناح ہسپتال میں کسی سے بات کروا دے۔

جیسے ہی مجھے مطلوبہ نمبر ملا۔ میں نے کہا "دیکھیں جناب میں ڈاکٹر دھمن صاحب کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اب ان کی صحت کیسی ہے، وہ بے ہوشی کی حالت میں ڈاکٹر عالیہ کے ہمراہ ہسپتال میں داخل کیے گئے تھے۔"

دوسری طرف انکوائری پر کوئی بڑا ہی ذمّے دار آدمی بیٹھا تھا۔ "میں ابھی معلوم کر کے بتاتا ہوں جناب! ذرا انتظار کریں۔"

کچھ ہی دیر بعد جو آواز مجھے سُنائی دی وہ کسی خاتون کی تھی۔ "ہیلو! میں ڈاکٹر جمیلہ بول رہی ہوں آپ ڈاکٹر دھمن کے بارے میں پُوچھ رہے ہیں؟"

"جی ہاں! وہ میرے پرانے دوست ہیں، سُنا ہے وہ بہت سخت بیمار ہیں۔"

"جی وہ بیمار تھے اب تو بھلے چنگے ہیں اور کمرے میں اطمینان سے سو رہے ہیں انہیں کسی نے بے ہوشی کی دوا کھلا دی تھی۔"

"کس کمرے میں ہیں وہ؟"

"جی [illegible] نمبر کمرے میں ہیں وہ۔ مگر اس وقت آپ اُن سے [illegible]"

"ہاں ظاہر ہے اب تو وہ سو رہے ہوں گے۔ میں صبح اُن کی عیادت کے لیے آؤں گا۔"

"آپ کا نام؟"

"نام بتانے کی ضرورت نہیں ہے میں صبح خود مل لُوں گا اُن سے۔" یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔ میرا خُون پھر کھولنے لگا تھا۔

ہمارے بدترین دشمن پھر سے جی اُٹھے تھے۔ انہیں اُن کی اپنی دوا بھی موت کے گھاٹ نہیں اتار سکی تھی اور مجھے یقین تھا کہ وہ گولیاں انھوں نے خود کو ختم کرنے کے لیے ہی کھائی تھیں۔ وہ بہت زیادہ خوفزدہ اور مایوس ہو گئے تھے انھیں ہمارے پنجے سے رہائی کی کوئی امّید باقی نہیں رہ گئی تھی۔

اُن پر دُوسرا حملہ آبی نے کیا تو وہ اُسے بھی پی گئے۔ اس ڈاکٹر اویس نے سارے معاملے پر ہی مٹی ڈال دی تھی۔ حالانکہ اُن کا ایک اہم کارکن اکبر میاں آبی کے ہاتھوں زخمی ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود وہ اس قضیے کو پولیس کی نظروں سے چھپا گئے تھے۔ کیونکہ اُن کا اپنا پردہ چاک ہوتا تھا۔ مجھے اس ڈاکٹر ترمذی کے رویے پر بھی حیرت ہوتی تھی۔ ہمارے سامنے وہ کس طرح بگلا بھگت بن گیا تھا۔ ہر بات پر حیرت کا اظہار کرتا تھا جیسے وہ ڈاکٹر دھمن کے اُس رُخ کو جانتا ہی نہ ہو۔ اس کی اداکاری کو ہم سمجھ ہی نہ سکے۔ حالاں کہ مجھے اب یقین ہو چکا تھا کہ وہ سب کچھ جانتا تھا۔ وہ خود بھی بہت مشہور سرجن تھا اور میرا خیال ہے کہ اُس ڈاکٹر دھمن سے جسے میں ڈاکو دھمن کہوں تو زیادہ بہتر ہے باقاعدہ رقمیں وصول کرتا ہو گا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ عالیہ کے بیان کی ٹیپ کو صاف کیوں کر دیتا۔ وہ کام اسی نے کیا تھا۔ اگر وہ اس دھمن کے جُرم میں برابر کا شریک نہیں تھا تو بھی اس نے ان کو بچا لینے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ اور ہم چاروں شانے چت گر گئے تھے۔

کتنی ہی دیر تک میں بستر میں پڑا اس ساری صُورتحال پر جھنجھلاتا رہا۔ یہاں تک کہ بالآخر میری پلکوں پر نیند اُتر ہی آئی، اور میں بے سُدھ ہو کر سو گیا۔ میری جب آنکھ کھلی تو اس وقت دروازے پر بڑے زور سے کسی نے دستک دی تھی۔ میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ اس وقت صبح کے پونے چار بج رہے تھے۔

"کون ہے؟"

"جی میں ہوں امتل، دروازہ کھولیں۔ آپ کے دوست کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔" یہ اس پلپلی کٹیکری کی آواز تھی جس کا نام سُن کر آبی کو اپنے گاؤں کی کوئی مغویہ انجل یاد آ گئی تھی۔ میں بستر سے اُچھل کر اٹھا اور عادتاً پستول کو پیٹی کے نیچے اُڑس کر میں نے دروازہ کھول دیا۔ مگر وہ دروازہ کھولنا ہی قیامت ہو گیا۔

میرے سامنے مسلح پولیس کے چھ سپاہی بندوقیں تانے کھڑے تھے اور اُن کے عقب میں کھڑے پولیس کے دو اعلیٰ افسر بڑے غضبناک انداز میں مجھے گھور رہے تھے۔ امتل اور راشدہ اُن کے دائیں ہاتھ کھڑی مسکرا رہی تھیں۔

"ہاتھ اُوپر اٹھا لو جیلانی! تمھاری رسّی اب ختم ہو چکی ہے۔" سپاہیوں کی قطار میں کھڑے تھانیدار نے اپنا پستول مجھ پر تانتے

ہوئے کہا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟ میرا نام ہاشم خان ہے کیا چاہتے ہو تم، یہ کیا بدتمیزی ہے؟" میں نے اپنے حواس مجتمع کرتے ہوئے کہا۔

"ہاتھ اوپر اٹھاؤ ہم تمھیں گرفتار کر رہے ہیں۔" وہ پھر گرجا۔ میری بات کا جواب وہ نہیں دے رہا تھا۔ آبی مجھے کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ اسے وہ پہلے ہی دبوچ کر کسی الگ خانے میں ڈال چکے تھے۔

ہم بازی ہار چکے تھے۔ کسی نے ہمیں پہچان کر پولیس کو بلوا لیا تھا اور آبی کی وہ زن پرستی رنگ لا چکی تھی۔ میں نے صورتِ حال کی سنگینی کا احساس کرتے ہوئے ہاتھ اوپر اٹھا لیے تو میری بُشرٹ کا دامن اوپر اٹھ گیا۔ پستول کا دستہ سامنے ہی نظر آرہا تھا۔ اُس تھانیدار نے آگے بڑھ کر وہ پستول میری پیٹی کے اندر سے نوچ لیا۔ میری خم بارہ تقدیر نے مجھے ایک نئے ہولناک آتش فشاں کے دہانے میں پھینک دی تھی۔ پستول سے مجھے محروم کرکے اُس تھانیدار نے دو سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ وہ اپنی رائفلیں بغلوں میں دبا کر مجھے ہتھکڑی پہنانے کے لیے آگے بڑھے تو عین اس وقت ہوٹل کی انتظامیہ کے دو تین آدمی شب خوابی کے لباس میں دوڑتے ہوئے وہاں آپہنچے۔ میں ابھی دروازے کی دہلیز پر کھڑا تھا اور سپاہی اس وقت میرے ہاتھ نیچے کر ہی رہے تھے کہ اُن میں سے ایک کو گریبان سے پکڑ کر میں نے پوری... قوت سے اندر کی طرف گھسیٹا اور برق رفتاری سے پیچھے ہٹ کر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ سپاہی بندوق سمیت سامنے فرش پر گر گیا تھا۔ میں نے دروازے کی تینوں چٹخنیاں چڑھا لیں۔ مجھے یوں اچانک خود کو موت کے حوالے کر دینے سے پہلے وقت کے دریا میں ایک تُرَک تو لگا ہی لینی چاہیے تھی۔ میری جان اتنی سستی نہیں تھی کہ میں اسے یوں ریزہ ریزہ کر دیتا۔ دروازہ میں نے کچھ اتنی تیزی سے اور اُن لوگوں کی توقعات کے برعکس اتنے جارحانہ انداز سے بند کر لیا تھا کہ وہ بھونچکے سے رہ گئے تھے۔ انھوں نے دروازے پر کچھ اتنے زور سے ٹھوکریں ماریں کہ میں سمجھا وہ ٹوٹ جائے گا۔ میں بدترین صورتِ حال سے دوچار ہو چکا تھا۔ میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ بازی یوں الٹ جائے گی۔ میں نے کنڈیاں چڑھاتے ہی اس سپاہی کو تیزی سے اپنے عقب میں اٹھتے دیکھا۔ بندوق اس کی بغل سے نکل کر دور جا پڑی تھی اور وہ اُس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے اس کو وہیں روک دیا اور اس کے ساتھ ہی میں نے بندوق اٹھا لی۔ اس کا میگزین گولیوں سے بھرا ہوا تھا۔ بندوق کی نال میں نے اس کے سینے سے لگا دی۔

دروازے پر بلا کی ضربیں لگ رہی تھیں۔ اُن کی تلملاہٹ لمحہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی اور کوئی آدمی مجھے گندی گالیاں دے رہا تھا۔ وہ اُن کا وطیرہ ہے مگر مجھے اُن کی گالیوں کو سننے کی فرصت ہی کہاں تھی۔ میں نے ایک بار پھر گہری نظر سے کمرے کا جائزہ لیا۔ عقبی کھڑکی پر آہنی گرل لگی تھی اور ہم ہوٹل کی دوسری منزل پر تھے۔ گرل کو [illegible] کسی بھی طرح ممکن نہیں تھا۔ میرے سامنے کھڑا سپاہی لرز رہا تھا۔ اچانک دروازے پر خاموشی چھا گئی۔ اُن لوگوں کی وہ ضربیں [illegible] ہی آپ تھم گئی تھیں اور اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ ہوٹل میں [illegible] ہنگامہ مچ جانے کے خوف سے منیجر نے پولیس کو شور برپا کرنے [illegible] دیا تھا۔ اس ہوٹل میں شرفا ہی آکر ٹھہرتے تھے اور اُن کے غیض و غضب اور برہمی سے ڈرتے ہوئے شاید منیجر نے پولیس سے درخواست کی ہو کہ وہ مجرم کو کمرے سے باہر لانے کے لیے کوئی اور حربہ استعمال کریں۔ ایک لمحے کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر میں نے چند ساعتیں خرید تو لی تھیں مگر وہ مجھے بہت مہنگی پڑتی نظر آرہی تھیں۔ میرے سامنے کھڑے سپاہی کی جان ہوا ہوئی جاتی تھی۔ اُس کے چہرے کی پیلاہٹ اس کے اندر کی دہشت کی غماز تھی۔ مجھے ہر قیمت پر اُن کے اس جال سے نکل جانا چاہیے مگر حیرت مجھے یہ تھی کہ اُن لوگوں کو ہمارے بارے میں اطلاع کس نے دی تھی۔ ہمیں یوں بھول بھلیاں کی گدھی کس نے بنا دیا تھا۔ دروازے پر شور تھما تو میں نے اس سپاہی کو بندوق کی نال سے ایک ہلکا سا کچوکا دیا۔ "تمھیں یہاں تک کون لایا ہے؟ کیا جرم کیا ہے ہم نے؟"

میری آواز سُن کر وہ لرز کر ایک قدم پیچھے ہٹا۔ اس آواز میں شاید کچھ ایسی ہی لرزہ خیز دہشت تھی۔ بڑی ہی کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ "وہ... وہ لڑکیاں خفیہ پولیس کی ملازم ہیں۔ بڑے بڑے ہوٹلوں میں انھیں خاص طور پر بھیجا جاتا ہے اور اس ہوٹل پر اُن کی ڈیوٹی کل ہی لگی تھی۔" اس کی آواز حیرت انگیز حد تک میری آواز سے ملتی تھی۔ "آپ کے دوست آبی کو انھوں نے شراب پلائی تو وہ اوٹ پٹانگ بکنے لگا۔ اسی نے آپ کے بارے میں انھیں سب کچھ بتا دیا۔"

اُس سپاہی کی یہ بات مجھے سُن کر گئی۔ آبی نے اپنی بربادی کا خود ہی ایسا سامان پیدا کر لیا تھا۔ جس کی ہلاکت خیزی میں جل بیٹھی تھی۔ اور اب ہم آگ میں جھونک دیے گئے تھے۔ ایسی آگ جو آدمی کو بھسم کر دیتی ہے۔ ذرا سی غفلت ہمیں اپنی منزل سے ہزاروں لاکھوں کوس دور پھینک گئی تھی۔ اب ڈاکٹر دھمن کا وہ پرانا خواب پورا ہو جائے گا۔ وہ مجھے پھانسی کے تختے پر دیکھنا چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کا سب سے بڑا دشمن کون ہے۔ وہ خود تو ہمارا کچھ نہ بگاڑ سکا مگر ہمارے اپنے ہی تیر ہمارے سینوں میں اُتر گئے۔

"وہ آبی کہاں ہے اب؟"

"اسے ہم نے گرفتار کر لیا ہے اب وہ نچلی منزل کے ایک کمرے میں بندھا پڑا ہے۔" سپاہی نے مجھے بتایا۔

"ہتھکڑی لگی ہے اسے؟"

"اس کی مشکیں کس دی گئی ہیں وہ ہل بھی نہیں سکتا۔"

"تم نے نشے کی حالت میں پکڑا ہے اُسے؟"

"ہاں! وہ اپنے حواسوں میں نہیں تھا۔ اصل نے اُسے کچھ زیادہ ہی شراب پلا دی تھی۔"

"نام کیا ہے تمھارا؟"

"شاہین احمد۔"

میں نے اس کا یہ جواب سُن کر اس کے گلے سے لٹکتی گولیوں کی پیٹی اتار کر اپنے کندھے پر ڈال لی۔ اچانک دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ "دروازہ کھول دے جیلانی! ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔ میں ڈی ایس پی کلیانی تمھیں حکم دیتا ہوں کہ خود کو میرے حوالے کر دو۔"

"میرے ساتھ تمھیں اس شاہین کی بھی لاش ہی ملے گی کلیانی صاحب! واپس چلے جاؤ میں تمھیں خبردار کر رہا ہوں۔" میں نے چیختے ہوئے کہا۔ پنجرے میں پھنسے وحشی کی طرح میں اس وقت یہ کھول ہی چکا تھا کہ انجام کیا ہوگا۔

میری یہ بات سنتے ہی اُس نے سپاہیوں کو کوئی حکم دیا جسے میں سمجھ نہ سکا۔ چند ہی لمحوں بعد دروازے کے نیچے سے ایک تیز گیس اندر آنے لگی۔ وہ دو نالیوں میں سے اتنی تیزی سے نکل رہی تھی اور اس کی بدبو ناگوار تھی کہ میں سمجھا وہ مجھے اسی گیس سے ہلاک کر دیں گے۔ میں نے شاہین کو بندوق کی زد میں لے کر عقبی کھڑکی کھولی اور پھر اسے اپنے ساتھ گھسیٹتے ہوئے غسل خانے میں جا گھسا۔ اس گیس سے تو بہر حال میں بچ جانا چاہتا تھا۔ وہ چاہتے تو دروازہ توڑ سکتے تھے مگر انھیں معلوم تھا کہ اُن کا ایک ہتھیار میرے ہاتھ آچکا ہے اور اُن کا ایک آدمی میری گرفت میں ہے۔ وہ کوئی بھی ایسی احمقانہ حرکت کرتے تو میں مرنے سے پہلے اُن میں سے دو چار کو ضرور مار دیتا۔ اس بات کا انھیں اچھی طرح اندازہ تھا۔ مگر اپنے طور پر میں بھی یہ محسوس کر رہا تھا کہ میں پسپائی کی جنگ لڑ رہا ہوں۔ کوئی دم جاتا ہے کہ وہ مجھ پر غلبہ آجائیں گے۔

کمرہ اس زہریلی گیس سے بھر چکا تھا۔ کھڑکی میں سے اس کا کچھ حصہ خارج بھی ہو رہا تھا مگر وہ اتنی زیادہ مقدار میں اندر ڈالی گئی تھی کہ کمرہ سفید رنگ کے دھوئیں سے بھر گیا تھا۔ ہم اس وقت غسل خانے میں کھڑے تھے اور اس کے دروازے کی دہلیز پر جو خلا تھا گیس اس میں داخل ہو کر غسل خانے میں بھی آنے لگی تھی۔ غسل خانے میں میری شلوار اور قمیص ٹنگی تھیں۔ میں اُن کو نیچے پھینک کر اس خلا کو بھر ہی رہا تھا کہ اس شاہین نے موقع پا کر میرے سر میں اپنا آہنی مُکّا کچھ اس طرح مارا کہ میں منہ کے بل فرش پر جا گرا مگر بندوق ابھی میرے ہاتھ میں تھی۔ اس نے مجھے گرتے دیکھ کر بندوق جھپٹنے کی کوشش کی مگر اس وقت میں سنبھل چکا تھا۔ میں نے بندوق ہاتھ سے جانے نہیں دی۔ بایاں ہاتھ فرش پر جما کر میں تیزی سے اٹھا تو اس نے بندوق کے دستے پر زور دے کر مجھے پیچھے گرانے کی کوشش کی۔ وہ دیوار سے جا لگا مگر وہ ٹیک میرے کام آگئی۔ میں نے اٹھ کر بندوق کو کچھ اس طرح دونوں ہاتھوں میں پکڑا کہ اب وہ میری ڈھال بن گئی تھی۔ وہ میرے پیٹ میں گھونسا مارنے کے لیے ہاتھ اٹھا ہی رہا تھا کہ میں نے نیچے سے بندوق کا دستہ اس کی ٹھوڑی پر دے مارا۔ وہ الٹ کر پیچھے گرا تو میں نے اس کی گردن دبوچ کر رگِ احساس پر دباؤ بڑھا دیا۔ وہ سُدھ بُدھ کھو بیٹھا۔ گیس غسل خانے میں داخل تو ہو رہی تھی مگر بہت کم۔ صورتِ حال دم بدم سنگین ہوتی جا رہی تھی۔ وہ مجھے بے ہوش کرنے کے بعد دروازہ توڑ دینے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ انھوں نے یہی سوچ رکھا تھا۔ ایک ایک لمحہ بہت قیمتی تھا۔ میں نے تیزی سے سپاہی کی وردی اتار کر پہن لی۔ اُس کے بوٹ تک مجھے پورے آتے تھے۔ اپنے کپڑے وہیں ڈھیر کرکے میں نے اپنی اتری ہوئی شلوار سے اپنا سر منہ اچھی طرح چھپایا اور اپنے بریف کیس میں سے نوٹوں کی چار گڈیاں اور سگریٹ کے دو پیکٹ جیبوں میں بھر کر میں اپنا سانس روک کر غسل خانے سے نکلا۔ کمرہ دودھیا رنگ کے دھوئیں سے بھر چکا تھا۔ میں نے بندوق بائیں ہاتھ میں تھام رکھی تھی۔ کمرے کو عبور کرکے میں نے دروازے کی چٹخنیاں کھول دیں اور زور زور سے کھانستا ہوا باہر نکل آیا۔

"وہ بے ہوش ہو گیا ہے۔" میں نے اپنے کھانسی کے دورے میں سامنے کھڑے سپاہیوں سے چیخ کر کہا۔ وہ میری طرف توجہ دینے کے بجائے منہ پر رومال رکھ کر کمرے میں جا گھسے مگر میں کھانستا ہوا اُن سے ذرا دور ہو گیا۔ سامنے ہی سیڑھی تھی۔ اور اُن کی ساری توجہ کمرے پر مرکوز تھی۔ راہداری میں اَن گنت لوگ جمع ہو چکے تھے۔ وہ ایک لمحے کی مہلت بہت قیمتی تھی۔ میں نے بڑی آہستگی سے سیڑھیوں میں قدم رکھا۔ کھانسی میری ابھی تک جاری تھی۔ اسی طرح کھانستے کھانستے میں نے سیڑھی کے دوسرے قدم پر پاؤں رکھا اور پھر پاگلوں کی طرح میں اوپر آتے لوگوں کے درمیان سے نکلتا ہوا نیچے چلا گیا۔

یہ ایک لمحے کی فرصت بھی کیا چیز ہوتی ہے۔ نیچے پہنچتے ہی میں یوں دوڑتا ہوا ہوٹل کے بڑے دروازے سے باہر نکلا جیسے کوئی سپاہی کسی حکم کی تعمیل میں جان لڑا رہا ہو۔ دروازے کے سامنے ہی کسی کا اسکوٹر کھڑا تھا۔ میں نے جاتے ہی اس اسکوٹر کے ہینڈل کو زبردست جھٹکا جو دیا تو اس کا تالا تڑاخ سے ٹوٹ گیا۔ شلوار میں نے ابھی اپنے سر پر لپیٹ رکھی تھی۔ اسکوٹر کو بس ایک ایڑ کی ضرورت تھی وہ اسٹارٹ ہوا تو میں اس کو بلا خیز رفتار سے اڑاتا ہوا ہوٹل سے باہر نکل گیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے پیچھے کیا ہو رہا ہے اور میں سامنے کس طرف نکل رہا ہوں۔ شاہین کی بندوق میرے کندھے پر لٹک رہی تھی اور میں صبح کے دھندلکے میں آہستہ آہستہ گم ہوتا جا رہا تھا۔ سڑکیں اس گھڑی ویران ہی تھیں۔ میں کوئی دس منٹ قائدِ اعظم کے مقبرے کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ میرے کسی جگہ رکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اپنے اس فرار کو میں آج تک معجزہ ہی سمجھ رہا ہوں۔ خدا کی مدد میرے شاملِ

حال نہ ہوتی تو میں کسی بھی طرح اس جال سے بچ کر نہیں نکل سکتا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں اسکوٹر جواب نہ دے جائے۔ اس کا پٹرول کسی بھی جگہ ختم ہو سکتا تھا مگر نہیں اس کا پیٹ مالک نے اچھی طرح بھر رکھا تھا اور اس کے کل پرزے بڑا زور دکھا رہے تھے۔

کچھ ہی دیر بعد مجھے محسوس ہوا کہ میں اس شاہراہ پر جا چڑھا ہوں جو حیدرآباد کی طرف لے جاتی تھی۔ ساری علامتیں بتہ دیتی تھیں کہ یہ وہی راستہ تھا جس پر ہم اس ڈاکو دھمن کی کیڈلک میں گزرے تھے۔ میں نے کہیں رکنے کے بجائے یہ فیصلہ کر رکھا تھا کہ میں جس قدر جلدی ممکن ہو سکا، شہر سے باہر نکل جاؤں گا اور اب میں شہر سے دُور ہوتا جا رہا تھا۔ اُجالا چار سُو پھیلنے لگا تو گرد و پیش میرے سامنے زیادہ واضح ہوتا چلا گیا۔ صبح نے دھرتی کو آغوش میں لے لیا تھا۔

ایک گراں قدر ساتھی اس کو ہار میں پیچھے رہ گیا تھا۔ ایک بڑی رستم سے میں محروم ہو گیا تھا۔ آبی کی گرفتاری نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس کو واپس لے آنا فوری طور پر کسی بھی طرح ممکن نہیں تھا۔ وہ ایسی مصیبت میں پھنس گیا تھا کہ زر، زور اور زاری وہاں کسی کام نہیں آ سکتے تھے لیکن آبی کا سلاخوں کے پیچھے رہ جانا تو میں کسی بھی طرح قبول نہیں کر سکتا تھا۔ میرا حال اس چھپکلی کا تھا جو کسی کے حملے کی زد میں آتے ہی اپنی دُم جسم سے الگ کر کے دور پھینک دیتی ہے۔ حملہ آور ذرا دیر کے لیے اُدھر متوجہ ہوتا ہے تو چھپکلی بھاگ کر جان بچا لیتی ہے۔ میں آبی کو وہاں اسی طرح چھوڑ آیا تھا مگر سوال یہ تھا کہ میں اس طرح منہ چھپا کر اس شہر سے بھاگ نکلوں، یُوں کہ پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھوں آبی کی کمک کو میرے سوا اور کون پہنچے گا۔ وہ عیش پرست آدمی جس نے دو نفسیاتی معالجوں کی ذرا سی توجہ کے عوض اپنی زندگی بیچ ڈالی تھی۔

اسکوٹر کو سیدھا لے جانے کے بجائے میں نے بہت آگے نکل کر بائیں ہاتھ کی ایک کچی سڑک پر ڈال دیا۔ میں کہاں تک آگے بھاگتا چلا جاتا۔ مجھے کہیں رک کر بیٹھ کر صورتِ حال کا نئے سرے سے جائزہ لینا چاہیے تھا۔ میرے اعصاب جھنجھ سے گئے تھے۔ کوئی چار میل اس کچی سڑک پر اسکوٹر دوڑانے کے بعد مجھے ایک چھوٹا سا گاؤں نظر آیا۔ اس وقت تک سورج طلوع نہیں ہوا تھا۔ ہوا سبک خرام تھی اور جب آنکھوں کو لگتی تھی تو ٹھنڈک پہنچاتی تھی۔ میں نے اپنے سر سے لپٹی شلوار شہر کے وسط ہی میں کسی جگہ پھینک دی تھی۔ وہ اپنا فرض ادا کر چکی تھی۔ اس گھڑی شاید وہ خراہ داشتی تقدیر مجھ پر مہربان ہو گئی تھی۔ وہ مجھے قدم قدم پہ جھک دیتی چلی آ رہی تھی۔ اور میرا خیال ہے وہ مجھ پر خندہ زن بھی تھی۔ اور کہہ رہی ہوگی کہو میاں جیلانی! کیسی رہی۔ بڑے سُورما بنتے تھے تم! مروا دیا نا آخر تھیں ایک چیونٹی نے۔ اور وہ چیونٹی ہماری غفلت تھی۔

جو امتل اور راشدہ کا بھیس بدل کر ہمیں تڑپا گئی تھی۔

میں گاؤں کے قریب سے ہو کر آگے نکل گیا۔ میں جو مرد گر ... اب کسی بھیڑ کا، کسی انبوہ کا وجود برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ ... کے اعتبار سے اب میں پولیس کا ہیڈ کانسٹیبل دکھائی دیتا تھا۔ ... گاؤں سے کوئی دو میل آگے نکلا تو ایک جگہ مجھے ایک پکہ و تنہا مکان ... آیا۔ وہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس کے گرد چار دیواری تعمیر کر دی گئی ... اس کے قریب ہی ایک ٹیوب ویل چل رہا تھا۔ اس کا وہ چاندی ایسا پانی کھیتوں کو سیراب کرتا تھا۔ میں نے اس چار دیواری کے قریب جا کر اسکوٹر روک دیا۔ اس کے انجن کی آواز نے اندر بیٹھے آدمی کو چونکا دیا ... وہ دروازے سے باہر نکل آیا۔ وہ کوئی ادھیڑ عمر کا کسان تھا۔ مجھے ... دیکھ کر ایک دم مودّب ہو گیا۔

”سلام علیکم سائیں! خیر تو ہے! اتنے سویرے سویرے آپ کیسے اِدھر آ گئے؟“

”سلام سائیں! میں ایک کام سے ہی اِدھر آیا ہوں۔ پانی رکھ کر رُک گیا کوئی گلاس ہو تو دے دو۔ پیاس بہت لگ رہی ہے۔“

”آپ نے بھی روزہ نہیں رکھا سائیں! میرا بھی یہی حال ہے۔ ... کاج والے بندے کیا کریں۔ آپ اندر آ جائیں۔ میں شربت پلاتا ہوں آپ کو۔“

میں اس کے ساتھ چار دیواری میں داخل ہو گیا۔ صحن میں اُس نے اِدھر اُدھر سبزی اگا رکھی تھی جس میں دھنیا، ٹماٹر اور مرچیں زیادہ نمایاں تھیں۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر کمرے میں جا گھسا۔ وہاں دو چار پائیاں تھیں۔ کچھ برتن بھی ایک کونے میں ڈھیر تھے۔ ایک چھوٹی سی میز پر اس نے اپنی ضرورت کی کچھ چیزیں سجا رکھی تھیں جن میں سب سے زیادہ صاف ستھری شے ایک شیونگ برش اور سیفٹی تھے۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ وہ اُسی وقت شیو کر کے فارغ ہوا تھا۔ برش پر صابن کے جھاگ ابھی تک موجود تھے۔

”اِدھر بیٹھو سائیں! یہ پولیس کی نوکری بھی جان کا عذاب ہے۔ نہ آدمی گھر کا رہتا ہے نہ گھاٹ کا۔“

”ہاں یہ تو ہے آدمی کا اپنا کوئی وقت ہی نہیں ہوتا۔ آج مجھے صبح ہی صبح اِدھر آنا پڑا۔ یہ کون سا گاؤں ہے اِدھر پیچھے؟“

”یہ سچل گڑھ ہے سائیں، پر آپ کو کہاں جانا ہے؟“

”... آگے کون سا گاؤں ہے؟“ میں نے اس علاقے سے اپنی عدم واقفیت کو خاص انداز سے چھپاتے ہوئے کہا۔

”اُدھر جو گاؤں سامنے نظر آتا ہے نا وہ مراد پور ہے۔ اُدھر دکھن کی طرف پیر بین ہے۔“

”پیر بین! ہاں مجھے وہیں جانا ہے وہاں کے کامدار سے ملنا ہے۔

... ہی منگی ہے۔“

”اچھا اچھا! پر اس نام کا تو کوئی بندہ نہیں ہے وہاں۔“

”وہ کل ہی اُدھر آیا ہے کہہ رہا تھا کہ وہ اُدھر امام مسجد کے گھر میں ... رہے گا۔“ میں نے بات بنائی۔

وہ گلاس میں شربت گھولنے لگا تھا، بولا ”کوئی واردات تو ... ہو گئی اُدھر؟“

”نہیں۔ میں ایس پی صاحب کے ایک کام سے نکلا ہوں۔“ یہ ... ہوئے میں نے گلاس اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ وہ دیسی شکر کا ... بت تھا اور گھڑے کے ٹھنڈے پانی میں گھل کر بڑا ہی لذیذ بن ... گیا تھا۔ میرے لیے وہ اس گھڑی ایک نعمت سے کم نہیں تھا۔ میرے ... کا ایندھن کچھ زیادہ ہی خرچ ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے میری ... بھڑک اٹھی تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ سے لے کر دو گلاس حلق میں ... لیے تو مجھے ہوش سا آ گیا۔

”اس ڈیوٹی کی وجہ سے میں کل بھی روزہ نہیں رکھ سکا تھا۔ آج ... بھی یہی حال ہوا۔“ میں نے جیب سے سگریٹ نکال کر ایک اسے دیتے ... ہوئے کہا۔

وہ خوش ہو گیا، بولا ”سائیں روزہ تو نیت کا ہوتا ہے خالی ... بند رکھنے سے کوئی رب راضی تو نہیں ہو جاتا۔ روزہ تو بندے سے ... چاہتا ہے کہ وہ اپنی پانچوں اندریاں بند کر لے۔ نہ جھوٹ بولے نہ غیبت ... نہ بد نظری رکھے، پرائے مال کو حرام سمجھے اور ہر گناہ سے بچا رہے۔“

”ٹھیک کہتے ہو تم۔ کیا نام ہے تمھارا؟“

”میرا نام یار محمد ہے جناب! آپ آرام کرنا چاہیں تو میں اِدھر یہ ... بچھا دیتا ہوں آپ لیٹ جائیں گے۔“

”تمھاری مہربانی ہے یار محمد! یہ کوٹھا صاف ستھرا ہے میں اِدھر ... ہی بیٹھ کر لیٹ جاتا ہوں۔“ میں نے کھری چارپائی پر لیٹ کر چھوٹا ... سرہانہ سر کے نیچے دباتے ہوئے کہا۔

”آپ اٹھیں میں چادر بچھا دیتا ہوں۔“ اس نے اصرار کرتے ... ہوئے کہا۔ جب وہ چادر بچھا چکا تو بولا ”آپ آرام کریں۔ میں ... اسکوٹر اندر لے آتا ہوں۔“

”ہاں۔ اسے اندر لا کر سائے میں کھڑا کر دو۔ میں بہت تھک ... گیا ہوں یار محمد۔“

اسکوٹر اندر لا کر اس نے دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا اور خود صحن ... کا دروازہ بھیڑ کر باہر نکل گیا۔ میں نے آنکھیں موند لیں مگر یوں محسوس ... ہو رہا تھا جیسے میرا دل چاہتا ہو میں دھاڑیں مار مار کر روؤں اتنا روؤں ... کہ روح کا سارا گرد و غبار دُھل کر باہر نکل جائے۔ کوئی زندگی ... تھی وہ۔ ہر رات مجھے نئے بستر پر آتی تھی۔ ہر صبح مجھے نئی دہلیز پر دیکھتی تھی۔ آبی پر جو کچھ بیت رہی ہوگی اس کا میں اچھی طرح اندازہ لگا سکتا تھا۔ وہ گرفتاری کی اذیت سہنے کے لیے تو بنا ہی نہیں تھا۔ اس سے وہ صدمے کہاں جھیلے جا سکیں گے۔ غصہ مجھے اس کی زن پرستی پر آ رہا تھا۔ اس سالے نے طے کر رکھا تھا کہ کوئی موقع خالی نہیں جانے دے گا۔ جہاں کہیں اسے رنگین آنچل نظر آتا تھا وہ وہیں آنکھیں بند کر کے اتر جاتا تھا۔ یہ نہیں سوچتا تھا کہ وہ آنچل ہم رنگِ زمیں دام بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ اپنی اسی روشنیٔ طبع کے سبب وہ ان روز یوں مارا گیا تھا کہ میری آواز بھی اس تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ وہ امتل اپنی تیز کٹاری آنکھوں سے اسے گھائل ہی کر گئی تھی۔ آبی کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہوگی کہ وہ پھنسی ہے۔ وہ تو اس سے لپٹ جانے کی آرزو میں مرا جاتا تھا۔ اور وہ راشدہ، وہ جائزہ خانم جس انداز سے کمرے کو گھور گھور کر دیکھتی تھی وہ انداز ہی مجھے کھل رہا تھا مگر میں چپ ہی رہا۔ میں آبی کو خبردار بھی نہ کر سکا۔ مگر میں کہاں کا ستارہ شناس تھا۔ مجھے بھی کیا خبر تھی کہ اُن کو پولیس نے اِدھر اُدھر چھوڑ رکھا ہے۔ ہم ہوٹل میں اس پچھلے پہر داخل ہوئے تو وہ وہیں کہیں موجود تھیں۔ انھیں ہم پر پہلی ہی نظر میں شک پڑ گیا تھا۔ اور انھوں نے بڑے ہی غیر محسوس طریقے سے ہم تک رسائی حاصل کر لی تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہ بیرا بھی خفیہ پولیس ہی کا آدمی تھا مگر ہم ان میں سے کسی کو بھی نہ پہچان سکے۔ آدمی کی سب سے بڑی بدنصیبی یہی ہے کہ جب وہ پھسلتا ہے تو آنکھیں رکھنے کے باوجود اسے پاؤں تلے آتا کیلے کا چھلکا نظر نہیں آتا۔ ہم بھی آدمی ہی کی نسل سے تھے اور اسی لیے مارے گئے تھے۔ سب کچھ ہی درہم برہم ہو گیا تھا۔ معاملہ اب کلی طور پر پولیس کے اختیار میں تھا اور مجھے یقین تھا کہ وہ آبی کو اپنی اذیت کے بیلن میں سے ضرور گزاریں گے۔ تاکہ وہ اس سے اگلوا سکیں کہ جیلانی کا ڈاک کا پتہ کیا ہے اور گھر اس کا کہاں ہے اور وہ پرندہ کہاں کہاں پایا جاتا ہے۔ وہ اس سے یہی پوچھیں گے مگر آبی بے چارا کیا بتا سکے گا۔ اس کا تو ایک گھر تھا بھی جہاں اس کی ماں دہلیز پر کھڑی اس کی منتظر رہتی تھی مگر میرے بارے میں وہ کیا کہے گا۔ آبی تو مجھے بالکل ہی نہیں جانتا تھا۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ چوبیس گھنٹے ساتھ رہنے والے آدمی کے بارے میں بھی کبھی کبھار کچھ بھی معلوم نہیں ہوتا۔ ہم بس فرض کر لیتے ہیں کہ اسے ہم جانتے ہیں۔ حالانکہ ہم بسا اوقات اپنے ہم نفسوں سے ناآشنا ہوتے ہیں۔“

میں کوئی ایک گھنٹے تک اس چارپائی پر لیٹا سوچتا رہا کہ میں آبی کی مدد کو کس طرح پہنچ سکتا ہوں، اچانک میرے ذہن میں ماس کا نام اُبھر آیا۔ میں اچھل سا گیا۔ وہ بڑی کارآمد عورت تھی اور کارگر بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ میں اس سے کہوں کہ اس کا منگیتر یوں پکڑا گیا

ہے تو وہ ضرور اسے چھڑا لے گی۔ ثابت کردے گی کہ آبی پر جو الزام لگا ہے بے بنیاد ہے۔ وہ ایسا آدمی ہے ہی نہیں۔ اور اصل بات تو یہ ہے کہ آبی کا اس سے پہلے کسی تھانے میں نام تک نہیں لکھا گیا تھا۔ پولیس کا کوئی آدمی اس کے خلاف کچھ بھی ثابت نہیں کرسکتا تھا۔ اگر آبی نے اپنا منہ بند رکھا اور اس نے کہہ دیا کہ وہ کسی جیلانی کو نہیں جانتا۔ جو آدمی اس کے ساتھ ہوٹل میں آیا تھا اس کا نام ہاشم خان ہے اور وہ کراچی میں ہی اس کا دوست بنا تھا تو مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی جان بڑی آسانی سے چھڑا سکتا تھا۔ کوئی طرفہ تماشا قسم کا جھوٹ بولنے کی اسے ضرورت ہی پیش نہیں آسکتی تھی مگر اب تو یہ اس کی عقل پر منحصر تھا کہ اس صورت حال سے کس طرح نپٹتا ہے۔ میں اتنی دور بیٹھ کر تو اس کے کسی کام نہیں آسکتا تھا۔ میں تو اس گھڑی زیادہ سے زیادہ یہ کرسکتا تھا کہ دونوں ہاتھ اٹھا کر اس کے لیے دعا کروں۔ سو وہ میں کر رہا تھا۔ خود دوں کو جلنے کا صلہ تو اس "کھوتے" کو ملنا ہی چاہیے تھا۔ ان دو نفسیاتی معالجین کا وہ پیشنٹ بن بیٹھا تھا خوب علاج کیا انھوں نے اس کے مرض کا۔

میں نے طے کرلیا کہ اگلے روز میں الماس سے ہوائی اڈے پر ملوں گا اور اسے بتادوں گا کہ اسکا دوست کس طرح پولیس کی تحویل میں جا پہنچا ہے۔ اگر اسے آبی سے کچھ بھی لگاؤ ہوا تو وہ اس کے لیے ضرور کچھ نہ کچھ کرے گی۔ ورنہ وہ بھی اس سے اس اندھیرے میں سائے کی طرح جدا ہو جائے گی۔ اس کے خلوص اور اس کی محبت کی آزمائش کی گھڑی سامنے آکھڑی تھی۔ وہ کچھ نہ کرسکی تو پھر میں تو بہر حال کوئی راستہ دیکھوں گا جس پر چل کر میں آبی تک پہنچ سکوں۔ اس کی رہائی تو دل میں اترنے والے خون سے بھی زیادہ ضروری تھی۔ اس کے بغیر تو میں کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ مجھے عدّت میں بیٹھنے کا مشورہ دیتا تھا اب خود سالا اس پنجرے میں جا پھنسا تھا وہ اسلم آبی۔

مجھے وہاں لیٹے کوئی دو گھنٹے ہوئے تھے کہ صحن میں مجھے کسی عورت کی آواز سنائی دی وہ کہہ رہی تھی۔ "پولیس کا بندہ ہے کوئی؟"

"ہاں! ذرا تمیز سے بات کرنا جیفے! وہ بہت اچھے آدمی ہیں۔ کھانا کچھ زیادہ لے آتی تو اچھا ہوتا۔"

"آئے ہائے چھ روٹیاں تو لے آئی ہوں، اور یہ کریلے گوشت چھنا بھرا ہوا ہے۔"

"بس ٹھیک ہے ان کا بھی کام چل جائے گا۔ چل اندر میں انھیں جگاتا ہوں۔"

چند ہی لمحوں بعد کمرے کا بھڑا ہوا دروازہ کھل گیا۔ میں تو جاگ ہی رہا تھا۔ ان کے باؤں کی چاپ سن کر میں نے آنکھیں کھول دیں۔ یار محمد کے پہلو میں جو عورت کھڑی تھی وہ اس کی عمر سے کوئی بھی مناسبت نہیں رکھتی تھی۔ یار محمد چالیس بیالیس کے پیٹے میں تھا جب کہ وہ عورت بیس بائیس سال سے زیادہ کی ہرگز نہیں تھی۔ وہ لہنگا [illegible] تھی ———— اور پسینے میں نہائی سی نظر آرہی تھی [illegible] اس کا تمتمایا ہوا تھا۔ رنگ اس کا گندمی تھا جس میں دھوپ نے [illegible] رچا دی تھی۔ دھوپ اس گھڑی کچھ زیادہ ہی مچل گئی تھی اور وہ [illegible] سے یار محمد کے لیے بھتہ لے کر آئی تھی مگر یوں کہ وہ ایک گٹھڑی [illegible] سب کچھ باندھ لائی تھی جسے وہ رمضان کی وجہ سے کھلے عام نہیں لا سکتی تھی۔

"آؤ بھئی یار محمد! کون ہے تمھارے ساتھ؟"

"یہ میری بیوی ہے سرکار! اس کا نام جیفہ ہے۔ میرے لیے کھانا لائی ہے۔"

"اچھا اچھا! پھر تو ہمارا روزہ کھل سکتا ہے مجھے بھی بھوک لگ رہی تھی۔ ہر بندے کا رزق اللہ اس کے پاس پہنچا دیتا ہے۔ آج اس نے میرا رزق تمھاری بیوی کے ہاتھ بھیج دیا ہے۔"

"میں اللہ کے پاس سے نہیں آتی ہوں بابو جی! گھر سے آئی ہوں اور باہر رمضان کا مہینہ چڑھ آیا ہے۔"

اس نے یہ بات کچھ ایسے بے ساختہ انداز سے کہی کہ میں تو جھینپ سا گیا۔ یار محمد ہنس دیا۔ بولا "تو فقرے بازی نہ کیا کر جیفے۔ ایک تو تیرا یہ نام بہت مشکل ہے۔ پتہ ہے سرکار! اس کا کیا مطلب ہے اس نام کا۔ میں نے پہلے تو چاہا کہ بدل ڈالوں، عائشہ رکھ دوں یا ثریا کہہ لیا کروں۔ کرم بی بی ہی نام رکھ دوں اس کا، پر اس کا باپ بگڑ گیا۔"

"کیوں؟ کیا کہتا تھا اس کا باپ؟"

"بہت گرم سرد ہوا جی اس بات پر۔ کہنے لگا تو جاہل آدمی ہے تجھے کیا قدر اس نام کی۔" یار محمد نے میرے پاس چارپائی پر بیٹھ کر کہا۔

"اچھا! کوئی خاص بات ہوگی اس نام میں؟"

"میرے نام کا بڑا اچھا مطلب ہے بابو جی! جیفہ اس زیور کو کہتے ہیں جو بادشاہ پگڑی پر باندھتے تھے، پر اسے قدر ہی نہیں ہے ہمارے بندے کو۔"

"یار محمد! یہ نام تو پھر واقعی بہت اونچا ہے۔ تجھے تو خوش ہونا چاہیے۔"

"بس اسی لیے تو میں نے پھر زور نہیں دیا سرکار! ورنہ اس کا نام [illegible] بشیراں، بھتی، جمی کچھ بھی رکھ دیتا۔ یہ کیا کرسکتی تھی میرا۔"

جیفہ مسکرا رہی تھی۔ اس نے برتن ہمارے آگے رکھ دیے۔ [illegible] کے ساتھ پراٹھے پکا کر لائی تھی ساتھ میں آم کا اچار بھی تھا اور مجھے [illegible] نے پریشان کردیا تھا۔ وہ کھانا میں نے بڑے ہی شوق سے کھایا۔ [illegible] لقمہ مزہ دیتا تھا۔ جیفہ کو پکانے کا سلیقہ آتا تھا۔ میں مزے لے کر کھا رہا تھا اور وہ خوش ہو رہی تھی کہ میں نے اس کھانے میں اتنا [illegible]

ہے۔ ایک عجیب طرح کی ممنونیت اس کی آنکھوں سے جھانک رہی تھی۔ جیسے کہہ رہی ہو کہ میرے کھانے کو اتنا پسند کرتے ہو۔ بابو جی تمھارا بہت بہت شکریہ۔ آدمی کے دل کا احاطہ ہوتا ہی کتنا ہے ایک قدم میں پھلانگ لو تو اس طرف دوسرے قدم میں اس دن۔ میری زندگی کی ساری اذیتوں سے بھی زیادہ شباب تھا اس کا۔ یار محمد کا تو اس سے لگا ہی نہیں کھاتا تھا اور شاید یہی وجہ تھی کہ مجھے اس عورت کی آنکھوں میں ایک تشنہ لب آرزو جھانکتی نظر آئی تھی۔ یوں جیسے کوئی نوخیز لڑکی گھونگھٹ کی اوٹ میں کھڑکی سے باہر دیکھ رہی ہو کہ کون اسے دیکھ کر ٹھوکر کھاتا ہے۔ کون چوکڑی بھول جاتا ہے۔ کھانا ختم کرکے ہم نے پانی پیا تو جیفہ نے برتن سمیٹ لیے۔

"تمھاری بیگم کھانا خوب پکاتی ہے یار محمد! یہ دن میں کبھی نہ بھول سکوں گا۔"

"یہ بیگم تھوڑی ہے سرکار! میرے گھر کی نوکرانی ہے اور میں اس کا نوکر ہوں۔"

"ہاں یہ تو ہے۔ دو بندوں کا ساتھ تب ہی نبھ سکتا ہے۔ کتنی زمین ہے تمھاری؟"

"میں مزارع ہوں سرکار! میر اللہ بخش کا۔ زمین اسی کی ہے اور ٹیوب ویل بھی۔"

"کتنا کما لیتے ہو؟"

"بس گزارا ہو جاتا ہے جی! کچھ دودھ بیچ لیتے ہیں ہم۔ یہ میری گھروالی بہت محنتی ہے اس نے مرغیاں بھی پال رکھی ہیں چار پیسے وہ بھی دے جاتی ہیں۔"

"لیو! چار پیسے کہتے ہو تم روز کے بابو جی ہم تین درجن انڈے بیچ لیتے ہیں۔ ولایتی مرغیاں رکھی ہیں میں نے۔ دڑبے میں پچاس سے زیادہ ہی ہوں گی۔" جیفہ نیچے فرش پر لمنگا سمیٹ کر بیٹھ گئی۔

"کتنے بچے ہیں تمھارے؟"

"دو ہیں جی۔ مگر وہ میری پہلی بیوی سے ہیں۔ اس سے میری شادی کو تین سال ہو گئے ہیں پر ابھی کچھ اللہ کو منظور نہیں ہوا۔" پھر اس نے جیفہ کی طرف دیکھا اس نے سر جھکا لیا اس کے چہرے کے رنگ میں کستوری گھلنے لگی تھی۔

"تو ادھر بیٹھ جیفے! میں ذرا پانی موڑ آؤں۔ دوسرے کھیت کی طرف۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور کسی صحن میں سے اٹھا کر باہر نکل گیا۔ میں نے سگریٹ نکالنے کے لیے ہاتھ جیب میں ڈالا تو پیکٹ باہر نہیں آیا۔ نوٹوں کی گڈی کے ساتھ پھنسا تھا۔ پیکٹ نکالنے کے لیے میں نے نوٹوں کی گڈی ایسے ہی بے خیالی میں باہر نکالی تو میری انگلیوں سے چھوٹ کر فرش پر جا گری۔ جیفہ اس گھڑی سر جھکا کر بیٹھی ہوئی تھی۔ گڈی اس کے سامنے آئی تو اس نے ایک جھٹکے سے اپنا سر اوپر اٹھایا۔ یوں کہ اس کی بھاری بھرکم چوٹی لہراسی گئی۔ آنکھیں وہ جھپکانے لگی جیسے پوچھ رہی ہو "یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں جی! اتنے سارے نوٹ لیے پھرتے ہو جیب میں۔ اور کس لیے؟"

"اوہ! یہ... یہ ذرا پکڑا دینا جیفے۔" میں نے یونہی بے خیالی میں اس کا نام لے دیا۔ اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔ وہ حیا کی سرخی تھی۔ جو میرے منہ سے اپنا نام یوں بے تکلفی سے نکلتے دیکھ کر ابھر آئی تھی۔ اس نے اپنا وہ نرم کومل سا ہاتھ بڑھا کر گڈی اٹھائی اور میری طرف بڑھا کر بولی "یہ اتنے سارے نوٹ کیوں لیے پھرتے ہیں آپ؟"

"کوئی گندی چیز ہے یہ؟"

"جی نہیں! پر دیکھیں ناجی یہ جنگل بیلا اور آپ تنہا آدمی۔"

"یہ بندوق بھی تو میرے ساتھ ہے!"

"اس سے کیا ہووے ہے جی! یہ تو دھپا مار کر آدمی سے چھینی جا سکتی ہے۔"

"اچھا! یہ حوصلے ہیں تمھارے! چھین کر دکھاؤ ذرا۔" میں نے دیوار کے ساتھ لگی بندوق اٹھا کر کمر سے پکڑ لی۔

وہ مسکرا دی، بولی "میں تو عورت ذات ہوں جی! میرا کیا ہے میری کلائی سے تو مرد کے سر کا بال مضبوط ہووے۔ پر میں کہتی ہوں کہ یہ اچھی بات نہیں ہے۔ آدمی کی جان کے دشمن نوٹ اس کے سینے سے لگے رہیں تو اچھا نہیں ہوتا۔"

"بڑی سچائی ہے تیری بات میں جیفے! تیرا نام واقعی مشکل ہے۔ تیرا باپ کوئی پڑھا لکھا آدمی ہوگا۔"

"وہ امام مسجد ہے جی میرا والد ادھر سچل گڑھ میں۔ اسی نے یہ نام رکھا تھا۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔ نام سے کیا ہوتا ہے۔ تم اچھے لوگ ہو۔ کوئی کام ہو تو مجھے بتانا۔ میں کراچی صدر کے تھانے میں ہوتا ہوں۔ امام شاہ نام ہے میرا۔" میں نے بندوق الگ رکھتے ہوئے کہا۔

وہ چپ رہی۔ میری بات کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ نظر اس کی ابھی تک میرے سینے کی اس جیب پر ٹکی تھی جس میں میں نے وہ نوٹ رکھ لیے تھے اور منہ اس نے یوں بنا لیا تھا جیسے وہ بہت دکھی ہے۔

"کیا بات ہے تم بہت پریشان سی نظر آرہی ہو؟"

"کچھ نہیں بابو جی! بس اپنے اپنے نصیبوں کی بات ہے۔ میری شادی پہلے جس آدمی سے ہوئی تھی۔ وہ سرکاری دفتر میں کام کرتا تھا۔ دفتری لگا تھا وہاں۔ گھر ہم نے لیاقت آباد میں لے رکھا تھا۔ پھر ایک دن وہ بس کے حادثے میں مر گیا۔ میں اجڑ کر گھر جا بیٹھی تو پھر

میرے ابا نے مجھے یار محمد سے بیاہ دیا۔ یہ اپنی برادری کا آدمی ہے اس کی بیوی مر گئی تھی۔"

"کتنی عمر ہے تمھاری؟"

"میں پچیس سال کی ہوں جی اب۔ بس وقت کو دھکا تو دینا ہی ہے نا جی۔"

"یار محمد تو اچھا آدمی لگتا ہے مجھے۔"

"یہ تو اچھا ہے بابو جی! پر اس کی عمر بھی تو دیکھو، یہ پچاس سال کا ہے۔ میں تو بس لیتے ہی میں رہ جاؤں گی کسی روز۔"

"ارے نہیں! زندگی موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ہو سکتا ہے اس کی عمر تم سے زیادہ لمبی ہو۔"

اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ کسی گہری سوچ میں ڈوبی رہی، پھر کچھ سوچ کر وہ اٹھی اور بولی "آپ سو جائیں، آرام کریں میں پنکھا جھلتی رہوں گی، آپ کی خدمت کر کے مجھے خوشی ہو گی۔" وہ پنکھا لے کر میری پائنتی بیٹھ گئی۔

"نہیں بھئی! میں ٹھیک ہوں ابھی تو مجھے نیند نہیں آ رہی۔" میں نے پہلو بدلتے ہوئے کہا مگر وہ مجھے پنکھا جھلنے لگی تھی۔

"شرمندہ نہ کرو بھئی! وہ یار محمد دیکھے گا تو کیا کہے گا کہ تم یہ پنکھا کس خوشی میں جھل رہی ہو۔ مارے گا وہ تمھیں۔"

"ایسے ہی مارے گا وہ لاٹ کا بچہ ہے۔ آپ آج ادھر ہی رہیں رات کو میں مرغا پکا کر لاؤں گی جلدی تو نہیں ہے آپ کو۔"

"نہیں! ایسی بھی جلدی نہیں ہے تم کہو گی تو ٹھہروں گا۔"

"بس ٹھیک ہے۔ یار محمد شام کو کراچی جائے گا کوئی کام ہے اسے وہاں۔ اس کا چاچا رہتا ہے ادھر برنس روڈ پر۔ رات یہ وہیں رہے گا۔ میں خود آپ کے لیے کھانا لے کر آؤں گی افطاری کے بعد۔" وہ صحن کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"جیسے تمھاری مرضی۔ میں یہ رات یہیں گزار لوں گا۔"

"سچی! بڑی ٹھنڈی رات ہوتی ہے یہاں کی ذرا گرمی نہیں لگتی بھینس کا دودھ بھی لاؤں گی آپ کے لیے۔"

"یہ تو اور بھی اچھا ہے کہ تم میرے لیے اتنا کچھ کرو گی۔"

ابھی میں یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ یار محمد صحن میں داخل ہوا مگر وہ میری پائنتی بیٹھی مجھے پنکھا جھلتی رہی۔ میں نے جان بوجھ کر آنکھیں موند لیں جیسے میں سو چکا ہوں۔

یار محمد اندر آ گیا تو مجھے سوتا دیکھ کر بڑی آہستگی سے بولا۔

"یہ سو گئے ہیں کیا؟"

جیفہ بھی میری پائنتی سے اٹھتی ہوئی سرگوشی کرنے لگی۔

"ہاں! میں نے کہا تنگ ہو گئے ذرا پنکھا جھل دیتی ہوں بہت شریف آدمی لگتے ہیں بیچارے۔" وہ کچھ زیادہ ہی دبی آواز میں بول رہی تھی جیسے وہ میری نیند کے ٹوٹ جانے سے ڈرتی ہو حالانکہ اسے پتہ تھا کہ میں جاگ رہا ہوں۔

"ٹھیک ہے تو اب جا۔ میں چار بجے تک گھر آ جاؤں گا، شام کو مجھے کراچی بھی جانا ہے بھتیجے کی منگنی پر۔"

"ہاں! وہاں تو تمھارا جانا بہت ضروری ہے سگا بھتیجا ہے تمھارا۔ میں اب گھر جاتی ہوں۔"

میں آنکھیں موندے پڑا رہا بلکہ دکھاوے کے لیے خراٹے بھی لینے لگا۔ جیفہ چلی گئی تو یار محمد کمرے کا دروازہ بھیڑ کر اس کے پیچھے باہر نکل گیا۔

اس عورت کی باتوں سے مجھے یہ احساس ہو چکا تھا کہ وہ میرے نوٹوں کو دیکھ کر پاگل ہو گئی ہے۔ میں اسے سادہ لوح سی معصوم دیہاتی عورت سمجھا تھا مگر وہ اندر سے کتنی تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کس بلا سے بات کر رہی ہے کبھی وہ میرے پاس سے ہو کر گزر جاتی تو میں اس کا گوشت نوچ لیتا۔ کہ میں وہ کتا تھا جس کے بیس ناخن تھے اور میرے دانت بہت ہی زہریلے تھے۔

وہ دونوں باہر نکلے تو میں نے چارپائی چھوڑ دی۔ ان لوگوں سے الجھ کر میں کوئی نئی بپتا پالنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ مجھ سے مانگ لیتی تو شاید نوٹوں کی پوری گڈی اس کے حوالے کر کے وہاں سے آ جاتا مگر وہ جیفے اس ہتل ایسی ہی تھی جو آپی کو لے ڈوبی تھی۔ اس کا جو حال ہو چکا تھا اس میں میرے لیے بھی عبرت کا سبق مضمر تھا۔ مجھے اس یار محمد کی بیوی سے بھی حذر ہی کرنا چاہیے تھا۔ وہ میرے لیے کسی بہت بڑی مصیبت کا سبب بن سکتی تھی۔ بندوق سنبھال کر میں صحن میں نکلا تو اچانک مجھے باہر سے کسی کے چیخنے کی آواز سنائی دی۔ وہ کسی عورت کا واویلا تھا۔ اس کی چیخوں میں ایک دم شدت آ گئی تھی۔ میں بھاگ کر باہر نکلا تو دیکھا کہ یار محمد نے اپنی بیوی کے بال پکڑ رکھے تھے اور وہ تڑاخ تڑاخ اس کے منہ پر تھپڑ مار رہا تھا اور وہ پاگلوں کی طرح اس کی ضربوں سے بچنے کے لیے شور مچا رہی تھی۔

"یہ کیا کرتے ہو یار محمد! کیا قصور کیا ہے اس نے؟"

"کچھ نہیں سرکار! میں اسے جان سے مار دوں گا۔ اس کی باتیں میں نے سن لی تھیں۔ یہ رات کو آپ کے پاس آنے کا وعدہ کر رہی تھی یہ گشتی۔ نوٹ کھانا چاہتی تھی۔" وہ اسے اور زیادہ زور شور سے زدوکوب کرنے لگا تھا۔ میں اس کو روکنے کے لیے آگے بڑھا تو وہ کڑک کر بولا "آپ یہاں سے چلے جائیں سرکار! ورنہ اچھا نہیں ہو گا۔ پتہ ہے آپ کا کوئی قصور نہیں مگر اس کی کمینگی میں سمجھ چکا ہوں"

ہے کھینچتا ہوا پرے ہٹنے لگا۔

"تمھارا غصہ بھی برحق ہی ہو گا یار محمد! مگر اسے کچھ نہ کہو۔ میں یہاں سے چلا جاتا ہوں ابھی اور اسی وقت۔ جا جیفے! اور یہ لے اگر کوئی بڑی ضرورت رکی ہے تو یہ لے یہ دو ہزار روپیہ۔ میں تجھے دیتا ہوں یہ میری طرف سے رکھ لے۔ اس کا کوئی عوض معاوضہ میں تم لوگوں سے طلب نہیں کرتا۔" یہ کہہ کر میں نے دو ہزار کے نوٹ گڈی سے الگ کر کے جیفے کے قدموں میں پھینک دیے۔ "اسے محبت سے رکھ یار محمد! ایسی نازک سی عورت کو زور سے نہیں زاری اور محبت سے باندھتے ہیں۔"

وہ دونوں حیرت زدہ سے ہو کر مجھے یوں دیکھنے لگے جیسے انھیں اپنی بصارت اور سماعت پر اعتبار نہ آ رہا ہو۔ میں تیزی سے پیچھے مڑا اور جب میں صحن سے اسکوٹر نکال کر ان کے قریب سے ہو کر گزرنے لگا تو یار محمد ڈبڈبائی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا "سرکار! مجھ سے بڑی بھول ہو گئی۔ میں آپ کو سمجھ نہیں سکا تھا مجھے معاف کر دیں۔"

"میں کیا معافی دوں تمھیں! معافی تو تمھیں اپنی عورت سے مانگنی چاہیے اسے خوش رکھو گے تو یہ تمھاری عزت کی حفاظت کرے گی ورنہ اسی طرح یہ راہیں ہاہیں تیر چلاتی رہے گی۔" یہ کہہ کر میں نے اسکوٹر رواں کیا اور اس پر بیٹھ کر آگے بڑھ گیا۔ میں نے شاید اس جوڑے کی زندگی میں بہت ہی سریع الاثر زہر بھر دیا تھا میری باتیں اور میرے نوٹ ان کو پھر سے قریب لانے میں مددگار ثابت ہوئے تھے کہ نہیں مجھے پھر کوئی علم نہ ہو سکا۔ وہ دونوں مجھے دیر تک اور دور تک وہاں کھڑے دیکھتے رہے۔ خدا جانے وہ میرے بارے میں کیا سوچتے ہوں گے۔ شاید وہ میرے الفاظ اس کے دل میں اتر گئے ہوں اور وہ جیفے کی اس جرأت رندانہ کو معاف کر کے اسے دوبارہ عزت اور احترام سے اپنے گھر لے گیا ہو۔

مختلف پگڈنڈیوں پر اسکوٹر دوڑاتا ہوا میں اس ٹیوب ویل سے خاصا دور نکل آیا۔ جنگل گڑھ ایک طرف رہ گیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں اور کس طرف نکلوں کہ میں تو ہر طرف سے مایوس ہو چلا تھا۔ اور میں وہ دیوانہ تھا جس سے ایک دنیا آشنا تھی۔ میری تلاش میں وہ لوگ خدا جانے کس کس سمت میں پھیل چکے تھے اور میرا یہ حال تھا کہ میں اپنے ایک مضبوط بازو سے محروم ہو گیا تھا۔ آپی کی رہائی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ وہ تو اس وقت خدا جانے اس بدنصیب کو کن مراحل سے گزار چکے ہوں گے۔ ان اذیتوں کا تصور میرے ذہن میں ابھرا تو میں نے اپنی رفتار ایک دم تیز کر دی۔ مجھے شہر سے دور اس کھلی فضا میں دو گھڑی جو سوچ بچار کی مہلت مل گئی تھی وہ میرے اعصاب کا تشنج ختم کرنے میں بڑی ہی معاون ثابت ہوئی تھی۔ میری سوچ کے زاویے کسی حد تک سیدھے ہونے لگے تھے اور وہ جو وحشت میرے دل و دماغ پر طاری تھی آہستہ آہستہ کم ہو گئی تھی۔ میں ایک بار پھر شہر کی طرف بھاگ رہا تھا جہاں سے اس صبح میں ایک ذلت آمیز شکست سے دوچار ہو کر فرار ہوا تھا۔ میرا حال شاید پھر اس گیدڑ کا سا ہو رہا تھا جس کی موت آتی ہے تو وہ شہر کی طرف چل دیتا ہے۔ مگر اب کی بار میں ایک نئے منصوبے کو ذہن میں استوار کر کے کراچی جا رہا تھا۔ مجھے آپی کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دینے کے بجائے مر جانا زیادہ آسان نظر آتا تھا۔

کسی اور طرف مڑنے کے بجائے میں سیدھا ہوائی اڈے پر جا پہنچا۔ وہاں کسٹم نے ضبط شدہ مال کی فروخت کے لیے ایک دکان کھول رکھی تھی۔ اس کے اندر جا کر میں نے اپنے لیے عمدہ قسم کی جینز کے چار جوڑے اور ایک اٹیچی کیس خرید لیا۔ اپنی ضرورت کی کچھ دوسری چیزیں اس میں بھر کر پولیس کی وردی سے چھٹکارا پانے کے لیے میں ایک غسل خانے میں جا گھسا۔ کچھ ہی دیر بعد جب میں باہر نکلا تو میں ایک نیا ہی آدمی تھا۔ سپاہی کی وردی تہہ کر کے اٹیچی کیس میں رکھ لی تھی۔ لاہور کے لیے فلائیٹ چار بجے نکلتی تھی۔ میں نے ٹکٹ خریدا اور مسافروں کے لاؤنج میں جا بیٹھا۔ سر پر میں نے ایک ہلکی سی فیلٹ ہیٹ رکھ لی تھی۔ پولیس اور کسٹم کے سپاہی وہاں بھی مستعد تھے مگر وہ ایسے شکار کی تلاش میں تھے جن سے وہ کچھ خون نچوڑ سکیں۔ ان کی نگاہ میں وہ لوگ زیادہ اہم تھے جو بیرون ملک سے واپس آ رہے تھے۔ ان کے گرد وہ مکھیوں کی طرح بھنبھنا رہے تھے۔ میں ہر شے سے بے نیاز ہو کر ایک طرف ہو کر بڑے اطمینان سے بیٹھا سوچتا رہا کہ آپی کی رہائی کے لیے مجھے کیا کچھ کرنا ہے۔

ٹھیک چار بجے ہوائی جہاز نے کراچی کا ہوائی مستقر چھوڑ دیا۔ مجھے اسی روز ڈھلوں صاحب کے پاس پہنچنا تھا جس مشکل میں آپی پھنس چکی تھی اس کا حل ان کے سوا کسی کے پاس نہیں تھا اور میں انھی کے پاس جا رہا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ کار ہی نہیں تھا۔ طیارہ لاہور کے ہوائی اڈے پر اترا تو میں کسی طرف دیکھے بغیر ٹیکسی اسٹینڈ پر جا پہنچا۔ کراچی سے لاہور تک کا سفر پل بھر میں ختم ہو گیا تھا۔ اس وقت شام کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ میں ٹیکسی میں بیٹھ کر ڈھلوں صاحب کے گاؤں کی طرف چل دیا۔

میرا حال اس سپاہی کا سا تھا جو میدان جنگ میں اپنے بازو کٹوا دینے کے بعد گھر لوٹ رہا ہو۔ کوئی شے اچھی نہیں لگتی تھی۔ فضا میں عجیب طرح کی اداسی چھائی تھی۔ سڑک کے دو رویہ اگے درخت پیچھے بھاگ رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ میرے دن بھی اسی طرح میرے قریب سے ہو کر ماضی کی طرف بھاگتے چلے جا رہے ہیں۔ مجھے اور زیادہ بے بس اور مایوس کر کے وہ میرے وجود کو دو کھن کرتے چلے جا رہے تھے۔ آدمی کے اندر ہمہ وقت وہ ہمت وہ دلیری و جرأت قائم نہیں رہتی،

جسے وہ اپنا سب سے قیمتی اثاثہ سمجھتا ہے۔ راستے میں ایسی ایسی ٹھوکریں لگتی ہیں کہ انسان کا وجود پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔ میرا حال بھی اس روز کچھ ایسا ہی ہو رہا تھا۔

جب میں چوگوٹھ پہنچا تو سورج نے مغربی دہلیز پر سر رکھ دیا تھا۔ اور افطاری کا وقت سامنے ہی تھا۔ ٹیکسی کو میں نے گاؤں سے باہر روک کر واپس بھیج دیا۔ کرایہ میں نے ڈرائیور کو اس کی توقع سے زیادہ دیا تھا۔ راستے میں وہ بھی خاموش رہا اور میں بھی اپنی سوچ میں کھویا رہا۔ نہ اسے ہمت ہوئی کہ وہ سگریٹ سلگا سکے نہ میں یہ جرأت کر سکا۔ رمضان کا احترام وہ بھی کرتا آ رہا تھا اور میں بھی۔ حالت یہ تھی کہ ہوائی جہاز میں بھی لوگوں نے کوئی شے منہ میں نہیں ڈالی تھی۔ وہاں بھی سب لوگ منہ باندھ کر بیٹھے رہے۔ چند غیر ملکی بھی اس میں سوار تھے مگر ان کو بھی طیارے کی میز بانوں نے کوئی چیز پیش نہیں کی۔ انھیں بھی شاید بتا دیا گیا تھا کہ ماہِ صیام کی وجہ سے دورانِ سفر انھیں کچھ نہیں مل سکے گا۔ وہ بھی صبر شکر کر کے بیٹھے رہے۔

جب میں چوگوٹھ کی حدود میں داخل ہوا تو مسجد سے مغرب کی اذان گونجنے لگی۔ اس آواز نے ہر طرف سناٹا پھیلا دیا تھا۔ گاؤں کی خاموش فضا میں اس آواز کے سوا کوئی اور آواز ابھرتی سنائی نہیں دیتی تھی۔ گاؤں کے لوگ غروبِ آفتاب سے بہت پہلے اپنے کام دھندے سے فارغ ہو کر گھروں کو لوٹ چکے تھے۔ جب میں حویلی کے دروازے پر پہنچا تو اندر ڈیوڑھی ہی میں مجھے ڈھلوں صاحب کے کئی ملازم افطاری میں مصروف نظر آئے۔ برکت بھی وہیں موجود تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ ہڑبڑا کر اٹھا اور بولا "آئیے خان جی! یہ اتنے دنوں بعد آپ کی صورت کیسے نظر آ گئی۔ ڈھلوں صاحب کئی بار پوچھ چکے ہیں۔"

"میں کچھ ایسے کام میں پھنس گیا تھا یار! ڈھلوں صاحب اندر ہی ہیں؟"

"ہاں! وہ رمضان کی وجہ سے کہیں نہیں جاتے۔ یہ مہینہ تو وہ اندر بیٹھ کر گزارتے ہیں۔"

"انھیں میرے آنے کی اطلاع دو۔" میں نے اٹیچی کیس ایک طرف رکھ کر چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"یہ شربت پئیں پہلے اور یہ لیں کھجوریں، یہ تو پہلے منہ میں ڈالیں، آپ نے ابھی روزہ نہیں کھولا ہو گا۔"

"نہیں! سیدھا ادھر ہی آ رہا ہوں۔" میں نے پیاس مٹانے کے لیے شربت کا گلاس منہ سے لگا لیا۔ کچھ ہی دیر بعد برکت مجھے وہاں سے اٹھا کر اسی کمرے میں لے گیا جہاں اس سے قبل بھی میں کئی راتیں گزار چکا تھا۔ میں ابھی وہاں بیٹھا ہی تھا کہ ڈھلوں صاحب تیز تیز قدم اٹھاتے وہاں آ گئے اور مجھے سامنے دیکھ کر بولے "آپ سے ہم بہت ناراض ہیں خان جی! یہ کوئی طریقہ نہیں ہے۔ اپنے بارے میں آپ نے ہمیں کچھ بتایا ہی نہیں۔" یہ کہہ کر بڑی گرمجوشی سے انھوں نے مجھے سینے سے لگا لیا۔ اپنے تہیں کرتے پر انھوں نے کوئی بہت عمدہ قسم کا عطر لگا رکھا تھا۔

"میں آپ سے شرمندہ ہوں ڈھلوں صاحب! میں اپنی بہن کی خاطر میں ادھر سندھ کی طرف نکل گیا تھا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر مجھے بتا تو دیا ہوتا۔ کتنے دنوں سے میں آپ کا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے بڑی ضرورت تھی آپ کی۔"

"میں حاضر ہو گیا ہوں۔ امرتسر سے کچھ مال بھیجا تھا میں نے۔"

"وہ جو ٹرک میں آیا تھا، ہاں! وہ مال مجھے مل گیا تھا۔ بلبیر سنگھ اور سیتا اس میں سے زندہ ہی برآمد ہو گئے تھے۔ ان دونوں کو میں نے پولیس کے حوالے کر دیا تھا۔ سیتا بھی اب جیل میں ہے اور بلبیر سنگھ بھی۔"

"میرا خیال ہے کہ ان کو سزا ملنی ہی چاہیے تھی۔"

"بہت ہاں ہاں کرتا تھا وہ بلبیر سنگھ۔ پولیس کو جب میں نے آپ کے رقعے کے مطابق ساری بات بتائی تو وہ خوش ہو گئے۔ انھیں حیرت تھی کہ ایسے مجرم کو ان تک کون لے آیا ہے۔ میں نے کہہ دیا کہ ایک درویش خدا مست نے ان کو اڑنگے میں پھنسا کر لاہور پہنچا دیا۔"

"وہ تو اچھا ہو گیا۔ بلبیر سنگھ بھی کیا یاد کرے گا کہ اس نے کن لوگوں سے پنجہ لڑایا تھا مگر میں تو ایک اپنے ہی دھندے میں آپ کے پاس آیا ہوں اور اب کی بار میں کچھ زیادہ ہی سخت جال میں پھنسا ہوں۔"

"ہوا کیا ہے آخر؟ یہ لیں یہ آم کھائیں۔ آج ہی ملتان سے میرے یار نے بھیجے تھے۔ دیکھیں کیا سندوری رنگ ہے ان کا۔" ڈھلوں صاحب کے پاس برکت ڈھیر ساری چیزیں رکھ گیا تھا اور اب وہ باہر برآمدے میں کھڑا تھا۔ حویلی کی فضا پر ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ شام انسان پر ویسے ہی بہت بھاری ہوتی ہے مگر جب اتنی بڑی حویلی کی اونچی اونچی دیواروں کے اندر آدمی بیٹھا ہو تو وہاں تک کوئی زندگی کی ترنگ سے بھرپور آواز پہنچ ہی نہیں پاتی۔

"بات یہ ہے ڈھلوں صاحب کہ کراچی میں میرا یار اسلم آبی پولیس کے ہتھے چڑھ گیا ہے۔" یہ کہہ کر میں نے مختصر الفاظ میں وہ تمام واقعات ڈھلوں صاحب کے سامنے بیان کر دیے جو امرتسر سے ہماری واپسی کے بعد ہمیں پیش آئے تھے۔

وہ بڑے غور سے میری باتیں سنتے رہے۔ جب میں خاموش ہوا تو وہ پریشان ہو چکے تھے، بولے "خان جی! یہ نیا چکر آپ نے کیوں چلا دیا۔ ان کو آپ نے پکڑا تھا اس ڈاکٹر دھمن اور عالیہ کو تو اسی کیڈلک میں ڈال کر اسے سیدھا میرے پاس لے آتے میں نہیں چیر کر رکھ دیتا۔ مگر اب کراچی میں پھنسا ہے آپ کا دوست۔ کیا اس کا نام پہلے بھی کسی معاملے میں پولیس تک پہنچا تھا؟"

"نہیں ڈھلوں صاحب! یہ اس کی پہلی آزمائش ہے۔ وہ بہت محتاط آدمی ہے بس وہ غوریں اسے لے بیٹھیں، اسے اندھا دھند شراب نے اندھا کر دیا۔"

"خیر۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ میں دیکھتا ہوں اس کے لیے کیا ہو سکتا ہے۔ یہ آم تو کھائیں۔"

وہ کام انھیں آبی کی رہائی سے زیادہ ضروری نظر آ رہا تھا۔ میں بھی طبیعت پر جبر کر کے ان کے ساتھ آموں پر دانت آزماتا رہا۔ کوئی پندرہ منٹ کی گہری خاموشی کے بعد وہ بولے "اوئے برکت! جا ذرا برکی سے کہہ میری کار باہر نکالے، ہم لاہور جائیں گے۔" انھوں نے فیصلہ کن انداز سے کہا۔

برکت فوراً ہی وہاں سے چلا گیا تو وہ بولے "میں لاہور سے شاید رات کی فلائیٹ سے کراچی چلا جاؤں، آپ ادھر ہی رہیں۔ اور میری غیر حاضری میں میرا ایک کام کر دیں۔"

"آپ حکم کریں، آپ کے لیے تو میری جان بھی حاضر ہے۔"

"وہ پیر آباد کا رحمت علی ہمارے لیے پھر مصیبت بن رہا ہے۔ پتہ نہیں ادھر اسلام آباد سے کیسا حکم آیا، پولیس نے اسے رہا کر دیا۔ اب کی بار آپ اسے ختم کر دیں ورنہ وہ ہر وقت ہمارا راستہ روکتا رہے گا۔"

"یعنی۔ آپ کا مطلب ہے میں اسے گولی مار دوں۔"

"ہاں۔ میں اب اس کا وجود برداشت نہیں کر سکتا۔ آپ بے فکر ہو کر یہ کام کر دیں۔ میں آبی کو آپ کے پاس لے آؤں گا۔ یہ میرا ذمہ۔ یہ سودے بازی کی بات نہیں ہے بلکہ میں تو کئی دنوں سے آپ کا انتظار کر رہا تھا۔ آپ کے دوست کی رہائی میرا فرض ہے۔ مگر یہ کام تو بہت پہلے میں نے آپ کے لیے سوچ رکھا تھا۔" وہ میرے چہرے پر پھیلی تحیر اور تذبذب کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے بولے۔

"کوئی اور راستہ نہیں ہے اس آدمی سے جان چھڑانے کا؟"

"نہیں بھئی! وہ لوگ روز بروز مضبوط ہوتے جا رہے ہیں۔ لاہور رینج میں ایک ڈی آئی جی آیا ہے ملوک خان۔ وہ رحمت علی کا ہی خواہ ہے۔ اس کے بل بوتے پر ان لوگوں نے ہمارے آدمیوں کو ادھر چھب پار زمین پر ہل چلانے سے روک دیا ہے۔ وہ زمین پچھلے پندرہ سال سے ہمارے قبضے میں تھی۔ سنا ہے وہ اس کو الاٹ کروانے کی فکر میں ہے وہ رحمت علی۔"

"وہ آپ کی زمین نہیں تھی؟"

"نہیں تھی۔ مگر متروکہ ہے اور ہم نے اس کو آباد کر دیا تھا لیکن اب پانسہ ہی پلٹ رہا ہے۔"

"آپ کا تو اتنا اثر رسوخ ہے، آپ بھی۔۔۔۔۔ اس سے مات کھا گئے!"

"بس وقت وقت کی بات ہے۔ یہاں تو روز روز صورت بدلتی ہے ان لوگوں کے درمیان یہ رحمت علی ہی سوچ فکر والا آدمی ہے۔ اسے تو ٹھکانے لگانا ہی ہو گا۔"

"اس کے سوا کوئی راستہ نہیں؟"

میری اس بات پر وہ جھنجھلا سے گئے، بولے "یہ کام میں اپنے کسی آدمی سے بھی کروا سکتا ہوں مگر وہ اناڑی پن کا ثبوت دے گئے تو مشکل ہو جائے گی۔ آپ بھی اس پر ہاتھ ڈالیں گے تو واقعات سے یہ ثابت ہونا چاہیے کہ وہ قدرتی موت مرا ہے یا حادثے میں ختم ہو گیا ہے اسی لیے میں یہ کام آپ کے سپرد کر رہا ہوں۔"

"اگر ایسا ہے تو پھر آبی کو آ جانے دیں۔"

"نہیں! اسے چھڑانے میں خدا جانے کتنے دن لگ جائیں میں بہرحال آج ہی کراچی جا رہا ہوں۔ اس کام میں آپ کسی اور کو شامل نہ کریں۔ یہ بہت ضروری ہے۔ رحمت علی کی موت حادثہ ثابت ہونا چاہیے۔ اور ہاں! آپ کے لیے ایک خوشخبری بھی ہے۔"

"وہ کیا؟" میں نے قدرے حیران ہو کر کہا۔

"سردار خان آپ کی منہ بولی بہن مجیدن کو ادھر چھوڑ گیا تھا۔ آپ نے اسے بہت خوفزدہ کر دیا۔ وہ آپ سے معافی مانگ رہا تھا۔"

"مجیدن؟ کیا وہ یہاں آ گئی ہے، کب سے ہے وہ یہاں؟"

"کئی دن ہو گئے۔ وہ بھی آپ کا انتظار کر رہی تھی۔ آپ آج رات اس سے مل لیں۔ اس بچاری کی ماں پر فالج گر گیا تھا۔ میں نے دو ہزار روپے اسے بھجوا دیے تھے۔"

"یہ تو آپ نے بہت اچھا کیا۔ میں آج مجیدن سے ضرور ملوں گا۔ وہ خوش تو ہے نا!"

"ہاں! خوش ہی ہے۔"

"ٹھیک ہے ڈھلوں صاحب! رحمت علی پر میں کل ہی ہاتھ ڈال دوں گا آپ فکر نہ کریں۔"

"میری اطلاع یہ ہے کہ وہ اپنے کسی بہنوئی کے ہاں گیا ہوا ہے۔ اسے وہاں تین چار دن لگ جائیں گے اس کا جھٹکا وہیں کر دیں تو بہتر ہے پتہ میں آپ کو دے دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر ڈھلوں صاحب نے ایک چھوٹا سا کاغذ نکال کر مجھے تھما دیا۔ "یہ لیں یہ اس کا پتہ ہے، وہ چوہدری خیرات محمد کے گھر ٹھہرا ہوا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ سودا ہو گیا ڈھلوں صاحب!" میں نے کاغذ جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

"ایسا نہ کہیں خان جی! میں آپ کو اپنے بھائی سے زیادہ عزیز سمجھتا ہوں۔ آپ بے فکر رہیں اور آبی کو ہر قیمت پر واپس لے آئیں۔ میں یہ کام وہاں کراچی میں خود بھی کر سکتا تھا مگر بہت خون خرابہ کرنا پڑتا۔ وہ کسی ایک آدمی کی قید میں نہیں ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے اور میں اسی لیے اس کام میں عجلت کر رہا ہوں۔ زیادہ دیر ہو گئی تو پھر وہ بہت آگے نکل جائے گا۔ اس کو اسی مرحلے میں واپس لایا جا سکتا ہے۔ اچھا اب آرام کریں۔ مجیدن سے آپ کو برکت ملوا

دے گا۔" یہ کہہ کر وہ مجھ سے گرم جوشی سے ہاتھ ملا کر واپس چلے گئے۔
برکت نے اُن کے جانے کے بعد میرے سامنے سے پھلوں کا ٹرے اٹھایا تو میں نے کہا "برکت! ادھر ایک لڑکی مجیدن آئی ہوئی ہے اُسے میرے پاس لے آؤ۔ وہ میری منہ بولی بہن ہے۔"
"مجھے معلوم ہے خان جی! وہ تو بہت دنوں سے یہاں آئی ہوئی ہے۔ چوہدری سردار خان کے پاس تھی وہ۔ بچاری بڑی ہی بے زبان لڑکی ہے مجھے تو اس پر ترس آتا ہے۔"
"اسے میرے پاس لے آؤ، اور برکت! وہ بہت دکھی ہوگی بدنصیب۔"
"میں اسے ابھی لے آتا ہوں مگر میرا خیال ہے کہ وہ عشا کی نماز سے پہلے کسی سے بات نہیں کرے گی۔ وہ روزے بڑے زور شور سے رکھتی ہے مغرب اور عشا کی نماز وہ ایک ہی مصلّے پر ادا کرتی ہے اٹھتی ہی نہیں۔"
"ہاں اسے خدا تو بہت یاد آتا ہوگا۔ کچلے ہوئے لوگوں کا آخری سہارا تو وہی ہوتا ہے۔"
برکت باہر نکل گیا۔ میرا ذہن جلتی ہوئی خشک لکڑی کی طرح چٹخنے لگا تھا۔ میں پھر ایک پھندے میں پھنس رہا تھا۔ پھر میری ایک غرض مجھے اس صاحبِ اختیار کے ہاں لے آئی تھی۔ اس نے پھر مجھ سے ایک سودا کر لیا تھا۔ ایسا سودا جسے میں موڑ ہی نہیں سکتا تھا۔ آبی کی جان شکنجے میں پھنسی تھی۔ اس کا وہ بے داغ بدن جن اذیتوں کے آرے میں چیرا جا رہا تھا اس کا میں بخوبی اندازہ کر سکتا تھا۔ پولیس کے تشدد کا دور بیٹھ کر کوئی آدمی تصور ہی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ملزم کو مجرم سمجھتے ہوئے ایسے ایسے جان لیوا عذابوں میں مبتلا کرتے ہیں کہ آدمی چاہتا ہے کہ وہ مر جائے مگر وہ اسے مرنے بھی نہیں دیتے۔ ایک گولی انسان کے وجود سے آر پار گزر جائے تو پتہ بھی نہیں چلتا کہ ہوا کیا ہے اور آدمی شعور و ادراک کی ساری حدیں پھلانگ کر دوسری طرف نکل جاتا ہے جہاں اس کا معاملہ ہی اور ہوتا ہے جہاں اسے کسی انسان سے کوئی واسطہ نہیں رہتا۔ وہ جس حال میں بھی ہوتا ہے رحمتِ خداوندی کی آغوش میں پہنچ کر گہری نیند میں کھو جاتا ہے۔ اپنے سارے دُکھ وہ یوں پیچھے چھوڑ جاتا ہے جیسے اُن سے اس کا کوئی واسطہ ہی نہیں تھا۔ ایک بے کراں سکون اور طمانیت اسے حاصل ہو جاتی ہے۔ مگر جب آدمی پولیس کے دانتوں تلے پہنچ جاتا ہے تو پھر وہی جانتا ہے کہ وہ اس کو کس کس طرح چباتے ہیں۔ کس کس طرح اس کی انا کو اس کی قوتِ ارادی کو اس کے خوابوں اور اس کی آرزوؤں کو ریزہ ریزہ کرتے ہیں۔ سارے سمندروں کا پانی سیاہی ہو جائے تو بھی قلم کے لیے وہ سیاہی اس کیفیت کو ظاہر کرنے کے لیے ناکافی ہوگی جو اس آدمی پر بیت جاتی ہے جسے وہ اپنے بے پناہ تشدد کا نشانہ بناتے ہیں۔ میرا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ ڈھلوں صاحب نے جان کے بدلے جان مانگی تھی۔

وہ بڑا ہی صبر آزما فیصلہ تھا جو اس روز مجھے کرنا پڑا۔ آبی کو سکتے کی راہ سے گزر ہی جانا چاہیے تھا کہ اس کے بغیر تو میں بالکل ہی معذور رہ گیا تھا۔ اس کو میں بے موت مرتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔
مجیدن کو ساتھ لے کر برکت کچھ ہی دیر بعد مجھے برآمدے میں چلتا نظر آیا۔ وہ دھان پان سی لڑکی افسردہ سی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے جب میرے سامنے آئی تو میں اس کے احترام میں اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ وہ مجھے یوں دیکھتی آ رہی تھی جیسے وہ مجھے پہچان نہ رہی ہو مگر پھر اس کی نظر ٹھہر گئی۔ میرے قریب آ کر وہ رُکی تو مجھے احساس ہوا کہ اس کے ہونٹ لرز رہے ہیں اور اس کی آنکھیں آنسوؤں میں ڈوبنے لگی ہیں۔ وہ مجھے سلام کرنا بھی بھول گئی تھی۔ جب وہ ضبط نہ کر سکی تو دونوں ہاتھوں پر اپنا چہرہ رکھ کر بے تحاشا رونے لگی۔ میں نے اسے کندھوں سے پکڑا تو وہ میرے سینے سے لگ کر یوں روئی جیسے اپنے وجود کا سارا غم وہ میری طرف منتقل کر دے گی۔
"نہ رو پگلی! میں تجھ سے بہت شرمندہ ہوں مجیدن! میں تیرے لیے کچھ نہ کر سکا اور تجھے بھیڑیے اٹھا کر لے گئے۔" میری آواز گلوگیر ہو گئی تھی۔ میں تو اپنی سگی ماں جائی بہن کے لیے اب تک کچھ نہ کر سکا تھا اور وہ تو تھی ہی پرائی۔ ورنہ چھانگا مانگا کچھ زیادہ دور تو نہیں تھا مگر میں عمداً ادھر کا رخ نہ کر سکا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ میں مجیدن کو اس خوک زادے کی گرفت سے چھڑا بھی لاتا تو کیا ہوتا۔ مجیدن جو زخم سہہ چکی تھی ان کا تو ازالہ ممکن ہی نہیں تھا۔ کنوئیں میں گندگی کا ایک قطرہ گر جائے تو وہ ناپاک ہو جاتا ہے مجیدن تو سرتاسر نجاست میں ڈبو دی گئی تھی، اس کا پاک پوتر ہو جانا کیسے ممکن تھا۔ اس کی اذیت کا ایک لمحہ ساری کائنات کے برابر تل سکتا تھا مگر میں وہ ترازو کہاں سے لاتا۔ میری اپنی سگی بہن آسیہ اسی راستے سے گزر کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے برباد ہو گئی تھی۔ حالانکہ میں زندہ تھا اور ابھی تک بے غیرت بن کر جی رہا تھا۔ اس کے تعاقب میں میں نے اپنے پاؤں لہولہان کر لیے تھے مگر وہ کہیں نہیں ملتی تھی۔ روز بروز وہ مجھ سے دور ہوتی چلی گئی تھی۔ پھر مجیدن... بچاری کس شمار قطار میں تھی۔ میں سردار خان کی گردن مار سکتا تھا مگر وہ گھڑی جو مجیدن پر جانکنی بن کر برس چکی تھی اسے میں کیسے واپس لا سکتا تھا۔ انتقام تو کبھی پورے کا پورا لیا ہی نہیں جا سکتا ہے۔ ممکن ہے ایک کے بدلے چار جانیں لینے کے باوجود مجھے یقین ہے کہ وہ آدمی جو پہلے کسی گولی میں مارا گیا، اس کا حق تو کسی بھی طرح لوٹایا نہیں جا سکتا۔ وہ جان سے گزر گیا۔ پھر کوئی چاہے پوری پوری بستیاں جلا دے، اُسے کیا مل سکتا ہے اس کی روح تو کبھی آسودہ نہیں ہو سکتی۔ یہی حال مجیدن کا تھا۔ وہ رو رو کر دل کا غبار نکال چکی تو میں نے کہا۔
"دیکھ مجیدن میری بہن! زندگی ایسی ہی ہے۔ اسے جس حال میں بھی آدمی کو قبول کرنا پڑتا ہے تو زندہ ہے نا تو اس کا مطلب ہے

اور جینے کی، مقابلہ کرنے کی، دکھ اٹھانے کی ہمت ابھی باقی ہے۔ تجھے اپنے لیے نہیں تو ماں جی کے لیے اور بہن بھائیوں کے لیے زندہ رہنا ہوگا۔"
"انھوں نے مجھے گھر سے اُٹھا۔۔۔" وہ بلکنے لگی۔
"مجھے سب معلوم ہے۔ اس میں تیرے ارادے کو کوئی دخل نہیں تھا۔ مجیدن! تجھے پتہ ہے تیری ماں بیمار رہی ہے اس پر فالج کا حملہ ہوا ہے۔"
وہ چونک کر میری طرف یوں دیکھنے لگی جیسے اُسے یقین نہ آ رہا ہو۔
"تجھے نہیں معلوم؟"
اس نے بڑی بے بسی سے دائیں بائیں سر ہلا دیا۔ آنکھیں اس کی جھرنا بنی ہوئی تھیں۔
"وہ بیمار ہے۔ شاید تجھے چوہدری صاحب نے جان بوجھ کر نہیں بتایا ہے کہ تو دکھی ہوگی۔ انھوں نے تیری ماں کے لیے دو ہزار روپے بھجوا دیے تھے۔ وہ اس کا علاج بھی کرواتے رہے تھے۔"
"مگر مجھ سے کیوں نہیں کہا انھوں نے؟"
"یہی سوچ کر کہ تجھے بہت صدمہ ہوگا۔ میرا یہی خیال ہے۔"
"ان کو چاہیے تھا وہ مجھے گھر بھیج دیتے۔" اس کے لہجے میں کرختگی پیدا ہو چلی تھی۔
"وہ میرے انتظار میں تھے۔ تجھے وہ میرے ہی سپرد کرنا چاہتے تھے۔ اب تو یوں کر آج ہی رات لاہور چلی جا۔"
برکت سامنے کھڑا ہوا تھا، بولا "چوہدری صاحب کے ساتھ بھیج دیں۔ وہ ابھی شہر جا رہے ہیں اپنی کار میں۔"
"ہاں! اُن سے کہو وہ اسے ساتھ لے جائیں اور اس کے گھر پہنچا دیں۔ یہ لے مجیدن یہ دس ہزار روپے ہیں تو ساتھ لے جا۔ میں بھی چند دن کے بعد تیرے پاس آؤں گا۔ ماں جی کو تیری ضرورت ہوگی جا ابھی چلی جا۔ باقی باتیں میں تجھ سے بعد میں کروں گا۔" وہ اپنی جگہ سے اسی وقت اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے نوٹوں کی گڈی اس کے ہاتھ میں دے کر اس کی مٹھی بند کر دی۔
"آپ کب آئیں گے ہمارے گھر؟"
"میں بس جیسے ہی فرصت ملی آ جاؤں گا۔ ماں جی سے کہنا کہ وہ جینے کی ہمت پیدا کریں ہمیں ان کی زندگی کی ضرورت ہے مجیدن! جا اب زیادہ دیر نہ کر۔" میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ وہ دوپٹہ سنبھالتی ہوئی اسی وقت برکت کے ساتھ باہر نکل گئی۔ وہ اس وقت بھی ویسی ہی دبلی پتلی تھی جیسی میں نے پہلی بار دیکھی تھی۔ میرا خیال ہے اذیتوں نے اس کے جسم کی کچھ اور بوٹیاں نوچ لی تھیں مگر اس کی آواز میں، لہجے میں، لفظوں میں پختگی اور کرختگی آ چکی تھی۔ جیسے وہ زبان سے ہی تلوار کا کام لینے کی کوشش کرتی رہی ہو۔ خدا جانے کس کس کی بانہوں میں بے بس ہوتے وقت وہ ان لوگوں کو کیسی کیسی گالیاں دیتی رہی تھی۔ جو اس کی عزت کے موتیوں کو بے دریغ پیستے رہے تھے۔ وہ بہت دکھی تھی۔

غم کی دردناک تصویر بنی پھرتی تھی۔ وہ مفلس زادی جو قلندروں کا تھقہہ بن کر رہ گئی تھی۔ وہ نظروں سے اوجھل ہوئی تو میں نڈھال سا ہو کر بستر پر گر گیا۔
زندگی چتا پر رکھی میت کی طرح جھیر جھیر جلتی نظر آتی تھی۔ میں تقدیر کا زندانی بن کر رہ گیا تھا۔ بڑا زور تھا میرے بازوؤں میں، بڑا حوصلہ تھا میرے سینے میں، سارے جہان سے ٹکرا جانے کا عزم میں دل میں لیے پھرتا تھا مگر اب جو میں حساب کرنے بیٹھا تھا تو مجھے خسارہ ہی خسارہ نظر آتا تھا۔ میں جو تیغ کوہ پہ کھڑا تھا۔ تند و تیز ہوا کی زد میں آ کر منہ کے بل نیچے گر رہا تھا۔ آبی کی گرفتاری نے مجھے نڈھال کر دیا تھا۔ وہ میرا ایسا ہم نفس تھا جس نے اپنے خلوص اور ایثار کے بے پناہ مظاہرے سے میرے خون میں جگہ بنالی تھی۔ وہ تیل میں ہاتھ ڈال کر میری دوستی کا دعویٰ کرتا تھا اور مجھے یہ سوچ کر ہول آتا تھا کہ میں اسے یوں بے یار و مددگار چھوڑ کر کس منہ سے اس عظیم الشان ہوٹل سے باہر نکل آیا۔ میں کیوں اُسے یوں بے سہارا چھوڑ آیا۔ وہ ادھر کسی تھانے میں بیٹھا اب چار چوٹ کی مار کھا رہا تھا اور میں اپنے دیے کی لو کو آندھیوں سے بچا کر ڈھلوں صاحب کے ڈیرے پہنچ جانے ہی کو غنیمت سمجھ رہا تھا۔ جیسے کوئی بچہ پٹ پٹا کر اپنے باپ کی گود میں جا گرے۔ اس کے سوا میں آبی کے لیے کیا کر سکتا تھا۔ کچھ بھی نہیں۔ اور اب میرے حوصلوں کا چاند سُندری کے گھاٹ اُتر چکا تھا۔ میں آبی کو حاصل کر سکتا تھا مگر اس صورت میں کہ میں رحمت علی کا سر قلم کر کے ڈھلوں صاحب کے قدموں میں لا ڈالتا۔ یہ بہت ہی کڑی شرط تھی اور میرا دل گواہی دیتا تھا کہ رحمت علی اس چوہدری مختار ڈھلوں سے کہیں زیادہ بہتر آدمی تھا۔ اُسے میں دیکھ چکا تھا۔ نمازی پرہیزگار آدمی تھا اور اپنے اسی تقوے اور زہد کی وجہ سے لوگ اس کی عزت کرتے تھے۔ اس پر یہ الزام ہی غلط تھا کہ اس کی شہ پر کسی نے چھب یار کی زمین پر قبضہ کر لیا تھا۔ ڈھلوں صاحب کا اس زمین پر تصرف ہی غلط ہوگا۔ وہ خواہ مخواہ ہی اس زمین کو اپنے گھر میں ڈال چکے تھے اب کسی نے انصاف کا تقاضا پورا کر دیا ہوگا۔ کسی حقدار کو اس کا حق دے دیا ہوگا۔ تو ڈھلوں صاحب اپنی اس ہزیمت کو بھی رحمت علی کے حساب میں لکھ رہے تھے۔ انھیں ہر طرف وہی تیرہ تیزی نظر آ رہی تھی حالانکہ معاملہ کچھ اس کے بالکل ہی برعکس تھا لیکن ان سب باتوں کے باوجود میں دم نہیں مار سکتا تھا۔ مجھے ڈھلوں صاحب کی ہر بات بے چون و چرا تسلیم کرنی پڑ رہی تھی کیونکہ اُن کا اثر و رسوخ اور اُن کا اختیار معجزے دکھا سکتا تھا۔ وہ آہو سے کئی ہاتھ آگے تھے۔ ڈھلوں صاحب اس علاقے کے بے تاج بادشاہ تھے اور آہو کے سر پر محض ایک تاجِ خروس تھا جس کی قیمت کبھی پڑ جاتی تھی اور کبھی نہیں۔
کوئی آدھ گھنٹے بعد حویلی کا ایک ملازم میرے لیے رات کا کھانا لے آیا۔ افطاری پروف پھل اور ما کولات ہی سامنے رکھے گئے تھے میری

بھوک ویسے ہی تا تا تھیّا کر کے لوٹ چکی تھی۔ میں نے چند لقمے لے کر سارے کا سارا کھانا واپس کر دیا۔ ملازم واپس گیا تو برکت تیز تیز قدم اٹھاتا میرے پاس آ پہنچا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بریف کیس تھا۔ اُسے میرے سامنے رکھتے ہوئے بولا "یہ رکھ لیں خان جی! ڈھلوں صاحب نے دیا تھا۔ یہ رہی اس کی چابی۔"

"ڈھلوں صاحب کہاں ہیں؟"

"وہ شہر چلے گئے ہیں۔ کہہ گئے تھے کہ میں آپ کو یہ بریف کیس پہنچا دوں۔"

"اور کچھ؟"

"جی کچھ نہیں۔ بس انھیں آپ کے آرام کی فکر لگی رہتی ہے" بولے "برکت ادھر خان صاحب کو کوئی پریشانی نہیں ہونی چاہیے۔ اُن کا ہر طرح خیال رکھو۔"

"یہ اُن کی مہربانی ہے برکت کہ مجھ پر اپنی شفقت فرماتے ہیں۔"

"وہ آپ کی بہت قدر کرتے ہیں خان جی! آپ یہاں نہیں تھے تو وہ روز آپ کے بارے میں مجھ سے پوچھتے تھے۔ ایک نئی لڑکی آئی ہے یہاں صغراں، اُسے میں آپ کے پاس بھیج رہا ہوں ڈھلوں صاحب کہہ گئے تھے۔ وہ آپ کی مٹھی چپی کر دے گی۔"

"نہیں برکت! اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ایسا مت کرنا۔ مجھے کسی کی مٹھی چپی کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے بدکتے ہوئے کہا۔ آپی کا حشر میں دیکھ چکا تھا اور اب میں کسی اجنبی عورت کے تصور ہی سے لرز اٹھتا تھا۔

"وہ بہت خوبصورت ہے خان جی! آپ کا دل خوش ہو جائے گا۔ ڈھلوں صاحب مجھے کہہ گئے ہیں۔"

"یہ بکواس بند کر اور جا۔ اب میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔ میرا کیا واسطہ اس صغراں سے۔" میں نے برکت کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

وہ شرمندہ سا ہو کر اسی وقت نکل گیا۔ لڑکیاں نہ ہوئیں چوسر کی نردیں ہو گئیں، کھنکتی پیالیاں ہو گئیں۔ افلاس کے مارے مزارعوں اور کمینوں کی بہو بیٹیاں خدا جانے اُن حویلیوں میں کیسے آ پہنچتی تھیں اور کیسے بے غیرت لوگ تھے جو سب کچھ جانتے ہوئے اپنی اُن مُنہ بند اور شگفتہ کلیوں کو اُن کے پاؤں تلے ڈال دیتے تھے اور وہ صغراں بھی کوئی ایسی ہی تھی۔ کسی کی ڈھلوں صاحب کے ہاں اٹکی کوئی بڑی غرض کی بھینٹ چڑھ رہی تھی۔

برکت باہر نکلا تو میں نے اندر سے کنڈی چڑھا لی اور جالی لگی تمام کھڑکیاں کھول کر میں نے ڈھلوں صاحب کا دیا ہوا بریف کیس کھول لیا۔ اس میں ڈھلوں صاحب نے میرے لیے ایک بڑا ہی سانپ ایسا خوبصورت مگر ہلکا پھلکا سائلنسر لگا پستول، اس کی گولیوں کا ڈبا اور دس دس ہزار کی دو گڈیاں ڈال رکھی تھیں۔ اس نئی مہم پر روانہ ہونے کے لیے وہ زادِ راہ ڈھلوں صاحب نے میرے لیے بھیجا تھا ... روپے کی بھلا کیا ضرورت تھی۔ ان نوٹوں کے نیچے سگریٹ ... ایک بوسکی کی قمیص شلوار، بنیان، جانگیہ، جرابیں اور نازک سا ... جُوتا رکھا تھا جس پر چاندی کے تار لگے تھے۔ اشارہ یہ تھا کہ اپنا لباس بدل لوں۔ اُن سب چیزوں کا جائزہ لے کر میں نے بریف کیس بند کر دیا۔ ڈھلوں صاحب میری ضرورتوں کا واقعی بہت خیال رکھتے تھے، ایسے ہی جیسے کوئی کسی شکرے کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ اس شکرے سے جسے وہ آسمانوں میں چھوڑ کر اڑتے پرندوں پر جھپٹتے دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ یہ ڈھلوں صاحب کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ مجھ سے پہلے خدا جانے کس کس سے وہ اس قسم کے کتنے ہی کام لے چکے تھے۔ اور پھر اُن کا کیا انجام ہوا تھا اس کا مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا۔ ان کے پزاوے میں ہر روز ان گنت رنگ رنگیلی اینٹیں پکتی تھیں۔

وہ رات مجھ سے گزارے نہیں گزرتی تھی میرے ضمیر کی ایک نہیں لاکھ آنکھیں تھیں۔ وہ اکثر مُندی رہتی تھیں مگر اُس رات وہ سب کی سب کھل گئی تھیں اور ہر آنکھ میں میرے لیے بے پناہ نفرت بھری تھی۔ میں اُن کی ٹکٹکی سے پریشان ہو کر بار بار بستر سے اچھل کر اُٹھ جاتا تھا۔ میں چاروں طرف سے اُن آنکھوں کے نرغے میں تھا اور وہ اُس رات مجھ سے یہی کہتی تھیں کہ جیلانی اے کاش ترا مادرزادے رحمت علی کی گردن کا سودا تو نے کیوں کر لیا ہے؟ کیا حق پہنچتا ہے تجھے کہ تو اس آدمی کو زندگی سے محروم کر دے جس کو تو جانتا تک نہیں جس کے بارے میں تجھے کچھ بھی معلوم نہیں سوائے اس کے کہ پیر آباد کا مُلا بھی اس کے زہد و تقویٰ کی گواہی دیتا تھا۔ جو ایک بار پہلے بھی تیرے ظلم کا نشانہ بن چکا ہے۔ اس وقت اس کا قتل تو نے اپنے ذمے نہیں لیا تھا۔ وہاں تک تو شاید تیری اس زیادتی کو معاف بھی کیا جا سکتا ہے مگر اس سے آگے کا حق تجھے کس نے دے دیا ہے۔ تو کرائے کا قاتل بن رہا ہے۔ ایک ہادی علی پہلے بھی تیرا شکار ہو چکا ہے اس لیے کہ اس وقت تجھے اپنی بہن کی رہائی مطلوب تھی اور تو آہو پہ تکیہ کر بیٹھا تھا مگر اب تو جس سودے کو پکا کر چکا ہے وہاں سے کہیں زیادہ ہولناک ہے۔ تو اپنی بہن کو تو بے گناہ سمجھتا تھا مگر آپی کی صفائی میں تو کہاں سے کیا دلیل لائے گا۔

ساری رات میں خود سے دست و گریباں رہا۔ میری گردن دو مخالف اور متصادم قوتوں کے شکنجے میں پھنسی رہی۔ یہاں تک کہ جوگیاں کی مسجد میں اللہ اکبر کی گمبھیر صدا گونج اٹھی۔ لوگ سحری کھا کر مسجد کی طرف روانہ ہونے لگے تھے۔ مُلّا یہی کہہ رہا تھا کہ اٹھو اور فلاح کی طرف آؤ، خیر کی طرف دوڑو کہ نماز نیند سے ہر حال میں بہتر ہے۔ اس آواز کی طرف سے کان بند کر کے میں ایک بار پھر تکیے میں مُنہ دے کر لیٹ گیا۔ صبح کی خنک ہوا کھڑکیوں میں سے اندر آ رہی تھی۔ وہ بیابانوں سے ... وہاں تک آ پہنچی تھی۔ اس ہوا میں مُنہ بند کلیوں کے سے ... اور تازگی کا پیغام تھا۔ وہ ہوا میرے کمرے میں اٹھلاتی چلی آ رہی تھی مگر ... ڈھلوں صاحب کا پھندیت بنا ہر طرف سے بے نیاز ہو کر وہاں لیٹا رہا۔ یہاں تک کہ جب لوگوں نے مسجد میں پہنچ کر سر سجدے میں ڈالے میری آنکھ لگ گئی اور میں بے سُدھ ہو کر گہری نیند میں کھو گیا۔ مجھے یہی کرنا چاہیے تھا کہ میں نہ اس صبح اپنا سامنا کر سکتا تھا نہ خدا کا۔

جب میری آنکھ کھلی تو سورج خاصا اُوپر اٹھ آیا تھا اور برآمدے میں برکت کے پاؤں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔

میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو برکت اندر آ گیا، بولا "میں چار پانچ بار آ کر دیکھ چکا ہوں خان جی مگر آپ گہری نیند میں تھے۔"

"ہاں یار! تھکن کچھ زیادہ ہی تھی۔"

"آپ نہا لیں تو میں ناشتہ لے آؤں۔"

"کیوں گناہگار بنتے ہو خود تو تم نے روزہ رکھا ہو گا۔"

"کہاں جی! ابھی تو میں ڈھلوں صاحب کی نماز ہی پوری نہیں پڑھ سکا تو اللہ کے روزے کیسے رکھ سکتا ہوں؟"

"یہ سب بہانے بازی ہے برکت! تجھے اگر اللہ نے پکڑ لیا نا تو اس کے فرشتے ایسے گُرز ماریں گے تجھے کہ تو بھول ہی جائے گا کہ کوئی ڈھلوں صاحب بھی تھے۔"

برکت ہنستا ہوا باہر نکل گیا، بولا "ان گُرزوں میں ڈھلوں صاحب کا بھی حصہ ہو گا۔ وہ بھی میرے ساتھ ہی اُدھر جائیں گے۔ آپ کے لیے میں ناشتہ لا رہا ہوں جلدی نہا لیں۔"

جب میں نہا کر ڈھلوں صاحب کا عطا کردہ نیا جوڑا پہن چکا تو مجھے ایک عجیب سی تازگی کا احساس ہوا۔ اس جوڑے میں ولایتی قسم کی کوئی بہت ہی جاں فزا خوشبو بسی تھی۔ یہ اُس خوشبو کا اعجاز تھا کہ مجھے زندگی اپنے مشامِ جاں میں لَوٹتی نظر آتی تھی۔ موسموں کا، رُتوں کا، دن کے، رات کے مختلف پہروں کا انسان کے ذہن پر بڑا ہی گہرا اور متنوع اثر مرتب ہوتا ہے۔ کالی رات میں یا تو عشق کا جذبہ بیدار ہوتا ہے یا مایوسی کا۔ اور وہ رات جو میں گزار آیا تھا ایسی ہی تاریک اور ویران رات تھی کہ وہ میرے جسم میں یاس کا زہر گھولتی رہی تھی مگر اس کی صبح نے مجھے پھر حقیقت کا ادراک لوٹا دیا تھا۔ میں پھر سے خود کو ایک نئی تگ و تاز کے لیے تیار پا رہا تھا۔

برکت مجھے ناشتہ کھلا کر برتن واپس بھجوا چکا تو میں نے اس کے سامنے بریف کیس میں ضرورت کی تمام چیزیں بھریں اور اس کو ساتھ لے کر اسی وقت حویلی سے باہر نکل آیا۔ ایک چتکبری سی شوخ شریر اور بڑی ہی مغرور قسم کی پلی ہوئی گھوڑی اس نے میرے حوالے کر دی تھی۔ میرا خیال ہے برکت جانتا تھا کہ میں کس کام کے لیے کس طرف جا رہا ہوں۔ انداز اس کا یہی بتا رہا تھا۔ وہ مجھے بڑی سڑک تک پہنچانے اور پھر گھوڑی کو وہاں سے واپس لے جانے کے لیے میرے پیچھے بیٹھ گیا، بولا۔

"آپ کدھر جا رہے ہیں؟"

"بس ایک کام سے شہر جا رہا ہوں۔ تجھے ڈھلوں صاحب نے بتایا ہی ہو گا۔ یہ کام انھوں نے ہی میرے سپرد کیا ہے۔"

"جی نہیں! مجھے کیا پتہ آپ کس کام سے جا رہے ہیں۔ کوئی بڑا ہی کام ہو گا جو وہ آپ کے سپرد کر گئے ہیں۔"

"تو اتنا بھولا نہیں ہے برکت! مجھے یقین ہے کہ تجھے ہر بات کا علم ہوتا ہے۔ وہ صغراں کہاں سے آئی ہے جس کی تو رات سیلز مینی کر رہا تھا؟"

برکت ہنس دیا، بولا "وہ تو آپ کے لائق چیز تھی خان جی! پر لگتا ہے آپ کا پیٹ کچھ زیادہ ہی بھرا ہوا تھا۔"

"نہیں یار! میں اس جوٹھے کا بیل ہی نہیں ہوں، پر وہ ہے کون؟"

"کوئی آدمی چھوڑ گیا ہے اُسے یہاں ڈھلوں صاحب کی خدمت کے لیے، آپ اُسے دیکھ لیتے تو ساری چوکڑی بھول جاتے۔ ایسی مٹیار کبھی کبھار ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔"

"تو خود کیوں نہیں کھاتا اس پھل کو۔"

"کہاں جی! میں دھنیا پینے والا آدمی۔ حویلی کا کتا۔ میرا کیا ہے جی! ایسی چیزیں تو آپ ایسوں کے لیے بنی ہیں۔"

بڑی محرومی تھی اس کے لہجے میں اور میرا خیال ہے کہ وہ خود بھی اس لڑکی پر بُری طرح فریفتہ ہو چکا تھا مگر اس کا وہ آتش بداماں جذبہ حفظِ مراتب کی نذر ہو گیا تھا۔

بڑی سڑک پر پہنچ کر اس نے مجھے ایک بس میں بٹھایا اور خود گھوڑی دوڑاتا ہوا اسی وقت واپس چلا گیا۔ لاہور تک بس میں میں نے بڑی خاموشی سے سفر کیا۔ یوں کہ خود کو ہر آنکھ سے بچا لینے کی کوشش میں مصروف رہا۔ دل میں ٹھہر ٹھہر کر یہی خوف ابھرتا تھا کہ کوئی مجھے پہچان نہ لے۔ اس زمین کے اوپر مجھے اپنے کندھوں پر سر اٹھا کر چلتے ہوئے دن بھی تو بہت گزر گئے تھے اور میرے گناہوں کا بوجھ ہمیشہ بڑھتا ہی رہا تھا مگر اس روز میں جس مہم پر روانہ ہو رہا تھا، اس کی نوعیت کچھ ایسی شرمناک تھی کہ میں اپنی طرف اٹھنے والی ہر نظر سے پریشان ہوا جاتا تھا۔

لاہور پہنچ کر میں نے ایک کار کرائے پر لی اور اس میں بیٹھ کر میں اسی روز دن کے ایک بجے وزیر آباد جا پہنچا۔ میری منزل سوہدرہ تھی جہاں مجھے کسی چوہدری خیرات محمد کے گھر پر رحمت علی کو نیست و نابود کرنا تھا اور وہ بھی اس طرح کہ میری وہ ساری کارروائی محض ایک حادثہ معلوم ہوتی۔ ہدایت مجھے یہی دی گئی تھی۔ رحمت علی کی موت قتلِ عمد ثابت نہیں ہونی چاہیے تھی۔ میرے ذہن کی پھرکی اسی نکتے پر گھومتی ... چلی آ رہی تھی کہ یہ سب کچھ کیسے ممکن ہو گا۔ کوئی صاف سیدھا منصوبہ میری

سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ اپنے مطلوبہ شکار کے مکمل کوائف مجھے معلوم نہیں تھے۔ اگر وہ پیر آباد میں ہوتا تو پھر صورت حال بالکل ہی مختلف ہو سکتی تھی مگر اب وہ کسی اور کے گھر میں تھا۔ اور مجھے اس کی طرف بہت سوچ سمجھ کر قدم بڑھانا چاہیے تھا۔ میں نے گاڑی وزیر آباد کے عقبی حصے سے گزاری اور کچھ ہی دیر بعد اس سڑک پر جا چڑھا جو سیدھی سیالکوٹ جاتی ہے۔ گاڑی نئی تھی اور ڈرائیور کوئی بڑا ہی خاموش طبع آدمی تھا۔ اپنے کام سے کام رکھنے والا۔ وہ غالباً روزے سے تھا کیونکہ سارا راستہ اس نے کسی جگہ رک کر کسی بھی چیز کی طلب ظاہر نہیں کی تھی۔ جب میں مولانا ظفر علی خاں کے گاؤں کرم آباد کے سامنے سے گزرا تو ان کی تعمیر کردہ خوبصورت مسجد کو دیکھ کر مجھے اپنے اندر کے بے دین وحشی پر کچھ زیادہ ہی غصہ آنے لگا تھا۔ مسجد میں اپنے اونچے اونچے میناروں سے دلوں میں عجیب سے گداز کی کیفیت پیدا کرتی ہیں مگر اس لب سڑک مسجد نے مجھے اس روز دہلا کر رکھ دیا۔ پتہ نہیں اس گھڑی مجھے کیا ہوا۔ میں نے ذرا آگے لے جا کر گاڑی رکوا دی۔

ڈرائیور استفہامی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا "اس گاؤں میں جانا ہے آپ کو؟"

"نہیں مجھے یہاں نماز پڑھنی ہے آؤ تم بھی سجدہ دے لو۔"

وہ خوش ہو کر بولا۔ "چاہتا تو میں بھی یہی تھا۔ ظہر کا وقت ہو رہا ہے۔ وضو کر کے ہم تازہ دم ہو جائیں گے آپ بھی روزے سے ہیں؟"

"یہ بات پوچھا نہیں کرتے اور گاڑی مسجد کے پاس کھڑی کر دو۔"

کچھ ہی دیر بعد ہم وضو سے فارغ ہو کر سنتیں ادا کر چکے تھے۔ نمازی آہستہ آہستہ اندر آ رہے تھے۔ میری سمجھ میں آج تک یہ بات نہیں آئی کہ اس روز اس مسجد کو دیکھ کر مجھے نماز کا خیال کیونکر آ گیا۔ میرا خیال ہے کہ میں اس روز اپنے آپ میں نہیں تھا۔ میرے دل پر عجیب سا بوجھ پڑ رہا تھا۔ ایسا بوجھ جس کے نیچے میری روح دبتی چلی جا رہی تھی اور اس کی کراہیں مجھے ہولائے دے رہی تھیں۔ میں عیاری پر لدا الدا نیچے گر گیا تھا۔ مسجد میں قدم رکھنا میری خدا پرستی کی دلیل تو نہیں تھا مگر مجھے پتہ نہیں کیا ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے جماعت کے ساتھ جب سجدے میں سر ڈالا تو میرے آنسو بہہ نکلے۔ میں نے خود کو بہت سنبھالنے کی کوشش کی مگر میرے ضبط کے بند ٹوٹ گئے تھے۔ میں سسک سسک کر رونے لگا تھا۔

میرے بائیں طرف ڈرائیور کھڑا تھا اور دائیں ہاتھ ایک معمر آدمی۔ وہ دونوں ہی میری اس کیفیت سے آگاہ ہو گئے تھے۔ چار فرض میں نے ادا کیے مگر یوں جیسے کوئی میرا گلا کند چھری سے کاٹ رہا ہو۔ میں ایسے غمناک ہیجان میں مبتلا تھا کہ جب امام صاحب نے سلام پھیرا تو میرا چہرہ آنسوؤں سے بری طرح بھیگ چکا تھا۔ وہ ڈرائیور اور وہ معمر آدمی جو میرے چھالوں کے چیخ جانے سے آگاہ تھے، بڑی حیرت سے مجھے تکنے لگے تھے۔ عین اس وقت امام صاحب کی نگاہ بھی میرے چہرے پر پڑی وہ رخ پھیر کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھا رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں بھی بے پناہ تحیر ابھر آیا تھا۔ دعا تو امام صاحب نے مانگ لی مگر نگاہ ان کی میرے چہرے ہی پر جمی رہی اور میں نظریں جھکائے بیٹھا اپنے آنسوؤں کو رومال میں جذب کرتا رہا جسے میں نے دونوں ہاتھوں میں لے کر منہ پر رکھ لیا تھا۔

سنتیں اور نفل میں نے اس جگہ سے اٹھ کر دوسری جگہ پڑھے مگر اس وقت تک میں کئی آدمیوں کی توجہ کا مرکز بن چکا تھا۔ لیکن ان میں سے کسی کو یہ جرأت نہ ہو سکی کہ مجھ سے میرے اس گریے کا سبب دریافت کرتا۔ نماز ادا کر کے میں کسی طرف دیکھے بغیر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا جوتوں تک پہنچا اور انھیں پاؤں میں پھنسا کر میں بھاگتا ہوا کار میں جا بیٹھا۔ چند ہی لمحوں بعد ڈرائیور بھی کار کے اندر آ گیا۔ چھوٹتے ہی بولا۔ "خیر تو ہے صاحب جی! آپ تو بری طرح رو رہے ہیں۔"

"خیر ہی ہے بھائی! تو چل اب دیر نہ کر مجھے جلدی سوہدرہ پہنچا ہے۔"

اس نے کار اسٹارٹ کی اور میرے چہرے پر پھیلی اتھاہ سنجیدگی سے کچھ نہ سمجھتے ہوئے وہ آگے چل دیا۔ کوئی بیس قدم آگے جا کر بولا۔ "آپ خوش نصیب ہیں جی! اللہ نے آپ پر بڑا فضل کر رکھا ہے کہ آپ نماز میں رو لیتے ہیں۔ یہ آنسو بڑے قیمتی آنسو ہیں۔ کسی کسی ہی کو یہ موتی ملتے ہیں۔"

"نہیں یار! یہ گندا پانی ہے اسے نکل ہی جانا چاہیے۔ اس سے کوئی آدمی کی بخشش تھوڑی ہو جاتی ہے یہ تو مگر مچھ کے آنسو ہوتے ہیں رونا تو وہ ہے جو آدمی اندر ہی اندر روئے۔ یہ دکھاوے کے آنسو خدا کو ان کی کیا پڑی ہو گی۔" میں نے کار کے باہر اپنے پیچھے بھاگتے منظر پر نظریں جما کر کہا۔ دھوپ تیز ہو گئی تھی اور دور دور تک اپنے جھالے پھیلا رہی تھی۔ ڈرائیور نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ خود الجھ کر رہ گیا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد اس نے اونچی کرسی والے قصبے کے بازار میں لے جا کر گاڑی روک دی۔

"بس بھئی اب تو جا۔ یہ لے اپنا کرایہ تیرا میرا ساتھ ختم۔" میں نے اسے کرایہ ادا کر کے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا

وہ اسی وقت گاڑی کو موڑ کر واپس چل دیا۔ بازار دھوپ سے بھرا پڑا تھا۔ اکا دکا آدمی ادھر ادھر پھرتے نظر آ رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے قصبے کی ساری رونقیں سمٹ سکڑ کر اس دھوپ کی تمازت سے بچنے کے لیے مکانوں میں دبک گئی ہیں۔ رمضان کی وجہ سے کاروبار زندگی وہاں بھی معطل ہی نظر آتا تھا۔ اور مجھے اس مبارک مہینے کی حرمت کا بھی احساس نہیں تھا۔ میرے ذمے ڈھلوں صاحب نے ایسا کام لگا دیا تھا جو کسی بھی شریعت میں جائز نہیں تھا مگر وہ مجھے بہر حال سرانجام دینا تھا کیونکہ میں اپنی غرض کا سودا کر آیا تھا۔

بازار کے وسط میں پہنچ کر میں نے ایک حکیم صاحب کو دیکھا جو کسی ماہر ڈاکٹر کی طرح گلے میں اسٹیتھسکوپ لٹکائے کرسی پر بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ ان کی دکان کے تھڑے پر میں جان بوجھ کر زور سے پاؤں مار کر اندر جا پہنچا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور سنبھل کر بولے۔ "آئیے آئیے جناب تشریف رکھیے معلوم ہوتا ہے کوئی اجنبی ہیں آپ۔"

"جی ہاں! میں میانوالی سے آیا ہوں کسی نے مجھ سے آپ کا ذکر کیا تھا۔ میں نے سوچا۔ اپنی زندگی کا آخری علاج سمجھ کر آپ سے مل لوں۔"

"اچھا! یعنی حد ہے کہ کسی نے ادھر میانوالی میں مجھ ناچیز کو یاد رکھا۔ بڑی زحمت فرمائی آپ نے۔ اپنا قارورہ تو لاتے ہوں گے؟"

"قارورہ تو ہر وقت آدمی کے اندر موجود ہوتا ہے حکیم صاحب۔ یہ کوئی برازیل سے تو درآمد نہیں کرنا پڑتا۔"

وہ مسکرا دیے، بولے "آپ میرا مطلب نہیں سمجھے ہیں۔ دراصل ہمیں مریض کا پہلے قارورہ درکار ہوتا ہے مرض کا وہیں سے صحیح اندازہ ہوتا ہے مگر خیر۔ کوئی بات نہیں میرا خیال ہے آپ روزے سے ہوں گے۔"

"جی نہیں! آپ کی طرح میں بھی دنیا دار ہی ہوں۔"

وہ چونک سے گئے۔ اسٹیتھسکوپ گلے سے اتار کر بولے "یہ ... یہ آپ نے کیسے اندازہ لگا لیا جناب! آپ نے کمال کر دیا ہے۔"

"آپ کے چہرے کی رونق اور آپ کے اس قیلولے سے میں نے اندازہ کیا ہے جناب۔ کسی روزے دار کو تو یوں کرسی پر نیند نہیں آ سکتی ہے نا!"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میں دراصل صبح وقت پر اٹھ نہ سکا اور آٹھ پہر کا روزہ میرے لیے ممکن نہیں ہوتا۔" وہ کچھ شرمندہ سے ہو گئے ان کے گورے چٹے چہرے پر داڑھی بہت بھلی دکھائی دیتی تھی۔ سر پر وہ ایک ہلکی سی ٹوپی رکھتے ہوئے تھے اور کرتا وہ ململ کا پہنے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں کاجل بھی بہار دے رہا تھا۔ آدمی مجھے خاصے طرح دار اور رنگین مزاج نظر آتے تھے وہ چند لمحوں کے توقف کے بعد بولے۔ "ہاں تو بتایا نہیں آپ نے کہ آپ کو عارضہ کیا ہے۔"

"بس کیا عرض کریں جی حکیم صاحب! جوان تو ہوں مگر جوانی سے محروم ہوں۔ وہ کسی شاعر نے کہا ہے کہ صد زن بہ کمند آورد اے قوت مردانہ۔ تو بس اسی شے کی کمی ہے بڑی خفت اٹھانی پڑتی ہے۔" میں نے اپنا بریف کیس زانو پر رکھتے ہوئے کہا۔

وہ کچھ متذبذب انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولے۔ "ویسے تو آپ بہت تندرست و توانا نظر آتے ہیں، ذرا نبض دکھائیں اپنی۔" یہ کہہ کر انھوں نے میری کلائی اپنے ہاتھ میں لے لی۔ کچھ دیر تک وہ نبض کی رفتار پر غور کرتے رہے پھر کچھ سوچ کر میری دوسری کلائی پکڑ کر بولے۔ "کچھ جگر اور مثانے کی گرمی نے پریشان کر رکھا ہے آپ کو۔۔۔ دراصل ہمارے نوجوان بچپن کی غلط کاریوں کا شکار ہو کر تباہ ہو جاتے ہیں مگر خیر آپ کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں؟"

"جی میں ٹھہرا تو کہیں بھی نہیں۔ سیدھا آپ کے ہاں آ گیا ہوں۔"

"مگر اس علاج کے لیے کم از کم دو ہفتے تو آپ کو میرے زیر مشاہدہ رہنا پڑے گا۔"

"میں حاضر ہوں۔ کوئی ٹھہرنے کی جگہ مل جائے تو میں ایک مہینہ بھی یہاں رہ سکتا ہوں آپ کی بڑی شہرت سنی ہے میں نے حکیم صاحب!"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر آپ ٹھہریں گے کہاں۔ اس چھوٹے سے قصبے میں کوئی ہوٹل بھی نہیں ہے۔"

"یہ انتظام تو آپ ہی کو کرنا ہو گا جناب! میں تو پردیسی آدمی ہوں۔"

"مگر یہ تو بہت بڑا مسئلہ ہے۔ علاج میں آپ کا ایسا کر دوں گا کہ بیشک اس کے بعد آپ چار شادیاں کریں مگر۔۔۔"

"اگر آپ مناسب سمجھیں تو آپ کے ہاں ہی رہ لیتا ہوں۔ دیکھیں نا یہ میری اور آپ کی طبی ضرورت ہے۔ میں آپ کو اخراجات کے لیے مناسب رقم دے دوں گا۔ کھانے اور رہائش کے لیے آپ کو میں پچاس روپے روزانہ دے سکتا ہوں۔"

میری یہ بات سن کر وہ حکیم عبدالکریم آرزو صاحب اچھل سے گئے۔ دکان کے بورڈ پر انھوں نے زبدۃ الحکما لکھ رکھا تھا۔ پتہ نہیں کس طبیہ کالج کے وہ فارغ التحصیل تھے اور وہاں دکان پر بیٹھے بیٹھے وہ کرسی پر کیوں اونگھتے رہتے تھے۔ تخلص بھی کرتے تھے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ شاعری سے بھی وہ شغل فرماتے ہوں گے۔

"کیا کہا آپ نے پچاس روپے روزانہ دے سکتے ہیں آپ!" وہ اپنی سماعت کا شک دور کرنا چاہتے تھے۔

"جی ہاں! یہ میری زندگی اور موت کا سوال ہے حکیم صاحب! اپنے علاج کے لیے میں سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ غریب خانہ حاضر ہے۔ آپ کو میں الگ کمرے میں ٹھہرا لیتا ہوں بس پندرہ دن میں آپ تاتاری گھوڑے جیسے ہو جائیں گے۔"

"یہ تو آپ کی بڑی مہربانی ہو گی جناب! یہ لیں میں یہ ایک ہزار روپے پیشگی حاضر کر دیتا ہوں پانچ سو علاج کے لیے اور پانچ سو رہائش اور کھانے کے لیے۔" میں نے جیب سے سو سو کے دس نوٹ نکال کر ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

وہ انھوں نے فوراً ہی میرے ہاتھ سے اچک لیے، بولے۔ "ماشاءاللہ بڑے نئے نئے نوٹ ہیں آپ کے پاس۔ تو چلیں پھر۔ ابھی تو آپ میرے غریب خانے پر آرام فرمائیں اور کھانا بھی کھائیں۔" یہ کہہ کر وہ کرسی سے اٹھ گئے۔ ان کے جسم میں ایک دم چستی پیدا ہو گئی تھی۔ اس رقم نے انھیں برقی توانائی عطا کر دی تھی۔ انھوں نے دکان کو اسی وقت تالا لگایا اور مجھے ساتھ لے کر اس عہد عتیق کے کسی کھنڈر پر

کھڑے قصبے کے اونچے نیچے بازار میں سے گزرتے ہوئے ایک گلی میں مڑ گئے۔ عمر اُن کی یہی کوئی پینتیس چالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ صحت البتہ اُن کی قابلِ رشک تھی اور میرا خیال تھا کہ ان کی حکمت بھی اچھی ہی چل رہی ہوگی اور پندرہ بیس روپے وہ ہر روز مار ہی لیتے ہوں گے۔ گھر اُن کا دو منزلہ تھا۔ کسی ہندو کا متروکہ مکان اُن کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔

مجھے وہ نچلی منزل کے ایک قدرے ٹھنڈے اور نیم تاریک کمرے میں بٹھا کر بولے ”اب آپ سے کیا پردہ! آپ کو میرے مہمان کی حیثیت سے یہاں دو ہفتے رہنا ہے۔ میں نے دراصل تین شادیاں کر رکھی ہیں۔ بس ایسے ہی میرے مطب میں آنے والی کچھ خواتین زیادہ ہی آگے بڑھ آتی ہیں۔ کچھ اِس میں میرے علاج اور میری شخصیت کو بھی بہت دخل ہے۔ اور پھر چار کی اجازت تو اللہ نے بھی دے رکھی ہے۔ میں نے ابھی تک بہرحال تین شادیاں کی ہیں۔“

”اللہ مالک ہے حکیم صاحب! ایک آدھ اور کی بھی امید رکھیں۔ آپ کے گھر میں کس چیز کی کمی ہے۔ ویسے بھی آپ دیدہ زیب جوان ہیں یہ آپ کی بادامی آنکھیں، یہ گورا چٹا سُرخ رنگ، یہ گھنگھریالی داڑھی۔ اور پھر آپ کے مشہورِ زمانہ کُشتے۔ آپ کے نکاح میں تو دس عورتیں ہونی چاہئیں۔“ میں نے اُن کی شان میں پورا قصیدہ پڑھ دیا۔

وہ خوش ہو گئے، میرے کندھے پر بڑی بے تکلفی سے ایک دھپ مارتے ہوئے بولے ”بڑے دلچسپ آدمی ہیں آپ! اپنا نام نہیں بتایا آپ نے۔“

”میرا نام بزرگوار خان ہے۔ ذات کا پٹھان ہوں مگر بے کمان ہوں۔“

وہ پھر ہنس دیے۔ اب کی بار زیادہ زور سے میرے کندھے پر ہاتھ مار کر بولے ”آپ کی باتیں بھی دل چسپ ہیں اور یہ آپ کا نام بھی خوب ہے۔ یعنی ہر آدمی آپ کو بزرگوار ہی کہتا ہوگا۔“

”جی ہاں! اس میں کیا ہرج ہے، ویسے بھی اندر سے بوڑھا ہی ہو چکا ہوں۔“

”ہم آپ کو جوان بلکہ نوجوان بنا دیں گے۔ صبح سے ہم آپ کا علاج شروع کر دیں گے تو دنوں میں آپ اپنے اندر زبردست تبدیلی محسوس کریں گے۔“

”بڑی مہربانی ہے آپ کی۔ اگر کچھ کھانے کو مل جائے تو بڑا ثواب ملے گا آپ کو۔“

”کیوں نہیں! میں ابھی نمبر تین سے کہتا ہوں۔ یہ سب بھی روزہ نہیں رکھتی ہیں۔ میں بھی کہتا ہوں ٹھیک ہے۔ ابھی اِن کے مرادوں کے دن ہیں۔ آپ کے لیے میں انڈے فرائی کرا دیتا ہوں، پراٹھے، اچار اور لسی۔ تازہ مکھن بھی حاضر ہوگا یہ ہماری اپنی بھینس کا ہے۔“

”پھر اور کیا چاہیے حکیم صاحب۔ بس جلدی کریں۔“

”ابھی لیں۔ میں نمبر تین سے آپ کے لیے کھانا پکوا لیتا ہوں۔“

”یہ سب سے پہلی ہیں کہ سب سے آخری؟“

”نہیں جی! یہ لیٹسٹ ہیں۔ یہی کوئی چھ ماہ پہلے میں نے اُن سے عقد کیا تھا۔ دسویں تک پڑھی ہوئی ہیں اور پردہ نہیں کرتیں۔ بس یہی قباحت ہے اُن میں۔ آپ کے سامنے آ جائیں تو بُرا نہ منائیں۔“

”ویسے تو میں اسے اچھا نہیں سمجھتا مگر خیر۔ آپ کہتے ہیں تو ٹھیک ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا گھر کی بات ہے۔“

”ہاں بس یہی بات یاد رکھیں بزرگوار صاحب“ میرا نام وہ بڑی مشکلوں سے لے سکے، پھر چونک کر بولے ”میں آپ کو خان صاحب نہ کہہ لیا کروں؟“

”مجھے تو آپ مریض خان بھی کہہ سکتے ہیں میرا کیا ہے میں تو آپ کے زیرِ علاج رہوں گا۔“

وہ ہنس دیے پھر میرے زانو پر دھپ مار کر بولے ”یہ کیسے ہو سکتا ہے بزرگوار خان صاحب ہم آپ کو مریض تھوڑا رہنے دیں گے۔“

”میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں رہتی معدہ اُلٹ جاتا ہے۔ زیادہ وقت مجھے اسی کمرے میں گزارنا ہوگا۔ امید ہے آپ بُرا نہیں منائیں گے۔“

”نہیں جی! برا ماننے کی کیا بات ہے، آپ کی ضرورت کی ہر شے ادھر پہنچ جایا کرے گی۔ میں نمبر تین سے کہہ دوں گا۔ وہ آپ کا خیال رکھیں گی۔ اُن میں جھجک بالکل بھی نہیں ہے۔ نئے زمانے کے ساتھ چلتی ہیں وہ۔“ یہ کہہ کر حکیم صاحب باہر نکل گئے۔

ابھی تک میں اپنا حرفِ مدعا زبان پر نہیں لایا تھا۔ مجھے سب سے پہلے تو وہاں ایک محفوظ اڈے کی ضرورت تھی جو مجھے بڑی آسانی سے ہاتھ آ گیا تھا۔ حکیم صاحب عقل سے کچھ زیادہ ہی خوش فہم نظر آتے تھے اور ہر بات کے روشن پہلو پر نظر رکھتے تھے۔ ان کی اپنی اتنی عمدہ صحت کا راز بھی یہی تھا۔ انہیں ہر ایک پر اعتماد تھا۔ جو کوئی اُن سے کہتا تھا وہ اس سے نکاح بھی پڑھوا لیتے تھے۔ نوٹ دیکھ کر ان کی آنکھوں کی روشنی بڑھ جاتی تھی۔ اور ہنس مکھ وہ ایسے تھے کہ ہر بات میں مزاح کا عنصر تلاش کر لیتے تھے میرے لیے وہ اس مہم میں بڑے ہی کارآمد ثابت ہو سکتے تھے۔

کچھ ہی دیر بعد مکان کی دوسری منزل سے قہقہوں کی آوازیں سُنائی دینے لگیں۔ حکیم صاحب کی آواز اُن میں نمایاں تھی، وہ کہہ رہے تھے ”دیکھو بیبیو! یہ دو دو سو روپے تو تمھیں مل گئے۔ اس میں اپنے کپڑے شپڑے بنوا لینا۔ سمجھو اللہ نے فرشتہ بھیج دیا ہے۔ آپ کشور بیگم انڈے فرائی کر دیں اور پراٹھے پکا دیں بزرگوار خان صاحب کے لیے۔“

”یہ نام ہے اُن کا؟ بزرگوار خان۔“ ایک چلبلی سی آواز کان میں پڑی۔

”ہاں ہاں بھئی آہستہ بولیں۔ وہ یہاں پندرہ دن رہیں گے میرے زیرِ علاج۔ اب جلدی سے کھانا پکا دیں پراٹھے نہیں پکتے تو مکھن ہی پیچھے بھیج دینا۔“

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ یہ مصیبت پندرہ دن یہاں رہے گی۔ اللہ توبہ کیسے سودے کرتے ہیں آپ۔“ یہ کسی اور کی آواز تھی۔ اور اس میں خاصی جھنجلاہٹ تھی، اور غصہ بھی۔

”ڈسپلن سیکھو بی بی ڈسپلن... یہ کوئی طریقہ ہے بات کرنے کا پاکیزہ بیگم۔ آپ نمبر دو ہیں کچھ خیال کیا کریں۔ اپنی آواز کو اتنا اونچا نہ رکھیں کہ ہمسائے بھی اس سے لطف اندوز ہوتے رہیں۔“ حکیم صاحب نے اپنی بڑی بیگم کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

”اچھا اچھا! یہ آپ کے ڈسپلن کا ہی نتیجہ ہے کہ یہ گھر دارالامن بن گیا ہے۔ تین تو آپ نے باندھ ہی لی ہیں۔ اس موئے ڈسپلن کی وجہ سے اب بات بھی نہیں کرنے دیں گے۔“

”کریں ضرور کریں۔ باتوں کے لیے ہی تو میں آپ سب کو یہاں لایا ہوں۔“

”یہاں بے شک دو درجن عورتیں آ جائیں آرزو صاحب! مگر آنگن میں بچہ کوئی نہیں کھیلے گا۔“

”کیا کہتی ہیں صغریٰ بیگم! ابھی ہماری عمر ہی کیا ہے ——

آپ کھانا پکائیں کشور بیگم! آپ ذرا اچھا پکاتی ہیں۔“

”ہاں! اس کا تو ہر کام اچھا لگے گا آپ کو۔ کیونکہ وہ کیا کہا کرتے ہیں آپ کہ یہ لیٹسٹ جو ٹھہری۔ آپ کی چہیتی۔“

”استغفر اللہ۔ لاحول ولا قوۃ۔“ حکیم صاحب کی آواز نیچے کی طرف ڈھلتی سُنائی دی۔

کچھ ہی دیر بعد وہ میرے پاس کرسی پر آ بیٹھے، بولے ”میں اب مطب جا رہا ہوں۔ آپ کو ابھی کھانا مل جائے گا۔ اس کے بعد آرام فرمائیں، یہ بستر موجود ہے ذرا حبس ہے یہاں مگر یہ کھڑکیاں کھول لیں۔“

”ٹھیک ہے جناب! آپ کی بڑی مہربانی کہ آپ نے مجھے یہ سہولت فراہم کر دی ہے۔“

”آپ نے پیسے بھی تو دیے ہیں صاحب! آپ کوئی مفت تھوڑی رہیں گے یہاں۔ اور بڑی معقول رقم دی ہے آپ نے۔ مجھے ہر وقت احساس رہے گا۔“ یہ کہہ کر وہ اسی وقت باہر چلے گئے۔

کوئی آدھ گھنٹے بعد کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی میں بستر سے اُٹھ کر آگے بڑھا اور پوچھا ”کون ہے؟“

”میں ہوں حکیم صاحب کی بیگم۔ یہ کھانا لائی ہوں آپ کے لیے۔“

دروازہ بھِڑا ہوا تھا وہ آہستہ سے کھُل گیا۔ سامنے گندمی رنگ کی ایک دراز قد عورت کھڑی تھی۔ دو بھاری بھرکم چوٹیاں اس کے کندھوں پر سے اچھل کر سینے پر مچلنے لگی تھیں۔ وہ سُرخ پھولوں والی سفید ریشمی قمیص اور اسی رنگ کی شلوار پہنے ہوئے تھے۔ وہ جھجکی جھجکی سی آگے بڑھی اور تپائی پر بڑا سا ٹرے رکھ کر اس نے سر کو کچھ اس طرح جھٹکا دیا کہ اس کی دونوں چوٹیاں گھوم کر کمر پر جا ٹھہریں۔ بلاشبہ وہ خوبصورت عورت تھی۔ اس نے ایک اچٹتی سی نظر میرے چہرے پر ڈالی اور بڑے سنجیدہ اور بھاری بھرکم لہجے میں بولی ”آپ نمکین لسی پسند کرتے ہیں کہ سادہ پانی بزرگوار صاحب!“

لفظ بزرگوار پر اس نے خاص طور پر زور دیا میں کچھ سٹپٹا سا گیا۔ مجھے احساس ہوا کہ میں نے وہ نام اختیار کر کے خواہ مخواہ خود کو مذاق کا نشانہ بنا لیا ہے۔ ہر کوئی میرا نام سن کر ہی مسکرا دے گا۔

”جی لسی! اور وہ بھی نمکین، بڑی نعمت ہے یہ جگر کی گرمی کے لیے تو بہت ہی مفید ہے۔“

”تو پھر شروع کریں میں لسی ہی لاتی ہوں۔ مکھن بھی ساتھ رکھا ہے۔ آم کا اچار اور فرائی انڈے۔ اس وقت تو یہی کچھ حاضر تھا۔“

”آپ کی بڑی مہربانی ہے بی بی! ورنہ میں اس سلوک کا مستحق تو ہرگز نہیں تھا۔“ میں نے تپائی کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ لقمہ توڑتے ہوئے میری نظر دروازے پر جا پڑی وہاں حکیم صاحب کی دوسری بیگمات تختے کی اوٹ میں کھڑی مجھے بڑے غور سے دیکھ رہی تھیں۔ میں نظریں جھکا کر کھانے میں مصروف ہو گیا تو ایک کھی کھی کھسّ کی آواز دروازے پر ابھری۔ وہ دونوں مجھے دیکھ دیکھ کر ہنس رہی تھیں۔ اُن کی آواز سُن کر کشور بیگم تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی اور بولی ”آؤ اندر آ جاؤ نا! وہاں کھڑی کیا کر رہی ہو یہ نقل مارنے کی کیا ضرورت ہے؟“

”تو بیٹھ۔ تو ذرا زیادہ آزاد خیال ہے نا۔ ہم اوپر جاتے ہیں۔“ اُن میں سے ایک نے کہا اور پھر وہ دونوں ہنستی ہوئی پیچھے ہٹ گئیں۔ اُن کے اس طرح کے تماشہ رویے نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ وہ چلبلی نوخیز لڑکیوں ایسی حرکتیں کر رہی تھیں اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میری وہاں موجودگی نے انھیں کیوں اتنا خوش کر دیا تھا جیسے کوئی تماشا اُن کے ہاتھ لگ گیا ہے۔

”آپ بیٹھ جائیں بی بی! حکیم صاحب نے مجھے بتایا تھا کہ آپ اُن کی سب سے چھوٹی بیگم ہیں۔ کشور ہے نا آپ کا نام؟“

”ہائے! انھوں نے آپ کو میرا نام بھی بتا دیا۔ ذرا شرم نہیں آئی اُن کو کسی غیر مرد کے سامنے میرا نام لیتے۔“

”آپ کا نام لینا اچھا نہیں ہے کیا۔ کوئی شرمناک بات ہے اس میں؟“

"نہیں جناب! پر دیکھیں نا، یہ اچھا نہیں لگتا۔ اپنی بیگم کا نام بتایا ہے آپ نے انہیں؟"

"نہیں تو! مگر اس کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ میری بیوی کا نام انوری ہے یہ میں نے آپ کو بلا جھجک بتا دیا۔" میں نے کھانے پر تیزی سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔ روٹیاں گرم تھیں اور مکھن تازہ تھا۔ اچار بھی سلیقے کا تھا اور مجھے بھوک نے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔

"میرا کیا ہے خان صاحب! میں تو نانی ہوں نا حکیم صاحب کو تو خیال رکھنا چاہیے تھا!"

"چلیں گزشتہ را صلوٰۃ آئندہ را احتیاط۔ یہ قصبہ تو خاصا بڑا ہے آپ کا۔"

"جی ہاں، اب تو بڑی آبادی ہو گئی ہے یہاں۔"

"کسی ایک ہی آدمی کی ملکیت ہو گی یہاں۔ اردگرد کی زمینوں پر اُسی کا قبضہ ہو گا۔"

"جی نہیں! کئی بڑے زمیندار ہیں یہاں مثلاً قاضی صفی اللہ ہیں چوہدری خیرات محمد۔ پھر اور لوگ بھی ہیں۔"

"مجھے یہ جگہ اچھی لگی ہے۔ میں تو حکیم صاحب سے علاج کے لیے آیا ہوں۔ آپ کو دس پندرہ روز پریشانی رہے گی۔"

"جی نہیں۔ جہاں اوروں کے لیے پکتا ہے وہاں آپ کے لیے بھی پک جائے گا۔ کیا مرض ہے آپ کو؟"

"میری ریڑھ کی ہڈی میں درد رہتا ہے۔ بڑے علاج کر لیے مگر آرام ہی نہیں آیا۔" میں نے فی البدیہہ کہا۔ دشمنوں میں آدمی گھر جائے تو گولی پہ گولی اور جھوٹ پہ جھوٹ تو بولنا ہی پڑتا ہے۔

"حکیم صاحب سے آپ کو آرام مل جائے گا۔ بڑے سیانے ہیں یہ اس معاملے میں۔"

"ان کی مہربانی ہے بی بی! ویسے یہ زمیندار بھی ان سے ہی علاج کرواتے ہوں گے۔"

"جی ہاں! وہ چوہدری خیرات محمد تو ان کا پرانا گاہک ہے۔ اب اس کا ایک عزیز آیا ہوا ہے چوہدری رحمت علی ادھر پتوکی سائڈ سے۔ اسے یہاں آتے ہی یرقان ہو گیا تھا۔ حکیم صاحب ہی علاج کر رہے ہیں۔"

"پھر تو ماشاء اللہ خاصی آمدنی ہو گی حکیم صاحب کی۔"

"کچھ نہیں ہے جی اس کام میں۔ کبھی دس کبھی بیس مل گئے تو کیا ہوتا ہے۔ اور ہم تین ہیں۔ حکیم صاحب نے مجھے بتایا نہیں ورنہ میں ان کے جھانسے میں نہ آتی۔ کہتے تھے ابھی تک بیچلر ہوں۔"

"اچھا وہ انگریزی بھی بول لیتے ہیں۔"

"ہر چیز آتی ہے انھیں۔ میں پڑھی لکھی ہو کر اُن کے کھونٹے سے بندھ گئی۔ ایسی لچھے دار باتیں کرتے تھے کہ میں پاگل ہی ہو گئی۔"

"اچھا! آپ کو پتہ نہیں تھا کہ پہلے سے دو دفعہ کے شادی شدہ ہیں؟"

"دو دفعہ کیا ان پر تو دفعہ تین سو دو لگنی چاہیے۔ آج پہلی بار دو سو روپے کا منہ دیکھا ہے میں نے ان کے گھر میں آ کر۔" وہ بڑے ہی بیزار لہجے میں بولی۔

"اچھا! اپنی کمائی کہاں خرچ کرتے ہیں یہ؟"

"کہاں کریں گے! ہمارے درمیان انصاف فرماتے ہیں۔ دس کماتے ہیں تو اس کے چار حصے کر کے ڈھائی ڈھائی ہمیں دے دیتے ہیں اور ڈھائی گھر کے خرچ کے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ آپ خوش نہیں ہیں حکیم صاحب کے ہاں؟"

"خوش تو ہوں۔ اب خوش تو رہنا ہی پڑے گا۔ ان کھول جوڑی گئی۔"

"آپ نے تفتیش نہیں کی تھی پہلے؟"

"تفتیش تو ان کی خدا کرے گا۔ انھوں نے اپنے ہمسائے عبدالغنی سے بھی کہلوا دیا کہ حکیم صاحب کنوارے ہیں۔ میری چچی پوچھنے آئی تھی ڈسکہ سے۔"

"آپ وہاں کی رہنے والی ہیں؟"

"ہاں! علاج کے لیے ان کے پاس آئی تھی۔ باؤ گولا اٹھتا تھا میرے پیٹ میں۔ میرے ماں باپ ہوتے تو ان کا قیمہ کر دیتے۔"

"اچھا! تو آپ چچا کے گھر میں رہتی تھیں؟"

"جی ہاں! جب ہی تو چچی نے مار کے یہاں پھینک دیا۔"

"اپنے جھوٹ کے بارے میں کیا کہتے ہیں حکیم صاحب؟"

"کچھ نہیں۔ کہتے ہیں مجھے آپ سے عشق ہو گیا تھا۔ اس لیے جھوٹ بولنا پڑا۔ ادھر میری عمر نکلی جا رہی تھی۔ اب میں تیس کی ہو چکی ہوں۔ میں بھی اب چپ ہو گئی ہوں کہ اللہ کو یہی منظور تھا۔"

"چلیں رفع کریں مٹی ڈالیں اس بات پر۔ حکیم صاحب بہت اچھے آدمی ہیں، بہت ہی اچھے اور پیارے۔ میں اگر عورت ہوتا تو شاید میں بھی ان سے نکاح پڑھوا لیتا۔"

میری یہ بات سن کر وہ مسکرا دی، بولی "میں بھی ان کی خوبصورتی ہی پر مر مٹی تھی۔ آپ بہرحال میری یہ باتیں ان سے نہ کہہ دیں۔ مجھے پتہ ہی نہیں تھا کہ یہاں انھوں نے یتیم خانہ کھول رکھا ہے۔ یہ دونوں بھی یتیم مسکین ہی ہیں۔ آگے پیچھے ان کا بھی کوئی نہیں ہے۔ نہ اصغری کا، نہ پاکیزہ کا۔"

"چلیں، اچھا ہے، خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے تین۔" میں نے کھانا ختم کرتے ہوئے کہا۔ اس کی وہ دلچسپ باتیں مجھے بہت پسند آئی تھیں۔ وہ کسی لاگ لپیٹ کے بغیر کھری کھری باتیں کرتی تھی۔ وہ ناخوش بھی تھی اور خوش بھی۔ اور اب صبر شکر کر کے اس ڈربے سے سمجھوتہ کر چکی تھی۔

"کھانا پسند آیا آپ کو؟"

"یہ خالی چنگیر اس بات کا پکا ثبوت ہے بی بی! آپ کمال کا

مزے دار کھانا پکاتی ہیں اور حکیم صاحب کو بھی اس پر بہت ناز ہے۔"

"اُن کی چھوڑیں آپ۔ وہ عورتوں کو پھانسنے کا اور انھیں پھانس کر باندھ رکھنے کا فن خوب جانتے ہیں۔ مجھے تو ڈر ہے کہ کسی دن چوتھی ڈولی بھی یہاں اُتر آئے گی۔ ابھی وہ اپنا کورم پورا کرنے کے خواب دیکھتے رہتے ہیں۔"

اُس کی یہ بات سن کر میں بے ساختہ ہنس دیا، وہ بھی مسکرا دی، بولی۔ "اس دُنیا میں عورت ہونا سب سے بڑی ذلت ہے۔ یہ واحد مخلوق ہے جس کو لوگ چومتے بھی ہیں اور پھر اُسے جوتے بھی مارتے ہیں۔" یہ بات اس نے کچھ ایسی بے ساختگی سے کہی کہ میں اس کے شعور کی پختگی اور برہنگیِ گفتار پر حیران رہ گیا۔ وہ کچھ زیادہ ہی آزاد خیال دکھائی دیتی تھی۔

"آپ ٹھیک کہتی ہیں مگر مجھے یقین ہے کہ آپ ایسی ذہین عورت کو کوئی جوتا مارنے کی حماقت نہیں کر سکتا۔"

"میں تو چھت سے نیچے گرا دوں گی اس آرزو صاحب کو جس روز انھوں نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا۔"

"کیا حکیم صاحب یہ کام بھی کرتے ہیں؟"

"ہاں اصغری اور یہ پاکیزہ ان کے ہاتھوں پٹتی ہیں، اور یہ بڑی خطرناک بات ہے۔"

"کیا ایسا اکثر ہوتا ہے؟"

"ہاں جب حکیم صاحب کا ہاتھ زیادہ تنگ ہوتا ہے تو یہ ڈرامہ لگتا ہے یہاں۔ مگر میں نے اُن سے کہہ دیا ہے کہ مجھ سے وہ بچ کر رہیں۔ میں برداشت نہیں کروں گی اور وہ سمجھ چکے ہیں کہ ان کا واسطہ کس سے پڑا ہے۔"

جس پُرعزم لہجے میں وہ بات کشور نے کہی اس سے مجھے اُس کے ارادے کی پختگی اور ذہن کے ایک خاص رجحان کا پتہ مل رہا تھا۔ وہ عام عورتوں سے بڑی حد تک مختلف اور دہشت گرد قسم کی عورت نظر آتی تھی۔ وہ برتن اٹھا کر باہر جانے لگی تو میں نے کہا۔ "مجھے آپ ذہین ہی نہیں بڑی دل گردے والی بہادر عورت نظر آتی ہیں۔ آپ کو اگر فرصت ہو تو ادھر ضرور آئیں میں آپ سے بہت ہی اہم بات کروں گا۔ اگر آپ میرے ساتھ تعاون کر سکیں تو میں آپ کو ہزاروں روپے دے سکتا ہوں۔"

میری یہ بات سن کر اُس کی آنکھوں میں تجسس اور حرص کی چمک ابھرنے لگی۔ میں نے اس کو اچھی طرح سمجھنے بوجھنے کے بعد وہ پانسہ پھینکا تھا۔ بچوں کی طرح اس کا ذہن سازش کو فوراً قبول کرتا تھا۔ دبی آواز میں بولی "ایسی کیا بات ہے جو آپ مجھ سے کہنا چاہتے ہیں؟"

"ابھی میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ رقم میں بہرحال لے کر آیا ہوں یہ دیکھیں۔ یہ آپ کی ہو سکتی ہے۔" میں نے بریف کیس میں سے ایک گڈی نکال کر اُسے دکھاتے ہوئے کہا۔

اُس کی آنکھوں میں اُس لمحے جو چمک ابھری اُسے میں آج تک نہیں بھول سکا ہوں۔ وہ اتنی بڑی رقم تھی کہ اس نے شاید زندگی میں پہلی بار دیکھی تھی۔ برتن اس نے تپائی پر رکھ دیے۔ سرگوشی کے انداز میں بولی "مجھے آپ ابھی بتا دیں میں آئی ہوئی تو ہوں۔"

"ابھی نہیں! ابھی آپ کی کلاس فیلو شک کریں گی۔ وہ آپ کا انتظار کر رہی ہوں گی۔ پھر کوئی فرصت کا موقعہ نکال کر آئیں مگر جلدی میرے پاس وقت زیادہ نہیں ہے۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

وہ میرے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے بولی "ٹھیک ہے، مجھے جیسے ہی موقعہ ملا میں آؤں گی اور اس اُمید پر کہ آپ میرے ساتھ کوئی غلط حرکت نہیں کریں گے۔"

"اس طرف سے آپ بے فکر رہیں مجھے معلوم ہے کہ آپ عورت ہیں اور ... اور خوبصورت بھی۔ آپ کی عزت پر حرف نہیں آئے گا۔"

وہ مسکرانے لگی، بولی "ٹھیک ہے بزرگوار خان صاحب! میں ضرور آؤں گی، شاید آج رات۔"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔ میں نے صحن میں نکل کر کُلی کی۔ منہ پر دو چھینٹے مارے اور پھر اطمینان سے بستر پر لیٹ کر سگریٹ پھونکنے لگا۔ میرے ذہن میں اس کشور بیگم کے وسیلے سے ایک نیا منصوبہ جنم لے رہا تھا جس کی وجہ سے مجھے اپنا وہ کام زیادہ آسان نظر آنے لگا تھا۔

آدمی کا وتیرہ یہ ہے کہ گھنے جنگل میں جس راہ پر کبھی چل پڑتا ہے اُسی راہ کو ہموار کرنے لگتا ہے۔ اسے یہ خیال نہیں رہتا کہ شاید کچھ فاصلے پر کوئی پرانا ہموار راستہ بھی موجود ہے۔ میں بھی وہی کچھ کر رہا تھا۔ میں کسی اور جگہ اترتا تو وہاں کے حالات کے مطابق عمل کرتا مگر اب جب کہ میں سن چکا تھا کہ حکیم عبدالرشید آرزو سے خیرات محمد اور رحمت علی کا ایک تعلق قائم ہو چکا ہے معالج اور مریض کی حیثیت سے تو میں نے اسی سے فائدہ اٹھانے کی تدبیر سوچی۔ ڈھلوں صاحب کے حکم پر عمل تو مجھے بہرحال کرنا ہی تھا۔ اپنے ضمیر کو میں کرم آباد کی مسجد ہی میں روتے چھوڑ آیا تھا۔ اب اس کے نالہ و شیون پر اور زیادہ دھیان دینے کی نہ مجھے فرصت تھی نہ ضرورت۔ ٹھہر ٹھہر کر آئی کا وہ حیران پریشان چہرہ میری نگاہوں میں ابھرتا تھا۔ اسے شاید یہ احساس ہو چکا تھا کہ کوئی بہت ہی بُری گھڑی اس کی طرف طوفان کی طرح لپکی چلی آ رہی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس شام وہ الماس مجھ سے ملنے کے لیے اتنا بے چین نہ ہوتا۔ حالانکہ میں نے اسے سمجھایا تھا مگر اس کا لہجہ بہت ہی افسردہ تھا۔ یوں جیسے وہ اندر سے کسی شدید شکست و ریخت کا شکار ہو چکا ہے۔ اس کی ساری باتیں مجھے یاد آ رہی تھیں، اُسے زندگی اور اُس کی مسرتوں کی

بے ثباتی نے دہلا کر رکھ دیا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ یوں رستہ تڑاکر المارر کر فون کرنے نہ نکل جاتا۔ پھر وہ ایک لمبا موڑ کاٹ کر جب مجھے دوبارہ [illegible]نا تو اس وقت بھی وہ خوش نہیں تھا، اسے یقین ہو گیا تھا کہ اکبر میاں نہ گولی مار دینے اور سات سو چھپاسی نمبر بنگلے میں دہشت پھیلا دینے کے باوجود وہ کچھ حاصل نہیں کر سکا ہے۔ اس کی ایک ہی بات مجھے یاد آ رہی تھی اور یہی وجہ تھی کہ ایسے وقت میں جب کہ ڈھلوں صاحب اس کی گلوخلاصی کے لیے کراچی جا چکے تھے، میں ان کے دشمن کو ملیامیٹ و نابود کر دینے کا تہیہ کر چکا تھا۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ وہ سودا ہماری اپنی بقا کے لیے حد ضروری تھا۔ کچھ دیے بغیر کچھ لے لینا ناممکن ہوتا ہے۔ پھیپھڑے اندر کی ہوا خارج کیے بغیر باہر سے تازہ ہوا حاصل نہیں کر سکتے۔ یہی قانونِ قدرت ہے اور اس میں کوئی استثنا نہیں۔

دو سگریٹ پھونک کر میں نے دروازے اندر سے اچھی طرح بند کیے اور پھر میں مطمئن ہو کر آنکھیں موند کر بستر پر لیٹ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد میں گہری نیند میں گم ہو چکا تھا۔ وہ نیند کی سکون پرور ردا ذہن پر اترتی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے آدمی اور اس کے دکھوں کے درمیان دیوار حائل ہو گئی ہے۔ وہ خوش قدم نیند جس پر ہر سکون قربان کیا جا سکتا ہے۔ آدمی کو ہزار دکھوں سے نجات دلا دیتی ہے۔ اس کے۔۔۔۔ خمار آگیں لمس کی کیفیت کو لفظوں میں سمویا ہی نہیں جا سکتا۔ وہ لذتِ وصال سے کہیں زیادہ سکون پرور ثابت ہوتی ہے۔ دکھوں کو آدمی کی روح پر سے نوچ کر پرے پھینک دیتی ہے۔ خدا کرے کوئی بشر نیند سے محروم نہ ہو جائے کہ اس سے زیادہ بڑی محرومی اور کوئی نہ ہو گی۔ بھوک کسی بھی ستم کی ہو اپنا آپ منوا لیتی ہے، اپنے تقاضے پورے کروا کر رہتی ہے مگر نیند ایک ایسی الوہی آفاقی کیفیت ہے کہ اس کیفیت سے محروم ہو جانے سے آدمی یوں ہو جاتا ہے جیسے کوئی زندگی سے بیزار تھکا ہارا نحیف و نزار بوڑھا موت کو ترستا رہ جائے۔ وہ بھی تو ایک نوم ایسی ہی کیفیت ہے جو ہمیشہ باقی رہتی ہے اور قیامت تک آدمی کو اپنی بانہوں سے نکلنے نہیں دیتی۔ اور میں ان چند خوش نصیبوں میں سے تھا کہ وہ جب چاہتے ہیں جہاں چاہتے ہیں، اس پری وش کو آنکھوں میں اتار کر لہلہاتی بہشتوں کی طرف چل دیتے ہیں۔ میری پچھلی رات بے خوابی کی نظر ہو گئی تھی تو میں رات کے پچھلے پہر تک باولا سا ہو چکا تھا مگر اس سہ پہر کو میں نے حکیم آرزو صاحب کے مکان پر جب تکیے پر سر رکھا تو ایک ناخوشگوار کام میں خوشگوار کامیابی کی امید لیے میں فوراً ہی گہری نیند میں کھو گیا۔

حکیم صاحب افطاری کے وقت بھی گھر نہیں لوٹے۔ وہ وقت ان کے شربت شیرے کی اندھا دھند فروخت کا ہوتا تھا [illegible]ن سے وہ خوب خوب فائدہ اٹھاتے تھے۔ کشور میرے لیے [illegible] کھانا لے آئی۔ میری خاطر اس نے کوئی خاص اہتمام نہیں کیا تھا [illegible] تک کہ کھانے میں گوشت بھی میسر نہیں تھا۔ دو قسم کی دالیں تھیں [illegible] روٹیاں اور چاول۔ شیرینی کے نام پر اس نے حلوہ تیار کر لیا تھا۔ حکیم صاحب کے حرم میں شامل ان تینوں میں سے کوئی بھی روزہ نہیں رکھتی تھی۔ کشور کی زبانی مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ حکیم صاحب بھی اس سلسلے میں کوئی خاص تردد نہیں کرتے تھے۔ بس منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے وہ دو چار روزے رکھ لیتے تھے اور یوں وہ 'رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی' کے مصداق لہو لگا کے شہیدوں میں شامل ہو جاتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ گھر گھر یہی عالم تھا۔ لوگ بس نام کے مسلمان رہ گئے تھے۔ منافقت ان میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ بازاروں میں نکلتے تھے تو منہ بند رکھتے تھے۔ تاکہ کسی کو پتہ نہ چلے کہ وہ کیا ہیں مگر جیسے ہی وہ خلوت میں پہنچتے تھے کارِ دیگر میں مصروف ہو جاتے تھے۔ کیا وہ اللہ سے فریب کرتے تھے؟ کہ بندوں سے اپنا آپ چھپاتے پھرتے تھے۔ میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا تھا مگر میں تھا کون آخر فیصلہ کرنے والا۔ میری حیثیت ہی کیا تھی۔ جب میرے اپنے منہ سے بدبو آتی تھی تو میں دوسروں سے کیسے کہتا کہ تم مسواک کیا کرو۔

جب میں کھانا کھول کر بیٹھا تو کشور مجھے بڑے غور سے دیکھ کر بولی "مجھے لگتا ہے جیسے علاج تو محض ایک بہانہ ہے۔ آپ کسی اور ہی چکر میں یہاں آئے ہیں۔"

"میں نے کہا تو تھا کہ آپ بڑی ذہین عورت ہیں۔ بات کی تہہ تک پہنچنا آپ کے لیے کچھ مشکل نہیں ہو گا۔"

"حکیم صاحب کا حرم تو خالی کرنے نہیں آئے۔ یہ 'نمبر ٹو' مجھے بتا چکی ہے کہ اس کے دو عاشق اور بھی تھے، ان میں سے ایک آپ تو نہیں ہیں؟"

"توبہ توبہ! یہ کیسی کفر کی باتیں کر رہی ہیں آپ! میں تو اس معاملے میں بہت ہی برگزیدہ آدمی ہوں خاتون!"

"تو پھر اور کیا بات ہے؟ آپ مجھے بتلاتے کیوں نہیں؟"

"میں نے کہا تو ہے میں آپ کو ضرور بتا دوں گا مگر یہ تو کوئی مناسب موقع نہیں ہے بات بیچ ہی میں رہ جائے گی۔"

"تو پھر میں کس وقت آؤں؟"

"آدھی رات کو آ سکتی ہیں آپ؟"

"وہ کوئی شریفانہ وقت نہیں ہے۔ کوئی دیکھ لے تو کیا کہے گا؟ صاف تہمت آئے گی مجھ پر آپ کی۔"

"ہاں یہ تو ہے۔ تو پھر آپ کل صبح آ جائیں۔"

"نہیں دن کو یہ دونوں کمبختیاں لپٹی رہتی ہیں۔"

"تو پھر کب آپ میری بات سن سکیں گی۔ ہم ادھر سیالکوٹ [illegible] پر جا کر بات کر لیتے ہیں۔"

"آپ مذاق کرتے ہیں اور میں یہ سوچ سوچ کر تھک گئی [illegible] کوئی اس گلی میں رہتی ہے جسے آپ بھگانا چاہتے ہیں۔"

"نہیں جناب! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"ڈاکا ڈالنا ہے کسی کے ہاں؟"

"میں آپ کو شکل سے ڈاکو نظر آتا ہوں۔"

"حکیم صاحب سے کوئی پرانی دشمنی ہے آپ کی؟"

"میں نے تو انہیں آج ہی دیکھا ہے خاتون! ایسا الزام تو نہ [illegible] مجھ پر۔"

"یہ کمال کر رہے ہیں آپ! آخر چاہتے کیا ہیں آپ بزر۔۔۔"

"گنوار خان صاحب۔" میں نے اس کا فقرہ مکمل کر دیا۔

"گنوار تو خیر آپ ہرگز نہیں ہیں۔ بہت پالشڈ آدمی نظر آتے ہیں اور زمانہ ساز بھی مگر آپ کا مقصد کیا ہے؟ مجھے بتائیں ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گی۔"

"ایسا نہ کہیں خاتون! آپ کب آ سکتی ہیں؟ کب آپ کو ہر طرف سے فرصت مل سکتی ہے؟"

"ایک ہی طریقہ ہے۔" وہ میری طرف جھک کر سرگوشی کرنے لگی۔

"وہ کیا؟"

"وہ یہ کہ میں حکیم صاحب کو آج رات دودھ میں خواب آور دوا پلا دیتی ہوں اور ان دونوں کو بھی۔ یہ بھی ایک ایک گلاس دودھ کی عادی ہیں سونے سے پہلے اور وہ میں ہی ان کو تیار کر کے دیتی ہوں۔" اس کی آواز بہت ہی مدھم ہو گئی تھی۔

"واہ! یہ تو بہت ہی اچھا ہو گا۔ پھر تو ہم اطمینان سے ساری باتیں کر سکیں گے، پوری رات ہو گی ہمارے پاس۔"

"تو ٹھیک ہے میں یہ بھی کر گزرتی ہوں مگر آپ سوچ لیں، اگر گڑبڑ کی نا آپ نے، تو اچھا نہیں ہو گا۔ میں آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔"

میں نے دونوں کانوں کو آڑے ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ "آپ ایسا کبھی سوچیں بھی نہیں۔ میں بہت شریف آدمی ہوں اس معاملے میں۔ بلکہ مجھے آپ خواجہ سرا ہی سمجھیں۔"

وہ میری بات کا مفہوم سمجھ کر کھل سی گئی۔ مسکراتی ہوئی بولی۔ "بہت شیطان ہیں آپ! پتہ نہیں یہ قیم کیوں لیے پھرتے ہیں۔"

"جو بڑھ کر ہاتھ میں لے لے یہ پیمانہ اسی کا ہے۔ ٹھیک کہہ رہا ہوں نا میں؟"

ہم دونوں اپنی اپنی جگہ پر ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ کر اتنی جلدی بے تکلف ہو گئے تھے کہ وہ بھی اوپر جا کر سوچتی ہو گی کہ وہ کیا کر رہی ہے اور میں تو حیران تھا ہی مگر عمداً میں اسے اس راہ پر لے آیا تھا تاکہ میرا کام آسان ہو جائے۔

میں کھانا کھا چکا تو وہ بڑے لیے دیے انداز میں برتن سمیٹ کر باہر نکل گئی۔ اسے بھی جبینہ کی طرح رقم کی جھلکی نے پاگل کر دیا تھا۔ وہ بھی نوٹوں کی گڈی کے لیے ہر منزل سے گزرنے پر آمادہ ہو گئی تھی۔ مگر نہیں۔ اس کے کردار کے اس رخ کے بارے میں میں کوئی بات قطعیت سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس ضمن میں وہ بار بار مجھے بڑے واضح الفاظ میں متنبہ کرتی چلی جا رہی تھی۔ مگر اس کے اس رخ کا تو میں خریدار ہی نہیں تھا پھر میں اس کے متعلق سوچتا ہی کیوں۔

حکیم صاحب نو بجے واپس آئے اور مجھ سے چند رسمی باتیں کر کے اوپر چلے گئے۔ وہ کچھ تھکے تھکے سے نظر آتے تھے اور ان کی تھکن کی وجہ بھی تھی۔ وہ صبح سات بجے مطب کھولتے تھے اور رات نو بجے تک وہیں بیٹھے رہتے تھے۔ بیچ میں وہ دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے گھر آتے ہوں گے یہ میرا اندازہ تھا۔ ورنہ ان تینوں گھر میں بندھی گھوڑیوں کے آوارہ ہو جانے کا خدشہ قوی تھا۔ وہ مرد جو صبح کے گئے شام کو گھر کا پتہ لیتے ہیں ان کے ہاں ایسی ہی آوارگی کی بھنک گھٹنے لگتی ہے۔ اور ان کی عورتیں سارے دن کی اذیت ناک تنہائیوں سے گھبرا کر سکونِ دل کی خاطر کوئی نہ کوئی سہارا ڈھونڈ ہی لیتی ہیں کہ دل کے فروختار تو گلی گلی کھڑے رہتے ہیں۔ ان کی نظروں کا جال کھڑکیوں اور دروازوں کا ہمہ وقت احاطہ کیے رہتا ہے۔ جیسے ہی کوئی چڑیا انگڑائی لینے کے لیے پر کھولتی ہے وہ اسے چھاپ لیتے ہیں۔ عشق کی گرم بازاری تو اسی طرح ہی قائم رہ سکتی ہے۔

کشور بیگم اپنی دھن کی پکی نکلی۔ رات کے اس وقت ساڑھے گیارہ بج رہے تھے کہ کمرے کا بھڑا ہوا دروازہ بے آواز کھلا۔ میں اس وقت جاگ ہی رہا تھا۔ اس کا ایک تختہ پیچھے ہٹا کر کشور ایک سربستہ راز کی طرح کمرے میں داخل ہوئی اور پھر اس نے اپنے پیچھے بڑی احتیاط سے دونوں تختے بھیڑ کر ان پر کنڈی چڑھا دی۔ تپائی پر رکھی لالٹین کی روشنی میں اس کو دیکھ کر میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں میں نے کہا ہے نا کہ وہ بڑی خوبصورت عورت تھی اور اس کے وجود سے صحرا کی دھوپ میں پکنے والے تربوز ایسی مہک اٹھتی رہتی تھی ایسی مہک جو مشامِ جاں میں تازگی پیدا کرتی تھی۔ اس کی اپنی سانسیں زیر زبر ہو رہی تھیں جیسے وہ پہاڑ پر چڑھتی چلی آ رہی ہو۔ وہ نہا دھو کر اور نیا جوڑا پہن کر آئی تھی۔ دروازے کے ساتھ لگ کر اس نے اپنے سینے کو یوں دبایا جیسے وہ دل کی تیز دھڑکن کو تھپکی دے کر آہستہ خرامی کے لیے کہہ رہی ہو۔ پھر وہ لڑکھڑاتی ہوئی آگے بڑھی اور میری آنکھوں میں جھانکتی ہوئی وہ کرسی پر بیٹھ گئی، بولی "اب فرمائیے بزرگوار خان صاحب! کہ وہ کیا بات تھی جو آپ مجھ سے کہنا چاہتے تھے؟"

"ذرا آپ کے دم میں دم آ جائے تو میں کچھ عرض کروں آپ کا تو سانس پھول رہا ہے۔"

"زندگی میں پہلی بار میں ایک غیر مرد کے پاس یوں تنہا چلی آئی ہوں اور وہ بھی اس طرح کہ سارے گھر کو سانپ سنگھا دینے کے بعد، حکیم صاحب کو پتہ چل گیا کہ ان کو خواب آور دوا دی گئی تھی تو وہ پتہ نہیں کیا کر ڈالیں۔"

"انھیں کیسے پتہ چل سکتا ہے جب وہ دودھ پیتے وقت نہیں پہچان سکے تو بعد میں کیا کر لیں گے؟"

"وہ دودھ میں شہد ملا کر پیتے ہیں۔ یہ اُن کا معمول ہے۔ اس کی وجہ سے انھیں پتہ نہیں چل سکا۔ مگر میری جان ہوا ہو رہی ہے۔ خیر دیکھا جائے گا۔ آپ اب مجھے اصلی بات بتا دیں۔"

"آپ نہا کر آئی ہیں۔ تازگی کی خوشبو آ رہی ہے آپ کے وجود سے۔"

"ہاں! ہانڈی روٹی کا سارا کام ان دونوں نے میرے ذمّے ڈال رکھا ہے۔ حکیم صاحب کو بھی وہ یہی بتاتی ہیں کہ کشور کھانا بہت اچھا پکاتی ہے اور بس یوں مجھے انھوں نے چولھے میں جھونک رکھا ہے۔ میں پسینے میں نہائی ہوئی تھی سوچا ذرا تازہ دم ہو کر ہی آپ کے پاس جاؤں ورنہ آپ کی کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آئے گی۔"

وہ اب بھی اپنے آپ میں نہیں تھی۔ یہ احساس اس پر شدت سے طاری تھا کہ وہ ایک غیر مرد کے پاس ایسی سناٹوں سے لبریز تنہائی میں آ بیٹھی ہے جس کے انجام کا اندازہ کوئی بھی احمق آدمی با آسانی لگا سکتا ہے مگر وہ جان بوجھ کر اس جلتی آگ میں کود گئی تھی۔ عورتوں میں خدا نے یہ صفت ودیعت کر رکھی ہے کہ وہ کوئی کام کرنے پر آتی ہیں تو آندھی طوفان میں بھی کر گزرتی ہیں۔ وہ نتیجے کی کوئی پروا نہیں کرتی ہیں۔ جب ایک بات اُن کے مغز میں جم جاتی ہے تو وہ اس کو مرئی صورت میں ہر قیمت پر دیکھ لینے کی متمنی ہوتی ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ موت سے زیادہ اذیت ناک دردِ زہ جس کا ذکر خدا نے اپنے کلامِ پاک میں بھی کیا ہے ہنستے ہنستے سہہ جاتی ہیں کہ وہ ماں کی کسی بے کراں خوشی کو مرئی اور مادی صورت میں دیکھنے کے لیے مچل رہی ہوتی ہیں ورنہ میرا خیال ہے کہ اگر کسی مرد کو ایک بار اس جیسے درد کو سہنا پڑے تو وہ زندگی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے منہ موڑ جائے، کہ وہ درد تو پہاڑ پر جا پڑے تو اُسے بھی ریزہ ریزہ کر دے۔

رات کا بے ایمان پہر اور وہ کافر تنہائی مجھے اس کی طرف دھکیل رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں بھی کئی رنگ ابھر رہے تھے اندرونی خلجان سے جان چھڑانے کے لیے وہ بڑے منجمد لہجے میں بولی "بتلاتے کیوں نہیں ہیں آپ، کیا کہنا چاہتے تھے آپ مجھ سے؟"

"آپ اتنی دُور بیٹھی ہیں میں کیسے کہوں۔ میں آواز بلند نہیں کر سکتا۔"

وہ سٹپٹا کر اپنی جگہ سے اٹھی اور تنک کر میرے پاس آ بیٹھی۔

"لیں اب بتائیں ایسی بھی کیا مصیبت ہے۔ میں بھی پاگل ہوں جو آپ کے پھندے میں خواہ مخواہ ہی پھنس گئی۔ نیت آپ کی مجھے بالکل ٹھیک نہیں لگتی۔"

اُس سے مجھے کچھ اور کہنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ میں نے بن کہے بن سُنے لالٹین بجھا دی۔

جب میں نے دوبارہ وہ چراغ جلایا تو وہ مجھ سے بہت ناراض تھی۔ بہت ہی زیادہ۔ جیسے وہ بس رو دے گی۔

"دیکھیں کشور! اب میں بتاتا ہوں وہ کام جو آپ کو کرنا ہے۔ مجھے آپ چودھری خیرات محمد کے بارے میں وہ سب کچھ بتا دیں جو آپ کو معلوم ہے اور چودھری رحمت علی کے بارے میں بھی۔"

"کیوں یہ کیوں پوچھ رہے ہیں آپ؟" وہ ذرا سنبھلی، اُس کا دھیان بٹنے لگا تھا۔

"کچھ ایسا ہی کام ہے مجھے اُن سے جس کو میں آپ کی مدد کے بغیر کر نہیں سکتا۔ آپ میرے ساتھ تعاون کریں سوال مت پوچھیں۔ یہ بیس ہزار روپیہ ہے اس میں سے دس ہزار میں اس دن دوں گا، جس دن یہ کام مکمل ہو جائے گا۔" میں نے دس ہزار کی گڈی اُس کی جھولی میں ڈال دی۔

وہ نوٹ اُس نے ہاتھوں میں پکڑ کر تاش کی طرح ایک طرف سے چلائے اور اُن کی ہوا کو محسوس کرتے ہوئے بولی "چلیں میں نے یہ نوٹ رکھ لیے مگر اب بتائیں تو سہی کہ اُن کے بارے میں آپ کیوں پوچھتے ہیں؟"

"میں نے کہا ہے نا کہ آپ سوال نہیں پوچھیں گی۔ چودھری رحمت علی کب سے ہے یہاں؟"

"وہ تو اکثر یہاں آتا ہے، ہر پندرہ دن بعد وہ یہاں ہوتا ہے۔"

"کیا کرنے آتا ہے وہ یہاں؟"

"یہ بڑے راز کی بات ہے جو صرف پاکیزہ کو معلوم ہے یا مجھے۔"

"اچھا! ایسی کیا بات ہے وہ جس کا آپ دونوں کے سوا کسی کو بھی معلوم نہیں؟"

"یہاں قریب ہی ایک گھر ہے ہماری گلی میں امیر الدین کا، وہ لوہاروں کا کام کرتے ہیں۔ وزیرآباد میں دو کارخانے ہیں۔ بڑے کھاتے پیتے لوگ ہیں وہ۔ ذات کے وہ راجپوت ہیں۔ اُن کی ایک لڑکی ہے جسے طلاق ہو چکی ہے اس کا نام زلیخا ہے۔ چودھری رحمت علی سے اس کا یارانہ ہے۔ اُن کی پہلی ملاقات حکیم صاحب کی دکان پر ہوئی تھی۔ یہ چھ مہینے پہلے کی بات ہے۔ چودھری خیرات محمد کے گھر اکثر جایا کرتی تھی۔ اس کی بیوی پاکیزہ کی سہیلی بنی ہوئی ہے۔ چودھری رحمت علی نے وہیں پاکیزہ کو گھیر کر زلیخا تک اپنا پیغام پہنچایا۔ پھر

پاکیزہ نے ہی ان کی ملاقات کروائی۔ اِسی گھر میں اس کے ساتھ والے کمرے میں۔ جب سے اب تک اس نمبر تو کے ذریعے اُن کی ملاقاتیں جاری ہیں جن کے بدلے میں چودھری رحمت علی پاکیزہ کو تین چار جوڑے بنوا کے دے چکا ہے مگر وہ لوہار بہت سخت اور اکھڑ قسم کے لوگ ہیں انھیں پتہ چل گیا تو وہ رحمت علی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ ان کا راجپوتی خون کھول گیا تو پتہ نہیں وہ کیا کر دیں میں تو پاکیزہ کو بہت سمجھاتی ہوں مگر وہ باز نہیں آتی۔" کشور نے مجھے ایک نیا باب کھول کر سُنا دیا۔ "مگر آپ کیوں پوچھتے ہیں یہ سب کچھ؟"

"آپ کو پتہ ہے زلیخا کہاں بیاہی گئی تھی؟"

"وہ کامونکی میں بیاہی گئی تھی۔ چودھری حیات علی کے گھر۔ ان کے چاول چھڑنے کے دو کارخانے ہیں وہاں۔"

"آپ کو پتہ ہے اس کے خاوند کا کیا نام ہے؟"

"عبد العلی نام ہے اس کا۔ اور اس کے تین بھائی ہیں۔ ارشد علی۔ امجد علی اور مرشد علی۔"

"ٹھیک کہتی ہیں آپ۔ مگر آپ کو پتہ ہے کہ عبد العلی نے ابھی اسے طلاق نہیں دی۔" میں نے خواہ مخواہ ہی اس کی سوچ پر ناخن مار دیا۔

"کیوں نہیں دی طلاق۔ وہ ایسے ہی گھر آ بیٹھی ہے۔ وہ پڑھی لکھی ایف اے پاس لڑکی ہے۔"

"یہی تو آپ کو معلوم نہیں ہے اس نے زلیخا کو صرف ایک طلاق دی تھی۔ اور میں نے سنا ہے کہ یہ چاہتے ہیں کہ عبد العلی زلیخا کو پوری طلاقیں دے کر حق مہر اور جہیز کی سوئی سلائی تک واپس کر دے۔"

"یہ آپ سے کس نے کہا ہے؟"

"مجھے معلوم ہے تو میں کہہ رہا ہوں نا۔ میں بلا وجہ تو ادھر نہیں آیا۔"

"تو یہ علاج محض ڈھونگ ہے؟"

"نہیں! میری یہاں آمد کی سب سے بڑی وجہ تو آپ ہیں کشور۔ میں نے آپ کو تین مہینے پہلے وزیرآباد میں دیکھا تھا۔ میں آپ کا تعاقب کرتے یہاں تک آیا مگر میں آپ کا گھر نہ دیکھ سکا۔ میں تانگے میں تھا اور آپ ٹیکسی میں آ رہی تھیں۔"

"ہاں ہاں! مجھے یاد ہے حکیم صاحب کے ساتھ میں اُن دنوں کئی بار وزیرآباد گئی تھی۔ کپڑا خریدنے کے لیے۔"

"ہاں! دوسری بار میں نے آپ کا گھر اور آپ کے خاوند کا مطب دیکھ لیا اور اب تیسری بار میں آپ تک آ ہی پہنچا۔ آپ کے بغیر مجھے چین نہیں آتا تھا۔ اور میں نے قسم کھائی تھی کہ آپ کو حاصل کر کے رہوں گا۔"

"ہوئی نا بے ایمانی کی انتہا۔ اب تو بزرگنوار صاحب میں آپ کو نہیں چھوڑوں گی۔" یہ کہہ کر اس نے میرے بال پکڑ کر مجھے جھنجھوڑ ڈالا۔

"ایسے مکار آدمی ہیں آپ، بھولی بھالی عورتوں کو اس طرح پھانس لیتے ہیں۔"

میں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے "میں آپ سے معافی چاہتا ہوں تھانیدار صاحب پھر کبھی چوری اور مکاری نہیں کروں گا۔"

وہ خوش ہو گئی، بولی "خبردار جو اپنے یہ پلید ہاتھ پھر مجھے لگائے تو۔ اب مجھے یہ بتائیں کہ آپ کو اس زلیخا سے کیا دلچسپی ہے؟"

"میں عبد العلی کا دوست ہوں۔ اس کو بھی یہ خبریں مل چکی ہیں کہ زلیخا آج کل کیا کر رہی ہے مگر وہ طلاق دینے سے پہلے ثبوت چاہتا ہے پکا ثبوت۔"

"کیا کرے گا وہ اس ثبوت کو؟"

"وہ دراصل یہ سمجھتا ہے کہ زلیخا پر کسی نے تہمت لگائی ہے۔ وہ زلیخا کو پھر اپنے گھر لے جانا چاہتا تھا مگر۔ وہ یہ سوچتا ہے کہ اگر یہ خبر سچی ہے تو پھر وہ زلیخا کو ہمیشہ کے لیے طلاق دے دے گا۔"

"مگر آپ کو اس سے کیا دلچسپی ہے؟ کیا ملے گا آپ کو وہ ثبوت حاصل کر کے۔ اگر وہ پھر سے زلیخا کو بسانا چاہتا ہے تو یہ تو بہت اچھی بات ہے۔"

"یہ اچھی بات نہیں ہے کشور! میں چاہتا ہوں کہ عبد العلی کو یہ ثبوت مل جائے۔"

"مگر کیوں! اس سے آپ کو کیا فائدہ ہوگا؟"

"فائدہ یہ ہوگا کہ... دراصل کشور! میں اپنی بہن کی شادی عبد العلی سے کرنا چاہتا ہوں۔ اس کی منگنی پہلے اسی کے ساتھ ہوئی تھی مگر یہ لوہار بیچ میں آ گئے۔ بس اتنی سی بات ہے جس کے لیے میں پریشان ہو رہا ہوں۔"

"اور یہ ثبوت آپ کیسے حاصل کریں گے؟"

"آپ رحمت علی اور زلیخا کو کسی جگہ اکٹھا کرنے کا انتظام کر دیں میں اُن دونوں کی قابلِ اعتراض حالت میں ایک تصویر اُتاروں گا اور بس وہ تصویر میں لے جا کر کسی طرح عبد العلی کو دکھا دوں گا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اُسے فوراً ہی پکی طلاق دے دے گا اور ہم اپنی بہن لبنیٰ کا بیاہ اس سے کر دیں گے۔"

"عبد العلی آپ کا کیا لگتا ہے؟"

"وہ میری پھوپھی کا لڑکا ہے۔" میں نے اس کے سامنے جھوٹ کا

پورا دفتر کھول لیا تھا۔

وہ کچھ دیر تک کسی گہری سوچ میں ڈوبی رہی پھر مجھے غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "اور اس اتنے سے کام کے آپ مجھے بیس ہزار روپے دے رہے ہیں؟"

"ارے نہیں میری جان! یہ تو میری محبت کا نذرانہ ہے جو میں آپ کے لیے ساتھ لایا تھا۔ یہ زلیخا والا قصہ تو یوں ہی بیچ میں آگیا۔ آپ رحمت علی کا نام نہ لیتیں تو میں اس کا ذکر بھی نہ کرتا۔"

"ہاں یہ تو ہے۔ مجھے آپ کی باتوں میں سچائی نظر آتی ہے۔ مگر مجھے آپ نے خبر بھی نہ ہونے دی اور چپکے ہی چپکے میرا پیچھا کرتے رہے۔ یہ شرافت ہے آپ کی؟"

"میں کیا کرتا۔ کوئی بات میرے بس میں نہیں تھی۔ آپ سے میں الگ ڈرتا رہتا تھا۔ آپ کو ناراض کر کے تو میں کہیں کا بھی نہ رہتا۔"

"بہت چالاک آدمی ہیں آپ، مگر باقی دنوں آپ کام کیا کرتے ہیں؟"

"میری بھی چاول چھڑنے کی مل ہے ادھر حافظ آباد میں۔"

"اگر میں یہ رقم نہ لوں اور پھر بھی آپ کا کام ہو جائے تو؟"

"تو میں اس رقم کو ادھر ہی تیلی دکھا دوں گا — ایسی ایسی ہزار رقمیں میں آپ پر قربان کر سکتا ہوں جناب کشور بیگم صاحبہ مدظلہا العالیہ۔"

"اتنی محبت ہے آپ کو مجھ سے؟"

"نہیں بہت تھوڑی۔ بس ایک رتی برابر۔ میں جناب علاج کے بہانے اب اکثر یہاں آیا کروں گا اور ادھر ہی ٹھہرا کروں گا۔"

"ہاں اس طرح یہ سلسلہ آسانی سے چل سکتا ہے۔ مگر آپ کہیں مجھ سے چار سو بیسی تو نہیں کر رہے؟"

"میں کوئی آپ کے بندے تو نہیں اُتار رہا خدانخواستہ۔ کیا خیال ہے آپ کا؟"

"وہ بندے نہیں تھے جو ابھی آپ نے اُتار لیے ہیں نا! بہت ذلیل ہوتے ہیں یہ مرد۔ ایسے مکار! اُف توبہ۔" وہ کانوں کو ہاتھ لگانے لگی۔ "یہ قبلہ حکیم عبدالرشید آرزو دوزخی بھی ایسی ہی چکنی چپڑی باتیں کر کے مجھے مار گئے تھے۔"

"اُن پر لعنت بھیجیں۔ یہ کوئی موقع ہے ایسے ہوس پرست کے ذکر کا۔ تو پھر کر سکیں گی آپ انھیں کسی جگہ اکٹھا؟"

"کر تو سکتی ہوں، ساتھ والے کمرے میں کر سکتی ہوں۔"

"تو پھر کر ہی دیں۔ مگر یہ کام پاکیزہ کے ذریعے کروائیں، آپ اس میں نہ پڑیں۔"

"کرے گی تو وہی ہی، اسے کوئی لالچ دینا پڑے گا۔"

"آپ کہہ دیں کہ چوہدری رحمت علی نے ہزار روپیہ دینے کا وعدہ کیا ہے وہ آپ مجھ سے الگ لے کر اُسے دے دیں۔"

"مگر واقف تو وہ پاکیزہ کل ہے۔ یوں نہیں میں ایسے بہانے تیار کروں گی۔ کہوں گی زلیخا نے پیغام بھیجا ہے۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔ اس طرح کسی کو شک بھی نہیں پڑے گا۔" میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ "یہ چوہدری رحمت علی تو بڑا پہنچا ہوا آدمی معلوم ہوتا ہے۔"

"ایسا ویسا! ارے شراب بھی پی لیتا ہے۔ یہ رمضان کا مہینہ اور وہ اسی مار پر آیا ہوا ہے۔ اب یرقان کا بہانہ بنا کر یہاں بیٹھ گیا ہے۔ دوالے جا کر نالی میں بہا دیتا ہے اور نمازی ایسا ہے کہ شاید تہجد بھی پڑھ لیتا ہوگا۔"

"ہاں! یہ تو ہے۔ ہیں کوا کب کچھ نظر آتے ہیں کچھ۔"

"یہ نظم میں نے دسویں میں پڑھی تھی۔" کشور کی یاد میں کوئی دیا سا جھلملا اُٹھا۔

وہ سحری کی اذان تک میرے پاس بیٹھی رہی۔ وہ بھول ہی گئی کہ وہ کہاں ہے کس کے حبالۂ نکاح میں ہے اور کیوں اتنی آسانی سے وہ دیوار کی دوسری طرف کود گئی ہے۔ پہلے تو اسے رقم کا لالچ تھا مگر اب اس کی سوچ کے زاویے بدل رہے تھے۔

"تو پھر کل رات آپ اُن کی ملاقات کا انتظام کرائیں گی؟" وہ جانے لگی تو میں نے اسے پھر یاد دلایا۔

"ہاں! یہ تو کل ہو جائے گا مگر آپ کے پاس کیمرہ ہے؟"

"اس کا میں بندوبست کر لوں گا۔ مجھے بس ایک ہی تصویر تو لینی ہے۔"

"تو پھر بے فکر رہیں بزرگنوار غلن صاحب! کل رات یہ کام ہو جائے گا۔ آپ بھی ادھر ہی رہیں گے۔"

"مگر وہ تو دروازے بند کر لیں گے۔"

"ہاں! صرف وہی دروازے جو اندر کھلتے ہیں۔ گلی میں کھلنے والے دو دروازوں میں سے ایک کی کنڈیاں کھلی ہوں گی۔ آپ اطمینان سے اندر جا کر تصویر لے سکیں گے۔"

"مگر کیمرے سے جو روشنی نکلے گی، اس سے وہ خبردار ہو جائیں گے۔"

"اس کی فکر نہ کریں۔ میں انھیں جو دودھ بھیجوں گی، اسے پی کر وہ گہری نیند میں کھو جائیں گے پھر آپ جتنی تصویریں چاہیں لے لیں۔"

"ہو سکتا ہے وہ دودھ نہ پئیں۔"

"اس کی انھیں عادت ہے جب وہ تھک جاتے ہیں تو دودھ ضرور پیتے ہیں۔ اس کا انتظام پاکیزہ کرتی ہے اسے ہر ملاقات کے عوض چوہدری رحمت علی سو روپیہ دیتا ہے۔"

"مگر مجھے حیرت ہے کشور! رحمت علی تو خاصی عمر کا آدمی ہے۔"

"وہ بھی کوئی چالیس سال کا ہوگا۔ پتہ نہیں زلیخا کو کیا سنگھایا ہے۔ وہ بس اسی کا دم بھرتی ہے۔"

"بس ٹھیک ہے کشور۔ اب آپ جائیں اذان ہو رہی ہے۔ کل کام کا سارا انتظام کر کے مجھے بتائیں۔"

"آپ بے فکر رہیں یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔"

نوٹ ابھی تک بستر پر تکیے کے نیچے دھرے تھے وہ میں نے اٹھا کر اس کے ہاتھ میں تھما دیے اور وہ مسکراتی ہوئی وہاں سے بڑی ایسی احتیاط سے باہر نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں ذہن سے سب کچھ جھٹک کر گہری نیند میں کھو گیا۔ جب میری آنکھ کھلی تو دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔ اور ایک شوخ کرن روشن دان کی راہ سے کمرے میں اُتر آئی تھی۔

میں نے اُٹھ کر دروازہ کھولا تو ایک بڑی گاڑھی قسم کی... السلام علیکم نے میرا استقبال کیا۔ سامنے حکیم صاحب کھڑے تھے، بولے۔ "کیا حال ہے جناب! طبیعت تو ٹھیک ہے نا!"

"جی میں بالکل ٹھیک ہوں حکیم صاحب! بڑی گہری نیند آئی۔"

"سات بج چکے ہیں میرا خیال ہے کہ آپ اپنا قارورہ مجھے دے دیں۔ آج میں دوا تیار کر دوں گا۔"

"ہاں! یہ اچھا رہے گا۔ کوئی بوتل دے دیں تو یہ کام کر دوں۔"

"میں نے بوتل غسل خانے میں رکھ دی ہے آپ نہا دھو کر مطب پر آجائیں اور قارورہ ساتھ لیتے آئیں۔"

"ٹھیک ہے جناب! میں بس آٹھ بجے تک دکان پر آجاؤں گا۔"

"میں مطب پر جا رہا ہوں کسی چیز کی ضرورت ہو تو اپنی ہمشیرہ سے کہہ دیں کشور بندوبست کر دے گی۔ روزہ تو آج ہم میں سے کوئی بھی نہ رکھ سکا۔ جب آنکھ کھلی تو صبح ہو چکی تھی۔" یہ کہہ کر وہ لوٹنے لگے۔

"آپ فکر نہ کریں۔ میری ضرورتیں ہی کیا ہیں؟" یہ کہہ کر میں نے تولیہ اٹھا لیا۔ حکیم صاحب خراماں خراماں چلتے ہوئے گلی میں نکل گئے تو میں غسل خانے میں جا گھسا۔ ایک سفید رنگ کی صاف ستھری بوتل وہاں موجود تھی اور میرے قیمتی قارورے کو حکیم صاحب بہت اہمیت دیتے تھے۔

میں غسل خانے سے نہا کر کمرے میں آیا تو کشور ناشتہ میز پر رکھ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بڑے دلفریب انداز میں ماتھے پر ہاتھ رکھ کر آداب بجا لائی اور کھنکتے ہوئے مسرور لہجے میں بولی۔ "کنیز ناشتہ لائی ہے۔"

"اتنا ڈھیر سارا ناشتہ! اور آپ کو معلوم ہے کہ ہم بیمار ہیں اور آج سے ہمارا علاج شروع ہو جائے گا۔"

"علاج تو آپ کا میں کروں گی۔ ایسا علاج کہ پھر کبھی آپ بیماری کا نام ہی نہیں لیں گے۔" یہ کہہ کر وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ "بیٹھ کیا گئی" وہ کرسی اس کے وجود سے سج گئی۔ اس کی گوری ایسی گردن کا چنبر بھی نبضوں کی زد میں دھڑکتا نظر آتا تھا۔

"کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی؟ یہ لوگ ٹھیک وقت پر جاگے؟"

"ہاں خیریت ہی رہی حکیم صاحب البتہ کسلمندی کا شکوہ کر رہے تھے۔ اس دوا سے ایسا تو ہوتا ہی ہے۔"

"اب کیا سوچا ہے آپ نے۔ کچھ بات کی آپ نے پاکیزہ سے؟"

"مجھے ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ زلیخا نے خود صبح صبح ادھر آکر پاکیزہ سے کہا ہے کہ وہ آج رات چوہدری صاحب کو یہاں بلا لے۔"

"یہ تو بہت اچھا ہوا۔ معلوم ہوتا ہے اُن دونوں میں بڑی چھن رہی ہے۔"

"ہاں! عشق نے دونوں کو باندھ لیا ہے۔"

"اور در دلِ معشوق اس کا اثر زیادہ ہے، یہی بات ہے نا؟"

"ہاں! زلیخا تو کچھ زیادہ ہی ریشہ خطمی ہو رہی ہے۔ طے یہ پایا ہے کہ چوہدری صاحب کو آج رات گیارہ بجے یہاں بلا لیا جائے گا۔ پاکیزہ نے یہی کہا ہے۔"

"بس ٹھیک ہے میں کیمرے کا بندوبست کر لیتا ہوں۔ اس کے لیے وزیر آباد جانا پڑے گا۔"

"آپ ناشتہ کریں میں اوپر جا رہی ہوں میرا یہاں زیادہ دیر بیٹھنا ٹھیک نہیں ہے۔" یہ کہہ کر کشور نے باہر جھانکا اور پھر بولی۔ "وزیر آباد سے جلدی لوٹ آئیں میں دوپہر کا کھانا تیار کر رکھوں گی۔" یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدم اُٹھاتی باہر نکل گئی۔

رقم اس کے پوٹے میں اُتر چکی تھی اور اپنا اثر دکھا رہی تھی۔ ایک فزوں تر مسرت اس کے انگ انگ سے ہویدا تھی۔ وہ جو کسی نے کہا ہے کہ عورت کی ہاں اور نہیں میں بال برابر فاصلہ نہیں ہوتا تو وہ بات کشور پر بھی صادق آتی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد میں نے بوتل ایک اخبار میں لپیٹ کر ہاتھ میں لی اور بریف کیس اٹھا کر باہر نکل آیا۔ میرے سامنے ایک بڑا روشن اور چمکیلا دن تھا اور رات میرے عقب میں اپنی تمام تر سیاہیوں سمیت وقت کے بہتے دریا میں گھل گئی تھی مگر مجھے محسوس یہ ہو رہا تھا کہ میں لحظہ بہ لحظہ ضائع ہوتا جا رہا ہوں۔ جرم کی راہ پر پہلا قدم رکھ دینے کے بعد مراجعت میرے لیے ناممکن ہو گئی تھی۔ مجھے بھرپور احساس ہو رہا تھا کہ میں کرائے کے قاتل کی حیثیت سے وہاں پہنچا تھا۔ مجھے ایک جان لینی تھی اور ایک جان بچانی تھی۔ آپی کے بغیر میں آدھا رہ گیا تھا۔ اگر میں یوں کہوں کہ میں خود کو پر بریدہ سا محسوس کر رہا تھا تو یہ بات زیادہ صحیح ہوگی اور اب جو کام میرے ذمے ڈھلوں صاحب نے اس نئی سودے بازی کے نتیجے میں لگایا تھا۔ وہ میں نہ چاہنے کے باوجود کر گزرنے پر مجبور تھا کیونکہ آپی ایسے شکنجے میں جکڑا جا چکا تھا جس کے دانت آہستہ آہستہ اپنے ہدف پر آتے ہیں اور پھر اس کی ہڈیوں کا گودا تک کھینچ کر نکال دیتے ہیں۔ اپنی اس بے تدبیری پر بھی مجھے ندامت محسوس ہو رہی تھی۔ میں ڈھلوں صاحب کے پاس یوں جا پہنچا تھا جیسے

کوئی بچہ گلی میں پٹ پٹا کر ماں کی گود میں جا گرتا ہے۔ میرا رویّہ ایسا ہی تھا۔ حالانکہ مجھ پر لازم تھا کہ میں وہیں کراچی میں رہ کر اپنی تمام قوتوں کو بروئے کار لا کر آپی کی رہائی کے لیے ہاتھ پیر مارتا۔ مگر میں تو شاید مٹی کا مادھو بن چکا تھا۔ صاف سیدھی راہ پر تو بچہ بھی چل لیتا ہے۔ ذرا سی وہ مشکل میرے سامنے آئی اور میں حواس باختہ ہو کر وہاں سے نکل بھاگا۔ اور مجھے یقین تھا کہ آپی مجھے اور میری کم ہمتی کو کسی حوالات کی آہنی سلاخوں کے پیچھے بیٹھا کوس رہا ہوگا۔ خدا خدا کر کے تو میں آسیہ کو جیل کے محبس سے نکال لایا تھا کہ اب میرا بازو اس مگرمچھ کے منہ میں پھنس گیا تھا جس کی کوئی کلید میرے پاس نہیں تھی۔

میں بڑی بے دلی سے قدم اٹھاتا ہوا گلی سے نکلا اور بازار میں جا پہنچا۔ اپنے مقصد پر آدمی کا یقین متزلزل ہو جائے تو اس کے قدم بھی ڈگمگاتے رہتے ہیں۔ میرا بھی یہی حال تھا۔ بازار میں بچھی وہ ناہموار۔۔۔ اینٹیں میرا توازن بگاڑتی تھیں اور میرے ذہن پر دھند سی چھانے لگی تھی۔ وہ تر و تازگی جو گزشتہ کل میرے وجود میں ہلکورے لے رہی تھی آج روز عنقا ہو گئی تھی۔

حکیم عبدالرشید آرزو نے مجھے سامنے دیکھا تو مسکرا دیے، بولے۔ "آئیے آئیے جناب بڑی دیر کر دی آپ نے بوتل لے آئے ہیں؟"

"ہاں یہ لیں، یہ تازہ کشید ہے۔ اگر میں بھارت میں ہوتا تو اس کے بڑے دام مل سکتے تھے۔" میں نے ان کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

حکیم صاحب ہنس دیئے، بولے۔ "ان کی کیا بات ہے جناب! وہ تو اس میں بھی صحت تلاش کر لیتے ہیں۔ ویسے آیورویدک والے ایسے کرم کُش بتاتے ہیں۔" حکیم صاحب نے سفید بوتل کو روشنی کے رخ پر رکھ کر غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

چند لمحوں تک وہ کسی گہری فکر میں ڈوبے رہے پھر ان کی نظر میرے چہرے پر آ رکی مگر وہ بولے کچھ نہیں۔ شاید وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ رہے تھے۔ انھوں نے ایک بار پھر بوتل کو اچھی طرح دیکھا اور اسے میز پر سے اٹھا کر دکان کے عقبی حصے میں چلے گئے۔ وسط میں ایک پردہ لٹک رہا تھا۔ قارورہ کا معائنہ کچھ زیادہ ہی معنی خیز ہو گیا تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی تفتیشی پولیس افسر کی طرح بوتل پر لگے میری انگلیوں کے نشان پہچاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ سگریٹ کی طلب نے مجھے بے چین کر رکھا تھا مگر رمضان کا احترام میرا ہاتھ روکتا تھا۔ میں گم صم سا ہو کر وہاں بیٹھا اس ویران بازار کو تکتا رہا جس میں دکاندار ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے تھے۔

حکیم صاحب کوئی پانچ منٹ بعد پردے کے پیچھے سے برآمد ہوئے بوتل اب بھی ان کے ہاتھ میں تھی۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے کرسی پر آ بیٹھے اور کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولے۔ "معلوم یہ ہوتا ہے جناب کہ آپ کے جسم میں صرف ایک ہی گردہ موجود ہے۔"

ان کی یہ بات سن کر میں اندر سے منجمد ہو کر رہ گیا۔ اس حکیم نے مجھے ششدر کر دیا تھا۔ میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ ایک اُجڑے ویران بازار میں بیٹھا معمولی سا حکیم جو شربت شیرازی کا چلا رہا تھا اپنے فن میں ایسا یکتا بھی ہو سکتا ہے کہ میرا جسمانی معائنہ کیے بغیر میری ساری کیفیت کو یوں بوجھ لے گا۔ میں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ "یہ آپ۔۔۔ کیسے کہہ سکتے ہیں حکیم صاحب!"

وہ مسکرا دیے، بولے۔ "محرکِ عضلات اور محلّلِ اعصاب دوائیں سے ہم بہت سے نتائج اخذ کر سکتے ہیں۔ رات میں نے آپ کے کھانے پر ایسی ہی دوا شامل کر دی تھی۔ اب جو میں نتیجہ دیکھتا ہوں تو پیشاب کا ایک ہی رنگ اور ایک ایسی مفرد علامتیں یہی بتاتی ہیں کہ آپ کا صرف ایک ہی گردہ کام کر رہا ہے۔ دوسرا ناکارہ بھی نہیں ہے۔ اگر وہ ناکارہ ہوتا تو اس میں سے رِس کر آنے والا قارورہ کوئی اور ہی رنگ لیے ہوتا۔"

"میں اس تشریح کے لیے آپ کا ممنون ہوں مگر آپ کس نتیجے پر پہنچے ہیں؟"

"میرا یہ خیال ہے کہ آپ کے جسم میں دوسرا گردہ موجود ہی نہیں ہے۔" حکیم صاحب نے قطعی فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"آپ کا خیال بالکل درست ہے حکیم صاحب! میرے دوسرے مرض کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"وہ آپ کے وہم کا نتیجہ ہے، ورنہ آپ ہر لحاظ سے تندرست ہیں مگر یہ بتائیں آپ کا دوسرا گردہ کیا ہوا؟"

"وہ ناکارہ ہو گیا تھا۔ ڈاکٹروں نے آپریشن کر کے نکال دیا۔ بہت عرصے پہلے کی بات ہے۔" میں نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

حکیم صاحب اپنے فن میں بلاشبہ یکتا تھے اور ان کے بارے میں جو رائے میں نے پہلے قائم کی تھی اس پر مجھے سخت ندامت ہو رہی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ میں آپ کے لیے دوا تیار کر دیتا ہوں اس کا نتیجہ بھی دیکھ لیں گے۔" یہ کہہ کر وہ نسخہ لکھنے لگے۔

ابھی وہ ہوالشافی ہی لکھ پائے تھے کہ تین آدمی دکان کے سامنے آ ٹھہرے۔ وہ تینوں بہت عمدہ قسم کا موسم کے مطابق لباس پہنے ہوئے تھے۔ دو کے کندھوں پر پستول لٹک رہے تھے اور ان کے زانوؤں تک لمبے کرتوں کے نیچے سفید براق شلواریں ان کی خوشحالی اور بے فکری کا پتہ دیتی تھیں۔

"آئیے چوہدری خیرات محمد جی! آئیے آئیے۔" حکیم صاحب کرسی پر سے اچھل گئے۔

"آپ کا کیا حال ہے رحمت علی صاحب! اب تو آپ ماشاءاللہ بہت بہتر نظر آ رہے ہیں۔" حکیم صاحب نے باری باری ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ میری نظریں چوہدری رحمت علی کے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔ مجھے توقع ہی نہیں تھی کہ اس سے وہاں یوں میری ملاقات ہو جائے گی۔ اس نے بھی نظر میرے چہرے پر ڈالی تو زینے پر سے اٹھتا ہوا اس کا قدم زینے پر آ کر لڑکھڑا گیا۔ اس نے خود کو سنبھالنے کے لیے حکیم صاحب کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا اور پھر مجھے بڑے غور سے دیکھتا ہوا وہ حکیم صاحب کے دائیں ہاتھ رکھی کرسی پر جا بیٹھا۔ اس کی آنکھوں میں یادوں کا ہجوم ابھر آیا تھا مگر مجھے یقین تھا کہ وہ مجھے پہچان نہیں سکے گا لیکن اس کے چہرے کی بدلتی رنگت میرے اس یقین کی نفی کر رہی تھی۔

"کیا بات ہے چوہدری صاحب! کیا دیکھ رہے ہیں؟ انھیں جانتے ہیں آپ؟"

"آں۔۔۔ جی۔۔۔ جی نہیں! میں نے انھیں کہیں۔۔۔ شاید پہلے بھی دیکھا ہے۔" رحمت علی نے بڑے ہی غیر یقینی لہجے میں کہا۔

"ان کا نام بزرگوار خان ہے یہ میرے پاس علاج کے لیے میانوالی سے آئے ہیں۔"

"ہوں۔۔۔ خیر۔۔۔ ہماری دوا تیار ہے؟"

"جی ہاں! آپ کا یرقان تو معمولی سا تھا۔ اب تو اعضائے رئیسہ کی تقویت کے لیے میں نے دوا تیار کی ہے، بڑی رقم خرچ ہو گئی ہے اس نسخے پر۔"

"رقم! مثلاً کتنی؟"

"اس میں طلائی ورق ڈالنے پڑے ہیں۔ یہی کوئی سو روپے کی دوا بنی ہے آپ کے لیے اور اس میں میرا حق الخدمت شامل نہیں ہے۔" یہ کہہ کر حکیم صاحب نے الماری میں سے ایک بڑی سی بوتل نکال کر رحمت علی کے سامنے رکھ دی۔ بولے۔ "یہ پندرہ دن کی دوا ہے اس کو کھا کر آپ چاہیں تو ایک اور شادی کر سکتے ہیں۔"

"کہاں حکیم صاحب! یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا۔۔۔" رحمت علی نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ برابر میرے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔

"یہ تو میں مذاقاً کہہ رہا تھا جناب! میرا مقصد یہ ہے کہ آپ کے دل، جگر اور معدے کا فعل درست ہو جائے گا اور آپ بدن میں نئی طاقت محسوس کریں گے۔"

"کہاں ٹھہرے ہیں یہ آپ کے مہمان مریض! ان کی صورت مجھے بڑی شناسا سی لگتی ہے۔" رحمت علی نے پوچھا۔ وہ اب تک میرے بارے میں سوچ رہا تھا۔

"یہ میرے ہی غریب خانے پر ٹھہرے ہیں۔ پندرہ دن یہاں رہیں گے، ان کے گردے کا فعل خراب ہو رہا ہے۔"

رحمت علی کے ذہن کو میں اچھی طرح پڑھ رہا تھا۔ اس کے حافظے پر میری تصویر بار بار ابھر رہی تھی۔ اس نے مجھے بس ایک ہی بار دیکھا تھا اور وہ بھی یوں کہ جب میں نے گھوڑی کو موڑ کر اس کی گردن پر ہاتھ ڈالا تھا تو اس کی دہشت زدہ آنکھوں میں میری تصویر دھندلا گئی تھی۔ ایک لمحے کی تو مہلت تھی نہ۔ مگر پھر بھی وہ اس ایک لمحے میں سموئی ساری اذیت ناک صورتِ حال کو اب تک حافظے میں دہرائے پھرتا تھا لیکن مجھے میرے اصلی رنگ میں وہ ابھی تک پوری طرح پہچان نہیں پایا تھا۔

"ان کا تعارف نہیں کرایا ہے آپ نے حکیم صاحب؟" میں نے جوابی حملہ شروع کر دیا۔ اس کی نظروں کے برمے سے بچنے کا یہی ایک طریقہ باقی رہ گیا تھا۔

"یہ چوہدری رحمت علی ہیں۔ ادھر پتوکی سے آئے ہیں۔ چوہدری خیرات محمد کے عزیز ہیں، ان کے ہاں ہی ٹھہرے ہوئے ہیں۔۔۔ انھیں کچھ عرصے پہلے یرقان ہو گیا تھا۔"

"وہ بھی اچھا مرض ہے۔ اس میں آدمی کا رنگ سرسوں کے پھول ایسا ہو جاتا ہے اور وہ زیادہ خوبصورت نظر آتا ہے۔" میں نے رحمت علی کو عمداً اکسایا۔

وہ مسکرا دیا۔ میری بات کا اس نے بُرا نہیں منایا، بولا۔ "مرض اچھے بھی ہوتے ہیں، یہ میں نے آپ ہی سے سنا ہے۔"

"کئی مرض ایسے ہی ہوتے ہیں جناب جو آدمی جان بوجھ کر خرید لیتا ہے۔ مثلاً عشق کا مرض۔ آدمی چاہتا ہے کہ وہ کبھی اچھا نہ ہو، اور جس قصبے کے نام پر اس کا دل زور سے دھڑکے وہ وہیں کا ہو کر رہ جائے کہ اس کی زلیخا وہاں رہتی ہے۔" میں نے رحمت علی کو ایک اور کچوکا دیا۔ وہ سٹپٹا گیا۔

اس کا رنگ ایک دم بدلنے لگا۔ تیزی سے بولا۔ "آپ کو باتیں بنانا تو خوب آتی ہیں۔ آپ بھی غالباً کسی ایسے ہی مرض میں گرفتار ہو کر یہاں آئے ہیں۔"

"آپ بھی ہے آپ کی مراد میں سمجھ نہیں سکا۔ کیا میرے سوا آپ نے اور بھی کوئی یہاں دیکھا ہے؟ جو کسی زلیخا کے لیے یہاں آ بیٹھا ہو؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

خیرات محمد بھی ہماری طرف متوجہ ہو گیا، بولا۔ "بھئی آپ کی باتیں تو بہت ہی پُرلطف ہیں۔ یہ کس یوسف زلیخا کا ذکر کر رہے ہیں آپ اس ماہِ رمضان میں۔۔۔ لاحول پڑھیں۔ اس مہینے میں تو سنا ہے شیطان کو قید کر لیا جاتا ہے۔"

"جی ہاں آپ نے ٹھیک سنا ہے مگر اسے قید کر کے سو ہدرہ جیل میں ڈال دیا جاتا ہے۔"

رحمت علی کا رنگ کچھ زیادہ ہی بدلنے لگا تھا۔ اسے میری ذومعنی باتوں نے پریشان کر دیا تھا۔ وہ زلیخا کے لیے ہی وہاں بیٹھا تھا۔ تیزی سے بولا۔ "یہ لیں حکیم صاحب! یہ دوائی کی قیمت رکھ لیں اور ہمیں اجازت دیں میرا خیال ہے کہ میں کل صبح گاؤں چلا جاؤں گا۔"

"جی بہتر! بس دوا باقاعدگی سے کھاتے رہیں جب ختم ہو جائے

تو مجھے بتا دیں۔" حکیم صاحب نے نوٹ گن کر جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

"میرے لیے بھی کوئی ایسی توانائی کا نسخہ تیار کر دیں حکیم صاحب! اس عمر میں تو انجن کی اوور ہالنگ بہت ضروری ہو جاتی ہے۔" خیرات محمد نے بڑے ہی باغ و بہار لہجے میں کہا۔

حکیم صاحب کھلکھلا کر ہنس دیے۔ بولے "میں حاضر ہوں جناب! جب کہیں میں نسخہ تیار کر دوں گا۔"

"میں بھی اب شرعی گنتی پوری کر کے رہوں گا آپ تین تک پہنچے ہیں تو میں کیوں پیچھے رہوں ... کیوں چوہدری کیا خیال ہے تیرا؟" خیرات محمد نے ٹھٹھے پر بہنچ کر کہا۔

"آں ... ہاں! چلیں اب دھوپ تیز ہو گئی ہے۔" یہ کہہ کر رحمت علی دکان سے اتر گیا مگر اس کے چہرے پر عجیب سا دھواں چھا گیا تھا۔ دو قدم آگے جا کر اس نے ایک بار پھر مجھے غور سے دیکھا۔ اور سر کو غیر اضطراری انداز سے جھٹک کر آگے نکل گیا۔ اس کا حافظہ اس کا ساتھ نہیں دے رہا تھا مگر پھر بھی شک کا نسر اس کے ذہن کی منڈیر پر آ بیٹھا تھا۔

وہ تینوں نظروں سے اوجھل ہوئے تو حکیم صاحب بولے "معلوم ہوتا ہے چوہدری رحمت علی نے آپ کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔"

"ہو سکتا ہے۔ میں تو اس دنیا میں بہت عرصے سے موجود ہوں اور مخفی بھی نہیں رہتا۔"

"ہاں آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ آپ اب آرام کریں گھر جا کر۔ میں دوپہر تک دوا تیار کر کے لے آؤں گا۔ کوئی دقت تو نہیں ہے آپ کو؟"

"جی نہیں! آپ کے گھر والے میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ میری وجہ سے بھابی کشور نے پردہ کرنا بھی چھوڑ دیا ہے۔"

"وہ پردے کی ویسے بھی زیادہ پابند نہیں ہے اور اسے معلوم ہے کہ میرے مہمان کے لیے اسے کیا کرنا ہے وہ بہت سمجھ دار اور سلیقہ شعار عورت ہے۔"

"میری رائے بھی یہی ہے آپ واقعی بہت خوش قسمت ہیں۔"

"اللہ کی دین ہے۔ پہلی دو تو بس ایسی ہی ہیں مگر پھر بھی ان کے دم سے گھر میں بڑی رونق ہے اب کیا ارادے ہیں آپ کے؟"

"میں ذرا دیر کے لیے وزیر آباد جا رہا ہوں کچھ چیزیں خریدنا ہیں مجھے دوپہر تک واپس آ جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں اتنے میں دوا بھی تیار کر لوں گا آپ بے فکر رہیں۔ اصل علاج مجھے آپ کے دم کا کرنا ہے۔"

ان کی یہ بات سن کر میں دکان سے نکلا اور بازار میں بڑی احتیاط سے چلتا ہوا گھاٹی سے نیچے اتر گیا۔ مجھے دراصل اس وقت کھلی فضا میں دو گھڑی گزار لینے کی آرزو تھی۔ ایسی فضا میں جہاں پہنچ کر میں اطمینان سے آگے پیچھے کی صورت حال پر غور کر سکتا۔ بریف کیس میرے ہاتھ میں تھا اور جیب میں سگریٹوں سے بھرا پیکٹ بھی۔ مگر پھر بھی میں سگریٹ سلگانے کی ہمت نہ کر سکا۔ حالانکہ اس کی طلب نے مجھے بے چین کر رکھا تھا۔ تلنگے میرے قریب سے گزر رہے تھے۔ مگر میں پیدل چلتا ہوا بڑی سڑک پر جا پہنچا۔ وہ سڑک ... سیدھی سیالکوٹ جاتی ہے اور اس کے دو رویہ اُگے درخت ٹھنڈے سایوں سے آدمی کا استقبال کرتے ہیں۔

میرا ذہن ٹھہر ٹھہر کر رحمت علی کے انجام پر مرکوز ہو رہا تھا۔ مجھے یہ فیصلہ کرنے میں دقت پیش آ رہی تھی کہ رحمت علی کو میں ماروں تو کہاں ماروں؟ اگر میں اسے حکیم صاحب کے مکان میں ہلاک کرتا ہوں تو ایسی صورت میں وہ سب لوگ پولیس کے ملبے چکر میں پڑ جاتے۔ کشور بھی تلی جاتی اور حکیم صاحب بھی۔ ان لوگوں کو ایسے فشار میں مبتلا کر کے مجھے افسوس کے سوا اور کیا ملتا۔ اور پھر سب سے بڑا سوال تو یہ تھا کہ رحمت علی کو آخر جان سے کیوں ماروں؟ کیا اس کی جان لیے بغیر میں آگے نہیں بڑھ سکتا تھا؟ اگر میں اسے چھوڑ دوں اپنی راہ چلنے دوں تو ڈھلوں صاحب کا رویہ کیا ہو گا۔ وہ تو پھر میرے کسی کام نہیں آ سکیں گے اور اس تحفظ سے جو مجھے ان کی وجہ سے حاصل تھا، میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم ہو جاؤں گا۔ یہ سارے خدشے اپنی جگہ پر موجود تھے۔ میں کتنی ہی دیر تک ایک درخت کے نیچے کھڑا سوچتا رہا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ مگر میں کسی بھی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ آبی کی بندھی پھنسی گردن بار بار میرے تصور میں ابھرتی تھی۔

ابھی میں وہاں کھڑا ہی تھا کہ ایک سرمئی رنگ کی کار میرے قریب سے گزری مگر ابھی سو گز آگے نکلی تھی کہ اس کے پچھلے پہیے سے ہوا نکلنے لگی۔ ٹائر ایک دم پھٹا نہیں بلکہ وہ آہستہ آہستہ بیٹھنے لگا۔ کار کی رفتار مدھم ہو گئی اور پھر کچھ دور جا کر وہ ایک دم رک گئی۔ کار میں سے ایک ادھیڑ عمر کا آدمی باہر نکلا۔ وہ کسی بڑے صاحب کا اردلی معلوم ہوتا تھا۔ وردی اس کی ویسی ہی تھی۔ اس نے کار کے بیٹھے ہوئے پہیے کو دیکھا اور پھر ڈگی کھول کر اس میں سے اس نے ایک پہیہ نکال لیا۔ جب اس نے سہارا دے کر کار کے ناکارہ پہیے کو باہر نکال لیا تو عین اس وقت میرے ذہن میں بجلی کے کوندے کی طرح ایک خیال ابھرا اور میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا کار کے پاس جا پہنچا۔ وہ آدمی اس وقت نیا پہیہ چڑھا رہا تھا۔

"کیا ہوا ہے میاں جی؟" میں نے اس کے پاس پہنچ کر بڑے رسان سے پوچھا۔

"یہ کچھ نہ پوچھو بابو جی! یہ سالی گاڑی بہت خراب کر رہی ہے۔ دوسرا ٹائر بدلا ہے میں نے۔ ادھر راہوالی کے قریب اگلا پہیہ اڈا

رہ گیا تھا۔"

"گرمی بھی تو بہت ہے نا! کہاں جانا ہے آپ کو؟"

"میں ادھر سیالکوٹ جا رہا ہوں۔ ہمارے صاحب کے بیوی بچے وہاں گئے ہوئے ہیں ان کو لینے جا رہا ہوں۔"

"اچھا اچھا! کیا نام ہے آپ کے صاحب کا؟ گاڑی تو بہت عمدہ ہے آپ کی۔"

"وہ بڑے انجنیئر ہیں مرزا قمر الدین اری گیشن کے محکمے میں کام کرتے ہیں۔"

"اچھا اچھا! یہ بات ہے اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو میں بھی ساتھ بیٹھ جاؤں! میں بھی سیالکوٹ جا رہا ہوں۔"

اس نے پچکا ہوا ٹائر ڈگی میں رکھتے ہوئے مجھے بڑے غور سے دیکھا اور پھر ڈگی بند کر کے بولا "کوئی ہرج نہیں بیٹھ جائیں گاڑی تو خالی ہی جا رہی ہے کیا کام کرتے ہیں آپ وہاں؟"

"میں کالج میں پڑھاتا ہوں مرے کالج میں۔ سفیر احمد ندوی نام ہے میرا۔ انگریزی پڑھاتا ہوں میں وہاں۔"

"اوہ! یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ ہمارے چیف صاحب کا لڑکا عبدالرفیع بھی وہیں پڑھتا ہے۔" اس نے میرے لیے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

میں اندر بیٹھا تو اس نے بڑے مؤدب طریقے سے دروازہ بند کیا اور ڈرائیور کی نشست پر جا بیٹھا۔ رومال سے چہرے کا پسینہ پونچھ کر بولا "آپ تو جانتے ہی ہوں گے انہیں۔ ایف اے میں ہیں وہ۔ بڑا خیال رکھتے ہیں میرا۔ میں دس سال سے مرزا صاحب کی خدمت میں ہوں۔"

"کیا نام ہے آپ کا؟"

"عبداللہ نام ہے جی میرا۔ اس گاڑی کی نوکری کرتا ہوں۔ مرزا صاحب آج کل لاہور میں ہیں۔ بڑے ہی نیک دل انسان ہیں۔"

"ہاں! اچھے لوگ سب جگہ اچھے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔" میں نے کار کی پچھلی نشست پر اس کے عین عقب میں پھیل کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

گاڑی سبک رفتار تھی اور حالت اس کی نئی ایسی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس کی نشستوں پر سرخ مخمل چڑھی تھی۔ جو آنکھوں کو بھلی معلوم ہوتی تھی اور میری نظر اس کار پر تھی۔ مجھے اس رات ایک ایسی ہی تیز رفتار سواری کی ضرورت تھی تاکہ میں اپنا کام مکمل کر کے وہاں سے جتنی جلدی ممکن ہو نکل بھاگوں۔

عبداللہ نے گاڑی کوئی دو میل آگے نکالی ہو گی کہ میں نے بریف کیس میں سے پستول نکال کر اگلی دو نشستوں کے بیچ میں سے ہاتھ آگے بڑھایا اور نال اس کی پسلی سے لگا دی۔

"گاڑی بائیں ہاتھ موڑ لو میاں جی اس گاؤں کی طرف۔" میں نے بائیں ہاتھ آگے مکئی کے کھیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ عقب نما میں عبداللہ کا چہرہ دیکھ کر مجھے ہنسی آنے لگی۔ دہشت نے اس کی صورت کچھ یوں یکلخت بگاڑ دی تھی کہ اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔ نتھنے پھول گئے تھے اور ماتھے کی شکنیں گہری ہونے لگی تھیں۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے اسٹیئرنگ کو گھما کر گاڑی بائیں ہاتھ کچے پہیے پر ڈال دی۔ دھول کا ایک طوفان سا اٹھ کر ہمارا تعاقب کرنے لگا۔

وہ ہکلاتے ہوئے بولا "یہ ... یہ ... تم تو کہتے تھے کہ میں پروفیسر ہوں۔"

"تمھیں اس میں کوئی شک ہے کیا؟" میں نے نال اس کی پسلی میں دھنساتے ہوئے کہا۔

"یہ ... یہ پروفیسر لوگ اس طرح بھی کر لیتے ہیں؟ مجھے کہاں لے جا رہے ہو تم؟"

"ادھر گاؤں میں لے جا کر تمھارا عقیقہ کروں گا۔ ابھی تمھاری عمر چالیس سال سے تو کم ہی ہو گی۔"

"مذاق نہ کرو مجھ سے۔ میں نے کیا بگاڑا ہے تمھارا؟ مجھے فوراً سیالکوٹ پہنچنا ہے مرزا صاحب کی بڑی بچی لاہور میں بیمار ہے۔"

"اللہ اسے شفا دے گا میاں۔ تم یا میں بھلا کیا کر سکتے ہیں؟ کہ کر سکتے ہیں؟ آدمی تو بالکل بے بس ہے اس دنیا میں۔" میں نے اس کے پیلے چہرے کو عقب نما میں دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ بری طرح سہما ہوا تھا۔ اور اب گاڑی اس سے سنبھالے نہیں سنبھلتی تھی۔ وہ ہچکولے کھا رہی تھی۔ راستہ بہت ہی ناہموار تھا۔ اس نے گیئر بدلتے بدلتے اچانک اپنا بایاں ہاتھ اتنی تیزی سے اپنی پسلی پر رکھ کر پستول کی نال کو پرے ہٹا کر اپنی طرف کھینچا کہ پستول ہم دونوں کے ہاتھ سے چھوٹ کر دو نشستوں کے بیچ میں گر گیا۔ اس نے ایک ہاتھ سے گاڑی روکی اور بائیں ہاتھ سے پستول پکڑنا چاہا۔ اس کا ہاتھ جیسے ہی پستول پر پڑا میں نے اپنا بایاں ہاتھ اس پر رکھ دیا اور دائیں ہاتھ سے اس کی گردن پکڑ کر اس کی رگِ احساس مسل دینا چاہی مگر اس نے اس عرصے میں اپنی جیب سے گراری دار چاقو کھول کر اس کی نوک کچھ اتنی تیزی سے میرے ہاتھ کی پشت میں چبھوئی کہ اس کی گردن پر سے میری گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ بائیں ہاتھ سے اس نے پستول کا دستہ پکڑ لیا تھا۔ مگر میں نے ابھی تک اسے پستول گاڑی کے فرش پر سے اٹھانے نہیں دیا۔ جیسے ہی اس کی گردن پر سے میری گرفت نرم ہوئی اس نے جھٹک کر اپنا سر پیچھے ہٹایا اور اگلی دونوں نشستوں کے اندر سے چاقو آگے لا کر اس نے میری بائیں کلائی پر مارنا چاہا۔ بہت کاریگر آدمی تھا وہ کسی چیف انجنیئر کا سالا۔

اپنا دفاع کرنا خوب جانتا تھا۔ جیسے ہی اُس نے چاقو آگے بڑھایا، میں نے پچھلی نشست سے ذرا اوپر اٹھ کر اس کی دائیں کلائی پکڑ کر ذرا سا دباؤ جو ڈالا تو کڑک ایسی آواز پیدا ہوئی۔ اس کا جوڑ کھل گیا تھا۔ چاقو اس کی گرفت سے نکل کر نیچے گرا تو میں نے اس کی گھٹی گھٹی چیخ سن کر اس کا بایاں ہاتھ پستول پر سے اٹھا دیا اور پھر اُس کی گردن پر ہاتھ ڈال کر اُسکی رگِ احساس مسل دی۔ وہ بائیں نشست پر جھول کر گرا تو میں نے گردن اور کمر کی پیٹی سے پکڑ کر کار سے باہر نکال لیا۔

چاروں طرف اس گھڑی سناٹا چھایا ہوا تھا۔ دھوپ تیز تھی۔ اتنی تیز کہ چیل نے اس پہر آسمان چھوڑ دیا تھا۔ رمضان کی وجہ سے کسان کھیتوں سے مُنہ موڑ کر یادِ الٰہی میں مصروف رہتے تھے۔ یہ میرا احساس تھا کہ گاؤں کے لوگ دین کی راہ پر زیادہ ... استقامت سے چلتے ہیں۔ وہ نماز روزے کی پابندی اتنی سختی سے کرتے ہیں کہ انہیں واقعی خدا ہمہ وقت اپنی شہ رگ کے قریب محسوس ہوتا ہے۔ جتنی حضوری انھیں حاصل ہوتی ہے شہروں کے لوگ اس کو بس ترستے ہی رہ جاتے ہیں۔ اُن سادہ لوح دہقانوں کی فطرت سے ہم آہنگی ہر کسی کو حیران کرتی ہے مگر اس روز ارد گرد پھیلے کھیتوں پر جو ہُو کا عالم طاری تھا اس سے میں یہی نتیجہ اخذ کر سکا تھا کہ خدا کی خوشنودی کے حصول کے لیے سب کے سب کسی اور طرف نکل گئے ہیں۔ وہ شخص جو نماز روزے کی پابندی نہیں کرتا کیسے دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہ خدا پر ایمان رکھتا ہے۔ یہ دونوں عمل آدمی کے ایمان کے مظہر ہیں۔ اور میرا بُرا ہو میں تو اُن دنوں شاید بدترین حالت میں زندگی گزار رہا تھا پتہ نہیں مجھے قدم قدم پر کون تحفظ دیے جاتا تھا۔

عبداللہ کو گاڑی کی پچھلی نشست پر لٹا کر میں نے اسٹیئرنگ سنبھالا اور پھول سے اَٹے راستے پر گاڑی کو پیچھے ہٹا کر بڑی سڑک پر جا پہنچا۔ میں اس شخص کو یونہی کسی جگہ پھینک کر اپنے لیے کوئی نئی مصیبت پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ایک راستہ تو یہ تھا کہ میں اسے جان سے مار دیتا۔ مگر اس کا میرے پاس کوئی جواز نہیں تھا۔ اپنے مقصد کے حصول کے لیے میں کس کس سر کو گردن سے اتار دیتا۔ میرا ہاتھ اب ایسے موقعوں پر بار بار رُکنے لگا تھا۔ اندر ہی اندر وہ خوں آشام جذبے جو مجھے زندگی کی ہر کونپل کو مسل دینے پر اکساتے تھے مدھم پڑنے لگے تھے۔ اور میں اس کوشش میں رہتا تھا کہ کوئی آدمی اب میرے ہاتھوں جان سے نہ گزرے۔ یہ انقلاب مجھے حیران کرتا تھا۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ میں بُزدل ہو چکا تھا۔۔۔ میرے نزدیک لیے ہی کا مفہوم بدل رہا تھا۔ میں نے گاڑی کی رفتار تیز کی اور اُس کا رُخ سیالکوٹ کی طرف کر دیا۔ عبداللہ کو میں کم از کم ایک دن کے لیے اُس کے حال سے بے خبر رکھنا چاہتا تھا تاکہ مجھے رحمت علی سے اپنے منصوبے کے مطابق نپٹنے کی مہلت مل سکے۔ اگر میں یونہی اُس آدمی کو کسی جگہ پھینک دیتا تو وہ ہوش میں آتے ہی واویلا مچا دیتا اور اس علاقے میں میرا وہ تھوڑا سا قیام صبر آزما ہو جاتا۔ پولیس سڑک کی ناکہ بندی کر لیتی یا مختلف تھانوں کو خبردار کر کے وہ لوگ میری نقل و حرکت کو محدود کر دیتے۔ ان تمام خدشوں سے عاجز آ کر میں عبداللہ کو سیالکوٹ شہر سے بھی آگے لے گیا۔ میرا خیال ہے کہ میں نے اس مصیبت سے چھٹکارا پانے کے لیے کوئی پچاس میل کا سفر طے کر لیا تھا۔ میں پختہ سڑک پر گاڑی دوڑاتا ہوا آگے نکلا تو اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میں نور کوٹ کے قریب جا پہنچا ہوں۔ اسٹیشن پر ایک مال گاڑی کھڑی تھی میرے بس میں ہوتا تو میں عبداللہ کو اس کے کسی ڈبے میں پھینک دیتا۔ مال گاڑی کا رخ ناروال کی طرف تھا مگر اس اُجالے میں اتنے سارے لوگوں کی موجودگی میرا راستہ روکتی تھی۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ کبھی کبھی آدمی پر ایسی غیر یقینی کیفیت طاری ہوتی ہے کہ اس کی قوتِ فیصلہ مفلوج ہو جاتی ہے۔ میرے ذہن پر بھی اُس روز کوئی ایسی ہی دھند چھائی ہوئی تھی۔ میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اس شخص کا کیا کروں۔

ابھی میں نور کوٹ سے کوئی دو میل آگے نکلا تھا کہ سڑک کے بائیں ہاتھ مجھے کھیتوں کے وسط میں ایک کچا کوٹھا نظر آیا۔ میں نے گاڑی وہیں روک دی اور اُس کو مقفل کر کے میں اس کوٹھری کی طرف بڑھا۔ کسی کسان نے کھیتوں کی رکھی کے لیے وہ چھوٹا سا کوٹھا کھیتوں کے وسط میں کھڑا کر رکھا تھا۔ اس کے کیکر کے دروازے پر تالا پڑا تھا۔ اسے میں نے ذرا دبا کر کھینچا تو اُس کا دانت کھل گیا۔ اندر ایک جھلنگا سی چارپائی پڑی تھی جس کے نیچے معمولی قسم کے زرعی آلات دھرے تھے۔ میں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا اور عبداللہ کو کار میں سے نکال کر کندھے پر لادا اور اس کوٹھے کے اندر لے جا کر چارپائی پر ڈال دیا۔ وہ ابھی تک بے سُدھ تھا مگر نبضیں اس کی نہیں ڈوب رہی تھیں اور مجھے یقین تھا کہ وہ اس مشکل مرحلے سے سرخرو ہو کر نکلے گا۔ اُس کی موت سے مجھے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔

جب میں دوبارہ کار میں بیٹھا تو مجھے اپنے وجود کے اندر کی کوئی دیوار بیٹھتی محسوس ہو رہی تھی۔ دہری تنہائی اور اپنی بے بسی اور بے سمتی کا احساس بڑھتا جا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے میں نے اس ڈھلوں کا شکار کا تعاقب کر کے اپنی عاقبت خراب کر لی ہے اور جو سودا میں کر آیا ہوں سراسر خسارے سے اَٹا سودا ہے۔ بڑی بے دلی سے میں نے کار کا رُخ موڑا اور ایک بار پھر سیالکوٹ

کی طرف چل نکلا۔ دل میں وہ لگن نہیں تھی جو کسی ہدف پر جھپٹنے سے پیدا ہوتی ہے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں بیگار میں پکڑا گیا ہوں۔ مجھے آبی کی رہائی کے لیے ڈھلوں کے پاس جانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ ایک جان لے کر ایک جان بچا لینا کوئی بہادری کی بات نہیں تھی مگر اب تو میں اس دلدل میں دھنس چکا تھا۔ مجھے اگلا مرحلہ بہر حال اب طے کر ہی لینا چاہیے تھا۔ جب میں دوبارہ سوہدرہ پہنچا تو دن کا ایک بج رہا تھا اور مجھے بھوک نے بے چین کر رکھا تھا۔ حکیم صاحب کی دکان اُس وقت بند تھی۔ وہ قیلولے کے لیے شاید گھر جا چکے تھے۔ میں نے گاڑی بازار میں سے گزاری اور اسکول کے احاطے کے عقب میں سے ہوتا ہوا اس رُخ پر جا پہنچا جہاں سے میں حکیم صاحب کی گلی کے عقبی موڑ پر گاڑی کو محفوظ کر سکتا تھا۔ کار میں نے ایک درخت کے نیچے کھڑی کر کے مقفل کی اور بریف کیس ہاتھ میں لے کر حکیم صاحب کے مکان کی طرف چل دیا۔ میں نے طے یہ کر رکھا تھا کہ رات کو رحمت علی جب ان سے ملنے آئے گا تو میں اُسے دبوچ کر کندھے پر لاد دوں گا اور گلی میں سے گزار کر کار میں ڈال لوں گا۔ میں اسے زندہ سلامت حالت میں ڈھلوں صاحب کے پاس پہنچا دینا چاہتا تھا۔ اسے سوہدرہ میں یا کسی اور جگہ لے جا کر میں خود اپنے ہاتھوں سے مار دینے میں تامل محسوس کر رہا تھا۔ جانے کیا بات تھی۔ میں اس کے خون سے ہاتھ رنگنے سے اس روز بھی گریزاں تھا۔ بلاشبہ وہ ڈھلوں صاحب کا سیاہی زلف تھا۔ اس نے علاقے میں اُن کی بالادستی کو للکار کر اپنے لیے کافی مشکلات پیدا کر لی تھیں۔ لیکن جب سے میں نے یہ سُنا تھا کہ وہ زلیخا کے عشق میں مبتلا ہے تو اس کے انسان ہونے اور دل میں جذبوں کا سیلاب بھرنے کی کیفیت کا اندازہ کر لینے کے بعد اس سے زیادہ ... ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ آدمی جو عورتوں کی محبت میں گرفتار ہو کر اپنا قبلہ بدل لیتا ہے اور اپنے گھر سے دُور کسی جگہ بیماری کا بہانہ کر کے دھونی رما بیٹھا ہے گردن زدنی نہیں رہتا۔ آدمی کسی بھی موسم میں جنم لے اُس کی شکل صورت کچھ بھی کیوں نہ ہو اس کے رگ و ریشے کی ... ساخت کتنی ہی سخت کیوں نہ ہو، اگر وہ صنفِ نازک کے لیے اپنا سینہ کھوٹا کر لیتا ہے دنیاوی دھندوں سے ہٹ کر کسی کا ہو رہتا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ آدمی کمینہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اُس میں آدمی اور گداز قائم رہتا ہے۔ وہ لوگ جو عورت کو محض ایک جھاڑن سمجھتے ہیں اور اُن کو لمحے کی ضرورت سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے بدترین قسم کے شقی القلب لوگ ہوتے ہیں۔ انھیں نہ سورج کا طلوع و غروب منزّہ کرتا ہے نہ چاندنی کا نور اُن کے لیے کوئی معنی رکھتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آدمی کو یونہی کسی دروازے پر سر جھکا کر بیٹھ رہنا چاہیے بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ دنیا کے تمام بڑے بڑے اولوالعزم لوگوں نے زندگی کی راہ میں جو لازوال چراغ جلائے اُن کے پس منظر میں حرکی قوت کسی عورت ہی نے مہیا کر رکھی تھی۔ اور اب جو میں رحمت علی کے بارے میں یہ سُن رہا تھا کہ وہ کسی زلیخا کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر ہو کر یرقان کا بہانہ کر کے سوہدرے میں اتنے دنوں سے خیرات محمد کے ہاں ٹھہرا ہوا ہے تو مجھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ وہ گوشت پوست کا بنا ہوا ایک جان دار آدمی ہے اُسے زندگی کرنے کا سلیقہ آتا ہے۔ یُوں تو ڈھلوں بھی عورتوں کا رسیا تھا مگر اس کا رویّہ بس یہ تھا جیسے کوئی غسل خانے میں لے جا کر تولیے سے بدن خشک کر لے۔ وہ عورت کو تولیے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا۔ اور اس کا یہ رویّہ زندگی کی دُوسری پیچیدگیوں پر بھی حاوی تھا۔ مجھے بھی اُس نے تولیہ ہی سمجھ لیا تھا۔ میں بھی اس کے ہاتھ میں ایک جھاڑن کی حیثیت رکھتا تھا۔ جھاڑن نہ کہیں تو مجھے اس کی گرفت میں آیا ہوا خنجر سمجھ لیں جسے آلۂ قتل کے طور پر وہ استعمال کر رہا تھا۔ جیسے ہی قاتل کا مقصد پورا ہو جاتا ہے وہ اُس آلۂ قتل کو کسی ایسی جگہ پھینک دیتا ہے جہاں سے وہ کبھی برآمد نہ ہو سکے۔ ڈھلوں کے اس وحشیانہ رویّے کو میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں رحمت علی کے سلسلے میں ایک عجیب سی دوہری دھار کے جذبے کا شکار ہو رہا تھا۔ میرا ہاتھ بڑھتا تو تھا مگر میرا بازو اس کا ساتھ نہیں دیتا تھا۔ میرا ذہن کہتا تھا کہ یہ سودا اچھا ہے خرید لو مگر دل اس کی نفی کرتا تھا۔ کرائے کے قاتل تو پتھر کے بنے ہوتے ہیں انھیں کسی بھی مرحلے پر دو دلا نہیں ہونا چاہیے۔ وہ ہو ہی نہیں سکتے ہیں ورنہ وہ اپنے مقصد میں ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں کر سکتے مگر میں کچھ ایسی ہی دو کیفیتوں کے آرے میں لگ کر چرتا جا رہا تھا۔ اور یہ بات میرے لیے حیرت کا باعث تھی میرے اندر کا دبا کچلا آدمی پھر سے سر اٹھانے لگا تھا۔ اگر میں اُسے پھر سے جی اٹھنے کا موقع فراہم کر دوں تو وہ مجھے سیدھا تختۂ دار تک پہنچا دے گا۔ مجھے یہی محسوس ہو رہا تھا۔ کرم آباد کی مسجد میں جو آنسو میں ضبط نہ کر سکا تھا وہ اسی نیم جان شریف آدمی کے آنسو تھے جسے میں پیروں پیر کچلتا چلا آ رہا تھا۔ اور اب میں اُس سے ڈرنے لگا تھا۔ اُس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ تو کسی بھی وقت مجھے مروا سکتا تھا۔ جس راہ پر میں چل رہا تھا وہ ایسی سنگلاخ راہ تھی کہ وہاں کسی ایسے ضمیر خان کو ساتھ نہیں رکھا جا سکتا تھا جو مجھے ہمہ وقت یہ سمجھاتا رہے کہ یہ بات غلط ہے اسے مت کرنا۔

میں نپے تُلے قدم اٹھاتا حکیم صاحب کے مکان پر پہنچا تو دستک دینے پر دروازہ حکیم صاحب ہی نے کھولا۔ مجھے دیکھ کر اُن کا چہرہ کھل اٹھا بولے ”آئیے آئیے کہاں چلے گئے تھے آپ! کھانا بھی ٹھنڈا ہو رہا ہے۔“

”میں ایک کام سے وزیر آباد گیا تھا۔ اگر کھانا زیادہ ہی ٹھنڈا نہ ہو گیا ہو تو لے آئیں۔“

وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر بیٹھک میں داخل ہوئے اور وہیں سے

آواز دے کر بولے "ان کے لیے کھانا لے آئیں کشور! میں بھی ان کے ساتھ ہی کھاؤں گا۔"
جب میں بریف کیس کو الگ رکھ کر کرسی پر بیٹھا تو وہ بولے۔
"میرا خیال ہے چوہدری رحمت علی آپ کو جانتے ہیں۔"
"کیا مطلب؟ وہ کیسے جانتے ہیں مجھے؟" میں نے بڑے محتاط لہجے میں پوچھا۔ معاملہ گڑبڑ ہوتا نظر آتا تھا۔
"آپ جب دکان سے چلے گئے تو چوہدری صاحب دوبارہ میرے پاس آئے تھے اور بہت کرید کرید کر پوچھ رہے تھے۔ مگر میں نے جب انھیں بتایا کہ آپ علاج کے سلسلے میں پہلی بار کسی کے بتانے پر یہاں آئے ہیں تو وہ مطمئن ہو گئے۔"
"مگر وہ کہتے کیا تھے؟"
"انھیں یہ خیال ہے کہ شاید انھوں نے آپ کو پہلے کہیں بہت قریب سے دیکھا ہے۔ مجھے کہہ رہے تھے کہ میں آپ کو اپنے ہاں نہ ٹھہراؤں پتہ نہیں انھیں کیا شک ہے آپ پر۔"
"یہ تو کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ انھیں کسی اجنبی کے بارے میں ایسی باتیں کہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ کہ ہے؟"
"میں نے بھی انھیں یہی کہا تھا۔ دیکھیں نا! آپ تو علاج کے لیے آئے ہیں۔ یہاں کوئی ہوٹل بھی نہیں جہاں آپ ٹھہر سکیں لامحالہ آپ کو جگہ دینا میرا فرض ہے۔"
"آپ کی مہربانی ہے حکیم صاحب لیکن رحمت علی کو شرم آنی چاہیے میرے بارے میں وہ خواہ مخواہ آپ کے دل میں شبہ پیدا کر رہا ہے۔"
"مجھے بھی اس کی یہ بات پسند نہیں آئی۔ میں نے اس کا ذکر کشور سے بھی کیا ہے وہ بھی بہت ناراض ہوئی کہہ رہی تھی کہ آپ ایسے شریف آدمی کے بارے میں کسی کو ایسی رائے دینے کا کیا حق ہے۔ لیں کشور بھی آ ہی گئی۔" انہوں نے دروازے کی طرف دیکھ کر کہا۔
کشور بڑا سا تھال اٹھائے اندر آ رہی تھی۔ اس نے میز پر تھال رکھ کر برتن کھولے تو حکیم صاحب کہنے لگے "میں ان سے رحمت علی کی بات کر رہا تھا وہ ان کے بارے میں خواہ مخواہ ہی ایک رائے دے رہے تھے۔"
"بکواس کرتا ہے وہ پاگل۔ انھیں وہ جانتا تک نہیں اور کہتا ہے کہ آپ انھیں یہاں نہ ٹھہرائیں۔ یہ تو جب تک چاہیں یہاں ٹھہر سکتے ہیں۔ آدمی کی تو پہلی ہی نظر میں پہچان ہو جاتی ہے۔"
"یہی تو میں نے کہا تھا ان سے مگر مجھے لگتا ہے کہ ان کے دل میں کوئی خوف بیٹھا ہوا ہے۔ انھیں تو ان کا یہاں ٹھہرنا اچھا نہیں لگتا۔ کہتا تھا کہ آج ہی میں ان کو یہاں سے چلتا کر دوں۔"
"اس میں کیا ہرج ہے میں وزیر آباد جا ٹھہرتا ہوں۔ اپنی گاڑی بھی میں لے آیا ہوں۔ خراب ہو گئی تھی اور اسے وزیر آباد چھوڑ آیا تھا۔ اب میں اسے یہاں لے آیا ہوں۔"
"اچھا! آپ کے پاس اپنی کار بھی ہے! یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ ہم آج شام اس میں سیر کریں گے کیوں حکیم صاحب۔" کشور نے خوش ہو کر کہا۔
میں اس کی یہ تجویز سن کر اندر سے جز بز ہونے لگا۔ یوں لگا جیسے اس نے میرے عاتے پر خنجر دے مارا ہو۔ "گرمی بہت ہے اور حبس بھی۔ سیر کا مزہ تو صبح سویرے ہی آ سکتا ہے۔ کل سحری کے بعد ہم سیر کے لیے نکل چلیں گے۔" میں نے اپنی جان چھڑاتے ہوئے کہا۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ کل صبح تک تو میں وہاں سے بہت دور جا چکا ہوں گا۔
"چلیں کل ہی سہی۔ میں ان تینوں کو ہیڈ مرالہ دکھا لاؤں گا کیا خیال ہے نمبر تین!" حکیم صاحب نے مجھے آنکھ مار کر کہا۔
"یہ آپ مجھے نمبر تین نہ کہا کریں حکیم صاحب! لگتا ہے کل کلاں کو آپ مجھے نمبر دس بنا دیں گے۔"
"ہاں! یہ تو اور بھی اچھا ہے۔ دس نمبری لوگ تو بڑے نامی گرامی ہوتے ہیں کیوں خان صاحب!"
"ہاں! یہ تو ہے اور میرا خیال ہے کہ آپ مزید سات آٹھ شادیاں تو ضرور ہی کریں گے۔ پھر بھی ان کا نمبر تو تین ہی رہے گا سینیارٹی کے لحاظ سے۔"
"آپ بھی ان کے ساتھ مل گئے ہیں خان جی! چار سے زیادہ کی اجازت کہاں ہے۔"
"کچھ عملہ نکال کر نیا بھرتی کیا جا سکتا ہے۔ یہ نہ ہو تو باندیاں رکھی جا سکتی ہیں کیا خیال ہے خان صاحب!" حکیم صاحب نے ایک نوعمر مرغے کی ٹانگ پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔ میرے لیے انھوں نے کھانے میں خاصا اہتمام کر رکھا تھا اور حکیم صاحب اس پر بڑھ بڑھ کر ہاتھ مار رہے تھے۔
"ہاں صاحب! اللہ توفیق دے تو آبادی بڑھانے کے لیے باندیاں جتنی بھی چاہیں رکھی جا سکتی ہیں، کارِ ثواب ہے۔" میں نے ان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔
"ہاں ہاں! مردوں کے لیے بس یہی تو ایک آزادی ہے۔ دین کی اسی بات پر تو وہ عمل کرتے ہیں باقی تو سارے فرض انہیں معاف ہیں مگر ادھر چوتھی آئی نہیں کہ میں نے حکیم صاحب کو کوٹھے سے پھینکا نہیں۔ پہلے ہی میرے ساتھ کافی فراڈ ہو چکا ہے۔" کشور نے آنکھیں نچلاتے ہوئے کہا وہ میرے سامنے ہی تپائی پر بیٹھ کر گلاسوں میں پانی ڈالنے لگی تھی۔
اس کی یہ بات سن کر حکیم صاحب کھلکھلا کر ہنس دیے، بولے "میں نے آپ کے ساتھ کیا فراڈ کیا ہے بیگم سوئم! واللہ ذرا سی محبت ہی تو کی ہے اور نان نفقے کی آپ حقدار ہو گئی ہیں ساری عمر کے

"ہاں! یتیم خانہ کھول رکھا ہے نا آپ نے۔ آپ کے ہمسائے کو نہیں روزگار ہی دیتی ہوں۔ اس نے ہی بتایا تھا بلکہ تصدیق کی تھی کہ آپ ماشاءاللہ ہنوز کنوارے ہیں۔ پتہ نہیں تھا کہ دو سالم عورتیں پہلے ہی ہضم کر چکے ہیں۔" کشور نے بڑے کٹیلے لہجے میں کہا۔
"دفع کریں۔ اب گلا شکوہ کس کام کا۔ ویسے اچھا ہے گھر میں رونق لگی رہتی ہے۔" میں نے بیچ بچاؤ کراتے ہوئے کہا۔
کشور سنجیدہ ہونے لگی تھی۔ "ابھی رونق ہے کسی کو بھی ڈھنگ کی روٹی نصیب نہیں اور حکمت ان کی دھری رہ جاتی ہے اور بن بیٹھے ہیں زبدۃ الحکماء۔ بورڈ دیکھا ہے آپ نے ان کا؟"
"اس پر بس ایک ہی کمی ہے۔ اس بورڈ پر۔" میں نے فرنی کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔
"وہ کیا؟ یعنی بورڈ پر اور کیا لکھوانا چاہیے مجھے؟" حکیم صاحب نے چونک کر پوچھا۔
"جس طرح ایک آدمی نے دروازے پر اپنے نام کی تختی کے ساتھ ایم اے لکھوایا جس سے پتہ چلتا تھا یہ شخص ایم اے کر چکا ہے مگر چھ ماہ بعد کسی نے تختی پر ایم اے کی جگہ بی اے لکھا ہوا دیکھا۔ اس نے رک کر پوچھا یا حضرت! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟ تو وہ صاحب بولے جناب! دراصل ایم اے سے میری مراد تھی کہ میں ’’ریڈی میریڈ‘‘ یعنی کہ میں پہلے ہی شادی شدہ ہوں مگر اب بیوی کو طلاق دینے کے بعد میں نے بی اے لکھ دیا جس کا مطلب ہے بیچلر اگین۔"
اس پر کشور کھلکھلا کر ہنس دی، بولی "یہ کبھی بی اے نہیں ہو سکتے۔ ان کو تو بورڈ پر لکھوانا چاہیے حکیم عبدالرشید آرزو دو زخمی زبدۃ الحکماء تین دفعہ کے شادی شدہ، مزید شادی کا بھی ارادہ ہے۔"
"بس بس میں یہی کہنے والا تھا۔ یہی کمی ہے اس بورڈ میں۔"
"یہ سراسر زیادتی ہے صاحب! ہم تو دینِ متین کی مصلحت کے مطابق عمل کرتے ہیں اور اس راہ پر صدق دلی سے قائم ہیں گے۔ کوئی ہمارا ہاتھ نہیں روک سکتا۔"
"دیکھ لوں گی سمجھ لوں گی میں آپ پہ تیل چھڑک کر آپ کو تیلی نہ دکھا دوں گی۔ کوئی گائے بھینسیں ہیں عورتیں آپ کے لیے!" کشور نے آنکھیں لال پیلی کرتے ہوئے کہا۔
حکیم صاحب ایک بار پھر قہقہہ لگا کر بولے "آگ تو پہلے ہی لگا رکھی ہے آپ نے وہی بجھ جائے تو بہت کافی ہے بیگم نمبر تین! یہ پانی ادھر دے دیں۔" وہ گلاس کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔
عین اس وقت دروازے پر کسی نے دستک دی۔ حکیم صاحب فوراً اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئے۔ اس ذرا سی مہلت سے فائدہ اٹھا کر کشور بولی "میرا خیال ہے کہ رحمت علی کو آپ کی یہاں موجودگی سے ڈر لگتا ہے کیونکہ ساتھ کے کمرے میں تو وہ زلیخا سے ملتا ہے۔"
"آپ ٹھیک کہتی ہیں مگر میں تو یہیں ٹھہروں گا۔"
"ہاں! آپ کو یہاں سے جانے کی کیا ضرورت ہے؟"
ابھی وہ یہ بات کہہ ہی رہی تھی کہ حکیم صاحب ایک مضبوط قد کاٹھ کے آدمی کے ہمراہ کمرے میں آ گئے، بولے "یہ آدمی بھیجا ہے چوہدری خیرات محمد نے، کہتا ہے کہ آپ کے ٹھہرنے کے لیے انھوں نے اپنی حویلی میں انتظام کر دیا ہے۔"
"کیا کہہ رہے ہیں آپ! مجھے کہیں نہیں جانا ہے حکیم صاحب! آپ کو یہ اچھا نہیں لگتا۔ تو میں کسی اور جگہ جا رہتا ہوں۔ میں خیرات محمد کا احسان کیوں لوں؟" میں نے بڑے ہی تپتے ہوئے لہجے میں کہا۔ وہ لوگ میرا سارا منصوبہ تہس نہس کیے دیتے تھے۔
"ناراج نہ ہوں کھان صاب! چوہری صاب تو تہاکو اپنا اپنا مہمان سمجھتے ہیں، بڑا اچھا انتجام ہے اُن کی حویلی میں۔"
"نہیں بھائی! میرا اُن سے کیا واسطہ! اُن سے میرا شکریہ ادا کر دو۔ کہو کہ میں یہیں ٹھیک ہوں۔ میرا خیال ہے حکیم صاحب! یہ تجویز انھیں آپ ہی نے دی ہو گی ورنہ انھیں اس کی کیا ضرورت تھی۔"
میری یہ بات سن کر حکیم صاحب پریشان ہو گئے، بولے۔
"واللہ یہ بات نہیں ہے۔ وہ اصرار کر رہے تھے، میں نے ہاں کہہ دی۔ اُن کی حویلی میں آپ زیادہ آرام سے رہیں گے۔"
"تو آپ بھی یہی چاہتے ہیں؟"
"یہ اچھی بات نہیں ہے حکیم صاحب! یہ بچارے اتنی دور سے آپ کے پاس آئے ہیں کیا سمجھیں گے کہ ہم دس دن ان کو جگہ بھی نہ دے سکے حالانکہ آپ اُن سے رقم بھی لے چکے ہیں۔" کشور نے حکیم صاحب کو درشت آواز میں ایک طرح سے لتاڑتے ہوئے کہا۔
"آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ جاؤ میاں اُن سے کہہ دو چوہدری سے کہ خان صاحب ادھر ہی رہنا پسند کرتے ہیں۔" حکیم صاحب نے اس آدمی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
"اچھا جی! میں کہہ دیتا ہوں اُن سے جا کر میرا کیا ہے۔ وہ تو اِن کی 'عجت' ہی کر رہے تھے۔"
"مجھے نہیں چاہیے یہ عزت۔ میں علاج کے لیے آیا ہوں، اور ادھر ہی رہوں گا۔ جاؤ اور پھر ادھر مت آنا۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ وہ آدمی اسی وقت سر جھکا کر واپس چلا گیا۔ حکیم صاحب کچھ پریشان سے ہو گئے، بولے "پتہ نہیں وہ لوگ آپ میں اتنی دلچسپی کیوں لینے لگے ہیں میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔" یہ کہہ کر وہ پھر کھانے میں مصروف ہو گئے۔
"آپ ان کی فکر نہ کریں۔ ایسے ہی خبطی قسم کے لوگ معلوم ہوتے ہیں یہ، کوئی خاص مسئلہ پیدا ہوا تو میں نپٹ لوں گا۔"
حکیم صاحب نے میری بات کا جواب دیا خاموشی سے کھانے

یں لگے رہے۔ کچھ ہی دیر بعد کشور تھال میں خالی برتن دھر کر اوپر لے گئی تو حکیم صاحب بھی مجھے آرام کرنے کا کہہ کر باہر نکل گئے۔

میں کتنی ہی دیر تک پلنگ پر لیٹا اس صورتِ حال پر غور کرتا رہا۔ میری سمجھ میں یہی بات آتی تھی کہ چوہدری رحمت علی کو اپنا رات کا عیش میری وجہ سے برباد ہوتا نظر آتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ مجھے یہاں سے کسی اور جگہ منتقل کرنے پر مُصر تھا۔ اس کے سوا تو کوئی اور سبب ایسا نہیں تھا جو اس کو یہاں تک کھینچ لاتا کہ اس نے میری رہائش کے لیے چوہدری خیرات محمد کی حویلی میں انتظام کروا دیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ زلیخا سے اُس کے تعلق کا علم خیرات محمد کو بھی تھا۔ اگر وہ اس کا رازدار نہیں تھا تو پھر اس کو کیا ضرورت تھی کہ وہ مجھے ایسی پیشکش کرتا۔

صورتِ حال کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتے کرتے میں نیند میں کھو گیا۔ باہر دوپہر بہت گرم تھی مگر اس مکان کی نچلی منزل کے اُس کمرے میں ٹھنڈک کا احساس ہوتا تھا۔ کھانا اتنا اچھا تھا کہ پیٹ میں پہنچ کر اُس نے دماغ پر ایسی غنودگی طاری کر دی کہ میں جب دوبارہ اٹھا تو سہ پہر کے ساڑھے چار بج رہے تھے۔ میں تولیہ اٹھا کر غسل خانے میں جا گھسا۔ جب میں نہا کر باہر نکلا تو کشور میرے کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ وہ میرے لیے چائے لائی تھی۔ اسے بھی شاید کسی نے بتا دیا تھا کہ سہ پہر کو چائے پینے سے کسلمندی دُور ہو جاتی ہے۔ مجھے سامنے دیکھ کر وہ کھل اٹھی۔ دبی آواز میں بولی۔ ”یہ لیں جناب! چائے نوش فرمائیں۔ یہ بھی حکیم صاحب کا حکم ہے کہ آپ کو شام کی چائے بھی پیش کی جائے۔“

”یہ اُن کی مہربانی ہے، خیر۔ بیٹھیں اور یہ بتائیں کہ زلیخا کس وقت آئے گی؟“

”وہ... وہ تو آج رات یہاں نہیں آئے گی۔ پتہ نہیں کیا بات ہے۔ وہ تھوڑی دیر پہلے پاکیزہ سے یہی کہہ گئی ہے۔“

”یہ تو بہت بُرا ہوا مگر وجہ کیا ہوئی ہے؟“

”میرا خیال ہے کہ یہاں آپ کی موجودگی نے انھیں خوفزدہ کر دیا ہے۔ چوہدری رحمت علی اب یہاں نہیں آئے گا۔“

”ذرا معلوم کریں کہ اب اُن کی ملاقات کہاں ہو گی۔“

”اور تو اُن کے پاس کوئی جگہ نہیں ہے۔“

”تو پھر اُن کو کسی طرح بتا دیں کہ میں یہاں سے چلا گیا ہوں۔ میں ابھی یہاں سے نکل جاتا ہوں، رات کو خاموشی سے یہاں آ جاؤں گا۔“

”ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔ میں یہ بات اُن تک پہنچا دیتی ہوں پھر تو وہ ضرور یہاں آ جائیں گے۔“

”تو پھر میں جا رہا ہوں۔ حکیم صاحب کو میں بتا دیتا ہوں کہ میں وزیرآباد کے کسی ہوٹل میں جا ٹھہرتا ہوں۔“

”ہاں یہ بہتر رہے گا مگر... مگر... خیر۔ میں آپ سے وزیرآباد آ کر مل لوں گی۔ اپنا پتہ کل آپ حکیم صاحب کو بتا جائیں۔“ پھر کچھ رک کر بولی۔ ”مجھے یہ بات اچھی نہیں لگتی ہے مگر مجبوری ہے۔ آپ کو کیسے پتہ چلے گا کہ وہ آج رات یہاں آئیں گے بھی کہ نہیں؟“ کشور نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”میں ٹھیک نو بجے رات کو اس گلی سے گزروں گا۔ آپ چھت پر کھڑی ہوں اور ٹارچ کو تین بار جلائیں جس سے میں سمجھ لوں گا کہ وہ لوگ یہاں آ گئے ہیں۔ اگر وہ... رہے ہوں تو آپ ٹارچ جلا کر بجھائیں نہیں۔ میں خاموشی سے گزر جاؤں گا۔“

”چلیں ٹھیک ہے۔ میں نو بجے آپ کو اشارہ دے دوں گی۔ گلی کا دروازہ کھلا ہو گا آپ چپکے سے اندر آ جائیں۔“

میں نے اپنی چیزیں سمیٹیں اور بریف کیس اٹھا کر اسی وقت وہاں سے نکل کر گاڑی تک جا پہنچا اور اسے اسٹارٹ کر کے میں ایک بار پھر سکول کے عقبی حصے سے گزر کر بازار میں جا پہنچا۔

حکیم صاحب دکان میں موجود تھے۔ میں نے گاڑی اُن کے سامنے لے جا کر کھڑی کر دی۔ مجھے سامنے دیکھ کر وہ تھڑے سے نیچے اُترے بولے۔ ”تو یہ گاڑی ہے آپ کی۔ کدھر جا رہے ہیں اس وقت؟“

”میں وزیرآباد جا رہا ہوں اور میرا خیال ہے کہ میں یہ دن وہیں کسی ہوٹل میں گزار لیتا ہوں۔ دوا لینے کے لیے ہر روز آپ کے پاس پہنچ جایا کروں گا۔“

”ایسا کیوں کرتے ہیں آپ! کوئی مجبوری تو نہیں ہے ہمیں، مہمان تو آپ میرے ہیں۔“

”نہیں! میرا ذہن اُلجھ رہا ہے۔ خدا جانے وہ لوگ میرے بارے میں کیا سوچ رہے ہیں۔“

”پھر تو میں آپ کو رقم لوٹانے پر مجبور ہوں گا۔“

”رقم کی فکر نہ کریں گھر کی بات ہے۔ بہرحال میں کل نو بجے یہاں آؤں گا، فاصلہ ہی کتنا ہے۔“

”جیسے آپ کی مرضی۔ اپنے طور پر میں یہ معلوم کرنے کی کوشش کروں گا کہ رحمت علی کا منشا کیا ہے، کیوں وہ آپ کو میرے گھر سے اکھاڑ رہا ہے۔ مجھے سخت حیرت ہے۔“ حکیم صاحب کا لہجہ خاصا متفکر تھا۔

اُن سے مصافحہ کر کے میں گاڑی میں بیٹھا اور اسے آگے بڑھا کر میں بڑی سڑک پر جا نکلا۔ کار میری نہیں تھی۔ اس کا ڈرائیور وہاں سے بہت دُور ایک ویرانے میں کچے کوٹھے کے اندر بندھا پڑا تھا۔ اُس کے باوجود ایک خوف میرے دل پر طاری تھا۔ کوئی بھی شخص جو اس کار کو جانتا تھا، میرا راستہ روک سکتا تھا مگر میں نے اس خوف کو زیادہ دیر تک ذہن پر سوار نہیں رہنے دیا۔ گاڑی کو وزیرآباد لے جانے کے

یں ہاتھ کی ایک کچی سڑک پر ڈال دیا۔ ڈیک نالہ اب میرے ... طرف تھا۔ سڑک دھول سے اَٹی ہوئی تھی اور سورج زوال کی منزلوں میں بھٹک رہا تھا۔ اس کی دھوپ میرے عقب میں تھی۔ اور وجود میرا بکھرتا نظر آتا تھا۔ مجھے وہ ساری تگ و دو بیکار اور بے مصرف دکھائی دیتی تھی۔ آبی اس وقت بھی میرے دھیان کی پہلی سیڑھی پر کھڑا تھا۔ اس کی اذیتوں کا کوئی حساب نہ ہو گا۔ میرے بارے میں بھی ... تک خدا جانے کیا کچھ بتا چکا ہو گا۔ وہ اس سے ڈھلوں صاحب کا ... بھی سن چکے ہوں گے، اسے پھر ان لوگوں نے ادھیڑ کر رکھ دیا ہو گا۔ ان کے تشدد کا تو کوئی حساب ہی نہیں ہوتا۔ وہ آدمی سے اس کی... عزتِ نفس ہی چھین لیتے ہیں اور میں اس کو ان کے نرغے میں... بے یار و مددگار چھوڑ کر پنجاب کی طرف آ نکلا تھا۔ میری بے حسی اور بے ہمتی تو دیدنی تھی۔ میں ڈھلوں کے اشارے پر ایک ایسے آدمی کے پیچھے بھاگ رہا تھا، ایک ایسے شخص کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا، جس نے میرا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ میں نے چاہا کہ سب کچھ وہیں چھوڑ کر اسی وقت کراچی جا پہنچوں اور آبی کے لیے اپنی جان داؤ پر لگا دوں مگر کوئی دھواں سا تھا جو ٹھہر ٹھہر کر میری سوچ پر حاوی ہو جاتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں ارادے کی شکستگی میں مبتلا ہوں اور میرے وجود میں وہ جو پہاڑوں سے ٹکرا جانے کا حوصلہ تنا رہتا تھا شکستہ ہو گیا ہے۔ ایک ایسا ملبہ میرے اوپر آ گرا تھا جس کے نیچے دب کر میں کچل کر رہ گیا تھا۔

شام کے چھ بج رہے تھے۔ اُس وقت میں درختوں کے ایک جھنڈ کے قریب گاڑی روک کر سگریٹ پی رہا تھا کہ دو جوان اس جھنڈ کے عقب سے نمودار ہوئے۔ اُن کی نظریں میری گاڑی پر جمی تھیں۔ بڑے گرانڈیل جثے تھے اُن کے۔ خالص دُودھ مکھن اور لہکتے ہوئے سرسبز کھیتوں کی تروتازگی اُن کے چہروں سے عیاں تھی۔ وہ کھدر کے کُرتے اور تہمد پہنے ہوئے تھے۔ دونوں کے ہاتھوں میں شام دار لاٹھیاں تھیں۔ مجھے دیکھ کر وہ ذرا دیر کے لیے رکے، اور پھر کسی بات پر ایک دوسرے سے مشورہ کرنے لگے۔ کار کی کھڑکی میں سے نکلتا سگریٹ کا دھواں انھیں صاف نظر آ رہا تھا۔ چند لمحوں تک وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر کھڑے آپس میں باتیں کرتے رہے اور پھر جچے تلے قدم اٹھاتے ہوئے میری طرف بڑھے۔ دونوں بڑی عیاری سے مسکرا رہے تھے۔ کسی طرف دیکھے بغیر وہ سیدھے میری کار کے پاس آ ٹھہرے۔ ایک نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور بڑے رعب دار لہجے میں بولا۔ ”کیا بات ہے باؤ جی! امریکہ سے آئے ہو؟“

”کیا مطلب ہے تمھارا۔ کوئی امریکی جھنڈا نظر آ رہا ہے تمھیں میری کار پر؟“

”میرا مطلب ہے باؤ جی کہ یہ رمضان کا مہینہ ہے اور تم سگٹ کے بھبھڑاکے مار رہے ہو۔“

”اچھا اچھا! تو تم دونوں روزے سے ہو؟“

”نہیں پر ہم کسی کے سامنے کچھ کھاتے پیتے نہیں ہیں۔ تم اس مہینے کا لحاج کیوں نہیں کرتے؟“ اس کا لہجہ بہت ہی کھردرا تھا۔ لاٹھی اُس نے ٹھوڑی کے نیچے جمائی تھی۔

”اینوں بار کڈھ کے ایہدی مالش کر چھبی! ایسے کا بھٹے حساب دا پتر۔ گل کس طراں کردا اے۔ توں ہیں کون اوئے ایجھے کہہ کرہیاں؟“ دُوسرے نے کار کا دروازہ نہایت بدتمیزی سے کھولتے ہوئے کہا۔

میرا پستول میری کمر سے بندھا تھا اور کُرتے کے نیچے اِس طرح چھپا تھا کہ وہ اسے دیکھ نہیں سکتے تھے۔ میں نے کہا۔ ”میں مسافر ہوں یار! ویسے ہی دم لینے کے لیے یہاں رک گیا ہوں۔“

”باہر تے آ جرا کہ ایس پچھ کے تینوں کڈھیے ایس پنجرے وچوں۔“

”کیا چاہتے ہو تم لوگ؟“

”ایہہ سگٹ بجھا دے کھوتے دے پترتے باہر نکل۔“ اُس نے لاٹھی کی نوک میری ران میں چبھوتے ہوئے کہا۔ اُن دونوں کی نیت کو میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ مجھے اس ویرانے کی ڈوبتی شام کی ردا میں لپٹے دیکھ کر وہ مجھے چھیل دینا چاہتے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ مجھ سے انھیں اچھی خاصی رقم حاصل ہو جائے گی۔

”کیہہ کجھ اے تیرے کول؟“

”میری جان توں سوا تے میرے کول کجھ نیئں۔“ میں نے اب اُنہی کی زبان میں بات شروع کر دی تھی۔

میری مسکراہٹ دیکھ کر وہ آدمی جھنجھلا گیا۔ اس کے ساتھی نے اُسے چھبی کہہ کر پکارا تھا۔ تنک کر بولا۔ ”توں سنیا نیئں گڈی وچوں باہر آ جا۔“ چھبی نے کڑکتے لہجے میں کہا۔ میں نے اس کے کہنے پر عمل کرتے ہوئے گاڑی سے اُتر کر دروازہ بند کر دیا۔ میرا بریف کیس اگلی دو نشستوں کے درمیان گاڑی کی ہینڈ بریک پر رکھا تھا۔ اسے وہ اب تک دیکھ نہیں سکے تھے۔

”چل اودھر! اونہاں رکھاں تھلے۔“

میں نے کار مقفل کر دی اور چابی جیب میں ڈال لی۔ ”اوئے تھلے کیہہ کرو گے، ایتھے ای گل کر لو۔“ میں نے بازو پھیلا کر انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

”اوئے کُکڑ وانگراں پر نہ کھول، چل اودھر۔“

”جے میں نہ جاواں تے فیر؟“ میں نے چھبی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"سر کھول دے اوئے ایہدا۔ ایہہ گل کس طراں کردا اے؟"

"نئیں کاکے! ایہدا کھیسا ویکھ جو کچھ ہے کڈھ لے؟"

چھبی نے دو قدم پیچھے ہٹ کر کہا تاکہ اسے لاٹھی کا وار کرنے کی جگہ مل سکے۔ وہ دونوں خباثت پر تلے ہوئے تھے۔ کاکے نے آگے بڑھ کر میری جیب پر ہاتھ پھیرا۔ کچھ نوٹ اس میں موجود تھے انہیں نکالنے کے لیے جیسے ہی اس نے جیب کے اندر ہاتھ ڈالا میں نے اس کی کلائی پکڑ کر پوری قوت سے اس کی بغل میں گھونسا مارا۔ اس کے دوسرے ہاتھ سے لاٹھی چھوٹ گئی۔ وہ چوٹ اس کے لیے اتنی غیر متوقع اور شدید تھی کہ میرا خیال ہے اس کی پسلی نیچے چلی گئی ہو گی۔ ایک ثانیے کے ہزارویں حصے میں میں نے کھڑے ہاتھ کی ایک ضرب اس کی گردن پر دے ماری۔ وہ پھڑک کر دوہرا ہوا تو چھبی نے گھما کر لاٹھی میرے سر میں مارنی چاہی مگر میں کچھ اتنی تیزی سے اس کے اٹھے ہوئے بازوؤں کے نیچے جا پہنچا کہ اس کا گریبان میرے ہاتھ میں آ گیا۔ اس کی لاٹھی بے کار ہو گئی تھی میں نے اس کی گردن پر ایک ہاتھ ڈال کر دوسرا ہاتھ اس کی ٹانگوں میں ڈالا اور پورے قد سے اسے سر کے اوپر اٹھایا اور گھما کر ایک تیز چکر دیا پھر دھول سے اٹی سڑک پر پھینک دیا۔ وہ منہ کے بل گرا تو اس کا منہ سر دھول سے اٹ گیا۔

کاکا اس عرصے میں گندی گالیاں دیتا ہوا اٹھ رہا تھا۔ لاٹھی اس نے پھر ہاتھ میں لے لی تھی۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹا اور پھر اس نے اتنی تیزی سے لاٹھی گھمائی کہ میں اگر اچھل کر پیچھے نہ ہٹتا تو اس نے میری کنپٹی ادھیڑ ڈالی تھی۔ چھبی کی لاٹھی کو پکڑنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ میں اچھل کر سڑک کے باہر نکل گیا تھا۔ اور ایسی جگہ کھڑا تھا جہاں درختوں کے جھنڈ تک ہری ہری گھاس کا فرش بچھا تھا جیسے ہی میں وہاں پہنچا۔ چھبی اپنی جھونجل پر قابو پا کر اٹھا اور لاٹھی سنبھالتا ہوا اپنی آنکھوں میں دھنسی دھول پونچھنے لگا۔ وہ بھی گندی گالیاں بک رہا تھا۔ اب وہ دونوں پھر میرے مقابل آ کھڑے تھے۔ میں درختوں کی طرف پسپا ہونے لگا تو وہ سمجھے میں خوفزدہ ہو کر بھاگنے کی سوچ رہا ہوں۔ وہ لاٹھیاں سنبھالتے ہوئے پھر میری طرف لپکے مگر سڑک سے کوئی ساٹھ ہاتھ آگے نکل کر میں ایک جگہ رک گیا۔ اپنے دونوں ہاتھ میں نے دائیں بائیں یوں پھیلا دیے جیسے میں انھیں آگے بڑھنے کی دعوت دے رہا ہوں۔

"یارو تمھاری موت آئی ہے میرے ہاتھوں تمھیں نہیں پتہ کہ کس سے کھلواڑ کر بیٹھے ہو۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں اس ذرا سی کسرت سے ہانپنے لگے تھے۔ ان دونوں نے پھر مجھے ایک غلیظ گالی دی۔ اب ان کے درمیان کوئی چھ ہاتھ کا فاصلہ تھا۔ چھبی دانت پیستے ہوئے بولا "توں بچ کے نہیں جا سکدا پترا! تیرا تے میں گھٹ بھر کے رہواں گا۔ پھڑ لو اوئے ایہنوں۔ جانڑ نہ دے ایہنوں۔" اس نے کاکے کو ہشکارا۔ ایک بار پھر وہ میرے قریب آ گئے تھے کہ درمیان میں صرف چھ فٹ کا فاصلہ رہ گیا تھا اور دونوں کے کندھے ملے ہوئے تھے۔ میں نے ان کی نیت کو بھانپتے ہوئے بدن کو اوپر اٹھایا اور پوری قوت سے اچھل کر اڑتے ہوئے میں نے دونوں پاؤں کی ٹھوکر ان کے سینوں پر اس طرح ماری کہ وہ دونوں بھسے گئے۔ میری وہ طائر ضرب انھیں نڈھال کر گئی تھی پر ان سے دو قدم آگے گرا تو خود کو فوراً ہی سنبھالتے ہوئے میں تیزی سے اٹھا اور ان دونوں کو بالوں سے پکڑ کر میں نے ان کے سر اتنے زور سے ٹکرا دیے کہ ان کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا ہو گا۔ ایک بار پھر میں نے ان کے سروں کو پیچھے ہٹا کر زور سے ٹکرا دیا۔ وہ دونوں چیختے ہوئے منہ کے بل گرے مگر ان کی قوت برداشت حیرت انگیز تھی۔ اپنے سروں میں گڈمڈ ہوتے لہو اور مغز کو سنبھالتے ہوئے وہ پھر اٹھنے لگے۔ ان کا کس بل دیکھ کر میں نے چھبی کی کلائی پکڑ کر ہلکا سا جھٹکا جو دیا تو اس کا جوڑ کھل گیا۔ کڑک ایسی آواز پیدا ہوئی اور اس کے ساتھ ہی چھبی کی بھیانک چیخ فضا میں گونج گئی۔ اور وہ اپنے ہاتھ کو رانوں میں دبا کر سی سی کرنے لگا۔ میں نے کاکے کو پھر بالوں سے پکڑ کر اس کا سر اوپر اٹھایا۔ "کھو بچے! ... ی رہی۔ کتنے پیسے دوں تھیں دوا دارو کے لیے!" یہ کہہ کر میں نے اس کے منہ پر الٹے ہاتھ کا ایک تھپڑ دے مارا۔ وہ الٹ کر دوسری طرف جا گرا۔ یہ اچھا تھا کہ وہ ہری بھری گھاس پر پڑے تھے ورنہ وہ دونوں ہی دھول میں گر کر بھوت بن گئے ہوتے۔

"معاف کر دیو بھاجی! معافی دیو ساڈی غلطی سی۔"

"تمھاری پہلے نہیں غلطی تھی مگر اب گل گئی ہے۔" یہ کہہ کر میں نے پوری قوت سے بوٹ کی ٹھوکر اس کے پیٹ میں دے ماری۔ وہ دوہرا تہرا ہو کر آگے جھکا اور منہ کے بل گھاس پر اوندھا ہو گیا۔ اس کے منہ سے عجیب سی ہولناک آوازیں نکلنے لگی تھیں۔

عین اس وقت درختوں کے جھنڈ میں سے دو بوڑھے آدمی تیزی سے ہماری طرف بڑھے۔ دونوں سفید ریش تھے اور بہت سنجیدہ نظر آ رہے تھے۔ ابھی وہ دور ہی تھے کہ میں نے انھیں ڈانٹتے ہوئے کہا "کیا چاہتے ہو تم! ان کا حشر دیکھ کر آنا۔"

"تساں بہت اچھا کیتا اے بابو جی! ایناں نوں ہور چھتر مارو۔ ایہہ دونویں بدماش نیں۔ ایس پنڈ وچ ایناں اَت چکی ہوئی سی۔" ایک بوڑھے نے اپنی خوشی کو چھپاتے ہوئے کہا وہ ان کی درگت درختوں کی اوٹ میں کھڑے دیکھتے رہے تھے۔ چھبی نے سر اٹھا کر انھیں یوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو "بابیو! ایہہ تہاڈا کیہہ وگاڑیا سی؟" وہ دونوں بوڑھے تیز تیز قدم اٹھاتے میرے قریب آ گئے۔ ایک نے صرف تہمد باندھ رکھا تھا۔ وہ پاؤں سے بھی ننگا تھا اور گلے سے بھی۔ دوسرے نے البتہ تینوں کپڑے پہن رکھے تھے۔ اس کے سر پر بندھی سفید پگڑی اسے بھلی لگتی تھی۔ وہ بھی مسکرا رہا تھا۔

"ان کے گاؤں کا نام پتہ ہے؟"

"ہاں! اڈیک نالے سے اس طرف ہے باؤ جی پر ہوا کیا تھا؟"

"یہ بدمعاش مجھے لوٹنا چاہتے تھے، کہتے تھے جو کچھ ہے باہر نکال دو۔ وہ میں نے نکال دیا۔ اب صرف ان کے اندر مغز ہی باقی ہے کہو تو وہ بھی نکال دوں۔"

"یہ گاؤں کے بروالے کا پتر ہے۔ علی بخش کا اور یہ چوہڑا ہے کاکا مسیح۔ دونوں نے اکیلے دکیلے آدمی کو لوٹنے کا دھندا پکڑ رکھا ہے۔"

"میں ان کو تھانے پہنچا دیتا ہوں وہ خود سیدھا کر دیں گے ان کو۔"

"تھانے سے زیادہ بری ہو گئی ہے ان کے ساتھ۔ ہم نے سارا تماشا دیکھا ہے بہت ستھری مار دی ہے آپ نے انھیں۔ بڑے جی دار جوان ہو تم باؤ جی۔ دل خوش کر دیا ہے تم نے۔" دستار بند بوڑھے نے کہا۔

"کیا نام ہے آپ کا بابا جی!"

"میرا نام احمد دین ہے اور یہ میرا بیلی ہے فقیر علی۔ یہ کھیت ہمارے ہی ہیں۔ چلیں ہمارے گھر روزہ کھلنے کا وقت ہے۔"

"جی نہیں! آپ کی بڑی مہربانی! ان کو لے جائیں کچھ ہینگ پھٹکری لگائیں میں پھر کسی دن ان کو دیکھنے آؤں گا ان خسروں کو۔" یہ کہہ کر میں نے انھیں سلام کیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گاڑی میں جا بیٹھا۔

مجھے تنہائی کی ضرورت تھی، دکھوں کے میرے گرد لنگر لگے تھے۔ مگر ہر جگہ مجھے کوئی نہ کوئی مصیبت آ گھیرتی تھی۔ ان کو درگت کر کے پہلی بار مجھے زندگی میں صحیح خوشی حاصل ہوئی۔ اس روز مجھے احساس ہوا کہ جوان کے بدن میں اگر قوت نہیں ہے، اگر وہ اپنے ہاتھ پاؤں سے کام لینا نہیں جانتا ہے تو وہ بالکل بیکار ہے اور کسی نسخے میں کام نہیں آ سکتا۔ اس دنیا میں ہر جگہ جنگل کا قانون نافذ ہے جہاں دلیل کام نہیں آتی جہاں حرف گنگ ہو جائیں، جہاں حق کی پہچان کرنے والا کوئی نہ رہے جہاں تنی ہوئی گردنوں کا تکبر حد سے بڑھ جائے تو وہاں ایک وحشی قوت ہی کجکلاہوں کو راہ راست پر لا سکتی ہے۔ منت، آہ و زاری، رحم کی بھیک اور ایسی بے معنی چیزیں ہو جاتی ہیں۔ اس چھبی اور کاکے کو کچل کر میں اس روز اسی نتیجے پر پہنچا تھا۔ ورنہ میں تو ان کو منہ نہ لگاتا۔ میں تو وقت کی اس لعنت سے بچنے کے لیے اس ویرانے میں جا بیٹھا تھا کہ مجھے کسی نے تالی بجا کر میرے گھونسلے سے اٹھا دیا تھا۔ ورنہ کشور کی آغوش اور نظر تو بہت ہی مہربان تھی اور اس کے گھر کی فضا میں ٹھنڈک رچی رہتی تھی۔

مگر مجھے اس روز مصلحتوں نے مار کر وہاں سے اٹھا دیا تھا۔ درمیان میں وقت نے نیزے تان لیے تھے اور میں انہی سے بچتا ہوا اس سمت جا نکلا تھا۔ مگر آدمی کا خبث باطن مجھے وہاں بھی مصروف کار نظر آیا تھا۔

میں نے گاڑی کا رخ موڑا اور کچھ ہی دیر بعد پھر بڑی سڑک پر جا نکلا۔ سورج اس وقت غروب ہو چکا تھا پھر بھی نو بجنے میں ابھی کافی وقت تھا اور مجھے اس کے ایک ایک حلقے کو کاٹ کر دوبارہ نو بجے کشور کے مکان کے سامنے سے گزرنا تھا۔

آپی اب بھی میرے تصور میں موجود تھا۔ وہ میرے سامنے کھڑا ملر ملر مجھے تک رہا تھا۔ جیسے پوچھ رہا ہو کہ کہو تیس مار خان! غلام جیلانی! تو یار مار ہے کہ نہیں۔ کوئی بھروسا کر سکتا ہے تجھ پر ہم اور میں... میں تو تیرے لیے سرمد بن جاؤں گا۔ فنا کے گھاٹ اتر جاؤں گا مگر تو بہت خراب آدمی ہے جیلانی! تو میرا یہ پہلا دکھ بھی نہ بانٹ سکا۔ میری پہلی ضرب میں بھی شریک نہ ہو سکا۔ میں تو بہت خوش نصیب تھا اور میرے حساب میں اللہ نے چھہتر لاکھ روپے ڈلوا دیے تھے۔ وہ نہ ہوتے تو بھی میں تنہا رہ کر بھی جی سکتا تھا کہ میرے حکم پر مرمٹنے کے لیے بڑے لوگ موجود تھے ان میں تابیا بھی تھا اور وہ دو بھی تھے جو اس روز لاہور کے اقبال پارک میں جان ہار گئے تھے۔ تو کیا کر سکا جیلانی! کچھ بھی نہیں۔ کبھی کبھی وہ بہت اداس ہو جاتا تھا تو کسی کا یہ شعر بڑی دردناک لے میں پڑھا کرتا تھا ؎

ہم سے کیا ہو سکا محبت میں
تو نے تو خیر بے وفائی کی

مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس شعر میں اسے کیا ملتا تھا۔ مگر جب بھی اس نے یہ شعر پڑھا اس کا گلا رندھ گیا تھا۔ وہ شاعر صفت آدمی جس نے زندگی کا صرف ایک رنگ دیکھا تھا وہ تشدد کی راہ پر چلا ہی اس لیے تھا کہ وہ ظلم کے ساتھ سمجھوتہ نہیں کر سکا تھا مگر اب وہ اس اندھے ظلم کے تیز نوکیلے ناخنوں کی زد میں آ چکا تھا اور میں یہ سوچ سوچ کر لرزتا تھا کہ خدا جانے وہ اس پر ستم کے کیسے کیسے پہاڑ توڑ چکے ہوں گے۔ میرا دل اس رات بھی لہو روتا تھا۔ اپنی بے بسی پر اور آپی کی اذیتوں کے تصور پر۔ کوئی گولی سیدھی آ کر اس کے دل میں اتر جاتی تو میں صبر کر کے بیٹھ رہتا۔ قسمت کا لکھا سمجھ کر چپ ہو رہتا مگر۔ مگر وہ تو زندگی کی تمام تر رعنائیوں سمیت ایسے دوزخ میں جا گرا تھا جہاں قدم قدم پر وہ لوگ اس کو

ذلتوں کی اتھاہ گہرائیوں میں گراتے ہوں گے۔ میری سوچ دم بدم اس کے زہر میں بجھی جا رہی تھی اور میرے لیے کار کو سنبھال رکھنا مشکل ہو گیا تھا۔ میں وزیر آباد سے ابھی کچھ ہی دور تھا کہ کار کی بتیاں بجھا کر میں نے اسے سڑک سے اتارا اور ایک درخت کے گھنے سائے تلے کھڑی کر دیا۔ وقت کاٹنا میرے لیے مشکل ہو گیا تھا۔

ساڑھے آٹھ بج گئے تو میں نے بتیاں جلا کر اگنیشن میں چابی گھما دی۔ انجن یوں بولا جیسے نیند سے جاگ رہا ہو — گاڑی کو گھما کر میں نے سوہدرہ کی طرف بڑھا دیا۔ وہ اونچے ٹیلے کا پُراسرار قدیمی قصبہ کچھ ہی دیر بعد پھر میرے سامنے تھا۔ اسے دیکھ کر ہر بار میرے ذہن میں اُن لوگوں کا تصوّر ابھرا جو تہہ در تہہ اُس بستی میں فنا ہوتے رہے۔ اور اپنا ملبہ وہ اگلی نسلوں کے قدموں تلے بچھاتے چلے گئے۔ پتہ نہیں وہ کون لوگ تھے! کیسے زندگی بسر کرتے تھے۔ کیسے جیتے تھے اور جب وہ مرتے تھے تو اُن کے چہروں کے رنگ کیسے ہوتے تھے۔ بستیاں اپنے ماضی پر ماتم کناں رہتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں راتیں زیادہ دلدوز اور غم انگیز ہو جاتی ہیں۔ تاریکی میں ڈوبے اس قصبے میں جب میں نے کار حکیم صاحب کی گلی کے عقبی حصّے میں کھڑی کی تو ہر طرف سناٹا طاری تھا۔ ویسا ہی ایک سناٹا میرے وجود کے اندر چھایا ہوا تھا۔

میں نے کار مقفل کر کے اس کی چابی جیب میں ڈالی اور بریف کیس ہاتھ میں لے دبے پاؤں چلتا ہوا حکیم صاحب کی گلی میں جا گھسا۔ جیسے ہی میں اُن کے مکان کے سامنے پہنچا چھت پر سے روشنی کا ایک نیزہ میرے منہ پر پڑا۔ ٹارچ بجھی نہیں مسلسل جلتی رہی۔ یہاں تک کہ میں اس بیٹھک کے دروازے تک جا پہنچا جسے کشور نے میرے داخلے کا دروازہ قرار دیا تھا۔ اس کے پٹ بھڑے ہوئے تھے۔ روشنی بجھی تو میں نے پٹ دھکیل دیے۔ وہ بے آواز کھلے اور میں سانس روک کر بیٹھک میں داخل ہو گیا۔ عورتیں مجھے اسی لیے زیادہ محبوب ہیں اور میں انھیں مردوں سے زیادہ نفیس اور مکمل مخلوق سمجھتا ہوں کہ اُن کی سوچ میں الجھاؤ اور بے یقینی کم ہوتی ہے۔ وہ کوئی فیصلہ کر لیتی ہیں تو ہر قیمت پر اُس پر عمل بھی کرتی ہیں۔ دنیا کی جتنی بھی جنگیں ہوئی ہیں میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اُن کے پس پردہ ہمیشہ سے عورت ہی کا ہاتھ کارفرما رہا ہے۔ وہ سامنے کے تخت نشین کے عقب میں پردہ تان کر بیٹھی حکمرانی کرتی رہی ہیں۔ اس دنیا میں ہمیشہ سے اُس کے فرمانوں کا دور رہا ہے اور مرد محض تعمیلوں کے موسم میں زندگی کرتا آیا ہے۔ اُس رات کشور میرے بہت کام آئی۔ وہ نہ ہوتی تو میں ایک قدم آگے نہ بڑھ سکتا۔ ابھی مجھے اُس گھُپ اندھیرے کمرے میں چند منٹ ہی گزرے تھے کہ اندر کا دروازہ بے آواز کھلا —

روشنی کا ایک دائرہ میری طرف بڑھا اور پھر بے جان ہو گیا۔ اس دائرے کے پیچھے کشور کھڑی تھی۔ وہ سربستہ راز کی طرح میری طرف بڑھی اور بولی "وہ آج رات بارہ بجے یہاں ملیں گے۔ پاکیزہ نے زلیخا کو سمجھا دیا تھا کہ "کھُڈا خالی است"۔ اس کا دل بلّیوں اچھل رہا تھا۔ دھڑکنیں صاف سُنائی دیتی تھیں۔ ہم دونوں پلنگ پر بیٹھے تو وہ بولی "حکیم صاحب کسی مریض کو دیکھنے دھونکل گئے ہیں وہاں کا زمیندار کار لے کر آیا تھا افطاری کے وقت، وہ اب صبح ہی آئیں گے۔"

"یہ تو بہت اچھا ہوا۔ چوں خانہ خالی و معشوق مست باز بود۔"

"یہ شعر تو حکیم صاحب اکثر پڑھا کرتے ہیں اور وہ بڑے دلدوز انداز میں کہا کرتے ہیں کہ تو نگر نیست ہر آں کس کہ پاکباز بود۔ یہی ہے نا اس کا دوسرا مصرع؟"

"آپ کی ذہانت کی داد دیتا ہوں کشور! مجھے خوشی ہے کہ سوہدرہ میں میرا قیام اتنا خوبصورت ہو گیا ہے۔"

میری یہ بات سُن کر وہ نہال ہو گئی۔ اور پھر۔۔۔۔ پھر چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ اُس کی وہ والہانہ محبت میں آج تک نہیں بھُول سکا ہوں۔ مجھے برف سے اسی لیے نفرت ہے کہ وہ گرد و پیش کو سرد کر دیتی ہے۔ فطرت گرمجوش ہے حرارت بکھیرتی ہے تو شگوفے کھلا دیتی ہے۔ ریگستانوں کے رہنے والے بدّو اسی لیے خدا کو پیغمبروں کے انتخاب کے لیے بار بار یاد آتے ہیں کہ برف زاروں کے رہنے والے اس کی بات کو اتنے شوق و جذبۂ ایجاب سے قبول نہیں کر سکتے تھے کہ اُن کی رگوں میں دوڑنے والا خون برفانی ریچھ کے خون ایسا ہوتا ہے۔ بدّو اور اُن کا گرد و پیش اسی لیے خدا کو زیادہ پسند ہے کہ اس میں جذبے کی بے ساختگی کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوتی ہے اور وہ جو کسی نے کہا ہے کہ سُست خرام گھوڑی اور سرد عورت دل پر خون جما دیتی ہے تو یہ بات کسی بھی طرح غلط نہیں ہے کہ زندگی کی ہما ہمی تیز روی اور گرمجوشی کا تقاضا کرتی ہے۔

حکیم صاحب کی دوسری دونوں بیویوں کو کشور خواب آور شربت پلا آئی تھی اور ہم خوش تھے۔ بے حد خوش کہ ہم نے زندگی کے سارے تابناک لمحوں کو اس کمرے کی خوابناک سیاہی میں گم ہو کر معطّر بنا رکھا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اگر آدمی آگے پیچھے کی نہ سوچے، ماضی کے نقصان اور وسوسوں پر اپنی جان نہ گھلائے تو وہ حال کے ہر لمحے کو منوّر کر سکتا ہے کہ جینا تو اسی لمحے میں ہے کس کو خبر ہے کہ صبح ہو گی کہ نہیں۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ساری اہمیت تو حال کو حاصل ہے اس کے آگے پیچھے تو لامتناہی اندھیرا ہے۔ نہ آدمی ادھر کچھ دیکھ سکتا ہے نہ اُدھر۔

پونے بارہ بجے مجھے پہلو کے کمرے کا بیرونی دروازہ چرچرانے کی آواز سنائی دی۔ وہ ایسی غیر محسوس اور ملفوف آواز تھی کہ میں سمجھا میرا وہم ہے مگر نہیں کوئی دوسرے کمرے میں داخل ہو چکا تھا۔ دونوں کمروں کی وسطی دیوار میں ایک دروازہ لگا تھا۔ بیرونی دروازے کے پٹ بند ہوئے تو کمرے کے سناٹے میں رونق گھلنے لگی۔ چوڑیوں کی دبی دبی ہنسی کی آواز ابھری۔

"وہ آگئی ہے۔ یہ زلیخا کی چوڑیاں بج رہی ہیں۔"

"وہ بڑی بے پرواہ ہے چوڑیوں کا منہ بند نہیں رکھتی۔"

"ہاں دونوں کلائیوں میں چوڑیاں بھر رکھتی ہے۔ بہت سوہنی ہے وہ خان جی! آپ دیکھیں تو سب بھول جائیں۔" کشور نے سرگوشی کی۔

"یہ۔۔۔ یہ رحمت علی پہلے سے موجود تھا یہاں؟"

"ہاں! ہمیں پتہ ہی نہیں چلا۔ میرا خیال ہے جب آپ حکیم صاحب کو برباد کر رہے تھے نا تو وہ اُس وقت کمرے میں گھس آیا ہو گا۔"

چند ہی لمحوں بعد دوسرے کمرے میں سرگوشیوں کی آواز گونجنے لگی۔ کمرے کے وسطی دروازے کی کنڈی کھلی تھی۔ میں نے بریف کیس میں ہاتھ ڈال کر وہاں رکھا اپنا چپ شاہ سیدھے ہاتھ میں لے لیا۔ "اب آپ اُدھر چلی جائیں۔ میں اُن کے کمرے میں جا رہا ہوں۔" میں نے سرگوشی میں کشور سے کہا۔

"کیمرہ ہے آپ کے پاس؟"

"ہاں! وہ میرے بریف کیس میں ہے میں اسے درست کرتا ہوں آپ جائیں۔"

"ٹھیک ہے تصویر لے کر آپ یہاں رہیں گے کہ باہر نکل جائیں گے؟"

"میں باہر چلا جاؤں گا اور کل صبح دس بجے واپس آؤں گا۔۔۔ حکیم صاحب کی دکان پر۔"

"اچھا خدا حافظ! وہ دودھ پی لیں گے تو فوراً ہی سو جائیں گے اس کے بعد آپ اُن کی جیسی چاہیں تصویر اُتار لیں۔"

"میں ایسا ہی کروں گا، اب آپ جائیں۔"

اُس کے پیچھے دروازہ بند کر کے میں پھر اپنے پلنگ پر جا بیٹھا۔ مگر میرے خون کی گردش تیز ہونے لگی تھی۔ میں نے پستول کی گولیاں انگلیوں سے ٹٹول کر گنیں وہ پوری تھیں۔ اس پر لگا سائیلنسر بھی صحیح تھا اور رحمت علی کے وجود سے موت اب چند قدم دور رہ گئی تھی۔ میرے نفس کے خونخوار چیتے نے منہ کھول لیا تھا اور اب وہ رحمت پر زقند بھرنے کو ہی تھا۔ میں دبے پاؤں چلتا ہوا وسطی دروازے کے پاس جا ٹھیرا۔ اُن کی سرگوشیاں اب میں زیادہ واضح طور پر سُن سکتا تھا۔ زلیخا کی آواز میں نسائیت کُوٹ کُوٹ کر بھری تھی۔

وہ اس رحمت علی کو بڑی عمر کا طعنہ دے رہی تھی۔

"یہ سب تمھارے حسن کا فسانہ ہے زلیخا! ورنہ میں کہاں اور تم کہاں۔"

"اب سوچا کیا ہے تم نے! یہ لُکن میٹی کب ختم ہو گی؟"

"تمھیں اغوا ہی کرنا پڑے گا۔ تمھارے والدین تو کبھی راضی نہیں ہوں گے۔"

"رمضان کے بعد ہم چپکے سے شادی کر لیں گے۔ میں نے یہی سوچا ہے حق مہر کی بات ابھی کر لیں۔"

"میری ساری زمینیں تمھاری۔ حق مہر تمھارا دو لاکھ، کہو منظور ہے؟"

"منظور ہے! آپ کو میں اچھی طرح نتھ ڈال کر رکھوں گی آپ کا کیا پتہ کسی اور کو پھانس کر بیٹھ جائیں۔ آدمی آپ بہت تیز ہیں۔"

"ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ سمجھ دار لوگ جنگلی کبوتر پکڑتے ہی اس کے پر قینچ دیتے ہیں تم بھی یہی کرو گی۔"

"ہاں! میں یہی کروں گی۔ آنکھوں پر کھوپا باندھ دوں گی۔"

وہ ہمک رہی تھی۔ اُن کی روحوں کی وہ ہم آہنگی مجھے حیران کرتی تھی۔ یوں لگتا ہے جیسے دونوں کو اُن کی ازلی ابدی خوابوں کی تعبیر مل گئی ہے۔

ابھی میں اُن کی وہ سرگوشیاں سُن ہی رہا تھا کہ مجھے اُس کمرے میں گلی کی طرف کا دروازہ تڑاخ سے کھلنے کی آواز سُنائی دی۔ ساتھ ہی میرے سامنے کے وسطی دروازے کی درزیں روشن ہو گئیں میں ابھی کچھ سمجھ نہیں پایا تھا کہ کمرے میں گولیوں کی تڑتڑ سنائی دی۔ چار گولیاں چلیں اور کمرہ دلدوز چیخوں سے بھر گیا۔

میں نے تیزی سے وسطی دروازہ کھولا تو مجھے دو آدمی جو لالٹینیں اٹھائے ہوئے تھے کمرے سے بھاگ کر دروازے کی طرف جاتے دکھائی دیے۔ میں نے اپنے چپ شاہ کی نال سیدھی کر کے اس آدمی کی پیٹھ پر چلا دی جو ابھی دروازے تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ وہ گولی لگتے ہی منہ کے بل گرا تو دوسرے آدمی نے پیچھے مڑ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے باہر کھینچنے کی کوشش کی۔ اس کے دائیں ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول کی نال کا رُخ میری طرف پھر رہا تھا۔ میں نے اس کا بازو تاک کر گولی چلا دی تو پستول اُس کے ہاتھ سے دُور جا پڑا۔ اس کی کلائی زخمی ہو گئی تھی پھر بھی وہ دوسرے آدمی کو پوری قوت سے باہر کھینچ رہا تھا۔

میں نے ایک اور گولی اس کے دوسرے بازو پر چلا دی۔ لالٹین ابھی تک روشن تھی اور فرش پر سیدھی پڑی ہوئی تھی — اُن دونوں کو بیکار کر کے میں نے پلنگ پر نظر ڈالی۔ زلیخا اور رحمت علی دم توڑ چکے تھے۔ دونوں کے سینوں میں دو دو گولیاں پیوست

تھیں۔ زلیخا بے شک اپنے وقت کی زلیخا ہی تھی۔ اس کی خوبصورتی کی قسم کھائی جاسکتی تھی۔ اور اُن دونوں نے بڑی ہی عبرت آموز حالت میں اپنی جانیں جان آفریں کو پیش کی تھیں۔

عین اس وقت کشور دوڑتی ہوئی کمرے کے وسطی دروازے میں نمودار ہوئی۔ اس کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا اور اس کے ہونٹ یوں لرز رہے تھے کہ اُس سے بات نہیں ہو پاتی تھی۔ میں پلٹ کر اس تک جا پہنچا۔

"یہ۔۔۔ یہ کون ہیں؟ انہوں نے ان دونوں کو گولی ماردی ہے۔"

"یہ۔۔۔ زلیخا کا بھائی کاظم علی اور یہ۔۔۔ اس کا بہنوئی شبیر ہے۔" اُس نے سسکتے ہوئے کہا۔

"آپ ان کو سنبھالیں میں جا رہا ہوں۔ میرا یہاں ٹھہرنا کسی بھی طرح ٹھیک نہیں ہے۔" میں نے اسے پیچھے دھکیلتے ہوئے کہا۔ مگر جیسے ہی میں نے پلٹ کر دیکھا شبیر مجھے اٹھتا ہوا نظر آیا۔ وہ کاظم کو کھینچ نہیں سکا تھا اور اب خود بھاگ نکلنا چاہتا تھا۔ میں نے پستول اُس پر تان کر اسے للکارا۔ "رُک جاؤ ورنہ میں تجھے بھی جان سے ماردوں گا۔"

میری آواز سن کر وہ وہیں منجمد ہو گیا۔ اس کی کلائی خون سے تر ہو رہی تھی۔ میں اس کے پیچھے دروازے میں جا پہنچا۔ کاظم کے کولھے میں گولی لگی تھی۔ وہ ہلنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ ابھی تک وہ فرش پر اوندھے منہ پڑا تھا۔ گلی میں اِدھر اُدھر سے کئی لوگ گھروں سے نکل آئے تھے انہیں ادھر بڑھتے دیکھ کر کشور نے ایک چادر لے کر زلیخا اور رحمت علی پر ڈال دی۔

میں نے پیچھے ہٹ کر کشور سے کہا۔ "ان کو سمجھائیں ہوا کیا ہے۔ اس کاظم اور شبیر نے ان دونوں کو قتل کر دیا ہے، ان کو بھاگنے سے روکنے کے لیے میں نے ان پر گولی چلا دی تھی۔"

"کیا ہوا ہے؟ کس نے گولی چلائی ہے؟" ایک محلے دار نے سراسیمہ لہجے میں پوچھا۔

کشور نے بدن دوپٹے میں چھپایا اور آنچل سر پر لیتے ہوئے انہیں بتانے لگی کہ کس نے کس کو مارا ہے۔

"اختر! جا پولیس کو اطلاع دے یہ تو خون خرابہ ہو گیا ہے یہاں۔" اس آدمی نے اپنے قریب کھڑے جوان سے کہا۔

پولیس کا نام سنتے ہی میں پیچھے ہٹا اور بریف کیس میں پستول بند کر کے کمرے سے نکل کر صحن میں جا پہنچا اور پھر سیڑھیاں چڑھ کر۔۔۔ چھت پر چلا گیا۔ حکیم کی دونوں بیویاں پہلی منزل کی چھت پر بے سُدھ پڑی تھیں۔ خواب آور دوا نے انہیں بے بس کر رکھا تھا۔ میں وہاں سے جلد از جلد نکل جانا چاہتا تھا۔ پولیس میرے لیے کوئی نئی مصیبت کھڑی کر سکتی تھی۔

میں حکیم صاحب کے عقب کے مکان کی چھت پر جا اترا۔ اس مکان کی دوسری طرف ایک پتلی سی گلی موجود تھی۔ وہ بھی دو منزلہ مکان تھا۔ اس کی پہلی منزل کے صحن میں سوئے لوگ ابھی تک گرد و پیش سے بے خبر تھے۔ گولیوں کی آواز شاید اُن تک نہیں پہنچی تھی۔ میں اُن لوگوں کے درمیان سے دبے پاؤں چلتا ہوا اندھیرے کا حصہ بنا آگے نکلا اور سیڑھیاں اُتر کر صحن میں جا پہنچا۔ بڑا دروازہ میرے سامنے ہی تھا۔ اس کی کنڈی میں نے بڑی احتیاط سے کھولی اور گلی میں پاؤں رکھتے ہی اُس سمت بھاگا، جدھر میں نے کار ٹھہرا رکھی تھی۔ معاملے کی اس سنگینی کے پیش نظر مجھے وہاں سے فوراً نکل جانا چاہیے تھا۔ چند ہی لمحوں بعد میں کار کو اسٹارٹ کر کے اسکول کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے کار کی بتیاں روشن کر رکھی تھیں۔ اسکول کے گرد کار کو دوڑا کر میں بازار میں پہنچا اور کسی بات کی پروا کیے بغیر بلا خیز رفتار سے کار کو اڑاتا ہوا میں قصبے کے نشیب میں اتر گیا۔ کچھ ہی دیر بعد میں ستر میل کی رفتار سے وزیر آباد کی طرف بڑھ رہا تھا۔ مجھے اسی رات ڈھلوں صاحب کی حویلی تک جا پہنچنا تھا۔

میرے سارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے تھے۔ رحمت علی تو پہلے ہی موت کا ہدف بن چکا تھا۔ اس کی تقدیر اسے گھیر کر وہاں پہنچا چکی تھی جہاں سے اس کی مراجعت ناممکن تھی۔ ورنہ وہ عمر کے اس حصے میں تھا جس میں کسی ایسی جنوں خیز جست کی امید ہی نہیں کی جاسکتی تھی۔ اسے عشق لے آیا تھا۔ اور وہ جو صاحباں نے مرزا سے کہا تھا کہ تیرے گرد ہونی نے گھیرا ڈال رکھا ہے اور تجھے موت اس جنڈ کے درخت کے ٹھنڈے سائے سے اٹھنے نہیں دیتی اور تو جو یہ سُرخ دوشالا تان کر سو گیا ہے تو یہی تیرا لہو رنگ کفن بن جائیگا تو وہ ایسی تنبیہ تھی جس پر وہ عشق پیشہ اگر کان دھرتا تو شاید تقدیر کے اس سیاہ پوش لمحے کی زد سے بچ سکتا تھا مگر وہ بے فکر ہو کر وہاں سو رہا صاحباں کے زانو پر سر رکھ کر۔ اور اس سے زیادہ نرم و گداز تکیہ اسے اور کہاں سے مل سکتا تھا۔ رحمت علی کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ میں اس سہ پہر وہاں سے نہ نکلتا اور وہ لوگ مجھے غیر محسوس طریقے سے حکیم صاحب کے گھر سے اٹھ جانے پر مجبور نہ کرتے تو شاید اس کی جان بچ جاتی۔ اور اس کے ساتھ زلیخا بھی جان سے گزر نہ جاتی۔ وہ بھی زندگی کی لَو کچھ عرصے اور بچا لیتی مگر تقدیر کا جال اپنے ہر حلقے میں ایک شکنجہ لیے ہوتا ہے۔ میں حکیم صاحب کے گھر سے نکلا تو کشور نے انہیں باور کرا دیا کہ اب میدان صاف ہے اور وہ حسب سابق اس کے گھر میں ملاقات کر سکتے ہیں۔ اسی یقین دہانی پر وہ دونوں وہاں یکجا ہو گئے تھے۔ مگر۔۔۔ مگر کسی نے زلیخا کے بھائی اور بہنوئی کو بھی خبردار کر دیا تھا۔ انھیں بھی اپنی بہن کے اس نئے سفر کا علم ہو چکا تھا۔ اور وہ ان دونوں کی تاک میں تھے۔ وہ جیسے ہی حکیم صاحب کی بیٹھک میں پہنچے تقدیر نے اپنی کڑی کمان سے تیر چلا دیا۔ ان کے حصے میں جو دو گولیاں آئی تھیں وہ مجھے وحشت زدہ کرنے کے لیے بہت کافی تھیں۔ ورنہ میں نے تو رحمت علی کے لیے ایسی موت تجویز نہیں کی تھی۔ میں تو ان دونوں کو وہاں سے باندھ کر لے جانا چاہتا تھا۔ زندہ سلامت حالت میں میں انکو ڈھلوں صاحب کے سامنے ڈال دیتا آگے وہ جانتے اور اُن کا کام۔ مگر یارو! تقدیر تو دور کھڑی میرے اس منصوبے پر قہقہے لگا رہی تھی۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ موت ان پر پہلے ہی فریفتہ ہو چکی ہے۔

رحمت علی نے زلیخا کو پا کر سب کچھ ہی فراموش کر دیا تھا۔ ایسا ہوتا آیا ہے۔ اسے بھی اچانک ہی کسی دن یہ احساس ہوا ہوگا کہ اس کی تکمیل کا لمحہ سامنے ہے۔ جب ہی تو زلیخا کے لیے اُس نے اپنی جان گروی رکھ دی تھی۔ حالانکہ اسے معلوم تھا کہ وقت نے اس کے وجود میں سیندھ لگا رکھی ہے۔ اس کی کنپٹیوں کے بال سفید ہو چکے تھے۔ خاصا صحت مند آدمی تھا مگر اسے عشق نے آلیا۔ اُس مرحلے میں آلیا جس مرحلے کو عہد پیری کہتے ہیں۔ وہ عابد و زاہد قسم کا آدمی تھا۔ گاؤں میں اُس کے زہد و تقوٰی کا بہت چرچا تھا۔ اس مولوی نے مجھے یہی بتایا تھا کہ وہ پرہیزگار انسان ہے۔ میں نے بھی اسے مسجد میں سربسجود دیکھا تھا مگر۔۔۔ مگر پھر اُس نے اچانک ہی اپنا رُخ بدل لیا تھا۔ وہ نادیدہ کے بجائے دیدہ کی پرستش کرنے لگا تھا۔ یہ اس کی لغزش تھی کہ کسی پرانی زنگ آلود زنجیر کو کاٹ دینے کی ایک ارادی کوشش کی، میں اُس کے بارے میں اپنی ذاتی معلومات تو رکھتا ہی نہیں تھا۔ اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ اسے جذبے کے اس سیلاب نے آخر کیسے اور کیونکر آلیا۔ شاید اس کی زندگی میں کوئی بہت بڑا خلا تھا جسے پُر کرنے کے لیے وہ فنا کے گھاٹ اُتر گیا۔

زلیخا کا وہ لہو لہو سراپا بھی ٹھہر ٹھہر کر میری نظروں میں ابھرتا تھا۔ وہ گولیوں کی زد میں آکر بکھری تو اور زیادہ حسین ہو گئی۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔ ایسے۔۔۔ اس چاند کو کسی نے نہ جانے کس گناہ کی پاداش میں اپنے آسمان سے اتار دیا تھا۔ وہ کوئی بدنصیب ہی ہوگا۔ جسے اس کی چاندنی راس نہ آئی۔ ورنہ وہ۔۔۔ وہ تو ایسی تھی کہ اس کے فانی بدن پر تاج محل تعمیر کیا جاتا۔ مگر وہ۔۔۔ وہ بے موت ماری گئی۔ اپنے ہی گھر کے لوگوں کے عتاب کا نشانہ بن گئی۔ حسن کی سب سے بڑی خرابی یہی ہے کہ وہ فتنہ خیز ہے وہ اٹھتا ہے تو قیامت اس کے ساتھ اٹھتی ہے۔ وہ شعلۂ مستعجل تو ہوتا ہی ہے مگر جب سیاہ پوش ہوتا ہے تو رونقیں اُس کے گرد تا دیر ماتم کناں رہتی ہیں۔

میں نے اچھا کیا جو اُن دونوں حملہ آوروں کو زخمی کر کے موقعۂ واردات پر باندھ آیا تھا۔ اور لوگوں نے اُن کو پہچان لیا تھا۔ مگر میری وہاں پُراسرار موجودگی اور پھر میرے اس فرار کا جواز کشور کے پاس کیا ہوگا۔ وہ بھی کئی دنوں تک پولیس کے چکر میں پڑی رہے گی۔ پھر بھی وہ اپنی بے گناہی ثابت کر سکتی تھی۔ ان دونوں کے پستول اُن کی لائسنس اور اُن کے زخمی وجود اُن کے جرم کا کھلا ثبوت تھے مگر اس بات کا کوئی کیا جواب دے گا کہ میں نے انہیں زخمی کیوں کر دیا۔ اور پھر وہاں سے منہ چھپا کر بھاگ کیوں نکلا؟ حالات کی ستم ظریفی کی حد تو یہ تھی کہ حکیم صاحب بھی اس رات گھر پر موجود نہیں تھے۔ اور پاکیزہ حکیم صاحب کی دوسری بیوی کے ہمراہ گہری نیند میں کھوئی تھی۔ اُن کے فرشتوں کو بھی یہ علم نہیں تھا کہ وہاں کیسا خونچکاں اندھیر مچ چکا ہے۔

کار اچھی تھی اور میرا ساتھ دے رہی تھی۔ گوجرانوالہ پہنچ کر میں نے اُس میں پٹرول ڈلوایا اور لب سڑک ایک ہوٹل میں بیٹھ کر چائے کی دو پیالیاں پیٹ میں انڈیل کر میں پھر آگے چل دیا۔ دھڑکا مجھے یہی لگا تھا کہ کہیں اس کار کی گمشدگی کے بارے میں کسی نے پولیس کو خبردار نہ کر دیا ہو۔ ایسی صورت میں وہ لوگ سڑکوں کی ناکہ بندی کر کے بیٹھ رہتے ہیں مگر میرا سفر بڑے اطمینان سے طے ہوتا رہا۔ گاڑی کے تمام کاغذات مکمل تھے اور ڈیش بورڈ میں رکھے تھے۔ کوئی مجھ سے میرا ڈرائیونگ لائسنس پوچھ بیٹھتا تو مشکل پیش آسکتی تھی مگر اُس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ رمضان کے مہینے کی وجہ سے پولیس نے بھی ہاتھ نرم کر لیا تھا۔ وہ مجھے کسی بھی جگہ مردم آزاری کے لیے موجود نظر نہیں آئے۔ یہ اچھی بات تھی۔

جب میں ڈھلوں صاحب کی حویلی پہنچا تو صبح ہونے والی تھی اور چوگوٹھ کی مسجد سے فجر کی اذان بلند ہو رہی تھی۔ حویلی کی ڈیوڑھی کے سارے ہی ملازم بیدار تھے۔ وہ سحری کھا کر اب نماز کی تیاری کر

رہے تھے۔ برکت بھی مجھے وہیں مل گیا۔ اُس نے پہلے تو مجھے، اور پھر میرے عقب میں کھڑی کار کو بڑی حیرت سے دیکھا اور دبی آواز میں بولا "آپ کہاں سے آ رہے ہیں خان جی! چوہدری صاحب کا پیغام نہیں ملا ہے آپ کو؟"

"نہیں! مجھے تو کوئی پیغام نہیں ملا، کوئی خاص بات ہے کیا؟"

"ہاں! ڈھلوں صاحب نے کل صبح دس بجے کراچی سے فون کیا تھا لاہور میں۔ ایک آدمی بھاگا آیا، اس نے کہا آپ فوراً کراچی پہنچ جائیں۔"

"کراچی! کہاں ٹھہرے ہیں وہ؟ کوئی پتہ دیا ہے انہوں نے؟"

"جی ہاں! یہ پتہ ہے ان کا۔ وہ لیاقت آباد میں ٹھہرے ہیں۔" اُس نے جیب میں دھرے پلاسٹک کے بٹوے میں سے ایک کاغذ نکال کر میرے سامنے کر دیا۔

"اور کیا کہا ہے ڈھلوں صاحب نے؟"

"کچھ نہیں۔ وہ آدمی کہہ رہا تھا کہ جیسے ہی آپ کو یہ پیغام ملے آپ فوراً کراچی چلے جائیں۔"

"اس آدمی کو جانتے ہو جو پیغام لایا تھا؟"

"میں نے اُسے پہلے تو نہیں دیکھا میرے لیے وہ اجنبی ہی تھا۔"

"اپنا پتہ بھی وہ بتا گیا ہے وہ کہ نہیں؟"

"ہاں! وہ کامران ہوٹل میں رہتا ہے لمبی سے کار میں یہاں آیا تھا۔ نام اس کا ولایت علی ہے، پہلے اُس سے مل لیں۔"

"ہوں، ٹھیک ہے میں معلوم کرتا ہوں کہ یہ قصّہ کیا ہے۔" میں نے کار کی طرف لوٹتے ہوئے کہا۔

"آپ بہت تھکے ہوئے نظر آتے ہیں دو گھڑی آرام کر لیں اور صبح ناشتہ کر کے چلے جائیں آپ کا بُرا حال ہو رہا ہے، یہ کار میں اندر رکھوا دیتا ہوں۔"

"ہاں، یہ بہتر رہے گا۔ چلو مجھے کمرے میں پہنچا دو۔" میں نے ڈیوڑھی میں قدم رکھتے ہوئے کہا۔ کچھ ہی دیر بعد برکت نے مجھے میرے لیے مخصوص کمرے میں پہنچا دیا اور میں اندر سے دروازہ بند کر کے اُسی وقت بے سُدھ ہو کر سو گیا۔

جب میری آنکھ کھلی تو نو بج چکے تھے سُورج بہت اُوپر اُٹھ آیا تھا۔ جیسے ہی میں برآمدے میں نکلا برکت مجھے احاطے میں داخل ہوتا نظر آیا۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکراتے ہوتے بولا "دیکھا اب آپ زیادہ بہتر نظر آ رہے ہیں۔ آرام بہت ضروری تھا۔ آپ نہا لیں تو میں ناشتہ لے آتا ہوں۔"

"تم نے تو روزہ رکھا ہو گا؟"

"جی ہاں! ادھر ہم سب پکڑے گئے ہیں۔ بڑی بی بی کا حکم ہے کہ ہم میں سے کوئی روزہ خور نہیں ہونا چاہیے۔ انہیں خواب میں کسی بزرگ نے کہا ہے کہ خود ہی نہیں، حویلی کے ہر آدمی سے روزے کی پابندی کرائیں۔"

"یہ تو بہت اچھا ہُوا۔ کچھ عاقبت کی بھی فکر کرنی ہی چاہیے یہاں تو پتہ نہیں کون کتنے دن کے لیے ہے۔" میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ مجھے زندگی کی بے ثباتی نے کل رات سے نڈھال کر رکھا تھا۔ رحمت علی کے اس اندوہناک انجام نے مجھے دہلا دیا تھا۔

برکت واپس گیا تو میں غسل خانے میں جا گھسا۔ پانی ٹھنڈا تھا اور سکون پہنچا رہا تھا۔ میں خوب مَل مَل کر نہایا۔ برکت واپس آیا تو وہ میرے لیے ایک نیا لباس لے آیا تھا۔ اس کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں عمدہ پشمینہ کی ایک سرمئی رنگ کی ایک شیروانی بھی شامل تھی۔

"یہ کس لیے لے آتے ہو اس موسم میں؟"

"یہ کپڑا گرم نہیں ہے اور آپ کراچی جا رہے ہیں یہ لباس آپ کے لیے بہتر رہے گا۔ آدمی ذرا بارعب نظر آتا ہے۔"

"کوئی خاص ہدایت ہے اس سلسلے میں؟"

"نہیں! مگر آپ کو شاید پتہ نہیں ڈھلوں صاحب نے ایسی تین اچکنیں آپ کے لیے سلوائی ہیں۔ دو اندر رکھی ہیں اور بوسکی کے تین جوڑے بھی اُن کے ساتھ ہیں۔ ایک میں لے آیا ہوں۔ باقی دو بھی میں سوٹ کیس میں رکھ دیتا ہوں۔"

"آج تو کچھ زیادہ ہی مہربان ہے مجھ پر، خیر تو ہے نا برکت!"

"یہ میرا فرض ہے خان جی! مجھے معلوم ہے ڈھلوں صاحب کے دل میں آپ کی کتنی عزت ہے۔"

"ٹھیک ہے یار جی! تم کسی مضبوط سے سوٹ کیس میں وہ چیزیں رکھ دو میں ابھی شہر چلا جاؤں گا۔"

ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے اپنی چیزیں سمیٹ کر سوٹ کیس میں رکھیں اور اسی وقت حویلی سے باہر چلا آیا۔ برکت نے کار پر پڑا گرد و غبار صاف کروا دیا تھا اور اب وہ بدلی بدلی سی نظر آتی تھی۔

مگر جیسے ہی میں اس کے اندر بیٹھا اور اسے اسٹارٹ کرنے لگا تو برکت تیزی سے میری طرف بڑھا، بولا "ایک بات تو مجھے یاد ہی نہیں رہی خان جی!"

"کون سی بات؟ آج کچھ زیادہ ہی باتیں یاد آ رہی ہیں تمھیں"

"کل ڈاکٹر عذرا بھی یہاں آئی تھیں ڈھلوں صاحب سے ملنے کے لیے۔ بڑی بی بی سے مل کر چلی گئیں آپ کو وہ سلام کہہ رہی تھیں۔ کہتی تھیں کہ آپ اگر لاہور آئیں تو اُن سے ضرور ملیں"

"ڈاکٹر عذرا؟ ٹھیک ہے۔ میں اُن سے بھی مل لوں گا مگر کراچی سے واپس آنے کے بعد ہی وہاں جا سکوں گا۔" یہ کہہ کر میں

گنیشن میں لگی چابی گھما دی۔ انجن بڑے زور سے ہنہنایا اور میں برکت سے ہاتھ ملا کر اسی وقت وہاں سے روانہ ہو گیا۔

کامران ہوٹل کے ولایت علی کا نام میرے ذہن سے چپک کر رہ گیا تھا۔ اس کا ذکر مجھ سے ڈھلوں صاحب نے کبھی نہیں کیا تھا۔ کراچی جانے سے پہلے میرا اس سے مل لینا بہت ضروری تھا عین ممکن ہے کہ فون پر اسے ڈھلوں صاحب نے زیادہ تفصیل سے کوئی بات بتائی ہو۔ آبی کی رہائی کے لیے وہ اب تک جو کچھ کر چکے تھے اس کے بارے میں مجھے سب کچھ معلوم ہونا چاہیے تھا۔ وقت نے میرا اور آبی کا بٹوارا کچھ اس طرح توڑ دیا تھا کہ ہم دونوں ہی پریشان ہو کر رہ گئے تھے۔ میری بھی پتلیاں پھر گئی تھیں۔ اور اس کی بھی۔ اب پچھوا نہیں چلتی تھی۔ ہم دونوں بادِ سموم کی زد میں آ گئے تھے مجھے آبی کی رہائی اس گھڑی ہر شئے پر مقدم نظر آتی تھی۔ میرے سارے ہی راز اس کے سینے میں دفن تھے۔ پولیس اسے میرے خلاف سب سے بڑا گواہ بنا سکتی تھی۔ وہ شاید اتنی ساری اذیت نہ سہہ سکے اور انہیں وہ سب کچھ بتا دے جو میں خدا سے بھی چھپا لینا چاہتا تھا۔

کامران ہوٹل اسٹیشن کے سامنے کھڑی فلک بوس عمارتوں میں گھرا تھا۔ میں نے کار اس سے ذرا دور وکٹوریہ ہوٹل کے سامنے کھڑی کی اور اسے مقفل کر کے میں کامران ہوٹل کے اندر جا گھسا۔

کاؤنٹر کلرک سے جب میں نے ولایت علی کے بارے میں پوچھا تو وہ ایک دم مستعد ہو گیا، بولا "میں ابھی آپ کو اُن کے کمرے میں بھجوا دیتا ہوں، ارے فرید! دیکھ چوہدری صاحب کو ان ملک صاحب کے پاس لے جا اُن کے کمرے میں۔" اس نے قریب کھڑے ایک بیرے کو مخاطب کرتے ہوتے کہا۔

"چلیں صاب جی! ملک صاحب کمرے ہی میں ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

مگر کاؤنٹر کلرک نے اُسے روک لیا، بولا "ذرا ٹھہرو! میں اُن کو فون پر اطلاع کر دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے سامنے رکھے ایک فون کے دو نمبر گھمائے اور ریسیور کان سے لگا کر بولا "سر! ایک صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

✱

"جی! نام۔۔۔ آپ کا کیا نام ہے جناب؟"

"ہاشم خان۔ میں ڈھلوں صاحب کے گاؤں سے آیا ہوں۔" میں نے بریف کیس کو کاؤنٹر پر رکھتے ہوتے کہا۔

"جی حلیہ؟" کاؤنٹر کلرک نے دبی آواز میں کہا۔ پھر مجھے بڑے غور سے دیکھنے لگا۔ پھر دوسری طرف سے کوئی ہدایت ملنے پر بولا "آپ کس سلسلے میں ملک صاحب سے ملنا چاہتے ہیں؟"

"مجھے اُن کا پیغام ملا تھا۔ کراچی جانے کے سلسلے میں۔ ملک صاحب کل خود چوگوٹھ گئے تھے۔" میں نے اس کلرک کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں میں تجسّس اُبھر آیا تھا۔ اور معلوم یہ ہوتا تھا کہ ولایت علی مجھ سے ملنے سے پہلے میرے بارے میں تمام ممکنہ معلومات حاصل کر لینا چاہتا تھا۔

وہ چند لمحوں تک ریسیور پر کوئی بات بڑے غور سے سُنتا رہا پھر فون بند کر کے بولا "ٹھیک ہے جناب آپ جائیں۔ فرید آپ کو ملک صاحب کے کمرے تک پہنچا دے گا۔" یہ کہہ کر اس نے مجھے سامنے کی سیڑھی کی طرف بڑھنے کا اشارہ کیا۔ فرید میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا جب میں سیڑھیاں چڑھ کر دوسری منزل پر پہنچا تو مجھے کوئی سو فٹ لمبی راہداری میں کئی آدمی اِدھر اُدھر چلتے دکھائی دیے۔ راہداری کے فرش پر سُرخ قالین بچھا تھا اور اس کی فضا میں خس کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔

فرید مجھے اپنے ساتھ لے کر راہداری عبور کرنے کے بعد ایک وسیع ہال سے گزرتا ہوا دائیں ہاتھ کے ایک الگ تھلگ کمرے کے سامنے رُک گیا، اور دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر بولا "ملک صاحب! آپ کے مہمان کو میں لے آیا ہوں۔"

فرید کے ان الفاظ کا کوئی جواب نہیں آیا۔ لمحے کچھ زیادہ گراں بار ہو گئے تھے۔ میں نے ایک اچٹتی سی نظر پھر راہداری پر ڈالی سیڑھیوں میں سے دو آدمی تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اُوپر آ رہے تھے کسی اور طرف توجہ دیے بغیر اُن کی نظریں سیدھی ہم پر اٹھیں مگر صرف ایک لحظے کے لیے۔ اس کے بعد وہ دُوسری طرف چل دیے عین اُس وقت ولایت علی کے کمرے کا دروازہ کھل گیا۔

میرے سامنے ایک لمبا تڑنگا آدمی کھڑا تھا۔ قد اس کا چھ فٹ سے کسی بھی طرح کم نہیں تھا۔ عمر یہی کوئی پینتیس سال ہو گی، بولا "آئیے جناب آئیے۔ مجھے ولایت علی کہتے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے بڑے تپاک سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اس کا پنجہ سخت اور کھُردرا تھا۔ یوں جیسے وہ عمر بھر گھاس کھودتا رہا ہو۔ لہجہ اس کا مہذّب تو تھا مگر اس میں ایک عجیب طرح کی غیر محسوس دھقانیت جھلکتی تھی۔

میں نے دروازے کے اندر قدم رکھا تو وہ بولا "تم جاؤ فرید! کسی چیز کی ضرورت ہوئی تو میں تمھیں بلواؤں گا۔" یہ کہہ کر اس نے دروازہ بند کیا اور ہاتھ کو پوری لمبان سے پھیلا کر صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "تشریف رکھیں جناب! مجھے دراصل ڈھلوں صاحب کا پرانا خادم ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اُن کا فون آیا تھا کراچی سے کہہ رہے تھے ہاشم خان صاحب کو فوراً کراچی بھیج دیں۔ میں اسی لیے اُن کی حویلی گیا تھا مگر آپ سے ملاقات نہ ہو سکی۔" اس کی وہ کرنجی

آنکھیں۔ مجھے ایک مخصوص قسم کی سرد مہری اور درشتی کا احساس دلاتی تھیں۔

"آپ کا پیغام ملتے ہی میں اِدھر چلا آیا۔ ڈھلوں صاحب نے کوئی خاص بات کہی ہو تو وہ مجھے بتا دیں گے"

"اُن کے ملازم برکت سے تو میں سب کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ خاصے پریشان تھے۔ کہہ رہے تھے کہ میں جس کام کے لیے کراچی آیا ہوں اُس کا ابھی تک سر پیر نہیں بنا ہے"

"ہوں، اُن کا فون نمبر تو آپ کے پاس ہوگا؟"

"بس یہی گڑبڑ ہو گئی۔ اپنا فون نمبر انھوں نے نہیں بتایا۔ اب آپ کا کیا پروگرام ہے؟"

"میں آج ہی کراچی چلا جاؤں گا"

"ہاں یہی بہتر ہے۔ کوئی صاحب ہیں اسلم آبی، اُن کے بارے میں وہ کہہ رہے تھے کہ وہ ابھی تک اُن سے نہیں مل سکے ہیں"

ولایت علی نے امریکن سگریٹ کا ایک بڑا سا پیکٹ میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا "آپ روزے سے تو نہیں ہیں نا؟"

"جی نہیں! میں اس سعادت سے محروم ہی رہ رہا ہوں"

"اچھا اچھا، ویسے یہ بتائیں کہ ڈھلوں صاحب آپ کے کیا لگتے ہیں؟"

"وہ میرے دوست ہیں" میں نے بہت محتاط لہجے میں کہا۔

"اچھا اچھا! میں سمجھا آپ اُن کے شاید قریبی عزیز ہیں۔ بہت بڑے آدمی ہیں وہ، بڑا اثر رسوخ ہے اُن کا"

"جی ہاں! اب مجھے اجازت دیں میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ میں دوپہر کی فلائٹ سے کراچی چلا جاؤں گا" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ آدھ جلا سگریٹ میں نے سامنے راکھ دان میں مسل دیا۔

"ایسی بھی کیا جلدی ہے اگلی فلائٹ شام پانچ بجے جاتی ہے آپ پانی شانی تو پی لیں" یہ کہہ کر اُس نے کمرے کے ایک کونے میں دھری میز کے سامنے کرسی پر بیٹھ کر گھنٹی بجا دی۔ "آپ کا کیا شغل ہے بائی دی وے، زمینداری کرتے ہیں؟"

"جی ہاں! میری کچھ زمینیں ہیں اُدھر واں رادھا رام میں۔ میرا خیال ہے آپ مجھے اجازت دیں، مجھے کچھ کام بھی ہیں شہر میں" میں نے ایک بار پھر اٹھتے ہوئے کہا۔ مجھے عجیب طرح کے اندرونی اضطراب نے آگھیرا تھا۔ میرا پستول بریف کیس میں بند تھا حالانکہ لازم تھا کہ میں کسی بھی اجنبی سے ملاقات کرتے وقت اُسے اپنے سیدھے ہاتھ کی دسترس میں رکھتا۔

"آپ فکر نہ کریں۔ کھانے کا وقت بھی زیادہ دور نہیں ہے ساڑھے بارہ بج رہے ہیں۔ شاید ڈھلوں صاحب کا فون بھی آجائے۔ کل اُن کا فون اسی وقت آیا تھا کہہ رہے تھے کہ وہ مجھ سے معلوم کریں گے کہ اُن کا پیغام آپ کو ملا کہ نہیں"

اُس کے لہجے میں تصنع کی جھلک نمایاں تھی۔ میں ایک بار پھر صوفے میں دھنس گیا اور بریف کیس کو زانوؤں پر رکھ کر میں نے ولایت علی کی طرف سے اوٹ کرتے ہوئے اپنا چپ شاہ اُس میں سے نکال لیا۔ میری نقدی سوٹ کیس میں دھری تھی۔ ابھی میں پستول اچکن کے پلتے تلے دے کر نیفے میں اُڑس ہی رہا تھا کہ ولایت علی کی چابک ایسی آواز میری سماعت پر گری۔ اُس نے سیدھے ہاتھ میں پستول تھام رکھا تھا، یوں کہ اُس کی نال کا رُخ میرے سینے کی طرف تھا۔

"یوں کام نہیں چلے گا خان جی! میزبانوں پر اتنی بدگمانی اچھی نہیں ہوتی"

میرا ہاتھ جہاں تھا وہیں منجمد ہو کر رہ گیا مگر میں اُسے پہل کرنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ میں نے بریف کیس کے ڈھکنے کی اوٹ میں پڑا اپنا ہاتھ ابھی تک پیچھے نہیں ہٹایا تھا۔ ابھی وہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے اور مجھے صرف اُسی ایک لمحے کی مہلت میسر تھی۔ میں نے اپنا چپ شاہ بریف کیس کے ڈھکنے کی اوٹ میں ایک لحظے کے ہزارویں حصے میں سیدھا کر کے اُس پر گولی داغ دی۔ یوں کہ میری اُس حرکت کا صحیح اندازہ کر کے اُس نے بھی گولی چلا دی۔ مگر میں اُس کے ہدف کو سمجھ کر پہلے ہی اپنی جگہ سے ہٹ چکا تھا۔ میری گولی اُس کے دائیں بازو میں لگی اور اُس کی گولی صوفے میں جا دھنسی۔ عین اُس جگہ جہاں ایک ثانیہ پہلے میرا سر ٹکا تھا۔ گولی لگتے ہی اُس کے ہاتھ سے پستول چھوٹ کر میز پر گرا۔ اُسے اٹھانے کے لیے میں آگے بڑھا تو کمرے کا دروازہ بے آواز کھلا کسی نے کڑک کر کہا "ہلنے کی کوشش نہ کرنا۔ ورنہ بے موت مارے جاؤ گے"

میرا میز کی طرف بڑھتا ہوا دایاں ہاتھ پستول پر پڑ چکا تھا۔ مگر میری پشت محفوظ نہیں تھی۔ میں نے مُڑ کر دیکھا میرے عقب میں دو آدمی کھڑے تھے اور اُن دونوں کے ہاتھوں میں پستول تھے۔ میں نے سامنے کی کرسی پر بیٹھے ولایت علی پر پستول تان رکھا تھا۔ میں نے سیدھا ہو کر بہت ہی جمے ہوئے لہجے میں کہا "اگر تم نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو میں اس دیّوث کو جان سے مار دوں گا۔ تم فوراً باہر نکل جاؤ"

ولایت علی کا رنگ زرد ہونے لگا تھا۔ گولی اُس کے بازو کو پھاڑتی چلی گئی تھی اور اُس کا ململ کا کُرتا لہو میں تر ہونے لگا تھا۔ اُس نے بڑی بے بسی سے دروازے کے اندر کھڑے دونوں آدمیوں کو دیکھا اور بڑے ہی کرب ناک لہجے میں بولا "تم دونوں باہر نکل جاؤ"

مگر ابھی وہ یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ مجھے یوں لگا جیسے کوئی

بلی پھر میری کمر پر آ پڑا ہو۔ میرے پیچھے کھڑے ایک آدمی نے اچھل کر دونوں پاؤں کی ضرب میری کمر پر کچھ اِس طرح لگائی کہ میں میز سے ٹکرا کر اوندھے مُنہ قالین پر جا گرا۔ اسی لمحے دوسرے آدمی نے میری کنپٹی پر پستول کا دستہ مارنا چاہا مگر میں تیزی سے اُلٹ گیا اور اپنی دونوں ٹانگوں میں میں نے اُس آدمی کو جکڑ لیا۔ مگر میری وہ کوشش لاحاصل تھی۔ اب دو پستول مجھ پر تن چکے تھے اور جس آدمی کو میں نے قینچی لگائی اُس کے پستول کی نال کا رُخ میرے سینے کی طرف تھا۔ دوسرے آدمی نے میرے سر کی طرف سے آ کر اپنا پاؤں کچھ اِس تیزی سے میری دائیں کلائی پر مارا کہ میرا چپ شاہ میری گرفت سے نکل گیا۔ خون کے سارے سرچشمے اُن کی طرف منتقل ہو چکے تھے میرے سر کی طرف کھڑے آدمی نے میرے پستول کو ٹھوکر مار کر پرے کیا اور پھر اپنے پستول کا دستہ کچھ اتنی تیزی سے اُس نے میرے ماتھے پر دے مارا کہ میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ میرے حواس میرا ساتھ چھوڑ رہے تھے میرے ماتھے کی ہڈی تو نہیں ٹوٹی مگر میرا مغز اپنی جگہ سے ہل کر رہ گیا تھا۔

وہ دونوں آدمی وہی تھے جن کو میں نے اپنے عقب میں سیڑھیوں سے اُوپر آتے دیکھا تھا۔ ابھی تک اُن کے عکس میری آنکھوں میں لہرا رہے تھے۔ میری ٹانگوں کی گرفت میں آئے ہوئے آدمی نے جھٹکا دے کر میری ٹانگوں کی قینچی کھول دی۔ وہ دونوں مجھے بے بس کر چکے تھے میں چند ساعتوں تک آنکھیں بند کر کے اپنی بچی کھچی قوتیں مجتمع کرتا رہا۔

"اس کو باندھ لو — اس جیلانی کو۔ دھمن کی تاکید نہ ہوتی تو میں اسے ابھی جان سے مار دیتا" یہ ولایت علی کی آواز تھی۔

دھمن کا نام سنتے ہی میرے ذہن میں اُن سب کے خلاف نفرت کا لاوا سا اُبلا اور میں نے سامنے کھڑے آدمی کے پیٹ پر بُوٹ کی ضرب لگانے کی کوشش کی مگر وہ اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔

"اِس کی ہتی ابھی تک گل نہیں ہوئی ہے بجو! کہو! مار دوں اسے؟"

"نہیں! اِس سے تو لمبا حساب چکانا ہے ہمیں۔ اسے پکڑ کر باندھ لے شرفو!" ولایت علی نے چیخ کر کہا۔ وہ اپنے زخم پر رومال رکھ کر اب میرے پاس آ ٹھہرا تھا۔ اُس کی یہ بات سنتے ہی میں ایک بار پھر پورے قد سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا مگر میرے عقب میں کھڑے بجو نے میرے سر کی پشت پر ایک بار پھر پستول کا دستہ کچھ اتنے زور سے مارا کہ میرے سامنے کی ہر شے اندھیرے میں ڈوب گئی اور میں بے سُدھ ہو کر فرش پر ڈھے گیا۔ مجھے خود پر اب کوئی اختیار حاصل نہیں رہا تھا۔

میں جب دوبارہ حلقۂ ادراک میں واپس آیا تو میری حالت اُس مُرغی کی سی تھی جس کے پر مروڑ کر ایک دوسرے میں پھنسا دیے گئے ہوں۔ میری دونوں ٹانگوں پر ایک مضبوط رسی بندھی تھی اور میرے دونوں بازو میری کمر پر اس طرح جکڑ دیے گئے تھے کہ میں صرف اوندھے منہ ہی آرام سے لیٹ سکتا تھا۔ میری شیروانی اتار لی گئی تھی اور میرے نیچے قالین بچھا تھا۔ کمرے میں ایک سبز رنگ کا چھوٹا سا بلب لائٹ شن تھا۔ میں نے اُلٹ کر کمرے کا جائزہ لینا چاہا تب مجھے بجو کی صورت نظر آئی وہ مجھ سے چند قدم دُور کرسی پر بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ مجھے ہوش میں آتے دیکھ کر پستول کو بائیں ہاتھ میں لہرا کر بولا "کیا حال ہے پیارے! تیرا جی متلا تو نہیں رہا۔ کہے تو اچار کھلاؤں؟"

وہ میرے چپ شاہ پر قبضہ جمائے بیٹھا تھا۔ مسکراتا ہوا اُٹھا اور کمرے کی دونوں دیواروں پر لگی ٹیوب لائٹیں جلا کر پھر کرسی پر جا بیٹھا۔ میری کلائی پر بندھی گھڑی بھی وہ لوگ اتار چکے تھے۔ "یہ لے یہ تکیہ سر کے نیچے رکھ لے" اُس نے قریب پڑے پلنگ پر سے ایک تکیہ اٹھا کر میرے سر تلے رکھ دیا۔ مگر یوں کہ میرے بال پکڑ کر اُس نے میرا سر بڑی ہی بدتمیزی سے اوپر اٹھایا۔ جب میں تکیے پر سر ڈال چکا تو وہ مجھے پاؤں سے آڑ لگا دیتے ہوئے الٹا کر بولا۔

"یوں لیٹو، آرام ملے گا" میرے دونوں بازو نیچے دب گئے تھے۔

"کیا چاہتے ہو تم؟" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

"ہم تو تجھے ہی چاہتے ہیں پیارے"

"یہ مذاق چھوڑ دے بجو! مجھے بتا کہ تم نے مجھے کیوں باندھ لیا ہے؟"

"تم نے ڈاکٹر دھمن کو کراچی میں کس لیے باندھ لیا تھا؟"

"اُس سے تمھارا کیا تعلق ہے؟"

"اس کے نمکخوار ہیں ہم۔ اور چاہتے ہیں کہ تمھاری بھی اُتنی ہی چھان پھٹک کر دیں جتنی تم اُن کی کر چکے ہو"

"وہ تو تم کر ہی چکے ہو۔ آگے کی بات کرو"

"آگے کی بات تو دھمن صاحب ہی کریں گے ابھی تو ہمیں یہ حکم ہے کہ ہم تجھ سے وہ پچھتر لاکھ روپیہ اگلوائیں جو تم نے اُن سے چھین لیا تھا"

"وہ تو میرے پاس نہیں ہے۔ کراچی کے ایک بینک میں پڑا ہے"

"وہاں کی سیر بھی تمھیں ہم ضرور کرائیں گے اور پھر سپردِ خدا کر کے تمھیں سمندر میں ڈال دیں گے۔ مچھلیوں کو اچھا ناشتہ مل جائے گا"

"تم بہت گھٹیا بات کر رہے ہو۔ تمھیں پتہ نہیں کہ تم کس آگ میں ہاتھ ڈال چکے ہو"

"ہماری فکر نہ کرو پیارے! آبی کو ڈاکٹر دھمن نے پولیس سے چھڑا کر اپنی حوالات میں ڈال رکھا ہے اور وہاں تک تمھارے ڈھلوں صاحب کبھی نہیں پہنچ سکتے"

"یہ ولایت علی کون ہے؟"

"دھمن صاحب کا دوست ہے مگر اتنی ساری باتیں اپنے مغز میں جمع نہ کرو، پاگل ہو جاؤ گے۔"

عین اس وقت کونے میں دھرے ٹیلیفون کی گھنٹی ٹراں ٹراں کرنے لگی۔ نجو تیزی سے اس طرف لپکا۔ "ہیلو کون؟"

- - - - - - - - -

"اوہ! سوات خان! کہو کیا خبریں ہیں؟"

- - - - - - - - -

"ہاں! پنچھی ادھر ہی پڑا ہے۔"

- - - - - - - - -

"کیا! یعنی ---- نہیں یار! ---"

- - - - - - - - -

"اچھا! مگر یہ تو پاگل ہو جائے گا۔" نجو نے ہنستے ہوئے کہا۔

- - - - - - - - -

"اچھا اچھا۔ ٹھیک ہے پیارے! لاؤ اس کو فون پر۔ دونوں کی ملاقات کرا ہی دو۔" یہ کہہ کر اس نے فون اٹھایا اور اس کا ریسیور میرے منہ کے پاس لاکر بولا "لے پیارے! اپنے یار سے بات کر۔ اسلم آبی مقعول پوری ہے۔" یہ کہہ کر اس نے چونگے کا دوسرا سرا میرے کان سے لگا دیا۔

"بول اوئے بات کر۔" یہ سوات خان کی آواز تھی۔ وہ کراچی سے بول رہا تھا اور آبی کو ٹھوکا دے رہا تھا۔

"ہیلو تو کہہ دے پیارے! آبی تیری آواز کو ترس رہا ہے۔" نجو نے ریسیور میرے کان پر مارتے ہوئے کہا۔ وہ ہم دونوں سے بلی چوہے کا کھیل کھیل رہے تھے۔

"اوئے یہ بولتا کیوں نہیں ہے۔ مار اس کی پسلی پر ایک چھرا۔" سوات خان نے دوسری طرف سے للکارتے ہوئے کہا۔

"یہ کیا کرتے ہو؟ کیا ہو رہا ہے یہ؟" اچانک ڈاکٹر دھمن کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ بہت غضبناک ہو رہا تھا۔ اور اچانک ہی وہاں آ پہنچا تھا۔

"وہ --- وہ صاب جی! ذرا اس کی جیلانی سے بات کرا رہا تھا۔"

"بند کرو یہ قصہ۔ کوئی اور بھی یہ باتیں سن سکتا ہے۔" دوسری طرف سے کلک کی آواز آئی۔ فون بند ہو چکا تھا۔ ریسیور کے اندر خرخر کی آواز گم ہوئی تو نجو نے فون مجھ سے لے لیا۔ "ہیلو --- ہیلو۔ ارے یہ تو شاید لائن ہی کٹ گئی۔"

چند ہی لمحوں بعد اس نے کراچی کے نمبر پھر گھما دیے۔ مگر کوشش کے باوجود وہ مطلوبہ نمبر نہ ملا سکا۔ مایوس ہو کر بولا "تمھیں وہ لوگ یہ خوشخبری سنانا چاہتے تھے کہ انھوں نے آبی کے دونوں ہاتھ کاٹ ڈالے ہیں۔"

"کیا! یہ کیا بکتے ہو تم؟" میں نے قالین پر سے تڑپ کر اٹھتے ہوئے کہا۔ اس گھڑی میرا چپ شاہ میز پر پڑا تھا۔ اس نے پلٹ کر تڑاخ سے ایک زناٹے دار تھپڑ میرے منہ پر دے مارا۔ اور غضبناک ہو کر بولا "تو مجھ سے بات کس طرح کرتا ہے سالے! ابتر تو میں چمڑی ادھیڑ دوں گا۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی کمر پر بندھی بیلٹ اتار لی۔ اُف میرے خدایا۔ وہ بپھرا ہوا نجو وحشی نظر آتا تھا۔ بیلٹ کے بھاری بھرکم بکل سے مجھ پر حملہ آور ہوا تو میں کمر پر برستے اس چابک کی ضربوں سے پاگل ہو کر اپنی جگہ سے اچھل گیا۔ مگر میرے دونوں پاؤں اس طرح کس کر بندھے تھے کہ مجھ سے اپنا توازن قائم نہیں رکھا جاتا تھا۔ اس نے میرے گرد گھوم کر کئی ضربیں میری کمر پر لگائیں۔ میں سمجھا میری کھال اُدھڑ گئی ہے۔ درد کی تیز کٹیلی لہریں مجھے پاگل کیے دیتی تھیں۔ کلائیاں میری نائیلون کی ڈوری سے کمر پر اتنی سختی سے بندھی تھیں کہ میں اگر جنبش دیتا تھا تو وہ اور سخت ہو جاتی تھیں۔ چھٹی ضرب پر میں اندھے بھینسے کی طرح سر نیچے کر کے اس سے جا ٹکرایا۔ اس طرح کہ وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا اور قالین پر گر گیا۔ میں نے پوری قوت سے اپنا سر اس کے سر پر دے مارا۔ وہ ضرب اتنی شدید تھی کہ وہ سر پٹخنے لگا ---- میں نے اپنا منہ اس کی گردن پر رکھ دیا ---

اور اس کی شاہ رگ دانتوں میں اتنی سختی سے بھینچ لی کہ اس کا دم گھٹنے لگا۔ میں تو شاید غصے سے پاگل ہو گیا تھا۔ اس کی شاہ رگ پر میں اپنے دانتوں کا دباؤ بڑھاتا ہی چلا گیا۔ یہاں تک کہ اس کی شاہ رگ کٹ گئی۔ اس کی بڑی ہی دلدوز چیخ گلے میں گھٹ کر رہ گئی۔ اس کا بدن کپکپایا اور پھر ساکت ہو گیا۔ اس کے خون سے میرا منہ لتھڑ گیا تھا اور اس کی کٹی ہوئی شاہ رگ میں سے خون اب قالین پر گرنے لگا تھا۔ زندگی اس کا ساتھ چھوڑ چکی تھی۔

میری نظر سامنے کی دیوار پر ٹنگی گھڑی پر جا پڑی۔ اس وقت رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ میں ایک بار پھر اپنے ہاتھوں پر بندھی ڈوری سے زور آزمائی کرنے لگا۔ مگر وہ تو کسی بھی طرح راہ نہیں دیتی تھی۔ نجو کے خون سے میرے منہ کا ذائقہ بہت ہی خراب ہو رہا تھا۔ میں نے کئی بار قالین پر تھوک کر منہ صاف کیا اور پھر اپنے بدن کو سکیڑ کر میں نے اپنی کمر باہنوں کے حلقے میں سے گزارنے کی کوشش کی۔ یہ راستہ زیادہ آسان ثابت ہوا۔ ابھی میرے بدن میں اتنی لچک باقی تھی کہ میں کوئی ہڈی تڑوائے بغیر اسے دوہرا کر سکتا تھا۔ چند ہی لمحوں بعد میری بندھی ہوئی کلائیاں میرے سامنے آ چکی تھیں۔ اب میں اپنی باہنوں کو زیادہ آسانی سے حرکت دے سکتا تھا۔ میز پر نجو کا سگریٹ لائیٹر دھرا تھا۔ میں نے قالین پر بندھے بندر کی طرح اچھل اچھل کر خود کو میز کے قریب کیا اور پھر دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر انگلیوں سے لائیٹر اُٹھا لیا۔ وہ گیس لائیٹر تھا۔ اُسے جلا کر میں نے میز پر رکھا اور وہ نائیلون کی ڈوری اس کے شعلے پر رکھ دی۔ شعلہ اپنا کام دکھا گیا۔ ڈوری فوراً ہی جل کر میری جان چھوڑ گئی۔ اس جکڑ بند کو کلائیوں سے جھٹک کر میں نے باہنوں کو تیزی سے حرکت دی۔ اور اپنا دوران خون درست کیا۔ میری کمر اس بدمعاش نے بری طرح زخمی کر دی تھی۔ اور زخموں میں سے خون رس رہا تھا۔ اطمینان کی بات یہ تھی کہ بکل کی ضرب سے میرا منہ بچ گیا تھا۔

جیسے ہی میرے ہاتھ آزاد ہوئے میں نے لائیٹر اٹھا کر پاؤں میں بندھی ڈوری بھی جلا کر اُتار دی۔ مجھے نئی زندگی مل رہی تھی۔ میری اچکن کمرے کے ایک کونے میں کیل پر لٹک رہی تھی۔ اس کی جیبوں کو صاف کر دیا گیا تھا۔ میرا بریف کیس بھی وہاں موجود نہیں تھا۔ میں نے اچکن پہنی اور کمرے میں اِدھر اُدھر نظر دوڑائی مگر اپنا بریف کیس مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔ نجو کے سگریٹ کا پیکٹ اور لائیٹر اٹھا کر میں نے جیب میں رکھا۔ پستول نیفے میں اُڑس لیا۔ اطمینان مجھے یہ تھا کہ میری رقم کار میں دھرے سوٹ کیس میں تھی۔ اور کار کی چابی اچکن کی بغل کے نیچے لگی چور جیب میں پڑی تھی۔ اس طرف ان کا دھیان نہ جا سکا تھا۔ اور اس جیب میں چابی کے علاوہ میں نے اور کچھ نہیں رکھا تھا۔ اپنی ہر اچکن کی بغل کے نیچے ڈھلوں صاحب نے چور جیب سلوا رکھی تھی جہاں وہ اپنا بالشت بھر لمبا چمکتے جھمکتے سانپ ایسا پستول رکھا کرتے تھے۔ میں نے کار کی چابی کو اس جیب کے اندر موجود پا کر اطمینان کا سانس لیا۔ مجھے یقین تھا کہ میری کار کے بارے میں انھیں کچھ معلوم نہیں ہو سکا ہوگا۔ میں ہوٹل سے نکلتے ہی کار میں بیٹھ کر نکل جانے کی سوچ رہا تھا۔ میں نے نجو کو قالین پر سے گھسیٹ کر کمرے کے ایک کونے میں ڈالا۔ اور قالین کا ایک سرا اٹھا کر اس پر ڈال دیا۔ اس کا سارا خون قالین پر نچڑ چکا تھا۔

میز کی درازوں کو میں نے اچھی طرح کھنگال کر دیکھ لیا۔ وہاں دفتری ضرورت کی مختلف چیزیں رکھی تھیں جن میں ایک ڈائری بھی موجود تھی۔ اس ڈائری میں مختلف لوگوں کے پتے اور فون نمبر لکھے تھے۔ وہ ڈائری اٹھا کر میں نے نیفے میں اڑس لی۔ تمام چیزوں کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد اور پھر کمرے کی تمام بتیاں بجھا کر میں نے اس کا ایک پٹ کھولا تو سامنے مجھے اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دیا۔ رات کی سیاہی چاروں طرف محکم ہو رہی تھی۔ میں نے اللہ کا نام لے کر اس اندھیرے میں قدم رکھ دیا۔ میرے پاؤں تلے پختہ فرش تھا۔ میں نے کمرے میں جلتی بتیوں کو بجھایا نہ ہوتا تو ان کی روشنی میرے کام آ سکتی تھی۔ چند قدم آگے نکلتے ہی میرا ہاتھ ایک دیوار پر جا لگا۔ میں نے اس پر اعتبار کر کے بائیں طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہاں بھی ایک دیوار تھی۔ اس اندھیرے سے چھٹکارا پانے کے لیے میں نے جیب سے گیس لائیٹر نکال کر جلا لیا۔ میں کسی کوٹھی میں پھر رہا تھا۔ ایسی کوٹھی میں جس کی راہداری میں دبیز قالین بچھا تھا ---- اور مجھے ان لوگوں نے اس کے عقبی کمرے میں باندھ رکھا تھا۔ تین کمرے دائیں ہاتھ تھے اور تین بائیں طرف۔ ان کے بیچ میں سے گزر کر میں بڑے دروازے تک جا پہنچا۔ اس میں اندر سے تالا لگا تھا اور اسے توڑ دینا اس وقت میرے لیے کسی بھی طرح ممکن نہیں تھا۔ میں انہی قدموں واپس پلٹا اور دائیں طرف کے ایک کمرے کا دروازہ بے جھجھک دھکیل دیا۔ لائیٹر کو ایک بار پھر میں نے ٹکسا دیا۔ اس کی لائٹ میں مجھے وہ کمرہ خالی نظر آیا۔ البتہ اس کی عقبی کھڑکی مجھے دعوت مبارزت دے رہی تھی۔ میں نے اس کے پٹ کھولے تو میری جان میں جان آ گئی۔ اس کھڑکی کے باہر آزادی ہی آزادی تھی۔ اس میں نہ تو سلاخیں لگی تھیں اور نہ گرل۔ میں نے اللہ کا نام لے کر اس کی دہلیز پر ہاتھ رکھا اور اچھل کر دوسری طرف چلا گیا مگر جیسے ہی میرے قدم فرش پر لگے ایک بل ٹیریر قسم کے کتے کی خوفناک آواز نے مجھے آ لیا۔ وہ مجھ سے کوئی دس قدم دور تھا۔ وہ اتنی تیزی سے اچھل کر مجھ تک آ پہنچا کہ اگر میں چپ شاہ کی گولی اس کے سینے میں نہ مار دیتا تو وہ میرا نرخرہ دبوچ بیٹھا تھا۔ گولی لگنے پر اس کی دلدوز چیخ ساری کوٹھی میں پھیل گئی۔ چاندنی نے اس گھڑی کھیت کر رکھا تھا۔ کتے کی آواز کے ساتھ ہی دو کمروں کی بتیاں جل اٹھیں۔ میں دیوار کے ساتھ لگا کھڑا تھا۔ اوٹ میرے سامنے کوئی نہیں تھی۔ برآمدے سے پرے ایک پختہ روش تھی جو سیدھی گیراج تک جاتی تھی۔ مجھے ان لوگوں نے ہوٹل سے اٹھوا کر کسی کی رہائش گاہ پر پہنچا دیا تھا اور نجو کو ان لوگوں نے میری صفائی کے لیے وہاں بٹھا رکھا تھا مگر اس کی موت بھی اس کے ساتھ جا بیٹھی تھی۔

کمرے کی بتیاں جلیں تو دو آدمی نیم برہنہ حالت میں دروازے سے باہر نکلے۔ ان میں سے ایک شرفو تھا۔ دوسرے کی صورت میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔

برآمدے میں میرا ہیولا دیکھ کر شرفو بولا "کون ہے تو اوئے کیا کر رہا ہے یہاں؟ بول ورنہ گولی مار دوں گا۔" مگر میں دیکھ چکا تھا پستول اس کے ہاتھ میں نہیں تھا۔ دوسرا آدمی ہتھیار اٹھانے کے لیے اندر کی طرف بھاگا تو میں نے چپ شاہ کا رُخ شرفو کی طرف پھیر دیا۔ لبلبی دبتے ہی ایک مہربان گولی اس کی ران میں جا دھنسی۔ وہ زخمی کتے کی طرح چیخ کر اچھلا اور دروازے میں گر گیا۔ دوسرے لمحے

مَیں اُس کے سر پر جا پہنچا' اسے گریبان سے پکڑ کر میں نے اوپر اٹھا لیا۔

دُوسرا آدمی اس عرصے میں پستول ہاتھ میں لے کر شرفو کے عقب میں آ کھڑا ہوا تھا۔

"یہ پستول پھینک دے اُستاد! ورنہ میں اس شرفو کو ختم کر دوں گا۔ پھینک دے پستول۔" میں نے اپنا پستول شرفو کی کنپٹی سے لگاتے ہوئے کہا۔ اسے میں نے اپنی ڈھال بنا لیا تھا۔ دوسرا آدمی کچھ متذبذب سا نظر آیا۔ تو اس کے ہاتھ سے ہتھیار ڈلوانے کے لیے میں نے اس کو سنبھلنے بغیر تیزی سے چیپ شاہ کی نال کا رُخ اسکی کلائی کی طرف پھیرا۔ گولی ٹھک سے نکل کر اپنا کام کر گئی۔ اس کے ہاتھ سے پستول نیچے گرتے ہی میں نے شرفو کو پوری قوت سے اُس کی طرف گرا دیا۔ یوں کہ شرفو اس کے اوپر جا پڑا۔ میں اس بدمعاش کو کوئی موقعہ نہیں دینا چاہتا تھا۔ اُس کی منجھلی انگلی سے خون رسنے لگا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کی گردن پر اپنی انگلیاں جما کر اسکی رگِ احساس مَل دی۔ وہ مزاحمت کے قابل تھا ہی نہیں' کوئی کرم کتابی قِسم کا آرام طلب آدمی تھا اور گردن تو اس کی بہت ہی نرم ثابت ہوئی۔ وہ فوراً ہی بے سُدھ ہو گیا۔ کمرے کے اندر دو پلنگ بچھے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی ابھی ابھی ان سے اُتر کے وہاں سے باہر نکل گیا ہے۔ میز پر شراب کی بوتلیں گلاس اور سوڈے سے بھرا ایک جگ نظر آ رہے تھے۔ میں نے شرفو سے ذرا دُور پڑا پستول اٹھا کر جیب میں رکھا۔ کمرے میں بڑی ہی خوشگوار قسم کی خوشبو پھیلی تھی۔ جیسے کسی نے چنبیلی کے عطر کی کپّی وہاں لُنڈھا دی ہو۔ شرفو کو ران میں لگی گولی نے مفلوج کر دیا تھا۔ وہ مجھے دیکھ رہا تھا جیسے اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آ رہا ہو۔ دونوں آدمی ریشمی دھوتیاں اور بنیانیں پہنے ہوئے تھے۔ میں نے اُن سے صرفِ نظر کر کے غسل خانے کا دروازہ کھول دیا۔ مجھے معلوم ہونا چاہیے تھا کہ وہ زنانہ کپڑے وہاں کیا کر رہے ہیں۔ جیسے ہی میں نے دروازہ کھولا میرا سارا جسم سنسنا گیا۔ سامنے کسی مغربی مصوّر کے دو مجسّمے کھڑے تھے۔ وہ دو لڑکیاں تھیں۔ اور ایک دوسرے کے ساتھ لگ کر کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھیں

"کون ہو تم اور کیا کر رہی ہو یہاں؟" میں نے انھیں غسل خانے سے باہر بلا کر پوچھا۔

"ہمیں کرمو کوچوان یہاں چھوڑ گیا تھا۔" ایک نے کہا۔ اُس کی زلفیں بیٹے کے گھونسلے ایسی تھیں، اُوپر کو بندھی تھیں اور بالوں پر اس نے طلائی رنگ پھیر رکھا تھا۔ ولایتی میم بننے کی کوشش میں وہ خدا معلوم کیسے کیسے جتن کرتی رہتی تھیں بھنویں بھی اس کی نُچی ہوئی تھیں ابرو کو محراب بنانے کا شوق تھا اسے۔

"یہ کس کی کوٹھی ہے؟"

"اِن کی ہے۔ یہ لیاقت صاحب ہیں۔ اِن کا بیکری کا کاروبار ہے۔ ہوٹلوں کو مال سپلائی کرتے ہیں۔" اُس کی آنکھیں اب اُن دونوں منہدم آدمیوں پر ٹکی ہوئی تھیں۔

"رہتی کہاں ہو تم؟"

"ہم وسن پورہ سے آئی ہیں۔"

"یہ کوٹھی کس جگہ ہے؟"

"ڈیوڈ روڈ پر ہے یہ کوٹھی۔"

"ہُوں۔ ولایت علی کو جانتی ہو؟"

"جی ہاں۔ وہ شام کو یہاں ہی تھے۔"

"اور نجو کو۔ اُسے بھی جانتی ہو؟"

"وہ بھی شام کو ادھر ہی تھا۔"

"یہ لیاقت علی یہاں رہتا ہے؟"

"جی ہاں! ان کے بیوی بچے چھ ماہ سے کوہاٹ گئے ہوئے ہیں یہ وہیں کے رہنے والے ہیں۔" وہ لڑکی میری ہر بات کا جواب دیے جاتی تھی بالکل میکانکی انداز میں مگر وہ مجھ سے نظریں نہیں ملا رہی تھی۔

"ہوں۔ ولایت علی کا گھر کہاں ہے؟"

"وہ تو ادھر سمن آباد میں رہتے ہیں۔"

"کس مکان میں؟"

"ظفر علی ہائی اسکول کے پاس مکان ہے اُن کا۔ ایک بڑی کوٹھی ہے اُن کے پاس۔"

"وہ تنہا رہتا ہے وہاں؟"

"جی نہیں! اُن کے بیوی بچے بھی ساتھ ہیں۔ یہ کوٹھی اُن لوگوں نے اپنے عیش کے لیے لے رکھی ہے۔"

"کیا نمبر ہے اس کی کوٹھی کا؟"

"نمبر ہمیں معلوم نہیں ہے۔"

"اُس کا فون نمبر معلوم ہے تمہیں؟"

"جی ہاں! اُن کی ڈائری میں لکھا ہے۔" وہ اب زیادہ اعتماد سے بات کر رہی تھی۔

"وہ ڈائری کہاں ہے؟"

"شام کو وہ میں نے نجو کے ہاتھ میں دیکھی تھی۔ وہ دُوسرے کمرے میں لے گیا تھا۔"

"یہ تو نہیں ہے وہ؟" میں نے نیفے میں اُڑسی ڈائری نکال کے اس کو دکھائی۔

"جی ہاں یہی ہے۔"

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"میرا نام صاعقہ ہے اور اس کا تاباں۔"

"تمھیں پتہ ہے کہ میں بھی یہاں بند تھا؟"

"جی نہیں۔ مجھے تو کسی نے نہیں بتایا۔"

"ہوں! ٹھیک ہے تم دونوں میرے ساتھ دُوسرے کمرے میں چلو اور جو کچھ کہوں خاموشی سے کرتی جاؤ۔"

"آپ ہمیں ماریں گے تو نہیں؟" دوسری لڑکی نے پہلی بار منہ کھولتے ہوئے کہا۔ اُس کی آواز میں خوف ابھی تک نمایاں تھا۔

"نہیں۔ میں عورتوں پر ہاتھ نہیں اُٹھاتا۔ ویسے یہ بتا دوں کہ میں نے نجو کو قتل کر دیا ہے۔ وہ مجھے مار دینا چاہتا تھا۔ چلو میرے ساتھ۔" یہ کہہ کر میں نے پستول اُن پر تان لیا اور انھیں کمرے سے باہر نکالا۔ دروازے پر چٹخنی چڑھا کر میں انھیں کوٹھی کے اس کمرے میں لے گیا جہاں نجو کی لاش پڑی تھی۔ میں نے بتیاں جلائیں تو نجو کو یوں کٹی پھٹی لہولہان حالت میں دیکھ کر اُن دونوں نے منہ پر ہاتھ رکھ لیے۔ وہ اپنی چیخیں دبانے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔ اُن کے لیے وہ منظر ناقابلِ برداشت تھا۔

"آپ نے۔۔۔ لیاقت صاحب کو بھی مار دیا اور اسے بھی۔"

"لیاقت ابھی زندہ ہے۔ تم یوں کرو مس صاعقہ کہ اس ڈائری میں دیکھ کر ولایت علی کو فون کرو اور اسے کہو کہ وہ فوراً ڈیوڈ روڈ پر پہنچ جائے۔ کہنا کہ لیاقت صاحب سخت بیمار ہو گئے ہیں۔"

"جی۔۔۔ جی بہت اچھا۔" اُس نے ڈائری میرے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔

"اور دیکھو! اسے تم وہی کہو گی جو میں نے تمھیں بتایا ہے۔ وہ کوئی سوال پوچھے تو اس کا جواب بھی وہی دو گی جو میں چاہتا ہوں۔ اگر تم نے میرے بارے میں یا اُن لوگوں کے متعلق کوئی بات اُسے بتائی تو یہ دیکھ لو میں بدن میں سُوراخ ڈال کر آدمی کو مار دیتا ہوں۔" میں نے پستول اس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔

"جی جی۔ میں وہی کہوں گی جو آپ نے بتایا ہے۔" وہ لرزتے لہجے میں بولی۔ خوف نے اُسے اندر سے جھرجھری کر دیا تھا۔

"کہنا کہ لیاقت کو لرزے کا بخار چڑھا ہے اور وہ بہت۔۔۔ زیادہ بیمار ہے۔" یہ کہہ کر میں نے اُسے کرسی پر بٹھا کر ریسیور اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ اُس نے ڈائری میں جھانک کر ایک نمبر گھمایا۔ وہ ولایت علی ہی کا نمبر تھا۔ ڈائری میں اس کا نام صاف لکھا تھا۔ دوسری طرف سے چند لمحوں کے توقف کے بعد کسی کی آواز آئی۔ میں نے بھی کان ریسیور کے سمعی حصے پر لگا دیا۔ وہ ولایت علی ہی کی آواز تھی۔

"ہیلو۔"

"جی میں صاعقہ بول رہی ہوں۔"

"کیوں فون کیا ہے تم نے؟" ولایت علی بڑے رعب سے بولا۔

"وہ جی صاب جی، لیاقت صاحب بہت بیمار ہو گئے ہیں۔ انھیں لرزے کا تپ چڑھا ہے اور وہ اول فول بک رہے ہیں۔ انھوں نے شرفو کے سر میں شیشے کا گلاس مار دیا ہے شرفو سخت زخمی ہے۔"

"وہ نجو کہاں ہے؟"

"وہ تو پتہ نہیں کہاں ہیں۔ باہر چلے گئے تھے کوئی گھنٹہ پہلے۔" صاعقہ کا دماغ کام کرتا تھا اور وہ موقعے کی نزاکت کو اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔ چیپ شاہ نے اُسے سیدھی راہ پر لگا دیا تھا۔

"کیا بکتی ہو تم؟ لیاقت بیمار ہے تو میں کیا کروں۔ وہ کتا زیادہ پی گیا ہو گا۔"

"پتہ نہیں صاب جی میں نے آپ کو بتانا ضروری سمجھا۔ اُن کی حالت بہت زیادہ خراب ہو رہی ہے۔"

"ٹھیک ہے میں ابھی آتا ہوں۔ نجو واپس آئے تو اسے کہنا کہ وہ وہیں ٹھہرے۔ پتہ نہیں یہ بدبخت کیا کرتے ہیں۔" یہ کہہ کر ولایت علی نے فون بند کر دیا۔

"شاباش! مجھے تمھاری حاضر دماغی پسند آئی۔ تم بہت اچھی لڑکی ہو۔ آؤ اب کسی صاف ستھرے کمرے میں بیٹھتے ہیں۔ مگر نہیں، ذرا میں اس ڈائری میں دیکھ لوں، ایک نمبر کراچی کا بھی ملاؤ۔" یہ کہہ کر میں نے ڈائری اس کے ہاتھ سے لے لی۔ اس میں بہت سے نمبر لکھے تھے اور حروفِ ابجد کے حساب سے لکھے تھے۔ دمن کا نام بھی اس میں سب سے جلدی ہی نظر آ گیا۔ وہ نمبر میں نے صاعقہ کے سامنے رکھ دیا۔ تاباں کو میں نے اپنے بائیں بازو میں یوں پکڑ رکھا تھا کہ وہ ہل نہیں سکتی تھی۔

صاعقہ نے تین چار بار وہ نمبر آزمائے مگر دوسری طرف سے کسی نے بھی فون نہیں اُٹھایا۔ مایوس ہو کر میں نے ڈائری اٹھا کے نیفے میں اُڑسی اور اُن دونوں کو ساتھ لے کر میں اس کمرے سے باہر نکل آیا۔ اُن پر میں مزید بھروسا نہیں کر سکتا تھا۔ اُن کے اعصاب چٹخنے جا رہے تھے۔ یوں میری معمول بن کر زیادہ دور تک میرے ساتھ نہیں چل سکتی تھیں۔ کسی بھی لمحے اُن کا حوصلہ ٹوٹ سکتا تھا۔ اس کوٹھی میں چار بیڈ رُوم تھے اور وہ کمرہ بطور اسٹڈی استعمال ہوتا تھا جس میں نجو کی لاش پڑی تھی۔ ایک بیڈ رُوم میں لیاقت اور شرفو پڑے تھے۔ شرفو اس لحاظ سے خوش قسمت رہا کہ اس نے زخم کھا لینے کے بعد کوئی فتور نہیں مچایا تھا۔ زخمی ران کو دیکھ دیکھ کر اس کے ہوش اُڑے جاتے تھے اور وہ بالکل ہی ہمت ہار بیٹھا تھا۔ میں نے اُن دونوں لڑکیوں کو اسی کمرے میں لے جا کر غسل خانے میں دھکیل دیا۔

"مجھے افسوس ہے مگر یہ بہت ضروری ہے ادھر چُپ چاپ کھڑی رہو۔ میں تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ میں ولایت علی سے مل لوں اس کے بعد خود تمہیں تمھارے گھروں پر چھوڑ دوں گا۔"

صاعقہ عجیب سے انداز میں آنکھیں جھپکا رہی تھی۔ جیسے کہہ رہی ہو "تم کیسے سنگدل ہو۔ تمہیں ہمارے اندر کوئی بھی چیز نظر نہیں آتی ہے۔ تمھیں کچھ بھی محسوس نہیں ہوتا ہے پگلے!" وہ یہی کہہ رہی تھی۔ تاباں کی بھی شاید یہی سوچ رہی تھی۔ اب اُن پر وہ لرزش طاری نہیں تھی۔ جو

ابتدا میں انھیں دہلاتے دیتی تھی مگر میں انھیں کیا کہتا۔ انہیں کس نسخے میں ڈالتا۔ تاباں کے دلفریب چاہِ زنخداں کو کیا کرتا۔ مجھے تو میری تقدیر نے ایک گھُپ اندھیرے، ویران اور سنپولیوں سے بھرے اندھے کنوئیں میں گرا رکھا تھا۔ اور میں کسی کارواں کا منتظر تھا۔ کسی نئی امید، کسی، نئی آرزو، کسی نئی صبح اور کسی چمکتے سورج کے کارواں کی توقع میں مرتا تھا جو مجھے اس کنوئیں سے نکال کر کسی نئے معرکے، نئے بازار میں بیچ ڈالتا۔ پھر میری قسمت میں... اُلٹی ہی کیوں نہ پڑتی میں اس سے سمجھوتہ کر لیتا۔ مجھے دل کی دھڑکنیں سُن لینے اور اُن کے لیے کسی آنچل کی طرف بڑھنے کی مہلت ہی کہاں مل رہی تھی۔ ایک وہ مسند آرا تھی جسے میں نے ازل سے اپنے خوابوں میں بسا رکھا تھا۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر میری نیند بھری پلکوں پر اُترا کرتی تھی مگر میں ایسا بدنصیب تھا کہ میں اس کی طرف بھی نہ جا سکا تھا۔ میں ان دو آبرو باختہ لڑکیوں سے کیا کہتا۔ کیا کہہ سکتا تھا میں اُن سے کہ میرا ایک بازو کسی بیلن میں جا پھنسا تھا۔ اور میری عزت، میری ماں جائی بہن کسی اجنبی شہر میں اس گھڑی بھی شاید کہیں لچّوں کا قہقہہ بنی ہوئی تھی۔ میں نے اُن دونوں کو پیچھے دھکیل کر غسل خانے کا دروازہ باہر سے بند کر کے چٹخنی چڑھا دی۔ مجھے امید تھی کہ وہ میری ہدایت پر حرف بہ حرف عمل کریں گی۔

شرفو مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ دونوں ہاتھوں سے اُس نے اپنی زخمی ران دبا رکھی تھی جس میں سے خون اب رِسنا بند ہو چکا تھا جیسے ہی میں نے پلٹ کر اسے دیکھا اس نے نظریں جھکا لیں۔

"صبر کر شرفو! میں جلدی ہی تیرا علاج کرا دوں گا۔ میں تجھے زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہنے دوں گا۔" یہ کہہ کر میں نے پلنگ سے اٹھا کر ایک چادر پھاڑی اور اس کی پٹی کس کر اس کی ران پر اِس طرح باندھ دی کہ اس کا زخم کھنچ سا گیا۔ وہ درد کی ٹیس سے ذرا بلبلایا تو میں نے گرہ ذرا نرم کر دی۔ اور اسے گھسیٹ کر ایک کونے میں ڈال دیا۔ لیاقت یوں سانس لے رہا تھا جیسے وہ نزع کے عالم میں ہو۔ میں نے اُس کی نبض دیکھی تو مجھے اطمینان ہوا کہ وہ مر نہیں جائے گا۔ وہ جھٹکا سہہ گیا تھا۔ کمرے کی ساری بتیاں بجھا کر میں نے اس کا دروازہ باہر سے بند کیا اور پھر پستول سیدھے ہاتھ میں لے کر مین گیٹ کے قریب اُگی باڑھ کے پاس جا ٹھہرا۔ مجھے امید تھی کہ ولایت علی وہاں ضرور آئے گا۔

میرا مغز نجّو کے ایک فقرے نے اُلٹ دیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔ نجّو نے کہا تھا کہ آبی کے دونوں ہاتھ کاٹ دیے گئے ہیں۔ یہ بات وہ بلا وجہ نہیں کہہ سکتا تھا۔ کوئی بڑا ثبوت ہوگا اس کے پاس۔ صوات خاں نے اسے جھانسا تو نہیں دیا ہوگا۔ مگر عین ممکن ہے کہ وہ مجھے اذیت پہنچانے کے لیے یہ خبر اُڑا رہے ہوں

لیکن ۔۔ لیکن انھیں یہ احساس تو ہوگا کہ آبی کے بارے میں یہ خبر سُن کر میں درندہ بن سکتا ہوں۔ چار کھونٹ اس بستی کو آگ لگا سکتا ہوں۔

اور میں زندگی کے ایسے پُرخطر لمحے کی زد میں تھا جہاں مجھے ہر قدم پر بڑی احتیاط کی ضرورت تھی۔ میرے دشمن نے اپنی ساری سپاہ میرے پیچھے لگا دی تھی۔ وہ ایک دو نہیں تھے، اُن لوگوں نے مختلف شہروں میں ایسے گرگ صفت آدمیوں کا جال پھیلا رکھا تھا جو اُن کے لیے ہر کام کرنے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ وہ سر پر کفن باندھے رہتے تھے۔ یہ نجّو اور شرفو بھی دھمن ہی کے نمکخوار تھے۔ اور عین ممکن ہے کہ ولایت علی نے دھمن سے کوئی بہت بڑا فائدہ اٹھا رکھا ہو۔ یہ اتنا بڑا ہوٹل یوں ہی تو ہاتھ نہیں آ جاتا۔ اور ایسے ہوٹل کو چلانے کے لیے فاحشہ عورتوں کی ہی نہیں فاحشہ مردوں اور درندہ صفت غنڈوں کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ اپنی سادگی پر بھی مجھے سخت ندامت محسوس ہو رہی تھی۔ میں احمقوں کی طرح کیسے بھولپن کے انداز میں چلتا ہوا خود اُن کے جال میں جا پھنسا تھا۔ مجھ پر لازم تھا کہ میں پُوچھتا، استفسار کرتا۔ ولایت علی کے بارے میں واضح معلومات حاصل کرنے کے بعد اس کی طرف بڑھتا مگر میرا پاگل پن دیکھیں میں آنکھیں بند کر کے اس کے کھودے ہوئے کنوئیں میں جا گرا کہ میرے زخم اب تک مجھے بے چین کیے ہوئے تھے۔ اور جوں جوں وہ ٹھنڈے ہو رہے تھے ان کی ٹیسیں مجھے نڈھال کیے دیتی تھیں۔ نجّو کی بیٹی کے اس بھاری بھرکم بکسوئے نے میری کھال جگہ جگہ سے چاٹ لی تھی مگر وہ لمحہ اُن زخموں کی خاطر داری کا لمحہ تو نہیں تھا۔ میں ایک جاں بلب جیلانی کو عقوبت کے اس تند و تیز سیلاب سے بچا لایا تھا اور وہی بہت کافی تھا۔

باڑھ مجھے غیر محفوظ نظر آئی تو میں وہاں سے ہٹا اور گیراج کے عقبی حصّے میں جا ٹھہرا۔ چھت اس کی زیادہ اونچی نہیں تھی۔ میں نے چھپکلی کی طرح دیوار کی اینٹوں کی درزوں میں انگلیاں پھنسائیں۔ اور پھر زمین سے تین فٹ اُوپر اٹھ کر میں نے منڈیر پر ہاتھ ڈال دیا۔ چھت پر پہنچ کر میں خود کو زیادہ محفوظ سمجھ رہا تھا اور وہاں سے میں لیٹ کر آنے والوں کو زیادہ بہتر طریقے سے گولی کی زد میں لا سکتا تھا۔ کوئی دس ہی منٹ بعد ایک گاڑی دروازے پر آ رُکی۔ ڈرائیور نے نیچے اُتر کر دروازے کے اندر ہاتھ ڈال کر چٹخنی ہٹائی اور پھر گاڑی کو اسٹارٹ کر کے اندر لے آیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میں نے مورچہ ہی غلط جگہ پر بنایا تھا۔ گاڑی کو گیراج میں ٹھہرانے کے بجائے وہ عمارت کے قریب لے گئے۔ گاڑی رُکی تو ولایت علی تیزی سے باہر نکلا۔ ڈرائیور بھی اس کے ساتھ ہی گاڑی سے نکل گیا۔ وہ جیسے ہی عمارت کے اندر گھسے میں گیراج کی چھت پر سے نیچے کود گیا اور پنجوں پر بھاگتا ہوا گاڑی کے پاس جا پہنچا ۔۔۔ وہ

لوگ اس وقت کمرے میں داخل ہو کر بتیاں جلا چکے تھے کہ میں نے دروازے پر پہنچ کر اپنے چپ شاہ کی رگ دبا دی۔ دو گولیاں اُن دونوں کی پنڈلیوں میں بے آواز دھنسیں۔ وہ زخمی گِدھوں کی طرح قلابازی کھا کر دائیں بائیں گرے تو میں نے اپنے لہجے کا تمام تر تحکم ان کی طرف منتقل کرتے ہوئے کہا۔ "وہیں پڑے رہو ولایت علی! مجھے تم سے بہت کچھ پوچھنا ہے۔" اُن دونوں کی آنکھوں میں ایسی دہشت اور دہشت ابھر آئی تھی کہ انہیں اپنی بصارت پر اعتبار نہیں آ رہا تھا۔ ولایت علی کے ہاتھ میں پستول ہوتا تو شاید وہ مجھے اس حالت میں بھی بے بس کر دیتا۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار نہیں تھے۔ ایک تحیّر تھا۔ ایسا تحیّر جو کسی شکرے پر اس گھڑی طاری ہوتا ہے جب وہ کسی شکار پر جھپٹنے کے دوران کسی شکاری کے چھرّے سے زخمی ہو جائے۔ میرا خیال ہے کہ وہ بہادر آدمی تھا۔ البتہ اس کے ڈرائیور کا چہرہ بہت ہی مکروہ ہو رہا تھا۔ درد نے اُسے پاگل کر دیا تھا۔ زخم تو بسا اوقات جان لیوا نہیں ہوتے۔ یہ اُن کی دہشت ہے جو آدمی کو لے ڈوبتی ہے۔ اور وہ اس تجربے کی زد میں آ کر سُن ہو گیا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر ڈرائیور کی گردن پر اپنی گرفت مضبوط کر کے اس کی رگ مسل دی۔ اس کے درد کا درماں بھی تو ضروری تھا۔ وہ بے سُدھ ہوا تو میں نے پستول کا رُخ ولایت علی کی طرف رکھ کر ڈرائیور کی جیبیں ٹٹولیں۔ اُن میں کوئی ہتھیار موجود نہیں تھا۔ اس کی طرف سے بے فکر ہو کر میں نے ولایت علی کی تلاشی لی۔ اس کی جیب میں ایک ہلکا سا کھلونے ایسا پستول موجود تھا اور اسے شاید یہی افسوس تھا کہ اس گھر میں داخل ہوتے وقت اس نے وہ پستول ہاتھ میں کیوں نہ لیا۔ وہ یہی محسوس کر رہا تھا۔ وہ اُس سے لے کر میں نے اپنی جیب میں ڈال لیا۔ ولایت علی نے اپنی پنڈلی دونوں ہاتھوں سے دبا رکھی تھی۔ گولی اس کی بوٹی ادھیڑ کر آگے نکل گئی تھی۔ اور یہ اچھی بات تھی۔

"میں نے نجّو کو مار دیا ہے ولایت علی! اور شرفو اور لیاقت بے ہوش ہیں۔ میں تم سے جو پوچھتا ہوں اس کا صحیح صحیح جواب دو ورنہ تم بہت خراب ہو گے۔ تمھیں معلوم ہے میں کون ہوں۔ تم ایسے آدمی کو معاف کر دینا میرے بس میں نہیں ہو گا۔"

میں نے کرسی کھینچ کر اس کے قریب کر لی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ اب تک کچھ بھی نہیں بولا تھا۔ ہلکی سی اُف آف کے سوا اُس نے کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ درد اس کی پنڈلی میں سوا ہو رہا تھا۔ مگر میرے پاس کوئی ایسا علاج نہیں تھا جس سے میں اس کے درد کو دُور کر سکتا۔ مجھے تو زندگی نے خود چاندی کر کے رکھ دیا تھا۔ میں دردوں کا مارا اس کے زخم کو اور زیادہ کھول تو سکتا تھا۔ اسے مندمل کرنا میرے بس میں کہاں تھا۔ وہ مجھے یُوں دیکھ رہا تھا جیسے جیسے میرے سوال کا منتظر ہو۔

"تم بہادر آدمی نظر آتے ہو ولایت علی، لو یہ سگریٹ پیو۔" میں نے میز پر سے اٹھا کر سگریٹوں سے بھری ایک تھالی اس کے سامنے رکھ دی۔

"نہیں! اس کی ضرورت نہیں ہے، یہ مذاق بند کرو اور پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

"کیا یہ سچ ہے کہ تمھیں دھمن نے ہی میرے پیچھے لگایا تھا؟"

"ہاں! اور میں انہی کے کہنے پر ڈھلوں صاحب کے گاؤں گیا تھا۔"

"تمھیں کیسے پتہ تھا کہ میں وہاں مل جاؤں گا؟"

"یہ بات مجھے ڈاکٹر صاحب نے فون پر بتائی تھی۔ ڈھلوں صاحب تمھارے یار کو چھڑانے کے لیے کراچی گئے ہوئے ہیں۔"

"ہوں! مگر آبی کو دھمن نے کیسے پکڑ لیا۔ وہ تو پولیس کی حراست میں تھا؟"

"آبی کو اُسی شام ڈاکٹر دھمن نے اپنی ضمانت پر رہا کروا لیا تھا اور وہ اب انہی کے شکنجے میں ہے۔"

"اس دھمن کو کیسے پتہ چلا کہ میں چوگوٹھ میں ٹھہرا ہوں؟"

"اُن کا کوئی آدمی ڈھلوں صاحب سے ملتا رہا ہے۔ تمھارا راز اُسے وہیں سے معلوم ہوا۔"

"اور مجھے پکڑنے کے لیے تم چوگوٹھ جا پہنچے۔ حربہ تم نے اچھا استعمال کیا ہے۔ ولایت علی میں تو مارا ہی گیا تھا۔ اچھا یہ بتاؤ کہ آبی کے ہاتھ کٹنے کی خبر کہاں تک درست ہے؟ نجّو نے مجھے بتایا تھا کہ دھمن نے اس کے ہاتھ کاٹ دیے ہیں۔"

"اس کا مجھے کچھ علم نہیں۔ ہو سکتا ہے نجّو کو کسی نے فون پر بتایا ہو۔"

"وہ ہوٹل تمھارا ہے؟"

"نہیں! وہ ڈاکٹر دھمن کی ملکیت ہے اور آمدنی میں آدھے حصّے کا میں حقدار ہوں۔" اس نے پنڈلی کو اور زیادہ سختی سے دباتے ہوئے کہا۔ خون زخم میں سے ٹپ ٹپ گر رہا تھا۔

"وہ میرا دوست ہے، بہت پرانا دوست۔ میں نے ہی اسے ہوٹل خریدنے کی صلاح دی تھی۔"

"ہوں! مجھے اب تم یہ بتا دو کہ آبی کو اُن لوگوں نے کہاں باندھ رکھا ہے؟"

"اس کا تو مجھے علم نہیں۔ میری اُن سے صرف فون پر بات ہوتی ہے۔"

"مجھے پکڑ کر تم کراچی لے جانا چاہتے تھے پھر تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ تمھیں اُن کے ٹھکانے کا علم نہیں؟"

"ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی اُدھر اسٹار گیٹ کے پاس ہے، سات سو چھیاسی نمبر۔"

"ٹھیک ہے ولایت علی! میں تمھیں جان سے مارنا نہیں چاہتا۔ میں کسی کے بھی خون سے ہاتھ رنگنا پسند نہیں کرتا۔ نجو نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا تو میں نے اُسے ختم کر دیا۔ البتہ دھمّن کو بچانے کے لیے تم جو کچھ کر سکتے ہو کر لو، میں اسے بہر حال نہیں چھوڑوں گا۔ میں جا رہا ہوں۔ وہ دونوں لڑکیاں اس غسل خانے میں بند ہیں۔ تمھاری گاڑی کچھ دنوں بعد تمھیں واپس مل جائے گی۔" یہ کہہ کر میں نے سگریٹ کے دو پیکٹ اور لائیٹر میز پر سے اٹھا کر جیب میں رکھے اور کمرے پر ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر میں باہر جانے لگا تو ولایت علی بولا "میری گاڑی مت لے جانا۔ مجھے دن رات اس کی ضرورت رہتی ہے۔"

وہ اب بھی اپنے زخم کی اذیت کا پرتو اپنے لہجے میں نمایاں نہیں ہونے دیتا تھا۔ اور میں اچھی طرح سمجھتا تھا کہ وہ جرائم پیشہ لوگوں کی کسی سخت جان نسل سے تعلق رکھتا ہے۔

"اپنی جان کے صدقے میں تم مجھے اتنی سی بھی رعایت نہیں دو گے ولایت علی۔" یہ کہہ کر میں نے اس کا وہ چھوٹا سا پستول جیب سے نکال کر اس پر گولی داغ دی، یوں کہ وہ اُس کے گھنے بالوں کو چاٹتی ہوئی نکلی اور دیوار میں جا لگی۔

ولایت علی منجمد ہو کر رہ گیا مگر جب اُس نے جان لیا کہ میں نے محض اُسے خوفزدہ کرنے کے لیے وہ گولی چلائی ہے جس کا دھما کا خاصا خوفناک تھا تو اُس کے لبوں پر بڑی ہی رسیلی مسکراہٹ اُبھر آئی۔ وہ بڑے شیریں لہجے میں بولا "ٹھیک ہے جیلانی! جا عیش کر۔ آج نہیں تو کل تمھیں مجھ پر سیدھی گولی چلانی پڑے گی۔ میں دھمّن کو ہر قیمت پر تمھارے وار سے بچاؤں گا ——— جا لے جا۔ یہ گاڑی میں نے تمھیں دے دی۔ میں اس کی چوری کی رپورٹ بھی درج نہیں کراؤں گا۔" یہ کہہ کر وہ قالین پر چت لیٹ گیا۔ زانو اُوپر اُٹھا کر اُس نے اب پتلون ران تک نیچے کھینچ لی۔ مجھے معلوم تھا، اچھی طرح معلوم تھا کہ میری اس کارروائی نے اس کی جاکھن توڑ دی ہے۔ اس کا سارا منصوبہ تلپٹ ہو گیا تھا۔ ایک ایک کر کے اُس کے سارے یار میں نے اُس سے چھین لیے تھے۔ اسکا ہر کام الٹ پلٹ ہو کر رہ گیا تھا۔ مگر وہ اب بھی منجھے ہوئے تلوا‌ئیے کی طرح میرے سامنے جم کر کھڑا تھا۔ وہ ہار نہیں مان رہا تھا۔ اُس نے صاف ہی کہہ دیا تھا کہ وہ دھمّن کو مجھ سے ہر قیمت پر بچائے گا۔ اُس کے تلڑ میں ایسی ہی کوئی شکتی تھی جو اُسے منہدم ہونے سے بچا رہی تھی۔ ورنہ نجو کی موت کی خبر اُسے رُلا سکتی تھی۔ مگر اُس نے ذرا سا بھی ردِ عمل ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اُس کے ماتھے پر شکن تک نہیں ابھری تھی۔ یُوں لگتا تھا جیسے وہ اپنے دل میں پہلے ہی سے کسی ایسے منظر کو آراستہ کیے بیٹھا تھا اور اسے معلوم تھا کہ میں پلٹ کر اسے ڈس لیا تو اُن کی حالت ایسی ہی ہو جائے گی۔ اور وہ جو اندر غسل خانے میں کھڑی تھیں اور جنھیں اُن کی پیٹ کی آگ نے اس حال کو پہنچا دیا تھا اُن کے بارے میں بھی ولایت علی نے ایک لفظ نہیں کہا تھا۔ اس کی نظر میں اُن کی وقعت ہی کیا تھی۔ وہ جذبوں کی جاروب کشی کرتی تھیں اور بس۔ اس کے سوا اُن کی حیثیت کچھ بھی نہیں تھی۔ ولایت کی دیدہ دلیری بھی مجھے حیران کرتی تھی۔ اُس نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ وہ کار کا تعاقب نہیں کرے گا۔ پولیس کو میرے پیچھے نہیں لگائے گا۔ اور مجھے یقین ہے کہ اپنی جان بچانے کے لیے وہ یہ سب کچھ نہیں کر رہا تھا۔ وہ پاشنہ کوب آدمی ہوتا تو اس کا رویہ بالکل ہی مختلف ہوتا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ولایت علی کو میں سمجھ ہی نہیں سکا تھا۔

گاڑی کی چابی میں نے بے ہوش ڈرائیور کی جیب سے نکالی اور اور پھر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا میں گاڑی میں جا بیٹھا۔ مشینوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے پرائے میں تمیز نہیں کرتی ہیں۔ جو کوئی اُن کی کل دبا سکے وہ اس کا حکم مانتی چلی جاتی ہیں۔ وہ گاڑی بھی ایسی ہی تھی۔ میرے اشارے پر وہ فوراً ہی چل پڑی ——— وہ کوٹھی کئی دوسری عمارتوں کے عین عقب میں تھی۔ میں ذرا آگے نکلا تو ایک بہت مشہور و معروف آدمی کی خوبصورت رہائش گاہ کی جبیں پر مجھے اُس کے نام کا نیون سائن چمکتا نظر آیا۔ اُس کے دروازے پر رات کے اس منجھلے پہر میں ایک مسلح پہریدار کھڑا تھا ——— میں اُس بڑے آدمی کی بڑی ہی پُر شکوہ کوٹھی کے سامنے سے رفتار کوش کو اور زیادہ دباتا ہوا بڑی سڑک پر جا پہنچا۔ میرا دماغ اس گھڑی بھی بہت زیادہ الجھا ہوا تھا۔ میں اگر اُس پیر آباد کے چوہدری رحمت علی کی تقدیر کا آخری الم ناک منظر دیکھنے کے لیے سوہدرہ کی طرف نہ نکل جاتا تو شاید میرے پاؤں کسی صحیح سمت میں اٹھ جاتے۔ مگر دھمّن صاحب پر جو میں اندھا اعتماد رکھتا تھا وہ مجھے کسی اور طرف دیکھنے کی مہلت ہی نہیں دیتا تھا۔ سارے ہی دور مجھ پر سے گزر گئے تھے۔ میں تربھون دیکھ چکا تھا۔ سورگ بھی، پرتھوی بھی اور پاتال بھی۔ اب شاید ایک مرگِ ناگہانی ہی باقی رہ گئی تھی۔ یارو کوئی یُوں جھیر جھیر تو کبھی بھی نہیں جلا ہو گا۔ میرے خون کی تراوش تھمنی ہی نہیں تھی۔ میں بچ کے نکل آیا تھا۔ دھمّن کے اِن نئے پھندے سے، پر کوئی حساب تو لگائے کہ میں کیا کر آیا تھا۔ ایک اور خون میری گردن پر آ چڑھا تھا۔ ایک اور داغ میرے چہرے پر آ لگا تھا۔ میرے آگے تو شاید اب موت بھی [illegible] اسے پگڑی میں باندھ کر کسی اور طرف نکل گئی تھی کہ وہ واپسی پر اس کے

[illegible] ماندہ حصے کو بھی سمیٹ کر ساتھ لے جائے گی۔

گاڑی کو بھگاتا ہوا میں مال روڈ پر جا نکلا اور پھر وہاں سے الماس کے گھر کی طرف چل دیا ———

مجھے معلوم ہونا چاہیے تھا کہ الماس جب اس روز کراچی گئی تو آبی کو وہاں نہ پا کر اس نے کیا کیا۔ طے تو یہ تھا کہ آبی اُسے لینے کے لیے ہوائی اڈے پر موجود ہو گا مگر وہ سب کچھ تلپٹ ہو گیا۔ آبی کو راستے ہی میں شکاریوں نے آ لیا اور اس کے اپنے نفس کے بینگ اسے ایسی سخت جان جھاڑیوں میں پھنسا گئے تھے کہ وہ وہاں سے کوشش کے باوجود اپنی جان نہ چھڑا سکا تھا۔

رات آدھی گزر چکی تھی۔ میں نے گاڑی ایک درخت کے نیچے روک کر مقفل کر دی اور پھر گیٹ پر جا کر میں نے اس کے برقی بٹن پر انگلی رکھ دی۔ اس کی آواز کسی اندرونی حصے میں پہنچی تو سہی مگر مجھے وہاں کھڑے دس منٹ گزر گئے تب جا کر کہیں ایک منحنی سے اللہ لوک قسم کے آدمی کی مجھے صورت نظر آئی۔ وہ بنیان اور پاجامہ پہنے ہوئے تھا۔ بڑی بے زاری کے عالم میں وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا ہوا گیٹ تک آیا۔ اور اس کے آہنی روزن کو دوسری طرف سے کھول کر میری صورت دیکھتے ہوئے بڑے بھنائے ہوئے لہجے میں بولا "کیا بات ہے بھائی جی! سحری تو ابھی بہت دور ہے۔ کیوں نیند خراب کرتے ہو لوگوں کی۔"

"اوئے میں تجھے سحری کا ڈھولچی نظر آتا ہوں۔ تو بات کس طرح کرتا ہے؟ میں مادام سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"اچھا اچھا! میں سمجھا تم مسجد کے لیے چندہ مانگنے آئے ہو۔ کل ایک آدمی آپ کی شکل کا رات ڈھائی بجے آ دھمکا تھا، بولا مسجد کے سارے بلب کوئی چرا کر لے گیا ہے چندہ دو۔ پر صاب جی! یہ مادام سے ملنے کا کون سا وخت ہے۔"

"مہمان کا اور موت کا کوئی وقت نہیں ہوتا ہے بھائی! جا کہہ اوپر مادام سے کہ ہاشم خان آیا ہے اسلم آبی کا دوست۔"

"اوئے میں مرجاواں! وہ جو مادام کا منگیتر ہے چوہدری اسلم آبی! پہلے کیوں نہیں بتایا آپ نے۔ صاب جی! مادام تو سوات گئی ہوئی ہیں۔"

"وہ کس لیے؟"

"وہ جی فلم بن رہی ہے 'نا تیری میری مرضی'۔ اس کی شوٹنگ کے لیے گئی ہوئی ہیں۔ ویسے یہ آپ کا گھر ہے لیٹنا لوٹنا چاہیں تو میں سارے کمرے کھول دیتا ہوں۔"

"کیا بکتا ہے تو اوئے۔ ہوش میں تو ہے نا۔ میں تجھے ڈاکو نظر آتا ہوں۔ کیا نام ہے تیرا؟"

"میرا نام تخت ور ہے جی، پر میں نے یہ کب کہا ہے صاب جی! میرا مطلب تھا کہ آرام کرنا چاہیں تو کریں۔"

"کب واپس آئیں گی وہ ——— بھائی تخت ور؟"

"کوئی پتہ نہیں ہے صاب جی! جب بھی آ جائیں یہ اُن کا گھر ہے چاہیں تو ساری عمر یہاں نہ آئیں۔" وہ بہت بہکا ہوا آدمی تھا۔

"کیا مطلب ہے تیرا؟"

"مطلب یہ ہے جی کہ آدمی سب سے زیادہ ناقدری اپنے گھر کی کرتا ہے۔ میڈم بھی یہی کرتی ہیں۔ مجال ہے جو ٹک کر بیٹھ جائیں اور نوکروں نے یہاں کتنے مجا رکھی ہے، گیٹ کھول دوں آپ کے لیے؟"

"نہیں! میں جا رہا ہوں، اُن سے کہہ دینا کہ ہاشم خان آیا تھا۔"

یہ کہہ کر میں وہاں سے واپس ہو لیا۔ اس تخت ور نے میرا دماغ خراب کر دیا تھا۔ یُوں چبا چبا کر باتیں کر رہا تھا کہ میرا جی چاہتا تھا کہ میں اُس کا گلا گھونٹ دوں۔ الماس دُور کہیں اُدھر سوات، چترال کے برف زاروں میں بیٹھی اپنی زلفیں سنوارتی ہو گی جب کہ آبی پر کسی بند کمرے میں قیامت بیت رہی تھی۔ میں تڑپ کر کار میں بیٹھا اور اسی وقت سیدھا کامران ہوٹل کی طرف چل دیا۔ میرا سُوٹ کیس وہیں دھرا تھا اس سرقہ کار کے اندر جسے میں ہوٹل کے قریب چھوڑ آیا تھا۔ اُمید تو نہیں تھی کہ وہ کار اب تک وہاں ہو گی مگر مجھے رپوں کی سخت ضرورت تھی اور میری جیب میں کوڑی تک موجود نہیں تھی۔

مگر جب میں وہاں پہنچا تو یہ دیکھ کر میری جان میں جان آ گئی کہ وہ کار ابھی تک وہیں کھڑی تھی۔ یُوں کہ اُس کے آگے پیچھے کئی کاریں موجود تھیں اور اُسے وہاں سے نکال لینا آسان نہیں تھا۔ میں نے ولایت علی کی کار ایک کھلی جگہ پر روکی اور جیب سے چابی نکال کر میں نے عبداللہ اردلی سے چھینی ہوئی کار کا دروازہ کھولا۔ میرا سُوٹ کیس ابھی تک وہیں پڑا تھا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ کاروں کی وہاں دن رات حفاظت ہوتی تھی۔ مگر اس بات کا علم مجھے اس وقت ہُوا جب میں کار کو دوبارہ مقفل کر کے مڑا۔ ایک آدمی دوسری طرف سے میری طرف لپکتا ہوا آیا اور بولا "کیا بات ہے بابو جی آپ کہیں باہر چلے گئے تھے؟"

"ہاں یار! مگر تمھیں کیسے پتہ چلا ہے کہ میں باہر چلا گیا تھا؟"

"کار یہاں کھڑی کر کے آپ دوبارہ ادھر نہیں آئے۔ آپ نے ٹوکن بھی نہیں لیا تھا، اس لیے پُوچھ رہا ہوں۔"

"اچھا اچھا تو یہ بات ہے۔ ٹوکن اب دے دو مگر یہ کار ابھی یہاں رہے گی۔ میں کل شام کو آؤں گا۔"

"بہت اچھا بابو جی! یہ لیں، یہ رکھ لیں۔" اس نے مجھے ایک چھوٹی سی رسید کاٹ کر دے دی۔ اسے میں نے جیب میں رکھا ——— اور ولایت علی کی گاڑی میں بیٹھ کر میں وہاں سے نکل کر سیدھا چوگڈھ کی

طرف چل دیا۔ مجھے امید تھی کہ ڈھلوں صاحب اس وقت تک وہاں پہنچ چکے ہوں گے۔ میں ان سے مل کر آبی کے بارے میں تمام حالات معلوم کرنا چاہتا تھا۔ جب میں کار کی تیز دھار روشنیوں سے اندھیرے کو کاٹتا ہوا چوکوٹھ پہنچا تو اس وقت بھی صبح کی اذان فضا میں ابھر رہی تھی۔ یہ حالات کی عجب ستم ظریفی تھی کہ وہ راستے میرے گلے کا پھندا ہی بن گئے تھے جن پر میں نے پہلے روز قدم رکھا۔

میرا وہ اذیت ناک سفر ختم ہونے ہی میں نہیں آتا تھا۔ وہ بڑی منحوس گھڑی تھی جب میں نے اس ٹیکسی میں قدم رکھا جس کے ڈرائیور نے مجھ سے پوچھا تھا کہ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔ کوئی نشے پانی کا قصہ تو نہیں ہے بابو جی۔ اس کی چھٹی حس نے اسے صحیح بات سمجھا دی تھی۔ میں اس رات واقعی اپنے آپ میں نہیں تھا۔ میں پاگل ہو چکا تھا۔ ایسا پاگل جو بڑھتے بڑھتے کرائے کا قاتل بن گیا۔ ایسا قاتل جس کے لیے دنیا کے کسی قانون میں کوئی معافی نہیں، کوئی گنجائش نہیں جو اپنی ہر ناکامی کو تقدیر کا جبر سمجھ کر اپنی راہ چلتا رہتا ہے۔

جب میں نے حویلی کے سامنے کار روکی تو اس کے بریکوں پر میرا دباؤ اتنا سخت تھا کہ گاڑی اس ستم پر چیخ اٹھی۔ اس کا شور سن کر ڈھلوں صاحب کی حویلی میں سے دو تین ملازم باہر آ گئے ان میں برکت بھی شامل تھا وہ مجھے دیکھ کر خوش ہو گیا، بولا ”اچھا ہوا خان جی آپ آ گئے۔ رات ڈھلوں صاحب دیر تک آپ کا انتظار کرتے رہے ہیں۔“

”کہاں ہیں وہ، واپس آ گئے ہیں؟“

”ہاں! آتے ہی پوچھ رہے تھے کہ آپ کہاں ہیں۔ میں نے جب کامران ہوٹل کے مالک کی بات ان سے کی تو وہ بہت حیران ہوئے، بولے کہ میں نے کسی ایسے آدمی کو کوئی پیغام نہیں دیا۔“

”وہ کس وقت واپس آئے؟“

”رات گیارہ بجے۔ وہ تو اسی وقت شہر جانا چاہتے تھے کامران ہوٹل کی طرف، مگر پھر رک گئے۔ بڑی بی بی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔“

”اب کہاں ہیں وہ؟“

”ابھی تو وہ سو رہے ہیں۔ صبح وہ آپ کی طرف ضرور جاتے۔“

”ٹھیک ہے یہ کار اندر لگواؤ۔ اور مجھے میرے کمرے میں پہنچا دو۔ میں بہت تھکا ہوا ہوں کچھ کھانے کو مل سکے تو وہ بھی لا دو۔“

یہ کہہ کر میں نے حویلی کے اندر قدم رکھ دیا۔

اپنے مخصوص کمرے میں پہنچ کر میں کپڑے اتار کر غسل خانے میں جا گھسا۔ آئینے میں جھانک کر میں نے اپنا بدن دیکھا تو مجھے بہت افسوس ہوا۔ اس نجو کے چابک نے بڑے نشان چھوڑ دیے تھے۔ لہو تو ان خراشوں میں سے نہیں رستا تھا مگر وہ درد سے بھری ہوئی تھیں اور میں نہا لینا چاہتا تھا۔ پسینے کی وجہ سے سارا بدن چپچپا ہو رہا تھا۔

جوں توں کر کے میں نے بدن پر پانی ڈال ہی دیا۔ ضرورت کی ہر شے غسل خانے میں موجود تھی۔ کچھ ہی دیر بعد بدن کے درد نے پانی سے سمجھوتہ کر لیا۔ اور میں خوب مل مل کر نہایا۔ سوٹ کیس میں نئے کپڑے موجود تھے۔ نہا کر میں نے لباس تبدیل کیا اور تازہ دم ہو کر میں نے سگریٹ سلگا لیا۔ ایک اور کربناک رات غرقاب جہاز کے اوپر سے گزرتے پانیوں کی طرح مجھے نگلتی ہوئی آگے بڑھ گئی تھی۔ اس رات کی سیاہی کتنوں کو اپنے ساتھ لے گئی ہو گی۔ ان میں نجو بھی شامل تھا۔ جس کے خون کے کچھ دھبے میری قمیص پر موجود تھے جو میں نے غسل خانے میں اتار دی تھی۔ مگر میرے دکھوں کی مدت اور سوزش پھر بھی کم نہیں ہوئی تھی۔ پہلے مجھے آسیہ کا غم تھا اب اس غم میں آبی کا غم بھی شامل ہو گیا۔ میرے تصور میں آبی کے کٹے ہوئے بازو بھر بھر کر ابھرتے تھے تو مجھے جھرجھری سی آنے لگتی تھی۔ وہ پورن سمپورن آبی اپنی اس پُر شکستگی کے ساتھ کیسے جی رہا ہوں گا۔ اگر نجو کی خبر درست تھی تو پھر ۔۔۔ پھر ۔۔۔ تو ہم کہیں کے بھی نہیں رہ گئے تھے۔ دشمن نے مجھ سے بدترین انتقام لے لیا تھا۔ میرے دل کے ایک اور نازک مقام پر اس نے ناخن مار دیا تھا۔ اس جراحت سے تو ہم کبھی بھی صحت مند نہیں ہو سکتے تھے۔ دشمن کی تیغ دو دم تو ہمیں تباہ کر گئی تھی۔

کاش وہ ترمذی ہماری حراست سے بھاگ نہ سکتا۔ اے کاش! مگر کوئی پانی کو چھلنی میں کہاں روک سکا ہے۔ ہم تو سوچتے ہی رہ گئے اور دشمن کا وار ہم پر چل گیا۔ یوں کہ ہمیں اپنی ذات پر جو یقین ایمان تھا وہ بھی ہم سے اب چھن گیا۔

کتنی ہی دیر تک میں ڈھلوں صاحب کے اس مہمان خانے میں بیٹھا خود سے الجھتا رہا میرے خشک پوال میں جو آگ لگی تھی، وہ کسی طرح بجھ ہی نہیں پاتی تھی۔ اتنے میں برکت میرے لیے کھانا لے آیا۔ وہ سحری کا سامان تھا۔ مگر میں اسے روزے کی نیت سے تو نہیں دیکھتا تھا۔ اس کھانے کی خوبی یہ تھی وہ انسان پر سارا دن زبردست قسم کی غنودگی طاری رکھتا تھا۔ بڑے چٹ پٹے اور مرغن اجزا تھے۔ اور میں دو نہیں تین وقت کی بھوک کا مارا ہوا اس پر بد دل کی طرح پل پڑا۔ برکت میری اس بے تابی کو سمجھ رہا تھا۔

میں کھانا کھا چکا تو وہ مسکرا کر بولا ”خان جی لگتا ہے آپ کو کل سے نہ سحری ملی نہ افطاری۔“

”کچھ نہ پوچھ یار! زندگی عذاب بن گئی ہے۔ ڈھلوں صاحب اٹھیں تو انہیں بتا دینا، اب میں بھی ذرا آرام کر لوں۔“

”فکر ہی نہ کریں خان جی! وہ صبح جیسے ہی اٹھیں گے میں انہیں بتا دوں گا۔“

”ادھر غسل خانے میں کچھ کپڑے پڑے ہیں ان پر خون کے نشان ہیں وہ صاف کروا دو۔ یا یہ کپڑے ہی جلا دو۔“

”میں دیکھ لوں گا، کوئی دنگا فساد ہو گیا؟“

”ہاں۔ کچھ ایسی ہی بات تھی۔ تم یہ برتن اٹھواؤ۔ اب میں تھک گیا ہوں۔“

اس نے وہ سامان وہاں سے اٹھایا۔ تو میں چادر تان کر لیٹ گیا۔ نیند سامنے تھی مگر وہ میری آنکھوں پر نہیں اتر رہی تھی ۔۔۔ آزردگی، درماندگی اور بے در و بے گھر ہونے کے احساس نے اس رات مجھے نڈھال کر رکھا تھا میرے جیسے تاریک راہوں کے مسافر یوں ہی زندگی بسر کرتے ہیں خود سے خائف اور دنیا سے بھی۔ ان کا حال اس درندے ایسا ہوتا ہے جو دوسروں کے گوشت پر پلتا تو ہے مگر ذرا سے کھٹکے پر وہ اپنی جگہ سے اچھل جاتا ہے کہ اپنی جان کے زیاں کا خوف اسے بھی ہمہ وقت بے چین کیے رہتا ہے۔ رت بدل رہی تھی۔ بھادوں کا آخر آخر تھا۔ ایک اور گرما میرے اوپر سے گزر گیا تھا۔ وہ ساون بھادوں پنجاب میں بہت برسے تھے ۔۔۔ ندی نالوں میں طغیانیاں بھی آئی تھیں۔ دریا بپھرے نظر آتے تھے ۔۔۔ وہ زمین کے جھلسے ہوئے چہرے کے سارے داغ دھبے دھوتے چلے جاتے تھے۔ اپنے بہاؤ میں وہ نئی مٹی بھی لائے تھے۔ دھرتی کو وہ انگ سے سنوار رہے تھے۔ ہریالی پھر عود کر آئی تھی اور یہ دنیا زیادہ نکھری نکھری نظر آتی تھی۔ آسمان کے چہرے کی دھول دھل گئی تھی۔ راتیں بالخصوص ان کا پچھلا لہلہاتی بہشتوں ایسے سکون کا نقیب حصہ زیادہ خنک ہو گیا تھا مگر۔ مگر میں جن ویرانیوں کا شکار تھا وہ کم ہونے میں نہیں آتی تھیں۔ لگتا تھا میرے حوصلے کی انی ٹوٹتی جا رہی ہے۔ آبی کی اس کھٹو کرنے مجھے بھی اوندھے منہ گرا دیا تھا۔ اور اب وہ دشمن، وہ میرا ازلی ابدی دشمن اپنے سارے ہتھیار صیقل کر کے میرے تعاقب میں لگ گیا تھا۔ کاش میں نے اس روز ان سب کو گولی مار دی ہوتی۔ میں اس لمحے کے زیاں پر جتنا ماتم کرتا کم تھا مگر وہ تو میرے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ وہ عالیہ، دشمن کو برابر میرے خلاف اکسا رہی ہو گی۔ اس کی آنکھوں کی وہ نفرت انگیز آگ مجھے ابھی تک یاد تھی۔ اور وہ لوگ مجھ پر تکان کا داؤ آزما رہے تھے۔ مجھے وہ تھکا تھکا کر مار دینا چاہتے تھے۔ ہانکے میں شکاری بھی یہی کرتے ہیں وہ جانور کو تاک کر اس پر سیدھی گولی نہیں چلاتے۔ مختلف سمتوں سے اس کے پیچھے لگ کر اسے اتنا بھگاتے ہیں کہ وہ جانور جہتوں کے احساس سے عاری ہو جاتا ہے اسے یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ اس کی کھوہ کہاں ہے۔ وہ کون سی گھاٹی ہے جس کی اوٹ اسے بچا سکتی ہے۔ دشمن بھی میرے ساتھ اب یہی سلوک کر رہا تھا میرے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ لاہور میں اس نے اپنا ایک مضبوط گروہ تیار کر رکھا ہے۔ اب میں ایسا لکنجن کہاں سے لاتا کہ جسے آنکھوں میں لگا کر ان سب سے خود کو مخفی کر لیتا۔ مجھے تو بہرحال زمین کے اوپر ہی رہنا تھا۔ مرا اے کاش کہ مادر نہ زادے۔

آسیہ بھی چلم میں رکھی گٹک ہو کر رہ گئی تھی اور میں سلفے کی طرح حالات کے ایک ہی کش میں جل کر راکھ ہو گیا تھا۔ بہن بھائی کی تقدیر ایسی بھی ہو سکتی ہے۔ یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا ۔۔۔ میں ۔۔۔ میں ان دنوں شاید خود ترسی میں مبتلا ہو گیا تھا۔ کاش میں خدا ترسی سے بہرہ ور ہو جاتا۔ انہی کالی سوچوں میں ڈوبے ڈوبے مجھے نیند آ گئی۔

جب میری آنکھ کھلی تو دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔ اور اس کے شفاف شیشوں میں سے مجھے ڈھلوں صاحب برآمدے میں کھڑے نظر آ رہے تھے۔ میں اچھل کر بستر سے نکلا اور خود کو سنبھالتا ہوا دروازے تک جا پہنچا۔ ڈھلوں صاحب مجھے سامنے دیکھ کر مسکرا دیے۔ بڑے تپاک سے بولے ”کیف حالک یا اخی؟“

”اچھا ہوں ڈھلوں صاحب! مگر یہ اتنی ساری عربی آپ کو کہاں سے مل گئی؟ آئیں ادھر بیٹھیں“ میں نے کرسی ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”ویسے ہی کراچی میں ایک آدمی نے مجھے دو لفظ پڑھا دیے تھے۔ کیا بنا اس رحمت علی کا؟“

”آپ نے کوئی خبر نہیں سنی؟“

”نہیں ۔۔۔ میں تو رات واپس آتے ہی سو گیا۔ ابھی اٹھ کر آ رہا ہوں۔“

”آپ کا دشمن منوں مٹی تلے آ چکا ہے۔ ڈھلوں صاحب! آپ کو مبارک ہو۔“

”سچ؟ مگر یہ ہوا کیسے؟“

”بس کسی نہ کسی طرح ہو ہی گیا۔ اپنا آدمی ہیرآباد بھیج کر معلوم کروا لیں۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا۔“

”مجھے آپ سے یہی امید تھی خان جی! کہ آپ ناکام نہیں ہوں گے۔ مگر کچھ تفصیل تو بتائیے۔“

”ہم میں سے کسی پر الزام نہیں آئے گا۔“ یہ کہہ کر میں نے چاہا کہ اس کا قتل اپنے سر لے لوں مگر میری زبان میرا ساتھ نہ دے سکی۔ میں نے وہ سارے واقعات بے کم و کاست انہیں بتا دیے جو مجھے سومرہ میں پیش آئے تھے۔

وہ بڑے غور سے میری باتیں سنتے رہے۔ جب میں خاموش ہوا تو وہ بڑے جوش سے اٹھے اور میرا کندھا تھپتھپا کر بولے۔ ”یہ تو اور بھی اچھا ہوا کہ آپ نے اس کے قاتلوں کو وہاں بے بس کر کے ڈال دیا۔ میں ابھی کسی کو ہیرآباد بھیجتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ برآمدے کی طرف بڑھے تو عین اس وقت برکت کندھے پر دونالی بندوق لٹکائے احاطے میں داخل ہوا۔ اسے دیکھتے ہی ڈھلوں صاحب بولے ”اوئے برکت علی! حکمت کو ہیرآباد بھیج دے، اسے کہہ کہ وہ رحمت علی کے بارے میں تازہ ترین

خبر لے کر فوراً واپس آئے۔ میں نے سُنا ہے کہ اُسے کسی نے قتل کردیا ہے۔ اُدھر سوہدرہ میں اس کی لاش واپس آئی ہوگی۔ حکمت سے کہ وہ ساری باتیں معلوم کرکے مجھے بتائیے۔"

"بہت اچھا سرکار! میں ابھی اُسے پیر آباد بھیجتا ہوں۔" یہ کہہ کر برکت علی اُنہی قدموں واپس چلا گیا۔

جب ڈھلوں صاحب دوبارہ کرسی پر بیٹھے۔ تو اُن کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ میری طرف سگریٹ بڑھا کر بولے "میرے لیے یہ آج کی سب سے بڑی خوش خبری ہے۔"

"آبی کے بارے میں آپ نے کچھ نہیں بتایا۔"

"ہاں! وہاں سے تو خان جی میں خجل خوار ہوکر آ گیا۔ اُسے تو اُسی شام کسی آدمی نے ضمانت پر رہا کروا لیا تھا۔"

"کون آدمی تھا وہ؟ اس کے بارے میں تو معلوم کیا ہوگا آپ نے؟"

"مجھے یہ بتایا گیا ہے کہ آبی کو اس کے کسی مہربان ظہیر احمد نے اپنی ضمانت پر رہا کروا لیا تھا۔ یہ کہہ کر کہ آبی نے کوئی جرم نہیں کیا ہے اس کا نام پولیس کے کاغذوں میں ایس جی ایم پیرزادہ لکھا ہے۔"

"میری سمجھ میں اب بھی کچھ نہیں آ رہا ہے ڈھلوں صاحب۔"

"بھئی! میں وہاں پہنچا تو اپنے ذرائع سے مجھے معلوم ہوا کہ اُس رات پولیس کی دو مخبر آپ کے دوست کو گھیر بیٹھی تھیں۔ اُن کے سامنے شراب کے نشے میں جو کچھ آبی نے کہا، اس کی بنا پر اُن لڑکیوں نے آپ لوگوں کو پکڑوانا چاہا۔ آپ تو بھاگ نکلے مگر آبی پکڑا گیا۔ وہ اُسے ہوٹل سے اٹھا کر تھانے لے گئے۔ آبی نے یوں کیا کہ وہ صاف ہی مُکر گیا۔ اس نے کہا کہ اس کا اصل نام سید غلام محمد مرشد پیرزادہ ہے اور وہ کسی اسلم آبی کو نہیں جانتا۔ اپنی شناخت کے ثبوت میں اس نے یہ بھی کہہ دیا کہ مشہور اداکارہ الماس کا وہ منگیتر ہے اس پر پولیس نے الماس سے رابطہ قائم کیا۔ وہ اُس وقت پشاور میں تھی۔ اس نے کہہ دیا کہ جس آدمی کا حلیہ وہ بتا رہے ہیں وہ اُس کا منگیتر ہے۔ اس پر کسی قسم کا شبہ کرنا بالکل ہی غلط ہوگا۔ پولیس نے الماس سے کہا کہ وہ فوراً کراچی پہنچے مگر وہ پشاور سے سوات چلی گئی۔ آبی کی مدد کو وہ کراچی نہیں پہنچی۔ آبی سے پولیس نے آپ کے بارے میں بھی سوال کیا مگر اس نے کہہ دیا کہ ساتھ کے کمرے میں جو آدمی ٹھہرا تھا وہ اُسے بالکل نہیں جانتا۔ اس دوران اُن لوگوں نے ڈاکٹر دھمن، ڈاکٹر ترمذی اور سوات خان کو تھانے بلوا کر آبی سے ملوایا مگر اُن تینوں نے اسے پہچاننے سے انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ وہ اُسے بالکل نہیں جانتے ہیں۔ حالانکہ آپ کے اور اس کے خلاف سب سے بڑے مدعی تو وہی ہیں جب پولیس کو اس طرف سے بھی مایوسی ہوئی اور وہ آبی کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت مہیا نہ کر سکے تو ان کا رویہ بدل گیا۔ اسی شام ایک شخص ظہیر احمد وہاں جا پہنچا۔ اس نے اپنی شخصی ضمانت پر آبی کو رہا کروا لیا۔

میں نے وہاں پہنچ کر جب یہ حالات معلوم کیے تو میں نے چاہا کہ ظہیر احمد سے مل کر آبی کو ساتھ لے لوں مگر ظہیر احمد نے اپنا پتہ ہی غلط لکھوایا تھا۔ اپنے بارے میں جو تفصیل اس نے پولیس کو بتائی وہ بالکل ہی غلط تھی۔ میں نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح اس آدمی کو ڈھونڈ لوں مگر وہ مجھے مل نہیں سکا۔ اور یوں میں آبی سے ملے بغیر واپس آ گیا ہوں اور وہ بھی اس لیے کہ کل دوپہر مجھے لاہور سے فدا حسین نے فون کیا تھا کہ میں فوراً واپس آ جاؤں۔ رحمت علی کا معاملہ بہت پیچیدہ ہو گیا ہے۔ فدا حسین میرا پرانا جاننے والا ہے۔ سیاسی حلقوں میں میرے لیے اُس نے بہت کام کیا ہے، اُسے پتہ نہیں رحمت علی کے بارے میں کسی نے کیا کچھ بتایا۔ کہ اس نے مجھے افراتفری میں ڈال دیا۔ فون پر وہ تفصیل نہیں بتانا چاہتا تھا۔ میرے ہر سوال کو بس ٹال ہی گیا۔ کہہ رہا تھا کہ وہ سب کچھ زبانی بتائے گا۔ رات میں اُسکے گھر بھی گیا تھا۔ وہ بیڈن روڈ کے عقب میں رہتا ہے۔ اس کی بیوی نے مجھے بتایا کہ وہ سوہدرہ گیا ہوا ہے صبح واپس آئے گا۔ اب میں کسی کو اس کی طرف بھیجتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئے۔ میرے چہرے پر جمی تکدر اور مایوسی کی گرد زیادہ دبیز ہونے لگی تو ڈھلوں صاحب بولے "کیا بات ہے؟ آپ تو بہت پریشان ہو گئے ہیں۔"

"بات ہی ایسی ہے ڈھلوں صاحب! آبی کو ڈاکٹر دھمن نے بڑی عیاری سے اپنی گرفت میں لے لیا ہے اور میں نے سُنا ہے کہ اس نے آبی کے دونوں ہاتھ کاٹ دیے ہیں۔"

"نہیں خان جی! یہ نہیں ہو سکتا۔ میں... میں اس کا بیج ہی ختم کر دوں گا۔ اگر یہ بات سچ نکلی تو میں اُسے زمین کے آخری کونے تک نہیں چھوڑوں گا۔" اُن کے چہرے کی رگیں پھولنے لگیں انھیں ایک دم اتنا طیش آ گیا تھا کہ اس سے پہلے میں نے اُن کو کبھی اتنا مشتعل نہیں دیکھا تھا۔

"یہی ہوا ہے ڈھلوں صاحب! کل کا دن اور پچھلی رات کا آدھا حصّہ میں نے دھمن کی سُولی پر گزارا ہے۔ یہ دیکھیں یہ میرے بدن پر ضربوں کے نشان۔" یہ کہہ کر میں نے اپنی قمیص بنیان سمیت الٹ کر اُن کو اپنی کمر اور دونوں پہلو دکھائے۔ وہ سپٹپا سے گئے۔ حیرت زدہ ہو کر بولے "یہ کیسے ہو گیا، کون لوگ تھے وہ؟ میں اُن پر کتّے چھوڑ دوں گا۔ بتائیں مجھے کون تھے وہ؟"

"وہ کامران ہوٹل کے مالک ولایت علی اور اُن کے گرگے تھے۔" یہ کہہ کر میں نے انہیں اس مصیبت کی ساری تفصیل بتا دی جو مجھ پر لکڑی کے بیچ میں سے گزرتے آرے کی طرح بیت چکی تھی۔

اب کی بار ڈھلوں صاحب کی حیرت دیدنی تھی۔ بڑے ہی غضبناک لہجے میں بولے "وہ تو کوئی بڑے ہی عیار لوگ معلوم ہوتے ہیں خان! میں تو اُن کا ہوٹل ہی مسمار کر دوں گا۔ وہ بچ کر نہیں جا سکتے۔ اوئے ڈِتے! جا ذرا بدری کو ادھر بُلا لا۔ حد ہو گئی۔ اُن کی یہ ہمت۔"

ڈِتا اُن کا ملازم تھا جو احاطے کے چھوٹے دروازے پر ایک نالی بندوق لے کر بیٹھا تھا۔ اس نے ڈھلوں صاحب کی آواز سُنتے ہی دُوسری طرف دوڑ لگا دی۔

"میں آپ کے ایک ایک زخم کا اُن سے حساب لُوں گا۔ یہ کیا بات ہوئی۔" یہ کہہ کر وہ بڑے ہی مضطرب انداز میں کرسی پر سے اُٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔

"انھیں میں کافی سزا دے آیا ہوں ڈھلوں صاحب! میں اب آج ہی کراچی جا رہا ہوں۔ آبی کی مدد میرے سوا اور کوئی نہ کر سکے گا۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میں اپنے چار آدمی آپ کے ساتھ بھیج دیتا ہوں وہ ان سب کو باندھ کر ادھر لے آئیں گے۔"

"نہیں! میں تنہا ہی جاؤں گا۔"

"شام کو پانچ بجے کے جہاز سے چلے جائیں۔ اتنے میں بھی اس ولایت علی سے نپٹ لوں گا۔"

ابھی وہ یہ بات کہہ ہی رہے تھے کہ ایک چھ ہاتھ اونچا جوان چیتے ایسی پُروقار چال چلتا ہوا احاطے میں نمودار ہوا۔ وہ لمبا سفید کُرتا پہنے ہوئے تھا۔ اُسے میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی چمک نظروں کو خیرہ کرتی تھی اور رنگ اس کا تانبے ایسا تھا۔ بڑے کھلے اور کسرتی ہاتھ پاؤں کا جوان تھا وہ۔ اس سے میری نظریں ملیں تو وہ مسکرا دیا۔ دروازے سے اندر آ کر بولا "آپ نے مجھے بلایا ہے چوہدری صاحب؟"

"ہاں بدری! معاملہ ہی ایسا ہے تم ابھی برکی کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر لاہور جاؤ۔ وہاں ایک کامران ہوٹل ہے۔ اس کے مالک ولایت علی اور سمن آباد سے اس کے بیوی بچوں کو باندھ کر آج دوپہر سے پہلے پہلے یہاں لے آؤ۔ زندہ یا مُردہ ہر حال میں وہ آدمی آج تین بجے تک یہاں ہونا چاہیے اُدھر تہہ خانے میں۔"

بدری کی آنکھوں کی چمک کچھ زیادہ تیز ہو گئی۔ اُس کے حسّاس نتھنے اور بازوؤں کی مچھلیاں یوں پھڑکیں جیسے کوئی درندہ شکار پر جھپٹنے کے لیے بدن تول رہا ہو۔

"اس کا کچھ اور اتا پتا معلوم ہو تو بتا دیں۔ بندہ میں حاضر کر دوں گا۔ گل خور ڈال کر اسے یہاں لے آؤں گا۔"

"ہاں! اس کا نام ولایت علی ہے۔ باقی باتیں تم خود معلوم کر سکتے ہو۔ ابھی نکل جاؤ۔"

"ٹھیک ہے جناب۔ گرچہ یہ ماہ رمضان ہے، پر خیر۔ یہ بھی کارِ خیر ہی ہو گا۔" یہ کہہ کر وہ چیتے کے سے انداز میں گردن گھما کر پلٹنے لگا مگر نگاہیں اس کی میرے چہرے پر جمی تھیں معلوم یہ ہوتا تھا کہ وہ مجھے تول رہا ہے۔ رہا تھا۔

"تم سے مل کر، تمھیں دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔ ان کو ڈھلوں صاحب یونہی جمع کرتے ہیں۔" میں نے اپنے دل میں اس کے لیے اُبلتی ستائش دباتے ہوئے اس کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا کر کہا۔

اُس نے قدم روک کر اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔ بڑی گرمجوشی تھی اُس کے مصافحے میں۔ آنکھیں پھڑکا کر بولا "مجھے بھی آپ سے مل کر دلی خوشی ہوئی ہے۔ میرا نام بدرالدین ہے۔" اس کے پنجے کی گرفت سخت تھی اور ہتھیلیاں خشک۔ یوں جیسے اپنے وجود کے ہر مسام پر اُسے مکمل اختیار حاصل ہو۔

"یہ ہمارا نیا دوست ہے۔ کوئی دو مہینے پہلے ہمارے پاس آیا تھا۔ ہم نے اسے اپنے خاص آدمیوں میں شامل کر لیا ہے۔ یہ ہاشم خاں ہیں بدری! ہمارے پرانے مہربان ہیں۔"

بدری نے اپنا بھاری بھرکم بایاں ہاتھ میرے کندھے پر رکھ دیا۔ بولا "واپسی پر آپ سے ملاقات ہو گی۔ امید ہے آپ میرا انتظار کریں گے۔"

"ہاں! شاید تمھیں ان کے ساتھ آج رات کراچی جانا پڑے مگر پہلے یہ کام کر آؤ۔"

"ٹھیک ہے۔ ان کے ساتھ چل کر مجھے خوشی ہو گی۔" یہ کہہ کر اس نے میرا کندھا ذرا سا دبایا۔ اور بڑے ہی شاہانہ انداز سے پنے تُلے قدم اٹھاتا ہوا وہ باہر نکل گیا۔

"یہ جوان کہاں سے ہاتھ لگا ہے آپ کو۔ بڑے دل گُردے کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔"

"اس کا تفصیلی تعارف پھر کسی وقت کراؤں گا۔ فی الحال یہ سمجھ لیں کہ یہ کمانڈو رہ چکا ہے۔ میرے ایک دوست ہیں افضل صاحب انھوں نے اسے میرے پاس بھیج دیا۔ میں نے اسے پندرہ سو روپے ماہانہ پر یہاں رکھ لیا ہے، بڑا چوکس اور خونخوار جوان ہے رحمت علی کے پیچھے اُسے ہی لگا دیتا مگر مجھے اس کی ذہانت پر شبہ تھا اس لیے میں نے وہ کام آپ کے سپرد کر دیا تھا۔"

"میرا خیال ہے کہ یہ اگر کراچی میرے ساتھ گیا تو میرے لیے بڑی آسانی رہے گی۔"

"ہاں اسے ساتھ لے جائیں بڑے گُر جانتا ہے یہ۔ آپ اب نہا لیں میں مرہم بھیجتا ہوں کمر پر مَل لیں اور ناشتہ بھی کر لیں۔ جیسے ہی یہ واپس آئے گا میں آپ کو اطلاع دوں گا۔"

"ہاں! مگر میں آج شام تک یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔ آبی کی اس مصیبت کا سُن کر تو مجھے بھی سخت غصہ آ رہا ہے کوئی وہاں مشکل پیش آئے تو مجھے فون کر دیں۔

مخبر نے اُدھر ذیلدار روڈ پر ایک کوٹھی خریدی ہے۔ اپنے دو ملازم وہاں بٹھا دیے ہیں۔ اس میں دو ٹیلی فون بھی لگے ہیں، یہ ہیں اُن کے نمبر۔ آپ کو کوئی پیغام دینا ہو تو اس نمبر پر دے دیں۔ ملازموں میں سے ایک کا نام حنفی ہے اور دوسرے کا مدثر۔" یہ کہہ کر ڈھلوں صاحب نے ایک کاغذ کے پُرزے پر دو فون نمبر اور کوٹھی کا پتہ لکھ کر مجھے تھما دیا۔ وہ میں نے بڑی احتیاط سے سنبھال کر جیب میں رکھ لیا۔

وہ کمرے سے جانے لگے تو میں بھی اُن کے ساتھ ہی اُٹھ گیا۔ برآمدے میں پہنچ کر بولے "میرا خیال ہے کہ میں اپنا وقت اب اس کوٹھی میں بھی گزاروں گا۔ دس کنال رقبہ ہے اس کا، آرام رہے گا۔"

"ہاں! مجھے آپ سے رابطہ قائم کرنے میں بھی آسانی رہے گی۔"

"فکر نہ کریں خان جی! آپی کو کوئی نقصان پہنچا تو وہ لوگ ہمارے انتقام سے نہیں بچ سکیں گے۔"

"خدا کرے یہ خبر غلط ہو۔ ورنہ میں تو پاگل ہو جاؤں گا۔"

"ہو سکتا ہے ان لوگوں نے آپ کو اشتعال دلانے کے لیے یہ خبر سُنائی ہو تاکہ آپ بھڑک کر اُن کے سامنے جا پہنچیں۔ بہرحال میں ان کے بارے میں بڑے صاحب سے بھی بات کرتا ہوں اُن کو تو ویسے ہی گولی مار دینی چاہیے۔" یہ کہہ کر وہ کچھ سوچتے ہوئے احاطے میں اُترے اور پھر ڈتے کو اپنے ساتھ لے کر دوسری طرف چلے گئے۔

میں ایک بار پھر پایاب پانیوں تلے چھپی اداسی کی تہ در تہ دلدل میں دھنسنے لگا۔ میرے وجود پر تاتن رُت حاوی ہوتی جا رہی تھی۔ ایک لدوز اضمحلال تھا جو میری رُوح پر طاری ہونے لگا تھا۔ میں شاید بے تلا ہوتا جا رہا تھا۔ جواریوں کے ہاتھ آیا لاوارث مال جو اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر ہوتا ہے اور اس کی قیمت برابر گرتی چلی جاتی ہے۔ میری میزان کے دونوں پلڑے خالی تھے اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں۔ بڑا استقلال تھا میرے دل میں، اپنے اعصاب پر مجھے بڑی بند ھیج حاصل تھی۔ مگر اب یُوں لگتا تھا جیسے میرا بند بند کھلتا جا رہا ہے اور اندر سے خلا ہی خلا برآمد ہونے لگے ہیں۔ آپی کی اس نئی مصیبت نے مجھے آسیہ کی ابتلا بھلا دی تھی۔ اور میں یوں محسوس کرتا تھا کہ آپی تب مجھے سارے جہان سے زیادہ عزیز ہو چکا تھا۔ اس کو اگر واقعی اس دشمن نے ڈس لیا ہے تو پھر... پھر کیا ہو گا۔ میں آپی کے ہاتھ اُسے کیونکر واپس دلا سکوں گا۔ دنیا کا کوئی جرّاح، کوئی حکیم، کوئی سنیاسی بھی ان کٹے ہاتھوں کو آپی کی کلائیوں پر دوبارہ نہ اُگا سکے گا۔ وہ تو بے موت ہی مارا گیا۔ وہ خوشبوؤں کا رسیا، وہ ناری کا دیوانہ، اپنے کٹے ہوئے ٹنڈ منڈ بازو دیکھتا ہو گا تو میرے بارے میں وہ کیا سوچتا ہو گا۔ وہ آپی جس نے دشمن کو خوفزدہ کرنے کے لیے لکڑی کے اڈّے پر اُس کا پاؤں رکھ کر گنڈاسا ہاتھ میں لے لیا تھا، یُوں جیسے وہ اُس کے پاؤں کاٹ ہی دے گا مگر وہ تو محض اُسے ڈرا رہا تھا۔ اُس کی نیت تو یہ نہیں تھی۔ اور دشمن کو یقین آ جانا چاہیے تھا کہ اگر ہم اُسے یُوں کاٹ دینا چاہتے تو وہاں کوئی ایسا نہ تھا جو ہمارا ہاتھ روک سکتا۔ پھر... پھر اُس سگ زادے نے ایسا کیوں کیا۔ اس کا اصل مجرم تو میں تھا۔ میں اس کے ہاتھ آ جاتا تو وہ جو سلوک بھی چاہتا میرے ساتھ کر لیتا۔ میں اسے اپنے کسی عمل کا ردِّعمل سمجھ کر معاف بھی کر سکتا تھا۔ میں اس کی ہر چوٹ سہہ جاتا۔ مگر... مگر جس سولی پر اُس نے آپی کو لٹکا دیا تھا۔ وہ اس کا مستحق تو ہرگز نہیں تھا۔ نہیں تھا یارو! آپی اس سزا کا کسی بھی طرح مستحق نہیں تھا اور اب میں اُس مار گزیدہ کے لیے باد مہرہ کہاں سے لاؤں؟ میں... میں دشمن کو تو زمین میں گاڑ دوں گا، وہ اب کی بار میرا وار نہیں سہہ سکے گا، مگر وہ آپی کے سارے جہان سے زیادہ خوبصورت ہاتھ، میں اسے کیسے واپس دلا سکوں گا۔ یہ سوال میرے ذہن میں زہر گھول رہا تھا۔

میں نے ناشتہ کیا، سگریٹ پھونکتے ہوئے احاطے میں اِدھر اُدھر دھوپ میں پاگلوں کی طرح چکر لگاتا رہا مگر میرے اس اضطراب سے کون سا عقدہ حل ہو سکتا تھا۔ میرے ستاروں کی پھلت تو میرے سامنے تھی۔ میں نے اس کو بدلنے کی بڑی کوشش کی مگر وہ سب سعی لاحاصل ہی ثابت ہوئی کہ ماتھے کی بھونری والا گھوڑا اور آدمی سدا سے منحوس سمجھا گیا ہے۔ میں بھی شاید کوئی ایسی ہی نادیدہ بھونری ساتھ لیے پھرتا تھا۔ سچ پوچھیں تو مجھے اپنے ساتھ ساتھ جا بجا چلتے نظر آتے تھے ان کی سارنگیوں سے بڑے المناک سُر نکلتے مجھے صاف سُنائی دیتے تھے۔ زندگی میں جیتی جاگتی حیات کے پُر سرور لمحوں میں میتوں کا تصور ذہن میں اُبھرنے لگے تو ایسے نوحہ کناں بھی سامنے بھرتے نظر آتے ہیں۔ میرا حال بھی کچھ ایسا ہی ہو چکا تھا۔ آپی کی اُس پریشانگی نے مجھے پاگل کر دیا تھا۔

تھک ہار کر میں وقت گزارنے کے لیے پھر بستر پر جا لیٹا۔ آدمی موت کی آرزو کرے اور نیند مل جائے تو وہ اُسے ہی غنیمت سمجھتا ہے۔ اپنی مرضی کے مطابق کوئی چیز اس جہان میں ہر وقت کسے ملتی ہے۔ کچھ ہی دیر بعد مجھے نیند نے آ لیا اور میں دم بھر کے لیے اپنے ذہنی عذاب سے بچ گیا۔ مگر پھر... پھر یُوں ہُوا کہ وہ نیند کا شیشہ میرے سر میں تڑاخ سے ٹوٹ گیا۔ کوئی کھلے دروازے پر دستک دے کر مجھے پکار رہا تھا۔ میں نہ خان تھا نہ خان جی، نہ ہاشم نہ ہاشم خان پھر بھی یہ نام مجھے اپنی سماعت پر گراں نہیں گزرتا تھا۔ میری آنکھ کھلی تو سامنے برکت کھڑا تھا، بولا "خان جی! اُٹھیں، آپ کو ڈھلوں صاحب بُلا رہے ہیں۔"

"کیوں؟ خیر تو ہے! تو کچھ گھبرایا ہوا سا ہے۔" میں نے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بستر چھوڑ دیا۔

"بڑا تماشا ہے اِدھر۔ کوئی سواریاں آئی ہیں، بدری انھیں شہر سے لایا ہے۔"

بدری کا نام سنتے ہی میں نے اپنا پستول تکیے کے نیچے سے نکال کر نیفے میں اُڑسا اور جوتا پہن کر برکت کے ساتھ چل دیا۔

"یار تو کن سواریوں کی بات کر رہا ہے کون لوگ ہیں وہ؟"

"آپ جا کر دیکھ لیں۔ بدری نے تو کمال کر دیا ہے ایسا تیز آدمی ہے وہ۔" برکت نے میرے آگے آگے بھاگتے ہوئے کہا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ مجھے حویلی کے شمالی حصے میں لے گیا۔ وہاں بھی چار کمرے بنے ہوئے تھے۔ جن کے وسط میں ایک راہداری تھی۔ دو کمرے دائیں ہاتھ تھے اور دو بائیں ہاتھ۔ اس راہداری کے درمیان میں پہنچ کر برکت نے ایک دروازہ کھول دیا، بولا "آپ اندر چلے جائیں۔"

سامنے ایک زینہ تھا جسے میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ میں نے سیدھے ہاتھ میں چپ شاہ کو تھام کر زینے پر قدم رکھ دیا۔ وہ زینہ ایک وسیع تہہ خانے میں اُترتا تھا۔ ابھی میں دو قدم نیچے ہی تھا کہ مجھے اپنے سامنے تین آدمی فرش پر اوندھے منہ پڑے نظر آئے۔ بدری اور ڈھلوں صاحب ان کے قریب کھڑے تھے۔ لالٹین کی روشنی میں اُن کے چہرے دیکھ کر میں صرف ولایت علی کو ہی پہچان سکا۔ اس کا چہرہ جگہ جگہ سے زخمی تھا جیسے کسی نے ناخن مار کر اُس کی جلد اُدھیڑ دی ہو۔ مجھے دیکھتے ہی وہ تڑپ کر اُٹھا اور چیت لیٹ گیا۔

"اسے جانتے ہو ولایت علی؟" ڈھلوں صاحب نے کڑک کر پوچھا۔

"مجھے معاف کر دیں جناب مجھے معاف کر دیں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ آپ کا آدمی ہے۔"

"جھوٹ مت بول ولایت علی! یہ تو ہی تھا جو اس کی تلاش میں یہاں آیا تھا۔ تو نے ہی اسے اپنے ہوٹل میں بلوا کر پکڑ لیا تھا۔" یہ کہہ کر ڈھلوں صاحب نے بدری کو اشارہ کیا کہ وہ انھیں سیدھا کر کے دیوار کے ساتھ بٹھا دے۔ ولایت علی نے ان کی بات کا جواب نہیں دیا۔

"یہ کون ہیں یہ دونوں؟"

میرے اس سوال پر بدری بولا "یہ اس ولایت علی کے ہوٹل کا مینجر ہے تاجر اور اس کا ساتھی ہے رشید۔"

"اور یہ سب ٹوا کٹر دشمن کے گُرگے ہیں۔ اس بندے کے تو میں جبڑے چیر دوں گا، ان کو پیالے پر لگا دے بدری۔ گاٹی سے کہو کہ وہ ان کا مناسب بندوبست کرتا ہے۔"

"مگر ان سے پتہ تو پوچھیں اس دشمن کا اور یہ بھی معلوم کریں کہ آپی کے ساتھ ان لوگوں نے کیا سلوک کیا ہے؟"

"وہ میں پوچھ چکا ہوں۔ آئیں آپ۔ ان سے وہیں جا کر بات ہو گی۔" بدری نے میرے قریب آ کر کہا۔ اتنے میں ایک آدمی دھپ دھپ کرتا سیڑھیاں اُتر آیا۔ اس کے ہاتھ میں چابک تھا۔

"اوئے گاٹی! یہ اب تیرے چارج میں ہیں سنبھال ان کو۔" ڈھلوں صاحب نے اس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"پھکر ای نہ کرو سرکار! اینہاں دی تے میں بھمبیری بھواں دیاں گا۔"

"ہاں بس ٹھیک ہے آئیں خان جی!"

"آکھو تے اینہاں نوں جاری کر دیاں؟" گاٹی نے پوچھا۔

"نہیں نہیں! ایسی زیادتی نہیں ہونی چاہیے ویسے تمھیں پورا اختیار ہے۔" یہ کہہ کر ڈھلوں صاحب سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ میں اور بدری بھی اِن کے پیچھے ہو لیے۔

تہہ خانے کا دروازہ بند کر کے جب ہم راہداری میں پہنچے تو بدری بولا "اس کی ٹانگ پر پٹی بندھی ہے اس ولایت علی کے۔ مجھے یہ ہوٹل میں ہی مل گیا تھا۔ ہمیں انتظار کرنا پڑا۔ یہ ایک بجے کے قریب تاجور اور رشید کے ساتھ کار میں باہر نکلا تو ہم اُن کے پیچھے چل دیے۔ یہ ایئرپورٹ کی طرف جا رہے تھے۔ راستے میں انھیں روک کر میں اِن کی گاڑی میں جا بیٹھا۔ ساری دھن پیٹاخ وہیں ہو گئی۔ جب ان کی ہوا نکل گئی تو میں ان کی گاڑی وہاں سے خود چلا کر پتوکی کی طرف لے آیا۔ اور پھر یہاں تک آنا تو کچھ بھی مشکل نہیں تھا۔"

"مجھے تم سے یہی اُمید تھی بدری! یہ تینوں چھ مہینے تک اِدھر ہی پڑے رہیں گے۔" ڈھلوں صاحب نے خوش ہو کر کہا۔

"یہ پیالے کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔" میں نے ذہن میں اٹکا سوال پوچھ ہی لیا۔

"یہ بھی ایک علاج ہے۔ بھنگ اور افیون گھوٹ کر گاٹی ایسے لوگوں کو اتنی پلاتا ہے کہ وہ نہ گھر کے رہتے ہیں نہ گھاٹ کے۔ وہ نشہ ان کی نس نس میں رچ جائے گا۔ پھر ہم ان کو چھوڑ بھی دیں گے۔ تو یہ کسی کام کے نہیں رہیں گے۔" ڈھلوں صاحب نے اس احاطے سے باہر آتے ہوئے کہا۔

"مگر ان کو یُوں باندھ رکھنے سے کیا ملے گا ہمیں؟"

"دشمن کی طاقت کچھ تو کم ہو گی۔ لاہور میں دشمن کے یہ سب سے زیادہ خطرناک نمائندے ہیں۔ اب دیکھتے ہیں اور کون ہمارے سامنے آتا ہے۔ ان کی گاڑی میں نے سیاں گیراج میں رکھوا دی ہے۔" بدری نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

"ہاں یہ بہتر رہے گا۔ اس کا حلیہ بدل کر کسی وقت اسے بیچ لینا گاڑی بہت اچھی حالت میں ہے۔"

"بالکل نئی ہے جناب! ستر اسّی ہزار میں تو نکل ہی جائے گی۔"

بدری بہت خوش تھا۔ اس نے برق رفتاری کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ ایسا آدمی تھا کہ اس کی صلاحیتوں پر میں بھی اعتبار کر سکتا تھا۔ دنیا میں ایک

میں ہی پھنّے خان نہیں تھا، ماؤں نے اور بھی بڑے بڑے جی دار جوان پیدا کر رکھے تھے۔ میں اس کی کارگزاری کو بلاشبہ رشک کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ وہ ایسا گھاتیہ تھا جس نے ایک ہی جست میں ان لوگوں کو بے بس کر کے منہ میں دبایا اور لا کر اپنی کچھار میں ڈال دیا۔

مجھے یقین کر لینا چاہیے تھا کہ وہ کمانڈو رہ چکا ہے مگر میرا دل اس کے اس دعوے کو قبول نہیں کرتا تھا۔ ایسے جی دار جوان کو اُن لوگوں نے کیسے ہاتھ سے نکلنے دیا۔ ایک عجیب سا وسوسہ مجھے نرغے میں لے رہا تھا۔ اور میں اس سوچ میں گم تھا کہ کہیں وہ بدری ڈھلوں کے دشمنوں کا آلۂ کار تو نہیں۔ وہ کسی مقام پر انھیں کوئی گہرا زخم لگا کر اسے سرحد پار تو نہیں کر جائے گا۔ جس گھال میں وہ ڈھلوں صاحب کو پھنسا سکتا تھا۔ اُن کا مکمل اعتماد جیت لینے کے بعد اس کا تو تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں نے چاہا کہ میں اپنے اس محسن کو ان خدشات سے آگاہ کر دوں جو بدری کے بارے میں میرے دل میں اُبھر رہے تھے۔ مگر میں چپ ہی رہ گیا۔ میں سمجھا کہ یہ خدشہ درحقیقت اس حسد کی وجہ سے ہے جو مجھے غیر محسوس طریقے سے اپنے شکنجے میں لے رہا ہے۔ بدری کی اس حویلی میں آمد کے بعد میری وقعت ڈھلوں صاحب کی نظر میں وہ نہیں رہے گی جو پہلے تھی۔ میرا خیال ہے کہ بدری کے سلسلے میں جو شک میرے ذہن میں ابھرا وہ اسی بنا پر تھا۔ میں نے بہرحال خاموش رہنے ہی میں مصلحت سمجھی۔

ڈھلوں صاحب نے یہ فیصلہ صادر فرما دیا تھا کہ آبی کی مدد کے لیے وہ بدری کو میرے ساتھ کراچی بھیج دیں گے اور یہ اچھی بات تھی وہاں لے جا کر میں بدری کو زیادہ قریب سے دیکھ سکتا تھا۔

رحمت کے انجام کی تصدیق بھی اسی روز ہو گئی۔ اُن کا ملازم حکمت واپس آ گیا تھا۔ مجھے اور بدری کو ساتھ لے کر جب ڈھلوں صاحب اس مہمان خانے میں آئے جہاں میں ٹھہرتا تھا تو حکمت بھی وہیں آ گیا بولا۔ "چوہدری صاب! اس رحمت علی کو تو دفن بھی کر دیا گیا ہے۔ کوئی عشق مُشک کا قصہ تھا۔ ادھر سوہدرہ میں کوئی لڑکی تھی زلیخا۔ اس کے لواحقوں نے اُن دونوں کو گولی مار دی۔"

"پر یہ بھی تو سوچ حکمت کہ رحمت علی اس سیڑھی پر کیسے چڑھ سکتا تھا۔"

"او جی عشق بندے کے اندر بڑی ہارس پاور پیدا کر دیتا ہے، اور پھر ایسی ناری کا عشق۔ سُنا ہے بہت سوہنی کُڑی تھی وہ اور رحمت علی اس کے لیے لال خان کے ٹکڑے میں پھنسنے کے لیے تیار تھا۔" حکمت واقعی کوئی باحکمت آدمی تھا۔

"چلو اچھا ہوا۔ خس کم جہاں پاک۔" ڈھلوں صاحب نے خوش ہو کر کہا۔

"پر چوہدری صاب! پولیس کسی ایسے آدمی کی تلاش میں ہے جو واردات کے وقت اس حکیم کے گھر میں موجود تھا۔ اس پٹھے نے زینت اور زلیخا کے قاتلوں کو زخمی کر کے وہیں بیکار کر دیا۔ اور وہ موقعہ واردات سے پکڑے گئے۔"

"پولیس کا کیا خیال ہے؟" ڈھلوں صاحب نے پوچھا۔

"چوہدری صاب پولیس کا تو مجھے پتہ نہیں۔ رحمت علی کا بھتیجا جو میرا یار بن گیا ہے، بتا رہا تھا کہ اس حکیم عبدالرشید کی زنانیاں یہ چیخ چلاتی رہی ہیں۔ اس حکیم نے تین شادیاں کر رکھی ہیں۔ کوئی لمبا ہی قصہ نظر آتا ہے مجھے۔ پولیس نے اس حکیم اور اس کی بیویوں کو بھی شاملِ تفتیش کر لیا ہے۔"

"چلو اچھا ہے اُن کو بھی قانون سے کچھ واقفیت ہو جائے گی۔ اب تم جاؤ حکمت اور دھیان رکھو کہ حالات کیا رُخ اختیار کرتے ہیں۔ رحمت علی کا قتل کوئی معمولی بات نہیں ہے۔"

"وہ کُشتۂ زن خود اپنی موت کا سامان کر بیٹھا تھا چوہدری جی۔ آپ جو کچھ سوچ رہے ہیں، وہ نہ سوچیں۔"

ڈھلوں صاحب اُس کی یہ بات سن کر ہنس دیے، بولے۔ "ٹھیک ہے اب تم آرام کرو۔"

حکمت وہاں سے اُٹھ کر باہر نکلا تو وہ مجھ سے مخاطب ہو گئے بولے۔ "آپ دونوں آج ہی کراچی چلے جائیں اور عالیہ کو چھوڑ کر ان سب کو جان سے مار دیں۔ آپ نے عالیہ کی جو تصویر میرے سامنے کھینچی ہے۔ اس کو پیشِ نظر رکھ کر میں چاہوں گا کہ آپ اُسے یہاں لے آئیں۔ میں بھی تو دیکھوں کہ وہ کیا چیز ہے۔"

"فکر نہ کریں ڈھلوں صاحب میں اُسے باندھ لاؤں گا۔ آپ تیار ہو جائیں خان جی! میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔" بدری نے بڑے پُرعزم لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے پیارے! میرے مقدّر کی سیاہی میں تم بھی حصے دار بن جاؤ۔ میں تو زخم ہی کھاتا چلا آیا ہوں۔"

"یہ مایوسی اچھی نہیں ہے ہاشم صاحب! آپ ہیں تو مجھے ایسی باتوں کی امید نہیں ہوتی۔ حوصلہ رکھیں سب ٹھیک ہو جائے گا۔" ڈھلوں نے میرے قریب آ کر میرے کندھے تھپتھپائے۔

دوپہر کا کھانا ہم نے اکٹھے بیٹھ کر کھایا اور پھر چار بجے کے قریب میں اور بدری ولایت علی کی گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے شہر کو چل دیے۔ سہ پہر بڑی اداس تھی۔ راستے ویران اور اوندھے منہ پڑے نظر آتے تھے۔ بدری کے حوصلے کی اُڑان تو بہت اونچی تھی۔ گاڑی وہی چلا رہا تھا۔ اور اس کی وہ کھوری کھوری سی کرنجی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ گاؤں کی حد سے نکل کر جب وہ بڑی سڑک پر پہنچا تو بولا۔ "میں نے آپ کے بڑے کارنامے سنے ہیں جیلانی صاحب! ڈھلوں صاحب تو آپ کے بڑے معتقد ہیں آپ دشمن سے کیسے مار کھا گئے؟"

"کچھ ایسی ہی بات تھی یار جی! بس میرا وہ پاگل دوست دو لڑکیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ اُس رات وہ کچھ زیادہ ہی بہک رہا تھا۔"

"ہاں! تریا چلتر نے تو بڑے بڑوں کو مار دیا۔ مگر آپ اس قدر دل گرفتہ نہ ہوں۔ آدمی کی کچیچی ٹوٹ جائے تو وہ کسی کام کا نہیں رہتا۔"

"میں نے سُنا ہے تم کمانڈو رہ چکے ہو۔"

"ہاں! یہ صحیح ہے۔ مگر مجھے وہ ہاتھ پیر بندھی ایک نالی میں بند زندگی پسند نہیں تھی۔ اگرچہ وہ گدھے کو بھی آدمی بنا دیتے ہیں۔ مگر میں کچھ زیادہ ہی آگے نکل گیا تھا۔ میری اصل فیلڈ یہی ہے۔ جنگ ہوتی رہے تو سپاہی خوش رہتا ہے ورنہ نہیں۔"

"کوئی اور بات ہو گی یار جی! ورنہ وہ تم ایسے آدمی کبھی نہ چھوڑتے۔"

"بس میرا اپنے افسر سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ پستول نکال لیے تھے۔ ہم نے ایک دوسرے کے خلاف۔ پھر میں نے کہا کہ جینے کے تو اور بھی کئی ڈھنگ ہیں۔ میں نے کسی طرح اپنی جان چھڑا ہی لی۔ ویسے میرا ریکارڈ بھی کچھ زیادہ ہی خراب ہوتا جا رہا تھا۔"

"مجھے اب بھی یقین نہیں آ رہا ہے کہ تم صرف افسر سے جھگڑے کی وجہ سے نوکری چھوڑ آئے ہو۔ پتہ نہیں کیا بات ہے بدری۔ مجھے تم وہ نظر نہیں آتے ہو جو تم ظاہر کر رہے ہو۔"

"یہ آپ کا وہم ہے جیلانی صاحب! پرے دفع کریں، اپنے کام سے کام رکھیں۔ میں ڈھلوں صاحب کے حکم پر آپ کے ساتھ جا رہا ہوں آپ خود ہی دیکھ لیں گے کہ میں کیسا آدمی ہوں۔"

"ہاں یہ تو ہے۔ مگر میری یہ بات یاد رکھنا بدری! میری راہ بڑی ہی خطرناک راہ ہے اور ذرا سی غفلت ہمیں تباہ کر سکتی ہے۔"

"مجھے معلوم ہے، یہ ولایت علی تو بس اتفاقاً ہی میرے ہاتھ آ گیا ورنہ شاید یہ کام اتنا آسان نہیں تھا۔ اس میں مجھے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی۔"

"ویسے تمھارے پیشِ نظر کوئی مقصد تو ہو گا۔ کیوں تم نے اپنی جان داؤ پر لگا دی ہے؟"

"پتہ نہیں! مجھے یہ 'تھرل' زیادہ پسند ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کے پاس کوئی ایسا گُر ہے جس سے آپ گردن دبا کر آدمی کو بے ہوش کر دیتے ہیں۔"

"یہ بات کس نے بتائی ہے تمھیں؟" میں نے چونکتے ہوئے کہا۔

"ڈھلوں صاحب نے۔ اور میں چاہتا ہوں کہ آپ وہ گُر مجھے سکھا دیں۔ میں کوئی بڑا ہاتھ مار کر کسی جگہ بیٹھ رہنا چاہتا ہوں۔ میں اس دھندے میں زیادہ دن نہیں رہوں گا۔"

"اوہ! تو یہ بات ہے۔ میرے ساتھ اسی لیے چل رہے ہو تم۔ اگر آبی کو ہم بچا سکے اور میرا دوست مجھے صحیح اور زندہ سلامت مل گیا تو تمھاری یہ آرزو پوری ہو جائے گی لیکن کتنا روپیہ کافی رہے گا تمھارے لیے؟"

"کچھ نہیں کہہ سکتا۔ دس بیس لاکھ بھی مل جائے تو میرا کام بن جائے گا۔" وہ کوئی زیادہ پڑھا لکھا آدمی نہیں تھا۔ سادہ لوح تھا اور چالاکی اسے نہیں آتی تھی۔ مجھے وہ ابھی تک بڑی عزت اور تکریم سے مخاطب کرتا چلا آیا تھا۔ اور اس احترام کو قائم رکھنا چاہتا تھا۔

آبی کی بھی یہی آرزو تھی کہ اسے ڈھیر ساری رقم مل جائے تو وہ کہیں زانو دبا اور حقہ کھانس کر اپنے بچّوں کو کسی وسیع آنگن میں پھلتا پھولتا دیکھے۔ وہ بھی چاہتا تھا اور بدری کے دل میں بھی کسی ایسی ہی آرزو کا اکھوا پھوٹ رہا تھا۔ اُس نے اپنے اسی مقصد کے لیے نوکری چھوڑ کر ڈھلوں صاحب کے ہاں ڈیرہ جما لیا تھا۔ یہ میرا قیاس تھا اور میری کوشش یہ تھی کہ اس کو اپنا ہمسفر بنانے سے پہلے میں اچھی طرح پرکھ لوں کیونکہ اس پر اندھا اعتماد کر کے میں اپنا رہا سہا وجود بھی برباد کروا سکتا تھا۔

شہر پہنچ کر اس نے فیروز پور روڈ پر گاڑی ایک مستری کے عقبی احاطے میں کھڑی کر کے مقفل کر دی تو ہم دونوں ٹیکسی میں بیٹھ کر ہوائی اڈے پر جا پہنچے۔ اس کے انداز و اطوار بتا رہے تھے کہ وہ ہوائی سفر کا عادی ہے۔ سارے ہی مرحلے وہ بخوبی طے کر گیا۔ کسی بھی جگہ اس نے کسی قسم کے ہیجان یا حجاب کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اسے اپنے اعصاب پر مکمل اختیار حاصل تھا۔

جہاز شام کے سات بجے کراچی کی طرف اُٹھتا تھا۔ وقت گزارنے کے بجائے وہ مجھے سیدھا وی آئی پی روم میں لے گیا۔ میرے لیے اس کا وہ رویّہ خاصا حیران کن تھا کیونکہ میں ایسی اہم جگہ پر بیٹھنے کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ جب میں اس کے ساتھ بیٹھ چکا تو وہ میرے چہرے کے تاثرات کو سمجھتے ہوئے بولا۔ "گھبرائیں نہیں! یہاں بھی آدمی ہی بیٹھتے ہیں۔ میں ذرا اچھی اور منفرد جگہ پر بیٹھنے کا عادی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے سوڈے کی دو بوتلیں منگوائیں۔ وہ ابھی ہم پی ہی رہے تھے کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ڈھلوں صاحب کا ڈرائیور بڑی افراتفری کے عالم میں اندر آ رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی ہم اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اس کی آنکھوں سے دہشت عیاں تھی وہ لپک کر ہمارے قریب آیا اور بولا۔ "ذرا باہر آئیں خان جی! میں آپ کو اُدھر دیر سے ڈھونڈتا آ رہا ہوں۔"

"ہوا کیا ہے یار! خیر تو ہے۔" ہم نے اس کے ساتھ کمرے سے نکلتے ہوئے کہا۔

وہ اردگرد بڑے غور سے دیکھ کر بولا۔ "ڈھلوں صاحب سخت زخمی ہو گئے ہیں۔"

"کیا کہہ رہے ہو، کس نے زخمی کیا ہے انہیں؟"

"پتہ نہیں وہ کون لوگ تھے۔ جب آپ حویلی سے باہر آ گئے تو اس کے کوئی آدھ گھنٹے بعد ڈھلوں صاحب نے گاڑی نکلوائی اور مجھے

ساتھ لے کر وہ پتوکی کی طرف چل دیے۔ انھیں وہاں سے کسی کا پیغام ملا تھا مگر جب ہم بڑی سڑک پر پہنچے تو گورپور کے قریب ایک گاڑی ہمارے پیچھے آئی اور اس میں بیٹھے دو آدمیوں نے ہم پر اندھا دھند گولیاں برسا دیں۔ ڈھلوں صاحب شدید زخمی ہو گئے مگر میں رکا نہیں اور گاڑی کی رفتار ایک دم تیز کر کے انھیں وہاں سے نکال لایا۔ اور انھیں کرسچین ہسپتال میں داخل کر کے آپ کی طرف بھاگا آیا ہوں۔ اچھا ہوا آپ مل گئے ورنہ میں پریشان ہوتا۔"

"یہ تو بہت ہی برا ہوا برکی۔ کون لوگ تھے وہ؟" میں نے سراسیمہ ہو کر کہا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ سب کچھ کیسے ہو گیا ہے۔ ہمارا سفر بھی ملتوی ہوتا نظر آ رہا تھا۔

"مجھے کچھ معلوم نہیں ہے خان جی! میں نے ان لوگوں کو پہلی بار دیکھا ہے۔"

"گولی کہاں لگی ہے انھیں؟"

"ڈاکٹر نے کہا ہے کہ گولی بائیں پھیپھڑے میں جا دھنسی ہے خدا ہی خیر کرے بہت برا حال ہے ان کا۔"

"چلیں خان جی یہ تو قصہ ہی کچھ اور ہو گیا ہے۔" بدری نے برکی کو گہری گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ کراچی کا سفر کھٹائی میں پڑ گیا تھا۔ میرے اور آپی کے درمیان ایک اور پردہ حائل ہو گیا تھا۔ ہم دونوں برکی کے ساتھ بھاگتے ہوئے اسی وقت ہوائی اڈے سے باہر نکلے اور اس کی گاڑی میں بیٹھ کر سیدھے کرسچین ہسپتال جا پہنچے۔ معلوم یہ ہوا کہ ڈاکٹروں نے ڈھلوں صاحب کو اس وقت تک آپریشن روم میں ڈال رکھا تھا۔ اور وہ لوگ ان کی جان بچانے کی پوری کوشش کر رہے تھے۔ اور ان کا حال دریافت کرنے کے لیے ہم ہی نہیں کئی اور آدمی بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ اور وہ سب کے سب بڑے معزز لوگ تھے۔ لمبی لمبی کاروں اور خوبصورت لباسوں میں وہاں پہنچے تھے۔ مگر میں ان میں سے کسی ایک کو بھی نہیں جانتا تھا۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ ہسپتال کے کئی ڈاکٹر ڈھلوں صاحب کو ذاتی طور پر جانتے تھے۔ اور ان کے رتبے کا احساس انھیں مسلسل ادھر ادھر دوڑا رہا تھا۔ سب ہی پریشان تھے اور سب ہی ان کی صحتیابی کے لیے دعائیں کر رہے تھے۔ بدری کی پریشانی دیدنی تھی۔ وہ ہم سے الگ ہو کر آپریشن تھیٹر کے اندرونی دروازے پر جا ٹھہرا تھا۔ میرا تو ذہن اس سارے اندوہناک سلسلے کو قبول ہی نہیں کرتا تھا۔ حیرت ہی حیرت تھی جو مجھے مسلسل نرغے میں لیے رہی۔ ٹھہر ٹھہر کر میرا خیال چوہدری رحمت علی کے وارثوں کی طرف جاتا تھا مگر وہ اتنی تیزی سے حرکت میں کیسے آ گئے۔ رحمت علی کا قتل تو بالکل ظاہر تھا۔ اس کے محرکات بھی ان کی نظر میں ہوں گے۔

کسی کو سو مدرہ میں نہیں معلوم تھا کہ میں کون ہوں۔ رازداری کی اس دودھ کو پھاڑ لینا آسان نہیں تھا۔ پھر وہ کون لوگ تھے جو ڈھلوں صاحب پر چڑھ دوڑے۔ وہ کون آدمی تھا جو ان کے لیے پتوکی سے پیغام لے کر آیا تھا۔ اس کے بارے میں برکی بالکل کچھ نہیں بتا رہا تھا حالانکہ اسے اس بارے میں کچھ نہ کچھ تو معلوم ہونا چاہیے تھا۔

"تمھارا کیا خیال ہے برکی! ڈھلوں صاحب پتوکی کس لیے جا رہے تھے؟"

"مجھے کچھ پتہ نہیں ہے خان جی!"

"کیا ڈھلوں صاحب پریشان تھے؟"

"نہیں ایسی بھی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ خوش تھے اور مجھ سے ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ مجھے کہہ رہے تھے کہ اب تم شادی کر لو برکی، کب تک یوں لنڈورے پھرتے رہو گے۔ میں ان کی اس بات پر ہنس دیا۔ وہ پہلے بھی مجھے اس قسم کا مشورہ دیتے رہتے تھے۔ میں نے تو کہہ دیا کہ ٹھیک ہے سرکار! کوئی گنجی کانی ڈھونڈ ہی دیں۔ اس پر وہ اور زیادہ ہنسے، بہت خوش تھے وہ۔"

"جو آدمی پیغام لایا اسے دیکھا تھا تم نے؟"

"وہ گھوڑی پر سوار تھا جب وہ واپس جانے لگا تو اس وقت میں نے ایک جھلک دیکھی تھی اس کی۔ ادھیڑ عمر کا دیہاتی سا آدمی تھا وہ۔"

"برکت کو کچھ معلوم ہو گا؟"

"ہو سکتا ہے وہ اسے جانتا ہو کیونکہ وہ اسے چھوڑنے کے لیے باہر تک آیا تھا۔"

"ہوں — تم اتنے بے پروا بھی ہو سکتے ہو، اس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کہیں یہ ان لوگوں کے ساتھی تو نہیں اس ولایت علی اور تاجور کے جنہیں یہ بدری باندھ لایا تھا۔"

"نہیں! میرا خیال ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو وہ ڈھلوں صاحب پر گولی چلانے کے بجائے ان لوگوں کی رہائی کے لیے ان سے بات کرتے۔"

"ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے مگر پھر یہ سب کچھ ہوا کیسے؟ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا ہے۔"

اتنے میں ایک ڈاکٹر ہمارے پاس سے گزرا۔ اسے روکتے ہوئے میں نے کہا "جناب! ڈھلوں صاحب کا کیا حال ہے اب؟"

"اللہ سے دعا کریں مسٹر! زخم انھیں خاصا گہرا لگا ہے۔" یہ کہہ کر وہ کسی خیال کے زیر اثر انہی قدموں واپس چلا گیا۔ وہ آپریشن تھیٹر سے ہی باہر آیا تھا۔

"میرا خیال ہے برکی، یہ کارروائی رحمت علی کے آدمیوں نے کی ہے اور کوئی ان پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتا تھا۔" میں نے قطعی لہجے میں کہا۔

"ان میں اتنی ہمت کیسے آ گئی؟"

"ڈھلوں صاحب کہہ رہے تھے کہ اس نے بڑی طاقت حاصل کر لی ہے کچھ زمینوں پر بھی اس نے قبضہ کر لیا ہے۔"

"ہاں! ہو سکتا ہے آپ کا خیال درست ہو۔" برکی نے کہا۔ اتنے میں بدرالدین لودھی ہمارے پاس آ ٹھہرا اور مجھے الگ لے جا کر بولا "میرا خیال ہے خان جی کہ آپ اپنا سفر کھوٹا نہ کریں۔ ابھی ساڑھے چھ بجے ہیں۔ آپ کراچی چلے جائیں۔ جو ہونا تھا، ہو چکا۔ میں دیکھ لوں گا کہ ہم کیا کر سکتے ہیں۔ آپ اپنے دوست کے پیچھے چلے جائیں۔ ڈھلوں صاحب اس کے بارے میں بہت پریشان تھے۔"

"نہیں یار! یہ بھی تو کچھ کم سنگین معاملہ نہیں ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر آپ کے لیے بھی ایک ایک لمحہ بہت قیمتی ہے پتہ نہیں آپ کا دوست کس حال میں ہو۔"

"مگر ڈھلوں صاحب کیا سوچیں گے۔ میں انھیں اس حال میں چھوڑ کر کیسے چلا جاؤں؟"

"ان کے لیے تو اب وہ لوگ آرام ہی آرام تجویز کریں گے۔ میری مانیں تو آپ چلے جائیں۔ میں دیکھتا ہوں وہ کون لوگ ہیں ایک ایک کو ختم کر دوں گا۔ بس ایک بار ان کا پتہ مل جائے۔" بدری کا مشورہ درست ہی معلوم ہوتا تھا۔

"ٹھیک ہے میں چلا ہی جاتا ہوں مجھے امید ہے تم سارے معاملات سنبھال لو گے۔"

"دیر نہ کریں، برکی کو نہ بتائیں۔ میں کہہ دوں گا کہ آپ ڈھلوں صاحب کے دشمنوں کے تعاقب میں گئے ہیں۔"

"ہاں یہی کرو مگر مجھے ان کی خیر خیریت کا کیسے علم ہو گا؟"

"میں یہاں ٹیلیفون آپریٹروں کو بتا دیتا ہوں۔ کراچی سے فون پر بات کر لیں، میں یا برکی ادھر موجود ہوں گے۔"

"تو پھر اللہ بیلی — میں جا رہا ہوں۔"

یہ کہہ کر میں نے بدری سے ہاتھ ملایا۔ اور برکی کی طرف دیکھے بغیر میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ہسپتال سے باہر نکل آیا۔ جب میں ہوائی اڈے جانے کے لیے ٹیکسی میں بیٹھا تو میرے ذہن پر دھند سی طاری تھی۔ سوچ کا کوئی بھی دھاگا سیدھا نہیں تھا۔ ایک احساس یہ تھا کہ ڈھلوں صاحب پر دشمن کے آدمیوں نے حملہ کیا تھا — مگر اس کی کوئی فوری وجہ میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ کیونکہ بدری اپنا بیڑہ تو اپنے پیچھے نہیں چھوڑ آیا تھا۔ ولایت علی، تاجور اور رشید کو اغوا کر کے اگرچہ ڈھلوں صاحب براہ راست میری لڑائی میں شریک ہو گئے تھے مگر اتنی جلدی میرے دشمن ان تک پہنچ بھی سکتے ہیں، اس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ معاملہ کچھ زیادہ پیچیدہ نظر آتا تھا۔ بدری بھی میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میرا خیال ہے کہ اس نے اپنی کوئی کارکردگی دکھانے کے لیے مجھے وہاں سے ٹلا دیا تھا۔ میرا اپنا دل آپی کی اذیتوں نے ڈس لیا تھا۔ اس کی شہ ملتے ہی میں وہاں سے چل دیا۔ مجھے اپنی حماقت پر پہلے ہی بہت افسوس ہو رہا تھا۔ میں اگر یوں پاگل ہو کر کراچی سے نہ نکل بھاگتا تو شاید میں آپی کو اپنی کوشش سے اب تک دشمنوں کے نرغے سے نکال لایا ہوتا۔ اس کی زندگی ہر شے سے مقدم تھی۔ میں پہلے ہی بڑی مجرمانہ ناسمجھی بلکہ بے وقوفی کا مظاہرہ کر چکا تھا۔ میں اور کچھ نہ کر سکتا تو آپی کے لیے وہاں جان تو دے سکتا تھا مگر میں کچھ بھی نہ کر سکا اور ڈھلوں صاحب وہاں سے بغلیں جھانکتے واپس آ گئے تھے۔ وہ یہ بھی معلوم نہ کر سکے کہ کس کے اشارے اور کس کی اجازت سے پولیس نے آپی کو یوں اتنی آسانی سے کسی کے حوالے کر دیا تھا۔ حالانکہ سب سے اہم سوال یہی تھا۔ مگر جس بے پروائی کا ڈھلوں صاحب نے آپی کے سلسلے میں مظاہرہ کیا تھا اس کی وجہ سے ان کی طرف سے میرا دل کھٹا ہو گیا تھا۔ آدمی کو اپنی نفسیاتی الجھنوں کا علم نہیں ہو پاتا مگر اب میرا خیال ہے کہ اس شام جو میں ڈھلوں صاحب کو یوں ہسپتال میں مرگ و زیست کے درمیان معلق چھوڑ آیا تھا تو اس کی وجہ آپی کی طرف سے ان کا وہ اغماض بھی تھا۔ اگر ان کا کوئی اپنا آدمی یوں پھنس جاتا تو شاید وہ کبھی ایسا نہ کرتے۔

جب میں کراچی کے لیے ہوائی جہاز میں جا بیٹھا تو مجھے یوں لگتا تھا جیسے میں بکھر جاؤں گا۔ آپی سے میرا کوئی خونی رشتہ نہیں تھا مگر میرے محسوسات میں قیامت مچی تھی۔ اس کے بغیر مجھے ہر سو تیرگی ہی تیرگی نظر آتی تھی۔ وہ بہت اونچا اڑنے والا وہ میرے پسینے پر خون گرانے والا میرا دوست، میرا بھائی، میرا محسن آپی خدا جانے کن اذیتوں سے گزر چکا تھا۔ اور میں اس کی مدد کے لیے اسلحہ لینے لاہور آیا تھا۔ ایسی حالت میں کہ وہ ہر طرف سے دشمن کے تیروں میں گھرا تھا میرے جیسا بھی کوئی مورکھ کہاں ہو گا۔

کراچی پہنچتے ہی میں نے مردان شاہ کے ہوٹل کا رخ کیا۔ مجھے یقین تھا کہ اس سے مجھے مناسب رہنمائی مل سکے گی — مگر وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ ہوٹل اپنے ملازم کے حوالے کر کے رمضان کی وجہ سے گاؤں چلا گیا ہے۔ وہاں سے نکل کر میں اسی بازار کی ایک دکان میں فردوسی بیگم کے فلیٹ پر فون کرنے کے لیے جا گھسا۔ کراچی شہر کی خوبی یہ ہے کہ وہاں رات بھی اتنی ہی رواں دواں رہتی ہے جتنا دن۔ رمضان نے اس شہر کے معمولات میں کچھ فرق ڈال دیا تھا۔ پھر بھی رت جگا وہاں کے لوگوں کو بہت مرغوب ہے۔ ان کے کاروباری مرکزوں اور ان کے جسموں کا حال اس ٹیکسی ایسا ہے جسے دن کو کوئی اور ڈرائیور چلاتا ہے اور رات کو کوئی اور —

دوسری طرف سے ریسیور فردوسی بیگم نے ہی اٹھایا۔ اس وقت رات کے گیارہ بجے تھے اور وہ ابھی تک جاگ رہی تھی

"میں تکریم کا دوست ہاشم بول رہا ہوں۔"

"اچھا؟ تو یہ آپ ہیں۔ کہاں سے بول رہے ہیں؟"

"لاہور سے۔ تکریم صاحب کہاں ہیں؟" میں نے آواز دبلتے ہوئے کہا۔ دکاندار کو متوجہ کیے بغیر میں نے جھوٹ بول دیا تھا۔

"وہ تو لاہور چلے گئے۔ بیچارے بہت پریشان ہوئے۔ ملے نہیں آپ کو؟"

"جی نہیں۔ مجھے اُن کا پتہ ہی معلوم نہیں۔"

"میں پتہ بتا دیتی ہوں آپ اُن سے مل لیں۔"

"مل لوں گا مگر ابھی میرا ایک آدمی آپ کے پاس آئے گا اُسے آپ کے ہاں ٹھہرنے کو جگہ مل جائے گی؟ گھر میں کون کون ہے؟"

"میں ہی ہوں، اور کون ہو سکتا ہے۔ مگر کسی اجنبی کو۔۔۔"

وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"مجھے بتائیں کہ صورتِ حال کچھ بہتر ہوئی کہ نہیں؟"

"تکریم صاحب واپس گئے تو اس کے بعد مجھے کسی نے کچھ نہیں بتایا۔" فردوسی کا لہجہ بہت ہی محتاط تھا۔

"ٹھیک ہے صبح میں خود آپ کے پاس پہنچ رہا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔ اور دکان سے نکلتے ہی میں ٹیکسی میں جا بیٹھا۔ مجھے اس وقت فردوسی بیگم سے مل ہی لینا چاہیے تھا۔ اس سے مجھے بہت کچھ معلوم ہو سکتا تھا۔

جیسے ہی میں نے فلیٹ کے دروازے پر دستک دی۔ اس کی اندر کی چٹخنی فوراً ہی نیچے گر گئی۔ سامنے فردوسی بیگم کھڑی تھی، اپنی تمام تر پُروقار شخصیت کا سحر بکھیرتی ہوئی وہ مسکرا دی۔

"میں آپ کی منتظر تھی۔" وہ مجھے راستہ دیتے ہوئے ایک طرف ہٹ گئی۔

"کیا؟ یعنی آپ کو یقین تھا کہ۔۔۔" میں نے فلیٹ کے اندر قدم دھرتے ہوئے کہا۔

"ہاں! آپ کی آواز یہی بتا رہی تھی کہ آپ لاہور سے نہیں کراچی سے ہی بول رہے ہیں۔"

"میرے بارے میں اتنا کچھ معلوم ہونے کے باوجود آپ کی جبیں پر شکن تک نظر نہیں آتی۔"

اس نے اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے اپنی اُس رانا فشا خوبصورت ساڑھی کا پلو سر پر لیتے ہوئے مجھے یُوں آنکھیں پُوری طرح کھول کر دیکھا جیسے کوئی گلی میں شور سن کر ایک دم دروازے سے باہر نکل کر دیکھے کہ ہوا کیا ہے۔

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔ کیا خیال ہے مجھے آپ کے لیے دروازہ نہیں کھولنا چاہیے تھا؟"

"دیکھیں نا! ہماری وجہ سے تکریم احمد صاحب کو اتنی زحمت اٹھانی پڑی، حوالات تک کا منہ دیکھ لیا، پھر بھی۔۔۔"

"آپ پریشان نہ ہوں مجھے تکریم صاحب نے آپ کے بارے میں بہت کچھ بتایا ہے۔ وہ کتنا بھی خوفناک کیوں نہ ہو، میں آپ کے لیے دروازہ بند نہیں رکھ سکتی۔ مجھے یقین ہے آپ بہت اچھے آدمی ہیں بہت ہی اچھے۔" یہ کہتی ہوئی وہ مجھے سیدھی اپنی خوابگاہ میں لے گئی۔ بولی "بیٹھیں۔ آپ بہت تھکے ہوئے نظر آتے ہیں، کوئی کپڑے لائے ہیں اس بریف کیس میں کہ میری ساڑھی باندھنی پڑے گی آپ کو۔"

وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ کمال اس کی شخصیت کا یہ تھا کہ وہ اپنی تزئین و آرائش کے بغیر، انتہائی سادگی میں بھی بیحد سجی سنوری نظر آتی تھی۔ میرے دل میں پہلے ہی روز سے اس کے لیے احترام کا جو جذبہ ابھرا تھا اُس روز اُس کی بے ساختگی نے اس میں اور اضافہ کر دیا تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں اس سے بہت زیادہ مرعوب تھا۔ اتنا مرعوب کہ اس کو دیکھ کر ہر بار میرے ذہن میں کسی بڑی صاحبِ امر خاتون کا تصوّر اُبھرتا تھا۔ وہ دلوں پر ہی نہیں ذہنوں پر بھی حکمرانی کرنے کی سکت رکھتی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ فرم کا مینجر بھی اس کا اتنا ہی مطیع و فرمانبردار بلکہ گرویدہ تھا کہ اس نے فردوسی بیگم کو ہر آسائش مہیا کر رکھی تھی اور تکریم احمد اس کا نام لے کر جیتا تھا۔

"میرے پاس کپڑے موجود ہیں، میں بدل لوں گا آپ آرام کریں میں دوسرے کمرے میں لیٹ جاؤں گا آدھی رات ہو گئی ہے۔"

"میں آپ کے لیے کھانا نکالتی ہوں۔ پلاؤ پکایا تھا میں نے آج۔ کچھ شوربا بھی رکھا ہے۔"

"یہ نیک کام تو کر ہی لیں۔ مجھے واقعی بڑی بھوک لگی ہے۔"

یہ کہہ کر میں اُس کے نرم نرم بستر پر لیٹ گیا۔ اس بستر میں آسودگی تھی، راحت تھی۔ ایک صندلی بدن کی مہک اور ایک مہربان چھت کا خنک سایہ تھا مگر وہ بستر میرا تھا نہ چھت۔

میں نے اپنی شیروانی اتاری اور قمیص کی آستین اوپر اٹھا کر غسل خانے میں جا گھسا۔ مگر وہ صاف شفاف غسل خانہ اپنے تمام خوبصورت اور پُرآسائش ساز و سامان سمیت کچھ اور کہہ رہا تھا۔ میں کپڑے اتار کر نل کے نیچے بیٹھ گیا۔ جب میں نہا کر تولیہ استعمال کر چکا تو مجھے خوابگاہ میں فردوسی بیگم کے قدموں کی آہٹ سنائی دے رہی تھی۔

"یہ میرا بریف کیس مجھے دے دیں میں نہا چکا ہوں کپڑے بدل لوں گا۔"

اس نے غسل خانے کا پٹ ذرا سا پیچھے دھکیل کر بریف کیس مجھے تھما دیا مگر اس کے دستے پر رکھا اس کا ہاتھ میرے ہاتھ سے

چھو گیا۔ وہ لمس مجھے یہ بتا گیا کہ فردوسی بیگم اگر کسی جاں بلب مریض پر بھی مہربان ہو جائے تو وہ اللہ اللہ کرتا ہوا اُٹھ بیٹھے گا۔

میں کپڑے بدل کر خواب گاہ میں داخل ہوا تو اس نے بستر کے سامنے تپائی پر کھانا لگا رکھا تھا۔ "کھانا، بستر اور گھر بہت بڑی نعمتیں ہیں۔ ایسی کہ آدمی ان کا شکر ادا ہی نہیں کر سکتا۔"

خدا جانے یہ بات میں نے کس لہجے میں کہی، وہ کچھ افسردہ سی ہو گئی بولی "کیا واقعی؟"

"ہاں! فردوسی بیگم! جو آدمی ان سے محروم ہے اس کی بدنصیبی کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہیں۔ جب میدانِ جنگ میں توپیں موت اُگلتی ہیں، گولیاں جوانوں کے سینے تلاش کرتی ہیں اور ایسے کربناک لمحوں میں سپاہی چمنیوں سے نکلتے دھوئیں، سُلگتے چولھوں، نرم گرم بستروں اور بیویوں کی لچکتی شاخوں ایسی بانہوں کے تصور میں کھوئے کھوئے موت کو گلے لگا لیتے ہیں۔ ایسے میں مرنا انھیں بہت آسان لگتا ہے۔"

"آپ فوج میں رہ چکے ہیں؟" وہ میرے سامنے کرسی پر بیٹھ کر بولی۔

"نہیں۔ مگر مجھے معلوم ہے کہ وہاں جوان کیونکر ہنسی خوشی جان دے دیتے ہوں گے۔"

"کھانا کھائیں۔ ایسی ایسی غمناک باتیں نہ سوچا کریں آپ پہلے ہی بہت دکھی ہیں۔"

"یہ۔۔۔ یہ آپ کیسے کہہ سکتی ہیں تکریم احمد نے بتایا ہوگا؟"

"نہیں! میرا اندازہ ہے آپ کو پہلی بار دیکھ کر مجھے یہی محسوس ہوا تھا۔"

"ہاں۔ اندر کا دُکھ شاید آدمی کے چہرے پر رقم ہونے لگتا ہے ورنہ میں تو خوش رہنے کی بہت کوشش کرتا ہوں۔"

"آپ کے دوست کہاں ہیں وہ پیرزادہ صاحب؟"

"آپ کو نہیں معلوم؟" میں نے لقمہ منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ مگر سنا تھا کہ انھیں ضمانت پر رہا کر دیا گیا ہے، آپ کے پاس نہیں پہنچے تھے وہ؟"

"نہیں مگر یہ بتائیں کہ اس کی ضمانت کس نے دی تھی؟"

"میں نے معلوم کیا تھا کوئی ظہیر صاحب تھے۔ انھوں نے ضمانت دی تھی اُن کی۔"

"ہاں! سُنا تو میں نے بھی یہی ہے مگر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ ظہیر صاحب تھے کون۔ سُنا ہے وہ کوئی جعلی آدمی تھا اس نے پولیس کو اپنا پتہ بھی غلط بتایا۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کہیں رشوت چلی ہو گی، بلی رشوت۔ آپ کے دوست کے پاس مال بھی تو بہت ہے تکریم صاحب بتا رہے تھے کہ پچھتر لاکھ روپیہ اُن کے حساب میں جمع ہے۔"

"ہاں۔ مگر۔۔۔ مگر مجھے یقین ہے کہ وہ روپیہ اُس کے کسی کام نہ آیا ہوگا۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اگر اپنے پلے سے انھوں نے رقم خرچ نہیں کی تو دوسرا کون کر سکتا تھا۔ کوئی بلاوجہ کسی کی ضمانت دیتا ہے بھلا؟" وہ کچھ حیران سی نظر آنے لگی تھی۔

"بات یہ ہے فردوسی بیگم کہ میرے دوست کی ضمانت اُس کی بدنصیبی نے دی ہو گی۔ اس کو کچھ اور زخم لگانے کے لیے۔ پیرزادہ اس شہر کے ہجوم میں گم ہو گیا ہے اور۔۔۔ اور میں اُس کی تلاش میں لاہور سے واپس آیا ہوں۔"

"کمال ہے۔ انھیں رہا ہونے کے بعد فوراً آپ سے رابطہ قائم کرنا چاہیے تھا۔ وہ یہاں بھی نہیں آئے۔"

"میرا خیال ہے کہ اسے ڈاکٹر دھمن نے اپنے آہنی پنجے میں لے لیا ہے۔"

"کون ہیں یہ ڈاکٹر دھمن۔ میں نے ان کا نام پہلی بار سُنا ہے۔"

"تکریم صاحب نے آپ کو کچھ نہیں بتایا؟"

"نہیں تو۔ مگر یہ ہیں کون؟"

"ابھی بتاتا ہوں۔ میں اپنے نصیب کے لقمے اُس کا نام لے کر زہریلے نہیں بنانا چاہتا۔"

وہ بھی چپ ہو گئی اور میں بھی۔ کھانا مختصر تھا مگر بے حد لذیذ۔ میں نے اُس سے نمٹ کر کُلی کی اور پھر تولیے سے مُنہ پونچھتا ہوا بستر پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ فردوسی بیگم نے میرے سامنے سگریٹ، ماچس اور راکھ دان رکھ دیے۔ اپنے بستر پر میری موجودگی اسے بُری نہیں لگ رہی تھی۔ وہ خوش تھی کہ میں اُس کے سامنے ہوں۔ اس نے کمرے سے سب چیزیں اٹھا کر باورچی خانے میں رکھیں اور پھر پنکھے کی رفتار تیز کر کے وہ میرے سامنے پلنگ پر یوں بیٹھ گئی جیسے میرا اس کا ازل ابد کا ساتھ ہے۔ اس کی وہ پُرخلوص بے تکلفی مجھے بھلی لگتی تھی۔ وہ خود کو چھوئی موئی ایسی ظاہر نہیں کر رہی تھی۔

کھانے سے فارغ ہو کر میں نے اُسے سب کچھ بتا دیا۔ وہ بھی جو اُسے نہیں بتانا چاہیے تھا۔ وہ بڑی خاموشی سے میری بات سنتی رہی۔ اسے احساس تھا کہ میں اُس کے سامنے جھوٹ نہیں بول سکتا ہوں۔

جیسے ہی میں خاموش ہوا تو وہ میرے سامنے سے اٹھ گئی۔ بولی "میں۔۔۔ میرا خیال ہے کہ میں اپنے مینجنگ ڈائرکٹر سے بات کرتی ہوں۔"

"جی نہیں! اُسے بتلانے کی ضرورت نہیں ہے، دیکھنا یہ ہے کہ وہ آدمی کون تھا۔ ہمیں بہرحال اس تک پہنچنا ہو گا مگر آپ پریشان نہ ہوں، میں خود اُس آدمی کا پتہ لگا لوں گا۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔۔۔ مگر۔۔۔"

"بس آپ فکر نہ کریں۔ مجھے تو یہ رات کسی نہ کسی جگہ گزارنی ہی تھی، یہاں گزر گئی تو اور بھی اچھا ہوا۔ آپ بس یہ رات کسی جگہ مجھے گزارنے کی مہلت دیں۔ صبح میں خود اُن کو دیکھ لوں گا۔"

وہ میرے چہرے پر پھیلی بے کراں بے بسی کو دیکھ کر بڑی حیرت سے بولی "ٹھیک ہے صاحب! مجھے کچھ کہنے کا حق تو نہیں ہے چلیں میں آپ کو دوسرے کمرے میں پہنچا دیتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ میرے ساتھ اٹھی اور مجھے دوسرے کمرے میں پہنچا کر بولی "اگر آپ کو کسی شے کی ضرورت ہو تو مجھے بُلا لیں --- اچھا خدا حافظ۔" یہ کہہ کر وہ بڑی خاموشی سے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

اِس کمرے میں رات گزارنے کا سارا ہی سامان موجود تھا۔ پلنگ تھا، بستر تھا۔ دائیں ہاتھ پہ عمدہ قسم کی خوبصورت میز تھی۔ سامنے ایک خوبصورت الماری تھی جس میں ایک سے ایک عمدہ کتاب پڑی تھی۔ یہ سب کچھ اس بات کا مظہر تھا کہ وہ کمرہ اس عزہ خانم کا اسٹڈی رُوم ہے۔ لیکن میں --- میں اپنے وجود میں آہستہ آہستہ ختم ہوتا جا رہا تھا۔ کیفیت یہ تھی کہ مجھے آبی سے دُور رہ کر عجیب سا خوف آتا تھا۔ ٹھہر ٹھہر میرے دل میں یہ احساس ابھرتا تھا کہ زندگی ہار گئی ہے بالکل ہار گئی ہے۔ کوئی تو صورت ایسی ہوتی کہ میں آبی سے مل سکتا۔ مگر نہیں --- کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔

صبح چار بجے میں بستر سے اٹھ گیا۔ بڑی خاموشی سے اُس کمرے کو بند کیا اور چُپ چاپ وہاں سے باہر نکل آیا۔ مجھے اُس عزہ خانم سے کچھ نہیں کہنا تھا۔ میں کہتا بھی تو کیا کہتا۔ مجھے تو بہرحال وہاں سے نکل جانا چاہیے تھا۔ میں اس کے گھر سے باہر نکلا تو میرے ذہن میں ظہیر کا نام تھا۔ مجھے اس سے بہرحال ملنا تھا۔ مگر ظہیر کا گھر مجھے کہاں مل سکتا تھا۔ کوئی صورت ایسی نظر نہیں آتی تھی کہ میں اس سے جا ملتا۔

میں نے طارق روڈ سے نکل کر بہت آہستگی سے چاروں طرف دیکھا۔ دکانیں بند تھیں اور اکّا دُکّا آدمی اِدھر اُدھر نکلتے نظر آتے تھے۔ میں چند قدم آگے نکلا تو مجھے ایک ٹیکسی مل گئی وہ میں نے اپنے لیے روک لی۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر میں پریشان ہو گیا۔ اسے میں کہاں کا بتاؤں کیا کہوں میں اسے؟ اچانک مجھے ڈاکٹر ترمذی یاد آ گیا اور میں نے اسے ڈاکٹر ترمذی کا پتہ بتا دیا۔ وہ زیادہ بہتر تھا۔ مجھے کسی نہ کسی جگہ کا پتہ تو ملنا ہی چاہیے تھا۔ میں نے ڈاکٹر ترمذی کا پتہ اسے بتایا تو وہ آگے چل دیا۔ زندگی ایک عجیب عذاب میں آ گئی تھی۔ میں اس کوشش میں تھا کہ میں زندگی کو گزار لوں مگر زندگی مجھے گزارنے کا حکم دے رہی تھی۔ میں خود کو بہت سہما ہوا سمجھ رہا تھا مگر زندگی مجھ سے زیادہ سہمی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ وقت نے ہمارے درمیان بہت بڑا فاصلہ دے رکھا تھا۔ ایسا فاصلہ جس نے ہر شے کو ہم سے دُور کر دیا تھا۔

ٹیکسی آہستہ آہستہ منزل کی طرف بڑھنے لگی۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ کراچی جاگ اٹھی ہے۔ اُس میں وہ دن کو نظر آنے والی زندگی ابھی سے جاگ اٹھی تھی۔ اُس کے بازار ہرے بھرے اور اس کے چوراستے صاف ستھرے نظر آتے تھے۔ لگتا تھا زندگی کسی پہر وہاں کبھی نہیں سوتی ہے۔ ڈاکٹر ترمذی کا گھر وہاں سے کچھ زیادہ دور نہیں تھا۔ مگر وہ آدمی مجھے بہت ٹیڑھے میڑھے راستے سے لے کر گیا اور کوشش اس نے یہی کی کہ راستے کا کرایہ زیادہ بنے۔ مگر میں نے بھی اسے طرح دے دی اور کرایہ جو بنا اس سے زیادہ ہی دے دیا۔ وہ خوش ہو کر آگے بڑھا تو میں نے گرد و پیش پر نظر ڈالی۔ بہت ہی خوش کن آبادی تھی وہ۔ ایسی کہ آدمی بس دیکھتا ہی رہ جائے۔ میں نے ادگرد اچھی طرح دیکھ کر اس خوبصورت بنگلے پر انگلی رکھ ہی دی تھی کہ مجھے ایک عجیب طرح کا احساس ہوا۔ مجھے کسی گھر میں پہلی بار دروازے پر لگی گھنٹی کو دبانا نہیں دینا چاہیے تھا۔ دن اس وقت بس طلوع ہو رہا تھا۔ اور ابھی کوئی دم میں زندگی اپنی آسائشوں سے باہر آ جائے گی۔ مجھے معلوم ہونا چاہیے تھا کہ ڈاکٹر ترمذی گھر پر ہے۔ مگر یہ بات میں فوراً کیسے معلوم کر سکتا تھا۔ دن کو اجالے میں شامل ہو جانا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ مجھ سے وہ گھنٹی دوبارہ نہ دبائی جا سکے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی کسی ایک جگہ گھنٹی بجا کر دوبارہ اسے اس طرح دبا نہیں سکتا ہے مجھے کسی نہ کسی طرح اطمینان کر لینا چاہیے تھا۔ میں --- میں کسی جگہ بیٹھ کر سوچ سکتا تھا۔ دو گھڑی آرام سے بیٹھ کر یہ معلوم کر سکتا تھا کہ اندر کون کون ہے۔ ڈاکٹر ترمذی کی بیوی، اس کی بہن، اس کی بیٹی، کوئی بھی ہو سکتا تھا۔ ایک اردلی، ایک چوکیدار اور کیا کیا کچھ۔

میں پیچھے ہٹ گیا۔ ایک بڑا سا قطعۂ زمین میرے سامنے موجود تھا۔ اس کے عین بیچ میں میں ایک جگہ دوہرا ہو کر بیٹھ گیا۔ مجھے ہر شے سے اپنا وجود بچانا تھا۔ مگر کیا میں ایسا کر سکتا تھا؟ نہیں نہیں --- یہ نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے بہرحال وہاں بیٹھ کر یہ معلوم کرنا چاہیے تھا کہ اُدھر کیا ہے' اُدھر جہاں ترمذی رہتا ہے۔ میں کتنی ہی دیر وہاں بیٹھا یہ سوچتا رہا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ بہت آہستہ آہستہ مجھ پر یہ حقیقت کھلی کہ اب کی بار میں ڈاکٹر ترمذی سے کوئی بات آسانی سے معلوم نہیں کر سکتا ہوں۔

مسئلہ تو یہ تھا کہ اسے جب تک وہ سامنے نہ آ جائے، کوئی بات صحیح نہیں بتانی ہو گی۔ دن آہستہ آہستہ اُوپر اچھل رہا تھا۔ اندھیرے پر اجالا غالب آتا جا رہا تھا۔ کوئی دم جاتا تھا کہ اجالا ہی اجالا چار سو ہو گا۔ اور میں یہی چاہتا تھا۔ مجھے یہی معلوم ہونا چاہیے تھا کہ اجالا ہو گیا ہے۔ ایک اجالا تو آدمی کے اندر ہوتا ہے مگر میں اس کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ میں --- میں اُس اجالے کی بات کر رہا ہوں جو سامنے ہوتا ہے جو درمیان میں دوہری دھار کی تلوار ایسا تنا رہتا ہے جو موجود ہوتا ہے اس اجالے کی بات کیسے کر سکتا ہوں جو میرے دل میں کبھی تھا اور اب نہیں ہے ہمیشہ کے لیے نہیں ہے --- میں

اِس کی بات نہیں کرتا ہوں۔ اس کو تو میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے موت کے اتھاہ اندھیرے میں غائب کر چکا ہوں۔ مجھے یہ معلوم ہوتا تھا میں --- میں دراصل اپنی موت آپ بن چکا تھا۔ اور مجھے اپنے چاروں طرف بھی اندھیرا ہی نظر آتا تھا۔ ہاں مگر وہ اجالا جو درمیان میں تلوار ایسا تنا رہتا ہے وہ مجھے احساس دلاتا تھا کہ زندگی ابھی اس قابل ہے کہ اسے جی کر گزار دیا جائے۔ بارش جب زمین پر برستی ہے تو مجھے یہ احساس ہوتا تھا کہ زندگی پر ابھی فطرت مہربان ہے۔ ابھی بے شمار پودے اس زمین پر ایسے ہیں جو اُگنے کے لیے زمین کے نیچے بل کھا کر بیٹھے ہیں۔ کچھ ایسی ہی کیفیت تھی میری، اور میں اس سے سمجھوتہ کر رہا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد زندگی اجالے میں نہا گئی۔ یوں جیسے اندھیرے کو اجالے نے نگل لیا ہے۔ میں اپنی جگہ سے اُٹھا اور کچھ سوچ کر اس بنگلے کی طرف بڑھا۔ انگلیاں میری فگار تھیں، بالکل فگار۔ میں دراصل بہت زیادہ پریشان تھا۔ اتنا کہ مجھے اپنا وجود بھی صحیح سالم حالت میں نظر نہیں آتا تھا۔ دوست کا غم کوئی ایسا غم نہیں تھا کہ میں اسے بھول سکتا۔ ناممکن تھا۔ کسی نہ کسی طرح مجھے اپنا سارا وجود بے معنی نظر آتا تھا اس لیے میں دوست کے بغیر زندہ تھا اور بہت ہی شرمندہ تھا اتنا کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔

میں نے آگے بڑھ کر گیٹ کی اطلاعی گھنٹی بجا دی --- مگر یُوں کہ مجھے اپنا سارا وجود ہلتا نظر آیا۔ اور پھر --- پھر کچھ ہی دیر بعد ایک آدمی تیزی سے باہر آیا۔ وہ گھاس کی مٹی سے ذرا ہٹ کر ایک سبز رنگ کی کائی پر چلتا ہوا گیٹ تک آیا تھا۔ اُس نے گیٹ کی دائیں ہاتھ کی چرخی گھما دی۔ اس کے ساتھ ہی سامنے ایک چھوٹا سا گیٹ کھل گیا اور وہ آدمی سامنے آ گیا۔

"کیا بات ہے جناب؟"

"جی مجھے ڈاکٹر ترمذی سے ملنا ہے۔"

"فرمایئے کیا کام ہے آپ کو؟"

"دیکھیں میرا نام افضل خان ہے اور میں اُن سے ایک بہت اہم معاملے میں ملنا چاہتا ہوں۔ دراصل مجھے ایک جگہ اپنا تبادلہ کروانا ہے اس لیے میں اُن سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"ہوں۔ ٹھیک ہے۔ پر دیکھیں نا یہ تو دفتری معاملہ ہے۔"

"جی ہاں! بجا فرمایا آپ نے۔ مگر میں اُن سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں، بڑی مہربانی ہو گی آپ کی، یہ --- یہ لیں اپنی فیس۔" میں نے اپنی جیب سے نکال کر اس کے سامنے دو سو روپے رکھ دیے۔

وہ کچھ خوش سا ہو گیا، بولا "ٹھیک ہے جناب آپ اندر آ جائیں میں اُن سے کہتا ہوں، ابھی وہ اُٹھے ہی ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے مجھے اپنے ساتھ اندر بُلا لیا اور گیٹ بند کر دیا۔ پھر وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر ایک کمرے میں جا پہنچا، بولا "آپ یہاں بیٹھیں وہ تیار ہوتے ہیں تو میں آپ کو بلوا دیتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ مجھے کمرے میں چھوڑ کر باہر نکل گیا۔ کمرہ چھوٹا سا تھا مگر وہاں ہر شے قرینے سے سجی ہوئی تھی۔ کرسیاں میز صوفے اور دوسری چیزیں بہت عمدگی سے سجائی گئی تھیں۔ میں کافی دیر وہاں بیٹھا سوچتا رہا کہ میں اس ڈاکٹر ترمذی سے کیا بات کہوں گا مگر میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ مجھے جو کچھ کہنا ہے اسے دیکھ کر کہوں گا وہ کیسے یقین کرے گا کہ میں پھر وہاں آ پہنچا ہوں۔ وہ کیسے اس بات پر یقین کرے گا کہ میں اس کے پیچھے اس کے گھر آ گیا ہوں۔ اس کو مجھے سمجھنے میں کچھ دیر تو لگے گی اور میں اسے اس وقت ہی دبوچ لوں گا۔ اُف نہیں کرنے دوں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ یہ میرے دوست کا معاملہ ہے میرے ہم راز، میرے سب سے بڑے محسن کا۔ میں اسے کیسے ان کے حوالے کر کے دم لے سکتا ہوں۔ اس کے لیے تو میں اپنی ساری زندگی حرام کر لوں تو یہ بات اس سے کہیں زیادہ بہتر ہو گی کہ وہ ایک پل اُن کے لیے اُن کی رضا سے بے چین رہے۔

میں نے وہاں بیٹھ کر بہت سگریٹ پیے' اتنے کہ میرے سامنے راکھ دان بھی سیاہ ہو گیا۔ میری اپنی زبان بھی کھلکھلانے لگی۔ کوئی اتنا زہر اپنے وجود میں برداشت کر سکتا ہے؟ مگر نہیں میں بس وہ سگریٹ پیتا رہا اور سوچتا رہا۔ مجھے بہرحال اس ڈاکٹر ترمذی سے کوئی بات تو ایسی کرنی ہو گی جس سے وہ معاملے کو صحیح طور پر سمجھ کر سچ سچ بتا دے کہ آبی کے ساتھ معاملہ کیا ہوا ہے۔ مجھے یہی کرنا ہو گا۔ سگریٹ کے ساتھ ساتھ مجھے وہاں کئی قسم کے رسالے بھی مل گئے وہ میں دیکھتا رہا سوچتا رہا۔

کوئی پون گھنٹے بعد اس کمرے کا دروازہ کھلا اور اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر ترمذی کا چہرہ میری طرف اُٹھا۔ اُف میرے خدایا۔ وہ اس کا چہرہ --- میں اس کی کیفیت نہیں بھول سکا ہوں۔ بہت سے چہرے میں نے دیکھے، اچھے بھی اور بُرے بھی۔ اس نے مجھے دیکھا اور پیچھے ہٹنے لگا مگر میں نے فوراً ہی اُٹھ کر اس کے گلے کو اپنی گرفت میں لے لیا اور دائیں ہاتھ سے میں نے اپنا پستول نکال لیا۔

"یہ بے آواز چلتا ہے ڈاکٹر ترمذی! معاملے کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ اور --- اور مجھے بتاؤ کہ میرا دوست آبی کہاں ہے؟"

وہ میرے ہاتھ میں آ کے وحشی کی طرح پیچھے کو لپکا۔ مگر میں نے اُسے اٹھا کر پیچھے پھینک دیا۔ دروازہ میں نے اندر سے بند کر لیا۔ جیسے ہی وہ زمین پر گرا میں نے پستول اس کے سینے سے لگا دیا "سوچنے سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے مجھے بتاؤ آبی کہاں ہے؟"

وہ مجھے یوں دیکھ رہا تھا جیسے اس کو اپنے وجود کے جلتے بجھتے کھڑکتے نظر آتے ہوں۔ اس کو دیکھ کر مجھے یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ بہت پریشان ہے۔ وہ ذرا دیر کے لیے اٹھا اور اٹھ کر آرام کرسی پر بیٹھ گیا، بولا "کیا چاہتے ہو تم؟"

"میں آپ سے صرف آبی کا پتہ پوچھتا ہوں مجھے ہر حال میں آبی کا پتہ چاہیے۔" میں نے اس کے بدن کو آڑ میں لیتے ہوئے کہا۔ میں جانتا تھا اس پر کوئی دم جاتا ہے کہ وہ جان دے دے گا۔ عہد اس نے یہی کر رکھا تھا مگر وہ جان دینے کا عہد بالکل ہی بیکار چلا گیا۔ کوئی یوں ہی جان تو نہیں دے دیتا، بالکل بھی نہیں۔

"مجھے تو یہی معلوم ہے کہ آبی کو ایک شخص ظہیر نامی پولیس سے چھڑا کر لے گیا تھا۔"

"مگر وہ تھا کون؟ میں آپ سے یہی معلوم کرنا چاہتا ہوں، مجھے بتائیں کہ وہ کون تھا؟"

"مجھے یہ معلوم ہوا تھا کہ وہ ناظم آباد میں رہتا ہے۔ کوٹھی اس نے وہاں بنا رکھی ہے اور وہ اس شہر کا بہت کارآمد آدمی ہے۔"

"مجھے اس کا پتہ معلوم ہونا چاہیے۔"

"پتہ اس کا یہ ہے۔" یہ کہہ کر ڈاکٹر ترمذی نے مجھے ظہیر کا پتہ بتا دیا۔ "دفتر اس کا صدر بازار میں ہے فون نمبر آپ کو میں لکھے دیتا ہوں۔"

"ہوں — یہ بات درست نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ وہ کہاں ہے، آپ میرے ساتھ چلیے۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔ ایسا کبھی نہیں ہو گا۔"

"آپ بھول رہے ہیں ڈاکٹر ترمذی! میں آدمی کی جان نکال لیتا ہوں۔ مجھے بتاؤ وہ کہاں ہے میرا دوست آبی؟"

"میں نے پتہ بتا دیا ہے۔"

"ہوں۔ ٹھیک ہے میرے ساتھ فون تک چلیں۔ میں اُن سے بات کر لیتا ہوں۔"

"ہاں! یہ بات میں یہاں کسی سے کہہ کر معلوم کر لیتا ہوں۔ مجھے بات کرنے کی اجازت دیں۔"

"ہاں۔ مگر معاملہ پھر وہیں ہے۔ یہ پستول دیکھتے ہیں نا آپ! بہت گڑبڑ ہو گی۔"

"ہاں مجھے معلوم ہے آپ خود کسی کو آواز دیں۔"

"ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر میں نے اُسے پستول کے ساتھ اوپر اُٹھایا اور ساتھ لے کر دروازے کے پاس جا ٹھہرا۔ وہ اس حال میں تھا کہ مجھے ایک دم الٹا کر آگے جا سکتا تھا مگر میں نے کوشش یہی کی کہ وہ دروازے کے پٹ کے پیچھے رہے میرے لیے یہی بہتر تھا۔ سامنے سے ایک گنجا آدمی گزرا۔ وہ غالباً اس کا کوئی اندر کا آدمی تھا۔ میں نے اس کو مخاطب کر کے کہا "ذرا فون ادھر لے آؤ۔ ڈاکٹر صاحب بات کریں گے۔ ہاں جلدی لے آؤ۔" میں نے اسے ذرا اکسایا۔ وہ فوراً ہی پیچھے مڑ گیا۔ کوئی پانچ منٹ بعد وہ واپس آیا تو اس نے فون اٹھا رکھا تھا۔ میں نے دروازہ کھول کر اُس میں سے فون کو اندر لے لیا۔ ڈاکٹر ترمذی اُس لمحے پٹ کے پیچھے ہی رہ گیا۔ اور دروازہ اندر سے بند ہو گیا۔

"ہاں ڈاکٹر! اب اس پر وہ نمبر ڈائل کر دو۔"

اُس نے انکار کر دیا۔ وہ ایسا ہرگز نہیں چاہتا تھا معلوم یہ ہوتا تھا کہ اس کو دُوسری طرف سے فون ملنے پر عجیب طرح کی پریشانی لاحق ہو گی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ کن حالات میں وہاں فون کر رہا ہے۔

"ٹھیک ہے ڈاکٹر! بیٹھ جاؤ میں اُس سے خود بات کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے اس کو سامنے بٹھایا اور پستول اس کی طرف اٹھا کر میں نے فون ایک ہاتھ سے گھُما دیا۔ دوسری طرف سے بات ہوئی۔ کوئی عورت بول رہی تھی۔

"یہاں ظہیر صاحب رہتے ہیں؟"

"ہاں — وہ یہاں ہی ہیں کون صاحب ہیں آپ؟"

"جی میں اُن کا دوست افضل خان بول رہا ہوں۔ ذرا اُن کو فون دیں۔"

وہ فون چھوڑ کر دوسری طرف چلی گئی۔ کچھ ہی دیر بعد دوسری طرف سے فون پر بات ہوئی ظہیر صاحب تھے۔ "کیا حال ہیں حضور!"

"میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔"

"میں ڈاکٹر دھمن کا دوست ہوں افضل خان۔ وہ آبی کہاں ہے اس وقت؟"

"اوہ! تو یہ بات ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔ مجھے کیا پتہ کون ہے، وہ اور ڈاکٹر دھمن کا مجھ سے کیا تعلق ہے؟"

"ہوں، ٹھیک۔ میں آج ہی آپ سے ملتا ہوں بہت مزے کے آدمی ہیں آپ۔ مگر سوال یہ ہے کہ آپ کس چیز سے رام ہوتے ہیں؟"

"شٹ اپ۔ میں کسی ڈاکٹر دھمن کو نہیں جانتا۔ حد ہو گئی۔ کمال ہے۔" یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

"تو یہ بات ہے۔ ٹھیک ہے ڈاکٹر ترمذی! مجھے افسوس ہے کہ آپ کو میرے ساتھ چلنا ہو گا۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ ناممکن ہے۔"

"تم — تم یوں نہیں مانو گے۔" میں نے اپنا پستول پیچھے ہٹا کر اپنے بائیں ہاتھ کا انگوٹھا اس کے گلے پر رکھا۔ اور ---- اور وہ اسی وقت ختم ہو گیا۔ دوسری بار اُس نے نہیں کی ہی نہیں۔ یہی بہتر تھا۔ مجھے اس کو وہیں ختم کر دینا چاہیے تھا۔ وہ اسی قابل تھا۔ فون میں نے اسی وقت اس گنجے آدمی کے حوالے کر دیا۔ وہ آس پاس ہی پھر رہا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں نے یہ سوچا کہ جس طرح بھی ہو سکے میں اس آدمی کو وہاں سے لے جا کر ظہیر کے سامنے رکھ دُوں مگر حالات اس کی اجازت نہیں دیتے تھے۔

چار و ناچار مجھے ایک اور بہانہ تراشنا پڑا۔ میں نے پستول فوراً ہی جیب میں رکھا اور اس کے ساتھ ہی وہاں شور مچا دیا کہ ڈاکٹر ترمذی بہت سخت بیمار ہو گئے ہیں۔ اُن کی بیٹی اور اُن کا بیٹا تیزی سے وہاں آ گئے۔ دو نوکر بھی ادھر ہی آ رہے ہے۔ وہ جو مجھے گیٹ سے اندر لایا تھا سخت پریشان تھا اور وہ جو مجھے فون اندر پکڑا گیا تھا وہ سب کے سب سخت حیران تھے۔

"یہ — یہ کیا ہو گیا ہے ترمذی صاحب کو؟"

"ویری ساری۔ دراصل پتہ نہیں انھیں کیا ہوا ہے خدا خیر کرے۔"

"تو پھر انھیں ہسپتال لے چلیں، گاڑی تو گھر میں موجود ہے۔"

"تو پھر چلیں دیر کس بات کی ہے، میں تیار ہوں۔" میں نے ڈاکٹر ترمذی کی "لاش" کو ہاتھ لگا دیا۔ وہ فوراً ہی اس کے گرد ہو گئے اور اسے لے کر گیراج کی طرف چل دیے۔

کچھ ہی دیر بعد وہ گاڑی میں "لاش" کو لٹا چکے تھے۔ اب معاملہ دوسرے آدمیوں کو ساتھ لے جانے کا تھا "میرا خیال ہے کہ میں انھیں خود ساتھ لے جاتا ہوں آپ دوسری گاڑی میں آ جائیں یہ بیٹا میرے ساتھ بیٹھتا ہے۔" میں نے مشورہ دیا۔

"ہاں یہ بہتر رہے گا۔ آپ فوراً انھیں ساتھ لے کر جائیے۔" اس کی بیوی نے کہا اور دوسری گاڑی میں جا بیٹھی۔ بیوی اس کی بہت اچھی ڈرائیونگ جانتی تھی۔ ایک نوکر گھر میں رہا اور دوسرے کو ساتھ لیکر آگے نکل چلے۔ میں نے اپنی گاڑی اُن سے پہلے باہر نکالی اور پھر کچھ ہی دیر بعد میں اُن کی گاڑی سے اپنی گاڑی خاصی آگے لے گیا۔

ہسپتال کا راستہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ وہ لڑکا میری رہنمائی کر رہا تھا۔ چوک میں پہنچ کر گاڑی بائیں ہاتھ کو آگے نکلنی تھی میں نے پیچھے نظر ڈالی تو دوسری گاڑی مجھے خاصے فاصلے پر نظر آئی۔ میں نے ایک نظر اس لڑکے پر ڈالی تو وہ مجھے بہت ہی بھولا اور معصوم نظر آیا۔ والد کی پریشانی نے اس کو سخت بوکھلا دیا تھا۔ مگر میں تو کچھ بھی کر سکتا تھا۔ میں نے کار روک کر اس کا دروازہ ذرا سا کھولا اور لڑکے سے کہا "ذرا جلدی سے سامنے والی دکان سے پان لے آؤ۔ میری طبیعت بھی کچھ خراب ہو رہی ہے۔"

"جی اچھا۔ ابھی آیا بس ایک سیکنڈ۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے نیچے اُترا اور دکاندار کو پیسے دینے لگا۔ میں نے اس عرصے میں گاڑی آگے بڑھا دی۔ اور آگے اور آگے۔ میری رفتار ساٹھ ستر میل فی گھنٹہ ہو گئی تھی۔ کیفیت ایسی ہی تھی ذہن بہت فاصلہ طے کر گیا تھا۔ زندگی بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ پیچھے بھی موت تھی اور آگے بھی موت۔ میں ... میں خود کو موت سے الگ نہیں سمجھ سکتا تھا میں تو خود موت کا نوشتہ بنا ہوا تھا۔ مجھے کوئی موت سے الگ تصور نہ کرے کہ میں نے نواب کی بار کراچی میں قدم ہی اس لیے رکھا تھا کہ وہاں میری زندگی موت سے ہمکنار تھی۔ مجھے معلوم ہونا چاہیے تھا کہ وہ کون لوگ تھے جو میرے دوست آبی کو یوں زندگی سے ویران کر کے موت کے ویرانے میں لے گئے ہیں۔ وہ کون لوگ تھے؟

میں نے گاڑی بہت آگے لے جا کر دائیں ہاتھ موڑی اور آہستہ آہستہ میں اس کو ہاکس بے کی طرف لے گیا۔ مجھے یہ احساس ستا رہا تھا کہ میں کسی بھی وقت کسی بھی جگہ کسی غلط قسم کے آدمی سے مل سکتا ہوں مگر خیریت یہ ہوئی کہ وہ معاملہ بس چلتا ہی رہا۔ اور میں ہاکس بے پہنچ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں معاملہ یہ تھا کہ میرے پیچھے ایک لاش ایسی پڑی تھی کہ مجھے اس کو وہاں کسی جگہ اتارنا تھا۔ میں نے کوشش کی کہ وہاں کسی بھی جگہ سے کوئی آدمی سامنے نہ آئے۔ اپنی اس کوشش میں میں کامیاب بھی ہو گیا۔ خاصے فاصلے پر وہاں مجھے ایک ہٹ نظر آئی۔ وہ بالکل ہی بیکار اور بے جان ہٹ تھی۔ کم از کم اس کے پاس جا کر تو مجھے یہی محسوس ہوا۔ میں نے اس ہٹ کے پاس جا کر گاڑی کھڑی کی اور اس ہٹ کو چاروں طرف سے اچھی طرح دیکھ لیا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے گاڑی کا پچھلا دروازہ سامنے لے جا کر اس کا ایک پٹ کھول دیا۔ اور وہیں سے میں نے ڈاکٹر ترمذی کی "لاش" ایسا معجزہ اٹھا کر ہٹ کے برآمدے میں ڈال دیا۔ مجھے یہی کرنا چاہیے تھا۔ پھر میں نے گاڑی سنبھالی اور اسے چلاتا ہوا آگے نکل گیا۔

جب میں شہر میں واپس آیا تو ہر شے وہاں کی جوں کی توں موجود تھی۔ ایک صرف ڈاکٹر ترمذی وہاں ہاتھ نہیں آ رہے تھے۔ بہت بڑی بات تھی "ایسے اچھے ڈاکٹر کا وہاں سے یوں غائب ہو جانا کسی بھی طرح اچھا نہیں تھا۔ میں نے گاڑی ایک جگہ کھڑی کر کے اس کو تالا لگایا، اور اس کی چابی جیب میں رکھ کر میں صدر بازار کی طرف چل دیا۔ میں کار کی وجہ سے کوئی خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔

کوشش میری یہ تھی کہ میں جس قدر جلدی ممکن ہو سکے فوراً ہی صدر بازار جا پہنچوں مگر معاملہ کچھ گڑبڑ ہی تھا۔ فاصلے کا مجھے صحیح اندازہ نہیں تھا اس لیے احتیاطاً میں نے ایک ٹیکسی لی اور اس میں بیٹھ کر میں صدر بازار جا پہنچا۔ وہ بازار ایک طرح کا بہت بڑا مچھلی بازار ہے۔ یہاں سے وہاں تک دکانیں۔ دکانوں کے اندر دکانیں اور اُن کے پیچھے دکانیں، گلیوں اور بازاروں میں دکانیں ہر جگہ دکانیں۔ سب کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آدمی گھُسنا کس طرف سے ہے، اور واپس کس طرح آتا ہے۔ اور مجھے اس بازار کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے سارا کچھ گلی میں پڑا ہے۔ بہر حال سب کچھ دکان کے باہر ہے اندر کچھ بھی نہیں ہے۔ میں اس کوشش میں تھا

کہ دکانیں نہ دیکھوں وہ جگہ دیکھوں جہاں سے مال بن کر بازار میں پہنچتا ہے میرے لیے وہ دفتر زیادہ بہتر تھے کیونکہ میرا مال وہیں بنتا تھا۔ میں نے ایک دکان کے اندر جا کر بڑے مہذب طریقے سے انھیں اپنا مطلب سمجھایا کہ میں کسی جگہ فون کرنا چاہتا ہوں۔ آدمی وہ کوئی تڑی والا تھا۔ اس نے مجھے یوں ٹہلا دیا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

"اچھا صاحب آپ کی مہربانی" میں نے اس کی طرف پیٹھ پھیر کر کہا اور باہر نکل آیا۔ ایسے تو تڑی والے بہت ہیں کراچی کے بازار میں۔ مگر میں ان سے نپٹنا نہیں چاہتا تھا۔ ذرا آگے نکلا تو مجھے ایک جگہ فون نظر آیا۔ وہ فون کسی آدمی نے بس ذرا اکڑ دکھانے کے لیے لگا رکھا تھا۔ تھا تو وہ بہت ہی معمولی آدمی کپڑے کے تھان بیچتا تھا مگر تھا وہ بہت ہی اچھا آدمی۔ اس سے میں نے اپنی غرض ظاہر کی تو وہ بولا "آیئے صاحب آیئے۔ یہ فون کس لیے ہے۔"

یہ اچھا آدمی تھا اور فون کے پیسے بھی کم چارج کرتا تھا۔ میں نے اس سے فون لے کر ظہیر کا نمبر گھمایا۔ معلوم یہ ہوا کہ وہ دفتر پہنچ چکا ہے۔

"کون صاحب ہیں؟"

"ارے بھائی! میں مرشد علی ہوں ایک کام کے سلسلے میں، اُن سے ملنا چاہتا تھا۔"

"اچھا اچھا۔ ذرا ہولڈ کریں۔" یہ کہہ کر اس آدمی نے کسی سے بات کی اور اس نے مجھ سے فون ملا دیا۔

"کہیے جناب کیسے زحمت فرمائی؟"

"دیکھیں میں ایک کام کے سلسلے میں آپ سے ملنا چاہتا تھا۔ اجازت ہو تو ابھی آجاؤں پہلے فون کرنا مناسب سمجھا۔"

"ٹھیک ہے۔ ابھی آجائیں۔" یہ کہہ کر اس نے فون رکھ دیا۔ مگر میں تو اس سے فون پر یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ دفتر کہاں ہے جہاں سے اس کے گھر پانی جاتا تھا۔ میں نے پھر فون گھما دیا۔ آواز پھر ابھری "ہیلو۔"

"یا حضرت! مجھے اپنے دفتر کا ایڈریس تو بتائیں، میں تو بس بھول بھلیوں میں پھنس گیا۔"

"ہاں! یہ ہے دفتر فارن ایکسچینج لمیٹڈ۔ آپ ابھی آجائیں۔"

"مگر یہ ہے کہاں؟"

"یہ حبیب بنک ہے نا اس سے آگے آپ آئیں تو تھوڑی دور بائیں ہاتھ پر یہ دفتر ہے۔" اس آدمی نے کہا۔

"شکریہ جناب۔" یہ کہہ کر میں نے فون نیچے رکھ دیا۔ اور اس آدمی کو پانچ روپے دے کر میں بھول ہی گیا تھا کہ اسے کچھ دینا لینا بھی ہے۔ وہ مجھے پوچھتا ہی رہا مگر میں آگے بڑھ گیا۔ اس آدمی کو جس نے مجھے ایک قمیص شلوار اور اس پر ایک عمدہ قسم کی اچکن کے ساتھ دیکھا تھا، میں بہت ہی عجیب و غریب آدمی نظر آیا ہوں گا۔

کچھ ہی دیر بعد میں فارن ایکسچینج لمیٹڈ کے سامنے کھڑا تھا۔ اور میرا کلیجہ باہر کو آرہا تھا۔ مجھے اس آدمی سے ملنا تھا جس نے آبی کو اپنے شکنجے میں لے رکھا تھا۔ مجھے کسی بات کا پھر ہوش ہی نہیں رہا تھا۔ اس کی کرتا نے مجھے کسی کام کا نہیں رکھا تھا۔ لے دے کر میرے حوصلے کی اَنی مضبوط تھی اور وہ میں اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ میں نے اس اونچی مضبوط بلڈنگ پر ایک نظر ڈالی اور اپنے حواس ٹھکانے رکھ کر میں اندر جا گھسا۔ مجھے وہ کرسی کا احمق نظر نہیں آتا تھا۔ معقول آدمی دکھائی دیتا تھا جس نے پولیس کو اپنے چکر میں لا کر مجھے اور آبی کو نڈھال کر دیا تھا۔ بلاشبہ وہ آدمی اس لائق تھا کہ میں اسے کسی اور حالت میں بہت اونچا اٹھاتا۔ کسی طرح بھی اس کی کوئی بات غلط نہ ہونے دیتا۔ مگر آبی کو جس طریقے سے اس نے وہاں سے اٹھوا لیا تھا وہ ایسا کام تھا ———— جس کی اسے سزا ملنی چاہیے تھی۔ کرن کا پھول اپنی جگہ خود بناتا ہے مگر وہ جو کرمک شب تاب ہے اس کا کوئی کیا کر سکتا ہے۔

میں آہستہ آہستہ تمام دروازے دیکھ چکا۔ وہ اپنے دفتر کے آخری حصے میں بیٹھا تھا اور ایک دفتر وہاں تھا جو اس کے اسٹینو گرافر کے لیے مخصوص تھا۔ دائیں ہاتھ وہ دفتر تھا۔ میں نے اس کی طرف نگاہ نہیں کی بلکہ سیدھا کمرے میں جا گھسا۔ وہ آدمی ایک اونچی سی میز کی دوسری طرف بیٹھا تھا۔ فون اس کے ہاتھ میں تھا۔ مجھے اس نے دیکھا اور فون ہاتھ سے نیچے رکھ دیا۔

"کہیے جناب کیسے آنا ہوا؟"

"وہ دراصل۔۔ میں۔۔۔ آپ سے کچھ عرض کرنا چاہتا تھا۔ بات یہ ہے کہ۔۔۔"

"جی تشریف رکھیے۔ کوئی خاص بات ہو تو مجھے بتائیں ورنہ میرے اسٹینو گرافر سے بات کر لیں۔"

"جی نہیں! مجھے آپ سے ہی ملنا ہے اور میرا مقصد یہ ہے کہ۔۔"

"آپ اطمینان سے بیٹھیں اور مجھے بتائیں میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔" اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ آدمی بہت ہی جامہ زیب ہے۔ اس کا وہ خوبصورت چہرہ مجھے آج تک نہیں بھولا ہے۔ وہ گرمیوں کا لباس زیب تن کیے ہوئے تھا اور سگریٹ وہ بہت عمدہ پی رہا تھا۔

"میں۔۔۔ میں دراصل آبی کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے اپنا پستول دائیں ہاتھ میں لے لیا۔ "یہ بے آواز چلتا ہے مجھے آپ ابھی اور اسی وقت آبی کے بارے میں بتا دیں۔"

وہ آدمی ذرا دیر کے لیے پریشان ہو گیا۔ ایسی کیفیت تھی اس کی کہ

وہ کسی بھی طرح وہ آدمی نظر نہیں آتا تھا جو اس سے پہلے میں دیکھ چکا تھا۔

"ہوں۔ تو آپ آبی کے بارے میں بات کرنا چاہتے ہیں لیکن میں یہ کہوں گا کہ۔۔۔ آبی آبی میرے لیے ایک عذاب بن گیا ہے میں کیسے سمجھاؤں کہ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"آپ مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔ مجھے بتائیں کہ آبی کہاں ہے؟"

"نہیں ۔۔ یہ بالکل جھوٹ ہے۔ میں قسم کھا سکتا ہوں کہ میرا آبی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں۔۔۔ آپ کو کیسے سمجھاؤں۔ میرا آبی سے رتی بھر تعلق نہیں ہے۔"

"یہ بات صاف ظاہر ہے کہ وہ اس روز پولیس کی حراست میں تھا آپ نے اسے اس روز وہاں سے اٹھوایا اور اب وہ پتہ نہیں کہاں ہے۔"

"میں آپ سے کیسے عرض کروں۔ ٹھہریں ۔۔ یہ دیکھیں اس ڈائرکٹری میں ظہیر نام کے آدمی ہیں، ان سے آپ کیوں تعلق پیدا نہیں کرتے؛ ان سے بات کریں۔" وہ ذرا دیر کے لیے بھول ہی گیا تھا کہ میرا پستول اس کے مغز کو زد میں لیے ہوئے ہے۔ ہاتھ اس کے میز کے اوپر تھے، اور وہ کسی بھی طرح کی کوئی حرکت نہیں کر رہا تھا مگر میرا دل یہ کہہ رہا تھا کہ وہ کوئی ایسی حرکت کر رہا ہے جو میری تباہی کا باعث بن سکتی تھی۔ ایسا ہی یہ احساس تھا۔

میں نے اٹھ کر اسے دائیں ہاتھ سے آگے بڑھ کر اوپر اٹھایا۔ میرا خیال ہے کہ وہ اپنی بائیں ٹانگ سے کوئی ایسی حرکت کر رہا تھا جس سے اس کے لواحقین اس کی طرف راغب ہو سکتے تھے، بات ایسی ہی تھی مگر میں نے اسے جانے دیا۔

"میرا خیال ہے کہ تمھیں اپنی جان کی قیمت کا خیال رکھنا چاہیے آبی تمھارا کوئی نہیں لگتا۔ ایک آدمی کی جان سے زیادہ قیمتی کوئی شے نہیں ہے۔ سیدھی طرح بتا دو کہ وہ آدمی کہاں ہے۔" میں نے اس کے گلے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ایک لحظے کی دیر تھی اور میرا ہاتھ اس کے نرخرے کو دبا سکتا تھا۔ "بولو۔ میری بات کا جواب دو۔"

"ٹھہرو۔ میں تمھیں بتاتا ہوں مجھے چھوڑ دو۔"

"بتاؤ۔ وقت ضائع نہ کرو۔ اس کے لیے میں اس سارے شہر کو تباہ کر سکتا ہوں۔"

"وہ۔۔۔ وہ دراصل ڈاکٹر دھمن کے پاس ہے اور وہ لوگ پتہ نہیں کہاں چلے گئے ہیں۔"

"نہیں۔ مجھے ان کے پاس لے چلو۔ میں ہر حال میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔" وہ میرے انگوٹھے کی زد سے باہر نہیں تھا۔ کلینشن اس کے لیے بہت ہی زرد ثابت ہوئی۔ وہ کسی بھی سختی کے لیے نہیں بنا تھا۔

"میں تمھیں بتاتا ہوں، ذرا میری جان چھوڑو۔" وہ مجھ سے دو قدم پیچھے ہٹنا چاہتا تھا مگر میں نے اس کا پنڈ نہیں چھوڑا۔ وہ کرسی سے الگ ہو کر ایک صوفے کی طرف بڑھا۔ یوں کہ میرے انگوٹھے کا دباؤ اس پر بے حد سخت تھا۔

"دونوں چیزیں الگ رکھ لو اور میری بات غور سے سنو۔ اس رات جو میں نے ڈاکٹر دھمن کے کہنے پر آبی کو پولیس کی زد سے باہر نکالا تو وہ بے حد پریشان تھا۔ میں نے اسے وہاں سے اٹھا کر ڈاکٹر دھمن کے خفیہ تہہ خانے پر پہنچا دیا۔ وہ جگہ یہاں سے تھوڑی دور ہے وہاں ڈاکٹر دھمن اور اس کی بیوی کے علاوہ سوات خان اور تین آدمی اور بھی موجود تھے۔ میں نے ڈاکٹر دھمن کو مبارکباد دی اور وہاں سے چل دیا۔ اس کے بعد کیا ہوا، یہ مجھے معلوم نہیں۔"

"تو پھر تم میرے ساتھ اس خفیہ تہہ خانے تک چلو گے؟"

"ہاں! مجھے اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نظر نہیں آتا۔ میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔"

"تو پھر چلو ۔۔ اور بھول جاؤ کہ تمھارے یہاں بہت سے گرگے موجود ہیں۔" میں نے پستول جیب میں رکھ لیا۔

اس نے وہیں سے اپنے اسٹینو گرافر سے کہا کہ وہ ایک ضروری کام سے باہر جا رہا ہے۔ بلاشبہ وہ اس فرم کا مالک تھا اور جدھر سے بھی وہ گزرتا تھا لوگ اس کی بہت عزت کرتے تھے۔ وہ میرے ساتھ چلتا ہوا آگے نکلا اور دفتر سے باہر آکر ایک کار میں جا بیٹھا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہی لگا تھا۔ حیرت مجھے یہ تھی کہ اس نے کسی ایک کو بھی اپنے پیچھے آنے کے لیے نہیں کہا۔ بہت حیرت تھی مجھے مگر میرا خیال ہے کہ اس نے اپنے لیے کوئی بہت ہی محفوظ جگہ تلاش کر لی تھی۔ یہ میرا احساس تھا۔ میں اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا تو اس نے گاڑی چلا دی۔ ذہن اس کا ایک ہی نکتے پر اٹکا ہوا تھا۔ کسی بھی صورت میں وہ اس نکتے سے اپنا ذہن ہٹا لینے پر راضی نہیں تھا۔ اور میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ ایسا کون سا نکتہ ہے جس پر اس نے اپنا ذہن پوری طرح مرتکز کر لیا تھا۔

گاڑی نکال کر وہ سڑک پر لایا اور مجھ سے بولا "کیا آبی صاحب آپ کے دوست ہیں؟"

"ہاں وہ میرا دوست ہے اور سارے جہان سے زیادہ اچھا دوست۔"

"ٹھیک ہے۔ مگر مجھے یہ بات معلوم کر کے بے حد افسوس ہوا ہے کہ آبی اس دنیا میں اب پورا نہیں آدھا رہ گیا ہے۔"

"مجھے اس کے بارے میں کچھ نہیں سننا ہے۔ پہلے میں اسے دیکھ لوں، پھر بات کروں گا۔"

میں نے اپنے وجود کے سارے طاق بند کرتے ہوئے کہا۔ میں آبی کے بارے میں کوئی بات سننا نہیں چاہتا تھا۔ بالکل بھی کوئی بات۔ یہ میں نے طے کر رکھا تھا۔ اس کو دیکھ کر ہی میں کوئی نتیجہ اخذ کر سکتا تھا۔

"آپ کو یقین کر لینا چاہیے۔"

"نہیں، نہیں نہیں — میں کوئی بات سُننا نہیں چاہتا۔ گاڑی ٹھیک طرح سے چلاؤ۔" میں نے ایک بار پھر اُسے سڑک کی بات بتائی۔ وہ چُپ ہو گیا۔

کچھ ہی دیر بعد اُس نے گاڑی ایک چار منزلہ عمارت کے سامنے کھڑی کی، اس کو تالا لگایا اور مجھے اپنے ساتھ لے کر وہ نچلی منزل میں جا گھسا۔

سامنے ایک بڑا سا دروازہ تھا۔ اس پر تالا لگا ہُوا تھا۔ اس کو الگ چھوڑ کر وہ بائیں ہاتھ تنگ دروازے پر پہنچا۔ وہاں ایک ... یوں ہی بے جان سا آدمی پہرہ دے رہا تھا، یُوں جیسے کسی نے اس آدمی کو وہاں ڈیوٹی دینے کے لیے بٹھا رکھا ہو۔

ظہیر نے اُس آدمی کو اٹھایا۔ اور تالے کی چابی مانگی جو اُس نے دے دی۔ جیسے ہی دروازہ کھلا، میرے سامنے کئی قسم کی اونچی نیچی ٹیڑھی ترچھی میزیں اور کرسیاں نظر آ رہی تھیں۔ اُن سے پیچھے زمین پر ایک شخص لیٹا تھا۔

اُف میرے خدایا! انھوں نے آبی کا یہ حال کر رکھا تھا۔ وہ سر سے پاؤں تک مٹی میں ملا ہوا تھا۔ اور اُس کی آنکھوں پر پٹی بندھی تھی۔ اور... اور اس کے ہاتھ ابھی تک سلامت تھے مگر وہ ہاتھ پہلو سے بندھے تھے۔ بالکل بندھے تھے۔ یُوں کہ وہ اُن سے کوئی بھی کام نہیں لے سکتا تھا۔

"افسوس مجھے یہ ہے کہ اس کی جگہ وہ تمھیں دیکھنا چاہتے تھے۔ ہاں! یہی خواہش تھی اُن کی۔" ظہیر نے کہا۔

"تم بکواس بند کرو۔ یہ... یہ میرے دوست کا یہ حال کر دیا ہے تم نے سوٴر!" یہ کہہ کر میں نے ظہیر کو گلے سے پکڑنا چاہا مگر وہ — وہ ایک دم آپے سے باہر ہو گیا۔ مجھے اُس نے گرا دینے والے انداز سے پیچھے جُھک کر ایسی پٹخنی دی کہ میں اگر آگے نہ ہو گیا ہوتا تو وہ مجھے زمین پر لے ڈوبا تھا۔

"ہاں! اب میں تم سے بات کر سکتا ہُوں، نکالو اپنا پستول۔" اس نے میرے دائیں ہاتھ پر خوفناک وار کیا اور پیشتر اس کے کہ میں اُس کو سمجھ سکتا، اس نے پُورے قد سے میرے گلے میں اپنی ٹانگیں اتار دیں، مجھے اُس نے ٹانگوں سے پکڑ لیا تھا۔ میں سمجھا میں پاگل ہو گیا ہوں۔ اس کی وہ ہمت میرے لیے قابلِ داد تھی اور قابلِ دید بھی۔ میری ٹانگیں پکڑ کر اس نے پیچھے جُھکائیں اور اس کے ساتھ ہی اس نے میری گردن زمین پر ٹکا دی۔ وہ اب میرا پستول ڈھونڈ رہا تھا۔ وہ تو کچھ زیادہ دُور نہیں تھا۔ میں نے کوشش کی کہ اس کو اپنی جیب تک نہ پہنچنے دوں — مجھے وہ اس ڈبے میں اس لیے لے گیا تھا کہ میرے لیے وہ وہاں ایک ایسا قید خانہ بنائے جس میں کوئی روزن ہو نہ دروازہ۔ اس کو سامنے لا کر میں نے پوری قوت سے اُسے دُھن ڈالا، یوں کہ... ایک ایک جگہ میں نے اس کی سیدھی کر دی۔ مگر وہ اس سے بھی بے بس نہ ہُوا مجھے اُس نے ٹانگوں سے اٹھا کر اُوپر اچھالا تو میں اس وقت میرے ہاتھ میں اس کا وہ گردن والا حصّہ آ گیا۔ میں... میں بس اسی کے چکر میں تھا مجھے وہ نرخرہ ہی چاہیے تھا۔ میں نے اس کی رگِ احساس مَل کر اسے خاموش کر دیا — بہت زیادہ خاموش —

اس سے فارغ ہو کر میں آبی کی طرف لپکا۔ مگر وہ بالکل خاموش تھا، یُوں جیسے اس کو کوئی ٹیکہ لگا دیا گیا ہے میں نے اسے بہت مشکلوں سے اُوپر اٹھایا، مگر وہ پھر نیچے جُھک جاتا تھا۔

یہ صورتِ حال دیکھ کر میں نے انھی قدموں آٹھ کر پہرے دار سے کہا کہ وہ اس کے لیے پانی لے آئے۔ وہ اٹھا اور پانی لے آیا۔ میں نے جا کر وہ پانی آبی کے چہرے پر ڈالا، اُس کے سر پر ڈالا — اس کے دونوں مُکھ اور اس کے دونوں پاؤں پر ڈالا۔ تب کہیں جا کر اس کو ہوش آیا مگر بڑی مشکلوں کے ساتھ۔

اُس نے بڑی ہی پریشان کن صورتِ حال میں بات کی — یوں جیسے وہ اُس نیند سے بہت زیادہ حظ اُٹھا چکا ہے۔

"کیا لینے آئے ہو میرے پاس! کیا ہے میرے پاس؟"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو آبی! میں... میں تمھارا دوست ہوں جیلانی۔"

"اوہ... ارے... تم... یہ میں کیا سُن رہا ہوں۔ وہ... وہ تمھیں بھی پریشان کر دیں گے۔ وہ... تمھاری بھی آنکھیں نکال لیں گے۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ خدا کے لیے۔ میں پاگل ہو جاؤں گا — مجھے بتاؤ ہوا کیا ہے؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ میں تو کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔ پہلے انھوں نے مجھے کسی اور جگہ رکھا۔ اب کل سے یہاں ڈال دیا ہے۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"ہوا کیا تھا؟ کس نے تم پر یہ ظلم کیا؟"

"وہ... وہ ڈاکٹر دھمن ہی تھا میرے یہ ہاتھ کھولو۔ مجھے تو ان سے کام لیے بھی دن گزر گئے ہیں۔"

میں نے اس کے ہاتھ کھول کر اچھی طرح مَسلے تو اُن میں کچھ حرکت پیدا ہوئی۔ اس کے بعد میں نے اس کے دونوں پاؤں بھی کھول دیے۔ جوں توں کر کے میں نے اس کے دونوں ہاتھ پاؤں کا اچھی.... طرح مساج کیا۔ کچھ اُن میں حرکت پیدا ہُوئی تو وہ اُٹھ بیٹھا۔ بولا۔ "تُو... تُو میرے پیچھے کس لیے آیا ہے پیارے! چھوڑ دیا ہوتا مجھے۔ میں تو بے کار ہو گیا ہوں۔"

"نہیں یار! ایسا نہ کہہ۔ میں... میں تیرے بغیر کیسے جی سکتا تھا۔ کچھ تو سوچ — مجھے بتا میں کیا کروں؟"

"کچھ نہیں۔ کچھ بھی نہیں یار! بس تو اَب یہاں سے چلا جا۔ کوئی آدمی آتا ہو گا، اپنے ساتھ بہت بڑے آدمی لے کر۔ وہ تمھیں بھی نہیں چھوڑیں گے۔"

"پاگل ہے تو — میں تیرے ساتھ ہوں تو دنیا کی کوئی شے تجھے چھو نہیں سکتی ہے، اٹھ یہاں سے۔"

"نہیں یار! یہ نیند اچھی تھی۔ تو نے بہت پریشان کیا۔ کیا ہو گیا ہے مجھے؟"

"بالکل پاگل ہے تو۔ فکر نہ کر میں تیرا علاج کراؤں گا۔ میرے ساتھ چل، اُٹھ۔" میں نے اس کو سہارا دے کر اوپر اٹھایا۔ پٹی اس کے سر پر بندھی تھی۔ اور اس کا سارا بدن ریزہ ریزہ ہو رہا تھا۔ میں نے اس کو بڑی مشکلوں سے اوپر اٹھا کر اونچی نیچی میزوں کے پار اتارا۔ اور پھر سہارا دے کر میں اسے آگے لے گیا۔ وہ آدمی جو پہرے پر تھا ابھی تک سامنے بیٹھا تھا۔ میں نے چابی اس کے حوالے کی تو وہ مجھے یوں دیکھنے لگا جیسے میں کوئی بہت ہی پریشان حال آدمی ہوں، بولا "یہ چابی مجھے کیوں دیتے ہو؟ اس آدمی کو اندر رکھو تالا لگا دو۔"

"پاگل ہے تو! اس آدمی کو میں ہسپتال لے جا رہا ہوں اندر ایک آدمی ہے وہ اندر ہی رہے گا۔" یہ کہہ کر میں نے اس کو ایک ہی دھول میں آگے کر دیا۔

اُس دروازے کی طرف جس سے میں نکل کر باہر آیا تھا، دراصل اُن لوگوں نے وہاں ایک ایسا آدمی بٹھا رکھا تھا جس کے بارے میں کسی کو کوئی شبہ نہیں ہو سکتا تھا۔ کوئی اس کے متعلق کسی بھی قسم کا کوئی شک نہیں کر سکتا تھا۔ ایسا ہی وہ آدمی تھا نشے کا مارا ہوا اور اوّل آخر پاگل۔ دراصل ایسا ہی آدمی انھیں راس آ سکتا تھا اور اس کے بارے میں آبی یا کسی اور آدمی کو بھی شک شبہ نہیں ہو سکتا تھا۔ دراصل آبی اُن کے لیے اس حالت میں کسی خطرے کا سبب نہیں بن سکتا تھا اس لیے انھوں نے اس کی حفاظت کا معقول بندوبست نہیں کیا تھا۔

آبی کو میں نے اس موٹر میں ڈالا جس کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ چلتی کس طرح ہے۔ چابی اس کی ظہیر کے پاس تھی۔ آبی کو وہاں بٹھا کر میں اس آدمی کے پاس جا پہنچا جو اپنی تکلیف کا اب دُوسرا مرحلہ شروع کرنے والا تھا۔ اس کی جیب سے میں نے چابی نکالی اور اس آدمی کو میں نے کمرے کے اندر ڈال دیا جسے میں پاگل سمجھ چکا تھا۔ دروازہ میں نے بند کیا اور آ کر چابی موٹر میں لگائی، وہ فوراً ہی اسٹارٹ ہو گئی اور میں اسے لے کر باہر چل دیا۔ میں کسی ایسی جگہ کا متلاشی تھا جہاں سے آبی کو میں فوراً کسی ماہر ڈاکٹر کے پاس لے جا سکتا۔ اس وقت میرے پاس غمزہ خانم کی جگہ موجود تھی۔ میں سیدھا اُسے لے کر طارق روڈ جا پہنچا۔

اس روز کوئی اہم دن تھا۔ بازار تو کھلے تھے مگر دفتروں میں چھٹی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میں جب آبی کو ساتھ لے کر وہاں پہنچا تو غمزہ خانم مجھے گھر پر ہی مل گئی۔ آبی کو اس نے میرے ساتھ دیکھ کر ایک عجیب سی آہ بھری۔

"یہ... یہ کیا کر لیا ہے آپ نے اپنے بھائی کو۔"

"کچھ پتہ نہیں — بس تقدیر اس کا ساتھ چھوڑ گئی ہے۔ اس کو آرام سے اطمینان کے ساتھ اندر لٹائیں۔"

میں نے آبی کو آگے بڑھایا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے آبی کو تھاما اور ہم نے اندر لے جا کر اسے خوابگاہ میں لٹا دیا۔ کچھ ہی دیر بعد فردوسی خانم نے کپڑے نکالے اور مجھے دے کر بولی "میں کسی ڈاکٹر کو بلاتی ہُوں۔"

"نہیں — ذرا ٹھہر جائیں اس سے پُوچھیں تو سہی کہ ہوا کیا ہے۔" یہ کہہ کر میں نے خوابگاہ کا دروازہ بند کیا اور آبی کے کئی دنوں کے گلے سڑے کپڑے اس کے بدن پر سے اتارے۔ کوئی بھی شے سلامت نہیں رہی تھی، میں نے اس کو اچھی طرح ایک ایک کپڑے سے صاف کر کے تولیہ مارا اور پھر کپڑے میں نے اسے پہنا دیے۔ جب وہ ذرا اطمینان سے بیٹا تو میں نے خواب گاہ کا دروازہ کھول دیا۔ فردوسی خانم ہمارے لیے دو کوک تیار کر لائی تھی — وہ میں نے اور آبی نے حلق سے اتارے تو میں نے آبی سے پوچھا —

"مجھے بتا تو سہی آبی! یہ تیرے ساتھ ہوا کیا ہے؟ کس نے تجھے اس حال کو پہنچایا ہے؟"

"ڈاکٹر دھمن کا ایک ساتھی ہے ڈاکٹر کھٹی۔ اُس نے اور ڈاکٹر عالیہ نے میرے لیے یہ جال بچھایا ہے۔"

"مگر یہ ہوا کیسے؟ کچھ تو پتہ ہو گا تجھے۔"

"ہاں! میں جب اُن عورتوں سے بے بس ہو گیا اور اُن لوگوں نے مجھے ڈھیر ساری شراب پلا دی۔ مجھ سے میرا سارا راز لے لیا تو اُن عورتوں نے پولیس کو خبر کر دی۔ تم تو اپنی جگہ بچ گئے جیسے بھی تھے تمھیں خبر ہو گئی تھی۔ مگر مجھے اُن لوگوں نے پہلے ہی سے باندھ لیا تھا۔ اٹھا کر مجھے اُن لوگوں نے وہاں سے ایک الگ کمرے میں پہنچا دیا۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ تم وہاں سے کس مصیبت سے باہر نکلے ہو۔ مگر میں اس رات پولیس کی حراست میں رہا — مگر دُوسرے دن کوئی ظہیر نام کا آدمی تھا۔ وہ میرے پاس آ گیا۔ مجھ سے اس نے ساری بات پوچھی۔ پولیس والا وہاں کوئی موجود نہیں تھا۔ کچھ ہی دیر بعد مجھے معلوم ہوا کہ میں ظہیر کے ساتھ پولیس کی حراست سے باہر جا رہا ہوں۔ یہ میرے لیے بہت بڑا اعزاز تھا۔ میں ظہیر کا بہت زیادہ شکر گزار تھا۔ مگر ان لوگوں نے تو کوئی چال چلی تھی۔ مجھے ظہیر نے اُس رات ایک ایسی جگہ پہنچا دیا جہاں سے میرا نکلنا ناممکن تھا۔ مجھے اُن لوگوں نے ایسے ہسپتال پہنچایا کہ میں اسکی ایک ایک بات ابھی تک نہیں بھولا ہُوں۔ وہیں میری ملاقات

ڈاکٹر دھمن سے ہوئی اور ڈاکٹر عالیہ سے بھی۔ وہیں وہ ڈاکٹر بھٹی بھی تھا۔ اُن کے چہروں سے ایسی عیاری ٹپک رہی تھی کہ میں کچھ بھی نہ کر سکا۔ میرے ہاتھ پاؤں تو اُن لوگوں نے پہلے ہی باندھ دیے تھے۔ گاڑی سے میں اُترا تو پیچھے سے کسی نے میرے دونوں بازو جکڑ لیے۔ میں نے بہت کوشش کی مگر وہ بازو اپنی جگہ سے ہلتے ہی نہیں تھے۔ اس کے بعد میں اُن کے لیے کوئی مسئلہ نہیں رہا۔ مجھے ٹانگوں اور بازوؤں سے بے بس کر کے وہ ایک مشین کے پاس لے گئے۔ میرا خیال ہے کہ وہ بازو کاٹنے کی کوئی مشین ہوگی۔ میں نے بہت واویلا مچایا مگر کوئی میری بات سننے کے لیے تیار نہ تھا۔

ڈاکٹر دھمن نے سب سے پہلے میرا معائنہ کیا اور بولا ”ہاں! اس کے قرنیے تو بہت عمدہ ہیں۔ آپ ان کو اتار لیں۔“

”اُف میرے خدایا! جب وہ یہ بات مجھ سے کہہ رہا تھا تو میں ہی جانتا ہوں یا میرا خدا۔ مجھے بہت ہی افسوس ہوا۔ مگر میں کر کیا سکتا تھا۔ اس رات انھوں نے میرے دونوں قرنیے نکال لیے اور اب وہ مجھے تیسری جگہ منتقل کر چکے تھے، سوات خان بھی وہیں تھا اور اس کے تین غنڈے بھی مگر وہ تو محض اُن کے غنڈے تھے۔ اب تیسری جگہ منتقل کرنے کے بعد وہ مجھے ایک اور آپریشن سے گزارنا چاہتے تھے۔ اور اب کی بار اُن کا ہدف میرے گُردے تھے۔ پتہ نہیں ایسا کیوں ہے مگر مجھے اب کی بار جینے کی ہوس بالکل نہیں رہی تھی۔ وہ پاگل کا بچہ پہریدار تھوڑی تھوڑی دیر بعد آکر مجھے دیکھ لیتا تھا اور مجھے یقین تھا کہ اب کی بار میرا قرنیا کا آپریشن درست ہونے پر وہ مجھے گردے سے بھی محروم کر دیتے۔ مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ قصہ کیا ہے میں تو پاگل ہو گیا ہوں۔ تم نہ آتے تو میں ویسے ہی مر جاتا۔ میرے جسم میں اب جان تو باقی ہی نہیں رہ گئی تھی۔“

”ایسا نہیں کہتے ہیں پیارے! فکر مت کرو۔ میں ان سب کو دیکھ لوں گا۔“ یہ کہہ کر میں نے فردوسی بیگم سے کہا کہ وہ کسی ماہرِ چشم ڈاکٹر کو فون کر دے۔ میں پیسے دینے کو تیار ہوں۔

میری اس بات پر وہ قدرے ہنسی، بولی ”پیسے بہت ہیں، آپ کے بھائی کو آرام ملنا چاہیے۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک ڈاکٹر افضال احمد کو فون کر دیا۔ وہ گھر پر ہی تھا فوراً آنے کا کہہ کر فون بند کر دیا۔

”یہ بتاؤ کہ وہ ڈاکٹر دھمن کہاں ہے ابھی یہاں ہے نا؟“

”ہاں! میرا خیال ہے کہ وہ ابھی یہاں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ دو چار دن میں باہر نکل جائے۔“

”میں دیکھ لوں گا۔ فکر نہ کر پیارے! اس ڈاکٹر دھمن کی آنکھوں کا بھی آپریشن ایک دن ہونا ہے بالکل ہونا ہے۔“

”تجھے تو تمغۂ ذلالت ملنا چاہیے پیارے! تو کیا سوچ کر وہاں سے نکل بھاگا تھا؟“

”ایسے نہ کہہ یار! میں تو اپنی جان بچا لے گیا مگر مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ تیرے ساتھ کیا کر چکے ہیں۔ تیری یہ پٹی نئی ہے؟“

”ہاں! آج صبح انھوں نے بدلی تھی ابھی وہ میرے گُردے کا آپریشن کرنے والے تھے۔“

”دیکھ تو بالکل فکر نہ کر۔ بس میں اب تیرے ساتھ ہوں سمجھا ہے نا تو۔ میں اُن کو دیکھ لوں گا۔“

”مگر تو کیا کر سکے گا پیارے! میری تو انھوں نے آنکھوں سے قرنیے ہی نکال لیے ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ قصہ کیا ہو گیا ہے؟“

”فکر نہ کر میں تیری آنکھوں میں اُن کے قرنیے ڈال دونگا۔ مت سوچ کہ وہ میرے یار کے قرنیے کھا کر جی لیں گے۔“

آبی کچھ سوچ میں ڈوب گیا، اُسے میری بات کا یقین نہیں آتا تھا۔ ایک ہی تو میرا دوست تھا مگر وہ بھی مجھ پر اعتبار نہیں کر رہا تھا۔ کیسی بے بسی کی بات تھی۔

”مجھ سے کوئی کہہ رہا تھا کہ وہ تجھ سے تیرے دونوں ہاتھ چھین چکے ہیں۔ تو غالباً اُن کی دوسری منزل کے پنجرے میں تھا۔“

”ہاں۔ وہ یہی کہہ رہے تھے۔ میں اُن کے پاس ہی تھا۔ وہ جگہ مجھے نہیں بھولی ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ تجھے فون پر بلا رہے تھے اور عین اُس وقت کمرے میں ڈاکٹر دھمن گھس آیا۔ اور اُس نے وہ معاملہ ختم کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ میں تجھ سے ساری بات کہہ دوں اور تجھے بس تقدیر کے آگے ہار مان لینے کی بات کہہ دوں وہ یہی چاہتے تھے۔“

”تو یہ بات تھی۔ میں بھی حیران تھا کہ وہ تیرے کٹے ہوئے ہاتھ کیا کریں گے۔ وہ تو پنجرے کو یوں پھیرتے ہیں کہ آدمی کا ایک عضو دوسرے کے کام آسکے۔ حد ہو گئی۔ حد ہو گئی بھائی۔ خدا کی قسم میں اُن سے بہت خوفناک انتقام لوں گا۔“

”نہیں پیارے! وہ کسی بھی طرح باز نہیں آسکتے ہیں۔ ان کو چھوڑ دے اُن کے حال پر چھوڑ دے۔“

”نہیں آبی! یہ نہیں ہو سکتا۔ بالکل نہیں ہو سکتا۔ ایک دن وہ میرے ہاتھ ضرور آئیں گے۔“

”تمھاری مرضی۔ مگر میرا حال تم دیکھ رہے ہو۔ مت سوچ کہ تو اُن سے بدلہ لے سکتا ہے۔“

”یہ تو خیر مجھ پر چھوڑ دے۔ میں جانوں اور میرا کام۔ فردوسی بیگم ان کے لیے کھانا لے آؤ۔“

”ہاں! کھانا۔ واقعی بہت عمدہ چیز ہے یہ کھانا۔ اور۔ مجھے

انھوں نے بس بیڑی لبنی چائے اور نمکین بسکٹ دے دیے ہیں۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“

”کھانا لے آئیں فردوسی بیگم پتہ نہیں یہ کیسا دور جا رہا ہے ہم پر۔ خدا کو ہی معلوم ہے کہ آگے کیا ہوگا۔“ میں نے یہ بات کچھ ایسے لہجے میں کی کہ آبی بھی پریشان ہو گیا، بولا ”تجھے جب پتہ چلا کہ میرے بازو کٹ گئے ہیں تو تیرا کیا حال ہوا ہوگا؟“

”ہاں! میں سمجھا تیرے اپنے بازو کٹ گئے ہیں۔ اُف پروردگار یہ کیسے لوگ ہیں۔ میں نے ڈھلوں صاحب کی پروا کبھی نہیں کی، اُن کی کار پر گولیاں چلی تھیں۔ وہ ہسپتال میں ہیں مگر میں ان کو بھی چھوڑ کر چلا آیا۔“

”وہ کیسے؟ یہ تو بہت بری خبر ہے۔“

”ہاں! بات کچھ ایسی ہی ہے مگر اُس میں اُن کا اپنا بھی تو عمل دخل ہے کس کس کو دشمن نہیں بنایا ہے انھوں نے۔ ایک وہ رحمت علی چوہدری تھا، وہ بھی ختم ہو گیا اب پتہ نہیں اور کس کس کی باری ہے۔“

”رحمت علی چوہدری! یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟“

”ہاں۔ وہ لمبا قصہ ہے۔ بہرحال وہ ادھر سوہدرہ میں ایک پری چہرہ کا شکار ہو گیا تھا۔ اس کے آدمیوں نے اسے تباہ کر دیا اس کے بھائی بندوں نے، اور پری چہرہ بھی ختم ہو گئی۔ رحمت علی کے ساتھ۔ وہ ڈرامہ میں نے خود دیکھا ہے۔“

”اچھا! کمال ہے۔ یہ تمھیں کیسے پتہ چلا کہ وہ ادھر سوہدرہ میں ہے۔“

”وہ اس طرح کہ ڈھلوں صاحب نے ہی مجھے بتایا تھا کہ وہ ادھر جا ٹھہرا ہے۔ اس کے پیچھے میں بھی وہاں جا نکلا۔ ان کا حکم تھا کہ میں رحمت علی کو ختم کر دوں مگر وہ تو خود ہی مارا گیا۔“

”ہوں۔ تو یہ بات ہے۔ مگر اب ڈھلوں صاحب کس کے آگے آئے ہیں؟ کون ہیں وہ لوگ؟“

”میں کچھ نہیں کہہ سکتا بہرحال وہ آدمی بہت چالاک ہیں اور ڈھلوں صاحب کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔“

”خدا ہی خیر کرے۔“

”ہاں! اور اب کھانا کھا لو۔“ یہ کہہ کر میں نے فردوسی بیگم سے کھانے کا تھال لے لیا اور اُسے اپنے سامنے بچھا کر آبی کے ساتھ کھانا کھانے لگا مگر وہ ہاتھ کہاں رکھتا تھا اور جاتا کہاں تھا۔ ناچار میں نے اسے کھانا کھلایا، خود بھی کھاتا رہا۔

کچھ ہی دیر بعد ڈاکٹر افضال احمد وہاں آگئے اور مریض کو غور سے دیکھنے کے بعد بولے ”ذرا یہ پٹی تو اتار دیں۔“

”ہاں! یہ پٹی تو اتارنا ہی ہوگی، خود ہی یہ کام کریں۔“

آبی نے کہا۔ وہ سیدھا ہو کر بستر پر لیٹ گیا تھا۔

ڈاکٹر نے پٹی اتاری تو اس کے جہاں دیدے تھے وہاں بس ایک ہلکا سا زخم تھا جہاں کی تعکیس ہوتی تھی وہاں اب محض ایک حقیر سا اُجلا اُجلا زخم تھا۔

”یہ۔۔۔ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں جناب! آپ نے اپنے قرنیے کسی کو نکال دیے ہیں۔“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں ڈاکٹر! مگر میں نے نہیں یہ کسی نے میری آنکھوں سے نور چھین لیا ہے۔ میں تباہ ہو گیا ہوں ڈاکٹر! مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔“

”کمال ہے۔ میں۔۔۔ میں نے ایسا کوئی آپریشن نہیں دیکھا جس میں کسی کے قرنیے نکال دیے گئے ہوں، دونوں قرنیے۔۔۔ یہ آپریشن کب ہوا ہے؟“

”کافی دن ہو گئے۔ اب تو زخم بھی بہت کم رہ گیا ہے۔“

”ہوں۔ مگر وہ کون ڈاکٹر تھا؟“

”بس یہ تو پتہ نہیں چلتا۔ مگر کیا اس کی آنکھوں کا علاج ہو سکے گا؟“

”کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ علاج ممکن ہے، بالکل ممکن ہے۔ کسی کے دو قرنیے نکال کر یہاں لگا دیے جائیں تو ان کو نظر آنے لگے گا۔“

”ہوں۔ ٹھیک ہے ڈاکٹر۔ ایسا ہی ہوگا۔ ایسا ہی ہوگا۔“ میں نے یہ بات کچھ ایسے دلدوز انداز میں کہی کہ ڈاکٹر بھی پریشان ہو گیا بولا ”یہ کون صاحب ہیں یہ ڈاکٹر۔ کوئی ان کا نام، کوئی ولدیت؟“

”ان کا نام ڈاکٹر دھمن ہے، بہت بڑا ڈاکٹر ہے۔ مگر بہت بدنام بھی۔“

”اوہ! آئی سی۔ میں نے نام سُنا ہے مگر دیکھا نہیں ہے۔ لیکن یہ قرنیے کوئی کیسے نکال سکتا ہے؟“

”کچھ ایسی ہی بات ہے ڈاکٹر۔ بہرحال آپ غور سے دیکھیں کیا یہ علاج ممکن ہے؟“

”ہاں ہاں! علاج ممکن ہے بالکل ممکن ہے مگر۔۔۔ خیر میں پٹی بدل دیتا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے آبی کی آنکھوں کی پٹی بدل دی اور وہ فیس لے کر چلا گیا۔ میں اور فردوسی بیگم آبی کو بس دیکھتے کے دیکھتے ہی رہ گئے۔ اس سے کچھ بھی نہ کہہ سکے، کیا کہتے۔

اور وہ۔۔۔ رائی کا پہاڑ بنانے والا۔ وہ میرا دوست آبی۔ سارے جہان کا درد اپنے جگر میں جمع کرنے والا اس روز بھی نہیں رو رہا۔ وہ اپنے جمع جتھا دل کو بہت پہلے رو چکا تھا۔ بہت رو چکا تھا۔ اتنا کہ پھر اس سے رویا نہ گیا۔ وہ چپ چاپ ایک طرف ہو کر لیٹ رہا۔ ”آبی!“ میں نے بڑے ہی دل گردے سے اُس کا نام لیا۔

"آہ! کچھ نہیں یار۔ بس ایک مرنے کی آرزو باقی ہے۔ زندگی میں اور کیا باقی رہ گیا ہے۔"

"ہاں! ایسا بھی ہوتا ہے مگر۔۔ مگر نہیں۔ مجھے میں زندہ دیکھنا چاہتا ہوں، زندہ اور تابندہ۔"

میں نے اس کے دونوں بازو ہاتھ میں پکڑ لیے۔ وہ اس کے بازو ہی نظر نہیں آتے تھے۔ یوں جیسے ڈھیلے ڈھالے بے مغز، بے روح، بے جوانہ۔ کچھ بھی نہیں۔ " اب تو سو جا پیارے! میں تیرے ساتھ بیٹھتا ہوں۔"

اس نے آنکھیں پہلو کی طرف لگا رکھی تھیں میرے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر اس نے یوں ہلائے جیسے کوئی کنوئیں میں اترتے آدمی کا ہاتھ ہلاتا ہے۔ وہ بھی کنوئیں میں اتر رہا تھا اور میں بھی۔ یہ الگ بات ہے کہ میں کنوئیں کے اس طرف تھا اور وہ اس طرف۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ آدمی کو بھنگ کے بھاڑے میں جاتے دیکھنا ہو تو آبی کو دیکھنا چاہیے تھا۔ وہ کوئی ایسا شخص تو نہیں تھا جس کے لیے ایک دنیا روتی۔ مگر وہ جو اس کے لیے روتا تھا اس کا حال تو دیکھنا چاہیے وہ رد کرتا تھا ہر اس چیز کو، جو اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اور میں اسے روکتا تھا کہ ان سیڑھیوں پر نہ چڑھ۔ یہ بہت بری سیڑھیاں ہیں آدمی کو کھا جاتی ہیں۔ ان پر پڑتے والا چالیسواں پاؤں آدمی کو کہیں کا نہیں رکھتا۔ مگر وہ سمجھتا ہی نہیں تھا۔ وہی بات اس کے ساتھ ہو گئی۔ بغل کا دشمن اس کا اپنا ہی اندر کا آدمی ثابت ہوا۔ اب وہ لغارہ ہاتھ میں لیے جگہ جگہ ناچتا پھرے تو کیا ہوتا ہے۔ ہونی تو ہو کر رہی اور یہ جو میں اس کے لیے تیر بہدف نسخے تجویز کرنے کی کہتا تھا تو یہ بھی اس کو تسلی دینے کے لیے ورنہ ایسا کون تھا جو اس کے لیے اپنے قرنیے کٹوا لیتا۔ کون تھا جو ایسا کرتا۔ کہنے کو آدمی بلک بھی جھٹک کر بیٹھتا ہے۔ مگر۔۔۔ اس جھٹکنے سے کیا ہوتا ہے۔ بہت آگے گئے تو ہمیں کسی نہ کسی طرح ایک قرنیا مل بھی گیا تو کیا ہوگا؟ کوئی آدمی کا اصل قرنیا تو واپس نہیں آجاتا۔ اس کے لیے بھی انسان کو عینک کی ضرورت پڑتی ہے کتنی عجیب مشکل میں آپھنسے تھے ہم؟

آبی کو یہ احساس تھا کہ میں اس کے ساتھ ہوں۔ دو گھڑی کے لیے وہ آرام کرنے کے لیے لیٹ گیا۔ میں اس کے پاس کچھ دیر تک بیٹھا رہا اور پھر فردوسی بیگم کے ساتھ دوسرے کمرے میں جا بیٹھا۔

وہ بھی بہت پریشان تھی، بولی "۔ رات آپ چار بجے یہاں سے واپس چلے گئے۔ میں سوچتی رہ گئی کہ آپ کیسے آدمی ہیں۔ مجھے بتایا تک نہیں۔"

"یہ بات نہیں ہے فردوسی بیگم۔ در اصل میں اس آدمی کی تلاش میں تھا۔ مجھے ایک ایک پل گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ مل گیا ہے۔"

"ہاں! ان کی حالت بہت خراب ہے۔ پتہ نہیں یہ کیسے جی سکیں گے؟"

"ہاں! حالت تو واقعی ایسی ہے اور قرنیا ملنا بہت مشکل ہے مگر ابھی چار پانچ آدمی ایسے ہیں جن کا قرنیا مل سکتا ہے۔"

"وہ کیسے؟ یہ آپ کیوں کر کہہ سکتے ہیں؟"

"یہ بات صرف اسے ہی معلوم ہے مگر معاملہ تو کرنا ہی ہوگا۔ جن لوگوں نے ان کے قرنیے کو نکال لیا وہی اس کی قیمت بھی دیں گے۔ یہ ہوگا اور ضرور ہوگا۔"

"مگر کیسے! یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی ہے۔"

"پتہ نہیں کیسے ہوگا مگر یہ ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر دھمن اور اس کے چیلے چانٹے آخر کس دن کام آئیں گے میں اس کو ہرگز نہیں چھوڑوں گا۔"

"آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی ہیں، بہر حال معاملہ بہت ہی برا ہوا۔ خدا نہ کرے آبی کی یوں پریشان حالی میں زندگی گزرے۔"

"فکر نہ کریں انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" میں نے بے خیالی میں یہ بات ایسے کہہ دی، جیسے میں اپنے ہاتھ کے نقوش کو پڑھ کر یہ بات کہہ رہا ہوں۔ فردوسی بھی بہت پریشان تھی مگر اس کا غم آدمی کا غم تھا جب کہ میں یہ محسوس کرتا تھا کہ مجھے دوہرا غم ہے، ایسا دوہرا غم جو مجھ سے سہارا نہیں جاتا تھا مگر اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔

"اچھا فردوسی بیگم! میں ذرا یہ گاڑی دے آؤں۔ آپ اس کا خیال رکھیں۔"

"بے فکر رہیں میرے لیے یہ کسی عزیز سے کم نہیں ہیں کوشش کریں کہ آپ جلدی آجائیں۔"

"ایسا نہ کہیں ۔۔۔ یہ عزیز کا غم نہیں ہے یہ اپنے کسی ماں جائے کا غم ہے۔ فردوسی بیگم! اس کا خیال رکھیں۔ میں جلدی آنے کی کوشش کروں گا۔" یہ کہہ کر میں نے کچھ روپیہ جیب میں ڈالا اور پہلو سے لگی اچکن کی جیب سے میں نے پستول کو ٹھکانے سے رکھا اور اسے خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آیا۔

ظہیر کی گاڑی باہر ہی کھڑی تھی۔ اس پر سوار ہو کر میں طارق روڈ سے آگے نکل گیا۔ کافی دیر تک میں اسے ادھر ادھر بھگاتا رہا اور پھر ایک جگہ لے جا کر میں نے اس کو کھڑا کر دیا۔ وہ جگہ قائد اعظم کا مقبرہ تھی۔ مجھے افسوس ہے مگر اس سے زیادہ موزوں جگہ اور کون سی ہو سکتی ہے کہ قائد اعظم کو ان بدمعاشوں کی تصویر جا دکھاؤں جو ہر جگہ پیپسیت دکھاتے ہیں۔

گاڑی کھڑی کر کے میں نے تالا لگایا اور پھر وہاں سے آگے نکل کر

میں کچھ ہی دور ایک ٹیکسی میں جا بیٹھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں کیا کرنے جا رہا ہوں۔ ایک آگ تھی جو میرے دل میں لگی تھی مجھے کچھ نہ کچھ تو ضرور کر دینا چاہیے تھا۔ اور نہیں تو میں اس ظہیر ہی کو ختم کر دیتا۔ ایک عجیب سا اظہار میرے لیے ممکن ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے در اصل اس ڈاکٹر دھمن کی تلاش تھی اور اس عالیہ کی جسے میں نے بہت مشکل سے پکڑا تھا اور بہت آسانی سے چھوڑ دیا تھا، اتنی آسانی سے کہ وہ میرے دوست آبی کو بھی لے ڈوبے تھے۔

ڈرائیور نے میرے کہنے پر گاڑی کا رخ ادھر موڑ دیا جہاں وہ حفیظ صاحب رہتے تھے۔ معنک حفیظ صاحب۔ میرا خیال تھا کہ وہ اس وقت گھر پر ہوگا۔ کچھ ہی دیر بعد گاڑی وہاں جا ٹھہری۔ اس کو کرایہ دے کر میں نے فارغ کر دیا۔ اور خود اس گلی کا جائزہ لینے لگا۔ گلی تو وہی تھی، میری دیکھی ہوئی۔ آدمی بھی وہی تھے مگر میں ہی بدل گیا تھا۔ محض اس لیے کہ آبی اس چکر میں پھنس گیا تھا۔ میں نے آگے جا کر بڑے اطمینان سے دروازے پر دستک دے دی۔ ایک بچے نے دروازہ کھولا تو وہ کہنے لگا۔ "آپ کو کس سے ملنا ہے؟"

"مجھے حفیظ صاحب سے ملنا ہے۔ اندر جا کر کہو کہ باہر ایک آدمی آیا ہے۔"

اس نے ابھی کوئی بات نہیں کی تھی کہ حفیظ صاحب کی تیز طرار بیوی باہر نکل آئی، بولی "۔ کس سے ملنا ہے آپ کو؟"

"جی میں حفیظ صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"ٹھہریں۔ میں انہیں بتاتی ہوں کیا نام ہے آپ کا؟"

"ہاشم خان۔"

"اچھا اچھا۔ آپ وہی ہیں جو ہمیں پانچ سو روپے دے گئے تھے۔ اللہ آپ اندر آجائیں نا!" یہ کہہ کر اس نے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا اور پھر دروازہ بند ہو گیا۔

معلوم یہ ہوتا تھا کہ حفیظ صاحب بیمار ہیں۔ وہ اس وقت چارپائی پر پڑے دکھائی دیتے تھے۔

"یہ کیا ہو گیا ہے حضرت آپ کو؟"

"بس ایسے ہی فلو ہو گیا۔ پھر فیور ہو گیا پھر فیور کے بعد پسلیاں دکھنے لگیں اب ڈاکٹر نے کہا ہے کہ کچھ پریشانی ہو گئی ہے۔"

"کیسی پریشانی؟" میں نے اس کے پاس بیٹھ کر کہا۔

"یہی کہ کچھ کچھ وہ ہو گیا ہے تپدق۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

"اچھا! کمال ہے۔ ابھی تو چند دن پہلے آپ اچھے خاصے تھے۔ قصہ کیا ہے یہ؟" میں نے اس کی نبض دیکھ کر کہا۔ کچھ کمزوری تھی نبض میں ورنہ تو وہ اچھا خاصا نظر آتا تھا۔

"کچھ ہو گیا ہے مجھے۔ بس اللہ کی شان ہے آپ سنائیں کیسے آنا ہوا؟"

"بات در اصل یہ تھی کہ میں اس کام کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔"

"کام تو بس اللہ کے سپرد ہے۔ میں نے کوشش تو بہت کی مگر ابھی کوئی پندرہ یا بیس دن لگیں گے آپ کے کام کو۔"

"اچھا! یہ تو بہت اچھی بات ہے، وہ اپنے ڈاکٹر دھمن کہاں ہیں آج کل؟"

"وہ ۔۔۔ وہ تو کل شام یہاں سے نکل کر واشنگٹن چلے گئے۔ ڈاکٹر عالیہ بھی ان کے ساتھ ہیں۔"

"نہیں یار! ایسا نہ کہیں۔ ان کے بغیر تو کاروبار کیسے چلے گا۔" میں نے پریشان ہو کر کہا۔

"بس وہ ایسے ہی چلے جاتے ہیں، دو مہینے یا مہینہ رہ کر واپس آجائیں گے۔"

"اوہ! یہ تو بہت برا ہوا معلوم یہ ہوتا ہے کہ وہ میرے ہاتھ سے بچ کر نکل گئے۔"

ایسے ہی یہ بات میرے منہ سے نکل گئی۔ مگر اس نے تو میری یہ بات پکڑ ہی لی، بولا "۔ کیا کہا آپ نے؟ کیا فرمایا آپ نے؟"

"ایسے ہی میرے منہ سے نکل گیا۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ ڈاکٹر دھمن ہی تو میرے کام کا آدمی تھا، اب وہ ہی نہیں رہا تو بات کیسے بنے گی؟"

"بس ایسے ہی یہ معاملہ ہے۔ ڈاکٹر بھٹی بھی ان کے ساتھ ہیں اور وہ ہمارا منیجر بھی۔"

"ہوں۔ تو اور کون ہے یہاں۔ ان کی غیر حاضری میں کام کرنے کے لیے؟"

"کوئی بھی نہیں۔ بس وہ سوات خان ہے۔ مگسی ہے مگر وہ زخمی ہے۔ کچھ اور لوگ ہیں مگر اصل بات کیا ہے؟ کوئی خاص معاملہ ہے آپ کا ان سے۔"

"نہیں جی! خاص کیا عام بھی نہیں ہے ایسے ہی پوچھ رہا ہوں اللہ آپ کو صحت دے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ سوات خان کا گھر کہاں ہے؟"

"وہ تو ادھر گولیمار کے علاقے میں ہے مگر آپ کیوں پوچھتے ہیں؟"

"ایسے ہی پوچھتا ہوں۔ ذرا پتہ بتا دیں تو مہربانی ہوگی۔"

"ہاں پتہ لکھ لیں، یہ ڈائری مجھے دیں۔"

میں نے اس کو ڈائری پکڑا دی۔ کاغذ قلم لے کر اس نے مجھے پتہ لکھ دیا۔

"یہ تو بہت اچھا ہوا۔ میں سوات خان سے مل لیتا ہوں۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتائیں۔"

"جی نہیں شکریہ۔ بس بیس دن بعد پتہ کریں۔"

"ہاں یہ تو ہے ہی۔ یہ لیں پانچ سو روپیہ رکھ لیں۔ بچوں کے

کلام آئیں گے۔" میں نے کہہ کر پانچ سو کے نوٹ اس کی طرف سرکا دیے۔

"ایسی کیا ضرورت تھی۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔" اس نے نوٹ اپنے سامنے رکھ لیے۔

"کوئی بات نہیں۔ آدمی آدمی کا دارو ہوتا ہے۔ میں پھر آؤں گا۔ اپنا علاج کرواتے رہیں۔" یہ کہہ کر میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور وہاں سے تیز تیز قدم اٹھاتا باہر آ گیا۔

اُس گلی سے نکلتے ہوئے میرے ذہن میں یہ خیال گہرا جاگزیں تھا کہ مجھے اُن کے لیے کوئی تدبیر اختیار کرنی ہو گی۔ کاش مجھے وہاں سے امریکہ جانے کا پاسپورٹ مل سکتا۔ میں اُن کے لیے وہاں جاکر زبردست مصیبت پیدا کر سکتا تھا مگر کاش میں نے اس سلسلے پر بھی غور کیا۔ اور پھر میں وہاں سے ایک نئی تحریک لے کر آگے روانہ ہوا۔ مجھے اپنے دشمنوں سے نمٹنے کے لیے وہاں تک جانا ہو گا۔ اس کے سوا میرے پاس اور کوئی چارۂ کار نہیں تھا۔

اُس وقت دن کے دو بج رہے تھے۔ دوپہر کچھ خاموش ہو گئی تھی۔ میں نے بڑی سڑک سے ایک ٹیکسی پکڑی اور گولیمار جا پہنچا۔ وہ بستی اپنے مکینوں کے ساتھ اس وقت بہت ہی رچھی رچھی سی نظر آتی تھی۔ گولیمار کوئی ایک علاقہ نہیں ہے بہت بڑے علاقے کا نام گولیمار ہے۔ مجھے جگہ تلاش کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ گھر اس کا بہت ہی صاف ستھرا تھا مگر اس وقت نہیں میں کسی اور وقت وہاں آؤں گا۔ یہی بہتر تھا۔ مجھے سوات خان سے اب کی بار زیادہ دل جمعی سے بات کرنا ہو گی۔ دونوں بار وہ مجھ سے بہت زیادہ دب گیا تھا۔ اور جیسے ہی موقعہ ملا اس نے مجھے پریشان کر دیا۔ اب کی بار ایسا نہیں ہو گا۔ مجھے کسی نہ کسی طرح سوات کی آنکھیں چاہیے تھیں۔ ایسی آنکھیں جو آپ کے قرینے کی جگہ ٹھیک جا بیٹھیں۔ میں ہاتھ روک نہیں سکتا تھا۔ مجھے ہر حال میں سوات کی آنکھیں چاہیے تھیں۔

لیکن یہ کام کوئی اتنا آسان تو نہیں تھا۔ میں نے ساری صورتِ حال پر غور کر لیا تھا۔ مگر اس کو پکڑنا کاردارد تھا۔ بہر حال میں نے اس کے لیے خود کو اچھی طرح تیار کر لیا تھا اور مجھے یقین تھا کہ آج رات میری اُس سے مڈبھیڑ ضرور ہو گی۔

میں نے وہ شام کسی نہ کسی طرح ایک چائے خانے میں بیٹھ کر گزاری۔ یوں کہ بس چائے پیتا رہا اور دُنیا کو بیٹھا یوں دیکھتا رہا جیسے میں تماشہ بین ہوں۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میرے گرد کچھ لوگوں کا حلقہ تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ یوں جیسے چند لوگ مل جل کر تاثر کے ساتھ ایک دُوسرے کی طرف بڑھ رہے ہوں۔ یوں ہی میرا احساس تھا۔ میں چونک گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ آدمی میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ اور کوئی دم میں مجھے آلیں گے۔ میں چاروں طرف بڑے غور سے دیکھتا ہوا اٹھا تو وہ آدمی بھی میرے ساتھ اٹھ گئے۔ وہ تعداد میں چار تھے۔

کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ وہیں کے ہیں یا کوئی پچھلا حساب صاف کرنے کے لیے وہاں موجود ہیں۔ میں نے اپنے پیچھے کرسی کو ہٹا دیا۔ اور خود ان کے سامنے چلتا ہوا ہوٹل کے مالک کے پاس جا پہنچا۔ وہ سب لوگ میری طرف دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ ہوٹل والے کو پیسے دے کر میں دس قدم آگے نکلا تو وہ لوگ میرے پیچھے ہو گئے۔ یوں جیسے کہ کسی اور خیال میں ہوں۔ مگر میں جانتا تھا کہ وہ مجھ سے واقف ہیں۔ میرا بھید جانتے ہیں لیکن یہ مجھے معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ پولیس کے لوگ ہیں یا عام آدمی۔

کوئی بیس قدم میں آگے نکلا ہوں گا کہ وہ لوگ میرے پاس آ گئے۔ "السلام علیکم!"

میں نے اُن کے سلام کا کوئی جواب نہیں دیا تو وہ آدمی بولا۔ "کیا بات ہے بادشاہو! ہم سے ناراض ہو۔"

"اوئے! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں، حد ہو گئی تو ماہیے۔ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے اس کے ساتھ ہاتھ ملایا تو وہ بہت تیزی سے میرے قریب آ گیا

"یہ میرے دوست ہیں۔ یہ مقصود ہے، یہ عارف اور یہ وضاحت۔ آپ سے ملنا تو کمال ہو گیا۔"

"حد ہو گئی بھئی! میں تو ان تینوں کو دیکھ کر ڈر ہی گیا تھا۔ اور آپ تو ان میں سے بالکل ہی پیچھے تھے۔ آئیں کہیں چائے پیتے ہیں۔"

"وہاں چلیں۔ مگر یہ مقصود اور یہ وضاحت تو ابھی گھر جائیں گے۔ کچھ انھیں کام ہے ہم آپ کے ساتھ چلتے ہیں۔"

"بہت بہتر۔ اللہ حافظ جناب! ویسے یہ ملاقات بھی عجیب رہی ہے۔" میں نے اُن کے ساتھ مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا وہ خدا حافظ کہہ کر واپس چلے گئے۔ میں عارف اور ماہیے کو لے کر ایک اور ہوٹل میں جا بیٹھا۔

"یار یہ بتا تو آیا کس طرح ہے یہاں؟"

"بس ایسے ہی تقدیر یہاں لے آئی۔ میں نے سنا ہے بہت مال ہے یہاں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے پر تیرا تو سارا پنجاب واقف ہے تو یہاں کیا کرنے آیا ہے؟"

"یہ اپنا عارف ہے نا! اس کی بھی یہاں کسی سے یاری ہے۔ وہ آج ملا نہیں دو چار دن میں مل جائے گا۔ آپ سنائیں کیا حال ہیں آپ کے۔"

"میں ٹھیک ہوں یار! بس ٹھیک ہی ہوں کوئی نئی تازہ؟"

"نہیں بس اپنے وہ دوست جو ہلاک ہو گئے تھے انکو دفنا کر ہم بھی دفن ہو گئے۔ کچھ مزہ نہیں رہا۔ مگر پھر کرنے کو تو کچھ چاہیے نا! اس لیے اب ابھر آ گئے ہیں۔"

"اللہ مالک ہے۔ کچھ نہ کچھ ہو رہے گا۔ یہ اپنے عارف صاحب کہاں رہتے ہیں؟"

"یہ تو میرے ساتھ لاہور سے آئے ہیں۔ ان کا بہت بڑا کاروبار تھا مگر وہ سارا تباہ ہو گیا۔ کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گئے ہیں اب یہ بھی اپنے ساتھ مل کر یہی دھندا اختیار کرنا چاہتے ہیں۔"

"نہیں یار! یہ کوئی دھندا ہے۔ کوئی اور کام سکھا دیں انھیں کیوں عارف صاحب؟"

"نہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہی کام ان کے لیے بہت اچھا رہے گا۔ آپ سنائیں کیا حال ہیں آپ کے۔ کچھ آپ موٹے نہیں ہو گئے ہو؟"

"نہیں! موٹا تو نہیں پتلا ہو گیا ہوں مگر یہ قصہ کیا ہے۔ کوئی خاص اسامی ہے جس کے پیچھے تم یہاں آئے ہو؟"

"تھی تو ایک اسامی ہی مگر وہ ہوائی جہاز میں جا بیٹھی۔ بہت روپیہ تھا اس کے پاس مگر وہ تباہ ہو گیا" تاہیے نے بڑے افسوس ناک لہجے میں کہا۔

"کوئی کام ہو تو مجھے بتاؤ۔ میں شاید تمھارے کام آ سکوں۔" میں نے اسے ٹٹولتے ہوئے کہا۔

"ہاں کام تو ہے۔ مگر یہ کوئی اچھی جگہ نہیں کہیں الگ جا کر بیٹھتے ہیں۔"

"یہ بہت اچھی جگہ ہے۔ تم بات کرو۔ ہر آدمی یہاں اپنی جگہ مست ہے۔" میں نے کرسی پر پھیل کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ سگریٹ میں نے جلا کر ہاتھ میں اس طرح پکڑ لیا تھا کہ وہ حقہ معلوم ہوتا تھا۔ تاہیا اور اس کا دوست عارف ابھی تک کسی گہری سوچ میں تھے۔

"یہ تمھارے دونوں دوست مجھے دیکھتے ہی نکل گئے۔ ایسا کیا کام تھا انھیں؟"

"پتہ نہیں! دراصل انھیں اپنی ہی ایک اسامی کا پتہ کرنا تھا۔ وہ بھی دراصل اس کے پیچھے بہت دور سے لگے ہوئے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے لمبا سا پائپ نکالا اور اس میں تمباکو بھر کر پینے لگا۔ چہرہ اس نے عجیب سا بنا رکھا تھا۔ سر پر اس نے ایک نمازی قسم کی جھالر سی پہن رکھی تھی۔ میں یہی کہوں گا۔ وہ ٹوپی تو کسی طرح بھی نظر نہیں آتی تھی۔ پھر بھی وہ اسے ٹوپی کہتا تھا تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اپنی مونچھیں اس نے منڈوا رکھی تھیں گلے میں قمیص ایسی تھی جو زانو تک نیچے جاتی تھی اور شلوار وہ ایسی پہنے ہوئے تھا جو گھٹنے تک ہی رہتی تھی۔ ایک طرح سے وہ پکا نمازی بنا ہوا تھا۔ عارف صاحب بھی اسی کے مسلک کی پیروی کرتے تھے اور اسی قسم کے کپڑے پہنے ہوئے تھے مگر اتنا ضرور تھا کہ ان صاحب نے شلوار جو پہن رکھی تھی وہ ذرا گھٹنے سے نیچے جاتی تھی۔

سامان نام کی کوئی شے ان کے پاس نہیں تھی۔ اور مجھے وہ کسی بھی طرح وہ تاہیا نظر نہیں آتا تھا جس سے میں لاہور میں مل چکا تھا۔ پھر بھی وہ میرے آبی کا دوست اور مجھے عزیز تھا۔

جب وہ پائپ بھر کر سلگا چکا تو عارف صاحب کو آنکھ مار کر بولا "کیا خیال ہے عارف صاحب! یہ آبی کے دوست ہیں اور مجھے تو وہ کئی دنوں سے ملا ہی نہیں ہے۔"

"وہ بھی مل جائے گا۔ جلدی ہی تم سے اس کی ملاقات ہو گی وہ کام بتاؤ مجھے۔" میں نے سگریٹ کا گل زمین پر پھینکتے ہوئے کہا۔

"معاملہ یہ ہے حضرت! کہ یہاں سے ایک لڑکی اٹھانی ہے۔ اپنے دس لاکھ روپے کے ساتھ۔" عارف نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب؟ یعنی یہ بھی کوئی کام ہے آپ لوگوں کی نظر میں۔ کہاں ہے وہ لڑکی؟"

"وہ ادھر ہی ہے، ناظم آباد میں رہتی ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ کام آپ بہتر طریقے سے کر سکتے ہیں۔"

"پر وہ ہے کون؟ قصہ کیا ہے یہ؟"

"قصہ یہ ہے کہ اپنے ان عارف صاحب کا اس پر بہت دنوں سے دل آیا ہوا ہے ایسے ہی بس جیسے آ جاتا ہے۔ اس کو یہ بڑی لمبی رقمیں کھلاتے رہے ہیں۔ یوں سمجھیں کہ یہ اسے دس لاکھ روپیہ کھلا چکے ہیں اب وہ کسی اور سے شادی کرنا چاہتی ہے بس یہ معاملہ ہے۔"

"لعنت بھیج یار! کوئی کام کی بات بتا۔ کمال کرتا ہے تو۔ یعنی یہ کوئی بات تو نہ ہوئی نا۔" میں نے سگریٹ نیچے گرا کر مسل دیا۔

"حد ہو گئی۔ یعنی یہ کوئی بات ہی نہ ہوئی آپ کے لیے، اور ان کی جان ہوا ہوئی جاتی ہے۔"

"خیر دیکھیں گے۔ کل کو کوئی بات سوچیں گے۔ ابھی تو میرے ساتھ چل میں تجھے آبی سے ملوانا چاہتا ہوں۔"

"ہاں! یہ تو بہت اچھی بات ہے آپ بہرحال یہ کام ضرور کر دیں۔"

"کر دیں گے، کر دیں گے، تو کیوں خواہ مخواہ پریشان ہو رہا ہے۔ ان سے تو اب رخصت ہو لے۔"

"ہاں! یہ تو ہو گا ہی۔ میں کل شام کو آپ سے ملوں گا۔ عارف صاحب! بس بے فکر رہیں۔"

"ٹھیک ہے حضور! میں کل شام کو چھ بجے آپ کا انتظار کروں گا۔" یہ کہہ کر وہ آدمی وہاں سے اٹھ گیا۔ اور تیز تیز قدم اٹھاتا وہاں سے باہر نکل گیا۔

میں نے تاہیے کو پکڑ لیا۔ "یہ تو کیا کر رہا ہے یار! آدمی ہے کہ

مصیبت! چھوڑ ان باتوں کو۔"

"مگر حضرت! یہ تو میرے لیے بڑی جان مارتا ہے۔"

"بالکل بے کار آدمی ہے یہ۔ تو ان گھس چڑوں میں کہاں پھنس گیا۔ کمال ہو گیا ہے۔ تو تاہیا ہے میرے یار تاہیا تیرے تو ادھر بڑے رعب تھے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے پیارے مگر میرے یار میرے ساتھ نہیں ہے میں اکیلا کہاں پریشان ہوتا مجھے مجبوراً ان جیسے لوگوں کے ساتھ پھرنا پڑ رہا ہے۔"

"پاگل ہے تو! یہ کوئی تیرے ڈھب کے آدمی نہیں ہیں کہاں تو کہاں یہ لوگ۔ ذرا سوچ کہ تو کیا سے کیا بن گیا ہے۔"

تاہیا میری یہ بات سن کر بہت ہی آزردہ ہو گیا۔

"تجھے معلوم ہے کہ تیری اپنی ایک بیوی ہے دو بچے ہیں۔ تجھے آبی نے اپنی والدہ کے ساتھ کیا تھا تجھے یاد ہو گا۔ وہ تو تجھ سے اپنی والدہ کا پتہ پوچھے گا۔"

"ان کو میں اپنے گاؤں چھوڑ آیا ہوں۔ آبی کی والدہ کو میں نے اس کے گھر پہنچا دیا تھا وہ بہت پریشان تھی یہی بہتر سمجھا کہ میں اس کو گھر پہنچا دوں۔"

"چلیں یہ تو اچھا ہوا۔ تجھے وہ دونوں دوست بھی یاد آتے ہوں گے، ان کو تو نے دوستی کا حق ادا کرتے ہوئے بڑی رقم بھی پہنچا دی ہو گی۔ مگر تیرا کیا بنے گا۔ ان لونڈوں لپاڑوں سے تو تیرا کام نہیں چلے گا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر مجبوری یہ ہے کہ ان سے بھی مجھے دو پیسے ملنے کی امید ہے۔"

"دفع کر یار! میرے ساتھ چل۔ تجھے میں آبی سے ملواتا ہوں آ ذرا۔" یہ کہہ کر میں نے جگہ چھوڑ دی اور ہوٹل کا بل ادا کر کے میں نے ایک ٹیکسی پکڑی اور اسے اپنے ساتھ بٹھا لیا۔

"میاں ذرا ہمیں طارق روڈ پر لے چلو۔" میں نے ڈرائیور سے کہا اور تاہیے سے میں اس کی اپنی آپ بیتی سننے لگا۔ معلوم یہ ہوا کہ جب اس کے دوست اس کا ساتھ چھوڑ گئے تو کئی معاملوں میں اس نے براہ راست ہاتھ ڈالا۔ کہیں سے اسے دو ہزار ملا کہیں سے چار ہزار مگر اس سے زیادہ رقم اسے ہاتھ نہیں آئی۔ اس عرصے میں دو چار ماہ کے لیے جیل بھی چلا گیا تھا۔ وہاں سے جب وہ واپس آیا تو پھر بیکاری اس کا مشغلہ بن گئی۔ آدمی کے دوست اس کے ہاتھ سے نکل جائیں تو پھر کچھ بھی پلے نہیں رہتا ہے۔ کچھ ایسا ہی حال اس کا تھا۔ ابھی ہم طارق روڈ کی طرف چلے ہی تھے کہ ایک جگہ وہ تینوں آدمی جو تاہیا کے ساتھ تھے ایک ٹیکسی کو روکے کھڑے تھے۔ ٹیکسی کے اندر ایک گل بہار قسم کی عورت بیٹھی تھی اور ڈرائیور ایک دم پاگل ہوا

جاتا تھا۔ تینوں آدمی ٹیکسی کے اندر جا بیٹھے تھے۔ ہم نے ٹیکسی وہاں روکی تو ڈرائیور بولا "یہ کیا بدماشی ہے۔ میں نہیں جانتا ہے کسی طرف۔"

"چل باؤ تیرے لیے یہی بہتر ہے۔" عارف اور وضاحت پچھلی سیٹ پر جا بیٹھے تھے اور مقصود اگلی نشست پر۔ ہم نے گاڑی وہاں روکی اور اُتر کر اس ٹیکسی کے گرد ہو گئے۔ کئی اور آدمی بھی وہاں جمع ہو گئے تھے۔

"یہ کیا قصہ ہے جناب خیر تو ہے۔" تاہیبے نے انھیں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

اتنے میں وہ عورت دائیں ہاتھ سے ٹیکسی پر سے اُتر گئی اور تیز تیز قدم چلنے لگی عارف نے اُسے دو قدم آگے جا کر پکڑ لیا۔

"تمھیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ یہ میری بیوی ہے اور مجھ سے بات ہی نہیں کرتی چل میرے ساتھ۔" اس نے ایک نظر میری طرف دیکھ کر کہا۔

"یہ بالکل بکواس ہے میں تمھیں بالکل نہیں جانتی۔ مجھے جانے دو۔ میں کسی کے ساتھ نہیں جانا چاہتی۔"

اتنے میں مقصود اور وضاحت تیزی سے آگے نکلے اور ان لوگوں نے اُسے --- ٹیکسی میں ڈال لیا۔ عارف بولا "چل میاں! دیکھتا ہوں یہ کیا کرتی ہے چلو۔" یہ کہہ کر اس نے جیب سے خنجر نکال لیا، بولا۔ "چل۔ میں کہتا ہوں نکل چل یہاں سے۔"

اس ڈرائیور نے مجبوراً گاڑی چلا دی تو مجھے اس قصّے میں پہلی بار عجیب طرح کی دلچسپی محسوس ہوئی۔

"اوئے تاہیبے! میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ یہ معاملہ کیا ہے۔" میں نے یہ کہہ کر تاہیبے کو اپنے ساتھ ٹیکسی میں بٹھایا تو وہ ڈرائیور ذرا دیر کے لیے رُکا، بولا "کیا ان کے ساتھ جانا ضروری ہے؟"

"ہاں ہاں۔ ذرا چلو میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ یہ معاملہ کیا ہے۔"

"ٹھیک ہے صاحب۔" یہ کہہ کر اس نے گاڑی چلا دی ــ گاڑیاں آجا رہی تھیں۔ وہ لوگ جو وہاں جمع تھے آہستہ آہستہ وہاں سے کھسکنے لگے۔ ہم اس کوشش میں تھے کہ وہ گاڑی ہماری نظر سے دُور نہ ہو۔ کچھ ایسی ہی مشکِ ختن ایسی خوشبو تھی اس میں کہ مجھے یہ معلوم کرکے دلی خوشی ہوتی کہ وہ تھی کون؟ اور ان تینوں آدمیوں بلکہ ان چاروں آدمیوں سے اس کا کیا تعلق تھا۔ ذرا دیر کے لیے وہ میری نظر میں کھب کر رہ گئی تھی۔ تاہیبا بھی سخت پریشان تھا، اسے یہ امید نہیں تھی کہ وہ تینوں ہمیں وہاں یوں ٹیکسی والے سے لڑتے دکھائی دیں گے اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ میرے ساتھ کیا جھوٹ بولے۔ اس نے وہاں بہت زیادہ ہی دروغ گوئی سے کام لیا تھا۔ ایسا دروغ گوئی کا کام جس کی کوئی کل سیدھی نہیں ہوتی۔

ابھی ہم ایک ہی میل چلے ہوں گے کہ وہ گاڑی دائیں ہاتھ مڑی۔ اُن کے پیچھے ہم بھی لپکے چلے آرہے تھے مگر عین اس وقت ہماری گاڑی کا پہیہ پنکچر ہو گیا۔ اڑا اڑا دھم۔ سب کچھ ہی غرق ہو کر رہ گیا تھا۔

"ارے یہ کیا ہو گیا بھائی کچھ تو خیال کیا ہوتا۔" ہم نے گاڑی سے نکل کر کہا۔

"آپ دوسری گاڑی میں بیٹھ جائیں۔" ڈرائیور نے نیچے دیکھ کر کہا۔ ہم نے دائیں بائیں بہت دیکھا مگر کوئی بھی ٹیکسی ہمیں نہیں مل رہی تھی اور وہ گاڑی ہم سے بہت آگے نکل چکی تھی۔

مجھے اس ٹیکسی کو ہاتھ سے جاتا دیکھ کر سخت طیش آرہا تھا مگر میں مجبور تھا۔ ہمیں جو گاڑی ملی وہ کوئی دس منٹ بعد ملی۔ اس میں بیٹھ کر ہم نے بہت زیادہ کوشش کی، بہت خاک چھانی مگر ان لوگوں کا پتہ ہمیں نہیں مل سکا۔ ناچار ہو کر ہم نے گاڑی طارق روڈ کی طرف موڑ دی۔

"میری سمجھ میں تو یہ بات نہیں آتی ہے تاہیبے ــ یا تو تو اُن کے بارے میں جھوٹ بول رہا ہے یا پھر میں ہی پاگل ہوں۔"

"نہیں یار! ایسی بات نہ کہیں۔ میں نے آپ سے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔"

"بولا ہے۔ یہی کہ میں اُن کو کوئی کام سکھا دوں۔ یہی کہ میں اُن کی بات پر یقین کر لوں کہ یہ بہت بڑے آدمی تھے۔ کیسی باتیں کرتا ہے تو۔"

"مجھے وہ یہی بتاتے تھے۔ سو میں نے آپ کو وہی بتا دیا۔ کیا لینا ہے مجھے جھوٹ بول کر۔"

"ٹھیک ہے۔ آج رات تُو اطمینان سے سو نہیں سکے گا۔ یہ رات تجھ پر بہت بھاری ہوگی۔"

"کیا مطلب ہے آپ کا؟"

"ہاں کچھ ایسی ہی بات ہے، دیکھتا رہ۔" یہ کہہ کر میں نے گاڑی سے باہر نظر ٹھہرا دی۔ ہوا میں نمی بڑھتی جا رہی تھی اور آسمان گدلا گدلا ہونے لگا تھا۔

طارق روڈ پر پہنچ کر میں نے اُسے اپنے ساتھ لیا اور فردوسی کے دروازے پر جا ٹھہرا۔

"یہاں کون رہتا ہے؟" تاہیبے نے پوچھا۔ اس کا ذہن یہ باور کرنے کو تیار نہیں تھا کہ میں کسی اچھی جگہ پر رہ رہا ہوں۔

کچھ ہی دیر بعد دروازہ کھل گیا میرے سامنے فردوسی بیگم تھی۔ وہ اُس وقت رات کا لباس پہنے ہوئے تھی، بولی۔ "کون

ہے آپ کے ساتھ؟"

"یہ میرے دوست ہیں۔ آپ اپنے کمرے میں چلی جائیں۔"

"ٹھیک ہے۔ کھانا میں نے تیار کرکے رکھ دیا ہے۔" یہ کہہ کر وہ پیچھے پلٹ گئی۔

میں نے دروازہ بند کیا اور آبی کے کمرے کی طرف چل دیا۔ تاہیبا میرے ساتھ ہی تھا مگر ہر شے کو بڑے غور سے دیکھتا آرہا تھا۔ میں نے دروازہ کھولا تو آبی اس وقت دوسری طرف منہ کرکے لیٹا ہوا تھا۔ ہمیں کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر اُس نے سر اُلٹ دیا۔ اور ـــ اور ـــ میرے خدایا! تاہیبے کی جو حالت ہوئی، میں بیان نہیں کر سکتا۔ وہ پاگلوں کی طرح اس کی طرف دوڑا۔ "یہ ـــ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں آبی! یہ تیرے ساتھ کیا ہو گیا۔"

"اچھا تو ہے تاہیبے! تو یہاں کیسے آیا؟"

"یہ مجھے بھائی صاحب مل گئے تھے، پر یہ تیرا حال کیسے خراب ہو گیا ہے۔"

"یہ بہت لمبی کہانی ہے۔ کسی وقت سناؤں گا، تم میری والدہ کا حال بتاؤ۔ وہ کیسی ہیں؟"

"وہ تو اپنے گھر میں ہیں، میں انھیں گاؤں چھوڑ آیا تھا۔ بڑے اطمینان سے ہیں وہاں۔"

"ہاں۔ یہی بہتر تھا۔ پر یار تُو آخر یہاں کیسے آیا؟ بیٹھ نا ادھر۔" وہ بستر سے ذرا دُور ہو گیا۔ تاہیبے کے لیے اس نے جگہ بنا دی تھی۔

"ایسے ہی یار میں ایک کام سے یہاں آیا تھا۔ یہ پتہ نہیں تھا، کہ تیرے ساتھ یہ حال ہو چکا ہے۔"

"بس تقدیر کے چکر ہیں، آدمی کو برداشت تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ ادھر کھانا رکھا ہے یار، وہ کھا لو۔"

"ہاں! میں دیکھ رہا ہوں۔ تمھارا یار تاہیبا آیا ہے۔ لاہور میں تو اس کے نام کا ڈنکہ بجتا تھا، اب یہ یہاں آگیا ہے۔"

"ہاں اچھا ہے، بہت اچھا ہے کسی دھندے سے لگا دے اسے بہت اچھا آدمی ہے یہ۔"

"ہاں کچھ کرنا ہی ہوگا۔ آؤ تاہیبے کھانا کھا لو۔" یہ کہہ کر میں نے میز پر رکھا کھانا کھول دیا۔ غمزہ خانم نے تمام ہی اچھی چیزیں پکائی تھیں۔

کھانے کے دوران آبی بولا "تم نے اسے بتایا نہیں کہ میرے ساتھ کیسا واقعہ پیش آچکا ہے۔"

"نہیں! بتانے کی ضرورت بھی نہیں۔ اُن لوگوں کو یہ جانتا تک نہیں ہے۔"

"پر یار! تو آدمی کچھ گڑبڑ ہے، اسے بتا دیا ہوتا۔"

"بتا دیں گے یار! پہلے تُو اچھا تو ہوئے۔"

"میں کیسے اچھا ہو سکتا ہوں پیارے۔ بہت سی باتیں ناممکن ہیں ــ مجھے تو زندگی بھر اس اندھیرے میں رہنا ہوگا۔"

"نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ بالکل ایسا نہیں ہوگا۔ کسی دشمن نے اس کی آنکھیں نکال لی ہیں تاہیبے! اور خدا ہی جانتا ہے کہ اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔"

"اچھا! یہ کمال کر دیا ہے اس دشمن نے! کون ہے وہ؟ کیا نام ہے اُس کا؟"

وہ سب لوگ آج کل واشنگٹن چلے گئے ہیں، امریکہ۔ مگر اُن کے کچھ لوگ یہاں موجود ہیں۔"

"حد ہے۔ یہ ـــ یہ میں کیسے یقین کر لوں۔ تم سے بھی وہ ـــ؟"

"ہاں! ہم سے بھی وہ یہ ہاتھ کر گئے۔ اور آج میں تمھیں وہاں لے جاؤں گا جہاں اُن کا ایک آدمی رہتا ہے۔"

"میں تمھارے ساتھ چلوں گا، دیکھتا ہوں وہ کون لوگ ہیں۔ میں ـــ میں انھیں معاف نہیں کروں گا، وہ ایسے ذلیل آدمی ہیں۔"

"ہاں! کچھ زیادہ ہی۔ بہرحال آج ہم وہاں ضرور جائیں گے۔"

کھانا ختم ہو گیا تو میں نے اٹھ کر وہ تمام برتن الگ رکھ دیے۔ تاہیبا ہم سے پوچھتا رہا کہ وہ کون لوگ تھے، ساری بات ہم اسے بتا چکے تو وہ بولا "میں ـــ میں سوات خان کو سات تالوں میں سے باہر نکال لوں گا، اٹھو میرے ساتھ۔"

"ہاں چلتے ہیں۔ اب تو تمھیں کوئی دقت نہیں ہے۔"

"نہیں یار! دقت کی چیز تو نکل ہی گئی ہے۔ اب تو یہاں ٹھنڈ ہی ٹھنڈ ہے باقی تو کچھ بھی نہیں بچا۔"

"ہاں! تیرے لیے واقعی بڑا کٹھن کام ہے بہرحال بے فکر رہ۔ کچھ نہ کچھ میں تیرے لیے ضرور کروں گا۔"

چند ساعتوں تک ہم وہاں بیٹھے سگریٹ پیتے رہے۔ آبی نے یوں کیا تھا کہ جب سے اس کی آنکھیں ختم ہوئی تھیں اس نے سگریٹ پینا چھوڑ دیا تھا۔ بہت پریشان تھا وہ۔ اور میں سوچتا تھا کہ وہ دن کب آئے گا جب وہ اپنے لبوں سے لگا کر سگریٹ مجھے دیا کرے گا۔ وہ ایسا نٹل تھا، ایسا بے یار و مددگار کہ کوئی اس کی نہیں سنتا تھا۔ اور جو سنتا تھا اس کی بات کا وہ اعتبار نہیں کرتا تھا۔ وہ ایسا پینسل بن چکا تھا جو کسی بھی طرح خود کو آدمی کی صورت میں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اور مجھے اس کی یہی بات سب سے زیادہ ناپسند تھی۔ وہ کچھ کہتا ہی نہیں تھا۔ کیوں نہیں کہتا تھا یہ تو کوئی اس کے دل سے پوچھے۔ مگر وہ مجھے صرف ایک مریض نظر آتا تھا۔ ایسا مریض، جس کے لیے مجھے سارے جہان کے دیدے اکھاڑنے پڑیں تو میں اکھاڑ دیتا۔ کوئی اس جیسا دوست کہاں مل سکتا ہے۔

رات کے ساڑھے بارہ بجے تو میں نے اس کا بستر چھوڑ دیا۔

"آؤ تاہیے! مجھے اس سوات خان کی تلاش ہے۔ آؤ۔"

"ہاں۔ اُسے تو ضرور پکڑنا چاہیئے ہر قیمت پر۔" وہ میرے ساتھ ہو لیا۔ آپی نے اپنے بستر سے اُٹھ کر باری باری ہماری کمر پر ہاتھ پھیرا جیسے وہ ہمارے وجود سے خود کو آشنا کر رہا ہو۔ اس کو شاید یقین تھا کہ ہم پھر لوٹ کر اس کی طرف نہیں آئیں گے۔ وہ یہی کہہ رہا تھا۔ "ذرا احتیاط سے کام کرنا پیارے۔ تم آدمی ہو بہت گڑبڑ والے بہت سمجھ داری سے کام لینا ہوگا تمھیں۔"

"فکر نہ کرو۔ انشاءاللہ ہم دو گھنٹے بعد واپس آجائیں گے۔" میں نے اُسے اطمینان سے پلنگ پر بٹھلاتے ہوئے کہا۔ "پریشان نہ ہو۔ تمھاری یہ پٹیاں بس چند دن کی محتاج ہیں۔ پھر تم اطمینان سے دیکھ سکو گے۔"

"ٹھیک ہے یار! مجھے تمھاری ہی فکر لگی ہے اپنا تو بیڑا ہی پار ہو چکا ہے۔ وہ کہاں ہے وہ غمزہ خانم اُسے بلواؤ ذرا۔"

"کیوں تنگ کرتے ہو اسے۔ خواہ مخواہ بد دعا دے گی اور کسی کی بد دُعا نہیں لینی چاہیے۔ ایک تو ویسے ہی ہم اس کے مکان پر قابض ہیں۔ اُوپر سے وہ آدمی رات کو تیرے پاس آتے گی۔ ہائیں! کیا خیال ہے تیرا؟"

"اچھا ٹھیک ہے۔ خدا حافظ۔" آپی نے پریشان ہو کر کہا۔ اس کا دل نہیں مانتا تھا کہ وہ مجھے اس وقت وہاں سے رخصت کرے۔ اور تاہیا تو اسے دیکھ دیکھ کر پریشان ہو رہا تھا۔ اس نے کبھی کسی کو اس حال میں تو نہیں دیکھا تھا۔ آدمی زخمی ہو جاتا ہے، اس کو کسی دشمن کا تیر لگ جاتا ہے تو وہ اس کا علاج کروا لیتے ہیں۔ علاج نہیں ہوتا تو وہ جانبر نہیں ہو سکتا۔ مر ہی جاتا ہے نا۔ یُوں آدمی کو کسی نے آدھا اِدھر اور آدھا اُدھر لٹکا کر نہیں رکھا ہوتا۔ مگر اس ڈاکٹر دھمن کا شکار نہ اس طرف رہتا ہے نہ اس طرف۔ عین بیچ میں لٹک کر وہ زندگی گزارتا تھا۔ اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ آپی کی بھی یہی حالت تھی۔ تاہیے کے وہ دوست مر گئے تھے تو مر ہی گئے تھے نا۔ کسی کو یہ احساس تو نہیں تھا کہ وہ بے علاج مر گئے۔ اور بھی اُس کے ایسے کئی دوست عزیز تھے۔ وہ بھی یا تو جان سے چلے گئے تھے یا پھر بچ گئے تھے مگر آپی کی آنکھیں ہی ختم ہو گئی تھیں۔ اُن آنکھوں سے وہ کیا کچھ نہیں دیکھتا تھا۔ اس نے بڑے معرکے سر کیے تھے اور پھر وہ دو عورتوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ یوں کہ اس کے سینگوں سے وہ کبھی نیچے نہیں اُتر سکا۔ میں اس کو یہی سمجھانا چاہتا تھا مگر اس نے میری بات کبھی مان کر دی ہوتی تو یہ بھی مانتا۔

بازار میں پہنچ کر ہم نے گولیار کے لیے ٹیکسی لی۔ وہ جگہ میں دیکھ آیا تھا۔ وہاں تک پہنچنا تو کچھ بھی مشکل نہیں تھا۔ تاہیا پچھلی سیٹ پر میرے ساتھ بیٹھا تو بولا۔ "وہ جگہ معلوم ہے آپ کو؟"

"ہاں۔ لو تم سگریٹ پیو اور اس بات کو دھیان میں رکھو کہ ہمیں آج اس شخص کا تیا پانچا کر دینا ہے، بہت پچتا رہا ہے وہ ہم سے۔"

"سگریٹ تو اچھا ہے لائیں ذرا۔ کچھ گولیاں شولیاں بھی ہیں آپ کے پاس؟"

"ہاں! میرا سامان میرے ساتھ ہی رہتا ہے۔"

"یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں، یہ چیز!" تاہیے نے سامنے کی سیٹ کے پیچھے سے ایک بڑا سا پلاسٹک کا لفافہ نکال کر مجھے دکھاتے ہوئے کہا۔ آواز اس نے دبا لی۔

"اوئے، یہ... یہ تو ... دکھائی دیتا ہے، دکھا ذرا۔" میں نے اس سے لفافہ لے کر کھولتے ہوئے کہا۔

"ارے! اس میں تو یہ نوٹ ہیں اور یہ زیور بھی، یہ کیا معاملہ ہے بھئی!"

"لا ذرا مجھے دکھا۔ یہ تو گڑبڑ لگتی ہے مجھے۔" اس نے وہ نوٹ اور زیور دیکھ لیے تو بولا۔ "کیا خیال ہے ڈرائیور کو بتا دیں؟"

"نہیں یار، دفع کر، اس کو سنبھال کر رکھ تیرے کام آئے گا۔"

"نہیں بھائی! یہ گڑبڑ نہ کرو۔ میں اس کو بتا دیتا ہوں۔"

"پھر وہی بکواس! ابے یہ ایمانداری رہنے دے سنبھال کر رکھ لے اس کو۔"

"تم مجھے بے ایمانی سکھا رہے ہو، ہائیں۔ پتہ نہیں کس کا ہے یہ میں ڈرائیور کو بتاتا ہوں۔"

"بھائی ڈرائیور! یہ تیرے خانے میں کیا چیز ہے یہ پلاسٹک کا تھیلا؟ اس میں تو بہت مال ہے پیارے۔" تاہیے نے ڈرائیور سے کہہ ہی دیا۔

"یہ۔ اچھا؟ کمال ہے۔ مجھے بتائیں تو کیا ہے اس میں؟"

ڈرائیور نے گاڑی سڑک کے ایک کنارے کھڑی کر دی۔

"یہ دیکھ نا! یہ کوئی چالیس ہزار روپے ہیں اور یہ زیوروں کا ڈبہ بھی موجود ہے۔" تاہیے نے لفافہ اسے دکھاتے ہوئے کہا۔

"ہوں! تو۔۔۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی سواری یہاں یہ سامان چھوڑ گئی ہے۔ مجھے دے دیں میں اسے تھانے پہنچا دوں گا۔"

"جی نہیں! ایسی گڑبڑ نہیں ہوگی۔ آپ یوں کریں کہ اس سواری کو یاد کریں جس کے پاس یہ سامان تھا۔"

"پتہ نہیں! کون سواری تھی وہ! تھانے والے ہی پتہ کر سکتے ہیں۔"

"یوں کام نہیں چلے گا بھائی جی! اور پولیس سے ہمیں کیا لینا ہے۔ وہ تو اپنے ہی سپاہی "میں یہ رقم رکھ لیں گے۔" تاہیے نے پریشان ہو کر کہا۔ بات تو وہ کر بیٹھا تھا مگر اب اس کے اثرات

اس کے لیے مصیبت بن رہے تھے۔ میری طرف اس نے بڑے غور سے دیکھ کر کہا۔ "کچھ سوچو بھائی جی! یہ کسی غریب کی رقم ہے۔ وہ یہاں چھوڑ گیا ہے۔"

"اوئے بکواس نہ کر تم۔ یہ لفافہ مجھے دے دو یہ میرا لفافہ ہے۔" میں نے تاہیے سے لفافہ لے کر اپنی ران کے نیچے رکھ لیا۔

"چل اوئے آگے نکل بے وقوف سمجھتے ہیں میں پاگل ہوں۔ نکل چل۔"

"نہیں نہیں جناب بھائی جی! میں تو یہ رقم پولیس کے حوالے کروں گا۔" ڈرائیور اکڑ گیا۔ اس نے ہمیں صاف سیدھا پولیس کا "ہوّا" دکھا دیا تھا۔

"یہ بکواس کرتا ہے بھائی جی! یہ آدمی میرے ساتھ مذاق کر رہا ہے۔ کس کا لفافہ اور کیسی پولیس۔ میں اسے خود بازار سے لے کر آیا ہوں۔ یہ دیکھو اس میں بازار کی رسید ہے۔" یہ کہہ کر میں نے زیورات کے ڈبے میں ہاتھ ڈال کر رسید اس کو دکھا دی۔ وہ کچھ گھبرا سا گیا مگر میں اس رسید کو پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔

"میرا نام علی احمد ہے آج ہی یہ چیزیں بازار سے خرید کر لایا ہوں۔ اس کا دماغ خراب ہے خواہ مخواہ اس نے آپ سے مذاق کر دیا۔" میں نے تاہیے کا ہاتھ پوری طرح دبا دیا۔ وہ تاہیا بالکل ہی پاگل ہو رہا تھا۔ حالانکہ اسے پیسے کی ضرورت تھی۔ بے حد ضرورت تھی۔ مگر وہ اس گھڑی اپنی اس ضرورت کو بھی نظر انداز کر رہا تھا۔ اور وجہ اس کی میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ آدمی دراصل اندر سے کچھ ہوتا ہے اور ظاہر کچھ کرتا ہے۔ تاہیے کو بھی یہ احساس تھا کہ وہ رقم ہماری نہیں ہے۔ اس کے اندر بھی یہ دُکھ جاگ چکا تھا کہ جس کسی کی بھی وہ رقم ہے وہ اس کے غم میں پریشان ہو رہا ہوگا۔ تاہیا اسی لیے بہت غم میں تھا۔ مگر اس کو نہیں معلوم تھا کہ وہ اس رقم کا کیا کرے۔ ڈرائیور سے بات کر کے اس نے خواہ مخواہ کی پریشانی پیدا کر لی تھی۔ وہ بھی اس میں حصے دار بن رہا تھا۔

جب اس رقم کو میں نے ران تلے دبا لیا تو ڈرائیور بولا۔ "یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

"ابے میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ یہ ایسے ہی مذاق کر رہا ہے تجھ سے۔ چل گاڑی چلا۔ تیری سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا۔"

"آپ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہوں گے۔ پر یہ بندے مجھے پاگل تو نظر نہیں آتے۔"

"یہ ہو جاتا ہے کبھی کبھی۔ دماغ اس کا آؤٹ ہو جاتا ہے۔ دوپہر میں بھی اس نے میرے ساتھ یہی ہاتھ کیا۔ بہرحال تو جلدی کر ہمیں دیر ہو رہی ہے۔"

"ٹھیک ہے صاحب، ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر اس نے گاڑی اسٹارٹ

کردی۔

تاہیا میرے کان کے قریب منہ لاکر بولا۔ "یار آپ نے یہ اچھا نہیں کیا۔"

"بک نئیں اوئے! تیری وجہ سے خواہ مخواہ ڈرائیور سے چکر چل گیا ہے۔ حد ہوگئی ہے تیرے مذاق کی۔"

میں نے پلاسٹک کے تھیلے سے دونوں چیزیں نکال کر اپنی جیبوں میں رکھ لیں، رسید سمیت۔ اور لفافہ تہہ کر کے ٹیکسی کے پچھلے خانے میں ڈال دیا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم گولیمار جا اترے۔ ٹیکسی والا ابھی تک ہم سے سخت ناراض تھا۔ اس کا ذہن اس بات کو قبول نہیں کرتا تھا کہ ہم نے اتنی تیزی سے اس کے سامنے دو جھوٹ بولے ہیں۔ بہر حال میری باتوں کا اس پر اچھا اثر ہوا تھا۔ بولا۔ "آپ کے دوست نے تو کمال ہی کر دیا ہے۔ ان کے مذاق کا آپ کب سے نشانہ بن رہے ہیں؟"

"ایسے ہی پاگل ہے یہ۔ یہ لو تم کرایہ اور جان چھوڑو ہماری۔ لو۔"

یہ کہہ کر میں نے اس کو پچاس کا نوٹ دیا تو وہ بولا۔ "میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔"

"تو دفع کرو۔ یہ سارے کا سارا رکھ لو۔ آؤ یار! اس سے کیا بات کریں تیری طرح یہ بھی پاگل ہی ہے۔" یہ کہہ کر میں نے تاہیے کو ٹیکسی میں سے اُتارا اور اپنے ساتھ لے کر گولیمار کے اس علاقے میں جا گھسا، جہاں وہ سوات خان ٹھہرا ہوا تھا۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات
چوتھے حصے میں
مُلاحظہ فرمائیں
جوکہ اس حصے کے ساتھ ہی شائع ہو چکا ہے۔

جاسوسی ڈائجسٹ کا مشہور سلسلہ
گمراہ
حصہ چہارم

جبار توقیر

رات کا ایک بج رہا تھا کہ ہم نے سوات خان کے مکان کو گھیر لیا۔ یوں کہ ہم دونوں دروازے کے پاس جا ٹھہرے۔ اندر باہر چاروں طرف خاموشی طاری تھی۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہاں دو آدمی ٹھہرے ہیں۔ ایسے دو آدمی جو انسانوں کے دنوں کا پھیر بدل دیتے ہیں۔ آگ بھی اپنا آپ گھونٹ کر بیٹھی تھی۔ وہ ایسا ہی پہر تھا۔ ہر شئے اپنے وجود سے الگ ہو کر بیٹھی تھی۔

ہم نے دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ احساس تو ہمیں یہی تھا کہ وہ لوگ صحن میں سوتے ہوئے ہوں گے مگر نہیں۔ معلوم یہ ہوا کہ صحن بالکل خالی ہے اور وہ لوگ اندر کمروں میں جا سوئے تھے۔ چند لمحوں تک ہم نے دستک کے جواب کا انتظار کیا۔ مگر اندر سے کوئی آواز نہیں آئی۔

تاہیا بولا "میرا خیال ہے کہ ہم اس دیوار کو پھلانگ جاتے ہیں۔"

"ہاں ابھی کرو۔ مگر کچھ دیر انتظار کر لو۔" میں نے ارد گرد کے مکانوں پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ سارے ہی مکان اس بلاک میں یک منزلہ تھے۔ تاہیا نے ایک اور دستک دی تو مجھے صحن میں کسی کے نکلنے کی آواز سنائی دی۔ کوئی باہر آ رہا تھا۔ بات بن رہی تھی۔ میں اور تاہیا دروازے سے ہٹ کر ایک طرف ہو گئے۔

"کون ہے؟" صحن سے آواز باہر آئی۔

تاہیے کو میں نے جواب دینے پر اکسایا تو وہ بولا "میں ہوں فرید شاہ۔ سوات خان کا دوست، لاہور سے آیا ہوں۔"

"فرید شاہ؟ ہوں۔ کون فرید شاہ؟"

یہ کہہ کر کسی نے دروازہ کھول دیا۔ وہ مگسی تھا اور اب اس کا گھٹنا ٹھیک ہو چکا تھا۔ میں نے جان بوجھ کر خود کو پیچھے کر لیا مگر جیسے ہی اس نے تاہیے کو دیکھا میں نے پلٹ کر پوری قوت سے ایک زبردست جھانپڑ اس کے منہ پر دے مارا۔ مگسی دیوار سے جا ٹکرایا مگر اس میں بڑی قوت تھی۔ وہ دیوار سے جان چھڑا کر میری طرف لپکا تو تاہیے نے اسے اپنے رومال میں لپیٹ لیا۔ یوں کہ وہ رومال اس نے جیب سے نکالا اور اس کو پھیلا کر اس نے فوراً ہی مگسی کے سر اور منہ پر لپیٹ دیا۔ یوں جیسے آدمی کو بے موت مارنے کے لیے اجل نے اپنا جال پھیلا دیا ہو۔

کچھ ایسا ہی کیا تھا اس نے۔ رومال خاصا بڑا تھا اور تاہیے نے اسے خاص خاص موقعوں پر آزمانے کے لیے رکھا ہوا تھا۔ جیسے جیسے اس کی گرفت مضبوط ہوتی گئی مگسی اپنے آپ سے بے خبر ہوتا چلا گیا۔ دراصل وہ رومال اس نے خاص قسم کے کپڑے سے بنوایا ہوا تھا۔ اور صرف ان لوگوں پر اسے استعمال کرتا تھا جو سامنے سے آکر اس پر حملہ نہیں کر سکتے تھے بلکہ الٹے ہاتھ سے تاہیے کو مارنا چاہتے تھے۔ اس کا وہ رومال دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ اس میں خوبی یہ تھی کہ جیسے ہی اس کی گرفت مضبوط ہوتی تھی۔ آدمی کا اس میں سے آواز نکالنا مشکل ہو جاتا تھا۔ وہ گردن پر آکر گرہ مانگتا تھا۔ تاہیے نے یوں کیا کہ اس کی گرہ گردن پر لا کر باندھی اور بولا "چل اندر ہمیں سوات خان کے بیدار کرانے سے پہلے!" یہ کہہ کر اس نے مگسی کو دروازے کے اندر دھکیل دیا۔ بولا "یہ دروازہ بند کر دے یار! اس خبیث سے میں اب نپٹ لوں گا۔"

میں نے اطمینان سے دروازہ اندر سے بند کیا اور اسے ساتھ لے کر ہم صحن سے گزر کر کمرے میں جا پہنچے۔ وہ چھ فٹ کا جوان آدمی اس رومال کی وجہ سے بالکل ہی بے بس ہو گیا تھا۔ اس کے دماغ کی شاید شریانیں بھی اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔ رومال کا ریشہ ہی ایسا تھا کہ اس کو کچھ بھی کرنے نہیں دیتا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ کھلے تھے مگر وہ ان سے کوئی کام نہیں لے سکتا تھا۔ مجھے اپنے اناڑی پن پر بہت زیادہ افسوس ہوا۔ میں تو خواہ مخواہ ہی لوگوں کو اپنے جھانپڑے سے پریشان کر دیتا تھا۔ تاہیے نے تو کمال ہی کر دیا تھا۔

"سوات خان کہاں ہے؟" تاہیے نے پوچھا۔

مگسی نے ہاتھ کے اشارے سے ہمیں جواب دیا کہ وہ دائیں ہاتھ کے کمرے میں ہے۔ وہ منہ سے کچھ بھی نہیں بول رہا تھا۔ ہاتھ بھی وہ معمولی سا ہلا سکا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہاتھ کو حرکت دینے میں اسے بہت دقت

پیش آ رہی تھی۔

"ٹھیک ہے پیارے! تو ادھر بیٹھ۔ یہ دروازہ کھول دیں یار جی!" تابیبے نے مگسی کو بستر پر ڈالتے ہوئے کہا۔ اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ مگسی نے قطعاً کوئی مزاحمت نہیں کی۔ حالانکہ وہ اس کے بڑے جتن کا معاملہ تھا۔ اس کو سوات خان کے بچانے کے لیے بہت کچھ کرنے کی ضرورت تھی۔ اتنا زیادہ کہ وہ اس کے لیے اپنا خون بھی بہا سکتا تھا ایسے دوست کب کام آئیں گے۔ مگر تابیبے کے اس رومال نے سارا معاملہ ہی ٹھنڈا کر دیا تھا۔ مگسی پاگل ہو چکا تھا کہ وہ تابیبے کی ہر بات بے چون و چرا مانتا چلا گیا۔

میں نے آگے بڑھ کر سوات خان کا کمرہ کھول دیا۔ وہ اپنے بستر پر موجود تھا مگر وہ تنہا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ایک عورت بھی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر سوات خان کو بہت اطمینان سے جگا دیا مگر وہ پوری طرح نہیں جاگا۔

"اٹھ بھائی سوات خان! ذرا اٹھ میرا ویر۔" میں نے اپنا چپ شاہ سوات خان کی گردن پر دھر دیا۔

"اٹھ جا میرا ویر! تیرے لیے یہی بہتر ہے۔" اس نے میری یہ بات سنی تو ایک دم اپنی جگہ سے اچھل گیا۔

"یہ... کون ہو تم؟ اوہ... تو یہ تم ہو۔" اس نے مجھے حیرت زدہ سا ہو کر دیکھتے ہوئے فوراً ہی اس عورت کو جگا دیا۔ وہ بھی خوفزدہ مرغی کی طرح اپنے آپ کو لپیٹتی ہوئی اٹھی اور مجھے یوں دیکھنے لگی جیسے میں کوئی موت کا فرشتہ ہوں۔ حالت اس کی یہی ہوئی تھی۔ وہ اپنے بڑے بڑے دیدے گھماتی ہوئی بولی "یہ... یہ کیا دیکھ رہی ہوں میں؟"

"گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے بی بی! تم سو رہو۔ ابھی تمھارا وقت نہیں آیا۔ اٹھ سوات خان اٹھ۔" میں نے اس کو پاؤں کی ٹھوکر سے بستر پر سے اتارتے ہوئے کہا۔

"تم یہ بدمعاشی بند نہیں کر سکتے۔ کیا چاہتے ہو تم مجھ سے؟"

"زیادہ بک بک نہیں کرو میرے ساتھ چلو تم سے بہت ضروری کام ہے۔" میں نے کرسی کی پشت پر پڑے اس کے کپڑے اسے دکھاتے ہوئے کہا۔

"اٹھ جاؤ۔ میں کہتا ہوں۔" اب کی بار میں نے زیادہ سختی سے کہا۔ پستول کی نالی ابھی تک اس کی گردن پر تھی۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے اٹھ گیا۔ سامنے کے دروازے میں سے اسے مگسی نظر آ رہا تھا مگر اس طرح کہ وہ اسے آدمی تو نظر ہی نہیں آتا تھا۔ تابیبے نے اس کو بکری بنا دیا تھا اور اس کے رومال کی گرہ اس کے ہاتھ میں تھی جس کو اس نے مٹھی میں لے رکھا تھا۔ مجھے تابیا اس وقت بازی گر نظر آتا تھا جس نے اتنے بڑے شیر جوان کو یوں باندھ لیا تھا کہ وہ ہل نہیں سکتا تھا۔

سوات خان میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "کیا کہتے ہو اب تم کہاں لے جانا چاہتے ہو مجھے؟"

"کوئی خاص کام نہیں ہے۔ جلدی چھوڑ دوں گا تمھیں آگے نکلو۔" میں نے اس پر پستول تانتے ہوئے کہا۔ اب میں اس سے دو قدم دور تھا۔ "چلو اٹھو تابیبے اسے چھوڑ دو۔"

تابیا تو میرا خیال ہے اپنا ورد مکمل کر چکا تھا، اس نے بڑے آرام سے رومال مگسی کے سر پر سے اتارا تو وہ دھپ سے ایک بار پھر بستر پر جا پڑا۔ یوں جیسے وہ بالکل ہی خاموش ہو چکا ہے۔

"ٹھہر بھائی! تیرا تو بہت خیال رکھنا ہے ہمیں۔ یہ... یہ سر آگے کر۔" مگر سوات خان اس پر تیار نہیں تھا۔ اس پر تابیبے نے آگے بڑھ کر فوراً ہی وہ رومال سوات خان کے سر پر ڈال دیا، یوں کہ اس کی گرہ اب تابیبے کے ہاتھ میں تھی اور وہ بے بس ہو چکا تھا۔ سوات خان ایک بار پھر ہماری مٹھی میں تھا۔ تابیبے نے اس کی گرہ اپنی گرفت میں لے کر سوات خان کو کمرے سے باہر نکالا اور بولا "یہ گرہ تم پکڑ لو۔ میں اس کا بندوبست کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے رومال کی گرہ میرے ہاتھ میں دے دی۔ میں صحن میں پہنچا تو تابیا دوسرے کمرے میں جا کر اس عورت کو باندھنے لگا۔ کوئی پانچ منٹ بعد وہ واپس آ گیا۔ بولا "اس کو یوں ہی چھوڑ دینا اچھا نہیں تھا۔ لے چلو اس کو۔"

میں نے گرہ اس کے ہاتھ میں دے دی۔ اس کے رومال نے مجھے حیران کر رکھا تھا۔ سوات خان کا یہ حال تھا کہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے تھے اور پاؤں بھی مگر وہ کسی بھی طرح کچھ کرنے کے قابل نہیں تھا۔ یوں ہو گیا تھا کہ اس پر ہم کوئی بھی گر آزما سکتے تھے۔

کچھ ہی دیر بعد ہم اس کو ساتھ لے کر بڑی سڑک پر آ گئے۔ آدھ گھنٹہ ہمیں اس آپریشن میں لگا تھا۔ بڑی سڑک پر پہنچتے ہی ہم نے ایک ٹیکسی روکی اور سوات خان کو ساتھ لے کر اندر جا بیٹھے مگر جیسے ہی اس ڈرائیور نے ہمیں دیکھا وہ بلبلانے لگا، بولا "یہ... یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں صاحب! یہ کون صاحب ہیں؟"

"یہ پاگل ہو چکا ہے یار! ہم اس کو ہسپتال لے جا رہے ہیں۔ پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے اسے۔" میں نے بتایا۔

"پاگل ہو گیا ہے کیا؟ کیا کہتے ہیں آپ، معاملہ کیا ہے؟"

"زیادہ باتیں نہ کرو۔ جلدی لے چلو ہمیں۔" میری یہ بات سن کر وہ خاموش ہو گیا۔ گاڑی اس نے اسٹارٹ تو کر دی مگر دل میں وہ بہت پریشان تھا۔ ایسی سواری اس نے کہاں دیکھی تھی۔ کہ کسی نے آدمی کو رومال سے باندھ کر ڈال دیا ہو اور وہ یوں ہو گیا ہو کہ کسی سے کوئی بات ہی نہ کر سکتا ہو۔

گاڑی کی طرف ہم نے خاصا دھیان دیا کہ کہیں وہ اسے لے کر ہمیں سیدھا کسی تھانے ہی میں نہ لے جائے۔ ڈرائیور پریشان ہو تو پھر کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا سواریاں بھی اپنی جگہ نہیں پہنچ سکتی ہیں

اور گاڑی بھی ٹھکانے پر نہیں پہنچ پاتیں۔

طارق روڈ کے وسط میں سے گزار کر ہم نے سوات خان کو گاڑی سے اتار کر ڈرائیور کو کرایہ دے دیا۔ اس کی حیرت دیدنی تھی۔ مگر وہ بولا کچھ نہیں۔ کرایہ لے کر اسی وقت آگے نکل گیا۔ کراچی کا یہ فائدہ ہے کہ وہاں دن رات موٹر ملتی ہے اور کوئی کسی سے نہیں پوچھتا کہ وہ کس حال میں ہے مگر جب ایسی سواریاں ملنے لگیں تو پھر ڈرائیور بھی پریشان ہو جاتا ہے۔

سوات خان کو اسی بندھی حالت میں ساتھ لے کر ہم دونوں نے اسے غمزہ خانم کے ہاں پہنچایا۔ دروازہ اس نے اندر سے بند کر لیا تھا۔ جب میں نے دستک دی تو وہ گہری نیند میں تھی۔ تیسری دستک پر اس نے دروازہ کھولا تو وہ پریشان ہو گئی۔

"یہ... یہ کس کو اٹھا لائے ہیں آپ۔ یہ میرا گھر... آپ نے... کیا سے کیا بنا دیا ہے؟"

"مجھے افسوس ہے فردوسی بیگم! مگر صرف چند دن کے لیے مجھے یہ گھر استعمال کرنا ہو گا۔ آپ کی زحمت کا مجھے احساس ہے مگر مجبوری ہے۔"

"کمال کرتے ہیں آپ! پتہ نہیں یہ کون آدمی ہے، آخر یہ میرا گھر ہے، آپ نے اسے......"

"نہیں! کچھ اور نہ کہیں۔ براہِ کرم کچھ اور نہ کہیں، مجھے معلوم ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔" یہ کہہ کر میں نے سوات خان کو تابیبے کی مدد سے فلیٹ کے ڈرائنگ روم میں پہنچا دیا۔ تابیبے کو میں نے سوات خان کے رومال کی گرہ دے دی تو فردوسی بیگم بھی وہیں تھی، بولی "اسے ہوا کیا ہے، کیا کر دیا ہے اس نے؟"

"اس نے نہیں ہم نے اس کو باندھ لیا ہے، یہ اسی قابل تھا۔ آئیں، میں آپ کو بتاتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں غمزہ خانم کو دوسرے کمرے میں لے گیا۔ وہ نیند میں دھت تھی جب وہ اٹھ کر ہماری طرف لپکی۔ مگر اب نیند اس کی آنکھوں سے اڑ چکی تھی اور وہ سخت پریشان تھی کہ ہم نے اس کے گھر کو کیا سے کیا بنا دیا ہے۔ وہاں تو ایک سے ایک بڑھ کر بدمعاش جمع ہو رہا تھا اور یہی بات اس کے لیے حیران کن تھی۔

وہ آدمی جو ہمیں اپنے ساتھ وہاں لے گیا تھا، یہ تو سمجھتا تھا کہ ہم کس قسم کے آدمی ہیں مگر اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ ہم اس گھر کو اپنا ہی گھر بنا لیں گے۔

میں نے فردوسی بیگم کو ساری بات سمجھائی اور اسے بتایا کہ سوات خان کی ہمیں ضرورت کس لیے پیش آئی ہے؟

"مگر یہ تو بہت ہی ظلم ہو گا جناب! ایک اچھے خاصے آدمی کو اندھا کر دینا تو کوئی شرافت نہیں ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے جناب! مگر یہ بھی تو دیکھیں کہ میرے دوست آبی کی آنکھیں وہ نکال چکے ہیں ذرا یہ تو دیکھیں۔"

"میں سب سمجھتی ہوں۔ مگر یہ ظلم ہے، کوئی بھی ڈاکٹر ایسا ستم کرنا پسند نہیں کرے گا۔"

"کرے گا۔ کیوں نہیں کرے گا جناب فردوسی بیگم صاحبہ! مدظلہ العالیہ! بات تو اس ظلم کی ہے جو میرے دوست کے ساتھ ہو چکا ہے۔"

"میں اس کی اجازت نہیں دے سکتی۔ یہ سراسر زیادتی ہے۔"

"آپ ایسا نہ کہیں۔ کبھی کبھی تو یہ ظلم ہوتا دیکھ کر بھی آدمی کو خوشی ہوتی ہے، بے حد خوشی ہوتی ہے، ذرا یہ سگریٹ تو میرے لیے سلگا دیں۔" میں نے اپنا سگریٹ اس کے سامنے رکھ دیا۔

وہ مسکرا دی، بولی "آپ بہت شیطان آدمی ہیں، مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ ایسے کردار کے حامل ہیں۔"

"شکریہ! میں... دراصل نا زیادتی برداشت نہیں کر سکتا۔ آبی کا خیال رکھیں، وہ آپ کی پناہ میں ہے۔"

"وہ سویا ہوا ہے اور ابھی اسے معلوم ہو گا تو وہ بھی سخت حیران ہو گا، اسے بھی یہ بات پسند نہیں آئے گی۔"

"آئے گی، کیسے نہیں آئے گی۔ اس نے تو اپنے دیدے کھو دیے ہیں۔ بس اب کوئی ڈاکٹر ایسا ڈھونڈنا چاہیے جو یہ کام کر دے۔ بس اتنی مہربانی کریں آپ۔"

"مجھے کچھ پتہ نہیں ہے۔ بس یہ کام کسی اور جگہ جا کر کروائیں کوئی آسان کام نہیں ہے یہ۔"

"نہیں! یہ کام تو ادھر ہی ہو گا۔ میں ان ڈاکٹروں کے سارے اوزار یہاں لے آؤں گا فکر نہ کریں بس ڈاکٹر کا نام مجھے بتا دیں۔"

"آپ کو یہ کام خود کرنا ہو گا۔ حد ہو گئی، میرا ہی گھر رہ گیا تھا اس کام کے لیے؟" وہ بڑے غور سے مجھے دیکھنے لگی تھی۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ اس کے دل میں میرے خلاف جو جذبہ ابھرا تھا، وہ نرم پڑنے لگا تھا۔ میں نے کہا نا کہ عورت کی ہاں اور نہیں میں کوئی فرق نہیں ہوتا ہے۔ ابھی وہ میرے سخت خلاف ہو رہی تھی مگر ابھی وہ ایک خاص رخ سے مجھے دیکھنے لگی تھی اور اس رخ کا مجھے خوب اندازہ تھا۔

"آپ جا کر ادھر کمرے میں لیٹ جائیں۔ بہت کام کر لیا ہے آپ نے آج۔"

"میرا خیال ہے کہ میں اپنے دوست تابیبے اور اس کے خادم سوات خان کو وہیں سلا دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں ڈرائنگ روم میں جا پہنچا۔ اس عرصے میں تابیبے نے سوات خان کو اپنی جگہ بالکل ہی سن کر دیا تھا اور اب وہ بہت ہی پرسکون نظر آتا تھا۔

"کیا خیال ہے یہ گرہ باندھ کر تم الگ ہو جاؤ اور ادھر قالین پر ہی سو رہو۔"

"ہاں! میں یہی کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے گرہ وہیں اس کی گردن پر مضبوطی سے باندھ دی۔ سوات خان اب بڑے آرام سے قالین پر لیٹا تھا۔ ایک صرف اس کا سانس ٹھیک انداز سے چل رہا تھا۔ ورنہ اس رومال میں ایسی خاصیت تھی کہ وہ سب کچھ ہی سُن کر دیتا تھا۔

"یار! تیرے اس رومال نے مجھے حیران کر دیا ہے، آخر کیا چیز ہے اس میں؟ آدمی کو ایک دم سُن کر دیتا ہے۔"

"ہاں! یہ ایسا ہی رومال ہے میں نے بڑی محنت سے بنوایا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگا لیا۔

"پر یہ بنا کس چیز سے ہے؟"

"یہ بس فائبر کا بنا ہے۔ اس میں خوبی یہ ہے کہ یہ آدمی کو اس کی گویائی سے محروم کر دیتا ہے۔ اس کا سرا اور یہ ٹھوڑی کا حصہ یوں باندھ دیتا ہے کہ آدمی بولنے کی قوت سے محروم ہوتا ہے تو اس کی سماعت بھی پوری طرح کام نہیں کرتی ہے۔"

"ہوں۔۔۔ مجھے بھی ایک ایسا ہی رومال بنوا دو۔ میں اس کے لیے پچاس ہزار روپیہ خرچ کرنے کو تیار ہوں۔"

"یہ بھی تمھارا ہی ہے یار جی! میں جو تمھارا ہوں۔ مگر خیر میں بنوا دوں گا۔ اس کا ایک ہی کاریگر ہے ادھر پاکستان میں۔ اور وہ ہے بہت ہی بڑا خر دماغ۔۔۔ بیس ہزار روپے لیتا ہے وہ اس رومال کے۔" وہ اب مجھ سے تُو تم سے بات کرتا تھا اور آہستہ آہستہ وہ مجھ سے کھل رہا تھا۔

"تم بھی یہاں ہی سو جاؤ۔ یہ پنکھا تیز کر لو۔ میں دوسرے کمرے میں سو رہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ میں ادھر ہی سو رہتا ہوں۔ اس کا بھی خیال رکھوں گا، ویسے صبح تک تو یہ ہوش میں نہیں آئے گا۔"

"اچھا، خدا حافظ۔" یہ کہہ کر میں نے دروازہ اپنے پیچھے بند کیا اور چپ چاپ فردوسی بیگم کے کمرے میں جا گھسا۔ وہ ابھی تک بتی جلا کر بیٹھی تھی اور اسے یقین تھا کہ میں وہاں ضرور آؤں گا۔

میں جب اس کے سامنے پہنچا تو اس کی آنکھوں سے نیند اڑ گئی تھی۔ اس کی جگہ ایک ایسے جذبے نے لے لی تھی جس کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ اس کے سامنے بیٹھ کر میں نے سگریٹ سلگایا تو وہ بولی۔

"اب آپ جائیں اور آپی صاحب کے کمرے میں سو جائیں۔"

"جی نہیں! میرا تو یہ دل چاہتا ہے کہ میں آج ساری رات آپ سے باتیں کرتا رہوں، کچھ ایسا ہی دل چاہتا ہے میرا۔"

"آپ مہربانی کریں اور وہاں سو جائیں۔"

"ایک بات بتائیں۔ یہ جو تکریم احمد یہاں آتا ہے یہ کس سلسلے میں آتا ہے؟ بہت ذاتی سوال ہے مگر ہے بہت ضروری۔"

"بات یہ ہے کہ کچھ معاملے ایسے ہوتے ہیں جن کو کریدنا اچھا نہیں ہوتا۔" اس نے میرے سگریٹ کے دھوئیں سے حظ اٹھاتے ہوئے کہا۔ کبھی کبھی آدمی کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کے اندر جو سانس جاتا ہے وہ دوسرے کے لیے بہت ہی جانفزا ہوتا ہے، یوں کہ اس کے لیے وہ حرزِ جاں بن جاتا ہے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت میرے اس دھوئیں میں تھی۔

"ایسا نہ کہیں یہ بہت اہم سوال ہے۔"

"کیا وہ آپ کا دوست ہے؟"

"ہاں! واقعی بہت اچھا دوست ہے۔ ایسا دوست جس پر بھروسا کیا جا سکتا ہے۔"

"لیکن۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ عورتوں کا مردوں سے یہ میل ملاپ۔۔۔ سمجھتی ہیں نا آپ؟"

"ہاں! مگر ایسی کوئی بات نہیں ہے جناب! وہ مجھے پسند ہے۔ اس کی اپنی زندگی کیسے گزرتی ہے میں نہیں جانتی۔ مگر بہر حال وہ مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔"

"کیا وہ دوستی عشق میں بدل سکتی ہے؟"

"جی نہیں؛ ایسا نہیں ہوا اور میرا خیال ہے کہ ایسا ہو گا بھی نہیں۔ اگرچہ اس نے کوشش بہت کی مگر وہ جب کچھ بھی حاصل نہ کر سکا تو دوستی پر ہی قناعت کرنے لگا۔ اس نے یہ بات ایسے انداز سے کہی کہ میں اپنی جگہ شرمندہ ہو گیا۔ مجھے اس سے ایسی بات نہیں پوچھنا چاہیے تھی بالکل بھی نہیں۔ یہی وجہ تھی، وہ سرد تھی بالکل سرد۔ اس کا ظاہر اور تھا اور اس کا باطن اور۔

اس کے پلنگ پر سے اٹھ کر میں اس سے کچھ کہے بغیر ڈرائنگ روم میں جا لیٹا میرے لیے یہی بہتر تھا۔

اپنی جگہ لیٹ کر مجھے فردوسی بیگم کے بارے میں بہت کچھ سوچنا پڑا۔ مگر۔۔۔ مگر آخر کار میں نے دل کو یہی سمجھایا کہ ایسی عورت سے کوئی کیا بات کرے مجھے اس کے بارے میں زیادہ نہیں سوچنا چاہیے تھا۔ وہ جیسی بھی تھی ہمارے لیے بہت ہی بہتر تھی۔

صبح ہوئی تو میں نے ڈرائنگ روم کی گھڑی پر نظر ڈالی آٹھ بج رہے تھے۔ اٹھتے ہی میں نے سوات خان پر نظر ڈالی۔ وہ ابھی تک بے ہوش تھا۔ تاہیا البتہ اپنی جگہ اٹھ بیٹھا تھا، بولا "کیا حال ہیں تمھارے! وہاں سے کیسے ادھر چلے آئے تم؟"

"وہ۔۔۔ ارے نہیں! میں تو ذرا گپ شپ کے لیے ادھر گیا تھا۔ اس کو اچھی طرح باندھ دے۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں اب یہ کام کرنا پڑے گا۔ کوئی رسی لے آؤ۔"

"ٹھیک ہے۔ میں کوئی مضبوط سی رسی لے آتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں اپنی جگہ سے اٹھا اور فردوسی بیگم کے کمرے میں جا گھسا۔

وہ شاید خاصی دیر پہلے اٹھ گئی تھی اور اب وہاں سے جانے ہی والی تھی۔ اپنا ہار سنگار اس نے مکمل کر لیا تھا۔ بولی "مجھ سے ناراض ہیں آپ؟"

"اوہ نو پلیز! ایسا نہ سوچیں۔ مجھے دراصل رسی چاہیے تھی۔ اس بیل کو باندھنے کے لیے۔"

"یہ لیں، یہ مضبوط رسہ ہے۔" اس نے مجھے مضبوط فائبر کا ایک رسا دیتے ہوئے کہا۔ رسا لے کر میں وہاں سے باہر نکل آیا۔

تاہیے نے وہ رسہ لے کر سوات خان کو اچھی طرح باندھ کر ڈال دیا۔ اور اس کام سے فارغ ہو کر ہم دونوں آپی کے پاس جا ٹھہرے وہ بھی اس وقت تک جاگ گیا تھا، بولا "کیا حال ہیں یارو! کسی کو میرا خیال ہی نہیں آیا۔"

"آیا ہے پیارے! تم سوئے ہوئے تھے اس لیے ادھر نہیں آئے۔" میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

"بہت برا ہوا ہے یار! رات میں نے خواب میں دیکھا، کہ کوئی آدمی میری آنکھیں ہاتھ میں پکڑے آسمانوں کی طرف جا رہا ہے میں اس کے پیچھے بھاگتا ہوں مگر وہ میری سنتا ہی نہیں۔"

"ہاں! تیرے ساتھ یہی ہوا ہے۔ کوئی تیری آنکھیں اپنے ساتھ لے کر آسمانوں کی طرف بھاگ گیا تھا مگر اب وہ واپس آ رہا ہے۔ کوئی دن جاتا ہے کہ تیری آنکھیں تجھے واپس مل جائیں گی۔"

"وہ کیسے مل جائیں گی۔ تم کیسی خوش خبری کی باتیں مجھے سناتے ہو! یہ زخم تو زندگی بھر مندمل نہیں ہو گا۔"

"ہو گا کیسے نہیں بھئی! ہم نے اس سوات خان کو پکڑ لیا ہے اسے ساتھ لے آئے ہیں۔ کسی بھی دن ہم ڈاکٹر کو بلوا کر تیری آنکھوں سے ڈھلا ہوا زخم اتار دیں گے نئے قرنیے تجھے لگ جائیں گے تو تو ٹھیک ہو جائے گا۔"

"یہ نہیں ہو سکتا ہے پیارے! انھوں نے پتہ نہیں میری آنکھوں کا کیسا نقصان کر دیا ہے مجھے سب معلوم ہے۔"

"نہیں یار! ڈاکٹر نے بھی دیکھ لیا ہے تجھے۔ وہ بھی یہی کہہ رہا تھا کہ کسی کے قرنیے مل جائیں تو یہ آدمی درست ہو سکتا ہے۔"

"مگر وہ تو کسی مردہ آدمی کے قرنیے کی بات کرتا ہے کوئی زندہ آدمی کیسے اپنے قرنیے دے گا؟"

"دے گا کیوں نہیں! سوات خان جو موجود ہے۔ ہم یونہی تو نہیں پکڑ لائے اسے۔"

"جو تمھاری مرضی ہے کرو۔ تاہیا کہاں ہے؟"

"میں ادھر ہی ہوں یار! کچھ حوصلہ رکھ۔ تیرے ہی لیے تو یہ کر رہے ہیں ہم۔" تاہیے نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ وہ بہت زیادہ دکھی ہو رہا تھا۔ آپی کی حالت اس سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔ میں خود بھی یہی سوچ رہا تھا کہ جس طرح بھی ہو سکے۔ ہم اس کے غم کو آدھا آدھا کر کے بانٹ لیں۔ کوئی دل میں درد سا اٹھتا تھا۔ آپی کی وہ کم نصیبی ہمیں لے ڈوبی تھی۔ اسے وصال تو نہ مل سکا۔ اس کے لیے وہ دونوں عورتیں عذاب بن گئی تھیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ عاشق کو اگر لذتِ وصل حاصل ہو جائے تو اس کی یہ سب سے بڑی کامیابی ہوتی ہے مگر۔۔۔ آپی تو لذتِ ہجر سے ہی آشنا تھا اس نے بڑا تیر مارا کہ ان عورتوں کو پھنسا لیا۔ بلکہ وہ خود اس کے لیے تیر چلاتی پھرتی تھیں لیکن ہوا کیا۔ یہی نا کہ وہ دنیا جہان کی لذتوں سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گیا۔

"میرا خیال ہے کہ آپی کو ہم یہاں سے اٹھا لیتے ہیں یہ جگہ ٹھیک نہیں۔" میں نے معاملے کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔۔ جو کچھ تم اس کے بارے میں مجھے بتلاتے ہو اس سے تو یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے یہ تو خواہ مخواہ ہی مارا جائے گا یہاں۔"

"بہت رہ لیا ہے ہم نے یہاں، مگر سوال یہ ہے کہ ہم اس کو یہاں سے کس جگہ لے جائیں؟"

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ طارق روڈ ہی ہے نا! یہاں پچھلی گلی میں میرا دوست رہتا ہے اس کو وہاں لے چلتے ہیں۔"

"کیا نام ہے اس کا؟"

"مقصود نام ہے اس کا بہت عمدہ فلیٹ لے رکھا ہے اس نے آپی وہاں بہت آرام سے رہے گا۔"

"ہوں! ٹھیک ہے۔ تم آپی کو لے کر نیچے آؤ۔ میں ٹیکسی دیکھتا ہوں۔"

یہ کہہ کر میں فردوسی بیگم کی طرف نکلا۔ وہ اس وقت دفتر جانے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔ اسے میں نے خدا حافظ کہا تو وہ بولی۔

"خیر تو ہے یہاں سے جانے کی کیوں سوچ رہے ہیں آپ؟"

"معاملہ کچھ ایسا ہی ہے۔ یہاں تکریم احمد سے بھی تو وہ لوگ مل چکے ہیں کہیں "سیاپے" میں نہ پھنس جائیں ہم۔"

"ہاں! آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ کچھ دنوں کے لیے یہاں سے چلے جائیں اور۔۔۔ اور مجھ سے ملتے رہیں۔ ڈاکٹر بھی سوچ سمجھ کر لانا ہو گا۔"

"ہاں یہی ہو گا۔ ہم بس پچھلی گلی میں جا رہے ہیں فکر نہ کریں۔ وہاں ہم بالکل محفوظ ہوں گے۔"

یہ کہہ کر میں گلی میں اترا تو کچھ ہی دور مجھے ٹیکسی نظر آ گئی۔ اسے لے کر میں تاہیے کے پاس آیا تو اس نے آپی اور سوات خان کو نیچے اتار لیا تھا۔ یوں کہ سوات خان ابھی تک بے ہوش تھا اور اس

کے ہاتھ پاؤں پر سے رسّا غائب تھا۔

"یار! اس کو تو ہوش ہی نہیں آ رہا ہے کسی ڈاکٹر کو دکھانا چاہیے۔" تابیے نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ سوات خان کو پکڑ کر ٹیکسی میں ڈال کر بولا۔ "خان جی! آپ فوراً کسی ڈاکٹر کو بلائیں پتہ نہیں اس کو ہوش کب آئے گا؟"

"فکر نہ کرو۔ میں ابھی کسی ڈاکٹر کو بلا کر لاتا ہوں ایسا جوان آدمی اور یوں بے ہوش ہو جائے۔"

ڈرائیور ہماری باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا، بولا۔ "کیا بات ہے اسے کوئی خاص قسم کا مرض ہے؟"

"ہاں مرگی ہے اسے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس کو دورہ پڑا تھا، چلو لے چلو اسے۔"

تابیے نے آبی کو بھی اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ گاڑی آگے چل دی تو میں نے تابیے سے کہا۔ "آپ ابھی اس کو لے کر کمرے میں بیٹھیں۔ ایک ڈاکٹر میرا دوست ہے میں اُسے بلا لاتا ہوں۔"

"ہاں! یہی کرنا ہوگا۔ آپ کا کیا حال ہے جناب! ٹھیک ہیں نا؟"

"ہاں! بس اللہ کو یہی منظور تھا یارو! میں تو ٹھیک ہی ہوں۔"

گاڑی دس منٹ میں نئے مکان پر جا ٹھہری۔ تابیے نے اُتر کر ان دونوں کو اُتارا اور بولا۔ "ان کا ہاتھ آپ پکڑ لیں، میں اس خان کو سنبھالتا ہوں۔"

کچھ ہی دیر بعد ہم مقصود کے فلیٹ پر جا ٹھہرے۔ تابیے کے پاس اس کی چابی تھی اور فلیٹ بند تھا۔ معلوم یہ ہوا کہ مقصود اُس عورت کے سلسلے میں باہر گیا ہوا ہے۔ فلیٹ کے تین کمرے تھا، اور ایک نشست گاہ۔ ہر کمرے میں الگ الگ باتھ روم موجود تھے۔ ہم تو وہاں پہنچ کر نہال ہو گئے۔ مقصود نے فلیٹ کو بہت عمدہ طریقے سے سجا رکھا تھا۔ جس سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ اس کے پاس روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں ہے۔

ہم نے سوات خان کو الگ کمرے میں لٹا کر تالا ڈال دیا۔ آبی وہاں کچھ زیادہ ہی پریشان ہو گیا۔ بولا۔ "یہ جگہ تو محفوظ ہے نا؟"

"ہاں ہاں! بالکل محفوظ ہے۔ جاؤ تابیے تم ہمارے لیے ناشتہ لے آؤ۔ ہم ایک دم بھوکے ہیں۔ آبی کا تو بُرا حال ہو گیا ہے۔"

کچھ ہی دیر بعد ہم ناشتہ بھی کر چکے اور نہا دھو کر ایک دم تازہ ہو گئے۔ اس روز ہم نے یوں کیا کہ ناشتہ پہلے اور غسل بعد میں۔

"میرا خیال ہے کہ اب ہمیں زیادہ دیر نہیں کرنی چاہیے کوئی ڈاکٹر بلاؤ تو یہ کام جلدی ختم ہو سکے۔" تابیے نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"میں بھی تو یہی سوچ رہا ہوں! مگر ڈاکٹر کا ملنا محال ہے بہرحال یہ کام آج ہو جانا چاہیے۔"

اسی شام پانچ بجے ہم آبی کو اپنے ساتھ لے کر چیندر روڈ پر جا پہنچے۔ وقت بھی کیسی ظالم شے ہے، آدمی کو اسی راستے واپس لے جاتی ہے جس پر چل کر وہ خود تباہ ہو چکا ہوتا ہے۔ سامنے ہی افضل آئی ہسپتال تھا اور ہمیں ڈاکٹر افضل سے ملنا تھا۔ آبی کو لے جا کر ہم نے ڈاکٹر کے سامنے ڈال دیا۔ اس نے آبی کا معائنہ کیا۔ پٹی کھلوا کر دیکھی اور مجھے اپنے بائیں ہاتھ کھڑے دیکھ کر بولا۔ "یہ کیا ہوا ہے انھیں معلوم ہوتا ہے ان کے قرنیے نکال لیے گئے ہیں؟"

"ہاں ڈاکٹر افضل! یہ ایسا ہی بدنصیب ہے۔ کسی دشمن نے اس کے دونوں قرنیے نکال لیے ہیں۔ مگر بہت مہارت کے ساتھ۔ کیا آپ کے خیال میں اس کو نئے قرنیے لگ سکتے ہیں؟"

"ہاں! ففٹی ففٹی چانسز ہیں۔ اگر نئے قرنیے مل جائیں تو بات بن سکتی ہے۔"

"ہوں! میرا خیال ہے کہ ہمیں زیادہ دیر نہیں کرنی چاہیے۔ اِس کا مجرم ہم ساتھ لے آئے ہیں۔ اور اُسی کے قرنیے اس کو لگیں گے۔"

وہ حیرت سے میرا منہ دیکھنے لگا، بولا۔ "یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ! کیسا مجرم؟ مجھے تو یہ مذاق ہی لگتا ہے۔"

"یہ بات نہیں ہے ڈاکٹر! ہم آپ کو اس کام کے بیس ہزار روپے دینے کو تیار ہیں۔ اس آدمی کے قرنیے نکال کر اسے لگا دیں۔"

"یہ نہیں ہو سکتا ہے جناب! کسی آدمی کو آپ خواہ مخواہ پکڑ لائیں اور کہیں کہ اس کے قرنیے نکال لیں تو یہ ناممکن ہے۔"

"مجھے معلوم ہے آپ کا یہی جواب ہونا چاہیے تھا مگر ہم بہت مجبور ہیں۔ کبھی کبھی آدمی ہی آدمی کا دارو بنتا ہے اور جو آدمی ہم یہاں لائیں گے وہ اسی کام کے لیے ہوگا۔"

"سوری سر! میں یہ کام نہیں کر سکتا۔" اس نے آبی کے سر پر پٹی باندھتے ہوئے کہا۔ کچھ دوا اس نے آبی کی آنکھوں میں ڈال دی تھی اور وہ دوا کی وجہ سے پریشانی محسوس کر رہا تھا۔

میں نے بیس ہزار روپے ڈاکٹر افضل کے سامنے ڈال دیے۔ "یہ اُٹھا لیں ڈاکٹر! اور آج ہی یہ آپریشن کر دیں۔ یہ ہمارا حکم ہے سمجھتے ہیں نا آپ! یہ دیکھیں یہ پستول بغیر آواز کے چلتا ہے سمجھے ہیں نا آپ۔ اپنے دو آدمی ساتھ لے چلیں اور اُن کو ہدایت کر دیں کہ وہ کسی سے اس کا ذکر نہیں کریں گے۔"

"مگر... مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے، بالکل ناممکن ہے۔ میں یہ کام نہیں کر سکتا۔"

"آپ کو بہرحال یہ کام کرنا ہوگا۔ کسی اور کے پاس ہم نہیں جا سکتے۔ آپ اِدھر ہی بیٹھ جائیں اور یہ کام کر کے واپس جائیں۔ مجھے معلوم ہے یہاں ہر قسم کی سہولت موجود ہے۔"

پہلی بار اُس کے مغز میں پریشانی کی لہر اُٹھتی نظر آئی۔ وہ سخت مضطرب تھا۔ تابیے نے یوں کیا کہ دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ بولا۔ "ہمیں مجبور نہ کریں ڈاکٹر! ہم بہت دُکھی ہیں اور ہمارے دوست کی آنکھیں ہمارے لیے سارے جہان سے زیادہ ضروری ہیں۔" یہ کہہ کر تابیے نے بھی اس ڈاکٹر پر اپنا پستول تان لیا۔ ڈاکٹر پستہ قد آدمی تھا اور اپنی بڑی بڑی آنکھوں کی وجہ سے ہی دُوسروں پر رعب ڈالنا چاہتا تھا۔ ورنہ اُس میں اور کوئی ایسی خوبی نہیں تھی جو دُوسروں کو متاثر کر سکتی۔

"تم بکواس کرتے ہو۔ یہاں سے نکل جاؤ اور پھر میرے کلینک میں کبھی قدم نہ رکھنا۔ چلے جاؤ یہاں سے۔" اُس نے میز کے سامنے بیٹھ کر بڑے ہی قد آور انداز سے کہا۔ وہ ہم سے قطعاً متاثر نہیں ہو رہا تھا۔ ابھی ہم سوات خان کو لے کر وہاں نہیں گئے تھے۔ طے یہ پایا تھا کہ اس کو ہم وہاں اس وقت لے کر جائیں جب ڈاکٹر اس کام کے لیے راضی ہو جائے گا۔ وہاں تو صورتِ حال ہی مختلف تھی۔ ڈاکٹر افضل کسی بھی طرح ہم سے مرعوب نہیں ہوا تھا اور یہ بات ہمارے لیے سب سے زیادہ پریشان کن تھی۔

"ایسا نہ کہو ڈاکٹر! مجھے یقین ہے کہ تمھارے مغز میں یہ بات اُتر جانی چاہیے کہ تمھیں یہ کام بہرحال کرنا ہوگا۔" میں نے پستول اس کے قریب کرتے ہوئے کہا۔

"میں کسی قیمت پر یہ کام نہیں کروں گا تم جو چاہے کر لو۔"

یہ کہہ کر اُس نے اپنا دایاں ہاتھ میز کی طرف بڑھایا مگر میں نے اس کا بازو پکڑ کر اُسے کرسی سے نیچے گرا دیا۔

"بہاں بہتر رہو گے ڈاکٹر افضل! تمھیں اپنا نہیں تو اپنے بچوں کا ہی خیال کرنا چاہیے۔ وہ یتیم ہو جائیں گے۔ ہم پتہ نہیں کیا کر چکے ہیں، ذرا سوچو ڈاکٹر! یہ کام بھی کسی ڈاکٹر نے کیا ہے تمھیں بھی یہی کرنا ہوگا۔"

"مجھے کسی بھی قیمت پر یہ کام نہیں کرنا ہے، چاہے تم مجھے گولی مار دو۔ میں یہ آپریشن ہرگز نہیں کروں گا۔"

"تم اس کو لے کر باہر جاؤ۔ اس پیرزادہ کو۔" میں نے تابیے سے کہا اور اس ڈاکٹر کو بالوں سے پکڑ کر اُوپر اٹھا دیا۔ "مجھے مجبور نہ کرو ڈاکٹر! جیسے بھی ہے یہ کام کر دو۔"

"نہیں نہیں نہیں! میں کسی بھی قیمت پر یہ آپریشن نہیں کروں گا۔ کامران! کامران!" اس نے آواز اُونچی کی ہی تھی کہ میرا مغز پلٹ گیا اور میں اس کی مسلسل نفی پر مزید انتظار نہیں کر سکا۔ گولی سیدھی میرے ہاتھ سے نکلی اور اس کے دل میں پیوست ہو گئی۔ وہ بہت زور سے اچھلا اور نیچے گر گیا۔ مجھے یہی کرنا چاہیے تھا۔ وہ ہم سے تعاون نہیں کر رہا تھا اور میں آبی کے لیے سارے جہان کی آنکھیں تباہ کر سکتا تھا۔ مجھے اس سے ہر قیمت پر وہ آپریشن کروانا تھا۔ مگر بات ایسی بگڑی کہ سیدھی کسی بھی طرح نہ ہو سکی۔ وہ بڑے مغز کے کا آدمی تھا۔

وہ ڈاکٹر کسی بھی طرح ہم سے مرعوب نہیں ہو رہا تھا۔ تابیے نے اس ڈاکٹر کی یہ حالت دیکھی تو بولا۔ "یہاں سے نکل چلو۔ یہ اچھا نہیں ہوا۔" اور یہ کہہ کر اس نے آبی کو میز پر سے اُٹھایا اور پاؤں پاؤں چلاتا ہوا باہر نکل گیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ واپس آیا تو بولا۔ "یہ اچھا کام نہیں ہوا۔ میں نے ٹیکسی پکڑ لی ہے آؤ اب۔" میں نے ایک نظر اس ڈاکٹر کو دیکھا۔ [illegible] کا ایک سرا اس پر ڈال دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی دُوسرا اس راز سے آشنائی حاصل کرے۔

میں اس امید پر [illegible] گیا تھا کہ آبی کے علاج کے لیے سہولت وہاں میسر تھی مگر سب کچھ ہی وہاں خرچ ہو گیا تھا۔ کسی کی زندگی بھی اور میری اَنا بھی۔ وہ بات پسند نہیں آتی تھی۔ مگر اپنی اَنا کو میں اس کی نفی سے [illegible] نہیں سکتا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے پولیس سے بھی بچنا تھا۔ نہ وہ کسی ایسے آدمی کا پتہ بتا سکتا تھا جو اُس کے پاس ایک ایسا مریض لائے جس سے وہ کسی کا قرنیہ ملنا چاہتا تھا۔ بلاشبہ وہ میرے سوا کون ہو سکتا تھا۔

ہم تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے باہر نکلے اور ٹیکسی میں بیٹھ کر آگے نکل گئے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ ہمارے پیچھے وہاں کیسا فساد مچا۔ آدمی مجبور ہو، بے بس ہو، بہت پریشان ہو تو اس کو یہی کچھ سوجھتا ہے۔ زندگی بہت ستاری دیکھ لی تھی ہم نے۔ ہم سے سب کچھ ہی چھن گیا تھا۔ صرف ایک آنکھ نہ ہونے سے کچھ بھی باقی نہیں بچتا، اور وہ آنکھ جس کی تھی اس کی طرف دیکھ نہیں جاتا تھا۔

ہم ٹیکسی میں بیٹھے کہ نکلے تو آبی بولا۔ "تم نے اچھا نہیں کیا ہے پیارے! اچھا نہیں کیا ہے تم نے۔"

"میں کیا کرتا؟ وہ تو پولیس کو اطلاع کر دیتا۔"

"کر دیتا نا! یہی ہوتا۔ وہ کچھ دیر ہمارے پیچھے بھاگتے اور بس۔ لیکن ایسے ڈاکٹر کو... نہیں یار تم نے اچھا نہیں کیا ہے۔ کوئی وجہ تو ہونی چاہیے تھی۔"

"چپ رہو یار! میں بہت پریشان ہوں۔ اس ڈاکٹر نے تو مجھے تباہ کر دیا ہے میری کوئی بات مانتا ہی نہیں تھا۔"

"وہ اپنی جگہ سچ تھا پیارے! وہ بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا۔ مگر خیر دیکھتا ہوں۔ اب کیا ہوتا ہے۔" آبی نے بہت زیادہ مایوس ہو کر کہا۔

ڈرائیور ہماری باتیں بہت غور سے سن رہا تھا۔ آدھے راستے جا کر ہم نے وہ گاڑی چھوڑ دی۔ ہمارے لیے یہی بہتر تھا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم نے دس قدم آگے جا کر دوسری ٹیکسی لی۔ جب ہم گھر پہنچے تو مقصود وہاں موجود تھا اور سخت پریشان تھا۔ ہمیں

دیکھ کر وہ بولا۔ یار! یہ کیا مصیبت ہے، کون آدمی ہے یہ؟ مجھے یقین تھا کہ تمہارا ہی کوئی دوست ہوگا پر یہ کوئی طریقہ نہیں ہے۔"

"گھبراؤ نہیں پیارے! یہ بھی اپنا مجرم ہی ہے۔ اس سے بھی ہمیں کچھ کام ہے۔ چابی جو میرے پاس تھی۔ کہاں سے آ رہے ہو تم؟" تابیے نے اسے تسلی دیتے ہوئے پوچھا۔

"میں۔۔۔ میں ذرا ایک کام سے گیا تھا، اس عورت کے پیچھے بہرحال میں آج شام کو یہاں سے نکل جاؤں گا۔ ذرا کام ہے مجھے لاہور میں۔ وہاں سے میں دو ہفتے بعد آؤں گا اس آدمی کو کیا ہوا ہے؟"

"یہ ہمارا دوست ہے اسلم آبی۔ اس کی آنکھیں خراب ہو گئی ہیں۔ اسی کے علاج کے سلسلے میں ہم باہر نکلے تھے۔"

"ہوں! خیر ٹھیک ہے۔ تم میرا خیال ہے ادھر ہی رہو گے۔ اور یہ تمہارے دوست بھی؟"

"ہاں! مجبوری ہے۔ کوئی ڈھنگ کا مکان ملا تو وہاں جا ٹھہریں گے۔"

"نہیں ادھر ہی پڑے رہو۔ اور یہ لو یہ کچھ کاغذات ہیں ان کو سنبھال کر رکھنا۔ بڑی مشکلوں سے یہ میں نے اس عورت سے نکلوائے ہیں۔"

"اچھا؟ یہ تو بہت اچھا ہوا، لاؤ میں انہیں سنبھال کر رکھ دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے کاغذات مقصود سے لے لیے۔

"اب میں جا رہا ہوں۔۔۔ مجھے یقین ہے کہ تم کوئی لمبی گڑبڑ کر کے نہیں آ رہے ہو۔" اس نے اپنی ضروری چیزیں سنبھالنی شروع کر دیں۔

"کچھ بھی نہیں ہوا ہے یار! ہم تو اس کے علاج کے لیے گئے تھے۔" تابیے نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ دل میں وہ سخت پریشان ہو گیا تھا کہ مقصود نے ایسی بات کہہ دی تھی جو ہماری دکھتی رگ کو پکڑتی تھی۔ تابیے کے ذہن میں بھی یہ احساس جاگزین ہو گیا تھا کہ ہم نے اس ڈاکٹر کو غلط جگہ جا پھانسا تھا۔ اور وہ اپنی دھن کا اتنا پکا نکلا کہ اس نے جان دے دی مگر بات نہیں ہاری۔ مقصود نے ہماری اس دروغ گوئی پر کوئی برا نہیں منایا۔ کاش اسے سمجھ ہوتی تو وہ وہاں سے ہمیں نکالنے کے بعد ہی باہر جاتا۔ اسے بھی اپنی شانت کا بہت دھیان رہتا تھا۔

وہ باہر نکلا تو تابیے نے سوات خان کو جگا دیا۔ پھر اس کے منہ میں صبح دوپہر اور شام کا کھانا اکٹھا ہی ڈال دیا۔ وہ کھانا نہیں تھا مگر بہرحال اسے زندہ رہنا تھا۔ مجبوراً اسے وہ سب کچھ نگلنا پڑا جو تابیے نے اسے دیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے سوات خان کے دونوں ہاتھ پاؤں اچھی طرح باندھ دیے۔ وہ کسی قسم کی رعایت کا مستحق نہیں تھا۔ سوات خان بالکل ہی خاموش رہا۔ یہ اس کا خاص حربہ

تھا۔ وہ جب مجبور کر دیا جاتا تھا۔ تو وہ مجبور ہو جاتا تھا۔ اپنے آپ سے وہ یہی کہہ دیتا تھا کہ یہ سب کچھ اس کے بس سے باہر ہے۔ اس لیے وہ اس کو برداشت کر جاتا تھا۔ جب وہ اپنے آپ میں ہوتا تھا تو پھر نئے سرے سے پر پرزے نکال لیتا تھا۔ وہ یہی کرتا تھا۔ اور اس کے کردار کی سب سے بڑی خوبی یہی تھی۔ ورنہ وہ اس روز بھی ہم سے بہت زیادہ پٹتا۔ وہاں سے وہ جب باہر نکلا تو ایک بار پھر اس نے خود کو ڈاکٹر دھمن کے سپرد کر دیا۔ اس کے لیے وہ ہر قسم کی خواری برداشت کر رہا تھا۔

آبی کو ہم نے الگ بستر پر ڈال دیا تھا۔ اس کی حالت ایسی ہو گئی تھی کہ وہ دم بدم مرتا جا رہا تھا۔ نہ اس میں وہ پہلی ایسی چلبلاہٹ رہی تھی نہ وہ گرم جوشی۔ اس کا انداز ایسا ہو گیا تھا کہ وہ ڈاکٹر افضل کے مرنے کے بعد خود بھی آدھا رہ گیا تھا، اسے نہیں معلوم تھا کہ ہم اس کے لیے کیا کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر افضل کی موت کا اسے اس قدر افسوس تھا کہ اس نے ہم سے بات کرنی بند کر دی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ہم اس کے لیے کوئی ایسا قدم اٹھائیں جو اس کے لیے شرمندگی کا باعث بنے۔ یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کس شرمندگی کی بات کرتا تھا۔ خدا کے سامنے شرمندگی یا بندوں کے سامنے۔ دونوں صورتوں میں اس کے لیے آنکھوں سے محروم ہونا اس امر کا ثبوت تھا کہ وہ بندوں کے ظلم سے عاجز ہے اور ہم اس کی یہی عاجزی ختم کرنے جا رہے تھے۔ مگر۔۔۔ مگر اس کی سمجھ میں یہ معاملہ نہیں آ رہا تھا۔

ہم اس کے پاس ہی بیٹھے تھے کہ وہ بولا۔ "جیلانی بھائی! تم مجھے اسی حالت میں چھوڑ کر الگ ہو جاؤ۔ مجھے کسی سوات خان کی آنکھیں نہیں چاہییں، یہ میری تم سے درخواست ہے۔"

"کیسی بات کرتے ہو! آبی میں تجھے زندگی کا اتنا سارا غم اٹھانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ تمہیں میرے ساتھ ہاتھ میں ہاتھ ملا کر چلنا ہوگا۔ میں تمہارے بغیر کچھ بھی نہیں ہوں۔"

"ایسا نہ کہہ جیلانی! مجھے کوفت محسوس ہوتی ہے اس ڈاکٹر کو ختم کر کے تم نے مجھے نئی زندگی نہ دی ہے مجھے اب یہ آنکھیں نہیں چاہییں بس اس سوات خان کو چھوڑ دے۔"

"ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں اس کی آنکھیں تجھے ضرور دلواؤں گا یہ ہو کر رہے گا۔ مت سوچ کہ میں تجھے ایسے ہی رہنے دوں گا۔"

اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ منہ دوسری طرف کر کے لیٹا رہا۔ مجھے اس کے وجود میں مچی ہلچل کا اندازہ تھا۔ اس نے اس سزا کو خدا کی دی ہوئی سزا سمجھ لیا تھا اور یہی اس کا قصور تھا۔ ورنہ تو اس دنیا میں کیا کچھ نہیں ہوتا ہے۔ یہی وہ دنیا ہے جہاں انسان نے انسان کو بدترین اذیتوں سے دوچار کر رکھا ہے۔ کہاں ایسے لوگ موجود تھے جو دوسروں کے ظلم کے خلاف آواز

اٹھا سکتے۔ یہ تو ہم ہی تھے۔ چند ہم ایسے اور لوگ جو حق کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے تھے اور سوات خان انہی لوگوں میں سے تھا، جس کو اب یہ سزا بھگتنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ بہت دن عیش کر لیے تھے اس نے۔ بہت رنگ و رامش سے دل بھر لیا تھا اس نے۔ اب تو اس بکرے کی ماں زیادہ دن خیر نہیں منائے گی۔

اس رات نو بجے ہم نے افضل آئی کلینک فون کیا۔ میں اور ماہیا اکٹھے ہی تھے۔ دوسری طرف سے کوئی آدمی بولا۔ "کون ہے؟"

"جی میں ڈاکٹر صاحب کا مریض ہوں وہ کہاں ہیں اس وقت؟"

"جی وہ تو ہسپتال میں ہیں کسی نے گولی مار دی ہے انہیں۔"

"ارے یہ کیسے ہو گیا۔ اب کیا حال ہے ان کا؟"

"اب قدرے بہتر ہیں۔ گولی دل اور پھیپھڑے کے درمیان سے ہو کر گزر گئی اور ان کی جان بچ گئی۔"

"کون تھے وہ؟ کیا چاہتے تھے وہ؟"

"پتہ نہیں کون تھے وہ، کوئی ڈاکو ہی نظر آتے تھے۔"

"اچھا! یہ بات ہے اللہ معافی دے اب کیا حال ہیں ڈاکٹر صاحب کے؟ وہ تو بہت ہی اچھے آدمی ہیں بیچارے۔"

"اب تو بہتر ہیں جناب! اب آپ پندرہ دن بعد فون کریں۔ میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو اتنے دن ضرور لگ جائیں گے۔"

"اچھا بھائی! خدا حافظ۔ یہ تو بہت بری خبر سنائی ہے آپ نے۔" یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا اور ہم دکان سے نکل کر سڑک پر آ گئے۔

"یار! یہ تو اچھا ہی ہو گیا۔ ورنہ وہ ڈاکٹر خواہ مخواہ ہی مارا جاتا۔"

"ہاں! میرا خیال ہے کہ آبی اب زیادہ بہتر محسوس کرے گا۔ اس کو ڈاکٹر کی موت کا بہت زیادہ افسوس تھا۔"

"چلو اس آبی کو بتا ہی دو، مجھے یقین ہے کہ وہ خوش ہو جائے گا۔"

"ہاں! اس کے دماغ سے یہ خرابی ضرور دور کرنی چاہیے۔ ڈاکٹر افضل کے بچ جانے سے اسے خوشی ہوگی۔"

کچھ ہی دیر بعد ہم آبی کے پاس جا پہنچے مگر یہ دیکھ کر ہمیں سخت حیرت ہوئی کہ سوات خان وہاں نہیں تھا۔ ہم نے سب کمرے گھوم کر دیکھ لیے مگر وہ وہاں ہوتا تو نظر آتا۔

"آبی! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں وہ سوات خان کہاں ہے؟"

"وہ۔۔۔ میں نے اسے یہاں سے نکال دیا ہے۔ مجھے اس پر ترس آتا تھا۔ اس کو باندھ کر رکھنا کسی بھی طرح صحیح نہیں تھا۔" آبی نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ حالانکہ اس کا چہرہ میری طرف ہی تھا۔

"یہ۔۔۔ یہ تم نے اچھا نہیں کیا ہے، اُف خدایا! تم نے اچھا نہیں کیا ہے آبی! یہ سراسر زیادتی ہے۔" میں نے اپنے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"یار یہ تجھے کیا سوجھی؟ اتنی محنت سے ہم اس کو یہاں لائے تھے۔ تو آدمی ہے کہ پاجامہ! کیا ملا ہے تجھے اس کو چھوڑ کر؟" تابیے نے بھی سر پیٹ لیا۔ وہ بھی سخت پریشان تھا۔

"مجھے نہیں چاہییں کسی کی آنکھیں۔ میں ہمیشہ کے لیے برباد ہو جانا بہتر سمجھتا ہوں مگر کسی کی آنکھیں مجھے نہیں چاہییں، مجھ سے بات مت کرو۔ میں۔۔۔ میں تمہارے سامنے اپنا سر پیٹ لوں گا۔ جاؤ یہاں سے چلے جاؤ مجھے کسی کی ہمدردی کی ضرورت نہیں ہے۔" آبی نے بہت ہی مشتعل لہجے میں کہا۔

"وہ۔۔۔ وہ یہاں پولیس لے کر آ جائے گا پاگل! تیرے لیے بھی یہاں رہنا مشکل ہو جائے گا۔ وہ یہاں سے نکلتے ہی سیدھا پولیس اسٹیشن گیا ہوگا۔"

"وہ کچھ نہیں کرے گا۔ یہی بہتر ہے کہ میں نے اسے چھوڑ دیا ہے میں نے اسے بتا دیا ہے کہ تم اس کے ساتھ کیا کرنا چاہتے تھے۔ وہ اب یہاں نہیں رہے گا، کسی اور طرف نکل جائے گا۔" ابھی وہ بہت مشتعل تھا۔ یوں کہ ہم سب کو چیر پھاڑنے پر تیار تھا مگر ابھی وہ سوات خان کے بارے میں بہت وثوق سے یہ بات کہہ رہا تھا کہ وہ ہم میں سے کسی کو کچھ نہیں کہے گا۔

"مجھے معلوم تھا کہ وہ سب سے پہلے میری ہی جان کو آئے گا میں نے یہ بات ذہن میں رکھی تھی اور اس کو کھولنے سے پہلے بتا دیا تھا۔ اس نے تو اپنی جان چھوٹتی دیکھی تو یہاں سے سینگ کٹا کر باہر نکلا۔ پیچھے بھی مڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ سیدھا یہاں سے نکل کر کسی اور طرف چلا گیا ہوگا۔" آبی اس وقت تک سرہانے کا تکیہ بنا کر بیٹھ چکا تھا۔ "آؤ جیلانی میرے پاس بیٹھو۔ مجھے سوات خان کو چھوڑ کر دلی خوشی ہوئی ہے۔ کیوں خواہ مخواہ اس کی آنکھیں پھوڑتے ہو۔ تجھے تو ستارۂ رذالت ملنا ہی چاہیے کہ تو مجھے چھوڑ کر چلا گیا تھا مگر سوات خان تو کسی ایسی سزا کا مستحق نہیں تھا آؤ بیٹھو یہاں میرے پاس۔" اس نے میرے لیے جگہ چھوڑ دی۔

میں پریشان ہو کر اس کے پاس بیٹھ تو گیا مگر اس آبی کی سمجھ مجھے نہیں آتی تھی اس نے اپنے ہی لیے قبر کھود لی تھی۔ اور جسے یہ منظور نہیں تھا کہ ہم کسی زندہ آدمی کی آنکھیں اس کے لیے الگ کر سکتے۔

"تیری مرضی ہے آبی! تو بہتر جانتا ہے کہ تو نے یہ کیا کر دیا ہے، بہرحال اب یہاں ٹھہرنا اچھا نہیں ہے۔"

"نہیں! تو بے فکر رہ سوات خان مجھ سے یہی کہہ کر گیا ہے وہ ہم پر ہاتھ نہیں ڈالے گا۔ اس غمزہ خانم سے بھی تو جان

چھوڑ آیا تو یہ بھی اچھا ہی کیا ہے ورنہ وہ خدا جانے کیا سوچتی لا، مجھے سگریٹ پلا۔"

میں نے اس کو سگریٹ نکال کر دیا تو وہ خوش ہو گیا۔ بولا "ایک عرصے بعد مجھے آج دلی خوشی ہوئی ہے۔ تو کیوں باندھ لایا تھا اُسے گھر خیر اب آگے کی سوچ۔ مجھے تو اسی حال میں رہنے دے۔ نہ یہ آنکھیں ہوں گی نہ میں کسی طرف دیکھ سکوں گا۔ مجھے ان آنکھوں کے بغیر بہت اچھا لگ رہا ہے۔"

"پاگل ہے تو۔۔۔ میں تجھے یوں نہیں مرنے دوں گا۔ کل ہی میں کسی آدمی سے اس کی آنکھیں لے لوں گا۔ کراچی میں سیکڑوں آدمی مرتے ہیں کوئی تو ان آنکھوں کو تمھاری آنکھوں میں منتقل کرنے پر راضی ہو جائے گا۔"

"ہاں! یہ تم کر سکتے ہو۔ اس کی اجازت میں تمھیں دیتا ہوں۔ ایسا کر دیکھو۔" آبی نے یہ کہہ کر گہرا کش لگایا۔ تاہیا بھی اس کے پاس ہی بیٹھ گیا تھا۔ بولا "یار! تیری مجھے سمجھ نہیں آتی ہے بہرحال اب تیرے لیے یہی کرنا ہو گا ہمیں۔"

"ہاں! کوئی اچھا سا آدمی دیکھنا اور اس کے لواحقین کو مطمئن کر دینا۔ کسی کا حق چھیننا نہیں چاہیے۔"

"بالکل پاگل ہو گیا ہے تو۔۔۔ تجھے پتہ ہے کہ اس دنیا میں کیا کچھ ہوتا ہے کیسا کیسا ظلم اس دھرتی پر روا رکھا جاتا ہے۔ وہ جو افریقہ سے آدمیوں کو کام کرنے کے لیے لے گئے، وہ بھی آدمی ہی تھے۔ وہ غلام بنا کر لے گئے تھے افریقہ کے لوگوں کو۔۔۔ کون سے لوگ ہیں جو دوسری قوم کو تباہ کر کے اپنا کھیت سیراب نہیں کرتے۔" میں نے فلسفہ بگھارا۔ حالانکہ اس میں فلسفہ کوئی نہیں تھا۔

"وہ تو ٹھیک ہے مگر کوئی کسی کتے کی دم کٹوا کر خود نہیں لگواتا ہے، یہ ظلم ہے، خیر دفع کرو۔ تم یوں کرو کہ کوئی ایسا آدمی ڈھونڈو جو نیا نیا مرا ہو کیا خیال ہے تیرا جیلانی۔۔۔ ایسا آدمی مل جائے گا نا؟"

"ہاں ہاں! مصیبت ڈال دی ہے تُو نے ہمیں۔ اب کوئی ایسا ہی بندہ تلاش کرنا ہو گا جو نیا نیا مرا ہو۔ یہی مطلب ہے نا تمھارا؟" یہ کہہ کر میں نے موضوع بدل دیا۔ کوئی فائدہ نہیں تھا اس سے مغز پچی کرنے کا۔

اگلے دن ہم نے مختلف ہسپتالوں کے چکر لگائے ایسے معلوم یہ ہوتا تھا کہ بہت سے لوگ مر رہے ہیں مگر کوئی بھی اُن لوگوں کے قرنیے نکلنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ جو کوئی بھی سُنتا سخت متنفر ہو جاتا تھا۔ یہ بات سُنتے ہی اُن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے کہ وہ اُن کے قرنیے بیچ لیں گے۔ ایسا تو کوئی نہیں تھا جو اُن کے اعضاء بیچ لیتا ہو۔

آخر ایک ہسپتال میں ایک ایسا آدمی مل گیا جو ہم سے متفق تھا، بولا "آپ میرے خالو کے قرنیے نکلوانا چاہتے ہیں نا؟"

"جی ہاں۔ میرا خیال ہے کہ وہ ابھی ابھی مرا ہے اور ہمیں اُس کے لیے روپیہ خرچ کرنے سے بھی گریز نہیں ہے۔"

"تو پھر آپ مجھ سے بات کریں میں پانچ ہزار لے کر اُس کے قرنیے آپ کو دے دوں گا۔"

"یہ تو کوئی بات نہیں۔ میں ابھی پانچ ہزار آپ کو دے دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے پانچ ہزار روپے اس کو دے دیے۔ وہ فوراً ہی بدل گیا۔ میری جیب میں اتنے سارے نوٹ دیکھ کر اس کی نیت خراب ہو گئی، بولا "یہ تو کچھ بھی نہیں ہیں جناب! پچیس ہزار روپے میں نے کہا ہے اس سے کم پر بات نہیں ہو گی۔"

"تو پھر ٹھیک ہے یہ لو پچیس ہزار روپے۔" میں نے پچیس ہزار روپے اس کی طرف منتقل کر دیے۔

وہ خوش ہو گیا، بولا "آپ ڈاکٹر کو بلائیں اور ابھی بلا لیں مجھے یہ رقم منظور ہے۔"

"آپ ہمارے ساتھ آئیں۔ ہم ہسپتال کے ڈاکٹر سے بات کرتے ہیں۔" یہ کہہ کر ہم نے اسے اپنے ساتھ لیا اور تمام مراحل طے کرنے کے بعد اُس نے ہمارے لیے کاغذات پر دستخط کر دیے۔

کچھ ہی دیر بعد اس آدمی کے خالو کے قرنیے ہم نے نکلوا کر ہسپتال میں جمع کروا دیے اور آبی کو لے کر اسی وقت ہسپتال جا پہنچے۔ وہ بہت خوش تھا۔ اس کو ڈاکٹروں کے حوالے کر کے ہم اطمینان سے ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے۔ اس کا آپریشن ہوتا رہا۔

شام کو ساڑھے تین بجے تک اس کا آپریشن جاری رہا۔ پھر اُن لوگوں نے آبی کو اٹھا کر ایک کمرے میں پہنچا دیا۔ خاصا بڑا کمرہ تھا وہ۔ ہم نے اسے وہاں بہت آرام سے لٹا کر پنکھا فل اسپیڈ پر چلا دیا۔ آبی دراصل آپریشن کے بعد پسینے سے نہا گیا تھا اور اس کو ہم سے بات کرنے سے بھی روک دیا گیا تھا۔

دسویں دن پٹی کھلی تو ہمیں یہ احساس ہوا کہیں آپریشن غلط نہ ہو گیا ہو۔ ڈاکٹروں سے تو کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ اُن کے لیے تو آپریشن تلے آیا آدمی محض ایک کل پُرزا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ابھی پٹی کھول ہی رہا تھا کہ تاہیا آبی کے بالکل سامنے جا ٹھہرا۔ اس کا خیال تھا کہ جیسے آبی پہلی بار اپنے سامنے دیکھے وہ تاہیا ہی ہونا چاہیے۔ پٹی کھل گئی۔ مگر۔۔۔ مگر آبی کی نظر واپس نہ آ سکی۔ وہ بس یونہی دیکھتا رہ گیا۔ ایسی آنکھوں سے جو دیکھ نہیں سکتی تھیں، آپریشن ناکام ہو گیا تھا۔ آبی کے چہرے پر ایک رنگت آ کر گزر گئی۔ اسے

یقین تھا کہ وہ آپریشن کامیاب ہو گا مگر وہاں تو کچھ بھی نہیں تھا نہ وہ قرنیے کام آ سکے نہ وہ اس کی آنکھوں کے پچھلے پردے ہی صحیح ہو سکے۔

"میں نہ کہتا تھا ہاشم خان! مجھے یوں ہی رہنے دو۔ میں اس علاج کے بغیر ہی بہتر ہوں مجھے پڑا رہنے دو۔" آبی کا لہجہ بڑا ہی غم انگیز تھا۔

"یہ۔۔۔ یہ تو بہت ہی غلط ہوا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا ہے کہ یہ کیسے ہو گیا ہے۔" ڈاکٹر نے پریشان ہو کر کہا۔ وہ بہت زیادہ فکر مند تھا۔ آنکھیں اُس نے بار بار گھما کر دیکھیں۔ کئی قسم کے آلات اُس نے آزمائے مگر آبی کچھ بھی نہ دیکھ سکا۔ دونوں ہی آنکھیں ناکام رہ گئی تھیں، اُن میں دیکھنے کی قوت ہی باقی نہیں تھی۔ تو وہ دیکھتیں کیسے؟

"کیا خیال ہے تیرا ہاشم خان! آدمی کو ایسی صورت میں علاج کروانا چاہیے کہ نہیں؟" آبی نے ایک بار پھر بہت ہی دُکھی لہجے میں کہا۔ وہ میرے سامنے یوں لیٹا تھا جیسے اُس کے اندر رُوح ختم ہو رہی ہو۔ کوئی بھی تو بات اُسے اچھی نہیں لگتی تھی اور وہ کسی حد تک ٹھیک ہی تو کہتا تھا۔ غم جب حد سے بڑھ جائے تو مداوا ہو جاتا ہے اور پھر اس کا غم تو بے حد و حساب تھا۔

"فکر نہ کر یار! کچھ نہ کچھ ہو رہے گا۔ تجھے کسی اور ڈاکٹر کو دکھاتا ہوں یہ تو سب بے کار ہیں۔"

میری یہ بات سن کر وہ ڈاکٹر بھی حیران ہوا اور اُس کے دونوں اسسٹنٹ بھی مگر وہ کچھ کہہ نہیں سکے۔ آبی کو مزید آلات لگا کر دیکھنے لگے۔ لیکن اس سے کیا ہوتا تھا۔

"ڈاکٹر یہ بات یاد رکھو کہ اس کی آنکھیں واپس ملنی چاہئیں۔ سمجھتے ہو نا۔ اس میں کوئی آدمی ہی کام آ سکتا ہے۔ خدا تو اپنی جگہ قائم و دائم ہے اس کو ہم قصوروار نہیں ٹھہرا سکتے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر مجھے حیرت ہے بہرحال یہ چانسز تو ففٹی ففٹی ہوتے ہیں ہم کوشش کرتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح اس کا علاج کر دیں۔"

"آؤ یار جی! چلتے ہیں۔ مجھے یہاں بہت گھٹن محسوس ہوتی ہے۔ تاہیے! اپنا ہاتھ دو مجھے۔"

"یہ کیا ہو گیا ہے یار! میں تو خود حیران ہوں کیا کریں ڈاکٹر! کس کے پاس لے کے جائیں ہم اس کو؟"

"نہیں رہنے دیں۔ ہم کچھ علاج سوچتے ہیں۔" ڈاکٹر نے آبی کو بستر پر لٹاتے ہوئے کہا۔

"نہیں! میں یہاں نہیں رہوں گا۔ چھوڑ دیں مجھے میں یہاں نہیں رہنا چاہتا۔ تم سب بے کار ہو، ایک دم کنڈم۔ ہٹ جاؤ سامنے سے، لا تاہیے اپنا ہاتھ مجھے دے۔ اتنی سمجھ نہیں ہے کہ مریض کس حال میں ہے۔" آبی نے بستر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

وہ اپنے سلیپر ڈھونڈ رہا تھا۔ تاہیے نے اس کو ہاتھ دے کر اٹھایا تو وہ بولا "یہ تمام چارٹ ساتھ لے لو۔ مجھے آج ہی کسی ڈاکٹر سے ملنا ہو گا۔ اسے بتائیں گے ہم کہ ہوا کیا ہے۔"

تاہیے نے وہ چارٹ ہاتھ میں لے لیے۔

"یہ ادھر ہی رہنے دیں یہ ہماری ضرورت ہیں۔" ڈاکٹر نے وہ چارٹ پکڑتے ہوئے کہا۔

"ہاں! ہم ان کی کاپیاں بنوا لیتے ہیں پھر یہ ابھی آپ کو واپس کر دیں گے۔"

"ٹھیک ہے آپ ان کو فوراً واپس کر دیں اور بھول جائیں کہ لوگوں کو آپ گالیاں بھی دے سکتے ہیں۔"

"ہم آبی کو لے کر اسی وقت شہر کے ایک بہت بڑے ڈاکٹر کے پاس جا پہنچے۔ اُس نے ڈیفنس سوسائٹی میں اپنا ایک بہت بڑا کلینک قائم کر رکھا تھا جس میں رہنے کے لیے کمرے موجود تھے اور اس کا نام عبدالقوی عثمان تھا۔ بڑی مشکلوں سے ہم اس تک پہنچے زیادہ کام اس کے اسسٹنٹ ہی کرتے تھے۔ کوئی خاص قسم کا کیس وہ خود دیکھتا تھا اور لوگ کہتے تھے کہ اس کے ہاتھ میں بڑی شفا ہے۔

ہم اس کے پاس پہنچے تو وہ ہم سے بڑی محبت سے پیش آیا۔ اس کی فیس بھی زیادہ تھی اور کام بھی وہ بہت عمدہ کرتا تھا، بولا "حکم کریں جناب! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"ہمارے اس مریض کو دیکھیں۔ اس پر کسی نے اپنے ناخن آزمائے ہیں، کوئی ڈاکٹر تھا جس نے اس کے قرنیے نکال لیے ہیں۔ ہم نے ایک مُردہ آدمی کے قرنیے اس کے لیے تجویز کیے۔ ڈاکٹروں نے وہ بھی دے دیے مگر اس کی آنکھیں واپس نہیں آئیں۔"

"اچھا! یعنی یہ قرنیے کسی ڈاکٹر نے ان کی مرضی کے بغیر ان سے لے لیے تھے؟"

"جی ہاں! ہمیں یہی معلوم ہوا ہے اور وہ ڈاکٹر دھمن تھا۔ اُس نے آبی کی دونوں آنکھیں نکال لیں۔" میں نے کہہ ہی دیا۔ اس کو بھی معلوم ہونا چاہیے تھا کہ اس پیشے میں کیسے کیسے لوگ موجود ہیں۔

"مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ڈاکٹر دھمن تو ہمارے جاننے والوں میں سے ہیں۔ ابھی وہ امریکہ گئے تو ہم سے مل کر گئے تھے۔ وہ کیسے یہ کام کر سکتے ہیں؟"

"یہی تو حیرت ہے ڈاکٹر! یہ اسی ڈاکٹر کا کرشمہ ہے اور یہ میرے پیٹ پر زخم کا نشان بھی دیکھیں۔ یہ بھی اسی کے نشتر کا کرم ہے۔" یہ کہہ کر میں نے اپنا دامن اُٹھا دیا۔

"کمال کرتے ہیں آپ! میں یہ کیسے مان لوں۔ یہ تو گردے کا آپریشن ہے۔"

"جی ہاں! وہ آدمی کا صحیح گردہ نکالنے کا فن جانتا ہے اور یہی اس کی کامیابی کا راز ہے۔" میں نے زہرخند کیا۔

"اس کو چھوڑیں ڈاکٹر! اپنے اس مریض کو دیکھیں کہ ہوا کیا ہے۔" تابیہ نے اس ذکر سے بدمزا ہو کر کہا۔

"ہاں۔ لائیں میں انھیں دیکھتا ہوں، آئیں ادھر میز پر لیٹ جائیں۔" یہ کہہ کر وہ آبی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

کوئی بیس پچیس منٹ اس کا معائنہ کرنے کے بعد وہ بولا۔

"معاملہ یہ ہوتا ہے کہ دو پردوں کے درمیان ہوا رہ گئی ہے اور قرنیے صحیح نہیں جڑے ہیں ورنہ یہ آپریشن کامیاب ہو جاتا۔"

"پھر کیا کرنا چاہیے اس کا۔ ہمیں تو یہی فکر لگی ہے کہ یہ صحیح کب ہوگا؟"

"آپ ان کو یہاں داخل کرا دیں۔ میں کسی نہ کسی طرح ان کے لیے قرنیے حاصل کرتا ہوں۔ پرانے نکال کر نئے لگا دیں گے تو یہ صحیح ہو جائے گا مگر آپ پیسوں کا سوچ لیں۔"

"اس کی فکر نہ کریں۔ ہم ابھی دس ہزار یہاں جمع کروا دیتے ہیں۔"

میں نے جیب سے بیس ہزار کی گڈیاں نکال کر میز پر رکھ لیں۔

"آپ یہ رقم ادھر جمع کروا دیں ہمارے کیشیئر کے پاس۔ کمرہ وہ آپ کو دے دے گا۔ آپ بے فکر رہیں۔ انشاءاللہ یہ آدمی ٹھیک ہو جائے گا۔"

ابھی وہ ڈاکٹر یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ کمرے میں ایک ادھیڑ عمر کا آدمی داخل ہوا اس کی صورت مجھے جانی پہچانی نظر آتی تھی۔

"کیا حال ہیں ڈاکٹر! کوئی خاص معاملہ ہے؟"

"اوہ آئیے! کہاں تھے آپ ڈاکٹر سیفی، ان کے لیے ہمیں کسی آدمی کا قرنیہ چاہیے بہت پریشان ہیں یہ لوگ۔ پہلے بھی ان کو قرنیہ لگایا گیا مگر وہ کام نہیں کر سکا۔ یہ آپریشن دوبارہ کرنا ہوگا۔"

ڈاکٹر سیفی ایک دم آگے بڑھ آیا۔ مگر جیسے ہی اس نے آبی کو دیکھا اس کا رنگ بدلنے لگا۔

"یہ۔۔۔ اچھا اچھا تو یہ بات ہے۔۔۔" یہ کہہ کر وہ فوراً ہی پیچھے مڑنے لگا تو ایک دم میرے ذہن میں ماضی کی کئی یادیں ابھر آئیں۔ ڈاکٹر سیفی کو میں نے لاہور میں شفا بار کلینک میں آتے دیکھا تھا۔ اس کے ڈاکٹر دھمن سے بہت پرانے تعلقات تھے۔ اور مجھے ابھی یہ معلوم کرنا تھا کہ آبی کی آنکھوں کا آپریشن کس نے کیا تھا۔ ظہیر تو محض اس کا ضامن تھا اسے پولیس سے چھڑانے میں اس نے اہم کام سرانجام دیا تھا مگر ڈاکٹر سیفی وہاں کیا کر رہا تھا۔

"کہاں جا رہے ہیں آپ؟ ذرا اس کیس پر نظر ڈالیں۔" ڈاکٹر نے کہا مگر وہ رکا نہیں دروازے تک جا پہنچا۔ تو میں نے ایک دم اس کے پیچھے جا کر اسے گردن سے ناپ لیا۔

"تم۔۔۔ تم کہاں جا رہے ہو۔ ذرا اس کیس کو دیکھ ہی لو۔ تمھارے نشتر نے جو کام کیا ہے وہ دیکھو گے نہیں؟"

ڈاکٹر سیفی نے ایک دم رک کر مجھے بڑے غور سے دیکھا، کہا۔ "یہ کیا کر رہے ہیں آپ! کون ہیں آپ؟ یہ بات کرنے کا طریقہ ہے کوئی؟" یہ کہہ کر اس نے اپنی گردن میرے ہاتھ سے چھڑا لینی چاہی مگر میں پوری قوت سے اپنے دائیں ہاتھ کو حرکت میں لا چکا تھا۔ پنجہ جو اس کے چہرے پر پڑا تو وہ الٹ کر دیوار میں جا لگا۔

"بدمعاش! تم خود کو ڈاکٹر کہتے ہو! تابیہ یہ دروازہ بند کر دے میں اس کی ہڈیاں توڑ دوں گا۔"

تابیہ نے میرے حکم کی تعمیل کر دی اور پلٹ کر بولا۔ "اس کو باندھ لو۔ اگر یہ کام اس نے کیا ہے تو یہ اس کی قیمت بھرے گا۔"

"ہاں! تم ڈاکٹر دھمن کے یار ہو۔ شفا بار میں بھی میں تمھیں دیکھ چکا ہوں۔ تم اس سے انکار نہیں کر سکتے۔"

"مجھے کچھ معلوم نہیں ہے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، میرا کسی شفا بار سے کوئی تعلق نہیں رہا۔"

"تم جھوٹ بولتے ہو مگر میں تم سے سچ کہلوا کر رہوں گا۔"

"یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟ چھوڑ دیں انھیں۔ یہ ہمارے بہت سینیئر ڈاکٹر ہیں۔ ہمارے کلینک کی سو طرح سے مدد کرتے ہیں۔"

"تم چپ رہو ڈاکٹر! اس ڈاکٹر سیفی سے پوچھ تو لینے دیں کہ آبی پر اس نے نشتر کب چلایا تھا۔ بولو کیا کہتے ہو تم؟"

"یہ غلط ہے بالکل غلط ہے، میں کسی آبی کو نہیں جانتا۔" ڈاکٹر سیفی کی رگیں پھولنے لگی تھیں۔

"تم خود ہی مانو گے، اس آبی کو کب سے جانتے ہو تم؟"

"میں کسی آبی کو نہیں جانتا۔ پتہ نہیں کون ہے یہ۔ مجھ سے سوچ سمجھ کر بات کرو۔"

"ہاں! بات تو تم سے ہم سوچ کر ہی کر رہے ہیں۔ دیکھو ڈاکٹر! یہی وہ آدمی ہے جس نے آبی کے قرنیے نکال لیے، اسی نے اس کو تہ خانے میں ڈالا اور اب ہم ظہیر کی وجہ سے اس کو نکال کر یہاں لائے ہیں۔ میں اس کو معاف نہیں کروں گا۔"

"مجھے یقین نہیں آتا۔ کوئی ڈاکٹر کسی کو اندھا نہیں کر سکتا!"

"یہ کرتا رہا ہے، یہ ایک آدمی نہیں ہے، پورا گروہ ہے۔ اس کو معلوم ہے کہ ڈاکٹر دھمن اس وقت کہاں ہے۔ بتا سیفی! بد تجھے کسی قیمت پر نہیں چھوڑوں گا۔" یہ کہہ کر میں نے اس کا بازو مروڑ کر کندھے سے لگا دیا۔ "مجھے بتا ڈاکٹر کہ یہ سب کچھ تم نے کیسے کر لیا؟ میرے دوست کو اندھا کر دیا اور خود تم مزے سے کیس دیکھتے پھر رہے ہو۔"

"میں کہتا ہوں مجھے کچھ معلوم نہیں ہے۔"

"اس کا دھیان رکھ تابیہ، اس ڈاکٹر کا۔ ہاں تو پھر تم یوں نہیں مانو گے۔" میں نے یہ کہہ کر پستول نکال لیا۔ "یہ بغیر آواز کے کام کرتا ہے بچے! اور ہمیں معلوم ہے کہ ہمیں تمھارے ساتھ کیا سلوک کرنا ہے۔" یہ کہہ کر میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ "بتا مجھے کہ اس کام کے تجھے کتنے پیسے ملے اور وہ ڈاکٹر دھمن کہاں ہے؟"

تابیہ نے دوسرے ڈاکٹر کو نرغے میں لے لیا۔ وہ بچارا کرسی پر بجھ سا گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔

"ڈاکٹر دھمن اور ڈاکٹر عالیہ امریکہ چلے گئے ہیں۔ انھوں نے یہ بات غلط طور پر پھیلائی تھی کہ وہ لاہور چلے گئے ہیں۔" ڈاکٹر سیفی نے پستول کی زد میں آ کر ہمیں سچی بات بتا دی۔ اس کی آنکھیں عجیب انداز سے کبھی کھلتی تھیں اور کبھی بند ہونے لگتی تھیں۔ اس کے چہرے پر زردی کھنڈ گئی تھی اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنی جان کیسے بچائے۔ سچ بولنے کے سوا اس کے پاس کوئی چارۂ کار نہیں تھا۔

"ہوں! اس آبی کا آپریشن تم نے کتنے پیسے لے کر کیا؟"

"مجھے ڈاکٹر دھمن نے بیس ہزار روپے دیے تھے کہتا تھا کہ میں اس آدمی کے قرنیے نکال دوں کسی کو یہ تحفتاً دینا چاہتا ہے۔"

ڈاکٹر سیفی اب سیدھی راہ پر آ رہا تھا۔

"ہوں! ٹھیک ٹھیک! ویری گڈ! اور تم نے بیس ہزار روپے لے کر ایک آدمی کو بالکل اندھا کر دیا ہے، یہی کیا ہے نا تم نے؟"

وہ چپ رہا۔ گردن اس کی ڈھلک سی گئی تھی اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ وہ یوں پکڑا جائے گا، مجھے اس کے پلٹ جانے کے انداز ہی سے شک ہو گیا تھا اور اب وہ خود بول رہا تھا کہ اس کے نشتر نے کیسا کام کر دیا تھا۔

آبی اس وقت تک بالکل خاموش تھا۔ جیسے ہی اس نے وہ بات سنی، وہ میز سے اٹھا اور درمیان کی دو کرسیوں سے ٹکرا کر وہ میری طرف بڑھا۔

"یہ۔۔۔ یہ پستول مجھے دے دے ہاشم خان میں خود اس کی دونوں آنکھیں نکالوں گا میں اسے بھی اندھا کر دوں گا۔"

"نہیں آبی! اسے ایک اور قیمت دینی ہوگی۔ اپنے دونوں قرنیے اس کو ہارنے ہوں گے۔ ڈاکٹر قوی! اس کو ہمارے سامنے لٹا کر اس کے دونوں قرنیے نکال لو۔ اس سے کم پر بات نہیں ہو سکتی۔ اس کی یہی سزا ہے۔ اور میری بات غور سے سنو تم بچ کر کہیں نہیں جا سکتے ہو۔"

"نہیں نہیں! خدا کے لیے ایسا نہ کرو۔ میرا کوئی قصور نہیں ہے۔"

ڈاکٹر سیفی کو پہلی بار یہ احساس ہوا کہ وہ کیسی مشکل میں پھنس گیا ہے۔ اور اس کے کرم اسے کھینچ کر کہاں لے آئے ہیں۔

"ہم کچھ سننا نہیں چاہتے ڈاکٹر سیفی! یہ ہمارا حکم ہے۔ قوی صاحب یاد رکھیں آپ نے اگر ہم سے تعاون نہیں کیا تو آپ بھی سمجھیں کہ اس کے ساتھ ہی جائیں گے۔"

"آپ یہ ظلم نہیں کر سکتے۔ ہم پولیس کو اطلاع دے دیں گے۔"

"ایسے کمنگر ہم ہرگز نہیں ہیں۔ برتن دیکھ کر بجاتے ہیں ڈاکٹر! اس کا آپریشن ابھی اور اسی وقت ہوگا۔"

"نہیں! میں یہ کام کسی طرح بھی نہیں کر سکتا۔"

"تو ٹھیک ہے۔ تابیہ اس کو باندھ کر ڈال دو، ان دونوں کو۔ یہ کام ہم کسی تیسرے ڈاکٹر سے بھی کروا سکتے ہیں۔ مگر ایسا نہیں ہوگا۔ قوی صاحب ہی کو یہ آپریشن کرنا ہوگا۔"

تابیہ نے یوں کیا۔ جیب سے رومال نکال کر ڈاکٹر سیفی کے منہ پر ڈالنا چاہا مگر وہ بدک گیا۔ عین ممکن تھا کہ وہ شور مچا دیتا مگر تابیہ نے جیب سے اپنا خاص رومال نکال کر اس کے سر پر ڈال دیا۔ جیسے ہی اس نے رومال کے کنارے ڈاکٹر سیفی کی گردن پر سے جھٹکے وہ بے ہوش ہونے لگا، اور ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ ٹھنڈا ٹھار ہو گیا۔

"اس کا حال دیکھ رہے ہو نا تم۔ یہی کیفیت تمھاری بھی ہو سکتی ہے۔ اب بھی وقت ہے اس کو اسی حال میں پکڑ کر آپریشن کر دو۔" میں نے ڈاکٹر قوی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ آپ جیسا کہتے ہیں میں کر دیتا ہوں مگر ایک نرس کو اندر بلانا ہوگا۔"

"اس کی فکر نہ کرو۔ اسے ہم بلوا لیں گے، اس کو آپریشن ٹیبل پر ڈال لو۔" یہ کہہ کر میں نے تابیہ کی مدد سے ڈاکٹر سیفی کو اٹھا کر میز پر ڈال دیا۔

کمرے میں آپریشن کا سارا ہی سامان موجود تھا۔ ڈاکٹر قوی نے بادل ناخواستہ وہ کام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ یوں جیسے کوئی اپنے کسی عزیز کی تجہیز و تکفین کر رہا ہو۔ اس کے چہرے کی رنگت دیدنی تھی۔ ڈاکٹر سیفی بالکل بے ہوش ہو چکا تھا مگر وہ چند لمحوں کی بے ہوشی تھی۔ اپنے تمام اوزار اس نے قریب کر لیے مگر اب بھی وہ کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ جب وہ سیفی کو ٹیکہ لگا چکا تو وہ میری طرف دیکھے بغیر بولا۔ "یہ بدترین قسم کا جرم ہے جو آپ مجھ سے کروانا چاہتے ہیں، میں اس میں شامل نہیں ہو سکتا۔"

"زیادہ بڑبڑ کی ضرورت نہیں ہے جو میں کہہ رہا ہوں وہی کرو۔"

یہ بھی تو سوچو کہ ڈاکٹر سیفی نے بھی تو آخر ایک زندہ انسان کی آنکھیں زبردستی نکال کر کسی کے لگائی تھیں کیا اسے اپنے جرم کی سزا نہیں ملنی چاہیے؟"

پتہ نہیں میرے لہجے کی تلخی اسے کھا گئی یا میرے انصاف طلب انداز نے اسے متاثر کیا، اس کے ہاتھ آپ ہی آپ ڈاکٹر سیفی کی آنکھوں تک جا پہنچے۔ میرا خیال ہے کہ شاید وہ بدترین حالات میں بھی ایسا کرنے پر راضی نہ ہوتا۔

میں اور تاہیا دونوں پستول لے کر اس کے پاس کھڑے رہے۔ بلاشبہ وہ بہت ہی ماہر ڈاکٹر تھا اور اپنے فن سے اسے جو پیار تھا، وہ اس کے ہاتھوں کی انگلیوں سے ظاہر ہوتا تھا۔

کوئی آدھے گھنٹے میں اس نے ڈاکٹر سیفی کے قرنیے نکال لیے۔ مجھے اس سے کوئی ہمدردی نہیں تھی ورنہ میں تو اس کے لیے بدترین سزا تجویز کرتا مگر ابھی اتنا ہی بہت کافی تھا۔ جو کچھ اس نے چھین لیا تھا وہی مالک کو واپس کر رہا تھا۔ اگر وہ کسی اور جگہ مجھے ملتا، کوئی اور مقام ہوتا تو میں پستول کی پوری گولیاں اس کے جسم سے گزار دیتا مگر اس وقت اس کے قرنیوں ہی کی ہمیں ضرورت تھی۔

اور وہ ڈاکٹر قوی نے پوری کر دی تھی، اسے کسی نرس کو بھی اندر بلانے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ سارا کام اس نے خود ہی سرانجام دے لیا تھا۔

سہ پہر تین بجے تک ڈاکٹر قوی نے آبی کو بے ہوش کر کے اس کی آنکھوں میں نئے قرنیے لگا دیے۔ جب وہ انہیں پٹیوں میں دبا چکا تو میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا "میں نے یہ کام مکمل کر دیا ہے، اب کیا کہتے ہو؟"

"اگر اس آدمی کی روشنی واپس نہ آئی تو یاد رکھو تمھیں اس کی بہت زیادہ قیمت ادا کرنی ہوگی۔"

"میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ دونوں قرنیے میں نے نکال کر لگا دیے ہیں۔ ایک آدمی اندھا ہو چکا ہے، دوسرے کو روشنی ملتی ہے کہ نہیں اس کا اختیار خدا کو حاصل ہے۔"

"تمھارے خدا کو میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ پیسہ تمھارا خدا ہے اور اس کی روشنی واپس لانے کے لیے ہم تمھیں بے تحاشا پیسہ دے سکتے ہیں۔ تاہیے ذرا دیکھو باہر صورت حال کیسی ہے؟"

تاہیا اسی وقت دروازے میں سے باہر نکل گیا۔ اس عرصے میں ڈاکٹر قوی بڑی خاموشی سے کرسی پر بیٹھا چھت کو دیکھتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ یہ عجیب اتفاق تھا۔ ڈاکٹر قوی کے اس کمرے میں اس دوران کوئی بھی آدمی نہیں آیا۔ یہاں تک کہ سہ پہر کے تین بج گئے تھے۔ دراصل وہ ان کا آپریشن کا دن نہیں تھا۔ کلینک کے اس حصے میں خاموشی سی چھائی رہی۔ کوئی بھی شخص اس سے ملنے نہیں آیا۔ میں نے غور کیا تو یہ احساس ہونے لگا کہ ڈاکٹر قوی نے اپنے خاص مریضوں کے لیے وہ کمرہ بنوا رکھا تھا۔ اور تمام ضروری سامان اس نے وہاں لگوا لیا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد تاہیا واپس آ گیا، بولا "معاملہ تو صاف ہی نظر آتا ہے حکم کریں آپ۔"

"میرے حکم کی نہیں تمھاری عقل کی ضرورت ہے بھائی! ڈاکٹر قوی ذرا ادھر میری بات سن لیں تو بہت ہی اچھا ہو۔"

یہ کہہ کر میں نے قوی کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ سمجھا میں کوئی اس سے بہت ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔ مگر جیسے ہی میرا ہاتھ اس کی گردن پر پڑا، وہ اچھلا تو، مگر میری انگلیاں کام دکھا چکی تھیں۔ وہ میرے سامنے ہی کرسی پر جھول گیا۔ اب معاملہ بہت ہی آسان ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر کی کار میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ ہم نے سب سے پہلے تو آبی کو کار میں ڈالا —— اور اس کے بعد ڈاکٹر قوی کو سفید لٹھے کی چادر میں کار تک لے گئے۔ ہم اسے وہاں چھوڑ کر آگے نہیں نکل سکتے تھے۔ بہت کام تھا ابھی ہمیں اس سے۔ آبی کی ساری ہی تندرستی کا دار و مدار اس کے فن کی کرشمہ سازیوں میں مضمر تھا۔ ان دونوں کو وہاں لٹا کر ہم نے ڈاکٹر سیفی کو بھی سفید چادر میں ڈالا اور اطمینان سے بڑے ہال میں سے گزار کر کار تک لے گئے۔

مگر عین اس وقت ایک چپراسی نے ہمارا راستہ روک لیا بولا۔ "یہ کون صاحب ہیں؟ کہاں لے جا رہے ہیں انھیں آپ؟"

"یہ تینوں مریض ہیں ان کو ہم بڑے ہسپتال لے جا رہے ہیں۔"

"مگر... یہ... یہ تو مجھے ڈاکٹر سیفی نظر آتے ہیں۔"

"بکتے ہو تم۔ ڈاکٹر سیفی یہاں کہاں، جاؤ تم اپنا کام کرو۔"

یہ کہہ کر میں نے تاہیے کو کار میں بٹھایا۔ مگر جیسے ہی میں نے ڈرائیور کا دروازہ کھولا چپراسی ایک دم میری طرف لپکا۔ خاصا دبلے پتلے بدن کا آدمی تھا مگر بلا کا تیز۔ آتے ہی اس نے ڈاکٹر سیفی کی چادر کھینچ دی۔ جیسے ہی اس کا چہرہ سامنے آیا۔ اس نے سر پیٹ لیا۔ وہ آنکھوں پر بندھی پٹی کی وجہ سے اور ٹیکے کے زیر اثر ابھی تک بے ہوش تھا۔

چپراسی بولا "ادھر آؤ او ئے! یہ کیا ہو گیا۔ او ئے جمیل! او ئے قادر!..." وہ شور مچا ہی رہا تھا کہ میں نے آگے بڑھ کر پوری قوت سے اس کا گلا دبا دیا۔ یوں کہ اس کو دوسرا سانس لینا بھی نصیب نہیں ہوا اور وہ وہیں فرش پر اوندھے منہ لیٹ گیا۔ مگر میں نے اس کو اٹھا کر سامنے کے لان میں ڈال دیا۔ تاہیے نے اس عرصے میں ڈاکٹر سیفی کو پھر سے چادر کے ساتھ ڈھانپ دیا تھا۔

میں نے دیکھا کہ اس کی آواز نے کئی لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا مگر مجھے ان کو دیکھنے کی فرصت ہی کہاں تھی۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور پہلے ہی چکر میں اسے میں نے بہت اوپر اٹھا دیا۔ کار نئی تھی اور آرام دینی تھی جیسے ہی میں نے اسے گیٹ سے باہر نکالا۔ ہمارے پیچھے بہت سے لوگوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ وہ پکڑو، مارو، دوڑو کی صدائیں لگا رہے تھے۔ انھیں معلوم ہو گیا تھا کہ ان کا ایک چپراسی بھی بے ہوش ہو چکا ہے مگر میں ان کے ہاتھ کہاں آتا تھا۔

گاڑی میں نے پوری رفتار سے چلائی اور کچھ ہی دیر بعد میں طارق روڈ پر جا پہنچا۔ وہ لوگ بس چلاتے ہی رہ گئے۔ گاڑی فلیٹ کے قریب لے جا کر میں نے ان تینوں کو تاہیے کی مدد سے نیچے اتارا اور کمرے میں جا کر دونوں ڈاکٹروں کو —— ایک ہی بستر پر ڈالا اور آبی کو دوسرے کمرے میں لے جا کر لٹا دیا۔

"تم کرنا کیا چاہتے ہو؟" تاہیے نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ وہ بہت حیران ہو رہا تھا کہ میں نے ڈاکٹر قوی کو بے ہوش کیسے کر لیا۔ ایک ہی جھٹکے میں اس کا کام تمام کر دیا۔

"یہ بہت ضروری ہے تاہیے! اس ڈاکٹر قوی کو آبی کے ساتھ رہنا ہوگا پیارے! یہ دروازہ بند کر دے۔"

"تیرے مزے ہیں بھئی! پر تو یہ آدمی کو غضب کس طرح کر دیتا ہے کیا چیز ہے تیرے پاس؟"

"یہ بھی استاد کی دین ہے پیارے۔ تیرے پاس ہی یہ جال نہیں ہے کچھ اور لوگ بھی یہ کام جانتے ہیں۔"

"یہ تو... یہ تو بالکل بے کار ہے تیرے مقابلے میں۔ اس کو جھٹکا دو تو پھر اس کے "سیل" کام کرتے ہیں۔ دراصل یہ آدمی کو بے ہوش ہی کر دیتا ہے۔ سُن کر کے ڈال دیتا ہے پر تیرا طریقہ تو کچھ اور ہی ہے۔"

"چھوڑ ان باتوں کو۔ ابھی ان کو پڑا رہنے دے۔ جا دوڑ کر اپنے لیے کھانا لے آ۔ بھوک سے بُرا حال ہو رہا ہے، وہ مقصود بھی واپس نہیں آیا۔"

"ہاں وہ کہہ تو رہا تھا۔ میں ابھی کھانا لے آتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ میرے ہاتھوں کی طرف دیکھنے لگا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ پھندے میں پھنسا ہے اس کے ہاتھ خالی تھے۔ کچھ بھی اس کے پاس نہیں تھا۔

"اچھا! تو یہ حال ہے تیرا۔ بالکل ہی ختم ہو چکا ہے تو۔ لے یہ لے پیسے۔ عمدہ کھانا لے کر آنا۔" یہ کہہ کر میں نے پانچ سو کے نوٹ اس کے حوالے کر دیے۔

وہ خوش ہو گیا، بولا "بہت خراب ہو رہا ہوں یار! ایک آنہ پلے نہیں ہے۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

میں نے ان دونوں ڈاکٹروں پر نظر ڈالی۔ ایک تو پٹیوں میں دبا پڑا تھا۔ آنکھیں اس کی نکال لی گئی تھیں، یوں کہ کوئی بھی شخص اس کی وہ روشنی اسے واپس نہیں دلا سکتا تھا۔ ڈاکٹر قوی اپنی جگہ ٹھیک ہی لگ رہا تھا۔ اک ذرا اس کا رنگ بدلا ہوا تھا۔ ورنہ وہ تندرست نظر آتا تھا۔ ان کو ایک ہی جگہ دیکھ کر میں قدرت کے کاموں میں اپنے دخل کا حساب لگاتا رہا۔ وہ اس لالچ میں کلینک آیا تھا کہ شاید کوئی نیا کیس مل جائے۔ وہ ان کا آئی اسپیشلسٹ تھا۔ مگر... وہ خود اس روشنی سے محروم ہو گیا جو اسے آبی تک لے گئی۔ جو اسے اتنے بڑے جرم پر آمادہ کرتی رہی۔ اسے یقین نہیں تھا کہ کوئی اس کے ساتھ بھی وہی کر سکتا ہے جو اس نے آبی کے ساتھ کر دیا تھا۔ مگر قدرت کا تو ایک اپنا نظام ہے اور میں اس نظام میں محض ایک پرزہ بن کر رہ گیا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ وہ کسی ترکیب کے سائے میں جی رہا ہے۔ جو اسے کوئی گزند نہیں پہنچنے دے گی مگر اسے کیا معلوم کہ ہونی تو اس پر بھی بیت چکی ہے۔

ابھی تاہیا کھانا لے کر واپس نہیں آیا تھا کہ مقصود کے اس فلیٹ پر بڑی ہی نازک سی دستک ابھری۔ میں اپنی جگہ سے اچھل گیا تھا۔ وہ دستک دینے والا کون ہو سکتا ہے۔ دو ہی تو کمرے تھے۔ اس فلیٹ میں، تیسرا ڈرائنگ ڈائننگ، اور ابھی مجھے یہ بھی معلوم کرنا تھا کہ مقصود کے ملنے والے کون لوگ ہیں۔ میں نے پستول سیدھے ہاتھ میں لے لیا اور دونوں کمروں کے دروازے باہر سے بند کر کے میں دروازے تک جا پہنچا۔

"کون ہے؟"

"میں ہوں مقصود صاحب!" کسی عورت کی آواز ابھری۔ وہ آواز مجھے یہ احساس دلاتی تھی کہ عورت کوئی نک سک سے بہت ہی درست قسم کی ہوگی۔ یہی معلوم ہوتا تھا مجھے اور وہ سمجھی کہ اندر مقصود براجمان تھا۔ میں نے دروازہ کھول دیا تو وہ عورت تیزی سے مجھے دیکھے بغیر اندر آ گئی۔ وہ قمیص شلوار پہنے ہوئے تھی اور مجھے یہ خیال گزرتا تھا کہ وہ ابھی ابھی نہا کر آئی ہے۔

جیسے ہی اس نے مجھے دیکھا وہ کچھ گڑبڑا سی گئی، بولی۔ "وہ... وہ مقصود صاحب کہاں ہیں؟"

"وہ تو یہاں نہیں ہیں کیا کام ہے آپ کو ان سے؟"

"وہ... وہ مجھے پرسوں ملے تھے، کہہ رہے تھے کہ میں ان کے فلیٹ میں آ جاؤں۔"

"ہوں! تو اس کا مطلب ہے کہ مقصود صاحب بھی آپ کے پیشنٹ ہیں۔"

"جی کیا مطلب؟ میں سمجھی نہیں۔ دراصل انھوں نے کہا تھا کہ میں ٹھیک چار بجے یہاں پہنچ جاؤں۔ کوئی کام تھا انھیں مجھ سے کہہ رہے تھے کہ گھر میں آئیں تو بتائیں گے آپ سمجھتے ہیں نا۔۔۔ دراصل۔۔۔"

"میں سمجھ چکا ہوں جناب! بالکل سمجھ چکا ہوں۔ اندر چلیے۔"

"مگر وہ تو یہاں نہیں ہیں۔"

"تو کیا ہوا میں تو یہاں ہی ہوں نا۔ ویسے بھی میں دراصل خود اُداسی کا شکار ہو رہا ہوں۔"

"میں معافی چاہتی ہوں مجھے اجازت دیں۔"

وہ پیچھے مڑنے لگی تو میں نے اس کا راستہ روک لیا۔ "بیٹھیں کوئی ہرج نہیں، مجھے بھی یہ اداسی لے ڈوبے گی آئیے۔" یہ کہہ کر میں نے اس کے بازو پر ہاتھ ڈال دیا۔ وہ چلی تو سہی مگر یوں جیسے کوئی بے بس ہو کر چلتا ہے نشست گاہ میں لے جا کر میں نے اُسے صوفے میں دھنسا دیا۔ آپ نے کبھی ٹاپو دیکھا ہوگا۔ وہ بالکل ویسی ہی نظر آتی تھی۔ میری بھی زندگی کیا عجیب زندگی تھی۔ میرے پیچھے بھی پانی تھا اور آگے بھی اور ایسے میں کسی ایسی کا مل جانا میرے لیے بہت بڑی نعمت تھا۔ عمر اس کی یہی کوئی بائیس سال ہوگی۔ میں نے کہا ہے نا کہ اس کی آواز یہ بتاتی تھی کہ وہ نک سک سے بہت درست ہوگی۔ مگر وہ کچھ زیادہ ہی شاداب اور زیادہ ہی گل بہار نظر آتی تھی۔

"کیا پئیں گی آپ؟ اِدھر فریج میں بوتلیں موجود ہیں۔"

"مجھے افسوس ہے کہ میں نے خواہ مخواہ آپ کو زحمت دی دراصل مقصود صاحب سے یوں ہی میری ملاقات ہو گئی تھی۔ وہ بہت مصروف آدمی ہیں آنا پتا وہ مجھے دے گئے تھے، بس اسی پر چلی آئی۔"

"اس میں شرمندہ ہونے کی کیا بات ہے، آدمی سے آدمی ملتا ہے۔ نہ سہی مقصود صاحب میں جو حاضر ہوں کوئی کام ہو تو بتائیں۔"

"جی بس کام تو کوئی بھی نہیں۔ کہا ہے نا کہ وہ شدید نفسیاتی الجھن کا شکار تھے۔ مجھ سے ہوٹل میں ملے تو بولے میں اُن کے پاس آ جاؤں تو بہت ہی اچھا ہو۔"

"کہیں آپ بھی پولیس کی ملازم تو نہیں ہیں؟"

"جی یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ! میں۔۔۔ میں تو اُن کو دیکھنے آئی ہوں، میرا پولیس سے کیا واسطہ؟"

"ٹھیک ٹھیک! یہ لیں، یہ کوکا کولا تو ضرور ہی پی لیں اور ذرا کھل کر بیٹھیں پنکھے کے نیچے ہو جائیں۔ میرا یہ اندازہ تھا کہ آپ بھی پولیس کی ملازم ہیں۔ دراصل ہمیں لوگوں کے بارے میں صحیح اندازہ نہیں ہوتا ہے نا! اس لیے غلط رائے قائم کر لیتے ہیں یہ اور بوتل پئیں۔"

"جی نہیں شکریہ! کسی اور شے کی ضرورت نہیں ہے مجھے اب اجازت دیں، میں چلتی ہوں۔"

"کیا میں اتنا ہی بُرا ہوں، بیٹھ جائیں دو گھڑی ہمارا بھی دل بہل جائے گا۔" یہ کہہ کر میں اس کے قریب جا بیٹھا مگر اس طرح کہ میرے اور اس کے درمیان ایک ہاتھ کا فاصلہ تھا۔ وہ کچھ گھبرا سی گئی، بولی "مجھے اجازت دیں میں اب چلتی ہوں۔"

"جی نہیں۔ آدمی آتا اپنی مرضی سے ہے اور جاتا دوسرے کی مرضی سے ―― آپ کام کیا کرتی ہیں؟"

"جی کچھ نہیں، ایسے ہی گھوم پھر لیتی ہوں۔ مقصود صاحب مل جاتے تو میں انھیں بتاتی کہ میں کس پریشانی میں ہوں۔"

"اس کو جانے دیں جناب! کیا نام ہے آپ کا؟"

"جی میرا نام حُسنہ ہے۔"

"ہوں! تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ اگر آپ مجھے کسی قابل سمجھیں تو اپنی پریشانی مجھے بتا دیں۔"

"کچھ ایسی ہی بات ہے۔ میں آپ سے کیا عرض کروں دراصل۔۔۔"

"جی فرمائیے نا آپ! کیوں پریشان ہیں آپ؟"

"دراصل میرے پیچھے دو غنڈے لگے ہیں اور وہ جگہ جگہ میرا پتا پوچھتے پھرتے ہیں۔ وہ مجھے قتل کر دینا چاہتے ہیں۔"

"یعنی آپ کو وہ۔۔۔ وہ یعنی بالکل ہی قتل کر دینا چاہتے ہیں۔ یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟"

"میں صحیح کہہ رہی ہوں۔ دراصل ایک صاحب تھے یہاں غلام رسول میں اُن کے پاس رہ رہی تھی۔ بہت مہربان تھے وہ مجھ پر۔ کل اُن لوگوں نے غلام رسول کو قتل کر دیا۔ ایک صرف میں ہی موقع کی گواہ ہوں اور وہ مجھے بھی مار دینا چاہتے ہیں۔ میں نے بڑی مشکلوں سے اپنی جان بچائی ہے مگر وہ اب بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑتے۔"

"یہ تو کمال بات بتائی ہے آپ نے؟ یعنی یہ غلام رسول صاحب کون تھے؟"

"یہ ایک تعمیراتی فرم کے مالک تھے۔ میں بھی اُن کے ہاں کام کرتی تھی پھر انھوں نے مجھے اپنے گھر میں پناہ دے دی۔ اُن کے بال بچے اُدھر مردان میں ہیں۔ مجھ سے کام بھی انھوں نے چھڑوا دیا مگر اب صورتِ حال یہ ہو گئی ہے کہ مجھے جو پناہ حاصل تھی وہ بھی گئی اور غنڈے مجھے بھی مار دینا چاہتے ہیں کیونکہ انھیں یقین ہے کہ میں اُن کی مخبری کر دوں گی حالانکہ مجھے اپنی جان کی زیادہ فکر ہے۔"

"ہوں! مگر وہ غنڈے غلام رسول کے پیچھے کیسے لگ گئے؟ کیوں مار دیا ہے انھوں نے اُسے؟"

"وہ دراصل جی کچھ لین دین پر کسی کے ساتھ ان کا جھگڑا تھا۔ غلام رسول نے کسی سے دس لاکھ روپے وصول کرنا تھے، اس پر اس آدمی نے غنڈوں سے کام لے کر اُن کا پتّہ صاف کرا دیا نہ رہے بانس، نہ بجے بانسری۔"

"ہوں! تو یہ بات ہے مس حُسنہ ان کا نام کیا ہے؟ اُن آدمیوں کا۔"

"جی ایک کا نام اسلم خان ہے اور دوسرے کا مستان شاہ۔ اور جس آدمی سے غلام رسول صاحب کا جھگڑا تھا اس کا نام کبیر خان ہے۔"

"کہاں رہتے ہیں یہ سب لوگ؟"

"جی وہ اُدھر ڈیفنس میں رہتا ہے وہ کبیر خان۔ اُن کے غنڈے دوست کسی اور جگہ رہائش رکھتے ہیں اور اُن سے وہ لمبا ہی کام لیتا ہے وہ کبیر خان۔"

"ہوں! تو یہ بات ہے۔ بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ دیکھتے ہیں ہم کہ اُن کے بارے میں ہم کیا کر سکتے ہیں۔ آپ جوتا اتار کر بیٹھیں اور اسے اپنا ہی گھر سمجھیں۔"

اس نے اپنا جوتا اتار کر پاؤں صوفے پر رکھ لیے۔ مگر ابھی تک اس کے چہرے کی رنگت بدلی نہیں تھی۔ نہ اسے مجھ پر اعتماد تھا نہ ان لوگوں کی طرف سے اسے قرار تھا جنھوں نے اس کی جان سُولی پر لٹکا رکھی تھی اور تاہیا ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ پتہ نہیں اسے کہاں دیر لگ گئی تھی۔

"کہیں اُن لوگوں نے آپ کو اس عمارت میں تو آتے نہیں دیکھا؟"

"میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔ اُن سے چھپتی پھر رہی ہوں۔ کچھ ہی دیر پہلے میں نے اُن کے ایک آدمی کو اپنے پیچھے آتے دیکھا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ انہی کا آدمی ہو۔ میری جان سخت مصیبت میں پھنسی ہے۔" پہلی بار اُس نے دلی غم کا اظہار کیا۔ ابھی تک وہ بظاہر بہت کُھلی چھپی نظر آتی تھی۔ اپنے کسی بھی رویے سے وہ اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاتی تھی۔ پہلی بار اُس کے لہجے میں یاس گھلی۔

"آپ پریشان نہ ہوں۔ اگر وہ ادھر آ گئے تو بچ کر نہیں جا سکیں گے۔ آپ صحیح جگہ پر آئی ہیں۔" میری یہ بات سن کر اس کا جسم تھرتھرایا، یوں جیسے کوئی چھری تلے آنے سے پہلے آخری ہچکی لیتا ہے۔ اس کے وہ گل نژاد ہاتھ، مجھے بہت ہی بھلے معلوم ہوتے تھے۔ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا۔ ایک بے طرح کی اداسی نے مجھے گھیر لیا تھا۔ اور میرا دل چاہتا تھا کہ وہ میرے سامنے بیٹھی اپنے غم کا اظہار کرتی رہے اور میں سنتا رہوں۔ اس کے ہاتھوں میں آہستہ آہستہ پسینہ ابھر آیا۔ دراصل وہ ہاتھ اس کے اندرونی جذبے کی مکمل عکاسی کرتے تھے۔ کوئی گزند آدمی کو پہنچتی ہے تو ہاتھ اس کا بہت ساتھ دیتے ہیں۔ وہ گستہ عیاں ہاتھ مجھے بہت ہی بھلے لگتے تھے۔

"میں۔۔۔ میں کیا عرض کروں، میں غلام رسول صاحب کے پاس رہی تو اس دوران بھی کبیر خان نے مجھے پھانس لینے کی بہت کوشش کی۔ وہ بہت ہی دریدہ دہن آدمی ہے مگر میں تو غلام رسول کی ہو کر رہ گئی تھی۔ اب انھیں کبیر خان سے دس لاکھ روپے لینے تھے جس کا جواب اُس نے یہ دیا کہ اسے ختم کروا دیا۔ اور اب وہ میرے پیچھے پڑا ہے۔ یا تو وہ مجھے اغوا کر لے گا یا پھر جان سے مار دے گا۔"

"پاگل ہیں آپ! کوئی آپ کی ہوا کو بھی نہیں پہنچ سکتا، مجھے معلوم ہے کہ ایسے لوگوں سے کیسے نِپٹا جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ کوئی بڑی رقم ہوگی آپ کے پاس۔"

"جی کچھ بھی نہیں ہے میرے پاس صرف میرے یہ زیورات ہیں بہت ہوں گے تو بیس ہزار کے ہوں گے۔ نو ہزار میرے پاس نقد موجود ہے اور اس بیگ میں پڑا ہے یہ آپ مجھ سے لے لیں اور اُن لوگوں سے مجھے بچا لیں۔ میں آپ سے یہی درخواست کرتی ہوں۔"

"ارے نہیں! رقم کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں انھیں ایسی گردنی دوں گا کہ سب سیدھے ہو جائیں گے، گھبرائیں نہیں آپ۔" میں نے اس کے نم آلود ہاتھ پر ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

عین اس وقت تاہیا اندر آ گیا۔ وہ اپنے ساتھ کھانے کا سامان لے آیا تھا۔ دونوں ہاتھ اس کے بھرے ہوئے تھے۔ مجھے اس خاتون کے ساتھ دیکھ کر وہ کچھ بدک سا گیا، بولا "یہ۔۔۔ یہ کون خاتون ہیں، کوئی خاص بات تو نہیں ہوئی یہاں؟"

"نہیں یار! خاص بات تو کیا، کوئی عام بات بھی نہیں ہوئی۔ تجھے کیا یاد آ رہا ہے؟"

"مجھے اس فلیٹ کے باہر سڑک پر ایک آدمی نظر آ رہا تھا۔ وہ اس جگہ کو خاص طور پر دیکھ رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا چاہتا تھا۔"

"اچھا! دیکھوں تو ذرا، تم ادھر ہی بیٹھو۔"

یہ کہہ کر میں وہاں سے اٹھا اور پستول سیدھے ہاتھ میں لے کر میں نے رومال سے ڈھانپ لیا۔ دروازے سے باہر نکلا تو ایک آدمی تیزی سے میرے سامنے سے گزرا۔ مگر وہ تو کوئی اور ہی شخص تھا۔ ہمارے دروازے پر اس کی نظر نہیں تھی۔ میں کوئی دس منٹ تک سامنے کی سڑک پر اِدھر اُدھر پھرتا رہا۔ مگر وہاں مجھے کوئی آدمی نظر نہیں آیا۔ مایوس ہو کر میں فلیٹ میں واپس آ گیا اور پستول میں نے نیفے میں اُڑس کر نشست گاہ میں قدم رکھ دیا۔

تاہیا اس عرصے میں کھانا بچھا چکا تھا، بولا "کوئی آدمی نظر آیا تمھیں؟"

"نہیں! کوئی بھی نہیں تھا وہاں۔ بہرحال جو بھی ہوگا دیکھ لیں گے ہم اُسے تم یوں کرو کہ آپی کو جگا کر اسے کھانا کھلا دو۔"

"میں نے اُسے جگا دیا ہے، بہت ہی بہادر آدمی ہے یار۔ مجھے معلوم ہے کہ آنکھوں کا درد کیسا ہوتا ہے۔ مگر وہ سی نہیں کرتا۔"

"میں خود اس کے پاس بیٹھ کر اسے کھلاتا ہوں تم یہ کھانا ادھر لے آؤ۔ آپ دونوں یہاں بیٹھ کر کھا لیں۔"

"جی مجھے تو بھوک نہیں ہے" حسنہ نے کہا۔

"ایسا نہ کہیں کھانا ضرور کھا لیں اور بے فکر ہو جائیں۔ یہاں آپ کو کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا ہے" یہ کہہ کر میں نے ضروری سامان اٹھایا اور آبی کے پاس جا بیٹھا۔

میری آواز سن کر وہ بولا "میرے لیے کب تک یہ تکلیف اٹھاتے رہو گے یار! میں اب سیدھا نہیں ہو سکتا ہوں۔ لا یہ پلیٹ ادھر دے دے حد ہے کہ میں سامنے رکھا برتن بھی نہیں دیکھ سکتا۔"

"نہیں یار! تو کیسی باتیں کرتا ہے۔ ہم نے دونوں ڈاکٹر ادھر ڈال دیے ہیں، وہ خود تیرا علاج کریں گے۔" یہ کہہ کر میں نے پلیٹ اس کے سامنے رکھ دی۔ مرغ کا سالن تھا اور روٹیاں بہت ہی نرم تھیں۔ آبی نے کھانے میں ہاتھ ڈال دیا۔ ذائقہ بہت ہی عمدہ تھا وہ خوش ہو گیا، بولا "کھانا تم اچھا لاتے ہو۔ پتہ نہیں یہ سیاپا کب ختم ہوگا، میں تو تھک گیا ہوں یار!"

"یوں نہیں کرتے ہیں آبی! حوصلے سے کام لو۔ تمہیں خدا نے بڑا کام ڈال دیا ہے اس سے تمہیں نمٹنا ہوگا۔ کوئی گرز بردار ایسا نہیں گزرا جس سے گرز نہ اٹھ سکے اور اس کی نوکری بھی بحال رہے۔۔۔ چھ ٹمیں تو ہمارے نصیب میں ہیں۔"

"ہاں یہ تو ہے مگر یار اس ڈاکٹر سیفی کو تو ذرا دیکھو، مجھے یقین ہے کہ اسی نے میری روشنی ختم کی تھی۔ تم نے خوب پہچانا ہے اسے۔۔۔ ورنہ تو اسے پکڑ لینا آسان نہیں تھا۔"

"ہاں! جس انداز سے اس آدمی نے تمہیں دیکھا اور دیکھ کر پلٹ گیا، وہی انداز مجھے کھلنے لگا تھا۔ اس کو تو سیدھا کر دوں گا اس ڈاکٹر کو۔"

"بہت زیادتی ہے یار! اب یہ خود بھی ساری عمر کے لیے۔۔۔ پتہ نہیں ڈاکٹر قوی نے اس کے قرنیے بھی صحیح نکالے ہیں کہ نہیں۔"

"نہیں نکالے ہوں گے تو خود بھگتے گا۔ تمہاری روشنی تو تمہیں واپس مل جانی چاہیے۔ درد تو نہیں ہے تمہیں؟"

"نہیں۔۔۔ ابھی تو نہیں، میرا خیال ہے کہ ٹیکے کا اثر ہے۔ بعد میں درد تو ضرور ہوگا۔ میں نے ابھی یہاں کسی عورت کی آواز سنی تھی۔"

"بس یہ عورتیں ہی تمہیں لے ڈوبی ہیں۔ بھلا عورت ادھر کہاں سے آ گئی۔"

وہ میرے لہجے کی شوخی کو سمجھتے ہوئے بولا "عورت ہی تو اصل چیز ہے۔ یہ نہ ہوتی تو ادھر بھنگ گھٹتی۔ مگر تمہیں ابھی پتہ نہیں چل سکا۔ تھی نا کوئی عورت یہاں؟"

"ہاں! مقصود صاحب سے ملنے کے لیے ایک خاتون آئی ہیں۔ بہت طرح دار ہیں اور حسین بھی مگر وہ اس غم میں گھل رہی ہیں کہ کوئی انہیں قتل کر دے گا۔"

"تو بچا لو نا اسے۔ عورتوں کو ہر حال میں بچا لینا چاہیے۔ میں تمہاری جگہ ہوتا تو دیوار کھڑی کر دیتا اس کے اور موت کے درمیان۔"

"ہاں! تیرا تو مطلب ہی یہ ہے کہ عورت خواہ کوئی بھی ہو، تمہارے حرم سے گزر جائے تو بس وہ تمہاری ہو گئی۔"

"یہ بات نہیں ہے یار! دراصل اس کے بغیر تو زندگی کا تصور ہی ناممکن ہے۔ مجھے نہیں دکھاؤ گے اسے؟"

"تم کوئی دیکھنے دکھانے کی چیز ہو۔ ذرا دم لو چھری تلے۔ پھر دیکھ بھی لینا بہت دن رہے گی وہ یہاں۔"

"کوئی پولیس کی بھیجی ہوئی عورت تو نہیں تمہیں بھی مروا دے گی۔"

"نہیں وہ ایسی نہیں ہے اور نہ ہی کسی تم ایسے بیشنٹ کو طلب کرتی ہے۔ سگریٹ پیو گے؟"

"ہاں یار! اس سے تو میں بالکل ہی محروم ہو گیا ہوں۔ لا ذرا۔ ایک مجھے بھی سلگا دے، کیسے سیاپے میں پھنس گئے ہیں ہم۔" آبی نے کلی کر کے ہاتھ پونچھ لیے اپنے ہی کرتے کے دامن سے۔

اتنے میں نے سگریٹ سلگا کر دیا تو وہ بولا "اس سالے میں تم نے نمی تو نہیں بھر دی۔ تمہارے ہونٹ ویسے ہی بہت شیریں ہیں۔"

"نہیں یار! تو خواہ مخواہ ہی عاشق بن رہا ہے۔ تو اب لیٹ جا اطمینان سے۔ میں پھر آؤں گا، فکر نہ کر تو ٹھیک ہو جائے گا۔"

میری یہ بات سن کر اس نے زہرخند کیا اور تکیے پر سر ڈال کر بولا "نہیں جیلانی! اب مجھے کوئی امید نہیں رہی ہے۔ بہرحال تیرا یہ نسخہ بھی دیکھ لیں گے۔"

اسے میں نے پنکھے کے نیچے لٹا کر اوپر چادر اوڑھا دی تو اس نے پہلو بدل لیا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ سونے کے موڈ میں تھا۔ برتن میں نے وہاں سے اٹھائے اور تابیے کے پاس جا پہنچا وہ اس خاتون سے کسی مسئلے پر بحث کر رہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ معاملہ کسی کے قتل ہی کا تھا۔ کھانا وہ دونوں کھا چکے تھے۔ پتہ یہ چلا کہ تابیے کے نزدیک کسی کو قتل کر دینا کوئی بات ہی نہیں تھی۔ اس کا خیال یہ تھا کہ کوئی آدمی جب ہی قتل ہوتا ہے جب خدا اس کی درازیٔ رسی کو کم سے کم کر دیتا ہے، ورنہ تو کسی کے قتل ہونے کا کوئی جواز نہیں۔ اور وہ جو خاتون مجھ سے کہہ رہی تھی کہ اسے اپنے قتل کا شبہ قوی ہے تو تابیے کے نزدیک یہ بھی خدا کی رضا ہی تھی۔ ورنہ کوئی آدمی بھلا کسی دوسرے کو کیسے قتل کر سکتا ہے۔۔۔ یہ اس کا خیال تھا۔

"ابے کیوں بے تکی ہانک رہا ہے۔ قتل بھی گویا خدا ہی کی طرف سے ہوتا ہے، کچھ تو خدا سے ڈر۔"

"کیوں نہیں بھائی جی! خدا کی مرضی کے خلاف تو ایک پتہ تک نہیں ہلتا ہے اور آپ قتل کی بات کرتے ہیں۔"

"چھوڑ یار تو کس چکر میں پڑ گیا ہے۔ ساری دنیا کے مذاہب اس بات پر متفق ہیں کہ قتل سے زیادہ بڑا گناہ کوئی نہیں اور تو چاہتا ہے کہ یہ خاتون قاتل کے سامنے اپنی گردن پیش کر دے۔ یہ نازک سی، نرم گفتار اور نرم مزاج گردن۔۔۔ یہ خیال ہے تمہارا۔۔۔ یہ ایسے ہی بھونکتا ہے خاتون! آپ پریشان نہ ہوں ہم آپ کو قتل نہیں ہونے دیں گے۔"

"جی! آپ کا بہت بہت شکریہ۔ میں دراصل ان کو یہی سمجھا رہی تھی کہ میرا کیا قصور ہے؟ میں نے ایک آدمی کو قتل ہوتے دیکھا تو ہے میں اس کی گواہ بھی ہوں مگر میں پولیس میں نہیں جاؤں گی۔ پھر بھی وہ مجھے مار دینا چاہتے ہیں تو یہ کوئی۔۔۔ یعنی یہ کوئی اچھی بات ہے؟"

تابیا اس کی یہ بات سن کر ہنس دیا، بولا "آپ مانیں یا نہ مانیں۔ میرا قتل بھی آخر کسی نہ کسی کے ہاتھوں ضرور ہوگا۔ اب میں کہاں جا کر انصاف ڈھونڈتا پھروں گا۔ مر گئے سو گئے۔ اللہ کے ہاں جا کر خود ہی معاملہ ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ تو بہرحال سیدھی جنت میں جائیں گی۔ ہر مقتول ادھر ہی جاتا ہے۔"

"بکواس نہ کر تابیے! تو ان کو خواہ مخواہ ہی پریشان کر رہا ہے۔ آپ اطمینان سے یہاں لیٹ جائیں۔ ادھر بھی ایک بستر پڑا ہے ہم آپ کا پہرا دیں گے۔"

"اچھا یار! تم ادھر اطمینان سے بیٹھو۔ میں ایک فلم دیکھ آؤں۔ تمہارے یہ کچھ روپے میری جیب میں پڑے ہیں کہو تو ہو آؤں۔"

"ضرور جاؤ یار! یہ کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ میری بھی جان چھوٹی رہے گی۔"

"اچھا خدا حافظ! دراصل میں کوئی بھی اچھی فلم چھوڑ دینا پسند نہیں کرتا۔ میرا خیال ہے کہ آپ بھی میرے ساتھ جانا چاہیں گی؟"

"خواہ مخواہ ہی۔ یعنی ان کو کیا ضرورت ہے فلم کی۔ یہ تو اپنے قتل کے خوف میں مبتلا ہیں بھئی! جاؤ موج کرو۔ اور ان کو ادھر ہی رہنے دو۔"

"میرا خیال ہے کہ آدمی سینما میں زیادہ محفوظ ہوتا ہے۔ بہرخیر، ادھر بھی کوئی ہرج نہیں۔ کوئی قاتل آ ہی گیا تو تم اس کا بندوبست کر ہی لو گے۔" یہ کہہ کر اس نے آئینے میں ایک نظر ڈالی اور تیز تیز قدم اٹھاتا باہر نکل گیا۔ میں نے اس کے پیچھے دروازہ بند کر دیا۔

میں لوٹ کر کمرے کی طرف آنے لگا تو میرے وجود میں ایک عجیب سی سسکار اٹھنے لگی تھی۔ ایک عورت جو تنہا ہو، پناہ کی تلاش میں بھی ہو، اسے قتل کا خوف بے جان کیے دیتا ہو تو پھر۔۔۔ ایسے میں آدمی کو کیا کرنا چاہیے! میں تو چاہتا تھا کہ اسے سموچا نگل لوں مگر۔۔۔ کوئی شے ایک دم میرے اندر ٹوٹنے لگی اور کمرے کے دروازے تک واپس جاتے وقت میں اس قابل بھی نہ رہا کہ اس کا سامنا کر سکوں۔ وہ بہت حسین تھی۔ ایسی حسین کہ دلی کے کوچے بھی ایسی صورتوں کو ترستے ہوں گے اور وہ کراچی میں پھر رہی تھی۔ اسے پا لینا اپنی جان پر سے ہزار رحمتیں گزار دینے کے مترادف تھا۔ مگر میں۔۔۔ میں بس ان چند لمحوں میں ہی اندر سے بجھ سا گیا۔ کوئی روشنی تھی جو ایک دم زائل ہو گئی۔

میں اس کے سامنے بیٹھا تو وہ بولی "مقصود صاحب آج نہیں آئیں گے؟"

"نہیں، وہ لاہور جا چکے ہیں کچھ دن بعد آئیں گے۔"

"اچھا! تو یہ بات ہے۔ مجھے ہر گھڑی ڈر محسوس ہوتا ہے۔ کوئی ایسی جگہ نہیں ہے جہاں میں چھپ کر بیٹھ سکوں۔ آپ کا یہ احسان میں کبھی نہیں بھلا سکوں گی۔"

"خوف تو آدمی کے اندر موجود ہوتا ہے جگہ کا تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ کیسی بھی محفوظ جگہ پر جا بیٹھیں آپ کا خوف جب تک دور نہیں ہوگا، کچھ نہ ہو سکے گا۔" یہ کہہ کر میں نے سگریٹ سلگا لیا۔ اور ٹانگیں پھیلا کر میں نے میز پر رکھ دیں۔

"ہاں یہ تو ہے میرے ہاتھوں میں دیکھ کر آپ کوئی نادیدہ تحریر پڑھ رہے تھے کچھ نظر آیا آپ کو کہ میری تقدیر کیا ہے؟"

"بہت اچھی تقدیر ہے آپ کی۔ دلوں پر راج کریں گی آپ۔ اک ذرا صبر سے کام لیں تو ساری مشکل آسان ہو جائے گی۔"

میری یہ بات سن کر وہ پہلی بار مسکرائی تو اس کے وہ صاف شفاف اور ہموار دانت مجھے نظر آئے۔ تب مجھے محسوس ہوا کہ وہ چاہے تو سارے گھر کو گلزار بنا سکتی ہے۔ وہ مسکراتی نہیں تھی بلکہ خوبصورتی بکھیرتی تھی۔ اور مجھے اس کے لپ اسٹک لگے ہونٹوں تلے دبی دولت کا احساس تک نہ ہو سکا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور میرے پاس آ بیٹھی۔ ایک تپائی اس نے اپنے لیے منتخب کر لی تھی۔ اپنا ہاتھ بڑھا کر بولی "ذرا دیکھیں تو کیا لکھا ہے میرے ہاتھ میں؟"

"ارے نہیں! آپ کا ہاتھ تو ایک گلبدن کا ہاتھ ہے۔ اس میں اپنی نہیں کسی کی تقدیر دیکھا کرتے ہیں۔ ایسی باتیں نہ سوچیں جو آپ کا حوصلہ ہی پست کر دیں۔" یہ کہہ کر میں نے اس کا ہاتھ پیچھے ہٹا دیا۔ میں اسے شہہ نہیں دے رہا تھا مگر اب کی بار وہ کوئی فیصلہ کر کے اٹھی تھی، بولی "آپ یہاں کب سے رہ رہے ہیں؟"

"ایک کام سے ہم یہاں آئے تھے میرے دوست کی آنکھوں کا آپریشن ہوا ہے۔ بہرحال آپ ذرا یہاں بیٹھیں میں ابھی آتا ہوں یہ دروازہ کھلا رہنے دیں۔"

یہ کہہ کر میں اٹھا اور نشست گاہ کے دروازے کو پوری طرح کھول کر آگے نکل گیا۔ دوسرے کمرے میں لیٹے ڈاکٹر سیفی اور ڈاکٹر قوی دونوں ہی کلبلا رہے تھے۔ ڈاکٹر قوی کو ہوش آ رہا تھا اور سیفی ابھی تک بیند کے ٹیکے سے جان چھڑا کر ہوش میں آنے کا منتظر تھا۔ میں نے ڈاکٹر قوی کو لوہں آنکھیں کھولتے دیکھا تو قریب پڑی ایک رسّی لے کر اس کے دونوں ہاتھ کمر پر باندھ دیے۔

اُسے ایک دم ہوش آ گیا، بولا "یہ۔۔۔ یہ تم میرے ساتھ کیا کر رہے ہو؟ مجھے چھوڑو گے نہیں تم؟"

"نہیں! ابھی نہیں تمھیں کم از کم دس دن یہاں رہنا ہوگا۔ میرے دوست کو آرام آ جائے تو چلے جانا مجھے افسوس ہے مگر یہ بہت ضروری ہے۔"

"تمھیں میرے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرنا چاہیے۔ میں اس کا معالج ہوں معاملے کو خراب بھی کر سکتا ہوں میرے یہ ہاتھ کھول دو۔"

"مگر اس کی کیا ضمانت ہے کہ تم شور نہیں مچاؤ گے؟ چیخو گے نہیں؟"

"اس کی بھی میں ضمانت نہیں دے سکتا۔ اس کا کیا کرو گے اب تم؟" اس نے ساتھ لیٹے ہوئے ڈاکٹر سیفی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"اس کا تو میں پکّا بندوبست کر دوں گا۔ میں اس کے پرزے ادھیڑ دوں گا بہرحال تم اب کچھ کھالو میں تمھارے لیے کھانا لاتا ہوں۔"

یہ کہہ کر میں دوسری طرف چلا گیا۔ جب میں کھانا لے کر اس کے پاس پہنچا تو اس نے زہر خند کیا، بولا "تم بہت عجیب آدمی ہو۔ اس کے ساتھ مجھے بھی تم نے باندھ لیا ہے حالانکہ تمھارا اصل مجرم یہی ہے۔"

"مجھے افسوس ہے اگر تم اپنی نیک چلنی کی ضمانت دیتے ہو تو میں تمھیں کھول دیتا ہوں۔"

"ہاں! میں دس دن یہاں رہ لوں گا میرے ہی ہم پیشہ آدمی نے آپی کو اندھا کر دیا۔ میں کچھ نہ کچھ تو تلافی مافات کرنا چاہوں گا۔ مجھے کھول دو۔ آپی کا تم نے درست علاج کیا ہے مگر اس سیفی نے یہ سب کیسے کر لیا؟"

"بس رقم کے لالچ نے اسے اندھا کر دیا تھا۔ اسے برباد کرکے ان لوگوں نے ایک کالی کوٹھڑی میں پھینک دیا۔ میں تمھارے ہاتھ کھول دیتا ہوں ہمارے ساتھ تعاون کرو گے تو بات ٹھیک رہے گی۔"

یہ کہہ کر میں نے اس کے ہاتھ کھول دیے۔

وہ بڑی مشکلوں سے اٹھا۔ پہلو میں بنے باتھ روم میں جا گھسا۔ جب وہ باہر آیا تو تازہ دم نظر آتا تھا اور پہلے سے بہت ہی اچھے موڈ میں تھا۔ اس کے سامنے میں نے کھانا رکھا تو وہ بڑی رغبت سے کھانے لگا، بولا "عجیب بات ہے کہ ہمارے پیشے میں بھی ایسے لوگ گھس آئے ہیں، بہرحال آپ فکر نہ کریں۔ آپی کا علاج ہو رہا ہے وہ ٹھیک ہو جائے گا۔"

"تمھاری مہربانی ہے ڈاکٹر! مجھے افسوس ہے کہ تمھیں یوں باندھ کر مجھے لانا پڑا مگر اس کے سوائے کوئی طریقہ نہیں تھا۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ اس کو تو یہاں سے ہٹائیں۔ میں اس کے ساتھ یہاں نہیں رہ سکتا۔"

"ہاں! اس کا میں بندوبست کرتا ہوں فکر نہ کریں، ایک ایک پرزہ میں اس کا الگ کر دوں گا۔"

جب میں خالی برتن اٹھانے لگا تو وہ بولا "اس کو یہاں سے ضرور ہٹا دیں۔ جہاں جی چاہے پھینک دیں اسے۔ میں ایسے آدمی کی صورت دیکھنا پسند نہیں کرتا۔"

"یہی ہوگا۔" میں نے برتن الگ رکھ کر سیفی کو وہاں سے اٹھایا۔ اور لے جا کر بائیں ہاتھ کے اسٹور میں ڈال دیا۔ فرش پر اس کا بدن لگا تو اُس نے جھرجھری لی مگر پھر بے سُدھ ہو کر لیٹ گیا۔ ابھی ٹیکے کا اثر باقی تھا۔

دروازہ باہر سے بند کرکے میں ڈاکٹر قوی کے پاس جا بیٹھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم تھا مجھے دیکھ کر بولا "مجھے تمھارا قیدی بن کر یہاں رہنا ہوگا؟"

"سوچ لیں ڈاکٹر! ہم بہت بُرے لوگ ہیں، ایسے بُرے کہ ہمارے اخباروں میں اشتہار چھپتے ہیں۔ ہم سے تعاون کریں گے تو مزے میں رہیں گے۔ اُس نے آنکھیں نکالنے کے بیس ہزار لیے تھے، میں آپ کو روشنی واپس دینے کے پچاس ہزار دے سکتا ہوں۔ آپی کی زندگی آنکھوں کے بغیر کچھ بھی نہیں ہے۔"

"میں سمجھ رہا ہوں۔ اگر اس کی روشنی واپس آ گئی تو میں آپ کے انعام کا مستحق ہوں گا۔ میں سمجھوں گا کہ مجھے میرا معاوضہ مل گیا ہے۔"

"تو ٹھیک ہے یہ لیں بیس ہزار روپیہ رکھ لیں۔" یہ کہہ کر میں نے اپنے بیلٹ سے بندھی رقم نکال کر اسے بیس ہزار گن دیے۔ وہ بہت خوش ہو گیا، بولا "معلوم ہوتا ہے آپ کے پاس بہت پیسہ ہے۔ میں آپی کو اب کل صبح دیکھوں گا۔"

"ہاں! اور آپی کے لیے تو میری زندگی بھی حاضر ہے۔ اس کو روشنی واپس مل جانی چاہیے۔"

اس نے نوٹ جیبوں میں ڈال لیے اور مجھ سے سگریٹ لے کر سلگانے لگا۔ اس کا ذہن اب اس کام کے لیے تیار ہو گیا تھا۔

اس کو باندھ لینا میری مجبوری تھی مگر اب وہ از خود اس کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ سودا طے ہو گیا تو میں اسے بستر پر آرام کرنے کا کہہ کر وہاں سے نکل گیا۔ میں نے اُسے واقعی ایسی گولی دے دی تھی جو اس کے لیے بہت کافی اور شافی ثابت ہو سکتی تھی۔

میں لوٹ کر نشست گاہ میں پہنچا تو حسنہ ابھی تک ویسے ہی بیٹھی ہوئی تھی، بولی "میں کیا کروں مجھے سخت خوف آ رہا ہے۔ کسی جگہ مجھے آرام کرنے کا موقعہ مل سکتا ہے؟"

"آرام! جسے قتل ہونا ہو وہ بھلا کیسے آرام کر سکتا ہے۔ بہرحال آپ اس بستر پر لیٹ جائیں۔"

میری یہ بات سن کر وہ وہاں سے اٹھی اور چادر اوڑھ کر بستر پر دراز ہو گئی۔ وہ جب کھڑی ہوتی تھی تو فتنہ ساماں بن جاتی تھی مگر جب وہ لیٹی تو میں سمجھا وہ مجھے پاگل کر دے گی۔ اس کے سونے کا وہ انداز اتنا خوبصورت اور دلآویز تھا کہ میں نے چاہا، میں اٹھ کر اُس کے پاس جا لیٹوں مگر میں نے دل کو سمجھا لیا تھا کہ مجھے ایسی ہر عورت سے گریز کرنا چاہیے جس پر کسی اور نے قبضہ کر رکھا ہو۔ جو جان کے خوف میں مبتلا ہو اور جسے یہ بھی معلوم نہ ہو سکے کہ کون سی گولی کس وقت اس کے جسم میں داخل ہو جائے گی۔ وہ چادر اوڑھ کر لیٹی تو میں نے خود کو صوفے پر ڈال دیا۔ دو گھڑی مجھے بھی آرام کی ضرورت تھی۔

شام کا وہ پہر بڑا ہی پرسکون تھا۔ ٹھنڈی ہوا نے چاروں طرف خنکی بکھیر رکھی تھی۔ میں لیٹا تو فوراً ہی گہری نیند میں کھو گیا۔ میری آنکھ جب ہی کھلی جب تابیا سینما دیکھ کر واپس آ چکا تھا۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو اس نے ایک لمبی سی انگڑائی لیتے ہوئے کہا "فلم تو بالکل ہی بور تھی بالکل مزہ نہیں آیا۔ وہ قتل ہو گئی کہ نہیں؟"

"ابے تو ہوش میں تو ہے، وہ ایسے ہی پاگل بنا رہی ہے ہمیں۔ دل اس کا کچھ اور چاہتا ہے اور تو سمجھتا ہے وہ قتل ہو جائے گی۔"

"اچھا! تو پھر تو اسے میرے حوالے کر دے۔ تو اس معاملے میں بالکل اناڑی نظر آتا ہے۔"

"نہیں یار! اتنی زیادتی نہ کرو۔ میرا خیال ہے وہ کسی مرض کا شکار ہے میں نے سُنا ہے کہ لوگوں کو شیزوفرینیا ہو جاتا ہے ایسے میں انھیں ہر طرف خون ہی خون نظر آتا ہے۔"

"اچھا! تیرا یہ خیال ہے گویا۔ چل ذرا دکھا مجھے۔ یہ تو سوئی ہوئی ہے۔"

"ہاں اسے آرام کرنے دے۔ یہی بہتر ہے اس کے لیے۔"

"ٹھیک ہے پیارے! ویسے چیز اچھی ہے۔ تو ادھر ہی سوئے گا؟"

"ہاں! کیا ہرج ہے؟"

"چل ٹھیک ہے میں بھی یہاں لیٹ رہتا ہوں۔" اس نے قالین پر ڈیرہ جما لیا۔ اس وقت رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ اور میرا خیال تھا کہ تابیے نے سینما کا آخری شو دیکھا تھا۔ وہ لیٹتے ہی سو گیا۔ مگر میری آنکھ نہیں لگی۔ بتّیاں بجھی ہوئی تھیں۔ میں سگریٹ سلگا کر صوفے پر لیٹ رہا مگر خیال میرا اس حسنہ پر مرتکز تھا۔ کیا واقعی اسے کسی طرف سے کوئی خطرہ تھا یا وہ شیزوفرینیا کی شکار تھی۔ میں اس کو ابھی تک نہیں سمجھ سکا تھا۔ اس کا وہ سونے کا انداز مجھے پاگل کیے دے رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر چاہا کہ اُسے بانہوں میں بھر کر کسی طرف نکل جاؤں مگر کوئی پردہ تھا جو بیچ میں حائل ہو جاتا تھا۔ میں کچھ بھی نہ کر سکا۔ میرا خیال ہے اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا کہ فلیٹ کی گھنٹی کسی نے بجا دی۔ یوں جیسے سوتے میں کسی کو کوئی آواز سُنائی دے۔ گھنٹی صرف ایک ہی بار بجی پھر خاموشی چھا گئی۔ میں صوفے سے اٹھ کر نشست گاہ سے باہر نکل آیا۔ تابیا اور وہ عورت بالکل بے سُدھ ہو کر لیٹے تھے۔ گھنٹی دوبارہ نہیں بجی۔

ہر طرف مکمل سکوت طاری تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کسی نے عمارت کے اس حصے پر پہرا لگا رکھا تھا۔ اپنا کوئی آدمی وہاں چھوڑ رکھا تھا اور وہ حملہ آور ہونے سے پہلے یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ ہم جاگ رہے ہیں کہ نہیں۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ عورت کسی غیر مرئی خطرے کی بات نہیں کرتی تھی، اسے معلوم تھا کہ اس کی جان کو حقیقی خطرے کا سامنا ہے، وہ بافندگی نہیں دکھا رہی تھی۔ اس کو کسی نے باگھ نکھ بلاوجہ نہیں باندھ دیا تھا۔ نشست گاہ سے نکل کر میں دروازے پر جا ٹھہرا۔ مجھے معلوم ہونا چاہیے تھا کہ گھنٹی بجانے والا کون تھا مگر میرے سامنے تو کوئی بھی نہیں تھا۔ دروازے کے دوسری طرف کوئی بھی آدمی نظر نہیں آتا تھا۔ وہ اماوس کی رات تھی۔ باہر کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ دور کہیں کسی لیمپ کی روشنی چھدری چھدری سی کیفیت میں وہاں تک پہنچتی تو تھی مگر بہت ہی دُھندلی دھندلی سی۔ میں چند منٹ تک دروازے کے پاس کھڑا سوچتا رہا کہ وہ کون لوگ ہیں جو ایسی دیدہ دلیری کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ فلیٹ تنہا نہیں تھا اوپر نیچے دائیں بائیں سب جگہ آدمی موجود تھے۔ کچھ ہی دیر بعد صبح کی اذان ہونے کو تھی مگر وہ لوگ پھر بھی وہاں نقب لگانے پر آمادہ تھے۔ میں نے پستول سیدھے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ ایک عذاب ایسی کیفیت تھی جس سے میں دوچار تھا۔ وہ عورت اس قابل تھی کہ اُس کے لیے آدمی جان لڑا دیتا۔ وہ تنہا آئی تھی اور اسے معلوم تھا کہ اس کی زندگی خطرے میں ہے۔ مگر۔۔۔ مگر۔۔۔ وہ آدمی میرے سامنے تو آئے! میں دیکھوں تو سہی کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ کیوں وہ اس عورت کی جان کے لیے عذاب بن گیا تھا۔

کتنی ہی ساعتیں اسی کیفیت میں گزرتی چلی گئیں — بالآخر اس آدمی نے محسوس کر لیا کہ مکان کے اندر سب لوگ گہری نیند میں ہیں تو اس نے یوں کیا کہ ایک کھڑکی کا شیشہ توڑ دیا۔ اس طرح کہ کم سے کم آواز پیدا ہو۔ اب اس کا کام آسان ہو گیا تھا۔ اس نے ہاتھ ڈال کر کنڈی اتاری اور پھر اس کے اندر داخل ہونے لگا۔ میں اس وقت تک کھڑکی کے ساتھ جا کھڑا تھا وہ جیسے ہی آگے نکلا میں نے اس کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر اپنا چپ شاہ اس پر چلا دیا۔ گولی بے آواز چلی اور اس کا ہاتھ شل کر گئی پستول اس کے ہاتھ سے دُور جا گرا تھا۔ میں نے بائیں ہاتھ سے اس کی گردن دبوچ لی۔ وہ چیخا نہیں۔ گولی کی ضرب وہ اتنی خاموشی سے سہہ گیا کہ اِک سی کی سی آواز اس کے منہ سے نکلی اور بس۔ اس کی گردن پر ہاتھ ڈالتے ہی میں نے اسے بے سُدھ کر دیا۔ دوسرا آدمی اس سے چند ہاتھ پیچھے تھا وہ بھی آگے آیا اور کھڑکی میں سے گزر گیا۔ مگر جیسے ہی وہ میرے سامنے آیا، میں نے اس کا دایاں ہاتھ اس طرح نیچے جھٹکایا کہ اس کی ایک ٹانگ جو ابھی دوسری طرف تھی آگے نہ آ سکی۔ اور وہ اُلٹ کر کھڑکی کے اندر گر گیا — اسے امید ہی نہیں تھی کہ کوئی دوسرا آدمی اس پر یوں حملہ آور ہو جائے گا۔ اس کو نیچے جھکا کر میں نے اپنا پستول اس کی گردن سے لگا دیا۔

"بہتر یہ ہے کہ تُو اپنا پستول چھوڑ دے۔"

میری آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تو وہ اچھل سا گیا۔ پستول اس نے نہیں چھوڑا — اس کی خوبی یہ تھی کہ وہ اندھیرے میں بھی بلّی کی سی تیزی سے دیکھ سکتا تھا۔ پستول اس نے میرے بائیں ہاتھ سے چھڑا لینا چاہا مگر میں اس سے کیسے دست بردار ہو سکتا تھا۔ اسے میں نے اور زیادہ نیچے جھکا کر اپنا پاؤں اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"سوچ لو بیٹے! یہ سودا مہنگا پڑے گا۔ میں تمہیں ابھی مار سکتا ہوں۔" میں نے یہ بات کہی ہی تھی کہ اس نے اُلٹ کر اپنی دونوں ٹانگیں میرے گلے میں ڈال دیں، یوں کہ میرا دایاں ہاتھ اب اس کے ہاتھ میں تھا اور میرا پستول اپنے نشانے سے ہٹ چکا تھا۔ میرا پاؤں ابھی تک اس کے دائیں ہاتھ پر تھا — مجھے اس نے جھٹکا جو دیا تو میرا پاؤں اپنی جگہ رُک نہ سکا۔ جیسے ہی اس کا پستول میری گرفت سے نکلا، اس نے چاہا کہ مجھے گولی کا نشانہ بنا دے۔ مگر ابھی میرے دونوں ہاتھ سلامت تھے۔ میں نے اپنا پستول چھوڑ دیا، اور پوری قوت سے میں نے اس کے بائیں ہاتھ کو پکڑ لینا چاہا مگر اسے نشانہ لینے کے لیے ذرا سی مہلت کی جو ضرورت تھی وہ نہیں مل رہی تھی۔ ہاتھ اس کا میرے جسم سے خاصا دُور تھا اور اَب میں اس کے پستول کو پکڑ چکا تھا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے اس خام کار سے وہ مہلک ہتھیار چھین کر دُور پھینک دیا مگر جیسے ہی اس کا ہاتھ فارغ ہوا،

اس نے مجھے زبردست جھٹکا دے کر نیچے گرا لیا۔ میری گردن ابھی تک اس کی ٹانگوں کی گرفت میں پھنسی تھی۔ میں نیچے جھکا تو اس نے ٹانگیں کھول کر پوری قوت سے میرے چہرے پر مکّا دیا۔ میں اس مکّے سے دہل سا گیا۔ اس بدمعاش نے اپنے بدن کی پوری قوت اس پر صرف کر دی تھی۔ چند لمحوں تک تو میں بھول ہی گیا کہ ہوا کیا ہے۔ اس لمحے سے فائدہ اٹھا کر وہ اپنے پستول کی طرف لپکا مگر میں نے اس کے دونوں بازو راستے ہی میں روک لیے اور اس کا دایاں بازو ہاتھ میں لے کر میں نے ذرا سا زور ڈالا تو اس کا جوڑ کھل گیا۔ تڑاخ کی آواز پیدا ہوئی اور اس نے اپنا بازو بڑی ہی دہشت خیز آواز سے رانوں میں دبا لیا۔ وہ آواز بڑی ہی دلدوز تھی۔ دوسرے آدمی کے بالکل برعکس اس سے وہ چوٹ سہی نہ جا سکی۔ میں چاہتا تو پہلے ہی مرحلے میں اسے بھی جان سے گزار سکتا تھا۔ اس کو ٹھنڈا اتار کر دیتا مگر میں اس کو بولنے کی قوت سے محروم نہیں کرنا چاہتا تھا۔

جیسے ہی اس نے اپنی کلائی ران میں دبائی میں نے اس کو کھینچ کر پیچھے ہٹایا اور نشست گاہ کے کمرے کے سامنے جا کر ڈال دیا۔

"تجھے معلوم نہیں کہ تو کس کے گھر آ گیا ہے بچّے! بتا کیا کام تھا تجھے۔ یہاں کس سے ملنے آیا ہے تو؟" میں نے اپنا پستول اٹھاتے ہوئے کہا۔ اس کا اور اس کے ساتھی کا پستول میں نے گولیوں سے خالی کر کے ایک طرف ڈال دیا تھا۔ ان جیسے پستولوں سے مجھے کوئی سروکار ہی نہیں تھا۔ گولیاں میں نے جیب میں ڈال لیں۔

"یہ بے آواز چلتا ہے پیلیے! تو کہے تو میں اس کی آواز سنوا دوں تجھے؟" یہ کہہ کر میں نے اپنے چپ شاہ کو اس کے بالوں کے اُوپر سے گزار دیا۔ گولی سیدھی اس کے گھنے سیاہ بالوں کو چاٹتی ہوئی نکل گئی۔ آواز بس اتنی ہی پیدا ہوئی کہ وہ دونوں جو کمرے میں گہری نیند میں کھوئے تھے کروٹ بدل کر رہ گئے۔

"کون ہے تو اور کس لیے یہاں آیا ہے؟"

"اپن کو کچھ پتہ نہیں، اپن تو اپنے ساتھی کا غلام ہے۔"

"بدمعاش بکواس کرتا ہے! اُٹھ اوئے تاہیے! آ گئے ہیں یہ کوڈیوں والے۔ اُٹھ سالے۔" یہ کہہ کر میں نے اس کی پسلی میں ایک ٹھوکر لگائی۔

"اوئے تاہیے! اٹھ جا۔ دیکھ انہیں۔ یہ کس کے لیے آئے ہیں۔"

میری یہ بات سن کر تاہیا بیدار ہو گیا۔ اپنا پستول اس نے نیفے میں اڑس رکھا تھا۔ اسے سیدھے ہاتھ میں لے کر وہ قالین پر سے اٹھا تو اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ اس نے صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لیے بتّی جلا دی۔

"اوئے میں صدقے جاواں۔ تو ان کو مار بھی چُکا۔ مجھے تو جگا لیا ہوتا۔ لگا جُوتے اس سالے کے۔ شام سے ان کا انتظار تھا ہمیں۔" یہ کہہ کر

وہ اس آدمی کے پاس آ پہنچا اور اس کے گھنے بالوں کو مٹھی میں دبا کر بولا۔ "بدمعاش! ایک عورت کو مارنے آیا ہے لفنگے! یہ بدمعاشی ہے تمھاری۔ وہ بڑی ہے وہ عورت، لگا اُسے ہاتھ۔ دیکھوں میں کتنے پانی میں ہے تو۔"

اُس نے نظریں جھکا لیں — ہاتھ اس کا بالکل ہی کام نہیں کرتا تھا۔ اور وہ اُس کا دایاں ہاتھ تھا۔

"کیا گناہ کیا ہے اس عورت نے کیوں مارنا چاہتے ہو تم اُسے؟ بتاتا ہے کہ نہیں! مار جُوتے اس کے۔ یہ یوں سیدھا نہیں ہو گا۔" یہ کہہ کر تاہیے نے اس کے بال چھوڑ دیے اور اس کی قمیص کا گریبان پکڑ کر اندر کھینچتے ہوئے بولا۔ "لے بول، یہ رہی وہ عورت۔ اُٹھ جا بڑی بی! یہ رہے تیرے قاتل۔ کیا گناہ کیا ہے اس عورت نے؟"

"وہ... وہ جی دراصل ہمیں کبیر خان نے یہاں بھیجا تھا۔ اُس نے ہمیں بیس ہزار روپے دیے تھے کہ ہم اس کو ختم کر دیں۔"

حسنہ اس عرصے میں اُٹھ گئی تھی اور اس کو یوں دیکھ رہی تھی۔ جیسے اس کا خنجر ابھی اس کے سینے میں اُتر جائے گا۔ اس سے بات نہیں کی جاتی تھی۔ وہ سہم سمٹ کر پلنگ کے دوسرے حصّے تک جا پہنچی، رنگ اس کا ہلدی ہو رہا تھا۔

"تیرے کبیر خان کی ایسی تیسی! جا ہم تجھے تیس ہزار دیتے ہیں تو اس کبیر خان کو ختم کر دے۔ مگر دے گا تو — کرائے کا قاتل ہے تو۔ سمجھتا کیا ہے تو خود کو۔" یہ کہہ کر تاہیے نے جوتا اتار کر تڑاخ سے اس کے سر پر دے مارا۔ ایک دو تین۔ وہ مارتا ہی چلا گیا۔ اس سے اپنا سر بچانے کے لیے وہ آدمی کبھی ادھر ہوتا کبھی اُدھر۔ اپنے ہاتھ کو وہ بھول ہی گیا تھا۔ اکیس جُوتے مار کر تاہیے نے جوتا پاؤں میں ڈال لیا۔

"یہ تنہا ہی تھا کہ کوئی اور بھی تھا اس کے ساتھ؟"

"ایک آدمی باہر بھی پڑا ہے اس دیوار کے ساتھ۔"

"ہوں! مارو جُوتے اس کو بھی۔ بتا اب کیا سزا دیں تجھے۔ پولیس کے حوالے کر دیں؟"

"اپن کو ماف کر دو میاں جی! بس بھول ہو گئی اپن سے۔ یہ پتہ نہیں تھا کہ اس حسنہ کے لیے ایسے دوست بھی یہاں پڑے ہیں۔"

"اچھا یہ بتا اوئے کہاں ہے تیرا استاد؟ اُس سے تو ہم ابھی ملیں گے۔"

"وہ جی اپن کو پتہ نہیں گھر پر ہی ہو گا جناب! ہمیں ماف کر دیں میاں جی، بڑی گلتی ہو گئی۔"

"وہ تو ہونی ہی ہے، پر تیرے کبیر خان پر کل کی صبح طلوع نہیں ہو گی۔ چل اُٹھ ہمیں تو اس کبیر خان تک لے چل — ابھی اسی وقت۔" تاہیے نے اس عورت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، بولا۔ "آپ پڑی رہیں یہاں! اور بے فکر ہو جائیں۔ سمجھا کیا ہے ان لوگوں نے آپ کو۔ چل اوئے ابھی چل۔"

"نہیں یار! اتنی تیزی تو ٹھیک نہیں ہے۔" میں نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"کیسی تیزی جنابِ عالی! یہ تو فرض آج ہی ادا ہو گا۔ میں ویسے بھی جان سے بیزار ہوں ایک دھیلا پلّے نہیں ہے میرے۔ چل اوئے! اٹھ جا۔"

اس کی یہ بات سنتے ہی وہ آدمی اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

"یار! تو کیسی تیزی دکھا رہا ہے، یہ کوئی وقت ہے اس کے پاس جانے کا۔"

"کیوں نہیں — میں دیکھوں تو وہ کون سا الپ بہادر ہے جس نے ان کو یہاں بھیج دیا۔ کیا نام ہے تیرا اوئے! تو بول تا کس طرح ہے۔ تیری کوئی رگ خراب ہے۔"

"جی میرا نام مستان شاہ ہے اور میرے ساتھ جو آدمی ہے اس کا نام اسلم خان ہے۔"

"وڈی خوشی ہوئی تہانوں مل کے، کتّے دے پُترو۔ اٹھو تسیں دونویں اٹھو۔ تہاڈے لئے میں کھبّے ای بٹھا دیاں گا۔"

تاہیا اور زیادہ جوش میں آ گیا۔ وہ ان مرے ہوؤں پر اور زیادہ شیر ہو رہا تھا۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ ان کی گت کیسی بن چکی ہے۔ اب وہ انھیں اور زیادہ ذلیل کرنے پر تلا ہوا تھا۔ اور اس عورت پر اپنا رعب جمانے کے لیے وہ ان پر اپنا سارا اسلحہ خرچ کر رہا تھا۔ مستان شاہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور کلائی کو دباتے ہوئے دروازے کی طرف چل دیا۔

"چل بھئی — دیکھتے ہیں وہ کبیر خان کیا کہتا ہے۔" میں بھی اس کے پیچھے ہو لیا۔ تاہیا بھاگ کر مستان شاہ کے پاس جا پہنچا، بولا۔ "تو ذرا دروازہ باہر سے بند کر دے — اس عورت کو زیادہ ہی پناہ کی ضرورت ہے مگر اس کا کیا کریں اس اسلم خان کا۔"

"یہ گیا کام سے — کم از کم چار گھنٹے اسے ضرور لگ جائیں گے ہوش میں آنے میں۔"

"بس ٹھیک ہے۔ دیکھ بی بی! ہم ابھی واپس آ رہے ہیں۔ یہ دروازہ اندر سے بند کر لے۔ میں اس دوسرے آدمی کے ہاتھ پاؤں باندھ دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے نشست گاہ کا دروازہ باہر سے بند کر دیا اور پھر اپنا لمبا ازار بند اس نے خنجر سے دونوں طرف سے کاٹ لیا۔ وہ پھر بھی بہت ہی لمبا تھا۔ دونوں ٹکڑے لے کر.....

اُس نے اسلم خان کو کس کر باندھ دیا۔ اس طرح کہ اس کے دونوں ہاتھ اور پیر جکڑے گئے تھے۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے

دوسرے قیدیوں پر نظر ڈالی، بولا "وہ گڑبڑ تو نہیں کریں گے؟"

"نہیں! انہیں میں نے کمروں میں بند کر رکھا ہے، باہر سے کنڈی چڑھی ہے، آپی البتہ کھلا ہے۔"

"اس کی خیر ہے یار جی! بس اس کو لے چلو۔ چل اوئے خنزیر کے پتر۔" یہ کہہ کر وہ اُسے فلیٹ سے باہر لے گیا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہی تھا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم نے فلیٹ کا دروازہ باہر سے بند کر کے ڈاکٹر قوی کی کار میں مستان شاہ کو ڈالا اور ڈیفنس کی طرف لے چلے۔ مستان شاہ کچھ زیادہ ہی پریشان تھا مگر تابیے نے اسے اپنی گرفت میں اس طرح لے رکھا تھا کہ وہ ہل نہیں سکتا تھا۔

"کہاں رہتا ہے وہ تمہارا کبیر خان؟"

"وہ جی اُدھر ڈیفنس میں رہتا ہے جناب۔ مجھے ماف کر دیں جناب بڑی بھول ہوگئی۔"

"ماف تو کر ہی دیں گے تجھے۔ کسی جگہ گولی مار کر پھینک دیں گے تجھے اور فرشتے تیری رُوح کو ساتھ لے جائیں گے اللہ اللہ خیر سلاّ۔ پر تیرے ہاتھ کو کیا ہوگیا ہے؟"

"وہ جی بس ان کا جھٹکا جو لگا تو کلائی ٹوٹ گئی ہے جناب! مجھے ماف ہی کر دیں تو اچھا ہے۔"

وہ اب بھی ایک ہی رٹ لگا رہا تھا۔ اُس میں وہ پرانے پاپی غنڈوں ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی تھی مگر تھا وہ اپنے گُن کا پکّا۔ ہمارے سامنے ویسے ہی اچر پچر باتیں کر رہا تھا۔ وہ جو اُلٹی پر پاؤں رکھتا ہے اتنا سیدھا نہیں ہوتا۔ ہاتھی کو سدھاتا ہے، اپنی مرضی سے، اسے جس رُخ پر چاہے موڑ لیتا ہے مگر دیکھنے میں وہ بھی آدمی ہی نظر آتا ہے وہ مستان شاہ بھی ایسا ہی تھا۔ تابیے نے یُوں کیا کہ جوتے مار مار کر اس کا سر گنجا کر دیا۔ وہ ایسی مار تھی کہ جسے وہ کبھی نہیں بھول سکے گا۔ کچھ اس کو عورت کے دل پر رعب جمانے کا بھی احساس تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کھل کر برسا تھا، اور ابھی تک سمجھنے میں نہیں آتا تھا۔

گاڑی کچھ ہی دیر بعد ڈیفنس تک جا پہنچی۔ وہ اونچی اونچی دیدہ زیب عمارتوں کا شہر رات کے اس پہر دبیز سناٹوں میں کھویا ہوا تھا مستان شاہ نے کار ایک بڑے دروازے کے سامنے رکوا دی، بولا "کبیر خان ادھر ہی رہتا ہے۔"

"ہوں! اور کون ہے اُس کے ساتھ؟"

"اس کے بیوی بچّے ہیں دو بیٹے اور ایک بیٹی — ایک ملازم بھی ساتھ ہے۔"

"ہوں! تم آگے جا کر دروازہ کھلواؤ۔"

"جی اچھا! میں ابھی جاتا ہوں جناب!"

تابیے نے اُسے کار سے باہر نکال دیا اور خود پستول لے کر اُس کے ساتھ ساتھ دروازے تک گیا مستان شاہ کسی گہری سوچ میں گم تھا اور اُس کی چال ہی یہ بتاتی تھی کہ وہ کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اُس کی نیت کو سمجھتے ہوئے میں پستول لے کر اُس کے پاس جا پہنچا۔ بڑے گیٹ کے پاس ایک اونچا درخت اُگا ہوا تھا۔ اس کے پاس سے گزرتے وقت اس مستان شاہ نے یُوں کیا کہ اپنی ران کھجلانے کے بہانے اس نے اپنا ایک ہاتھ نیچے ڈالا میں سمجھا سالا کھاج محسوس کرتا ہے مگر نہیں۔ اس نے اُلٹ کر ہم دونوں کو پاگل کر دیا۔ اس کے بائیں ہاتھ میں دوہری دھار کا نوکیلا خنجر تھا اور ہم دونوں اُس کے دائیں بائیں یوُں چل رہے تھے کہ پاس سے سایہ بھی نہیں گزر سکتا تھا۔

پہلا وار اس نے تابیے پر کیا، یوں کہ اُس کا ہاتھ اس نے ایک دم چھلنی کر دیا۔ پستول اس کے ہاتھ سے گرا تو وہ پلٹ کر پیچھے ہٹا۔ مستان شاہ نے دُوسرا وار اسی جھپٹ میں مجھ پر کیا۔ اگر اس کا خنجر ذرا سا بھی میری کلائی یا بدن کے کسی حصے سے چھو جاتا تو میں وہیں ختم ہو جاتا۔ اس کا انداز کچھ ایسا ہی بے باکانہ تھا۔ میں اس پر گولی چلا دیتا تو وہ وہیں جان دے دیتا۔ مگر ابھی اس کی زندگی باقی تھی۔ اور مجھے اس سے کچھ کام لینا تھا۔ میں نے الاؤ کے گرد ناچنے کے انداز میں اس کا وار خالی کر دیا۔ وہ اپنی جھونک میں گزرتا ایک دم گھوم گیا تو میں نے اس کا بایاں ہاتھ دوسری بار سامنے آنے پر بائیں ہاتھ میں تھام لیا۔ بلا کی قوت تھی اس کے بازو میں۔ اور میں سمجھ ہی نہیں سکا کہ وہ سالا بائیں ہتھا ہے۔ کھبا ہونے کی وجہ سے اُسے جو انوکھی قوت حاصل تھی اس سے کام لے کر اس نے مجھے دونوں ٹانگوں سے اٹھا کر نیچے گرانا چاہا مگر میں نے اس کا ہاتھ نہیں چھوڑا۔ دوسرے لمحے میں اُس کے اوپر جا چڑھا تھا۔ اس طرح کہ وہ چاروں شانے چت زمین پر پڑا تھا مگر خنجر اس نے ابھی تک ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔ عین ممکن تھا کہ اس کی نوک میرے سینے میں دھنس جاتی کہ میں نے اپنا پستول اس کے ماتھے میں دے مارا۔ یوُں کہ وہ چند لمحوں کے لیے بھول ہی گیا کہ وہ ہے کہاں۔ خنجر میں نے اُس کے ہاتھ سے چھین کر الگ پھینک دیا، اور اٹھ کر تابیے کی طرف لپکا۔ وہ اپنی لہولہان کلائی سے نڈھال ہو رہا تھا۔

"یار! تو کیسا پاگل ہے؟ کلائی آگے کر دی۔ ایسے ذلیل آدمی سے تو بہت بچنا چاہیے تھا۔"

"مجھے کیا پتہ تھا یار کہ اس نے ران میں خنجر دبا رکھا ہے، حد ہوگئی۔ یہ تو لمبا ہی فساد ہوگیا ہے مرہم کہاں سے ملے گا۔"

"اس کا بھی بندوبست کر لیں گے، اٹھا اِس کو۔ اِس نے تو مروا ہی دیا تھا ہمیں۔" میں نے تابیے کو دلیار سے ہٹا کر مستان شاہ تک پہنچایا۔ وہ اُس وقت تک اپنی غشی کی حالت سے واپس آ چکا تھا۔ خود کو خالی ہاتھ دیکھ کر وہ اٹھ بیٹھا اور گرد و پیش کو بڑے غور سے دیکھنے لگا۔

"اٹھ جا مستان شاہ! تیری ابھی موت نہیں آئی ہے۔ میں نے اسی لیے تجھ پر ہاتھ نہیں اُٹھایا۔ بہتر یہ ہے کہ تو کبیر خان کو اٹھا دے۔"

میری یہ بات سن کر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور ہمیں گندی گالی دیتے ہوئے بولا "تمھیں میں زندہ نہیں چھوڑوں گا، تم دونوں کو — میری یہ بات اچھی طرح یاد رکھنا — آج نہیں تو کل میں تم سے ضرور بدلہ لوں گا۔ آج تو میں تمھیں کبیر خان سے ملوا دیتا ہوں مگر کل یہ نہیں ہوگا۔"

"ہشکے بھئی! تیرا جواب نہیں ہے پیارے! ذرا یہ گھنٹی تو دبا دے۔ تیرا یہ داؤ بھی ہم سہہ ہی لیں گے۔" میں نے ذرا آگے نکل کر اس کا خنجر ہاتھ میں لے لیا۔ وہ تپ کر پیچھے ہٹا اور دروازے پر لگی گھنٹی پر اس نے بوجھ ڈال دیا۔

کوئی پانچ ہی منٹ میں کوٹھی کے سامنے کا ایک حصّہ روشن ہو گیا۔ ایک ادھیڑ عمر کا ملازم باہر نکلا اور گیٹ کی طرف چل دیا۔ اُسے سامنے دیکھ کر ہم گیٹ سے ذرا ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ جیسے ہی وہ سامنے آیا اور دروازے کے اندر لگے تالے پر اس نے ہاتھ ڈالا ہم تیزی سے مستان شاہ کے پاس جا پہنچے۔ اسی کا خنجر میں نے اس کے پہلو سے لگا دیا۔ ملازم نے مستان شاہ کو دیکھ کر دروازہ کھولنا چاہا تھا۔

"تو بالکل خاموش رہے گا ورنہ سمجھ لے تیری خیر نہیں ہے۔" تابیے نے اپنی زخمی کلائی پر رومال سخت کرتے ہوئے کہا۔ اُس کی جلد کچھ زیادہ ہی کٹ گئی تھی۔

دروازہ یوں بنا تھا کہ اس کے پٹ موٹے لوہے کے پردوں میں چھپے تھے۔ اور اُوپر سے آدمی گردن اٹھا کر اندر کے آدمی سے مخاطب ہو سکتا تھا۔

"کیا بات ہے مستان شاہ خیر تو ہے؟" دروازہ کھول کر ملازم نے پوچھا۔ مگر میں نے مستان شاہ کو بولنے کی مہلت ہی نہیں دی۔ ہاتھ بڑھا کر میں نے اس ملازم کا ٹینٹوا دبا دیا۔ وہ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے دائیں ہاتھ جھول گیا۔

"اس کا حشر دیکھ چکے ہو نا تم! چلو اب آگے۔ اب ہم تمہارے کبیر خان سے بات کرتے ہیں۔" میں نے مستان شاہ کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ خنجر اُس کے پہلو سے لگا تھا اور اسے طرح طرح کے وسوسوں میں مبتلا کر رہا تھا۔ خیریت یہ گزری کہ اس وقت ہم کار میں سوار ہونے کی وجہ سے جگہ جگہ کھڑی پولیس کی ٹکڑیوں سے مسلسل بچتے چلے گئے۔ کسی نے بھی ہمیں کسی جگہ روک کر نہیں پوچھا کہ ہم کون ہیں۔ رات کو سفر کرنے والے کراچی میں بہت مل جاتے ہیں۔ مستان شاہ کو ساتھ لے کر ہم کوٹھی کی عمارت تک پہنچے تو وہی دروازہ ہمارے سامنے تھا جسے ملازم نے کھول دیا تھا — ہم بڑے اطمینان سے چلتے ہوئے اس کمرے میں جا پہنچے۔ ملازم کے لیے کبیر خان نے خاصا اہتمام کر رکھا تھا۔ کمرے میں ہر ضروری شے موجود تھی جس پر آدمی تکیہ کر سکتا تھا۔

"کون ہے خیر دین! یہ گھنٹی کس نے بجائی تھی؟"

کسی طرف سے شاید ہمیں کبیر خان کی آواز سنائی دی وہ زیادہ دور نہیں تھا۔ ہم نے آواز کی طرف دھیان دیتے ہوئے اندر کی طرف کھلنے والے دروازے کو دبا دیا۔ وہ کھلتا چلا گیا سامنے ہی ایک ہال کمرہ بنا تھا اور میرا خیال یہ ہے کہ ملازم کو ان لوگوں نے عمارت کے وسط میں ایسی جگہ ٹھہرا رکھا تھا جہاں سے وہ کسی بھی وقت کسی کی بھی آواز بڑے اطمینان سے سُن سکتا تھا۔ ہال کمرے سے نکل کر ہم دائیں طرف بڑھے تو ایک دروازہ عین اُس وقت ہمارے سامنے کھلا ہمارے آگے اب کبیر ہی کھڑا تھا۔ سلیپنگ گاؤن کے بجائے اس نے بنیان اور شلوار پہن رکھی تھی عمر کے لحاظ سے وہ یہی کوئی چالیس سال کا آدمی نظر آتا تھا۔ یہ بڑے بڑے کان، ڈاڑھی مونچھ صفاچٹ اور سر کے بال چھدرے چھدرے۔ ہمیں اس نے دیکھا تو تیزی سے باہر نکل آیا۔

"یہ — یہ تم — یہ مستان شاہ کو کیا کر دیا ہے تم نے۔ اس کا رنگ زرد ہے، کیا ہو گیا ہے اسے؟"

"یہ آپ کا خادم ہے جناب مائی باپ! اسی سے پوچھیں یہ کسی کو ادھر مارنے گیا تھا یہ بن باپ کا بیٹا۔" تابیے نے مخصوص لہجے میں بات کی۔

"اور ہم بھی آپ کے خادم ہیں جناب! یہ خنجر بھی اسی کا ہے اور یہ گولیاں بھی اپنے ساتھ لے کر گیا تھا۔ اسلم خان ابھی وہیں ہے آپ کی مقتولہ ہلاک نہیں ہوئی۔" میں نے جیب سے گولیاں نکال کر اُسے دکھاتے ہوئے کہا۔

"یہ کیا بکواس ہے، میں کیا سن رہا ہوں یہ مستان شاہ تو ہوش میں تو ہے؟"

"اسے سنبھال تابیے! یہ پستول دیکھتے ہو نا! یہ بے آواز چلتا ہے کبیر! اور ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ حسنہ کو قتل کرنے کے لیے تم نے اِن کو کیوں تکلیف دی ایسے بے ہنروں کو۔"

"تم پیچھے ہٹ جاؤ، خبردار! جو میری طرف بڑھے تو۔ میں تمھیں جان سے مار دوں گا۔" کبیر نے کمرے کی طرف لوٹتے ہوئے کہا۔ رنگ اس کا زرد ہونے لگا تھا۔

"یوں نہیں کبیر صاحب! یوں نہیں۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اس کے سامنے کھلا دروازہ روک لیا۔ "تم اندر نہیں جاؤ گے پیارے! ہمیں بتاؤ کہ تم نے غلام رسول کو کیوں قتل کروایا تھا؟ ان کے ہاتھوں۔ اور اب اُس حسنہ کو بھی ختم کرنے جا رہے ہو۔" میں نے پوری قوت سے ایک مکّا اس کے منہ پر مار دیا۔ وہ تیورا کر

دیوار میں جا لگا۔" یوں بات نہیں بنے گی کبیر! تمہارے بچے کہاں ہیں اُن کو بھی باہر لاؤ۔" یہ کہہ کر میں نے اسے بائیں بازو سے پکڑ کر دروازے کی طرف دھکیل دیا۔ وہ سامنے کے قالین پر مُنہ کے بل گرا۔

"مجھے چھوڑ دو، میں کسی غلام رسول کو نہیں جانتا۔"

"ہاں! کیوں نہیں! صرف دس لاکھ کے بدلے تم نے اُسے مار دیا۔ اور ہم سمجھے کہ حسنہ پاگل ہو گئی ہے مگر وہ تو ٹھیک کہتی تھی۔" یہ کہہ کر میں نے کبیر کو آگے دھکیل دیا۔ وہ خوابگاہ تک پہنچا تو اُس نے بھیانک چیخ ماری جیسے وہ اُن کو خبردار کر رہا ہو۔ ابھی اس کی بیگم کوئی قدم نہیں اٹھا سکی تھی کہ میں نے دروازہ کھول دیا۔ وہ شب خوابی کے لباس میں تھی اور واقعی شوہر کا دِل جیتنا جانتی تھی۔ آدھ نیم شبی اُسے دیکھتے ہی دل سے اٹھنے لگتی تھی۔ مجھے اور کبیر کو اُس نے دیکھا تو اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں خوف کے سائے لہرانے لگے۔ اُسے اپنی بصیرت پر اعتبار نہیں آتا تھا مگر دوسرے ہی لمحے میں اُس کے پاس جا پہنچا۔ پستول دونوں پر تان کر میں نے بڑے ہی درشت لہجے میں کہا۔" اس پر غلام رسول کو قتل کرنے کا الزام ہے۔ ایک عورت حسنہ گواہ ہے اس قتل کی اور اسے یہ آج مروا دینا چاہتا تھا۔ آپ کا کیا خیال ہے ایسے مجرم کے بارے میں بیگم کبیر خان!"

"یہ مجرم ہرگز نہیں ہیں، خدا کے لیے انہیں آپ کچھ نہ کہیں۔ یہ بالکل بے گناہ ہیں۔"

"یوں کام نہیں چلے گا بیگم صاحبہ! جو کچھ آپ کے پاس ہے وہ باہر نکال دیں ابھی اور اسی وقت۔"

"آپ ہمیں لُوٹنا چاہتے ہیں کچھ نہیں ہے ہمارے پاس۔"

"یوں نہیں بیگم صاحبہ! یوں نہیں۔" میں نے پستول کی نال سیدھی کر کے اس کے دائیں کان کا بُندا اڑا دیا۔ گولی چلی تو وہ اپنے آپ سے باہر ہو گئی چیختی ہوئی وہ کبیر سے لپٹ گئی۔

"رقم بی بی! رقم ___ جلدی کرو۔"

"وہ سامنے کی الماری میں ہے، یہ رہیں چابیاں ___ خدا کے لیے میرے شوہر کو کچھ نہ کہیں ورنہ ہم برباد ہو جائیں گے۔" وہ بلکنے لگی تھی۔ چابیاں اُس نے بائیں ہاتھ میں لے کر میری طرف پھینک دیں۔

"اس مستان شاہ کی بتی گل کر دو تابیے! اور اندر آ جاؤ۔"

وہ تو اس کا ہی منتظر تھا فوراً ہی اس نے اپنا رومال مستان شاہ کے سر پر ڈال دیا۔ جیسے ہی اس نے رومال کے کونے کھینچے تو وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر گیا۔ اس تابیے نے وہ رومال وہاں لا کر میرے لیے بہت آسانیاں پیدا کر دی تھیں۔ اس میں دراصل ایسے سیل بنے ہوتے تھے جو آدمی کو لمحے بھر میں دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیتے تھے۔ یہی اس کی سب سے بڑی خوبی تھی اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ رومال کا معتوب زندہ بھی بچے گا کہ نہیں جب کہ میرے علاج میں یہ بات یقینی تھی۔ آدمی زندہ بچ جاتا تھا اور اسے زندگی کی طرف واپس لانے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی تھی۔

جیسے ہی مستان شاہ زمین پر گرا، تابیا تیزی سے دوڑ کر میری طرف لپکا۔

"یہ لو چابیاں ___ بچے سوئے ہوئے ہیں اُن کو جگانے کی ضرورت نہیں۔ الماری کھول دو۔"

تابیے نے چابیاں لے کر الماری کھول دی۔ اس میں کبیر کے بزنس کا نہیں، منافع کا مال دھرا تھا۔ اور ہمیں اس وقت اسی کی ضرورت تھی۔ کیونکہ تابیا بالکل ہی قلاش ہو رہا تھا۔ الماری کے ایک خانے میں اُسے نوٹوں کے کئی بنڈل مل گئے۔ وہیں ایک بریف کیس بھی دھرا تھا۔ اس میں بھر کر تابیے نے زیوروں پر ہاتھ ڈالا مگر میں نے اُسے روک دیا۔

"رہنے دو۔ اس کی ضرورت نہیں ہے، بیگم صاحبہ کے کام آئے گا۔ بس یہی بہت کافی ہے۔"

اُس نے ہاتھ روک لیا۔ الماری میں بہت سے کاغذات اور اَلا بَلا قسم کی چیزیں بھری تھیں اور تابیے کا خیال تھا کہ وہاں ہیرے موتی بھی ہوں گے۔ بعد میں وہ یہی کہہ رہا تھا مجھ سے مگر میں نے اُسے مزید ہاتھ مارنے سے روک دیا۔

اس نے بریف کیس بھر کر بند کیا تو میں نے کبیر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔" غلام رسول کا معاملہ خدا اور تمہارے درمیان ہے کبیر! ہم اسلم کو بھی رہا کر دیں گے۔ گھر یہ ہمارا دیکھے ہوئے ہیں۔ ابھی ہم وہاں بہت دن رہیں گے۔ ہمت ہے تو ان کو پھر ادھر بھیج دینا لیکن حسنہ کا خیال دل سے نکال دو۔ وہ تمہارے خلاف کوئی گواہی نہیں دے گی۔ بالکل نہیں دے گی۔ اس کو بخش ہی دو، میں یہی کہنے آیا ہوں۔ یہ رقم بیہ ہم تم سے ضمانت کے طور پر لے جا رہے ہیں۔ کوئی غلط حرکت کی تو ہم پھر بالکل ہی تمہارے سامنے آ جائیں گے۔ سمجھے ہو کہ نہیں! حسنہ کو قتل کروانے کا خیال دل سے نکال دو۔ اس کو سمجھائیں بیگم صاحب جی! اس کے لیے یہی بہتر ہے۔" یہ کہہ کر ہم دونوں وہاں سے فوراً ہی باہر نکل آئے۔ زیادہ شور شرابے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ بڑے کمرے میں پہنچ کر ایک بار پھر ہم نے ان دونوں کو دیکھا۔ وہ ہمیں وحشت زدہ ہرنوں کی طرح دیکھ رہے تھے جیسے ہم نے اُن کے قتل کا ارادہ ترک کر کے ان پر بڑا احسان کیا ہو۔ کبیر میں ہم نے اتنی جان رہنے ہی نہیں دی تھی کہ وہ اُٹھ کر کوئی کارروائی کرتا ___ بالکل ہی نڈھال ہو چکا تھا وہ ___ ہم چاہتے تو اُن سب کو جان سے مار سکتے تھے۔ دیر ہی کتنی لگتی ___ مگر اس کا فائدہ ہی کیا تھا۔ ڈر مجھے یہ تھا کہ وہ کل پھر حسنہ پر کوئی کارگر وار کریں گے۔ اس کا بندوبست میں نے کر لیا تھا۔ میری آواز کی دہشت، کبیر کو بہت دن یاد رہے گی۔ رہ گیا غلام رسول کا معاملہ ہم کسی کے غیب کے بارے میں کیا کہہ سکتے تھے۔ وہ جو گزر چکا تھا، واقعی گزر چکا تھا اس کو پھر سے دہرانے کا کیا فائدہ!

بڑے کمرے میں پہنچ کر اُن دونوں کو بڑی ہی خوفزدہ صورت میں دیکھ کر میں نے مستان شاہ کی کمر میں ٹھوکر لگا کر اُسے تھوڑا اُن کی طرف دھکیل دیا۔

"اِس کو سمجھا دینا یہ پھر کبھی اس طرف نہیں آئے گا۔ آیا تو پھر تم سب کی خیر نہیں ہوگی۔" یہ کہہ کر میں نے ان دونوں کے سر کے اوپر سے گولی چلا دی۔ ٹھک کی سی آواز پیدا ہوئی۔ وہ فوم کے ٹھنڈے میٹھے بستر میں دبک کر رہ گئے۔ میں اس کی بیگم کی صورت کبھی نہیں بھول سکوں گا۔ اس کی آنکھوں سے ایسا خوف اور ایسی نفرت کا بھرا لاوا اُبل رہا تھا کہ اس کی طرف دیکھا نہیں جاتا تھا۔ تابیے نے یوں کیا کہ لوٹ کر اُن کے کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا اور پھر مجھے وہ گھسیٹتا ہوا اس بڑی سی کوٹھی میں سے باہر نکل آیا۔ گیٹ کے اندر اُن کے ملازم کی میت دھری تھی۔ اسے میت ہی کہنا چاہیے کہ وہ صبح سے پہلے دنیا میں واپس نہیں آ سکتا تھا۔

اس کو وہیں چھوڑ کر ہم نے گیٹ کے باہر سے کنڈی چڑھائی اور ڈاکٹر قوی کی کار میں بیٹھ کر ہم سیدھے طارق روڈ کی طرف چل دیے۔

"معاملہ خاصا کامیاب رہا ہے، کیا خیال ہے تیرا؟"

"ہاں! ہمارے ساتھ رہو گے تو اسی طرح عیش کرتے رہو گے تابیے! تیرے یار جب سے مرے ہیں تو آدھا رہ گیا ہے۔"

"ہاں! یہ تو ہے، اُن کے بغیر مزہ ہی نہیں آ رہا ہے مگر اب میں پھر سے زندہ ہو گیا ہوں۔ مگر یہ تو بتا تو نے انہیں مار کیوں نہیں دیا؟ وہ پھر اُچھلیں گے۔"

"نہیں یار! ایسی بات نہ سوچ۔ اُن کو مارنے سے فائدہ کیا ہوتا۔ موج کرنے دے انہیں۔ کوئی کسی کا حق مارتا ہے تو مارتا رہے قتل بھی ہوتے ہی رہتے ہیں۔ ہم کہاں کے منصف ہیں۔ بات صرف حسنہ کی تھی۔ میں نے اُس سے وعدہ کیا تھا کہ اسے ہم ضرور بچا لیں گے۔ وہ کام ہم نے کر ہی لیا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے یار! مگر یہ لوگ پھر کوئی چکر نہ چلا دیں۔ ان سے کچھ بھی بعید نہیں ہے۔"

"ہم اُن کو اپنے پتے دکھا آئے ہیں اب وہ کچھ نہیں کریں گے۔ کچھ نہیں کر سکتے ہیں وہ۔"

"پتہ نہیں تو یہ بات کس طرح کہہ رہا ہے، مجھے تو میرا تجربہ یہی بتاتا ہے کہ ایسے لوگ جب دوبارہ اٹھتے ہیں تو بہت خطرناک ہوتے ہیں۔"

"نہیں یار! کبیر کو ہم نے ٹھیک سبق دیا ہے کسی کو مار دینا کوئی شرافت نہیں ہے۔ سوال اب یہ ہے کہ ہم آبی اور اس کے ڈاکٹروں کو لے کر کہاں جائیں؟"

"ہاں! یہ سوال میں تم سے پوچھ رہا تھا۔ وہ ہمارا ٹھکانا بھی دیکھ چکے ہیں۔ وہ کسی بھی طرح ہمیں معاف نہیں کریں گے۔ اتنی بڑی رقم ہم لے آئے ہیں۔"

"یہ تو خیر وہ اپنی جان کی ضمانت سمجھتا ہوگا، خیرات نکل گئی اُس سالے کی، پر میرا خیال ہے کہ وہ اب ہماری طرف نگاہ نہیں کریں گے۔ خاصا سبق دے آئے ہیں ہم اُسے۔"

"تیری مرضی ہے یار! میں تجھے کیا نصیحت کروں۔ وصیت بھی میں ابھی نہیں کر سکتا۔"

"چل دفع کر، یہ رقم تیرے لیے بہت کافی ہے۔ بہت دنوں کے لیے کافی رہے گی۔"

"ہاں میرا کام تو آسان ہو گیا۔ ایک دھیلا میرے پلے نہیں تھا اب میں اس میں سے آدھی رقم لے کر گھر چلا جاؤں گا۔"

"اوئے تیرے یہ چھن ہیں؟ کمال ہو گیا۔ میں سمجھا تو نے آبی کی جگہ لے لی ہے، وہ بیمار ہے، تو تو کچھ دن میرے پاس رہے گا۔ تو بھی چلا جائے گا؟"

"ہاں یار! میں ادھر نہیں رہ سکتا۔ مال تو مل ہی گیا ہے سال بھر آرام کروں گا۔ آبی کی والدہ کو بھی رقم کی سخت ضرورت ہوگی اسے بھی میں ایک لاکھ دے دوں گا۔"

"ہاں! یہ تو اچھی بات ہے۔ ٹھیک ہے تو کل ہی چلا جا ___ میں ان سے نمٹ لوں گا۔" یہ کہہ کر میں نے موضوع بدل دیا۔ تابیے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ وہ تو میرے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اسے تو صرف ایک لمبی رقم کی ضرورت تھی، وہ اُسے مل چکی تھی اور بس۔ اب وہ میرے پاس کس لیے رہے گا۔ وہ کوئی آبی تو نہیں تھا ___ کبھی کبھی تو وہ بھی مجھ سے عاجز آ جاتا تھا۔ اُسے بھی وہ زندگی راس نہیں آتی تھی ___ وہ بھی رسّا تڑا کر بھاگنے کی سوچتا تھا مگر پھر اُسے کوئی چیز روک لیتی تھی۔ وہ میرے بغیر خود کو آدھا آدھا محسوس کرتا تھا۔ تنہا وہ رہ ہی نہیں سکتا تھا۔ اور حال ہمارا یہ تھا کہ ہم نے کبھی سینے سے سینہ نہیں ملایا تھا۔ کبھی ایک دوسرے سے معانقہ تک نہیں کیا تھا۔ یہ بات دوستی کی راہ میں بڑی معاون ثابت ہوتی ہے لیکن ہم اس راہ سے نہیں گزرے ___ آدمی کو دوسرے کی دوستی اور چاہت کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب اس کے ہاتھ دوسرے کے ہاتھ سے مل جائیں ___ مردوں کی اور عورتوں کی دوستی میں یہی شے عیاں اور نمایاں ہوتی ہے۔ محبت اپنا عملی اظہار مانگتی ہے مگر نہیں۔ ہم ایک دوسرے کو نہ جانتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے لیے مر مٹنے کا عہد کیے ہوئے تھے۔ اور مجھے اس کی یہی ادا سب سے زیادہ پسند تھی۔ مجھے وہ لوگ اچھے نہیں لگتے جو خواہ مخواہ ہی

دوسروں کو دکھانے اور اپنے دل کو یہ احساس دلانے کے لیے معانقہ کرتے پھرتے ہیں۔ دوستی کوئی عید کا دن تو نہیں ہوتی کہ دو گھڑی مل کر بھاگ لو۔ یہ تو جان سے جان ہارنے کا سودا ہوتا ہے اور آبی مجھے اسی لیے زیادہ پسند تھا۔ جب تابیے نے لاہور جانے کی بات کی تو میں نے اسے روکنا مناسب نہ سمجھا۔ اور اس موضوع ہی کو بدل دیا۔

کار طارق روڈ پر چڑھی تو کسی طرف سے روزے کے لیے سائرن کی آواز ابھرنے لگی۔ ہم نے کار اپنے فلیٹ سے دور کھڑی کی تو تابیے نے بریف کیس اٹھایا۔ وہ اس کے بارے میں کچھ زیادہ ہی پریشان تھا۔ پستول ہم نے نیفے میں اڑس کر اپنے فلیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ وہ عورت اس وقت ہمیں دروازے سے ذرا دور نہایت ہی بے چینی سے ٹہلتی نظر آئی۔ حالانکہ ہم نے اس کے کمرے کا دروازہ باہر سے بند کروا دیا تھا مگر وہ اسے کھول کر آزاد گھوم رہی تھی۔

"کیا بات ہے بی بی! خیر تو ہے؟"

"اوہ! آپ آ ہی گئے میں سخت پریشان تھی خدا کا شکر ہے آپ آ گئے۔"

"ایسی پریشانی کی کیا بات تھی، اندر تو خیر ہے نا؟ وہ اسلم کہاں ہے؟"

"وہ بندھا پڑا ہے۔ میں نے ایک رسی لے کر اس کے ہاتھ پاؤں زیادہ مضبوطی سے باندھ دیے تھے وہ بکواس کرنے لگا تھا۔"

"اچھا! اسے اتنی جلدی ہوش آ گیا۔ کچھ منہ میں ٹھونسا ہوتا آپ نے۔"

"وہ میں نے کر دیا تھا۔ رومال منہ میں ڈال کر اوپر سے پٹی باندھ دی جب جا کر کہیں وہ آرام سے بیٹھا ہے مگر کسی آدمی نے اس کمرے میں شور مچا رکھا ہے۔ ٹھہر ٹھہر کا چیختا ہے۔ میں نے تو اس کا دروازہ نہیں کھولا۔"

"اچھا! اس سیفی کو ہوش آ گیا ہے شاید۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ تیرا خیال ٹھیک ہی ہے تابیے! ہمیں یہ جگہ چھوڑ دینی چاہیے۔"

"میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ یہاں رہنا کسی بھی طرح مناسب نہیں ہے مگر تم مانتے ہی نہیں تھے۔"

"ہوں! ذرا دیکھیں تو کیا کر رہا ہے وہ ادھر۔" یہ کہہ کر میں نے سیفی کے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ وہ بری طرح مرتڑخ رہا تھا۔ آنکھوں پر پٹی بندھی تھی اور ایک منٹ کے لیے بھی وہ منہ میں زبان نہیں ڈالتا تھا۔

"کیا ہے بے، کیا ہو گیا ہے تجھے؟" میں نے بتی جلا کر اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ ہم اس کے ساتھ کیا کر چکے ہیں۔

میری آواز سنتے ہی چیخنے لگا۔ "یہ کیا کر دیا ہے تم نے؟ میری آنکھوں کو کیا ہوا۔ مجھے کیوں اندھا کر دیا ہے تم نے؟ اوہ میرے خدایا!"

"گھبراؤ نہیں بیٹے! تم نے کسی کو اندھا کیا تو ہم نے تمھاری آنکھیں نکال لیں حساب برابر ہو گیا۔ پریشان کیوں ہوتے ہو؟"

وہ پاگل ہو رہا تھا اور اندھی آنکھوں کے باوجود اس کے ہاتھ کسی سامنے آئی چیز کو جھپٹ لینے پر تیار تھے۔ بستر اس کے وجود کو سنبھال نہیں رہا تھا۔ وہ بالکل ہی آپے سے باہر ہونے لگا تھا۔

"مجھے بہت سخت بھوک لگی ہے۔" اس نے بالآخر پریشان کن لہجے میں کہا۔ میں نے پستول نیفے میں اڑس لیا۔ اس کی حسیات بیدار ہونے لگی تھیں اب اسے بھوک بھی لگتی تھی اور پیاس بھی۔ اور نیند کا ساغر اس کے سر میں ٹوٹ چکا تھا۔

"اسے کھانا کھلائیں حسنہ! ادھر ڈھیر سارا کھانا دھرا ہے۔ تابیے! تم یوں کرو کہ اس کے ہاتھ باندھ دو حسنہ جب ہی اس کے پاس آئے گی۔"

تابیے نے اب کی بار نواڑی پلنگ میں سے ایک رسی نکالی اور سیفی کے ہاتھ باندھنے لگا۔ اس نے بہت جان چھڑائی۔ ہاتھ بچا لینے کی بہت کوشش کی مگر تابیے نے اس کی پیش نہیں چلنے دی۔ جب وہ اس کے ہاتھ کمر کے پیچھے باندھ چکا تو بولا۔ "آؤ میں دو گھڑی آبی کے پاس بیٹھنا چاہتا ہوں وہ مجھ سے بات ہی نہیں کرتا ہے۔"

"ہاں چلو۔ مگر یہاں زیادہ دیر رکنا ٹھیک نہیں ہے تابیے! یہ جگہ چھوڑ دو۔"

"تو پھر جلدی کرو بابا! دیر کیوں کرتے ہو؟ میں آبی سے پھر بات کر لوں گا۔"

"ہاں! اس سیفی کو ابھی کھانا بھی مت دو۔ اس کمینے کا کچھ پتہ نہیں ہے کہ وہ کیا کر بیٹھے۔" یہ کہہ کر میں نے سیفی کو وہاں سے اٹھا کر کار میں ڈال دیا۔ آبی اور ڈاکٹر قوی کو بھی میں نے تابیے کی مدد سے وہاں سے اٹھا دیا۔ اب تین آدمی زخمی تھے اور حسنہ سمیت ہم تین صحیح سالم تھے۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ ہم دیر تک وہاں ٹھہر سکتے۔ مگر سوال یہ تھا کہ ہم جائیں کہاں۔ میرا بہت دل چاہا کہ اٹھ کر فردوسی بیگم کے ہاں جا ٹھہریں۔ مگر اس کے پاس جا ٹھہرنا کوئی اچھی بات نہیں تھی۔ ہماری وجہ سے اس نے پہلے ہی بہت پریشانی اٹھائی تھی۔ ڈاکٹر سیفی کو ایک بار پھر میں نے بے ہوش کر دیا۔ اس کا کوئی اعتبار نہیں تھا۔ رات اب زیادہ رواں ہو گئی تھی سحری کے لیے اٹھنے والوں نے بستر چھوڑ دیا تھا جب حسنہ میرے ساتھ والی نشست پر بیٹھی تو وہ بہت پریشان تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کن لوگوں میں آ پھنسی ہے۔ مقصود سے تو اسے یونہی رسمًا مدد کی توقع تھی، یوں جیسے کوئی راہ چلتا آدمی راستے سے پتھر اٹھا کر الگ پھینک دے۔ اسے کیا خبر تھی کہ ہم کیا کر بیٹھے ہیں اور اس کے دشمن کو کیسی گہری چوٹ لگا آئے ہیں۔

میں نے گاڑی اسٹارٹ کی تو وہ بولی۔ "اب کہاں جا رہے ہیں آپ؟"

"کچھ پتہ نہیں ہے بی بی! ہم اچھے لوگ نہیں ہیں۔ ہمیں کوئی اچھی جگہ کیسے مل سکتی ہے؟"

"نہیں نہیں! آپ سے زیادہ اچھا تو میں نے کوئی دیکھا نہیں۔ آپ نے میرے جیسی مظلوم عورت کی مدد کی ہے۔ آپ برے کیسے ہو سکتے ہیں؟"

"ہاں! یہی تو ہمارا کمال ہے۔ ہم اس زمین کی طرف لپکتے ہیں جو بیٹھ رہی ہو۔ اس کو بچانا ناممکن ہوتا ہے مگر اس پر اُگے کسی بھی شجر کو بچا کر ہم سمجھتے ہیں کہ ہم نے بڑا کام کر دیا ہے۔"

میری نگاہیں سڑک پر جمی تھیں وہاں سے ہٹتی تھیں تو آبی اور سیفی پر جا ٹھہرتی تھیں۔ آبی کسی گہری سوچ میں گم تھا اور اسے یہ بھی احساس نہیں تھا کہ اس کا دوست تابیا اس کے قریب بیٹھا ہے۔ مجھے لگتا تھا وہ خالی الذہن ہو کر بیٹھا ہے اور تابیے کو یہی شکوہ تھا کہ آبی نے اسے پہچاننے ہی سے انکار کر دیا ہے۔ مگر ایسا نہیں تھا۔ تابیے کی آواز سن کر اس کے چہرے کی رنگت بدلنے لگتی تھی۔ وہ احسان فراموش نہیں تھا مگر اسے یہ دکھ کھائے جا رہا تھا کہ اس کے لیے ہم نے بہت تکلیف اٹھائی ہے۔ ہمیں وہ یوں در در کی ٹھوکریں کھاتے نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اس رات ہم جو پچھلے پہر میں گھر سے بے گھر ہوئے تو اس بات کا بھی اسے گہرا قلق تھا۔ مگر پھر بھی وہ چپ چاپ بیٹھا رہا۔ آدمی کا غم کچھ سینے سے بھی آگے گزر جائے، اسے یہ معلوم ہو جائے کہ اس کا کوئی اُپائے نہیں، کوئی مداوا نہیں تو پھر وہ چپ ہی سادھ لیتا ہے۔ ہم تیغ دودم کے سامنے کھڑے تھے۔ ہم تینوں ہی۔ اور میرا احساس یہ تھا کہ کراچی کی پولیس ہماری ٹوہ میں ہے اتنی بڑی وارداتیں کر چکے تھے، وہ کیسے چپ رہ سکتے تھے اور پھر کبیر تھا، اسے معلوم تھا کہ وہ گولیاں جو جو اس کے سر پر سے گزر گئیں ذرا نیچے ہوتیں تو وہ اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر چکا ہوتا۔ یہی حال اس کی بیوی کا تھا۔ خوفزدہ آدمی شاید خدا کے زیادہ قریب ہو جاتا ہے۔ وہ بھی یہی سمجھ رہے تھے کہ یہ خدا ہی تھا جس نے ان کی جان بچا دی۔ مگر کس کو خبر تھی کہ کون کس کے کام آ گیا ہے۔

"کہاں جا رہے ہو اب؟"

"میں خود یہی سوچ رہا ہوں میں کس طرف نکلوں۔"

طارق روڈ کے چوک سے آگے گزر کر تابیے نے کہا۔ "میری مانو تو ان کو ادھر لیاقت آباد لے چلو۔ وہاں میرا دوست رہتا ہے اس کے ہاں جا ٹھہرتے ہیں۔"

"ابے تو جلدی بول نا۔ منہ میں گھنگھنیاں ڈال کر بیٹھا ہے تیرا ابھی جواب نہیں ہے۔" میں نے گاڑی لیاقت آباد کی طرف موڑ دی۔ کچھ ہی دیر بعد ہم لیاقت آباد کے مرکز میں جا پہنچے۔

"گاڑی دائیں ہاتھ لے چلو تیسری لین میں۔ میرا دوست افسر علی وہیں رہتا ہے۔" تابیے نے کار سے سر باہر نکال کر گرد و پیش کو گہری نظر سے دیکھتے ہوئے کہا۔

ایک دو منزلہ عمارت کے سامنے جب ہم پہنچے تو تابیے نے گاڑی رکوا دی۔ بولا۔ "یہی وہ جگہ ہے۔"

اس کا دوست افسر علی بالائی منزل پر رہتا تھا۔ گیٹ پر لگی گھنٹی کی آواز سن کر وہ نیچے آیا۔ تو تابیے کو دیکھتے ہی اس سے لپٹ گیا، بولا۔ "اوئے توں کتھے بھئی! ایس ویلے ایہہ چند کس طرح چڑھ آیا۔"

"بس یار! ایک دھندے سے ادھر آئے ہیں۔ ہم کچھ دن تیرے پاس ٹھہریں گے، دو مریض ہیں ہمارے ساتھ۔"

"ہزار دن رہو یار! یہ گھر کس کا ہے میری جان یہ جگر کس کا ہے۔" یہ کہہ کر وہ میری طرف لپکا۔

"یہ میرے دوست ہیں غلام جیلانی۔ آؤ یار مریضوں کو نیچے اتارو۔"

کچھ ہی دیر بعد ہم افسر علی کے مکان کی دوسری منزل پر جا پہنچے۔ آبی اور دونوں ڈاکٹروں کے لیے اس نے الگ کمرہ کھلوا دیا اور ہم تینوں کے لیے اس نے دوسرے کمرے میں ٹھہرنے کا بندوبست کر دیا۔ مکان بہت عمدہ تھا۔ ہر کمرے کے ساتھ باتھ روم بنے تھے۔ نچلی منزل بالکل خالی تھا۔ وہاں جو لوگ ٹھہرے ہوئے تھے کسی کام سے لاہور گئے ہوئے تھے۔ افسر علی نے ساری تعلقہ داری ختم کر رکھی تھی۔ اور ابھی تک وہ تنہا ہی رہ رہا تھا۔ شکل صورت سے وہ خاصا بارعب آدمی نظر آتا تھا۔ گورا رنگ، پھیلی پھیلتی آنکھیں، گھنگھریالے بال۔ قد بھی کوئی پونے چھ فٹ۔ لگتا تھا کہ دنیا اس نے بہت کثرت سے دیکھ رکھی ہے۔ لفظوں کی تعریب میں اسے خاص مزا ملتا تھا۔

"آپ کے لیے طعام میں کیا پیش کروں؟"

"ابے نہیں! یہ کوئی کھانے کا وقت نہیں ہے بس تم سو رہو۔"

"نہیں یار! سحری کا وقت بھی اب ہو ہی رہا ہے۔ کچھ کھا لیتے ہیں، یہ وقت عارفوں کا وقت ہے۔"

"ہاں! ہم ایسے عارفوں کا۔ پوچھا نہیں تم نے کہ اس وقت کیسے آئے ہو؟" تابیے نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"کہا تو ہے تم نے کہ ایک دھندے سے آئے ہیں اور یہی بہت کافی ہے۔ یہ رات تم نے کہاں گزاری ہے۔ ایسی تعجیل میں۔۔۔۔ کہاں سے باہر نکلے ہو؟"

"ارے یار! کیا بتائیں تیرے ہی "تعبّد" میں باہر نکل آئے۔

ٹھیک کہا ہے نا میں نے؟"

"نہیں! یہ تو گڑبڑ کی بات ہے، کچھ تعدیل تو ہونی ہی چاہیے کون تھا جس نے تمھارے کسی جگہ ٹھہرنے پر تعرّض کیا؟"

"دیکھا! تیری عزبی ہمیں لے ڈوبے گی۔ پولیس کے ڈر سے نکل بھاگے ہیں، لا ذرا کچھ کھانا ادھر لے آ۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور باہر نکل گیا مگر دروازے پر پہنچ کر بولا "خدا ہی خیر کرے، یہ تعزیر کا معاملہ نہ بن جائے!"

"نہیں تو فکر نہ کر۔ یہاں تک کوئی نہیں پہنچ سکے گا۔ تو ان کو دیکھ ذرا، وہ کس حال میں ہیں جیلانی! آبی تو زیادہ ہی پریشان لگتا ہے۔"

مگر جب میں تاہیے کو ساتھ لے کر دوسرے کمرے میں پہنچا تو وہ تینوں ہی بے سُدھ ہو چکے تھے۔ ٹیکے ابھی تک اپنا کام دکھا رہے تھے۔ لیٹتے ہی وہ بے سُدھ اور بے خبر ہو گئے۔

"یہ کون ہے تاہیے! یہ افسر علی — ؟"

"یہ بھی اپنے ہی محکمے کا آدمی ہے۔ بہت بڑا اسمگلر ہے۔ مگر آج کل ہاتھ روک کے بیٹھا ہے کچھ نہیں کرتا ہے۔"

"ہوں! سونے کی اسمگلنگ کرتا ہے؟"

"ہاں! جو چیز بھی مل جائے۔ مگر سونا اس کی خاص تجارت ہے۔"

کچھ ہی دیر بعد ہم کھانا کھا کر اطمینان سے لیٹ گئے۔ افسر علی نے دراصل اپنے کمرے میں ایک خاص قسم کا انتظام کر رکھا تھا۔ کوئی آوارہ حُور تھی جو اس نے وہاں باندھ رکھی تھی۔ اور وہ خوش تھا بے حد خوش کہ ایسی بہلا آفریں شے اسے کبھی کبھار ہی ملتی ہو گی۔ اس نے حُسنہ کے بارے میں ہم سے کچھ نہیں پوچھا۔ بس ایک نظر دیکھ کے دوبارہ اسے نہیں دیکھا۔ وہ بھی سر جھکائے وہاں بیٹھی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہم کس قسم کے لوگ ہیں؟ اچھائی بھی کرتے ہیں اور بُرائی بھی۔ ایسے تو اسے کہیں نہ ملے ہوں گے۔

صبح ہم نو بجے بستر سے اٹھے تو حسنہ ہم سے پہلے ہی بیدار ہو چکی تھی اور افسر علی اپنی چوزہ باز کو لے کر باہر جا چکا تھا۔ ہمیں بستر پر سے سر اٹھاتے دیکھ کر بولی "وہ۔۔۔ وہ افسر صاحب کہہ گئے ہیں کہ شام کو واپس آئیں گے۔ ڈاکٹر سیفی نے کئی بار ہم کو پکارا ہے مگر میں اُدھر نہیں گئی۔"

اس کی یہ بات سنتے ہی ہم نے بستر چھوڑ دیا "ذرا دیکھ تو تاہیے معاملہ کیا ہے؟" یہ کہہ کر میں غسل خانے میں جا گھسا۔

جب میں باہر نکلا تو تاہیا واپس آ چکا تھا، بولا "سیفی کی حالت بہت خراب ہے۔ اس کی آنکھوں سے خون بہہ رہا ہے، پٹی تر ہے۔"

"اور آبی؟ وہ کیسا ہے؟"

"وہ اطمینان سے لیٹا ہے اور اب ہوش میں ہے۔ ڈاکٹر قوی بہت پریشان ہے سیفی کی وہ تکلیف اس سے دیکھی نہیں جاتی۔"

"بکواس کرتا ہے وہ۔ اور میں دیکھتا ہوں انھیں۔" یہ کہہ کر میں نے ان کے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ حسنہ بھی ہمارے ساتھ ہی چلی آئی۔ سیفی، واقعی بہت تکلیف میں تھا۔ آنکھیں اس کی لہولہان ہوتی جاتی تھیں۔ پٹیاں خون سے تر تھیں اور قوی اسے دیکھ کر بڑے دلدوز انداز سے سینے پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا تھا اور کمرے کا دروازہ باہر سے مقفل ہونے کی وجہ سے وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی جگہ میں ہوتا تو آبی کی شہ رگ کاٹ دیتا۔ کہ اس کی اصل مصیبت کا سبب تو وہی تھا۔ اور اسے معلوم تھا کہ ہم آبی کو کتنا عزیز رکھتے ہیں مگر قوی ان لوگوں میں سے تھا جو ہر حال میں اپنے نفس کو لہو رنگ نہیں ہونے دیتے، اُس پر دھیرج کا دارو آتارتے ہیں۔

"کیا بات ہے سیفی، کیوں چیختے ہو؟"

"تم نے میری زندگی تباہ کر دی ہے میں تمھیں زندہ نہیں چھوڑوں گا کتّے! مجھے طاقت مل گئی تو میں تیری موت ثابت ہوں گا۔"

"یوں نہیں بیٹے! یوں نہیں۔ تم نے آبی کی آنکھیں نکال کر دراصل اپنی ہی آنکھوں سے ہاتھ دھو لیے تھے۔ اٹھو اور جاؤ۔ تاہیا تمھیں کسی سڑک پر پھینک دے گا۔" یہ کہہ کر میں نے اس کو بازو سے پکڑ کر اوپر اٹھا دیا۔ "اسے لے جاؤ تاہیے! کسی جگہ پھینک آؤ۔ ویرانے میں ڈال دو اسے۔"

تاہیا تو شاید یہی چاہتا تھا۔ اُس نے فوراً ہی ڈاکٹر سیفی کو بانہوں سے پکڑا اور نچلی منزل کی طرف لے چلا۔ وہ خود اُس کی چیخ پکار سے تنگ آ چکا تھا اور چاہتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح اُس سے جان چھوٹ جائے۔ وہ ایسی چوڑیاں کبھی نہیں پہنتا تھا جس سے اس کے بازو کی حرکت رُک جائے۔ وہ تو چوکڑ آدمی تھا۔ کھرا، نادر اور عمدہ۔ وہ کسی ایسے ادھار کا قائل ہی نہیں تھا جس کے لیے اُسے تقاضا کرنا پڑے۔

ڈاکٹر سیفی باہر نکلا تو میں نے ڈاکٹر قوی کو بستر پر سے اٹھا دیا۔ "کیا حال ہیں آپ کے ڈاکٹر! ابھی وقت آ گیا ہے کہ آپ آبی کے علاج کا دُوسرا مرحلہ طے کر سکیں۔"

"ہاں مجھے معلوم ہے۔ میں آپ کو دوائیں لکھ دیتا ہوں، منگوا لیں پھر میں ان کی پٹی بدل دوں گا۔"

"ہاں لکھ دیں میں دوائیں منگوا لیتا ہوں جلدی کریں حُسنہ آپ ہمارے لیے کھانا پکا دیں یہ بھی بھوکے ہیں۔"

"جی میں ابھی دیکھتی ہوں۔" یہ کہتی ہوئی وہ فوراً ہی باہر نکل گئی۔ دراصل وہ سب کچھ اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ ایک آدمی کی آنکھیں بندھی تھیں۔ ایک ملفوف چشم آدمی باہر بھیجا جا چکا

تھا اور اُن دونوں سے ابتر ڈاکٹر قوی کی حالت تھی۔ ایسا سماں اُس نے بھلا کہاں دیکھا ہو گا۔ وہ تو سمجھتی تھی کہ سب لوگ غلام رسُول ایسے ہی ہوتے ہیں۔ مہربان، کرپا کرنے والے۔ تاحدِّ نظر سُرخ قالین بچھانے والے ــ مگر اسے کہاں معلوم تھا کہ اس شہر میں ایسے بھی ہیں جو دوسروں کی آنکھیں نکال لیتے ہیں۔ انہیں بے آسرا کر کے چھوڑ دیتے ہیں۔ دردر کی ٹھوکریں کھانے کے لیے کوئی ہر آدمی کے لیے ایسا ٹھٹیا ہی پیرا کہاں سے لائے گا کہ وہ اپنے گھر میں، اپنے شہر میں، اپنے گلی کوچے میں ہر شے سے محفوظ رہ سکے اور انسانوں کے منہ کو تو لہو لگ چکا تھا۔ اور وہ دُوسروں کا خُون پی کر ہی زندہ رہ سکتے تھے۔ یہ ساری باتیں حُسنہ کی سمجھ میں کیسے آ سکتی تھیں۔

ڈاکٹر قوی نے اٹھ کر ایک کاغذ پر دوائیں لکھ دیں، بولا۔ "یہ جلدی منگوا لیں پٹی کا وقت ہو چکا ہے۔"

"آپ کھانا کھا لیں، پک ہی رہا ہے پھر یہ دھندا بھی دیکھ لیں گے، تیرا کیا حال ہے آبی! آرام سے تو ہو؟"

"ہاں! مجھے بہت سکون ہے مگر میری روشنی کیسے واپس آئے گی یہ ناممکن ہے جیلانی ناممکن۔"

"سب کچھ ممکن ہے، تجھے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔"

آبی نے مجھے رُلا دیا تھا۔ اُس کی آواز اس کے دلی غم کا پتہ دیتی تھی۔ اس کی چھیتیسی آپ ہی نمایاں ہوئی جاتی تھی لگتا تھا کہ آبی اندر سے وہ آدمی نہیں تھا جو مجھے باہر سے نظر آتا تھا۔ میں تو اُسے پہاڑوں سے زیادہ اٹل سمجھتا تھا مگر وہ تو بالکل ہی اُلٹ ثابت ہو رہا تھا۔ اس امید کی کوئی بات ہی نہیں تھی اس میں ــ بڑا جی دار بنا پھرتا تھا وہ، مگر جب اس کی آزمائش کا وقت آیا تو وہ ڈھیری ہی ڈھا بیٹھا۔ اُسے کسی حکیم، کسی ڈاکٹر پر بھروسا نہیں رہا تھا جب سے اُس پر آخری آپریشن کیا گیا تھا جب سے تو وہ بالکل ہی خاموش پڑا رہتا تھا اب جو اُس نے بات کی تو میں سمجھا وہ میری کسی بھی تدبیر کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جو کچھ ہو چکا ہے وہ خدا کی مصلحتوں میں سے ایک تھا ایسی مصلحتیں جن کا بھید ہم نہیں پا سکتے تھے۔ مگر خدا تو کسی کو نور دے کر اس سے واپس نہیں لیتا۔ یہ آدمی ہی کی خصلت ہے کہ وہ دوسروں سے اُن کی روشنی تک چھین لیتا ہے۔ اور اس روشنی کے لیے اسے کرۂ ارض پر پاپیادہ بھی گھومنا پڑے تو اُسے دریغ نہیں کرنا چاہیے مگر آبی اس نکتے کو سمجھ ہی نہیں پا رہا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد تاہیا بھی واپس آ گیا۔ وہ ڈاکٹر قوی کی کار میں ڈال کر سیفی کو باہر لے گیا تھا۔

"میں اسے سمندر کے کنارے پھینک آیا ہوں اس بدمعاش کو لہریں آئیں گی اور اسے ساتھ لے جائیں گی۔"

"گڈ۔ اچھا کیا تم نے ــ وہ سمندر کا مال تھا اسی میں جا ملے گا یہ لو یہ دوائیں لے آؤ۔ آبی کی پٹی بدلنی ہو گی۔"

"اچھا! یہ تو بہت ضروری تھا لاؤ۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے بریف کیس میں سے دو ہزار روپے نکالے اور اسی وقت باہر نکل گیا۔ اُس کے جاتے ہی ہم نے حسنہ کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا پیٹ بھر کر کھایا۔ ہر عورت میں دلربائی کی ایک شان ہوتی ہے مگر حسنہ میں یہ خصوصیت تھی کہ وہ کھانا بھی بہت اچھا پکاتی تھی۔ اور اس بات پر بے حد خوش تھی کہ میں نے اس کے کھانے کو بے حد پسند کیا ہے۔ ابھی وہ خاتونِ فلک نہیں بنی تھی۔ وہ نہ چاند تھی نہ سورج نہ زہرہ نہ مشتری۔ ابھی تو وہ میرے دل میں بھی نہیں اتر سکی تھی۔ بس اس نے صرف اتنا کیا تھا کہ میرے وجود میں اٹک گئی تھی۔ یوں جیسے پہاڑ سے گر کر کوئی آدمی کسی چٹان کے کنگرے میں پھنس جائے۔ اپنے ناخن کسی درز میں چبھو دے۔ اور سمجھے کہ وہ بچ گیا ہے۔ ورنہ اس کی ملاقات ہم سے جن حالات میں ہوئی تھی وہ بہت ہی ناگفتہ بہ تھے۔ پھر بھی مجھے یقین ہو چلا تھا کہ وہ ہمارے ساتھ رہنا پسند کرے گی، اُسے یہ احساس تھا کہ ہم اس کے محسن ہیں۔

کچھ ہی دیر بعد تاہیا دوائیں لے کر واپس آ گیا اسے تو ہم نے کھانے میں الجھا دیا اور ڈاکٹر قوی دوائیں ساتھ لے کر دوسرے کمرے میں جا گھسا۔ آبی کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ درد سے بلبلاتا نہیں تھا۔ صبر سے اس کے جھٹکے سہتا رہتا تھا۔

ڈاکٹر قوی نے یوں کیا کہ کمرے میں ہم میں سے کسی کو بھی ساتھ نہیں رکھا۔ تنہا ہی اس آبی کے جگر گوشوں کے لیے دوائیں سمیٹتا رہا۔ وہ اپنی آنکھوں کو کئی نام دیتا تھا۔ اور جب وہ انھیں جگر گوشے کہتا تھا تو میرا دل کٹنے لگتا تھا۔ آدمی کو اپنے اعضا سے جو محبت ہے اس کی تو مثال ہی نہیں مل سکتی۔ کوئی بھی شخص یہ نہیں چاہتا کہ اس کے ہاتھ، پاؤں، ہونٹ، ناک، کان، آنکھیں بدل دی جائیں۔ مگر ایک مجبوری تھی جس کے تحت آبی نے وہ آپریشن قبول کر لیا تھا اور وہ اس کا اثر دیکھنا چاہتا تھا لیکن اپنے جگر گوشوں کو کھو دینے کا غم اُسے اتنا زیادہ تھا کہ ٹھہر ٹھہر کر اس کے ہونٹ کسی نادیدہ دُعا کے لیے کھلتے تھے جیسے وہ خدا سے چپکے چپکے کہہ رہا ہو کہ وہ اس کی یہ ابتلا دُور کر دے۔ شاید خدا کو اسی کی عاجزی پسند آ جائے اور وہ پھر سے دیکھنے لگے۔ اپنی طرف سے تو ہم اس کے لیے وہ سب کچھ کر رہے تھے جو ہمارے بس میں تھا۔

ہم کمرے میں آ بیٹھے تو تاہیا بولا "اُس نے بہت شور مچایا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں اسے کہاں پھینک رہا ہوں۔"

"کیا کہتا تھا وہ؟" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"گالیاں دیتا تھا مجھے۔ کہتا تھا میں تمھیں پھانسی لگوا

دوں گا۔ مجھے اندھا کرکے تم زندہ نہیں بچ سکو گے۔" میں نے کہا۔ جا جو تیری مرضی ہو وہ کر۔ ہمارے یار کی آنکھیں چھین کر تو کیسے بچ سکتا ہے۔ میں نے کار سے نکال کر اسے پانی کے قریب پھینک دیا کہ خس کم جہاں پاک۔"

"بہت اچھا کیا ہے تم نے۔ وہ اسی لائق تھا۔ صرف بیس ہزار روپوں کے لیے اس نے آبی کی آنکھیں نکال لیں۔ دعا کرو اب آبی کو صحت ہو جائے۔"

"ہاں! میں تو دن رات دعا گو ہوں، ویسے بھی میں اکثر اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتا رہتا ہوں۔"

سات دن گزر گئے۔ سات بڑے ہی مضمحل، بڑے ہی پریشان کن اور بہت ہی اداس دن اس مکان میں ہم نے گزار دیے۔ افسر علی صبح ہی صبح وہاں سے نکلتا اور شام کو واپس آتا تھا۔ اس نے نہیں پوچھا کہ ہم کون ہیں اور وہاں ہمارا دھندا کیا ہے، وہ اپنے ہی کام میں الجھا رہتا تھا۔ ایک خارپشت قسم کی حور اس کے ساتھ رہتی تھی۔ بلاشبہ وہ خارپشت ایسی ہی تھی۔ بہت تیز طرار، بہت دیدہ زیب مگر اس نے بھی ہم سے نہیں پوچھا کہ معاملہ کیا ہے۔ اور یہ اس کی مہربانی تھی۔ افسر علی نے یوں کر رکھا تھا کہ گھر میں کئی مہینوں کا راشن اکٹھا کر دیا تھا اور اس میں سے ہم ضرورت کی چیزیں نکال کر استعمال کر لیتے تھے۔ عید سے دو دن پہلے وہ ہم سے خدا حافظ کہہ کر گھر چلا گیا۔ ہمیں عید کا دن بھی وہیں آیا۔ مگر ہم سب یوں سہمے سمٹے بیٹھے رہے جیسے وہ عید کا دن ہی نہ ہو کسی عزیزہ کی موت کا دن ہو۔ دلوں میں کوئی جذبہ پیدا ہی نہیں ہوتا تھا۔ ہم سمجھے، جیسے ہم مر گئے ہیں۔ افسر علی کا وہ مکان ہمارے لیے قبرستان ایسا بن کر رہ گیا تھا۔ حسنہ ہمارے لیے کھانا پکا دیتی تھی۔ ہم نے کپڑے دھونے کا اور دوسرے تمام کام اس کے سپرد کر دیے تھے اور وہ بڑی محبت اور محنت سے ہمارا ساتھ دے رہی تھی اور خوش تھی، بے حد خوش۔ میں نے اور تاہیے نے پہلی رات کے بعد ایک لمحے کیلئے بھی اس کے متعلق کوئی غلط بات نہیں سوچی تھی۔ ہمیں کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ فکر یہی تھی کہ آبی صحتیاب ہو جائے۔ ساری خوشامدیں، ساری عبادتیں، ساری بندگی اس ڈاکٹر کے لیے وقف ہو گئی تھی جو ہمارے ساتھ بندھا پڑا تھا۔ اس نے بھی شاید یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ہمارے ساتھ اس وقت تک رہے گا جب تک آبی صحتیاب نہیں ہو جاتا۔ اس نے ایک دفعہ بھی ہم سے مزید روپوں کا تقاضا نہیں کیا اور نہ اس ظلم کے خلاف کوئی نعرۂ احتجاج بلند کیا۔ حالانکہ ہم نے اسے اس کی مرضی کے بغیر ہی وہاں باندھ رکھا تھا مگر وہ خود اس پابندی کو قبول کر چکا تھا۔

ساتویں دن اس نے ہمیں بھی اپنے ساتھ کمرے میں بلوا لیا، بولا۔ "آج ہم آبی کی پٹی کھول دیں گے، مجھے یقین ہے کہ اس کی آنکھیں واپس مل جائیں گی۔"

"خدا کرے آپ کی زبان مبارک ہو ڈاکٹر۔ ہمیں افسوس ہے آپ کو ہم نے یوں باندھ رکھا ہے مگر مجبوری تھی۔"

"اس کا ذکر نہ کریں میرے کسی ہم پیشہ نے اس کی روشنی ختم کر دی۔ میرا فرض تھا کہ میں اس کے لیے جو کچھ بھی کر سکتا ضرور کرتا۔" ڈاکٹر نے آبی کی پٹیاں کھولنی شروع کر دیں۔ میرے دل سے مسلسل یہ دعا نکلتی تھی کہ خدا کرے آبی کی روشنی واپس آ جائے۔ خدا کرے وہ اس دنیا کو پھر سے اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے۔ پٹیاں کھل گئیں، اور ۔۔۔ اور ۔۔۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے باغوں میں بہار آ گئی، کلیاں پھول بننے لگی ہیں۔ آبی مسکرانے لگا تھا۔ اس کی روشنی اسے واپس مل گئی تھی وہ ہمیں دیکھ سکتا تھا۔ اگرچہ ابھی ہمارے سائے اس کی آنکھوں میں لرزاں تھے مگر وہ ہمیں دیکھنے کی قوت محسوس کرنے لگا تھا۔

"دیکھ رہے ہیں نا! ذرا ادھر دیکھیں۔ گڈ! آپ کو مبارک ہو۔ یہ قرنیے کام کر گئے ہیں۔"

"اوہ ڈاکٹر! آپ کا ہم کس منہ سے شکریہ ادا کریں۔ تاہیے لا ادھر دو لاکھ روپیہ ان کے سامنے رکھ دے، جا وہ رقم لا ادھر۔"

"دو لاکھ! نہیں صاحب ایسا لالچ نہ دیں ہمیں۔ یہ ہماری فیس نہیں ہے۔" ڈاکٹر نے آبی کی آنکھیں اچھی طرح دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے آبی سے پوچھا۔ "کیا محسوس کرتے ہیں آپ؟"

"ایک دم فائن ۔ مجھے ان کی صورتیں نظر آنے لگی ہیں ڈاکٹر! آپ نے کمال کر دیا ہے۔ اب میں دیکھ سکتا ہوں۔"

آبی اپنی جگہ سے اٹھ کر گرد و پیش کو یوں دیکھنے لگا جیسے اس ماحول کو پہلی بار دیکھ رہا ہو۔ اتنے میں تاہیا بریف کیس لے کر اندر آ گیا اور دو لاکھ روپے گن کر اس نے ڈاکٹر کے آگے رکھ دیے۔

"یہ لو ڈاکٹر! ہم سے کہو ہم اپنی جان بھی دے سکتے ہیں۔ یہ کچھ بھی نہیں ہے آپ نے جو کمال دکھایا اس کے مقابلے میں بڑی سے بڑی رقم کچھ نہیں ہے۔"

ڈاکٹر سہما سمٹا پیچھے ہٹا، بولا۔ "یہ میں کیسے لے لوں! آپ نے پچاس ہزار کا کہہ رکھا تھا، وہ میں لے لیتا ہوں۔"

"نہیں یہ ساری رقم اٹھا لیں اور اپنی گاڑی کا کرایہ بھی۔ وہ ابھی تک ہمارے پاس ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

آبی کی خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں تھا۔ اپنے ہاتھ پاؤں یوں دیکھتا جیسے وہ پہلی بار نظر آ رہے ہوں۔ "اب ۔۔۔ اب ڈاکٹر مجھے کیا کرنا ہو گا؟"

"دو دن اور لگیں گے۔ آپ کو ہم آنکھوں کے لیے لینز خود دیں گے اور یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔"

"یہ تو ضرور ہی کر دیں۔ اس کے بغیر تو یہ بالکل ہی بیکار ہو گا ہمارے لیے۔"

"بک نئیں اوئے ۔ میں اب بھی بالکل ٹھیک ہوں، حد ہو گئی۔ اس سالے نے تو مار ہی دیا تھا مجھے۔ ذرا دیکھ اوئے تاہیے کوئی 'چپ شپ' تو نہیں پڑ گئے۔ بڑے دنوں تک لیٹا رہا ہوں۔" آبی نے اٹھ کر بازو پھیلاتے ہوئے کہا۔ اس کی ڈاڑھی خاصی بڑھ آئی تھی۔ طویل عرصے تک وہ بیمار رہا تھا۔ خاصی مرمت کی ضرورت تھی اسے مگر وہ خوش تھا بے حد خوش جیسے اس کو نئی زندگی مل رہی ہو۔ ڈاکٹر نے اسے اپنے سامنے بٹھا کر مختلف عبارتیں مختلف قسم کے شیشوں کی مدد سے پڑھوائیں اور پھر ایک نمبر اس کو دے دیا۔ بولا۔ "یہ لینز لے آئیں آپ اب بالکل ٹھیک ہو چکے ہیں۔"

تاہیے نے وہ کاغذ پکڑ لیا، بولا۔ "اب تو سیدھا ہو جا آبی! بہت ذلیل کروا لیا ہے تو نے ہمیں۔ خدا کا شکر ادا کر کہ تو بچ گیا ہے۔"

"یار! یہ آئی لینز لگنے سے میں کہیں بھینگا تو نظر نہیں آؤں گا؟"

"نہیں یار! تو خواہ مخواہ ہی ایسی باتیں نہ سوچ۔ بھینگا بھی لگے گا تو کیا ہو گا۔ تیرے نسخے سے تمام عورتیں خارج کر دی گئی ہیں، اب ہر عورت تیرے لیے حرام ہے۔"

"وہ جو یہاں آئی ہوئی ہے، وہ حسنہ، وہ کیسی ہے؟ میرا مطلب ہے ۔۔۔"

"اپنے ہوش کی دوا لے۔ وہ تو بہت ہی نیک ہے، بچاری۔"

"میرے بارے میں کیا خیال ہے تیرا۔ کوئی جوڑا ہے تیرے پاس؟ یہ کپڑے تو دیکھ کیسے ہو گئے ہیں۔"

"وہ بھی مل جائیں گے، بس ذرا تیرا یہ نمبر مل جائے تو پھر تو سب کچھ دیکھ سکے گا۔" میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ آبی کو بالآخر صحت ہو ہی گئی تھی اور ہم اس پر خدا کا جتنا بھی شکر کرتے اچھا تھا۔ اسی شام ڈاکٹر نے آبی کی آنکھوں پر لینز چڑھا دیے۔ اب وہ بہت دور تک دیکھ سکتا تھا۔ ہم نے ڈاکٹر قوی کو دو لاکھ روپے دے کر اسی شام رخصت کر دیا۔ وہ اتنا خوش تھا کہ ہم سمجھے کہ اپنی اس کامیابی پر پاگل ہی نہ ہو جائے۔ سارا کام اس نے خود ہی کیا تھا۔ نہ اسے کسی نرس کی ضرورت پڑی نہ ڈاکٹر کی۔ گاڑی کی قیمت وہ پینتیس ہزار بتاتا تھا وہ بھی تاہیے نے اسے دے دی اور اس سے رسید لکھوا لی۔

"آپ براہ کرم یہ وعدہ کریں کہ ڈاکٹر سیفی کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اس کی ہوا بھی کسی کو نہیں لگنے دیں گے۔" تاہیے نے اسے رخصت کرنے سے پہلے روکتے ہوئے کہا۔

"آپ فکر نہ کریں۔ میں مجرم نہیں ہوں اور کسی مجرم کا ساتھ بھی نہیں دوں گا۔ آپ نے جو نقصان اٹھایا ہے وہ میں نے پورا کر دیا ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ کسی سے بھی اس معاملے کا ذکر نہیں کروں گا۔ کلینک میرا اپنا ہے۔ میں کسی کی ملازمت میں نہیں ہوں، جو ہو گیا ہے اس پر مٹی ڈال دوں گا، بالکل مطمئن رہیں۔"

"یہ آپ کی مہربانی ہو گی ڈاکٹر! ہمیں بہرحال اس ڈاکٹر دشمن تک پہنچنا ہے جس نے ہمیں اس حال کو پہنچا دیا ہے۔ یہ دیکھیں یہ میرا گردہ بھی اس نے نکال لیا تھا۔" میں نے اپنا دامن اس کے سامنے اٹھاتے ہوئے کہا۔

"اچھا! تو وہ یہ کام بھی کر لیتا ہے، مجھے وہ مل گیا تو میں اس کا پردہ ضرور فاش کروں گا۔ آپ کو یقین ہے کہ یہ کام اسی نے کیا تھا؟"

"جی ہاں! اور اب وہ ملک سے باہر نکل گیا ہے۔"

"وہ جا کہاں سکتا ہے، اس کی رسی اتنی دراز نہیں ہے، ایک نہ ایک دن تو وہ ضرور ہمارے ہتھے چڑھے گا۔" آبی نے ایک عرصے بعد مجھ سے سگریٹ طلب کرتے ہوئے کہا۔ وہ میں نے اسے لب لگا کر دے دیا تو وہ بولا۔ "یار! تو باز نہیں آتا ہے یعنی میں اس تھوک ہی کے لیے رہ گیا ہوں؟ نیا سگریٹ دے مجھے۔"

میں نے ہنستے ہوئے پیکٹ ہی اس کے سامنے رکھ دیا۔

"اچھا میں اب چلتا ہوں میری طرف سے آپ بالکل بے فکر رہیں۔" یہ کہہ کر اس نے ہم سب سے باری باری ہاتھ ملایا۔ اس کے ہاتھوں میں بڑی گرمجوشی تھی اور یوں لگتا تھا جیسے وہ اپنے عزیزوں سے رخصت ہو رہا ہے۔

وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر باہر نکلا تو حسنہ ہمارے کمرے میں آ گئی، بولی۔ "آپ کو نئی آنکھیں مبارک ہوں بھائی جان، میں دن رات دعائیں مانگتی تھی آپ کے لیے۔"

"یعنی میں ۔۔۔ بھائی ۔۔۔ جان ۔۔۔ خیر، خیر آپ کا بہت بہت شکریہ مس ۔۔۔ حسنہ۔ آپ ماشاءاللہ ویسی ہی ہیں جیسی میں نے سوچ رکھا تھا۔ میرا خیال تھا آپ بہت حسین ہوں گی بہن جی۔ ن ۔۔۔ ی ۔۔۔ ی ۔۔۔" اس نے بہن کا لفظ خاص طور پر بہت بلند آواز میں کہا تھا۔

وہ کچھ جھینپ سی گئی اور میرے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی، بولی۔ "مجھے تو اس موقعے پر آپ کی طرف سے کسی بڑے انعام کی توقع ہے بھائی جان جی ۔۔۔ ی ۔۔۔ ی ۔۔۔"

"اوئے اس کو انعام دے کر ابھی رخصت کر دو۔ مجھ سے یہ بھائی جان جی ۔۔۔ ی ۔۔۔ ی برداشت نہیں ہو سکتا۔"

"اکیس روپے دے دو اس کو، یہ بھی کیا یاد رکھے گی ۔۔۔ مگر اب سوال یہ ہے کہ کیا ہمیں آج کی رات ادھر ہی ٹھہرنا ہو گا۔ یہ ہے اصل میں سوال۔" میں نے حسنہ کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ اس کی زلفیں کچھ زیادہ ہی برہم تھیں اور آدمی کو بلا وجہ ہی اپنی

طرف مخاطب کرتی تھیں۔

وہ کچھ شرما سی گئی، بالوں کو جھٹکا کر اسی وقت باہر نکل گئی۔ بولی: "آپ کو میں اتنی بے تکلفی نہیں دے سکتی ہوں جناب صاحب: بس ہاتھ اپنا دور ہی رکھیں مجھ سے۔"

"یہ تو اب تجھے صحیح نظر آتی ہے نا؟"

"ہاں یار! کمال کی چیز ہے یہ حسنہ بہن جی۔۔ بی۔۔۔ی۔ کہاں سے مل گئی تھی یہ تمھیں؟"

"یہ بھی راز کی بات ہے۔ اب میرا خیال ہے کہ ہمیں یہاں سے چل دینا چاہیے۔"

"مجھے اس ظہیر سے بات کرنی ہے اس کو تو میں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"کیا کیا تھا اس نے؟"

"یار اس بدمعاش نے مجھے پولیس سے چھڑا لیا اور پھر لے جا کر دھمن کے حوالے کر دیا۔ اس نے بہت سوچ سمجھ کر مجھے اس ڈاکٹر سیفی کے حوالے کر دیا۔ اس پاگل نے میرے قرنیے نکالے اور اٹھا کے باہر پھینک دیا۔ ظہیر نے مجھے اس تہہ خانے میں ڈال دیا۔ اگر تم نہ پہنچتے تو وہ اس روز مجھے جان سے مار ڈالتے۔ ان کی صلاح یہی تھی۔"

"نہیں! میرا خیال ہے کہ ظہیر ہی تمھاری رہائی کا سبب بنا ہے۔ جو کچھ بھی اس نے کیا، اسے معاف کر دو۔ ہمیں تو اصل مجرم تک پہنچنا ہے آپی! دھمن تک۔"

"مگر وہ تو ادھر ہے ہی نہیں۔ سنا ہے امریکہ چلا گیا ہے۔"

"ہاں! اس کا ہم انتظار کریں گے نہیں تو کوشش کرتے ہیں ہم خود امریکہ چلے جائیں۔"

آپی نے میری یہ بات سنی ان سنی کر دی، بولا۔ "تابیے ماں جی کا کیا حال ہے؟"

"میں انھیں گاؤں چھوڑ آیا تھا ان کے اپنے گھر میں۔ کچھ وہ خرچ پٹے سے تنگ ہیں ان کے لیے میں کچھ رقم لے کر واپس جانا چاہتا ہوں۔"

"ہاں تو ٹھیک ہے نا۔ میں بینک سے رقم نکلوا دیتا ہوں۔ کل ہی چلے جاؤ۔"

"نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ تین لاکھ روپے ہم اس کو دے دیتے ہیں، دو لاکھ پھر بھی بچ رہے گا۔" میں نے بریف کیس کو اپنی طرف سرکا کر رقم نکال لی۔

"یہ کہاں سے ہاتھ لگی ہے یہ اتنی لمبی رقم؟"

"بس ایسے ہی اس حسنہ کی وجہ سے ہم نے ایک دھندا کر لیا تھا۔ یہ لو میاں! یہ تین لاکھ روپے رکھ لو اور آج ہی لاہور چلے جاؤ۔"

تابیے نے رقم اپنی مختلف جیبوں میں رکھ لی۔ نوٹ کچھ زیادہ ہی تھے۔ ان کی وجہ سے اس نے کمر کھول کر ان کو پیٹی میں لپیٹ لیا، بولا: "کیا خیال ہے میں ابھی لاہور نہ چلا جاؤں؟"

"ہاں تیرے لیے یہی بہتر ہے۔ جہاز تو مل ہی سکتا ہے، آج ہی نکل جاؤ۔ ماں جی کو ڈیڑھ لاکھ روپے دے دینا۔"

"ہاں میں یہی کروں گا۔ کچھ اپنے خرچ کے لیے رکھ لوں گا۔"

"تو چلو پھر تمھیں آج ہی سوار کرا دیتے ہیں۔" یہ کہہ کر ہم نے حسنہ کو ساتھ لیا اور اسی وقت ڈاکٹر قوی کی کار میں بیٹھ کر ہوائی اڈے جا پہنچے۔

ہماری بدقسمتی یہ تھی کہ ہم اخبار نہیں پڑھتے تھے۔ ورنہ ہمیں حالات کا کسی حد تک قبل از وقت اندازہ ہو جاتا۔ ہوائی اڈے پر پہنچ کر ہم نے گاڑی ایک جگہ پارک کی تو تابیا بولا۔ "یہ ٹکٹ شکٹ تم ہی لے لو، میں اس دھندے میں کبھی نہیں پڑا ہوں۔"

"ہاں! لاؤ میں ٹکٹ لے آتا ہوں۔" میں نے تابیے سے رقم لے کر کھڑکی کا رخ کیا۔ مگر عین اس وقت ایک ہاکر میرے سامنے آ گیا۔ وہ شام کے اخبار بھی بیچ رہا تھا اور ابھی تک صبح کے اخبار بھی اس کی ٹوکری میں موجود تھے۔ جس چیز نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا وہ دراصل ڈاکٹر سیفی کی صورت کا ایک آدمی تھا۔ اس کی تصویر پہلے ہی صفحے پر چھپی تھی۔ اخبار پر نظر پڑتے ہی میں نے اسے خرید لیا۔ اسے میں نے جستہ جستہ پڑھا تو مجھے معلوم ہوا کہ پولیس کو کل شام ڈاکٹر سیفی کی لاش ملی تھی۔ وہ ریت میں دھنسنے کی وجہ سے پانی کی دست برد سے تو محفوظ رہی مگر اس زندہ سلامت آدمی کو موت سے نہ بچا سکی۔ سیفی کا چہرہ صاف بتا رہا تھا کہ اس کی آنکھیں نکال لی گئی ہیں۔ پولیس نے اس کی کئی تصویریں بنا لی تھیں اور لکھا یہ گیا تھا کہ جس آدمی کو بھی اس لاش کے بارے میں کوئی علم ہو وہ قریبی تھانے سے رجوع کرے۔ انھیں معلوم ہو چکا تھا کہ وہ ڈاکٹر سیفی کی لاش ہے۔ اس کی گمشدگی کا معمہ بہت پہلے ان کے نوٹس میں آ چکا تھا اور وہ اس کی تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مارتے رہے تھے مگر انھیں معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ اسے کن لوگوں نے سمندر میں ڈال دیا ہے۔ ایک اور خبر جو میرے لیے بہت اہم تھی کبیر کے بارے میں تھی۔ وقائع نگار نے لکھا تھا کہ پولیس ابھی تک کبیر کو لوٹنے والوں کا سراغ نہیں لگا سکی ہے حالانکہ اس واقعے کو بہت دن گزر چکے ہیں۔ پولیس کو یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا ہے کہ غلام رسول کو کس آدمی نے قتل کیا ہے۔ انھیں دن دہاڑے ان کی کوٹھی میں قتل کر دیا گیا تھا۔ کام کی بات اس میں یہ تھی کہ اس میں حسنہ کی تصویر بھی چھپی تھی۔ پولیس کو اس عورت کی تلاش تھی، جو سب سے بڑی موقع کی گواہ تھی۔ اخبار نے لکھا تھا کہ پولیس نے ان سارے معاملات میں اب تک کچھ بھی نہیں کیا ہے حالانکہ کبیر

کے گھر سے ڈاکو سات لاکھ روپیہ اڑا کر لے گئے تھے۔ ان پر نصف رات کو کسی نے اندھا دھند گولیاں برسائیں۔ ان کے دو ملازموں کو بے ہوش کر دیا۔ مگر اب تک اس واقعے کا کوئی سراغ نہیں مل سکا ہے۔ ڈاکٹر سیفی بھی ان کے لیے معمہ بنا ہوا تھا۔

میں نے اخبار پڑھ کر بغل میں دبایا اور لاہور کے لیے اسی رات چار ٹکٹ لے لیے۔ میرے لیے کسی طرح بھی کراچی ٹھہرنا مناسب نہیں تھا۔ وہ لوگ ہماری تلاش میں پھر رہے تھے۔ وہ یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ غلام رسول کے قتل اور کبیر کے ہاں ڈاکے میں کیا تعلق ہے؟ درمیانی کڑی وہ تلاش کر چکے تھے اور غلام رسول کے ہاں سے دستیاب کاغذات سے وہ اندازہ لگا چکے تھے کہ غلام رسول کا قتل لین دین پر ہی ہوا تھا۔ ڈاکٹر سیفی کے بارے میں انھیں ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ اس کی آنکھیں کس نے نکالی ہیں اور اسے سمندر کے آگے کس نے پھینک دیا تھا۔

چار ٹکٹ لے کر واپس آیا تو آپی میرے چہرے کی پریشانی دیکھ کر بولا۔ "کیا بات ہے؟ تیرے چہرے پر پھر بارہ بج رہے ہیں، خیر تو ہے؟"

"گڑبڑ کچھ زیادہ ہی لگتی ہے۔ یہ دیکھو ذرا اور ابھی گاڑی سے باہر مت نکلو۔" یہ کہہ کر میں ان کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ اخبار میرے ہاتھ سے لے کر اس نے اپنے سامنے بچھا لیا۔

"ارے بیڑا غرق! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں جیلانی، وہ تو ہماری تلاش میں ہیں۔"

"ہاں میں یہی کہہ رہا تھا۔ اخبار آدمی کو ضرور پڑھنا چاہیے شہر کی خیر خبر ملتی رہتی ہے۔"

"اب کیا سوچا ہے تو نے؟"

"میں چار ٹکٹ لے آیا ہوں ابھی لاہور چل دیتے ہیں۔"

"مگر یہ گاڑی۔ اس کا کیا کریں؟" تابیے نے پوچھا۔

"یار! ہم یوں کرتے ہیں کہ خود جہاز میں چلے جاتے ہیں۔ تم اس کو لاہور تک ڈرائیو کر لو۔" آپی نے کہا۔

"میں؟ ۔۔۔ مگر یار! میں اتنا لمبا سفر کیسے کر سکوں گا؟"

"اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے، لے چلو اسے لاہور۔"

"ٹھیک ہے لاؤ یہ رقم مجھے دے دو میں سیدھا ماں جی کے پاس چلا جاؤں گا۔ وہیں مجھ سے مل لینا۔"

"ہاں! یہ بریف کیس سنبھالو اور نکل جاؤ۔"

"مگر اس حسنہ کا کیا کریں! اس کو بھی تم ساتھ لے جاؤ۔ یہ تصویر دیکھتے ہو اس کی، یہی اس کو پھنسانے کے لیے کافی ہے۔" میں نے حسنہ کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ بھی میرے ساتھ ہی چلی جائے تو کیا حرج ہے؟ ذرا رونق رہے گی، کیوں بی بی کیا خیال ہے تیرا؟"

"ہاں! میں بھی ان کے ساتھ ہی نکل جاتی ہوں۔ یہ تصویر کیسے چھاپ دی ان لوگوں نے میری؟"

"میری مانیں تو ہم چاروں کار کے ذریعے لاہور چلے جاتے ہیں۔ ہوائی جہاز کا قصہ ہی چھوڑ دو۔" تابیے نے کہا۔ وہ تنہا اتنا لمبا سفر کرنے کے حق میں نہیں تھا اور اسے معلوم تھا کہ وہ کسی بھی مشکل کی صورت میں حالات سے عہدہ برآ نہیں ہو سکے گا۔

"تو پھر یوں کرو ٹکٹ واپس کر دو۔ اس حسنہ کو ساتھ لے کر ہم ہوائی جہاز تک بھی نہیں جا سکتے۔ یہ تصویر آج ہی چھپی ہے۔" آپی کسی گہری سوچ میں گم تھا۔

میں نے ٹکٹ واپس کر دیے۔ چند ہی لمحوں بعد ہم کار میں بیٹھ کر لاہور کی طرف چل دیے۔ تابیا گاڑی چلا رہا تھا اور ہم تینوں پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے اور پوری رات ہمارے سامنے تھی۔ ہماری بچت صرف اسی میں تھی کہ ہم بار بار اپنا ٹھکانا بدلتے رہتے تھے اور پولیس کو یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ ہم ابھی یہاں تھے اور ابھی کہاں نکل گئے۔ مسافروں اور جرائم پیشہ لوگوں پر یہی لازم ہے۔ وہ اپنے ٹھکانے بدلتے رہیں تو پرسش سے محفوظ رہتے ہیں۔ اخبار میں جو رپورٹ چھپی تھی وہ پولیس نے اپنی تمام تر تفتیش کے بعد ہی چھپوائی تھی۔ انھیں ان تمام جرائم کے اصل محرک کی خبر نہ مل سکی تھی۔ انھیں مجبوراً اخبار کا سہارا لینا پڑا تھا۔ مگر مجھے یہ ڈر تھا کہ راستے میں ہمیں کسی بھی جگہ اگر پولیس نے روک لیا تو ہمارے پاس اپنی شناخت کا ایک بھی کاغذ نہیں تھا۔ اور ہمیں لق و دق صحراؤں سے بھی گزرنا تھا، اور پایاب پانیوں سے بھی۔ ابھی کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ہمارا وہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے۔ ایک بات طے تھی کہ پولیس اب ہماری تلاش میں کچھ زیادہ ہی سرگرم تھی۔

آپی میرے دائیں ہاتھ بیٹھا تھا اور سائیں سائیں کرتی رات کا نظارہ کر رہا تھا۔ اس کے چہرے سے کسی گہری سوچ کا پتا ملتا تھا۔ اپنی آنکھیں وہ ٹھہر ٹھہر کر ٹٹولتا تھا جیسے اس کو یہ اندیشہ لاحق ہو کہ وہ روشنی کہیں پھر تو اس سے نہیں چھن جائے گی۔ اسے یہی وہم تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ کوئی اس سے اس کی آنکھیں بھی چھین سکتا ہے۔ جب وہ روشنی چھن گئی تو اسے یہ امید ہی باقی نہیں رہی تھی کہ اس کا نور اسے واپس بھی مل سکتا ہے۔

"کیا سوچ رہے ہو آپی! ماضی پہ نظر ڈالتے ہو؟"

"ہاں! بات کچھ ایسی ہی ہے ہم کہاں سے کہاں آ پہنچے۔ میں نے آنکھیں کھو بھی دیں اور پا بھی لیں۔ روشنی گئی بھی اور واپس بھی آ گئی۔ مگر اس سیفی کا تو دیکھو کیا حال ہو گیا۔ اس کی شکل پہچانی نہیں جاتی تھی۔"

"اور تم نے اسے بہت دفعہ دیکھا ہوگا۔"

"وہاں جیتم قاتل کو میں نے بڑی دفعہ دیکھا اب یہ میری آنکھوں کا نور بن گئی ہیں۔ پتہ ہے وہ کیا کہتا تھا۔ مجھے بے ہوش کرتے وقت — میں بندھا پڑا تھا۔"

"کیا کہتا تھا وہ ؟"

"ہم تمہیں نیند کا ایسا ٹیکہ لگائیں گے کہ تو ہمیشہ اس کے نشے میں جیے گا۔ یہ بڑا ہی لاجواب نشہ ہے اور اب وہ خود اس نشے میں غرق ہو کر جانے کہاں نکل گیا۔"

"ایک دم بدمعاش آدمی تھا وہ۔ اچھا ہوا ہم نے اسے مار دیا۔ تاہیا جو کام بھی کرتا ہے ٹھیک ہی کرتا ہے۔"

"پر جیلانی! یہ بھی تو دیکھ ہم کب تک یوں ہلکان ہوتے پھریں گے کچھ سوچا ہے تو نے ؟"

"مجھے تو بس اب ایک ہی آرزو ہے کہ وہ آسیہ مجھے مل جائے۔ تو میں اُسے لے کر کسی طرف نکل جاؤں۔ مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔ اب تو — اب تو اس بدنصیب کے ہاں بچہ بھی ہو چکا ہوگا — کئی ماہ کا ہوگا اب وہ۔"

جانے میری آواز میں کیسا غم جھلک رہا تھا۔ آبی نے بھانپ لیا۔ مجھے باہوں میں لے کر بولا "میں بھی یہی سوچتا رہتا ہوں یار! خدا جانے وہ کہاں ہوگی وہ تیرہ نصیب! پر تو نے اب سوچا کیا ہے؟"

"اس کی خبر اب اخبار میں بھی نہیں چھپتی۔ چھپتی ہوتی تو بھی ہمیں پتہ نہیں چل سکتا تھا۔ میں نے سوچ رکھا ہے کہ اب کی بار پھر راولپنڈی کا چکر لگاؤں۔ مجھے امید ہے کہ وہ ادھر ہی کسی طرف رہ رہی ہوگی۔"

"ہاں! میرا بھی یہی خیال ہے۔"

"تمہیں پتہ ہے وہ چوہدری ڈھلوں صاحب بیمار تھے۔ راستے میں کسی نے حملہ کر کے انہیں سخت زخمی کر دیا تھا۔"

"یہ کب کی بات ہے ؟"

"جس دن میں تیری تلاش میں ادھر آیا یہ اسی روز کا ذکر ہے۔ وہ کار میں جا رہے تھے کہ دشمنوں نے ان پر حملہ کر دیا۔ بڑی اُن کو بچا کر تو لے گیا مگر اب پتہ نہیں کیا حال ہے اُن کا۔"

"تو رکا کیوں نہیں ؟ دیکھا تو ہوتا کہ ہوا کیا ہے۔"

"میں چاہتا تھا کہ رک جاؤں مگر میری روح تیری تلاش میں تھی آبی! مجھے تیرے دکھ کا احساس تھا بس میں پاگل ہو کر ادھر نکل آیا۔ شکر ہے تو مل گیا اگر دیر ہو جاتی تو تیرا وہ سر کاٹ دیتے۔"

"ہاں! ان کا منشا یہی تھا۔ اگلے مرحلے میں وہ یہی کرتے۔ اسی لیے تو میں ظہیر کا پتہ صاف کرنا چاہتا تھا مگر تو کہتا ہے کہ ابھی ہم ان کو چھوڑ ہی دیں جب ہی میں خاموش رہ گیا۔"

"یہی بہتر تھا آبی! یہی بہتر تھا۔ ابھی وقت نہیں آیا۔ ان سب کو ہم پھر باندھ لیں گے۔ ابھی چاہو تو ہم امریکہ بھی جا سکتے ہیں مگر کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اس کے چھپ رہنے کے سو سامان ہیں وہاں۔"

"ہاں! میں نے بھی یہی سوچا ہے۔ اب تو اس آسیہ کو دیکھ اور یہ قصہ ختم کر دے میں بہت تھک گیا ہوں جیلانی! یہ کوئی زندگی نہیں ہے۔"

"مجھے معلوم ہے آبی! مجھے معلوم ہے۔ تیرے درد کا بھی مجھے احساس ہے۔ پر میں آسیہ کے بغیر کیسے لوٹ جاؤں ؟ مجھے دیکھنا ہوگا کہ وہ محفوظ بھی ہے کہ نہیں۔ تم اگر وہ رقم ساتھ لے آتے تو بہت اچھا ہوتا۔"

"اس کی مجھے بھی فکر لگی ہے میں لاہور جا کر بینک کو خط لکھوں گا۔ میرا خیال ہے کہ وہ رقم بھیج دیں گے۔"

"بھیج تو دیں گے مگر تیری تصدیق بہت ضروری ہے — وہ کیسے کر سکے گا تو ؟"

"میں پھر کسی دن کراچی آؤں گا۔ میرا خیال ہے تیرے پاس کافی روپے ہوں گے، کام چل جائے گا۔"

"ہاں ہاں فکر نہ کر — ہمیں کون سی شادی کرنی ہے یا کوئی مکان بنانا ہے۔ روزمرہ خرچ کے لیے وہ روپیہ بہت ہے۔" میں نے آبی کے لیے بھی ایک سگریٹ سلگا دیا۔ خود بھی اس سگریٹ نے مجھے بہت مزہ دیا۔ رات ٹھنڈی تھی اور صحرا میں سے گزرتے وقت تو وہ نیند کا ہلکورا دیتی تھی۔ وہ بیابانوں کی رات میٹھی میٹھی یادوں سے بھری — دلِ شاعر میں طوفان اٹھاتی وہ رات بڑی ہی سہانی تھی اور تاہیا بہت اچھا ڈرائیور تھا۔ آہستہ آہستہ ہم دونوں گہری نیند میں کھو گئے۔ حسنہ ہم سے الگ تھلگ ہو کر بیٹھی رہی، کچھ نہیں بولی، لیے دیے انداز میں یوں ہو گئی جیسے اس کو ہمارے کسی غم کا احساس نہیں تھا۔ وہ خود بھی غموں میں ٹھٹھری ہوئی تھی۔ سرتاپا اس کا وجود انگار بنا ہوا تھا مگر اس نے ابھی تک ہم سے اپنی داستان نہ کہی تھی۔ ہم نے بھی یہی سوچا کہ وہ جیسی ہے ہمیں منظور ہے۔ اس کو پناہ دے کر میں یہی سمجھ رہا تھا کہ اس کے سر سے ہم نے غم کا بہت بڑا بوجھ اتار دیا ہے۔ ٹھہر ٹھہر کر اس کی آنکھیں نمناک ہو جاتی تھیں اور ہونٹ تھرتھرانے لگتے تھے مگر اپنی اس کیفیت پر وہ جلد ہی قابو پا لیتی تھی۔ جانے اس کے دل کے کس حصے میں غم نے کیسی پارہ سی تھرکتی آگ رکھ دی تھی۔ اُسے چین نہیں آتا تھا مگر اس کے باوجود وہ بہت ہی پرسکون نظر آنے کی کوشش کرتی تھی۔ ہم نے جان بوجھ کر اس رات اُسے نظرانداز کر دیا اور گہری نیند میں کھو گئے۔

ہمارے آگے اور پیچھے رات کے مسافر وہ ٹرک ڈرائیور اس لمبے سفر کو جوں توں کر کے گزارتے ہی چلے جاتے تھے۔ انھیں رات ہی کو سفر مزہ دیتا تھا۔ دن کی تپش اُن سے برداشت نہ ہوتی تھی اور سڑکوں کی بھیڑ بھاڑ انھیں راستہ نہیں دیتی تھی۔ اسی لیے وہ رات کو طویل طویل سفر کرتے تھے ان سے بچ بچا کر تاہیا، کار کو بڑی عمدگی سے آگے لیے جا رہا تھا۔ ہم بہت دنوں سے جی بھر کر سو نہیں سکے تھے۔ ٹھہر ٹھہر کے آنکھ کھل جاتی تھی۔ کبھی آبی کے درد کا احساس جاگ اٹھتا تھا کبھی مسند آرا میری پلکوں پر اُتر آتی تھی۔ اس سے جو ہم نے عشق کیا تو وہ غارت ہی چلا گیا۔ ادھر سے دھیان پلٹتا تھا تو آسیہ پر جا رکتا تھا۔ سارے غم کا درد اسی کے مرکز پر گھومتا تھا۔ خدا جانے وہ کس حال میں ہے کن لوگوں میں پھنسی ہے۔ اب تو وہ اپنے ناجائز بچے کی ماں بھی بن چکی ہوگی۔ کیسے وہ اس کی پرورش کرتی ہوگی۔ پولیس سے اس نے کیسے جان بچائی ہوگی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ ایک وہ میری دیدہ باز مخم بلا تقدیر مجھے کتنے گھر دکھلائے گی — میں سوچ سوچ کر تھک گیا تھا اور پولیس الگ ہمارے پیچھے لگی تھی۔ انھیں یہ خبر جب ہی ملتی تھی، جب ہم کوئی نئی واردات کے نشان اپنے پیچھے چھوڑ جاتے تھے پھر وہ اپنی ساری برچھیاں ساتھ لے کر ہمارے پیچھے چل پڑتے تھے۔ اگر ہم جگہ نہ بدلتے رہتے اور ہمارے ساتھی کوئی ایسے ہی کچے کولے ہوتے تو ہم کبھی کے دریا کے پار اتر چکے ہوتے مگر ابھی تقدیر کے زندانی کو کچھ اور آگے جانا تھا۔ ابھی ہمارا خیال ہم تک ہی محدود تھا۔

پتہ نہیں تاہیا کب تک گاڑی چلاتا رہا۔ ہوش مجھے جب ہی آیا جب ایک زبردست جھٹکے سے کار رک گئی۔

"کیا ہوا ہے تاہیے، کیا بات ہے ؟"

"وہ سہروں والے ہیں جیلانی صاحب اور گاڑی روک رہے ہیں۔"

"کیا مطلب ؟ ارے یہ تو پولیس کے سپاہی ہیں۔ یہ کیا کر دیا ہے تم نے — گاڑی آگے بڑھاؤ۔"

"وہ راستہ روکے ہوئے ہیں۔ تین تو ہمارے سامنے ہیں اور باقی کار کے گرد کھڑے ہیں۔" تاہیے نے دبی آواز میں کہا۔ معلوم یہ ہوا کہ وہ کوئی بین الصوبائی قسم کی پولیس تھی اور رات کو سڑکوں پر پہرہ دیتی تھی۔ ان دنوں بھی زبردست قسم کی تخریب کاری جاری تھی اور پولیس کو یہ حکم تھا کہ اگر کوئی گاڑی ان کے حکم پر نہ رکے تو اس کو چھلنی کر دو۔

میں نے کار سے باہر نظر ڈالی تو ایک تھانیدار ہمارے سامنے کھڑا تھا۔ پستول اس نے باندھ رکھا تھا، بولا "صاحب ذرا باہر تو آئیں ہمیں گاڑی کی تلاشی لینی ہے۔"

"وہ کس لیے ؟ یہ تم کس کے حکم سے کاروں کی تلاشی لے رہے ہو؟"

"بس ایسے ہی ذرا موج میلے کے لیے! پلیز ذرا باہر آ جائیں۔" وہ اپنی بڑی بڑی مونچھیں چہرے پر پھیلاتے ہوئے بولا۔

"مگر قصہ کیا ہے ؟ کیوں روکا ہے آپ نے ہمیں ؟"

"کیا مجھے آپ کو یہیں بیٹھے بیٹھے بتانا پڑے گا کہ ہم نے کار کیوں روکی ؟ یہ میرا فرض ہے جناب! میں کسی بھی گاڑی کو روک سکتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے دروازہ کھول دیا۔ وہ خاصا جیم شحیم آدمی تھا اور اس کا حلیہ ہی یہ بتاتا تھا کہ اس کا جسم کس جنس کا سہ سے تیار ہوا ہے۔ اس میں رشوت کی کسک زیادہ تھی۔

آبی نے اس کی یہ بات سنی تو گاڑی سے باہر نکل آیا۔ میں نے بھی اس کے ساتھ ہی قدم باہر نکال دیا۔ تاہیا ابھی تک اگلی نشست پر بیٹھا تھا۔

"آپ کے پاس کوئی ہتھیار ہے تو پلیز باہر نکال لیں۔"

"یہ آپ نے کیسے سوچا کہ — — ہمارے پاس ہتھیار ہے۔ ہم شریف آدمی ہیں جناب! یہ گاڑی آپ کے سامنے ہے اسے دیکھ لیں مگر لوگوں کو اس طرح ذلیل نہ کریں۔" آبی نے پہلی بار زبان کھولی۔ وہ اس تھانیدار کو بڑی گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ چار سپاہی تھے اور وہ سب کے سب مسلح تھے۔

"مجھے معلوم ہے جناب! پر یہ میرا فرض ہے۔ ذرا اس گاڑی کو دیکھیں مختار صاحب! آپ ان کی تلاشی لیں۔"

"یہ تو نہیں ہوگا جناب! ہم سفر اس لیے نہیں کر رہے تھے کہ آپ کی بازپرس سے گزرنا ہوگا۔" آبی نے ذرا فاصلہ دے کر خود کو تھانیدار کی زد سے محفوظ کرتے ہوئے کہا۔ پستول اس کے پاس کوئی بھی نہیں تھا مگر میرے اور تاہیے کی جیبیں تو خالی نہیں تھیں۔ ہم سخت مشکل میں پھنس گئے تھے۔ ہم سکھر سے آگے نکل آئے تھے۔ اور اس وقت صبح کے چار بج رہے تھے۔ تھانیدار کو اس روز واقعی ایک زبردست شکار ہاتھ آ گیا تھا۔ ہم سب کے سب اس کے خانے میں پورے اتر رہے تھے۔ ہم پر وہ ہاتھ ڈالتا تو کئی طرح سے اس کو بے مثال کامیابی حاصل ہوتی۔

"اندر تو یہ بریف کیس ہے جناب بیگ صاحب اور ایک خاتون بیٹھی ہے اس کے ہاتھ میں پرس ہے۔" سپاہی نے تھانیدار کو بتایا۔

"اسے کھولیں ذرا دیکھیں تو کیا ہے اس میں۔"

"اسے آپ نہیں کھولیں گے، اس میں ہماری رقم محفوظ ہے۔" یہ کہہ کر میں نے اس سپاہی سے بریف کیس جھپٹ لیا۔

"جی نہیں! اسے آپ ضرور کھولیں گے۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں اپنا فرض ادا کر رہا ہوں۔"

اس کی یہ بات سن کر میں نے بریف کیس کھول دیا — وہ نوٹوں سے لبالب بھرا تھا۔ اس کی آنکھیں چندھیا سی گئیں۔

"اوہ تو یہ نوٹ ہیں مگر ان کو ساتھ لے کر کیوں چل رہے ہیں۔ یہ بینک کا کام تھا۔ وہ آپ کو پہنچا دیتے۔"

"جی نہیں! یہ ہماری ضرورت ہے اب آپ ہیں آگے نکلنے دیں۔" آبی نے کار کی طرف بڑھتے ہوئے کہا

"آپ اندر نہیں آئیں گے، ادھر ہی ٹھہریں۔ ان کی تلاشی لیں مختار صاحب! یہ بہت ضروری ہے۔ آپ بھی باہر آجائیں۔" اس نے تابیے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

آبی وہیں رُک گیا۔ میری طرف اس نے یوں دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ اس کی وہ تیزی طراری بڑی حد تک ختم ہو چکی تھی۔ وہ جو بات بات پر مجھ سے ہنسی مذاق میں جتا رہتا تھا اس دور کا آبی تو شاید ختم ہی ہو چکا تھا۔ آنکھوں کے آپریشن نے اس کی کایا ہی پلٹ دی تھی۔ تھانیدار کے کہنے پر مختار نے آبی کی تلاشی لی اس کے پاس چند نوٹوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ اس سے فارغ ہو کر وہ میری طرف لپکا۔ میں نے دیکھا کہ آبی نے ایک دم تھانیدار کا پستول اس کی پیٹی سے اتار لیا۔ ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں اس نے تھانیدار کو بے بس کر دیا تھا۔ دوسرے لمحے وہ اس سے لپٹ گیا اور تب مجھے مختار کو روکنا پڑا یوں کہ میں نے دیکھتے ہی دیکھتے اُس کی رگِ احساس مسل دی اور وہ کٹے برچھ کی طرح زمین پر جھول گیا۔ آبی نے پستول تھانیدار کی پسلی میں لگا دیا۔ بولا "ان لوگوں سے کہو پیچھے ہٹ جائیں۔ ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔ میں تمھیں یہیں ختم کر دوں گا۔"

وہ سپاہی آبی کی بات سن کر گم صم سے ہو کر ایک دم لرز سے گئے۔ مختار کو یوں میرے ہاتھ آتے ہی زمین پر گرتے دیکھ کر اُن کی مَیا ہی مر گئی۔ بندوقیں وہ یوں اٹھائے تھے جیسے وہ ہم سب کو مار دیں گے مگر ان میں اتنی ہمت ہی نہیں تھی کہ وہ لبلبی دبا دیتے۔ آبی نے تھانیدار کو بری طرح جکڑ رکھا تھا۔

"سب لوگ پیچھے ہٹ جاؤ۔ دس دس قدم دُور۔ کوئی آدمی آگے نہیں آئے گا۔"

عین اس وقت دو سپاہیوں نے میری طرف بندوقیں تان لیں۔ "تھانیدار صاحب کو چھوڑ دو، ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔"

عین اس وقت تابیا گاڑی سے نکلا اور ان پر یوں جھپٹا جیسے آسمانی بجلی کسی آشیانے کا رُخ کرتی ہے۔ اُس نے جاتے ہی ان دونوں سپاہیوں کو گردن سے پکڑ کر پیچھے کھینچا اور خود ان کے نیچے گر گیا۔ اس طرح کہ دونوں کی گردنیں اس کے ہاتھ میں تھیں۔ اُن سے فرصت ملتے ہی میں نے آبی کو اشارہ کیا تو وہ تھانیدار کو ساتھ لے کر کار کی طرف بڑھا۔ دو سپاہی ابھی تک سامنے موجود تھے۔ مگر وہ حسنہ کے رُخ پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہ بھی سخت تنزلزل تھے۔ بندوقیں اُن سے سنبھالی نہیں جاتی تھیں۔ دونوں کے رنگ فق ہو چکے تھے۔ مگر ابھی آبی نے تھانیدار کو کار کے اندر نہیں ڈالا تھا کہ ایک جیپ ہمارے پاس آ کر رُکی۔ وہ پولیس کی جیپ تھی۔ اس میں سے ایک انسپکٹر اور دو سپاہی نیچے اترے وہ سب کے سب مسلح تھے۔ صورتِ حال کو یوں بگڑتے دیکھ کر ان لوگوں نے آتے ہی ہمیں للکارا۔

"یہ کیا کر رہے ہو تم! خبردار جو کسی نے حرکت کی۔ گولی مار دو انھیں۔" انسپکٹر نے بلند آواز میں سپاہیوں سے کہا۔ اور ابھی وہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ تابیے نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ وہ اُن دونوں سپاہیوں سے جان چھڑا کر کار کے اندر آگیا تھا۔ آبی نے تھانیدار کو کار کے اندر ڈال دیا تو میں نے اپنا پستول لہراتے ہوئے کہا۔ "اگر تھانیدار کو بچانا چاہتے ہو تو اپنا ہاتھ روک لو ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔" یہ کہہ کر میں نے پستول انسپکٹر پر داغ دیا۔ ایک گولی اُس نے بھی چلائی مگر اس کا وہ وار خالی نکل گیا میرے پستول کی گولی نے اس کا ہاتھ چھلنی کر دیا تھا۔ پستول اس کی انگلیوں کی گرفت سے نکل گیا۔ میں فوراً ہی کار کے اندر جا گھسا مگر سپاہیوں کی گولیاں کام کر گئیں۔ ایک گولی تابیے کی پسلی میں جا لگی۔ ایک بھیانک چیخ اس کے منہ سے نکلی تو میں نے پاگل ہو کر اندھا دُھند ان سپاہیوں پر گولیاں برسا دیں۔ پانچ گولیاں میرے پستول سے نکلیں۔ تین سپاہی تو میں نے شاید وہیں زخمی کر دیے تھے۔ ان سے ملا نہیں جاتا تھا۔ گولیاں ایسے تواتر سے چلیں کہ انھیں سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا۔

آبی نے تھانیدار کو اندر باندھ رکھا تھا۔ ایک لمحے کے لیے وہ پستول پیچھے نہیں ہٹا رہا تھا۔ مخالف سمت سے گولیاں تابیے کو چیر گئیں تو اس نے زبردست جھٹکے سے دروازہ کھولا، اور گولیوں کی بوچھار میں زخمی شیر کی طرح اُن پر جا پڑا۔ وہ تین آدمی اکٹھے ہی کھڑے تھے۔ اُس نے اندھا دُھند ان پر اپنے پستول سے گولیاں چلائیں۔ ابھی اس کے وجود کی آگ سرد نہیں ہوئی تھی۔ وہ اُن تینوں کو بے بس کر کے زمین پر گر گیا۔ اُس کے زخم اسے مہلت نہیں دیتے تھے۔ ورنہ وہ اس انسپکٹر کو بھی مار دیتا جس کا ہاتھ میں نے زخمی کر دیا تھا۔ وہ جیپ کے پچھلے حصے میں جا ٹھہرا تھا۔ تابیا نیچے گرا تو میں نے گرد و پیش پر نظر ڈالی۔ اُن کے دو آدمی صحیح سلامت تھے۔ ایک تھانیدار جو ہمارے ساتھ بندھا تھا اور دوسرا جیپ کے پیچھے پناہ لے رہا تھا۔ چھ سپاہی ہمارے ہاتھوں زخمی ہو چکے تھے وہ بہت ہی جانکاہ مقابلہ تھا۔ پولیس مقابلہ۔ اور مجھے اپنی زندگی کی اس بھیانک جنگ جیت لینے کے باوجود کوئی خوشی نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے کار سے اُتر کر تابیے کو بانہوں میں لیا تو پتا یہ چلا کہ تابیا زندگی کی بازی ہار چکا ہے۔ زخم کچھ ایسے ہی گہرے لگے تھے کہ اس نے اپنی بازی وہیں الٹ دی تھی۔ وہ پتلی جسے ماں نے بڑی محنت سے تیار کیا تھا جس پر زمانے نے بہت گہرا رنگ چڑھا دیا تھا۔ وہ بالآخر ختم ہو گئی۔ اس کے حصے کی موت اسے شاید وہیں آتی تھی۔ میں نے اسے بانہوں میں لیا اور لا کر کار کے دوسرے حصے میں ڈال دیا۔

اس کا جسم لہولہو ہو رہا تھا۔ وہ اب نہ تو کوئی تبرا بولنے کے قابل تھا، نہ انھیں کوئی گالی دے سکتا تھا۔ چُپ چاپ وہ اپنے زخموں کے ساتھ ہی آگے نکل گیا تھا۔ میں نے جب اسے گاڑی میں ڈالا تو میرا دل بھر آیا۔ ہم نے اس لیے تو وہ سفر نہیں کیا تھا۔ تابیے کے جسم سے نکلتی موت کی — نزع کی دمِ آخر کی تپک مجھے حیران کرتی تھی۔ اس کا چہرہ ابھی تک غصے سے تنا ہوا تھا۔ وہ مر کر بھی انھیں معاف نہیں کر سکا تھا۔ کاش کوئی پردہ ہوتا کوئی تنتق ہوتی جس سے ہم موت کو اس پر حاوی ہونے سے روک سکتے مگر وہاں تو کچھ بھی نہیں تھا۔ گولیاں براہِ راست چلتی رہیں، آمنے سامنے۔ برابر کی جنگ میں تابیا بازی ہار گیا۔ اور میں سوچتا تھا کہ میں تابیے کی بیوی کو کیا جواب دوں گا۔ اسے یہ کس طرح بتا سکوں گا کہ اس کا وہ شیر دل تابیا جس نے ہر جگہ موت سے پنجہ لڑایا کیسے اپنی جان ہار گیا۔ کیا کہہ سکوں گا میں اُس سے۔

میں نے ایک بار پھر ان سپاہیوں پر نظر ڈالی۔ اُن میں سے کوئی بھی زندہ نہیں تھا۔ بندوقیں ان کی دُور دُور بکھری پڑی تھیں نقشہ بالکل جنگ ایسا تھا اور وہ سپاہی جو محض فرض کی ادائی میں بری طرح زخمی ہو گئے تھے، میں اُن کے مورکھ پن کو کیا کہتا وہ پابند تھے حکم کے قانون کے، تھانیدار کے۔ اُن سے وہ کسی بھی طرح جان نہیں چھڑا سکتے تھے۔ انھیں تپ لرزہ تھا فرض کو ادا کر دینے کا اور وہ کر گئے تھے۔

کار میں تابیے کو ڈالتے ہی میں نے انجن اسٹارٹ کیا اور اُسے میں فوراً ہی ستر اسی کی رفتار سے آگے لے چلا۔ اب میرے لیے بہت ضروری تھا کہ میں وہ راستہ ہی چھوڑ دیتا۔ بڑی سڑک پر چلنا میرے لیے کسی بھی طرح ممکن نہیں تھا۔ کوئی گولی حسنہ تک نہیں پہنچی تھی کیونکہ وہ کار کے دوسرے حصے میں بیٹھی تھی۔ آبی اور وہ تھانیدار بیگ صاحب بھی محفوظ ہی رہے۔ کوئی گولی میرے حصے میں بھی نہیں آئی کاش ایسا ہو جاتا۔ میں خود زندگی سے بہت بیزار ہو چلا تھا۔ کیا حاصل تھا مجھے اس چند روزہ قیدِ حیات میں، ایک جہدِ مسلسل اور وہ بھی ناکام۔ میں زندہ رہ کر کیا کر رہا تھا، کچھ بھی نہیں۔ کئی ایسے تھے جو میری گولیوں کا شکار ہو گئے۔ میں — میں بھلا جی کر کیا کر رہا تھا۔ مگر کوئی ایسی گولی نہیں نکلی جو مجھ تک پہنچ سکتی۔

گاڑی کو میں نے کچھ فاصلے پر لے جا کر بائیں طرف موڑ دیا۔ وہ پختہ سڑک تھی اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ کس طرف نکلتی ہے۔ مجھے ہر حال میں وہ راستہ چھوڑ دینا چاہیے تھا۔ وہ جوان کا پتا کرنے آتے ضرور ہی ہمارے پیچھے لپکتے۔ اور ایک تھانیدار وہاں موجود تھا، اپنے چھلنی ہاتھ سے وہ انھیں بتا دیتا کہ اُن پر غالب آنے والے کون لوگ تھے اور ان کی تعداد اور طاقت کیا تھی۔

اس گھڑی صبح کے چار بج رہے تھے۔ ہم کچھ ہی دُور آگے نکلے تو آبی بولا "اس سپاٹے کا کیا کریں یار! اس کا سیاپا ختم کر دوں؟"

"نہیں بھئی! اس کا کیا قصور ہے۔ یہ تو بندھا بیٹھا ہے، ادھر کسی سڑک پر ڈال دو اسے۔"

"ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔ گاڑی روک ذرا۔ میں اس کو باندھ کر ڈالتا ہوں۔ چل اوئے باہر نکل۔" آبی نے دائیں ہاتھ کا دروازہ کھول کر تھانیدار کو باہر نکال لیا۔

"منہ ادھر کر اور ہاتھ باندھ لے۔"

تھانیدار نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لیے۔ آبی نے کار کی پچھلی نشست پھاڑ لی تھی۔ اس کی رسی بنا کر وہ تھانیدار کو باندھنے لگا تو وہ بدک گیا۔

"یہ کیا کرتے ہو۔ مجھے واپس بھی جانا ہے۔"

"یہ بہت ضروری ہے بچے! تیرے جیسے آدمی کا یہی علاج ہے۔ کل پرسوں تک تو کسی جگہ پہنچ جائے تو بڑی ہمت ہے۔" یہ کہہ کر اس نے تھانیدار کے ہاتھ اور پاؤں باندھ کر اسے کمر پر لادا اور سڑک سے دور لے جا کر کھیتوں کی اوٹ میں ڈال دیا۔ جب وہ واپس آیا تو بولا "چل اب۔ اس مصیبت سے جان چھوٹی۔ مروا دیا ہے اس نے۔"

"اچھا کیا جو اسے یہاں پھینک دیا۔ کہاں ساتھ لیے پھرتے ہم۔ میرا خیال ہے کہ ہم کسی قریبی گاؤں میں جا ٹھہرتے ہیں۔"

"یار مروا نہ دینا۔ تیری تدبیروں نے ہمیں اکثر گڑبڑ میں ڈال دیا ہے، اس تابیے کا کیا کریں؟ اس کو تو کسی باقاعدہ قبر میں ڈالنا ہوگا۔"

"ہاں! اس کا بھی بندوبست کر لیتے ہیں۔ کوئی قبرستان مل جائے تو وہیں دفن کر دیں گے۔"

"ٹھیک ہے استاد! چل اب مگر یہ علاقہ تو میرا دیکھا بھالا لگتا ہے۔" اس نے سڑک پر لگے کسی تختے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ میری جو نظر اُدھر پڑی تو معلوم ہوا کہ وہ سڑک سیدھی لکھی کی طرف جاتی ہے۔

"یار! یہ راستہ تو لکھی کی طرف جاتا ہے، آگے شکارپور ہے۔ یہ ہم کدھر نکل آتے ہیں؟"

"چل تو سہی دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔ میری مانو تو تابیے کو ادھر ہی دفن کر دو۔"

"کرنے ہیں، ابھی کرتے ہیں۔" میں نے گاڑی آگے بڑھا

دی۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے ہمارے راستے پھر سے یکجا کر دیے ہیں۔ وہ لاکھو لاشاری کے گھر کا پتہ دیتا تھا وہ راستہ۔ ہمیں ادھر ہی لیے جاتا تھا۔ ہم نہ چاہنے کے باوجود آگے بڑھتے رہے۔ میرے دل میں طرح طرح کے وسوسے ابھرتے چلے آتے تھے۔ اور میں سوچتا تھا کہ شاید۔۔۔شاید آسیہ مجھے اسی جگہ مل جائے۔ وہ لاکھو لاشاری کو بھول نہیں سکی ہو گی۔ اس کے بیٹے کی ماں بن کر وہ اسے معاف تو نہیں کرے گی۔ وہ لوٹ کر اس پر حملہ ضرور کرے گی۔ یہی میرا احساس تھا۔

کوئی آدھ گھنٹے کی مسافت طے کرنے کے بعد میں نے گاڑی روک دی۔

"آؤ آبی اپنے دوست کو یہاں ہی دفن کر دیں۔ میں نے سنا ہے کہ جہاں کوئی مر جائے اسے وہیں دفن کر دینا چاہیے۔"

"ہاں میں نے بھی یہی سنا ہے مگر ہم اسے 'مقامِ مرگ' سے دور لے آئے ہیں۔ مگر قبر کیسے کھودیں گے ہم۔۔۔"

"اس کی فکر نہ کرو، ہاتھوں سے کھود لیں گے۔ یہ جگہ بہت نرم معلوم ہوتی ہے۔" میں نے یہ کہہ کر تابیے کو کار سے اتار کر گھاس پر ڈال دیا۔ اس کی حالت زخموں نے اور زیادہ تباہ کر رکھی تھی۔ سارا خون نچڑ گیا تھا نشست بھی اس کے لہو سے داغ داغ ہونے لگی تھی۔ اس کی موت نے میرے دل میں بہت گہرے داغ ڈال دیے تھے۔ ان رنگوں سے زیادہ گہرے جو اگلی نشست کو لہولہو کیے ہوئے تھے۔ وہ اس یار کا خون تھا جس نے ہمارے لیے اپنی جان نچھاور کر دی۔ اس کو ہم کیا انعام دے سکیں گے؟ کون سی چیز اسے زیادہ پسند تھی۔ میں آبی سے یہی پوچھنا چاہتا تھا۔ مگر میں چپ ہی رہا۔ اب تو کوئی بھی انعام اس کی بے پناہ محبت کے بدلے میں کوئی وقعت نہیں رکھتا اور وہ ویرانے میں دفن ہونے کے لیے وہاں آ بیٹھا تھا۔

ہم نے اردگرد نگاہ ڈالی۔ کچھ فاصلے پر کسی کسان کا چھوٹا سا کوٹھا نظر آیا۔ آبی بولا "میرا خیال ہے وہاں سے ہم کوئی اوزار حاصل کر سکتے ہیں۔"

"ہاں! پتا کرو شاید کوئی چیز مل جائے۔ صبح کے ساڑھے چار بج رہے ہیں اب سورج زیادہ دور نہیں ہے۔"

آبی فوراً ہی اس طرف نکل گیا جب وہ لوٹا تو اس کے ہاتھ میں ایک کسی تھی اور وہ ہمارے بہت کام آ سکتی تھی۔ بولا "اس کوٹھری میں آدمی تو کوئی نہیں تھا یہ کسی ہمارے کام آ سکتی تھی، میں اسے ہی لے آیا ہوں۔"

"ٹھیک ہے اس سے قبر کھود ڈالو مگر اس کو کفن کہاں سے ملے گا۔ یہ اسی صورت خدا کے سامنے جا پہنچے گا؟" میں نے شاید

یہ بات بڑے ہی دلدوز کرب سے کہی تھی۔

میری آواز کا درد سمجھتے ہوئے آبی نے نگاہ جو اٹھائی تو وہ بھی مجھے لہو روتا نظر آیا، بولا "اس کی آخری تلاشی لے لو۔ کچھ نوٹ تھے اس کے پاس۔" یہ کہہ کر اس نے قبر کے لیے جگہ منتخب کر لی۔ اور اس پر کسی چلا دی۔ میں نے تابیے کو سر سے پاؤں تک ٹٹول لیا۔ نوٹ اس نے کمر سے باندھ رکھے تھے، وہ میں نے کھول لیے۔ پستول تو اس کا وہیں رہ گیا تھا۔ کاش ہم ساتھ۔۔۔ لا سکتے۔ مگر یہ بات سبھے سوجھ ہی نہ سکی۔ ایک اور شے بھی اس کے پاس، وہ اس کا جادوئی رومال! مگر وہ مجھے نہیں ملا۔ میرا خیال ہے کہ وہ اس نے سپاہیوں میں سے کسی ایک کے سر پر ڈالا تھا۔ مجھے ٹھیک سے یاد پھر بھی نہیں آیا۔ کچھ ہی دیر بعد آبی نے آدھی قبر کھود ڈالی۔ کچھ کام میں نے مکمل کر دیا اور یوں اپنے اس شیر دل تابیے کو ہم نے قبر میں اتار دیا۔ اس کے اپنے ہی لباس میں۔ نہ اس کو کافور مل سکا نہ کوئی اور خوشبو ہم اس کے ساتھ رکھ سکے جب ہم نے اس کا چہرہ قبلہ رخ کیا تو ہمیں یوں لگا جیسے وہ پوچھ رہا ہو کہ یہ تم میرے ساتھ کیا کر رہے ہو یارو۔۔۔ کیا میں ایسا ہی گناہ گار تھا؟

ہم دونوں نے اس کے چہرے سے اپنی نگاہوں کو ہٹاتے ہوئے جلدی جلدی اس پر مٹی ڈالی اور پھر جو دعائیں ہمیں یاد تھیں وہ ہم نے اس کی قبر پر پھینک دیں۔ یوں پھینک دیں، جیسے ان کی کوئی قیمت ہی نہ ہو۔ پانچ بجے تک ہم اسے ہاتھ بھر زمین کھود کر مٹی تلے لٹا چکے تھے۔

اس کو منوں مٹی تلے دبا کر میں نے کار سنبھالی اور آگے چل دیے۔ حسنہ اب تک کار کے اندر گم صم سی ہو کر بیٹھی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کن لوگوں سے آ ملی ہے اور کیوں؟ اسے وہ گھڑی شاید یاد نہیں آتی تھی جب اس نے پہلی بار ہمارے ہاں پناہ مانگی تھی۔ وہ کچھ بھی تو نہیں بولی۔ ٹک ٹک ہمارا منہ تکتی رہی۔ ایسے اندوہناک مناظر تو اس نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھے ہوں گے۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ اسے ہم ساتھ کیوں لے آئے۔ کس لیے، آخر کس لیے ہم اس کو یوں ذلیل کر رہے ہیں کہ وہ اپنی ہی نگاہوں میں خود کو گرا ہوا محسوس کرتی تھی۔

"آپ پریشان نہ ہوں حسنہ بی بی! یہ۔۔۔ یہ ہماری زندگی تو بس ایسے ہی چلتی ہے۔۔۔"

"جی۔۔۔ جی۔۔۔ میں پریشان تو نہیں ہوں۔ آپ جیسے جی دار آدمی ساتھ ہوں تو مجھے کس بات کا ڈر ہے۔" اس نے صبح کے اجالے کو نظروں میں سموتے ہوئے کہا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ خواب میں بات کر رہی ہے۔ انداز اس کا ایسا ہی تھا۔

"ان کو کیوں ساتھ لیے پھرتے ہو یار! ان کو کراچی چھوڑ دیتے تو اچھا تھا۔"

"ٹھیک ہے آبی! یہ ہمارے ساتھ رہے تو کیا ہرج ہے۔ بھوک تو نہیں لگ رہی ہے آپ کو؟"

"جی نہیں۔ میں ٹھیک ہوں اب کہاں جا رہے ہیں آپ؟"

"ہمارا ایک واقف رہتا ہے ادھر۔ ہم اس کے پاس جا رہے ہیں۔" میں نے کار کی رفتار تیز کر دی۔ کچھ ہی دیر بعد ہم شکارپور جا پہنچے۔ علاقہ وہی تھا۔ وہی منظر وہی پیش منظر۔ مجھے یقین ہونے لگا تھا کہ لاکھو لاشاری سے ہماری یہ دوسری ملاقات زیادہ ثمر آور ثابت ہو گی۔ اس کا رونا ہی اس روز اس کے کام آ گیا ورنہ میں شاید اسے اس دن جان ہی سے مار دیتا۔ آسیہ کے لیے وہ بہت پریشان تھا۔ وہ عاشقِ مہجور۔ جس نے جیل کے ڈاکٹر سے مل کر میری بدنصیب بہن پر مجرمانہ حملہ کیا تھا اور جس کا ثمر یہ تھا کہ آسیہ اس کا بوجھ اٹھائے پھرتی تھی۔ یوں جیسے کوئی بے جواز زندگی کسی کے گلے میں جھول گئی ہو۔

خوف مجھے یہی تھا کہ وہ لوگ پلٹ کر ہم پر حملہ کر دیں گے۔ ان سے کچھ بھی بعید نہ تھا۔ ان کے اتنے جوان ہم نے زخمی کر دیے تھے۔ وہ کیسے ہمیں معاف کر دیتے۔ آبی کو بھی یہی خطرہ لاحق تھا۔ اور اس کی نظریں ٹھہر ٹھہر کر آگے پیچھے کے منظر پر جا رکتی تھیں شکارپور میں ہم نہیں ٹھہرے۔

آبی نے یوں کیا کہ وہاں سے کچھ کھانے پینے کا سامان لیا اور بولا "ادھر سے نکل چلو جیلانی۔ سبھی مجھے اس شہر سے بھی خوف آتا ہے۔ پتا نہیں ہماری قسمت میں کیا لکھا ہے کوئی نجومی ملتا تو میں اسے ہاتھ دکھاتا۔"

"ہاں نجومی بھی مل سکتا ہے مگر یہ بات تو طے ہے کہ ہمیں موت کسی ویرانے میں آئے گی۔ وہ ہمیں نرغے میں لے کر ایسی جگہ ماریں گے جہاں ہمیں پانی بھی نہ مل سکے۔"

"بات کچھ ایسی ہی ہے جیلانی! ایک مرض ہے نارو، اس میں آدمی کے جسم سے دھاگا سا نکلتا ہے اور اس کی جان ہوا ہو جاتی ہے۔ ہم بھی کسی ایسے ہی مرض میں مبتلا ہیں۔ یہ جو ہمارا خون جگہ جگہ گرتا ہے تو یہ بھی ہمیں ایک دن لے ڈوبے گا۔" اس نے کار کے اندر آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ حسنہ کے گھٹنے سے اس کا گھٹنا چھونے لگا تھا۔

"تیرے دھاگے کو تو میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ یہ گھٹنا ذرا پیچھے ہٹا کر بیٹھ۔ یہ نامحرم ہیں یہ خاتون۔" میں نے عقب نما میں اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں یار! تو یوں کر کہ یہ خاتون میرے سپرد کر دے۔ میں بہت دکھی ہوں جیلانی! مجھے کسی ٹھنڈے میٹھے سائے کی سخت ضرورت ہے۔ اور یہ بی بی مجھے اچھی لگتی ہے، ایک دم بہت اچھی۔"

میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ وہ ایک بار پھر جوعِ زن میں مبتلا ہونے لگا تھا۔ میں نے کہا ہے نا کہ وہ عورت کے معاملے میں بہت ہی پھسڈی تھا۔

"کوئی اور بات کر آبی! اس خاتون کو تو اپنی جگہ رہنے دے یہ تیرے کام کی نہیں ہے۔"

"ہاں! آپ ٹھیک کہتے ہیں جیلانی صاحب مگر۔۔۔ مگر کون کہہ سکتا ہے کہ وہ زندگی کا ہاتھ پکڑ کر کس سمت جا رہا ہے کس کو معلوم ہے کہ اس کی منزل کیا ہے؟" حسنہ نے کھڑکی میں سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ اپنا بدن وہ آبی سے چرا کر بیٹھ گئی تھی۔ اسے آبی کی وہ بات پسند نہیں آئی تھی۔

"لو یہ کھانا کھا لو۔ کچھ شکارپوری حلوہ پوری کا بھی مزا چکھو۔ آگے تو پتا نہیں کیا ہے، مجھے تو لگتا ہے کہ زندگی کی شام ہونے کو ہے۔"

"نہیں یار! ایسی باتیں نہ کر۔ مجھے ہول ہوتا ہے۔ ابھی تو ہمیں بہت کام کرنے ہیں آبی! تیرا کیا خیال ہے ہماری ماؤں نے ہمارے لیے دعا ترک کر دی ہو گی؟"

آبی کچھ نہیں بولا۔ میری بات نے اس کے ذہن کو ایسی سمت میں ڈال دیا تھا کہ وہ تا دیر واپس نہ آ سکا۔ وہ اس گھر کی سوچتا تھا جہاں اس نے پرورش پائی تھی۔ اس ماں کی صبح و شام دل سے اٹھتی دعاؤں پر نظر ڈالی ہو گی جس نے آبی کو آبی بنا دیا۔ اتنی ناکامیوں کے باوجود وہ ناکام نہیں رہا تھا۔ اپنے مقصد میں وہ بہت کامیاب تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ میرے ساتھ مل کر اس نے اپنی زندگی تباہ کر لی تھی۔ ورنہ وہ تو بہت اچھا آدمی تھا۔ دو گھڑی کسی سمت آگے بڑھ کر اپنے لیے مہینوں کا راشن جمع کر لیتا تھا اور پھر آرام سے بیٹھا رہتا تھا۔ میں نے اس کے شب و روز ہی بدل ڈالے تھے۔ میرے لیے جانے اس کے دل سے کیسی کیسی بددعا نکلتی ہو گی مگر بظاہر وہ مجھ سے بہت خوش تھا۔

گاڑی نہر پر سے گزرتے وقت ہم نے محسوس کیا کہ علاقے میں بارش ہو چکی تھی۔ دور دور تک پانی پھیلتا چلا گیا تھا۔ بس ایسے ہی کسی بادل نے راہ چلتے میں وہاں پر دامن نچوڑ دیا تھا۔ ورنہ شکارپور میں تو کسی بادل کا نشان نہیں تھا۔

نہر عبور کر کے گاڑی ہم نے ایک جھنڈ تلے کھڑی کر دی۔ مگر سوال یہ تھا کہ ہم اس کو پولیس سے کیسے بچا سکیں گے؟ وہ ہماری تلاش میں دور دور تک پھیل جائیں گے مگر مجبوری تھی۔ فوری طور پر ہم کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے تھے۔

آبی نے بڑا سا بریف کیس اٹھایا اور حسنہ کے بازو پر رکھ کر

اسے گاڑی سے اتارا، بولا "تیری قسمت میں خدا جانے کیا لکھا ہے حسنہ بی بی! ابھی تو تیرا نام بھی ہمارے نام کے ساتھ آلگا ہے۔" وہ مسکرا رہا تھا۔ پہلی بار میں نے اس کے چہرے پر بشاشت دیکھی۔ حسنہ اسے پسند آگئی تھی اور وہ اپنے بدن کا لمس اس تک براہ راست پہنچانے لگا تھا۔

حسنہ نے اسے نظر بھر کر دیکھا اور بولی "مجھے پہلے تو نہیں معلوم تھا مگر اب جانتی ہوں کہ میری قسمت میں کیا ہے۔ مجھے یہیں کہیں دفن ہو جانا ہے۔"

"ارے نہیں! یہ سب وہم ہے آپ کا۔ آؤ ہم تمھیں عجیب و غریب آدمی سے ملواتے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے حسنہ کا ہاتھ پکڑا اور مجھ سے دو قدم آگے نکل گیا۔

مغل گاؤں کی وہ حویلی جس میں لاکھو لاشاری رہتا تھا درختوں کے عقب میں عجیب سا جادوئی منظر پیش کرتی تھی۔ ہم دروازے پر پہنچے تو سیف علی سامنے ہی کھڑا تھا۔ دروازے کے دونوں بڑے پٹ کھلے پڑے تھے۔ سیف علی نے ہمیں دیکھا تو حیرت زدہ سا ہو کر بولا "ارے آپ! یہ آپ کیسے آگئے ادھر، خیر تو ہے سائیں! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟"

"ہم بندے نظر نہیں آتے تجھے! ارے ہم وہی ہیں پیارے تمھارے لاشاری صاحب سے ملنے آئے ہیں۔"

"وہ تو مجھے معلوم ہے سائیں! پر خیر آجائیں آپ کی بہن ملی ہے کہ نہیں؟"

"نہیں سیف علی! وہ ابھی تک ہمیں نہیں ملی ہے اور اب تک ہم اس کی تلاش میں ہیں۔"

"آئیے میں لاشاری صاحب کو اطلاع دیتا ہوں۔ وہ آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔" یہ کہہ کر اس نے ہمیں وہیں روکا اور خود آگے نکل گیا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ واپس آیا تو لاکھو لاشاری بھی اس کے ساتھ تھا اور دو آدمی اس کے دائیں بائیں چل رہے تھے اور وہ دونوں مسلح تھے۔ لاشاری کو سندھی لباس بہت ہی اچھا لگتا تھا مگر اس روز وہ پنجابی کرتا پہنے ہوئے تھا اور سفید لٹھے کی شلوار آواز دیتی تھی۔ اس نے ہمیں دیکھا تو بھاگ کر ہمارے پاس آ پہنچا۔ مجھ سے نظر ملاتے ہی اس کی نظریں جھک گئیں اور بڑے ہی والہانہ انداز میں وہ مجھ سے بغلگیر ہو گیا، بولا "آپ کو میں کیسے یاد آگیا سائیں! یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ نے پھر مجھے خدمت کا موقع دیا۔ کیا حال ہیں آپ کے؟"

"اچھے ہی ہیں۔ یہ میرے دوست ہیں، انھیں جانتے ہیں نا آپ؟"

"جی کیوں نہیں۔ یہ میرے لیے بھی اتنے ہی اہم ہیں جتنے آپ کے لیے، کیا حال ہے آپ کا آبی صاحب!" یہ کہہ کر اس نے آبی کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ اس کا تپاک دیکھ کر ہم متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے اس کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ کوئی ٹوٹا ہوا بچھڑا ہوا لمحہ اس تک لوٹ آیا تھا۔ اسے آسیہ کی یادوں نے شاید دہلا دیا تھا، بولا "آئیے اندر چلتے ہیں یہ خاتون کون ہیں؟"

"یہ حسنہ ہیں، ہماری دوست۔ ہمارے ساتھ ہی چلی آئی ہیں" میں نے حسنہ کا تعارف کروا دیا۔

"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر مگر... مگر اس کی کوئی خبر ملی ہے آپ کو؟" اس نے حویلی کی طرف لوٹتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ ابھی نہیں۔ اسی کی تلاش میں ہم دوبارہ ادھر آئے ہیں"

"مجھے معلوم تھا۔ وہ نہ مجھے مل سکی ہے نہ آپ ہی اس تک پہنچ سکے ہیں، مجھے معلوم تھا۔" اس نے زمین پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ وہ آسیہ کے بارے میں بلند آواز سے بات نہیں کرتا تھا۔ وہ جیسے اپنے آپ سے خوفزدہ ہو اور یوں وہ میرا خواہ مخواہ کا "بہنوئی" بن بیٹھا تھا۔ اس بات پر مجھے بہت طیش آتا تھا۔ مگر..... وہ وقت اس سے کوئی ایسی بات کہنے کا نہیں تھا جس پر اسے غصہ آجاتا۔

ہم حویلی کے اندر اُن کے ٹھنڈے میٹھے کمرے میں جا بیٹھے تو وہ بولا "سیف علی! ان کے لیے پانی لاؤ اور کھانا بھی۔ ان کی خاطر مدارات میں کوئی دقیقہ نہیں چھوٹنا چاہیے یہ میرے عزیز بھی ہیں، میں اس کے لیے معافی چاہتا ہوں مگر... بات ایسی ہی ہے۔"

"مجھے یوں ذلیل نہ کر لاشاری! اتنا ہی بہت ہے، جو ہو چکا ہے۔ وہی بہت کافی ہے اور شکر کر کہ ہم تجھ سے نرمی سے بات کرتے ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔ اپنی غلطی کا بھی احساس ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ سے کیسے معذرت کروں، مجھے چند روز پہلے آسیہ کی خبر ملی تھی میں نے اپنے دو آدمی اس کی طرف بھیج رکھے ہیں وہ ابھی تک نہیں لوٹے انہی کے انتظار میں بیٹھا ہوں ورنہ مجھے خود جانا پڑے گا۔"

"کیا خبر ملی تھی تجھے اس کی؟"

"پتا یہ چلا تھا کہ اس نے جیل کے اس ڈاکٹر کو مار دیا ہے۔ یہ خبر اخبار میں بھی چھپی تھی۔ اسی کی بنا پر میں نے اپنے دو آدمی راولپنڈی بھیجے مگر وہ ابھی تک نہیں لوٹے۔ آسیہ نے ایک اور آدمی کو بھی قتل کر دیا تھا۔"

"ہوں! تو یہ بات ہے۔ ہم بھی راولپنڈی ہی جانا چاہتے تھے۔ مگر ہمارے ساتھ زبردست گھپلا ہو گیا ہے۔"

"کیا مطلب؟ خیر تو ہے نا؟"

"خیر نہیں ہے لاکھو! راستے میں ہمارا پولیس مقابلہ ہو گیا تھا۔

میرا خیال ہے ہم نے ان کے چھ آدمی مار دیے ہیں۔ ہماری گاڑی اُن لوگوں نے روک لی تھی۔ ہم کراچی سے لاہور جا رہے تھے کہ ان لوگوں نے ہمارا راستہ روک لیا اور ہمیں اپنی حفاظت کے لیے مجبوراً ان پر گولی چلانی پڑی۔ ہمارا اپنا ایک آدمی وہاں ضائع ہو گیا یہ آج صبح کی بات ہے۔"

اُس کے منہ سے سیٹی سی نکل گئی۔ آنکھیں اس کی پھیلنے لگی تھیں۔ بولا "یہ... یہ تو بہت بُری خبر سنائی ہے آپ نے۔ وہ گاڑی کہاں ہے جس میں آپ سفر کر رہے تھے؟"

"وہ باہر کھڑی ہے۔ اور سمجھ میں نہیں آتا کہ اب ہم کیا کریں، ایسے ہی راستہ دیکھ کر ہم ادھر آگئے۔"

"ممتاز شاہ! دیکھ تو وہ گاڑی کہاں کھڑی ہے؟ اُسے وہاں سے ہٹا کر اندر حویلی کے پچھلے حصے میں پہنچا دے یہ تو بہت بُرا ہوا۔ اُن کے چھ آدمی مار ہی دیے آپ نے۔"

"ہاں! میرا خیال ہے مر ہی گئے ہوں گے وہ۔ ہمیں اور کچھ سوجھا ہی نہیں تھا ورنہ ہم انھیں ذرا سا زخمی کر کے چھوڑ دیتے۔ مگر انھوں نے مہلت ہی نہیں دی۔ سالے ہماری جان کو آ رہے تھے۔ کیوں جیلانی ٹھیک ہی کہہ رہا ہوں نا میں۔" آبی نے جیب سے سگریٹ نکالتے ہوئے کہا۔ اب وہ زیادہ تر و تازگی سے مسکرا رہا تھا۔

"ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔ ہمارے لیے کوئی صورت انھوں نے باقی ہی نہیں رہنے دی تھی۔"

ممتاز شاہ ایک آدمی کو ساتھ لے کر اُسی وقت باہر نکل گیا۔ لاشاری ہمارے اور زیادہ قریب ہو گیا، بولا "آخر ہوا کیا تھا؟ کس بات پر جھگڑا ہوا تھا؟" میں نے اسے تفصیل بتائی تو وہ بولا "مجھے ڈر ہے کہ وہ آپ کی تلاش میں یہاں تک آنکلیں گے اگر گاڑی کسی جگہ چھپ سکے تو پھر بھی کچھ بچت ہو جائے۔" لاکھو نے سیف علی سے پانی کا جگ لیتے ہوئے کہا۔ وہ ہمارے لیے شربت بنا لایا تھا۔

کوئی بیس منٹ بعد ممتاز شاہ واپس آگیا، بولا "لاکھو سائیں! گڈی کو تو ہم نے نہر میں ڈال دیا ہے پر کوئی دیکھے گا تو یہی کہے گا کہ یہ گاڑی وہاں کیسے آئی؟"

"بہت اچھا کیا ہے تم نے، دیکھا جائے گا۔ نہر تک ہم کسی کو جانے ہی نہیں دیں گے۔ آپ اطمینان سے بیٹھیں۔"

"یار وہ پینتیس ہزار کی گاڑی تھی۔" آبی نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔

"پر تیری جان سے اچھی نہیں تھی۔ نہر میں گئی تو بہت اچھا ہوا۔" میں نے اسے تسلی دی۔

وہ دوپہر ہم نے لاکھو کی حویلی میں بہت ہی پرسکون انداز سے گزاری۔ ہمارے لیے اس نے تین پلنگوں کا انتظام کر دیا تھا اور وہ کمرہ بہت ٹھنڈا تھا۔ کھانا جو ہمیں اس نے دیا، وہ بہت عمدہ تھا۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ اُسے لذیذ کھانوں کا بے حد شوق ہے۔ بیتہ بھی وہیں تھا۔ اس نے اور سیف علی نے ہماری بہت خدمت کی۔ حسنہ کو تو وہ کچھ زیادہ ہی اہمیت دیتے تھے اور اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ حویلی میں عورت نظر نہیں آتی تھی۔ لاکھو بھی تنہا تھا اور تنہا لوگ ہی اس نے اپنے گروہ میں شامل کر رکھے تھے۔ کھانا پکانے اور دوسرے دھندوں کے لیے البتہ اُن لوگوں نے دو نوکرانیاں وہاں بھرتی کر رکھی تھیں۔ وہ ادھیڑ عمر کی عورتیں جی جان سے اُن کی خدمت کرتی تھیں۔ ایک اُن میں بائیں آنکھ سے اندھی تھی۔ اس کی صرف دائیں آنکھ ہی کام کرتی تھی اور حلیے کے اعتبار سے مجھے وہ بہت پرانی پاپی نظر آتی تھی۔ دوسری عورت بھی ویسی ہی تھی اور میرا خیال ہے کہ وہ کوئی بہت بڑا جرم کر کے وہاں آ ٹھہری تھیں اس حویلی کی شہر پناہ میں، کہ باہر انھیں گرفتاری کا ڈر تھا۔ کانی عورت کا نام شاداں تھا اور دوسری فرحت۔ پتا نہیں یہ نام اسے کس نے دے دیا۔ حالانکہ فرحت نام کی کوئی شے اس کے حلیے میں موجود نہیں تھی۔ وہ حسنہ پر کچھ زیادہ ہی مہربان تھی۔ اس کی زبانی ہمیں معلوم ہوا کہ حویلی میں لاکھو نے خود کسی عورت کا داخلہ بند کر رکھا تھا۔ اس کی نظر میں ہر عورت مشکوک ہوتی ہے اور وہ کسی بھی ایسی شے پر اعتبار نہیں کرتا جو سر پر بالوں کا جوڑا اٹھائے پھرتی ہو۔ آسیہ پر ہاتھ ڈالنے کے بعد ہی شاید اسے یہ عقل آئی تھی۔

پانچ بجے ہم سو کر اٹھے تو لاکھو ہمارے پاس آ بیٹھا، بولا "میں نے اپنے آدمیوں کو دُور دُور تک پھیلا دیا ہے۔ کوئی بھی کھٹکا ہوا تو وہ ہمیں اطلاع دے دیں گے آپ اٹھ کر نہا لیں۔"

"ہاں! یہ بہت ضروری ہے ہم کچھ زیادہ ہی تھکے ہوئے ہیں۔ تمھارے آدمی بہت چوکس لگتے ہیں۔"

"ہاں! آپ نہا کر پچھلے کمروں میں جا ٹھہریں۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی فساد آپ کی وجہ سے پیدا ہو۔ کہیں وہ تھانے دار احمد بیگ تو نہیں تھا؟"

"بالکل وہی تھا۔ وہ لوگ اسے بیگ صاحب کہہ کر پکارتے تھے۔"

"ہوں! وہ پہلے ہی ہمارا زبردست دشمن بنا ہوا ہے۔ اسے ہماری حویلی کا بھی علم ہے، یہ جگہ وہ دیکھ چکا ہے۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے۔ البتہ اسے ہمارے یہاں آنے کی اطلاع نہیں ملنی چاہیے۔"

"ہاں! دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔ آپ کے لیے میں نے چائے بنوائی ہے وہ بھی نہا کر پی لیں مگر مجھے یہ بتائیں کہ آپ نے آسیہ کے بارے میں کیا کچھ سنا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں! ایک خبر اخبار میں چھپی تھی وہی اس کی آخری

خبر تھی۔ اُس کے بعد کیا ہوا ہمیں کچھ معلوم نہیں ۔"
"ہوں ۔۔ میرا خیال ہے وہ آدمی اب واپس آنے ہی کو ہیں۔ بہت دن ہو گئے انھیں گئے ہوئے۔ خط بھی اُن لوگوں نے کوئی نہیں لکھا ہے ۔"

مجھے احساس ہو رہا تھا کہ وہ جان بُوجھ کر مجھ سے آسیہ کے بارے میں سوال پوچھتا تھا جیسے وہ اسے زیرِ بحث لا کر خوشی محسوس کرتا ہو۔ میرا خیال ہے کہ لاکھو کو آسیہ سے شدید قلبی لگاؤ تھا ورنہ کوئی کسی کو دو گھڑی کی ملاقات کے بعد کہاں تک یاد رکھتا ہے آسیہ کچھ اس کے دل میں زیادہ ہی گہری اُتر گئی تھی۔ وہ اس کے لیے بار بار ہم سے پوچھتا تھا۔

اس وقت شام کے چھ بجے تھے کہ لاکھو کے ایک آدمی نے اندر آ کر بتایا کہ پولیس کا ایک ٹرک اِدھر آ رہا ہے اور اس کا رُخ لاکھو کی حویلی کی طرف ہے۔ اُس کی یہ بات سُن کر لاکھو تڑپ کر اٹھا، بولا۔

"یہ تو بہت ہی غلط ہوا۔ صرف دو آدمی میرے قریب ہیں باقی سب لوگ اِدھر اُدھر ہتھیار لے کر حویلی میں پھیل جائیں اور ممتاز شاہ سے کہو وہ اس کارروائی کے لیے سب کی رہنمائی کرے گا۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی مشین گن دوسرے کمرے سے نکالی، اس کو اچھی طرح دیکھ بھال کر بولا۔

"یہ دو مشین گنیں آپ لے لیں، لگتا ہے مقابلہ اس پولیس سے سخت ہو گا ویسے ہم اسے ٹالنے کی کوشش کریں گے۔ آپ اِدھر ہی بیٹھیں میں اُن سے اگلے کمرے میں بیٹھ کر بات کرتا ہوں۔ یہ دروازہ بند کر لیں ۔"

ہم نے اس کی فراہم کردہ دونوں مشین گنیں سنبھال لیں جس کا رنگ فق ہونے لگا تھا۔ ایسی زردی اس کے چہرے پر اتر آئی تھی کہ میں سمجھا وہ وہیں جان دے دے گی۔ آبی کا ہاتھ مشین گن پر پڑا تو اُس نے زبردست گالی دی۔ بولا "یہ معاملہ تو کچھ زیادہ ہی خطرناک ہو گیا ہے۔ ہمیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا لاکھو خواہ مخواہ مارا جائے گا۔"

"قسمت کی بات ہے یار! ورنہ ہم اِدھر آنے کا ارادہ تو نہیں رکھتے تھے۔" میں نے اُٹھ کر اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ ہم دونوں کی حالت نزع میں آئے ہوئے جانور ایسی ہو رہی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد اس آدمی کے پیغام کے مطابق پولیس کا ٹرک حویلی کے سامنے آ ٹھہرا۔ آبی کا رنگ سرخ ہونے لگا۔ جب اسے کسی بات پر طیش آتا تھا تو اس کے ماتھے کی رگیں بھی چمکنے لگتی تھیں۔

کچھ ہی دیر بعد پہلو کے کمرے کا دروازہ کھلا تو معلوم ہوا کہ لاکھو نے پولیس افسروں کو خوش آمدید کہا۔
"لاکھو صاحب! یہ سکھر کے ڈی آئی جی ہیں کھیری صاحب اور یہ ایس ایس پی وانڈر صاحب ہیں ۔"
"آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی کیسے آنا ہوا آپ کا اِدھر خیر تو ہے نا کھیری صاحب؟"

"ہاں خیر ہی ہے ہمیں ان دو مجرموں کی تلاش ہے جنھوں نے سڑک پر کھڑے ہمارے چھ آدمی شدید زخمی کر دیے ہیں۔ ہماری اطلاع یہ ہے کہ وہ اِدھر ہی آئے ہیں ۔"

"یہاں کیسے آ سکتے ہیں وہ۔ بیٹھیں نا آپ۔ اوئے سیف علی! ان کے لیے چائے پانی کا انتظام کرو۔ وہ یہاں کس لیے آتے۔ کوئی قتل کر دیا ہے اُن لوگوں نے؟"

"ہاں! میں نے کہا ہے نا کہ ہمارے چھ جوان شدید زخمی کر دیے ہیں اُن لوگوں نے ۔"

"یہ تو بہت ہی بُرا ہوا مگر ایسی جرأت انھیں ہوئی کیوں کر کوئی بہت بڑے بدمعاش ہوں گے ۔"

"ہاں لگتا تو ایسا ہی ہے۔ ابھی ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ ان کا نام کیا ہے، یہ حویلی تو دکھا دیں ہمیں ۔"

"دیکھ لیں بے شک دیکھ لیں مگر ایسا کوئی آدمی یہاں نہیں آیا۔ اگر آتا تو ہم آپ کے حوالے نہ کر دیتے ۔" لاکھو نے بڑی دل جمعی سے کہا۔ وہ انہیں ٹال دینے کی کوشش میں تھا۔ اتنے میں کسی نے شربت کے برتن لا کر میز پر رکھ دیے تھے۔

وہ شربت پینے لگے تو لاکھو نے کہا "آپ چاہیں تو ابھی حویلی دیکھ لیں۔ ایک ایک حصہ ہم آپ کو دکھا دیں گے مگر اس قسم کا کوئی آدمی اِدھر نہیں آیا ہے۔ جاؤ سیف علی! اپنے ان تھانیدار صاحب کو حویلی دکھا دو۔ لاکھو نے ان دونوں افسروں کے ساتھ آئے ہوئے بیگ صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ کوئی دس منٹ گزر گئے وہ لوگ ہمارے بارے میں طرح طرح کے قیاس میں مصروف رہے اور لاکھو اُن کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔

"میں نے بڑی مشکلوں سے اپنی جان بچائی۔ وہ مجھے بھی باندھ کر لے گئے تھے۔ اِدھر لاکھی سے پرے سڑک پر انھوں نے مجھے ڈال دیا۔ وہاں ایک راہگیر نے آ کر میرے جکڑے بند کھولے تو میں ان کے پاس جا پہنچا۔ کھیری صاحب! مجھے یقین ہے کہ وہ بہت ذلیل آدمی ہیں۔۔ دونوں ۔"

"تم بالکل گدھے ثابت ہوئے ہو بیگ صاحب! وہ تمھارا پستول کیسے لے گئے۔ تم بالکل نکمے ہو، ورنہ کوئی مجرم ایسی جرأت کر سکتا ہے ۔" کھیری صاحب نے کہا۔

"وہ جی۔۔۔ وہ صاحب دراصل وہ بہت چالاک لوگ تھے وہ دونوں۔ ایک نے بے خبری میں میرا ہتھیار چھین لیا اور میں بے بس ہو گیا۔ میں نے تو ایسے خبیث آدمی کہیں نہیں دیکھے ۔"

"اچھا تھا تمھیں وہ جان سے مار دیتے۔ تم پر گولی چلانا اُن کے لیے بہت آسان تھا، پتا نہیں وہ تمھیں چھوڑ کیسے گئے!"

"بس جی یہ اللہ کی مہربانی ہے ورنہ وہ تو مجھے کبھی نہ چھوڑتے۔ اس اللہ یار کا تو ہاتھ ہی بے کار ہو گیا ہے ۔" بیگ صاحب نے کہا۔ اُن کی تمام باتیں ہم سُن رہے تھے۔

"جاؤ بیگ صاحب اس حویلی کو دیکھو اور آنکھیں کھول کر دیکھنا۔ مجھے یقین ہے لاکھو کہ تمھیں اُن سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔"

"مجھے کیا ہمدردی ہو سکتی ہے جناب اُن کمینوں سے، آپ نے مجھے اتنی عزت دی۔ ہزار موقعوں پر میں نے آپ کے سامنے مجرم پیش کر دیے۔ میں اب بھلا کیسے آپ سے انکار کر سکتا ہوں جاؤ سیف علی ان کو لے جاؤ ۔" لاکھو نے بڑے جوش سے کہا۔

بیگ صاحب کو ساتھ لے کر سیف علی باہر نکل گیا۔

وہ دونوں آدمی باہر نکلے تو لاکھو اُن کے قریب ہو کر بیٹھ گیا۔ اب اُن کی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ میں اور آبی ایک دوسرے کو یوں دیکھ رہے تھے جیسے ہمیں سانپ سونگھ گیا ہو۔ ایسا کوئی راستہ بھی ہمیں نظر نہیں آتا تھا جس میں سے گزر کر ہم آگے نکل سکتے۔ ہم اس کمرے میں بند ہو کر رہ گئے تھے۔ آبی کی آنکھوں پر شیشہ چڑھا تھا اور وہ اس احساس میں ڈوبا رہتا تھا کہ اُس کی نظر اپنی نظر نہیں ہے، بولا "یار اگر کسی جگہ یہ شیشہ اُتر گیا تو کیا ہو گا ۔"

"کچھ نہیں ہوتا، ذرا سنبھل کر رہ۔ اور دیکھ ہتھیار سے کبھی غافل نہ ہونا مجھے یقین ہے کہ ہمیں ان کی سخت ضرورت پڑے گی، بیٹھ جا اِدھر آ کر ۔" میں نے اسے حسنہ کے قریب بٹھاتے ہوئے کہا۔

"یہ کس مصیبت میں پھنس گئی ہے یہ حسنہ بی بی۔ اس کو تو چھوڑ کیوں نہیں دیتا۔ بس بہت ہو گئی۔ ابھی یہ سہروں والے جائیں تو اسے کراچی واپس بھیج دینا ۔"

"میں یہی کروں گا۔ اس کا تو خواہ مخواہ ہی مردہ خراب ہو رہا ہے۔ یہ اچھا ہُوا کہ کار ان لوگوں نے نہر میں ڈال دی تھی ۔"

"ہاں حویلی میں تو کچھ بھی نہیں ہے کہیں وہ اِدھر آ گئے تو مصیبت ہو گی ۔"

کچھ ہی دیر بعد ہمیں پہلو کے کمرے سے بیگ صاحب کی آواز سُنائی دی۔ ہم اس طرف متوجہ ہو گئے۔ وہ کہہ رہے تھے "حویلی میں تو نہ کار ہے نہ وہ آدمی۔ کمرے بھی ہم سب دیکھ چکے ہیں۔ ایک صرف یہ ساتھ والے تین کمرے رہ گئے ہیں یہ ہم نہیں دیکھ سکے ۔"

"اِدھر کیا ہے بھئی؟"

"یہ حویلی کا زنانہ حصہ ہے کھیری صاحب! مجھے افسوس ہے کہ یہ ہم آپ کو نہیں دکھا سکتے۔ ہماری عورتیں پردے کی سخت پابند ہیں ۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے، ہمیں تو یہ حصہ بھی ضرور دیکھنا ہے۔ براہِ کرم آپ عورتوں کو اطلاع دے دیں۔ وہ الگ ہو جائیں تو ہم یہ حصہ دیکھ لیں گے ۔" کھیری صاحب نے کہا۔ وہ بضد معلوم ہوتے تھے۔ اور انھیں یقین تھا کہ اُن کے مجرم شاید لاکھو نے وہیں چھپا دیے ہوں۔

"ٹھیک ہے صاحب! میں انھیں اطلاع کر دیتا ہوں۔ آپ ذرا ٹھہریں میں ابھی آتا ہوں ۔" یہ کہہ کر لاکھو وہاں سے اٹھ گیا۔ چند منٹ تک کمرے میں گہری خاموشی طاری رہی۔ ابھی ہم سوچ ہی رہے تھے کہ ہمارا اگلا قدم کیا ہونا چاہیے کہ لاکھو دوسری طرف سے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آ گیا، بولا "یار! وہ تو بضد ہیں۔ چاہتے ہیں کہ یہ کمرے بھی ضرور دیکھیں ۔"

"کیا کریں ہم؟ اُن کی باتیں تو ہم نے بھی سُنی ہیں ۔"

"یوں کرو کہ تم یہاں سے نکل کر اس کمرے میں چلے جاؤ۔ بیگ صاحب ہی تو آئیں گے یہاں۔ ہم اُن سے بات کر لیتے ہیں ۔"

"کیا بات کریں گے آپ؟ وہ تو جان نہیں چھوڑیں گے ۔"

"رشوت! یہ سب کام رشوت سے ہی چل سکتا ہے۔ آئیں میں ان کو کمرے دکھا دیتا ہوں ۔" یہ کہہ کر لاکھو نے ہم تینوں کو ایک اسٹور نما کمرے میں پہنچا دیا۔ بیٹھنے کے لیے وہاں کوئی بھی جگہ نہیں تھی۔ سارا کمرہ سامان سے بھرا ہوا تھا۔ ہمیں وہاں ٹھہرا کر لاکھو نے کمرہ بند کیا اور باہر نکل گیا۔

کوئی دس منٹ بعد ایک افسر لاکھو کے ساتھ اندر آ گیا۔ ہم اس اسٹور نما کمرے کی کھڑکی میں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ اُس نے آتے ہی وہ دونوں کمرے دیکھ لیے اور پھر اس کمرے کی طرف دیکھنے لگا جس میں ہم ڈال دیے گئے تھے۔

لاکھو نے نہایت ہی ریسان سے کہا "کنڈیارو صاحب! اس کمرے میں ہمارے گھر کی عورتیں بند ہیں آپ مہربانی کر کے اُن کو بے پردہ نہ کریں ۔"

"نہیں جی یہ کیسے ہو سکتا ہے، یہ میرا فرض ہے میں اسے بھی ضرور دیکھوں گا ۔"

"میری گزارش ہے اگر آپ قبول کریں تو بڑی مہربانی ہوگی۔ میں آپ کو یہ رقم پیش کر سکتا ہوں، یہ بیس ہزار روپے ہیں۔" لاکھو نے دائیں ہاتھ رکھے صندوق میں سے رقم نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔

"نہیں جی یہ کیسے ہو سکتا ہے میں یہ کمرہ ضرور دیکھوں گا۔"

"آپ کی مہربانی ہے، یہ لیں، دس ہزار اور رکھ لیں میرے پاس اس وقت یہی ہے۔ میں پھر کسی وقت اور زیادہ خدمت کر دوں گا۔"

"ہوں! تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دونوں آدمی یہاں ہیں۔"

"کچھ بھی سمجھ لیں لیکن یہ میری عزت کا سوال ہے۔ آپ ہی میری جان چھڑا سکتے ہیں۔"

"دیکھیں، آدمی سوّر کھائے تو ڈھیروں کھائے، اس رقم سے کیا ہوگا۔"

"اس وقت میرے پاس یہی موجود ہے آپ کو میں بیس اور دے سکتا ہوں صرف چند لمحوں کی مہلت دیں مجھے۔"

"ٹھیک ہے، لائیں وہ رقم مگر یہ اچھی بات نہیں ہوگی۔ آپ مجھے میرے فرض سے روک رہے ہیں۔"

"آپ کی زندگی سرتاسر فرض ہے۔ آج اس کمرے کو نہ دیکھیں تو آپ کا بڑا احسان ہوگا۔" یہ کہہ کر وہ اسٹور کی طرف لپکا، اور کھڑکی میں آ ٹھہرا۔ بولا "حسنہ! مجھے بیس ہزار روپے کی سخت ضرورت ہے۔ وہ تیرے پاس ہیں تو دے دے۔" ہمارا نام جان بوجھ کر نہیں لیا تھا۔ آپی نے بریف کیس کھولا اور اس میں سے بیس ہزار روپے نکال کر لاکھو کی طرف کھڑکی کی جھری میں سے بڑھا دیے۔ وہ نوٹ لے کر پیچھے ہٹا تو بولا "یہ لیں، یہ رہے بیس ہزار ان کو جلدی سمیٹ لیں وہ انتظار کر رہے ہوں گے۔"

دو سپاہی اس کے ساتھ اور بھی تھے مگر وہ دونوں کمروں کے باہر برآمدے میں کھڑے تھے کیونکہ لاکھو نے پردے کا ایسا ڈھونگ رچایا تھا کہ انہیں سمجھ ہی نہ آسکی کہ معاملہ کیا ہے۔ کنڈیارو صاحب نے وہ رقم جلدی جلدی قمیص کے اندر ڈال کر پتلون کی بیلٹ میں اڑسی۔ اور فوراً ہی باہر نکل گئے۔ ہم اسی وقت اسٹور سے نکلے اور اس کمرے میں آ دھمکے جہاں سے ہم ان لوگوں کی باتیں سن سکتے تھے لاکھو نے یوں کر رکھا تھا کہ ان کمروں تک کسی کی رسائی ناممکن بنا دی تھی۔ اندر آنے کے لیے دوسرا راستہ استعمال کرنا پڑتا تھا۔

"مجھے افسوس ہے جناب ان کمروں میں بھی کوئی نہیں ہے۔ ان کی تین عورتیں موجود تھیں۔ ساری حویلی ہم نے چھان ماری ہے۔"

"مجھے بھی یہی یقین تھا کہ وہ اس حویلی میں نہیں آئے ہیں۔ متصل گاؤں بھی ہم نے دیکھ لیا ہے وہ کسی اور طرف نکل گئے ہیں۔"

یہ بیگ صاحب کی آواز تھی۔ ان کو وہاں روک کر کھیری صاحب نے کنڈیارو صاحب کو ہماری طرف بھیجا تھا کیونکہ اپنے حسابوں وہ زبردست غلطی کر چکے تھے۔ اگر وہ بیگ صاحب کو ادھر بھیجتے تو ہم ان کے ساتھ "کھنچے" چلے آتے۔ وہ ایسا ہی آدمی تھا اور ہماری مار سہہ چکا تھا۔ اس کے منہ میں جو بھین اٹھتی تھی وہ اس کے انتقامی جذبے کی مظہر تھی، وہ ہمیں کبھی بھی نہیں بخشتا، مگر اب اس کا پیالہ بھر نکلا تھا۔ وہ بالکل ہی نڈھال نظر آتا تھا۔ کوئی پوچھے، تجھے پوربی زردہ کس نے کھلایا ہے۔ خود تو نے ہمیں للکارا اور اب خود ہی ناکام لوٹ رہا ہے۔ لاکھو کی تدبیر کامیاب ہو گئی تھی۔ اس نے بڑے تحمل سے پولیس کا وہ وار روک لیا تھا۔ پچاس ہزار روپے کنڈیارو صاحب کی جیب میں تھے اور وہ ان کی گرمی محسوس کر رہے تھے۔

"اچھا لاکھو صاحب! اجازت دیں، ایک نہ ایک دن تو وہ لوگ ہمیں ضرور ہی ملیں گے۔ ہم ان کے لیے بہت دنوں سے پُرز مال لیے پھرتے ہیں۔" کھیری صاحب نے کہا۔

"میں تو ہر وقت حاضر ہوں جناب، وہ مجھے کہیں بھی نظر آئے تو میں انہیں پکڑ لوں گا انشاء اللہ۔" لاکھو نے کہا۔ وہ بہت ہی عیار آدمی تھا اور اسے رشوت دینے کا ڈھنگ بھی آتا تھا۔ ایسی میٹھی زبان تھی اس کی کہ کھیری صاحب بھی اس کے شیشے میں اتر آئے وہ اس سے ہاتھ ملا کر اسی وقت باہر نکل گئے۔ سورج بس غروب ہو ہی چاہتا تھا۔ لاکھو انہیں چھوڑنے کے لیے باہر نکلا اور جب آدھ گھنٹے بعد وہ واپس آیا تو بہت ہی خوش تھا۔ حویلی کے تمام چھوٹے بڑے دروازے اس نے بند کروا دیے اور سیدھا ہمارے پاس آ دھمکا۔ مجھ سے وہ یوں ملا جیسے صدیوں بعد میری اس سے ملاقات ہو رہی ہو، بولا "تجھے نئی زندگی مبارک ہو جیلانی! ورنہ آج تو تم مارے ہی گئے تھے۔"

"ہاں! اور یہ سب تیری مہربانی ہے لاکھو! تو جانتا ہے کہ کس کو کب اور کن حالات میں رشوت دینی چاہیے۔"

"تجھے بھی مبارک ہو آپی! تیرے لیے بھی میں نے ڈھیروں دعائیں مانگی تھیں آؤ میرے کمرے میں بیٹھو۔ میرا خیال ہے کہ یہ سب حسنہ بی بی کی وجہ سے ہوا ہے پتا نہیں دل میں یہ کیسی کیسی دعائیں مانگ رہی تھی۔"

"ہاں! میں واقعی ان کی زندگی چاہتی تھی۔ ایک زندگی اللہ نے مجھے بھی بخشی تھی۔ اس کے عوض میں ان کے لیے دعائے خیر کر رہی تھی۔" حسنہ نے برجستہ کہا۔ اسے بھی ہماری اس رہائی پر دلی خوشی محسوس ہوئی تھی۔

"ویسے تم دونوں بہت مال لیے پھرتے ہو میرے پاس

وہی تھا جو میں نے دے دیا۔ بہت بوڑھے اور مالدار لوگ ہو تم۔"

"یہ بات نہیں ہے لاکھو! بہرحال یہ لو یہ ایک لاکھ روپیہ ہم تمہیں دیتے ہیں، یہ رکھ لو۔" میں نے آپی سے بریف کیس لے کر اس میں سے رقم گن کر اسے دے دی، مگر وہ اس نے لی نہیں، خاموشی سے میرا ہاتھ پیچھے ہٹا دیا، منہ سے کچھ نہیں بولا۔ میں نے اصرار کیا تو کہنے لگا۔ "میں آپ کا شکر گزار ہوں جیلانی! اور میرا خیال ہے کہ میں اس کا حقدار بھی ہوں۔ یہ سب لوگ حقدار ہیں۔ آپ کو بچا لینا ایک معجزہ تھا۔ میری اپنی رقم تو سکھر کے ایک بینک میں ہے ضرورت پڑتی ہے تو وہاں سے منگوا لیتا ہوں مگر آپ کو بچا لینے کی قیمت ہم نہیں لیں گے اور اب اسی خوشی میں ایک دور شراب کا بھی ہو جائے۔ میں نے آج تمہارے لیے مرغ روسٹ بھی تیار کروایا ہے۔"

"نہیں اس کی تو ہمیں معافی ہی دو۔ یہ ہمارا مسلک نہیں ہے بس دو گھڑی یہاں ٹھہر کر آگے نکل جائیں گے۔ ہماری وہ گاڑی تو باہر نکلوا دو۔" میں نے رقم بریف کیس میں ڈال لی۔ لاکھو کی زیادہ آزمائش ٹھیک نہیں تھی۔

"اسے وہیں پڑا رہنے دو۔ کیا کرو گے ساتھ لے جا کر؟"

"نہیں یار! بہت عمدہ گاڑی ہے۔"

"اللہ تمہیں اور دے دے گا مگر آگے کہاں جاؤ گے؟ ہمارے آدمی واپس آتے ہیں تو پھر سوچیں گے، ہمیں کیا کرنا ہے۔ دو دن اور ٹھہر جاؤ۔ میں صبح ان کو تار دے دوں گا۔"

وہ رات ہم نے لاکھو کے ہاں ہی گزاری۔

صبح ہوئی تو میں نے پو پھٹتے ہی بستر چھوڑ دیا۔ کوئی آدمی لاکھو کو جگا رہا تھا۔

"کیا بات ہے سائیں! کیوں اتنی صبح جگا رہے ہو ابھی نہیں؟"

"ایک ایسی ہی بات ہے۔ لاکھو سائیں اٹھ جائیں۔ میں لشکر علی ہوں۔ ضروری پیغام لایا ہوں۔"

لاکھو نے آنکھیں کھول دیں اور انگڑائی لیتے ہوئے وہ بستر سے اٹھ گیا۔

"لشکر علی! یہ تو ہے، کہاں رہا اتنی دیر۔ بہت دن لگا دیے ہیں تو نے۔" لاکھو نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"سائیں میں ادھر ہی گیا تھا۔ راولپنڈی کی طرف۔ خبر اچھی نہیں ہے۔ اسی لیے مجھے دیر ہو گئی۔"

"آخر ہوا کیا ہے، وہ آسیہ کہاں ہے؟"

"سائیں! مجھے جو کچھ معلوم ہے، اس سے تو یہ پتا چلتا ہے کہ اس نے جس روز اس ڈاکٹر کو قتل کیا۔ اسی روز وہ راولپنڈی سے نکل کر میانوالی جا ٹھہری۔ اس کی کوئی دوست رہتی تھی وہاں، جیل میں وہ اس کے ساتھ رہی ہے۔ اس عورت کا نام شب خیر ہے اور وہ اچھی عورت نہیں ہے۔ اس کے ہاں آسیہ پندرہ دن رہی۔ بچہ بھی وہیں ہوا اس کے ہاں، مگر ابھی وہ چلے میں ہی تھی کہ شب خیر نے اس کا سودا کر لیا۔ اور اسے کسی آدمی کے ہاتھ بیچ دیا۔ میں شب خیر کو ساتھ لے کر ادھر گیا۔ قندیار گاؤں میں وہ کسی جاگیردار کے ہاں ٹھہری ہے لیکن اس سے کوئی مل نہیں سکتا۔ جاگیردار کا نام مکرم علی ہے اور وہ جگہ میانوالی سے بہت دور ہے۔ مجھے یقین ہے آسیہ کو اس نے زبردستی گھر میں ڈال رکھا ہے۔"

"یہ کیا بکواس کر رہا ہے تو۔ یہ شب خیر کون تھی؟ یہ سن رہے ہو جیلانی سائیں اس کتے کی بکواس۔" اس نے تکیے تلے رکھا پستول اٹھا کر پیٹی میں رکھتے ہوئے کہا۔

"تو آسیہ کا پتا کرنے گیا تھا؟"

"ہاں سائیں، میں وہیں سے آ رہا ہوں میرے ساتھ صفدر علی بھی تھا۔ وہ ہسپتال میں ہے کسی نے ادھر قندیار سے نکلتے ہی اسے چھری ماری تھی۔ میں بھی بڑی مشکلوں سے بچا ہوں۔ دو چاقو میرے بھی بازو پر لگ گئے تھے۔ حملہ آور دو تھے اور وہ خنجروں سے مسلح تھے۔ بے خبری میں انھوں نے ہم پر اس وقت حملہ کیا جب ہم تانگے میں بیٹھے تھے۔ اسی حالت میں صفدر کو میں میانوالی کے ہسپتال میں لے گیا۔ وہ ابھی تک وہیں ہے اگرچہ رو بصحت ہے۔ پر یہ اچھا نہیں ہوا شب خیر نے آسیہ کا بچہ خود سنبھال رکھا ہے۔"

"کیا اچھا نہیں ہوا۔ تیرا بچ جانا کہ صفدر کا زخمی ہونا؟"

"اٹھ جائیں جیلانی سائیں، یہ تو قصہ ہی کچھ اور ہو گیا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ غسل خانے میں جا گھسا۔ میں اپنی جگہ بیٹھا آسیہ کی قسمت پر گریہ وزاری کرتا رہا۔ اس پر ابھی یہ افتاد بھی باقی تھی۔ کسی جاگیردار کے حرم کی زینت بھی بننا تھا اسے۔ یہ ذلت بھی اس کی راہ میں پڑی تھی۔ ایک بیڑی تو میں نے کاٹ ڈالی۔ وہ اس سے بچ کر زندہ سلامت باہر بھی آ گئی تھی مگر اب کی بار جس مشکل میں وہ پھنسی تھی، اس میں تو اس کا جسم راکھ راکھ ہو جائے گا۔ وہ جاگیردار اس سے کیا کچھ نہیں چاہتا ہوگا۔ کیسے کیسے ناچ وہ اس سے نچواتا ہوگا۔ میں۔۔۔ میں اس کا خون پی جاؤں گا۔ غضب خدا کا، میری بہن اور یوں لچوں کا تختہ بن کر رہ جائے۔ یہ۔۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میرے پروردگار! تو نے آسیہ کو کیسی قسمت دی ہے۔ یہ تیرے بندے اس پر قہر بن کر ٹوٹ پڑے اور تیری قدرت خاموش رہ گئی۔ ایسی معصوم لڑکی کو بیسوا بنا دیا گیا، یہ کیونکر ہو گیا ہے میرے پروردگار؟

میں اٹھ کر آپی کی طرف چل دیا۔ وہ عقبی حصے میں بڑے آرام سے لیٹا ہوا تھا۔ مجھے سامنے دیکھ کر وہ اٹھ بیٹھا۔

"کیا بات ہے ہاشم خان؟"

"ادھر تو معاملہ ہی اور ہو گیا ہے۔"

"کیسا معاملہ؟ خیر تو ہے نا! تیرا تو چہرہ بُری طرح لٹک رہا ہے۔"

"میں آسیہ کی بات کر رہا ہوں۔ وہ پھر زبردست مشکل میں پھنس گئی ہے۔ سُنا ہے اُسے کسی عورت نے کسی جاگیردار کے ہاتھ بیچ دیا ہے۔"

"یہ... یہ کیسے ہو سکتا ہے یار! پاگل ہے وہ لڑکی۔ وہ کیسے بک گئی؟ میری سمجھ میں تو کچھ آتا نہیں ہے۔"

"یہ تو جا کر ہی معلوم ہو گا کہ اصل معاملہ کیا ہے، اب کی بار لاکھو بھی ہمارے ساتھ جائے گا۔"

"تو جگا دے اُسے ہم آج ہی وہاں پہنچیں گے۔ یہ تو گویا غریب کی جورو سب کی بھابی، ایسی بات ہو گئی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" آبی نے بستر سے اٹھ کر جوتا پہنتے ہوئے کہا۔ اسے سخت طیش آنے لگا تھا۔ آسیہ کو وہ ایسی ہرگز نہیں سمجھتا تھا۔ وہ میری بہن تھی مگر مجھ سے کتنی مختلف، جو چاہتا تھا، اس سے وہی کام لے لیتا تھا۔ کسی شب خیر کی وہ مہمان ہوئی اور اسی کے ہاتھوں بک گئی۔ وہ ایسی ہی سستی اور ایسی ہی مہمل ہو کر رہ گئی تھی۔ نہ اُسے اپنی انا کا خیال تھا نہ اپنی حیا کا۔ یہ کیونکر ممکن ہو گیا؟ آسیہ تو ایسی ہرگز نہیں تھی۔ لاکھو تو لاکھ جتن کر کے اس تک پہنچا تھا۔ وہ اس کی مجبوری تھی۔ وہ جیل میں تھی اور بندے کی عاجزی، محکومی اور لاچاری کا احساس تو وہیں جا کر ہوتا ہے مگر اب کی بار تو وہ آزاد تھی، اپنے فیصلے خود کر سکتی تھی۔ وہ کیوں کر مغلوب ہو گئی؟ یہ سوال ایسا تھا جو میں حل نہیں کر سکتا تھا۔

لاکھو نہا کر باہر نکلا تو میں نے آبی کو اس کے پاس بٹھا دیا اور خود غسل خانے میں جا گھسا۔ کوئی ایک گھنٹے میں ہم منتھل سے جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ مگر سوال یہ تھا کہ حُسنہ کیا کرے گی؟ کہاں ٹھہرے گی؟ جن کا کوئی نہیں ہوتا وہ اس دُنیا میں کس کس کے پاس جا کر رہتے ہیں؟ ایک گھر لاکھو کا تھا۔ ہم حسنہ کو وہاں بٹھا سکتے تھے۔ لاکھو نے کہا بھی مگر وہ نہیں مانی، بولی "میں یہاں رہ کر کیا کروں گی، مجھے آپ اپنی والدہ کے پاس بھیج دیں، میں وہیں جا ٹھہرتی ہوں۔"

آبی نے اُس کی یہ بات سُنی تو دُزدیدہ نگاہ سے میری طرف دیکھنے لگا، بولا "ٹھیک ہے تم سیف علی کے ساتھ آج ہی میرے گاؤں چلی جاؤ، پتا میں لکھ دیتا ہوں اور یہ روپیہ بھی ساتھ لے جاؤ اور وہاں جا کر آرام کرو۔" یہ کہہ کر اس نے ڈیڑھ لاکھ روپیہ حُسنہ کے حوالے کر دیا اور ایک رقعہ لکھ کر اس نے سیف علی کو دیتے ہوئے کہا "سیف علی! تم اس لڑکی کو لے کر سیدھے میرے گاؤں چلے جاؤ۔ ماں جی سے مل کر میرا بہت بہت سلام کہنا، میں بھی جلد ہی آ جاؤں گا۔ کیا خیال ہے لاکھو! میں اسے بھیج دوں؟"

"کیا حرج ہے، یہ لڑکی وہاں زیادہ محفوظ رہے گی۔" لاکھو نے کوئی تعرض نہیں کیا۔ طے یہ پایا کہ سیف علی ہمارے ساتھ ہی حسنہ کو لے کر لاہور تک سفر کرے گا۔ مگر ہم ابھی تیار ہو رہے تھے کہ لاکھو کے آدمیوں نے اندر آ کر اطلاع دی کہ پولیس ابھی تک اسی علاقے میں ہے اور جگہ جگہ چھاپے مارتی پھر رہی ہے۔

"ارے، یہ تو بہت بُرا ہوا۔ وہ چلے کیوں نہیں گئے، خیر کوئی بات نہیں، ہم کشمور کے راستے سے ہو کر آگے نکل جائیں گے۔"

"مگر حضور، وہ ہمیں کیسے جانے دیں گے؟ ہر طرف اُن کے سپاہی موجود ہیں۔" آبی نے پھر سے پلنگ پر دھرنا مارتے ہوئے کہا۔

"باہر نکلنے کے بہت سے راستے ہیں، آپ بے فکر رہیں۔ اٹھیں میں گھوڑا نکلواتا ہوں۔" لاکھو نے کہا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم نے حویلی سے باہر قدم نکال دیے۔ تین گھوڑے تیار کھڑے تھے۔ طے یہ پایا تھا کہ سیف علی اس روز حُسنہ کو لے کر سیدھا سکھر جائے گا اور وہاں سے لاہور کی طرف نکل لینا اس کے لیے آسان ہو گا۔ حُسنہ نے برقعہ پہننے کی ہامی بھر لی تھی۔ اگرچہ وہ بے پردہ ہی پھرتی تھی مگر سیف علی کے ساتھ جانے کے لیے یہ پابندی اُس نے قبول کر لی تھی۔

ہم گھوڑوں پر سوار ہوئے اور منتھل کے شمال کی طرف چل نکلے۔ سورج ابھی سوا نیزے پر نہیں آیا تھا۔

آبی کی نظر شاید کچھ زیادہ ہی تیز ہو گئی تھی۔ بولا "ذرا دیکھ بھال کر چلو اور پستول ہاتھ تلے رکھو، وہ لوگ کہیں راستے میں گھات لگا کر نہ بیٹھے ہوں۔"

"وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ یہ راستہ کھیتوں میں سے ہو کر نکلتا ہے، ہم جلدی ہی غوث پور جا پہنچیں گے۔" لاکھو اس علاقے سے پوری طرح واقف تھا۔ اسے بھی آسیہ کے غم نے نڈھال کر دیا تھا اور وہ جس قدر جلدی ممکن تھا، اپنے 'بیٹے' کے پاس پہنچنا چاہتا تھا۔ وہ کسی قیمت پر اپنے بچے کو خود سے جُدا نہیں دیکھ سکتا تھا، یہ اس کی خوبی تھی۔ اُس نے دل میں طے کر رکھا تھا کہ وہ آسیہ کو اپنی منکوحہ کی حیثیت سے زندگی کا ساتھی بنا لے گا اور بچے کو اپنے کندھے پر بٹھا کر دنیا بھر کی سیر کرائے گا، وہ یہی کہتا تھا۔ مجھ سے اس نے آسیہ کے بارے میں بہت کچھ کہا تھا۔ اُسے افسوس یہ تھا کہ وہ اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکا۔ وہ آئی بھی اور چلی بھی گئی، مڑ کر اُس نے دیکھنا بھی پسند نہیں کیا تھا، اُسے شاید لاکھو سے نفرت ہو چکی تھی۔ جب ہی تو اُس نے منتھل پر رہنا پسند نہیں کیا تھا مگر اب وہ جس پیچ میں جا پھنسی تھی وہ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ وہ دونوں اس خیال کے حامی تھے کہ اُن کوئی ایسی ہی افتاد آ پڑی تھی کہ پولیس سے جان چھڑانے کے لیے اس نے کسی جاگیردار کے ہاں پناہ لے لی تھی۔ اس پر ڈاکٹر کے قتل کا جرم تو ثابت ہی تھا۔ کوئی اور بھی قتل اُس نے ضرور کیا تھا۔ میں سُن چکا تھا۔ اپنی خودداری کو ورنہ وہ یوں ترک نہ کر دیتی۔

غوث پور سے ابھی ہم کچھ میل دُور ہی تھے کہ ہمیں کچی ناہموار سڑک کے کنارے پولیس کے کئی سپاہی کھڑے نظر آئے۔ وہ شاید ابھی تک ہماری تلاش میں پھر رہے تھے۔ ڈی آئی جی کھچری صاحب نے اُن کی نیندیں حرام کر رکھی تھیں، ان کو سب سے پہلے آبی نے دیکھا اور ہمیں رُکنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا "ان سے بچو، یہ پولیس کے آدمی ہیں اور ہماری تلاش میں ہیں۔"

ہم نے فوراً ہی گھوڑے روک لیے، آبی ٹھیک کہہ رہا تھا۔ سپاہی دھوپ سے بچنے کے لیے درختوں کے سائے میں ٹھہرے ہوئے تھے اور جس جیپ میں وہ وہاں آئے تھے وہ خالی کھڑی تھی۔ ہمارے اور اُن کے درمیان فاصلہ یہی کوئی آدھ فرلانگ سے بھی کم تھا، مگر جہاں ہم کھڑے تھے وہ جگہ زیادہ اونچی تھی اور سامنے کا منظر وہاں سے صاف نظر آتا تھا۔

"یہ تو بہت گڑبڑ کی بات ہے۔ ہمیں راستہ بدل لینا چاہیے۔" یہ کہہ کر لاکھو نے گھوڑا بائیں طرف بھگا دیا۔ آبی بھی اس کے پیچھے ہو لیا۔ ہمیں اس علاقے سے بچنے کے لیے سخت جدّوجہد کی ضرورت تھی۔ ابھی میں نے گھوڑے کو ایڑ دی ہی تھی کہ اُن لوگوں نے ہم کو راستہ بدلتے دیکھ لیا۔ وہ چونک کر اٹھے اور سب کے سب تیزی سے جیپ کی طرف لپکے۔ اُن کے تعاقب نے ابھی تک ہماری جان نہیں چھوڑی تھی۔ پیشتر اس کے کہ وہ جیپ سیدھی کرتے، ہم گھوڑے بھگاتے ہوئے خاصے آگے نکل گئے۔ مگر ان لوگوں نے ہمارے عقب میں آنے کے بجائے ہمیں سامنے سے مارنے کی کوشش کی اور بڑی ہی برق رفتاری سے وہ ہمارے سامنے آ گئے۔ فاصلہ بھی کوئی دو سو قدم کا تھا۔ ہم نے اُن کی جیپ کا رخ اپنی طرف دیکھا تو گھوڑوں کو دائیں جانب بھگا دیا۔ لاکھو اور آبی مجھ سے کافی دُور نکل گئے، وہ میرا انتظار نہیں کر رہے تھے اور میری مشکل یہ تھی کہ رکاب ٹوٹ جانے کی وجہ سے میں گھوڑے کو قابو میں نہیں.... رکھ سکتا تھا، اس کے باوجود میں نے اس کی لگام ڈھیلی نہیں ہونے دی۔ اب جیپ اِتنی قریب آ گئی تھی کہ وہ براہ راست ہم پر گولی چلا سکتے تھے۔ راستہ بہت ہموار تھا۔ یوں سمجھیں کہ کھیت بالکل صاف پڑے تھے۔ نئی فصل کی تیاری ابھی ہو رہی تھی۔ ستمبر آ لگا تھا اور میں حیران تھا کہ میری قبر کہاں بنے گی۔ خیال سارے کا سارا موت کی سمت لگا تھا کیونکہ عقب میں وہ لوگ موت بن کر ہمارے پیچھے لپک رہے تھے۔ عین اس وقت کسی نے ہم پر اندھا دُھند گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ ایک دو تین، میرے آگے پیچھے سے کئی گولیاں نکل گئیں۔ میں نے اپنی رفتار اور تیز کر دی اور گھوڑے کو پاگلوں کی طرح بھگاتا ہوا بائیں ہاتھ لے چلا۔ آبی اور لاکھو کچھ زیادہ دور نہیں تھے، اب گولیاں ان پر برس رہی تھیں۔ جیپ میں سوار سارے جوان مسلح تھے اور یہ طے کر کے نکلے تھے کہ وہ کھچری صاحب کی عزت کے لیے اپنی جانیں بھی قربان کر دیں گے، انھیں یقین تھا کہ اصل مجرم ہم ہی ہیں ورنہ ہم انھیں دیکھ کر یوں نہ بھاگتے۔ اور یہی ہماری سب سے بڑی غلطی تھی۔ عین ممکن تھا کہ اُن میں سے کسی نے بھی ہمیں نہ دیکھا ہو۔ وہ بیگ صاحب تو اُن کے ساتھ نہیں تھے۔ کھچری صاحب اُن کو اپنی جیپ میں لیے پھرتے تھے۔ یہ کوئی اور ہی پارٹی تھی۔ اور ایسی ایسی کئی پارٹیاں ان لوگوں نے ہماری تلاش میں چاروں طرف بھیج رکھی تھیں۔

تب میں نے دیکھا کہ ایک آتش بداماں گولی لاکھو کی کمر میں جا لگی ہے۔ وہ جس انداز سے اچھل کر گھوڑے سے نیچے گرا اس سے میں نے یہی اندازہ لگایا کہ کوئی گولی کام کر گئی ہے۔ اسے گرتا ہوا دیکھ کر آبی ذرا دیر کے لیے رکا مگر پھر عقب میں لپکتی موت کو دیکھ کر وہ بھاگ نکلا۔ اس کا گھوڑا برابر اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ میں نے چاہا کہ رُک کر، لوٹ کر لاکھو کو اٹھا لوں مگر یہ ممکن نہیں تھا۔ میں اور زیادہ تیز رفتاری سے بھاگا، مجھے ہر حال میں اپنی جان بچا لینی چاہیے تھی۔ میں اتنا سستا تو نہیں تھا کہ وہ مجھے یوں ہی بے موت مار دیتے۔ اور لاکھو تو میرے نزدیک بہت ہی قیمتی تھا۔ مگر اس کو بچا لینا میرے لیے کسی بھی طرح ممکن نہیں تھا۔

لاکھو کو گرتا دیکھ کر جیپ کی رفتار آہستہ ہوئی تو اس لمحے کی مہلت سے فائدہ اٹھا کر ہم گھوڑا بھگاتے ہوئے بہت آگے نکل گئے۔ میرے اور آبی کے درمیان اب بیس ہاتھ کا فاصلہ تھا۔ جیپ لاکھو کے پاس رُکی تو ہم وہاں سے ایک فرلانگ سے زیادہ دُور نکل چکے تھے۔ گھوڑے ہمارا پورا ساتھ دیتے رہے تا وقتیکہ ہم ان کی زد سے کوئی دو میل دُور نکل گئے۔ آبی بُری طرح ہانپ رہا تھا۔ گھوڑے کو میرے قریب لا کر بولا "یہ کیا ہو گیا ہے جیلانی! وہ لاکھو! اس کو تو بچا لیا ہوتا تم نے، اسے گولی لگ گئی ہے۔"

"مجھے معلوم ہے مگر ہم وہاں رُک نہیں سکتے تھے آبی! یہ پاگل پن ہوتا۔ زخم گہرا نہیں ہے تو پھر وہ بچ جائے گا۔ میرا خیال ہے گولی کمر میں لگی ہے۔"

"ہاں یہی ہوا ہے، پر یہ کیا ہو گیا ہے یار! ہماری بچت کی کوئی صورت نہیں تھی۔ یہ تقدیر ہمارے ساتھ کیا کر رہی ہے۔" اس کا لہجہ بہت ہی زخم خوردہ تھا اور اُس کے سینے میں سانس کی دھونکنی کام نہیں کرتی تھی۔

"وہ بیگ صاحب اُن کے ساتھ تھا۔ وہی انھیں سب کچھ بتا رہا تھا۔ میں نے خود دیکھا ہے۔"

"اچھا، کمال ہے۔ میں سمجھا تھا وہ کچہری صاحب کے ساتھ ہوگا۔ گھوڑے کو تیز رکھو۔ ہم سخت مشکل میں ہیں۔" میں نے آبی کو تیزی سے اپنے پیچھے آنے کے لیے کہا۔ ذرا دیر کے لیے اس کی رفتار دھیمی پڑ گئی تھی مگر پھر اس کو احساس ہونے لگا کہ اس سے غلطی ہو گئی ہے۔ ہم دونوں نے اپنے مرکب پھر سے راہ پر لگا دیے۔ غوث پور ہمارے دائیں ہاتھ رہ گیا اور ہم لاکھو کے مدفن سے بہت آگے کئی میل آگے نکل گئے۔ اس کی قبر دیکھنے کی فرصت کس کو تھی۔ کون رک کر پوچھتا کہ اس کو گولی کہاں لگی ہے۔ اس کے وہ سارے خواب دھرے کے دھرے رہ گئے۔ آسیہ کے بارے میں اس نے جو کچھ سوچا تھا، وہ کسی کام نہ آیا۔ اور پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ بن بیاہی آسیہ بیوہ ہو چکی ہے۔ ہاں مجھے یقین ہونے لگا تھا کہ لاکھو مر گیا ہے اور آسیہ ابھی ابھی بیوہ ہوئی ہے۔ اور اس کا بچہ یتیم ——— یہ سوچتے ہی میرا مغز خراب ہونے لگا۔ میں نے چاہا کہ میں لوٹ کر اُن پر جا پڑوں، اُن سے لاکھو کی لاش چھین لوں۔ میں نے گھوڑے کو موڑ بھی لیا۔

آبی نے جب مجھے پیچھے لوٹتے دیکھا تو میرے سامنے آ گیا۔ بولا "یہ کیا کر رہا ہے تو! جیالانی تو ہوش میں نہیں ہے کدھر جا رہا ہے تو؟"

"کچھ نہیں یار! تو دیکھتا نہیں انھوں نے میری بہن کو بیوہ بنا دیا ہے، تو سوچتا ہی نہیں۔ وہ میری بن بیاہی بہن کس عذاب میں پھنس گئی ہے۔"

"پاگل ہو گیا ہے تو! کیسا عذاب جھیل رہا ہے تو ——— وہ بیاہی کب تھی اور بیوہ کب ہو گئی۔ تو لاکھو کو اپنا بہنوئی سمجھنے لگا ہے! نہیں یار! باز آ جا اس خیال سے، چل آگے نکل۔" اس نے یہ کہہ کر گھوڑا میرے گھوڑے سے ٹکرا دیا۔ "چل آگے۔ ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے یہ بہت ہی خطرناک جگہ ہے۔"

میں نے گھوڑے کا رخ پھر دوسری طرف پھیر لیا۔ آبی ٹھیک کہتا تھا۔ ہمیں وہاں سے نکل جانا چاہیے تھا۔ ہم کس کے رشتے دار تھے؟ کون تھا ہمارا جس کے لیے ہم رکتے؟ اور وہ لاکھو تو خود اپنے ضمیر کا قیدی تھا۔ اپنے ہی بوجھ تلے مرا جاتا تھا۔ اس کو یہ احساس لے ڈوبا تھا کہ جیل میں اس سے زبردست قسم کی غلطی ہو چکی ہے اسی کے ازالے کے لیے وہ ہمارے ساتھ چل نکلا تھا۔

میں ایک بار پھر آبی کے ساتھ ہو لیا۔ ہم وہاں سے کوئی بیس میل آگے نکل آئے۔ راستے میں دو گاؤں ہمیں ملے مگر اُن میں ٹھہرنے کا ارادہ ہم نے ترک کر دیا۔ ہم آگے ہی بڑھتے چلے گئے۔ جیپ دوبارہ ہماری طرف نہیں لپکی۔ وہ ادھر ہی لاکھو کی لاش پر صبر کر کے رہ گئے۔ ہمارے تعاقب میں کوئی نہیں آیا۔ حالانکہ اُن کے پاس وقت تھا مگر جانے وہ کیا سوچ کر چپ ہو رہے۔ میرا یہ خیال تھا کہ انھیں ہم دوبارہ مل ہی نہیں سکے۔ راستے میں غوث پور بھی آتا تھا اور کئی گاؤں بھی۔ وہ اِدھر اُدھر ہی دیکھتے رہ گئے ہوں گے، ورنہ وہ ہمیں کبھی نہ چھوڑتے۔

دوپہر ڈھلی، سہ پہر سر پر آ گئی۔ ہم اس وقت تک گھوڑوں پر چالیس میل کا سفر طے کر آئے تھے۔ اُن کے پسینوں سے ہم نے یہی اندازہ لگایا تھا۔ بریف کیس آبی نے بہت مضبوطی سے کاٹھی پر باندھ رکھا تھا۔ وہ اس پر ٹھہر ٹھہر کر ہاتھ پھیرتا چلا جاتا تھا۔ ہم ایک گھنے جنگل کے کنارے پہنچ کر گھوڑوں سے اتر گئے۔

"میرا خیال ہے ہمیں یہاں رک کر ذرا دیر آرام کر لینا چاہیے۔"

آبی نے گھوڑے سے اترتے ہی سگریٹ سلگا لیا۔ پسینے سے وہ بھی اٹا ہوا تھا۔ اور میں تو کچھ زیادہ ہی بھیگ چکا تھا۔ ہم پر پولیس کے یہ دو حملے کچھ ایسے سخت اور ایسے تابڑ توڑ تھے کہ ہمارے لیے اپنی جان بچانا مشکل ہو گیا تھا۔ بدن میں درد جاگ اٹھا تھا۔ جنگل کا وہ کنارہ خاصا گھنا تھا۔ گھوڑے ہم نے درختوں کے نیچے کھڑے کیے اور خود بھی سائے میں بیٹھ گئے۔

آبی نے اپنی قمیص اتار دی۔ بنیان اس کی کچھ زیادہ ہی بھیگی ہو رہی تھی۔ پسینہ سکھاتے ہوئے وہ بولا "سنا ہے ان جنگلوں میں ایک پرندہ ملتا ہے جس کا نام ترزو ہے وہ جسے نظر آ جائے اس کی قسمت چمک اٹھتی ہے دیکھ تو کہیں تیری نگاہ میں آ گیا ہے وہ؟"

"میں تیرا مطلب سمجھ رہا ہوں مگر قسمت ہم دونوں کی اچھی نہیں ہے سب کچھ ہونے کے باوجود ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔"

"نہیں! میں نے تو ایک نجومی کو ہاتھ دکھایا تھا، کہتا تھا کہ تو بہت خوش نصیب ہے، ایک اداکارہ تیری یار بن جائے گی اور بھی کئی باتیں بتائی تھیں اس نے جو میں اب بھول رہا ہوں۔"

"اور یہ بتایا ہوگا کہ تیری قسمت میں اپنی موت نہیں، پھانسی کا پھندا یا بندوق کی گولی وغیرہ تیری تقدیر ہے۔ لا ادھر یہ سگریٹ دے مجھے اور یہ سوچ کہ وہ جو ہمارے پیچھے ہیں اُن سے کب جان چھوٹے گی۔"

وہ ہنس دیا۔ سگریٹ میری طرف بڑھا کر بولا "یار میرے تو گوڈے گٹے سوج گئے ہیں، پر یہ تیری رکاب کیا ہوئی؟"

"خراب ہو گئی تھی۔ پھر بھی میں گھوڑے کو دوڑاتا ہی رہا۔ اب اس پر رسّی باندھتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے رکاب پر نظر ڈالی۔

در اصل اس کا تسمہ اپنی جگہ سے ہل گیا تھا وہ میں نے جلدی ہی درست کر لیا۔

"یار مجھے یہ بتا کہ آخر یہ پولیس والے ہم سے چاہتے کیا ہیں؟ کیا بگاڑا ہے ہم نے ان کا؟ کیوں یہ ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتے؟"

"ہاں بہت نیک آدمی ہے تو! ابے اُن کے چھ آدمی مارے گئے، صاف ستھرے مارے گئے اور تو کہتا ہے ان کا بگاڑا کیا ہے ہم نے۔"

"چلو دفع کرو۔ ہم نے بھی تو دو آدمی ضائع کر دیے اپنے۔ میرا یار تاہیا، کوئی دکھ نہیں اس کا تمھیں، اور یہ لاکھو، جسے تو اپنا بہنوئی کہتا ہے۔ یہ نہ مرتے تو زیادہ اچھا ہوتا۔"

"خدا کی مرضی میں کس کو دخل ہے آبی! اُن کی موت اِسی طرح لکھی تھی، خدا کرے لاکھو بچ جائے ورنہ مجھے اس کی موت کا زیادہ افسوس ہوگا۔ اس کا گھوڑا بھی تافی تھا۔ آنکھیں ہی منحوس تھیں اُس کی۔ وہ بھی اس کے ساتھ ہی رک گیا۔ ویرانے کی موت کیسی بے بسی کی موت ہوتی ہے۔"

آبی نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ اس کی نظریں کسی شے کا تعاقب کرنے لگی تھیں۔ میں نے جو ادھر دیکھا تو مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آیا۔ ہمارے سامنے ایک نورانی صورت کا بوڑھا آدمی کھڑا تھا۔ وہ ہم سے چند قدم دور تھا اور ہمیں وہ ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا تھا۔ اُس کی بھویں اور سفید لانبی داڑھی سر پر بندھا سفید پٹکا اور گلے میں لانبا کرتا اور کمر پر بندھے تہمد نے ہمیں ذرا دیر کے لیے حیران کر دیا۔ نگاہیں اس کی ہم پر جمی تھیں اور وہ برابر ہمیں یوں دیکھ رہا تھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ تم اِدھر کیسے آ نکلے۔ اس کے ہاتھ میں تسبیح تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ابھی ابھی نماز سے فارغ ہوا ہے۔

اُسے دیکھتے ہی آبی اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ مجھے بھی اُس کے ساتھ اٹھنا پڑا۔ وہ سفید بابا دو قدم ہماری طرف بڑھا، تو ہمیں یوں لگا جیسے اس کے ہاتھ ہمارے کندھوں پر آ رکے ہیں۔ میں نے اپنی زندگی میں اس جیسا بزرگ صورت بوڑھا نہیں دیکھا۔ رخسار اُس کے سرخ و سفید تھے اور یہی حال اس کے باقی بدن کا تھا۔ بال اُس نے کندھوں پر بکھیر رکھے تھے۔

"سلام بابا جی!" آبی نے آگے ہو کر اسے بڑے ادب سے آداب کہی۔

"سلام میرے بچو! تم دونوں اِدھر کیا کر رہے ہو؟"

"جی بس سستا رہے ہیں ذرا، سفر لمبا تھا۔ ہمیں رکنا پڑا۔" آبی نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔

"بیٹھو بیٹھو! آرام کر لینا اچھا ہے، بڑی تگ و دو ہے زندگی میں۔ یہ جنگل بھی اچھا ہے بڑا سکون ملتا ہے یہاں۔" وہ یہ کہتے ہوئے ہمارے قریب گھاس پر ہی بیٹھ گیا۔

"جی بس اس سائے کو دیکھ کر ہم یہاں بیٹھ گئے ہیں۔ آپ کیا کرتے ہیں یہاں اس جنگل میں؟"

"میری راتیں ادھر ہی گزرتی ہیں اور دن بھی، مگر تم اپنے پیچھے کیسا فساد ڈال آئے ہو؟" اس کی نظریں آبی کے چہرے پر جمی تھیں۔

"آپ کو۔۔۔ آپ کو کس نے بتایا ہے؟"

"نماز پڑھو، اپنے گناہوں کی معافی ——————— طلب کرو۔ ابھی تمھاری توبہ کا دروازہ بند نہیں ہوا ہے میرے بچو! اب بھی وقت ہے۔" اس نے پہلی بار میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اُس کی آنکھوں سے عجیب قسم کی نورانی لہریں اٹھ رہی تھیں جو سیدھی جگر میں اتر جاتی تھیں، اسے دیکھنے کا فن آتا تھا۔ اس دوشیزہ کی طرح جسے اپنی آنکھ پر بہت ناز ہو، جسے معلوم ہو کہ اُس کی نظریں کیسے قلعے فتح کر لیتی ہیں۔ میں جب سے بابا کلّے شاہ سے ملا تھا، مجھے کسی اور طرف دیکھنے کی ہمت نہیں پڑی تھی۔ یہ دوسرا آدمی تھا جس کے صدق و صفا نے میرے دل پر گہرا اثر ڈالا تھا۔

"آپ، کو۔۔۔ آپ کو کیسے معلوم ہے کہ ہم کیا کر آئے ہیں؟"

"ہمیں کہاں معلوم ہے، ہمیں کسی نے بتایا تھا۔ پتا نہیں کون تھا۔ پر۔۔۔ پر یہاں سے نکل جاؤ، اسی میں تمھاری بہتری ہے وہ تمھارے تعاقب میں آ رہے ہیں اُن کے ہاتھ نہ آ جانا۔ وہ انتقام پر تلے ہوئے ہیں۔ جاؤ میرے بچو! یہاں سے نکل جاؤ۔ خدا تمھارے گناہ معاف کرے، جاؤ۔"

"یہ سب آپ کو کیسے پتا چلا؟ ہمیں تو خود معلوم نہیں کہ ہم کدھر جا رہے ہیں، ہمیں رستہ بتا دیں بابا جی! ہم بہت بھٹکے ہوئے ہیں۔"

"ہمیں معلوم ہے۔ ہم تمھارے لیے دعا کریں گے کاش وہ قبول ہو جائے، مگر تم نے جو کچھ کیا ہے اچھا نہیں کیا۔ کئی جانیں تلف ہو گئیں، ابھی لاکھو بھی شدید زخمی ہے، تاہیا بھی مر گیا۔ کتنے آدمی مار کر مرے گے، ایسا نہ کرو میرے بچو! ایسا نہ کرو۔"

"آپ کو تاہیے کا بھی علم ہے اور لاکھو کا بھی! آپ کون ہیں بابا جی! ہمیں اپنے دامن میں لے لیں، ہم بہت گناہ گار ہیں، بہت گناہ گار۔" آبی سمٹ کر اس کے قریب ہو گیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے بوسہ دینے لگا۔ مگر ابھی اس کے لب آگے جھکے ہی تھے کہ وہ سفید بابا وہاں سے اٹھ گیا، بولا۔

"نکل جاؤ یہاں سے، وقت بہت کم ہے۔" یہ کہہ کر وہ گویا ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ ہم سے ذرا آگے نکلا اور پھر نگاہوں سے اوجھل

ہوگیا۔ ہم پھٹی پھٹی نظروں سے اسے بس دیکھتے ہی رہ گئے۔

"یہ۔۔۔ یہ کون تھا یار! اس نے ہمیں حیران کر دیا ہے۔ کیا بھید تھا اس میں؟" آبی نے حیرت زدہ ہو کر اپنی جگہ سے اچھلتے ہوئے کہا۔ "یہ کون تھا جیلانی؟"

"بیٹھ جا آبی۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ شاید ہماری رُوح تھی۔ انسان کی صورت میں سامنے آ گئی۔ ہمارا دوسرا وجود جو ہمیں سیدھی راہ دکھاتا ہے۔ یہاں سے بھاگ چل' وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وقت بہت کم ہے۔ یہاں سے بھاگ چل آبی! ان کی رفتار ہم سے زیادہ تیز ہے۔" یہ کہہ کر میں نے گھوڑے کی رکاب پر قدم رکھ دیا۔

آبی بھی میرے پیچھے لپکا۔ اُس کی حیرت کم نہیں ہو رہی تھی۔ بولا "یہ کون تھا یار! اسے تو ہر شے کا علم ہے۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ کبھی کبھی آدمی کو اپنا وجود دو حصوں میں نظر آتا ہے ہم دو ہیں مگر وجود ہمارا ایک ہے۔ وہی ہمیں نظر آ گیا۔ یہ کبھی کبھار ہوتا ہے۔ بہت نیک آدمی ہو تو اُس کا عکس ملتا ہے یا بہت ہی بد ہو تو یہ سامنے آ جاتا ہے۔ ایسا ہوتا ہے۔ مجھے تو یہ کوئی آسمانی مخلوق نظر نہیں آئی۔ دیکھا نہیں تم نے اس کے چہرے پر ہم دونوں کا عکس تھا۔"

"نہیں یار! بات کچھ اور ہی نظر آتی ہے' ایسے بزرگ روز روز نہیں ملتے ہیں' اسے ڈھونڈو۔"

"کہاں؟ وہ تو دیکھتے ہی دیکھتے ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ اس کی دو لمحوں کی ملاقات نے ہمیں حیران کر دیا ہے' یہ ایسے ہی کرتے ہیں یہ آدمی کا وجودِ ثانی ہے، ساتھ ساتھ رہتا ہے کبھی کبھار خود کو ظاہر کر دیتا ہے۔"

مگر آبی کو میری بات کا یقین نہیں آیا۔ اُس کے ذہن میں برابر یہ ہلچل مچ رہی تھی کہ سفید بابا کوئی نورانی شے تھی جو ہمیں جنگل میں نظر آ گئی۔ وہ ایسے ہی خبط میں مبتلا رہا۔ ایک عرصے تک وہ اس کے بارے میں مجھ سے عجیب عجیب سوال کرتا رہا۔ مگر میں اسے کیا جواب دیتا جسے ہم نے دیکھ لیا جس سے بات کر لی' اپنی خیر کا مژدہ جس سے سن لیا جس نے ہمیں نیکی اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ وہ ہمارے سامنے رہتا تو جانے کیا ہوتا۔ میں بھی اس کی آمد پر سخت حیران تھا، اُس کی باتیں بھی میرے لیے حیرت کا سبب بنی تھیں۔ مگر میں نے تو دل کو یہی سمجھا لیا تھا کہ وہ ہمارا ہی پرتو تھا ہاں' اسے تسبیح کس نے دے دی' اسے ہمارا حال کیسے معلوم ہو گیا؟ وہ پہلے کبھی ہماری نظر میں کیوں نہیں آیا؟ یہ ایسے سوال تھے جن کا کوئی جواب مجھے نہیں ملتا تھا۔ ہاں اس نے ہماری رہنمائی خوب کی۔ ہم جنگل عبور کر کے آگے بڑھے ہی تھے کہ عقبی حصے میں دو جیپوں کی آواز ہمیں سنائی دی۔ پولیس ابھی تک ہمارے تعاقب میں لگی تھی' اور ہمیں وہاں سے بھاگ کر ہی اپنی جان بچانی تھی۔ اُن کا حملہ ایک بار پھر بہت ہی تابڑ توڑ قسم کا تھا اور انھیں یقین تھا کہ ہم جنگل میں گھس گئے ہیں۔ ہمارے گھوڑوں کے سموں کے نشان اُن کی رہنمائی کرتے تھے۔ اور ہمیں سفید بابا نے یہی کہا تھا کہ ہم جنگل کے بیچ میں سے گزر جائیں' اسے معلوم ہو گا کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ میں اس واقعہ کو یوں بیان کر رہا ہوں کہ اس جیسا کوئی اور واقعہ ہماری زندگی میں رونما نہیں ہوا۔ وہ ایسی ہی خوفناک گھڑی تھی جس میں ہمیں واقعی زبردست رہنمائی کی ضرورت تھی۔ خدا نے ہمیں اس سے محروم نہیں رکھا مگر پھر کبھی وہ سفید بابا رونما نہیں ہوا۔ اگرچہ اَن گنت موقعوں پر ہمیں اس کی اشد ضرورت محسوس ہوئی۔ پتا نہیں وہ کون تھا۔ کئی لوگوں سے میں نے اس کے بارے میں پوچھا مگر کوئی بھی اس کی صحیح طور پر وضاحت نہ کر سکا۔ کاش کوئی ہمیں بتا سکتا کہ وہ کون تھا۔ واقعی وہ ہمارا وجودِ ثانی تھا۔ ہمارے جسم کا غیر مرئی حصہ کیا تھا وہ؟

ہم جنگل کے بیچوں بیچ گزرتے ہوئے آگے نکل گئے گھوڑے تازہ دم ہو چکے تھے۔ ان کے پسینوں کی رالیں ختم ہو گئی تھیں اور ہم دونوں تلونڈے چراغوں کی طرح ایک دوسرے پر جھکے جھکے آگے بڑھ رہے تھے۔ آبی جس ذہنی اضطراب میں مبتلا تھا۔ میں اسے خوب سمجھتا تھا۔ اس نے تلوار پر پاؤں رکھ دیا تھا۔ کئی گولیاں تو بس انگلی برابر فاصلے سے گزر گئی تھیں۔ کوئی بھی اُن میں سے اُسے چیر سکتی تھی۔ آدمی کا جسم شے ہی کیا ہے اور آبی! وہ زنانِ بازاری کا قہقہہ، وہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر تتلی کی طرح کسی خوبرو کو نہال کر دینے والا آبی جس کو موت سے بہت ڈر لگتا تھا' جس نے ابھی جینا سیکھا تھا۔ وہ مرگ آسا دوپہر گزار کر جنگل میں آگھسا تھا اور میری طرف جھک کر چلتا تھا جیسے وہ میرے بغیر جی نہیں سکے گا۔ اُس پر گولی اثر کرتی تو گہری ہی دھنس جاتی۔ پولیس نے اب کی بار طے کر رکھا تھا کہ وہ ہمیں نکلنے نہیں دے گی۔ ہمارا مدفن وہیں کہیں بن کر رہے گا۔ یہی سوچ رکھا تھا اُن لوگوں نے۔ پھر وہ کہہ دیتے کہ پولیس مقابلے میں دو بندے مارے گئے۔ اُن میں ایک کا نام جیلانی تھا اور دوسرے کا آبی۔ اور وہ پولیس کو متعدد مقدمات میں مطلوب تھے۔

ہم جنگل میں سے گزر کر بہت آگے نکل آئے تھے، اور ہمیں یقین تھا کہ پولیس اب ہمارا پنڈ چھوڑ دے گی۔ وہ اتنی دور تک شاید نہیں آ سکتے تھے۔ دراصل ہم اپنا کھرا ساتھ ہی لے آئے تھے۔ ایک لمبی جو ہم نے گھوڑوں کی پیٹھ پر گزار دی تھی۔ اب ہم تنگوان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ایک راہگیر سے ہم نے پوچھ لیا تھا اور وہ ہمیں یہی بتا رہا تھا کہ کچھ دور تنگوان ہے۔

دائیں ہاتھ قندکوٹ اور بائیں ہاتھ سمہ سٹہ۔ زندگی نے ہمیں کیسے کیسے علاقے دکھا دیے تھے۔ ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ہمیں وہ علاقے بھی دیکھنے ہوں گے کبھی جن کے بارے میں ہم کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ میرے ذہن میں آسیہ کا سوال بار بار کچوکے دیتا تھا۔ اس کو کیسی تقدیر ملی تھی۔ ایک بار پھر وہ کسی کی زیرِ بار ہونے پر مجبور ہو گئی، اور اب وہ کوئی جاگیردار تھا مکرم علی' اور اس کی موت آئی تھی میرے ہاتھوں۔

اچانک آبی نے اپنا گھوڑا روک لیا۔ ہم اس وقت ایک گہری کھڈ کے قریب سے گزر رہے تھے۔

"کیا ہوا گھوڑا کیوں روک لیا تم نے؟"

"یہ دیکھو ذرا۔ کوئی آدمی شدید زخمی معلوم ہوتا ہے' یہ نیچے دیکھو۔" میں نے گھوڑے کو ذرا آگے لے جا کر کھڈ کے اندر نظر ڈالی۔

"یار یہ تو واقعی شدید زخمی ہے' یہ آدمی کسی نے مار کر ڈال ڈال دیا ہے اسے یہاں، نیچے اُتر کر دیکھو۔" میں نے یہ کہہ کر گھوڑے سے چھلانگ لگا دی۔ آبی بھی نیچے اُتر آیا اور ہم دونوں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے کھڈ میں اُتر گئے۔ کوئی جوان آدمی تھا جس کے بدن پر کسی نے برچھی سے زخم لگائے تھے اور وہ اوندھا پڑا ہوا تھا۔ لگتا تھا اُس کا آخری وقت آ پہنچا ہے۔ ہم نے اُسے سیدھا کیا تو آبی بولا "کون ہے بھائی تو! تجھے کس نے زخمی کیا ہے؟"

"میں۔۔۔ میں یار محمد ہوں، احمد پور میں رہتا ہوں' مجھے حضور علی نے زخمی کر دیا ہے۔ نکا بھی اس کے ساتھ تھا' وہ بھاگ گئے ہیں مجھے مردہ سمجھ کے۔"

"پر کیوں؟ کیا نقصان کیا تھا تم نے اُن کا؟" میں نے اُسے سہارا دیتے ہوئے کہا۔ پانی کی اسے سخت ضرورت تھی مگر وہاں پانی ہم کہاں سے لاتے' اس کے ہونٹ بار بار اپنی پیاس ظاہر کرتے تھے۔

"وہ۔۔۔ وہ دراصل میری منگنی ہو گئی تھی منیرہ کے ساتھ۔ رانی پور میں رہتے ہیں وہ لوگ۔ اسی بات پر وہ بگڑ گئے۔ حضور علی اور نکا منیرہ کے چچازاد ہیں اور منیرہ کے پاس پچاس بیگھہ زمین ہے وہ اس کا رشتہ خود حاصل کرنا چاہتے تھے۔ مگر اس کی ماں نے منیرہ مجھے دے دی۔ کچھ پانی دے سکو گے۔ مجھے سخت پیاس لگی ہے۔"

"جا آبی! دیکھ تو کسی جگہ سے پانی مل سکتا ہے۔" آبی نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ کھڈ میں بہت آگے برساتی پانی جمع تھا۔ آبی نے دوڑ کر وہاں سے رومال کو پانی میں بھگو یا اور لا کر اس کے منہ میں انڈیل دیا۔ یار محمد کو پانی نے کچھ سہارا دیا۔ اُس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر جیسے ہی اُس نے پاؤں پر اپنا بوجھ ڈالا اُس کے پیٹ کا زخم اور زیادہ کھل گیا۔ اور وہیں ڈھیر ہو گیا۔ پھر اُس سے کچھ بھی نہیں کہا گیا۔

"یہ تو ختم ہو گیا ہے جیلانی۔ ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔"

"ہاں آؤ۔ لاش کے پاس ٹھہرنا بھی اچھا نہیں ہوتا اور پھر ایسی لاش؟ نکل چلو یہاں سے۔" یہ کہہ کر ہم نے یار محمد کو وہیں چھوڑ دیا۔ اس کی آنکھیں بند ہو چکی تھیں اور ہونٹ یوں کھلے تھے' جیسے وہ زندگی کی بھیک مانگ رہا ہو۔ مگر یوں بچھڑی ہوئی حیات اسے واپس کیسے مل سکتی تھی۔ اُس کے دشمنوں نے اس کو موت کا تلخاب پلا ہی دیا تھا۔

ہم کھڈ میں سے باہر نکلے تو آبی بولا "یار! ہمیں سامنے کے گاؤں میں رات گزارنی ہو گی۔ میرا خیال ہے یار محمد اسی جگہ رہتا تھا۔"

"ہاں چلتے ہیں شاید کسی گھر میں جگہ مل جائے۔ صبح اٹھ کر ہی ہم کسی طرف نکلیں گے' راستہ تو کھوٹا ہو ہی چکا ہے۔"

سامنے کے گاؤں کا نام رانی پور تھا جب ہم نے وہاں قدم رکھا تو سہ پہر ڈھل چکی تھی' سائے لمبے ہو گئے تھے اور آدمی کو سنجی ثابت کرتے تھے۔ کھیتوں سے لوٹتے ہوئے ڈھور ڈنگروں کی گھنٹیاں سنائی دے رہی تھیں اور ہمیں یہ معلوم کرنا تھا کہ کس استھان پر ہمارے گھوڑے بندھیں گے۔

آبی نے اچانک ایک راہ چلتے آدمی کو روک لیا۔ "بھائی جی! یہ کچھ بتا سکتے ہیں کہ منیرہ کا گھر کون سا ہے؟"

"جی وہ سامنے ہی ہے' اس گلی کے آخری کونے میں چلے جائیں۔ کوئی کام ہے آپ کو اُن سے؟"

"ہاں! اسی لیے تو پوچھا ہے' بڑی مہربانی ہے تمہاری۔" یہ کہہ کر آبی گھوڑے سے اُتر گیا اور ہم دونوں گام گام چلتے اس گلی کے آخری کونے تک جا پہنچے۔ منیرہ کا مکان بس کچا کوٹھا تھا۔ یہاں سے وہاں تک پھیلے تین کمرے اور اُن کے آگے صحن' جب ہم نے دروازے پر دستک دی تو ایک ادھیڑ عمر کی عورت نے کنڈی کھولی۔ ہمیں دیکھ کر وہ کچھ بدک سی گئی۔

"کیا بات ہے بھائی! کس کو پوچھتے ہو؟"

"یہ منیرہ کا گھر ہے نا؟ ہمیں آپ سے ہی ملنا تھا۔ آپ منیرہ کی والدہ ہیں نا؟"

"ہاں ہاں' میں اس کی خالہ ہوں، کیا کام ہے تمھیں مجھ سے؟"

"یہ بات تو ہم اندر بیٹھ کر ہی بتا سکتے ہیں بی بی! اگر دروازہ کھولو تو ہم اندر آ جائیں۔" آبی نے اسکے کندھوں کے اوپر سے صحن میں نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"ہاں، آجاوَ۔ ایہہ منیراں ذرا دیکھ تو یہ لوگ تیرے واقف ہیں۔ تیرا نام لے رہے ہیں یہ۔" اس نے دروازہ چھوڑ دیا۔ گھوڑے ہم نے صحن میں لے جا کر درخت تلے باندھ دیئے بکائن اُگی تھی اُن کے ہاں اور وہ شاید اسی کے قد سے منیرہ کا قد ناپتے تھے۔ ہم گھوڑے باندھ چکے تو ایک کمرے سے ایک چلبلی سی طلائی رنگت کی لڑکی برآمد ہوئی۔ وہ شلوار قمیص پہنے ہوئے تھی اور دوپٹہ اس نے گلے میں حمائل کر رکھا تھا۔ اس نے ہمیں دیکھا تو آبی لڑکھڑا سا گیا۔ میرا بھی یہی حال ہوا۔ کسی عورت کا جوان ہونا ہی بہت کافی ہے دلوں پر سواری ڈالنے کے لیے مگر منیرہ کے جسم سے تو چنگاریاں پھوٹتی تھیں۔ رنگ اس کا بہت گورا تھا جس میں سونے کا رنگ نمایاں تھا۔ آنکھیں جب وہ جھپکتی تھی تو لگتا تھا کہ وہ ہر شے کو سر جھکانے کا حکم دے رہی ہو۔ بلاشبہ اس پر شباب ٹوٹ کر آیا تھا اور لب و لہجے کے اعتبار سے وہ پنجابی ہی نظر آتے تھے، وہ آدمی بھی ہمیں پنجابی ہی معلوم ہوتا تھا جس سے ہم نے منیرہ کے گھر کا پتا پوچھا تھا۔

"یہ کون ہیں ماں! میں نے تو انھیں کبھی نہیں دیکھا کیا کرنے آئے ہیں یہ؟"

"یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ آپ ہم غریبوں کو نہیں جانتی ہیں ورنہ ہم نے تو آپ کے نام کا چرچا دُور دُور سے سُن رکھا ہے۔" آبی کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ اس لڑکی نے اسے بلاشبہ حیرت میں ڈال دیا تھا۔

"پر آپ ہیں کون؟"

"ابھی بتلاتے ہیں بی بی! ذرا ہمیں کچھ بیٹھنے تو دو۔ یار محمد کو جانتی ہیں آپ؟" آبی نے اس کے قریب پہنچ کر کہا۔ اس کی زلفیں کمر تک کی خبر لاتی تھیں اور جب وہ کسی بات پر پریشان ہوتی تھی تو اس کی آنکھیں پھیلتی نہیں تھیں، مچنے لگتی تھیں۔

"آپ بیٹھ جائیں بھائی جی! ادھر اس کمرے میں آ جائیں۔" بڑی بی نے ہمارے لیے منجھلے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ وہاں دو پلنگ بچھے تھے جن کے بیچ میں چلنے پھرنے کے لیے خاصا راستہ موجود تھا۔

"یار محمد کو جانتے ہیں آپ؟" منیرہ نے اندر آ کر کہا۔ اب وہ بیٹھنے کے لیے جگہ مانگتی تھی۔ ہم دونوں ایک ہی پلنگ پر بیٹھ گئے تو وہ سامنے کے پلنگ پر جا بیٹھی۔

"آپ کے لیے پانی لاتی ہوں، لسی پیئں گے آپ؟" منیرہ کی خالہ نے پوچھا۔

"ہاں! یہ تو بہت اچھا ہے بی بی! لسی تو اس گھڑی بہت آرام دے گی۔" یہ کہہ کر آبی نے دو سگریٹ نکال کر سلگائے۔ ایک اس نے میری طرف بڑھا دیا۔ وہ اس کے لبوں نے گیلا کر دیا تھا۔ جب اس کے دل میں شرارت ابھرتی تھی تو وہ میرے ساتھ اکثر یہی سلوک کرتا تھا۔ میرے قریب ہو کر بولا۔ "تیرے لیے یہ لعاب بہت اکسیر ہے جیلانی! تیرے سارے دلدر دور ہو جائیں گے پی اسے اور یاد کر اس وقت کو جب تجھے دوزخ میں ڈال دیا جائیگا اس خاتون کے ساتھ۔ کیا خیال ہے یہ اچھی ہے کہ نہیں؟"

"ایک دم فرسٹ کلاس۔" میں نے دبی آواز میں کہا۔ منیرہ ہم سے ذرا فاصلے پر بیٹھی تھی۔

"آپ نے بتایا نہیں کہ آپ یار محمد کو کیسے جانتے ہیں؟"

"وہ ملتان میں ہمارے پاس آیا کرتا تھا اس سے ہم بھی ملنے چلے آئے مگر آج وہ گھر پر نہیں ہے، باہر گیا ہوا ہے آپ کا وہ بہت ذکر کرتا تھا۔ سوچا آپ سے کیوں نہ مل لیں مگر آپ سے مل لینے کے بعد یار محمد کا خیال بہت درست معلوم ہوا۔"

"جی... جی کیا کہا آپ نے۔ میں ایسی ہی بری ہوں!"

"بلکہ اس کے اُلٹ۔ یار محمد بہت خوش نصیب ہے کہ اُسے آپ جیسی بیوی مل جائے گی۔" آبی نے تیر چلا ہی دیا۔ اپنے ترکش میں ہاتھ آئے تیر کو وہ چلائے بغیر نہیں چھوڑتا تھا۔

وہ کچھ شرما سی گئی، جھینپتی ہوئی بولی۔ "میرا نام منیرہ ہے میرے والد فوت ہو چکے ہیں یہاں ہماری پچاس بیگھہ زمین ہے اسی کے لیے یہاں بیٹھے ہیں میرے ساتھ یہ میری منہ بولی خالہ رہ رہی ہیں، بڑی عبادت گزار عورت ہیں یہ۔ ایک ملازم ہے فقیر محمد۔ وہ سارا دن کھیتوں میں رہتا ہے، مجھے والد صاحب نے دسویں تک تعلیم دلائی اور پھر میں گھر میں بیٹھ رہی۔ مگر آپ نے اپنے بارے میں تو کچھ بھی نہیں بتایا۔ میں ایسے ہی بولتی جا رہی ہوں۔"

"ہم بھی انسان ہی ہیں اور اس کی ایک خاص قسم سے تعلق رکھتے ہیں۔ پنجاب سے آئے ہیں۔ سوچا تھا سندھ دیکھیں گے مگر وہ یار محمد ملا ہی نہیں، وہی ہماری رہنمائی کر سکتا تھا۔ یہ آپ اتنی دُور کیوں بیٹھی ہیں، قریب آ جائیں نا۔ لیں، وہ لسی بھی آ گئی۔"

آبی نے منیرہ کی خالہ سے اٹھ کر لسی کا جگ لے لیا۔ بولا۔ "بڑی زحمت دی آپ کو ہم نے۔" یہ کہہ کر اس نے دو گلاس بھی اُس سے لے لیے۔ لسی وہ میٹھی بنا کر لائی تھی۔ ہم دو دو گلاس چڑھا گئے۔ پیاس نے ہم دونوں کو نڈھال کر رکھا تھا۔ جب ہم پی چکے تو آبی نے جگ منیرہ کی طرف پھیر دیا۔ بولا۔ "یہ لیں آپ بھی پئیں مگر یہ گلاس دھلوائیں بی بی! ان کو صاف ستھرے برتن میں ڈال کر چیز دینی چاہیے، آپ کی بھانجی بہت سمجھ دار معلوم ہوتی ہے۔"

"اللہ کا شکر ہے بھائی جی کہ اُس نے ہمیں ایسی بیٹی دی۔ میں اس کے لیے ہی یہاں رہ گئی ہوں۔ بہن فوت ہوئی تو پھر ان کے والد نے مجھے یہاں ہی ٹھہرا لیا۔ گھر نہیں جانے دیا۔ میں نے بھی سوچا کہ میرا پیچھے کون ہے سو اِن کے گھر کی ہو کر رہ گئی۔" بڑی بی نے اپنی بپتا سنانی شروع کر دی۔ حیرت مجھے یہ تھی کہ آبی نے اُن کو یار محمد کے قتل کی خبر اب تک کیوں نہیں دی تھی۔ بڑی بی برتن سمیٹ کر واپس گئی تو منیرہ بھی باہر نکل گئی۔

میں نے آبی سے پوچھ ہی لیا۔ میرا سوال سُن کر وہ میری طرف جُھک کر بولا۔ "ابھی نہیں! آپ ہی انھیں پتا چل جائے گا۔ قتل تو ہو ہی چکا ہے اب بندے کو واپس تو نہیں لایا جا سکتا۔ ہماری خاطر تواضع میں البتہ فرق رہ جائے گا۔"

"یار کچھ خدا کا خوف کر۔ تجھے خاطر تواضع کی پڑی ہے۔ وہ اس کا منگیتر تھا، وہ سُنے گی تو کیا کہے گی۔"

"تیرا مغز درست نہیں ہے، اسے کیسے پتا چلے گا کہ ہم یہ سب کچھ جانتے ہیں۔ میرا یہ خیال ہے کہ اس ڈرامے کا ڈراپ سین ہونے والا ہے۔ ان کے دشمن اب زمین کے لیے منیرہ کو یہاں سے اٹھانے کی کوشش کریں گے۔"

"ہاں یار! بات تو کچھ ایسی ہی نظر آتی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ تیرا دماغ ابھی کام کر رہا ہے حالانکہ اس کا نظر سے بہت تعلق ہے۔"

"تیرا کیا خیال ہے میں پاگل ہو چکا ہوں! ویسے میرا خیال ہے کہ اس بکھیڑے میں پڑنے کے بجائے ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔"

"نہیں میرا خیال ہے کہ منیرہ پر انھیں ہاتھ ڈالنے دو۔ یہ ذرا سی نیکی ہے کر ہی ڈالو۔ آج رات ہی شاید وہ لوگ ادھر آ جائیں۔"

"زمین چیز ہی ایسی ہے منیرہ کا والد مر گیا تو اس کا چچا اب منیرہ کے بعد اس زمین کا مالک بن سکتا ہے۔ انھیں معلوم ہے وہ منیرہ سے اپنے بیٹے کی شادی نہیں کر سکیں گے عین ممکن ہے کہ وہ یار محمد کے بعد منیرہ کو ختم کرنے کی کوشش کریں۔" آبی نے پلنگ پر اپنی ٹانگیں پھیلاتے ہوئے کہا

"ہاں ٹھیک ہے۔ اسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ ادھر ہی ٹھہر لو۔ مگر باہر تو شام ہو گئی ہے آؤ صحن میں بیٹھتے ہیں۔" میں نے آبی کو اٹھاتے ہوئے کہا۔

جب ہم صحن میں پہنچے تو منیرہ اپنی گائے اور بھینس کا دودھ دوہ رہی تھی۔ اور اس کی خالہ دیوار کے ساتھ بنے چولہے کے سامنے بیٹھی چاول ابالنے میں مصروف تھی۔ بظاہر اُن لوگوں کے ہاں ہمارا کوئی کام نہیں تھا۔ بن بلائے مہمان بن کر ہم وہاں جا ٹھہرے تھے۔ منیرہ کی خالہ اس بات کو سمجھ رہی تھی اور میرا خیال ہے کہ وہ ہمیں وہاں سے ٹہلانے کی فکر میں تھی۔ بولی۔ "آپ رات کو ادھر ہی ٹھہریں گے؟"

"ہاں خالہ کوئی حرج ہے کیا؟ یار محمد تو شاید سکھر گیا ہوا ہے۔"

"آپ نے اس کے باپ سے بات کی ہوتی۔ وہ تو گھر پر ہی ہوگا۔"

"اس سے ملے تھے ہم۔ ایسے ہی خشک سا آدمی ہے، بڑے رُوکھے لہجے میں بات کرتا ہے۔" میں نے صحن میں چارپائی بچھاتے ہوئے کہا۔

"ہم---- ہم دراصل آپ کو ایک بات بتانا چاہتے ہیں خالہ۔ آپ اور منیرہ ادھر آ جائیں آپ کے دشمنوں نے آپ کے خلاف اپنی کارروائی شروع کر دی ہے۔"

"کیا مطلب؟ کون سے دشمن ہیں ہمارے؟ ادھر آ جا منیرہ! ان کی بات تو سُن۔" خالہ نے آبی کے یہ لفظ سُن کر چاولوں کی برات الگ رکھ دی۔ چولہے میں منجھٹی جل رہی تھی۔ اس کی لکڑیاں خالہ نے باہر نکال دیں تاکہ آگ سرد ہو جائے۔ منیرہ اس وقت بھینس کے نیچے سے اُٹھ گئی تھی۔ وہ دودھ کی بالٹی الگ رکھ کر ہمارے پاس چلی آئی۔ حالانکہ وہ انھیں فوری طور پر کچھ بھی بتانا نہیں چاہتا تھا مگر خالہ آمنہ کے وہ الفاظ سُن کر اس نے ان کو جان بوجھ کر اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

"تیرا کیا مطلب ہے۔ کن دشمنوں کی بات کرتا ہے تو بھائی؟"

"بات یہ ہے خالہ آمنہ! کہ ادھر منیرہ کا چچا رہتا ہے اس گاؤں میں؟"

"ہاں رہتا ہے۔" خالہ ہمارے پاس ہی زمین پر بیٹھ گئی۔

"کیا نام ہے اس کا؟"

"اس کا نام عبدالحمید ہے۔"

"اس کا کوئی بیٹا بھی ہے؟"

"ہاں دو بیٹے ہیں اس کے ایک حضور علی ہے، دوسرے کا نام محمد عاقل ہے اس کو نکا کہتے ہیں۔"

"اور وہ اپنے بیٹے کے لیے منیرہ کا رشتہ مانگتے تھے؟" آبی نے پوچھا۔ اُس نے پھر دو سگریٹ سلگا لیے تھے۔

"ہاں! اس نے عاقل کے لیے منیرہ کا رشتہ مانگا تھا۔ مگر منیرہ کی والدہ پہلے ہی انکار کر چکی تھی۔ وہ مر گئی تو اس کے والد نے بھی نہ کر دی۔ ہمیں وہ لوگ بالکل پسند نہیں تھے۔ عاقل تو پڑھا لکھا بھی نہیں ہے مگر آپ یہ سب کیوں پوچھتے ہیں؟"

"ہوں! بات یہ ہے خالہ آمنہ! کہ وہی لوگ اب خون خرابے پر اُتر آئے ہیں۔"

"یہ کیا کہہ رہا ہے تو! کیا کر دیا ہے اُن لوگوں نے؟"

"ابھی بتاتا ہوں۔ میری بات سن کر آپ شور نہیں مچائیں گی۔

آرام سے ساری بات سنیں جب آپ نے عاقل کے لیے نہ کر دی تو پھر یار محمد سے منیرہ کا رشتہ کر دیا۔ یہی بات ہے نا؟"

"ہاں وہ اُس کی سگی خالہ کا لڑکا ہے۔ پڑھا لکھا بھی ہے اور زمینداری کرتا ہے بہت سوہنا جوان ہے وہ۔"

"ہوں! اس کا مطلب یہ ہے کہ منیرہ کو یا اس کی زمین کو حاصل کرنے کے لیے اُن لوگوں نے اب نیا تیر چلایا ہے۔"

"تیری بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ آخر کیا کیا ہے اُن لوگوں نے؟"

"بات یہ ہے خالہ کہ اس عبدالحمید کے لڑکوں نے آج یار محمد کو قتل کر دیا ہے ہم اس کی لاش دیکھ کر آ رہے ہیں۔"

"نہیں نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے بھائی جی! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ منیرہ! ارے تجھے کیا ہو گیا، اپنے آپ کو سنبھال۔"

میں نے منیرہ پر نظر ڈالی۔ اس کی آنکھیں مچنے لگی تھیں اور رنگ اس کا ہلدی ایسا ہو گیا تھا۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ چارپائی کی پائینتی گر گئی۔

"یہ کیا ہو گیا ہے تجھے! ذرا پانی لائیں بھائی جی! یہ تو بے ہوش ہو گئی ہے۔" خالہ نے اپنی اشک آلود آنکھیں منیرہ پر جما دیں۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ عبدالحمید ایسا قدم بھی اٹھا سکتا ہے۔ آبی اُٹھ کر نلکے پر سے گلاس میں پانی لانے کے لیے چلا گیا تو ہم دونوں منیرہ کے ٹھنڈے پاؤں گرم کرنے لگے۔ وہ کچھ زیادہ ہی آگے نکل گئی تھی۔ آبی نے پانی لا کر اسے پلایا تو بھی اس کو ہوش نہیں آیا۔ آبی ایک اور گلاس بھر لایا اور لا کر منیرہ کے چہرے پر ڈالنے لگا۔ "اُٹھ جا بی بی! پتا نہیں تجھے کیا ہو گیا ہے۔ یار محمد مرا ہے تو نہیں مری۔ جس کی موت آتی ہے وہی مرتا ہے۔"

منیرہ کے چہرے پر پانی پڑا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔

"اس کو سمجھائیں خالہ! یہ ہوش میں رہنے کا وقت ہے کسی کو اپنی زبان سے مت بتائیں کہ ہوا کیا ہے؟"

"پر ہم چپ کیسے رہ سکتے ہیں۔ وہ تو ہمیں بھی مار دیں گے منیرہ کو ختم کر کے وہ زمین کے مالک بن سکتے ہیں، اِن کی یہی چال ہے۔" خالہ نے بین کرتے ہوئے کہا۔

"ایسا نہیں ہو گا خالہ جان ایسا نہیں ہو گا۔ ہم یار محمد کے قتل کا بدلہ لیں گے اُن سے۔ ان کو یہاں ہی ختم کر دیں گے کوئی اُن میں سے ادھر آیا تو بچ کر نہیں جا سکتا۔ ہم اسی لیے ادھر آئے ہیں۔ ہم منیرہ کو بچ... نہیں گے۔" میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ مگر وہ کچھ زیادہ ہی بدک گئی تھی۔ کتنی ہی دیر تک وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے ہمیں دیکھتی رہی جیسے پوچھ رہی ہو کہ اب اُن کا کیا بنے گا۔ وہ یکے و تنہا عورتیں بے بسی کی تصویر بنی بیٹھی تھیں۔

"آپ کا وہ ملازم کہاں ہے؟"

"وہ تو باہر پانی کے لیے گیا ہوا ہے۔ آج نہر سے ہماری زمین کو پانی ملنا تھا۔"

"وہ آ جائے تو اُسے بھی خبردار کر دیں۔ ہم آج رات ادھر ہی ٹھہر رہے ہیں۔ ذرا آپ محتاط ہو کر سوئیں۔ یار محمد کی لاش ادھر ہی ہم نے کھڈ میں دیکھی تھی، وہ شاید اب کسی نے اٹھا لی ہو۔ اگر ایسا نہیں ہے تو آپ کا ملازم آ جائے تو آپ اسے یار محمد کے والد کے پاس بھیج دیں۔"

"ہاں میں یہی کروں گی۔ مگر آپ کو ہم سے کیا ہمدردی ہے آخر آپ ہمارے پاس کس لیے آتے ہیں؟"

"یہ خدا خوفی ہے خالہ جی! خدا خوفی۔ ورنہ تو آپ سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یار محمد سے ہماری تھوڑی سی دوستی تھی مگر وہ بھی ختم ہو گیا۔ اس نے یہ بیان دیا ہے کہ اسے عبدالحمید کے لڑکوں نے قتل کیا ہے۔ وہ ابھی لبِ جان ہی تھا کہ ہم اس کے پاس جا پہنچے اُس نے انہی کا نام لیا تھا۔" آبی نے خالہ آمنہ کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

دونوں عورتیں ٹکر ٹکر ہمیں دیکھ رہی تھیں میرا خیال ہے کہ اُن کے دل میں یہی وسوسہ ابھرا ہو گا کہ ہمیں اُن کا اتنا خیال کیسے آ گیا۔ ہم اُن کے ہمدرد کیسے بن گئے۔ ہمیں بھی شاید ان لوگوں نے ہی ان کے پاس بھیجا ہے، وہ یہی سمجھ رہی تھیں اور اُن کی آنکھوں میں ہویدا خوف ہمیں یہی سمجھا رہا تھا۔ وہ ہمیں یوں دیکھ رہی تھیں جیسے وہ ہم سے بے حد خوف زدہ ہوں۔

"آپ... آپ کو عاقل نے یہاں بھیجا ہے۔" خالہ آمنہ نے کہہ ہی دیا۔ اس کا رنگ توری کے پھول ایسا ہو گیا تھا۔

"ایسا نہ کہیں خالہ! ہمیں یہ الزام تو نہ دیں۔ ہم یار محمد کی لاش دیکھ کر ادھر آئے ہیں، ہمیں عاقل نے نہیں بھیجا ہے بلکہ اپنی بہن منیرہ نے یہاں بلایا ہے۔ میں اس کے لیے جان دے دوں گا اسے کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہ وہم دل سے نکال دیں کہ ہمیں عاقل نے بھیجا ہے۔" میں نے اس کے ٹھنڈے ٹھار ہاتھ کو پکڑتے ہوئے کہا۔ وہ سر سے پاؤں تک پسینے میں بھیگ گئی تھی۔ چاولوں کی پرات یونہی رہ گئی تھی اور چولہا سرد ہو چکا تھا۔ انھیں کسی بھی بات کا ہوش نہیں رہ گیا تھا۔

بڑی مشکلوں سے ہم نے اُن کو یکجا کیا۔ اُن کا بکھرنا ہم سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ عورت جب غم کی تصویر بنتی ہے تو وہ ماحول کو اور زیادہ سوگوار بنا دیتی ہے۔

منیرہ نے یار محمد کے لیے خدا جانے کیسے کیسے خواب دیکھے تھے اُن کی تعبیر کا وقت آیا تو وہ منوں مٹی کے نیچے جا دبا۔ دشمنوں نے اُس سے جینے کا حق ہی چھین لیا اور اب وہ اس ٹنڈ منڈ درخت ایسی ہو گئی تھی جس پر خزاں نے وار کر دیا ہو اور جس کی جڑ بھی ننگی ہو گئی ہو۔ اگرچہ زن، زر، زمین ہی بنائے فساد ہیں مگر زمین نے جس انداز سے انسان کو انسان سے جدا کر دیا ہے اس کی تو مثال ہی نہیں ملتی۔ گرہ گرہ، چپہ چپہ زمین کے لیے آدمی نے دوسرے کا گھر پھونک دیا ہے۔ وہ پچاس بیگھہ زمین تو کچھ بھی نہیں تھی مگر اس کے حصول کا ایک سیدھا راستہ چھوڑ کر عبدالحمید کے بیٹے نے منیرہ ہی کو ختم کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کا منگیتر یار محمد بھی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا کیونکہ وہ منیرہ کا منگیتر تھا اور اس سے شادی رچا کر وہ پچاس بیگھے زمین کا مالک بن سکتا تھا۔ اور عبدالحمید نہیں چاہتا کہ وہ زمین دوسری طرف نکل جائے کیونکہ وہ اس کے والد کی یکجا زمین کا ایک حصہ تھی۔ وہ انھیں وراثت میں ملی ہوئی نعمت تھی۔ اگر منیرہ کا کوئی بھائی ہوتا تو پھر شاید عاقل یہ قدم نہ اٹھاتا۔ مگر اسے کیا کیجیے کہ اسے بھی زمین اتنی ہی پیاری تھی جتنی منیرہ کو تھی۔

رات کے دس بج گئے۔ ہم ابھی تک اُن کے صحن میں بیٹھے تھے۔ خالہ آمنہ اور منیرہ کے بستر بھی وہیں لگ گئے ہمیں ان لوگوں نے چھت پر سُلا دیا۔ وہاں ہوا زیادہ تیز تھی اور آرام دیتی تھی۔ اگرچہ ستمبر کا وسط آ چکا تھا پھر بھی مکانوں کے اندر سونے کے بجائے کھلی ہوا میں سونا زیادہ اچھا معلوم ہوتا تھا موسم کے اس تغیر نے فضا میں ایک عجیب سی نمی پیدا کر دی تھی۔ آبی خوش تھا بے حد خوش۔ اسے بدلتے موسم ہمیشہ سے اچھے لگتے تھے مگر اب کی بار اسے کچھ زیادہ ہی خوشی محسوس ہو رہی تھی کہ اس کی کھوئی ہوئی نظر واپس مل گئی تھی۔

ہم چھت پر لیٹے تو آبی بولا۔ "اپنا پستول سنبھال کر رکھ، میرا خیال ہے کہ ان کا دشمن آج ہی دوسرا حملہ بھی طے کرنے کی کوشش کرے گا۔ آدمی دشمنی میں اندھا ہو جائے تو اسے کچھ نہیں سوجھتا ہے۔"

"ہاں! مجھے معلوم ہے۔ گولیاں میں نے بھر لی ہیں اور میرا چپ شاہ جانتا ہے کہ اسے کیا کرنا ہے۔" میں نے بستر پر لیٹتے ہوئے کہا۔ ہمیں اس جھگڑے میں پڑنا ہی نہیں چاہیے تھا مگر یہ آبی کی ضد تھی۔ اسے کسی مظلوم کے لیے دس قدم بھی آگے جانا پڑے تو وہ نکل جاتا تھا مگر جب سے منیرہ کو اس نے دیکھا تھا تو وہ زیادہ ہی مائل بہ کرم تھا۔ وہ اسے تھوڑی سی نیکی سمجھ رہا تھا مگر بات اس کے سوا بھی تھی۔ ہمیں دراصل اس رات کھلے کھیتوں سے نکل کر کسی جگہ آرام کر لینے کی ضرورت تھی۔ پولیس نے اس علاقے کے تمام اہم حصوں پر اپنا پہرہ بٹھا رکھا۔ ہم اپنے دو آدمی اُن کی نذر کر چکے تھے۔ اُن کے زمین پر گرتے جسموں کو دیکھ کر ہمیں ہول آیا تھا۔ وہ بس گر ہی گئے تھے پھر کبھی نہیں اُٹھ سکے۔ لاکھو کا وہ گھوڑے سے الٹ کر زمین پر گرنا مجھے یاد تھا۔ بہت خوبصورت جوان تھا وہ مگر گولی اُس کی کمر چیر گئی۔ وہ ہمارے ہی لیے وہاں جان ہار بیٹھا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ آبیہ کے بھائی کا ساتھ دے رہا تھا۔ میرے ہی لیے اس نے اپنے موتی نچھاور کر دیے تھے۔ اور مجھے یقین تھا کہ وہ... وہ مر چکا ہو گا۔ اس کا زندہ بچ جانا محال تھا۔ یہی حال تابے کا ہوا۔ وہ بھی ہمارے ہی لیے اپنی جان قربان کر گیا۔ ورنہ وہ اُس کے مرنے کے دن تو نہیں تھے۔ اور میرے دل میں بار بار یہ سوال ابھرتا تھا کہ ہم اُس کے بیوی بچوں کو اس کے بارے میں کیا جواب دیں گے، انھیں کیا بتائیں گے کہ اسے ہم نے کیسی ادھ کچی قبر میں ادھ کچی حالت میں دفنا دیا تھا۔ اس کی لاش تو کسی بھی ہل سے کٹ کر باہر آ سکتی تھی۔ کاش ہم نے اُس کے لیے کوئی باقاعدہ قبر تلاش کر لی ہوتی مگر ہم اپنی افراتفری میں کچھ بھی نہ کر سکے جہاں بھی جگہ ملی اُسے دفن کر آئے اور لاکھو کا حال تو اس سے بھی زیادہ دیدنی تھا۔ اُسے تو وہ کسی ہسپتال کے خانے سے گزار کر کسی لاوارث لاش کی طرح کسی جگہ دفن کر دیں گے۔ اس کی مومیائی وہ پہلے نکال لیں گے۔ وہ یہی کرتے ہیں انھیں کیا معلوم کہ لاکھو کو اس دنیا میں ابھی کتنے ہی لوگوں کا حساب دینا تھا۔ سب سے بڑی مرغی تو اُس کے لیے آبیہ ہی تھی مگر وہ سب طرف سے مُنہ موڑ کر موت سے جا ملا۔ اس کے بھی تو یہ مرنے کے دن نہیں تھے۔ اس کے چہرے کے گلاب بے وقت مرجھا گئے اور وہ گل در گل ہو کر رہ گیا۔ آدمی کے جسم میں وہ موت کا گل خور تو پیدا ہوتے ہی موجود ہوتا ہے وہ اس سے بہت جان چھڑاتا ہے مگر وہ اسے کہیں ملنے نہیں دیتا کسی نہ کسی جگہ موقع ملتے ہی جان سے مار دیتا ہے مگر لاکھو کو کہاں یقین تھا کہ اس کی موت یوں لکھی تھی۔ یہ کاتبِ تقدیر کیسے کیسے سانحے پیدا کرتا ہے۔ آدمی اس مرگ سے بچنے کے لیے بڑے بڑے مرگ چھالے بچھاتا ہے، ان پر پہروں کھڑا دوزانو رہتا ہے، دعا مانگتا ہے اس کی موت یوں ویرانے میں نہ آئے۔ وہ مرے تو اپنوں کے درمیان، وہ جیے تو اپنوں کے ساتھ۔ مگر ہم ایسوں کی موت تو شاید ویرانوں میں ہی واقع ہوتی ہے، کوئی اڑتی ہوئی گولی جس پر ہمارا نام ہوتا ہے ہمیں چیر کر رکھ دیتی ہے مجھے بھی اور آبی کو بھی یہ احساس تھا مگر ابھی ہمیں مرنے کی فرصت ہی کہاں تھی۔ ہم تو شاید مرگِ طبعی کی امید رکھتے تھے جو شاید ہم میں سے کسی کے بھی نصیب میں نہیں تھی۔ میں بھی انسان تھا اور آبی بھی۔ ہماری موت انسانوں کے درمیان ایک کمی تو آ سکتی تھی مگر کون اس جانکنی کے

عالم میں ہم سے کہے گا کہ تم بہت قیمتی تھے۔ تمھیں بنانے سنوارنے میں قدرت نے ان گنت دنوں اور راتوں کو ایک دوسرے کے پیچھے لگا دیا تھا۔ اس کے بیش بہا موتی عطا کیے گئے۔ یہ آنکھیں، یہ ہونٹ، یہ پیشانی یہ ذہن، یہ دل، یہ ہاتھ، یہ پاؤں تمھاری تزئین کے لیے تراشے گئے مگر پھر وہ کسی نادیدہ گولی کی نذر ہو گئے جو تمھیں فنا کے گھاٹ اتار گئی۔ کیا تمھیں اسی لیے تراشا گیا تھا۔ نہیں۔۔۔۔ مقصد کچھ اور تھا مگر اس کو ہم پورا نہ کر سکے۔ ہم گمراہ ہو گئے۔ غلط راستوں پر چل نکلے۔ اگرچہ ہم انسانیت ہی کا ایک حصّہ تھے مگر کوئی ہمارے بارے میں یہ نہیں کہے گا کہ تمھاری موت انسانیت کی موت ہے۔ کیونکہ ایک موت تو وہ ہے جس سے ہم اوّل روز سے دوچار ہو چکے تھے۔ اصولوں کی موت، اس میں تو ہم بہت دنوں سے مبتلا تھے۔ کوئی بھی نیکی ہمارے راستے میں نہیں آتی تھی۔ آتی تھی تو ہم اس میں سے بھی اپنے مطلب کے موتی حاصل کر لیتے تھے۔ اسے یہ تو اس جہانِ خانہ خراب میں برباد ہو گئی مگر ہم بھی اس کے ساتھ تباہ ہو گئے، اور ہماری دوسری موت راستے میں کسی جگہ کھڑی ہماری منتظر تھی جس سے ہمارا ایک نہ ایک دن معانقہ ضرور ہو گا۔

آبی بھی خاموش تھا اور کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا اسے ان عورتوں کی وہ بپتا اپنی ہی معلوم ہوتی تھی سگریٹ کے گہرے گہرے کش لیتے ہوئے وہ بولا "انھیں نیند نہیں آ رہی ہے جیلانی! موت کے خوف نے انھیں بھی بےبس کر رکھا ہے۔" وہ نیچے صحن میں جھانک رہا تھا۔

"ہاں! یار محمد کی موت نے انھیں نڈھال کر رکھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر ان کے دشمن ادھر نہیں آئے تو ہمیں بہت افسوس ہو گا۔ یار محمد کے قاتل کو میں ضرور دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"ہو سکتا ہے وہ آج ادھر نہ آئیں۔ کچھ روز گزارنے کے بعد اور یار محمد کا قتل ہضم کرنے کے بعد وہ یہاں آئیں۔" آبی نے کہا۔

"اور یہی میں نہیں چاہتا ہمیں رات تو یہاں ٹھہرنے کی اجازت مل گئی ہے مگر اس رات نے ہمیں ایک کام بھی دے دیا ہے۔ ان کو قاتلوں سے بچا لینا بےحد ضروری ہے۔"

"دیکھتے رہو کیا ہوتا ہے، اگر وہ نادان ہیں تو پھر یار محمد کے قتل کے بعد یہاں بھی آ دھمکیں گے، ورنہ وہ کچھ دن ضرور لیں گے اور اتنے دن ہم یہاں نہیں رہ سکتے۔"

"ان کو خود نہ چھیڑ دیں جا کر، ابھی قلع قمع کر دیتے ہیں ان کا۔ ہرج ہی کیا ہے۔" میں نے کہا۔

"خواہ مخواہ بندر کی بلا طویلے کے سر نہیں ڈالتے۔ بس سو رہو۔ اور محتاط رہو۔ مجھے یقین ہے کہ پولیس کا کوئی آدمی ادھر نہیں آیا ہے۔"

ہم کتنی ہی دیر ادھر ادھر کی گپ ہانکتے رہے اور بالآخر سو گئے۔ رات بھی بہت بیت گئی تھی اور ان کسانوں کے کوٹھے بس ایک دوسرے سے یوں ملے تھے کہ دیکھتے رہیے۔ آتنا منیرہ نے ضرور کر رکھا تھا کہ اپنے کوٹھے کے گرد کچی دیوار کھینچ رکھی تھی جس کی وجہ سے ہم خود کو زیادہ محفوظ سمجھتے تھے۔ صبح ہو گئی مگر عاقل وغیرہ وہاں نہیں آئے۔ میرا خیال درست ہی نکلا وہ اتنا نادان نہیں تھا۔ یار محمد کے قتل کو ابھی وہ ہضم کر رہا تھا۔

ابھی جھٹپٹا ہی تھا۔ سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا، کہ احمد پور سے پیغام آ گیا۔ ایک چوکیدار، یار محمد کے..... قتل کی خبر لے کر صحن میں آ ٹھہرا تھا اور اب منیرہ اور اس کی خالہ آمنہ نئے سرے سے رات کا شیون اٹھا رہی تھیں۔ انھیں یار محمد کی موت کی خبر نے رات ہی سے نڈھال کر رکھا تھا مگر اب وہ دنیا کو دکھانے کے لیے بلند آواز سے رو رہی تھیں۔ چوکیدار نے کہا تھا کہ وہ دونوں اس کے ساتھ احمد پور چلیں گھوڑے ہمارے ان لوگوں نے راتوں رات کسی اور مکان میں پہنچا دیے تھے جہاں ان کے دوسرے ڈنگر بندھے تھے۔

"کیا کریں آبی! ہمارے لیے یہاں ٹھہرنا تو اب کسی بھی طرح ممکن نہیں ہے۔"

"ہاں میرا خیال ہے یہاں سے نکل چلو اور ان سے کہہ دو کہ کم از کم دو تین مہینے ادھر یار محمد کے گھر رہیں یہاں ٹھہرنا ان کے لیے کسی بھی طرح اچھا نہ ہو گا۔"

"ہاں ابھی چلو اور یہ پیغام انھیں دے دو۔ ان کی جانیں یہاں محفوظ نہیں ہیں۔"

"مگر ہم ان کے کیا کام آ سکے۔ ان کے دشمن تو اپنی جگہ موجود ہیں، یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔"

"مجھے بھی افسوس ہے مگر ہم کیا کر سکتے ہیں؟ ان کے دشمنوں کو چھیڑنا کسی طرح بھی اچھا نہیں حیثیت ہے کہ ہم ان کے خلاف گواہی تک نہیں دے سکتے۔" میں نے جوتوں میں پاؤں پھنسا دیے ضروری تھا کہ ہم فوراً وہاں سے نکل جاتے۔

مگر جب ہم نیچے گئے تو خالہ آمنہ نے ہمیں روک لیا۔ وہ چوکیدار کو باہر گلی میں ٹھہرا چکی تھی اور خود احمد پور جانے کی تیاریوں میں مصروف تھی۔

"آپ ادھر ہی رہیں۔ میں خود احمد پور جا رہی ہوں لڑکی کو یہاں چھوڑ جاتی ہوں، اس کا وہاں جانا ٹھیک نہیں ہے اور پھر آپ کو گواہی بھی دینا ہو گی۔"

"نہیں، اب ہمارا یہاں ٹھہرنا ٹھیک نہ ہو گا۔ ہمارے گھوڑے کہاں ہیں؟"

"وہ میں نے ساتھ کی حویلی میں بندھوا دیے تھے۔ رات فقیر محمد گیارہ بجے آ گیا تھا۔ ابھی وہ حویلی میں ہی ہو گا۔"

عین اسی وقت ایک ادھیڑ عمر آدمی صحن میں داخل ہوا اس کا حلیہ جوگیوں ایسا تھا۔ سر پر یہ بڑا سا پٹکا بندھا ہوا۔ ڈاڑھی چھاج ایسی پھیلائے ہوئے، سر کے بال کندھوں تک جھولے ہوئے، چوڑا چکلا سینہ، کھدر کی قمیص کے نیچے تہمد۔ وہ خالہ آمنہ کو سلام کر کے بولا "یہ میں کیا سن رہا ہوں آمنہ! کیا ہوا ہے یار محمد کو؟"

خالہ نے اسے دیکھتے ہی گھونگھٹ نکال لیا اور منہ چھپا کر بولی "یہ تو پولیس ہی بتائے گی کہ یار محمد کو کس نے قتل کیا ہے، ہم بڑے کے گھر تک پہنچا دیں گے قاتل کو۔ مذاق سمجھا ہے کسی نے ہمیں؟"

"یہ کیا کہہ رہی ہے تو! تیرا مطلب کیا ہے، میں پوچھتا ہوں کہ یار محمد کو کس نے مارا ہے، وہ ہمارا بھی کچھ لگتا ہے۔"

"مجھے پتا ہے، بہر حال سپریم کورٹ بھی جانا پڑا تو ہم جائیں گے، دشمنوں کو چھوڑیں گے نہیں۔"

"کمال کرتی ہو۔ وہ کب قتل ہوا؟ کون دشمن تھے اس کے؟"

"یہ تو پولیس ہی بتائے گی اور یہ جوان گواہ ہیں، ان کو بیان دے کر مرا ہے وہ۔ ادھر کھڈ میں پڑا تھا۔"

"اچھا آپ ہیں عبدالحمید صاحب۔ حضور علی آپ کا بیٹا ہے نا!"

"ہاں ہاں کیا کیا ہے اس نے کیوں نام لیتے ہو اس کا؟"

"یار محمد کو حضور علی نے قتل کر دیا ہے، یہ ہے خبر آپ کے سننے کی۔ اب یہاں پوچھنے آتے ہو کہ کس نے کیا کر دیا ہے۔ اس منیرہ کی زمین کے ٹکڑے کے لیے آپ نے یار محمد کو قتل کر دیا۔ یہ کرتوت ہیں آپ کے۔" آبی نے عبدالحمید کو آڑے ہاتھوں لیا۔

وہ کچھ گھبرا سا گیا، دو قدم پیچھے ہٹ کر بولا "یہ کیا کہہ رہے ہو تم۔ کیوں جھوٹا الزام دیتے ہو میرے بیٹے پر۔ کیا بگاڑا ہے اس نے تمھارا؟"

"یہ جھوٹ نہیں ہے حمید صاحب! یار محمد ابھی زندہ تھا کہ ہم اس کے پاس جا پہنچے۔ اس نے ہمارے ہاتھوں میں جان دی ہے۔ وہ یہی بیان دے کر مرا ہے۔"

ابھی میں نے یہ بات کہی تھی کہ صحن کا دروازہ کھلا اور دو آدمی تیزی سے اندر آ گئے۔ ان کے ہاتھوں میں برچھیاں تھیں۔ بڑا ان میں سے حضور علی تھا۔ باپ کی طرح اونچے برچھ ایسے قد کا۔ اور دوسرا نکلتا درمیانے قد کا تھا مگر تھے دونوں ہی بہت ٹھوس اور بگڑے جسم کے مالک۔

"سن لو بھئی! یہ جوان کیا کہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یار محمد کو تم نے قتل کیا ہے، یہی کہا ہے تم نے؟"

"ہاں میاں جی! اب بھی ہم یہی کہتے ہیں۔ ہم تو آج کی رات منیرہ پر بھاری سمجھتے تھے اور اس خیال میں تھے کہ آپ آج ہی اس پر ہلہ بولیں گے مگر آپ ادھر نہیں آئے کسی اور وقت پر منیرہ کا قصہ ٹال دیا یہی بات ہے نا؟"

"بکتے ہو تم۔ بدمعاشو! میں تمھیں یہیں ختم کر دوں گا۔ پکڑ لو اوئے ان کو باندھ کر مار دو انھیں۔ کتے کے بچے یہ بڑے بابو بنے پھرتے ہیں۔" عبدالحمید نے ہمیں للکارتے ہوئے کہا۔

وہ گھڑی جس کو ہم سمجھتے تھے ٹل گئی ہے، ایک دم سامنے آ گئی تھی۔ خالہ آمنہ اور منیرہ دونوں بھاگ کر کمرے میں جا گھسیں۔ اور دروازہ انھوں نے اندر سے بند کر لیا۔ انھیں ڈر تھا کہ کہیں وہ لوگ انھیں ہی نہ مار دیں۔

حضور علی کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا، بولا "تو تمھارا یہ خیال ہے کہ اس کو ہم نے مار دیا ہے یہی کہہ رہے ہو نا تم؟"

"ہاں بھئی! تمھارا نام لے رہا تھا وہ۔ اور دیکھو ذرا سنبھال کے قدم رکھو۔ ہم تو محض گواہ ہیں۔"

"تیرے گواہ کی ایسی تیسی! تو ہوتا کون ہے ہمارا نام لینے والا۔" یہ کہہ کر حضور علی نے برچھی تان کر سیدھا میرے سینے پر وار کرنا چاہا مگر میں تیزی سے ایک طرف ہو گیا۔ اتنے میں آبی نے اپنا پستول نکال لیا اور صحن اس کی گولی سے گونج اٹھا۔ "ڈھم ڈز" ایسی آواز پیدا ہوئی۔ اور حضور علی کے سینے سے خون ابلنے لگا۔ وہ ذرا دیر کے لیے ڈگمگایا برچھی اس نے پھر سنبھالی مگر گولی نے اسے مہلت ہی نہیں دی، اور وہ صحن میں دھڑام سے نیچے گر گیا۔

"اور یہ ہے تیرے نکّے کے لیے میاں جی! یہ لے آواز چلتی ہے یہ گولی۔" یہ کہہ کر میں نے عبدالحمید کے سامنے ہی نکے کی گردن میں سے گولی گزار دی۔ وہ آبی کی طرف خوفناک انداز سے آگے بڑھ رہا۔ اس کی گھٹی گھٹی چیخ ابھری مگر اس کی بولنے کی طاقت ہی سلب ہو چکی تھی۔ وہ تیورا کر اپنے والد کے قدموں میں جا گرا۔

"کیا خیال ہے میاں جی! ایک گولی آپ کو بھی دے دوں، کا رِ خیر ہے۔ دے دوں؟" میں نے عبدالحمید کے پاس پہنچ کر کہا۔ اس نے دو بیٹوں کو یوں لاشوں میں بدلتے دیکھا تو اس کا رنگ اڑنے لگا۔ وہ پاگلوں کی طرح تیجے جھک کر ان کو بانہوں میں لینے لگا۔

"پچاس بیگھے زمین کے لیے تم نے یہ کھیل کھیلا ہے میاں جی! صرف پچاس بیگھے زمین کے لیے۔ ہم نے تمھارے دونوں بیٹے ختم کر دیے، اب جاؤ موج کرو۔ ہو سکے تو معاف کر دینا۔ مگر منیرہ کی طرف آنکھ نہیں اٹھاؤ گے، یہ ہماری بہن ہے اور ہمیں بڑے قتل معاف ہیں،

سمجھتے ہو کہ نہیں ۔" میں نے ایک گولی عبدالحمید کی آنکھوں کے سامنے سے گزارتے ہوئے کہا۔ اس نے ڈر کر منہ پیچھے ہٹایا جیسے اسے گولی نظر آ رہی ہو۔

گاؤں میں شور سا مچنے لگا مگر ابھی لوگ ان گولیوں کی سمت کا تعین نہ کر پائے تھے کہ ہم دونوں صحن سے باہر نکلے۔ وہاں کھڑا چوکیدار شاید بھاگ کر نمبردار کے پاس جا پہنچا تھا۔ ہم نے مکان کے قریب بنی کچی حویلی کا دروازہ کھولا۔ اور اپنے گھوڑے وہاں سے لے کر اسی وقت رانی پور سے باہر نکل گئے۔ سورج ابھی طلوع ہو رہی رہا تھا۔

آبی نے ایک گالی عبدالحمید کو دیتے ہوئے کہا "اس بدمعاش کی اکڑ فوں دیکھی تھی تم نے۔ اپنے ان زخموں کو برچھیاں دے کر ہم پر چڑھا رہا تھا۔"

"تم نے اچھا سبق دیا ہے اسے۔ اب منیرہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئی ہے۔ وہ یتیم و لیسیر بچی۔"

"ہم بھی تو یتیم و لیسیر ہیں بھائی۔ کون ہے ہمارا اس دنیا میں۔ سوائے ان پستولوں کے۔" آبی نے ایک بار پھر زور کے ترکے میں دو سگریٹوں کو سلگاتے ہوئے کہا۔ ایک اس نے مجھے دے دیا، بولا۔ "یہ لے اسے پی اور یاد رکھ کہ یہ تیرا شاید بائیسواں قتل ہے۔"

"نہیں یار! جھوٹ نہ بول، میرا قتل سے کیا کام۔ یہ تو موت ہے جسے جس حال میں چاہتی ہے لے لیتی ہے میرا کیا ہے، میں کسی کو قتل کر ہی نہیں سکتا۔ ویسے تیرا تو یہ چھتیسواں قتل ہوگا۔"

"یار! تعداد کچھ زیادہ ہی ہو گئی ہے، ان لوگوں نے پکڑ لیا تو بہت ماریں گے، مگر ہر قتل کی ایک ٹھوس وجہ موجود تھی ماسوا ان چھ سپاہیوں کے، وہ بےچارے بے گناہ مارے گئے۔"

"ہاں ان کا مجھے بھی افسوس ہے کسی دن وقت ملا تو ایک ایک کے گھر جا کر پرسا دیں گے اور رقم بھی۔ وہ سمجھیں گے کہ وہ سپاہی بیمہ شدہ تھے۔"

میں نے گھوڑے کی رفتار تیز کر دی ہمیں ہر حال میں وہاں سے نکل جانا چاہیے تھا اور گاؤں میں کوئی ایسا نہیں تھا جو ہمارا راستہ روکتا۔ کس کو پڑی تھی کہ وہ دوسروں کے لیے اپنی جان دیتا۔ پھر قدرت کا اصول یہ ہے کہ جب کوئی پرندہ کسی ڈار سے بچھڑ کر نیچے گرتا ہے تو ان میں سے کوئی بھی جھجک کر اسے دیکھنے نہیں لگتا ہے۔ وہ آگے ہی آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ انھیں کسی ساتھی پرندے کی موت روک نہیں سکتی ہے وہ اپنی منزل کی طرف رواں رہتے ہیں۔ یہی حال آدمی کا ہے۔ زندگی ایسی ہی ہے اور یہی سبق دیتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ہم بےفکر تھے اور صبح کے اجالے میں ملی دھوپ کی اوڑھنی سروں پر سے کر ہم بہت آگے نکل گئے تھے۔

ہم غوث پور سے نکل کر سیدھے قند کوٹ جا پہنچے۔ وہاں سے کشمور کے لیے گاڑی نکل ہی رہی تھی۔ یہی کوئی پندرہ منٹ باقی تھے۔ ہم نے تانگوں کے اڈے پر لے جا کر گھوڑے ایک سائیس کے سپرد کیے اور اسے پچاس روپے بھی دیے کہ وہ ان کا خیال رکھے، ہم کشمور سے واپس آ کر وہ گھوڑے اس سے واپس لے لیں گے۔

وہ بھلا آدمی مان گیا۔ اس نے ہمارے چہروں پر پڑی شرافت کی لکیریں شاید پڑھ لی تھیں، بولا "تساں فکر ای نہ کرو۔ شام تک آ جاؤ گے نا!"

"ہاں ہاں، ہم شام تک لوٹ آئیں گے، ان کو صبح کے مقابلے میں شام تک زیادہ طاقت ور ہونا چاہیے۔ خوب راشن پانی کھلاؤ انھیں۔" آبی نے اسے پچاس روپے اور دے دیے اور وہ پوری طرح اندر باہر سے خوش ہو گیا۔ اور ہم ٹکٹ خرید کر اسی وقت ڈیرہ غازی خان کی طرف چل دیے۔ وہاں سے میانوالی پہنچنا بہت آسان تھا۔

ہم گاڑی میں سنبھل کر بیٹھے تو آبی چاروں طرف نظریں دوڑاتے ہوئے بولا۔ "ویسے تو اچھا آدمی نہیں ہے جیلانی! میں اسی نتیجے پر پہنچا ہوں۔"

"کیا مطلب؟ یعنی میں اچھا کیوں نہیں ہوں، اچھوں کے سر پر کوئی سینگ ہوتے ہیں؟"

"دیکھ نا میرا مطلب ہے کہ اتنے سارے آدمی مار دیے تم نے خواہ مخواہ۔"

"کیا کہنا چاہتا ہے تو؟"

اس نے میری یہ بات سن کر پھر دو سگریٹ سلگا لیے، اب کی بار میرا سگریٹ زیادہ ہی گیلا تھا وہ میں نے باہر پھینک دیا۔ "ابے کچھ شرافت سے کام لے۔ میں یہ سگریٹ نہیں پیوں گا۔ ایک دم نامعقول آدمی ہے تو۔"

"دیکھ، یہ بزرگوں کا لعاب ہے، تیرے لیے اچھا ہے تیری عاقبت سنور جائے گی اس سے۔ پر تو اچھا آدمی نہیں ہے یار۔ یہی مجھے افسوس ہے۔"

"ہاں تیری کیا بات ہے پہلی گولی تو نے ہی چلائی تھی اس حضور علی پر۔"

"وہ بھی میں نے تجھے بچانے کے لیے چلائی تھی پیارے! ورنہ میں کوئی اس کا دشمن تو نہیں تھا۔"

"اچھا! یعنی تجھے کوئی دشمنی نہیں تھی اس سے۔ اور وہ جو منیرہ پر تو مرا جا رہا تھا؟"

"وہ ... وہ تو میری دراصل خاندانی کمزوری ہے۔ میرے پردادا کے ہاں چار بیویاں شرعی اور تیرہ باندیاں تھیں، پر یہ بت تجھے لوگوں کو مار کر کیا ملتا ہے؟"

"میں تو اس آدمی کو مارتا ہوں جس سے مجھے خطرہ ہوتا ہے، اور بس۔"

"چلو ٹھیک ہے، پر تو یہ بتا کہ کوئی خوبصورت عورت تجھے اچھی کیوں نہیں لگتی۔ اس کی کیا وجہ ہے حالانکہ منیرہ خاصی طرحدار تھی مگر تو نے اسے بہن بنا لیا۔"

"وہ مظلوم تھی بھئی! آسیہ جیسی ہی مجھے نظر آتی تھی اسی لیے میں نے اس کے دشمنوں کو مار دیا۔ اب وہ عبدالحمید وہاں بیٹھا رو رہا ہوگا۔"

"دیکھ ذرا سنبھل کر بیٹھ! وہ ٹی ٹی آ رہا ہے ادھر۔"

"فکر نہ کر میرے پاس ٹکٹ ہے۔ مگر یار یہ کون ہے، یہ جو ہمارے سامنے بیٹھا ہے۔ اس کی شکل صورت مجھے پولیس والوں ایسی نظر آتی ہے۔" میں نے واقعی سنبھل کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ پتا نہیں ہمارے حلیے میں ایسی کیا بات تھی۔ وہ آدمی جب سے ہم وہاں بیٹھے تھے بڑے غور سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ گاڑی میں کئی اور لوگ بھی موجود تھے مگر کسی اور طرف اس کا دھیان ہی نہیں جاتا تھا۔ حالانکہ ہم نے لاکھو کے ہاں سے چلتے ہوئے نئے کپڑے پہن لیے تھے۔ ان پر کوئی داغ دھبہ بھی نہیں تھا مگر اسے کوئی ایسی بات نظر آتی تھی ہمارے چہرے پر کہ اس کا دھیان کسی اور طرف نہیں گیا اور وہ آدمی عام سے کپڑوں میں تھا۔ وردی میں ہوتا تو اور بات تھی۔

ٹکٹ چیکر ٹکٹ دیکھ کر باہر نکلا تو وہ آدمی اپنی جگہ سے اٹھا اور غسل خانے میں جا گھسا۔ جب وہ باہر نکلا تو وہ آدمی اپنی جگہ پر نہیں بلکہ سیدھا ہمارے پاس آ بیٹھا۔ آبی نے اس کو بٹھانے کے لیے تھوڑی جگہ دے دی تو وہ بولا "شکریہ جناب بہت بہت شکریہ! دراصل وہ جگہ اچھی نہیں تھی بڈھے آدمی کسی کام کے نہیں ہوتے۔"

"جی ہاں! اندر سے تو ہر آدمی ہی بوڑھا ہوتا ہے۔ جیسے ہم ہیں، پر باہر سے ویسا نظر نہیں آتا۔ کہاں جا رہے ہیں آپ؟"

"میں ذرا ڈیرہ غازی خان تک جا رہا ہوں، ایک کام ہے وہاں۔ ماچس ہوگی آپ کے پاس؟"

"جی ہاں۔ یہ لیں، بلکہ سگریٹ بھی لیں۔ یہ لیں، اور یہ کیا نکال لیا ہے آپ نے، یہ بگلے کے سگریٹ کیا مزہ دیں گے آپ کو۔" آبی نے یہ کہہ کر اپنا ولایتی سگریٹ اس کے سامنے رکھ دیا۔

"واہ! یہ تو راتھ مین ہے سنا ہے یہ بہت عمدہ سگریٹ ہے۔ کچھ چہرہ آپ کا دیکھا دیکھا سا لگتا ہے کیا کام کرتے ہیں آپ؟"

"کاروبار۔ ہر قسم کا کاروبار۔ ابھی ہم بھیڑیں خریدنے جا رہے ہیں، یہ بھی تو اچھا کام ہے نا؟"

"جی جی بالکل بہت اچھا کام ہے، کوئی بھی کام برا نہیں ہوتا۔" اس نے سگریٹ سلگا لیا۔

"ویسے بائی دی وے آپ کا کیا شغل ہے معاف فرمایئے مجھے۔" آبی اس سے بےتکلف ہونے لگا۔

"جی۔ میں ... میں دراصل ایک ... میں بتاؤں آپ سے بس سرکاری ملازم ہوں میں۔"

"اوہ تو یہ بات ہے۔ یہ کوئی چوری چکاری کا کام تو نہیں ہے کیوں شرماتے ہیں آپ اس کا ذکر کرتے ہوئے؟"

"بس ایسے ہی جی! دراصل اس میں تنخواہ کم ہوتی ہے نا! اس لیے۔"

"ارے نہیں! آپ تو ماشاءاللہ کلے ٹھلے کے بہت مضبوط ہیں، خوب کھاتے پیتے نظر آتے ہیں آپ۔ کچھ ہٰذا من فضل ربی بھی ہو جاتا ہوگا۔ کیوں شرماتے ہیں آپ؟"

"جی نہیں یہ بات نہیں ہے۔ میں ... بس ایک چھوٹی سی ملازمت ہے ادھر ٹریژری میں۔" اس نے اپنا چھوٹا سا اٹیچی کیس بھی اب سامنے کی برتھ سے اتار کر اپنی طرف رکھ لیا۔

"یہ تو بہت اچھا ہے سرکاری خزانے کے محافظ ہیں آپ۔ کیا کام ہے آپ کا وہاں؟"

"جی میں مختلف محکموں کی تنخواہوں کے بل وغیرہ دیکھتا ہوں۔ میری بیوی بھی میرے ہمراہ ہے اگر آپ اجازت دیں تو میں اسے دیکھ آؤں۔" گاڑی ایک غیر معروف سے اسٹیشن پر رکنے لگی تھی۔

"ضرور جائیں جی! بیوی کو نہ دیکھا تو کیا دیکھا۔ کیوں خان؟ آپ بھی تو یونہی بیوی کو اتر اتر کر دیکھا کرتے ہیں۔" آبی نے مسکرا کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ اتر گیا تو میں نے کہا "ایک دم فضول آدمی ہو تم۔ اس سے اتنی لمبی چوڑی بحث کی کیا ضرورت تھی۔"

"یہ ابھی نمودار نہیں ہوا ہے پیارے۔ یہ جھوٹ بولتا ہے یہ ٹریژری میں نہیں کسی پولیس کے خانے میں ملازمت کرتا ہے سمجھا بھی کر۔"

"یہ کیسے کہہ رہے ہو تم۔ کوئی سینگ آگتے ہیں ان کے ہاں؟ ایسے ہی کوئی بڑے جثے والا کلرک بادشاہ نظر آتا ہے مجھے۔"

"نہیں! میرا اندازہ غلط نہیں ہے۔ بہرحال دیکھتے ہیں کہ یہ ہے کون؟"

گاڑی آگے بڑھی تو وہ آدمی تیزی سے اندر آ گیا۔ اس کے پیچھے تین چار آدمی اور بھی تھے۔ وہ ہم سے ذرا ہٹ کر بیٹھ گئے۔

جب وہ ہمارے پاس آیا تو آبی نے کہا "کیسی ہیں آپ کی بیگم۔ ٹھیک جا رہی ہیں نا؟"

"جی ہاں! بالکل ٹھیک ہیں۔ دراصل عورتوں کے ساتھ سفر کرنا بہت دشوار ہوتا ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے، مجھے تو خیر ابھی تجربہ نہیں ہے۔ ہمارے یہ خان صاحب البتہ تین بیویاں کھا چکے ہیں اور آج کل چوتھی پر

ہاتھ رکھے ہوئے ہیں، آپ نے اپنا نام نہیں بتایا۔"

"جی میرا نام غیور احمد ہے آپ نے بھی اپنا نام ابھی تک نہیں بتایا ہے۔"

"جی مجھے ایس جی ایم پیرزادہ کہتے ہیں میرے والد بہت بڑے پیر تھے۔ پیر سجادت شاہ۔ اُدھر شورکوٹ میں ان کی گدی ہے سجادت شریف کے نام سے مشہور تھے وہ۔ اور یہ ہاشم خان ہیں، بہت اللہ والے لوگ ہیں۔ وضع ولایتی ہے مگر کام سب کے سب دیسی ہیں ان کے۔"

"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ دراصل سفر میں آدمی کو ہر طرح کا بندہ ملتا ہے۔ مگر آپ کو دیکھ کر میں بہت خوشی محسوس کر رہا تھا۔ میں۔۔۔ میں دراصل کچھ کاروبار بھی کرتا ہوں، سونے کا کاروبار۔ ڈیرہ غازی خان میں میرے بھائی کی دکان بھی ہے زرگری کی۔"

"اچھا! یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ سونا تو ہر آدمی کی کمزوری ہے، کیوں خانصاحب؟"

"جی آپ نے ٹھیک فرمایا۔ سونے کی کیا بات ہے۔" میں نے اس سے سگریٹ جھپٹتے ہوئے کہا۔

"اگر آپ کو ضرورت ہو تو میں یہ خدمت کر سکتا ہوں۔"

"نہیں بھائی! ابھی تو یہ مرحلہ نہیں آیا۔ کہیں ہماری شادی ہونے کو آئی تو آپ کو زحمت دیں گے۔"

"چلیں کوئی بات نہیں، پھر سہی۔ میں اپنا پتا آپ کو دے دوں گا۔" یہ کہہ کر وہ اپنی جیب سے سگریٹ نکال کر پینے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ دو آدمی جو اس کے عقب میں چلتے ہوئے اندر آئے تھے، اسے دزدیدہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے، جیسے ان لوگوں کے درمیان کوئی خفیہ پیغام رسانی جاری ہو اور وہ کوئی فیصلہ نہ کر پا رہے ہوں۔ بس ایک لحظے کے لیے ہی مجھے یہ احساس ہوا کہ وہ اس آدمی کے ساتھی ہیں مگر پھر یہ احساس دھندلانے لگا۔ کیونکہ غیور احمد اب انھیں نہیں دیکھ رہا تھا۔ میرا خیال ہے آبی نے بھی یہ سب کچھ دیکھا ہو گا مگر اس نے مجھ سے ذکر نہیں کیا۔

دس منٹ اسی طرح گزر گئے۔

گاڑی اب کسثور پہنچ رہی تھی جیسے ہی وہ اسٹیشن پر رکی۔ اس آدمی نے اٹھ کر اپنی بیوی کو دیکھنا چاہا اور ہم سے معذرت کر کے باہر نکل گیا۔ وہ جب واپس آیا تو اس کی بیوی بھی اس کے ہمراہ تھی بہت سجی سنوری خوبصورت تھی وہ۔

"میں معافی چاہتا ہوں۔ دراصل وہاں بہت زیادہ بھیڑ ہو گئی تھی عورتوں کے ڈبے میں۔ اسی لیے میں ان کو اٹھا لایا۔ جگہ مل سکے گی ان کے لیے؟"

"کیوں نہیں جناب! چشم ما روشن دل ماشاد۔ آپ انھیں بٹھا دیں۔" آبی نے اپنی جگہ سے سرکتے ہوئے کہا مگر تیسرا آدمی نفاست ستھرا نہیں تھا اور اس کے پاس وہ عورت بیٹھنا نہیں چاہتی تھی۔ غیور صاحب نے یوں کیا کہ اسے اپنے اور آبی کے درمیان بٹھا دیا۔

آبی خوش ہو گیا، بولا "بہت اچھا ساتھ رہے گا۔ ماشاءاللہ آپ کی نصف بہتر تو بہت ہی اللہ والی ہیں۔"

"جی جی۔ آپ کی مہربانی ہے مگر یہ نماز نہیں پڑھتی۔"

"اچھا اچھا! ویسے میرا خیال ہے یہ سیدھی جنت میں جائیں گی یہ۔ مجھے یقین ہے۔"

"جی، بہت مہربانی ہے آپ کی کہ آپ ایسا سوچتے ہیں۔"

میں نے کہا ہے ناکہ آبی اپنی ہی قسم کا بدمعاش تھا۔ عورت کو دیکھ کر اس کی باچھیں کھلنے لگتی تھیں، منہ گل و گلزار ہونے لگتا تھا۔ ابھی گاڑی کسثور سے چلی نہیں تھی کہ معلوم ہوا کہ ایک کراس آ پڑا ہے اس لیے ذرا دیر سے چلے گی۔ آبی نے اپنا بریف کیس میرے اور اس عورت کے درمیان رکھ کر کہا "میں ذرا چائے پی لوں، آپ بھی آ جائیں خانصاحب! یہ خاتون بیٹھی رہی ہیں۔ آپ ہمارے سامان کا دھیان رکھیں پلیز۔"

"جی کوئی بات نہیں، میں یہاں موجود ہوں۔" عورت نے ہمارے اور اپنے اٹیچی کیسوں کو سنبھالتے ہوئے کہا اور ہم دونوں غیور کو ساتھ لے کر اسٹیشن پر چائے پینے چل دیے۔

آبی بہت خوش تھا، غیور احمد کو خوش کر دینا چاہتا تھا اُس نے ڈھیر ساری چیزیں اپنے ساتھ رکھوائیں، بولا "ایک پیالی اندر اپنی بیوی کو بھی بھجوا دیں۔"

"ہاں! یہ تو بہت ضروری ہے میرا خیال ہے آپ خود ہی چلے جائیں۔ گھر ایسی بات ہے۔"

"ٹھیک ہے، میں یہ پیالی اور کیک انھیں خود دے آتا ہوں" آبی نے خوشی خوشی ایک پیالی چائے اور کھانے کی بہت سی چیزیں ٹرے میں رکھیں اور گاڑی کی طرف چل دیا۔ ڈبہ چائے کی کنٹین سے ذرا دور تھا۔ اس کام میں اس کے تین منٹ صرف ہو گئے ہوں گے میں اُسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس کی رفتار میں عجیب سرشاری آ جاتی تھی ایسے لمحوں میں خدا جانے اُسے کیا ہو جاتا تھا اس کے انگ انگ سے خوشی پھوٹنے لگتی تھی مگر جیسے وہ ڈبے کے سامنے پہنچا۔ اس کی رفتار ایک دم تیز ہو گئی۔ ڈبے کے اندر کا منظر اسے بے چین کر گیا تھا۔ چائے کی پیالی اور کیک وغیرہ اس نے دروازے میں پھینکے اور تیزی سے اندر گھس پڑا۔ یہ بات میرے لیے حیرت کا باعث تھی۔ مگر میں وہاں کھڑا چائے پیتا رہا لیکن آبی واپس نہیں آیا اور جب واپس آیا تو وہ عورت اس کے ساتھ تھی۔ اس کو آبی نے بالوں سے پکڑ رکھا تھا اور تڑاخ تڑاخ اس کے منہ پر طمانچے مار رہا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر میں تیزی سے اس کی طرف بڑھا غیور احمد بھی میرے ساتھ تھا۔

"یہ کیا کر رہے تم؟" غیور احمد نے بڑے غصے سے پوچھا۔

"یہ ذلیل میرا بریف کیس اپنے یاروں کو دے بیٹھی ہے۔"

"بریف کیس! اوئے بیڑا غرق۔ یہ کیا ہو گیا آبی! ان کو پکڑ یار! ہوا کیا تھا؟" میں نے گھبرا کر کہا۔

"میں اس کا خون پی لوں گا۔ ان کے ساتھ کوئی دو آدمی اور بھی ہیں۔ میں ڈبے تک پہنچا بھی نہیں تھا کہ وہ اسے مار پیٹ کر اس سے ہمارا بریف کیس اور اس کا اٹیچی کیس چھین کر لے گئے۔ میں اندر پہنچا تو یہ بُری طرح چیخ رہی تھی۔ یہ ذلیل! میں کہتا ہوں بتا وہ کون تھے؟ تیرے کیا لگتے تھے؟" آبی سخت غصے میں تھا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا ورنہ وہ اس عورت کا گلا گھونٹ دیتا۔

"بتاتی کیوں نہیں۔ کون تھے وہ؟ کیسے لے گئے وہ تجھ سے اٹیچی کیس اور بریف کیس؟ اس میں تو بھائی کی دکان کا زیور بھی تھا۔" غیور احمد نے پوچھا۔

"مجھے کچھ پتا نہیں۔ آپ باہر نکلے تو وہ آ دھمکے اور آتے ہی اُن دونوں نے میرے منہ پر زوردار تھپڑ مارا اور دونوں چیزیں لے کر غائب ہو گئے۔ میں چیختی ہی رہ گئی۔ اُن کو دیکھیں خدا کے لیے۔ اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔"

"تیرا قصور نہیں ہے۔ تو جھوٹ بولتی ہے اور تو بھی سن لے غیور احمد! تجھے بھی ہم نہیں جانے دیں گے، یہ چار سو بیسی نہیں چلے گی۔" آبی نے یہ کہہ کر غیور احمد کو گریبان سے پکڑ کر اوندھا کر دیا۔ "بتا وہ کون تھے؟"

"مجھے معلوم ہے آبی! ادھر آ۔ ان دونوں کو ادھر لے آ۔ گاڑی کو جانے ہی دو۔" میں نے اُن دونوں کو ڈبے سے اور زیادہ دور ہٹاتے ہوئے کہا۔ "اور چُپ رہو، شور مت مچاؤ ورنہ پولیس آ گئی تو کچھ نہیں ہو سکے گا۔" میں نے اُن دونوں کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ بہت سے لوگ ہمارے قریب آ کھڑے تھے۔ مگر میں نے انھیں پرے ہٹا دیا۔ "جاؤ! کوئی تماشا نہیں ہے یہاں! یہ ہماری گھر کی بات ہے، جاؤ۔" میں نے لوگوں کو پیچھے دھکیل کر انھیں اپنے ساتھ لیا۔ وہ عورت میرے دائیں ہاتھ تھی اور غیور احمد بائیں ہاتھ۔ مجھے یقین تھا کہ وہ لوگ گاڑی سے اتر کر اسٹیشن سے باہر جا چکے ہیں۔ آبی انھیں زبردست قسم کی گندی گالیاں دے رہا تھا۔ عورت کا اس نے دو چار ہاتھوں ہی میں بھرتا بنا دیا تھا۔ اس کے بال کھل گئے تھے، دوپٹہ گلے میں جھول رہا تھا اور اس کا سارا میک اپ خراب ہو چکا تھا اور وہ پہلے ایسی تیزی طراری، اس میں باقی نہیں رہی تھی۔ آبی کا ایک ہاتھ اس کے رخسار پر ایسا لگا تھا کہ منہ سے خون آنے لگا تھا جسے وہ بار بار تھوک کر صاف کر رہی تھی۔

عین اس وقت پولیس کے دو سپاہی آگے بڑھے، بولے۔ "کیا بات ہے؟ کیوں مارتے ہو اس عورت کو؟"

میں نے وہیں رک کر ان سے کہا "یہ ہماری گھر کی بات ہے، آپ جائیں تھانے میں رپورٹ درج نہیں ہو گی۔"

"ہو گی اور ضرور ہو گی۔ آخر کیوں مارا ہے تم نے اسے؟ یہ کیا بات ہے میاں؟"

"صاحب میرا اٹیچی کیس اور ان کا بریف کیس لے کر دو آدمی بھاگ گئے ہیں، انہوں نے میری بیوی کو مارا بھی ہے اندر ڈبے میں، وہ اچانک اس پر حملہ آور ہو گئے۔ کچھ آپ ہی ہماری مدد کریں۔" غیور احمد نے کہا۔

"ان کی مدد کی ضرورت نہیں ہے ہم خود ڈھونڈ لیں گے کہ وہ دونوں کہاں گئے ہیں۔ پلیز یہاں سے چلے جائیں۔ یہ عورت خود بتلائے گی کہ وہ آدمی کون تھے۔"

میں نے پولیس کے سپاہیوں سے درخواست کی کہ وہ پیچھے ہٹ جائیں۔ انھیں جب اپنی دال گلتی نظر نہیں آئی اور جب ان کو لے کر آگے ہی بڑھتا چلا گیا تو وہ چُپ چاپ واپس چلے گئے۔ گاڑی وہاں سے روانہ ہو رہی تھی۔ گارڈ نے سیٹی بجا دی تھی۔ چند ہی لمحوں بعد گاڑی وہاں سے چل دی، تو اسٹیشن بھائیں بھائیں کرنے لگا۔ ایک دم خاموشی چھا گئی۔

"اس سے پوچھ یار! میں اسے جان سے مار دوں گا اس نے سمجھا کیا ہے ہمیں۔ اس میں ساڑھے تین لاکھ روپیہ موجود تھا۔" آبی نے بلبلاتے ہوئے کہا۔ اسے کسی طرح چین نہیں آتا تھا۔

غیور احمد بھی سخت پریشان تھا مگر ابھی تک اپنے بس میں تھا اور یہ بتانے کے لیے تیار نہیں تھا کہ وہ دو آدمی کون تھے مگر مجھے معلوم تھا کہ وہ انہی کے ساتھی تھے۔ آبی کو بھی یہی احساس تھا۔

گاڑی کے اندر دوسری بار جب غیور احمد داخل ہوا تو اس نے جن دو آدمیوں سے آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں کیں وہ وہی دونوں تھے جو بریف کیس لے کر نکل گئے تھے۔ عورت کو اُن لوگوں نے محض دکھاوے کے لیے مارا تھا تاکہ واردات ڈاکے کی معلوم ہو لوگوں کو یہی تاثر دینے کے لیے انھوں نے اس عورت پر ہاتھ اٹھایا تھا تاکہ وہ یہی سمجھیں کہ وہ عورت اُن کے ساتھ شامل نہیں ہے۔

"اور غیور احمد کی بات کچھ زیادہ ہی لمبی ہو گئی ہے پیارے آؤ۔ باہر آ ؤ۔" میں نے ان دونوں کو گھسیٹ کر اسٹیشن سے باہر نکالا اور کچھ ہی دور ہم انھیں ایک ہوٹل میں لے گئے۔

"یہ کیا مذاق ہے آپ ہم سے یہیں بات کریں۔" غیور احمد نے ہوٹل کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "صاف ظاہر ہے کہ یہ ڈاکا ہے، آپ ہمیں خواہ مخواہ اس میں شامل سمجھ رہے ہیں۔"

"یوں نہیں بچے! یہ دیکھو۔ کیا نام ہے تمھارا؟" میں نے عورت سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

"میرا نام عذرا ہے بھائی جان! مگر خدا کے لیے میری بات کا یقین کریں۔ میں انھیں بالکل نہیں جانتی۔"

"میں کب کہتا ہوں کہ تم انھیں جانتی ہو، یہ تو نہیں کہا ہے میں نے، ذرا ہوٹل کے اندر کسی کمرے میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں کچھ رقم تو ہو گی تیری جیب میں پیرزادہ صاحب؟"

"ہاں! میرے پاس کوئی چھ ہزار روپے ہیں۔ یہ بھی ہماری خوش قسمتی ہے کہ میں نے یہ جیب میں رکھ لیے تھے۔"

"ایک کمرہ کرائے پر لے لو۔ یہ دوپہر ہم یہاں ہی گزاریں گے۔" میں نے اُن دونوں کو قہر آلود نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اور پستول میں نے جان بوجھ کر اُن پر ظاہر کر دیا۔

"یہ دیکھتے ہو نا غیور احمد! یہ بے آواز چلتا ہے اور اس سے پتہ نہیں ہم کیا کچھ کر چکے ہیں، اب سیدھے کھڑے رہو۔ جاؤ پیرزادہ کمرہ بُک کرا لو۔"

آبی اُسی وقت ہوٹل کے اندر چلا گیا

وہ دونوں بڑے غضبناک انداز سے مجھے دیکھ رہے تھے۔۔ غیور احمد بولا۔ "آپ کو یقین کیوں نہیں آتا۔ یہ بچاری خود بیٹ کر رہ گئی ہیں، آپ ان کو تلاش کریں ہمارا کوئی قصور نہیں ہے اس میں۔"

"یوں نہیں بچے! ہم تو چور کی ماں کو مارتے ہیں پیارے! یوں نہیں! ابھی تو تمھیں لمبے امتحان سے گزرنا ہو گا۔ وہ خود یہاں آئیں گے رقم لے کر، ہاں! وہ خود آئیں گے۔" میں نے غیور احمد کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ اور اسے معلوم تھا کہ وہ اسے چھڑا نہیں سکتا ہے۔ کچھ ایسی ہی مضبوطی سے اُس عذرا کی کلائی میرے بائیں ہاتھ میں تھی مگر یوں کہ وہ دیکھنے والے کو نظر نہیں آتی تھی۔ ایسے ہی میں نے کلائی دبا کر پہلو میں دبے رکھی تھی۔

"آپ کو خدا رسول کا واسطہ! مجھے ذلیل نہ کریں۔ میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں میرا اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔ میں تو خود ذلیل ہو کر رہ گئی ہوں۔"

"ساڑھے تین لاکھ روپے ہیں اس بریف کیس میں بی بی! وہ تو ہم یوں ہی نہیں چھوڑ سکتے ہیں۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ وہ دونوں ہی مجھے بدترین قسم کے خبیث نظر آتے تھے۔ اور آبی انہی پر اعتبار کر بیٹھا تھا۔

چند ہی لمحوں بعد آبی واپس آ گیا بولا۔ "کمرہ بُک ہو گیا ہے۔"

"تو چلیں پھر آ گئے مگر غیور احمد! یہ بہت ضروری ہے، ورنہ میں تمھیں یہیں ختم کر دوں گا۔" میں نے اس کی کلائی کو اور زیادہ دباتے ہوئے کہا۔ دُہرے بدن کا وہ آدمی بظاہر تو بہت تندرست نظر آتا تھا مگر جب ہاتھ میں ہاتھ پڑا تو میں سمجھا کہ وہ آرام طلب آدمی ہے حرام خور، پرلے درجے کا عیاش اور بے نور۔ وہ دونوں میرے آگے آگے چلے تو آبی بولا۔ "ان کا کیا کرو گے تم ہدرقم تو پتا نہیں کہاں جا پہنچی ہے۔"

"دیکھتے رہو۔ یہی سب کچھ بتائیں گے۔ میں انھیں یونہی تو نہیں لے جا رہا ہوں اندر۔"

کمرہ خاصا معقول تھا چار آدمی وہاں اطمینان سے سو سکتے تھے۔ پنکھے بھی موجود تھے اور باتھ روم بھی۔ میں نے اُن دونوں کو لے جا کر پلنگ پر بٹھا دیا۔

"اِن کے لیے تھوڑی چائے منگواؤ پیرزادہ صاحب۔"

آبی نے فوراً ہی کمرے سے نکل کر چائے کے لیے کہہ دیا۔

"آرام سے بیٹھیں بی بی! اور مجھے بتائیں کہ یہ دھندا آپ نے کب سے اختیار کر رکھا ہے؟"

وہ سٹپٹا سی گئی، بولی۔ "یہ غلط ہے۔ آپ مجھے بالکل ہی غلط سمجھ رہے ہیں، میں بالکل بے قصور ہوں۔ وہ میرے ہاتھ پر ہاتھ مار کر مجھے ذلیل کر کے مجھ سے دونوں چیزیں لے گئے۔"

"اور تم دیکھتی رہ گئیں۔ لعنت ہے تمھاری صورت پر۔۔ بچارے کیا سوچیں گے ہمارے بارے میں؟" غیور احمد نے پہلی بار عذرا کو دھمکاتے ہوئے کہا۔

"مگر میں کیا کر سکتی تھی تنہا عورت۔ جب کہ وہ ہاتھا پائی پر بھی اُتر آئے تھے۔"

چائے شاید تیار ہی تھی، بیرا فوراً ہی کپ ٹرے میں رکھ اندر لے آیا۔ وہ آبی نے اُس سے لے کر دروازہ بند کر دیا۔

"اس چائے کی مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے، ان سے کہو یہ ہماری رقم واپس کر دیں، ساڑھے تین لاکھ روپیہ ہے اس۔" آبی نے ایک بار پھر اپنا راگ الاپا۔

"مل جاتی ہے یار۔ رقم کے بارے میں اتنا پریشان ہو، یہ خود بتائیں گے کہ وہ کون لوگ تھے، ہاں مس عذرا یہ آپ کے شوہر ہیں؟"

"جی ہاں کوئی شک ہے آپ کو؟"

"نہیں! ایسا نہ کہیں، یہ آپ کے شوہر نہیں ہیں۔ بہرحال یہ دھندا آپ کب سے کر رہے ہیں؟" میں نے یہ کہہ کر پستول نکال لیا۔ "یہ دیکھیں، یہ بالکل بے آواز چلتا ہے غیور صاحب! آپ بہت کاریگر آدمی ہیں مگر آپ کو پتا نہیں کہ ہم کون ہیں۔"

یہ کہہ کر میں نے ایک گولی اُس کے سر پر سے گزار دی، وہ تو ڈھے سا گیا۔ بستر پر ایک دم لیٹ گیا اور اس کے مُنہ سے سسکاری سی نکل گئی۔ جیسے پہیے سے ہوا خارج ہو جائے۔

"کیوں مس عذرا! کیا خیال ہے یہ گولی ذرا نیچے ہوتی تو کیا ہوتا؟"

"اوہ خُدا کے لیے انھیں چھوڑ دیں۔ میں کیسے یقین دلاؤں کہ اس میں کسی کا بھی کوئی قصور نہیں ہے۔"

"یوں نہیں مس عذرا! یوں نہیں! ہمیں آپ خود ہی بتا دیں کہ رقم کہاں ہو گی؟"

"میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ وہ چور تھے، ڈاکو تھے، مجھے کیا پتا وہ کون تھے اور کہاں چلے گئے۔ اُن کو ڈھونڈا ہوتا نا آپ نے؟"

"کیا خیال ہے غیور صاحب! بتائیں گے نہیں آپ؟"

"میں نے بتایا تو ہے آپ کو، مجھے کچھ پتا نہیں ہے۔" اس نے پلنگ سے اٹھتے ہوئے خود کو سنبھال کر کہا۔ بال بھی اس کے بکھر سے گئے تھے۔

"ہوں، ٹھیک ہے۔ میں۔۔ مجھے آپ پھر نہ کہیں کہ زیادتی ہو گئی ہے۔" میں نے ان کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ دھیان میرا پستول کی طرف تھا۔ اُن دونوں نے کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھا تو میری نظر اُن پر جا پڑی۔

آبی بھی اس کھیل میں شامل ہو رہا تھا، بولا۔ "کیا خیال ہے غیور احمد! آپ کی بیوی کو اگر ذرا سی تکلیف دے دی جائے تو۔۔ تو ناراض تو نہیں ہوں گے آپ؟"

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ! آپ کو شرم آنی چاہیے یہ میری بیوی ہے، میں اس کے خلاف ایک لفظ نہیں سُن سکتا۔"

اُس کی یہ بات سنتے ہی میں نے اُٹھ کر اس کو گردن سے پکڑ لیا۔ اور پھر میں نے اس کی رگِ احساس مسل دی، یوں کہ وہ عذرا کے سامنے ہی بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ آنکھیں اُس کی یُوں کھلی تھیں جیسے اب کبھی بند نہیں ہوں گی۔

"یہ۔۔۔ یہ کیا کر دیا ہے آپ نے میرے شوہر کو مار دیا ہے آپ نے؟ اوہ میرے خدایا۔"

میں نے اس کا یہ نالہ سُن کر پستول اُس کے سر سے لگا دیا۔ "زیادہ بکواس کی ضرورت نہیں ہے مس عذرا! تمھیں بہت کچھ برداشت کرنا ہو گا۔ آپ کا جعلی شوہر بہت آگے نکل چکا ہے۔ جلدی واپس نہیں آ سکتا۔" یہ کہہ کر میں نے ایک جھٹکا دے کر اس کی قمیص سیون سے پھاڑ دی۔ "یہ ابھی زندہ ہے مس عذرا! مگر ہم اسے مار بھی سکتے ہیں۔ بہتر ہے ہمیں بتا دیں کہ وہ دونوں آدمی کون تھے اور اب کہاں ہوں گے؟"

وہ بے تحاشا رونے لگی۔

"یوں نہیں بے بی یوں نہیں! ہمیں اُن کا پتا معلوم کرنا ہے ورنہ تمھارا یہ لباس ہم تار تار کر دیں گے اور یہ پھر کبھی اپنے پاؤں سے چل کر گھر نہیں پہنچ سکے گا۔"

اس کی ہمت جواب دے گئی۔ بولی۔ "وہ بیرآباد میں رہتے ہیں۔ یہ اسی شہر کا ایک محلہ ہے۔ ہمارے ہی گھر میں رہ رہے ہیں وہ۔ ایک کا نام غیاث ہے اور دوسرے کا انور۔"

"کیا کرتے ہیں وہ، میرا مطلب ہے یہ دھندا کب سے چلا رہے ہیں وہ؟"

"یہ ہمارا روز کا دھندا ہے۔ کبھی ہم ملتان کی طرف نکل جاتے ہیں اور کبھی سکھر کی طرف۔ گاڑی میں ہمیں کچھ نہ کچھ ضرور ہی مل جاتا ہے۔"

"ہوں! بہت اچھی بات ہے، یہ تو ہمیں بھی اس دھندے میں شامل سمجھیں۔ اور کون ہے آپ کے گھر میں؟"

"اور کوئی نہیں ہے۔ ایک یہ میرے شوہر ہیں اور وہ ان کے دوست ہیں۔"

"گڈ۔ ویری گڈ۔ اب اگر آپ کہیں تو میں ان کو ہوش میں لے آؤں؟ مگر ابھی نہیں۔ ہمارا مال پہلے برآمد ہونا چاہیے پیرزادہ صاحب کیا خیال ہے، ہم دونوں بیرآباد نہ چلیں؟"

"میں تو یہی چاہتا ہوں ہاشم خان، ہمارے ساتھ تو بہت ظلم ہو گیا ہے غریب مسافروں کو لوٹنا کوئی اچھی بات ہے اور پھر ہم جیسے غریبوں کو۔" آبی کے چہرے کی رنگت بدلنے لگی تھی اور اس پر جو بے پناہ اداسی چھا گئی تھی وہ چھٹ گئی تھی۔

"تو پھر آؤ، اُن سے مل لیتے ہیں کیا نمبر ہے آپ کے مکان کا؟"

"تیئیس نمبر مکان ہے اور دو منزلہ ہے، غیور احمد کا نام لکھا ہے اس پر۔"

"شکریہ! کتنی اچھی ہیں آپ! دل چاہتا ہے آپ کو میں سینے میں چھپا لوں۔ بٹھایا تو اسی لیے تھا گاڑی میں آپ کو اپنے پاس، مگر یہ پتا نہیں تھا کہ یہ کریلا اتنا کڑوا نکلے گا۔" آبی نے خوش ہو کر کہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ سب کیسے ہو گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر بڑی آہستگی سے اس کی گردن پر ہاتھ پھیرا اور پھر ایک دم میں نے اس کو گرا دیا۔ وہ فوراً ہی بستر پر جھول گئی غیور احمد کے ساتھ۔

"چل بھئی! اب دیکھتے ہیں وہ سالے کیا کہتے ہیں۔ وہ غیاث اور وہ انور کمینوں نے ایسے ایسے دیدہ ور پیدا کر رکھے ہیں، اس کی تو ہمیں خبر ہی نہیں تھی۔" یہ کہہ کر میں نے اُن پر چادر ڈالی اور دروازہ باہر سے بند کر کے ہم ہوٹل سے باہر نکل گئے۔ آبی کی رفتار کچھ زیادہ ہی تیز تھی جیسے وہ عید پڑھنے جا رہا ہو۔ ایک دم بدمعاش آدمی تھا وہ۔ بہت غصہ آتا تھا مجھے اُس پر۔ خوبصورت عورت کو دیکھتے ہی پاگل ہو جاتا تھا۔

دوپٹے نام کی کوئی شے اُسے کیکر پر بھی ٹنگی ملتی تھی تو وہ اُس پر لٹو ہو جاتا تھا۔ عورت کو دیکھ کر اس کے وجود میں بتیاں سلگنے لگتی تھیں جو اسے چین نہیں لینے دیتی تھیں۔ راتوں کو اس کی نیند اُڑ اُڑ جاتی تھی۔ انہی عورتوں کے سیاپے میں پھنس کر وہ اپنی آنکھوں سے بھی محروم ہو گیا تھا۔ یہ ان کی زلفوں پر نثار ہوا تو وہ اس کے بدن کو بھی پولیس کے پاس گروی رکھ گئیں۔ ان کا ستم رانی کا انداز بھی منفرد تھا۔ وہ خون کرتی تھیں اور آدمی کا خون کھینچتی تھیں۔ اس کی شاہ رگ نچوڑ دیتی تھیں مگر آبی اُن کے سامنے بھی بے لباس ہو گیا۔ ذلت و رسوائی کی آخری حدوں کو چھو گیا۔ محض اُن کے بدن کی پُراسرار لذتوں سے ایک گھڑی کے لیے آشنا ہونے کی آرزو میں وہ مرا جاتا تھا مگر اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ دیوار کے اس طرف کیا ہے۔ یہی طریقہ اس نے سفر کے دوران بھی قائم رکھا۔ میں نے اسے حسنہ دے دی۔ ایک رات کی وہ زر خرید لونڈی میں نے اُس کی جھولی میں پھینک دی اور وہ اس پر مہربان ہو گیا کہ صبح وہ اسے سیف علی کے ساتھ اپنی والدہ کے پاس بھیجنے پر آمادہ نظر آتا تھا تاکہ بس انداز دوپٹے کی طرح وہ اس عورت کو بھی کسی محفوظ جگہ پر پہنچا دے۔ اس کی وہ کیفیت کسی طرح بدل ہی نہیں رہی تھی۔ گاڑی کے ڈبے میں بھی وہ کسی شعلہ بدن کی تلاش میں تھا اور وہ اسے مل بھی گئی۔ یوں کہ غیور احمد نے اپنی اس ’چاچی‘ کو لا کر اس کے پاس بٹھا دیا اور وہ خوش ہو گیا۔ اتنا خوش کہ اس نے اپنا وہ بھاری بھرکم بریف کیس اس کے حوالے کر دیا۔ خود وہ ہم سب کو ساتھ لے کر اسٹیشن پر چائے پینے چل دیا مگر اسے کیا معلوم تھا کہ ہر عورت قابلِ اعتماد نہیں ہوتی۔ ایسی تو بہت سی ملتی ہیں۔ ان سے آدمی کچھ بھی حاصل نہیں کر سکتا۔ اُلٹا وہ بریف کیس ہی اس سے چھین کر لے گئی۔ اور اب وہ انہیں بتا رہا تھا کہ بریف کیس میں تو ساڑھے تین لاکھ روپیہ موجود تھا۔ اُن لوگوں نے اس واردات کے لیے اپنے طے شدہ منصوبے کے تحت پہلے سے دو آدمی وہاں بٹھا رکھے تھے جس سے دیکھنے والا یہی سمجھتا تھا کہ عورت تنہا تھی۔ مسافر یک جا ہونے کے باوجود تنہا اور الگ الگ ہوتے ہیں۔ عورت کو یوں بے سہارا پا کر ان لوگوں نے اُسے مارا پیٹا اور اس سے دونوں بریف کیس چھین کر لے گئے۔ کسی نے نہیں پوچھا کہ بھیا تم کون ہوتے ہو یہ مال لے جانے والے۔ مسافر تو ایسے ہی ہوتے ہیں، وہ تنہا تنہا ہو کر لٹتے ہیں اور کوئی کچھ نہیں کہتا۔ اب اگر ان لوگوں نے پولیس کے سامنے

ٹپس لڑا رکھی ہو اور وہ بھی اُن کے حصے دار ہوئے تو ہماری رقم تو اب تک کئی حصوں میں تقسیم ہو چکی ہو گی۔ ہم تو بس ٹاپتے ہی رہ جائیں گے۔ کیونکہ جہاں پولیس آتی ہے وہاں سے رونق چلی جاتی ہے۔ مثل تو یہی مشہور ہے۔

ہم ہوٹل سے باہر نکلے تو آبی بولا۔ ”یار! تجھے کیسے پتہ چل گیا تھا کہ مال ان کے ساتھیوں نے لوٹا ہے، تیرے پاس کوئی گیدڑ سنگی ہے؟“

”اوئے بکواس نہ کر۔ تیرا تو مغز خراب ہے۔ جہاں تجھے عورت نظر آئی تو نے وہیں ڈیرا ڈال لیا۔ ایسے یہ عورتیں تجھے مروا دیں گی ایک دن۔ صاف مروا دیں گی۔“

”میں کیا کروں یار! بس مجھ سے صبر نہیں ہو سکتا، تیرے پاس کوئی دوا ہے اس کی؟“

”کیا مطلب؟ میں کوئی حکیم ہوں تیرے خیال میں؟“

”میرا مطلب تھا کہ کوئی نسخہ نہیں ہے تیرے پاس صبر کا، دھیرج کا، اپنی باری کے انتظار کرنے کا، دھنیا نہ پی لوں میں؟“

”ہا۔۔۔ تیری ساس مر جائے۔ خبیث آدمی اتنا تو دیکھ لیا ہوتا کہ وہ عورت ہے کون؟ وہ دو آدمی اس غیور احمد کے سامنے دروازے کے پاس بیٹھے تھے۔ میں نے ان کو آپس میں بات کرتے دیکھ لیا تھا۔ پتہ نہیں تیری نظر کیا دیکھتی رہی ہے؟“

”میں۔۔۔ میں دراصل اس خاتون کو دیکھ رہا تھا۔ اور پتہ ہے اس نے کیا کیا، آتے ہی میری ران میں چٹکی بھر لی۔ ہاں! ایک نمبر بدمعاش عورت تھی وہ۔“

”یہ اچھی رہی۔ وہ تیرے گل کتر گئی اور تجھے خبر بھی نہ ہوئی۔ ذرا سنبھل کے چل۔ یہ کشمور، پتہ نہیں کس نے نام رکھ دیا تھا اس شہر کا۔“

”اور یہاں کا یہ کتا ابھی تک چار ٹانگوں پر ہی چل رہا ہے ذرا دیکھ تو، ہے نا حیرت کی بات۔“

”تیرا کیا خیال ہے اس کی چھ ٹانگیں ہونی چاہیے تھیں، ہا ہیں؟“

”میرا تو یہی خیال تھا۔ دراصل میں نے کوئی پندرہ بیس سال کے بعد کتے کو غور سے دیکھا ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ شاید اس میں کوئی تبدیلی آ گئی ہو گی۔“

”ہاں یہ ٹھیک ہے جس چیز پر تیری نظر نہیں جاتی اُس کا حلیہ بدل جانا چاہیے۔ محلہ کون سا بتایا تھا اس نے؟“

”پیر آباد۔ ذرا ٹھہر میں کسی سے پوچھ تو لوں۔“

”نہیں پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ٹیکسی پکڑ لے۔“ آبی نے خالص بدمعاشوں ایسے طریقے سے سیٹی بجائی تو

وہ ٹیکسی والا ٹھہر گیا۔ وہ ہمارے قریب ہی سے گزر رہا تھا۔ کھڑکی سے سر باہر نکال کر بولا۔ ”کیا بات ہے باؤ جی، یہ سیٹی کس لیے بجاتے ہو، کراچی سے آئے ہیں آپ؟“ وہ رمز شناس تھا۔ سمجھ گیا کہ سواریاں باہر سے آئی ہیں۔

”ہاں! ابھی تیری سمجھ میں ہماری بات آ گئی ہے، ورنہ شاید کوئی بھی سیٹی کا مطلب نہ سمجھتا۔ چل، ذرا ہمیں پیر آباد لے چل۔“ آبی نے ٹیکسی میں گھستے ہوئے کہا۔

”میں ایک کام سے ادھر آیا تھا سکھر شہر سے، ورنہ یہاں ٹیکسیاں کہاں۔ بیٹھیں میں آپ کو پہنچا دیتا ہوں۔ راستہ معلوم ہے آپ کو؟“

”نہیں یار! اسی لیے تو تجھے روکا ہے، اب کسی سے پوچھ، اور ہمیں وہاں لے چل۔“ میں نے بدمزہ ہو کر کہا۔ خرابی مجھے سامنے ہی کھڑی نظر آتی تھی۔ رقم ہماری سلامت نہیں رہ گئی تھی۔ سارے اندازے یہی بتلاتے تھے۔ پیر آباد کا نام اس نے غلط بتایا تھا۔ وہ عورت اتنی سیدھی نہیں تھی کہ ذرا سے تشدد پر سچ اگل دیتی۔ پھر بھی ایک آس بندھ گئی تھی اور اسی کے سہارے ہم پیر آباد جا رہے تھے۔ ہم خواہ مخواہ ہی اس گھمس میں۔۔۔۔ پڑ رہے تھے۔ لوٹ کا مال تھا۔ لٹ گیا، اچھا ہوا۔ آبی کے لیے سوائے پچھتاوے کے اب کچھ باقی نہیں رہ گیا تھا۔ ڈرائیور نے ایک راہ گیر سے پیر آباد کا پتہ پوچھا اور آگے چل دیا۔ بولا۔ ”یہاں کے بدمعاش بھی خاصے ہٹے کٹے کے لوگ ہیں۔ میرے ساتھ ٹیکسی میں دو سواریاں یہاں اُتری ہیں۔ میں انہیں سکھر سے یہاں لایا تھا مگر وہ ہوٹل کے سامنے اُتر کر ایسے غائب ہوئے ہیں کہ میں صبح سے انہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گیا ہوں۔ پولیس کے پاس میں جانا نہیں چاہتا۔ وہ اپنا حصہ مانگتے ہیں۔“ ڈرائیور نے عقب نما کو سیدھا کرتے ہوئے کہا۔

”اچھا! تیرے ساتھ بھی یہ قصہ ہو چکا ہے، کمال ہے۔ ایسے ایسے لوگ پڑے ہیں یہاں؟“

”لگتا تو کچھ ایسا ہی ہے۔ بڑی رقم بن گئی تھی اُن کی طرف مگر وہ ہاتھ ہی نہیں آئے۔“

”تیرا بھی خدا حافظ ہے پیارے۔ بہتر ہے تو واپس چلا جا۔ یہ کشمور ہے، کشمیر کی کھچڑی۔ سمجھتا ہے نا تو! اور کشمیری برہمن زادی ایسا حال ہے اس کا۔ وہ سب کو گھر بلا کر خود کسی اور جگہ جا کھڑی ہوتی ہے۔“

”مگر میں ان کو چھوڑوں گا نہیں! اتنی مار دوں گا میں انہیں کہ وہ یاد ہی رکھیں گے۔“

میں نے ڈرائیور کے ڈیل ڈول پر نظر ڈالی۔ خاصا مضبوط اور کسرتی بدن کا آدمی تھا اور اپنی اس بے عزتی پر بہت بُری طرح تلملا رہا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد اس نے ہمیں پیر آباد محلے کے چوک میں جا اتارا۔ آبی نے پچاس کا نوٹ اس کی طرف سرکا دیا۔ تو وہ بولا۔ ”میرے پاس ریزگاری تو نہیں ہے جناب۔“

”تو پھر تو یہ سارے ہی رکھ لے، یہ لے سو روپیہ میں تجھے اور دیتا ہوں، پیٹرول لے لینا۔ ان سالوں کو تو اب تو بھول ہی جا۔ وہ تیری ٹیکسی بھی چھین لیں گے، پتہ نہیں کون لوگ ہیں، دفع کر انہیں۔“ آبی نے اس کی مٹھی میں نوٹ رکھ کر اسے تسلی دی۔

”آپ کمال کرتے ہیں بھائی جی مگر۔۔۔۔۔“

”بس ٹھیک ہے نا۔ دفع کر انہیں۔ ٹیکسی بچ گئی، یہی کافی ہے اور یہ کشمور ہے پیارے۔ پتہ نہیں کیسے کیسے لوگ رہتے ہیں یہاں۔“ یہ کہہ کر آبی پیچھے ہٹ گیا۔ ڈرائیور کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہاں تک کا کرایہ شاید پانچ روپے بھی نہیں بنتا تھا مگر اسے ڈیڑھ سو روپے مل رہے تھے۔ بہت بڑی رقم تھی یہ اس کے لیے۔ آبی نے اس کے لیے خواہ مخواہ ہی مصیبت پیدا کر دی تھی۔ چند لمحوں تک وہ سمجھا کہ ہم کوئی بہت ہی بگڑی ہوئی قسم کے بدترین رئیس ہیں۔ رقم کو رقم ہی نہیں سمجھتے۔ پانچ کے بدلے ڈیڑھ سو دے کر بھی سمجھتے ہیں کہ ہم نے کچھ نہیں دیا ہے۔

ہم ذرا آگے نکلے تو آبی بولا۔ ”یہ سالا پس و پیش کر رہا تھا ہے کہ نہیں، میں نے فقرہ صحیح بولا ہے نا؟“

”ہاں تیری زبان بہتر ہو گئی ہے۔ پس و پیش ٹھیک لفظ ہے مگر اس کی ڈاڑھ تلے یہ رقم رکھنے کی کیا ضرورت تھی؟“

”ایسے ہی یار! آدمی مجھے ٹھگوں کا مارا ہوا لگتا تھا۔ میں نے سوچا چلو اسے یہ رقم دے ہی دو۔ نیکی کی ہے نا میں نے؟“

”ہاں۔ تیرے کھاتے میں سنہری حرفوں سے لکھی جائے گی یہ نیکی۔ تیرا اسکور پتہ ہے کتنا ہو چکا ہے۔ ایسے ایسے گرز ماریں گے وہ تجھے کہ پسلیاں اندر ڈال دیں گے۔“ میں نے پیر آباد کی گلی میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

”اوئے بک نہیں اوئے، تو بڑا نیک ہے۔ تیرا اسکور تو مجھ سے بھی زیادہ ہے۔ پر یار کسی دن لینے کے دینے ہی نہ پڑ جائیں۔ خطرہ کچھ زیادہ ہی بڑھتا جا رہا ہے۔“

”دیکھ لیں گے جب وقت آئے گا تو سیدھے چون و چرا اپنی جان حاضر کر دیں گے۔ اب کی بار دس بیس لاکھ کا بیمہ ضرور کروا لیں گے۔“

”وہ بھی سالے پوچھیں گے ہم سے کہ ولدیت کیا ہے۔

کس کے تخم ہو تم ۔ اور یہی ہمیں معلوم نہیں ہے ۔ تجھے پتہ ہے تیرا باپ کون تھا ؟"

"بکواس نہ کرا دے! یعنی یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ تیری اپنی ولدیت البتہ مشتبہ لگتی ہے مجھے۔"

"کوئی بھی اپنی ولدیت کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا ہے بیٹے! اسی لیے قیامت کے دن لوگوں کو ان کی ماؤں کی نسبت سے پکارا جائے گا۔ وہ زیادہ، کیا کہتے ہیں اُسے "اتھانٹی کیٹیڈ" طریقے سے بات کرسکتی ہیں۔ کیا خیال ہے تیرا، اس غیور احمد کو دیکھ اس سالی قاتل حسینہ نے مصیبت میں ڈال دیا ہے ہمیں۔" آبی نے گلی میں چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا "وہاں غیور احمد کا نام ہمیں کہیں نظر نہیں آیا۔

"چل ذرا آگے جا کر دیکھتے ہیں۔ پتہ نہیں کس چور خانے میں رہتا ہے وہ۔ بہت خبیث آدمی تھا یار وہ ایسا لا اُسے لگایا اس نے ہمیں..." آبی کو پھر واردات کی تفصیل یاد آنے لگی "یار میری بائیں آنکھ کام ہی نہیں کرتی۔ ذرا دیکھنا تو۔ کوئی گڑبڑ تو نہیں ہو گئی۔" وہ میرے سامنے بائیں آنکھ پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا "دیکھ تو سہی ذرا، تیری دوستی میں آنکھیں بھی گئیں۔ پتہ نہیں اور کیا کچھ ہو گا میرے ساتھ۔"

میں نے اس کی بائیں آنکھ ذرا کھول کر دیکھی تو پتہ چلا کہ اس کا وہ آئی لینز، اپنی جگہ سے ہٹ چکا ہے اور اب اُس کو ہر شے دھندلی نظر آنے لگی تھی۔

"ابے اس شیشے کو استعمال کرنا سیکھ! یہ اپنی جگہ سے ہٹ گیا ہے، لا میں اسے ٹھیک کرتا ہوں۔" وہ سدھائے ہوئے کتے کی طرح میرے سامنے سر ڈال کر ٹھہر گیا۔ سر سے پاؤں تک وہ پنجر کا بت نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس کا شیشہ رومال سے آنکھ کی پتلی پر جما دیا۔

وہ ہنسنے لگا، بولا "اب ٹھیک ہے یار! تو مجھے نظر آنے لگا ہے ورنہ میں سمجھا کہ تیرا وجود ہی ختم ہو چکا ہے۔ چل اب۔ میرا خیال ہے کہ اس کو استعمال کرنے کا کوئی خاص گر ہے۔"

"ہاں! آنکھیں زیادہ نہ کھولا کر تو جو پاگل ہو کر عورتوں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگتا ہے نا تو اسی وجہ سے یہ تکلیف پیدا ہوتی ہے، ان کو آنکھیں میچ کر دیکھنا چاہیے یوں۔" میں نے اپنی آنکھوں کو ذرا تیر نیم کش بنا کر اس کے سامنے پیش کیا۔

وہ اور زیادہ ہنسنے لگا، بولا "تیری کیا بات ہے۔ اور تیرے اس تیر نیم کش پر ہزار لعنت۔ بالکل بھینگا نظر آ رہا ہے تو۔ کوئی حسینہ ان کو دیکھنا پسند نہیں کرے گی، ابے وہ دیکھ وہ سامنے غیور احمد لکھا ہے۔ یہ چھوٹی سی تختی دیکھ ذرا۔"

میں نے سامنے نظر ڈالی تو ایک چھوٹی سی تختی پر غیور احمد لکھا تھا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ٹھیک ہی کہتی تھی وہ قاتل حسینہ۔ ہائیں۔ کھٹکھٹا دے یہ دروازہ۔ بدمعاش ہم سے اتنی بڑی رقم چھین کر لے گئے۔ ان کا بیڑہ غرق۔ دو یتیموں کو تباہ کر گئے ہیں سالے۔"

آبی نے فوراً ہی آگے بڑھ کر غیور احمد کا دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ "ذرا اکڑ کر کھڑا ہو۔ پتہ نہیں کیسے لوگ ملیں گے یہاں، اپنا چپ شاہ بھی سیدھے ہاتھ میں لے لے۔"

"ٹھیک ہے یار! ادھر ذرا اونچ نیچ نہیں ہو گی۔ انھیں معلوم ہے کہ وہ کیا کر آئے ہیں۔"

چند ہی لمحوں بعد ایک بزرگ صورت آدمی نے دروازہ کھول دیا۔ ہمیں سامنے دیکھ کر بولا "فرمایئے کیا حکم ہے۔" آدمی وہ خاصا لکھا پڑھا نظر آتا تھا اور ڈاڑھی اس کی ساری کی ساری سفید ہو چکی تھی۔

"السلام علیکم یا حضرت! خیریت سے تو ہو ؟" آبی نے بڑی محبت سے اسے سلام کیا اور اس کے نہ چاہنے کے باوجود اس سے معانقہ شروع کر دیا۔ وہ بچارا اپنا پیچھا چھڑانے کے لیے دروازے کے اندر تک پیچھے ہٹ گیا مگر آبی نے اس کا پنڈ نہیں چھوڑا، اس سے یوں بغلگیر ہوا جیسے دو مدتوں سے بچھڑے باپ بیٹے ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔

"راضی تو ہو نا میاں جی! ماشاء اللہ ڈاڑھی بھی اب سفید ہو گئی ہے جب میں نے آپ کو دیکھا تو آپ جوان تھے۔ اب بابرکت بڑھاپا آ چکا ہے ماشاء اللہ۔ ویسے آپ سے مل کر ہمیں دلی خوشی ہوئی ہے۔"

"کیا فرما رہے ہیں آپ؟ میں نے تو آپ کو پہلی بار دیکھا ہے جناب، آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"آپ ہی غیور احمد کے والد ہیں نا! میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا آپ کی۔ بہت دنوں کے بعد ملنا ہوا۔ اندر بیٹھنے کے لیے نہیں کہیں گے؟ وہ انور صاحب کہاں ہیں ؟"

"وہ تو اندر ہی ہیں کوئی خاص کام ہے اُن سے ؟"

"اُن سے ایک کام تھا ہمیں، انھیں ذرا اطلاع دے دیں کہیں کہ بڑی دور سے دو یتیم ملنے آئے ہیں انہیں۔ ان کی ضرورت ہے ہمیں۔" آبی نے بڑے میاں کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

وہ پریشان سا ہو گیا۔ بولا "یہ عجیب بے تکلفی ہے۔ حد ہو گئی۔ میں انور کو ابھی باہر بھیجتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ پیچھے ہٹنے لگا تو میں نے ڈیوڑھی کی اندر سے کنڈی چڑھا دی۔ جیسے ہی بڑے میاں اندر کو لپکے ہم بھی اس کے ساتھ ہی صحن میں جا گھسے۔

"آپ اندر کہاں چلے آتے ہیں، میں انور کو باہر بھیجتا ہوں۔" وہ کچھ بدک سا گیا۔

"کوئی بات نہیں میاں جی! جہاں ہماری رقم جاتی ہے نا، وہیں ہم بھی جا پہنچتے ہیں۔" عین اس وقت صحن کے عقبی کمرے کا دروازہ کھلا تو انور کی صورت ہمیں نظر آئی۔

اس نے ہمیں دیکھا تو اس کا رنگ ایک دم سفید ہونے لگا۔ یوں بدک کر پیچھے ہٹا جیسے اس نے کوئی دو بھوت دیکھ لیے ہوں۔ مگر آبی نے اُسے دروازہ بند نہیں کرنے دیا۔ فوراً اس تک جا پہنچا۔ بڑے میاں کو میں نے پستول کی زد میں لے لیا۔

"کہاں جاتے ہو بھائی جی! تمھاری صورت دیکھنے کو تو ترس گئے ہیں ہم۔ ہم سے ایسی بھی کیا بے رخی۔ آگے چلو میاں جی! ہمیں ذرا اس انور سے حساب لینا ہے، اس بچہ بہادر سے۔" میں نے اس بزرگ صورت آدمی کو آگے دھکیل کر دروازے میں سے گزار دیا۔

وہ سٹپٹا گیا، بولا "یہ کیا شرافت ہے؟ آپ کون ہوتے ہیں میرے گھر میں دھاندلی کرنے والے ؟"

"ابھی بتلاتے ہیں بڑے میاں، اندر تو چلو۔"

عین اس وقت انور نے آبی کی گرفت سے اپنا پنجہ چھڑا لیا اور تیزی سے پیچھے بھاگا مگر آبی نے اپنا پستول نکال کر اُسے للکارا "ذرا ٹھہر جا بیلٹے! تیرے پیچھے گولی منڈلا رہی ہے۔"

وہ جہاں تھا وہیں رک گیا۔ بولا "ت...ت... تم... کیا چاہتے ہو ؟"

"ہا۔ ہا۔ ہا، ہم وہی چاہتے ہیں جو ت...ت... تم چاہتے ہو، رقم ۔ بھائی جی رقم۔"

"کیسی... ر... ر... ر... رقم ؟ م... م... میرے پاس کوئی رقم نہیں ہے۔"

"اتنے بھولے نہ بنو بھائی انور! تمھاری وہ مسز غیور ہمیں سب کچھ بتا چکی ہے بہتر ہے کہ وہ بریف کیس ہمیں دے دو۔ ابھی اور اسی وقت۔ تمہیں پتہ نہیں کہ وہ مال کس کا ہے ؟"

"مجھے... ک... ک... ک... کچھ پتہ نہیں کہ تم کیا کہتے ہو ؟"

"اس بابے کو اندر لے آؤ خان جی! اس کمرے میں۔ رقم ادھر ہی ہو گی، آؤ انور میاں۔ بہتر ہے وہ رقم ہمیں ابھی واپس کر دو۔" یہ کہہ کر آبی نے انور کو پاؤں کی ٹھوکر سے آگے دھکیلا تو وہ کمرے کے دروازے میں جا لگا۔ پٹ ایک دم کھل گئے۔

سامنے اس کا ساتھی ہمیں عجیب حالت میں ملا۔ اس نے نماز قائم کر لی تھی اور وہ بڑے خشوع و خضوع سے رکوع میں جھکا ہوا تھا۔

"واہ! کیسے کیسے عابد و زاہد آدمیوں سے پالا پڑا ہے ہمیں، ابے کتے کی دم! یہ کیا کر رہا ہے تو، وہ رقم کہاں ہے ؟" میں نے جاتے ہی اس کی پیٹھ پر ٹھوکر لگائی، وہ ایک دم منہ کے بل جا گرا۔ وہ سمجھا تھا کہ ہم اسے نماز کی حالت میں دیکھ کر خاموش رہیں گے۔ پتہ نہیں وہ کون سی نماز پڑھ رہا تھا۔

وہ الٹ کر گرا تو واویلا مچانے لگا "تم نے ہماری نماز خراب کی ہے خدا تمھیں تباہ کرے گا۔ یہ شرافت ہے تمھاری ؟ آخر تم ہو کون ؟"

"بیٹے ہم بھی اسی اسکول میں پڑھے ہیں جس میں تم داخلہ لے چکے ہو مگر ہم ایم ایس سی کر چکے ہیں اس سائنس میں۔ وہ رقم کہاں ہے؟ اسے باہر نکالو، ساڑھے تین لاکھ روپیہ ہے بریف کیس میں۔" آبی نے انور اور اس کے ساتھی کو پستول کی زد میں لے کر کہا۔

وہ دونوں وہی تھے جن کو میں غیور احمد کے ساتھ غیر مرئی زبان میں گاڑی کے اندر ایک دوسرے سے باتیں کرتے دیکھ چکا تھا۔ اُن کے دیدوں کی حیرت دیدنی تھی۔ اُن کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ہم یوں اتنی جلدی اُن کے ڈیرے پر پہنچ جائیں گے ۔ وہ بزرگ صورت آدمی بھی انہی میں شامل تھا مگر ظاہر یوں کرتا تھا جیسے وہ اُن میں سے نہیں ہے۔ واقعی وہ اُن میں سے نہیں تھا بلکہ وہ اُن سب کا استاد تھا۔ جیسے بہت سے شیاطین کا اُستاد ابلیس ہے اور وہ انھیں اپنے زیر تعلیم رکھ کر ان سے طرح طرح کے کام لیتا ہے، وہ بھی یہی کچھ کر رہے تھے۔ وہ اِن کی لن ترانیاں دیکھ کر خوش ہوتا تھا مگر اس کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کے لنگاروں نے اب کی بار کس قسم کے لوگوں پر ہاتھ ڈالا ہے۔ اُن کے لنج لنبان کو تو ہم جڑ سے کاٹ دیتے، یوں کہ پھر وہاں تنکا نہ اُگ سکتا۔

"کیا خیال ہے انور بھائی! وہ رقم نہیں دو گے تم ؟" میں نے بابے کو اُن کی طرف بڑے زور سے دھکیل کر پوچھا۔ اپنا چپ شاہ میں نے اُن پر تان لیا تھا۔

"وہ... وہ... ر... ر... رقم... ت... ت... تو ہمارے پاس نہیں ہے۔"

"ہوں! کہاں گئی پھر؟ سنبھل جاؤ انور میاں! یہ گولی بے آواز چلتی ہے اور تمھاری یہاں لاشیں ہی رہ جائیں گی۔" میں نے اس کے سر کے اوپر سے گولی چلاتے ہوئے کہا۔

اُس کی تو میاؤں ہی مر گئی۔ وہ ایک دم نیچے بیٹھ گیا۔ "وہ جی، بھاجی اُدھر ہے وہ رقم چار حصوں میں بٹی ہے۔ اس الماری میں دیکھیں۔" اس کے ساتھی نے خوف سے بیٹھی ہوئی آواز میں کہا۔

"دیکھ یار! اگر وہ رقم پوری ہے تو ہم ان پر لعنت بھیج دیں گے۔"

آبی نے میری بات سُنی تو تیزی سے الماری کی طرف لپکا' دروازہ کھلتے ہی اپنا بریف کیس اسے نظر آگیا۔ وہ اس پر جھپٹ پڑا۔ یُوں جیسے کوئی نادیدہ خزانہ اسے ہاتھ لگ گیا ہو۔ اُسے آبی نے کھول کر دیکھا تو رقم چار حصوں میں برابر بٹی ہوئی تھی۔ اور ہر حصے پر الگ نام لکھا تھا۔

"اچھا! تو یہ حصے بخرے بھی کر لیے تھے تم نے۔ خوب! بڑے پکّے اُلّو کے پٹھے حساب دان ہو تم۔" آبی نے جلدی جلدی رقم گنی' وہ پوری ہی تھی۔

"اوئے لوٹن کبوتر! یہ دھندا کب سے چلا رہے ہو تم؟ تمھاری ساس مر جائے، یہ قصہ کیا ہے؟" آبی نے بریف کیس بند کرتے ہوئے اُن سے پوچھا۔

"اور تو بڑے میاں! تیرا بھی دھندا یہی ہے؟ غفور احمد تیرا بیٹا ہے کیا؟"

اس نے سر ہلا دیا' اُسے رقم کے یُوں ضائع ہو جانے کا بے حد افسوس تھا۔ پر وہ کر کچھ نہیں سکتا تھا۔ اس کی آنکھیں ایسی ہو رہی تھیں جیسے ہاتھ سے موتی گرتے جا رہے ہوں اور وہ ان پر اپنی گرفت مضبوط نہ کر سکتا ہو۔

"تو واقعی مُرغِ مصلّیٰ نظر آتا ہے مجھے۔ تیری نماز کے کیا کہنے' کس کے لیے یہ سجدہ کر رہا تھا؟ اس دولت کے لیے مگر یہ تیرے لیے نہیں تھی پیارے! بڑے بُدھو ہوئے ہیں اس کے لیے اور تو اسے یونہی ہاتھ پر ہاتھ مار کر چھین لینا چاہتا تھا ہم سے۔" آبی نے اُن کے ساتھی کے مُنہ پر ایک کرارا سا ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "اس کی بے وقت نماز نے ہمیں حیران کر دیا تھا۔"

"چل یار نکل یہاں سے۔ پتہ نہیں کیسے کمینے لوگ ہیں یہ۔" میں نے آبی کے ہاتھ سے بریف کیس لے کر باہر نکلتے ہوئے کہا۔

وہ تینوں صُمٌ بُکمٌ ہو کر یُوں کھڑے تھے جیسے اُن کا حساب ہو چکا ہے اور اب وہ دوزخ میں ڈال دیے جائیں گے۔ تینوں کی آنکھیں یُوں جھکی تھیں جیسے کہنے کے لیے ان کے پاس کچھ بھی نہ ہو۔ کمرے سے باہر نکل کر ہم نے دروازہ بند کیا اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے گلی سے باہر نکل آئے۔ اُن سالوں نے ہمارا سفر ... بدمزہ کر دیا تھا۔

"یار! یہ تو بڑے پیر کاریگر نکلے۔ رقم تو پار ہی کر دی تھی ان لوگوں نے۔ وہ تو تیری نظر کام کر گئی۔ ورنہ تو تباہ ہو گئے تھے ہم۔" آبی نے بریف کیس میرے ہاتھ سے جھپٹتے ہوئے کہا۔ اسے اب اس کی قدر معلوم ہو گئی تھی۔

"تیرے ساتھ ایسا ہی ہوتا رہے گا آبی! نہ تو اپنی حرکتوں سے باز آئے گا' نہ یار لوگ تیرا پیچھا چھوڑیں گے۔"

"نہیں یار! اب تو میں بھی توبہ کرتا ہوں کسی عورت پر غلط نظر نہیں ڈالوں گا۔ یہ تو بڑی تباہ کُن چیز ہے۔"

"چل دفع کر۔ مٹی ڈال اس بات پر' کوئی گاڑی پکڑ۔ ہم ابھی میانوالی چلتے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ آسیہ کسی اور ہی سیاپے میں جا پھنسی ہے۔"

"ہاں لگتا تو مجھے بھی ایسا ہی ہے ... [illegible] ... اس جاگیر دار کے پاس نہیں گئی ہو گی۔ مگر اُن دونوں کا کیا کریں وہ کہیں مر ہی نہ جائیں ہوٹل میں۔"

"کچھ نہیں ہوتا انھیں۔ خود ہی نکل کر گھر چلے جائیں گے تم کوئی لاری دیکھو۔" یہ کہہ کر ہم تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے بسوں کے اڈے کی طرف چل دیے مگر خوف مجھ پر یہ طاری تھا کہ ابھی تک ہم خطرے کی زد سے باہر نہیں نکلے تھے۔ پولیس نے چاروں طرف تمام تھانوں میں اطلاع دے دی ہو گی۔ وہ یوں خاموشی سے اس ضرب کو نہیں سہہ گئے ہوں گے۔ گاڑی میں بیٹھ کر تو شاید ہم بہت دُور نکل چکے ہوتے مگر ان ٹھگوں نے ہمیں خوامخواہ ہی اتنی دیر ٹھہرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"میرا خیال ہے لاری میں بیٹھنے سے پہلے کسی جگہ سے کھانا کھا لیں۔ بھوک لگ گئی ہے۔"

"یہ کون سی مشکل بات ہے۔ چل اُدھر' وہ سامنے جو ہوٹل ہے "میرے پنڈ ورگا" وہی اچھا رہے گا۔" میں نے ایک سائن بورڈ پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ وہ کوئی شاعر صفت آدمی تھا جس نے وہ ہوٹل کھول رکھا تھا۔ باہر چارپائیاں بچھی تھی اور دائیں ہاتھ مانڈر چڑھا رکھی تھیں اس نے' اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اندر مکھی کا نشان نہیں تھا۔ سب طرف اس نے جالی لگا دی تھی۔ ہوٹل کے اندر پہنچ کر تو ہم خوش ہو گئے۔ کرسیاں اس نے بڑے قرینے سے رکھی تھیں اور گاہک اخبار کے ساتھ چائے اور کھانے سے لطف اندوز ہوتے تھے۔

آبی نے کھانے کا آرڈر دیا اور پھر سگریٹ نکال کر سلگانے لگا' بولا۔ "تیری نظر ہمیشہ اچھی چیز پر ٹکتی ہے آخر اس کی وجہ کیا ہے؟" ماحول کا وہ گہری نظر سے جائزہ لے رہا تھا۔ کرسیاں خاصی آرام دہ تھیں۔

"بات یہ ہے آبی کہ میں اونچے خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔ لودھی فیملی تھی نا جس میں بڑے بڑے بادشاہ گزرے ہیں! میرے آباؤاجداد تھے۔"

"بہت تیرے آباؤاجداد کی ایسی تیسی! اب میرے سامنے ...

بڑ نہ ہانکا کر۔ پولیس پوچھے گی تو یہی کہے گا کہ نام غلام جیلانی ولد حیدر علی پیشہ چوری چکاری یہی بات ہے نا؟"

بات اس نے دبی زبان میں کہی مگر میں سمجھ گیا کہ سالا چوٹ کر رہا ہے۔ ایک دم بدمعاش آدمی تھا وہ' اور ابھی میں نے اس کی آنکھیں بنوا کر اسے پھر سے کھڑا کیا تھا مگر وہ میرا کوئی احسان ماننا نہیں تھا۔ جگری یار ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ہر معاملے پر یہاں تک کہ انسان کے پورے وجود پر اپنا حق جتاتے ہیں۔ یہ شکر کے تو عادی ہی نہیں ہوتے۔"

"ذرا دیکھیں تو بھائی جی۔ یہ کیا چیز چھپی ہے اخبار میں' یہ دیکھیں۔" ہمارے قریب بیٹھے ایک آدمی نے دوسرے کو آواز دے کر کہا۔

"کیا ہے یار! خیر تو ہے' تیرے تو دیدے پھٹے جا رہے ہیں۔ کس کی ماں مر گئی؟"

"ماں نہیں باپ ہی مر گیا ہے' یہ دیکھ۔"

اس نے اخبار اپنے ساتھی کے سامنے رکھ دیا۔ مگر اس نے چند سطریں پڑھ کر اخبار الگ پھینک دیا' بولا۔ "چھوڑ یار! اس ملک میں یہی کچھ ہو گا۔"

وہ دونوں باتوں میں مصروف تھے کہ آبی نے اخبار اپنی طرف گھسیٹ لیا' بولا۔ "یہ سالے دونوں ہی یہاں بیٹھ کر جلتے سے اندر جلاتے ہیں اور فلسفہ جھاڑتے رہتے ہیں۔" یہ کہہ اس نے اخبار اپنے سامنے پھیلا لیا۔ اس میں جو خبر درج تھی وہ ہمارا دل دہلانے کے لیے بہت کافی تھی۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ سندھ پولیس کے ساتھ ہمارا جو مقابلہ ہُوا تھا' وہ اُن سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ اُن لوگوں نے چاروں صُوبوں کی پولیس کو خبردار کرتے ہوئے لکھا تھا کہ پولیس کی بھاری پارٹیاں مجرموں کی تلاش میں روانہ کر دی گئی ہیں۔ خیال ہے کہ مجرم جو تعداد میں دو تھے' ایک عرصے سے پولیس کو فریب دے رہے ہیں اور ابھی تک روپوش ہیں۔ جس جگہ مقابلہ ہُوا اس جگہ کا باقاعدہ آئی جی نے معائنہ کیا ہے۔ اطراف کے تمام گاؤں کی باقاعدہ تلاشی لی گئی ہے۔ ان کو بالآخر پولیس نے تلاش کر لیا مگر وہ اپنے ساتھی کو شدید زخمی حالت میں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ خیال ہے کہ ان کا رُخ ملتان کی طرف تھا۔ پولیس نے ہر جگہ اپنے آدمی کھڑے کر رکھے ہیں۔ عوام کو خبردار کیا جاتا ہے کہ جس کسی نے بھی ان کو پناہ دی' وہ قانون کی نظر میں مجرم ہو گا۔ مجرموں کے بارے میں اطلاع دینے والے کو بیس ہزار روپے انعام دیا جائے گا۔ خبر کچھ ایسی ہی تھی۔

آبی نے وہ اخبار ختم کر کے میرے سامنے رکھ دیا۔ ایک عجیب سا بے بسی کا احساس اُس کے چہرے پر اُتر آیا تھا' بولا۔ "تیرا کیا خیال ہے جیلانی! یہ معاملہ تو کچھ زیادہ ہی خراب ہو گیا ہے۔"

"ہاں! یہ مُکری میرے لیے ناقابلِ فہم نہیں ہے۔ ہم بڑی خوفناک صُورتِ حال سے دوچار ہیں' کھانا کھا کر یہاں سے نکل چل۔"

"ہاں' مگر ہم جائیں گے کہاں' وہ ایک دو تو نہیں ہیں' لو یہ سگریٹ پیو۔" آخری فقرہ اُس نے بلند آواز میں کہا تھا۔ مگر اتنے میں بیرا کھانا لے آیا اور ہم جلدی سے اس میں جُت گئے۔ میرے لیے ایک ایک لقمہ دوزخ کا پھل معلوم ہو رہا تھا۔ کوئی چیز مجھ سے کھائی نہیں جا رہی تھی۔ میں جو سینے میں شیر ایسا دل لیے پھرتا تھا خود کو اس گھڑی ایسا بُزدل سمجھتا تھا کہ سامنے کا آدمی بھی مجھے اپنا دشمن نظر آتا تھا۔ آبی نے البتہ کھانا بہت دھیرج سے کھایا۔ وہ اس نگ ایسا تھا جو جنگلی کبوتری کو اڑا کر اپنے گھونسلے میں لے جاتا ہے اور یہی سمجھتا ہے کہ اس پر اس کا حق ثابت ہے۔ خیر کا متن ایسا تھا کہ مجھے اس میں اپنے اعمال صاف نظر آتے تھے' مجھے کیا حق پہنچتا تھا کہ میں کسی بے گناہ کو یوں موت کے گھاٹ اتار دیتا۔ مگر آبی میرے اس مسلک کو نہیں سمجھ رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ حالات نے ہمیں وہ سب کچھ کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ آدمی کو اپنی جان بچانے کے لیے دوسرے کی جان لینی پڑتی ہے ورنہ وہ یوں بن بر کھا کے تو نہیں برستا ہے۔ وہ کھانا کھا رہا تھا اور میں اس سوچ میں گم رہا کہ اگر میری یہ تقدیر مجھے اُن کے ہاں لے گئی تو پھر......... پھر مجھے کون بچا سکے گا۔ وہ تو مجھے بدترین قسم کے تشدد سے گزار کر میری لاش میں بھُس بھر دیں گے۔ وہ ایسے ہی ہیں۔ عام حالات میں بھی کوئی پولیس کے آہنی جال سے بچ نہیں سکتا ہے' اب تو وہ ہمیں انتقامی کارروائی کا نشانہ بنائیں گے اور کوئی اُن سے پوچھنے والا نہ ہو گا۔ عین ممکن ہے وہ ہمیں کسی چوراہے میں کھڑا کر کے گولی مار دیں۔ اُن کے لیے تو سب کچھ ہی ممکن تھا' اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں' وہ لکنجن کہاں سے لاؤں جسے آنکھوں میں لگا کر میں اُن سے چھپ سکوں۔ وہ مُردے کو تو لکڑیاں بھی نہیں دیتے ہیں۔ اس کو ایسی آگ پر جلاتے ہیں جو نہ تو بھسم کرتی ہے' نہ بجھتی ہے۔ بڑے لفنگے بہادر تھے ہم دونوں۔ ایک دنیا ہمارا لوہا مانتی تھی ہمیں کسی میدان میں کبھی کوئی شکست نہیں ہوئی تھی مگر اب کی بار سندھ پولیس کو للکار کر ہم نے اپنا بیڑہ خود غرق کر لیا تھا۔ آبی نے کھانا ختم کیا تو میں بھی آخری لقمہ لے کر وہاں سے اٹھنے لگا۔ وہ دونوں فلسفی ابھی تک اس خبر کے متن کو بھول کر ظلم کے موضوع پر بحث کر رہے تھے۔ ...

انہیں خبر ہی نہیں تھی کہ ان کے درمیان سے کون باہر چلا گیا ہے۔ کنوئیں بہت دیکھے تھے ہم نے مگر اپنے ہی لیے کوئی اتنا گہرا کنواں کبھی نہیں کھودتا ہوگا۔ اور ہم ایسے ہی تھے۔ ہر دم خود کو نیچے اور نیچے گرتا محسوس کرتے تھے۔

ہوٹل سے نکل کر ہم بسوں کے اڈے کی طرف چل دیے۔ مگر خدشہ یہی تھا کہ پولیس کی کوئی پارٹی وہاں موجود ہوئی تو وہ ہمیں تباہ کر کے رکھ دے گی۔ ہماری لاشیں بھی وہاں نظر نہیں آئیں گی۔ میں نے بہت چاہا کہ اپنا حلیہ بدل لوں، مگر بریف کیس میں کچھ بھی نہیں تھا اور شہر وہ ایسا تھا جہاں سے کوئی ڈھنگ کا لباس مل نہیں سکتا تھا۔ خوف کی ایک بے پناہ لہر مجھے دہلائے ہوئے تھی۔ وہ پہلا موقع تھا کہ میں خود کو بے حد کمزور سمجھ رہا تھا۔ حالانکہ جان تو دینی ہی تھی۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ میں بن آئی موت نہیں مر سکوں گا۔ وقت تو اللہ نے ایک ہی مقرر کر رکھا ہے۔ وہ جو کہا ہے خدا تعالیٰ نے کہ انسان کی موت کی جو ساعت مقرر کر دی گئی ہے وہ نہ تو مقدم ہو سکتی ہے اور نہ موخر۔ تو اس پر ہم ایسے لوگوں کا ایمان تو کہیں زیادہ گہرا ہوتا ہے۔ وہ جو دنیادار ہوتے ہیں جن کو سرمایہ لٹ جانے کا خدشہ ہوتا ہے ان کی حالت تو اور بھی غیر ہوتی ہے۔ ہم تو جان ہتھیلی پر لیے پھرتے تھے۔ موت کی تلاش میں رہتے تھے۔ مگر اپنی جان ہم نے اتنی بھی سستی نہیں لگا رکھی تھی کہ پولیس آئے اور ہمیں پکے ہوئے پھل کی طرح ٹہنی سے اتار کر لے جائے۔ میرے ساتھ آبی کی تقدیر بھی خراب ہو چکی تھی۔ اس کو گام گام پر دھچکے لگتے تھے اور مجھے سب سے زیادہ افسوس اسی بات کا تھا۔ ہم دونوں کو ایک جنبک نے باندھ رکھا تھا۔ یوں کہ ہمیں ایک دوسرے کے بغیر جینا محال نظر آتا تھا اور میں شاید اس سے اسی دوستی کے صدقے میں بڑی بڑی قربانیاں مانگتا رہتا تھا جن کے بارآور ہونے پر میں اب دل میں عجیب سی ندامت محسوس کرتا تھا۔ اس کے پاس ان دنوں ڈھیروں روپیہ جمع تھا۔ وہ اس رقم کو آدھی آدھی پھاڑ کر الگ کر سکتا تھا۔ کئی بار اس نے کہا بھی مگر میں نے ہی اسے باندھ رکھا تھا۔ کہیں بھی نہیں جانے دیا۔ پتہ نہیں میں اس سے کیا چاہتا تھا۔

بسوں کے اڈے پر پہنچ کر ہم جلدی ہی ملتان کی طرف جانے والی بس میں منہ چھپا کر بیٹھ گئے۔ ہمیں وہاں سے فوراً ہی نکل جانا چاہیے تھا۔ اسی میں ہماری بہتری تھی کہ اس چومکھی لڑائی میں ہمارا تو گھر ہی اُف ہو کر رہ گیا تھا۔

ہم بس میں بیٹھے تو آبی نے سواریوں پر گہری نظر ڈالی۔ جگہ ہمیں بس کی آخری نشستوں پر ملی۔ ہمارے دائیں ہاتھ پانچ چھ آدمی بیٹھے تھے اور وہ سب کے سب پینڈو نظر آتے تھے۔ آبی نے دو سگریٹ نکال کر ایک مجھے دے دیا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اپنی اس تازہ ترین کامیابی پر اسے دلی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔

سگریٹ سلگا کر بولا ”فکر نہ کر بس میں سب کے سب مسلمان ہی بیٹھے ہیں۔ کوئی ”تفتیشیا“ مجھے نظر نہیں آ رہا ہے۔“

”پھر بھی سنبھل کر بیٹھ! مجھے یہ شہر بڑا منحوس نظر آتا ہے۔ تیری نظر اب وہ نہیں رہی ہے۔ شیشہ الٹ جائے تو تجھے میں بھی الٹا دکھائی دوں گا۔“

”اس شیشے نے واقعی بیڑہ غرق کر دیا ہے ورنہ اس عورت کو میں صاف سمجھ نہ جاتا۔ کیسی بھولی نظر آتی تھی وہ۔“

اچانک بس میں چار فقیر چڑھ آئے۔ آتے ہی ان لوگوں نے واویلا مچا دیا۔ ”اکھیاں بڑی نیامت ہیں بابا۔ میرے آٹھ چھوٹے چھوٹے معصوم بچے ہیں بابا لوگ! ان پر ترس کھاؤ۔“

”تو۔۔۔ اس سالے نے اور کوئی کام ہی نہیں کیا۔ بیٹھا بچے ہی بناتا رہا ہے اور اب عامۃ المسلمین سے ہمدردی طلب کرتا ہے۔ پوچھو اس سے کہ اتنے بچے اس نے کیسے بنا لیے۔ ہڈی پسلی تو صاف نظر آتی ہے اس کی۔“

”ضرور پوچھو! بلاؤ اسے۔ کرو بات کہ تو نے آٹھ بچے کیسے پیدا کر لیے؟“ تین فقیر بس کے اگلے حصے میں جا پہنچے تھے۔ اور جس کے آٹھ بچے تھے وہ ہماری طرف آ رہا تھا۔ نظر اس کی عجیب انداز سے ہم پر جمی تھی۔ یوں جیسے وہ ہمیں پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ ہاتھ اس کا کبھی دائیں طرف پھیلتا تھا اور کبھی بائیں طرف۔ ”اکھیاں بڑی نیامت ہیں بابا۔ میرے معصوم چھوٹے چھوٹے بچے بھوکے ہیں۔“

”اوئے تو بیٹھ کر بچے ہی بناتا رہا۔ کوئی اور دھندا نہیں تھا تجھے؟ تیری بیوی کس نسل سے ہے؟“ آبی نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ وہ خواہ مخواہ ہی اس سے الجھ رہا تھا۔ ہاتھ میں اس نے ایک روپے کا نوٹ پکڑ لیا تھا۔

فقیر نے نوٹ دیکھا تو بڑی ہی عاجزی سے بولا ”کیا کرتا میاں جی! اللہ کی مخلوق بھی تو بڑھانی تھی۔“ ”اکھیاں بڑی نیامت ہیں بابا“ کہہ کر اس نے نوٹ آبی کے ہاتھ سے جھپٹ لیا تھا۔ اور۔۔۔ اور عین اسی وقت اس نے ذرا سا جھک کر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا ”یہ گاڑی چھوڑ دیں بابا لوگ! پولیس شہر سے نکلتے ہی اس کی تلاشی لے گی۔“ اور پھر بلند آواز سے بولا ”اکھیاں بڑی نیامت ہیں بابا!“ اس کی آواز نے مجھے لرزہ براندام کر دیا۔ ایک لمحے

لیے ہی وہ میرے پاس رکا تھا۔ آبی بھی اس کی وہ بات نہ سن سکا۔ چوتھے پانچویں آدمی تک اس نے ہاتھ پھیلا دیے۔ ہر ایک کے پاس اس کے لیے پانچ دس پیسے تھے۔ اس کی حالت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ چلتا تھا تو اس کی دونوں ٹانگیں لرز لرز جاتی تھیں۔ یہی حال اس کے ہاتھوں کا تھا۔ ان میں بھی لرزش تھی۔ آنکھیں بند کر کے وہ بس میں بھیک مانگ رہا تھا۔ وہ پچھلی لمبی نشست سے ذرا دور گیا تو میں نے آبی کو کہنی مار کر اٹھاتے ہوئے کہا ”آ یار! ہمیں تو یہ بس راس نہیں آئے گی۔ پتہ نہیں کب چلے اور ہم جلدی میں ہیں۔“

”کیا کرتے ہو یار! ہوا کیا ہے؟“

”بس باہر آ جا! ہم کوئی اور بس دیکھتے ہیں۔“ یہ کہہ کر میں اتنی تیزی سے بس سے باہر نکلا کہ آبی میرے پیچھے آتے آتے سراسیمہ سا ہو گیا۔

”یہ تجھے ہوا کیا ہے؟ کیوں چھوڑ دی ہے یہ بس؟“

”بات کچھ ایسی ہی ہے آبی! ادھر آ جا۔ یہ فقیر کوئی بہت کرنی والا فقیر ہے۔“

”کون سا فقیر! یہ جو اندھا بنا ہوا ہے؟“

”ہاں! یہ ہم دونوں کو پہچانتا ہے آبی! اسے معلوم ہے کہ پولیس ہماری تلاش میں ہے۔ وہ مجھے یہی بتا کر گیا ہے۔“

”پر کب؟ یہ واقعہ پیش کب آیا؟ کون ہے یہ آخر؟“

”یہی تو مجھے معلوم نہیں ہے مگر وہ بہت کچھ جانتا ہے۔ اس پر نظر رکھو! آ ذرا ادھر۔“ یہ کہہ کر میں آبی کو اپنے ساتھ لے کر بس کے عقب میں جا ٹھہرا۔ آبی سخت پریشان ہو گیا تھا۔ وہ فقیر اسکی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ نظریں اس کی بس کے دروازے پر جمی تھیں۔ وہ چاروں فقیر بس سے اترے تو ہم نے چاہا کہ آگے نکل کر اسے روک لیں مگر وہ دوسری بس میں جا چڑھا۔ ہم ادھر کو لپکے تو ہمیں مگر اتنے میں مسافروں کی بھیڑ کو چیرتا ہوا وہ اور آگے نکل گیا۔ اس کا تعاقب ہمارے لیے بے حد ضروری تھا۔ ہمیں معلوم ہونا چاہیے تھا کہ اسے کس نے ہمارے پاس بھیجا ہے۔ اور بس سے ہمیں اتار دینے میں کون سی مصلحت اس کے پیش نظر تھی۔ ہم تیزی سے بھیڑ کو کاٹتے ہوئے آگے بڑھے تو ہم نے دیکھا کہ وہ فقیر ایک لمبے تڑنگے دوہرے بدن کے آدمی کے سامنے ہاتھ پھیلا رہا تھا۔ وہ آدمی قمیص شلوار میں ملبوس تھا اور ہاتھ میں اس نے ایک چھوٹا سا اٹیچی کیس پکڑ رکھا تھا۔ چند لمحوں تک وہ اس کے سامنے کھڑا رہا اور پھر وہ تیزی سے آگے نکل گیا۔ میری نظر الجھ رہی تھی۔ اس آدمی کا چہرہ بار بار میرے ذہن میں اٹھی زقند لگانے لگا۔ کون ہے یہ آدمی؟ اسے میں نے کہاں دیکھا ہے۔ آبی کی نگاہ بھی اس پر جمی تھی۔

وہ بظاہر ہم سے بے تعلق ہو کر دوسری طرف دیکھ رہا تھا۔۔۔ مگر حقیقت یہ تھی کہ وہ ہمیں نگاہ میں رکھ رہا تھا۔ ہم کئی ساعتوں تک اس کے سامنے کھڑے سوچتے رہے کہ کہیں اسی آدمی نے تو اس فقیر کو ہمارے پاس نہیں بھیجا تھا مگر وہ ہماری طرف متوجہ نہیں ہوا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کسی کے انتظار میں کھڑا ہے۔ اس اثنا میں وہ فقیر ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ہم کوشش کے باوجود اب اس کو مسافروں کی بھیڑ میں سامنے نہیں پا رہے تھے۔

آبی نے مجھے ٹہوکا دیتے ہوئے کہا ”اس سے پوچھ جیلانی کہ یہ آدمی کون ہے۔“

”نہیں! جب وہ خود متوجہ نہیں ہو رہا تو ہمیں خواہ مخواہ اس کو چھیڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا اور آبی کو ساتھ لے کر میں اس کے قریب سے ہو کر آگے نکل گیا۔ بلاشبہ وہ آدمی مجھے بہت ہی پراسرار سا نظر آتا تھا مگر اب تک اس کے کسی بھی اشارے سے ہمیں یہ محسوس نہ ہو سکا کہ وہ ہمیں جانتا ہے۔ ہم ابھی چند ہی قدم آگے نکلے تھے کہ اس کے ارد گرد تین چار آدمی اور آ کھڑے۔ وہ بھی قمیص شلوار میں ملبوس تھے اور ان کے انداز بتا رہے تھے کہ وہ پولیس کے آدمی ہیں۔ ان میں سے شاید کوئی بھی ہمیں نہیں جانتا تھا۔ ایک شک تھا جس کی میزان میں ڈال کر وہ دوسروں کے چہروں کا جائزہ لیتے تھے۔ مگر ابھی تک وہ یہ نہ سمجھ سکے تھے کہ جیلانی تو ان کے درمیان پھیر رہا ہے۔

”یہاں سے نکل چل آبی! ہم شدید خطرے میں ہیں۔ یہ شہر ہمیں لے ڈوبے گا۔“ میں نے آبی کو اپنے ساتھ گھسیٹتے ہوئے کہا۔ مجھے اس فقیر کی تلاش تھی جس نے ہمیں انتہائی غیر یقینی حالات میں بس سے اتر جانے کے لیے کہا تھا۔ مگر وہ ہمیں کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر بھی اس کی سمت کا اندازہ کر کے ہم آگے بڑھے تو وہ ایک دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا ہمیں نظر آیا۔ ہاتھ اس کا اب تک پھیلا ہوا تھا۔ وہ ہر کسی سے بھیک مانگتا تھا اور آنکھیں اس نے یوں بند کر رکھی تھیں جیسے اس کو کچھ بھی نظر نہ آ رہا ہو اور وہ لاچار ہو کر ان جھروکوں کے در بند کرنے پر مجبور ہو۔ آبی نے اسے وہاں کھڑے دیکھا تو ایک نوٹ پھر اس نے ہاتھ میں پکڑ لیا جیسے ہی ہم اس کے پاس پہنچے وہ نوٹ آبی نے اس کے ہاتھ میں دے دیا، بولا ”تیری شناخت کیا ہے استاد! اور وہ آدمی کون تھا جس کو تو مل کر آیا ہے؟“

”اس کا نام ارجمند خان ہے اور وہ آپ کو جانتا ہے۔ اسی لیے آپ کو خبردار کر رہا ہے۔“ اس فقیر نے اب کی بار آنکھیں پوری طرح کھول کر ہمیں یوں دیکھا جیسے وہ ہمیں مدتوں سے جانتا ہو۔

"تیری مہربانی ہے استاد، مگر تیرا نام کیا ہے؟"

"میرا نام اکبر ہے۔ آپ آج رات پیر اجمل شاہ کے ڈیرے پر گزار لیں، ہم آپ سے وہیں ملیں گے۔" یہ کہہ کر اکبر نے ہم سے پنڈ چھڑایا اور تیزی سے دوسری طرف نکل گیا۔ "اکھیاں بڑی نیامت ہیں بابا! میرے آٹھ معصوم بچے ہیں میاں جی! ان پر ترس کھاؤ۔" اس کی آواز شور کو چیرتی ہوئی اوپر اٹھ رہی تھی۔

"آؤ آبی! یہ معاملہ تو کچھ زیادہ ہی خطرناک ہوتا جا رہا ہے، اس پیر کا ڈیرا دیکھتے ہیں کہاں ہے۔"

چند قدم آگے نکل کر ہم نے پیر اجمل شاہ کے بارے میں ایک آدمی سے پوچھا تو وہ بولا۔ "شہر سے باہر جنوب کی طرف چلے جائیں وہیں اس کا ڈیرا ہے۔ مرض کوئی بھی ہو شفا ہے اس کے یہاں۔"

"ہاں ٹھیک ہے ہمیں بھی کئی بیماریوں نے گھیر رکھا ہے، دعا کرو ہم ٹھیک ہو جائیں۔" آبی نے اس کی طرف مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اللہ مہربانی کرے گا۔ اس سے آپ ضرور ملیں۔ ان کے مزار پر حاضری ہی بہت کافی ہے۔" اس آدمی نے اجمل شاہ کی تعریف میں کہا۔

"چل یار جلدی کر۔ اچھا بھائی جی خدا حافظ۔" یہ کہہ کر ہم وہاں سے آگے چل دیے۔ ہر دوسرا آدمی ہمیں اس روز پولیس کا کارندہ معلوم ہوتا تھا۔ کوئی راستہ ہمیں نہیں مل رہا تھا۔ ہر شخص سے ہم اپنے چہرے چھپائے ہوئے بسوں کے اڈے سے باہر نکلے اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے جنوب کی طرف چل دیے۔ راہ، راستہ تو ہمیں یاد ہی نہیں تھا پھر بھی ہم کسی سے پوچھے بغیر کچھ ہی دیر بعد شہر سے باہر نکل گئے۔

پیر اجمل شاہ کا مزار کچھ زیادہ دور نہیں تھا۔ درختوں کے ٹھنڈے میٹھے سایوں کے عین وسط میں ایک مزار تھا جو بظاہر ہمیں غیر آباد نظر آتا تھا مگر جیسے ہی ہم لوحِ مزار پر پہنچے ہمیں وہاں کئی آدمی قرآن خوانی میں مصروف نظر آئے۔ ان کی دیکھا دیکھی ہم بھی جوتے اتار کر قبر کے پاس جا بیٹھے۔ ابھی ہم دعا مانگ ہی رہے تھے کہ ایک مجاور نے اٹھ کر ہمارے سامنے قرآن لا رکھے۔ ان کو رحل پر رکھ کر اس نے ہمارے سامنے کھول دیا اور بولا۔ "آپ بھی ثواب میں شریک ہو جائیں۔ آج پیر صاحب کی برسی ہے۔" یہ کہہ کر وہ پیچھے ہٹا تو آبی نے مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے قرآن اپنے قریب کر لیا۔ اس روز پہلی بار مجھے معلوم ہوا کہ آبی بڑی جانسوز قرأت کے ساتھ قرآن پڑھ سکتا ہے۔ قرآن میں نے بھی بچپن میں پڑھ رکھا تھا۔ مگر اس کو یوں اپنے سامنے کھلا دیکھ کر مجھے اس روز بڑی ہی ندامت محسوس ہوئی۔ وہ جانِ رُشد، وہ قرآن، مجھے یہ احساس دلاتا تھا کہ میں اس کے کسی بھی فرمان پر عمل نہیں کر رہا ہوں۔ پھر۔۔۔ پھر اسے کھول کر میں اس سے کیا حاصل کر سکوں گا۔ مگر اس کے باوجود میں اس کی تلاوت کرنے لگا۔ مجھے اچانک ہی اس آزمائش سے گزر جانا پڑا تھا۔ اور میں گزر بھی گیا۔ فرار کا کوئی راستہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ آبی پر بھی ایک عجیب سی مستمند کیفیت آ کر گزر گئی۔ ہم کوئی دو گھنٹے تک اس کی تلاوت میں مصروف رہے مگر اس طرح کہ جب ہم نے قرآن ختم کیا تو ہمیں اپنا وجود ٹمیا بھوس نظر آنے لگا۔ ہم دونوں کیسہ لبول ہو کر رہ گئے۔ کہاں ہم اور کہاں وہ بے مثال سلسلۂ رُشد و ہدایت۔ کاش ہمارے پَر وہیں بند ہو جاتے، ہم پر فالج گر جاتا، ہم معذور ہو جاتے اور وہیں بیٹھے بیٹھے اس قرآن کے سامنے جان دے دیتے، کہ ہمارے پَر کھلتے تھے تو ہم ہلاکت کے پیغامبر بن جاتے تھے۔

وہ دو گھنٹے جو ہم نے اس کی ترتیل میں صرف کیے ہماری تمام زندگی پر حاوی ہو گئے تھے۔ قرآن کی تلاوت ختم ہوئی تو مجاوروں نے ہمیں تبرک پیش کیا۔ میں اور آبی اپنی طشتریاں بھروا کر الگ جا بیٹھے۔ تبرک لذیذ تھا اور ہمیں بھوک نہ ہونے کے باوجود بہت مزہ دے رہا تھا۔

آبی نے لقمہ منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ جب میں مر جاؤں تو تو کسی جگہ میرا ایسا ہی مزار بنا دے۔"

"وہ کیوں؟ کیا خوبی ہے تیرے اندر؟"

"خوبی کی بات نہیں ہے جیلانی! تیرا بھی دھندا چلتا رہے گا اور میری روح کو بھی ثواب پہنچتا رہے گا۔ لوگ بڑے خشوع و خضوع سے قرآن خوانی کریں گے۔"

"بک نہیں اوئے! تجھے تو میں پانی میں ڈبو دوں گا تا کہ تیرا نشان ہی باقی نہ رہے ورنہ تیرے مزار سے تو لوگ ڈاکا زنی کی تربیت لیں گے اور اس کا نام ہو گا "آبی ڈیکائٹی سینٹر"۔"

"چھوڑ یار! بہت گھٹیا سوچ ہے تیری! میں اس چکر سے نکل جاؤں تو پھر بتاؤں گا تجھے کہ میں کتنا شریف آدمی ہوں مگر یار اس اجمل شاہ کے مزار پر ان لوگوں نے ہمیں کیوں بٹھا دیا ہے؟"

"کوئی وجہ ضرور ہو گی۔ وہ اکبر اور وہ دوسرا آدمی ادھر ضرور آئیں گے وہی بتا سکتے ہیں کہ ہمیں یہاں سے نکلنے کے لیے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم ادھر کسی دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ جاتے ہیں۔" ہم نے اپنی اپنی پلیٹیں مجاور کے حوالے کر دیں اور ہم

سے اٹھ کر مزار کے مغربی حصے میں ایک درخت تلے جا بیٹھے۔ فائدہ یہ تھا کہ ہم وہاں اطمینان سے سگریٹ پی سکتے تھے۔

اس وقت شام کے چار بجے تھے کہ ہمیں مزار کے صحن سے اکبر کی آواز سنائی دی۔ وہ اپنی آنکھوں کا ازلی ابدی رونا رو رہا تھا۔ حالانکہ اسے سب کچھ صاف دکھائی دیتا تھا۔ صحن میں لوگوں سے بھیک مانگ کر وہ کچھ آگے آیا تو ہم پر اس کی نظر پڑ گئی۔ فوراً ہی اس کی چال میں تیزی پیدا ہو گئی اور وہ لپکتا ہوا ہم تک آ پہنچا۔

"اچھا تو آپ ادھر بیٹھے ہیں۔ یہ اچھی جگہ ہے۔" وہ ہمارے پاس ہی آ بیٹھا۔ اب اس کے ہاتھوں میں لرزش تھی، پاؤں میں خفقان، اور اس کا لہجہ پہلے سے کہیں زیادہ صاف ہو چکا تھا۔

"ارجمند صاحب بھی آ رہے ہیں۔ پر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ پولیس کیوں آپ کی تلاش میں ہے؟"

"ہمیں کیا پتہ۔۔۔ ارجمند صاحب کو زیادہ بہتر معلوم ہو گا۔ وہ آتے ہیں تو ہم انہی سے پوچھتے ہیں۔"

"مگر آپ کو بھی تو علم ہو گا۔"

اس کا سوال بہت سیدھا تھا جس سے میں نے یہی نتیجہ نکالا کہ ہمیں اس سے اپنی شناخت، چھپا لینی چاہیے تھی۔ ارجمند ہمارے بارے میں اگر کچھ جانتا تھا تو اس فقیر کو اس نے اپنے راز سے آگاہ نہیں کیا تھا۔

"نہیں بھائی! ہمیں اس بارے میں کچھ بھی علم نہیں ہے۔"

"تو پھر آپ بس سے پولیس کے نام پر فوراً ہی کیوں اتر آئے؟"

"بس ایسی ہی کوئی بات تھی۔ ہم پولیس کے سامنے نہیں جانا چاہتے تھے۔ آدمی کے سو راز ہوتے ہیں بھائی! ان کو چھپا لینا ہی اچھا ہوتا ہے۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں! بہرحال ابھی وہ ارجمند صاحب آ ہی رہے ہوں گے۔" یہ کہہ کر اس نے جیب سے ایک بیڑی نکال کر سلگا لی۔

"یہ۔۔۔ یہ تیرا بدن تو لوہے ایسا ہے پیارے! تجھے لوگوں کو دھوکا دینے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ لرزش تجھے کہاں سے ہو گئی ہے؟" آبی نے اس کے جسم کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"او جی ہوتی! کوئی عیب لے کر تو نکلنا ہی پڑتا ہے، ورنہ بھیک کون دے گا ہم ایسوں کو؟"

"ہاں یہ اچھا ہے۔ تیری آنکھیں بھی دیکھنے میں بے کار نظر نہیں آتیں پھر بھیس بدلنے میں تیرا جواب نہیں ہے پیارے۔ کوئی [illegible] ادھر آ بیٹھا ہے یہ کیا بات ہے؟"

"نہیں جی! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ دراصل فقیری ہمیں پسند [illegible] مرنے سے بچ گئے ہیں۔ کسی کا دینا، کسی سے لینا۔"

"لینا تو بہت کچھ ہے تمہیں۔ ہر شخص سے مانگتے ہو اور بے بغیر ملتے نہیں ہو۔ بیوی بچے بھی ہیں؟"

"بیوی تھی، مر گئی۔ ایک بیٹی ہے اس کے لیے در در کی بھیک مانگتا ہوں، پر آپ نے اپنا تعارف نہیں کروایا۔"

"کروا دیں گے، ضرور کروا دیں گے، ذرا تیرے ارجمند صاحب سے مل لیں۔ اس تیل کی دھار تو دیکھ لیں۔ لو یہ سگریٹ پیو۔ یہ تمہیں فائدہ دے گا۔ یہ تیرا لرزہ ختم کر دے گا۔" آبی نے اس کو سگریٹ دیتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے میاں جی! کہ ہم ادھر مزار کے عقبی حصے میں بیٹھ جاتے ہیں، لوگ بہت آ جا رہے ہیں۔"

"ہاں! یہ تو اور بھی اچھا ہے مگر وہ ارجمند صاحب ہمیں کیسے ملیں گے؟"

"میں انہیں بتا آیا ہوں۔ ہمارے پاس خود ہی آ جائیں گے وہ۔" یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا تو ہم مجبوراً اس کے ساتھ چل کر عقبی حصے میں جا پہنچے۔ وہاں درخت زیادہ گھنے تھے اور ہر طرف سبزہ ہی سبزہ اُگا نظر آتا تھا۔ ستمبر اپنا رنگ جمانے لگا تھا۔ دھوپ نہ نیلی تھی نہ سفید۔ سائے میں بیٹھنا زیادہ اچھا لگتا تھا۔

ابھی ہم وہاں بیٹھے ہی تھے کہ ارجمند خان اپنے چھوٹے سے اٹیچی کیس سمیت وہاں آ دھمکا اور چھوٹتے ہی اس نے ہم دونوں کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے، بولا۔ "میرا فرض تھا کہ میں آپ کو بچا لیتا۔ شہر کی پولیس کو ان دو آدمیوں کی تلاش ہے جنہوں نے ہوٹل میں ایک مرد اور ایک عورت کو بے ہوش کر دیا تھا۔ وہ لمبا ہی واویلا مچا رہے تھے۔ عورت کا بیان یہ ہے کہ ان دو آدمیوں نے اس کی زبردستی بے حرمتی کر دی ہے۔ مرد کا بھی یہی بیان ہے کہ جاتے وقت وہ ان کے زیور اور اکیس ہزار روپیہ ساتھ لے گئے ہیں۔"

"مگر آپ نے ہم پر یہ نوازش کیوں کی؟ ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں جناب ارجمند خان صاحب!" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو جناب جیلانی صاحب مجھے پہچاننے کی کوشش کریں۔ آپ کے ساتھ میں بہت عرصہ جیل میں رہ چکا ہوں۔"

میرے منہ سے سیٹی سی نکل گئی۔ وہ "ارجم" تھا۔ جیل میں اس کا یہی نام مشہور تھا اور میرے ساتھ اس نے بہت دن گزارے تھے۔ اس کو کسی متمول آدمی کے ساتھ دھوکا دہی کے جرم میں دو سال کی سزا ہوئی تھی۔ لوگ کہتے تھے کہ اس نے جعلی دستاویز تیار کر کے اس کا بنگلہ بیچ دیا تھا۔ ایسے ہی کئی اور الزامات بھی اس پر

عائد تھے۔ اب جو میں اسے اتنے سالوں بعد دیکھ رہا تھا تو مجھے اس کی صورت بہت ہی بدلی بدلی سی نظر آتی تھی۔

"تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی ارجم مگر تجھے کس نے بتایا ہے کہ ہم ہی وہ آدمی ہیں۔"

"آپ کو میں نے اسٹیشن پر اُن کے ساتھ چلتے دیکھا تھا۔ آپ کا دوست اس عورت پر ہاتھ چلا رہا تھا۔"

"اس سے آگے کی کہانی بھی بتانی ہے تمھیں ارجم خان!" میرا لہجہ تلخ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ آدمی میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ چنڈال کی طرح وہ میرے پیچھے بس لگ آیا تھا اور بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

وہ ہنس دیا، بولا "نہیں تو ــــ اس کا تو مجھے کوئی علم نہیں۔ میں نے سنا ہے کہ وہ عورت تھانیدار کی دوست ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس نے آپ کو تلاش کرنے کا حکم دیا ہے۔"

"اگر یہی بات تھی تو اس نے ہمارے پیچھے کوئی ایسا آدمی کیوں نہیں لگایا جو ہمیں شناخت کر سکتا۔"

"آپ کو شناخت کرنے والا تو اسے ملا ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کسی نے آپ کو بازار میں نہیں روکا۔ مگر اب وہ غیور احمد بھی آپ کی تلاش میں ہے۔ ہوش میں آنے کے بعد وہ بھی بازار میں نکل آئے ہیں۔"

"اب کیا خیال ہے تمھارا، ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

"میرا خیال ہے کہ آپ میرے گھر چلیں۔ دو دن وہاں رہیں اور پھر جس طرف چاہیں نکل جائیں، پولیس خود ہی چُپ رہ جائے گی۔"

"میں سمجھا پولیس ہمیں کسی اور معاملے میں تلاش کر رہی ہے، میرا یہی خیال تھا مگر یہ معلوم نہیں تھا کہ ہمارا سفر تم کھوٹا کر رہے ہو۔"

"نہیں جیلانی صاحب! میں تو آپ کے بھلے کے لیے ہی کہہ رہا ہوں۔ آپ کا پرانا داس ہوں۔"

"رقم تو ہم سے وہ چھین چکے ہیں ارجم خان! ساڑھے تین لاکھ روپیہ تھا ہمارے پاس۔"

"اچھا! کمال ہے اور آپ اس پر فاتحہ پڑھ کر واپس جا رہے ہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آپ کو رقم واپس ملنی چاہیے۔"

"تو لے دو نا۔ کہو اُن سے کہ وہ ہمیں رقم لوٹا دیں۔"

"تو چلیں نا میرے ساتھ! میں خود بات کروں گا اُن سے۔ آئیں، میرا گھر اسی شہر میں ہے۔" ارجمند نے مجھے وہاں سے اٹھاتے ہوئے کہا۔ آبی بھی میرے ساتھ ہی اٹھ گیا۔

"آئیں بھائی جی! یہ فیصلہ تو ہونا چاہیے۔ وہ تھانیدار کی دوست ہے تو کیا ہوا۔ انصاف بھی تو کوئی چیز ہے۔"

"رہنے دے یار! تو کس چکر میں ہے۔ یہ دیکھ! یہ رہی وہ رقم، اُن کو ہم نے "سمیش" کر دیا ہے۔ خواہ مخواہ تو نے ہمارا سفر کھوٹا کیا!" آبی نے اپنا بریف کیس کھول کر اسے دکھاتے ہوئے کہا۔

اس کی آنکھیں چندھیا سی گئیں۔ بڑی عاجزی اور فروتنی سے بولا "یہ تو اور بھی اچھا ہے۔ شکر ہے آپ کو رقم واپس مل گئی۔ اگر آپ مجھے خدمت کا موقع دیں تو یہ آپ کی مہربانی ہوگی۔ کیا خیال ہے جیلانی صاحب؟ پولیس سے بھی آپ بچ جائیں گے۔ وہ ایک دو دن میں سمجھ جائیں گے کہ آپ آگے نکل گئے۔"

"کیا حرج ہے۔ ہم تمھارے ساتھ ضرور چلیں گے لیکن اس رقم پر اگر کسی کی نظر ہے تو اسے بھول جانا چاہیے۔ اسے کوئی آدمی ہم سے چھین نہیں سکتا ہے۔ یہ ساڑھے تین لاکھ روپیہ ہے۔"

"آپ فکر نہ کریں جیلانی صاحب! مجھے وہ پرانے دن یاد آ گئے ہیں۔ آپ کی خدمت میرا فرض ہے۔ یہ میرا شہر ہے۔"

"آپ کا میں شکرگزار ہوں ہم رات کو کسی وقت یہاں سے نکل جائیں گے۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔"

وہ ہمیں درختوں کی اوٹ میں لے کر شہر کی طرف بڑھا۔ انداز اس کا ایسا تھا جیسے اس سے زیادہ بڑا ہمدرد کوئی پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔

"اس غیور احمد کو ہم نے کچھ سبق ضرور سکھایا ہے ــــ اگر وہ تھانیدار بھی اُن ٹھگوں سے ملا ہوا ہے تو پھر اللہ حافظ ہے اس شہر کا!"

"بات کچھ ایسی ہی ہے۔ تھانیدار بھی ان سے ملا ہوا ہے۔"

"کیا نام ہے اس کا؟"

"تسلیم شاہ ــــ بہت دنوں سے وہ یہاں کام کر رہا ہے۔ اِدھر اس گلی میں سے ہو کر گزریں۔ میرا مکان آخری حصے میں ہے۔" اس نے ایک تنگ سی گلی میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں کچھ عجیب سی گومگو کی کیفیت میں اس کے ساتھ چلتے رہے۔ آبی بھی اس حق میں نہ تھا کہ ہم اس کے ساتھ کسی جگہ بند ہو کر بیٹھ رہیں۔ میرا اپنا دل بھی اس اقدام کے حق میں نہیں تھا مگر ارجمند نے ہمیں جس انداز میں بس سے اتارا اور جس طرح وہ ہمیں پیر اجمل شاہ کے ڈیرے پر آ کر ملا اس سے ہم یہی سمجھے تھے کہ اس نے پولیس سے ہمیں خبردار کرنے کے لیے زبردست خطرہ مول لیا ہے۔ ہمارا یہ خیال تھا کہ اسے یہ بات معلوم نہیں ہے کہ سندھ کی پولیس کئی دنوں سے ہمارا پیچھا کر رہی ہے اور ہم اپنے دو آدمی راستے میں ضائع کر بیٹھے ہیں۔ یہ سب کچھ اسے معلوم نہیں تھا وہ تو اُن "میٹھے والوں" کی اس اوچھی حرکت کے نتائج سے بچانے کے لیے ہماری طرف بڑھا تھا۔

ہم اس کے مکان میں داخل ہوئے تو ہمیں بڑی فرحت اور طمانیت کا احساس ہوا۔ اگرچہ تنگ سی بند گلی میں اس کا مکان تھا مگر اندر سے وہ بہت کشادہ تھا۔ صحن میں راستے کے دونوں طرف طرح طرح کے پودے اُگے ہوئے تھے اور ان کی ہریالی اور تازگی دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ ان کی پرداخت بہت اچھے طریقے سے ہو رہی ہے۔

"میرے بیوی بچے آج کل ملتان گئے ہوئے ہیں ــــ یہ نوکر ہی گھر میں موجود ہے اور یہی سب کام چلا رہا ہے۔" اس نے ہمیں مکان کے اندر لے جا کر نشست گاہ میں بٹھاتے ہوئے کہا۔

کرسیاں وہاں بڑے قرینے سے بچھی تھیں۔ صوفہ سیٹ تو وہاں نہیں تھا۔ فرش پر موٹی نیلے رنگ کی دبیز دری بچھی تھی اور دائیں ہاتھ ایک نواڑی پلنگ موجود تھا۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ کسی سگھڑ بیوی نے گھر کو بہت سلیقے سے سجا رکھا ہے۔

ارجمند نے ہمارے لیے لیموں کا شربت تیار کروایا۔ اس کا ملازم جب وہ ٹرے لے کر اندر آیا تو ارجمند نے کہا "دیکھ فیروز! ان کے لیے تو ایک مرغا بھون دے۔ بازار سے روغنی نان بھی لے آ۔ یہ ہمارے بہت پرانے دوست ہیں انھیں کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔"

"جی بہت اچھا، بس ایک گھنٹے میں کھانا تیار ہو جائیگا۔"

"ہم کھانا تو کھا چکے ہیں بھئی! اس کی ضرورت نہیں ہے۔ شام کو دیکھ لیں گے۔"

"ایسا نہ کہیں، اس گھر کو اپنا گھر سمجھیں۔ یہ لو، یہ پچاس روپے رکھ لو اور سودا لے آؤ۔"

فیروز نے روپے لیے اور اسی وقت باہر نکل گیا۔

"تیرا دھندا کیا ہے بھئی! جیل سے رہا ہونے کے بعد کیا کرتا رہا ہے تو؟" میں نے بڑی بےتکلفی سے پوچھا۔

"میری یہاں دو دکانیں ہیں اس شہر میں۔ ایک میں آڑھت کا کاروبار کرتا ہوں، دوسری دکان میں میں نے لوہے کا کارخانہ کھول رکھا ہے۔ گزارا چل رہا ہے، واپڈا کے لیے میں کئی چیزیں بناتا ہوں۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ تجھے بہت دنوں بعد دیکھا تو میں پہلی نظر میں پہچان ہی نہ سکا۔"

"آپ بھی بہت بدل گئے ہیں جیلانی صاحب! سچی بات، یہ ہے کہ میرے دل میں آپ کی بہت عزت ہے۔ قید کے دن یاد آتے ہیں تو عجیب سا احساس ہوتا ہے، خدا کا شکر ہے کہ آپ بھی رہا ہو گئے۔"

"ہاں! ...... وہ ...... دراصل ...... میرا وکیل بہت مضبوط تھا ورنہ پتہ نہیں وہ کیا کرتے۔" میں نے بات بنائی۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا، اپنے حصے کی صعوبت تو میں بھگت آیا تھا۔ پھانسی کی کوٹھڑی سے میں بچ کر بھاگ نکلا تھا مگر اسے کہانی کا یہ حصہ معلوم نہیں تھا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ ہم سے بہت زیادہ بےتکلف ہو گیا۔ کھانے میں ابھی بہت دیر تھی ہمیں وہ اپنی خواب گاہ میں لے گیا، بولا "آپ آرام کریں، کھانا تیار ہوگا تو میں آپ کو جگا دوں گا ــــ بالکل بےفکر رہیں۔"

"ٹھیک ہے بھائی! تیری مہربانی ہے ارجم خان ورنہ یہ شہر تو ہمارا دشمن ہو گیا تھا۔" میں نے بستر پر ڈھیر ہوتے ہوئے کہا۔ کسی اجنبی شہر میں اس ایسے دوست کا مل جانا نعمتِ غیر مترقبہ کے مترادف تھا ورنہ مجھ سے ضال اور گمراہ کو ایسے اندھیرے لمحے میں کوئی ٹھکانہ کہاں مل سکتا تھا۔ میری تقدیر نے مجھ سے ضد باندھ رکھی تھی کہ اسے قرار کا کوئی لمحہ دینا ہی نہیں ہے۔ خود وہ دُور کھڑی میری گردن پر لگتے زخموں کو دیکھ کر خوش ہوتی تھی۔ ارجم خان کا رویہ ایسا تھا کہ ہم دونوں اس کی طرف سے مطمئن ہو چکے تھے۔ خیال یہی تھا کہ رات کو کسی گھڑی اٹھ کر ہم میانوالی جا پہنچیں گے۔ قندیارہ کوئی زیادہ دور نہیں تھا اور مجھے اس بار آسیہ کو سارے جہان کی بلاؤں سے محفوظ رکھنے کے لیے کوئی بہت ہی تابڑ توڑ قسم کا حملہ کرنا تھا۔ ورنہ وہ پھر بلّے کے سامنے آئی گیند کی طرح مجھ سے بہت دور جا پڑتی۔

فیروز نے واپس آ کر باورچی خانے کا کام سنبھال لیا۔ تو ارجم خان بولا "میرا خیال ہے کہ آپ نہا لیں، حبس بہت زیادہ ہے، پسینہ سوکھتا ہی نہیں ہے۔"

"ہاں یار! میرا بھی یہی خیال ہے جیلانی۔ ذرا نہا لیتے ہیں۔ غسل خانہ کدھر ہے؟" آبی نے اس تجویز پر خوش ہو کر کہا۔

"یہ سامنے ہی ہے، تولیہ بھی اُدھر ہی رکھا ہے۔ اتنا شکر ہے کہ یہاں کا پانی بہت ٹھنڈا ہے۔"

آبی فوراً ہی غسل خانے میں جا گھسا۔

"آپ اس دوسرے غسل خانے میں چلے جائیں ــــ کھانا بس تیار ہی ہے۔"

"اچھا تو یہ ٹھاٹھ ہیں۔ گھر تمھارا بہت اچھا ہے ارجم خان! لگتا ہے اب کی بار تم نے بہت محنت کی ہے۔"

"ہاں جیل سے نکل کر میں اِدھر ہی آ گیا تھا جیلانی صاحب! پھر میں نے سوچا کہ بےایمانی کام نہیں دے گی۔ بس یہی سوچ کر میں نے کاروبار میں ہاتھ ڈال دیا۔ اللہ نے بڑی برکت دی ہے۔"

"ہاں! آدمی جی جان سے محنت کرے تو خدا اسے مایوس نہیں کرتا۔" یہ کہہ کر میں دوسرے غسل خانے میں جا گھسا۔ مکان

میں کسی جگہ کنڈا لگا تھا جس پر ارحم خان نے موٹر لگا رکھی تھی جس کے ذریعے پانی چھت پر بنی ٹنکی میں پہنچتا تھا اور وہاں سے نلوں میں آجاتا تھا۔ غسل خانہ بہت عمدہ تھا۔ میں نے کپڑے اتار کر الگ رکھ دیے مگر جیسے ہی میں نے صابن بدن پر ملا، مجھے یہ احساس ہوا کہ غسل خانے کا دروازہ کسی نے بے آواز کھول دیا ہے، ایک لمحے کے لیے تازہ ہوا اندر آئی اور پھر بند ہو گئی۔ میں نے فوراً ہی منہ پر پانی ڈالا تو یہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا کہ میرے کپڑے کسی نے دروازے پر سے اُچک لیے تھے۔ اُن میں میرا پستول بھی تھا اور کچھ رقم بھی جیبوں میں رکھی تھی ــــ وہ بریف کیس جس میں رقم موجود تھی، آبی اپنے ساتھ دُوسرے غسل خانے میں لے گیا تھا۔ میں نے فوراً ہی اٹھ کر دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر وہ کسی نے باہر سے بند کر دیا تھا۔

"اوئے! یہ میرے کپڑے کہاں چلے گئے؟ یہ سالیوں والا مذاق کون کر رہا ہے میرے ساتھ؟ اوئے جیلانی یہ کیا ہو رہا ہے؟" یہ آبی کی آواز تھی۔ وہ بھی غسل خانے میں کھڑا تھا اور مجھے بھی کسی نے بے لباس کر کے چھوڑ دیا تھا۔

"اوئے ارحم خان! یہ کیا ہو رہا ہے بھئی! یہ کپڑے کس نے اُٹھا لیے؟" میں نے آبی کی آواز سُن کر اپنے کپڑوں کے بارے میں پوچھا مگر اس کٹانے نے جواب میں زہر خند کیا۔

وہ زیادہ دُور نہیں کھڑا تھا، بولا "یہ کپڑے بہت گندے ہو رہے ہیں۔ میں آپ کو نیا جوڑا دے رہا ہوں، یہ پہن لیں"۔

"یہ کیا بکواس ہے؟ اس میں میرا پستول بھی رکھا ہے اور یہ آبی کیوں چیخ رہا ہے؟"

"میں اسے بھی نیا لباس دے رہا ہوں جناب! فکر نہ کریں۔ یہ لیں، یہ پہن کر باہر آجائیں"۔ ارحم خان نے دروازے کے شیشے والے حصے کی چٹخنی ہٹا کر ایک چادر اور ایک قمیص مجھے تھما دی۔ آبی کو بھی اس نے پستول سے محروم کر دیا تھا۔ البتہ اُس کا بریف کیس ابھی تک اس کے پاس تھا۔ وہ ارجمند خان کے ہاتھ نہیں آسکا تھا۔ میں نے جلدی جلدی بدن پر پانی ڈال کر تولیہ استعمال کیا اور اس کے دیے ہوئے دونوں سفید کپڑے پہن لیے۔ آبی کو بھی اس نے نیا لباس پہنا دیا تھا مگر ہم دونوں اندر سے کھٹالی میں جا گرے تھے۔ ارحم خان بدترین قسم کا دھوکے باز ثابت ہو رہا تھا۔ ابھی ہم غسل خانوں میں کھڑے سوچ ہی رہے تھے کہ اس ارحم خان نے چور پکڑنے کے لیے جو کٹورا پھرا دیا ہے اُس کا جواب کیا ہونا چاہیے کہ کمرے میں دو آوازیں اور ابھرنے لگیں۔ اُن میں سے ایک تو اکبر تھا جسے ہم اجمل شاہ کے ڈیرے پر ہی چھوڑ آئے تھے۔ دُوسرے کو ہم نہیں جانتے تھے۔

"یہ پستول کوئی خاص قسم کا ہے جیلانی صاحب! میرا خیال ہے کہ یہ بے آواز چلتا ہے"۔ ارحم خان کی آواز میں اب کی بار بڑی زبردست گونج تھی۔

"ہاں! ارحم خان اس کو بہت سوچ سمجھ کر چلانا۔ اُس کی گولی پلٹ کر اپنے ہی سینے میں آ گھستی ہے اب یہ دروازہ کھول دو ذرا"۔

"ہاں میں ابھی کھولتا ہوں جیلانی صاحب! میں آبی سے وہ بریف کیس لے لوں آخر ساڑھے تین لاکھ روپیہ بند ہے اس میں"۔ یہ کہہ کر وہ آبی کے غسل خانے کی طرف بڑھا۔

اکبر اس گھڑی بہت زیادہ خوش ہو رہا تھا، بولا "کیا آپ آپ لگا رکھی ہے تم نے ــــ بتاؤ انھیں کہ ہم کون ہیں؟ ان کی ایک ایک انھیں بتا دو"۔

"نہیں یار! یہ ہمارے معزز مہمان ہیں، کچھ لحاظ بھی تو رکھنا ہو گا۔ لاؤ آبی میاں، وہ بریف کیس مجھے دے دو"۔

"یہ کیا بکتے ہو تم ارحم خان! میں تیری زبان کتر دوں گا تمھیں پتہ نہیں ہے کہ تیرا واسطہ کن لوگوں سے ہے"۔ آبی کا لہجہ غضبناک ہونے لگا تھا۔ اس آدمی کی عیاری نے ہمیں صاف سیدھا ایک ایسے غار میں دھکیل دیا تھا کہ اس سے باہر نکلنا کسی بھی طرح ممکن نہیں تھا۔

"میری بات سُن آبی! میں تمھیں زیادہ پریشان نہیں کروں گا۔ میرا عہدہ سی آئی ڈی سب انسپکٹر کا ہے جب میں جیلانی کے ساتھ جیل میں تھا تو اس وقت بھی میں سرکاری ڈیوٹی انجام دے رہا تھا۔ مجھے وہاں کچھ خاص لوگوں میں گھل مل کر ان کے راز معلوم کرنا تھے اور وہ میں نے کر لیے۔ نو مہینے میں جیل میں رہا۔ میری بات سن رہے ہو نا! اور اب میں یہاں بھی خاص کام سے آیا ہوا ہوں ــ پرسوں ہی مجھے ملتان میں اطلاع ملی تھی کہ تم لوگ سندھ پولیس سے مقابلہ کرنے کے بعد ادھر آ گئے ہو۔ تمھیں کوئی پہچانتا نہیں تھا۔ یہ اکبر بھی میرے ساتھ ہے ــ یہ بھی اپنا فرض ادا کر رہا ہے میرے ساتھ علی نواز بھی ہے۔ یہ سی آئی ڈی میں انسپکٹر ہے، بہتر یہ ہے کہ یہ بریف کیس مجھے دے دو۔ تم سے ہمیں کچھ اور بھی حساب لینا ہے، اس کے بعد ہم تمھیں پولیس کے حوالے کر دیں گے۔ سمجھتے ہو نا میری بات! اچھے بچے بنو میاں جی"۔

"تیری ایسی تیسی ــ بہت بدمعاش ہو تم۔ مگر یہ سودا تمھیں مہنگا پڑے گا استاد! تمھیں ہم کتے کی موت ماریں گے"۔ آبی آگ بگولہ ہونے لگا۔ ہاتھ مار کر اس نے دروازے کا کنڈا کھول دیا۔ اس کی کنڈی دوسری طرف سے پہلے ہی کھلی تھی۔

"لو، یہ رہا بریف کیس! اٹھاؤ اسے ــ اور دیکھو کہ یہ کیا کچھ کر سکتا ہے، اس میں چار دھماکہ خیز بم بھی ہیں۔ کھولو اسے"۔ آبی نے بریف کیس ارحم خان کے سامنے رکھ دیا۔ "کھولو اسے! اس میں ساڑھے تین لاکھ روپیہ ہی نہیں، تمھاری موت بھی بند ہے"۔ وہ جھوٹ بول رہا تھا مگر شاید وہ جھوٹ ـ کام کر رہا تھا۔

"تو تم ہمیں ان بموں سے ڈرا رہے ہو جو بڑے دھماکہ خیز ہیں یہی کہا ہے نا تم نے؟ مگر یہ اکبر بہت بم پروف آدمی ہے۔ اس پر کوئی دھماکہ اثر نہیں کرتا۔ اسے الگ رکھ لیں انسپکٹر صاحب"۔ ارجمند خان نے اکبر سے مخاطب ہو کر کہا۔ میں نے دروازے پر ہاتھ مارا تو آپ ہی آپ کھل گیا۔ میرے سامنے علی نواز کھڑا تھا ــ اور پستول اس نے یوں ہاتھ میں تھام رکھا تھا کہ میری ذرا سی حرکت مجھے موت کی نیند سلا سکتی تھی۔ وہ بھی عام سے لباس میں کھڑا تھا۔ اور اُن تینوں کے حُلیے سے یہ کہیں ثابت نہیں ہوتا تھا کہ وہ پولیس سے تعلق رکھتے ہیں البتہ اُن کے ڈیل ڈول یہ بتاتے تھے کہ وہ کھیلے کھائے آدمی ہیں۔ حد یہ تھی کہ اکبر نے بھی حُلیہ بدل لیا تھا۔ سفید براق شلوار قمیص میں وہ کوئی اور ہی آدمی نظر آتا تھا۔ ارجمند نے مجھے باہر نکلتے دیکھا تو کمرے کے وسط میں جا پہنچا، بولا "یار جی! بڑی حیرت کی بات ہے۔ پر یہ بات تو اب ثابت ہی ہے کہ جیل میں جو فساد ہُوا تھا اس کی وجہ سے تم وہاں سے بچ نکلے تھے ــ میں تمھیں ابھی پولیس کے حوالے کر دیتا مگر تم سے مجھے سارا حساب کتاب معلوم کرنا ہے۔ تم بھی ادھر آجاؤ آبی، کرسی پر بیٹھ جاؤ"۔ آبی کے سامنے سے اکبر نے بریف کیس اٹھا لیا تھا اور آبی بس اسے دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔ اکبر نے بھی پستول اُٹھا رکھا تھا اور رُخ ان تینوں نالیوں کا ہماری طرف تھا۔

"تم اچھا نہیں کر رہے ہو ارجمند خان! تم غلط کہتے ہو کہ جیل میں تم سرکاری ڈیوٹی دے رہے تھے"۔

"میں ٹھیک کہتا ہوں استاد! تمھیں معلوم ہے وہاں علی قلی بھی تھا اور درویش بھی۔ اور سہیل احمد بھی وہیں تھا۔ وہ کسی طرح بکتے ہی نہیں تھے کہ بینک کا روپیہ ان لوگوں نے کہاں رکھا ہے مگر میں نے اُن سے دوست بن کر پوچھ ہی لیا۔ اب وہ لمبی جیل کاٹ رہے ہیں مجھے ابھی بہت کچھ معلوم کرنا تھا۔ مگر خیر تم یہ بتاؤ کہ تم وہی جیلانی ہو نا جس نے ڈاکٹر دھمن سے پچھتر لاکھ روپیہ چھین لیا تھا۔ میرا اندازہ غلط نہیں ہو سکتا ہے"۔

"یہ تمھیں کیسے پتہ چلا، کس نے بتایا ہے تمھیں؟" میں نے غسل خانے سے نکل کر کرسی کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"یہ سب کچھ تمھارے نامۂ اعمال میں لکھا ہے جیلانی! مجھے غلط نہ سمجھو۔ تمھیں پہلی جھڑائی کے لیے میں یہاں لے آیا ہوں۔ دوسرے مرحلے پر میں تمھیں پولیس کے حوالے کر دوں گا۔ نان نفقہ جو تمھارے پاس ہے ادھر رکھ دو تو میں تمھارے بارے میں کچھ اور بھی سوچ سکتا ہوں"۔

"تو تم جیل کے پرانے قیدی ارجمند خان نہیں ہو بلکہ وہاں فرض ادا کرنے گئے تھے"۔ میں جم کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ آبی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا اور اس کے چہرے سے میں یہی اندازہ لگا رہا تھا کہ وہ اُن کے ہاتھوں قانون کے شکنجے میں جکڑے جانے کے بجائے وہیں جان دے دینا زیادہ آسان سمجھتا تھا۔ تین آدمی پستولوں سے مسلح ہو کر ہم پر آ چڑھے تھے اور ارجمند کے سوال ایسے تھے جن کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

"ہاں میں اب بھی وہی ہوں جیلانی! اور اب بھی اپنا فرض ادا کر رہا ہوں"۔

"تو پھر یہ بھی سوچ رکھ ارحم خان کہ جیلانی سے تجھے کچھ بھی نہیں مل سکتا۔ ہاں یہ پستول الگ رکھ دو تو پھر بات ہو سکتی ہے۔" میں نے تپائی پر رکھے سگریٹ کا پیکٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔ اُن لوگوں نے ہمیں سخت مخمصے میں ڈال دیا تھا لہٰذا ہر وہ اچھے نظر آتے تھے۔ کراچی میں جو کچھ ہُوا وہ انھیں اخبار سے معلوم ہو گیا ہو گا۔ دھمن نے بہت واویلا مچایا ہو گا۔ میں یہ ماننے پر تیار نہیں تھا کہ وہ تینوں پولیس کے آدمی ہیں۔

"ابھی بہت وقت پڑا ہے۔ پولیس کو کوئی جلدی اتنی جلدی نہیں ہے۔ سوچ لو، ہم تمھارے تھن ابھی دھو ڈالیں گے۔ جتنا بھی روپیہ تمھارے پاس ہے وہ تمھیں یہاں ڈھیر کر دینا ہو گا"۔

"تو یہ شرط ہے تمھاری ــ تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ ارحم خان! تمھیں ہماری دوسری کہانی بھی یاد ہے"۔

"مجھے پتہ ہے تم ابھی سندھ پولیس کے چھ آدمی زخمی کر آئے ہو۔ چار آدمی ابھی ہسپتال میں پڑے ہیں، دو مر چکے ہیں ــ تمھارے دو آدمی ضائع ہوئے۔ ایک ان میں لاکھو تھا نمبری بدمعاش ــ وہ ابھی زندہ ہے اور سکھر کے ہسپتال میں پڑا ہے"۔

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا اور اس کی معلومات سے یہی ثابت ہوتا تھا کہ وہ پولیس کے اس محکمے سے تعلق رکھتا تھا جو جرائم کی اندر کی کہانی کو بھی اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ ذرا دیر کی خاموشی کے بعد وہ بولا "میری بات یاد رکھو جیلانی! اب تمھیں چھڑانے والا کوئی آگے نہیں آئے گا۔ تمھاری پشت پناہی کرنے کو اب کوئی نہیں آئے گا۔ تمھارے بڑے صاحب کا اب بولورام ہونے والا ہے۔ یاد رکھو اب ڈھلوں صاحب بھی تمھارے کام نہیں

آ ئے گا۔"

اس کا نام اس کے منہ سے سن کر میں ششدر رہ گیا۔ وہ سالا بے حساب باتیں جانتا تھا۔ ایسی باتیں جن کے بارے میں میں گمان بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ کسی اور کو معلوم ہو سکتی ہیں۔

"ٹھیک ہے ارجم خان! تم ہم سے سودا کر لو۔ میں تمھیں اتنی ہی رقم اور دے سکتا ہوں۔ اس رقم کو تم بانٹ سکتے ہو۔"

"یہ نہیں ہوگا جیلانی! مجھے وہ سب کچھ چاہیے جو تمھارے پاس ہے۔ سب کچھ۔۔۔ اور پھر میں تمھارا پنجرا خالی کر دوں گا۔ پولیس تم سے خود بات کر لے گی۔"

اس کی یہ بات سنتے ہی آبی نے پوری قوت سے اچھل کر اکبر کے ہاتھ پر پاؤں کی ٹھوکر لگائی۔ پستول اس کے ہاتھ سے اچھلا تو آبی دوسرے ہی لمحے اکبر کی اوٹ میں جا پہنچا۔

"اوئے ارجم خان! پستول پھینک دے ورنہ اکبر کو تو نہیں بچا سکے گا۔" اس نے اکبر کو دیوار کی طرف کھینچتے ہوئے اس کا پستول اٹھا لیا۔ وہ سب کچھ اتنی جلدی ہو گیا کہ ارجم خان کچھ بھی نہ کر سکا مگر عین اسی وقت علی نواز نے دائیں طرف ہٹ کر آبی کو زد میں لے لیا۔

وہ گندی گالیاں بکنے لگا تھا۔ وہ تیزی سے آبی کی طرف لپکا اور کسی بات کی پروا کیے بغیر اس نے آبی کے ہاتھ پر گولی چلا دی۔ آبی نے بھی لبلبی دبائی مگر علی نواز کا نشانہ خطا نہیں گیا۔ پستول آبی کے ہاتھ سے دور جا پڑا۔ اس کی انگلیوں کو گولی چاٹتی ہوئی آگے نکل گئی تھی۔

"چھوڑ دے اسے ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔" علی نواز نے کونے میں پڑے پستول کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ اس کی نالی کا رخ اب آبی کے پہلو کی طرف تھا۔ وہ لپک کر دیوار کے پاس جا پہنچا تھا۔ آبی کو تنہا دیکھ کر اکبر نے ذرا سا نیچے جھک کر آبی کی گردن پر ہاتھ ڈالا اور اسے اپنے بدن پر سے گھما کر کمرے کے وسط میں پھینک دیا۔ مجھے بہت دکھ ہوا۔ ہاتھ اس کا زخمی تھا اور خون قطرہ قطرہ زمین پر گر رہا تھا۔ وہ فرش پر لگا تو اکبر نے آگے بڑھ کر اسے دبوچ لیا۔ اس کی دونوں ٹانگیں پکڑ کر اس نے آبی کو الٹایا اور اس کی کوچیں دبانے لگا۔ آبی کے لیے یہ تکلیف زیادہ ہی صبر آزما ثابت ہوئی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر اکبر کا داؤ ایسا سخت تھا کہ اس نے کہنی سے آبی کی گردن بھی دبا دی۔

"کیا خیال ہے، کر دوں جھٹکا تیرا کتے کے بچے! تو سمجھتا ہے تیرا کوئی جوڑ ہی نہیں ہے؟" اکبر نے اسے گالی دیتے ہوئے کہا۔ آبی نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے۔ وہ بے بس ہوتا نظر آ رہا تھا۔ جیسے ہی اس کا بدن نڈھال ہوا اکبر نے اسے چھوڑ کر اپنا پستول اٹھا لیا۔ بولا "اٹھ جا اب۔ تو ہم سے پنجہ کیا لڑائے گا، اٹھ جا خچر کی اولاد۔"

آبی نڈھال سا ہو کر فرش سے اٹھا۔ وہ بہت زیادہ خجل ہو رہا تھا۔ مجھے اس نے یوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ تو مٹی کا مادھو ہے سالے، تجھ سے کچھ بھی نہ ہو سکا۔ کیا فائدہ ہے تیری دوستی کا۔ کس لیے تو مجھے اپنے ساتھ لیے پھرتا ہے تو بسکھرا ہے جیلانی۔

میں نے اپنی نظریں اس سے چرا لیں۔ اس کی ان کہی بات کا میں کوئی جواب دے سکتا تھا۔ میرے اوسان جواب دے گئے تھے۔ صورت حال قطعاً ایسی نہ تھی کہ ہم تینوں کو ایسی مسلح حالت میں نیچا دکھا سکتے۔ وہ پستول ان کے ہاتھ میں لمبی اوکھی تھے، اور ابھی ان کے خلاف مزاحمت کسی بھی طرح بار آور ثابت نہیں ہو سکتی تھی۔ جس مکاری سے ارجم خان نے ہمیں یوں پنجرے میں بند کر دیا تھا، ویسی ہی مکاری سے ہم اس کے جال سے چھوٹ بھی سکتے تھے مگر اس کا کوئی نقشہ ابھی میرے ذہن میں نہیں ابھرا تھا۔ وہ بہت بھرے ہوئے تھے۔ اس کا ایک ایک فقرہ مجھے احساس دلاتا تھا کہ وہ ہم سے کچھ زیادہ ہی واقف ہے۔

"چلو جیلانی! مجھے یہ سب کچھ پسند نہیں ہے۔ تم عزت دار آدمی ہو۔ عزت داروں کا سا سلوک ہونا چاہیے تم سے۔۔۔ اٹھو دوسرے کمرے میں چلو۔ تم بھی چلو کسی بازی گر کی اولاد، چلو اٹھو۔"

ارجم خان کے ساتھ اکبر نے بھی آبی کو اپنے آگے لگا لیا۔ میں تو پہلے ہی اٹھ چکا تھا۔ آبی بھی اپنے زخمی ہاتھ کا لہو خشک کرتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ وہ منہ سے کچھ نہیں بولا، خاموشی سے ان کے کہنے کے مطابق دروازے میں سے گزر کر اگلے کمرے میں چلا گیا۔

"دیکھو تم ادھر ہی بیٹھو گے۔ اس کمرے میں، اچھی طرح سوچ لو۔ ہمیں وہ پچھتر لاکھ روپیہ دے دو گے تو پھر بات آگے چلے گی۔ اگر وہ روپیہ بینک میں ہے تو ہمیں اس تک پہنچنے دو ورنہ ہم تمھارے ساتھ چلیں گے، یہی شرط ہے ہماری۔"

"بکواس نہ کر اوئے! نام نہ لے اس رقم کا ورنہ میں تیرا قیمہ کر دوں گا۔ میں پھر کہہ رہا ہوں نکل جا یہاں سے۔" آبی نے غراتے ہوئے کہا۔ وہ اب بھی غصے کی تال بنا ہوا تھا۔

ارجم خان نے بائیں ہاتھ سے ایک زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر رسید کیا، بولا "بکواس تم کر رہے ہو سالے۔ وہ روپیہ تو تم سے ہم ضرور لیں گے، ورنہ تمھاری لاشیں بھی یہاں نظر نہیں آئیں گی۔۔۔" یہ کہہ کر اس نے پاؤں کی ٹھوکر سے آبی کو دور پھینک دیا۔ علی نواز ایک بار پھر حرکت میں آ گیا۔ اس نے آبی کو گرتے دیکھا تو اس پر پل پڑا۔ بائیں ہاتھ سے وہ اس کو کچھ اس طرح دھننے لگا کہ وہ بیچارا بلبلا اٹھا۔ چیخ کر اس نے اپنی پوری قوت سے علی نواز پر حملہ کیا۔ اس طرح کہ اب کی بار علی نواز کی گردن اس کے شکنجے میں پھنس گئی مگر علی نواز نے اپنا پستول اس کے سینے پر رکھ دیا، بولا "پیچھے ہٹ جا سالے، ورنہ میں تجھے گولی مار دوں گا۔ ہٹ جا پیچھے۔"

عین ممکن تھا کہ علی نواز اس پر گولی چلا دیتا کہ آبی نے صورت حال کو سمجھتے ہوئے اس کی گردن چھوڑ دی۔ اکبر اور ارجم خان کے پستولوں کی نالیں مجھے زد میں لیے ہوئے تھیں اور وہ جانتے تھے کہ میں حرکت میں آیا تو انھیں کیا کرنا ہوگا۔ ان تینوں نے ایک دم دروازے کا رخ کیا اور فوراً ہی باہر سے کنڈی چڑھا کر دوسری طرف نکل گئے۔ ہمیں وہ یوں افراتفری میں ضائع کر دینے کے حق میں نہیں تھے۔ کوئی گولی چل جاتی تو ہم میں سے ایک آدھ تو ضرور ہی ختم ہو جاتا اور یہی وہ نہیں چاہتے تھے۔

وہ باہر نکلے تو آبی دیوار سے ٹیک لگا کر فرش پر بیٹھ گیا۔ حالانکہ وہاں کرسیاں بھی موجود تھیں۔ دھیان اس کا اب تک اپنے زخمی ہاتھ کی طرف تھا۔ بڑے دلدوز لہجے میں بولا "یہ کیا ہو گیا ہے یار! یہ کون ہیں؟ یہ آخر چاہتے کیا ہیں ہم سے؟"

"مجھے تو تلنگے ہی نظر آتے ہیں۔" میں نے اس کے پاس بیٹھ کر اس کا ہاتھ غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ گولی ہاتھ کو باہر کے حصے پر سے چھیلتی ہوئی گزر گئی تھی۔ ہڈی کو نقصان نہیں پہنچا تھا مگر دوا ہمارے پاس کوئی بھی نہیں تھی۔ آبی بڑے صبر سے اس درد کو سہہ رہا تھا۔

"یہ تو لمبی کہانی سناتے ہیں جیلانی! ہمیں ادھر نہیں آنا چاہیے تھا۔ اس خبیث آدمی کے ساتھ۔ مگر ہم خواہ مخواہ ہی دھوکے میں آ گئے۔"

"ہاں! حالات ہی کچھ ایسے تھے کہ ہم بس سے اترنے پر مجبور ہو گئے۔ بظاہر یہ ارجم خان ٹھیک ہی نظر آتا تھا مگر اس کا باطن تو یہی سمجھتا تھا۔"

"ہم بہت بری طرح پھنس گئے ہیں جیلانی! یہاں سے نکل چل، یہ پولیس کے آدمی ہیں تو پھر چند دن میں ہماری لاشیں ہی کسی بڑے گھر سے باہر نکلیں گی۔"

"میں کیا کروں؟ یہ مکان تو دیکھو کم از کم چار کنال پر بنا ہے۔ عمارت اس قطعے کے وسط میں ہے۔ ہماری چیخیں بھی کوئی نہیں سن سکے گا۔ میرا خیال ہے کہ اس کا بڑا دروازہ کہیں عقب میں ہوگا۔"

"اس سے کیا ہوگا۔ سوال تو ہماری رہائی کا ہے۔"

"صبر کر، کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ کوئی موقع ملا تو میں اس ارجم خان کا خون پی لوں گا۔ اسے زندہ تو نہیں رہنے دوں گا۔"

"اسے اس پچھتر لاکھ کا بھی علم ہے۔ اسے یہ بھی معلوم ہے کہ ہم سندھ پولیس سے مقابلہ کر کے نکلے ہیں۔ ایسے لوگوں کو باندھ لیا ہے اس نے کہ اس کے تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔"

"میرا خیال ہے یہ دروازہ میں اندر سے بند کر دوں۔ بہت بدمعاش لوگ ہیں یہ۔"

"ہاں! تو بیٹھ میں خود بند کر دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں دروازے کی طرف بڑھا تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ سامنے کے کمرے میں کسی معاملے پر بحث کر رہے ہیں۔ میں نے بڑی آہستگی سے اندر کی دونوں چٹخنیاں اوپر چڑھا دیں۔ ہمارے حساب کتاب کا وقت قریب آ چکا تھا۔ ارجمند خان ان سے کہہ رہا تھا "ان کی چھترائی کر دو یار! مار مار کر دنبہ بنا دو۔ خود بولیں گے کہ رقم کہاں ہے۔ اس کے بعد ہی میں انھیں پولیس کے حوالے کروں گا۔ ڈی ایس پی زاہد بھی یہاں آیا ہوا ہے۔ مجھ سے وہ صبح شام حساب مانگتا ہے۔"

"ان کی گرفتاری پر پچاس ہزار کا انعام بھی تو رکھا گیا ہے؟"

"ہاں! مگر اس کو دفع کرو۔ ساڑھے تین لاکھ تو تم نے سنبھال لیا ہے، اس کے تین حصے کر لو اور پچاس ہزار بھی میرے حوالے کر دو۔ ان کی نشان دہی میں نے ہی کرائی تھی۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ ایک ایک لاکھ ہی کافی ہے۔" علی نواز نے کہا۔

"اس سے کیا ہوگا، ان کے پاس پچھتر لاکھ روپیہ ہے۔ وہ مل جائے تو یہ نوکری ختم۔ میں ابھی استعفیٰ لکھ دوں گا۔ یہ دونوں پھانسی لگ جائیں گے، کوئی انھیں نہیں بچا سکتا ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے، ان سے پوچھو۔۔۔ انھیں چین مت لینے دو۔"

"نہیں! پہلے تم ان کو کھانا بھیجو۔ کچھ پیٹ میں جائے گا تو یہ زیادہ بہتر بول سکیں گے۔"

"کھانا تو تیار ہے۔ میں ابھی بھیج دیتا ہوں۔"

"تو جاؤ پھر۔۔۔ یہ ٹیپ میں سیدھا کرتا ہوں۔ ان کا بیان بھی تو ٹیپ کرنا ضروری ہے۔" علی نواز نے کہا۔ کمرے میں پھر کچھ کھسر پھسر ہونے لگی۔

"نہیں یار! ان کو ابھی پولیس کے حوالے کرنا ٹھیک نہیں۔"

"مگر یہ انھیں مرنے سے پہلے سب کچھ بتا دیں گے، اور ہمیں جنگل کا رخ کرنا پڑے گا۔" یہ اکبر تھا۔ اس کی آواز ایک دم تیز ہو گئی۔

"پاگل ہے تو! دیتے رہیں نا بیان! کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ سب قانون میں نے پڑھ رکھے ہیں۔ تو سب انسپکٹر ہے اور میں انسپکٹر ہوں۔ رقم برآمد کیسے کریں گے؟ کون گواہی دے گا کہ ہم ان سے روپیے چکے ہیں۔"

"ان کا بیان ہی بہت کافی ہے، پولیس ہمیں اُدھیڑ کر رکھ دے گی۔" اکبر نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"دیکھ! یہ ایک ایک لاکھ ابھی سے بانٹ لو۔ ڈیڑھ مجھے دے دو اور ایسے اندر کھاتے میں رکھو کہ کسی کو پتہ نہ چل سکے۔ نوکری تو بہرحال چھوڑ دینی ہے پھر اپنے مزے ہی مزے ہیں۔"

یہ ارحم خان تھا وہ بات بات پر یہ بڑی وزنی گالی دینے کا عادی تھا۔ میرے اور آبی کے لیے بھی وہ بہت ہی واہیات قسم کے الفاظ بول رہا تھا۔ شکل اس کی یہودیوں ایسی تھی۔ میں ہی پاگل تھا جو اس کے بھرّے میں آ گیا۔ آبی تو بار بار مجھے ٹوکتا تھا کہ میں اس سیڑھی پر قدم نہ رکھوں۔ ہم پھنسے بھی تو کس شہر میں۔ اس کی آبادی زیادہ سے زیادہ چالیس ہزار کی ہو گی۔ ایک واپڈا کا دفتر وہاں بہت بڑا تھا۔ کوئی ہائیڈل پاور اسٹیشن قائم کیا تھا ان لوگوں نے وہاں۔ کچھ ان دنوں پیٹرول اور گیس کی تلاش والے بھی وہاں پھر رہے تھے۔ انہی کی وجہ سے وہاں شہر میں رونق لگی تھی۔ ورنہ تو وہاں کچھ بھی نہیں تھا اور ہم اس شہر میں کتے کی موت مر رہے تھے۔ ان میٹھے والوں نے ہمیں ایک دم ایسا زہر کھلا دیا تھا کہ ہم نیم پاگل ہو گئے تھے۔ ساری ہی اگلی پچھلی باتیں طے ہو کر رہ گئی تھیں اور تو اور وہ ڈھلوں کو بھی جانتا تھا، اسے یہ بھی معلوم تھا کہ بڑا صاحب ہمارا پرانا کرم فرما ہے۔ اسے ہادی علی کے قتل کی بات ابھی شاید معلوم نہیں تھی۔ ورنہ وہ بھی ہم سے کہہ دیتا۔ دروازے کو چٹخنی لگا کر میں پیچھے پلٹا تو آبی دیوار کے ساتھ سر لگا کر کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ ہمیں کوئی "پلسیا" یوں دھوکے سے پکڑ لے گا۔ اب مجھے ان لوگوں کے خلاف گاؤ پچھاڑ قسم کے داؤ آزمانا ہوں گے۔ میری اور میرے یار کی جان جب ہی چھوٹ سکتی تھی۔ ہاتھ پر آبی نے بستر کا ایک ٹکڑا پھاڑ کر باندھ لیا تھا اور اب پہلے سے کہیں زیادہ وہ مطمئن تھا۔

"غصہ مجھے تجھ پر بھی آ رہا ہے جیلانی! تجھے میں نے دو موقعے فراہم کیے مگر تو ان سے فائدہ نہ اٹھا سکا۔"

خواہ مخواہ میں اُن سے مغز تڑوا لیتا۔ وہ دونوں پستولوں سے مسلح تھے اُن کی گالیاں نہیں سنی تم نے؟"

"بہت سنی ہے۔ وہ جان سے مار دیتے نا۔ یہی ہوتا نا۔۔۔

مگر یوں چوہے کی موت مرنا بہت دشوار ہے جیلانی! وہ ہمیں ترسا ترسا کے ماریں گے۔"

"نہیں! وہ فیروز کھانا لا رہا ہے۔ میں ان کی باتیں سن آیا ہوں۔ کچھ بھی ہو، اُن کے ہاتھوں مرنا مجھے منظور نہیں ہے۔ میں ایک ایک کو ختم کر دوں گا یا خود مر جاؤں گا۔ پولیس، کچہری، جیل کی کوٹھری میرے بس کا روگ نہیں ہے۔ میں۔۔۔ میں شہادت کی موت مرنا چاہتا ہوں۔"

"جانے دے یار! شہادت کا رتبہ تجھے کیسے مل سکتا ہے، تو ٹھہرا ایک دم گندم آدمی۔ وہ اور ہوتے ہیں جو شہادت کی موت مرتے ہیں تو ٹھہرا پاپی آدمی۔"

"دیکھتا رہ پیارے۔ مجھے نہیں جانتے ہیں وہ۔۔۔ بس اک میرے دل کو ذرا صبر آ جائے۔ مجھے یہاں ان کا قیدی بن کر بیٹھنا ہی عذاب لگتا ہے۔"

اتنے میں کسی نے دروازہ کھٹکھٹا دیا باہر فیروز کھڑا تھا۔

"کون ہے! کیا چاہتے ہو تم؟"

"میں کھانا لایا ہوں صاب جی! کھا لیں۔"

"نہیں چاہیے ہمیں کھانا، لے جاؤ اسے۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" آبی نے تپ کر کہا۔

"دروازہ کھولو اوئے! فیروز کھانا لایا ہے، کھا لو۔ پھر پتہ نہیں تمھیں کب یہ کھانا مل سکے۔" یہ ارحم خان تھا۔ بڑی پاٹ دار آواز تھی اس سالے کی۔ یوں بات کرتا تھا جیسے گرج برس رہا ہو۔

"کتے کے بچے! تیری تو میں کھال کھینچ لوں گا۔ ذرا موقع آنے دے۔" آبی کا غصہ ایک دم پاگل پن کی حد تک جا پہنچا تھا۔

"ٹھیک ہے استاد! تجھے ایک ایک گالی کی قیمت دینی ہو گی۔ لے جا اوئے فیروز! یہ کھانا اندر رکھ دو۔ بھوک ہو گی تو یہ خود بھیک مانگیں گے۔" اس نے فیروز کو وہاں سے ہٹ جانے کے لیے کہا۔

چند ہی لمحوں بعد وہاں مکمل سکوت طاری ہو گیا۔ یوں جیسے مکان میں کوئی بھی آدمی موجود نہ ہو۔

"خواہ مخواہ ان کو اشتعال نہ دلا آبی! یہ تو تکرار بالکل بیکار ہے۔"

"کیا بیکار ہے؟ کیسے بیکار ہے؟ ہم ان کی قید میں ہیں۔ بھلے سے یہ پولیس کے آدمی ہیں مگر خود بے ایمان ہیں۔ ہاتھ آئی اسامی پہلے خود نچوڑ لینا چاہتے ہیں۔ یہ نیت ہے ان کی؟

"تیری مرضی ہے استاد! ورنہ راستے اور بھی ہیں جن سے گزر کر ان سے انتقام لیا جا سکتا ہے۔"

"مثلاً۔۔۔ کون سے راستے؟ کیا گیدڑ سنگی ہے تیرے پاس اس کمرے سے نکل جانے کے لیے؟"

"سوچیں گے بھائی! ضرور سوچیں گے، ذرا دم تو لے چھری کے نیچے۔۔۔ یہ جو کچھ سوچ رہے ہیں، وہ ہم نہیں ہونے دیں گے۔" میں نے چھت پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ مجھ سے وہ کڑیاں گِنی نہیں جاتی تھیں۔ دماغ سن ہو کر رہ گیا تھا۔ کوئی گاہن میں کہاں پھنسا ہو گا۔ ہماری تو ان لوگوں نے جان ہی نکال دی تھی۔ وہ تعداد میں تین ہی تھے مگر پوری فوج نظر آتے تھے۔ نشانہ بھی اُن کا بے خطا تھا۔ وہ ہمیں وہاں مار کر ہماری لاشیں سڑک پر پھینک دیتے تو ہم کیا کر سکتے تھے ان کا۔ کچھ بھی نہیں۔ ہمیں ہمارے نامۂ اعمال نے شاید تباہ کر دیا تھا۔ بے گناہ اور معصوم لوگوں کو ہم نے سڑک پر رک کر بے دریغ ہلاک کر دیا تھا۔ اُن کی روحیں چلا چلا کر کہہ رہی ہوں گی کہ انھیں پکڑو۔۔۔ انھیں روکو۔۔۔ وہ شاید انہی کی فریاد تھی کہ کشمور پہنچ کر ہم گونگے کا خواب بن کر رہ گئے تھے۔۔۔ نہ ہمارے حال کی ڈھلوں صاحب کو کچھ خبر تھی، نہ کسی اور کو۔ اور ہمارا ہمدرد تھا ہی کون! ایک ہماری جان تھی جو ہم تقدیر سے بچتے پھرتے تھے۔ کوئی گوندنی کا پھل تو نہیں تھے ہم کہ ہمیں کوئی بہت سینچ سنوار کر رکھتا اور ان پولیس والوں کے پاس تو جلاہے کا کوچ ہوتا ہے جسے تانے پر بھی پھیرتے ہیں اور بانے پر بھی۔ اور اس کوچ کی لپیٹ میں اب کی بار ہم بھی آ گئے تھے۔

فیروز واپس گیا تو میں چند لمحوں تک فرش پر بیٹھا صورتحال پر غور کرتا رہا۔ کمرے میں نہ کوئی کھڑکی تھی نہ روشندان کچھ بھی تو نہیں تھا وہاں۔ دیواریں تھیں دس دس فٹ اونچی اٹھی ہوئی۔ جنوبی دیوار میں البتہ ایک لکڑی کی الماری پڑی تھی جس کے دروازے پر چھوٹا سا تالا لگا تھا۔ اس کے سوا وہاں کوئی چیز نظر نہیں آتی تھی۔

میں اُٹھ کر الماری کے تالے سے زور آزمائی کرنے لگا۔ وہ کسی لچوندی کا لگایا ہوا تالا تھا، جلدی ہی میری انگلیوں کی ضرب سے کھل گیا۔ الماری میں طرح طرح کی دوا کی شیشیاں، کنگھے، آئینے، سستی قسم کی آٹھ آٹھ آنے والی کتابیں، کچھ چینی کے برتن، چمچے، کچھ قلم اور روشنائی کی دو دواتیں رکھی تھیں۔ بڑا کاٹھ کباڑ جمع تھا وہاں۔ نچلے خانے میں ایک رسّا رکھا تھا وہ شاید کسی چارپائی میں سے نکالا گیا تھا۔ دوائیں میں نے ایک بار پھر غور سے دیکھیں۔

ایک شیشی پر لکھی دوا کو دیکھ کر میں نے باہر نکالا۔ وہ زخموں پر تیر بہدف اثر کرتی تھی۔ وہ دوا لے جا کر میں نے آبی کے سامنے رکھ دی۔ "لے یار! تیرے زخم کا علاج مل گیا ہے۔ یہ دوا لگا لے، بہت عمدہ دوا ہے یہ۔"

"تجھے اس الماری سے ملی ہے۔ کوئی زہر ہی نہ ہو؟"

"نہیں یار! میں اس کا رنگ پہچانتا ہوں، لے اسے پٹی کھول کر زخم پر لگا دے، زخم دو گھنٹے میں ٹھیک ہو جائے گا۔"

اس نے میرے کہنے پر عمل کیا اور زخم پر دوا لگا کر اس پر پٹی دوبارہ باندھ دی۔

"یار! یہ تو بہت اچھی دوا ہے، مجھے بہت آرام ملا ہے، ورنہ سڑن سی لگی تھی زخم میں۔"

"بس اب تو آرام سے سو جا۔ کوئی آئے گا تو میں اسے دیکھ لوں گا۔" میں نے زانو پر اس کا سر رکھ لیا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ چند ہی لمحوں بعد اسے گہری نیند آ گئی۔ کرسیوں پر گدے دھرے ہوئے تھے۔ اُن میں سے دو اٹھا کر میں نے آبی کے سرھانے تلے رکھ دیے۔۔۔ اور وہ اطمینان سے لمبی تان کر سو گیا۔ اس کے لیے سو جانا ہی بہتر تھا۔ اس کے ماتھے پر بڑی للاٹ تھی۔ بہت اچھا نصیب تھا اس کا۔ جو چاہا، اسے مل گیا۔ اس نے دل سے دعا مانگی کہ اسے فردوس مل جائے، اور وہ اسے مل گئی۔ بڑی آرزو تھی اس کی کہ اس کے پاس ڈھیر ساری رقم جمع ہو جائے۔ اور وہ اسے یوں مل گئی کہ اسے اپنے ہاتھوں پر اعتبار نہیں آتا تھا۔ اب وہ کسی جگہ آباد ہونے کی سوچ رہا تھا اور میں اسی خیال میں گم تھا کہ کہیں ان پلسیوں کے ہاتھوں وہ آباد ہونے کے لیے عدم کو نہ جا پہنچے۔ اور سب کچھ دھرے کا دھرا رہ جائے۔ آدمی کی تقدیر ہی اگر اس سے روٹھ جائے تو پھر باقی کیا بچتا ہے اور وہ جو مدبرانِ فلک آدمی کے لیے سوچتے رہتے ہیں، وہ زمین پر پہنچ کر تو ایک دم بدل جاتا ہے۔ چیزوں کی اپنی اصل ماہیت ہی باقی نہیں رہتی کیونکہ ان میں آدمی کے ہاتھ کا لمس شامل ہو جاتا ہے۔ وہ جو ہم ایسے اس دنیا میں چار دن جی لیتے ہیں، انھیں ایک ہی سہارا کام دیتا ہے۔ تقدیر پر اُن کا ایمان اس قدر گہرا ہوتا ہے کہ وہ کسی اور شے کو نگاہ ہی میں نہیں رکھتے۔ اور اس روز جو ہم ان پلسیوں کے قیدی ہو کر رہ گئے تھے تو یہ بھی ہماری خانہ ساز تقدیر ہی کا ایک تحیر آمیز حصہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آبی اتنی تند و تیز آندھی کی زد میں آ کر بھی میرے زانو پر سر رکھ کر بے فکر ہو کر سو گیا تھا کہ ابھی وہ گولی پیدا ہی نہیں ہوئی تھی جو اسے عدم آباد پہنچا دیتی۔ راستے بڑے ہی

متاثر ہوتے ہیں۔ نیکی اور بدی کی راہیں ایک دوسرے کو کاٹ کر نکل جاتی ہیں اور آدمی کی سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ اسے کس گھڑی کس راستے پر چل لینا چاہیے اور یہی تقدیر ہے جس سے کسی بھی آدمی کو کوئی مفر نہیں۔

آبی کی نیند کچھ زیادہ ہی لمبی ہو گئی۔ میرا خیال ہے اس کا حال اس بچے کا سا تھا جس سے اس کی پسند کی چیز چھین کر ماں نے اس کی پٹائی بھی کر دی ہو۔ رقم بھی اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی اور اس کی جان الگ گردی ہو گئی تھی اور میرا یہ حال تھا کہ میں نے اپنا سب کچھ تقدیر کے حوالے کر رکھا تھا۔ میں خود اس زندگی سے عاجز آ چکا تھا۔ وہ رقم، وہ لاکھوں کی رقم اگر میرے ہاتھ میں ہوتی میرے دستخطوں تلے پڑی ہوتی تو میں اُن کے کجکول میں ڈال دیتا۔ اور بھی وہ جو کچھ مانگتے میں اُن کے حوالے کر دیتا۔ مگر شرط یہ تھی کہ وہ جس قسم کی دھمکیاں ہمیں دے رہے تھے اُن سے ہماری جان چھوٹ جاتی۔ بلا شبہہ وہ بہت بیہر گا۔ بگر قسم کے آدمی تھے۔ پولیس میں ملازم ہونے کے باوجود وہ اپنی اسامی سے وہ سب کچھ چھین لیتے تھے جو ان کے حصے میں آتی تھی۔ اسامی کے چنگل میں وہ کچھ بھی باقی نہیں چھوڑتے تھے اس کے باوجود وہ اس حصے بخرے سے نمٹنے کے بعد آدمی کو قانون کے حوالے کر دیتے تھے۔ وہ یہی کر رہے تھے اور ان سے اپنی چندیا بچا لینا کسی بھی طرح ممکن نہ تھا۔ وہ روٹی کو بیلن میں سے گزار دیتے تھے۔ یہاں تک کہ اس کے بیچ کی گرہ بھی گداز ہو جاتی تھی۔

آبی ابھی سویا ہوا ہی تھا کہ ان لوگوں نے پھر ہمارے دروازے پر حملہ کر دیا۔ اب کی بار وہ پہلے سے کہیں تلخ لہجے میں بات کر رہے تھے۔ دروازہ اندر سے بند تھا مگر اس کا بھی حل اُن کے پاس موجود تھا۔ تختے کو اب کی بار علی نواز نے کسی ہتھوڑے سے اتنی قوت سے کوٹا کہ دونوں چٹخنیاں اپنی جگہ سے سرک کر نیچے گر گئیں۔ آبی یہ شور سن کر فوراً ہی اٹھ گیا۔

وہ تینوں اندر گھسے تو پستولوں سے۔ اب بھی مسلح تھے۔ علی نواز نے پستول اکبر کے ہاتھ میں دیا اور سیدھا آبی کی طرف بڑھا۔

"اٹھ اوئے! تیرے تو میں ابھی 'ڈکرے' کر دوں گا اٹھ جاؤ۔"

یہ کہہ کر اُس نے آبی کا زخمی ہاتھ پکڑ کر مجھ سے الگ ہٹا دیا۔ "چل کھوتے دے پتر! تیرا بیان میں خود لوں گا۔" یہ کہہ کر اُس نے آبی کے دونوں ہاتھ مروڑ کر کمر کے پیچھے لگائے اور کھٹ سے اُن میں ہتھکڑی پہنا دی۔ وہ زیور اس نے دائیں جیب میں ڈال رکھا تھا۔ مجھے اس کا علم جب ہی ہوا جب آبی کے دونوں ہاتھ بندھ گئے۔ مجھ سے وہ سب کچھ برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ علی نواز آبی کے عقب میں کھڑا تھا۔ کہ میں نے اس کے پیچھے جا کر پوری قوت سے اس کی گردن پر ہاتھ ڈالا۔ میری انگلیاں اس کی رگوں میں دھنس سی گئیں میرے سامنے آبی بھی کھڑا تھا اور علی نواز بھی۔ جیسے ہی میں نے اس کی رگ کو نچوڑا، وہ دھڑام سے زمین پر گر گیا مگر میں نے اسے باہوں میں بھر لیا۔ آبی گھوم کر دائیں طرف ہٹا تو اکبر نے فوراً ہی ہم پر گولی چلا دی مگر اس کا نشانہ چوک گیا۔ گولی سیدھی علی نواز کی ران سے مس کرتی ہوئی دیوار میں جا لگی۔

"ذرا بچ کے فقیر کے بچے! تیرا یار حلال ہو رہا ہے۔"

آبی آناً فاناً میرے عقب میں آ ٹھہرا۔ اب وہ لکڑی کی الماری کے پیچھے چلا گیا تھا۔ اس کو اوٹ میں لے کر میں نے علی نواز گولی کی زد پر رکھ لیا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے اس کو چھوڑ دے جیالانی! ورنہ یہ گولی تیرے مغز میں سے گزر جائے گی۔" ارحم خان نے چیخ کر کہا۔

"سوچ لے ارحم خان! یہ سودا تجھے بہت مہنگا پڑے گا۔" میں نے محسوس کیا کہ علی نواز کے نیفے میں خنجر اڑسا ہوا ہے وہ میں نے نکال لیا۔ بہت تیز دھار خنجر تھا وہ۔ اس کی چمک اُس کی نگاہوں کو خیرہ کرتی تھی۔ وہ میرے ہاتھ میں تو وہ دونوں محتاط ہو گئے۔ علی نواز کا بدن میں نے پوری طرح سامنے رکھ لیا تھا۔ ٹانگ کے پیچھے ٹانگ اور دھڑ کے پیچھے دھڑ۔ سر بھی میرا انھیں سامنے سے نظر نہیں آتا تھا۔ جیسے ہی اکبر نے نشانہ لینے کے لیے جنوبی دیوار کا رخ کیا۔ میں نے اُس کے سینے کو ہدف بنا کر خنجر کو نوک سے پکڑ کر اس کی طرف پھینکا، وہ سبک رفتار خنجر اسی طرح ہدف کے [illegible] لپکتا تھا۔ اُس سے بچنے کے لیے اکبر ایک دم بائیں طرف [illegible] مگر میں اس کی حرکت کا اندازہ کر چکا تھا۔ خنجر سیدھا اس کی دائیں بغل کو کاٹتا ہوا پسلی میں اُتر گیا۔ عین اس وقت [illegible] میری طرف لپکا۔ وہ اب براہ راست مجھ پر حملہ کرنا چاہتا تھا۔ درمیان کا فاصلہ اُس نے طے کر ہی لیا تھا کہ میں نے علی [illegible] کو اچھال کر اس پر یوں پھینکا کہ وہ اپنا توازن برقرار نہ [illegible] سکا اور ایک دم الٹ گیا۔ جیسے ہی وہ زمین پر گرا میں نے اس کی گردن پر پاؤں رکھ کر دوسرا پاؤں اس کی دائیں [illegible] پر ڈال دیا۔ وہ بے بس ہو کر الٹنے کی کوشش میں تھا [illegible] نے گردن سے پاؤں اٹھا کر اس کے ہاتھ کو کچل دیا۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تو میں نے اسے پاؤں کی ٹھوکر سے دیوار تک پھینک دیا۔ اب معاملہ زیادہ آسان ہو گیا تھا۔

ارحم خان کو میں نے اٹھنے کی مہلت دے دی۔ پستول اب میرے ہاتھ میں تھا۔ وہ اکبر کے پستول کی طرف لپکا مگر یہ اتنا آسان نہیں تھا۔

"رک کے ارحم خان! رک کے چل۔" میں نے اکبر کے پستول کو تاک کر گولی چلا دی۔ ایک شعلہ سا فرش پر بھڑکا اور ارحم خان وہیں رک گیا۔ آبی شاید اسی لمحے کا منتظر تھا۔ اُس نے بندھے بازوؤں کے ساتھ اچھل کر قلابازی لگائی اور ارحم خان کو ٹانگوں کی قینچی میں پھنسا کر فرش پر الٹ گیا۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے بندھے بازو اسے بہت تکلیف دے رہے تھے مگر اس کو وار کرنے کا تو حق حاصل تھا۔ اکبر کو اس کی پسلی میں دھنسے خنجر نے ہی گھیر رکھا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ خالہ چاندنی کا کبنہ ہو گئے۔ تینوں کو ہم نے مغلوب کر لیا تھا۔ میں نے تینوں پستول یکجا کر کے علی نواز کی جیب سے چابی نکالی اور آبی کے ہاتھ کھول دیے۔ ارحم خان اُس کی ٹانگوں میں پھنسا بالکل ہی گدھے کا بچہ نظر آتا تھا۔ خود کو چھڑانے کی اُس نے کوئی کوشش نہیں کی۔ آبی کے ہاتھ پر بندھی پٹی کھل گئی تھی اور زخم پر لگی دوا صاف نظر آ رہی تھی۔ اکبر نے اس عرصے میں بڑی مشکلوں سے خنجر اپنی پسلی سے علیحدہ کر لیا تھا مگر خون کی ہلکی سی لکیر کو وہ کسی طرح روک نہیں سکتا تھا۔ قطرے زمین پر گرے تو وہ پریشان ہو کر وہیں فرش پر اوندھا ہو گیا۔ اسے زخم زیادہ گہرا نہیں لگا تھا۔ مگر فکر اس کی سہ چند ہو گئی تھی۔ مگر ابھی میں کچھ سوچ نہیں سکا تھا کہ مجھے سامنے کے کمرے میں دگڑ دگڑ کی آواز سنائی دی۔ آبی کو ساتھ لے کر میں دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ پولیس کے چھ سپاہی ایک تھانیدار کے ساتھ تیزی سے دروازے پر آ ٹھہرے۔ وہ سب کے سب بندوقوں سے مسلح تھے۔ تھانیدار اُن کے وسط میں کھڑا پستول ہلا ہلا کر بولا۔

"ہتھیار پھینک دو جوان! ورنہ تم دونوں کو ہم یہیں مار دیں گے۔"

فیروز اُن کے عقب میں کھڑا تھا۔ اب وہاں سے بچ نکلنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہ گئی تھی۔ ارحم خان تھانیدار کی آواز سن کر ایک دم شیر ہو گیا۔ اُس نے اٹھ کر آبی کو ایک دم بانہوں میں جکڑ لیا۔ میں نے بھی تینوں پستول ہاتھ سے پھینک دیے۔ اب مزاحمت کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اب سارے ہی دفتر بند ہو چکے تھے۔ کراماً کاتبین بھی شاید اپنی اپنی دستگی لپیٹ چکے تھے۔

"لگا ہتھکڑی ان کو۔ یہ ہیں کون فیروز میاں! یہاں کیسے آ گئے؟"

"پتہ نہیں جی! ارحم صاحب ہی کو معلوم ہے کہ ان کا جرم کیا ہے۔"

دو سپاہیوں نے آگے بڑھ کر ہم دونوں کو ہتھکڑی لگا لی۔ اب کوئی دروازہ کھلا نہیں رہ گیا تھا۔ پولیس والے سامنے آ کھڑے تھے۔ اور اُن کی بھری بندوقوں نے ہمیں زندگی میں پہلی بار یہ احساس دلایا تھا کہ ہم کچھ بھی نہیں ہیں ہم سے خنجر اٹھا نہ تلوار آزمائی جا سکی۔ ان پر ہماری کوئی گرفت یا تدبیر کارگر نہیں ہو سکتی تھی۔

جب ہم مقفل کر دیے گئے تو تھانیدار نے ارحم خان سے مخاطب ہو کر کہا۔ "کیوں خان جی! یہ قصہ کیا ہے؟ یہ اکبر صاحب تو شدید زخمی ہیں، ان کو اٹھاؤ کچھ دوا دارو کا بندوبست کرو۔"

دو سپاہیوں نے اکبر کو اسی وقت وہاں سے اٹھا کر دوسرے کمرے میں پہنچا دیا۔

"اس کا نام خوشی محمد ہے اور یہ اس کا ساتھی ہے... مشتاق علی۔"

ارحم نے ہم دونوں کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ مجھے اپنے اس نئے نام پر سخت حیرت ہوئی۔ آخر وہ کہنا کیا چاہتا تھا۔ "ان دونوں نے غیور احمد اور اس کی بیوی کو نگینہ ہوٹل میں لے جا کر بے ہوش کر دیا۔ پھر یہ اس کے گھر چلے گئے۔ ان کا بیان ہے کہ ان لوگوں نے ان کی چار لاکھ کی رقم چھین لی تھی۔ اسٹیشن پر بھی ان کا جھگڑا ہوا تھا۔ اپنی رقم ان لوگوں نے غیور احمد کے والد سے واپس لے لی تھی۔ تسلیم شاہ ایس ایچ او نے اسی لیے پولیس کو خبردار کر دیا تھا کہ ان کو تلاش کیا جائے۔ ہم نے ان کو اُدھر گلی میں سے گزرتے دیکھا تو روک لیا۔ اس اکبر کو ہاتھا پائی میں زخم بھی آ گیا۔ اب ہم ان کو تھانے لے جا رہے تھے کہ آپ آ گئے۔"

"فیروز نے بتایا تھا کہ دو ملزم آپ کی حویلی میں موجود ہیں اور آپ کا اُن سے باقاعدہ مقابلہ ہو رہا ہے۔"

"بس ایسے ہی تھوڑی سی اٹھک بیٹھک ہو گئی ہے اِن سے، بہرحال آپ انہیں تھانے لے جانا چاہیں تو لے جائیں۔ تسلیم شاہ کو بتا دیں کہ اُن کے ملزم ہم نے پکڑ لیے ہیں۔"

ارحم خان سر تا سر جھوٹ بول رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔

"وہ رقم کہاں ہے اب؟"

"ان کا بیان ہے کہ وہ رقم ان لوگوں نے اپنے ساتھی کو دے دی تھی۔ وہی اس کا مالک ہے اور وہ ملتان جا چکا ہے۔"

"کیا نام تھا اس کا۔ وہ ملتان کیسے چلا گیا؟"

"پتہ نہیں۔ اس کا نام ان لوگوں نے سلیمان بتایا ہے۔ وہ یہاں سے کچھ مال خریدنے آیا تھا۔ اِن کا بیان ہے کہ وہ انکو گاڑی میں ملا تھا جب اس کی رقم چھنی تو اِن لوگوں نے اُس کی مدد کی اور رقم اُسے واپس لے دی۔"

"عجیب قصہ سُنا رہے ہیں آپ! کیوں بھئی یہ معاملہ کیا ہے خوشی محمد؟" تھانیدار مجھ سے مخاطب تھا۔

"ارحم خان ٹھیک کہتا ہے جناب! ہم گاڑی میں سفر کر رہے تھے کہ سلیمان صاحب ہمارے دوست بن گئے۔ غیور احمد بھی اسی گاڑی میں تھا۔ اس نے اپنی بیوی کو ہمارے ڈبے میں لاکر اس سے دوستی پیدا کرلی مگر جیسے ہی اس نے بریف کیس غیور احمد کی بیوی کے حوالے کیا، اس کو دو آدمیوں نے زبردستی چھین لیا۔ ہم اس وقت چائے پینے کے لیے اسٹیشن کی طرف گئے تھے۔" میں نے تفصیل بتائی۔

"ہوں! کیسے چھین لیا وہ بریف کیس؟ کون لوگ تھے وہ؟"

"وہ غیور احمد کے آدمی تھے جناب! انھوں نے ظاہر یہ کیا جیسے وہ اپنے طور پر کام کر رہے ہیں۔ انھوں نے عذرا کو مارا پیٹا اور اس سے بریف کیس چھین کر لے گئے۔ میں نے اسے واقعہ سے آگاہ کیا۔

"مگر تم نے یہ پولیس مقابلہ کیوں شروع کر رکھا ہے؟ اس اکبر صاحب کو کیا ہوا ہے؟ کس نے مارا ہے انہیں، اور یہ علی نواز کو کیا ہوا ہے؟ یہ بے ہوش ہو رہا ہے۔"

"دراصل اکبر اور علی نواز میں کسی بات پر جھڑپ ہو گئی تھی۔ علی نواز نے اس کو خنجر ہی دے مارا۔" ارحم خان کے جواب نے مجھے حیرت میں ڈال رکھا تھا۔ وہ تھانیدار کے سامنے ایسا جھوٹ بول رہا تھا جس کی قلعی کسی بھی وقت کھل سکتی تھی علی نواز ہوش میں ہوتا تو کوئی اور ہی کہانی سناتا۔

"اور یہ پستول آپ کے پاس کہاں سے آئے ہیں؟ خوشی محمد صاحب!" تھانیدار پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔

"یہ تو ان کے ہی ہیں۔ میں نے ان سے چھین لیے تھے کہ کہیں خواہ مخواہ گولی ہی نہ چل جائے۔"

"مگر یہ فیروز تو کچھ اور ہی بتا رہا تھا۔"

"پاگل ہے یہ سالا باورچی۔ اصل بات کا پتہ ہی نہیں کیا اور تھانے جا پہنچا۔"

"تو پھر کیا خیال ہے ان کی ہتھکڑیاں کھول دوں؟"

"یہ تو کھولنی ہی پڑیں گی۔ اِن کا قصور تو صرف یہ ہے کہ انہوں نے غیور احمد اور اس کی بیوی کو بے ہوش کر کے رقم واپس لینے کی کوشش کی مگر رقم ان کو اس کے والد سے ملی۔"

"یوں کام نہیں چلے گا، لے چلو اوئے ان کو تھانے۔ تسلیم شاہ کو بھی ان کے دیدار کراؤ۔ چلو اوئے۔" یہ کہہ کر تھانیدار گل بہار نے ہمیں کمرے سے نکلنے کا حکم دیا۔ سپاہیوں نے ہمیں اسی وقت نرغے میں لیا اور مکان کے عقبی حصے میں سے ہوتے ہوئے وہ ہمیں تھانے کی طرف لے چلے۔ مکان کا عقب بازار میں کھلتا تھا اور اس کا اصل دروازہ وہاں ہی لگا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم تھانے جا پہنچے۔ تسلیم شاہ اپنے کمرے میں موجود تھا جب گل بہار ہمیں اپنے ساتھ لے کر اس کے سامنے پہنچا تو مجھے محسوس ہوا کہ شاید میں نے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ اس کی وہ بڑی بڑی تاتاری مونچھیں، مشکی رنگ اور گھنے بال مجھے احساس دلاتے تھے کہ کسی نہ کسی جگہ میں پہلے بھی اس سے مل چکا ہوں۔ اسے مونچھوں کو تاؤ دینے کا بے حد شوق تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ کرسی سے اٹھ گیا۔ گل بہار نے اُسے سلام کیا۔ اور ہماری ہتھکڑی کی چابی اس کی دراز میں ڈال دی۔

تسلیم شاہ نے ہمیں سرسری نظر سے دیکھا اور بولا۔ "یہ کون لوگ ہیں، کہاں سے ملے ہیں یہ آپ کو؟"

"یہ وہی ہیں جناب جنھوں نے غیور احمد کو بے ہوش کر دیا تھا۔ اس کا نام خوشی محمد ہے اور یہ اس کا ساتھی ہے مشتاق علی۔ ان کو میں نے ارحم خان کے گھر سے گرفتار کیا ہے۔"

"اچھا تو یہ بات ہے۔ ارحمند صاحب کے گھر یہ کیا کر رہے تھے؟ بٹھاؤ انہیں ادھر کونے میں۔" تسلیم شاہ نے یہ کہہ کر سگریٹ سلگا لیا۔ ابھی تک میں ذہن کے کسی خانے میں حافظے پر زور دینے کے باوجود یہ نہ جان سکا تھا کہ میں نے اسے کہاں دیکھا ہے۔

"وہ رقم کہاں ہے؟"

"وہ تو ان لوگوں کے بیان کے مطابق ایک اور آدمی کی ملکیت تھی اس آدمی کا نام سلیمان ہے۔"

"ادھر وہ غیور احمد اور اس کی بیوی عذرا بیٹھے ہیں، ان کو بلواؤ ادھر۔" تسلیم شاہ نے ایک سپاہی کو ان کی طرف بھیج دیا۔ "بیٹھو ارحمند صاحب! آپ بھی بیٹھیں یار جی۔" اتنے میں غیور احمد بھی آ گیا۔

"آ بھئی غیور احمد۔ یہ رہے تیرے ملزم ان کو پہچانتے ہو؟" تسلیم شاہ نے غیور احمد کو اندر آتے دیکھ کر کہا۔ عذرا اس کے پیچھے تھی۔

غیور احمد نے ہمیں بڑے غور سے دیکھا، بولا "یہی شاہ جی! بالکل یہی ہیں۔"

"اور تو نے ان کو اپنے گھر کا پتہ دے دیا تاکہ تیرے والد سے یہ رقم چھین لیں۔"

"میرا اس رقم سے کوئی تعلق نہیں ہے جناب!"

"تم بکتے ہو۔ کیوں بھئی کہاں سے ملی تھی وہ رقم تمھیں؟"

"اسی گھر سے ملی تھی سرکار! یہ بہت چکردار آدمی ہے، بیوی کی جھلک دکھا کر آدمی کو لوٹتا ہے۔" آبی نے دبنگ لہجے میں کہا۔

تسلیم شاہ نے ان دونوں کو اپنے دائیں ہاتھ کرسیوں پر بٹھا لیا تھا۔

"ان کا کہنا یہ ہے کہ وہ رقم کسی تیسرے آدمی سلیمان کی تھی، اسے دیکھا تھا تم نے؟"

"جی نہیں! وہ رقم ان کی ہی تھی۔"

"اس کو کیا پتہ ہے جناب! بچارا سلیمان تو خواہ مخواہ ہی مارا گیا۔ پتہ ہوتا تو ہم اُسے آپ کے پاس لے آتے۔"

"چلو یہ قصہ ختم کرو۔ جس کی رقم تھی اُسے مل گئی کیوں بھئی! کسی کو کوئی نقصان تو نہیں ہوا؟" تسلیم شاہ نے مجھے پہلی بار بڑے غور سے دیکھا میرے چہرے پر نظر پڑتے ہی اس کی بھنویں تن گئیں۔

"یہ۔۔۔ یہ شخص۔۔۔ کیا نام ہے تیرا اوئے؟"

"جی خوشی محمد ہے میرا نام۔"

"بکتے ہو تم۔ اوئے نبی احمد وہ فائل لا ادھر۔ یہ۔۔۔ یہ تو قصہ ہی کچھ اور ہو گیا ہے۔"

وہ ایک دم کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہوا۔ نبی احمد نے فائل لاکر اس کے سامنے رکھ دی تو وہ تیزی سے اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ فائل میں کئی اخباروں کے تراشے بھی موجود تھے۔

"تو یہ قصہ ہے۔ ٹھیک ہے تم سب باہر چلے جاؤ۔ میں خود اِس آدمی سے بات کرتا ہوں۔"

"اسے جانتے ہیں آپ شاہ جی؟" گل بہار نے حیران ہو کر پوچھا۔

"جانتا تو نہیں ہوں مگر تعارف تو ضروری ہے نا۔ تم چلو۔ ضرورت ہوئی تو میں تمھیں بلا لوں گا۔" یہ کہہ کر اس نے پھر میرے چہرے پر نظریں جما دیں سگریٹ اس کے ہاتھ میں جل کر راکھ ہو رہا تھا۔ گل بہار، ارحم خان اور غیور احمد باہر نکل گئے۔ تو عذرا کو جو ابھی تک کرسی پر بیٹھی تھی اس نے بڑی رسان سے کہا۔ "تم بھی جاؤ عذرا بی بی! تم سے پھر ملاقات ہوگی ابھی وقت نہیں ہے۔"

عذرا مسکراتی ہوئی اٹھی اور بالوں کی لٹ سر پر جما کر بولی۔ "اِن کو تو بند کر دیں شاہ جی! بہت ذلیل کیا ہے اِن لوگوں نے مجھے۔"

"یہی کروں گا تم بے فکر رہو۔ اور اپنی 'بے حرمتی' کا ذکر نہ کرو کیونکہ بے حرمتی ہوئی ہی نہیں تو پھر ان کا چالان کیسے کروں؟"

وہ مسکراتی ہوئی باہر نکل گئی۔ اس نے جو کہانی گھڑ کر اسے سنائی تھی، وہ تسلیم شاہ نے تسلیم ہی نہیں کی تھی۔ کمرے میں چند ساعتوں کیلئے سناٹا چھا گیا۔

تسلیم شاہ نے بڑے اطمینان سے دروازہ اندر سے بند کیا اور بولا۔ "تم دونوں اِدھر آجاؤ اِن کرسیوں پر۔"

ہم بندھے ہاتھوں سے اُٹھے اور بڑی معصوم صورت بنا کر اُس کے سامنے جا بیٹھے۔

"لو سگریٹ پیو۔"

"جی شکریہ! ہمارے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔"

اس نے دو سگریٹ سلگا کر ہمیں دے دیئے، بولا۔ "ان کو ہتھکڑی میں بھی پیا جا سکتا ہے کیا نام بتایا ہے تم نے اپنا؟"

"جی خوشی محمد ہے میرا نام۔"

"اس ارحم خان کو تم نے اچھا بے وقوف بنایا ہے مگر غلام جیلانی! میں تمھارے چکر میں نہیں آ سکتا۔ یہ تصویر دیکھتے ہو نا! تمھارے لیے یہی کافی ہے۔" یہ کہہ کر اُس نے فائل میرے سامنے رکھ دی۔ اخبار کے پرانے تراشے میں میری تصویر چھپی تھی اور تسلیم شاہ بہت خوش تھا کہ اس نے شکار مار لیا ہے۔

"یہ کون ہے تمھارے ساتھ؟"

"آپ غلط سمجھ رہے ہیں جناب! ہمارا اس تصویر سے کیا تعلق ہو سکتا ہے بھلا۔ یہ مشتاق علی ہیں میرے دوست!"

"دیکھو جیلانی! مجھے سختی پر مجبور نہ کرو۔ تم صاف سیدھے پولیس کی زد میں آ چکے ہو۔ پچاس ہزار روپے کا انعام ہے تمھاری گرفتاری پر۔ اور میرے لیے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کوئی نہیں ہے کہ تم میرے ہاتھوں گرفتار ہوئے ہو۔"

"ہاں! آپ کے لیے واقعی یہ بہت خوشی کی بات ہے شاہ جی! آپ کو انعام اور ترقی بھی مل سکتی ہے۔ مگر۔۔۔ مگر میرے ساتھ سودا کریں میں آپ کو نہال کر سکتا ہوں۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے جیلانی میاں! مگر تم اس ارحم کے ہاتھ کیسے آ گئے؟"

"وہ جیل میں میرے ساتھ رہا ہے، کہہ رہا تھا کہ وہ جیل

کارِ سرکار کے سلسلے میں کاٹ رہا تھا۔"

"ہاں یہ بات صحیح ہے۔ سی آئی ڈی کے لوگوں کے لیے چکر زیادہ ہی لمبا ہوتا ہے، مجھے سکھر سے بھی فون آیا تھا۔ تم پولیس سے مقابلہ کر کے آ رہے ہو۔"

"جی ہاں ۔۔۔ یہ صحیح ہے۔"

"کتنے بندے مار دیے تم نے؟"

"وہ تعداد میں چھ تھے۔ سب کے سب زخمی ہو گئے تھے۔"

"مجھے تفصیل سے بتاؤ کہ ہوا کیا تھا؟"

"میں نے اپنی تمام کہانی اسے سنا دی مگر بہت سے اہم واقعات میں حذف کر گیا۔ وہ بڑی توجہ سے میرے ایک ایک لفظ پر غور کرتا رہا۔ باہر سورج نے اپنی صف لپیٹ لی تھی اور شام نیچے اتر آئی تھی۔ میں جب خاموش ہوا تو وہ بولا "اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ رقم ارجمند خان کے گھر میں ہے۔"

"جی ہاں! ابھی تک تو وہیں تھی۔"

"تم سکھیرا صاحب کو جانتے ہو؟ پارٹی کے بڑے اہم رکن ہیں۔"

"جی ہاں! ڈھلوں صاحب سے میں نے ان کا ذکر سنا تھا۔"

"ہوں! میرا خیال ہے کہ میں ان سے فون پر بات کر لوں۔ میں تو انہی کی ملازمت میں ہوں اور تمہارے نام سے وہ بخوبی واقف ہیں، وہ کہیں گے تو میں تمہیں چھوڑ دوں گا، فیصلہ انہی کے ہاتھ میں ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے لاہور سے بات کرنے کے لیے فون اٹھا لیا۔ میں ابھی تک اس صورتِ حال کے بارے میں کوئی بھی فیصلہ نہیں کر سکا تھا جو مسلسل خراب ہوتی جا رہی تھی۔ فون فوراً ہی مل گیا۔ سکھیرا صاحب گھر پر موجود تھے۔ تسلیم شاہ نے اپنا تعارف ان سے کروایا، بولا "سکھیرا صاحب تقدیر ان آدمیوں کو میرے تھانے میں گھیر لائی ہے جن کے بارے میں آپ نے مجھے ہاتھ روکنے کو کہا تھا۔"

۔۔۔ "جی ہاں وہی آدمی جو ڈھلوں صاحب کا دوست ہے۔"

۔۔۔ "ہاں ہاں وہی شخص۔" ۔۔۔ "کیا مطلب؟ مجھے واضح حکم دیں۔" ۔۔۔ "ٹھیک ہے میں انہیں باندھ کر لاہور بھیج دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

جیسے ہی وہ گھوم کر کرسی کی طرف آیا، میں اس کے پاس جا پہنچا۔ "سکھیرا صاحب نے کیا کہا ہے جناب؟"

"مجھے افسوس ہے ان کا حکم ہے کہ آپ کو باندھ کر لاہور بھیج دوں۔"

"ارے یہ آپ کے گلے پر کیڑا چل رہا ہے، یہ دیکھیں یہ تو کن کھجورا ہے۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اس کی گردن پر ہاتھ ڈالا اور پہلے ہی جھٹکے میں اس کی رگِ احساس مسل دی۔ اس کی آنکھوں میں ایسی حیرت ابھر آئی کہ جب وہ فرش پر گرا تو مجھے یوں دیکھ رہا تھا جیسے میں اس کے حافظے میں اندر تک جا گھسا ہوں۔ دروازے پر ابھی تک چٹخنی چڑھی تھی۔ عقبی دیوار کے اس طرف بھی ایک کمرہ تھا جس میں سے مجھے کسی ٹائپ رائٹر کی کھٹ کھٹ سنائی دے رہی تھی۔ جیسے ہی تسلیم شاہ فرش پر گرا میں نے ہتھکڑی کی چابی دراز سے نکال کر آبی کو کھول دیا۔ اس کے ہاتھ آزاد ہوئے تو اس نے میری ہتھکڑی کھول دی۔

"اب کیا کرنا ہے؟ یہ تو تھانہ ہے استاد! کدھر چلنا ہے؟"

"آؤ دیکھتے ہیں۔ اس کمرے ہی میں جایا جا سکتا ہے۔" کہہ کر میں نے عقبی دروازے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہاں کمرے کے دائیں حصے میں دو ٹائپسٹ بیٹھے تھے اور بڑے انہماک سے کوئی لمبی چوڑی فہرستیں سامنے رکھ کر ٹائپ کر رہے تھے۔ ہم دونوں ہی سفید براق قسم کے تہبند اور کرتے میں ملبوس تھے۔ ایک کلرک کی نظر انھوں نے ہم پر ڈالی تو میں نے کہا "گل بہار شاہ صاحب تو ادھر نہیں آئے؟"

"وہ اپنے کمرے میں ہوں گے یہ دروازہ بند کر دو شاہ صاحب پریشان ہوں گے۔"

میں نے فوراً ہی تسلیم شاہ کا دروازہ بند کر دیا اور ہم دوسرے کمرے سے گزر کر عقبی برآمدے میں جا ٹھہرے۔ چار سپاہی اس طرف چارپائی پر بیٹھے گپ ہانک رہے تھے۔ برآمدے میں بلب جل رہا تھا۔ ہم تیزی سے آگے بڑھے اور ان سپاہیوں کے پاس سے گزر کر تھانے کی عمارت کے پچھلے حصے میں جا پہنچے۔ اب ہم غسلخانوں کے سامنے جا ٹھہرے تھے۔ اور ان کی عقبی دیوار پھاندنا مشکل نہیں تھا۔ ہم فوراً ہی ان کے اندر جا گھسے۔ آبی دائیں ہاتھ والے غسل خانے میں گھسا تو کسی نے کھنکار کر اسے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ وہ پلٹ کر دوسرے غسل خانے میں جا گھسا۔ چند منٹ ہم نے وہاں توقف کیا اور جیسے ہی وہ شخص غسل خانے سے نکل کر آگے کی طرف گیا، میں نے میدان صاف دیکھ کر غسل خانے کی عقبی دیوار پر ہاتھ رکھا اور اچھل کر دوسری طرف جا پہنچا۔ آٹھ ہاتھ کی تھی۔ اس پر سے کود جانا کچھ مشکل نہیں تھا۔ میرے پیچھے آبی نے باہر چھلانگ لگا دی۔ تھانے کے پچھلے حصے میں گھپ اندھیرا ہوا تھا۔ اس طرف ان لوگوں نے بتیوں کا بھی انتظام نہیں کیا تھا۔ ایک بلب چھت کے ساتھ لگا تھا مگر اس کی روشنی بے حد دھیمی تھی اور ہم تک نہیں پہنچ رہی تھی۔

"چل جیلانی بھاگ چل یہاں سے ہم دونوں ایک بہت بڑے میلے سے بچ گئے ہیں۔" آبی نے وہاں سے بھاگتے ہوئے کہا۔

"ہاں یار! کس گندے شہر میں آ پھنسے تھے ہم مگر اب کیلئے میرے پاس تو ایک پھوٹی کوڑی نہیں ہے؟"

"اللہ مالک ہے۔ کوئی نہ کوئی انتظام اس نے کر رکھا ہوگا۔ بس نکل چل۔"

عقبی محلے کو عبور کر کے ہم جب آگے نکلے تو اس وقت رات کے نو بج رہے تھے۔ آبی بولا "تم ادھر ہی ٹھہرو۔ اس کھمبے کے پاس۔ میں ان سے رقم واپس لاتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے وہ کہاں ہے۔"

"پاگل ہو گئے ہو۔ وہ رقم کو ہوا بھی نہیں لگنے دیں گے وہ اتنے بھولے نہیں ہیں۔"

"مگر ہم پیسے کہاں سے لیں گے۔ یہ تو سراسر زیادتی ہے پولیس کو تو کم از کم ایسا نہیں کرنا چاہیے۔"

"یہ بھی ہوتا ہے پیارے! ہماری جان بچ گئی بس یہی کافی ہے۔ چوروں کے کپڑے لاٹھیوں کے گز۔ وہ جیسے آیا تھا ویسے چلا گیا۔ آ جا یہاں سے نکل چل۔" یہ کہہ کر میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے کھینچتا ہوا اس شہر سے باہر نکل گیا۔ ہماری بہتری اسی میں تھی کہ ہم ان کی آنکھ سے اوجھل ہو جاتے ورنہ وہ رامپی ڈال کر ہماری کھال ادھیڑ دیتے۔ ان سے بچ نکلنا ہی بہت بڑی بات تھی۔

یہ احساس مجھے مارتا تھا کہ ہم بہت سے لوگوں کو اپنا دشمن بنا آئے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ تسلیم شاہ کو خالصے لگ گئے تھے۔ وہ اوندھے منہ فرش پر پڑا تھا اور اگر کسی نے اندر جا کر اسے نہ دیکھا تو کم از کم تین گھنٹے تک تو ضرور ہی بے ہوش رہے گا۔ جب وہ ہوش میں آیا تو اس وقت تک ہم بہت دور نکل چکے ہوں گے اور یہ بہت ہی خوش آئند بات تھی۔

ہم بڑی سڑک پر پہنچے تو آبی بولا "یار! تو سمجھتا کیوں نہیں ہے ہم پیسے کے بغیر کیا کریں گے؟"

"میں خود حیران ہوں مگر کیا کیا جا سکتا ہے، تیرے ذہن میں کوئی تدبیر آتی ہو تو بتلا دے۔"

"ڈاکے کے بارے میں تیرا کیا خیال ہے کسی کو گھیر لیتے ہیں ادھر؟"

"یہاں کون ہے جس کو تو لوٹے گا۔ یہ جنگل ہماری کیا مدد کر سکتا ہے؟"

عین اس وقت کنمو شہر سے ایک بس ہمیں اپنی طرف آتی نظر آئی۔ وہ ملتان جا رہی تھی۔ آبی کو ایک طرف ہٹا کر میں نے اسے رکنے کا اشارہ کیا تو ڈرائیور نے ہم سے چند قدم آگے لے جا کر بس روک دی۔ ہم دونوں افراتفری میں اس پر سوار ہو گئے۔ بیٹھنے کے لیے ہمیں دائیں ہاتھ پر دو نشستیں مل گئیں۔ کنڈکٹر ابھی تک بس کی سواریوں کے لیے ٹکٹ کاٹ رہا تھا۔ ہم بس میں بیٹھے تو ہمیں محسوس ہوا جیسے ہم سارے دکھوں سے محفوظ ہو گئے ہیں۔ نیم خوابیدہ مسافر دکھوں بھرا دن گزار کر اب نیند سے باتیں کرنے لگے تھے۔

"آپ کو کہاں جانا ہے بھائی جی؟" کنڈکٹر ہماری طرف بڑھا۔

"ملتان جانا ہے بھائی مگر میری بات سن، ادھر آ ذرا۔"

"جی حکم فرمائیے میں کیا کر سکتا ہوں آپ کے لیے؟"

"دیکھ بھائی ہم سفید پوش لوگ ہیں مگر پیسہ ہمارے پاس کوئی نہیں، ہماری جیبیں کسی نے صاف کر دی ہیں۔ تو یوں کر کہ یہ انگوٹھی اپنے پاس رکھ لے، یہ چار سو سے کم کی نہیں ہوگی۔" آبی نے بڑے ہی افسردہ لہجے میں کہا۔

"کوئی بات نہیں بھائی! میں ٹکٹ کاٹ دیتا ہوں ۔۔۔ میں اپنے پاس سے پیسے دے دوں گا۔" اس پبلک نواز نے ہمیں حیران کر دیا۔ ٹکٹ کاٹ چکا تو بولا "یہ دن مجھ پر بھی آئے ہیں بھائی جی! مگر پھر میں نے تنگ آ کر یہ نوکری کر لی۔ اللہ آپ کے کاروبار میں ترقی دے میرے لیے دعا کر دیں بس یہی کافی ہے۔"

"تیری مہربانی ہے یار! ورنہ تو ہم سمجھے تھے کہ پتہ نہیں ہمارا کیا حال ہوگا۔ بہت بڑی رقم تھی ہمارے پاس مگر چوروں کے ہتھے چڑھ گئی۔"

"کوئی بات نہیں اللہ مہربانی کریگا۔" یہ کہہ کر وہ دوسرے آدمی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

ہم مسمسی سی صورت بنا کر بیٹھ رہے۔ کرنے کے لیے ہمارے پاس کوئی بات ہی نہیں تھی۔ ہم لٹ لٹا کر وہاں یوں آ بیٹھے تھے جیسے اب تحت الثریٰ کے سوا ہمارا کوئی ٹھکانہ ہی نہیں ہے۔ پلے سے ساڑھے تین لاکھ روپیہ نکل جائے تو دکھ کسے نہیں ہوتا مگر آبی کچھ زیادہ ہی پریشان تھا۔ حالت یہ تھی کہ ہمارے پاس سگریٹ کے لیے پیسے نہیں تھے۔ اور ہماری غیرت گوارا نہیں کرتی تھی کہ کسی کے سامنے اس ادنیٰ سے نشے کے لیے ہاتھ پھیلائیں مگر اللہ بڑا کارساز ہے۔ ہماری طلب زیادہ ہی بڑھ گئی تھی کہ بائیں ہاتھ کی نشست پر بیٹھے ایک آدمی نے ہم سے ماچس طلب کی۔ آبی کو تو بہانہ مل رہا تھا، بولا "ہمارے پاس ماچس تو کیا ہوگی صاحب سگریٹ کو بھی ترس گئے ہیں۔ بس کہیں رکتی ہی نہیں ورنہ لے لیتے۔"

"اوہ! تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے، یہ لیں میں آپ کو سگریٹ دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے جیب سے نیا پیکٹ نکال کر آبی کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"ارے تو آپ کیا کریں گے جناب؟"

"میرے پاس بہت سگریٹ ہیں۔ دراصل یہ لائیٹر جل نہیں رہا ہے اسی لیے ماچس کی تلاش تھی۔"

"آپ کا بہت بہت شکریہ جناب! آپ کی مہربانی تا دیر

یاد رہے گی۔ کسی سے ماچس مانگ یار! کچھ تو بھی کرے گا کہ نہیں؟"
آبی نے میری طرف جھک کر، مجھے کچھ نہ کرنے کا طعنہ دیا۔
ٹکٹ اور سگریٹ تو اسی کے حسنِ طلب کا کرشمہ تھے۔ میں نے سامنے کی سیٹ پر بیٹھے آدمی سے لے کر ماچس اسے نہیں دے دی۔
جب ہم دونوں سگریٹ سلگا چکے تو آبی دبی آواز میں بولا
"یار! تو بھی ضرور ہاتھ پیر مار۔ چار پیسے پیدا کرنے بہت ضروری ہیں یار، ورنہ تو ہم مارے ہی جائیں گے۔"
"کچھ کریں گے بھئی! موقع ملا تو چھوڑیں گے تو نہیں ہم۔ اتنا ہی بہت جانو کہ وہاں سے بچ کر نکل آئے ہو۔"
"ہاں یار! تیرے اس فن کے قربان جاؤں۔ میری تو عمر بڑھا دی ہے اِن انگلیوں نے، ورنہ وہ بدمعاش ..... خدا غارت کرے انھیں .....!"
"آدمی کو ترسا ترسا کے مارتے ہیں۔ مگر تو جو کچھ سوچ رہا ہے نا، وہ اچھا نہیں ہے۔"
"کیا مطلب ہے تیرا۔ تو میرے دماغ کی لکیریں پڑھ رہا ہے؟"
"ہاں! اس بس میں کوئی ہاتھ دکھانے کی ضرورت نہیں ہے، ہم ویسے ہی بخشش کی سواریاں ہیں۔"
"ہاں ہاں! مجھے یاد ہے۔ اس کنڈکٹر کی مہربانی ہے یار، ویسے تو نے کوئی اس قسم کا بے مثال آدمی بہت کم دیکھا ہو گا۔"
"ہاں بہادری اسے ہی کہتے ہیں، اس نے ٹکٹ بھی دیے اور جگہ بھی۔"
"تیرا کیا خیال ہے ٹکٹ تو ہوتا ہی نشست کے لیے ہے، کیسی بات کرتا ہے تو؟"
"وہ ہمیں کھڑا بھی رکھ سکتا تھا میرے بھائی! ویسے میں ملتان جا کر تسلیم شاہ کو گالیوں سے لبریز خط لکھوں گا اور ارحم خان کو تو میں خط میں تباہ کر دوں گا۔" میں نے اپنے دل میں بھرے غصے کو اظہار کی راہ دکھائی۔ میرے وجود میں آگ لگی ہوئی تھی۔ اس شہر نے ایسے ایسے کمینے پال رکھے تھے کہ میرا بس نہیں چلتا تھا۔ ورنہ اُن سب کو بھسم کر دیتا۔
"ہاں! ضرور لکھنا چاہیے کہ اے فلاں ولد فلاں! تیرے فلاں ابن فلاں کی ایسی تیسی۔" آبی خوش ہو کر بولا۔
"جا یار۔ تو نے میرا غصہ ٹھنڈا کر دیا ہے یہ کوئی ہنسنے کی بات ہے بھلا۔ اتنی بڑی رقم چھین گئی ہے ہم سے اور ہم ٹھنڈے ٹھار دل بہار ہو کر وہاں سے نکل آئے۔"
"یہ سب وہ کیا کہتے ہیں بندے کے لذائذِ نفسانی کا نتیجہ ہے پیارے۔ لذائذ سمجھتا ہے نا تو۔ یہ لذت کی جمع ہے، اور میں نے سوچ رکھا تھا کہ کسی جگہ بیٹھ کر ان بیسیوں سے زبردست مجرا کراؤں گا۔"
"تو بالکل ہی پاگل ہو گیا ہے سالے! تیرے عشق نے بڑے بڑے فساد ڈالے ہیں اب آگے کی سوچ۔ لاہور چل کر بینک سے رقم لیں گے اور کل ہی میانوالی جا پہنچیں گے۔"
"ہاں! میرا بھی یہی خیال ہے۔ اگر اس پولیس سے ہم بچ گئے تو میں گھوڑے شاہ جا کر چڑھاوا چڑھاؤں گا۔ وہ سالے ہم سے لیس ہو کر چمٹ گئے ہیں۔"
بس ابھی ملتان سے پندرہ میل دور تھی کہ دو سواریاں ایک بستی کے قریب اُتر گئیں۔ اُن کی دیکھا دیکھی ہم بھی بس سے اُتر گئے۔
"ہمیں یہیں اُترنا ہے بھائی جی! آپ کی بڑی مہربانی ہے اتنی مہربانی سے پیش آئے۔"
"کوئی بات نہیں جناب! خدا ایسا وقت کسی پر نہ لائے" کنڈکٹر نے بڑی محبت سے بات کہی اور بس کو لے کر آگے بڑھ گیا۔
"تو یہاں کیوں اُتر گیا ہے یار! تیری کوئی بات میری [سمجھ] میں نہیں آتی۔"
"مجھے ڈر ہے آبی! وہ لوگ ملتان میں پہنچنے والی ہر بس کو دیکھ رہے ہوں گے۔ پولیس نے ملتان اطلاع بھیج دی ہو گی۔ کچھ سمجھا بھی کر۔"
"ہاں یار! یہ تو بہت اچھا ہوا۔ یہ رات ہم کسی مسجد میں بسر کر سکتے ہیں مگر ان سے تو ہر حال میں بچنا ہو گا۔" آبی کے مغز میں یہ بات گہری اتر گئی کہ ہم ابھی تک شدید خطرے میں ہیں۔
اس گاؤں کا نام میرے ذہن سے اُتر گیا ہے۔ ہم اس کی مسجد کے مینار نگاہ میں رکھے اور سیدھے اس طرف چلے۔ گاؤں خاصا بڑا تھا۔ قصبے ایسا نظر آتا تھا۔ وہ رات ہم نے مسجد میں بسر کی۔ بھوک تو ہماری مٹ نہیں سکتی تھی، البتہ نیند ضرور آ گئی اور ہم مسجد کے صحن میں ہی سو گئے۔ صبح جب ہم بیدار ہوئے تو وضو کر کے نماز میں شامل ہو گئے۔ رات گزاری تھی تو سجدہ کیوں نہ کرتے۔ شکر ہے کہ ملّا نے خانۂ خدا پر رات کو تالا نہیں ڈال دیا تھا۔
نمازی ایک ایک کر کے مسجد سے رخصت ہوئے۔ ہم نے ملّا کے گرد ڈیرا جما لیا۔ وہ ہم سے پوچھتا رہا کہ ہم کہاں سے آئے ہیں کس طرف جا رہے ہیں۔ آبی اسے گھڑ گھڑ کر سناتا رہا۔ تو ملّا نے اس کی کہانی سن کر اس سے ناشتہ بھیج دینے کا وعدہ کیا اور باہر نکل گیا۔ مسجد میں ایک چھوٹا سا کمرہ بنا تھا۔ اس میں غالباً مسجد کا خادم رہتا

تھا مگر ابھی تک وہاں کوئی خادم نہیں رکھا گیا تھا۔ دروازے پر تالا لگا تھا۔ اور تختے کے عین وسط میں ایک سوراخ تھا، جس پر کسی نے 'چندہ مسجد' کی تختی لگا دی تھی۔ جتنے بھی لوگ چندہ دیتے تھے، وہ اس سوراخ میں سے نوٹ گزار دیتے تھے۔ پیچھے ایک صندوقچی بنی تھی۔ سارے پیسے اس سوراخ میں سے نکل کر صندوقچی میں جا گرتے تھے۔ ملّا گھر کی طرف نکلا تو آبی نے اس دروازے کو تاک کر کہا۔
"کیا خیال ہے تیرا، بیچ اس مسئلے کے، کہ ہم ایسے بے سہارا لوگوں کو مسجد کا چندہ جائز ہے کہ نہیں؟"
میں نے اس کی صورت دیکھی تو وہ بہت ہی سنجیدہ نظر آئی۔ "مسافروں کا حق فائق ہے۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔
"تو پھر تو دھیان رکھ، میں یہ دروازہ کھول رہا ہوں۔"
وہ میرے لہجے کے طنز کو نظر انداز کر کے دروازے کی طرف لپکا۔ میرا خیال ہے اس کی چھٹی حس ان دنوں کچھ زیادہ ہی تیز چل رہی تھی۔ اس نے دروازے کے اردگرد کی دیوار پر ہاتھ مارا۔ بائیں ہاتھ پر ایک چھوٹے سے سوراخ میں اس کو تالے کی چابی مل گئی۔ مولوی نے اپنی آسانی کے لیے اس کو وہاں ڈال رکھا تھا۔ چابی ملتے ہی آبی نے جزاک اللہ کہا اور دروازہ کھول دیا۔ تختے کے پیچھے لگی صندوقچی کا ڈھکنا ہی اٹھانے کی ضرورت تھی۔ اس میں سے اسے بیاسی روپے آٹھ آنے مل گئے۔ وہ اس نے گن کر جیب میں بھرے اور پھر دروازہ بند کر کے وہ میری طرف چلا آیا۔
"بیاسی روپے آٹھ آنے کا نصف کیا ہوتا ہے؟"
"بک نہیں اوئے! مجھے اس میں سے کچھ نہیں چاہیے۔ بس نکل چل یہاں سے۔"
"مگر وہ ناشتہ لینے گیا ہے۔"
"اس پر لعنت بھیج — وہ خود کھا لے گا۔" یہ کہہ کر ہم تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے وہاں سے نکلے اور سیدھے بڑی سڑک پر جا پہنچے۔ ملتان کے لیے بس ہمیں جلد ہی مل گئی۔ زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ آبی بار بار کانوں کو ہاتھ لگا کر خانۂ خدا سے مسجد کا چندہ چرانے پر سخت شرمندگی کا اظہار کر رہا تھا، توبہ تلا کر رہا تھا، بولا "یار! آدمی کی ضرورت بھی کتنی بری شے ہے۔ کہیں اللہ ہمارے زیادہ ہی خفا ہو گیا تو وہ اس چوری کو بنیاد بنا کر ہمارا خانہ خراب کرے گا۔"
"نہیں آبی! بس تیری توبہ تلا قبول ہو گئی ہے سمجھ لے کہ بوقتِ شدید ضرورت آدمی کو خنزیر کا گوشت بھی حلال ہو جاتا ہے تو سمجھتا کیوں نہیں ہے۔ پیسے ہمارے ہاتھ آئے تو ان کو منی آرڈر کر دیں گے۔"
"ہاں یہ ٹھیک ہے بلکہ اکیس گنا واپس کریں گے۔ یہ بہت ضروری ہے۔ اس پر لکھ دیں گے منی آرڈر پر، چندہ برائے مسجد بسلسلہ چوری، جو مورخہ ستمبر اکیس بوقت صبح کی گئی تھی، اصل مقام پر حاضر کی جا رہی ہے۔"
"ہاں یہی بہتر ہے۔ سگریٹ تو تو نے خرید ہی لیے تھے، کہیں سے ملتان جا کر چائے بھی پی لیں گے۔"
سفر بہت اطمینان سے گزرا۔ ملتان پہنچ کر ہم نے ایک چھوٹے سے ہوٹل میں ناشتہ کیا اور جیسے ہی گاڑی آئی ہم اس میں جا بیٹھے۔ بہت سا وقت ہمارا اس سفر کی وجہ سے خراب ہو رہا تھا۔ گرگابیاں اُتر گئی تھیں اور ہم گرنڈ میں پھنسے آٹے کی طرح اس چکر سے باہر ہی نہیں نکل رہے تھے۔ اب جو ہم لاہور کی گاڑی میں بیٹھے تو خدا کا شکر ادا کیا، کہ اس نے اس مصیبت سے ہماری جان چھڑا دی تھی۔ پولیس سے ہم البتہ بہت ڈرنے لگے تھے۔ کوئی سایہ بھی کسی کا نظر آ جاتا تھا تو ہم سر جھکا لیتے تھے۔ اتنی ہمت ہی نہیں رہ گئی تھی کہ کسی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ سکتے۔ کرشور نے ہمیں تباہ کر دیا تھا۔ جس اذیت سے ہم گزر رہے تھے، وہ تقاضا کرتی تھی کہ سر چھپا کر گناہ گاروں کی طرح کسی جگہ بیٹھ رہیں مگر وہ جو میری جان کو آسیہ کا آزار لگا تھا، وہ چین نہیں لینے دیتا تھا۔ میں اُسے کسی گھر میں آباد دیکھنا چاہتا تھا۔ میں گھر سے اسی کے لیے نکلا تھا مگر یہ نہیں پتہ تھا کہ یہ سفر اتنا جانگسل بن جائے گا۔ میری واپسی ناممکن ہو جائے گی۔ میں مارو بیل کی طرح کبھی یوں نکل جاؤں گا اور کبھی یوں۔ میرے پیچھے جو ماکھو لگی تھی، وہ بہت مدماتی تھی۔ مجھے کہیں چین نہیں لینے دیتی تھی۔ میرا اشتعال دم بدم بڑھتا ہی رہتا تھا۔ میں رسّی کے ایک سرے پر ٹنگا جھول رہا تھا اور دوسرے حصے کا حلقہ آسیہ کی گردن پکڑ رہا تھا۔ آبی ہماری اس صلیب میں خدا جانے کہاں سے آ گیا تھا۔ اور وہ بھی بُری طرح مسلا جا رہا تھا۔ کوئی مشیر، کوئی حکیم، کوئی طبیب ہماری اس اذیت کا حل تلاش نہیں کر سکتا تھا کہ دکھوں کے سارے ماندری اِن لمحوں میں ہاتھ پیر چھوڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔
جس ڈبے میں ہم بیٹھے تھے اس کے ساتھ ہی فرسٹ کلاس کا ڈبہ منسلک تھا۔ گاڑی چلی تو تازہ ہوا کے لیے میں نے کھڑکی کھول لی۔ باہر کا منظر بہت خوبصورت نظر آ رہا تھا۔ دُور دُور تک باغوں کی لمبی قطاریں پھیل گئی تھیں۔ ملتان کی زمین اپنا رنگ دکھا رہی تھی۔ سبزہ ہی سبزہ، ہریالی ہی ہریالی۔ میری آنکھیں تراوت محسوس کر رہی تھی۔
میری طرح فرسٹ کلاس کے ڈبے میں کھڑی دو عورتیں بھی شاید اس منظر سے لطف اندوز ہونے کے لیے دروازے میں

ابھری تھیں۔ اچانک جو میرا دھیان اُن پر پڑا تو میرا دماغ سُن ہونے لگا میرے سامنے ڈاکٹر نفیسہ کھڑی تھی۔ ہری بھری، تروتازہ، جوان اور خوش رنگ۔ اس کا سراپا دیکھ کر میں لرز سا گیا۔ میں نے اُسے کیسے حالات میں خود سے جُدا کر دیا تھا۔ دوبارہ میں اُس سے مِل ہی نہ سکا تھا۔ اس نے آنکھوں پر عینک چڑھا رکھی تھی۔ چند ساعتوں تک وہ دروازے میں کھڑی رہیں۔۔۔ دوسری عورت بھی اس جیسی بنی تھی مگر بہت شوخ و شنگ اور بہت ہنس مکھ۔ وہ بھی شاید ڈاکٹر ہی تھی۔ چند منٹ بعد ہوا کی شدت سے تنگ آکر انھوں نے دروازہ بند کر لیا۔۔۔ میں کھڑکی سے ہٹ کر اپنی نشست پر سمٹ کر رہ گیا۔

آبی ان دنوں میرے چہرے پر کچھ زیادہ ہی غور کرنے لگا تھا۔ مجھے جب بھی ذہنی اذیت میں دیکھتا، پوچھ گچھ شروع کر دیتا تھا۔ میں نے سگریٹ سُلگایا تو وہ میری طرف جُھک کر بولا۔

"کیا قصہ ہے، کیا یاد آرہا ہے تمھیں؟"

"کچھ نہیں یار! ساتھ والے ڈبے میں ڈاکٹر نفیسہ بیٹھی ہے، وہی عورت جس نے آسیہ کو جیل سے نکالنے میں میری مدد کی تھی۔"

"مائی گاڈ! وہ ساتھ کے ڈبے میں ہے؟ کیا کہتی ہے وہ؟"

"کہے گی کیا! بس ڈبے میں سفر کر رہی ہے، مجھے اس نے نہیں دیکھا ہے۔"

"اچھا! یہ وہی ہے نا جو جیل میں کام کرتی تھی؟"

"ہاں! اور اسے بہت دکھ تھا اس بات کا کہ اس سے جو بھی مِلا تباہ ہو گیا، اُسے اپنی قسمت سے شکایت تھی۔"

"تو اس سے مل لو نا! ملاقات میں کیا حرج ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ تمھیں بھولی نہیں ہو گی۔"

"نہیں! میں ان کپڑوں میں ملوں گا تو وہ کیا سمجھے گی۔ میں خود ایسے پھٹے حال میں پھر رہا ہوں۔"

"ہاں یہ تو ہے۔ چلو دفع کرو مٹی ڈالو اس کی شکل پر۔ ایسی تو بہت سی مل جاتی ہیں۔"

"نہیں یار! وہ بہت مخلص تھی۔ مجھ پر جان وارتی تھی۔ میں ہی اُسے کھو بیٹھا۔ ایسے حالات میں کہ اب اُسے مجھ پر کوئی اعتبار نہیں رہا ہو گا۔"

آبی چپ ہو رہا۔ میری اس بات کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ میرا اپنا ذہن اُلجھ کر رہ گیا تھا۔ اس نفیسہ سے چند بڑی ہی حسین یادیں وابستہ تھیں۔ اس کا وہ خوبصورت گھر۔ وہ اس کا ہرا بھرا آنگن جس میں پھول ہی پھول اُگے تھے اور اُس گھر سے اُسے نکال دینے میں میرا جو کردار تھا وہ سب کچھ۔۔۔ میرے ذہن میں بڑی کھلبلی مچاتا تھا۔ اس سے مجھے ہزاروں لاکھوں مرتبہ معافی مانگنی چاہیے تھی۔ میں نے ہی اس کی سجی سجائی زندگی میں زہر گھول دیا تھا۔ میرے بارے اس کے خیالات خدا جانے کیا ہوں گے، مگر میں نے اسے وفا کے کامل روپ میں دیکھا تھا۔ اس کا خلوص بے پناہ تھا۔ وہ بہادر تھی، میرے لیے جی جان سے اُن شعلوں میں جا گری تھی جن میں آسیہ جل بھُن کر بھسم ہو جاتی تھی۔ اس کی یادیں میرے ذہن میں کئی مندمل زخموں کو ادھیڑ گئیں۔ وہ جب مجھ سے بچھڑی تو خدا جانے اس نے کیسے کیسے دُکھ اٹھائے ہوں گے مگر اس روز وہ پہلے ایسی نفیسہ نظر آتی تھی، شاداں و فرحاں معلوم ہوتا تھا اسے زندگی سے کوئی شکوہ نہیں ہے۔ اس کی سجی سنوری آئینہ سی عکاس آنکھیں پہلے سے زیادہ روشن نظر آتی تھیں۔ لگتا تھا وہ کسی کے ہاں تیج تہوار میں شرکت کے لیے جا رہی تھی۔ انداز اس کا ایسا ہی تھا۔ خانیوال کے قریب پہنچ کر اس نے ایک بار دروازہ کھول دیا۔ وہ دونوں اب پھر باہر کے منظر سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔

میرا سر کھڑکی سے باہر نکل گیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ مجھے دیکھ لے اور پہچان بھی لے، کہ میں وہی ہوں جس کے ہاتھوں اس کی زندگی تلخ ہو گئی تھی۔

اچانک اس کی نظر پیچھے مڑی۔ بیرونی منظر اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ۔۔۔ وہ مجھے دیکھ کر دنگ سی رہ گئی۔ اُس کو یقین نہیں آرہا تھا کہ اس کے سامنے وہی اصغر علی ترانڈہ بیٹھا ہے۔ گاڑی کی رفتار سُست ہوئی تو وہ اور زیادہ باہر کو جھک گئی اور جب اس نے مجھے پہچان لیا تو گاڑی کے رُکنے کا انتظار کرنے لگی۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی دلکش مسکراہٹ اُبھر آئی تھی۔ گاڑی رُکی تو وہ پھر دروازے سے اُچھل کر باہر نکلی اور سیدھی میرے سامنے آپہنچی۔

"آپ! یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں ترانڈہ صاحب!"

"میں سوچتا تھا شاید آپ مجھے پہچان نہ سکیں گی۔ کیا حال ہے آپ کا؟" یہ کہہ کر میں کھڑکی سے ہٹا اور دروازے میں سے نکل کر اس کے سامنے جا ٹھہرا۔

"آپ نے چادر کب سے باندھنا شروع کر دی؟ یہ حال کیا بنا رکھا ہے آپ نے! میرے ڈبے میں آئیں۔"

"مگر میرا ٹکٹ تو۔۔۔"

"فکر نہ کریں ہم کرایہ ادا کر دیں گے، آئیے۔"

"میرے بھائی بھی اندر ہیں اکبر علی ترانڈہ۔"

"میں دیکھ رہی ہوں، انھیں بھی بلائیں، آئیں ترانڈہ صاحب آپ بھی میرے ڈبے میں آجائیں۔"

آبی نے اس کی یہ بات سنی تو فوراً ہی ڈبے سے باہر نکل آیا۔

"اچھا ہے کہ آپ سے ملاقات ہو گئی۔ آپ سے ملنے کے لیے اصغر بہت پریشان تھا۔" آبی نے کہا۔

ہم دونوں اس کے ساتھ چلتے ہوئے اس کے ڈبے میں جا بیٹھے۔ اس کی ساتھی خاتون ہمیں سامنے دیکھ کر اپنی جگہ سے اٹھی اور سوالیہ نظروں سے نفیسہ کو دیکھ کر بولی۔ "یہ کون ہیں؟ یہاں کیوں آئے ہیں؟"

"یہ ترانڈہ صاحب ہیں۔ اصغر علی ترانڈہ، اور یہ ان کے بھائی ہیں اکبر علی۔ ان سے ملیے یہ ڈاکٹر زاہدہ ہیں۔"

"آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی خاتون! یہ نہیں معلوم تھا کہ ہماری آپ سے یوں ملاقات ہو جائے گی۔" میں نے نشست پر سمٹ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ڈاکٹر زاہدہ بڑی خیرہ کُن عورت تھی اور مخاطب کو مرعوب کر دیتی تھی۔ "کہاں جا رہی ہیں آپ؟"

"ہم لاہور جا رہے ہیں مگر آپ کا رُخ کدھر ہے؟ یہ حلیہ کیا بنا رکھا ہے آپ نے؟"

"کچھ نہ پوچھیں ڈاکٹر نفیسہ! کبھی کے دن بڑے کبھی کی راتیں۔ کچھ ایسا ہی معاملہ ہے کہ کسی سے کہہ بھی نہیں سکتے۔"

"جی ہاں! ایک دنیا ہمارا لوہا مانتی تھی مگر اب ہم نکو بن گئے ہیں۔ کسٹوڈین میں ہم سے یار لوگوں نے چار لاکھ روپیہ بھی چھین لیا اور کپڑے بھی، بہت بُرے حال میں لاہور جا رہے ہیں۔" آبی نے نفیسہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ آسیہ کہاں ہے اب؟"

"وہ اچھا نصیب لے کر پیدا نہیں ہوئی تھی۔ وہ اب بھی ہم سے اتنی ہی دور ہے جتنی پہلے روز تھی۔ آپ سے مجھے بہرحال معذرت کرنی چاہیے تھی۔ آپ کے ساتھ ہماری وجہ سے اچھا سلوک نہیں ہوا۔"

"نہیں جناب! معذرت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔۔۔ ڈھلوں صاحب نے مجھے ملازمت پر بحال کروا دیا تھا۔ یہ اسی آسیہ کا قصہ ہے اور یہ اس کے سگے بھائی ہیں۔"

"اچھا! تو یہ بات ہے۔ اُس کی وجہ سے وہ آفت آئی تھی آپ پر؟" زاہدہ نے مترنم لہجے میں کہا۔

"اب کہاں کام کرتی ہیں آپ؟"

"میں میانوالی جیل میں کام کر رہی ہوں۔ پہلے میں راولپنڈی بھیجی گئی وہاں سے میں میانوالی چلی گئی۔ ڈھلوں صاحب نے مدد کی تھی میری۔ آسیہ کہاں ہے اب؟"

"وہ جیل سے نکل کر اس جھگڑے میں پھر ہم سے بچھڑ گئی۔ اس نے کسی عورت شب خیر کے ہاں پناہ لی۔ وہ میانوالی میں رہتی ہے مگر اس کے ہاں اپنا بچہ چھوڑ کر وہ کسی جاگیردار کے ہاں جا پہنچی ہے۔ وہ قندیارو میں رہتا ہے، اب ہم اسی کی طرف جا رہے ہیں۔"

"کمال ہے اس کے ہاں بچہ کہاں سے ہو گیا؟ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"کسی نے جیل میں اُس کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ دوا کے ذریعے اُسے بے ہوش کر دیا گیا تھا۔"

"یہ تو بہت بُرا ہُوا۔ بہرحال آپ گھبرائیں نہیں! میں بھی اُدھر ہی جا رہی ہوں۔ قندیارو کوئی گاؤں ہے وہاں؟"

"جی ہاں! سُنا تو یہی ہے۔ ایک عذاب ہے جسے ہم مسلسل جھیل رہے ہیں۔"

"گھبرائیں نہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں کچھ آپ کی مدد کر سکتی ہوں۔ یہ دن کیسے گزارے آپ نے؟ میں۔۔۔ میں تو سچی بات ہے آپ کو بہت یاد کرتی تھی۔"

"آپ کی مہربانی ہے ڈاکٹر۔ ورنہ میں اس قابل کہاں ہوں؟ کیا خدمت کر سکا میں آپ کی؟ کچھ بھی نہیں۔ میری وجہ سے آپ کی ہنستی بستی زندگی تباہ ہو گئی۔"

میں اس سے آنکھ نہیں ملا سکتا تھا۔ میرے بجھے بجھے چہرے کے عقب میں میری ناتمام آرزوئیں سر چھپائے کھڑی تھیں۔۔۔ وہ مسیحا نفس اُن جاں گُسل جذبوں کو اچھی طرح پہچانتی تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ میں نے شاید اس کی زندگی کی کتنی ہی اداس شاموں کو رنگین بنا دیا تھا۔ اس نے محبت کا مفہوم سمجھ لیا تھا۔ مگر میں۔۔۔ میں ہی اس کے قابل نہیں تھا۔ مگر وہ اب بھی میری چاہت میں مبتلا تھی۔ وہ یہی سمجھتی تھی کہ اس مصیبت کے پیدا کرنے میں میرا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ وہ لمحہ آپ ہی آپ اس کی راہ میں آگیا تھا۔ اس کے کسی گناہ کی پاداش میں وہ گردش میں آگئی تھی۔ اس کی شخصیت کی وہ جنبلک مجھے اب بھی اُس کی طرف کھینچتی تھی۔ اس کی چمک چلک میں ابھی تک کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ میں ہی چلن ہار ثابت ہوا۔

آبی بڑے اطمینان سے الگ کونے میں بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ اس کا رویہ بہت ہی بدل گیا تھا۔ کہاں تو وہ عورت کی ایک جھلک پر جی جان سے فدا ہو جاتا تھا۔ اس کے نام کی مالا جپنے لگتا تھا۔ اور اب یہ عالم تھا کہ ڈاکٹر زاہدہ اس کے سامنے بیٹھی تھی مگر وہ اُسے نظر بھر کر دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ اس کے چہرے پر ایسے ہی تاثرات تھے کہ میں سمجھا وہ اندر سے بہت بجھ گیا ہے۔ اسے یہ بھی احساس تھا کہ اس کی نظر اپنی نہیں رہی ہے۔ اک ذرا وہ ننھا سا شیشہ اس کی پتلی سے اُتر آئے تو اس کو جان کے لالے

پڑ جاتے تھے۔ یہی نامکمل ہونے کا احساس اس کو کھینچ کر محفل سے دور لے جاتا تھا۔ اس نے ہماری باتوں پر کوئی توجہ نہیں دی۔ زاہدہ کو شاید ہم دونوں پسند ہی نہیں آئے تھے۔ وہ سمجھی کہ ہم یونہی جاہل ان پڑھ اور ان گھڑ قسم کے دیہاتی آدمی ہیں۔ وہ ہمیں درخور اعتنا ہی نہیں سمجھتی تھی۔ نفیسہ البتہ پوری طرح میری طرف متوجہ تھی۔ وہ مجھ سے طرح طرح کے سوال پوچھتی رہی۔ پولیس کی زیادتی کی خبر جب اس نے سنی تو بہت زیادہ چراغ پا ہو گئی۔ اس کی رائے ان کے بارے میں پہلے بھی اچھی نہیں تھی مگر اس روز تو وہ کچھ زیادہ ہی ان سے بدظن ہو گئی۔ میں نے لاہور تک اس سے ڈھیر ساری راز و نیاز کی باتیں کریں۔ میری محبت نے اب تک اسے گھیر رکھا تھا۔

لاہور جب قریب آیا تو وہ بولی "اب کیا پروگرام ہے آپ کا؟"

"مجھے ایک دن لاہور ٹھہرنا ہو گا۔ بینک سے کچھ رقم نکلوانی بہت ضروری ہے۔"

"تو ٹھیک ہے۔ میں تو میانوالی جا رہی ہوں۔ شام کی گاڑی ہمیں مل جائے گی۔"

"بہتر ہے۔ میں کل شام یا پرسوں تک آپ سے مل لوں گا۔"

"ہاں یہ میرا پتہ ہے۔ اس پر مجھے آملیں۔" میں نے چھوٹا سا کارڈ لے کر اپنی جیب میں ڈال لیا۔ مگر کارڈ دیتے وقت اس نے میرا ہاتھ کچھ اس طرح دبایا جیسے کہہ رہی ہو کہ مجھے بھول نہیں جانا چوہدری صاحب! اس کی بلند و بالا اور اثیر نگاہ میں ابھی تک نہیں بھول سکا ہوں۔ بڑی تاکید تھی ان نگاہوں میں۔

وہ گاڑی سے اتر کر سامنے کی انتظار گاہ میں جا گھسی تو میں آبی کو ساتھ لے کر اسٹیشن سے باہر نکل آیا۔ نفیسہ کی اس ملاقات نے میرے دل پر گہرا اثر کیا تھا۔ کوئی شے اچھی نہیں لگتی تھی۔ کبھی کبھی ماضی کا کوئی لمحہ دل کو اس طرح زنغے میں لے لیتا ہے کہ اس سے جان چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔ نفیسہ بھی ایسی ہی تھی۔ اس کا تکلم دل کو بڑا سکون پہنچاتا تھا۔ وہ ان چند گھنٹوں کی ملاقات کے بعد مجھ سے بچھڑی تو میں سمجھا کہ میں بالکل ہی تنہا ہو گیا ہوں۔

"اب کیا ارادے ہیں بھائی پھیرو! تیرا اس طرح پرائی عورتوں سے میل جول مجھے قطعاً پسند نہیں ہے۔"

"بک نہیں اوئے! تو اپنے کرم میری جھولی میں ڈال رہا ہے۔ آج ذرا تجھے اس زاہدہ نے توجہ نہیں دی تو تو عابد زاہد بن بیٹھا ہے۔"

"یہ بات نہیں ہے استاد! میں بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھاتا ہوں۔ تیری طرح اٹھائی گیرے کا کاریگر نہیں ہوں۔ کوئی اتنی مہربان مجھ پر ہوتی تو میں اسے بھرے بازار میں اغوا کر کے لے جاتا۔"

"چل ٹھیک ہے میں اٹھائی گیرے کا کاریگر ہی سہی۔ چل یار، ہم تیرے گاؤں میں گزارتے ہیں۔ کوئی ٹیکسی پکڑ۔ تیری ماں بھی پریشان ہو گی۔"

"ہاں یار! یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ پکڑ کوئی ٹیکسی۔ میری بھی ماں کے پاس پتہ نہیں پہنچی ہے کہ نہیں۔" یہ کہہ کر وہ ... سے ایک نویں نکور ٹیکسی کی طرف بڑھا اور اس میں بیٹھ ... اس نے مجھے بھی اندر بلا لیا۔

"چل یار! ہمیں ذرا ہر بکے لے چل۔ بہت دنوں بعد جا رہا ہوں۔ یہ کیسی زندگی ہے یار؟"

"ہاں! ہم تو بالکل ہی بیدل ہو کر رہ گئے۔"

"مجھے یوں لگتا ہے جیسے میری روح کسی اَلّو ساز ... ہاتھ میں آ گئی ہے اور اس نے اصلی زخموں کے رنگ اس پر ... دیے ہیں۔ ماں مجھے دیکھ کر شاید اب پہلی سی خوشی محسوس نہ کر ... کیا کیا ہے میں نے آخر اس کے لیے۔ اس کا بڑھاپا بھی تباہ کر ... جوانی تو کر ہی دی تھی۔ وہ مجھے دیکھ دیکھ کر جلنے کیسے سپنے ... تھی سب پر وہ کچھ بھی نہ پا سکی۔"

"ہاں، تو ٹھیک کہتا ہے۔ میری والدہ بھی یہی سوچتی ... اس کی تو بیٹی بھی اس سے بچھڑ کر راستوں میں گم ہو گئی۔" ... نڈھال ہو کر سر کھڑکی کے ساتھ لگا دیا۔ ان گنت یادیں ... ذہن میں اودھم مچانے لگی تھیں۔ آبی ٹھیک کہتا تھا۔ میں ... اٹھائی گیرے کا کاریگر ہو کر رہ گیا تھا جس سے کوئی بھی کام صحیح نہیں ... تھا مگر دعوے وہ بہت بڑے بڑے کرتا تھا۔ میرا برا ... نے تو لوٹ کر ماں کی خبر بھی نہیں پوچھی تھی۔ اور میری راہ ... دیکھ کر شاید اس کی آنکھیں پتھرا گئی ہوں۔

لاہور میں ستمبر کے مہینے کے اواخر میں شام کو ... لوچ بھر جاتا ہے، وہ یوں ٹھمک ٹھمک کر چلتی ہے کہ ... جی چاہتا ہے کہ کسی جگہ ہرے بھرے کھیتوں میں لیٹ کر ... تکتا رہے۔ فرصت کے جن رات دنوں کی آرزو شاعر ... میں ابھرتی ہے، وہ اسے مل بھی جاتے ہیں۔ مگر موسم تو جب لگتے ہیں جب آدمی کا دل ٹھکانے پر ہو، اس کے وجود ... للکار سی اٹھتی ہو اور ہمارا یہ حال تھا کہ ہم دونوں ... تھے۔ ہم اجین کے بھکاری تھے جنہیں مانگے بھیک بھی ... تھی۔

جب ہم ہر بکے پہنچے تو رات کے نو بج چکے تھے ... سناٹے کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ لوگ چھتوں سے اتر کر ... باورکمروں میں سونے لگے تھے۔ آبی نے بڑے دھیمے ...

دروازے پر دستک دی، یوں جیسے کوئی لب جان مریض کے رخسار تھپتھپاتا ہے۔ اسے گھر آنے کی ماں سے ملنے کی، اس ہوا میں سانس لینے کی کوئی خوشی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ دوسری دستک پر دروازہ کھل گیا۔ سامنے آبی کی ماں کھڑی تھی۔ وہ آبی سے لپٹ کر اس کی بلائیں لینے لگی۔ ڈھیر ساری دعائیں اس کے منہ سے نکل گئیں۔

"تو کہاں چلا جاتا ہے آبی۔ اتنی اتنی دیر تک گھر سے کیوں غائب ہو جاتا ہے؟"

"میں نے پیغام تو بھیجا تھا۔ ایک عورت نہیں آئی تھی یہاں؟"

"ہاں وہ آئی ہوئی ہے۔ بڑی رقم تھی اس کے پاس، وہ اس نے مجھے دے دی تھی۔ پر رقم سے کیا ہوتا ہے بیٹے! جب تو نہیں آتا تو تیرے پیسے لے کر کیا کروں گی میں؟ میرا گزارا تو ہو ہی جاتا ہے۔"

"یہ تو اچھا ہوا اماں! مجھے ڈر تھا کہ کہیں ان کی نیت خراب نہ ہو جائے۔ بالکل اجنبی لوگ تھے، ایک آدمی بھی آیا تھا اس کے ساتھ؟"

"ہاں، مگر وہ اسی روز واپس چلا گیا۔ میں نے اسے سفر خرچ کے لیے پانچ سو روپے دے دیے تھے۔ تیرے بعد مجھے تھانے کی راہ بھی دیکھنی پڑی۔ وہ تو خدا بھلا کرے تابیے کا، اس نے میری جان بچائی۔ تو کیسا دھندا کرتا ہے آبی! پولیس والے طرح طرح کے سوال پوچھتے تھے؟"

"ایسے ہی وہ بکواس کرتے ہوں گے۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا۔ اسی لیے میں نے ایک تگڑی سفارش بھی پیچھے لگا دی تھی۔ اچھا ہوا تم گھر آ گئیں۔ ارے حسنہ!" سامنے وہ اس کی ایک رات کی دلہن کھڑی اسے آداب کہہ رہی تھی۔ اس کا رنگ پہلے سے زیادہ نکھر گیا تھا۔ "کیا حال ہیں تمہارے؟"

"بالکل ٹھیک ہوں جناب! ماں جی کی خدمت کر کے مجھے دلی خوشی ہوتی ہے۔ آپ اتنی اچھی ماں کو چھوڑ کر چلے جاتے ہیں؟"

"میں جلد ہی گھر آ جاؤں گا حسنہ! ہمارے مسئلے حل ہو جائیں تو میں ساری دنیا چھوڑ کر ماں کے قدموں میں آ بیٹھوں گا۔ ماں تم نے اسے نہیں پوچھا؟" وہ میری طرف اشارہ کر کے بولا۔

"آ بیٹے! بیٹھ ادھر۔ تجھے بھی میرا خیال نہیں آتا۔ تیرے دن ہی کتنے رہ گئے ہیں۔ کبھی خط ہی لکھ دیا ہوتا۔"

"نہیں ماں جی، اللہ آپ کی عمر دراز کرے۔ ہم تو یہی دعا مانگتے ہیں۔ آبی تو روز آپ کا ذکر چھیڑتا رہتا ہے۔ بس کام سے فرصت ہی نہیں ملی۔ مگر اب ہم جلدی واپس آ جائیں گے۔"

ہم دونوں حسنہ کے ساتھ کمرے میں جا بیٹھے۔ گھر کی صورت کچھ زیادہ ہی نکھری نکھری نظر آتی تھی۔ حسنہ نے واقعی وہاں پہنچ کر ماں جی کی بہت خدمت کی تھی۔ پلنگوں پر بستر بھی دھلے دھلائے نظر آتے تھے۔ ضرورت کی کئی نئی چیزیں گھر میں آ گئی تھیں۔ اور وہ دونوں بے حد خوش تھیں۔ حسنہ نے آبی کے گھر کو ہی اپنا آخری ٹھکانا سمجھ لیا تھا۔

"حسنہ کہہ رہی تھی کہ میرا دل کہتا ہے آبی تم جلدی گھر آ جاؤ گے۔ کل اس نے خواب بھی دیکھا تھا کہ تم دونوں یہاں آ گئے ہو۔ اسی لیے آج بھی اس نے مرغ پکا لیا تھا اور کل بھی۔" ماں جی نے ہمارے سامنے کھانا رکھتے ہوئے کہا۔

"کیا واقعی تمہیں خواب آتے ہیں اور اتنے سچے بھی؟"

"ہاں! آپ کو نہیں آتے؟"

"ہمیں ... ہمیں تو بڑے ڈراؤنے خواب آتے ہیں۔ کیوں جیلانی ٹھیک کہتا ہوں نا میں؟"

"ہاں کل بھی ہم کسی خواب کے پیچھے ہی بھاگ رہے ہوں گے۔ صبح ہم یہاں سے چلے جائیں گے ماں جی! اور پھر جلدی ہی واپس آنے کی کوشش کریں گے۔"

"کیوں ایسی کیا مصیبت پڑی ہے تمہیں! میں تو کہتی ہوں آبی! جتنی بھی زمین ہے اس کی خود دیکھ بھال کرو اور یہاں رہ جاؤ۔"

"میں یہی کروں گا ماں! بے فکر رہ۔ مگر تمہاری الماس تو یہاں نہیں رہے گی۔"

"ارے میں اس کے پاس گئی تھی آبی! مگر اس نے توجہ ہی نہیں دی۔ مجھے مہمان خانے میں سلا دیا اور بس۔ ایک بار بھی وہ میرے پاس نہیں بیٹھی۔ وہ کیسی منگیتر ہے تیری؟"

"اچھا! کیا کہا تھا اس ذلیل نے؟" آبی کا رنگ ایک دم بدلنے لگا۔ اسے توقع ہی نہیں تھی کہ الماس اس کی ماں سے ایسا سلوک کرے گی۔

"آبی! میں نے کہا تھا نا کہ ایسے لوگوں سے ہمارا نباہ نہیں ہو سکتا۔ اور وہ ٹھہری ایکٹریس، اسے کیا قدر ہو سکتی ہے تمہاری؟"

"ہوں! میں اس سے سمجھ لوں گا ماں! میں اس سے سمجھ لوں گا۔ مجھے معلوم ہے اس نے تم سے اچھا سلوک نہیں کیا ہو گا۔ آدمی کو مارنا ہو تو ایک بدلی ہوئی نظر ہی کافی ہوتی ہے۔"

کھانا اچھا تھا۔ اور ہمیں بھوک نے زیادہ ہی پریشان

کر رکھا تھا۔ جب اماں نے برتن اٹھائے تو آبی کے ہاتھ دھلانے کے لیے حسنہ پانی لے آئی۔ بولی "یہ الماس کون ہے جناب؟"
"الماس کا نام نہیں سُنا تم نے؟ میری منگیتر ہے۔ اس ملک کی نامور اداکارہ الماس!"
"اچھا! تو یہ ٹھاٹھ ہیں آپ کے۔ وہ کیسے ہاتھ لگ گئی آپ کے۔ اسے پتہ نہیں تھا کہ آپ کے کرتوت کیا ہیں؟"
"یوں کہو کہ مجھے اس کے کرتوتوں کا علم نہیں تھا۔ اس بدکار عورت کو تو میں اب سمجھا ہوں۔" آبی بہت زیادہ غصے میں تھا۔ مجھے کمرے سے اٹھا کر صحن میں لے گیا۔ وہاں بھی دو چار چارپائیاں بچھی تھیں، ماں جی ہمارے پاس ہی آ بیٹھیں۔ حسنہ بھی آبی کی پائنتی بیٹھ گئی۔ ہم خاصی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ ماں جی نے بہت پوچھا کہ آخر ہم دونوں کا دھندا کیا ہے، مگر ہم کیا بتلاتے، ہمارا تو کوئی دھندا ہی نہیں تھا۔ ایک آسیب تھے جس نے ہمارے سارے ہی کنویں کھنگال ڈالے تھے۔ اور یہی ہمارا دھندا تھا۔ آبی ہاں ہوں کر کے رہ گیا۔

وہ رات حسنہ نے کمرے میں ماں جی کے ساتھ ہی گزاری۔ اور ہم برآمدے میں سو رہے۔ بہت گہری نیند آئی۔ کئی دنوں سے ہم بے خوابی کا شکار تھے اور کشمور نے تو ہمیں نڈھال کر دیا تھا۔
صبح اٹھتے ہی میں نے آبی کو بھی اپنے ساتھ ہی بستر سے اٹھا دیا۔ ماں جی اور حسنہ صحن میں مصلّے بچھا کر نماز کے بعد تسبیح میں مصروف تھیں۔ جب ہم نہا کر غسل خانے سے نکلے تو صبح کا اُجالا چار سُو پھیل چکا تھا۔ آبی نے میرے اور اپنے لیے دو نئے جوڑے نکال لیے۔ جب وہ ہم پہن چکے تو وہ بولا "ماں جی! ذرا ناشتہ تیار کر دیں ہمیں آج ہی راولپنڈی پہنچنا ہے۔"
"کیسی بات کرتے ہو آبی! رات ہی تو آئے ہو۔" ماں جی نے اٹھ کر آبی کے منہ پر پھونک مارتے ہوئے کہا۔ اچانک اُن کی نظر آبی کی آنکھوں پر جا پڑی۔ وہ آنکھیں انھیں بدلی بدلی سی نظر آئی تھیں۔ رات کو تو وہ کچھ نہ دیکھ سکی تھیں مگر اب صبح کے اجالے میں بیٹے کی آنکھ انھیں مصنوعی سی نظر آئی، بولیں "یہ تیری آنکھوں کو کیا ہو گیا ہے؟ شیشہ لگایا ہے تو نے؟"
"اوہ، ہاں! ماں ایسی ہی بات ہے۔ میری آنکھیں خراب ہو گئی تھیں، عینک کے بجائے میں نے شیشہ اندر لگوا لیا۔"
"ہائے! تو کیسے کیسے دُکھ اٹھاتا رہتا ہے آبی! اس عمر میں تیری آنکھیں کیسے خراب ہو گئیں۔ ذرا کھول اِن کو میں دیکھوں تو ہوا کیا ہے۔" اُن کے لہجے میں بڑا اضطراب تھا۔
"کیسی آنکھیں تھیں تیری۔ موتی کوٹ کوٹ کر بھر دیے تھے خدا نے، پر اب کیسی بے نور ہو گئی ہیں۔" وہ پریشان ہو کر آبی سے لپٹ گئیں۔ ممتا کا دل کیسا دیوانہ ہوتا ہے۔ آبی کی آنکھیں بھی بھر آئیں اور وہ پاگلوں کی طرح ماں کے سینے سے لگ کر پھوٹ پڑا۔ ہم بھی پریشان ہو گئے۔ اور میرا تو دل ہی بیٹھنے لگا۔ آبی کو میں نے کبھی روتے نہیں دیکھا تھا۔ چند لمحوں تک یہی کیفیت رہی۔
"مت رو آبی! مجھے بھی تو نے رُلا دیا ہے۔ مجھ سے تیرے آنسو نہیں دیکھے جاتے ہیں۔ تو تو کبھی بھی نہیں رویا تو اب کیوں دیدے ہار رہا ہے؟" میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ بیٹا کوئی بھی ہو، ماؤں نے تو انھیں ایک ہی طرح پیدا کیا ہوتا ہے۔ ماں کے تن بدن کا حصہ ہونے کے ناتے دو روحوں میں جو لاسلکی رابطہ قائم ہوتا ہے وہ مر کر بھی قائم رہتا ہے۔
آبی کے آنسو جلدی ہی تھم گئے۔ مجھے دکھانے کے لیے مسکرا دیا مگر فوراً ہی اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ چادر کے پلو سے آنکھیں پونچھتے ہوئے بولا "میرے لیے دعا کیا کر، مجھے تیری دُعا کی ہر وقت ضرورت رہتی ہے۔ میں کوئی بُرا نہیں کرتا ہوں، کچھ بھی تو نہیں کیا ہے میں نے۔ ایک ہی پریشانی ہے، وہ دور ہو جائے تو میں تیرے پاس واپس آ جاؤں گا۔" اس کی آواز رندھ گئی تھی۔
"میں تو ہر وقت تیرے لیے سجدے میں پڑی رہتی ہوں آبی! پتہ نہیں تو اتنا کٹھور کیسے ہو گیا۔ پھر میں تجھے پیسے بھیجتی ہوں۔" یہ کہتی ہوئی وہ اپنے آنسو پونچھتی ہوئی کمرے میں چلی گئیں۔ حسنہ بھی ڈبڈبائی آنکھوں سے آبی کو یوں دیکھ رہی تھی جیسے پھر اس کا چہرہ اسے دیکھنا نصیب نہ ہو گا۔ اس لڑکی نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ وہ آبی کے بے حد قریب آ گئی تھی۔ اس نے شاید آبی کو ذہنی اور قلبی طور پر اپنا شوہر تسلیم کر لیا تھا۔ کچھ ایسی بات ہی ہوئی تھی۔
آبی بھی اس کو عجیب سی اپنائیت کے احساس سے دیکھ رہا تھا، بولا "تم یہاں خوش ہو نا حسنہ! یہ گاؤں کی زندگی کیسے رہ لو گی یہاں؟"
"میں تو یہاں بہت خوش ہوں جناب! ماں جی نے ایسا پیار دیا ہے کہ مجھے اور کچھ یاد نہیں رہا۔" اس کی بھی آنکھوں میں دھندلا گئی تھی۔ آبی گھر سے جا رہا تھا اور اس کی جان بھی۔ میرا خیال ہے کہ وہ آبی سے ملنے سے پیشتر واقعی میں نا کتخدا تھی۔ اس کا لب و لہجہ، اس کی چال ڈھال، اس کا وہ نپا تلا انداز بھی بتاتا تھا۔ اور یہ اچھی بات تھی، لڑکیاں اپنی عصمت کہاں برقرار رکھ سکتی ہیں۔ لفنگے ایسی کو دو دن بھی معاف نہیں کرتے۔ پھر جس ماحول سے

نکلی تھی وہاں تو سب سے پہلا وار عورت کی عصمت پر ہی ہوتا ہے۔
"یہ اچھی بات ہے حسنہ! تم بھی ہمارے لیے دعا کرو۔ جیلانی کی بہن بڑی مشکل میں ہے۔ اس کو واپس لا کر ہمیں اور کچھ نہیں کرنا ہے۔ میں گھر آ جاؤں گا پھر تیرے بارے میں بھی کچھ سوچیں گے۔ تو خوش ہے نا یہاں؟"
"ہاں! میں یہاں بہت سکھی ہوں آبی صاحب! اگر آپ یہاں آ جائیں تو پھر بات ہی کچھ اور ہو جائے۔ میں پہلے واقعی بہت دکھی تھی مگر اب نہیں۔" اس کا ذہن سیدھی سوچ کا مالک تھا۔ وہ بات کہتی تھی تو اس کا دل، دماغ ساتھ لپٹا نظر آتا تھا۔
اتنے میں ماں جی کمرے سے ڈھیر ساری رقم نکال کر لے آئیں۔
"یہ رکھ لو، یہ پچاس ہزار ہیں۔"
"نہیں ماں جی! اس کی ضرورت نہیں ہے۔ بس صرف پانچ ہزار ہمیں دے دیں یہی بہت کافی ہے۔"
"نہیں یار! اس سے کیا ہو گا۔ ادھر تو زندگی سے لمبا ہی پنجہ لڑانا ہو گا۔" آبی جلدی سے بولا۔
"یہی کافی ہیں آبی! میں بنک سے رقم نکلواتا ہوں۔ آپ اس میں سے حسنہ کو بھی کچھ دے دیں۔"
"میں نے تو کہا ہے اس سے مگر یہ مانتی ہی نہیں۔ کہتی ہے یہاں کیا کروں گی؟ ایک دھیلا مُرمُرے والا ہی تو آتا ہے یہاں۔"
حسنہ کے تیج پاتر بہت ہی مختصر تھے، بولی "میں ٹھیک کہتی ہوں نا ماں جی! مجھے کیا ضرورت ہے بھلا؟"
"ٹھیک ہے بیٹی! خدا تجھے سلامت رکھے۔ بیٹی تو مجھے ایسی ہی چاہیے تھی نہ کہ وہ ایکٹریس۔" یہ کہہ کر پانچ ہزار روپیہ ہمارے ہاتھ پر رکھ کر واپس چلی گئیں۔
"اس گستاخی کا تو میں ایسا بندوبست کروں گا کہ وہ یاد ہی رکھے گی۔ چل آ یار دیکھتے ہیں اب کی بار تقدیر ہمارے ساتھ کیا سلوک کرتی ہے۔"
اتنے میں ماں جی باہر آ گئیں اور ہم انہیں سلام کر کے اسی وقت باہر نکل آئے۔ آبی کی آنکھیں پھر بھیگنے لگی تھیں۔ جانے اسے کیا کچھ یاد آ رہا تھا کہ اب کی بار وہ زندہ واپس نہیں آئے گا۔ پولیس کے رویے نے اسے پریشان کر رکھا تھا۔ ہمارے اعمال کچھ زیادہ ہی زبان زدِ خاص و عام ہو گئے تھے اور ہم یہی ڈر رہے تھے کہ اب مرے کہ مرے۔ میرا اپنا دل وسوسوں میں مبتلا رہتا تھا۔ سوزن جبر کا اور ایک دن شاہ کا۔ کوئی بھلا کب تک اتنے سارے نیوروں سے رُوح کے پنچھی کو بچا سکتا ہے۔ پنچ مل خدا، خدا مل پنچ۔ لوگوں کی تو یہی رائے ہے۔ پر چار آدمی مل کر بے گناہوں کو مجرم ٹھہرائیں تو وہ مجرم ہو جاتا ہے۔ اور ہمارے خلاف تو ایک زمانہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ کشمور میں جو کچھ ہوا وہ ہماری اسی شہرت کی وجہ سے ہوا تھا۔ ورنہ وہ ارجمند خان، اس گل بہار شاہ اور تسلیم شاہ کو کیسے پتہ چل سکتا ہے کہ ہم کون ہیں؟
ہم گاؤں سے نکل کر بڑی سڑک پر آئے تو ایک بس ہمیں مل گئی اور ہم اس میں بیٹھ کر اسی وقت لاہور جا پہنچے۔ جب ہم ٹیکسی سے اتر کر بنک میں داخل ہوئے تو نو بج چکے تھے۔ میں سیدھا مینجر کے کمرے میں جا گھسا۔ آبی باہر ہی کھڑا رہا۔ اسے کاؤنٹر پر کھڑی ایک عورت کچھ زیادہ ہی بھا گئی تھی۔ حرکتیں اب بھی اس کی وہی تھیں۔ حالانکہ اسے اتنی مار پڑ چکی تھی۔ مگر وہ کہتے ہیں کہ چور چوری سے جائے پر ہیرا پھیری سے توبہ نہیں نہیں کر سکتا۔ یہی حال اس کا تھا۔
مینجر وہی پرانا آدمی تھا۔ وہ مجھ سے بڑے تپاک سے ملا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ مجھے ایک 'لوز چیک' دے دے۔ یہ چیک بک کا ٹنٹا میں سنبھال نہیں سکتا۔ وہ شریف آدمی تھا فوراً ہی مان گیا۔ میں نے بنک سے ایک لاکھ روپیہ نکلوایا اور کہا کہ وہ اسی ہزار کا تو ڈرافٹ بنوا دے میانوالی کے کسی بینک کے نام۔ میں وہاں جا کے رقم لے لوں گا۔ بیس ہزار میں نے جیب میں ڈال لیے ـــــ جب تمام کارروائی مکمل کر کے میں کمرے سے نکلا تو آبی اس خاتون کے ساتھ بینک سے نکل کر باہر برآمدے میں کھڑا تھا۔ میرا خیال ہے آبی نے اسے پھانس لیا تھا اور وہ گھر سے نکلی بھی اسی لیے تھی کہ کوئی اسے واقعی 'پھانس' لے۔ اس کا انداز ایسا ہی تھا۔ سرو سا اونچا لمبا قد تھا اس خاتون کا اور اسے یہ احساس تھا کہ وہ مت شر کر سکتی ہے۔ اپنی ساری دکان وہ خوب سجا سنوار کر باہر نکلی تھی۔ اور آبی کی ماں نے اس کی جیب میں پانچ ہزار کے نئے نئے نوٹ ڈال رکھے تھے جن کو دکھانے کے لیے اس نے سگریٹ کے ساتھ پرس بھی جیب سے باہر نکال لیا تھا۔ مگر اس مصیبت کو میں کسی بھی طرح بھگتنے کے لیے تیار نہیں تھا۔
آبی کو میں نے دیکھتے ہی بڑے غصے سے پوچھا "کیا قصہ ہے بھئی! یہ خاتون کون ہیں؟"
"یہ ــــ" وہ مسکرا دیا، بولا "یہ دراصل میرے ساتھ پڑھتی رہی ہیں ایف سی کالج میں۔ شمسہ نام ہے ان کا۔ ایسے ہی بینک میں ملاقات ہو گئی ہے ان سے۔"
"السلام علیکم!" اس نے بڑے مہذب طریقے سے مجھے سلام کیا، بولی "بہت دنوں بعد ملے ہیں یہ۔ اب تو میں ان کا نام بھی بھول گئی ہوں۔ بہت اچھے طالب علم تھے اپنے کالج کے۔ میں تو اکثر ان کے بارے میں سوچتی رہتی تھی۔ آج یہ

مل ہی گئے۔ کالج کے ہیرو کہہ سکتے ہیں آپ انہیں۔ اب پتہ نہیں کیا کرتے ہیں، کیا شغل ہے آپ کا جناب؟"

"جی میرا نام ایس جی ایم پیرزادہ ہے۔ کچھ اپنا چھوٹا سا کاروبار ہے راولپنڈی میں فرنیچر بناتا ہوں آجکل۔ آئیں نا، آپ کو چائے تو ضرور پلانی پڑے گی۔ آخری بار ریاب ہے آپ کو کہ آپ نے چائے کا بل ادا کیا تھا؟ اب میری باری ہے۔"

خدا غارت کرے اس آبی کو وہ اس خاتون سے لمبی پینگ بڑھا رہا تھا اور میرا راستہ کھوٹا ہوا جاتا تھا۔

"ہاں مجھے یاد ہے اب تک یاد ہے آپ نے اس روز تہ گرے سوٹ پہن رکھا تھا۔ فروری کے دن تھے بہت سردی پڑ رہی تھی اُن دنوں۔"

آبی مسکرا دیا۔ سالے میرے سامنے دونوں ہی جھوٹ بول رہے تھے۔ لاہور کی گشتیوں کا یہ وتیرہ ہے کوئی پرانی اور لمبی آشنائی ڈھونڈ کر بندے کو پکڑتی ہیں اور پھر کلیجہ بھون کر کھا جاتی ہیں۔ دونوں کی آنکھوں میں مستی چھا رہی تھی۔ دونوں ہی اس جذبے کی زد میں تھے جو آدمی کو مارنے مرنے کی دعوت دیتا ہے۔ میں ہونقوں کی طرح اُن کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

"یار پیرزادہ صاحب! ہمیں بڑی دیر ہو جائے گی، جانا بھی تو بہت دُور ہے۔"

"جائے تو پی لینے دو انھیں! آخر ہرج ہی کیا ہے۔ ہمیں کون سا امریکہ جانا ہے۔ آپ نے امریکہ دیکھا ہے کبھی؟"

"جی میں پار سال وہاں گئی تھی۔ مانچسٹر شہر میں رہی۔ ہائے کتنا پیارا سماں تھا وہاں۔ ایفل ٹاور بھی میں نے دیکھا۔ لگتا تھا ابھی گر جائے گا مگر وہ گرا کبھی نہیں۔"

وہ مال زادی خواہ مخواہ ہی آبی کی ہاں سے ہاں ملا رہی تھی۔ حالانکہ وہ وہاں گئی ہی نہیں تھی۔ کہاں ایفل ٹاور اور کہاں مانچسٹر کہاں امریکہ۔ میں نے چاہا کہ اس سے کہہ ہی دوں کہ تو نے تو کبھی پیچہ وطنی بھی نہیں دیکھا ہوگا، تجھے کیا پتہ مانچسٹر کہاں ہے مگر وہ اپنی بڑ ہانکتی ہی چلی گئی۔

"ہاں وہ شہر تو میں نے بھی دیکھا ہے۔ بڑی خوبصورت جگہ ہے، امریکہ کا سب سے اچھا شہر ہے وہ۔ آئیں میرے خیال میں یہ ہوٹل بہترین رہے گا۔" آبی نے چلتے چلتے ایک بڑے ہوٹل کے سامنے لنگر ڈال دیا۔

وہ خوش ہو گئی، بولی "ہاں میرا بھی یہی خیال ہے یہاں آرام کے لیے کمرے بھی مل سکتے ہیں۔"

"نہیں آبی! ہمیں یہاں نہیں ٹھہرنا ہے، اسے کہیں گاڑی میں ڈال کر جنگل میں لے جاؤ۔ ان ہوٹلوں سے مجھے سخت نفرت ہے۔" میں نے آبی کو ایک طرف لے جا کر کہا۔

وہ دیدے مٹکاتی ہوئی ہمارے قریب آگئی، بولی "کیا مشورے ہو رہے ہیں۔ ہمارے بارے میں کوئی بحث ہے؟ بڑے آپ کے دوست ہیں بہت طرحدار۔"

"اِسے کیا سمجھتی ہیں آپ! پورا بدمعاش ہے یہ۔ میرا کوئی کام سیدھا ہی نہیں ہونے دیتا۔ اب مجھے گاڑی کا مشورہ دے رہا ہے کوئی لاد کر لے جانے والی چیز ہیں آپ!" اس کی آنکھیں رنگی رنگی سی نظر آتی تھیں اور یہی حال اس خاتون کا تھا۔

"میرا مشورہ تو یہی ہے۔ ان ہوٹلوں میں بہت خراب لیے ہم۔"

"بھئی ان سے میری پرانی دوستی ہے اس کا ہی کچھ خیال کرو۔ میری کلاس فیلو رہ چکی ہیں، ان کو دیکھو تو سہی۔ کوئی ان جیسی دیکھی ہے تم نے یہاں۔ آئیں چائے تو پی لیں شمسہ!" یہ کہہ کر وہ ہوٹل میں داخل ہو گیا۔ وہ خاتون اب اس کا ہاتھ زیادہ بے تکلفی سے پکڑے ہوئے تھیں۔

مجھے بھی مجبوراً اُن کا ساتھ دینا پڑا۔ ان دونوں نے ہوٹل کے اندر پہنچ کر آخری کونے کی میز تلاش کی اور وہاں بڑی آزادی سے جا بیٹھے۔ میں نے اپنے لیے دوسری طرف جگہ ڈھونڈی جہاں سے میں انھیں بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ جب انھوں نے دیکھا کہ میں بھی سامنے ہوں تو وہ خاتون اٹھیں اور آبی کو ساتھ لے کر دوسری منزل کے ایک بند کیبن میں جا بیٹھیں۔ جن لوگوں کے ساتھ خواتین ہوتی تھیں، وہ وہیں بسیرا کرتے تھے۔ کاش کوئی آج کے دور کا حدود نافذ کرنے والا وہاں پہنچ جاتا تو اُن دونوں سالوں ——— کو کوڑوں کی لمبی سزا مل جاتی۔ میں نچلے حصے میں بیٹھا سگریٹ پیتا رہا اور کڑھتا رہا۔ آبی کسی بھی طرح نہیں رہ سکتا تھا۔ میں سمجھا تھا کہ وہ اس رستے سے تو بہ کر چکا ہوگا مگر میں نے کہا نا کہ عورت کو دیکھتے ہی اس کے نسیمے زد ہونے لگتے تھے۔ کوئی بلا تھی جو اسے چمٹ جاتی تھی۔ اور وہ پاگل ہو کر عورت کو سموچا نگل لینے کی آرزو کرنے لگتا تھا۔ یہ وقت تھا جب اس کی شادی ہو جانی چاہیے تھی۔ میری رفاقت میں نہ ہوتا تو اب تک شادی کر چکا ہوتا۔ میں نے اس کی زندگی سے فرصت ہی منہا کر دی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ جہاں بھی موقعہ ملتا تھا کسی بھی ہانڈی میں منہ مارنے سے گریز نہیں کرتا تھا۔ وہ خاتون اچھی تھیں، بہت اچھی تھیں۔ نک سک سے درست گفتگو کرتی تھیں۔ کسی محفل کی جان بن جاتی ہوں گی۔ میرا خیال ہے کہ اعلیٰ درجے کی محفلوں میں اس کا آنا جانا

اور اس روز وہ اپنے جسم کا چیک لے کر بنک گئی تھیں کہ انھیں آبی نے دیکھ لیا۔ اور نقد جان ان پر نثار کرنے لگا۔ ورنہ اُس روز بینک سے تو اس خاتون نے صرف پچاس روپے ہی تڑائے تھے کہ اس کو باہر کہیں سے ریزگاری نہیں مل رہی تھی۔

آبی اس کیبن سے نکلا تو میں نے دیکھا کہ وہ دونوں کمروں کی طرف لپک رہے تھے۔ کسی بیرے نے اندر ہی اندر کسی خلوت گاہ کا انتظام کر دیا تھا اور آبی جانتا تھا کہ میں نیچے بیٹھا کڑھ رہا ہوں گا مگر میں کیا کر سکتا تھا۔ بیٹھا ان کا انتظار کرتا رہا۔ اور وہ ایف سی کالج کے کیے ہوئے وعدے پورے کرتے رہے۔ حالانکہ میں جانتا تھا کہ آبی نے اسکول اور کالج کا کبھی منہ بھی نہیں دیکھا تھا مگر کس ڈھٹائی سے وہ دونوں کہہ رہے تھے کہ ابھی انہیں ایک دوسرے کی چائے بھی لوٹانی ہے اور کالج فیلو ہونے کے ناتے سے کئی مرحلے اور بھی طے کرنے ہیں۔ وہ خاتون بھی ایسی تھیں کہ برابر ایف سی کالج سے ناتا جوڑ رہی تھیں۔ ورنہ میں سمجھتا ہوں کہ وہ جس درسگاہ میں پڑھی تھیں، وہ کسی اور ہی علم کی تربیت دیتی تھی۔ کالج تو محض ایک بہانا تھا۔

آبی کوئی دو گھنٹے بعد نیچے اُترا تو تنہا تھا۔ سیدھا میری میز کی طرف لپکا چلا آیا۔ اب وہ بہت مطمئن نظر آ رہا تھا اور اس کی آنکھوں کا رنگ اب ڈھل سا گیا تھا۔ بولا "چل یار! کچھ زیادہ ہی دیر لگ گئی ہے شاید۔ میں شمسہ سے کہہ آیا ہوں کہ میں ایک کام سے جا رہا ہوں۔ شام کو واپس آؤں گا۔ وہ چھ بجے تک میرا انتظار کرے گی ورنہ کمرہ چھوڑ دے گی۔"

"ٹھیک کہا ہے تم نے اُس سے۔ عین ممکن ہے اسے اس عرصے میں کوئی اور کالج فیلو مل جائے۔ اس کالج میں صرف تم ہی تو نہیں پڑھتے تھے۔"

"یار ایک تو تجھ سے میں بہت تنگ ہوں۔ میری ذرا سی خوشی بھی تم سے برداشت نہیں ہوتی۔ ویسے وہ تمھاری بہت تعریف کر رہی تھی۔ میں نے کہا ہٹاؤ بالکل بکواس ہے یہ۔ تم میرے اور میرے یار کے خون کو یکجا کرنے والی کون ہوتی ہو۔ ٹھیک کہا ہے نا میں نے۔ چل اب کوئی گاڑی پکڑ بڑی بڑی دیر ہو گئی ہے اس دھندے میں۔"

"میرا خیال ہے تم اِدھر ہی رہ جاؤ، عورت واقعی بہت حسین ہے۔"

"میں چکر دے آیا ہوں اسے۔ پتہ بھی میرے پاس ہے، ہم واپسی پر اس سے مل لیں گے۔ کہہ رہی تھی آپ کے دوست کے لیے بھی میں ایک کالج فیلو حاضر کر دوں گی۔ بہت تیز عورت تھی یار! میں پانچ سو روپے اس کو دے آیا ہوں پھر بھی کام پڑ سکتا ہے نا!"

"پہلی قوموں کو خدا نے اسی ایک برائی پر صفحۂ ہستی سے مٹا دیا تھا۔"

"اوئے رہنے دے یار! تو خواہ مخواہ ہی اللہ کا ٹھیکیدار بن رہا ہے۔" اُس نے ہوٹل سے نکل کر ایک ٹیکسی کو ہاتھ دیتے ہوئے کہا۔ ہم ٹیکسی میں بیٹھے تو اس نے دو سگریٹ سلگا لیے۔ جو مجھے ملا وہ واقعی گیلا تھا۔ میں نے وہ سگریٹ گاڑی سے باہر پھینک دیا، اور اس سے نیا سگریٹ لے کر سلگا لیا۔

میری یہ حرکت دیکھ کر وہ ہنسنے لگا، بولا "تو آہستہ آہستہ ایک دن مڈل سکس جا پہنچے گا۔ میری یہ بات یاد رکھ لے۔"

"کیا مطلب ہے تیرا۔ یہ تو ایک شہر کا نام ہے۔"

"ہاں، اور وہاں سب کے سب لوگ خواجہ سرا کہلاتے ہیں — اور اس پر فخر کرتے ہیں کہ کسی نے انھیں جن تو دیا مگر کوئی ان سے جنا نہیں گیا۔"

"تو بکواس کرتا ہے، بالکل بکواس کرتا ہے تو۔ مڈل سکس میں بھی شریف اور بہادر اور بچے جننے والے لوگ رہتے ہیں اور اس کی آبادی مسلسل بڑھ رہی ہے اور میں زندگی کے آخری دن تک جوان بلکہ نوجوان رہوں گا اور تو دو سال میں کھوتے کا پتر بن جائے گا، جس پر بوجھ لادا کرتے ہیں۔"

وہ کھلکھلا کر ہنس دیا، بولا "تیری معلومات کافی حد تک صحیح ہیں مگر اپنا بھی کچھ بندوبست کر لیا کر۔ زیادہ تیز دوڑنے والوں کو کسی نہ کسی جگہ رُک کر اپنا دم درست کر لینا چاہیے۔"

"کدھر جانا ہے باؤ جی؟" ڈرائیور نے ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

"کمال ہے یار! اسے یہ بھی پتہ نہیں کہ ہمیں جانا کدھر ہے۔" آبی نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

"اسے کوئی الہام تو نہیں ہوتا۔ بتا دو نا اسے کہ جانا کہاں ہے۔"

"یار میں نے کئی ڈرائیوروں کو دیکھا ہے انھیں معلوم ہوتا ہے کہ سواری کو کدھر جانا ہے۔"

"میں اُن عالموں میں سے نہیں ہوں جناب! نہ میں نے فال، رمل، نجوم سیکھا ہے یہ تو آپ ہی بتائیں گے کہ آپ کو چڑیا گھر جانا ہے کہ عجائب گھر۔" ڈرائیور نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اوئے یہ تو بولتا بھی ہے، بتا دو اسے۔"

"ہاں ہاں، تیرا دماغ کام نہیں کر رہا ہے اس وقت۔ ہمیں اسٹیشن لے چل یار!"

"میں سمجھا ہمیں شاید جیل جانا ہے۔" آبی نے دبی آواز میں کہا۔ شکر ہے ڈرائیور نے سنا نہیں، ورنہ خدا جانے وہ کیا سمجھتا۔

گاڑی میانوالی کے لیے دو بجے چھوٹتی تھی۔ ہم نے ٹیکسی چھوڑی

اور فرسٹ کلاس کا ٹکٹ خرید کر سٹیشن کی انتظار گاہ میں جا بیٹھے۔ آبی کی بھوک چمک اٹھی تھی اور وہ بہت بے صبر ہو رہا تھا۔ مجھے اس کی وجہ بھی معلوم تھی۔ انتظار گاہ میں ایک بیرا پھر رہا تھا۔ میں نے اسے کھانا لانے کے لیے کہا اور پھر میں اس سوچ میں گم ہو گیا کہ جس مقصد کے لیے میں گھر سے نکلا ہوں، وہ کسی بھی طرح ابھی تک پورا نہیں ہوا تھا۔ خدا کرے ہمارا یہ سفر ہی مبارک ثابت ہو ورنہ تو یوں لگتا تھا جیسے کسی نے چھری پھونک کر ہماری طرف پھینک دی ہو۔ ہمارا کوئی کام سیدھا ہو ہی نہیں رہا تھا۔ ورنہ کوئی تو ایسا ہوتا جو ہمیں پھیپھڑا دلا دیتا۔ مگر کوئی ایسا ملا ہی نہیں تھا جو بھی ہمیں ملا، وہ ہمیں باندھنے کے لیے ہمارے پاؤں میں پنجنی ڈال کر چلا گیا۔ ایسی پیکڈی باندھ کر نکلا کہ ہم اور زیادہ الجھ کر رہ گئے۔ ورنہ کوئی تو ایسا ہوتا جو ہمارا پکشی بنتا۔ کسی کو تو ہم سے ہمدردی ہوتی۔

ہم کھانا کھانے کے بعد گاڑی میں جا بیٹھے۔ ڈبہ آرام دہ تھا اور مسافر کی ضرورت کا خیال رکھ کر اسے بنایا گیا تھا۔ آبی نشست پر بیٹھا اور پھر یہاں سے وہاں تک خالی جگہ دیکھ کر لیٹ ہی گیا۔

گاڑی جب میانوالی پہنچی تو صبح کے تین بج رہے تھے۔ ہم ڈبے سے نکلے اور سٹیشن سے باہر ایک ہوٹل میں جا ٹھہرے۔ ہوٹل اچھا تھا مگر لاہور کے مقابلے میں کرائے بہت ہی سستے تھے۔ آبی لیٹتے ہی سو گیا مگر میری سوچ کے زاویے پھر آسیہ کی طرف سمٹ گئے۔ اس بدنصیب کے خیال نے پھر مجھے آ گھیرا۔ ساری رات آنکھوں میں گزر گئی۔ تارے جل بجھے ایک ایک کر کے مدھم ہونے لگے۔ کھڑکی کا کھلا دروازہ مجھے آسمان کی خبر دیتا تھا۔ وقت کا احساس مجھے روشنی نے دلایا۔ اجالا دم بدم بڑھنے لگا۔

آبی کو میں نے سات بجے بستر سے اٹھا دیا۔ اس نے لمبی سی انگڑائی لی اور بستر سے اٹھ گیا۔ پھر اس نے تولیہ لیا اور غسل خانے میں جا گھسا۔ اپنے بریف کیس میں وہ ضرورت کی ساری چیزیں بھر لایا تھا۔ یہاں تک کہ حجامت کا سامان بھی۔ ایک بریف کیس اس نے گھر سے چلتے وقت مجھے تھما دیا تھا۔

آٹھ بجے تک ہم ناشتہ کر چکے تو آبی بولا "کیا ارادے ہیں تیرے۔ ذرا پتہ تو کر یہ قندیار ہے کہاں؟"

"ابھی تو ہمیں شب خیر کا پتہ کرنا چاہیے۔ آسیہ کا وہ ناجائز بچہ اسی کے پاس تھا۔"

"ہاں یہ تو ہے مگر اس کو ہم کہاں ڈھونڈیں گے؟ یہ تو بہت مشکل کام ہے۔"

"کچھ سوچنا ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ ہم سیدھے قندیار جا پہنچتے ہیں۔ آسیہ سے مل کر اس کا بھی پتہ مل جائے گا۔"

"بات تو ٹھیک ہے تمہاری، مگر مجھے یہاں کسی پولیس والے سے مل لینے دے۔ میرا خیال ہے کہ وہ شب خیر کے بارے میں ضرور جانتے ہوں گے۔ وہ جیل میں رہ چکی ہے کسی تھانے کے ذریعے ہی وہاں پہنچی ہو گی۔"

"ہاں یہ زیادہ بہتر ہے۔ میں ادھر بیٹھتا ہوں تم خود بازار میں نکل جاؤ۔ کوئی سپاہی ملے تو اسی سے پوچھو ورنہ تو تھانے جا کر پوچھنا پڑے گا۔"

"میں دیکھتا ہوں کوئی نہ کوئی آدمی تو اسے جانتا ہی ہو گا مگر میرا خیال ہے کہ تم بھی میرے ساتھ چلو۔"

"ہاں کیا حرج ہے میں بھی چلتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے [illegible] باندھے اور اپنے کمرے کو تالا لگا کر ہم بازار میں نکل گئے۔ کئی پولیس کے سپاہی ہمیں نظر آئے مگر کسی سے شب خیر کے بارے پوچھنے کی جرأت ہمیں نہیں ہوئی۔ ان سالوں کی نظریں ہی [illegible] دہلائے دیتی تھیں۔

اچانک ایک تانگے والا ہمیں نظر آ گیا۔ آبی سے اس کی نظریں ملیں تو وہ مسکرانے لگا۔ تانگہ ہمارے قریب لا کر بولا "چلنا ہے باؤ جی؟"

"چلنا تو ہے مگر کہاں چلنا ہو گا ہمیں؟" آبی نے اس کے گھوڑے کی گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "کوئی ٹھکانا ہے تیرے پاس؟"

"ٹھکانے بہت! ہزاروں من ٹھکانے۔ ضرورت تو [illegible] کی ہوتی ہے۔ جو دام خرچے۔"

"تو پھر چل۔ جہاں چاہے لے چل۔ آؤ خان جی! [illegible] جاؤ اس کے ساتھ۔"

"یہ کسی فساد میں ہی نہ ڈال دے؟"

"اس کی کیا مجال ہے ہاشم خان! تو بیٹھ تو سہی۔" یہ کہہ کر آبی تانگے کی پچھلی نشست پر جا بیٹھا۔ مجھے اس کا ساتھ دینا پڑا۔ دراصل کوچوان آبی ایسے گاہک کو پہچان لینے کا خاص ملکہ رکھتا تھا۔ اس نے دیکھ لیا کہ یہ موج شوق والا آدمی ہے اور بازار کا پھرا ہوا ہے۔ اس نے آبی کی فوراً ہی شناخت کر لی اور آبی بھی آدمی کو جلدی ہی دلالوں کے اس گروہ کا آدمی سمجھا جو [illegible] چلاتے ہیں۔

تانگہ چل پڑا تو آبی بولا "اس شہر میں بھی یہ دھندا ہو [illegible]"

"او جی بس آدمی ہے نا! ہر جگہ پلیدی بکھیرتا ہے۔ یہ جو غریب لوگ ہیں نا، ان کے ہاں تو سارے ہی پاپڑ بیلنے [illegible] ہیں۔"

"تیرا جواب نہیں ہے استاد! کوئی کام کی چیز بھی ہے کہ نہیں؟"

"ہر شے ملے گی جناب! اور ہر عمر کی، ہر رنگ کی۔"

"یہ بتا کہ کوئی عورت شب خیر بھی رہتی ہے یہاں، سنا ہے اس کے پاس بہت بڑھیا مال ہے۔"

"شب خیر! یہ نام کس نے بتایا ہے آپ کو؟"

"بس کسی نے بتا دیا۔ کوئی رات رہ کر گیا ہے وہاں۔ اس نے لاہور جا کر ہمیں اطلاع دے دی۔"

"اچھا! تو آپ لاہور سے آئے ہیں۔ جب ہی میں کہوں کہ ایسا نظر والا کون ہے جس نے تاجے کو فوراً پہچان لیا۔"

"مانتا ہے نا تو ہمیں! اور یہ علم ہمیں لاہور کی گلیوں نے سکھایا ہے۔ اب تو بتا، ادھر ہی چل رہا ہے نا!؟"

"ٹھیک ہے جناب! میں آپ کو ادھر ہی لے چلتا ہوں۔ وہ شہر کے باہر جس طرف سینما ہے نا، وہاں رہتی ہے۔ بڑی پر فضا جگہ ہے وہ نہر کے کنارے۔"

"پھر تو مزے ہی آ گئے۔ کیوں ہاشم خان! نہر کا ٹھنڈا پانی اور شربتِ وصل، ہائے تاجے! تو بہت بڑا آدمی ہے۔ یو آر گریٹ، تیرا تو اس شہر کے وسط میں بت بننا چاہیے تاکہ لوگ تجھے ہمیشہ یاد رکھیں۔ تیری خدمات اس ملک کے لیے بے مثال ہیں۔"

"او جی کیوں شرمندہ کرتے ہیں آپ اس غریب کو۔ کہتے تو مجھے تاجا دلال ہی ہیں نا۔ پولیس کو بھی پتہ ہے کہ میرے تانگے میں یہی کام ہوتا ہے، پر اپنے یار بیلی ہیں سالے۔ آنکھ میچ لیتے ہیں۔ کبھی کبھار سو پچاس کی چپت بھی دے جاتے ہیں۔"

"چل ٹھیک ہے، اس سے کیا ہوتا ہے۔ تو تانگے کا لائسنس بھی تو لیتا ہے نا! اس دھندے کو بھی سمجھ کہ یہی لائسنس ہے۔"

آبی اس تاجے دلال سے کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہو گیا تھا اور میں چپ چاپ بیٹھا اس کی باتوں پر غور کرتا رہا۔ آبی کا یہ رخ ابھی میں دیکھ ہی نہیں سکا تھا۔ بہت پرانے مہا پاپی ایسا انداز تھا اس کا۔

تانگہ نہر کے پل کی طرف مڑنے کے بجائے سینما کی طرف چل پڑا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم ایک چاردیواری کے سامنے رک گئے۔ دروازہ اس کا دوسری طرف تھا۔ تاجا ہمیں ساتھ لے کر دوسری طرف چل دیا۔ معلوم یہ ہوا کہ وہ مکان اس چاردیواری کے غربی حصے میں بنا تھا اور اس میں چھوٹے چھوٹے دس گیارہ کمرے موجود تھے۔ جب ہمیں تاجا اپنے ساتھ لے کر اندر گیا تو ہمیں مکان کے برآمدے میں ایک عورت بیٹھی نظر آئی۔ عمر اس کی یہی کوئی پچاس پچپن کے درمیان تھی۔ وہ پیچوان سامنے رکھے بیٹھی تھی۔ دو نوجوان لڑکیاں اس کے دائیں بائیں بیٹھی سویٹر بن رہی تھیں۔ تاجے کو اپنی طرف آتے دیکھ کر اس نے ہم پر نظر ڈالی تو بڑے تپاک سے مسکرانے لگی۔

"السلام علیکم باجی جان! کیا حال ہیں آپ کے؟"

"اچھی ہوں تاجے! یہ کن کو ساتھ لے آیا ہے تو آج؟ کوئی دور سے آئے مہمان لگتے ہیں مجھے۔" یہ کہہ کر اس نے پیچوان کی نے لڑکی کے ہاتھ میں دے دی اور خود وہ سرو قد ہو کر کھڑی ہو گئی۔

"یہ خود ہی آپ سے ملنے کے لیے بہت بے تاب تھے باجی جان! ورنہ میں انہیں کسی اور طرف لے جا رہا تھا۔ اپنے نام انہوں نے مجھے نہیں بتائے۔"

"جی میرا نام ہاشم خان ہے اور یہ میرے دوست ہیں پیرزادہ صاحب۔ آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔"

"آپ کی مہربانی ہے جناب! آپ اندر آ جائیں۔ اس گھر کو اپنا ہی گھر سمجھیں۔" یہ کہہ کر اس نے عقبی دروازے پر پڑی چق اٹھا کر ہمیں اندر آنے کے لیے کہا۔ شکل صورت سے وہ بہت ہی گھر گھرستن عورت نظر آتی تھی۔ انداز و اطوار بھی ویسے ہی تھے۔ رنگ اس کا گورا تھا اور چہرے سے رعب ٹپکتا تھا، جیسے وہ اپنا حکم منوا سکتی ہو۔ پیشانی اس کی محراب دار تھی اور بال گھنے۔ وہ سرمہ لگاتی تھی مگر ہونٹوں کو رنگتی نہیں تھی۔ وہ آپ ہی آپ سرخیاں بکھیرتے تھے۔ صحت اس کی بلاشبہ بہت اچھی تھی۔ جب وہ بات کرتی تھی تو نچلا ہونٹ زیادہ ہی پھیل جاتا تھا، جس سے اس کے بات کرنے کے انداز کو دلفریبی ملتی تھی۔

"آئیے اندر بیٹھ جائیں۔ تو باہر بیٹھ جا تاجے، میں تجھ سے ابھی بات کرتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ ہمیں مکان کے وسطی کمرے میں لے گئی۔ فرش پر سرخ رنگ کا قالین بچھا تھا، جس کے تین اطراف کرسیاں اور صوفے لگے تھے۔ وسط میں ایک بڑا سا شیشے سے مزین میز سجا تھا۔

ہمیں بڑے تپاک سے اس نے صوفے پر بٹھا دیا۔ اس کی ملازمہ کا نام شاید سگو تھا۔ بولی "سگو ادھر آ ذرا، ان کے لیے چائے بنا دے، آپ اطمینان سے بیٹھیں جناب! یہ سگریٹ ہیں لے لیں۔" یہ کہہ کر وہ ہمارے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کی نظریں ہمارے وجود میں دھنسی جاتی تھیں۔ احساس ہمیں یہ تھا کہ ہم کسی بہت ہی زمانہ شناس عورت کے سامنے آ بیٹھے ہیں، جسے معلوم ہے کہ لوگوں کے منہ سے سچی بات کیسے کہلوائی جا سکتی ہے۔ وہ تتا تو ہرگز نہیں تھی۔ بہت دھیرج سے بات کرتی تھی۔ اور میں یہ سمجھتا تھا کہ وہ کبھی کسی معاملے پر کسی سے ناراض نہیں ہوئی ہو گی۔

"آپ نے کیسے زحمت فرمائی؟ میرا خیال ہے میں نے آپ کو پہلی بار دیکھا ہے۔"

"جی ہاں! یہ شہر ہم نے پہلی بار دیکھا ہے۔ اس تاجے سے ایسے ہی بازار میں ملاقات ہو گئی۔ آپ کا ذکر بڑی محبت سے کرتا تھا، سو ہم ادھر آ گئے۔"

"اس کی مہربانی ہے۔ آدمی کے دل میں تپک تپس ہو تو اسے تاجے ایسے لوگ مل ہی جاتے ہیں ویسے آپ کا شغل کیا ہے، میرا مطلب ہے کاروبار؟"

آبی نے پہلو بدلا اور سگریٹ سلگا کر بولا "یہ بہت بڑے صنعتکار ہیں۔ توپیں اور ٹینک بناتے ہیں۔ ان کا نام شاید آپ نے سن رکھا ہو، حاجی ہاشم خان۔ بس ایسے ہی کبھی کبھار موج میلے کے لیے باہر نکل آتے ہیں۔"

"اچھا۔ کمال ہے۔ میں سمجھی شاید آپ کی کوئی جنرل اسٹور کی دکان ہے۔ اب پاکستان میں ٹینک بھی بننے لگے ہیں؟"

"اندر ہی اندر سب کچھ تیار ہو رہا ہے خانم! جس طرح آپ لڑکیوں کی جنس بدل کر انہیں کسبی بنا دیتی ہیں۔ یہ بھی لوہے کی جنس بدل دیتے ہیں۔ کوئی رونق نظر نہیں آتی ہے یہاں، تنہا رہ رہی ہیں آپ؟" آبی نے کئی سوال کر ڈالے۔

"میں عرفان علی صاحب کی بیوہ ہوں جناب! باہر آپ نے ان کے نام کی تختی دیکھی ہو گی۔ میں یہاں تنہا ہی رہتی ہوں۔ کچھ نوکرانیاں میرے ساتھ ہیں۔"

"ہاں ہاں! اچھا تو اُن کی بیوہ ہیں آپ! بات یہ ہے خانم! آپ کو شب خیر ہی کہتے ہیں نا؟"

"ہاں مگر میرا اصل نام تحسین بیگم ہے۔ عرفان صاحب نے مجھے شب خیر کہنا شروع کر دیا تھا۔"

"اچھا اچھا۔ یعنی دن کو آپ کے ہاں خیر نہیں ہوتی۔ یہی مطلب ہے نا آپ کا؟"

وہ آبی کے اس فقرے پر کچھ جز بز سی ہو گئی۔ سنجیدہ سی صورت بنا کر بولی "ایسا تو نہ کہیں، دن کو بھی یہاں خیر ہی ہوتی ہے جناب! آپ حکم کریں۔"

"بات یہ ہے خانم کہ ہمیں۔۔۔ کیا آپ جیل میں رہ چکی ہیں؟"

"یہ بات آپ کو کس نے بتائی؟" وہ کچھ اور سنجیدہ ہو گئی۔

"یہ ہماری معلومات ہیں۔" آبی نے پہلو بدلا۔ وہ اب اصل سوال کی طرف آ رہا تھا۔

"ہاں۔ یہ سچ ہے پولیس نے ہمیں صد بازی میں ایک سال کے لیے جیل بھیج دیا تھا۔"

"چلیں کوئی بات نہیں۔ یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ مجھے یہ بتائیں کہ کوئی لڑکی آسیہ نام کی آپ کے علم میں ہے؟"

آبی کا یہ سوال سن کر شب خیر الجھ کر رہ گئی، اسے بڑے غور سے دیکھتے ہوئے بولی "اس کا کیوں پوچھتے ہیں آپ؟ آپ کی عزیز ہے وہ؟"

"ہاں! وہ ہماری بہن ہے خانم! اور ہم اسی کے لیے یہاں آئے ہیں۔"

"کوئی ثبوت ہے اس بات کا؟"

"ثبوت تو کوئی نہیں ہے ہمارے پاس! کوئی کسی کو بہن ثابت کرنے کے لیے ثبوت کہاں سے لائے گا۔ ہمارے خون کا گروپ البتہ ثابت کر سکتا ہے کہ وہ ہماری بہن ہے۔"

"بہت بدنصیب لڑکی ہے وہ۔ جیل میں وہ کچھ دنوں میرے ساتھ رہی۔ وہ اس وقت راولپنڈی جیل میں تھی کسی نے اسے وہاں سے فرار ہونے میں مدد دی۔ میں نے اسے اپنا پتہ دیا تھا۔ وہ جیل سے نکلی تو معلوم ہوا کہ وہ حاملہ ہو چکی ہے اور یہ کام جیل کے ڈاکٹر کی وساطت سے ہوا تھا۔ کوئی لاکھو نام کا آدمی تھا، وہ اس کی بھینٹ چڑھی تھی، لاکھو لاشاری۔ ہاں یہی نام تھا اس کا۔ آسیہ نے جیل سے فرار ہونے کے بعد کسی جگہ سے پستول لیا۔ اور اس ڈاکٹر کو اس کی کوٹھی پر جا کر مار دیا۔ پولیس کو اس بات کی اگ سُنگ مل گئی اور اس نے آسیہ کا تعاقب کیا مگر وہ سیدھی میرے پاس آ گئی۔ اس کا بچہ میرے ہی گھر میں پیدا ہوا۔ مگر وہ بچے کو یہاں چھوڑ کر آگے نکل گئی۔"

"ہم یہی بات معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ اب وہ کہاں ہے؟" میں نے پہلی بار اس گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

"مجھے افسوس ہے میں اب اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ وہ ایک دن یہاں سے چپ چاپ نکل گئی۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے خانم! آپ کو تو ضرور معلوم ہو گا، اُس کا بچہ کہاں ہے؟"

"وہ ادھر ہی ہے سُگّو اسے پال رہی ہے۔ اری سُگّو! چائے کہاں گئی؟" اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے ملازمہ کو آواز دی۔

"لا رہی ہوں بیگم صاب! لا رہی ہوں۔" یہ کہتی ہوئی سُگّو کمرے کے اندر آئی۔ وہ چائے کے سامان سے لدی پھندی ٹرے اٹھائے ہوئے تھی۔

"وہ چیکو کہاں ہے؟ اسے لا ادھر، اس کے ماموں آئے ہیں۔"

"وہ سو رہا ہے۔ دودھ پلا کے میں نے اسے سُلا دیا تھا۔ ابھی لاتی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ انہی قدموں لوٹ گئی۔ شب خیر نے چائے کے برتن سیدھے کیے اور اُن میں چائے انڈیلنے لگی۔

چند ہی ساعتوں بعد ہمیں سُگّو واپس آتی نظر آئی۔ اُس کے کندھے سے ایک گول مٹول سا خوبصورت فراک میں ملبوس بچہ لگا ہوا تھا۔ اس کو دیکھ کر مجھے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی۔ شب خیر کی مسکراہٹ مجھے یہی بتا رہی تھی کہ وہ اس معاملے کو کس نظر سے دیکھتی ہے۔ ماموں کے لفظ پر اُس نے بہت زور دیا تھا۔ بچے کو لا کر سُگّو نے میری گود میں دے دیا۔ آسیہ سے اس کی مشابہت برائے نام ہی تھی بلکہ نہ ہونے کے برابر تھی۔

"میں نے اس کا نام بلال احمد رکھا ہے۔ سُگّو اسے چیکو کہتی ہے۔ یہ کچھ زیادہ ہی چیخیں مارتا تھا مگر اب اس کو آرام مل رہا ہے۔ سُگّو اس کی بہت خدمت کرتی ہے۔"

میں نے چیکو کو سُگّو کے حوالے کر دیا، مجھے اس سے کوئی رغبت محسوس نہیں ہوتی تھی۔

"آسیہ نے اس کو بہت مارا تھا۔ وہ اس کو جان ہی سے مار دینا چاہتی تھی مگر میں نے اسے بچا لیا۔ اس کا بھلا کیا قصور تھا۔ میرا خیال ہے آپ کو بھی اس سے ہمدردی ہو گی۔"

"لے جاؤ اسے سُگّو! آسیہ کو یہ کیسے اچھا لگ سکتا ہے۔ اس کی ممتا ہی مر گئی ہو گی اسے دیکھ کر۔ یہ اس کی مجبوری کا منہ بولتا ثبوت ہے۔" میں نے بچہ اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں وہ یہی کہہ رہی تھی۔ اس نے لاکھو سے ملاقات بھی کی تھی۔ اس نے بہت زور دیا مگر وہ اس کے پاس نہیں رہی۔ راولپنڈی واپس آ کر اس نے ڈاکٹر کو بھی مار دیا۔"

"بہت اچھا کیا ہے اس نے۔ لاکھو اس کا کیا لگتا تھا۔ میں آپ کا ممنون ہوں، مجھے آپ آسیہ کا پتہ بتا دیں۔ میرے لیے وہ لڑکی عذاب بن گئی ہے۔"

"میں کچھ نہیں کہہ سکتی ہوں۔ اپنا پتہ وہ میرے پاس چھوڑ کر نہیں گئی ہے۔ پولیس سے وہ بہت خائف تھی اور میرا خیال ہے کہ اس کا جرم وہ ثابت بھی کر سکتے تھے۔"

"یہ آپ کیسے کہہ سکتی ہیں؟"

"اس لیے کہ جس ٹیکسی میں وہ ڈاکٹر کی کوٹھی پر گئی، اُس کا ڈرائیور بھی گواہ ہے۔ اُسے آسیہ کے ارادے کا علم نہیں تھا۔ اُس نے گولی کی آواز بھی نہیں سُنی تھی مگر وہی اسے مکان پر لے کر گیا تھا اور اسی کے ساتھ وہ واپس آ گئی تھی۔ کوٹھی سے نکل کر وہ صدر پہنچی تو اس نے دوسری ٹیکسی پکڑ لی۔ ڈرائیور کا بیان بہت کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔"

"اور کیا کچھ بتایا ہے اس نے؟"

"آسیہ کی شکل صورت کا پورا نقشہ کھینچ دیا ہے اس نے، یہاں تک کہ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ حاملہ عورت ہے۔"

"آپ کا میں بے حد شکر گزار ہوں مگر میں تو بہر حال اس سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"آپ تلاش کریں اسے، مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ میرے پاس اس کا پتہ بہر حال نہیں ہے۔"

"ذرا رُک کے خانم! یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ! وہ قندیار کا قصہ کہاں تک درست ہے؟" آبی اسے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔

"کیا مطلب؟ مجھے تو اس بارے میں کچھ علم نہیں ہے۔" اس نے چائے کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ حیرت سے اس کی بجیری آنکھیں کچھ اور دراز ہو گئی تھیں۔

"ایسا نہ کہیں! آپ کو سب کچھ معلوم ہے۔ قندیار کا بکرم علی اسے یہاں سے اپنے گھر لے گیا ہے۔ آپ پر لازم ہے کہ قومی ترانہ سنیں تو کھڑی ہو جائیں۔" آبی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ کچھ پریشان سی ہو گئی، بولی "آپ کس ترانے کی بات کر رہے ہیں؟"

"وہی جو قندیار میں بج رہا ہے۔ آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہو گا خانم! اگر ہمیں آسیہ نہ ملی تو ہم برباد ہو جائیں گے۔" آبی نے چائے کا ایک نیا کپ بنا لیا۔

عین اس وقت عقبی کمرے سے ہمیں کسی عورت کی زبردست چیخیں سنائی دیں۔ ابھی ہم اس پر غور ہی کر رہے تھے کہ دوسرے کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک عورت اپنا دریدہ لباس سنبھالتی ہوئی روتی چیختی ہمارے کمرے میں آ گئی۔ بال اس کے کندھوں پر پھیلے ہوئے تھے اور چہرہ اس کا ہلدی ہو رہا تھا۔ ایک آدمی تیزی سے اس کے پیچھے لپکا۔ وہ صرف پاجامہ پہنے ہوئے تھا۔ آتے ہی اس نے عورت کو بالوں سے پکڑ کر اندر کھینچ لیا اور اتنی تیزی سے اس نے دروازہ دوسری طرف سے بند کر لیا کہ آبی کے اٹھے ہوئے قدم وہیں رک گئے۔

"بالکل پاگل لڑکی ہے یہ۔ حالانکہ گاہک نے اسے ہزار روپے دے دیے ہیں۔ گدھی کہیں کی۔" شب خیر نے ہنستے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں بلا کا فخر پنہاں تھا جیسے کہہ رہی ہو کہ اس کے گاہک کوئی ایسے ویسے تھوڑی ہوتے ہیں۔

"یہ۔۔۔ یہ کیا ہو رہا ہے خانم؟"

"میں نے کہا نا کہ یہ لڑکی کسی وقت بالکل پاگل ہو جاتی ہے۔ گاہک نے مال پانی خرچ کیا ہے تو پھر یہ نخرے کیسے؟ میں دیکھتی ہوں آپ چائے پئیں۔" یہ کہہ کر وہ کمرے کے بڑے دروازے تک گئی اور پھر دائیں طرف نکل گئی۔

"یہ۔۔۔ یہ جگہ تو مجھے کوئی اور ہی منظر دکھاتی ہے ہاشم خان! یہ کیا ہو رہا ہے یہاں؟"

"میرا خیال ہے وہ لڑکی اس دھندے میں نئی نئی آئی ہے،

آؤ ذرا دیکھتے ہیں کہ وہ کون ہے؟" یہ کہہ کر میں آبی کو ساتھ لے کر کمرے سے نکلا اور چھوٹی سی چار پانچ فٹ کی راہداری میں سے گزر کر ہم عقبی کمرے کے بڑے دروازے تک جا پہنچے۔ شب خیر ہمیں نظر نہیں آئی۔ ہم نے دروازے پر ہاتھ مارا تو اس کے پٹ آپ ہی کھل گئے۔ کمرے میں وہ لڑکی کرسی پر ڈھیر کر دی گئی تھی۔ اور وہ آدمی اس کے پاس کھڑا تھا۔ وہ اب بھی اس کے بالوں کا جوڑا ہاتھ میں لیے اس کے چہرے کو الٹ رہا تھا۔ اس کا انداز بہت ہی وحشیانہ تھا۔ اس کی آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں اور چہرے پر ہوس کی بدا ہر کچھ اس طرح چھائی تھی کہ اسے نہ تو شب خیر نظر آتی تھی نہ ہم۔ وہ لڑکی پر جھک کر اسے کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لڑکی کی آنکھیں بند تھیں اور وہ پھٹی ہوئی تار تار قمیص اور دوپٹے سے اپنی برہنگی چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے سردار صاحب! یہ کیا طریقہ ہے آخر؟" شب خیر نے کہا۔

"ادہ آپ! اس کو سمجھائیں' یہ مجھے زبردستی پر مجبور کر رہی ہے۔" اچانک اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ وہ بدک سا گیا۔ لڑکی کے بال اس نے چھوڑ دیے اور ہمارے سامنے ایک دم تن کر کھڑا ہو گیا۔

"یہ — یہ کون ہیں؟ ان کو اندر آنے کی اجازت کس نے دی؟ آپ لائی ہیں انہیں؟"

"نہیں! یہ میرے مہمان ہیں' ایسے ہی میرے پیچھے آ گئے ہیں۔"

لڑکی نے ہمیں دیکھا تو کرسی چھوڑ کر وہ ایک دم تیزی سے اٹھی اور آبی کے قدموں میں جا گری۔

"مجھے بچالیں بھائی جی! میری عزت سخت خطرے میں ہے۔ یہ۔۔۔ یہ عورت۔۔۔۔"

"بکواس بند کر۔ آپ باہر جائیں بھائی جی' میں خود نپٹ لوں گی اس سے۔ جائیں آپ باہر۔ اٹھ جا ادھر سے' وہ ہزار روپیہ خرچ کر رہا ہے تجھ پر' جانے کیسے دے گا۔"

"روک کے خانم روک کے۔ یہ کس ہزار کی بات کرتی ہیں آپ! یہ لڑکی کون ہے؟"

"میں نے اس کی فیس دی ہے بھائی جی! آپ جائیں یہاں سے۔ ہم یوں بے عزت ہونے کے لیے تو نہیں آتے تھے' شب خیر! مجھے سخت افسوس ہے کہ آپ نے ہمارے ساتھ دھوکا کیا ہے۔" یہ کہہ کر اس آدمی نے فوراً ہی قمیص پہن لی۔ اس کی شیروانی بھی الگنی پر ٹنگی تھی اور پستول کی پیٹی بھی۔ پستول اتار کر اس نے فوراً ہی کندھے پر لٹکا لیا۔ اب وہ جوتوں میں پاؤں پھنسا رہا تھا۔

"دھوکا نہیں ہے سردار صاحب! یہ لڑکی ابھی کچی ہے۔ یہ پہلا موقع ہے اس کا اس لیے ستا رہی ہے آپ کو۔ چل ری اٹھ یہاں سے

تو کب تک ہمیں ستائے گی' خراب کرتی رہے گی۔" خانم نے لڑکی کا دوپٹہ اس کے نیم برہنہ جسم پر ڈالتے ہوئے کہا اور اسے زمین پر سے اٹھانے لگی۔

وہ آبی کی طرف اور کھسک گئی' بولی "یہ جھوٹ بولتی ہے' میری بدقسمتی مجھے یہاں لے آئی اور اس نے مجھے نیلام پر چڑھا دیا' میں شریف خاندان کی بیٹی ہوں بھائی جی! مجھے بچالیں ان لوگوں سے۔" وہ بلکنے لگی تھی۔ اس کی آنکھوں سے یہ موٹے موٹے آنسو گر رہے تھے۔

آبی کا دل کچھ زیادہ ہی پسیج گیا۔ وہ جھکا اور لڑکی کو فرش پر سے اٹھا کر بولا "ان کے لیے کوئی اور کپڑے ہیں تو انہیں دے دیں۔ ہمیں نہیں معلوم تھا کہ یہاں دھاندلی چل رہی ہو گی۔"

"کوئی کپڑے نہیں ہیں اس کے۔ یہی ایک جوڑا لائی تھی یہ۔ ہفتہ بھر پہلے یہ میرے پاس آئی۔ خود کہہ رہی تھی مجھ سے کہ کسی سے میرا نکاح پڑھوا دیں۔ اب نخرے کرتی ہے۔ بہر حال آپ کا یہاں کوئی کام نہیں ہے۔ چل ری! میں تجھ سے بعد میں بات کروں گی۔ چل ادھر۔ آپ اطمینان سے بیٹھیں سردار صاحب! میں ابھی اس کا مزاج ٹھکانے لگا دوں گی۔" یہ کہہ کر اس نے لڑکی کو گھسیٹ کر دوبارہ سے باہر نکالنا چاہا مگر وہ کسی بھی طرح اس کے ساتھ نہیں جا رہی تھی۔ آبی نے شب خیر کا ہاتھ جھٹک دیا اور بستر کی چادر لے کر اس نے لڑکی کے بدن پر ڈال دی۔

"آئیں! ہم دوسرے کمرے میں جا کر بات کرتے ہیں۔ آپ بھی نہ جائیں سردار صاحب! آپ کی فیس بھی واپس کر دی جائے گی۔" یہ کہہ کر آبی اس لڑکی کو ساتھ لے کر راہداری میں نکل گیا۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد میں بھی اس کے پیچھے ہو لیا۔ جب ہم شب خیر کی نشست گاہ میں پہنچے تو وہ لڑکی ایک بار پھر کرسی پر ڈھیر ہو گئی۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا ورنہ وہ بوند کی طرح زمین میں جذب ہو جاتی۔ نین اس کے بھادوں کی بھرن ہو کر رہ گئے تھے۔ اس کے آنسو ہی نہیں تھمتے تھے۔ وہ اس مرحلے کے لیے بنی ہی نہیں تھی۔ خیال ہے کہ شب خیر نے اسے دو رات کے لیے گھر میں پناہ دے کر اس کو نیلام چڑھا دیا تھا۔ لڑکی کا سارا بدن تھر تھر کانپ رہا تھا۔

"کیا کہہ رہی ہے یہ گستی! میں اس کے ٹکڑے کر دوں گی۔ یہ ذلیل کہہ رہی تھی کہ میرے نان نفقے کا بندوبست کر دیں۔ جب گاہک آیا تو یہ فیل مچاتی ہے۔" شب خیر نے گرجتے ہوئے کہا۔

"میں نے یہ کب کہا تھا کہ آپ مجھے یوں بیچ دیں؟"

"تیری ایسی تو یوں ہی بکتی ہیں' کیا ہے تیرے پاس! بدن ہی ہے' وہ اسی طرح بکے گا۔"

"روک کے خانم روک کے' یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟" آبی نے بڑے ہی طنز بھرے لہجے میں کہا۔

"آپ نے میری چڑ ہی بنالی ہے۔ روک کے خانم روک کے۔ آخر مطلب کیا ہے آپ کا؟ کیا لگتی ہے یہ آپ کی؟"

"اب تو یہ میری بہن بن چکی ہے خانم! اور میں ایک لفظ اس کے خلاف سننا پسند نہیں کروں گا۔ کہاں ہیں وہ سردار صاحب؟"

"وہ بھی آ رہے ہیں۔ مجھے ان کو فیس لوٹانی پڑے گی۔ اس نے تو مجھے پریشان کر دیا ہے۔ اس گستی نے۔"

"سوچ سمجھ کے بات کریں خانم! اور یہ بکواس بند کریں۔ اس لڑکی کے خلاف میں آپ سے ایک لفظ نہیں سنوں گا۔ اوئے سردارا! کیا نام ہے تیرا کتے کے بچے!" آبی ایک دم طیش میں آ گیا۔ خانم کا گاہک دروازے میں داخل ہو رہا تھا۔

"کیا نام ہے تیرا؟" آبی کی زنجیر ٹوٹنے لگی تھی۔

"یہ کیا طریقہ ہے بات کرنے کا؟ کون ہیں آپ؟ مجھ سے مخاطب کس طرح ہوتے ہیں؟" اس کا ہاتھ پستول کی طرف لپکنے لگا۔ "پتہ ہے تمہیں کہ تم کس سے بات کر رہے ہو۔ سردار علی عاشق کو نہیں جانتے ہو تم' بدمعاش! تم بات کس طرح کرتے ہو؟"

ابھی اس کا ہاتھ پستول تک نہیں پہنچا تھا کہ آبی ایک دم چیتے ایسی پھرتی سے اس کے پاس جا پہنچا۔ اور جاتے ہی اس نے علی عاشق کا دایاں ہاتھ کلائی سے پکڑ کر کچھ اس طرح مروڑ دیا کہ وہ آدمی بے بس ہو کر رہ گیا۔ مڑا ہوا ہاتھ کمر پر پہنچا تو اس نے میری توقع کے بالکل برعکس قلابازی جو کھائی تو آبی کے ہاتھ سے اس کی کلائی چھوٹ گئی۔ اور وہ اندھے بھینسے کی طرح آبی پر پل پڑا مگر اس کا کوئی بھی ہاتھ اس کے بدن پر سیدھا نہیں پڑ رہا تھا۔ شیروانی کے اوپر سے کھسک کر اس کا پستول نیچے جا پڑا تو اس نے آگے بڑھ کر آبی کی گردن پر دونوں ہاتھ اس طرح ملائے کہ اگر آبی پیچھے جھک کر اپنے گھٹنے اس کے پیٹ میں نہ دے مارتا تو میرا خیال ہے کہ وہ اسی وقت آبی کو چت کر سکتا تھا۔ جیسے ہی آبی نے کمر کے بل پر لیٹ کر علی عاشق کے پیٹ میں دونوں گھٹنے دے کر اسے اٹھایا تو وہ پلٹ کر سامنے دیوار میں جا لگا۔ سردار علی عاشق کوئی معمولی شے کا نام نہیں تھا' اسے اپنے کماتے ہوئے بدن پر بہت ناز تھا۔ شب خیر انگشت بدنداں یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی — وہ عام عورتوں کی طرح واویلا نہیں مچا رہی تھی اور وہ لڑکی کرسی پر بیٹھی برابر لرز رہی تھی۔ میں نے بھی ان کے درمیان مداخلت نہیں کی۔ آبی کی تھک بیٹھک ضروری تھی۔ بہت دنوں سے اس کا بدن کھل نہیں رہا تھا۔

دیوار سے لگتے ہی علی عاشق نے نیفے میں سے ایک خنجر نکال لیا۔ یہ اس سالے کی سراسر زیادتی تھی۔ اس کا انداز اب کچھ زیادہ ہی جارحانہ ہو گیا تھا۔ اور مجھے یوں لگتا تھا جیسے وہ مرنے مارنے پر تل چکا ہے۔ آبی نے خنجر کو یوں تکتے دیکھا تو ایک لحظے کے لیے تو وہ پریشان ہو گیا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ سردار چاہتا کیا ہے۔ مگر وہ دراصل اپنی بے عزتی کا انتقام لینے پر تل چکا تھا۔ دونوں آدمی ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ علی عاشق کا پستول پیٹی سمیت کونے میں جا لگا تھا۔ آبی کی نگاہ اس کی نظروں کا تعاقب کر رہی تھی۔ خنجر سیدھے ہاتھ میں لیتے ہی اس نے آبی کو زبردست قسم کی گالی دی اور اس کا پھل ہاتھ میں لے کر خنجر کو اس نے آبی پر اس طرح چلایا کہ اگر وہ اس کی نظر کو نہ تولتا تو وہ چت ہو گیا تھا۔ خنجر آبی کے سینے سے چھوتا ہوا دروازے میں جا لگا۔ آبی اپنا آپ بچا گیا تھا۔ مگر اس طرح کہ خنجر کے سامنے آتے ہی اس نے اپنی چوڑی چکلی چھاتی کو ایک دم پیچھے ہٹا لیا تھا۔ آبی نے تیزی سے دیوار تک پہنچ کر اس کا پستول اٹھا لیا۔ اور جیسے ہی علی عاشق کا ہتھیار اس کے ہاتھ میں آیا' اس نے ہار مان لی۔ پلٹ کر دیوار کے ساتھ لگ کر سردار نے ہاتھ اوپر اٹھا لیے۔ اسے معلوم تھا کہ شکست کس طرح تسلیم کی جاتی ہے۔ پستول کی گولی جس طرح بدن پر بندر کا گھاؤ ڈال دیتی ہے' اس کا علی عاشق کو اچھی طرح علم تھا۔

"کیا خیال ہے تمہارا سردار صاحب! چلا دوں گولی؟" آبی نے اپنا سانس روکتے ہوئے کہا۔

"تمہیں شاید اس کی بہت زیادہ قیمت ادا کرنی پڑے۔ میں جا رہا ہوں شب خیر! یہ ہزار روپیہ ہم نے تمہیں معاف کیا۔ لڑکی سیدھی ہو جائے تو ہمارے ڈیرے پر بھیج دینا۔ اب کی بار ہم یہاں نہیں آئیں گے۔ لائیں یہ پستول مجھے دے دیں۔"

"اوئے جا دوڑ یہاں سے۔ یہ ہمارے ہی پاس رہے گا۔ تمہاری نشانی کے طور پر۔" آبی نے دروازے کے پٹ میں سے خنجر کو بائیں ہاتھ سے کھینچتے ہوئے کہا۔

"یہ نہیں ہو سکتا۔ ہم نے اپنی ہار تسلیم کر لی ہے۔"

"اوئے جا تو بند کشادہ آدمی سردار علی عاشق! دفع ہو جا یہاں سے۔ اسے پکڑیں خان صاحب! میں اسے باہر دھکیل کر آتا ہوں۔" آبی نے خنجر میری طرف پھینک دیا۔ "چلو نکل جاؤ یہاں سے اور بھول جاؤ کہ تمہارے ساتھ کوئی زیادتی بھی ہوئی تھی۔"

سردار بے بس ہو گیا۔ پستول آبی نے یوں تھام رکھا تھا کہ اس کی طرف سے ذرا سی حرکت ہو جاتی تو وہ گولی داغ دیتا۔ سردار نے صورت حال کو سمجھتے ہوئے اسی وقت دروازے کا رخ کیا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

تاجا اس عرصے میں شور سن کر دروازے پر آ کھڑا تھا۔ سردار

عاشق علی جیسے ہی باہر نکلا، وہ کمرے میں آگیا۔ بولا: "یہ کیا ہو رہا ہے بی بی جی! ادھر تو پستول بھی نکل آئے۔"

"تم جاتا جے! باہر بیٹھ۔ میں دیکھتی ہوں یہ کیا کہتے ہیں۔ آخر آپ ہیں کون؟ میرے گھر میں ڈرامہ کرنے کی آپ کو جرأت کیسے ہوئی؟"

"بہتر ہے شب خیر کہ تم آسیہ کا پتہ ہمیں بتا دو ورنہ اچھا نہ ہوگا۔" آبی نے اب کی بار اُسے آڑے ہاتھوں لیتے ہوئے کہا۔ اس کا لہجہ بہت ہی تلخ ہو چکا تھا۔

"یہی بہتر ہے شب خیر! خدا تمھارے جیسے کو آباد رکھے۔ ہمیں بہت جلدی ہے۔" میں نے خانم کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ یوں جیسے وہ بھی بکاؤ مال ہو۔

وہ ایک دم سمٹ کر پیچھے ہٹی۔ "میں نے کہہ جو دیا کہ مجھے اُس کا کوئی پتہ نہیں۔ آپ کو یقین کیوں نہیں آتا؟"

"ہماری بہن قندہار میں مکرم علی کے پاس تمھاری ہی وجہ سے پہنچی ہے ذلیل عورت! اور تمھیں ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔" میں نے اب کی بار اس کے بالوں کا جوڑا پکڑ کر اسے جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔

"تم... تمھاری یہ جرأت! خبردار! جو مجھے ہاتھ لگایا تو میں تمھارے ٹکڑے کر دوں گی۔ مت سمجھنا کہ مجھے بھی سردار علی عاشق کی طرح دبوچ لو گے۔ یار محمد! ارے او یار محمد!" یہ کہہ کر اس نے دیوار میں لگی ایک گھنٹی دبا دی۔

"تو اور کیا سمجھیں تمھیں! ساری بات کا علم ہے تمھیں اور پھر بھی انکار کر رہی ہو، یہ کہاں لکھا ہے خانم!" میں نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ مگر وہ فوراً ہی وہاں سے دبک کر دروازے کی طرف لپکی۔ تو اسی وقت تین آدمی راہداری میں سے نکل کر اس کے پاس آ پہنچے۔

وہ تینوں اس گشتی کے غنڈے تھے، اُن کی صورتیں ہی قابلِ نفرت تھیں۔ بدن اُن کے خوب تنے ہوئے تھے۔ وہ لمبے کرتے اور تنگ شلواریں پہنے ہوئے تھے۔

"کیا بات ہے خانم! خیر تو ہے؟"

"اِن شہدوں سے نپٹو یار محمد! نکال دو اِن کو میرے گھر سے۔ پتہ نہیں کہاں سے آ گئے ہیں یہ کسی بات کا لحاظ ہی نہیں ہے انھیں۔"

اس کی یہ بات سن کر یار محمد نے ہمیں پھاڑ کھانے والی نظروں سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں کی لہو رنگ سرخی ہمیں یہ احساس دلاتی تھی کہ وہ شراب پیتا رہا ہے۔ اس کے ساتھی اس کے عقب میں چلتے ہوئے اندر آ گئے۔ آبی نے اس عرصے میں پستول کندھے پر لٹکا لیا تھا۔

"کون ہو تم اوئے! یہ کیا چکر چلا رہے ہو؟ جانتے ہو یہاں سے کہ نہیں؟"

"ہم دراصل خانم کے ساتھ معاملہ کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارا اسی پر دل آ گیا ہے۔" آبی نے پستول سیدھے ہاتھ میں لے لیا۔ لگ رہا معلوم تھا کہ اب کی بار معاملہ اتنا آسان نہیں تھا۔ وہ تینوں ہٹے کٹے بہت مضبوط دکھائی دیتے تھے اور خانم نے اُن کو ایسے ہی موقعوں کے لیے پال رکھا تھا۔ بیٹھے بیٹھے وہ بھی تنگ آ چکے تھے اور چاہتے تھے کہ تھوڑی سی ورزش ہو جائے۔

"اچھا! تو یہ معاملہ ہے۔ کیا خیال ہے خانم! فیس پوری دیتے ہیں تو چلی جاؤ اِن کے ساتھ۔" یار محمد نے ہنستے ہوئے کہا اور آبی کی طرف گھوم کر اس نے کچھ ایسی تیزی سے اچھل کر پاؤں کی ٹھوکر اس کے ہاتھ پر لگائی کہ پستول اس لڑکی کے پاؤں میں جا گرا جو اس افراتفری میں دیوار کے پاس جا ٹھہری تھی۔ اس نے نیچے جھک کر فوراً ہی اسے اٹھا لیا۔ مگر اس کا منی سی مورت سے وہ ہتھیار جس شکتی کا تقاضا کرتا تھا، وہ اسے مل ہی نہیں سکتی تھی۔ دوسرے لمحے میں یار محمد نے آبی کے دونوں پنجے اپنی گرفت میں لے لیے اور بولا: "بہتر ہے تم یہاں سے فوراً نکل جاؤ۔ خانم کا یہی حکم ہے۔"

مگر آبی کے لیے یہ توہین ناقابلِ برداشت تھی۔ اس نے یار محمد کو دونوں پنجے دور تک کھینچنے کی مہلت دی اور پھر کچھ ایسی برق رفتاری سے آگے بڑھ کر اس کے سر سے اپنا سر ٹکرایا کہ پنجوں پر اس کی گرفت ایک دم مہمل ہو کر رہ گئی۔ آبی کے سر کی ٹکر کوئی کوئی ہی برداشت کر سکتا تھا۔ یار محمد لڑکھڑا کر دیوار میں جا لگا تو آبی نے لڑکی کی طرف بڑھ کر پستول اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور... اور میں یہ دیکھ کر لرز اُٹھا کہ اس نے یار محمد پر بے دریغ گولی چلا دی تھی مگر اس کے اندازے کے بالکل برعکس پستول خالی تھا۔ اگر خالی نہیں تھا تو اس میں گولی جام ہو کر رہ گئی تھی۔ کوئی نہ کوئی نقص ضرور پڑا تھا۔ پستول اس کے ہاتھ میں بے جان کھلونا بن کر رہ گیا۔ اتنی سی مہلت سے فائدہ اٹھا کر اُن دو میں سے ایک نے تیزی سے آگے بڑھ کر میرے منہ پر ایسا زوردار چھانپڑ دیا کہ میں سمجھا میرا مغز ہی ہل گیا ہے۔ وہ ان تینوں میں سب سے زیادہ طاقتور تھا۔ پستول لڑکی کے حوالے کر کے آبی نے اس کے عقب میں آ کر اس کے بال پکڑے تو تیسرا آدمی آبی سے الجھ گیا۔ میں نے اس پہلوان کو گریبان سے پکڑ لیا۔ آبی نے ابھی تک اس کے بال نہیں چھوڑے تھے۔ دائیں ہاتھ سے وہ تیسرے آدمی کے وار روک رہا تھا۔ پہلوان کا گریبان میرے ہاتھ میں آیا تو اس نے زوردار جھٹکا دے کر اپنے بال آبی کی گرفت سے چھڑا لیے اور ایک زبردست مکا اُس نے میرے منہ پر جڑ دیا مگر وہ مکا ہی اُس

کے لیے مصیبت بن گیا۔ میں نے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ کلائی سے پکڑا اور جھٹکا دے کر اس کی کلائی پر دباؤ جو ڈالا تو اس کی ہڈی چیخ گئی۔ کلائی دو حصوں میں بٹ چکی تھی۔ ایک مہیب چیخ اس کے منہ سے نکلی اور وہ کلائی تھام کر وہیں فرش پر بیٹھ گیا۔ حالانکہ وہ بڑے مضبوط بدن کا آدمی تھا مگر حیرت مجھے یہ تھی کہ اس کی کلائی ہی میرے ہاتھ میں آئی تو وہ بے جان ہو کر رہ گیا۔ اب صرف تیسرے آدمی کو اپنی ضربوں کا حساب لگانا تھا۔ آبی نے اسے ٹانگوں کی قینچی میں لے کر زمین پر گرا دیا تھا۔ اور اس کے منہ پر تابڑ توڑ مکے لگانے میں مصروف تھا۔

"پرے ہٹ آبی! میں اس کا پکا جھٹکا کر دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے اس کی گردن پر انگلیاں ڈال دیں۔ اس کی رگِ احساس پر دباؤ بڑھا تو وہ ایک دم شل ہو گیا۔ آبی نے ٹانگیں اس سے الگ کر لیں وہ بالکل ہی نڈھال ہو چکا تھا۔ آبی نے اٹھتے ہی لڑکی کے ہاتھ سے پستول لیا تو معلوم ہوا اس کا سیفٹی کیچ پوری طرح کھل نہیں سکا تھا۔ اس عرصے میں یار محمد کا مغز لوٹنے لگا تھا۔ وہ جھرجھری لے کر اٹھ بیٹھا۔ مگر آبی نے اب کی بار اس کو تاک کر گولی چلا دی۔ اس طرح کہ وہ اس کے سر پر سے گزر کر دیوار میں جا لگی۔ وہ لرز کر فرش پر بیٹھ گیا۔ چیخ کر بولا: "تم چاہتے کیا ہو؟ مجھے بتاؤ، میں تمھارا مطالبہ پورا کر دوں گا۔"

"ہاں اب آئے ہو نا سیدھی راہ پر۔ ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ یہاں ایک لڑکی آئی تھی آسیہ۔ وہ اس وقت کہاں ہے؟"

خانم اس عرصے میں تاجے کے ساتھ اسی وقت گھر سے کہیں غائب ہو گئی تھی۔ یار محمد نے راہداری میں سے نکل کر اسے آوازیں دیں مگر وہ کہیں نظر نہیں آئی۔ "وہ تو شاید باہر چلی گئی ہیں، آپ بیٹھیں، میں انھیں دیکھتا ہوں۔" اس کی آنکھوں میں بے پناہ حیرت ابھر آئی تھی اور اس کا لہجہ کسی شکر گزار آدمی کا پتہ دیتا تھا۔ اس کی یہ ماہیتِ قلب میرے لیے نئی بات تھی۔ ابھی ہم سے وہ پنجہ لڑا رہا تھا اور ابھی وہ ہمارے حکم کی بجا آوری کو اپنے لیے باعثِ فخر سمجھ رہا تھا۔ وہ چند لمحوں بعد واپس آ گیا، بولا: "آپ یہاں سے فوراً نکل جائیں، خانم شاید پولیس تک جا پہنچیں گی۔ میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ میرا خیال ہے میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔ پولیس آ گئی تو مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔"

"کیا تمھیں یقین ہے کہ وہ پولیس تک جا پہنچے گی؟"

"ہاں! یہاں جو کچھ ہو چکا ہے وہ ان کے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ فوراً یہاں سے نکل جائیں۔"

"آپ بھی اٹھیں بی بی! ہمارے ساتھ چلیں۔" میں نے اس بے بس، عاجز لڑکی سے مخاطب ہو کر کہا۔

"جی بہتر... بہتر۔" یہ کہہ کر وہ اٹھی اور بستر کی سفید لٹھے کی چادر اپنے بدن پر لپیٹ کر ہمارے ساتھ ہی کمرے سے باہر نکل آئی۔ آبی بھی میرے ساتھ ہی باہر آ گیا۔ اب اس کا پستول رواں ہو چکا تھا اور اس کے کندھے پر زیور ایسا لٹک رہا تھا۔

ہم جیسے ہی یار محمد کے ساتھ مکان سے باہر نکلے۔ ہمیں دوسری جانب سے پولیس کے کئی سپاہی خانم کے ساتھ ساتھ چلتے نظر آئے۔ وہ ابھی سڑک کے درختوں کی اوٹ میں تھے کہ یار محمد نے کہا۔ "پولیس آ رہی ہے۔ اِدھر سے آئیں یہ مکان کا پچھلا حصہ زیادہ محفوظ ہے۔" اس نے ہمیں دوسری طرف چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ لڑکی بھی جوں توں کرتی ہمارے ساتھ چل رہی تھی۔ اس کی مشکل یہ تھی کہ وہ پاؤں سے ننگی تھی۔

ہم تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے بڑی سڑک پر پہنچے۔ جیل کی عمارت ہم سے ذرا فاصلے پر تھی۔ پولیس ہیڈ کوارٹر بھی زیادہ دور نہیں تھا۔

یار محمد نے آواز دے کر ٹیکسی روکی اور ہمیں اس میں بٹھا کر اگلی نشست پر خود بیٹھ گیا، بولا: "جلدی نکل چلو۔ ہمیں آج ہی موسیٰ خیل پہنچنا ہے۔"

"ابھی لو جی! آپ آنکھیں بند کریں اور موسیٰ خیل پہنچ جائیں۔" ڈرائیور نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب ہے تیرا؟ یہ گاڑی اُدھر نہیں جا سکتی ہے؟"

"جا تو سکتی ہے مگر سو روپیہ کرایہ ہوگا۔"

"وہ ہم دے دیں گے بھئی تو فکر نہ کر۔ قندیار اُدھر ہی ہے؟"

"ہاں! میں قندیار ہی تو جا رہا تھا۔ آپ کو کیسے پتہ ہے اُس جگہ کا؟" یار محمد نے حیرت سے کہا۔

"کسی نے ہمیں یہی بتایا تھا۔"

"یہ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے مگر سرسبز علاقہ ہے آپ خوش ہو جائیں گے وہاں جا کر۔"

"اور وہ مکرم علی بھی وہیں ہوگا؟"

"جب آپ کو اتنا کچھ معلوم تھا تو خانم سے کیا پوچھ رہے تھے آپ؟"

"اس کی تصدیق چاہتے تھے ہم مگر وہ مان ہی نہیں رہی تھی۔ تم یہ بتاؤ یار محمد! کہ تم کس طرح ہمارے دوست بن گئے۔ یہ راز ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔" اتنے میں ٹیکسی شہر کے باہر ایک پیٹرول پمپ پر رک گئی۔

"لے بھئی تو پیٹرول ڈلوا۔ ہم ذرا چائے پی لیں۔" یار محمد نے کہا اور ہمیں ساتھ لے کر پیٹرول پمپ کے قریب بنے ایک کھوکھے کے سامنے جا بیٹھا۔ درخت کے نیچے چند میزیں لگی تھیں۔ یار محمد

نے ہمیں کرسیوں پر بٹھا کر چائے کے لیے کہہ دیا۔

"تم نے بتایا نہیں کہ تم ہمارے دوست کیسے بن گئے۔ ابھی تو تم ہمیں اپنے پنجے کی طاقت دکھا رہے تھے۔"

"میں کیا کہوں یارو! دراصل میں اندر سے شاید پاگل ہو چکا ہوں۔ آپ کو دیکھ کر آپ سے زور آزمائی کر کے میں یہی سمجھا کہ میں کبھی نہ جیت سکوں گا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر تم ہمارے یار کس طرح بن گئے؟"

"مجھے کسی مرد آدمی کی تلاش تھی یارو۔۔۔ آپ سے آج پنجہ لڑا کر میں سمجھا کہ مجھے جن لوگوں کی تلاش تھی وہ مل گئے ہیں۔ آپ نے مجھے حیران کر دیا ہے۔ سمجھیں کہ یار محمد آپ کا زر خرید غلام بن چکا ہے۔ میں ایسے ہی لوگوں کی تلاش میں تھا۔ اس کنجری کی ملازمت تو میں نے مجبوراً اختیار کی تھی۔ کوئی دھندا نہ ملا تو ادھر بھرتی ہو گیا۔"

"کیا تنخواہ ملتی تھی تمھیں یہاں؟"

"پانچ سو روپے مہینہ۔ صبح شام کھانا۔ چھ مہینے بعد کپڑے اور مہینے میں چار عورتیں۔"

"نہیں یار! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ مذاق نہ کر۔" میں اس کی بات سن کر بے تحاشا ہنسنے لگا۔ سالے نے چار عورتوں کا ذکر یوں کیا تھا جیسے کوئی مرغیاں ہیں جو اس کے ناشتے میں دھر دی جاتی ہیں۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔ مہینے میں چار عورتیں وہ بہرحال مہیا کر دیتی تھی۔ کام ہی ایسا تھا۔ بڑے بڑے رئیس آتے ہیں یہاں۔ خانم کا ڈیرا تو بہت مشہور ہے۔ پولیس کو بھی علم ہے مگر وہ بھی مزے لیتے ہیں۔"

"ہوں! خانم بہت چالاک عورت معلوم ہوتی ہے مگر یہ لڑکی اس کے قابو میں نہیں آئی۔" وہ ابھی تک ٹیکسی میں بیٹھی تھی۔ یار محمد صرف مجھے اور آبی کو لے کر کھوکے کے سامنے جا بیٹھا تھا۔ ڈرائیور اب ٹیکسی کا اندرونی معائنہ کرنے میں مصروف تھا۔ ٹیکسی میں شاید کوئی خرابی پیدا ہو گئی تھی۔

"اس لڑکی کا نام نگہت ہے۔ بیچاری بہت برے حالوں میں خانم کے پاس پہنچی تھی۔ اس کے کسی عاشق نے اسے گھر سے نکالا اور لا کر ہوٹل میں ٹھہرا دیا مگر ابھی وہ اس سے ملا نہیں تھا کہ لڑکے کے والدین آ گئے اور اسے زبردستی گھر واپس لے گئے۔ بالکل نوعمر تھا وہ لڑکا، والدین کی بات نہ ٹال سکا۔ لڑکی ہوٹل میں تنہا رہ گئی۔ اسے جب پتہ چلا تو وہ بہت پریشان ہوئی۔ یہ سرگودھا سے آئی ہے۔ اتفاق سے خانم بھی ہوٹل میں موجود تھی وہ اسے اپنے ساتھ لے گئی اور ایک ہی ہفتے بعد اس کے لیے گاہک بھی ڈھونڈ لیا۔ وہ بیچاری بالکل کنواری ہے۔ یہ بات کسی بھی طرح برداشت نہیں کر سکتی۔ نتیجہ یہ ہے کہ خانم کا گاہک بھی ناراض ہوا اور خانم کا بھٹہ بھی بیٹھ گیا۔"

"تو یہ بات ہے۔ ہم نے اچھا کیا کہ اسے خانم کے پنجے سے چھڑا لیا ہے ورنہ تو یہ تباہ ہو گئی تھی۔ مگر تیرا معاملہ ہماری سمجھ میں اب تک نہیں آیا ہے یار محمد! تمھاری دوستی پر ہمیں اب بھی شبہ ہے۔"

"نہیں یارو! ایسا نہ کہو! میں خانم کو چھوڑ آیا ہوں۔ اس گشتی کی نوکری پر میں ویسے ہی خوش نہیں تھا۔ کہتے ہیں کہ نامرد کی بارات سے مرد کے جنازے میں شامل ہونا بہتر ہے۔ پتہ نہیں آپ کا دھندا کیا ہے خان! مگر مجھے تم اپنا نوکر ہی سمجھو۔ جو حکم دو گے میں کروں گا۔ کہو تو آپ کے دشمن کا سر قلم کر لاؤں۔"

یار محمد نے بڑی معصومیت سے یہ بات کہی۔ آبی بھی خوش ہو گیا، بولا "ٹھیک ہے! ہمیں تیری بات پر اعتبار ہے یارا! تو ہمارے ساتھ ہی رہا کر۔ جو بھی دھندا ہو گا مل کر کر لیں گے۔"

"آپ نے جس طرح اس کوڑی کو بے جان کر دیا تھا، وہ طریقہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ بس آپ نے گردن میں انگلیاں پھنسا کر اسے مار دیا تھا۔"

"ہاں! ہم یہی کرتے ہیں۔ وہ کچھ زیادہ ہی تیزی دکھا رہا تھا۔"

"مجھے صرف ایک آدمی ملا تھا، کوئی پانچ چھ سال پہلے۔ وہ بھی یہی گُر جانتا تھا۔ آدمی کا سانس بند کر کے اسے مار دیتا تھا۔"

"کون تھا وہ؟" میں نے کان کھڑے کیے، وہ میرے مطلب کی بات کہہ رہا تھا۔

"وہ کوئی پہلوان تھا۔ اب تو بیچارا مر چکا ہے، گولی لگ گئی تھی اسے۔ بڑا کاریگر تھا وہ اس فن میں۔ آدمی کو گردن سے پکڑ کر ایک سیکنڈ میں بے جان کر دیتا تھا۔ ایک اور گُر بھی تھا اس کے پاس۔ ٹخنے کے پاس کوئی رگ ہے وہ اسے دباتا تھا تو آدمی پاگل ہو جاتا تھا۔ اس کا یہ وار کوئی سہہ ہی نہیں سکا۔"

"ہاں! بھلے سے بھلا آدمی موجود ہے یہاں۔ بہرحال تو فکر نہ کر۔ تجھے میں یہ گُر نہیں سکھا سکتا۔"

"اس کے لیے تو آپ جیسی بھی خدمت چاہیں میں کرنے تیار ہوں یارو! کوئی بھی کام۔ بس ایک بار یہ گُر مجھے بتا دیں۔ میں زندگی بھر آپ کا شکر گزار رہوں گا۔"

"اچھا! یہ حالت ہے تمھاری۔ خیر دیکھیں گے، ہو سکا تو تمھیں یہ گُر میں سکھا دوں گا۔ آؤ ٹیکسی تیار ہو گئی ہے۔" یہ کہہ کر میں ان کو ساتھ لے کر پٹرول پمپ کی طرف دوڑا۔ ٹیکسی بڑی سڑک پر آ ٹھہری تھی اور نگہت ابھی تک ڈبڈبائی آنکھوں سے ہمیں یوں دیکھ رہی تھی جیسے وہ ہم پر اعتبار کرنا چاہ رہی ہو مگر اس کا دل اس کا ساتھ نہ دے رہا ہو۔

"کیا بات ہے بی بی! اپنی پریشانی کو بھول جاؤ۔ خدا سے دعا مانگو، انشاء اللہ اچھا ہی ہو گا۔ ہم تمھیں یونہی نہیں لے آئے، ایک اچھے مستقبل کی توقع رکھو۔" میں نے نگہت کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھیں کچھ اور زیادہ بہہ نکلیں۔

"نہیں نہیں نگہت بی بی! یہ رونا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ تم نے آبی کو بھائی کہا ہے اور یہ تمھارا بہت عمدہ بھائی ثابت ہو گا۔ پچھلی پریشانیوں کو بھول جاؤ۔"

وہ کچھ نہیں بولی۔ شیشے سے سامنے پھیلی تنگ سی سڑک کو دیکھنے لگی جو اس کی زندگی کی طرح کسی غمگسار کی راہ تکتی رہتی تھی۔

قندیار وہاں سے کوئی پچھتر میل دور تھا۔ سڑک سے اتر کر ہم بائیں ہاتھ کی ایک کچی، ریتلی پگڈنڈی پر ہو لیے۔ کچھ آگے نکلے تو ہمیں وہ پگڈنڈی نظر آئی جو ایک بہت ہی سرسبز علاقے میں اترتی تھی۔ کوئی بائیس میل آ گئے پہنچ کر ہمیں قندیار نظر آیا۔ ایک اونچی سی حویلی ہمارے سامنے تھی۔ گاؤں کا رقبہ بہت ہی کم تھا۔ سمجھیں کوئی چالیس گھر ہوں گے جو وہاں آباد تھے۔ حویلی اپنی تعمیر کے اعتبار سے علاقے کے دوسرے گھروں کے مقابلے میں بہت بالا بلند نظر آتی تھی۔

"بس بھئی! ہمیں تم یہیں اتار دو۔ حویلی تک ہم پیدل جائیں گے۔" یار محمد نے ڈرائیور کو ایک جگہ پہنچ کر روک دیا۔

آبی نے سو روپیہ نکال کر اسے دے دیا۔

وہ ایک دم خوش ہو گیا، بولا "واپسی کی ضرورت نہیں ہو گی؟"

"نہیں یار! ہم یہاں چند دن رہیں گے۔ اب تم جاؤ خدا حافظ۔" یہ کہہ کر یار محمد نے ہمیں ٹیکسی سے اتارا اور حویلی کی طرف چل دیا۔ ٹیکسی اسی وقت نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

یار محمد کی سرکردگی میں اس حویلی تک جانا ہمیں کچھ عجیب سا معلوم ہوتا تھا مگر ہم جس مقصد کے تحت وہاں گئے تھے، وہ تو جب ہی پورا ہو سکتا تھا جب کوئی آدمی واقعی ہماری صحیح طور پر رہنمائی کر سکتا۔

حویلی کے سامنے ہم پہنچے تو یوں معلوم ہوا جیسے ہم کسی تاریخی قلعے تک جا پہنچے ہیں۔ اس کے وہ پرانی طرز کے دروازے، وہ اونچے اونچے مینار، وہ دریچے، وہ روشندان ہمارے لیے حیرت کا باعث تھے۔ کسی نے واقعی اس حویلی کو بڑی محنت سے تیار کرایا تھا۔ زمیندار کا نام مکرم علی گورایا تھا۔

ہم نے بڑے دروازے پر دستک دی تو ایک ملازم نے آ کر پٹ کھول دیے، بولا "کیا بات ہے جناب! کسے ملنا ہے؟"

"ہم گورایا صاحب سے ملنا چاہتے ہیں کیا وہ گھر پر ہیں؟"

"جی نہیں! وہ تھوڑی دیر پہلے جیپ میں بیٹھ کر باہر نکلے ہیں، کہاں سے آئے ہیں آپ؟"

"ہم لاہور سے آئے ہیں یار! کوئی جگہ ہو تو ہمیں دے دو۔ ہم ان کا انتظار کریں گے۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں! مہمان خانہ کس لیے ہے۔ آئیے آپ اندر بیٹھیں۔" یہ کہہ کر وہ اپنے ساتھ لے کر ہمیں حویلی کے دائیں ہاتھ بنے ایک جدید طرز کے مکان میں لے گیا۔ آمنے سامنے چار کمرے بنے تھے اور چوتھا ان کی نشست گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔

"آپ یہاں بیٹھیں جناب! میں کھانا لگواتا ہوں۔ گورایا صاحب کا حکم ہے کہ مہمان کو کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہیے۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے دوست! کیا نام ہے تمھارا؟"

"جی میرا نام غوث محمد ہے۔ کوئی خاص کام ہے آپ کو گورایا صاحب سے؟"

"جی ہاں! کام خاص ہی ہے۔ میرا خیال ہے یہاں پانی بھی مل جائے گا؟"

"جی جی، سینکڑوں من پانی ہے یہاں جناب! آپ چاہیں تو نہا بھی سکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے بڑی مہربانی ہے تمھاری۔ ہم دیکھ لیں گے۔" آبی نے کہا۔ جیسے ہی وہ باہر نکلا آبی نے غسل خانے کا دروازہ کھول لیا۔ میں نے نگہت کو سامنے کے کمرے میں بٹھا دیا۔ چادر کے نیچے اب بھی اس کا لباس پھٹا ہوا تھا۔

"یار محمد! جس لڑکی کے لیے ہم یہاں آئے ہیں اس کا نام آسیہ ہے اور وہ میری ہمشیرہ ہے۔"

"اچھا؟ کمال ہے جناب! یہ تو مجھے ابھی معلوم ہوا کہ آسیہ آپ کی بہن ہے۔"

"ہاں! اب تم ہمیں یہ بتاؤ کہ شب خیر نے آسیہ کو یہاں کیسے بھیج دیا۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔"

"مکرم علی کبھی کبھار اس کے ہاں بھی جایا کرتا ہے۔ جب آسیہ نچنے سے فارغ ہوئی تو یہ بھی ایک دن وہاں جا پہنچا۔ اسے لڑکی اتنی پسند آئی کہ شب خیر کو پچاس ہزار روپے دے کر خرید لایا۔ اور اب وہ اس کے پاس ہے۔"

"ہوں! تو یہ بات ہے۔"

"آسیہ کی شان ہی نرالی ہے خان صاحب! آپ نے اپنا کیا نام بتایا ہے؟"

"میرا نام ہاشم خان ہے اور یہ میرے دوست ایس جی ایم ایم پیرزادہ کہلاتے ہیں۔" میں نے اپنی شناخت کو اس سے بچلاتے ہوئے کہا۔ وہ ہمیں صحیح جگہ پر لے آیا تھا مگر ابھی اس بات کا فیصلہ ہونا باقی تھا کہ اس صحیح جگہ پر ہم کسی غلط آدمی کی جگہ تو

نہیں پہنچے ہیں، سب سے اہم سوال یہی تھا۔

"تو میں کہہ رہا تھا کہ میں نے بہت سی عورتیں دیکھی ہیں مگر آسیہ جیسی اُن میں سے ایک بھی نہیں تھی اور اس کی اس خوبی کی بنا پر مکرم علی نے اسے خرید لیا۔"

"خرید لیا!" میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ "اس کا مزہ تو میں اس کو ایسا چکھاؤں گا کہ وہ پھر کسی عورت کو میلی نظر سے نہیں دیکھے گا۔"

میری یہ بات، یار محمد نے سن کر بہت عجیب سا منہ بنایا، بولا۔ "یہ مشکل معاملہ نظر آتا ہے۔ شاید آپ کو کوئی کامیابی نہ ہو سکے۔ اس مکرم کو عورتوں کا ٹھرک ہے میرا خیال ہے حویلی میں بیسیوں ایسی بھری ہوں گی، ایک سے ایک سوہنی اور سجیلی۔ اور ان پر پہرہ بھی بہت سخت ہے کئی طریقوں سے وہ اُن کی رکھوالی کرتا ہے۔"

"تم بہرحال اتنی بات بتا دو یار محمد! کہ کہیں تمھارا تو کوئی مسئلہ یہاں نہیں پھنسا ہے؟"

"توبہ توبہ کریں خان صاحب! مجھے کیا کام ہو سکتا ہے ایسے آدمی سے۔ میں تو اس قسم کا بندہ ہی نہیں ہوں۔ آپ کی نوکری مجھے کھینچ لائی ہے خان جی! ورنہ میں کسی کے ساتھ دو قدم نہیں چلتا۔"

"ٹھیک ہے، مجھے تمھاری بات پر اعتبار ہے۔"

اتنے میں آبی غسل خانے سے باہر نکل آیا، بولا۔ "تمھارا اس گوراۓ سے کوئی "کنکشن ونیکشن" ہے تو ابھی بتا دو۔ تمھاری رگ ہم ابھی مسل سکتے ہیں۔" آبی غسل خانے میں بیٹھا ہماری باتیں سن رہا تھا۔ "اچھی طرح سوچ لو۔ تمھارا ادھر آنا ہی مجھے مشکوک لگتا ہے یار محمد! اور میں سچی بات کہہ رہا ہوں تم سے۔۔۔ سیانے کہتے ہیں کہ جو چاقو چھری سے ڈرے، اسے چھپاتی چھری سے مارو۔ تم کہیں اسی بات پر تو عمل نہیں کر رہے ہو؟"

"توبہ کریں پیرزادہ صاحب! میں آپ کو ایسا ہی بے ایمان لگتا ہوں؟ کوئی اور ہوتا تو آپ کے سائے سے بھی بھاگتا۔ مگر میں بہادر آدمیوں کا غلام ہوں۔"

"سوچ لو! اچھی طرح سوچ لو، وہ گشتی تمھیں کہیں ہمارے پیچھے نہ لگا گئی ہو۔"

"اس کا تو اب نام ہی نہ لیں پیرزادہ صاحب! میں نے اس کی نوکری نہیں بھٹ جھونکا ہے مگر سوال یہ ہے کہ آپ گورایا صاحب سے بات کیسے کریں گے؟"

"بات بھی کریں گے، اس میں کیا مشکل ہے، کوئی توپ کا گولا تو نہیں ہے وہ۔ آدمی ہی ہے نا؟" آبی نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔ اتنے میں غوث محمد ہمارے لیے کھانا لے آیا۔

جب وہ میز پر برتن سجا چکا تو میں نے نگہت کو بھی وہیں بلوا لیا گوشت بھنا ہوا تھا اور روٹیاں تازہ تھیں۔ بھوک نے ہمیں ڈھال کر رکھا تھا۔ ہم سب نے خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ غوث محمد کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا جس کو وہ جمالی کہہ کر پکارتا تھا اور اسے معلوم تھا کہ ہمیں کس وقت کس چیز کی ضرورت ہے۔

جب ہم کھانا کھا چکے تو غوث محمد بولا۔ "آپ ذرا آرام کریں میاں جی! گورایا صاحب جب آئے تو میں آپ کو اطلاع دے دوں گا۔"

"ٹھیک ہے یار! یہی بہتر ہے۔" میں نے اسے برتن اٹھوا دیے۔ اور پھر نگہت الگ کمرے میں جا پڑی اور ہم تینوں دوسرے کمرے میں جا سوئے۔

ستمبر کا آخر آخر تھا۔ اور ہم بہت تھکے ہوئے تھے۔ بستر پر لیٹتے ہی نیند آ گئی۔

جب میری آنکھ کھلی تو شام کے پانچ بج چکے تھے۔ اور غوث محمد دروازہ بجا رہا تھا۔

"میاں جی اٹھ جائیں گورایا صاحب واپس آ چکے ہیں اور آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

آبی اور یار محمد بھی اس کی آواز سن کر جاگ اٹھے۔ اسی وقت ہم نے منہ ہاتھ دھویا اور تازہ دم ہو کر ہم غوث محمد کے ساتھ حویلی کے دوسرے حصے کی طرف چل دیے۔ نگہت کو ہم نے کہہ دیا کہ وہ کمرے کا دروازہ اندر سے اچھی طرح بند کر لے۔ ہم ایسے آدمی کی حد پر جا پڑے تھے جس کی عورتوں پر رال کچھ زیادہ ہی ٹپکتی تھی۔ ابھی ہم چند ہی قدم چلے تھے کہ آبی ایک دم رک گیا۔ اس کے کندھے پر پستول جو لٹک رہا تھا وہ بالکل مصنوعی تھا۔ کم نے اس کا اصلی پستول پیٹی میں سے نکال لیا تھا۔

"غوث محمد! یہ۔۔۔ یہ میرا پستول کس نے نکال لیا ہے؟" اپنا بریف کیس اس نے بائیں ہاتھ میں لے رکھا تھا۔

"وہ میاں جی دراصل میں نے ہی الگ رکھ لیا تھا۔ آپ فکر نہ کریں۔ یہ بڑے لوگ ہیں۔ کوئی چھری چھپاڑی پسند نہیں کرتے۔ میں آپ کو واپسی پر دے دوں گا۔"

"تو تمھاری یہ مجال ہے۔ ہمارا بریف کیس بھی تم نے دیکھا ہوگا؟" آبی نے زمین پر رکھ کر اپنا بریف کیس کھول لیا۔ مگر اس میں تمام چیزیں جوں کی توں موجود تھیں۔ آبی کو غصہ آتا تھا تو پھر اس کے لیے ضبط نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہتی تھی۔ اس کا چہرہ دیکھ کر مجھے یقین ہو چلا تھا کہ وہ اس غوث محمد کے اندر غوطہ ضرور لگا دے گا۔ میں نے اسے آنکھ ماری کہ وہ غصہ پی جائے۔ غوث محمد کی زیادتی پر اس وقت احتجاج اچھا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ وہ جو آدمی کو اس کی استعداد سے زیادہ چوکنا رکھتی تھی۔ حالانکہ وہ

زمین بالکل ہموار تھا جس پر وہ حویلی تعمیر کی گئی تھی مگر اس کو زیادہ بارعب اور ہیبت ناک بنانے کے لیے اس کے مختلف تختے بنا دیے گئے تھے اور مہمان خانہ سب سے نچلے تختے پر تھا۔ ملاقات کے کمرے اس کے اوپر والے تختے پر بنائے گئے تھے جس پر پہنچنے کے لیے ہمیں سیڑھیاں عبور کرنا پڑیں۔

مکرم علی گورایا ایک بڑے سے وسیع کمرے کی عقبی دیوار کے ساتھ لگے صوفوں پر براجمان تھا۔ اس کے دائیں بائیں اس کے تین ملازم برابر کی بنیاد پر مختلف صوفوں پر بیٹھے تھے اور وہ دو عورتوں کے ساتھ شطرنج کھیل رہا تھا۔ ہم کمرے میں داخل ہوئے تو اس نے اپنا ہاتھ نہیں روکا۔ ایک نظر اس نے ہمیں دیکھا اور پھر شطرنج کھیلنے میں مصروف ہو گیا۔ اس کا رنگ گورا چٹا تھا، غلافی آنکھیں، ستواں ناک، قد چھ فٹ سے اونچا ہی ہو گا اور عمر یہی کوئی پینتیس سال تھی۔ اس نے دوسری بار دیکھنے کی زحمت نہیں کی مگر بولا۔ "کیا بات ہے غوث محمد کیسے آئے ہو؟"

"سرکار یہ آدمی آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ دوپہر کو یہاں آئے تھے۔"

"یہ تین آدمی ہیں بلکہ ایک عورت بھی ان کے ساتھ ہے؟"

"جی جی سرکار! ایک عورت بھی ان کے ساتھ ہے۔"

"یہ اچھی بات نہیں ہے نیلو! بے ایمانی نہیں چلے گی بلکہ تمھارا یہ حسن یہاں کام نہیں کرے گا۔"

"ان کے لیے کیا حکم ہے سرکار؟"

"میرا خیال ہے غوث محمد کہ ابھی تم ان کو اُدھر ہی بٹھاؤ۔ شام کے کھانے کے بعد میں ان سے بات کروں گا۔ کوئی ایسی جلدی تو نہیں ہے نا انہیں؟" اس نے اب کی بار بھی ہماری طرف توجہ نہیں دی۔ ہاتھ اس کا برابر شطرنج کی بازی میں مصروف رہا۔

"بہت اچھا سرکار! میں انہیں نو بجے آپ کی خدمت میں روانہ کر دوں گا۔ آئیں بھائی جی! سرکار ابھی آپ کو وقت نہیں دے سکتے۔" غوث محمد نے ہماری طرف پلٹتے ہوئے کہا۔

آبی کا دماغ چٹخنے لگا۔ میں خود بے حد سبکی محسوس کر رہا تھا۔ مکرم علی گورایا زمین پر آ ہی نہیں رہا تھا۔ وہ ان عورتوں سے چہلوں میں مصروف تھا اور وہ ایسی کھیلی کھلائی عورتیں تھیں کہ اسی کے مطلب کی بات کر رہی تھیں۔ اُن کی آنکھوں میں حیا اور شرم قطعاً نہیں تھی۔ میں نے چاہا کہ گورایا کے اس حسنِ سلوک پر احتجاج کروں، آبی بھی یہی چاہتا تھا۔ مگر وہ جن لوگوں کے درمیان بیٹھا تھا اُن کی وجہ سے ہم نے خود کو بہت روکا اور انہی قدموں چل کر ہم کمرے سے باہر نکل آئے۔ آبی کا منہ گالیوں سے لبالب بھرا تھا۔ میں بھی بہت تپ گیا تھا۔

دروازے سے باہر نکلتے ہی آبی نے گورائے کو بہت ہی ٹیڑھی قسم کی گالی دیتے ہوئے کہا۔ "اس کا مغز توڑنے کی ضرورت ہے خان! اس کو ہم شرافت سے سیدھا نہیں کر سکتے۔"

"اس نے تو حد کر دی ہے یار! کسی کو ہماری یوں بے عزتی کرنے کی جرأت نہیں ہوئی، یہ خود کو سمجھتا کیا ہے یار محمد؟"

"یہ بہت اونچی شے ہے یہ گورایا صاحب! خانم نے اچھا کیا کہ میں اس کے سامنے نہیں گیا ورنہ یہ مجھے پہچان جاتا اور پتہ نہیں ہم سے کیا سلوک کرتا۔"

"اس کی "ناٹس پلس" کی ایسی تیسی۔ میں اس کو پوری طرح منہا کر دوں گا۔" آبی بہت زیادہ طیش میں آ چکا تھا۔ وہ دھپ دھپ کرتا ہوا سیڑھیاں اترا تو ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ہمارے پیچھے غوث محمد بھی لپکتا چلا آ رہا تھا حالانکہ ہم سمجھتے تھے کہ وہ دروازے میں ہی رک گیا ہے۔

"وہ میرا پستول تو دے دو مجھے غوث محمد! ہمیں اس کی کسی بھی وقت ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اس کا لائسنس ہے میرے پاس۔" آبی نے اپنی طبیعت پر جبر کرتے ہوئے کہا۔ کوئی اور موقع، کوئی اور مقام ہوتا تو مجھے یقین تھا کہ آبی اس غوث محمد کو نیست و نابود کر چکا ہوتا۔ مگر وہ اس گھڑی صبر کی علامت بن گیا تھا۔ اب اُسے آنکھ کے اندر لگے شیشوں کو سنبھالنا آ گیا تھا۔

غوث محمد نے اس کی بات سُنی تو بولا۔ "دے دوں گا جناب! ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ آپ کی امانت میرے پاس ہے۔ گورایا صاحب سے آپ کی ملاقات تو کروا دوں۔ اوئے ملے ادھر آ ذرا۔ ان کو مہمان خانے میں پہنچا دے۔" اس نے دور کھڑے ایک ملازم کو پکارتے ہوئے کہا اور خود وہیں ٹھہر گیا۔

ملا تیزی سے ہماری طرف لپکا اور بولا۔ "آئیں بھائی جی! میں آپ کو کمرے میں پہنچا دیتا ہوں۔"

"آپ اس کے ساتھ جائیں، مجھے کچھ کام ہے جناب! کوئی ضرورت ہو تو ملے کو بتا دیں۔"

غوث محمد بھی ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس سالے نے چھوٹتے ہی ہمیں بے ہتھیار کر دیا تھا۔ اور اب وہ بغلیں بجاتا پھر رہا تھا۔ اور وہ گورایا بدمعاش ایسا ابلیس تھا کہ ہمارے سامنے بھی ان عورتوں سے ٹھٹھا کھیل رہا تھا۔ اور وہ جو تین آدمی اُس کے اردگرد صوفوں پر جم کر بیٹھے تھے وہ غالباً ناکارہ کر دیے گئے تھے۔ اُن پر کوئی اثر ہی نہیں ہو رہا تھا۔ ہم مہمان خانے میں پہنچے تو یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ نگہت بڑے اطمینان سے بستر پر

سو رہی تھی۔ ابھی تک نیند نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ پتہ نہیں خانم کے گھر پر اس کے ساتھ کیا کچھ بیت چکی تھی۔

آبی نے کمرے میں پہنچ کر میرا اور اپنا بریف کیس لیکر الماری میں رکھا اور جیب سے سگریٹ نکال کر بولا۔ "یار! اس مکرم علی نے کیسی بدمعاشی دکھائی ہے۔ وہ ہم سے بات کرنا بھی گوارا نہیں کر رہا تھا کتنے کا بچہ کیسی اکڑفوں سے بیٹھا تھا ان نوٹنکیوں کے ساتھ۔"

"کیا کیا جا سکتا ہے آبی! اس دنیا میں ہر قسم کے آدمی ملتے ہیں۔ ہمیں بہت سوچ سمجھ کر چلنا ہوگا۔"

"ہاں یہ تو ہے ہی۔ کہیں وہ آسیہ ہمیں خود ہی دیکھ لیتی تو ہمارا کام آسان ہو جاتا۔"

"ذرا اس نگہت کو تو بلاؤ۔ پتہ تو کریں کہ وہ ہے کیا مصیبت! اسے ہم خواہ مخواہ ہی بہن بنا کر اٹھا لائے۔ اس کی عمر دیکھو اور کرتوتوں پر نظر ڈالو۔" آبی کچھ زیادہ ہی سیخ پا ہو رہا تھا۔ سگریٹ کا دھواں بھی اس کے حلق سے نیچے نہیں اترتا تھا۔

"تو بولا نا اس سے کہہ وہ ادھر آجائے۔ ایک تو اس کے کپڑے ہی پھٹ چکے ہیں، اس کا کیا کریں؟"

"یہاں سے کپڑے کیسے مل سکتے ہیں۔ وہ گورایا تو ہم سے بات ہی نہیں کرتا۔"

"میرا خیال ہے میں اس یملے سے کہتا ہوں وہ ضرور کوئی بندوبست کر دے گا۔"

"ہاں! بلاؤ اسے۔ اوئے یملے! ذرا بات سن ادھر آکے۔" آبی نے کھڑکی میں سے جھانک کر یملے کو آواز دی۔

وہ باہر گھاس پر بیٹھا تنکے توڑ توڑ کر اپنے ارد گرد پھینک رہا تھا۔ وہ فوراً ہی اندر آگیا، بولا۔ "جی بھائی جی! کیا حکم ہے میرے لیے؟"

"دیکھ یار! ہمارے ساتھ ایک عورت بھی ہے اس کے لیے اگر تو کپڑوں کا ایک جوڑا لا دے تو تیری بڑی مہربانی ہوگی۔" آبی نے اسے ایک سگریٹ بطور رشوت دیتے ہوئے کہا۔

"نہ میاں جی! میں کپڑے کہاں سے لا سکتا ہوں، ویسے تو اندر سیکڑوں جوڑے ہوں گے مگر میں کیسے لا سکتا ہوں؟"

"دیکھ یہ لے پچاس روپے۔ سمجھ رہا ہے نہ میری بات۔ جس طرح بھی ہو سکے، ایک دو جوڑے باہر لے آ۔ چھپ چھپا کر ہی لے آ۔"

بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے روپے ہاتھ میں پکڑے اور بولا۔ "ٹھیک ہے میاں جی! میں کوشش کرتا ہوں ـــ مگر زنانے میں جانا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ میں اپنی عورت سے کہتا ہوں۔"

"وہ بھی ادھر ہی کام کرتی ہے؟"

"جی ہاں! وہ زنانے میں ملازم ہے اس کو ساری بات سمجھانی پڑے گی۔"

"ہاں جاؤ، جیسے بھی ہو سکے ہمیں کپڑے ضرور لا دو۔" آبی نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔

وہ باہر نکلا تو آبی نے نگہت کو جگا دیا۔ وہ اپنی چادر سنبھالتی ہوئی نیم وا آنکھیں لیے جن میں نیند کا خمار ابل رہا تھا۔ ہمارے کمرے میں آگئی۔

"بی بی! تم اندر جا کر منہ دھو لو۔ چاہو تو نہا بھی سکتی ہو۔ تمھارے لیے ہم نے نئے کپڑے منگوائے ہیں۔ ملازم کو ابھی ابھی بھیجا ہے۔"

"میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔ کپڑے مل گئے تو پھر میں نہا لوں گی۔" یہ کہہ کر وہ میرے پلنگ کی پائنتی بیٹھ گئی۔

"میں پوچھتا ہوں نگہت کہ تو شب خیر کے ہاں کیسے جا پہنچی وہ تو بہت ذلیل عورت ہے۔"

"میں کیا بتاؤں بھائی جان! میری تقدیر کھوٹی تھی کہ میں زمان بیگ کے ساتھ گھر سے نکل بھاگی۔ وہ مجھے یہاں میانوالی لے آیا مگر اسی شام اس کے والدین آگئے اور وہ اسے سمجھا بجھا کر سیڑھیوں پر سے واپس لے گئے۔ مجھے پتہ ہی نہیں چل سکا کہ ہوا کیا ہے۔ اتفاق سے یہ شب خیر وہاں گئی ہوئی تھی۔ باپ بیٹے کا جھگڑا اس کے سامنے ہی ہوا۔ وہ باہر نکلے تو یہ میرے پاس آ پہنچی اور وہاں سے اٹھا کر مجھے اپنے گھر لے گئی۔"

"یہ بات ہم پہلے بھی سن چکے ہیں۔ وہ زمان بیگ تھا کون؟"

"اس نے حال ہی میں گریجویشن کی تھی۔ اب پتہ نہیں کہاں ہوگا۔"

"یہ پہلا آدمی تھا جس کے حوالے تمھیں کیا گیا؟"

"ہاں شب خیر نے کہا تھا کہ وہ مجھ سے شادی کر لے گا۔ اک ذرا ملاقات کر لو۔"

"تم اپنے گھر جانا چاہتی ہو؟"

"وہ مجھے کیسے قبول کریں گے؟ میری صورت سے وہ نفرت کرتے ہوں گے۔"

"زمان بیگ کا گھر تمھارے قریب ہی ہے؟"

"نہیں وہ اُدھر کچہری کے پاس رہتا ہے۔ مجھ سے وہ میکلو کے راستے میں ملا کرتا تھا۔"

"ہو سکتا ہے تمھارے والدین تمھاری گھر سے غیر حاضری کو

کوئی اور بہانہ پیش کر رہے ہوں۔ اگر ایسا ہے تو وہ تمھیں واپس لینے پر تیار ہوں گے۔"

"پتہ نہیں، میرا کوئی بھائی نہیں ہے۔ ہم پانچ بہنیں ہیں والد میرے دکاندار ہیں۔ پتہ نہیں وہ کیا سوچتے ہوں گے؟"

"میرا خیال ہے کہ ہم تمھیں گھر بھیج دیتے ہیں۔ اگر تم چاہو تو یار محمد تمھارے ساتھ جا سکتا ہے یہ تمھاری کہانی کو اچھی طرح سمجھتا ہے۔"

"آپ جو مناسب سمجھتے ہیں کریں، میں تو تباہ ہو ہی چکی ہوں۔"

"بس ٹھیک ہے۔ تم ذرا نہا لو اور اپنی شکل درست رکھو۔ کپڑے آ جائیں تو ہم تمھیں یار محمد کے ساتھ گھر بھیج دیں گے۔" آبی نے بڑے جلے کٹے لہجے میں کہا۔ وہ ہر طرف اپنی نحوست کا سایہ پھیلاتی نظر آتی تھی۔ نیند ابھی تک اس کی آنکھوں پر طاری تھی اور وہ حسنِ سوگوار ہی نظر نہیں آتی تھی بلکہ گرد و پیش کو بھی یہ متاعِ غم پیش کر رہی تھی اور آبی کو یہ سب کچھ پسند نہیں تھا۔ عجیب سی مُردنی چھائی ہوئی تھی اس کے چہرے پر۔ لگتا تھا وہ ساری رات اس المیے پر ماتم کناں رہی ہے جو اس پر بیت چکا تھا۔ حالاں کہ ایسی عورتوں کو عصمت کے معاملے میں اتنا حساس نہیں ہونا چاہیے۔ وہ جو گھر سے بھاگ آئی، اس کے لیے اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ اس کا مرد زمان بیگ تھا یا کوئی اور۔

یملا کوئی بیس منٹ بعد واپس آگیا۔ اس کے ہاتھ میں پہنے ہوئے کپڑوں کا ایک زنانہ جوڑا تھا مگر وہ دھلے دھلائے معلوم ہوتے تھے۔ نگہت نے انھیں ہی غنیمت سمجھا اور غسل خانے میں جا گھسی۔ آبی کا غصہ دم بدم بڑھتا جا رہا تھا۔ مکرم علی گورایا کے اس نخرے پر اسے اتنا طیش آ رہا تھا کہ اس نے مجھ سے کوئی آدھ گھنٹے تک کوئی بات نہیں کی۔

نگہت غسل خانے سے باہر نکلی تو آبی بولا۔ "دیکھو بی بی! تم کہاں ہمارے ساتھ خراب ہوتی رہو گی۔ ابھی تم یار محمد کے ساتھ واپس چلی جاؤ۔ یہ تمھیں گھر پہنچا دے گا۔"

"ٹھیک ہے بھائی جی! مگر ہم جائیں گے کیسے؟"

"میرا خیال ہے کہ بڑی سڑک سے تمھیں تانگہ یا بس مل جائیگی۔ یہ لو یہ ہزار روپیہ رکھ لو تمھارے کام آئے گا۔ کیا خیال ہے تیرا یار محمد! اس امانت کو گھر تک پہنچا دے گا؟"

"میں حاضر ہوں جناب! میں اس کو گھر چھوڑ آتا ہوں۔ آپ یہاں ہی میرا انتظار کریں میں کل شام تک واپس آجاؤں گا۔"

"اس کی فکر نہ کرو۔ اس کے باپ سے مل کر اسے سمجھا دینا کہ وہ اسے سنبھال کر رکھے اور اس کی شادی کر دے۔ ابھی تو یہ معصوم ہے کل کو یہ تباہ بھی ہو سکتی ہے۔"

"میں اس سے ملوں گا بھائی جی! اور سمجھا کر آؤں گا۔ مجھے امید ہے کہ وہ اس کو گھر میں جگہ دے دے گا۔ چل بھئی اٹھ اب۔ کوئی تانگہ، کوئی بس مل ہی جائے گی۔"

نگہت اٹھی اور ہزار روپے کے نوٹ جیب میں ڈال کر ہمیں اس نے بڑے ادب سے سلام کیا اور یار محمد کے ساتھ خاموشی سے باہر نکل گئی۔ محسوس مجھے یہ ہو رہا تھا کہ اگر کہیں یار محمد کی نیت بدل گئی تو نگہت کہیں کی بھی نہیں رہے گی۔ اور ہمیں یہ قطعاً معلوم نہیں تھا کہ اس سالے کا گھر گھاٹ کہاں ہے۔ یار محمد کے بارے میں ہم کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ پھر بھی آبی نے اسے نگہت کا سرپرست بنا دیا۔ وہ دراصل اس لڑکی سے نجات حاصل کر لینا چاہتا تھا۔ پتہ نہیں اس پر وہ عاشق کیوں نہیں ہو گیا۔ کوئی ایسی ہی بات تھی آبی نے اپنے پر پرزے اس کے سامنے نہیں پھیلائے تھے۔ ورنہ وہ تو ہر خاتون کی خلوت کو اپنا حق سمجھتا تھا۔ وہ دونوں حویلی سے نکل گئے تو آبی پلنگ پر چت لیٹ گیا، بولا۔ "اس گورائے سے بات کرو جیلانی! اس کا مغز درست کرنے کی ضرورت ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ آسیہ یہاں نہیں ہے۔"

"یہ تو کیسے کہہ سکتا ہے۔ تجھے الہام ہوتا ہے۔ وہ شب خیر ہمیں یہی نہیں بتا رہی تھی مگر ہماری خبر غلط نہیں ہو سکتی۔ آسیہ ادھر ہی ہے۔"

"یہ میرا اندازہ ہے جو غلط بھی ہو سکتا ہے۔"

شام چار سو پھیل چکی تھی اور اس کا اندھیرا دبیز تھا حویلی کے اندر کسی جگہ جنریٹر لگا ہوا تھا جس کی بدولت ہر کمرہ روشن تھا۔

یملا جو ابھی تک باہر بیٹھا ہوا تھا، اندر آیا اور کمرے کی بتیاں جلا کر بولا۔ "میں آپ کے لیے کھانا لے آؤں کسی اور چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔"

"نہیں! گورایا صاحب کو ہمارا سلام پہنچا دو۔ کہو کہ ہم ایک بہت ضروری کام کے سلسلے میں ان سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

"وہ آپ کو پھر وقت دیں گے جناب! شاید صبح ملاقات ہو جائے۔" یہ کہہ کر وہ اسی وقت باہر نکل گیا۔

ہم کھانا کھا چکے اور یملا برتن اٹھا کر واپس چلا گیا، تو مجھے محسوس ہوا کہ آبی کی رنگت ایک دم بدلنے لگی ہے۔ وہ گھبرا کر پلنگ سے اترا اور غسل خانے کی طرف لپکا۔ مگر ابھی وہ راستے ہی میں تھا کہ اسے چکر سا آیا اور وہ الٹ کر فرش پر جا گرا۔ اس کو سہارا دینے کے لیے میں تیزی سے اس کی طرف لپکا مگر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے بدن میں جان ہی نہیں رہی ہے۔ میری

ٹانگیں مفلوج ہونے لگی تھیں۔ خود کو سنبھالنے کی میں نے بہت کوشش کی مگر میرا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ میں تیسرے قدم پر جھول کر فرش پر جا گرا۔ آنکھیں مچتی جا رہی تھیں۔ ایک موہوم سا خیال، مجھے یاد ہے میرے ذہن میں ابھرا تھا کہ ان لوگوں نے اس کھانے میں کوئی ایسی نشہ آور شے ملا دی تھی جس نے ذائقے میں بھی کوئی فرق نہیں ڈالا تھا۔ مگر جو بدن میں اُترا تو ہمیں یوں تھکا کر اس نے نیچے گرا دیا کہ خود کو سنبھالنے کی ساری تگ و دو بیکار چلی گئی۔ کمرہ میری آنکھوں سے معدوم ہوا اور میں ایک لامتناہی گھپ اندھیرے غار میں لڑھکتا چلا گیا۔ وہاں کوئی ایسا شخص باقی نہیں تھا جو ہماری مدد کو آ سکتا۔ نگہت اور یار محمد کو ہم پہلے ہی رخصت کر چکے تھے۔ کوئی ایسا ہی بے رنگ بے بُو بے ذائقہ گھلا کر وہ ہمیں پلا چکے تھے کہ ہمارے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہو سکی کہ ہمارے ساتھ کیا ہو چکا ہے۔ ہمارا حال اس عورت کا سا تھا جسے معلوم بھی نہ ہو سکا ہو کہ اس کی بے حرمتی کر دی گئی ہے۔ بہت ہی بری حالت ہو چکی تھی ہماری۔ آبی الگ فرش ہو چکا تھا۔ اور میری رگِ احساس کسی نے الگ مسل دی تھی۔

جب مجھے ہوش آیا تو محسوس ہوا کہ میں ابھی تک فرش پر پڑا ہوں مگر وہ کوئی اور ہی فرش تھا۔ کھردرا سا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہاں اینٹیں بچھی ہیں میرے دائیں بائیں خلا ہی خلا تھا۔ میں نے بازو پھیلا کر فرش کو ٹٹولنے کی کوشش کی تو مجھے محسوس ہوا کہ میں وہاں تنہا نہیں ہوں میرے دکھ میں آبی بھی شامل تھا۔ میں خود کو بالکل بکھرا بکھرا محسوس کر رہا تھا۔ خود کو یکجا کر کے میں اٹھا اور آبی تک گھسٹتا ہوا جا پہنچا۔ کمرے میں گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ایسا گھنا اور دبیز اندھیرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ لگتا تھا ہم دونوں عالمِ لاہوت تک جا پہنچے ہیں۔ خود کو فنا کر کے اللہ کی ذات میں مدغم ہو چکے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ قبر بھی اتنی تاریک نہیں ہوگی کہ وہاں آدمی کی ملاقات منکر نکیر سے تو ہوتی ہی رہتی ہے۔ اُن فرشتوں کے چہروں کا نور مُردے کو مسحور کرتا رہتا ہے۔

"آبی! اوئے آبی! اٹھ جا اب۔" میں نے اس کو ٹٹولتے ہوئے کہا۔ اس کا منہ کھلا تھا اور اس کی سانسیں گھر گھر کر کے کمرے کے سناٹے کو درہم برہم کر رہی تھیں۔ آبی کو جگا لینے کا فن سب مجھے نہیں آتا تھا۔ اُسے تو ساقی نے نشہ پلا کے زیر کر رکھا تھا اور وہ ساقی کہیں نظر بھی نہیں آتا تھا۔ ابھی مجھے یہ بھی معلوم کرنا تھا کہ اُن لوگوں نے ہمیں کس مکان کے کس کمرے میں ڈال رکھا ہے۔ کوئی آدھ گھنٹے تک میں آبی کی منت سماجت کرتا رہا۔ وہ کچھ زیادہ ہی بہک گیا تھا۔ اس کی بھی جیبیں خالی تھیں اور مجھے بھی ان لوگوں نے سبکبار کر دیا تھا۔ وہ ایسے ہی سابدھان تھے وہ نشہ پلانے والے کہ ایسے میں وہ ہمیں ناکارہ بھی کر دیتے تو ہمیں پتہ نہ چلتا۔ جب آدھے گھنٹے بعد آبی نے کروٹ لی تو اس کی سانسوں کی گھر گھر معمول پر آ گئی۔

"اوئے اٹھ بھی جا اب! تیرا تو بولو رام ہو چکا ہے استاد! دیکھ تو ہم کہاں آ پہنچے ہیں۔"

میری ہی آواز سن کر اُس نے جھرجھری سی لی اور خود کو یکجا کر کے وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ گورائے کو لمبی سی بہت ہی پیچیدہ سی گالی دے کر بولا۔ "اس بدمعاش نے ہمیں کہاں پھینک دیا ہے بھئی! اس کھانے میں کیا چیز ڈال دی تھی اُس نے؟"

"کچھ نہ پوچھ یار! تیرے پاس کوئی سگریٹ ہے تو وہ نکال دے۔"

اُس نے جیبوں میں ہاتھ ڈالا تو ایک پیکٹ اور ایک دیا سلائی اس کو مل گئیں، بولا۔ "یار! میری جیب سے وہ ساری چیزیں نکال چکے ہیں۔ وہ بریف کیس بھی نظر نہیں آتا۔ یہ ہوا کیا ہے آخر ہمارے ساتھ؟"

"اس گورائے نے ہمیں ذرا سا نشہ پلا کر مار دیا ہے۔ سگریٹ تیرے پاس کیسے رہ گئے؟"

"یہ اُن کی مہربانی ہے، سوچتے ہوں گے کہ سگریٹ سے ہمارا دل ذرا بہلتا رہے گا۔" یہ کہہ کر اس نے دو سگریٹ سلگا کر ایک مجھے دے دیا۔ وہ اب کی بار گیلا نہیں تھا۔ ماچس کی روشنی میں اُس نے گرد و پیش کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ ہم واقعی پنجرے میں ڈال دیے گئے ہیں۔ کمرہ تینوں طرف سے بند تھا اور آ... کے دروازے پر لوہے کا آہنی جال لگا دیا گیا تھا جس کی چابی وہ اپنے ساتھ لے گئے تھے۔

"ہوں! تو یہ بات ہے۔ اس گورائے نے آخر ہمیں کس بنا پر یہاں ڈال دیا ہے؟" آبی نے آہنی دروازے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"کوئی خاص ہی بات ہوگی آبی ورنہ اسے کیا ضرورت تھی پر یہ ظلم ڈھانے کی۔" میں نے دروازے سے باہر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ رات ابھی باقی تھی۔ دروازے کے قریب جا کر میں نے آسمان پر نگاہ ڈالی۔ "میرا خیال ہے کہ آدھی سے زیادہ رات گزر چکی۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر... یار! یہ سراسر زیادتی ہے۔ ہم نے کیا کیا ہے اس گورائے کے خلاف؟"

"میں خود حیران ہوں بہرحال وہ جلدی ہم سے رابطہ قائم کریں گے۔ ذرا دیکھو تو باہر دو تالے لگے ہیں اور دونوں ... شکار پوری ہیں۔" میں نے آہنی دروازے میں سے ہاتھ باہر نکال کر تالوں کی سرگزشت اسے سنا دی۔

آبی بھی میرے قریب ہی آ گیا۔ اب وہ پہلے سے خود کو بہت بہتر محسوس کر رہا تھا۔ "لے تو ادھر قندیار کی سیر کر لے۔ بہت ارمان تھا تجھے آسیہ سے ملنے کا۔ اس کتے نے پہلے ہی جھٹکے میں ہمارا کام تمام کر دیا ہے۔"

"سمجھ لوں گا میں اس سے۔ فکر نہ کر۔ مجھے ہر بات یاد رہتی ہے۔"

"اس سے کیا ہوگا۔ ابھی تو اس نے ہمیں باندھ ہی لیا ہے۔ ہماری ضمانت دینے والا بھی یہاں کوئی نہیں ہے۔"

"چل آ جا ادھر۔ اطمینان سے بیٹھ۔ جو کچھ ہوگا دیکھ لیں گے کیا کر لیں گے وہ ہمارا؟" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے کمرے کے وسط میں لا بٹھایا۔ وہ بہت زیادہ تپا ہوا تھا۔ اندھیرے کی دبیز چادر کو کاٹنے کے لیے اس نے ایک ساتھ دو دو سلائیاں جلا دیں۔ اس کا چہرہ دیکھ کر میں لرز سا گیا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ اس صدمے سے پاگل ہو کر مجھے ہی نہ ادھیڑ ڈالے۔ اس پر جو کچھ بھی بیت رہی تھی، وہ میری ہی وجہ سے تھی۔ بہت پر بین سمجھتا تھا وہ مجھے۔ مگر قدم قدم پر میری ہر تدبیر اُسے الٹی ہوتی نظر آتی تھی تو اس کی رائے میرے بارے میں ایک دم خراب ہو جاتی تھی۔ دیا سلائیاں جلدی ہی بجھ گئیں تو اُس نے قمیص اتار کر اپنی بنیان الگ رکھ کر اسے آگ دکھا دی۔ کمرہ اور زیادہ روشن ہو گیا۔ اس آگ کی لو میں آبی کے چہرے کی بدلتی رنگت، مجھے اس وحشی کی یاد دلاتی تھی جس کو جنگل سے باندھ کر کسی نے پنجرے میں ڈال دیا ہو۔ وہ مجھ سے بھی کوئی بات نہیں کر رہا تھا اور میں اس سوچ میں گم تھا کہ آخر اس مکرم علی گورایا نے ہمیں یہ سزا کیوں دی ہے؟ کس لیے وہ ہم سے یوں قیدیوں ایسا سلوک کر رہا ہے؟ اسے کیا پرخاش ہے ہم سے؟ میرا خیال تھا کہ شاید اس یار محمد نے ہم سے یہ چالاکی کی ہے۔ میانوالی میں وہ ہمارے برابر نہ اتر سکا تھا تو اس نے ہمیں قندیار میں ذلیل کروانے کے لیے مکرم علی گورایا کو بتا دیا ہوگا کہ ہم کس قماش کے لوگ ہیں مگر اس بات کا ثبوت کوئی نہیں مل رہا تھا۔ وہ ہم سے ایک لمحے کے لیے بھی الگ نہیں ہوا تھا۔ جب وہ بچھڑا تو نگہت اس کے ساتھ تھی۔ اسے مکرم علی سے بات کرنے کا کوئی موقعہ ہی نہیں مل سکا تھا۔ وہ بلاشبہ بےقصور تھا۔ اس کے بارے میں کوئی بدگمانی میرے دل میں نہیں پیدا ہونی چاہیے تھی۔ مگر اصل راز تو کوئی ہم پر آشکارا کرتا۔ آخر اس گورائے نے ہمارے کس جرم کی سزا دی ہے ہمیں۔

بنیان جھیر جھیر جلتی رہی۔ اس کا شعلہ کبھی تیز ہو جاتا تھا اور کبھی یوں لگتا تھا جیسے وہ بھسم ہو رہا ہے۔ بنیان کا جلا ہوا حصہ خاکستری ہوتا جا رہا تھا۔ یہی کیفیت ہمارے ذہنوں کی تھی۔ وہ بھی اندر سے جل کر راکھ ہو گئے تھے۔

"میرا خیال ہے کہ اس مکرم علی کو آسیہ سے کوئی بہت بڑی شکایت ہے ورنہ وہ ہمارے ساتھ یہ سلوک نہ کرتا۔ ایسا تو ہمارے ساتھ کبھی بھی نہیں ہوا۔" آبی نے دوسرا سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"تو اس شکایت کو وہ ظاہر تو کرتا۔ یہ تو کوئی طریقہ نہیں ہے یار جی! ہم اس کا گلہ دور کر سکتے تھے۔"

"میرا خیال ہے کہ یہاں پہرے دار کوئی بھی نہیں ہے صرف دو تالے ہماری حفاظت کر رہے ہیں۔"

"لگتا تو ایسا ہی ہے کوئی ہوتا تو سامنے نہ آ جاتا۔"

بنیان اس عرصے میں جل کر راکھ ہو چکی تھی۔ آبی فرش پر ٹانگیں پھیلا کر لیٹ رہا، بولا۔ "تو بھی سو جا اپنے نصیب کی طرح۔ تیرے لیے یہی بہتر ہے۔ جیلانی! تیرا راستہ واقعی بہت کٹھن ہے۔" آبی نے ایسے آزردہ لہجے میں یہ بات کہی کہ میں سمجھا اس نے میرے سینے میں خنجر گھونپ دیا ہے۔ میں کتنی ہی دیر تک اپنے ماضی کے آئینے میں مستقبل کی تصویر دیکھتا رہا۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ میرا راستہ واقعی بے حد کٹھن تھا اور اب میں ایسے مقام پر جا پہنچا تھا کہ میری واپسی کسی بھی طرح ممکن نہیں تھی۔ ان گنت لوگوں کا خون میرے ہاتھوں پر لگا تھا۔ اور وہ پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ مجھے تختہ دار سے ادھر رکھ لینا ناممکن تھا۔ وہ لوگ جو مجھ سے بچھڑ گئے تھے ان کے لیے اپنی جان چھڑانا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ ساتا رحمن کے مارے لوگ بسا اوقات موت کے منہ میں جا گرے تھے۔ یہ میرے ہاتھ کی کرامت تھی کہ میری تقدیر مجھے اُن لوگوں کے سامنے رسوا ہونے سے بچا لیتی تھی مگر ہوتا یہی آیا تھا اور اب میرے سامنے مکرم علی گورایا آ ٹھہرا تھا۔ اس نے کوئی پوچھ گچھ کیے بغیر ہی ہمارے کھانے میں کوئی زہریلی شے ملا کر ہمیں بے بس کر دیا تھا تو مجھے یقین ہونے لگا تھا کہ اس کی موت اسے آوازیں دینے لگی ہے۔ ہم پر ہاتھ اٹھا کر کبھی کوئی آدمی سکھ کا سانس نہیں لے سکا تھا۔ اس کا بھی یہی حشر ہونے کو تھا۔ وہ کوئی بات کرتا، ہمارے آنے کا مقصد ہی پوچھ لیتا۔ اسے بہت غصہ آتا تو وہ ہمیں قلم بند سناتا، کچھ تو کہتا۔ مگر اس نے ہم سے بات کرنا بھی گوارا نہیں کی تھی اور اب ہم دونوں وہاں بیٹھے سوچ رہے تھے کہ اس کے ساتھ اگلا مرحلہ کیسے طے ہوگا؟

رات ٹھنڈی تھی اور کھلے دروازے میں سے ہوا اندر آ کر ہمیں یہ احساس دلاتی تھی کہ گرمیوں کی رُت آخر ہو گئی ہے۔ اکتوبر شروع ہونے کو تھا اور اب راتوں کو آدمی لحاف کے بغیر گہری نیند سو نہیں سکتا تھا۔ آبی تو میرے سامنے دل پر صبر کا پتھر رکھ کر لیٹا اور گہری نیند میں کھو گیا مگر مجھے ایک پل اونگھ نہیں آئی۔ یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ میں نے آبی کو جگانا مناسب سمجھا۔ خدا جانے اسے پھر

ایسی گہری نیند کب میسر آئے گی۔ اگلی راتیں پتہ نہیں ہماری کس طرح گزریں۔ کوئی کل کی بات آج کیسے کہہ سکتا ہے۔ اگلے پل کی تو آدمی کو خبر نہیں ہوتی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اگلا لمحہ آدمی کو زمین کے اوپر آئے گا کہ زمین اس کے اوپر آ جائے گی۔

میرا خیال ہے کہ اس وقت صبح کے چھ بج رہے ہوں گے۔ مجھے سلاخ دار دروازے کے سامنے ایک سایہ سا لرزتا نظر آیا۔ کوئی آدمی آیا اور تیزی سے دوسری طرف نکل گیا۔ میں اس کو آواز دینے کے لیے دروازے کے قریب جا ٹھہرا۔ چند ہی لمحوں بعد وہی آدمی دوبارہ وہاں آ کھڑا۔ اب اس کے ہاتھ میں دونالی بندوق تھی۔ وہ دروازے سے تین چار قدم دور ٹھہر گیا۔ مجھے اس نے وہاں کھڑے دیکھ لیا تھا مگر اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ دور کھڑا مجھے بڑی گہری نظروں سے دیکھتا رہا۔

"کیا بات ہے میاں! یہ ہمیں کس بات کی سزا دے رہے ہو تم لوگ؟ ہم تو گورایا صاحب کے مہمان تھے؟" میں نے اس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ مگر میری اس بات کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بندوق کو کچھ اس انداز سے اس نے پکڑ رکھا تھا، جیسے وہ ابھی مجھ پر گولی چلا دے گا۔

"اوئے تو بولتا کیوں نہیں ہے میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتا ہے کتے کے بچے! جانتے ہو ہم کون ہیں؟ اس حویلی کو جڑ سے اکھاڑ سکتے ہیں ہم۔ بتاؤ ہمیں کس نے ڈالا ہے یہاں؟" میں نے اب کی بار ذرا دبنگ لہجے میں بات کی۔ میرے پہلے لفظوں کا تو اس پر اثر ہی نہیں ہوا تھا۔ لازم تھا کہ میں اپنی زبان کو اس کے لیے قینچی بنا لیتا۔

"منہ سنبھال کر بات کر اوئے! مجھے نہیں پتہ تو کون ہے۔ چل اندر بیٹھ۔ گورایا صاحب سے پوچھنا کہ تمہیں یہاں کس لیے باندھا گیا ہے۔ اوئے بیلے! لا ادھر یہ چائے اسے دے دے، اس کھوتے کے پتر کو۔"

اس کی یہ بات سنتے ہی بیلا چائے کا سامان ایک ٹرے میں رکھ کر دروازے میں آ کھڑا۔

"اچھا تو یہ تو ہے! وہ کھانا بھی تو ہی لایا تھا ہمارے لیے؟" میں نے ٹرے اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔ ایک ایک کر کے میں نے چائے کے سارے برتن دروازے کی سلاخوں میں سے اندر ڈال دیے۔

"مجھے کیا پتہ تھا جی! کھانا تو میں ہی لایا تھا۔ آپ اس کے فوراً ہی بعد بے ہوش ہو گئے۔ کوئی اپنا ہی نشہ پانی کر رکھا ہو گا آپ نے۔"

"دیکھ بیلے! مجھے معلوم ہے کہ تو سب کچھ جانتا ہے۔ اتنا بھولا نہیں ہے تو۔ مگر اس مکرم علی سے کہہ دینا کہ اس نے بڑے غلط لوگوں سے پیچ ڈال لیا ہے۔ ہم شاید اسے زندہ نہ رہنے دیں۔ کہہ دینا اس سے۔"

"یہ کس سے باتیں کر رہا ہے تو؟" آبی نے ہماری باتیں سن لی تھیں۔

"یہ وہی بیلا ہے کتے کا بچہ! ہمارے لیے رات کا کھانا یہی لایا تھا۔"

"پکڑ اس کو یار! ٹھہر، میں اس سے بات کرتا ہوں اس کلیان روگ سے۔" یہ کہہ کر آبی اپنی جگہ سے اٹھا اور دروازے میں آ کھڑا۔ آتے ہی اس نے بیلے کو گریبان سے پکڑ کر دروازے کی سلاخوں سے اس کا سر کچھ اتنی تیزی سے دے مارا کہ اس کے ماتھے سے خون بہنے لگا۔ آبی اسے گندی گالیاں دے رہا تھا، بولا۔ "تیرے۔۔۔ یار آئے اور تو نے انہیں نشہ پلا کر باندھ لیا کمینے تو چاہتا کیا ہے آخر؟ اس گورائے کو بتا دینا کہ اس کے جوائی یونہی نہیں جائیں گے یہاں سے۔ دو چار کا خون کر کے نکلیں گے۔"

اس بیلے کا یہ حال دیکھ کر پہرے پر کھڑا آدمی بلا کی تیز رفتاری سے آگے بڑھا اور اس نے بندوق کے دستے کو گھما کر آبی کے ہاتھ پر دے مارا۔

"چھوڑ دے اس کا گریبان چھوڑ دے ورنہ میں گولی مار دوں گا۔ ایک تو تمہارے لیے یہ چائے لایا اور اس پر یہ سلوک کرتے ہو اس سے۔ چھوڑ دو اسے۔"

آبی کی کلائی پر ابھی دستہ نہیں لگا تھا کہ اس نے بیلے کو چھوڑ دیا۔ وہ تیورا کر فرش پر گر گیا۔ چوٹ اسے زیادہ ہی آ گئی تھی۔ پہرے دار نے فوراً ہی اسے اوپر اٹھا کر اس کی قمیص کے دامن سے اس کا ماتھا پونچھتے ہوئے کہا۔ "یہ چائے دے کر کس نے بھیجا تھا یہاں؟ کیوں آیا تھا تو ادھر؟"

"مجھے بیگماں نے بھیجا تھا جی! اس نے کہا تھا کہ میں ان کو چائے دے آؤں۔"

"بیگماں؟ اس کا کیا تعلق ہے ان سے؟ ایک دم بیوقوف آدمی ہے تو۔ ان کو گورایا صاحب کے حکم سے یہاں ڈالا گیا تھا۔ وہ بیگماں کون ہوتی ہے انہیں چائے دینے والی۔ چلو میں خود بات کرتا ہوں اس سے۔" یہ کہہ کر وہ بیلے کو ساتھ لیے اسی وقت واپس چلا گیا۔ اس کے ماتھے سے اب تک خون بہہ رہا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ اس محبس کے سامنے پہنچتے ہی اس کے ساتھ کوئی ایسا سلوک بھی ہو سکے گا۔ پہرے دار کا نام غلام فرید تھا۔ اس نے بیلے کو کہیں راہ میں چھوڑا اور پھر ہمارے سامنے آ کھڑا۔

کمرے کی صورت بالکل حوالات ایسی تھی جس کا دروازہ آہنی سلاخوں سے بند کیا گیا تھا اور وہ دروازے سے چار قدم دور آ رکا تھا۔

آبی نے پیچھے پلٹ کر چائے تیار کی۔ ٹرے میں پراٹھے بھی دھرے تھے۔ وہ ہم نے کھا لیے۔ ذائقہ ان کا بھی معمول کے مطابق ہی نظر آتا تھا۔ اور اب ہمیں اس بات کی ٹوہ بھی نہیں تھی کہ کسی نے چائے میں کوئی نشیلی چیز ملا دی ہو گی۔ اپنے انجام کو تو ہم پہنچ ہی چکے تھے۔ وہاں سے ہمیں بے ہوش کر کے کسی اور جگہ لے جانے کی انہیں کوئی ضرورت نہیں تھی۔ جو کچھ بھی ہمیں بھگتنا تھا وہیں بھگت سکتے تھے لیکن ابھی تک ہمیں اپنے جرم کا علم نہیں ہو سکا تھا۔ پہرے دار غلام فرید اور بیلا دونوں ہی اصل صورت حال سے بے خبر تھے۔

چائے پی کر ہم نے برتن الگ رکھ دیے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ہم بات کس سے کریں۔ آبی نے سگریٹ سلگا کر دیوار کے ساتھ ٹیک لگا دی۔ غلام فرید پر بار بار اس کی نگاہ اٹھتی تھی مگر اب اس سے مخاطب ہونا بالکل بے معنی تھا۔ آدھا گھنٹہ اسی طرح گزر گیا۔ بیلے کے زخم کی نوعیت سمجھنے کی کسی کو شاید فرصت ہی نہیں تھی۔ اس نے اندر جا کر بہت واویلا مچایا ہو گا۔ مگر کسی نے بھی اس کی بات پر دھیان نہیں دیا۔

آبی نے پیکٹ میری طرف پھینک دیا، بولا۔ "اس میں بھی اب دو ہی سگریٹ باقی ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارا بنے گا کیا؟"

"کچھ نہ کچھ تو بن ہی جائے گا۔ اب تو یہ سگریٹ بھی آدھا آدھا کر کے پینا پڑے گا۔ ایسی تنگدستی تو ہم نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس گورائے کو سوجھا کیا ہے؟"

"پتہ نہیں کس شمر کی اولاد ہے یہ کتے کا بچہ میرے سامنے آتا تو میں اس کی کھال ادھیڑ دوں گا۔ مہمانوں کے ساتھ یہ سلوک کر رہا ہے وہ۔"

دروازہ ایک بار پھر تاریک ہونے لگا۔ ہم دونوں وحشت زدہ جانوروں کی طرح ادھر دیکھنے لگے۔ اب کی بار وہاں ایک ناٹے قد کا آدمی آ ٹھہرا تھا، بولا۔ "تم نے بیلے کو خواہ مخواہ ہی پیٹ دیا۔ وہ تو تمہارے لیے چائے لے کر آیا تھا۔"

"وہ اسی لائق تھا۔ وہ بدمعاش۔ اور اب تم کس لیے آئے ہو، کیا چاہتے ہو ہم سے؟"

"میں نے تمہارے لیے دو چارپائیاں اور بستر پچھلے کمرے میں ڈال دیے ہیں۔ غسل خانہ بھی وہاں موجود ہے۔ ضرورت کی تمام چیزیں بھی وہاں رکھوا دی ہیں۔ اٹھ کر منہ ہاتھ دھو لو اور پلنگ بچھا لو۔ پتہ نہیں تمہیں کتنا عرصہ یہاں رہنا پڑے گورایا صاحب کا مہمان بن کر۔"

"تو کون ہے بڑے بھائی! تیری شکل مجھے شیطان سے ملتی جلتی نظر آتی ہے۔ یہ بستر کس لیے ڈالا ہے تم نے، کون سا مردانہ کام لینا ہے ہم سے؟" آبی نے بہت ہی جلے کٹے لہجے میں کہا۔ وہ اٹھ کر دروازے تک جا پہنچا تھا۔

آبی کی یہ بات سن کر وہ ہنسنے لگا۔ بولا۔ "میرا نام خرد خان ہے بھائی جی! اور میں گورایا صاحب کے مہمانوں کی ہر ضرورت کا خیال رکھتا ہوں۔ وہ پچھلا دروازہ کھول لو۔" یہ کہہ کر اس نے نیفے میں ہاتھ ڈال کر پستول باہر نکال لیا۔ وہ باقاعدہ مسلح ہو کر ہمارے سامنے آیا تھا۔ آبی نے اس چھوٹے سے مٹھی بھر پستول کو دیکھا تو وہ کچھ بدک سا گیا۔ اس خرد خان سے وہ بیلے ایسا سلوک نہیں کر سکتا تھا حالانکہ چاہتا وہ یہی تھا۔ وہ پیچھے ہٹ آیا اور عقبی دیوار کے دروازے تک جا پہنچا اور پاؤں سے ٹھوکر مار کر اسے کھول دیا۔ خرد خان ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اس نے وہاں دو پلنگ کھڑے کر رکھے تھے اور ان پر بستر بھی موجود تھا۔

"اچھا تو یہ قصہ ہے۔ یہ تو سگریٹ بھی موجود ہیں یہاں اور صابن تولیے کا بھی انتظام ہے جیلانی! اس پر تو غور کر ذرا۔"

اس کی یہ بات سن کر میں بھی اس کے پاس جا ٹھہرا۔ وہ کمرہ غسل خانے کے طور پر استعمال ہوتا تھا اور خرد خان نے یوں کیا تھا کہ دوسری طرف کا دروازہ کھول کر اس نے وہ تمام چیزیں وہاں ڈال دی تھیں اور اس سے آگے دروازہ دوسری طرف سے مقفل کر دیا تھا۔

"یہ قصہ کیا ہے خرد خان! تو نے واقعی ادھر 'حجرۂ عروسی' کا بندوبست کر دیا ہے مگر ہم بھلا کس کام آ سکتے ہیں پیارے! کوئی قیدیوں کو ان کی مرضی کے خلاف کیسے استعمال کر سکتا ہے۔ کیا خیال ہے تیرا بیچ اس مسئلے کے۔"

خرد خان پھر ہنسنے لگا، بولا۔ "یہ حجرۂ عروسی نہیں ہے بھائی جی! اک ذرا آپ کی قید لمبی ہو جائے گی۔ گورایا صاحب کا یہی خیال ہے۔ دو پلنگ اس کمرے میں ڈال لیں اور آرام کریں۔ ابھی بارہ بجے آپ کو کھانا بھی مل جائے گا۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے پیچھے ہٹا اور غلام فرید کا کندھا تھپتھپا کر دوسری طرف نکل گیا۔

آبی کی طرح میں بھی اس صورت حال سے بے حد پریشان تھا۔ گورائے نے واقعی ہمارے لیے لمبی قید کا بندوبست کر دیا تھا۔ اور خدا ہی بہتر جانتا تھا کہ اس نے ہمیں کس مقصد کے لیے اس قید خانے میں ڈال دیا تھا۔ وہ ابھی تک کھل کر ہمارے سامنے نہیں آ رہا تھا۔

"ہٹاؤ یار! یہ پلنگ تو ادھر ڈال لو اور یہ سگریٹ بھی

اٹھالو۔ اِن کُتّے کے بچوں نے عمدہ قسم کے سگریٹ بھیجے ہیں اور بستر بھی تو دیکھو۔ لحاف بھی ساتھ ہیں اور مہکتے ہوئے۔" یہ کہہ کر اس نے ایک پلنگ خود اُٹھا لیا۔ جب ہم دوسرے کمرے میں پلنگ ڈال کر اُن پر بستر بچھا چکے تو آبی غسل خانے میں جا گھسا۔ پانی کا انتظام بھی وہاں معقول تھا۔ کسی جگہ ان سالوں نے شاید کوئی ٹیوب ویل لگا رکھا تھا۔ غسل خانے میں باقاعدہ ٹیپ چل رہا تھا۔ دروازہ بند کر کے آبی نے بالٹی سیدھی کی اور نہانے میں مصروف ہو گیا۔ مجھے اس سارے انتظام میں کوئی ازلی ابدی خرابی نظر آتی تھی۔ گورائے نے ہمیں ایسے گورکھ دھندے میں پھنسا دیا تھا کہ میں اسکی کوئی بھی بات سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس لبلوس نے ہمیں ذلیل کر کے رکھ دیا تھا۔ کوئی پوچھے کہ سالے آخر تجھے سوجھی کیا ہے؟ کون سی دشمنی تھی تجھے ہم سے؟ تو جو ٹھکانے کر کے ہم غریبوں پر پل پڑا تھا تو اس کا فائدہ کیا تھا؟ تیرا کوئی کام اٹکا ہے ہم سے تو صاف صاف کہہ دے۔ بڑا بیبے بڑا دانا بنتا ہے تو مگر تجھے کچھ تو حیا ہونی چاہیے تھی۔ ہمارا کوئی جرم بتلائے بغیر تُو نے ہمیں قید کر دیا اور وہ بھی کسی لیپا ڈگی کے بغیر۔

آبی نہا کر باہر نکلا تو وہ تازہ دم نظر آ رہا تھا، بولا "تُو بھی نہا لے پیارے! تیرے گناہوں کا بوجھ اتر جائے تو یہی غنیمت سمجھو۔ جاؤ، پانی بہت ٹھنڈا ہے، اُدھر دُوسرا تولیہ بھی پڑا ہے۔"

"تو تو یُوں نہا کر نکلا ہے جیسے یہ تیری سسرال کا گھر ہے۔ بڑی رونق آ گئی ہے تیرے چہرے پر۔"

"تو میں اور کیا کروں؟ اک ذرا فرصت کے دن آتے ہیں تو تجھے یہ بھی راس نہیں آتے۔ جو دم گزر جائے وہی غنیمت سمجھو۔ یہ آسیہ پتہ نہیں ہمیں کیسے کیسے کنوئیں دکھوائے گی۔"

"اس کا تو کوئی پتہ ہی نہیں چل رہا ہے۔ یُوں لگتا ہے جیسے وہ یہاں کبھی آئی ہی نہیں۔" یہ کہہ کر میں بھی غسل خانے میں جا گھسا۔ نل میں پانی وافر تھا اور نیچے بالٹی لبالب بھری تھی۔ اور اس میں ڈونگا بھی دھرا تھا۔ آبی نے صابن کی ایک تہائی ٹکیہ خود استعمال کر لی تھی۔ میرا خیال ہے کہ اس نے اپنے سارے ہی گناہوں کو دھو ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ اتنی ٹکیہ چار، پانچ مرتبہ صابن لگانے ہی سے گھلتی تھی اور آبی کی یہ عادت تھی کہ وہ غسل خانے میں گھس کر ایک بار نہیں کئی بار بدن پر صابن لگاتا تھا۔ نیا تولیہ اس نے میرے لیے الگ چھوڑ دیا تھا۔

جب میں نہا کر باہر آیا تو آبی اس وقت آہنی دروازے پر کھڑا تھا اور غلام فرید کو آگے آنے کے لیے کہہ رہا تھا مگر وہ کھسک کر اور پیچھے ہٹ گیا۔ بندوق اس نے یوں کندھے سے لگا لی تھی، جیسے وہ شست باندھ رہا ہو۔ میرا خیال ہے کہ قیدیوں کی نگرانی پر اسے پہلی بار مامور کیا گیا تھا۔ آبی اس سے مخاطب ہوتا تھا تو اس کا رنگ پیلا پڑنے لگتا تھا۔ آبی مایوس ہو کر پلنگ پر آ بیٹھا۔ غلام فرید کو وہ بڑی پر پیچ گالیاں دے رہا تھا اور اس نے سُن بھی لی تھیں مگر وہ آبی کی کسی بات کا جواب نہیں دیتا تھا۔ پتہ نہیں اسے اُن لوگوں نے ہم پر کیوں مسلط کر رکھا تھا۔ وہ کسی بھی کام کا آدمی نہیں تھا۔ محض بندوق اٹھا لینے سے تو کچھ نہیں ہوتا۔

میرا خیال ہے کہ دن کے گیارہ بج رہے ہوں گے جب وہ ناٹے قد کا آدمی ایک بار پھر آہنی دروازے پر نمودار ہُوا۔ اس کے عقب میں مکرم علی گورایا بڑے طمطراق سے چلتا ہوا دوار آ ٹھہرا تھا۔ دو آدمی اور بھی اس کے ساتھ اور وہ پوری طرح مسلح تھے۔

اس کو دروازے پر دیکھ کر ہم دونوں غضبناک ہو کر اپنی جگہ سے اُٹھ گئے۔ ہمیں اس کی صورت سے نفرت ہو گئی تھی۔ آبی کی آنکھوں میں جب غصّہ بھر آتا تھا تو اس کی طرف دیکھا نہیں جاتا تھا۔ وہ تڑپ کر آگے بڑھا اور بولا "یہ کیا شرارت ہے گورائے! تُو نے کیا سمجھ کر ہمارے ساتھ یہ کھیل کھیلا ہے جانتا ہے تُو ہم کون ہیں؟" اس نے جاتے ہی دروازے کی سلاخوں کو یُوں پکڑ لیا تھا جیسے وہ انہیں توڑ ڈالے گا۔

"تیرا نام جیلانی ہے نا؟"

"نہیں میں اسلم آبی ہوں۔ جیلانی وہ ہے۔ تُو نے ہمیں اپنی کس بیٹی کے لیے باندھ کر رکھ لیا ہے یہاں؟ آخر تیرا مقصد کیا ہے؟ یہ ذلالت کیوں دکھا رہا تو؟ ہم تو تیرے مہمان تھے۔"

"اتنا غصّہ ٹھیک نہیں ہے برخوردار! اس جیلانی کو اِدھر۔ اور زیادہ کچھوں کچھاں کی ضرورت نہیں ہے۔ اِدھر میاں! میں تم سے ہی بات کرنے آیا ہوں۔" اس کا لہجہ اس کے بے پناہ ضبط کا پتہ دیتا تھا۔ وہ آبی کی اتنی تلخ ترش باتیں سننے کے باوجود طیش نہیں آیا تھا۔

"جی فرمائیے! میرا نام ہی غلام جیلانی ہے۔"

"ہوں! تم اس لڑکی کے بھائی ہو جسے آسیہ کہتے ہیں؟"

"جی ہاں! میں اس کا سگا بھائی ہوں۔"

"ہوں! وہ ہمارے پاس یہاں آئی ضرور تھی، اسے ہم نے شب خیر سے پچاس ہزار روپے میں خریدا تھا۔ اسے ہم داشتہ بنا کر یہاں لے آئے تھے۔" اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"سوچ کر بات کرو مکرم علی! تمہیں معلوم ہے وہ جیلانی کی بہن ہے۔ ہمیں طیش نہ دلاؤ۔ تم اپنی بہن کے بارے میں ایسی بات سُننا پسند نہیں کرو گے۔" آبی نے ایک بار پھر آہنی سلاخ سے اُلجھتے ہوئے کہا۔ مکرم علی ہماری پہنچ سے دور کھڑا تھا۔ کاش اس تک ہمارا ہاتھ پہنچ سکتا۔

آبی کی بات کا اس نے کوئی احساس نہیں کیا، بولا "وہ چھ دن ہمارے پاس رہی۔ وہ بہت خوبصورت لڑکی ہے مگر ہمیں یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ ایک بچّے کی ماں بن چکی ہے اور ہمیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کے پیٹ کا آپریشن ہو چکا ہے۔ ہماری رقم برباد ہو گئی مگر ہم نے اسے اپنے ملازموں میں شامل کر دیا۔ وہ ہمارے لائق ہرگز نہیں تھی۔ ہمارے ساتھ شب خیر نے دھوکا کیا مگر پھر بھی وہ دیکھنے دکھانے کی چیز تھی، وہ آسیہ، وہ دس دن تک ہمارے ملازموں میں شامل رہی مگر پھر ایک رات وہ ہماری تین داشتاؤں کو ساتھ لے کر یہاں سے فرار ہو گئی — یہاں سے جاتے وقت وہ ہماری تجوری سے پانچ لاکھ روپے بھی لے گئی اور اب تم ہمیں یہ بتانے آئے ہو کہ اس کے ٹھکانے کا تمہیں کوئی علم نہیں ہے۔ ہم نے تمہیں اسی لیے یہاں قید کیا ہے کہ جب تک ہماری رقم اور وہ تین عورتیں واپس نہیں مل جاتیں، تم یہاں ہی رہو گے یہی ہمارا فیصلہ ہے۔ اب تم سوچ سمجھ کر ہمیں بتاؤ کہ تم کیا چاہتے ہو۔ جب تک آسیہ کا ہمیں پتہ نہیں ملتا، تم دونوں اِدھر ہی پڑے رہو گے، خواہ اس میں ایک سال لگ جائے۔"

"ذرا آگے تو آؤ مکرم علی! تم سے ہاتھ ملا کر مجھے خوشی ہو گی۔" آبی نے آہنی سلاخوں پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا ورنہ وہ اس کی تِکا بوٹی نوچ لیتا۔ میری کیفیت بھی اس سے مختلف نہیں تھی۔ مگر وہ ہماری پہنچ سے دور تھا اور ہمارے ہاتھوں کی کوتاہی ہمیں یہ احساس دلاتی تھی کہ ہم محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔

"تمہیں ہمارے بارے میں یہ سب کچھ کیسے معلوم ہُوا؟ رات تو تم ہم سے بات بھی کرنا گوارا نہیں کر رہے تھے؟"

"یار محمد ہمیں تمہارے یہاں آنے کا سبب بتا گیا تھا۔ اس نے اچھا کیا، وہ تمہارے ساتھ آ گیا۔ مگر تم اس کی باتوں میں آ گئے۔ اب وہ نکہت کو ساتھ لے کر آزاد گھوم رہا ہو گا۔"

"تمہیں بڑی غلط فہمی ہوئی ہے مکرم علی! بہتر ہے تم ہمیں چھوڑ دو۔ آسیہ کے کسی فعل کے ہم ذمّے دار نہیں ہیں۔ ہم تو خود اس کی تلاش میں پھر رہے ہیں۔ ہمیں کیا پتہ وہ کہاں چلی گئی ہے۔"

"اس کے آنے تک تمہیں یہاں رہنا ہو گا۔ اب یہ خبر اُسے مل جائے گی کہ میں نے تمہیں باندھ لیا ہے۔ تمہیں یہاں کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ اس کو پیغام بھیج دو کہ تم کس مصیبت میں پھنس گئے ہو۔"

"تمہیں یقین نہیں آتا۔ ہمیں معلوم نہیں ہے کہ وہ کہاں ہے۔ ہم نے پہلے بھی دو آدمی یہاں بھیجے تھے۔ اُن پر کس نے حملہ کیا تھا؟"

"وہ بچ کر چلے گئے جس کا مجھے افسوس ہے۔ ورنہ میں انہیں زندہ نہ جانے دیتا۔ میرے آدمی ہی نکمے نکلے کہ انہیں پکڑ نہ سکے۔ بہرحال تمہیں میں اب یہاں سے جانے نہیں دُوں گا۔ ان کا خیال رکھو غلام فرید! بہرحال انہیں روٹی پانی کی تکلیف نہیں ہونی چاہیے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے عقب میں کھڑے آدمیوں کو ساتھ لیا اور تیزی سے دوسری طرف نکل گیا۔ اس کے رویّے نے ہمیں حیران کر دیا تھا۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ آسیہ کے بارے میں ہمیں سب خبریں معلوم ہیں۔ اسے یقین تھا کہ ہم اس سے مل کر آئے ہیں اور اس سے جھوٹ بول رہے ہیں کہ ہمیں اب تک اس کی تلاش ہے۔

وہ باہر نکل گیا تو آبی اپنی اس بے حد و حساب بے بسی پر تلملاتا ہوا پیچھے ہٹا اور پلنگ پر جا لیٹا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔ وہ پہلا موقعہ تھا کہ میں نے اسے یوں بلک بلک کر روتے دیکھا۔ اس کی آواز نہیں نکلتی تھی مگر میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ پتہ نہیں اس کا دھیان کس طرف جا پڑا تھا۔ اسے کیا یاد آیا تھا کہ اس کا دل سنبھالے نہیں سنبھلتا تھا۔

"یہ۔۔۔ یہ تجھے کیا ہو گیا ہے آبی! تُو تو ایسا نہیں تھا یار! اتنی ذرا سی بات پر تو رو دیا ہے۔ ہوا کیا ہے آخر؟"

مگر میری بات کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تکیے میں سر دے کر وہ جی بھر کر رو لیا تو خود اس نے اپنے آنسو پونچھ لیے اور میری طرف دیکھے بغیر غسل خانے میں جا گھسا۔ جب وہ باہر آیا تو مسکرانے کی کوشش کر رہا تھا، بولا "یار یہ ہم کس مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔ آسیہ اسکی تین عورتیں بھی لے گئی۔ کیا کرے گی وہ اُن کے ساتھ، اس کے کس کام آ سکیں گی وہ؟"

"میرا خیال ہے کہ وہ بھی اس کی طرح یہاں برباد ہو رہی ہوں گی، اس کے کہنے پر باہر نکل گئیں۔"

"اس کا پتہ کرو یار! یہ مکرم علی تو کوئی بہت ہی ذلیل آدمی نظر آتا ہے۔ کیسا تحمل تھا اس کی آواز میں۔ کوئی بہت ہی منجھا ہُوا کھلاڑی ہے۔"

"تو بھی کم منجھا ہوا نہیں ہے، پر تیرا رونا میری سمجھ میں نہیں آیا۔"

"رونے کی بات ہی ہے یار! ہمیں اللہ نے سب کچھ دے دیا۔ اتنی پہاڑ ایسی رقم ہمارے پاس ہے مگر ہم اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے، دشمن سے بدلہ نہیں لے سکتے۔ ہم تو کچھ بھی نہیں کر سکے۔ کتنی بڑی بدنصیبی ہے یہ۔ کیسی زندگی گزار رہے ہیں ہم۔"

"ہاں یہ تو ہے مگر یوں ہمت ہارنے سے کچھ نہیں ہو گا۔

مت رویا کر میرے سامنے۔ اک تیری وجہ سے تو میں زندہ ہوں یار جی! ورنہ تو یہاں زمین کے اوپر ہمارے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ ہم یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں گے۔ یہ کب تک ہمیں باندھ سکتا ہے،" میں نے گرد و پیش پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ یوں جیسے وہاں سے کوئی خفیہ راستہ باہر نکلتا ہو۔ حالانکہ سنگی دیواریں ہماری راہ میں حائل تھیں اور دروازہ حوالات کے دروازے ایسا تھا۔ مضبوط آہنی سلاخوں سے مزین اور غلام فرید وہاں کھڑا پہرہ دے رہا تھا۔

وہ رات بھر کا جاگا ہوا آدمی ابھی تک دروازے پر کھڑا تھا۔ اور اب اسے اونگھ آنے لگی تھی۔ مگر بندوق کی لبلبی اس کی انگلی تلے ابھی تک دبی ہوئی تھی۔ کوئی ایک گھنٹے بعد ایک اور آدمی پہرے پر آ ٹھہرا۔ وہ کوئی نئی عمر کا آدمی تھا اور جانتا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ غلام فرید اسے عمر دراز کہہ کر مخاطب کر رہا تھا، بولا۔

"ذرا دھیان سے رہنا، بڑے ہیر کاریگر لوگ ہیں اور گورایا صاحب نے کہا ہے کہ اگر یہ فرار ہو گئے تو ہماری جان نہیں چھوڑیں گے۔"

"فکر ہی نہ کر پیارے! ان کو تو میں ایسی نکیل ڈالوں گا کہ دیکھتے رہ جائیں گے تو جا اب نہا دھو کر سو جا۔ اب میں جانوں اور میرا کام۔"

"اور دیکھو ان کے قریب مت جانا۔ یہ بندے پر جھپٹا مارتے ہیں، ہاں۔"

"اچھا! ٹھیک ہے۔ میں خیال رکھوں گا۔" عمر دراز نے کہا۔ غلام فرید اس سے مصافحہ کر کے باہر نکل گیا۔ یہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ ہم حویلی کے کس حصے میں بند ہیں۔ عمر دراز نے یوں کیا کہ وہ ہمارے سامنے ہی نہیں آیا۔ دروازے سے ہٹ کر اس نے دیوار کے ساتھ ٹیک لگائی اور پھر چپ سادھ کر لیٹ رہا۔ اسے ہماری نگرانی میں کوئی دقت اٹھانی نہیں پڑ رہی تھی۔ دروازہ مقفل تھا جس میں سیر سیر بھر کے دو تالے لگے تھے اور وہ بالکل مطمئن تھا۔

یونہی صبح شام پہرے بدلتے رہے۔ ہمیں تین وقت کا کھانا بڑی باقاعدگی سے پہنچتا رہا۔ سگریٹ ختم ہوتے تو وہ بھی ہمیں پہنچا دیے جاتے۔ یوں لگتا تھا جیسے ہم لمبے عرصے کے لیے وہاں ڈال دیے گئے ہیں۔ کوئی نہیں پوچھتا تھا کہ میاں تم کون ہو، کیسے اس چکر میں پھنس گئے ہو۔ گورایا اس عرصے میں ایک دن بھی ہمارے پاس نہیں آیا۔ اس کا کوئی آدمی ہم سے کوئی بات ہی نہیں کرتا تھا۔ اس مصیبت میں پڑ کر تو ہم بھول ہی گئے تھے کہ ہم تھے کون اور وہاں آئے کس مقصد کے لیے تھے؟ یوں لگتا تھا جیسے ہم ریگ رواں پر کھڑے تھے جو پھیلی اور ہمیں اپنی تہوں میں لپیٹ کر زمین کے اندر لے گئی۔ کچھ بھی تو ہمارے پاس باقی نہیں بچا تھا۔ تین چار دن بعد البتہ غلام فرید ہم سے ضرور پوچھ لیتا تھا کہ میاں جی! گورایا صاحب پوچھتے ہیں کہ ان کے سوال کا جواب کیا ہے؟ آبی کو بہت غصہ آتا تھا اس سوال پر۔ کسی دن تو وہ بہت زیادہ تپ جاتا تھا اور وہ بے چارہ اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا تھا۔ اسے شاید ہم پر جبر و تشدد کا کوئی حق حاصل نہیں تھا۔ میرا خیال ہے کہ گورایا نے خود ہی اسے منع کر رکھا تھا ورنہ وہ تو شاید ہماری بوٹی بوٹی نوچ لیتے۔ انہیں تو ہم ایسا کوئی تر نوالہ ہی ملنے کی دیر تھی۔

افسوس مجھے یہ تھا کہ بینک سے اب کی بار بھی جو روپیہ ہم نے نکلوایا، وہ گورائے کے ہاتھ آ گیا۔ ہماری ایک رقم تو یار لوگوں نے کستورہ میں ہڑپ کر لی تھی اور اب یہ دوسری بھی تباہ ہوتی نظر آتی تھی اور اس کا مجھے بہت زیادہ افسوس ہو رہا تھا۔ بڑے گنج پال بنے پھرتے تھے ہم۔ جنگل جنگل گھومتے تھے اور کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے مگر جب ہم گرے تو پھر گرتے ہی چلے گئے۔ ہمارے تنزل کی کوئی انتہا ہی باقی نہیں رہی تھی۔ یار لوگوں نے اب کی بار گٹھڑی حلال اور لقمہ مردار کے مترادف ہمیں تو اس قید خانے میں ڈال دیا تھا اور ہماری رقم سنبھال کر رکھ لی تھی۔ گورائے کا کھنس ہماری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ آسیہ اس کے پاس آئی اور کئی لاکھ روپے کا نقصان پہنچا کر واپس چلی گئی۔ شب خیر کو تو اس نے پچاس ہزار ہی دیے تھے مگر آسیہ اس کی تجوری سے پانچ لاکھ روپے لے گئی اور تین عورتیں بھی وہ اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ کوئی پوچھے، بدمعاش! تجھے اتنی ساری عورتیں جمع کرنے کی کیا سوجھی؟ ان سے کیا کام لیتا ہے؟ شطرنج کھیلتا ہے تو ان کے ساتھ۔ مغلئی طرز کی شطرنج کہ ان کے پاس بڑا وقت تھا، سارے جہان کی دولت سمٹ کر ان کی طرف چلی آتی تھی اور وہ اپنی تاریک راتوں کو چاند دکھانے کے لیے حسینوں کی بساط بچھا لیتے تھے۔ ہر چال پر برہنہ دوشیزائیں بھی بساط پر چل کر ادھر سے ادھر ہو جاتی تھیں۔ کیا کرتا تھا تو ان عورتوں کے ساتھ گورایا صاحب؟ تجھے آسیہ نے اچھا سبق دیا ہے مگر اب اس کے جرم کا بدلہ تو ہم سے لے رہا ہے۔ ہمیں اس کھکیڑ میں ڈال کر تجھے کیا مل جائے گا؟ ہماری قید تو کسی روز ختم ہو ہی جائے گی مگر تجھے نہیں معلوم کہ ہم تیرا کیا حال کریں گے۔ حیرت مجھے یہ تھی ان میں سے کوئی بھی آدمی ہمارے قریب نہیں آیا تھا۔ کھانا وہ دروازے میں سے اندر دھکیل دیتے تھے۔ اور باسی برتن وہاں سے اٹھا کر باہر لے جاتے تھے۔ کوئی عورت تھی، ادھیڑ عمر کی۔ اس کو اسی کام پر لگا رکھا

ان لوگوں نے۔ وہ ایسی بھولی بھالی اور معصوم نظر آتی تھی کہ اس پر نہ میں ہاتھ اٹھاتا نہ آبی۔ وہ ہماری روزی رساں بن گئی تھی۔ اس کو ناراض کر کے ہم بھوکوں نہیں مرنا چاہتے تھے۔

میرا خیال ہے گورائے کی قید میں وہ ہمارا پندرھواں دن تھا۔ ہم رات کو ادھر ادھر کی بکواس کے بعد سونے کی تیاری کر رہے تھے کہ مجھے غسل خانے میں جانا پڑا۔ میں ابھی وہاں بیٹھا ہی تھا کہ مجھے کسی طرف سے ایک بڑی ہی دلدوز آواز سنائی دی۔ گھٹی گھٹی، دبی دبی۔ جیسے کوئی بے پناہ اذیت سے پریشان ہو کر فریاد کر رہا ہو۔ میں نے چونک کر چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ آواز ذرا دیر کے لیے ابھرتی تھی اور پھر ساکت ہو جاتی تھی۔ میں نے کمرے میں لوٹ کر آبی کو جگا دیا۔

"کیا بات ہے، خیر تو ہے؟" آبی کسی نئے حادثے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہونے لگتا تھا تو سب سے پہلے جوتے پہن لیتا تھا۔

"خیر ہی ہے، مجھے ایک آواز سنائی دی ہے ادھر غسل خانے میں۔ مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ آواز کہاں سے آ رہی ہے؟"

"آواز؟ تیرا وہم ہوگا یار! ویسے ہی تو معلم الملکوت بنا پھرتا ہے۔ یہاں آواز کہاں سے آئے گی؟"

"نہیں بھئی! میں نے خود سنی ہے، آ ذرا ادھر غسل خانے میں آ۔" یہ کہہ کر میں اسے دوسرے کمرے میں لے گیا۔ آواز اب بھی آ رہی تھی مگر بڑی مفلوج، بہت ہی گھٹی گھٹی اور بڑی ہی نحیف و نزار۔

"یار! یہ تو کسی آدمی کی آواز ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ آواز اس کمرے سے آ رہی ہے۔" اس نے کمرے کی مغربی دیوار کے ساتھ کان لگا دیے۔ بلاشبہ وہ آواز اسی کمرے سے آ رہی تھی مگر وہ تھا کون بدنصیب؟ گورائے نے اسے کیوں قید کر رکھا تھا وہاں؟ اس کی آواز میں اس قدر حزن و ملال کس نے بھر دیا ہے؟ کیا اس پر راتوں کو تشدد کیا جاتا ہے؟ آخر اس کو کس جرم کی سزا دی جا رہی ہے۔ گورائے کی اس حویلی نے ہمیں پریشان کر دیا تھا۔ ہم سے اپنی ہی مصیبت نہیں جھیلی جاتی تھی کہ اب اس میں یہ آواز بھی آ ملی تھی۔ ہم نے چاہا کہ اس دیوار کو کسی نہ کسی طرح توڑ ڈالیں مگر ہمارے پاس کوئی اوزار ہی نہیں تھا۔ ہم لوٹ کر دروازے کے سامنے جا ٹھہرے اس وقت عمر دراز پہرہ دے رہا تھا۔

"اوئے کن کھجورے! ادھر آ ذرا۔" آبی نے اسے بڑے تحکم آمیز لہجے میں بلایا۔

"کیا گل اے بھائی جی! میں کوئی بات نہیں کرتا تم سے۔"

"یہ اس کمرے میں کس کو باندھ رکھا ہے تم نے؟ اس کی آوازیں ہمیں سونے نہیں دیتی ہیں۔"

"کوئی بھی نہیں ہے ادھر بھائی جی! میں نے تو ادھر کسی کو نہیں دیکھا۔"

"تجھے پتہ ہے سالے! مگر تو بتانا نہیں چاہتا ہے۔ کون ہے وہ؟"

"میں نے کہا ہے ناکہ مجھے کچھ پتہ نہیں ہے۔" یہ کہہ کر وہ بندوق کندھے پر لٹکا کر دوسری طرف چلا گیا۔ وہ یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہاں سے وہ آواز کون پیدا کر رہا ہے مگر وہ اپنی جگہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ غسل خانے کے عقب میں جو کمرہ بنا تھا، اس کا دروازہ سامنے نہیں تھا۔ وہ کسی اور طرف کھلتا تھا اور اس کی نگرانی کی ذمہ داری اس پر نہیں تھی۔ وہ کچھ ہی دیر بعد واپس آ گیا، بولا "مجھے تو کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ یہ آپ کا وہم ہے بھائی جی! اب آپ سو جائیں۔"

"سو تو ہم جائیں گے ہی استاد! مگر اس ماتم کو کیسے بند کریں جو کوئی آدمی گورائے کی لاش پر کر رہا ہے۔" آبی نے پلنگ کی طرف لوٹتے ہوئے کہا۔ میں بھی اس کے سامنے جا بیٹھا۔ آوازیں غسل خانے میں کھڑے ہو کر ہی سنائی دیتی تھیں۔ ہمارا کمرہ محفوظ تھا۔ چند منٹ کے توقف کے بعد آبی پھر غسل خانے میں جا گھسا۔ اب وہ آوازیں بند ہو گئی تھیں۔ یوں جیسے کوئی تھکا ہارا آدمی اپنی آواز کو صدا بہ صحرا سمجھ کر چپ ہو جائے۔ اس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ آبی چند منٹ بعد واپس آ گیا، بولا "اب وہ آوازیں تھم گئی ہیں۔ پتہ نہیں کوئی آدمی کب سے یہاں سڑ رہا ہے۔ وہ خدا سے مدد کی درخواست کر رہا تھا۔"

"ذرا صبر کرو۔ ہم اس کی مدد کو ضرور پہنچیں گے۔ کوئی نہ کوئی ذریعہ ضرور استعمال کریں گے۔" میں نے گرد و پیش پر نظر ڈالتے ہوئے کہا مگر وہاں میرے مطلب کی کوئی بھی شے نظر نہیں آتی تھی۔

رات کے دو بج رہے تھے اور ہم بستر پر لیٹے ابھی تک جاگ رہے تھے۔ عمر دراز بھی اونگھنے لگا تھا۔ وہ برآمدے کے کونے میں ستون سے ٹیک لگا کر سو گیا تھا۔

عین اس وقت حویلی کے اندرونی حصے میں ہمیں گولیاں چلنے کی آواز سنائی دی۔ ایک عجیب سا بے ہنگم سا شور تھا جس کا کوئی لفظ ہماری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ چند ہی لمحوں کے بعد دو آدمی تیزی سے برآمدے میں آ گئے۔ عمر دراز ابھی تک اونگھ رہا تھا۔ ان لوگوں نے آتے ہی اس کے سر پر لاٹھی دے ماری۔

وہ بیچارہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ خون اس کے سر سے کوئی نہیں نکلا۔ لاٹھی کی ضرب اسے بے ہوش کر گئی تھی۔ اس سے فارغ ہو کر ان لوگوں نے اس کی جیبوں پر ہاتھ مارا۔ اور چابیاں نکال کر وہ ہمارے دروازے پر آ ٹھہرے۔ دونوں نے منہ پر نقاب ڈال رکھے تھے۔ صرف ان کی آنکھیں ہی نظر آتی تھیں۔ چابیاں لگا کر انھوں نے تالے کھول دیے۔ ایک آدمی تیزی سے اندر آیا اور بولا: "یہاں سے نکل چلیں جیلانی صاحب! یہی نام ہے نا آپ کا؟ فوراً نکل چلیں۔"

"مگر یار! تم ہو کون؟ یہ قصہ کیا ہے؟"

"یہ قصہ ہیر رانجھا کا ہے۔ جلدی نکلیں، اپنی چیزیں سنبھال لیں۔"

ہمارے پاس تھا ہی کیا۔ جو کپڑے ہم پہنے ہوئے تھے وہی ہمارے پاس تھے۔ ہم ان کے ساتھ اسی وقت کمرے سے باہر نکل آئے۔

"ایک اور آدمی بھی اس کمرے میں بند ہے، اسے بھی نکالو۔"

"وہ سب کام ہو چکا ہے۔ آپ تیزی سے باہر نکلیں۔"

یہ کہہ کر وہ ہمارے دائیں بائیں چلنے لگے۔ برآمدہ ختم ہوا تو وہ ہمیں حویلی کے بڑے حصے میں لے گئے۔ حویلی کے لمبے چوڑے صحن کے نچلے تختے پر ایک چھوٹا ٹرک کھڑا تھا اور اس میں کئی آدمی سوار ہو رہے تھے۔ ہم ٹرک تک پہنچے تو ان لوگوں نے ہمیں فوراً ہی اس کے اگلے حصے میں بٹھا دیا۔ ابھی چند ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ دو آدمی ایک شخص کو بڑی سی چادر میں لپیٹ کر ٹرک میں آ چڑھے۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ اس کارروائی میں عورتیں بھی شامل ہیں۔ انداز ان کا ایسا ہی تھا۔ جیسے ہی اس شخص کو ٹرک میں ڈالا گیا، کسی نے منہ سے سیٹی بجائی اور ٹرک بڑے دروازے سے نکل کر آگے چل دیا۔ وہ ساری کارروائی اتنی تیزی سے مکمل ہو گئی کہ ہمیں کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ ٹرک کھیتوں سے نکل کر بڑی سڑک پر پہنچا تو اس کی رفتار ایک دم تیز ہو گئی۔

حویلی کے اندر کا منظر میری نگاہ میں تھا۔ وہاں بڑی دیر تک گولی چلی تھی۔ کچھ بتیاں بھی گل ہو گئی تھیں۔ پتہ نہیں وہ کون لوگ تھے اور کیسے اس حویلی پر آ چڑھے تھے اور ہماری رہائی کے لیے ان لوگوں نے اتنی کوشش کیوں کی تھی۔ وہ تعداد میں چھ معلوم ہوتے تھے۔ ڈرائیور اس گنتی میں شامل نہیں تھا۔ حویلی میں سے وہ شاید کئی لوگوں کو اٹھا لائے تھے۔

ٹرک بڑی سڑک پر نکلا تو میں نے ڈرائیور سے مخاطب ہو کر کہا: "یار جی! یہ قصہ کیا ہے؟ ہماری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا ہے، اب کہاں جا رہے ہیں ہم؟"

"اپنے ڈیرے پر جا رہے ہیں ہم۔"

"وہی تو پوچھ رہے ہیں ہم۔"

"بہن جی کا ڈیرہ۔ اور کون سا ڈیرہ ہے ہمارے پاس! تم بھی گھامڑ ہی نظر آتے ہو۔ بہن جی نے تمھاری رہائی کے لیے ہمیں خاص طور پر بھیجا ہے اور تمھیں کچھ پتہ ہی نہیں۔"

"پر یہ بہن جی کون ہیں بھائی جی! دراصل بات یہ ہے کہ ہم نئے نئے اس دنیا میں آئے ہیں۔ ہمیں پتہ نہیں چل رہا ہے کہ سورج کہاں سے نکلتا ہے؟"

"بڑے کی ماں کے سر سے نکلتا ہے سورج! چپ کر کے بیٹھے رہو ورنہ ٹرک الٹ جائے گا۔"

"اتنا تو غصہ نہ دکھاؤ یار جی! آخر دیکھو نا، ہم بھی تمھارے قدموں کے طفیل ابھی تک بقیدِ حیات ہیں۔" آبی نے سر آگے جھکا کر ڈرائیور کو بڑے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمھیں بہن جی کا ہی پتہ نہیں ہے تو میں کیا بتاؤں۔ وہ سارے جہاں سے انوکھی ہیں ہماری بہن جی۔ ان کے ساتھ کئی عورتیں بھی ہیں۔ انھوں نے ابھی حال ہی میں اپنا جتھا بنایا ہے اور یہ پہلا ڈاکا ہم نے قندیارہ پر مارا ہے۔ گورائے کو بھی ہم ساتھ ہی لے آئے ہیں۔"

"اچھا! کیا وہ بے ہوش ہے؟"

"ہاں! کچھ اور لوگ بھی پیچھے بیٹھے ہیں۔ چار عورتیں، دو مرد ہم نے وہاں سے اٹھا لیے ہیں۔"

"بڑا مقابلہ ہوا ہو گا؟"

"ہاں! گولی چلی ہے۔ میرا خیال ہے کہ گورائے کے تین چار آدمی شدید زخمی ہیں۔ ایک تو مر ہی گیا ہو گا۔ اسے سینے پر گولی لگی تھی۔"

"پر یہ ڈاکا کیوں ڈالا ہے تم نے؟ کوئی میرا مطلب ہے یہ کوئی ثواب شواب کا کام ہے کیا؟"

"مجھے کیا پتہ۔ بہن جی کا حکم تھا، سو وہ ہم نے پورا کر دیا۔"

"پھر وہی بہن جی۔ بھئی! کچھ پتہ بھی تو چلے کہ وہ بہن ہیں کون؟ وہ کوئی عورت ہے کیا؟"

"اور کیا کسی مرد کو بھی بہن جی کہہ سکتے ہیں؟" وہ [illegible] سا ہو گیا۔

"میں اپنے اس دوست کو کئی بار بہن جی کہہ چکا ہوں، اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"پتہ نہیں تم کیا کہہ رہے ہو؟ ہمیں یہ حکم ہے کہ سیدھا ان کے پاس لے چلیں۔"

"کہاں رہتی ہیں وہ؟"

"یہاں سے دو گھنٹے کا راستہ ہے۔ بیچ میں دریا ہے، ہمیں کشتی میں بھی سفر کرنا پڑے گا۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ مجھے تیرنا آتا ہے۔" آبی نے خوش دلی سے کہا۔

وہ ڈرائیور کچھ زیادہ ہی نک چڑھا معلوم ہوتا تھا۔ ہم سے وہ سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتا تھا۔ بولا: "تمھارے تیرنے سے کیا ہو گا، سب کو کشتی میں بیٹھنا پڑے گا۔"

"اچھا یار! تم اتنے ناراض تو نہ ہو ہم سے۔ اک ذرا تم ہمیں چھڑا ہی لائے ہو نا اور تو کچھ نہیں کیا ہے تم لوگوں نے ہمارے لیے۔ مگر یہ بتاؤ کہ یہ جتھا کیسے بنا لیتے ہیں لوگ؟"

"پیسہ خرچ کرتے ہیں۔ کئی بدمعاشوں کو اپنی ٹولی میں ملانے کے لیے لمبی رقمیں خرچ کی ہیں بہن جی نے۔ ادھر مسولینی بھی ہمارے گروہ میں شامل ہے اور گل خان بھی۔ ان کو بہن جی نے اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔"

"اچھا! مگر وہ ان سے کام کیا لیتی ہیں؟ میرا مطلب ہے کہ وہ اسی طرح غریبوں کی رہائی کے لیے کوشش کرتی رہتی ہیں کہ کوئی مسجد بھی بنوائی ہے انھوں نے؟"

"اس سے کیا ہوتا ہے، وہ مسجد بھی بنوا سکتی ہیں۔ مگر تمھارا مطلب کیا ہے آخر؟ یہ مذاق تم کس سے کر رہے ہو؟ خبردار! جو بہن جی کے خلاف ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو۔"

"توبہ توبہ! ہماری یہ مجال نہیں ہو سکتی ہے یار جی! میں ویسے ہی کہہ رہا ہوں کہ اس حساب سے بہن جی ایسے ہی نیک کام لیتی ہوں گی، یہی ہے نا۔"

"چپ رہو یار! تم جرح بہت کرتے ہو۔ پیچھے دیکھو کوئی ہمارا تعاقب تو نہیں کر رہا۔"

"کوئی نہیں آ رہا ہے پیچھے، بے فکر رہو۔ ساری بتیاں تو تم گل کر آئے ہو۔ کتنی عورتیں لائے ہو ساتھ؟"

"چار۔ بہن جی کا یہی حکم تھا۔ ان سب کو بے ہوش کر دیا گیا تھا۔"

"یار! تیری بہن جی نے کمال کر دیا ہے۔ قندیار کی حویلی ہی تباہ کر دی۔ آخر کیا دشمنی تھی اسے گورائے سے؟"

"ڈاکا خواہ مخواہ نہیں پڑتا، کوئی وجہ تو ضرور ہو گی۔ اتنی دور سے آتے تھے ہم، خالی ہاتھ کیسے واپس جاتے۔ تمھارا نام جیلانی ہے نا؟" اس نے آبی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں، جیلانی یہ ہے، اس کا فوٹو لے لو۔ اس کا نام بہت یاد ہے تمھیں؟"

"ہاں، بہن جی کا یہی حکم تھا، کہتی تھیں کہ جیلانی کے بغیر واپس نہیں آنا ہے۔"

"اچھا! وہ کیسے جانتی ہیں اسے؟ کیوں بھئی! تیری کب سے واقف ہیں وہ بہن جی؟" آبی ہنس رہا تھا پر اس ڈرائیور کی باتیں سن کر وہ بہت خوش ہو رہا تھا کہ بالآخر کسی نہ کسی نے اسے رہائی تو دلوا دی۔ ورنہ وہ اپنی فاتحہ پڑھ ہی چکا تھا اور اسے قندیار سے زندہ باہر نکلنے کی امید نہیں تھی۔

"مجھے کیا پتہ! میں نے تو آج ہی نام سنا ہے ان بہن جی کا۔ پر یہ بتا ڈرائیور صیب! وہ آدمی کون تھا جو ہمارے ساتھ والے کمرے میں بند تھا؟"

"اسے شاید کئی دن سے کھانا بھی نہیں ملا تھا۔ بہت کمزور ہو رہا ہے وہ۔ اس کا تو بہت برا حال ہے، پتہ نہیں کون ہے وہ۔"

"مگر وہ ہے کون! کس لیے بند تھا وہ اس قید خانے میں؟"

"پتہ نہیں، بس بہن جی کا حکم تھا کہ اسے بھی ضرور ساتھ لانا۔ تجوری میں سے البتہ ہمیں کچھ نہیں مل سکا ہے، اس کا ہمیں بہت افسوس ہے۔"

"اس گورائے نے اپنی ہی جیل بنا رکھی تھی۔ اسے بھی ساتھ لائے ہو کہ نہیں؟"

"اس کو تو لانا ہی تھا۔ اصل مجرم تو وہی ہے۔ میرا خیال ہے بہن جی اس کے لیے گولی کا حکم دیں گی۔ بہت غصہ ہے انھیں اس گورائے پر۔"

"تیرے منہ میں گھی شکر۔ یار! تو آدمی بہت پیارا نظر آتا ہے مجھے، لے یہ سگریٹ پی۔ خدا تجھے ایسی کئی کامیابیاں عطا کرے۔" آبی نے پیکٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے بائیں ہاتھ سے سگریٹ لیا اور جیب سے لائیٹر نکال کر اسے سلگا لیا۔

"میرا خیال ہے، میں یہ کام بہتر طریقے سے کر سکتا ہوں۔ میرا نشانہ بہت اچھا ہے۔" آبی نے خوش ہو کر کہا۔

ڈرائیور کے چہرے پر پہلی بار مسکراہٹ نظر آئی، بولا: "تم آدمی بہت مزے کے معلوم ہوتے ہو۔ بہن جی سے تمھارا کیا تعلق ہے؟"

"ان کو تو ہم نے دیکھا نہیں۔ پتہ نہیں وہ کیوں ہم پر اتنی مہربان ہو گئی ہیں۔"

"اچھا! مجھے حیرت ہے۔ بہرحال ٹھیک ہے، آپ کو ہم ان تک پہنچا دیں گے۔"

ٹرک اب بڑی سڑک سے ہٹ کر ایک تنگ سی اینٹوں کی بنی ہوئی سڑک پر چل رہا تھا۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے میں ہم دریا پر جا پہنچے۔ ان کا انتظام مکمل معلوم ہوتا تھا۔ دریا کے کنارے ایک بڑی سی کشتی کھڑی تھی۔ اتنی بڑی کہ اس میں وہ منی ٹرک

پُورا سما سکتا تھا۔ ڈرائیور نے کیا بھی یہی۔ ٹرک کو سیدھا کر کے اس نے کشتی تک پہنچا دیا۔ میں تو سمجھا وہ ڈوب ہی جائے گی مگر نہیں، کشتی میں جو ملاح سوار تھے فوراً ہی کشتی کا انجن اسٹارٹ کر کے دُوسری طرف بڑھنے لگے۔ وہ دریائے سندھ کا بہت چوڑا پاٹ تھا اور اس میں ایسی ہی کشتیاں ڈال دی گئی تھیں۔ کچھ ہی دیر بعد ہم دوسرے کنارے پہ جا پہنچے۔ وہاں دریا کا بہاؤ تیز نہیں تھا مگر اس کی گہرائی کی تو قسم کھائی جا سکتی تھی۔ کشتی سے اُترتے ہی وہ منی ٹرک دائیں طرف بڑھا اور کوئی آدھ گھنٹے میں ہم ایک پہاڑی کے سامنے جا پہنچے۔ اس کی گھنی جھاڑیاں راستہ نہیں دیتی تھیں مگر اُن میں مختلف پگڈنڈیاں سی بنی تھیں۔ ٹرک میں موجود اُن لوگوں نے بے ہوش آدمیوں کو کندھوں پر ڈالا اور ہمارے آگے چل دیے۔ وہ اس ورزش کے عادی معلوم ہوتے تھے۔ اُن کے ساتھ چار عورتیں تھیں اور دو مرد۔ اور وہ سب کے سب چادروں میں لپٹے ہوئے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے انھیں ابھی وہ اسی حالت میں کسی جگہ لے کر زمین میں دفن کر دیں گے۔ پہاڑی خاصی اونچی تھی۔ وہ لوگ کئی موڑ مڑنے کے بعد بڑے غور سے اپنے ساتھیوں کو دیکھنے لگے۔ انھیں یہ شک تھا کہ کہیں کوئی غیر آدمی اُن کے درمیان نہ آ ٹھہرا ہو۔ کچھ ہی دیر بعد وہ ہمیں اپنے ساتھ لیکر گھنے جنگل میں گھس گئے۔ اب ہم ایک غار کے مُنہ پر کھڑے تھے۔ دو پہرداروں نے آگے بڑھ کر ان کا استقبال کیا۔ وہ انھیں دیکھتے ہی پہچان گئے تھے۔

"کتنے آدمی لائے ہو؟" ایک پہرے دار نے پوچھا۔ وہ ملیشیے کی وردی پہنے ہوئے تھے۔

"یہ آٹھ آدمی ہیں۔ چار آدمی اور دو مرد بے ہوش ہیں اور دو زندہ سلامت ہیں" ڈرائیور نے کہا۔

"چلو اِن کو اندر لے چلو اور اِن پہ نگاہ رکھو گُل خان!" ایک آدمی نے بڑے تحکم آمیز لہجے میں کہا۔

تب مجھے پتہ چلا کہ گل خان کس مصیبت کا نام ہے۔ وہ ٹرک کے پچھلے حصے میں بیٹھا تھا۔ بڑا دیو ہیکل جوان تھا وہ عمر اس کی یہی کوئی بتّیس سال ہوگی۔ آنکھیں اس کی حیرت انگیز حد تک بڑی تھیں۔ وہ آدمی کو دیکھتا تو اس پر کپکپی طاری کر دیتا تھا۔ پنجے میں اس کے شیر ایسی طاقت تھی اور بہن جی نے اُسے بھی رام کر لیا تھا۔ ڈرائیور نے بتایا تھا کہ اس نے بڑی رقمیں خرچ کر کے وہ گروہ تیار کیا تھا۔ گل خان کو خدا جانے اس نے کتنی رقم دی ہوگی۔ اس نے مجھے اور آبی کو غار کے اندر جانے سے روک دیا۔ بولا "آپ اِدھر ہی کھڑے رہیں۔ بہن جی جو حکم دیں گی وہی ہوگا" یہ کہہ کر اس نے مجھے کلائی سے پکڑ کر ایک طرف کر دیا۔ عورتیں اندر چلی

گئیں تو دونوں مردوں کو بھی وہ غار میں لے گئے۔

آبی میرے قریب ہی کھڑا تھا، بولا "اس جوان کا پنجہ دیکھا ہے تم نے؟" وہ آخری پہر کی چٹکی ہوئی چاندنی میں گل خان کا جائزہ لے رہا تھا۔

"میرا خیال ہے گل خان نے اس کی بات سُن لی تھی۔ وہ خوش ہو گیا، بولا "میرے پنجے کی بات کرتے ہو! اس نے بڑی گردنیں مروڑی ہیں جوان! پر اب یہ پنجہ بہن جی کا تابع ہو گیا ہے"

"ایسی کیا بات ہے بہن جی میں جوان! کہ تم سب اس کا کلمہ پڑھتے ہو" آبی رہ نہ سکا۔ وہ ڈرائیور بھی یہی کہہ رہا تھا۔

"بہن آخر بہن ہی ہوتی ہے۔ سندھو کو پتہ ہے کہ وہ کس کی بات کر رہا ہے" گل خان نے اپنا پنجہ پھیلاتے ہوئے کہا۔

"اتنے میں مسولینی باہر آ گیا۔ دونوں بے ہوش آدمی اس کے پیچھے آ رہے تھے۔ اس کے ساتھیوں نے انھیں کندھوں پر ڈال رکھا تھا۔

"بہن جی کا حکم ہے کہ ہم ان دونوں کو ابھی فرید پور پہنچا دیں آپ بھی آئیں بھائی جی! ٹرک میں بیٹھ جائیں۔"

مسولینی اکہرے بدن کا بہت چاق و چوبند آدمی تھا۔ اس کے نچلے ہونٹ کے قریب زخم کا گہرا نشان تھا۔ اور جب وہ بات کرتا تھا تو اس کی بائیں آنکھ خود بخود پھڑکنے لگتی تھی۔

"تو چلو پھر ٹرک کی طرف نکل چلو۔ یہ گویا ابھی تک بے ہوش ہے"

"ہاں! اس رُومال نے اپنا کام دکھا دیا ہے سب کے سب بے ہوش ہیں" مسولینی نے ٹرک کی طرف دونوں آدمیوں کو بھگاتے ہوئے کہا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم دوبارہ ٹرک میں جا بیٹھے۔ سندھو بھی اُن کے عقب میں آ رہا تھا۔ وہ بھاگ کر اپنی نشست پر بیٹھا، تو گل خان اس کے ساتھ براجمان ہو گیا۔ ہم ٹرک کے پچھلے حصے میں جا بیٹھے۔ ہم نے راستے بھر بہت کوشش کی کہ ہمارے ساتھ دو آدمی بیٹھے تھے اُن سے اس شخص کے بارے میں معلوم کر سکیں جو گورائے کے ساتھ بے ہوش پڑا تھا مگر وہ منہ سے کچھ بولتے نہیں تھے۔

آبی نے مجھے اُن سے مزید بات کرنے سے روک دیا، بولا "لعنت بھیج یار! دیکھتا نہیں کیسی منحوس شکل ہے ان کی۔ مجھے اس بہن جی پر حیرت ہو رہی ہے یہ ہے کون آخر؟"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں مگر میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔ وہ میرا نام بھی جانتی ہے"

"تو اب نامی گرامی آدمی بن چکا ہے بھئی۔ ہر تھانے میں تیری تصویر لگی ہوئی ہے کوئی معمولی آدمی تو نہیں ہے تو" آبی نے

چہرے کے چاند پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ وہ جب میرا مذاق اڑاتا تھا تو اس کی یہ عادت تھی کہ مجھ سے آنکھ ملا کر بات نہیں کرتا تھا۔

"تو بھی کچھ کم مشہور نہیں ہے استاد! اس محکمے کا ڈپٹی ڈائریکٹر تو تو بھی بن چکا ہے۔ اب دُعا مانگ کہ ہماری یہاں سے خلاصی ہو جائے۔ اس گورائے کو تو ان لوگوں نے زیادہ ہی بے ہوش کر رکھا ہے۔"

"یہ ہے بھی اسی قابل۔ میرا خیال ہے اس کو خلوت کی حالت میں پکڑا گیا ہے۔ سالا صرف چادر پہنے ہوئے ہے۔"

"ہاں لگتا یہی ہے۔ اس کے منہ سے تو ہر وقت عورتوں کے سُرمے کی بُو آیا کرتی ہوگی۔ بہت عیاش آدمی ہے یہ۔ پتہ نہیں اس کے بیوی بچے بھی ہیں کہ نہیں۔"

"ضرور ہوں گے! بے اولاد تو مرنا یہ پسند نہیں کرے گا۔ اب یہ ٹرک کس طرف جا رہا ہے؟"

"میرا خیال ہے یہ سڑک سیدھی فرید پور جاتی ہوگی۔ یہی نام بتایا ہے نا ان لوگوں نے؟"

"ہاں! پتہ نہیں اب ہمارا کیا حال ہوگا۔ اگر وہ ہماری دشمن نکلی تو پھر سمجھو ہمیں عبورِ دریائے شور کی سزا سنائے گی۔ کبھی سُنی ہے یہ سزا؟"

"پتہ نہیں! تیرے والد صاحب کو شاید عدالت نے یہ سزا سنائی ہو۔"

"بک نہیں اوئے! وہ بہت نیک آدمی تھا۔ یہ سزا تیرے ایسوں کے لیے ہی سُنائی جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ اس میں آدمی کو دریائے سندھ کے اس کنارے سے اس کنارے تک سردیوں میں بار بار گزرنا پڑتا ہے۔"

"کیا مطلب! یعنی عبورِ دریائے شور کا یہ مطلب ہے؟"

"ہاں! آدمی کو سردیوں میں اتنی بار دریا تیر کر عبور کرنا پڑتا ہے کہ بچارے کی قلفی جم جاتی ہے اور آخر میں وہیں جان دے دیتا ہے۔"

"نہیں یار! یہ بڑی ظالمانہ سزا ہے۔ میرا خیال ہے کہ عبورِ دریائے شور کا یہ مطلب نہیں ہے" میں نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔

مگر وہ بہت سنجیدہ نظر آتا تھا۔ ٹرک کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر اس نے سگریٹ سلگا لیا۔ بولا "تجھے جب پتہ چلے گا تب تجھے یہ سزا سنا دی جائے گی۔ دریائے سندھ وہ تجھ سے دسمبر میں پار کروائیں گے تاکہ تیرا قصہ ختم جلدی ہو سکے ورنہ عام موت تو مرنے کا نہیں ہے۔"

"میرا خیال ہے تیرا دماغ ٹھکانے نہیں رہا۔ تجھے یہ تک معلوم نہیں ہے کہ اس ہماری بہن جی نے آخر اس گورائے کو پکڑا کس لیے ہے۔ دیکھ تو کتنا معصوم نظر آتا ہے یہ سالا۔ جیسے ابھی تک روتے روتے سو گیا ہو" میں نے گورائے کے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ دُوسرا آدمی واقعی بہت ہی نڈھال ہو رہا تھا۔ مگر جب میں نے اُسے ذرا غور سے دیکھا تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کی شکل صورت گورائے سے اس قدر ملتی تھی کہ ان دونوں میں پہچان مشکل تھی۔ اُن کا قد کاٹھ بھی ایک جیسا تھا اور چہرے کے نقوش میں تو اس قدر مشابہت تھی کہ میں دونوں میں تمیز نہیں کر سکتا تھا اور اُن دونوں کو ان لوگوں نے لاشوں کی طرح ہمارے سامنے ڈال رکھا تھا۔ حالت اُن کی یہ تھی کہ ٹرک کی ہر حرکت پر اُن کے سر کبھی یوں ہلتے تھے کبھی یوں۔ انھیں اس بے ہوشی کے عالم میں خود پر قطعاً کوئی اختیار نہیں تھا۔ کلوروفارم انھیں کچھ زیادہ ہی سنگھا دیا گیا تھا۔

آبی نے بھی اُن کی اس بے مثال مشابہت کو پہچان لیا تھا۔ وہ کبھی گورائے کو دیکھتا تھا اور کبھی اس دوسرے آدمی کو جس کا نام بھی ابھی ہمیں معلوم نہیں ہو سکا تھا، بولا "یار! یہ ۔۔۔۔ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ دونوں میں اتنی مشابہت ہے کہ اُن میں تمیز کرنی مشکل ہے ذرا دیکھ تو انھیں۔"

"ہاں معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ ایک ہی باپ کے بیٹے ہیں۔"

"ایک ماں کے بھی تو ہو سکتے ہیں۔"

"ہاں ان میں حیرت انگیز مشابہت ہے۔ اسی لیے میں اب سمجھا کہ اس بہن جی نے اس آدمی کو کیوں وہاں سے نکالا ہے۔"

"اُسے کیا فائدہ ہوگا؟ فائدہ تو میرا خیال ہے گورمانی اٹھا رہا تھا۔ اس مشابہت کی بنا پر ہو سکتا ہے یہی شخص قند پور کی جاگیر کا اصل وارث ہو۔"

ہماری باتیں چلتے ٹرک میں وہ دونوں آدمی نہیں سن رہے تھے جو دوسری دیوار کے ساتھ لگے بیٹھے تھے۔ آبی کچھ زیادہ ہی خوابناک کیفیت میں گھر گیا۔ بولا "یہ کوئی گہری سازش معلوم ہوتی ہے مجھے۔ ورنہ یہ دونوں آدمی ایک ہی حویلی میں اس طرح نہ ملتے کہ ایک تو سالہا سال سے قید تھا اور دوسرا بے حد آزاد بلکہ شُتر بے مہار۔"

"ہاں بات کچھ ایسی ہی لگتی ہے۔ بہن جی سے مل کر ہی معلوم ہوگا کہ یہ قصہ کیا ہے۔"

ٹرک کوئی پندرہ میل آگے جا کر ایک گاؤں میں ٹھہر گیا۔ اس وقت پو پھٹ رہی تھی۔ ٹرک درختوں کے جھنڈ سے نکل کر ایک بے پیے پتے گھر کے سامنے جا ٹھہرا۔ سندھو نے ٹرک چھوڑ دیا۔ دونوں آدمیوں کو ان لوگوں نے پھر کندھوں پر اٹھایا اور مکان کے اندر لے

گئے۔ گل خان اور مسولینی بھی ہمارے ہی ساتھ چل رہے تھے۔ رنددھو ہمارے ساتھ نہیں آیا۔ وہ ٹرک کے پاس ہی ٹھہرا رہا۔ جب ہم مکان کے اندر پہنچے تو یہ دیکھ کر ہمیں حیرت ہوئی کہ باہر سے اس مکان کی دیواریں اگرچہ کچی تھیں مگر اس کے کمرے پختہ اینٹوں کے بنے ہوئے تھے اور ان کے سامنے بڑا سا برآمدہ تھا۔ اُن بے ہوش آدمیوں کو برآمدے میں پڑی چارپائیوں پر ڈال دیا گیا تو وہ دونوں آدمی جو انہیں اندر لائے تھے فوراً ہی باہر نکل گئے۔ اب گل خان اور مسولینی ہمارے سامنے کھڑے تھے۔ اُن کا استقبال کرنے کوئی آدمی باہر نہیں آیا۔ کمروں کے دروازے اندر سے بند تھے اور صرف ایک ادھیڑ عمر عورت ہی ہمارے سامنے کھڑی تھی جس نے دروازہ کھولا تھا۔

گل خان بولا ”بوتی! اندر جاکر بہن جی کو اطلاع دو۔ کہو گل خان آیا ہے۔“

”خوش آمدید گل خان! کیا خبر لائے ہو؟“ ایک بڑی ہی گمبھیر آواز نے اس کا استقبال کیا۔ کوئی عورت تھی جس کا لب و لہجہ پشتونی معلوم ہوتا تھا وہ بلاشبہ سرحد کی رہنے والی معلوم ہوتی تھی۔

”سلام بہن جی! میں گورائے اور تجمل حسین کو لے آیا ہوں اور یہ دونوں آدمی بھی حاضر ہیں۔“

انہوں نے ہمیں دیکھتے ہوئے کہا ”ان میں سے ایک کا نام غلام جیلانی ہے اور دوسرے کا نام اسلم آبی ہے۔“

”بہت اچھا کیا ہے تم نے۔ اس گورائے کو پچھلے کمرے میں ڈال کر ہوش میں لاؤ اور اس تجمل حسین کو بھی۔ گورائے کو باندھ کر رکھو یہ ہوش میں آجائے تو مجھے اطلاع دو۔ آپ بیٹھ جائیں بھائی جی!“ آخری جملہ اس نے ہم سے مخاطب ہو کر کہا۔

گل خان اور مسولینی نے دونوں آدمیوں کو وہاں سے اٹھایا اور دائیں ہاتھ کے کمرے کا دروازہ کھول کر انہیں اندر لے گئے۔ میں اور آبی وہیں برآمدے میں بیٹھ گئے۔ محسوس یہ ہوتا تھا کہ وہ عورت ہمیں بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ کمرے کی کھڑکی میں ایک پردہ سا تنا تھا اور وہ اس کے عقب میں کھڑی ہمارا جائزہ لے رہی تھی۔

جب ہم بیٹھ چکے تو وہ بولی ”ہمیں افسوس ہے کہ ہم آپ کی جلد ہی کوئی مدد نہ کرسکے۔ گورائے کو اب اس کی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ قندیار میں آپ کو بڑی تکلیف اٹھانی پڑی۔“

”جی نہیں! بس بندھے رہتے تھے اور تو کوئی تکلیف نہیں تھی جی! مگر آپ ہمیں کیسے جانتی ہیں؟“

”آپ آسیہ کے بھائی ہیں نا؟“

”جی ہاں! میں اسی کا بدنصیب کا بھائی ہوں۔“

”ایسا نہ کہیں، ہمیں آپ کی قید کا جیسے ہی علم ہوا ہم نے ان آدمیوں کو آپ کی طرف بھیج دیا۔ ہم آسیہ کے بڑے احسان مند ہیں۔ ہم اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے مگر یہ اس کے احسان کا بدلہ ہے جو ہم چکا رہے ہیں۔“

”آپ کب سے جانتی ہیں اسے؟“

”یہ بڑی پرانی بات ہے مگر ہم آپ کو کچھ بتا نہیں سکتے ہیں۔ اسی نے ہمیں بتایا تھا کہ آپ کو قندیار میں گورائے نے باندھ لیا ہے۔“ بوتی! ان کے لیے چائے تیار کرو۔“ اس نے اپنی خادمہ کو آواز دے کر کہا۔ وہ شاید اس کے قریب ہی کھڑی تھی۔

”اس گورائے کو آپ نے کیوں اٹھا لیا ہے اور وہ تجمل حسین کون ہے؟“

”یہ بھی ہم آپ کو جلد ہی بتا دیں گے۔ ابھی آپ آرام کریں۔ آپ ساری رات کے جاگے ہوئے ہیں۔“

”نہیں بہن جی! ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ آپ نے یہ مہربانی ہم پر کیوں کی۔ ایک پورا گروہ آپ کا مداح ہے۔ آپ کے حکم پر وہ ہر کام کر جاتا ہے۔ وہ گورائے کو اٹھا لائے۔ قندیار میں گولی چلی کوئی نہیں جانتا کہ کتنے آدمی مارے گئے۔ یہ سب کچھ ہمارے لیے بہت حیران کن ہے۔ ہمیں اپنی رہائی کی بہت زیادہ خوشی ہے مگر اس راز پر تو ابھی تک پردہ پڑا ہوا ہے۔“

”بھائی جی آپ جانتے ہیں کہ جب آسیہ راولپنڈی جیل سے رہا ہوئی تو اس کے ساتھ ایک اور لڑکی بھی تھی، آپ کو یاد ہوگا“

”جی ہاں! مجھے یاد ہے۔ وہ لیڈی ڈاکٹر کے پیچھے چل رہی تھی مگر اس کو میں نے کار میں نہیں ڈالا تھا۔“

”وہ ہماری بہن تھی زرینہ۔ ہماری سگی بہن۔ وہ چودہ سال کی قید کاٹ رہی تھی۔ آسیہ کے ساتھ وہ بھی رہا ہوگئی۔ اُسے بھی آسیہ ہی رہا کرکے لائی تھی اور یہی وہ احسان تھا جس کا بدلہ ہم چکا رہے ہیں۔“

”مجھے یہ سب کچھ معلوم نہیں تھا مگر اس گورائے اور تجمل کا کیا قصہ ہے؟“

”یہ راز کی بات ہے جو ہم آپ کو نہیں بتا سکتے ــــ آپ آرام کریں، اس کے بعد بات کریں گے۔“ یہ کہہ کر وہ پردے سے ہٹ گئی۔ اس کی آواز معدوم ہونے لگی تھی۔ اس کی خادمہ بوتی باہر آئی اور ہمیں اشارہ کرکے وہ ایک کمرے میں لے گئی جہاں دو پلنگ بچھے تھے۔ ہم اُن پر جا بیٹھے مگر ہماری حیرت کسی بھی طرح کم نہ ہوسکی۔ اس بہن جی کے رویے نے ہمیں پریشان کر رکھا تھا۔ وہ ابھی تک ہماری سمجھ میں نہیں آسکی تھی۔ کچھ دیر تک میں پلنگ پر بیٹھ کر صورتِ حال پر غور کرتا رہا۔ آبی بھی خاموش تھا۔ وہ بھی کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد میں ایک بار پھر وہاں سے اٹھ

بہن جی کے کمرے کی طرف چل دیا۔

دروازے پر دستک کی آواز سن کر وہ چونک اٹھی، بولی ”کون ہے؟“ اس کا لہجہ مجھے بلاشبہ پشاوریوں جیسا معلوم ہوتا تھا۔ زبان کو وہ خاص طور پر بل دے کر بات کرتی تھی۔

”میں ہوں غلام جیلانی۔ بہن جی! مجھے یہ بتائیں کہ آسیہ اس وقت کہاں ہے؟ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”آسیہ تو اپنے گاؤں جا چکی ہے۔“

”کون سے گاؤں؟ وہ تو لاہور میں رہتی تھی۔“

”پتہ نہیں! وہ فیصل آباد کے قریب کسی گاؤں کا ذکر کر رہی تھی۔ میرا خیال ہے وہ اپنی ماں کے پاس جا پہنچی ہوگی۔“

”یہ کیسے ہوسکتا ہے، وہ مجھے یوں چھوڑ کر تو نہیں جاسکتی تھی۔ آپ کو اس نے اتنے بڑے کام کے لیے تیار کیا اور خود غائب ہوگئی۔ مجھے یقین نہیں آتا ہے بہن جی! مجھے بتائیں کہ اصل بات کیا ہے؟“

”آپ کو ہم پر اعتبار نہیں ہے۔ وہ یہاں ہوتی تو میں آپ کو اس سے ملا نہ دیتی؟“

میں نے چاہا کہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو جاؤں مگر وہ اندر سے مقفل تھا۔ مجھے اس عورت کی شخصیت دو حصوں میں بٹی نظر آتی تھی اور مجھے یقین تھا کہ اس کا وہ روپ اپنا نہیں ہے جو وہ ہم پر ظاہر کر رہی تھی۔ وہ اس سے کہیں زیادہ گہری تھی مگر وہ تھی کون اور ہم سے اس کی اس قدر گہری ہمدردی کی اصل وجہ کیا تھی۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

اتنے میں بوتی میرے عقب میں آ کھڑی، بولی ”چائے میں نے آپ کے کمرے میں رکھ دی ہے، پی لیں۔“ اس کا لہجہ بھی خالصتاً سرحدی معلوم ہوتا تھا مگر بات وہ پنجابی میں کرتی تھی۔ پتہ نہیں اسے بوتی کیوں کہتے تھے وہ، حالانکہ وہ ہر بات آسانی سے سن سکتی تھی۔

”بہن جی! کیا میں آپ کے روبرو ہوسکتا ہوں؟ میں آپ کو دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”یہ کیا سوجھ رہی ہے آپ کو؟ میں کبھی کسی کے سامنے نہیں گئی آپ اس کا خیال بھی دل میں نہ لائیں۔ آپ میرے بھائی ہیں بس یہی کافی ہے۔“

”آپ کو معلوم ہے گورائے نے ہماری رقم اور ہمارے پستول بھی قبضے میں لے لیے تھے؟“

”وہ رقم گل خان لے آیا ہے اور آپ کے پستول بھی ــــ وہ آج آپ کو مل جائیں گے۔“

”یہ تو بہت اچھا ہوا۔ میں ابھی گل خان سے بات کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں وہاں سے پلٹ کر آبی کے پاس جا ٹھہرا۔

وہ چائے کے برتن سیدھے کر رہا تھا، بولا ”کہاں گئے تھے تم؟“

”میں اس بہن جی سے ملنے گیا تھا وہ کچھ زیادہ ہی پُراسرار بننے کی کوشش کر رہی ہے۔“

”ملی نہیں تم سے؟“

”نہیں۔ کہتی ہے کہ میں پردے کی بہت زیادہ پابند ہوں۔“

”میرا خیال ہے کہ بات اتنی نہیں ہے جتنی وہ بتا رہی ہے۔ آسیہ نے وہ رقم جو گورائے کے ہاں سے اٹھائی تھی وہ اس نے لاکر بہن جی کو دے دی ہوگی۔ کوئی نہ کوئی ایسا سودا ضرور ہوا ہے، ورنہ یہ ہم پر اتنی مہربان نہ ہوتی۔“

”تو پھر میں کیا کروں۔ وہ تو کچھ بتاتی ہی نہیں ہے۔“

”خیر اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ چائے پی لو۔ ہم گل خان سے بات کریں گے۔ یہ مکان تو خاصا وسیع نظر آتا ہے۔ پچھلے حصے میں بھی تین چار کمرے موجود ہیں اور اس سے آگے شاید صحن ہے۔“

”ہاں! گل خان گورائے کو لے کر ادھر ہی گیا ہے۔ وہ بھی ابھی تک نہیں لوٹا۔“

آبی نے چائے میرے سامنے رکھ دی۔ بوتی نے ہمارے لیے پراٹھے بھی تیار کر دیے تھے۔ اُن میں نمک زیادہ تھا مگر پھر بھی وہ مزہ دیتے تھے۔

ابھی ہم چائے پی کر فارغ ہی ہوئے تھے کہ گل خان اندر آگیا، بولا ”آپ اگر یہاں سے جانا چاہیں تو ابھی ٹرک یہاں ہی ہے، اس میں بیٹھ کر چلے جائیں۔“

”یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ ہمیں بہن جی کا شکریہ ادا کرنا ہے کیا ہمیں یہاں سے رخصت کرنے کا مشورہ انہوں نے دیا ہے؟“

”ہاں! وہ یہی چاہتی ہیں۔“

”مگر ہم ابھی دو چار دن یہاں ٹھہریں گے۔“ میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

وہ کچھ شش و پنج میں پڑ گیا، بولا ”آپ یہاں رہ کر کیا کریں گے؟“

”ہم آسیہ سے ملنے کے لیے یہاں آئے ہیں اور وہ ابھی تک ہمیں نظر نہیں آئی اور بہن جی نے کہا ہے کہ وہ یہاں سے چلی گئی ہے یہ بات ہم کیسے مان لیں؟“

”سن اوئے بھائی گل خان! بہن جی سے کہہ کہ ہم ان سے ملنا چاہتے ہیں۔ ہمیں آسیہ کا ٹھیک ٹھیک پتہ وہ بتا دیں تو ہم آج ہی یہاں سے چلے جائیں گے۔“ آبی نے بڑے پُرعزم لہجے میں یہ بات کہی۔ وہ کسی قطعی فیصلے پر پہنچ چکا تھا۔

”میں ان سے بات کرتا ہوں، مجھے یقین ہے کہ آسیہ کے بارے میں وہ یہی کچھ جانتی ہیں۔“

اتنے میں مسولینی بھی اندر آگیا، بولا ”میں نے گورائے کو باندھ کر ڈال دیا ہے۔ اُسے ہوش آچکا ہے۔ تجمل کو کھانا بھی کھلا دیا گیا ہے۔ اُسے صحت مند ہونے میں کچھ دن ضرور لگیں گے۔“

"آؤ میرے ساتھ! ہن جی سے پوچھتے ہیں کہ اب ہمیں کیا کرنا ہے۔" یہ کہہ کر گل خان اسے دوسرے کمرے میں لے گیا۔ ہمارا حال اس گھر میں شیش محل کے کتوں ایسا ہو گیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ہم کس چکر میں پھنس گئے ہیں۔ میں یہ سمجھ رہا تھا کہ ہن جی دراصل آسیہ کا دوسرا نام ہوگا۔ مگر اس کا پشاوری لہجہ، اس کی آواز کا زیروبم اس بات کی نفی کرتا تھا۔ وہ کوئی اور ہی عورت نظر آتی تھی۔ جس احسان کا اس نے ذکر کیا تھا، وہ اپنی جگہ بہت اہم تھا۔ آسیہ نے گورائے کے ہاں سے جو رقم چرائی تھی، وہ اس نے لا کر ہن جی کے حوالے کر دی اور اتنے تھوڑے سے عرصے میں اس عورت نے اتنے سارے جرائم پیشہ لوگ بڑے منظم طریقے سے اپنے ساتھ ملا لیے، یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ آبی اپنی جگہ حیرت میں گم تھا۔

مسلسل کئی گھنٹے گزر گئے۔ ہم نے سر تکیوں پر رکھا اور ذرا دیر کے لیے اونگھ گئے۔ نیند آدمی کے سو دکھوں کا ایک علاج ہے۔ ہمارے خواب بالآخر ہماری طرف لوٹ آئے اور ہم ہن جی کے ان بستروں پر گہری نیند میں کھو گئے۔ جب ہماری آنکھ کھلی تو عقبی کمرے سے کسی کی زبردست چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ ہم دونوں دم بخود رہ گئے۔ معلوم ہوتا تھا جیسے کسی آدمی کو باندھ کر زدوکوب کیا جا رہا ہے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے یار! یہ کون ہو سکتا ہے؟" آبی نے جوتے پہنتے ہوئے کہا۔

"پتہ نہیں! یہ کون بدنصیب ہے، آؤ معلوم کرتے ہیں۔" یہ کہہ کر میں نے کمرے کا پچھلا دروازہ کھول دیا۔ آبی میرے ساتھ ہی تھا۔ عقبی کمرے کا جیسے ہی ہم نے دروازہ کھولا، ایک عجیب سا خونچکاں منظر ہمیں نظر آیا۔ مسولینی نے گورائے کو باندھ کر چھت کے ساتھ ایک رسّے سے لٹکا رکھا تھا اور خود کوڑا ہاتھ میں لیے اس پر بار بار پل رہا تھا۔

اس نے ہمیں دیکھا تو ذرا دیر کے لیے اپنا کوڑا روک لیا، بولا۔ "آپ کیوں آئے ہیں ادھر؟"

"یہ بڑا پیارا منظر ہے اور اس کی چیخیں بہت آرام پہنچاتی ہیں۔ ان کو سننے کے لیے ہم ادھر آ گئے ہیں۔" آبی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ مگر اندر سے وہ لرز کر رہ گیا تھا۔ گورائے کی جلد جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھی۔

"یہ اسی قابل ہے یہ حرامزادہ۔ ہن جی نے حکم دیا ہے کہ اس کی پہلی ٹھکائی ابھی ہو جانی چاہیے۔ یہ عیاش انسان! اس نے بے شمار لڑکیوں کو ذلیل کیا ہے، یہاں تک کہ آسیہ کو بھی۔" کونے میں کھڑے گل خان نے کہا۔ وہ بھی اس منظر کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا اور دوسرے کمرے کی کھڑکی میں ہن جی موجود تھیں۔ وہاں بھی اس نے اپنے سامنے پردہ تان رکھا تھا۔ وہ خود نظر نہیں آ رہی تھی مگر ہمیں وہ پوری طرح دیکھ سکتی تھی۔

"کام ختم ہو گیا کہ نہیں؟"

"ابھی تو بس اتنا ہی کافی ہے۔" مسولینی نے کہا۔ گورایا اس اذیت کو برداشت نہ کرتے ہوئے بے ہوش ہو گیا تھا۔ مسولینی نے اس کا رسّا ڈھیلا کر کے اس کے بازو کھولے اور اسے اٹھا کر اس نے دوسرے کمرے میں ڈال دیا اور دروازہ باہر سے مقفل کر کے وہ ہمارے ساتھ ہی باہر آ گیا۔

اس کمرے میں تجمل حسین چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ گورائے کی چیخ و پکار نے اسے بھی دہلا دیا تھا۔

"اب کیا حال ہے آپ کا تجمل حسین صاحب؟" گل خان نے پوچھا۔

"جی میں بالکل ٹھیک ہوں، یہ کون چیخ رہا تھا؟ گورائے کی آواز معلوم ہوتی تھی۔"

"ہاں وہی تھا۔ آپ کا بدلہ ہم نے اس سے لے لیا ہے۔" گل خان نے اس کے سر میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

تجمل حسین نے آنکھیں بند کر لیں۔ یوں جیسے وہ تصور میں گورائے کو کوڑے کی ضربیں پڑتے دیکھ رہا ہو۔

میں اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ پائنتی کی طرف۔ چارپائی پر میرا بوجھ محسوس کر کے اس نے آنکھیں کھول دیں اور سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

"اٹھ جا تجمل حسین! اور مجھے بتا کہ اس گورائے نے تجھے کیوں قید کر رکھا تھا؟ تیری مصیبت کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آتی۔"

اس نے تکیے سے سر اٹھا کر گرد و پیش پر گہری نظر ڈالی، بولا۔ "میری مصیبت کی وجہ میری شباہت ہے۔ وہ میرا دشمن اسی لیے بن گیا تھا کہ میری صورت اس سے ہوبہو ملتی تھی۔"

"مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ تیرا اس کا رشتہ کیا ہے؟"

"میں۔۔۔ میں دراصل۔۔۔ ہمارا باپ ایک تھا محسن علی گورایا۔ اور میری ماں اس کی داشتہ تھی۔ وہ مراد پور میں رہتی تھی۔ مکرم علی مجھ سے چار سال چھوٹا ہے۔ مراد پور بھی قندیار کی جاگیر میں شامل ہے۔ میری ماں لبانہ خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ بھی مر چکی ہے اور مکرم علی کی والدہ بھی فوت ہو چکی ہے۔ مکرم علی سے میں پانچ سال پہلے ملا تو اس نے میری مدد کرنے کے بجائے مجھے قید کر دیا۔ اسے یہ ڈر تھا کہ کہیں میں ان کی جاگیر پر قبضہ نہ کر لوں۔ تب سے میں قندیار کی حویلی میں پڑا ہوں۔ کوئی دو مہینے پہلے مجھ سے ایک عورت ملنے آئی تھی۔ اس نے ہی مجھ پر یہ مہربانی کی ہے۔ وہ کہتی تھی کہ میں تجھے یہاں سے چھڑا لوں گی۔"

"کیا نام تھا اس کا؟"

"اس کا نام آسیہ تھا۔ اسے مکرم علی نے اپنی داشتہ بنا لیا تھا۔ میری رہائی اسی کی وجہ سے ہوئی ہے۔"

[illegible] ہتا تھا۔ مگر یہ بات مجھے بھی نے نہیں بتائی۔ اب وہ کہاں چلی گئی ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ میں نے اسے پھر نہیں دیکھا ہے۔"

"تو اب بہتر محسوس کر رہا ہے تجمل حسین! اب اٹھ جا۔ تیری مصیبت کے دن ختم ہو گئے ہیں۔ تیری جگہ اب مکرم علی قید بھگتے گا۔ میں یہی محسوس کر رہا ہوں۔ کسی نے تیرے بارے میں کوئی اہم فیصلہ کر رکھا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں، یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" وہ چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر رنگت سی ابھر آئی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ بہت خوش ہو گیا ہو۔

"میرا یہی خیال ہے۔ جلدی ہی تجھے کوئی اپنے پروگرام میں شامل کر لے گا۔" میں خاصی بلند آواز سے بول رہا تھا اور میں چاہتا تھا کہ ہن جی بھی میری آواز سن لیں اور ہوا بھی وہی۔

پہلو کے کمرے سے ہن جی کی آواز ابھری۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "گل خان! تجمل حسین کو میرے پاس لاؤ۔ میں اس سے ضروری بات کرنا چاہتی ہوں۔"

جیسے ہی تجمل حسین نے وہ آواز سنی، وہ ہڑبڑا کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔

"اٹھو بھائی جی! اب یہ بیماری کا قصہ ختم کرو۔ خاصی جان میں ہو تم۔ کچھ گھی شی کھاؤ گے تو ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

تجمل حسین اٹھ بیٹھا اور جوتے پہن کر گل خان کے ساتھ پہلو کے کمرے میں جا گھسا۔ مسولینی بھی ان کے ساتھ ہی تھا۔ میں آبی کو لے کر اپنی جگہ پر آ گیا۔

وہ ابھی تک تجمل حسین کی باتوں پر سخت حیران تھا، بولا۔ "یار! یہ تجمل حسین بھی عجیب ہے۔ پکا حرامی ہے۔ داشتہ کا بیٹا کسی گنتی کھاتے میں تو آ نہیں سکا، اب کیا کر سکے گا؟"

"میں کچھ ٹھیک سے کہہ نہیں سکتا۔ ہن جی اس سے کوئی زبردست کام لینا چاہتی ہیں۔"

"تو پھر اب تو کیا کر رہا ہے۔ میرا خیال ہے ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں مگر اس ہن جی کو دیکھے بغیر میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ مجھے یقین ہے کہ آسیہ یہی ہے۔"

"نہیں یار! وہ تجھے دیکھ کر پاگل ہو جاتی۔ یہ وہ نہیں ہے۔ ہمیں ماں جی کے پاس چلنا چاہیے۔"

"ہاں تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ابھی گل خان آتا ہے تو میں اس سے بات کرتا ہوں۔"

کچھ ہی دیر بعد مسولینی ہمارے پاس آیا، بولا۔ "آئیں آپ کو ایک تماشا دکھاتا ہوں۔ آئیں میرے ساتھ۔"

ہم فوراً ہی اس کے ساتھ چل دیے۔ وہ ہمیں عقبی کمروں سے گزار کر سب سے پچھلے برآمدے میں لے گیا۔ منظر وہاں کا بھی بہت دل گداز تھا۔ گورائے کو ان لوگوں نے ایک بار پھر باندھ لیا تھا اور اب اس کے بدن پر قمیص کوئی نہیں تھی۔ وہ ہوش میں تھا اور اسے ان لوگوں نے ستون سے جکڑ رکھا تھا۔ لکڑی کا پرانی طرز کا ستون مجھے صلیب کی یاد دلاتا تھا۔ گورایا ہمیں بڑے غور سے دیکھنے لگا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ لوگ اب اس سے کیا سلوک کریں گے۔ اس کی آنکھوں میں رحم کی درخواست تھی۔

چند ہی لمحوں بعد گل خان وہاں آ گیا، بولا۔ "گورائے! تجھے معلوم ہے تو اب تک کتنے گھرانوں کی عزت خاک میں ملا چکا ہے۔"

"مجھ پر رحم کرو۔ خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔ میں نے آج تک کسی کو قتل نہیں کیا۔ میرا کوئی جرم ثابت نہیں ہے، مجھے اور ذلیل نہ کرو۔"

"عزت، ذلت تو خدا کے ہاتھ میں ہے البتہ ہن جی کا حکم ہے کہ تمھیں آج ہی گولی مار دی جائے اور میں اسی لیے آیا ہوں۔"

"نہیں گل خان ایسا نہ کر دیار! یوں باندھ کے تو جانور کو بھی نہیں مارتے ہیں۔"

"اس کی باتوں میں مت آؤ گل خان! یہ واجب القتل ہے۔ اسے ابھی ختم کر دو۔" یہ آواز ہن جی کی تھی۔ وہ کمرہ کمرہ گھومتی تھی اور ہر کمرے کے دروازے کو اس نے اندر سے تالا لگا رکھا تھا۔ گل خان نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، گورائے کے سینے کو تاک کر اس نے گولی چلا دی۔ ایک، دو، تین۔ چوتھی کی نوبت ہی نہیں آئی۔ گورایا ستون سے بندھا ستون ایسا ہو چکا تھا۔ اس کا سر ڈھلک کر نیچے آ رہا۔ اس کے جسم سے جان نکل چکی تھی۔ آدمی کو مارنے کے لیے تو ایک ہی گولی کافی ہوتی ہے، اس پر تین چلی تھیں اور وہ بے آواز تھیں۔ گل خان نے بھی کہیں سے وہ بے صوت ہتھیار حاصل کر لیا تھا اور اسے چلانے میں وہ فرحت محسوس کرتا تھا۔ جیسے ہی گورائے نے سر ڈالا، اس نے آگے بڑھ کر اس کے جکڑ بند کھول دیے۔

"اس کو پچھلی دیوار کے ساتھ دفن کر دو، یہ اسی لائق تھا۔" ہن جی کی ڈوبتی ہوئی آواز مجھے سنائی دی۔ اس عورت نے مجھے اور آبی کو حیران کر رکھا تھا اور مزے کی بات یہ تھی کہ گل خان اور مسولینی اس کا حکم بے چون و چرا مانتے تھے۔

گورائے کا قتل میرے لیے بڑا ہی اذیت ناک ثابت ہوا۔ آبی بھی سخت پریشان تھا۔ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے لوٹنے کا اشارہ کرنے لگا۔ ہن جی اس تماشے کو دیکھ کر کمرے کے اندر چلتی ہوئی کبھی اور حجرے میں جا بیٹھی تھیں۔ مسولینی اور گل خان نے گورائے کی لاش کو سر اور پاؤں سے پکڑ کر اٹھایا اور کٹے ہوئے بکرے کی طرح اسے مکان کے عقبی حصے میں لے گئے۔

ہم وہاں سے نکل کر ایک بار پھر اپنے کمرے میں آ بیٹھے۔ کسی چیز میں کوئی مزہ نہیں آرہا تھا۔ حیرت مجھے یہ تھی کہ تحمل حسین دوبارہ باہر نہیں آیا۔ اُسے بہن جی نے کہیں اندر ہی گم کر دیا تھا۔ سگریٹ بھی بدمزہ معلوم ہوتے تھے پھر بھی ہم دونوں کتنی ہی دیر تک وہاں بیٹھے سگریٹ پھونکتے رہے۔

کوئی ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ دونوں واپس آگئے۔ اب وہ نیا جوڑا زیب تن کیے ہوئے تھے معلوم یہ ہوتا تھا کہ وہ نہا کر آئے ہیں۔ کسی نے اُن کے جسموں پر عطر بھی انڈیل دیا تھا۔ وہ سفید براق لٹھے کی قمیصیں اور شلواریں پہنے ہوئے تھے اور بہت خوش دکھائی دیتے تھے۔

آبی انھیں دیکھتے ہی بولا "میرا خیال ہے کہ آپ بہن جی سے کہیں کہ وہ ہماری چیزیں واپس کر دیں۔ ہم آج ہی یہاں سے چل دیں گے۔"

"چیزیں! کیسی چیزیں بہن جی کے پاس ہیں؟"

"جی ہاں کچھ رقم ہے اور ہمارے ہتھیار۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔ میں اُن سے کہتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ آپ لوگ اس گھر کے راز کو راز ہی رہنے دیں گے۔"

"یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے؟ ہمیں معلوم ہے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ آپ کو ہم پر اعتبار کرنا چاہیے۔"

"ہاں میں بھی کتنا پاگل ہوں۔ سنا ہے پیشہ آپ کا بھی یہی ہے۔" گل خان نے ہمارے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

"یہ بات آپ کو کس نے بتائی ہے؟"

"یہ میرا اندازہ ہے۔ ہوسکتا ہے غلط بھی ہو۔"

"نہیں یار! ہم شریف آدمی ہیں جاؤ تم اُن کو ہمارا پیغام دے دو۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہیں گل خان؟" بہن جی کی چھماتی ہوئی آواز پہلو کے کمرے سے اُبھری۔ وہ کسی بھی طرح ہمارے سامنے نہیں آرہی تھی۔

"اس رقم کا کہہ رہے ہیں جو آپ کے پاس ہے بہن جی! مسولینی نے آپ کو لادی تھی نا؟"

"ہاں مگر وہ تو چھ لاکھ روپیہ ہے۔"

"میں خود اُن سے بات کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں تیزی سے کھڑکی کے سامنے جا ٹھہرا۔ وہ پردے کے پیچھے کھڑی تھی اور درمیان میں مچھر جالی لگی تھی اور اس جالی میں سے ہاتھ گزارا نہیں جاسکتا تھا ورنہ میں اس کا گریبان پکڑ کر اس کی صورت دیکھ لیتا۔ اس عورت نے ہمیں عاجز کر دیا تھا۔

"مجھے یوں اتنا قریب دیکھ کر وہ گھبرا سی گئی، بولی۔ "میں رقم ابھی بھیج دیتی ہوں اور پستول بھی۔" یہ کہہ کر وہ اُلٹے قدموں واپس چلی گئی۔ میں مایوس ہو کر پھر چارپائی پر جا بیٹھا۔

کچھ ہی دیر بعد بوتی ہاتھ میں ایک بریف کیس لیے اندر داخل ہوئی۔ اس میں ہماری رقم جوں کی توں رکھی تھی اور دو پستول بھی موجود تھے۔ دوسرا شاید میرے لیے تھا۔ بہن جی نے گولیوں کا ڈبہ بھی ساتھ رکھ دیا تھا۔ آبی نے رقم گنی وہ پوری ہی تھی۔ اتنی ہی جتنی ہم سے گورائے نے چھینی تھی مگر وہ سندھو کہتا تھا کہ رستم ان کے ہاتھ نہیں آسکی۔ دراصل اسے گل خان نے بتایا ہی نہیں ہوگا کہ وہ اندر سے کیا کچھ لے کر باہر نکلے ہیں۔

آبی اُٹھ کھڑا ہوا، بولا "آپ ہمیں اجازت دیں۔ ہمارا یہاں زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہیں ہوگا۔"

گل خان اور مسولینی نے ہم سے مصافحہ کیا۔ اور ہم اسی وقت برآمدے میں پہنچے۔ بہن جی نے برآمدے کے ساتھ والے کمرے سے ہمیں مخاطب کرتے ہوئے کہا "خدا حافظ بھائی جی! خدا حافظ۔ مجھے افسوس ہے میں آپ کی کوئی خدمت نہ کرسکی۔ مجھے ہمیشہ اس بات کا افسوس رہے گا۔ اپنی ماں جی سے ہمارا سلام کہیں اور آسیہ کو بھی۔"

"جی بہت بہتر! آپ کا سلام انہیں پہنچ جائے گا مگر ہمیں حسرت ہی رہے گی کہ ہم آپ کو دیکھ نہ سکے۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے میں نے تو آپ کو دیکھ لیا ہے۔ گل خان! اُن کی ایک تصویر تو لے لو۔" اس نے قریب کھڑے اس آدمی سے کہا۔ جس کے شیر ایسے پنجے آدمی کو حیران کر دیتے تھے۔

وہ فوراً ہی مستعد ہو کر دوسرے کمرے کی طرف دوڑا اور جب وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک عمدہ قسم کا کیمرہ موجود تھا۔ اس نے کئی زاویوں سے ہماری چھ تصویریں لیں۔ الگ الگ بھی اور اکٹھے بھی۔

تصویروں سے فارغ ہو کر اس نے ایک بار پھر ہم سے ہاتھ ملایا اور ہم اُن کو خدا حافظ کہہ کر مکان سے باہر نکل گئے۔ گاؤں کی اصل آبادی وہاں سے کوئی ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھی۔ درمیان میں درختوں کے جھنڈ پردے کا کام دیتے تھے۔

جب ہم گاؤں سے باہر نکلے تو شام کا جھٹپٹا پھیل رہا تھا۔ آبی نے ہوا کو سونگھتے ہوئے کہا "مجھے لگتا ہے آج رات بارش ضرور ہوگی آسمان گدلا گدلا نظر آتا ہے۔"

"کیا خیال ہے ادھر کسی مسجد میں جا کر نہ رات گزار لی جائے؟"

"تو پھر یہاں سے کیوں نکلے ہو؟"

"وہ یہی چاہتے تھے۔ بہن جی نے خود کہا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ گورائے کے قتل تک ہم وہیں موجود رہے۔"

"نہیں میرا خیال ہے یہاں سے نکل جاؤ۔ بہت خراب ہو لیے ہم۔ مکرم علی گورایا کو بھی مرتے دیکھ لیا اب اور کیا چاہتے ہو تم!" آبی نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ وہ مجھے یوں دیکھ رہا تھا جیسے میں اس کے لیے کوئی اجنبی ہوں۔

"ٹھیک ہے آبی! بہن جی نے فیصل آباد کا پتہ دیا ہے۔ خدا کرے آسیہ وہاں پہنچ چکی ہو۔" میں نے قدم آگے بڑھا دیا۔ میرے لیے سفر اور حضر ایک سی بات ہو کر رہ گئی تھی۔ سکون عنقا تھا۔ گلی گلی قریہ قریہ پھرنا مقدر ہو چکا تھا۔ کوئی میرا دکھ کیسے سمجھ سکتا ہے۔ آبی بھی کسی لمحے مجھ سے بہت دُور دکھائی دیتا تھا اور وہ کوئی ایسی ہی گھڑی تھی۔

آبی نے پھیلتی ہوئی شام کے تاریک سایوں میں جگنو سا جلا دیا۔ اس نے دو سگریٹ سلگا لیے تھے۔ ایک اس نے مجھے دے دیا، بولا "یہ کیسی زندگی ہے جیلانی! کبھی سوچا ہے تم نے۔ خدا کرے آسیہ گھر جا پہنچی ہو۔ اس کے بعد تو ہمیں یہ راستہ چھوڑ دینا ہوگا۔"

"میں یہی کروں گا آبی! مجھے بھی یہ احساس ہے۔ شاید یہ ہمارا آخری سفر ہے جو ہم ایک ساتھ کر رہے ہیں۔ پھر تم کسی جگہ زمینیں خرید کر بیٹھ رہنا۔ مجھے تو ابھی اپنے جرائم کا بھی حساب دینا ہے۔"

"نہیں یار! حساب کون لے گا ہم سے۔ وہی جو خود مہا پاپی ہیں؟ نہیں جیلانی ہمیں کہیں بیٹھ رہنا ہے، توبہ کا دروازہ ابھی بند نہیں ہوا ہے۔ خدا سے معافی مانگ کر کسی جگہ بیٹھ رہیں گے۔"

"ہاں! یہ بھی ہوسکتا ہے مگر وہ ایسا ہونے نہیں دیں گے۔"

اب ہم گاؤں سے کافی دُور بڑی سڑک پر جا پہنچے تھے۔

"چھوڑو اس فلسفے کو یار! یہ سزا جزا کا معاملہ ہم نہیں سمجھ سکتے ہیں۔ ہاتھ دے اس بس کو۔ اس میں بیٹھ کر آگے چلے جائیں گے۔" آبی نے کچھ فاصلے پر ایک بس کو اپنی طرف آتے دیکھ لیا تھا۔ پھر وہ اسے رکنے کا اشارہ کرنے لگا۔ ڈرائیور نے بریک لگائے تو معلوم ہوا وہ بس سیدھی راولپنڈی جا رہی ہے۔ ہم فوراً ہی اس میں بیٹھ گئے۔ فرید پور سے جتنی جلدی ہم دُور ہوسکتے تھے، ہوتے چلے گئے۔

بس کے اندر ہمیں سب سے آخری نشست پر جگہ ملی۔ وہ ہمارے لیے زیادہ بہتر تھی۔ راولپنڈی کا ٹکٹ خرید کر ہم بے فکر ہو گئے۔ آبی نے یوں کیا کہ بریف کیس میں پڑا ایک تولیہ نکال کر اپنا سر لپیٹ لیا اور جلدی ہی گہری نیند میں کھو گیا۔ مجھے اس کی یہ ادا اچھی لگی۔ اُسے جس آرام کی ضرورت تھی، وہ اُسے ملنے لگا تھا۔ میں نے بھی آنکھیں موند لیں۔ میرا رومال جو بہت گندا ہو رہا تھا وہ میں نے آنکھوں پر ڈال لیا۔ ہماری دو ضرورتیں پوری ہو رہی تھیں۔ اپنی شناخت کا اخفا تو ہمارے لیے بے حد ضروری تھا اور روشنی میں سونے کے لیے آنکھوں کو لپیٹ لینا ہی بہتر تھا۔ پتہ نہیں بس کس کس راستے سے ہوتی ہوئی کہاں کہاں سے گزری۔ راولپنڈی ہم رات کے دو بجے پہنچے۔

اڈے سے نکلے تو آبی بولا "یار! اب یہ بتا کہ ہم جائیں تو جائیں کہاں۔ کس کے گھر جا کر کہیں کہ ہم تمھارے بچھڑے ہوئے والد صاحب ہیں؟"

"اسٹیشن کے بارے میں تیری کیا رائے ہے؟"

"مگر وہاں جائیں گے کیسے؟"

"ٹیکسی پکڑ اور چل دے اور کرنا کیا ہے ہمیں؟"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔ ان پلسیوں سے بچ کے رہنا۔"

"ایک تو تیری تصویر ہر تھانے میں ٹنگی ہے، اس سے بہت ڈر لگتا ہے مجھے۔" اس نے ایک ٹیکسی کا رُخ کیا جو لبِ سڑک کھڑی تھی۔ اُس میں دو آدمی سوار تھے۔ ایک ڈرائیور ایک اس کا محافظ۔

"چلو یار! ذرا ہمیں اسٹیشن تک لے چلو۔"

"بیس روپے ہوں گے بھائی جی!"

"لے لینا یار! پچاس لے لینا، اور بول صرف سواریاں ہی ڈھوتے ہو کہ کوئی اور دھندا بھی ہے؟" آبی نے اپنی مخصوص آواز میں پوچھا۔ اشارہ اس نے دے دیا تھا۔

ڈرائیور سمجھ دار تھا، بولا "رات تو گزر ہی چکی ہے ورنہ تو بڑی موج کرواتے آپ کو۔"

"بڑی رات باقی ہے کہیں لے چل یار! بہت اُداس ہو رہے ہیں ہم۔ کہیں بھی لے چل۔"

ڈرائیور نے اپنے محافظ سے صلاح مشورہ کیا اور وہ دونوں ہمیں بڑے غور سے دیکھنے کے بعد ٹیکسی کو آگے لے چلے۔

"یہ اچھی بات نہیں ہے یار! ہم سفر میں ہیں اور جو تو چاہتا ہے وہ ٹھیک نہیں ہے۔"

"سب ٹھیک ہے مولوی صاحب! لگتا ہے تو اندر سے شل ہو چکا ہے۔ تیری ٹیوننگ ہونے والی ہے۔ کوئی اتنے پیسے جیب میں رکھ کر بازار میں پھرے اور خالی ہاتھ رہ جائے تو اس پر ہزار لعنت اور تجھ پر لکھ لعنت۔" آبی نے میرا گھٹنا دبا دیا جس کا مطلب تھا کہ اسے اس لفظ پر سخت ندامت ہے۔ میرا گھٹنا وہ خاص خاص موقعوں پر ہی دباتا تھا۔ میں نے کہا "ٹھیک ہے آبی! تیرے ساتھ تو میں جہنم میں بھی جاسکتا ہوں۔"

ڈرائیور ہمیں رتہ امرال کی طرف لے چلا۔ وہ جگہ جہاں چکلا آباد تھا اب باقاعدہ مارکیٹ کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ جب وہاں پابندی لگی تھی اور لوگوں نے شہروں کی تمام گندی نالیاں باہر سے بند کر دی تھیں۔ گندا پانی اب نالیوں اور نالوں کی صورت میں باہر نہیں بہتا تھا اور انھیں اطمینان تھا کہ شہروں سے یہ غلاظت ختم کر دی گئی ہے مگر گھروں کے اندر جو کچھ ہو رہا تھا، وہ اس سے بے خبر تھے بلکہ جان بوجھ کر اس سے اغماض کرتے تھے — انھوں نے سمجھ لیا تھا کہ اب وہ تمام غلاظتوں بلکہ غلیظوں سے بھی معاشرے کو پاک صاف کر چکے ہیں مگر انھیں کیا پتہ ہے کہ مال تو بکتا ہی رہتا ہے۔ مال، دلال اور گاہک کا رابطہ تو ازلی ابدی ہے۔ کوئی اُن سے جان کیسے چھڑا سکتا ہے۔ رتہ امرال کے بازار سے ہٹ کر ٹیکسی عقبی آبادی میں جا گھسی۔ ٹیکسی کا نمبر پولیس والے پڑھ رہے تھے اور وہ جانتے تھے کہ ٹیکسی کدھر جا رہی ہے۔ وہ گاہک کا ہیولا بھی اندر سے دیکھ چکے تھے مگر ڈرائیور کے کہنے پر آبی نے چپکے سے سو روپے کا نوٹ

پُلسیوں کی ایک ٹکڑی کو تھما دیا۔ وہ خوش ہو گئے۔ انہیں معلوم تھا کہ ہم کدھر جا رہے ہیں۔ وہ سارا دھندا ان کی وساطت سے قانون کی حد کے اندر رہ کر باہر نکلتا تھا جہاں سے وہ اُسے پھر کسی نالی میں بہا دیتے تھے۔ اپنی قانونی نالی میں جو کبھی آدمی کو حوالات پہنچا کر ان کی نیکنامی کا باعث بنتی تھی اور کبھی اسے جیل پہنچا کر کسی نہ کسی جگہ پر جہاں سے انھیں باقاعدہ بھتہ نہیں ملتا تھا وہ چھاپے مارتے تھے اور لوگوں کو ننگے ہاتھوں پکڑ لیتے تھے۔ صبح اخباروں میں چند گناہگاروں کی تصویریں چھپتی تھیں۔ اور عامۃ المسلمین خوش ہو جاتے تھے کہ پولیس اپنے فرض سے غافل نہیں ہے۔ الحمدللہ اور خیر سلا۔ کسی تگڑم لڑ رہی تھی اور بیچ میں نوٹ مسلسل گردش میں رہتے تھے۔ ہم لوگوں کی خوش تدبیری تو ویسے بھی اب ضرب المثل ہے۔ ایسا انتظام کرتے ہیں کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

ڈرائیور نے ہمیں ایک مکان کے سامنے اتار دیا۔ محافظ ٹیکسی ہی میں بیٹھا رہا۔ اُس وقت رات کے ڈھائی بج رہے تھے۔ دروازہ کسی نے دوسری ہی دستک پر کھول دیا۔ اور ہم ڈیوڑھی میں سے گزر کر کمرے میں جا گھسے۔ عام سی معمولی قسم کی نشست گاہ تھی جس میں چار کرسیاں دیوار کے ساتھ لگی تھیں۔ اُن پر رکھا کپڑا بھی پھٹا ہوا تھا۔ فرش پر ایک چیتھڑا سی دری بچھی تھی۔ جس کا ننگ ایک سفید چادر نے ڈھانپ رکھا تھا۔

بس یہی اس گھر کی کل کائنات تھی۔ ہم جلدی ہی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

آبی نے عیاشی کے موڈ سے سرشار ہو کر دو سگریٹ سُلگا لیے۔ ایک اس نے مجھے مرحمت فرمایا، بولا۔ "تیری شکل پر بارہ کیوں بج رہے ہیں؟ تو کوئی قتل کی تاریخ بھگتنے نہیں آیا۔ ذرا کھُل کر اور کھِل کر بیٹھ۔ کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا؟"

"ایک تو تیری اس بدمعاشی سے میں بہت تنگ ہوں یہ کوئی وقت ہے کسی حسنِ خوابیدہ کو جگانے کا۔ ہائیں؟ لوگ تہجد پڑھتے ہیں اور تو اپنا مُردہ خراب کر رہا ہے۔"

ڈرائیور مکان کے اندرونی حصے میں جا چکا تھا۔ گھر والوں کو جگانے کے لیے۔

"دیکھ، وہ کیا کہا تھا تو نے حُسنِ خوابیدہ۔ ہاں بھئی سویا ہوا حسن، جاگے ہوئے تند و تیز حُسن سے زیادہ بہتر ہوتا ہے اور تجھے یہ پتہ نہیں۔ خدا جانے تیرا اُستاد کون تھا کتّے کا بچّہ۔"

"وہ جو کوئی بھی تھا، تیرے اُستاد سے بہتر تھا۔"

"میرا خیال ہے وہ لوگ جاگ چکے ہیں۔"

ڈیوڑھی کے فرش پر جُوتوں کی آواز اُبھری۔ ڈرائیور کے پیچھے ایک ادھیڑ عمر کا آدمی اندر آیا۔ اس نے ہمیں نگاہوں میں تولا۔ ہمارے حلیے پر غور کیا اور بولا۔ "کتنے پیسے خرچ کر سکتے ہیں یہ؟"

ڈرائیور مُسکرا دیا، بولا۔ "پیسوں کی فکر نہ کر بابا۔ بس تو اُن تینوں کو ادھر لے آ۔ یہ نہال کر دیں گے۔"

"ٹھیک ہے، میں انھیں بھیجتا ہوں۔ ایک رات کے دو سو روپے لگیں گے۔ یہ تین سے تین تک یہاں رہ سکتے ہیں یعنی کل سہ پہر تک۔"

"تو پیسوں کی بات چھوڑ ہی دے بابا۔ کچھ زیادہ ہی تجھے مل جائے گا۔ بڑے دردلیش ہیں یہ لوگ۔"

بابا اُسی وقت باہر نکل گیا تو ڈرائیور ہمارے پاس ہی بیٹھ گیا۔ بولا۔ "اس کے پاس تین لڑکیاں ہیں۔ چکلے کا پرانا آدمی ہے، اب پردے میں چلا گیا ہے۔ آپ دیکھیں گے تو حیران رہ جائیں گے۔"

ہم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ڈرائیور اپنے حسنِ انتخاب کی داد، مال دکھانے سے پہلے ہی وصول کرنا چاہتا تھا۔ کوئی پندرہ منٹ بعد تین نوجوان لڑکیاں اندر آگئیں لگتا تھا وہ واقعی سوئی ہوئی تھیں۔ نیند اُن کی آنکھوں میں اُبل رہی تھی مگر وہ فرض کی ادائیگی کے سلسلے میں فوراً اُٹھ بیٹھی تھیں۔ جیسے اُن کی تربیت ہی اسی طرح کی گئی ہو۔ وہ اس لیٹ نائٹ شفٹ کے لیے ایک دم تیار ہو کر باہر آگئی تھیں۔ اِن کے لباسوں پر بستر کی شکنیں صاف نظر آتی تھیں۔ بال انھوں نے کچھ اِتنی جلدی جلدی سنوارے تھے کہ اُنکی لٹیں بھی نہیں نکل سکیں تھیں۔ تینوں نہایت ہی ادنیٰ قسم کے نائیلون میں ملبوس تھیں اور اُن کی لپ اسٹک اتنی سستی نظر آتی تھی کہ دیکھ کر مجھے کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ اُن کی اپنی صحتیں البتہ بہت اچھی تھیں۔ ابھی وہ سڑک پر چڑھی ہی تھیں۔ ڈرائیور یہی کہہ رہا تھا۔ کاروبار کی ابھی انہیں نہ تو عادت تھی اور نہ اُن کو لبھانے کا ڈھنگ آتا تھا۔ ہمیں سلام کر کے وہ دیوار کے ساتھ کھڑی ہو گئیں۔ بریف کیس میرے پاس تھا۔ اس مکان پر پہنچ کر آبی نے جان بوجھ کر اسے میرے حوالے کر دیا تھا۔

"ٹھیک ہے بابا! یہ لو یہ چھ سو روپے اِن کے ہیں اور بابا یہ دو سو روپے تمھارے لیے ہیں اور یہ آپ کے لیے یہ دو سو روپے جناب ڈرائیور صاحب!" میں نے مول تول کیے بغیر ایک ہزار کے نوٹ گن کر الگ الگ اُن کے حوالے کر دیے۔

بابا تو ایک دم خوش ہو گیا۔ یہی حال ڈرائیور کا تھا۔ اُسے اتنی بخشش کی اُمید ہی نہیں تھی۔ وہ دونوں ہمیں دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ بابا دروازے کے پاس پہنچ کر بولا۔ "میں اندر بستر لگوا دیتا ہوں، آپ وہاں آرام سے رہ سکتے ہیں۔"

ڈرائیور بھی دروازے پر رُک گیا، بولا۔ "جناب! میں کل کسی وقت آپ کو لینے آ جاؤں؟ سواری کو اس کے اڈّے پر پہنچانا بھی ہماری ذمّے داری ہوتی ہے۔"

"تم فکر نہ کرو۔ ہم خود دیکھ لیں گے کہ ہم کس وقت یہاں سے جائیں گے۔" آبی نے خوش ہو کر کہا۔ اس کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں لڑکیاں اس کے مشامِ جان میں تازگی پیدا کر گئی تھیں۔ ڈرائیور باہر نکلا تو بابا نے

دروازہ اندر سے بند کر لیا اور ہمارے لیے بستر بچھانے کے لیے دوسرے کمرے میں جا گھسا۔

"اِدھر آؤ بھئی ہمارے پاس بیٹھو کیا نام ہے آپ کا کچھ تعارف شعارف بھی تو ہونا چاہیے۔"

وہ اپنا بدن چراتی ہوئی ہماری طرف بڑھیں۔ ایک نے کہا۔ "یہ سعدیہ ہے، یہ سلمیٰ ہے اور میرا نام سنبلہ ہے۔"

"تیرا جواب نہیں ہے سنبلہ، تجھے تو وزیرِ تعارف بنا دیا جانا چاہیے۔ تو تو میرا خیال ہے میرے ساتھ ہی چل۔ کیا پڑا ہے اس چکر میں۔ بہت روپیہ ہے میرے پاس۔ ہم دونوں موج اڑائیں گے، لا ملا ہاتھ اسی خوشی میں۔" سنبلہ کی ہنسی دلفریب تھی۔ جب وہ مُنہ کھولتی تھی تو اس کے گالوں میں گڑھے پڑتے تھے اور ٹھوڑی چاہِ ذقن سے سج جاتی تھی۔ اس نے بڑی دلیری سے آبی کی طرف اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ دونوں کے درمیان ایک دم مفاہمت پیدا ہو گئی تھی۔ گناہ گاروں میں بس ایک یہی خامی پائی جاتی ہے کہ وہ جلد باز ہوتے ہیں۔ آگے پیچھے کی انھیں کوئی پروا نہیں ہوتی۔ اُن کے جذبوں کو جب راہ ملتی ہے تو وہ پھیل کر بے کراں ہو جاتے ہیں۔ اور اسی بے کرانی سے ڈر کر عامۃ المسلمین نے بڑی مُنہ زور نالیوں کے مُنہ بند کر دیے تھے تاکہ کسی کو ان نالیوں میں بہہ کر آنے والی غلاظت کا علم نہ ہو سکے۔ جب غیر ملکی لوگ ہمارے شہروں کو دیکھیں تو کہیں کہ واہ واہ سبحان اللہ کتنا صاف ستھرا شہر ہے۔ نہ کہیں غلاظت نظر آتی ہے نہ گناہ کی رمق موجود ہے۔ کیسا صالح معاشرہ ہے اِن لوگوں کا۔ مگر انھیں کیا پتہ کہ رتّہ امرال تو اب حبشی محلّے میں آباد ہے اور بابا لوگ اپنی افیون کا خرچ اب بھی نئی نسل کو بیچ کر پُورا کرتے ہیں اور پُرانوں پر انھوں نے فاتحہ پڑھ لی ہے۔

بابا جلدی ہی واپس آ گیا، بولا۔ "میں نے تین بستر بچھا دیے ہیں۔ ایک کمرے میں دو اور ایک میں ایک۔ جو آپ پسند کریں۔"

ہم دونوں اُٹھ کر اس کے ساتھ چل دیے۔ سنبلہ پر پہلے ہی آبی ہاتھ رکھ چکا تھا۔ دُوسرا ہاتھ اس نے سلمیٰ کے کندھے پر ڈال دیا۔ اور اُن دونوں کو ساتھ لے کر دائیں ہاتھ کے کمرے میں جا گھسا۔ اس کی نیت کو میں اچھی طرح سمجھتا تھا۔ میں نے کہا "ٹھیک ہے بھائی! تو اپنی مرضی کا مالک ہے، میں تجھے کیا کہہ سکتا ہوں۔ تو دو بستر چاہتا ہے وہ تجھے مل جائیں گے۔ میرا کیا ہے، میں تو اس راستے کا راہی ہوں بھی نہیں۔ مجھے تو خواہ مخواہ ہی مصیبت میں ڈال رہا ہے۔"

جس کمرے میں، میں گھسا اس کے عین وسط میں بڑا سا پلنگ بچھا تھا۔ چادر اس پر سفید بچھائی گئی تھی اور پائنتی پر لحاف رکھا تھا۔ سعدیہ میرے ساتھ وہاں تک گئی تو میں نے اُسے پرے ہی روک دیا۔ میں نے کہا۔ "مجھے سخت نیند آئی ہے اور میں سونا چاہتا ہوں آپ یہ سو روپیہ مجھ سے اور لے لیں اور مجھے آرام کرنے دیں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہو گی۔"

وہ کچھ خجل سی ہو گئی۔ سمجھی اس کی توہین ہو گئی ہے۔ نوٹ لینے سے اس نے احتراز کیا تو میں نے اُس سے کہا۔ "تو بہت اچھی ہے سعدیہ! تیرا چہرہ پریوں ایسا ہے۔ تیرے ایسی میں نے بہت کم دیکھی ہیں مگر میں اتنی راتوں سے جاگ رہا ہوں کہ یہ دو گھڑی کی نیند میرے لیے بے حد ضروری ہے۔ میں تجھ سے صبح بات کروں گا، خدا حافظ۔"

یہ کہہ کر میں نے بستر پر قدم ڈال دیا۔ وہ کچھ پشیمان سی ہو گئی۔ میرا خیال ہے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ اس کا رُخ بتی کی طرف ہوتا تو میں اس کی آنکھیں زیادہ بہتر طور پر دیکھ سکتا تھا۔ اس نے نوٹ کی طرف پھر بھی ہاتھ نہیں بڑھایا تو میں نے خود وہ نوٹ اس کی مٹھی میں دے دیا۔

"یہ میری طرف سے رکھ لو میں تم سے صبح ملوں گا۔ میری بات کا بُرا نہ ماننا سعدیہ! میں ویسے ہی ٹھنڈا ٹھار آدمی ہوں اور تیری عمر بہت کم ہے۔"

وہ وہاں سے سر جھکا کر اسی وقت چلی گئی۔ کہنے کے لیے اُس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ کسی کے ہاتھ آئی سودے کی گانٹھ تھی مگر خود کو یُوں دھتکار دیے جانے پر اس کی اَنا جاگ اٹھی تھی۔ میرا خیال ہے وہ روتی ہوئی واپس گئی تھی۔

آبی میری زندگی میں یُوں رَچ بس گیا تھا کہ میں اس کے بغیر شاید جی ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کو شراب اور عورت نے یُوں گھول کر پی لیا تھا کہ میری ہر کوشش اس کو راہِ راست پر لانے میں ناکام ہوتی چلی جاتی تھی۔ یوں تو ہر آدمی جو جُرم کی راہ پر چلتا ہے، ایسے ٹھکانے ڈھونڈتا رہتا ہے جہاں وہ اِن چیزوں سے زیادہ سے زیادہ سیراب ہو سکے مگر آبی کی رُوح کچھ زیادہ ہی پیاسی تھی۔ وہ ہر چشمے پر مُنہ رکھ دیتا تھا۔ میں جو اُس کی زندگی کے یہ تمام واقعات زیرِ بحث لاتا ہُوں تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ میری ہزاروں راتوں کی تپسیا اس کی ایک ہی جست میں اُدھڑ کر رہ جاتی تھی۔ وہ ایسے ہی ہوتے ہیں جنھیں یہ احساس ڈسنے لگتا ہے کہ ہمارا کیا ہے مثالِ قطرۂ شبنم رہے رہے کہ نہ رہے۔۔۔۔ پھر۔۔۔ پھر کیوں سسک سسک کر جیا جائے۔ جو ہاتھ آتا ہے اُسے خوب تل تل کر بتیس دانتوں کی ہر شاخ کو نہال کر کے کھا لینا چاہیے۔ موت کی ٹیکی ہمہ وقت ان کا پیچھا کرتی رہتی ہے۔ اُن کے لب، لبِ نوشیں پر اتر کر بے پناہ لذت محسوس کرتے ہیں۔ آبی ایسا ہی تھا۔ اور میں اس کی کسی بات کو آپ سے چھپا لینا بیکار سمجھتا ہُوں۔ اس کے دل کی ماترا میں ہر شخص کے لیے بے پناہ محبت تھی۔ قتل و غارت گری اس کا پیشہ نہیں تھا، اسے تو ہر آدمی پسند آتا تھا مگر وہ جس انداز سے خود کو خرچ کرتا تھا وہ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا تھا۔ مگر وہ میرا ایسا دوست تھا جس کے لیے میں واقعی جہنم میں

بھی جاسکتا تھا۔ مجھے اس ڈرائیور کی ایمانداری پر بھی بہت فخر ہے۔ وہ دلدل میں چلتے ہیں۔ اُن کے پاؤں زانوؤں تک کیچڑ میں دھنسے ہوئے ہیں۔ ان کی کمائیاں سب کی سب حرام ہوتی ہیں، وہ اندھیروں کے مسافر ہیں مگر اُن میں سے کوئی کسی کو دھوکا نہیں دیتا۔ ہمیں وہ بسوں کے اڈے سے اٹھا کر بابا کے گھر چھوڑ گئے۔ فیس ہم نے انھیں دے دی، وہ چاہتے تو ہمارے لیے زبردست مشکل پیدا کر سکتے تھے مگر ایسا نہیں ہوا۔ اُن کے ساتھ پولیس نے بھی بہت شریفانہ برتاؤ کیا۔ ایک سو روپے کا نوٹ اُن کی طرف منتقل ہوا تو انھوں نے مڑ کر بھی نہیں دیکھا کہ ہم کہاں جا گھسے ہیں۔ یہ اُن کی بھی ایمانداری کی ایک واضح دلیل تھی۔ ورنہ وہ گناہ کی اس مشک کی طرف پلٹ کر دیکھتے تو اس کی دوسری طرف انھیں غلام جیلانی مل جاتا جس کی گرفتاری پر ہزاروں روپے انعام کا مقرر کیا جا چکا تھا۔

میری آنکھ نو بجے کھلی۔ دن بہت اُوپر آ چکا تھا۔ میں نے اٹھ کر غسل خانے کا رُخ کیا۔ وہاں سے نکل کر میں نے آبی کا دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ وہ سالا گہری نیند میں تھا۔ دستک سن کر ایک دم اُٹھ بیٹھا۔ جب اس نے دروازہ کھولا تو نیند سے اس کی آنکھیں بھری ہوئی تھیں۔

"اب اٹھ جا آبی! بڑی دیر ہو گئی ہے۔ ہمیں یہاں سے جلدی نکل جانا چاہیے۔"

"لگتا ہے تو ساری رات توبہ تلا ہی کرتا رہا ہے۔ آ بیٹھ اِدھر، میں ابھی تیار ہو جاتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے مجھے اندر لے جا کر خالی بستر پر بٹھا دیا۔ غسل خانہ وہاں ایک ہی تھا اور وہ جانتا تھا کہ اس کا دروازہ کس طرف ہے۔

"دروازہ اندر سے بند کر لے، میں ابھی آیا۔" یہ کہہ کر وہ تولیہ لے کر دوسری طرف نکل گیا۔ لڑکیاں ابھی تک نیند میں دُھت تھیں۔ اور میں حیران تھا کہ انھیں یوں ایک نامحرم کے پہلو میں اتنی گہری نیند کیسے آ جاتی ہے۔ وہ قدرت کا شاہکار معلوم ہوتی تھیں۔ جوانی قدرت کا فی نفسہ ایک بہت بڑا شاہکار ہے اور پھر عورت کی جوانی! اس پر ہزار قیامتیں نثار کی جا سکتی ہیں۔ اُن کو دیکھ کر میرے وجود میں زلزلہ سا آ گیا مگر میری ہمت ہی نہیں پڑی کہ میں انھیں اپنی طرف متوجہ کرتا۔ میں اُن کی جانب سے رُخ موڑ کر پلنگ کی دوسری طرف جا بیٹھا۔

آبی واپس آیا تو وہ بہت خوش تھا۔ وہ نہا کر آیا تھا اور تازہ دم معلوم ہوتا تھا۔

"یار! اس بابے سے کہہ، کچھ چائے ہی پلا دے ہمیں۔"

"نہیں! اس کی ضرورت نہیں ہے، چائے ہم کسی ہوٹل سے پی لیں گے۔"

"کیسی بات کرتے ہو تم؟ سسرال کی چائے کی بات ہی اور ہوتی ہے، اب تو ہم اس کے تہرے رشتے میں بندھے ہیں۔" اس نے دیوار میں لگے آئینے میں دیکھ کر اپنے بال سنوارتے ہوئے کہا۔

"اٹھ جاؤ بھئی! مہربانو! قدردانو! اب اُٹھ جاؤ۔ یہ آ گیا ہے تمھارا مکلاوا لینے۔" ایک دم بدمعاش آدمی تھا۔ لڑکیوں نے اس کی آواز سُن لی اور وہ اپنے لباس سنبھالتی ہوئیں اسی وقت اُٹھ گئیں۔ دونوں نے بیک وقت مجھے یوں سلام کیا جیسے میں واقعی انھیں واپس لینے آیا ہوں۔

آبی تیار ہو گیا تو بریف کیس سے سو روپیہ نکال کر انھیں دیتے ہوئے بولا "یہ لو یہ تمھارے دودھ کے پیسے ہیں۔ رکھ لو اور خوب جانیں بناؤ۔ ہم جا رہے ہیں۔"

"ابھی سے، آپ نے تو ناشتہ بھی نہیں کیا۔" سلمیٰ نے نوٹ پکڑتے ہوئے کہا۔

"اس کی ضرورت نہیں۔ ہم کسی ہوٹل میں چائے پی لیں گے۔ چل بھئی ہمیں دیر ہو گئی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے اُن سے باری باری مصافحہ کیا، بولا "مجھے یہ رات ہمیشہ یاد رہے گی جب میں بوڑھا ہو جاؤں گا تو اس رات کا تصور مجھے پھر سے جوان کر دے گا۔ تم دونوں مجھے ہمیشہ یاد آتی رہو گی۔" یہ کہہ وہ دروازے کی طرف پلٹا اور باہر نکل گیا۔

میں نے ایک بار پھر ان لڑکیوں کو دیکھا اور پھر اس مکان پر آخری بار نظر ڈال کر میں بھی آبی کے پیچھے سڑک پر جا نکلا۔ وہ بلاشبہ ہمیشہ یاد رہنے والی لڑکیاں تھیں۔ آبی ٹھیک کہتا تھا۔ کوئی ایسی قیامت کی رات بھلا کیسے بھلا سکتا تھا۔ زندگی کی لامتناہی طوالت کو مختصر کر دینے والی راتیں تو چند ایک ہی ہوتی ہیں جن کے تصوّر سے آدمی کبھی چھٹکارا نہیں پا سکتا۔ وہ بڑی مخملی، بڑی ملائم، بڑی جانفزا اور بڑی ہی خلد آفرین راتیں ہوتی ہیں۔ جو بار بار ذہن کے نہاں خانوں میں چمکارا سا مارتی ہیں اور اُسے بے چین کر دیتی ہیں۔ آبی ٹھیک کہتا ہے جب وہ بوڑھا ہو جائے گا تو اُسے ان یادوں کے سہارے زندگی گزارنا زیادہ آسان معلوم ہو گا۔

ہم ریتا مرال کے اس عقبی محلے سے باہر نکلے اور ٹیکسی میں بیٹھ کر سیدھے بس اسٹاپ پر جا پہنچے۔ فیصل آباد کے لیے بس تیار کھڑی تھی۔ ہم اس میں جا بیٹھے۔ مجھے یقین تھا کہ آسیہ سے اب کی بار میری ملاقات ضرور ہو جائے گی۔ آخر وہ کب تک یوں آوارہ ہوا کی طرح نفلک کے گوشے گوشے میں سرگرداں رہے گی۔ کبھی تو اسے قرار آ جانا چاہیے۔ حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ وہ ماں جس کے بغیر میں زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے اس طویل سفر کے دوران کبھی یاد نہیں آئی تھی۔ اور اب میں اسی کی طرف لوٹ رہا تھا۔ وہ رقم میں نے اُسے دی، اس سے کیا ہوتا تھا۔ میں سمجھا میں نے اس کی ممتا کا بدلہ چکا دیا ہے، اب میری طرف اس کا کوئی اُدھار نہیں ہے۔

آدمی کی شقی القلبی کا تو کوئی حساب ہی نہیں ہے مگر میں اُس سے ایسا غافل ہوا کہ ایک بار بھی لوٹ کر اُس کی طرف نہیں گیا۔ میرا دل شاید اندر سے پتھر ہو چکا تھا۔ کوئی ایسی ہی بات تھی کہ بہن کے غم نے مجھے ہر سمت سے مایوس کر دیا تھا اور اب میرا دل آہستہ آہستہ پگھل رہا تھا۔ آسیہ بھی اس کی طرف لوٹ آئی ہو گی اور میں اُن دونوں کو لے کر فوراً ہی کسی طرف نکل جانا چاہتا تھا۔ یہی ایک راستہ کھلا رہ گیا۔ بہت سے خوفناک جرائم میرے نامۂ اعمال میں درج ہو چکے تھے اور مجھے قانون سے بچ کر کسی نہ کسی طرف نکل ہی جانا چاہیے تھا۔ ورنہ میں اُن کا اگر حساب دینے بیٹھ جاتا تو میرے پلّے تو کچھ بھی نہیں بچتا تھا۔ جلادوں کی بھرن مجھ پر آ پڑی تھی۔ ہر وقت جل تھل سا نظر آتا تھا اور اس میں مجھے اپنی لاش نہیں نظر آتی تھی۔ وہ بہت بھاری پتھر تھا جو میں نے اٹھا رکھا تھا۔ اب میری کمر شل ہونے لگی تھی، اور میرے پیٹ پر بندھا بارکش ریزہ ریزہ ہو چکا تھا۔ مجھ میں اتنی ہمت باقی نہیں رہی تھی کہ میں اپنے ازلی ابدی دشمنوں کا حساب برابر کر کے انھیں ختم کر سکتا۔ میں اندر سے ٹوٹتا جا رہا تھا۔ جا بجا میرا خون زمین پر پھل پھل گرا تھا۔ بڑے سر میری گردن پر طوقِ گناہ کی طرح لٹک رہے تھے اور اب میں انہی کے بوجھ تلے اتنا دب گیا تھا کہ مجھ سے اس کا بھگتان مشکل نظر آتا تھا۔ وہ بھاگوتی، وہ مسند آرا، شاید اب تک میرے اس طویل سفر کے دوران کسی اور چوکھٹ پر جا بیٹھی ہو گی۔ میں شاید یہی چاہتا تھا۔ میں اس کے قابل تھا ہی کہاں۔ خدا جانے میں نے اُسے خوابوں میں کیسے ڈھونڈ لیا تھا۔ وہ کس جنم میں میرے ساتھ رہی تھی۔ وہ آپ ہی آپ میری نیند میں آتی رہی۔ اب بھی آتی تھی۔ وہ ویسی ہی تھی جیسی میں نے اسے پہلے روز دیکھا تھا مگر مجھے وہ بھکل بنا کر چلی جاتی تھی۔ زندگی سے اور زیادہ نراش اور مایوس کر کے۔ پتہ نہیں وہ کس حال میں تھی اور اس کے بہنوئی نے اس کے ساتھ کیسا سلوک کیا تھا۔ بڑے گہرے غار کے کنارے پہنچا کر میں اس سے الگ ہو گیا تھا۔ اب تک تو وہ پاتال میں اُتر چکی ہو گی۔ کاش میں اس کے لیے کچھ کر سکتا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" آبی نے مجھے ٹہوکا دیتے ہوئے کہا۔ بڑی عیاشی اسے میرے لیے سوجھتی تھی تو وہ دو سگریٹ سلگا کر ایک مجھے دے دیتا تھا۔ اب بھی اس نے یہی کیا تھا۔

"کچھ نہیں یار! سوچتا ہوں جس ماں نے مجھے جنم دیا، جس کے بھگ میں میں نے زندگی کا رُوپ دھارا وہ مجھ سے اتنی دور ہو گئی کہ کبھی اس کا خیال بھی میرے ذہن میں نہیں آیا۔ یہ کیسی ناشکر گزاری ہے۔"

"ایسا بھی ہوتا ہے پیارے! شیر لوٹ کر اپنی ماں کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ اسے اپنے سامنے کا ہی شکار یاد رہ جاتا ہے انسان کا بھی یہی حال ہے۔ ماں کو بھی کہاں یاد رہتا ہے کہ اس نے کس بچے کے لیے کتنا دُکھ جھیلا ہے۔"

"نہیں یار! ایسا نہ کہو۔ ورنہ تو مائیں بچوں کو پوری دنیا بھی عذاب سمجھنے لگیں گی۔ ہم ہی نالائق ہیں آبی! ورنہ مائیں تو پرستش کے قابل ہوتی ہیں۔ میں جو زندہ ہوں تو سمجھ لو کہ اب بھی میری ماں میرے لیے دعائیں مانگتی ہوں گی ورنہ... ورنہ تو میں کبھی کا مر چکا ہوتا۔ کیسا کیسا عذاب نہیں سہا ہے ہم نے۔"

"ہاں موسیٰ کو بھی یہی جواب ملا تھا کہ تو جوتے پہن کر آ جاتا تھا کیونکہ تیری ماں تیرے لیے دعائیں مانگتی تھی مگر اب وہ زندہ نہیں ہے جوتے اتار کر آنا۔ ماں نہ ہوتی تو شاید یہ دنیا ویرانہ بن جاتی۔ اس سے مل لیا کر اسی میں تیری بہتری ہے۔"

"میں اسی لیے اس کی طرف جا رہا ہوں۔ خدا کرے وہ خیریت سے ہو۔" میں نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔

"وہ ٹھیک ہی ہو گی۔ مائیں ہمیشہ ٹھیک ہی رہتی ہیں کہ انھیں بیٹوں کا انتظار رہتا ہے۔ آنکھیں پتھرا بھی جائیں تو بھی دروازے پر سے نگاہ نہیں ہٹتی ہے۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔"

ماموں ارشد کا گاؤں فیصل آباد سے بہت آگے تھا۔ وہاں سے ہمیں سرگودھا تک کا سفر کرنا پڑا۔ چک سوانن میں اس کا گھر تھا۔ ہمیں خاصی دُور تک پیدل بھی چلنا پڑا۔ شام ہونے کو تھی کہ ہم اس گاؤں میں جا پہنچے۔ دل میرا بلّیوں اچھل رہا تھا۔ میں ماں کا سامنا کیسے کر سکوں گا۔ مجھے اپنی وہ ساری زندگی اکارت نظر آئی جو میں نے اس کو تج کر گزار دی تھی۔ میرا بُرا ہو میں ماں کو ہی بھول چکا تھا۔

ماموں ارشد علی کا گھر مسجد کے قریب ہی تھا۔ اس کے دو بیٹے فوج میں ملازم تھے۔ گھر کا سارا نظام وہ خود سنبھال رہا تھا۔ ہم نے دروازے پر دستک دی تو ارشد علی ہی باہر نکلا۔ وہ مجھے پہچان ہی نہیں رہا تھا۔

"جی بھائی جی! کسے ملنا ہے آپ کو؟"

"ارے ماموں آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟ میں غلام جیلانی ہوں یا حضرت!"

"اچھا! یہ تم ہو غلام جیلانی! کتنی مدت بعد دیکھا ہے تمھیں۔" اس نے مجھے سینے سے چمٹا لیا۔ بولا "بڑے ذلیل آدمی ہو۔ ماں کو بھی دیکھنے نہیں آتے اس کی تو آنکھیں بھی تھک گئی ہیں۔"

"میں بہت شرمندہ ہوں ماموں! کچھ ایسا ہی سفر درپیش تھا۔ مجھے کہاں ہے ماں جی؟"

"وہ تو الگ گھر میں رہتی ہیں، قریب ہی ہے۔ میں نے فضیلت کو وہاں بھیج رکھا ہے۔ مزے میں ہیں۔"

"چلیں مجھے اُن کے پاس لے چلیں۔"

"ہاں چلو۔ تمھاری ممانی بھی اُدھر ہی گئی ہیں۔ یہ کون ہے تمہارے ساتھ؟"

"یہ میرے دوست ہیں اسلم آبی۔"

"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" ماموں نے آبی سے مصافحہ کیا اور ہمیں لے کر وہ ماں جی کے گھر کی طرف چل دیا۔ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا مگر بڑی چستی تھی اس کے بدن میں۔ اپنی زمین وہ خود ہی کاشت کرتا تھا۔ تین چار مزارع بھی اس نے کام پر لگا رکھے تھے۔ اور وہ بڑی اچھی زندگی گزار رہا تھا۔

ماں جی نے مجھے دیکھا تو پاگلوں کی طرح مجھے باہوں میں سمیٹ لیا۔ اُن کی آنکھیں بہہ نکلیں۔ مجھے وہ یوں ٹٹول ٹٹول کر دیکھ رہی تھیں جیسے وہ دیکھ رہی ہوں کہ کہیں وقت نے میرا کوئی پرزہ کم نہ کر دیا ہو۔ بڑی ہیجان خیز ملاقات تھی وہ۔ اس سے گزر کر ہم ذرا اطمینان سے بیٹھے تو میں نے کہا "ماں جی آسیہ کہاں ہے؟ سُنا ہے وہ آپ کے پاس آگئی تھی۔"

"نہیں بیٹے! وہ تو یہاں نہیں آئی۔ کس نے بتائی ہے یہ بات تمھیں؟"

"مجھے یہی معلوم ہوا تھا کہ آپ کے پاس آگئی ہے۔ اس لڑکی نے مجھے حیران کر دیا ہے۔ یہ سارا وقت اُسی کی تلاش میں گزر گیا۔ مگر وہ ابھی تک مجھے نہیں ملی ہے۔ آگے ہی آگے سرکتی جا رہی ہے۔"

"اس کو دیکھو بیٹے! اُس کو لے کر آؤ۔ تم نے کہاں اتنا وقت ضائع کر دیا۔ پتہ نہیں وہ کس حال میں ہے۔"

"وہ اچھے حال میں ہے ماں جی! آج نہیں تو دس دن بعد وہ یہاں ضرور آئے گی۔ یہ راستہ اسے معلوم ہے۔"

"وہ تمھارے تایا صاحب بھی یہاں آئے ہوئے ہیں بھئی! عبدالغنی! جن کا بیٹا ڈاکٹر بن چکا ہے۔"

"عبدالغنی! وہ یہاں کیا کر رہا ہے، کس لیے آیا ہے وہ یہاں؟" میں نے پلٹ کر ماموں سے پوچھا۔

وہ مسکرا رہا تھا، بولا "بھابی کی خیر خبر کے لیے آیا تھا۔ اُس کی تھوڑی سی زمین بھی ہے نا ادھر چک سوالن میں۔"

"ہوں! تو یہ بات ہے۔ کہاں ٹھہرا ہے وہ؟"

"میرے ہی گھر میں ٹھہرا ہوا ہے وہ۔ کسی کام سے شہر گیا ہوا ہے۔ ڈاکٹر اختر بھی اس کے ساتھ ہی ہے۔ زمین بیچ رہا ہے وہ آج کل۔"

"یہ اچھی خبر دی ہے آپ نے! میں اس سے ضرور ملوں گا۔ اُس لکھ پتی سے۔"

"اُسے کچھ نہیں کہنا ہے بیٹے! سارے معاملات خدا پہ چھوڑ دو۔"

"وہ تو چھوڑ ہی دیے ہیں ماں جی! میں تو اُن سے صرف ملنا چاہتا ہوں، اس میں کیا حرج ہے۔ کیوں آبی کیا خیال ہے تیرا؟"

"ہاں! اک صرف ملنا ہی تو ہے۔ ڈاکٹر کی بھی صورت دیکھنی چاہیے۔ میں نے بھی اُسے کبھی نہیں دیکھا ہے۔" آبی نے زہر خند کیا۔

کافی دیر تک ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ ماں جی بہت ہوش میں تھیں۔ عمر اُن کی یہی کوئی پچاس سال کی ہو گی۔ بڑھاپا ابھی بہت دُور تھا۔ سارا روپیہ انھوں نے بینک میں رکھا تھا اور اس کے منافع پر ہی گزارا کر رہی تھیں۔ وہ خاصی رقم بن جاتی تھی۔ فضیلت، ناک نقشے کی تو یوں ہی سی تھی مگر اُن کی خدمت وہ جی جان سے کرتی تھی اور ماموں بھی اس کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ممانی تو اُن کا کوئی حکم ٹالتی ہی نہیں تھی۔ وقت گزاری کے لیے انھوں نے گاؤں کی بچیوں کو قرآن مجید پڑھانا شروع کر رکھا تھا اور ان کا وقت بہت اچھی طرح گزر رہا تھا۔ ایک طرح سے ہمیں بھلا ہی چکی تھیں۔ وہ رونا دھونا جو ایسے موقعوں پر ماؤں کی عادت ہے، وہ اس سے بہت دُور تھیں۔ ہر دکھ کو وہ رضائے الٰہی سمجھ کر جھیل جاتی تھیں اور یہی صبر اُن کی بہت بڑی ڈھال بن گیا تھا۔

ماموں رشد علی کوئی دس بجے واپس چلے گئے۔ تو ہم بستر بچھا کے اور ماں جی کے گھر میں سو رہے۔ ہمیں معلوم ہو گیا تھا کہ تایا عبدالغنی اور اختر واپس آچکے ہیں۔ ماموں سے میں نے کہہ دیا کہ وہ ہماری آمد کی اطلاع انہیں نہیں دے گا۔ وہ خاموشی سے واپس چلا گیا اور ہمارے بارے میں اس نے انھیں کچھ نہیں بتایا۔ مجھے ڈر یہ تھا کہ کہیں وہ چک سوالن سے راتوں رات نہ نکل جائیں۔ ہماری زندگی میں زہر تو اُن لوگوں ہی نے گھولا تھا۔ پہلا پتھر لوگوں کی طرف ہی سے ہم پر پڑا تھا۔ میں اس عبدالغنی کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا تھا اور نہ اس کے اختر صاحب کو۔ آبی میری اس کیفیت سے آگاہ تھا۔ مگر وہ بولا کچھ نہیں چپ چاپ اپنی چارپائی پر لیٹا رہا۔

میرا مغز بار بار اُلٹ رہا تھا۔ عبدالغنی اور اختر مجھ سے زیادہ دُور نہیں تھے۔ میں انھیں لاشوں میں بدل دینا چاہتا تھا۔ اُن ہی کی وجہ سے میرا اور بہن کا راستہ ایسا بدلا کہ ہم تباہی کے غار میں جا گرے۔ ہمارا سکھ چین ہی ختم ہو گیا تھا۔ ورنہ ہم تو منزلوں کے راہی نہیں تھے۔ ایک بھرے پرے گھر کو اجاڑنے والے یہی لوگ تھے مگر اُن کی ضد نے ہماری تقدیریں ہی بدل دیں۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میں کیا کروں۔ گولیوں سے بھرے پستول پر بار بار میرا دباؤ بڑھتا رہا مگر میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

صبح جب ہم اُٹھے تو ناشتے کے بعد ہم دونوں ہی ماموں کے گھر کی طرف چل دیے۔ میرے دماغ میں آگ سی لگی تھی اور ایک عرصے بعد میرے سامنے آیا تھا۔ میرا اصل دشمن جس نے ہماری

تباہ کر دی تھی۔ ماں جی سے میں نے کہہ دیا کہ ہم ذرا کھیتوں کی سیر کو جا رہے ہیں۔ وہ مطمئن ہو کر بیٹھ رہیں۔

راشد علی کے گھر میں جب ہم داخل ہوئے تو وہ دونوں سامنے ہی بیٹھے نظر آگئے۔ ماموں بھی حقہ سامنے رکھ کر وہیں بیٹھا تھا۔ اس نے ہمیں دروازے میں داخل ہوتے دیکھا تو وہ گھبرا سا گیا، بولا "آؤ آؤ بھئی! میں ان کو بتانا ہی بھول گیا۔ کیا حال ہیں بھانجے! اس کو پہچانا ہے آپ نے؟"

"جی نہیں — لگتا ہے میں نے انھیں کہیں دیکھا ہے، ارے غلام جیلانی! یہ ... یہ تم ہو؟" عبدالغنی نے اٹھ کر مصافحے کے لیے ہاتھ میری طرف بڑھائے۔

"جی ہاں، یہ میں ہی ہوں لکھ پتی صاحب! اپنے ہاتھ پرے ہی رکھیں تو بہتر ہے۔" میں نے اس کی طرف بڑی نفرت سے دیکھتے ہوئے کہا "اور یہ ہیں آپ کے ڈاکٹر اختر ایم بی بی ایس۔ ہوں! اچھا ہوا آپ یہاں مل گئے۔ یہ چک سوالن بھی بڑی عجیب جگہ ہے۔"

"میاں! ہم سے ابھی تک ناراض ہو۔ قسمت کی بات ہے بیٹے اللہ کو یہی منظور تھا۔ تمھیں ہم سے اتنا متنفر نہیں ہونا چاہیے۔ تمھارے تایا ہیں ہم۔ تم ہمارے بھائی کی اولاد ہو۔" وہ ابھی تک میری طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھائے ہوئے تھا۔ اختر اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ جم کر چارپائی پر بیٹھا رہا۔ میں اور آبی دونوں ماموں کی پائنتی بیٹھ گئے تو وہ بھی مایوس ہو کر چارپائی پر ڈھے سا گیا۔ ہم سے وہ آنکھ نہیں ملا رہا تھا۔

"سُنا ہے اُدھر تم پر کوئی کیس بن گیا تھا۔ پھانسی کی سزا ہو گئی تھی تمھیں۔" اب کی بار اس نے بڑے ہی زہر خند لہجے میں کہا۔

"جی ہاں! میں تو مر بھی چکا۔ اب تو یہ ایک اور ہی غلام جیلانی آپ کے سامنے ہے تایا صاحب جی! ایک نیا غلام جیلانی جسے رشتوں کے بھرم کا پورا پورا احساس ہے۔"

"لو یار حقہ پیو۔ چھوڑو ان باتوں کو۔ یہ بتاؤ تمھاری سزا ختم کیسے ہو گئی؟ کوئی بڑا وکیل کیا ہو گا تم نے۔"

"ہاں! میرا وکیل خدا تھا ماموں جان! اور مجھے معلوم تھا کہ ایک دن میری ان سے ملاقات ضرور ہو گی، اپنے اس محسن سے۔"

"خدا گواہ ہے ہمیں بہت دکھ ہوا تھا تمھاری سزا کا سن کر۔ اختر بھی بہت پریشان تھا۔ اچھا ہوا تم وہاں سے رہا ہو گئے۔" عبدالغنی نے کہا مگر اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ مجھے زمین کے اوپر نہیں، زمین کے اندر دیکھنے کا خواہش مند تھا۔

"خواہ مخواہ کی بکواس کا کیا فائدہ ہے تایا صاحب جی! کون کس کے لیے پریشان ہوتا ہے! ہو تو آپ کو لکھ پتی مل گئی ہو گی۔"

"ہاں! اللہ کا فضل ہے ایک لیڈی ڈاکٹر سے اختر کی شادی ہو گئی تھی۔"

"اور وہ لاکھوں روپیہ ساتھ لائی ہو گی؟"

"ہاں بس ٹھیک ہی تھا۔ اللہ کا فضل ہے، تم کہو کیا کر رہے ہو آج کل؟"

"آسیہ کو ڈھونڈ رہا ہوں۔ آپ نے ہمیں یہ دن نہ دکھائے ہوتے تو ہم بھی ٹھیک ہی رہتے۔"

"ایسا نہ کہو بھتیجے! یہ سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔"

"ہاں میں بھی اسی نتیجے پر پہنچا ہوں، اب دیکھیں نا، ہماری یہ ملاقات بھی اللہ ہی کو منظور تھی، اس چک سوالن میں ہے نا یہی بات؟"

"ہاں! آؤ بیٹے! میرا خیال ہے اب ہمیں چل دینا چاہیے ناشتہ تو تم نے کر ہی لیا ہے۔"

"جی ہاں! سرگودھا کی بس ابھی نہیں نکلی ہو گی۔ ان سے رخصت لے لیں۔" اختر نے اٹھتے ہوئے کہا۔ وہ ابھی تک ہم سے براہِ راست بات نہیں کر رہا تھا۔

ماموں نے اس بحث کو ختم ہوتے دیکھ کر انھیں فوراً ہی خدا حافظ کہہ کر دروازے تک پہنچا دیا۔ اور وہ اُسی وقت وہاں سے رخصت ہو گئے۔ اس وقت صبح کے سات بج رہے تھے۔

وہ باہر نکلے تو ہم نے بھی ماموں سے مصافحہ کیا اور اسی وقت گلی میں نکل گئے۔ عبدالغنی اور اختر اس عرصے میں تیز تیز چلتے ہوئے گاؤں سے آگے نکل چکے تھے۔ ہم نے راستہ ذرا سا بدلا اور اُن دونوں کو راستے میں چھوڑ کر ہم مکئی کے کھیت میں سے گزر کر اُن سے پہلے بڑی سڑک پر جا پہنچے۔ بس ابھی تک نہیں پہنچی تھی۔

"تیرا کیا ارادہ ہے جیلانی!"

"میں ان دونوں کو آج ہی ختم کر دینا چاہتا ہوں۔ میں ان کا وجود برداشت نہیں کر سکتا ہوں، ان کی لاشیں ہی گھر پہنچنی چاہییں۔"

"یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تو ابھی زندہ ہے اور اپنے زخموں کا حساب رکھتا ہے۔"

"ان کو دیکھ کر میرا خون کھول اُٹھا ہے آبی۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کی وجہ سے ہمیں یہ دن دیکھنے پڑے۔"

"ہاں! یہ تو ہے۔ دیکھ وہ سڑک پر آ چڑھے ہیں حملہ اُن پر یہاں نہ کرو تو زیادہ بہتر ہے۔"

"فکر نہ کرو۔ میں ان کو ایسی جگہ ماروں گا کہ انہیں وہاں پانی بھی نہیں ملے گا۔"

آبی نے اتنے میں بس روک لی۔ وہ سیدھی سرگودھا جا رہی تھی۔ ہم اندر بیٹھے تو وہ بھی بس میں آ بیٹھے۔ ہم عادت کے مطابق پچھلی نشستوں کی طرف بڑھ گئے اور وہ بھی شاید اپنی عادت کے مطابق اگلی سیٹوں پر

بیٹھ گئے۔ دونوں بڑے آدمی تھے، اپنے لیے بہتر جگہ کی تلاش میں رہتے تھے۔ کاش ہم ماں جی سے مل کر آتے مگر ایسا نہ ہو سکا۔ اور ہمارا وہ سفر کچھ زیادہ ہی لمبا ہو گیا۔ دونوں جانتے تھے کہ ہم پچھلی نشستوں پر بیٹھے ہیں مگر ہم سے انھوں نے کوئی بات نہیں کی اور یہ بات تو ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ ہمارے ارادے نیک نہیں ہیں دونوں کے ماتھوں پر تیوریاں چڑھی تھیں اور میرا خیال ہے کہ وہ آپس میں ہمارے ہی بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔

سرگودھا پہنچ کر وہ تیزی سے ٹیکسی میں بیٹھے اور کچہری کی طرف چل دیے۔ آبی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا، بولا "دوبارہ ان کو نہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہم اُن کا پیچھا کر رہے ہیں۔"

"تو پھر کیا کریں؟"

"کسی ٹیکسی میں بہر حال بیٹھ جاؤ اور ان کو نگاہ میں رکھو۔" اُس نے ایک ٹیکسی کو روکتے ہوئے کہا اور ہم بھی اسی وقت کچہری کی طرف چل دیے۔ کچھ ہی دیر بعد ہمیں معلوم ہوا کہ دونوں باپ بیٹا سیدھے ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں جا گھسے ہیں۔ یہ اچھی بات تھی۔ ہم اُن پر وہاں برابر نظر رکھ سکتے تھے۔ دفتر سے وہ کوئی ایک گھنٹے بعد باہر نکلے۔ تو وہ دونوں بہت خوش تھے معلوم ہوتا تھا کہ وہ جس کام کے لیے وہاں گئے تھے وہ پورا ہو چکا تھا۔ اختر اپنے بریف کیس کو بہت سنبھال کر پکڑے ہوئے تھا۔ دو آدمی اُن کے ساتھ اور بھی تھے۔ وہ شاید زمین کے خریدار تھے اور رجسٹری انھوں نے اسی روز ہی تیار کروائی تھی۔

وہ کچہری سے نکلے اور ٹیکسی میں بیٹھ کر شہر کی طرف چل دیے ہم اُن کا برابر تعاقب کر رہے تھے۔ ہمیں جو ٹیکسی ملی وہ بڑی خاموشی سے اُن کے پیچھے چلتی رہی۔ فاصلہ دے کر۔ تاکہ انھیں معلوم نہ ہو سکے کہ ہم کس لیے اُن کے پیچھے لگے ہیں۔ ڈرائیور کو ہم نے بتا دیا تھا کہ ہمیں بہر طور سامنے کی ٹیکسی کو نگاہ میں رکھنا ہے۔ وہ بھلا آدمی ہمارے کہنے کے مطابق آگے بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ لوگ ایک بار پھر بسوں کے اڈے میں جا گھسے۔ اور جس بس میں وہ بیٹھے وہ سیدھی لاہور کو جاتی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنا کام ختم کر کے واپس جا رہے تھے۔

"کیا خیال ہے تیرا۔ اسی بس میں نہ جا بیٹھیں؟"

"ہاں یہی بہتر ہے۔ آؤ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔" آبی نے اُسی بس کی طرف قدم بڑھا دیا۔ وہ پھر حسبِ عادت اگلی نشستوں پر جا بیٹھے تھے۔ سواریوں کی بہت بھیڑ تھی، اس میں گھس کر ہم پچھلی سیٹوں پر جا بیٹھے۔ انھیں بہر حال یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ ہم بھی اسی بس میں سوار ہیں۔

میرے ذہن میں ماضی کی وہ تلخ یادیں بار بار مجھے لہو رلاتی تھیں، ماں جی کی وہ باتیں مجھے یاد آئیں جو انھوں نے بڑی عاجزی اور انکساری سے عبدالغنی کے سامنے کہی تھیں مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوا تھا خود اختر کا بھی یہی حال تھا۔ اُس کی نظر میں بھی زر کی مستی ایسی چھائی تھی کہ ہم اُسے دکھائی ہی نہیں دیتے تھے۔ وہ کسی اعلیٰ طبقے کی بالا بلند خاتون کے خواب دیکھنے لگا تھا۔ اُس کا خیال یہ تھا کہ اب آسیہ اُس کے کسی کام کی نہیں رہی ہے اور عبدالغنی کے تو مزاج ہی ٹھکانے نہیں رہے تھے۔ وہ سمجھتا تھا کہ ڈاکٹر بننے کے بعد اس کا بیٹا کسی شاہی گھرانے ہی میں بیاہا جائے گا۔ آج جب اس کی لاش گھر پہنچے گی تو اس کی وہ دلھن سر پیٹ کر رہ جائے گی اور ہماری تائی جب عبدالغنی کو دیکھے گی تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ اسے کس کی نظر کھا گئی ہے۔ اس کا لہولہان بدن اُسے زندگی بھر لہو رلاتا رہے گا۔ میں یہی چاہتا تھا۔ اُن سے انتقام لینے کا اس سے بہتر موقع اور کوئی نہ مل سکتا تھا۔ آبی کا ذہن اس صورتِ حال کو پوری طرح قبول کر چکا تھا۔ ہم اپنی اس واردات کو ڈاکے کی صورت دینا چاہتے تھے تاکہ پولیس جب ہماری تلاش میں نکلے تو اس کے ذہن میں یہی تصور ہونا چاہیے کہ یہ قتل کسی دیرینہ عداوت کا نتیجہ نہیں ہے۔

بس فیصل آباد کے راستے چلتی ہوئی جب کھڑیانوالہ سے آگے نکلی تو آبی نے بریف کیس سے نکال کر ایک پستول رومال میں رکھ کر میرے حوالے کر دیا۔ وہ گولیوں سے لبالب بھرا تھا۔ ایک پستول اُس نے سنبھال لیا۔ جب ہم کھڑیانوالہ سے آگے نکلے تو معلوم ہوا کہ بس کو روک لینا کسی بھی طرح ممکن نہیں تھا۔ دونوں طرف سے ٹریفک کا تانتا بندھا تھا اور ایسی بھیڑ میں کسی جگہ بس کو روکنا اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا آبی اس صورتِ حال سے مایوس سا ہو کر بولا "کسی مناسب جگہ بس روکو تو زیادہ بہتر ہے۔"

"کون سی جگہ بہتر رہے گی، ٹریفک تو دونوں طرف جاری ہے۔" اس وقت شام کے سات بج رہے تھے اور ہم ابھی تک منصوبے ہی بنانے میں لگے تھے مگر بات بنتی نظر نہیں آتی تھی۔ سارے انبوہ میں سے کسی دو آدمیوں کو قتل کر دینا کوئی آسان کام نہ تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ اس مسلسل انتظار کی وجہ سے ہم دونوں کے اعصاب بالکل ہی چٹخ گئے تھے۔ نہ آبی میں اتنی ہمت تھی اور نہ میں اتنی کہ بس کو روک سکتا تھا۔ عجیب گومگو کی کیفیت میں پھنسے تھے ہم ہماری نشستیں ہمیں جکڑے بیٹھی تھیں اور اُن دونوں کو ابھی تک نہیں پتا تھا کہ ہم بھی پچھلی نشستوں پر بیٹھے ہیں۔ گاڑی ابھی شیخوپورہ سے میل دو دور تھی کہ چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ بس کی بتیاں روشن ہو گئیں تو آبی خود کو سنبھالتا ہوا اٹھا اور بائیں ہاتھ میں بریف کیس لے کر اُس نے پستول دائیں جیب میں رکھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا ڈرائیور کے قریب ہی خالی جگہ پر جا بیٹھا۔ سر پر اُس نے عجیب

سے تولیہ باندھ لیا تھا۔ چند ہی لمحوں بعد وہ ڈرائیور کے سامنے کھڑا تھا اور اس کا پستول اس کے سینے پر تنا تھا۔

"بس کو بائیں ہاتھ لے چلو، اس طرف۔ جلدی کرو۔" اس نے سامنے کی ایک چھوٹی سڑک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ کیا کیا کر رہے ہو تم۔ کیوں روکتے ہو بس کو؟"

"زیادہ بکو اس کی ضرورت نہیں ہے بس کو بائیں ہاتھ موڑو۔" میں نے پچھلی نشست سے چنگھاڑتے ہوئے کہا سب کی نظریں میری طرف اٹھ گئیں مگر میں نے تولیہ کچھ اس طرح باندھ لیا تھا کہ صرف میری آنکھیں ہی نظر آ رہی تھیں۔

"شاباش! اب اسے آگے لے چلو۔ کوئی گڑبڑ کی تو پہلی گولی تمھارے سینے میں اُترے گی۔"

ڈرائیور اس کی دھمکی سے عاجز آ کر بس کو بائیں ہاتھ کی چھوٹی سڑک پر لے چلا تھا۔ اور اب بھی اس کی رفتار خاصی تیز تھی وہ بہت پریشان ہو گیا تھا۔ کنڈیکٹر منحنی سا آدمی تھا وہ دروازے میں لٹکا کبھی مجھے دیکھتا تھا اور کبھی ڈرائیور کو۔

"سب لوگ اپنا اپنا مال الگ رکھ دو۔ ایک دو۔۔۔۔۔ دو ۔۔۔ کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔" آبی نے اپنی آواز کا سارا تحکم سواریوں کی طرف منتقل کرتے ہوئے کہا۔

سب لوگ دہشت زدہ ہو چکے تھے۔ ڈرائیور نے بس روک لی تو میں نے دیکھا کہ آبی نے پہلی گولی اختر کے سینے میں دھنسا دی۔ وہ کسی خاص مقصد کے لیے بریف کیس کھول رہا تھا۔ گولی لگتے ہی وہ اُلٹ کر کھڑکی کے ساتھ جا لگا۔ اُس کی چیخیں ساری بس کو لرزہ براندام کر گئیں۔ آبی ایک بار پھر ڈرائیور کو زد میں لے چکا تھا۔ عین اُس وقت میں نے آگے بڑھ کر کنڈیکٹر کو زوردار قسم کا تھپڑ مار کر بس سے نیچے اتار دیا۔ اور پھر دوسری گولی میں نے عبدالغنی پر چلا دی، وہ اُس کی گدی میں لگی اور دوسری طرف سوراخ ڈال کر باہر نکل گئی۔ مجھے کوئی بڑا ہی مہلک قسم کا ہتھیار بہن جی نے دیا تھا۔ ڈرائیور اس دہشت کو برداشت نہ کر سکا اور فوراً ہی کھلے دروازے سے نکل کر کھیتوں میں جا گھسا۔ حالانکہ اس سے ہمیں کوئی مطلب نہیں تھا۔ آبی نے دیکھا کہ اختر ابھی تک چیخ رہا تھا۔ اس نے تاؤ کھا کر ایک اور گولی اس کے سینے میں دھنسا دی۔ عبدالغنی تو پہلے ہی جھٹکے میں ختم ہو چکا تھا۔ آبی نے ان کا بریف کیس اٹھا لیا۔ سواریوں نے اس عرصے میں اپنی اپنی نقدی گھڑیاں اور زیور فرش پر ڈال دیا تھا۔ آبی صرف نوٹوں کو سمیٹتا ہوا تیزی سے بس میں گھوما اور پھر فوراً ہی بس کے کھلے دروازے سے نکلا، بولا "باہر آ جا اب میں دیر ہو رہی ہے۔"

میں نے اس کی یہ آواز سُنی تو بس کی سواریوں کو پستول کی زد میں لے کر اُلٹے پاؤں دروازے میں سے نکلا اور پھر ہم دونوں نے جان بوجھ کر کنڈیکٹر کے پاؤں میں دو گولیاں دھنسا دیں۔ وہ سامنے ہی کھڑا بچاؤ بچاؤ کا شور مچا رہا تھا۔ وہ گولی کھا کر وہیں ڈھیر ہو گیا تو ہم سیدھے مکئی کے کھیتوں میں جا گھسے۔ وہ سوا نیزے ایسی اونچی مکئی ہمارے لیے زبردست ڈھال ثابت ہوئی تھی۔ ہم دونوں وہاں سے چور ایسی احتیاط سے آگے نکلے تو معلوم ہوا دس منٹ میں ہم آدھا میل فاصلہ طے کر چکے ہیں۔ آبی نے دونوں بریف کیس ایک ہی ہاتھ میں سنبھال رکھے تھے۔ ایک اس نے کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد مجھے دے دیا۔ اور پھر ہم جس قدر تیز بھاگ سکتے تھے وہاں سے بھاگ لیے یہاں تک کہ ہم دو گھنٹے تک مسلسل بھاگتے چلے گئے۔ رات کے دس بج چکے تھے مگر آبی کہیں رُکنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ راستے میں کئی گاؤں آئے مگر ہم اُدھر نہیں نکلے۔ ہم بس سے جس قدر دور ہو سکتے تھے، ہوتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ ہم اس عرصے میں شاید دس پندرہ میل کا فاصلہ طے کر گئے تھے۔ بالآخر ہمارا سانس جب زیادہ ہی اکھڑا تو ہم دم لینے کے لیے ایک نہر کے کنارے پر پہنچ کر ایک گھنے درخت کی چھاؤں میں جا بیٹھے۔ وہ ایسی جگہ تھی جہاں سے ہمیں نہر پر کھڑا کوئی آدمی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

"بیٹھ جا یہاں جیلانی! اس عبدالغنی کا بھی تو صفایا کر آیا کہ نہیں؟"

"ہاں گولی اس کی گدی میں لگی تھی اور پار نکل گئی تھی۔ دوسری کی اسے ضرورت ہی نہیں تھی۔" میں نے اس کے سامنے گھاس پر لیٹتے ہوئے کہا۔ میرا دم کچھ زیادہ ہی اکھڑ گیا تھا۔

"اچھا کیا تو نے۔ جسے قتل ہی کرنا ہے تو اس سے بحث مباحثہ فضول ہی ہوتا ہے میرا ارادہ تھا کہ میں آسیہ کا نام لوں مگر پھر میں نے فیصلہ ہی کر لیا۔ وہ بدمعاش بریف کیس کھول رہا تھا۔ دیکھوں تو کیا ہے اس بریف کیس میں۔" اس نے یہ کہہ کر بریف کیس کھول لیا۔ اس میں دو لاکھ روپے اور کچھ کاغذات موجود تھے۔ اس کے علاوہ اس میں ایک پستول بھی رکھا تھا۔

"تو یہ بات تھی۔ وہ سالا اسی کو کھول رہا تھا۔ دیکھتے ہو یہ پستول۔۔۔ درّے کا تو نہیں لگتا۔"

"نہیں یار یہ تو بلجیم کا بنا ہوا معلوم ہوتا ہے۔" میں نے پستول کو ہاتھوں میں تولتے ہوئے کہا۔ وہ خاصا ہنگا ہتھیار تھا۔

"چل اسے سنبھال کر رکھ کسی روز کام آئے گا۔"

"میرا خیال ہے کہ اختر بھی ختم ہو ہی گیا تھا۔ میں نے اسے دو گولیاں ماری تھیں۔"

"ہاں وہ بھی خاموش ہو گیا تھا۔ اب یہ باقی رات کہاں

گزاریں گے ہم ؟"

"دیکھتے ہیں، شاید راستے میں کوئی گاؤں مل جائے تو ہم اس کی مسجد میں رہ لیں گے۔"

آبی نے بریف کیس بند کر دیا اور دو سگریٹ سلگا کر ایک ایک اس نے مجھے دے دیا۔

"آج میں بہت خوش ہوں جیلانی! میں نے تمھاری بربادی کے اصل ذمے دار آدمی کو پاتال میں اتار دیا ہے۔ وہ اسی لائق تھے۔ ایسے لوگوں سے اس دنیا کو پاک کر دینا چاہیے۔ زمین پر بوجھ ہوتے ہیں یہ لوگ۔"

"ہاں، میں بھی بہت خوش ہوں آبی! اس سے بدلہ لینے کا تو میں ایک عرصے سے سوچ رہا تھا مگر یہ کہیں ٹرکا ہی نہیں۔ اب اس کے گھر میں صفِ ماتم بچھے گی تو اس کی بیوی کو پتہ چلے گا کہ ہُوا کیا ہے۔"

"چل، اب نکل چل کسی طرف۔ بھوک بھی چمک اٹھی ہے۔"

آبی نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ عبدالغنی کا بریف کیس اس نے مجھے دے دیا تھا۔ "اسے سنبھال کر رکھو۔ میرا خیال ہے کہ سارے کاغذ جلا دو۔"

"ہاں، یہ بہتر رہے گا۔ میں یہی کرتا ہوں۔" میں نے بریف کیس پھر کھول لیا اور کاغذوں کو یک جا کر کے انہیں آگ دکھا دی۔ وہ بھلا ہمارے کس کام آ سکتے تھے۔

مجھے یقین تھا کہ بس کے بارے میں پولیس یہی سوچے گی کہ ڈاکوؤں نے اسے لوٹ لیا ہے اور اُن دو آدمیوں کو انہوں نے مزاحمت کرنے پر قتل کر دیا ہے۔ آبی نے جیبوں میں ہاتھ ڈال کر بس میں سے اکٹھے کیے گئے نوٹ سامنے ڈھیر کر لیے۔ وہ صرف چھ ہزار سات سو روپیہ باہر لا سکا تھا۔ زیور کو اس نے ہاتھ ہی نہیں لگایا تھا۔ اُن نوٹوں کو سیدھا کر کے بریف کیس میں ڈال دیا۔ سوال اب ہمارے سامنے یہ تھا کہ رات کے اس پہر ہم کس کا دروازہ کھٹکھٹائیں۔

"میرا خیال ہے کہ سفر جاری رکھنا چاہیے بھائی مختون الحواس، یہی بہتر ہے۔"

آبی مسکرا دیا، بولا "آج تو کچھ زیادہ ہی خوش نظر آتا ہے مجھے۔ مگر تیرا ہاتھ لرز رہا تھا جیلانی! تیری گولی نے بڑی دیر بعد اثر کیا تھا اس پر۔"

"نہیں! وہ تو وہیں ڈھیر ہو گیا تھا۔"

"ایسا نہیں تھا۔ وہ بڑی دیر تک تڑپتا رہا تھا۔ وہ عبدالغنی۔ تجھے اس پر کاری وار کرنا چاہیے تھا۔ اس کا تڑپنا مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔"

"اسی لیے تم نے دوسری گولی چلائی تھی ؟"

"نہیں! وہ اختر کے لیے تھی۔ وہ ٹھنڈا ہی نہیں ہو رہا تھا۔ ویسے کسی کو یوں ثابت سالم موت کے حوالے نہیں کرنا چاہیے۔ مجھے اپنی اس حرکت پر بہت دکھ ہو رہا ہے، خدا میرے گناہ معاف کرے۔ مجھے تیرے اس جرم میں شریک نہیں ہونا چاہیے تھا۔" اس نے گھاس پر بریف کیس رکھ کر اس پر سر ڈالتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب ہے تیرا ؟ میں سمجھ نہیں سکا ہوں۔"

"وہ تیرے دشمن تھے جیلانی! تیری ذات کے دشمن۔ میرا اُن لوگوں سے تو کوئی بیر نہیں تھا مگر پہلی گولی میں نے ہی اُن پر چلائی۔ تجھ سے تو میں خُرسند ہو گیا مگر وہ تو مجھے کبھی معاف نہیں کریں گے۔ اختر کی ڈوبتی آنکھوں میں یہی سوال نظر آتا تھا مجھے، جیسے وہ پوچھ رہا ہو کہ تیرا میں نے کیا بگاڑا تھا آبی! ذرا سوچ یار! یہ کیا ہو گیا ہے۔"

"لعنت بھیج اس ذکر پر۔ مر گئے مردود، نہ فاتحہ نہ درود۔ اُٹھ اب یہاں سے چل نکل۔ تیرے اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔" میں اس کے سامنے لاجواب ہو گیا تھا۔ میں نے بریف کیس اُٹھا لیا۔ وہ بھی اسی وقت میرے پیچھے چل دیا۔ کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ بلاشبہ عبدالغنی اور اختر کا قتل اس کے سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ موت انہیں نگل کر آگے بڑھ چکی تھی۔

آبی کی باتوں سے میں بہت ہی عاجز آ گیا تھا۔ اُسے یہ احساس ستانے لگا تھا کہ اسے میری وجہ سے اُن لوگوں پر ہاتھ اٹھانا پڑا تھا جن سے اسے کوئی شکوہ نہیں تھا اور یہ احساس جب کسی دل میں پیدا ہونے لگے۔ تو اس کے ساتھ جینا مرنا ممکن نہیں رہتا۔ ہم کوئی آدھ میل تک اپنی سوچوں میں غرق ہو کر چلتے رہے۔ بات وہ صحیح کہہ رہا تھا مگر وہ تلوار ایسی منہ بیچی بات تھی جس کے سامنے آیا کوئی آدمی زخم کھائے بنا نہیں رہتا ہے۔ میں نے چاہا کہ اسے وہیں چھوڑ دوں، بہت روپیہ تھا اس کے پاس اور ابھی جو بریف کیس اس کے ہاتھ میں تھا اس میں دو لاکھ چھ ہزار روپے موجود تھے۔ میرا خیال ہے کہ شاید وہ بھی مجھ سے علیحدہ ہونے ہی کی بات سوچ رہا تھا۔ ایسے میں مَیں نے چاہا کہ میں اس سے رخصت ہو کر پھر سے ماں جی کے پاس جا بیٹھوں۔ چک سوالن دا زیادہ دُور نہیں تھا مگر وہ اچانک رکا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا "تو کیا سوچ رہا ہے جیلانی! یہ زندگی تو ایسی ہی ہے۔ تو کہیں مجھ سے بدظن تو نہیں ہو گیا ؟"

"میں تو یہی سوچ رہا ہوں آبی کہ تو مجھ سے خوش نہیں۔"

"ایسا نہ سوچ پیارے! میں بھلا تجھ سے کیسے ناراض ہو سکتا۔ پتہ نہیں ہمارا انجام کیا ہو گا مگر میں تیرے ہاتھ میں ہاتھ دے کر رہنا چاہتا ہوں۔" اس نے بازو پھیلا کر مجھے اپنے سینے سے چمٹا لیا "تو ایسی باتیں نہ کر جیلانی! ابھی تو بڑے مرحلے باقی ہیں۔ آسیہ ابھی تک ہمارے لیے معمّا بنی ہوئی ہے۔"

"نہیں، میرا خیال ہے کہ وہ ماں جی کے پاس ضرور لوٹ آئے گی۔ اب تو وہ بالکل آزاد ہے۔ ایک بچّہ اس کے پاؤں کی زنجیر بن سکتا ہے مگر میرا خیال ہے وہ اسے بھی چھوڑ دے گی۔"

"ہاں توقع یہی رکھنی چاہیے۔ جن کی باتوں سے تو یہی معلوم ہوتا تھا۔"

"میں تھوڑی دیر پہلے سوچ رہا تھا کہ ابھی لوٹ کر ماں جی کے پاس جا پہنچوں مگر میں نے دیکھا ہے کہ انھوں نے تو شاید دل پر پتھر رکھ لیا ہے۔ انھیں میرے وہاں جانے کی کوئی خوشی نہیں ہوتی تھی۔ یوں اجنبی سی بن کر بیٹھی رہیں جیسے میں اُن کا کچھ نہیں لگتا۔"

"ہاں! مجھے بھی حیرت ہو رہی تھی۔ اُن کے دل میں ذرا سا بھی جوش، جذبہ پیدا نہیں ہو رہا تھا حالاں کہ تو اتنی دیر بعد اُن سے ملا تھا۔ یہ بات کیا ہوتی ہے یار! مائیں تو ایسی نہیں ہوتی ہیں ؟"

"ہم نے انھیں دکھ بھی تو بہت دیے ہیں آبی! وہ یہی سمجھ رہی ہیں کہ وہ بے اولاد ہیں۔ اُن کے زخم بھی تو دیکھو۔"

"ہاں! بات کچھ ایسی ہی ہے۔ دفع کر اس ذکر کو۔ میرا خیال ہے ہم پھر کسی بڑی سڑک پر پہنچ رہے ہیں۔"

"اگر ایسا ہے تو پھر کوئی بس پکڑ۔ میں آج ہی ڈھلوں صاحب کے پاس جانا چاہتا ہوں۔ میں اُس آسیہ پر لعنت بھیج دوں گا۔ کوئی فائدہ نہیں ہے، اپنے بُرے بھلے کی وہ خود ذمّے دار ہے۔" میں نے نہایت ہی تلخ لہجے میں کہا۔ مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ میری ساری محنت اکارت چلی گئی ہے۔ نہ میں اس کو ڈھونڈ سکا۔ نہ میں اس کو کسی گھر کے آنگن میں آباد دیکھ سکا۔ میں اس کا کوئی بھی دُکھ دُور نہ کر سکا تھا۔ پھر میں پاگلوں کی طرح اس ہوا کا کب تک پیچھا کرتا جو میرے ہاتھ میں آتی ہی نہیں تھی۔

"تو ٹھیک کہہ رہا ہے جیلانی! اُسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔ پتہ نہیں وہ کس چکر میں ہے اور کہاں جا پہنچی ہے۔"

اب ہم سڑک پر جا پہنچے تھے۔ جو دونوں طرف سے میرے دل کی طرح ویران اور بے آباد نظر آتی تھی۔ کھیتوں کے بیچوں بیچ خدا جانے وہ کہاں جا پہنچتی تھی۔ ہم اس پر جا چڑھے تو کھیتوں کی بُو باس اور زیادہ واضح ہو گئی۔

ہم سمت کا اندازہ کر کے لاہور کی جانب چلنے لگے، یوں جیسے وہ سارا فاصلہ ہم پیدل ہی طے کر لیں گے۔ ہماری بے سروسامانی کی کوئی حد ہی نہیں تھی۔ ابھی ہم سو قدم ہی آگے گئے ہوں گے کہ ہمارے عقب سے ایک کار آگے نکلتی نظر آئی۔ اس کی بڑی روشنیاں بجھی ہوئی تھیں۔ صرف نچلی بتیاں روشن تھیں۔ کار ہمارے قریب آئی تو اگلی بڑی بتیاں بھی جلنے لگیں۔ ہم دونوں ہاتھ پھیلا کر اس کے سامنے جا ٹھہرے تھے۔ کار ہمارے پاس پہنچ کر رُک گئی۔

"کیا بات ہے بھئی! کہاں جانا ہے آپ کو ؟" ڈرائیور نے کھڑکی سے باہر سر نکال کر پوچھا۔ وہ چہرے مہرے سے کوئی بہت ہی نیک نفس آدمی معلوم ہوتا تھا اور عمدہ قسم کی بُوشرٹ اور پتلون پہنے ہوئے تھا۔

"ہم لاہور جانا چاہتے ہیں۔ اگر آپ ہماری مدد کریں تو بڑی مہربانی ہو گی۔"

"آئیں، پیچھے بیٹھ جائیں۔ غازی ان کو جگہ دے دو۔" اس نے عقبی نشست پر بیٹھے اپنے ملازم سے کہا۔ ہم فوراً ہی کار کے اندر جا بیٹھے۔

"کہاں سے آ رہے ہو بھئی ؟"

"جی اُدھر کمال پور سے آئے ہیں ہم۔ کل ہمیں ڈیوٹی پر پہنچنا ہے۔ ہم دونوں منگلا ڈیم پر کام کرتے ہیں۔"

"گڈ! یہ سڑک ننکانہ صاحب کو جاتی ہے۔ میں ایک سرکاری کام سے یہاں آیا تھا۔ صبح مجھے بھی ڈیوٹی پر پہنچنا ہے۔"

"آپ کی بڑی مہربانی ہے جناب! میرا خیال ہے آپ کوئی بہت بڑے افسر ہیں شاید۔" آبی نے لہجے میں مٹھاس پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"میں واپڈا میں کام کرتا ہوں، ایکسین ہوں۔ یہ غازی بھی میرے ساتھ ہی ہوتا ہے۔ آپ نے اپنا نام نہیں بتایا ؟"

"جی، میرا نام پیرزادہ ہے۔ ایس جی ایم پیرزادہ اور یہ ہاشم خان ہیں۔ ہم دونوں سیکیورٹی آفیسر ہیں منگلا تو آپ نے دیکھا ہو گا ؟"

"ہاں دیکھا ہے مگر میں نے وہاں کام نہیں کیا۔"

"کیا نام ہے آپ کا ؟"

"جی، میر سیّد غلام رسول میرا نام ہے۔ میں واپڈا کالونی میں رہتا ہوں وہ شالامار کے قریب ہے۔"

یونہی اِدھر اُدھر کی باتوں میں غلام رسول صاحب کے ساتھ ہمارا وقت بہت اچھی طرح گزر گیا اور ہم بخیریت لاہور پہنچ گئے۔

"اب یہ بتا کہ رات کے بارہ بجے ہم کدھر نکلیں ؟" میں نے کار سے اُتر کر آبی سے کہا۔

"ہاں! کس طرف جائیں کدھر نکلیں کہ تو رسوا نہ ہو۔ بڑی بات کہی ہے شاعر نے۔ کیا خیال ہے تیرا، ہیرا منڈی نہ جا ٹھہریں ؟"

"لعنت بھیج یار! کوئی ٹیکسی پکڑ، ہم ابھی ڈھلوں صاحب کے ہاں چلتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ کتّے کا بچہ ڈاکٹر رحمتی واپس آیا کہ نہیں۔ اس کے دو آدمی وہاں ڈھلوں صاحب نے قید میں ڈال رکھے ہیں۔"

"ہاں یہ تو بہت ضروری ہے۔ اُن سے ہم انتقام نہ لے سکے تو سمجھو ہم نے کچھ کیا ہی نہیں۔ اُن کو تو کتّے کی موت مارنا چاہیے۔"

آبی نے اسٹیشن کے باہر کھڑی ایک ٹیکسی کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

ٹیکسی میں دو آدمی بیٹھے تھے۔ یہ نئی مصیبت تھی۔ چوروں، ڈاکوؤں سے بچنے کے لیے لاہور میں بھی یار لوگ محافظ کے طور پر دوسرا آدمی ساتھ رکھنے لگے تھے۔ بالخصوص رات کے وقت وہ بہت زیادہ چوکنے ہو کر پھرتے تھے۔ آبی کچھ اور آگے بڑھ گیا۔ وہاں نئی کاریں ٹیکسی اسٹینڈ سے مل جاتی تھیں اور مسافر کے ہمراہ ایک ہی ڈرائیور باہر نکلتا تھا۔ آبی نے ایک کار کرائے پر لی اور مجھے بھی اس نے عقبی نشست پر اپنے ساتھ بٹھا لیا۔

"چل بھئی! ہمیں پنوکی کی طرف لے چل، چوگوٹھ کی طرف۔"

"ٹھیک ہے صاحب!" ڈرائیور نے اپنی مہین سی آواز میں کہا اور آگے چل دیا۔

"اگر میں اُن لوگوں سے انتقام نہ لے سکا تو اس کا مجھے بے حد افسوس رہے گا۔ وہ جو کچھ کر رہے ہیں وہ ناقابلِ معافی ہے۔"

"دیکھ اگر اب کی بار عالیہ ہمیں مل گئی تو تجھے مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا۔"

"کیسا وعدہ؟ کیا کرے گا تو عالیہ کو؟"

"بس میں اسے چند راتیں اپنے پاس رکھنا چاہتا ہوں۔ وہ ایسی ہی چیز ہے یار! اس پر تو جان واری جا سکتی ہے۔" آبی نے اس کے تصور میں ڈوبتے ہوئے کہا۔

وہ ٹھیک کہتا تھا۔ وہ بڑی رُوح افزا چیز تھی اور اس پر آدمی اپنا سب کچھ نثار کر کے بھی سمجھتا تھا کہ اس نے کچھ نہیں کیا۔

"ٹھیک ہے۔ یہ میرا وعدہ ہے ہم اسے کچھ نہیں کہیں گے، اس کے سارے گناہ معاف کر دیں گے۔" میں نے دریادلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

آبی خوش ہو گیا، بولا۔ "تیری بڑی مہربانی ہے یار!"

ڈرائیور کوئی بہت ہی سادہ لوح آدمی تھا اور مجھے معلوم تھا کہ اسے ہماری باتوں سے کوئی تعلق نہیں ہے، اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ ہم آزادی سے وہاں بیٹھے گپ ہانکتے رہے۔ میں سوچتا تھا کہ آبی میرے ساتھ نہ ہوتا تو پھر میں کیا کرتا؟ زندگی کتنی بے کیف گزرتی۔ دن کتنے ویران ہو جاتے۔

جب ہم چوگوٹھ پہنچے تو رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا اور حویلی کے دروازے بند ہو چکے تھے۔ ہم نے دستک دی تو ڈھلوں صاحب کا گن مین ڈتا باہر نکلا اور ہمیں پہچان کر بولا۔ "ہتکے بھئی — یہ آپ ہیں گویا — کیا حال ہیں آپ کے! اندر آ جائیں۔ برکت تو سو چکا ہے۔"

"اسے جگا دے یار! اور کہیں ہمارے ٹھہرنے کا بندوبست کر۔ بہت تھکے ہوئے ہیں ہم۔" میں نے اُس کے پیچھے اس اونچی لمبی ڈیوڑھی کے اندر قدم رکھ دیا۔ وہاں ڈھلوں صاحب کے کئی ملازم اِدھر اُدھر صفوں پر لیٹے ہوئے تھے۔

ڈتے نے اپنے ایک ساتھی کو نیند سے جگا دیا، بولا۔ "جا ذرا برکت کو بلا لا اِدھر۔ اِن کے لیے جگہ کا انتظام کرنا ہے۔"

"اِن کو تو میں جانتا ہوں، ڈھلوں صاحب کے دوست ہیں اِن کو لے جا کر مہمان خانے میں سلا دو۔ خود چلے جاؤ اِن کے ساتھ۔"

"اچھا بھئی ٹھیک ہے۔ آئیں جناب! میں آپ کو کمرے میں پہنچا دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ ہمارے ساتھ مہمان خانے کی طرف چل دیا۔

ابھی ہم برآمدے میں ہی تھے کہ میں نے ڈتے سے پوچھا۔ "ڈھلوں کا کیا حال ہے ڈتے؟ سنا ہے وہ کچھ بیمار تھے۔"

"آپ کو پتہ نہیں ہے؟ ڈھلوں صاحب کا کچھ اتا پتہ نہیں مل رہا ہے، بدری بھی اُن کے ساتھ غائب ہے۔ اُن کو کسی نے ہسپتال سے اغوا کر لیا تھا۔"

"نہیں یار! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" اس خبر کو سُن کر میرا وجود تھرتھرا اُٹھا۔ دشمنوں کا وار آخر چل ہی گیا تھا۔ وہ ڈھلوں صاحب کو اُن کی تمام تر اونگزیبی سمیت اٹھا کر لے گئے تھے۔ شاید رحمت علی کے وارث اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ انہیں بھی تو معلوم ہو گا کہ ڈھلوں صاحب رحمت علی کے خلاف کیا کچھ کرتے رہے ہیں۔

"مجھے افسوس ہے خان جی! پندرہ دن ہو گئے ہیں ڈھلوں صاحب کا کوئی پتہ نہیں چل سکا ہے۔"

"اور اِدھر وہ ولایت علی بندھا پڑا تھا۔ اُس کا منیجر تاجور اور رشید بھی یہاں ہی تھے۔"

"اُن کا تو مجھے کچھ علم نہیں ہے، اب سارا انتظام بیگم صاحب کے ہاتھ میں ہے۔"

"اندر آ جا یار! اطمینان سے بات کرتے ہیں۔ یہ تو بہت ہی بُری خبر سُنائی ہے تم نے۔" میں اُسے کھینچ کر مہمان خانے کے اندر لے گیا۔ اُسے کرسی پر بٹھا کر میں نے تفصیل پوچھی تو وہ بولا۔ "مجھ میں نہیں آیا ہے خان جی! کہ ہوا کیا ہے۔ وہ ہسپتال میں تھے۔ اُن کے سینے میں گولی لگی تھی اور اِن دنوں وہ مکمل طور پر صحت یاب ہو چکے تھے۔ ہسپتال سے انہیں ایک دو دن میں چھٹی ملنے والی تھی کہ ایک صبح خبر ملی کہ جس کمرے میں وہ ٹھہرے تھے، وہ خالی ڈھنڈار پڑا ہے۔ بدری اُن کے ساتھ ہی ہوتا تھا۔ وہ بھی غائب تھا۔ ہماری تو باؤ بھڑک گئی، پاگل ہو گئے ہم۔ پولیس کو اطلاع دی گئی مگر وہ بھی کچھ نہ کر سکے۔ آج پھر ڈی ایس پی ڈوگر صاحب یہاں آئے ہوئے تھے۔ اُن کی بھی کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ وہ رحمت علی سوہدرہ میں مارا گیا تھا نا! پولیس کا خیال ہے کہ شاید یہ کام اس کے لواحقین نے کیا ہو گا۔ مگر یہ کام! اُن کا معلوم نہیں ہوتا۔"

"برکت کو جگا دے ذرا۔ مجھے اس سے کچھ پوچھنا ہے۔" جا! اُسے ... میں نے اسکو وہاں سے واپس بھیج دیا۔

آبی ہماری باتیں بڑے غور سے سُن رہا تھا، بولا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے یار! وہ بدری بھی بھروسے کا آدمی تھا کہ نہیں۔ اُس کا نقشہ تم نے کھینچا ہے، اس سے تو میں بھی سہم گیا تھا، ایسے آدمی کو یہاں نوکری کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"ہو سکتا ہے یہ کام اُسی نے کیا ہو۔ وہ بدمعاش اس بات پر بضد تھا کہ میں کراچی چلا جاؤں۔ میں سمجھا وہ اپنی کارگزاری دکھانا چاہتا ہے مگر یہ پتہ نہیں تھا کہ اندر سے اتنا گہرا آدمی ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ یہ کام اسی نے کیا ہے مگر اس سالے کا اتا پتا بھی تو معلوم نہیں ہو گا تمہیں۔"

"جس آدمی کا حوالہ اس نے دیا تھا، میں اس تک پہنچ سکتا ہوں۔"

"ہاں پتہ کرنا چاہیے۔ کوئی یُوں آدمی کو غائب کر دے تو ہر طرف صفِ ماتم بچھ جاتی ہے۔ بیگم صاحبہ بھی سخت پریشان ہوں گی۔"

"وہاں رونا تو یہی ہے۔ میں اب کس سے پتہ کروں؟ برکت آئے تو میں اس سے پوچھتا ہوں۔"

چند ہی منٹ بعد برکت ہمارے کمرے میں آ گیا۔ وہ گہری نیند میں تھا۔ جھولتا جھلاتا اندر آیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ "کیا حال ہے خان جی؟" ڈتا اس کے ساتھ نہیں آیا تھا۔

"میں تو ٹھیک ہوں یار! مگر یہ کیا خبر سُن رہا ہوں میں؟ ڈھلوں کو کہاں بھیج دیا ہے تم نے؟"

"میں تو خود حیران ہوں خان جی! اتنا بڑا آدمی اور یُوں کتوں کے ہاتھ آ جائے۔ پولیس بھی اب تک کچھ نہیں کر سکی ہے۔"

"تمہیں معلوم ہے وہ ولایت علی بھی یہاں ہی تھا، اس کا کیا بنا؟"

"وہ تو اِدھر ہی ہے، اُن کے بارے میں ہم سے کسی نے نہیں پُوچھا۔ بھنگ پی پی کر اُن کا تو بُرا حال ہو گیا ہے۔"

"چلو ذرا مجھے اُن سے ملوا دو۔ حالات یُوں خراب ہو جائیں گے، میں تو اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔"

"چلیں، میں آپ کو اُن سے ملوا دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اپنی بندوق سنبھالتے ہوئے اٹھا اور ہمیں ساتھ لے کر حویلی کے عقبی حصے کی طرف چل دیا۔ ڈھلوں صاحب کے اس تہہ خانے کا راستہ اُسے اچھی طرح معلوم تھا۔ وہ ہمیں بڑی دیوار کے ساتھ ساتھ چلاتا ہُوا آگے بڑھا۔ تھوڑی دیر بعد ہم تہہ خانے کے دروازے پر جا پہنچے۔ چابی اس کے ہاتھ میں تھی۔ بتی جلا کر بولا۔ "ان کو ہم نے زنجیر ڈال دی تھی۔ کھانا اُن کو میں ہی پہنچاتا ہوں۔ حویلی میں بدری کے اور میرے سوا کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ لوگ اِدھر بند ہیں۔ ایک جمعدار اہستہ یہاں روزانہ آتا ہے۔"

تالا کھول کر اس نے تہہ خانے کی بتی جلائی تو ہمیں اس کے اندر بنے ایک آہنی پنجرے ایسے کمرے میں وہ تین آدمی نظر آئے مگر وہ آدمی کا بس ہیولا ہی نظر آتے تھے۔ اُن کے کپڑے میلے چیکٹ ہو رہے تھے بال اُلجھے ہوئے، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں، جسم اُن کے ڈھانچے بن چکے تھے۔ اِن چند دنوں میں ان کی کایا ہی پلٹ چکی تھی۔ ولایت علی تو بالکل ہی مسمار ہو چکا تھا۔ واقعی بھنگ کے نشے نے ان کو اور زیادہ پاگل کر رکھا تھا اور برکت انہیں صبح، دوپہر، شام ایک ایک پیالہ گھول کر زبردستی پلاتا تھا۔

جب ہم اندر پہنچے تو اُن کے جسموں سے عجیب سی بدبُو اٹھ رہی تھی۔ انہیں نہانے کی سخت ضرورت تھی مگر اس کا وہاں کوئی بندوبست نہیں تھا۔

"اِن کو چھوڑ دو برکت! ورنہ یہ مر جائیں گے۔" آبی نے اُن کی حالت پر افسوس کرتے ہوئے کہا۔

"یہ تو ڈھلوں صاحب کا حکم ہے جناب! اِن کو وہی آ کر چھوڑ سکتے ہیں۔"

"نہیں، یہ اچھی بات نہیں ہے۔ یہ تو ہمیں کیا، کسی کو بھی پہچان نہیں پاتے۔ بھنگ نے ان کا بُرا حال کر رکھا ہے۔"

"یہ بھی ڈھلوں صاحب کا حکم ہے، آپ تو اس دن ساتھ ہی تھے۔"

"اِن کو چھوڑ دو برکت! یہ میری وجہ سے اس مصیبت میں پڑے ہیں۔ انہیں کئی دن ہسپتال میں رہنا پڑے گا تب جا کر کہیں یہ تندرست ہوں گے۔"

"میں انہیں چھوڑ تو نہیں سکتا البتہ اِن کا کھانا درست کر کے ان کو بھنگ پلانی بند کر دیتا ہوں۔ نئے کپڑے لا کر میں اِن کو نہلا دُھلا کر پہنا دیتا ہوں۔"

"ہاں اتنا تو ضرور ہی کر دو۔ ورنہ تو بے موت مارے جائیں گے۔"

"بس ٹھیک ہے۔ صبح سے میں اِن کا نیا انتظام کر دوں گا۔ آپ بے فکر رہیں۔"

"یہی بہت ہے برکت! آدمی کو اتنی ہی سزا دو جتنی وہ برداشت کر سکے۔"

"ڈھلوں صاحب ایسے لوگوں کو بعد میں ایک دوا بھی دیا کرتے تھے۔ وہ بھی انہیں لا دُوں گا۔ میرے پاس گولیاں موجود ہیں۔"

"ہاں وہ بھی انہیں کھلا دو۔ یہ ہمارے دشمن تو ہیں مگر اتنے ذلیل بھی نہیں ہیں۔ اِن کو آدمی کے جامے میں تو رہنے دو۔ اس جمعدار کا کیا نام ہے؟"

"نیامت۔ وہی ان کا بندوبست کرے گا۔ نائی بھی یہاں موجود ہے۔" برکت نے اپنی ناک پر کپڑا رکھتے ہوئے کہا۔ اسے بھی وہ بدبُو بہت ہی پریشان کر گئی تھی۔ ہم فوراً ہی وہاں سے باہر نکل آئے۔ آدمی کا درجہ اتنا بھی گرا نہیں دینا چاہیے کہ وہ پیشِ نظر

آنے لگے۔"

ہم پھر مہمان خانے میں آ گئے۔ حویلی کا وہ ماحول مجھے بے حد افسردہ اور ویران نظر آتا تھا۔ مالک گھر پر نہیں تھا تو وہاں کی ہر شے اُجڑی اُجڑی نظر آتی تھی۔ برکت کو ہم نے اسی وقت واپس کر دیا۔ اور خود بستر پر لیٹ گئے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ ہُوا کیا ہے۔ کس لُٹیرے نے ڈھلوں صاحب کو کاٹ لیا تھا اور وہ کس غار میں جا دفن ہوئے تھے۔

صبح اُٹھ کر ہم نے برکت کو خدا حافظ کہا اور ڈھلوں صاحب کی حویلی سے باہر نکل آئے۔ ہمیں معلوم ہونا چاہیے تھا کہ انہیں ہسپتال سے کس نے اغوا کر لیا ہے۔ وہ ہمارے محسن تھے اور میرا دل یہ کہتا تھا کہ اُن پر کسی ہمارے ہی دشمن نے حملہ کیا تھا مگر وہ تھا کون؟ یہ سوال ہمیں حیران کرتا تھا۔ ایک خیال یہ تھا کہ ہو سکتا بدری ہمارے امرتسری دوستوں کا بھیجا ہوا آدمی ہو اور موقع ملتے ہی ڈھلوں صاحب کو لے اُڑا ہو مگر اس کا کوئی ثبوت ہمارے پاس نہیں تھا۔

گڑھ سے نکل کر ہم بڑی سڑک پر پہنچے اور بس میں بیٹھ کر سیدھے لاہور جا پہنچے۔ سب سے پہلے ہم نے اپنے لیے نیا لباس خریدا۔ تین تین جوڑے قمیص شلوار کے اور ضرورت کی کچھ اور چیزیں لے کر ہم انارکلی سے نکلے اور شاہ عالمی دروازے کے اندر ایک ہوٹل میں جا ٹھہرے۔ قدم قدم پر ہمیں زبردست احتیاط کی ضرورت تھی۔ ہمیں معلوم تھا کہ وہاں ہمارا ہمدرد کوئی نہیں ہے۔ موقع ملتے ہی پولیس ہمیں بڑے گھر پہنچا دے گی۔ آبی نے راستے میں سے اخبار خرید لیا تھا۔ وہ ہم نے ہوٹل کے کمرے میں بند ہو کر کھولا تو اُس میں بس کے لُٹنے کا قصّہ شہ سرخیوں میں درج تھا۔ پولیس کا خیال تھا کہ ڈاکوؤں نے ان دونوں آدمیوں کی مزاحمت پر انہیں قتل کر دیا تھا۔ پھر وہ سواریوں سے نقد رقم لے کر بس سے اُتر گئے۔ ڈرائیور اور کنڈیکٹر کی بھی تصویریں چھپی تھیں۔ کنڈیکٹر کے دونوں پاؤں پر پٹیاں بندھی تھیں۔ ڈاکٹر نے گولیاں نکال دی تھیں اور وہ بڑی مسکین صورت بنائے کیمرے کے سامنے گیا تھا۔ ڈرائیور ہمیں دیکھ کر بس سے اُتر گیا تھا مگر اس کی بہت تعریف کی گئی تھی کہ اس نے ڈاکوؤں سے زبردست مقابلہ کیا تھا۔ حالانکہ اس کی میّا ہی مر گئی تھی۔ عبدالغنی اور اختر کے بارے میں انھیں فوری طور پر تو کچھ معلوم نہیں ہو سکا تھا مگر بس کے اندر ہی کوئی آدمی بیٹھا تھا اور وہ انھیں جانتا تھا۔ اُس نے ہی ان کی اندوہناک موت پر روشنی ڈالی تھی اور وہ روشنی کچھ اتنی تیز تھی کہ ہم بھی چندھیا گئے۔ اس نے کہنا تھا کہ اُن دونوں نے ڈاکوؤں کو پکڑنے کے لیے پستول نکال لیے تھے مگر انھیں گولی چلانے کا موقع ہی نہ مل سکا اور وہ موت کے منہ میں چلے گئے۔ آبی نے خبر پڑھ کر اخبار الگ پھینک دیا، بولا "یہ اچھا ہے کہ انھوں نے بس کے لُٹنے کی خبر دی ہے کسی کو ان کے قتلِ عمد کا علم نہیں ہے اور ہم یہی چاہتے تھے۔"

"ہاں لعنت بھیج اس خبر پر۔ کھانا کھا کر ابھی ہسپتال چلتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ ڈھلوں صاحب پر کس نے حملہ کیا تھا۔"

"ہمیں وہاں نہیں جانا ہے جیلانی! پولیس بھی وہاں موجود ہو گی۔ اگرچہ اس واقعہ کو بہت دن گزر چکے ہیں مگر وہ لوگ ابھی تک بُو سونگھ رہے ہوں گے۔"

"تو پھر کیا کریں ہم؟ ڈھلوں صاحب تک پہنچنا تو بہت ضروری ہے آبی!"

"تو چل پھر وہاں تک ہو ہی آتے ہیں۔ یہ ساری رقم ایک ہی بریف کیس میں بند کر کے بینک میں رکھ دے۔ اس کو ساتھ لے کر جانا اچھا نہیں ہو گا۔"

"ٹھیک ہے۔ تم پچاس ہزار روپے اپنے پاس رکھ لو۔" میں نے دونوں بریف کیس کھول کر رقم ایک میں بند کی اور پھر ناشتہ کر کے ہم ہوٹل سے باہر نکل آئے۔ کمرہ ہم نے دو دن کے لیے مخصوص کرا لیا تھا۔ اور ہمیں اُمید تھی کہ ہم وہاں ضرور واپس آئیں گے۔ ہوٹل سے نکل کر ہم بینک پہنچے اور فالتو رقم میں نے اپنے حساب میں جمع کروا دی۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ اگر کسی وقت ہم کسی جھنجھٹ میں پھنس جائیں تو ہماری رقم سیدھی پولیس کی جیب میں چلی جائے۔

ہسپتال کا وہ کمرہ مجھے یاد تھا جس میں ڈھلوں صاحب کو رکھا گیا تھا۔ جب ہم وہاں پہنچے تو یہ احساس مجھے بری طرح ڈس رہا تھا کہ ہم جان بوجھ کر پولیس کی نظر میں آ گئے ہیں۔ وہ لوگ سفید کپڑوں میں وہاں موجود تھے۔

"آبی! میرا خیال ہے ہم نے یہاں آ کر سخت غلطی کی ہے۔" میں نے ایک جگہ رُک کر گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ تیرا ابھی حلیہ بہت بدل چکا ہے اور میں تو گنتی ہی میں نہیں ہوں میرا خیال ہے کسی جمعدار سے بات کر۔ جو اُن کے کمرے کی صفائی کیا کرتا تھا۔"

"ہاں! یہ بہتر رہے گا۔ اگر کوئی ڈاکٹر ہمارا یار بن جائے معاملہ زیادہ آسان ہو سکتا ہے۔"

عین اس وقت ایک نٹ کھسٹ نرس آبی کے سامنے گزری۔ اس کی بوٹی بوٹی پھڑک رہی تھی۔ اس کی رفتار کچھ دلفریب تھی کہ آبی بس اس کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ ابھی وہ چند قدم دُور گئی ہو گی کہ آبی تیزی سے اس کے پیچھے لپکا اور بولا "

پلیز! آپ کچھ ہماری مدد کر سکتی ہیں؟"

وہ رُکی اور دواؤں کا ٹرے ہاتھوں میں سنبھالتی ہوئی بولی۔

"جی فرمائیے۔ کیا حکم ہے؟"

"بات یہ ہے سسٹر! کہ ہمارے ایک عزیز یہاں داخل تھے ڈھلوں صاحب۔ وہ میرے انکل ہیں مگر اُن کا کمرہ نہیں مل رہا ہے۔ ہم کراچی سے آئے ہیں۔ بڑی دیر بعد ہمیں کل ہی پتہ چلا کہ وہ یہاں داخل ہیں۔"

"ڈھلوں صاحب! ارے آپ کو پتہ نہیں ہے کیا۔ اُن کے ساتھ تو بڑا اسکینڈل ہو گیا۔ انہیں اغوا کر لیا گیا ہے۔"

"ارے نہیں! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ پلیز ہمیں کچھ تفصیل سے بتائیں کہ ہوا کیا ہے؟"

"میرے کمرے میں آ جائیں۔ جو کچھ مجھے معلوم ہے وہ میں آپ کو بتا دوں گی۔"

"بڑی مہربانی ہے آپ کی چلیں ہم آپ کے ساتھ چلتے ہیں۔ سونا میں آف بو۔ آ جائیں خان صاحب! ان کے کمرے میں چلتے ہیں۔"

وہ بل کھا کر آگے بڑھی اور دو رویہ بنے کمروں کے آخر میں پہنچ کر وہ ایک دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ وہ اسی کا کمرہ تھا۔ بولی "بیٹھیں جناب! ویسے یہ بیان میں بار بار پولیس کو دے چکی ہوں مگر چونکہ وہ آپ کے انکل تھے اس لیے میرا فرض ہے کہ میں ساری بات آپ کو بھی بتا دوں۔"

ہم اس کے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ درمیان میں اس کی دواؤں سے اَٹی میز پڑی تھی۔

"اِف یو ڈونٹ مائنڈ؟" اُس نے میز کی دراز میں سے سگریٹ نکال لیا "یہ اچھی بات تو نہیں، بس عادت پڑ گئی ہے۔"

"کوئی بات نہیں، ہم بھی فرق نہیں کرتے بلکہ دو سگریٹ سُلگا کر پی لیتے ہیں۔" آبی نے اپنی جیب سے دو سگریٹ نکال لیے اور انہیں دیا سلائی دکھا کر ایک مجھے تھماتے ہوئے بولا "آپ کے ہم شکر گزار ہیں کہ آپ نے ہم پر اتنی توجہ دی۔"

"نہیں! یہ میرا فرض تھا۔ کیا نام ہے آپ کا؟"

"جی مجھے ایس جی ایم پیرزادہ کہتے ہیں اور یہ ہاشم خان ہیں۔ ہم ایک عرصے سے کراچی میں رہ رہے ہیں۔ کل ہی پتہ چلا کہ وہ یہاں داخل ہیں۔ ہوائی جہاز میں بیٹھ کر یہاں آ گئے مگر آپ کچھ اور ہی بتا رہی ہیں۔"

"جی ہاں! یہ بہت بُرا ہوا ہے صاحب! ڈھلوں صاحب کا یُوں غائب ہو جانا ہمارے لیے بھی مصیبت بن گیا تھا۔ وہ بیمار تھے کسی نے انھیں گولی مار دی تھی۔ علاج تو ان کا ٹھیک ہو رہا تھا۔ اور وہ صحتیاب بھی ہو چکے تھے مگر پھر ایک صبح پتہ چلا کہ وہ ہسپتال ہی میں نہیں ہیں۔"

"سب سے پہلے یہ خبر آپ کو معلوم ہوئی ہو گی؟"

"نہیں! ہسپتال کے جمعدار سموئیل نے یہ خبر دی تھی۔ وہ صبح صبح اُن کے کمرے میں جاتا تھا۔ اس نے دیکھا کہ ان کا بستر اُدھڑا ہوا تھا، چادر کہیں تھی اور فوم کا گدا زمین پر پڑا تھا۔ لگتا تھا کمرے میں بڑی دھینگا مشتی ہوئی ہے۔ دوائیں بھی اُلٹی پڑی تھیں۔ اور اُن کی تمام چیزیں وہاں سے غائب تھیں۔ جب اس نے مجھے یہ خبر سُنائی تو میں سیدھی اُن کے کمرے میں جا پہنچی۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ کمرے کی حالت بہت ہی ابتر تھی۔ اور اُن کا ملازم بدری بھی وہاں نہیں تھا۔ اُن کی کار بھی موجود نہیں تھی۔ حالانکہ وہ کار ان کا ملازم برکی چلایا کرتا تھا۔ ڈھلوں صاحب کے ساتھ برکی بھی غائب تھا اور بدری بھی۔"

"اچھا! اُن کا ڈرائیور برکی بھی غائب ہے؟ یہ تو اور بھی بُرا ہوا۔"

"ہاں! میں نے ڈاکٹر کو اطلاع دی۔ پولیس آ گئی۔ بہت چھان بین ہوئی مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ اسی دن مجھے کمرے کی صفائی کرنے والا دوسرا جمعدار وکٹر ملا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ برآمدے کی صفائی میں مصروف تھا کہ اسے وہاں سے رات ایک بجے دو آدمی ڈھلوں صاحب کو ساتھ لے کر کمرے سے باہر آتے نظر آئے۔ ڈھلوں صاحب بے ہوش ہو رہے تھے اور اُن لوگوں نے انھیں اسٹریچر پر ڈال رکھا تھا۔ وہ سمجھا کہ اُن کی حالت اچانک بگڑ گئی ہو گی۔ اس لیے اس نے کچھ خیال نہیں کیا۔ اسے کیا پتہ تھا کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ وہ دونوں آدمی ڈھلوں صاحب کو لے کر آپریشن تھیٹر کی طرف نکلے اور پھر اسے نہیں معلوم کہ وہ کہاں گئے۔"

"جمعدار وکٹر نے تو اُن آدمیوں کو اچھی طرح دیکھا ہو گا؟"

"ہاں! مگر اُن کی شکلیں اسے یاد نہیں ہیں۔ ہسپتال میں وردی والے تمام لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں، اُن میں سے کسی کو پہچان لینا مشکل ہی ہوتا ہے۔ بس وہ مرد آرڈرلی تھے۔ وکٹر سمجھا کہ ہسپتال ہی کے لوگ ہیں۔ مگر آپریشن تھیٹر کو جو راستہ جاتا ہے وہی باہر بھی نکلتا ہے۔ وہ ڈھلوں صاحب کو لے کر سیدھے کار تک پہنچے اور وہیں سے انھیں باہر لے گئے۔"

"وہ لوگ اسٹریچر لے کر واپس تو آئے ہوں گے؟"

"نہیں! یہ بات وکٹر کو نہیں معلوم ہو سکی مگر اس کا اب یہ خیال ہے کہ اُن میں سے ایک آدمی بدری کے سوا اور کوئی نہیں تھا اور دُوسرا آدمی اس کا خیال ہے کہ اسی ہسپتال کا ملازم ہے۔"

"اس کو نہیں پہچان سکا ہے وہ؟"

"نہیں! اس بارے میں وہ بالکل خاموش ہے۔ میں نے اس سے بار بار پوچھا ہے مگر وہ کچھ نہیں کہتا ہے۔ اس نے بعد میں کہہ دیا کہ ہو سکتا ہے وہ اس کا وہم ہو۔ کسی خاص آدمی کی نشاندہی وہ نہیں کر سکا ہے۔ ڈھیلا سا آدمی ہے اس کی کسی بات کا اعتبار بھی نہیں کیا جا سکتا۔"

"اب کہاں ہوگا وہ؟"

"وہ شام کو یہاں آئے گا۔ اس کی ڈیوٹی رات کو ہوتی ہے۔ میں نے آپ کو چائے بھی نہیں پوچھی ہے۔ آئی ایم سوری۔ کینٹین سے منگوا لیتی ہوں۔"

"جی نہیں آپ کا بہت بہت شکریہ سسٹر! یہی آپ کا کیا کم احسان ہے کہ ہمیں اتنی تفصیل سے آپ نے سب کچھ بتا دیا۔ کیا اسمِ گرامی ہے آپ کا؟"

"میرا نام اشرفی ہے۔ عجیب سا نام ہے مگر ہے تو کیا کیا جا سکتا ہے۔"

"آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے ہمیں۔ سچی پوچھیں تو میں آپ کو دیکھتے ہی آپ کا گرویدہ ہو گیا تھا۔ اسی لیے اتنی جرأت سے میں نے آپ کو بلا بھی لیا۔ آپ نے برا تو نہیں مانا؟" آبی نے اسے شیشے میں اتارنے کی کوشش کی۔ وہ بلاشبہ بڑی حسین لڑکی تھی۔ اگر اس کا رنگ ذرا سانولا نہ ہوتا تو وہ قیامت مچا دیتی۔

"جی نہیں! اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے۔ میں ایسی چھوٹی موٹی لڑکی نہیں ہوں کہ مردوں سے خواہ مخواہ ڈروں۔ عورتیں تو دیکھیں نا، ذرا دیکھنے دکھانے کی چیزیں ہوتی ہیں۔ جس کو کوئی نہیں دیکھتا اس کو موت دیکھ لیتی ہے۔ ہے نا یہی بات؟"

"جی بالکل ٹھیک کہا ہے آپ نے۔ عورتوں کو ہم نہ دیکھیں، تو پھر اور کون دیکھے گا اور جو آپ ایسا حسین چہرہ لیے ہو تو اس کو نہ دیکھنا تو گناہ ہے۔ میرا خیال ہے آپ چائے منگوا ہی لیں۔ پیسے ہم دیں گے۔" آبی نے بلا تکلف اپنا بریف کیس اس کے سامنے کھول دیا۔ اس میں ڈھیر سارے نوٹ دیکھ کر وہ دنگ رہ گئی۔

"ارے باپ رے! اتنے نوٹ لیے پھرتے ہیں آپ؟"

"ایسے ہی کسی جگہ ضرورت پڑ سکتی ہے مس اشرفی! ہم سفر میں ہیں نا۔" یہ کہہ کر آبی نے پچاس کا نوٹ الگ رکھ دیا، بولا۔ "کسی سے کہیں وہ کچھ پھل اور چائے لے آئے۔ ہم نے خرچ لیے یا آپ نے، بات ایک ہی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے بریف کیس بند کر دیا۔

اشرفی نوٹ اٹھا کر اسی وقت باہر نکل گئی اور جب وہ چند لمحوں بعد واپس آئی تو بولی۔ "میں نے کارٹر کو بھیج دیا ہے۔ وہ ابھی چائے لے آئے گا۔"

"آپ کا کیا خیال ہے وکٹر سے پولیس نے کچھ نہیں پوچھا؟"

"نہیں! میں نے کہا ہے نا کہ پھڈے کا آدمی نہیں ہے وہ —— افیون بھی کھاتا ہے اور دماغ اس کا ویسے ہی آؤٹ رہتا ہے۔ مجھ سے البتہ وہ ساری باتیں کہہ لیتا ہے۔ میں اس کو پانچ دس روپے دیتی ہی رہتی ہوں۔ میرا کام وہ خوشی سے کر دیتا ہے۔"

"ہم اس سے ضرور ملیں گے۔ وہ رہتا کہاں ہے؟"

"ہسپتال کے پیچھے اسے کوارٹر ملا ہوا ہے وہیں رہتا ہے وہ۔ ایک اس کی بہن ہے، وہ بھی کسی کوٹھی میں کام کرتی ہے۔"

"چائے پی کر ہم وہیں نہ جا ملیں اس سے؟"

"ہاں یہ بھی ہو سکتا ہے، آپ اس سے ضرور مل لیں۔" مگر... "مگر خیر، آپ میرا نام بھی اسے بتا دیں۔ یہ بڑا اہم معاملہ ہے۔"

"ہاں، یہ تو ٹھیک کہا آپ نے۔ حیرت مجھے یہ ہے کہ پولیس نے اس کو شاملِ تفتیش کیوں نہیں کیا؟" آبی نے اس کے سامنے ایک اور سگریٹ سلگا لیا۔

"نہیں، بیان تو اس کا لیا تھا ان لوگوں نے مگر اس پر انھوں نے زیادہ دھیان نہیں دیا۔ ہو سکتا ہے وہ آپ کو کوئی اہم بات بتا دے۔"

اتنے میں چائے آ گئی۔ کچھ بیکری کا سامان بھی موجود تھا۔ ہم نے اشرفی کے ساتھ بیٹھ کر وہ چائے پی اور وکٹر کا پتہ لے کر ہم اسی وقت باہر نکل آئے۔ یونائیٹڈ کرسچین ہسپتال اپنے وجود میں ایک دنیا سموئے ہوئے ہے۔ ہم اس کی مختلف روشوں پر ہوتے ہوئے عقبی حصے میں جا پہنچے۔ وکٹر سات نمبر کوارٹر میں رہتا تھا۔ پتہ ہمیں اشرفی نے صحیح بتایا تھا۔ جب ہم نے اس کے دروازے پر دستک دی، تو وہ اندر ہی موجود تھا۔ دوسری دستک پر وہ باہر نکل آیا۔ روشنی میں اس کی آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔ بڑی بڑی غلافی آنکھیں اس نے میچ رکھی تھیں۔ سانولے رنگ کا تیس بتیس سال کا آدمی افیون کے پیچ میں پڑ کر اپنی عمر سے کہیں زیادہ کا نظر آتا تھا۔ ہمیں دیکھ کر بولا۔ "کیا بات ہے بھائی جی؟"

"یار! ہمیں مس اشرفی نے آپ کی طرف بھیجا ہے، ایک ضروری کام تھا آپ سے۔ اگر اجازت دیں تو ہم اندر آ جائیں۔"

اس نے قدرے توقف کیا اور پھر دروازہ چھوڑ کر الگ ہو گیا۔ ہم اندر پہنچے تو اس نے کنڈی چڑھا دی۔ ایک کمرے کا کوارٹر ہمارے سامنے کھلا پڑا تھا۔ اندر یونہی بے ہنگم سا سامان ادھر ادھر بکھرا ہوا تھا۔ کمرے میں دو چارپائیاں پڑی تھیں۔ غسل خانہ اور باورچی خانہ صحن کے ایک کونے میں تھا۔ کوارٹر صاف ستھرا تھا مگر اس کو وہ صاف نہیں رکھتے تھے۔ اندر جا کر ہم ایک ہی چارپائی پر بیٹھ گئے۔

وکٹر اندر آ کر دروازے میں رک گیا، بولا۔ "خیر تو ہے نا؟ میں نے آپ کو پہلی بار دیکھا ہے۔"

"ہاں ہاں خیر ہی ہے بھائی! تم کس سوچ میں پڑ گئے! آؤ ادھر آ جاؤ۔ ہمیں تم سے ایک بہت ضروری بات پوچھنی ہے۔"

وہ اندر آ کر سامنے کی چارپائی پر بیٹھ گیا اور ایک گھٹیا قسم کا سگریٹ سلگا کر دھوئیں کے مرغولے بنانے لگا۔

"تو بات کریں نا، کیا کام ہے آپ کو مجھ سے؟" اس ک

تلخ ہو گیا تھا۔ اسے ہماری وہ بے جا مداخلت پسند نہیں تھی۔ کسی بھی اجنبی کو کوئی آدمی بلا وجہ اپنے گھر میں بٹھلانے پر رضامند نہیں ہوتا۔ وہ بھی ایسا ہی تھا اور اس وقت نشے کی پینک میں تھا۔ اسے ایسے وقت میں ہم سے بات کرتے سخت کوفت محسوس ہو رہی تھی۔ آنکھیں اس کی میچی جا رہی تھیں۔ وہ بار بار جماہیاں لے رہا تھا۔

"بات یہ ہے وکٹر! کہ جس رات ڈھلوں صاحب ہسپتال سے اغوا ہوئے تم اس وقت برآمدے میں جھاڑو دے رہے تھے۔ یہی بات ہے نا؟"

آبی کی یہ بات سن کر اس کی آنکھیں ایک دم کھلنے لگیں۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ "جی جی۔۔۔ آگے فرمائیے۔"

"اور ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ وہ دو آدمی کون تھے، جنھوں نے اسٹریچر اٹھا رکھا تھا؟"

"میں پولیس کو بھی بتا چکا ہوں۔ ایک تو ان کا اپنا ملازم بدری تھا مگر دوسرے کے بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اسے میں نے پہلی بار دیکھا تھا اور میں اسے دیکھ کر دوبارہ پہچان نہیں سکتا ہوں۔"

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی وکٹر! تم اتنے سمجھدار آدمی ہو۔ ہسپتال سے ایک آدمی اغوا ہو گیا ہے، اس کا پتہ نہیں چل رہا۔ تمھیں اگر کچھ معلوم ہے تو ہمیں بتا دو۔ ڈھلوں صاحب ہمارے انکل ہیں، پھر ان کے بارے میں ہماری تشویش بالکل فطری بات ہے۔"

"میں سمجھتا ہوں جناب! مگر میں کیا کر سکتا ہوں۔ مجھے تو اس سے زیادہ کچھ بھی علم نہیں ہے۔" وہ صاف ستھرے لہجے میں پڑھے لکھے لوگوں کی طرح بات کرتا تھا۔ ہمیں اس نے لاجواب کر دیا۔ مگر ہم یہاں اس کے ہاتھوں ذلیل ہونے کے لیے تو نہیں گئے تھے۔

"ہم جانتے ہیں وکٹر! تم اکثر نشے میں رہتے ہو۔ تمھاری یادداشت بھی کمزور ہو گئی ہو گی، مگر ہماری مدد کرو دوست! یہ معاملہ یوں ہی نہیں پھینکا جا سکتا ہے۔" میں اٹھ کر اس کے قریب جا بیٹھا۔ پائنتی کی طرف، مگر وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا اور ایک کرسی جھاڑ پونچھ کر اس نے میرے سامنے رکھ دی، بولا۔ "اس پر بیٹھیں جناب! جو کچھ مجھے معلوم تھا وہ میں آپ کو بتا چکا ہوں۔"

میں اٹھ کر کرسی پر جا بیٹھا۔ وہ اس سے آگے کی بات بتانے پر تیار نہیں تھا۔ آبی نے مجھے آنکھ ماری کہ میں بالکل خاموش رہوں، پھر وکٹر سے مخاطب ہو کر بولا۔ "یار! یہ کوارٹر تو بہت اچھا ملا ہے تمھیں مگر سامان تمھارے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔"

"کیا کروں جی! غریب آدمی ہوں۔ سامان کہاں سے آ سکتا ہے۔ تین سو روپے ملتی ہیں۔ نشے پانی پر ہی بہت خرچ آ جاتا ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے۔ کوئی اور بھی تمھارے ساتھ رہتا ہے یہاں؟"

"جی ہاں میری بہن ہے، سلومی۔ وہ بہت محنت مزدوری کرتی ہے۔ گلبرگ کی کسی کوٹھی میں جاتی ہے وہ۔"

"سو ڈیڑھ سو وہ بھی لے آتی ہو گی مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ وکٹر کو کچھ پیسے دے دیں خان جی! یہ بھی غریب آدمی ہے۔"

"ہاں ہاں دے دیں، ان کو پانچ سو روپے دے دیں۔ ان کی ضرورت پوری ہو جائے گی۔"

ہسپتال کے کوارٹر نمبر سات کی فضا بوجھل ہوتی جا رہی تھی۔ مس اشرفی نے ہمیں صحیح آدمی کا پتہ بتا دیا تھا مگر وہ ہماری سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ اس کی ابلہی تو شاید اس کے چہرے سے ہی عیاں تھی مگر پانچ سو روپے کی طرف وہ ہاتھ نہیں بڑھا رہا تھا۔ کسی بہت ہی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا وہ کارٹر مجھے ایسا الو کا پٹھا نظر آیا جس کا دروں کچھ تھا اور بروں کچھ۔

"لے لو بھائی! یار رکھ لو۔ ہمیں معلوم ہے تم ضرورت مند آدمی ہو۔" آبی نے ایک بار پھر بڑی رسان سے کہا اور خود اس کے پاس جا بیٹھا۔

"ہمیں بتاؤ کارٹر مسیح ولد لاولد مسیح کہ ہوا کیا تھا۔ تیرے نخرے ہم زیادہ دیر نہیں سہہ سکتے۔ ہٹاؤ یہ لوٹ، پیچھے ہٹاؤ یار! یہ اس طرح سیدھا نہیں ہوگا۔" آبی نے اپنا خنجر اس کی پسلی میں دھنساتے ہوئے کہا۔

"بتاؤ وہ دوسرا آدمی کون تھا جس نے ڈھلوں صاحب کو برآمدے میں سے گزارا تھا؟"

کارٹر کی آنکھیں مندنے لگیں۔ میرا خیال ہے کہ اسے اپنی موت کا یقین ہو گیا تھا۔ "یسوع مسیح میری مدد کر!"

"اوئے بک نئیں لئے! وہ تیرے جیسے چوہڑے کی کیا مدد کرے گا۔ تو لمبی رشوت لے کر منہ بند کر بیٹھا ہے مگر تیرا تو ہم ستیاناس مار دیں گے۔ یہ دروازہ بند کر دو۔ لارسی میں اس کو باندھ کر ماروں گا۔" آبی ایک دم طیش میں آ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ ایسوں سے کیسے نپٹا جاتا ہے مگر اس کا اندازہ غلط نکلا۔ کارٹر کچھ زیادہ ہی گھنا تھا۔ سالا ٹس سے مس نہیں ہو رہا تھا۔

"میری مدد کر یسوع مسیح! میں بے قصور ہوں۔" وہ پھر بڑبڑایا۔

"چل تیرے یسوع مسیح کو ہم بھی آواز دیتے ہیں۔ اے جیسس کرائسٹ اس کا ابھی بیڑہ غرق کر دے کیونکہ یہ جھوٹ بول رہا ہے۔" آبی نے اب کی بار اس کی پسلی چھیل کر رکھ دی۔ ایک لمبی لکیر دیکھتے دیکھتے سرخ ہونے لگی۔ اس نے کارٹر کو یاد دلایا تھا کہ خنجر آگے بھی دھنس سکتا ہے۔

زخم کو دیکھ کر کارٹر کے پران چھوٹ گئے، بولا ——

"میں بتاتا ہوں، ابھی بتاتا ہوں —— اوہ میرے خدایا! کتنے ظالم ہو تم! مجھے کس بات کی سزا دیتے ہو۔ وہ کمپاؤنڈر فیلڈن تھا

جس نے دوسرے آدمی کے ساتھ مل کر اس بیمار کو سہارا دے رکھا تھا؛ اتنی سی بات تھی جسے تم خواہ مخواہ ہی لو سٹوری بنا رہے تھے۔ فیلڈن کا نام لینے میں کیا حرج تھا بھلا۔ وہ تو اپن کا بھائی بند ہی نکلا، سالا فیلڈن۔" آبی نے خنجر نیفے میں اڑستے ہوئے کہا۔ پتہ نہیں وہ اس نے کہاں سے اُڑایا تھا۔ باورچی خانے کی چھری ایسا نظر آتا تھا مجھے۔

"تم اس کا نام کیوں نہیں تبلانے تھے؟" میں نے کارٹر کو پلنگ سے اٹھا کر اس کی پسلی کے زخم پر فرش کی مُٹھی بھری مٹی ڈالتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں! یہ نہ ڈالو۔ مجھے کیوں تباہ کرتے ہو۔ یہ تو زخم بڑھا دے گی۔ وہ پاؤڈر لے لو۔" اس نے فوراً ہی مٹی کو ہاتھ مار کر جھاڑ دیا۔ مگر اس کا کچھ حصہ تو وہاں لگ ہی چکا تھا۔

"کچھ نہیں ہوتا تجھے! یہ بڑی شافی مٹی ہے۔" میں نے اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا۔ کارٹر بالکل بونق نظر آ رہا تھا۔

"ہاں، اور یہ شخص ولی ہے جس نے یہ مٹی تجھے بخشی ہے۔" آبی نے اسے پھر سے پلنگ پر ڈال دیا۔ وہ بیچارا رُونہانسا ہو گیا۔ اس کی آنکھیں بہہ نکلی تھیں۔ اس کے ہاتھ سے راز بھی گیا اور اب پانچ سو روپیہ بھی نکلتے جا رہے تھے۔

"یہ لو، یہ پانچ سو روپے ہم پھر بھی تمہیں دے رہے ہیں۔ یہ رکھ لو۔ وہ فیلڈن کہاں ہوگا اب؟"

"وہ اندر کاؤنٹر پر بیٹھا ہوگا۔ مگر میرا نام آپ نہیں لیں گے۔ وہ مجھے نوکری سے نکال دے گا۔"

"کتنے پیسے دیے تھے اس نے تمہیں؟"

"کوئی بھی نہیں! ایک دن دوائیں اس نے مجھے ڈھیر ساری دے دی تھیں کہ میرے کام آئیں گی۔ وہ میں نے پینتیس روپے میں بیچ لیں اور بس!" اس نے ڈبّہ اٹھا کر پاؤڈر زخم پر ڈالتے ہوئے کہا۔ ایسے ہی لکیر سی کھنچ گئی تھی اس کی جلد پر مگر وہ سمجھ رہا تھا کہ بس اس کا دم آخر آ گیا ہے اور اب اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں رہی ہے۔ بار بار وہ یسوع مسیح کو یاد کر رہا تھا۔ جیسے وہ اس کے لیے بار بار آسمان سے اتر کر نیچے آتے رہیں گے۔

آبی نے مجھے باہر نکلنے کا اشارہ کیا اور بولا "دیکھ اوئے چھنکنے! تم ابھی ادھر ہی رہو۔ اگر فیلڈن کو تم نے بتا دیا تو وہ بدک جائے گا، سمجھا کہ نہیں۔"

"میں سمجھ گیا ہوں جناب! بالکل سمجھ گیا ہوں۔ یہ نقد مال اس بات کا گواہ ہے۔" اس نے بائیں ہاتھ میں دبی رقم اونچی کر کے کہا۔

ہم دونوں وہاں سے باہر نکل آئے۔ آبی کا خیال تھا کہ ہم نے رقم خواہ مخواہ ضائع کر دی ہے۔ اس کی بھلا ضرورت ہی کیا تھی؟

"نہیں یار! غریب آدمی ہے اس کو کچھ انعام تو دینا ہی چاہیے تھا۔ مگر مجھے تو ڈھلوں صاحب کے ساتھ کسی لمبے گھپلے کا اندیشہ ہے آبی! یہ کسی ایک آدمی کا کام نہیں ہے۔ خدا ہی خیر کرے۔ ہمارے لیے اس نے بڑی جان قربان کی ہے۔"

"ہاں! لگتا تو مجھے بھی یہی ہے۔ پتہ نہیں اب وہ فیلڈن کیا بکواس کرے۔ خدا ہی خیر کرے۔"

"آؤ دیکھتے ہیں کہ وہ کیا کہتا ہے۔ اس سے ذرا سوچ سمجھ کر بات کرنی ہوگی۔"

"اوئے لعنت بھیج ایسی سوچ پر۔ اس نے خواہ مخواہ ہمارے لیے مصیبت پیدا کر دی ہے۔ ڈھلوں بیچارے کا کیا قصور ہے۔ وہ ہم سے بات کرتا تو ہم اس کو جواب بھی دیتے۔" آبی کے قدم تیز ہو گئے۔ ہم ایک بار پھر ہسپتال کی بڑی عمارت میں جا پہنچے۔ جب ہم ڈسپنسری میں داخل ہوئے تو ہمیں وہاں تین آدمی کھڑے نظر آئے۔ وہ دوا کے مارے ہوئے لوگ طرح طرح کی بوتلیں، ٹیکے اور الا بلا اپنے گرد کر بیٹھے تھے۔ میں دروازے میں ہی رُک گیا۔ آبی کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے ہدف کی طرف لپکتا چلا جاتا ہے۔ اس کو کوئی اندازہ نہیں تھا ان میں سے فیلڈن کون ہے مگر اس کے باوجود اس نے بڑے یقین کے ساتھ درمیان میں کھڑے آدمی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "فیلڈن صاحب!"

اس آدمی نے فوراً ہی سر اوپر اٹھایا، بولا۔ "جی! مجھ سے کچھ کہا ہے آپ نے؟" اس کا مطلب یہ تھا کہ آبی نے صحیح آدمی کو مخاطب کیا ہے۔ آنکھوں پر اس نے عینک لگا رکھی تھی اور سفید کی وردی اس کو بہت سجتی تھی۔ رنگ اس کا ہسپتال میں کام کرنے والے ففٹی ففٹی قسم کے لوگوں ایسا تھا، جیسے آٹے میں سیاہی گھول دی گئی ہو۔ وہ ایک طرف سے آدھے انگریز تھے اور دوسری طرف آدھے ہندوستانی۔ اسی لئے وہ خود کو اینگلو انڈین کہلاتے تھے۔

"جی ہاں، وہ دراصل کارٹر بہت سخت بیمار ہے۔ میں وہیں سے آ رہا ہوں۔ آپ کو بلا رہا ہے وہ۔"

"اوہ کارٹر، وہ ہمارا جمعدار، کیا ہو گیا ہے اسے؟ ذرا تو لیں سنبھال ڈیوڈ! میں ابھی آتا ہوں۔" فیلڈن سب کام چھوڑ کر آبی کی طرف لپکا۔ "کہاں ہے وہ؟"

"اپنے کوارٹر میں ہے جناب! میں نے آپ کو اس کا بتا دیا ہے۔ بیچارا بہت پریشان ہو رہا ہے۔" یہ کہہ کر آبی باہر نکل آیا۔ مجھ سے اس نے جان بوجھ کر کوئی بات نہیں کی۔ دروازے سے نکل کر تیزی سے ہسپتال کے عقبی حصے میں جا

رہا تھا، ہم اس کو مسلسل دیکھ رہا تھا۔ جیسے ہی وہ نظروں سے اوجھل ہوا۔ آبی نے مجھے اپنے ساتھ لیا اور تیز تیز قدموں سے کوارٹروں کی طرف جانے لگا۔ فیلڈن کی چال سے اضطراب ہویدا تھا۔ یوں جیسے کارٹر کی بیماری کی خبر نے اسے واقعی پریشان کر دیا ہو۔ پتہ نہیں ایسی کیا بات تھی۔ کوئی گہرا راز تھا۔ جو ان دونوں کو یکجا کیے ہوئے تھا۔

ابھی وہ کوارٹر تک پہنچا نہیں تھا کہ آبی روش کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ کے ساتھ چلتا ہوا ایک دم اس کے پاس جا پہنچا۔ پستول اس نے سیدھے ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔ فیلڈن نے اس کے قدموں کی چاپ سنی تو اس کے پاؤں بندھنے لگے۔ اس نے پلٹ کر آبی کو بڑے غور سے دیکھا۔ اس کی عینک کے اندر اس کی آنکھیں مجھے پھیلتی ہوئی نظر آتی تھیں۔

"چلیں فیلڈن صاحب! ہم بھی آپ کے ساتھ چلتے ہیں۔ کارٹر زیادہ ہی بیمار ہے نا!"

"مگر..... مگر..... آپ کو اتنے تردّد کی کیا ضرورت ہے؟" فیلڈن نے متذبذب لہجے میں کہا۔ آبی نے ابھی تک اپنا سیدھا ہاتھ اس کے سامنے نہیں کیا تھا۔

"چلیں تو سہی میرے بادشاہ! کارٹر کو شاید آپریشن کی ضرورت ہے۔" یہ کہہ کر آبی نے فیلڈن کو بازو سے پکڑ کر گھما دیا اور پستول اس کے کوٹ کے اندر دے کر کمر سے لگا دیا۔ "بہتر ہے تم سیدھے چلے چلو۔ تم سے کارٹر کے کوارٹر میں بات کرنی ہوگی۔ آؤ خان جی!" یہ کہہ کر وہ فیلڈن کو دھکیلتا ہوا کوارٹر کے دروازے تک جا پہنچا۔ دروازہ ابھی تک کھلا تھا اور کارٹر اپنے کمرے میں بند ہو کر اپنے مستقبل کے بارے میں پریشان ہو رہا تھا۔ میرا یہی خیال تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے فیلڈن کا پتہ پوچھنے والے کون ہیں۔

جیسے ہی ہم کوارٹر کے صحن میں داخل ہوئے آبی نے مجھے اشارہ کیا کہ میں کُنڈی بند کر دوں۔ صحن میں ہمارے قدموں کی چاپ گونجی تو کارٹر تیزی سے باہر آ گیا۔

"ہم فیلڈن کو لے آئے ہیں چاچا! اسے اپنا زخم دکھاؤ۔" یہ کہہ کر آبی نے فیلڈن کو پستول کی نوک سے آگے دھکیلتے ہوئے کمرے میں پہنچا دیا۔ کارٹر کو میں نے گریبان سے پکڑ کر اندر داخل کر دیا تھا۔

"یہ..... یہ کیا بدتمیزی ہے؟ کون ہو تم؟" فیلڈن نے کمرے میں پہنچ کر آبی سے اپنا آپ چھڑاتے ہوئے کہا۔ مگر اندر سے اس کی تمام بتیاں بجھ چکی تھیں اور اسے معلوم ہو چکا تھا کہ اسے کس گستاخی کی پاداش میں وہاں تک گھسیٹا گیا ہے۔ اتنا بھی بھولا نہیں تھا وہ، ہماری گرفت کا مطلب نہ سمجھ سکتا۔

"بیٹھ جاؤ فیلڈن اور اطمینان سے دو چار سگریٹ پی کر ہمیں بتاؤ کہ ڈھلوں صاحب کا تم لوگوں نے کیا کیا ہے؟ لو یہ سگریٹ سلگا لو۔" آبی نے بائیں ہاتھ سے جیب میں سے پیکٹ کھینچ کر اُسے دیتے ہوئے کہا۔ اس کی اندھا دھند کارروائی سے میں ہمیشہ ہی پریشان ہو جاتا تھا مگر کارٹر اور فیلڈن کو جس طرح اس نے بے بس کر دیا تھا وہ میرے لئے زیادہ ہی حیران کن تھا۔ اُن کو اس نے سوچنے کی بھی مہلت نہیں دی تھی۔

"کیا سوچ رہے ہو؟ ہمیں ڈھلوں صاحب کا پتہ چاہیے۔ وہ تمہارے والدِ محترم کہاں گئے؟ اِدھر وہ ہسپتال میں داخل تھے۔ آخری بار تمہیں اور بدری کو اُن کے ساتھ دیکھا گیا تھا۔ وہ آپریشن تھیٹر میں گئے تھے یا کہیں اور؟" ایک جھلنگا سی کرسی پر آبی نے بڑے اطمینان سے بیٹھتے ہوئے کہا۔

فیلڈن نے واقعی سگریٹ سلگا لیا تھا۔ جیسے ہی اس نے پیکٹ آبی کو واپس کیا اُس نے دو سگریٹ سلگا کر ایک مجھے دے دیا۔ شکر ہے کہ وہ گیلا نہیں تھا۔ صورت اس نے ایسی بنا رکھی تھی جیسے کوئی بہت ہی عابد زاہد آدمی رکوع میں جھکنے کے لیے خدا کو ہر طرف سے حاضر ناظر جان رہا ہو۔ بڑے خشوع و خضوع سے وہ یہ کام کر رہا تھا اور اس کے چہرے پر ایسی متانت اُبھر آئی تھی جیسے وہ سچ کے سوا کچھ اور سننے کے لیے قطعاً تیار نہ ہو۔

کارٹر نے یوں کیا کہ اس نے جان بوجھ کر اپنے پہلو کا کپڑا اٹھا کر فیلڈن کو وہ زخم دکھا دیا جو اسے آبی کے ہاتھوں لگا تھا۔ اس پر اگرچہ اس نے پاؤڈر تھوپ لیا تھا مگر اس کی لمبائی دیکھنے والے کو حیران کرتی تھی اور وہ یہی چیز فیلڈن کو بتانا چاہتا تھا۔

"بتایا نہیں تم نے فیلڈن! اتنے زیادہ سوچ بچار کی ضرورت نہیں ہے پیارے! ہمیں بہت جلدی ہے۔"

"بولو بھئی! ڈھلوں صاحب کو کہاں بھیج دیا تھا تم نے؟ ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے برخوردار! گھر کی بات ہے۔ ان کا ہمیں صرف پتہ درکار ہے، کچھ رقم نکلتی ہے ہماری ان کی طرف۔" میں نے فیلڈن کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"مجھے ان کے بارے میں کوئی علم نہیں ہے۔ جس کسی نے بھی آپ کو میرا نام بتایا ہے، وہ سخت غلطی پر ہے۔"

"تم ڈھلوں صاحب کو جانتے ہو نا۔ بہت خوبصورت جوان ہیں۔ تمہاری بہن کے لیے اچھے شوہر ثابت ہو سکتے ہیں۔ کہیں تم نے انہیں گھر میں تو نہیں ڈال لیا؟" آبی نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"زبان سنبھال کر بات کریں۔ میں کوئی ایسا گیا گزرا آدمی نہیں ہوں۔ میں ہسپتال کا سب سے سینئر کمپاؤنڈر ہوں۔"

آبی اس کی یہ بات سن کر ہنس دیا، بولا۔ "میرا مطلب یہ ہے مائی ڈیئر! فیلڈن آف دی اینگلو انڈین فیلڈنگ راسکلز، کہ

آخر رشتے ناطے میں ہرج ہی کیا ہے۔ ڈھلوں صاحب کو تم نے چُن لیا ہے تو ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟ ہمیں تو اُن کا پتہ درکار ہے ہز پریذیڈنٹ ایڈریس اونلی؟" پستول کی نال اب اس نے فیلڈن کے سینے پر رکھ دی تھی۔

"لیل وو فیلڈن! خدا تمہاری جان کی حفاظت کرے۔ تبا دو اسٹیں، آخر ایسی بھی کیا پردہ داری؟" میں نے اپنا پستول نکال کر اس کی گدّی پر رکھ دیا۔ وہ سالا کسی بھی طرح بات نہیں کر رہا تھا۔

کارٹر اپنی چارپائی پر بیٹھا بڑے غور سے یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ فیلڈن نے اسے اپنا رازدار بنا کر اچھا نہیں کیا تھا۔ میرا خیال ہے اس کو فیلڈن نے کوئی رقم بھی ضرور دی ہوگی مگر اس کا ذکر وہ ہم سے نہیں کرتا تھا۔ وہ اُن جواچوروں ایسا تھا جو اپنا دائو جیت کر کھسک لیتے ہیں اور نہیں دیکھتے کہ ان کے پیچھے دوسروں کا کیا حال ہوگا؟ میرے پستول کی نال گدّی پر محسوس کر کے اس نے ذہن میں کوئی فیصلہ کر لیا۔ سر کو اس نے کچھ ایسے ہی انداز میں ہلایا تھا۔ بولا "تم کون ہو؟ میں کسی ایرے غیرے کے سامنے اس بات کا ذکر نہیں کر سکتا۔ مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ میں کن لوگوں سے مخاطب ہوں"

"یہ سوال بالکل "گیر ضروری" ہے مسٹر فیلڈن! ہمیں بتاؤ ڈھلوں صاحب کہاں ہیں؟" آبی نے اب کی بار بڑے ہی تلخ لہجے میں کہا۔ لبلبی پر اس کی انگلی کا دباؤ بڑھ رہا تھا۔

"نہیں، یہ بہت ضروری ہے۔ مجھے بتائیں آپ کون ہیں؟"

فیلڈن کے لب و لہجے کی قوت دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ ابھی تک ہم اس کا کس بل نکال نہیں سکے تھے۔ وہ کوئی بہت ہی ڈھیٹ آدمی تھا اور مجھے اس کے ایک ایک لفظ میں اس کی ظاہری شخصیت کی تکذیب نظر آتی تھی۔ اندر سے اس کا حوصلہ تو بدوی معلوم ہوتا تھا۔ حالانکہ وہ دو پستولوں کی زد میں تھا مگر خوف سے وہ ابھی تک ناآشنا تھا۔

آبی نے جھنجلا کر اس کے منہ پر بائیں ہاتھ کا ایک زوردار ریٹا لگایا۔ تب مجھے محسوس ہوا کہ وہ شاید اسی موقع کی تلاش میں تھا۔ کارٹر کی طرف گرتے گرتے اس نے دونوں ٹانگیں ہم دونوں کی ٹانگوں میں ایسے پھنسائیں کہ ہم بھی اُلٹ کر رہ گئے۔ نہ آبی اپنا توازن برقرار رکھ سکا نہ میں۔ اور عین اس وقت کارٹر نے تکیے کے نیچے رکھے ایک عجیب سے شکنجے کو اتنی تیزی سے کھولا کہ آبی کی دائیں کلائی اس میں پھنس کر رہ گئی۔ میں نے فوراً ہی خود کو سنبھالا مگر فیلڈن مجھ سے کہیں زیادہ تیز نکلا۔ اس نے مجھے دونوں ٹانگوں سے پکڑ کر بوری کی طرح الٹ دیا۔ اس کے وجود میں بھینسے ایسی طاقت تھی۔ میرا یہ حال ہو گیا کہ میرے دونوں ہاتھ اب زمین پر تھے اور میرے پستول پر ہاتھ مار کر اس نے اسے دور پھینک دیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میں سُن ہو کر رہ گیا۔ میں نے پستول ہاتھ سے جاتے دیکھا تو تیزی سے اس کی دونوں ٹانگوں میں سر دے کر اس کے پاؤں کھولنے کی کوشش کی مگر اس نے میرے ارادے کو سمجھتے ہوئے مجھے کمان کی طرح دوہرا کر کے میری دونوں ٹانگیں اس طرح باندھ دیں کہ میں سمجھا وہ میری ہڈیاں ہی توڑ دے گا۔ وہ بڑا ہی مشکل مرحلہ تھا۔ میں خود کو اس کے سامنے بالکل ہی بے بس محسوس کرنے لگا تھا کہ اس سے مجھے مروڑ دینے کے ارادے میں ذرا سی غلطی ہو گئی۔ میری ٹانگوں کو مروڑتے ہوئے ذرا سا میری طرف جھکا تو اس کے بال میرے ہاتھ میں آ گئے۔ ان پر اپنی گرفت مضبوط کر کے میں نے اس کے دونوں ہاتھ گردن کی طرف اٹھتے دیکھے۔ اب میری ٹانگیں آزاد تھیں اُن پر اپنا بوجھ سنبھالتے ہوئے میں اپنی جگہ سے اٹھا اور اسے میں نے دونوں بانہوں میں تول کر زمین پر پٹخ دیا۔ اس کی عینک کہیں دور جا پڑی تھی۔ مگر اس کی نظر ان شیشوں کی محتاج نہیں تھی۔ فرش پر گرتے ہی اس نے پھر اٹھنے کی کوشش کی تو میں نے دائیں ہاتھ پر پڑا پستول اٹھا کر اس کی ران پر گولی چلا دی۔ اب معاملہ میرے لیے زیادہ آسان ہو چکا تھا۔ گولی لگتے ہی وہ بھسم سا ہو کر رہ گیا۔ حیرت مجھے یہ تھی کہ اس کے منہ سے ہلکی سی بھی چیخ نہیں نکلی تھی مگر عین اسی وقت کارٹر نے آبی کے پستول سے مجھ پر گولی چلا دی مگر وہ اس معاملے میں اناڑی تھا۔ اس کا ہاتھ کچھ زیادہ ہی ہل گیا۔ دوسرا وار کرنے کی میں نے اسے مہلت نہیں دی۔ سیدھی گولی میں نے اس کے سینے میں اتار دی۔ وہ الٹ کر اوندھے منہ گرا تو پستول آپ ہی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اب جو میں نے آبی پر نظر ڈالی تو میں سمجھا وہ شکنجہ اس کی کلائی ہڑپ کر جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ وہ جانوروں کو پکڑنے کا زبردست آہنی شکنجہ تھا جس کے پھل کھول دیں تو وہ ہدف پر آپ ہی آپ پل پڑتا ہے۔ آبی کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ حالت اس کی اتنی خراب تھی کہ وہ بول بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کی ساری نسیں کھنچ کر رہ گئی تھیں۔ اس شکنجے کے سارے نظام کو سمجھ کر میں نے اس کے لیور پر ہاتھ ڈالا تو دو پیچ آپ ہی آپ ڈھیلے ہونے لگے۔ اُن کے کھلتے ہی وہ شکنجہ نرم پڑ گیا۔ جب میں نے اس کے دونوں پھل کھولے تو آبی کی جان میں جان آئی۔ وہ کراہتے ہوئے اٹھا اور بازو کو زور زور سے جھلانے لگا۔ وہ تو شکر ہے کہ قریب کے چاروں کوارٹر اس وقت خالی تھے اور اُن کے مکین اس وقت اپنی اپنی ڈیوٹی پر حاضر تھے ورنہ وہ ہمارے لیے نئی مصیبت کھڑی کر دیتیں۔ وہ ایسا ہی جان لیوا مرحلہ تھا، اُن دونوں چوہڑوں نے ہمیں پاگل کر دیا تھا۔ کوئی دس منٹ کی مالش کے بعد آبی کی کلائی کام کرنے لگی اور اس کے پنجے کی گرفت لوٹ آئی۔

"یار! اِن لوگوں نے تو کمال کر دیا ہے۔ یہ شکنجہ تو میری موت ثابت ہو رہا تھا۔" اس نے اس مشین کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"تیری تو آواز ہی نہیں نکلتی تھی اور میں خود حیران تھا کہ اس کا علاج کیا کروں؟" میں نے پستول کا رُخ فیلڈن کی طرف پھیرتے ہوئے کہا۔ وہ ابھی تک درد کی شدت سے تڑپ رہا تھا۔ مگر اسے ضبط کرنا آتا تھا۔ ایک بار بھی اس کے منہ سے آہ نہیں نکلی اور کارٹر تو جان سے گزر گیا تھا۔ آبی اپنی کلائی کی ابھری ہوئی نسوں کو زور سے ملتا ہوا اس کی طرف متوجہ ہوا، بولا "تیرا کیا حال ہے بچے! یہ شکنجہ اسے کہاں سے مل گیا تھا۔ بہت ذلیل آدمی ہو تم دونوں میرا بازو کٹا جاتا تو کیا ہوتا، کیوں بھئی!" یہ کہہ کر اس نے فیلڈن کی زخمی ران پر ہلکا سا ٹھوکا دیا۔ مگر وہ تو شاید وہاں تھا ہی نہیں۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں، دونوں ہاتھ اس نے سینے پر رکھ لیے تھے اور اس کی رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی تھی۔ جیسے ہی مجھے یہ شبہ ہوا میں تیزی سے اس کی طرف لپکا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا خالی پیکٹ تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس نے اس میں سے کوئی گولی یا کیپسول نکال کر نگل لیا ہے۔

میں ہذیانی کیفیت میں بولا۔ "اسے کیا ہو گیا ہے یار! ذرا دیکھو تو، اس نے تو شاید زہر کھا لیا ہے۔"

آبی کو جھٹکا سا لگا۔ وہ کلائی کی مالش چھوڑ کر فیلڈن کے پاس پہنچ کر اس کی نبض دیکھنے لگا۔ "یہ تو ختم ہو چکا ہے۔ اسے کیا ہو گیا ہے جیلانی! یہ اس زخم کی وجہ سے تو نہیں مرا۔" اسے اپنے سامنے ڈھیر فیلڈن کی موت کا یقین نہیں آ رہا تھا مگر وہ تو سامنے کی بات تھی، اس سے کوئی کیسے انکار کر سکتا تھا۔ اس کی نبضیں ڈوب چکی تھیں اور وہ ہر شے سے بے نیاز ہو کر موت کی طرف لڑھک چکا تھا۔

"یہ تو واقعی مر چکا ہے۔ یہ پیکٹ دیکھو، کیا تھا اس میں؟" میں نے اس کے ہاتھ سے کھلا پیکٹ نکال کر آبی کی طرف بڑھا دیا۔ اس پر کوئی عبارت درج نہیں تھی۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ اسے کسی بڑے ڈبے سے نکال کر اس نے جیب میں ڈال لیا تھا۔ آبی نے پیکٹ الگ پھینک دیا اور اسے بڑی بے چینی سے اٹھانے کی کوشش کرنے لگا مگر اس کا بیرن تو بڑھ کر موت کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ فیلڈن ختم ہو چکا تھا۔ آبی کے جھٹکے اس کے کسی کام نہیں آ سکتے تھے۔

"یہاں سے نکل چلو جیلانی! مجھے اس جگہ سے خوف آنے لگا ہے۔"

"ہاں! یہاں تو موت حاوی ہو چکی ہے۔ مگر اس کا بچ جانا تو بہت ضروری تھا۔ یہ اسے کیا سوجھی؟ اس بدمعاش نے تو خودکشی کر لی ہے۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ ڈھلوں صاحب کے اغوا کا معاملہ کچھ زیادہ ہی پیچیدہ ہے۔ یہ اگر بچ جاتا تو اس سے ہمیں بہت کچھ معلوم ہو سکتا تھا۔"

"چلو، میرا خیال ہے ہم اشرفی سے مل لیتے ہیں۔"

"نہیں یار! اس کا کیا قصور ہے۔ جو کچھ اس نے بتایا تھا وہ تو صحیح نکلا مگر اس سے آگے کی بات اسے معلوم نہیں ہوگی۔"

"ہاں! اور اب اس کے پاس جانے کا مطلب یہ ہوگا کہ ہمیں اُن کی موت کے بارے میں بھی اُسے بتانا پڑے گا۔"

"ہماری یہ تفتیش تو یہاں ہی ختم ہو گئی۔ اب تو پھر جو گوٹھ جانا پڑے گا۔"

"ہاں، بڈی سے ہم بہت کچھ معلوم کر سکتے ہیں مگر اس کا بھی کچھ پتہ نہیں ہے۔"

"آؤ یہاں سے نکل چلو۔ یہاں زیادہ دیر ٹھہرنا اچھا نہیں ہوگا۔"

"ٹھہرو! اس کی جیبوں کی تلاشی لو۔" یہ کہہ کر میں نے فیلڈن کے کپڑوں میں ہاتھ ڈال دیا۔ اس کی جیب سے مجھے ایک چھوٹی سی ڈائری ملی۔ ایک منی سگریٹ کا پیکٹ ماچس ایک رومال اور چند سکے دوسری جیب سے ملے۔ میں نے لوٹ آبی کی طرف بڑھا کر ڈائری کھولی۔ تو اس میں فیلڈن کے گھر اور دفتر کا پتہ لکھا ہوا تھا۔ ڈائری کے مختلف صفحات پر مختلف لوگوں کے پتے درج تھے۔ کسی کا صرف فون لکھا تھا اور کسی کے گھر کا پورا پتہ۔

آبی بھی میرے پاس کھڑا ڈائری کے صفحات کھنگال رہا تھا، بولا: "چلو اس کے گھر چلتے ہیں۔ وہاں سے شاید ہمیں کوئی اہم بات معلوم ہو جائے۔"

"ہاں! ڈائری کے آخری صفحے میں جلد کی تہہ کے اندر ایک عورت کی تصویر تھی۔ وہ غالباً فیلڈن کی بیوی تھی۔

"یہ تو کوئی بڑی زبردست شے معلوم ہوتی ہے۔ اس کا حلیہ تو دیکھو۔"

"ہاں! اس سے تو آج ہی ملاقات ہوگی، آؤ۔" یہ کہہ کر ہم اسی وقت کوارٹر سے باہر نکلے اور ہسپتال کے اندر جانے کے بجائے کوارٹروں کے سامنے بنی تنگ سی سڑک عبور کر کے عقبی حصے میں جا پہنچے۔ فیلڈن کینال پارک کے قریب ہی کہیں رہتا تھا۔ ہسپتال سے نکل کر ہم ٹیکسی میں بیٹھے اور کینال پارک جا پہنچے۔ آبی کچھ زیادہ ہی سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ فیلڈن اور کارٹر کی موت نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ فیلڈن کے بارے میں تو وہ کچھ زیادہ ہی پریشان تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ مر کیسے گیا اور وہ زہر اس نے کیوں پھانک لیا؟ جس نے چند لمحوں میں اس کا کام تمام کر دیا۔

"ذرا تیز چل یار! تیرا پاؤں کیوں بھاری ہو رہا ہے آبی! ذرا ہوشیاری دکھا۔" میں نے کینال پارک کے عربی حصے کی کوٹھیوں کے نمبر پڑھتے ہوئے کہا۔ یار لوگوں نے زمین پر بھی جنت تعمیر کر رکھی تھی۔ یہ بڑی بڑی جیل ایسی اونچی لمبی کوٹھیاں بنا کر وہ لوگ بڑے ہی اطمینان سے زندگی گزار رہے تھے۔ ایسی زندگی جس میں کل کی فکر شامل نہیں ہوتی کہ ان کی کل ہی نہیں، آنے والے وقت کی کئی دہائیاں محفوظ ہو چکی تھیں۔ دولت ان کے پاؤں پوجتی تھی۔ ان کی چھپکلیاں بھی سونے کے سینگ لے کر پیدا ہوتی تھیں۔ راتوں کو پولیس کا پہرا وہاں اتنا شدید ہوتا ہے کہ پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا یہی وجہ تھی کہ وہ راتوں کو بڑے شکوہ کی نیند سوتے تھے۔

آبی نے قدم تیز کر دیے، بولا: "میں سست نہیں ہو رہا ہوں جیلانی! میری سوچ سست ہو گئی ہے۔ اگر ڈھلوں صاحب کو اس ملعون ترسے نے اغوا کر لیا ہے تو ان کو بچا لینا ہمارے بس کی بات نہیں ہوگی۔"

"ان کی فہرست میں ڈھلوں صاحب کا بھی نام شامل تھا مگر میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔"

"تم اس چکر میں نہ ہی پڑو تو اچھا ہے۔ میں اس کے حق میں نہیں ہوں۔ دو آدمی پہلے ہی وار میں ہمارے ہاتھوں مارے گئے۔ آگے پتہ نہیں کیا ہو؟"

"نہیں یار! ڈھلوں صاحب کے بعد ہماری بھی باری آ سکتی ہے۔ کوئی ان کا ہاتھ کیسے روک سکتا ہے۔ ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ کون لوگ ہیں اور ان کا منصوبہ کیا ہے۔"

اب ہم کوٹھیوں کی لمبی قطار سے آگے نکل کر دو رویہ بنے مکانوں تک جا پہنچے تھے۔ وہ بہت عمدہ مکان تھے اور ان میں زیادہ تر متوسط طبقے کے لوگ رہائش پذیر تھے۔ بالآخر ہم فیلڈن کے مکان تک جا پہنچے۔

آہنی گیٹ کی داہنی طرف اطلاعی گھنٹی لگی تھی۔ آبی نے اس گھنٹی کی طرف ہاتھ بڑھایا تو میں نے اُسے ایسا کرنے سے منع کر دیا۔ دروازے کے عین بیچ میں ایک سوراخ سا بنا تھا جس سے آدمی آر پار دیکھ سکتا تھا۔ اس کے پچھلی طرف ایک چھوٹی سی تختی لگی تھی جس کو انگلی سے پیچھے ہٹایا جا سکتا تھا۔ اس میں سے میں نے اندر جھانک کر دیکھا تو وہاں مجھے ایک موٹر سائیکل نظر آئی۔

"اندر تو ایک موٹر سائیکل پڑی ہے آبی! معلوم ہوتا ہے کہ یہ فیلڈن کی نہیں ہے۔"

"تمہیں کیسے پتہ چلا؟ کوئی الہام ہوتا ہے تجھے؟ کیسی باتیں کرتے ہو یار، یہ گھنٹی بجا دو۔"

"نہیں، کوئی اور راستہ دیکھو۔ یہ فیلڈن کی ہوتی تو وہ اسے ساتھ لے گیا ہوتا۔ ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ اندر کون ہے؟" میں آبی کو اپنے ساتھ لے کر دروازے سے ہٹا تو اصل عمارت سے ذرا آگے مجھے قدِ آدم دیوار نظر آئی۔ اسے ہم آسانی سے اچھل کر عبور کر سکتے تھے مگر دن کا وقت تھا۔ راہ چلتے لوگ ہمیں خواہ مخواہ ہی پکڑ کر باندھ لیتے اور ہم کسی ایسے فساد کے لیے بالکل تیار نہیں تھے۔ ہم نے وہ گلی عبور کی تو معلوم ہوا کہ اس کے عقب میں ایک اور گلی موجود ہے۔ ہم اس میں داخل ہو گئے اور ایک بار پھر اسی مکان کے پچھلے حصے میں جا ٹھہرے۔ ہم نے چاروں طرف نظر دوڑائی مگر اس گھڑی کوئی آدمی ہمیں سامنے دکھائی نہیں دیا لیکن مکان میں وہاں سے داخل ہونا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا کسی بھی آدمی کی نظر ہم پر پڑ سکتی تھی۔

"لعنت بھیج یار! اس چکر پہ۔ دستک دے کر اندر چلے جاؤ۔" آبی نے جھنجلاتے ہوئے کہا اور پلٹ کر دوسری گلی کی طرف چل دیا۔

مجھے بھی اس کے پیچھے بھاگنا پڑا۔ کسی کام میں ذرا سی تاخیر وہ برداشت نہیں کر پاتا تھا۔ ایسی پارہ سی طبیعت تھی اس کی کہ کسی بھی معاملے میں ذرا سی رکاوٹ اس کے اندر ایسا جوش بھر دیتی تھی کہ وہ چٹانوں سے ٹکرانے کو بھی تیار ہو جاتا تھا۔ جیسے ہی ہم دروازے کے سامنے پہنچے، ایک نوعمر لڑکا اسی وقت دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں بائیسکل تھی۔ اندازہ میرا یہ تھا کہ وہ اس گھر کا ملازم ہے۔ لباس اس کا یونہی سا تھا اور سائیکل کے ہینڈل پر اس نے ایک ٹوکری لٹکا رکھی تھی۔ وہ باہر نکلا تو دروازے کو اس نے بھیڑ دیا اور سیٹی بجاتا ہوا وہ سائیکل پر سوار ہو کر دوسری طرف نکل گیا۔ ہم سڑک کے بیچ میں کھڑے تھے۔ اس نے ہمیں یونہی سے کوئی آدمی سمجھ کر نظرانداز کر دیا۔ اس کا خیال ہوگا کہ ہم ایسے تو وہاں روز ہی پھرتے ہیں۔

جیسے ہی وہ نظروں سے اوجھل ہوا ہم دروازہ کھول کر گیراج میں جا گھسے۔ گیراج کے حصے میں مکان کے اندر جانے کا دروازہ تھا اور وہ بھی ہمیں کھلا نظر آیا۔ لڑکے نے باہر جاتے وقت اسے بھی کھلا چھوڑ دیا تھا۔ ہم اس کے سامنے کھڑے تھے کہ اندر سے ہمیں کسی خاتون کی آواز سنائی دی۔ وہ کسی بات پر خوش ہو کر قہقہہ لگا رہی تھی۔ اس آواز میں اچانک کسی مرد کی آواز بھی گھل گئی۔

آبی نے وہ دروازہ کھٹکھٹا کر اس کے دونوں پٹ کھول دیے۔ ہمارے سامنے ایک ہی صوفے پر دو صورتیں ایک دوسرے سے بہت قریب بیٹھی نظر آئیں۔ ان میں سے ایک تو وہ خاتون تھی جس کا قہقہہ ہم سن چکے تھے اور دوسرا کوئی مرد تھا۔ وہ دونوں ہمیں دیکھ کر ایک دم سنبھل گئے۔ خاتون کا لباس مہین سا تھا اور آپ کہتا تھا کہ مجھے دیکھو۔ اس مہین سی قمیص کی آستین اور گلے کا چاک کچھ زیادہ ہی دعوتِ مبارزت دیتا تھا اور مرد ابھی تک اپنے روایتی لباس میں تھا۔ کوٹ پتلون اور ٹائی، وہ بہت سلیقے سے پہنے ہوئے تھا اور وضع قطع کے اعتبار سے وہ کوئی بہت ہی طرح دار آدمی معلوم ہوتا تھا۔ خاتون کوئی اینگلو انڈین لگتی تھی اور ایسا اسکرٹ پہنے ہوئے تھی جسے ہم اگر بکنی کہیں تو زیادہ بہتر ہے۔ وہ ہمیں دیکھ کر ایک دم کھڑے ہو گئے۔

"ہم معافی چاہتے ہیں میڈم! کہ بغیر اجازت اندر آ گئے۔ کسی نے گھنٹی کی آواز پر دھیان ہی نہیں دیا۔" میں نے کھنکارتے ہوئے کہا۔

"کون ہیں آپ اور گھنٹی کہاں بجائی ہے آپ نے؟ ہم نے تو کوئی آواز نہیں سنی۔" خاتون کا چہرہ غصے سے سرخ ہونے لگا تھا۔ "کیوں آئے ہیں آپ اندر! یہ شرافت ہے آپ کی؟ کیا چاہتے ہیں آپ؟" وہ سرک کر اس مرد کے پاس جا ٹھہری۔ وہ بھی ہمیں بہت غضبناک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"دراصل وہ لڑکا گیا ہے نا یہاں سے! تو وہ ہمیں بتا رہا تھا کہ اس کی میڈم کو اندر ایک آدمی ذبح کر رہا تھا۔ بس ہم اسی لیے جلدی میں اندر آ گئے تاکہ آپ کی جان بچائی جا سکے۔" آبی نے خالص دیہاتی لہجے میں یہ بات کہی۔

وہ سٹپٹا کر رہ گئی، بولی: "کیا! کیا کہا ہے اس لڑکے نے؟ کیا کر رہا تھا ایک آدمی میرے ساتھ؟" اس کی حیرت دیدنی تھی۔

"وہ کچھ ذبح وغیرہ کی بات کر رہا تھا۔ یعنی یہ آدمی آپ کو سلاٹر کر رہا ہے۔" آبی نے ذرا سا آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ پستول اس نے سیدھے ہاتھ میں یوں پکڑ لیا تھا کہ وہ انہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ اسے ہتھیلی کی اوٹ میں لے کر وہ ان کی طرف سرکا اور صوفے کی پہلی نشست تک جا پہنچا۔

"یہ کیا بکواس ہے؟ نکل جاؤ یہاں سے۔ کوئی کسی کو ذبح نہیں کر رہا ہے۔ پتہ نہیں کہاں سے آ جاتے ہیں یہ دیہاتی گدھے! نکل جاؤ یہاں سے۔"

آبی کے چہرے کی سنجیدگی ابھی تک قائم تھی، بولا: "تو وہ لڑکا جھوٹ بول رہا تھا کیا؟ ہم تو اس کے کہنے پر اندر آئے ہیں ہمیں بیٹھنے کے لیے نہیں کہیں گے آپ؟ پہلی بار آپ سے مل رہے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ خود ہی نشست پر جم کر بیٹھ گیا۔

"آئیں خان صاحب! اس لڑکے نے تو ہمیں پریشان کر دیا ہے۔ یہ تو آپس میں محبت کر رہے تھے بیچارے۔ ہم سمجھے کہ شاید کوئی قتل ہو چکا ہے یہاں۔"

میں اس کی بات سن کر سامنے کی کرسی پر جا بیٹھا، بولا: "عجیب لوگ ہیں آپ! ہمیں بیٹھنے کے لیے بھی نہیں کہتے۔ کوئی پانی شانی تو پوچھ لینا چاہیے آدمی کو۔"

"یہ کیا مصیبت ہے پال؟ انہیں اٹھا کر باہر پھینک دو پلیز! ایسے ذلیل آدمی ہیں یہ، مان نہ مان میں تیرا مہمان۔" اردو وہ بڑے سلیقے سے بولتی تھی۔ اور زبان اس کی بہت تیز چلتی تھی۔ لہجے کی کھنک صاف بتلاتی تھی کہ وہ کس قماش کی عورت ہے مگر ہم نے اس کے پکوڑے میں بھنگ ڈال دی تھی۔ ہمارا وہاں آنا اسے سخت ناگوار گزر رہا تھا۔

"تم سیدھی طرح سے جاتے ہو یہاں سے کہ نہیں؟" اس آدمی نے اپنا کوٹ اتار کر الگ پھینک دیا۔ اب وہ ہم سے واقعی دو دو ہاتھ کرنے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ اکہرے سڈول بدن کا وہ پال یہ سمجھ رہا تھا کہ جیسے وہ ہمیں وہاں سے اٹھا کر واقعی باہر پھینک دے گا۔ کوٹ اس نے اسی انداز سے اتارا تھا۔

آبی بھی اپنی ہی قسم کا ایک حرامزادہ تھا، بولا: "تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ انہیں ذبح نہیں کر رہے تھے۔" یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ اب پستول اس نے ان کے سامنے کر دیا تھا۔ اسے دیکھ کر پال

ایک دم سکتے میں آ گیا یہی حال اس عورت کا ہوا۔ اُس کا رنگ زرد ہونے لگا۔

"بیٹھ جاؤ پال مسیح اور ہماری بات غور سے سنو! ہم چلے جائیں گے تو پھر جو مرضی آئے کرتے رہنا۔ تم بھی بیٹھ جاؤ مس کلکٹی کلک! بیٹھ جاؤ۔"

یہ لفظ میں نے اس کی زبان سے پہلی بار سنا تھا اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس کا مفہوم کیا ہے مگر وہ اس نام کو سنتے ہی ٹپٹا سی گئی۔ منہ سے تو کچھ نہیں بولی مگر اس کی آنکھیں اور زیادہ غضبناک ہو گئیں۔ فوراً ہی وہ پال کے پاس دوسرے صوفے پر بیٹھ گئی۔

"آپ مسٹر فیلڈن کی بیوی ہیں؟"

"ہاں، کوئی اعتراض ہے آپ کو؟"

"جی نہیں، جب آپ کو اعتراض نہیں ہے تو مجھے کیوں ہونے لگا۔ جب فیلڈن چلے جاتے ہیں تو آپ مسٹر پال کو ڈیوٹی پر حاضر کر لیتی ہیں۔"

"کیا مطلب؟ یہ ہمارے دوست ہیں۔ فیلڈن کے بھی دوست ہیں اور میرے بھی۔"

"جی ہاں، وہ تو ظاہر ہی ہے۔ اسی لئے آپ اس شفٹ کو بھی خالی نہیں رکھتی ہیں۔ میرا خیال ہے وہ یہ اپنا فرضِ منصبی بہت عمدہ طریقے سے ادا کرتے ہوں گے۔" آبی نے منہ پکّا کر کے کہا۔

"یہ...... یہ کیا کہہ رہے ہیں وہ آپ کو مجھ سے ایسا کوئی سوال پوچھنے کا حق نہیں ہے۔"

"سوال تو میں نے کیا ہی نہیں۔ میں نے اپنا اندازہ ظاہر کیا ہے۔ آپ کیا کام کرتے ہیں مسٹر پال؟"

"میں ڈرگ انسپکٹر ہوں۔ مگر آپ یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہے ہیں؟" اس نے پستول پر اپنی نظریں جماتے ہوئے کہا۔ اس ہتھیار نے ان کی ستیا ہی کھینچ لی تھی۔

"مسز فیلڈن! ہم دراصل چوہدری مختار ڈھلوں صاحب کے بارے میں آپ سے پوچھنا چاہتے تھے کہ وہ اس وقت کہاں ہوں گے؟"

یہ نام سنتے ہی وہ خاتون تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھی اور تپائی پر پڑے سگریٹ اٹھا کر اُن میں سے ایک ہونٹوں میں لے کر سُلگانے لگی۔ اس کا رنگ اور زیادہ زرد ہو گیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس نام میں کوئی ایسی ہی تاثیر تھی کہ اس کا رُواں رُواں لرز گیا تھا مگر پھر بھی اس نے سگریٹ کا گہرا کش لے کر خود کو بہت زیادہ پُرسکون ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "یہ نام میں آپ سے پہلی بار سن رہی ہوں مجھے کیا معلوم کہ یہ کون ہیں اور کہاں رہتے ہیں؟"

"آپ کو معلوم ہے بی بی! آپ کو معلوم ہے۔ اچھا یہ بتائیں کہ وہ بدری کہاں ہے؟"

"پھر وہی بات، مجھے کیا معلوم کہ یہ لوگ کون ہیں؟ کس نے آپ کو بتایا ہے کہ میں ان لوگوں کے بارے میں جانتی ہوں؟ میرا خیال ہے آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"جی نہیں، ہم ٹھیک جگہ پہنچے ہیں۔ ڈھلوں صاحب ایک رات کے لیے یہاں بھی آئے تھے۔ ہمیں سب کچھ معلوم ہو چکا ہے ہسپتال سے اٹھا کر انہیں فیلڈن اور بدری یہاں لے آئے تھے ہم اس سے آگے کی بات پوچھ رہے ہیں۔" اب کی بار میں نے بھی اپنا پستول ان کے سامنے کر دیا۔ ان کی دہشت سہ چند ہو گئی معلوم یہ ہوتا تھا کہ وہ ڈرگ انسپکٹر اس معاملے میں بالکل بے خبر تھا۔ اس کے چہرے سے یہی ظاہر ہوتا تھا۔

آبی اٹھا اور پستول اس کے پہلو سے لگا کر بولا "مسٹر پال! میرے ساتھ آئیں۔ میرا خیال ہے آپ کو اس معاملے میں نہیں الجھنا چاہیے۔ آئیے میرے ساتھ۔" اس نے نال اس کے پہلو میں دھنسے ہوئے جیسے ہی یہ بات کہی، پال کوٹ اٹھا کر اس کے آگے لگ گیا۔

"ذرا دیر کے لیے میں آپ کو میں غسل خانے میں بند کروں گا اور بس۔ اس مس کلکٹی کلک سے ہمیں جو پوچھنا ہے، وہ پوچھ لیں تو پھر آپ کو ہم چھٹی کرا دیں گے۔"

یہ کہہ کر آبی اُسے دھکیلتا ہوا دائیں ہاتھ بنے غسل خانے میں لے گیا اور اسے وہاں بند کر کے اُس نے باہر سے کُنڈی چڑھا دی۔ اس عرصے میں مَیں نے مسز فیلڈن کو نگاہ میں رکھا۔ افراتفری میں اس نے پہلا سگریٹ مَسل کر پھینکا اور دُوسرا سلگا لیا۔ اس کا ذہن بہت تیزی سے کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تذبذب اور بے حد و حساب پریشانی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ جیسے ہی آبی واپس پلٹا وہ سیدھا مسز فیلڈن کے پاس جا پہنچا۔ وہ ابھی تک تپائی کے پاس کھڑی تھی۔ آبی اس کے قریب ہی صوفے پر بیٹھ گیا، بولا: اب ہمیں بتائیں کہ یہ قصّہ کیا ہے۔ بعد میں ہم آپ کو ایک خوش خبری بھی سنائیں گے۔"

وہ چند لمحے کسی گہری سوچ میں ڈوبی رہی پھر بڑے اطمینان سے بولی: "آپ یہاں بیٹھیں! ابھی شام تک وہ لوگ خود یہاں آ جائیں گے جو اس معاملے کے ذمّے دار ہیں۔"

"کون لوگ؟ کن کا ذکر کر رہی ہیں آپ؟"

"میرا مطلب ڈاکٹر عالیہ سے ہے۔ یہ سارا کام اسی کے کہنے پر فیلڈن نے کیا تھا۔ بدری بھی اس کام میں ان کا برابر کا شریک ہے۔"

"اچھا۔ آپ نے یہ بات بتا کر ہم پر بڑا احسان کیا، خواہ مخواہ ہمیں آپ پر تشدد کرنا پڑتا۔ مگر میں نے تو سنا تھا وہ امریکہ گئی ہوئی ہے۔"

"نہیں، وہ واپس آ چکی ہے اور ڈاکٹر دھمن بھی اس کے ساتھ ہے مگر ان دونوں میں سنا ہے کچھ ناچاقی ہو گئی ہے۔ اس لیے وہ آج کل الگ الگ رہ رہے ہیں؟"

"وَیری گڈ! مگر یہ بتائیں کہ وہ بدری ان کے ساتھ کیسے شریک ہو گیا؟"

"وہ ابن الوقت آدمی ہے۔ وہ ڈھلوں صاحب کا ملازم ہو کر بھی ان کی نوکری میں پھنس گیا ہے۔"

"مگر وہ کیسے؟ میں اس کو بالکل سمجھ نہیں سکا ہوں۔"

"دراصل جب اس نے ہوٹل کے دو آدمیوں کو اغوا کیا، تو اس کی صورت تیسرے آدمی کو یاد رہ گئی تھی۔ اس نے کسی نہ کسی ذریعے سے اس کا پتہ کر لیا اور پھر اسے دو لاکھ روپے دے کر اس نے خرید لیا۔ ڈھلوں صاحب پر گولی بھی اس نے ہی چلوائی تھی مگر جب وہ بچ گئے تو وہ اسے لے کر ہسپتال جا پہنچا۔ آپ کا نام غالباً جیلانی ہے۔ یہی بات ہے نا؟"

"جی ہاں، میرا نام غلام جیلانی ہے۔"

"ہاں، آپ کو اس نے زبردست چکّر دیا اور کراچی بھجوا دیا اور خود ڈھلوں صاحب کو اس نے ہسپتال سے اغوا کر لیا۔ فیلڈن ڈاکٹر عالیہ کا پرانا واقف کار بلکہ دستِ راست رہا ہے۔ وہ بھی اس کے ساتھ شریک ہو گیا اور اس رات بدری اور فیلڈن، ڈھلوں صاحب کو لے کر یہاں آ گئے اور پھر اسی صبح یہاں سے لے کر کسی اور طرف چلے گئے۔ میرا خیال ہے کہ وہ اب تک اپنے تینوں آدمیوں کو چوگوٹھ کی حویلی سے رہا کرا چکے ہوں گے۔ ان کا یہی منصوبہ تھا۔"

"مگر اب ڈھلوں صاحب کہاں ہوں گے؟"

"اس کا مجھے علم نہیں ہے۔ مجھے اس بارے میں انہوں نے کچھ نہیں بتایا۔"

اب وہ خاتون پہلے سے کہیں زیادہ پُرسکون نظر آنے لگی تھی۔ جیسے اس کے دل سے سارا بوجھ اتر گیا ہو۔ اس نے ہم سے کچھ بھی نہیں چھپایا تھا۔ ساری بات اس نے از خود ہی ہمیں بتا دی تھی محض اس خیال سے کہ اگر اس نے انکار کیا تو ہم اس کی چمڑی اُدھیڑ دیں گے اور اس کے ساتھ اس کے دوست پال کی بھی۔

"میرا خیال ہے کہ ہم پال کو یہاں سے نکال دیتے ہیں۔ اس کو ابھی تک کسی بات کا پتہ نہیں چلا ہے۔"

"ہاں، وہ بالکل بے گناہ ہے یہاں وہ اکثر آتا رہتا ہے مگر اس معاملے کا اسے علم نہیں ہے۔"

"آپ خود اس کو سمجھائیں۔ ہم ابھی دوسرے کمرے میں جا ٹھہرتے ہیں۔ آپ کے لیے اسے مطمئن کرنا زیادہ آسان ہو گا۔"

"میری یہ بات سن کر اس نے قدرے توقف کیا اور بولی۔

"ٹھیک ہے۔ آپ میرے بیڈروم میں جا بیٹھیں، میں ابھی اُسے فارغ کر دیتی ہوں۔"

ہم اس کے کہنے پر پہلو کے کمرے میں جا گھسے۔ پردہ ہم نے دروازے پر پوری طرح تان لیا تھا تاکہ وہ لوگ کوئی گڑبڑ کریں تو ہم اُن سے اچھی طرح نپٹ سکیں۔ مسز فیلڈن اسی وقت غسل خانے کی طرف گئی اور جب وہ میز کی طرف واپس آئی تو بولی ——

"آپ یہاں سے چلے جائیں مسٹر پال! فیلڈن کسی بھی وقت واپس آ سکتا ہے۔ ان دونوں کو میں نے مطمئن کر کے واپس بھیج دیا ہے۔ بھلا ہمارا ایسے لوگوں سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟"

"یو آر شور، کہ وہ لوگ واپس چلے گئے ہیں؟"

"ہاں، ایسے ہی شہدے سے آدمی تھے۔ بہر حال آپ فکر نہ کریں۔ میں پرسوں آپ کا دس بجے انتظار کروں گی، سو لانگ۔"

یہ کہہ کر اس نے پال کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اس نے اپنی وارفتگی میں اسے چومنا چاہا مگر مسز فیلڈن پرے ہٹ گئی۔

"نہیں مسٹر پال! ابھی آپ جائیں۔ ان بدمعاشوں نے خواہ مخواہ مزا کِرکرا کر دیا ہے۔ آپ کی بوتل میں پرسوں کے لیے محفوظ رکھوں گی۔"

"ہاں، وہ تو اب پرسوں ہی کام آئے گی۔ اچھا، بائی بائی۔"

وہ یہ کہہ کر تیزی سے باہر لپکا اور وہاں سے چند ہی لمحوں بعد ہمیں اس کی موٹر سائیکل کی آواز سنائی دی۔ اسے بھی وہ جگہ فوراً چھوڑ دینے کی جلدی تھی۔ ایسا عشق جس میں اتنے سارے فساد میں سے گزرنا پڑے، کسی کو بھلا کہاں راس آ سکتا ہے۔ اور وہ ٹھہرا صرف ڈرگ انسپکٹر۔ وہ ایسی جرأت کہاں سے لاتا۔ میرا خیال تھا کہ وہ پرسوں تو کیا اگلے کئی سال تک فیلڈن کے گھر کا نام نہیں لے گا۔ ہم دونوں وہاں سے اٹھ کر مسز فیلڈن کے پاس جا بیٹھے۔ وہ ابھی تک بہت سنجیدہ تھی اور اسے ابھی یہ یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایسا بیان دینے کے بعد بھی اس کی جان چھوٹ چکی ہے۔

"یہ لڑکا کون ہے؟"

"یہ ہمارا ملازم ہے۔"

"آپ بھی کوئی کام کرتی ہیں؟"

"جی نہیں۔ ویسے یہ گھر میری ملکیت ہے۔ یہاں دو بنگلے بھی میری جائیداد ہیں۔ اُن کا کرایہ مل جاتا ہے۔"

"وہ بنگلے آپ نے بنوائے تھے؟"

"جی نہیں۔ وہ میرے والد نے بنوائے تھے۔ ان کا اب انتقال ہو چکا ہے۔"

"عالیہ سے آپ کی ملاقات کہاں ہوئی؟"

"میں اس سے یہیں ملی تھی، بہت تیز عورت ہے وہ۔ فیلڈن

نے مجھے بتایا تھا کہ وہ کسی زمانے میں نرس کا کام کرتی تھی۔"
"آپ کو معلوم ہے کہ وہ لوگ کہاں ٹھہرے ہیں؟"
"نہیں، میں کبھی نہیں گئی۔ ویسے میرا خیال ہے کہ وہ کسی ہوٹل میں ٹھہری ہوئی ہے۔ اُسے اپنے گھر جانے سے دہشت ہوتی ہے۔"
"آپ سے مل کر ہمیں بہت خوشی ہوئی مسز فیلڈن! ویسے آپ کا اپنا نام کیا ہے؟"
"جی مجھے جونز کہتے ہیں، جونز پارکر۔ میرے والد کا نام ہنری پارکر تھا۔"

اتنے میں ان کا ملازم لڑکا واپس آگیا۔ جیسے ہی اس نے سائیکل گیراج میں رکھی، ہم نے پستول چھپا لیے۔ لڑکا اندر آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک ٹوکری تھی۔ جونز فوراً ہی اس کی طرف لپکی تو اس نے نہایت ہی معصومیت سے ٹوکری میں سے شراب کی بوتل نکال کر اس کے سامنے کر دی۔

"مسز گراف نے آپ کو سلام بولا ہے بی بی جی! کہتی تھیں بس ایک ہی بوتل رہ گئی تھی۔"

"او ڈیم اِٹ۔ یہ ٹوکری سٹور میں رکھ دو۔ اور جاؤ تم ان کے لیے ہوٹل سے کھانا لے آؤ۔ یہ ہمارے مہمان ہیں اور کھانا یہیں کھائیں گے۔ دو روسٹ مرغے لے آنا۔" یہ کہہ کر اس نے اسکرٹ کی جیب سے سو روپیہ نکال کر اسے دے دیا۔

"بٹی! جلدی آجانا — میں انتظار نہ کرتی رہ جاؤں۔" بٹی اسی وقت واپس چلا گیا۔ اس نے یونہی اچٹتی سی نظر ہم پر ڈالی تھی اور اُسے میرا خیال ہے کہ یقین نہیں آرہا تھا کہ ہم اس کے لیے اتنے اہم بھی ہو سکتے ہیں۔

وہ باہر نکلا تو مجھے یہ احساس ہوا کہ جونز نے ہمارے لیے اپنا رویّہ اس حد تک تبدیل کر لیا ہے کہ وہ ہمیں کھانے کی بھی دعوت دے رہی ہے تو اس کی وجہ کیا تھی؟

"میرا خیال ہے کہ میں آپ کے لیے چائے بنا دوں۔" اس نے پلٹتے ہوئے پوچھا۔ وہ ابھی تک بہت سنجیدہ نظر آرہی تھی۔

"نہیں، چائے کی ضرورت نہیں ہے ہمیں۔ میرے اس دوست کو کچھ تبخیرِ معدہ کی شکایت ہے۔ شاید السر بھی ہو چکا ہے۔ ہو سکے تو کافی لے آئیں۔" آبی نے نہایت ہی بے تکلفی سے کہا۔ وہ سالا مسکرا رہا تھا اور اس بیر بہوٹی کے انگ انگ سے اس کی نظر لپٹ رہی تھی۔ وہ بال سنوارتی تھی تو وہ اس کی ایک ایک لٹ گن لیتا تھا۔ پاؤں اٹھاتی تھی تو اس کا فاصلہ ماپ لیتا تھا۔ میرے بارے میں جو بکواس اس نے کی تھی، اس پر مجھے ہنسی بھی آئی اور رونا بھی۔ اسے کوئی ایسی نرغے میں آئی عورت ہمیشہ سے بے حد پسند تھی۔

وہ بھی کھیلی کھلائی عورت تھی مسکرانے لگی، بولی "کافی تو پھر ان کے لیے اور زیادہ نقصان دِہ ہوگی۔ کیوں جیلانی صاحب آپ کے بارے میں جو نشانیاں مجھے عالیہ نے بتائی تھیں، وہ ساری صحیح نکلیں، مگر مجھے السر کے بارے میں اس نے نہیں بتایا تھا۔"

"کیا کہا تھا اس نے میرے بارے میں؟"

"بہت کچھ کہا تھا اس نے، یہ بھی بتایا تھا کہ آپ بہت خوبصورت ہیں۔ مردانہ وجاہت کا نمونہ ہیں۔ چہرے سے بہت بارُعب معلوم ہوتے ہیں۔ بات کرتے میں تو دوسروں کو خواہ مخواہ مرعوب کر لیتے ہیں۔ بڑے گُن گائے تھے اس نے مگر یہ نہیں بتایا تھا کہ آپ کو تبخیرِ معدہ کی شکایت ہے۔" وہ جھوم کر میرے سامنے کی کرسی پہ آبیٹھی۔ وہ پہلے سے بہت مطمئن نظر آنے لگی تھی۔

"آپ کو یہ نہیں بتایا عالیہ نے کہ یہ چہرے سے ولی نظر آتے ہیں۔ ولیٔ آخر الزّمان! اب اِن کے بعد کوئی ولی پیدا نہیں ہوگا۔" آبی نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا اور جان بوجھ کر اپنی جگہ سے اٹھ کر جونز کے پہلو میں آبیٹھا۔

"یہ تو میں نہیں جانتی ہوں صاحب! البتہ وہ آپ کے بارے میں بھی بتا گئی تھی۔ کہتی تھی کہ ایک لونچڑا سا آدمی اس کے ساتھ ہے۔ جہاں کہیں بھی وہ نظر آجائے، اسے پولیس کے حوالے کر دینا چاہیے۔"

لفظ 'لونچڑا' پر اس نے خاص زور دیا۔ ہم دونوں کھلکھلا کر ہنس دیے۔ جونز جانتی تھی کہ چٹکی کہاں بھری جاتی ہے۔

"شکر ہے اس نے مجھے لونچڑا ہی کہا۔ ویسے آپ کا کیا خیال ہے میرے بارے میں؟"

وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی، بولی "ویسے تو آپ بھی اُلّو کے پٹھے ہی نظر آتے ہیں، وہ کہہ رہی تھی کہ اس سے کراچی میں آپ نے پچھتّر لاکھ روپیہ چھین لیا تھا، کیا یہ سچ ہے؟"

"ایسے ہی بکواس کرتی ہے وہ۔ اتنا روپیہ وہ مجھے دے دیتی تو میں اسے ہمیشہ کے لیے اپنی جان بنا لیتا۔ ویسے ہے بہت خوبصورت عورت۔ ابھی تک اس کے ہاں کوئی بچہ تو نہیں ہوا ہے نا؟"

"نہیں، اور میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر دھمن سے اس کا اسی وجہ سے فساد ہوا ہے۔ بچے کا بہت شوق ہے اسے۔" جونز نے بھی دوسرا سگریٹ سلگا لیا۔

"یہ کونسی بڑی بات ہے۔ اپنے جیلانی صاحب جو موجود ہیں۔ پھر میں بھی حاضر ہوں جو خدمت ہو سکی ضرور کریں گے۔ بھی کوئی بات ہے آخر۔ بڑا حق ہے اس کا ہم پہ۔"

"خیر آپ تو مذاق کرتے ہیں، مگر وہ واقعی بہت

"میرا خیال ہے کہ پھر تو ڈاکٹر دھمن کو تِرپھلا کھانا چاہیے۔ کیوں جیلانی صاحب؟"

"بک نئیں اوئے! تیرے حکیم کی ایسی تیسی۔ یہ بتائیں جونز کہ وہ اس وقت کہاں ہوگی؟"

"میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ اپنا صحیح پتہ وہ میرے پاس چھوڑ کر نہیں گئی۔ بہر حال شام کو وہ ضرور آئے گی۔ اس کی کچھ چیزیں یہاں موجود ہیں۔"

"وہ آپ ہمیں دکھا سکتی ہیں؟"

"دیکھ لیں، ویسے آپ کے کام کی ان میں کوئی چیز نہیں ہے۔ ایک وی سی آر ہے اور چند فلمیں۔"

"اچھا! ذرا دکھائیں تو ہمیں کہ وہ کیسی فلمیں ہیں؟"

"ایک ڈبے میں بند ہیں۔ میں نے تو کھولا نہیں، آپ دیکھ لیں۔ واپسی پر میرا خیال ہے، وہ یہ چیزیں خرید لائی تھی۔" یہ کہہ کر وہ اٹھی اور ہمیں نشست گاہ سے اٹھا کر عقبی کمرے میں لے گئی۔

عالیہ کی دونوں چیزیں میز پہ دھری تھیں۔ وہ ہم نے کھولیں تو معلوم ہوا کہ وہ چار فلمیں بھی ساتھ لائی تھی۔ جونز نے وی سی آر کھول کر اسے ٹیلی ویژن سے لگا دیا اور ہمارے کہنے پر ایک فلم اس نے چلا دی۔ وہ کوئی بیس منٹ کی فلم تھی جس میں عالیہ، دھمن اور ایک اور آدمی کسی جزیرے میں پھرتے دکھائی دیتے تھے۔ ہمیں نہیں معلوم تھا کہ وہ جزیرہ کہاں ہے اور اس کا نام کیا ہے۔ ساحلِ سمندر سے ہٹ کر ایک عمارت بھی دکھائی دے رہی تھی۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ وہ لوگ وہاں بالکل تنہا رہتے آئے ہیں۔ آس پاس آبادی کا کوئی نشان نہیں تھا۔ ایک وسیع و عریض جنگل عقب میں نمایاں تھا اور عالیہ وہاں دھمن کے ساتھ مختصر لباس میں اِدھر اُدھر گھومتی نظر آتی تھی۔ وہ ساحل سے اترے تو سمندر کے کنارے کھڑی ایک کشتی میں جا بیٹھے۔ کیمرہ مسلسل ان کا تعاقب کر رہا تھا۔ کشتی میں بیٹھ کر وہ سمندر میں خاصی دُور تک نکل گئے مگر کسی جگہ وہ ٹھہرے نہیں۔ فلم بالکل خاموش تھی۔ اور صرف اس جزیرے کی تصویریں ہی دکھاتی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ واپس آئے تو پھر عمارت کے اندر چلے گئے۔ جب وہ دوبارہ کیمرے کے سامنے آئے تو دونوں نے بہت خوبصورت لباس پہن رکھا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد تین حبشی لڑکیاں اُن کے قریب آگئیں۔ وہ ان کے لیے باہر لان میں کھانا لگا رہی تھیں۔ میں نے بہت چاہا کہ کسی نہ کسی طرح میں اس جزیرے کے بارے میں کچھ معلوم کر لوں۔ مگر مجھے اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ کچھ ہی دیر بعد منظر بدل گیا۔ اب وہ اس عمارت سے ہٹ کر ایک دوسری عمارت میں داخل ہو رہے تھے اور دونوں نے ڈاکٹروں والا لباس پہن رکھا تھا۔ معلوم یہ ہوا کہ اس عمارت میں جو دوسری عمارت سے قائم کی گئی تھی، ایک ہسپتال کھول رکھا تھا جس کے اندر ایک ہی وارڈ میں کوئی تیس پینتیس مرد بستروں پہ لیٹے ہوئے تھے۔ دونوں ڈاکٹر باری باری مختلف مریضوں کے پاس جاتے رہے اور انہیں دیکھ کر پرچیوں پر کچھ لکھتے رہے۔ وہاں اُن کی مدد کے لیے کئی اور لوگ بھی موجود تھے۔ جن میں کچھ نرسیں تھیں اور کچھ ڈاکٹر۔ ڈاکٹر بھی سب کی سب عورتیں تھیں۔ کیمرہ ابھی تک ان کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ مریضوں میں سے کئی آدمی پیٹ کی تکلیف میں مبتلا تھے۔ کسی کو آنکھ کا مرض لاحق تھا تو کوئی اپنی ٹانگیں پٹیوں میں دبائے ہوئے بیٹھا تھا۔

"یہ کیا سلسلہ ہے یار! اس جزیرے کو جانتے ہو تم؟" آبی نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"ہاں، تمہارے والد صاحب یہاں رہا کرتے تھے۔ ابے! مجھے کیا پتہ کہ یہ کون سی جگہ ہے۔ کیوں مسز جونز! یہ جزیرہ کہاں ہوگا؟"

"مجھے بھی کچھ پتہ نہیں ہے۔ میں نے تو یہ فلمیں آج ہی دیکھی ہیں۔" جونز نے بڑی دلچسپی سے اس فلم کو دیکھتے ہوئے کہا۔ عالیہ بلاشبہ اس فلم میں قیامت ڈھا رہی تھی۔ اس کی صحت پہلے سے بہت اچھی ہو چکی تھی اور وہ پہلے سے کہیں زیادہ جوان نظر آتی تھی۔

"خدا اسے نظرِ بد سے بچائے۔ دھمن اس کے لائق ہر گز نہیں ہے۔" آبی نے خوش ہو کر کہا۔ "ہائے۔ اس نے تو میری جان ہی نکال لی ہے۔ اس کو حاصل نہ کرنا بہت بڑی اخلاقی گراوٹ ہے۔" آبی نے واقعی سینے پر دو ہتڑ مارتے ہوئے کہا۔ جونز بھی ہنسنے لگی۔ اس کی حالت بہت ہی ابتر ہونے لگی تھی مگر پھر وہ فوراً ہی سنبھل گیا، بولا۔ "یہ بہر حال آپ کے پاسنگ بھی نہیں ہے مس جونز! اللہ نے آپ کو اس سے کہیں زیادہ جاذبِ نظر بنایا ہے۔"

جونز نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے یہ فلم نکال کر دوسری فلم چلا دی، جو چند لمحوں تک تو بالکل ہی خاموش رہی مگر پھر جب وہ فلم شروع ہوئی تو ہم تینوں ہی ذلیل ہو کر رہ گئے۔ وہ ساری کی ساری فلم عیاشی کا مرقع تھی۔ آبی نے فلم وی سی آر سے کھینچ کر ڈبے میں بند کی اور جونز کو وہاں سے اٹھاتے ہوئے بولا۔ "مجھے..... مجھے افسوس ہے مسز جونز! ہم نے آپ کو بہت پریشان کیا۔ میں نے اس سے زیادہ بھیانک مناظر آج تک نہیں دیکھے ہیں۔ ہم واقعی آپ سے شرمندہ ہیں۔" آبی نے زمین پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔ ہم جونز کو ساتھ لے کر اس کی نشست گاہ میں آگئے تھے۔ آبی واقعی بہت زیادہ افسردہ تھا اور میں بھی۔ ہماری نظریں اوپر نہیں اٹھتی تھیں۔

"نہیں نہیں! آپ شرمندہ نہ ہوں۔ یہ..... یہ ہماری تہذیب نہیں ہے۔ یہ..... یہ ذلّت کی انتہا ہے۔ میں اپنی جگہ ڈر گئی تھی کہ کہیں آپ یہ فلم دیکھ کر پاگل نہ ہو جائیں۔ مجھے یہی ڈر تھا بائی گاڈ! مگر..... مگر..... مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں اتنے قابلِ احترام لوگوں کے

درمیان بیٹھی ہوں میں..... میں آپ کی شکر گزار ہوں جیلانی صاحب!"
اس کی آنکھیں بہہ نکلی تھیں، ایک تحیر آمیز جذبۂ تشکر اس کے دل میں لہر
اُبھر آیا تھا کہ اس کی آنکھیں بھی اس کو دبا لینے میں ناکام رہ گئی تھیں
حالانکہ ہم جان چکے تھے کہ پال اس کے پاس کیوں آیا ہے اور وہ
بوتل ٹمی کس کے لیے لایا تھا۔ وہ دونوں اسی تہذیب کا حصہ تھے۔

"چھوڑیں مسز جونز، دفع کریں۔ جائیں ہمارے لیے چائے بنائیں"
وہ نشست گاہ سے اٹھی اور بائیں ہاتھ کے باورچی خانے میں جا گھسی۔

"میرا خیال ہے کہ ہم اسے فیلڈان کے بارے میں بتا دیتے ہیں۔"

"نہیں یار! دو گھڑی یہاں بیٹھنا بھی عذاب ہو جائے گا۔ یہ کیسی
بھی کیوں نہ ہو، خاوند کی موت پر صبر نہیں کر سکے گی۔" میں نے
آبی کو ٹوکتے ہوئے کہا۔

"ہاں! تیری بات بھی درست ہی ہے۔ مگر اس کو کوئی نہ
کوئی تو بتا ہی دے گا۔ ہو سکتا ہے کوئی ابھی آ جائے۔"

"آ جائے نا۔ مگر اس میں ہمارا نام تو کوئی نہ لے سکے گا۔ ہم تو
بری الذمہ ہوں گے۔ کسے پتہ ہے کہ اس کوارٹر میں کون گیا تھا؟"

"ہاں! تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ہمیں تو آج شام تک یہاں
رہنا ہوگا۔"

"یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ ہم ابھی یہاں سے نکل کر کسی ایسی جگہ
جا ٹھہریں گے جہاں سے ہم عالیہ کو ادھر آتے دیکھ سکیں۔ پھر جو ہوگا
دیکھا جائے گا۔"

اتنے میں ٹمی واپس آ گیا۔ وہ چیزوں سے لدا پھندا کمرے میں
گھس آیا۔ اور میز پر ساری چیزیں رکھ کر بولا "بی بی جی! یہ دیکھ لیں
چونسٹھ روپے آٹھ آنے لگے ہیں اور یہ پھل بھی لے آیا ہوں، جو
آپ نے صبح کہا تھا۔"

"ٹھیک ہے۔ اندر آ جا اور یہ چائے اُن کو پہنچا دے...
شاباش۔" جونز نے وہیں کھڑے کھڑے اسے آواز دی۔

چائے ہم نے جونز کے ساتھ بیٹھ کر پی۔ وہ ایک بار پھر
بہت سنجیدہ ہو گئی تھی۔ جب وہ باورچی خانے میں گھسی ہوئی تھی
تو وہیں کسی راستے سے وہ اپنے وارڈ روب میں سے لباس
تبدیل کر آئی تھی اور اب اس کے حلیے سے متانت ٹپک رہی تھی۔
پتہ نہیں وہ کس خیال میں تھی۔ ٹمی وہاں سے ہٹ کر باہر جا بیٹھا تھا۔
مکان کچھ اس قسم کا تھا کہ نشست گاہ کے بالکل سامنے ایک
چھوٹا سا گھاس کا قطعہ تھا۔ بائیں ہاتھ گیراج جس میں موٹر آرام
سے کھڑی کی جا سکتی تھی۔ وہیں سے گزر کر مکان کے اندر کا راستہ
کھلتا تھا۔ تین بیڈ روم نیچے تھے اور دو اوپر۔ عقبی حصے میں زیادہ
بڑا لان تھا اور اس کے پیچھے دیوار۔ ٹمی غالباً وہیں جا بیٹھا تھا۔ ہم
چائے پی رہے تھے کہ عین اس وقت فون کی گھنٹی بجی۔ ہم چونک
سے گئے۔ کیونکہ ہمیں نہیں معلوم تھا کہ وہاں فون موجود ہے۔ مگر
خواب گاہ میں رکھا گیا تھا۔ جونز اُٹھ کر تیزی سے اس کمرے میں
تو ہم نے بھی برتن میز پر رکھے اور اس کے پیچھے وہاں جا پہنچے۔
اٹھا کر وہ بولی: "ہیلو! جی میں مسز فیلڈن بول رہی ہوں۔"

"دیکھیں میں ہسپتال سے ...ک بول رہا ہوں۔ آپ کے لیے
اچھی خبر نہیں ہے..... مسٹر فیلڈن کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔" آواز
خاصی اونچی تھی جسے ہم بھی بخوبی سُن رہے تھے۔

"کیا کہا! فیلڈن کو کسی نے قتل کر دیا ہے؟"

"لگتا تو ایسا ہی ہے۔ وہ ہسپتال کے ایک کوارٹر میں شدید
زخمی حالت میں ملے ہیں اور انہیں کوئی ہوش نہیں ہے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کہاں سے ملے ہیں وہ؟"

"وہ کارٹر جمعدار ہے نا! فیلڈن اس کے کوارٹر میں تھا
کسی نے کارٹر کو بھی قتل کر دیا ہے۔" آواز پھر اُبھری۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ! میں ابھی آ رہی ہوں۔"

"مگر ٹھہریں! ذرا ہولڈ کریں۔ کیا حال ہے اب اس
کا۔" کسی قریب آتے ہوئے آدمی سے اس نے پوچھا، پھر بولا
"مسز فیلڈن! اُسے ہوش آ گیا ہے۔ ڈاکٹر پُر امید ہیں۔ بس شانہ
پر ایک زخم ہے، وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ کو مبارک ہو کہ وہ زندہ
بچ گئے۔"

"میں ابھی آ رہی ہوں۔" یہ کہہ کر مسز جونز نے فون رکھا
اور بولی "یہ..... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ مسٹر فیلڈن پر کس نے
کیا ہے؟ ایسے! اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ہسپتال بھی
تھے؟" اس کی آنکھیں اس کے اندرونی کرب کا مظہر بن گئی تھیں۔

"ایسی بات نہیں ہے جونز! ہم ہسپتال نہیں گئے تھے
ہماری اطلاع کا ذریعہ کوئی اور تھا۔ ہمیں اس کے بارے میں کچھ
نہیں ہے۔" آبی نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"آپ کہتے ہیں تو میں مان لیتی ہوں مگر..... مگر حالات
تو یہی بتاتے ہیں۔ مجھے فوراً ہسپتال جانا ہوگا۔"

"ہاں ضرور جائیں۔ ہم شام کو پھر آ جائیں گے۔" آبی نے
اس کے قدم سے قدم ملاتے ہوئے کہا۔

"ہاں! آپ بے شک شام کو آ جائیں۔ ٹمی! ایسے او ٹمی
یہ سامان اُدھر میز پر لگا دے، یہ لوگ ابھی کھانا کھائیں گے۔
کسی نے فیلڈن کو زخمی کر دیا ہے، میں ہسپتال جا رہی ہوں۔"

"زخمی کر دیا ہے؟ کس نے زخمی کیا ہے انہیں؟ یہ تو
بُرا ہوا بی بی جی!"

"ہاں! تم گھر کا دھیان رکھنا۔ یہ لوگ کھانا کھا کر جائیں
تو اندر سے تالا لگا لینا۔"

یہ کہہ کر اس نے باورچی خانے سے برتن نکال کر بڑی میز
پر لگا دیے۔ ٹمی بھی اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ دونوں کے چہرے
بجھے سے گئے تھے۔

"ایسے میں ہم کھانا کیسے کھا سکتے ہیں جونز! آپ ہسپتال جائیں،
پتہ نہیں اس کی کیا حالت ہو؟" میں نے اس کے قریب جا
کر کہا۔

"آپ میرے مہمان ہیں جناب! اور کھانا آ چکا ہے۔ دس
منٹ میں ہم فارغ ہو جائیں گے۔" اس نے تیزی سے برتن میز پر لگا کر
کھانا ہمارے سامنے لگا دیا۔ روسٹ مرغ میں نمک کچھ زیادہ ہی تھا۔
مگر پھر بھی وہ بہت خستہ تھا..... روٹیاں بھی تازہ تھیں۔ پلاؤ اس
نے پہلے ہی پکا رکھا تھا۔ جس کے لیے سالن بھی وہ نکال لائی تھی۔ ہم
دونوں نے ڈٹ کر وہ کھانا کھایا۔ کچھ بھوک بھی ہمیں زیادہ ہی لگی تھی
اور حیرت ہمیں یہ تھی کہ جونز نے بھی وہ کھانا بہت ڈٹ کر کھایا۔ پھر
وہ بولی: "پتہ نہیں کیا بات ہے؟ کوئی غم کی خبریں سنتی ہوں، تو
میرے پیٹ میں بل پڑنے لگتے ہیں۔ بہت زور سے بھوک لگ
جاتی ہے۔"

"ہاں، کچھ طبیعتوں پر غم کی خبر کا اُلٹا اثر پڑتا ہے، ورنہ ایسے
میں لوگ تو کبھی کچھ کھا نہیں سکتے۔"

"بس میرا تو بُرا حال ہو جاتا ہے۔ اب میں اطمینان سے ہسپتال
جا سکوں گی۔" وہ ہمارے سامنے مختلف چیزیں رکھتی جا رہی تھی۔ اس کام
میں ٹمی بھی اس کی مدد کر رہا تھا۔ ہم کھانا کھا چکے تو ٹمی برتن اٹھانے
لگا۔ مگر ابھی ہم میز سے اٹھ نہیں سکے تھے کہ آبی نے سر پکڑ لیا۔ اسے
چکر سا آ رہا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ دھڑام سے فرش پر جا گرا۔
سر میرا بھی اپنا نہیں رہا تھا۔ مجھے بھی اپنے اِرد گرد کی ہر شے گھومتی
نظر آتی تھی مگر آبی کا حال کچھ زیادہ ہی بُرا ہو گیا۔ تب مجھے محسوس ہوا
کہ جونز نے ہمیں جان بوجھ کر کھانے میں زہر ڈال کر کھلا دیا تھا۔
وہ اپنے خاوند کے قاتلوں کو وہیں پکڑ لینا چاہتی تھی۔ جب ہی تو وہ
ہم سے اصرار کر رہی تھی کہ ہم کھانا کھا لیں۔ پتہ نہیں میرے وجود
میں ایسی کونسی حِس تھی جس نے مجھے آنے والے وقت کی پوری
تصویر دکھا دی تھی۔ میرا معدہ بھی الٹنے لگا تھا مگر میں نے اپنی
قوتِ ارادی سے کام لیتے ہوئے خود کو گرنے سے بچاتے ہوئے
کہا: "یہ..... یہ تم نے کیا کر دیا ہے جونز! ہمیں زہر دے دیا ہے
تم نے؟ مگر میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" یہ کہہ کر میں نے
بڑی مشکلوں سے پستول سیدھے ہاتھ میں پکڑا اور جونز کو اس
کی زد میں لے کر میں نے پاگلوں کی طرح اسے دھکیل کر غسل خانے
میں اتنی تیزی سے بند کر دیا کہ وہ چیخ بھی نہ سکی۔ ٹمی باہر بھاگنے لگا
تھا مگر میں نے اسے روکتے ہوئے کہا: "او ئے کتے! رک جا ورنہ میں
تجھے ذبح کر دوں گا۔" اس کے اٹھتے ہوئے قدم وہیں رک گئے۔ وہ
پلٹا تو میں نے بہت مشکل سے خود کو اس کے پاس پہنچایا اور اس کو
گردن سے پکڑ کر میں تیزی سے دیوار گیر الماری تک جا پہنچا اور دروازہ
کھول کر میں نے ٹمی کو اس میں بند کر کے باہر سے کنڈی چڑھا دی۔
میری حالت دم بدم غیر ہوتی جا رہی تھی مگر میں نے اپنے اعصاب
پر ضبط کا کوڑا برساتے ہوئے فوراً ہی آبی کو کندھے پر ڈالا اور
دروازے کو مقفل کر کے میں اسی گھڑی گیٹ سے باہر نکل آیا۔ آبی
ابھی تک میرے کندھے پر پڑا تھا۔ عین اس وقت ایک کار وہاں
سے گزری تو میں نے آگے جا کر اس کو روک دیا۔

وہ کوئی بھلا آدمی تھا۔ فوراً ہی اس نے بریک لگا دیے،
بولا "کیا بات ہے بھائی جی؟"

"یہ بہت سخت بیمار ہیں۔ انہیں فوراً کسی ڈاکٹر تک پہنچا دیں
پلیز.....!"

"ہاں، کیوں نہیں۔ ایک ڈاکٹر تو یہاں قریب ہی ہے۔" اس
نے ہمارے لیے دروازہ کھول دیا۔

میں نے آبی کو پچھلی سیٹ پر ڈالا تو میرا جی بُری طرح متلا
رہا تھا۔ میں نشست پر بیٹھا تو مجھے بھی قے ہو گئی، جسے میں نے بڑی
مشکل سے کھڑکی میں سے باہر پھینکا مگر پھر بھی کچھ غلاظت کار میں
رہ گئی۔

"کوئی بات نہیں، میں اسے صاف کر لوں گا۔ لگتا ہے آپ کی
طبیعت بھی سخت خراب ہے؟"

"ہاں، کسی نے ہمیں زہر کھلا دیا ہے۔ پلیز ذرا جلدی کریں۔"
میں نے منہ کھڑکی سے باہر رکھتے ہوئے کہا۔ اس نے کار کی رفتار
اور تیز کر دی۔ ڈاکٹر زیادہ دور نہیں تھا۔ جب ہم وہاں پہنچے تو آبی
کے منہ سے جھاگ نکلنے لگے تھے۔ اس کی زندگی سخت خطرے میں تھی اور
میرا اپنا کچھ پتہ نہیں تھا کہ میں کہاں دم توڑ دوں۔ اب تک تو میں نے
صرف اپنی قوتِ ارادی سے کام لے کر خود کو آگے بڑھایا تھا مگر اب
میری ہمت بھی جواب دینے لگی تھی۔ کھانے میں اس گشتی نے نہ جانے
کیا ملا دیا تھا۔

ڈاکٹر سیف اللہ اس کا نام تھا اور وہ ابھی تک کلینک میں موجود
تھا۔ وہ آدمی جس نے ہمیں وہاں تک پہنچایا، تیزی سے ڈاکٹر کو
ہمارا حال بتانے لگا تو فوراً ہی اس نے ہمیں پچھلے کمرے میں پہنچا دیا
اور پھر ہمارے مرض کو سمجھتے ہوئے اس نے ہمیں دو دو ٹیکے لگا دیے
اور ہمارے معدوں کو صاف کرنے کے لیے دوائیں دینے لگا۔ کوئی چار
گھنٹے بعد میں زہر کے فنا کُن اثر سے محفوظ ہو چکا تھا۔ مگر آبی کو
ابھی تک ہوش نہیں آیا تھا۔ پھر بھی سیف اللہ کا خیال تھا کہ وہ

بچ جائے گا، اس کی حالت زیادہ ہی بدتر ہو گئی تھی۔ میری زندگی میں یہ دوسرا بلکہ تیسرا موقع تھا کہ ہمیں دشمنوں کے ہاتھوں زہر پھانکنا پڑا۔ مگر وہ زہر جو میں نے قندیار میں پیا تھا اس سے مختلف تھا کہ اس زہر نے تو ہمیں نیند میں محو کر دیا تھا مگر یہاں کیفیت ہی اور تھی۔ وہ آدمی جو ہمیں کار میں ڈال کر وہاں لایا تھا اسی وقت باہر نکل گیا تھا، اسے ڈر ہو گا کہ تفتیش ہوئی تو پولیس اس کا بھی بھرکس نکال دے گی۔ آبی رات کے نو بجے ہوش میں آیا، میں بھی زہر کے اثر سے محفوظ تو ہو گیا تھا مگر مجھے بھی اٹھنے میں آٹھ بج گئے۔ اعصاب کسی طرح کام ہی نہیں کرتے تھے، پتہ نہیں اس جونز نے ہمیں کیسا زہر دیا تھا کہ ہمارے حواس ہی معطل ہونے لگے تھے۔ ڈاکٹر سیف اللہ ہمیں دوا دارو دے کر گھر چلا گیا۔ جب وہ شام کو چھ بجے لوٹا تو ہم ابھی تک نیم بے ہوشی کے عالم میں تھے۔ میں بات تو کر سکتا تھا مگر نہ ہاتھ چلتے تھے نہ پاؤں میرا ساتھ دیتے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے میری کمر سے کسی نے ہڈی ہی نکال لی ہے۔

رات کو گیارہ بجے تک آبی بہرحال اس عذاب سے باہر نکل آیا مگر سکت اس میں بھی باقی نہیں رہ گئی تھی۔ اس گھڑی ایک چلبلی سی نرس ہمارے پاس تھی۔ اس نے مجھے اور آبی کو ہوش میں دیکھ کر کہا۔ "اب کیا حال ہے جناب کا؟ کیا کھا لیا تھا آپ لوگوں نے؟"

"پتہ نہیں، ایک آدمی کے ہاں کھانا کھاتے ہی ہماری یہ حالت ہو گئی۔ میری اور اس کی جیب میں کچھ رقم تھی؟" میں نے آبی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نرس سے پوچھا۔

"وہ سب کچھ محفوظ ہے جناب! اسی ہزار کا ڈرافٹ اور نقد رقم ڈاکٹر نے الگ رکھوا دی تھی۔ آپ تھانے میں رپورٹ درج نہیں کرائیں گے؟"

"نہیں بی بی! اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میرا خیال ہے وہ کھانا ہی غلط تھا۔"

"جی نہیں! آپ کو باقاعدہ زہر دیا گیا ہے۔ بہرحال تھانے کا معاملہ ڈاکٹر نے آپکی مرضی پر چھوڑ دیا تھا۔ آپ اٹھیں گے، تو پھر بات کر لیں ڈاکٹر سے۔"

آبی بھی اس کی باتیں سن رہا تھا، اس نے چادر ایک جھٹکے سے الگ پھینکی اور بولا۔

"اٹھ جا یار! وہ تو وہاں آ کر جا بھی چکے ہوں گے۔ ہمیں ان کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔" وہ اپنے بوٹ پہننے لگا۔

"اب وہاں جانے کا کوئی فائدہ نہ ہو گا بھائی جی! کل صبح دیکھ لیں گے۔ ہمارے معدے تو بالکل ہی خالی ہو رہے ہیں۔"

"ہاں! آپ چاہیں تو پھل وغیرہ منگوا کر کھا سکتے ہیں۔"

"تو پھر جلدی کرو نا، کھڑی منہ کیا دیکھ رہی ہو سسٹر منی!" آبی نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"مگر وہاں پیسے لگتے ہیں جناب!"

"ارے تو لے جاؤ نا، ہزار روپیہ لے جاؤ۔ ڈاکٹر سے مانگو۔ کہاں رکھ گیا ہے وہ ہمارا مال بھکیہ تو سوچو، ہم... شی... راہ من!" آبی نے یہ تینوں لفظ الگ الگ ادا کیے۔ تسمے اس نے باندھ لیے تھے اور اب وہ اپنے جسم میں پہلی سی توانائی محسوس کرنے لگا تھا۔ بولا "یار! یہ ہم کس چکر میں پھنس گئے ہیں۔ بہت دیر ہو گئی ہے ہمیں۔ جا بڑی بی! کوئی پھل شل لے آ، روز روز تو ہم یہاں نہیں آئیں گے۔" آبی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ بھی مسکرا دی، بولی "ٹھیک ہے بھائی مریض صاحب جی! میں ابھی پھل فروٹ لے آتی ہوں۔"

"اوئے دفع کر! بھاگ ان بردہ فروشوں سے کہاں کے بھائی ہے تا یہی بات۔ ایک دم بڑھیا پھل لانا۔ ہو سکے تو روٹی ہی لا دو۔"

وہ ہنستی ہوئی باہر نکل گئی تو آبی اٹھ کر میرے بستر پہ آ گیا، بولا "یار! اس خنزیر کی بچی نے تو ہمیں تباہ کر دیا تھا ایسی ذلیل کی پتر ہے وہ۔"

"ہاں، بہت گھٹیا عورت ہے وہ۔ بہرحال اس کو بھی فہرست میں شامل کر لو۔ انتقام اب اس سے بھی لینا ہے۔"

"ہاں، ان لوگوں نے کیا سمجھا ہے ہمیں۔ ایسے نامی گرامی بدمعاشوں کو بھی وہ چکر دینے سے باز نہیں آتے، حد ہو گئی۔ اٹھ اب بھینک دے سارا مق ادھر ہی۔" یہ کہہ کر وہ اپنے بدن کو چست کرنے کے لیے دائیں بائیں ہاتھ ہلانے لگا۔ میں نے بھی بوٹ پہن لیے۔ وہ رات ہم ہسپتال کے اس کمرے میں گزارتے کے حق میں ہرگز نہیں تھے ورنہ خدا جانے وہاں کیسی صورتِ حال پیدا ہو جاتی۔

کوئی بیس منٹ بعد وہ نرس ٹرے میں رکھ کر ہمارے لیے سیب اور کچھ کیلے لے آئی، بولی "ابھی تو یہی مل سکتے ہیں۔ آپ انہیں کھا لیں۔"

"پیسے کہاں سے لیے تم نے ہم... شی... راہ؟" آبی نے سیب پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "یہ اچھا خاصا پلا ہوا سیب ہے۔ لگتا ہے یہ آپ کے رخساروں کا رنگ چرا لایا ہے۔"

"جی ہاں، یہ اسی لیے ہے کہ سیبوں میں منتقل ہو جائے۔ اس میں آپ کی مونچھوں کا رنگ بھی شامل ہے۔ ابھی تو آپ مر رہے تھے اور اب مذاق کی سوجھ رہی ہے آپ کو۔"

"دراصل آدمی بہت ڈھیٹ شے ہے سسٹر من! ابھر بلا اُس پر سے گزر جاتی ہے اور وہ پھر اٹھ بیٹھتا ہے۔ ویسے بائی دی وے تمہارا نام کیا ہے ہم... شی... راہ...؟"

"میرا نام ہم... شی... راہ ہی ہے۔ ویسے بائی دی وے آپ کا اسمِ گرامی کیا ہے؟ رجسٹر میں تو کچھ نہیں لکھا۔ صرف یہی لکھا ہے، نام، نامعلوم، ولد، نامعلوم، مرض، زہر خورانی۔"

"ہاں، یہ اور بھی اچھا ہے۔ بے نام ہی مرنا اچھا ہے۔ ویسے بائی دی وے، آپ کا...؟"

"میرا نام منزہ ہے! اور آپ کا؟"

"مجھے... مجھے تو ایس جی ایم پیرزادہ کہتے ہیں اور یہ ہاشم خان ہیں۔"

"آپ کو زہر کس نے دیا ہے؟"

"بس تھی ایک ایسی ہی نالائق سی عورت۔ وہ دراصل ہم دونوں کی لاشیں حنوط کر کے ڈرائنگ روم میں سجانا چاہتی تھی تاکہ ہم بھاگ نہ جائیں، اتنی محبت تھی اُسے ہم سے۔" آبی نے سیب کا ایک ٹکڑا اُسے پیش کرتے ہوئے کہا۔ وہ ہمارے قریب ہی کرسی پر بیٹھ گئی تھی اور ہماری باتوں میں زبردست دلچسپی ظاہر کر رہی تھی۔ وہ ہنس دی۔ آبی کی حسِ ظرافت کچھ زیادہ ہی پھڑک رہی تھی۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ اب وہ زہر کے اثر سے محفوظ ہو چکا ہے۔

پھل کھا کر ہم نے ٹرے اسے واپس کر دی تو عین اس وقت ڈاکٹر سیف اللہ ہمارے کمرے میں گھس آیا۔ وہ اس وقت کسی جان بلب مریضہ کو وہاں دیکھنے آیا تھا۔ ہماری بھی عیادت کو آ نکلا۔ "اب کیا حال ہے جناب؟"

"ہم تو اب خدا کے فضل سے بالکل ٹھیک ہیں اور یہاں سے جانا چاہتے ہیں۔"

"مگر مجھے آپ نے یہ نہیں بتایا کہ یہ زہر آپ کو کس نے دیا تھا۔ اپنا نام پتہ بھی آپ نے نہیں بتایا۔ وہ آدمی بھی نہیں رکا جو آپ کو یہاں لایا تھا؟"

"آپ کے سوال تو ڈھیر سارے ہیں۔ آپ جائیں مس منزہ! ہم ان سے ضروری بات کرنا چاہتے ہیں۔" میں نے نرس کو باہر بھیج دیا۔

آبی اٹھ کر ڈاکٹر کے سامنے جا ٹھہرا، بولا "ہم کسی کے لیے مصیبت نہیں بننا چاہتے، خدا اس کا بھلا کرے جس نے ہمیں اس حال کو پہنچایا ہے۔ وہ ہماری عزیزہ ہی ہیں مگر ذرا پاگل ہیں۔ آپ یوں کریں کہ ہمیں ہماری رقم واپس دے دیں اور اپنا بل اس میں سے کاٹ لیں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے جناب؟ یہ تو پولیس کا کیس ہے آپ کو بچا لینا میرا فرض تھا مگر اب تو کارروائی پولیس کو کرنا ہو گی۔ آپ کے دونوں پستول بھی میرے پاس ہیں۔" وہ بہت سنجیدہ ہو رہا تھا۔

"جی نہیں، ہم بچ گئے ہیں بس یہی بہت کافی ہے۔ پلیز! ہماری رقم ہمیں دے دیں اور سلام علیکم! آپ کا بہت بہت شکریہ ڈاکٹر سیف اللہ صاحب! آپ کا یہ احسان ہم کبھی نہیں بھول سکیں گے۔" آبی نے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا مگر پھر جلدی سے بولا۔ "ٹھیک ہے میں دس ہزار روپے رکھ لیتا ہوں، اگر آپ کو منظور ہو تو باقی رقم آپ کو ابھی دے دیتا ہوں۔"

"ہمیں منظور ہے! چلیں میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔" یہ کہہ کر آبی فوراً ہی ڈاکٹر کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔ جب وہ لوٹا تو ساری رقم اس کے ہاتھ میں موجود تھی اور پستول بھی۔ وہ بہت خوش تھا۔ رقم میری جیب میں دھر کر بولا "میں مس منزہ کو اپنی 'لو ایٹ فرسٹ سائٹ' کا یقین دلا آیا ہوں۔ اس سے میں پھر ملوں گا۔"

"تو کیسے یقین دلا آیا ہے اسے۔ کوئی رقم رکھی ہو گی تو نے اس کے ہاتھ پر؟"

"نہیں یار! بالکل ہی گھامڑ ہو تم! رقم کیا چیز ہے، میں اس کے لیے تاج محل بنوا سکتا ہوں۔ ایسی ہم رقص کے لیے۔"

"تو تم اس کے ساتھ رقص کرتے رہے ہو؟"

"نہیں یار! کچھ سمجھا کر۔ میں اس کے ہاتھ پہ ایک سو ایک روپیہ بھی رکھ آیا ہوں۔ اس نے ہماری اتنی خدمت کی ہے بھئی!"

"چل دفع کر! اس کا ایڈریس بھی لے آیا ہو گا تو؟"

"ہاں! وہ کاچھو پورے میں رہتی ہے۔ اب یہ مصیبت پتہ نہیں کہاں ہے؟ خیر معلوم کر لیں گے۔ لڑکی بہرحال اچھی ہے۔" یہ کہہ کر وہ میرے ساتھ ہی کلینک سے باہر نکل آیا۔

اس وقت رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ ایک پہاڑ ایسی اُجاڑ ویران رات ہمارے سامنے تھی اور ہمارے عقب میں... مسز فیلڈن کا گھر تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ہم ایسے میں کہاں جائیں؟"

آبی باہر کی فضا کو سونگھتے ہوئے بولا "یار! اس سے تو اچھا تھا ہم کلینک میں ہی رہ جاتے۔ وہاں وہ بھی تھی اور علاج بھی وہ کر ہی رہے تھے۔"

"ہاں! مگر اب ہم واپس نہیں جا سکتے ہیں۔ چلو ذرا اس فیلڈن کی ہمشیرہ کو دیکھتے ہیں۔ اس ذلیل عورت نے ایسا دھوکا کیا ہے ہم سے کہ ہم جان سے ہی گزر گئے تھے۔ اس ڈاکٹر نے الگ ہمیں چھیل لیا ہے۔"

"دس ہزار میں یہ سودا مہنگا نہیں ہے جیلانی! وہ ہمیں پھنسا بھی سکتا تھا۔" آبی نے اپنی ران کو دونوں ہاتھوں میں لے کر ملتے

ہوئے کہا: یار! میں کچھ کمزور ہو گیا ہوں۔ میرا خیال ہے میرا دس پاؤنڈ وزن کم ہو گیا ہے۔"

"ٹھیک ہو جاؤ گے۔ ذرا راشن ڈبل کر دو۔ ایسے جھٹکے تو اس عاشقی میں آتے ہی رہتے ہیں۔"

"مگر ایسا جھٹکا، لاحول ولا قوۃ۔ اب کیا کہو گے اس جونز سے کہ بی بی ہم عشق سے باز آئے، ہمارے پیسے واپس کر دو۔ یہی کہو گے اس سے؟"

"نہیں یار! خواہ مخواہ ذلیل نہ کر مجھے۔ میں نے کون سے پیسے دیے تھے اُسے؟"

"میرا مطلب ہے کہ پھر تم کیا کہو گے اس سے؟"

"دیکھ لوں گا میں اُسے۔ میرا نام بھی جیلانی ہے۔ عالیہ کے ساتھ اس کو بھی کوٹھے پر نچا دوں گا۔"

"ہاں! یہ ٹھیک ہے۔ اس کے پاؤں میں گھنگرو بہت سجیں گے یار! میرا اس وقت گانا سننے کو دل چاہتا ہے۔ کوئی ترکیب سوچو!"

"دُر فٹے منہ، تیرا جواب نہیں ہے۔ یعنی اب تجھے کوٹھا یاد آنے لگا، ہے نا پاگل پن کی بات۔"

"اس میں کیا ہرج ہے یار! یہ رات تو ویسے ہی بے کار جا رہی ہے۔ مجھے پتہ ہے وہاں سے ہمیں کچھ نہیں ملے گا۔ عالیہ آئی بھی ہو گی اور چلی بھی گئی ہو گی اور جونز شاید ہسپتال میں ہو۔"

"چلو دیکھتے ہیں کہ وہاں سے ہمیں کیا ملتا ہے، آؤ۔" ہم خاصے آگے تک نکل آئے تھے اور اب جونز کا گھر زیادہ دُور نہیں تھا۔

"چل بھئی! تو بھی ایک گولی کا بھوکا ہے اور میں بھی، دیکھیں یہ ہمیں کہاں ملتی ہے۔" آبی نے فضا میں رچی رات کی رانی کی خوشبو سونگھتے ہوئے کہا۔ ایسے میں وہ ہمیشہ گہرے گہرے سانس لینے لگتا تھا۔ مجھے بھی وہ نم آلود خوشبو بے حد مرغوب تھی۔

ایک دیوار کے پاس ہم دونوں رُک ہی گئے۔ اس سانسوں کو معطر کر دینے والے پھول کی خوشبو وہاں زیادہ ہی تیز تھی اور یہ پھول پھیل کر گرد و پیش کو یوں مہکا رہے تھے جیسے وہ ہمارے ہی لیے کھلے ہوں۔ کسی نے یہاں سے وہاں تک وہ پودے اُگا رکھے تھے۔ ہوا میں نمی زیادہ تھی۔ اکتوبر کا آغاز تھا اور ہمیں اب راتوں کو گرم کپڑے کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی۔ دن کو بھی کبھی کبھی یہ احساس ہوتا تھا کہ ہم مٹی کے بنے ہوئے فانی انسان ہیں۔ چند گھڑی اس دیوار کے پاس رُک کر ہم پھر آگے چل دیے۔

اس خوشبو کو سونگھ کر آبی بے طرح اُداس ہو گیا، بولا۔ "ایسی ہی خوشبو راتوں کو الماس کے پائیں باغ سے اٹھا کرتی ہے۔ آدمی سے وہ لپٹ لپٹ جاتی ہے مگر وہ کیسی عجیب عورت ہے، اس نے لوٹ کر بھی نہیں پوچھا کہ اس کا منگیتر کہاں ہے حالانکہ میری ماں بھی اس کے پاس گئی تھی۔"

"میں نے تو کہا تھا وہ عورت نہیں ہے۔ اس کے اندر مت جھانک، وہ صرف دیکھنے کی چیز ہے۔"

"ہاں، میرا بھی اب یہی خیال ہے۔ پتہ نہیں اس نے مجھ سے منگنی کا سوانگ کیوں رچایا تھا؟"

ہم اب جونز کے گھر کے قریب جا پہنچے تھے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ رات کے اس پہر وہاں پہرہ کوئی نہیں دے رہا تھا۔ تیس فٹ چوڑی سڑک ویران پڑی تھی اور دو رویہ مکان کسی نزع کا پتہ دے رہے تھے۔ کسی کسی جگہ صحن میں ایک ایک بتی جل رہی تھی جو اس ویرانی میں اور زیادہ اضافہ کرتی تھی۔ مجھے پیٹھ اونچی کرتی ہوئی قبریں اور نوحہ کرتے لوگوں سے ہمیشہ نفرت محسوس ہوتی ہے۔ وہ گلی بھی مجھے ایسی ہی نظر آتی تھی، جیسے وہ لوگ چار قل پڑھ کر سرِ شام مر گئے ہوں۔ کسی بھی کھڑکی یا چلمن سے لگا کوئی چہرہ مجھے نظر نہیں آتا تھا۔ ہو سکتا ہے یہ میرا احساس ہی ہو جو میری تنہائی کی وجہ سے فزوں تر ہو رہا تھا کیونکہ ہم تو ٹیلیویژن کے دَور سے گزر رہے تھے۔ لوگ دیر تک بیٹھے لاہور اور امرتسر کے پروگرام دیکھتے رہتے تھے اور وہاں کے مکین بھی اس راحت سے ناآشنا نہیں تھے۔ عین ممکن ہے، بدلتی رُت کے زیرِ اثر وہ گھروں کے دروازے کھڑکیاں بند کر کے پچھلے کمروں میں جا بیٹھے ہوں۔ بہرحال گلی میں ہمیں کوئی آدمی نظر نہیں آیا اور اب ہم جونز کے مکان کے سامنے جا پہنچے تھے۔

گیٹ کے سامنے رُک کر ہم نے اندر کی کیفیت کا جائزہ لیا۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ گھر کی ساری بتیاں بجھی ہوئی ہیں۔

آبی کچھ زیادہ ہی جھانجھ میں ہوتا ہے تو اس کے چہرے کی رگیں تن جاتی ہیں۔ اس نے گھر کی صورتِ حال کو سمجھتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے، وہ سب لوگ سو چکے ہیں — ہو سکتا ہے فیلڈ سے گھر آ گیا ہو؟"

"ہاں، مگر ہم جونز کو جگائے بغیر کیسے پتہ کریں گے کہ عالیہ آئی تھی یا نہیں؟"

"یار! ہم سے سخت غلطی ہو گئی۔ جونز کا فون نمبر تو نہ مجھے یاد ہے نہ تمہیں۔"

"اوئے ہوئے، یہ تو بہت بڑی غلطی ہے۔ ورنہ ہم اصل صورتحال کا باہر سے ہی پتہ لگا لیتے۔"

"کچھ نہیں یار! تیرا بھی کوئی فائدہ نہیں ہے۔ میں دستک دے رہا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے بڑی آہستگی سے اطلاعی گھنٹی پہ انگلی رکھ دی۔ نظریں ہماری گیٹ کی جھری پر لگی تھیں۔ ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے مکان کی نشست گاہ میں کچھ ہلچل ہوئی ہے۔ چند ہی لمحوں بعد ہمیں دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی مگر کسی نے یہ نہیں پوچھا کہ گیٹ پر کون ہے۔ گیراج کے فرش پر کسی کے پاؤں کی چاپ اُبھری۔ آبی کی نظر گیٹ کی جھری پر تھی۔ میں نے ایسے ہی نگاہ اٹھا کر چھت کی طرف دیکھا تو ایک سایہ سا مجھے وہاں اُبھرتا نظر آیا۔

"اوئے جھالوئیں! بیٹھ جا نیچے۔ وہ ہمارے ہی انتظار میں تھے۔" آبی نے مجھے فوراً ہی گیٹ سے پرے ہٹاتے ہوئے کہا۔ عین اسی وقت کسی نے گیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ "تڑ تڑ تڑ" ہم پر کئی گولیاں دو اطراف سے چلیں مگر ہم دیوار میں ایسے کھُب کر کھڑے تھے کہ ان کا پہلا وار خالی گیا۔ وہ آدمی جو گیٹ کھول رہا تھا، ایک دم آبی کی زد میں آ گیا۔ اس کے پاس اسٹین گن تھی جسے اس نے نکلتے ہی چلا دیا تھا مگر اس کا ہدف سامنے نہیں تھا کہ آبی کے پستول کی گولی اس کی طرف لپکی۔ اس کے ساتھ ہی چھت پر سے کسی نے مسلسل ہم پر فائرنگ شروع کر دی۔ پتہ نہیں وہ تعداد میں کتنے تھے۔ آبی نے مجھے آگے دھکیل دیا، بولا۔ "یہاں سے نکل چل۔" یہ کہہ کر اس نے اب اس آدمی پر براہِ راست گولی چلا دی اور پھر وہ اگلے مکان کی دیوار تک جا پہنچا۔ اس وقت تک ہم پر چند گولیاں چل چکی تھیں۔ میں بھی آبی کے ساتھ لگ کر اگلی دیوار تک جا پہنچا۔ درمیان میں مکانوں کو جدا کرتا ہوا ایک بڑا سا ستون کھڑا تھا۔ ہم اب اس کی اوٹ میں جا ٹھہرے۔ چاروں طرف سے لوگوں نے کھڑکیاں اور دروازے کھول لیے۔ وہ اس فائرنگ کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ستون کی اوٹ میں پہنچتے ہی میں نے سامنے کھڑے آدمی پر گولی چلا دی۔ گولی اس کے سینے میں لگی۔ مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ اسٹین گن سیدھی کر کے اس نے ہم دونوں کو ایک ہی گولی میں پرونے کی کوشش کی تھی مگر میں اسے اپنی تقدیر ہی کہوں گا کہ وہ گولی عین ہمارے بیچ میں آ لگی اور اینٹ کو پھاڑتی ہوئی اُلٹ کر سڑک پر گری۔ جیسے ہی یہ صورتِ حال ہم پر واضح ہوئی۔ ہم نے فوراً ہی بائیں طرف کے مکان کے چھوٹے سے گیٹ پر سے اندر چھلانگ لگا دی مگر ابھی ہم کچھ بھی نہ کر پائے تھے کہ جونز کے مکان پر کھڑے آدمی نے ہمیں آ لیا۔ اس کی گولیاں ہمارا راستہ یوں روکنے لگیں کہ اگر ہم اس مکان کے لان میں لیٹ نہ جاتے تو ہماری تباہی یقینی تھی۔ ایک لحظے کے لیے اس کا ہاتھ رُکا۔ وہ اندھیرے میں یہ دیکھنے کی کوشش میں تھا کہ ہم باڑھ میں کہاں جا چھپے ہیں کہ آبی نے مجھے اسی طرح باڑھ کی اوٹ میں آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ چند ہی لمحوں میں ہم مکان کے اندرونی دروازے تک جا پہنچے تھے۔ مگر بات وہاں رُکی نہیں۔ گیٹ پر کھڑا آدمی برق رفتاری سے ہمارے پیچھے لپکا، میں نے اس کو باڑھ تک پہنچتے دیکھا تو آبی کو اپنے پیچھے کر کے میں نے اب کی بار اس کی گردن کا نشانہ لیتے ہوئے گولی چلا دی اور..... اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ گولی لگتے ہی کچھ اس طرح اُچھلا کہ اس کے ہاتھ سے اسٹین گن گر گئی۔ وہ بُری طرح زخمی ہو چکا تھا۔ مکان میں جو لوگ موجود تھے انہیں گولیوں کی آواز برابر سنائی دے رہی تھی مگر وہ دروازہ کھولنے پر آمادہ نہیں تھے۔ چھت پر جو آدمی تھا، اسے اب ہم نظر نہیں آ رہے تھے۔ ہم دروازے پر سے ہٹے اور دیوار کا سہارا لے کر ان کی نشست گاہ کے سامنے سے گزرے یوں کہ ہم دونوں دوزانو ہو رہے تھے۔ ہمیں ڈر تھا کہ وہ کہیں کھڑکی کھول کر ہم پر حملہ نہ کر دیں۔ جیسے ہی ہم آگے نکلے کسی نے دوسری چھت پر سے صحن میں چھلانگ لگا دی۔ وہ آدمی اب اس شخص پر جھکا ہوا تھا، جسے میری گولی بُری طرح زخمی کر گئی تھی۔ ایک گھڑی کی مہلت ہمیں حاصل تھی۔ ہم تیر کی طرح باڑھ کی اوٹ میں بیرونی دیوار تک بڑھے اور پھر ایک دم اس پر سے کود پڑے۔

"نکل چلو یہاں سے۔" آبی نے مجھے آگے دھکیلتے ہوئے کہا۔ میرے پاؤں میں تو آگ بھر گئی تھی۔ میری رفتار اتنی تیز ہوئی کہ آبی بھی بمشکل میرا ساتھ دے سکا۔ ہم سڑک پر دیواروں کے ساتھ لگ کر مسلسل بھاگتے چلے گئے۔ ہمیں نہیں معلوم تھا کہ ہمارا مقابلہ کن لوگوں سے ہو رہا ہے اور وہ ہمارا تعاقب بھی کر رہے تھے یا کہ نہیں۔ پیچھے مُڑ کر دیکھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا مگر جلدی ہی ہمیں معلوم ہو گیا کہ ہمارے تعاقب میں دو موٹر سائیکل دوڑ رہی ہیں۔ وہ ہمیں ہر قیمت پر جھپٹ لینا چاہتے تھے۔ آبی دائیں ہاتھ کے ایک زیرِ تعمیر مکان میں جا گھسا۔

"آؤ، ہمیں یہاں رُک کر ان کا مقابلہ کرنا ہو گا۔ دو گھڑی کے لیے بھول جاؤ کہ ہم زندہ ہیں۔" اس نے اپنا پستول والہانہ انداز سے چومتے ہوئے کہا۔ اُسے یقین تھا کہ موت ہمارے عقب میں لپکی چلی آ رہی ہے۔ ہم بھاگ بھی سکتے تھے مگر وہ سڑک پر جھپٹتی گولیوں کی زد میں آ کر بے بسی کی موت نہیں مرنا چاہتا تھا۔ لیکن مجھے بھی یہی تھا کہ وہ ہمیں جانے نہیں دیں گے۔ دو رویہ مکانوں کے سبھی مکین اٹھ گئے تھے۔ کئی ایک گیٹ کھل چکے تھے اور ان میں سے مسلح لوگ باہر بھی نکل آئے تھے، مگر وہ اپنے احاطے میں ہی کھڑے تھے کہ ان کے سامنے سے دو موٹر سائیکل سوار جھاڑو تارے کی طرح اپنے پیچھے دُنبالہ دار دھُواں چھوڑتے آگے بڑھے اور پھر وہ آگے ہی بڑھتے چلے گئے۔ وہ ہمیں اس غیر آباد اور زیرِ تعمیر مکان میں جاتے ہوئے نہیں دیکھ سکے تھے۔

"ھت تیرے کی، سالے ہمیں دیکھ ہی نہیں سکے، سٹین گن لے کر نکلے تھے۔" آبی نے انہیں سڑک کے بیچ میں سے برابر برابر گزرتے دیکھ کر کہا۔

"مگر یہ ہیں کون آبی؟ ہم ابھی تک ان سے محفوظ نہیں ہیں۔"

"ذرا یہاں رُکو اور دیکھو کہ یہ لوگ کیا کرتے ہیں؟ ان کے نشانے نے تو مجھے حیران کر دیا ہے، تم نے کیسے مار لیا اُسے؟"

"پتہ نہیں۔ میں نے اس کی گردن پر گولی چلائی تھی۔ میرا خیال ہے کہ اس بدمعاش نے کوئی خاص چیز پہن رکھی تھی۔ پہلی گولی سیدھی اس کے سینے پر لگی تھی، مجھے اچھی طرح یاد ہے۔"

"ہاں میرا بھی یہی خیال ہے۔ آؤ اُدھر پیچھے سے نکل چلتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ مجھے ساتھ لے کر مکان کے عقبی حصے کی طرف چل دیا۔ مکان دو منزلہ تھا مگر ابھی تک اُوپر کے حصے میں اس کی صرف دیواریں ہی تعمیر ہوئی تھیں۔ پہلی چھت مکمل ہو گئی تھی اور سیڑھیاں بھی موجود تھیں۔ ابھی ہم اس پر قدم دھر ہی رہے تھے کہ ہمیں موٹر سائیکلوں کی آوازیں پھر سنائی دیں۔ دونوں سوار تیزی سے واپس آ رہے تھے۔ ہم فوراً ہی پیچھے ہٹے اور مکان کی عقبی دیوار تک جا پہنچے۔ موٹر سائیکل سوار آگے نکل گئے تھے اور شاید اب جو تنز کے گھر تک جا پہنچے تھے۔

ہم پچھلی دیوار پر بڑی آسانی سے کُود کر گلی میں اُتر گئے۔ وہ گلی دونوں طرف کے مکانوں کا پچھواڑا تھی اور اس میں یار لوگوں نے ڈھیر ساری غلاظت جا بجا پھیلا رکھی تھی۔ اس سے بچتے بچاتے ہم آگے نکلے اور پھر کچھ ہی دیر بعد ہم پُل پر جا پہنچے۔ وہاں سپاہی موجود تھے۔ اُن کو ہم نے درختوں کی اوٹ میں سے دیکھ لیا تھا۔ ان کو نگاہوں میں رکھتے ہوئے ہم چلتے چلتے عیسائیوں کے قبرستان میں جا پہنچے۔ اس تربے پر پہنچتے ہی میرا دم گھٹنے لگا۔ آبی بھی اس جگہ کو پہچان گیا، بولا: "ریٹا کی قبر یہیں ہے جیلانی! میں اس کے جنازے میں شامل تھا۔"

"ہاں، مجھے معلوم ہے۔" اَن گنت یادیں میرے ذہن میں کُلبلانے لگی تھیں۔ وہ پلک دریا، وہ سچی اور سیر چشم ریٹا وہاں منوں مٹی تلے سوئی تھی اور میں ابھی تک زندگی سے الجھتا پھر رہا تھا۔ اس زندگی سے جس نے سکون کا مجھے ایک پل بھی نہیں بخشا تھا۔ یہ اس بندھے پلنگ ایسا تھا جسے باندھ کر کسی نے اس کے نیچے آگ جلا دی ہو۔ بلائیں میرے پیچھے پر کما لگائے بیٹھی تھیں۔ لگتا تھا وہ مجھ پر نثار ہو رہی ہیں۔ قدم قدم پر میرے لیے اس نے پھندے گاڑ رکھے تھے اور وہ ریٹا سارے جہان سے اچھی ریٹا، اپنے پر پھیلا کر مجھ سے بہت دُور نکل گئی تھی اور میں نہیں سمجھتا تھا کہ میں جب موت کی وادی میں اُتروں گا تو وہ مجھے مل بھی جائے گی یا نہیں۔ اس کو اگلے جہان میں ڈھونڈ لینا بھی کہاں ممکن ہو گا؟ کہ وہاں تو گناہ گاروں کے ٹھٹھ لگے ہوں گے۔ ان میں ریٹا کو میں کیسے پہچان سکوں گا۔ میرے لیے اس نے کیسے کیسے دُکھ نہیں جھیلے تھے۔ اس کے قاتلوں کو تو میں نے اگلی ہی صبح ختم کر دیا تھا مگر میں اس اذیت کا مداوا کہاں سے لا سکتا تھا جو دو[...] آگے نکل گئی تھی۔ وہ ریٹا، وہ سارے جہان سے انوکھی اور [...] ریٹا۔ "مجھے بتاؤ آبی! اس کی قبر کہاں ہے؟"

"ہاں، میں نے پادری کو قبر کے لیے بھی رقم دی تھی، وہ کہیں عین وسط میں ہو گی۔" آبی نے اس گورستان [...] کر چلنا شروع کر دیا۔

اَن گنت قبریں تھیں وہاں۔ خوبصورت کتبوں سے [...] سنگِ مرمر کے وہ لہلہاتے کتبے۔ اُن کو چھونے میں ایک عجیب لُطف پنہاں تھا۔ چاند کچھ زیادہ ہی اُوپر اٹھ آیا تھا۔ تاریکی پیلی ہونے لگی تھی اور ہم دونوں قبرستان کے وسط میں ریٹا کی تلاش میں گم تھے۔ آبی کی یادداشت کام کرتی تھی۔ [...] ہی منٹ بعد اس نے مجھے ایک خراب و خستہ قبر کے سرہانے جا کھڑا کیا۔ "یہ ہے ریٹا کی آخری آرامگاہ۔ پادری سے میں نے کہا بھی تھا کہ اس پر کتبہ لگا دے اور قبر پکی بنوا دے مگر اس نے توجّہ ہی نہیں دی۔" آبی نے قبر کی مٹتی ہوئی صُورت پر رنج کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

میں نے ریٹا کی بخشش کی دُعا مانگی تو وہ بھی میرے [...] شامل ہو گیا۔ بڑی دیر تک میں خدا سے ریٹا کے لیے لطف و کرم کا تقاضا کرتا رہا کہ اس نے میرے لیے اپنی جان گنوا دی تھی۔ [...] قریب نہیں رہی تھی مگر اس کے باوجود وہ مجھے اپنی شاہ رگ سے بھی زیادہ قریب محسوس ہوتی تھی۔ میں اس کے لہو میں [...] گیا تھا اور میرا ہی نام لیتے ہوئے اس نے اپنا جسم کٹوا لیا تھا۔ [...] کی موت میرے لیے نئی زندگی کا پیام بن گئی تھی۔ میرے خون [...] اس نے ایسی حدّت بھر دی تھی کہ اس کے بدلے میں نے کئی [...] کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ وہ جو کسی کے ہاتھ نہیں [...] میرے سامنے بے بس ہو گئے کہ ریٹا کی ذلّت میں کسی بھی طرح [...] نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بلاشبہ بہت ہی باکمال عورت تھی۔ اس [...] تو پھر مجھے کوئی ملی ہی نہیں۔

دعائے مغفرت کے بعد ہم وہیں سے پیچھے ہٹ آئے [...] کی قبر پہ ہم ایک لپ مٹی بھی نہ ڈال سکے۔ ہم بہت ہی آزردہ ہو رہے تھے۔ میرے غم میں آبی بھی برابر کا شریک تھا [...] گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہم قبرستان سے واپس [...] اس نے ایک سگریٹ سُلگا کر مجھے دے دیا، بولا: "پتہ نہیں ہم [...] نکل آئے۔ معلوم ہوتا ہے ریٹا کی رُوح ہماری رہنمائی کر رہی [...]"

"ہاں، میرا بھی یہی خیال ہے۔ ورنہ ہم آج بچ کر نہیں [...] سکتے تھے۔ یہ وہی تھی جو ہمیں کھینچ کر یہاں لے آئی ورنہ [...] ہمارے پیچھے لگے تھے ان کا نشانہ خطا نہ جاتا۔" میں نے کچھ [...] پہلے گولیوں کے بے دریغ تبادلے کا منظر آنکھوں میں پھر سے اُبھرتے ہوئے دیکھا۔

"معلوم یہ ہوتا ہے کہ وہ ہمارے ہی انتظار میں تھے۔ تمہارا کیا خیال ہے، عالیہ وہیں ہو گی؟"

"نہیں، وہ اتنی ساری دہشت قبول نہیں کر سکتی تھی۔ آؤ، میرا خیال ہے ہم گلبرگ چلتے ہیں۔ شاید وہ اپنے گھر پر ہو۔ مجھے اس جو تنز کی بات پر شک ہے۔ دھمن اور عالیہ میں ناچاقی ہو ہی نہیں سکتی۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو جیلانی! مگر مجھے سخت نیند آ رہی ہے کوئی جگہ دیکھو، میں سو جانا چاہتا ہوں۔"

"نیند تو مجھے بھی آ رہی ہے مگر جائیں گے کہاں؟"

"دیکھو اگر ہمیں اس کوٹھڑی میں جگہ مل جائے تو ہم یہیں سو رہیں۔" اُس نے قبرستان کے کونے میں بنی چوکیدار کی کوٹھڑی کی طرف اشارہ کیا۔ ہم اس وقت تک گھنے درختوں کے جھنڈ تلے پہنچ چکے تھے۔ چوکیدار کی کوٹھڑی وہاں سے صاف نظر آ رہی تھی۔

"ہم لکھ پتی آدمی ہیں آبی! اور تو اس جھونپڑی میں رات گزارنے کی سوچ رہا ہے۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے یار! مجھے تو لگتا ہے وہ روپیہ ہمارے کسی کام نہیں آ سکے گا۔ کسی دن کراچی جا کر میں وہ رقم لاہور لے آؤں گا اور اپنی ماں کے نام منتقل کر دوں گا۔ کسی کے کام تو آئے گی۔ ورنہ تو پتہ نہیں کسی وقت کیا ہو جائے۔"

ہمارے قدم اب اس کوٹھڑی کی طرف بڑھ رہے تھے ——

"ہاں —! جیسے ہی فرصت ملے، تم کراچی چلے جاؤ۔ میں بھی رقم ماں کے نام منتقل کر دوں گا۔" مجھے اس کی تجویز اچھی معلوم ہو رہی تھی۔ مگر اپنی ماں کو میں جس حال میں دیکھ آیا تھا۔ اس سے تو میں یہی نتیجہ اخذ کر سکا تھا کہ میرے اور اس کے درمیان صدیوں کا فاصلہ حائل ہو چکا ہے۔ اُسے یاد بھی نہیں رہا تھا کہ اس نے کسی غلام جیلانی کو بھی جنم دیا تھا۔ مجھ سے وہ یوں بات کر رہی تھی، جیسے میں کوئی دُور پار کا رشتہ دار ہوں۔ پتہ نہیں اس نے کون سی 'چُپ جی' پڑھ لی تھی۔ رشتوں پر سے اس کا اعتبار ہی اُٹھ گیا تھا۔

ہم کوٹھری کے دروازے پر جا پہنچے تھے۔ کُنڈی اندر سے بند تھی اور اس وقت رات کا ڈیڑھ بج چکا تھا۔ نیند ہمیں بُری طرح نرغے میں لے چکی تھی۔ لگتا تھا ہمیں کوئی بھی جگہ ملی تو ہم وہیں پر ڈھیر ہو جائیں گے۔

آبی نے دستک دی تو تیسری آواز پر کسی نے اندر سے پوچھا۔ "کون ہے اوئے؟ کیوں بُوہا توڑتے ہو؟"

"دروازہ کھول یار! ایک ضروری کام ہے تجھ سے۔"

"کوئی مُردہ لائے ہو؟" اس نے بستر سے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں، تیری مدد کی ضرورت ہے ہمیں۔ مُردہ پوری طرح مر نہیں رہا ہے۔" آبی نے اسی کے لہجے میں جواب دیا۔

کُنڈی کھلی تو ہمیں سامنے ایک موٹا تازہ آدمی دروازے میں کھڑا نظر آیا۔ اس نے کھیس بدن پر لپیٹ لیا تھا۔

"کیا بات ہے میاں جی؟"

"یار! تجھے ہم نے بڑی تکلیف دی۔ تیرے پاس کوئی جگہ تو ضرور ہو گی۔ ہمیں سخت نیند آ رہی ہے۔"

"پر تم ہو کون؟ یہاں کیوں آئے ہو؟"

آبی نے اسے دروازے سے پرے ہٹاتے ہوئے کوٹھری کے اندر قدم رکھ دیا۔ "آ جا یار! کوٹھری میں ایک چارپائی اور بھی موجود ہے۔ آ جا اندر۔" آبی نے جاتے ہی لالٹین کی بتّی اُکسا دی۔

"مگر یہ کیا طریقہ ہے بھاجی! کیوں گھسے آئے ہیں اندر۔ کوئی واردات کر کے آئے ہو؟"

"نہیں یار! کیا نام ہے تیرا؟ دراصل ادھر ہماری چار پھوپھیاں دو مامیاں اور تین بھتیجیاں دفن ہیں۔ اُن کی فاتحہ کے لیے ہم یہاں آئے تھے۔ اتنے سارے رشتہ داروں کو یہاں ویرانے میں چھوڑ کر ہم کیسے واپس جا سکتے ہیں۔ بتا بھلا؟" آبی نے اس کا لحاف پائنتی کی طرف پھیرتے ہوئے کہا۔ اب وہ بستر پر پھیل کر لیٹ چکا تھا۔

"یہ کیا بدمعاشی ہے بھاجی! مان نہ مان میں تیرا مہمان!"

"کوئی بات نہیں ہے بھائی! ذرا سی رات باقی ہے۔ وہ ہم یہاں گزار لیں گے۔ کوئی چائے شائے بن سکتی ہے یہاں؟" میں نے اس کے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ وہ بھاری بھرکم ڈیل ڈول کا آدمی تھا۔ پلٹ کر پیچھے تو آیا مگر وہ غضبناک ہو رہا تھا۔

"کوئی ہوٹل کھول رکھا ہے میں نے؟ کیا سمجھا ہے آپ نے مجھے؟"

"نہیں یار! ایسا سلوک نہ کر ہم سے۔ بیٹھ جا، تو کب سے یہاں نوکری کر رہا ہے؟ یہ چارپائی سیدھی کر کے کوئی بستر بچھا دے یہاں۔ ہم بہت تھکے ہوئے ہیں۔"

"میں تم دونوں پر لعنت بھیجتا ہوں، نکل جاؤ یہاں سے۔ ورنہ اچھا نہیں ہو گا۔" اب وہ واقعی بہت زیادہ طیش میں آ چکا تھا۔

"اس کو گولی مار دے یار! کر دے ٹھنڈا اسے، یہ چوہڑے کا پتر سیدھا ہی نہیں ہو رہا ہے۔"

آبی کی یہ بات سنتے ہی میں نے بڑے اطمینان سے اس کی گردن پر ہاتھ رکھا تو میری انگلیاں گدّی میں دھنس گئیں۔ اس کو میں نے بُرجی سے نیچے گرا دیا تھا۔ رگِ احساس پر میرا دباؤ بڑھا تو وہ جھول کر فرش پر اوندھا جا پڑا۔ اس کا یہ علاج بہت ضروری تھا ورنہ وہ ساری رات بھونکتا رہتا۔ اس کو ٹانگ سے پکڑ کر میں نے دیوار کے ساتھ لگایا اور پھر ہم دونوں چارپائیوں پر بستر بچھا کر لیٹ گئے۔ بڑی

اتنی زیادہ نہیں تھی کہ لحاف کی ضرورت پڑتی۔ ایک ایک کھیس ہی ہمارے لیے کافی تھا۔ کوٹھری اندر سے بھی پختہ تھی اور اس کے عقب میں خاصا بڑا روشن دان بنا ہوا تھا۔ وہ ہم نے کھول لیا اور پھر اندر سے کنڈی چڑھا کر ہم اطمینان سے سو گئے۔

ایک عرصے کے بعد وہ پہلی سکھ کی نیند تھی جو ہمیں مل سکی۔ بہت چین تھا وہاں۔ چاروں طرف اس ترپے میں کوٹھری کے گرد مُردوں کا پہرہ تھا اور ہم وہاں ایسی چین کی نیند سوئے کہ اس رات کے ایک ایک پل نے ہمیں خوش کر دیا۔ اس رات پھر مسند آرا میرے خوابوں میں ابھر آئی۔ یہ اس کی عادت تھی۔ مجھے جس بستر پر بھی آرام ملتا تھا وہ وہیں آ جاتی تھی۔ وہ بہت خوش تھی، ہنستی مسکراتی وہ کبھی یوں نکلتی دکھائی دیتی تھی، کبھی یوں۔ کتنی ہی دیر تک وہ میرے خوابوں میں اُدھم مچاتی رہی۔ میرا خیال ہے کہ صبح ہو چکی تھی جب اس کے گیت اور واضح ہوئے، جب اس کی باہیں اور کھل گئیں تو میں خواب سے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ مسند آرا پھر نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی اور مجھے اس کے کھو جانے کا قلق تھا، بے حد قلق تھا۔ مگر اس کی عادت کو میں سمجھتا تھا۔ وہ مجھے آرام کی حالت میں دیکھتی تھی تو پہروں تک مجھے بے آرام کرنے کے لیے میرے خوابوں میں در آتی تھی۔ ایک بار پھر میں نے اس کے تصور سے جان چھڑانے کے لئے سر کو جھٹک دیا۔ اس شراب کے چھوٹے بطک ایسے شیشے کو میں کہاں تک سنبھال کر رکھتا۔ وہ لبنیٰ کی مانند میرے حواسوں پر چھا جاتی تھی۔ اس کی دو گھڑی کی وہ ملاقات مجھے پہروں ملول رکھتی تھی اور یہی میں نہیں چاہتا تھا۔ میں حقائق سے سر پھوڑنے والا آدمی بھلا کہاں اس کو خوابوں میں ڈھونڈتا رہتا۔ مگر اس نے اپنی یاد میرے ذہن میں تازہ کر رکھنے کا یہی ایک طریقہ اپنا رکھا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ اس کے چہرے کی وہ بے مثال تازگی، اس کی آنکھوں کی وہ سرخوشی اور سرمستی، اس کے شباب کا وہ جوالا مکھی مجھے مسلسل اپنی طرف بلا رہا تھا۔ وہ اشاروں ہی اشاروں میں مجھے اپنی طرف کھینچتی تھی مگر میں نے ذہن سے اس کا خیال پھر سے جھٹک دیا۔ زندگی اتنی فرصت ہی نہیں دیتی تھی کہ میں اس کے پیچھے بھاگ سکتا اور اب کی بار تو مجھے یہ اندیشہ پیدا ہو چلا تھا کہ ہمارے قاتل ہمیں بچ کر جانے نہیں دیں گے۔ جن لوگوں نے ہمارا اس رات تعاقب کیا تھا اُن کی سخت جانی نے مجھے حیران کر دیا تھا۔

ابھی چھ ہی بج رہے تھے۔ دو گھڑی کی نیند نے مجھے تازہ دم کر دیا تھا۔ میں نے آبی کو جگا دیا۔ وہ لمبی سی چیتے ایسی انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھا، بولا "یار! تم نے اتنی جلدی مجھے جگا دیا ہے کیا ٹائم ہو گا اس وقت؟"

"بس اٹھ جا اب، ہمارا یہ مقتول ابھی تک بے ہوش ہے۔"

"تیرے صدقے جاواں، ایسا علاج کرتا ہے ناتُو ... کا کہ اس کا کلیجہ بھی نکال لو تو اُسے پتہ نہیں چلتا ہے۔"

"یہ بہت ضروری تھا آبی! ورنہ یہ ہمیں یہاں سونے نہ دیتا۔ اُٹھ جا اب۔" میں نے اپنے بوٹ کے تسمے بند کر لیے۔

وہ بھی بستر چھوڑ کر اٹھ بیٹھا اور دروازے کے باہر ... کنڈی اس نے کھولی تو تازہ ہوا کا ایک شبنم آلود جھونکا اندر ... آبی نے صبح کی فضا میں گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے کہا ... بات ہے جیلانی! کہ ہم ابھی تک زندہ ہیں۔"

"تیرا کیا خیال ہے، تیرا آخری وقت آ چکا تھا ... میرا خیال ہے یہاں دودھ بھی موجود ہے۔ چائے پک سکتی ہے ..." چوکیدار کے برتنوں کو دیکھ کر کہا۔ کھانا پکانے کا سارا ہی سا ... وہاں موجود تھا اور تمام برتن دُھلے ہوئے تھے۔ چولھے کے ... لکڑیاں بھی دھری تھیں۔

اس نے لکڑیاں جلا دیں۔ کوٹھری میں ایک گھڑا بھی ... تھا۔ اس میں سے پانی لے کر اس نے چولھے پر رکھ دیا۔

"اس سالے نے تو سارا ہی انتظام کر رکھا ہے یہاں ... ہمیں جگہ دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ یہ کب تک ہوش میں ... گا؟" آبی نے اس کی نبض ٹٹولتے ہوئے کہا۔

"دو ڈھائی گھنٹے تو اُسے مزید لگ ہی جائیں گے۔ ہم ... پی کر نکل چلتے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"یار! یہ بھی تو سوچ کہ اس کے برتنوں میں ہم چائے پئیں ..."

"سب جائز ہے۔ کُلُّ مومنٌ اِخوَۃ۔"

"یہ کہاں کا مومن ہے سالا۔ سیدھا دوزخ میں جائے گا۔"

"چل دفع کر، تو چائے بنا۔ میں منہ ہاتھ دھو لوں۔" ...

میں نے اس کے گھڑے میں سے پانی انڈیل کر دیں منہ ہاتھ ...

جب ہم چائے پی چکے تو آبی نے بڑے زور شور سے ایک لا... چوکیدار کی کمر میں رسید کی اور اسے لمبی چوڑی بامعنی گالی ... کوٹھری سے باہر نکل گیا۔ میں نے بھی دروازہ اپنے پیچھے بند ... اس کے ساتھ بھرے پڑے آباد شہر کے ویران راستوں پر چل ...

ہمیں ایک نئے دن کا سامنا تھا۔ ایک نئے عذاب ... گزرنا تھا اور ہمیں نہیں معلوم تھا کہ اس دن کی شام ہمیں زمین ... اوپر آئے گی یا اس کے نیچے۔ پولیس کے خوف نے ہمیں ... کر رکھا تھا۔ کوئی بھی غیر معمولی لمحہ ہماری گرفتاری کا سبب ... ہم دونوں کی جانیں قانون کے ہاتھوں میں گروی رکھی ہوئی ... بہت سے لوگوں کا خون ہمارے سر پر تھا اور خون تو بولتا ... آواز دیتا ہے کہ قاتل کو پکڑ لو۔ یہی ہے وہ اسے گرفتار ... کو کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ اس کی بغل کا دشمن اس کا ...

پر بہنہ کر دیتا ہے۔ مجھے بھی یہی ڈر تھا۔ میں بہت ڈھارس دیتا تھا دل کو کہ سب کچھ اندر ہی اندر فنا کر دو، ضمیر کی بات نہ سنو۔ سمجھو اس نام کی کوئی شے ہوتی ہی نہیں ہے مگر وہ تو موجود تھا۔ ہمہ وقت میری نگرانی کرتا تھا۔ میرے ہر عمل کو پرکھتا تھا۔ میں اس کا گلا کیسے گھونٹ دیتا۔ مگر ابھی تک اس کو میرے سامنے آ کر مجھے للکارنے کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔ میں ابھی تک اپنے بس میں تھا۔

"چل آبی! کوئی ٹیکسی پکڑ کر ہم ابھی گلبرگ چلتے ہیں۔"

"کیا کرے گا تو وہاں جا کر ـــ مجھے لگتا ہے کہ اب کی بار وہ پہلے سے کہیں زیادہ خطرناک ہو کر واپس آئی ہے۔ آتے ہی اس نے ڈھلوں صاحب کو ذلیل کر دیا ہے۔ پتہ نہیں وہ ہمارے ساتھ کیا کرے؟"

"میں ڈھلوں صاحب کا ہی تو پتہ کرنا چاہتا ہوں۔"

"یار! وہ کہہ رہی تھی.... وہ جونز، کہ شاید اس نے اپنے تینوں ساتھیوں کو چوگوٹھ سے رہا بھی کروا لیا ہو۔ اس بات پر غور نہیں کیا ہے تم نے؟"

"وہ کہہ تو یہی رہی تھی۔ مگر وہاں وہ کیسے جا سکتے ہیں؟"

"میرا خیال ہے ہمیں سیدھا چوگوٹھ چلنا چاہیے۔"

"آؤ کسی جگہ سے کامران ہوٹل فون کرتے ہیں۔ وہاں سے ہمیں پتہ مل جائے گا کہ وہ لوگ کہاں ہیں؟"

"ہاں، یہ بہتر رہے گا۔" یہ کہہ کر اس نے ایک ٹیکسی روکی اور ہم اس میں بیٹھ کر اسٹیشن جا پہنچے۔ کامران ہوٹل وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اسٹیشن کے احاطے سے ہمیں فون کی سہولت بھی مل سکتی تھی۔ آبی کے پاس سگریٹ ختم ہو گئے تھے۔ ایک جگہ رُک کر اس نے چار پیکٹ خریدے اور پھر ہم ٹیلی فون بوتھ کی طرف چل دیے۔ آبی دروازے پر کھڑا رہا اور میں اندر چلا گیا مگر شیشے میں سے میری نظریں سامنے کے مسافر خانے پر جمی تھیں۔ وہاں کئی سپاہی بلا وجہ گھوم رہے تھے۔ اُن کے ساتھ ریلوے کے سپاہی بھی موجود تھے۔ آبی کی نگاہ میں بھی وہ لوگ بہت ہی مشتبہ حالت میں پھر رہے ہیں۔ آبی پر دو سپاہیوں کی نظر پڑی مگر وہ پھر دوسری طرف متوجہ ہو گئے۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ ہم وہاں سے نکلتے ہی اپنا لباس تبدیل کر لیتے۔ ہم ضرورت سے کچھ زیادہ ہی گندے ہو رہے تھے اور ہماری وو آن بان بہت پھیکی پڑنے لگی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ہم دونوں کے اندر کا پیالہ بھر چکا ہو۔ دونوں کے پیٹ کمر سے جا لگے تھے۔ میں نے سپاہیوں پر سے نظر ہٹا کر کامران ہوٹل میں فون کیا تو ریسیور اٹھاتے ہی کوئی بولا۔ "کامران ہوٹل ـــ"

"کون صاحب بول رہے ہیں؟"

"میں خورشید احمد بول رہا ہوں جناب! فرمائیے۔"

"برادر! وہ اپنے ولایت علی صاحب موجود ہیں؟"

"جی..... جی نہیں۔"

"کہاں ہوں گے وہ؟"

"آپ کون صاحب ہیں؟"

"میں ارشد منصور بول رہا ہوں، اُن کا دوست۔ کراچی سے یہاں آیا ہوں، ان کے گھر کا پتہ معلوم ہو تو بتا دیں۔"

"دیکھیں جناب! وہ..... وہ اس وقت کلینک میں داخل ہیں۔ دراصل وہ سخت بیمار ہیں۔"

"کیا ہوا ہے انہیں؟ یہ تو بہت بُری خبر سنائی ہے آپ نے۔ کس کلینک میں ہیں وہ؟"

"وہ شفایار کلینک میں داخل ہیں۔"

"ان کے دوست تاجور یہاں تھے، ان سے ہی ملا دیں۔"

"جناب! وہ بھی وہیں ہیں۔ انہیں بھی وہی مرض لاحق ہے جو ولایت علی صاحب کو ہے۔ شراب نے ان کا ستیاناس مار دیا ہے۔ انہیں آپ وہیں دیکھ سکتے ہیں۔"

"آپ کون ہیں برادر! میرا مطلب ہے کہ آپ کا عہدہ؟"

"میں یہاں کا نیا منیجر ہوں جناب! آپ تاجور سے بھی وہیں مل سکتے ہیں۔"

"اچھا بھائی! بڑی مہربانی آپ کی۔ میں ان سے وہیں مل لیتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔

جب میں باہر نکلا تو آبی بولا "یہاں سے نکل چلو یار! یہ سپاہی مجھے بہت مشکوک نظر آتے ہیں۔ پتہ نہیں کس کی تلاش میں ہیں یہ؟"

"ہاں! ان کے طور طریقے مجھے بھی اچھے نہیں لگتے۔ مگر ابھی ہم سب سے پہلے اپنا یہ لباس تبدیل کریں گے۔ ان کپڑوں میں تو ہم بالکل ہی پاگل لگتے ہیں۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔ آؤ انارکلی چلتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ مجھے اپنی اوٹ میں لے کر اسٹیشن کے احاطے سے باہر نکل آیا۔

ٹیکسی سامنے ہی موجود تھی۔ ہم اس میں بیٹھے اور انارکلی جا اُترے۔ راستے میں آبی نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا کہ مجھے فون پر کیا اطلاع ملی ہے۔ جب ہم نے انارکلی میں پہنچ کر ٹیکسی چھوڑی تو وہ بولا "فون پر کون ملا تھا تجھ سے؟"

"چلو کسی ہوٹل میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔ دکانیں تو ابھی کھلی ہی نہیں ہیں۔" یہ کہہ کر میں آبی کو ساتھ لے کر ایک معروف ہوٹل میں جا گھسا۔ ناشتے کا آرڈر دے کر ہم بڑے سے ہال کے ایک کونے میں جا بیٹھے۔

آبی کے سگریٹ ہر جگہ کام آتے تھے۔ وہ اس نے اپنے سامنے ڈال لیے اور سر کرسی کی پشت پر کسی تھکے ہارے آدمی کی طرح جما کر بولا "اب بتا کہ ہوا کیا تھا؟ ولایت علی کے بارے میں کیا پتہ چلا؟"

"غضب ہو گیا ہے آبی! ان لوگوں کو چوگوٹھ سے کسی نے رہا کروا لیا ہے۔ پتہ نہیں یہ سب کچھ ہو کیسے گیا ہے؟"

"کیا خیال ہے، یہ کام بدری کا نہیں ہے؟"

"مجھے بھی یہی شبہ ہے۔ اس کا اعتبار وہاں پر اب بھی قائم ہے۔"

"کیا خیال ہے ہم ابھی چوگوٹھ نہ چلیں۔ ہمیں بدری کو بےنقاب کر دینا چاہیے۔"

"ہاں! یہ بہت ضروری ہے۔ وہ ولایت علی اب شفا بار کلینک میں داخل ہے اور تاجور اور رشید بھی۔ نیا منیجر خورشید احمد بتا رہا تھا کہ ان کو شراب لے ڈوبی ہے۔"

آبی ہنس دیا، بولا "شراب کہ بھنگ! میرا خیال ہے۔ برکت نے ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا ہے۔"

"یہ تو ظاہر ہی ہے ـــــ بھنگ واقعی بہت خطرناک چیز ہے آبی! آدمی کی عقل پر زنگ چڑھا دیتی ہے۔"

کتنی ہی دیر تک ہم ہوٹل میں بیٹھے اس صورتِ حال پر غور کرتے رہے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ڈھلوں صاحب کی اس مصیبت کا علاج کیا ہے۔ انہیں عالیہ نے خدا جانے کہاں رکھا ہوا تھا۔ ہمیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ زندہ بھی ہیں کہ نہیں۔ ان کا قصور تو صرف یہ تھا کہ وہ میرے پشتیبان تھے، میری آخری پناہ گاہ تھے۔ مجھے انہوں نے ایسے وقت میں اپنی باہوں میں لے لیا تھا جب آبو بھی میرا دشمن بن چکا تھا اور مجھ سے اس نے چوہدری ہادی علی کو قتل کروا دیا تھا۔ میری انٹی کے ایک ایک تار کو حوادث نے الگ کر دیا تھا اور کوئی ایسا نہ تھا جو میری بکھری ہوئی ذات کو یکجا کر سکے۔ میرے پھول تو وہیں جا کے ہمیش چڑھے تھے۔ میں ان کو یوں ضائع ہوتے کیسے دیکھ سکتا تھا اور عالیہ نے پہلا شکار انہی کے سر کھیلا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے اتنے سارے آدمی کس کی بھینٹ چڑھے ہیں۔ آخری وار ہم نے ولایت علی اور تاجور پر کیا تھا اور اسے معلوم تھا کہ ان لوگوں کو ہم نے کہاں رکھا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ کس طرح ڈھلوں صاحب نے کراچی جا کر میرے بارے میں استفسار کیا تھا اور وہ کتنے اثر و رسوخ کے مالک تھے۔

دن کچھ زیادہ روشن ہوا تو انارکلی کی دکانیں کھلنے لگیں۔ ہم نے ہوٹل سے اٹھ کر اپنے لیے عمدہ قسم کے سلے سلائے سوٹ خریدے اور ان کے سیاق و سباق کو ساتھ لے کر ہم پھر ایک ہوٹل کے کیبن میں جا بیٹھے۔ جہاں ہم نے کپڑے تبدیل کیے اور ایک دم نئے لباس پہن کر ہم بازار میں جا نکلے۔ پرانے کپڑے ہم نے تہہ کر کے ہوٹل میں ہی پھینک دیے تھے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ ہم مناسب اسلحہ کہاں سے حاصل کریں۔ اپنے پاس تو اس وقت معمولی قسم کے پستول تھے، جن پہ ہم کسی بھی طرح بھروسہ نہیں کر سکتے تھے۔

"تیرا کیا خیال ہے آبی؟ اسلحہ ہمیں کہاں سے مل سکے گا؟"

"ہاں! یہ سوال تو بڑا اہم ہے۔ مگر ٹھہرو، میرا خیال ہے کہ اُدھر لنڈے بازار کے پیچھے تاجیے کا ایک دوست رہا کرتا تھا۔ اگر وہ وہیں ہے تو اس سے ہم ہر قسم کے ہتھیار لے سکتے ہیں مگر رقم وہ بہت زیادہ لیتا ہے۔"

"اس کی فکر نہ کرو۔ پیسہ تو ہمارے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔"

"تو پھر چلو! سمندر خان مل جائے تو ہمارا کام ہو جائے گا۔ ایک دم فرسٹ کلاس آدمی ہے وہ۔" آبی نے ایک رکشا روکا اور ہم اسی وقت سیدھے لنڈے بازار جا پہنچے۔ آبی نے مجھے پان کی ایک دکان کے سامنے کھڑا کیا اور خود سامنے کے چوبارے پر جا چڑھا۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد جب وہ لوٹا تو اس نے ایک تھیلا اٹھا رکھا تھا۔

مجھے دیکھ کر اشارے سے اپنے پیچھے آنے کا کہہ کر وہ تیزی سے ایک رکشے کی طرف بڑھ گیا۔ جب میں اس کے پاس جا بیٹھا تو وہ بولا "یہ لاہور ہے پیارے! یہاں پے سے بندوق اور تمنچے سے تلوار بنانا کچھ مشکل نہیں۔ بس صرف تھوڑی سی پیسے کی ضرورت ہے۔"

"کام بن گیا ہے نا؟"

"ہاں! اسٹین گن اور پستول۔ بےآواز پستول پلس گولیاں، ڈھیر ساری گولیاں۔" اس نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

ڈرائیور کچھ نہیں سن رہا تھا۔ پھر بھی اس سے احتیاط لازم تھی۔ چند قدم آگے جا کر اس نے رکشا روک لیا، بولا "آؤ ذرا ایک ایک اوورکوٹ مزید لیتے ہیں۔ آج تو بارش کا بھی امکان ہے اور سردی بڑھ رہی ہے۔"

سائز میرا اس کا برابر ہی تھا۔ میں رکشے میں ہی بیٹھا رہا اور وہ دو بہت خوبصورت قسم کے اوورکوٹ لے آیا۔ ان میں سے ایک نیلا تھا اور دوسرا بھورے رنگ کا۔ یہ بہت اچھی بات تھی۔ اپنے ہتھیار ہم ان کوٹوں میں بہت عمدگی سے چھپا سکتے تھے۔ اب کی بار میں نے کمبل کا ٹنٹا ہی ختم کر دیا تھا۔ سردیاں اب اسی کوٹ میں گزر سکتی تھیں۔

رکشہ ہم نے شفا بار کلینک سے ذرا اُدھر چھوڑا اور درختوں کی گھنی اوٹ میں جا کر ہم نے وہ کوٹ پہن لیے۔ وہ ہمیں ایسے سجے کہ ہم سمجھے ابھی ابھی ہم امریکہ کی سیر سے واپس آئے ہیں۔ ان کے اندر بھی جیبیں تھیں اور باہر بھی۔

آبی نے مجھے ایک بےآواز پستول اور ایک اسٹین گن تھما دی۔ ان کی گولیاں بھی وہ ساتھ لایا تھا۔ اپنے کوٹ کے اندر ہتھیار سجا کر وہ دھن سیٹھوں ایسی انگڑائی لیتے ہوئے بولا "انگریزوں کی ایسی تیسی! ذرا دیکھ تو کیسا لگ رہیا اوں اس کوٹ میں؟"

"اپنے طلیئر! تیرا جواب نہیں ہے۔ اک تیری کمر ذرا زیادہ نازک ہوتی تو وہ تجھے نخیتے سمجھ کر اٹھا لے جاتے۔ یہ ہتھیار اچھی طرح لبالب بھر لے۔ کچھ پتہ نہیں اندر کیا حالات ہو جائیں۔"

"وہ میں نے پہلے ہی بھر لیے تھے۔ مگر یار! اس شفا بار کلینک پر ڈاکٹر رحمٰن کا نام تو نظر نہیں آتا۔" اس نے شفا بار کے گیٹ پر لگے بورڈ کو گھورتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ یہ کلینک اس نے کسی کے ہاتھ بیچ دیا ہوگا۔ آداب! مگر ہمیں بڑی احتیاط سے کام کرنا ہوگا۔"

"مگر وہ کام کیا ہے؟ پہلے تو یہ طے کر لو کہ ہمیں اندر جا کر کیا کرنا ہے؟"

"میں طویل عرصے بعد اس کلینک کی طرف جا رہا ہوں۔ عالیہ ملے تو اسے دبوچ لو۔ ولایت علی اور تاجور نظر آئیں تو ان کو ساتھ لے چلو۔ کسی نہ کسی کی گاڑی تو موجود ہی ہوگی۔"

"مگر یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے جیلانی! ان پر ہمیں بےخبری میں حملہ کرنا چاہیے۔ سب لوگوں کو آواز دے کر، ان کو للکار کر ہم کسی بھی طرح کامیاب نہیں ہو سکتے۔ میرا خیال ہے ہمیں رات کو ادھر آنا چاہیے۔"

"تو پھر میں کیا کروں؟ میرے سینے میں آگ لگی ہے آبی! میں ان دونوں کا وجود برداشت نہیں کر سکتا۔"

"ذرا صبر سے کام لو۔ کسی جگہ سے ہم فون پہ ان سے رابطہ قائم کرتے ہیں۔ یوں اندھا دھند آگے بڑھنا ٹھیک نہیں ہے۔"

"تو پھر کیا کریں ہم؟ کسی اور کو اس طرف بھیجیں؟" میں نے آبی کی بات پر قائل ہوتے ہوئے کہا۔

"نہیں! ہم خود یہ کام کریں گے مگر ذرا صبر سے۔ ہمیں چاہیے تھا کہ صبح سیدھے شفا بار فون کرتے۔ مگر اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ ان سے اب بھی بات ہو سکتی ہے۔" آبی نے کہا۔

"نہیں، وہ چونک جائیں گے اور یہی میں نہیں چاہتا۔"

"تو پھر ایک ترکیب اور ہو سکتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ بدری ابھی تک حویلی میں موجود ہوگا۔ وہ ان سب کو دھوکا دے رہا ہے کہ وہ ان کا ہمدرد ہے۔ اور ڈھلوں صاحب کا ملازمِ خاص۔ اگر وہ وہیں ہے تو ہم اس کو باندھ کر ادھر لے آتے ہیں۔ وہی ہمیں بتلائے گا کہ وہ لوگ کہاں ہیں۔"

"ارے! یہ بات تو میرے ذہن میں آئی ہی نہیں۔ جونہ کے کہنے کے مطابق وہ تو ابھی تک ان کو دھوکا دے رہا ہوگا۔ مگر یار! اسے معلوم ہے کہ وہ ہمارا سامنا نہیں کر سکے گا۔" میں نے خدشہ ظاہر کیا۔

"اسے تو یہی معلوم ہوگا نا، کہ ہمیں ساری بات کا علم نہیں ہے۔ جونہ کہاں اسے جا کر بتا سکی ہوگی کہ ہم بھی اس کے پیچھے لگے ہیں۔"

"ہاں! یہ بھی ٹھیک کہتے ہو تم! چلو پھر ہم ابھی چوگوٹھ چلتے ہیں۔ اس عالیہ سے ہم شام کو ہی نپٹ لیں گے۔"

یہ کہہ کر ہم نے چند قدم آگے نکل کر ایک ٹیکسی لی اور اسے ہم نے پتوکی چلنے کے لیے کہا۔ ڈرائیور مان گیا اور ہم اس میں بیٹھ کر اسی وقت چوگوٹھ چل دیے۔ ہمیں واقعی اب کی بار بہت سوچ سمجھ کر اس معاملے میں ہاتھ ڈالنا چاہیے تھا۔ ہمارے دونوں مجرم لاہور میں موجود تھے۔ اپنے تینوں آدمیوں کو بھی وہ چوگوٹھ سے رہا کروا چکے تھے اور ہمیں ان سے ایک ایک زخم کا حساب لینا تھا۔

ٹیکسی ہم نے چوگوٹھ پہنچ کر چھوڑ دی۔ معاوضہ ہم نے اسے اتنا دے دیا کہ وہ ہمیں دعائیں دیتا ہوا رخصت ہو گیا۔ جب ہم حویلی کے دروازے پر پہنچے تو برکت اور برکی ہمیں کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے ملے۔ وہ اندر کرسیوں پر بہت ہی پژمردہ حالت میں بیٹھے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ برکت نے بڑے تپاک سے ہمیں سلام علیکم کیا۔ برکی بھی ہمیں بڑے شوق سے ملا۔ جب ہم کرسیوں پر بیٹھ چکے تو برکت بولا "آپ کہاں چلے گئے تھے خان جی؟ آپ کو کچھ پتہ بھی ہے کہ ہوا کیا ہے؟"

"ہاں! ہمیں معلوم ہو چکا ہے برکت! مگر یہ سب ہوا کیسے؟ ہمیں تو ڈھلوں صاحب کی ابھی تک کوئی خبر نہیں مل سکی۔ اور اب سنا ہے کہ....."

"آپ نے ٹھیک سنا ہے خان جی! ان تینوں آدمیوں کو کسی نے یہاں سے نکال لیا ہے اور بدری کو یہ شک ہے کہ یہ سب کام کسی ایسے آدمی نے کیا ہے جو حویلی کے ہر راز کو جانتا ہے۔"

"بدری ٹھیک کہتا ہے برکت! مگر وہ خود کہاں ہے اب؟"

"وہ اپنے کمرے میں ہے۔ کہہ رہا تھا کہ دو گھڑی آرام کر لوں پھر کسی طرف نکلتے ہیں۔"

"پولیس بھی یہاں آئی تھی؟"

"جی ہاں! کئی بڑے بڑے افسر یہاں آ چکے ہیں۔ مگر ان تین آدمیوں کے بارے میں ہم نے کسی کو کچھ نہیں بتایا ہے۔ میرا تو خیال ہے خان جی! کہ یہ سب انڈیا والوں کی شرارت ہے۔ آپ نے ہی بتایا تھا کہ وہ لوگ ہمارے کچھ آدمیوں کو ختم کرنا چاہتے ہیں؟"

"یہ بات نہیں ہے۔ ہمارے دشمن کوئی اور ہی ہیں۔ آؤ ذرا ہمیں بدری سے ملوا دو۔" میں نے آبی کو اپنے ساتھ لیا اور برکت کے

ہمراہ ہم حویلی کے اندر جا پہنچے۔ بدری کو ان لوگوں نے بہت عمدہ کمرہ دے رکھا تھا۔ حالت یہ تھی کہ فرش پر اس نے گہرے سُرخ رنگ کا قالین بھی بچھا دیا تھا۔ اس کا بستر بھی اس کی شہنشاہی کا مظہر تھا۔ کمرے میں ایک طرف صوفہ اور دوسرا ساز وسامان بہت قرینے سے لگایا گیا تھا اور بدری اس وقت کمبل اوڑھے بے سُدھ پڑا تھا۔ دروازہ اس نے اندر سے بھیڑ رکھا تھا۔ جیسے ہی ہم دروازہ کھول کر اندر پہنچے، وہ کسمسا کر اٹھ بیٹھا۔ نیند اس کی چیتے ایسی تھی ایک آنکھ کھلی رکھ کر سوتا تھا۔ پلنگ اس کے بوجھ تلے چرچرانے لگا اور اس نے کمبل الگ پھینک دیا۔

"کیا حال ہے بدرالدین! آرام ہو رہا ہے؟"

"آیئے خان جی! بس ایسے ہی ذرا میں لیٹ گیا تھا۔ آؤ بھئی برکت تم بھی بیٹھو! یہ کرسی لے لو۔" یہ کہہ کر اس نے تپائی پر رکھے سگریٹ اٹھا لیے۔

"کب آئے ہیں آپ؟"

"ہم ابھی آئے ہیں بدری! سوچا تم سے مل لیں۔" یہ کہہ کر میں اس کے پاس ہی پلنگ پر بیٹھ گیا۔

"لگتا ہے آپ ابھی ابھی امریکہ سے آئے ہیں۔ کپڑے تو بڑے غضب کے پہن رکھے ہیں آپ نے؟"

"ہاں، آدمی کو اپنا سین پارٹ بدلتے رہنا چاہیے اور کہو، سنا ہے یہاں سے ولایت علی اور تاجور فرار ہو چکے ہیں؟"

"ہاں خان جی! مجھے افسوس ہے۔ بڑے عجیب واقعات ہو رہے ہیں۔ پتہ نہیں وہ لوگ تہہ خانے تک کیسے جا پہنچے ــــ؟ ڈھلوں صاحب کا ابھی پتہ نہیں چلا تھا کہ یہ واقعہ پیش آگیا۔" وہ تکیے پر جھک سا گیا۔ مجھے یقین تھا کہ اس نے وہاں اپنا ہتھیار چھپا رکھا تھا۔ مگر ہم نے اس سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ میری اور آبی کی بغلوں میں سٹین گن دَبی تھی، جسے ہم کسی بھی وقت ہاتھ میں لے سکتے تھے۔ ان کا حجم بھی کوئی ڈیڑھ ہاتھ ہوگا اور ان کو استعمال کرنا ہمارے لیے کچھ بھی مشکل نہیں تھا اور بے آواز پستول تو ہم نے اوور کوٹ کی جیبوں میں ڈال رکھے تھے۔ آبی سخت بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ بدری کے مغز میں وہ اسی وقت سوراخ کر دینے کے حق میں تھا۔ ایسے آدمی سے کسی قسم کی تمہید باندھنے سے اسے سخت چڑ تھی۔

"بیٹھ جاؤ برکت! تمہیں کسی ایسے گھر کا پتہ ہے جہاں چور بغیر کسی وسیلے کے گھس آئے ہوں؟"

برکت نے کان کھڑے کیے۔ آبی کی بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

"مَیں کچھ سمجھا نہیں ہوں میاں جی!" اس نے کرسی پر بیٹھ کر اپنی بندوق پر بوجھ ڈالتے ہوئے کہا۔ وہ ہتھیار اس کے لیے اوڑھنا بچھونا بن چکا تھا۔

"میرا خیال یہ ہے کہ کسی بھیدی کے بغیر چور کسی دروازے میں داخل نہیں ہو سکتے۔ کیسا ہی ذوالفنون آدمی کیوں نہ ہو۔ کیوں، جیلانی صاحب! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟"

"جی ہاں! آپ کا فرمانا تو مستند ہے مگر چوروں کا یہاں کیا ذکر ہے؟"

"یہ چوری ہی ہوئی نا، گھر سے آدمی غائب ہو گیا، ہسپتال سے آدمی غائب ہو گیا۔ بغیر بھیدی کے تو یہ نہیں ہو سکتا۔ کیوں بدری بھائی؟"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ اس برکت سے میں کئی بار کہہ چکا ہوں کہ اس گھر کی خبر لو۔ مگر یہ سنتا ہی نہیں۔"

اس کی یہ بات سنتے ہی آبی نے اوور کوٹ کی جیب سے پستول نکال لیا اور اس کی نال بدری کی طرف موڑتے ہوئے بولے۔ "میں کہوں کہ میں نے چور کو ڈھونڈ لیا ہے تو پھر تیرا ردِ عمل کیا ہوگا، بڈی ڈھیڈرس۔" یہ کہہ کر وہ کرسی سے اٹھ گیا، بولا۔ "اس بدری کو باندھ لے جیلانی! مجھے اس سے بہت کچھ پوچھنا ہے۔ یہی بتلائے گا کہ یہ سب لوگ کہاں چلے گئے؟"

حیرت سے بدری کی آنکھیں پھیلنے لگیں۔ اُس نے تیزی سے تکیے کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر آبی نے تڑاخ سے گولی اس کے تکیے میں دے ماری۔

"یوں نہیں بچے! یوں کام نہیں چلے گا۔ تکیے سے ہٹ ہی جاؤ تو اچھا ہے۔"

گولی لگتے ہی بدری نے اپنا ہاتھ پیچھے ہٹا لیا اور کمبل کو ہاتھوں میں باندھتے ہوئے بولا۔ "یہ کیا کر رہے ہو تم! گولی کیوں چلائی ہے تم نے؟" برکت بھی ششدر رہ گیا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں میری گولی اس کو بھی زد میں نہ لے لے۔ وہ عادتاً بندوق کو شست لینے کے انداز میں پکڑ کر اٹھ بیٹھا۔ میں نے اس افراتفری میں جو آبی کی گولی نے وہاں برپا کر دی تھی، اٹھ کر تکیے کے نیچے ہاتھ ڈال کر چادر کے نیچے سے بدری کا ننھا سا پستول اٹھا لیا۔ اگر وہ تکیے کی چادر کے نیچے نہ ہوتا تو بدری اسے اٹھا کر چلا بھی چکا ہوتا۔ پستول میں نے کوٹ کی جیب میں ڈال لیا۔

"ہمیں بتاؤ بدری کہ اس سارے معاملے میں تیرا اپنا کردار کیا ہے۔ اگرچہ ہمیں سب کچھ معلوم ہو چکا ہے مگر ہم تیرے منہ سے سننا چاہتے ہیں۔" آبی نے بدری کو پستول کی زد میں لیتے ہوئے کہا تو بدری کا رنگ زرد ہونے لگا۔

اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ہماری معلومات اس قدر صحیح ہو سکتی ہیں کہ ہمیں ان کی بنا پر اس کے خلاف پستول تان لینا پڑا۔ "کیا کہنا چاہتے ہو؟ مجھے قصوروار سمجھتے ہو تم؟ سن رہے ہو برکت! ان کو سمجھاؤ یہ پستول پیچھے ہٹا لیں، ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔" بدری بڑی زبردست جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے پلنگ سے اتر گیا۔ وہ ہمارے پستولوں کی زد میں تھا مگر پھر بھی ہم سے نظر ملا کر بات کر رہا تھا۔ کمبل اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔

"یہ کیا کرتے ہو خان جی! بدری صاحب تو خود دن رات ڈھلوں صاحب کے لیے پریشان رہتے ہیں۔ ان کے لیے صبح شام روتے رہتے ہیں۔" برکت نے اب کی بار بندوق واقعی ہم پر تانتے ہوئے کہا۔ آبی کو برکت پر بھی طیش آنے لگا، بولا۔ "تو بکواس نہ کر او برکت! میں سمجھوں گا کہ تو بھی اس کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ اس نے ڈھلوں صاحب کو تباہ کر دیا ہے اور تو ..... ۔" یہ کہہ کر اس نے برکت کی بندوق نال سے پکڑ کر کچھ اس طرح کھینچی کہ وہ بھی کھنچا چلا آیا۔ مگر بندوق اس نے چھوڑی نہیں۔ کرسی پر اوندھے منہ گرنے لگا تو آبی نے اسے چھوڑ دیا۔

میرا دھیان بدری پر جما تھا۔ وہ سمجھا کہ اک ذرا سی افراتفری اس کو بڑی مہلت دے دے گی۔ عین اسی وقت ڈھلوں صاحب کی بڑی بیگم دندناتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئیں۔ حویلی کی دو نوکرانیاں بھی ان کے ساتھ تھیں۔ اندر کی فضا میں اتنی ساری کشمکش دیکھ کر وہ مجھے للکارتے ہوئے بولیں۔ "یہ کیا ہو رہا ہے یہاں؟ تم نے بدری پر پستول کیوں تان رکھا ہے؟ کیا چاہتے ہو تم؟" وہ ڈھلوں صاحب کی خاتونِ اوّل فراست بیگم تھیں اور ان کو میں دوسری بار دیکھ رہا تھا۔ ساوتری کے معاملے میں وہ پہلے بھی میرے سامنے آ چکی تھیں۔

"اوہ بیگم صاحبہ آپ؟ ہم آپ سے معذرت چاہتے ہیں۔ مگر معاملہ اتنا الجھ چکا ہے کہ ہمیں مجبوراً بدری پر ہاتھ اٹھانا پڑا ہے۔ اس کو معلوم ہے کہ ڈھلوں صاحب کہاں ہیں؟ ان کو اسی نے اغوا کیا ہے۔"

"یہ غلط ہے۔ مجھے بدری پر پورا اعتماد ہے۔ یہ پستول پیچھے ہٹائیں اور شرافت سے بات کریں۔"

"آپ کو کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔ ڈھلوں صاحب ہسپتال سے غائب ہو گئے تھے۔ ہماری اطلاع یہ ہے کہ اس بدری نے اور ہسپتال کے ایک ملازم فیلڈن نے ان کو وہاں سے اٹھا کر کسی اور جگہ پہنچا دیا ہے مگر یہ مانتا ہی نہیں۔" میں نے بڑی بیگم کو اصل صورتحال سمجھائی۔ وہ اور زیادہ سیخ پا ہو گئیں، بولیں۔ "میں پھر کہتی ہوں کہ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ اس میں بدری کا کوئی قصور نہیں ہے۔ ہمیں اس پر کوئی شک نہیں ہے۔"

"میں بھی ان سے یہی کہہ رہا ہوں بیگم صاحبہ! پر یہ مانتے ہی نہیں ہیں۔" برکت نے نہایت ہی افسردہ لہجے میں کہا۔ اسے ہمارے اس رویّے نے پریشان کر دیا تھا۔

"میری بات سنیں بی بی! یہاں بیٹھ جائیں۔ یہ خود اس بات کو مانے گا کہ ہم نے اس کو یوں ہی نہیں پکڑا ہے۔" میں نے بیگم صاحبہ کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

بدری اب پہلے سے کہیں زیادہ مطمئن دکھائی دیتا تھا اور مسکرانے لگا تھا۔ اس نے ڈھلوں صاحب کے اہلِ خانہ پر اپنے اعتماد کا ڈنکا بجا لیا تھا اور تو اور خود بیگم ڈھلوں یہ کہہ رہی تھیں کہ بدری بے گناہ ہے۔

وہ جب بیٹھ چکیں تو میں نے انہیں اوّل سے آخر تک ساری کہانی سنائی۔ فیلڈن کی بیوی نے ہمیں جو کچھ بتایا تھا، وہ غلط نہیں ہو سکتا تھا۔ اسے کیا ضرورت تھی اس قدر جھوٹ بولنے کی؟ اس کا خاوند خود اس میں ملوث تھا۔ جب میں خاموش ہوا تو بیگم صاحبہ بولیں۔ "دیکھیں، آپ کو سخت غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ بدری نہیں ہو سکتا۔ میں خود اس حوزن سے بات کروں گی۔ بدری ایک لاکھ روپے لے کر ڈھلوں صاحب کو بیچ دے گا، یہ کبھی میں مان ہی نہیں سکتی۔"

"پھر تو بات ہی ختم ہو گئی۔ چلو آبی! یہاں بیٹھنے کا اب کوئی فائدہ نہیں ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ سازش صرف ڈھلوں صاحب کے اغوا کی نہیں ہے بلکہ اس کی جڑیں کچھ اور گہری ہیں۔ لیکن ہم ڈھلوں صاحب کو ضرور تلاش کریں گے۔ پھر جھوٹ سچ کا آپ ہی پتہ چل جائے گا۔"

"وہ ہمیں مل جائیں تو اور کیا چاہیے ہمیں؟ بہرحال آپ براہِ کرم یہاں سے چلے جائیں اور پھر ادھر کا رُخ نہ کریں۔ ورنہ میں پولیس کو اطلاع دینے پر مجبور ہوں گی۔"

اس پینتیس چالیس سالہ خوبرو عورت نے ہمیں حیران کر دیا تھا۔ اس کے لباس کی سج دھج، اس کے چہرے کے حسین نقوش، اس کے وجود میں آہستہ آہستہ ماند پڑتی ہوئی نسوانیت، اس کی وہ کاجل بھری آنکھیں اب بھی دلوں کو اپنی طرف کھینچتی تھیں۔ اور ڈھلوں صاحب اس پر بے پناہ اعتماد کرتے تھے۔ ان کی شاید تین بیویاں اور بھی تھیں۔ مگر ان کو ہم نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ سارے اختیارات اس بیگم فراست ڈھلوں کے پاس تھے اور کوئی بھی ان کی برابری نہیں کر سکتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ جاگیر پر بھی ڈھلوں صاحب کے بعد ان ہی کا قبضہ تھا۔ دوسری خواتین کا کسی جگہ ذکر نہیں آتا تھا۔ وہ صرف ہلکے پھلکے حقِ مہر کی ہی حق دار تھیں اور بس ــــ وہ بحیثیت الطرفین عورتیں نہیں تھیں۔ بس ڈھلوں صاحب کا اُن پر دل آگیا تھا اس لیے وہ ان کے حبالۂ نکاح میں آگئی تھیں۔ جہاں تک

مجھے معلوم تھا اُن کی کوئی اولاد بھی نہیں تھی اور وہ اس کے بارے میں کوئی خاص تردد بھی نہیں کرتے تھے۔

آبی سخت اضطراب کی حالت میں وہاں سے اٹھ کر باہر نکل گیا۔ بدری کا پستول میری جیب میں تھا۔ وہ میں نے خالی کر کے اس کی طرف پھینک دیا۔

"لومیاں مزے کرو۔ ہم جو واپس آئے تو ڈھلوں صاحب کو ساتھ ہی لائیں گے ورنہ نہیں۔ ہماری بلا سے تم اس حویلی کو نیلام کر دو۔ چاہے جوئے میں ہار دو۔ ہم اپنا فرض ادا کر چکے ہیں۔"

"زیادہ بکواس کی ضرورت نہیں ہے جیلانی! بہتر ہے تم یہاں سے چپ چاپ نکل جاؤ اور پھر ادھر نہیں آنا ہے۔" اس نے برکت کی بندوق سنبھالتے ہوئے کہا۔

"نہیں، ان سے الجھنے کی ضرورت نہیں ہے بدری! یہ بندوق برکت کو دے دو۔ تم ان کو گیٹ تک پہنچا دو برکت! جاؤ۔"

بیگم فراست ڈھلوں کی یہ بات سن کر میں بھی چپ چاپ وہاں سے باہر نکل آیا۔ برکت بھی ہمارے پیچھے آ گیا اور ہم اسی وقت حویلی کا طویل صحن عبور کر کے ڈیوڑھی میں سے باہر نکل آئے۔ آبی کا ذہنی کرب کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا تھا۔ مجھ سے اس نے کوئی بات نہیں کی۔ جب ہم حویلی سے خاصے دور جا پہنچے تو آبی نے دو سگریٹ سلگائے ایک اس نے مجھے دیتے ہوئے کہا۔

"اب کیا ارادے ہیں۔ یہاں سے تو کوئی ٹیکسی بھی نہیں مل سکے گی؟"

"آؤ سڑک پر چلتے ہیں۔ وہاں سے بس میں بیٹھ جائیں گے۔ مگر یار! اس معاملے کو کچھ سمجھے بھی ہو کہ نہیں۔"

"میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا۔ یا تو وہ جونز جھوٹ بول رہی تھی۔ یا پھر یہ لوگ ہمیں بے وقوف بناتے رہے ہیں۔"

"جونز کو ایسا جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"ہمیں ایک بار پھر اس سے ملنا ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ کوئی شخص دور بیٹھا ایک تیر سے دو شکار کر رہا ہے۔"

"وہ کیسے؟ تیرا دھیان کس طرف جاتا ہے؟"

"ڈھلوں صاحب پر گولی ڈاکٹر دھمن کے آدمیوں نے چلائی۔ وہ ہسپتال جا پہنچے۔ اپنے تین آدمی بھی انہوں نے رہا کروا لیے۔ جب ڈھلوں صاحب ہسپتال میں تھے تو کسی نے اس حویلی میں بیٹھ کر.... ڈھلوں صاحب کو ختم کر دینے کا منصوبہ بنایا۔ یہ بیگم فراست ڈھلوں اس منصوبے کی مصنف ہیں۔ ان کے حکم سے ہی بدری نے چوہدری صاحب کو اغوا کر لیا تھا۔ کیونکہ ایسا موقع انہیں بار بار نہیں مل سکتا تھا۔ اب اُن کا ارادہ کیا ہے؟ اس کے بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میرا خیال ہے کہ بدری نے بیگم صاحبہ کو پھانس لیا ہے۔"

"نہیں یار! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ عورت ایسی نہیں ہو سکتی ہے۔"

"کیوں نہیں جیلانی! جب وہ آہو کی بیگم ایک رات کسی تیری دلہن بن سکتی ہے، جب سینکڑوں ہزاروں عورتیں اپنے شوہر کو مروا کر لیتے یاروں سے جا ملتی ہیں تو بیگم فراست ایسا کیوں نہیں کر سکتی؟"

"نہیں آبی! ایسا نہ سوچ، پھر تو ساری ہی قدریں ختم ہو جائیں گی۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ڈھلوں صاحب نے بیگم فراست کو بالکل ہی دل سے اُتار دیا ہو۔ وہ کسی یا پچوں کے چکر میں بھی پڑ سکتے تھے۔ ان کا بستر تو کبھی خالی نہیں رہا۔ کوئی نہ کوئی تازہ اصفہانی، سمرقندی سیب انہیں ملتا ہی رہا ہے۔"

"ہو سکتا ہے یہی بات ہو۔ مگر میرا دل نہیں مانتا ہے۔ ڈھلوں صاحب کا کوئی بھائی بھی نہیں ہے۔ زمین پر وہ بلا شرکت قابض تھے۔ ان کے بعد یہ جاگیر بیگم فراست کو ہی ملے گی۔ جانتا ہوں مگر بدری اتنا اونچا نہیں سوچ سکتا ہے۔"

"کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بہر حال تیل دیکھو اور تیل کی دھار دیکھو۔ جلد ہی ہم اس بارے میں کوئی نئی خبر سنیں گے۔ مگر سوال اب عالیہ اور دھمن کا ہے۔"

"ان سے تو ہم ضرور نپٹیں گے آبی! اُن سے ہم نے انتقام نہ لیا تو سمجھو کچھ بھی نہیں کیا۔"

"مگر ڈھلوں صاحب کا کیا کریں۔ اُن کو اس مصیبت سے ضرور نکال لینا چاہیے ورنہ وہ تباہ ہو جائیں گے۔ ان سے میری ہمدردی بڑھتی جا رہی ہے۔ یہ فراست بیگم کیا چاہتی ہے آخر۔"

"آؤ۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں اس ولایت علی سے ضرور ملنا چاہیے۔ اس سے بہت کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔"

"ہاں! ان سے بھی ملیں گے ہم اور عالیہ سے بھی ملا جائے گا۔ مگر سب سے پہلے جونز سے ملنا بہت ضروری ہے!"

ہم یونہی باتیں کرتے ہوئے گاؤں سے خاصے دور نکل آئے۔ ہمارے سارے ہی معاملات الجھ کر رہ گئے تھے۔ کوشش کے باوجود ڈور کا سرا نہیں مل رہا تھا۔ بات کئی گھروں تک پھیل چکی تھی۔ سب سے زیادہ افسوس مجھے اس بات کا تھا کہ ڈھلوں صاحب بیں آ کر تباہ ہوئے جاتے تھے۔ میرا دھیان کبھی رحمت علی کی طرف بھی جاتا تھا۔ یہ احساس بھی ڈستا تھا کہ کہیں اُن لوگوں نے ڈھلوں صاحب کو اغوا نہ کر لیا ہو۔ دشمن کے سو روپ ہوتے ہیں۔ بیگم فراست کا یقین سے یہ بات بار بار دہرانا کہ بدری پر ہمارا شک بے بنیاد ہے بے سبب نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر جونز تو مجھے خود بتا چکی تھی کہ یہ ساری کارروائی عالیہ کے کہنے پر کی گئی ہے۔ ولایت علی، تاجور اور رشید کو ان لوگوں نے ڈھلوں صاحب کی حویلی سے نکال لیا تھا مگر اس کا وہ ذکر ہی نہیں کرتے تھے۔ کوئی ایسا آدمی تو وہاں ضرور تھا جس کو معلوم تھا کہ حویلی کے اندر وہ تہہ خانہ کہاں ہے؟ اسی نے ان لوگوں کی رہنمائی کی ہوگی۔ پھر بھی فراست بیگم کیوں اتنے یقین سے کہہ رہی تھی کہ بدری بے گناہ ہے۔ یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

آبی کو یہ احساس تھا کہ ہمارا حویلی سے یوں نکل جانا انہیں راس نہیں آئے گا۔ وہ مجھے بار بار یہی کہہ رہا تھا کہ ہمیں جس طرح بھی ہو سکے وہاں سے فوراً نکل جانا چاہیے۔ ہو سکے تو گاؤں میں کسی جگہ پناہ لے لینی چاہیے کیونکہ وہ لوگ ہم پر وار ضرور کریں گے۔ بدری اور فراست بیگم اگر واقعی قصور وار ہیں تو وہ ہمیں یوں بچ کر نکلنے نہیں دیں گے۔ مگر مجھے یقین نہیں آتا تھا۔ ہم اُن کے دشمن تو ہرگز نہیں تھے۔ عین ممکن ہے بدری کا نام جونز نے خواہ مخواہ ہی لے دیا ہو۔

"تو سمجھتا کیوں نہیں ہے جیلانی! حالات بہت خطرناک ہو چکے ہیں۔"

"میں کیا کروں؟ سیدھے تو جا رہے ہیں ہم۔ بڑی سڑک زیادہ دور نہیں ہے۔" میں نے اپنے قدم تیز کرتے ہوئے کہا۔ مگر آبی چپ ہو جاتا تھا۔ وہ بار بار سر اٹھا کر چاروں طرف نظر دوڑا رہا تھا۔ اس کے خدشے بے بنیاد نہیں تھے۔ بدری نے واقعی ہمارا راستہ روک لیا تھا۔ ابھی ہم مکئی کے اونچے کھیت کی لمبان سے باہر نہیں نکلے تھے کہ چار گھڑ سوار برق رفتاری سے ہمیں اپنے عقب میں آتے دکھائی دیے۔ ان کا انداز ایسا تھا کہ جیسے وہ کسی شکار پر جھپٹ رہے ہوں۔ چاروں کے چاروں بندوقوں سے مسلح تھے۔ میرا خیال ہے ابھی وہ ہم سے کوئی چار سو گز دور ہوں گے کہ ان میں سے ایک نے بندوق سیدھی کر کے ہم پر گولی داغ دی۔ اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ ڈھلوں صاحب کے سیاہ پوش تھے اور راغب علی ان کی قیادت کر رہا تھا۔ پہلی گولی اسی نے ہم پر چلائی۔ ہم دونوں بھاگ کر مکئی کے کھیت میں جا گھسے۔ اس کی کٹائی بس شروع ہونے والی تھی۔ کھیت میں گھستے ہی آبی بلی کی سی تیز رفتاری سے ایک درخت پر جا چڑھا۔ میں بھی اس کے پیچھے لپک رہا تھا کہ وہ چاروں بھی کھیت میں گھس آئے۔ اوٹ کوئی نہیں تھی۔ صرف درخت کا تنا ہی ہمیں بچا سکتا تھا۔ میں اس کے پیچھے جا ٹھہرا۔ وہ اب چاروں طرف پھیل کر اس درخت کی طرف بڑھ رہے تھے اور ان کی بندوقوں سے مسلسل گولیاں اگل رہی تھیں کہ آبی نے اسٹین گن نکال کر اُن پر تڑ تڑ گولیاں برسانا شروع کر دیں۔ میں نے بھی اسٹین گن نکال لی۔ آبی کی گولیوں سے دو گھوڑے زخمی ہو کر گرے تو ان کے سوار کھیت میں لیٹ کر گولیوں سے بچنے کے لیے زمین پر رینگنے لگے۔

میں نے پہلی گولی راغب علی کے مغز میں گزارنا چاہی۔ مگر اس کا گھوڑا بہت بے چین ہو رہا تھا۔ وہ عین اسی وقت گھوم کر گولی کے ہدف کو پرے ہٹا گیا۔ راغب علی کے پاس دو نالی بندوق تھی اور اب اسے گولی بھرنے کے لیے مہلت کی ضرورت تھی۔ اس سے فائدہ اٹھا کر میں نے دوسری گولی چلا دی۔ وہ اس کی کمر کو چیرتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی اور وہ دوسرے ہی لمحے گھوڑے پر سے جھول کر نیچے گر گیا۔ آبی زیادہ محفوظ جگہ پر تھا اور اس کی گولیاں دو آدمیوں کو بے کار کر چکی تھیں۔ چوتھا آدمی بہت ہی محتاط تھا۔ وہ ایک زخمی گھوڑے کی اوٹ میں لیٹا تھا اور اس کی طرف سے مسلسل گولیاں ہماری طرف لپک رہی تھیں۔ عین اس وقت بائیں ہاتھ سے کسی نے بندوق داغ دی۔ معلوم یہ ہوا کہ ابھی ایک اور آدمی بھی بالکل محفوظ تھا۔ آبی کی نظر اس پر پڑی تو اس نے عجیب سے خوفناک انداز سے علی کا نعرہ لگاتے ہوئے اس کو گولیوں کی زد پر رکھ لیا۔ میرا ہدف گھوڑے کی اوٹ میں لیٹا آدمی تھا۔ میں نے دیکھا کہ آبی نے دو گولیاں چلائیں تو دوسری طرف سے فائرنگ بند ہو گئی۔ آبی نے اس شخص کا صحیح بندوبست کر دیا تھا۔ دو گھوڑے ابھی تک سواروں کے بغیر ادھر ادھر ٹاپتے پھرتے تھے۔ اُن کے سوار ان کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ اب آخری آدمی میرے سامنے تھا اور اس کی بندوق ابھی خاموش نہیں ہوئی تھی کہ آبی نے اسے دیکھتے ہی اپنا رخ بدلا اور گولی سیدھی اس کے مغز میں اُتار دی۔ ہمارے سامنے کا منظر میدانِ جنگ کا سا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ مکئی کا کھیت اُجڑ کر رہ گیا تھا اور ان سب کی لاشیں اپنی بے ثباتی کا رونا رو رہی تھیں۔ ڈھلوں صاحب کے وہ سیاہ پوش کسی ایسے ہی معاملے کو نپٹانے کے لئے باہر نکلا کرتے تھے۔ بڑا ناز تھا انہیں اُن لوگوں پر۔ وہ انہیں باہر کی ہوا جب ہی لگواتے تھے جب ان کے بالا بلند رہنے کو واقعی خطرہ لاحق ہوتا تھا۔ ان کے لوہے کا پانی جب ہی چمکتا تھا، جب انہیں شیروں کی ضرورت ہوتی تھی۔ وہ بڑے ہی بے جگر لوگ تھے، نڈر اور بہادر۔ موت سے وہ کبھی بھی نہیں گھبراتے تھے اور وہ چاروں اپنے ہتھیاروں سمیت شل ہو کر لیٹ گئے تھے۔ انہیں فراست بیگم نے ہمارا راستہ روکنے اور وہیں دفن کر دینے کے لیے بھیجا تھا۔ ان کے ریا میں جب لہرا اٹھتی تھی تو وہ سیاہ پوش ایسے ہی کارنامے دکھاتے تھے مگر ہم نے ان کو مہلت ہی نہیں دی۔ اُن کا وہ سارا کھن ہم نے تنکا تنکا کر کے بکھیر دیا تھا۔ صرف دو گھوڑے سلامت تھے اور بس۔

آبی نے بڑے شوق اور لھاؤ سے درخت پر سے نیچے چھلانگ

لگا دی۔ اسٹین گن اس کے ہاتھ میں تھی اور وہ اُن کی لاشوں کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے وہ موت کے منہ میں پھنسی مرغابیاں ہیں۔

"یہ ڈھلوں صاحب کے سیاہ پوشس تھے جیلانی! فراست بیگم نے انہیں ہمارے پیچھے بھیج کر اچھا نہیں کیا۔"

"ہاں! وہ سمجھتی ہوگی کہ ہم اگر بچ نکلے تو پتہ نہیں کیا کر بیٹھیں۔"

"مگر موت اُن کا لہو پی گئی۔ میرا خیال ہے کہ یہ چاروں مر چکے ہیں۔"

"ہاں! یہاں سے نکل چلو آبی! کوئی راہگیر اِدھر آ نکلا تو اچھا نہ ہوگا۔"

"یہ گھوڑے نہ سنبھال لوں میں؟"

"نہیں ان کو رہنے دو، بس نکل چلو۔ یہ ہتھیار بھی اِدھر ہی رہنے دو۔ وہ خود سنبھال لیں گے۔"

"ٹھیک ہے یار! مگر اس لیلا دتی نے اچھا نہیں کیا۔ بہت ناز تھا اس ڈھلوں کو اس عورت پہ۔ مگر میرا خیال ہے' وہ بدری پہ مر مِٹی ہے۔" آبی نے فراست بیگم کو بے نقط سناتے ہوئے کہا۔

"اللہ کی شان ہے آبی! گھٹتی پر کسی کا کوئی زور نہیں چلتا۔ یہ راغب علی تھا۔ پہلی گولی اسی نے چلائی تھی۔" ہم درخت سے ہٹ کر لاشوں کو دیکھنے لگے۔ وہ سارے ہی ختم ہو چکے تھے۔

"تو تم اسے جانتے ہو؟ چلو اچھا ہوا۔ اس کو اِدھر ہی گھیرا لگ گیا۔ آؤ! مجھ سے ان کی یہ صورت دیکھی نہیں جاتی۔" یہ کہہ کر اس نے اسٹین گن کوٹ کے اندر دبائی اور کھیت سے نکلنے لگا۔ ان لوگوں کو یوں جان سے گزرتے دیکھ کر اسے کوئی خوشی نہیں ہو رہی تھی۔ اس کی افسردگی اس حد تک بڑھی کہ اس نے پلٹ کر میری اسٹین گن خود ہاتھ میں لے کر میرے کوٹ میں دبا دی۔ بولا۔ "یہ سلسلہ بند ہو جانا چاہیے جیلانی! ہم خدا کو کیا جواب دیں گے۔ وہ تو ہر حال میں ہم سے پوچھے گا کہ تمھیں میں نے جو طاقت' جو عقل' جو ہنر دیا تھا وہ تم نے کس کام میں صرف کیا۔"

"تیری اس بات کا میں کیا جواب دوں؟ موت تو ہمیں بھی آسکتی تھی۔ وہ مٹھائی بانٹنے کے لیے تو ہمارے پیچھے نہیں آئے تھے۔"

"نہیں جیلانی! کوئی ترکیب سوچو! یہ سلسلہ بند ہو جانا چاہیے۔ یہ محاذ ہمیں بالآخر لے ڈوبے گا۔ اس کٹائی کی کوئی اُجرت نہیں ہے میرے یار!"

"تیری کھوپڑی میں جوئیں پڑ گئی ہیں آبی! ورنہ تو یوں نہ کہتا۔ انہوں نے ہم پر حملہ کیا تھا۔ وہ ہمیں جان سے مار دینا چاہتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہم تنہا ہیں۔ اسی لیے وہ گھوڑوں پہ سوار ہو کر آئے تھے۔ اُنہیں پتہ تھا کہ ہمارے پاس معمولی سے پستول ہیں۔ اسی لیے وہ بندوقیں لے کر آئے تھے۔ اپنی جان کا تحفظ تو ہر کسی پہ لازم ہے۔"

آبی میری یہ بات سن کر چپ ہو رہا۔ پگڈنڈی کے آخری کھیت کے کونے پہ ہمیں کئی دیہاتی ملے۔ وہ سخت تذبذب میں تھے۔ گولیوں کی آوازیں ابھی تک ان کے دماغ میں افراتفری مچا رہی تھیں جو وہ لمحے پہلے سُن چکے تھے۔ انھوں نے ہمیں دیکھا تو تیزی سے دو تین آدمی ہماری طرف لپکے۔

"بھاجی! یہ گولیاں کیسی چل رہی تھیں؟ لگتا تھا کوئی فوج چڑھی ہے اِدھر!"

"پتہ نہیں یار! ہم تو پردیسی ہیں۔ آوازیں تو ہم نے بھی سنی تھیں مگر اب بند ہو گئی ہیں۔" آبی نے بڑی معصومیت سے کہا۔

وہ تینوں دیہاتی آگے بڑھ گئے۔ ان کا رُخ اب مکئی کے کھیت کی طرف تھا۔ ہم اُن کو انہی کی گُتل میں پھنسا کر آگے بڑھ گئے۔ ہم کیا جواب دیتے؟ ہمارے پیچھے جو کتھک ناچنے والے گھوڑوں پر سوار نکلے تھے۔ اُن کی حالت وہ جب دیکھیں گے تو انہیں خود ہی پتہ چل جائے گا کہ ہُوا کیا ہے؟

ہم خاصے آگے نکل آئے تو آبی مسکراتے ہوئے بولا۔ "یار سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ فراست بیگم' جو کبوتری کی طرح گونجنے لگی تھی اُسے آخر سُوجھی کیا ہے۔ بُڈھے منہ مہاسے، لوگ چلے تماشے۔"

"یہ بات نہیں ہے آبی! وہ اب بھی بہت خوبصورت ہے۔ ابھی عہدِ شباب کی دو چار خراکیں اُس میں باقی ہیں۔"

"نہیں جیلانی! اب تو بس کیڑ چھان ہی باقی ہوگا۔ ڈھلوں سمجھو زوال شروع ہو چکا ہے اور میرا خیال ہے یہ سب کچھ اسی کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ اس کی بددعا اسے لے ڈوبی ہے۔"

"پتہ نہیں! خدا ہی جانتا ہے کہ کس گھر کو وہ کس پہ چھوڑے گا۔ فراست بیگم اس حویلی کی بنیاد تھی اور بدری نے اسے کھوکھلا کر دیا ہے۔"

ہم نے بڑی پگڈنڈی چھوڑ دی تھی اور کھیتوں کے بیچ سے آگے نکل کر سڑک کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ہمیں یہی ڈر تھا کہ ان سیاہ پوشوں کے وارث کہیں اُدھر آ نکلے تو بڑی تباہی مچے گی۔

"یار! اس کو مستی بھی آئی تو کس عمر میں؟ بدری سے ہزار درجے بہتر تھا۔ تیرا ایک اپنا کیریئر ہے۔ تو اپنا آپ ہے، تیرے پاس ایک کروڑ روپیہ بھی موجود ہے۔ پچھتر لاکھ اور دس بارہ لاکھ لاہور والا۔ اُسے منہ ہی کالا کرنا تھا تو تو بُرا تھا؟"

"تیرا جواب نہیں ہے آبی! یعنی میرا بھی ایک کیریئر ہے۔ میں بھی اہم آدمی ہوں؟"

"ہاں! میرا بس چلے تو میں تمہیں تمغۂ جرأت دے دوں۔ ویسے میرا خیال ہے' وہ کوئی دو گھنٹے بعد اُن کا پتہ کریں گے۔"

"ہاں! میرا بھی یہی اندازہ ہے۔ ویسے کمال ہے آبی! پڑوں پہ خون تک نہیں لگا ہے وہ کیا کہا کرتا ہے تو...؟"

"ہاں! دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ۔ تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو۔ پتہ نہیں یہ کس کا شعر ہے مگر ہم پر صادق آتا ہے۔"

اب ہم بڑی سڑک پہ جا پہنچے تھے اور چوگوٹھ کی حویلی بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ ہمیں یقین تھا کہ اب ہم کبھی لوٹ کر اِدھر نہیں آ سکیں گے۔ ہمارے سارے ہی راستے فراست بیگم نے بند کر دیے تھے اور ہمیں نہیں معلوم تھا کہ ڈھلوں صاحب سے پھر کبھی ہماری ملاقات ہو بھی سکے گی یا نہیں۔ اُن کو تلاش کرنا ہمارا فرض تھا مگر راستے ہمارے سارے ہی بند ہو گئے تھے۔ اگر یہ بات ثابت ہو جاتی کہ بدری ہی وہ آدمی ہے جس نے ڈھلوں صاحب کو ہسپتال کے کمرہ سے نکالا تھا تو میں نے یہ طے کر لیا تھا کہ جیسے بھی ممکن ہوا میں اس بدری کو زمین میں گاڑ کر رہوں گا۔ اس سے کم پر میری تسلی نہیں ہو رہی تھی۔ ابھی تو میں اسے مدِّ امانت میں ڈال آیا تھا۔

فراست بیگم کی باتوں پہ مجھے کچھ کچھ یقین آتا بھی تھا مگر دماغ تو یہی کہتا تھا کہ وہ جھوٹ بولتی ہے۔ جونز ہم سے اتنی بڑی غلط بیانی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ تو یہاں تک کہتی تھی کہ عالیہ نے بدری کو ایک لاکھ روپیہ دے دیا تھا۔ اس کے سوا ہمیں اس کے خلاف اور کیا ثبوت چاہیے تھا۔ اور آبی کہتا تھا کہ بدری اب براہِ راست جاگیر پہ قبضہ کرنے کی کوشش کرے گا۔ وہ بھی مجھے سچا ہی نظر آتا تھا۔ فراست بیگم اس کے پہلو میں جا لیٹی تو جاگیر کہاں جا سکتی تھی۔ جبکہ ڈھلوں صاحب کے بعد وہ ہر شے کی مالک بن جائے گی۔

میرے سامنے اب بھی اَن گنت مسائل تھے۔ مجھے آسیہ کو کسی نہ کسی طرح اس کے کنجِ تنہائی سے نکال کر گھر واپس لانا تھا۔ ماں بھی کہتی تھی کہ تو اب تک کیا کرتا رہا ہے۔ آسیہ کے بغیر اس کا گھر بالکل ہی ویران نظر آتا تھا۔ عین ممکن ہے ماں نے ہم دونوں کو دل سے بالکل ہی بھلا دیا ہو۔ وہ بھائی کے پڑوس میں مکان لے کر بہت مطمئن ہو گئی تھی اور وہ بچپن کے انہی دنوں کی طرف لوٹ گئی تھی جب وہ اپنے بھائی کے ساتھ ماں کے آنگن میں بے فکری کی نیند سوتی تھی۔ اس نے شاید یہ سوچ لیا تھا کہ اس نے کبھی بچے جنے ہی نہیں تھے۔ میرا خیال ہے کہ اس کی سوچ اسی سمت مڑ گئی تھی ورنہ وہ مجھ سے اتنی بے رُخی نہ برتتی۔ اچانک مجھے تائی رابعہ کا خیال آیا تو اس کے اونچے لمبے کڑیل بیٹے اور بھائی کی طرف دھیان جا نکلا۔ تایا کی اپنی بھی تو دو بیٹیاں تھیں۔ باپ اور بھائی کے بغیر وہ اس یتیمی میں کیا کر سکیں گی۔ اور وہ جو لیڈی ڈاکٹر تھی جس نے آسیہ کے منگیتر سے شادی کر لی تھی۔ وہ بھلا اُن کے کس کام آ سکے گی۔ ایسے میں مجھے اُن کی مدد ضرور کرنی چاہیے۔ ورنہ وہ تو بے موت ہی مر جائیں گی۔ وہ کیسی ہی فرخندہ بخت کیوں نہ ہوں۔ انہیں کسی نہ کسی مدد کی ضرورت تو ضرور ہو گی۔ ان کی بھوجو اب بیوہ ہو چکی تھی۔ اپنے ساتھ لاکھ روپیہ تو ضرور لائی ہو گی۔ ہمارے تایا کی یہی شرط تھی مگر وہ لاکھوں روپیہ بیٹھا تھوڑی ہو گا۔ وہ اُن کی کسی بھی طرح مدد نہیں کر سکے گی۔ ایسے میں تائی کی بیوگی ان کی محرومی میں اور اضافہ کر دیگی۔

"آبی! تیرا کیا خیال ہے۔ میں تایا کے گھر جانا چاہتا ہوں۔"

"ابھی نہیں۔ انہیں ذرا بیوگی اور یتیمی کا مزا چکھ لینے دو۔ اُن کی مدد ایسے وقت میں کرو، جب اس کی انہیں سخت ضرورت ہو۔"

"ہاں! یہ ٹھیک ہے۔ میرا خیال ہے ہم چالیسویں کے بعد وہاں جائیں گے۔"

"یہی بہتر رہے گا۔ اس جُرم میں وہ تائی بھی برابر کی شریک تھی جس میں اُن لوگوں نے تم سے ہمشیرہ کی شادی پہ لاکھوں روپیہ طلب کیا تھا۔"

"ہاں! یہ تو صحیح ہے۔ وہ بھی بہت بڑھ چڑھ کر باتیں بناتی ہے۔ یہ مُعاملے عورتوں کی صلاح کے بغیر تو آگے نہیں چلتے۔"

بس ہمارے قریب آ ٹھہری اور ہم اس میں بیٹھ کر لاہور کی طرف چل دیے۔ ہمارے پیچھے ابھی تک ان سیاہ پوشوں کے ماتم کے لیے کوئی نہیں آیا تھا۔ بدری کو اور فراست کو بھی یقین ہوگا کہ وہ ان کے دشمن کو مار کر ہی واپس آئیں گے، وہ کتے سیاہ پوش۔ لاہور پہنچ کر ہم نے بسوں کے اڈے پر ایک غیر معروف سے ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا کھایا اور پھر ٹیکسی میں بیٹھ کر اسی وقت ہم سیدھے جونز کے مکان کے سامنے جا اُترے۔ اب کی بار ہم نے زیادہ دل جمعی سے اس کے دروازے پر دستک دی۔ اس وقت دن کے دو بج رہے تھے۔ دستک دینے کے بعد ہم دونوں فوراً ہی گیٹ سے ہٹ گئے۔ دروازہ ٹمی نے کھولا۔ ہمیں اس نئے اور شاندار لباس میں دیکھ کر وہ میں پہلی نظر میں پہچان نہیں سکا۔ بولا۔ "آپ کو کس سے ملنا ہے جناب!" وہ بہت تمیز دار لڑکا تھا اور جانتا تھا کہ معزز مہمانوں سے کس طرح پیش آتے ہیں۔

"مسز جونز گھر پہ ہیں؟"

"ہاں! وہ ابھی ہسپتال سے آئی ہیں۔ کیا کام ہے آپ کو اُن سے؟"

"اور کون ہے گھر میں؟"

"کوئی نہیں۔" اس نے نہایت سادگی سے جواب دیا۔ اب اس کی نظریں ہمارے چہروں پہ نہیں بوٹوں پہ پڑ رہی تھیں۔

"ٹھیک ہے ہم خود ہی اُن سے جا ملتے ہیں۔" یہ کہہ کر ہم تیزی

سے لڑکے کو ساتھ لے کر اندر جا پہنچے۔ ان کی نشست گاہ کا دروازہ جیسے ہی ہم نے کھولا ہمیں جونز کھانا کھاتی نظر آئی۔ وہ دائیں ہاتھ رکھی کھانے کی میز پر بیٹھی سوچ سوچ کر لقمے اٹھا رہی تھی۔ اس نے ہمیں دیکھا تو وہ بھی پہلی نظر میں ہمیں پہچان نہیں سکی مگر جیسے ہی اس نے ہمارے چہروں پر دوبارہ نظر ڈالی اسے ہم یاد آ گئے، بولی: "آپ...... آپ...... میں آپ کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔" وہ تیزی سے فون کی طرف لپکی۔

آبی فوراً ہی آگے بڑھا اور اس کے دونوں ہاتھ فون سے پیچھے ہٹاتے ہوئے بولا: "ایسا بھی کیا غصہ! ہم آپ کے مہمان ہیں مسز جونز!" یہ کہہ کر وہ اسے وہاں سے ہٹا کر میز کی طرف لے آیا۔ میں نے ٹمی کو تھام رکھا تھا کہ اگر اس نے کوئی شور مچایا تو میں اس کا منہ بند کر سکوں۔

"آخر...... آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟ آپ کو ادھر آنے کی جرأت کیسے ہوئی؟" جونز ہذیانی کیفیت میں بولی۔

وہ آبی کی باہوں سے نکلی جاتی تھی مگر وہ شاید اس کی خالص زنانہ خوشبو سے لطف اندوز ہونے لگا تھا، بولا: "کتنی عمدہ خوشبو لگا رکھی ہے آپ نے، میرا تو سینہ مہکنے لگا ہے۔"

"چھوڑ دیں مجھے! میں کہتی ہوں مجھے چھوڑ دیں۔" اب کی بار زیادہ ہی غصے میں آ گئی تھی۔

"نہیں، چھوڑنے کی سند نہیں ہے جونز، تم حسین بھی ہو اور جوان بھی۔ اور ہم اس مسٹر پال سے تو ہر لحاظ سے بہتر ہیں۔"

میں نے ٹمی کو دھکیل کر سامنے کے غسل خانے میں گھسیڑا اور باہر سے کنڈی لگا دی۔ "تو ادھر ہی ٹھہر یار! ہم جونز سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتے ہیں۔"

"ضروری باتیں...... کیسی ضروری باتیں؟ میرے شوہر کو مار دینے والی باتیں۔ رات کی فائرنگ کی باتیں۔ کیا چاہتے ہیں آپ مجھ سے؟"

"رات ہم پر فائرنگ کس نے کی تھی جونز! وہ تو ہمیں یاد ہی نہیں رہا کہ آپ سے مل کر پوچھ ہی لیتے۔" میں نے اس کے کھانے میں دھری سیب کی قاش منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔ وہ کھانے کے ساتھ اپنے سامنے ڈھیر سارا پھل بھی لیے بیٹھی تھی۔

"میں کہتی ہوں کہ رات آپ یہاں کس لیے آئے تھے؟ مجھے غسل خانے میں بند کر کے آپ نے بہت سخت زیادتی کی۔ میرا دم گھٹ جاتا تو کیا ہوتا؟"

"ہمی ہمی۔ یہ دنیا ایک خوبصورت عورت سے محروم ہو جاتی۔" ...وہ مجھ سے کھل نہیں رہا تھا۔ مجھے بعد میں خالیہ نے...

سے نکالا۔"

"تو وہ یہاں آئی تھی؟" میں نے بڑے ہی غضبناک... کہا۔ پتہ نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔ اس کا نام اب میرے لیے... بن گیا تھا۔

"ہاں" وہ رات یہاں آئی تھی۔ اپنی چیزیں... آپ کے لئے وہ یہاں اپنے گن مین چھوڑ گئی تھی۔ ایسے... وہ اپنے ساتھ لائی ہے۔ ان میں سے ہر ایک ایسا نشانہ باز... شارپ شوٹر ہے کہ کوئی ان سے بچ کر نہیں جا سکتا۔ اور وہ... ہر وقت اپنے ساتھ رکھتی ہے۔ رات بھی وہ آپ سے نمٹنے کے... اپنے دو آدمی یہاں چھوڑ گئی تھی۔ مگر آپ کی قسمت اچھی تھی... آپ بچ نکلے مگر اگلی بار ایسا نہیں ہو گا۔"

"لعنت بھیجو اُن پر جونز! تم ایسی گلبدن کے منہ سے... باتیں اچھی نہیں لگتی ہیں۔ آؤ کھانا کھاؤ! ویسے یہ بتاؤ کہ تم... ہمیں زہر کس قسم کا دیا تھا۔ آرسینک تھا یا کوئی اور؟" آبی... اسے کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ وہ ایسا کرتے وقت اس کے... ٹٹول رہا تھا۔ شاید وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کہیں اس نے... ہتھیار تو نہیں چھپا رکھا ہے۔ جونز بڑے غصے سے اس کے... پیچھے ہٹائی ہوئی میز پر بیٹھ گئی۔ "میرا مطلب ہے کہ وہ کیسا... زہر تھا جونز؟ کچلا تو نہیں تھا؟"

"میں نے کسی کو زہر نہیں دیا۔ آپ جھوٹ بولتے ہیں..." ...کے عارضِ سیمیں کا رنگ اور زیادہ تپ گیا۔

"چلو زہر نہ سہی کچھ اور سہی۔ آپ ہمیں یہ بتائیں جونز... فیلڈن کا کیا حال ہے؟ اسے ہم نے تو نہیں مارا تھا..."

"وہ میں سب کچھ سن چکی ہوں۔ فیلڈن ابھی... ہے اور پولیس آپ کو تلاش کر رہی ہے۔ آپ دونوں کا... نے لکھوا دیا تھا۔ گرفتاری سے آپ بچ نہیں سکتے ہیں..." ...کاٹر کو آپ نے گولی مار دی، یہ شرافت ہے آپ...

"ہم مجبور تھے جونز! اس کے پاس ایک زبردست... شکنجہ تھا۔ وہ اس نے میری کلائی پر جما دیا۔ بہت مجبوری... جونز! ورنہ وہ ہمیں مار دیتا۔"

جونز نے کچھ جواب نہیں دیا۔ وہ ٹمی کی طرف متوجہ... غسل خانے میں کھڑا چیخ رہا تھا۔

"اچھا! یہ بتائیں کہ بڈی کو آپ نے دیکھا ہے؟"

"نہیں! مگر فیلڈن نے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔ عالیہ... اسے ایک لاکھ روپیہ دیا تھا تاکہ وہ ڈھلوں کو وہاں سے اغوا...

"مگر بڈی تو یہ بات تسلیم نہیں کرتا ہے، بہر حال..."

"...یہ کا پتہ بتا دیں کہ وہ کہاں ٹھہری ہوئی ہے؟"

"جیسی آپ کہیں میں قسم کھا سکتی ہوں، مجھے اس کے بارے میں کچھ علم نہیں ہے۔"

"اچھا یہ بتائیں کہ فیلڈن کو اس سودے میں کتنے روپے ملے ہیں؟"

"اس نے دو لاکھ روپیہ لیا تھا۔ کام اس کا صرف یہ تھا کہ وہ ڈھلوں صاحب کو ہسپتال کے کمرے میں بے ہوشی کی دوا دے کر کسی طرح گاڑی تک پہنچا دے۔"

"مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی ہے جونز! کہ آپ ہم سے تعاون کر رہی ہیں اور سچ بول رہی ہیں۔ ہم فیلڈن کو اب کچھ نہیں کہیں گے۔ آپ سے بھی ہمارا کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ سارا معاملہ تو اس عالیہ سے ہے، وہ ہم خود دیکھ لیں گے۔ فیلڈن سے کہیں کہ وہ پولیس کو ہمارے بارے میں کوئی خاص بات نہ بتائے۔ ہمارے حلیے ہی غلط بتا دے تو اس کی مہربانی ہو گی۔ آپ کے لیے بھی یہی بہتر ہے۔" میں نے اس کے قریب ہو کر کہا۔ اس دوران آبی نے پستول نکال کر ہاتھ میں لے لیا تھا۔ "ہٹاؤ اس پستول کو آبی! آؤ چلیں۔ ان کو آرام کرنے دو۔ ہم نے آپ کی اس زہر خورانی کی بات بھی بھلا دی ہے۔ سمجھیں کچھ ہوا ہی نہیں۔" یہ کہہ کر میں نے اس کے بالوں میں بڑی محبت سے ہاتھ پھیرا۔ وہ مجھے بہت اچھی لگ رہی تھی کہ وہ اتنے سارے الجھے ہوئے قصے میں بھی ہمارے سامنے سچ بول رہی تھی اور مجھے یقین تھا کہ وہ عالیہ کے بارے میں واقعی کچھ نہیں جانتی تھی۔ ورنہ وہ اس کے بارے میں بھی ہمیں بتا دیتی۔ جو کچھ اس کے بس میں تھا، وہ اس نے ہمیں بتا دیا بھلا ایسا نہ ہوتا اور ہمیں یقین نہ آتا تو شاید ہم اس کو اس کے مگڈ سمیت زمین میں اتار دیتے۔ اس کے مکلاوے کے لیے آبی اتنا پریشان نہ ہوتا۔ اس کا لباس چیر پھاڑ دیتا۔ آبی کے اشارے پر مجھے جونز کو وہاں سے اٹھا کر عقبی کمرے کے غسل خانے تک لے جانا پڑا۔ وہ بہت چیخی، بہت چلائی۔ مگر ہم تو مجبور محض تھے۔ وہ یتیم و لسیر بھلا اسے اپنی سی کر لینے کی اجازت کیسے دے دیتے؟ غسل خانے میں اسے دھکیل کر میں نے باہر سے کنڈی چڑھائی اور پھر دونوں اسی وقت وہاں سے باہر نکل آئے۔ عالیہ نے ہمارے لیے ایک اور زبردست آزمائش کھڑی کر دی تھی۔ ایسی آزمائش جو دلوں کو چکر میں ڈال دیتی تھی کہ آدمی کی روح فنا ہونے لگتی تھی۔

"یا مقلب القلوب ہم پر رحم فرما!" آبی نے سڑک پر پہنچتے ہی بڑے دلگداز لہجے میں یہ دعا مانگی۔

"تو کیا کہنا چاہتا ہے آبی! کس کا دل بدلنے کی دعا مانگ رہا...

ہے تو؟ کوئی سگریٹ ہے تیرے پاس تو نکال۔"

"یار! تو کبھی اپنی جیب میں بھی سگریٹ رکھ لیا کر۔ ہر وقت مانگتا ہی رہتا ہے تو! مجھے اس جونز سے بڑی والہانہ محبت ہو گئی ہے۔ بہت معصوم عورت ہے جیلانی!"

"بکواس نہ کیا کر! وہ کرسچین عورت ہے۔ تثلیث پر گہرا ایمان رکھتی ہے۔ تیرے جیسے لچے آدمی کو وہ گھاس بھی نہیں ڈالے گی۔"

"نہ ڈالے نا، مگر وہ مجھے اچھی لگتی ہے اور محبت تو ہم ایسوں کی ہمیشہ یکطرفہ ہوتی ہے۔ عشق اول در دلِ معشوق پیدا می شود۔"

"بک نئیں اوئے! تو کہاں کا معشوق بن بیٹھا ہے۔ ہائیں! تیرا جواب نہیں ہے۔ منہ پر تیرے چودہ پندرہ بجے ہوئے ہیں۔ لا یہ سگریٹ ادھر کر۔"

اس نے دو سگریٹ سلگا لیے تھے اور جو مجھے اس نے دیا، وہ کچھ زیادہ ہی گیلا تھا۔ جب اسے مجھ سے کچھ زیادہ ہی محبت بگھارنی ہوتی تھی تو وہ سگریٹ کو اور زیادہ نم آلود کر دیتا تھا۔

"یہ ٹیکسی روک یار! ہمیں اب شفا بار چلنا ہو گا۔" اس نے قریب سے گزرتی گاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا مگر میں نے توجہ نہ دی تو اس نے خود ہی زبردست قسم کی سیٹی بجا دی۔ گاڑی آپ ہی آپ رکنے لگی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ ڈرائیور ان سیٹیوں کا مطلب بھی سمجھ جاتے ہیں۔

جب ہم شفا بار پہنچے تو شام کے ساڑھے چار بج رہے تھے۔ گیٹ کے بڑے بورڈ پر سے واقعی اب ڈاکٹر دمن اور ڈاکٹر عالیہ کا نام مٹا دیا گیا تھا۔ ان کی جگہ کوئی ڈاکٹر ایم ایس قریشی صاحب آ گئے تھے۔ کلینک انہی کے نام منتقل ہو چکا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ڈاکٹر دمن کے کرایہ دار ہوں مگر اندر یا باہر کسی بھی جگہ ان دونوں کا نام درج نہیں تھا۔

گیٹ پر موجود پہریدار نے ہمیں بڑے احترام سے سلام کیا اور مؤدب ہو کر ایک طرف ہٹ گیا۔ ہمارے لباس ہمیں راہ دیتے تھے اور پہریدار ہمیں کوئی بہت نفیس قسم کے بارعب اور مہذب آدمی سمجھ کر الگ ہو گیا تھا۔ کوئی مفلس بیگ ہوتا تو وہ اس کو ایک

قدم اندر نہ دھرنے دیتا۔ اس کی تربیت ہی ایسی ہوئی تھی کہ وہ لباس کو ہی آدمی کا آئینہ تصور کرنے پر مجبور تھا۔ گیٹ کے اندر ایک نئی چیز ہمیں نظر آئی۔ وہاں اُن لوگوں نے ایک استقبالیہ تعمیر کر دیا تھا۔ بائیں ہاتھ۔ اور اس کے اندر ایک چڑیا ہمہ وقت پھڑپھڑاتی رہتی تھی۔ ہم آگے بڑھنے کے بجائے اس کے پاس جا ٹھہرے۔ وہ کھڑکی میں سے بات کرتی تھی تاکہ کسی کو استقبالیہ کے کمرے میں جانے کی ضرورت پیش نہ آئے۔

آبی اسے دیکھ کر اپنی ٹائی درست کرتے ہوئے بولا "مادام ہم ایک مریض کے بارے میں معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو ہم اُسے دیکھ آئیں؟"

"جی، ضرور دیکھیں۔ کیا نام ہے اس مریض کا؟ کس لیے وہ یہاں داخل ہے؟"

"جی اُن کا نام ولایت علی ہے۔"

خاتون نے پرچی پر وہ نام لکھا، بولی۔ "آپ کا اسمِ گرامی؟"

"جی میرا نام رفیق گوندل ہے، ایم اے ایل ایل بی۔ اور یہ میرے بھائی ہیں، پروفیسر شفیق گوندل۔ ایم اے ایم او ایل۔"

"اوہ گڈ! تو آپ گوندل ہیں۔ گڈ! یہ لیں پرچی ساتھ رکھ لیں۔ ولایت علی دُوسری منزل پر چار نمبر کمرے میں ہوں گے۔"

"اُن کا حال کیا ہے اب؟"

"مجھے تو کچھ پتہ نہیں، آپ معلوم کر لیں۔ کوئی عزیز ہیں وہ آپ کے؟"

"جی نہیں، ہمارے دوست ہیں۔ اچھا خدا حافظ۔"

یہ کہہ کر آبی وہاں سے ہٹ گیا۔ لڑکی وہ ایسی تھی کہ اُسے خواہ مخواہ چھو لینے کو جی چاہتا تھا۔ پتہ نہیں آبی نے اُس کی اشتعال انگیزی کو کیسے برداشت کر لیا۔ ہم ذرا آگے نکلے تو مجھے اپنی حماقت پر سخت طیش آیا۔ ہم اس خاتون سے وہیں معلوم کر سکتے تھے کہ عالیہ اس وقت کہاں ہو گی؟ آبی کو بازو سے پکڑ کر ہم پھر اسی کے پاس آ پہنچے۔

"جی فرمائیے! کوئی اور حکم؟"

"وہ دراصل...... آپ ہمیں بتا سکتی ہیں کہ ڈاکٹر عالیہ اور ڈاکٹر دھمن اس وقت کہاں ہوں گے؟"

"جی، وہ تو اب یہاں کام نہیں کرتے۔ کلینک انہوں نے بیچ دیا ہے۔ اب تو میں نے اُن کا ایک عرصے سے نام بھی نہیں سُنا ہے۔ کہتے ہیں وہ امریکہ چلے گئے ہیں۔"

"اوہ! تو یہ بات ہے۔ میرا خیال تھا کہ ولایت علی انہی کے زیرِ علاج ہوں گے۔"

"جی نہیں، اب تو قریشی صاحب ہی سب کام کرتے ہیں اور انہوں نے چھ ڈاکٹر بھی ملازم رکھے ہوئے ہیں۔"

"بہت بہت شکریہ خاتون! میرا خیال تھا کہ شاید آپ کو ان کے بارے میں کچھ علم ہو گا۔" میں نے اس کو ہاتھ کے اشارے سے ... کیا اور آبی کو ساتھ لے کر عمارت کی طرف چل دیا۔ اس کلینک سے میری بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔ تلخ، ترش، شیریں ... اس سارے قصے کا مرکزی کردار کہیں غائب ہو چکا تھا اور اس کے بارے میں صحیح بات کسی کو بھی معلوم نہیں تھی۔ حالانکہ وہ شہر میں تھا مگر شاید وہ اپنا نام ہر کسی سے چھپا رہا تھا۔ یہی کہ اب لوگ اس کے نام کو بھی بھول چکے تھے۔ وہ اپنی شہرت اور دھن دولت کی فراوانی کے باوجود غیر معروف رہنا پسند کرتا تھا۔ یہ تبدیلی میرے لیے حیران کن تھی۔ ورنہ ڈاکٹر دھمن اور ڈاکٹر عالیہ تو نام و نمود کے ایسے رسیا تھے کہ وہ ہر جگہ ... کھیل جاتے تھے۔

ہم دُوسری منزل پر جا پہنچے۔ راستے میں ہمیں کسی نے روکنے کی جرأت نہیں کی۔ ہسپتال کا سارا ہی عملہ بدل دیا گیا تھا۔ نئے چہرے برآمدوں میں گھومتے پھرتے نظر آتے تھے۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ ڈاکٹر قریشی نے ہر گھڑا خوب ٹھونک بجا کر خریدا تھا۔ نرسیں خوبصورت بھی تھیں اور صحت مند بھی۔ یہی حال ڈاکٹروں اور ... کا تھا۔ مٹی کی ہر مورت میں وہاں مجھے بڑی جان نظر آتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ اُن کو بھرتی کرتے وقت ڈاکٹر قریشی نے دونوں باتوں کا بے حد خیال رکھا تھا۔

چار نمبر کمرے کے سامنے پہنچ کر ہم ذرا دیر کو ٹھٹکے۔ آبی کا خیال تھا کہ ہمیں پہلے اردگرد کی سُن گُن لے لینی چاہیے ورنہ عین ممکن تھا کہ ڈول ہم اندر ڈالتے اور کوئی ہماری ... کاٹ دیتا۔ مگر مجھے اس سے اتفاق نہیں تھا۔ پستولوں کو اوور کوٹ کی دائیں جیبوں میں رکھ کر ہم نے دروازہ کھولا۔ ولایت علی بستر پر موجود تھا مگر یوں جیسے خانۂ تقدیر کا حرف غلط سمجھ کر مٹا دیا ہے۔ وہ بستر پر پڑا تھا مگر اس کو ... میں ہمیں دیر لگی۔ وہ ایک طرح سے پاگل ہو چکا تھا۔ ڈاڑھی تو اس کی صفا چٹ تھی مگر آنکھیں اندر دھنسی نظر آتی تھیں۔ دواؤں کی شیشیوں کی لمبی قطار اس کے بستر کے قریب دھری تھی اور ایک بہت ہی طرح دار عورت اس کی پائینتی بیٹھی تھی۔ وہ بلاشبہ کسی ہوٹل کے منیجر کی ہی بیوی لگتی تھی۔ ... کر کے وہ ہسپتال آئی تھی مگر اس کے چہرے کی سادگی ... برباد ہو چکی تھیں۔ ایک صرف لباس ہی اس کی تازگی کی ... تھا۔ جس کے لیے اس نے بڑا اہتمام کر رکھا تھا۔ ورنہ وہ اندر سے بہت دُکھی لگتی تھی۔

اُس نے ہمیں دیکھا تو ایک دم بستر سے اُٹھ گئی اور ولایت علی ہمیں یوں دیکھ رہا تھا جیسے ہمارا عکس اس کی آنکھوں میں اُتر نہ رہا ہو۔ خالی خالی نظروں سے اس نے ہمیں یوں دیکھا جیسے ہم وہاں تھے ہی نہیں۔ اس کے چہرے سے کوئی تاثر نمایاں نہیں ہوا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ مٹی کا ڈھیر بن چکا ہو۔ آدمی نزع میں ہو تو بھی وہ نظر کے سامنے پھرتی ہر شے کو دیکھ لیتا ہے۔ اسے بُلا نہ سکے، اس سے بات نہ کر سکے تو بھی وہ ہاتھ سے، چہرے سے یا جسم کی کسی حرکت سے اپنے وجود کا احساس دلاتا ہے کہ ابھی وہ زندگی کی اس سرحد پر موجود ہے۔ مگر ولایت علی وہاں تھا بھی تو اپنی کسی حرکت سے وہ خود کو ظاہر نہیں کرتا تھا۔ اس ٹُنگے شیطان نے انہیں ایسے ہی مشروب پر لگا دیا تھا۔ ولایت علی مجھے لوٹنی کا گنبد بنا نظر آتا تھا —— اس کی لوحِ عشق پر جو گوٹھ میں یار لوگوں نے کچھ زیادہ ہی تیز دھار قلم سے گہری لکیریں ڈال دی تھیں جن کے اثرات اب بھی اس کی بنتی حالت سے نمایاں تھے۔ اس خاتون نے ہمارے قدم روکتے ہوئے کہا "جی فرمائیے! کس سے ملنا ہے آپ کو؟"

"ہم مُعافی چاہتے ہیں خاتون! اگر ہم غلط نہیں سمجھے تو یہ ولایت علی صاحب کا ہی کمرہ ہے نا؟"

"جی، جی! یہ ولایت علی ہی تو ہیں۔ دشمنوں نے تو انہیں تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔"

اس کی آنکھیں اُمڈ آئیں۔ ہونٹوں پر وہ یوں زبان پھیرنے لگی تھی جیسے وہ ان کی پپڑیوں کو اپنے آنسوؤں سے تر کر لے گی جو اس کے ہونٹوں کو بھگونے لگے تھے۔ خاوند کی اس اذیت نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔

"ہم اِن ہی کو دیکھنے آئے ہیں خاتون! میرا خیال ہے کہ آپ اِن کی اہلیہ ہیں۔" میں نے اس کی اندوہناک حالت سے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔ اس کا غم مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ ولایت علی ہی اس کی زندگی کا سب سے بڑا سہارا تھا۔ وہ تنہا تھی۔ کمرے میں اور کوئی دُوسرا موجود نہیں تھا۔ کوئی اس کا بیٹا بیٹی بھی اس کے پاس نہیں تھا اور اس کربناک کیفیت سے اسے تنہا ہی گزرنا پڑ رہا تھا۔ مجھے اس کی یہ حالت دیکھ کر بہت ترس آ رہا تھا۔ اس ولایت علی کو بھنگ کے پیالے پر ڈال دینے میں آخر کہاں کی مصلحت تھی۔ مگر ڈھلوں صاحب اپنے دشمنوں سے یہی سلوک کرتے آئے تھے۔

"جی! میرا نام ثریا ولایت علی ہے۔ ان کی حالت مجھ سے دیکھی نہیں جاتی.... مگر آپ نے اپنا نام نہیں بتایا ہے۔ اِدھر تشریف رکھیں۔" اس نے دونوں کرسیاں ہمارے آگے رکھ دیں۔ وہی اس کمرے کی کُل متاع تھیں۔

دروازہ ابھی تک ہمارے عقب میں بھڑا ہوا تھا اور کوئی بھی آدمی اچانک اندر آ سکتا تھا مگر اس خاتون کو کسی پریشانی میں ڈالنا ہمیں منظور نہیں تھا۔ اِس بچاری کا اپنے خاوند کے اعمال میں کسی قسم کی شرکت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میرا احساس یہی کہتا تھا۔ اکثر و بیشتر بیویاں دراصل جانتی ہی نہیں —— کہ شوہر کا دَرُوں کیا ہے اور بَرُوں کیا؟ وہ ڈولی کے مہبط میں اترتی ہیں تو پھر بھول جاتی ہیں کہ تقدیر نے اُن کے ساتھ انصاف بھی کیا ہے کہ نہیں۔ مہرِ معجّل اور مہرِ موجّل کی ساری باتیں بے معنی ہو جاتی ہیں۔ انہیں صرف ایک ہی آرزو ہوتی ہے کہ اُن کا شوہر اُن سے خوش رہے اور بس۔ اُس ثریا کو دیکھ کر میں یہی سمجھ رہا تھا کہ اس کے شوہر کا کرب برابر اس کی طرف منتقل ہو رہا تھا اور وہ ہر آنے والے سے ہمدردی کے دو بول سننے کو ترس رہی تھی۔

"جی! میرا نام شفقت گوندل ہے، یہ میرے بھائی ہیں رفیق گوندل ایم اے ایل ایل بی۔" میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

آبی ابھی تک برابر ولایت علی کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ایسے مخبوط الحواس آدمی سے کیا بات کرے۔ وہ تو بچارا کچھ کہتا ہی نہیں تھا۔ اس بھنگ کے پیالے نے اسے واقعی تباہ کر دیا تھا۔

"انہیں ہوا کیا ہے آخر! ان کی یہ حالت کیسے ہو گئی؟"

"خدا اُن کا بیڑا غرق کرے۔ پتہ نہیں وہ کون لوگ تھے۔ سُنا ہے اُنہوں نے اِن تین آدمیوں کو سڑک پر راہ چلتے اغوا کر لیا تھا اور پھر ان کو ایسی دوائیں پلائیں کہ یہ اب تک اپنے آپ میں نہیں آ سکے۔ ہوش میں آتے ہیں تو عجیب عجیب باتیں کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سارا زور لگا چکے ہیں۔"

"مگر وہ کون لوگ تھے؟ کیسے اغوا کر لیا ان کو انہوں نے؟"

"مجھے تو کچھ بھی پتہ نہیں ہے۔ کسی سے ان کی دشمنی بھی نہیں تھی۔ میں تو آج تک اس راز کو سمجھ نہیں سکی ہوں۔"

"آپ کہتی ہیں کہ دو آدمی ان کے ساتھ اور بھی تھے؟"

"جی ہاں! ان میں سے رشید تو ختم ہو چکا ہے۔ اس کی لاش پرسوں یہاں سے واپس گئی تھی۔ خدا میرے شوہر کو بچا لے۔ میں تو برباد ہو گئی ہوں۔" اس نے ولایت علی کے چُورہ بدن پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ وہ ہڈیوں کی مُٹھ ہو چکا تھا۔ ایک صرف اس کے چہرے کے نقوش ہی اس کی پہچان تھے۔ ورنہ ولایت علی تو دکھتا ہی نہیں۔ ثریا کی آنکھوں سے کسی وقت عجیب سا لَو دیتا ہوا نائرہ سا نکلتا دکھائی دیتا تھا۔ جس کی تپش دیکھنے والے کو بھسم کر دیتی تھی اور وہ دراصل اس کے اندرونی غیظ و غضب کا مظہر تھا۔ جس کو وہ ابھی تک کسی پر ظاہر نہیں کر سکی تھی۔ اندر ہی اندر اُس کی ندی میں آ کر خود کو بھسم کرتی چلی جاتی تھی۔

ولایت علی نے ہمارے کام میں ایسی کھنڈت ڈال دی تھی کہ ہمارا وہاں جانا ہی بے کار ہو گیا تھا۔ مجھے یہ بتائیں کہ اِن کو کس نے اغوا کر لیا تھا؟"

"مجھے کچھ معلوم نہیں بھائی جی! مجھ بدنصیب سے تو یہ ہر چیز چھپا لیا کرتے تھے۔"

"وہ تیسرا آدمی کیا ہوا؟ کیا نام تھا اس کا؟"

"اس کا نام تاجور ہے۔ وہ ابھی زندہ ہے مگر اس کا حال بھی مُردوں سے بدتر ہے۔ وہ ہر وقت پیالے پیالے کی رَٹ لگاتا رہتا ہے۔ ولایت علی تو ایسا نہیں کرتے مگر ان کی چُپ ہمیں لے ڈوبی ہے۔ بظاہر انہیں کوئی مرض بھی نہیں ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ یہ ٹھیک ہو جائیں گے مگر یہ کب ٹھیک ہوں گے؟"

"اِن کے دماغ پر گہرا اثر پڑا ہے۔ بہر حال اللہ بہتری کرے گا۔ یہ اِنشاء اللہ ٹھیک ہو جائیں گے۔"

"پتہ نہیں یہ کب ٹھیک ہوں گے۔ گھر میں دھول اُڑنے لگی ہے۔ یہ کچھ کرنے کے قابل ہوں تو مجھے بینک سے کچھ روپیہ نکلوا دیں مگر یہ وہ بھی نہیں کر سکتے۔"

"وہاں تو ان کے نام کافی روپیہ جمع ہوگا؟"

"جی ہاں! سُنا ہے کہ دو تین جگہ پر ان کا حساب کھلا ہوا ہے مگر گھر میں تو اب کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ ان کے علاج پر میرے زیور بھی خرچ ہو گئے۔ کہتے ہیں کہ بینک میں ان کے کوئی ساٹھ ہزار روپے جمع ہیں۔"

"کوئی بات نہیں! ان کے لیے اب دو دُعائیں مانگیں کہ اللہ یا تو انہیں زندگی دے اور یا پھر شام تک انہیں اُوپر اٹھا لے۔ اس کے سوا اور کیا کر سکتی ہیں آپ؟" آبی نے صورتِ حال کی سنگینی کی پروا نہ کرتے ہوئے کرسی سے اُٹھ کر کہا۔ اُسے اس عورت کے آنسو متاثر نہ کر سکے تھے۔ کیونکہ اس کے شوہر کا اعمال نامہ اس کے سامنے تھا۔

"یہ..... یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ اس قدر سنگدل ہیں آپ؟ میں ان کی موت کی دُعا کیسے مانگ سکتی ہوں۔ میرا تو سب کچھ یہی ہیں۔" وہ ایک دم بپھر کر کرسی سے اُٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں سے لَو دیتے ہوئے نائرے کی تپش اب صاف محسوس ہونے لگی تھی۔

"یہ ایسے ہی مذاق کر رہے ہیں۔ اللہ بہتر کرے گا خانم! ابھی میں یہ دو ہزار روپے آپ کے پاس چھوڑ رہا ہوں۔ اور پھر کسی وقت آؤں گا۔" میں نے جیب سے دو ہزار روپے نکال کر ولایت علی کے پلنگ پر ڈال دیے۔

وہ عورت کچھ مطمئن سی ہو گئی۔ جیسے اس کی نیند کی ترسی ہوئی رُوح کو سکون مل گیا ہو مگر پھر بھی اس نے نوٹ اٹھا کر میری طرف بڑھا دیے، بولی "نہیں نہیں بھائی جی! یہ آپ رکھ لیں، آپ کی ہمدردی کا بہت بہت شکریہ۔ میں نے اس لیے تو اپنی تنگی کا ذکر آپ سے نہیں کیا تھا۔"

"جی نہیں! یہ تو ہمارا فرض ہے۔ آخر کو یہ ہمارے دوست ہیں۔ ہم پھر آئیں گے۔" یہ کہہ کر میں نے آبی کو ساتھ لیا اور اسی وقت ہم اس کمرے سے باہر نکل آئے۔ ثریا کے کمانچے میں پھنسی ساری رُوئی نیچے گر گئی تھی۔ اس سے اب کچھ بھی سنبھالے نہیں سنبھلتا تھا۔ ولایت علی کے تیروں کی ساری گانسیاں ٹوٹ چکی تھیں اور اب وہ واقعی مُردوں سے بدتر حالت میں وقت گزار رہا تھا۔ ڈاکٹر کہتے تھے، وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ مگر ڈاکٹر تو یہی کہا کرتے ہیں اُن کا کیا ہے۔

ہم برآمدے میں نکلے تو عین اس وقت مجھے حیدر سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ وہ سیڑھیاں چڑھنے کے بعد اپنا دم درست کرنے کے لیے لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ اس نے ہاتھ میں پھلوں کی ٹوکری پکڑ رکھی تھی اور میرا خیال یہ تھا کہ وہ سیدھا ولایت علی کے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ بلاشبہ حیدر کو معلوم ہوگا کہ عالیہ اس وقت کہاں ٹھہری تھی اس سے ہم بیش بہا معلومات حاصل کر سکتے تھے مگر حیدر ہمیں ایسی جگہ ملا تھا کہ ہم اس پر وہاں براہِ راست ہاتھ نہیں ڈال سکتے تھے۔ برآمدے میں لوگوں کی بھیڑ تھی۔ ان میں کلینک کا عملہ بھی شامل تھا اور مریضوں کے لواحقین بھی۔ کوئی آ رہا تھا اور کوئی جا رہا تھا ایسے میں حیدر کی کینچلی میں ہاتھ ڈالنا اچھا نہیں تھا۔ وہ تو ہمیں دیکھتے ہی شور مچا دیتا۔

ایک بات البتہ ظاہر تھی کہ اس ڈرامے کے سارے ہی کردار اب ہمارے سامنے تھے۔ ایک ذرا ڈھنگ سے اُن پر ہاتھ ڈالنے کی فرصت باقی تھی۔ ڈاکٹر دمن بھی وہیں تھا، عالیہ بھی اُدھر ہی تھی اور ان کے چیلے چانٹے بھی وہیں موجود تھے۔ ہو سکتا ہے سوات خان سے بھی ہماری ملاقات ہو جاتی مگر جو نرز جو کچھ کہہ رہی تھی، وہ بات ہمارے لیے زبردست تشویش کا باعث بن سکتی تھی۔ اس نے ہمیں بتایا تھا کہ اب کی بار عالیہ اپنے ساتھ چھ شارپ شوٹرز لے کر آئی ہے۔ پتہ نہیں وہ کس ملک سے تعلق رکھتے تھے اور کن شرائط پر اس کے ساتھ آ گئے تھے۔ وہ اگر ان کے حلقے میں زندگی گزار رہی تھی تو ان سے نمٹنے کے لیے ہمیں دُگنی تگنی طاقت کی ضرورت تھی۔ میں اور آبی تو شاید کبھی بھی اُن کے للکار نہیں سکتے تھے۔ مجھے یہی احساس ڈسنے لگا تھا۔ "دیکھ آبی! یہ حیدر ہے۔ یہ جس نے صدری پہن رکھی ہے۔"

"اچھا؟ پھر؟" آبی نے حیدر پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔

"میں نیچے چلتا ہوں۔ اُدھر پچھلے باغ میں میں تیرا انتظار کروں گا۔ تم جس طرح بھی ہو سکے اس کو لے کر باہر آ جاؤ۔ میرا خیال ہے کہ وہ تمہیں یہ ہرگز پہچان نہیں سکے گا۔"

"ہاں! یہ ٹھیک ہے۔ تم چلو میں اس کو لے کر وہاں پہنچتا ہوں۔"

آبی کی یہ بات سن کر میں دو آدمیوں کے عقب میں چلتا ہوا سیڑھیوں سے نیچے اتر گیا۔ حیدر کی صحت اب پہلے سے بہت بہتر تھی۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ موٹا ہو چکا تھا اور اس کی وہ فالتو چربی اسے آگے چلنے نہیں دیتی تھی۔ سیڑھیاں اُتر کر میں نے اِدھر اُدھر نگاہ ڈالی مگر جب کوئی بھی شناسا چہرہ مجھے نظر نہیں آیا تو میں عمارت سے باہر نکل گیا اور عقبی باغ میں جا ٹھہرا۔ گھاس کے قطعے وہاں بڑی بہار دکھا رہے تھے اور دھوپ ڈھل چکی تھی سائے معدوم ہونے لگے تھے۔ گھاس کے اُن قطعوں پر کئی اور لوگ بھی بیٹھے تھے۔ وہ مریضوں کی عیادت کے لیے آئے تھے اور اِدھر اُدھر ٹکڑیوں کی صورت میں بیٹھے تھے۔ ان سے الگ ہو کر میں نے بھی باڑھ کے ساتھ اپنا ڈیرہ جما لیا۔ مجھے معلوم ہونا چاہیے تھا کہ ایسی صورتِ حال میں آبی کیا کارگزاری دکھا سکتا ہے۔ ڈر مجھے یہی تھا کہ کہیں وہ متوحش آدمی حیدر کو گولی مار کر مُردہ حالت میں میرے پاس نہ لے آئے اور اسے کفن میں لپٹا کر میرے سامنے لا رکھے کہ میاں! تیرا بندہ حاضر ہے۔ اس سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔

مگر میرا اندازہ غلط نکلا۔ آبی کوئی پندرہ منٹ بعد باغ میں آیا۔ اس حال میں کہ حیدر اس کے پہلو سے لگا ہوا تھا۔ آبی نے اپنا پستول رُومال میں لپیٹ کر اس کی پسلی سے لگا رکھا تھا۔ حیدر کا رنگ فق ہو رہا تھا۔ اس کے منہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔ ٹانگ اُس کی کتے کی دم کی طرح ابھی تک سیدھی نہیں ہو سکی تھی۔ ذرا سا لنگڑا کر وہ یوں چل رہا تھا جیسے اس پر نزع کا عالم طاری ہو۔ میں باڑھ کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ آبی میری طرف بڑھا تو حیدر بدکنے لگا۔ مگر آبی نے اسے غیر محسوس طریقے سے ایک ٹھوکا دیا۔ تو وہ الٹ کر میری طرف بڑھ آیا۔ وہ مجھے ابھی تک پہچان نہیں سکا تھا۔ مجھے اس قسم کے عمدہ سُوٹ اور اتنے نفیس قسم کے اوورکوٹ میں اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ میرے قریب آیا تو میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ اب وہ ہم دونوں کی اوٹ میں باڑھ کے ساتھ آ رُکا تھا۔ اس نے اب کی بار مجھے بڑی گہری نظر سے دیکھا تو اچانک ہی اس کے ذہن میں ماضی کا غلام جیلانی اُبھر آیا۔

"تمہارا کیا حال ہے حیدر؟ بہت دنوں بعد ملے ہو۔" میں نے اس کے دونوں لجلجے ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچا۔ رنگ اس کا ابھی تک اُڑا ہوا تھا۔

آبی نے اُسے اور زیادہ دہشت زدہ کر رکھا تھا، بولا "یہ اِدھر نہیں آ رہا تھا۔ بہت ڈھیٹ آدمی ہے۔ پستول سے البتہ ڈر جاتا ہے، شاید موت سے ڈرتا ہے۔" آبی نے اس کے رویّے کی شکایت کی، مگر حیدر میری طرف نہیں جھکا۔ ہاتھ چھڑا کر وہیں کھڑا رہا۔

"نہیں بھئی! یہ تو اپنا بہت پُرانا یار بیلی ہے۔ اس کی خدمتیں یاد آتی ہیں تو کلیجہ مُنہ کو آنے لگتا ہے۔ کیا کر رہے ہو آج کل حیدر؟ تم کچھ موٹے ہو گئے ہو۔"

"تو یہ تم نے..... تمہاری وجہ سے ہی مجھے اغوا کیا گیا ہے۔"

"نہیں یار! کون کہتا ہے تم اغوا ہو گئے ہو۔ ابھی تو تم یہاں ہی موجود ہو اور بہت سے لوگ یہاں بیٹھے ہیں۔ دراصل تم سے ہمیں ایک بہت ضروری کام تھا۔"

"کیا کام تھا مجھ سے تمہیں! تم سمجھ کر مجھے اغوا کر لائے ہو۔ میری آواز پر سینکڑوں آدمی یہاں جمع ہو سکتے ہیں۔" وہ بہت زیادہ تپا ہوا تھا۔

"کوئی ٹیکسی روک یار! حیدر کو آج ہم فلم دکھائیں گے۔" میں نے اسے باڑھ کے اندر بنے چھوٹے سے راستے میں سے زبردستی گزارتے ہوئے کہا۔

"یہ کیا کرتے ہو تم؟ تمہارا مطلب کیا ہے؟"

"آواز بند کر لے حیدر! ورنہ تیرا ہم ابھی جھٹکا کر دیں گے۔ چل اُدھر۔" یہ کہہ کر میں نے اسے اپنے آگے دھکیلا اور ہم باڑھ کے عقب میں جا پہنچے۔ ایک ڈرائیور سواریوں کو اتار کر واپس جا رہا تھا۔ آبی نے اس ٹیکسی کو روکا اور ہم حیدر کو اس میں بٹھا کر فوراً ہی باہر نکل گئے۔ آبی کا پستول ابھی تک حیدر کی پسلی سے لگا تھا اور اسے معلوم تھا کہ ہم کس قماش کے آدمی ہیں۔ بندے کو تو ہم جُوں کی طرح مار دیتے ہیں۔ ہماری دہشت نے اس کا کلیجہ دبوچ لیا تھا۔

"ہمیں جناح باغ لے چلو میاں!" میں نے ڈرائیور سے مخاطب ہو کر کہا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم جناح باغ کے عقب میں کھڑے تھے۔ ڈرائیور کو میں نے فارغ کر دیا اور دیوار پر سے چڑھا کر ہم حیدر کو ایک ویران گوشے میں لے گئے۔ اسے گھاس پر بٹھا کر آبی نے چلغوزے اس کے سامنے رکھ دیے، بولا "لو یہ کھاؤ۔ اس کا موسم شروع ہو چکا ہے۔"

حیدر بالکل خاموش تھا۔ کبھی اس کی نظریں مجھ پر اٹھتی تھیں اور کبھی آبی پر۔ چلغوزوں کی طرف اس نے کوئی توجہ نہیں دی۔

"یہ بتا حیدر کہ عالیہ اس وقت کہاں ہوگی؟ وہ اپنی کوٹھی میں بھی نہیں ہے اور ہسپتال میں بھی ہم نے دیکھ لیا ہے۔"

"اتنی سی بات کے لیے تم نے مجھے پریشان کر دیا ہے استاد! یہ بات تو میں تمہیں وہیں بتا سکتا تھا۔ عالیہ اس وقت ہوٹل السوڈ میں ہے۔"

"اور وہ دھمّن؟"

"اس کا مجھے کوئی علم نہیں۔ اُسے میں نے بہت دنوں سے نہیں دیکھا ہے۔"

"تم اس سے ملتے رہتے ہو، اس عالیہ سے؟"
"نہیں! میں آج کل ڈاکٹر صفدر کے پاس رہتا ہوں... شفابار کلینک اس نے خرید لیا ہے۔"
"گڈ! آدمی تم واقعی بہت اچھے ہو حیدر! مگر یہ عالیہ کب سے وہاں رہ رہی ہے؟"
"کچھ ہی دن پہلے وہ امریکہ سے آئی تھی۔ جب سے اب تک ہوٹل میں رہ رہی ہے۔"
"اس کا کمرہ نمبر تو یاد ہوگا تمہیں؟"
"ہوٹل وہ کچھ اس طرح کا ہے کہ اس میں الگ الگ سُوٹ بنے ہوئے ہیں۔ وہ گیارہ نمبر میں رہ رہی ہے۔ اس کے پاس تین کمرے ہیں۔ چوتھا کمرہ اس نے اپنے ملازموں کو دے رکھا ہے۔"
"سُنا ہے اپنے ساتھ وہ اب مسلح محافظ رکھتی ہے؟"
"اس کا مجھے علم نہیں! میری اس سے ملاقات بہت کم ہوتی ہے کبھی وہ شفابار آئے تو سلام کے لیے حاضر ہو جاتا ہوں۔"
"تمہیں ہم نے واقعی بہت تکلیف دی ہے حیدر! لیکن ہماری اِس ملاقات کا تم کسی سے ذکر نہ کرو تو ہم تمہیں آزاد کر دیتے ہیں. مگر وعدہ پکّا کرنا ہوگا۔ وَرنہ ہم تمہیں اِدھر ہی گاڑ دیں گے۔" آبی نے اس کے قریب ہو کر سرگوشی کی۔

حیدر کچھ سٹپٹا سا گیا۔ آبی کے چہرے پر کچھ ایسی درشتگی آگئی تھی جیسے وہ حیدر کو سموچا نگل لینا چاہتا ہو۔ "ایسا ہی ہوگا — میاں جی! میں کسی سے اس بات کا ذکر نہیں کروں گا۔ وَیسے بھی ڈاکٹر عالیہ سے اب میرا کوئی واسطہ نہیں ہے۔"
"ٹھیک ہے، اب تم جاؤ۔ یہ لو سو روپیہ حاضر ہے۔ ٹیکسی لے کر سیدھے شفابار چلے جاؤ۔" آبی نے سو کا نوٹ نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔

حیدر نے نوٹ مٹھی میں پکڑا اور اسی وقت وہاں سے اُٹھ گیا۔ بولا "خدا حافظ اُستاد! خدا تمہاری حفاظت کرے۔ مجھے ڈر ہے کہ تمہاری رسّی اب زیادہ دَراز نہیں رہی ہے۔"
"میں تمہارا مطلب سمجھ رہا ہوں حیدر! مگر میری رسّی عالیہ کی رسّی کے بعد ہی ختم ہوگی اور مجھے امید ہے کہ تمہیں مجھ سے بہت ہمدردی ہے۔"
"اسی لیے تو میں خدا سے تمہاری حفاظت کی دُعا کرتا ہوں، اچھا اجازت دو۔" یہ کہہ کر اس نے بڑی محبت سے میرا ہاتھ پکڑا اور پھر آبی کو بھی سلام کر کے وہ دیوار پھلانگ کر باغ سے باہر نکل گیا۔

ہم بڑی دیر تک باغ میں بیٹھے رہے۔ کھانا بھی ہم نے وہیں کھایا، یہاں تک کہ شام بھی ہمیں وہیں آملی۔ درختوں کا عجب ڈھنگ ہے۔ صبح و شام ان کے سائے طویل ہونے لگتے ہیں۔ وہ سائے جب بالکل معدوم ہو گئے تو ہم باغ سے نکل آئے۔

حیدر کی طرف سے ہم بالکل مطمئن تھے۔ ہمیں یقین تھا کہ وہ کسی سے ہمارا ذکر نہیں کرے گا۔ حالانکہ ہم اُسے اڈّے سے اٹھا کر باغ میں لے آئے تھے، اس سے ہم نے کوئی اچھا سلوک نہیں کیا تھا۔ پھر بھی میں سمجھتا تھا کہ وہ عالیہ سے ہمارا تذکرہ نہیں کرے گا۔ پتہ نہیں میں ایسا کیوں سوچتا تھا۔ میں خود کو یہی تسلیاں دیتا رہا۔ آبی کا بھی یہی خیال تھا کہ حیدر چُپ ہی رہے گا۔ جس انداز سے وہ ہم سے عالیہ کا ذکر کر رہا تھا اس سے ہم نے یہی اندازہ لگایا تھا کہ وہ عالیہ سے ہماری ملاقات کو مخفی رکھے گا۔ کبھی کبھی آدمی اپنی آسانی کے لیے طفل تسلّیوں سے ہی کام لیتا ہے، ورنہ بات کچھ بھی نہیں تھی۔ ہم نے خواہ مخواہ فرض کر لیا تھا کہ حیدر بھی عالیہ سے اتنا ہی ناراض ہے جتنے ہم ہیں۔

رات نے جب شہر پہ اپنا تسلّط جما لیا تو ہم سیدھے ہوٹل السوز جا پہنچے۔ کئی ایکڑ رقبے پر پھیلا ہوا وہ ہوٹل ہمیں یہی احساس دلاتا تھا کہ لوگ وہاں با قاعدہ کُنبوں کی صُورت میں رہ رہے ہیں۔

اِستقبالیہ میں موجود ایک خاتون سے ہم نے جب پوچھا کہ ہم ڈاکٹر عالیہ سے ملنا چاہتے ہیں تو اس نے قطعاً لاعلمی کا اظہار کیا۔ بولی "اس نام کی تو کوئی خاتون یہاں نہیں رہتی ہیں۔۔ جناب!"
"اور ڈاکٹر دھمّن! اُن کو تو آپ جانتی ہی ہوں گی؟"
"جی نہیں! یہ نام بھی ہمارے لیے اجنبی ہے۔"
"اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں غلط اِطلاع دی گئی ہے۔" آبی نے مایوس ہو کر کہا۔ "وہ حیدر ہم سے بھی پنجو سات پچھتر کر گیا ہے!"
"نہیں یار! وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ آؤ اُدھر گیارہ نمبر میں چلتے ہیں میرا خیال ہے وہ وہیں رہتی ہے۔" میں نے آبی کو اپنے پیچھے آنے کے لیے کہا۔

راستے میں ہم نے ایک ویٹر سے گیارہ نمبر کے بارے میں معلوم کیا تو اس نے ہمیں ہوٹل کے عقبی حصّے کی طرف بھیج دیا۔ سامنے ہی ایک بہت گل بہار قسم کی خوبصورت عمارت تھی۔ جس کے چاروں طرف پھول ہی پھول اُگے ہوئے تھے اور اُن پھولوں کے وسط میں وہ چھوٹی سی عمارت بہت ہی دلفریب منظر پیش کرتی تھی۔ پھولوں کی کیاریوں کے عین بیچ میں ایک پختہ روش چلتی تھی جس پر گاڑی بھی آسانی سے گزر سکتی تھی۔ سامنے ایک برآمدہ تھا۔ جس کے ستونوں کے بیچ میں جالی لگی تھی۔ برآمدے کے وسط میں ایک دروازہ تھا جو ہمیں بھڑا ہوا نظر آیا۔ اس دروازے پر لگی گھنٹی آبی کی انگلی تلے آئی مگر میں نے اسے بجانے سے منع کر دیا۔ اس عمارت کا آگا پیچھا تو ہمیں دیکھ لینا چاہیے تھا۔ پتہ نہیں حالات کیا سے کیا ہو جائیں۔ برآمدے کے اندر صرف ایک بتّی جل رہی تھی۔ عمارت کا جائزہ لینے کے لیے ابھی ہم پیچھے ہٹے ہی تھے کہ کسی نے وہ دروازہ کھول دیا۔

[پ]یلے رنگ کی وَردی میں ملبوس ایک آدمی تیزی سے باہر نکلا۔ وہ [چ]ہرے مہرے سے کوئی بہت ہی مہذب آدمی نظر آتا تھا۔ اگرچہ [اس] کا رنگ گندمی تھا مگر جب وہ بولا تو ہمیں معلوم ہوا کہ جن [ن]ارپ شوڈروں کی بات ہم سُن چکے تھے وہ ان میں سے نہیں تھا۔ [و]ہ بڑی رَواں دَواں اُردو میں بولا "فرمایئے! آپ کو کس سے ملنا ہے؟"
"اوہ! ہم دَراصل علی نواز صاحب سے ملنا چاہتے ہیں۔ وہ [اِ]دھر ہی رہتے ہیں کیا؟"
"جی نہیں! یہاں کوئی علی نواز نہیں رہتا۔"
"مگر ہمیں تو یہی بتایا گیا تھا! کون رہتا ہے یہاں؟"
"اِدھر مسز ناہیدامان رہتی ہیں۔"
"ناہیدامان! یار مسز کبیر نے ان کا بھی تو ذکر کیا تھا [ت]م سے۔ پلیز! آپ اُن کو بتا دیں کہ شفیق صاحب آئے ہیں۔ [و]ہ اُن کے وکیل ہیں۔" آبی نے ایک دم اُس کی بات پکڑتے ہوئے کہا۔
"مسز کبیر؟ یہ کون ہیں؟"
"مسز ناہید انہیں جانتی ہیں۔ وہ ملتان روڈ پر رہتی ہیں۔ [م]یرا خیال ہے کہ مسز ناہید سے مل لینا بہتر ہوگا۔"
"آپ کے پاس کوئی کارڈ ہے اپنا؟"
"جی نہیں! بس آپ انہیں بتا دیں کہ مسز کبیر کے وکیل شفیق صاحب آئے ہیں۔" آبی نے عالیہ کے اس ملازم کا کندھا بلا وجہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔
"ٹھیک ہے۔ میں انہیں بتا دیتا ہوں۔ آپ یہاں ٹھہریں۔" یہ کہہ کر وہ پیچھے ہٹا اور برآمدے میں جا گھُسا۔ ساری ہی بتّیاں ایک دم روشن کر دی گئیں تھیں۔ برآمدے کے اندر اور باہر کئی بلب منوّر ہوتے تو ایک عجیب سی چکا چوند روشنی نے ہمیں نرغے میں لے لیا۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی شخص ہمیں بڑے غور سے دیکھ رہا ہے اور کسی جگہ چھُپ کر ہمارا جائزہ لے رہا ہے۔
"یہ اچھی بات نہیں ہے آبی! ہمیں اندر نہیں جانا چاہیے!" میں نے سرگوشی میں آبی سے کہا۔
"دیکھتے ہیں کہ مسز ناہیدامان کون ہیں؟ اُن سے مِلنا تو [پ]ڑے گا ہی۔"
"مگر ہم نے کسی عقل مندی سے کام نہیں لیا۔ عالیہ یہاں ہی [ر]ہتی ہے اور اس برآمدے میں سے ہمارے خلاف وہ کوئی بھی قدم اٹھا [سک]تی ہے۔" مگر ابھی میں یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ مجھے برآمدے کے [ا]ندر سے میں سے ایک عورت باہر آتی دکھائی دی۔ وہ سُرخ ساری [ب]اندھے ہوئے تھی۔ پہلی نظر میں دیکھنے پر وہ کوئی ہندو عورت نظر آتی تھی۔

اس نے سیڑھی سے قدم نیچے اتارا اور ہمیں بڑے غور سے دیکھتے ہوئے بولی "آیئے صاحب! آپ مسز کبیر کا کوئی پیغام لائے ہیں؟"
"جی ہاں! یہ اُن کے وکیل ہیں، شفیق احمد صاحب۔ کیا آپ کا نام مسز ناہیدامان ہے؟"
"جی نہیں! وہ تھوڑی دیر کے لیے بازار گئی ہیں۔ ابھی آتی ہی ہوں گی۔ آپ اندر بیٹھ جائیں۔"

آبی الجھ کر رہ گیا۔ مسز کبیر کا نام تو اس نے یُوں ہی لے دیا تھا ورنہ اس نام کی کسی عورت سے ہم واقف نہیں تھے اور وہ عورت ہمارے جھُوٹ کو بڑی خوبصورتی سے آگے بڑھا رہی تھی۔ اس نے بھی شاید سوچ لیا تھا کہ ہم ایسوں کا ناطقہ کیسے بند کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے لیے پس و پیش کا کوئی بہانہ باقی نہیں رہ گیا تھا۔ جس انداز سے اس وقت اُس نے ہمیں اندر آنے کے لیے کہا تھا اس سے یہی احساس ہوتا تھا کہ وہ بڑے خلوص سے ہمیں جال میں پھنس جانے کی دعوت دے رہی ہے۔ وہاں سے بھاگ لینا اب کسی بھی طرح مناسب نہیں تھا۔

ہم برآمدے میں سے گزر کر ایک نہایت ہی خوبصورت نشست گاہ میں جا بیٹھے، اس کی آرائش و زیبائش کی قسم کھائی جا سکتی تھی۔ روشنیاں وہاں ایسے قرینے سے لگی تھیں کہ ہم اندر سے منوّر ہو کر رہ گئے۔ ملازم تو باہر ہی کھڑا تھا مگر وہ خاتون ہمیں صوفے پر بٹھا کر خود الگ ہو کر ایک کرسی پر جا بیٹھی، بولی "آپ کچھ پینا پسند کریں گے؟"
"جی نہیں! ہمیں ذرا جلدی ہے۔ اگر مسز ناہید جلدی آجائیں تو ہمیں بڑی آسانی رہے۔"
"میں آپ کے لیے کافی بنواتی ہوں۔ ناہید زیادہ دُور نہیں گئی ہیں، ابھی آتی ہوں گی۔" یہ کہہ کر اس نے تالی بجائی تو پہلو کے دروازے سے ایک ادھیڑ عمر کی خاتون اندر آگئیں۔ وہ اُن کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "اماں! ان کے لیے کافی بنا دو اور یہ سگریٹ بھی ان کے سامنے رکھ دو۔ آپ مسز کبیر سے مل کر آئے ہیں؟" وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔
"جی ہاں! وہ جو ماڈل ٹاؤن میں رہتی ہیں۔ دراصل ان کا جائیداد کے سلسلے میں کسی سے مقدمہ چل رہا ہے اور میں ان کا وکیل ہوں۔"
"شفیق احمد نام بتایا ہے نا آپ نے اپنا؟"
"جی ہاں! اور ہمیں مسز ناہید سے اسی سلسلے میں ملنا تھا۔"
"گڈ! یہ وکالت بھی بڑا انوکھا تجربہ ہے۔ آدمی کو بڑی محنت کرنی پڑتی ہے۔"
"جی ہاں! کام ہی ایسا ہے۔ یہ میرے بھائی ہیں رفیق احمد گونمل، یہ بھی ایم اے ایل ایل بی ہیں۔ ہم مل کر کام کرتے ہیں۔ ذرا آسانی

رہتی ہے۔" میں نے خواہ مخواہ ہی جھوٹ کا دفتر اس کے سامنے کھول دیا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ میں اس عورت سے کیا بات کروں۔ ابھی تک اس ڈور کا کوئی سرا ہمارے ہاتھ نہیں آیا تھا اور مجھے یہ ڈر تھا کہ شاید ہم کسی غلط خانے میں جا گھسے ہیں۔ حیدر نے شاید ہمیں عالیہ کا صحیح پتہ نہیں بتایا تھا مگر جس انداز سے وہ میرے جھوٹ کو آگے بڑھا رہی تھی اس سے مجھے اس کے پُراسرار ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہ گیا تھا۔ اس عورت کا لُوٹا سا قد آپی کے لہلہاتے تخیل کو بہت آرام دے رہا تھا۔ اس کو آنکھوں ہی آنکھوں میں سموچا نگلتے ہوئے، وہ سگریٹ سلگا کر بولا۔

"آپ نے ابھی تک اپنا اسم گرامی ہمیں عطا نہیں کیا؟"

"اوہ! میرا نام شگفتہ خانم ہے۔ ناہید اماں میری پھوپی زاد بہن ہیں۔"

"واقعی! آپ کا نام شگفتہ ہی ہونا چاہیے تھا۔ ویسے ناہید کام کیا کرتی ہیں؟"

"جی کچھ بھی نہیں! شادی شدہ ہیں۔ اُن کے خاوند امریکہ گئے ہوئے ہیں۔ خود یہ ایک عرصے سے اس ہوٹل میں ہی ٹھہری ہوئی ہیں۔"

"حیرت ہے! ان کے خاوند کا نام ڈاکٹر دھمن تو نہیں ہے؟"

"جی! نہیں تو! امان اللہ نام ہے اُن کا اور وہ ایکسپورٹ کا کام کرتے ہیں۔" شگفتہ نے کہا۔

"کمال ہے! ہمارے تمام ہی اندازے غلط ہو چلے ہیں۔ ہم کسی غلط گھر میں تو نہیں آ گئے ہیں؟" آپی نے پریشان ہو کر کہا۔

شگفتہ کی آنکھیں ہماری ہر حرکت کا جائزہ لے رہی تھیں اور وہ ابھی تک ذہنی طور پر کوئی قطعی فیصلہ نہیں کر سکی تھی۔ اس کی چال کو ہم بھی قطعاً سمجھ نہیں سکے تھے۔ وہ برابر ہمیں "رب اَرِنی" کا وِرد کرتی سنائی دیتی تھی۔ ایسے میں آپی مجھ سے براہِ راست کوئی بھی بات نہیں کر سکتا تھا۔ ہم بلاشبہ بڑی ہی غلط صورتِ حال سے دوچار تھے اور ہمیں نہیں معلوم تھا کہ اس اڑنگے میں پھنس کر ہم باہر کیسے نکلیں گے۔ ہم ایسے اروگی کے سامنے جا بیٹھے تھے، جسے ہمارے درد کا قطعاً کوئی احساس نہیں تھا۔

"آپ کا خیال غلط ہے جناب! ناہید اماں یہاں ہی رہتی ہیں۔ اگر کسی اور سے آپ کو ملنا ہے تو پھر بات دوسری ہے۔"

"جی نہیں! ہمیں ناہید سے ہی ملنا ہے خانم!"

اتنے میں پہلو کا دروازہ کھلا اور شگفتہ کی ملازمہ ہمارے لیے کافی لے آئی۔ وہ اس نے بڑے سلیقے سے ہمارے سامنے رکھی اور خود سر پر دوپٹہ جماتی ہوئی تیزی سے باہر نکل گئی۔ کافی تو ہم نے ہونٹوں سے لگائی مگر جس تذبذب میں ہم پھنس گئے تھے اس کا کوئی علاج ہمیں نظر نہیں آتا تھا۔

"میں آپ سے معافی چاہتی ہوں۔ آپ بیٹھیں وہ ابھی آ جائیں گی۔ میرا خیال ہے میں اُن سے فون پر بات کرتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھی اور اپنی ساری کو ایک عجیب سی ادائے دلفریبی سے سنبھالتی ہوئی باہر نکل گئی۔

کوئی پانچ منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ وہ پھر ہمارے کمرے میں آ گئی، مگر اب کی بار وہ تنہا نہیں تھی۔ اس کے پیچھے ڈاکٹر عالیہ بھی تھی۔ اُف میرے خدا! وہ ویسی کی ویسی ہی تھی حسین و شاداب۔ سر سے پاؤں تک وہ شعلۂ جوالا بنی ہوئی تھی مگر۔۔۔ مگر اس کی نظریں ایسی اجنبیت کا شاہکار تھیں کہ ہم اسے بس دیکھتے ہی رہ گئے۔

"لیں جناب! یہ ہیں ناہید اماں! میرے فون کرنے سے پہلے ہی آ گئیں۔ یہ آپ کے لیے مسٹر کبیر کی طرف سے کوئی پیغام لائے ہیں۔" شگفتہ نے عالیہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

عالیہ ہمیں یوں دیکھ رہی تھی جیسے اس نے ہمیں اس سے پہلے کبھی دیکھا ہی نہ ہو۔ اس کی آنکھوں سے ایسی اجنبیت ظاہر ہو رہی تھی کہ ہم سٹپٹا کر رہ گئے۔ "آپ کے مزاج کیسے ہیں؟" میں نے بالآخر مسکراتے ہوئے کہا۔

مگر وہ یوں ظاہر کر رہی تھی جیسے ہمیں پہلی بار دیکھ رہی ہو۔ بڑی سنجیدہ سی صورت بنا کر بولی: "جی الحمدللہ! آپ نے کیسے زحمت فرمائی؟"

"ہم آپ سے ملنے آئے ہیں مسز ناہید! آپ نے ہمیں پہچانا نہیں؟"

"جی نہیں! میں نے تو آپ کو آج پہلی بار دیکھا ہے۔ کیا کام تھا آپ کو مجھ سے؟"

"کمال ہے۔ اپنے پرانے خادم کو بھی بھول گئی ہیں آپ! یہ چہرہ بھی آپ کو یاد نہیں رہا؟"

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ میں نے آپ کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ یہ معاملہ کیا ہے شگفتہ؟"

"میں..... میں خود حیران ہوں۔ یہ شفیق صاحب ہیں، کہتے ہیں، کہہ رہے تھے کہ کوئی مسٹر کبیر ہیں انھوں نے ان کو آپ کی طرف بھیجا ہے۔ میں نے اندر بٹھا لیا۔"

"پاگل ہو تم! پتہ نہیں کون لوگ ہیں یہ۔ میں انھیں نہیں جانتی۔" وہ ہم سے ذرا دور ہٹ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کا وہ حیرت انگیز رویّہ ہمارے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ وہ ہماری توقع سے کچھ زیادہ فنکار ہو گئی تھی۔ آنکھیں اس کی بھینچی بھینچی

تھیں جیسے زیادہ چربی کی وجہ سے وہ انھیں کھول نہ سکتی ہو۔ ورنہ وہ تھی تو عالیہ ہی مگر اس نے ہمیں پہچاننے سے بالکل ہی انکار کر دیا تھا۔

"وہ ڈاکٹر دھمن کہاں ہیں آج کل؟ وہ کہیں نظر نہیں آ رہے ہیں؟" میں نے ایک بار پھر اسے ٹٹولنے کی کوشش کی۔

"کون ڈاکٹر دھمن؟ یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ! میرا خیال ہے کہ آپ غلط جگہ داخل ہو گئے ہیں۔" اس کی آنکھوں میں ابھی تک اجنبیت کا رنگ نمایاں تھا۔

"عالیہ! اتنی بھولی نہ بنو! تمہیں معلوم ہے کہ ہم یہاں کس لیے آئے ہیں۔" میں نے ایک دم پستول اس پر تانتے ہوئے کہا۔ آپی نے فوراً ہی شگفتہ کو نرغے میں لے لیا۔ اس کی رگیں اتنی تن چکی تھیں کہ وہ اس عورت کو ایک لحظے کے لیے بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا مگر اس کارروائی کا بھی اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ ہمیں انتہائی سادگی اور معصومیت سے یوں دیکھ رہی تھی۔ جیسے ہم کوئی تماشا دکھا رہے ہیں۔ شگفتہ کا رنگ البتہ پیلا ہونے لگا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے گھٹنے کی ٹھوکر سے عالیہ کو آگے چلنے کے لیے کہا۔ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ ہم اسے تماشا نہیں دکھا رہے ہیں بلکہ اسے اغوا کر لینا چاہتے ہیں۔ جیسے ہی میں عالیہ کو زد میں لے کر برآمدے میں پہنچا تو مجھے معلوم ہوا کہ اُن کا ملازم برابر کے کمرے سے کسی کو فون کر رہا ہے۔ آپی نے شگفتہ کو اپنے آگے لگا لیا تھا۔

"اس کو روکو یار! وہ بدمعاش کہیں فون کر رہا ہے۔" میں نے چیختے ہوئے کہا اور برآمدے کی دیوار میں لگے سوئچ پر ہاتھ رکھ کر باہر کی تمام بتیاں بجھا دیں۔ آپی نے شگفتہ کو میرے حوالے کیا اور تیزی سے کمرے میں جا گھسا۔ فون کی گھر گھر فوراً ہی ختم ہو گئی۔ میرا خیال ہے آپی نے اس آدمی کے سر پر پستول کا دستہ دے مارا تھا۔ وہ جب کمرے سے نکل کر برآمدے میں آیا تو میں اس وقت اُن دونوں عورتوں کو لے کر دائیں ہاتھ پر بنے گیراج میں جا گھسا تھا۔ وہاں ایک بہت عمدہ گاڑی کھڑی تھی اور اس کی چابیاں اندر ہی تھیں۔ آپی نے وہاں پہنچتے ہی ڈرائیور کی سیٹ سنبھالی تو میں نے عالیہ اور شگفتہ کو پچھلی نشست پر بٹھا دیا۔ دونوں کا رنگ فق ہو رہا تھا۔ گاڑی گیراج سے نکالتے ہی آپی نے اس کی رفتار تیز کر دی۔ پچھلی سیٹوں کے گرد تمام شیشوں پر پردے پڑے ہوئے تھے۔

جب ہم اس ہوٹل کے بڑے دروازے سے نکلے تو عالیہ رونے لگی تھی۔ یہی حال شگفتہ کا تھا۔ ان پر عجیب سی ہسٹریائی کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔

"تم روتی کیوں ہو عالیہ؟ ابھی تو ہمیں تم سے لمبا حساب لینا ہے۔"

"تم غلط کہتے ہو۔ میں عالیہ نہیں ہوں۔ میرا نام ناہید امان ہے۔ خدا کے لیے ہمیں چھوڑ دو۔"

"اس بات کا پتہ تو ہمارے ڈیرے پر چل کر لگے گا۔ ہمیں اتنا بے وقوف نہ سمجھو۔" میں نے عالیہ کو باہوں میں سمیٹتے ہوئے کہا۔

وہ میری گرفت سے نکل کر بولی: "میں عالیہ نہیں ہوں۔ میں عالیہ نہیں ہوں۔ مجھے چھوڑ دو۔ ہٹ جاؤ پیچھے۔" مگر میرے پستول کی نال جب اس کے سامنے پھیل کر بے کراں ہوئی تو اس کی گھگھی بندھ گئی۔

آپی نے گاڑی کو بلاخیز رفتار سے شہر کی حدود میں سے نکالا اور جلدی ہی قصور روڈ پر جا چڑھا۔ کوئی دس میل آگے نکلنے کے بعد اس نے کار کو بائیں ہاتھ ڈالا اور آموں کے ایک وسیع و عریض باغ کے پاس جا ٹھہرا۔ جب اس نے گاڑی بند کی تو بولا: "اب اس سے یہ پوچھو کہ یہ عالیہ نہیں ہے تو اور کون ہے؟ اور وہ اس کا ایجنٹ دھمن کہاں ہے؟ نکالو باہر ان کو۔"

میں نے دونوں دروازے کھول دیے۔ شگفتہ کو آپی نے بازو سے پکڑ کر باہر نکالا تو دور تک پھیلے سناٹے کو دیکھ کر وہ اور زیادہ لرزنے لگی۔ اپنے لباس پر اس کی گرفت اور زیادہ مضبوط ہو گئی۔ اسے یہی ڈر تھا کہ شاید ہم اس کی بے حرمتی کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اس خوف سے بے حد نڈھال ہو گئی تھی۔ عالیہ کو جب میں نے کار سے اُتارا تو وہ پھر چیخی: "میں عالیہ نہیں ہوں۔ مجھے غور سے دیکھو، تم نے عالیہ کو ضرور دیکھا ہو گا۔ اس کی کوئی نشانی تمہیں یاد ہو گی؟"

پہلی بار میرے دل میں شک کی سوئی چبھی۔ کیا یہ عورت واقعی عالیہ نہیں ہے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ "یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟ میں کیسے مان لوں کہ تم عالیہ نہیں ہو؟"

"میرے چہرے کا میک اپ ایسا بنا دیا گیا ہے کہ میری صورت عالیہ سے بہت ملتی جلتی ہے۔ تمہیں یقین نہیں آتا تو لو، اب دیکھ لو۔" اس نے اپنے سر سے سرخ رنگ کی وگ دونوں ہاتھوں سے نوچ پھینکی۔ "لو غور سے دیکھو! میں عالیہ نہیں ہوں۔" اس وگ کے نیچے اس کے کٹے ہوئے بال یہی بتاتے تھے کہ وہ عالیہ ہرگز نہیں ہے۔ "اب دیکھو۔ اب تو تمہیں یقین آ جائے گا۔" یہ کہہ کر اس نے چہرے سے ایک نرم ملائم جھلی سی اتار پھینکی۔ وہ اب اپنے اصلی رنگ روپ میں ظاہر ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے کے نقوش عالیہ ایسے نہیں تھے۔ مگر بناوٹ ایسی تھی کہ اس جھلی کے اوپر چڑھا لینے سے وہ ہو بہو عالیہ نظر آتی تھی۔ وہ خود بھی بہت خوبصورت

تھی۔ ایسی کہ اُس سے عشق کرنے کو جی چاہتا تھا۔ بڑی نٹ کھٹ بڑی سوہل اور نازک مگر وہ عالیہ تو ہرگز نہیں تھی۔ اس کو اِس رُوپ میں دیکھ کر ہم دونوں ہی ششدر رہ گئے۔ عالیہ نے اسے کسی خاص مقصد کے لیے یہ رُوپ دے دیا تھا۔

"مگر..... مگر یہ رُوپ تم نے کیوں بدلا؟ یہ عالیہ کی شکل تمھیں کس نے دے دی ہے؟"

"مجھے کچھ معلوم نہیں! ڈاکٹر عالیہ نے یہی کہا تھا کہ میں اس کی شکل اپنا لوں۔ پتہ نہیں اس کو کس بات کی فکر ہے؟ خود اپنی صورت اس نے مکمل طور پر بدل لی ہے۔ جس نے اسے پہلے دیکھا ہے وہ اسے کبھی پہچان نہیں سکتا... اور وہ یہی کہتی ہے کہ اسے کچھ مجرموں کی طرف سے دھڑکا لگا رہتا ہے۔"

"مگر وہ ہے کہاں؟"

"اس کے پاس اپنا چہرہ بدلنے کے لیے ایک نہیں کئی چہرے ہیں۔ اس کو پہچان لینا ناممکن ہے۔ بینک میں اس کے پاس کروڑوں روپیہ جمع ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ڈاکٹر دشمن سے اس کی لڑائی ہو چکی ہے۔ اسے بھی میں نے امریکہ سے واپسی پر عالیہ کے ساتھ نہیں دیکھا ہے اور مجھے یہ بھی پتہ نہیں کہ وہ کہاں ہے؟"

"مگر عالیہ کا پتہ تو تمھیں معلوم ہوگا؟"

"وہ اس ہوٹل میں کبھی کبھی آتی ہے۔ اس ہوٹل کا سارا خرچ وہی برداشت کرتی ہے۔ مگر مجھے یہ معلوم نہیں ہے کہ خود باقی راتیں کہاں گزارتی ہے۔"

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ تمھیں وہ کس رُوپ میں ملتی ہے؟"

"کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کبھی وہ کوئی چہرہ بدل لیتی ہے اور کبھی کوئی ___ مجھ سے جب بھی ملنے آتی ہے تو اس نے اسکرٹ پہن رکھا ہوتا ہے۔ ولائتی لباس پہن کر آتی ہے اور چہرہ اس نے کوئی اور لگا رکھا ہوتا ہے۔"

"مگر کیوں؟ ایسا کیوں کرتی ہے وہ؟"

"پتہ نہیں! اپنی کوٹھی اس نے بیچ ڈالی ہے۔ شفا بار کا بھی اس نے سودا کر لیا ہے۔ اب کوئی اور جائداد ہے جسے وہ بیچ کر امریکہ جانے کا سوچ رہی ہے۔ جب تک یہ کام ختم نہیں ہو جاتے، وہ یہاں رہنے پر مجبور ہے۔"

"تمہارا کیا نام ہے؟"

"میرا نام نرگس ہے۔"

"تم اس کے ہتھے کیسے چڑھ گئیں؟"

"وہ مجھے دو ہزار روپے مہینہ تنخواہ دیتی ہے۔ میں نے نرسنگ کا کام اس سے سیکھا تھا۔"

"مگر تم ہو کہاں کی؟"

"میں کراچی میں اس سے ملتی تھی۔ میرا گھر وہیں ہے۔"

"یہ کیا بکواس کر رہی ہے جیلانی! میں تو کچھ سمجھ ہی نہ سکا ہوں!"

"اور یہ کون ہے، یہ شگفتہ؟"

"یہ میری پھوپھی زاد بہن ہے۔ میرے ساتھ ہی رہتی ہے کے والدین فوت ہو چکے ہیں۔ یہ بھی عالیہ سے دو ہزار روپے اس کو میری طرح ہی اپنا حلیہ کبھی کبھار بدلنا پڑتا ہے۔ اس باقاعدہ اسکول سے نرسنگ کا امتحان پاس کیا تھا۔" وہ طرح رٹا رٹایا سبق میرے سامنے دُہرا رہی تھی۔ میرے چہرے اپنی باتوں کا اثر دیکھ کر اب اس کا رنگ واپس آنے لگا اسے اب بھی معلوم نہیں تھا کہ ہم کون ہیں؟

"یہ تو بہت بُرا ہوا یار! وہ عورت تو ہم سب کو رہی ہے۔ وہ تو شاید دشمن کو بھی کھا گئی ہے۔" میں نے جیب میں ڈال کر نرگس کو کار کے اندر دھکیلتے ہوئے کہا۔

آپی نے بھی شگفتہ کو بہت اطمینان سے کار کی اگلی پر بٹھا لیا، بولا: "تم سے ہم بہت شرمندہ ہیں شگفتہ! ہمیں نہیں تھا کہ ہمارے ساتھ اتنا زبردست فریب ہو جائے گا۔"

"میں تو سمجھی تھی کہ آپ لوگ ہمیں گولی ہی مار دیں"

"ارادہ تو یہی تھا خانم! مگر یہ کوئی اچھی بات آج ہم سب قصور چلتے ہیں۔ ذرا موج میلا ہی رہے گا۔ کیوں"

"ہائے! آپ کا نام جیلانی ہے؟ اُف توبہ! عالیہ نام کی دہشت سے ہی کانپتی رہتی ہے۔" نرگس نے ہو کر کہا۔

"کیا مطلب؟"

"وہ آپ ہی کا نام لیا کرتی ہے۔ کہتی ہے کہ اس سے خوفناک مجرم کوئی نہیں ہوگا۔ آپ کی وجہ سے ہی وہ کر رہ رہی ہے۔"

"مگر وہ کتنے ہی رُوپ کیوں نہ بدلے۔ وہ بچ نہیں نرگس! میں نے قسم کھا رکھی ہے کہ وہ لوگوں کے گُردے بیچ میں اس کا جسم نیلام پر چڑھا دوں گا۔ تمھیں بالکل پتہ نہیں رہتی ہے؟"

"نہیں! البتہ اس کا ایک فون نمبر میرے پاس ہے آپ کو دے سکتی ہوں۔ وہ میری مالکن تو ہے مگر اس کے میں پہلے ہی بہت پریشان تھی۔ وہ اچھے بھلے گُردے کو نکا تھی اور مجھے نہیں پتہ تھا کہ وہ ان کا کرتی کیا ہے؟"

آپی نے گاڑی باغ سے باہر نکالی اور پھر اسے طرف چل دیا۔ نرگس کا خوف بڑی حد تک دور ہو چکا تھا

زیادہ دل جمعی سے باتیں کر رہی تھی۔

"وہ فون نمبر مجھے بتا دیں۔ ہم اسے ڈھونڈ کر رہیں گے۔ تمھیں کسی مسز جونز کا پتہ ہے؟"

"جونز! ہاں! وہ ہمارے ہاں بیٹھی تھی کہ اُسے کسی مسز جونز نے فون کیا تھا اور وہ فوراً ہی اپنے دو ملازموں کو ساتھ لے کر چلی گئی تھی۔ فون کینال پارک سے آیا تھا۔"

"یہ ملازم کون تھے؟"

"وہ کوئی غیر ملکی ہیں۔ عربی بھی بولتے ہیں اور اردو بھی۔ ہر وقت پستول ساتھ رکھتے ہیں۔ عالیہ نے بتایا تھا کہ وہ دونوں بہت کمال کے نشانہ باز ہیں۔"

"اُن کو بھی دیکھ لیں گے ہم۔ کیا نام ہے اُن کا؟"

"ایک کا نام مہدی ہے اور دوسرے کا فواد۔ انہیں وہ ہر وقت ساتھ رکھتی ہے۔"

"ہوں! مگر ہم اسے پہچانیں گے کیسے؟ تم کہتی ہو کئی قسم کے چہرے ہیں اس کے پاس۔"

"اگر آپ مجھ پر اعتبار کریں تو میں آپ کو بتا سکتی ہوں۔ اس کی کئی تصویریں بھی میرے پاس ہیں۔ میرے اس بیگ میں رکھی ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ وہ مجھے دے دو ___ وہ تمھیں دو ہزار روپے دیتی ہے۔ میں تمھیں تین ہزار دوں گا۔ چند دن ہمارے ساتھ رہو۔ اسے پکڑ لیں گے تو تمھیں ہم نہال کر دیں گے۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔ مگر ابھی عالیہ کو پتہ نہیں چلنا چاہیے کہ ہم آپ کے ساتھ مل گئی ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے بیگ میں سے چار تصویریں نکال کر مجھے دے دیں۔ کار کی اندرونی بتی آپی نے روشن کی تو وہ تصویریں دیکھ کر میں پریشان ہو گیا۔ اس کو پہچان لینا کسی بھی طرح ممکن نہیں تھا۔ چاروں تصویریں بالکل ہی مختلف تھیں اور ہر چہرہ دوسرے سے الگ۔

وہ تصویریں آپی نے بھی دیکھیں ___ بولا: "اس ذلیل نے تو مصیبت ڈال دی ہے ہمیں۔ اس کو پکڑو یار! بہت مال ہے اس کے پاس۔ دشمن کی ساری دولت بھی ہڑپ کر رہی ہے۔"

"لگتا تو ایسا ہی ہے۔ پتہ نہیں وہ زندہ بھی ہے کہ نہیں! کوئی اور آدمی بھی تم نے اُن کے ساتھ دیکھا؟" میں نے نرگس اور شگفتہ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"ایک شخص بدری بھی اس کے ساتھ ہمارے پاس آیا تھا مگر اس کے بارے میں ہمیں زیادہ معلومات نہیں ہیں۔ اُونچا لمبا بھاری بھرکم بدن کا آدمی ہے۔" نرگس نے اپنی یادداشت پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"تمھیں پتہ ہے عالیہ نے ایک شخص مختار ڈھلوں کو اغوا کر کے کہاں رکھا ہے؟"

"نہیں! اس کے بارے میں مجھے کچھ پتہ نہیں ہے۔ البتہ وہ بدری سے کسی ایسے ہی شخص کے بارے میں بات کر رہی تھی۔ کیوں شگفتہ؟ وہ ڈھلوں صاحب ہی تھے نا؟"

"ہاں! اور مجھے معلوم ہے کہ وہ ابھی تک زندہ ہے۔ اُسے عالیہ نے کسی جگہ قید کر رکھا ہے۔ مگر مجھے اس جگہ کا علم نہیں ہے۔" شگفتہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"ہم ان کے بارے میں زیادہ پریشان ہیں نرگس! وہ ہمارے بہت بڑے محسن ہیں۔ ان کے لیے ہی ہم عالیہ کو پکڑنا چاہتے ہیں۔"

"اس عالیہ نے تو ہمیں تباہ کر دیا ہے..... حیرت ہے، وہ عورت ایسی عیّارہ نکلی!"

"عیّار تو وہ ہے ہی اور حسین بھی ہے۔ ہر چہرہ ہر لباس اسے سج جاتا ہے۔"

"ہاں! وہ مجھے مل جائے تو پھر بات کروں گا میں اس سے۔ افسوس ہے کہ ہم عالیہ کی جگہ نرگس کو پکڑ لائے۔" آپی نے گاڑی کی رفتار اور تیز کرتے ہوئے کہا۔

اب وہ بڑی سڑک پر جا چڑھا تھا۔ کار کو اس نے قصور کی طرف موڑنا چاہا تو میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "ادھر کہاں جا رہے ہو؟ ہمیں لاہور جانا ہے۔ قصور میں ہمارا کیا ہے؟"

"میرا تو یہ خیال تھا کہ آج کی رات ہم ہوٹل میں گزار لیں گے۔"

"نہیں بھئی! ہمیں ہر حال میں آج عالیہ کا قصّہ ختم کرنا ہے۔ وہ گشتی عورت ہمیں ذلیل کر رہی ہے۔ اس کا فون نمبر مجھے بتا دیں نرگس!"

وہ میرے قریب ہی بیٹھی تھی۔ ذرا سا میری طرف جھک کر اُس نے عالیہ کا فون نمبر بتا دیا، بولی: "یہ فون کوئی آدمی اٹھاتا ہے، عالیہ خود بات نہیں کرتی۔"

"ٹھیک ہے۔ مگر یہ فون ہے کہاں کا؟"

"اس کا مجھے کوئی علم نہیں ہے۔" اچانک میں نے دیکھا کہ شگفتہ آپی کی طرف جھک رہی تھی۔ اس کا دایاں ہاتھ آپی نے پکڑ رکھا تھا۔ ان کے درمیان اچانک ہی گاڑھی چھننے لگی تھی۔ گاڑی کو وہ ابھی تک قصور کی طرف بڑھا رہا تھا۔ میرے کہنے پر اس نے کار کا رُخ لاہور کی طرف نہیں موڑا تھا۔ شگفتہ کے ساتھ وہ بہت ہی گھٹیا پن کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

"گاڑی لاہور کی طرف موڑ لے آپی! یہ بہت ضروری ہے۔"

"میں عالیہ پر لعنت بھیجتا ہوں۔ تم پھرتے رہو اس کے پیچھے۔ میں صبح ہی کراچی چلا جاؤں گا۔" اُس کا لہجہ ایک دم تلخ ہو گیا۔ آئینے میں اس کی صورت دکھائی نہیں دیتی تھی۔ کار کے اندر

اندھیرا سا چھا رہا تھا۔ شگفتہ کا ہاتھ ابھی تک اس نے نہیں چھوڑا تھا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟" میں نے حیرت زدہ ہو کر اس سے پوچھا۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ رقم لینے کے لیے صبح ہی کراچی چلا جاؤں گا اور یہ بھی میرے ساتھ جائیں گی۔"

"بکواس کرتے ہو تم! یہ کون سا وقت ہے کراچی جانے کا؟ کچھ تو شرم کرو۔"

"بہت شرم کر لی ہے میں نے۔ کوئی زرخرید نہیں ہوں تمہارا۔ بہت پھر لیا ہے ہم نے عالیہ کے پیچھے۔ میں چھ سات دن کراچی میں رہ کر واپس آ جاؤں گا۔"

"نہیں یار! یہ کوئی شرافت ہے تمہاری! روکو گاڑی یہاں۔ ہمیں قصور نہیں جانا ہے۔" میں نے اس کا کندھا مضبوطی سے دباتے ہوئے کہا۔ اس نے گاڑی روک کر اندر کی بتی جلا دی۔

شگفتہ مسکرا رہی تھی۔ اس عورت نے شاید آبی کو مسحور کر لیا تھا۔ وہ آبی کے اور زیادہ قریب ہو گئی تھی اور اسی کی وجہ سے وہ مجھ سے باغی ہونے لگا تھا۔

"یہ تم بول رہے ہو آبی! یا اس گشتی نے تمہیں ورغلا لیا ہے؟" میں نے شگفتہ کو گھورتے ہوئے کہا۔

"اس کے بارے میں کچھ مت کہو۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ اتنی بڑی رقم پھنسی ہے ہماری کراچی میں، وہ میں لا کر رہوں گا۔ عالیہ کے پیچھے پھر کر تو ہم یہ رقم بھی ضائع کر لیں گے۔"

"تمہارا جواب نہیں ہے آبی! ان عورتوں کے لیے تم مجھے بھی آنکھیں دکھا رہے ہو۔" میں نے اس کے لہجے سے مایوس ہو کر کہا۔

وہ بہت ہی بھڑک چکا تھا۔ میری اس بات پر جھک کر بولا "تم کیا چاہتے ہو مجھ سے؟ میں بہت ذلیل ہو لیا ہوں تمہارے ساتھ۔ مجھ سے یہ مزدوری نہیں ہوتی ہے اب! میں کسی قیمت پر تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔"

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ ان عورتوں کے سامنے مجھے تم یوں ذلیل کرو گے۔ کیا ہے اِن دونوں میں؟ کوئی لعل لگے ہیں ان میں؟ حد کر دی ہے تم نے! انتہائی کمینے ثابت ہوئے ہو تم۔" اس نے اسٹیئرنگ چھوڑ کر اپنا رُخ میری طرف موڑ لیا۔

"مجھ سے لڑنا چاہتے ہو؟ میں نے کوئی چوڑیاں نہیں پہن رکھی ہیں۔ تم سے اتنا بھی نہیں ہو سکا کہ ایک رات مجھے قصور میں گزار لینے دیتے، تمہیں ضد ہے مجھ سے۔ میں نفرت کرتا ہوں تم سے۔ میں ابھی تمہیں لاہور چھوڑ کر تم سے الگ ہو جاؤں گا۔ آدھی رقم میں واپسی پر تمہارے حساب میں جمع کروا دوں گا، بس بات ختم کرو۔ میں اب کسی بھی طرح تمہارا ساتھ نہیں دوں گا۔" آبی نے ایک دم اپنے دل میں دبی گھٹی نفرت مجھ پر انڈیل دی۔ جو خدا جانے وہ کب سے پال رہا تھا۔ اس کی وہ تلخ آواز سن کر میں ششدر رہ گیا۔ میرے پسینے پر جان نثار کر دینے والا آبی، یوں میرا ساتھ چھوڑ دے گا، اس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ مجھ سے پہچانا ہی نہیں جا رہا تھا۔ اس کی صورت ہی اجنبیوں ایسی ہو گئی تھی۔ آنکھوں میں اس نے میرے خلاف اتنی نفرت بھر لی تھی کہ وہ پہلا سا آبی مجھے نظر ہی نہیں آتا تھا۔ شگفتہ کا ہاتھ ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ اسے یوں دیکھ رہی تھی جیسے اس پر سحر پھونک رہی ہو۔ سارا قصور شاید اسی کا تھا۔ وہ حسین تھی، بے حد حسین اور میرا یہ اندازہ شاید غلط نہیں تھا کہ وہ پہلی ہی نظر میں مجھے ہندو عورت نظر آتی تھی۔ اس کے ماتھے پر لگا وہ تلک کا نشان مجھے یہی احساس دلاتا تھا۔ بال اس کے بہت خوبصورت تھے جن کا سرخ رنگ دل کو متاثر کرتا تھا۔ اس کی وہ من موہنی صورت آبی کے حسن پرست دل میں کھب کر رہ گئی تھی۔ نرگس پر بھی آبی کی نظر تھی اور اپنی اپنی جگہ وہ خاموش بیٹھی تھیں۔ وہ انہیں سموچا نگل لینا چاہتا تھا۔

"ٹھیک ہے آبی! یہ گاڑی تم لاہور لے چلو اور جہاں چاہتے ہو مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ۔" میں نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔ اس کی مرضی کے خلاف تو میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اپنے ارادے میں وہ اٹل ثابت ہوتا تھا۔ جو فیصلہ وہ کر لیتا تھا، اس سے اس کو منحرف کرنا ناممکن تھا۔

"بس یہی بہتر ہے۔ میں پہلی فلائیٹ سے کراچی جا رہا ہوں اور تم میرا راستہ نہیں روکو گے۔"

"مجھے اپنی قدر و قیمت کا پتہ چل گیا ہے آبی! آئندہ میں تمہیں کوئی تکلیف نہیں دوں گا۔"

میری بات سن کر اس نے اسی وقت کار لاہور کی طرف موڑ دی۔ وہ مجھ سے اب کوئی بات نہیں کر رہا تھا۔ کار کے اندر کی بتی اس نے ابھی تک جلا رکھی تھی اور عقب نما آئینے میں اس کی صورت دیکھ کر مجھے اپنے سارے ہی اندازے غلط معلوم ہو رہے تھے۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ مجھ سے یوں ایک دم بدظن ہو کر دوسری طرف نکل جائے گا۔ رقم واپس لانے کا تو محض ایک بہانہ تھا۔ وہ مجھ سے ہمیشہ کے لیے علیحدہ ہو رہا تھا مگر اس کو یوں نہیں جانا چاہیے تھا۔ میں اسے ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہم اچھے دوستوں کی طرح الگ ہو جاتے تو یہ زیادہ بہتر تھا۔ کسی مقام پہ ہم پھر ایک دوسرے سے مل سکتے تھے، ایک دوسرے کا دُکھ بانٹ سکتے تھے۔ وہ لڑ کر مجھ سے جدا ہوتا تو یہ سارے امکانات ختم ہو جاتے، ہر شے پر پانی پھر جاتا۔

آئینے میں اس کی صورت اب بھی میری نگاہ میں تھی۔ وہ شگفتہ سے برابر چہلیں کرتا جا رہا تھا اور وہ ایسی عورت تھی کہ مسلسل اس کا حوصلہ بڑھا رہی تھی۔ یہ وہی تھی جس نے آبی کو مجھ سے برانگیختہ کر دیا تھا مگر میں اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا تھا۔ آبی اس کے لیے جان دینے کو تیار تھا۔ کوئی بات وہ سننے کو تیار ہی نہیں تھا۔ خدا معلوم اس کے ذہن میں کیسی آندھی چل رہی تھی؟ وہ بات سامنے آ گئی تھی جس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

لاہور پہنچ کر اس نے کار ہوائی اڈے کی طرف دوڑا دی۔ وہ راستہ میرا دیکھا ہوا تھا۔ ہوائی اڈے پہ پہنچ کر اس نے شگفتہ سے پوچھا "یہ کار کس کی ہے شگفتہ؟"

"یہ بھی عالیہ نے ہوٹل سے کرائے پر لی ہوئی ہے۔ وہی اس کے مالک ہیں۔"

"گڈ! یہ اچھی بات ہے۔ لے بھئی جیلانی! مجھے معلوم ہے کہ کراچی کے لیے فلائیٹ رات بارہ بجے چلتی ہے۔ ہم اس میں سوار ہو رہے ہیں۔ تم دونوں میرے ساتھ چلو گی۔ سمجھ رہی ہو نا! میں تمہیں گھر پہنچا دوں گا۔" میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ تو وہ پریشان سا ہو گیا، بولا "یوں نہ کرو جیلانی! مجھے جانا ہے بہرحال جانا ہے۔ میں تم سے پھر آ ملوں گا۔ بس ایک ہفتے کی مہلت دے دو اور غصہ تھوک دو۔ مجھے وہ باتیں نہیں کرنی چاہیے تھیں، ان کے لیے میں تم سے بہت شرمندہ ہوں۔"

میں نے پھر بھی اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ میں سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ کوئی دشمن ہوتا تو میں تیر تلوار سے اس سے بات کرتا مگر وہ تو آبی تھا اور میرے ساتھ کھڑا تھا۔ میں اس سے کیسے الجھ سکتا تھا۔

میری ذہنی حالت کو سمجھتے ہوئے اس نے ہاتھ میری طرف بڑھایا "تم ابھی تک مجھ سے ناراض ہو۔ ایسا نہ کرو جیلانی! میں وہ رقم لے آؤں پھر تم سے آ ملوں گا۔ واپسی پر میں اپنی والدہ کے پاس جا رہا ہوں گا۔ تم ایک ہفتے بعد وہاں مجھ سے آ ملنا۔ یہ بہت ضروری ہے۔"

"ٹھیک ہے آبی! تم ضرور جاؤ، میں تمہیں روک تو نہیں رہا ہوں۔" میں نے اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے کہا۔

وہ اس کیفیت کو سمجھ گیا، بولا "دیکھو! مجھ سے ناراض نہ ہو۔ بس چند دن کی بات ہے۔ ابھی سوا گیارہ بج رہے ہیں۔ میں ٹکٹ لے آتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ کار سے اُتر گیا۔ کوئی پندرہ منٹ بعد وہ واپس آیا تو بولا "چلو بھئی! تم دونوں اُٹھو! میں تمہارا بھی ٹکٹ لے آیا ہوں۔"

شگفتہ فوراً ہی کار سے نکل گئی۔ اس کی دیکھا دیکھی نرگس بھی کار سے اُتری اور مجھے واجبی سا بے مہر سلام کر کے وہ آبی کے پاس جا ٹھہری اور بولی "مگر ہمارا سامان؟ وہ تو ہوٹل میں ہی پڑا ہے۔"

"دفع کریں اسے۔ بہت سامان لے دوں گا آپ کو۔ شکر کریں کہ اس مصیبت بالو سے آپ کی جان بچ گئی ہے۔" آبی نے اس کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"اچھا بھئی! خدا حافظ! ایک ہفتے بعد مجھ سے تم گاؤں میں ضرور ملو گے۔ رقم واپس لا کر میں تمہارے حساب میں جمع کروا دوں گا۔"

"اس کی مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے۔ وہ تمہیں مبارک ہو۔ میں اس کے بغیر بھی جی سکتا ہوں۔"

"نہیں یار! یہ نہیں ہو گا مجھ سے۔ یہ غصہ تھوک دو اب اور مجھے اچھی طرح خوش دلی سے رخصت کرو۔"

"ہاں! تیرا بیاہ جو ہو رہا ہے ان کے ساتھ۔ جا آبی! بس بہت ہو گئی۔ مجھے اور ذلیل نہ کر۔" میں نے اب کی بار بہت ہی تلخ لہجے میں کہا۔

"تمہاری مرضی! اچھا خدا حافظ۔" یہ کہہ کر وہ آگے نکل گیا۔

شگفتہ اور نرگس اس کے پیچھے تھیں اور یوں لگتا تھا جیسے وہ اس کی زرخرید لونڈیاں ہیں۔ میں آج تک اس معمّے کو حل نہیں کر سکا ہوں کہ آبی نے انہیں کیسے قابو کر لیا۔ وہ غیر مرئی انداز میں آپ ہی آپ اس کی طرف سرک گئی تھیں۔ بغیر کہے سنے وہ اس کے ساتھ کراچی جانے پر آمادہ ہو گئی تھیں۔ وہ دونوں عورتیں اپنے حسن اور بانکپن میں بے مثال تھیں۔ عالیہ نے انہیں اپنی خدمت پر یوں ہی نہیں مامور کر لیا تھا۔ اس کا معیار بہت سخت تھا۔ خدا جانے وہ انہیں کس کس کے سامنے رشوت کے طور پر پیش کر چکی ہو گی اور اب آبی نے اُن کو بندۂ بے دام بنا لیا تھا اور اس معاملے میں سب سے زیادہ کام شگفتہ نے دکھایا تھا۔ کوئی ایسی ہی بے مثال قوت تھی اس کے پاس کہ وہ جس مرد کو چاہتی تھی، زیر کر لیتی تھی۔ آبی پر مہربان ہوئی تو اسے اس حد تک اس نے ورغلا لیا تھا کہ وہ مجھ سے بھی بغاوت کر بیٹھا۔ یہ فتنہ اس نے چند ہی لمحوں میں اتنا بیدار کر دیا تھا کہ میں آبی سے باقاعدہ جنگ کے امکان پر غور کرنے لگا تھا۔ شگفتہ نے دو دوستوں کو آپس میں بھڑا دیا تھا۔ اس کو سمجھ لینا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ میرا خیال

ہے کہ ایک روز آپی پر بھی یہ حقیقت عیاں ہو جائے گی کہ اس عورت کے ایک تیر نے کیسے گہرے یارانے کو دولخت کر دیا تھا۔ وہ ایسی ہی تیر انداز تھی اور اس کی آنکھوں کا سحر تو مجھے اب تک یاد ہے۔ وہ دیکھتی نہیں تھی آدمی کو غیر مرئی انداز میں اپنی طرف کھینچتی چلی جاتی تھی اور اس کا وہ دایاں ہاتھ جو مسلسل آپی کی گرفت میں رہا، خدا جانے اسے کیسے کیسے پیغام دیتا تھا کہ آپی نے کوئی زبردست فیصلہ کر کے اچانک ہی کراچی جانے کا اعلان کر دیا۔ میں بے بس ہو کر رہ گیا۔ اس کو روک لینا کسی بھی طرح میرے بس میں نہیں تھا۔ نرگس کا سراپا الگ اس کی نظر میں تھا۔ وہ بھی گاڑی کے جھٹکے سے بچنے کے لیے جب اگلی نشست پہ ہاتھ رکھتی تھی تو اس کی انگلیاں بھی آگے بڑھ کر آپی کو ایک لہلہاتی بہشت کا پتہ دیتی تھیں۔ وہ بھی اسے دانستہ طور پہ اس ماحول سے انہیں نکال لینے کا مشورہ دیتی تھی۔ دونوں شاید وہاں سے سخت متنفر تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے بھی خود کو عالیہ سے الگ کر لیا تھا۔ اس کے سارے راز وہ ہمیں بتا دینے کے بعد چاہتی تھیں کہ وہاں سے نکل جائیں اور آپی اُن کے لیے بہت عمدہ سواری کا کام دے رہا تھا۔ نرگس کی کھنچی کھنچی مست مسرور آنکھیں آپی کو عقب نما آئینے میں یہی پیغام دیتی تھیں کہ خدارا ہمیں اپنا لو۔ اس ماحول سے ہمیں نکال دو اور آپی انہی کے کہنے پہ عمل کرتا ہوا مجھ سے اتنی دُور نکل گیا تھا کہ میں اس کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ میری نظروں سے اوجھل ہوئے تو میں نے اگلی سیٹ پہ بیٹھ کر اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔ مگر میرا دل لہو رو رہا تھا۔ مجھ سے اسٹیئرنگ سنبھالے نہیں سنبھلتا تھا۔ میں نے اس پہ بانہیں رکھ کر اپنا سر اُن پہ ڈال دیا۔ سب کچھ ہی غارت ہو کر رہ گیا تھا۔ نہ میرے آگے کچھ باقی تھا نہ میرے پیچھے۔ آپی کے بغیر تو میں زندگی کر ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ میرا اوڑھنا بچھونا تھا۔ وہ میرا دوست ہی نہیں تھا بلکہ میں سمجھتا تھا میری جان اس میں اٹکی ہوئی ہے۔ اس کے بغیر تو میں صفر ہو کر رہ گیا تھا۔ مگر اس نے کسی بھی بات پہ دھیان نہیں دیا تھا۔ ان عورتوں کے سامنے اس نے مجھے ذلیل کر کے رکھ دیا تھا۔ ان عورتوں کو میں کیا جواب دیتا۔ ایک ایک لفظ اس کا زہر میں بجھا ہوا تھا۔

میں کتنی ہی دیر تک اسٹیئرنگ پر سر رکھے سوچتا رہا کہ آخر یہ سب کچھ ہو کیسے گیا ہے کہ اچانک مجھے اپنے کندھے پہ کسی کا ہاتھ محسوس ہوا۔ میں نے ایک دم سر اٹھایا تو آپی میرے سامنے کھڑا تھا، بولا "یہ ہتھیار تو رکھ لو جیلانی! وہ انہیں ہوائی جہاز میں سوار نہیں ہونے دیں گے۔" یہ کہہ کر اس نے پستول اور اسٹین گن کوٹ کے نیچے سے نکال کر پچھلی سیٹ پر رکھ دیں۔ بولا "میں ایک ہفتے تک گاؤں پہنچ جاؤں گا۔ تم اتوار تک میری ماں جی کے پاس آ جانا۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔"

"ہاں! مجھے یاد ہے۔ اگر کوئی گڑبڑ نہ ہو گئی تو میں وہاں آ جاؤں گا۔"

"ہاں! بہت محتاط رہنا۔ بڑی مکار عورت سے پالا پڑا ہے تمہارا۔ اچھا خدا حافظ!" یہ کہہ کر وہ مجھ سے ایک بار پھر یونہی واجبی سا ہاتھ ملا کر واپس چلا گیا۔ یوں جیسے اس کو امید ہو کہ ہم صبح پھر مل لیں گے۔ انداز اس کا ایسا ہی تھا مگر میں جانتا تھا کہ وہ ایک بڑی رقم کے ساتھ مجھ سے الگ ہو رہا ہے۔ اس کی واپسی ناممکن ہے۔

کار جب میں نے ہوائی اڈے سے باہر نکالی تو میں خالی الذہن ہو چکا تھا۔ رات کے اس وقت ساڑھے گیارہ بج رہے تھے اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری اگلی منزل کہاں ہو گی۔ اک صرف عالیہ کا چہرہ میرے ذہن میں تھا۔ وہ بلا کا حسین چہرہ، جس نے اتنے سارے لوگوں کو ٹھگ لیا تھا اور جس کی وجہ سے دھمن جیسا عیار آدمی بھی اپنی ساری جمع پونجی اس کے حوالے کر کے خود اس کی قید میں جا پھنسا تھا۔

اس رقم کو حاصل کرنے کے لیے اس نے کیسی کیسی مصیبتیں نہ جھیلی تھیں مگر اس سے وہ ابھی صحیح طور پر فیض یاب بھی نہ ہو سکا تھا کہ عالیہ کے اندر کی باغی عورت نے اسے ٹھوک کر سڑک پر ڈال دیا اور اب وہ اس کا سارا اثاثہ سمیٹ کر خود امریکہ جانے کا سوچ رہی تھی۔ کیا وہ کسی اور کے چکر میں پھنس چکی تھی؟ یا اسے کوئی اور چاہنے والا مل گیا تھا؟ کیوں اس نے دھمن کو ایسی ذلت آمیز شکست سے دوچار کر دیا تھا؟ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ میرا ایک دشمن تو خود اپنے ہی تیر سے زخمی ہو چکا تھا اور ایک دوست ان کی قید میں پھنس کر دُور کہیں زندگی اور موت کے دوراہے پر کھڑا تھا۔ میں نہ تو ڈھلوں صاحب تک ہی پہنچ پایا تھا اور نہ دھمن تک اور میری نخیارہ تقدیر نے مجھے بہن کی صورت دیکھنے سے بھی ابھی تک محروم رکھا تھا۔ مجھے اب تک یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ بیچاری کس حال میں ہے۔ میں قندیار سے بھی نامراد واپس آیا تھا اور فرید کوٹ سے بھی۔ وہاں تک تو اس کا پتہ چلتا تھا مگر پھر کسی کو معلوم نہیں تھا کہ اسے زمین کھا گئی کہ آسمان۔ ماں کو بھی اس کی کوئی خبر نہیں تھی۔ میں ایسا کم نصیب آدمی تھا کہ جس منزل کی طرف بھی میں بڑھتا تھا وہ مجھ سے مسلسل اتنی ہی دُور ہو جاتی تھی۔ بہن کا سراغ ملنا بھی ناممکن ہو جاتا تھا اور عالیہ میرے سامنے تھی مگر

بھی اتنے پردوں میں چھپی تھی کہ اس کو پا لینا ہی ناممکن نظر آتا تھا۔ بدری ایک ایسا آدمی تھا جو اس سارے معاملے میں بہت اہم ثابت ہو سکتا تھا مگر اسے ڈھلوں صاحب کی فراست بیگم سنبھال کر بیٹھ گئی تھیں۔ اس نے میرے پیچھے بھیج کر اپنے چار سیاہ پوش مروا لیے تھے اور خدا معلوم فراست بیگم کے ارادے کیا تھے۔ وہ ڈھلوں صاحب کے تخت پر اب بدرالدین کو بٹھا دینا چاہتی تھی یہی نظر آتا تھا مجھے۔ کتنے ہی مسائل تھے جو ابھی تک لاینحل نظر آتے تھے اور میں تھک گیا تھا۔ میرے وجود کی ساری قوتیں شاید راستے میں ہی برف ہو گئی تھیں مگر لہریں تھیں کہ ایک کے اوپر ایک چڑھی چلی آتی تھیں تو اتنی ساری شکتی کہاں سے لائے گا جیلانی؟ اور پھر دیکھ تو تُو تنہا رہ گیا ہے۔ آپی نے ایک لمحے کی دیر نہیں کی اور تجھ سے ہاتھ ملا کر الگ ہو گیا ہے۔ اسے احساس تک نہیں ہوا کہ تُو تنہا رہ جائے گا تو کیا کر سکتا ہے؟ میں یہ سوچ سوچ کر پاگل ہو گیا تھا۔

اس وقت بھوک نے مجھے نڈھال کر دیا تھا۔ مال روڈ کے ایک ہوٹل کے سامنے میں نے گاڑی کھڑی کی اور بیرے کو آرڈر دے کر میں ایک تنہا میز پہ ہارے ہوئے جواری کی طرح جا بیٹھا تھا۔ میں بلاشبہ ساری ہی بازیاں ہار چکا تھا۔ آپی کے ہتھیار میں نے گاڑی کے اندر ہی سنبھال کر رکھ دیے تھے۔ اپنی اسٹین گن بھی میں وہیں چھوڑ آیا تھا۔ اسے میں کہاں ساتھ لیے پھرتا۔ وہ میرے ساتھ ہوتی تھی تو میرے سر پہ جنون سوار رہتا تھا۔ ہتھیار آدمی کا حوصلہ بڑھاتا ہے مگر مجرم کے ہاتھ تلے آ کر ہتھیار اس کو بے رحمی اور رسوائی پر آمادہ کرتا ہے۔ میرے ساتھ بھی اکثر اوقات یہی کچھ ہو چکا تھا۔ ورنہ کتنے ہی ایسے لوگ تھے جن کو میں چھوڑ سکتا تھا، ان کی جان بخشی کر سکتا تھا۔ وہ مزاحم ہوتے تھے تو میں ان سے کنّی کترا کر نکل سکتا تھا مگر میرے ہتھیار مجھے بے چین کر رکھتے تھے اور میرے نامۂ اعمال میں یہی وہ چیز تھی جو مجھے ذلتوں سے آشنا کر گئی تھی۔ میں خنجر بکف ہوتا تو کسی ایک آدمی کی پسلی چیرتا، دُوسرا تو میری زد میں نہ آتا۔ میں اسے مار نہ سکتا تو وہ مجھے مار دیتا، یہی کچھ ہوتا نا۔ مگر ان ہتھیاروں کو بے دریغ استعمال کر کے میں نے اپنی عاقبت بھی خراب کر لی تھی اور دُنیا تو گئی ہی تھی میرے ہاتھ سے۔ نہ میری بہن ان ہتھیاروں نے واپس دلائی نہ میرے دوست ہی مجھ سے کوئی فیض اٹھا سکے۔ میری بدنصیبی کی تو انتہا ہی نہیں تھی اور اب میرا یہ حال تھا کہ نہ میں گھر کا رہا تھا نہ گھاٹ کا۔

بیرا کھانا لے آیا تو مجھے قدرے سکون محسوس ہوا۔ کھانا بہت اچھا تھا اور لذیذ بھی۔ وہ میں نے پیٹ بھر کر کھایا۔ کون جانے کل کسی چولھے کی پکّی مجھے ملتی بھی ہے کہ نہیں۔ جب میں کھانا کھا کر ہوٹل سے باہر نکلا تو رات کے ساڑھے بارہ بج چکے تھے۔ میں پلٹ کر ہوٹل کے فون تک جا پہنچا۔ فون کا نظام خود کار تھا۔ پیسے ڈالو اور نمبر ملا لو۔ میں نے جب مطلوبہ نمبر گھمائے تو دوسری طرف سے کسی مرد کی آواز سنائی دی۔

"ہیلو!" آواز بڑی گمبھیر اور مستحکم تھی مگر اس میں سے مجھے ہلکے سے تذبذب کی بُو آتی تھی۔

"میں بدری بول رہا ہوں۔ کون صاحب ہیں؟"

"مہدی!" آواز آئی۔

"میں آج ہی چوگوٹھ سے واپس آیا ہوں۔ میڈم کہاں ہیں؟"

"کون میڈم؟"

"میڈم عالیہ۔"

"کیا کہنا ہے آپ کو ان سے؟"

"ایک ضروری بات کرنی ہے۔ وہ فوّاد کہاں ہے؟"

"وہ اس وقت سو رہا ہے۔ میڈم بھی اس وقت آرام کرتی ہیں۔"

"سنو! یہ آرام کا وقت نہیں ہے بھائی! مجھے بتاؤ، وہ اس وقت کہاں ہیں؟ مجھے نرگس اور شگفتہ کے بارے میں بات کرنی ہے۔"

"وہ اُدھر ہی گئی ہیں اُن کی طرف۔"

"کس وقت؟ میں تو انہیں وہاں دیکھ کر آیا ہوں۔ وہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔"

"مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہوں گی۔ جب آئیں گی تو میں آپ کا پیغام انہیں دے دوں گا۔" یہ کہہ کر اُس نے فون بند کر دیا۔ مگر چند ہی لمحوں بعد میں نے فون دوبارہ اٹھا لیا۔ جیسے ہی میں نے نمبر گھمائے، دوسری طرف سے مجھے کسی کے ریسیور اٹھانے کی آواز آئی۔ مگر مہدی بولا نہیں، بالکل خاموش رہا۔ میں نے کئی بار ہیلو ہیلو کہا مگر کسی نے مجھے جواب نہیں دیا۔ آواز میں نے بڑی حد تک بدل لی تھی اور مجھے معلوم تھا کہ بدری کا لہجہ کیسے اپنایا جا سکتا ہے۔ چند لمحوں بعد کسی عورت کی آواز سنائی دی۔ بلاشبہ وہ عالیہ کی آواز تھی۔

"ہیلو۔ کون؟"

"اوہ میڈم میں بدری بول رہا ہوں۔ آپ مجھ سے بات ہی نہیں کرتی ہیں۔"

"کیا معاملہ ہے؟"

"وہ نرگس اور شگفتہ کہاں ہیں؟ میں انہیں دیکھ کر آ رہا ہوں۔ خبر بہت بری ہے۔"

"مجھے معلوم ہے مگر وہ لوگ انہیں کچھ نہیں کہہ سکتے۔ تم اس وقت کہاں سے بول رہے ہو؟"

"میں یہ کہہ رہا تھا کہ ہمارے چار آدمی ان لوگوں نے ختم کر دیے ہیں۔ وہ چوکوٹھ آئے تھے۔ میں نے ان کے پیچھے چار سیاہ پوش بھیجے مگر وہ خوفناک ہتھیاروں سے مسلح تھے۔ ان چاروں کو ان لوگوں نے ختم کر دیا۔"

"یہ تو بہت بُرا ہوا۔ اب کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"وہ ڈھلوں صاحب کا پتہ پوچھ رہے تھے۔"

"ڈھلوں صاحب تو گئے ملعونہ صاحب کی جیب میں. اب وہ یہاں کہاں؟ تم نے خود تو اُن کا پتہ دیا تھا۔"

"مگر اتنی جلدی کیسے پہنچ گئے وہ ملعونہ کے پاس؟ اُن کو یہاں ہی ختم کر دینا چاہیے تھا۔ کس کے ذریعے بھیجا ہے آپ نے انہیں؟"

"شاستری آیا تھا ــــ اس کے ٹرک پر لدوا دیا میں نے! مگر سنو! تم اب یہاں ڈھلوں صاحب کی گدّی پر بیٹھو گے؟"

"ہاں! مجھے یہی کرنا چاہیے تھا۔ میں نے اپنا بندوبست پہلے ہی کر لیا تھا۔"

"مزے کرو۔ آج اتوار ہے۔ میں جمعرات کو امریکہ چلی جاؤں گی۔ میری سیٹ بک ہو چکی ہے۔ سارا انتظام میں نے کر لیا ہے۔"

"مگر اس شگفتہ اور نرگس کا کیا ہو گا؟"

"وہ خود بھگت لیں گی۔ مجھے فون آیا تھا۔ وہاں میں گئی بھی تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہ جیلانی ہی تھا۔ کاش! وہ میرے ہاتھ آ جاتا۔"

"آپ اس وقت کہاں ہیں؟" میرا یہ سوال ہی احمقانہ تھا۔ مجھ سے زبردست غلطی سرزد ہوئی۔ عالیہ نے ایک دم پریشان ہو کر اپنی آواز بند کر لی۔ بدری کو معلوم تھا کہ وہ فون کس جگہ لگا ہے۔ مگر مجھے عالیہ سے یہ سوال ہرگز نہیں پوچھنا چاہیے تھا۔ لیکن اب تو بات زبان سے نکل گئی تھی۔ واپس نہیں آ سکتی تھی۔ وہ چیخ کر بولی۔

"بدمعاش! تیری یہ مجال، تو بدری بن کر مجھ سے راز معلوم کر گیا ہے مگر میں تیرے فرشتوں کے بھی ہاتھ نہیں آ سکتی۔ تم جو کر سکتے ہو کر لو، شیطان کی اولاد! جیلانی! میں تجھے ذلت کی موت ماروں گی۔"

میں نے فون بند کر دیا۔ مجھے ہر حال میں یہ معلوم ہونا چاہیے تھا کہ وہ ٹیلی فون کس جگہ ہے۔ میں نے ہوٹل سے نکل کر اسی وقت ٹیلی فون ایکسچینج کا رُخ کیا۔ رات کی شفٹ پر وہاں آدمی ہر وقت موجود رہتے تھے۔ کاؤنٹروں سے پرے ایک بڑی میز پر محکمے کے کوئی افسر بیٹھے تھے۔ میں سیدھا ان کے پاس جا پہنچا۔ "جناب! آپ میری ایک مشکل حل کر دیں تو یہ آپ کا مجھ پر احسان ہو گا۔"

"بیٹھیں! تشریف رکھیں۔ آپ حکم کریں، آخر ہم بیٹھے کس لیے ہیں جناب!" وہ کوئی بڑا ہی خوش رو اور متواضع قسم کا آدمی تھا۔ میں جب کرسی پر بیٹھا تو اس نے سامنے رکھی دو پیالیوں میں سے ایک پیالی چائے کی میری طرف سرکا دی۔

"یہ چائے پئیں! آج سردی ایک دم زیادہ ہو گئی ہے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔"

"جی آپ کا بہت بہت شکریہ! چائے تو واقعی اس وقت بہت ضروری ہے اور پھر آپ کا رات کا کام۔ دراصل مجھے یہ معلوم کرنا ہے کہ یہ فون کس گھر میں لگا ہے۔ وہ لوگ خود نہیں بتلاتے۔ بڑی رازداری سے کام لیتے ہیں۔" یہ کہہ کر میں نے فون نمبر اس کے سامنے رکھ دیا۔

اس نے فون نمبر پر غور کیا اور پھر ایک رجسٹر دیکھنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ بولا۔ "اس بات کا تو صبح ہی پتہ چل سکتا ہے کہ یہ فون کہاں ہے۔"

"مگر.... مگر اس وقت تک تو بہت دیر ہو چکی ہو گی، ہو سکتا ہے کوئی آدمی قتل ہو جائے؟"

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" وہ اچھل سا گیا۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں جناب! حالات کا کیا پتہ کیا ہو جائیں۔"

"ٹھہریں! میں خود وہاں فون کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے نمبر گھما دیے۔

"آپ میرا ذکر اُن سے ہرگز نہ کریں۔ یہ بہت ضروری ہے۔"

"ٹھیک ہے آپ بے فکر رہیں۔" اس نے آخری نمبر گھما کر کا انتظار کیا۔ مگر دوسری طرف سے کسی نے فون نہیں اٹھایا۔ اچانک اسے کچھ یاد آیا تو اس نے ایک اور نمبر گھما دیا۔

"ہیلو! یہ آپ کا نمبر ہے؟" یہ کہہ کر اس نے میرا نمبر دوہرایا۔

"جی ہاں، حکم؟" دوسری طرف سے کسی نے پوچھا۔

"یہ ہوٹل کا نمبر ہے؟"

"جی ہاں! یہ ہمارا آن لسٹ نمبر ہے۔ ڈائریکٹری میں ذکر نہیں ہے۔"

"اچھا ٹھیک ہے، مہربانی!" یہ کہہ کر اس آدمی نے فون بند کر دیا، بولا۔ "لو جی! یہ تو مسئلہ ہی حل ہو گیا۔ وہ تو ہوٹل السعود کا نمبر نکلا۔ اب بتائیں کہ کون کہاں قتل ہو جائے گا؟"

"میں آپ سے معذرت خواہ ہوں جناب! دراصل آدمی کو پریشانی اُسے طرح طرح کے خواب دکھاتی ہے۔ میں نے آپ

کو خواہ مخواہ تکلیف دی۔" یہ کہہ کر میں وہاں سے اٹھا اور گاڑی میں جا بیٹھا۔ عالیہ بھی گویا ہوٹل السعود میں ہی ٹھہری ہوئی تھی اور مجھے اس سے وہیں دو دو ہاتھ کرنے تھے مگر سوال یہ تھا کہ کار بھی میرے پاس ہوٹل ہی کی تھی۔ اس میں بیٹھ کر تو میں وہاں نہیں جا سکتا تھا۔ وسوسے ڈھیر سارے تھے مگر پھر بھی میں نے یہی فیصلہ کیا کہ فی الحال تو مجھے اسی کار سے کام چلانا ہو گا۔ وہ پولیس کو خبردار بھی کریں گے تو صبح سے پہلے وہ کوئی توجہ نہیں دیں گے۔ اگر کسی نے رات کو خبر بھی لی تو وہ بہت کرے گا تو یہی ہو گا کہ شہر سے باہر متعین پولیس کو خبر کر دے گا کہ فلاں گاڑی کا دھیان رکھو، وہ چوری ہو چکی ہے۔ اسی خیال کے تحت میں گاڑی کو لے کر سیدھا ہوٹل السعود کی طرف بڑھا میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ عالیہ نے میرے خلاف پورے شہر کو اٹھا دیا ہے۔ ابھی میں مال روڈ پر سے گزر کر گورنر ہاؤس سے آگے نہر کے پُل پر پہنچا ہی تھا کہ دوسرے حصے میں مجھے ایک ٹرک نظر آیا جو پُل کے بیچ میں پھنسا دیا گیا تھا، اس طرح کہ وہاں سے ایک سائیکل بھی آگے نہیں نکل سکتی تھی اور اس ٹرک پر مسلح سپاہی کھڑے تھے۔ پُل کے عین وسط میں پہنچ کر مجھے اُن کا علم ہوا۔ میں نے کار اس وقت بلا تمیز رفتار سے پیچھے ہٹائی مگر عقب سے دو جیپیں میرے اوپر چڑھی آ رہی تھیں۔ فاصلہ صرف چھ ہاتھ کا تھا کہ سامنے سے مسلح سپاہیوں نے کار پر گولی چلا دی۔ شیشہ کرچی کرچی ہو کر الگ ہو گیا۔ گولیوں سے بچنے کے لیے میں نے کار کا دروازہ کھولا اور اس کی اوٹ میں ہو کر پل کی دیوار تک کودنے لگا کہ ایک برسٹ اور میری طرف آیا۔ میرے عقب میں پولیس کی جیپوں میں سے گولیاں میری طرف آئیں۔ میری جان شکنجے میں پھنس چکی تھی۔ دروازہ میری جان نہیں بچا سکتا تھا۔ میں پریشان ہو کر نیچے بیٹھ گیا۔ وہ گولیاں ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ایک کڑکتی ہوئی آواز اُبھری۔

"اپنے ہتھیار پھینک دو اور سامنے آ جاؤ۔ ورنہ ہم تمہیں جان سے مار دیں گے۔" اس آواز نے میرے ذہن پر چابک ایسا اثر کیا۔ ابھی تک میں اپنے ہتھیاروں کو بھولا ہوا تھا۔ ان کا نام سن کر میں نے اسٹین گن سیدھی کی اور آڑی ترچھی کار کی اوٹ میں بیٹھ کر میں نے عقب میں موجود سپاہیوں کو گولیوں کی زد میں لے لیا۔ وہ مجھے نظر نہیں آ رہے تھے۔ وہ بھی جیپ کی اوٹ میں پناہ لیے ہوئے تھے جیسے ہی میں نے گولی چلائی، وہ دبک کر بیٹھ گئے۔ ان کی طرف سے مایوس ہو کر میں نے سامنے ٹرک کی دیوار کے پیچھے کھڑے سپاہیوں پر باڑھ ماری مگر ان میں سے بھی کوئی آدمی میری زد میں نہیں آیا۔ صورتِ حال بہت ہی پریشان کن تھی۔ پُل کے دونوں راستے اُن لوگوں نے بند کر رکھے تھے۔

"جیلانی! اپنے ہتھیار پھینک کر سامنے آ جاؤ۔ ہم تمہیں آخری وارننگ دے رہے ہیں۔ تم ہمارے نشانے کی زد میں ہو۔" وہی آواز پھر اُبھری۔ میرے لیے خود کو ان کے حوالے کر دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ عالیہ نے انہیں بتا دیا تھا کہ ہوٹل کی گاڑی کس نے چُرائی ہے۔ گاڑی کا دروازہ ابھی تک کھلا تھا۔ اس میں کئی سوراخ ابھر آئے تھے، کار کا شیشہ بھی چکنا چور ہو چکا تھا اور فرار کے دونوں راستے بند تھے۔ میں نے اس آواز پر پاگل ہو کر اوورکوٹ اتارا اور ڈھائی تین فٹ اونچی دیوار پر سے کود کر نہر میں چھلانگ لگا دی۔ نہر پانی سے بھری ہوئی تھی۔ میں اُس میں کودا تو کئی گولیاں سائیں سائیں کرتی میرے پاس سے گزر گئیں۔ اُن میں سے شاید کوئی بھی میرے لیے نہیں بنی تھی۔ میں پانی میں اترا تو میں سمجھا کہ میں پاتال تک جا پہنچوں گا اور یہ اچھی بات تھی۔

میں خاصا گہرا اُتر کر پھر پانی میں اُبھرا تو اس وقت تک میں پُل سے کئی گز دُور جا چکا تھا۔ سانس لینے کے لیے میں نے پانی سے سر نکالا تو مجھے اس وقت بہت سی آوازوں کا شور سنائی دیا۔ وہ گروہ کی صورت میں چیخ رہے تھے۔ کچھ آوازیں دائیں ہاتھ سے اٹھ رہی تھیں، کچھ پل کے اوپر سے اور ان کے ساتھ ہی ساتھ گولیوں کی سنسناہٹ فضا میں گونجتی تھی۔ میں نے پھر پانی میں غوطہ لگایا۔ اسٹین گن میں نے گلے میں ڈال لی تھی۔ اوورکوٹ کار کے پاس ہی میں ڈھیر کر آیا تھا۔ لباس کا بوجھ بھی مجھے آگے بڑھنے سے روکتا تھا مگر میں نہر کے عین بیچ میں پانی کے اندر چلتا رہا۔ سانس لینے کے لیے میں ذرا دیر کے لیے اوپر اُبھرتا تو مجھے دائیں بائیں جیپیں چلنے کی آواز سنائی دیتی تھی۔ وقت نے مجھے زبردست مخمصے میں پھنسا دیا تھا۔ وہ کسی طرح بھی میرے تعاقب سے باز نہیں آ رہے تھے۔ راستے میں ایک اور پُل آتا تھا اور اس کے کنارے نہر کے پانی میں کچھ پتھر پڑے ہوئے تھے۔ میں نے اُن کے ساتھ اپنا سر ٹکا دیا۔ پل میرے سامنے تھا۔ ٹھنڈا پانی مجھے نڈھال کر رہا تھا مگر میں نے پانی میں سے اپنی ناک اونچی کر کے خود کو پوری طرح غرق کر دیا۔ انہیں میں اب شاید کہیں بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ٹارچ کی روشنیاں وہ مسلسل پانی پر بکھیر رہے تھے مگر ان پتھروں نے مجھے ایسا سہارا دیا کہ وہ پُل پر سے گزر کر آگے نکل گئے۔ انہیں یقین تھا کہ میں کسی نہ کسی جگہ پانی سے باہر ضرور نکلوں گا۔ جیپیں اُن کے پاس تھیں اور ٹارچ کی روشنی انہیں آگے بڑھا رہی تھی۔ مگر میں تو راستے میں ہی رہ گیا تھا۔ کوئی آدھ گھنٹے تک میں وہیں منجمد ہو کر بیٹھا رہا۔ وہ اس وقت تک بہت آگے نکل چکے تھے۔ پتھروں کا سہارا لے کر بالآخر میں پانی میں سے باہر نکل آیا مگر حالت میری بہت ہی بُری ہو چکی تھی۔ جسم میں سے شاید ساری ہی حرارتِ عزیزی خارج ہو چکی تھی۔ مجھ سے دو

قدم بھی آگے نہیں نکلا جاتا تھا مگر پھر بھی بدن پر قوتِ ارادی کا کوڑا برساتے ہوئے میں نڈھال حالت میں نہر سے نکلا اور پانی کو کپڑوں سے خارج کر کے میں اسی وقت بائیں ہاتھ کی طرف چل دیا۔ سامنے گھنا جنگل تھا جس کے پرے بھی ایک بستی تھی۔ میں نے اس جنگل میں دو گھڑی آرام کرتے ہوئے اپنے کپڑے اتارے اور اُن کو نچوڑ کر اچھی طرح خشک کر لیا۔ مگر گیلے تو وہ پھر بھی تھے۔ انہیں دوبارہ پہن کر میں نے اسٹین گن کوٹ کے نیچے دبائی مگر کوٹ اس کا وجود کہاں برداشت کر سکتا تھا۔ اسٹین گن صاف نظر آتی تھی۔ میں نے چاہا کہ میں اسے پھینک دوں، مگر میری تو زندگی اسی سے وابستہ تھی۔ کوٹ میں اس کی اور پستول کی گولیاں موجود تھیں۔ مجبوراً میں اسے بدن سے لپٹا کر آگے نکلا۔ مگر میری تقدیر میرا ساتھ چھوڑ رہی تھی۔ عالیہ ایک بار پھر جیت گئی تھی۔ گھنے درختوں کے نیچے جھاڑیوں سے الجھتا ہوا میں چند ہی قدم آگے گیا تھا کہ مجھے اپنی کمر پر بندوق کی نال لگنے کا احساس ہوا۔

"اپنے ہاتھ اوپر اٹھا لو جیلانی! تم اب بچ کر نہیں جا سکو گے۔" میں نے یہ آواز سنی تو چیتے ایسی پھرتی سے گھوم کر اس آدمی کو دیکھا جس کی وردی مجھے بتاتی تھی کہ وہ پولیس کا اہلکار ہے۔ بندوق اس نے چلائی نہیں۔ میرا ہاتھ پستول کی طرف بڑھا مگر عین اسی وقت چار آدمی مجھے نرغے میں لے چکے تھے اور ان کے پستولوں کی نالیں میرا جسم چھلنی کرنے کے لیے بے چین تھیں۔

"ہاتھ اوپر اٹھا لو جیلانی! تمہارا قصہ ختم ہو چکا ہے۔" وہ کوئی افسر تھا جس نے شاید میری تلاش میں ہر گلی کھنگال ڈالی تھی۔ میرا ہاتھ وہیں رک گیا۔ پستول میری جیب میں ہی رہ گیا۔

"اس کی تلاشی لو۔" اس آدمی نے سپاہی کی طرف اشارہ کیا۔ تو دو ہاتھ میری جیبوں میں اُتر گئے۔ کوٹ کے نیچے سے اسٹین گن اور پستول اس نے نکال کر اپنے افسر کو دے دیے۔ تمام نوٹ جو ایک پلاسٹک کے بٹوے میں بند تھے اس نے نکال لیے۔ سگریٹ اور ماچس بُری طرح بھیگ چکے تھے۔ جب وہ مجھے اچھی طرح صاف کر چکا تو اپنے افسر کے کہنے پر اس نے مجھے ہتھکڑی لگا دی۔ وہ زنجیر جس سے بچنے کے لیے میں نے بارہا کوشش کی بالآخر میرے ہاتھوں پر آ پہنچی تھی۔ وہ مجھے گرفتار کر چکے تھے۔ میری زندگی ہی شاید ختم ہونے کو آ گئی تھی۔ یہ آپی کی قسمت تھی کہ وہ مجھ سے چند ہی گھنٹے پہلے رخصت ہو گیا تھا۔ ورنہ وہ بھی اس وقت میرے ساتھ ہوتا تو میرا دُکھ سوا ہو جاتا۔ وہ خوش نصیب تھا کہ اپنا راستہ اس نے مجھ سے الگ کر لیا تھا۔ میں تنہا ہی اس طویل سفر پر نکلا تھا اور اب تنہا ہی مجھے اس قانون کی خارا شگاف تلوار کا وار سہنا تھا۔ میرے حوصلے کی ساری شمعیں گل ہو گئیں۔ میں اُن کے ہاتھ بھی آیا تو اس طرح کہ اپنے تحفظ میں میں ان کے خلاف ایک گولی بھی نہ چلا سکا۔ کچھ بھی تو نہ ہو سکا تھا مجھ سے۔ وہ بلائے بے درماں کی طرح چاروں طرف سے مجھے یوں نرغے میں لے چکے تھے کہ میں شل ہو کر رہ گیا۔ میں چاہتا تو شاید ان میں سے دو چار کو مار کر وہیں مر جاتا مگر مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ مرنا اتنا آسان نہیں ہے۔ مہلک ہتھیار کی زد میں آ کر اپنے حوصلے کے مینار اونچے رکھ لینا بہت مشکل تھا۔ میں دراصل ڈھے سا گیا تھا۔ جب سے آپی مجھ سے جدا ہوا تھا مجھے زندگی کے بے وقعت ہونے کا احساس لے ڈوبا تھا اور وہ خدا جانے کب سے اس جنگل میں محاصرہ کیے ہوئے تھے۔ میں آدھ گھنٹے تک پتھر کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھا رہا اور وہ میرا انتظار کرتے رہے۔ میں باہر نکلا تو تب بھی وہ میرے سامنے نہیں آئے۔ دراصل کسی ایک نے اُن میں سے مجھے دیکھ لیا تھا مگر وہ تنہا میرے سامنے نہیں آنا چاہتا تھا۔ ایک خوف تھا، ایک دہشت تھی، ایک بے کراں لرزہ تھا جو پولیس کو میرے سامنے آنے سے روکتا تھا۔ چند ہی لمحوں بعد اُن کی سیٹیاں چاروں طرف گونجنے لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے بارہ چودہ آدمی میرے گرد آ ٹھہرے۔ ابھی تک انھوں نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ مجھے دھکیل کر نہر کے کنارے کھڑی جیپ کے پاس لے گئے۔ میں تو محض ایک نخچیر تھا۔ ان کے جال میں پھنس کر بے دم ہو چکا تھا۔ وہ غالباً کوئی ڈی ایس پی تھا۔ لوگ اسے راشدی کہہ کر پکارتے تھے۔ وہ مہم ان لوگوں نے اسی کی سرکردگی میں طے کی تھی۔ وہ پستول سیدھے ہاتھ میں لے کر میرے سامنے آ ٹھہرا۔ کُسے اب بھی شک تھا کہ شاید میرے ترکش میں کوئی تیر موجود ہو گا۔

"بڑی راہ دکھائی ہے تم نے جیلانی! تمہارے حوصلے کی داد دیتا ہوں مگر تمہارا انجام اچھا نہیں ہوا۔ چلو جیپ میں بیٹھو! میں مرے ہوئے آدمی پر کوڑا نہیں برساتا، چلو!" اس کی آواز میں تحمل تھا، بُردباری تھی، ایک ٹھہراؤ تھا۔ اس کے کہنے پر میں جیپ کے اندر جا بیٹھا۔ مجھ پر ایک نہیں بے حساب الزامات تھے اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ میں پھانسی کی کوٹھری سے بھاگا ہوا آدمی تھا۔ وہ میرا کچھ بھی نہ کرتے تو سیدھے تختۂ دار پر لٹکا سکتے تھے۔ ایک بہت بڑے جرم کی بہت بڑی سزا تو مجھے سنائی ہی جا چکی تھی۔ حیرت مجھے یہ تھی کہ راشدی صاحب بالکل خاموش تھے۔ جیپ کے اندر چاروں طرف مسلح سپاہی بیٹھے تھے اور ان کی نالوں کا رُخ میری ہی طرف تھا مگر راشدی کی خاموشی کی وجہ سے سپاہی بھی بالکل چُپ تھے۔ یہ غالباً اس کا احترام تھا جس نے ان کی زبان بند کر رکھی تھی۔ ورنہ ان کی آنکھوں میں فتح کا سیلاب جھلکتا نظر آتا تھا۔ راشدی اگلی سیٹ پر نہیں بلکہ پچھلے حصے میں میرے پاس ہی بیٹھ گئے۔ جیپ چلی تو اس نے ایک

سگریٹ مجھے پیش کیا، بولا: "لو یہ پیو! یہ تو میرے بس میں ہے۔ تمہارے سگریٹ تو بھیگ گئے تھے۔" میں نے کھنکتی زنجیر کو لہرا کر سگریٹ پکڑا تو اس نے دیا سلائی جلا دی، بولا: "ہماری اطلاع غلط نہیں تھی۔ مخبر معتبر تھا، کیوں ولی صاحب؟"

"جی ہاں! یہ اتفاق ہے کہ اسے ہتھیار چلانے کا موقع نہیں ملا۔ ورنہ یہ کئی آدمیوں کو لے ڈوبتا۔"

"نہیں! یہ بہادر آدمی ہے۔ اسے جینا آتا ہے تو مرنا بھی جانتا ہوگا۔ تمہارا ایک یار بھی تو تھا تمہارے ساتھ....؟"

"جی ہاں! مگر میرے کسی گناہ میں شامل نہیں تھا۔"

راشدی مسکرا دیا، بولا: "میں یہ نہیں پوچھ رہا ہوں کہ وہ تمہارے کسی گناہ میں شامل تھا کہ نہیں! مگر وہ تمہارے ساتھ کیوں نہیں ہے؟"

"وہ مجھ سے آج ہی رات الگ ہو گیا تھا۔ میری عادتیں اُسے اچھی نہیں لگتی تھیں۔"

"گھر کہاں ہے اس کا؟"

"مجھے اس کا علم نہیں ہے۔"

راشدی پھر مسکرا دیا۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ مجھ سے زیادہ بات نہیں کرے گا۔ کم از کم بحث سے وہ بہرحال بچ رہا تھا۔ کسی معاملے پر اصرار نہیں کرتا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم چھاؤنی کے تھانے میں جا پہنچے۔ میں جیپ سے اترا تو بہت سے سپاہی میرے اردگرد تھے۔ تھانے میں سناٹا سا چھا گیا۔ جتنے بھی سپاہی اور افسر وہاں موجود تھے وہ میری ایک جھلک دیکھنے کے لیے وہاں جمع ہو گئے۔ ان کی آنکھوں میں بے پناہ حیرت تھی۔ کئی تو ایسے تھے تو مجھے دیکھتے ہی گالیاں بکنے لگے تھے مگر راشدی نے انہیں موقع نہیں دیا۔ وہ مجھے ساتھ لے کر اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ تھانیدار کا نام ولی محمد تھا۔ اس سے بولا: "ہمارے لیے چائے بنوا دو ولی صاحب! تم بھی میرے ساتھ آؤ۔ درانی صاحب کو بھی اندر بھیج دو۔" یہ کہہ کر وہ مجھے اپنے کمرے میں لے گیا، بولا: "بیٹھو! اس کرسی پر بیٹھ جاؤ اور یہ سوچ لو کہ تمہارا قصہ ختم ہو چکا ہے۔ اب صرف پھانسی کا پھندا تمہارے گلے میں لٹکنا باقی ہے۔" یہ کہہ کر وہ کرسی پر جا بیٹھا۔ دو سپاہی میرے ساتھ ہی اندر آ گئے تھے اور وہ دونوں مسلح تھے۔ مجھے ان لوگوں نے دھکا دے کر صوفے پر بٹھا دیا۔

"ہوں! تو تمہارا نام غلام جیلانی ہے؟"

"جی ہاں! اب چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں۔"

"تمہارے بارے میں اطلاع ہمیں یہ ملی تھی کہ تم آج ہوٹل باہو سے دو عورتیں اغوا کر کے لے گئے ہو۔"

"جی ہاں! مگر میرا خیال ہے کہ وہ خوشی سے ہمارے ساتھ گئی تھیں اور اب وہ میرے دوست پیرزادہ کے پاس ہیں۔ وہ انہیں سکھر لے گیا ہے۔"

"وہاں کس پتے پر ٹھہرے گا وہ؟"

"اس کا مجھے علم نہیں ہے۔ وہ خود اپنی مالکن سے تنگ آئی ہوئی تھیں۔"

"تمہارا لہجہ تو بہت مصفا ہے۔ پڑھے لکھے ہو؟"

"جی ہاں! میں ایف اے تک پڑھا ہوا ہوں۔"

"تم پھانسی کی کوٹھری سے بھاگ نکلے تھے؟"

"جی ہاں! یہ سچ ہے۔"

"مصیبت یہ آ گئی ہے کہ پولیس میں اب زیادہ پڑھے لکھے لوگ بھرتی ہونے لگے ہیں۔ میں بھی اسی گروہ سے تعلق رکھتا ہوں اور میں تم سے مجرموں ایسا سلوک کرنا بھی چاہوں تو نہیں کر سکتا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے سارے گناہوں کا خود اعتراف کر لو۔ تمہارے لیے یہی بہتر ہے۔"

"میں نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے راشدی صاحب! ایک زبردست بے انصافی کے خلاف میں نے آواز ضرور اٹھائی ہے۔"

"مثلاً، وہ کونسی بے انصافی تھی جو تمہارے ساتھ ہوئی؟"

"چھوڑیں بس اب! میری فائل آپ نکالیں گے تو اس میں سب کچھ موجود ہو گا۔"

"ہاں! میں سب کچھ دیکھوں گا۔ ابھی تو میں اخبار نویسوں کو یہاں بُلا رہا ہوں۔"

"یہ زیادتی نہ کریں۔ اس سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔"

"نہیں! یہ بہت ضروری ہے۔ تمہاری گرفتاری کے لیے وہ بہت شور مچاتے رہے ہیں۔ میں انہیں ابھی بُلواؤں گا اور میرا خیال ہے وہ آ بھی جائیں گے۔"

"پھر بھی کل کے اخبار میں میری تصویر نہ چھپ سکے گی۔ رات بہت گزر چکی ہے۔"

"ہاں، یہ تو ہے۔ خیر! میں ان کو صبح بُلوا لوں گا۔ تمہیں پتہ ہے تمہاری گرفتاری پر انعام بھی مقرر ہے۔"

"وہ آپ کو مبارک ہو۔ مجھے معلوم ہوتا کہ آپ اتنے اچھے افسر ہیں تو میں پہلے ہی تھانے میں حاضر ہو جاتا۔ اتنی تگ و دو کرنی پڑی آپ کو۔ مجھے اس کا افسوس ہے۔"

اس نے نظریں جھکا لیں۔ میرا یہ فقرہ اسے پسند نہیں آیا تھا۔

"ٹھیک ہے! میں ڈاکٹر عالیہ کو یہاں بُلا رہا ہوں۔ آپ کی مخبر وہی تھی۔"

"اسے تو میں ضرور دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس کو فون کر دیں۔"

اتنے میں ولی صاحب اندر آگئے، آتے ہی بولے۔"اس کو ہمارے حوالے کریں راشدی صاحب! وہ درّانی اسی کے انتظار میں بیٹھا ہے۔ اس سے ہمیں بہت کچھ معلوم کرنا ہے۔"

"ہمیں چائے تو پی لینے دو!"

"اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بہت چائے پی لی ہے اِس نے۔ آج ہی تو یہ ہاتھ آیا ہے ہمارے۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔ وہ مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔ "میں تیری ان آنکھوں میں سلائی پھیر دوں گا جیلانی! تو مت سمجھ کہ اس طرح تو راشدی صاحب کا مہمان بن کر بیٹھا رہے گا۔"

"میرا خیال ہے تمہیں ابھی تک کسی نے تمیز نہیں سکھائی ہے ولی احمد! ہوش سے بات کرو۔ کیا ہوا جو میں تھانے میں آ بیٹھا ہوں! یہ حدِ آخر نہیں ہے ولی احمد! یہاں سے باہر جانے کا بھی ایک راستہ موجود ہے۔"

میری یہ بات سن کر وہ بھڑک اٹھا مگر راشدی صاحب کی وجہ سے خود پر ضبط کرتے ہوئے بولا۔

"یہ تمہیں جب پتہ چلے گا، جب ہم تمہارے پُرزے ادھیڑ دیں گے۔ کوئی ایک جرم نہیں ہے تمہارا! مگر ہر بار تم بچ بچا کر نکل جاتے تھے مگر اب نہیں۔ اب یہاں سے کوئی راستہ باہر نہیں جاتا ہے۔ بیٹے! میرا نام ولی احمد نہیں اگر میں نے تجھے موت سے پہلے نہ مار دیا تو......!"

"کوئی ذاتی دشمنی ہے تمہیں مجھ سے؟"

"ہاں یہی سمجھو! کتنے ہی پولیس افسر تم نے مار دیے۔ ہم ایک ایک بات کا حساب لیں گے تم سے۔"

"تم غلط کہتے ہو۔ میرا کبھی پولیس سے مقابلہ ہی نہیں ہوا۔ بدگمانی اچھی نہیں ہوتی ہے ولی احمد! چائے پیئیے۔ تمہیں بلڈ پریشر تو نہیں ہے کہیں؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس پر وہ غصّے سے پاگل ہو گیا۔ سپاہی اتنے میں چائے لے کر اندر آگیا تھا وہ چائے میں نے اُسے اشارہ کر کے اپنے سامنے میز پر رکھوالی۔ "اسے بناؤ میاں! میری سردی تو کچھ کم ہو۔ ہنر سالی بے حد ٹھنڈی تھی۔"

"ٹھنڈ تو تمہیں اب لگے گی جیلانی! اس کو میرے حوالے کردیں راشدی صاحب! یہ اس چائے کا کسی بھی طرح حقدار نہیں ہے۔"

"چپ رہو ولی احمد! مجھے تمہارا یہ انداز پسند نہیں آیا۔ ہم اس کو گرفتار کر چکے ہیں۔ اعتراف یہ خود کرے گا۔ سزا اس کو قانون کی طرف سے ملے گی۔ تمہیں اتنا سیخ پا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" یہ کہہ کر راشدی خود اٹھا اور میرے پاس آ کر چائے بنانے لگا۔ ولی احمد اسی وقت اٹھ کر باہر نکل لیا۔ اس سے میری یہ خاطر مدارات برداشت نہیں ہوتی تھیں۔

"آئی لائیک یُو راشدی صاحب! ورنہ میں سمجھتا تھا کہ سب پولیس افسر شریف نہیں ہوتے مگر میرا یہ خیال غلط نکلا۔" میں نے راشدی کی طرف جھک کر کہا۔

راشدی نے چائے بنا کر مجھے دے دی۔ دو پیالیاں سپاہیوں کو بھی مل گئیں۔ میرے ہاتھ سلگنے لگے تھے مگر میرے سامنے دو مسلح سپاہی میرا حوصلہ پست کر رہے تھے۔ پیالیاں ہاتھ میں لینے کے باوجود اُن دونوں نے اپنی بندوقیں مجھ پر تان رکھی تھیں، ورنہ میں شاید راشدی کو وہیں کھنگال دیتا۔ چائے ختم ہوئی تو اس کے چند ہی منٹ بعد درّانی اندر آگیا۔ چار سپاہی اس کے عقب میں آرہے تھے۔

"اس کو حوالات میں بند کر دیں راشدی صاحب! کسی بھی وقت یہاں کوئی سینئر افسر آسکتا ہے۔"

راشدی صاحب ہاتھ جھٹکتے ہوئے اٹھ بیٹھے۔

"ٹھیک ہے! اسے حوالات میں بند کر دو۔" یہ کہہ کر وہ فوراً ہی باہر نکل گئے۔ جیسے ہی وہ برآمدے میں پہنچے درّانی نے مجھے ٹٹخارتے ہوئے کہا۔

"اٹھ جا جوان اب! اب تو ہماری باری آئی ہے۔ بہت لوگ تیرے ہاتھوں تباہ ہوئے۔ اٹھ جا اب!" یہ کہہ کر اس نے بڑے ہی منتقمانہ انداز سے میری پسلیوں میں پاؤں کی ایک ٹھوکر لگائی۔

میں اپنی جگہ سے اٹھ تو گیا مگر میری آنکھوں میں شاید اس نے ایک سفّاک روشنی کا مفہوم پڑھ لیا تھا۔ اس کو دیکھتے ہی اس نے بڑے ہی غضب ناک طریقے سے الٹے ہاتھ کا ایک جھانپڑ میرے منہ پر دے مارا۔

"کتّے کے بچّے! تیری تُو ٹُھن ابھی تک مری نہیں ہے۔ میں تجھے فرش کردوں گا۔ ہماری باری تو آج ہی آئی ہے۔" اس کا ہاتھ کچھ اتنا بھاری تھا کہ میں الٹ کر رہ گیا۔ جب میں دوبارہ اٹھا تو وہ ایک اور وار کرنے کا ارادہ کر رہا تھا۔

"تمہیں اس کی بڑی قیمت دینی پڑے گی درّانی! میرا نام غلام جیلانی ہے بیٹے! تیرا نام بھی میں نے اپنی فہرست میں لکھ لیا ہے۔ چل اب! کس کے پاس لے جانا چاہتا ہے، چل!" میں نے اس کے سامنے تن کر کہا۔ میرے وجود سے اس گھڑی شعلے سے نکل دکھائی دیتے تھے۔ اس کے اہانت آمیز رویے نے میرے بدن کو آگ دکھا دی تھی۔ سپاہی سب کے سب مسلح تھے اور مجھے معلوم تھا کہ ایک ہی لحظے میں مجھے چار دیواری کے اندر ہی ختم کر سکتے تھے۔ درّانی میری آنکھوں میں ابھرتے اس سفّاک جذبے

دیکھ چکا تھا جو کسی بھی طرح سمجھنے میں نہیں آتا تھا۔ میں دروازے کی طرف نکلا تو وہ بولا۔ "اس کو نرغے میں لے کر چلو۔ یہ ذرا بھی حرکت کرے تو اسے گولی مار دو۔" خود بھی اس نے پستول نکال لیا تھا۔ ہم برآمدے میں نکلے تو سپاہیوں نے میرے گرد اپنا حلقہ تنگ کر لیا۔ تھانے میں موجود تمام لوگ اب بھی مجھے بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔ وہ لوگ مجھے اسی طرح اپنے حلقے میں لے کر حوالات تک جا پہنچے۔

درّانی عقب میں چل رہا تھا، بولا۔ "ادھر نہیں! اس کو تین نمبر کمرے میں لے چلو۔ ولی احمد اس کا انتظار کر رہا ہے۔"

سپاہی مجھے گھما کر دائیں طرف کے ایک کمرے میں لے گئے۔ میرے سامنے اب برآمدے کے عقب میں دو ہیڈ کانسٹیبل بیٹھے تھے۔ ان کے کمرے سے گزر کر ہم آگے بڑھے تو وہاں سپاہی بستر بچھا کر اُن پر لیٹے تھے۔ دو ایک ان میں سے ایسے تھے جو ابھی تک سو نہیں سکے تھے۔ ان کے قریب سے نکل کر ہم عقبی کمرے میں جا پہنچے۔ ولی احمد اور دو سپاہی وہاں ایک میز کے گرد بیٹھے تھے۔

ہم اندر پہنچے تو ولی احمد بولا۔ "بس اب ٹھیک ہے درّانی صاحب! آپ جائیں، میں خود اس سے نپٹ لوں گا۔ اس کو سامنے بٹھادیں۔" درّانی نے پھر مجھے دھکا دیتے ہوئے سامنے کی دیوار تک پہنچا دیا۔ میرے ہاتھوں میں جو ہتھکڑی لگی تھی۔ وہ مجھ تک ہی محدود تھی۔ کوئی سپاہی اس کے ساتھ نہیں بندھا تھا۔ میں دیوار تک پہنچا تو ولی احمد بولا۔ "بیٹھ جاؤ۔ تمہارا ناشتہ ابھی تیار ہو رہا ہے۔ آپ جائیں درّانی صاحب، میں صبح آپ سے بات کروں گا۔"

"اس پر بہت سوچ سمجھ کر ہاتھ اٹھانا۔ میڈیکل رپورٹ میں ضربیں نظر نہیں آنی چاہییں۔" یہ بات اس نے ولی احمد کی طرف جھک کر سرگوشی میں کہی۔ مگر کمرے میں مکمل سنّاٹا طاری تھا۔ آواز میں نے بھی سن لی تھی۔ ولی احمد سر ہلا کر رہ گیا۔ درّانی نے مجھ پر آخری نظر ڈالی اور پھر چپ چاپ باہر نکل گیا۔ اب کمرے میں ہم چار آدمی تنہا رہ گئے تھے۔ عین اس وقت بائیں ہاتھ کا دروازہ کھلا اور اس میں سے دو سپاہی ایک تنومند جوان کو لے کر باہر آگئے۔ اس کے دونوں ہاتھ کمر پہ بندھے تھے۔ بال اس کے بُری طرح الجھے ہوئے تھے اور نیند اس کی آنکھوں سے ابل رہی تھی۔ جسم پر صرف ایک تہہ بند اس نے باندھ رکھا تھا۔ سپاہی اسے دھکیل کر میز کے سامنے لے گئے۔ وہ دہشت زدہ سا ہو کر گرد و پیش سے بے نیاز سر جھکائے ان کے سامنے جا ٹھہرا۔

"کیوں بھئی کوُبے! کیا خیال ہے تیرا۔ صرف ایک ہی کار چرائی تھی تو نے؟" ولی احمد نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"جی سرکار! وہ میری غلطی تھی زناب! مجھ کو معافی دے دیں۔ کھونڈے کے کہنے پر میں نے اس میں چابی چلائی تھی۔"

"اور کھونڈا تو ہمارے ہاتھ نہیں آیا اور تیری صفائی ہم اب تک نہیں کر سکے۔ ذرا سیدھا کرو اسے۔" ولی احمد نے دو سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ ان دونوں نے کرسی سے اٹھتے ہی کوُبے کو دونوں ٹانگوں سے پکڑ کر ایک دم سیدھا لٹا دیا۔ چادر اس کی کمر پر سے آپ ہی آپ اُتر گئی۔ اس کو ان لوگوں نے الگ پھینک دیا۔ سپاہیوں نے اس کی دونوں ٹانگیں اپنی اپنی طرف کھینچ کر اس کو بالکل اردو کا آٹھ بنا دیا۔ بازو تو اس کے کمر پہ بندھے ہی ہوئے تھے اور وہ الٹا لیٹا ہوا تھا۔ ان لوگوں نے اس کی ٹانگیں کھینچ کر اس کے ٹخنوں کے درمیان ایک اڈّا پھنسا دیا۔ اب کوُبا اپنی ٹانگوں کو حرکت نہیں دے سکتا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح سر پٹخنے لگا۔ دونوں ہاتھ اس نے بار بار درد سے دہل کر کمر پہ ملے، جیسے اس کی جان نکل رہی ہو۔ اس کا سارا بدن پسینے میں نہا گیا تھا۔

"کیوں بچّے! اب بتا، باؤ نصیر کی وہ پہلی کار تھی جو تم نے چرائی کہ کچھ اور بھی کیا؟"

"میں بتاتا ہوں زناب! میں ابھی بتاتا ہوں۔ اوہ میں مر گیا چوہدری جی! میں مر گیا۔" کوُبے نے چیختے ہوئے کہا۔

"ابھی کہاں مرا ہے تو! یہ اڈّا ہٹا دو۔" ولی احمد نے کرسی پر بیٹھ کر سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ تمام دروازے اندر سے بند کر دیے گئے تھے۔ پھر بھی مجھے یقین تھا کہ اس کی آواز دُور دُور تک سنائی دیتی ہو گی مگر کوئی آدمی اس کی مدد کو نہیں پہنچا۔

جیسے ہی وہ اڈّا ان لوگوں نے اس کی دونوں ٹخنوں کے درمیان سے ہٹایا۔ اس نے درد سے نڈھال ہو کر اٹھنے کی کوشش کی مگر اس کی ٹانگیں کوشش کے باوجود اکٹھی نہ ہو سکیں۔ وہ پلٹ کر سیدھا ہوا تو اس کے بازو کمر کے نیچے دب گئے۔ ان کو بچانے کے لیے وہ بڑی مشکلوں سے اٹھا تو اس نے اٹھتے وقت ایک دم اپنے بازو کمر کے نیچے سے یوں کھینچ کر آگے کر لیے، جیسے وہ کوئی بہت بڑا بازی گر ہو۔ بانہوں کے حلقے میں سے اس کا بدن گزرا تو ولی احمد نے اسے زبردست گالی دیتے ہوئے کہا۔

"اوئے بندر کی اولاد! یہ کیا چکّر ہے؟ اس کو پکڑ دوبے۔"

سپاہی پہلے ہی مستعد تھے۔ ان لوگوں نے اس کو بالوں سے اور اس کی دونوں ٹانگوں سے پکڑ کر الٹا لٹکا لیا۔ چھت پر ایک کُنڈا لٹک رہا تھا اور اس میں ایک رسّہ جھول رہا تھا۔ ٹانگیں اوپر کر کے ان لوگوں نے رسّے کے ساتھ کوُبے کے پاؤں باندھ دیے۔ اف میرے خدایا! میں اس منظر کو ابھی تک نہیں بھول سکا ہوں۔ اس کے بندھے ہوئے ہاتھ لٹک کر سر کے نیچے جا پہنچے۔ اس کے منہ سے

کف بہنے لگا۔ رسّے سے باندھتے ہی سپاہیوں نے اس کو لٹو کی طرح گھما دیا اور کوبا اس رقصِ ابلیس کا حصّہ بن کر رہ گیا جس سے وہ سپاہی اور ولی احمد اس وقت تک حظ اٹھاتے رہے۔ جب تک وہ چکّر ختم نہیں ہوگیا۔ کوبا پہلے بائیں ہاتھ گھوما۔ جب رسّے کو اچھی طرح بَل چڑھ گیا تو پھر وہ دائیں ہاتھ گھومنے لگا۔ اذیّت کے کئی منظر میں پہلے بھی ان تھانوں میں دیکھ چکا تھا مگر ولی احمد کا طریقِ کار بالکل ہی جداگانہ تھا اور انسانوں کو یوں سُولی پر چڑھا کر وہ بے حد خوش ہوتا تھا۔ جب کوبا اس رقص کو مکمل کر چکا تو ولی احمد بید لے کر اس کے پاس جا ٹھہرا اور اسے روکتے ہوئے بولا۔

"ہاں بچّے! اب بتا، کیا وہ پہلی کار تھی؟"

"ج... ج... جی... ہاں چوہدری صاحب! میں سچ کہتا ہوں۔ وہ بھی میں نے کھُونٹے کے کہنے پر چرائی تھی۔ میرا اس میں کوئی... ح... ح... حصّہ نہیں تھا۔" اس کو شاید الٹی آنے لگی تھی۔

"ہاں! تو اس طرح سیدھا نہیں ہوگا۔" یہ کہہ کر اس نے بید کو لہرا کر فضا میں اُچھالا اور پھر تڑاخ پڑاخ کئی ضربیں اس نے کوبے کی کمر پر دے ماریں۔ وہ ضربیں اس کی کمر پر ہی نہیں بلکہ اس کے پیٹ اور کولھوں پر بھی لگیں۔ کئی جگہوں سے اس کا خون بہنے لگا تو ولی احمد نے ہاتھ روک لیا۔

"ہاں برخوردار! اب بتا، کیا وہ تیری پہلی واردات تھی؟"

مگر کوبا جواب دینے کے قابل کہاں رہ گیا تھا۔ اس کی زبان باہر نکل آئی تھی اور آنکھیں درد کی شدت سے ابلتی نظر آتی تھیں۔ اس نے جب کوئی جواب نہیں دیا تو ولی احمد نے کہا۔

"اس کو اتار کر پانی پلاؤ اور دوسرے کمرے میں لے جاؤ۔ ذرا ہوش میں آئے تو اسے پھر میرے پاس لے آؤ۔"

سپاہیوں نے اسے رسّے پر سے اتارا اور کھینچ کر پہلو کے کمرے میں لے گئے۔ ولی احمد نے دوسرا سگریٹ سلگا لیا۔ بڑا بہت ہی عمدہ قسم کے سگریٹ پی رہا تھا جس کے کئی پیکٹ میز پر دھرے تھے اور سپاہی بھی اس میں سے اپنا حصّہ برابر لے رہے تھے۔

"اب تو اِدھر آ اوئے! کیا نام ہے تیرا... گلام یلانی! اِدھر آ، دیکھتا ہوں تجھے کتنی ٹمیج ہے۔" اس نے مجھے انگلی کے اشارے سے بلاتے ہوئے کہا۔

اس کا اندازِ تخاطب ہی مجھے اس قدر توہین آمیز معلوم ہوا کہ میرا دل چاہا کہ میں اسے سموچا نگل جاؤں۔ وہ ایسا ہی خبیث آدمی تھا کہ اس کے وجود سے زمین بھی سخت متنفر ہوگی۔ مگر میری تقدیر مجھے اس کے اشاروں پر نچانے لگی تھی۔ میں بے بس ہو کر اپنی جگہ سے اٹھا اور پتلون کو دونوں بندھے ہاتھوں سے اوپر اٹھاتے ہوئے میں اس کے سامنے جا ٹھہرا۔ میری آنکھوں میں ایک بار پھر بڑی ہی سفاک اور دہشت ناک چمک ابھر آئی تھی جس کا نظارہ وہ کر چکا تھا اور اسی سے خوف زدہ ہو کر مجھے وہ اس وقت ولی احمد کے سپرد کر گیا تھا۔

"ہاں! اب بتا وہ عورتیں کہاں ہیں جنہیں تو ہوٹل سے اٹھا لایا تھا؟"

"مجھ سے بہت تمیز سے بات کرو ولی احمد! میرے ساتھ تم نے کوئی غلط حرکت کی تو صبح ہونے سے پہلے پہلے تو نوکری سے ڈسمس ہو جائے گا۔ تو مجھے نہیں جانتا ہے۔"

"کیا؟ کیا مطلب ہے تیرا؟ تو مجھے دھمکی دے رہا ہے کتّے کے پُتّر! چوہدری ولی احمد کو دھمکا رہا ہے تو۔" وہ گرجتا ہوا کرسی سے اٹھ بیٹھا۔ سگریٹ اس نے پاؤں تلے رکھ کر مسل دیا اور یوں تن کر میرے سامنے آ ٹھہرا جیسے وہ قیمہ پُرزے کر دے گا۔ "تیری یہ مجال بدمعاش!" یہ کہہ کر اس نے مجھے گریبان سے پکڑنا چاہا مگر میں بہت زیادہ تپ چکا تھا۔ جیسے ہی اس نے میرا گریبان پکڑا، میں نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر پوری قوت سے اس کے سر میں ضرب لگائی اور اس کے ساتھ ہی میں نے دوسرے ہی لمحے اس کی گردن پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کی رگ احساس مسلی گئی تو وہ یوں بے سُدھ ہو کر زمین پر گرنے لگا جیسے اس کو مرے ہوئے کئی دن گزر چکے ہوں۔ مگر میں نے اسے نیچے نہیں گرنے دیا ـــــ میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کی پتلون کی پیٹی کو گرفت میں لے کر اس کو اپنے سامنے کھڑا کیا۔ دونوں سپاہی ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ بالکل نہتّے تھے۔ ایک صرف ڈنڈے ہی ان کے پاس تھے۔ دوسرے ہی لمحے میں نے ولی احمد کا پستول اس کی پیٹی سے نکال کر اُن پر تان لیا۔

"تم نے اگر کوئی حرکت کی تو زندہ نہ بچ سکو گے۔ یہ ہتھکڑی کھولو۔ ابھی اور اسی وقت۔"

وہ دونوں حیرت زدہ ہو کر مجھے یوں دیکھنے لگے جیسے میں کوئی بھُوت ہوں۔ انہیں یقین نہیں آتا تھا کہ کوئی مجرم یوں تھانے میں آ کر اس قدر اکڑ پھُوں دکھانے کے بعد ایسا کارنامہ بھی سر انجام دے سکتا ہے۔ ولی احمد میرے ایک ہاتھ میں جھول رہا تھا اور میں اس کو خود سے الگ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"یہ دروازہ کھولو! سنا نہیں تم نے۔" میری آواز کا تحکم اُن کے معدے میں اترا تو ان میں سے ایک سپاہی فوراً ہی دروازے تک جا پہنچا۔ جس سے وہ کوبے کو لے کر اگلے کمرے میں جا پہنچے تھے مگر وہ دروازہ دوسری طرف سے بند تھا۔ سپاہی کی سی دستک کے بعد وہ فوراً کھُل گیا۔ دوسرے سپاہی کو اس عرصے میں میں نے پستول کی زد پر رکھ لیا تھا۔ سامنے بھی ایک

مُڑا تھا۔

"اوئے کیا ہوا تجھے! تیرا تو رنگ فق ہو رہا ہے۔" میں نے سپاہی سے فوراً ہی پوچھا۔ پھر اس کی نگاہ ہم پر جا پہنچی۔ ولی احمد ابھی تک میری ڈھال بنا ہوا تھا اور دوسرا سپاہی میرے پستول کی زد میں تھا مگر مجھ سے ہاتھ پورے نہیں کھلتے تھے اور میری چابی خدا معلوم کس کے پاس تھی۔ اس کمرے کے منظر پر یقین نہیں آیا مگر جب اس نے مجھے ولی احمد کی گردن کے اوپر سے دوسرے کمرے میں جھانکتے دیکھا تو وہ اس قدر وحشت زدہ ہو کر پیچھے بھاگا کہ اس کا پاؤں الٹ گیا اور وہ سر کے بل نیچے گر گیا۔ میں نے سپاہی کو آگے چلنے کا اشارہ کیا اور پھر ولی احمد کو اسی طرح ہاتھوں کی سُولی پر لٹکا کر میں اگلے کمرے میں جا گھسا۔ وہاں کوبا موجود تھا اور ایک سپاہی اس کے دل کی مالش کر رہا تھا مگر کوبا وہاں ہونے کے باوجود وہاں نہیں تھا۔ اس کی موت واقع ہو چکی تھی اور وہ دونوں اَن پڑھ ڈاکٹروں کی طرح اپنی سمجھ کے مطابق اس کو زندگی کی طرف واپس لانے میں مصروف تھے۔

دوسرے سپاہی نے جب ہم تینوں کو عجیب و غریب حالت میں اپنے سامنے دیکھا تو وہ کوبے کو وہیں چھوڑ کر ایک دم اٹھ بیٹھا، بولا "یہ... یہ کیا ہوا ہے چوہدری صاب کو؟ کیا کر دیا ہے تم نے...؟"

"لو سنبھالو اس کو، اور چابی اِدھر لاؤ!"

وہ آدمی وہی تھا جس نے میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی لگائی تھی۔ "چابی تو درّانی صاحب کے پاس ہے۔"

"ٹھیک ہے کوئی اور چابی آزماؤ۔" میں نے ولی احمد اور اس سپاہی کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ مگر ان کے پاس تو میری ہتھکڑی کھولنے کا کوئی سامان نہیں تھا اور مجھے دیر ہو لی جا رہی تھی۔ کوئی بھی سپاہی اور افسر اندر آ سکتا تھا۔ عقبی کمرے میں سے دوسری طرف نکلنے کا کوئی دروازہ مجھے نظر نہ آتا تھا۔ وہ ہر طرف سے مکمل طور پر بند کمرہ تھا۔ اب صرف اسی دروازے سے ہم باہر نکل سکتے تھے جس میں سے ہم داخل ہوئے تھے۔ میں نے سامنے کے سپاہی کو پستول کی زد میں لیتے ہوئے اپنا دوسرا ہاتھ آگے بڑھایا تو ولی احمد زمین پر جا گرا۔ میرا ہاتھ اس سپاہی کی گردن تک جا پہنچا تو میں نے اس کی بھی رگِ احساس مسل دی۔ وہ جھوم کر لہرا کر نیچے گرا تو اب دوسرا سپاہی میرے پستول کی زد میں آ گیا تھا۔ "اِدھر آ اوئے! تم نے کوبے کو جان سے مار دیا ہے؟ کیا قصور تھا اس کا؟" میں نے اس پر پستول لہراتے ہوئے کہا۔

جان کے خوف سے وہ تھر تھر کانپنے لگا تھا۔ شکل اس کی ابلیس ایسی تھی اور وہ کوبے کو جان سے مار چکا تھا!

ان لوگوں نے اس کو رسّے سے باندھ کر چکر ہی نہیں دیا تھا۔ بلکہ اس کمرے میں پہنچا کر بھی اس پر ستم توڑتے رہے تھے۔ کوبے کا جسم کئی جگہوں سے زخمی تھا اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ اُن لوگوں نے اس کو کیسی کیسی اذیتیں پہنچائی ہیں۔ وہ سپاہی دہشت زدہ ہو کر میرے قریب آیا تو اپنے دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر میں نے اس کی گردن پکڑ لی، اس طرح کہ ولی احمد کا پستول اس کی شاہ رگ سے جا لگا۔ وہ سمجھا میں اس کی جان لینا چاہتا ہوں۔ پاگلوں کی طرح وہ اچھل کر پیچھے ہٹا تو میں نے ایک بار پھر لپک کر آگے بڑھ کر پکڑ لیا۔ اب وہ دیوار کے ساتھ جا لگا تھا۔ مجھ سے دور رہنے کے لیے اس نے بڑے زوردار طریقے سے اپنے ہاتھ چلائے، اس کا گھونسہ میری پسلی میں لگا۔ دوسرے ہاتھ سے وہ بڑی چابک دستی سے میری ناف کو مٹھی میں لینے لگا مگر میں نے اس کو اسی کوشش کے دوران گردن سے پکڑ کر مسل دیا۔ وہ وہیں جھول کر دیوار کے ساتھ اوندھے منہ لیٹ گیا۔ ناف پر اس نے جس طرح ہاتھ ڈالا تھا۔ اس سے میں یہی محسوس کر رہا تھا کہ اسے اگر موقع مل جاتا تو وہ مجھے ذلیل کر دیتا۔

وہ فرش ہوا تو میں نے صورتِ حال کا پھر سے بغور جائزہ لیا۔ وہ کمرہ ایسا نہیں تھا کہ میں اس میں سے باہر نکل سکتا۔ ایک صرف اس کی جنوبی دیوار میں چھوٹا سا آہنی روشن دان تھا جس میں سے گزر جانا کسی بھی طرح میرے بس میں نہیں تھا۔ دوسری صورت یہ تھی کہ میں ولی احمد کا لباس خود پہن کر وہاں سے فرار ہو جاتا مگر ابھی میں اس بات پر غور کر ہی رہا تھا کہ تھانے کی بتیاں ایک دم بجھ گئیں سب کمروں میں اندھیرا چھا گیا۔ روشنیاں واپڈا کے سیاپے میں لگ گئی تھیں اور یہ وہاں سے فرار ہونے کا میرے لیے بہت اچھا موقع تھا۔ میں تیزی سے پہلے کمرے میں آیا مگر جیسے ہی میں اس میں سے نکلنے کے لیے دروازے کی طرف بڑھا تو بتیاں پھر سے روشن ہو گئیں ان کی نیند پھر سے اچاٹ ہو گئی تھی۔ میں پلٹ کر عقبی کمرے میں جانے کے لیے مڑا تو عین اس وقت درّانی اندر آ گیا۔ کوئی آدمی اس کے ساتھ آ رہا تھا۔ وہ عمدہ قسم کا سلیٹی رنگ کا سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ شکل و صورت سے وہ مجھے کوئی اعلیٰ سرکاری افسر نظر آتا تھا۔ اس وقت میں میز کے پاس جا ٹھہرا تھا اور پستول میں نے ولی احمد کی دراز میں رکھ دیا تھا۔ وہ دونوں میرے عقب میں چلے آ رہے تھے اور انہی کو دیکھ کر میں نے پستول کو میز کے خانے میں ڈال دیا تھا۔ "جناب! اسی آدمی کا نام غلام جیلانی ہے۔" درّانی نے بڑے مؤدب لہجے میں کہا۔

"اوہ! سو نائس آف یُو! اچھا کیا آپ نے مجھے اس سے ملا دیا۔ کیا حال ہیں آپ کے مسٹر جیلانی؟"

مَیں نے پلٹ کر ان کی طرف دیکھا۔ "جی! آپ کی مہربانی ہے ۔۔۔ یہ..... یہ کون صاحب ہیں مسٹر درّانی ؟"

"یہ..... یہ ستناجا صاحب ہیں! عزیز احمد ستناجا صاحب۔ آپ سے ملنے کے مشتاق تھے۔" درّانی صاحب نے پہلی بار مجھے آپ کے لفظ سے نوازتے ہوئے کہا۔

ستناجا صاحب میری ہتھکڑی پر غور کرتے ہوئے بولے۔ "میرا خیال ہے آپ ان کی ہتھکڑی کھول دیں۔"

"جی ٹھیک ہے! ابھی لیں۔ گولی کس کی اور گہنے کس کے؟" یہ کہہ کر اس نے جیب سے چابی نکال کر میری زنجیر کھول دی اور اسے میز کی دراز میں رکھنے لگا مگر وہاں اُسے ولی احمد کا پستول نظر آ گیا۔ کچھ سوچتے ہوئے اس نے کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی اور بولا۔ "وہ..... وہ ولی احمد کہاں ہیں؟"

"وہ شاید اگلے کمرے میں ہیں۔ اس عفریت خانے میں!"

میری یہ بات سُنتے ہی وہ تیزی سے اگلے کمرے میں جا گھسا مگر جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا، کمرے میں تاخت و تاراج منظر دیکھ کر وہیں کھڑا رہ گیا۔ اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا، پلٹ کر بولا۔ "یہ..... یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟"

"کیوں؟ کیا ہوا ہے وہاں؟" میں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔

"یہ سب تو شاید مر چکے ہیں۔" اس وقت تک وہ کمرے کے اندر جا کر ولی احمد کی نبضیں ٹٹولنے لگا تھا۔ "یہ..... یہ تو بے ہوش ہیں اور..... ان کو کیا ہوا ہے؟" اس نے تینوں سپاہیوں کی نبض ٹٹولتے ہوئے کہا۔ اس کا ایک جی دار انسپکٹر اور تین بڑے ہی سفّاک سپاہی اندر بے ہوش پڑے تھے اور اس کی سمجھ میں یہ بات کبھی نہیں آ سکتی کہ ان کو کس بیماری نے یوں لپیٹ کر پھینک دیا تھا۔ ان کو دیکھ لینے کے بعد وہ کوُبے کی طرف بڑھا۔

"میرا خیال ہے کہ یہ بیچارا مر چکا ہے اور کل اخبار میں یہ خبر چھپے گی کہ اس نے چھت پر سے نیچے چھلانگ لگا دی تھی۔"

درّانی، کوُبے تک جا پہنچا۔ مگر وہ تو وہاں تھا ہی نہیں۔ اس پر تو موت وارد ہوئے عرصہ گزر چکا تھا۔ کسی سِٹلے آدمی کی طرح وہ نہایت ہی بے ہودہ اور مکروہ موت مرا تھا۔ اسے شاید جینا بھی نہیں آتا تھا۔ وہ پہلی ہی واردات کے بعد پکڑا گیا تھا اور پولیس نے پہلے ہی جھٹکے میں اسے عادی مجرم سمجھتے ہوئے جان سے گزار دیا تھا۔ اس کی لاش دیکھ کر درّانی پریشان ہو گیا۔ اس کی نبضیں تو کب کی چھوٹ چکی تھیں۔ زندگی کے سارے ہی نشان اس کے وجود سے مِٹ چکے تھے۔

درّانی کوُبے سے مایوس ہو کر اٹھا اور بڑے غصّے سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "کیا میں سمجھوں کہ یہ تمہاری ایک واردات ہے اور وہ بھی تھانے کے اندر؟" اس کا لہجہ پہلے کی طرح سفّاک اور بے رحم ہو گیا تھا اور اسے ستناجا کی موجودگی کا بھی احساس نہیں رہا تھا۔

"آپ کو میرے بارے میں ایسی زبردست خوش فہمی ہے، کے لیے مَیں آپ کا شکر گزار ہوں درّانی صاحب!"

"یہ مذاق نہیں ہے۔ مجھے بتاؤ کہ انہیں کیا ہوا ہے؟"

"اس آدمی کی لاش آپ سے کچھ نہیں کہتی ہے؟"

"یہ..... یہ ناممکن ہے۔ کوئی پولیس کا آدمی کسی ملزم کو نہیں مار سکتا۔"

"مگر مار مار کر حلال کر سکتا ہے۔ ہے نا یہی بات! ان لوگوں نے کوُبے کو الٹا لٹکا کر اس کی ٹانگوں میں لکڑی کے اڈے پھنسا کر اس پر بے تحاشا تشدد کیا اور اسے مار کر ہلاک کر دیا ہے مگر مرنے سے پہلے کوُبے نے بھی ان کو چھٹی کا دودھ یاد دلا دیا۔"

"یہ سب بکواس ہے۔ ولی احمد جیسا آدمی اس کوُبے کے ہاتھ نہیں آ سکتا۔"

"تو آپ کا خیال ہے، یہ میرے ہاتھوں اس حال کو پہنچے؟ ناممکن ہے۔ مگر ولی احمد اس سے زیادہ سزا کا مستحق تھا۔"

"اگر یہ ستناجا صاحب یہاں نہ ہوتے تو پتہ نہیں میں تمہارا کیا حشر کرتا۔ وہ پستول میز کی دراز میں کس نے رکھا ہے؟ ولی احمد کا پستول؟"

"بالکل اسی کا ہے۔ مگر وہ اسے کوُبے پر استعمال کرنا چاہتا تھا اور اس کی نال اس نے بیچارے کی پیٹھ میں رکھ کر چلا بھی دی تھی۔ کوُبے کا جب طبّی معائنہ ہو گا تو سب پتہ چل جائے گا۔ گولی اس کے وجود میں ہی گم ہو کر رہ گئی تھی۔"

"اِدھر آئیں درّانی صاحب! دوسرے کمرے میں آ جائیں۔" ستناجا صاحب نے اس صورتِ حال سے پریشان ہوتے ہوئے کہا اور اس نے ہم سب کو ساتھ لے کر میز کے گرد بچھی کرسیوں پر جا بٹھایا، بولا۔ "کیا میں یہ سمجھوں کہ پولیس ملزموں کو تھانوں میں لا کر اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاتی ہے؟"

"مجھے افسوس ہے جناب! یہ سب کچھ ہو گیا ہے۔ جب تک یہ ہوش میں نہیں آتے، میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"ہوں! ان کو ہوش میں لائیں۔ میں ان میں سے ہر ایک کا بیان سننا چاہوں گا۔ یہ اندھیر ہے۔ ایسا تو کبھی انگریزوں کے دور میں بھی نہیں ہوا تھا۔"

"مَیں ان کے لیے کچھ کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ کسی ڈاکٹر کو اندر بُلا لیتے ہیں۔"

"ہاں! یہی کریں۔" ستناجا صاحب نے بڑی ہی بے رُخی سے کہا۔ اسے درّانی سے شاید اس گھڑی سخت نفرت ہو چکی تھی۔ جیسے ہی باہر نکلا، ستناجا صاحب نے کرسی میرے قریب کر لی۔ بولے: "میں نے آپ کو آج پہلی بار دیکھا ہے جیلانی صاحب! اندر میں صرف آپ ہی کے لیے آیا ہوں۔ آپ..... آپ کیسے ان کے چکر میں آ گئے ہیں؟"

"میں آپ سے متعارف تو نہیں ہوں مگر مجھے ڈھلّوں صاحب کی تلاش میں یہ دن دیکھنا پڑا ہے۔ وہ مجھے کہیں بھی نہیں مل رہے۔"

"اُن کی تلاش میں تو ہم بھی سخت پریشان ہو چکے ہیں مگر اُن کا کوئی سراغ نہیں مل رہا ہے۔ ان کے دشمن رحمت علی کے بارے میں ہم نے سوچا مگر اُن کے وارث بے گناہ لگتے ہیں۔ پولیس ابھی تک ڈھلّوں صاحب کا سراغ نہیں لگا سکی ہے۔ مگر آپ کی اطلاع کیا ہے۔ بڑے صاحب سخت پریشان ہیں۔"

"میری اطلاع یہ ہے کہ ڈھلّوں صاحب کو اُن کے نئے ملازم بدرالدین عرف بدری نے پہلے تو کار میں گولی مار دینا چاہی مگر جب وہ بچ گئے تو وہ لوگ انہیں ہسپتال لے گئے۔ ہسپتال میں جب وہ صحت یاب ہو رہے تھے۔ تو بدری نے ہسپتال کے ایک آدمی کے ساتھ مل کر انہیں اغوا کر لیا۔ اسی دوران ایک عورت ڈاکٹر عالیہ بھی ہسپتال میں سے ڈھلّوں صاحب کو اغوا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کیونکہ میرے معاملے میں وہ بہت زیادہ آگے بڑھ گئے تھے۔ ڈاکٹر عالیہ کے دو تین آدمی بھی انہوں نے اغوا کروا لیے تھے اور وہ بھی بدری کے ذریعے سے۔ عالیہ نے بدری کو ایک لاکھ روپیہ دیا کہ وہ ڈھلّوں صاحب کو کہیں ٹھکانے لگا دے۔ بدری نے کسی شخص شاستری کے ذریعے ڈھلّوں صاحب کو اب امرتسر میں ملہوترہ کے پاس پہنچا دیا ہے۔ میں ڈاکٹر عالیہ کی تلاش میں ہی تھا کہ مجھے پولیس نے پکڑ لیا۔" میں نے بالتفصیل انہیں وہ سب کچھ بتا دیا جو مجھے معلوم تھا۔ ڈاکٹر عالیہ کے کارنامے بھی میں نے اس کے گوش گزار کر دیے۔

اس کی حیرت دیدنی تھی، بولا۔ "اوہ! تو یہ بات ہے۔ بالآخر ملہوترہ ان کو اغوا کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ مجھے ان حالات کا بالکل علم نہیں تھا، بخدا نہیں تھا۔ میں بڑے صاحب کا خادم آدمی ہوں۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ ڈھلّوں صاحب نے اپنے اس معاملے کا ذکر کسی سے نہیں کیا تھا۔ بہت بُرا ہوا جیلانی صاحب! بہرحال آپ فکر نہ کریں۔ آپ کو میں کوئی دو گھنٹے بعد یہاں سے نکلوا دوں گا۔ پہلے میں بڑے صاحب سے مل کر معلوم کر لوں کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے۔"

"میں آپ کا شکر گزار ہوں ستناجا صاحب! کہ آپ کو میری بہتری کی اس قدر فکر رہتی ہے۔ بخدا! مجھے نہیں معلوم تھا میں تو کسی بھی افسر سے واقف نہیں ہوں!"

"آپ کے لیے یہی بہتر ہے۔ کسی کے سامنے مت جائیں۔ ابھی تو آپ سے ہمیں بہت کام لینا ہے۔ آپ آئیں میرے ساتھ۔ میں ابھی آپ کو ساتھ لے چلتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھے مگر پھر کچھ سوچ کر بولے۔ "ٹھیک ہے آپ ابھی یہیں بیٹھیں۔ میں ان سے خود بات کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اسی وقت کمرے سے باہر نکل گئے۔

ابھی کوئی دس منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ ایک سپاہی ٹرے لیے بہت ہی پُر تکلف چائے لے کر اندر آ گیا۔ ٹرے میں ڈھیر ساری چیزیں رکھی تھیں۔

سپاہی نے اندر آ کر مجھے بڑے ادب سے سلام کیا اور بولا۔ "یہ کھائیں صاحب! راشدی صاحب نے بھیجی ہیں۔"

"یہ تو بڑی مہربانی کی ہے راشدی صاحب نے۔ ان سے ہمارا شکریہ ادا کر دو۔" یہ کہہ کر میں نے ٹرے سامنے رکھ لی۔ سگریٹ تو ابھی تک میز پر دھرے تھے اور ان سے میں برابر استفادہ کر رہا تھا۔ چائے میں ابھی پی ہی رہا تھا کہ درّانی صاحب ایک ڈاکٹر کو لے کر اندر آ گئے۔ میرے سامنے چائے کے برتن دیکھ کر انہیں سخت حیرت ہوئی، بولے۔ "یہ..... یہ چائے تمہیں کس نے بھیجی ہے؟"

"اللہ بڑا کارساز ہے درّانی صاحب! آپ بھی پئیں ابھی تو ڈھیر ساری چائے موجود ہے۔" مگر وہ میری بات سُنی اَن سُنی کر کے ڈاکٹر کے ساتھ اگلے کمرے میں جا گھسے۔ کچھ ہی دیر بعد درّانی کے کہنے پر کمرے میں کچھ سپاہی بھی چلے گئے۔ وہ اپنے ساتھ چارپائیاں بھی لے گئے تھے۔ بے ہوش سپاہیوں کو لے کر وہ اسی وقت میرے کمرے سے گزرتے ہوئے آگے نکل گئے۔ آخر میں کوُبے کی لاش اٹھی اور یوں اٹھی کہ اس کی موت پر رونے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ مگر پولیس کو سانپ سونگھ گیا۔ کوُبے کی لاش نے وہاں افراتفری مچا دی۔ میرے کمرے میں تو کوئی نہیں آیا مگر ان کی دوسرے کمروں میں نقل و حرکت سے صاف ظاہر تھا کہ وہ بہت زیادہ پریشان ہیں۔

کوئی آدھ گھنٹہ اسی طرح گزر گیا۔ میں میز کے گرد بیٹھا مسلسل سگریٹ پھونکتا رہا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ کیوں اور کیسے وقوع پذیر ہو رہا ہے؟ ستناجا صاحب کی اصلیت مجھ پر ابھی تک واضح نہیں ہو سکی تھی مگر وہ رازہائے درونِ پردہ سے پوری طرح واقف تھے۔ لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ اتنے سارے وسائل کے باوجود وہ ابھی تک ڈھلّوں صاحب کی گمشدگی کے راز پر سے پردہ نہ اٹھا سکے تھے۔ ہاں ایک بات بالکل عیاں تھی۔ وہ بدری کے ذکر پر بُری طرح چونک اٹھے تھے

اور مجھے یقین تھا کہ اُسے ایک قدم آگے نہیں بڑھنے دیں گے۔ جو کچھ وہ کر چکا تھا۔ وہی اس کے لیے بہت کافی تھا اور میں نے اس کا ذکر کر کے اپنے دل سے بہت بڑا بوجھ اتار لیا تھا۔ مجھے پہلے ہی یہ عمل کر لینا چاہیے تھا۔ پولیس کو بدی کے بارے میں فون پر ایک معمولی سی اطلاع دے دینا ہی بہت کافی ہوتا۔ وہ اسے ہر حال میں چوگوٹھ جا کر پکڑ لیتے اور اس سے سارا راز وہ بہت آسانی سے اگلوا سکتے تھے۔ مگر مجھے اس کی سمجھ ہی نہیں آئی۔ نہ اس کا موقع ہی مل سکا اور خواہ مخواہ اتنا وقت بیچ میں ضائع ہو گیا۔ کوئی کہے جیلانی تجھے کوئی ایسا سجن جل کہاں سے لا کر دے گا جس میں تُو اپنا صحیح عکس دیکھ سکے۔ بہت غصہ آ رہا تھا مجھے اپنے اوپر! میری بے تدبیریاں ہی مجھے لے ڈوبی تھیں۔ ورنہ یوں اندھا دھند پولیس کے جال میں جا پھنسنا میرے لیے کیسے ممکن تھا۔ مگر میں نے کہا ہے نا کہ میری بچارہ تقدیر مجھے بار بار لہو رُلاتی تھی اور غصہ مجھے آپی پر بھی بہت آتا تھا۔ اس سالے نے تو مجھے تباہ ہی کر دیا تھا۔ اسے بھی میں گم شدوں ہی کی فہرست میں داخل سمجھتا تھا۔ وہ میرے لیے ماضی کا زخم بن چکا تھا۔ جب وہ مجھ سے الگ ہوا تو مجھے یوں لگا۔ جیسے وہ میرے ہاتھ پر اُگی چھٹی انگلی تھا۔ کٹنے میں بڑی تکلیف دی تھی اس نے، مگر اب مجھے بہت سکون مل رہا تھا۔ وہ میرے ساتھ ہوتا تو پتہ نہیں صورتِ حال کیا سے کیا ہو جاتی۔ اچھا ہی ہوا، وہ مجھ سے الگ ہو گیا۔ میرے لیے وہ جتنی بھی مصیبتیں جھیلتا تھا۔ اتنا ہی میں اس سے شرمندہ بھی ہوتا تھا۔ وہ مجھے برابر زیر بار کرنے لگا تھا۔ ہر قدم پر وہ مجھ پر احسان دھرتا تھا۔ کبھی میری کم عقلی کا ماتم کرتا تھا اور کبھی میری تقدیر کو کوستا تھا۔ دونوں ہی باتیں سچ تھیں مگر جب اُن میں کوئی شریک ہو جائے اور اس کی اپنی بھی قسمت ٹھیکرا بن جائے تو پھر کوئی مجھے الزام کیوں نہ دے۔ آپی کا بھی یہی حال تھا۔ اپنی منگیتر سے الگ رہنے کا طعنہ بھی وہ مجھے ہی دیتا تھا۔ عورت کی محبت کا وہ جس قدر دیوانہ تھا اور میں جس طرح اس کو روکتا تھا۔ وہ سارا سلسلہ بھی اسے بے حد کھٹکتا تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ بہاڑا ایسی اونچی رقم کا مالک بن جانے کے باوجود اس سے میری وجہ سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ یہ سب چیزیں مل کر اسے پاگل کر رہی تھیں۔ میں نے اس کے نتھنوں سے تیر نکال لیا تھا تو اچھا ہی کیا تھا۔ اسے میں کہاں لیے پھرتا۔ وہ ایسے دھکے کھانے کے لیے تو بنا ہی نہیں تھا۔ اُسے عیش کی ضرورت تھی۔ آرام کے لیے وہ مرا جاتا تھا۔ وہ میں نے اُسے مہیا کر دیا۔ اس کی واپسی کی اب مجھے کوئی امید نہیں تھی اور یہ ایک لحاظ سے اچھا بھی تھا۔ میں تنہا اس گوہار میں زیادہ اچھی طرح لڑ سکتا تھا۔ وہ ایک اور ایک گیارہ مجھے نہیں بناتا تھا بلکہ میری کمزوری بن چکا تھا۔

آدھ گھنٹہ گزر گیا تو ستناجا صاحب تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اندر آ گئے، بولے "مجھے افسوس ہے بڑے صاحب آپ کی فوری رہائی پر راضی نہیں ہوئے، ورنہ میں ابھی آپ کو لے جاتا۔"

"کیا مطلب؟ یہ..... یہ لوگ تو سیدھا مجھے تختۂ دار پر لے جائیں گے۔ ذرا سوچیں تو ستناجا صاحب!"

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا جیلانی صاحب! بہرحال آپ بے فکر رہیں۔ آپ کو کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس بات کی ضمانت میں دیتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ کچھ معاملات ایسے ہیں جن کی وضاحت سے پہلے آپ کی رہائی ممکن نہیں ہو گی۔ لیں وہ راشدی صاحب بھی آ گئے۔ ان سے بات کر لیں۔"

"آئی ایم ساری جیلانی صاحب! مجھے امید ہے ستناجا صاحب نے آپ کو سب کچھ بتا دیا ہو گا۔ آپ ابھی کچھ دن تک ہمارے مہمان رہیں گے۔" راشدی صاحب نے کہا۔

"میں حاضر ہوں راشدی صاحب! مگر یہ سلسلہ میری سمجھ میں نہیں آیا ہے۔"

"آ جائے گا۔ یہ کچھ ایسی مشکل بات نہیں ہے۔ یہی کوئی ایک ہفتہ تک آپ کو یہاں مزید رہنا ہو گا۔ مگر آپ نے ولی احمد صاحب کا کیا کر دیا تھا۔ وہ تو سخت پریشان ہے۔"

"اسے ہوش آ گیا ہے؟"

"ہاں! اب تو وہ بالکل ٹھیک ہے مگر یہ بتائیں کہ آپ کے پاس کوئی زہر ہے کیا؟"

"جی نہیں! وہ دراصل ایک مظلوم کو مارتے مارتے خود بے ہوش ہو گیا تھا۔ کوڑے کی آہ اُسے لے ڈوبی۔"

"بہرحال! جو کچھ ہو گیا ہے اس پر مٹی ڈالیں۔ آپ ابھی ستناجا صاحب کے کہنے کے مطابق چند دن اور ہمارے پاس رہیں گے۔ آپ کی گرفتاری کی خبر ہم نے راز میں رکھی ہے۔ کسی کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ ہتھکڑی آپ کو پھر پہننا ہو گی اور حوالات بھی آپ کو سہنا پڑے گی۔"

"یہ سراسر زیادتی ہے۔ مجھے بہت کام ہیں راشدی صاحب! آخر بڑے صاحب نے سوچا کیا ہے؟"

"یہ تو وہی جانتے ہیں! بہرحال آپ مطمئن رہیں۔"

اس نے سپاہیوں کو آواز دی، تو دو آدمی اندر آ گئے۔ ہتھکڑی پکڑ رکھی تھی۔ وہ اس نے راشدی صاحب کے کہنے کے مطابق میرے ہاتھ میں پہنا دی اور پھر وہ لوگ مجھے دوبارہ ملزموں کی عام حوالات میں لے گئے۔ جب وہ مجھے اندر گئے اس وقت تک راشدی صاحب اور ستناجا صاحب بہت

چکے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی باہر نہیں آیا تھا۔ مجھے اتنی ساری تسلیاں دینے کے باوجود وہ میرا ساتھ دینے کے لیے تیار نہیں تھے کسی کے سامنے وہ مجھ سے کوئی بات نہیں کرتے تھے۔ یہ اچھی بات تھی لیکن جس تنہائی نے مجھے آگھیرا تھا۔ اس کا وہ اندازہ ہی نہیں کر سکتے تھے۔

اس تھانے کی حوالات میں مجھے ایک عجیب سی تبدیلی محسوس ہوئی تھی۔ غسل خانہ اُن لوگوں نے حوالات کے کمرے سے الگ بنا دیا تھا جس کا دروازہ حوالات کے اندر ہی کھلتا تھا۔ حوالات میں اس وقت چار آدمی اور بھی موجود تھے اور وہ سب کے سب سوئے ہوئے تھے۔ سپاہی نے مجھے دو کمبل دے دیے اور میں انہیں بچھا کر ایک کونے میں لیٹ گیا۔ بے خوابی نے مجھے نڈھال کر رکھا تھا اور میں کمبل پر لیٹتے ہی گہری نیند میں کھو گیا اور یہ اچھی بات تھی۔

صبح سات بجے میری آنکھ کھلی تو حوالات میں اس وقت صرف دو آدمی موجود تھے۔ دو کو وہ شاید رہا کر چکے تھے۔ دروازے سے چند قدم دور مسلح سپاہی کھڑا تھا۔ حوالات میں موجود میرے دونوں ساتھی جاگ چکے تھے اور متواتر سگریٹ پھونک رہے تھے میں اپنے گرد کمبل لپیٹ کر دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ وہ دونوں آدمی شکل و صورت سے خالص دیہاتی نظر آتے تھے... دونوں جوان تھے عمر ان کی بھی کوئی تیس پینتیس سال ہو گی۔

"تم زیادہ نہیں سو سکے۔ میرا خیال ہے تمہیں وہ ایک بجے یہاں لائے تھے۔" اُن میں سے ایک نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا اور ایک سگریٹ میری طرف پھینک دیا۔ "لو پیو! یہ بھی بس غنیمت ہی سمجھو، ورنہ وہ ان کو بھی چھین لیتا، وہ سنتری!"

میں نے سگریٹ سلگا لیا۔ وہ عمدہ سگریٹ پی رہے تھے اور ان کا لباس یہ بتاتا تھا کہ انہیں روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں ہے۔

"تم کس سلسلے میں اندر آئے ہو؟" میں نے سگریٹ کا گہرا کش لیتے ہوئے کہا۔

"اُن کا خیال ہے کہ ہم ڈاکے مارتے ہیں۔ شک میں پکڑ لائے ہیں، حالانکہ ہم دونوں زمیندار ہیں۔"

"کوئی ثبوت بھی تو ہو گا اُن کے پاس؟"

"کچھ بھی نہیں! عینی گواہ بھی کوئی نہیں اور ڈاکا بھی ہمارے گاؤں سے چھ میل دور پڑا تھا۔"

"کون سا گاؤں ہے تمہارا؟"

"چک بلبن۔ وہ پتوکی کے قریب ہے۔"

پتوکی کا نام سن کر میں اس کی طرف زیادہ متوجہ ہو گیا۔

"پتوکی! ڈاکا کہاں پڑا تھا؟"

"چوگوٹھ میں۔ وہاں ایک ٹھیکیدار رہتا ہے نوازش علی! بڑا مال دار آدمی ہے وہ۔ اس کے گھر ڈاکہ پڑا ہے۔ چور اُن کے ہاں سے پانچ لاکھ روپے لے گئے۔"

"پانچ لاکھ۔ نہیں یار! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اتنی دولت کوئی آج کل گھر میں کہاں رکھتا ہے؟"

"رپورٹ اس نے یہی درج کرائی تھی کہ چور اس کے ہاں سے دو سو تولے سونا اور نقد رقم لے گئے ہیں۔"

"مگر..... میں بھی کئی بار چوگوٹھ جا چکا ہوں۔ مجھ سے تو ڈھلوں صاحب نے کبھی ذکر نہیں کیا کہ وہاں کوئی ایسا مال دار آدمی بھی موجود ہے۔"

"ڈھلوں صاحب؟ تم اُسے کیسے جانتے ہو؟"

"کیا نام ہے تمہارا؟" میں نے اس کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

"میرا نام جوہر علی ہے اور یہ میرا دوست ہے عاشق علی۔ تم نے بتایا نہیں کہ ڈھلوں صاحب کو کیسے جانتے ہو تم؟"

"وہ میرے دوست ہیں۔ اب تو ان سے کوئی دو تین مہینے سے میری ملاقات نہیں ہوئی۔" میں نے اس سے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

"ہوں! کیوں بھئی عاشق! کچھ تمہاری سمجھ میں آتا ہے یہ آدمی کہ نہیں؟ تمہارا کیا نام ہے بھئی! تم تو بہت کام کے آدمی نظر آتے ہو۔" یہ کہہ کر وہ میرے قریب سرک آیا۔ عاشق علی نے بھی پہلو بدلا اور کمبل کو اپنے گرد لپیٹ کر میرے پاس آ بیٹھا۔

"میرا نام ہاشم خان ہے۔"

"ہاشم؟ ہوں! تو یہ بتا مجھے کہ ڈھلوں صاحب سے تیری آخری ملاقات کب ہوئی تھی؟"

"کوئی تین مہینے پہلے..... مگر تم کیوں پوچھتے ہو؟"

"تجھے پتہ ہے اُن پر گولی چلی تھی؟"

"ہاں! کسی نے مجھے بتایا تھا۔"

"تجھے پتہ ہے وہ ہسپتال بھی پہنچے تھے؟"

"ہاں! یہ تو مجھے بھی معلوم ہے۔"

"اب کہاں ہیں وہ؟"

"اس کی مجھے کوئی خبر نہیں ہے۔"

"تم اس کو ملنا چاہتے ہو؟"

"ہاں بھئی! وہ تو چوگوٹھ میں ہی ہوں گے۔ میں خود جا کر مل لوں گا اُن سے۔"

"نہیں میرے باچھا! یہی تجھے خبر نہیں ہے۔ یار لوگوں نے اُسے انڈیا پہنچا دیا ہے اور اب وہ امرتسر جیل میں پڑا ہے۔ لاوارث، یتیم، بے سہارا ہو کر۔"

"امرتسر جیل میں! مگر وہ کس لیے؟"

"اس پر بغیر پاسپورٹ اور ویزے کے انڈیا میں داخل ہونے کا الزام ہے اور اسمگلنگ کا بھی۔"

"مگر وہ اپنی مرضی سے تو نہیں گئے ہوں گے وہاں۔"

"یہی تو بات ہے میرے باچھا۔ شاستری سے میں خود مال لیتا رہا ہوں۔ وہ چاندی اور سونے کی اسمگلنگ کرتا ہے۔ اسی کے ذریعے کسی نے ڈھلوں صاحب کو انڈیا پہنچا دیا۔ پتہ مجھے اس شاستری نے کسی کا نہیں بتایا۔ مگر ڈھلوں صاحب کو میں نے خود اس کے ٹرک میں لیٹے دیکھا تھا۔ پتہ نہیں، بارڈر کیسے پار کر جاتا ہے وہ شاستری۔ میں نے کہا اچھا ہے علاقے کی اس مصیبت کو انڈیا میں ڈال دو۔ ڈھلوں سے میں بھی خوش نہیں تھا ورنہ شاید میں اس رات اسے بچا لیتا۔"

"پھر یہ سب کچھ ہوا کیسے؟"

"اس کی بھی مجھے کوئی خبر نہیں ہے۔ شاستری سے میں اس دن کے بعد نہیں ملا۔ ویسے وہ ہر ہفتے پاکستان آتا ہے۔ ہم خلاص پور میں اس سے ملتے تھے۔ مگر اب ہم خود حوالات میں آ پڑے ہیں۔ اب کیا ہو سکتا ہے؟"

"خلاص پور؟ ہوں! کبھی تم بدی سے ملے ہو؟"

"نہیں! وہ شاید ڈھلوں صاحب کا کوئی ملازم ہے۔ ہے نا؟"

"ہاں! وہ پہلے کہاں کام کرتا تھا؟"

"اس کے بارے میں مجھے کچھ علم نہیں ہے۔ یونہی میں نے اس کا نام سُن رکھا ہے۔" جوہر علی نے مجھے خلاص پور کا نام بتا کر ایک نئے مخمصے میں ڈال دیا تھا۔ میں شاستری سے ہر حال میں مِلنا چاہتا تھا۔

"شاستری کا حُلیہ بتا سکتے ہو مجھے؟"

"وہ اونچا لمبا جوان ہے۔ گورا رنگ، سر اس نے منڈا رکھا ہے اور اس کے بائیں گال پر یہاں ایک پیسہ بھر چوڑا تِل ہے مگر تم کیوں پوچھتے ہو؟" اس نے میرے اس تجسس پر حیرت ظاہر کی۔

"کچھ نہیں! بس ایسے ہی۔ میں دراصل خود شاستری سے ملنا چاہتا تھا۔ میرا دھندا بھی یہی ہے۔ مگر میں افیون، چرس کا کاروبار کرتا ہوں۔"

"اچھا! اچھا! یہ بات ہے تو پھر میرے باچھا، ہم سے بات کرو۔ اِدھر سے تو ہم ضمانت پر رِہا ہی ہو جائیں گے۔ دو چار دن کی بات ہے۔ کہاں سے مال لاتے ہو تم؟"

"میں قبائلی علاقے سے مال لاتا ہوں۔ مگر اب یہاں پولیس نے دباؤ بڑھا دیا ہے۔ گاہک بہت محتاط ہو گیا ہے۔"

"تو پھر چک بلبن آ جاؤ۔ میں ٹھیک دس دن بعد تمھیں مل جاؤں گا۔ یہ ڈاکے شاکے کی بات بالکل بکواس ہے۔"

"ٹھیک ہے میں آ جاؤں گا۔ میرا معاملہ بھی دو چار دن میں ختم ہو جائے گا۔"

"تو پھر اور کیا چاہیے میرے باچھا! ہم کس کے لیے پڑے ہیں وہاں۔ لو میں ذرا منہ ہاتھ دھو لوں۔ ان سالوں نے یہ انتظام کیا ہے، ورنہ حوالات میں بیٹھنا مشکل ہوتا تھا۔ غسل خانہ تو صاف ستھرا بنا دیا ہے۔" یہ کہہ کر وہ غسل خانے میں جا گھسا۔

کوئی آدھ گھنٹے بعد ہم سب نے منہ ہاتھ دھو لیے تو پہرے پر کھڑے سپاہی نے ہمیں پانی جیسی پتلی چائے اور دو دو سڑے بسکٹ لا کر دے دیے۔

جوہر علی خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ مجھ سے بھی وہ برداشت نہیں ہوتا تھا مگر چائے میں چینی وافر مقدار میں تھی۔ لہٰذا یہ دیکھ کر ہم نے چائے پر ہی اکتفا کیا اور پھر سگریٹ سُلگا کر بیٹھ گئے۔ جوہر علی سے مجھے اس روز بہت سی کام کی باتیں معلوم ہوئیں۔ وہاں پر ان لوگوں کا راج تھا اور بڑے مزے سے وہ مال اِدھر سے اور اُدھر سے اِدھر کرتے رہتے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ ان کی وجہ سے دونوں طرف کے دیہاتیوں کو زبردست فائدہ پہنچتا تھا۔ وہ خود زمیندار تھے مگر ان دونوں نے چک بلبن میں زرگری کی دکان کھول لی تھی۔ تاکہ وہ اپنے دھندے کو ٹھیک طریقے سے چلا سکیں۔

نو بجے ان لوگوں نے مجھے حوالات سے نکال کر درانی کے سامنے پیش کر دیا، مگر اس طرح کہ مجھے ہتھکڑی وہ پہنا چکے تھے اور دو سپاہی میرے عقب میں آ ٹھہرے تھے۔ جب اندر داخل ہوئے تو اس وقت درانی صاحب کے قریب سپاہی پہلے سے موجود تھے۔ وہ شاید رات کی ڈیوٹی سے آئے تھے۔ تینوں کے ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں۔

درانی صاحب نے مجھے دیکھا تو بڑے غضب ناک لہجے میں بولے:

"رات میں تم سے ستنا جا صاحب کی وجہ سے بات نہ کر سکا۔ ایک نہیں ایک سو ایک جرم سرزد ہو چکے ہیں۔ کتنے ہی لوگوں کو تم نے قتل کر دیا۔ میں تمہارا بیان لینا چاہتا ہوں۔ اِدھر مجھے سب کچھ بتا دو، وَرنہ اچھا نہیں ہوگا۔" اس نے اپنے سامنے میز پر بہت سے کاغذ اکٹھے کر رکھے تھے اور پنسلیں بھی اس نے رکھی تھیں۔

"میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے درانی صاحب! وہ کوئی غلام جیلانی ہوگا۔ میں تو بندہ پرور بہت ہی غریب آدمی ہوں۔" یہ کہہ کر میں اس کے سامنے ہی کرسی پر ڈٹ کر بیٹھ گیا مگر

ابھی بیٹھا ہی تھا کہ درانی نے تالی بجائی جس کے ساتھ ہی کمرے میں موجود پانچ سپاہی بھوکوں کی طرح مجھ پہ پل پڑے۔ وہ لاٹھیاں لیے کھڑے تھے اور دروازے ان لوگوں نے اندر سے بند کر لیے تھے۔ لاٹھیاں میرے کندھوں پر لگیں تو میں الٹ کر ان کے درمیان آ ٹھہرا۔ وہ مجھے نرغے میں لے کر مار رہے تھے اور میری کوشش تھی کہ کسی نہ کسی طرح سر کی چوٹ سے بچ جاؤں۔ وہ پانچ بپھرے ہوئے سؤر ایک دم مجھ پہ آ چڑھے تھے۔ میرا خیال ہے کہ وہ ولی احمد کا انتقام مجھ سے لے رہے تھے۔ کاش! میرے ہاتھ بندھے ہوئے نہ ہوتے۔ میں نے اپنا سر بچاتے ہوئے ان کی ضربوں کا مقابلہ جسم پر کیا اور پھر میں غصے سے پاگل ہو کر دو آدمیوں کے قریب ہو گیا اور جاتے ہی میں نے اُن میں سے ایک کو پاؤں کی ٹھوکر ماری اور دوسرے کے ہاتھ سے لاٹھی چھین لی۔ ہاتھوں میں ہتھکڑی کے باوجود میں نے گھوم کر انہیں لاٹھی کی زد میں لے لیا۔ مگر وہ بہت منجھے ہوئے لٹھ باز تھے۔ میرے سامنے فوراً ہی پھیل گئے۔ چند لمحوں کے لیے تو میں سمجھا کہ میں ان کی ضربوں سے محفوظ ہو گیا ہوں۔ جس آدمی سے میں نے لاٹھی چھینی تھی۔ اس کی کنپٹی پر میں نے ایک ضرب لگائی تو وہ الٹ کر درانی کی کرسی کے پاس جا گرا۔ اب میرے سامنے صرف چار آدمی تھے اور میرے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ ایک بار پھر ان لوگوں نے میرے گرد اپنا گھیرا تنگ کر لیا۔ وہ مجھے شاید جان سے مار دینا چاہتے تھے۔ عندیہ ان کا یہی معلوم ہوتا تھا۔ اچانک ایک زوردار لاٹھی میرے ٹخنے پہ لگی، تو میں الٹ کر پیچھے جا گرا۔ وہ چوٹ ایسی تھی کہ مجھ سے اپنا توازن برقرار نہ رکھا جا سکتا تھا۔ میں جیسے ہی نیچے گرا چار لاٹھیاں بیک وقت میرے جسم پر یوں لگیں جیسے وہ روئی دھن رہے ہیں۔ وہ مجھ سے ذرّہ بھر رعایت برتنے پر آمادہ نہیں تھے۔ ولی احمد اور اس کے سپاہیوں کا انتقام لینے کے لیے ہی درانی نے مجھے اندر بلایا تھا اور انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ مجھ سے وہ صرف ایک خاص فاصلے پر رہ کر بات کریں گے تو جو چاہیں گے منوا لیں گے مگر میرے سامنے نہ ماننے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ وہ مجھے پوری طرح بچھا چکے تھے اور ہاتھ میرے ہتھکڑی نے جکڑ رکھے تھے۔ اب تک تو میں نے اپنا سر اُن سے پوری طرح بچا رکھا تھا۔ ساری ضربیں میں اپنی بانہوں پر سہہ رہا تھا۔ مگر جب میرے بازو شل ہو گئے تو میرا سر اُن کے سامنے جھک گیا۔ اور جھک گیا کہ لاٹھی کی دو ہی ضربوں سے میرے حواس میرا ساتھ چھوڑ گئے اور میں بے سُدھ ہو کر رہ گیا۔ میرے منہ سے اس وقت تک خون بہنے لگا تھا۔ کوئی ضرب میرے پیٹ پہ ایسی لگی تھی کہ میرے خون خارج ہونے لگا تھا۔ جب میں بے ہوش ہوا تو وہ خون منہ میں جمع ہو کر باہر رسنے لگا تھا۔ انہوں نے ولی احمد کی شکست کا بدلہ مجھ سے لے لیا تھا۔ ان سے یہی توقع مجھے رکھنی چاہیے تھی مگر میں سمجھا کہ ستنا جا صاحب کی وجہ سے شاید وہ مجھ سے رعایت برتیں گے۔ میں اسی وجہ سے بے دھڑک درانی صاحب کے پاس جا پہنچا تھا مگر وہ کسی ملزم کے سامنے یوں ذلیل ہونے سے مر جانا بہتر سمجھتے تھے۔ یہ بات ان کی تربیت میں داخل ہے۔ جب مجھ پر وہ لاٹھیاں برسا رہے تھے تو اس وقت ولی احمد بھی کمرے میں داخل ہو چکا تھا مگر اس کو دیکھنے کی مجھے فرصت ہی کہاں تھی لاٹھیوں کی ضربیں مجھے کسی طرف نگاہ اٹھانے کی مہلت ہی نہیں دیتی تھیں اور وہ سپاہی بھپرے ہوئے تھے۔ رات کو اُن سپاہیوں اور ولی احمد کے ساتھ جو کچھ میں کر چکا تھا وہ ان کے لیے حیرت کا باعث ہی نہیں تھا بلکہ وہ یہ بھی سمجھ چکے تھے کہ میرے ہاتھ ان کی گردن تک نہیں پہنچنے چاہئیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ مجھے فاصلے پر رکھ کر مار رہے تھے اور درانی کا پستول اس کے ہاتھ تلے رکھا تھا۔

مجھے نہیں معلوم کہ میں کتنی دیر تک بے ہوش رہا اور پھر کب اور کیسے ہوش میں آیا۔ میرے حواس جب بیدار ہوئے تو میں ایک چھوٹی سی آٹھ فٹ لمبی کوٹھری میں پڑا تھا۔ اس حال میں کہ ان لوگوں نے میرے دونوں ہاتھ میری کمر پہ باندھ رکھے تھے اور میرے پاؤں میں بھی ایک زنجیر تھی۔ ایسی زنجیر کہ جس نے میرے دونوں ٹخنے بھی جکڑ رکھے تھے۔ کمرہ بالکل ویران تھا۔ استعمال کی کوئی شے وہاں موجود نہیں تھی۔ میرے نیچے برہنہ فرش تھا اور چھت بہت اونچی تھی۔ مجھے ہوش آیا تو میں نے بڑی مشکلوں سے خود کو کھڑا کیا مگر میرا جسم میرا ساتھ نہیں دیتا تھا۔ دیوار سے ٹیک لگا کر میں اٹھا تو سہی مگر میرا جوڑ جوڑ دُکھ رہا تھا۔ ان لوگوں نے واقعی مجھے ایسی گُھٹّی مار دی تھی کہ زخم کا نشان کہیں بھی موجود نہیں تھا مگر میرا ہر حصّہ اندر سے زخمی تھا۔ پتہ نہیں میرے منہ سے خون کہاں تک بہتا رہا تھا مگر اب میری زبان پتھرا ہو رہی تھی تھوک نگلنا بھی مشکل نظر آتا تھا۔ ٹخنہ میرا پاؤں کی درمیانی ہڈی تک سُوج چکا تھا اور یہی حال میرے بازوؤں کا تھا۔ وہ ٹوٹے نہیں تھے مگر اندر سے گوشت یوں لگتا تھا جیسے اس کا قیمہ کوٹ دیا گیا ہو۔ کمر کا بھی حال کچھ مختلف نہیں تھا۔ مجھے سانس لینے میں شدید تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ پانی کی مجھے شدید ضرورت تھی۔ ایک ایک لمحہ گزارنا مشکل تھا۔ کہیں سے دو گھونٹ پانی مل جاتا تو میں سمجھتا میری جان بچ جائے گی۔ میری پیاس جب حد سے بڑھی تو میں نے دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ اب دو سپاہی میرے سامنے کھڑے تھے۔ بڑا طنز تھا ان کی نگاہ میں اور باہر اس وقت رات ہو چکی تھی۔ پتہ نہیں کہ پہلا پہر تھا کہ آخری۔ وقت کا مجھے صحیح اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ بتیاں روشن تھیں اور تھانے کے کسی حصّے سے آوازیں آ رہی تھیں۔

"تو تمہیں ہوش آ ہی گیا؟"

"یہ تو بہت ڈھیٹ آدمی ہے یار! میں سمجھا تھا سالا مر گیا ہو گا۔"

میرا منہ بھی سُوجا ہوا تھا اور مجھ سے بات نہیں ہو پاتی تھی "مجھے..... مجھے پانی لا دو!"

"ہوں! ٹھیک ہے۔ جا بِلّو اس کے لیے پانی لے آ۔"

"زہر نہ لا دوں تھوڑا سا۔ ولی احمد صاحب کو بھیجتا ہوں اِدھر۔" یہ کہہ کر وہ پیچھے ہٹ گیا۔

دوسرا سپاہی مجھے غور سے دیکھ رہا تھا، بولا "تیری پٹائی میں مَیں بھی شامل تھا پیارے! چوٹ زیادہ تو نہیں لگی۔ میری لاٹھی سے کوئی کوئی ہی بچ سکتا ہے۔"

"بڑے بہادر ہو تم۔ واقعی بہت زور تھا تیری لاٹھی میں۔" اب کی بار میں نے اُن پانچ آدمیوں کو پھر سے اپنے تصوّر میں ابھرتے دیکھا۔ ان لوگوں میں وہ سپاہی بھی شامل تھا۔

میری بات سن کر وہ مسکرا دیا۔ ایک عجیب سا طنز تھا اس مسکراہٹ میں۔ میرے زخموں پر وہ ہنس رہا تھا، بولا "ابھی ولی احمد صاحب آتے ہیں تو تم سے بات کریں گے۔ ویسے تو نے انہیں بے ہوش کیسے کر دیا تھا؟ یہ معاملہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔"

اُس کے اِس سوال کا میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں اُسے کیا کہتا؟ میرے ہاتھ فارغ ہوتے تو شاید میں اُس کا گلا ہی دبا دیتا۔ انتقام کی آگ نے مجھے پاگل کر دیا تھا مگر میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ابھی تو مجھے پتہ نہیں کتنے دن ان کی چارپائی پر رہنا ہو گا۔ بِلّو ایک جگ میں پانی لے آیا۔ گلاس بھر کر اس نے مجھے دیا تو میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ وہ کچے دودھ ایسا شہد آگیں پانی میں نے ہونٹوں سے لگا لیا اور ایک ہی گھونٹ میں پورا گلاس پی گیا۔ ایک گلاس میں نے اُس سے اور مانگا تو اس نے جگ ہی میرے حوالے کر دیا۔ میرا خیال ہے کہ میں نے سارا ہی جگ خالی کر دیا تھا۔ جب وہ میں نے اسے واپس کیا تو اس میں صرف چند قطرے ہی باقی رہ گئے تھے۔ پانی پی کر میری جان میں جان آئی۔ پتہ نہیں وہ پانی میرے کس کس زخم کو سیراب کر گیا تھا۔

"بتایا نہیں تم نے کہ ولی احمد صاحب بے ہوش کیسے ہو گئے تھے؟"

"یہ تو انہیں ہی معلوم ہو گا میرے بھائی! میں انہیں کیسے بے ہوش کر سکتا ہوں؟" میں نے دیوار کے ساتھ اپنا سر ٹکا دیا۔ مجھ سے اپنا بدن سنبھالا نہیں جا رہا تھا۔

! احمد دروازے میں آ بیٹھا۔ مجھ پر اسکی نظر پڑی

تو بولا: "ہوں! تو تجھے ہوش آگیا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ اتنا بلا دا

سو اتنی سی مار سے مر نہیں جائے گا۔ اس کے لیے کھانا لا دو۔"

"میرا خیال ہے پہلے اسے ہم دوا نہ پلا دیں۔" بِلّو نے کہا۔

"نہیں! پہلے اسے کھانا کھلاؤ۔ پھر دوا کام کرے گی۔"

بِلّو اسی وقت باہر نکل گیا۔

"اس وقت رات کے دس بج چکے ہیں۔ تم تقریباً بارہ گھنٹے بے ہوش رہے ہو۔ کیا یہ بہتر نہیں تھا کہ تم درّانی صاحب کو بیان لکھوا دیتے۔" ولی احمد نے میرے سامنے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ سگریٹ اس نے میری طرف پھینک دیا تھا۔ "پیو! یہ تمہارے لیے اکسیر کا کام دے گی۔" یہ کہہ کر اس نے ماچس بھی میری طرف پھینک دی۔ وہ کسی بھی قیمت پر میرے قریب آنے پر آمادہ نہیں تھا۔ "میں اپنے کمرے میں بیٹھا ہوں۔ کھانا کھلا کر یہ لوگ تمہیں دوا پلا دیں گے۔ تمہارا بیان بہت ضروری ہے۔" یہ کہہ کر وہ سپاہی کو ساتھ لے کر اسی وقت کمرے سے نکل گیا۔

دروازہ اُن لوگوں نے باہر سے مقفّل کر دیا اور میں ایک بار پھر تنہا ہو کر رہ گیا۔ میں مکمل طور پر اُن کے رحم و کرم پر جا پڑا تھا۔ یہاں سے نکل جانے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ تھانے کے اس اذیت ناک تجربے سے میں نے لوگوں کو گزرتے دیکھا تھا۔ وہاں ہاتھ آ کر چُرمُر ہو جاتے تھے۔ اُن کی انا ہی ختم ہو جاتی تھی۔ تھانے کے لوگ اُن سے جو چاہتے تھے لکھوا لیتے تھے۔ وہاں کوئی کسی کا نہیں تھا۔ ہر شے انہی کے اختیار میں تھی۔ کسی قسم کی قانونی موشگافی وہاں کام نہیں دیتی تھی۔ تھانے کے اندر معمولی سا سپاہی بھی بڑے اِختیارات رکھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ لوگ ہی وہاں سے بچ نکلتے تھے جو اپنی سفارش لاتے تھے۔ مگر میری سفارش ساقط ہو گئی تھی۔ ستنا جا صاحب انہیں خدا جانے کیا کچھ کہہ گئے تھے اور بڑے صاحب کا وہ ذکر کرتا تھا۔ اس نے پتہ نہیں کس مقصد سے میری کھُلی ہتھکڑی پھر مجھے پہنا دی تھی۔ ورنہ میں رات ہی وہاں سے رہا ہو گیا ہوتا۔

کوئی آدھ گھنٹے بعد بِلّو میرے لیے کھانا لے آیا۔ ماش کی دال اور ایک دال کا چھنّا! اپنے ساتھ وہ دوا کی بوتل بھی لے آیا۔ جب وہ میرے پاس آ کر بیٹھا تو بولا "لو یہ کھانا کھا لو۔ پھر دوا بھی پی لینا۔ تمہیں ان کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے۔ یہ بہت ظالم ہیں جیلانی! اور مجھے تم پر ترس آتا ہے۔"

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ روٹیاں رکھ کر اس پانی جیسی پتلی ماش کی دال سے میں نے لقمے بھگو کر منہ میں ڈال لیے۔ دال کا ذائقہ اچھا تھا، اس میں تڑکا لگا لایا تھا اور یہ اچھی بات تھی۔ میں نے ساری ہی روٹیاں حلق میں اُتار لیں۔

جب میں پانی پی چکا تو وہ بولا "اب میرا خیال ہے تم یہ دوا پی لو۔ یہ اندر کے زخموں کو بہت آرام دیتی ہے۔ یہ تو حکیم کی بنی ہوئی دوا، مگر آدمی کو بہت سکون پہنچاتی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے گلاس میں یہ دوا انڈیل دی۔ میں اُسے پینا نہیں چاہتا تھا مگر اس کا اصرار دیکھ کر پہلے میں نے اس کو زبان پر رکھ کر چکھا۔ دوا میٹھی تھی۔ میں ڈرا کہ کہیں وہ لوگ مجھے زہر ہی نہ پلا رہے ہوں۔ دوا میں نے پھر سامنے رکھ دی۔

بِلّو میری ہچکچاہٹ کا مطلب سمجھ گیا۔ اُس نے ایک گھونٹ دوا خود پی لی، بولا "اطمینان رکھو یہ زہر نہیں ہے۔ اسے پی لو۔ تمہاری بہتری کے لیے لایا ہوں۔ ابھی پتہ نہیں تمہیں کتنے مرحلوں سے گزرنا ہو گا۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا، وہ مجھے پھر ماریں گے؟"

"میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ ولی احمد کا غصّہ ابھی تک نہیں ڈھلا ہے۔ صبح وہ پھر تم سے بیان لینے کی کوشش کریں گے۔ جھوٹ سچ جو کچھ بھی ہے۔ اُن کو بتا دو۔ پھانسی کی سزا تو تمہیں پہلے ہی ہو چکی ہے۔ پھر مرنے سے پہلے کیوں اپنی جان گنواتے ہو۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں یہی کروں گا۔ صبح میں اپنا بیان لکھوا دوں گا۔" یہ کہہ کر میں نے دوا پی لی۔ حیرت انگیز بات یہ ہوئی کہ دوا پیتے ہی مجھے نیند آنے لگی اور میں کوشش کے باوجود بِلّو کے سامنے ہی آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ حالانکہ میں بارہ گھنٹے بے ہوش رہ چکا تھا مگر اس دوا نے ایک بار پھر مجھے نیند کی آغوش میں سُلا دیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ بِلّو وہاں سے کس وقت واپس گیا۔ جب میں دوبارہ اٹھا تو صبح ہو چکی تھی اور سورج خاصا اُوپر اٹھ آیا تھا۔

میں پہلے سے بہت زیادہ آرام محسوس کر رہا تھا۔ جسم میں درد اَب بھی تھا مگر میں اُسے برداشت کر سکتا تھا۔ مگر میرے زانو اس زنجیر میں ایسے جکڑے ہوئے تھے کہ مجھ سے دو قدم بھی چلا نہیں جاتا تھا۔ کوئی تیس منٹ بعد دروازہ کھُلا۔ بِلّو اندر آیا اور مجھے ایک لاٹھی دے دی، بولا "اس کے سہارے چلتے ہوئے باہر آ جاؤ۔ تمہیں درّانی صاحب بُلا رہے ہیں۔"

وہ لاٹھی ہاتھ میں لے کر میں نے بڑی مشکلوں سے خود کو کمرے سے باہر نکالا۔ آدمی کی مٹی خراب کرنے کے لیے ان کے پاس بہت سے حربے تھے مگر جس انداز سے وہ بِلّو مجھے سپاہیوں کے بستروں کے پاس سے گزار کر آگے لے گیا۔ وہ سارا تجربہ میرے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ میں یوں چل رہا تھا جیسے میری کمر کی ہڈی ٹوٹ چکی ہے۔ مجھ سے اپنا بوجھ سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ مگر پھر بھی میں لاٹھی پر اپنا وزن ڈالتے ہوئے دوسرے کمرے سے نکلا تو میں سمجھا وہ مجھے وہاں سے ایسا داغ لگا کر باہر نکالیں گے کہ میں اُسے کبھی نہ مٹا سکوں گا۔ اگلا کمرہ درّانی صاحب کا تھا۔ وہ کمرے کے ایک کونے میں میز کے سامنے بیٹھے تھے اور ولی احمد بھی اُن کے پاس بیٹھا تھا۔

"انہیں سلام کرو جیلانی! یہ بہت ضروری ہے۔" بِلّو نے سرگوشی کی۔ وہ میرے قریب ہی کھڑا تھا مگر میں نے اس کی بات پر دھیان نہیں دیا۔ وہ مجھے ذلّت کی آخری دہلیز چھُو لینے کا حکم دے رہا تھا۔ مگر میں انہیں کیسے سلام کرتا۔ میرا سر کٹ تو سکتا تھا مگر جھک نہیں سکتا تھا۔ میرے وجود میں اُن دونوں کے لیے نفرت کا سیلاب آیا ہوا تھا۔ وہ دونوں میز کے گرد یوں اکڑ کر بیٹھے تھے، جیسے ساری دُنیا کا نظام انہی کے ہاتھ میں ہو۔ ان کے وہ سرخ و سفید چہرے مجھے ایک ایسے عذاب کا پتہ دیتے تھے جو ایک دن اس تھانے کو بھی اپنے ساتھ بہا لے جائے گا۔ وہ عذاب اُن کا منتظر تھا۔ کسی نہ کسی جگہ وہ یک جا ہو رہا تھا مگر مجھے اس کی سمتوں کا اندازہ نہیں تھا۔ یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ کیسے انہیں آ لے گا۔ مگر اتنا مجھے یقین تھا کہ وہ ایک دن انہیں ضرور آ لے گا۔ میرے سر سے خون شاید ابھی تک خشک نہیں ہوا تھا۔ بال مجھے سر سے جڑے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ اُس زخم پر ہاتھ پھیرنے کے لیے میں نے یوں ہی بے خیالی میں ہاتھ اوپر اٹھا دیا تو لاٹھی ایک دم میرے ہاتھ سے چھُوٹ کر دُور جا پڑی۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا تھا کہ میرے دونوں ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اور میں لاٹھی کے سہارے کھڑا ہوں۔ جیسے ہی وہ لاٹھی گری، میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور ایک دم زمین پر گر گیا۔ بِلّو نے مجھے سہارا نہ دیا ہوتا تو میرا سر پھٹ گیا ہوتا۔ فرش پختہ تھا اور اس پر ایسی کوئی چیز گر کر سلامت نہیں رہ سکتی تھی۔

"کیا کرتے ہو جیلانی! یہ لو، یہ لاٹھی پکڑو۔" اس نے لاٹھی میرے ہاتھ میں دے کر مجھے پاؤں پر کھڑا کرتے ہوئے کہا۔

"تمہیں پتہ ہے وہ ڈاکٹر عالیہ کہاں رہتی ہے؟" درّانی نے مجھ سے براہِ راست سوال کیا۔

"نہیں! مجھے اس کے بارے میں کچھ علم نہیں ہے۔"

"تمہاری آواز کا طنطنہ ابھی تک ختم نہیں ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے ابھی تمہارے کَس بل نہیں نکلے۔" درّانی نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ اسے یقین ہی نہیں آتا تھا کہ اتنی ساری مار سہہ کر بھی کوئی آدمی اس لہجے میں بات کر سکتا ہے۔

"اُن عورتوں کو تو نے ہوٹل السعود سے اٹھایا تھا۔ عالیہ کو بھی وہیں ہونا چاہیے تھا۔ مگر وہ وہاں نہیں ہے اور اس پر تم بہت بڑا الزام لگا رہے ہو۔"

"میں سچ بول رہا ہوں۔ مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟ خاص طور پر لاٹھیوں کی مار سہہ لینے کے بعد کوئی کیسے جھوٹ بول سکتا ہے درّانی صاحب!"

وہ دونوں مسکرا دیے۔ میں نے شاید ان کے دل کی بات کہہ دی تھی۔

ولی احمد بولا "ابھی تو صرف تم نے لاٹھی ہی دیکھی ہے، ابھی تو بڑے مرحلے ہیں بچے! بڑے حربے ہیں ہمارے پاس۔ تم عالیہ پر ایسا الزام کیوں لگاتے ہو؟"

"بھائی جی! آپ ذرا میرے کرتے کا دامن اٹھائیں۔" میں نے بلّو سے کہا۔ اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے میرا چرمُر کوٹ الگ کیا اور پتلون میں سے میرا کرتہ اٹھا کر اُن کو میرا پیٹ دکھانے لگا۔

"یہ زخم دیکھ رہے ہیں نا آپ! یہ مجھے عالیہ نے ہی لگایا تھا۔ وہ میرا ایک گُردہ بیچ چکی ہے۔ میری بہن کا بھی اس نے یہی حال کیا تھا اور اب خدا معلوم وہ کہاں ہے؟"

درّانی کرسی سے اٹھ کر میرے قریب آگیا۔ میرے پیٹ کے زخم کو بغور دیکھتے ہوئے بولا "کیا کہہ رہے ہو تم۔ تمہارا ایک گُردہ وہ نکال چکی ہے؟"

"جی ہاں! اور اب میں اسی کی تلاش میں تھا۔ میں اس کو زندہ نہیں چھوڑوں گا درّانی صاحب! اور یہ بات میں آپ کے سامنے بھی کہہ رہا ہوں۔"

"تمہاری اب زندگی ہی کتنی رہ گئی ہے۔ جیسے ہی ہم تمہیں چھوڑیں گے۔ وہ تمہیں پھانسی چڑھا دیں گے۔ بہتر ہے تم اپنا بیان لکھوا دو۔"

"ٹھیک ہے! آپ جو کچھ لکھنا چاہتے ہیں لکھ لیں۔ میں آپ سے کچھ بھی نہیں چھپاؤں گا۔"

"ہاں! اب آئے ہو نا سیدھی راہ پر۔ لکھیں ولی احمد صاحب! اس کا بیان قلم بند کر لیں۔"

"اس کو یہاں بٹھا دے بلّو! میں دیکھتا ہوں یہ کیا کہتا ہے۔" بلّو نے مجھے سہارا دے کر ولی احمد کے قریب فرش پر بٹھا دیا۔ اس طرح کہ میری ٹانگیں پھیل گئی تھیں اور دیوار کی ٹیک مجھے سہارا دیتی تھی۔

درّانی نے ایک سگریٹ سلگا کر میرے حوالے کر دیا، بولا "اس سے تمہیں بولنے میں آسانی رہے گی۔"

میں نے انتہائی مختصر الفاظ میں اپنی اور اپنی بہن کی بپتا انہیں بتا دی۔ کسی جگہ بھی میں نے کسی آدمی کے قتل کی ذمہ داری اپنے اوپر نہیں لی۔ بلکہ پولیس مقابلوں کا میں نے ذکر ہی نہیں کیا۔ اسی طرح قندیارہ کا واقعہ اور کراچی میں پیش آمدہ حالات بھی میں نے اُن سے چھپا لیے۔ اپنی فردِ جرم تو میں نے کم سے کم الفاظ میں ان کے گوش گزار کر دی۔ ولی احمد بڑی خاموشی سے وہ سب کچھ لکھتا رہا۔ بہت سے واقعات کا اسے بھی علم تھا مگر اس نے مجھے ٹوکا نہیں۔

جب میں خاموش ہوا تو ولی احمد بولا "آدمی تم بہت ہوشیار ہو جیلانی! مگر بات صرف اتنی نہیں ہے۔ تم ہی وہ [illegible] ہو نا جس نے ٹیکسی میں رات کے وقت ہمارے چار آدمی زخمی کر دیے تھے۔ اُن میں سے ایک ہسپتال میں مر گیا تھا۔ تم اس [illegible] کہاں جا رہے تھے؟"

"مجھے اس کے بارے میں کچھ علم نہیں ہے۔"

"تم اس رات اسلم آبی کے گاؤں جا پہنچے تھے۔ پولیس نے تمہارا پیچھا بھی کیا تھا مگر اُن کو فریب دے کر تم بھاگ نکلے تھے۔ تمہیں سب کچھ یاد ہے بیٹے! اور تم بولو گے۔"

"تو پھر مجھ سے کیا پوچھتے ہو ولی احمد! لکھ لو وہ سب کچھ لکھ لو، جو تمہیں یاد ہے۔" میرے لہجے نے اسے ایک دم [illegible] مگر پھر بھی وہ چُپ رہا اور خود ہی وہ سب کچھ لکھنے لگا جو اُسے معلوم تھا۔

چار کاغذ جب وہ کالے کر چکا تو بولا "لو اب اس پر دستخط کر دو!"

میں نے قلم اس کے ہاتھ سے لے کر بڑی مشکلوں سے کاغذ پر اپنے دستخط کر دیے۔ پتہ نہیں اُن کاغذات میں اس نے کیا کچھ لکھ لیا تھا۔ میرے کردہ اور ناکردہ سارے ہی گناہوں کی فہرست وہاں درج کر لی گئی تھی۔ اس سے وہ کاغذ لے کر درّانی نے اپنے سامنے رکھ لیے۔ جب وہ انہیں پڑھ چکا تو بولا۔

"یہ تو کچھ بھی نہیں ہے ولی احمد! اس کے جرائم کی فہرست تو بہت طویل ہے۔ مگر خیر! میں کل اس سے بات کروں گا۔ اس کو دوا پلا کر اسی کمرے میں ڈال دے بلّو! لے جا اس کو......"

اس نے مجھے گندی سی گالی دیتے ہوئے پرے ہٹا دیا۔ میرا ہاتھ اس وقت پھیل ہی رہا تھا۔ میں درّانی کے منہ سے گالی برداشت ہی نہیں کر سکتا تھا۔ میرے چہرے کے سفاک نقوش اُسے پاگل کر گئے تھے۔ اس نے تڑاخ سے الٹے ہاتھ کا ایک تھپڑ میرے منہ پر دے مارا اور مجھے نہایت ہی غلیظ گالی دیتے ہوئے بولا۔

"تیرا میں اب کل بندوبست کروں گا۔ تجھے ہم مجسٹریٹ کے سامنے بھی پیش نہیں کریں گے۔ اِدھر ہی تیرا کچومر نکال دیں گے کتّے! تو سمجھتا کیا ہے خود کو۔ تیرے جیسے ایک سے ایک ذلیل آدمی کو ہم نے سیدھا کر دیا ہے۔" کمرہ اس کی آواز سے گونجنے لگا تھا۔ مجھے جب بلّو نے اٹھایا تو میں ایک دم درّانی کے اوپر جا گرا۔ اس کی گردن میں میرے دونوں ہاتھ بہت گہرے پیوست ہو گئے تھے۔ ایک ہی لحظے میں وہ بے جان ہو گیا۔ کرسی اس کے وجود سے ڈولنے لگی تھی۔ دونوں ہاتھ اور اس کا سر کرسی سے باہر نکل گئے تھے۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر ولی احمد نے فوراً مجھے دھکا دے کر پیچھے گرا دیا۔ میں فرش پر جا لگا تو اس نے بید نکال لیا، بولا "بدمعاش! کتّے کے بچّے! تو اب بھی باز نہیں آتا۔" یہ کہہ کر اس نے تڑاخ پڑاخ کئی بید میرے جسم پر مار دیے۔ وہ بید اتنے سخت تھے کہ میری کھال اُدھڑ کر رہ گئی۔ وہ بے حد غضب ناک ہو چکا تھا۔ میں نڈھال ہونے لگا تو اس نے درّانی کو فوراً ہی کرسی پر سے اٹھا کر فرش پر ڈال دیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ فوراً ہی وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ چند ہی لمحوں بعد وہاں راشدی صاحب اور کئی سپاہی جمع ہو گئے۔ ایک سپاہی کے ہاتھ میں پانی کا جگ تھا۔ وہ اس نے درّانی کے منہ پر ڈال دیا مگر میں نے کچھ اس طرح درّانی کا جھٹکا کر دیا تھا کہ مجھے امید نہیں تھی کہ وہ بچ جائے گا۔ دو سپاہی اس کے ہاتھ پاؤں ملنے لگے۔ ایک نے اس کے منہ پر منہ رکھ کر اسے اپنے سانس کی گرمی دی۔ وہ اس افراتفری میں پاگل ہو چکے تھے اور میں اپنی جگہ بُری طرح نڈھال پڑا ہوا تھا۔ بید نے میری کھال بُری طرح اُدھیڑ دی تھی۔ میری کمر پر اور میرے پیٹ پر اس کی ضربیں کچھ ایسی کاری لگی تھیں کہ مجھ سے ہلا بھی نہیں جاتا تھا۔

بالآخر دو سپاہی درّانی کو وہاں سے اٹھا کر دوسرے کمرے میں لے گئے۔ اب راشدی صاحب اور صرف دو سپاہی میرے پاس موجود رہ گئے تھے۔

مجھے راشدی صاحب نے سہارا دے کر اُوپر اٹھایا تو میری دونوں ٹانگیں زنجیر میں بندھی دیکھ کر بولا "یہ.... اس کی ٹانگیں کس نے باندھی ہیں؟ یہ اس قدر زخمی کیوں ہے؟ کیا ہوا تھا اسے؟"

"وہ..... وہ کل شام درّانی صاحب نے اسے پِیٹا تھا۔ وہ اس سے بیان لکھوانا چاہتے تھے۔" بلّو نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

راشدی صاحب نے گردن تک میرا کرتا اوپر اٹھا دیا۔ اس کے بعد وہ میری ٹانگیں دیکھنے لگے۔ انہیں جب معلوم ہو چکا کہ مجھ پر زبردست تشدّد کیا گیا ہے اور میرے سر میں بھی سخت چوٹیں آئی ہیں تو وہ ایک دم کمرے سے باہر نکل گئے۔ انہیں بہت زیادہ طیش آگیا تھا۔ کوئی پانچ ہی منٹ بعد وہ ولی احمد کے ساتھ میرے کمرے میں آگئے، بولے "اسے کیا ہوا تھا ولی احمد؟ یہ اس قدر زخمی کیوں ہے؟"

"میں..... میں دراصل اس سے بیان لکھوانا چاہتا تھا___ درّانی صاحب کے سامنے جب اسے پیش کیا گیا تو یہ بدمعاشی دکھانے لگا۔"

"ہوں! اور تمہیں پتہ ہے کہ یہ شخص میری ذمہ داری میں ہے۔ میں ستناجا صاحب کو کیا جواب دوں گا؟"

"اس وقت تک ہم اسے ختم کر چکے ہوں گے راشدی صاحب! اب ہماری اس سے ذاتی دشمنی بن گئی ہے۔ اس نے درّانی صاحب کو بھی مار دینے کی کوشش کی ہے۔ یہ گردن دبا کر آدمی کو ہلاک کر دیتا ہے۔"

"بکواس کرتے ہو تم! میں تمہیں ڈِسمس کرا دوں گا علی احمد! مجھے نہیں جانتے ہو تم۔ میں آج ہی تم دونوں کو معطّل کراتا ہوں۔ ملزم یہاں اس لیے نہیں آتے کہ تم اُن پر تشدّد کرو۔ انہیں اپنی جہالت کا ثبوت دو۔ یہ سراسر ظلم ہے۔"

"اگر آپ اس تھانے کے انچارج رہے تو پھر کام ہو چکا۔ میں خود ڈی آئی جی سے اس بارے میں بات کروں گا۔ یہ بدترین قسم کا مجرم ہے۔ پھانسی کے تختے سے بھاگا ہوا۔ مگر اس کا ہاتھ ابھی تک نہیں رُکا ہے۔ پچاس آدمیوں کو یہ قتل کر چکا ہے اور آپ اس سے نرمی برتنے کا کہہ رہے ہیں۔ اس پر تو کتّے چھوڑ دینے چاہئیں۔ آپ ہیں کہاں راشدی صاحب! ایں کتاب نہ باشد کہ آپ ورق پلٹ کر رہ جائیں گے۔" یہ کہہ کر ولی احمد غضب ناک حالت میں کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہ بہت سینئر انسپکٹر تھا اور راشدی کو اس پر ہاتھ ڈالتے ہوئے بہت کچھ سوچنا پڑتا تھا۔ یہی حال درّانی کا تھا اور وہ دونوں اس تھانے کے ستون بنے ہوئے تھے۔ اُن سے بگاڑ کر وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

"اِس کی یہ زنجیر کھول دو اور ہتھکڑی سمیت اسے چھوٹے کمرے میں ڈال دو۔" بلّو نے اس کے کہنے کے مطابق درّانی کی دراز میں سے ایک چابی نکال کر میری ٹانگیں کھول دیں۔ پھر بھی میں بڑی مشکل سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکا۔ بلّو نے لاٹھی پھر میرے ہاتھ میں تھما دی اور مجھے سہارا دے کر وہ عقبی کمرے سے گزار کر چھوٹے کمرے میں لے گیا اور باہر نکل کر اس نے دروازے کو مقفل کر دیا۔

یہ آدمی کا مقدّر ہے یا روگ کہ اُسے سارے ہی دُکھ تنہا سہنا پڑتے ہیں۔ میری ماں میرے ساتھ ہوتی تو وہ اس اذیّت کا عشرِ عشیر بھی نہ جھیل سکتی تھی، جس سے میں دوچار ہو چکا تھا۔ ایک بیکراں سنّاٹے نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ وہ ایسا کمرہ تھا کہ اس میں روشنی کی کوئی رمق کسی طرف سے داخل نہ ہو سکتی تھی۔ ایک صرف برقی بلب مجھے یہ احساس دلاتا تھا کہ میں ابھی زمین کے پیٹ میں نہیں اس کے اوپر پڑا ہوں اور وہ بھی یوں کہ ابھی حسّیات زندہ تھیں۔ موت اب بھی مجھ سے چار قدم دُور

کھڑی تھی۔ میں ایسے کربناک مرحلے میں داخل ہو چکا تھا کہ نہ مستقبل میرے ہاتھ میں تھا، نہ ماضی۔ میری مداہنت، میری خوشامد، میرا اُن کے سامنے بچھ جانا میرے کسی کام نہ آسکتا تھا۔ وہ ایسے دشمن تھے جو کسی ذاتی پرخاش کی بنا پر نہیں بلکہ مجھے قانون کی زد میں لے کر اپنے تشدّد کو برحق ثابت کر رہے تھے۔ میرے سارے ہی مستول انھوں نے جلا ڈالے تھے اور میں اسی وقت سے ڈرتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میں جیسے ہی اُن کے ہاتھ آیا وہ میرے پُرزے ادھیڑ دیں گے۔ وہ بہت دنوں سے میری آس لگائے بیٹھے تھے۔ وہ اسی دن کی امید پر زندہ تھے اور اب وہ امید پوری ہو چکی تھی میں اُن کا ہاتھ نہیں روک سکتا تھا۔ اچھا ہوا کہ آبی میرے ساتھ نہیں تھا۔ اُس ولی احمد کو اس کے گاؤں کا بھی علم تھا۔ وہ اس کا بھی حدودِ اربعہ ناپ چکے تھے۔ وہ شاید اس کی ماں سے بھی آشنا تھے مگر انھیں آبی ہاتھ نہیں آتا تھا۔ وہ گاؤں میں رہتا ہی نہیں تھا۔ مگر اُس سے وہ زیادہ تعرّض بھی نہیں کرتے تھے۔ اس کے خلاف ان کے پاس کوئی بھی ثبوت نہیں تھا۔ سارے ہی گناہ وہ میرے سر ڈالتے رہتے تھے اور آبی کی ماں وہاں کھنجن چڑیا کی طرح چُپ چاپ زندگی بسر کیے جاتی تھی۔ آبی میرے ساتھ ہوتا تو اس گیہوں کے ساتھ اس کا بھی گُھن پس جاتا۔ وہ اُسے چھوڑ تو نہ دیتے۔ اچھا ہوا آبی نے میرا ساتھ چھوڑ دیا۔ میرا خیال ہے کہ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ میں اپنے انجام کو پہنچنے والا ہوں۔ جس تیزی سے میں نے خود کو عالیہ کے تعاقب میں لگا دیا تھا۔ اُس سے وہ حالات کی چال کا اندازہ لگا چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے مجھ سے علیحدگی اختیار کر لی وہ عورتیں تو محض ایک بہانہ تھیں۔ کوئی اس کی رقم اُس سے چھین نہیں سکتا تھا۔ اسے تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ مگر پھر بھی اس نے میرا ساتھ چھوڑ دینے میں ہی مصلحت سمجھی۔ اس کی چھٹی حس کچھ زیادہ ہی بیدار تھی۔ وہ کہاں کہاں ان بدمعاشوں کے ہاتھوں ذلیل ہو سکتا تھا۔ وہ پہلے ہی جھٹکے میں جان دے دیتا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ مجھے کہیں دم لینے کا بار بار مشورہ دیا کرتا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ ہم ایسوں کی زندگی بہت ہی مختلف ہوتی ہے۔ اس سے جتنا بھی لُطف اٹھا لیا جائے، بہتر ہے۔ اسے بھی مرنے کی آس لگی رہتی تھی۔ میں اسے آس ہی کہوں گا۔ اُس کے سارے گناہوں کا حل اسی موت میں تھا مگر وہ تو اس کے ہاتھ میں نہیں تھی۔ ایک صرف امید تھی کہ وہ کسی نہ کسی جگہ اس کی منتظر ہے اور اسی کے خوف سے وہ عیش کے ہر اُس حلقے میں جا گھُستا تھا جو اس کی راہ میں آتا تھا۔ تُو نے اچھا ہی کیا ہے آبی! ورنہ اس تھانے میں مجھ پر جو گزر رہی تھی وہ تیرا بھی مقدّر بن جاتی۔ اس سے بچ جانا تیرے لیے کسی بھی طرح ممکن نہ ہوتا۔ تقدیر نے میری کونچیں تو کاٹ ہی دی ہیں۔ تو کیوں خواہ مخواہ اُس مخمصے میں پھنستا۔ تو اچھا کنکوّت نکلا۔ تجھے ... کہ اِس کمبخت سے کیا اُگتا ہے اور اس کا کیا بھاؤ ... سے تو ایک ہی فصل اُگتی ہے۔ موت کی فصل۔ جو ابھی تیرا مقدّر نہیں بنی مگر جو میرے لیے ایک نکتے پر آ ٹھہری ہے۔ ایک ہی ... میں مَیں اب اس تک جا پہنچوں گا۔ وہ میرا ماضی بہت پیچھے ... جائے گا۔ مجھے نہ تو ستنا جا صاحب پناہ دے سکیں گے نہ راشدی ... کچھ بھی اُن کے بس میں نہیں ہے۔ میری مستد آرا بھی بہت پیچھے رہ گئی ہے۔ میں اس کے بے مثال حُسن سے اب کبھی فیض یاب نہ ہو سکوں گا۔ وہ میرے تصوّر کے نہاں خانوں میں راتوں کو خواب کی صُورت میں ابھرنے والی مستد آرا خواب ہو کر رہ گئی تھی۔ میرا اُس سے مری تعلق قائم نہیں ہوتا تھا۔ کبھی بھی نہیں ہو سکا تھا مگر اب وہ تصوّر کا باب بھی ختم ہونے کو تھا۔ محبتیں ایسے بھی کی جاتی ہیں اُس کا اب مجھے احساس ہو رہا تھا۔ میں تو بالکل ہی کنگال ہو کر رہ گیا تھا۔ ایک وہ میری اَنا تھی۔ وہ اسے بھی جھیر جھیر جلا چکے تھے۔ بدن پر بید کی اور لاٹھیوں کی ضربیں اُس بات کی گواہ تھیں ... کانوں میں ان کی گالیوں کے الفاظ گونجتے تھے۔ جب آدمی تنہا ... ہے تو اس کا تصوّر اسے طرح طرح کی ہزیمتیں اور گزری ہوئی اذیتیں ایک بار پھر سہہ لینے کی عادت ڈالتا ہے۔ مجھ پر بھی بیتے ہوئے لمحات پھر سے طاری ہو گئے تھے۔ ایک ایک بات مجھے پھر سے یاد آنے لگی تھی۔ میں بہت رویا، بہت جی ہلکان کیا میں نے اس کربناک تنہائی نے مجھے خون کے آنسو رلائے۔ میں پورا دن اور پوری رات وہاں بیٹھا اس سردی میں ٹھٹھرتا رہا۔ کسی نے مجھے پانی تک کو نہیں پوچھا۔ بار بار دروازہ کھٹکھٹانے کے باوجود کسی نے میری خبر نہیں لی۔ میرا خیال ہے بلّو کو بھی اُن لوگوں نے ... ہٹا لیا تھا۔ ایک موت تو وہ مجھ پر وہیں طاری کر دینا چاہتے تھے دوسری موت تختۂ دار پر رکھی تھی جس کی طرف میں آہستہ ... بڑھ رہا تھا۔ وہ میرے نزع کے عالم کو طویل کر دینا چاہتے تھے اُن کا منشا تھا اور وہ اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی تھے۔ ... کا کوئی پرسانِ حال ہی نہ ہو تو پھر اس کے لیے ایک موت ... وجود کے اندر سے ابھر کر اس کا گلا دبوچ لیتی ہے۔ وہیں بھی ... ہی کیفیت سے دوچار تھا۔

چوبیس گھنٹے میں اُس حبس میں پڑا سسٹرتا رہا۔ اگلے ... صبح نو بجے کے قریب پھر درِ زنداں کھُلا۔ بلّو پھر میرے سامنے ... وہ میرے لیے چائے اور بسکٹ لایا تھا۔ دروازہ کھول کر اس ... ٹرے میرے سامنے لا کر رکھ دی، بولا "یہ کھا لو۔ میرا خیال ہے کل سے بھوکے ہو۔"

"شکریہ۔ میں تمھیں یاد تو آ گیا۔"

"یہ بات نہیں ہے۔ مجھے دراصل ولی احمد نے منع کر دیا تھا۔ راشدی صاحب کسی کام سے شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں۔"

"ہوں! ٹھیک ہے بھائی! تمھاری مہربانی ہے کہ تم چائے ہی لے آئے ہو۔" میں نے ٹرے اپنے سامنے رکھ لی۔ بسکٹ نرم اور لذیذ تھے۔ میں نے انھیں آسانی سے حلق سے نیچے اُتار لیا۔

بلّو بولا "نہیں اگر کھانے کی ضرورت ہو تو لا دوں؟ کچھ سپاہی کھانا کھا رہے ہیں۔"

"ہاں! لا ہی دو تو بہتر ہے۔ اس سے تو میری بھوک نہیں مِٹی۔"

"ٹھیک ہے۔ وہ تمھارے دُرّانی صاحب تو ہسپتال میں ہیں اُن کا بہت بُرا حال ہے جیلانی! گلا ان کا سُوج کر یہاں تک آ چکا ہے۔ کوئی چیز ان سے نگلی نہیں جاتی۔"

"مرا نہیں وہ ابھی تک! میں تو یہی چاہتا تھا۔ وہ اب نہیں مرا تو پھر کب مرے گا؟" میں نے زہرخند کیا۔

"انھوں نے کارِ سرکار میں رکاوٹ ڈالنے اور ایک افسر پر قاتلانہ حملہ کرنے کے الزام میں بھی تم پر مقدمہ درج کر لیا ہے۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے بلّو سیٹھ! مجھے اب زیادہ دن نہیں جینا ہے۔ جتنے بھی آدمی میں مار سکوں اچھا ہے۔"

وہ خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔ میری باتوں کو وہ نوشتۂ دیوار سمجھنے لگا تھا، بولا "تیرے ہاتھ میں ایسی کیا بات ہے آخر! تو کیسے لوگوں کا یہ حال کر دیتا ہے؟" اس نے ٹرے اب زمین پر سے اٹھا لی تھی۔

میں نے اس کے سامنے اپنے بندھے ہوئے ہاتھ کھول دیے میرے پنجے پھیل گئے تھے۔ "یہ..... میرے یہ ہاتھ معجزہ دکھاتے ہیں بلّو سیٹھ! یہ صرف گناہ گاروں کی گردن کاٹتے ہیں۔ اور دُرّانی بہت بڑا پاپی ہے، مہا پاپی!"

"میں تیرے لیے کھانا لاتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے دروازہ بند کیا اور باہر نکل گیا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ پھر میرے کمرے میں آ گھُسا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لپٹا ہوا دسترخوان تھا جس کے اندر ٹفن کیریئر ایسی کوئی شے تھی۔ آتے ہی بولا "جیلانی! تیری ایک دوست آئی ہے۔ یہ کھانا تیرے لیے وہی لائی ہے۔"

"میری دوست! اوہ مجھ سے تو ہلا بھی نہیں جاتا۔ کونسی دوست ہے کیسی دوست؟ یہ کیا کہہ رہا ہے تو؟"

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔ ولی احمد بھی اس کے سامنے چپ ہو گیا ہے۔ وہ اس کے پاس بیٹھی ہے۔"

"مگر وہ کون ہے بلّو! میں تو کسی کو دوست نہیں رکھتا۔"

"میرا خیال ہے اخبار میں تیری خبر چھپ گئی ہے۔ اس خبر کو پڑھ کر ہی وہ عورت یہاں آئی ہے۔"

"کیا کہتی ہے وہ! اسے میرا نام کس نے بتایا ہے؟"

"تمھاری ایک تصویر بہت پہلے اخبار میں چھپی تھی۔ وہ بھی اس کے پاس ہے۔ تمھاری ایک جھلک دیکھنے کے لیے یہاں آ گئی ہے۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ جھوٹ ہے۔ میرا یہاں کوئی واقف نہیں ہے۔ کون مجھ ایسے آدمی میں دلچسپی لے سکتا ہے۔"

"پتہ نہیں! لمبی سی کار میں آئی ہے وہ۔ اور ڈرائیور بھی اس کے ساتھ نہیں ہے۔ کار وہ خود چلاتی ہے۔"

"ولی احمد کیا کہتا ہے؟"

"وہ اس کو اِدھر نہیں آنے دیتا۔ وہیں سے ٹرخا دینا چاہتا ہے۔"

"وہ پردے میں ہے؟"

"ہاں! یہ لمبا سا بُرقع اس نے پہن رکھا ہے۔ کسی کو اپنی صورت بھی نہیں دکھاتی ہے۔ لیکن میرا اندازہ ہے کہ وہ بہت ہی خوبصورت ہے۔ میں نے اس کے ہاتھ دیکھے تھے۔"

بلّو کی باتیں سُن کر میں اپنا غم بھول گیا حالانکہ میرے سارے جسم میں شدید درد ہو رہا تھا۔ ٹخنہ الگ سُوجا ہوا تھا مگر میں اس کی باتوں میں ایسا کھو گیا کہ مجھے کسی بھی بات کا ہوش نہیں رہا۔ میں نے اس کے ہاتھ سے وہ بڑا سا ٹفن کیریئر لے کر اپنے سامنے رکھ لیا اور اس کی گرہیں آہستہ آہستہ کھولنے لگا۔ یوں جیسے وہ کسی دلنواز کا بھیجا ہوا خوشبوؤں میں رچا خط ہو۔ دو برتنوں میں بھُنا ہوا گوشت تھا۔ ایک میں مُرغ کا اور دوسرے میں بکرے کا۔ تیسرے برتن میں پراٹھے رکھے تھے اور چوتھے میں فرنی۔ مگر نام اس پر کسی کا بھی نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس نے ڈبّے میں کوئی خط ضرور رکھا ہو گا۔ مگر وہاں اس قسم کی کوئی چیز نہیں تھی۔

"اس کو بلاؤ بلّو! میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"وہ کوشش تو بہت کر رہی ہے مگر ولی احمد اسے راستہ نہیں دیتا اور راشدی صاحب یہاں نہیں ہیں۔"

"یہ تو بہت بُری بات ہے۔ میں اس کو دیکھے بغیر یہ کھانا نہیں کھاؤں گا۔ لے جاؤ اسے اور ولی احمد کے منہ پہ دے مارو۔ اسے کہو، وہ مجھ سے بچ جائے۔ خود تو میں ڈوب ہی رہا ہوں، اسے بھی لے ڈوبوں گا۔" یہ کہہ کر میں نے تمام ڈبّے بند کر دیے۔ ولی احمد کو یہ حق کس نے دیا تھا کہ وہ مجھ سے ملاقات کے لیے آنے والے کا راستہ روک دے۔

"ٹھہرو! میں اس سے پھر بات کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر بلّو نے دروازہ بند کیا اور دوسری طرف نکل گیا۔ میرے لیے وہ سب کچھ ناقابلِ یقین تھا۔ کون مجھ ایسے راندۂ درگاہ آدمی سے اتنی ہمدردی رکھ سکتا ہے کہ وہ میرے لیے اس محبس میں کھانا لے کر آئے اور اتنا سارا پُرتکلّف کھانا۔ میری عقل کام نہیں کرتی تھی۔ ایک تو فریدپور کی اس بہن جی نے مجھے حیران کیا تھا۔ تمام تر کوشش کے باوجود اس نے ہمیں اپنی صورت نہیں دکھائی تھی اور دُوسری اب میرے سامنے آگئی تھی۔ وہ بھی شاید کسی کو اپنا چہرہ نہیں دکھاتی تھی۔ بلّو نے اس کے صرف ہاتھ دیکھے تھے اور وہ انہی سے اندازہ لگا رہا تھا کہ وہ بہت خوبصورت ہے۔ چہرہ اس کو دیکھنا نصیب نہیں ہوا تھا اور ولی احمد اس کا راستہ روک بیٹھا تھا۔ وہ کون تھی آخر؟ اسے مجھ سے کیا ہمدردی ہو سکتی تھی؟ میں سوچ سوچ کر تھک گیا مگر وہ مُعاملہ میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد بلّو پھر میرے پاس آگیا۔ دروازہ کھولتے ہوئے بولا "وہ تو چلی گئی ہے جیلانی! کہہ گئی ہے کہ وہ پھر آئے گی۔ یہ کھانا کھالو۔ ولی احمد پھر تمہارے پاس آرہا ہے۔"

"وہ پھر آئے گی؟ ٹھیک ہے میں اس کا انتظار کروں گا۔ لاؤ، یہ کھانا میں کھا لیتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے تمام ڈبّے کھول لیے اور بلّو کو بھی اس میں شامل کر لیا۔

"کھاؤ یار! تم بھی کھاؤ۔ پتہ نہیں کون تھی۔ مگر کھانا بہت لذیذ ہے، کھالو۔" وہ بھی میرے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ اس کی رفتار مجھ سے تیز تھی۔ ہم نے مل کر وہ تمام کھانا ختم کر دیا۔ بھوک نے مجھے واقعی نڈھال کر رکھا تھا۔

جب بلّو وہ برتن سمیٹ لگا تو بولا "کسی آدمی کو بھیج کر وہ یہ برتن منگوا لے گی۔ وہ یہ بات کہہ کر گئی ہے۔"

"پھر تو بہت ہی اچھا ہوگا۔ اس کا کوئی آدمی آئے تو اسے مجھ سے ملاؤ۔"

"میں اُسے کہہ دوں گا۔ آگے ماننا نہ ماننا اس کا کام ہے۔"

یہ کہہ کر بلّو وہاں سے اٹھنے لگا تو عین اسی وقت ولی احمد دروازے میں آٹھہرا۔ دو سپاہی اس کے ساتھ تھے۔ انہیں اس نے بلّو کے ساتھ واپس بھیج دیا اور ایک کرسی اٹھا کر وہ میرے پاس آبیٹھا۔ دروازہ اس نے اب بھی بند نہیں کیا تھا۔ دوسرے کمرے میں بیٹھے سپاہی ہماری ہی طرف متوجّہ تھے مگر ان کی اس نے پروا نہیں کی۔ "تمہیں پتہ ہے درّانی صاحب بہت سخت بیمار ہیں۔ کوئی چیز اُن کے گلے سے نہیں اُترتی ہے۔"

"مجھے یہ سُن کر دلی خوشی ہوئی ہے ولی احمد! تم بھی مجھ سے بچ جاؤ۔ میں تو ختم ہو ہی رہا ہوں مگر تمہیں بھی ساتھ لے جاؤں گا۔ یاد رکھو، میں تمہیں کبھی مُعاف نہیں کروں گا۔"

غیر ارادی طور پر ولی احمد کا ہاتھ پستول پر جا ٹھہرا۔ "تمہارا غصّہ ابھی تک نہیں اترا ہے؟ حالانکہ درّانی صاحب کو تم نے لبِ گور پہنچا دیا ہے۔ تمہارے خلاف ہم نے اقدامِ قتل کا مقدمہ درج کر لیا ہے۔"

"اب مجھے کوئی فکر نہیں ہے۔ تم چاہے دس مقدمے درج کر لو، مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔"

"میں تمہاری ذہنی کیفیت کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ یہ تمہاری جیب سے اسّی ہزار کا ڈرافٹ نکلا تھا مگر اس پر پانی پڑ چکا ہے۔ یہ کس بینک کے لیے تھا؟" اس نے جیب سے وہ ڈرافٹ نکال کر مجھے دکھایا جو ہم میانوالی لے گئے تھے۔ کاغذ پر پانی کی وجہ سے اب صرف دھبّے ہی دھبّے نظر آتے تھے۔ ایک صرف اس کی رقم کا ہندسہ ہی سالم نظر آتا تھا۔

"دکھاؤ ذرا۔" میں نے اُس کے ہاتھ سے ڈرافٹ جھپٹ لیا۔ اُس نے اُسے مجھ سے چھیننے کی کوشش کی مگر میں بڑے غور سے اسے دیکھتا رہا اور پھر میں نے اُسے پُرزہ پُرزہ کر دیا۔

"یہ کیا کرتے ہو تم؟ یہ تمہارے کام آسکتا تھا۔ پاگل ہو گئے ہو؟"

"اس کو پھاڑ دینا ہی بہتر تھا ولی احمد! مجھے معلوم ہے تم کس لیے میرے پاس آئے تھے مگر تمہیں مجھ سے کچھ حاصل نہ ہوگا اگرچہ میں ایک کروڑ روپے کا مالک ہوں۔"

"ایک کروڑ روپیہ! تم مجھے پاگل کر دو گے۔ کہاں سے آیا یہ روپیہ تمہارے پاس؟" اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ پستول اب اس نے سیدھے ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔ "بتاؤ! یہ روپیہ تمہارے پاس کہاں سے آیا؟"

"ہوش کی دوا لو ولی احمد! درّانی کا حال تم دیکھ چکے ہو۔ میں آدمی کا کھڑے کھڑے کلیجہ نکال لیتا ہوں۔ خواہ میں کا سارا بندھا ہوا ہوں۔" میں اپنے ٹخنے میں شدید درد کے باوجود اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی نیّت مجھے نیک نظر نہیں آ رہی تھی۔ آزمائش کی ایک اور گھڑی میرے سامنے آٹھہری تھی اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ اگلے لمحے وہاں ولی احمد کی لاش نظر آئے گی یا میری۔ اس کے تیور بہت ہی خطرناک تھے۔

"مجھے یہ پوچھنے کا مکمل حق حاصل ہے کہ وہ روپیہ تمہارے پاس کہاں سے آیا؟"

"اور میں نہ بتانے کا حق محفوظ رکھتا ہوں۔ بیٹھ جاؤ ولی احمد! مجھ سے مطلب کی بات کرو۔ میں تم سے سودا کر سکتا ہوں۔"

... کر کے بے پناہ درد کو ضبط کرتے ہوئے کہا "اس کے آدمیوں نے ... دھن ڈالا تھا۔ درد کسی طرح تھمتا ہی نہیں تھا۔ وہ تو ... کہ میری بھوک قائم تھی اور جینے کا حوصلہ بھی باقی تھا۔ ... وہ چور ایسی مارتھی اور سپاہیوں کو حکم تھا کہ وہ کوئی ... رعایت نہ رکھیں۔ جس کی طرف وہ اشارہ کر دیں، وہ اُسے ... کر کے رکھ دیں۔

"سودا تو میں تجھ سے ضرور کروں گا۔ مگر یہ رقم تو خود ہاتھ جوڑ کر میرے سامنے رکھے گا۔ ذرا تیرے یہ زخم صحیح ہو جائیں۔" یہ کہہ کر وہ اسی وقت وہاں سے باہر نکل گیا۔ دروازہ پھر وہ بند کر گیا تھا۔

دو بجے اُن لوگوں نے پھر مجھے اس ڈربے سے باہر نکال لیا۔ دو سپاہی اندر آئے اور مجھے وہاں سے اٹھا کر ولی احمد کے سامنے لے گئے۔ مگر جیسے ہی میں نے اس کے کمرے میں قدم رکھا، میرا دل اچھل کر رہ گیا۔ میرے سامنے بدری بیٹھا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑی تھی۔ اس نے مجھے دیکھا تو جس بینچ پر وہ بیٹھا تھا، اسے پاؤں کی ٹھوکر سے نیچے گرا کر اٹھ بیٹھا۔ ہتھکڑی کی زنجیر سپاہی کی پیٹی میں بندھی تھی۔ اس نے بدری کو جھٹکا دے کر بینچ سیدھا کیا اور پھر اسے جانور کی طرح کھینچ کر نیچے بٹھا دیا۔

"اسے پہچانتے ہو؟" ولی احمد نے پوچھا۔

"جی ہاں! اور اس کی مالکن کو بھی پہچانتا ہوں جس سے اس نے ایک لاکھ روپیہ لے کر مالک کو اغوا کر لیا۔ یہ بدرالدین ہے، ڈھلّوں صاحب کا نیا ملازم۔" میں نے بدری کے پاس پہنچ کر کہا۔ بدری نے مجھے غضب ناک نظروں سے دیکھا۔ مگر بولا کچھ نہیں۔

"بیٹھ جاؤ! اور مجھے بتاؤ کہ یہ ذاتِ شریف ڈھلّوں صاحب کے ملازم کیسے بن گیا؟"

"میرا تو خیال ہے کہ یہ سالا ابھی ہندو ہے۔ یہ بھیس بدل کر ادھر پھر رہا ہے۔"

ولی احمد کو گویا میں نے ایک نیا نکتہ دے دیا۔ وہ تیزی سے اٹھا اور سپاہی کو اشارہ کر کے دوسرے کمرے میں جا گھسا۔ سپاہی نے بدری کو پھر جھٹکا دے کر اوپر اٹھایا اور کھینچ کر اسی کمرے میں پہنچا دیا۔ خود وہ باہر ہی کھڑا رہا۔ زنجیر بھی اس کے ہاتھ میں رہی۔ جب بدری باہر نکلا تو ولی احمد اس کی کمر پر ٹھوکر مار رہا تھا۔ اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا تھا۔ باہر آتے ہی بولا "تم ٹھیک کہتے ہو جیلانی! یہ تو ہندو ہے۔ پتہ نہیں یہاں کیا کر رہا تھا۔" ... بدری کو زنجیر سے پکڑ کر خود کرسی تک لایا اور اسے فرش پر بٹھا کر بولا "کیوں اوئے چُوہڑے کے پُتّر! اس کا کیا مطلب ہے؟ تو ڈھلّوں صاحب کے پاس کتنے سے ملازم ہے؟"

"کوئی چھ مہینے ہو گئے ہیں۔"

"مگر تیرا اصلی نام کیا ہے؟"

"بدرالدین میرا نام ہے جناب! دراصل میں رسُولی ہوں۔"

"تم جھوٹ بولتے ہو۔ ڈھلّوں صاحب کو تم نے کہاں پہنچا دیا ہے؟ وہ تمہارا مالک تھا کتّے کے بچّے!"

"آپ کی اطلاع غلط ہے جناب! مجھے ان کے بارے میں کچھ پتہ نہیں ہے۔ میں قرآن کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔"

"گویا ہندو ہو کر بھی تو قرآن کو کچھ سمجھتا ہے۔ اس کو اندر لے جاؤ اور اس کی کھٹمل پریڈ کراؤ۔ الٹا لٹکا دو اسے۔" اس نے سپاہی کو اشارہ کیا۔ سپاہی پہلے سے مستعد تھا۔ فوراً ہی بدری کو ساتھ لے کر اگلے کمرے کی طرف چل دیا۔ تین سپاہی اور ولی احمد نے ساتھ کر دیے تھے اور مجھے معلوم تھا کہ کھٹمل پریڈ سے اس کی کیا مراد ہے؟

"یہ معاملہ تو بہت زیادہ خطرناک ہو گیا ہے۔ اس کو ابھی ادھر کمرے میں ہی بٹھاؤ۔ راشدی صاحب آجائیں تو میں اُن سے بات کروں گا۔ یہ لوگ تو ہندوستان پاکستان کی جنگ کرا دیں گے۔ ایسے خطرناک مجرم میں نے کبھی نہیں دیکھے۔" اس کی یہ بات سن کر اس سپاہی نے جو مجھے اس کمرے تک لے گیا تھا، مجھے بھی جھٹکا دے کر اپنی زنجیر ہلائی اور ہم دونوں کو ولی احمد نے باہر نکال دیا۔

جب میں واپس اپنے ڈربے میں پہنچا تو میرا ذہن پراگندہ ہو چکا تھا۔ حیرت مجھے یہ تھی کہ اُن لوگوں نے ابھی تک میرا ریمانڈ نہیں لیا تھا۔ پتہ نہیں وہ کیا سوچ رہے تھے۔ بدری کو ان لوگوں نے گرفتار کر کے بہت اچھا کیا تھا۔ وہ چوگوٹھ کی جاگیر حاصل کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کا حویلی کے لوگوں پر کوئی اثر و رسُوخ نہیں تھا۔ ایک صرف فراست بیگم کو اس نے اپنے شیشے میں اتار لیا تھا اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ عورت اس کے چکر میں کیسے پھنس گئی تھی۔ حالانکہ ڈھلّوں صاحب اس پر بہت زیادہ بھروسہ کرتے تھے اور ہر بات میں اس سے مشورہ لیتے تھے۔ میں اسے بدری ہی کی کارستانی سمجھتا تھا کہ اس نے فراست کو اپنے ڈھنگ میں پھنسا لیا تھا۔ بدری ایسا آدمی کسی بھی عورت کی خلوت میں پہنچ سکتا تھا۔ اُسے سُود در سُود وصول کرنے کی عادت تھی۔ پتہ نہیں عالیہ اس تک کیسے جا پہنچی۔ اس کو یہ تو معلوم ہی تھا کہ ولایت علی کو کس نے اغوا کیا ہے۔ اس سے تو میں یہی سمجھتا تھا کہ اس نے ہی بدری کو اس واردات پر آمادہ کیا تھا مگر سب کچھ ابھی تک پردے میں تھا۔ جب تک بدری منہ نہ کھولے میں اس راز

سے واقف نہیں ہو سکتا تھا اور ولی احمد نے اسی لیے اس کی کھٹمل پریڈ کا حکم دے دیا تھا۔

بدری پر بلاشبہ یہ دن بہت بھاری تھا۔ اُسے وہ سب کچھ اُگل دینا ہو گا۔ جو وہ ڈھلوں صاحب کے پاس رہ کر کرتا رہا ہے۔ اس کے سوا تو کوئی چارۂ کار ہی نہیں تھا۔ ولی احمد اپنے ارادے میں اٹل تھا۔ اسے یقین تھا کہ صُورتِ حال اتنی سادہ نہیں ہے جتنی بظاہر نظر آتی تھی۔

اسی شام وہ خاتون پھر تھانے آ پہنچی۔ مجھے بلّو نے فوراً ہی آ کر بتا دیا کہ وہ آئی ہے۔ یہ ایسا معاملہ تھا جس پر میں کسی بھی طرح صبر نہیں کر سکتا تھا۔ بلّو پھر کہہ رہا تھا کہ وہ کار خود ڈرائیو کرتی آئی ہے اور میرے لیے کھانا لے کر تھانے پہنچی ہے۔

"اور اب کی بار ولی احمد نے کہا ہے کہ تمہیں اس سے ملا دیا جائے۔"

"تو پھر اس کو ادھر لے آؤ۔ میں اس سے ضرور ملوں گا۔"

"نہیں! تمہاری ملاقات دوسرے کمرے میں ہو گی۔ آؤ میرے ساتھ۔ ولی احمد بھی وہیں ہو گا۔"

"یہ بڑی مصیبت ہے یار! تم کسی آدمی کو اس کے اڈّے پر نہیں رہنے دیتے۔ چل میں تیرے ساتھ چلتا ہوں۔" میں بلّو کے ساتھ چل دیا۔ سامنے کے کمرے میں سپاہی اس وقت بھی دھرنا دے کر بیٹھے تھے اور میری ہر نقل و حرکت پر وہ نگاہ رکھتے تھے۔ ایک صرف بلّو ہی ایسا آدمی تھا جو مجھ سے بات کر سکتا تھا۔ ورنہ وہ قطعاً خاموش رہتے تھے۔ حکم انہیں یہ تھا کہ اگر میں وہاں سے بھاگنے کی کوشش کروں تو وہ بے دریغ مجھے گولی مار دیں۔

میں جب ولی احمد کے سامنے پہنچا تو وہ خاتون اس کے قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھی تھی۔ وہ سر سے پاؤں تک بُرقعے میں چھپی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے وہ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ میرے جسم اور چہرے پر ابھی تک لاٹھیوں اور بیدوں کے نشان صاف نظر آ رہے تھے اور وہ نشانات ابھی تک درد سے بھرے ہوئے تھے۔

"یہ خاتون تمہارے لیے کھانا لائی ہیں۔"

"مگر میں نے انہیں پہچانا نہیں! خاتون! آپ اگر اپنا تعارف کروا دیں تو میں ممنون ہوں گا۔"

وہ چھریرے بدن کی اونچی لمبی عورت تھی اور اس کا سراپا مجھے یہ احساس دلاتا تھا کہ اسے خود کو عیاں و پنہاں رکھنے کا ڈھنگ آتا ہے۔ میری بات سن کر وہ کرسی پر بیٹھ گئی، بولی۔ "میں آپ سے معافی چاہتی ہوں بھائی جان! مجھ سے زبردست غلطی [illegible] ہے۔ آپ وہ آدمی نہیں ہیں جن سے میں ملنا چاہتی تھی۔ [illegible] افسوس ہے انسپکٹر صاحب! ویسے آپ یہ کھانا انہیں دے دیں [illegible]"

"مگر آپ کے پاس تو اُن کی تصویر بھی ہے؟"

"جی نہیں! میرا خیال تھا کہ یہ وہی صاحب ہوں گے [illegible] ایسا نہیں ہے۔ اچھا! میں اب چلتی ہوں۔ آپ یہ کھانا کسی اور برتن میں ڈال لیں۔"

"آپ کے پہلے برتن بھی یہاں ہیں، وہ بھی لے جائیں اور برتن کسی ملازم کو بھیج کر واپس منگوا لیں۔" بلّو نے اپنی رائے پیش کی۔

"ہاں! یہ بہتر رہے گا۔ پلیز! آپ ان سے کہہ دیں کہ میں ان [illegible] بہت شرمندہ ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور اُن برتنوں کو سمیٹنے [illegible] جو بلّو نے اس کے سامنے لا رکھے تھے۔ اس کے رویّے پر ولی احمد [illegible] سخت پریشان تھا اور میری تو حیرت کم ہونے میں ہی نہیں آ [illegible] تھی۔ اس عورت کو سمجھ لینا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ اگر میں اس سے تنہائی میں ملتا تو شاید وہ کوئی کام کی بات مجھے بتا دیتی [illegible] تو یوں ہو گئی تھی جیسے اس سے واقعی سخت غلطی ہو گئی ہو۔ برتن [illegible] نے سمیٹ لیے تو اچانک اس کے ہاتھ سے وہ پوٹلی نیچے گر گئی [illegible] پھر سے بکھر گئے۔ وہ انہیں اٹھانے کے لیے نیچے جھکی تب میں نے دیکھا کہ اس نے اپنا مستور ہاتھ خاص طور پر میرے سامنے کھول دیا تھا۔ اس کی مٹھی میں ایک کاغذ تھا۔ مگر وہ کاغذ [illegible] نے پھینکا نہیں۔

بلّو بھی فرش پر سے برتن اٹھا رہا تھا۔ اس نے وہ [illegible] نہیں دیکھا۔ خاتون کا برقع کچھ اس قسم کا تھا کہ اس میں سے اس [illegible] کا چہرہ دیکھ لینا ناممکن تھا۔ بلّو نے سارے برتن ایک بار پھر گٹھری میں باندھ دیے تو وہ بولی۔

"اچھا انسپکٹر صاحب! خدا حافظ۔ میں آپ سے سخت شرمندہ ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے وہ گٹھری اٹھائی اور میرے قریب سے گزر کر باہر نکل گئی۔ مٹھی میں دبا کاغذ وہ ساتھ ہی لے گئی تھی۔

جب وہ باہر نکلی تو وہ ولی احمد بولا۔ "یہ کیا قصہ ہے جیلانی! میں عورتوں کا بہت احترام کرتا ہوں۔ مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ یہ کہاں سے آئی ہے مگر یہ تمہیں دیکھنا چاہتی تھی۔"

"میں خود حیران ہوں! مگر آپ کو کیسے پتہ ہے کہ یہ کہاں سے آئی ہے؟"

"یہ بادامی باغ کے ایک رئیس کے گھر سے آئی ہے۔ بہت صنعت کار ہے وہ۔ خواجہ غلام علی۔ یہ اس کی بیٹی ہے۔ سپاہی [illegible] میں نے اس کا پتہ کروا لیا ہے۔ مگر یہ آئی کس لیے تھی؟ [illegible] اس کا نام فوزیہ ہے۔"

"یہی تو میں سمجھ نہیں سکا ہوں۔ بہرحال کھانا تو میں کھا سکتا ہوں۔"

"ہاں! یہ لے جاؤ اور اپنے کمرے میں بیٹھ کر کھاؤ۔ راشدی صاحب اگر آ گئے تو تمہارا قصہ کل ہم نمٹا لیں گے۔"

اس کی بات سنی ان سنی کر کے میں بلّو کے ساتھ پھر اپنے کمرے میں جا بیٹھا تھا۔ کھانا ہم ساتھ ہی لے گئے تھے۔ جب میں نے وہ بڑے سے دسترخوان میں لپٹے برتن کھولے تو اس میں مجھے دو بھُنے ہوئے مُرغ ملے۔ کچھ پراٹھے بھی اس نے پکا دیے تھے۔ شیرینی بھی وہاں خاصی تھی۔ فرنی اس نے خاص طور پر بنائی تھی۔ بلّو کو میں نے پانی لانے کے لیے باہر بھیج دیا۔ فرنی پر چاندی کے ورق لگے تھے اور چاندی کے ورق کے نیچے مجھے اسی رنگ کا ایک کاغذ نظر آ رہا تھا۔ جس کو میں بلّو کے سامنے کھول نہیں سکتا تھا۔ جیسے ہی وہ باہر نکلا میں نے وہ کاغذ باہر نکال لیا۔ اس میں لکھا تھا۔

"آپ کو جس روز وہ لوگ کچہری لے جائیں گے، اسی روز ہمارے آدمی ان کی حراست سے چھڑا لیں گے۔ اگر یہ ممکن نہ ہوا تو آپ ولی احمد سے بات کریں، وہ سخت راستی آدمی ہے۔" ان لفظوں کے نیچے محض "آپ کی بہن جی" لکھا تھا۔

خط پڑھ کر میرا تو مغز الٹ گیا۔ وہ فریدکوٹ کی بہن جی یہاں کیسے آ پہنچی اور اس نے فوزیہ کو کیسے میرے پاس بھیج دیا؟ میں نے فوراً ہی اس رقعے کو جیب میں ڈال لیا۔ بلّو واپس آ رہا تھا۔ مگر پھر مجھے کسی بات کا ہوش نہیں رہا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کھانا میں نے کیسے حلق سے نیچے اتارا۔ ہر شے بے ذائقہ ہو گئی تھی۔ میرا ذہن مسلسل اس رقعے کی عبارت کو سمجھنے میں مصروف رہا۔ اس بہن جی نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ اس کی رسائی لاہور تک بھی تھی اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ یہ لوگ مجھے گرفتار کر چکے ہیں۔ وہ ایک ایک پل کی خبر رکھتی تھی مگر وہ تھی کون؟ اسے مجھ سے اتنی ہمدردی کیوں ہے؟ وہ جن بازوؤں کے حلقے میں پھرتی تھی۔ وہ تو میالزالی تک ہی محدود تھے۔ انہیں یہ کس نے بتا دیا کہ غلام جیلانی پکڑا گیا ہے۔ رقعہ بے حد مختصر تھا۔ صرف آدھ اِنچ اس کی لمبائی چوڑائی ہو گی۔ رنگ اس کا چاندی کے ورق ایسا ہی تھا۔ جس پر کسی نے خاص قلم سے وہ عبارت لکھ دی تھی۔ مجھے ان لوگوں نے اپنے طور پر خبردار کر دیا تھا کہ میں جب کچہری جاؤں تو چوکس ہو کر بیٹھوں۔ پتہ نہیں وہ کیا کریں گے؟ مجھے پولیس کی حراست سے کیسے نکالیں گے؟ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ حالات کیا سے کیا ہو جائیں۔ ورنہ بظاہر تو میں اپنی فاتحہ پڑھ ہی چکا تھا۔ میرا کوئی بھی پُرسانِ حال نہیں تھا۔ ہر قدم پر ذلت ہی ذلت تھی مگر وہ بہن جی کہتی تھی کہ وہ مجھے پولیس کی حراست سے رہائی دلوا دے گی تو وہ بھی ٹھیک ہی کہتی ہو گی۔

کھانا ختم ہوا تو بلّو سامان سمیٹ کر باہر نکل گیا۔ دروازہ اس نے اپنے پیچھے بند کر دیا تھا۔ حوالات میں وہ مجھے جان بُوجھ کر نہیں رکھتے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ وہاں صُورتِ حال کسی بھی وقت خراب ہو سکتی ہے۔

اگلے دن صبح ہی صبح تھانے میں کہرام مچ گیا۔ میرے ڈربے کے سامنے کے کمرے میں لیٹے سپاہی بستروں سے اُبل کر باہر نکل گئے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس وقت صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ سورج ابھی نہیں نکلا تھا۔ میں نے فرش سے اٹھ کر بتی جلائی اور بڑے غور سے اُن کی آوازیں سننے لگا مگر کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔

عین اس وقت بلّو بھی کہیں سے آنکھیں ملتا ہوا میرے دروازے پر آ گیا۔ تالے کی چابی اسی کے پاس ہوتی تھی۔ اس نے میرا دروازہ کھول دیا، بولا۔ "مجھے یقین تھا کہ تم جاگ گئے ہو گے۔ ادھر تو بڑا اندھیر مچ رہا ہے۔ کسی نے تھانے کے اندر آ کر بدری کو قتل کر دیا ہے۔ اس کا سر یہاں تک کھُلا ہے۔ کسی نے اُسے گولی ماری ہے۔" اس نے اپنی گدی پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"یہ..... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کس نے مار دیا ہے اس کو؟"

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے۔ اسے ہم نے حوالات میں رکھا تھا۔ رات وہاں بدری کے سوا کوئی بھی نہیں تھا۔ پہرے دار کا کہنا ہے کہ حوالات تک کوئی بھی نہیں گیا۔ مگر صبح دیکھا تو وہ مُردہ پڑا تھا۔ سارے تھانے میں افراتفری مچی ہے۔"

"یہ تو بہت بُرا ہوا ہے بلّو! وہی ایک کام کا آدمی تھا۔ اس سے سو راز معلوم ہو سکتے تھے۔"

"لو یہ سگریٹ پیو! تمہارے پاس ختم ہو چکے ہوں گے۔ یہ پیکٹ ہی رکھ لو۔" اس نے ماچس اور سگریٹ کا ایک پیکٹ مجھے تھما دیا۔ ایک اس نے خود سُلگا لیا۔ "تم آرام کرو۔ کوئی اور بات معلوم ہوئی تو میں تمہیں بتا دوں گا۔" یہ کہہ کر اس نے دروازہ بند کیا اور دوسری طرف نکل گیا۔

میں سگریٹ سلگا کر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ کمبل میں نے اپنے گرد لپیٹ لیا تھا۔ سردی زیادہ ہو گئی تھی۔ مگر صبح کے وقت تو اس کی یخ بستگی بہت ہی بڑھ جاتی تھی۔ اس بدری کے

قتل نے مجھے بھی حیران کر دیا تھا۔ کسی نے ڈھلوں صاحب کی گمشدگی کا راز ہمارے لیے مسئلہ لاینحل بنانے کی کوشش کی تھی۔ کوئی ایسے وقت میں حوالات کے دروازے تک پہنچا جب پہرے دار وہاں سے دو گھڑی کے لیے اِدھر اُدھر گیا ہوگا۔ بدری کی آواز بھی کسی نے نہ سُنی ہوگی۔ پستول میرے جیب شاہ ایسا ہوگا جو آواز نہیں دیتا ہے۔ بدری کمبلوں میں لپٹا لپٹا یا موت کے منہ میں جا گرا۔ پہرے دار یہ سمجھا ہوگا کہ وہ سو رہا ہے۔ اسی لیے اس نے رات کو اس کے بارے میں کسی تردّد کا اظہار نہیں کیا مگر جب صبح اس نے کسی ضرورت کے تحت اندر جھانکا ہوگا تو اسے بدری کی لاش ہی دستیاب ہوئی۔

کوئی آٹھ بجے کے قریب ولی احمد نے مجھے بُلوالیا۔ وہ برآمدے میں میز لگا کر بیٹھا تھا اور راشدی صاحب ابھی تک دورے سے واپس نہیں آئے تھے۔ میں پا بجولاں اس کے سامنے پہنچا تو کمبل میں نے اپنے گرد لپیٹ رکھا تھا۔

مجھے دیکھتے ہی وہ بولا "کچھ سنا ہے تم نے! بدری کو کسی نے تھانے کے اندر قتل کر دیا ہے۔"

"ہاں! بلّو نے مجھے صبح ہی بتا دیا تھا۔ مگر یہ بات میری سمجھ میں بالکل نہیں آ رہی ہے۔"

"ہم نے پہرے دار کو گرفتار کر لیا ہے۔ وہ بڑا معتبر سپاہی ہے۔ ڈیوٹی سے کبھی غافل نہیں ہوتا۔ مگر وہ کہتا ہے کہ اُسے کوئی خبر ہی نہیں تم مجھے بتاؤ کہ یہ کام کون کر سکتا ہے؟"

"میں کیا عرض کروں، ولی احمد صاحب! میں تو خود حیران ہوں۔ کہیں کوئی آدمی بازار میں اسے قتل کر دیتا تو ہم سمجھتے کہ کسی دشمن نے اسے مار دیا ہے مگر تھانے کے اندر اور وہ بھی حوالات میں! یہ ناممکن ہے۔"

"مگر یہ سب کچھ ہو چکا ہے اور اب ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ بدری مُند تھا۔ مگر اس کے گروہ کے اور لوگ کون ہیں؟"

"میرا خیال ہے کہ آپ کسی نہ کسی طرح ڈاکٹر عالیہ کو پکڑیں۔ وہ شاید بتا سکے کہ ہوا کیا ہے؟ اور بدری کے ساتھی کون تھے؟ اور یہ کن لوگوں کے کہنے پہ کام کر رہا تھا؟"

"ہاں! یہ بات تو صحیح ہے مگر اس کا بھی تو کچھ پتہ نہیں چل رہا ہے۔ اس تک ہم ابھی تک نہیں پہنچ سکے ہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ اس نے بھیس بدل لیا ہوگا۔ اس کے ساتھ جو عورتیں تھیں۔ وہ بھی بتا رہی تھیں۔"

"مگر وہ کہاں گئی ہیں؟ اب تک تو تم نے اُن کا بھی پتہ نہیں بتایا۔"

"میں نے کہہ تو دیا تھا کہ وہ میرے دوست کے ساتھ بھاگ گئی ہیں۔ اُن بدمعاشوں کی نیت خراب تھی اور وہ خرابی کے لیے ہی فرار ہو گئے تھے۔ مگر میں ان کا گاہک نہیں تھا۔ اس لیے پیچھے رہ گیا۔ پر مجھے یہ معلوم نہیں ہے کہ وہ گئے کہاں ہیں؟" میرے گھٹنے میں اس گھڑی درد سوا ہونے لگا تھا۔ صبح کی ٹھنڈک نے اس درد کو پھر سے جگا دیا تھا۔ میں کمرے میں ہوتا تھا تو اس پر کمبل لپیٹ کر رکھتا تھا تاکہ درد نہ جاگے۔ میں نے بڑی مشکلوں سے خود کو سنبھالا۔

ولی احمد میرے چہرے کو غور سے دیکھ رہا تھا، بولا "بلّو! اس کے کمرے میں آیوڈیکس اور سر کے لیے مرہم رکھوا دو۔"

"جی بہت اچھا چودہری صاحب!"

"ہم آج پھر عالیہ کا پتہ کرتے ہیں۔ وہ جب تک نہیں ملے گی۔ اس راز پہ سے پردہ نہیں اٹھ سکے گا۔ اس کے اور کون کون سے ٹھکانے ہیں؟"

"اس کی ایک کوٹھی گلبرگ میں تھی اور ایک شفا بار کلینک اس کی ملکیت تھا۔ وہ اب بھی اکثر وہاں جاتی رہتی ہے مگر ہم کوشش کے باوجود اس سے مل نہیں سکے۔"

"ہوں! ٹھیک ہے میں خود وہاں جاؤں گا۔ ہوٹل السوئر پر بھی ہم نگاہ رکھیں گے۔"

اتنے میں درّانی کمرے میں داخل ہوا۔ وہ وردی پہنے ہوئے تھا اور چہرے سے بالکل بیمار نظر نہیں آتا تھا۔ اس نے مجھے ولی احمد کے پاس بیٹھے دیکھ کر غضب ناک لہجے میں کہا "کتے کے بچے! تو ابھی تک یہاں صحیح سالم بیٹھا ہے۔ میں تیرا وجود برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کا ریمانڈ لیا ہے کہ نہیں؟"

"نہیں! کل میرا خیال ہے اسے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کریں گے۔" ولی احمد نے اٹھ کر اس کا استقبال کیا۔ مگر درّانی کی نظر دیکھ کر پھر بولا "دفع کریں درّانی صاحب! بس وہ ایک بات تھی، ہو گئی۔ لعنت بھیجیں، غصہ تھوک دیں، یہ بہت ہی کام کا آدمی ہے۔"

"میں نے سنا ہے یہاں کوئی بدری نام کا آدمی رات قتل ہو گیا ہے۔ اس کی لاش کہاں ہے؟"

"وہ ہم نے رپورٹ کے لیے بھیج دی ہے! اسی سلسلے میں میں اس سے بات کر رہا تھا۔ درّانی! معاملہ کچھ زیادہ ہی سنگین ہو گیا ہے۔"

"اس سے میں آج رات خود بات کروں گا۔ سارا قصور اسی کا ہے۔ بدری کو مروانے میں بھی اسی کا ہاتھ ہے۔ میں دیکھوں گا یہ آج رات مجھ سے کیسے بچ جاتا ہے۔" اس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر اپنی گردن کی طرف اٹھ گیا۔ جواب بالکل معمول کے مطابق نظر آتی تھی۔

ولی احمد نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ بلّو کو اشارہ کر کے اس نے مجھے وہاں سے اٹھا دیا۔ میں ایک بار پھر اپنے ڈربے میں جا گھسا۔

حیرت کی بات یہ ہوئی کہ اگلے چھ دن میں اُن لوگوں نے ایک بار بھی مجھے کمرے سے باہر نہیں آنے دیا۔ بلّو مجھے صبح و شام کا کھانا پہنچا دیتا تھا۔ اس کا رویّہ بھی بہت حد تک بدل گیا تھا وہ مجھ سے کوئی بات ہی نہیں کرتا تھا۔ بدری کے قتل نے صورتحال کو بہت زیادہ بدل دیا تھا۔ معاملات کی اصل نوعیت سے مجھے کسی نے آگاہ نہیں کیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی ذریعے سے کسی بہت بڑے انکشاف کی توقع رکھتے ہیں۔ مگر وہ راز ان پر ظاہر نہیں ہو رہا تھا۔ اگر وہ مجھے کچہری لے جاتے تو شاید اس خاتون کے رتبے کے مطابق "بہن جی" کسی نہ کسی طرح مجھے چھڑا لیتی۔ مگر اس کے بھی تمام ارادوں پہ پانی پھر گیا تھا۔ وہ خاتون دوبارہ تھانے نہیں آئی۔

بلّو نے مجھے مرہم لا دیے تھے۔ وہ میں اپنے زخموں پر برابر لگا رہا جس سے مجھے بہت سکون ملا۔ میرے زخم مندمل ہو گئے۔ درد بھی بڑی حد تک ختم ہو چکا تھا مگر میری تقدیر کا وہ کوئی فیصلہ نہیں کر رہے تھے۔ موت کا خوف اب میرے ذہن پر زیادہ ہی سوار رہنے لگا تھا۔ تنہائی نے مجھے خوار کر دیا تھا۔ خیال گھوم گھوم کر پھانسی کی کوٹھری کی طرف نکل جاتا تھا۔ وہ قیامت کے دن جو میں پہلے بھی وہاں گزار چکا تھا ایک بار پھر میرا مقدر بننے کو تھے۔ حیران کن بات یہ تھی کہ راشدی صاحب نے بھی نہیں پوچھا تھا کہ وہ جیلانی کیا ہوا؟ وہ بھی مجھے مکمل طور پہ فراموش کر بیٹھے تھے اور ستناجا صاحب کا یہ عالم تھا کہ وہ بڑے صاحب کے حکم کے بغیر پتّا بھی نہیں ہلاتے تھے۔ ایک دفعہ بھی اس دوران میں مجھے ان کی صورت نظر نہیں آئی۔ میں اگرچہ تھانے میں بند تھا مگر یوں لگتا تھا جیسے ساری دنیا ویران ہو چکی ہے۔ باہر کی دنیا سے میرا رابطہ صرف اتنا رہ گیا تھا کہ صبح و شام بلّو اپنی منحوس صورت مجھے دکھا جاتا تھا اور ایک جمعدار اپنی تھوتھنی لٹکاتا ہوا اندر آ جاتا تھا۔ اس کی بھی ایک سپاہی دروازے میں کھڑا برابر نگرانی کرتا رہتا تھا۔ اپنے بدن کو رواں رکھنے کے لیے میں صبح شام ہلکی ورزش کر لیتا تھا مگر جسم میں درد نے ڈیرے ڈال لیے تھے اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ ہڈیوں میں اتری ہوئی ان کی ضربوں کا اندمال کیا ہے۔ درد پوری طرح ختم ہونے میں نہیں آتا تھا اور جب میں ورزش کرتا تھا تو بدن میں ٹیسیں اٹھنے لگتی تھیں۔ پھر بھی وہ کسرت بے حد ضروری تھی۔ ورنہ میں تو جام ہی ہو کر رہ جاتا۔

ساتویں دن دو سپاہی میرے پاس آئے اور مجھے راشدی صاحب کے کمرے میں لے گئے۔ ان کے رویّے کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ ایک غضب ناک کیفیت ان پر طاری تھی۔ درّانی اور ولی احمد میز کے گرد اُن کے سامنے بیٹھے تھے۔

"کیا حال ہیں جوان!" راشدی صاحب نے میز پر نظریں جما کر کہا۔ وہ مجھے دیکھنے سے گریزاں تھے۔

"جی اچھا ہوں، اور ابھی تک زندہ ہوں۔"

"بات یہ ہے جوان! کہ ستناجا صاحب واپس نہیں آئے وہ تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکے۔ آج اُن کا فون آیا تھا۔ ہم تمہیں آج ہی جیل بھیج رہے ہیں، مجھے افسوس ہے مگر یہ مقدّر کا کھیل ہے۔ میں نے تمہارا اعتراف دیکھا ہے۔ بہت سی باتیں تم نے صحیح کہی ہیں مگر ہماری تفتیش کچھ زیادہ ہی خبر دیتی ہے۔ جب تک تمہارے ان جرائم کا فیصلہ نہیں ہو جاتا، وہ پہلی سزا پر عمل نہیں کریں گے۔ تمہاری بچت کی کوئی صورت نہیں ہے۔ تمہیں درّانی صاحب نے معاف کر دیا ہے۔ اگرچہ تم نے ان کی جان لینے کی کوشش کی تھی ولی احمد بھی تم سے نہیں بچ سکا، مگر اس نے بھی تمہیں معاف کر دیا ہے میں بھی تمہیں مُعاف کرتا ہوں۔ باہر ہماری وین کھڑی ہے۔ تم اس میں بیٹھ جاؤ اور خدا حافظ!" راشدی صاحب اب بھی میری طرف نہیں دیکھ رہے تھے۔

میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔ وہ میری تقدیر کا فیصلہ سُنا رہے تھے۔ انہیں واقعی افسوس ہو رہا تھا کہ وہ مجھے تختۂ دار کی طرف بھیج رہے ہیں مگر وہ کر بھی کیا سکتے تھے۔ ایک صرف ستناجا صاحب کی وجہ سے وہ رُکے ہوئے تھے۔ ورنہ وہ شاید یہ فیصلہ پہلے ہی سُنا دیتے۔

"ٹھیک ہے راشدی صاحب! میں آپ سب کا ممنون ہوں۔ میرے دن یہاں بہت اچھے گزرے ہیں۔ میں..... میں آپ سب سے معافی کا خواستگار ہوں۔"

راشدی صاحب نے پہلی بار نگاہ اوپر اٹھائی۔ میری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اُن کو بھی پشیمانی محسوس ہو رہی تھی مگر وہ ضبط کر کے بیٹھے رہے۔ "اچھا خدا حافظ! اس کو گاڑی میں بٹھا دیں درّانی صاحب! انسپکٹر بختیار اور مسیح الدین اس کے ساتھ جائیں گے۔" اس کی یہ بات سنتے ہی سپاہیوں نے مجھے کمرے سے باہر چلنے کا اشارہ کیا۔

میں گاڑی میں بیٹھا تو دونوں انسپکٹر اور چار سپاہی میرے اِردگرد بیٹھے۔ وہ سب کے سب مسلّح تھے اور میری بڑی ہی فائل بختیار کے ہاتھ میں تھی۔

میں بالآخر اپنے انجام تک پہنچ رہا تھا۔ بہت انحصار کرتا تھا

میں بڑے صاحب پر، مگر وہ بھی میری کوئی مدد نہ کر سکے۔ انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ میں اب اُن کے کام کا نہیں رہا۔ مجھ پر وہ زیادہ توجہ ڈالیں گے تو ان کا اپنا ہی کام خراب ہوگا۔ میری قدر و قیمت اُن کی نظروں میں ختم ہو چکی تھی۔ انہیں اور بھی ہزاروں کام تھے۔ کوئی چلی ہوئی گولی کے کارتوس پھر سے بندوق میں نہیں بھرتا ہے۔ ان کا کام آنے کے لیے میرے ایسے سیکڑوں لوگ موجود ہوں گے۔ میری وساطت سے وہ صرف ہادی علی اور رحمت علی سے گلو خلاصی چاہتے تھے۔ وہ دونوں آدمی میں نے ٹھکانے لگا دیے تھے۔ ان کو اب مجھ سے کیا کام ہو سکتا تھا۔ میں حکومت میں تو اُن کا پتی دار نہیں ہو سکتا تھا۔ میرے سب سے بڑے ہمدرد ڈھلوں صاحب خود اس چکر میں پڑ کر ذلیل ہو چکے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ وقت ضرور آئے گا۔ میں اسے روک نہیں سکتا تھا۔ پھانسی کا پھندا میری تقدیر میں تھا۔ اس سے مجھے کوئی مفر نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر کاش! میں ڈھلوں صاحب کے کسی کام آسکتا۔ گاڑی چاروں طرف سے بند تھی اور میں بندھے ہوئے کتے کی طرح ان کے درمیان پھنس کر بیٹھا تھا۔ اس کی جالیوں میں سے باہر کا منظر صاف نظر آتا تھا۔ مگر مجھے لگتا تھا جیسے میری آنکھیں دیکھنا بھول گئی ہیں۔ کوئی چیز میری نظروں میں نہیں آ رہی تھی۔ مجھے بہن جی کے وہ الفاظ یاد آتے تھے تو تصوّر کی اس تن آسانی پر میں آپ ہی آپ ہنسنے لگتا تھا۔ وہ بچاری بھلا میرے لیے کیا کر سکتی تھی۔ اسے تو یہی معلوم تھا کہ میں دوسرے تیسرے روز ریمانڈ کے لیے کچہری ضرور جاؤں گا۔ مگر وہ دن بھی گزر چکے تھے۔ وہ انتظار کر کے لوٹ گئے ہوں گے اور پھر انہیں میری ضرورت ہی کیا تھی مگر اس خاتون کو جس انداز سے اُن لوگوں نے میرے پاس بھیجا تھا۔ اس سے تو میں یہی سمجھا تھا کہ وہ میرے پل پل کی خبر رکھتے ہیں۔ مجھ پر انکی خاص نظر ہے۔ انہیں ضرور علم ہوگا کہ اب ٹھکانے والے مجھے کہاں بھیج رہے ہیں۔ وہ میرے حال سے اس قدر باخبر رہنے والی بہن جی، مجھے یوں موت کے منہ میں نہیں جانے دے گی۔ اسے اگر میرا اتنا ہی خیال تھا تو اب بھی وہ شاید میرے لیے کچھ کر لے۔ بعید از قیاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔ مگر جس معجزے کی میں توقع رکھتا تھا، وہ وقوع پذیر نہیں ہو رہا تھا۔ گاڑی بازار سے نکلی تو پھر جیل کی طرف چل دی۔ فاصلے سمٹتے جا رہے تھے۔ میری گردن اور موت کے اُس حلقے کے درمیان اب زیادہ دوری نہیں رہ گئی تھی۔ میرا دل بار بار ڈوب رہا تھا۔ زندگی کی شام ہوئی جاتی تھی۔ مجھے بالآخر ایک دن یوں مرنا تھا تو پھر..... پھر..... میرا اے کاش کہ مادر نہ زادے ..... میں نے کیا کھویا کیا پایا؟ کچھ بھی نہیں۔ زندگی کا حاصل محض ایک صفر تھا۔ میری ساری تگ و دو بے کار ہو گئی تھی۔ بہت سے لوگوں کے خون سے ہاتھ رنگنے کے باوجود میں خالی ہاتھ تھا۔ آسیہ کے لیے میں اب تک کچھ بھی نہیں کر سکا تھا۔ شاید میں نے اپنی اس تگ و دو سے اس کے مصائب میں اضافہ ہی کیا تھا۔ اسے میں کوئی سُکھ تو نہیں پہنچا سکا تھا۔ مجھ پر بہت سے لوگوں کا حق تھا۔ ان سب کے ہاتھ میری گردن تک پہنچتے تو بھی میں سمجھتا کہ میں نے حق ادا نہیں کیا ہے مگر دینے کے لیے تو جیلانی کے پاس ایک ہی جان تھی، سو میں ان کے حوالے کرنے جا رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا، وہ جلدی ہی میرا فیصلہ کر دیں گے۔ پہلی سزا ہی میرے لیے بہت کافی تھی۔ انہیں کسی قسم کے سوچ بچار کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ کاش! میں نے بہن جی کے کہنے کے مطابق ولی احمد سے اپنی جان کا سودا کیا ہوتا۔ وہ کہتی تھی کہ ولی احمد بہت زیادہ راشی ہے۔ میں اسے دس لاکھ بھی دے دیتا تو وہ بخوشی مجھے اس حبس سے رہائی دلا دیتا۔ مگر میرا بُرا ہو، میں تو بھی نہ کر سکا۔ اسے میں نے اور زیادہ اپنا مخالف بنا لیا تھا۔ میری کوئی بھی تدبیر کارگر نہیں ثابت ہوئی تھی۔

گاڑی اب بڑی سڑک پر جا پہنچی تھی۔ میرے وجود کے سائے تو کہ زمین دوز ہونے لگے تھے۔ جیل کے تصوّر سے ہی میں لرز اٹھتا تھا۔ اس کے خوف سے عاجز آ کر ہی تو میں نے اتنے سارے سپاہیوں کو تہہ تیغ کر دیا تھا۔ جب بھی میرا اُن سے مقابلہ ہوا، میں نے جان ہتھیلی پر رکھ کر خود کو بچا لیا۔ مجھے اس پھندے کی صورت سے نفرت تھی جس کا مطالبہ یہ تھا کہ آدمی خود چل کر اس تک پہنچے۔ جلاد کے ہاتھوں کا لمس ہی آدمی کو وحشت میں مبتلا کر دینے کے لیے بہت کافی ہے اور وہاں تو ایک نہیں بہت سے لوگ آدمی کو ناکے گھاٹ اتار دینے کے لیے موجود ہوتے ہیں۔ وہ صبح سویرے خدا کا نام لے کر تختۂ دار کی طرف چلتے ہیں۔ ان میں مجسٹریٹ بھی ہوتا ہے اور ڈاکٹر بھی۔ جیل کا سپرنٹنڈنٹ بھی اور سپاہی بھی۔ وہ آدمی کی موت سے شاید بے حد لطف اٹھاتے تھے۔ وہ اسی لیے وہاں جمع ہوتے تھے تاکہ اس کے مر جانے کی تصدیق کر دیں اور خود دیکھ لیں کہ کسی ماں کے بطن سے جنم لینے والا آدمی کیسے موت کے مکھ میں داخل ہوتا ہے۔ بلاشبہ وہ اس تماشے سے بے حد لطف اندوز ہوتے تھے۔ وہ قرآن جو میں نے پچھلی سزا کے دوران جیل کی اس کوٹھری میں ختم کیے، وہ مجھے اب یاد آ رہے تھے۔ قرآن کی ایک ایک آیت کا مفہوم میری سمجھ میں آتا تھا۔ میں بہت رویا تھا، بہت گڑگڑایا تھا۔ پھانسی کی کوٹھری کو میں نے ماتم کدہ بنا دیا تھا۔ اور شاید خدا نے میری اسی آہ و زاری سے متاثر ہو کر مجھے ایک موقع فراہم کر دیا تھا۔ مگر اب..... اب میں کہاں اس کے سامنے فریاد کناں ہو سکوں گا۔ پھانسی کی کوٹھریاں میری نظر میں تھیں۔ ایک سے ایک گناہ گار وہاں بند تھا مگر وہ سب ہمت ہارے بیٹھے تھے۔ اُن کی آس، اُن کی امید صرف اور صرف قرآن پر ہی منحصر تھی۔ قرآن کو وہ یوں گلے لگاتے تھے، جیسے تمام دروازوں کی کلید اسی میں بند ہے۔ ان کی آہ و فغاں، ان کی گریہ زاری، ان کا نالہ و شیون اب بھی میری نگاہ میں تھا۔ مکیان کا شور اور زیادہ بالا و بلند ہو کر میرے تصور میں ابھرنے لگا تھا اور اب میں پھر اسی قیامت کے سپرد کیا جا رہا تھا۔ میں نے چاہا کہ میں ان سپاہیوں کا گلا دبا کر وہاں سے نکل جاؤں مگر ان کی بندوقیں مسلسل مجھ پر تنی ہوئی تھیں۔ میں جنبش بھی لیتا تھا تو وہ چوکنے ہو جاتے تھے۔

اچانک گاڑی کا پچھلا پہیہ پنکچر ہو گیا۔ ایک دردناک آواز فضا میں ابھری اور اس کے ٹائر سے ہوا نکل گئی۔ گاڑی چند ہی قدم دُور جا کر رک گئی۔ ڈرائیور نے زوردار جھٹکے سے بریک لگایا تھا۔

"یہ کیا ہو گیا ہے بختیار! گاڑی کیسے پنکچر ہو گئی؟" انسپکٹر مسیح الدین نے حیران ہو کر کہا مگر ان میں سے کوئی بھی گاڑی سے نیچے نہیں اُترا۔ وہ اور زیادہ مستعد ہو کر میری نگرانی کرنے لگے۔ ڈرائیور البتہ اپنی سیٹ سے اُتر کر پہیے کو دیکھنے لگا۔

"پہیہ بدلنا پڑے گا باجوہ صاحب!" وہ مسیح الدین سے مخاطب تھا اور صحیح سالم پہیہ شاید گاڑی کے اندر رکھا تھا۔ وہ اسے اتارنے کے لیے پچھلی طرف آیا تو درّانی موٹر سائیکل پر سوار ہو کر وہاں آ پہنچا۔ معلوم یہ ہوا کہ وہ برابر ہمارا پیچھا کرتا آ رہا تھا۔

"اوئے! یہ کیا ہوا ہے بھئی؟"

"صاب جی! پہیہ پنکچر ہو گیا ہے۔" ڈرائیور نے کہا۔

درّانی موٹر سائیکل سے اُترا تو گاڑی کے عقبی دروازے کو ڈرائیور نے کھول دیا۔ مگر جیسے ہی وہ ٹائر نکالنے کے لیے اندر گھسا، درّانی نے کھلے دروازے کے اندر جھک کر ایک پلاسٹک کا لفافہ سپاہیوں کی طرف پھینکا۔ مسیح الدین نے اسے پکڑنا چاہا مگر جیسے ہی اس کا ہاتھ لفافے پر پڑا وہ زبردست دھماکے سے پھٹ گیا۔ اور اس میں سے اتنا دبیز دھواں نکلنے لگا کہ وہ سب خوفزدہ ہو کر گاڑی کی دیواروں تک سرک گئے۔ مگر دھواں برابر بڑھ رہا تھا۔ عین اس وقت گاڑی کے اندر ایک اور دھماکا ہوا اور وہاں چاروں طرف آگ لگ گئی۔ ہمارے لیے اپنی جان بچانا مشکل ہو گیا۔ ڈرائیور نے گھبرا کر باہر چھلانگ لگائی تو وہ سپاہی بھی اس کے پیچھے کودنے لگے مگر آگ انہیں راستہ نہیں دیتی تھی۔ انھیں اس طرح افراتفری میں دیکھ کر میں نے موقعے سے فائدہ اٹھایا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر آگ سے خود کو بچاتے ہوئے ایک دم گاڑی سے باہر چھلانگ لگا دی۔ اس وقت تک مسیح الدین اور بختیار بھی نیچے اتر چکے تھے۔ جیسے ہی میں باہر آیا وہ آگ میں جھلستی گاڑی کو بھول کر پلٹے تو میں نے دیکھا کہ درّانی نے پولیس کا بھاری بھرکم ڈنڈا مسیح الدین کے سر پر دے مارا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے بختیار کو جا لیا۔ اتنی جگہ نہیں رہی تھی کہ وہ مجھ پر گولی چلا سکتا۔ حالانکہ پستول اس نے نکال لیا تھا۔ میں نے بختیار کو گردن سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور اس کی رگِ احساس کچھ اس طرح مسلی کہ وہ دوبارہ نہیں اُٹھ سکا۔ گاڑی کے اندر افراتفری مچی تھی۔ حیرت مجھے یہ تھی کہ وہ درّانی میرا اتنا بڑا ہمدرد کیسے بن گیا۔ گاڑی کی آگ برابر بڑھ رہی تھی۔ سپاہی ابھی باہر نہیں نکل سکے تھے کہ درّانی نے فوراً ہی اس کا عقبی دروازہ بند کر کے باہر سے کنڈی چڑھا دی مگر سپاہیوں کی تو جان پر بن آئی تھی۔ اُن میں سے ایک نے فوراً ہی جالی میں سے ہاتھ باہر نکال کر دروازہ کھول لیا اور وہ تیزی سے نیچے اُترے۔ اُن کی بندوقیں گاڑی میں ہی رہ گئی تھیں مگر درّانی نے انھیں دم نہیں لینے دیا۔ گھما کر اس نے اپنا ڈنڈا ان پر چلا دیا۔ دائیں بائیں کھڑے دونوں سپاہی نیچے گر گئے۔ تو اس نے پھر دروازہ بند کرنے کی کوشش کی مگر اندر ابھی چار سپاہی اور موجود تھے۔ اور وہ اتنے جل چکے تھے کہ جب باہر کودے تو وہ خود کو سنبھال نہ سکے۔ درّانی نے ان پر بھی ڈنڈا چلا دیا۔ عین اس وقت دور سے ہمیں ایک کار اپنی طرف بڑھتی نظر آئی۔ درّانی بولا۔ "اوئے بھانویں! نکل چل جلدی یہاں سے۔ تیرے مامے پھر تجھے پکڑ لیں گے۔"

وہ درّانی کی نہیں بلکہ آبی کی آواز تھی۔ وہ مجھے موٹر سائیکل کی طرف گھسیٹنے لگا تھا۔ فوراً ہی اس نے انجن اسٹارٹ کیا، بولا۔ "اپنی جان بچا لے جیلانی! جلدی کر۔" میں جب اس کی آواز پہچان کر فوراً ہی موٹر سائیکل پر بیٹھا تو آبی اسے لے کر وہاں سے ہوا ہو گیا۔

پولیس کی گاڑی مسلسل جل رہی تھی۔ اور اس میں سے سپاہی پاگلوں کی طرح چھلانگیں لگا رہے تھے۔ نہ ان کا دم درست تھا نہ اُن کے کپڑے۔ اُن میں آگ لگ چکی تھی۔ آبی موٹر سائیکل اُڑاتا ہوا بائیں ہاتھ کی سڑک پر نکلا چلا گیا۔

"یہ تو کہاں سے نکل آیا بدمعاش! میں تو تیری فاتحہ ہی پڑھ چکا تھا۔" میں نے پولیس کی گاڑی سے کافی آگے نکل آنے کے بعد آبی کو بانہوں میں بھینچتے ہوئے کہا۔

"خاموش بیٹھا رہ اور استغفار پڑھ۔ خدا تیرے گناہ معاف کرے۔" اس نے موٹر سائیکل کی رفتار اور زیادہ تیز کر دی۔ کوئی پندرہ منٹ میں ہم پندرہ میل آگے نکل آئے۔ آبی نے یوں کیا کہ جب آبادی ختم ہوئی تو وہ دائیں ہاتھ مڑ گیا۔ موٹر سائیکل اس کے بائیں نئی تھی اور اس کا حوصلہ اس سے بھی زیادہ نیا تھا۔

کوئی آدھ گھنٹے بعد آبی مجھے ساتھ لے کر بی آر بی نہر پار کر گیا۔ اب ہم ایک گھنے جنگل کے کنارے کھڑے تھے۔ آبی نے موٹر سائیکل بند کی اور مجھے بڑے غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "تو

صحیح سالم تو ہے نا! بہت ذلیل کیا ہے تو نے مجھے۔ تیرا تو آج وہ جھٹکا ہی کر دیتے۔" میرے ہاتھ اس نے دو اینٹوں کے درمیان رکھ کر میری ہتھکڑی کاٹ ڈالی۔ وہ مسکرانے لگا تھا۔

"تو نے یہ درّانی کی صورت کیسے اپنالی، یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی ہے۔"

اس نے فوراً ہی سر پر سے وگ قسم کی کوئی چیز اتاری۔ اس کے ساتھ ہی اسکے چہرے سے ایک خاص قسم کی جھلی بھی اُتر گئی۔

"یہ دیکھ! وہ جو تھی نا نرگس، یہ سارا کام اُسی نے کیا ہے۔ وہ جانتی تھی کہ آدمی کو نیا روپ کیسے دیا جا سکتا ہے۔ عالیہ کو بھی اُسی نے یہ سارے گر سکھائے تھے۔ میں بھی اُسی کے ذریعہ ایک میک اپ مین تک پہنچا تھا۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تو کراچی نہیں گیا تھا۔"

"کہاں یار! میں تو تیرے ہی چکّر میں پھنسا رہا۔ کراچی میں میں صرف ایک ہی دن رہا۔ دوسرے دن میں اُن کو ساتھ لے کر پھر لاہور آ پہنچا اور ایک ہوٹل میں جا ٹھہرا۔ اگلی صبح مجھے معلوم ہُوا کہ وہ تیرا بیڑا غرق کر چکے ہیں۔ دراصل تیری وہ گاڑی مجھے پُل پار کھڑی نظر آ گئی تھی۔ میرا ہوٹل وہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ میں اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ وہ تجھے گرفتار کر چکے ہیں۔ اس کی تصدیق تھانے کے ایک سپاہی نے بھی کر دی۔ وہ میرا یار بن گیا تھا۔ بس اسوقت سے میں تیری نگرانی کر رہا تھا۔ آج تجھے وہ جیل لے جا رہے تھے۔ میں تو تھانے کے اردگرد ہی پھرتا رہتا تھا۔ کسی اطلاع کے بغیر ہی وہ تجھے وہاں بھیج رہے تھے۔ میں نے گاڑی میں تجھے دیکھ لیا تھا۔ یہ موٹر سائیکل میں نے تیرے ہی لیے خریدی تھی۔ مجھے اپنا حُلیہ بدلنے میں صرف دس منٹ لگے۔ وردی میرے پاس پہلے ہی موجود تھی۔"

"کہیں اُس بدری کو تُو نے تو قتل نہیں کیا ہے؟"

"نہیں بھئی! مجھے سپاہی نے بتا دیا تھا۔ مگر اس میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔"

"یہ وردی تجھے کہاں سے ملی؟"

"یہ میں نے ایک ہی دن میں سلوالی تھی۔ کپڑا خود خریدا تھا میں نے۔ کیسا لگتا ہوں اس میں؟" اس نے وردی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے۔ تو سچ مچ کا درّانی نظر آتا ہے۔ اس کا بدن بھی تیری طرح ہی ہے۔ کمال ہے یار! میں تجھے بالکل ہی نہیں پہچان سکا تھا۔ اگر تو آواز نہ دیتا تو میں شاید درّانی کے سامنے مرغی بن جاتا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ تو اِدھر ہی پھر رہا ہے۔"

"چل اِدھر آ۔ یہ گاؤں ہے نا اِدھر ابری۔ میرا ایک دوست رہتا ہے یہاں۔ ہم اس کے پاس جا ٹھہرتے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے موٹر سائیکل پر رکھے ایک اٹیچی کیس میں سے جوڑے نکالے ایک اس نے مجھے دے دیا اور دُوسرا خود لے لیا۔ بولا "یہ حُلیہ بدل لے، ہماری بچت اسی میں ہے۔" یہ کہہ کر وہ ایک درخت کی اوٹ میں جا پہنچا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم اپنا لباس تبدیل کر چکے تھے۔ "یار! ان ڈرامہ سازوں کا سامان بنانے والے تو کمال کر دیتے ہیں۔ میں نے درّانی کی ایک تصویر اتار لی تھی۔ وہ بازار میں جا رہا تھا کہ میں نے اُسے کلک کر لیا۔ وہ کیمرا میرے پاس ہی ہے، چھوٹا سا باکس کیمرا ہے مگر ہے بہت عُمدہ۔ وہ تصویر میں نے اس میک اپ مین کو دکھائی تو اس آدمی نے میرے لیے ایسا چہرہ بنا دیا کہ کوئی پہچان ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ فلموں میں میک اپ کا کام کرتا ہے کبھی زمانے میں وہ سالا سائیکل مرمت کرتا تھا مگر اب وہ زبردست میک اپ مین ہے۔"

"واقعی یار! اس نے تو کمال کر دیا ہے۔ میرا خیال ہے میں بھی اس سے اپنا حُلیہ بدلواؤں۔"

"ہاں کسی دن اس کے پاس چلیں گے۔ میرا خیال ہے ہم فقیر بن جاتے ہیں۔ مگر سنو، اِدھر تو ایک زبردست واقعہ پیش آ چکا ہے۔"

"کیا مطلب! میں سمجھا نہیں؟" اس کی موٹر سائیکل اب میں چلانے لگا تھا۔ وہ میرے پیچھے بیٹھا تھا۔ بولا "میں عالیہ تک جا پہنچا تھا۔ وہ شاہ نور اسٹوڈیو کے عقب میں رہ رہی تھی۔ یہ چار دن پہلے کی بات ہے۔" میں نے موٹر سائیکل بند کر دی۔ اس کی بات بے حد اہم تھی اور اسے میں اطمینان سے سُننا چاہتا تھا۔

وہ پچھلی سیٹ سے اُتر گیا، بولا "یہ چار دن پہلے کی بات ہے۔ عالیہ اس کوٹھی میں مسز تابش الوری کے نام سے رہ رہی تھی مگر میں اسے پہچان چکا تھا۔ رات کو ایک بجے کے قریب میں اس کے بنگلے پر پہنچا تو میں نے دیکھا کہ میرے اندر جانے سے پہلے ہی چار آدمی بنگلے میں کود گئے۔ ان کا پیچھا کرتے ہوئے میں عمارت کے قریب جا پہنچا تو میں نے دیکھا کہ عالیہ کے دو ملازم اُن کے سامنے آ گئے۔ مگر وہ انھیں ادھیڑتے ہوئے اندر جا پہنچے۔ میرا خیال ہے کہ وہ دونوں قتل ہو گئے تھے۔ خنجر اندھا دھند چلے تھے۔ کسی کو گولی چلانے کی فرصت ہی نہیں ملی۔ اندر جا کر اُن چاروں نے عالیہ کو بستر سمیت اٹھا لیا اور اُسے ساتھ لے کر وہ سیدھے اپنی گاڑی تک جا پہنچے۔ میں بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ عالیہ کو لے کر اسی وقت باہر نکل گئے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہو سکی۔ میں وہاں تک موٹر سائیکل پر گیا تھا۔ جب میں اُن کے پیچھے لپکا تو مجھے محسوس ہوا کہ اُن کی گاڑی کا میں کسی طرح مقابلہ نہیں کر سکتا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ

کون لوگ تھے۔ وہ عالیہ کو لے کر ایسے غائب ہوئے ہیں کہ ان کا اب تک پتہ نہیں چل سکا ہے۔"

"یہ تو کمال کی بات سُنائی ہے تم نے! وہ کون ہو سکتے ہیں؟ مجھے تو اس پر اعتبار ہی نہیں آتا ہے۔"

"میں نے خود سب کچھ دیکھا ہے بھائی! مجھے بھی اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آتا تھا مگر وہ واقعی اغوا ہو گئی ہے اور کسی نے ان کے بارے میں پولیس کو اطلاع بھی نہیں دی۔ میں فون پر کئی لوگوں سے پوچھ چکا ہوں۔"

"میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آیا ہے آبی! وہ کوئی اس کے نئے ہی دشمن ہوں گے۔ چل اُدھر گاؤں کی طرف نکل۔ وہاں جا کر بات کرتے ہیں۔"

کچھ ہی دیر بعد ہم جنگل کے کنارے کنارے چلتے ہوئے ابری جا پہنچے۔ آبی کے دوست کا نام جمیل تھا۔ وہ گاؤں میں زرگر کی دکان کرتا تھا۔

آبی کو دیکھ کر جمیل بہت خوش ہُوا۔ دکان سے اُٹھ کر وہ اسی وقت ہمیں اپنے گھر لے گیا۔ چار صاف ستھرے پختہ کمروں کا مکان تھا اس کے پاس۔ ایک میں اس نے ہمیں ٹھہرا دیا۔ اُس کی بیوی دُوسرے حصّے میں تھی، اس سے بنوا کر وہ ہمارے لیے چائے لے آیا، بولا "کھانا تو ابھی تیار ہو رہا ہے۔ آپ یہ چائے پئیں آبی صاحب! بہت دنوں بعد آنا ہوا ہے آپ کا۔"

"ہاں یار! بس میں اِدھر آ ہی نہیں سکا۔ تم سناؤ۔ خوب چاندی بنا رہے ہو نا یہاں۔ تیرے مزے ہیں پیارے۔"

"بس جی آپ کی مہربانی ہے۔ آپ نے میرا خیال ہے یہ دھندا چھوڑ دیا ہے۔"

"ہاں۔ بات کچھ ایسی ہی ہے۔ یہ میرے دوست ہیں غلام جیلانی۔ ان کی ادل میں ایسا پھنسا کہ پھر کسی بات کا ہوش ہی نہیں رہا۔"

"اچھا ہے کسی نہ کسی کے مرید تو آپ ہوئے۔ میں ابھی دُکان پر جاؤں گا۔ کچھ کام ہے، دو بجے تک آ جاؤں گا۔ آپ اتنے میں آرام کر لیں۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو اپنی بھابی کو بتا دیں۔ بے غاورت! سُن رہی ہو۔ یہ میرے یار آئے ہیں، ان کا خیال رکھنا۔ کھانا پک جائے تو انہیں دے دینا۔" اس نے بڑے رعونت بھرے انداز سے اپنی بیوی کو پکار کر کہا۔

"سُن رہی ہوں، زیادہ بک بک کی ضرورت نہیں ہے، میں خود کھانا دے دوں گی۔" وہ دوسرے کمرے میں ہماری باتیں سن رہی تھی۔ جمیل نے اس کی بات پر توجہ نہیں دی، بولا "میں جا رہا ہوں اب۔ ان سے پردے شردے کی ضرورت نہیں ہے۔"

یہ کہہ کر جمیل اسی وقت باہر نکل گیا۔ آدمی وہ بہت ہی خوش اخلاق تھا۔ بیوی سے اپنی بے تکلفی کا اظہار وہ یوں کر گیا تھا کہ وہ اسے بُلاتا ہی "بے عورت" کہہ کر تھا۔

"کیوں کیسا لگا یہ آدمی؟ اس عورت کو اس نے بغیر نکاح ہی گھر میں ڈال رکھا ہے۔ میرا خیال ہے یہ چار سال سے اس کے پاس ہے مگر اس سے نکاح نہیں کرتا ہے یہ۔"

"اچھا! اس کی کیا وجہ ہے؟ کوئی خاص بات ہو گی۔"

"بدمعاش آدمی ہے یار! کہتا ہے جب دل بھر جائے گا، تو اس کو چھوڑ کر کوئی اور لے آؤں گا مگر گاؤں والوں کو اس کا علم نہیں ہے۔"

"تیرے یار بھی کمال کے آدمی ہیں آبی!"

"اچھا دفع کر اس بات کو، مجھے یہ بتا تیرے ساتھ کوئی زیادتی تو نہیں کی اُن لوگوں نے؟"

"مت پوچھ یار! اِدھر بڑا ڈرامہ لگا رہا۔" یہ کہہ کر تھانے کے اندر مجھ پر جو کچھ بیتی تھی، وہ میں نے اسے سنا دی۔ وہ بڑے غور سے میری باتیں سُنتا رہا۔ آخر میں جب میں نے بہن جی کا اس سے ذکر کیا تو وہ حیرت زدہ ہو کر بولا۔

"یار! اس بہن جی نے تو ہمیں پریشان کر دیا ہے آخر وہ چاہتی کیا ہے۔ اس کا تو کوئی آدمی مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔"

"میرا خیال ہے کہ وہ تھانے والوں کے پروگرام سے

بے خبر رہے ورنہ وہ ضرور سامنے آتے۔ ہمیں اس خاتون کا ضرور پتہ کرنا چاہیے کہ آخر وہ ہے کون؟"

"ہاں یہ تو بہت ضروری ہے۔ میں آج ہی رات اس کے پاس جاؤں گا۔ فوزیہ نام بتایا ہے ناتم نے؟ خواجہ غلام کی بیٹی اور وہ بادامی باغ میں رہتی ہے؟"

"ہاں، وہ کوئی بہت بڑا صنعتکار ہے۔ اس سے ضرور ملو یار۔ ہوسکتا ہے وہ بہن جی کے بارے میں کچھ بتا سکے۔ تم یہ بتاؤ کہ رقم تم کراچی سے لے آئے تھے؟"

"ہاں! وہ تو بہت آسان رہا۔ رقم انھوں نے لاہور بھیج دی ہے، اور ساری کی ساری تمھارے حساب میں جمع ہو چکی ہے۔"

"اس کا کیا مطلب ہے؟ اسے میرے حساب میں جمع کرانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"یہی بہتر تھا جیلانی! میرے کس کام کی تھی وہ۔"

"نہیں یار! ایسا نہ سوچو۔ میرا تمھارا مرنا جینا ایک ہے۔ ایسی بات نہ کرو جس سے میرا دل دکھ جائے۔" میں نے اس سے کہا۔ "کمال کرتے ہو تم بھی۔ خیر دیکھ لیں گے، میں بہرحال اسے استعمال نہیں کروں گا مگر وہ عورتیں کہاں ہیں اب؟"

"وہ تو میں نے گاؤں پہنچا دی ہیں ہاں، وہاں مزے سے رہ رہی ہیں۔ ماں جی کا خیال ہے کہ میں اُن سے شادی کر چکا ہوں حالاں کہ صرف نصف شادی کی ہے میں نے، پوری تو بعد میں کروں گا۔"

"بہت خبیث آدمی ہو تم۔ ایسی آوارہ عورتیں وہاں کب تک جمع کرتے رہو گے۔ تین تو اکھٹی ہو ہی چکی ہیں۔"

"ہاں یار! دراصل وہ غلط کتی تھیں اُن کا بھی والی وارث کوئی نہیں تھا۔ ماں جی اُن کا بہت خیال رکھتی ہیں۔"

"چلو اچھا ہے، وہاں تمھارا ایک زنانہ یتیم خانہ کھل چکا ہوگا۔ مگر اس ولی احمد کو پتہ ہے کہ آبی کون ہے اور اس کی ماں کہاں رہتی ہے؟"

"ضرور پتہ ہوگا۔ مگر۔۔۔ مگر میرا خیال ہے وہ وہاں نہیں جائے گا۔ ڈھلوں صاحب نے ماں جی کو بہت تحفظ دیا تھا۔ ان کا کچھ پتہ چلا یا نہیں؟"

"نہیں۔ ملوترا کا ہی پتہ چلتا ہے کہ وہ اُن کے پاس جا پہنچے ہیں۔ خدا ہی خیر کرے۔"

"میرا خیال ہے ہم آج رات یہاں سے نکل چلیں۔ پولیس ہمارا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ کام ہم نے بہت ہی خطرناک کیا ہے۔ وہ اسے اپنی توہین سمجھیں گے۔"

"بات تو کچھ ایسی ہی ہے تم پہلے اس فوزیہ کا پتہ کرو۔ اس کے بعد ہی ہم کوئی فیصلہ کر سکیں گے۔ بہتر ہوگا کہ ہم بارڈر پار کر جائیں کچھ دیر کے لیے تو یہ معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے گا۔ وہاں ہم ملوترا سے بھی نمٹ لیں گے۔"

"ہاں! تم ٹھیک کہتے ہو۔ وہ جانڈی والے سکھ ادھر آتے رہتے ہیں۔ جمیل کے یار ہیں وہ۔ اُن کے ساتھ مل کر ہم دوسری طرف جا سکتے ہیں۔"

اتنے میں ہمارے کمرے کا دروازہ کھل گیا۔ یوں لگا دھنک کے سارے ہی رنگ ہمارے سامنے آ گئے ہیں۔ ایک بہت سجی سنوری عورت اندر آ گئی۔ وہ جمیل کی بیوی تھی۔ وہ آسمانی رنگ کی ساری میں ملبوس تھی۔ ابری گاؤں میں کسی اس جیسی کا تصور بھی ہم نہیں کر سکتے تھے اور وہ زرگر کے گھر میں رہ رہی تھی۔ ہم دونوں اپنی جگہ سے اٹھ گئے۔ اس نے ہمیں مرعوب کر لیا تھا۔ اس کا رعب حسن مجھے بھی یہ احساس دلاتا تھا کہ میرا پہلو ازل سے خالی ہے اس جیسی میں نے خال خال ہی دیکھی تھی۔ مجھے جمیل کی قسمت پر بہت رشک آیا۔ اس سالے نے کمال کر دیا تھا۔ اس سے تو آدمی کو ہر مہینے نکاح پڑھوا لینا چاہیے تھا۔ وہ ایسی ہی تھی کہ اس سے آدمی کو بار بار سلسلۂ مناکحت میں بندھنا پڑتا تھا ورنہ وہ دلوں کو بے ایمان کر دیتی تھی۔

"میں معافی چاہتی ہوں بھئی جان! دراصل مرغی مجھ سے پکڑی نہیں جاتی، آپ ذرا میری مدد کریں۔"

تو یہ بات تھی۔ وہ ہمارے کھانے کے لیے پریشان ہو رہی تھی۔ میں بھی کہوں کہ صحن میں مرغی کے بار بار چلانے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔ پتہ یہ چلا کہ وہ اس کے پیچھے بھاگتی پھرتی تھی مگر وہ ہر بار کھمب چھڑا لیتی تھی۔

"اس بچاری کا کیا قصور ہے بی بی! کیوں ذلیل کرتی ہو اسے! کھانے میں ہم دال بھی کھا سکتے ہیں۔"

"جی نہیں! جمیل سنگھ ہے نا۔ وہ کہہ گیا ہے۔ اس کا حکم تو ماننا ہی پڑتا ہے۔"

"جمیل سنگھ! تو گویا یہ نام رکھا ہے آپ نے اس کا۔ جاؤ بھئی ان کو مرغی پکڑ دو۔" میں نے آبی کو اس کام پر اکسایا۔

"نہیں یار! میں یہ کام نہیں کر سکتا۔ میرا دل بہت کمزور ہے۔" آبی دھپ سے کرسی پر بیٹھ گیا۔

وہ ہنسنے لگی۔ بڑی رَل ترل تھی اس کی ہنسی میں۔ ندیوں کے پانی کی جھنکار سنائی دیتی تھی اس میں۔

"چلیں میں آپ کی مدد کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں اس کے ساتھ صحن میں جا نکلا۔ صحن میں کئی مرغیاں پھر رہی تھیں۔ میں اُن کے پیچھے بھاگا تو وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ میرے ہاتھ بہت ہی تیزی سے ترپ چھپے چل رہے تھے۔ مرغیوں کو پکڑنا بھی ایک فن ہے اور میں اُن

[سے نا]بلد تھا۔ کوئی دس منٹ تک جب میں کسی بھی مرغی کو نہ پکڑ [سکا] تو وہ بولی۔ "وہ ٹوکرا لے لیں اور کسی ایک پر ڈال دیں۔ یہ [ایسے] ہاتھ نہیں آئیں گی۔" اس نے صحن کے کونے کی طرف اشارہ کیا۔ تجویز مناسب تھی۔ میں نے ٹوکرا اٹھا کر فوراً ہی ایک مرغی پر ڈال دیا۔ "یہ کام تو آپ خود بھی کر سکتی تھیں؟" میں نے [ٹو]کرے کے نیچے سے مرغی نکال کر اس کی طرف بڑھا دی۔

وہ ابھی تک ہنسے جا رہی تھی۔ بولی۔ "یہ ٹوکرا ابھی مجھے [یاد آ]یا ورنہ میں اسے خود استعمال کر سکتی تھی۔"

"ہاں۔ اس کو بہت آرام سے ذبح کریں، نازک چیز ہوتی ہے یہ مرغی۔"

"یہ کام بھی آپ ہی کریں گے بھئی جان! ورنہ جمیل سنگھ کو بلا [ئ]یں۔ میں نے یہ کام کبھی نہیں کیا۔"

"چلو چھٹی ہوئی۔ یعنی یہ کام بھی ہمیں ہی کرنا ہوگا۔ اِدھر آ بھئی نشتر بہر جادہ! یہ مرغی ذبح کر دے ذرا۔"

آبی اُس وقت دروازے میں آ ٹھہرا تھا۔ میں نے اُس بی بی سے مرغی لے کر اس کے حوالے کر دی۔ وہ خاتون چھری لے آئی تو آبی نے اسے صحن میں نلکے کے قریب بیٹھ کر جیسے بھی ہوسکا، ذبح کر دیا۔ میرا خیال ہے اس سالے نے تکبیر بھی نہیں پڑھی تھی۔

وہ بی بی سمجھ گئی، بولی۔ "آپ نے تکبیر بھی پڑھی تھی کہ نہیں؟"

"وہ۔۔۔ وہ تو مجھے یاد ہی نہیں رہا۔ اب کیا ہوگا؟" مرغی اُس نے زمین پر ڈال دی تھی۔

"پھر یہ تو جھٹکا ہو گیا۔ یہ تو ہم نہیں کھا سکتے۔"

"کھا لیں گے بھئی! آخر کو یہ مرغی ہی تو ہے، کوئی بکرا تو نہیں تھا۔ بی بی اب بھی اس پر تکبیر پڑھی جا سکتی ہے۔" یہ کہہ کر آبی نے تین بار اللہ اکبر کہہ دیا۔ وہ بی بی برابر ہنستی جا رہی تھی۔ یوں جیسے ہم سے مل کر اسے بہت خوشی محسوس ہو رہی ہو۔ مجھے اس کی یہ عادت بہت پسند آئی۔ وہ گھر کو ماتم کدہ نہیں بنا رکھتی تھی۔ خود بھی ہنستی تھی اور دوسروں کو بھی ہنساتی تھی اور اس کی ہنسی میں چہکتی ندیوں کا سا شور محسوس ہوتا تھا۔

"میرا نام سنبلہ ہے بھئی جان! مجھے آپ میرے نام سے پکار سکتے ہیں۔" وہ بی بی کے لفظ کی تکرار سے عاجز سی آ گئی تھی۔

"یہ اچھا نام ہے سنبلہ۔ کیوں جیلانی! یہ نام پسند آیا تھیں؟"

"ہاں۔ نام ہی نہیں نام والی بھی پسند آئی۔ جمیل واقعی بہت خوش نصیب ہے۔" میں نے سنبلہ کو باورچی خانے کی طرف جاتے دیکھ کر کہا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے مجھے مڑ کر دیکھا اور پھر دروازے میں جا گھسی۔ میرے ان لفظوں نے اسے اور خوش کر دیا تھا۔

ہم دونوں ایک بار پھر کمرے میں جا بیٹھے۔ حالات کا تجزیہ ہمیں یہی احساس دلاتا تھا کہ کوئی گھڑی بھی ہمارے لیے نیک نہیں ہے۔ آبی نے تکیے پر سر رکھا اور چند ہی لمحوں بعد وہ گہری نیند میں کھو گیا۔ آبی کے حوصلے کی میں داد دیتا ہوں، ایک لمحے کے لیے بھی وہ میرے خیال سے غافل نہیں رہا تھا۔ مجھ سے جدا ہونے کے لیے اس نے جو وقت منتخب کیا وہ میرے لیے حیرت کا باعث تھا مگر وہ کراچی میں صرف ایک ہی دن رہ کر لاہور واپس آ گیا۔ میرے لیے اس نے خدا جانے کیسے کیسے پاپڑ بیلے تھے۔ کہاں کہاں وہ نہیں گیا ہوگا۔ اس بھاگ دوڑ کے دوران اس نے موٹر سائیکل بھی خریدی اور اس پر بیٹھ کر وہ میرے تعاقب میں چلتا رہا۔ اسے معلوم تھا کہ میں کس مصیبت میں پھنس چکا ہوں۔ ایک لمحے کے لیے بھی اسے چین نہیں آتا ہوگا۔ اس کی قسمت اچھی تھی کہ وہ مجھ سے الگ ہو گیا ورنہ وہ بھی میرے ساتھ ہی تھانے کی ذلت سہہ رہا ہوتا۔ مگر وہ آزاد رہ کر میرے لیے اتنا کچھ کر چکا تھا کہ میں اس کا احسان چکا ہی نہیں سکتا تھا۔ ورنہ موت کے منہ میں کون ہاتھ دیتا ہے۔ اس کی وِگ نے میری جان بچالی تھی۔ درّانی کا حلیہ اس نے اس طرح اپنایا کہ میں خود بھی آخری وقت تک اسے نہیں پہچان سکا۔ اس کی دوستی پر میں فخر محسوس کر سکتا تھا۔ آبی واقعی بہت عظیم تھا۔

اُسی شام آبی موٹر سائیکل پر بیٹھ کر لاہور کی طرف چل دیا۔ اس فوزیہ نے ہمیں حیران کر رکھا تھا اور ہمیں معلوم ہونا چاہیے تھا کہ وہ بہن جی سے کہاں ملی تھی اور کیوں وہ ہماری اتنی بڑی ہمدرد بن گئی تھی۔ آبی نے مجھے ساتھ لے جانے کی بہت کوشش کی مگر میں لاہور کی فضا سے بدظن ہو چکا تھا۔ اس کے ایک ایک ذرّے سے میرا وجود لرزتا تھا۔ ہر جگہ مجھے اپنی تصویر ٹنگی نظر آتی تھی۔ میں اُس کے ساتھ نہیں گیا۔ آخر وہ خود ہی آگے نکل گیا۔ ہم نے اپنے راز کی بہت زیادہ حفاظت کی تھی۔ جمیل یا اس کی بیوی سے ہم نے اپنے بارے میں کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ آبی نے مجھے روک دیا کہ میں بھولے سے بھی اپنے سلسلے میں اُن سے کچھ نہ کہوں۔ ہمارے لیے یہی بہتر تھا۔ راز کسی کے ہاتھ میں دینے کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ آپ نے خود کو بلاقیمت بیچ دیا۔ آپ کی سلامتی اب اس کی صوابدید کی مرہونِ منت ہو جاتی ہے۔ اس وقت رات کے آٹھ بج چکے تھے آبی باہر نکلا تو جمیل بھی اندر آ گیا۔ وہ رات کو بالعموم دیر سے آتا تھا۔ سنبلہ مجھے یہی بتا رہی تھی۔ وہ واپس آیا تو بولا۔ "عاؤرت! آج ہم واہگہ جا رہے ہیں۔ رات وہیں رہیں گے۔ تمھیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟"

"مگر کیوں جا رہے ہیں آپ؟ کوئی اور بھی عاؤرت اپنے

رکھی ہوگی وہاں۔ گھر میں مہمان آتے ہوئے ہیں گے وہ اس وقت برآمدے میں چارپائی پر بیٹھی تھی۔

"میں نے تو سارا دن کمرے میں ہی بیٹھ کر گزارا تھا۔ جان بوجھ کر میں سُنبلہ کے سامنے نہیں گیا تھا۔ وہ بھی دوپہر کے کھانے کے بعد جب سے جمیل دکان پر گیا تھا میرے سامنے نہیں آئی تھی۔ پتہ نہیں کوئی حجاب تھا جو آپ ہی آپ ہمارے درمیان آ ٹھہرا تھا اور جسے ہم میں سے کوئی بھی کاٹنے کی جرأت نہیں کر رہا تھا اور مجھے تو کوئی حق ہی حاصل نہیں تھا۔ میں اس سے بات بھی کرتا تو کیا کرتا۔ اسی لیے میں کمرے میں خاموش بیٹھا سگریٹ پیتا رہا۔ کرنے کے لیے میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ ایک میرا ماضی تھا جس کی گرہیں کھول کر میں بیتے دنوں پر ماتم کر لیتا تھا۔ ایک وہ میرا غیر یقینی مستقبل تھا، جس کی تخریب کی بنیاد میں نے ماضی میں تعمیر کر دی تھی۔ میں اسی کا پھل اب کھا رہا تھا۔ طبیعت میری بُری طرح بجھ گئی تھی۔ میری زندگی اور موت کے درمیان بس اب ایک ہاتھ کا فاصلہ باقی رہ گیا تھا۔ آبی بیچ میں نہ آتا تو وہ مجھے اسی وقت دوسری طرف لڑھکا چکے تھے اور اب آبی ہی مجھے اس بے یقینی سے نجات دلا سکتا تھا۔

برآمدے میں سے مجھے اُن دونوں کی آوازیں صاف سُنائی دے رہی تھیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ اُٹھ کر کمرے میں جا چکے تھے۔

آدھ گھنٹے بعد جمیل میرے کمرے میں آ گیا، بولا۔ "آبی تو لاہور چلا گیا ہے، میں بھی آج واہگہ جا رہا ہوں، کچھ کام ہے مجھے کسی چیز کی ضرورت ہو تو سُنبلہ سے کہہ دیں۔ میں نے اسے سمجھا دیا ہے۔"

"تمہارا بہت بہت شکریہ جمیل بھائی! مجھے تو گھر جیسا آرام ملا ہے یہاں کسی بھی چیز کی ضرورت نہیں ہے اب۔"

"گوربچن سنگھ اگر مجھے مل گیا تو میں آپ کے بارے میں بات کروں گا۔ میرا خیال ہے وہ کسی خفیہ راستے سے آپ کو انڈیا پہنچا سکتا ہے۔"

"ایسا ہو جائے تو بہت ہی اچھا ہو۔ ہمارا وہاں جانا بہت ضروری ہے جمیل بھائی۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ میرا خیال ہے وہ آپ کی بہت مدد کر سکتا ہے۔ وہ میرے لیے چاندی لایا کرتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ تم صبح تک وہاں رہو گے؟"

"ہاں۔ اچھا خدا حافظ۔ رات کو اِدھر بارڈر پولیس کے لوگ پھرا کرتے ہیں۔ آپ کو باہر نکلنے کی ضرورت نہیں ہے، ویسے وہ کسی کا دروازہ نہیں کھٹکھٹاتے ہیں۔"

"اچھا! وہ کیا کرتے ہیں یہاں رات کو؟"

"انہیں ہر آدمی سمگلر نظر آتا ہے۔ بارڈر کے سب گاؤں اُن کی نظر میں ہیں۔ میرا دھندا تو بس اللہ توکل چل رہا ہے۔ بڑی رقم دینی پڑتی ہے انہیں۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔ ایک ویسپا سکوٹر اس کے پاس بھی موجود تھا اور صرف اس کے پاس ہی نہیں گاؤں کے اکثر نوجوان گلیوں میں سکوٹر کھڑکھڑاتے پھرتے تھے۔ بارڈر پولیس کا شک بے وجہ نہیں تھا۔ انہیں جو ہر آدمی سمگلر نظر آتا تھا تو اس کی ایک بڑی وجہ بھی تھی۔ اُن کے درمیان رہ کر جمیل کا دھندا خوب چل رہا تھا۔

جمیل گھر سے نکلا تو کوئی بیس منٹ بعد سنبلہ پیٹی میں سے نیا لحاف لے کر میرے کمرے میں آ گئی، بولی۔ "یہ لحاف رکھ لیں بھائی جان! کمبل سے تو کام نہیں چلے گا۔" یہ عجیب بات تھی کہ وہ مجھے بھائی جان نہیں کہتی تھی، زبان کو ذرا سا خم دے کر بھئی جان کہہ دیتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہ ایسا جان بوجھ کر کرتی تھی۔ اسے لفظوں کو بل دینے اور اُن کا مفہوم بدل دینے میں زبردست ملکہ حاصل تھا۔

"اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میرے پاس بیٹھ جائیں۔ میں نے آپ جیسی کوئی نہیں دیکھی۔ اتنی ملنسار، اتنی ہنس مکھ، اتنی ہشاش بشاش۔" میں اس کی تعریف میں کچھ زیادہ ہی آگے بڑھ گیا۔ وہ تھی بھی اسی قابل۔

"کیا واقعی! نہیں آپ غلط کہتے ہیں۔ میں اس گاؤں میں پڑی عورت کسی کو کیا خوش کر سکتی ہوں۔ مجھے ہنسنا کیا، رونا بھی نہیں آتا ہے۔"

"اور یہ اچھی بات ہے۔ مجھے روتے، بسورتے چہرے بالکل پسند نہیں ہیں مگر یہ بتائیں آپ اس جمیل کے ساتھ کیسے رہ رہی ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتی ہے یہ بات۔"

"یہ میری تقدیر ہے جیسے میں جھیل رہی ہوں۔ جیل میں بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جن پر نہ کوئی مقدمہ چلتا ہے نہ کوئی اُن کی پیروی کرتا ہے بس انہیں یوں ہی فی سبیل اللہ پولیس والے جیل میں ڈال کر بھول جاتے ہیں۔ میرا بھی یہی حال ہے۔"

"مگر کیوں، ایسا کیوں ہے؟ آپ حسین ہیں، خوبصورت ہیں بلکہ لاکھوں میں ایک ہیں۔ میرا خیال ہے آپ پڑھی لکھی بھی ہیں پھر یہ سب کچھ کیسے ہو رہا ہے آپ کے ساتھ؟"

"میں۔۔۔ دراصل اس کے ساتھ گھر سے بھاگ نکلی تھی۔ ملتان میں رہتے تھے۔ اس نے وہاں سے دکان چھوڑی اور مجھے ساتھ لے کر یہاں آ گیا اور اب تک یہاں ہی ہے۔ میں اس سے نکاح کے لیے کہتی ہوں تو یہ انکار کر دیتا ہے کہتا ہے ایسے ہی ٹھیک ہے۔ میں کسی سے کہہ بھی نہیں سکتی۔ سب مجھے اس کی بیوی سمجھتے ہیں۔ میں بھی چپ ہوں، کیا کر سکتی ہوں۔"

"کوئی بچہ نہیں ہے آپ کا؟"

"نہیں بچہ تو کوئی بھی نہیں ہے۔ میں۔۔۔ میں دراصل اس کے کمرے میں نہیں سوتی ہوں۔ ہمارے درمیان ایک خاموش سمجھوتہ ہے۔ میں اس کی ہر خدمت کرتی ہوں مگر ایک شرط میں نے اس کی مانی ہے اور حیرت ہے کہ اس نے یہ سب کچھ برداشت بھی کر لیا ہے۔ خود یہ چاہتا ہے کہ میں پہل کروں مگر نکاح کے بغیر یہ ممکن نہیں ہے اور پھر یہ کوئی ایسا دیدہ زیب جوان بھی نہیں ہے۔ دراصل میں خود کو سزا دے رہی ہوں جو لمبی ہی ہوتی جا رہی ہے، اپنے جرم کی سزا۔ گھر سے بھاگ کر میں نے اچھا نہیں کیا ہے کیا خیال ہے آپ کا؟"

"مجھے حیرت ہے۔ ایسا تو میں نے کہیں نہیں دیکھا!"

"نہیں۔ میں۔۔۔ میں قسم کھا سکتی ہوں کہ میں ابھی تک کنواری ہوں۔ میں جمیل کی بیوی کہلا کر بھی اس کی بیوی نہیں ہوں۔ جب میں گھر سے بھاگی تو میری عمر سولہ سال تھی۔ اب میں اُنیس کی ہوں۔ میں نے جمیل کی مہربانی سے میٹرک کا امتحان بھی پاس کر لیا ہے۔ اب پرائیویٹ طور پر ایف اے کا امتحان دے رہی ہوں۔ وہ میرا سب کچھ ہے مگر نہ وہ میرا بھائی ہے نہ شوہر۔ پتہ نہیں کیا ہے۔ ٹھہریں میں آپ کے لیے چائے بناتی ہوں۔ آپ بھی آ جائیں، کیا آپ عورتوں کی طرح اندر بیٹھے ہوتے ہیں۔"

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ میں بس وہیں بیٹھا رہ گیا تھا۔ ایک پل کے لیے بھی باہر نہیں نکلا تھا اور یہ اچھی بات نہیں تھی۔ عورتوں پر تو اس کا بہت ہی بُرا اثر پڑتا ہے۔ صاف ہی کہہ دیتی ہیں وہ کہ گھر گھسنا آدمی ہے، پلنگ توڑ۔ پنجابی میں ایسے آدمی کو زناں وچ دھناں کہہ کر پکارتے ہیں۔ اسے میرا وہاں بیٹھنا اور بیٹھے ہی رہنا کسی بھی طرح پسند نہیں تھا۔ میں پلنگ سے اُتر کر اُس کے ساتھ ہی باورچی خانے میں جا گھسا۔ قد میں وہ میرے برابر آتی تھی۔ گاؤں میں اتنا عرصہ رہنے کے باوجود وہ عام گاؤں کی عورتوں سے بے حد مختلف نظر آتی تھی۔ اُس کی سادگی میں ایک اپنا ہی وقار تھا۔ باورچی خانے میں گھس کر اس نے چولہے کو آگ دکھائی۔ لکڑیاں خشک تھیں فوراً ہی جلنے لگیں۔ چائے کی پتیلی آگ پر رکھ کر وہ میرے سامنے ہی پیڑھی پر بیٹھ گئی مگر جب میں وہاں بیٹھا تو وہ بھی اُٹھ گئی۔

"نہیں، باہر چاندنی چٹک رہی ہے۔"

صحن کا منظر بڑا ہی دلفریب تھا۔ چاند بہت نیچے جھک آیا تھا۔ وہاں بھی دو چارپائیاں بچھی تھیں مگر وہ اُن پر نہیں بیٹھی۔ مجھے اپنے ساتھ لے کر سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

"میرا خیال ہے، یہ چودھویں کا چاند ہے۔"

"ہاں۔ اس کی روشنی ساری رات کو منور کرے گی۔"

"ہاں۔ یہ راتیں مجھے بہت پسند ہیں مگر یہ سرما کا چاند ہے، بُری طرح بالکل تنہا اور اُداس۔ پتہ نہیں کیا بات ہے، میں بار بار آپ کے سامنے اپنی ہی بات چھیڑ دیتی ہوں۔"

"چاند راتوں میں سمندر اونچا اچھلنے لگتا ہے، پتہ نہیں اسے چاند میں کیا نظر آتا ہے؟"

"میرے والدین میں سے صرف میرے والد ہی زندہ ہیں۔ ماں، مجھے بچپن میں ہی چھوڑ کر آگے نکل گئی۔ وہ جو دوسری آئی، وہی مجھے لے ڈوبی۔" وہ منڈیر پر دونوں ہاتھ رکھ کر چاند کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کی انگلیوں میں عمدہ قسم کی کیوٹیکس لگی تھی، سُرخ رنگ کی۔ ویسی ہی پالش اس نے پاؤں کے ناخنوں پر بھی لگا رکھی تھی۔ اس گھڑی وہ پیلے ساٹن میں ملبوس تھی۔ چاند کا عکس اس کے چہرے پر پڑتا تھا تو وہ دمکنے لگتا تھا۔ اس میں چاندی ایسی پیلاہٹ ابھرتی تھی جس میں اس کے رخساروں کی سُرخی جھلکتی تھی۔

"آپ کو سوتیلی ماں نے پرورش کیا ہے؟"

"ہاں۔ اس نے مجھے جی بھر کر ذلیل کیا۔ میری پڑھائی چھڑا دی۔ میں نویں میں پہنچی تو اس نے میرا اسکول جانا بند کرا دیا، اسے گھر کے کام کاج یاد آنے لگے تھے۔"

"ہاں۔ وہ ایسا ہی کرتی ہیں۔ پرائی اولاد کو کون سکھی دیکھ سکتا ہے۔"

"یہی ہوا۔ بالکل یہی ہوا۔ میرے والد گھر آتے تو وہ ان سے بھی مجھے پٹوا دیتی۔ یہ روز کا معمول بن گیا تھا۔ پتہ نہیں اُن سے وہ کیا کچھ کہتی تھی۔ وہ غصّے سے لال پیلے ہو کر مجھے دُھن ڈالتے حالانکہ اُن کی بچیاں اور بھی تھیں مگر وہ تو سگی ماں کے پاس تھیں۔ انہیں کوئی کیا کہہ سکتا تھا۔" اس نے منڈیر کے سامنے پھیلے مکانوں پر دور تک نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ "میری زندگی ان اجاڑ مکانوں ایسی ہو کر رہ گئی تھی جن کے اندر بہت سے آدمی رہتے تو ہیں مگر اس کے ان میں کوئی حرکت باقی نہیں ہے۔ میرا بھی یہی حال تھا۔ اب وہ دن یاد آتے ہیں تو میں پاگل ہو جاتی ہوں۔"

"اس لحاظ سے دیکھیں تو جمیل نے آپ کے ساتھ اچھا سلوک کیا ہے۔"

"ہاں۔ جب ہی تو میں اس کی بہت عزت کرتی ہوں۔ ایک اس کا چہرہ اتنا چیچک زدہ نہ ہوتا تو میں اس کے ساتھ بہت خوش رہ سکتی تھی۔ پھر وہ اَن پڑھ بھی تو ہے۔ پرائمری پاس کی تھی اس نے کہ اسے اس کے باپ نے کسی سُنار کی دکان پر بٹھا دیا۔"

"اس کے باوجود وہ بہت مضبوط ارادے کا آدمی ہے، ورنہ کوئی آپ ایسی سے الگ کیسے رہ سکتا ہے۔ آپ۔۔۔ آپ۔۔۔ کے لیے تو آدمی کو سو منزلہ عمارت سے چھلانگ لگانی پڑے تو وہ لگا دے۔"

"جی نہیں، ایسا سورما میں نے کوئی نہیں دیکھا۔"

"میرے بارے میں کیا خیال ہے آپ کا؟"

"منہ دھو رکھیں جناب! مجھے کیا پتہ آپ کیا کر سکتے ہیں۔"

"ہاں، آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ کسی کو دیکھنے پرکھنے بنا کوئی اس کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہے مگر اب کیا ارادہ ہے آپ کا؟"

"پتہ نہیں۔ ایک دن مجھے جمیل سے شادی کرنی ہی پڑے گی۔ وہ کہتا ہے کہ اس نے لاٹری کا ٹکٹ خرید رکھا ہے جس پر ایک نہ ایک دن اس کا انعام نکل ہی آئے گا۔ آئیں، نیچے چلتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ سیڑھیاں اُترنے لگی۔

اس کے سراپا نے مجھے پاگل کر دیا تھا۔ چند ہی لمحوں میں وہ میرے حواس پر بری طرح چھا گئی تھی۔ میں ۔۔۔ میں اُن لوگوں میں سے نہیں جو انتظار کر سکتے ہیں۔ عمر، عمر اُن کے صبر کی سِل نہیں گھستی ہے۔ نہ منزلِ مراد انھیں ملتی ہے نہ اس کی آس کٹتی ہے۔ وہ بے پناہ سیلاب ایسی کیفیت سے گزرنے کے باوجود راہ سے نہیں ہٹتے، منتظر رہتے ہیں۔ میں اُن میں سے نہیں تھا۔ سُنبلہ کو میں بانہوں میں دبوچ لینا چاہتا تھا مگر کوئی حجاب تھا، کوئی ناقابلِ عبور حد تھی جس کو پھلانگنا مشکل نظر آتا تھا۔

"سنبلہ!" میں نے یونہی پاگل ہو کر اسے سیڑھیوں میں ٹھہرا لیا۔

اس نے پلٹ کر سیڑھی پر رُک کر مجھے یُوں دیکھا جیسے وہ قطعی طور پر مجھ سے اجنبی ہو۔ کوئی ردِ عمل اس کے چہرے سے نمایاں نہیں تھا۔ "جی۔ کیا بات ہے؟"

"کیا تمھیں ۔۔۔ میرا مطلب ہے تم یہاں خوش ہو؟" میں نے اب کی بار تکلّف کو الگ رکھتے ہوئے کہا۔ اسے 'آپ' ایسے لفظ سے مخاطب کر کے میں عاجز آ گیا تھا۔

"جی ہاں، میں بہت خوش ہوں۔ مجھے یہاں کوئی تکلیف نہیں ہے۔ ڈھیروں روپیہ ہے میرے پاس۔ کپڑے، زیور، خوشبو۔ اور کیا چاہیے مجھے؟" یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدموں سے نیچے اتر گئی۔ چائے کی پتیلی میں اُبال آ گیا تھا۔ وہ چائے بنانے لگی۔ دو پیالیاں جب وہ بنا چکی تو الماری میں سے بہت عمدہ قسم کے بسکٹ لے آئی۔

"یہ کھائیں، بہت اچھے بنے ہیں یہ۔"

"ابھی تو کھانا کھایا ہے بھئی! اس کی کیا ضرورت ہے۔ رہنے دو۔"

"آپ کی مرضی۔ صبح میں آپ کو بہت عمدہ مکھن کھلاؤں گی۔ جمیل شہر سے لایا ہے۔ ادھر الماری میں رکھا ہے۔ سردی ہے نا، اس لیے محفوظ رہ جاتا ہے۔ بجلی یہاں ہوتی تو وہ شاید فریج بھی لے آتا۔"

میں چائے پینے لگا۔ اس کی باتوں میں پھر سے اجنبیت کی بُو آنے لگی تھی۔ جو آدمی کو آدمی سے سیکڑوں، ہزاروں میل دور پھینک دیتی ہے۔

"یہ آپ نے داڑھی کیوں بڑھا رکھی ہے، نائی نہیں ہے کوئی آپ کو؟"

"بس کچھ ایسی ہی بات تھی۔ آدمی کبھی کبھی اس زندگی میں بزرگی کا سماں دیکھ لیتا ہے۔ کچھ دن بڑے ہی منحوس ہوتے ہیں۔ ان کی راتیں بھی آدمی کو نڈھال کر دیتی ہیں۔" میں نے تھانے کے اندر بیتے دنوں کے خیال سے تھرّاتے ہوئے کہا۔ وہ ایسے دن تھے جن پر میں کبھی فخر نہیں کر سکتا تھا۔ پتہ نہیں ان کا سایہ میرے چہرے پر نمایاں ہو گیا تھا۔

وہ بڑے غور سے مجھے دیکھ رہی تھی میرے لہجے کو یوں بے جا دیکھ کر بولی "میں کچھ سمجھی نہیں۔ کیا دُکھ ہے آپ کو؟ کوئی چیز کھو گئی ہے آپ کی جو نہیں مل سکی ایسی کیا بات ہے آخر؟ مجھے نہیں بتائیں گے؟"

"کچھ نہیں! ایسی تو کوئی خاص بات نہیں ہے ویسے ہر آدمی کی زندگی ایک راز کی طرح بسر ہوتی ہے، اس میں ان گنت بھید ایسے ہوتے ہیں جن کو کسی پر ظاہر نہیں کیا جا سکتا۔ میں صبح شیو ضرور کر لوں گا۔" میں نے چائے کی پیالی خالی کرتے ہوئے کہا اور باورچی خانے سے باہر نکل گیا۔ تھانے کے دن اور تھانے کی راتیں میرے تصوّر کے نہاں خانوں میں پھر سے ابھرنے لگی تھیں۔ میں نڈھال ہو کر باہر صحن میں رکھی چارپائی پر جا بیٹھا۔

وہ باورچی خانے ہی میں رہ گئی۔ چند منٹ بعد جب باہر نکلی تو ہاتھ میں شیو کا سامان لیے ہوئے تھی۔ پانی اس نے گرم کر لیا تھا۔ تمام چیزیں میرے سامنے رکھ کر بولی "میں لیمپ اِدھر لا دیتی ہوں۔"

"ابھی اس کی کیا ضرورت ہے سنبلہ! تم یہ عنایت نہ کرو تو اچھا ہے میں اپنے آپ میں نہیں ہوں۔" میں نے اپنے کرب کو اس سے چھپانے کی ناکام کوشش کی۔

"ایسا نہ کہیں۔ آدمی کو اپنی پالش تو ٹھیک رکھنی چاہیے۔"

میں نے اُس سے سیفٹی لے لی۔ بلیڈ نیا تھا اور آئینہ بہت صاف اور شفاف۔

میں نے جب شیو کر لی تو وہ قدرے حیرت زدہ ہو کر دیکھنے لگی "شیو ضرور کر لیا کریں۔"

"مہربانی ہے تمھاری ورنہ تو میں ایسے ہی ٹھیک تھا۔ پتہ نہیں عورتوں کو یہ فکر کیوں کھاتی ہے کہ وہ مرد کو فوراً ہی ڈومیسٹک کریں۔ فوراً ہی انھیں گھرداری سکھانے لگتی ہیں۔" میں نے اُٹھ کر نل کے آگے برش رکھ دیا۔

جب میں وہاں سے مُنہ دھو کر واپس آیا تو وہ خوش ہو گئی، بولی۔ "میرا اندازہ صحیح نکلا۔ آپ واقعی وجیہہ آدمی ہیں، ماشاءاللہ۔ خدا نظرِ بد سے محفوظ رکھے۔" یہ کہہ کر اس نے سارا سامان اٹھا کر اندر پہنچا دیا۔ میز پھر سے صاف ہو گئی۔

واپس آ کر وہ سامنے کی چارپائی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی تھی۔ ڈھیر سارے چلغوزے اس نے تپائی پر رکھ لیے تھے۔ میں نے کہا "سنبلہ! میں حیران ہوں تمھیں میری شیو کا خیال کیسے آیا؟ میں تو تمھارے لیے بالکل اجنبی ہوں۔ اس مختصر سی مدت میں تم نے مجھ پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے مگر ۔۔۔۔۔"

"بات یہ ہے بھئی جان کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ سُنا تو ہی ہے۔"

"یہ تم مجھے بھائی جان کہتی ہو یا بھئی جان؟"

"آپ جو سمجھ لیں۔ کھائیں نا، یہ میں آپ کے لیے لائی ہوں۔"

"تم نے تو اس گاؤں کو نتھیا گلی بنا دیا ہے۔ کوئی کوئی گھر ہی یہاں پختہ ہے مگر تمھارے گھر میں تو ہر آسائش موجود ہے۔"

"یہ سب اس جمیل سنگھ کا کرشمہ ہے، بڑے پیسے کماتا ہے وہ۔" وہ جمیل کو جان بوجھ کر کبھی کبھی جمیل سنگھ کہہ کر پکارتی تھی۔

ہم دیر تک وہاں صحن میں بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے مگر اپنی اور میری ذات کو اس نے گفتگو میں سے منہا کر دیا تھا۔ دس بجے میں ایک الگ کمرے میں سو رہا اور وہ اپنے حجرے میں جا گھسی۔ میں ابھی تک کوئی ایسا پل نہ ڈھونڈ سکا تھا جس کا دوسرا حصّہ اس تک پہنچتا ہو۔ وہ میرے قریب آ کر بھی مجھ سے اتنی دور ہو گئی تھی کہ میں پھر سے اپنا سلسلہ تکلّم وہاں سے شروع نہیں کر سکتا تھا جہاں سے ٹوٹ گیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ سُنبلہ میری سمجھ میں ہی نہیں آئی تھی اور میں لحظہ بہ لحظہ اس کی طرف جھکتا چلا رہا تھا۔ پتہ نہیں ایسی کیا بات ہے آدمی کنوارہ ہو تو وہ سارے شہر کو اپنا سسرال سمجھتا ہے۔ میرا بھی یہی حال تھا اور آبی تو ہر گھر کا داماد بن جاتا تھا۔ جہاں کہیں بھی کوئی عورت اسے تنہا ملتی تھی، وہ اس کے لیے ہوائی جہاز کا ٹکٹ تک خریدنے کے لیے تیار ہو جاتا تھا۔ میں بھی اندر سے شاید ایسا ہی تھا۔ مگر سُنبلہ نے مجھے زیادہ ہی متاثر کر لیا تھا مگر وہ راستہ نہیں دیتی تھی۔ ایک بار پھر اس نے خود کو خول میں بند کر لیا تھا۔ وہ دو گھڑی کے لیے جھکی تو تھی مگر اسے پھر کسی خیال کے زیرِ اثر خود کو بند کرنا پڑا۔ اور جب کوئی عورت یُوں مستور ہو جائے، خود کو خول میں بند کر لے تو آپ کے پاس کوئی حربہ نہیں ہے کہ آپ اسے وہاں سے نکال سکیں۔ عورت بنی ہی محبت کے لیے ہے مگر اس سارے عمل کا پہلا غنچہ اسی کے دل میں کھلتا ہے۔ آپ کے پاس کوئی ایسی بادِ صبا نہیں ہے کہ اس کے جھونکوں سے اسے پھول بنا سکیں۔

کہ ہے؟ نہیں ہے۔ اور میں بھی اسی فساد میں مبتلا ہو گیا تھا اور اب میں تھا اور میرے بستر کی تنہائی تھی۔ آبی جیسے داؤ مجھے آتے تو شاید میں پہلے ہی وار میں اسے فتح کر لیتا۔ مگر وہ جو عشق اوّل در دلِ معشوق پیدا می شود والی بات ہے، وہ کہاں جاتی۔ یاروں نے تو عشق کے بھی اصول بنا رکھے ہیں اور شاید وہ فطرت کے عین مطابق بھی ہیں۔

میں نڈھال سا ہو کر بالآخر بستر پر لیٹ گیا۔ آدمی کی کوئی آرزو ادھوری رہ جائے، کوئی ارمانِ ناتمام سینے میں سلگ کر بھسم ہونے لگے تو اس کے خواب بھی پریشان ہو جاتے ہیں۔ میں نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح میں مسند آرا کو اپنے تصوّر میں سجا سکوں مگر حیرت کی بات ہے، وہ میرے ذہن میں اجاگر ہی نہیں ہو رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے میرا آئینہ تاریک ہو گیا ہے۔ اس کا کوئی بھی ہیولا سامنے نہیں آیا۔ میں دل کو تھپک تھپک کر سو گیا مگر نیند آنکھوں میں آ کر غائب ہو جاتی تھی۔ میں نے دو گھڑی بستر پر آنکھ لگائی اور پھر اُٹھ بیٹھا۔ مجھے کسی پہلو چین نہیں آتا تھا۔ سُنبلہ ہی سُنبلہ مجھے ہر طرف چھائی نظر آتی تھی۔ اس انوکھے تجربے سے میں پہلے کبھی آشنا نہیں ہوا تھا۔ میں نے سگریٹ سُلگا لیا اور لیمپ کی بتی پھر سے اونچی کر دی۔ کمرہ اپنی جگہ موجود تھا۔ اس کی ہر شے مجھے صاف نظر آتی تھی مگر وہ کرسیوں پر، بستر پر، فرش پر، یہاں تک کہ چھت پر بھی موجود تھی۔ ہر جگہ مجھے اس کا عکس نظر آتا تھا۔ وہ مجھ سے وہی بات کرتی تھی کہ میں نے ابھی کسی مرد کا منہ نہیں دیکھا۔ میں ابھی تک کنواری ہوں۔ حالاں کہ میں جمیل کے ساتھ اتنے عرصے سے رہ رہی ہوں مگر وہ مجھ تک نہیں پہنچ سکا۔ کبھی پہنچ بھی نہیں سکتا۔ میں نے درمیان میں دیوار حائل کر رکھی ہے۔ وہ الگ کمرے میں سوتا ہے اور میں الگ کمرے میں۔ میرا وجود ابھی تک سالم و ثابت ہے۔ میں مردوں کے لیے ایک للکار کی حیثیت رکھتی ہوں میں وہ نہیں ہوں جو آپ سمجھتے ہیں۔ میں قریب بھی آتی ہوں تو جھکائی دے کر آگے نکل جاتی ہوں۔ مجھے کوئی نہیں چھو سکتا۔ گاؤں والے بھی غلط کہتے ہیں اور آپ بھی غلط ہیں۔ مجھے یہ فخر ہے کہ سب کے ساتھ رہ کر سب کے سینے پر مونگ دَلتی ہوں۔ وہ یہی کہتی نظر آتی تھی۔ میں بھسم ہو کر رہ گیا۔ ایک اس کی آرزو تھی جو مجھے بُری طرح دبوچ بیٹھی تھی۔ میں اسے سموچا نگل جانا چاہتا تھا۔ اس کا موقع بھی تھا۔ جمیل گھر سے جا چکا تھا۔ آبی بھی وہاں نہیں تھا۔ رات میری تھی۔ مگر کیسے؟ یہ دیوار جو بیچ میں حائل ہے۔ یہ جمیل کو بھی اسی طرح سدِّ راہ معلوم ہوتی ہو گی۔ وہ بھی راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر اُسے گھونسے مارتا ہو گا۔ میری بھی اس نے یہی کیفیت بنا دی تھی۔ مجھے بھی اس نے بے چین کر دیا تھا۔ وہ کیا چیز ہے آخر؟ وہ ایسا کیوں کرتی ہے؟ مجھ سے اس نے اس موضوع پر بات ہی کیوں کی تھی؟ وہ مجھے کس خاص مقصد کے لیے ساتھ لے کر سیڑھیاں چڑھی تھی۔ اس نے مجھے

چاند بھی دکھایا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ میں اس کی تعریف میں غزل کہہ دوں، اس کو آسمان پر پہنچا دوں مگر پھر اس نے آپ ہی اپنا ارادہ بدل دیا اور مجھے ساتھ لے کر نیچے اتر آئی۔ یہ۔۔۔۔ یہ سنبلہ آخر چاہتی کیا ہے۔ وہ مجھ سے یہ سلوک کیوں کرتی ہے۔ جمیل بھی اس کی اس ادا پر پہلے تو مر مٹا ہوگا مگر پھر اس نے اپنے ارادوں کی ناکامی پر جھلا کر اسے مارنا شروع کر دیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں تھانے کی ساری اذیتیں بھول کر اس رات صرف اور صرف سنبلہ کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔ میں نے دل سے کہا اس کی کوئی قیمت تو ہوگی، کوئی بھی قیمت ہے وہ میں ضرور ادا کر دوں گا۔ یہ چاند کہے تو میں وہ بھی اسے نیچے لا دوں گا مگر یہ مانے تو سہی۔ میرے دل کو ان سلگتے جذبوں کی کوئی دوا تو دے۔ سکون کا کوئی لمحہ تو مجھے مہیا کرے۔ مجھے اس سے مل لینا چاہیے۔ ابھی اور اسی وقت۔ میں انتظار نہیں کر سکتا۔ میں جمیل نہیں ہوں۔ کسی طرح بھی میں اس کا کردار ادا نہیں کر سکتا۔ میں غلام جیلانی ہوں۔ اس کھونٹی پر میں زیادہ دیر لٹک نہیں سکتا۔ مجھے ابھی اور اسی وقت معلوم ہونا چاہیے کہ وہ آخر چاہتی کیا ہے۔ میرا ذہن اب زیادہ واضح ہو گیا تھا۔ میں کمرے سے نکلا دروازہ میں نے ابھی بند نہیں کیا تھا۔ وہ بھڑا ہوا تھا، اسے کھول کر میں سنبلہ کے کمرے کی طرف چل دیا۔ آگے پیچھے برآمدہ بنا ہوا تھا اور وہ تیسرے کمرے میں تھی۔ اس نے بھی دروازہ بھیڑ رکھا تھا۔ میں نے اس کے پٹ ذرا پیچھے کیے تو وہ ایک دم کھل گئے۔ سنبلہ اس وقت کتابوں پر جھکی ہوئی تھی۔ لیمپ کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اس نے دروازے میں حرکت دیکھی تو کتاب چھوڑ کر لحاف الگ پھینک دیا۔ وہ ابھی تک اسی شام والے لباس میں ملبوس تھی۔

"کیا بات ہے کیوں آئے ہیں آپ یہاں؟" اس کے لہجے میں سرزنش تھی۔

"میں بہت تنہا ہو رہا تھا اس لیے یہاں چلا آیا۔ مجھے نیند نہیں آ رہی۔"

"تو پھر؟ پھر میں کیا کروں؟ یہاں کیوں آئے ہیں؟"

"میں نے کہا تو ہے سنبلہ! مجھے۔۔۔ مجھے آپ کی محبت کی ضرورت ہے، پلیز! دیکھیں ذرا یہ رات کتنی اداس ہے۔"

"بہتر ہے آپ یہاں سے نکل جائیں۔ میں آپ کے لیے نامحرم ہوں۔ رات کے گیارہ بج رہے ہیں جائیں آپ اپنے کمرے میں سو جائیں۔" وہ پلنگ سے اتر گئی۔ اس کی آنکھوں میں سرزنش زیادہ واضح ہونے لگی۔ اس نے سلیپر نہیں پہنے بلکہ ساتھ پڑے ہوئے بوٹ پہن لیے۔ زنانہ قسم کے وہ بڑے ہی دیدہ زیب بوٹ تھے اور تسموں کے بغیر بند ہو جاتے تھے۔

"آپ میری بات نہیں سنیں گی؟"

"جی نہیں، اس وقت نہیں۔ آپ ابھی یہاں سے نکل جائیں۔ مجھے۔۔۔ مجھے بہت غلط سمجھے ہیں آپ۔"

"نہیں سنبلہ! یہ بات نہیں ہے۔ میں بہت پریشان ہوں، دکھ ہی اٹھاتا آ رہا ہوں۔ دو گھڑی مجھے یہاں بیٹھنے دیں ورنہ میں مر جاؤں گا۔"

"کمال ہے! مر جاؤں گا۔ کیسے مر جائیں گے آپ؟ پلیز، آپ جلدی نکلیں یہاں سے ورنہ اچھا نہ ہوگا۔ مجھے۔۔۔۔ غصہ نہ دلائیں۔ میں۔۔۔ میں جمیل کے ہاتھوں تو پٹ سکتی ہوں مگر کسی اور سے نہیں، ہاں۔"

"تم بہت ناراض معلوم ہوتی ہو۔ میں تم سے ایک رات کی بھیک مانگتا ہوں، آؤ ادھر بیٹھو، میری بات غور سے سنو۔ تم بہت اچھی ہو۔ میں نے تم ایسی کوئی نہیں دیکھی، مجھے مایوس نہ کرو۔" یہ کہہ کر میں اس کے پاس جا کھڑا ہوا اور اس کا ہاتھ میں نے ہاتھوں میں لینا چاہا مگر اس نے بائیں ہاتھ سے ایک ایسی کھڑی ضرب میری گردن پر لگائی کہ میں اپنی جگہ سے کئی فٹ اوپر اچھل کر زمین پر جا گرا۔ پتہ نہیں اس کے ہاتھ میں کس قدر قوت تھی۔ چند لمحوں تک تو مجھے ہوش بھی نہیں رہا کہ میں ہوں کہاں مگر جب میں اٹھا تو اس نے تکیے کے نیچے سے بھرا ہوا پستول نکال لیا تھا۔

"بہتر یہ ہے کہ تم فوراً یہاں سے نکل جاؤ ورنہ میں تمھیں گولی مار دوں گی۔ میری ضرب تم دیکھ چکے ہو۔ میں دوسرا ہاتھ مار دیتی تو تم بے ہوش ہو چکے ہوتے۔"

"تم بکواس کرتی ہو۔ میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ مجھے تمھاری ضرورت ہے سنبلہ! میں تمھارے بغیر نہیں رہ سکتا۔" جیسے ہی میں نے یہ الفاظ کہے، اس کا ہاتھ حرکت میں آ گیا مگر اس نے لبلبی نہیں دبائی۔ اس قدر تیزی سے آگے آئی کہ میں سمجھا وہ ابھی پستول سے ہی کھیل رہی ہے۔ دوسری ضرب اس نے پھر میری گردن پر لگائی مگر وہ میں برداشت کر گیا اور اس کی دائیں کلائی کو ہاتھ میں لے کر میں نے مروڑ دیا۔ مگر اس کے ہاتھ سے پستول چھڑا لینا کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ پوری کی پوری الٹ گئی اور دوسرے ہی لمحے میں مجھے اس کے ایک بمبار قسم کے گھونسے کی ضرب پیٹ پر محسوس ہوئی۔ اف میرے خدایا! اب کی بار میں زمین پر دہرا سا ہو گیا۔ اس سے پنجہ لڑانا ناممکن تھا۔ میرے پیٹ میں کمر کی ہڈی تک شدید درد اٹھا اور میں الٹ کر اس درد کو سمیٹنے لگا۔ مگر جیسے ہی میں نے اٹھنے کی کوشش کی، اس نے میری گردن پر کچھ اس طرح ہاتھ ڈالا کہ میں پاگل ہو گیا۔ اس نے میری رگ احساس مسل ڈالی تھی۔ میں جیسے پڑا تھا، ویسے ہی پڑا رہ گیا تھا۔ میرے حواس معطل ہو گئے۔

صبح کوئی پانچ بجے مجھے ہوش آیا تو جھٹپٹا سا ہو رہا تھا۔ باہر ابھی تاروں کی روشنی موجود تھی اور چاند بہت نیچے جا چکا تھا۔ میں نے دیکھا کہ میں لحاف میں دبا ہوں اور لیمپ بجھا ہوا ہے۔ کمرے کا بھی دروازہ بند تھا اور باہر برآمدے میں کھلنے والا دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ جوں جوں میرے حواس بیدار ہوئے، میں رات کے واقعات پر غور کرنے لگا۔ رات میرے وجود پر کیسی آندھی آئی تھی۔ سنبلہ نے میرے سارے ہی برگ و بار زمین پر بکھیر دیے تھے۔ وہ شاطر عورت میرے ہی ہتھیار سے مجھے قتل کر گئی تھی۔ اپنی عصمت اسے اس قدر عزیز تھی۔ اس کے فن نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ بھی اس حربے سے آگاہ تھی اور جانتی تھی کہ اسے کب اور کیسے استعمال کرتے ہیں۔ وہ اپنا دفاع کرنا جانتی تھی۔ مگر اس نے مجھے کیوں اس فن کے لیے تختۂ مشق بنایا۔ محض اس لیے کہ میں دو گھڑی کے لیے اس کے پاس بیٹھ کر اسے دکھ سنانا چاہتا تھا، مجھے اس کی آرزو تھی۔ میرا خیال ہے وہ میری آنکھوں میں سلگتے حیوانی جذبے کو پڑھ چکی تھی۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ میں اس سے کیا چاہتا ہوں۔ جبھی اس نے اپنا اور میرا ذکر گفتگو کے دوران بند کر دیا تھا۔ وہ ادھر ادھر کی باتوں میں لگ گئی تھی اور جب میں اس کے پاس پہنچا تو یہ بات میرے چہرے سے عیاں تھی کہ میں اس سے کیا چاہتا ہوں۔ میرا برا ہو، میں اسے سمجھ ہی نہیں سکا۔ وہ بار بار انکار کر رہی تھی۔ مجھے نامحرم بتا رہی تھی۔ میرے اور اس کے درمیان ابھی کسی بھی قسم کے سمجھوتے کی چادر نہیں تنی تھی اور میں بے وجہ ہی اس کے پاس جا پہنچا تھا۔ وہ مجھ پر کیسے اعتبار کر لیتی؟ پھر ایسی صورت میں کہ خود کہہ چکی تھی کہ اس نے جمیل سے اپنا آپ چھپا رکھا تھا۔ وہ اسے بھی اپنا مرد نہیں سمجھتی تھی۔ میں نے اس کے بارے میں اپنے طور پر سارے ہی اندازے غلط لگائے تھے۔ وہ اس بوٹے کی بیل ہی نہیں تھی۔ وہ اس شیر مرد کے ساتھ رہ رہی تھی جسے صبر کرنا آتا تھا۔ جس نے اس کے قریب رہ کر بھی خود کو اس قدر ترسایا تھا۔ کوئی اس کی بات سنتا تو شاید پھر اس کے آنسو خشک نہ ہو سکتے تھے۔ پتہ نہیں وہ غم کی، ہجر کی، محرومی کی کیسی کیسی داستان اپنے سینے میں سموئے پھرتا تھا۔ وہ جمیل جس کا نام اس نے جمیل سنگھ ڈال رکھا تھا اور وہ اسے پیٹتا بھی تھا۔ میرا خیال ہے وہ اس سے پٹ بھی جاتی ہوگی۔ اپنا فن اس نے جمیل پر کبھی نہیں آزمایا ہوگا۔ ورنہ وہ اسے گھر سے نکال دیتا۔ مگر اس کا استاد کون تھا۔ کس نے اسے کس مہربانی کے بدلے وہ سب کچھ سکھا دیا تھا جس پر غلام جیلانی فخر کرتا تھا کہ اس جیسا ماں نے ابھی پیدا ہی نہیں کیا۔ بالکل میری ہی طرح وہ گردن کی رگ کا انتخاب کرتی تھی۔ میری گردن ابھی تک سوجی ہوئی تھی۔ ابھری ہوئی نس مجھے اس کی انگلیوں کے لمس کا احساس دلاتی تھی۔ مجھے

اس سنبلہ نے واقعی برباد کر کے رکھ دیا تھا۔ اب کوئی چیز باقی نہیں رہ گئی تھی جس پر میں فخر کر سکتا۔ کچھ بھی باقی نہیں رہ گیا۔ میرا فن عام تو نہیں ہوا تھا مگر دو عورتوں میں منتقل ہو گیا تھا۔ میں اس پر جتنا بھی ماتم کرتا کم تھا۔ مگر میرے ماتم سے کیا ہو سکتا تھا، مجھے تو جو چپت پڑنی تھی، پڑ چکی تھی۔

میں نے بڑی مشکلوں سے خود کو سنبھالا اور تپائی پر رکھے سگریٹ اٹھا لیے مگر جب میں نے ایک سگریٹ سلگایا تو پتہ چلا کہ اندر سے گلا تنگ ہو چکا ہے۔ سانس کی نالی پہلے ایسی چوڑی نہیں رہی تھی۔ پھولی ہوئی نس نے جگہ زیادہ ہی گھیر لی تھی۔ اس عورت نے واقعی مجھے تباہ کر دیا تھا۔ اس سے انتقام لینے کے کئی طریقے میرے ذہن میں آئے مگر ہر بار میرے دل نے ان کو مسترد کر دیا۔ اس جیسی باکمال عورت سے اپنے کسی زخم کا بدلہ لینا کسی بھی طرح جائز نہیں تھا۔ وہ سراسر کمینگی ہوتی۔ اس نے مجھے للکار کر شکست دی تھی۔ میری انا کو یوں سرنگوں کر دیا تھا کہ اب اس میں پہلی سی سرفرازی نہیں آ سکتی تھی۔ اس نے مجھے اپنے حضور گرا لیا تھا، یوں کہ میں قیامت تک اس کے سامنے سر اونچا نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ایسی ہی بے مثال عورت تھی۔ مگر سوال یہ تھا کہ اس کا استاد کون تھا؟ وہ کیسے اس کو یہ فن دے گیا؟ سارے ملک میں اس جیسی تو ایک بھی نہیں ہوگی اور اسے فخر تھا کہ وہ بارڈر پر رہتی ہے اور ایک ایسے سنار کی بیوی بن کر جس نے چاندی کی اسمگلنگ میں بہت روپیہ کما لیا تھا اور وہ اس کے پیچھے ذلیل ہونے کے بجائے دور دور تک جھک مارتا پھرتا تھا۔

سگریٹ برابر جلتا رہا اور میری سوچ کے دھارے وسیع ہوتے گئے۔ ٹھہر ٹھہر کر آسیہ میرے ذہن میں ابھرتی تھی مگر اسے

توشاید اب گھر لوٹ آنے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ پتہ نہیں وہ کہاں غائب ہو گئی تھی۔ اس کا کسی سے بھی کوئی اتا پتہ نہیں ملتا تھا۔ آخری بار اس کا نام میں نے بہن جی کے منہ سے سنا مگر وہ بھی یہی کہہ رہی تھی کہ وہ گھر چلی گئی ہو گی۔ صحیح پتہ وہ بھی نہیں بتاتی تھی۔ اسی لیے تو میں ماں جی کے پاس گیا تھا۔ مگر وہ تو ویسے ہی ٹنڈ منڈ ہو کر بیٹھی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ بھول ہی گئی تھی کہ اس نے کبھی دو بچوں کو جنم دیا تھا۔

ابھی مجھے ڈھلوں صاحب کا بھی پتہ کرنا تھا۔ ان کے احسان یاد آتے تھے تو میرا جی چاہتا تھا کہ کوئی میری جان لے کر بھی انہیں رہائی دلا دے تو یہ سودا مہنگا نہیں رہے گا مگر ان کے بارے میں بھی کسی کو کچھ علم نہیں تھا۔ ایک وہ عالیہ تھی جو ان کے بارے میں سب کچھ جانتی تھی۔ دوسرا آدمی وہ بدری تھا جسے تھانے میں کسی نے گولی مار دی تھی۔ اب ایک ہی امید باقی تھی اور وہ تھی اس فوزیہ کی دستیابی۔ وہ اگر آپی کو مل گئی تو شاید وہ بتا سکے کہ عالیہ کہاں ہو گی۔ اسے پتہ نہیں کن لوگوں نے اغوا کر لیا تھا۔

بستر میں لیٹے لیٹے پانچ بج گئے۔ کمرے کی دیوار پر لگی گھڑی برابر مجھے احساس دلاتی تھی کہ مجھے وہاں سے نکل جانا چاہیے۔ میں اس گشتی عورت کا سامنا کر ہی نہیں سکتا تھا۔ مجھے اس نے کہیں کا بھی نہیں رہنے دیا تھا۔ مجھ سے میرے فخر و استکبار کو ہی وہ چھین چکی تھی۔ میری انا پاش پاش ہو گئی تھی۔ میں اس کے سامنے جانا ہی نہیں چاہتا تھا۔ یہ سوچ کر میں نے لحاف الگ پھینکا مگر عین اس وقت کمرے کا بھڑا ہوا دروازہ کھل گیا۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ میں نے فوراً ہی لحاف اوپر کر لیا اور یوں ظاہر کیا، جیسے میں ابھی تک بے ہوش ہوں۔ وہ دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ وہی تھی، اس کی خوشبو ہی بتاتی تھی کہ وہ اندر آ چکی ہے۔ اس وقت وہ سلیپر پہنے ہوئی تھی۔ میرے قریب آ کر اس نے مجھے بڑے غور سے دیکھا مگر وہاں روشنی کم ہونے کی وجہ سے وہ کوئی نتیجہ نہ نکال سکی۔ وہ پھر دروازے کی طرف لوٹی اور اس کے دونوں پٹ کھول کر واپس آ گئی۔ اب کمرے میں روشنی آنے لگی تھی۔

وہ میرے چہرے پر ہاتھ مارنے لگی۔ دونوں رخسار اس نے دائیں بائیں ہلکی سی چپت مار کر دیکھے۔ پھر وہ میری گردن کا معائنہ کرنے لگی۔ میں نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں اور سانس میں جان بوجھ کر روک روک کر لے رہا تھا۔ اس نے میری پھولی ہوئی رگ پر ہاتھ پھیرا۔ چند ہی لمحوں بعد اس نے میرے دونوں کان سہلا دیے مگر میں چپت لیٹا رہا۔ آنکھیں میری ابھی تک بند تھیں۔ مگر جانے اس نے کس بات سے یہ اندازہ لگا لیا کہ میں ہوش میں آ چکا ہوں۔ میرے پاؤں پر سے شاید لحاف اٹھانے سے اسے علم ہو گیا تھا کہ میں کن منزلوں میں ہوں۔ کوئی ایسی علامت ہو گی وہاں جس نے اس کو اس نتیجے پر پہنچا دیا کہ میں ہوش میں ہوں۔ وہ شاید مسکرا دی تھی۔

"تو یہ بات ہے۔ صاحب ابھی تک بے ہوش ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے میری اس حالتِ نوم کی کیفیت کو تسلیم کر لینے کے لیے کہا تھی حالانکہ اس کو یقین تھا کہ اس کا ڈسا ہوا اب پانی مانگ رہا ہے وہ فوراً ہی کمرے سے نکل گئی۔ میں نے اسی وقت لحاف اپنے پاؤں پر ڈال لیا۔ مجھے وہاں سردی محسوس ہو رہی تھی۔ ابھی کوئی پندرہ منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ وہ چائے کی پیالی بنا کر اندر لے آئی، بولی۔ "جناب اب آپ اٹھ جائیں، صبح ہو چکی ہے۔ چائے حاضر ہے پی لیں۔"

مگر میں پھر بھی نہیں اٹھا۔ آنکھیں میں نے بدستور بند کر رکھی تھیں۔ وہ چاہتی تو مجھے مکا مار کر بھی اٹھا سکتی تھی۔ بہت طاقت تھی اس کے پنجے میں۔ میرا خیال ہے کہ اگر وہ چاہتی تو بیل کی پسلیاں اندر ڈال سکتی تھی۔ ایک خاص انداز سے وہ جب ہاتھ مارتی تھی تو پھر اس کے ہدف کو کہیں پناہ نہیں ملتی تھی۔

جب میں نہیں اٹھا تو اس نے چائے کی پیالی میز پر رکھی اور باہر نکل گئی۔

"یہ چائے پی لیں بھئی جان! اس سے کوئی ناراضگی نہیں ہونی چاہیے۔"

مگر میں نے چائے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ وہ سالی سمجھتی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ ابھی تک اس کے ہاتھوں کے لمس کا مجھے احساس تھا۔ مگر غصہ اس پر مجھے بہت آ رہا تھا۔ "میں لعنت بھیجتا ہوں تیرے جیسی عورت پر۔ میرا سارا عشق اب ختم ہو چکا ہے بی بی ہاں، تو اب نئے سرے سے بھی جوان ہو جائے، زلیخا بن جائے تو میں تجھ پر ہزار بلکہ لاکھ بار لعنت بھیجتا ہوں۔ میں تیری چائے نہیں پیوں گا۔ آخر سمجھا کیا ہے تو نے مجھے؟" یہ ذہن تو یہی کہہ رہا تھا مگر دل اس کی بات نہیں مانتا تھا۔ اس کا طنبورہ ایک ہی راگ الاپ رہا تھا کہ وصل اس کا خدا نصیب کرے۔ میرا جی چاہتا ہے کیا کیا کچھ۔ اور وہ آپی بھی میر کو بھی فحش نگار سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر بقیہ حیات ہوتا تو یار روگ اسے جیل میں ڈال دیتے کہ لوگوں کے اخلاق خراب کرتا ہے یعنی تجھے وصل کے سوا کوئی کام ہی نہیں ہے اور وہ بھی غیر عورتوں سے تو وصل کی آرزو کرتا ہے۔ ہم بڑی سی تین سو چھہتر ایسی دفعہ لگا کر اندر بھیجتے ہیں۔ کا خیال تھا مگر میرا اپنا حال بھی اس روز یہی ہو رہا تھا اور وہ

سمجھ چکی تھی جب ہی تو اس نے میرے لیے وہ سزا تجویز کی تھی اور اب میں اس سزا سے سرخرو ہو رہا تھا کہ وہ میرے لیے چائے بنا کر لے آئی تھی۔

میں نے چائے پینے کے بجائے ایک سگریٹ سلگا لیا اور بس وہی کام خراب نکلا۔ دھوئیں کی بو برآمدے میں پہنچی تو وہ کہیں سے اٹھ کر تیزی سے اندر آ گئی اور بڑے مترنم لہجے میں بولی۔

"السلام علیکم! کیا حال ہیں آپ کے بھئی جان؟"

"اچھا ہوں بھئی جان! پہلے سے آرام ہے۔"

"مکمل آرام ہے نا؟ دراصل آپ نے حرکت ہی ایسی کی تھی بھئی جان کہ میرا سر پیٹنے کو جی چاہتا تھا۔ میں سوچتی تھی کہ یہ سارے ہی مرد ایسے ہوتے ہیں؟ سر پھرے، لاابالی اور ضدی۔ ٹچ اینڈ پور قسم کے۔ چائے تو پی لیں، اس سے تو کوئی ضد نہیں ہے آپ کو۔" یہ کہہ کر اس نے پیالی میرے دائیں ہاتھ میں تھما دی اور خود میرے پائینتی بیٹھ گئی۔ بظاہر وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ ہو سکتا ہے اندر سے ______ بھی وہ ویسی ہی ہو۔ کسی کے دل کا حال کوئی کیسے جان سکتا ہے۔

"یہ۔۔۔ یہ تم نے کیا کر دیا تھا مجھے؟ میں سخت حیران ہوں۔ یہ گلا تم کیسے مروڑ لیتی ہو؟ بہت خبیث عورت ہو تم۔"

"عورت کہاں ہوں، ابھی تو میں لڑکی ہوں۔ دراصل یہ بھی میرا ایک حربہ ہے۔ یہ آخری وار میں اس پر کرتی ہوں جو کسی طرح بھی سیدھا نہ ہو سکے۔ آپ کو زیادہ تکلیف تو نہیں؟"

"میری گردن ابھی تک پھولی ہوئی ہے اور تم تکلیف کی بات کرتی ہو۔ یہ دیکھو یہ نس۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ وہیں پڑے رہیں، مجھے کچھ دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔" یہ کہہ کر وہ کرسی پر جا بیٹھی۔

"ذرا سا سینک دینے سے یہ ٹھیک ہو جائے گی۔ فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے رات تین چار دفعہ اٹھ کر آپ کو دیکھا۔ مجھے بہت افسوس ہو رہا تھا مگر آپ کی نیت ہی خراب تھی، کوئی عورتوں سے یوں بھی ملتا ہے؟"

"مجھے افسوس ہے سنبلہ، میں تمہیں سمجھ نہیں سکا مگر مجھے یہ تو بتا دو کہ یہ حربہ تم نے کس سے سیکھا ہے؟"

"یہ سب کچھ تجربے سے آتا ہے۔ گھر کے غور و خوض سے۔ ایک مرد اپنے وجود پر دھیان دینے کی ضرورت ہے۔"

"نہیں۔ یہ بغیر استاد کے کوئی نہیں سیکھ سکتا ہے۔"

"میں آپ کو بتا ہی دیتی ہوں۔ یہاں جیل کے دو مہمان آئے تھے، وہ دونوں غیر ملکی تھے اور فلسطینیوں کے لیے کام کرتے ہیں۔ یہ گر مجھے ان میں سے ایک نے سکھا دیا تھا۔ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ اس کی بھی نیت خراب ہو گئی تھی مگر جب میں نے اسے پستول دکھایا تو وہ ڈر گیا۔ بعد میں اسی نے مجھے بتایا کہ جاپان میں لڑکیاں یہی کرتی ہیں اور یہ آخری حربہ ہے دشمن کو زیر کرنے کا۔"

"گڈ! مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی ہے سنبلہ! یقین رکھو، اب میری نگاہ بہت محتاط رہے گی۔ مجھے معلوم ہے کہ مجھے کہاں دیکھنا ہے۔"

"جہاں بھی دیکھیں، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔ ایک صرف آدمی کی نیت دھلی ہوئی ہونی چاہیے۔ بلکہ دھوبی سے دھلی ہوئی۔ آپ اب اٹھ کر منہ ہاتھ دھو کر نماز پڑھ لیں اور شکر کریں کہ آپ کی جان بچ گئی ورنہ اس حملے میں آپ شہید بھی ہو سکتے تھے۔ آئندہ مجھ سے بہت سوچ سمجھ کر بات کریں۔"

"جمیل کو پتہ ہے کہ تمہیں یہ حربہ آتا ہے؟"

"نہیں۔ اس سے تو میں پٹ لیتی ہوں اور یہ بہت ضروری ہے۔ اس کے بہت احسانات ہیں مجھ پر۔ مجھے وہ ہر شے سے زیادہ عزیز ہے۔ بس میں اسے اپنا شوہر نہیں بنا سکتی۔ پتہ نہیں ایسا کیوں ہے، کیوں ہے ایسا؟"

"مجھے کیا علم؟ وہ تمہارے معیار پر پورا نہیں اتر رہا ہو گا؟"

"ہاں، کچھ یہی بات ہے، کچھ ایسی ہی بات ہے بھئی جان!" یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔ اپنے پیچھے وہ خوشبو کی ایک لکیر چھوڑ گئی تھی جس میں اس کے بدن کی مہکتی ہوئی خوشبو رچی تھی۔

میں دیر تک اس فضا میں سانس لیتا رہا۔ دل میرا اب تک اسی کے خبط میں مبتلا تھا۔ وہ اب بھی اسے ہی چاہتا تھا۔ حالانکہ وہ اسے موت کے منہ میں دھکیل چکی تھی اور اگر اب بھی اسے ضرورت پڑتی تو مجھے یقین تھا کہ وہ مجھ پر ویسا ہی حربہ استعمال کرے گی اور مجھے جان سے گزار دے گی۔ اس کو سمجھ لینا ہی بہتر تھا۔ جب جمیل ایسا آدمی اس کے لیے اب تک اجنبی بنا رہا۔ تو وہ میرے ہاتھ کیسے آ جاتی۔ مجھے واقعی بہت محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔

میں نے منہ ہاتھ دھو لیا تو وہ کوئی آدھ گھنٹے بعد میرے لیے ناشتہ لے کر آ گئی مگر اب کی بار وہ بہت سنجیدہ رہی۔ مجھ سے اس نے کوئی بات نہیں کی۔ شاید وہ یہ چاہتی تھی کہ میں وہاں سے نکل جاؤں مگر آپی کے آنے سے پہلے تو یہ ممکن نہ تھا۔ وہاں سے اٹھ کر میں کسی گھوڑے پر بیٹھنے سے تو رہا۔ ناشتہ میں نے کر لیا تو اس نے اندر آ کر بہت خاموشی سے برتن اٹھا لیے۔ میرے لیے اس کے پاس الفاظ نہیں تھے۔ یوں جیسے میں وہاں موجود ہی نہیں تھا۔ بلاشبہ وہ یہی چاہتی تھی کہ میں وہاں سے

نکل جاؤں۔ اس کا گھر چھوڑ دوں۔ مگر یہ کیسے ممکن تھا۔ بستر پر لیٹے لیٹے میں نے کئی سگریٹ پھونک ڈالے مگر اس کا غصّہ اس عرصے میں بھی کم نہ ہو سکا۔ اس کا خیال یہ تھا کہ میں ہوش میں آتے ہی اس کے گھر سے نکل جاؤں گا۔ وہ چاہتی تو مجھے گلی میں بھی پھینک سکتی تھی۔ مگر ایسا نہیں ہُوا۔ وہ شاید اس تماشے سے ڈرتی تھی۔ جو میرے وہاں بے ہوش ہونے کی وجہ سے لگ جاتا۔ لوگ پوچھتے تو ضرور ہی کہ اسے ہوا کیا ہے؟ یہ زندہ تو ہے مگر مُردوں سے بدتر اس کی حالت ہے، اسے کس نے ڈس لیا ہے؟

کوئی ساڑھے نو بجے کے قریب جمیل واپس آگیا۔ وہ بہت خوش نظر آتا تھا۔ صحن میں اس کی آواز گونجی تو میں سمجھ گیا کہ اسے اس رات کوئی زبردست کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ آتے ہی بولا۔ ”ہے عاذرت! تو کہاں جا گھسی ہے، باہر آ ذرا۔“ اس نے صحن میں پڑی چارپائی پر ہی ڈیرہ ڈال دیا تھا۔ ایک بڑا سا اٹیچی کیس اس کے پاس تھا۔

میں نے دروازے میں ٹھہر کر اس پر نظر ڈالی تو وہ اپنے بھاری بھرکم بوٹ اتار رہا تھا۔

سُنبلہ باہر نکلی تو وہ بولا۔ ”خیر تو ہے، تیرا مُنہ کیوں سوجا ہوا ہے؟ ہائیں! یہ کیا قصہ ہے بھئی؟“

”کچھ نہیں۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے کام ہو گیا کہ نہیں؟“

”وہ تو ہو ہی جاتا ہے قسمت اچھی ہو تو پھر تم ایسی عاذرت بھی مل ہی جاتی ہے اور سودا بھی ہو جاتا ہے۔ لا میرے چپّل اِدھر لا۔ پر یہ تیرے رُخِ روشن پر بارہ کیوں بج رہے ہیں؟“ اچانک اس کی نظر مجھ پر آ پڑی۔ بڑے پُرخلوص لہجے میں بولا۔ ”کیا حال ہیں آپ کے جیلانی صاحب! کوئی مشکل تو نہیں پیش آئی۔“

”نہیں، میں ٹھیک ہوں جمیل صاحب! ابھی تک آبی واپس نہیں آیا ورنہ میں یہاں سے چلا گیا ہوتا۔“

”نہیں یار جی! یہ آپ کا گھر ہے جب تک چاہیں یہاں رہیں۔ میں ذرا دیر کے لیے سوؤں گا۔ رات بس ہنگامے کی نذر ہو گئی ہے۔“

”ہاں ضرور سو لیں۔ کچھ راتیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ آدمی کو بے چین کر جاتی ہیں۔“ میں نے سُنبلہ کی طرف دُزدیدہ نگاہ سے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ اس وقت باورچی خانے میں گھس رہی تھی۔ اس نے کوئی توجہ نہیں دی۔ چپ چاپ باورچی خانے میں جا گھسی۔ میں اُسے بھڑکا دینا چاہتا تھا۔ کوئی ایسی بات اس سے کہنا چاہتا تھا جو اس کے تن بدن میں آگ لگا دے، مگر مجھے کچھ بھی نہ سوجھ سکا۔

جمیل صحن سے اٹھا اور کمرے میں جا گھسا۔ ”ہے سُنبلہ! ذرا اِدھر آ عاذرت! یہ لحاف ٹھیک کر دے۔ کوئی کام اس سے سیدھا نہیں ہوتا۔ نالائق کہیں کی۔“

سنبلہ باورچی خانے سے نکل کر کمرے میں چلی گئی تو میں پھر سے بستر پر جا لیٹا۔

جمیل کو بستر میں دبکے ہوئے کوئی آدھ گھنٹہ ہی گزرا ہو گا کہ آبی واپس آگیا۔ موٹر سائیکل اُس نے صحن میں رکھی تو میں اس کی آواز سُن کر باہر نکل آیا۔ وہ بہت ہی تھکا تھکا سا نظر آتا تھا۔ کسی اور طرف دھیان دیے بغیر وہ سیدھا میرے کمرے میں آگیا۔ بولا۔ ”میں وہاں سے ہو آیا ہوں جیلانی! مگر وہ عورت مجھے وہاں نہیں مل سکی۔ خواجہ غلام علی سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔ اس کی بیٹی کا نام فوزیہ تو ہے مگر وہ تو میرے سامنے گونگی بن گئی۔“

”کیا مطلب؟ کیا کہتی تھی وہ؟“

”اس نے کہا کہ اس کا کسی جیلانی سے کوئی واسطہ نہیں۔ وہ تو یہ بھی مان کر نہیں دیتی کہ وہ تھانے بھی گئی تھی کہ نہیں۔“

”اچھا! یہ کیسے ہو سکتا ہے بھئی! میں کوئی جھوٹ تو نہیں بول رہا۔ وہ تھانے آئی تھی میرے لیے کھانا لے کر وہاں پہنچی تھی۔ اس سے پوچھا نہیں تم نے؟“

”نہیں یار! وہ ہر بات سے انکار کرتی ہے۔ تم کہتے ہو اس کا رنگ گورا تھا۔ ہاتھ بہت خوبصورت تھے۔ مگر وہ سانولی سی عورت ہے۔ فوزیہ اسی کا نام ہے۔ کوئی گوری عورت تو مجھے وہاں نظر نہیں آئی۔“

تم بھی بڑے احمق ہو آبی! چھوڑا تمھیں گائے کے پیچھے اور تم جا پہنچے بیل کے پیچھے۔ پتہ نہیں وہ کون عورت ہے جس سے تم جا ملے؟ ہو گئی ہے۔“

”نہیں بھئی! فوزیہ نام کی لڑکی خواجہ غلام علی ہی کی بیٹی ہے۔ خود مجھ سے ملی تھی مگر اس نے کہا ہے کہ وہ تو اس معاملے سے بالکل ہی ناواقف ہے۔ میں اسے کیا الزام دیتا؟“

”اس وقت خواجہ صاحب کہاں تھے؟“

”وہ وہیں بیٹھے تھے۔ وہ خود بھی یہی کہہ رہے تھے۔“

”بات کیسے ہوئی تھی؟“

”میں نے خواجہ صاحب سے کہا کہ میں سی آئی ڈی انسپکٹر ملا ہوں۔ اُن کی لڑکی فوزیہ سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ مان گئے اور انھوں نے مجھے فوزیہ سے ملا دیا۔“

”ختم کرو یہ قصہ یار جی! میں اس کے کھانے پر لعنت بھیجتا ہوں! اُس بدبخت نے خود مجھے فرنی میں رکھ کر رقعہ بھیجا تھا۔ خیر۔ تم نا تو مگر یہ بتاؤ رات تم کہاں رہے؟“

”بس ایسے ہی میں اپنی ایک دوست کے ہاں چلا گیا تھا۔ وہی جو ہمیں بینک میں ملی تھی۔“

”اچھا تو یہ بات ہے۔ مگر میرے ساتھ اچھا نہیں ہوا۔“

”کیوں؟ کیا ہوا ہے تمھارے ساتھ! خیر تو ہے۔“

”خیر نہیں ہے آبی! یہ عورت میری سمجھ میں نہیں آئی۔ رات میں اس کے کمرے میں جا گھسا تھا مگر اُس نے میری ایسی پٹائی کی۔ یہ دیکھو میری یہ نس ابھی تک پھولی ہوئی ہے۔“ یہ کہہ کر میں نے رات کے سارے واقعات اسے بتا دیے۔ وہ سنتا رہا اور مسکراتا رہا۔ جب میں چپ ہوا تو وہ بولا۔ ”جھانوپیں! تو سمجھتا ہے ہر عورت تیرے قبضے میں آسکتی ہے؟ پر وہ تیرا گُر کیسے سیکھ گئی؟ غیر ملکی مہمان تو اس کی اس طرح تربیت نہیں کر سکتے، کیا خیال ہے تیرا؟“

”سمجھ میں نہیں آتا۔ میں اسے اپنے ساتھ ہی لے جاؤں گا۔ یہ نہیں گئی تو میں اِدھر ہی رہ جاؤں گا۔ اس کو میں جمیل کے پاس نہیں رہنے دوں گا۔“

”دفع کر یار! تو آگے کی سوچ، یہ میں آج کا اخبار بھی لے آیا ہوں۔ حیرت ہے کہ اس میں تمھارے فرار کی کہانی درج نہیں ہے۔ وہ اس خبر کو گول کر گئے ہیں۔“

اخبار میں نے اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اُس میں میرے فرار کی خبر بالکل نہیں چھاپی گئی تھی اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ جلتی گاڑی میں سے سپاہی باہر بھی نکل سکے تھے کہ نہیں۔ میرے لیے آبی کا وہ ایثار اس کا ایک شاہکار تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ میرے عقب میں آرہا ہے۔ گاڑی اس کے بموں کے دھماکے سے جلنے لگی تھی۔ سپاہیوں کو میں نے دروازہ بند کر کے اندر ہی روک دیا تھا اور خدا ہی جانتا ہے کہ وہاں سے وہ کیسے نکلے ہوں گے۔

جمیل جلدی ہی بستر میں دبک کر سو گیا تو سُنبلہ آبی کے لیے ناشتہ لے آئی۔ وہ اب بھی بہت سنجیدہ نظر آتی تھی۔ پتہ نہیں اسے کیا ہو گیا تھا۔ صبح تو وہ اپنی فتح پر مسرور نظر آتی تھی کہ اس نے مجھے باندھ کے ڈال دیا تھا۔ وہ جب پانی پینے کے لیے واپس گئی تو میں نے کہا۔ ”آبی کیا خیال ہے تیرا! میں بھی اس کی نس دبا دوں؟ اسے معلوم ہونا چاہیے کہ یہ فن مجھے بھی آتا ہے۔“

”ایسا ہی کر دیا یار! ذرا مزہ ہی رہے گا۔ اس کو معلوم تو ہو کہ اس کا واسطہ کسی اناڑی سے نہیں پڑا ہے۔“

”میں نے بھی یہی سوچا ہے۔ تم اب سو جاؤ۔ میں اس کے ساتھ یہ ڈرامہ ضرور کروں گا۔“

کوئی آدھ گھنٹے بعد آبی بستر میں دبک گیا۔ وہ بہت زیادہ تھکا ہوا تھا۔ وہ گہری نیند میں کھو گیا تو میں باورچی خانے میں جا گھسا۔ سُنبلہ اس وقت صفائی میں مصروف تھی اور ایک عورت اُس کے ساتھ وہاں اور بھی تھی۔ وہ اس کے گھر میں بھانڈے برتن مانجھا کرتی تھی۔

”ذرا میرے لیے کافی تو بنا دیں۔“

”جی اچھا۔ کافی کو جی چاہتا ہے آپ کا۔ ٹھیک ہے، میں ابھی لاتی ہوں۔“

”مگر ابھی نہیں۔ یہ عورت چلی جائے تو پھر آئیں۔ پہلے صفائی ہو جائے۔“ یہ کہہ کر میں اپنے کمرے میں جا گھسا۔ آبی اس وقت واقعی گہری نیند میں تھا۔ میں عقبی دروازہ کھول کر سُنبلہ کے کمرے میں جا گھسا۔ وہاں میں نے ایک کیمرا دیکھ رکھا تھا۔ وہ دیوار پر لٹکا ہوا تھا۔ اس کے کمرے میں پہنچ کر میں نے اسے بڑی احتیاط سے اٹھا لیا۔ فلم اس میں موجود تھی اور وہ ایسا کیمرا تھا کہ رنگین تصویریں بن کر فوراً ہی باہر آ جاتی تھیں۔ جمیل نے پتہ نہیں وہ کس لیے خرید رکھا تھا۔ بہت ہی نفیس کیمرا تھا وہ۔ میں اسے لے کر اپنے کمرے میں آگیا۔ بستر ابھی تک شاید میرا منتظر تھا۔ اس کا لحاف آغوش وا کر کے بیٹھا تھا۔ میں سگریٹ سلگا کر اس کے اندر جا بیٹھا۔ گھر میں اب چاروں طرف مکمل خاموشی طاری تھی۔ ایک صرف اس ملازمہ ہی کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے طے کر رکھا تھا کہ سُنبلہ کو سبق دے کر واپس جاؤں گا۔ اس نے مجھے ذلیل کر کے رکھ دیا تھا اور اب سمجھتی تھی کہ وہ بالکل محفوظ ہے۔ میں دوبارہ اس کی طرف نہیں دیکھ سکوں گا۔

کوئی پون گھنٹے بعد سنبلہ میرے کمرے میں آ گئی۔ وہ میرے لیے کافی بنا لائی تھی اور ایک نہیں دو پیالے۔ وہ اس نے لا کر میز پر رکھ دیے۔

”لیں، یہ کافی پی لیں۔“

”آپ کی بڑی مہربانی ہے جناب! ورنہ میں اس قابل کہاں تھا۔“

”زیادہ باتیں نہ کریں۔ آپ کے گلے میں خراش بڑھ جائے گی، بس اسے پی لیں۔“

میں لحاف سے نکل کر اس کے پاس کرسی پر جا بیٹھا۔ کیمرا میں نے لحاف کے اندر ہی رکھ دیا تھا۔ اب وہ وقت آگیا تھا کہ میں اس پر اپنا داؤ آزماتا۔ ”میری باتیں آپ کو پسند نہیں ہیں؟“

”جی نہیں۔ مجھے آپ کا کچھ بھی پسند نہیں ہے۔ اس میں میٹھا زیادہ تو نہیں؟“

”میٹھا تو میں زیادہ ہی پیتا ہوں البتہ جب آپ نے ہیں تو پھر میٹھے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ حضرت علیلی کے بارے میں مشہور

ہے کہ جب وہ پانی کو ہاتھ لگاتے تھے تو وہ شراب بن جاتا تھا۔"
یہ کہہ کر میں نے پیالہ منہ سے لگا لیا۔
"میرا خیال ہے کہ آپ کو یہاں سے جلدی چلے جانا چاہیے ورنہ آپ کی جان محفوظ نہیں ہے۔ میں دوسری بار شاید آپ کو معاف نہ کروں۔"
"میری توبہ۔ میں دوبارہ ایسی غلطی کیوں کروں گا بھلا۔ آپ نے ایسا ہی بے وقوف سمجھا ہے مجھے؟ جی ذرا سوچیں تو۔ آپ تو اچھے خاصے مرد کو بے کار بنا دیتی ہیں۔" یہ کہہ کر میں نے پیالی اٹھائی اور اس کے قریب جا ٹھہرا۔ وہ کچھ بدکی تو سہی مگر اپنا خوف اس نے ظاہر نہیں کیا۔
"کاش میں وہ گر آپ پر آزما سکتا۔ مجھے آپ اپنا شاگرد بنا لیں۔"
وہ کنکھیوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میرا ہاتھ اس کی گردن کی طرف بڑھا تو وہ اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ دوسرے ہاتھ میں پیالی پیسے ہاتھ سے چھلک گئی مگر میں نے اس کو اٹھنے نہیں دیا۔ اس کی گردن ایک خاص زاویے سے ہاتھ میں لے کر میں نے اس کی رگِ احساس مسل دی اور اس کے ساتھ ہی وہ میرے ہاتھ میں جھول گئی۔ پیالا کچھ زیادہ ہی چھلک گیا تھا۔ اسے میں نے میز پر رکھا اور پھر سنبلہ کو کندھے پر ڈال کر میں نہایت احتیاط سے اس کے کمرے میں جا گھسا
سارا گھر خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ کسی طرف سے کوئی آواز نہیں آتی تھی اور سنبلہ میرے ہاتھ میں تھی۔ اسے میں نے پلنگ پر لٹا دیا۔ وہ نیند میں تھی، گہری نیند میں اور میں اس پر غالب آ چکا تھا۔ میں نے چاہا کہ میں اسے اس کی انا سے محروم کر دوں، مگر وہ جو میرے اندر ایک راستباز آدمی ہمہ وقت موجود رہتا ہے وہ مجھ سے دست و گریبان ہونے لگا۔ وہ مجھے کسی بھی طرح اپنی اس مفتوح کو مزید ذلیل کرنے سے باز رکھ رہا تھا۔ میں نے کیمرا سیدھا کیا اور اس کی چار تصویریں اتار لیں ۔ وہ سب کی سب بہترین حالت میں تھیں اور ان میں سنبلہ جیتی جاگتی نظر آتی تھی۔ اِک صرف اس کی آنکھیں ہی بند تھیں ۔ اس کا اپنے باقی وجود سے لاتعلق ہو گیا تھا۔ نہ اس کا شعور کام کرتا تھا نہ لاشعور۔ وہ پہلی خاتون تھی جسے میں نے غفلت کی حالت میں بلکہ صحیح سالم طبعی ذہنی حالت میں اس حال کو پہنچا دیا تھا۔ بلاشبہ وہ انتقامی کارروائی تھی مگر اس میں اور بھی بہت کچھ تھا مگر اس کے اس فخر کو میں نے ذلیل ہونے سے بچا لیا تھا۔ وہ رنگین تصویریں اس کے اصل سے کہیں زیادہ جاذبِ نظر تھیں۔ وہ میں نے جیب میں رکھیں اور کیمرا کیل پر لٹکا کر میں اپنے کمرے میں واپس آ گیا اور ایک بار پھر میں بستر میں دبک گیا۔ نیند نے مجھے بھی نڈھال کر دیا تھا۔

میں چار بجے بستر سے اٹھا تو جمیل اس وقت مجھے آواز دے رہا تھا۔
"کیا ہوا، خیر تو ہے تم بہت گھبرائے ہوئے ہو؟"
"یار وہ سنبلہ ۔ پتہ نہیں اسے کیا ہو گیا ہے، وہ بالکل بے ہوش ہے۔"
اتنے میں آپی بھی جاگ اٹھی۔ بستر سے سر اٹھا کر بولی۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟ وہ بے ہوش کیسے ہو گئی؟"
"کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ یہاں کوئی ڈاکٹر بھی تو نہیں ہے، تم ہی دیکھو اسے جا کر، میں تو سخت پریشان ہوں۔"
آپی نے حسبِ عادت اٹھتے ہی بوٹ پہن لیے اور ہم دونوں جمیل کے ساتھ سنبلہ کے کمرے میں جا گھسے۔ وہ واقعی ابھی تک بے ہوش تھی۔ میں نے جاتے ہی اس کی نبض ٹٹولی اور آنکھوں کا غلاف الٹ کر دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ آدھ گھنٹے تک ہوش میں آ جائے گی۔
"ذرا تھوڑا سا تیل لاؤ اور اس کے تلووں پر ملو۔ میں اس کی گردن کی مالش کرتا ہوں۔"
جمیل تیل کی شیشی لے آیا تو ہم نے اس کی مالش شروع کر دی۔ اس کی گردن اور اس کی کنپٹیوں کی مالش کا یہ اثر ہوا کہ وہ دس ہی منٹ میں ہوش میں آ گئی۔ کسمساتے ہوئے اس نے آنکھیں کھول دیں۔ میں اور جمیل اس کے سامنے ہی بیٹھے تھے۔ چند لمحوں تک وہ مجھے بہت غور سے دیکھتی رہی۔ یوں جیسے کوئی بات اس کے منہ پر آ کر رک جاتی ہو۔
"تجھے کیا ہو گیا تھا عاؤرت! ایسی حالت میں تو میں نے کبھی نہیں دیکھا ہے تجھے۔ کوئی دوا پی تھی تم نے؟"
"نہیں جمیل! یہ بات نہیں ہے، بس پتہ نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔ میں بستر پر لیٹی اور بے ہوش ہو گئی۔ کب سے میری یہ حالت ہے؟ کیا وقت ہو رہا ہے اب؟"
"چار بج رہے ہیں بھئی! پتہ نہیں تم کب سے بے ہوش ہو۔ یہ لوگ بھی سو رہے تھے۔"
"نہیں اس نے کافی پلائی تھی اور یہی کوئی دس بج رہے تھے اس وقت۔"
"بھوت پریت اسی وقت نیچے اترتے ہیں۔" آپی نے لقمہ دیا۔
"جی ہاں۔ لگتا تو ایسا ہی ہے مگر یہ کوئی انسانی بھوت تھا۔ تھوڑا پانی تو لائیں میرے لیے۔" وہ بہت ہی سنجیدہ بلکہ افسردہ دکھائی دیتی تھی۔ جمیل باہر نکلا تو وہ بولی۔ "یہ کیا حرکت کی ہے میرے ساتھ؟ یہ ۔۔۔ یہ گر آپ کو بھی معلوم تھا کیا؟" اس کی آنکھیں فرطِ حیرت سے پھٹی جا رہی تھیں۔

"جی ہاں۔ اس کی موجد آپ ہی نہیں ہیں۔ کچھ اور لوگ بھی اس تجربے میں کامیاب رہے ہیں اور ۔۔۔ آپی تم چلو میں ذرا اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے آپی کو آنکھ مار کر وہاں سے ہٹا دیا۔
"اور ۔۔۔ اور اب مجھے معلوم ہے کہ آپ کیسی ہیں۔ آپ کی میں نے کچھ تصویریں بھی کھینچ لی ہیں، یہ دیکھیں۔" یہ کہہ کر میں نے ایک تصویر اس کے سامنے رکھ دی۔
وہ یوں ہو گئی جیسے وہ چھوئی موئی کی بوٹی ہو۔ اس کا پیلا رنگ اور زیادہ پیلا ہو گیا۔ تصویر اس نے میرے ہاتھ سے چھین لی اور روشنی کی طرف کر کے دیکھتے ہوئے بولی۔ "آپ ۔۔۔ آپ نے اچھا نہیں کیا ہے جیلانی! میں اس ذلت کو کبھی برداشت نہیں کر سکتی۔ آپ ۔۔۔" لفظ اس کے ہونٹوں سے چپک گئے۔ "ایسی حالت میں تو آپ کچھ بھی کر سکتے تھے۔"
"جی نہیں، ایسی کمینگی مجھ میں نہیں آئی ہے ابھی۔ آپ بالکل محفوظ ہیں۔"
"آپ کا بہت بہت شکریہ جیلانی! میں ۔۔۔ مجھے یہی ڈر تھا کہ کہیں میں اس حال میں ماری تو نہیں گئی ۔۔۔ بے ہوش ہونا اور بات ہے مگر ۔۔۔"
ابھی وہ یہ بات کہہ ہی رہی تھی کہ جمیل اندر آ گیا۔ اس کے ہاتھ سے گلاس لے کر اس نے گھونٹ گھونٹ کر کے پانی حلق سے نیچے اتارا اور کہنے لگی۔ "تم ذرا حکیم صاحب ہی کے ہاں چلے جاؤ۔ کوئی دوا ہو تو لے آؤ، میرے گلے میں بھی سخت خراش آ گئی ہے۔ حلق تر ہی نہیں ہوتا۔ ساری کیفیت اسے بتا دینا۔"
"اچھا، میں ابھی جاتا ہوں۔ وہ گھر پر ہی ہوگا۔ تمہارے حالات تو ٹھیک ہیں نا؟"
"نہیں نہیں۔ اور کوئی بات نہیں ہے۔ ویسے میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔"
"ٹھیک ہے، میں اس سے پوچھتا ہوں تمہاری بے ہوشی نے تو مجھے پاگل کر دیا۔" یہ کہہ کر وہ اسی وقت باہر نکل گیا۔
"مجھے ۔۔۔ مجھے کسی تم ایسی ہی کی ضرورت تھی سنبلہ! مجھے معاف کر دو۔ میں نے شاید تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔"
"نہیں، مجھے اس کا کوئی افسوس نہیں ہے جیلانی! میں ۔۔۔ آج رات ۔۔۔"
"نہیں، اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔ پھر کسی دن تم سے ملنے آؤں گا سنبلہ! جس چیز کی مجھے تلاش تھی وہ مجھے مل ہی گئی ہے۔" میں نے اس کو یہ احساس دلا دیا کہ میں اس کے بغیر بہت ہی تنہا تھا اور حیرت کی بات یہ ہے کہ اس نے اُف تک نہیں کی۔
جمیل واپس آیا تو وہ اسے برآمدے میں بیٹھی ملی۔ اب وہ پہلے سے کہیں زیادہ مطمئن تھی۔ اس رات سنبلہ نے خوب اچھی طرح خود کو سنوارا، سجایا۔ وہ سولہ سنگھار کر کے کمرے سے نکلی تو میں اور آپی اس وقت صحن میں بیٹھے تھے۔ شام کے سات بج رہے تھے۔ راتیں اب جلدی ہی زمین پر اتر آتی تھیں۔ جمیل اس وقت کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ سنبلہ کو میں نے دیکھا تو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ آپی اس سے بہت زیادہ متاثر نظر آتا تھا۔
"یہ ۔۔۔ یہ چاند کہاں سے نکل آیا ہے یلہ! اسے دیکھو تو ذرا۔" آپی نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔
"دیکھیں ذرا، کیسی لگتی ہوں میں اس لباس میں؟"
"میں کیا کہوں سنبلہ! آپ تو میرے تصور سے بھی زیادہ حسین نکلیں۔ کیوں آپی! اسے ناں میں ایک نئی شان پائی جاتی ہے۔"
"کہیں جمیل آ گیا تو کیا سوچے گا کہ یہ ہار سنگھار کس کے لیے ہے؟"
"جی نہیں۔ اسے عادت ہو گئی ہے۔ مہینے میں ایک دو بار تو میں ایسا ضرور کرتی ہوں۔"
ابھی وہ یہ بات کہہ ہی رہی تھی کہ جمیل اندر آ گیا مگر وہ تنہا نہیں تھا۔ اس کے دو دوست بھی ساتھ آئے تھے اور وہ پردے کے لیے باہر گلی میں رک گئے تھے۔
"عاؤرت! تو جمیل اندر میرے دوست آئے ہیں چلو۔" وہ اسے گھورتے ہوئے بولا۔
سنبلہ اسی وقت کمرے میں جا گھسی۔
"آؤ یار! اندر آ جاؤ۔" اس کے دونوں دوست اندر آ گئے۔ ان کا حلیہ دیکھ کر تو میں پریشان ہی ہو گیا۔ وہ سر پر بڑی بڑی کلّے دار پگڑیاں باندھے ہوئے تھے اور گلے میں کمبل جھول رہے تھے۔ نیچے ان لوگوں نے سفید قمیص شلوار پہن رکھی تھی اور دونوں کے جوتے طلائی تھے۔ وہ کوئی سوداگر نظر آتے تھے مجھے۔
"ان سے ملو یار! یہ ہیں میرے دوست الفت علی خان اور قاسم حسین اور یہ ہیں جیلانی صاحب اور یہ آپی صاحب ہیں۔"
ہم نے اٹھ کر ان سے مصافحہ کیا تو وہ دونوں سامنے کی چارپائی پر بیٹھ گئے۔
"بہت بھوک لگی ہے یار!" قاسم حسین نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ وہ ہم دونوں کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔
"تمہارے یہ دوست کہیں ملازم ہیں؟"
"نہیں یار! یہ بھی اپنے ہی دھندے کے آدمی ہیں مگر ان کا محکمہ مختلف ہے۔ ٹھہرو میں تمہارے لیے پہلے کھانا تیار کرواتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ کمرے میں جا گھسا۔ الفت علی خاموش ہی بیٹھا تھا مگر اس کی آنکھوں سے یہی تاثر ملتا تھا کہ وہ جمیل کے گھر کو بڑے انہماک سے دیکھ رہا ہے۔ کبھی اس کی نظر ہمارے چہرے پر جم جاتی تھی۔

ہم سے وہ پتہ نہیں کیا چھپا لینا چاہتا تھا۔ دونوں کے ہاتھوں میں بھاری بھرکم اٹیچی کیس تھے۔ جو وہ بڑی مشکلوں سے اندر لائے تھے۔

"آپ یہاں کیسے پہنچے؟ یہ سامان تو آپ کے پاس بہت فضول ہے؟" آبی نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔

"بڑی مصیبت ہے یہ سامان بھی۔ ہمارے تو سر پڑے ہو گئے۔ بڑی مشکلوں سے یہاں پہنچے ہیں۔"

"در اصل ہم گھوڑوں پر سوار تھے۔ مگر وہ راستے میں ہی ہم سے چھن گئے۔ چھن کیا گئے، وہ دونوں ہی زخمی ہو گئے تھے۔ یہ سامان اٹھا کر بہت مصیبتوں سے ہم یہاں پہنچے ہیں۔" قائم حسین نے وضاحت کی۔

اتنے میں جمیل پھر ہمارے پاس آ بیٹھا، بولا۔ "اس میں کیا ہے یارو! کوئی مال بھی لاتے ہو کہ نہیں؟"

"لائے ہیں بھئی! اس بریف کیس میں ہم تمھارے لیے چاندی لائے ہیں اور اس میں الائچی ہے۔"

"گڈ، ویری گڈ ___ پھر تو مزے ہی آ گئے۔ الائچی کا بھی گاہک یہاں موجود ہے۔ تم آؤ میرے ساتھ۔ اندر آ جاؤ۔ حساب کتاب وہیں کر لیتے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے ایک اٹیچی کیس خود اٹھایا دوسرا اس نے قائم حسین کو اٹھوا دیا اور وہ دونوں ہی کمرے میں بند ہو گئے۔

رات ان تینوں نے خوب شراب پی۔ یہاں تک کہ وہ دھت ہو گئے۔ میں اور آبی اپنے ہی کمرے میں بیٹھے رہے۔ وہ لوگ ہماری سمجھ میں بالکل نہیں آ رہے تھے۔

اس وقت یہی کوئی بارہ بجے کا وقت ہو گا کہ سُنبلہ ہمارے پاس آ گئی۔ اس کی آنکھیں اشکبار تھیں، بولی۔ "آپ دیکھتے ہیں، یہ کیسا اودھم مچا رہے ہیں۔ میں نے ان کو پچھلے کمرے میں بٹھایا تھا مگر ان کا شور تو سنیں۔"

"یہ کون لوگ ہیں؟ کیوں آتے ہیں یہ ادھر؟"

"جمیل کے کاروباری یار ہیں۔ بارڈر کے پار سے آتے ہیں چاندی لے کر۔"

"ان کو ہوش کرنا چاہیے۔ آوازیں باہر تک بھی پھیل سکتی ہیں۔"

"مجھے یہی دھڑکا لگا ہے ان کے پاس گھوڑے بھی تھے۔ سپاہیوں کی گولیوں سے زخمی ہو گئے۔ پھر بھی یہ انھیں بھگاتے رہے اور بعد میں کسی جگہ جب وہ بے دم ہو گئے تو یہ انھیں چھوڑ کر یہاں آ گئے۔ پتہ نہیں پولیس کیا کرے۔ وہ کسی بھی وقت مصیبت کھڑی کر سکتے ہیں۔"

"مال کہاں ہے اب؟"

"وہ تو جمیل نے گھر سے باہر بھیج دیا ہے۔ ایسے یہ کہاں گھر میں رکھتے ہیں۔ فوراً ہی ادھر اُدھر کر دیتے ہیں۔"

"خدا ہی خیر کرے۔ میرا خیال ہے آبی! ہمیں یہاں سے نکل چلنا چاہیے۔"

"یہی ہو گا۔ صبح ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔ یہ سارا دھندا ہی بہت غلط ہے۔" آبی بھی ان کی ہاؤ ہُو سن کر افسردہ ہو گیا تھا۔ آدمی کو وہ یوں حیوانی سطح پر اُترتے نہیں دیکھ سکتا تھا، بولا۔ "ان کو سمجھاؤ جیلانی! یہ سراسر زیادتی ہے۔ ان کی عزت خاک میں مل رہی ہے۔ لوگ کیا کہیں گے؟"

ابھی وہ یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ دروازے پر زوردار قسم کی دستک ہوئی۔ میں اور آبی دونوں ہی اچھل پڑے۔ پولیس کے نام سے ہمیں وحشت ہوتی تھی۔ پتہ نہیں دروازے پر کون آیا تھا۔

"آپ ذرا دیکھیں کون ہے۔"

"نہیں۔ یہ کام آپ کو کرنا ہے۔ ہمیں دیکھ کر خواہ مخواہ ہی وہ لوگ شک کریں گے۔ خدا معلوم کون ہے دروازے پر۔"

"ٹھیک ہے، میں دیکھتی ہوں۔ آپ ذرا ان کو خاموش کرائیں۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئی۔ اندر سے آنے والی آوازیں آبی نے فوراً ہی بند کرا دیں جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ابھی تک ہوش میں تھے اور خواہ مخواہ ہی شور مچا رہے تھے۔

سُنبلہ نے دروازے پر جا کر پوچھا کہ کون ہے تو ایک بڑی تیز کراری سی آواز گلی میں گونجی۔ "ہم بارڈر پولیس کے آدمی ہیں۔ دروازہ کھولیں۔"

"کیا کام ہے آپ کو اس وقت ہمارے گھر میں؟"

"دروازہ کھولیں، ہم آپ کے گھر کی تلاشی لیں گے۔"

سُنبلہ پریشان ہو کر واپس آ گئی اور ہمارے کمرے سے گزرتی ہوئی بولی۔ "وہ بارڈر پولیس کے آدمی ہیں۔ میں انہیں بتاتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اگلے کمرے میں جا پہنچی۔

کچھ ہی دیر بعد جمیل ہمارے پاس آ گیا، بولا۔ "آپ بے فکر رہیں۔ میں ان کو وہیں سے ٹہلا دوں گا۔ یہ آتے ہی رہتے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے صحن کا دروازہ کھولا اور گلی میں نکل گیا۔ مگر ان کے سامنے اس کی دال نہیں گلی۔ وہ کچھ سُننا ہی نہیں چاہتے تھے۔ جمیل کو ایک طرف ہٹا کر وہ دروازے کے اندر آ گئے۔ پتہ نہیں باہر کتنے لوگ موجود تھے۔ صرف تین سپاہی اور ایک انسپکٹر ہی ہمیں صحن میں دکھائی دیے۔ میری اور آبی کی تو جان ہی نکل گئی۔ جمیل بھی ان کے عقب میں آ رہا تھا۔ وہ برآمدے میں پہنچ کر رک گئے۔ انسپکٹر نے مکان کا اچھی طرح جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "ہماری اطلاع یہ ہے کہ وہ اسمگلر آپ کے گھر میں موجود ہیں۔ یہ دروازہ کھلوائیں۔"

"دیکھ لیں صاحب! ضرور دیکھیں۔ میرے چند عزیز یہاں آئے ہوئے ہیں، ان سے مل لیں آپ۔" یہ کہہ کر جمیل نے انسپکٹر کو ہمارے کمرے میں داخل کر دیا۔ ہم اس وقت بستروں میں دبکے ہوئے تھے۔ لیمپ کی بتی کافی روشن تھی۔

"یہ ہمارے انسپکٹر صاحب ہیں۔ انھیں شبہ ہے کہ یہاں چند اسمگلر جمع ہیں۔" پھر جمیل نے ہمارے تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "یہ میرے خالہ زاد بھائی ہیں غلام جیلانی اور یہ آبی صاحب ہیں اسلم آبی۔ ملتان سے آئے ہیں۔"

"نہیں نہیں۔ میں ان کی بات نہیں کر رہا۔" اس نے ہمیں بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ ہم دونوں ہی اس کی یادداشت میں محفوظ نہیں تھے۔ "ہمیں لفت علی اور قائم حسین کی تلاش ہے۔" یہ کہہ کر وہ اگلے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اُن دونوں کی گرفتاری اب یقینی ہو گئی تھی۔ کوئی اُن کو پولیس سے بچا نہیں سکتا تھا۔ انسپکٹر نے اگلے کمرے میں جانے سے پہلے ایک بار پھر ہمیں مڑ کر دیکھا، بولا۔ "یہ۔۔۔۔ یہ ادھر شور کون مچا رہا تھا؟"

"آپ کا وہم ہے انسپکٹر صاحب! شور یہاں کون مچا سکتا ہے بھلا؟ ایسے ہی گپ شپ کر رہے تھے۔"

"ہوں۔ دیکھتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اگلے کمرے میں جا گھسا۔ لفت علی اور قائم حسین وہیں بیٹھے تھے اور میرا خیال تھا کہ وہ اُن کی گردنیں ناپ لیں گے۔ ہم بھی اُن کے پیچھے اس دروازے میں داخل ہو گئے۔ مگر یہ دیکھ کر ہم حیران رہ گئے کہ وہ دونوں وہاں موجود نہیں تھے۔ انسپکٹر پریشان ہو گیا۔ دو سپاہی اس کے ساتھ تھے۔ اس نے انہیں تمام کمروں کی تلاشی لینے کا حکم دیا مگر انہیں وہاں کسی کمرے سے کچھ بھی نہیں مل سکا۔ گھر میں کوئی سامان ایسا نہیں تھا جس پر اعتراض ہو سکتا۔ جمیل نے چاندی یا سونے نام کی کوئی بھی شے وہاں نہیں رکھی تھی۔ ایک صرف سُنبلہ کے چند زیورات تھے اور وہ ان کے بارے میں کوئی سوال نہیں کر سکتا تھا۔

"میری اطلاع غلط نہیں ہو سکتی ہے جمیل میاں! بہتر ہے تم مجھے ساری بات بتا دو۔"

"آپ نے گھر تو دیکھ ہی لیا ہے اور کیا چاہتے ہیں آپ؟ میرے یہی دو عزیز یہاں ہیں اور تو کوئی بھی نہیں آیا۔"

حیرت یہ تھی کہ وہ شراب کی بوتلیں اور اُن کے جام سب کچھ اٹھا کر کمرے سے غائب ہو چکے تھے جیسے وہ وہاں کبھی آئے ہی نہیں تھے۔ انسپکٹر کو اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا مگر سب کچھ دیکھ لینے کے بعد اس کے لیے کچھ کہنا ناممکن تھا۔ اُس نے ایک بار پھر سارے گھر کا جائزہ لیا۔ چھت تک وہ ہو آیا تھا مگر اُن دونوں کا کوئی نشان اُسے نہ مل سکا تو وہ جمیل سے مصافحہ کر کے اسی وقت باہر نکل گیا۔ اُس کی حیرت دیدنی تھی مگر وہ بے بس نظر آتا تھا۔

وہ گھر سے نکلے تو سنبلہ اور جمیل پھر ہمارے پاس آ بیٹھے۔ دونوں ہی خاموش تھے۔ مگر آنکھوں ہی آنکھوں میں وہ ایک دوسرے سے کچھ کہہ رہے تھے۔

"وہ کہاں گئے ہیں دونوں؟ اچھا ہوا وہ غائب ہو گئے مگر وہ ہیں کہاں؟" آبی نے اُن کو خاموش دیکھ کر کہا۔

"اللہ نے انہیں بچا لیا ہے ورنہ وہ دونوں مارے گئے تھے آج۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ سارا مال میں نے باہر بھیج دیا تھا۔" جمیل نے سُکھ کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "آبی صاحب آپ کچھ کہہ رہے تھے ان کے بارے میں۔ کیا خیال ہے انڈیا جائیں گے آپ؟"

"ہاں ارادہ تو ہے مگر اب تو یہ ممکن نہیں رہا ہے۔"

"نہیں، یہ اب بھی ممکن ہے۔ صبح وہ ہم سے مل کر جائیں گے۔ میں چار بجے آپ کو جگا دوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم صبح اِن کے ساتھ چلے جائیں گے۔ کچھ کام ہے ہمیں امرتسر میں۔" آبی نے مجھ سے مشورہ لیے بغیر ہی کہہ دیا۔

کچھ دیر تک وہ دونوں ہمارے پاس بیٹھے رہے اور پھر اپنے کمروں میں جا گھسے۔ سُنبلہ واقعی الگ کمرے میں سوتی تھی۔ وہ اپنی بات کی دھنی معلوم ہوتی تھی۔

"یار! کیا خیال ہے تیرا۔ ہم امرتسر چلے جائیں؟ ڈھلوں صاحب کو ڈھونڈنا بہت ضروری ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر پہلے ہمیں عالیہ کا پتہ معلوم ہونا چاہیے۔ تمھیں یقین ہے کہ وہ عالیہ ہی تھی جسے اس روز اغوا کر لیا گیا تھا؟"

"ہاں بھئی! میں خود وہاں موجود تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا، وہ کون لوگ تھے؟"

"گھر میں کوئی اور آدمی بھی تو ہوں گے؟"

"ضرور ہوں گے مگر میں نے اُن سے کوئی بات نہیں کی ___ موقع ہی نہیں تھا، مجھے اپنی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ اُن کا مقصد بھی وہی تھا جس کے لیے میں وہاں پہنچا تھا۔"

"ٹھیک ہے یار! ہٹاؤ اس قصے کو ہمیں بہرحال امرتسر پہنچنا ہے ورنہ وہ ڈھلوں صاحب کا پتہ نہیں کیا کر دیں گے۔" میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ میرے وجود میں ایک بار پھر ہلچل مچ گئی تھی۔ ڈھلوں صاحب کے بغیر ہمیں کہیں پناہ نہیں مل سکتی تھی۔ یہ وہی تھے جو ہمیں پولیس کی مصیبت سے بچا سکتے تھے ورنہ تو شاید ہم کبھی سرسبز نہیں ہو سکتے تھے۔ ہمیں اس لہو تر اسے بہرحال نمٹ لینا چاہیے تھا۔ اس کی تلوار تو کب سے ہمارے سر پہ لٹک رہی تھی۔ بالآخر وہ ہم پر آ پڑا۔ میرا خیال ہے کہ بدری کو لہو تر لے کے

آدمیوں نے ہی اس حال کو پہنچا دیا تھا ورنہ کوئی وجہ نہیں تھی کہ بڑی حوالات میں یوں بے بسی کی موت مر جاتا۔ وہ بہت اہم آدمی تھا اس کے سینے میں خدا جانے کیسے کیسے راز مخفی تھے۔ اس کا پولیس کے ہتھے چڑھ جانا انھیں کسی بھی طرح منظور نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ بالکل ہی مغلوب ہو گیا تو انھوں نے اسے گولی مار دی ورنہ وہ سارے ہی راز اُگل دیتا۔ ملہوترا پتہ نہیں کیوں ایسا کر رہا تھا حکومتوں کی لڑائی میں کسی فرد کی تو کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ ڈھلوں صاحب بھی ایسے ہی آدمی تھے، پھر وہ کیوں اُن کے پیچھے پڑ گیا تھا؟ یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

دو گھڑی رات باقی رہ گئی تھی۔ وہ ہم نے جوں توں کر کے بستر پر گزار دی۔ نہ آبی گہری نیند سو سکا نہ میں۔ مگر تین ہی بجے ہمیں جمیل کے کمرے سے آوازیں سُنائی دینے لگیں۔ قائم حسین شاید واپس آ گیا تھا اور اس کے ساتھ الفت علی بھی۔ ہم دونوں ہی اُٹھ بیٹھے۔ چند ہی لمحوں بعد عقبی دروازہ کھلا اور وہ تینوں واقعی صحیح سالم حالت میں ہمارے سامنے آ کھڑے۔

”لو بھئی! یہ واپس آ گئے ہیں۔ دو گھڑی کی مہلت ہی ان کے لیے بہت کافی تھی۔“ جمیل نے ان کو ہمارے پاس بٹھاتے ہوئے کہا۔

”یہ دفعتہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ آپ کہاں چلے گئے تھے جناب؟“ آبی نے سگریٹ سُلگاتے ہوئے کہا۔

”بس ایسے ہی ہم ذرا اِدھر اُدھر ہو گئے تھے۔ اپنا تو دھندا یہی ہے۔ آپ انڈیا جانا چاہتے ہیں؟“

”ہاں یار جی! کوئی محفوظ راستہ ہو تو وہ ہمیں دکھا دو۔ ہمیں امرتسر میں بہت ضروری کام ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ ہم ابھی جا رہے ہیں آپ تیار ہو جائیں۔ کچھ پیسہ ہے آپ کے پاس؟“

”ہاں، کوئی بیس ہزار ہے، کافی رہے گا؟“ آبی نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کہا۔

”ہاں بہت کافی ہے۔ وہ پانچ ہزار روپے لیتے ہیں۔ آپ کے دس ہزار لگیں گے اور آپ امرتسر پہنچ جائیں گے۔ اب ریٹ کچھ کم ہو گیا ہے ورنہ وہ پہلے دس ہزار لیتے تھے۔“ قائم حسین نے کہا۔ اس کی معلومات ہمیں متاثر کرتی تھیں۔ ”ویسے بائی دی وے آپ رہنے والے کہاں کے ہیں؟“

”کہیں کے بھی نہیں۔ سارے ہی ملک ہمارے ہیں، ویسے ہم لاہور میں ہی رہتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے اب نکل چلیں۔ ہمیں زیادہ دیر نہیں کرنی چاہیے۔“ یہ کہہ کر آبی اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ چند ہی منٹ بعد ہم وہاں سے جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ مگر جیسے ہی ہم باہر نکلے سنبلہ نے مجھے ٹھہرا لیا۔ وہ برآمدے میں کھڑی تھی، بولی ”آپ ذرا میری بات سنیں بھئی جان!“

میں اُن کو صحن میں چھوڑ کر برآمدے کی طرف بڑھا تو وہ بولی ”اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میری تصویریں مجھے دے دیں، یہ بہت ضروری ہے۔“

”ہاں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو ایسی حالت میں دیکھ لیا تھا۔“ یہ کہہ کر میں نے چاروں تصویریں اس کی طرف بڑھا دیں۔ اُن کو دیکھے بغیر اس نے اندر کا رخ کیا، بولی ”خدا حافظ جیلانی صاحب! مجھے امید ہے آپ واپسی پر ادھر ضرور آئیں گے۔“ آواز اس کی بہت مدھم تھی۔ جمیل سے وہ سب کچھ چھپا لینا چاہتی تھی لیکن اس کے ذہن میں شک گہرا ہو گیا مگر وہ موقع ایسا تھا کہ وہ مجھ سے کوئی بات نہ کر سکا۔ سُنبلہ نے دروازے پر ہاتھ رکھا اور بلند آواز سے بولی ”آپ رقم گن لیں، بعد میں نہ کہیں کہ پوری نہیں تھی۔“

”جی میں نے گن لی ہے، رقم پوری ہے۔“ میں نے بلند آواز سے کہا تاکہ جمیل سُن لے۔ موٹر سائیکل آبی نے وہیں چھوڑ دی اور ہم قائم حسین اور الفت علی کے ساتھ وہاں سے رخصت ہو گئے۔ زندگی ایک نئی راہ پر چل نکلی تھی اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ اب کی بار ہم واپس بھی آ سکیں گے کہ نہیں۔ سفر دشوار گزار ہی نہیں تھا، وحشتناک بھی تھا۔ جن لوگوں سے ہم ملنے جا رہے تھے وہ اگر ہم پر غالب آ گئے تو پھر ہم نہ ڈھلوں صاحب ہی کو بچا سکتے تھے اور نہ ہی اپنی ہڈیوں کو۔ جمیل ہم کو باہر تک چھوڑنے آیا۔ مگر اس کا رویّہ مجھے یہ بتاتا تھا کہ وہ مجھ سے سُنبلہ کا اس طرح ملنا خالی از علت نہیں سمجھتا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ واپس جا کر اس سے ضرور پوچھے گا کہ اس کا مجھ سے کیا تعلق ہے اور کون سی چیز میں نے اُسے دی تھی مگر سُنبلہ جیسی شاطر عورت وہ کسی بھی طرح جیت نہیں سکتا تھا۔ وہ جس نے اس کو اتنا عرصہ تلوار کی نوک پر رکھا اور اس کے ہاتھ نہیں آئی۔ اب اس کو کیسے راہ دے دیتی۔ جمیل کی تقدیر میں ہی ہار لکھی تھی۔ وہ سُنبلہ سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ اس طرف سے میں بالکل مطمئن تھا۔ ہم کچے راستوں پر چلتے ہوئے بارڈر کی طرف چل دیے۔ راستے میں کئی گاؤں آتے تھے۔ وہ ہم نے ایک گھنٹے کی مسافت میں طے کر لیے۔ کسی بھی جگہ ہمیں بارڈر پولیس کا آدمی نظر نہیں آیا۔ قائم حسین اور الفت علی بہت پُرامید تھے مگر مجھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ وہ شاید ناکام ہو جائیں۔ دولت کا لالچ ایک آدمی یا چند آدمیوں کو تو گمراہ کر سکتا تھا مگر اتنی ساری فوج کو راستے سے ہٹا لینا اور وہ بھی روپے کے بل بوتے پر، مشکل تھا مگر وہ مسلسل آگے بڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ ہم اہرن گاؤں میں جا پہنچے۔ وہ بالکل حد کے ساتھ تھا۔ اس وقت صبح کے ساڑھے چار بج رہے تھے اور میرا خیال ہے کہ وہیں کہیں پولیس پوسٹ بھی قائم تھی۔ الفت علی نے ہم سے دس ہزار روپے لیے، دس اس نے اپنی طرف سے جمع کیے اور وہ اس رقم کو لے کر آگے بڑھ گیا۔ ہمیں اس نے اہرن گاؤں سے دور ہی درختوں کے جھنڈ میں ٹھہرا دیا۔ اُسے گئے ہوئے کوئی بیس منٹ گزرے تھے کہ دو آدمی ہمیں اپنی طرف آتے دکھائی دیے۔ شکل صورت سے ہی وہ سکھ نظر آتے تھے۔ ان کے عقب میں الفت علی چل رہا تھا۔ سپاہی حلیے کے اعتبار سے بارڈر پولیس کے دکھائی دیتے تھے۔

”صرف اتنے ہی آدمی ہیں؟“

”جی ہاں۔ ہم صرف چار ہیں۔“

”ان کی تلاشی لو شیر سنگھ۔“ سکھ نے سپاہی کو حکم دیا۔ وہ افسر معلوم ہوتا تھا۔

سپاہی ہماری تلاشی لے چکا تو وہ بولا ”ان کے پاس کچھ نہیں ہے جناب! صرف یہ رقم ہے۔“

”بس ٹھیک ہے۔ ان کو آگے جانے دو۔ تمھیں زمین پر گھسٹ کر چلنا ہو گا۔ ان جھاڑیوں میں سے لیٹ کر آگے چلے جاؤ۔“

”جی بہت اچھا۔“

”ہاں۔ اگر کوئی پوچھے تو کہنا ہم بھارتی ہیں۔“ سکھ نے بڑے پُراعتماد لہجے میں کہا اور ہم بارڈر پار کر گئے۔ مگر اس طرح کہ ہم سب کو جھاڑیوں میں سے لیٹ کر آگے بڑھنا پڑا — وہ ہم ایسوں سے روپیہ لیتے تھے اور راستہ بنا دیتے تھے۔ ایسا راستہ جس پر چل کر کسی کو کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ ریٹ واقعی اُن لوگوں نے کم کر دیے تھے کیونکہ آمد و رفت گھٹ گئی تھی۔ شاید اس لیے کہ سرکاری طور پر لوگوں کو آنے جانے کی اجازت زیادہ مل رہی تھی اور بارڈر پولیس کے لوگ ایک دوسرے سے مل کر اپنے گھروں کا قحط نکال رہے تھے۔ سوچتے ہوں گے کہ ہم تو سارا دن بارڈر ہی دیکھتے رہتے ہیں۔ جہاں کچھ بھی نہیں اُگتا مگر گھروں میں داخل بھوک کیسے ختم ہو گی۔ اس کا حل اُن لوگوں نے یہ نکالا تھا۔

ہم سرحد پار کر کے جس گاؤں میں داخل ہوئے اس کا نام دربارہ پور تھا۔ گاؤں کے باہر ایک گوردوارہ بنا ہوا تھا۔ الفت علی ہمیں ساتھ لے کر اس میں جا گھسا مگر اس کے دروازے ابھی تک بند تھے حالانکہ پو پھٹ رہی تھی۔ وہاں سے ناکام ہونے کے بعد وہ گاؤں میں داخل ہو گیا۔ کسی ہرچرن سنگھ کا پتہ وہ ساتھ لے کر گیا تھا۔ اس گاؤں میں ایک پہرے دار موجود تھا۔ وہ ہر جگہ موجود ہوتا ہے۔ خواہ گاؤں میں کوئی رہتا ہو یا نہیں۔ تاروں کی روشنی ابھی قائم تھی اور چاند نے بھی آسمان نہیں چھوڑا تھا کہ وہ ہمیں ایک کنوئیں کے قریب مل گیا جس پر کھڑا سقہ پانی بھر رہا تھا۔ چوکیدار کے علاوہ وہ واحد آدمی تھا جو جاگ رہا تھا۔ اس سے ہم نے ہرچرن سنگھ کا پتہ پوچھا تو وہ ہماری رہنمائی کے لیے ہمارے ساتھ چل دیا۔ ہرچرن سنگھ گاؤں کے آخری حصے میں رہتا تھا۔ پہرے دار ہمیں وہاں چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ اس نے یہ نہیں پوچھا کہ ہم کون ہیں اور کیسے وہاں اتنی سویرے پہنچ گئے۔ میرا خیال ہے کہ ہم پہلے آدمی نہیں تھے۔ وہ اس قسم کے اجنبیوں کا عادی معلوم ہوتا تھا۔

مگر جیسے ہی ہم ہرچرن کے دروازے پر پہنچے آبی نے مجھے روک دیا بولا ”ہمیں ادھر جانے کی کیا ضرورت ہے یار! کیوں قائم حسین ہم آگے بھی تو نکل سکتے ہیں۔“

”نکل تو سکتے ہیں۔ کیوں الفت علی! کوئی ہرج تو نہیں ہے؟“

”میرا خیال ہے کہ ہرچرن سے ملنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے چلو تم آگے نکلو اور ان سے رخصت ہو لو۔ یہ جانیں اور ان کا کام۔“

قائم حسین پر اس کی بات کا گہرا اثر ہوا۔ اس نے ہمیں ساتھ لیا اور گاؤں کے جنوب میں جا نکلا۔ اور کوئی دو سو قدم آگے جا کر بولا ”اچھا سجنو! اب ہم چلتے ہیں۔ ہمارا یہاں کا پتہ نوٹ کر لو۔ ہم بھیشم پور میں رہتے ہیں جو ترن تارن کے پاس ہے۔ نام ہمارے الفت سنگھ اور قائم سنگھ ہیں۔ ہم دونوں طرف کے باسی ہیں۔“

”کیا کہا! یعنی تم سکھ ہو؟“

”ہاں۔ اور یہی بات یاد رکھو۔ کوئی کام ہو تو ہمیں بتانا — تمھاری سیوا کر کے ہمیں بہت خوشی ہو گی۔“

”اچھا بھئی! رب راکھا۔ پرتُساں سانوں ہُن تک چکر وچ ای رکھیا اے۔“ آبی نے اُن سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

”ایہہ دنیا ای چکر اے میاں جی! اسیں تہانوں کیہہ دسیے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ راستہ بدل کر دوسری طرف نکل گئے۔ بڑی سڑک زیادہ دُور نہیں تھی اور وہ ادھر ہی جا رہے تھے۔ مگر ہماری کوئی رہنمائی انھیں منظور نہیں تھی۔ حالانکہ وہ ہمیں امرتسر کی بس پر بھی بٹھا سکتے تھے مگر مجھے یوں لگا جیسے وہ ہم سے فوراً جان چھڑا لینا چاہتے ہیں۔ اندازہ ان کا ایسا ہی تھا۔ ہم دُور تک انھیں آگے بڑھتا دیکھتے رہے۔ دربارہ پور ہمارے پیچھے تھا اور سارا بھارت ہمارے آگے مگر ہمیں نہیں معلوم تھا کہ کون سی سڑک کس طرف نکلتی ہے۔ وہ سڑک پر پہنچ کر ایک بس میں بیٹھے تو ہمیں ہوش آیا کہ ہم بھی سفر میں ہیں، اپنے گھر کے پائیں باغ میں نہیں بیٹھے ہیں۔

"چلو یار! یہاں کب تک کھڑے رہو گے۔ اس ڈھلوں کے چکر میں پھنس کر شاید ہم نے اچھا نہیں کیا۔ مجھے یہ سفر مبارک نظر نہیں آتا ہے۔"

"نہیں بھئی! ہم ایک نیک کام کے لیے ادھر آئے ہیں۔ ڈھلوں کی رہائی کے لیے اور کون آگے آئے گا۔"

"تم جس ستنا جا صاحب کا نام لیتے تھے وہ کیا چیز ہے؟ اس کا بھی کچھ فائدہ ہے کہ نہیں یا صرف تمھیں پھانسی لگوانے پر ہی تُلا ہوا تھا۔"

"اُس کو تو میں بعد میں ملوں گا آبی! اس سے میں نے بڑی امیدیں لگا رکھی تھیں مگر وہ عین وقت پر دغا دے گیا۔ میرا خیال ہے اس نے ڈھلوں صاحب کے لیے کچھ بھی نہیں کیا ہے۔"

کچھ ہی دیر بعد ہم بڑی سڑک پر جا پہنچے مگر کسی بس کا وہاں کوئی نشان دُور دور تک نظر نہیں آتا تھا اور وقت تیزی سے گزرتا جا رہا تھا۔ اندازے کے مطابق ہم پیدل ہی آگے چل دیے۔ بس کسی نہ کسی جگہ تو مل ہی سکتی تھی۔

"بینک سے تم کتنی رقم ساتھ لائے ہو؟"

"یہی بیس ہزار میرے پاس تھے اور میرا خیال تھا کہ یہ وقتی ضرورت کے لیے بہت کافی ہوں گے۔"

"اب دس ہزار تو ہے نا تمھارے پاس؟"

"ہاں! اللہ مالک ہے۔ کچھ نہ کچھ بندوبست ہو جائے گا۔"

ہم کوئی سو قدم آگے چلے تھے کہ دربار پور سے ایک بس ہمیں اپنے پیچھے آتی دکھائی دی۔ اسے ہم نے ہاتھ دے کر روکا اور اس میں جا بیٹھے۔ کئی سکھ ایسے وہاں بیٹھے تھے جو ہماری طرح شلواریں پہنتے تھے۔ ان کو دیکھ کر ہم نے اطمینان کا سانس لیا۔ شلوار ابھی تک اُن کے لباس سے خارج نہیں ہوئی تھی۔ ان کی عورتیں بھی بالعموم شلوار پہنتی تھیں۔

بس میں زیادہ تر مزدور پیشہ لوگ بیٹھے تھے۔ وہ ایسے ستم رسیدہ لوگ تھے جنھیں اپنے ہی جھنجھٹ سے نجات نہیں ملتی تھی۔ کسی کا چہرہ ہمیں تر و تازہ نظر نہیں آیا۔ اپنی اپنی فکروں میں گھلتے ہوئے وہ لوگ اُس دہاڑی کا سوچ رہے تھے جو انھیں شام کو مل سکتی تھی۔ بس نے گھوم گھام کر کوئی ڈیڑھ گھنٹے بعد ہمیں امرتسر پہنچا دیا۔ بسوں کے اڈے سے ہم باہر نکلے تو معلوم ہوا کہ ہم شریف پورہ سے زیادہ دور نہیں ہیں۔ کچھ ہی دیر بعد ہم رکشا میں بیٹھ کر ملہوترا کی کوٹھی کے سامنے جا اترے۔ اس کوٹھی سے ہماری بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔ محلِ وقوع کا چاروں طرف سے جائزہ لینے کے بعد ہم وہاں سے آگے نکل گئے۔ ملہوترہ سے ملنے کے لیے ہمیں بہت سوچ سمجھ کر چلنے کی ضرورت تھی۔

وہ سارا دن ہم نے ادھر اُدھر گھوم پھر کر گزارا۔ اس شہر میں اگر دربار صاحب کا وجود نہ ہوتا تو شاید وہاں کچھ بھی نہ ہوتا۔ سکھوں نے اسے اپنا محور بنا رکھا تھا۔ انھیں بھی کسی ایسے شہر کی ضرورت تھی جسے وہ مرکز مان کر ساری دنیا میں گھوم آتے تھے۔ رات ہوئی تو ہم دونوں تھک ہار کر ایک ہوٹل میں جا گھسے۔ آبی نے اپنا نام وہاں ابدار شاہ لکھوایا اور میں ہاشم کا ہاشم ہی رہا۔ کہا کہ ہم دلی سے آئے ہیں اور دلی ابھی مسلمانوں سے خالی نہیں ہوئی تھی۔ شکر ہے کہ اُن سالوں نے سارے ہی مسلمانوں کو ملک سے باہر نہیں نکال دیا تھا۔ ورنہ ان کا تعصب تو کسی بھی شے کو برداشت نہیں کرتا تھا۔

ہم دونوں ہی بے حد افسردہ تھے۔ آبی کی وہ تیزی طراری گویا ختم ہی ہو گئی تھی۔ اسے بھی کوئی بات نہیں سوجھتی تھی۔ وہ بار بار مجھ سے یہی کہتا تھا کہ بارڈر پار کر کے ہم نے اچھا نہیں کیا۔ ڈھلوں ہمارا کیا لگتا ہے؟ کیوں ہم اس کے پیچھے اپنا آرام چھوڑ کر ادھر آ گئے ہیں؟ وہ مجھ سے یہی پوچھتا تھا مگر میں اسے کیا جواب دیتا۔ وہ اگر دشمنوں کی زد پر تھا تو میرا کیا قصور تھا۔ ہمارے لیے تو اس کے خلوص کا کوئی شمار ہی نہ تھا۔ ہر بار اس نے ہمیں ایسی عزت دی جس کے ہم کسی بھی طرح حقدار نہ تھے۔ میں بھلا اس کی مدد کیوں نہ کرتا۔ آبی کی یہ سوچ سر تا سر غلط تھی۔ وہ کسی پدمنی کا پیچھا کرتا تو شاید اسے عار نہ ہوتی۔ اس میں اس کا لہو گرم ہو جاتا تھا مگر ڈھلوں کے لیے وہ با دلِ ناخواستہ میرے ساتھ چلا آیا تھا۔ میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ آبی کو میں اس مہم پر اپنے ساتھ نہیں لے جاؤں گا۔ کم از کم ایک رات کے لیے تو میں اسے وہیں چھوڑ دوں گا۔ میں ہی تقدیر کے پتال جنتر کے لیے بہت کافی تھا۔ وہ مجھے آگ پر رکھ کر جس قدر چاہتی میرا عرق نکال سکتی تھی۔ آبی کو میں خواہ مخواہ اس مصیبت میں نہیں پھنسانا چاہتا تھا۔ کیونکہ اس کا دل ہی اس کا ساتھ نہیں دیتا تھا۔

سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ میرے پاس ہتھیار کوئی بھی نہیں تھا۔ آبی بھی غیر مسلح تھا۔ ہم دونوں نہایت ہی ناگفتہ بہ حالت میں وہاں پہنچے تھے اور ہتھیار کے بغیر باہر نکلنا قطعی سود مند نہیں ہو سکتا تھا۔ وہاں کوئی بھی آبی کا دوست نہیں تھا جو اسے ہتھیار دے سکتا۔

آبی کو بستر میں چھوڑ کر میں رات گیارہ بجے ہوٹل سے باہر نکل گیا۔ خاصا معقول ہوٹل تھا اور وہاں لوگوں کی آمد و رفت رات دن جاری رہتی تھی۔ آبی اس وقت گہری نیند میں تھا۔ اس کی جیب سے میں نے دو ہزار روپے نکال لیے۔ مجھے کسی بھی

وقت ضرورت پڑ سکتی تھی۔ جب میں بڑے ہال میں پہنچا تو کئی لوگ اس وقت وہاں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ان میں سے ایک ایک کو میں نے دیکھ لیا۔ وہ سارے سارے ہی تارک الدنیا معلوم ہوتے تھے۔ وقت اُن کو ذلیل کر رہا تھا اور وہ وقت کو۔ کرنے کے لیے اُن کے پاس کوئی کام نہ تھا۔ وہ جو راتوں کو بھی جاگتے رہتے ہیں اُن کے دن سوتے میں گزرتے ہیں۔ کسی کام کی اُن کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔

میں نے جان بوجھ کر ہال میں بیٹھے لوگوں کے درمیان ٹھہر کر اپنے نوٹ نکالے اور گننا شروع کر دیے۔ نوٹ گن کر میں نے ایک بار پھر جیب میں ڈال لیے۔ مجھے یقین تھا کہ اُن میں سے کوئی نہ کوئی تو ایسا ہو گا جو ان نوٹوں کے پیچھے بھاگے گا اور مجھے کسی ایسے ہی کی تلاش تھی۔ وہاں بیٹھ کر میں نے چائے پی اور ایک بار پھر دوسری جیب میں سے چند نوٹ نکال کر گنے اور اُن میں سے میں نے چائے کے پیسے دیے۔

کوئی پندرہ منٹ میں وہاں بیٹھا سگریٹ پھونکتا رہا اور پھر ہوٹل سے باہر نکل آیا۔ بڑی سڑک پر چلنے کے بجائے میں جان بوجھ کر ایک گلی میں جا نکلا۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ ابھی میں چند ہی قدم آگے نکلا تھا کہ مجھے اپنے عقب میں دو آدمی تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اپنی طرف آتے دکھائی دیے۔ میں نے اپنی رفتار سست کر دی۔ وہ میرے قریب سے ہو کر آگے نکل گئے۔ وہ پاجامہ کُرتا اور اس پر گرے سلیٹی رنگ کا سویٹر پہنے ہوئے تھے۔ دونوں کے کپڑے ایک ہی جیسے تھے اور ایک دوسرے کی تالا کنجی معلوم ہوتے تھے۔ گلی کے اگلے سرے پر پہنچ کر وہ میری نظروں سے غائب ہو گئے۔ گلی کے عین وسط میں ایک کمزور سا بلب لگا تھا۔ جب میں اس کے نیچے پہنچا تو مجھے گلی کے فرش پر ایک پوٹلی سی نظر آئی۔ وہ کوئی رومال تھا جس میں کچھ روپے بندھے تھے۔ میرا خیال ہے روپے دو روپے کے چھ نوٹ اور کچھ ریزگاری۔ وہ اٹھا کر میں نے مٹھی میں دبا لی مگر ابھی میں دس قدم بھی آگے نہیں گیا تھا کہ وہ دونوں آدمی پھر میرے سامنے آ گئے۔

"اے! تم نے یہاں سے کوئی پوٹلی اٹھائی ہے؟" سؤر کے منہ والے آدمی نے میرے سر پر پہنچ کر کہا۔

"ہاں! وہ تمھاری ہے کیا؟"

"تو اور کیا تمھاری ہے؟ بات کیسے کرتے ہو؟ لاؤ ادھر"

"کوئی نشانی بتاؤ تو میں تمھیں دے دوں گا۔"

"اس میں بائیس سو روپیہ ہے۔ چھ سو روپے الگ ہیں اور کچھ ریزگاری۔ یہ ہے اس کی نشانی، اب نکالو اسے۔"

مجھ سے سخت غلطی ہو چکی تھی۔ نوٹ میں نے اُن کے سامنے ہی ہوٹل میں گنے تھے اور وہ صاف جیت رہے تھے۔ میں آپ ہی اپنے ہاتھوں پِٹ رہا تھا۔

"کیا نشانی ہے تمھارے نوٹوں کی؟"

"نشانی کا کیا مطلب؟ اوئے سیدھا ہو جا۔ تو نہیں جانتا ہے ہمیں۔ سالے تیرے تِکّے کر دیں گے ہم۔ نکال رقم۔" اس نے میرے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔ اس کے ساتھی نے فوراً ہی پستول نکال لیا۔ اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس میں سائلینسر لگا ہوا تھا۔ وہ گلیوں میں وارداتوں کے لیے اسے بے دریغ استعمال کرتے ہوں گے۔

"میرے پاس یہ پوٹلی ہے اور اس میں تو صرف چھ روپے ہیں۔" میں نے مٹھی کھول دی۔

اُس نے فوراً ہی وہ مجھ سے جھپٹ لی۔ پوٹلی میں رقم تو وہی تھی جو انھوں نے ڈالی ہو گی مگر وہ اس کا وزن اتنا کم دیکھ کر آواز حلق میں دباتے ہوئے بولا۔ "باقی پیسے کہاں ہیں؟ اس کی جیبیں دیکھ یار! یہ تو بدماشی کر رہا ہے۔"

اس کی یہ بات سن کر اس کے پستول والے ساتھی نے فوراً ہی اپنا ہاتھ میری جیب میں ڈال دیا۔ ایسے میں اس کا پستول والا ہاتھ اوپر اُٹھ گیا۔ میری جیب سے اس نے سارے ہی نوٹ نکال لیے۔

"بدمعاش! پوٹلی اٹھاتے ہی رقم غائب کر دی بلڈی پگ!"

مگر ابھی اس نے ہاتھ باہر کھینچا ہی تھا کہ میں نے دائیں ہاتھ سے اس کی گردن پر اپنا پورا پنجہ گاڑ دیا۔ دو سیکنڈ لگے اور وہ نوٹوں سمیت میری باہوں میں جھول گیا۔ میں نے فوراً ہی اس کی دائیں کلائی پر ہاتھ مار کر پستول اس سے چھین لیا۔ دوسرے کے ہاتھ میں میرا گریبان ابھی تک پھنسا تھا۔

"اوئے ٹیریا! یہ کیا ہو گیا تجھے؟ اوئے ٹیریا۔۔۔"

میں نے اس کو بولنے کا موقع نہیں دیا۔ بائیں ہاتھ کی اُلٹی ضرب میں نے اس کی ناک پر لگائی۔ تو میرا گریبان اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ دوسری ضرب میں نے اس کے جبڑے پر لگائی۔ وہ اُلٹ کر مُنہ کے بل نیچے جا گرا۔ ان کا پستول اب میرے ہاتھ آ چکا تھا۔ جیسے ہی وہ فرش ہوا میں نے اس کی کمر پر پاؤں رکھ دیا۔ "کیوں بے! یہ قصّہ کیا ہے؟ لوگوں کو اسی طرح بے وقوف بناتے ہو؟ اٹھ ذرا میرے یار! تیرے جیسے کے لیے تو میں نے ہوٹل میں رقم گنی تھی۔ اور تو پھنس گیا، اُٹھ۔۔۔"

میری آواز کی گھن گرج سن کر وہ دونوں ہاتھ زمین پر ڈال کر اٹھا مگر اس کے گھٹنے جواب دے گئے تھے۔ پھر زمین پر جا گرا۔ اب کی بار میں نے اسے گردن سے پکڑ کر اوپر اٹھایا۔ "تیرا کیا نام ہے سالے! کیا دھندا ہے تیرا؟"

"جی۔۔۔ میرا نام شرما ہے۔ مجھے معاف کر دیں جی۔"

"وہ تو کر ہی دوں گا۔ مگر اس کا بندوبست کر لے، یہ کم سے کم چھ گھنٹے بے ہوش رہے گا۔ فکر نہیں کرنا سمجھے! یہ پچاس روپے رکھ لے۔" میں نے نوٹوں میں سے پچاس روپے نکال کر اس کے حوالے کر دیے۔

"پر یہ پستول بھاجی! ہم تو برباد ہو جائیں گے۔"

"بک نہیں لوئے! یہ اب میرے قبضے میں رہے گا۔ اچھا ٹاٹا۔ گڈ بائی۔" یہ کہہ کر میں نے اس کے سر پر ایک دھپ جمائی۔ جب وہ ٹیر بیر کے پاس بجھ سا گیا تو میں نے اردگرد نظر ڈالی۔ رات کے اس وقت بارہ بج رہے تھے۔ سارے ہی مکان بند تھے۔ کسی ایک کا بھی دروازہ نہیں کھلا تھا۔ انہیں میں وہیں چھوڑ کر گلی عبور کر گیا۔

اب میرا کام زیادہ آسان ہو گیا تھا۔ آبی میرے ساتھ ہوتا تو شاید مجھے ایسی اوچھی حرکت نہ کرنے دیتا۔ اس کا خیال یہ ہوتا تھا کہ کسی کو اس کے ہتھیار سے محروم کر کے مارنا بہت بری بات ہے۔ وہ سالے نظر کے بہت تیز نکلے۔ ایک ایک نوٹ کو وہ میرے ساتھ گنتے رہے۔ وہ بائیس سو کہہ رہے تھے اور میرے پاس صرف دو ہزار تھے۔ دو کا الٹ پھیر تو انہی کے ہاتھوں میں جاتا تھا۔ اناڑی تو واقعی ان کے فریب میں پھنس کر رہ جاتے ہوں گے۔ مگر یہاں انہیں کیا معلوم تھا کہ انہیں لاسا لگایا جا رہا ہے۔ ان کو پھانسنے کے انتظامات ہو رہے ہیں۔ آدمی بھارت کا ہو کہ پاکستان کا طریقۂ واردات اس کا ایک ہی ہوتا ہے اور امرتسر بھلا کونسا دور تھا۔

میں نے پستول کھول کر دیکھا وہ گولیوں سے لبالب بھرا تھا۔ اس ٹیر بیر نے اسے پتہ نہیں کہاں سے حاصل کیا ہوگا؟ جرمنی کا بنا ہوا وہ خوبصورت پستول آپ اپنا انعام تھا۔ وہ میرے جیب شاہ کی جگہ لے سکتا تھا۔ میں نے بڑے اطمینان سے اسے جیب میں رکھا اور پھر میں ٹیکسی میں بیٹھ کر ملہوترا کی کوٹھی کے سامنے جا اترا۔ ٹیکسی والے کو میں نے کافی فاصلے پر چھوڑ دیا۔ تاکہ وہ یہ نہ جان سکے کہ میں کہاں جا رہا ہوں اور کس کا مہمان بننے کا شرف مجھے حاصل ہوگا۔

ملہوترا کی کوٹھی میری دیکھی بھالی تھی۔ میں محض ایک اطلاع کی بنا پر اس کے پاس دوڑا چلا آیا تھا۔ اور خدا جانے وہ اطلاع درست بھی تھی کہ نہیں مگر عالیہ نے خود مجھے بتایا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس ملہوترا نے کیا کردار ادا کیا ہے اور بدری نے اس میں کیا کچھ کیا ہے۔ میں اس پر کیسے اعتبار نہ کر لیتا۔ فون پر مجھے عالیہ کی وہ بھنائی ہوئی آواز بھی یاد تھی جب اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اس کا مخاطب کوئی اور نہیں جیلانی ہے۔

خدا ہی جانتا تھا اس وقت ڈھلوں صاحب کہاں اور کس حال میں ہوں گے۔ وہ بے گناہ ہی مارے گئے تھے۔ بدری اس کوشش میں تھا کہ جس طرح بھی ہو سکے ان کی حویلی اور جاگیر پر قبضہ کر لے۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے فراست بیگم کو اپنے دام میں پھنسا لیا تھا۔ وہ لمبے ہی منصوبے باندھ کر آیا تھا۔ عین ممکن ہے کہ اس میں ملہوترا کا بھی ہاتھ ہو۔ کہانی کے آخری منظر کی جھلک میں مجھے انہی کے تصور کا عکس دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے دل میں کہا۔ ٹھیک ہے ملہوترا شاید اب تیری باری آ جائے۔ تجھے بھی ایک دن حساب تو دینا ہی ہوگا۔ تیرے سینے میں نیزہ بہرحال گھس کر رہے گا اور تجھے کوئی شے تیرے روزِ بد سے نہیں بچا سکے گی۔

کوٹھی اب میری نظر میں تھی۔ سامنے کے حصے میں اس وقت بھی پولیس کا سپاہی پہرہ دے رہا تھا۔ اس سے نظر بچا کر آگے نکل جانا کسی بھی طرح ممکن نہیں تھا۔ وہ مدار کے ٹڈے کی طرح اکڑ کر کھڑا تھا۔ حالانکہ رات بہت بھیگ چکی تھی۔ مگر اسے نہ سردی کا احساس تھا نہ وقت کا۔ پتہ نہیں ان پلسیوں میں بندوق لے کر ایک ہی جگہ ستون بن جانے کا مادہ کہاں سے پیدا ہوتا ہے۔

میں نے سپاہی کی نظر سے بچ بچا کر کوٹھی کو پوری طرح دیکھ لیا۔ اس میں داخل ہونے کا راستہ صرف ایک ہی تھا۔ اس کے عقب میں بھی عمارتیں بنی تھیں اور دائیں بائیں بھی۔ اب ایک ہی طریقہ باقی تھا کہ میں کسی نہ کسی طرح سپاہی سے رابطہ قائم کرتا۔ سامنے کی سڑک کافی وسیع تھی اور میں دوبارہ وہاں سے قدرے لنگڑاتا ہوا گزرا تھا۔ جس سے یہ معلوم ہو کہ میں کوئی جماندرو لنگڑا ہوں۔ سپاہی نے بھی مجھے ضرور دیکھا ہوگا مگر وہ اپنی کیبن میں بے فکر کھڑا رہا۔ تیسری بار میں نے جب واپسی کا ارادہ کیا تو اب ملہوترا کی کوٹھی میرے بائیں ہاتھ تھی۔ میں فٹ پاتھ پر چلتا ہوا بڑی مشکلوں سے اس سپاہی تک پہنچا۔ سڑک ویران تھی اور وہ سپاہی مجھے کیبن کی دیوار کے عقب میں کھڑا صاف نظر آتا تھا۔ اس کا صرف دھڑ ہی میرے سامنے تھا۔ میں اس کے پاس جا ٹھہرا۔ "سلام سنتری صاحب!"

"سلام بھئی سلام۔ تم یہاں کسے ڈھونڈ رہے ہو؟"

"وہ جی یہاں کوئی صاحب ہیں ملہوترا صاحب، ان کے ملازم پانڈے سے ملنا تھا مجھے مگر کوٹھی کا پتہ ہی نہیں مل رہا۔"

"پانڈے! وہ تو یہاں ہی رہتا ہے۔ کیا نام بتایا تم نے کوٹھی والے کا؟"

"او جی کیا کہوں، مجھے اس کا نام یاد نہیں ہے سنتری جی! بھلا سا نام تھا ان کا، سلہوترا صاحب تھا یا کچھ اور۔۔۔۔ ایک ٹانگ سے میں عاجز ہوں، چلا نہیں جاتا۔"

"تو پھر تم صبح آ جاؤ۔ اس وقت تو سب سو رہے ہیں۔"

"کہاں جی! میں لنگڑا آدمی، کہاں بار بار ادھر آ سکتا ہوں سنتری جی! تم مجھے اپنے پاس ہی جگہ دے دو۔ میں ادھر ہی انتظار کروں گا اس کا۔ رات اب زیادہ ہی گزر چکی ہے۔"

"کہاں سے آئے ہو تم؟"

"جی میں جستروال سے آیا ہوں۔ بڑا ضروری کام تھا پانڈے سے۔ کہتا تھا میں ادھر تمہارا سب کام کروا دوں گا۔ ضلع میں معاملہ پھنسا ہے میرا۔"

"ٹھیک ہے یار! تم اندر آ جاؤ۔ ادھر ہی بیٹھ رہو۔ دو گھڑی رات کا تو معاملہ ہے۔" یہ کہہ کر اس نے کیبن کے ساتھ بنا کوٹھی کا چھوٹا دروازہ کھول دیا اور میں دائیں ٹانگ پر بوجھ ڈال کر بڑی مشکلوں سے اس تک جا پہنچا۔ مگر ابھی میں کیبن کے فرش تک نہیں گیا تھا کہ اس نے مجھے معذور سمجھ کر میری مدد کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا، یوں کہ میں اس کے بائیں ہاتھ پر جھول سا گیا۔ دائیں ہاتھ سے اس نے کھڑی بندوق پر اپنا بوجھ سنبھال رکھا تھا۔ مگر جیسے ہی میں اس کے کندھے پر جھولا، میں نے اس کی گردن ہاتھ میں لے کر اس کی رگِ احساس کو مسل دیا۔ بس دو سیکنڈ صرف ہوئے جیسے ہی وہ زمین پر گرا، میں نے اس کے کپڑے اتارنے شروع کر دیے۔ پتہ نہیں اس بدبخت کی ڈیوٹی کب ختم ہوتی تھی۔ مجھے جو کچھ بھی کرنا تھا فوری طور پر کر لینا چاہیے تھا۔ قد اس کا میرے ہی برابر تھا۔ آدمی وہ پولیس میں خوب چن کر لیتے ہیں۔ معیار انڈیا میں بھی یہی ہے۔ میں نے جوں توں کر کے اس کے تمام کپڑے اتار دیے۔ اب بوٹ اتارنے کا مرحلہ باقی تھا۔ مجھے دور سے کسی کتے کی خرخر کی آواز سنائی دی۔ وہ کیبن کی طرف منہ کر کے کوئی ایسی بو سونگھ رہا تھا جس سے وہ پہلے متعارف نہیں تھا۔ میں نے ہاتھ روک دیے۔ کیبن چھوٹا سا تھا اور اس میں دو آدمی نہیں سما سکتے تھے۔ سپاہی کو میں نے نیم استادہ کر رکھا تھا۔ چند منٹ تک خاموش رہنے کے بعد کتا پھر بھونکا مگر اس عرصے میں میں نے سپاہی کے کپڑے پہن لیے تھے اور اس کے بوٹ بھی اتار لیے تھے۔ اس کی ٹوپی سر پر رکھ کر میں نے بندوق ہاتھ میں لی اور اس کی جگہ کھڑا ہو کر میں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ سپاہی میرے سامنے اکڑوں بیٹھا تھا۔ اور یہ بات مجھے پسند نہیں تھی۔ میں اس سے جلد از جلد چھٹکارا پا لینا چاہتا تھا۔ جیسے ہی میں کیبن میں کھڑا ہوا، کتا پھر کسی شک کے زیرِ اثر بھونکا۔ مگر کتے کا ذہن بھی کتا ہی ہوتا ہے۔ مجھے یوں وردی میں کھڑے دیکھ کر وہ پھر نہیں بھونکا۔ چپ چاپ دوسری

طرف نکل گیا۔ پستول اور نقدی میں نے جیب میں اچھی طرح محفوظ کر لی۔ حالات پتہ نہیں کیا سے کیا ہو جاتے، مجھے بہت محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔

مگر میرے سارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ اس کی ڈیوٹی تبدیل ہو رہی تھی۔ اندر سے شاید سرونٹ کوارٹر کی طرف سے ایک سپاہی کیبن کی طرف آ رہا تھا۔ اپنے اوور کوٹ کے کالر اونچے کر کے وہ تھکے تھکے قدم اٹھاتا میری طرف بڑھا تو میرا لہو منجمد ہونے لگا۔ اس سے نپٹ لینا شاید اتنا آسان نہیں تھا۔ ایسی صورت میں کہ میرے قریب ہی ایک سپاہی نیم بیہوش پڑا تھا۔ آنے والے سپاہی کے ساتھ کتا بھی کیبن کی طرف آنے لگا تو سپاہی نے اُسے دھتکار دیا۔ مگر وہ پھر بھی اس کے ساتھ لگا رہا۔ اسے کیبن میں ہونے والے واقعات کا تو علم نہیں تھا مگر پھر بھی اُس کا مغز کچھ زیادہ ہی کتے پن کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ ابھی وہ باغ کے عین وسط میں پہنچا تھا کہ میں نے کیبن میں سے سپاہی کو جنوب کی طرف کھلنے والے دروازے کے باہر پھینک دیا۔ میرے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار بھی تو نہیں تھا۔ سامنے باڑھ سی اُگی تھی۔ سپاہی اس کے اندر جا گرا۔ وہ دُنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر اندازہ بھی نہ کر سکتا تھا کہ اس پر کیا بیت رہی ہے۔ میں نے کیبن کی بتّی بجھا دی، یوں جیسے وہ از خود بجھ گئی ہو۔

"اوئے، یہ کیا ہو گیا گلاب سنگھ! تیری بتّی ہی گل ہو گئی۔" سپاہی نے مذاقاً کہا۔ "کوئی بلب نہیں ہے تیرے پاس؟"

"نہیں یار! پتہ نہیں اسے کیا ہو گیا ہے۔" میں نے اپنی آواز کو بہت حد تک بدل کر کہا۔ ساتھ ہی ساتھ میں کھانس بھی رہا تھا۔ وہ سپاہی فوراً ہی دروازے تک آ پہنچا۔ مگر کتے نے فوراً فساد ڈال دیا۔ وہ جیسے ہی وہاں پہنچا اُس نے بے ہوش سپاہی کو تلاش کر لیا۔ جیسے ہی کتا باڑھ کی طرف لپکا تو آنے والے سپاہی نے غیر ارادی طور پر اس کی طرف دیکھا جیسے وہ یہ معلوم کرنے کی کوشش میں ہو کہ کتا کس چیز پر لپکا ہے۔ مجھے موقع مل رہا تھا۔ جیسے ہی اس نے منہ پھیرا، میں نے اس کی گردن پر اپنا سکّہ جما دیا۔ اس کی رگِ احساس مسلی جا چکی تو وہ گھوم کر لہرایا اور کیبن کے کھلے دروازے میں سے اندر گر گیا۔ کتا اس وقت آدھی باڑھ عبور کر چکا تھا کہ میں نے کیبن سے نکل کر پستول اُس پر داغ دیا۔ گولی اس کی پسلی میں لگی۔ اس کے مُنہ سے ابھی آواز نکل ہی رہی تھی کہ میں نے دوسری گولی اس کی گردن میں اُتار دی۔ کتا جلدی ہی اُلٹ کر گرا اور پھر اس کی آوازیں آپ ہی آپ بند ہو گئیں۔ دوسرے سپاہی کو میں نے کیبن کے اندر کھڑا کر کے

اس طرح سہارا دیا کہ وہ بیرک بر کھڑا نظر آئے اور دور سے دیکھنے والا یہی سمجھے کہ سنتری برابر پہرے پر کھڑا ہے۔ اس کا منہ میں نے سڑک کی طرف کر دیا۔ دونوں ہاتھ اسی کے رومال کو پھاڑ کر اس طرح پھیلا دیے کہ ایک ہاتھ میں بندوق تھی اور دُوسرا ہاتھ اس نے کیبن کے تختے پر رکھا ہُوا تھا۔ دوسری بندوق میں نے اُس کی پیٹی سے اس طرح پھنسا دی کہ وہ نیچے نہیں گر سکتا تھا۔

اس کارروائی سے فارغ ہو کر میں کیبن سے نکلا۔ اب میدان زیادہ صاف نظر آ رہا تھا۔ مگر کوٹھی کے تمام دروازے اندر سے بند تھے۔ دُوسرے سپاہی کی جیب میں نے تلاشی لی، تو اس کی جیبوں سے مجھے چابیوں کا ایک گچھا مل گیا تھا۔ وہ میں نے سنبھال کر جیب میں ڈال لیا۔ مگر مجھے یقین نہیں تھا کہ ان میں سے کوئی چابی کام بھی کر سکے گی کہ نہیں۔ لیکن جب میں عمارت کے بڑے دروازے تک پہنچا تو وہی چابی میرے کام آ گئی۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ وہ سنتری ہی عمارت کے بیرونی دروازے خود بند کرتا تھا۔ اندازہ تو میرا یہی تھا مگر صورتِ حال یہ نہیں تھی۔ اس نے دراصل مختلف دروازوں کی دُہری چابیاں بنوا رکھی تھیں۔ تاکہ اگر اندر کے مکیں کسی وجہ سے اندر ہی رہ جائیں، انھیں سانپ سونگھ جائے، اُن میں سے کوئی بھی نہ جاگے تو پھر وہ اپنی چابیوں سے کام لے کر ان تک پہنچ سکے۔

وہ چابیاں مسلسل کام کر رہی تھیں۔ بڑا دروازہ میں نے کھولا تو غلام گردش میں سے گزرتے وقت مجھے وہ کمرہ نظر آیا جہاں مجھے اور آبی کو ملہوترا نے پہلے روز خوش آمدید کہا تھا اور جہاں شکنتلا اور پریتا ہمیں ملی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ شاید وہ دونوں اب بھی وہاں موجود ہوں گی۔ میں نے اس کے قفل میں چابی پھنسا دی۔ مگر وہ کام نہیں کر سکی۔ ایک اس گچھے میں سب سے زیادہ لمبی چابی تھی۔ وہ میں نے آزمائی۔ تو قفل راہ دے گیا۔ دروازہ نہایت احتیاط سے کھول کر میں کمرے میں جا گھسا۔ صوفے اور قالین ویسے ہی تھے جیسے ہم دیکھ چکے تھے۔ راہداری میں روشن بتّی کھڑکی کے شیشوں میں سے اندر پہنچ رہی تھی۔ مگر وہ کمرہ بالکل خالی تھا۔ اس میں پہنچ کر میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی مگر وہاں مجھے کوئی آدمی نظر نہیں آیا۔

سامنے ہی وہ بہشت آسا کمرہ تھا جس میں شکنتلا آبی کو لے کر گھس گئی تھی۔ میں اپنے سائے سے بچتا ہُوا آگے بڑھا۔ کسی کے گھر میں یوں گھس جانا ایک ایسا تجربہ ہے جسے لفظوں میں بیان ہی نہیں کیا جا سکتا۔ دل بلّیوں اُچھلتا ہے، نبضیں دھڑا دھڑ بجنے لگتی ہیں، دماغ ماؤف ہونے لگتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس سمت سے کیا خطرہ آدمی پر گود آئے۔ میری بھی یہی حالت

تھی۔ مگر میں جس دوست کو رہائی دلانے کے لیے وہاں پہنچا تھا۔ اس کی کشش ہر شے پر غالب آتی جا رہی تھی۔ ڈھلوں صاحب کو یوں دشمنوں کے حوالے کر کے میں زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ میری توہین تھی۔ مجھے ہر حال میں ان تک پہنچنا تھا۔ میں آہستہ آہستہ دروازے تک بڑھا اور اس کے قفل میں وہی چابی لگا دی۔ میرا خیال ہے وہ 'ماسٹر کی' تھی۔ قفل کلک کر کے کھل گیا۔ اس کے پٹ کو میں نے بڑی احتیاط سے پیچھے ہٹایا۔ تو مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے کوئی شخص پلنگ پر سو رہا ہے۔ یہ میرا احساس تھا۔ راہداری کی روشنی وہاں تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ میں دیوار کے ساتھ جا ٹھہرا۔ اتفاق ایسا ہُوا کہ میرے ہاتھ سوئچ بورڈ پر ہی پڑے۔ اس کی ایک بتّی میں نے جلا دی۔ کمرے میں ہلکی نیلی روشنی پھیل گئی۔ زیرو کا بلب دیوار کے کونے میں جل اٹھا تھا اور میرے سامنے پریتا سو رہی تھی۔ سارے جہان سے بے نیاز۔ اس کا وہ خوابیدہ حسن پلنگ کو چار چاند لگا رہا تھا۔ وہ اب بھی حسین تھی۔ بے حد جاذب، بے حد دلفریب اور وہ ابھی تک جاگی نہیں تھی۔ چند لمحوں بعد اُس نے کروٹ لینے کے لیے رُخ موڑا تو وہ ریشمی سا کمبل اس کے وجود کو اور زیادہ عیاں کر گیا۔ اسے کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ میں نے بتّی بجھا دی اور قفل بند کر دیا۔ اور پھر میں جوتوں سمیت اس کے پہلو میں لیٹ گیا۔ یُوں کہ میرا ایک ہاتھ اس کے منہ پر تھا اور دوسرا ہاتھ اس کے دوسرے شانے تک پھیل گیا۔ وہ نیند سے بیدار ہو گئی۔

"یہ... یہ تم کیا کرتے ہو، چھوڑو مجھے ورنہ میں شور مچا دوں گی۔" اس کی گھٹی گھٹی آواز پھر اُبھری۔

"مجھے معاف کر دو پریتا! میں تمھارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ میں اتنی مشکلوں سے یہاں پہنچا ہوں۔"

"تم بکواس کرتے ہو۔ تم وہی ہو نا جس نے ہیلی کاپٹر کے ذریعے بھنڈاری فیملی کو اغوا کر لیا تھا۔ میں تم سے نفرت کرتی ہوں، شدید نفرت۔"

"ایسا نہ کہو پریتا! وہ میری مجبوری تھی۔ میں پابند تھا، مجبور تھا۔ میں نے بھنڈاری فیملی سے کوئی زیادتی نہیں کی، ان کو واپس آنے کی اجازت دے دی تھی۔"

"تم اگر مجھے یوں ذلیل نہ کرتے تو میں تمھیں معاف کر دیتی مگر اب نہیں۔ میں تمھیں اس جُرم کی سزا دلوا کے رہوں گی۔ چھوڑ دو مجھے، بات تو کرنے دو۔" اس نے میرا ہاتھ کاٹنا چاہا مگر میں نے اس کا گلا دبوچ لیا۔

"میں تمھیں اسی حالت میں بے ہوش بھی کر سکتا ہوں، جان سے بھی مار سکتا ہوں۔ مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔"

اپنے گلے کو میری انگلیوں کی گرفت میں دیکھ کر وہ ڈھیلی پڑ گئی۔ میں جتنی مشقت سے اس کے پاس پہنچا تھا۔ اس کا کچھ نہ کچھ انعام تو مجھے ملنا چاہیے تھا۔

"مجھے بتاؤ! گھر میں کون کون ہے؟"

"سبھی ہیں۔ ملہوترہ ہیں، پانڈے ہے۔ برمن بھی آیا ہوا ہے۔ وہ بحری جہازوں میں کام کرتا ہے۔ انجنیئر ہے وہاں اور کیسے پوچھتے ہو؟"

"اور وہ شکنتلا؟"

"وہ اب یہاں نہیں رہتی۔ واپس چلی گئی ہے۔"

"یہ برمن کون ہے؟"

"یہ ملہوترا کی بہن کا لڑکا ہے۔ دلی میں رہتے ہیں یہ لوگ۔" اب وہ میرا ہاتھ نہیں کاٹ رہی تھی۔ "آپ اگر پسند کریں تو میں آپ کے لیے وسکی نکال دوں؟"

"ہاں ٹھیک ہے مگر شور نہیں مچانا ہے۔ اس کی ممانعت ہے۔"

"اب تو اس کی ضرورت ہی نہیں رہی ہے مسٹر جیلانی! اُس وقت آپ نے میرا منہ بند کر لیا تھا۔ چھوڑیں ذرا مجھے۔" یہ کہہ کر اُس نے تکیے کی طرف رکھی الماری میں سے وسکی نکال لی۔ گلاس بھی وہیں موجود تھے۔ اس نے دو گلاس بھرے اور ایک میرے سامنے رکھ کر دوسرا خود پینے لگی۔ وہ ان لمحوں کو کسی ایسے ہی خواب میں غرق کر دینا چاہتی تھی جس کے بارے میں وہ خود سے کہہ سکے کہ اس پر اس کا کوئی اختیار نہیں تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ دو گلاس چڑھا گئی۔ جب کہ میں ابھی پہلے گلاس کو محض چکھ کر ہی رہ گیا تھا۔

"پئیں نا، آپ بھی پئیں۔ یہ غلام جیلانی کے نام ہے۔ تم بہت بدمعاش آدمی ہو، مجھے بھی تمھارا اکثر خیال آتا تھا مگر یہ پتہ نہیں تھا کہ تم پھر آ جاؤ گے۔"

مجھے اس کی باتیں سن کر حیرت ہونے لگی تھی۔ وسکی نے اس کا موڈ بالکل ہی بدل دیا تھا۔ نظر بچا کر میں نے گلاس پلنگ کے نیچے خالی کر دیا اور دوبارہ بھر لیا تو وہ خوش ہو گئی۔

اس سے میں نے مختلف لوگوں کے کمروں کے بارے میں پوچھ لیا۔ تو پھر مجھے اس کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ میں نے پلنگ پر سے اُٹھنے سے پہلے اس کی بتّی گل کر دی اور پھر اس کے کمرے سے باہر نکل آیا۔ مجھے اب ملہوترا سے ملنا تھا۔ مجھے یاد ہی نہیں رہا کہ میں پریتا سے ڈھلوں صاحب کے بارے میں پوچھ لیتا۔ اس سے میری باتیں کسی اور ہی طرف نکل گئیں تھیں۔ کمرے سے نکل کر میں راہداری میں آ گے بڑھا۔ پریتا

نے جو پتہ مجھے دیا تھا اس کے مطابق تو ملہوترا کو تیسرے کمرے میں ہونا چاہیے تھا۔ میں نے اُس کے تالے میں چابی لگائی میرا پستول میرے سیدھے ہاتھ میں تھا اور میں وہاں کسی بھی مرحلے کے لیے بالکل تیار ہو کر پہنچا تھا مگر تالا کھلتے ہی مجھے محسوس ہوا کہ وہاں ایک نہیں دو آدمی موجود ہیں۔ یہ میرا احساس تھا۔ دروازے کے پیچھے پردہ کھنچا ہوا تھا اور اندر مکمل اندھیرا طاری تھا۔ میرا خیال ہے کہ انھیں یہ احساس ہی نہ ہو سکا کہ دروازہ کھل چکا ہے۔ جیسے ہی میں پردے سے آگے نکلا انھیں اندھیرے میں ایک سایہ سا لرزتا نظر آیا اور اس کے ساتھ ہی کسی نے بلب روشن کر دیا۔ کلک ایسی آواز پیدا ہوئی تو وہ دونوں روشنی میں نہا سے گئے۔ اُن میں ایک عورت تھی اور دوسرا مرد تھا۔

میرے سامنے جو آدمی تھا اُسے میں نہیں پہچانتا تھا۔ پہلی بار میں اس کی صورت دیکھ رہا تھا۔ عمر اس کی یہی کوئی چالیس سال ہو گی۔ مجھے دیکھ کر اس کا چہرہ بگڑنے لگا۔ بڑے غصے سے بولا "کون ہو تم! اندر کیسے آ گئے؟"

"شی۔۔۔ آواز دبا کر بولو۔ ملہوترا صاحب جاگ اٹھیں گے"۔

"تو میں کیا کروں؟ کون ہو تم؟"

میرے پستول کی نال اس کے رُخ پر تھی اور وہ کمرے میں میری آمد کا مطلب بڑی حد تک سمجھ چکا تھا۔ میں نے فوراً پستول کا دستہ اس کے سر پر دے مارا۔ وہ درد سے نڈھال ہو کر تکیے پر گرا تو پھر اوپر نہ اٹھ سکا۔ اس کی طبیعت کچھ زیادہ ہی نازک تھی۔ پلنگ کے اوپر سے گزر کر میں دوسری دیوار تک جا پہنچا۔ وہ عورت وہاں چھپی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں بری طرح لرز رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے اُسے رعشہ ہو گیا ہے مگر تھی وہ نوخیز۔ میرا خیال ہے اُس کی عمر زیادہ سے زیادہ بیس بائیس سال ہو گی۔ اس کو میں نے بازو سے پکڑ کر باہر کھینچا، تو وہ بستر کی چادر کھینچنے لگی۔

"کون ہے یہ تمھارا، کیا لگتا ہے؟"

"میں۔۔۔ جی میں صرف رات بھر کے لیے آئی تھی ان کے پاس۔ یہ برمن ہیں، ایس ڈی برمن"۔ وہ کانپتے ہوئے بولی۔

"اچھا! تو یہ چھٹیاں گزار رہا ہے یہاں گدھا! تمھارا نام؟"

"جی میرا نام کوشلیا ہے"۔

"اچھا! تو یہ بات ہے۔ گھبراؤ نہیں۔ اور مجھے بتاؤ کہ ملہوترا کہاں ہے؟"

"وہ اگلے کمرے میں ہے"۔

"ٹھیک ہے میرے ساتھ چلو، اٹھو جلدی کرو۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ دیکھو، میرا کہا نہیں مانو گی تو اچھا نہیں ہو گا۔ ملہوترا تم سے واقف ہے؟"

"جی ہاں۔ وہ مجھے جانتا ہے"۔

"تو پھر اسے جا کر جگا دو۔ مگر نہیں"۔ اچانک میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ اس کا تالا بھی تو میں بہ آسانی کھول سکتا تھا۔ وہ ماسٹر کی بنی ہی اسی لیے تھی۔ سنتری سے مجھے جو گچھا ملا تھا وہ اس دروازے پر کیوں کام نہیں آئے گا۔

اس کو میں نے پھر پلنگ پر بٹھا دیا تھا۔ اس کوشلیا کو وہاں سے جانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ وہ ابھی تک تھر تھر کانپ رہی تھی۔ برمن کا حال دیکھنے کے بعد اس کی رُوح زیادہ ہی فنا ہونے لگی تھی۔ اُسے میں نے بستر پر بٹھاتے ہی پستول کا دستہ مار کر بے ہوش کر دیا۔ مجھے وہ اس گھڑی بہت ہی زہر لگ رہی تھی۔ وہ دربار ملہوترا نے سنبھال رکھا تھا۔ ایک سے ایک ذلیل آدمی وہاں جمع تھا جنھیں عیش کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہیں تھا۔ کوشلیا کو بستر پر لٹا کر میں نے بتّی بجھا دی۔ اس کمرے میں پھر سے گہرا سناٹا چھا گیا تھا مگر وقت تیزی سے گزرتا جا رہا تھا۔ سپاہی کی ڈیوٹی دو گھنٹے بعد بدل جاتی تھی۔ میرے لیے یہی بہتر تھا کہ میں وہاں سے فوراً اپنا کام کر کے نکل جاتا۔

اب کی بار میں نے برمن کے دروازے کو باہر سے مقفل کر دیا اور اگلے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اس میں بھی بڑی چابی کام کر گئی اس کا ایک تختے کا پٹ کھلا تو مجھے کمرے میں گہرے سناٹے کا احساس ہوا۔ میں نے اندر جاتے ہی دروازہ مقفل کر دیا۔ کوئی آدمی ہلکے ہلکے خراٹے لے رہا تھا۔ میں نے بتّی پر ہاتھ رکھا تو کمرہ ایک دم بڑے بلب سے منوّر ہو گیا۔ مگر اس کے ساتھ ہی ڈھیلے ڈھالے گاؤن میں ملبوس ملہوترا کی آنکھ کھل گئی۔ مگر میں نے اس سے پہلے ہی اس کے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈال کر اس کا پستول جیب میں ڈال لیا تھا۔ مجھے صحیح طرح پہچاننے کے بعد ہی اس نے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈالا مگر وہاں اُسے مطلوبہ شے نہ ملی تو وہ زخمی کتے کی طرح اچھل گیا۔

"کون ہو تم، کیا چاہتے ہو؟"

"میرے ساتھ چلو ملہوترا صاحب۔ میں غلام جیلانی ہوں، تمھارا پرانا داس"۔ یہ کہہ کر میں نے پستول اس کی کنپٹی سے لگا دیا۔ بالآخر میں اس خبیث تک جا پہنچا تھا جس کا نام سن سن کر میرے کان پک گئے تھے۔ پہلی ہی رات بڑی معرکے کی رات ثابت ہو رہی تھی۔

"تم۔۔۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ کیا لینے آئے ہو اب؟"

"میں ڈھلوں صاحب کو لینے آیا ہوں کتے! تم سمجھتے ہو کہ اپنے گھر میں تم بالکل محفوظ ہو مگر میرے لیے نہیں۔ بتاؤ انھیں

نے کہاں رکھا ہے؟"

اس کی رنگت سیاہی مائل ہو گئی تھی۔ وہ ابھی تک بستر پر بیٹھا تھا مگر پستول کے خوف سے لرز کر وہ تکیے پر لیٹ گیا۔ جیسے وہ مجھے دعوت دے رہا ہو کہ میں اُسے ذبح کر دوں۔ وہ پولیس کا پرانا افسر تھا مگر اس میں حوصلے اور ہمت کی اتنی کمی دیکھ کر مجھے اس کی حالت پر رحم آ رہا تھا۔

"بتاؤ ڈھلوں صاحب کہاں ہیں؟"

"وہ تو جیل میں ہیں۔ بلبیر سنگھ کے قتل کے جرم میں انھیں سزا سنا دی گئی ہے مگر جیلانی! میرا اس میں کوئی قصور نہیں"۔

"وہ تو میں سمجھتا ہوں۔ تم تو بالکل ہی بے قصور ہوتے ہو! اٹھو میرے ساتھ چلو۔ میں یوں ہی واپس نہیں جاؤں گا"۔ عین اس وقت اچانک اس نے تکیے کے نیچے لگے کسی بٹن پر ہاتھ رکھ دیا۔ ایک ہلکی سی گھنٹی بجی تو میں نے اُسے فوراً ہی کھینچ کر فرش پر اتار لیا۔ اسے میں اب گالیاں دینے لگا تھا۔ پورے زور سے میں نے اس کی کمر میں پاؤں کی ٹھوکر لگائی تو وہ بجھ سا گیا۔ اوندھے مُنہ فرش پر جا پڑا۔ مگر اسی وقت دروازہ بھی کھل گیا۔ میرے سامنے پانڈے کھڑا تھا۔ پاجامے اور بنیان میں۔ اور سر اس نے اب بھی پوری طرح منڈا رکھا تھا۔ وہ ہاتھ میں ایک موٹا سا ڈنڈا لے کر باہر آیا تھا۔ پتہ نہیں وہ کس کمرے میں سوتا تھا۔ گھنٹی بجتے ہی وہ ملہوترا کے کمرے میں آ گیا۔ اس کی نظر زیادہ تیز تھی۔ مجھے اس نے پہلی ہی جھلک میں پہچان لیا تھا۔ غصے سے تھراتے ہوئے وہ بے خوف میری طرف بڑھا یوں جیسے پستول اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ اس کو دہشت زدہ کرنے کے لیے میں نے ملہوترا کا پستول بائیں ہاتھ میں پکڑ لیا مگر وہ پھر بھی نہیں رُکا۔ پاگلوں کی طرح وہ میری نظروں سے نظریں ملا کر آگے بڑھ رہا تھا۔ یوں کہ میں سمجھا وہ مجھ سے دونوں پستول چھین لے گا۔ ڈنڈا اس نے پوری قوت سے گھما کر میرے سر میں مارنا چاہا مگر اس اثنا میں میرا چپ شلہ چل چکا تھا۔ گولی اس کے سینے میں دل کی طرف لگی تو وہ اچھل کر میرے اوپر آ پڑا۔ اتنے میں ملہوترا بھاگنے لگا مگر میں نے پانڈے کی پروا نہ کرتے ہوئے تیزی سے نیچے جھک کر ملہوترا کی ٹانگ پکڑ لی۔ اتنے میں پانڈے نے میرا بایاں بازو اپنی گرفت میں لے لیا۔ وہ مر کر بھی دو چار آدمیوں کو مار دینے کی سکت رکھتا تھا۔ میں نے ملہوترا کو پیچھے گھسیٹتے ہی پانڈے کے دل میں گولی اتار دی۔ مجھے اس پر ترس کھانے کی کوئی ضرورت نہیں تھا۔ گولی لگتے ہی وہ اوندھے مُنہ بستر پر جا پڑا تو میں نے ملہوترا کو اور اپنی طرف گھسیٹ لیا۔

"تم بچ نہیں سکتے ملہوترے! میں تیرا خون پی جاؤں گا۔ ڈھلوں صاحب واپس نہیں ہوئے تو میں یہ شہر جلا دوں گا۔ سالے! مت سمجھ میں خالی ہاتھ لوٹ جاؤں گا"۔ یہ کہہ کر میں نے ملہوترا کا پستول جیب میں ڈال لیا اور اس کو گردن سے پکڑ کر میں نے اپنا رومال اس کے منہ میں ٹھونس دیا۔ بستر کے تکیے سے ایک ریشمی ڈوری لٹک رہی تھی، وہ ڈوری کھینچ کر میں نے ملہوترا کے دونوں بازو پُشت پر باندھ دیے۔ اس کے بعد بستر کی چادر کھول کر میں نے اس کے سر پر یوں لپیٹ دی کہ وہ کچھ دیکھ نہیں سکتا تھا۔ "چلو اب ملہوترا جی! مجھے بہر حال ڈھلوں تک پہنچنا ہے اور تمھاری مدد کے بغیر یہ ممکن نہیں"۔ یہ کہہ کر میں نے کھلے دروازے میں سے اسے آگے دھکیلا اور اسی وقت راہداری عبور کر کے میں اس کو عمارت سے باہر لے آیا۔ سنتری ابھی تک اسی رُخ پر کھڑا تھا جو میں اسے دے آیا تھا۔ ملہوترا کو میں گھسیٹتا ہوا گیرج میں جا گھسا۔ وہ عمارت کے بائیں ہاتھ پہ تھا۔ اس کا تالا بھی میں نے ماسٹر کی سے کھولا اور ملہوترا کی گاڑی کا دروازہ کھول کر میں نے اُسے اگلی سیٹ پر بٹھا دیا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ گاڑی کی چابی اندر تھی ورنہ چابی کے لیے مجھے ایک بار پھر اندر جانا پڑتا۔

میں نے بڑی احتیاط سے گاڑی گیرج سے باہر نکالی۔ اس کی آواز میرے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں کوٹھی کے پچھلے حصے میں سوتے سنتری نہ جاگ اٹھیں۔ پھر بھی میں مجبور تھا۔ گاڑی کو لے کر میں بڑے گیٹ تک پہنچا اور اس کا دروازہ کھول کر میں دوبارہ گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پہ آ بیٹھا۔ عین اس وقت ایک سنتری نہایت تیزی سے ہماری طرف لپکا۔ اس نے عقبی کوارٹر میں ہماری آواز سُن لی تھی۔

"بابو جی! آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

میں نے کھڑکی میں سے سر باہر نکال کر اسے دیکھا تو وہ تیزی سے ہمارے قریب آ گیا۔ وہ ڈیوٹی بدلنے کے لیے تیار ہو کر آیا تھا مگر جیسے ہی وہ میرے قریب آیا، میں نے اس کو اور قریب آنے کے لیے کہا تو وہ مؤدب ہو کر گاڑی کی کھڑکی تک آ پہنچا۔

"ملہوترا صاحب بیمار ہیں۔ میں انھیں ڈاکٹر کے پاس۔۔"

یہ کہتے ہوئے میں نے اسکی گردن پر پنجہ جما دیا۔ وہ لڑھک کر دور جا گرا تو میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ ایسے آدمی کے ساتھ یہی سلوک ہونا چاہیے تھا۔ بہت ہمدرد بنتا تھا وہ ان کا۔ گیٹ سے نکل کر میں نے گاڑی روکی اور تینوں بے ہوش سپاہیوں کو میں نے باری باری پچھلی سیٹ پر ڈال دیا۔ دو کو ایک دوسرے کے اوپر نیچے اور تیسرے کو اگلی اور پچھلی سیٹ کے وسط میں لٹا کر میں نے گیٹ بند کر دیا اور وہاں سے پچاس ساٹھ میل کی رفتار سے دوڑ لگا دی۔ مجھے وہاں سے ہر

حال میں بہت دُور نکل جانا چاہیے تھا۔ سب سے زیادہ مشکل میں مجھے اُن بے ہوش سپاہیوں نے ڈال رکھا تھا۔ اُن کو میں کہاں لیے پھرتا۔ نہر کی پٹڑی پر سے ہوتے ہوتے میں کار کو بھگاتا ہوا باغ میں جا گھسا۔ دو گھڑی کی مہلت مجھے حاصل تھی۔ کار روک کر میں نے تینوں سپاہیوں کو ایک گھنے درخت کے نیچے ڈال دیا۔ ملہوترا کی آنکھوں پر پڑی چادر اسے ہر گناہ ثواب سے بچا رہی تھی۔ اسے ساتھ لے کر میں آگے بڑھا اور کچھ ہی دیر بعد میں بٹالہ جانے والی سڑک پر جا نکلا مگر وہ محفوظ سڑک نہیں تھی۔ ٹریفک وہاں رات کے اُس وقت بھی جاری تھا۔ مجبوراً میں نے کار بائیں ہاتھ ایک چھوٹی سڑک پر ڈال دی۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد میں سڑک سے اتر کر گھنے درختوں کے جھنڈ میں جا گھسا۔ راستہ صاف نہیں تھا مگر میں نے کسی چیز کی پروا نہیں کی۔ گاڑی بند کر کے ملہوترا کے چہرے سے پردہ ہٹا دیا۔ اور اُس کے منہ سے رومال بھی نکال دیا۔ "ہاں ملہوترا، اب بتاؤ تم نے ڈھلوں کو کیوں اور کیسے اغوا کیا، اس کا قصور کیا تھا؟"

مگر اس کا منہ خشک ہو رہا تھا۔ رومال نے اس کی زبان کی ساری نمی چوس لی تھی۔ چند لمحوں تک وہ اپنا حلق تر کرتا رہا۔

"میری بات کا جواب دو ملہوترا۔ میں ڈھلوں صاحب کو واپس لینے آیا ہوں۔"

"تم.... تم بہت بڑے جرم کے مرتکب ہو رہے ہو۔ یاد رکھو تمھیں اس کی خوفناک سزا ملے گی۔"

"اس کو چھوڑو تم! یہ دیکھو کہ اس وقت تم کہاں ہو۔ کیا دشمنی تھی تمہیں ڈھلوں صاحب سے؟"

"ہم نے اسے بلبیر سنگھ کے قتل کے جرم میں پکڑا ہے اور ابھی اس کا مقدمہ چل رہا ہے۔"

"اور وہ خود کہاں ہیں؟"

"وہ امرتسر جیل میں ہے، اس کی ضمانت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"تمھاری پارٹی بھی اس میں ملوث ہے؟"

"ہاں! بھنڈاری نے اس کو اغوا کرنے کا حکم دیا تھا۔"

"اور وہ بدری کون تھا؟"

"وہ ہمارا ہی آدمی تھا۔ ہم نے اُسے اُدھر بھیجا تھا۔"

"اس کا اصل نام کیا تھا؟"

"بدری پرشاد۔"

"ہوں۔ تمھیں پتہ ہے اسے قتل کر دیا گیا ہے؟"

"ہاں، مجھے معلوم ہے۔ اس کا مر جانا ہی بہتر تھا۔ پولیس اس سے کوئی راز معلوم نہیں کر سکی۔ ہمارے ہی آدمی نے اسے تھانے میں قتل کر دیا تھا۔"

"گڈ! تم بہت اچھے بچے ہو ملہوترا! تم بتاؤ کہ ڈھلوں صاحب سے اب کیا سلوک کرنا چاہتے ہو؟"

"پتہ نہیں۔ ہو سکتا ہے اسے پھانسی ہو جائے۔"

"ان کا مقدمہ کس عدالت میں ہے؟"

"ڈاکٹر سرجیت سنگھ کی عدالت میں ہے۔"

"اب وہ کس روز عدالت میں پیش ہوں گے؟"

"اٹھائیس تاریخ کو۔"

"تمھیں پتہ ہے میں تمھارے ساتھ کیا سلوک کرنے والا ہوں؟"

"تم مجھے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ وہ لوگ تمھارے تعاقب میں آ رہے ہوں گے۔ تم کتے کی موت مرو گے جیلانی! تم یہاں سے بچ کر نہیں جا سکتے ہو۔ یہ تمھارا آخری پھیرا ہو گا۔" اس کے حوصلے اب بھی بہت بلند تھے۔ میرا خیال ہے اس نے موت کے تصوّر کو بھی ذہن میں نہیں آنے دیا تھا اور میں نے سوچ لیا تھا کہ میں اُس سے اسی وقت چھٹکارا حاصل کر لوں گا۔ میں نے بڑے غیظ و غضب کے عالم پستول کا دستہ اس کی گدّی میں دے مارا۔ ضرب کاری بیٹھی۔ ملہوترا اسی وقت بے ہوش ہو گیا۔ اُس کو ساتھ لے کر میں خواہ مخواہ خوار نہیں ہونا چاہتا تھا۔ میں نے پستول اس کے سینے پہ رکھا اور اسے دھکا دے کر کار سے باہر گرا دیا۔ وہ بالکل بے ہوش ہو چکا تھا۔ اسے کھینچ کر میں جھاڑیوں میں لے گیا اور وہیں میں نے اس کی کنپٹی پر گولی مار دی۔ اس کے زندہ رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اس کو وہیں چھوڑ کر میں نے کار کو پھر امرتسر کی طرف بھگا دیا۔ رات کچھ زیادہ اُوپر اٹھ گئی تھی۔ صبح کے چار بج چکے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد میں اسی ذیلی سڑک پر چلتا ہوا خالصہ کالج کے پاس جا پہنچا۔ اب میں نے کار چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا۔ میں اس کو اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا تھا۔ کار نئی تھی مگر میری نہیں تھی۔ پولیس اس کے پیچھے لگی ہو گی۔ وہ کسی بھی جگہ مجھے روک سکتے تھے۔ ایسا تو ممکن ہی نہیں تھا کہ انھیں ملہوترا کے اغوا کی خبر نہ ہو سکی ہو۔ میں نے کار کالج کی عقبی دیوار کے ساتھ کھڑی کی اور چابیاں وہیں رہنے دیں اور وہاں سے میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا شہر کی طرف چل دیا۔ کوئی دو فرلانگ میں آگے نکلا ہوں گا کہ مجھے ایک ٹیکسی نظر آ گئی۔ اس کو میں نے روکا تو اس میں دو سواریاں اور تھیں۔ پتہ نہیں وہ کہاں جا رہے تھے پھر بھی میں اگلی نشست پر بیٹھ گیا تو ڈرائیور بولا۔ "آپ نے کہاں جانا ہے؟"

"ذرا مجھے ہال بازار اتار دو۔"

"جی بہت اچھا۔ یہ سواریاں اسٹیشن جا رہی ہیں۔ میں نے سوچا آپ کو بھی ساتھ بٹھا لوں۔ آپ کو اعتراض تو نہیں ہے؟" آخری جملہ اس نے ٹیکسی میں موجود سواریوں کو دیکھ کر کہا۔

وہ دونوں سکھ تھے اور کسی اپنے ہی کام سے اسٹیشن جا رہے تھے۔ وہ دونوں ہنس دیئے، بولے۔ "کیا حرج ہے، کسی کا کام ہو جائے تو اس سے اچھی بات کیا ہو گی۔"

جب میں ہوٹل پہنچا تو میں نے دیکھا کہ آبی بڑے گیٹ کے باہر سڑک پر کھڑا ہے۔ ڈرائیور نے گاڑی روکی تو میں اس کو کچھ بھی نہ دے سکا۔ میرے پاس پاکستانی کرنسی تھی۔ ہمیں وہ فوراً بدل لینی چاہیے تھی۔

"یار! میں کتنے پیسے دے دوں؟"

"نہیں باؤ جی! خیر ہے۔ صبح سویرے پُن کا کام ہو گیا، یہی بہت ہے۔" یہ کہہ کر اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

آبی نے ابھی تک مجھے نہیں دیکھا تھا۔ اس کا دھیان دُوسری طرف تھا۔ میں ٹیکسی کی اوٹ سے نکل کر اچانک ہی اس کے پاس جا پہنچا۔

"اوئے کونترا! تو کہاں پاگل ہوتا پھر رہا ہے۔ ہائیں! تو زندہ تو ہے؟"

"ہاں ہاں۔ یہاں ہر طرح سے خیریت ہے اور تمھاری خیریت نیک مطلوب ہے اور اندر چل بات کرتے ہیں۔" یہ کہہ کر میں اسے اپنے ساتھ لے کر ہوٹل کی طرف بڑھا۔

اس نے مجھے روک لیا۔ "اندر مت جاؤ۔ پولیس کے سپاہی کسی کو تلاش کرتے پھر رہے ہیں، پتہ نہیں معاملہ کیا ہے۔"

"اوئے بیڑا غرق! یہ تو بہت بُرا ہوا۔ ہمیں یہاں سے فوراً نکل جانا چاہیے۔ آؤ ادھر۔"

اسے ساتھ لے کر میں پیچھے ہٹا اور وہاں سے ہم کوئی سو قدم تک ٹہلتے ٹہلتے آگے نکل گئے۔

"یہ یہاں کیسے آ گئے اور ان سے تم کیسے بچ گئے ہو؟"

"میں کوئی ایک گھنٹے سے باہر ہوں۔ وہ میرا خیال ہے لوگوں کے کمروں کی تلاشی لے رہے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کسے ڈھونڈ رہے ہیں؟"

آبی کو ساتھ لے کر میں نے ایک لنڈی گلی میں قدم رکھا اور پھر ہم نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ اسٹیشن کا فاصلہ وہاں سے زیادہ ہی تھا۔ ہم مختلف گلیوں سے ہوتے ہوئے بالآخر ایک مسجد میں جا پہنچے۔ وہی ٹھکانا ہمارے لیے سب سے محفوظ تھا۔ مولوی صاحب اذان دے چکے تھے۔ ہم نے وضو کیا اور خدا کے حضور جھک گئے۔ میں نے سجدے میں سر ڈالا تو میرے آنسو جاری ہو گئے۔ آبی کا بھی یہی حال تھا۔ اس کی آنکھیں بھی اشکبار ہو گئی تھیں۔ ہمارے اپنے ہی اعمال ہمیں لے ڈوبے تھے۔ چین کا ایک لمحہ ہمیں میسر نہیں تھا۔ مسجد میں نمازی زیادہ نہیں تھے۔ مشکل سے ایک صف پوری ہو سکی۔ دراصل وہاں سے سکھوں نے مسلمانوں کا کھوج ہی ختم کر دیا تھا۔ اب جو تھے وہ زیادہ تر کشمیری ہاتو تھے یا وہ لوگ جو محنت مزدوری کے لیے دوسرے شہروں سے آ کر آباد ہو گئے تھے۔

نماز سے فارغ ہو کر ہم دونوں مسجد کے ایک کونے میں جا کر بیٹھ گئے۔ آبی سگریٹ کے لیے مچل رہا تھا، بولا۔ "اٹھو یار! یہ جگہ ہمارے لیے نہیں ہے۔"

"باہر کہاں جاؤ گے، سویرا تو ہونے دو۔ میری بات غور سے سنو۔ میں ایک معرکہ سر کر کے آیا ہوں۔"

"کیا مطلب؟ تُو گیا کس وقت تھا؟"

"میں کوئی گیارہ بجے کے قریب باہر نکلا تھا۔" یہ کہہ کر میں نے اُس رات کے سارے واقعات اُسے سُنا دیے۔

وہ حیرت زدہ ہو کر مجھے دیکھتا رہا۔ یوں جیسے میری کسی بات کا اسے اعتبار نہ آ رہا ہو۔ میں خاموش ہوا تو وہ بولا۔ "وہ کوئی وقت تھا ایسی حرکت کا؟ پاگل ہے تُو۔"

"بہرحال اب ہمیں جیل تک پہنچنا ہے۔"

"مگر ابھی نہیں، وہ تم بتایا کرتے تھے کہ ادھر گورداسپور کے قریب کسی گاؤں میں تیری دوستی تھی۔"

"ہاں تھی۔ پھر؟"

"میری مان، چند دن کے لیے ہم وہاں جا رہتے ہیں۔ اِدھر ذرا ٹھنڈ ٹھنڈا ہو جائے تو پھر اِدھر آ جائیں گے ورنہ وہ ہمیں دو قدم نہیں چلنے دیں گے۔"

"تو ٹھیک کہہ رہا ہے یار! مجھے بھی اپنی جان شکنجے میں دکھائی دیتی ہے۔ اُٹھ پھر۔ ہم صبح کی گاڑی سے وہاں جا رہتے ہیں۔ یہ اچھی تجویز بتائی ہے تُو نے۔"

"یہی بہتر ہے۔ اس ملہوترے کا قتل تو پولیس کے لیے زبردست آزمائش بن جائے گا، چلو۔" یہ کہہ کر وہ اسی وقت اپنی جگہ سے اُٹھ گیا۔ جب ہم مسجد سے باہر نکلے تو وہ بولا۔ "مگر سفر کے لیے پیسے کہاں سے آئیں گے؟ ہمارے پاس تو پاکستانی کرنسی ہے۔"

"ہاں، یہ مشکل ہے۔ میرا خیال ہے ہم کسی مسلمان بھائی سے سو روپیہ اُدھار لیتے ہیں۔"

"تم ہی جاؤ۔ کسی نمازی سے بات کرو۔"

"ٹھیک ہے۔ تم ادھر ہی ٹھہرو۔" یہ کہہ کر آبی پھر مسجد میں جا گھسا۔ پتہ نہیں اُس نے کیا کیا۔ جب وہ واپس آیا تو سو روپے اُس کے پاس تھے۔ "لے بھائی! کام بن گیا۔ اسے میں دو سو روپے پاکستانی دے آیا ہوں۔ اب فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ میرا خیال ہے وہ کرنسی کے بزنس کو سمجھتا ہے۔"

"سمجھے یا نہ سمجھے، بس تو نکل چل۔" یہ کہہ کر میں اُسے ساتھ لے کر اسٹیشن کی طرف چل دیا۔ معلوم یہ ہوا کہ پٹھانکوٹ کے لیے گاڑی

وہاں سے ساڑھے پانچ بجے چھوٹتی تھی۔ دو ٹکٹ لے کر ہم ڈبے میں جا بیٹھے۔ مگر سکون ہمیں بالکل نہیں تھا جب تک ہم اسٹیشن پر رہے۔ ہماری آنکھیں متواتر حرکت میں رہیں۔ ڈر یہ تھا کہ اُن لوگوں نے ہر جگہ پولیس کو خبردار کر دیا ہوگا۔ ہمیں زیادہ لوگ پہچان تو نہیں سکتے تھے مگر پھر بھی دل میں وسوسہ تھا۔ کسی بھی وقت کوئی پلٹیا ہمیں نتھ ڈال سکتا تھا۔ مجھے اُن کی صُورت سے نفرت تھی۔ وہ ملھوترا بھی پولیس میں ہی تھا مگر اُس کے اعمال دیکھ کر شیطان بھی اس سے پناہ مانگتا ہوگا۔

گاڑی روانہ ہوئی تو ہم نے اطمینان کا سانس لیا۔ خدا خدا کر کے گاڑی گورداسپور پہنچی تو ہم اتر کر اسی وقت اسٹیشن سے باہر آگئے۔

آبی وہ علاقہ پہلی بار دیکھ رہا تھا، بولا "بڑا سرسبز علاقہ ہے یہ۔ پہلے تو سُنا تھا یہ پاکستان کو مل رہا ہے"۔

"ہاں! مگر ہندو کے باٹ تم نہیں جانتے ہو۔ لینے کے اور ہوتے ہیں اور دینے کے اور۔ ایسی ڈنڈی ماری اِن لوگوں نے کہ جب آنکھ کھلی تو گورداسپور اُن کے ہتھے چڑھ چکا تھا اور یہ ریلوے لائن سیدھی کشمیر تک جاتی ہے"۔

"یہ بہت بُرا ہوا جیلانی! مسلمانوں کی اکثریت تھی یہاں۔ مگر اب تو وہ ختم ہی ہو گئے"۔

"ہاں! بس غلطی ہو گئی"۔

"اللہ معافی دے"۔

"اب کوئی تانگہ پکڑ۔ گولہ سڑک جاتی ہے برنالہ کی طرف"۔

"تو اسے روک لے نا! یہ اُدھر بھی جا سکتا ہے"۔ آبی نے ایک تانگے کو روکتے ہوئے کہا اور ہم اس سے دس روپے کرایہ طے کر کے برنالہ کی طرف چل دیئے۔

آبی نے اچھی تجویز پیش کی تھی۔ اس شہر سے ہمارا فوراً نکل جانا ہی اچھا تھا۔ انھیں جب خبر ملی تو وہ اسی وقت شہر کے مختلف حصوں میں پھیل گئے تھے۔ آبی نے سمجھ داری سے کام لیا کہ وہ اس وقت ہوٹل میں موجود نہیں تھا۔ ورنہ اس کو دھر لیتے۔ ملھوترا اُن کے لیے بے حد اہم آدمی تھا۔ اس کے لیے تو وہ سارے شہر کو سر کے بل کھڑا کر دیتے۔

تانگہ بڑی سڑک پر چڑھا تو آبی مُسکراتے ہوئے بولا۔

"تم نے کسی کلونتی کا ذکر کیا تھا۔ وہ کیا چیز ہے یار؟"

"بس تجھے تو کوئی موقع ملنا چاہیے۔ خالص دیہاتی عورت ہے وہ"۔

"میں بھی پینڈو آدمی ہوں، یہ کوئی خاص بات نہیں ہے"۔

"اللہ معافی دے یار! تو کچھ زیادہ ہی آزاد خیال ہو گیا"۔

"اچھا یہ بتا، تجھے یہ پستول کہاں سے ملا؟"

"مت پوچھ یارا! اس کے بارے میں تو میں نے تجھے بتایا ہی نہیں۔ دو تلنگے مل گئے تھے مجھے"۔ یہ کہہ کر میں نے اسے ساری بات بتا دی۔

وہ بے اختیار ہنسنے لگا۔ "خوب پھینٹی لگائی تھی انھیں رحد ہو گئی۔ یعنی وہ تیرے ہی پیچھے چل پڑے اور یہ پتہ نہیں تھا کہ؟"

"ہاں۔ بڑا مکالمہ ہوا اُن سے بھئی! میرا خیال ہے آخر تک انھیں یہ محسوس نہیں ہوا ہوگا کہ اُن کے ساتھ ہو کیا گیا ہے؟"

"جب ہم برنالہ پہنچے تو دوپہر ہو چکی تھی۔ یہی کوئی تین بجے کا عمل ہوگا۔ ہم سڑک پار کر کے گدڑ منڈی جا پہنچے۔ بائیں ہاتھ ایک بھٹیارن دانے بھون رہی تھی اور بہت سے بچے اور جوان اس کے گرد بیٹھے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ مکی کی خوشبو گلی تک پھیل رہی تھی۔ آبی وہیں رُک گیا۔ وہ خوشبو شاید اسے اپنے گاؤں کی یاد دلا رہی تھی۔

"کیا خیال ہے یہاں سے دانے نہ لے لیں؟"

"نہیں یار! کوئی تو ویلا وقت دیکھا کر۔ یعنی یہ بھٹیارن بھی تیری نظر میں آگئی، چل آگے"۔ مگر عین اس وقت کلونتی مجھے گلی میں بھٹیارن کی طرف آتی دکھائی دی۔ اس کے ہاتھ میں دانوں کی ایک بڑی سی پوٹلی تھی۔ وہ سبز رنگ کی قمیص شلوار پہنے ہوئے تھی۔ اس پر وہ پھلکاری اوڑھے ہوئے تھی سرخ رنگ کی۔ صحت اس کی اب بھی ویسی ہی تھی اور چہرے کی چمک دمک اب بھی نگاہوں کو خیرہ کرتی تھی۔ وہ جھومتی ہوئی آگے بڑھی تو ایک دم ہمارے سامنے آگئی۔ ہم گلی کو تقریباً روک کر کھڑے تھے۔ سب سے پہلے اس کی نظر ہمارے پاؤں پر پڑی اور پھر وہ ہمیں دیکھنے کے لیے ذرا دیر کے لیے دیوار کے ساتھ لگ گئی۔ اُس سے میری نظریں ملیں تو ایک عجیب سی بھیدوں بھری مسکراہٹ اس کے لبوں پر اُبھری۔

"تم! یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں شیر سنگھ جی!"

"میں پھر آگیا ہوں کلونتی! کیا حال ہے تیرا؟"

"بالکل ٹھیک ہے۔ پر تُو اِدھر کیسے آگیا؟ چل میرے گھر۔ میں اِدھر بھٹی کی طرف آئی تھی۔ چل اب یہ کام پھر کر لوں گی۔ آ اِدھر"۔ اس نے دیوار سے ٹیک ہٹائی اور نہایت ہی بے تکلفی سے اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا، بولی "تیرا میں روج انتجار کرتی تھی۔ روج ہی روج! آخر تُو آ ہی گیا۔ یہ تیرے ساتھ کون ہے؟"

"یہ میرے دوست ہیں میرے ساتھ ہی آئے ہیں۔ ہولناک سنگھ نام ہے اِن کا"۔

"ہاں۔ برباد سنگھ کیوں نہیں کر دیتے۔ جگت سنگھ ابھی گھر پر نہیں ہے، شام کو آئے گا، چل آ"۔ یہ کہہ کر اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ سامنے سے دو تین آدمی گلی میں آ رہے تھے، اُن کو راستہ دے کر وہ آگے بڑھی تو بولی "جگت سنگھ بھی تجھے بہت یاد کرتا تھا۔ اچھا ہوا تیرے درشن ہو گئے"۔

ابھی تک آبی بالکل خاموش تھا۔ وہ کلونتی کو نگاہوں میں تول رہا تھا۔ گلی سے نکل کر وہ اپنے مکان کے دروازے کے سامنے جا کر ٹھہری۔ "آج بھابی بھی گھر پر نہیں ہے۔ وہ اپنے میکے گئی ہوئی ہے"۔ یہ کہہ کر اس نے دروازے پر لگی کنڈی کسی کو آواز دے کر کھڑکائی۔ صحن میں ایک نوکرانی کھڑی تھی، اسے نظر انداز کر کے وہ ہمیں ساتھ لے کر صحن عبور کر کے کمرے میں جا پہنچی۔ گھر اب بھی پہلے ایسا صاف ستھرا تھا۔ کہیں بھی کوئی شے ایسی نہیں تھی جو قرینے سے نہ سجی ہو۔ کلونتی کو گھر داری آتی تھی۔ شاید وہ سارا ہی دن اس کی جھاڑ پونچھ میں لگی رہتی تھی۔

"تو سجائے پیئے گا کہ دودھ؟" ہمیں اس نے کرسیوں پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

"جو مرضی ہو لے آؤ۔ ہو سکے تو یہ دانے ہی بھنوا دو"۔

"ہاں میں اس سہتی کو بھیجتی ہوں۔ یہ ہماری نوکرانی ہے"۔ یہ کہہ کر وہ صحن میں نکل گئی۔ جب وہ واپس آئی تو ہمارے لیے ایک گلاس گرم گرم دودھ کا لے آئی۔

اور پھر وہ میرے قریب کی کرسی پر بیٹھ گئی، بولی "پاکستان سے کب آیا ہے تو؟"

"کل ہی آیا ہوں۔ ہم امرتسر میں اُترے تھے، آج یہاں آ گئے"۔

"کوئی خاص کام ہوگا تجھے! بغیر وجہ کے تو یہ سفر نہیں کر سکتا تھا"۔

"بس تجھے دیکھنے چلا آیا ہوں۔ حسن ابدال میں کئی دفعہ گیا، پر تو مجھے کسی بھی جتھے کے ساتھ نظر نہیں آئی"۔

"جگت سنگھ میرا پاسپورٹ ہی نہیں بنواتا۔ ورنہ میں تو جانا چاہتی تھی۔ بس رگڑا ہی دیتا رہتا ہے، آج کر دوں گا، کل کر دوں گا"۔

"وہ مصروف آدمی ہے۔ تیرے لیے کہاں دھکے کھاتا پھریگا"۔

"اچھا یہ بتا تو کھانا کھائے گا نا؟ مرغا کاٹ دیتی ہوں"۔

"مگر جھٹکے کا نہیں ہونا چاہیے"۔

"تو اور کیا ہوگا۔ کوئی 'مولبی' تو یہاں ہے نہیں"۔

"مولبی میں ساتھ لایا ہوں۔ یہ ہولناک سنگھ کس دن کام آئے گا۔ ہماری کلونتی کو دیکھا تم نے؟ میں اسی کا ذکر تم سے کرتا تھا"۔

"ہاں اچھی ہے، مخلص ہے اور خوبصورت بھی"۔ آبی نے کلونتی کو دیکھے بغیر گلاس پر نظریں جما کر کہا۔

"دیکھا، یہ بھی تیری تعریفیں کرنے لگا ہے"۔

"پر یہ بندہ مجھے اچھا نہیں لگا شیر سنگھ جی! اس کی نظر بہت میلی ہے"۔ کلونتی نے بے ساختہ کہہ دیا۔

آبی تلملا کر رہ گیا مگر بولا کچھ نہیں۔ ہلکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر آگئی۔

چند لمحوں کے سکوت کے بعد کلونتی نے کہا "میری گل کا بُرا نہ ماننا۔ میں ایسے ہی 'مجاق' کر رہی تھی"۔

"کوئی بات نہیں۔ سب لوگ سب لوگوں کو پسند نہیں آ سکتے۔ میری نظر جو میلی ہے نا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں میں سُرمہ نہیں ڈالتا ہوں تیری طرح"۔ وہ کلونتی کی آنکھوں کی تعریف کر رہا تھا جو سُرمے نے اور زیادہ کالی کر رکھی تھیں۔

"اُس معاملے کا کیا بنا؟ وہ لوگ جو جگت سنگھ کو قتل کرنے آئے تھے تو کیا ہوئے؟" میں نے کلونتی کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

"وہ..... پولیس آئی تھی جناب! لاشیں تو ہمارے گھر سے برآمد ہوئیں۔ تھانیدار نے اُن سب کو باندھ لیا۔ دھنی رام بھی پکڑا گیا۔ اب مقدمہ چل رہا ہے"۔

"چلو یہ اچھا ہوا۔ وہ کُتّے کے پُتّر ورنہ اس دن جگت سنگھ کو مار ہی گئے تھے"۔

"ہاں! اسی لیے تو وہ تیری بہت تعریف کرتا ہے۔ سردارا! تیرے جیسا جوان ہم نے کم ہی دیکھا ہے۔ میں تیرے لیے کھانا پکاتی ہوں۔ مرغا خود ذبح کر لینا"۔

"اس ہولناک سنگھ کو ساتھ لے جا، یہ سب سمجھتا ہے"۔ میں نے آبی کو کلونتی کے ساتھ جانے کو کہا۔ وہ اسی وقت صحن کی طرف نکل گیا۔ میں کھڑکی میں سے انھیں دیکھ رہا تھا۔ کلونتی نے سہتی سے کہہ کر چھت پر پھرتے مرغ کو پکڑا اور وہ جلدی ہی پکڑا بھی گیا۔ زیادہ شور شرابا نہیں مچایا۔ ورنہ مرغ یوں آسانی سے کیسے ہاتھ آتے ہیں۔ کلونتی نے چھری آبی کے ہاتھ میں دے دی، مگر وہ بہت سنجیدہ ہو گئی تھی۔ آبی کے سامنے وہ کوئی بات نہیں کرتی تھی۔

مرغا ذبح کر کے آبی اندر آگیا تو بولا "تیرا کیا خیال ہے وہ جگت سنگھ ہمارے کام آسکے گا؟"

"امید تو یہی ہے۔ بہت جی دار آدمی ہے وہ۔ شام کو آئے تو پتہ چلے"۔

کھانا کھا کر ہم اسی کمرے میں الگ الگ بستروں پر لیٹ گئے اور کلونتی اپنے دھندے میں لگ گئی۔ ہمارے متعلق اسے قطعاً کوئی فکر نہیں تھی۔

شام کو جگت سنگھ واپس آیا تو اس وقت اندھیرا چھا چکا تھا۔ اور کلونتی نے لیمپ جلا دیے تھے۔

وہ ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوا، یوں ملا جیسے وہ مجھے مدتوں سے جانتا ہو۔ حالانکہ میری اس کی ملاقات وہ صرف ایک رات کی

تھی۔ مگر وہ بڑی ہی فیصلہ کن رات تھی۔ میں اگر اس کی مدد کو وہاں موجود نہ ہوتا تو شاید وہ بچ نہ سکتا۔ اور یہی احسان اُس کی گردن جھکاتا تھا۔

مجھے دیکھ کر بولا "کیسے آئے ہو میاں جی! میں تو آپ کی سیوا کو ترس گیا۔ میرا خیال تھا کہ میں پاکستان جاؤں مگر ادھر وہ مقدمہ لگ گیا۔ مجھے یہاں ہی رہنا پڑا۔ سالے ہر دو ہفتے بعد کچہری بلا لیتے ہیں۔"

"کچھ ایسی ہی بات ہے جگت سنگھ جی! ہمیں تمہاری مدد کی سخت ضرورت ہے۔"

"بات تو کرو! شاید میں تمہارے کام آسکوں کوئی دارو شارو بھی پیتے ہو کہ نہیں؟"

"نہیں جگت سنگھ جی! یہ عیب ہم میں نہیں ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ایک ہمارے دوست ہیں ڈھلوں صاحب۔ اُن کو امرتسر کے چند لوگوں نے اغوا کر لیا ہے۔ اُن میں سے ایک کا نام ملہوترا ہے۔ وہ پولیس افسر تھا۔ دوسرا آدمی بھنڈاری ہے۔ وہ امرتسر کی ایک سیاسی پارٹی کا صدر ہے۔ یہ سارا کام ان دونوں نے کیا ہے کچھ اور لوگ بھی اُن کے ساتھ شامل ہیں پتہ یہ چلا ہے کہ ڈھلوں صاحب آج کل جیل میں ہیں اور ابھی تک کسی بھی عدالت میں انہیں پیش نہیں کیا گیا اور ہم انھیں لینے آئے ہیں۔"

"یہ تو بڑی گڑبڑ کی بات ہے۔ ڈھلوں پر کوئی مقدمہ تو انھوں نے ضرور قائم کیا ہو گا۔"

"یہ تو لازمی بات ہے۔ اُن کا ایک آدمی بدری ما ڈھلوں کی حویلی میں ملازم ہو گیا تھا۔ وہ اپنا نام بدرالدین بتاتا رہا۔ اسی نے یہ کام کیا ہے مگر اب وہ اس دنیا میں نہیں رہا ہے۔ ڈھلوں پر مقدمہ اُن لوگوں نے ببیر سنگھ کے قتل کا قائم کیا ہو گا۔ اُس آدمی کو میں پاکستان لے گیا تھا۔ وہ پاکستان کی پنجاب پولیس میں بلال آغا کے نام سے کام کرتا تھا۔ ملہوترا نے ڈھلوں کو اسی سلسلے میں باندھا ہے۔"

"یہ تو بڑی گڑبڑ کی بات ہے جیلانی! بندہ کسی بندے کی قید میں ہو تو کام بن سکتا ہے مگر وہ تو جیل میں ہے۔" جگت سنگھ نے اپنی مونچھیں پھڑکاتے ہوئے کہا۔ دُہرے بدن کا وہ خوبصورت جوان تھا اور داڑھی اسے خوب سجتی تھی۔ کلونتی سے اس کی صورت بہت ملتی تھی مگر اس گھڑی وہ مجھے بہت ہی کھل رہا تھا۔ اُس کے انکار نے ہمیں پریشان کر دیا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اس بات کو کوئی اہمیت نہ دے رہا ہو۔

"ہم بڑی آس لے کر آئے ہیں سردار جی! ڈھلوں صاحب کی رہائی بہت ضروری ہے۔ وہ ہمارے دوست ہیں، سرپرست ہیں۔"

"بلکہ ماتا پتا ہیں۔" آبی نے اس کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔ "ان کے بغیر تو ہمارا گزارا ہی نہیں ہو سکتا۔ سمجھ رہے ہیں ناں آپ۔ ایک وہ دن تھا کہ جیلانی آپ کے دشمنوں کے سامنے دیوار بن گیا تھا۔ کچھ تو خیال کریں کہ آپ کے پاس کون آیا ہے۔" آبی کی تقریر کچھ زیادہ ہی لمبی ہو گئی تھی۔

"یہ بات نہیں ہے جگت سنگھ جی! میں نے آپ پر کوئی احسان نہیں کیا تھا۔ نہ یہ خیال تھا کہ آپ کو اس کا بدلہ اتارنا ہو گا۔ مصیبت کچھ ایسی ہی آپڑی ہے کہ ہم سیدھے یہاں آ گئے ہیں۔"

جگت سنگھ بڑے غور سے ہماری بات سنتا رہا۔ بولا "وہ تو ٹھیک ہے پر ہم حکومت سے کیسے ٹکرا سکتے ہیں۔ وہ بندہ کہیں باہر نکلے کوئی اس کی پیشی ویشی ہو تو ایک بات بھی ہے آدمی سوا ڈنگے ڈال سکتا ہے۔ پر..... مجھے آپ یہ بتائیں میں کیا کروں؟"

"سوچیں، اس بارے میں غور کریں۔ غور کرنے سے تو آدمی ایٹم بم بنا سکتا ہے۔" آبی نے صبر نہ کرتے ہوئے جگت سنگھ کے سامنے سگریٹ سلگا لیا۔ اس کا دھواں ایک دم پھیلا تو وہ کھانستا ہوا کرسی سے اُٹھ گیا۔

"صبح میں آپ کو بتاؤں گا۔ میں بھی غور کرتا ہوں آپ بھی غور کریں۔" یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

"یار! اس سکھڑے کے گھر تو ہم خواہ مخواہ ہی آئے۔ یہ تو کسی کام نہیں آسکتا۔ میں نے دیکھ لیا ہے۔" آبی ناراضگی سے بولا۔

"یہ تمہاری ہی تجویز تھی آبی! اب دیکھتے ہیں یہ کیا کہتا ہے۔ صبح کون سی دُور ہے؟"

"مجھے ڈر ہے یہ ہمیں کسی اور ہی سیاپے میں نہ پھنسا دے۔ ہم اس کے گھر میں آ بیٹھے ہیں۔"

"نہیں یار! ایسا بھی گیا گزرا نہ سمجھ اسے، مرد آدمی ہے۔ پہلے میں آیا تھا تو اس نے میری بہت آؤ بھگت کی۔ پلکوں سے زمین صاف کرتا تھا۔ پتہ نہیں اب اسے کیا ہو گیا ہے۔" یہ کہہ کر میں نے بھی ایک سگریٹ جلا لیا اور صحن میں نکلنے والی کھڑکی بند کر دی۔ وہ سگریٹ سے بہت الرجک تھے۔ جگت سنگھ صحن میں رکا نہیں، سیدھا باہر نکل گیا۔

میرا دھیان آبی کے اُس نکتے پر جا ٹھہرا۔ اس کی بعض باتیں تو بہت ہی صحیح ہوتی ہیں۔ کہیں جگت سنگھ ہمیں واقعی کسی لمبے سیاپے میں نہ پھنسا دے۔ میں نے سگریٹ پاؤں تلے دے کر مسل دیا۔

"اٹھو یار! میرا خیال ہے ہمیں یہاں رات نہیں گزارنی چاہیے۔"

"کوئی بات نہیں، بیٹھو تم۔ میں تو ویسے ہی ایک شک ظاہر کر رہا تھا۔ کچھ نہیں ہوتا۔ بیٹھے رہو۔" آبی نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لگاتے ہوئے کہا۔

"کیا خیال ہے میں کلونتی سے بات نہ کروں؟"

"ہاں کیا ہرج ہے۔ اس سے کہو وہ جگت سنگھ کو مجبور کر سکتی ہے بھئی۔"

"پر میں سوچتا ہوں جگت سنگھ سالا کون سا یہاں کمشنر لگا ہوا ہے۔ آخر وہ کر ہی کیا سکتا ہے۔ ہمیں ادھر نہیں آنا چاہیے تھا۔"

"اس کلونتی کو تو بلاؤ۔ دیکھو وہ کیا کہتی ہے۔"

میں آبی کی آواز سُن کر صحن میں جا نکلا۔

کلونتی اس وقت باورچی خانے میں تھی۔ ہمارے لیے وہ "بھوجن" تیار کر رہی تھی۔ میں اس کے سامنے جا ٹھہرا۔ وہ اس وقت دوپٹے سے بے نیاز ہو کر چولھے سے الجھ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اُس نے دوپٹہ اوڑھ لیا۔ بولی "یہ جگت سنگھ کیا کہہ رہا تھا۔ اس کی بات کی مجھے سمجھ نہیں آئی۔ کہہ رہا تھا کہ میں زیادہ آپ کے سامنے نہ جاؤں۔"

"اچھا! کیوں؟ ایسا کیوں کہا ہے اس نے؟"

"پتہ نہیں۔ اس کا یہ خیال ہے کہ آپ اس سے کوئی انوکھا کام کروانا چاہتے ہیں۔ کام کیا ہے آخر؟"

میں اس کے پاس ہی پیڑھی پر بیٹھ گیا۔ "بات یہ ہے کلونتی کہ ہمارا ایک دوست یہاں امرتسر جیل میں بند ہے۔ ہم اس کو رہا کروانا چاہتے ہیں۔ جگت سنگھ کے پاس ہم اسی لیے آئے تھے۔"

"لوئے یہ تو سوچو کہ وہ کوئی گورنر لگا ہے یہاں کا۔ جگت سنگھ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اس پر تو خود پانچ مقدمے چل رہے ہیں۔ پولیس اس کو ہر وقت نگاہ میں رکھتی ہے۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اُسے اس کام میں نہ پھنساؤ تو اچھا ہے۔"

"اب کہاں گیا ہے وہ؟"

"پتہ نہیں۔ وہ بہت پریشان تھا۔ کہہ گیا ہے کہ اگر وہ واپس نہیں آیا تو میں تمھیں رات یہاں ٹھہرا کر رخصت کر دوں گا۔"

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ اس قدر بودا آدمی ہے۔ ٹھیک ہے ہم ابھی یہاں سے جا رہے ہیں کلونتی۔" یہ کہہ کر میں باورچی خانے سے اُٹھ گیا۔

اس نے بڑے اچنبھے کی نظر سے مجھے دیکھا اور خود بھی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "دیکھو ہماری گل کا بُرا نہ مانو۔ جگت سنگھ ٹھیک ہی بول رہا تھا۔ میرا خیال ہے وہ اسی لیے گھوڑی پر بیٹھ کر کہیں نکل گیا ہے۔ وہ تم سے بہت شرمندہ تھا۔ مگر کوئی گل اس کے بس کی نہیں ہے تو وہ ہاں کیسے کر دے۔ تم کل کو کہو کہ اندرا گاندھی کو گرفتار کرا دے تو وہ کیسے یہ کام کر دے گا۔" یہ کہتی ہوئی وہ بھی صحن میں نکل آئی۔

"کوئی بات نہیں کلونتی! سچی سے شوم بھلا جو ترت دیوے جواب۔ اٹھو جا آبی! میرا خیال ہے ہم ابھی یہاں سے چل دیتے ہیں۔"

آبی بھی دروازے میں آ ٹھہرا تھا۔ "کیا فیصلہ ہوا ہے پھر؟"

"کچھ نہیں بھئی! جگت سنگھ گھر سے ہی بھاگ گیا ہے۔ آؤ ہم یہاں بیٹھ کر کیا کریں گے۔"

"رات تو یہاں ٹھہر لو۔ میں کھانا پکا رہی ہوں تمہارے لیے۔"

"نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ جگت سنگھ سے کہنا کہ وہ اب مردوں میں سے اپنا نام کٹوا ہی دے تو اچھا ہے۔ چلو ہو گئی۔ آؤ یار!"

"تم تو ناراض ہو گئے ہو۔"

"بات ہی ایسی ہے کلونتی! اچھا رب راکھا۔" یہ کہہ کر میں دروازے کی طرف بڑھ گیا، تو آبی بھی میرے پیچھے باہر نکل آیا۔ وہ زمین اچانک ہی ہمارے لیے اجنبی بن گئی تھی۔ کتنے شوق سے ہم وہاں گئے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے صدیوں پرانا تعلق ہے اُن لوگوں سے ہمارا مگر وہ تعلق ٹوٹا تو لگا، وہ کچے دھاگے سے زیادہ کمزور تھا۔ جگت سنگھ گھر سے ہی بھاگ گیا تھا۔ اور کلونتی اپنے بھائی کے اس رویے پر پریشان بھی نہیں تھی۔ اُلٹا وہ اس کی حمایت کر رہی تھی۔ اس کی مجبوری میں سمجھ رہا تھا۔ اسے تو جگت سنگھ کی ہی بات صحیح معلوم ہوتی تھی۔

ہم تو صرف ڈھلوں صاحب کو لینے گئے تھے اور پہلے ہی مرحلے پر جگت سنگھ نے ہمیں ذلیل کر کے رکھ دیا تھا۔

ہم گلی سے باہر نکلے تو آبی اس وقت تک بہت تپ چکا تھا، بولا "تم نے کیا سوچا ہے پھر؟ اس جگت سنگھ سے اس کی زندگی چھین لو۔ یہ اس قابل نہیں ہے کہ اسے زندہ رہنے دیا جائے۔"

"نہیں آبی! ایسا نہ سوچ۔ یہ اس کی اپنی مرضی ہے۔ وہ ہمارے کسی کام نہیں آنا چاہتا تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟"

"نہیں! تم میرا ساتھ دو یا نہ دو۔ میں اسے مزہ چکھا کر رہوں گا۔"

"کیا کرو گے تم! وہ تو بھاگ چکا ہے۔"

"کچھ نہیں۔ بس ٹھیک ہے۔ چلو گورداسپور چلتے ہیں۔ کسی ہوٹل میں ٹھہر پیں گے۔" اس نے اپنے ذہن میں ابلتے لاوے کو روکتے ہوئے کہا۔

"ہاں میں نے بھی یہی سوچا ہے۔ گورداسپور یہاں سے ڈھائی تین میل دُور ہے ہم جلد ہی وہاں جا پہنچیں گے۔"

وہ میرے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتا رہا مگر وہ مجھے کسی گہری سوچ میں ڈوبا نظر آتا تھا۔ اس کا سانس تیز تیز چل رہا تھا۔ پتہ نہیں وہ کیا سوچ رہا تھا۔ مجھ سے اُس نے پھر کوئی بات نہیں کی۔ بس دو سگریٹ اس نے سلگائے اور ایک مجھے دے کر وہ خاموش ہو رہا۔ راستہ ویران اور اداس تھا۔ سڑک کے آس پاس کوئی گاؤں نہیں تھا۔ شیشم کے درخت دو رویہ کھڑے ہمیں یہ احساس دلا رہے تھے کہ اُن کی طرح ہم بھی تنہا ہیں۔ بڑی بے کلی تھی اس رات میں۔

ایک ایک پل اس کا ہم پر بھاری تھا۔ بھارتی علاقے میں ہونے کی وجہ سے ہمیں یہ دھڑکا برابر لگا رہتا تھا کہ اگر ہم کسی چکر میں پھنس گئے تو وہ ہم پر سیدھا سیدھا جاسوسی کا الزام دھر دیں گے اور کسی جگہ ہمارے ہاتھ پاؤں باندھ کر ہمیں گولی مار دیں گے۔ اُن کے لیے تو ہماری کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔ ڈر مجھے یہ بھی تھا کہ کہیں جگت سنگھ ہماری مخبری کے لیے ہی باہر نہ نکلا ہو۔ پولیس کو خبردار کرنا اس کے لیے کیا مشکل تھا۔ ہم دونوں ہی اس خدشے میں مبتلا تھے۔ جو کوئی دوستی کی راہ پر نہیں چلتا اُسے دشمنی کرنے میں کیا دیر لگتی ہے۔

ابھی ہم کوئی چار فرلانگ ہی آگے نکلے تھے۔ میرا خیال ہے ہم تلائی کے پاس جا پہنچے تھے کہ ہمیں دُور سے چند گھوڑ سوار سڑک کی طرف آتے دکھائی دیے۔ آبی کو میں نے فوراً ہی روک کر جھاڑیوں میں گرا دیا۔

"یہاں رُک جاؤ آبی! کچھ گھوڑ سوار ادھر آ رہے ہیں۔"

آبی نے فوراً ہی اپنا سانس روک لیا اور جھاڑیوں کے بیچ یوں لیٹ گیا جیسے وہ اب کبھی نہ اٹھ سکے گا۔

"یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں؟" اُس نے سرگوشی کی۔

"کچھ پتہ نہیں کہ یہ کون لوگ ہیں ان کو گزر جانے دو۔"

"جھاڑیاں خاصی اونچی تھیں اور وہ ہمارے وجود کا بھرم رکھ سکتی تھیں۔ چند ہی منٹ بعد چھ گھوڑ سوار سڑک پر آ پہنچے۔ وہ پولیس کے لوگ تھے، وردیاں پہن کر نکلے تھے۔ اور۔ ۔ ۔ اور جگت سنگھ اُن کی رہنمائی کر رہا تھا۔ وہ اتنی تیزی سے آگے نکلے کہ جب ہم نے دوسرا سانس لیا تو وہ دو سو قدم آگے جا چکے تھے۔ کچی سڑک ریت سے اَٹی ہوئی تھی۔ وہ اسے عبور کر کے پگڈنڈی پر ہو لیے۔ گھوڑے وہاں زیادہ ثابت قدمی سے چل سکتے تھے۔

"یہ کتے کا پُتر جگت سنگھ ان کے ساتھ کیسے آ گیا؟" آبی بھڑک اُٹھا۔

"چپ رہو آبی! ان کو آگے نکلنے دو۔" چند لمحے اور گزرے تو ہم دونوں وہاں سے اٹھ کر کھیتوں میں جا گھسے۔ وہ ہماری ہی تلاش میں نکلے تھے۔

"وہ پولیس کو بُلا لایا ہے بھئی! اس جگت سنگھ کو تو انعام دینا چاہیے یعنی وہ اتنی سی بات برداشت نہیں کر سکا۔"

"ہمیں تو خدا نے بچایا ہے آج، ورنہ پتہ نہیں کیا ہو جاتا۔"

میں نے گنے کے کھیت سے آبی کو گزارتے ہوئے کہا مگر اس کے پودے ابھی بس اُگ ہی رہے تھے۔ کوئی ڈیڑھ ہاتھ اُونچے ہوئے ہوں گے۔ اس میں سے نکل کر ہم مکی کے کھیت میں جا گھسے۔ مگر وہ بھی ہماری پناہ ثابت نہیں ہو رہا تھا۔ چھوٹا سا کھیت تھا وہ ہم عبور کر گئے۔ بولا۔ "جلدی نکل چل یار! وہ پلٹ کر ہمیں ڈس لیں گے۔ جگت سنگھ انھیں چین نہیں لینے دے گا۔"

اس کی یہ بات سنتے ہی میں نے دوڑ لگا دی۔ ہم جلد از جلد وہاں سے نکل جانا چاہتے تھے۔ حالات کسی بھی وقت خراب ہو سکتے تھے۔ کوئی بیس منٹ بعد ہم شہر کی حدود میں داخل ہو گئے۔ اس وقت رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ کسی ہوٹل میں ٹھہرنا ہمارے لیے کسی بھی طرح مناسب نہیں تھا۔ مگر سوال یہ تھا کہ ہم جا کہاں سکتے تھے۔ کوئی عزیز تو وہاں تھا نہیں۔ شہر کی آبادی بہت آگے نکل آئی تھی۔ تلائی سے ذرا آگے ہی شہر کے مکان شروع ہو جاتے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ہم کیا کریں۔ کوئی مسجد بھی تو اب وہاں نہیں رہ گئی تھی۔ سب کی سب ان لوگوں نے آپس میں بانٹ لی تھیں۔ جو تقسیم نہ ہو سکیں اُن کو سکھوں نے گوردواروں میں بدل لیا تھا۔ اُن کا تقدس تو اُن کے نزدیک کوئی نہیں تھا۔ اُن کی حکومت عروج پر تھی تو رنجیت کے دور میں بادشاہی مسجد میں فوج ٹھہرا دی گئی تھی۔ اور اُن کے گھوڑے صحن میں بندھنے لگے تھے۔ اب تو سارا مشرقی پنجاب اُن کے حصے میں آ گیا تھا۔ کوئی انھیں کیسے روک سکتا تھا۔ وہ جو مالک تھے جو اُن مسجدوں کو آباد رکھتے تھے، کہیں دُور جا بسے تھے۔ اب کسی گلی کسی محلے سے اذان کی آواز سُنائی نہیں دیتی تھی۔ اور وہ یہی چاہتے تھے، اسی لیے اُن لوگوں نے وہاں سے مسلمانوں کو نکال دیا تھا۔

ہم پیاسے کے مارے ہوئے پرندوں کی طرح ایک گلی میں سے گزر رہے تھے کہ ایک دیوار کے ساتھ ہمیں ایک سکھ نظر آیا۔ وہ شراب کے نشے میں دُھت نظر آتا تھا۔ پگڑی اُس کے گلے میں پڑی تھی اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ تھا وہ جوان آدمی مگر کسی جگہ سے پی پلا کر نکلا تھا اور وہاں اوندھے مُنہ آ پڑا تھا۔ اس کا ایک پاؤں نالی میں آ پڑا تھا مگر اسے کچھ ہوش نہیں تھا۔

"یہ کیا قصہ ہے بھائی! اس کو اٹھانا چاہیے کہ نہیں؟"

"کچھ کر یار! اس کی جیب دیکھو شاید اس کا کچھ پتہ مل جائے۔"

میں نے اس سکھ کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں مگر سوچ بالکل مفقود ہو گئی تھی۔ آبی نے اس کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو اس میں سے ایک بٹوا نکلا۔ بٹوے میں کوئی چھ سو روپیہ پڑا تھا اور اس کا پتہ بھی وہیں تھا۔ معلوم یہ ہوا کہ وہ دسہرہ گراؤنڈ کے عقب میں بنگلہ نمبر دو سو پانچ میں رہتا ہے۔ آدمی وہ کسی کھاتے پیتے گھرانے کا دکھائی دیتا تھا۔ لباس اس کا عمدہ تھا اور کوٹ تو کسی اچھے درزی خانے کا بنا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ہاتھ بھی اس کے محنت مشقت کے عادی نہیں تھے۔ اس کا نام پریتم سنگھ تھا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کرتا کیا ہے۔ آبی نے اُسے اٹھا کر سیدھا کیا اور اُسے کندھے پر لٹکا کر بولا۔ "کوئی ٹیکسی مل جائے تو اسے اس میں لاد کر لے جاتے ہیں۔"

"ہاں! آؤ اُدھر سڑک تک آؤ۔ شاید کوئی ٹیکسی مل جائے۔"

"اسے ہوش ہے کچھ؟"

"ہاں۔ اس سالے نے تو شاید پوری بوتل ہی پی رکھی ہے۔ ہوش نہیں ہے اسے مُردے سے زیادہ بھاری ہو رہا ہے۔" آبی کے لیے چلنا دوبھر ہو رہا تھا۔ پھر بھی وہ اسے لے کر سڑک تک جا پہنچا اور اسے ایک دکان کے تھڑے پر ڈال کر کسی سواری کا انتظار کرنے لگا۔ عین اس وقت ایک تانگہ ہمیں نظر آیا تو وہ میں نے روک لیا اور پریتم سنگھ کو اس میں ڈال کر ہم سیدھے دسہرہ گراؤنڈ کے عقب کی جانب چل دیے۔

"اسے کیا ہوا صاحب جی!" کوچوان نے پریتم سنگھ کی حالت دیکھ کر کہا۔

"دیکھ نہیں رہے ہو، یہ کچھ زیادہ ہی پی گیا ہے۔"

"یہ شراب سکھوں کو لے ڈوبی ہے جی۔ ورنہ یہ بڑی جی دار قوم تھی۔ ہندو جاتی ان کو اپنا سجن سمجھتی ہے پر یہ سیدھے نہیں ہو سکتے۔ شراب نے ان کا بیڑا غرق کر دیا ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے۔ ہمیں یہ سڑک پر بے ہوش ملا تھا۔ سوچا گھر پہنچا دیں۔ پُن کا کام ہے نا یہ؟"

"اچھا کیا آپ نے جی۔ پر یہ جگہ جگہ پڑے ملتے ہیں۔ بکھری آتے ہیں تو شراب میں دُھت ہو کر سڑکوں پر نالیوں میں گرے ہوتے ہیں۔ ان کا ایک تماشا لگا ہوتا ہے، یار لوگ ان کی جیبیں خالی کر دیتے ہیں۔ پگڑیاں اتار لیتے ہیں۔ کبھی ایک تو الف ننگے پڑے ہوتے ہیں۔ عجیب حال ہے ان کا۔ لوگ ان کے لاچے اتار لے جاتے ہیں۔ سو یا مویا برابر ہوتا ہے جی۔ ان کی راکھی کون کر سکتا ہے۔"

"کیا نام ہے تمھارا بھئی! بڑی اچھی سوچ ہے تمھاری۔"

"جی میرا نام چرن داس ہے، کھتری ہوں۔ پُرکھ یہ کام نہیں کرتے تھے مگر میں کوچوان بن گیا۔ وقت وقت کی بات ہے۔"

کوچوان ہمیں دسہرہ گراؤنڈ میں سے گزار کر عقبی حصے میں لے گیا۔ وہاں زیادہ تر ایسی کوٹھیاں تھیں جو انگریز کے دور کی بنی ہوئی تھیں۔ شہر کے تمام انگریز حاکم اور گرجا کے پادری وہیں رہا کرتے تھے۔ مگر اب وہ سڑک دُور تک پھیل چکی تھی اور اُن پر جدید طرز کی کوٹھیاں اور بنگلے تعمیر ہو چکے تھے۔ پریتم سنگھ کو ہم نے دو سو پانچ نمبر بنگلے کے سامنے اتارا اور کوچوان کو فارغ کر کے ہم نے گیٹ کی گھنٹی بجا دی۔ آبی نے پریتم سنگھ کو سنبھال رکھا تھا مگر وہ ابھی تک ہوش میں نہیں تھا۔ چند ہی لمحوں بعد ایک بوڑھا آدمی دروازے پر آ گیا۔ بال اس کے کھچڑی ہو رہے تھے۔ وہ کمبل اوڑھے ہوئے ہمارے پاس آیا تو پریتم سنگھ پر نظر پڑتے ہی پریشان ہو گیا۔

"کیا ہو گیا اسے؟ کہاں سے ملا ہے یہ تمھیں؟"

"اس کو سنبھالیں سردار جی! یہ کچھ زیادہ ہی پی گیا ہے۔ اُدھر بہرام پور روڈ کی ایک سڑک پر پڑا تھا۔"

اس نے دروازہ کھولا اور پریتم سنگھ کو بانہوں میں لے کر بولا۔ "آپ کی بڑی دیا ہے جی! کہ اسے گھر لے آئے۔ یہ شراب اسے برباد کر گئی ہے۔ آئیں آئیں، اندر آ جائیں آپ۔ کوئی جل شل پی کر جائیں، ماں اس کی بہت پریشان تھی۔" یہ کہہ کر وہ پریتم کو ساتھ لے کر بنگلے کی عمارت کی طرف چل دیا۔ اس کے ساتھ ہی ہم بھی اندر جا پہنچے۔ پریتم کی ماں سامنے ہی تھی۔ بڑھیا نے پریتم کو ایسی حالت میں دیکھا تو اس نے سر پیٹ لیا۔ بولی۔

"اس لڑکے کا پتہ نہیں کیا بنے گا۔ میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہاں سے ملا ہے یہ آپ کو؟"

"جی اُدھر بہرام پور روڈ سے۔ پُوری طرح دُھت ہو رہا ہے یہ۔"

"اس کو اندر ڈال دو رشی جی! ذرا اسے ہوش آ جائے تو اس کو اتنے جوتے لگاؤں گی کہ سمجھ آ جائے گی اسے۔" یہ کہہ کر اس نے پریتم سنگھ کو سنبھالا۔ اور کمرے میں لے گئی۔

"آئیں آئیں اندر آئیں۔ آپ کا شکریہ تو میں ادا ہی نہیں کر سکتا۔"

پریتم کے والد نے ہماری طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔ اور ہمیں ساتھ لے کر وہ نشست گاہ میں جا پہنچا۔ "آپ بیٹھیں۔ اگر آپ چاہیں تو کھانا تیار ہے۔"

"جی نہیں! بس اب آپ ہمیں اجازت دیں۔ ہم دلی سے ایک کام سے اِدھر آئے تھے، اب ہم چلتے ہیں۔" میں نے اُس سے اجازت طلب کی مگر وہ نہیں مانا۔ ہمارے لہجے سے وہاں کے ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کی بول چال میں نمایاں فرق نظر آتا تھا۔ اور اُن کے درمیان مشترک الفاظ بھی ایک دوسرے کو پسند نہیں آتے ہیں۔

"نہیں جی، آپ بیٹھیں، چائے تو پی کر جائیں۔" یہ کہہ کر وہ دوسرے کمرے کی طرف لپکا اور دروازے میں رُک کر بولا۔

"پدما! ان کے لیے چائے بنا دو۔ سردی کچھ زیادہ ہی ہو گئی ہے۔" پھر وہ ہمارے پاس آ بیٹھا، بولا۔ "آپ نے بڑی مہربانی کی۔ دلی سے آپ آج ہی آئے ہیں؟"

"ہاں۔ کچھ کاروباری معاملہ تھا۔ اب ہم واپس ہی جا رہے تھے کہ یہ پریتم سنگھ ہمیں مل گیا۔"

"اس وقت تو کوئی گاڑی نہیں نکلتی ہے۔ آپ کہاں خراب ہوتے پھریں گے۔ رات یہاں ہی گزار لیں۔ آج صبح کی گاڑی سے چلے جائیں۔"

"یہ بھی ہو سکتا ہے مگر کہاں آپ تکلیف اُٹھاتے پھریں گے، آپ کو بڑی زحمت ہو گی۔"

"جی نہیں۔ مجھے بہت خوشی ہو گی آپ کی سیوا کر کے۔ آپ کے لیے میں بستر بچھا دیتا ہوں۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔ کیا خیال ہے پیرزادہ صاحب؟"

"ٹھیک ہے۔ ہم ادھر ہی ٹھہر جاتے ہیں۔ آپ نے اب تک اپنا تعارف نہیں کرایا شرمان جی!"

"میرا نام اودھم سنگھ ہے پبلک ورکس کا ٹھیکیدار ہوں میں۔"

"اچھا! تو یہ بات ہے۔ میرا نام پیرزادہ ہے اور یہ ہاشم خان ہیں۔ ہم غلّے کا کاروبار کرتے ہیں۔"

اتنے میں اُس کی ملازمہ پدما ہمارے لیے چائے لے آئی اس کے ساتھ ڈھیر سارے پھل بھی لے آئی تھی۔

چائے ہم تینوں نے ساتھ بیٹھ کر پی مگر اودھم سنگھ کھانے کے لیے برابر ہمارے پیچھے پڑا رہا۔ کوئی دس بجے تک ہم کھانے سے بھی فارغ ہو گئے۔ تو اودھم سنگھ نے ہمارے لیے دوسرے کمرے میں دو بستر ڈال دیے۔ وہ ہم پر کچھ زیادہ ہی مہربان نظر آتا تھا اور اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ اس نے کس قسم کے لوگوں کو گھر میں جگہ دے دی ہے۔

ہم بستر پر پڑتے تو جلدی ہی گہری نیند میں کھو گئے۔ میں دراصل بہت زیادہ تھکا ہوا تھا۔ اس سفر نے ہماری ستّیا ہی کھینچ لی تھی۔ آبی بھی بہت زیادہ پژمردہ ہو رہا تھا۔ وہ بھی بستر پر گرتے ہی سو گیا۔ رات کو ایک بجے کے قریب مجھے غسل خانے کی حاجت محسوس ہوئی۔ تو میں نے بستر سے اٹھ کر بتّی جلا دی۔ مگر یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ آبی اپنے بستر پر موجود نہیں تھا۔ میں سمجھا وہ غسل خانے میں ہو گا مگر جب میں وہاں پہنچا تو اندر آبی موجود نہیں تھا۔ میرا پستول بھی میری جیب میں نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ آبی اسے بھی ساتھ لے گیا تھا مگر وہ گیا کہاں؟ غسل خانہ بھی خالی تھا اور گھر کے کسی اور کونے میں آبی کو آدھی رات کے وقت تلاش کرنا کسی بھی طرح مناسب معلوم نہیں ہوتا تھا۔ میں نے چاہا کہ میں اسی وقت وہاں سے باہر نکل کر دیکھوں کہ وہ کس سیاپے میں جا پھنسا ہے مگر میرے تصوّر میں کوئی بات نہیں آ رہی تھی۔ ڈر مجھے یہ تھا کہ آبی کسی اپنے ہی سیاپے میں نہ پھنس جائے۔ مگر اسے تو رات گزارنے کے لیے ایک چھت میسّر آ گئی تھی اُسے اِس گھڑی باہر نکلنے کی کیا ضرورت تھی۔ بتّی جلتی رہی اور میں بستر پر بیٹھا اس معاملے پر غور کرتا رہا مگر میرا ذہن کام نہیں کرتا تھا۔ کتنے ہی سگریٹ میں نے اسی ادھیڑ بُن میں پھونک ڈالے مگر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ گیا کہاں ہے؟

یک خیال میرے ذہن میں یہ بھی آتا تھا کہ وہ کہیں جگت سنگھ سے نہ جا بھڑا ہو۔ مگر وہ تنہا آدمی — اس وقت کیسے جگت سنگھ سے نپٹ سکتا تھا؟ جب کہ اسے معلوم تھا وہ پولیس کو ساتھ لے کر برنالہ گیا تھا۔ سپاہی اب تک اس کے پاس موجود ہوں گے۔ ایسی باتیں تو انھیں خدا دے اور وہ تعدا[د] میں چھ تھے۔ خالی کیسے واپس آئے ہوں گے اور آبی اگر ان سے جا بھڑا تھا تو اس سے زیادہ احمق کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر یہ خیال میرے ذہن میں کچھ زیادہ آسودہ نہ ہو سکا۔ مجھے یقین تھا کہ آبی جگت سنگھ کی طرف نہیں گیا ہو گا۔ اس کا ہذیان اس حالت کو ابھی نہیں پہنچا تھا کہ وہ بُرے بھلے کی تمیز کیے بغیر ہی باہر نکل جائے۔

میں ایک بار پھر بستر سے اٹھا اور بتّی بجھا کر کمرے کا دروازہ دیکھنے لگا۔ وہ بھِڑا ہوا تھا۔ نہ اندر کی کنڈی بند تھی اور نہ باہر کی۔ دوسری جانب برآمدہ تھا۔ میں اس میں جا ٹھہرا۔ رات کے اس گھڑی دو بج رہے تھے۔ چاروں طرف موت ایسا سکوت طاری تھا۔ چاند بہت نیچے جھک آیا تھا۔ تاروں کی روشنی ضائع جا رہی تھی۔ کوئی بھی آسمان پر نگاہ نہیں کرتا تھا۔ کسی کو ان چاند ستاروں کی ضرورت نہیں تھی۔ ہر ذی روح نے کسی چھت کے نیچے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ سرما کی چاندنی میرے شباب ایسی تھی۔ ویران، تنہا، اُجاڑ اور وحشت ناک۔ میں برآمدے سے نکلا اور گیٹ تک جا پہنچا۔ وہ بھی کسی نے جلدی میں بند کیا تھا۔ کنڈی اس کی بھی نہیں لگی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ آبی کو کسی اور نے نہیں خود اس نے ہی باہر سڑک پر ڈال دیا تھا۔ وہ شاید خودکشی کرنے باہر نکلا تھا۔ ا[گر] تو مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی تھی۔ جگت سنگھ کو وہ مزہ چکھا[نا] چاہتا تھا مگر یہ سراسر اس کا پاگل پن تھا۔ مجھے اعتبار ہی نہیں آتا تھا کہ وہ اس کے پیچھے گیا ہو گا۔ آبی اتنا احمق نہیں تھا۔ گیٹ کو اسی حالت میں چھوڑ کر میں پھر برآمدے میں جا ٹھہرا۔ آبی نے میرا اس گھر میں رات گزارنا مشکل کر دیا تھا۔ میرا سکھ چین ہی وہ چھین کر لے گیا تھا۔ کوئی ایسا بھی نہیں تھا جس سے میں کہہ سکتا کہ میرا یار کہاں چلا گیا ہے؟ اودھم سنگھ نے بڑی مروّت دکھائی کہ ہمیں اُس نے رات گزارنے کے لیے بستر فراہم کر دیا تھا۔ یہ اُس کی طبعی شرافت تھی جس نے اسے اس قدر مہربان بنا دیا۔ ورنہ پریتم سنگھ کو گھر پہنچا دینے کا انعام تو نہیں تھا۔ بہت ہوتا تو وہ ہمارا شکریہ ادا کرتا اور بس مگر... کچھ زیادہ ہی آگے بڑھ آیا تھا مگر اب مجھے محسوس ہوتا

[ا]س کی مہربانی کوئی اور گُل کھلانے کو تھی۔ آبی پتہ نہیں جب [جان]ے تو کیا کر آئے اور مجھے اس کی کتنی قیمت ادا کرنی پڑے۔ [برآمد]ے سے ہٹ کر میں ایک بار پھر بستر پر جا بیٹھا۔ نیند [اُڑ گئ]ی تھی۔ آبی نے مجھے ایسے شش و پنج میں ڈال دیا تھا کہ اُس سے [ر]ہائی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی — ہم پردیس میں تھے [ایسی ج]گہ پر تھے جہاں کی مٹی کا ایک ایک ذرہ ہمارے خلاف تھا۔ [کوئ]ی وہاں ایسا نہیں تھا جو ہمارے کسی جرم کی پردہ پوشی کر سکے۔ [کوئی ہمار]ی ضمانت دے سکے۔ وہ میری تقدیر جو کبھی کبھی چمکا کرتی تھی، [اس] گھڑی بالکل ہی رنگت بدل گئی تھی۔ بات کرنے کے لیے بھی میرے [پاس] کوئی نہیں تھا۔ آدمی بے چین ہو تو اس کے دل کا انقباض لحظہ [لحظ]ہ بڑھتا رہتا ہے۔ میں اس گھڑی دیوار کو بھی مخاطب نہیں [کر] سکتا تھا۔ حالانکہ کسی مخاطب کی مجھے سخت ضرورت تھی۔ کسی [س]ے تو میں آبی کے بارے میں بات کر سکتا تھا مگر وہاں کوئی بھی نہیں [تھا۔] مجھے یوں لگا جیسے میری ٹانگیں شل ہونے لگی ہیں۔ کوئی نقرس [کا] درد تھا جس نے مجھے نڈھال کر دیا تھا۔ میں پریشان ہو کر بستر [پر ل]یٹ گیا۔ آبی نے مجھے پاگل کر دیا تھا۔ بستر میں لیٹے ابھی مجھے [چن]د منٹ گزرے تھے کہ پہلو کے کمرے سے مجھے عجیب سی [آو]ازیں سنائی دیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کسی نے گلاس میز [پر] دے مارا ہو۔ میں ایک دم اٹھا اور اس کمرے کے دروازے [ت]ک جا پہنچا جو ہماری طرف کھلتا تھا مگر وہ دوسری طرف سے بند تھا۔ گلاس کے ساتھ اب شاید جگ بھی حرکت میں آ گیا تھا۔ [ک]وئی آدمی بھاری بھاری سانس سینے میں آتار رہا تھا۔ پھر مجھے کُرسی گھسٹنے کی آواز سُنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی الماری کا پٹ کسی نے بڑے زور سے کھول دیا۔ کوئی آدمی منہ ہی منہ میں کسی کو زبردست قسم کی گالی دے رہا تھا۔

میں نے جان بوجھ کر وہ دروازہ کھٹکھٹایا۔ دستک کی آواز سن کر وہ آدمی تیزی سے اٹھا اور کُنڈی کھول کر اُس نے دونوں پٹ وا کر دیے۔ میرے سامنے پریتم سنگھ کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ بال کندھوں پر بکھرے ہوئے تھے، داڑھی بھی بے ترتیب تھی۔ وہ کرتا اور پاجامہ پہنے ہوئے میرے سامنے یوں کھڑا تھا۔ جیسے وہ اسی وقت میرا منہ نوچ لے گا، بولا۔

"کون ہے تو؟ یہاں کیا کر رہا ہے؟"

"... تمہارا مہمان ہوں پریتم سنگھ! یہ کیا حال بنا رکھا ہے تُم نے! ہوش میں آتے ہی تم نے پھر وہی کام شروع کر دیا۔" شراب سے بھرا ہوا گلاس سامنے میز پر دھرا تھا اور بوتل بھی اس کے قریب ہی رکھی تھی۔

"تم کون ہوتے ہو پوچھنے والے؟ یہ میرا گھر ہے میں جو جی چاہے کروں۔ تمھیں یہاں کس نے ٹھہرایا ہے؟"

"اودھم سنگھ نے۔ تمھارے پتا نے۔ مجھے تمھاری حالت پر بہت ترس آتا ہے پریتم سنگھ! یہ قصہ چھوڑ دو۔"

"کیوں چھوڑ دوں؟ تم کون ہوتے ہو یہ کہنے والے؟ وہ ذلیل میرے ساتھ فراڈ کھیلتی رہی۔ میں اب شراب بھی نہ پیوں، یہ کہاں لکھا ہے؟" یہ کہہ کر وہ پھر میز پر جا بیٹھا اور گلاس ہاتھ میں لے کر بولا۔ "تم نے دیکھا ہے اُسے۔ نہیں دیکھا۔ پرتاپ کور کو تم نے نہیں دیکھا ورنہ یہ بات نہ کہتے۔ اتنی سوہنی کُڑی ہے وہ کہ اس کے نام پر میں سو گلاس پی سکتا ہوں۔ لو تم بھی پیو۔"

"یہ پرتاپ کور کون ہے؟"

"ہے ایک، تم نے نہیں دیکھا اُسے تو پھر تم نے کچھ بھی نہیں دیکھا ہے شرمان جی! مگر اب اُس کی شادی ہو رہی ہے، دربارا سنگھ سے۔ وہ کھوتی کا پُتر دربارا سنگھ لون تیل کی ہٹّی چلاتا ہے وہ۔ بنیا سالا۔ میں اُسے گولی مار دوں گا۔ چوہڑے کا پُتر ہے وہ۔ پرتاپ کور، اب اس کی بیوی بن جائے گی۔ آؤ۔ پیو میرے ساتھ۔ پرتاپ کور کے نام پہ ایک گلاس۔" اس نے میرا ہاتھ کھینچ کر مجھے کُرسی پر بٹھا لیا۔ "لو پیو۔" ایک گلاس اُس نے مجھے بھر دیا۔

"میں مسلمان ہُوں پریتم سنگھ! مجھے تو تو معاف ہی رکھ۔ پریتم بتا کسی استری کے لیے کوئی یوں بھی جان گھلاتا ہے۔ پرتاپ کور نہیں تو کوئی اور سہی۔"

"نہیں۔ یہ رگڑا نہ دے مجھے۔ ہاں، پرتاپ کور جیسی تو اس شہر میں ایک بھی نہیں۔ تُو نے نہیں دیکھا ہے اُسے۔ بس یہی تیری بدنصیبی ہے۔ ٹھہر میں تجھے اس کی تصویر دکھاتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ الماری کی طرف بڑھا اور وہاں سے ایک ڈائری میں سے نکال کر اس نے دو فوٹو میری طرف بڑھائے۔ "یہ دیکھ! اور بتا کہ اس جیسی کوئی سارے بھارت مِل سکے گی؟ اور اب وہ کُتّے کا پُتر دربارا سنگھ اس کا پتی بن جائے گا۔"

تصویریں دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ دونوں ہی تصویریں قابلِ اعتراض تھیں۔ پرتاپ کور نے یہ تصویریں خدا جانے کس حال میں اتروائی تھیں۔ میرا خیال ہے وہ اس کی اصل تصویریں نہیں تھیں۔ میں اندازہ تو نہیں لگا سکتا تھا مگر میرا خیال ہے، کہ اس کا چہرہ کسی اور بدن پر لگا دیا گیا تھا۔ چہرہ یہ احساس دلاتا تھا کہ کسی بہت ہی پاکباز عورت کا چہرہ ہے جو ابھی گھونسلے سے نہیں نکلی تھی۔ تصویریں میں نے اسے واپس دے دیں۔ "ان کو سنبھال کر رکھو مگر یہ تمھاری پرتاپ کور کی تصویریں نہیں ہیں، وہ ایسی بدمعاش نہیں ہو سکتی کہ کیمرے کے سامنے اس حالت میں آ جائے۔

وہ ایسی نہیں ہو سکتی۔"

"کیوں نہیں ہو سکتی؟ وہ ہو گئی ہے۔" یہ تصویریں مجھے دربارا سنگھ نے بھیجی تھیں۔ وہ مجھے جلانا چاہتا ہے اور میں جل رہا ہوں۔ مگر ایک گولی تو میں اس کو ضرور مار دوں گا۔ خواہ مجھے پھانسی ہی کیوں نہ ہو جائے۔"

"دیکھ تو اپنے آپ میں نہیں ہے۔ یہ شراب چھوڑ دے۔ اور ہوش میں آنے کا انتظار کر۔ پھر میں تجھے بتاؤں گا کہ یہ بدن کس کا ہے اور چہرہ کس کا۔ تو کیوں اپنی جوانی خراب کر رہا ہے پریتم سنگھ، کہاں رہتی ہے وہ؟"

"وہ ادھر کچہری روڈ پر رہتی ہے۔"

"بس ٹھیک ہے۔ میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔ کل ہی ہم اُسے اغوا کر لیں گے اور پاکستان لے چلیں گے پھر تم مزے کرنا۔ مگر یہ شراب تجھے چھوڑنی ہوگی۔"

"پاکستان! وہاں کیسے جاؤ گے؟ کوئی بارڈر پار نہیں کرنے دے گا اور پاکستان میں کوئی سکھ رہ ہی نہیں سکتا۔ وہ مجھے پکڑ کر جیل میں ڈال دیں گے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر تیرے لیے یہی بہتر ہے میرے وہاں بہت سے دوست ہیں تم پرتاپ کور کے ساتھ وہاں آرام سے رہ سکتے ہو۔"

"سچ کہتے ہو تم؟"

"ہاں بھئی! کل ہم پرتاپ کور کو دن دہاڑے اغوا کر لیں گے۔"

"تم میری مدد کرو گے اس کام میں؟"

"ہاں ہاں بھئی! یہ تو میرا فرض ہے۔"

"بس ٹھیک ہے۔ کل میں تمہیں اس کا گھر دکھا دوں گا سالی کو اغوا کر لو۔ بتاؤ میں یہ شراب نہیں پیتا۔ میں اب کبھی نہیں پیوں گا۔ میں لعنت بھیجتا ہوں اس پر۔ لو یہ اُٹھا کر نالی میں پھینک دو ابھی۔" میں نے اس کی یہ بات سن کر سارے برتن الماری میں ڈال دیے۔

پریتم سنگھ کچھ زیادہ ہی مطمئن ہو گیا تھا، بولا۔ "مگر اسے تم اغوا کیسے کرو گے؟ تین بھائی اس کے کڑیل جوان ہیں۔ آدمی کو دیکھتے ہی پستول نکال لیتے ہیں۔"

"ان کی فکر نہ کرو پریتم سنگھ! وہ سب گیدڑ ہیں پرتاپ کور تو تیرے ساتھ آنے پر راضی ہو گی نا؟"

"ہاں۔ وہ تو میرے نام پر جان دیتی ہے۔"

"بس یہی بہت کافی ہے۔ پھر اس کا راستہ کوئی نہ روک سکے گا میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔ پستول تو تمہارے پاس بھی ضرور ہوگا۔"

"ہاں ہاں، میرے پتا جی کا پستول ہے، وہ میں تمہیں دے دوں گا۔"

ایسے میں وہ مجھے بہت ہی معصوم نظر آیا۔ اپنا دل اُلٹ کر اُس نے میرے سامنے ڈال دیا تھا۔ اس پرتاب کور کے لیے ہی اُس نے ڈھیروں شراب پینی شروع کر دی تھی۔

اس وقت رات کے ڈھائی بج چکے تھے۔ پریتم سنگھ مجھے پرتاب کور کی باتیں سنا رہا تھا۔ بڑا حزن، بڑا ملال تھا اس کی باتوں میں۔ پرتاپ کور کے لیے وہ واقعی دیوانہ ہو رہا تھا۔

مجھے بنگلے کا گیٹ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ ہلکی سی چور ایسی احتیاط سے دروازہ کھولا گیا تھا۔ میرا دھیان ادھر ہی لگا تھا۔

"اچھا میں اب سو رہا ہوں۔ صبح ملاقات ہو گی۔"

"ٹھیک ہے تم اب آرام سے سو رہو۔ پہلے ہی تمہارا بہت برا حال ہو چکا ہے۔" یہ کہہ کر میں نے اُسے اٹھا کر اگلے کمرے میں پہنچا دیا اور تیزی سے اپنے کمرے میں واپس آ کر برآمدے میں جا پہنچا۔ گیٹ پر نگاہ پڑتے ہی میں نے آبی کو پہچان لیا۔

وہ اس وقت گیٹ سے نکل کر اندر آ رہا تھا اور وہ تنہا نہیں تھا۔ ایک گھوڑی بھی اُس کے ساتھ تھی۔ جس پر اُس نے کسی کو بورے کی طرح لاد رکھا تھا۔

میں تیزی سے اس کی طرف بڑھا تو وہ سرگوشی کے لہجے میں بولا۔ "اسے اتارو! اس ذلیل کو۔"

"یہ... یہ کون ہے؟ کسے اٹھا لائے ہو تم؟" میں نے گھوڑی کی پیٹھ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ لمبی سی چادر میں سر سے پاؤں تک بندھی تھی میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس نے گھوڑی پر سے اُسے اتار کر کندھے پر لادا اور سیدھا برآمدے میں سے گزر کر کمرے میں جا گھسا۔ گھوڑی میں نے لا کر برآمدے کے قریب ایک کھڑکی کی سلاخ سے باندھ دی۔ جب میں کمرے میں پہنچا تو آبی نے بتی جلا کر اُس کو بستر پر ڈال دیا تھا۔

"یہ کون ہے آبی؟"

"یہ کلونتی ہے میں اسے گھر سے اُٹھا لایا ہوں اور جگت سنگھ سے کہہ آیا ہوں کہ میں اِسے پاکستان لے جا رہا ہوں۔ وہ گھر پر نہیں تھا۔ ایک رقعہ میں اس کے لیے چھوڑ آیا ہوں۔" اب بھی اس کی آواز بہت دھیمی تھی، اسے سرگوشی میں بات کرنے کا سلیقہ آتا تھا۔

"یہ... یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ یہ بیچاری کیا سوچے گی؟"

"تم اسے مذاق سمجھتے ہو۔ ہمارے پیچھے اس نے پولیس لگا دی۔ وہ خود اُن کی رہنمائی کر رہا تھا۔ اس کی یہی سزا ہے۔ میں اُسے بخش نہیں سکتا تھا۔"

"مگر اس کا کرو گے کیا؟ اس بیچاری کا کیا قصور ہے؟"

"یہ بھی اسکی طرفداری کرتی تھی۔ اسی نے اندرا گاندھی کا طعنہ دیا تھا ہمیں۔"

کلونتی بالکل بے ہوش تھی۔ آبی نے اُس پر لحاف ڈال دیا تھا۔ اس کا صرف چہرہ ہی نظر آ رہا تھا۔

"یہ گھوڑی کس کی ہے؟"

"یہ بھی اسی کی ہے۔ حویلی میں بندھی تھی۔ میں لے آیا۔"

"مگر اس تک تم کیسے پہنچے؟"

"دیوار پھاند کر میں اندر چلا گیا تھا۔ جیسے ہی میں نے اُسے آواز دی۔ اس نے دروازہ کھول دیا۔ جگت سنگھ گھر پر نہیں تھا۔ اس کو دیکھتے ہی میں نے اس کا سر دیوار میں دے مارا۔ یہ بے ہوش ہوئی تو میں اسے لے کر باہر آ گیا۔ گھوڑی پہلے ہی میں نے دروازے پر کھڑی کر رکھی تھی۔"

"تم نے اچھا نہیں کیا ہے آبی! خواہ مخواہ تم نے اپنے اتنے سارے دشمن پیدا کر لیے ہیں۔ جگت سنگھ کسی ایک آدمی کا نام نہیں ہے۔"

"تم اپنی یہ تقریر بند رکھو اور برآمدے میں جا لیٹو۔ میں جانوں اور میرا کام۔ میں جگت سنگھ کو معاف نہیں کر سکتا تھا۔" یہ کہہ کر اس نے میرے بستر پر سے لحاف اٹھایا اور پھر چارپائی اٹھا کر اس نے میرا بستر نہایت ہی احتیاط سے برآمدے میں بچھا دیا۔ بولا۔ "تم ادھر لیٹو گے۔ میں کلونتی کو جگا کر اس سے بات کروں گا۔ تم اندر نہیں آؤ گے۔ یہ میرا فیصلہ ہے قطعی فیصلہ۔"

"اور اگر میں تمہیں ایسا نہ کرنے دوں تو؟"

"ایسا مت بولو! میں نے دل میں عہد کر رکھا تھا۔ خدا کے لیے ادھر لیٹ جاؤ۔"

وہ اب بھی سرگوشی کے لہجے میں بات کر رہا تھا۔ اور گھر والوں کو قطعاً خبر نہیں تھی کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ اس کا لہجہ بہت ہی کرخت ہو گیا تھا۔ پتہ نہیں اسے کیا سوجھ رہی تھی۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں اس کو روک لوں مگر بات اتنی بڑھ جاتی کہ وہاں سے ہماری گلو خلاصی ناممکن ہو جاتی اور جگت سنگھ ایسا اودھم مچاتا کہ ہمارے روکے سے وہ کبھی نہ رک سکتا۔ مگر اس کے باوجود میں کلونتی کو اس کے ہاتھوں یوں ذلیل ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ آبی اُسے اس کی مرضی کے خلاف اغوا کر لایا تھا۔ اس میں کلونتی کی مرضی کا کوئی دخل نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں آبی کے ہاتھوں سے اُسے بچا لینا چاہتا تھا مگر ایسا ممکن نہیں تھا۔ ہاں آبی کی دوستی سے میں ہمیشہ کے لیے دستکش ہو سکتا تو سب کچھ ممکن تھا۔ اُسے صرف سختی ہی سے روکا جا سکتا تھا مگر اس کا میں متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

"تم... تم اس کے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"کچھ نہیں۔ تم بے فکر رہو، اسے کچھ نہیں ہوگا۔" یہ کہہ کر اُس نے بتی بجھا دی۔ اور مجھے دروازے کی طرف جانے کا اشارہ کرنے لگا۔ وہ میرے سامنے ہی کھڑا تھا۔ اس کا اب مجھے ہیولا سا دکھائی دے رہا تھا۔ اُس کی نیت مجھے نیک نظر نہیں آتی تھی۔ وہ کلونتی سے معیوب سا سلوک کرنا چاہتا تھا۔ اس کے چہرے سے یہ بات صاف نظر آتی تھی۔ میں دروازے کی طرف بڑھا تو سہی مگر جیسے ہی اس نے پٹ دبانے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا، میں نے پلٹ کر اس ہیولے کی گردن پر ہاتھ ڈالا اور پوری قوت سے میں نے اس کی رگ احساس مسل دی۔ میرا ذہن بری طرح اُلجھ گیا تھا۔ پہلی بار میں نے آبی کو اپنے ہاتھوں سے بے بس کر دیا تھا۔

وہ گھوم کر دروازے کے پاس ہی گر گیا تو میں نے بتی جلا دی۔ اس کی ساری قوتیں بے کار ہو گئی تھیں۔ آنکھیں اس کی ابھی تک کھلی تھیں مگر وہ دیکھنے سے عاجز تھیں۔ اسے میں نے اسی حالت میں کندھے پر ڈالا اور تیزی سے برآمدے میں سے نکل کر گھوڑی تک جا پہنچا اور اپنے سامنے اس کو لٹا کر میں گھوڑی کی پیٹھ پر جا چڑھا۔ ہمارا وہاں ٹھہرنا کسی بھی طرح مناسب نہیں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ کلونتی صبح جاگے گی تو اپنے گھر کا پتہ خود بتا دے گی۔ جگت سنگھ کے پاس وہ جلدی پہنچ سکتی تھی۔ اسے اپنے ساتھ لے جانا میں کسی بھی طرح مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ آبی کو گھوڑی پر لاد کر میں اسی وقت گیٹ سے باہر نکلا اور سیدھا شہر سے باہر کی طرف چل دیا۔ ویران سڑکوں پر اس وقت بھی اِدھر اُدھر پھرتے سپاہی میرے لیے سو قسم کے خطرے پیدا کر سکتے تھے۔

آبی کچھ زیادہ ہی نڈھال ہو گیا تھا۔ اس کے لیے وہ تجربہ بالکل ہی انوکھا تھا۔ میں نے اُسے کبھی اس راہ سے نہیں گزارا تھا۔ وہ لاش ایسی صورت میں گھوڑی پر پڑا رہا اور میں اُسے لے کر سوہل کی طرف چل دیا۔ وہ قصبہ گورداسپور سے زیادہ دور نہیں تھا۔ پکی سڑک وہاں سے امرتسر تک گزرتی چلی جاتی تھی۔ آبی کو ساتھ لے کر میں شہر سے کوئی دو ڈھائی میل آگے نکلا اور پھر سڑک سے اتر کر میں نے آبی کو گھاس پر لٹا دیا۔ اس کو ہوش میں لانا بہت ضروری تھا۔ اس کے منہ پر منہ رکھ کر میں نے اپنے پھیپھڑوں میں وافر مقدار میں ہوا داخل کی۔ اس کے گلے کی مالش سے خون کی روانی درست ہوئی تو وہ کوئی پندرہ منٹ کی تگ و دو کے بعد ہوش میں آ گیا۔ مگر اب بھی وہ بہت زیادہ نڈھال تھا۔

"اٹھ جا آبی! بڑی دیر ہو گئی ہے یار! ایک دن بیچ میں سے

گزر گیا ہے۔" میری آواز وہ سن رہا تھا۔ بڑی مشکلوں سے اُس نے آنکھیں کھولیں، ہاتھ پاؤں کی حرکت سے میں نے محسوس کیا کہ وہ اب بہتر محسوس کر رہا تھا۔

"اُٹھ یار! تیری نیند اتنی لمبی ہو گئی ہے۔"

اُس نے بڑے غور سے مجھے دیکھا اور بولا۔ "یہ۔۔۔ یہ تُو نے کیا کر دیا تھا مجھے؟ تو بالآخر میرا دشمن ہی نکلا، مجھے بھی نہیں چھوڑا تُو نے۔"

"تیرا وہم ہے یار! اُٹھ اب، درمیان میں سے پورا ایک دن نکل گیا۔ اور تو ابھی تک بے ہوش ہے۔"

اب وہ میری آواز زیادہ بہتر طور پر سُن رہا تھا۔ بڑی دقت سے وہ گھاس پر سے اٹھ بیٹھا اور بولا۔ "مجھے کیا ہو گیا تھا جیلانی! تو ایسا سخت ہاتھ مارتا ہے آدمی پر، مجھے شاید نئی زندگی ملی ہے۔"

"ہاں۔ لگتا تو ایسا ہی ہے۔ تیرا گلا تو ٹھیک ہے نا؟ تھوک نگل سکتا ہے نا؟"

"ہاں! مگر درد بہت ہے یہاں۔ وہ۔۔۔ وہ کلونتی کیا ہوئی؟"

"وہ تیرے ہاتھ سے بچ گئی۔ اب وہ گھر چلی گئی ہو گی۔ ہم نے اُسے اودھم سنگھ کے مکان پر چھوڑ دیا تھا، اُٹھ اب۔"

"بہت بُرا کیا تم نے جیلانی! تجھے۔۔۔ تجھے اس سے اتنی ہمدردی کیوں تھی؟"

"تیرے لیے یہی بہتر تھا آبی! بہادری اسی میں تھی کہ تو اسے معاف کر دیتا اور پھر کلونتی کا تو کوئی قصور نہیں تھا یار جی! اُٹھو اب۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔"

"چل یار! تیرا یہ ستم بھی دیکھنا تھا مجھے۔ اب پتہ چلا کہ تو آدمی کو کیسے بے ہوش کر دیتا ہے۔ آدمی کی تو زندگی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ میں کب تک بے ہوش رہا ہوں؟"

"میں نے کہا نا کہ پورا ایک دن گزر گیا۔ اب رات کا آخری پہر ہے چل، گھوڑی پر بیٹھ۔" یہ کہہ کر میں نے اُسے اپنے پیچھے بٹھایا اور ہم سوہل کی طرف چل دیے۔

"اب کدھر جا رہا ہے تو؟"

"سامنے سوہل ہے اور صبح قریب ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم وہاں کسی ہوٹل میں جا رہتے ہیں، میں بہت تھک گیا ہوں۔"

"ہاں یہ بہتر رہے گا، کوئی اچھا قصبہ ہے یہ؟"

"اچھا ہی ہو گا۔ میں بھی پہلی بار ہی اُدھر جا رہا ہوں یار! سڑک پر اس کے نام کا بورڈ لکھا تھا۔ وہی دیکھ کر کہہ رہا ہوں کہ سامنے سوہل ہے۔"

"چل بھئی! میں تو تیرے اس ہاتھ کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ تجھ سے تو بہت دُور رہنا چاہیے آدمی کو۔"

"دیکھ کہیں تو مجھ سے ناراض تو نہیں ہے؟ یہ بہت ضروری تھا آبی! آدمی کی بہادری یہ نہیں ہے کہ وہ مرے کو اور مارے۔ جو نہیں گرتا اسے گرا لو مگر اس سے آگے نہیں۔ یہ مردانگی نہیں ہے۔ دشمن کو بھی جینے کا حق حاصل ہے۔"

"وہ تو میں نے دیکھ ہی لیا ہے۔ بہرحال کلونتی ہمیں یاد رکھے گی کہ ہم کیا کچھ کر سکتے ہیں۔"

"ہاں یہ تو ہے اور جگت سنگھ بھی ہمیں کبھی نہیں بُھلا سکتا۔ مگر تھا وہ بہت ہی نامرد۔ پتہ نہیں وہ مشہور کیسے ہو گیا۔"

"میرا خیال ہے اس کی شہرت میں کلونتی کا ہاتھ ہے ورنہ وہ ایسا ہے نہیں۔"

"یہ بات نہیں ہے آبی! بلکہ میرا خیال ہے کہ وہ سالا متعصب سکھ ہے، ہمارے وہ کسی کام نہیں آیا تو اس کی وجہ یہی تھی۔"

"اچھا! اللہ کو شاید یہی منظور تھا۔" آبی نے سب کچھ خدا پر چھوڑ دیا تھا۔ پہلی بار اُسے اپنی بے بسی یاد آئی۔

ہم سوہل پہنچے تو اسٹیشن کے قریب ہی ہمیں ایک ہوٹل نظر آ گیا۔ مگر سوال یہ تھا کہ ہم گھوڑی کو کہاں باندھیں؟ وہ جگت سنگھ کو ہمارا سراغ فراہم کر سکتی تھی اور رات ابھی تک برابر رینگ رہی تھی۔ اذان کا تو وہاں اب تصوّر ہی ختم ہو چکا تھا۔ سنکھ بھی کوئی نہیں بجتا تھا۔ ہم ہوٹل کے سامنے سے گزر کر ایک بار پھر اسٹیشن کی طرف نکل گئے۔ عین اس وقت پٹھانکوٹ کی طرف سے ایک گاڑی اسٹیشن میں داخل ہوتی نظر آئی۔ ہم نے گھوڑی سے اُتر کر اسے جنگلے کے ساتھ باندھ دیا اور خود امرتسر کا ٹکٹ لے کر ہم گاڑی میں جا بیٹھے۔ ہمارا گورداسپور کا سفر ناکام ہو چکا تھا اور آبی کا گلا الگ سُوج چکا تھا۔ وہ بلا وجہ اتنی ساری اذیت سہہ گیا تھا مگر وہ مجھ سے ناخوش نہیں تھا۔ شاید اس نے مجھے معاف کر دیا تھا اور اسے سمجھ آ گئی تھی کہ اسے کلونتی کے پلنگ پر جانے سے پہلے میں نے کیوں روک دیا تھا۔ ہمیں یہ حق نہیں پہنچتا تھا کہ ہم کسی مجبور اور بے بس عورت کو یوں ذلیل کر دیتے۔ یہ کوئی مردانگی نہیں تھی۔

جب ہم امرتسر پہنچے تو دوپہر ڈھل چکی تھی۔ اسٹیشن سے نکل کر ہم بڑے اطمینان سے ایک ہوٹل میں جا ٹھہرے۔ کمرے میں پہنچ کر ہم نے دروازے اندر سے بند کیے اور مُردوں سے شرط

باندھ کر لیٹ گئے۔ نیند نے ہمیں پاگل کر رکھا تھا۔ ہمیں کھانے پینے کا بھی کوئی ہوش نہیں رہا۔ جب ہماری آنکھ دوبارہ کھلی تو اگلے دن کا سورج طلوع ہو رہا تھا۔ وہ ہوٹل اس لحاظ سے بہت اچھا تھا کہ وہاں ہم پولیس کی پوچھ گچھ سے بالکل محفوظ رہے۔ رقم تو اُن لوگوں نے ہم سے بہت لی مگر آرام بھی وہاں ہمیں بہت ملا۔ بستر سے اٹھ کر ہم نے غسل کیا اور تازہ دم ہو کر سگریٹ پھونکنے لگے۔ ناشتہ ہم نے کمرے ہی میں منگوا لیا۔ سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ ہمارے کپڑے بہت میلے ہو گئے تھے۔ ناشتہ کر کے ہم نے کمرہ بند کیا اور سیدھے بازار جا نکلے۔ وہاں سے ہم نے تنگ موری کے پاجامے اور لٹھے کے کرتے خریدے۔ وہی ان ہندوؤں کا لباس تھا۔ اس پر ہم نے لنڈے سے لے کر ہلکے سے اُودے کوٹ پہن لیے۔ اس کام سے فارغ ہو کر ہم نائی کے پاس جا پہنچے اور ہم دونوں نے بال اس طرح کٹوائے کہ اُن میں بودی باقی رہ جائے۔ طے یہ پایا کہ آبی کا نام رام لال ہو گا اور میرا نام گھنشام داس ہو گا۔ ہوٹل میں بھی ہم نے یہی نام لکھوائے تھے۔ ہم بیٹھے بٹھائے ہندو بن گئے تھے اب بس ہیٹ کے قشقے کی ضرورت تھی اور مندر بھی زیادہ دُور نہیں تھا۔ سروں پر ہم نے خالص کانگریسیوں ایسی ٹوپیاں پہن لی تھیں۔ یہ سوانگ رچا کر ہم ہوٹل واپس نہیں گئے بلکہ سیدھے رتنا میوزک سینٹر جا پہنچے۔ بالک رام سے مل لینا اب بہت ضروری ہو گیا تھا۔ وہی ہمارے کام آ سکتا تھا۔ حیرت مجھے یہ تھی کہ میں سیدھا اس کے پاس کیوں نہیں چلا گیا۔ مگر حالات کچھ ایسے ہو گئے تھے کہ اس کا نام بیچ میں آتا ہی نہیں تھا ورنہ اپنے ملک کا پرانا خادم ہونے کے ناتے ہماری مدد ضرور کرتا۔

میوزک ہال میں ہم داخل ہوئے تو یوں لگا جیسے کلیجے میں ٹھنڈ سی پڑ گئی ہو۔ کئی نوخیز سیتریاں وہاں ناچ گانا سیکھ رہی تھیں۔ تا تا تھئی تھئی تھئی۔ کوئی دس لڑکیاں وہاں جمع تھیں اور ان میں سے چار باقاعدہ ناچ رہی تھیں، چھ نے ساز اٹھا رکھے تھے۔

"یہ کیا ہو رہا بھئی!" آبی نے سرگوشی کی۔ کمرے کا ماحول بڑا ہی طرب انگیز تھا۔

"یہ میوزک ہال ہے بچے! ادھر یہی کچھ ہوتا ہے۔" میں نے بالک رام کو کمرے میں ڈھونڈا مگر وہ اس وقت وہاں نہیں تھا۔

اس کا ایک اور اُستاد انہیں سبق سکھا رہا تھا۔ وہ ہمیں دروازے میں دیکھ کر فوراً اپنی جگہ سے سرکا اور میوزک اس نے فوراً بند کرا دیا، بولا۔ "آپ کیسے آئے ہیں مہاراج! کس سے ملنا ہے آپ کو؟"

"ہمیں بالک رام جی سے ملنا ہے سرکار! کہاں ہو۔۔۔ وہ اِس وقت؟"

"ایک تو بالک رام کے ملنے والوں نے تباہ کر دیا ہے مجھے جب بھی ذرا سبق اسٹارٹ کرتا ہوں اس کے ملنے والے آ جاتے ہیں اور کلاس کا بیڑہ غرق ہو جاتا ہے۔ وہ ساتھ والے کمرے میں ہیں۔ وہاں جا کر مل لیں اُن سے۔" یہ کہہ کر وہ دروازہ بند کرنے کے لیے ہمارے پاس آ کھڑا۔ "اوئے تیرتھ! تیرا ستیاناس تُو ادھر کیوں نہیں بیٹھتا۔ جو بھی آتا ہے سیدھا منہ اٹھائے اِدھر چلا آتا ہے۔"

"پر استاد جی! میری بات تو سنو! آنے والا منہ نہ اٹھائے تو اور کیا مٹھائے، ایں۔ ذرا 'گور' کرو مہاراج گستاخی صاحب!" آبی نے واقعی اس کے سر پر ایک دھول مارتے ہوئے کہا۔

وہ بھڑک کر پیچھے ہٹا، بولا۔ "ہم سے تمیز سے بات کرو۔ گنجا کس کو کہتے ہو۔ میرا نام اتم چند ہے سمجھے! میں یہاں کا ڈانس ماسٹر ہوں سمجھے! کوئی ایسا ویسا نہ سمجھنا مجھے۔" وہ واقعی بری طرح جھلا اٹھا تھا۔ آبی نے کام ہی ایسا کیا تھا۔

"پر سوہنیو! ایڈے اوکھے کیوں ہوندے او۔ جے ایہیں ایہناں نوں تک لیا تے کیہہ ہو یا۔ ساڈا وی تے کجھ حق اے دنیا تے۔"

"او جا منہ پراں کر۔ لے جا اوئے تیرتھ راما ان کو بالک رام کے پاس۔ پتہ نہیں کہاں کہاں سے آ جاتے ہیں ڈنگر چراتے ہوئے۔" یہ کہہ کر اس نے واقعی ہمیں دروازے سے پیچھے دھکیل دیا۔ درمیان میں تیرتھ رام آ کھڑا تھا۔

"بھئی بڑی گرم شے ہے تو! تیرا تو میں پلستر اکھاڑ دُوں گا ڈانس ماسٹر! ذرا میں بالک رام سے بات کر لوں پہلے۔" آبی نے اسے غصے سے دیکھتے ہوئے کہا۔ مگر اس نے اتنے میں دروازہ اندر سے بند کر کے کنڈی چڑھا لی تھی۔

"چل اوئے تیرتھ راما! کدھر ہے وہ بالک رام ہیڈ ماسٹر؟ حد ہو گئی یعنی ہماری کوئی قدر ہی نہیں ہے یہاں۔"

"وہ تو جی ادھر بیٹھے ہیں۔ آئیں میں ان کو اطلاع کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر تیرتھ رام ہمیں ساتھ لے کر عقبی کمرے کے دروازے تک جا پہنچا۔ کمال کی بات یہ تھی کہ میوزک ہال کا شور وہاں تک سنائی نہیں دیتا تھا۔ میرا خیال ہے اس ہال کو انہوں نے ساؤنڈ پروف بنا رکھا تھا۔

"میں کیا کہوں جی اندر جا کر؟" تیرتھ رام نے ہم سے پوچھا۔

"کہنا کہ اس کے پتا جی آئے ہیں۔ میرا نام گھنشام داس ہے اور یہ میرا دُوسرا لڑکا ہے رام لال۔" میں نے منہ پکا کر کے کہا۔

تیرتھ رام نے بڑی حیرت سے مجھے دیکھا اور دروازہ کھول کر اندر جا گھسا۔

"یار! وہ گنجا اگر باہر نکلے تو میں اُسے خشک ڈانس سکھا دوں۔ مزے لے رہا ہے اندر، ہے کہ نہیں؟"

"بس اپنی اپنی قسمت ہے یار جی! ایک وہ ہیں کہ جنہیں چاہ کے ارماں ہوں گے۔"

ابھی میں یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ دروازہ کھلا اور بالک رام بڑے غصے سے باہر نکل آیا۔ پہلی تو کیا دوسری تیسری نظر میں بھی ہمیں نہیں پہچان سکا، بولا "کیا بات ہے کس کے پتا ہیں آپ! دماغ تو درست ہے آپ کا؟ کیا کہہ رہے تھے آپ؟"

"یار! اتنا گرم ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ کیا کہہ دیا ہے ہم نے؟ ذرا تمھارے پتا ہونے کا ہی دعوےٰ کرتے ہیں ہم۔ کوئی تمھیں اٹھا کر تو نہیں لے گئے۔"

وہ میری آواز سن کر چونکا اور بڑے غور سے مجھے دیکھ کر بولا "اوئے! یہ آپ کیسے آ گئے اِدھر۔ آئیں آئیں، جا اوئے تیرتھ تو دروازے کا خیال رکھ، کوئی آدمی ہال میں نہ جائے۔" یہ کہہ کر وہ ہمیں ساتھ لے کر کمرے میں جا گھسا۔ دو عورتیں اس کے پاس بیٹھی تھیں، ہمیں دیکھ کر وہ فوراً ہی اُٹھ کر میوزک ہال میں جا پہنچیں۔ بالک رام نے دروازہ اندر سے بند کر لیا اور ہمیں پچھلے کمرے میں لے جا کر اس نے صوفے پر بٹھا دیا۔ بولا "آپ۔ آپ کیسے آ گئے یہاں؟ وہ ڈھلوں صاحب والا معاملہ تو نہیں ہے؟"

"آپ سمجھ دار آدمی ہیں بالک رام جی! آئے تو ہم انھی کے لیے ہیں۔ آپ کی اطلاع کیا کہتی ہے؟"

"کئی پیغام مجھے مل چکے ہیں مگر میرے اپنے پر ندے بے بس ہیں۔ ڈھلوں صاحب کو انھوں نے امرتسر جیل میں ایسا بند کیا ہے کہ اُن کی خبر ہی نہیں ملتی ہے۔ کل ہی مجھے ستنا جا صاحب کا پیغام ملا تھا، کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔"

"ستنا جا صاحب!"

"ہاں۔ آپ جانتے ہیں انھیں؟"

"ہاں، میری اُن سے ملاقات ہوئی تھی مگر وہ میرے تو کسی کام نہ آ سکے۔ بہرحال آپ یہ بتائیں کہ انھیں کس وارڈ میں رکھا گیا ہے؟"

"یہی بات تو میری سمجھ میں نہیں آئی۔ میں دو بار خود جیل جا چکا ہوں مگر اُن کی کوئی خبر نہیں ملی۔"

"آپ کا کیا خیال ہے، وہ کہاں ہو سکتے ہیں؟ عین ممکن ہے انھیں وہاں سے نکال لیا گیا ہو۔"

"یہ امکان تو ہے مگر کسی کو تو اُن کے بارے میں خبر ہونی چاہیے۔"

"مثلاً ایسا کون آدمی ہے جو آپ کو یہ خبر دے سکتا ہے؟"

"ہیں کچھ آدمی۔ میں اُن کا نام بتانا ضروری نہیں سمجھتا۔ بہرحال آپ کی اطلاع کیا ہے؟"

"مجھے بھی اب تک یہی معلوم ہوا ہے کہ ڈھلوں صاحب امرتسر جیل میں بند ہیں مگر آپ نے اس معاملے کو کچھ زیادہ ہی پُراسرار بنا دیا ہے۔"

"نہیں۔ یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟ ایسی بات نہیں ہے جناب! میں صرف حالات بیان کر رہا تھا۔"

"آپ کو ان کے بارے میں کیا حکم ملا ہے؟"

"یہی کہ میں انھیں رہا کرانے میں مدد دوں بلکہ رہا کروا دوں۔"

اچانک اُسے کچھ یاد آ گیا، مجھے بڑے ہی عجیب طریقے سے دیکھ کر بولا "وہ۔۔۔ وہ آپ کا ملھوترا سُنا ہے قتل ہو گیا ہے، آپ کو پتہ ہے اُسے کیا ہوا؟ اب کی بار تو آپ کی اس سے ملاقات نہیں ہوئی؟"

"جی نہیں۔ ہم تو سیدھے آپ کے پاس چلے آئے ہیں۔ یہ میرے دوست ہیں، ایس جی ایم ایم پیرزادہ صاحب۔ یہ بھی میرے ساتھ اسی کام کے لیے آئے ہیں مگر اس ملھوترے کو کس نے مار دیا؟"

"میری اطلاع یہ ہے کہ انھیں کوئی گھر سے اغوا کر کے لے گیا تھا۔ انھی کی کار میں اور پھر شہر سے باہر لے جا کر انھیں گولی مار دی۔ قاتل صرف ایک ہی آدمی تھا مگر گھر والے اس کا نام نہیں لیتے میرا خیال ہے، وہ اسے جانتے تھے مگر وہ ابھی تک سب کے سب چپ ہیں۔"

"عین ممکن ہے انھوں نے مصلحتاً کسی کے سامنے منہ نہ کھولا ہو۔ جس کو بتلانا مقصود تھا اسے وہ بتا چکے ہوں گے۔"

"ہاں یہ ہو سکتا ہے مگر اگلی خبر کا مجھے ابھی تک انتظار ہے۔"

"بس آپ اور ہم انتظار ہی کرتے رہ جائیں گے اور وہ ڈھلوں صاحب کا کسی روز جھٹکا کر دیں گے۔" آبی نے پہلی بار زبان کھولی۔ وہ بالک رام کی ایک ایک حرکت کا بغور مطالعہ کر رہا تھا۔

"تو پھر آپ ہی کچھ کر لیں ادھر تو آپ آ ہی گئے ہیں۔" مالک رام نے اس کی بات کا بُرا مناتے ہوئے کہا۔

آبی مسکرا کر رہ گیا، بولا "اس ملھوترا کو جیلانی نے ختم کیا ہے۔ سمجھے بالک رام جی! وہ خبریں جو آپ ہمیں فراہم کر رہے ہیں اُن کو تو اس نے پہلے ہی دن معلوم کر لیا تھا۔ ہمیں کچھ آگے کی بات بتائیں، آپ کو تنخواہ ملتی ہے۔ بڑے الاؤنس ہیں آپ کے کچھ تو اپنا فرض ادا کریں۔"

"تو آپ کا کیا خیال ہے میں یہاں پلے کار بیٹھا ہوں۔۔۔؟ [illegible] خدمت کر رہا ہوں میں اپنی حکومت کی۔ مجھے آپ جیسے [illegible]ہیں۔ وہ کام جس میں آپ جیسے آپھنسیں کبھی پورا نہیں ہوتا [illegible] آپ کا کچا چٹھا مجھے معلوم ہے آبی صاحب قبلہ!" پہلی [illegible] اس کی باتوں نے مجھے چونکایا۔ گویا اسے معلوم تھا کہ ہم پھرا امرتسر [illegible] پہنچے ہیں اور یہ کہ میرے ساتھ دوسرا آدمی کون ہے۔ اس کے [illegible] واقعی بہت مؤثر تھے۔ خدا کا شکر ہے اسے بزنالہ کے واقعات [illegible] علم نہیں ہو سکا تھا۔

"آپ کو کیسے پتہ چلا کہ میرے ساتھی کا نام آبی ہے؟"

"مجھے معلوم ہو گیا تھا۔ آپ پولیس کو ایک بار پھر فریب [illegible]نے میں کامیاب ہو گئے ہیں مگر وہ بعد میں آپ کا کھوج نہ پا سکے [illegible] البتہ اُن کو معلوم ہے کہ آپ امرتسر میں ہیں۔ ستنا جا صاحب کے [illegible] پیغام میں یہ بات بھی درج تھی۔ آپ کے بارے میں پہلی خبر انہی نے [illegible] دی تھی۔"

"آپ کا بہت بہت شکریہ بالک رام جی! اب ہم زیادہ محتاط [illegible] رہیں گے مگر اب ہمارے لیے کیا حکم ہے اُن کا؟"

"پتہ نہیں۔ یہ باتیں تو صیغہ راز میں رکھی جاتی ہیں پھر بھی میں [illegible] نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اب انہیں آپ کی ضرورت نہیں رہی۔ [illegible] چاہتے ہیں کہ آپ قانون کا تقاضا پورا کر دیں۔" بالک رام کا [illegible] لہجہ بڑا ہی روکھا ہو چلا تھا اور مجھے یہ ڈر تھا کہ اگر ہم نے بات بڑھائی تو شاید وہ آدمی ہم سے نہیں نہ الجھ بیٹھے۔ آبی نے اس کو بہت ہی ترش رو کر دیا تھا اور وہ اپنے اڈے پر بیٹھ کر ایسی بے عزتی کا روادار نہیں ہو سکتا تھا۔

"قانون کا تقاضا تو ہم ضرور پورا کریں گے بھائی جی! مگر ابھی تو ڈھلوں صاحب کی جان بچانا مقصود ہے۔ اچھا خدا حافظ۔ اب ہمیں اجازت دیں۔"

"نہیں۔ آپ اِدھر ہی رہیں۔ رات میرے پاس گزاریں۔ میری بات کا بُرا نہ منائیں۔ مجھے بھی وہی کرنا ہے جو آپ کے پیشِ نظر ہے۔ کوئی نہ کوئی تجویز ہم ضرور سوچیں گے۔"

"جی نہیں۔ ہم یہ قصہ خود ہی نپٹا لیں گے۔ اچھا۔ خدا حافظ۔ البتہ اتنی بات یاد رکھیں کہ ہمارے پیچھے آپ کوئی آدمی نہیں لگائیں گے اور نہ ہی ہمارے بارے میں سرحد کے اُس پار کوئی خبر بھیجیں گے۔ ورنہ ہم آپ کے آدمیوں کی زندگی کے ذمہ دار نہیں ہوں گے اور شاید آپ کے بھی نہیں۔" میں نے بڑے جمے ہوئے لہجے میں بالک رام کو خبردار کیا۔

وہ میرے الفاظ پر اُچھل سا گیا۔ مگر میری آنکھوں کا پیغام اس کے دل میں گہرا اُتر گیا تھا اور اسے معلوم تھا کہ جب غلام جیلانی کوئی بات کہتا ہے تو پھر اس کو سچ بھی کر دکھاتا ہے۔

"ٹھیک ہے جیلانی صاحب! آپ بے فکر رہیں۔ کوئی آپ کے پیچھے نہیں جائے گا، ہرگز نہیں۔ یہ میرا آپ سے وعدہ رہا۔" ہم سے ہاتھ ملانے کے لیے اس نے دونوں بازو آگے کر دیے۔

اس سے رخصت ہو کر ہم اسی وقت وہاں سے باہر نکل آئے۔ بالک رام نے ہمیں بالکل ہی مایوس کر دیا تھا۔ یا عین ممکن تھا کہ اُسے معاملے کی نوعیت کا پوری طرح علم ہو مگر ہمیں ٹالنے کے لیے اس نے ڈھلوں صاحب کے بارے میں صحیح معلومات فراہم نہ کی ہوں۔ اُن کی رہائی کا مسئلہ تو اسی کے سپرد کیا گیا تھا۔ وہ انھیں چھڑا لیتا تو یہ اس کا بہت بڑا کارنامہ تصور کیا جاتا لیکن ہم اگر بازی لے جاتے اور ڈھلوں کو رہائی دلوا دیتے تو پھر اس کی نوکری بھی خطرے میں پڑ سکتی تھی۔ وہ پوچھتے تو ضرور ہی کہ میاں! تم کس لیے امرتسر میں بیٹھے ہو، کیوں مفت کا راشن ہڑپ کر رہے ہو؟ تو ایسے میں وہ کیا جواب دیتا۔

میوزک ہال سے باہر نکل کر آبی تلملا کر بولا "یار اس بالک رام کو بھی تو سمجھ سکا ہے کہ نہیں؟"

"پاگل ہے سالا۔ مجھے یقین ہے کہ اسے ڈھلوں صاحب کے بارے میں پوری خبر معلوم ہے مگر ہمیں وہ محض ٹرخا دینا چاہتا تھا۔"

"مگر کیوں؟ وہ ایسا کیوں سوچ رہا ہے؟"

"اپنے نمبر بنانے کے لیے۔ تاکہ اس کی نوکری بچی رہے اور وہ امرتسر میں بیٹھ کر اس میوزک ہال کو راجہ اندر کا اکھاڑہ بنائے رکھے۔ اس کو حرام کاری کی عادت پڑ چکی ہے۔"

"یہی نظر آتا ہے مجھے۔ وہ سیدھے منہ بات ہی نہیں کر رہا تھا۔ ہر معاملے کو وہ اپنی توہین سمجھتا ہے۔"

"ہاں! اس کا رویّہ بہت ہی عجیب تھا۔ بہرحال ہمیں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے آبی! ہمارے یہ لباس بھی سمجھو مشکوک ہو چکے ہیں۔ وہ ہمیں ان کپڑوں میں دیکھ چکا ہے۔"

"تو پھر۔ کیا خیال ہے کوئی اور سوانگ نہ رچا لیں؟"

"ہمیں یہی کرنا ہو گا۔ کہیں سے کیس مل جائیں تو وہ ہم سر پر جما لیں۔ وِگ تو مل جاتی ہو گی کیسوں کی؟"

"ہاں! یہ ٹھیک رہے گا۔ میرا خیال ہے بالک رام بھی سمجھو ہمارا دشمن بن چکا ہے۔ اسے ڈھلوں کے پیچھے ہمارا یہاں آنا بالکل پسند نہیں آیا۔"

"وہ تو ہے ہی۔ اب اس سے ملنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ لاہور پہنچ کر اس ستنا جا سے تو میں ضرور ملوں گا۔ آؤ ذرا بازار کا چکر وکر لگاتے ہیں، وِگ وہاں سے مل سکتی ہے۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔ یہ لباس تو اتار ہی دو ورنہ ہماری شامت

آجلے گی۔"

کچھ ہی دیر بعد ہم ایک بار پھر بازار جا پہنچے۔ ظاہر ہم نے یہ کیا کہ ہمیں ایک ڈرامے میں سکھ کے حلیے کی ضرورت ہے۔ سے لمبے بالوں کی دو وگیں اور پھر کچھ کڑا کرپان خرید کر ہم نے ہوٹل واپس پہنچ کر اپنا حلیہ پوری طرح بدل لیا۔ مگر اسی رات کھانا کھانے کے بعد آپی کو کچھ حرارت محسوس ہونے لگی۔ کچھ ہی دیر بعد اُسے بڑے زوروں کا بخار ہو گیا۔ یہ ایک نئی بپتا تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا بخار ایک سو چار تک جا پہنچا۔ آپی کو ملیریے نے آ لیا تھا۔ اُسے لحاف میں دبا کر میں بازار کی طرف بھاگا۔ کسی دوا کی اسے شدید ضرورت تھی مگر جیسے ہی میں ڈاکٹر کرم چند کی دکان پر پہنچا۔ مجھے دوا کی بات تو بھول ہی گئی۔ کرم چند سے ملنے کے لیے وہاں ایس کے بھنڈاری آیا ہوا تھا۔ اُسے میں نے اتنی مدت بعد دیکھا تو میرا مغز الٹنے لگا۔ ملہوترا کا اصل رازدار اور سازش کا دوسرا فریق وہی تھا اور وہ اپنے کسی مرض کے علاج کی خاطر کرم چند سے ملنے آیا تھا۔ دکان کے باہر دو کاریں کھڑی تھیں اور میرا خیال تھا کہ اُن میں سے ایک اس کی ہے۔ کرم چند نے دوسرے مریضوں کو چھوڑ کر بھنڈاری کو اندر بلا لیا۔ وہ اس سے بڑے ہی تپاک سے مل رہا تھا۔ مجھے وہ پہچان نہیں سکا تھا۔ حالانکہ میں سیدھا اس کے سامنے جا ٹھہرا تھا مگر میرے سر پر بندھی پگڑی، ہاتھ میں کڑا اور بغل میں دبی کرپان دیکھ کر وہ مجھے واقعی سکھ سمجھ رہا تھا حالانکہ میری داڑھی منڈھی ہوئی تھی۔ مگر منڈھے سکھ تو وہاں عام ملتے تھے۔

بھنڈاری ڈاکٹر کے پاس پردے کے پیچھے جا بیٹھا تو میں نے اس صورت حال کا جائزہ لیا جو میرے سامنے اچانک ہی ابھر آئی تھی۔ آپی کا بخار بھی فوری علاج کا تقاضا کرتا تھا مگر بھنڈاری آپ ہی میرے سامنے آ گیا تھا اور میں اس موقع کو ہاتھ سے کھونا نہیں چاہتا تھا۔ میں اسی وقت دکان سے باہر نکل گیا۔ گاڑی کے اندر ڈرائیور شیشے بند کر کے بیٹھا تھا۔ کار کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد میں پھر دکان کے تھڑے پر جا ٹھہرا۔ ارادہ ہمارا یہی تھا کہ ہم ملہوترا کے بعد بھنڈاری سے ضرور ملیں گے مگر اب وہ اچانک ہی میرے سامنے آ گیا تھا تو میرا ذہن مفلوج ہونے لگا تھا۔ اس کو بھرے بازار میں سنبھال لینا مجھے ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ کوئی دس منٹ اسی شش و پنج میں گزر گئے مگر میں کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ پانچ منٹ اور گزر گئے۔ تو بھنڈاری ڈاکٹر کرم چند کے ساتھ دکان سے باہر آ گیا۔ کرم چند اسے رخصت کرنے کے لیے دروازے پر آ ٹھہرا۔ بھنڈاری نے اسے سلام کیا اور بڑے متکبرانہ انداز سے وہ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر جا بیٹھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کا گھر وہاں سے کم از کم چار میل دُور ضرور تھا۔ مگر میں ابھی تک اس کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکا تھا۔ ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کی تو کرم چند دکان کے اندر چلا گیا۔ عین اس گھڑی ایک ٹیکسی میرے سامنے سے گزری تو میں لپک کر اس کے اندر جا بیٹھا۔ بھنڈاری کی کار کی وجہ سے اس نے اپنی رفتار سست کر لی تھی۔ میں ٹیکسی کی اگلی نشست پہ بیٹھا تو ڈرائیور نے کہا "کہاں جانا ہے سردار جی؟"

"اس کار کے پیچھے چلو یار! اس آدمی سے بہت ضروری کام ہے۔ مجھے اس کی کوٹھی تک لے چلو۔"

"جی بہت اچھا۔ ویسے میرا خیال ہے یہ بھنڈاری صاحب کی کار ہے۔ ایس کے بھنڈاری جی شہر کے بہت بڑے رئیس ہیں۔"

"ہاں۔ اسی لیے تو میں اسے یہاں مخاطب نہیں کر سکا۔ سنا ہے گھر پر یہ بہت اچھی طرح پیش آتے ہیں۔"

"ہاں۔ بڑے پرجاپتی آدمی ہیں یہ۔"

"ذرا گاڑی کو اُن کے قریب رکھو۔ ایسا نہ ہو کہ ہم انہیں ڈھونڈتے ہی رہ جائیں۔" ڈرائیور نے ٹیکسی کی رفتار تیز کر دی۔ ہم جیسے ہی بازار سے نکلے بھنڈاری کی گاڑی کمپنی باغ کی طرف نکل گئی۔ وہاں روشنی بہت کم تھی۔ ٹیکسی کو ذرا سا جھٹکا لگا تو میں جان بوجھ کر ڈرائیور پر جا گرا۔ میرا پنجہ اس کی گردن پر جا پڑا تھا۔ اس نے میری گرفت سے خود کو بچانے کی کوشش کی تو اسٹیئرنگ الٹنے لگا۔ اسے میں نے بائیں ہاتھ سے سنبھالا تو اس عرصے میں ڈرائیور بے ہوش ہو چکا تھا۔ گاڑی کو ایک لحظے کے لیے روک کر میں نے ڈرائیور کی نشست سنبھالی اور اسے دھکیل کر میں نے ٹیکسی سے باہر پھینک دیا۔ اس عرصے میں بھنڈاری کی گاڑی کوئی دو فرلانگ آگے نکل گئی تھی۔ اس کو پکڑنے کے لیے میں نے اپنی رفتار تیز کر دی اور پھر اس کی کار سے آگے نکل کر میں نے ٹیکسی کو تھوڑا سا آگے نکالتے ہوئے اس کو ایک دم روک دیا۔ بھنڈاری کی گاڑی اپنے زور میں آ رہی تھی۔ وہ ٹیکسی کے پچھلے حصے سے ٹکرائی اور مجھے یوں لگا جیسے زلزلہ سا آ گیا ہو۔ مگر میں نے بریک پھر بھی نہیں کھولے۔ بھنڈاری کی گاڑی بند ہو گئی۔ اس کے انجن کو خاصا نقصان پہنچ چکا تھا اور ڈرائیور اپنی سیٹ اور اسٹیئرنگ کے درمیان پھنس کر رہ گیا تھا۔ سڑک اس گھڑی بالکل ویران تھی۔ شاید بھنڈاری اس عرصے میں کار کا دروازہ کھول رہا تھا۔ میں اس کے سامنے پہنچا تو وہ ایک دم مجھ پر برس پڑا۔ "سالے بدمعاش! یہ کیا کر دیا ہے تو نے، کتے کے بچے! لاکھ روپے کی گاڑی برباد کر دی۔ کون یہ نقصان بھرے گا؟" وہ اپنا کندھا دبا رہا تھا۔ اسے وہیں لگی تھی۔ اس کا ماتھا بھی زخمی تھا۔

"میں معافی چاہتا ہوں مہاراج! بیچ میرا کوئی قصور نہیں، گاڑی

رک گئی تھی۔ آپ کو چوٹ تو نہیں آئی؟"

"ٹھہرو پیچھے۔ میں ابھی پولیس کو فون کرتا ہوں۔ بھاگنے کی کوشش کی تو اچھا نہ ہو گا۔ کیا نمبر ہے تمہاری گاڑی کا؟"

"آپ آئیں سرکار! میں آپ کو گھر تو پہنچا دوں۔ گاڑی بھی ٹھیک ہو جائے گی۔ پرماتما نے آپ کو بچا لیا۔ یہی بہت کافی ہے۔" دروازہ کھول کر باہر نکلا تو میں اسے زبردستی ٹیکسی کی طرف لے آیا۔ وہ نہ نہ ہی کرتا رہ گیا مگر میں نے اسے ٹیکسی کی اگلی سیٹ پر بٹھا دیا۔ ٹیکسی کا انجن ابھی تک ٹھیک کام کر رہا تھا۔

"تم کہاں لے جا رہے ہو مجھے؟"

"آپ پریشان نہ ہوں بھنڈاری صاحب! لائیں میں آپ کا کندھا دبا دیتا ہوں۔ مجھ سے بڑی غلطی ہو گئی ہے سرکار! مجھے معاف کر دیں۔" یہ کہہ کر میں اس کا کندھا دبانے لگا اور پھر میں نے اپنے ہاتھ اس کی گردن پر جما دیے۔ اس کا فوری آپریشن بہت ضروری تھا۔ اس کی رگِ احساس دبی تو اس کی آواز بھی بند ہو گئی۔ وہ پہلا سا پُرغرور بھنڈاری ختم ہو چکا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں جیسے وہ نزع کے عالم میں ہو اور اس سوچ میں گم ہو کہ میں دنیا کو آخری پیغام دوں تو کیا دوں؟ زبان تو گنگ ہو کر رہ گئی تھی۔

اُسے یوں بے بس کر کے میں نے ٹیکسی اسٹارٹ کی اور اُسے تیز رفتاری سے بھگاتا ہوا اسی وقت شہر سے باہر نکل گیا۔ بھنڈاری کی قربت پیچھے رہ گیا تھا۔ اس شہر کی آبادی بھی دُور دُور تک پھیلی تھی۔ میں بٹالہ روڈ پر چلتا ہوا آخری بستی میں جا پہنچا۔ اس وقت رات کے ساڑھے نو بج رہے تھے۔ بستی بالکل اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ لوگ شاید شام ہی منہ لپیٹ کر سو جاتے تھے۔ اب سوال یہ تھا کہ میں اسے لے کر کہاں جاؤں؟ اس سے تو مجھے بہت کچھ پوچھنا تھا۔ ٹیکسی میں نے بالآخر ایک بند دروازے کے سامنے کھڑی کر دی۔ یہ بستی کی گلی کا پہلا گھر تھا۔ اللہ کا نام لے کر میں نے دروازے پر دستک دے دی۔ بھنڈاری ابھی تک سیٹ پر اس حال میں بیٹھا تھا کہ اس کا سر جھک کر گھٹنے سے جا لگا تھا۔

چند ہی لمحوں بعد کسی ادھیڑ عمر آدمی نے دروازہ کھولا اور وہ دہشت زدہ نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا "آپ نے ہی دروازہ کھٹکھٹایا تھا؟"

"جی مہاراج! دراصل میں یہاں سے گزر رہا تھا کہ میری سواری بے ہوش ہو گئی۔ آپ کے پاس پانی ہو تو دے دیں۔ ان کو یہاں دو گھڑی بٹھا کر میں کسی ڈاکٹر کو دیکھتا ہوں۔"

"سواری؟ کیسی سواری؟ کیا ہوا ہے اسے؟"

"پتہ نہیں جی! بس بیٹھے بیٹھے بے ہوش ہو گئے ہیں۔"

"اچھا میں پانی لاتا ہوں۔ میرا خیال ہے آپ ان کو اندر لے آئیں۔ انہیں اگر آپ دودھ پلا دیں تو بہتر ہو گا۔"

"جی جی میں بس یہی چاہتا تھا۔ آپ ذرا میری مدد کریں۔"

میری بات سن کر وہ فوراً ہی باہر نکل آیا اور پھر ہم دونوں نے بھنڈاری کو ٹیکسی سے نکال کر بازوؤں میں بھر لیا۔ جب ہم کمرے میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ آدمی وہاں بالکل تنہا رہ رہا تھا۔ نام اس کا کشمیر سنگھ تھا۔ بھنڈاری کو ہم نے بستر پر لٹا دیا تو وہ دودھ لینے کے لیے باہر نکل گیا مگر بھنڈاری کی ایسی حالت کہاں تھی کہ وہ دودھ پی سکتا۔ پانی کا ایک قطرہ اس کے حلق سے نہیں اتر سکتا تھا۔ مجھے اس کی ناگفتہ بہ حالت کا بھرپور احساس تھا۔ کشمیر سنگھ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں دودھ کا گلاس تھا۔

"یہ گلاس مجھے دے دیں۔ کوئی ڈاکٹر نہیں مل سکتا ہے یہاں جی؟"

"کہاں جی! ادھر کوئی وید بھی نہیں ہے۔"

"پھر تو مشکل ہے۔ ان کی نبضیں تو چل رہی ہیں۔ سانس بھی ٹھیک ہے۔ میرا خیال ہے ہمیں انتظار کرنا چاہیے۔ آپ کو میں نے بڑی تکلیف دی ہے۔"

"جی نہیں! تکلیف کی کیا بات ہے۔ بندہ بندے کا دارو ہے۔ جو سیوا مجھ سے ہو سکتی ہے میں کر دوں گا۔"

"آپ کی بڑی دیا ہے مہاراج! ویسے آپ کام کیا کرتے ہیں؟"

"میں فرنیچر کا کام کرتا ہوں سکسینہ برادرز کے ہاں۔"

"آپ نے بڑی مہربانی کی ہے سردار جی! اگر آپ اجازت دیں تو میں رات یہاں ہی ٹھہر جاؤں۔ پتہ نہیں اس سواری کو کہاں جانا تھا؟"

"کوئی بات نہیں بیٹے! تم اطمینان سے یہاں رہ سکتے ہو۔ میں بستر لگا دیتا ہوں۔ آج کل میرے بیوی بچے گاؤں گئے ہوئے ہیں۔ تم بے فکر ہو کر یہاں رہ سکتے ہو۔"

کشمیر سنگھ نے انسانی ہمدردی کی آخری حدوں کو چھوتے ہوئے کہا۔ کوئی اس جیسا خدا ترس آدمی کہاں مل سکتا تھا۔ اس نے دوسرے کمرے میں دو بستر لگا دیے تو میں نے بھنڈاری کو اٹھا کر دوسرے بستر پر ڈال دیا۔ رات کی تنہائی میں میں اسے جگا کر اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ ٹیکسی باہر کھڑی تھی جس کا پچھلا حصہ کچھ زیادہ ہی خراب ہو چکا تھا مگر اب بھی وہ بہت کارآمد تھی۔ ہمیں وہاں سے اتنی دُور لے آئی تھی۔ ورنہ جس سنکٹ میں ہم پھنس گئے تھے اس سے بچ نکلنا کسی بھی طرح ممکن نہیں تھا۔ افسوس مجھے یہ تھا کہ بھنڈاری کی گاڑی کا ڈرائیور وہیں رہ گیا تھا۔ وہ سیٹ اور اسٹیئرنگ میں پھنس کر بے ہوش نہ ہوتا تو شاید میں اُسے بھی ساتھ لے آتا۔

کشمیر سنگھ کوئی ایک گھنٹہ میرے پاس بیٹھا رہا۔ بھنڈاری

اب بہتر طریقے سے سانس لے رہا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے وہ سو رہا ہے اس کی آنکھیں اب فطری طریقے سے بند ہو گئی تھیں۔ جب کشمیر سنگھ کو اطمینان ہو گیا کہ مریض کی حالت اب قدرے بہتر ہے تو وہ دوسرے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ فکرمندی کی کوئی علامت اس کے چہرے سے عیاں نہیں تھی جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ ایک اجنبی کو یوں گھر میں جگہ دے کر اس نے اچھا نہیں کیا۔ ایسی کوئی بات اُس کے بُشرے سے ہویدا نہیں تھی۔ وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ ایک ضرورت مند آدمی کو اُس نے وہاں رات بھر ٹھہرنے کی اجازت دے کر بڑا نیک کام کیا ہے۔

جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ کشمیر سنگھ سو چکا ہے تو میں نے بھنڈاری کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے اور پھر میں نے اس کے بدن کی مالش شروع کر دی۔ دماغ کی طرف خون کی فراوانی اس تکلیف کو دُور کرنے میں بہت آسانیاں پیدا کر دیتی ہے۔ ایک مرحلے پر میں نے بھنڈاری کو پاؤں سے پکڑ کر سر کے بل کھڑا کر دیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ ہوش میں آنے لگا۔ مگر ابھی تک اس کا ذہن سوچ کا بوجھ برداشت نہیں کر رہا تھا۔ اس کو میں نے دودھ دیا تو مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ اس نے فوراً ہی پی لیا۔

ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اُس نے پہلی بار مجھے غور سے دیکھا تو اس کی آنکھیں پُوری طرح کھل گئیں۔ وہ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ چند ہی لمحوں بعد ایک زبردست اشتعال اور التہاب اُس کی آنکھوں میں اُبھر آیا۔ وہ بستر سے اچھل سا گیا، بولا "یہ۔۔۔ تم مجھے کہاں لے آئے ہو، میری گاڑی کہاں ہے؟"

"وہ ادھر ہی ہے بھنڈاری صاحب! فکر نہ کریں۔ آپ کا ڈرائیور بھی بچ گیا ہے۔"

"مگر۔۔ مگر تم کون ہو۔ مجھے کہاں لے آئے ہو تم؟ وہ۔۔۔۔ وہ میری گردن پر تم نے ہی ہاتھ مارا تھا؟ مجھے کیا ہو گیا تھا اور یہ میرے ہاتھ پاؤں کس نے باندھے ہیں؟ کون ہو تم آخر؟"

"زیادہ پریشان نہ ہوں بھنڈاری صاحب! اتنے سارے سوال نہ پوچھیں، ابھی آپ کی کمزوری نہیں گئی ہے۔"

"پر میرے ہاتھ پاؤں کس نے باندھے ہیں؟" وہ رسّی کی گرفت سے اپنے ہاتھ نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔

"ایسا نہ کریں۔ یہ آپ کی کمر سے بندھے ہیں۔ ذرا چھری تلے دم لیں بھنڈاری صاحب اور مجھے بتائیں کہ ڈھلوں صاحب کہاں ہیں؟"

"ڈھلوں صاحب؟" پہلی بار اس کے چھوٹے سے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ میری صورت اُسے شناسا نظر آئی۔

"تو۔۔۔ تم غلام جیلانی ہو۔ اب سمجھا کہ میری اس مصیبت کی وجہ کون ہے۔"

"جی ہاں۔ میں آپ کا وہی غلام جیلانی ہوں حضور! اور میں ڈھلوں صاحب کو لینے آیا ہوں۔"

"وہ۔۔۔ وہ تو ختم ہو گئے ہیں۔ ملہوترا نے انہیں گولی مار دی تھی۔"

"تم غلط کہتے ہو بھنڈاری! میری طرف دیکھ کر مجھ سے آنکھ ملا کر بات کرو، ورنہ تم مجھ سے بچ نہیں سکو گے۔ تمھارے لیے میں نے ایسی سزا تجویز کی ہے کہ تمھارے فرشتے بھی اس سے پناہ مانگتے پھریں گے!" میں نے کشمیر سنگھ کے اوزاروں میں سے ایک شکنجہ ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ وہ شکنجہ لکڑیاں سیدھی کرنے کے کام آتا تھا اور اس کا پیچ ذرا سا زیادہ دبا دینے سے وہ لکڑی کو توڑ بھی سکتا تھا۔

"مجھے بتاؤ ڈھلوں صاحب کہاں ہیں؟ میں انھیں لینے آیا ہوں۔" شکنجہ میرے ہاتھ میں دیکھ کر وہ سہم گیا مگر پھر بھی بڑے جمے ہوئے لہجے میں بولا "میں ٹھیک کہہ رہا ہوں، اسے ہم نے گولی مار دی تھی۔"

"یہ نہیں ہو سکتا ہے بھنڈاری! تو جانتا نہیں ہے میں کون ہوں۔"

"اگر تم نہیں مانتے تو نہ سہی۔" عین اس وقت کمرے کا دروازہ کھُل گیا۔ کشمیر سنگھ اندر جھانک رہا تھا۔ اس کی صورت مجھے اس گھڑی اتنی منحوس دکھائی دی کہ میں شکنجے کو زمین پر رکھ کر تیزی سے اس کی طرف لپکا اور جاتے ہی میں نے اس کی داڑھی پکڑ کر اس کی گردن دبوچ لی۔ میں اس کا وجود برداشت نہیں کر رہا تھا۔ گردن پر ہاتھ ڈالتے ہی میں نے اُسکی رگ کو مسل دیا۔ وہ الٹ کر فرش پر گرا تو میں نے اس کو اٹھا کر دوسرے کمرے میں پہنچا دیا اور اسے لحاف اُڑھا دیا۔ اس کی وہ دخل اندازی مجھے کسی بھی طرح پسند نہ تھی۔ کوئی بھی میرے سامنے ہوتا" میں اُسے اسی راہ سے گزار دیتا۔ بھنڈاری پر میری اس کارروائی کا ـــــ یہ اثر ہوا کہ وہ اچھل کر بستر سے باہر جا پڑا۔ اگر اس کے پاؤں نہ بندھے ہوتے تو وہ اسی وقت کمرے سے باہر نکل جاتا۔ جب میں دوبارہ کمرے میں واپس گیا تو وہ گھسٹتا ہوا دروازے تک جا پہنچا تھا۔ اس کو دونوں بازوؤں میں دبوچ کر میں نے پھر بستر پر ڈال دیا اور شکنجہ لے کر اس کے دونوں پاؤں انگوٹھے کی طرف سے اس کے اندر پھنسا دیے مگر وہ فوراً ہی اچھل کر میرے اوپر آ گرا۔ اس کے ہاتھ کمر پر بندھے ہوتے تو شاید وہ مجھے بے بس کر دیتا۔ انداز اس کا کچھ ایسا ہی تھا۔ میرے سر پر اُس نے پُوری قوت سے ٹکر دے ماری تھی۔ درد کی ایک تیز طرار لہر میرے سر سے نکلی اور پاؤں تک جا پہنچی۔ اُس نے اِس ضرب پر پُورا زور صرف کر دیا تھا مگر میں نے اس کا پاؤں نہیں چھوڑا۔ اس کو میں شکنجے میں دے چکا تو وہ درد سے نڈھال ہونے لگا اور بُری طرح اچھلنے لگا۔ میں نے اس کے منہ سے کپڑا کھینچ لیا۔

"بتا بھنڈاری! اب بھی وقت ہے۔ ڈھلوں صاحب کہاں ہیں؟ بدری کو تو تُو نے مروا دیا مگر اب مجھ سے تو بچ نہیں سکے گا۔" وہ درد سے پاگل ہو کر چیخنے لگا۔ یہ خطرناک بات تھی کیونکہ ہمسائے بھی موجود تھے۔ میں نے پھر کپڑا لے کر اس کے منہ میں ٹھونس دیا۔ اس کی چیخیں تو تھم گئیں مگر اب اس کی اذیت آنکھوں کی راہ سے بہہ نکلی تھی۔

درد نے اُسے پاگل کر دیا تھا۔ میں نے شکنجے کے پیچ ڈھیلے کر دیے اور اس کے مُنہ سے کپڑا نکال دیا۔

"ہاں بتاؤ ڈھلوں صاحب کہاں ہیں؟"

"وہ لابھ سنگھ کے گوردوارے میں تہہ خانے کے اندر پڑے ہیں جب تک ان کے باقی ساتھی یہاں نہیں آ جاتے وہ وہیں پڑے رہیں گے۔"

"یہ گوردوارہ کہاں ہے بھنڈاری! مجھے ان کا صحیح صحیح پتہ معلوم ہونا چاہیے۔"

"امرتسر کے قریب ایک گاؤں ہے سہسرام۔ یہ گوردوارہ وہیں پر ہے۔"

"ان کی نگرانی پر کون لوگ ہوں گے؟"

"وہ سب کے سب اکالی دل کے آدمی ہیں۔ پہرہ وہاں بہت سخت ہوتا ہے۔ اوہ، یہ میرا پاؤں۔ اوف، یہ شکنجہ پرے ہٹا دو۔"

"یہ ہٹ جائے گا بھنڈاری۔ اصل بات تو تم سے معلوم کر لوں۔ سہسرام ہے اس گاؤں کا نام؟"

"ہاں۔ یہاں سے کوئی دس میل دُور ہو گا۔ بٹالہ روڈ سے اتر کر وہاں جاتے ہیں۔ پچھم کی طرف سہسرام میں سنت فتح سنگھ گوردوارے کا انتظام کرتا ہے اس سے کہہ دینا کہ میں نے تمھیں بھیجا ہے۔" بھنڈاری اپنی جان چھڑانے کے لیے قصہ مختصر کر دینا چاہتا تھا۔

"ٹھیک ہے بھنڈاری! جب تک میں واپس نہیں آتا تمھیں ادھر ہی ٹھہرنا ہو گا۔ میں تمھاری بتی ایک بار پھر گُل کر دیتا ہوں۔"

"بھگوان کے لیے یہ کام نہ کرنا۔ میں یہاں تمھارا انتظار کرتا رہوں گا ـــــ میں اِدھر ہی رہوں گا۔ تمھارے خدا رسول کی قسم، یہ کام نہ کرنا۔"

"تو پھر اور کیا کروں؟ تم اصلی کتّے کے بچّے ہو۔ تمھارا منہ کون بند کرے گا؟"

وہ چپ رہا تو میں نے اس کے مُنہ پر کس کر کپڑا باندھ دیا اور پھر ایک رسی لے کر اس کو بستر کے ساتھ جکڑ دیا۔ اس طرح کہ وہ ہل نہیں سکتا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں نے گھر کے تمام دروازے بند کیے اور بڑے دروازے پر تالا ڈال کر میں ٹیکسی میں جا بیٹھا۔ مجھے بہرحال میں سہسرام پہنچنا تھا۔

جب میں ٹیکسی لے کر بڑی سڑک پر پہنچا تو کچھ ہی دُور مجھے ایک گاڑی بان مل گیا۔ وہ سبزیاں لاد کر شہر سے جا رہا تھا۔ اُس کو روک کر میں نے سہسرام کا پتہ پوچھا تو اس نے مجھے بتایا کہ سہسرام وہاں سے کوئی سولہ میل دور ہے۔ سڑک پر اس گاؤں کا بورڈ لکھا ملے گا۔ یہ اچھی بات تھی۔ میرے لیے بڑی آسانی پیدا کرتی تھی۔ میں ایک بار پھر آگے چل نکلا۔

کوئی نو میل کا سفر طے کرنے کے بعد مجھے سڑک پر لکھا ہوا بورڈ مل گیا۔ سڑک پچھم کی طرف جاتی تھی اور آدمی کو سیدھا سہسرام پہنچا دیتی تھی۔ رات کے کوئی ایک بجے میں اس گاؤں میں جا پہنچا۔ گوردوارہ واقعی بہت بالا بلند اور خوبصورت تھا۔ کسی رئیس نے اپنی یادگار وہاں چھوڑ دی تھی اور اب اس میں دن رات واہگورو کی پوجا ہوتی تھی۔ ٹیکسی میں نے گوردوارے سے ذرا دُور کھڑی کر دی اور اس کو تالا لگا کر میں عمارت کی طرف چل دیا۔ دھڑکا مجھے یہ لگا تھا کہ اگر وہ سمجھ گئے کہ میں جعلی سکھ بنا ہوا ہوں تو میرے لیے سخت مشکل پیدا ہو جائے گی پھر بھی میں گوردوارے تک جا ہی پہنچا۔ اس کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ باہر کوئی ذی رُوح مجھے دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ گوردوارے میں تو کوئی بھی آدمی کسی بھی وقت آ سکتا تھا۔ چند منٹ بعد کسی نے دروازہ کھول دیا۔ میرے سامنے کوئی نیند کا مارا ہوا سکھ آنکھیں ملتے ہوئے آ ٹھہرا تھا۔

"ست سری اکال سردار صاحب!"

"ست سری اکال! کیا بات ہے بھائی جی! کہاں سے آئے ہو اس وقت؟"

"سردار جی! میں امرتسر سے آیا ہوں۔ سنت فتح سنگھ سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"ان سے تو تم صبح ہی مل سکتے ہو۔"

"وہ تو ٹھیک ہے، پر مجھے رات گزارنے کے لیے جگہ کی ضرورت ہے۔"

"تو اندر آ جاؤ۔ بہت جگہ ہے یہاں، بستر بھی ملے گا اور بھوجن بھی۔ ویسے کھانا کھا کے آئے ہو کہ نہیں؟"

"میں کھانا کھا چکا ہوں بھائی جی! بس رات گزارنے کے لیے جگہ کی ضرورت ہے۔"

اس نے دروازہ پوری طرح کھول دیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ مجھے ایک بڑے سے کمرے میں لے گیا جس کے فرش پر لمبی سی دری بچھی تھی۔ اور دس بارہ مہمان وہاں پہلے سے موجود تھے۔

اس آدمی نے مجھے ایک لحاف دے دیا اور چھوٹا سا تکیہ بھی۔ بولا "بس یہاں لیٹ رہو صبح تمھیں سنت فتح سنگھ ادھر ہی مل جائیں گے۔"

لیمپ کی روشنی میں وہ سب مہمان مجھے بہت ہی تھکے ہارے نظر آ رہے تھے۔ سب کے سب گہری نیند میں تھے۔ کسی کی آنکھ کھل گئی ہو

تو میں کہہ نہیں سکتا۔ مگر مجھ سے کسی نے بات نہیں کی۔ میں لحاف اوڑھ کر کونے میں جا بیٹھا مگر ساری رات میری آنکھ نہیں لگی۔ لحاف میں خدا جانے کیسے کیسے سُوؤر نے رات گزاری تھی۔ طرح طرح کی بدبوئیں اس میں رچ گئی تھیں مگر وہ زہر تو مجھے بہرحال پھانکنا ہی تھا سو میں پھانکتا رہا۔

گوردوارے کی تعمیر میں یہ امر ملحوظ رکھا گیا تھا کہ وہاں آدمی کی ہر ضرورت پوری ہو جاتی تھی اور کسی آنے والے کو کوئی تکلیف نہیں اُٹھانی پڑتی تھی۔ رات تو میں نے کسی نہ کسی طرح گزار لی ــــ مگر صبح جب میں اٹھا تو مجھے بہت ہی افسوس ہوا۔ مجھے کسی نہ کسی ذریعے سے رات ہی کو معلوم کر لینا چاہیے تھا کہ تہہ خانہ کدھر ہے اور کون سا راستہ وہاں تک جاتا ہے مگر میں کچھ بھی نہ کر سکا۔

اس کمرے میں سوئے ہوئے تمام مہمان صبح سویرے اٹھ گئے۔ کوئی دو آدمی بھی ایک دوسرے کے بارے میں یہ نہیں جانتے تھے کہ وہ کہاں سے آئے ہیں۔ میرا خیال ہے وہ سب کے سب اجنبی تھے۔ بھائی سوار سنگھ ان کے لیے مسواکیں لے آیا۔ تو وہ انہیں چھیلتے ہوئے کنوئیں کی طرف چلے گئے۔ وہاں ستاوے بنے ہوئے تھے۔ باری باری وہ سب نہا لیے جب میری باری آئی تو میں نے صرف منہ ہاتھ دھونا پسند کیا۔ ڈر مجھے یہ تھا کہ میری وِگ پگڑی کے ساتھ کُھل جائے گی۔ بھیس بدلنا بھی ایک عذاب سے کم نہیں ہوتا ہے۔ میں ایسے گھولے میں پڑ گیا تھا کہ مجھے اپنی جان چھُوٹتی نظر نہیں آتی تھی۔ اب مجھ پر خود ترسی کا احساس زیادہ طاری نہیں ہوتا تھا اور میں بلا وجہ بات بے بات خود پر رحم نہیں کھاتا تھا۔ کچھ ان دھکّوں کی مجھے عادت پڑ گئی تھی۔ سُکھ کی نیند سوئے تو مجھے عرصہ ہی گزر چکا تھا۔ وہ جو گھُونی سی مجھے آتی تھی تو اس کی وجہ میری مسلسل پریشانی تھی۔ ہر جگہ مجھے نیا کنواں کھودنا پڑتا تھا۔ میری مزاولت ہی وہی رہ گئی تھی اور وہ گھونگٹ والی ابھی تک میرے سامنے نہیں آئی تھی جسے میں تقدیر کا نام دیتا تھا۔ وہ مُٹھی کھول کر میرے سامنے آ جاتی تو شاید میں کبھی کا گھر لوٹ گیا ہوتا۔ مجھے معلوم تو ہوتا کہ اس کی مُٹھی میں میرے لیے کیا کچھ بند ہے۔ وقت نے طنابیں کھینچ رکھی تھیں اور لمحے مسلسل میرے گرد اپنا گھیرا تنگ کیے رہتے تھے اور اب میں گوردوارے میں جا بیٹھا تھا۔ ایک ایسی واردات کے لیے، جس میں خدا جانے کتنے بے گناہ لوگوں کا خون بہہ جائے۔ کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے ان کا پہلا وار مجھے ہی لے ڈوبے۔

جب میں منہ ہاتھ دھو کر کمرے میں واپس پہنچا تو بھائی سوار سنگھ وہاں آ گیا، بولا۔ "گرنتھ پاٹھ کے لیے نہیں جاؤ گے؟"

"ضرور جاؤں گا۔ چلو، میں تمہارے ساتھ ہی چلتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں اس کے ہمراہ گوردوارے کے بڑے سے ہال میں جا پہنچا۔ بہت سے سکھ وہاں قطار بنا کر بیٹھے تھے اور گرنتھ صاحب ان کے درمیان ایک صاف ستھری میز پر سنہری رنگ کے غلاف میں دھرا تھا۔ ہم جب وہاں پہنچے تو ایک آدمی نے گرنتھ کھول کر پڑھنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد وہ بلند آواز میں بھجن گانے لگے۔ مجھے بھی ان کا باقاعدہ ساتھ دینا پڑا۔ وہ سارا ہی سلسلہ مجھے بالکل دیسی اور نیم حکیمانہ نظر آتا تھا۔ اس میں فلسفۂ وحدانیت کا کوئی نکتہ واضح نہیں تھا۔ گرنتھ میں نے پہلی بار سنا تھا۔ پتہ نہیں ایسا کیوں تھا مگر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ خالص اَن پڑھ قسم کے دیہاتیوں کو ایک مرکز پر جمع کرنے کی ایک کوشش تھی۔ میں وہاں بیٹھا ان کی باتیں سُنتا رہا۔

جب وہ سلسلہ ختم ہوا تو مجھے بھائی سوار سنگھ نے سنت فتح سنگھ سے ملوا دیا۔ گرنتھ کے اشلوک وہی پڑھ رہا تھا۔ بلاشبہ وہ کوئی بہت ہی صاف ستھرا اور خوبصورت سکھ تھا۔ جس کے جسم کا ایک ایک حصّہ مجھے پاک اور پوتر نظر آتا تھا اور اس کی عمر بھی اس کو سج گئی تھی۔ سر سے پاؤں تک وہ سفید لباس میں ملبوس تھا۔ فتح سنگھ مجھے اپنے ساتھ لے کر ہال سے باہر نکلا اور اپنے کمرے میں لے گیا۔ اس میں چاروں طرف گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے اور فرش پر دبیز دری بچھی تھی۔ جب وہ مجھے اپنے پہلو میں بٹھا چکا تو بولا۔ "اب کہو پُتر! مجھ سے کیا کام تھا تمہیں؟"

"میں سچ کہوں یا جھُوٹ؟ آپ کس چیز کو پسند کرتے ہیں سنت جی؟"

"کیا کہا تم نے؟ یعنی تم گوردوارے میں بیٹھ کر جھُوٹ بول لوگے۔ میں تمہاری بات نہیں سمجھا۔"

"بات بڑی ہے سنت صاحب اور میرا منہ چھوٹا ہے۔ اس گوردوارے میں ایک بڑا انیائے ہو رہا ہے۔"

"انیائے! اور گوردوارے میں! تمہاری کوئی بات میرے پلّے نہیں پڑی۔"

"آپ کو معلوم ہے کہ اس گوردوارے کے تین حصّے ہیں۔ دو نظر آتے ہیں، ایک نظر نہیں آتا۔"

"ہاں، دو منزلہ عمارت ہے اس کی۔ ہم نے اس کو ہر لحاظ سے مکمل کیا ہے۔"

"جو حصّہ نظر نہیں آتا۔ اس میں کبھی آپ اُترے ہیں؟"

"نہیں! میں اس میں کبھی نہیں اترا۔ کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ اس کی چابی دوسری چابیوں کے ساتھ سنت ہربنس سنگھ کے پاس رہتی ہے۔ تہہ خانے میں بھی کچھ اکالی رہتے ہیں۔ مگر وہ بھی ہوا والے حصّے میں۔ نچلا حصّہ بند ہی رہتا ہے۔ مگر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

اتنے میں بھائی سوار سنگھ ہمارے لیے ناشتہ لے آیا۔ پراٹھے، مکھن، آم کا اچار اور ساتھ میں لسّی۔ وہ سنت فتح سنگھ نے اپنے سامنے رکھ لیا۔

"لو، پہلے یہ بھوجن کر لو۔ ویسے تمہارا بات کرنے کا طریقہ مجھے پریشان کر گیا ہے۔"

"ہاں۔ پہلے یہ کام تو کر ہی لینا چاہیے۔" یہ کہہ کر میں بھی کھانے میں جُت گیا۔ سنت فتح سنگھ کی رفتار زیادہ تیز تھی۔ مگر میں بھی اس کے ساتھ ہی فارغ ہو گیا۔ لسّی پی کر مجھے محسوس ہوا جیسے میری مدّتوں پرانی آرزو پوری ہو گئی ہے۔ وہ ایسی ہی عمدہ قسم کی جاٹوں کی لسّی تھی۔ جیسے کسی کنواری نے اپنے پوتر ہاتھوں سے بلویا تھا۔

ناشتے کے [illegible] میری طرف متوجہ ہو گیا۔ بولا۔ "اب بتا [illegible] ہے۔ تم پہیلیاں بوجھ رہے ہو؟"

"دیکھیں سنت صاحب! اس تہہ خانے میں ایک آدمی کو ان لوگوں نے ایس کے بھنڈاری کے کہنے پر قید کر رکھا ہے اور اس کا نام ہے مختار ڈھلّوں۔ اسے ان لوگوں نے پاکستان سے اغوا کیا ہے۔" اس کی آنکھیں پھیلنے لگیں۔ وہ سرک کر میرے قریب ہو گیا۔

"تم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہو کہ یہاں کوئی آدمی قید ہے؟"

"جی ہاں۔ میری اطلاع یہی ہے اور میں آپ سے بنتی کرتا ہوں کہ اس آدمی کو رہا کروا دیں۔ ورنہ پتہ نہیں کیا ہو جائے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ٹھہرو، میں سنت ہربنس سنگھ کو بلواتا ہوں۔ اوئے کاکا! سُن ذرا سنت ہربنس سنگھ کو ادھر بھیج دے ذرا۔" اس نے کمرے کے آگے سے گزرتے لڑکے کو آواز دے کر کہا اور پھر بولا۔ "تمہیں یہ بات کس نے بتائی ہے؟"

"بھنڈاری نے۔ میں اس سے مل کر آ رہا ہوں۔ آپ کو یہ نہیں پتہ کہ اس نے ملہوترہ نامی ایک پولیس افسر سے مل کر پاکستان کو نقصان پہنچانے کے لیے وہاں سے کئی مشہور آدمیوں کو اغوا کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ پتہ نہیں اور کون کون سے لوگ اُن کے ساتھ شامل ہیں۔ مگر ابھی تک وہ صرف ڈھلّوں صاحب تک پہنچ سکے ہیں۔"

"یہ تم نئی بات بتا رہے ہو میرے علم میں تو کچھ نہیں ہے۔ آ لینے دو سنت ہربنس سنگھ کو۔ مگر تم کہاں سے آئے ہو؟" اُس نے پہلی بار مجھ سے براہِ راست ایسا سوال کیا جس کا میں صحیح جواب دیتا تو بات وہیں بگڑ سکتی تھی۔

"مجھے یہ بات میرے ایک دوست نے بتائی ہے۔ وہ لاہور میں رہتا ہے اور یہ کام مجھے اسی نے سونپا ہے۔ میرا فرض ہے کہ میں اس کی مدد کروں۔ میرا نام جیون سنگھ ہے۔"

"کہاں رہتے ہو تم؟"

"میں دینا نگر میں رہتا ہوں۔"

"بھنڈاری نے یہ راز تمہیں کیسے بتا دیا؟"

"ایسے ہی میں اس کے دل میں جا گھُسا تھا۔ وہ میرا دوست بن گیا تھا۔"

سنت فتح سنگھ کو میری اس بات پر اعتبار نہیں آیا۔ پھر بھی وہ چُپ رہا۔ چند ہی لمحوں بعد سنت ہربنس سنگھ دروازے میں نمودار ہوا۔ داڑھی اس کی بھی سفید تھی اور خاصی لمبی بھی۔ وہ بھی عمر کے اس حصّے میں تھا جہاں پہنچ کر ساری

ہی سیاہیاں سفیدیوں میں بدلنے لگتی ہیں۔ اس کی بھوئیں بھی سفیدی مائل تھیں۔ وہ گیروے رنگ کا لباس پہنے ہوئے تھا۔ مگر رنگ اس کا بھی بے حد سفید تھا۔ شاید وہ دونوں سنت مغلیہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے کہ ترک تھے۔ دلیسی لوگوں میں ان کی آن بان ہی جدا گانہ تھی۔

"آؤ بھئی ہربنس سنگھ! میں نے تمہیں اس لیے بلایا تھا کہ آج ہم گوردوارے کے تہہ خانے کا معائنہ کرنا چاہتے ہیں۔"

"بڑے شوق سے کریں۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے سنت جی! کب جائیں گے وہاں؟"

"ابھی اور اسی وقت۔ کچھ صفائی شفائی کا انتظام دیکھیں گے ہم۔"

"تو ٹھیک ہے۔ میں چابیاں لے آؤں۔"

"ہاں۔ لے آؤ۔ ہم ابھی تمہارے ساتھ چلتے ہیں۔ یہ گوردوارہ پربندھک کی طرف سے آئے ہیں سردار......"

"جیون سنگھ۔" میں نے اسے یاد دلایا۔

"ہاں سردار جیون سنگھ، ان کو بھی تہہ خانہ دکھا دیتے ہیں۔"

"کوئی حرج نہیں۔" یہ کہہ کر وہ اسی وقت کمرے سے باہر نکل گیا۔

اپنے کمرے سے وہ چابیاں لینے گیا تھا اور چند ہی لمحوں بعد وہ واپس آیا تو ہاتھ میں اس نے چابیوں کا گچھا پکڑ رکھا تھا۔ ہمیں اپنے ساتھ لے کر وہ اسی وقت نچلی منزل کی سیڑھیاں اترنے لگا۔

تہہ خانہ سارے ہی گوردوارے کے نیچے بنا تھا اور ہوادار حصے میں چند مسلح اکالی رہتے تھے۔ وہ راستہ بالعموم کھلا رہتا تھا اصل چابی کی ضرورت ہمیں وسطی اور نچلے حصے کے لیے پڑی۔ جب ہم اکالیوں کے کمرے دیکھ چکے تو ہربنس سنگھ ہمیں تہہ خانے کے عقبی حصے میں لے گیا۔ مگر میں نے دیکھا کہ چار اکالی ہمارے عقب میں آ رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے ذرا آگے بڑھ کر کہا۔

"ادھر کہاں جا رہے ہیں سنت صاحب؟"

"میں ان کو یہ حصہ دکھا رہا ہوں، سنت فتح سنگھ کو۔ یہ صفائی وغیرہ کا انتظام دیکھیں گے۔"

"کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ گوردوارہ پربندھک پارٹی کے حکم کے بغیر کسی گوردوارے کے خفیہ حصے کو نہیں دیکھ سکتے۔"

"کیا مطلب؟ یہ حکم کس نے جاری کیا ہے؟"

"حکم یہی ہے۔ کیونکہ ہر گوردوارے میں کچھ ایسے خانے ہوتے ہیں جن میں سکھوں کی خاص امانتیں رکھی جاتی ہیں۔ یہاں اسلحہ بھی ہوتا ہے اور بارود بھی اور آپ کو یہ بات معلوم ہونی چاہیے۔"

دونوں سنتوں کے رنگ بدلنے لگے۔ وہاں سرخی کی رمق تک باقی نہیں رہی۔

گوردوارہ کسی بہت بڑے رئیس کے خرچ پر چل رہا تھا اور وہ اکالی اس کے خاص آدمی تھے۔ جو ہمیشہ تہہ خانے کی نگرانی پر مامور رہتے تھے۔ دونوں سنت گوردوارے کے تنخواہ دار ملازم تھے۔ اثر و رسوخ ان کا کچھ بھی نہیں تھا صرف گرنتھ صاحب کے پاٹھ کے لیے وہ وہاں موجود تھے۔ وہ اُن اکالیوں کے سامنے دم نہیں مار سکتے تھے۔ سب کے سب بہت ہی زبر جنگ قسم کے لوگ معلوم ہوتے تھے۔ قد کاٹھ کے مضبوط اور چوڑی چکلی چھاتیوں والے اور میں ان کو ایک جانب کھڑا نگاہوں میں تول رہا تھا۔ ان میں سے آتشیں اسلحہ کسی کے پاس بھی نہیں تھا۔ البتہ وہ تیغ، تلوار اور چھُرے کے ماہر معلوم ہوتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے چھُرے ان لوگوں نے پیٹیوں میں دبا رکھے تھے۔

"مگر سردار جسونت سنگھ جی! اس حصے کو دیکھ لینے میں کیا ہرج ہے۔ ہم تو گوردوارے کے ہی سیوک ہیں۔" سنت فتح سنگھ نے کہا۔

"جی نہیں۔ میں تمہیں اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا۔ ہاں، اکالی دَل کا کوئی حکم ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

دونوں سنت پریشان ہو کر مجھے دیکھنے لگے۔ سیڑھیوں کا دروازہ بند تھا اور وہ لوگ تہہ خانے کے روشن دان کی روشنی میں کھڑے مجھے کسی فیصلے پر پہنچنے کا پیغام دیتے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ ڈھلوں صاحب وہیں کسی جگہ بند ہیں۔ اور مجھے ان تک ہر حال میں پہنچنا تھا۔ مگر وہ میرا راستہ روک رہے تھے۔ میرا مغز اُلٹنے لگا۔ اس دیوار کو میں ہر حال میں گرا دینا چاہتا تھا۔ میں سرک کر دیوار کے قریب ہوا اور پھر میں نے جیب سے اپنا چُپ شاہ نکال لیا۔ اس سے کام لینے کا وقت نزدیک آ چکا تھا۔ ایک لحظے کے ہزارویں حصے میں میں نے پستول ان کے سامنے لہرا دیا۔

"سُن اوئے سردارا! یہ حصہ میں آج اور ابھی دیکھوں گا۔ جس میں ہمت ہے، وہ میرا راستہ روک لے۔" یہ کہہ کر میں نے ہربنس سنگھ سے چابیاں جھپٹ لیں۔ وہ چاروں اکالی ایک لحظے کے لیے تو حیرت زدہ سے ہو گئے۔ مگر جسونت زیادہ

دیر تک صبر نہ کر سکا۔ اس نے پیٹی میں سے اپنا چھُرا باہر نکال لیا۔

"اوئے، اس کے ڈکرے کر دو اوئے۔ یہ بچ کر نہ جائے اس کے پستول کی پرواہ مت کرو۔" یہ کہہ کر اس نے مجھ پر وار کرنے کے لیے بائیں ہاتھ سرکنے کی کوشش کی۔ دائیں ہاتھ سے وہ تینوں اکالی بھی میری طرف بڑھے۔ مگر میں دیوار سے ٹیک لگا کر پیچھے ہٹا اور پہلی گولی میں نے جسونت سنگھ کے پاؤں میں اتار دی۔ گولی اصلی تھی اور کام کرتی تھی۔ پستول میں نے خواہ مخواہ جیب میں نہیں ڈال رکھا تھا۔ وہ گولی کھا کر ذرا سا اچھل کر دھڑام سے نیچے گر گیا۔ اتنے میں وہ تینوں اکالی میرے اور زیادہ قریب آ گئے۔ ایک کا ہاتھ تو میرے گریبان پر آ پڑا۔ میں نے انتہائی غضب ناک ہو کر بائیں ہاتھ سے اس کی گردن مسل دی۔ وہ نیچے گرا تو دونوں سنت شور مچاتے ہوئے پیچھے ہٹے مگر میں نے انہیں آگے نہیں جانے دیا۔

"تم یہیں رُک جاؤ اوئے۔ ان کا تماشا دیکھتے جاؤ۔ زیادہ شور مچایا تو میں تمہیں بھی ختم کر دوں گا۔" وہ رُک گئے مگر اس عرصے میں دوسرے دو اکالی خاصے پیچھے ہٹ چکے تھے۔ میں نے اُن کو بے کار کر دینے کے لیے جان بُوجھ کر ان کی ٹانگوں کو چھلنی کر دیا۔ وہ گولیاں ٹھیک نشانے پر بیٹھیں۔ چھُرے ان کے ہاتھ سے گر گئے تھے۔ دونوں سنتوں کو میں نے اگلے دروازے کی طرف بڑھا دیا۔

"چلو اوئے! یہ دروازہ کھولو۔ میں ان کو ساتھ لے کر نیچے جاؤں گا۔" یہ کہہ کر میں نے ان دونوں اکالیوں کو بالوں سے پکڑ کر اوپر اٹھایا اور انہیں کھینچ کر میں وسطی حصے کے بڑے دروازے تک لے گیا۔ پہلی ہی چابی کام کر گئی۔ ہربنس سنگھ کو معلوم تھا کہ کونسا تالا کس چابی سے کھُلتا ہے۔

تالا کھُلا تو میں نے چاروں اکالیوں کو کھینچ کر نیچے اتار دیا۔ اس کام میں ان سنتوں نے بھی میری مدد کی۔ میرے پستول سے وہ بہت زیادہ خوف زدہ ہو چکے تھے۔ نو قدم کی سیڑھی وہاں بھی موجود تھی اور نچلے کمروں سے بوسیدہ، گندی ہوا برابر اوپر آ رہی تھی۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ وہ دروازے بہت دنوں سے بند ہیں۔ وہاں کی ہوا سانس میں گھٹن پیدا کرتی تھی۔ مگر میں تو ناگ کھا چکا تھا۔ مجھے اس ہوا سے زیادہ ڈھلوں صاحب کے سانسوں کی تازگی درکار تھی۔ چاروں اکالی ایک کونے میں ڈھیر ہو چکے تھے۔ ان کی گردنیں میں نے اچھی طرح مسل دی تھیں۔ میں ان کو مارنا تو نہیں چاہتا تھا۔ ان کا تو کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ تو محض پہرہ دینے والوں میں شمار ہوتے تھے۔ قصہ اب صرف ان دو سنتوں کا تھا جو ابھی تک میرے ساتھ چل رہے تھے۔ مگر وہ اتنے خوف زدہ ہو چکے تھے کہ میں اگر ان سے کہتا کہ وہ کنوئیں میں چھلانگ لگا دیں تو وہ انکار نہیں کر سکتے تھے۔ ہم ذرا آگے بڑھے تو ہوا میں مجھے تبدیلی سی محسوس ہوئی۔ ہربنس نے دائیں ہاتھ ڈیوٹ پر رکھی بڑی سی موم بتی جلا دی۔ اس کمرے کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ وہاں اسلحے کے طومار لگے تھے۔ اس میں بندوقیں بھی تھیں اور پستول سے لے کر اسٹین گن تک ہر ہتھیار وہاں موجود تھا۔ کئی بڑے اور چھوٹے ڈبے بارود سے بھرے ہوئے تھے۔ ان میں گولیاں بھی تھیں اور دھماکہ خیز بم بھی۔ پتہ نہیں اتنا اسلحہ ان لوگوں کے پاس کہاں سے آیا تھا اور وہ اسے کہاں استعمال کرنا چاہتے تھے۔ بلاشبہ سہسرام کا وہ گوردوارہ اپنی ذات میں پورا اسلحہ خانہ بنا ہوا تھا اور وہ اکالی دن رات اس کی نگرانی کرتے تھے۔

دونوں سنت اس منظر سے زیادہ متاثر نظر نہیں آتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ اس بات کا انہیں علم تھا کہ نچلے حصے میں اسلحہ بند ہے۔ ہربنس سنگھ نے کمرے سے باہر آ کر دروازہ بند کرنا چاہا تو میں نے اسے روک دیا۔

"تم اُدھر ہی ٹھہرو۔ اور میرا انتظار کرو۔ یہ چابیاں مجھے دے دو۔" مگر ہربنس سنگھ اس پر آمادہ نہیں ہوا۔ وہ متذبذب دکھائی دیا تو میں نے تیزی سے اس کی گردن پر ہاتھ ڈالا اور اس کی رگِ احساس مَسل دی۔

اس کا یہ انجام دیکھ کر دوسرا سنت تیزی سے باہر کی طرف بھاگنے لگا۔ مگر میں نے اس کو چھوڑ دینا کسی بھی طرح مناسب نہ سمجھا اور پستول کا دستہ تڑاخ سے اس کی گدّی پر دے مارا۔ اس کی بگڑی مزاحمت پیدا کرتی تھی مگر میں نے ضرب کچھ زیادہ ہی شدید لگائی۔ وہ لڑکھڑا کر زمین پر گر گیا۔ انہیں یوں پیوندِ زمین کر کے میں اس کمرے سے نکلا تو معلوم ہوا کہ ویسے ہی تین کمرے وہاں اور بھی موجود تھے اور ان میں بھی اسلحہ بھرا ہوا تھا۔ ایک ایک کمرہ کھول کر میں نے دیکھ لیا مگر مجھے ڈھلوں صاحب کہیں نظر نہیں آئے۔ ان کمروں کے بائیں ہاتھ ایک چھوٹی سی گلی بنی ہوئی تھی۔ اس میں سے گزر کر میں گوردوارے کے عقبی کمرے تک جا پہنچا۔ ابھی تک کئی چابیاں میں استعمال نہیں کر سکا تھا۔

اس کمرے کو جب میں نے کھولا تو وہاں مجھے سامنے کے روشن دان میں سے ہلکی ہلکی روشنی دکھائی دی۔ جب میری آنکھیں ذرا اس منظر سے متعارف ہو گئیں تو میں یہ دیکھ کر حیران

رہ گیا کہ کمرے کی آخری دیوار کے ساتھ ایک چارپائی بچھی تھی۔ اور اس پر کوئی آدمی نیم بے ہوشی کے عالم میں پڑا تھا۔ کمرے میں تعفن اتنا تھا کہ وہاں کھڑا رہنا کسی بھی طرح ممکن نہیں تھا۔ پھر بھی میں اپنا سانس دبا کر جب آگے بڑھا تو میں اس آدمی کی تقدیر پر حیرت زدہ رہ گیا۔ میرے سامنے مختار ڈھلوں اس چارپائی پر زندہ مگر مُردوں سے بدتر حالت میں پڑے تھے۔ ان کی داڑھی بڑھ آئی تھی۔ بال بھی بہت زیادہ الجھے ہوئے تھے۔ اور ان کی حالت ایسی تھی، جیسے کوئی شخص پھانسی کی کوٹھری میں پڑا اپنا سب کچھ قسمت کے حوالے کر دے۔ ان کے پاؤں دیوار میں گڑی زنجیر سے بندھے تھے۔ جو اتنی لمبی ضرور تھی کہ وہ کمرے میں تھوڑا بہت گھوم سکتے تھے۔ ہاتھ البتہ ان کے بالکل آزاد تھے اس قیدِ تنہائی میں مسلسل بند رہنے کی وجہ سے ان کا رنگ پیلا پڑ چکا تھا۔ میرا خیال ہے وہ لوگ انہیں خوراک بھی صحیح نہیں دیتے تھے۔ وقت کا احساس شاید انہیں نہیں رہ گیا تھا۔ وہ ابھی تک آنکھیں بند کیے کوئی بھولا بسرا خواب دیکھنے میں مصروف تھے۔ ایک بھاری بھرکم کمبل البتہ ان کا رفیق بنا ہوا تھا، اور یہ اچھی بات تھی۔ ورنہ وہ اس سردی میں تو اندر سے بالکل ہی کچلے جاتے۔ میں جب ان کے پاس پہنچا تو روشن دان میں سے چھن کر اندر آنے والی روشنی میں ان کو ایسی دگرگوں حالت میں دیکھ کر لرز اٹھا۔ وہ اس لیے تو نہیں بنے تھے۔ انہیں تو حکم دینے کی عادت تھی۔ ایسے حجلۂ تاریک میں وہ اتنے دن کیسے زندہ رہ لیے تھے میرے پاؤں کی چاپ شاید انہوں نے سن لی تھی۔ انہوں نے پریشان ہو کر ایک دم آنکھیں کھول دیں۔

"ڈھلوں صاحب!" میں نے ان کے ماتھے پر بڑے پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے ڈھلوں صاحب!" میری آواز لرزنے لگی تھی۔ ان کی یہ ناگفتہ بہ حالت مجھ سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔

میری آواز پر وہ چونک کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ "یہ میں کیا سُن رہا ہوں..... کیا تم ہاشم خان ہو؟"

"ہاں ڈھلوں صاحب! میں ہاشم خان ہوں۔ ان کی قید میں آپ کیسے پھنس گئے؟ یہ کیا حال کر دیا ہے۔ ان لوگوں نے آپ کا؟" میں نے ان کے جسم سے کمبل پرے ہٹا کر انہیں بازوؤں میں لے لیا۔ میری اس لمحے چیخیں نکل گئی تھیں۔ ڈھلوں صاحب میری آواز پہچان کر بے تحاشا رونے لگے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اپنے محسن کا کیسے شکریہ ادا کریں۔ وہ جھک کر میرے پاؤں چھونے لگے۔

"کیا کرتے ہیں ڈھلوں صاحب! یہ میرا فرض تھا جناب!"

"کیا میں واقعی ایسا خوش نصیب ہوں؟ یہ تم ہی ہو نا ہاشم خان! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟ تم مجھے بچا لو گے نا؟"

"ہاں ہاں، ڈھلوں صاحب! آپ فکر نہ کریں۔ اپنے آپ کو سنبھالیں۔"

"مگر..... مگر میری یہ زنجیر مجھے زیادہ آگے بڑھنے ہی نہیں دیتی۔"

"اس کو میں ابھی کھول دوں گا۔" یہ کہہ کر میں نے یوں ہی اٹکل پچو کئی چابیاں زنجیر کے تالے میں لگائیں۔ ایک چابی کام کر ہی گئی۔ ڈھلوں صاحب کے پاؤں آزاد ہوئے تو وہ ایک دم آگے بڑھ آئے۔ ان کا جسم ابھی تک صحیح سالم تھا۔ وہ انہی کپڑوں میں ملبوس تھے۔ جن میں ان لوگوں نے انہیں گرفتار کیا تھا اور وہ بہت میلے ہو چکے تھے۔ بستر پہ ایک دری بچھی تھی جس کا عیب ڈھانپنے کے لیے انہوں نے وہاں ایک چادر ڈال دی تھی۔ وہ چادر میں نے اٹھا کر ڈھلوں صاحب کو اُڑھا دی۔ ایک اور چادر وہاں پڑی تھی۔ وہ بھی انہوں اٹھالی اور بوٹوں کے تسمے باندھ کر لیے۔

"اب کیا سوچا ہے تم نے۔ ہم یہاں سے کیسے نکلیں گے؟"

"یہ لیں، یہ پگڑی باندھ لیں۔ میں آدھی آپ کو کاٹ دیتا ہوں۔ ہم یہاں سے سِکھ بن کر باہر نکلیں گے۔"

میں نے اپنی پگڑی انہیں آدھی کاٹ کر دے دی۔ وہ انہوں نے سکھوں کی طرح سر پہ باندھ لی۔ داڑھی ان کی پہلے ہی کوئی بالشت بھر ہو چکی تھی۔ وہ بہت دنوں سے ان کی قید میں پڑے تھے اور ان کی حجامت کا تو وہاں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ اپنی بھی حجامت نہیں کرتے تھے، اُن کو بھلا کون پوچھتا تھا۔

"میں..... کیسے تمہارا شکریہ ادا کروں ہاشم خان! تم نے مجھے خرید لیا ہے۔ وہ لوگ مجھے اس روشن دان میں سے کھانا اندر پہنچاتے تھے۔ پتہ نہیں مجھ سے انہیں کیا بَیر ہے؟"

"گھبرائیں نہیں! پچھلی باتوں کو بھول جائیں اور یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں۔" یہ کہہ کر میں نے چادر ان کے جسم پہ اچھی طرح اُڑھا دی اور انہیں ساتھ لے کر اسی وقت کمرے سے باہر نکل آیا۔ ڈھلوں صاحب پُرعزم معلوم ہوتے تھے اگرچہ اس صعوبت نے ان کی کایا ہی پلٹ دی تھی۔ مگر یہ دیکھ کر میں ان کی رہائی کے لیے وہاں آ پہنچا ہوں۔ وہ ایک دم اپنے بدن میں زبردست توانائی محسوس کرنے لگے تھے۔

اس کمرے سے نکل کر ہم گلی میں آئے اور پھر ہم ان کے اسلحہ خانے میں جا گھسے۔

"یہ..... یہ کون لوگ ہیں۔ یہ تو مر چکے ہیں شاید۔"

"نہیں، ابھی یہ زندہ ہیں مگر ان کو مار دینا بہت ضروری تھا۔ آپ اندر سے دو اسٹین گنیں اور گولیوں کا ڈبا اٹھالیں" ڈھلوں صاحب اس کمرے میں گھسے اور روشن دان کی راہ سے آتی روشنی میں ہتھیاروں کو دیکھنے لگے۔ چند ہی لمحوں بعد انہوں نے وہاں سے دو اسٹین گنیں اٹھالیں اور گولیوں کا ایک ڈبا بھی۔ ایک اسٹین گن میری طرف بڑھا کر بولے۔ "باہر تو زبردست پہرہ ہو گا۔"

"ہے تو سہی مگر اللہ مالک ہے۔ بس اب آپ نکل چلیں اور ان کو اِدھر ہی بھر لیں۔ پتہ نہیں اوپر کیا حالات ہوں۔"

اسٹین گنیں بھر کر ہم کمرے سے نکلے اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔ کسی بھی کمرے کو ہم نے مقفل نہیں کیا تھا۔ اتنی مہلت ہی ہمیں نہیں مل رہی تھی۔ ایک ایک لمحہ بڑا قیمتی تھی۔

"اپنا ہتھیار چادر میں چھپالیں ڈھلوں صاحب! یہ بہت ضروری ہے۔" میں نے تہہ خانے سے نکل کر سیڑھیاں عبور کرتے ہوئے کہا۔ ڈھلوں صاحب مجھ سے کہیں زیادہ محتاط تھے اور شکل و صورت سے وہ خود کو مکمل سِکھ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر ان کی شلوار کچھ اور ہی ثابت کرتی تھی۔ سکھ عموماً پاجامہ پہنتے تھے۔ اس کا حل انہوں نے یہ نکالا کہ وہ بستر کی دوسری چادر کھول کر پہننے لگے۔ شلوار انہوں نے سیڑھیوں میں ہی چھوڑ دی۔

جیسے ہی سیڑھیاں عبور کر کے ہم اوپر پہنچے تو مواد الحقے میں رہنے والے اکالی ہمارے سامنے آگئے۔ وہ تعداد میں تین تھے اور ہمارا راستہ روکے ہوئے تھے۔ مگر ابھی ان کو یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ ان کے ساتھیوں کا کیا حال ہو چکا ہے۔

"سنت جی! وہ سردار جسونت سنگھ کہاں ہیں؟"

"وہ نیچے تہہ خانے میں ہیں۔ کچھ کام تھا انہیں وہاں۔" میں نے انہیں جواب دیا۔ مگر عین اسی وقت ان کی نظر ڈھلوں صاحب پر جا پڑی۔ وہ ایک دم چونک اٹھے۔

"یہ..... اس کو کہاں لے جا رہے ہو؟ کس کے حکم سے لے جا رہے ہو؟" ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر ہمارا راستہ روکتے ہوئے کہا۔

"ہٹ جا پیچھے اوئے! ورنہ تیری لاش ہی نظر آئے گی یہاں۔" میں نے اپنا چپ شاہ تانتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی بائیں ہاتھ سے اس کی گردن دبا دی۔ اس کی رگ مسلی گئی تو اسے ایک جھٹکا سا لگا اور وہ اچھل کر دوسری طرف جا گرا۔ یہ تماشا ان دو اکالیوں کے لیے بڑا ہی حیرت انگیز تھا۔ "چلو اوئے، اندر چلو ورنہ اچھا نہیں ہو گا۔" میں نے ان پر دونوں ہتھیار تان لیے۔ "چلو کمرے میں ڈنگرو!" یہ کہہ کر میں نے ان کو دھکیل کر سامنے کے کمرے میں لے جا کر فوراً ہی اس کا دروازہ بند کر کے باہر سے کنڈی چڑھا دی۔ مگر میں یہ بھول گیا کہ ان کا منہ بند کرنا بھی ضروری تھا۔ مگر اب وقت گزر چکا تھا۔ ان کو وہیں چھوڑ کر میں ڈھلوں صاحب کے ساتھ گوردوارے کی پہلی منزل پہ جا پہنچا۔ ہتھیار ہم نے کپڑوں میں چھپا لیے تھے۔ مگر یوں کہ کوئی اگر ذرا سی بھی گڑبڑ کرتا تو ہم اسے بھون کر رکھ دیتے۔

گوردوارے کے بڑے دروازے تک پہنچنے میں ہمیں دو منٹ لگے۔ ڈھلوں صاحب کی پگڑی ان کی ڈھال بن گئی تھی۔ اور چادر نے انہیں صاف بچا لیا تھا۔ شکل و صورت سے وہ اس گھڑی بالکل ہی سکھ معلوم ہو رہے تھے۔ "چلیں آگے نکلیں۔ سواری میرے پاس موجود ہے۔" میں نے انہیں آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

چند ہی لمحوں بعد ہم ٹیکسی تک جا پہنچے۔ ایک ایک لمحہ میرے لیے بہت قیمتی تھا۔ ٹیکسی میں بیٹھتے ہی ڈھلوں صاحب نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اپنی طرف سے انہوں نے سر سجدے میں ڈال دیا تھا۔

ٹیکسی اسٹارٹ کر کے میں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ اندھا دُھند میں اس کی رفتار بڑھاتا چلا گیا۔ ٹیکسی ابھی بڑی سڑک سے دُور ہی تھی کہ میں نے اس کا رُخ فتح گڑھ چوڑیاں کی طرف موڑ دیا۔ ایک سڑک مجھے وہاں سے پچھم کی طرف جاتی دکھائی دی۔ جس پر فتح گڑھ چوڑیاں لکھا تھا۔ مجھے ہر حال میں وہ علاقہ چھوڑ دینا تھا۔ جس نے بار بار میرے صبر کو للکارا تھا۔ وہ سڑک ایک بار پھر موڑ کاٹ کر سہسرام کے پاس سے گزرتی تھی۔ اسی وقت سکھوں کا ایک پورا جتھا گھوڑوں پر سوار مجھے اپنی طرف بڑھتا نظر آیا۔ وہ بندوقوں سے مسلح تھے میں نے ٹیکسی کو موڑا اور ایک چھوٹی سڑک کے ذریعے گھوم کر پھر اسی سڑک پہ آگیا جو فتح گڑھ کی طرف جاتی تھی۔ ٹیکسی سکھوں کی نظر میں آ چکی تھی۔ گھوڑ سوار پاگلوں کی طرح میرے پیچھے لپکے چلے آ رہے تھے اور مجھے یہ ڈر تھا کہ اگر انہوں نے فائر کر دیا تو وہ ٹیکسی کے ٹائر پھاڑ دیں گے۔ ان کا پہلا حربہ یہی ہو گا۔ فاصلہ یہی کوئی چار فرلانگ کا رہ گیا تھا اور وہ چاروں طرف پھیل کر میرے تعاقب میں آ رہے تھے۔ ڈھلوں صاحب بھی انہیں دیکھ چکے تھے اور وہ سراسیمہ نظر آتے تھے۔ اسٹین گن ان کے ہاتھ میں تو تھی مگر ان کی انگلیاں لرز رہی تھیں۔

"ہمارے پیچھے ایک پورا جتھا آ رہا ہے ڈھلوں صاحب!"

"ہاں۔ میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ کچھ ان کا بندوبست کرو۔ ورنہ تو یہ ہمیں جانے نہیں دیں گے"

"یہ کام آپ کو کرنا ہوگا۔ پچھلی سیٹ پر چلے جائیں اور جو بھی سامنے آئے اُسے گولی ماردیں۔ اسٹین گن دُور تک کام کرتی ہے"

"ہاں۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ ٹیکسی کی رفتار آہستہ نہیں ہونی چاہیے" یہ کہہ کر وہ پچھلی سیٹ پر جا بیٹھے۔ ایک بڑا ہی قیامت خیز مرحلہ ہمارے سامنے تھا۔ وہاں سے بچ نکلنے کی ہمیں کوئی امید نہیں رہ گئی تھی۔

سکھ بپھرے ہوئے تھے اور ست سری اکال کے نعرے لگاتے ہوئے چلے آرہے تھے۔ وہ ان کا علاقہ تھا۔ ذرّے ذرّے پر اُن کی حکمرانی تھی۔ وہاں سے کوئی ان کے شکار کو ان سے چھین کر لے جائے، یہ انہیں کسی طرح بھی منظور نہیں تھا۔

سڑک پر دائیں ہاتھ آنے والے سواروں نے سب سے پہلے فائر کیا۔ ان کے ہاتھوں میں کاربین قسم کی بندوقیں تھیں۔ دو گولیاں ٹیکسی کے ٹائروں پر برسیں مگر وہ مڈ گارڈ کو چیر کر آگے نکل گئیں۔ میں نے ٹیکسی کی رفتار اور تیز کردی۔ اب وہ ساٹھ پینسٹھ میل کی رفتار سے چل رہی تھی۔ گھوڑے ذرا دیر کے لیے نظروں سے اوجھل ہوئے تو میں سمجھا کہ میں ان کی زد سے بچ نکلا ہوں۔ مگر میرا اندازہ غلط نکلا۔ سڑک ایک لمبا موڑ کاٹ کر آگے گزرتی تھی اور یہی وہ بھی چاہتے تھے۔ گھوڑے درمیانی راستے پر دوڑا کر وہ ایک دم ہمارے سامنے آگئے۔ وہ چار آدمی تھے اور گھوڑا دوڑانے کے فن میں ماہر۔ ایک بار پھر ان لوگوں نے ہم پر گولی چلادی۔ اب کی بار دو گولیاں پچھلے شیشے میں لگیں اور وہ کرچی کرچی ہو کر اُڑ گیا۔ ڈھلوں صاحب اب ان کے بالکل سامنے تھے۔ انہوں نے اب تک کوئی فائر نہیں کیا تھا۔ مگر دو گھوڑ سوار جیسے ہی ٹیکسی سے کوئی پچاس گز دُور پہنچے تو ڈھلوں صاحب نے سر اونچا کر کے سواروں کو مارنے کے بجائے ان کے گھوڑوں پر گولی چلا دی۔ ایک دو تین چار گولیاں ان کی اسٹین گن سے نکلیں اور میں نے ٹیکسی کے عقب نما میں دیکھا کہ دو گھوڑ سوار فوراً ہی نیچے جا گرے۔ دونوں کے گھوڑے شدید زخمی ہو چکے تھے۔ ان کے سوار سر کے بل زمین پر گر پڑے اور پھر فوراً ہی اٹھ کر وہ بندوقیں سیدھی کرنے لگے۔ دو سوار اب بھی ہمارے اوپر چڑھے آتے تھے۔ ان کی گولیاں اُن سے زیادہ تیز تھیں۔ ٹیکسی پر ان لوگوں نے چھ گولیاں برسائیں۔ ڈھلوں صاحب سیٹ کے عقب میں چھپ گئے تھے۔ مگر جیسے ہی انہیں ذرا سا وقفہ ملا۔ انہوں نے پھر گھوڑوں کو تاک کر گولی چلادی۔ پتہ نہیں، وہ سواروں پر گولی کیوں نہیں چلا رہے تھے کہ عین اس وقت میری ٹیکسی جواب دے گئی۔ اس کا پٹرول ختم ہو چکا تھا۔ میری زندگی کا بدترین لمحہ سامنے آگیا تھا۔ میں نے ٹیکسی کا اسٹیئرنگ چھوڑ کر اسٹین گن سنبھال لی۔

ڈھلوں صاحب جن دو سواروں کو سنبھال نہیں سکے تھے اور جن پر ان کی گولیاں اثر نہیں کر سکی تھیں۔ وہ اب میرے سامنے تھے۔ میں نے پچھلے حصّے کے ٹوٹے ہوئے شیشے میں سے انہیں دیکھا۔ وہ اب ہم سے صرف دس گز دُور رہ گئے تھے کہ ڈھلوں صاحب نے ان پر پھر وار کیا اور تیسرا آدمی نیچے گرا لیا۔ مگر جیسے ہی وہ نیچے گرا، چوتھے سوار کا بے مثال حوصلہ اسے اچھال کر ہمارے پاس لے آیا۔ وہ پلک جھپکنے کی مدت میں گھوڑے سے اُترا اور اس کی اوٹ میں ہو کر اس نے ہم پر ایسے بے دریغ انداز سے گولی چلائی کہ اگر ڈھلوں صاحب ٹیکسی کی عقبی سیٹ کی اوٹ نہ لیتے تو اُن کا مغز اُڑ گیا ہوتا۔ اتنے میں اُن کے باقی سوار بھی مجھے کھیتوں کی طرف سے اپنی طرف لپکتے نظر آئے۔ سامنے کے گھوڑ سوار نے یہ خیال نہیں کیا کہ وہ گھوڑے کے عقب میں ٹھہر کر اپنا پیٹ ہم سے نہیں بچا سکے گا۔ وہ ڈھلوں صاحب کی زد میں آیا تو انہوں نے اسے تاک کر گولی چلادی۔ گھوڑ سوار پیٹ میں گولی لگنے سے اُچھلا اور گھوڑے سے کئی ہاتھ دُور جا گرا۔ بندوق اس کے ہاتھ سے گر گئی تھی۔ کھیتوں میں سے جو لوگ نکل رہے تھے ان کی نیت کو سمجھ کر میں نے ٹیکسی چھوڑ کر سامنے کے گنّے کے کھیت میں پناہ لینے کی کوشش کی مگر عین اس وقت چار گولیاں میرے وجود پر سے گزر گئیں۔ میں زمین پر جُھک کر کھیت کی طرف بڑھا۔ سامنے ہی ایک درخت تھا۔ اس کی اوٹ میرے بہت کام آئی اور میں نے اس کے پیچھے جا کر ان کو باڑھ پر رکھ لیا۔ ایک ایک لمحہ بہت قیمتی تھا۔ ٹیکسی کے اندر سے بھی برابر گولیاں چل رہی تھیں اور سکھ اب کوئی اوٹ ڈھونڈ رہے تھے۔ اب تک ان میں سے ہم صرف ایک ہی کو ہلاک کر سکے تھے۔ وہ گھوڑوں سے اتر کر کھیت کی مچان کے پیچھے لیٹ گئے۔ ان کے گھوڑے اب بھی صاف نظر آتے تھے۔ مگر ان میں سے کوئی بھی آدمی میری زد میں نہیں تھا۔ مگر ڈھلوں صاحب اونچی جگہ پر بیٹھے تھے۔ اچانک مجھے ٹیکسی میں سے تین گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی مچان کے پیچھے سکھوں کی لرزہ خیز چیخیں فضا میں پھیل گئیں۔ ڈھلوں صاحب کے پاس گولیوں کا ڈبّا تھا۔ جبکہ میرے پاس صرف وہی گولیاں تھیں جو اسٹین گن میں ڈال دی گئی تھیں۔ میں کوئی گولی ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اچانک

[...]بے ڈھلوں صاحب ٹیکسی کے دروازے میں سے باہر آتے دکھائی [...]یے۔ میں درخت کے تنے کو تھام کر کئی ہاتھ اوپر اٹھ گیا اور [...]س کی ایک موٹی شاخ پر قدم جما لیے۔ درخت شیشم کا تھا [...]اس کے پتّے اس موسم میں اس کا ساتھ چھوڑ رہے تھے۔ میں [...]نا ید سامنے کی مچان کے پیچھے بیٹھے سکھوں کو اچانک نظر آگیا تھا۔ [...]گولیاں، چار بندوقوں سے میری طرف نکلیں۔ میں تو شاید [...]ن گولیوں کی نذر ہو گیا ہوتا۔ مگر میں نے انہیں بندوقیں سیدھی [...]رتے دیکھ کر نیچے چھلانگ لگا دی تھی۔ تب مجھے محسوس ہوا کہ [...]ڈھلوں صاحب میرے پاس پہنچ رہے ہیں۔ ان کا چہرہ غصّے [...]ے تمتا رہا تھا۔ بولے۔

"یہاں سے نکل چلو۔ ورنہ یہ لوگ ہمیں یہاں ہی ختم کر [...]دیں گے"

"وہ ڈبّا مجھے دیں۔ میں ان کو ختم کیے بغیر آگے نہیں نکلوں گا" وہ ڈبّا بغل میں دبائے ہوئے تھے۔ ابھی وہ اسے میری [...]طرف پھینک ہی رہے تھے کہ سامنے سے کئی گولیاں چلیں۔ سکھوں کا اندازہ درست تھا۔ ہم کھیت کے اندر درخت کے پاس ہی کھڑے تھے۔ میں نے ایک بار پھر ان کی گولی کا جواب گولی سے دیا۔ وہ ابھی [...]تک مچان کے پیچھے بیٹھے تھے اور سامنے آنے کا خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ عین اسی وقت سڑک پر کسی زخمی سوار کا گھوڑا گولیوں کی تڑ تڑ سے عاجز آکر کھیت میں گھس آیا۔ وہ اندھا دُھند ہماری طرف بھاگ رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کی لگام پکڑ لی۔ مگر اس عرصے میں ڈھلوں صاحب دشمن کی طرف کئی گولیاں برسا چکے تھے۔ وہ انہیں برابر مصروف رکھ رہے تھے اور انہیں یہ اندازہ نہیں ہونے دیتے تھے کہ ہم کہاں کہاں اور کس زاویے پر بیٹھے ہیں۔ گنّے کا کھیت ہماری بہت مدد کر رہا تھا۔ گھوڑے کی لگام ہاتھ میں لیتے ہی میں نے ڈھلوں صاحب کو پکارا۔ وہ تو شاید اسی تاک میں تھے۔ پلٹ کر فوراً ہی میرے پیچھے آ بیٹھے۔ اور ہم کھیت کے اندر ہی اندر دوسری طرف بھاگنے لگے۔ دشمن کو ابھی تک یہی معلوم تھا کہ ہم کھیت میں مورچہ بند ہیں۔ چند منٹ اسی طرح گزر گئے۔ اُن کی طرف سے کوئی گولی نہیں چلی مگر اس عرصے میں ہم کماد میں سے نکل کر بہت آگے جا چکے تھے۔ پتہ انہیں جب ہی چلا، جب ہم وہاں سے شاید دو میل آگے نکل چکے تھے۔

گھوڑا گولیوں کی مسلسل تڑ تڑ سے اتنا پریشان تھا کہ اس کی رفتار میرے اندازے سے بھی زیادہ تیز نکلی۔ سکھ بہت پیچھے رہ گئے تھے اور انہیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ ہم کس طرف نکلے ہیں۔ کچھ ہی دیر بعد ہم مکئی کے کھیت میں جا گھسے۔ اس کی کٹائی کا وقت قریب آ چکا تھا مگر کسانوں نے ابھی اس پر ہاتھ نہیں ڈالا تھا۔ اس میں سے گزر کر ہم خدا معلوم کہاں کہاں سے گزرتے ہوئے کئی پگڈنڈیاں پار کر گئے۔ مگر ہمارا اندازہ غلط نکلا۔

دو سکھ گھوڑیاں پھڑکاتے ہوئے ہمیں اچانک ایک پگڈنڈی کے گرد اُگی اونچی اونچی جھاڑیاں پھلانگتے بائیں ہاتھ سے نکلتے نظر آئے۔ ان کی تیز رفتاری نے ہمیں حیران کر دیا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ گھوڑیوں کو رالوں میں پھنسا کر اُڑ رہے ہیں۔ ان میں سے ایک نے جھاڑیوں سے نکلتے ہی گھوڑی ہمارے اوپر چڑھا دی۔ اس طرح کہ ہمارا گھوڑا بدک کر دائیں طرف نکلا مگر وہ جھاڑیوں میں اُلجھ کر رہ گیا اور ہم دونوں منہ کے بل نیچے گر گئے۔ سکھ سوار نے آتے ہی ہم پر فائر کر دیا مگر میں گھوڑے کے عقب میں جا گرا تھا۔ گولی گھوڑے کی گردن میں سے گزر گئی۔ وہ خود بھی اپنی جھونک میں گھوڑے سے گر پڑا۔ اتنے میں اس کا دوسرا ساتھی بھی ہم تک آ پہنچا۔

میں نے ڈھلوں صاحب کو بچانے کے لیے اسٹین گن سیدھی کی۔ مگر ابھی اس کی نال میں ان کی سیدھ میں نہیں لا سکا تھا کہ ڈھلوں صاحب نے جھاڑیوں میں پھنسنے کے باوجود ان پر گولی چلا دی۔ وہ دوسرا جوان کے بائیں ہاتھ میں لگی تو وہ ست سری اکال کا نعرہ مار کر گھوڑے سے اترا اور اس کی اوٹ میں ہو کر بندوق سیدھی کرنے لگا۔ مگر اس عرصے میں میں نے اسے تاک کر گولی چلادی۔ وہ اس کی ران میں لگی۔ میرا خیال ہے کہ وہ ران سے گزر کر پیٹ میں جا لگی تھی۔ مگر اس عرصے میں ہمارے عقب سے دو جوان ایک دم ہم پر آ چڑھے اور یوں آ چڑھے کہ ان کی بندوقیں ہماری کمر سے لگ گئی تھیں۔ پتہ نہیں وہ کہاں سے اتنی تیزی سے آگے آئے تھے کہ ہم سُن ہو کر رہ گئے۔

"ہتھیار پھینک دو اوئے! ورنہ تمہاری لاشیں ہی لے جانی پڑیں گی"

"تمہیں زندہ پکڑنے کا حکم ہے۔ ورنہ ہم تمہیں یہاں ہی ختم کر دیتے" دوسرے سکھ نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

ہمارے ہاتھ شل ہو کر رہ گئے تھے۔ اسٹین گن لکڑی کا ڈنڈا معلوم ہونے لگی تھی۔ ان کا چوتھا ساتھی شدید زخمی ہو کر گر پڑا تھا۔ دو آدمی ہمارے عقب میں کھڑے تھے اور تیسرا شخص اسٹین گن لیے ہمارے سامنے کھڑا تھا۔ وہ جھاڑیاں ہمیں لے ڈوبی تھیں۔ ہمارا عقب خالی ہوتا تو شاید ان کو ہم دُور سے ہی دیکھ سکتے تھے۔ مگر وہ ہمارے پیچھے بلّی ایسی احتیاط سے آئے۔ گھوڑے انہوں نے چند ہاتھ پیچھے ہی چھوڑ دیے تھے۔

"ہتھیار پھینک دو، کتے کے پُترو!" ہمارے پیچھے کھڑا آدمی پھر بھونکا۔
اس کی آواز سُن کر ڈھلوں صاحب نے اپنی اسٹین گن سامنے پھینک دی۔
"اب اٹھ کر سامنے جا ٹھہرو، چلو" کسی نے ان کی کمر میں زبردست ٹھوکر لگائی۔ ڈھلوں صاحب مجھے نہایت ہی بے بسی سے دیکھتے ہوئے اٹھے اور اس آدمی کے پاس جا ٹھہرے۔ جس کی بندوق کا رُخ ہمارے سینے کی طرف تھا۔
"تم کیا سوچ رہے ہو؟ اس سے یہ بندوق لے لو، کمال سنگھ" اس نے دوسرے آدمی کو للکارتے ہوئے کہا۔ مگر عین اس وقت میری کمر سے ہٹا کر اس نے بندوق کی نال سے میرے سر کی پگڑی الٹ دی ــ جس سے میری وگ بھی اتر گئی اور پگڑی میرے پاؤں میں جا گری۔ مجھے پتہ نہیں کیا سُوجھا۔ میں نے یوں ظاہر کیا جیسے میں بے ہوش ہو رہا ہوں۔ دیکھتے ہی دیکھتے میں ان کے سامنے یوں نظر آنے لگا جیسے میں سُدھ بُدھ کھو بیٹھا ہوں۔ اپنے ہاتھ پاؤں میں نے یوں اکڑا لیے، جیسے مجھ پر تشنج کا شدید دَورہ پڑا تھا۔ میرا سر کسی طرف تھا اور پاؤں کسی طرف۔ منہ سے میں نے جان بوجھ کر جھاگ پیدا کرنی شروع کر دی۔
"اوئے کمال سنگھ! اسے کیا ہو گیا ہے یار! یہ تو صدمے سے ہی بے ہوش ہو گیا ہے" اس سکھ نے میری حالت دیکھتے ہوئے کہا اور میں جو کچھ چاہتا تھا وہ وقوع پذیر ہونے لگا۔ وہ دونوں میری نبضیں ٹٹولنے لگے تھے۔ جیسے ہی وہ میری طرف جُھکے اور ان کی گردنیں میرے قریب آئیں۔ تو میں نے ان کی جھکی ہوئی بندوقیں دیکھیں اور اپنا زاویہ پوری طرح سمجھتے ہوئے میں نے ان دونوں کی گردنیں ہاتھ میں لے لیں اور ان کی رگیں کچھ اس طرح مَسل دیں کہ وہ دونوں میرے اوپر آ گرے۔ میرے لیے یہ مہلت بہت کافی تھی۔ ان میں سے ایک کی اسٹین گن میں نے ہاتھ میں لے کر سامنے کھڑے آدمی پر اتنی تیزی سے گولی چلائی کہ وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکا اور گولی لگتے ہی اچھل کر دُور جا پڑا۔ یوں جیسے میں نے اسے دھماکے سے اُڑا دیا ہو۔ بندوق اس کے ہاتھ سے نکل کر دُور جا پڑی تھی۔ ڈھلوں صاحب حیرت زدہ ہو کر کبھی مجھے دیکھتے تھے اور کبھی ان تینوں کو۔ جب انہیں یقین ہو گیا کہ وہ بالکل محفوظ ہیں تو وہ پاگلوں کی طرح میری طرف بڑھے، بولے۔
"یہ تم نے.... کیسے کر لیا ہے جیلانی! یہ بدمعاش کے بچے تو ہمیں لے ڈوبے تھے" انہوں نے دونوں سکھوں کو میرے اوپر سے گھسیٹ کر پرے ہٹایا۔ میں اسی وقت زمین پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔
"مجھے یہی کرنا چاہیے تھا ڈھلوں صاحب! ورنہ یہ تو ہمیں باندھ کر لے جاتے"
"کمال کر دیا ہے تم نے۔ مگر ان کو بے ہوش کیسے کر دیا تم نے؟ میں تو پاگل ہی ہو گیا تھا"
"بس یہ بھی ایک نسخہ ہے، نسخہ نمبر تین سو دو مگر آدمی پر اس سے قتل کا مقدمہ نہیں بنتا ہے" میں نے اُن تینوں کے ہتھیار یکجا کرتے ہوئے کہا۔ گھوڑے اب ہمارے پاس چار جمع ہو گئے تھے۔ دو جھاڑیوں کے پیچھے کھڑے ہنہنا رہے تھے۔ ایک زخمی تھا اور چوتھا بالکل صحیح سالم حالت میں تھا اور ہمارا اپنا گھوڑا ابھی وہیں موجود تھا۔
"یہاں سے نکل چلو یار! ورنہ وہ پھر ہمارے پیچھے لگ جائیں گے"
"ہاں! یہ ایک گھوڑا آپ پکڑ لیں اور یہ ہتھیار بھی سنبھال لیں۔ جلدی کریں"
چند ہی لمحوں بعد ہم دو گھوڑے لے کر وہاں سے فرار ہو گئے۔ سکھوں کی دم بُخت لاشیں ہم نے وہیں چھوڑ دیں وہ ہمارا راستہ روک رہے تھے مگر خدا نے ہماری مدد کی اور ہم ان کے اس تابڑ توڑ حملے سے بچ نکلے۔ یوں لگتا تھا۔ جیسے ہم ایک ملک فتح کر کے نکلے ہیں۔ ورنہ تو وہ ہمیں یرغمال بنا کر پھر سہسرام کے گوردوارے میں لے جاتے اور پھر خدا معلوم وہاں ہمارا وہ کیا حال کرتے۔ کوئی ان کا ہاتھ روکنے والا تو نہیں تھا۔ ہم سے وہ بلبیر سنگھ کے قتل کا ہی بدلہ لیتے، بلکہ ملھوترہ اور بھنڈاری پر جو کچھ بیت چکی تھی وہ سب بھی ہمارے نامۂ اعمال میں لکھ لیتے اور ایک ایک زخم کا وہ ہم سے حساب لیتے۔ ان کی اذیتوں سے بچ نکلنے کی تو کوئی صُورت ہی باقی نہیں رہ گئی تھی۔
ہمارے عقب میں آنے والے دوسرے لوگ پتہ نہیں کہاں غائب ہو کر رہ گئے تھے۔ ان میں سے کوئی آدمی ہمیں نظر نہیں آیا۔ میرا خیال ہے ان لوگوں نے ہماری تلاش میں کسی اور طرف کا رُخ کر لیا تھا۔ ہمارا عقب اور ہمارا یمین و یسار بالکل محفوظ ہو چکا تھا۔
میں بالآخر ڈھلوں صاحب کو اس اندوہناک موت سے بچا لایا تھا۔ جس نے انہیں ڈھونڈ کر سہسرام کے گوردوارے میں لا ڈالا تھا۔ ان کی وہ بے بسی دیدنی تھی۔ جس نے ان کو بے پر کر کے رکھ دیا تھا۔ اپنے اس محسن کو ایک نئی زندگی دے

[...] کر دیا تھا۔ ایسے محسن کو جس نے مجھے بارہا اَن گنت پریشانیوں [...] لیا تھا۔ وہ دوسرے گھوڑے پر بیٹھے تھے کہ انہیں [...] محسوس ہوا کہ وہ گھوڑا سخت زخمی ہے۔ اس کی ٹانگ [...] گولی لگی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ اس سے الگ ہو کر میرے [...] گھوڑے پر آ بیٹھے۔ مگر وہ بہت زیادہ پریشان تھے۔ صورتحال [...] قدر خراب ہو چکی تھی اور اس تھوڑے سے عرصے میں جتنے [...] انہیں لگ چکے تھے، وہ ان کی سمجھ میں ہی نہیں آتے تھے۔ اپنے [...] ابتلا سے انہیں جان چھڑا لینے کی کوئی امید ہی نہیں تھی۔ ان [...] کی آہنی گرفت نے انہیں واقعی نڈھال کر دیا تھا۔ جس انداز [...] ان کے اپنے ہی ملازموں نے ان کو دشمنوں کے حوالے کر دیا تھا۔ وہ [...] ان کے لیے ناقابلِ برداشت تھا مگر وہ ایسی حالت میں تھے کہ [...] غصّہ کا بھی اظہار نہیں کر سکتے تھے۔ بدری کے کردار نے [...] اس قدر ذلیل کر دیا تھا کہ انہیں اپنی ذہنی حالت پر بھی [...] شک ہونے لگا تھا کہ کیسے انہوں نے ایسے آدمی کو ملازم رکھ لیا۔ [...] انہیں بتانے والا نہیں تھا کہ بدری کی اصلیت کیا تھی اور ان [...] کے اغوا میں اس کے سوا اور کون کون ملوّث تھا۔
راستے میں کئی گاؤں آئے۔ مگر ہم وہاں نہیں رُکے۔ دن [...] کا شاید ایک بج رہا تھا۔ گھوڑا ہم مسلسل بھگا رہے تھے۔ بالآخر ہم [...] ڈیڑھ بجے ایک ٹیوب ویل پر جا پہنچے۔ حالت ہم دونوں کی بے حد پریشان کُن تھی۔ ٹیوب ویل کے حوض سے ہم نے منہ ہاتھ دھویا۔ [...] مجھ سے غلطی یہ ہو گئی کہ میں نے وگ سمیت اپنی پگڑی الگ رکھ دی اور یہی بات میرا عیب بن گئی۔ ٹیوب ویل کے پاس ایک چھوٹا سا کوٹھا۔ ہم سمجھے اس میں کوئی آدمی موجود نہیں ہے۔ مگر وہاں سے اچانک ہی ایک ادھیڑ عمر کا سکھ باہر نکل آیا۔ اس نے کمبل کی بُکل مار رکھی تھی۔ میرے سر پر سے اس نے پگڑی اتری دیکھی، تو وہ پانی کے حوض پر آ کر بولا۔
"کیا بات ہے سردار جی! راس دھاری ہو"
میں سُن ہو کر رہ گیا۔ اس کے لہجے میں بلا کا طنز تھا۔
"یہی سمجھ لو بھائی جی! ادھر منہ دھونے بیٹھ گئے ہیں۔ کوئی اعتراض تو نہیں ہے تمہیں؟"
"نہیں! جم جم منہ دھوؤ۔ میں تمہارا سر دیکھ کر کہہ رہا تھا۔ [...] یہ بال نقلی ہیں؟"
"ہاں! مگر آدمی میں اصلی ہوں۔ سروپ سنگھ نام ہے میرا اور یہ گردھاری لال ہیں" میں نے اچھا کیا تھا کہ نائی سے وہ لوہری بھی کٹوا لی تھی، جو وگ خریدنے کے بعد بے کار ہو گئی تھی۔ مگر میرے سر پر بال ابھی تک زیادہ نہیں اُگ سکے تھے یہی وجہ تھی کہ وگ میرے لیے بہت ضروری تھی۔
"تمہارا کیا نام ہے بھائی جی؟"
"میرا نام گورنام سنگھ ہے سردار جی! کہاں سے آئے ہو تم؟"
"ہم سہسرام سے آئے ہیں۔ فتح گڑھ چوڑیاں جا رہے ہیں"
"اچھا اچھا، وہ تو اب زیادہ دُور نہیں ہے۔ گھوڑے پر بہت ہو گا تو دس میل کا سفر ہو گا"
"ہاں۔ گاڑی یا بس میں یہ سفر زیادہ لمبا ہے"
"کھانا کھاؤ گے تم؟ ابھی میری گھر والی شاہ ویلا دے کر گئی ہے"
"ہاں بھائی جی! کھانا مل جائے تو اور کیا چاہیئے ہمیں۔ کیوں گردھاری لال جی؟"
"کیا حرج ہے۔ کھانا تو کھا ہی لو۔ مگر اس کے پاس تو اس کا کھانا ہو گا"
"نہیں! کچھ زیادہ ہی ہے۔ ساگ پکایا ہے سردارنی نے۔ اور مکھن اس میں تازہ ہے"
"تو پھر لاؤ بھائی جی! یہ کام تو کر ہی لینا چاہیے"
ہم حوض سے اٹھ کر اس کے کمرے میں جا بیٹھے۔ گھوڑا باہر ہی بندھا تھا۔ وہیں بندھا رہا۔ کھانے میں ساگ اس کی سردارنی بہت ہی عمدہ پکا کر لائی تھی اور مکھن واقعی تازہ تھا۔ روٹیاں وہ چھ لے آئی تھی۔ مگر خود وہ اسی وقت واپس چلی گئی تھی۔ حالانکہ اسے برتن واپس لے کر جانا چاہیے تھے مگر گورنام سنگھ نے بتایا کہ ان کا بچّہ بیمار ہے۔ اس لیے وہ جلدی واپس چلی گئی تھی۔
کھانا کھا کر ہماری ستّیا لوٹ آئی۔ گردھاری لال نے گھنا اور گہرا ڈکار لے کر اپنے دلی اطمینان کا اظہار کیا۔ اب ہم خطرے کی حد سے بہت دُور آ گئے تھے اور گردھاری لال کے لیے وہ دوپہر ایک نئی زندگی کا پیام لائی تھی۔ گورنام سنگھ کوئی بہت ہی خلیق اور متواضع آدمی تھا۔ خود اس نے صرف ایک روٹی کھائی۔ باقی تمام کھانا اس نے ہمارے حوالے کر دیا۔ یہ اس کی بہت بڑی نوازش تھی۔ ورنہ دوسروں کے لیے خود کون بھوکا رہ سکتا ہے۔ جبکہ کھانا اس کے سامنے دھرا ہو۔ ہم بھی ایسے ندیدے ثابت ہوئے کہ چنگیر میں پڑی ساری ہی روٹیاں خود لپیٹ لیں۔ یہ اس کے ساتھ سراسر زیادتی تھی۔ مگر وہ ایسا بے لوث نکلا کہ اس زیادتی کو ہنسی خوشی سہہ گیا۔ کہیں ہم شہر میں ہوتے تو شاید ہم ایک لمحے کے لیے بھی کسی کے یوں مہمان نہ ٹھہر سکتے۔ اس کسان نے کمال نوازش دکھائی کہ وہ ہمیں وہاں دو گھڑی آرام کرنے کے لیے بھی کہہ رہا تھا۔ مگر ہم نے

انکار کردیا۔ ہماری منزل کھوٹی ہوتی جاتی تھی۔ ہم نے اس سے مصافحہ کیا اور وہاں سے کچھ ہی دیر بعد گھوڑے پر سوار ہو کر آگے چل دیے۔ گورنام سنگھ کا نام میرے ذہن میں اس لیے محفوظ رہ گیا ہے کہ اس جیسا کوئی کم ہی ملتا ہے۔ ورنہ جس طرح وہ ہم سے مخاطب ہوا تھا اس سے میں یہی اندازہ لگا رہا تھا کہ اس کو سیدھا کرنے کے لیے ہمیں کوئی بہت ہی الٹا کام کرنا پڑے گا۔ اچھا تھا کہ ہم نے اپنی بندوقیں کپڑوں کے اندر چھپالی تھیں اور اسے آخر تک یہ محسوس نہیں ہونے دیا تھا کہ ہم مسلح ہیں۔ ورنہ خدا جانے وہ ہمارے بارے میں کیا کچھ سوچنے لگتا۔ اس کی پیدا کردہ مصیبت کا حل ہمارے پاس یہی تھا کہ میں اس کا گلا دبا دیتا۔ مگر شکر ہے کہ اس کی نوبت نہیں آئی۔ ورنہ وہ تنہا اور نہتا آدمی میرے ہاتھوں خواہ مخواہ ہی مارا جاتا۔

گھوڑے کی رفتار اب کی بار ہم نے سست ہی رکھی۔ وہ کچھ زیادہ ہی تھک گیا تھا۔ جس انداز سے میں اسے دوڑاتا چلا آیا تھا۔ وہ بھی اسے پسند نہیں تھا۔ مگر پھر بھی وہ ہمارا بوجھ برداشت ہی کرتا رہا اور ہمیں اس نے کسی بھی جگہ گرا دینے کی کوشش نہیں کی۔ میرا خیال ہے کہ گولیوں کی بازگشت ابھی تک اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ جب ہم فتح گڑھ چوڑیاں پہنچے تو شام ہو چکی تھی۔ وہ جگہ ہمارے اندازے سے بہت زیادہ دُور نکلی۔

گھوڑا ہم نے اسٹیشن کے باہر جنگلے کے ساتھ باندھ دیا۔ اب اس کی ہمیں ضرورت نہیں رہی تھی۔ ہم امرتسر کا ٹکٹ لے کر سٹیشن کے اندر ایک بنچ پر جا بیٹھے۔ امرتسر کے لیے گاڑی کوئی دو گھنٹے بعد نکلتی تھی اور اس وقت چھ بج رہے تھے۔ ہم ذرا اطمینان سے بیٹھے تو ڈھلوں صاحب نے پہلی بار مجھ سے اس صورتِ حال کا ذکر کیا جس میں پھنس کر وہ زندگی سے ہی ہاتھ دھو بیٹھے تھے بولے۔ "آپ کا اندازہ صحیح نکلا جیلانی صاحب! وہ لوگ اپنے منصوبے پر برابر عمل کر رہے ہیں۔"

"میں نے آپ کو خبردار کردیا تھا۔ پھر بھی آپ نے کچھ خیال نہیں کیا اور اس سارے سلسلے میں بدری ہی آپ کی تباہی کا باعث بنا ہے۔"

"ہاں! مجھے جب ہسپتال کے کمرے سے نکالا گیا تو اس وقت میں بالکل بے ہوش تھا۔ ہسپتال کے ایک کمپاؤنڈر نے مجھے ایسی دوا پلا دی کہ میں سُدھ بدھ ہی کھو بیٹھا۔"

"میرا خیال ہے۔ اس کا نام فیلڈن تھا۔ وہ بدری کے ساتھ ملا ہوا تھا۔"

"ہاں ہاں، اس نام کا آدمی اکثر میرے پاس آتا تھا۔ وہ اسی ہسپتال میں ملازم ہے۔"

"ہاں۔ آپ کے پیچھے بدری نے ڈاکٹر عالیہ کو بھی لگا دیا تھا۔ میری اطلاع یہ ہے کہ عالیہ نے ہی آپ کو کسی ٹرک پر ڈال کر امرتسر پہنچایا تھا۔"

"مگر وہ کیسے میری دشمن بن گئی؟" ڈھلوں صاحب نے بڑی حیرت سے پوچھا۔

"اس کو معلوم ہو چکا تھا کہ اس کے تین آدمی آپ نے اپنی حویلی میں بند کر رکھے ہیں۔ بدری کو اس نے ایک لاکھ روپے کا لالچ دیا اور اسے اپنے ساتھ ملا لیا۔ حویلی سے وہ تینوں آدمی بھی انہوں نے رہا کروا لیے اور آپ کو اس نے یہاں بھیج دیا۔ یہاں کا پتہ اسے بدری ہی نے دیا تھا۔ اور..... اور آپ کی بڑی بیگم بدری کو قطعی بے گناہ سمجھتی رہی۔ میں نے فراست بیگم کو سمجھایا بھی، مگر وہ ایک لفظ سننے کو تیار نہیں تھی۔ انہی دنوں میں پولیس کے ہاتھ آگیا۔ میں نے وہاں سب کو بتا دیا کہ ڈھلوں صاحب کو اغوا کرنے میں بدری کا ہاتھ ہے۔ ان لوگوں نے اسے گرفتار کر کے حوالات میں ڈال دیا۔ مگر حیرت ہے کہ بدری کو کسی نے راتوں رات حوالات میں ہی گولی مار دی۔ ملھوترہ سے جب میں یہاں آکر ملا تو اس نے مجھے بتایا کہ بدری کو اس کے حکم پر ہلاک کیا گیا تھا۔"

"ملھوترہ سے بھی تم ملے تھے؟"

"جی ہاں۔ اور میں نے اسے گولی ماردی تھی۔ وہ بدمعاش اسی لائق تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ آپ امرتسر جیل میں ہیں۔ مگر مجھے یقین نہیں آیا۔ بعد میں بالک رام نے مجھے بتایا تھا کہ آپ اسے جیل میں کہیں نظر نہیں آئے۔ وہ قیدیوں کی فہرستیں بھی دیکھ چکا ہے۔"

"تو گویا بالک رام ابھی اس معاملے سے بے خبر تھا۔"

"جی ہاں۔ بعد میں جب میں نے بھنڈاری کو کل رات پکڑا تو اس نے مجھے بتایا کہ آپ سہرام کے گوردوارے میں بند ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں بھنڈاری کو ختم نہیں کرسکا۔"

"یار! تم نے تو کمال کردیا ہے جیلانی! تمہاری اس جرأت کی میں جتنی بھی داد دُوں، کم ہوگی۔ کوئی تم ایسا دوست مجھے کہاں مل سکے گا؟"

"یہ میرا فرض تھا ڈھلوں صاحب! کوشش ہمیں یہ کرنی چاہیے کہ ہم اس فہرست کے دوسرے لوگوں کو محفوظ رکھ سکیں ورنہ وہ کسی بھی وقت ان پر ہاتھ ڈال سکتے ہیں۔"

"وہ تو کریں گے ہی، ان کی حفاظت تو بہت ضروری ہے۔ مگر میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ فراست بیگم اس بدری کی حمایت کیوں کرتی تھی؟ اس کا کیا تعلق تھا اس سے؟"

"میں معافی چاہتا ہوں ڈھلوں صاحب! مگر وہ عورت قابلِ اعتبار نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ بدری کے پھندے میں پھنس چکی تھی۔ اسے یقین تھا کہ آپ ختم ہو چکے ہیں اسی لیے وہ حویلی کا تمام انتظام بدری کے حوالے کرچکی تھی۔ وہ ٹھیک عورت نہیں ہے، ڈھلوں صاحب! وہ تمام جاگیر پر خود قبضہ کرلینا چاہتی ہے۔"

"اوہ! تو یہ بات ہے۔ استغفراللہ۔ میں تو مارا ہی گیا تھا جیلانی بھائی! یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

"میں سچ کہہ رہا ہوں ڈھلوں صاحب! میں نے ان دونوں کی آنکھوں کا رنگ دیکھا ہے۔ بدری وہاں مالک بن بیٹھا تھا۔ اگر وہ گرفتار نہ ہوتا تو شاید اب تک صورتِ حال اور زیادہ خراب ہوگئی ہوتی۔ وہ ہر شے پر قابض ہوگیا ہوتا۔"

"میں واپس جا کر اس فراست بیگم سے ضرور نپٹوں گا۔ میں اس پر کتے چھوڑ دوں گا۔ وہ میری عزت تھی جیلانی! مگر وہ ایسی ذلیل ثابت ہوئی ہے۔ میں اسے کبھی معاف نہیں کروں گا۔ اُف! میرے پروردگار، میرے گھر میں ایسی گندی عورت رہ رہی ہے اور مجھے اس کی خبر تک نہیں ہوئی۔"

"زیادہ پریشان نہ ہوں ڈھلوں صاحب! زندگی ایسی ہی ہے۔ ہمیں یہاں اپنی جان کے سوا کسی پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔ ابھی تو پتہ نہیں آپ کو کیسے کیسے واقعات کا علم ہوگا۔ جن کے بارے میں مَیں نہیں جانتا ہوں۔"

"ہاں۔ آپ گویا اُن دونوں سے مل چکے ہیں۔"

"جی ہاں! بڑی بحث ہوئی میری اُن کے ساتھ۔ میرا دوست آبی بھی میرے ساتھ تھا۔ حویلی سے ہم پریشان ہو کر باہر نکلے تو فراست بیگم نے آپ کے چار سیاہ پوش ہمارے پیچھے لگا دیے۔ وہ بندوقیں لے کر آئے تھے اور راغب علی ان کی رہنمائی کر رہا تھا۔"

"اچھا! یہ بھی ہو چکا ہے۔ یعنی نوبت بہ ایں جا رسید!" ڈھلوں صاحب کی حیرت کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔

"جی ہاں۔ باہر کھیتوں میں وہ ہم پر آچڑھے۔ مقابلہ بھی ہوا اور ہم نے اُن چاروں کو وہیں ختم کردیا۔ اگر ہم ایسا نہ کرتے تو آج آپ کے پیچھے آنے والا کوئی نہ ہوتا۔"

"کمال ہے یار! یہ تم عجیب کہانی سنا رہے ہو مجھے! خدا مجھے جلدی واپس لے جائے۔ پھر میں اس سے بات کروں گا۔ بخدا میں اسے معاف نہیں کروں گا۔"

"بدلہ لینا آپ کا حق ہے ڈھلوں صاحب! مگر بہت سوچ سمجھ کر چلیں۔ حویلی میں کئی آدمی آپ کے وفادار نہیں ہیں۔ ان سب کو نکال باہر کریں۔"

"باہر کیوں کروں؟ میں انہیں وہیں گولی مار دوں گا۔ ہاں وہ وہاں وفاداری کی قسم کھا کر وہاں آتے ہیں۔ ان کو ایک ایک کر کے ننگا کردوں گا۔"

"ہاں، یہ تو کرنا ہی ہوگا۔ ابھی ہم امرتسر جا رہے ہیں۔ وہاں آبی سخت بیمار ہے۔ میں تو اس کی دوا لینے نکلا تھا کہ مجھے بھنڈاری نظر آگیا اور میں اس کے پیچھے بھاگ نکلا۔ آبی ابھی تک میرے انتظار میں ہوگا۔"

"ٹھیک ہے۔ ہمیں وہیں چلنا ہوگا۔ آبی کو کیا تکلیف ہے؟"

"اسے بخار آرہا تھا۔ وہ بھی بیچارا میرے ساتھ ہی چلا آیا تھا۔ جگہ جگہ وہ میرے ساتھ دھکّے کھاتا پھرتا ہے۔"

"ایسا نہ کہو ہاشم صاحب! وہ آپ کا بہت بڑا پرستار ہے۔ آپ پر اپنی جان نثار کرتا ہے۔ اس کی جتنی بھی قدر کریں کم ہوگی۔ آپ کو ایسے ہی دوست کی ضرورت ہے۔"

اچانک ڈھلوں صاحب نے مجھے ایک نئی بات بتائی۔ وہ اپنا دامن اٹھا کر مجھے دکھا رہے تھے، بولے۔ "ہاشم خان! یہ..... یہ دیکھیں تو ذرا، ان لوگوں نے میرا پیٹ بھی پھاڑ دیا تھا۔ میرا خیال ہے، یہاں بھی ایک گولی لگی تھی۔"

میں نے ان کے پیٹ پر نظر ڈالی تو معلوم یہ ہوا کہ ان کا پیٹ وہیں سے کاٹ دیا گیا تھا جہاں سے عالیہ نے مجھے گُردے سے محروم کرنے کے لیے آپریشن کیا تھا۔

"یہ..... یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں، ڈھلوں صاحب! کہیں اس عالیہ نے آپ کو تو گُردے سے محروم نہیں کردیا؟" میں نے ان کے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"یہ..... یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ وہ مجھ تک کیسے پہنچ سکتی تھی۔ میں ہسپتال سے نکلا تو..... لیکن میرا خیال غلط ہے۔ کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور ہوئی ہے۔"

"میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں ڈھلوں صاحب! آپ کو بھی اس نے مردِ یک گُردہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ وہ کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی۔ یہ دیکھیں، میرا زخم بھی بالکل اسی طرح کا ہے۔"

"یار! یہ تو بہت بُرا ہوا۔ یعنی اب میں بھی ایک ہی گُردے پر چل رہا ہوں۔ اس نے مجھے بھی نہیں چھوڑا۔"

"شکر کریں اس نے آپ کو گولی نہیں ماری۔ صرف گُردہ ہی نکالا ہے، ورنہ آپ کیا کر لیتے؟ اس نے چار پانچ لاکھ روپیہ کما لیا ہوگا۔ اس سودے سے۔"

"استغفراللہ! یعنی وہ مختار ڈھلوں کا بھی گُردہ بیچ کر کھا گئی۔ میں اس پر کتے چھوڑ دوں گا۔ بخدا میں اسے تباہ کر

دوں گا۔"

"دفع کریں ڈھلوں صاحب! جس طرح میں صبر شکر کر کے بیٹھ رہا ہوں۔ آپ بھی بھول جائیں کہ آپ دو گردوں کے مالک تھے۔ اسے تو موقع ملنا چاہیے۔ آپ کو بے ہوش دیکھ کر وہ سیدھی آپ کو کلینک میں لے گئی ہو گی۔ میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر دھمن سے اس کی لڑائی نہیں ہوئی ہے بلکہ محض ایک دھوکا ہے۔ مشہور وہ یہی کر رہی ہے مگر ہیں وہ دونوں ابھی اکٹھے ہی۔"

"ٹھیک ہے۔ ایک دن تو وہ میرے ہاتھ آئے گی ہی۔ اسے اس کی بہت بڑی قیمت دینی ہو گی۔"

"لعنت بھیجیں اس پر۔ پتہ نہیں وہ کیا کچھ کرتی رہی ہے۔ ایک آپ ہی اس کے چکّر میں نہیں پھنسے۔ بلکہ اس کے کشتگان تو اور بھی بہت ہیں۔ مگر ہے وہ بہت بڑی فن کار۔ ایسے طریقے سے گردہ نکالتی ہے کہ آدمی کو مدّتوں پتہ نہیں چل سکتا ہے۔"

"ایک بار میں پاکستان پہنچ لوں۔ پھر میں بات کروں گا اس سے۔ میں سمجھتا تھا آپ کا گردہ اسے مجبوراً نکالنا پڑا۔ آپ زیادہ بیمار ہو گئے ہوں گے۔ مگر یہ پتہ نہیں تھا کہ وہ لوگ ان گردوں کا واقعی کاروبار کرتے ہیں۔"

"ایسا ویسا کاروبار! اس سے تو ان لوگوں نے کروڑوں روپے کما لیے ہیں۔ ڈھلوں صاحب! میں نے اسی لیے تو قسم کھا رکھی ہے کہ اس کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اس نے مجھے مروا دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اس نے مجھے قید کروا دیا تھا۔" یہ کہہ کر میں نے ڈھلوں صاحب کو اپنی حالیہ گرفتاری کی تمام بات بتا دی۔

وہ سخت حیران ہوئے، بولے: "وہ آپ کو جیل بھیج رہے تھے۔ کمال ہے ہاشم صاحب! وہ تو آپ کو سیدھا پھانسی کی کوٹھری تک پہنچا دیتے۔"

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں! اپنی جان بچانے کے لیے اس نے مجھے قید کروا دیا۔"

"اور وہ ستناجا صاحب بھی وہاں آئے تھے؟"

"جی ہاں۔ مگر وہ میرے بارے میں کوئی فیصلہ نہ کر سکے اور پولیس مجھے جیل بھیجنے پر مجبور ہو گئی۔ حالانکہ وہ مجھے بڑی ڈھیل دے رہے تھے۔"

"ہوں۔ اس سے تو میں لاہور پہنچتے ہی ملوں گا۔ ہادی علی اور رحمت علی کے قتل کا سارا منصوبہ تو اس نے ہی تیار کیا تھا۔ اس کو چاہیے تھا کہ وہ آپ کو پولیس کی قید سے چھڑا لیتا۔ پتہ نہیں اس نے ایسا کیوں نہیں کیا؟"

"وہ کہتا تھا کہ بڑے صاحب نہیں مان رہے ہیں۔"

"بکواس کرتا ہے وہ، اس کا مغز خراب ہو گیا ہے۔ اس بڑے صاحب کو آپ کا نام یاد ہے ہاشم خان! اور وہ مجھے خود کہتے تھے کہ اس کو ہر مرحلے پر پولیس سے بچا لینا چاہیے۔ میرے بارے میں بھی اب وہ بہت پریشان ہوں گے۔"

"میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ بہر حال پولیس آپ کے لیے جگہ جگہ ڈول ڈال رہی تھی۔ مگر انہیں اس بات پر اعتبار نہیں آیا کہ آپ کو سکھ اٹھا کر لے گئے ہیں۔"

اس بات پر ڈھلوں صاحب بے ساختہ ہنس دیے، بولے۔ "میرا حال تو مغویہ ایسا ہو گیا ہے۔ پتہ نہیں وہ کس بات کا انتظار کر رہے تھے۔ کیوں مجھے گولی نہیں ماری ان لوگوں نے؟"

"ہو سکتا ہے وہ ان پانچ چھ معزز آدمیوں کے منتظر ہوں جو وہ پاکستان سے اغوا کر لینا چاہتے تھے۔"

"ہو سکتا ہے یہی بات ہو۔ مگر میں انہیں اب خبردار کر دوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنا آپ تحفّظ کر سکتے ہیں مگر اس پاگل پن کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ کسی قوم کے اجتماعی شعور کو یوں تو نہیں بدل سکتے ہیں۔ میں نہ ہوا تو کوئی اور میری جگہ لے لے گا۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں ڈھلوں صاحب! مگر یہ بھی تو دیکھیں کہ جو فیصلہ آپ کر سکتے ہیں۔ وہ کوئی اور نہیں کر سکتا۔ آپ کی جگہ کوئی اور تو لے سکتا ہے مگر آپ جس سیاسی دیانت کا ثبوت دیں گے، وہ کوئی اور نہیں دے سکتا۔"

"وہ تو بجا کہتے ہیں آپ! مگر اس طرح تو کوئی فرداً فرداً کسی سے انتقام نہیں لے سکتا ہے۔ یہ اُن کا پاگل پن ہے اور میں یہ واقعہ حکومت کے نوٹس میں ضرور لاؤں گا۔ وہ خود ان کے بڑوں سے بات کر لیں گے۔ اگر یہی رسم چل نکلی تو پھر ہندوؤں اور سکھوں کے سارے لیڈر تو ادھر کہیں جنگلوں میں ہی مار دیے جائیں گے۔ ہم تو ان کے گھر تک بھی جا سکتے ہیں۔"

"اس میں حکومت ملوث نہیں ہے ڈھلوں صاحب! یہ چند سر پھرے لوگوں کا کام ہے۔ ورنہ وہ آپ کو دلی تک پہنچا دیتے۔"

"ہاں، یہ تو ہے۔ خیر میں دیکھوں گا کہ اس کا توڑ کیا ہو سکتا ہے۔"

ہم کتنی ہی دیر تک وہاں بیٹھے صورتِ حال کا جائزہ لیتے رہے۔ ڈر مجھے یہی تھا کہ کہیں کوئی آدمی سسرام سے چل کر ہمارے پیچھے وہاں تک نہ آ پہنچا ہو۔ مگر ہم ایسی جگہ بینچ پر جا بیٹھے تھے

جہاں بتّی کی روشنی نہیں پہنچ رہی تھی۔ نظر میری پلیٹ فارم پر جمی رہی مگر وہاں تک ان سکھوں میں سے کوئی نہیں آیا۔ انہیں شاید یہی معلوم تھا کہ ہم کسی گاؤں میں جا چھپے ہوں گے۔

گاڑی کوئی ساڑھے آٹھ بجے سٹیشن پر پہنچی تو ہم اس میں بیٹھ کر امرتسر کی طرف چل دیے۔ ڈھلوں صاحب کا لباس بہت میلا ہو رہا تھا مگر ان کی چادر نے انہیں پوری طرح ڈھانپ رکھا تھا۔

گاڑی کوئی ساڑھے بارہ بجے امرتسر پہنچی۔ پلیٹ فارم سے باہر نکل کر ہمیں ٹیکسی میں بیٹھتے بیٹھتے ایک بج گیا۔ کوئی دکان اس وقت کھلی نہیں تھی۔ ورنہ میں ڈھلوں صاحب کو نیا لباس لے دیتا۔ ان کپڑوں میں وہ سفید پوش آدمی سخت کوفت محسوس کر رہا تھا۔ وہ ہمیشہ صاف ستھرے، خوبصورت کپڑے پہننے کے عادی تھے۔ بدن بھی ان کا میل میں اٹا ہوا تھا اور داڑھی تو یوں بڑھی تھی جیسے وہ کوئی جٹا دھاری آدمی ہوں اور ابھی ابھی بن باس سے لوٹے ہیں۔ وہ تھا بھی ان کے لیے بن باس ہی۔ کہ ان کے سارے رشتے ناتے اس دنیا سے کٹ ہی گئے تھے۔ سکھوں کی اس قید کے دن وہ شاید زندگی بھر فراموش نہیں کر سکتے تھے۔ مگر اس کا ذکر وہ مجھ سے نہیں کرتے تھے۔ یہی کہتے رہے کہ جو بیت گئی، اس کا ذکر نہ کرو۔ وہ تلخ لمحے ان کا خون کھولا دیتے تھے مگر وہ بے بس تھے، بالکل ہی بے بس۔ اپنے لیے وہ ایک تنکا بھی دُہرا نہیں کر سکتے تھے۔ حالانکہ ان کے پہلو کے کمروں میں اسلحے کے انبار لگے تھے۔ کہیں وہ ان تک جا پہنچتے تو شاید ساری عمارت کو ہی زمین بوس کر دیتے۔ مگر ان کی وہ بے بسی دیدنی تھی۔

جب ہم ہوٹل پہنچے تو یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ آبی کے کمرے کا دروازہ باہر سے بند تھا۔ اس میں تالہ لگا تھا یہ بات میرے لیے اچنبھے کا باعث بن گئی۔ اس نے میرے لیے وہاں کوئی رقعہ بھی نہیں چھوڑا تھا۔ ڈھلوں صاحب کو دروازے پر ٹھہرا کر میں استقبالیہ کی طرف لپکا تو ایک نیند کے مارے آدمی نے لمبی سی جماہی لے کر مجھے بتایا کہ وہ شخص میرے لیے ایک رقعہ چھوڑ کر شام کے وقت باہر نکل گیا تھا۔ رقعہ ایک لفافے میں بند تھا۔ وہ اس نے الماری میں سے نکال کر چابی سمیت مجھے دے دیا۔

اسے ہاتھ میں لے کر میں تیزی سے برآمدے میں آ گیا اور بلب کی روشنی میں رکھ کر اسے پڑھنے لگا۔ آبی نے لکھا تھا۔

"میرے پیارے پاگلانی!

اس وقت پتہ نہیں تم کہاں آوارہ گردی کر رہے ہو گے۔ میرا بخار اتر گیا تھا۔ دوپہر کو میں نے غسل بھی کر لیا اور جی بھر کر کھانا بھی کھا لیا ہے اس وقت شام کے پانچ بج رہے ہیں اور میں کسی ہندو کے خال کے عوض سمرقند و بخارا بخشنے جا رہا ہوں۔ تم واپس آ ؤ تو اطمینان سے سو رہنا اگر واپس نہ آ سکو تو تم پر ہزار لعنت!

تمہارا اے، بی، سی۔"

اس کتے کے بچے نے میرا نام ہی بگاڑ دیا تھا اور وہ خود سیر سپاٹے کے لیے نکل گیا تھا۔ چابی لے کر میں کمرے کی طرف لوٹ گیا اور دروازہ کھول کر بستر میں جا بیٹھا۔ رقعہ میں نے ڈھلوں صاحب کو دے دیا اور وہ اسے پڑھ کر ہنسنے لگے تھے۔

"یہ وقت کوئی سیر سپاٹے کا ہے۔ اسے تو واپس آ جانا چاہیے تھا۔ کوئی اپنا خال اس وقت کیسے پیش کر دے گا۔ رات کا ڈیڑھ بج رہا ہے۔"

"اگر سمرقند اور بخارا پیش کر دیے جائیں تو سب کچھ ممکن ہے ڈھلوں صاحب! اس آبی سے میں بہت تنگ ہوں۔ روز کسی نہ کسی طرف کود جاتا ہے۔"

"کوئی بات نہیں، ابھی بچّہ ہے۔ سمجھ جائے گا۔ کوئی کپڑوں کا جوڑا نہیں مل سکتا یہاں؟ میں بہت پریشان ہوں۔"

"ہاں" مجھے یاد آیا۔ آپ یہ کپڑے پہن لیں۔ ہم نے کل ہی بازار سے خریدے تھے۔" میں نے الماری میں سے ایک نیا جوڑا انہیں نکال کر دے دیا۔ ڈھلوں صاحب اسی وقت غسل خانے میں جا گھسے اور نہانے لگے۔ وہ میل جو اُن کے جسم پر اٹا تھا انہیں چین نہیں لینے دیتا تھا۔ جب وہ نہا کر باہر نکلے تو نئے جوڑے میں وہ بہت اچھے لگ رہے تھے۔ داڑھی البتہ وہ نہیں مونڈ سکے تھے۔

"اب یہ داڑھی تو ایسی ہی رہنے دیں۔ آپ کو اچھی لگتی ہے۔"

"چلو اس کو یونہی رہنے دو اور مجھے سونے دو۔ ایک عرصے بعد میں آج گہری نیند سو سکوں گا۔"

"ہاں۔ آپ اس بستر میں لیٹ جائیں۔ آبی آیا تو میں اسے اپنے ساتھ سُلا لوں گا۔"

ڈھلوں صاحب فوراً ہی بستر میں دبک گئے اور کچھ ہی دیر بعد وہ گہری نیند میں کھو گئے۔ وہ نیند جو ان سے روٹھی ہوئی تھی اور جس کے انتظار میں انہوں نے اَن گنت راتیں جاگتے ہوئے گزار دی تھیں۔ اس حال میں کہ ان کے دونوں پاؤں میں اتنی موٹی زنجیر بندھی تھی، جو ساری رات کھنکتی رہتی ہو گی۔ نہ اسے

نیند آتی ہوگی نہ وہ ڈھلّوں صاحب کو سونے دیتی ہوگی۔ اس کی یہی وفا پیشگی تو ہمیشہ سے افسانے کا عنوان بنتی رہی ہے کہ زنجیر کا کام باندھ لینا ہوتا ہے ۔

آفریں بر وفائے زنجیریم
ہم رَوَم نالہ کرد تا سرِدار

کسی نے زنجیر کے بارے میں ٹھیک ہی کہا ہے۔ اسے اپنے نخچیر سے بھی محبت ہوتی ہے ۔ تقدیر اسے دار تک لے جائے تو وہ اس کے پاؤں سے لپٹی ہوئی اس کی درازئ عمر کی دُعا مانگتی جاتی ہے مگر اس کی دُعا کبھی قبول نہیں ہوتی کہ زنجیر کٹ کر ہی بدن سے الگ ہوتی ہے اور کٹے ہوئے کی دُعا کہاں قبول ہوتی ہے ۔

میں بھی تھوڑی دیر بعد بستر میں لیٹ گیا۔ رات ساری ہی بیت چلی تھی۔ وہ جو دو گھڑی رات باقی تھی میں اس میں اپنی نیند پوری کر لینا چاہتا تھا۔ وہ سِکھ وہاں بیٹھے اپنی جان کو رو رہے ہوں گے ۔ ان کا سیاپا دیکھنے کے قابل ہوگا۔ وہ اسی سلوک کے مستحق تھے۔ ہم پردیسیوں کو وہ اپنے شہر میں لا کر ذلیل کر دینا چاہتے تھے ۔ اللہ نے انہیں ہی ذلیل کر دیا۔

مگر ابھی شاید میں ایک گھنٹہ بھی نہیں سو سکا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ باہر آبی کھڑا تھا۔ "اوئے جھانویں! دروازہ کھول ۔" اس کی آواز میں بڑی توانائی تھی۔ میں نے اٹھ کر کُنڈی کھول دی ۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ اپنے ساتھ ایک ملوک سی نرم و نازک لڑکی لیے وہاں کھڑا تھا۔ مجھ سے وہ ایک دم بغل گیر ہو گیا، بولا۔

"میں سمجھا تو کہیں شہید ہو گیا ہے۔ اسی خوشی میں میں اس کو ساتھ لے آیا۔ اچھی ہے نا ؟"

"تو بہت ذلیل آدمی ہے یار! یعنی یہ بات تو مجھ سے پوچھ رہا ہے ۔"

"اوئے یہ کون ہے ؟ کون لیٹا ہے میرے بستر میں ؟" اس نے لڑکی کو کمرے میں داخل کر کے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔

"یہ ڈھلّوں صاحب ہیں۔ آہستہ بولو۔ انہیں جگانے کی ضرورت نہیں ہے ۔"

"ان کو تو لے آیا ہے۔ یہ کیا کہہ رہا ہے تو! تجھے کوئی الہام ہوتا ہے کیا ؟ کہاں سے ملے ہیں یہ تجھے ؟" میری بات نے اسے حیران کر کے رکھ دیا تھا۔

"بس مل ہی گئے۔ آدمی کی تلاش بے کار نہیں جاتی ہے تم اگر چاہو تو خدا بھی مل سکتا ہے ۔"

"بڑی حیرت کی بات ہے یار! تم نے..... واقعی کمال کر دیا ہے ۔" وہ ڈھلّوں صاحب کا لحاف اٹھا دینا چاہتا تھا۔

میں نے اسے روک دیا۔ "ایسا نہ کرو۔ بہت دنوں بعد انہیں یہ نیند ملی ہے۔ انہیں سونے دو ۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ میں نے دوسرا کمرہ بھی بک کروا لیا ہے۔ میں اس کو وہاں لے جاتا ہوں۔ چل بھاگ بھر لے! ہم ادھر چلتے ہیں ۔" یہ کہہ کر وہ دونوں تیزی سے باہر نکل گئے ۔

"کونسا کمرہ ہے وہ ؟"

"میں تیرہ نمبر کمرے میں ہوں گا۔ تم آنا چاہو تو بڑے شوق سے آسکتے ہو ۔" اس نے مجھے جیب سے نکال کر شراب کی بوتل دکھاتے ہوئے کہا۔

"اوئے جا! شکل غائب کر۔ میں باز آیا اس مصیبت سے ۔" یہ کہہ کر میں نے دروازے کی کُنڈی اندر سے بند کر لی ۔ آبی کے لچھن وہی تھے۔ وہ ہر جگہ اپنے لیے عیش کا سامان پیدا کر لیتا تھا اور وہ لڑکی تھی بھی بہت حسین ۔ پتہ نہیں اسے کہاں سے مل گئی تھی اور کیسے وہ اتنے اعتماد اور اعتبار کے ساتھ اس کے ساتھ چلی آئی تھی۔ میرا خیال ہے اس پٹھے نے اس پر لمبی ہی رقم خرچ کی ہوگی ۔

میں ایک بار پھر بستر میں جا دبکا۔ نیند مجھے کچھ سوچنے کی مہلت ہی نہیں دے رہی تھی اور ڈھلّوں صاحب تو گھوڑے بیچ کر نہیں بلکہ کئی گھوڑے موت کی نذر کر کے ایک مدت بعد گہری نیند میں غرق ہوئے تھے۔ انہیں پتہ بھی نہیں چلا کہ آبی کب کمرے میں آیا اور اس کے ساتھ کون تھا۔ انہیں کسی بھی بات کا ہوش نہیں تھا اور یہ اچھی بات تھی۔ ورنہ وہ خدا جانے آبی کے بارے میں کیا کچھ سوچتے رہ جاتے ۔

صبح جب میری آنکھ کھلی تو اس وقت نو بج رہے تھے اور ڈھلّوں صاحب ابھی تک نیند میں غرق تھے۔ میں نے ان کو جگانا مناسب نہ سمجھا اور کسی قسم کا کھڑکا پیدا کیے بغیر غسل خانے میں جا گھُسا۔ مجھے بھی اس سفر نے بہت زیادہ تھکا دیا تھا۔ پانی نیم گرم تھا۔ میں خوب مَل مَل کر نہایا۔ جب میں باہر نکلا تو میری ساری تھکن دُور ہو چکی تھی۔ مگر دل کو اطمینان حاصل نہیں تھا۔ یہی دھڑکا لگا تھا کہ وہاں اتنی وارداتیں کر لینے کے بعد کسی بھی وقت صورتِ حال خراب ہو سکتی ہے۔ پولیس کے لوگ اتنے زیادہ بے خبر نہیں ہوتے اور ہوٹل تو ہمیشہ ان کی زد میں رہتے ہیں۔ وہ کسی بھی لمحے ہم پر چڑھائی کر سکتے تھے اور ذرا سے شک کی بنا پر وہ ہوٹل کو ادھیڑ کر رکھ دیتے ۔ خاص طور پر ملہوترا اور بھنڈاری کے ساتھ جو کچھ ہو چکا تھا۔ وہ انہیں ہوشیار کر دینے کے لیے بہت کافی تھا۔

میں تیار ہو کر تیرہ نمبر کمرے کی طرف چل دیا۔ پہلی ہی دستک پر آبی نے خود اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ میرا خیال ہے اس نے دروازے کی جھری میں سے مجھے پہچان لیا تھا۔ اس کی دوست ابھی تک بستر میں دبکی پڑی تھی ۔ شاید ابھی تک اس کی نیند نہیں کھلی تھی۔ آبی البتہ تازہ دم نظر آتا تھا۔ وہ بھی نہا چکا تھا اور ناشتہ میز پر رکھ کر بیٹھا تھا۔

"آؤ یار! پہلے ناشتہ کر لو۔ مجھے بڑی سخت بھوک لگی ہے ۔"

"تمہاری بھوک مٹی نہیں ابھی!" میں نے اس کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ایسے ہی بکڑ نہ مار استاد! بس چھوڑ ان باتوں کو۔ یہ تیرے بس کا معاملہ نہیں ہے۔ یہ بتا کہ ہوا کیا تھا۔ یہ تجھے کہاں سے مل گئے ؟ یہ ڈھلّوں صاحب!"

"کیا نام ہے اس کا۔ اس کنہیا کا ؟"

"یہ ساوتری ہے۔ ایک دلّال مل گیا تھا مجھے۔ پانچ سو روپے لے کر ادھر چھوڑ گیا۔ میں نے کہا تھا بارہ بجے آکر اسے لے جانا ۔"

"اس کے سامنے میں کوئی بات نہیں کر سکتا۔ ہو سکتا ہے یہ جاگ رہی ہو ۔" میں نے سرگوشی کی ۔

"ہاں! یہ تو ہے۔ آؤ پھر ناشتہ کر لو۔ پتہ نہیں پھر کب کھانا نصیب ہو ۔" یہ کہہ کر اس نے ناشتے میں ہاتھ ڈال دیا۔ شراب کا اثر اب تک اس کی آنکھوں میں نظر آتا تھا اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس امّ الخبائث کے ساتھ کب سے اس نے رابطہ قائم کر رکھا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ اس کا پہلا دن تھا۔ ورنہ اس سے پہلے تو میں نے اسے کبھی جام بلب نہیں دیکھا تھا۔ شاید وہ دلّال اسے بوتل بھی فراہم کر گیا تھا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر وہ میرے ساتھ ڈھلّوں صاحب کے کمرے میں آگیا۔ وہ ابھی تک گہری نیند میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وہاں بیٹھ کر میں نے اسے ساری کیفیت بتا دی۔ وہ ان پُر پیچ مراحل کا ذکر سن کر پاگل ہو گیا، بولا۔

"جیلانی! تیرا جواب نہیں ہے پیارے! ڈھلّوں صاحب کے لیے تُو نے جو کچھ کیا ہے۔ یہ اُسے کبھی فراموش نہیں کر سکتے ۔"

"زیادہ بکواس کی ضرورت نہیں ہے۔ اس ساوتری کو دلّال کے متھے مارو اور چلنے کی تیاری کرو۔ ہم آج ہی واپس جانا چاہتے ہیں ۔"

"ہاں! یہ تو ہے۔ بس تم اِدھر بیٹھو۔ میں اسے سمجھا دیتا ہوں۔ وہ ہوٹل سے نکل کر خود ہی واپس چلی جائے گی ۔" یہ کہہ کر وہ اسی وقت تیرہ نمبر کمرے کی طرف چل دیا۔

کچھ ہی دیر بعد ڈھلّوں صاحب بیدار ہو گئے۔ غسل تو انہوں نے رات ہی کر لیا تھا۔ منہ ہاتھ دھو کر وہ جلدی جلدی تیار ہو گئے۔ آبی بھی تیرہ نمبر کمرے سے فارغ ہو کر میرے پاس آبیٹھا۔ سالا بہت ہی خوش تھا۔ بات بات پر چہک رہا تھا۔ ڈھلّوں صاحب بھی اس کا موڈ دیکھ رہے تھے، بولے۔

"کیا بات ہے آبی صاحب! بہت خوش نظر آتے ہیں آپ ؟"

"یہ حضرت ساری رات مکمل آرام کرتے رہے ہیں، خوب نیند پوری کی ہے ۔" میں نے طنزیہ مسکراہٹ سے کہا۔

"تم بہت بدمعاش ہو گئے ہو یار! میرا وہ رقعہ تمہاری سمجھ میں آگیا تھا ؟"

"ہاں۔ اور میں نے وہ ڈھلّوں صاحب کو بھی دکھا دیا تھا۔ کچھ تو شرم کرو، تم انڈیا میں ہو ۔"

"تو پھر کیا ہے ؟ کیا کروں میں؟ وہ دلال سالا میرے سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ میں کیا کرتا ؟"

"تم یوں کرتے کہ اس پر لعنت بھیج دیتے ۔"

"وہ تو میں کرتا ہی رہا ہوں، ساری رات انڈیا پر لعنت بھیجتا رہا بھلی لوگ! اب یہ چارج تم سنبھالو۔" آبی ہنس کر بولا۔

"روس کو پتہ چل گیا تو مصیبت آجائے گی ۔"

ڈھلّوں صاحب بھی اس کی باتوں پر ہنس دیے۔ انہیں ذرا دیر کے لیے اپنی وہ اذیت بھول گئی تھی جس نے ان کا ست نچوڑ دیا تھا۔ پہلے کے مقابلے میں بہت دُبلے ہو گئے تھے۔ مصیبت کی تو ایک رات آدمی سے نہیں جھیلی جاتی اور وہ اتنے دن وہاں بندھے رہے تھے۔ اس حال میں کہ کسی بھی بات پر ان کا اختیار نہیں تھا۔

ہم دس بجے ہوٹل کے واجبات ادا کر کے باہر نکلے اور ٹیکسی میں بیٹھ کر شہر سے باہر نکل گئے۔ ہمارا رُخ کھیم کرن کی طرف تھا۔ آبی کا یہی خیال تھا کہ ہم ایک بار پھر مستم پہنچ کر تیج رام کے ذریعے بارڈر پار کر جائیں گے ۔

تجویز اس کی بہت مناسب تھی۔ وہ شخص ایسا انتظام کرتا تھا کہ آدمی کو سوتے میں سرحد پار کروا دیتا تھا۔ ڈھلّوں صاحب کے لیے وہ سارا سلسلہ بہت ہی حیرت انگیز تھا۔ سرحد ان کے لیے ہمالہ پہاڑ سے زیادہ اونچی تھی۔ وہ کبھی تصوّر بھی نہیں کر سکتے تھے کہ لوگ بغیر اجازت راتوں کو اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر ہوتے رہتے ہیں۔

"یہ قصّہ کیا ہے بھئی ؟ اب کہاں جا رہے ہیں ہم ؟"

"کھیم کرن کے پاس ایک گاؤں ہے۔ وہیں سے ہم سرحد پار کریں گے ڈھلوں صاحب! ذرا اس ڈرائیور سے بچ کر بات کریں" میں نے ان کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔ وہ میرے دائیں ہاتھ بیٹھے تھے اور آبی میرے بائیں ہاتھ تھا:

"عجیب بات ہے جیلانی! بہرحال ٹھیک ہے۔ تم بہتر سمجھتے ہو۔ کسی چکر میں نہ پھنس جانا"

"فکر نہ کریں۔ راستہ بالکل صاف ہے"

وہ کچھ مطمئن سے ہو گئے۔ آبی نے تین سگریٹ سلگا لیے اور ہمیں دے کر بولا۔

"پیو یار! تمھیں شراب اگر جائز ہے تو سگریٹ کیوں نہیں۔ بے دھڑک ہو کر پیو" اس کی یہ بات سن کر ڈرائیور نے عقب نما آئینے میں ہمیں پہلی بار غور سے دیکھا اور ہماری طرف منہ کر کے بولا "ایک سگریٹ مجھے بھی دینا۔ میرا پیکٹ اُدھر چائے خانے میں ہی پڑا رہ گیا"

"تو تم بھی پیو! تم ہندو ہو شاید؟"

"ہاں! میرا نام شام لال ہے۔ اچھا ہے آپ سکھوں کو بھی اس راہ پر لگا رہے ہیں"

"تیری گاڑی میں پٹرول ہے نا؟"

"جی ہاں! آپ کہاں جائیں گے؟ میرا خیال تھا اب آپ مجھے چھوڑ دیں گے"

"نہیں یار! ہم کھیم کرن جا رہے ہیں۔ جتنے پیسے کہو گے ہم تمھیں دے دیں گے" آبی نے بڑی رسان سے کہا۔

"یہ تو اور بھی اچھا ہے۔ وہاں میری ماسی رہتی ہے۔ اسی بہانے میں اس سے مل لوں گا" وہ مطمئن سا ہو گیا۔ اسے لمبے رستے کی سواری مل گئی تھی اور اسے کیا چاہیے تھا۔

سفر بڑے اطمینان سے طے ہو گیا۔ راستے میں ہم نے جان بوجھ کر کوئی بات نہیں کی۔ ہمیں ڈرائیور کے بیچ کا نوں سے بہرحال بچ کر رہنا چاہیے تھا۔ مسٹم گاؤں کھیم کرن سے دائیں ہاتھ تھا۔ ہم ٹیکسی کو سیدھا وہیں لے گئے۔ ڈرائیور کو کرایہ دے کر آبی نے اسی وقت فارغ کر دیا۔ تب مجھے یاد آیا کہ رقم تو ہماری جیب میں بہت کم تھی۔ ہم تیج رام کو اتنی رقم کسی بھی طرح نہیں دے سکتے تھے۔ ڈھلوں صاحب کا دس ہزار روپیہ ہم کہاں سے فراہم کر سکتے تھے۔ ڈرائیور واپس گیا، تو میں نے آبی سے کہا۔

"استاد! رقم تیرے پاس کتنی ہے۔ ہمیں تو تیس ہزار روپے دینے ہوں گے"

"بڑی رقم ہے میرے پاس! رات میں نو بجے کے قریب سیر کے لیے باہر نکلا تھا"

"پھر؟ پھر کیا ہوا؟ کوئی واردات تو نہیں کر دی تو نے؟"

"بات کچھ ایسی ہی ہوئی تھی۔ راستے کا تو مجھے پتہ نہیں تھا میں رام باغ کی طرف جا رہا تھا کہ مجھے ایک گلی میں سے ایک آدمی تنہا جاتا نظر آیا۔ اس نے ہاتھ میں تھیلا پکڑ رکھا تھا۔ پتہ نہیں کیا ہوا۔ وہ تھیلا اس کے ہاتھ سے گر گیا اور...... یہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا کہ اس میں ڈھیر سارے نوٹ بند تھے۔ جو تھیلے سے باہر نکل گئے۔ وہ فوراً ہی گلی کے فرش پر بیٹھ گیا اور نوٹ تھیلے میں ڈالنے لگا۔ تو میں اس پر جا چڑھا اور اپنا خنجر میں نے اس کی گردن سے لگا دیا۔ وہ کوئی لالہ تھا اور پیشے کے لحاظ سے صرافی کرتا تھا۔ گلی بالکل سنسان پڑی تھی۔ وہ میرے خنجر کو دیکھ کر پاگل ہو گیا اور زمین پر گرے ہوئے نوٹ وہیں چھوڑ کر فوراً ہی بھاگ نکلا۔ میں یہی چاہتا تھا۔ آدھے نوٹ اس کے تھیلے میں ہی رہ گئے۔ میں نے وہ نوٹ اٹھائے اور انہیں سمیٹ کر گلی سے نکل گیا۔ کسی نے مجھے نہیں روکا۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ صراف کام کہاں کرتا ہے۔ یہ چوڑیاں اور یہ گلے کا ہار مجھے انہی نوٹوں کے ساتھ ملا تھا" اس نے جیب سے دونوں چیزیں نکال کر مجھے دکھائیں۔

"ہو سکتا ہے وہ کوئی چور ہو"

"نہیں۔ چور ہوتا تو ضرور مقابلہ کرتا۔ یوں رقم ضائع نہ ہونے دیتا۔ میں نے رام باغ پہنچ کر ایک چائے خانے میں بیٹھ کر نوٹ گنے تو وہ پینتالیس ہزار روپے بنے۔ میرا خیال ہے یہ رقم بہت کافی ہے۔ اسی خوشی میں رات میں نے دلال کو بھی ہزار روپے دے دیے۔ اس میں سے پانچ سو ساوتری کے تھے۔ میں کچھ زیادہ ہی بادشاہ بن گیا تھا"

"بہت خبیث آدمی ہو تم! سنا آپ نے ڈھلوں صاحب! یہ لچھن ہیں اس کے"

"کوئی بات نہیں! یہ بھی جائز ہی ہے۔ ہمارا کام تو بن سکتا ہے"

"جی ہاں! اب تو ہم بڑے اطمینان سے سرحد پار کر سکتے ہیں۔ کیوں آبی! تیج رام سے ہم ابھی مل لیتے ہیں"

"ہاں! میرا خیال ہے۔ وہ سالا گوئیاں بھی وہیں ہو گا۔ ہمیں وہ ضرور پہچان لیں گے"

کچھ ہی دیر بعد ہم تیج رام تک جا پہنچے۔ گوئیاں نے ہمیں دروازے کے اندر سے گزار کر صحن میں پہنچایا تو تیج رام بھی وہیں آ گیا۔

...ن کی صحت پہلے کے مقابلے میں بہت کمزور ہو چکی تھی۔ میرا ...ال ہے وہ لمبی بیماری جھیل کر اٹھا تھا۔ سلام دعا کے بعد ...بولا۔

"کیا معاملہ ہے سردار جی! کیسے آئے ہو؟"

"بات یہ ہے لالہ! کہ ہم سرحد پار کرنا چاہتے ہیں۔ پہلے ...ہم آئے تھے۔ آپ کو یاد ہو گا، کیوں گوئیاں؟"

"جی ہاں۔ میں نے آپ کو پہچان لیا ہے۔ پچھلی بار آپ ...تکلیف تو نہیں ہوئی تھی"

"نہیں یار! اتنا ضرور ہے کہ ہمیں کسی نے راستے میں ...ش کر دیا تھا۔ مگر اب اس کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے۔ ...ن ہی سرحد پار کریں گے"

"ٹھیک ہے۔ آپ تیس ہزار روپے دے دیں تو یہ گوئیاں ...کو رام تلائی لے جائے گا" تیج رام نے کھنکتے ہوئے ...یں کہا۔

آبی نے اسی وقت تیس ہزار روپیہ اس کے سامنے ڈھیر ...یا۔ وہ خوش ہو گیا۔ نوٹ اٹھا کر اس نے جلدی جلدی ان ...تی کی اور گوئیاں سے بولا "جا گوئیاں! ان کو رام تلائی ...پا دے۔ رات کو دس بجے ان کو آگے لے جانا"

"جی بہت اچھا! چلیں بھئی! جلدی کریں۔ بہت دنوں ...ڈھنگ کی سواریاں ملی ہیں"

ہم گوئیاں کے ساتھ اسی وقت رام تلائی جا پہنچے۔ اس ...ت شام کے چار بج رہے تھے۔ آبی کو تو معلوم تھا کہ ان کا ...ریق کار کیا ہے۔ مگر ڈھلوں صاحب اس معاملے کو نہیں ...جھ رہے تھے۔ میں نے انہیں جب تفصیل بتائی تو ان کی حیرت ...بدنی تھی۔

"یعنی ان لوگوں نے سرحد کے اندر سیندھ لگا رکھی ہے"

"جی ہاں! بات کچھ ایسی ہی نظر آتی ہے۔ ابھی آپ کو ...اس تجربے سے گزار دیں گے۔ اک ذرا آپ کو بے ہوش ہونا پڑے گا"

"کہیں وہ راستے میں بے ہوشی کی حالت میں ہمارا گلا ہی نہ کاٹ لیں!" ڈھلوں صاحب نے اپنا شک ظاہر کر دیا۔

"جی نہیں۔ وہ آپ کو صحیح سالم حالت میں سرحد پار کرائیں گے۔ ایسے بے ایمان نہیں ہیں کہ آدھی سواری اِدھر رہ جائے اور آدھی اُدھر"

شام ہوئی تو گوئیاں نے ہمیں مندر کے پچھلے کمرے میں پہنچا دیا۔ کھانا بھی اس نے ہمیں وہیں فراہم کیا۔ وہ اچھا کھانا تھا اور ہمیں بھوک نے کچھ زیادہ ہی پریشان کر رکھا تھا۔ گوئیاں نے ٹھیک دس بجے ہمیں ٹرالی پر بٹھا دیا۔ اس حال میں کہ اس پر ہم تینوں ہی لیٹ گئے۔ ٹرالی کی بتی جلتی رہی اور ہم ایک طویل سرنگ میں سے ہوتے ہوئے آدھی رات کے قریب ایک بہت بڑی چار دیواری کے اندر جا نکلے۔ ٹرالی کی رفتار بہت ہی سست تھی۔ احاطہ بالکل ویران تھا۔ چاندنی چٹکی ہوئی تھی... جس میں ہمیں چار دیواری کے اندر چاروں طرف سبزہ ہی سبزہ اُگا نظر آتا تھا۔ ہم عقبی دیوار کے پاس سرنگ سے باہر نکلے تھے اور گوئیاں ہمارے ساتھ تھا۔ کسی آدمی نے راستے میں اس کی کوئی مدد نہیں کی تھی اور نہ کوئی آدمی اسے لینے کے لیے سامنے آیا تھا۔ مگر وہ احاطہ ہماری آخری منزل نہیں تھا۔ ہمیں وہاں سے آگے جانا تھا اور شاید ہمیں تازہ دم کرنے کے لیے اس نے ٹرالی روکی تھی۔ چند ہی منٹ بعد اس نے ہمیں دوبارہ اس ٹرالی پر لٹا دیا، بولا۔

"ابھی ہمارا سفر ختم نہیں ہوا ہے۔ ابھی ہم بھارتی سرحد پر ہیں" دوبارہ ہم ٹرالی میں لیٹے تو آبی بولا۔

"یار! اس نے تو ہمیں معمول ہی بنا لیا ہے۔ گویا ہماری کوئی مرضی ہی نہیں ہے"

"ایسا بھی ہوتا ہے پیارے! ہم سفر میں ہیں اور ہمارا محافظ گوئیاں ہے"

"اس کو تو میں ضرور ٹکروں گا۔ سالا رقم بہت زیادہ لیتا ہے" اتنے میں گوئیاں بھی سرنگ میں اتر آیا اور ٹرالی کا انجن چلا کر وہ ہمارے سرہانے لیٹ گیا۔ ٹرالی آگے چل دی مگر کچھ ہی منٹ بعد گوئیاں نے ہمارے ساتھ وہی حرکت کی۔ جو وہ پہلے کر چکا تھا۔ اس نے سرنگ کی ہوا میں کوئی ایسی تیز خوشبو پھیلا دی کہ کوشش کے باوجود ہم میں سے کوئی بھی اپنے حواسوں میں نہیں رہا۔ دو ہی منٹ میں اس نے ہمارا جھٹکا کر دیا۔ خود وہ خدا جانے کیسے اس فضا میں اپنے حواس قائم رکھ سکا۔ اس بات کی سمجھ مجھے کبھی نہیں آئی۔

جب ہمیں ہوش آیا تو ہم ایک بار پھر ویرانے میں پڑے تھے۔ اس حال میں کہ ہمارے اردگرد کوئی کھیت نہیں تھا۔ بنجر زمین ہمارے اردگرد پھیلی تھی۔ صبح کا سورج طلوع ہو رہا تھا اور ایسے میں وہ اونچا ٹیلا جس کے نیچے ہم پڑے تھے، پہاڑ ایسا بالا و بلند نظر آتا تھا۔ آبی اور ڈھلوں صاحب بالکل بے سدھ پڑے تھے۔ ان کو میں نے بڑی مشکلوں سے اس نیند سے بیدار کیا جس میں وہ خواہ مخواہ ہی جا پھنسے تھے۔ آبی کی جب آنکھیں کھلیں تو

اردگرد کے حالات کا جائزہ لے کر ایک گالی گوئیاں کو دیتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اپنی جیبیں دیکھنے لگا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ہمارے ہتھیار اور ہماری رقمیں سب کی سب محفوظ تھیں۔ ان کو کسی نے چھوا تک نہیں تھا۔ دونوں اسٹین گنیں اور پستول ہمارے پاس تھے۔ گوئیاں کی ایمانداری کی میں جس قدر بھی تعریف کروں کم ہو گی۔ ورنہ وہ ہمیں راستے میں ہی ہر شے سے محروم کر سکتا تھا۔ ڈھلوں صاحب کی حالت دیدنی تھی۔ وہ یوں گرد و پیش کا جائزہ لے رہے تھے جیسے انہیں آسمان سے اتار کر کسی نے ویران جزیرے میں لا پھینکا ہو۔ ان کا حال کسی گم کردہ راہ کا سا ہو رہا تھا۔ وہ چڑھتے سورج کو بار بار آنکھیں جھپک جھپک کر دیکھ رہے تھے، بولے "یہ ..... یہ پاکستان کا سورج ہے نا؟ تمہیں یقین ہے کہ ہم وطن واپس پہنچ چکے ہیں"۔

میں نے سر سے پگڑی اور وِگ اتار کر ہاتھ میں پکڑ لی۔

"جی ہاں! خیال تو یہی ہے۔ ابھی معلوم کر لیتے ہیں، اٹھیں آپ! ذرا ہمت کریں۔" یہ کہہ کر میں نے انہیں ہاتھ سے پکڑ کر اوپر اٹھایا۔ اسٹین گن اب بھی ان کے پہلو سے لگی تھی۔ آبی البتہ ابھی تک شمس پرستی میں لگا تھا۔ سورج آہستہ آہستہ اوپر اٹھ رہا تھا۔ اس میدان میں سردی کچھ زیادہ ہی تھی۔ جب ہم ٹیلے کی اوٹ سے نکلے تو ہوا اور زیادہ تیز ہو گئی۔ کوئی ایک میل تک ہم پیدل چلتے رہے۔ جب کہیں جا کر ہمیں کھیتوں میں کسانوں کی صورت نظر آئی۔ آبی تیزی سے ان کی طرف لپکا اور بولا۔

"او بھائی! یہ کون سی جگہ ہے؟"

"کہاں جانا ہے تمہیں؟"

"اس گاؤں کا کیا نام ہے بھائی! ہم مسافر ہیں۔ کچھ ہماری مدد کرو۔"

"یہ علی پور ہے۔ اس سے آگے قصور ہے۔ اِدھر جاؤ تو سامنے فراش ہے۔ تمہیں کدھر جانا ہے؟"

"ہمیں قصور جانا ہے یار! تمہاری بڑی مہربانی! ہم تو راستہ ہی بھول گئے تھے۔"

"یہ عجیب بات ہے۔ ہر چوتھے روز یہاں کوئی نہ کوئی بھٹکا ہوا مسافر مل جاتا ہے۔ کہاں سے آئے ہو تم؟"

"جہنم سے۔ ڈاک خانہ برزخ بمقام خاص ہاویہ دوزخ۔ سمجھے تم۔ بڑے تفتیش خان بن رہے ہو؟" آبی اسے یہ لفظ سنا کر ہماری طرف لوٹا اور بولا "چلو یار! قصور چلتے ہیں۔ وہاں سے ٹیکسی لے لیں گے۔"

"چل بھئی! اب تو یہی کرنا ہو گا۔" ہم اس کے ساتھ چلنے لگے۔ کسان کا منہ آبی نے اچھی طرح بند کر دیا تھا۔ وہ ہل کو اور زیادہ تیز چلاتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔ سوچتا ہو گا کہ پتہ نہیں کس کا منہ دیکھا تھا صبح صبح کہ ایسی ڈانٹ سننی پڑی۔

قصور پہنچ کر ہم نے لاہور کے لیے ایک ٹیکسی کرائے پر لی اور اسی وقت ہم چوگوٹھ کی طرف چل دیے۔ ڈھلوں صاحب کا موڈ کچھ اور زیادہ خراب ہونے لگا۔ وہ سارا راستہ خاموش رہے۔ طوفان کی آمد سے پہلے کا سناٹا ان کے وجود پر طاری تھا۔ جیسے جیسے چوگوٹھ قریب آتا گیا۔ چادر کے نیچے دبی اسٹین گن پر ان کی گرفت مضبوط ہوتی چلی گئی۔ میری نظر بار بار ان کے چہرے کی طرف اٹھتی تھی۔ جو اتنی صعوبتیں سہنے کے بعد اپنی تر و تازگی کھو بیٹھا تھا۔ آنکھیں ان کی اندر کو دھنس گئی تھیں اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ آگے نکل گئے ہیں۔ بڑھاپے کے آثار ان پر نمایاں ہونے لگے تھے۔ پتہ نہیں کیسے کیسے خیال انہیں آتے تھے۔ بیگم کی وہ اندوہناک سازش، ایک ادنیٰ ملازم سے ان کا اتنا سارا لطف و کرم اور اس پر اندھا اعتماد ان کا جگر کاٹ رہا تھا۔ ہماری بھی کوئی بات انہیں اچھی نہیں لگتی تھی۔ ایک آہ تھی جو ان کے لبوں تلے سارا راستہ دبی رہی کبھی کبھی وہ پھیل کر بے کراں ہو جاتی تھی اور ان کی آنکھوں سے غیظ و غضب چھلکنے لگا تھا۔ وہ راغب علی جسے ہم نے ختم کر دیا تھا۔ ان کے ذہن میں ابھرتا ہو گا۔ کتنے احسانات تھے اس شخص پر ان کے مگر وہ انہیں مُردہ سمجھ کر بدری کا غلام بن گیا تھا۔ سازش وہاں یہی پھیل رہی تھی کہ ڈھلوں صاحب ختم ہو چکے ہیں۔ اب جاگیر فراست بیگم کی ملکیت ہو گی اور وہاں اب بدری کا طوطی بولے گا ایک نیا سورج طلوع ہو گا جس کی چمک دمک سے حویلی پھر سے بقعۂ نور بن جائے گی۔ فراست بیگم نے ملازموں کو بھی یہی یقین دلایا تھا۔ وہ جِھلّم جو ڈھلوں صاحب نے پہن رکھی تھی، وہ کٹ کر گر چکی تھی۔ اس کا تار تار الگ ہو چکا تھا اور بیچ میں سے وہ اتنے منحنی اور اتنے بے بس نظر آتے تھے کہ فراست بیگم سوچتی ہو گی کہ بدری انہیں پہلے کیوں نہیں ملا۔ خدا معلوم اس نے انہیں کیسی پٹی پڑھائی تھی کہ وہ اس کی تعلیم حاصل کر کے اندر سے عجلس کر رہ گئی تھیں۔ نئے عشق نے ان کو زندگی کی نئی راہ دکھا دی تھی اور انہیں یقین تھا کہ اب ڈھلوں صاحب کبھی واپس نہیں آ سکیں گے۔ وہ شاید کسی بہت ہی کمینے خاندان کی عورت تھی۔ جو شوہر کی لاش پر رقصِ کُناں تھی کہ اب اسے نیا شوہر مل جائے گا۔ جو اس کے اشاروں پر ناچا کرے گا۔ وہ اس بات کا بھی انتظار نہیں کرتی ہیں کہ ان کے شوہر کی لاش کو جلو یا آگ دکھا دے۔ اس سے پہلے ہی وہ دوسرے کی سیج پر جا سوتی ہیں۔ پتہ نہیں اس کے دل میں شباب کے کیسے کیسے ولولے ناچ رہے تھے۔ مجھے جس انداز سے انھوں نے بدری سے پرے ہٹایا تھا۔ وہ مجھے اب تک یاد تھا۔

جس انداز سے انھوں نے بدری سے پرے ہٹایا تھا۔ وہ مجھے اب تک یاد تھا۔ ان کی آنکھوں کا رنگ بھی میرے ذہن سے محو نہیں ہوا تھا۔ کس یقین اور اعتماد سے وہ کہتی تھیں کہ بدری بے گناہ ہے۔ وہ فراست بیگم وہ کسی جم جاہ کی بیوی شوہر کو الٹ کر بدری کے کندھے پر جا چڑھی تھی اور اب میں ڈھلوں صاحب کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ وہ ٹیکسی کے اندر بیٹھے ہر شے سے بے نیاز ہو کر حویلی کی اندرونی صورتِ حال پر غور کر رہے تھے۔ لوگ انہیں واقعی مُردہ سمجھ چکے تھے۔ مگر اب وہ نئی زندگی کا نیا ہالہ پہن کر اس حویلی کے افق پر نمودار ہو رہے تھے اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ ان کا اگلا قدم کہاں پڑے گا اور کس کس کی لاش کو رَوند ڈالے گا۔

"کیا سوچ رہے ہیں ڈھلوں صاحب ہلیں یہ سگریٹ پئیں۔" میں نے آبی سے سگریٹ کا پیکٹ لے کر ان کی طرف بڑھایا۔

"کچھ نہیں جیلانی! میں سوچتا ہوں کہ اگر تم نہ پہنچتے تو خدا جانے وہ لوگ میرا کیا حال کرتے۔ ابھی تو وہ مجھ پر بلبیر سنگھ کے قتل کا الزام لگا رہے تھے۔ مگر دَر پردہ ان کی سازش کچھ اور تھی۔"

"وہ تو ظاہر ہی ہے۔ آپ کو بہت پہلے ہی میں بتا چکا تھا۔"

"مجھے اب شیخ یوسف احمد، کبیر علی، شفیع اللہ لغاری اور کریم احمد چانڈیو کا دھیان لگا ہے۔ وہ پتہ نہیں ان کے خلاف کیا کچھ کر چکے ہیں؟"

"ان کا دوسرا وار ابھی چل نہیں سکا ہے۔ ورنہ وہ بھی آپ کے ساتھ ہوتے۔ ہمیں چانڈیو کے لیے سکھر جانا ہو گا۔ لغاری کوئٹہ میں ہوتے ہیں۔ البتہ یوسف احمد اور کبیر علی سے ہم وہاڑی جا کر مل سکتے ہیں۔ انہیں خبردار کرنا بہت ضروری ہے۔"

"میں ان سے پہلے فون پر بات کروں گا۔ ان سب کو میں پہلے بھی بتا چکا تھا کہ دشمن کی سازش کیا ہے۔ اب میں پھر ان سے ملوں گا۔ حیرت مجھے یہ ہے کہ آخر یہ ہندو اور سکھ چاہتے کیا ہیں؟ آپ تو اس معاملے میں میری وجہ سے آ پھنسے، مگر دیکھنا یہ ہے کہ یہ سلسلہ رکے گا کہاں؟"

"بے فکر رہیں۔ وہ اپنی سازش میں کامیاب نہیں ہو سکتے ہیں۔ بس آپ کو اب زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔"

"مگر سازشی تو ابھی تک ہمارے سامنے نہیں آیا ہے وہاں ایک جتھے دار تھا۔ پرتاب سنگھ بادل، وہ دو دفعہ میرے پاس آیا۔ ایک ہندو رام سروپ مہتہ بھی اس کے ساتھ تھا۔ وہ مجھ سے بلبیر کے بارے میں پوچھتے رہے۔ اس سے زیادہ بات ان لوگوں نے نہیں کی۔ وہ آپس میں اسی نام سے ایک دوسرے کو پکارتے تھے آخر میں پرتاب سنگھ نے کہا تھا کہ ان سب کو اکٹھا کر کے ہی وہ کسی نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں۔ آخر وہ کون سا نتیجہ ہے جو وہ نکالنا چاہتے ہیں؟"

"یہ بات تو میری بھی سمجھ میں نہیں آئی ہے۔"

"سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ ہمارے بڑے صاحب کے بارے میں بھی اچھے ارادے نہیں رکھتے۔ ہمارے ایک سابق گورنر کو بھی وہ اٹھا لینا چاہتے ہیں۔"

"پتہ نہیں ان لوگوں سے انہیں کیا ضد ہے؟"

"یہی بات تو میری سمجھ میں نہیں آئی۔ کوئی گہری سازش وہ ہمارے خلاف کر رہے ہیں۔ بہر حال میں ان لوگوں کو ضرور خبردار کروں گا۔ ان کو بچا لینا ہمارا فرض ہے جیلانی!"

"یہ تو کرنا ہی پڑے گا۔ عین ممکن ہے وہ ہم دونوں کو بھی کسی وقت لے اُڑیں۔"

"ہاں۔ تمہیں تو بہت محتاط رہنا ہو گا۔ ان کو جو شکست تم دے آئے ہو، اس کو وہ کبھی فراموش نہیں کر سکیں گے۔ میرا خیال ہے کوئی چند سر پھرے لوگ ہیں جو ہمیں اس طرح سے نقصان پہنچانا چاہتے ہیں اور یہ سوچتے رہتے ہیں کہ اس طرح کسی قوم سے اس کے رہنما چھین کر وہ اسے ذلیل کر سکتے ہیں۔ مگر یہ ان کی بھول ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ میں نہ ہوں گا تو میری جگہ کوئی اور لے لے گا۔"

"کسی پارٹی کا نام بھی آپ نے سُنا۔ وہ کچھ تو کہتے ہوں گے؟"

"ہاں۔ راشٹریہ سیوک سنگھ کا نام میں نے ان سے سنا تھا اور وہ بھی مشرقی پنجاب میں کچھ لوگ ہیں جو ان سے متعلق ہیں۔ اس پارٹی کی پاکستان دشمنی تو مشہور رہی ہے۔" ڈھلوں صاحب نے کہا۔

"ان کو ہم چُن چُن کر مار سکتے ہیں۔ ملہوترہ تو چل بسا۔ بھنڈاری کو بھی سمجھ آ گئی ہو گی۔ اگر وہ سیدھا نہیں ہوا تو میں پھر اس پر جا چڑھوں گا۔ پرتاب سنگھ اور رام سروپ کو بھی میں دیکھ لوں گا۔ میں ایک ایک کو گولی مار دوں گا۔"

"دیکھیں اب یہ سانپ کہاں سے سر نکالتا ہے؟ ابھی تو مجھے اپنے گھر کی خبر لینی ہے جیلانی! میں اس کے بارے میں بہت زیادہ فکرمند ہوں۔"

"اب گھبرانے کی کیا ضرورت ہے؟ سب کچھ آپ کے سامنے آ گیا ہے۔ جو فیصلہ آپ کی مرضی ہے، کریں۔"

"ہاں تم دیکھتے رہو۔ ایک ایک کو میں اُدھیڑ کر رکھ دُوں گا۔"

چوگوٹھ جب ہم پہنچے تو گیارہ بج چکے تھے۔ ٹیکسی ہم نے حویلی سے کافی دور روک کر واپس کردی۔ جب ہم تینوں حویلی کے دروازے پہ پہنچے تو ڈیوڑھی میں چند ملازم حقہ پی رہے تھے۔ ڈھلوں صاحب پر اُن کی نظر پڑی تو وہ بے یقینی کی حالت میں اپنی جگہ سے اٹھ گئے۔ کاشی، ناظر، غفار اور مشتاق ایک دم چیخ اٹھے۔

"چوہدری صاحب! آپ؟ اوئے برکت' ادھر آ- یہ دیکھ چوہدری صاحب آگئے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے وہ ڈھلوں صاحب کو سلام سلام کہتے ہوئے ان کے ہاتھ چومنے کے لیے آگے بڑھے مگر ڈھلوں صاحب نے انہیں ایسی غضب ناک نگاہوں سے دیکھا کہ وہ دہل سے گئے۔

"حویلی کا یہ دروازہ اندر سے بند کر دے اوئے مشتاق! اور تم سب میرے ساتھ آؤ۔" یہ کہہ کر وہ ڈیوڑھی سے نکلے اور صحن میں جا پہنچے۔ برکت سامنے سے آرہا تھا۔ اس نے ڈھلوں صاحب کو دیکھا تو حالت اس کی یہ ہوگئی کہ بندوق اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ وہ پاگلوں کی طرح دوڑتا ہوا ان تک پہنچا اور ہکلاتے ہوئے بولا۔

"سرکار آپ .... آپ کہاں چلے گئے تھے؟ ادھر تو آپ کے دشمن کوئی اور ہی افواہ اڑا رہے تھے۔"

"بکو مت! تم بھی میرے ساتھ آؤ۔ ہاشم صاحب! یہ بندوق آپ اٹھالیں۔"

برکت خوف زدہ ہو کر وہیں منجمد ہوگیا۔ میں نے اس کی بندوق اٹھائی تو وہ بولا۔

"آپ ٹھیک تو ہیں سرکار! نصیبِ دشمناں، لوگ کہتے تھے ....."

"بکواس بند کرو۔ مجھے پتہ ہے لوگ کیا کہتے تھے۔" یہ کہہ کر وہ تیز تیز چلتے ہوئے مہمان خانے میں جا گھسے۔ زنان خانے کا رُخ انہوں نے نہیں کیا۔ ایک عجیب سی غضب ناک کیفیت ان پہ طاری تھی۔ جانو وہ سر سے پاؤں تک آگ میں تپ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں لہو اُتر آیا تھا۔ حویلی کے اندر قدم رکھتے ہی انکے اندر وہاں کی ہر شے بھسم کر دینے کی آرزو مچلنے لگی تھی۔ وہاں کے ایک ایک آدمی سے انہیں نفرت ہو چکی تھی۔ سامنے کھڑا برکت اور ڈیوڑھی کے ملازم مشتاق، نا تھو، کمال اور دوسرے لوگ جو برآمدے میں آ ٹھہرے تھے، سب کے سب ان کی نظر میں گردن زدنی تھے۔ پتہ نہیں ان کی کس کس بے وفائی نے انہیں پریشان کر رکھا تھا۔ کیسی کیسی بدگمانیاں ان کے دل میں اُبھر آئی تھیں۔ وہ ان کا وجود ہی برداشت نہیں کر رہے تھے۔

وہ کرسی پر بیٹھے مگر فوراً ہی اٹھ گئے۔ بڑے ہی کرخت دار لہجے میں بولے۔

"اوئے برکت! اندر آ ذرا۔" برکت لرزتا کانپتا کمرے میں داخل ہوا تو ڈھلوں صاحب نے کرخت دار لہجے میں پوچھا۔

"برکت! تمہیں پتہ ہے راغب علی کہاں ہے؟ اسے بلاؤ ذرا۔"

"جی ...... وہ ..... وہ تو قتل ہو چکا ہے۔ اُدھر روہی میں اس کی لاش ملی تھی۔ اس کے ساتھ تین اور آدمی بھی ختم ہو گئے تھے۔"

"کیا کہہ رہے ہو تم؟ کس نے قتل کیا ہے انہیں۔ کون آدمی تھے اس کے ساتھ؟"

"جی وہ ..... اختر، جمیل اور رضا بھی اس کے ساتھ تھے۔ انہیں کسی نے گولی مار دی تھی۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" ڈھلوں صاحب نے غضب ناک ہو کر الٹے ہاتھ کا ایک تھپڑ برکت کے منہ پر دے مارا۔ وہ بے چارا الٹ کر دیوار میں جا لگا۔

"کیا کرتے رہے ہو تم یہاں؟ کس نے مار دیا ہے انہیں؟"

"وہ جی ..... سرکار! اس بات کا جواب تو ہاشم صاحب ہی دے سکتے ہیں۔"

"انہیں کیا پتہ؟ ان سے کیا پوچھوں میں؟"

برکت بُری طرح لرز رہا تھا۔ اس کی آنکھیں دھندلانے لگی تھیں۔ ڈھلوں صاحب نے اسے بازو سے پکڑ کر دیوار سے ہٹایا، بولے۔

"بتاؤ مجھے، میں ان سے کیا پوچھوں؟ ہوا کیا تھا آخر؟ کس نے انہیں کس لیے باہر بھیجا تھا؟"

"سرکار! میں بالکل بے گناہ ہوں۔ مجھے تو خود سمجھ نہیں آئی۔ بیگم صاحبہ نے ان سیاہ پوشوں کو ہاشم صاحب کے تعاقب میں روانہ کیا تھا۔ وہ انہیں مروا دینا چاہتی تھیں اور یہ کام بدری کے اشارے پر ہوا تھا۔"

"بدری؟ میں سمجھ لوں گا، تم سب سے سمجھ لوں گا.... ان کی لاشوں کا کیا کیا تم نے؟"

"وہ تو جی پولیس لے گئی۔ سارے گاؤں میں شور مچ گیا تھا۔ پھر وہ بیگم صاحبہ کے پاس آئے۔ سب لوگوں کو پتہ تھا کہ وہ حویلی کے ملازم ہیں۔ بیگم صاحبہ نے ہاشم صاحب کا نام لیا۔ پرچہ ان کے نام کٹا ہے۔ بدری اس معاملے میں سب سے زیادہ دلچسپی لے رہا تھا۔ وہ ...... وہ تو حویلی کا مالک بن بیٹھا تھا اور.... اور بیگم صاحبہ اس کی حمایت کرتی تھیں۔ اِدھر تو سب کچھ ہی بدل

گیا تھا سرکار!" برکت اب رونے لگا تھا۔ اس کی آنکھوں سے یہ بڑے بڑے گدلے گدلے آنسو بہہ نکلے تھے مگر ڈھلوں صاحب کا غصہ ابھی تک نہیں ڈھل سکا تھا۔

"جاؤ اندر جا کر فراست بیگم کو اِدھر بھیجو۔ مگر ٹھہرو! میرے تمام نوکروں کو پہلے یہاں جمع کرو۔ کوئی آدمی پیچھے نہ رہ جائے اور سب سے ہتھیار لے لو۔"

"جی بہت اچھا! میں انہیں یہاں لے آتا ہوں۔" یہ کہہ کر برکت تیزی سے باہر نکل گیا۔ ڈیوڑھی کے تینوں ملازم سر جھکائے سامنے کھڑے تھے۔

"اوئے! تم سب اُدھر تیسرے کمرے میں بیٹھ جاؤ۔ سُنا تم نے کہ نہیں؟"

ڈھلوں صاحب کی آواز سنتے ہی وہ تینوں مہمان خانے کے تیسرے کمرے میں جا گھسے۔ برآمدہ ان کے وجود سے خالی ہوا تو ڈھلوں صاحب کمرے سے نکل کر سامنے صحن میں جا ٹھہرے۔ ان کی حالت دیدنی تھی۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے وہ غصے سے پاگل ہو جائیں گے۔ اس وقت ہم بھی انہیں نظر نہیں آرہے تھے۔ آبی الگ بیٹھا مسلسل سگریٹ پھونک رہا تھا۔ اچانک اس نے پیکٹ میری طرف پھینک دیا، بولا۔

"سگریٹ پی جیلانی! تاکہ تیری حیرت کم ہو جائے۔ یہ ان کا اندرونی معاملہ ہے۔ ہمیں اس میں دخل نہیں دینا چاہیے۔"

"میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا ہے آبی! یہ تو کیسے سوچ رہا ہے کہ میں دخل اندازی کر رہا ہوں؟"

"تیرا چہرہ ہی بتا رہا ہے پیارے! اور مجھے یہ ڈر ہے کہ کہیں یہ ڈھلوں صاحب پلٹ کر ہم پر ہی حملہ آور نہ ہو جائیں۔"

"نہیں یار! اتنے پاگل نہیں ہوئے ہیں وہ۔ مجھے معلوم ہے، آدمی کی حالت ایسی صورت میں کیا ہو جاتی ہے۔ پوری حویلی ان کی دشمن ہو چکی ہے۔"

"لگتا تو ایسا ہی ہے۔ مگر ڈھلوں صاحب کو بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا چاہیے۔ لیکن وہ مشورے کی حد سے بہت آگے جا چکے ہیں۔"

ابھی وہ یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ صحن میں دس سیاہ پوش داخل ہو گئے۔ ان کے ہتھیار برکت نے بازوؤں میں بھر رکھے تھے۔ بھری ہوئی بندوقیں اس نے بڑی مشکل سے سنبھال رکھی تھیں۔ وہ اس نے لا کر ڈھلوں صاحب کے پاؤں کے قریب رکھ دیں۔ ڈھلوں صاحب نے ان کو انتہائی غضب ناک حالت میں دیکھا اور بولے۔

"ان سب کو اُدھر کمرے میں بٹھا دو۔ مگر وہ سالم نذیر اور جالی کہاں ہیں؟ وہ مجھے ان میں نظر نہیں آرہے۔"

"وہ ...... وہ مجھے کہیں نہیں ملے ہیں سرکار! وہ شاید کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔"

"ہوں ٹھیک ہے کمرے کو باہر سے تالا لگا دو۔ چلو اوئے سب کے سب اندر بیٹھ جاؤ۔" ڈھلوں صاحب نے تیسرے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ سدھلائے ہوئے جانوروں کی طرح کمرے کی طرف بڑھے تو برکت نے دروازہ بند کر کے باہر سے تالا ڈال دیا۔

"وہ برکی کہاں ہے؟"

"جی .... وہ شہر گیا ہوا ہے۔ گاڑی کا شیشہ اسے نہیں مل رہا تھا اور گاڑی ابھی تک ورکشاپ میں ہے۔ کل دوپہر کو گیا تھا وہ یہاں سے۔"

"ادھر آؤ ذرا!" یہ کہہ کر وہ کمرے میں آگئے اور مجھ سے سگریٹ لے کر سلگانے لگے۔ غصے کی وجہ سے اب تک ان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا، بولے۔

"ان کے لیے میرے کمرے میں سے شراب کی بوتلیں لے آؤ اور ان کو اتنی پلاؤ کہ یہ دُھت ہو جائیں۔"

"جی! میں شراب لے آؤں؟"

"ہاں! میں نے یہی کہا ہے۔ جاؤ بائیں ہاتھ کی الماری کے نچلے خانے میں جتنی بھی بوتلیں ہیں' وہ لے آؤ!"

مگر ابھی وہ یہ بات کہہ ہی رہے تھے کہ صحن کے سامنے کی دیوار کے اوپر سے کئی گولیاں تڑ تڑ اندر آنے لگیں اور اس کے ساتھ ہی دو آدمی اسٹین گن سے فائر کرتے ہوئے صحن میں آگئے۔ ان کا انداز بڑا ہی خوفناک تھا۔ میں اچھل کر دیوار کے ساتھ جا لگا۔ ایک گولی ڈھلوں صاحب کی ران میں لگی۔ آبی بھی حیرت زدہ ہو کر دیوار کے ساتھ جا لگا اور عین اس وقت مجھے یاد آیا کہ ایک ہتھیار تو میرے پاس بھی موجود ہے۔ مگر اس عرصے میں ایک آدمی دندناتا ہوا دروازے تک آ پہنچا— ڈھلوں صاحب پہلی گولی لگنے سے نڈھال سے ہو کر غسل خانے میں جا گھسے تھے۔ میں نے اسٹین گن سیدھی کی ہی تھی کہ اس نے پھر گولی چلا دی۔ لیکن اس کا نشانہ چوک گیا۔ جیسے ہی اس نے دوسری گولی پر ہاتھ رکھا آبی نے اپنی جگہ سے کئی ہاتھ اوپر اچھل کر اس کے سینے پر لات دے ماری۔ وہ ایسی فلائنگ کک تھی کہ وہ آدمی دروازے میں ہی ڈھیر ہو گیا۔ اسٹین گن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی مگر اس عرصے میں دوسرے دو آدمی گولیاں برساتے ہوئے اندر آ گھسے۔ وہ دونوں میری زد میں تھے۔ میں

اس وقت تک کھڑکی کے قریب جا ٹھہرا تھا۔ آبی الٹ کر زمین پر گرا تو ان دونوں آدمیوں نے اس پر گولی چلا دی۔ مگر اس کے ساتھ ہی میری اسٹین گن نے انہیں بھون کر رکھ دیا۔ میری گولیاں نشانے پر لگیں، وہ دونوں قلابازیاں سی کھا کر زمین پر گر گئے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے تیسرے آدمی کے سر میں اسٹین گن کا دستہ دے مارا۔ وہ اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر میں نے اسے وہیں سلا دیا۔ وہ لوگ آبی کو لے ڈوبے تھے۔ جیسے ہی میں ان سے فارغ ہوا، میں نے ان کے ہاتھ سے اسٹین گن چھین لیں مرتے مرتے بھی وہ مزاحمت کر رہے تھے۔ مجھ سے ان کا وجود برداشت نہ ہو سکا۔ ایک ایک گولی میں نے اور ان کو دے دی دونوں کے سینے چھلنی ہو چکے تھے۔ مگر آبی لٹ چکا تھا۔ ان کو زمین پر گرا کر میں اس کی طرف متوجہ ہوا تو پتہ یہ چلا کہ اس کا بایاں بازو شدید زخمی ہو چکا تھا اور ایک گولی اس کے کولھے میں دھنس گئی تھی۔ اس کو میں نے اٹھا کر پلنگ پر ڈالا۔ تو سارا بستر اس کے لہو سے تر ہو گیا مگر پھر بھی وہ ابھی تک ہوش میں تھا، بولا۔

"ڈھلوں صاحب کو دیکھو۔ وہ بھی سخت زخمی ہیں۔"

"اپنے آپ کو سنبھالو! تمہارا علاج ہو سکتا ہے۔ حواس قائم رکھو۔" یہ کہہ کر میں غسل خانے کی طرف لپکا۔ ڈھلوں صاحب کی ران میں گولی لگی تھی اور وہ بڑے صبر سے اس زخم کو جھیل رہے تھے۔

"آپ ٹھیک تو ہیں نا، ڈھلوں صاحب؟" میں نے ان کو فرش پر سے بڑی مشکلوں سے اوپر اٹھایا۔ اتنے میں برکت بھی اندر آ گیا اور ہم نے ان کو سہارا دے کر دوسرے بستر پر ڈال دیا۔ مگر عین اس وقت برکت کی چھٹی حس اسے بیدار کر گئی۔ وہ دروازے کے باہر دیکھتے ہوئے بولا۔

"وہ...... وہ فراست بیگم..."

"ان کو سنبھالو برکت! میں ابھی آ رہا ہوں۔" یہ کہہ کر میں تیزی سے کمرے سے نکلا اور صحن عبور کر کے دیوار کی دوسری طرف جا پہنچا۔ اس وقت فراست بیگم ایک نوجوان عورت کے ساتھ تیز تیز قدم اٹھاتی حویلی کے بڑے دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس کی رفتار میں بلا کی تیزی تھی۔ اس کو یوں وہاں سے فرار ہوتے دیکھ کر میں نے اسٹین گن کا رُخ ان کی طرف پھیر دیا۔ فاصلہ بھی کوئی چھ ہاتھ کا تھا اور وہ دونوں میری گولی کی زد میں تھیں۔

"بیگم صاحبہ! آپ باہر نہیں جا سکتی ہیں۔ آپ کو ابھی ڈھلوں صاحب بُلا رہے ہیں۔"

وہ ٹھٹک کر رہ گئیں۔ فراست بیگم نے گھوم کر مجھے دیکھا تو اسٹین گن پر اس کی نظر پڑتے ہی وہ وہیں ٹھہر گئیں۔ لڑکی ان کے عقب میں جا ٹھہری تھی اور وہ بڑی طرح لرز رہی تھی۔

"تم کون ہوتے ہو مجھے روکنے والے! میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔ ورنہ اچھا نہیں ہو گا۔"

وہ ہاتھ میں پستول لیے ہوئے تھی مگر اسٹین گن کا زاویہ دیکھ کر وہ دہشت زدہ ہو گئی۔ اس کا ہاتھ اوپر اٹھتے اٹھتے رہ گیا۔

"یہ پستول پھینک دیں، بیگم صاحبہ! اور میرے ساتھ آئیں۔" میں نے دو قدم اور آگے بڑھ کر کہا۔ اس نے گھبرا کر پستول زمین پر پھینک دیا۔ تو میں ان کے عقب میں جا پہنچا اور اسٹین گن کی نالی میں نے فراست بیگم کی کمر سے لگا کر کہا۔

"چلیں بیگم صاحبہ! ڈھلوں صاحب آپ کا انتظار کر رہے ہیں...."

لڑکی کو بائیں ہاتھ سے دھکیل کر میں نے آگے بڑھایا۔ فراست بیگم نال کی زد میں آئی تو بادلِ ناخواستہ مہمان خانے کی طرف چل دی۔ اس کا پستول اس کے پاؤں تلے دب کر رہ گیا تھا۔ ان دونوں کو ساتھ لے کر میں برآمدے میں پہنچا تو ڈھلوں صاحب چیخ کر بولے۔

"اس کو ادھر غسل خانے میں بند کر دیں اور اس دوسری کو بھی میں ان کو اپنے ہاتھ سے گولی ماروں گا۔"

میں نے ان کو دھکا دیتے ہوئے کمرے میں پہنچایا اور غسل خانے میں بند کر کے باہر سے کنڈی چڑھا دی۔ فراست بیگم کا حوصلہ مجھے حیران کرتا تھا۔ وہ بدترین حالات میں بھی اپنے حواس درست رکھتی تھی۔ غسل خانے میں جب میں نے اُسے بند کیا تو اس کے چہرے سے کوئی تاثر ظاہر نہیں ہو رہا تھا اور وہ مجھے یوں دیکھ رہی تھی۔ جیسے میرا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ اس کی ساری توجہ ڈھلوں صاحب کی طرف تھی۔ جو اس وقت اپنی زخمی ٹانگ کو دیکھنے لگے تھے۔ انہیں ان کا زخم کسی اور طرف دیکھنے کی مہلت ہی نہیں دیتا تھا۔ دروازے میں تینوں سیاہ پوش فرش پر آڑھے ترچھے پڑے تھے۔ جن کو اُلانگ کر وہ آگے نکلی تھیں۔

آبی کا حال ڈھلوں صاحب سے بھی زیادہ ابتر تھا اور وہ نڈھال ہوا جاتا تھا۔ برکت نے اس کے زخم پر ایک چادر رکھ دی تھی۔ مگر اس سے بھلا کیا ہوتا تھا۔

"برکت جا ذرا! گاؤں سے ڈسپنسر کو بُلا لا۔ اس سے کہنا، مرہم پٹی کا سامان لے کر فوراً آ جائے۔" ڈھلوں صاحب نے فکرمند لہجے میں کہا۔ آبی کے بارے میں وہ بھی سخت پریشان

نظر آتے تھے۔

"جی بہت اچھا۔ میں بس ابھی گیا اور آیا۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ آبی کے بازو پر میں نے چادر کی ایک پٹی کاٹ کر اس طرح باندھ دی کہ اس کا خون زیادہ نہ بہے۔ ایک پٹی کس کر میں نے اس کے کولھے کے اوپر باندھی مگر وہ زیادہ کارگر نہیں تھی۔ زخم کا خون روک لینا ممکن نہیں تھا۔

زنان خانہ وہاں سے کافی دُور تھا۔ میرا خیال ہے وہاں تک گولیوں کی آواز گئی ہی نہیں تھی ورنہ اُدھر سے کوئی نہ کوئی ضرور ہماری طرف آتا۔ میں کبھی ڈھلوں صاحب کا حوصلہ بڑھاتا تھا کبھی آبی کا۔ مگر علاج میرے پاس ان کے زخموں کا کوئی بھی نہیں تھا۔ یونہی پندرہ بیس منٹ گزر گئے۔ آبی پر غنودگی طاری ہونے لگی تھی۔ اس کا خون شاید زیادہ ہی بہہ گیا تھا۔

"یہ لاشیں یہاں سے ہٹا دیں جیلانی صاحب! ڈسپنسر کو ان کا علم نہیں ہونا چاہیے۔"

ڈھلوں صاحب ٹھیک کہہ رہے تھے۔ ان تینوں آدمیوں کو میں نے باری باری ٹانگوں سے پکڑ کر کھینچا اور دوسرے کمرے میں ڈال دیا۔ تیسرا آدمی بے ہوش تھا مگر زخم اسے کوئی نہیں لگا تھا۔ اس کو بھی میں نے وہیں پہنچا دیا مگر فرش پر ان کے خون کے چھینٹے صاف نظر آ رہے تھے۔

"یہ خون چادر سے صاف کر دیں۔ یہ بہت ضروری ہے۔" ابھی ڈھلوں صاحب کے حواس کام کر رہے تھے۔ ان کے کہنے کے مطابق میں نے ایک چادر لے کر وہ خون کا تلاف ختم کیا اور چادر پلنگ کے نیچے پھینک دی۔

برکت کی تیزی کی میں داد دیتا ہوں۔ وہ کوئی بیس منٹ بعد واپس آ گیا۔ ایک ادھیڑ عمر کا ڈسپنسر اس کے پیچھے تھا۔

"آ بھئی بیرم خان! تیری بڑی سخت ضرورت تھی۔ ادھر بڑا سخت فساد ہو گیا تھا۔ دیکھ ذرا پہلے ان کو دیکھ۔" ڈھلوں صاحب نے ڈسپنسر کو خوش آمدید کہتے ہوئے کہا۔

اس نے سب سے پہلے آبی کو دیکھا اور بولا: "گولی تو ان کے کولھے میں دھنس گئی ہے۔"

"ہاں! اسے جس طرح بھی ہو سکے نکال دے۔"

"میرا خیال ہے کہ یہ زیادہ اندر نہیں گھسی ہے۔" اس نے اپنا ڈبّا کھولتے ہوئے کہا۔ وہ آدمی مرہم پٹی کے فن میں ماہر تھا۔ اور اپنا سارا سامان ساتھ لے آیا تھا۔ آبی کو اس نے زندہ سلامت حالت میں پکڑ کر اوندھے منہ لٹا دیا اور پھر وہ اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ آبی کی چیخیں مجھ سے برداشت نہیں ہوتی تھیں۔ میں وہاں سے ہٹ کر صحن میں جا نکلا۔ دروازہ برکت نے بند کر لیا تھا۔

کوئی آدھ گھنٹے بعد برکت نے دروازہ کھول دیا۔ دونوں کے زخموں پر ڈسپنسر نے پٹی باندھ دی تھی اور وہ بہت خوش تھا۔ میں جب کمرے میں پہنچا تو اس نے وہ گولی مجھے دکھائی جو اس نے آبی کے جسم سے نکالی تھی، بولا۔

"میاں صاحب! یہ تھی وہ گولی! میں نے نکال دی تھی۔ ڈھلوں صاحب کا زخم زیادہ گہرا نہیں تھا۔ اب فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ انہیں آپ دُودھ پلا دیں۔"

"جی میں ابھی لاتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکلا تو میں آبی کے پاس جا بیٹھا۔ زخم کی ٹیس نے اسے ابھی تک نڈھال کر رکھا تھا۔ مگر ڈھلوں صاحب اب بہت بہتر محسوس کر رہے تھے۔

"اوئے جھالوں! یہ کیا حال ہو گیا ہے تیرا۔ ایک ہی رگڑے میں ختم۔"

"تنگ نہ کر یار! میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ سالوں نے یہ لمبی لمبی گولیاں گزار دیں۔ وہ بچ تو نہیں گئے ہیں؟"

"نہیں۔ ان کا قصّہ ختم ہو چکا ہے؟ بس تو اب جلدی سے اٹھ جا!"

"پتہ نہیں کتنے دن لگیں۔ میرا تو خیال ہے، زخم زیادہ ہی گہرا ہے۔ کچھ اس بیرم خان کا نشتر بھی زیادہ ہی اندر اتر گیا تھا۔"

"اچھا چوہدری صاحب! میں اب چلتا ہوں۔ ڈسپنسری میں بھیڑ لگی ہو گی۔ میں شام کو پھر آؤں گا۔"

"ہاں! اب تم جاؤ! شام کو ضرور آنا۔ یہ زخم جلدی بھر جانے چاہئیں۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ میں آج ایک اور دوا منگوا لوں گا۔ اسے آپ کھا لیں تو جلدی ٹھیک ہو جائیں گے۔" یہ کہہ کر بیرم خان اسی وقت وہاں سے باہر نکل گیا۔ برکت اسے حویلی سے نکال کر واپس آیا تو ڈھلوں صاحب بولے۔

"برکت! وہ شراب لے آ، اور ان سب کو پلا دے! سمجھا کہ نہیں۔"

"جی میں سمجھ رہا ہوں۔"

"تو بس پھر جا! اور ہمارے لیے اندر سے نئے کپڑے بھی لے آ۔ ہم تو وحشی بنے ہوئے ہیں۔"

برکت باہر نکلا تو میں نے ڈھلوں صاحب سے پوچھا۔

"یہ شراب کیوں پلا رہے ہیں آپ انہیں؟"

"بس دیکھتے جائیں۔ ابھی یہاں بہت بڑا ڈرامہ ہو گا۔"

میں ان کی سوچ کا اندازہ نہ کر سکا۔ پتہ نہیں وہ کیسے منصوبے

اپنے ذہن میں ڈھال رہے تھے۔

کچھ ہی دیر بعد برکت نے ان کے حکم کی تعمیل کر دی اور تیسرے کمرے میں اس نے سیاہ پوشوں کو شراب مہیا کر دی۔ ہمارے لیے وہ نئے کپڑے لے آیا تھا۔ اس نے باری باری ہم سب کی حجامت بنائی اور پھر اپنے ہاتھوں سے اس نے ان دونوں کو نئے کپڑے پہنا دیے۔ ایک جوڑا میں نے بھی پہن لیا۔

برکت اس کام سے فارغ ہوا تو تیسرے کمرے کا دروازہ دھڑا دھڑ بجنے لگا۔ سیاہ پوشوں نے ان کی دی ہوئی شراب حلق سے نیچے اتاری تھی اور اب وہ اودھم مچا رہے تھے۔ کمرے سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"غسل خانے کا دروازہ کھول دیں اور ان دونوں کو تیسرے کمرے میں ڈال دیں۔"

"نہیں ڈھلوں صاحب! یہ ظلم ہے، سراسر ظلم ہے۔"

"آپ اسے ظلم کہتے ہیں! نہیں ہاشم صاحب! یہ اسی سلوک کی مستحق ہیں۔ چل اوئے برکت! یہ دروازہ کھول دے۔"

برکت، ڈھلوں صاحب کا حکم ٹال نہیں سکتا تھا۔ وہ کوک بھرے کھلونے کی طرح آگے بڑھا اور اس نے غسل خانے کا دروازہ کھول دیا۔ مگر ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب ہم نے دیکھا کہ وہ دونوں عورتیں غسل خانے کے فرش پر چت پڑی تھیں۔ میں بھاگ کر اُن تک پہنچا تو معلوم ہوا کہ فراست بیگم کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی شیشی تھی جو خالی نظر آتی تھی۔ وہ دونوں زہر پھانک کر مر چکی تھیں۔ نہ فراست بیگم کے بدن میں زندگی کی رمق باقی رہ گئی تھی، نہ اس نوجوان لڑکی میں ہی زندگی کی کوئی حرارت نظر آتی تھی۔ وہ مٹی کا ڈھیر ہو چکی تھیں۔ وہ سازش اپنے بدترین اختتام تک جا پہنچی تھی۔ ڈھلوں صاحب بھی آہستہ آہستہ غسل خانے میں آ گئے۔ ان دونوں کو یوں بے جان دیکھ کر ڈھلوں صاحب نے اپنا سر پیٹ لیا۔ وہ ...... وہ فراست بیگم کو باہوں میں لے کر یوں رونے لگے، جیسے انہوں نے اس کے سارے ہی گناہ معاف کر دیے ہوں۔ وہ ان کی بہت چہیتی بیگم تھی۔ اس سے وہ بہت لوٹ کر محبت کرتے تھے۔ مگر اس روز وہ جب اس سے انتقام نہ لے سکے تو ماضی کا سارا غم لوٹ کر ان کے سینے پر آ پڑا۔ وہ فراست بیگم کے منہ سے کف ہٹاتے ہوئے بولے۔

"میں نے اسے سب سے زیادہ عزت دی۔ اس کی کسی بات کو نہیں ٹالا، مگر یہ کافر ہو کر مری۔ یہ میرے ہی خلاف ہو گئی۔ پتہ نہیں یہ مجھ سے اتنی نفرت کیوں کرتی تھی؟"

"معلوم ہوتا ہے، اس شیشی میں بہت قاتل زہر تھا۔"

"اچھا ہوا یہ مر گئی اور میں ان ملازموں کے ہاتھوں ذلیل ہونے سے بچ گیا۔ اوئے برکت! ان دونوں کو یہاں سے اٹھا دے۔ ایسا نہ ہو میں اس کے مردہ جسم پر گولی چلا دوں۔"

یہ کہہ کر انہوں نے فراست بیگم کو پھر فرش پر ڈال دیا اور رینگتے ہوئے وہاں سے باہر نکل آئے۔ ان کی آنکھیں اس گھڑی لہو روتی تھیں۔ اپنا زخم وہ بھول ہی گئے تھے۔ بستر پر لیٹ کر وہ چادر میں منہ چھپا کر رونے لگے اور یہ اچھی بات تھی۔ ورنہ وہ حادثہ ان کو مفلوج کر دیتا۔ ان کا غم گہرا تھا، بے حد گہرا۔ اور وہ اس میں ڈوب کر تباہ ہو گئے تھے۔ پتہ نہیں ان کی ران کا زخم کب صحیح ہوتا مگر دل پر جو وار وہ سہہ چکے تھے اس سے انہیں مدتوں فراغت نہیں مل سکتی تھی۔ فراست بیگم کی موت نے انہیں بے حد آزردہ کر دیا تھا۔ جن لبوں پر اس گھڑی زہر نے کف باندھ دیا تھا، وہ ان کی پرستش کیا کرتے تھے۔ بلاشبہ فراست بیگم بہت ہی حسین عورت تھی۔ مگر وہ سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ سارے ہی رشتے ناطے موت کی نذر ہو گئے تھے۔ وہ اس سے انتقام بھی نہ لے سکے اور اب وہ ان کی دسترس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دُور جا چکی تھی۔ ایسی جگہ جہاں سے وہ کبھی واپس نہیں آ سکتی تھی۔ ڈھلوں صاحب کے سینے کا گھاؤ اور گہرا ہو چلا تھا۔ وہ کرب وہ دُکھ جو انہیں فراست بیگم نے دیا تھا، ان سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ بہت ناز تھا انہیں فراست بیگم پر۔ تہہ خانے میں جس روز کتے ان پر چھوڑ دیے گئے تھے، تو وہ یہی عورت تھی جس نے انہیں بچا لیا تھا۔ مگر پھر خدا جانے کیا ہوا۔ وہی ان کی ستی ساوتری ان کے خلاف ہو گئی۔ اتنی خلاف ہوئی کہ وہ اس بدری کو اس حویلی کا مالک بنا دینے کا عزم کر بیٹھی۔ میرا خیال ہے کہ ڈھلوں صاحب نے اندر جو بیبیاں ڈال رکھی تھیں، وہی فراست بیگم کو اس کارروائی پر مجبور کر گئیں۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ اس حویلی میں ہر روز جو نئے بُت پوجے جاتے ہیں، ان کی موجودگی میں اس کی اہمیت دم بدم ختم ہوتی جا رہی ہے۔ ان کے کرجگ کا دور ختم ہو چلا تھا۔ اسی مایوسی میں گھر کر اس نے ڈھلوں صاحب کو ختم کر دینے کا فیصلہ کیا اور بدری کو ان پر سوار کر دیا۔ اچھا ہوا کہ وہ شخص تھانے میں ہلاک ہو گیا تھا۔ ورنہ پتہ نہیں صورتِ حال کیا سے کیا ہو جاتی۔

ڈھلوں صاحب روتے رہے۔ ہم نے اس دوران دونوں عورتوں کو وہاں سے اٹھا کر ساتھ کے کمرے میں ڈال دیا۔ آبی اپنی جگہ جم کر بیٹھا رہا۔ اسے وہ سارا سلسلہ بہت ہی بے ڈھب نظر آتا تھا۔ اسے نہ تو کوئی ڈھلوں صاحب سے ہمدردی تھی اور نہ فراست بیگم سے۔ وہ بستر پر بیٹھا بڑے اطمینان سے

سگریٹ پیتا رہا اور اپنے زخموں سے کھیلتا رہا۔

میں اور برکت جب دوبارہ کمرے میں آئے تو ڈھلوں صاحب تب بھی رو رہے تھے۔

"انہیں چُپ کراؤ یار! اب بھلا یوں رونے کا کیا فائدہ ہے۔ اب تو سب کچھ ہی ختم ہو چکا ہے۔" آبی نے سگریٹ فرش پر مسلتے ہوئے کہا۔

تیسرے کمرے سے سیاہ پوشوں کا شور مسلسل اٹھ رہا تھا۔ شراب نے انہیں پاگل کر دیا تھا۔ میں نے ڈھلوں صاحب کے پاس بیٹھ کر بڑی مشکلوں سے انہیں چُپ کرایا۔ ان کے آنسو تھمے تو وہ بولے۔

"چلو برکت! مجھے حویلی کے اندر پہنچا دو۔ ذرا سہارا دو مجھے۔"

برکت آگے بڑھا اور ان کو سہارا دے کر وہ مہمان خانے سے باہر لے گیا۔ جب ڈھلوں صاحب برآمدے میں پہنچے تو تیسرے کمرے سے اٹھتا شور سن کر بولے۔

"برکت! اُن سب کو ابھی ادھر ہی رہنے دو۔ دو گھنٹے بعد انہیں کھول دینا اور ان لاشوں کو اٹھا کر حویلی کے پچھلے حصے میں دفن کر دو۔ اسی حالت میں ان کو وہاں دبا دو۔"

عین اس وقت برکی حویلی کے صحن میں داخل ہوا۔ دروازہ اس کے لیے پتہ نہیں کس نے کھولا تھا۔ وہ لمبا سا اوور کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ ڈھلوں صاحب کو دیکھ کر وہ بہت حیران ہوا اور تیزی سے ان کی طرف لپکا۔ ان کی واپسی اس کے لیے کسی معجزے کی حیثیت رکھتی تھی، بولا۔

"آپ کہاں چلے گئے تھے، چوہدری صاحب؟ ہم سب تو بالکل ہی بے سہارا ہو گئے تھے۔"

"میں ادھر ہی تھا یار! وہ تیری گاڑی کہاں ہے؟"

"جی، وہ میں ساتھ لے آیا ہوں۔ اس کا شیشہ ولیشہ سب ٹوٹ گیا تھا۔ اس کی مرمت کروا کر لایا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ تم یوں کرو کہ ہاشم صاحب اور ان کے دوست کو ابھی شہر لے جاؤ۔ ان کو کسی ڈاکٹر کی شدید ضرورت ہے۔ بیرم خان سے علاج کروایا تھا مگر مجھے ڈر ہے کہ ان کی تکلیف دُور نہیں ہوئی۔"

"جی بہت بہتر! کیا ہوا ہے انہیں؟"

"کچھ فساد ہو گیا تھا یہاں! ہاشم صاحب! آپ اس کے ساتھ ابھی چلے جائیں۔ آبی کو صحت ہو جائے تو پھر ادھر آ جانا!"

"ٹھیک ہے ڈھلوں صاحب! اٹھ بھئی آبی، یہاں ٹھہرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے اب...... بس تیار ہو جا۔"

میرا خیال ہے آبی ذہنی طور پر پہلے سے تیار بیٹھا تھا۔ اگر ڈھلوں صاحب نہ بھی کہتے تو بھی وہ شہر چل دیتا۔ ارادہ اس کا یہی معلوم ہوتا تھا۔ برکی نے کمرے میں آ کر آبی کو سہارا دیا۔ مگر جب اس نے دیکھا کہ وہ چل ہی نہیں سکتا ہے تو اس نے آبی کو کندھے پر ڈال لیا اور ہم دونوں وہاں سے اٹھ کر حویلی سے باہر نکل گئے۔ ڈھلوں صاحب برکت کے ساتھ زنان خانے کی طرف جا چکے تھے۔ ہم سے انہوں نے الوداعی کلمات بھی نہیں کہے۔ پتہ نہیں وہ کس سوچ میں گُم تھے۔ میں نے بھی ان کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی۔ میرا خیال ہے، شاید ڈھلوں صاحب اپنے اغوا کا ذمّے دار مجھے ہی ٹھہرا رہے تھے۔ انہیں گہرا یقین تھا کہ اس سارے فساد کی اصل جڑ میں ہی ہوں۔ اگر میں بلبیر سنگھ کو ان کے حوالے نہ کرتا تو وہ سوچتے ہوں گے کہ سہسرام کے گوردوارے میں وہ لوگ انہیں اس کا قاتل نہ ٹھہراتے۔ ان پر الزام وہ ہی لگاتے تھے اور یہی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ مگر وہ یہ بھول رہے تھے کہ امرتسر میں موجود لوگ ان کو ہی نہیں کچھ اور لوگوں کو بھی نیست و نابود کرنے کی سوچ رہے تھے اور ان کے نام بھی میں انہیں بتا آیا تھا پھر بھی وہ مجھے ہی اس معاملے کا ذمّے دار ٹھہراتے تھے تو میں انہیں کیا کہہ سکتا تھا۔ اگر میں سہسرام نہ پہنچتا تو ان کی لاش کا ایک ٹکڑا بھی چوگوٹھ واپس نہیں آ سکتا تھا۔ مگر وہ کسی نے کہا ہے نا کہ بڑے بڑے احسانات کسی کو شکر گزار نہیں بناتے ہیں۔ معاملہ کچھ ایسا ہی ہو گیا تھا۔ وہ سوچ رہے ہوں گے کہ فراست بیگم بھی میری ہی وجہ سے ان کی مخالف بن گئی تھی۔ حالانکہ یہ ان کی بھول تھی۔ سادگی تھی، کچّا پن تھا۔ وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ مجھ سے ان کا معانقہ بھی کسی بڑے ہی غلط وقت میں ہوا تھا۔ پے بہ پے ان کو میری موجودگی میں شکستوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ مگر میں اسے کیا کہوں۔ میری تقدیر ہی ایسی تھی۔ میں نے جس بھی کندھے پر ہاتھ رکھا وہی کندھا شانے سے الگ ہو گیا۔ میری آوارہ و خجالا تقدیر میرے مخاطب کو بھی لے ڈوبتی تھی اور میں تو اس کا شکار رہتا ہی۔ ایسا نہیں ہوا کہ وہ آدمی مجھ سے کوئی فائدہ اٹھا کر پیچھے ہٹا ہو۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ میرا تجربہ مجھے یہی بتاتا تھا۔

آبی کو میں نے گاڑی میں ڈالا تو مجھے محسوس ہوا کہ اس کے زخموں سے ابھی تک خون رس رہا تھا۔ اگرچہ وہ بہت ہلکا تھا مگر معلوم یہ ہوتا تھا کہ بیرم خان کی تدبیر کارگر نہیں ہو سکی تھی۔ میرا خیال ہے ڈھلوں صاحب کو بھی وہ کوئی فائدہ

نہیں پہنچا سکا تھا۔ انہیں بھی کسی ڈاکٹر کی شدید ضرورت تھی اور برکی بھی یہی کہہ رہا تھا۔ جب میں گاڑی میں آبی کے قریب جا بیٹھا تو وہ بولا۔

"میرا خیال ہے یہ مرہم پٹی بیرم خان نے کی ہو گی؟"

"ہاں۔ برکت اسے بلا لایا تھا۔ مگر وہ بچارا کمپونڈر کیا کر سکتا تھا۔"

"ہے تو وہ بہت سیانا، مگر یہ معاملہ زیادہ گہرا نظر آتا ہے۔ ڈھلوں صاحب کے لیے بھی مجھے ڈاکٹر کو بلانا پڑے گا۔ وہ بھی سخت زخمی ہیں۔"

"ہاں۔ ان کے لیے کوئی ڈاکٹر لے آؤ۔ مگر جلدی چلو! گاڑی تک آتے آتے میرے بھی زخم کھل گئے ہیں۔" آبی نے اپنے وجود پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ اب تک وہ بڑی بے فکری سے کمرے میں بیٹھا سگریٹ پھونکتا رہا تھا۔ مگر خون سے پٹی کو سرخ ہوتے دیکھ کر اس کا دل ڈولنے لگا، بولا "یہ زخم بھی مجھے لگنا تھا۔ پر تو کیسے بچ گیا ہے جیلانی! تیرے پاس تو کوئی گیدڑ سنگھی ہے۔ تو ہر چکر سے بچ جاتا ہے۔"

"یہ بات نہیں ہے آبی! دراصل مجھے کسی کی بددعا لگ گئی ہے۔ کوئی گولی مجھے چھوتی ہی نہیں۔"

"دعا لگی ہے کہ بددعا۔ میرا خیال ہے تیرا حساب کتاب جب وہ کریں گے، تو خاص گرز تیرے لیے تیار کریں گے۔ بہت پلید شے ہے تو۔"

"اب میں تجھے ہسپتال میں داخل کروا دوں گا۔ چار نرسیں تیری خدمت کو موجود ہوں گی۔ عیش کرے گا تو وہاں۔ لے، سگریٹ پی اور یاد کر اس وقت کو جب تجھے وہ لوگ دوزخ میں ڈال دیں گے۔"

آبی ہنس دیا۔ سگریٹ جلا کر بولا "یار! اس چکر میں تو ہم خواہ مخواہ ہی پڑ گئے۔ میرا خیال ہے، ڈھلوں صاحب بھی تجھ سے خوش نہیں ہیں۔ ان کا چہرا دیکھا تھا تو نے؟"

"ہاں۔ ڈر مجھے یہی ہے۔"

"لعنت بھیج اس قصے پر اور ڈھلوں صاحب کا پیچھا چھوڑ دے۔ تیری وجہ سے وہ بھی زبردست مصیبت میں گھر گئے ہیں۔"

"یہ ان کا وہم ہے۔ میں تو اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر ان کو بچا لایا ہوں۔ کوئی اور اُن تک پہنچ ہی نہیں سکتا تھا۔"

"وہ کام تیری بہادری اور جی داری کی دلیل ہے۔ مگر کون کسی کا احسان مانتا ہے۔ چھوڑ اس قصے کو۔ اب ہم کبھی چوگوڑھ نہیں آئیں گے۔"

"میں نے بھی یہی سوچا ہے آبی! بات کچھ ادھر ہی ختم ہو گئی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے میں بگلے پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔"

"نہیں۔ تیرا انڈیا جانا بہت ضروری تھا۔ ڈھلوں صاحب بچ گئے، یہی بہت ہے۔ اب وہ خود نمٹتے رہیں اس سارے معاملے سے۔ ویسے ابھی وہ لوگ اُن کی اور کھٹمل پر بیڈ کرائیں گے۔"

"کراتے رہیں، مجھے اب اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔" میں نے کھڑکی کے باہر نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔ باہر کا منظر خوبصورت نظر آتا تھا اور مجھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ ایسے حسین اور چمکیلے دن میں زندگی کرنا فطرت کی بوقلمونیوں سے لطف اندوز ہونے کے برابر تھا۔ برکی گاڑی کے انجن کی گھر گھر سے الجھ رہا تھا۔ اس میں کوئی بڑا نقص پیدا ہو چکا تھا پھر بھی وہ اُسے لے کر بڑی سڑک پر جا پہنچا اور کوئی آدھ گھنٹے میں ہم لاہور کی حدود میں داخل ہو گئے۔

آبی کو میں نے ایک پرائیویٹ کلینک میں داخل کروا دیا۔ نام اس کا رحمان گل کلینک تھا۔ فیروز پور روڈ پر وہی کلینک سب سے پہلے ہمارے سامنے آیا تو میں نے گاڑی وہیں رکوا دی۔ سرکاری ہسپتال میں جانے کی ہم ہمت ہی نہیں رکھتے تھے۔ اُن کی چونکہ اور چنانچہ ہم سے برداشت نہیں ہوتی تھی۔ وہ ضرور پوچھتے کہ یہ زخم کیسے لگے ہیں۔ ہم بھلا اُن کی اس بات کا کیا جواب دیتے؟ برکی اپنے ڈاکٹر کی طرف بھاگ گیا۔ اُسے ڈھلوں صاحب کی فکر لگی تھی۔ جب کلینک کے لوگ آبی کے علاج میں لگ گئے تو میں نے ٹیکسی لی اور سیدھا اپنے بینک جا پہنچا۔ اُس کے دروازے بند ہو چکے تھے مگر وہ لوگ ابھی تک اندر موجود تھے۔ اس وقت ڈیڑھ بج چکا تھا۔ بینک کے اندر جانے کا عقبی راستہ کھلا تھا۔ سارا عملہ وہیں سے آجا رہا تھا۔ ہماری اتنی بڑی رقم وہاں موجود تھی۔ مجھے اندر جانے کے لیے کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں تھی کہ اس رقم سے ہم نے بینک کو اور زیادہ امیر بنا دیا تھا۔ میں عقبی دروازے سے ہوتا ہوا بینک کے اندر جا پہنچا۔ منیجر اپنے کمرے میں موجود تھا۔ دیوار گیر شیشوں سے مزین اس کے کیبن کا دروازہ کھول کر جب میں اندر پہنچا تو اس نے مجھے پہچان لیا۔ وہ ایک دم کرسی سے اٹھ گیا اور مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا کر بولا۔

"آئیے آئیے صاحب! کیسے مزاج کیسے ہیں؟"

"آپ کی مہربانی ہے بھٹہ صاحب! بینک تو بند ہو گیا ہے، کوئی گنجائش نکل سکتی ہے؟"

"کیوں نہیں۔ آپ کے لیے تو ہر وقت گنجائش نکل سکتی ہے جناب! ابھی چند دن ہوئے کراچی سے آپ کے حساب میں بہت

بڑی رقم جمع ہوئی ہے۔ وہ آپ نے بھیجی تھی۔"

"میرے بزنس پارٹنر نے وہ رقم بھیجی تھی۔ اس نے مجھے اطلاع دے دی تھی۔ آپ یوں کریں، مجھے پچاس ہزار روپے دلوا دیں۔"

"یہ کون سی مشکل بات ہے، آپ چیک لکھ دیں، چائے تو پئیں گے آپ؟" یہ کہہ کر اُس نے گھنٹی بجا دی۔ چپراسی دروازے میں آیا تو وہ بولا "ہمارے لیے چائے لے آؤ بھئی! کچھ کھانے کے لیے بھی لے آنا۔"

"چیک تو میرے پاس نہیں ہے کوئی لوز چیک دے دیں۔ مصیبت یہ ہے کہ میں چیک بک سنبھال نہیں سکتا ہوں۔"

"کوئی بات نہیں، یہ تو آپ کا اپنا بینک ہے۔ میں ابھی چیک دے دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر اُس نے دراز کھولی اور ایک چیک اُس نے میرے حوالے کر دیا۔

"یہ تو بہت اچھا کاروبار ہے منافع خاصا مل جاتا ہو گا۔ ایک ہم ہیں کہ ادھر ملازمت میں پھنسے ہیں۔ وہی بندھی ٹکی تنخواہ۔ نہ آنہ کم نہ آنہ زیادہ۔"

"ہاں، یہ تو ہے۔ کاروبار میں آج کل بہت فائدہ ہے۔ مگر رقم اس کے لیے بہت چاہیے۔ وہ دَور تو گیا جب سرکاری ملازم کی معاشرے میں عزت تھی کیونکہ سستا زمانہ تھا اور تنخواہ زیادہ تھی۔"

"ہاں، یہ تو ہے۔ کسی روز میں بھی یہ نوکری چھوڑ دوں گا۔ ویسے تو بہت سے لوگ مجھ سے ملتے ہیں۔ کاروبار میں رقم لگانے کا بھی کہتے ہیں، مگر مجھے کوئی تجربہ نہیں ہے۔ لیں وہ چائے آ گئی۔ پئیں۔" چپراسی چائے کی ٹرے لے کر اندر آ رہا تھا۔ وہ اُس نے لا کر دوسری میز پر رکھ دی اور اسے پیالیوں میں ڈالنے لگا۔ وہ کچھ بسکٹ بھی ساتھ لے آیا تھا۔

"بس تم جاؤ اور یہ چیک لے جاؤ۔ زبیر سے کہو کہ یہ رقم دے دے۔" یہ کہہ کر اس نے چپراسی کو وہ چیک دے دیا۔ عین اُس وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ بھٹہ نے تڑپ کر ریسیور اٹھایا اور بولا "کون صاحب؟... اوہ! تو یہ آپ ہیں! وہ میرا پیغام مل گیا تھا آپ کو؟... اچھا! یہ تو بہت اچھا ہوا۔ میں آپ کا منتظر ہوں۔" اس نے بڑے معنی خیز انداز سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا اور پھر اس نے فون بند کر دیا۔ اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ چہرے پر ہلکی سی زردی کھنڈ گئی تھی۔ محسوس مجھے یہ ہو رہا تھا کہ وہ اپنے وجود میں کسی خاص وجہ سے لرز کر رہ گیا ہے۔ میری طرف بسکٹ بڑھا کر بولا "یہ بھی کھائیں نہ جناب نیازی صاحب! ویسے اگر آپ چاہیں تو میں آپ کے ساتھ اس کاروبار میں شریک ہو سکتا ہوں۔"

"کیا بات ہے، آپ کچھ پریشان ہو رہے ہیں، خیر تو ہے؟"

"جی، جی نہیں۔ میں تو بالکل ٹھیک ہوں کیوں کیا محسوس کرتے ہیں آپ؟" اس نے خود کو بہت زیادہ پُرسکون ظاہر کرتے ہوئے کہا مگر جب اُس نے سگریٹ کے پیکٹ پر ہاتھ رکھا تو اس کا اندرونی اضطراب اور زیادہ نمایاں ہو گیا۔ اُس کی انگلیاں واقعی لرز رہی تھیں۔ وہ اضطرابی کیفیت کا شکار تھا۔ اچانک میرے ذہن میں اجالا سا ہونے لگا۔ مجھے اس وزیر علی بھٹہ کے رویے نے حیرت میں ڈال دیا تھا۔ اس کا وہ فون اور گفتگو اب تک میرے ذہن میں گونج رہی تھی۔ میرے اور اُس کے درمیان دیوار حائل ہو رہی تھی۔ چپراسی چیک لے کر ایکدم واپس آ گیا، بولا۔

"صاحب جی! یہ... یہ... دستخط صحیح نہیں ہیں دوبارہ کرا دیں کلیم صاحب نے کہا ہے۔"

میں نے چیک اس سے جھپٹ لیا۔ دستخط تو میرے ویسے ہی تھے جو اُن کے ریکارڈ میں موجود تھے۔ پھر بھی میں نے چیک سامنے رکھ کر اس پر دوسرے دستخط کر دیے جو زیادہ واضح تھے۔ وہ چیک لے کر واپس گیا اور دو منٹ بعد اس نے مجھے پچاس ہزار روپیہ لا کر دے دیا۔ اُسے گن کر میں جیب میں رکھ ہی رہا تھا کہ کیبن کا دروازہ کھلا اور دو آدمی بلند آواز سے بھٹہ صاحب کو سلام کہتے ہوئے اندر آ گئے۔ بھٹہ صاحب اپنی جگہ سے فوراً اٹھ گئے، بولے "آئیے مرشد صاحب! آئیے۔ کہیے کیا حال ہیں آپ کے؟"

"جی۔ بس اللہ کا شکر ہے۔ آپ سنائیں۔" یہ کہہ کر اُس شخص نے مجھے کچھ ایسے انداز سے گھور کر دیکھا جیسے وہ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کا حلیہ یہی بتا رہا تھا کہ وہ پولیس کا آدمی ہے۔ اس کا ڈیل ڈول ہی ایسا تھا۔ وہ قمیص شلوار پہنے ہوئے تھا اور اس پر سلیٹی رنگ کا کوٹ اُس نے ڈال رکھا تھا۔ دوسرا آدمی بھی اسی قماش کا تھا۔ اُن کو دیکھتے ہی میرا مغز گھٹنے لگا۔ وزیر علی نے میری کسی بات پر شک کرتے ہوئے مجھے پولیس کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ وجہ مجھے بھی معلوم نہیں تھی مگر اُس کے اضطراب و سراسیمگی کا مطلب میں اب سمجھ رہا تھا۔ حیرت مجھے یہ تھی کہ بینک کے عملے کے تمام لوگ اپنی اپنی جگہوں سے ہٹ کر وہاں سے غائب ہو چکے تھے۔ میرا چپ شاہ میری دائیں جیب میں تھا۔ پیشتر اس کے کہ مرشد اپنا ہتھیار نکالتا میں نے اپنا چپ شاہ ایک دم اُن کے سامنے تان لیا۔

"مرشد علی! بہتر ہے تم منہ دوسری طرف کر لو ورنہ اچھا نہیں ہو گا۔"

وہ میری یہ بات سن کر پاگل ہو گیا "یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں میرا پستول بھرا ہوا ہے۔"

"مگر تم یہاں سے بچ کر نہیں جا سکتے ہو۔ بینک کو پولیس نے گھیرے میں لے رکھا ہے بہتر ہے تم یہ پستول پھینک دو!"

"ایسا نہیں ہوگا۔ وزیر علی تم نے اچھا نہیں کیا۔ میں تمھیں کبھی معاف نہیں کروں گا، تمھیں اس کی قیمت ادا کرنی ہوگی۔"

میں نے بھٹہ کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ نگاہ میری مرشد اور اُس کے ساتھی پر جمی تھی۔ میں اپنی سادگی میں انتہائی پُرخطر مرحلے سے دوچار ہو چکا تھا میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ وہ وزیر علی مجھ سے یوں دھوکا کرے گا۔ اسے اس رقم نے چوکنا کر دیا تھا جو آبی نے میرے حساب میں جمع کرائی تھی میرے بارے میں کوئی خبر اُس نے اخبار میں ضرور پڑھی ہوگی، پولیس سے اُس نے بہت پہلے رابطہ قائم کر لیا ہوگا جالات پتہ نہیں کیا تھے مگر میں اس وقت بینک میں محصور ہو کر رہ گیا تھا۔ اُن کے دو بڑے ہی جی دار آدمی میرے سامنے آٹھہرے تھے۔ اُن کو پستول کی زد میں رکھ کر میں بجلی ایسی سرعت سے اُلٹے قدموں سے دروازے کی طرف بڑھا تو عین اُس وقت مرشد نے ایک دم میز کے پیچھے جھکنے کی کوشش کی، میں نے بے دریغ اُس پر گولی چلا دی، وہ تڑپ کر دیوار میں جا لگا۔ اس کے وزن سے تپائی پر رکھی ٹرے الٹ گئی۔ گولی اپنا کام کر گئی تھی۔ اُس کا دایاں کندھا زخمی ہو گیا تھا۔ بینک اس وقت بالکل خالی ہو چکا تھا۔ وہ لوگ اُن سے کہہ آئے ہوں گے کہ سب لوگ وہاں سے الگ ہٹ جائیں گے۔ ساری ہی میزیں خالی پڑی تھیں۔ جیسے ہی مُرشد نیچے گرا۔ دوسرے آدمی نے اس ذرا سی مہلت سے فائدہ اٹھا کر پاگلوں کی طرح آگے بڑھ کر میری کلائی پکڑنے کی کوشش کی۔ وہ میرے دائیں ہاتھ کھڑا تھا مگر میں نے پوری قوت سے دایاں گھٹنا اس کے پیٹ میں دے مارا۔ چوٹ بہت سخت تھی۔ وہ درد سے پاگل ہو کر فرش پر بیٹھ گیا۔ دوسری گولی میں نے جان بوجھ کر نہیں چلائی، دروازہ کھول کر میں کیبن سے باہر آگیا اور اس پر کنڈی چڑھا دی مگر اس عرصے میں پولیس کے سپاہی بینک کے اندر گھس آئے تھے۔ جیسے ہی میں دروازے سے باہر نکلا، وہ اندر کے منظر کو پوری طرح سمجھ چکے تھے۔ دروازے کے سامنے ایک بڑی سی لوہے کی الماری پڑی تھی۔ سپاہیوں کو دیکھتے ہی میں اس الماری کی طرف بڑھا مگر تھانیدار نے مجھ پر نظر پڑتے ہی گولی چلا دی۔ وہ پستول کی گولی تھی۔ مجھ سے بس دو انچ کے فاصلے سے گزری اور الماری میں جا لگی۔ اس کے ساتھ ہی تین سپاہیوں نے دو قدم آگے آ کر مجھ پر فائر کھول دیا۔ وہ الماری کو نشانہ بنا رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے بائیں ہاتھ نکل کر الماری کے پیچھے گولی چلانے کی کوشش کی مگر میں نے اس کا ہاتھ لبلبی پر سیدھا نہیں ہونے دیا۔ میرا چپ شاہ بے آواز چلا مگر اُسے تب خبر ہوئی جب گولی اُس کی کلائی میں جا لگی اور بندوق اس کے ہاتھ سے گر گئی۔ اب میرے سامنے چار سپاہی تھے جن میں ایک اُن کا افسر تھا۔ وہ سب کے سب یہ دیکھ کر فوراً ہی میزوں کے پیچھے چھپ گئے کہ میرے ہاتھ میں بھی آتشیں اسلحہ ہے۔ وہ اب مجھے نظر نہیں آ رہے تھے میرے پاس وقت بہت ہی کم تھا۔ زندگی کی ڈور کسی بھی جھٹکے میں کٹ سکتی تھی۔ زخمی سپاہی نے نیچے جھک کر اپنی بندوق اٹھانی چاہی تو میں ایک دم اچھل کر اس تک جا پہنچا اور اس کو میں نے اپنی ڈھال بنا لیا۔ یوں کہ اس تک میرا ہاتھ پہنچا تو میں نے بائیں ہاتھ سے اُس کی گردن مسل دی۔ وہ جھول کر رہ گیا تو اس کو میں بائیں ہاتھ سے روک کر بڑے دروازے کی طرف بڑھا۔ مگر وہ جو میرے شکار کو آئے تھے، وہ بھی مجھ سے غافل نہیں تھے۔ اُن کی بندوقوں کی نالیاں مجھ پر تنی تھیں۔

"پستول پھینک دے جیلانی! ورنہ اچھا نہیں ہوگا" کسی کی لرزہ خیز آواز بینک میں گونجی۔ مگر اس سپاہی کو سامنے رکھ کر میں دروازے تک جا پہنچا تھا۔ جیسے ہی وہ آواز گونجی میں نے دروازے کا ہینڈل کھینچ دیا۔ دروازہ باہر کی طرف کھلتا تھا۔ مجھے یوں فرار ہوتے دیکھ کر انسپکٹر اپنی جگہ سے اچھل کر سامنے آگیا۔ اور پستول سے اُس نے یکے بعد دیگرے مجھ پر تین فائر کیے مگر وہ شاید میری ٹانگوں کو زخمی کرنا چاہتا تھا شاید مجھے مار دینے کی اسے بھی اجازت نہیں تھی مگر وہ گولیاں بے ہوش سپاہی کا مقسوم بن گئیں۔ ایک شاید ضائع ہو گئی تھی۔ اس اثنا میں میں نے دروازہ کھول دیا حیرت مجھے یہ تھی کہ ان کی گاڑی کہیں نظر نہیں آتی تھی۔ وہ دراصل ان لوگوں نے بینک کے عقبی دروازے پر کھڑی کر رکھی تھی۔ میں نے انسپکٹر کو خوفزدہ کرنے کے لیے چپ شاہ سے ایک گولی اس کی ران پر چلائی وہ بالکل میرے سامنے کھڑا تھا جیسے ہی گولی اُسے لگی، وہ درد سے نڈھال ہونے کے باوجود تیزی سے میرے پیچھے لپکا۔ ڈرائیور میری صُورت دیکھ کر لرز گیا۔ میں نے دروازہ کھول کر ڈرائیور کو کھینچ کر سیٹ سے باہر نکالا اور ٹیکسی میں بیٹھ کر میں نے چلتے ہوئے انجن کو آگے بڑھا دیا۔ انسپکٹر دروازے میں پہنچ کر ڈھیر ہو گیا۔ اُس کا زخم اسے مُہلت نہیں دیتا تھا۔ ٹیکسی کو لے کر میں پاگلوں کی طرح وہاں سے نکلا اور بلا خیز رفتار سے آگے چل دیا۔ راستہ میں نے مال روڈ کا اختیار کیا تھا۔ بھیڑ کو چیرتے ہوئے میں سیدھا عجائب گھر کی طرف بڑھا اور چند ہی لمحوں بعد میں عقبی سڑک پر جا پہنچا۔ اب میرا رُخ ہیلے کالج آف کامرس کی طرف تھا۔ وہاں پہنچتے ہی میں نے

ٹیکسی کو سڑک پر چھوڑا اور فوراً ہی کالج کے اندر جا گھسا۔ کالج میں اس وقت چھٹی ہو چکی تھی۔ لان عبور کر کے میں عمارت کے دائیں راستے سے گزر کر آگے بڑھا تو پچھلے حصے میں ایک چھوٹا سا کوارٹر نظر آیا۔ اس میں شاید کالج کے ملازم ہمیشہ لوگ رہتے تھے۔ اس کا دروازہ کھلا دیکھ کر میں تیزی سے اُس میں جا گھسا۔ ایک ادھیڑ عمر عورت وہاں صحن میں بیٹھی آلو چھیل رہی تھی۔ مجھے یوں صحن میں گھستے دیکھ کر وہ پریشان ہو گئی۔ آلو اور چھری الگ رکھ کر وہ بڑھیا اُٹھی اور ہانپتے کانپتے لہجے میں بولی۔

"تو کون ہے بھائی! کیوں اندر گھسا آتا ہے؟"

"وہ۔۔۔ وہ مجھے بھائی صاحب سے ملنا ہے ماں جی! کہاں ہیں وہ! ابھی کچھ دیر پہلے کالج میں ملے تھے۔"

"رمضان کا پوچھ رہا ہے تو، وہ تو بازار گیا ہے۔" اس اثنا میں میں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

"وہ مجھ سے کچھ ادھار مانگ رہا تھا میرے ساتھ کالج میں کام کرتا ہے۔ دو سو روپے مانگے تھے اس نے، یہ آپ رکھ لیں اسے کہہ دیں کہ شفیق آیا تھا۔" یہ کہہ کر میں نے دو سو کے نوٹ بڑھیا کی طرف بڑھا دیے مگر وہ میرا حُلیہ دیکھ کر پریشان ہو گئی، بولی: "مگر یہ تو اتنا پریشان کیوں ہے آخر؟"

"کچھ نہیں ماں جی! کچھ بھی نہیں بس ذرا تھک گیا ہوں، میرا دم پھول جاتا ہے دو قدم بھی چلا نہیں جاتا۔"

"ارے تو بیٹھ جا، تا، اندر آ کر رمضان بس آتا ہی ہوگا۔" اس نے نوٹ میرے ہاتھ سے لے لیے تھے۔ پھر کھڑی چارپائی سامنے بچھا دی۔ مگر مجھے وہاں بیٹھنے کی مہلت ہی کہاں تھی، جیسے ہی وہ گھوم کر پیڑھی کی طرف گئی، میں نے اُس کی گردن دبا دی یوں کہ جب وہ زمین پر گری تو اس کی آنکھیں ادھ کھلی رہ گئی تھیں۔ اسے میں نے فوراً ہی چارپائی پر ڈال کر ایک چادر کھول کر اُس پر ڈال دی اور پھر میں کوارٹر کے کمرے میں جا گھسا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ اس کمرے کے عقب میں ایک کھڑکی لگی تھی۔ اسے کھول کر میں تیزی سے آگے نکل گیا۔ سامنے ایک گلی تھی اور اُس میں سے گزر کر میں پولیس کی نظروں سے بچ سکتا تھا مگر جیسے ہی میں کھڑکی میں سے نکلا تو مجھے محسوس ہُوا کہ کالج کے احاطے میں پولیس کے سپاہی سیٹیاں بجانے لگے تھے۔ شاید وہ میرے تعاقب میں وہاں تک چلے آئے تھے۔ میں نے اپنی رفتار ایک دم تیز کر دی اور گلی عبور کر کے میں اس کے آخری کونے تک جا پہنچا۔

اچانک میری نظر ظہور علی پر پڑی۔ وہ کسی زمانے میں میرے ساتھ ٹیکسی چلایا کرتا تھا۔ پتہ نہیں وہ اُس گلی میں کیا کر رہا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی میں اس کی طرف لپکا۔ "اوئے جھورے! تو کدھر پھر رہا ہے پیارے؟" میں نے اپنی درد میں ڈوبی آواز کو زیادہ سے زیادہ خوشگوار بناتے ہوئے کہا۔

وہ وہیں ٹھہر گیا اور مجھے غور سے دیکھتے ہوئے وہ بانہیں پھیلا کر میری طرف بڑھا، بولا: "اوئے تُوں کتھے! ہائیں؟ مر جائیں تو کہیں پھر نظر ہی نہیں آیا۔" وہ مجھ سے بغلگیر ہو کر بولا۔

"بڑی مدت بعد ملے ہو یار! یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"میرا گھر ہے ادھر بھئی! میں نے مکان بدل لیا تھا، اب اچھا مکان مل گیا ہے آ گھر چلتے ہیں۔"

"ہاں چلو۔ میں بھی سوچتا تھا اپنا جھورا کہیں نظر نہیں آیا۔ بال بچے تو راضی ہیں نا؟"

"ہاں بھئی ایک دم فسٹ کلاس۔ سالوں کو میں نے اسکول میں ڈال دیا ہے۔ شاید اُن کی قسمت سنور جائے۔ زور تو سارا تمھاری بھابی لگاتی ہے، بہت بھلی لوگ مل گئی ہے مجھے۔"

"یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے، کتنا کرایہ دیتے ہو؟"

"ایک سو پچیس روپے۔ بس گزارا ہو رہا ہے۔ ایک لڑکا تیسری میں ہے دُوسرا پہلی میں۔"

"اور تو خود کون سی جماعت میں ہے جھورے! ایں! اپنا بھی تو تجھے پتہ ہونا چاہیے۔"

"ادھر آ جا، یہ سامنے والا مکان میرا ہے۔ میرا کیا پوچھتے ہو یار! شادی کے بعد تو آدمی کسی بھی کام کا نہیں رہتا۔" یہ کہہ کر اُس نے ایک بھڑا ہوا دروازہ کھول دیا اور مجھے اپنے ساتھ لے کر بیٹھک میں جا گھسا۔

"ارے بھاگوان! دو کوپ چائے کے تو بنا دے، اپنا یار آیا ہے۔ وہ بسکٹ بھی ادھر دے دے جو میں صبح لایا تھا، پر یار! میرا خیال ہے تجھے بھوک لگی ہوگی۔"

"نہیں جھورے! بھوک نہیں ہے مجھے! بس چائے کافی ہے۔"

"تیری مرضی اور سُنا حال کیا ہے تیرا؟ کیا دھندا کرتا ہے آج کل؟"

"کچھ بھی نہیں۔ میں راولپنڈی چلا گیا تھا۔ وہاں بھی ٹیکسی ہی چلا رہا ہوں۔"

"پنڈی اچھی جگہ ہے، رکشا تو وہاں نہیں چلتا۔ ٹیکسیاں ہی ٹیکسیاں ہیں۔"

"ہاں۔ آرام یہی ہے چار پیسے بچ جاتے ہیں۔"

"شادی نہیں کی تُو نے؟"

"نہیں یار! بس ایسے ہی وقت گزار رہا ہوں۔"

"پر تیرا رنگ کیوں پیلا ہو رہا ہے! کوئی خاص بات ہے کیا؟ بتا نا یار قصہ کیا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں۔ بس تھک بہت گیا ہوں۔ دراصل میرا دم بہت جلد پھول جاتا ہے، پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے؟"

"تو پھر دو گھڑی آرام کر لے نہ یہاں۔ یہ تیرا ہی گھر ہے جیلانی! میں یہ دروازہ بند کر دیتا ہوں، تو ٹھہرا کہاں ہے؟"

"کہیں بھی نہیں۔ یہاں ایک آدمی سے ملنا تھا مجھے مگر وہ ملا ہی نہیں، اب میں واپس جا رہا تھا۔"

"نہیں یار! تو رات ادھر ہی رہ لے، فلم بھی دیکھیں گے، تیری میری مرضی۔ فلم چل رہی ہے، سنا ہے بڑی زبردست فلم ہے۔ میں دراصل تنہا فلم نہیں دیکھتا۔ کوئی ساتھ نہ ہو تو مزہ نہیں آتا۔ اور اب تو تو مل گیا ہے۔"

"ٹھیک ہے، رات کا آخری شو دیکھیں گے۔" میں نے اسے ٹالتے ہوئے کہا۔ اس کی بیوی نے کچھ ہی دیر بعد چائے کی ٹرے اسے دروازے میں بلا کر دے دی اور ہم چائے پینے لگے۔ وہ بہت دیر تک مجھ سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ میں بے دلی سے اس کی باتوں کا جواب بھی دیتا رہا مگر میرا ذہن کسی اور ہی الجھن میں پھنسا تھا۔ مجھے اس وزیر علی بھٹہ کے رویّے پر حیرت تھی۔ اس نے تو ہمیں تباہ کر کے رکھ دیا تھا۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ اب ہم بینک سے اپنی رقم بھی حاصل نہیں کر سکیں گے۔ اس مردود نے ہمیں تباہ کر کے رکھ دیا تھا۔ پولیس میرے فرار کے بعد اسے منجمد کر لے گی۔ انھیں معلوم تھا کہ میں نے کس حساب میں سے وہ رقم نکلوائی تھی۔ غلام علی نیازی وہاں دوبارہ کس طرح جا سکتا تھا۔ سب کچھ ہی برباد ہو کر رہ گیا تھا۔ اس رقم کے لیے ہم نے کیسے کیسے پاپڑ نہیں بیلے تھے مگر اب وہ سب کچھ ہی تباہ ہو گیا تھا۔ میں اس سوچ میں گم تھا کہ میں دوبارہ اس رقم تک کیسے پہنچ سکوں گا؟ کوئی صورت ایسی نظر نہیں آتی تھی۔ اس وزیر علی نے بینک کا اعتماد ہی کھو دیا تھا۔ مگر صرف اعتماد کی بات نہیں تھی، سوال یہ تھا کہ اس مینیجر نے ایسا کیوں کیا؟ کیا اس کا کوئی عزیز پولیس میں تھا جسے خوش کرنے کے لیے اس نے وہ حرکت کی تھی۔ آخر اس کا اسے کیا فائدہ ہو سکتا تھا؟ اسے میری پہچان کیسے ہو گئی؟ کون تھا جس نے انھیں میرے بارے میں اس قدر مکمل معلومات فراہم کر دی تھیں؟ کہیں میرا اپنا رویّہ ہی تو میری تباہی کا سبب نہیں بن گیا تھا؟ میں ہر بار اس سے اتنی بڑی رقم کے لیے ایک الگ چیک بک نہیں لیتا تھا۔ صرف لوز چیک ہی اس سے مانگتا تھا۔ عین ممکن ہے اس نے اخبار میں میرے بارے میں پڑھ لیا ہو مگر وہاں تو شاید میرے متعلق خبر بھی بہت مختصر سی چھپی تھی۔ وہ ستنا جا صاحب نہیں چاہتے تھے کہ میری خبر اخبار میں دے دی جائے۔ مگر وہ پُراسرار خاتون بھی تو اخبار پڑھ کر ہی میرے پاس آئی تھی۔ وہ دو دن کھانا لے کر آتی رہی، اسے بھی تو کسی نے بتایا ہی ہو گا کہ جیلانی اس وقت کہاں ہے مگر سوال یہ تھا کہ اب بینک سے ہم وہ رقم کیسے حاصل کر سکتے تھے۔ سب سے زیادہ فکر تو مجھے یہی لگی تھی آپی بھی سنے گی تو پریشان ہو جائے گی۔ ہمارا تو مرنا جینا ہی اسی رقم پر منحصر تھا۔ کیا اب ہمیں کہیں ڈاکا ڈالنا ہو گا؟ وہ رقم تو ہماری ساری زندگی کے لیے بہت کافی تھی۔ وہ یوں میرے ہاتھ سے چھن جائے گی، اس کا تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ اگر جاتی تو میری ہی رقم جاتی۔ آپی کو یہ کیا سوجھی تھی کہ اس نے کراچی سے اپنی ساری جمع پونجی وہاں لا ڈالی تھی مگر... مگر تقدیر کو کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔ اسے کیا معلوم تھا کہ بینک کے اندر میرے ساتھ یہ ہاتھ ہو جائے گا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں۔ آپی کو اس کی خبر کر دینا بھی ایک عذاب سے کم بات نہیں تھی۔ سو وہ تو پاگل ہی ہو جائے گی۔ اس رقم کے سہارے تو اس نے چوری چکاری اور ڈاکا زنی چھوڑی تھی۔ وہ بھی اس رقم کو کافی سمجھتا تھا مگر وہ یوں اتنی آسانی سے ہم سے چھن جائے گی، اس کا مجھے وہم بھی نہ تھا۔

جھورا کوئی آدھ گھنٹے تک میرے پاس بیٹھا رہا مگر جب اس نے دیکھا کہ میری آنکھیں مُندنے لگی ہیں اور میں ٹھیک سے اس کی کسی بات کا جواب نہیں دیتا تو اس نے میرے لیے بستر کی چادر سیدھی کی اور ایک لحاف لا کر پائنتی ڈال دیا۔ "تم آرام کر لو یار! بہت تھکے ہوئے لگتے ہو۔ دو گھڑی ادھر ہی سو لو، میں صحن میں بیٹھتا ہوں۔ آج میں نے چھٹی کر لی تھی۔ گاڑی میں کچھ کام تھا، میں نے وہ ورکشاپ میں ڈال دی تھی۔"

"ٹھیک ہے یار! تمھاری مہربانی ہے، میں نے تمھیں خواہ مخواہ ہی پریشان کیا۔"

"لو، اس میں مجھے پریشان کرنے والی کیا بات ہے۔ مہمان تو اللہ کی رحمت ہوتا ہے بھائی! بے فکر ہو کر سو جاؤ۔ شام کے لیے میں تمھارے واسطے مرغا پکواؤں گا۔" یہ کہہ کر وہ بیٹھک کا دروازہ بند کر کے باہر نکل گیا اور میں ایک بار پھر غموں کے ان تپتے، ان پیاسے گہرے سمندر میں جا پھنسا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ہمارے ساتھ یہ کیا ہو رہا ہے۔ حالات کسی بھی طرح ہمارے حق میں نہیں جا رہے تھے۔ شاید میرا پہلا ہی قدم غلط اٹھا تھا۔ ساری عمارت تو اسی بنیاد پر استوار ہوئی تھی اور وہ ٹیڑھی ہی اٹھتی چلی گئی تھی۔ اب ایک ہی صورت باقی رہ گئی تھی کہ جس طرح بھی ہو سکے میں وزیر علی بھٹہ کو زیر کر کے بینک سے وہ رقم نکلواؤں گا۔ پولیس میرے کھاتے سے تو اسے نکالنے سے رہی۔ اگر بھٹہ میری مدد کرتا تو پھر میں اسے حاصل کرنے میں ناکام نہیں ہو سکتا تھا مگر اس کو سیدھی راہ پر لانا بھی تو آسان کام نہیں تھا۔ اس کے لیے مجھے چند روز صبر کرنا ہو گا۔ اس کے تعاقب میں میں فوری طور

پر نکل گیا تو کچھ بھی نہ ہو سکے گا۔ وہ بینک میں پولیس متعین کروا سکتا تھا اور پولیس اسے وہ تحفظ فراہم بھی کر دیتی کیونکہ وہ تو ان کا بڑا ہی اہم مخبر تھا۔ ایسا مخبر جس نے ایک بہت بڑے مجرم کی نشاندہی کر دی تھی مگر... میرے لیے تو سب کچھ ہی غلط ہو گیا تھا۔ میرا کوئی مستقبل نہیں تھا۔ میری کوئی منزل نہیں تھی۔ میرا کرب میرا دکھ کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ میں آزاد تو تھا مگر چاروں طرف سے پنجرے کی سلاخیں برابر مجھے کچوکے دیتی تھیں۔ میرے وجود کا سارا پوٹن ختم ہو گیا تھا۔ میری قسمت بھی پہلے ایسی نہیں رہ گئی تھی۔ اذیت کی یہ گھڑی میرے وجود میں گہری دھنس جاتی تھی۔ کسی بھی پہلو مجھے چین نصیب نہیں ہوتا تھا۔ وقت نے اپنے سارے نوکیلے تیر میرے دل میں آتار دیے تھے۔ کوئی مجھ ایسا بدنصیب بھلا کون ہو گا یار کہ میری بھری مٹھی جب کھلی تو وہ بالکل ہی خالی تھی۔

میں کوئی تین گھنٹے تک نیم بیداری کی حالت میں جھورے کے بستر پر لیٹا رہا۔ میرا خیال ہے اس وقت شام کے پانچ بج رہے تھے کہ میں نے بستر چھوڑ دیا اور منہ دھونے کے لیے پہلو میں بنے غسل خانے میں جا گھسا۔ جھورے نے نلکا چلنے کی آواز سنی تو اندر آ گیا، بولا۔ "تو اٹھ گیا ہے جیلانی! کھانا تیار ہے، میرا خیال ہے ابھی کھا لیتے ہیں۔"

"ہاں، یہ ٹھیک رہے گا۔"

"تو کچھ سویا بھی ہے کہ نہیں؟"

"میں بہت تھکا ہوا تھا جھورے! میرا خیال ہے میں بہت اچھی طرح سویا ہوں۔"

منہ دھو کر میں کمرے میں جا بیٹھا۔ جھورا اتنے میں میرے لیے کھانا لے آیا۔ اس کی بیوی کھانا اچھا پکاتی تھی۔ میں نے اس کی جی بھر کر تعریف کی۔ جھورا خوش ہو گیا، بولا۔ "تم بھی شادی کر لو یار! بیوی کے بغیر تو مزہ ہی نہیں آتا۔ کسی بات کی آدمی کو فکر ہی نہیں رہتی۔"

"ہاں میں نے بھی یہی سوچا ہے، اب یہی کام کروں گا سب سے پہلے۔" کھانا کھا کر میں نے جھورے سے کہا۔ "مجھے ایک بہت ضروری کام ہے پیارے! اگر وہ ہو گیا تو میں نو بجے یہاں پہنچ جاؤں گا ورنہ سمجھنا میں یہاں نہیں ہوں۔"

"ایسا بھی کیا کام ہے۔ نو بجنے میں کون سی دیر ہے۔ قسم اللہ کی فلم بڑی زبردست لگی ہے۔"

"ضرور دیکھیں گے بھئی! بس دو گھنٹے کا کام ہے۔ میں بس نو بجے پہنچ جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ جیسے تیری مرضی۔ میں تیرا انتظار کروں گا۔ یہ پچاس روپے میں نے اسی کام کے لیے تمھاری بھابی سے لیے ہیں۔" اس نے مجھے نوٹ دکھاتے ہوئے کہا۔

"میں ضرور آؤں گا یار! پکا وعدہ رہا۔ پنڈی میں ابھی نہیں جاؤں گا۔" یہ کہہ کر میں جھورے سے اسی وقت رخصت ہو گیا۔ باہر نکل کر میں نے ٹیکسی پکڑی اور سیدھا بادامی باغ جا پہنچا۔ ماضی کی ان گنت یادیں میرے ذہن میں جھلملانے لگیں۔ وہ ماضی جو آدمی کو خواہ مخواہ ہی تابناک نظر آنے لگتا ہے، خواہ اس میں اسے کتنی ہی ذلتیں کیوں نہ اٹھانی پڑی ہوں۔ شیر دل آہو کا مکان بھی وہیں تھا۔ میں نے ٹیکسی چھوڑ دی اور مختلف گلیوں سے گزرتا ہوا اس کوٹھی تک جا پہنچا جس میں فوزیہ رہتی تھی۔ وہ خاتون جو مجھے دیکھنے کے لیے تھانے آ پہنچی تھی۔ اس سے مجھے بڑی ہی مفید معلومات حاصل ہو سکتی تھیں اور میں دعا مانگ رہا تھا کہ خدا کرے وہ مجھے گھر پر مل جائے۔ حالانکہ آپی اس کے بارے میں یہ خبر لایا تھا کہ اس نام کی کوئی عورت وہاں موجود نہیں ہے۔ بہت تفتیش کی تھی اس تفتیش خان نے اس فوزیہ کے بارے میں اور کہہ وہ یہ رہا تھا کہ وہ کوٹھی بالکل خالی ہے۔

بہت سی بے چراغ گلیوں میں سے گزر کر بالآخر میں اس کوٹھی تک جا پہنچا۔ اس وقت تک گہری گہری شام ہو چکی تھی۔ چھ بج رہے تھے۔ کوٹھی کو دیکھ کر مجھے یہ اندازہ ہوا کہ وہ تو سر تا سر آباد مکان تھا۔ اس میں جا بجا بتیاں روشن تھیں۔ گیٹ کے اندر ایک چوکیدار کھڑا تھا۔ میں نے دستک دی تو وہ فوراً ہی باہر آ گیا، بولا۔

"کیا بات ہے؟ دروازہ آپ نے کھٹکھٹایا ہے؟"

"جی ہاں، خواجہ غلام علی کا گھر یہی ہے؟"

"جی ہاں، حکم کرو۔"

"کیا وہ اس وقت گھر پر موجود ہیں؟"

"جی نہیں۔ وہ کراچی گئے ہوئے ہیں۔"

"میرا نام غلام جیلانی ہے اور مجھے خواجہ صاحب کی بیٹی فوزیہ سے ملنا ہے، ایک بہت ضروری پیغام ہے ان کے نام۔"

"کہاں سے آئے ہیں آپ؟"

"میں لائے ونڈ سے آیا ہوں، بس ان تک میرا پیغام پہنچا دو اور کون کون ہے گھر میں؟"

"جی ان کی والدہ ہیں، ان کی بہنیں ہیں مگر آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"ویسے ہی پوچھ رہا ہوں، بس تم میرا نام بتا دو انھیں۔"

"ٹھیک ہے، آپ ادھر ہی ٹھہریں، میں ان کو بتا دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے گیٹ اندر سے بند کر لیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا وہ عمارت کی طرف نکل گیا۔ میں نے سگریٹ سلگا لیا اور ماحول میں رچے دبیز سناٹے سے جان بچانے کے لیے گیٹ سے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

کوٹھی کے سامنے خاصی کھلی سڑک موجود تھی اور ابھی اردگرد کے پلاٹ پوری طرح آباد نہیں ہوئے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ لان سے پرے دوسری طرف مجیدن کا گھر بھی وہیں کہیں ہو گا۔ آہو لان کے اس طرف رہا کرتا تھا۔ میں نے سوچا فوزیہ سے مل کر میں آہو کے درشن کر لوں گا۔ ہو سکتا ہے اس وقت وہ گھر پر ہی موجود ہو۔ اندازہ میرا یہی تھا کہ ہادی علی کی موت کے بعد اس نے اپنا مستقبل سنوارنے کے لیے گاؤں میں رہائش اختیار کر لی ہوگی اور اب تک اس نے مسند آرا کو خدا جانے زندہ بھی چھوڑا ہو گا کہ نہیں۔ اس دل نواز کا خیال ذہن میں ابھرا تو میں ایک دم اداس ہو گیا۔ اپنے اس عشق کو میں کیا نام دوں؟ مسند آرا تو بس خواب ہو کر رہ گئی تھی۔ میں نے سوچا اب کی بار میں اس سے ضرور ملوں گا۔ زندگی کے اس عذاب نے تو میری جان ہی قبض کر لی تھی۔ اگر میں مسند آرا سے نہ مل سکا تو پھر باقی کیا رہ جائے گا۔ مجھے یقین تھا کہ سرداری خانم اس تک پہنچنے میں میری مددگار ثابت ہوگی۔

کچھ ہی دیر بعد وہ چوکیدار واپس آ گیا اور گیٹ کھول کر بولا۔

"آئیں جناب! وہ آپ کو اندر بلا رہی ہیں۔"

چوکیدار کے کہنے پر میں نے گیٹ کے اندر قدم رکھ دیا۔ میرے ذہن میں ایک بہت ہی خوبصورت عورت کا تصور ابھرنے لگا تھا۔ جو شاید مجھ پر نادیدہ عاشق ہو گئی تھی۔ اس کے قد کی رعنائی نے مجھے حیران کر دی تھی۔ اس کے وہ کومل سے نرم و نازک سجے سنورے ہاتھ اور برقعے میں لپٹا اس کا سراپا ہی میں نے دیکھ رکھا تھا۔ وہی میرے تخیل میں ہلچل مچاتا تھا۔ اس کا رخِ روشن میں نہیں دیکھ سکا تھا مگر میرا دل گواہی دیتا تھا کہ وہ سارے جہاں سے زیادہ حسین عورت ہے۔ ایسی حسین کہ اس کے لیے دین اور دنیا دونوں ہی تیاگے جا سکتے ہیں اور جب میں یہ سوچتا تھا کہ وہ صرف مجھ سے ملنے کے لیے تھانے گئی تھی تو یہ سوچ کر میرا دل بلیوں اونچا اچھلتا تھا کہ میں بھی ایک وجود رکھتا ہوں جس میں کسی کی بے انتہا دلچسپی مجھے زندہ رہنے کا آسرا دیتی تھی۔

چوکیدار نے مجھے دروازے تک پہنچا کر چھوڑ دیا۔ بولا "آپ اندر چلے جائیں، وہ اسی کمرے میں موجود ہیں۔"

دروازہ میرے سامنے ہی وا ہوا اور ایک ادھیڑ عمر کی ملازمہ نے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ کمرے میں سرخ رنگ کا قالین بچھا تھا۔ میں اس پر چلتا ہوا صوفے پر جا بیٹھا۔ دیواروں پر جگہ جگہ بڑی خوبصورت تصویریں آویزاں تھیں۔ ان کو ایک نظر دیکھ کر ہی میں سمجھ گیا کہ میرا میزبان بڑے ہی حسین ذوق کا مالک ہے مگر چند ہی لمحوں بعد جب وہ خاتون میرے سامنے آئیں تو میرا تخیل لرز کر رہ گیا۔ بلاشبہ وہ فوزیہ ہی تھی مگر اس کا چہرہ دیکھ کر مجھے بے حد مایوسی ہوئی۔ وہ حسن کے کسی بھی معیار پر پوری نہیں اترتی تھی۔ رخساروں پر چیچک کے گہرے داغ اس کا عیب بن گئے تھے۔ وہ آنکھوں پر سیاہ رنگ کی عینک لگاتی تھی۔ ہونٹ اس کے بہت موٹے اور بھدے سے تھے۔ یہی حال اس کی ناک کا تھا۔ رخسار کا رنگ خاکستری سا تھا۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں صرف دیکھنے کی چیز تھے جن کو وہ خوب سجا سنوار کر رکھتی تھی اور ایک اس کی آواز تھی جو ندیوں کی گہری رل ترل کا پتہ دیتی تھی۔ وہ جب کمرے میں آئی تو میں ایک دم صوفے سے اٹھ گیا۔ مجھے بڑے غور سے دیکھ کر وہ بولی۔

"آپ کو کیسے پتہ چلا کہ میں یہاں ہوں؟"

"میرا خیال ہے کہ یہ بات تھانیدار نے پہلے ہی روز معلوم کر لی تھی۔ اس نے جو پتہ مجھے دیا میں اس کے مطابق یہاں آ گیا۔"

"بہت چالاک آدمی ہے۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ آپ ان کی قید سے نکل گئے ہیں۔"

"ہاں، میری قسمت اچھی تھی کہ میں بچ نکلا۔ میرا دوست وہاں راستے میں ان پر حملہ آور ہو گیا تھا۔"

"آپ کے دوست کا نام اسلم آبی ہے نا؟"

"جی ہاں، ہے تو یہی نام اس کا مگر آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

"آپ کے ساتھ اس کا نام بھی جگہ جگہ پھیل رہا ہے مگر آپ کیسے ہیں؟"

"میں آپ کا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں جناب! آپ نے میرے لیے اتنی تکلیف اٹھائی تھی۔"

"جی نہیں، شکریے کی اس میں کوئی بات نہیں تھی۔ دراصل میں کسی کا آپ کو پیغام دینے وہاں گئی تھی۔"

"میں یہ بھی معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ وہ پیغام آپ کو کس نے دیا تھا۔"

"میں خود حیران ہوں۔ آپ کی گرفتاری کی ایک چھوٹی سی خبر میں نے اخبار میں پڑھی تو میں آپ کو دیکھنے تھانے پہنچی، دراصل میں آپ کی بہت پرانی مداح ہوں۔ آپ کو یاد ہو گا کہ آپ کا ذکر بار بار اخبار میں آتا رہا ہے، اسے میں بہت غور سے پڑھتی ہوں۔ پہلے روز جب میں تھانے گئی تو آپ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ میں کھانا وہاں چھوڑ آئی۔ جب میں دوسرے دن وہاں پہنچی تو راستے میں مجھے ایک آدمی ملا جس نے ہاتھ دے کر میری گاڑی تھانے سے کچھ دور روک لی۔ وہ رقعہ دراصل مجھے اسی آدمی نے دیا تھا اور کہا تھا کہ جیسے بھی ہو سکے وہ آپ تک پہنچا دوں۔ اس کا نام شیر محمد تھا۔ مجھے اس نے یہی بتایا مگر اسے آپ تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہیں مل سکتا تھا۔ وہ رقعہ لے کر میں آپ تک جا پہنچی۔ اس نے کہا بھی تھا کہ وہ مجھ سے ضرور ملے گا۔ میں اسے اپنا پتہ بھی بتا آئی تھی مگر وہ میرے پاس نہیں پہنچا۔"

"آپ نے اس کا نام شیر محمد بتایا ہے؟"

"جی ہاں۔ وہ کہہ رہا تھا کہ وہ آپ کا پرانا دوست ہے اور آپ کی رہائی کے لیے وہ پوری کوشش کر رہا ہے۔"

"کیا حلیہ تھا اس کا؟" میں نے اپنی حیرت چھپاتے ہوئے کہا۔ فوزیہ جو کہانی مجھے سنا رہی تھی اس سے تو میں کچھ بھی اخذ نہیں کر سکتا تھا۔

"بس عام سا آدمی تھا۔ کوئی خاص بات اس کی مجھے یاد نہیں ہے ہاں اس کے بال سیاہ گھنگھریالے تھے اور بائیں کان میں اس نے بالی سی پہن رکھی تھی۔"

"بالی پہن رکھی تھی! وہ کہیں راولپنڈی کا تو نہیں تھا؟"

"میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ بس وہ رقعہ دے کر اسی وقت مجھ سے دور ہٹ گیا۔ میں نے وہ رقعہ لے کر کھانے کے برتن میں اس طرح ڈال دیا کہ وہ ورق کے نیچے چھپ گیا تھا۔"

"ہاں وہ مجھے وہیں سے ملا تھا مگر میرا آپ سے ملنا تو بالکل ہی بیکار گیا۔ مجھے امید تھی کہ آپ سے کوئی بہت اچھی بات معلوم ہوگی۔"

"مجھے افسوس ہے جیلانی صاحب کہ آپ کو اتنی مایوسی ہوئی مگر سچی بات یہی ہے۔ آپ کو دیکھنے کا شوق ہی مجھے وہاں تک لے گیا تھا ورنہ اور کوئی بات نہیں تھی۔"

"میں بھی آپ کو دیکھنے چلا آیا تھا۔"

"مجھے دیکھ کر آپ کو بہت مایوسی ہوئی ہوگی۔ میں ..... میں کوئی حسین عورت نہیں ہوں۔"

"نہیں مس فوزیہ! ایسا نہ کہیں۔ شکل صورت پر آدمی کا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ اصل چیز تو دل کا درد ہے جو آپ کے دل میں ہر مظلوم کے لیے موجود رہتا ہے اور یہ بہت اچھی بات ہے۔"

"آپ کی مہربانی ہے جیلانی صاحب! بہرحال میں آپ سے یہی کہوں گی کہ یہ راستہ چھوڑ دیں، یہ اچھا راستہ نہیں ہے۔"

"میں تو کچھ بھی نہیں کرتا ہوں مس فوزیہ! دراصل میں ایسی راہ پر چل رہا ہوں کہ جس میں پولیس خواہ مخواہ میرے سامنے آ جاتی ہے۔ بہرحال آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے اتنی توجہ دی۔" میں نے صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"چائے تو پیتے جائیں۔"

"نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ بس اب آپ اجازت دیں۔ آپ کے والد آج یہاں نہیں ہیں۔"

"جی وہ کراچی گئے ہوئے ہیں مگر آپ چائے تو پیتے جائیں۔"

اس نے چائے کے لیے بہت اصرار کیا مگر میں وہاں رکا نہیں۔ دراصل اس کو دیکھ کر میں بجھ سا گیا تھا۔ اس کے بارے میں جو کچھ میں نے سوچا تھا وہ اس کے بالکل ہی برعکس نکلی۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے کسی بڑی ڈرامائی صورت سے باخبر کرے گی۔ کوئی ایسی ہی بات ہوگی اس کے پاس جو مجھے عالیہ تک پہنچنے میں مدد دے سکے گی۔ عالیہ نہ سہی کوئی اور آدمی ہی اس کے توسط سے میرے سامنے آ جائے گا جو مجھے بھن جی کے بارے میں کچھ بتا سکے گا مگر وہاں تو کچھ بھی مجھے معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ وہ مجھے محض ایک رقعہ پہنچانے کی ذمہ دار تھی اور بس۔ اور اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ رقعہ اسے جس آدمی نے دیا تھا اس کا حدود اربعہ کیا تھا۔

فوزیہ کی کوٹھی سے نکل کر میں پھر بڑی سڑک پر جا نکلا۔ دوپہر کے واقعے سے میں بہت زیادہ پریشان ہو رہا تھا۔ میری ساری پونجی لٹ گئی تھی۔ میں لاکھوں میں کھیل رہا تھا مگر اب راکھ ہو کر رہ گیا تھا۔ رستم کے غم نے مجھے اندر سے کھوکھلا کر کے رکھ دیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ فوزیہ سے مل کر کوئی مفید بات معلوم ہو سکے گی مگر میں وہاں سے کترا کر نکل گیا۔ مجھے اس وقت کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ آدمی کی امیدیں کہنہ ہونے لگیں تو پھر اس کا شباب بھی بوسیدہ ہونے لگتا ہے۔ دراصل یہ امیدیں، یہ آرزوئیں ہی اسے جوان رکھتی ہیں۔ ان کا چراغ گل ہو جائے تو پھر کچھ بھی باقی نہیں بچتا ہے اور میرے ساتھ یہی ہو رہا تھا۔ یہی کچھ ہوتا آ رہا تھا۔ میں آج بھی اتنا ہی دور تھا جتنا پہلے دن تھا۔ وہ خواب و خیال ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ جیل میں تھی تو ایک آس تو بندھی تھی کہ میں ایک نہ ایک روز اسے ضرور دیکھ لوں گا۔ اس تک جا پہنچوں گا مگر اب اس کا پتہ ہی مجھ سے کھو گیا تھا۔ میں یوں بے سہارا ہو کر رہ گیا تھا کہ مجھے کچھ بھی نہیں سوجھ رہا تھا۔ میرے ہاتھ سے عالیہ بھی نکل گئی تھی۔ میں اس تک پہنچتے پہنچتے راستے ہی میں کھو گیا تھا۔ میرا حال اس دیہاتی کا سا تھا جو شہر میں پہنچ کر یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ اسے جانا کس طرف تھا۔ میری جیب میں پچاس ہزار روپیہ پڑا تھا اور وہی میری کل جمع پونجی تھی جو میرے پاس رہ گئی تھی۔ اس سے آگے ایک آنہ میرے پاس نہیں تھا اور رستم میری ایسی ڈوبی تھی کہ اب اس تک میری رسائی کسی بھی طرح ممکن نہیں رہ گئی تھی۔ مسائل کا ایک بارِ گراں تھا جس نے میری گردن جھکا دی تھی۔ میرا کوئی بھی کام سیدھا نہیں ہو رہا تھا۔ میرے حوصلے کی لو بھی آہستہ آہستہ مدھم ہونے لگی تھی۔ کوئی کہاں تک ہواؤں کا تعاقب کر سکتا تھا۔ پولیس نے الگ میرے لیے جگہ جگہ جال ڈال رکھے تھے۔ وہ کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ ان سے بچ جانا ہی مجھے محال نظر آنے لگا تھا۔ میرے تحفظ میں جو نادیدہ لوگ ہمہ وقت پریشان رہتے تھے، وہ بھی اب مجھ سے دست کش ہو چکے تھے مگر کیوں؟ یہ بات

میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ کیا انھیں یہ ڈر تھا کہ میں اگر زندہ رہ گیا تو کسی روز کسی بھری کچہری میں ان کا نام لے دُوں گا۔ آخر وہ ایسا کیوں سوچتے تھے۔ کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ میں اُن میں سے کسی آدمی سے مل کر اپنی صفائی پیش کر سکتا۔ انھیں یقین دلا دیتا کہ میں ان کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاؤں گا۔ وہ مجھ پر جو یقین رکھتے تھے میں اس پر ہمیشہ پورا اترتا رہوں گا۔ سارا جھگڑا تو ہادی علی کے قتل نے پیدا کیا تھا ورنہ میں اُن کی نظر میں کہاں چڑھ سکتا تھا۔ اب وہ صرف اس کے آشکارا ہو جانے سے خوفزدہ تھے اور چاہتے تھے کہ مجھے پھانسی لگوا کر وہ ہر بات سے بری الذمہ ہو جائیں میرے اور کسی فعل کی وہ ذمہ داری نہیں لیتے تھے۔ لے بھی نہیں سکتے تھے۔ اب جب کہ مختار ڈھلوں کو میں ہندوستان سے بچا کر لے آیا تھا اور میرے پاس جن لوگوں کی فہرست تھی وہ اپنی جگہ ایک بہت بڑا کام تھا اگر اُسی کو وہ لوگ اہمیت دیتے تو شاید میرے تحفظ کی کوئی صُورت بن سکتی تھی۔ میں کسی کو قتل کرنے یا کسی کو ڈاکا زنی کا شکار بنانے کا ہرگز روادار نہ تھا۔ میرے لیے یہ دونوں چیزیں بیکار تھیں۔ کسی کی جان لینا مجھے کسی بھی طرح پسند نہیں تھا۔ ہاں جب ان کا ہاتھ میری گردن تک آ پہنچتا تھا تو پھر مجھے اپنے تحفظ کے لیے دوسروں پر گولی چلانے کی ضرورت پڑتی تھی اور یہ کوئی جُرم نہیں تھا۔ اس دو بیک کے واقعے نے مجھے پاگل کر دیا تھا اور میری سوچ کے زاویے کچھ زیادہ ہی بدلتے جا رہے تھے۔ اب مجھے شاید روپیہ حاصل کرنے کے لیے کسی کے ہاں ڈاکا ڈالنا پڑے اور یہ کچھ بھی مشکل نہیں تھا۔ میں ایسی وارداتوں کے اصل فلسفے اور اس کی غایت کو اچھی طرح سمجھ چکا تھا مگر اس راہ پر چلنے سے پہلے میں چاہتا تھا کہ میں اپنی رقم واپس لے لوں۔ وہ اگر مجھے مل جاتی تو پھر مجھے کسی کے روپے سے کوئی غرض نہیں تھی مگر میں اس رقم تک پہنچوں تو کیسے پہنچوں۔

میں نے بڑی سڑک پر پہنچ کر ایک بار پھر صورتِ حال پر غور کیا اور وہاں سے لوٹ کر میں شیر دل آہو کے گھر کی طرف چل دیا۔ مجھے کسی جگہ رُک کر ستنا جا صاحب کو فون ضرور کر لینا چاہیے تھا اور آہو کے ہاں مجھے فون کی سہولت میسر آ سکتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ آہو اگر وہاں نہ مل سکا تو وہ کبری تو..... ضرور ہی موجود ہو گا۔ اتنی بڑی عمارت کو وہ یُوں ویران چھوڑ کر گاؤں میں تو آباد نہیں ہو سکتے تھے۔ کسی نہ کسی ملازم کو تو ان لوگوں نے وہاں ٹھہرا رکھا ہو گا۔

آہو کے مکان پر جب میں پہنچا تو یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہُوئی کہ اس کے صحن کی بتی جل رہی تھی اور اُوپر کی منزل میں بھی روشنی ہو رہی تھی۔ اپنا چیک شاہ میں نے دائیں جیب میں ڈال رکھا تھا مگر مجھے یقین تھا کہ اس گھر میں مجھے اس کو استعمال کرنے کی نوبت نہیں آئے گی۔ میرا وہاں کسی سے کوئی جھگڑا نہیں تھا۔ مجھے صرف ایک فون کی حاجت تھی جو اس کے گھر میں موجود تھا۔

میری تیسری دستک پر کسی نے دروازہ کھول دیا۔ صحن کی روشنی گلی میں اُتری تو میں نے دیکھا کہ کبری بڑی حیرت سے مجھے دیکھ رہا تھا، بولا: ”اوستاد! تُو؟ یہ تجھے ہم کیسے یاد آ گئے پیارے!“

”کیا حال ہے کبری؟ دیکھ لے پھر تیرے پاس آ پہنچا ہوں۔“

”بڑی خوشی کی بات ہے اوستاد! جی آئیاں نوں قسم اللہ کی میں تجھے بہت یاد کرتا تھا۔ اندر آ جا باہر کیوں کھڑا ہے تُو؟“

”گھر میں کون کون ہے؟“

”آہو تو گاؤں گیا ہوا ہے اُس کی بیگم یہاں ہے۔“

”اور کوئی نہیں ہے گھر میں؟“

”نہیں۔ وہ باقی بھی اب گاؤں میں رہتا ہے، اندر آ جانا!“

وہ دروازے سے ہٹ گیا تو میں نے قدم اندر ڈال دیا۔ اس نے دروازہ بند کیا اور مجھے ساتھ لے کر وہ نشست گاہ میں جا پہنچا۔ وہاں کی ہر شے بہت قرینے سے سجی تھی۔ کوئی چیز بھی اپنی جگہ سے ہٹی ہوئی نہیں تھی۔ یہاں تک کہ وہ پلنگ بھی وہیں لگا تھا۔ جہاں میں اسے چھوڑ کر گیا تھا۔

میں صوفے پر پھیل کر بیٹھ گیا تو کبری بولا: ”تُو کیا پیے گا؟ اب تو کھانے کا وقت ہے، کہے تو میں لے آؤں۔“

”ہاں کھانا بھی کھا لیں گے۔ یہ بتا کہ یہ سروری خانم کب سے یہاں ہیں؟“

”یار تُو پتہ نہیں کہاں چلا گیا تھا۔ اِدھر تو بڑا جھگڑا ہو گیا ہے۔ سروری خانم سے آہو صاحب بہت ناراض ہیں۔“

”ناراض ہیں! آخر ہُوا کیا ہے؟“

”دراصل..... پر میں تجھ سے کیسے کہوں؟ گڑبڑ کچھ زیادہ ہی ہے۔ ٹھہر، میرا گولی کا وقت ہو گیا ہے پھر میں تجھ سے بات کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ ذرا دیر کے لیے اپنے کمرے میں گیا اور جب وہ واپس آیا تو یہ بڑی سی افیون کی گولی اس کے ہاتھ میں تھی جسے وہ دودھ کے ساتھ نگل رہا تھا۔ گلاس ختم کر کے وہ میرے پاس آ بیٹھا، بولا۔

”میاں بیوی میں زبردست جھگڑا ہو گیا ہے۔“

”پر ہوا کیا ہے کچھ پتہ تو چلے؟“

”آہو صاحب نے بیگم پر بدچلنی کا الزام لگایا ہے۔ بس کسی وجہ سے طلاق نہیں دے سکتا ہے وہ ورنہ معاملہ زیادہ ہی خراب ہو چکا ہے۔“

”یار! ایک تو تیری تمہید زیادہ لمبی ہو جاتی ہے۔ آخر ہُوا کیا ہے اِن کو؟“

”بات دراصل بچّے کی پیدائش پر شروع ہُوئی تھی۔ اب وہ بچّہ کم از کم پانچ ماہ کا ہو چکا ہے۔“

”اچھا۔ پھر؟ بچّہ ہو گیا ہے تو پھر کیا ہے؟ بچّے تو ہوا ہی کرتے ہیں۔“

”سمجھ بھی جاؤ نا! دراصل آہو یہ کہتا ہے کہ جب اتنے سال بچّہ نہیں ہُوا تو اب کیسے ہو گیا ہے؟“

”یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ خدا کسی بھی وقت مہربان ہو سکتا ہے۔“

”اپنے مال کا پتہ ہوتا ہے میاں جی سب کو اور آہو اسی بات پر بھڑکا ہُوا ہے۔ وہ سالا حساب لگاتا رہتا ہے کہ کب کیا ہُوا۔ کون کہاں گیا اور کہاں آیا۔“

”اچھا! اس کا حساب کیا کہتا ہے؟“

”بس یہی کہ وہ بچّہ اُس کا نہیں ہے۔“

”پھر اور کس کا ہو سکتا ہے؟ یعنی وہ اپنی بیوی کو مجرم سمجھتا ہے؟“

”ہاں۔ اور دیکھ کسی سے کہنا نہیں۔ وہ اس بارے میں تمھارا نام لیتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ بچّے کو گولی مار دے گا۔“

”لے بک نہیں اوئے! تیرا مغز خراب ہو چکا ہے میرا ایک کام ہے اس میں یعنی وہ تو اللہ کی دین ہے بھئی۔“

”اور..... دیکھ مجھے پتہ ہے کہ تُو ایک لمبی سیاہ رات یہاں گزار کر گیا تھا۔“

”نہیں یار! خواہ مخواہ مجھے چکر نہ دے۔ دیکھ ذرا سروری جاگ رہی ہے تو اُسے بتا کہ جیلانی آیا ہے!“

”ہاں۔ وہ ابھی کہاں سو سکتی ہے، بچّے کو بڑی دیر تک بہلاتی رہتی ہے۔ میں اسے بتا دیتا ہُوں۔“ یہ کہہ کر وہ خالی گلاس ہاتھ میں لے کر صحن میں نکل گیا۔ وہ دھپ دھپ کرتا ہوا سیڑھیاں چڑھ گیا، تو میں اس سوچ میں ڈوب گیا کہ ہمارا گناہ بالآخر رنگ لے آیا تھا۔ سروری کو ایک نئی زندگی مِل گئی تھی۔ ایک نیا باب کھل گیا تھا۔ اور اب وہ بچّہ ان دونوں کے درمیان وجہ نزاع بن گیا تھا مگر یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ آہو کو تو بہت خوش ہونا چاہیے تھا کہ وہ بچّے کا باپ بن رہا تھا۔ اُسے یُوں سروری پر الزام لگاتے شرم نہیں آئی آخر یہ قصہ کیا ہے؟

کچھ ہی دیر بعد کُبری واپس آ گیا، بولا: ”آؤ میاں! تجھے وہ یاد فرماتی ہیں اور اتنی خوش ہیں کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔“

میں صحن میں نکل کر اسی وقت اُوپر کی منزل پر جا پہنچا۔ سروری دروازے میں کھڑی تھی، مجھے دیکھتے ہی اس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔ بولی: ”اے آمدنت باعثِ آبادیٔ ما۔“

”ایسی کیا بات ہے جناب! خیر تو ہے۔ بہت دنوں بعد آپ سے ملاقات ہو رہی ہے طبیعت تو ٹھیک ہے۔“

”ہاں میں بالکل ٹھیک ہوں آئیں اندر بیٹھیں۔“ یہ کہہ کر وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر خواب گاہ میں جا پہنچی۔ دُوسرے پلنگ پر بچّہ بڑے اطمینان سے کمبل میں لپٹا ہوا تھا۔

”یہ..... آپ کو مبارک ہو سروری خانم! کہ آپ بچّے کی ماں بن گئی ہیں۔“ میں نے بچّے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”اور..... اور آپ کو بھی مبارک ہو۔“

”کیا؟ یعنی! خیر بچّہ تو سب کے لیے مبارک کا باعث ہوتا ہے مگر میرے لیے خاص طور پر کیوں؟“

”بس سمجھ جائیں جناب! اور میں خوش ہوں، بے حد خوش۔ کہ میری تکمیل ہو گئی۔ آہو مانے نہ مانے جاگیر کا وارث تو پیدا ہو ہی چکا ہے۔“

میں ٹک ٹک اس کا مُنہ تک رہا تھا۔ وہ واقعی خوش تھی، بے حد خوش میرے لیے اس نے ڈھیر سارا کھانا نکال کر میز پر رکھ دیا، بولی: ”یہ کھائیں جناب! اور اس ناچیز کو اتنی بڑی مہربانی کا شکریہ ادا کرنے کا موقع دیں۔ یہ مرغابی ہے، یہ بکرے کا گوشت ہے۔ یہ فرنی ہے، یہ حلوا ہے اور یہ مرغِ مسلم۔ پتہ نہیں تھا کہ آپ آ رہے ہیں۔ میں نے ساری ہی چیزیں پکالی تھیں۔ یہ مرغابی سکھیرا صاحب نے صبح بھیجی تھی۔“

”یہ سکھیرا صاحب کون ہیں؟“

”یہ مسند آرا کے منگیتر ہیں۔“

”اوہ! مجھے یاد ہی نہیں رہا تھا۔ مسند آرا کیسی ہے؟“

”وہ اب بھی بیمار ہے۔ صحت اُس کو ابھی تک نہیں ہوئی۔ پھر بھی سکھیرا صاحب چاہتے ہیں کہ اُس سے اُن کی شادی ہو جائے مگر وہ مانتی ہی نہیں، دراصل اسے کوئی شدید ذہنی بیماری ہے۔“

”وہ کہاں ہے اب؟“

”وہ بس گاؤں میں ہی رہتی ہے۔ اور..... اور کسی نے اسے یہ بھی بتا دیا تھا کہ اس کے والد کا قاتل کون ہے۔“

”کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں۔“

”وہ بہت اُلجھ گئی ہے جیلانی صاحب! کبھی تو وہ دن رات آپ کو گالیاں دیتی ہے، آپ کا نام لینا پسند نہیں کرتی اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ برش لے کر آپ کی خیالی تصویریں بنانے لگتی ہے۔“

”اوہ! تو یہ بات ہے مگر یہ بات اسے بتائی کس نے؟“

”پتہ نہیں، میرا خیال ہے آہو نے ہی کسی طریقے سے اسے سمجھا دیا ہو گا۔ اسے آپ کیا سمجھ رہے ہیں، بہت ذلیل آدمی ہے وہ۔“

”کمال ہے۔ میں..... میں اس سے ضرور ملوں گا سروری خانم! کسی طرح آپ میری اس سے ملاقات کروا دیں۔“

”ہاں آپ اس سے ضرور مل لیں اور قسم کھا جائیں کہ اس کے

والد کو آپ نے قتل نہیں کیا ہے۔ اس کی زندگی بچ جائے گی۔"

"میں یہی کروں گا۔ آہو کے باپ آخر اس کا ثبوت ہی کیا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں اگر وہ آپ کی بات سُنے تو آہو کو ہی اُن کی موت کا ذمے دار ٹھہرائیں۔ یہ بہت ضروری ہے میں اب اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ آہو دو قدم آگے بڑھ کر اسے بھی قتل کروا دے گا۔ وہ یہی چاہتا ہے۔ اس سازش میں میں خود اس کی شریکِ کار تھی۔ مسند آراء کو دواؤں پر میں نے ہی ڈالا ہے مگر اب صورتِ حال بالکل بدل گئی ہے۔ میں۔۔۔ میں ایک بچّے کی ماں بن چکی ہوں۔ اور اب میں اس کے ساتھ کسی سازش میں شریک نہیں ہو سکتی ہوں۔ وہ کئی دنوں سے یہاں نہیں آیا ہے۔ اس کے بس میں یہ نہیں ہے ورنہ وہ مجھے طلاق دے دیتا مگر میں اس کا سارا بھید جانتی ہوں اور وہ اسی وجہ سے چُپ ہے مگر اب وہ مجھے اور اس بچّے کو بھی مار دینا چاہتا ہے۔ میں یہی محسوس کر رہی ہوں۔" وہ بچّے کے پاس بیٹھ کر اس کا کمبل سیدھا کرنے لگی تھی۔

"اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے سروری بیگم! اسے ایسا کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

بچّے کو میں انتہائی حیرت سے دیکھ رہا تھا ——— وہ بلاشبہ میری ہی تصویر بن چکا تھا۔ وہی ماتھا، وہی ناک، ویسے ہی بال اور۔۔ حد یہ ہے کہ اس کے دائیں رخسار پر ویسا ہی ایک تِل تھا جو میرے چہرے کا نمایاں نشان تھا۔

"یہ دیکھیں! ذرا اس پر غور کریں۔" اس نے بچّے کا بایاں بازو اٹھا کر مجھے دکھایا۔ میری حیرت فزوں تر ہو گئی۔ اس کی بائیں کلائی پر ویسا ہی ایک روپے اتنا چوڑا سیاہ داغ تھا جو میری کلائی کو دوسروں سے الگ کرتا تھا۔ بالکل ہو بہو ویسا ہی سیاہ نشان ——

"کوئی اور ثبوت بھی درکار ہے آپ کو؟ یہ۔۔۔ یہ خدا کی قدرت ہے کہ بچّے باپ کی ایسی شبیہہ بن جاتے ہیں۔"

"آپ۔۔۔ آپ ٹھیک کہتی ہیں سروری خانم۔۔۔ مجھے۔۔۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے اپنی ساری بدنامی آپ کی جھولی میں ڈال دی۔"

"نہیں نہیں، مجھے اس کا کوئی ڈر نہیں ہے۔ میں۔۔۔ میں آہو کا مقابلہ کر سکتی ہوں۔ میں۔۔۔ میں اسے اپنی زندگی سے نکال دوں گی اس خبیث آدمی کو۔"

"حالات یہاں تک خراب ہو چکے ہیں؟"

"ہاں۔ آج کئی مہینے ہو گئے ہیں۔ وہ بار بار حملے کر کے آتا ہے مگر پھر کچھ سوچ کر چپ ہو جاتا ہے کیونکہ ابھی جاگیر ہادی علی کے نام ہے، ہماری طرف منتقل نہیں ہوئی۔ پتہ نہیں اس میں کیا مصلحتِ خداوندی ہے۔ کاغذات ابھی تک آگے نہیں نکلے حالانکہ وہ بہت ہی بارسوخ آدمی ہے۔"

"اس میں بھی کوئی خدا کی مصلحت ہوگی۔ کیا نام رکھا ہے آپ نے اس بچّے کا؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ بچّہ مجھے ایک دم بہت عزیز لگ رہا تھا۔ ایک انجانی سی خوشی میرے دل میں سرایت کر گئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے میں نے نیا جنم لیا ہو۔ اس کی بائیں کلائی پر میری نظریں جمی تھیں۔ چہرے کے رخسار کا تِل بھی مجھے حیران کر رہا تھا۔ لبوں کا زاویہ اور بالوں کا گھنگھر بھی میرے لیے حیرتوں کا سامان فراہم کرتا تھا۔ وہ میرے استعجاب کو بڑی محویت سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے کھانا پلیٹوں میں ڈالنا شروع کر دیا۔ میں اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

"میں آہو کا مغز توڑ دوں گا۔ وہ اس کی طرف میلی آنکھ سے دیکھے گا تو میں اس کی آنکھ ہی نکال دوں گا۔" میں نے کھانے کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ وہ بھی میرے ساتھ شامل ہو گئی۔

"کیا خیال ہے اس کا نام عدنان نہ رکھ دیں؟"

"سوچ لیں گے، اس کے بارے میں بھی سوچ لیں گے پہلے اس آہو سے تو میں نپٹ لوں۔ پتہ نہیں وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔"

"اب کہاں ہے وہ؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"گاؤں میں ہی رہتا ہے۔ دو گھڑی کے لیے یہاں آتا ہے تو اُسے آگ لگ جاتی ہے۔ اس کا مغز ہی صحیح نہیں رہتا۔ ایک یہ کبری ہے، یہی بے چارہ میری دیکھ بھال کرتا ہے۔ بہت وفادار ملازم ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ مسند آراء سے میری شادی کرا دیں؟"

اُس نے مجھے یوں دیکھا جیسے کوئی اجنبی کسی اجنبی کو دیکھتا ہے۔

"یہ۔۔۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ میں۔۔۔ میں یہ انتظام کیسے کر سکتی ہوں؟ وہ سکھیرا تو میری جان کا دشمن بن جائے گا۔"

"اس کو بھی ہم راستے سے ہٹا سکتے ہیں۔"

"دیکھیں اب صورتِ حال بالکل ہی بدل گئی ہے۔۔۔ میں یہ چاہتی ہوں کہ میں آہو سے طلاق لے لوں۔"

"طلاق! یعنی اس کا مطلب ہے خلع۔ مگر وہ کیسے مان لے گا؟ آپ پر وہ بھری عدالت میں بدچلنی کا الزام لگائے گا۔"

"تو پھر۔۔۔ پھر میں کیا کروں؟"

"اچھا فرض کریں کہ وہ آپ کو طلاق بھی دے دیتا ہے، پھر آپ کیا کریں گی؟" میں نے اُسے ٹٹولا۔

اس کا ہاتھ وہیں رُک گیا، بولی۔ "میں۔۔۔ میں اس بچّے کے باپ کو اپنا لوں گی۔"

"اوہ! تو یہ بات ہے۔ مگر۔۔۔ مگر میں کوئی اچھا آدمی نہیں ہوں

سروری خانم! میرا کوئی مستقبل بھی نہیں ہے۔ پتہ نہیں میں کب پولیس کے ہتھے چڑھ جاؤں۔"

"کچھ بھی ہو جائے جیلانی صاحب! میں یہ فیصلہ کر چکی ہوں اور اس پر ہر حال میں عمل کروں گی۔ میں آہو کو اب یہاں نہیں دیکھنا چاہتی۔"

"میں غور کروں گا۔ آپ۔۔۔ آپ بہرحال ابھی لاہور میں ہی رہیں۔ میں یہاں آتا رہوں گا۔ مجھے سوچنے کا موقع دیں۔"

وہ میری یہ بات سُن کر کچھ بجھ سی گئی مگر اس کے لطف و کرم میں کمی نہیں آئی۔ کھانے کے بعد وہ باورچی خانے میں چائے بنانے کے لیے چلی گئی تو میں نے اس کا فون اپنے سامنے رکھ لیا۔ مجھے ہر حال میں ستناجا صاحب سے مل کر اُسے ساری صورتِ حال سے آگاہ کر دینا چاہیے تھا مگر مجھے اس کے گھر کا علم نہیں تھا اور اس وقت اس کے دفتر میں موجود ہونے کا امکان بھی نہیں تھا۔ ساری بات کا فیصلہ اسی رات ہو جانا چاہیے تھا۔ اس کے ذمّے میں یہ کام لگانا چاہتا تھا کہ وہ بینک سے مجھے رقم نکالنے میں۔۔۔۔ مدد دے اور آئندہ کے لیے پولیس کو میرے پیچھے سے ہٹا دے۔ یہ دونوں باتیں وہ کر سکتا تھا کیونکہ بڑے صاحب کو اب بھی میری ضرورت تھی۔ میں۔۔۔ انڈیا تک مار کر سکتا تھا اور اس درمیان میں سیکڑوں مرحلے ایسے آ سکتے تھے جن میں انھیں میری اشد ضرورت محسوس ہو سکتی تھی۔ وہ مجھے ردّی کاغذ سمجھ کر ٹوکری میں تو نہیں ڈال سکتے تھے۔

ڈائرکٹری فون کے قریب ہی رکھی تھی، اسے میں نے کھول لیا۔ جس عملے کا وہ سربراہ تھا، وہ عملہ اب میرے سامنے تھا۔ وہ بڑے صاحب کا ملازم تھا اور ہر آدمی کے گھر کا پتہ اور نمبر ڈائرکٹری میں درج تھا۔ ستناجا صاحب جی او آر۔ اسٹیٹ میں رہتے تھے۔ اُن کا نمبر بھی صاف لکھا تھا۔ وہ نمبر میں نے اللہ کا نام لے کر گھما دیا۔ دوسری طرف سے کسی خاتون کی آواز سنائی دی۔

"کون ہے؟"

"جی میں ڈھلوں صاحب کا ڈرائیور برکی بول رہا ہوں۔ مجھے ستناجا صاحب سے بات کرنی ہے۔"

"ٹھہریں ذرا۔ میں دیکھتی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے فون میز پر رکھ دیا۔ کچھ ہی دیر بعد مجھے فون پر ستناجا صاحب کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو! کون صاحب؟"

"السّلام علیکم ستناجا صاحب! کیا حال ہیں آپ کے؟"

"جی میں ٹھیک ہوں۔ کون صاحب ہیں؟ برکی بول رہا ہے؟"

"جی نہیں۔ برکی میرے قریب کھڑا ہے۔ میں دراصل آپ کا پرانا خادم جیلانی ہوں۔"

"اوہ! آئی ایم سوری۔۔۔ رانگ نمبر۔" یہ کہہ کر اس نے فوراً ہی فون بند کر دیا۔ اس کی احتیاط نے مجھے خجل کر دیا تھا۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ فون پر اس سے میں کوئی بھی بات نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بھی اپنی عزّت کو ہر شے پر فوقیت دیتا تھا اور ٹیلیفون کوئی محفوظ چیز تو نہیں تھی۔ میں نے فوراً ہی فون رکھ دیا۔ سروری خانم چائے بنا کر لے آئی تھی، وہ اُس نے میرے سامنے رکھی اور لحاف اوڑھ کر میرے قریب ہی بیٹھ گئی، بولی۔ "میں بہت دنوں سے آپ کا انتظار کر رہی تھی مگر آپ کا کچھ پتہ ہی نہ چلتا تھا۔ اس دوران میں چوگوٹھ بھی گئی تھی مگر وہاں نہ آپ مل سکے، نہ ڈھلوں صاحب ہی وہاں موجود تھے۔"

"یہ کب کی بات ہے؟"

"یہ کوئی سات آٹھ مہینے پہلے کی بات ہے۔"

"ہوں۔ میں وہاں کم ہی جایا کرتا ہوں۔ اب مجھے اجازت دیں، ایک بہت ضروری کام ہے مجھے۔"

"ایسا بھی کیا کام ہے آپ کو۔ بچّے کو میں نے سُلا دیا ہے۔"

"یہ بچّہ بہت گہری نیند سوتا ہے، کیا کھلاتی ہیں آپ اسے؟"

"اپنے باپ کی طرح ہی ہوگا۔ سارا دن کھیلتا رہتا ہے جب ذرا اندھیرا ہوتا ہے، یہ سو جاتا ہے اور رات بھر کوئی چیز طلب نہیں کرتا۔ صبح اذان کے وقت اٹھ جاتا ہے۔"

"کمال ہے۔ اسے رات کو کسی چیز کی حاجت نہیں ہوتی۔"

"نہیں جناب! اتنا صاف ستھرا ہے کہ رات کو ایک بار بھی پیشاب نہیں کرتا۔ مجھے اس کی کوئی ضرورت پریشان نہیں کرتی۔ صبح سویرے دودھ پیتا ہے پھر دوپہر کو اور پھر شام کو۔ کیا آپ بھی یہی کرتے تھے؟"

"پتہ نہیں۔ بہرحال میری والدہ کہا کرتی ہیں کہ جیلانی نے مجھے تنگ نہیں کیا۔"

"یہی حال اس کا ہے۔ میں خود حیران ہوں اور مزے کی بات یہ ہے کہ روتا بالکل نہیں ہے ہاں۔"

"یہ کہیں ولی تو نہیں ہے۔ میں نے سُنا ہے وہ لوگ اسی طرح کیا کرتے ہیں، کسی کو کوئی پریشانی نہیں ہوتی ہے ان کے بارے میں۔"

"جی نہیں۔ ولی تو نہیں البتّہ ابھی سے مجھے کچھ کچھ بدمعاش نظر آتا ہے۔ میری سہیلیاں اسے دیکھنے آتی ہیں تو ان کو بڑے غور سے تاڑتا رہتا ہے۔ اُن کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک آ جاتی ہے۔"

"جیسی آپ کی آنکھوں میں مجھے دیکھ کر پیدا ہوتی ہے۔"

"جی نہیں۔ یہ بالکل آپ پر گیا ہے، خدا اسے محفوظ رکھے۔ بہرحال

آپ کے گر میں اسے نہیں سکھنے دوں گی ہاں۔"

"اب میں چلتا ہوں پھر کسی روز آؤں گا۔ اس کی بہتر حفاظت کرنا۔ آپ کی پیشکش پر میں ضرور غور کروں گا۔۔ مگر پہلے میں سندآرا سے مل لوں۔"

"اس پر لعنت بھیجیں، وہ کسی کام کی نہیں رہ گئی ہے جیلانی! آہو نے اس کا بہت بُرا حال کر دیا ہے، وہ بہت دنوں سے اس کو دوا میں گھول رہا ہے۔"

"پھر تو اس سے ملنا اور بھی ضروری ہو گیا ہے۔ میں آہو کو یہ اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ اسے نگل لے۔ ہادی علی کو تو اس نے مار ہی دیا ہے۔" یہ کہہ کر میں پلنگ سے اُتر گیا اور بوٹ کے تسمے بند کرنے لگا۔

وہ تیزی سے اٹھی اور بولی۔ "یہ آپ کے کپڑے کچھ اچھے نہیں لگتے ہیں ٹھہریں، میں آپ کو نیا جوڑا لا دیتی ہوں، شیروانی بھی پہن لیں۔" یہ کہہ کر وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ جب وہ واپس آئی تو آہو کے کئی نئے اور بہت ہی عمدہ جوڑے اس کے ہاتھ میں تھے۔ اُن میں سے ایک اس نے مجھے پہنا دیا اور پھر وہ آہو کی ایک نئی سلی ہوئی شیروانی میرے بدن پر چڑھا کر بولی۔ "لائیں، میں آپ کے بٹن بند کر دوں۔ ذرا آئینے میں دیکھیں، لگتا ہے یہ جوڑا آپ ہی کے لیے بنا تھا۔"

میں پلنگ کے پائینتی لگے قدِ آدم آئینے کے سامنے جا کھڑا۔ شیروانی واقعی میرے بدن پر پوری اتری تھی۔ اس کا رنگ سیاہ تھا اور آدمی کو خواہ مخواہ یہ احساس ہونے لگتا تھا کہ وہ بہت معزز ہے۔ دوسروں سے بالکل منفرد۔

سروری نے ایک عمدہ سی گھڑی بھی میری کلائی میں باندھ دی، بولی۔ "یہ ٹھیکرا اتار دیں۔ پتہ نہیں کہاں سے لی ہوئی ہے آپ نے۔"

اس کی نوازشیں بڑھتی جا رہی تھیں اور اُس نے فرض کر لیا تھا کہ میں ہی اب اُس کا شوہر ہوں۔ پتہ نہیں یہ احساس اُسے کس بنا پر ہونے لگا تھا۔ جب میں نے دوسرے جوڑے سے نکال کر اپنی رقم شیروانی میں ڈالنی چاہی تو وہ ٹھٹک کر رہ گئی، بولی۔ "یہ اتنی بھاری رقم آپ جیب میں ڈال کر چلیں گے؟"

"تو اور کیا کروں؟"

"نہیں، یہ آپ بریف کیس میں ڈال لیں۔ نہیں تو پانچ دس ہزار ساتھ لے جائیں اور باقی یہاں رکھ دیں۔" یہ کہہ کر اُس نے چھوٹا بریف کیس لا کر میرے سامنے ڈال دیا۔

"ٹھیک ہے سروری خانم! یہ لیں یہ پینتالیس ہزار ہے، اسے رکھ لیں۔"

"نہیں، مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اتنی رقم ساتھ نہ رکھا کریں۔ یہی آدمی کی کبھی دشمن بن جاتی ہے۔"

"آپ ٹھیک کہتی ہیں مگر ابھی اس کی میرے دوست کو ضرورت ہے۔ وہ ہسپتال میں پڑا ہے۔"

"تو اسے دے دیں۔ بریف کیس ساتھ لے جائیں۔" اس نے دیکھ لیا تھا کہ میں رکنے پر آمادہ نہیں ہوں۔

جب میں اس سے رخصت ہونے لگا تو پتہ نہیں کیا ہوا، میں بچے کے پاس پہنچ کر رُکا اور میں نے نیچے جُھک کر اس کا ماتھا چوم لیا، جیسے میں پدری شفقت سے نڈھال ہو رہا ہوں۔

وہ میری اس حرکت پر جھوم سی گئی۔ بولی۔ "مجھے یقین تھا کہ آپ اسے ضرور پیار کریں گے آخر کو۔۔۔۔"

"بس چپ رہو جی! ہاں۔ میں۔۔۔ میں پھر آؤں گا سروری خانم! میرا انتظار کریں اور ابھی لاہور نہ چھوڑیں۔"

"میں تو ایک عرصے سے یہاں رہ رہی ہوں۔ اب تو بس کسی دن بھی آہو سے معاملہ ختم ہو سکتا ہے۔" اس نے بڑی آزردگی سے کہا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس کے حلقے سے نکل کر میرے کندھے پر سوار ہو جائے گی۔ ابھی تک اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی بھی بات معلوم نہیں ہو سکی تھی۔ شاید وہ مہینوں میرا انتظار کرتی رہی تھی اور اب میں آیا تھا تو اس کی واضح دعوت کو بھی قبول نہیں کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر اس کی عمر صاف لکھی ہوئی تھی۔ وہ مجھ سے عمر میں کئی سال آگے تھی مگر پھر بھی اس کی طلوزی میں فرق نہیں آیا تھا۔ اب بھی وہ دلوں میں ہلچل مچا دیتی تھی۔ اسے لباس پہننے اور گفتگو کرنے کا سلیقہ تھا۔ اس نے کالج میں تعلیم حاصل کی تھی اور ایک بہت بڑے گھرانے کی فرد ہونے کے ناتے سے اُس نے خود کو ہمیشہ ایک خاص معیار کا پابند پایا تھا۔ اس سے شادی کر کے میں یقیناً خوش رہ سکتا تھا۔ مگر فیصلے کی گھڑی ابھی نہیں آئی تھی۔ میں سندآرا کو چھوڑ کر اس کی طرف کیسے نکل جاتا۔ وہ محبت جس میں شکوے گلے کی ابھی شکن تک نہیں اُبھری تھی، جو صرف دلوں تک محدود تھی۔ جذبوں میں نہیں رچ سکی تھی، اس کو تج کر میں اپنا آپ سروری کے حوالے کیسے کر دیتا، یہ ناممکن تھا۔ مگر پھر بھی وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ میرے بچے کی ماں بن چکی تھی۔ اس نے میری زندگی میں ایک زبردست الجھن پیدا کر دی تھی۔ اور اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ ایک راندۂ درگاہ آدمی سے کیا مانگ رہی ہے۔ ایک پھانسی کے تختے پر لٹکے شخص سے وہ کیا طلب کر رہی ہے، اسے اس بات کا قطعاً احساس نہیں تھا۔

میں سروری کو شب بخیر کہہ کر نیچے اتر گیا۔

کبری اس وقت صحن میں کھڑا تھا، بولا۔ "ارے تم! تو نے

نکور بن کے نکلے ہو۔ قسم اللہ کی اوستاد! اس وقت دولھا لگ رہے ہو تم۔"

"اوئے بک نئیں اوئے کبری! یہ لے یہ رہا تیرا راتب۔ ذرا کم گولی کھایا کر سالے، بالکل بجو بنتا جا رہا ہے تو۔" یہ کہہ کر میں نے پانچ سو روپے کے کڑکتے نوٹ اس کی طرف بڑھا دیے۔

اس پر شادیٔ مرگ ایسی کیفیت طاری ہو گئی۔ نوٹوں کی طرف وہ یوں لپکا جیسے کوئی کئی دنوں سے بھوکا آدمی روٹی کی طرف دوڑتا ہے، بولا۔ "تیرا بہت بہت شکریہ اوستاد! بس ہی طرح کی بخشش کیا کر، پھر دیکھ تیرے دن کیسے بدلتے ہیں فقیروں کی دعا لیا کر۔" نوٹ اس نے میرے ہاتھ سے اُچکتے ہوئے کہا۔

"اوئے جا وڈا فقیر بنا پھرتا ہے ذرا دروازے پر دھیان رکھا کر اور وہ آہو آئے تو سروری خانم کا بھی پہرہ دیا کر۔ وہ اس سے بہت خوفزدہ ہے۔ سمجھ رہا ہے نا تو۔"

"مجھے پتہ ہے اوستاد! پر میں دخل نہیں دے سکتا نا۔ دونوں کا خادم ہوں۔ بہر حال میں ان کا بہت خیال رکھتا ہوں۔"

"یہ بتا کہ اس نے یہ ڈھیر سارے کھانے کس کے لیے پکا رکھے تھے؟"

"وہ مرغابی خترغابی! یار بس ایسے ہی۔ پتہ نہیں اسے الہام ہوتا ہے شاید۔ جس دن کوئی مہمان آنا ہوتا ہے وہ اسی طرح ڈھیروں چیزیں تیار کر لیتی ہے۔"

"اچھا خیر ٹھیک ہے میں پھر آؤں گا۔ خدا حافظ۔" یہ کہہ کر میں وہاں سے نکل کر گلی میں جا اُترا۔ اب کی بار میرے دھیان کے عقب میں سروری خانم بھی سرسرانے لگی تھی اور اس کا بچہ تو میری ساری توجہ اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ جیلانی بھی صاحبِ اولاد ہو گیا تھا۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ کس کا بچہ ہے، کہاں پرورش پا رہا ہے اور کس دلہیت تلے۔ یا ہوتا ہے۔ تھا تو وہ میرا ہی بچہ اور میں اس کو عدنان کے نام سے پکارنے لگا تھا۔

وہ بہت خوش تھی۔ میرا خیال ہے کہ پہلے روز سے ہی اس کی نیت خراب تھی میرے سامنے جب بھی وہ آئی سولہ سنگھار کر کے آئی۔ ایک اس کی عمر مجھ سے زیادہ نہ ہوتی اور وقت کا سایہ اس کے چہرے پر نہ جھلک رہا ہوتا تو وہ شاید میرے دل میں زیادہ ہی گہری اتر چکی ہوتی مگر اب بھی وہ کچھ کم کامیاب نہیں تھی۔ بالخصوص اس بچے کی ماں بن کر اس نے میرے دل میں ایک عجیب سا پدری شفقت کا جذبہ بھڑکا دیا تھا۔ وہ آپ ہی آپ بلا دستک دیے میرے وجود میں اُتر آئی تھی۔ میں اس کے خیال سے اب ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہیں رہ سکتا تھا۔ یہ قسمت بھی عجیب رنگ دکھاتی ہے۔ ابھی میں سارے کا سارا سندآرا کی طرف جھک رہا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ نہ اسے کوئی مرد میرے سوا دیدہ زیب نظر آئے گا نہ میں کسی کو اس کے سوا نظروں میں جگہ دے سکوں گا۔ ہماری محبت ازل سے تھی اور ابد تک ایسی ہی رہے گی مگر اس سروری خانم نے ایسا تیر چلایا تھا کہ اس کا ہدف دو کھنڈ ہو کر رہ گیا تھا۔

بڑی سڑک پر پہنچ کر جب میں ٹیکسی میں بیٹھا تو اس وقت آٹھ بج رہے تھے۔ میں کبری کے ہاں سے جلدی ہی نکل آیا تھا۔ فوزیہ نے بھی مجھے زیادہ نہیں روکا تھا۔ ابھی شام زیادہ نہیں ڈھلی تھی اور میرا خیال تھا کہ ستنا جا صاحب کو میرے فون نے جس افراتفری میں مبتلا کر دیا ہو گا، میں اس کا علاج کر سکتا تھا۔ ان سے مل لینا میرے لیے بہت ضروری تھا۔ ہماری قسمت ڈوب رہی تھی۔ صرف رقم ہی نہیں میری زندگی بھی داؤ پر لگی تھی۔ لاہور کی پولیس اب بھی میرے تعاقب میں تھی اور مجھے تحفظ کی ضرورت تھی۔ میں کسی کا دشمن نہیں تھا۔ میں ان سماج دشمن عناصر کا بھی حصہ نہیں تھا جن کے پیچھے پولیس ہاتھ دھو کر پڑی رہتی ہے۔ جہاں کسی نے ان کا راتب بند کیا، وہیں ان لوگوں نے اُسے حوالات دکھا دی۔ وہ ایسے میں کسی کا بھی لحاظ نہیں کرتے تھے مگر میرا معاملہ بالکل ہی جداگانہ تھا۔ میرے لیے اب بھی اُن کے لیے بہت بڑا انعام مقرر تھا اور اب بھی وہ سینگ تیز کر کے میرے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ ایک نہیں، کئی بلائیں مجھے نرغے میں لیے ہوئے تھیں اور میرا غمگسار کوئی بھی نہیں تھا۔ ضروری تھا کہ میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کسی طرف نکل جاتا مگر اب یہ سب کچھ میرے بس میں نہیں تھا۔ ہماری رقم تباہ ہو چکی تھی اگر وہ منجمد نہ ہوتی، پولیس اس تک نہ پہنچ سکتی، تو عین ممکن تھا کہ میں آبی کو ساتھ لے کر کسی طرف نکل جاتا مگر اب تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا اور ایسے میں ایک صرف ستنا جا صاحب ہی میری مدد کر سکتے تھے مگر اُن سے ملنے سے پیشتر مجھے یہ سارا معاملہ ڈھلوں صاحب کے گوش گزار کر دینا چاہیے تھا لیکن وہ حویلی کے معاملات میں ایسے پھنس گئے تھے کہ انھیں کسی بات کا ہوش ہی نہیں تھا۔ اُن کا اپنا تخت لرزہ براندام تھا۔ اس شخص کی بدنصیبی کو کیا کہیے جس کا حرم ہی اس کا دشمن بن چکا ہو۔ ہم نے اچھا کیا تھا کہ وہاں سے نکل آئے تھے۔ اُن کا زخم زیادہ گہرا نہیں تھا۔ پھر ڈاکٹر کو برکی ساتھ لے گیا ہو گا، ان کا علاج ہو سکتا تھا لیکن جس مرض میں ہم مبتلا تھے اس کا علاج ہی ناممکن تھا۔ آبی کے کولہے سے ذرا نیچے جو گولی لگی تھی وہ ابھی تک اس سے جان نہیں چھڑا سکا تھا اور اب کلینک میں پڑا وہ میری جان کو رو رہا ہو گا۔ اس سے پہلے بھی وہ کئی بار زخمی ہو چکا تھا مگر۔۔۔ مگر اب جو اسے دُہرا صدمہ اٹھانا پڑ رہا تھا وہ اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہو جاتا۔ رقم کے کھو جانے کا غم اسے تباہ کر دیتا۔ میں نے اچھا کیا کہ اُس روز اس تک نہیں پہنچا

تھا ورنہ صورتِ حال پتہ نہیں کیا سے کیا ہو جاتی۔

ٹیکسی جب جی او اسٹیٹ کے وسط میں پہنچی تو میں نے ڈرائیور کو فارغ کر دیا۔ ستنا جا صاحب کی کوٹھی کچھ زیادہ دور نہیں تھی جب میں اُن کے گیٹ تک پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اُن کے ٹھاٹ باٹ ہی جداگانہ تھے۔ گیٹ کے اندر ایک چبوترے پر کھڑا پہرے دار اُن کے رُعب دبدبے کا پتہ دیتا تھا۔ سامنے پختہ روش پر دو گاڑیاں کھڑی تھیں۔ لان اُن کا اتنا وسیع تھا کہ اُس میں ہاکی کھیلی جا سکتی تھی۔ بلاشبہ وہ بہت بڑے افسر تھے اور مجھ خاک نشیں کے لیے وہ تھانے میں جا پہنچے تھے۔ ابھی میں گیٹ پر پہنچا ہی تھا کہ وہ مجھے عمارت میں سے نکل کر گاڑی کی طرف بڑھتے دکھائی دیے۔ وہ شاید کہیں جا رہے تھے۔ اُن کی بیگم بھی ان کے ہمراہ تھی اور وہ زرق برق لباس پہنے ہوئے تھی۔ کرن سی بنی وہ جھلملاتی ہوئی گاڑی کے اندر جا گھسی تو دوسرے دروازے میں سے ستنا جا صاحب بھی اندر جا بیٹھے۔ مجھے تو ہر حال میں اُن سے مل لینا چاہیے تھا مگر بات ہاتھ سے نکلتی نظر آتی تھی۔ میں تیزی سے گیٹ کے پاس پہنچا۔ پہرے دار نے چونک کر میری طرف دیکھا اور چبوترے سے ہٹ کر میرے پاس آ پہنچا۔

"کیا بات ہے کسے ملنا ہے آپ کو؟"

"میں ستنا جا صاحب سے ملنا چاہتا ہوں، ابھی اور اسی وقت۔ میں ڈھلوں صاحب کا ایک پیغام لے کر آیا ہوں۔"

"تم ادھر ہی ٹھہرو، وہ تو شاید کہیں جا رہے ہیں۔ میں اُن کو بتا دیتا ہوں۔ کیا نام ہے آپ کا؟"

"میرا نام غلام جیلانی ہے۔" میں نے اپنی اصلی شناخت بتا دی۔ وہ بندوق کو سیدھے ہاتھ میں لے کر بڑے مؤدب طریقے سے کار کی طرف بڑھا اور پھر اس نے کار کی کھڑکی کے قریب ہو کر ان کو میرا نام بتا دیا۔ کار کا دروازہ ایک دم کھل گیا۔ ستنا جا صاحب تیزی سے اس میں سے باہر نکل آئے، بڑی حیرت سے گیٹ کی طرف دیکھنے لگے۔ انہیں شاید یقین نہیں آ رہا تھا کہ غلام جیلانی یوں بے نقاب ہو کر اُن کے سامنے آ جائے گا۔ شاید انھیں میری نیت پر بھی شبہ تھا۔ میں ڈرا کہ کہیں وہ پہرے دار کو یہ حکم نہ دے دیں کہ وہ مجھے گیٹ پر ہی گولی مار دے۔ انداز اُن کا ایسا ہی تھا۔ چند لمحوں تک وہ گیٹ کی طرف دیکھتے رہے پھر وہ پہرے دار سے کچھ سرگوشی کرتے ہوئے عمارت کی طرف لوٹ گئے۔ ان کے پیچھے اُن کی بیگم بھی کار سے اُتر گئی۔ پہرے دار اسی وقت بندوق کندھے پر رکھ کر میری طرف آیا اور بولا: "آپ کو صاحب نے اندر بلایا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے گیٹ کھول دیا اور مجھے اپنے ساتھ لے کر عمارت کی طرف چل دیا۔ میں اندر تو چلا گیا مگر اس حالت میں کہ میرا سارا بدن پسینے میں نہا گیا تھا۔ ایک ایسی ابتری میرے وجود پر طاری تھی کہ میں سمجھا، مجھے شاید وہیں مر جانا تھا۔ کوئی اگلے لمحے کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہے۔ مگر میری تو جان ویسے ہی گروی رکھی ہوئی تھی۔ اس کا کچھ حصہ پولیس کے ہاتھ میں تھا، کچھ اُن بڑے لوگوں کی تحویل میں تھا اور جو بچ رہا تھا، وہ اُن کے لیے تھا جنھیں میں نے تباہ کر دیا تھا۔ اُن کے وارث الگ میرے لیے سوہانِ رُوح بنے ہوئے تھے۔ ایسے آدمی کو بھلا کہاں قرار مل سکتا تھا۔ جب میں پہرے دار کے ہمراہ اس دروازے تک پہنچا جس کے پیچھے ستنا جا صاحب بیٹھے تھے تو حالت میری ایسی ہو رہی تھی کہ مجھے سردی خانم کے رومال سے چہرے کا پسینہ پونچھنا پڑا۔

دروازہ کھول کر میں جیسے ہی کمرے میں پہنچا ستنا جا صاحب نے ایک دم دروازے کی اوٹ سے نکل کر مجھے پستول کی زد میں لے لیا۔ پہرے دار اس وقت برآمدے سے ہٹ رہا تھا اور مجھے کمرے کے پردوں نے اس کی نظروں سے بالکل اوجھل کر دیا تھا۔ جالی دار دروازے کے پیچھے بڑے دبیز پردے پڑے ہوئے تھے۔

"مجھے افسوس ہے جیلانی صاحب، مگر آپ کی نیت کا مجھے علم نہیں ہے، بیٹھ جائیں۔" ستنا جا صاحب نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے ستنا جا صاحب! میں تو خود آپ سے پناہ کی درخواست کرنے آیا ہوں۔ میں آپ کے لیے کسی بُری نیت کا سوچ بھی نہیں سکتا ہوں۔" میں نے اُن کے سامنے بنے ایک چبوترے کے قریب پہنچ کر کہا۔ انھیں خود بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ میرے خلاف پستول تان کر کوئی عقلمندی بھی کر رہے ہیں کہ نہیں۔ اُن کا تذبذب اُن کی آنکھوں سے نمایاں تھا۔

"کیسے آئے ہیں آپ؟"

"بہت سی باتیں ہیں جو میں آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔ اس پستول کا تکلف نہ کریں اور اطمینان سے بیٹھ کر میری بات سُن لیں۔" یہ کہہ کر میں صوفے پر گر گیا۔ انھیں مجھ سے ایسی امید نہیں رکھنی چاہیے تھی۔ ایک لحاظ سے تو وہ میرے محسن تھے۔ بڑے فسادے سے انھوں نے مجھے بچا لیا تھا لیکن اس رات انھیں میری نیت پر میرے ارادے پر اعتبار نہیں آ رہا تھا۔ پستول انھوں نے بالآخر جیب میں ڈال لیا۔ وہ اس شام بہت ہی عمدہ سوٹ پہنے ہوئے تھے۔

"آپ کہیں جا رہے ہیں؟"

"ہاں ملک اشرف کے ہاں ایک دعوت ہے۔ بہت سے لوگ وہاں آئے ہوں گے۔ مجھے آپ نے ہی فون کیا تھا؟"

"جی ہاں، وہ میں ہی تھا۔"

"آپ جانتے ہیں فون کے بھی کان ہوتے ہیں۔ میں آپ کے ساتھ کیسے بات کر لیتا؟"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں ستنا جا صاحب مجھے افسوس ہے کہ

میرا نام ہی باعثِ ننگ ہو چکا ہے۔"

"اب کیسے آئے ہیں آپ؟"

"آپ نے پوچھا نہیں کہ میں پولیس کے ہاتھ سے کیسے چھوٹ گیا؟"

"وہ مجھے سب کچھ معلوم ہے۔ جس آدمی نے آپ کو وہاں سے چھڑایا اس کے بارے میں مجھے ابھی تک کچھ پتہ نہیں چل سکا۔"

"اور اُسے میں بھی نہیں جانتا ہوں۔ مجھے گاڑی سے اتار کر وہ تھوڑی دور تک میرے ساتھ چلا اور پھر مجھے کھیتوں میں چھوڑ کر بھاگ گیا۔"

"مجھے اس میں بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ بہرحال مجھے خوشی ہے کہ آپ اُس روز بچ گئے ورنہ مجھے آپ کی موت کا بہت افسوس ہوتا۔"

"یہ آپ کی مہربانی ہے کہ آپ ایسا سوچتے ہیں مگر میں یہ کہنے آیا ہوں کہ میں ڈھلوں صاحب کو امرتسر کے قریب سہسرام گاؤں کے گرودوارے سے رہا کروا لایا ہوں اور اب وہ اپنی حویلی میں ہیں۔"

"سچ؟ یہ کیسے ہو گیا۔ وہ سہسرام جا پہنچے تھے؟" ستنا جا صاحب نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ "ہم نے تو انھیں سب جگہ ڈھونڈ لیا تھا۔"

"بس یہ میرا نصیب ہے کہ میں چھپے خزانے دریافت کر لیتا ہوں۔ اُن کی ٹانگ پر ایک زخم آ گیا تھا جس کی وجہ سے وہ یہاں نہیں آ سکے ورنہ وہ ضرور آتے۔"

"یہ تو بہت اچھی خبر سُنائی ہے آپ نے۔ آپ ..... واقعی بہت کام کے آدمی ہیں جیلانی صاحب! آپ نے بلاشبہ بہت بڑا کام کیا ہے۔"

"یہ میرا فرض تھا جناب! ڈھلوں صاحب میرے دوست بھی تو ہیں۔"

"میں آپ کے لیے چائے منگواتا ہوں۔"

"نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے، آپ کو دیر ہو جائے گی۔"

"مگر وہ سارا معاملہ ہوا کیسے؟ میں اس کی تفصیل سننا چاہتا ہوں۔"

میں نے انھیں وہ سب کچھ بتا دیا جو مجھے پیش آ چکا تھا۔ وہ بڑی توجہ سے میری باتیں سنتے رہے پھر میز پر رکھے کاغذ قلم کو ہاتھ میں لے کر اُن چھ آدمیوں کے نام لکھنے لگے جو میں نے انھیں تفصیل سے بتا رہے تھے اور کہا تھا کہ اب اُن کا اگلا قدم انگلی طرف اٹھے گا۔ وہ نام کاغذ پر اتار کر کچھ پریشان سے ہو گئے، بولے: "آپ کو اچھی طرح یاد ہے کہ یہی لوگ اُن کی زد میں ہیں۔"

"جی ہاں مجھے یہ ہی معلوم ہوا ہے مگر اب میرا مسئلہ ایک اور ہے جناب اور مجھے اس میں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔"

"وہ کیا ہے؟"

"دیکھیں سب سے پہلے تو آپ مجھے پولیس سے بچانے کی تدبیر کریں ورنہ وہ مجھے کسی بھی دن گرفتار کر لیں گے۔ بہت سے لوگ اب مجھے پہچان چکے ہیں۔"

"ہاں۔ یہ تو بہت ضروری ہے مگر میں تنہا کچھ نہیں کر سکتا۔ آپ میرے ساتھ چلیں، میں آپ کو بڑے صاحب کے سامنے پیش کر دوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ڈھلوں صاحب کے واقعہ کو سُن کر آپ کی ضرور مدد کریں گے۔"

"میرا دوسرا مسئلہ یہ ہے ستنا جا صاحب کہ ہماری کچھ رقم یہاں ایک بینک میں جمع ہے۔ میں وہاں سے آج کچھ روپے لینے کے لیے گیا تو مجھے پولیس نے گھیر لیا۔ مینجر نے دراصل اُن کو خبردار کر دیا تھا۔ میں بڑی مشکلوں سے اپنی جان بچا کر نکلا ہوں مگر اب وہ میری رقم دبا کر بیٹھ گئے ہیں، وہ رقم مجھے واپس ملنی چاہیے۔"

"تو یہ بات ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک آدمی مجھ سے اس واقعے کا ذکر کر رہا تھا مگر مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ پولیس آپ کے پیچھے لگی تھی۔ کتنی رقم ہے آپ کی وہاں؟"

"یہی کوئی اسّی بیاسی لاکھ ہوگی۔"

"اوہ! اتنی بڑی رقم! مجھے حیرت ہے۔ پولیس نے واقعی وہ رقم منجمد کر لی ہوگی۔ یہ تو بہت بُرا ہوا جیلانی صاحب! مجھے کچھ سوچنے دیں۔"

"اس میں سوچنے کی کیا بات ہے۔ وہ سیدھے نہیں ہوتے تو مجھے ہی کچھ کرنا پڑے گا۔ میں وہ رقم چھوڑ تو نہیں سکتا۔"

"اٹھیں آپ میرے ساتھ چلیں۔ ہم باقی باتیں راستے میں کر لیں گے۔"

"میں آپ کے ساتھ چلوں؟"

"ہاں کوئی حرج نہیں۔ آپ بھی دعوت میں شریک ہو جائیں۔"

"مگر میں کس حیثیت میں وہاں جاؤں گا؟"

"میرا خیال ہے کہ میں بڑے صاحب سے آپ کی ملاقات کروا دوں گا۔ ڈھلوں صاحب کو بچا کر آپ نے ہم پر بہت بڑا احسان کیا ہے جیلانی صاحب! میں یہ بات بڑے صاحب کے علم میں لانا چاہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے چلیں، میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں اُن کے ساتھ چل دیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ گاڑی گیٹ سے نکال کر ملک اشرف کے گھر کی طرف چل دیے۔ اُن کی بیگم بھی گاڑی میں موجود تھی۔ ڈرائیور کو انھوں نے جان بوجھ کر ساتھ نہیں رکھا تھا۔ اُن کی بیگم اگلی نشست پر بیٹھی تھی اور وہ خود گاڑی ڈرائیو کر رہے تھے۔ چند لمحوں بعد وہ بیگم سے مخاطب ہو کر بولے: "جانتی ہیں آپ کہ پچھلی نشست پر کون آدمی بیٹھا ہے؟"

اُن کی بیگم نے سر گھما کر پہلی بار مجھے بہت غور سے دیکھا اور

بولی " جی نہیں۔ میں نے تو انھیں پہلی بار دیکھا ہے کون صاحب ہیں یہ ؟"

"یہ ۔۔۔ یہ غلام جیلانی ہیں۔ جناب غلام جیلانی ۔"

" اوہ ۔۔۔ تو یہ ہیں غلام جیلانی ۔" اس نے اپنی بڑی بڑی غلافی آنکھیں گھما کر مجھے ایک بار پھر بڑے غور سے دیکھا، بولی ۔ "مگر انھیں آپ کہاں لے جا رہے ہیں ؟ آپ کے پاس یہ کیسے آ پہنچے ؟ کسی مصیبت میں نہ پھنس جائیں آپ !"

" کچھ نہیں ہوتا بیگم ! کچھ ان کے ہم پر ایسے ہی احسانات ہیں کہ میں انھیں آج بڑے صاحب سے ضرور ملوا دوں گا۔ یہ ۔۔۔۔۔ یہ ڈھلوں صاحب کو انڈیا سے بچا لائے ہیں ۔"

" اچھا ! یہ کیسے ممکن ہوا ؟ وہ انڈیا کیسے جا پہنچے ؟"

"بس کچھ ایسی ہی بات تھی۔ ابھی سنا ہے وہ کچھ بیمار ہیں۔ کل میں اُن کے پاس جاؤں گا ۔"

بیگم دوبارہ نہیں بولی۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی تھی۔ ملک اشرف صاحب کی کوٹھی نہر کے دوسرے کنارے تھی ۔ جب ہم وہاں پہنچے تو اس وقت آٹھ بج رہے تھے اور اُن کی کوٹھی بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ لان میں جا بجا بڑے بڑے قمقمے لگے تھے اور اشرف صاحب کے مہمان باہر لان میں ایک بڑے سے شامیانے کے نیچے بیٹھے تھے۔

گاڑی سے اتر کر جب ہم مہمانوں کی طرف بڑھے تو دروازے پر کھڑے آدمی نے ستنا جا صاحب کو بڑے تپاک سے سلام کیا، بولا۔ "آئیے آئیے ستنا جا صاحب! آپ نے تو بہت دیر کر دی۔ سب لوگ آپ کی راہ دیکھ رہے تھے ۔"

"بس تیار ہونے میں دیر لگ گئی۔ بیگم ساتھ ہوں تو یہی ہوتا ہے۔ ان سے ملیں اشرف صاحب یہ ہیں ہمارے سردار کریم نواز، آپ سے ملنے کے بہت مشتاق تھے ڈیرے کے بہت بڑے زمیندار ہیں ۔"

" اوہ ! آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ اُن کو آپ زنانہ حصّہ میں بٹھا دیں ۔" ملک اشرف نے ان کی بیگم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ دوسری طرف نکل گئیں تو ستنا جا صاحب مجھے ساتھ لے کر مردانہ حصے میں داخل ہو گئے۔ میری حالت بہت ہی دگرگوں ہو رہی تھی مجھے جس حیثیت میں ستنا جا صاحب نے وہاں متعارف کرایا تھا میں اس پر پورا نہیں اُتر رہا تھا۔ اگرچہ میرا لباس اس بات کی گواہی دیتا تھا کہ میں معزز آدمی ہوں مگر میرے وجود میں جو افراتفری مچی تھی وہ میرے چہرے سے عیاں تھی مگر میں نے اپنی اس شدید نفسیاتی الجھن پر چند قدم بعد قابو پا لیا۔ مجھے وہاں ایک مجرم کی حیثیت سے تو نہیں جانا چاہیے تھا۔ ایسی صورت میں کہ ستنا جا صاحب میرا ساتھ دے رہے تھے۔ سارے ہی چہرے میرے لیے اجنبی تھے۔ میں شاید اُن میں سے کسی کو بھی نہیں جانتا تھا مگر عین ممکن

تھا کہ اُن میں سے بہت سے لوگ مجھ سے واقف ہوں، اپنے اس احساس سے مجھے چھٹکارا نہیں مل رہا تھا۔ اُن کی نظریں میرے لیے تیغِ دودم کا کام کرتی تھیں۔

کوئی بیس پچیس مہمان وہاں جمع تھے اور اِدھر اُدھر صوفوں میں دھنس کر بیٹھے تھے۔ بڑے صاحب کی تصویریں تو میں نے بہت دیکھی تھیں مگر اس روز انھیں ایک مرصّع صوفے پر مہمانوں سے الگ تھلگ بیٹھے دیکھ کر پہلی بار مجھے محسوس ہوا کہ وہ کوئی بہت ہی مردم شناس آدمی ہیں۔ بر چھے ایسا اونچا قد تھا اُن کا اور وہ بہت ہی قیمتی سوٹ پہنے اپنے پانچ چھ دوستوں میں گھر کر بیٹھے تھے۔ محفل نجی قسم کی تھی جس میں تکلفات کو زیادہ دخل نہیں تھا۔ مجھے ستنا جا صاحب ایک صوفے پر بٹھا کر آگے نکل گئے تو میں نے وہاں بیٹھتے ہی اپنی ذہنی کشمکش سے نجات حاصل کرنے کے لیے سگریٹ سلگا لیا میرے لیے وہ بالکل ہی انوکھا تجربہ تھا۔ اتنے سارے معزز آدمی وہاں جمع تھے اور میں اندر ہی اندر اُن کے درمیان خود کو بہت ہی نکو سمجھ رہا تھا۔ میری آنکھوں میں بار بار ترمرا سا ناچنے لگتا تھا۔ یوں کہ مجھے سامنے کی چیزیں دھندلی دھندلی نظر آتی تھیں۔ دراصل آدمی کی عظمت یا اس کی کمینگی اس کے اپنے اندر موجود ہوتی ہے۔ کسی محفل میں آپ خواہ مخواہ ہی بالا بلند محسوس کرتے ہیں کسی میں آپ کو بار بار یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ آپ کو وہاں نہیں جانا چاہیے تھا میرے ساتھ بھی یہی ہو رہا تھا۔

اب تک تو میں نے مہمانوں کو بس صرف ایک نظر دیکھ کر اُن کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ سگریٹ کے مرغولے بناتے ہوئے میں نے ایک بار پھر ان پر نگاہ ڈالی تو مجھے محسوس ہوا کہ بڑے صاحب کے پاس ڈھلوں صاحب بھی موجود ہیں ان کو دیکھ کر میں حیرت زدہ رہ گیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھے تھے اور اُن کی ٹانگ کا زخم ان کا توازن قائم نہیں رہنے دیتا تھا۔ قدرے لنگڑا کر وہ دوسری جگہ جا بیٹھے۔ اُن کا وہاں موجود ہونا میرے لیے حیرانی کا باعث بن رہا تھا۔ وہ بھی بہت صاف ستھرا لباس پہنے ہوئے تھے اور شکل صورت سے اس زمیندار طبقے کا حصہ معلوم ہوتے تھے جس کی زندگی عیش کا مرقع ہوتی ہے مگر سوال یہ تھا کہ وہ وہاں کیسے آ گئے ؟ وہ تو چوگوٹھ میں گھر کا نظام درست کرنے میں مصروف تھے۔ انھیں اس دعوت کی خبر کیسے مل گئی ؟

مجھے وہاں بیٹھے ابھی پانچ ہی منٹ گزرے تھے کہ اُن کی نظر مجھ پر جم گئی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ اچھل سے گئے اور مہمانوں سے معذرت کرتے ہوئے تیزی سے اٹھے اور لنگڑاتے ہوئے میرے پاس آ پہنچے۔ ان کو سامنے دیکھ کر میں بھی اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ ابھی تک ستنا جا صاحب سے اُن کی مڈبھیڑ نہیں ہوئی تھی۔

"یہ ۔۔۔ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں ؟"

" میں آپ کا خادم سردار کریم نواز یہاں حاضر ہوں ۔" میں نے ان کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"مگر ۔۔۔ مگر آپ یہاں کیسے آ گئے ؟ یہ قصہ کیا ہے سردار کریم نواز صاحب !" وہ اپنے قدم سنبھالتے ہوئے میرے پاس صوفے پر بیٹھ گئے۔

" مجھے ستنا جا صاحب یہاں لائے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ وہ بڑے صاحب سے میری ملاقات کروا دیں گے ۔"

"غضب کرتے ہیں وہ بھی۔ یہاں پولیس کے کئی اعلیٰ افسر آئے ہوئے ہیں اگرچہ وہ وردی میں نہیں ہیں مگر ۔۔۔ یہ بڑی گڑبڑ کی بات ہے، سردار صاحب !"

" دفع کریں۔ جو ہونا ہے ہو جائے گا۔ میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔ اس محفل میں آ کر میں پاگل ہو گیا ہوں ۔"

" خیر ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ میں ستنا جا صاحب سے خود بات کرتا ہوں مگر بڑے صاحب سے کہنا کیا ہے آپ کو ؟"

" وہ باتیں میں نے ستنا جا صاحب سے کہہ دی ہیں۔ وہ خود دیکھ لیں گے کہ انھیں کیا کرنا ہے ۔"

" ٹھیک ہے۔ ابھی ہم کھانے کے لیے اندر جائیں گے تو میں بھی بڑے صاحب سے آپ کا ذکر کروں گا ۔"

" مگر آپ یہاں کیسے آ گئے آپ تو زخمی تھے ڈھلوں صاحب !"

"میں بر کی کے ساتھ علاج کے لیے شہر آ گیا تھا۔ میں نے سوچا میں اشرف صاحب سے بھی مل لوں مگر جب یہاں آیا تو پتہ چلا کہ اُن کے ہاں دعوت ہے ۔"

" چلیں یہ اچھا ہوا سارے فیصلے آج ہی ہو جائیں گے۔ کسی نہ کسی طرح اس پولیس سے میری جان چھڑائیں میں بہت پریشان ہو رہا ہوں ۔"

" فکر نہ کریں اس کی بھی کوئی تدبیر کر لیں گے ہم ۔" یہ کہہ کر وہ صوفے سے اُٹھے اور لنگڑاتے ہوئے پھر بڑے صاحب کے پاس جا پہنچے۔ اس دوران ستنا جا صاحب بھی وہاں جا بیٹھے تھے۔

چند ہی لمحوں بعد میں نے دیکھا کہ بڑے صاحب پائپ پیتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھے اور ستنا جا صاحب اور ڈھلوں صاحب کو ساتھ لے کر خیمے کے عقبی حصے کی طرف چل دیے۔ وہ کسی بات پر آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ جب وہ قنات کی آخری دیوار تک پہنچے تو اچانک بڑے صاحب نے نگاہ اُٹھائی اور میرے چہرے کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگے۔ چند لمحوں تک وہ مجھے اسی طرح دیکھتے رہے مگر ابھی وہ کوئی اندازہ نہیں لگا سکے تھے۔ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے تھے کہ ساری کوٹھی کی بتیاں ایک دم گل ہو گئیں۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا چھا گیا۔ میں تڑپ کر اپنی جگہ سے اٹھا اور ایک جھٹکے سے بڑے صاحب کے پاس جا پہنچا۔ بس

ایک ثانیے کی دیر ہوئی ہو گی کہ ایک دم کئی گولیاں خیمے کے طول و عرض میں پھنکارتی ہوئی لپکیں اور اس کے ساتھ ہی کئی چیخیں فضا میں اُبھرنے لگیں۔ میں نے بڑے صاحب کے عین سامنے پہنچ کر ان کو گولیوں سے بچانے کے لیے ایک دم نیچے بٹھا دیا۔ میں اس وقت ان کی ڈھال بن گیا تھا۔ گولیوں کی ایک اور بوچھار پڑی ستنا جا صاحب اور ڈھلوں صاحب اپنی جان بچانے کے لیے اِدھر اُدھر ہٹ گئے تھے۔ اچانک ایک گولی سنسناتی ہوئی میرے کندھے میں لگی۔ میں درد سے پاگل ہو گیا مگر میں نے بڑے صاحب کو اٹھنے نہیں دیا۔

"آپ لیٹے رہیں بڑے صاحب ! گولیاں آپ کے لیے ہیں۔ آگے نکل جائیں ۔" خیمے کے اندر افراتفری مچ گئی تھی۔ اندھیرا اتنا تھا کہ نگاہ کام نہیں کرتی تھی۔ میں نے بڑے صاحب کو دھکیل کر قنات کی دیوار کے نیچے سے گزار دیا۔

اندھیرا کوئی دس منٹ تک غالب رہا۔ اس عرصے میں خدا معلوم اُن گولیوں نے کس کس کو تباہ کر دیا تھا۔ عورتوں کے حصے میں بھی چیخ پکار کی آوازیں فلک شگاف ہو گئی تھیں جیسے ہی بڑے صاحب دوسری طرف نکلے میں بھی اپنے درد سے بے نیاز ہو کر اُن تک جا پہنچا۔

"یہاں سے نکل جائیں بڑے صاحب ! اٹھیں ۔" میں نے اپنا کندھا دباتے ہوئے ان کو اوپر اٹھا دیا۔ وہ سُن ہو کر رہ گئے تھے۔ اُن کے منہ سے بات نہیں نکلتی تھی مگر ابھی وہ اٹھے بھی نہیں تھے کہ بتیاں پھر روشن ہو گئیں۔ خیمے میں مہمان اِدھر اُدھر لوں لیٹے تھے جیسے وہ ابھی ابھی بمباری سے بچ کر نکلے ہوں۔ میں بھی اپنی جگہ سے اُٹھ گیا۔ بازو کا درد بڑھتا جا رہا تھا مگر وہ گولی جو میں نے سہہ لی تھی اگر کام کر جاتی تو اس شام بڑے صاحب وہاں سے زندہ بچ کر نہیں نکل سکتے تھے ۔۔ بتیاں روشن ہوئیں تو معلوم ہوا کہ دیوار کے ساتھ جو لوگ کھڑے تھے ان میں سے بہت سے زخمی ہو چکے تھے۔ ملک اشرف بھی زخمیوں میں شامل تھا۔ ستنا جا صاحب البتہ بچ گئے۔ وہ قنات کی دیوار کو اٹھا کر پھر اندر آ گئے۔

" آپ ۔۔۔ آپ ٹھیک تو ہیں ؟" کسی نے افراتفری میں آگے بڑھ کر بڑے صاحب سے پوچھا۔

" ہاں میں ٹھیک ہوں، انھیں البتہ گولی لگ گئی ہے انھیں فوراً ڈاکٹر کو دکھاؤ ۔" بڑے صاحب نے میرے کندھے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ گولی بائیں بازو میں لگی تھی اور گوشت کو چیر کر آگے نکل گئی تھی۔ خون تھا کہ بس بہتا چلا جا رہا تھا۔ ایک آدمی نے اچانک مجھے باہوں میں بھرا اور وہ مجھے اٹھا کر عمارت کے اندر لے گیا۔ ستنا جا صاحب اور ڈھلوں صاحب بڑے صاحب کے پاس ہی رہ گئے۔ چند لمحوں بعد ڈاکٹر بھی وہیں آ گیا اور اس نے میری قمیص اتروا کر میرے زخم کا

معائنہ شروع کر دیا۔ ابھی وہ میری مرہم پٹی کر ہی رہا تھا کہ بڑے صاحب، ستناجا صاحب اور ڈھلوں صاحب کے ساتھ کمرے میں آ گئے۔ کئی اور لوگ بھی ان کے پیچھے آ رہے تھے مگر کسی نے انھیں دروازے میں ہی روک دیا۔

"ان کا کیا حال ہے ڈاکٹر؟"

"جی میں نے زخم دیکھ لیا ہے اور پٹی بھی کر دی ہے۔ زخم خاصا گہرا ہے مگر ہڈی بچ گئی ہے۔"

"باہر جو لوگ زخمی ہو چکے ہیں آپ ان کو بھی دیکھ لیں۔ کوٹھی میں سے کسی کو باہر نہ جانے دیں، ڈوگر صاحب یہ میرا حکم ہے۔" بڑے صاحب نے پاس کھڑے ایک آدمی سے کہا۔ وہ ان کا حکم سن کر اسی وقت باہر نکل گیا۔

ڈاکٹر نے مجھے ایک ٹیکہ بھی لگا دیا اور اپنی چیزیں سنبھال کر بولا۔ "اب آپ کپڑے پہن لیں۔ انشاء اللہ آپ جلدی ٹھیک ہو جائیں گے۔ میرا خیال ہے آپ کا درد بھی کم ہو گیا ہے۔"

"جی ہاں۔ درد تو بالکل نہیں ہے۔ ٹیکہ شاید اسی درد کے لیے تھا۔"

"ہاں — اس میں کچھ اور دوا بھی ملی تھی۔ یہ کیپسول بھی منگوا لیں، اور چھ چھ گھنٹے بعد کھاتے رہیں۔" یہ کہہ کر وہ بڑے صاحب کے کہنے کے مطابق اسی وقت باہر نکل گیا۔ کمرے میں صوفے موجود تھے جن کے آگے بہت صاف ستھری سجی سنوری شیشے سے مزین میزیں رکھی تھیں۔ ہر میز پر مالی نے ایک ایک گلدستہ سجا رکھا تھا۔ میں اس وقت قالین پر بیٹھا تھا۔ جیسے ہی ڈاکٹر باہر نکلا میں نے شیروانی اٹھا کر پہن لی۔ مگر اس کے بازو میں یہ بڑا سا سوراخ گولی کی خبر دیتا تھا اور اس کو بدل لینا تو میرے بس کی بات نہیں تھی۔ اتنے میں ملک اشرف صاحب بھی کمرے میں آ گئے اور ڈھلوں صاحب کے قریب پہنچ گئے۔

بڑے صاحب نے میرے بازو کا زخم دیکھا تو بولے۔ "ملک صاحب! ان کے لیے کوئی کوٹ یا شیروانی مل جائے تو بہت اچھا ہو۔ یہ سوراخ تو بہت برا لگتا ہے۔"

"جی میں ابھی منگواتا ہوں میرا خیال ہے ان کو میری شیروانی پوری آ جائے گی۔" یہ کہہ کر ملک اشرف اسی وقت دوسری طرف نکل گیا۔ ڈھلوں صاحب بھی بڑے صاحب کے پاس ہی صوفے پر بیٹھ گئے تھے اور اب وہ سگریٹ سلگانے لگے تھے۔ ان کی نظر برابر مجھ پر جمی تھی مگر کنکھیوں سے۔ براہ راست ان کی نگاہ مجھ پر نہیں پڑ رہی تھی۔ حالت یہ تھی کہ ڈھلوں صاحب کی ٹانگ کا زخم شاید پھر سے ادھڑ گیا تھا۔ وہ بڑی بے چینی سے پاؤں کبھی یوں رکھتے اور کبھی یوں۔ چند منٹ اسی طرح گزر گئے۔ بڑے صاحب کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب ہوا کیسے۔ ملک اشرف کی کوٹھی میں بلاشبہ پولیس بھی آئی ہوئی تھی۔ ان کے بغیر تو وہ کہیں بھی نہیں جاتے تھے اگرچہ وہ تقریب بالکل ہی نجی قسم کی تھی مگر پولیس وہاں بھی موجود تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ ستناجا صاحب کے ساتھ مجھے دیکھ کر ان لوگوں نے میرے بارے میں زیادہ پوچھ گچھ نہیں کی تھی اور میں سردار کریم نواز کی حیثیت سے اندر جا پہنچا تھا مگر اس کا یہ مطلب تو اخذ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ اپنے فرائض سے غافل تھے۔ انھوں نے ہر آدمی کو اندر بھیجنے سے پہلے شناخت کر لیا ہو گا۔

"کیا خیال ہے ڈھلوں صاحب! یہ کون لوگ تھے؟ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا ہے۔ آپ ادھر صوفے پر آ جائیں۔" انھوں نے دوسرے صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔

"نہیں بڑے صاحب! میں یہاں ہی ٹھیک ہوں آپ کے قدموں میں۔ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ میں آج آپ کو اتنے قریب سے دیکھ رہا ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور قالین پر سرک کر ان کے قریب جا بیٹھا۔ میری بات سن کر وہ مسکرا دیے مگر جواب نہیں دیا۔ میرا خیال ہے کہ جس غلام جیلانی کے بارے میں وہ اتنا کچھ سن چکے تھے اس کے بارے میں کسی نے انھیں یہ نہیں بتایا تھا کہ میں دیکھنے میں بہت ہی نستعلیق قسم کا آدمی لگتا ہوں اور میرے اطوار میں ایک عجیب سا رکھ رکھاؤ ہے۔ وہ شاید یہی سمجھتے تھے کہ میں کوئی بہت ہی لٹھ مار قسم کا گنوار آدمی ہوں جسے خون کے رنگ کے سوا کوئی دوسرا رنگ پسند نہیں ہے اور میرے پستول میں سے گولیاں ابلتی رہتی ہیں مگر ان کی وہ مسکراہٹ دیکھ کر میرا وہ خیال بدل گیا۔ بلاشبہ کسی کو دیکھے بغیر اس کے بارے میں کوئی رائے قائم کر لینا دانشمندی کی بات نہیں ہوتی اور بڑے صاحب میرے بارے میں اپنا پہلا خیال شاید یکسر بدلنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

"کیا خیال ہے آپ کا؟ ہمیں بھی تو کچھ بتائیں اگر یہ آپ کے دوست ادھر نہ ہوتے تو ہمارا سینہ تو چھلنی ہو گیا ہوتا۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں جناب! اتنی ساری پولیس کے باوجود وہ لوگ اپنا کام کر گئے۔ آپ کا ایک ڈی سی بھی ختم ہو چکا ہے اور دو پولیس افسر بھی۔ ملک صاحب کا ایک عزیز بھی شدید زخمی ہے۔"

"ہمیں معلوم ہے اور ہم خود پر بہت لعنت ملامت بھی کر رہے ہیں۔ ہمیں ادھر نہیں آنا چاہیے تھا۔" بڑے صاحب نے نہایت ہی بے چارگی کے لہجے میں کہا۔

اتنے میں ملک اشرف میرے لیے نئی اچکن لے آیا۔ میں نے اپنی شیروانی اتار کر وہ پہنی تو یوں لگا جیسے وہ میرے ہی لیے بنوائی گئی تھی۔ میرا زخم اندر چھپ گیا تھا۔

"یہ آپ کو ٹھیک رہے گی۔ ملک صاحب باہر دیکھیں، کسی آدمی کو کوٹھی سے باہر نہ نکلنے دیں۔ ملازموں کو بھی ادھر ہی باندھ کر رکھیں۔"

"جی بہت بہتر جناب! آپ فکر نہ کریں۔ خدا نے آپ کی جان بچائی ہے مجھ پر بہت بڑا احسان ہے اس کا ورنہ میں تو تباہ ہو گیا ہوتا۔"

"کوئی بات نہیں — ہمارے حصے کی گولی ابھی تیار نہیں ہوئی۔ بہرحال آپ جائیں اور ہمارے حکم کی تعمیل کرائیں۔" بڑے صاحب نے ایک بار پھر اسے تاکید کی۔ انھیں اپنا حکم منوانے کی شاید بہت فکر لگی رہتی تھی۔ نظر ان کی ایسی تھی کہ آدمی میں سے کنگھی کی طرح گزر جاتی تھی۔ ایسا مردم شناس آدمی میں نے کم ہی دیکھا تھا مگر اس روز وہ خدا معلوم کیوں اس چکر میں پھنس گئے۔ ورنہ وہ گرد و پیش کو کھنگال لینے میں دیر نہیں کرتے تھے۔ پتہ نہیں وہ کس بھروسے اور کس اعتبار پر اس روز وہاں اتنے بے فکر ہو کر بیٹھ گئے تھے۔

ملک صاحب باہر نکلے تو ڈھلوں صاحب بولے۔ "جناب! وہ ایک زرہ ہوتی تھی آپ کے پاس وہ نہیں پہنے ہوئے آپ۔"

"نہیں۔ یہ بھی ہماری غلطی تھی۔ ہم اسے ایک بالکل ہی نجی محفل سمجھ رہے تھے۔ سوچا تھا کہ یہاں ہمارا دشمن کون ہو گا مگر......"

"خدا نے ہی آپ کو محفوظ رکھا ہے۔ ورنہ دشمن نے تو کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔"

"ہاں — اس نے اپنا بندہ ہماری طرف بھیج دیا۔ غلام جیلانی! آئیں ہم ان لوگوں کو ایک بار پھر دیکھنا چاہتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ صوفے سے اٹھ گئے۔ بولے۔ "ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی ہے کہ...... ہم آپ کے بہت شکر گزار ہیں جیلانی صاحب! بخدا ہم پر ایسا احسان کسی نے نہیں کیا تھا۔ آپ سے ہمارا تعارف ابھی ابھی ہوا ہے مگر یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ تعارف اتنا گہرا ہو جائے گا۔"

"میں کیا کہوں جناب! آپ کے لیے تو میری جان بھی حاضر ہے۔ میں تو اب تک کچھ بھی نہیں کر سکا ہوں، کچھ بھی نہیں۔" میں نے قالین سے اٹھ کر ان کے سامنے سر ڈالتے ہوئے کہا۔ وہ بڑی گہری دل چسپی سے میرا ردعمل دیکھ رہے تھے۔ میں اپنے پاؤں ہی سے اکھڑا جا رہا تھا۔ قد میرا ان کے برابر ہی تھا مگر میں سمجھ رہا تھا کہ میں منحنی سا ہو کر رہ گیا ہوں۔ کم تر بلکہ کم ترین۔ ادنیٰ اور بے وزن — میرے سامنے کھڑا ایک ایسا آدمی میرا شکریہ ادا کر رہا تھا جس کے اشارے پر قوم کٹ مرنے کو تیار رہتی تھی۔ میرا تو کوئی وجود ہی نہیں تھا جو ان کے سامنے ٹھہر سکتا۔ میں سوچتا تھا کہ اگر میں اس شام ان کے کام نہ آ سکتا تو میں اپنی ہی نظروں میں ذلیل ہو کر رہ جاتا۔ اس خجالت سے میں ساری عمر عہدہ برآ نہ ہو سکتا تھا جو اپنے اس فرض سے غافل رہ کر سہنی پڑتی۔ میں درحقیقت اس آدمی پر فدا ہو چکا تھا۔ اس کی شخصیت نے میرے دل و دماغ پر اتنا گہرا اثر چھوڑا تھا کہ وہ اگر کہتا کہ اپنے بدن کو فلیتہ دکھا دو تو میں وہ بھی کر گزرتا۔ اسے اپنا حکم منوانا آتا تھا۔ وہ دماغ سے زیادہ دل کو متاثر کرتا تھا اور اس وقت میری آرزو یہی تھی کہ وہ کہے تو میں آسمان سے چاند اتار کر اس کے ہاتھ پر رکھ دوں۔ مجھ پر اس کے احسانات ہی کچھ ایسے تھے کہ میں اس کے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتا تھا۔

"ہماری سمجھ میں نہیں آیا ہے ستناجا صاحب کہ جب اندھیرا ہوا اور پہلی گولی دغی تو یہ اچانک ہم تک کیسے آ پہنچے۔ انہیں کیسے معلوم ہوا کہ ہماری جان خطرے میں ہے؟"

"اس کی وجہ تو جناب میں بھی نہیں سمجھ سکا ہوں، یہی بتا سکتے ہیں کہ یہ آپ تک کیسے جا پہنچے۔ حالانکہ یہ خاصے فاصلے پر تھے۔"

"میں... میں کیا کہوں ستناجا صاحب! اندھیرے نے میری چھٹی حس بیدار کر دی تھی۔ میں ایسے اندھیروں کا مطلب خوب سمجھتا ہوں اور بڑے صاحب اس محفل کی جان تھے۔ ان تک نہ پہنچ سکتا تو میں کئی آدمیوں کو راستے میں ڈھیر کر دیتا۔ ان کی جان لاکھوں جانوں سے بھی زیادہ ہے۔" میں نے جان بوجھ کر اپنے لہجے میں سارے جہان کی حلاوت پیدا کرتے ہوئے کہا تاکہ وہ میری جان سپاری اور جاں نثاری کے اور زیادہ قائل ہو جائیں۔

ذرا دیر کے لیے انھوں نے ستناجا صاحب کو گھورا اور پھر مجھ سے بولے۔ "کیا ہم یہ نہ سمجھیں کہ آپ کو اچھی طرح معلوم تھا کہ یہاں کیا ہونے والا ہے مگر آپ نے عین وقت پر اپنا ارادہ بدل کر ہماری حفاظت کا ذمہ لے لیا؟"

ان کی یہ بات سن کر میرا رنگ فق ہونے لگا۔ بڑے صاحب نے معاملے کو ایک اور ہی اڑنگا دے دیا تھا۔ وہ مجھے ہی اس سارے واقعے کا ذمہ دار ٹھہرا رہے تھے۔ ان کے دل میں شاید یہ خیال زیادہ ہی گہرا دھنس گیا تھا کہ ان پر گولی میں نے چلوائی ہے اور وہ میرے ہی ساتھی تھے جنھوں نے اس تقریب میں بھیس بدل کر ان پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ وہ بات کو بہت زیادہ گھما پھرا کر ایسی جگہ لے آتے تھے کہ ان کے مخاطب کے لیے کوئی راہ کھلی نہیں رہتی تھی۔ وہ میرا شکریہ تو ادا کر چکے تھے مگر اب اس کی قیمت بھی مجھ سے وصول کر لینا چاہتے تھے۔ انداز ان کا ایسا ہی تھا کہ میں سمجھا مجھے وہ وہیں پولیس کے حوالے کر دیں گے۔

"ایسا نہ کہیں جناب! ایسا نہ کہیں ورنہ پھر کبھی کوئی کسی کے کام نہیں آ سکے گا۔ لوگ مرتے دم وصیت کر جائیں گے کہ کسی کے لیے اپنی جان کبھی خطرے میں نہ ڈالنا۔ ایسا نہ کہیں۔ میں... میں آپ پر کوئی احسان نہیں دھر رہا ہوں اور مجھے کوئی قسم کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے ان سے دو قدم پیچھے ہٹ کر کہا۔ میرا پستول اب تک میرے پیٹ سے بندھا تھا اور میں اس کو کسی بھی وقت بے نیام کر سکتا تھا مگر ویسا ہی ایک خوفناک ریوالور ستناجا صاحب نے بھی شیروانی پر لٹکا رکھا تھا اور ڈھلوں صاحب بھی خالی ہاتھ نہیں تھے۔ مجھے یہی محسوس ہوا جیسے ہم سب کو اپنے اپنے پتے وہیں سامنے رکھ دینے ہوں گے۔

میری بات سن کر وہ مسکرا دیے، بولے۔ "ہم تو ویسے ہی مذاق

کر رہے تھے جیلانی صاحب۔ ورنہ ایسا خیال ہم کبھی دل میں نہیں لا سکتے ہیں۔ آپ نے بے مثال بہادری کا ثبوت دیا ہے اور ہم واقعی آپ کے تہہِ دل سے شکر گزار ہیں۔ مجرموں کو ان مہمانوں میں آپ بھی ڈھونڈیں اور ہم بھی ڈھونڈتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئے۔ ایک نئے جذبے نے اُن کا سینہ پھُلا رکھا تھا۔ انھیں ایک نئی زندگی ملی تھی اور وہ اس وقت مہمانوں کی طرف ایک عجیب سے طمطراق کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ اس عرصے میں پولیس نے تمام مہمانوں کو لان کے عین بیچ میں تین قطاروں میں کھڑا کر رکھا تھا۔ زنانہ حصے میں عورتیں الگ پریشان تھیں۔ وہ بڑے صاحب کو لان کی طرف بڑھتے دیکھ کر کھسر پھسر کرنے لگیں۔ لاشیں وہاں سے ہٹائی جا چکی تھیں اور مہمانوں کی خدمت پر مامور ملازم الگ کھڑے ہو گئے تھے۔ جیسے ہی ہم لان میں پہنچے تمام مہمان اپنی اپنی جگہوں پر مؤدب ہو گئے۔ بڑے صاحب نے ان سب کو یوں دیکھا جیسے وہ سب اُن کے لیے اجنبی ہوں۔ اُن کی تعداد بھی کوئی پچیس کے قریب تھی۔ عورتیں بھی اتنی ہی تھیں اور اب تک انہیں مردانہ حصے میں آنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ حیرت مجھے یہ تھی کہ بڑے صاحب کی بیگم وہاں موجود نہیں تھیں۔ حالاں کہ اُن کے بغیر ایسی محفلیں بالکل ہی بے جان رہتی تھیں۔

بڑے صاحب نے مجھے اور ستناجا صاحب کو اپنے ساتھ رکھا اور ڈھلوں صاحب کو الگ کرسی پر بٹھا دیا کیونکہ انھیں چلنے میں دشواری محسوس ہوتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ بڑے صاحب کے ذہن میں بھی خیال سمایا ہوا تھا کہ مہمانوں میں سے ہی کسی نے اُن کے خلاف یہ سازش کی ہے۔ میں بھی شاید یہی سوچ رہا تھا۔ مگر ہم کسی پر یوں ہی تو ہاتھ نہیں رکھ سکتے تھے۔

ہم تینوں نے مہمانوں کی پہلی قطار کو کھنگال لیا۔ وہ سب کے سب شہر کے بڑے بڑے صنعتکار اور رئیس لوگ تھے۔ اُن کے چہروں سے ہمیں تاسف کے سوا کوئی اور چیز نہیں ملی۔ وہ سب کے سب بُت بنے کھڑے تھے اور ہر آنکھ جھکی ہوئی تھی۔ جیسے وہ بھی سمجھ رہے ہوں کہ اگر وہ وہاں نہ آتے تو شاید ان پر ایسا قاتلانہ حملہ نہ ہوتا۔ انداز ان کا ایسا ہی تھا۔ ہم چار قدم دُور پچھلی قطار تک جا پہنچے۔ ستناجا صاحب نے وہاں بھی ہر آدمی کا بڑے صاحب سے تعارف کرایا۔

"یہ ملک اللہ یار ہیں۔ یہ شیخ ایاز احمد، یہ کلب عباس، یہ غازی الدین۔" وہ اسی طرح اُن سے بڑے صاحب کا تعارف کرانے چلے گئے۔ ساتویں نمبر پر جو صاحب کھڑے تھے اُن کو دیکھ کر میں کچھ چونک سا گیا۔ اُن کا نام علی نواز کوناری تھا۔ اور وہ بھلوال کے زمیندار تھے۔ اور ملک اشرف صاحب انہی کے علاقے سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کے چہرے کا تاثر احمقانہ حد تک اس واقعے سے لاتعلقی کا اظہار کر رہا تھا مگر ایسی لاتعلقی کا مفہوم وہ نہیں تھا جو وہ ظاہر کرنا چاہتے تھے۔ وہ نہایت بیش قیمت لباس پہنے ہوئے تھے۔ یوں سمجھیں کہ اُن کی ٹائی میں جو ہیرا جڑا تھا، وہ بھی لاکھوں کا ہو گا۔ بڑی خیرہ کُن چمک تھی اس ہیرے کی۔ وہ ولایتی لباس پہنے ہوئے تھے اور کلائی میں جو گھڑی انھوں نے باندھ رکھی تھی، وہ ساری کی ساری طلائی معلوم ہوتی تھی۔ قمیص کے بٹن اور اُن کی انگوٹھیاں بھی اُن کے متمول کو ظاہر کرتی تھیں۔ بڑے صاحب نے ان سے ہاتھ ملایا تو وہ مسکرائے تو سہی مگر یوں جیسے ناگوار فرض ادا کر رہے ہوں۔ ہم اُن کو دیکھ کر آگے بڑھے تو میری نگاہ پھر بھی اُن کے چہرے پر جمی تھی۔ ایک بہت گہرا دبا دبایا سانس اُن کے ہونٹ کھول کر باہر نکلا جیسے کسی بڑے امتحان سے اُن کی جان چھوٹ گئی ہو۔

"یہ وقار الٰہی جنجوعہ ہیں۔" ستناجا صاحب نے پھر کہنا شروع کیا۔ وہ آٹھویں نمبر پر کھڑے تھے۔ "ان کی کھیوڑے کے قریب ایک بہت بڑی فیکٹری ہے علاقے کے بہت بڑے زمیندار ہیں۔ ان کا ایک بیٹا کراچی میں ایک بینک کا وائس پریذیڈنٹ ہے۔" یہ کہہ کر ستناجا صاحب نے بڑے صاحب کو اُن سے ملوا کر اگلے آدمی تک پہنچا دیا مگر جنجوعہ کو میں نے ایک دم لرزتے دیکھ لیا۔ وہ گھبرا کر بائیں طرف جھکے تو کوناری صاحب نے انہیں تھام لیا اور تب میں نے دیکھا کہ وہ جنجوعہ صاحب کی کمر تھپتھپانے لگے تھے۔ بس ایک لحظے کے لیے یہ منظر میں نے دیکھا اور پھر ہم آگے بڑھ گئے۔

"ان سے ملیں یہ سعید الدین ہیں۔ لاہور کے مشہور صنعت کار۔ ان کی کئی فیکٹریاں ہیں۔" بڑے صاحب نے اُن سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ سعید الدین کو خود پر مکمل اختیار حاصل تھا۔ وہ بڑی خوش دلی سے مسکرائے مگر وہ پُراسرار سا تاثر جو میں کوناری صاحب اور جنجوعہ صاحب کے چہروں پر دیکھ آیا تھا، وہ سعید الدین کو بھی پریشان کیے ہوئے تھا مگر نہ تو ستناجا صاحب اسے سمجھ سکے اور نہ بڑے صاحب۔ ہم اُن سب سے مل کر پچھلی قطار میں جا پہنچے دس آدمی وہاں بھی بڑے صاحب سے ملنے کے منتظر تھے۔ ستناجا صاحب نے ان سے بھی میرا تعارف کروا دیا۔ مگر وہ بات جس کے لیے بڑے صاحب اُن سے فرداً فرداً مل رہے تھے ابھی تک اُن کے ہاتھ نہیں آئی تھی۔ مہمانوں سے مل کر ہم ملازموں کی قطار تک جا پہنچے۔ ستناجا صاحب کو ان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا مگر میرے ذہن میں افراتفری جو مچ گئی تھی وہ ختم نہیں ہو رہی تھی ـــ ان ملازموں کو دیکھ کر میرے ذہن میں طرح طرح کے سوال اُٹھنے لگے۔ اُن میں سے پانچ آدمیوں کے حلیے ایسے تھے کہ وہ مجھے کسی فوج کے سپاہی دکھائی دیتے تھے۔ خوب پلے ہوئے اور وہ سب

کے سب مہمانوں کی میزوں پر خدمت کے لیے مامور تھے۔ کسی کا کوئی الگ شعبہ نہیں تھا۔ ستناجا صاحب کی مدد کے لیے اچانک ایک آدمی آگے بڑھ آیا۔ وہ شاید اُن کا سپروائزر تھا۔ بولا۔ "یہ فیضی ہے سرکار، یہ غلام محمد ہے، یہ ادھر ہی کام کرتے رہے ہیں۔ یہ کبیر احمد ہے، یہ عبدل ہے۔ سب کے سب بیرے ہیں۔ ملک صاحب نے انھیں ہوٹل النور سے بلوایا تھا۔ یہ مشتاق ہے۔"

وہ اسی طرح اُن کے نام بتاتا رہا اور ہم انھیں ایک ایک کر کے نظروں میں تولتے رہے۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ عبدل اور کبیر احمد نے یوں ہی بے خیالی میں اپنے ہاتھ پیچھے ہٹا کر کمر پر رکھ لیے۔ یوں جیسے وہ انھیں کھولنا نہیں چاہتے ہوں یا وہ ان کے وجود سے منکر ہو رہے ہوں۔ ستناجا صاحب نے بھی اُن کی یہ حرکت دیکھی مگر بولے کچھ نہیں۔ اُن کو دیکھ کر ہم تیزی سے مہمانوں کے درمیان میں سے گزر کر برآمدے کی طرف چلے گئے۔ بڑے صاحب نے اُن کے بیچ میں سے گزرتے ہوئے صرف اتنا کہا۔ "اب آپ تشریف رکھیں جناب! ان کے لیے کھانا لگوائیں ملک صاحب!" ملک اشرف اُن کے سامنے ہی کھڑے تھے۔

"جی۔ بہت بہتر۔ لیکن ۔ ۔ ۔ جناب صورتِ حال ایسی ہو گئی ہے کہ ۔ ۔ ۔ یہاں تو ماتم ہو گیا ہے جناب۔"

"آپ بھی ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ ایسے میں کھانے کا ہوش کسے ہو گا۔" اس وقت ہم لان سے نکل کر برآمدے میں جا پہنچے تھے۔

"ستناجا صاحب!" میں نے انھیں روکتے ہوئے کہا۔ میری آواز بڑے صاحب نے بھی سن لی تھی۔ "آپ کھانا کسی کے سامنے نہیں رکھیں گے۔ اُن دو ملازموں میں سے دو آدمیوں کو اندر بھیج دیں۔ ایک عبدل اور دوسرا کبیر احمد۔ مگر اس طرح کہ کسی کو پتہ نہ چلے کہ ملازموں میں سے کسے الگ کیا گیا ہے۔"

"یہ ۔ ۔ ۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ! کسی پر شبہ ہے آپ کو؟" ستناجا صاحب نے میرے قریب ہو کر کہا۔

"جی ہاں۔ ساری صورتِ حال ابھی واضح ہو جائے گی۔ آپ جائیں ملک صاحب! مہمانوں کے پاس بیٹھیں اور وہ جو کوناری صاحب ہیں نا انھیں اندر بھیج دیں۔ اُن کے ساتھ سعید الدین اور جنجوعہ کو بھی الگ کر لیں۔"

ملک اشرف نے بڑی حیرت سے مجھے دیکھا اور بولے۔ "کوئی خاص بات ہے کیا؟"

"جی ہاں۔ میں اسی لیے تو کہہ رہا ہوں۔ بڑے صاحب تو مجھے اُن سے ہی ملوانے کے لیے وہاں لے گئے تھے۔"

ملک صاحب نے بڑی بے بسی سے ستناجا صاحب کی طرف نظر ڈالی۔ بڑے صاحب میری باتیں بڑے غور سے سن رہے تھے ایک شک کا زہریلا ناگ اُن کے ذہن میں بھی ابھرنے لگا تھا۔ وہ میری نگاہ سے اس معاملے پر غور کر رہے تھے۔ مگر جب میں نے سعید الدین اور وقار الٰہی جنجوعہ اور علی نواز کوناری کا نام لیا تو وہ میرے قریب جھک آئے اور سرگوشی کے انداز میں بولے۔

"سردار صاحب! کیا آپ نے ان کے رویے میں کوئی خاص تبدیلی محسوس کی ہے؟"

"جی ہاں بڑے صاحب! بات کچھ ایسی ہی ہے۔ پتہ نہیں یہ میرا حق ہے کہ نہیں مگر میں ان کو ایک بار پھر دیکھنا چاہتا ہوں۔" میں نے اُن کو دوسروں سے الگ کر کے کہا۔ وہ مجھے سردار کریم نواز کی حیثیت سے بھی پہچاننے لگے تھے۔ میرا خیال ہے ستناجا صاحب نے انھیں سمجھا دیا ہو گا۔"

"ٹھیک ہے۔ ستناجا صاحب! آپ اُن لوگوں کو الگ کر کے ادھر لے آئیں۔ اسی کمرے میں لے آئیں۔"

باہر پولیس نے ابھی کوئی باقاعدہ کارروائی شروع نہیں کی تھی صرف لاشیں، اُن کا محل وقوع دیکھنے کے بعد لان سے پرے ہٹا دی گئی تھیں میرے زخم کی طرف انھوں نے کوئی دھیان نہیں دیا تھا۔ بڑے صاحب کی بات سن کر ستناجا صاحب ملک اشرف کو لے کر کمرے سے نکل گئے۔ اب بڑے صاحب کے پاس میں اور ڈھلوں صاحب ہی رہ گئے تھے۔ جب ہم برآمدے میں پہنچے تو ڈھلوں صاحب بھی قدم گھسیٹتے ہوئے وہاں آ پہنچے تھے اور اب وہ ہمارے ساتھ کمرے میں آ بیٹھے تھے۔ مجھے یہ احساس شدت سے ڈسنے لگا تھا کہ باہر پولیس کے کچھ ایسے لوگ بھی ہوں گے جو مجھے پہچانتے ہوں گے۔ اُن کی نگاہیں کچھ ایسی اندھی بھی نہیں ہوتی ہیں اگرچہ بڑے صاحب نے مجھے کئی بار سردار صاحب کے نام سے پکارا تھا مگر بات اس سے آگے بھی بڑھ سکتی تھی۔ اسی لیے میں نے طے کر لیا تھا کہ اب میں باہر نہیں نکلوں گا کیونکہ پولیس کے کئی اور آدمی کوٹھی میں آ چکے تھے اور اُن میں انسپکٹر جنرل بھی شامل تھا۔ اس بے چارے نے تو ابھی تک مجھے کہیں بھی نہیں دیکھا تھا مگر اس کے ساتھ جو لوگ آئے تھے وہ تو آنکھیں بند نہیں کر سکتے تھے، وہ تو غلام جیلانی کو اس کے ہر حلیے اور ہر لباس میں پہچان لینے کی قدرت رکھتے تھے۔ میں نے تو صرف ایک شیروانی ہی اوڑھ رکھی تھی اور وہ بھی پرائی۔ ورنہ تو میں اسی چہرے سے وہاں پھر رہا تھا جس کے ساتھ اتنے دن میں نے تھانے میں گزارے تھے صورتِ حال کسی بھی طرح میرے حق میں نہیں جاتی تھی۔ میں الگ ہو کر کمرے کے ایک کونے میں روشنیوں کے نیزے سے بچ کر بیٹھ رہا۔

چند ہی منٹ بعد انسپکٹر جنرل آفریدی اندر آ گئے ـــ وہ بڑے مؤدب طریقے سے بڑے صاحب کو سلام کر کے اُن کے پاس جا کھڑے، بولے۔ "مجھے ابھی ابھی فون پر اطلاع ملی تو میں جیسے کھڑا تھا ویسے ہی چلا آیا۔ آپ تو بہرحال محفوظ ہیں نا؟"

"جی ہاں۔ ہم تو خدا کے فضل سے ٹھیک ہیں۔ آپ اس معاملے کو اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ مجرموں کو ہر حال میں سزا ملنی چاہیے، یہ ہمارا حکم ہے۔ کوئی شخص بچ کر نہیں جانا چاہیے۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ ساری کوٹھی اور اردگرد کی سڑکیں روک لی گئی ہیں۔ مجرم ابھی اس علاقے سے نکل نہیں سکے ہوں گے۔"

"بس ٹھیک ہے۔ باہر جا کر صورتِ حال کا جائزہ لیں اور پھر مجھے بتائیں۔ ستنا جا صاحب، آپ کو تمام واقعہ بتا دیں گے۔"

"بہت بہتر جناب! آپ فکر نہ کریں۔ مجرم بچ کر نہیں جا سکتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ اسی وقت باہر نکل گیا۔

کوئی بیس منٹ تک بڑے صاحب، ڈھلوں کے ساتھ الگ صوفے پر بیٹھے معاملے کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتے رہے۔ اس دوران میں دُوسرے صوفے پر بیٹھ کر سگریٹ پیتا رہا۔ میرا خیال ہے ڈھلوں صاحب نے میرے بارے میں پھر اُن سے کوئی بات کہہ دی تھی۔ جس کا اثر یہ ہوا تھا کہ انھوں نے مجھے وہاں سے ہٹا کر اسی وقت کوٹھی کے عقبی کمرے میں پہنچا دیا۔ بڑے صاحب کی پریشانی سہ چند ہو گئی تھی۔ انھیں یہ احساس ستانے لگا تھا کہ وہ ایک ایسے آدمی کو پناہ دینے پر مجبور ہو گئے ہیں جس کے نامۂ اعمال میں سیاہیاں ہی سیاہیاں لکھی ہیں اور جس نے حال ہی میں پولیس کو ایک اور شکست دی ہے۔ انھیں بھی یہ بات منظور نہیں تھی کہ پولیس کے لوگ پھر میرے قدم کاٹ دیں۔ وہ مجھے ان سے بچا لینا چاہتے تھے۔ اسی لیے ڈھلوں صاحب نے جب میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے وہاں سے اٹھا کر دوسرے کمرے میں پہنچایا تو وہ بھی بے حد پریشان تھے۔ بولے "آپ ادھر ہی بیٹھیں ہاشم صاحب! ان تینوں ملازموں کو لے کر ایک آدمی ابھی آپ کے پاس آئے گا۔ وہ جو تین مہمان ہیں انھیں ہم نے الگ کمرے میں بٹھا دیا ہے۔ ملازموں سے مل لینے کے بعد آپ اُن سے بھی مل سکتے ہیں۔"

"جی بہت بہتر، ویسے میرا خیال یہ ہے کہ مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔"

"ہر کام میں اللہ کی کوئی مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے۔ آپ کا یہاں آنا باعثِ رحمت ثابت ہوا ہے۔ ہو سکتا ہے مجرموں تک آپ کی رسائی پہلے ہو جائے اور بڑے صاحب آپ سے اور خوش ہو جائیں۔"

"ہاں، یہ تو ہے۔ بہر حال میں اُن سے ضرور مل لیتا ہوں۔ انھیں آپ فوراً ادھر بھیج دیں۔"

وہ میری بات سن کر اسی وقت باہر نکل گئے۔ وہ ایک عام سا کمرہ تھا۔ چند کرسیاں اِدھر اُدھر بڑے قرینے سے رکھ دی گئی تھیں۔ اور دیوار کے ساتھ ایک پلنگ بچھا تھا۔ پتہ نہیں وہ کمرہ کس کے لیے تھا۔ بہر حال وہ بھی کوٹھی کا ایک اہم حصہ معلوم ہوتا تھا۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر پردے لٹک رہے تھے۔ کوئی دس منٹ بعد ستنا جا صاحب دو ملازموں کو ساتھ لے کر میرے کمرے میں آ گئے اور آتے ہی انھوں نے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ عبدل کی حالت کچھ ایسی تھی کہ اس کا ذہنی اضطراب اس کے چہرے سے عیاں تھا مگر کبیر احمد اپنی جگہ بہت مطمئن نظر آتا تھا۔ ستنا جا صاحب نے انھیں اندر لا کر کرسیوں پر بٹھا دیا، بولے "بہت سی باتیں آدمی کی سمجھ میں نہیں آتی ہیں مگر ان کا رویہ کچھ زیادہ ہی حیران کن ہے۔ مجھ سے یہ کہہ رہے تھے کہ میں انھیں غسل خانے میں جانے کی اجازت دے دوں۔ یہ عبدل خاص طور پر بہت بے چین ہو رہا تھا۔ بہر حال آپ انھیں دیکھ لیں سردار صاحب! یہ اس واقعہ کے عینی شاہد ہیں۔"

"آپ تشریف رکھیں ستنا جا صاحب! ہاں بھئی عبدل تمھیں غسل خانے میں جانے کی ایسی کیا جلدی تھی؟"

"سرکار! آدمی غسل خانے میں کیوں جاتا ہے بھلا؟ ضرورت ہوتی ہے تو جب جاتا ہے نا۔ ابھی ہم ہوٹل النور سے آئے ہیں۔ وہاں تو ہمیں کسی نے نہیں روکا۔ ہم ملک صاحب کے نوکر نہیں ہیں۔ اپنے مالک کے حکم سے آئے ہیں۔"

"کیا نام ہے تمھارے مالک کا؟"

"حاجی عبدالستار۔"

"ہوں۔ تمھیں معلوم ہے کہ بڑے صاحب پر گولی کس نے چلائی ہے؟"

"وہ تو ادھر سرکار ایک دم اندھیرا ہو گیا تھا، بتیاں ہی گل ہو گئی تھیں۔ کسی کو کسی کا ہوش نہیں رہا۔"

"تم اس وقت کہاں تھے؟"

"جی میں کچھ سامان لے کر مہمانوں کی طرف جا رہا تھا کہ تڑتڑ شروع ہو گئی۔" اس کے لہجے میں آہستہ آہستہ اعتماد بڑھ رہا تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے وہ اپنے خوف پر غالب آ چکا ہے۔ میں کرسی سے اٹھ کر اس کی طرف بڑھا اور جاتے ہی میں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر سونگھنے کی کوشش کی۔ اُن میں سے بارود کی بُو اٹھ رہی تھی جو اَب تک اگرچہ بہت ہی کم رہ گئی تھی مگر اس کا نشان ابھی باقی تھا۔

"آپ بھی اس کے ہاتھ سونگھیں ستنا جا صاحب! یہ بارود کی بُو ہے، ذرا دیکھیں۔" ستنا جا صاحب حیرت زدہ ہو کر اُس کے قریب ہو گئے۔ میں نے عبدل کے دونوں ہاتھ ان کی طرف بڑھا دیے عبدل نے پریشان ہو کر ہاتھ پیچھے کھینچ لیے۔ "یہ کیا کہہ رہے ہیں سرکار! یہ پیاز کی بُو ہے۔ میں کام کرتا رہا ہوں، کئی چیزوں پر میرے ہاتھ لگتے ہیں۔" عبدل نے مجھے بڑے ہی غضبناک انداز سے مخاطب کرتے ہوئے کہا مگر ستنا جا صاحب نے بھی اس عرصے میں اس کے ہاتھ اور اُس کی کلف لگی سفید وردی سونگھ لی تھی۔

"یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں سردار صاحب! آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اس بدبُو کے کیا معنی ہیں؟ تم سچ سچ بتا دو عبدل ورنہ میرے

پاس اور بھی کئی طریقے ہیں۔ تم یُوں بچ کر نہیں جا سکو گے۔" ستنا جا صاحب ایک دم طیش میں آ گئے اور انھوں نے عبدل کو بالوں سے پکڑ کر کبیر سے الگ کر دیا۔ عبدل اب واقعی پریشان ہو چکا تھا مگر اس کی تربیت ایسی تھی کہ اس سے کوئی راز اگلوانا آسان نہیں تھا۔ ستنا جا صاحب اسے گھسیٹ کر پلنگ کی طرف لے گئے تو میں کبیر احمد کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"کیوں بھئی! تم کیا کرتے رہے ہو؟ کتنی گولیاں چلائی تھیں تم نے اور وہ تمھارا پستول کہاں گیا؟"

"یہ غلط ہے جناب! آپ مجھ پر الزام لگا رہے ہیں۔ میں نے کسی پر گولی نہیں چلائی۔ میں بھلا یہ کام کیسے کر سکتا تھا۔"

"یوں کام نہیں چلے گا بچے! تمھیں سب کچھ اُگلنا ہو گا۔ اپنے یہ ہاتھ آگے کرو۔" میں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ اس کے جسم سے بارود کی بدبُو زیادہ تیز دکھائی دیتی تھی۔ اس کے ہاتھ سونگھتے ہی میں نے پوری قوت سے دائیں ہاتھ کا تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا۔

"کتے کے بچے! یہ کام تم نے کس کے کہنے پر کیا ہے، بتاؤ کون لوگ تھے وہ؟ تم بڑے صاحب کو مارنا چاہتے تھے پر کیوں؟"

تھپڑ منہ پر لگتے ہی وہ پیچھے ہٹا اور بڑے ہی تیز طرار لہجے میں بولا "آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔ میرے ہاتھوں میں کوئی بدبُو نہیں ہے۔ میں نے کوئی پستول نہیں چلایا۔ آپ خواہ مخواہ ذلیل کرتے ہیں۔" اس کا انداز عبدل سے کہیں مرعوب کن تھا اور اس کی زبان عبدل کے مقابلے میں زیادہ شُستہ تھی۔

"ستنا جا صاحب ان کو سپاہیوں کے حوالے کر دیں۔ اصل مجرم یہی ہیں۔ وہ اِن سے خود معلوم کر لیں گے کہ یہ کام ان لوگوں نے کس کے کہنے پر کیا ہے۔"

اتنے میں ستنا جا صاحب، عبدل کو دوبارہ گھسیٹ کر کبیر احمد کے پاس لے آئے۔ میرا بایاں بازو کام نہیں کرتا تھا ورنہ میں اُن کو وہیں ادھیڑ کر رکھ دیتا مگر معلوم یہ ہوتا تھا کہ کوئی چھوٹی موٹی مار پیٹ اُن پر اثر نہیں کرے گی۔ انھیں باقاعدہ بیلن میں سے گزارنا ہو گا۔ تب جا کر اُن سے اصل راز معلوم ہو سکے گا۔ کسی نے اُن کی تعلیم و تربیت ایسے ہی طریقے سے کی تھی کہ وہ شاید مرتے دم تک بھی ہمارے سامنے منہ کھولنے پر آمادہ نہیں ہو سکتے تھے۔

"آپ ہمارے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں جناب! یہ سراسر ظلم ہے۔" کبیر نے پھر منہ کھولا۔ اب وہ خود بھی اپنے ہاتھ سونگھ رہا تھا۔ "یہ دیکھیں میرے ہاتھوں سے کوئی بدبُو نہیں آ رہی ہے۔ آپ خواہ مخواہ ہم پر شک کر رہے ہیں۔ ہم ہوٹل کے ملازم ہیں، ہمیں کیا غرض ہے کسی پر گولی چلانے کی۔"

"تم یہ بتاؤ کہ تم دونوں جنگلی سوٴر کی طرح جو پھیل رہے ہو تو یہ سارا راشن تمھیں کون کھلاتا رہا ہے؟ کس کے دسترخوان کے گتے ہو تم؟ کتنا معاوضہ لیا ہے تم نے اس کام کا؟ سیدھی طرح بتا دو ورنہ اچھا نہیں ہو گا۔ مجھے نہیں جانتے ہو تم ورنہ اتنی دیر تم کبھی نہ لگاتے۔" میں نے اپنا چُپ شاہ اُن پر تانتے ہوئے کہا۔ پستول میرے ہاتھ میں دیکھ کر وہ بھونچکا سے رہ گئے مگر مجھے معلوم تھا کہ وہ صرف اس کے دیدار سے مطمئن نہیں ہوں گے۔ میں نے کبیر احمد کے ابھرے ہوئے بالوں کا نشانہ لے کر گولی چلا دی۔ وہ گھبرا کر فوراً ہی نیچے بیٹھ گیا مگر گولی اس کے کئی بال اڑا کر لے گئی۔ پہلی بار اس کا رنگ ہلدی ہونے لگا۔ اس نے شاید ایسی گولی کوئی نہیں دیکھی تھی جو دھماکہ پیدا کیے بغیر چل جاتی ہو۔

"یہ کیا کرتے ہیں آپ! یہ سراسر ظلم ہے، ہم تو بیراگیری کرتے ہیں سرکار! ہمیں کیا پتہ یہاں کیا ہو گیا ہے۔"

"تمھیں سب پتہ ہے کبیر احمد! اور تمھیں سب کچھ بتانا پڑے گا ورنہ یہ گولی سینے میں اتار دوں گا۔"

عین اس وقت بڑے صاحب ہمارے کمرے میں آ گئے۔ میں نے فوراً ہی پستول جیب میں رکھ لیا۔ مجھے اُن سے اب بھی پردے کی ضرورت تھی۔ کئی باتیں ایسی تھیں جو میں انھیں نہیں بتانا چاہتا تھا مگر جب انھوں نے کمرے کا منظر دیکھا تو پریشان ہو کر بولے۔ "یہ... یہ ہم کیا دیکھ رہے ہیں سردار کریم نوانہ! کیا کہتے ہیں یہ دونوں؟"

"اصل مجرم یہی ہیں جناب! میں نے انھیں اچھی طرح پہچان لیا ہے۔ انھیں بے شک آپ سپاہیوں کے حوالے کر دیں۔ یہ خود بتائیں گے کہ ہوا کیا تھا اور کس کے ایماء پر ہوا تھا۔" میں نے بڑے صاحب کو دائیں ہاتھ کی کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ آپ نے جنجوعہ اور کوناری پر جو شک ظاہر کیا، وہ بھی ٹھیک ہی تھا۔"

"جی ہاں۔ انھیں بھی آپ یہاں بلوائیں۔ میرا خیال ہے کہ اُن میں اتنا حوصلہ نہیں ہو گا... شاید وہ فوراً ہی اعتراف کر لیں۔ سعید الدین بھی انہی کا ساتھی ہے۔"

"ستنا جا صاحب! انھیں پولیس کے حوالے کر دیں۔ وہ خود اِن کی خبر لے لیں گے۔ غضب خدا کا، یہ تو ہم سب کو مار دینا چاہتے تھے۔" بڑے صاحب نے اپنے شدید ذہنی کرب سے نجات حاصل کرنے کے لیے سگریٹ سُلگا لیا۔ وہ مجھے اس وقت شدید اُداس اور تنہا نظر آئے۔ جیسے وہ پل صراط پر سے گزر رہے ہوں۔ اس بھری محفل میں کوئی بھی اُن کے ہمراہ نہیں تھا۔ اچانک وہ اُٹھ کر باہر نکل گئے۔ ستنا جا صاحب نے بھی اُن کے جاتے ہی عبدل اور کبیر احمد کو پستول کی زد میں لیا اور انھیں وہ ہانکتے ہوئے باہر نکل

گئے ۔ میں وہیں بیٹھا رہ گیا۔ مجھے اب بھی خود کو پولیس سے بچا لینے کی ضرورت تھی۔ ان کے سامنے میں کسی بھی طرح نہیں جا سکتا تھا۔ بڑے صاحب بھی اس صورت حال کو سمجھ گئے تھے کہ وہاں اگر کسی نے میرے چہرے سے نقاب نوچ لیا، کسی نے میری شناخت کر لی اور اسے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ میں اُن کی پناہ میں ہوں تو پھر وہ کچھ بھی نہیں کر سکیں گے مجھ ایسے سوختہ سامان کے لیے وہ اتنا بڑا عہدہ کیسے ترک کر دیتے۔ پھر بھی وہ میرے لیے دل میں ہمدردی رکھتے تھے اور انھیں معلوم تھا کہ میں مصیبتوں کا مارا آدمی دل میں خلوص کے پھول لیے اگر پھر کسی عذاب میں مبتلا ہو گیا تو وہ میرے لیے کچھ بھی نہ کر سکیں گے۔ یہی احساس انھیں پریشان کرتا تھا۔

عبدل اور کبیر احمد باہر نکلے تو میں نے کمرے کی اداسی سے پریشان ہو کر سگریٹ سلگا لیا۔ ایسے میں اس کا دھواں بہت آرام دیتا تھا۔ لگتا تھا وہ دل پر اطمینان کا غبار سے پھیلا دیتا ہے۔ میں دھویں کے مرغولے بنا رہا تھا کہ اچانک مجھے محسوس ہوا جیسے کمرے کے دائیں حصے میں لگے پردے کے پیچھے کوئی چیز حرکت کر رہی ہے۔ اوّل اوّل تو میں سمجھا وہ میرا وہم ہے وہاں بھلا کون ہو سکتا ہے مگر ایسا نہیں تھا۔ میں ابھی صورتِ حال کو سمجھ ہی رہا تھا کہ ایک آدمی اچانک پردے میں سے لپک کر باہر نکلا۔ اس نے ہاتھ میں ایک گولا سا تھام رکھا تھا۔ پردے سے نکلتے ہی اس نے وہ گولا میرے قریب پھینکا۔ میں اپنا ہاتھ پستول تک بھی نہ لے جا سکا تھا کہ وہ گولا پھیل کر دھویں کی صورت اختیار کر گیا۔ اس سے بچنے کے لیے میں کرسی سے اٹھا تو سہی مگر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا دم گھٹنے لگا ہے۔ میں ایک قدم بھی کرسی سے نہیں نکال سکا تھا کہ اس دھویں نے مجھے بے بس کر دیا اور میں جیسے کھڑا تھا ویسے ہی دھڑام سے زمین پر جا گرا۔ میری مفلوج ہوتی ہوئی ذہنی قوتیں صرف اتنا ہی یاد رکھ سکیں کہ وہ آدمی بیروں کی سفید وردی میں ملبوس تھا اور منہ پر اس نے شاید کوئی موٹا کپڑا باندھ رکھا تھا۔ وہ انھی بیروں میں سے ایک تھا جنھوں نے کوٹھی کے لان میں تباہی مچا دی تھی ۔ پتہ نہیں وہ کیا کرنا چاہتے تھے۔ بڑے صاحب کو تو وہ لے ڈوبے تھے۔ وہ کوٹھی میں موجود تو تھے مگر ہر لمحے وہ خود کو ان کا ہدف سمجھ رہے تھے۔ وہاں پولیس بھی موجود تھی۔ انھوں نے تمام بیروں کو ایک جگہ باندھ لیا تھا مگر پھر بھی وہ آدمی ان کی دست برد سے بچ گیا تھا۔ ضیافت کا سارا سامان بس دھرا رہ گیا تھا اور اب وہ مجھ پر آ چڑھے تھے۔ اُن کی سازش کے تانے بانے کا کوئی بھی شخص اندازہ نہیں کر سکتا تھا۔ مجھ سے وہ شاید اس عبدل اور کبیر احمد کی شناخت کا بدلہ لینا چاہتے تھے۔ اسی لیے اُن کی رسّی اب میرے گلے میں آ پڑی تھی۔ میرا خیال ہے کہ اگر بڑے صاحب انھیں کسی جگہ تنہا مل جاتے تو وہ انھیں اُچک لیتے ۔ اُن کے ہاتھ لمبے تھے۔ بے حد لمبے اور یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ اب کی بار ان لوگوں نے اس محفل میں اور کس کس کو اپنا ہدف بنا رکھا تھا۔

اس دلچسپ ترین داستان
کے بقیہ واقعات پانچویں
حصے میں
مُلاحظہ فرمائیں